

لپس ریڈیو

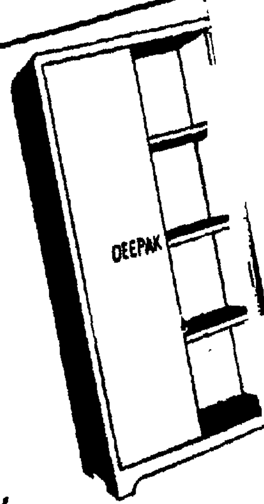


۱۹۶۴ پیچ کے ۱۲ ماڈل
ہر ذوق اور آمدنی کے لوگوں کے لئے
۱۷۵ روپے اور اس سے زیادہ قیمتوں پر

ردرن ریڈیو اینڈ ریفریجریشن کمپنی (پی. لیٹڈ)

حضرت گنج، لکھنؤ
فون نمبر ۲۲۳۲۹

۱۲ مال روڈ، کانپور
فون نمبر ۳۶۲۰۴



DEEPAK STEEL FURNITURE

ALMIRAHS, SAFES, WARDROBES,
FILING CABINETS,
FOLDING TABLES, CHAIRS,
SOFA-SET
AND
SOFA-CUM-BED

RACKS & SHELVES
FOR
STORAGE & DISPLAY
Assorted Sizes ...olor

Metal Components Compa...

34/9, HAZRATGANJ, LUCKNOW
Phone: ...

حسینی ۔ جی نہیں ایسا نہیں میں نے اپنی کہانیوں میں جہاں مستقبل کی نشاندہی کی ہے وہاں اس میں رنگ بھی بھرے ہیں۔
عابد سہیل ۔ جناب صدر میں دفتر سے اٹھ کر آیا تھا اور مجھے اب واپس جانا ہے۔ آپ کی اجازت چاہوں گا۔
ملّا ۔ میرا خیال ہے کہ یہ گفتگو اب ختم کی جائے۔
رام لعل ۔ جی ہاں بات چیت کافی ہو چکی ہے۔ ویسے ہنوز نامکمل ہے اور شاید کبھی بھی مکمل نہ ہو سکے۔ جناب صدر اور حسینی صاحب کا شکریہ۔
عابد سہیل ۔ ملّا صاحب اور حسینی صاحب کا بے حد شکریہ ۔ ہم سب کی تمنا ہے کہ حسینی صاحب کو عمر خضر نصیب ہو اور ہم دس سال بعد ان کی ۵۰ کیرٹ جوبلی اور پھر صد سالہ جشن منائیں۔

سالِ نو مبارک

ماہنامہ کتاب لکھنؤ

افسانہ نمبر

مرتبہ

رام لعل

عابد سہیل

صفحات ۲۱۲

ایک روپے ۶۰ نئے پیسے / مجلد گلیز کاغذ ۳

ماہنامہ کتاب
چوک، لکھنؤ ۳

پاکستان آفس
مسٹر نعیم اکبر خاں، الائڈ فوٹو گرافرس (پاکستان لمیٹڈ
4/5 موتی جھیل، کمرشیل ایریا
ڈھاکہ

۱۹۶۴ کے بہترین افسانے

جلد (۳) نمبر (۱)

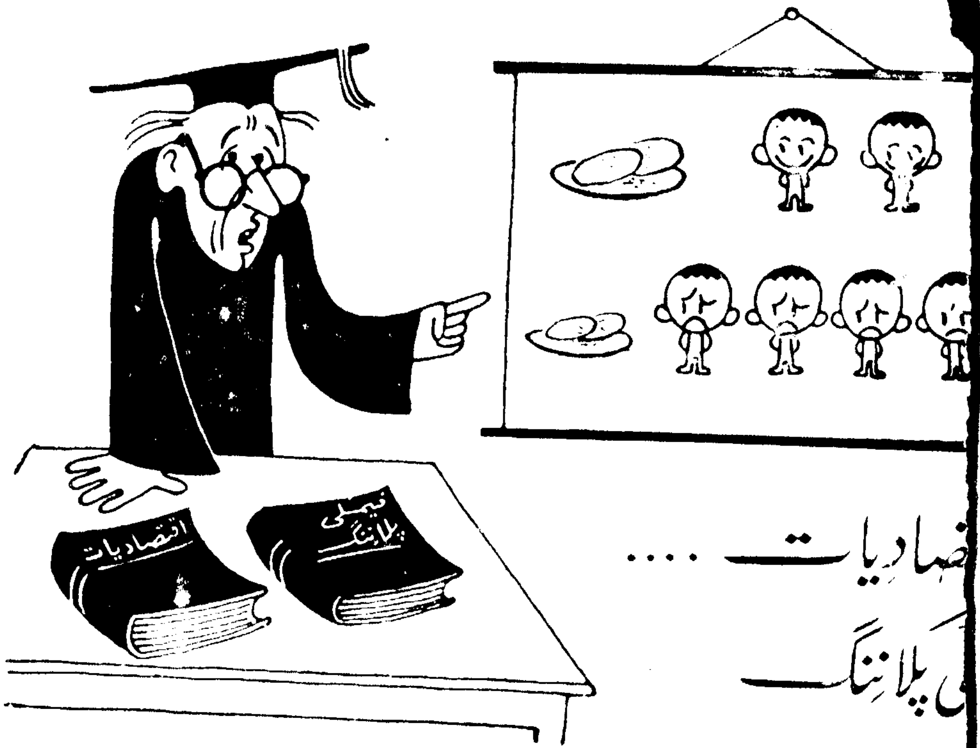
جنوری سنہ ۱۹۶۴ء

زرِ سالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں ½۶ روپے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

مجلسِ مشاورت
حیات اللہ انصاری
سید احتشام حسین
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر سید جمیل احمد
مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ



ہاں، اقتصادیات کا ہماری زندگی میں بڑا دخل ہے۔ ہم میں سے بیشتر کی آمدنی محدود ہوتی ہے نا! اسی آمدنی سے گھر بھر کے سبھی لوگوں کے لئے ڈھنگ سے رہنے سہنے، کھانے پینے اور پہننے کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ تعلیم اور تفریح کے اخراجات بھی اسی آمدنی سے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اور اگر ہو سکے تو تھوڑی بہت بچت بھی کرنا ہوتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے کنبے بڑے ہوتے ہیں، آمدنی زیادہ لوگوں میں بٹ جاتی ہے اور اس طرح ہر شخص کا حصہ نسبتاً گھٹ جاتا ہے۔

چنانچہ سمجھ دار ماں باپ ہمیشہ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اُن کے اتنے ہی بچے ہوں گے، جن کی پرورش و دیکھ بھال وہ ٹھیک ڈھنگ سے کر سکتے ہیں۔ بچوں کو تعلیم دی جانی چاہیئے؛ اُنہیں خوراک اچھی اور مناسب مقدار میں ملنی چاہیئے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کے رہن سہن کے حالات بہتر اور صحت مندانہ ہوں۔

کنبے کو محدود بنانے کے لئے آپ معلومات اور مشورہ مُفت حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی قریبی فیملی ویلفیئر پلاننگ سینٹر میں تشریف لائیں۔

یاد رکھیئے: چھوٹا کُنبہ — خُوش حال کُنبہ

کتاب ، افسانہ نمبر

کتاب، افسانہ نمبر

۱۹۶۲ کے بہترین افسانے

[illegible]

کرشن چندر
راجندر سنگھ بیدی
حیات اللہ انصاری
علی عباس حسینی
خواجہ احمد عباس
عصمت چغتائی
قدرت اللہ شہاب
احمد ندیم قاسمی
قرۃ العین حیدر

ممتاز شیریں
رضیہ سجاد ظہیر
ابراہیم جلیس
خدیجہ مستور
جیلانی بانو
واجدہ تبسم
ستیش بترہ
رحمان مذنب
رضیہ فصیح الدین

اقبال متین
قیصر تمکین
رتن سنگھ
ضمیر الدین احمد
آمنہ ابوالحسن
الطاف فاطمہ
رفعت نواز
رام لعل
عابد سہیل

اور

اردو افسانے کے تین دور ——— ڈاکٹر وزیر آغا

سن چندر

شانو

ں کے چہروں میں مجھے شانو کا چہرہ بہت یاد آتا ہے وہ ایک ک اندام عورت تھی۔ عمر پینتیس سال کے قریب، قد بوٹا سا۔ د رنگا بی، آنکھیں بڑی بڑی اور ڈوبتی ہوئی سی جلد کی رنگت سپید، وہ ہمیشہ ماتھے تک ذرا سا گھونگھٹ کاڑھے سفید دھوتی ر آتی، اس کی پوری شخصیت ایک ایسی تصویر کی مانند تھی جو روز لی ہوتی جا رہی ہو، اسے تپ دق تھی!۔

دنوں دق کا کوئی شافی علاج دریافت نہ ہوا تھا۔ اکثر مریض ۔ بہت کم ایسے خوش قسمت ہوتے تھے جو کسی نہ کسی طرح بچ جاتے ہوتی سی محدود دنیا میں ناکافی ذرائع کے ساتھ میرے والد کو تجربے کرنے کا بہت شوق تھا وہ اکثر مشکل مریضوں کا علاج اور ان میں سے اگر ایک بھی اُن کی کاوش سے اچھا ہو جاتا تو ں ہوتے اور کئی دنوں تک ان کا موڈ کلیوں کی طرح شگفتہ رہتا۔

رتوں کے لئے ہسپتال میں ایک الگ وارڈ تھا۔ لیکن میرے انو کو اس وارڈ میں نہیں رکھا اس وارڈ سے سو گز پرے ایک تھی جس پر ٹین کی چھت تھی اور جس پر چھ کمرے تھے ساتھ لگے تھے۔ ں میں سے دو کمروں میں [illegible] رہتے تھے اور ایک کمرے میں ہسپتال کرٹ چلمچیاں اور دیگر کباڑ بھرا ہوا تھا، چوتھا کمرہ سینئر کمپونڈر دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے اور گپ بازی کے لئے مخصوص کر دیا یا کمرے میں مالی نے باغبانی کا سامان رکھ چھوڑا تھا، چھٹے کمرے تعمال کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیونکہ اس کمرے کے بارے میں جو مریض اس میں آ کے رہتا ہو مر جاتا ہے میرے والد کو اس قسم اعتقاد نہ تھا لیکن جب پے در پے تین چار اسی قسم کے حادثات ہوئے تو انھوں نے لوگوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کمرے کو خالی رہنے دیا۔ شانو کو وہ اس کمرے میں نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے انھوں نے احتیاطاً سینئر کمپونڈر کی گپ بازی کا کمرہ جو سب سے بہتر حالت میں تھا اس سے چھین لیا اور اس میں شانو کو رکھ دیا۔ سینئر کمپونڈر نے اس امر پر اعتراض کیا۔ لیکن والد صاحب کا خیال تھا کہ کمپونڈر کو ایک چھوٹا سا اس کے رہنے کے لئے ملا ہوا ہے تو اسے اسی بنگلے کو اپنی اور اپنے دوستوں کی تفریح کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔ سینئر کمپونڈر موتی رام دل ہی دل میں بہت لیکن اس کے آفیسر کا حکم تھا۔ اس لئے اسے وہ کمرہ خالی کرنا پڑا۔ وہ اسی دن سے شانو کا دشمن ہو گیا تھا۔

عام طور پر مریضوں کے ساتھ ان کی دیکھ بھال کے لئے ان کے باپ بھائی، بہن، خاوند یا دوسرے رشتہ دار آتے تھے اور علاج کے دوران میں وہیں ہسپتال کے کسی برآمدے میں پڑے رہتے تھے، لیکن شانو کے ساتھ اس کا جیٹھ آیا تھا۔ اور اسے ہسپتال میں ڈال کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے موضع کا سب سے امیر آدمی تھا۔ اگر وہ چاہتا تو شانو کے کھانے پینے کا بندوبست کر سکتا تھا اور اکثر امیر مریض علاج کے دوران میں ایسا ہی کرتے تھے۔ لیکن اس نے شانو کے بارے میں کسی طرح کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔ اور چند دن اس کے پاس رہ کر واپس چلا گیا۔

شانو سورج نکلتے ہی اپنی کھاٹ کمرے سے باہر نکال کر دھوپ میں لے آتی اور بستر پر لیٹ کر دھوپ سینکتی، وہ نہایت کم گو اور شریف طبیعت کی عورت تھی اور کسی نے آج تک اس کے منہ سے تلخ بات نہ سنی تھی۔ لیکن مجھے اس بات پر بڑی حیرت تھی کہ وہ چاہے کسی حالت میں ہو اپنے ماتھے پر گھونگھٹ کاڑھے رہتی۔

لیکن ایک بار میں نے اسے گھونگھٹ کے بغیر دیکھ لیا، صرف ایک لمحے کے لئے، دھوپ خوشگوار تھی اور اسے دیکھتے ہی میں بھونچکا رہ گیا، ہوا یہ

انتخاب

ہمارے اندازے کے مطابق ۱۹۶۲ء میں اردو میں کم و بیش دو ہزار افسانے شائع ہوئے، یہ اندازہ لگاتے وقت ہمارے سامنے تقریباً ڈیڑھ ہزار تو وہ افسانے ہیں جو مختلف ماہناموں، دو ماہی، سہ ماہی مجلّوں، روزناموں اور ہفت روزہ اخباروں کے ذریعہ ہم تک پہونچے، ان کے علاوہ ہند و پاک میں یقیناً ایسے بھی جرائد ایسے ہیں جو ہماری نظر سے نہیں گزرتے اس لیے پانچسو کی تعداد ہم نے فرض کر لی (فرض کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ ریاضی کے بہت سے مشکل سوال کچھ نہ کچھ فرض کر کے ہی حل کیے جاتے ہیں۔)

افسانوی ادب کا انتخاب ہمیں پہلی بار کرنا پڑا اور یہ محسوس ہوا کہ دنیا میں سب کام آسان ہیں بس یہی کام مشکل۔ پہلی بار یہ احساس ہوا کہ جو لوگ مختلف ملازمتوں کے لیے امیدواروں کا انتخاب کرتے ہیں انہیں کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان تک پہونچنے والی سفارشوں کا بھی خیال آیا۔

ایک ہی مصنف کے دو تین افسانوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کے بارے میں ہمیں اختلافِ رائے ہوا تو سوچا گیا کہ مصنف کی رائے بھی معلوم کر لی جائے، ہم نے یہ بھی کیا۔ دو ایک خاموش رہے۔ ایک نے صاف صاف لکھ دیا "ہم کیوں مدد کریں"۔ نہ کیجیے مدد۔ ہم نے خود اپنی مدد کر لی ہے —— ایک صاحب نے لکھا "صاحب میری اس سال کی بہترین کہانی تو...... ہے۔ زیرِ نظر کہانی تو میری کہانیوں میں بھی نہیں، چہ جائیکہ بہترین۔" ہم نے ایک بار پھر ساری کہانیوں کو پڑھ ڈالا، اپنا فیصلہ تبدیل کیا اس کے بعد بھی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔

اس انتخاب سے ایک بات واضح ہو جائے گی کہ اردو افسانہ آج پھر ایک تاریخی موڑ پر آپہونچا ہے نعرہ بازی اس نے ترک کر دی ہے۔ لیکن ان نعروں کے پیچھے جو شعور اور جذبہ تھا اسے نئے افسانے نے اپنا ہمسفر بنا لیا ہے۔ اس نے اپنی آواز پہچان لی ہے اور کرشن چندر سے لے کر رفعت نواز تک —— ہر ایک اپنے اپنے راستے پر اپنی اپنی منزل کی تلاش میں ہے۔ انفرادیت کی تلاش اور زندگی کی گہرائیوں میں اتر جانے کی جستجو میں۔

ہم چاہتے تو اس ذیل میں بہت کچھ کہہ سکتے تھے —— ایک ایک افسانے کی خوبیاں گنا سکتے تھے لیکن ہم یہ کارِ نیک آپ پر چھوڑتے ہیں —— دیکھیں آپ کیا کہتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ کا ہر افسانہ ہمارا انتخاب ہے آپ کے فیصلہ کا منتظر ہے۔

—— رام لعل

—— عابد سہیل

مجھے اس کی بات پر بہت غصہ آیا۔ لیکن میں چھوٹا سا لڑکا تھا کیا کر سکتا تھا اور ماں جی یہاں نہ تھیں وہ تو لاہور کے ہسپتال میں پڑی تھیں۔ پتا جی ایک ماہ کی چھٹی لے کر ان کے آپریشن کے سلسلے میں لاہور گئے تھے میں بھی ساتھ گیا تھا۔ آپریشن کامیاب ہوا تھا، لیکن ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ابھی ماں جی کو تین ماہ اور ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔ پتا جی کو مزید چھٹی نہیں ملی تھی، اس لئے وہ ماں جی کو اپنے چھوٹے بھائی کی نگرانی میں چھوڑ کر واپس آ گئے تھے۔ اور اپنے ہسپتال کا کام سنبھال لیا تھا، ہر ہفتے ماں جی کی چٹھی آتی تھی جس میں میرے لئے بہت سا پیار ہوتا تھا، ایک بار انھوں نے میرے لئے قندھاری اناروں کا پارسل بھی بھجوایا تھا، کیونکہ ہمارے علاقے میں قندھاری انار نہیں ہوتے تھے، اور تاراں تو قندھاری انار کے دانے کھا کر حیران ہو گئی تھی، اس کا خیال تھا کہ ہمارے جنگل کے پیڑوں سے بڑے انار کہیں نہیں ہوتے" اسے ڈرنی تو اس انار کے تھا ... بالکل سچ ہے" تاراں کو اقبال کرنا پڑا تھا اور قندھاری انار کو دیکھ کر اسے لاہور کے بارے میں دوسری باتوں کے سلسلے میں بھی یقین کرنا پڑا تھا جو میں نے واپسی پر اسے سنائیں تھیں، قندھاری اناروں نے اسے مکمل قائل کر دیا تھا اور اب اس نے یہ سب سن کر طے کر لیا کہ اب تو وہ صرف مجھ ہی سے شادی کرے گی۔ اور شادی کر کے لاہور رہے گی لیکن اس دوران میں میرا ارادہ بدل گیا تھا کیونکہ میں اب اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو میری ماں جی کی نرس کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی اور جو میرے ساتھ گیند کھیلتی تھی اور بالوں میں ربن لگاتی تھی اس پر میری اور تاراں کی بہت لڑائی ہوئی تھی اور تین دن تک ہم نے ایک دوسرے سے بات نہ کی تھی۔ لیکن لاہور بہت دور تھا اور یہاں تاراں کے سوا اور کوئی میرے ساتھ کھیلنے والا نہ تھا۔ اس لئے دھیرے دھیرے وہ خوبصورت لڑکی میرے ذہن سے غائب ہو گئی اور پھر میں تاراں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ میں نے موتی رام کی خوفناک مونچھوں کے ڈر سے پتا جی کو اس کی باتیں نہیں بتائیں، موتی رام بڑا ہی کمینہ اور بد فطرت آدمی تھا۔ اور اکثر میری الٹی سیدھی شکایتیں کر کے مجھے ماں جی سے پٹوا دیا کرتا تھا۔ اس کا اپنا بھی کوئی بچہ نہ تھا۔ اور اس کی بیوی سوکھی سڑی بد مزاج عورت تھی، جو دن رات کبھی مالی، کبھی چپراسی کبھی اردلی کی بیوی سے لڑا کرتی تھی۔ میں اور تاراں اب کبھی ان لوگوں کے گھر کے پاس سے نہ بھٹکتے، پھر بھی موتی رام یا اس کی بیوی میری ماں سے شکایت کا کوئی نہ کوئی موقع نکال لیا کرتے تھے۔

شانو کے آ جانے سے پتا جی کا ذوقِ تحقیق پھر ابھر آیا تھا۔ وہ ویدک اور یونانی بھی کچھ شدبد رکھتے تھے اور انھوں نے کئی طرح کے نسخے اور کئی طرح کے علاج الگ الگ اور ملا جلا کر بھی شانو پر آزمانے شروع کر دیئے اور شانو کی صحت بہتر ہونے لگی، مجھے تو وہ اس دن سے بہتر معلوم ہونے لگی تھی جس دن سے اس کے سر کے بال بڑھنے شروع ہو گئے تھے اور اب تو اس کے بال لاہور کی میموں کی طرح شانوں تک آ چلے تھے، سیاہ بل کھاتے ہوئے بالوں میں اس کا سپید چہرہ ملیک دم موم کی گڑیا کی طرح پرسکون نظر آتا تھا، صبح و شام وہ اپنا کھانا خود ہی پکاتی تھی اور خود اپنے برتن صاف کرتی تھی، پتا جی نے اس کے کمرے کی دونوں کھڑکیوں کے لئے نیلے رنگ کے پردے لا دیئے تھے۔ جن پر اس نے خود بیل بوٹے کاڑھے تھے، ہولے ہولے اس نے اپنے کمرے کے سامنے کشادہ گھاس کے قطعے کے چاروں طرف سینٹے کی جھاڑیوں کی باڑ لگا دی تھی، اور دو رویہ کیاریوں میں پھولوں کے پودے لگا لئے تھے، باڑ پر زرد توری اور آل کی بیلیں چڑھا لیں اور وہ جو کہ اکیلی آئی تھی ہسپتال کی کھلی فضا میں اور مہربان ڈاکٹر کی ہمدردی پا کر زندگی میں امید اور امید میں جذبہ اور جذبے میں رس ڈھونڈنے لگی تھی۔ اس سے پہلے وہ مر جانے کی خواہش لے کر آئی تھی جس نے زندگی میں کچھ نہ دیکھا ہو جو پندرہ برس کی عمر میں کنواری بیوہ ہو جائے، جس کا مستقبل ایک منڈے ہوئے سر کی طرح سپاٹ ہو، جس کے گھر والے اس کے مر جانے کی شب و روز دعا کرتے ہوں اسے اگر تپ دق نہ ہو تو اور کیا ہو۔ شانو جانتی تھی کہ اس کا جیٹھ اسے اسی لئے لا کے ہسپتال میں چھوڑ گیا ہے کہ وہ ان کی آنکھوں سے دور مر جائے اور کسی کو اس کی تیمارداری نہ کرنا پڑے اور جب وہ مر جائے گی تو اس کا جیٹھ اس کے مرحوم خاوند کی زمینوں پر قبضہ کر لے گا اس لئے اس کا جیٹھ چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد مر جائے۔ اور یہی شانو چاہتی تھی۔ جب وہ ہسپتال میں آئی تھی۔ اور شروع کے بیس پچیس دنوں میں اس نے یہی چاہا تھا کہ وہ جتنی جلد مر جائے اتنا ہی سب کے لئے اچھا ہے، کنواری بیوہ تو دھرتی کے لئے لعنت اور سماج کے لئے گالی اور زندگی کے لئے ایک بوجھ ہوتی ہے جتنی جلدی یہ بوجھ آگ کی نذر ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ مگر یہ کس طرح کا ڈاکٹر تھا جو اسے بتا رہا تھا کہ زندگی ہر انسان کی مقدس حق

...ا اپنے بنگلے سے ہسپتال کی طرف دوڑا دوڑا آیا۔ ابھی پتاجی کو دوپہر کھانے پر بلانے کے لئے، دھوپ خوش گوار تھی لیکن ہوا تیز چل رہی اور شانو باغ کے ایک کونے میں سبھی پھولوں کی کیاریوں میں کھرپا لئے نئی کر رہی تھی کہ ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے سر پر ایک بال بھی نہ تھا۔ سارا سر اس طرح منڈا ہوا تھا جیسے بہرے جی کا چہرہ ... ہوتا ہے۔

جب میں نے اپنے پتاجی سے اس حیرت انگیز امر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا:

"شانو ایک کنواری بیوہ ہے۔"

"کنواری بیوہ ہے تو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا: "ہر عورت کے سر پر بال ہوتے ہیں، لیکن یہ تو اپنے بال منڈ داتی ہے۔"

"خود نہیں منڈ داتی۔ اس کے بال مونڈے گئے ہیں، ہمارے علاقہ کے برہمنوں میں یہ رسم عام ہے کہ اگر کنواری لڑکی بیوہ ہو جائے تو اس کے سر کے سارے بال مونڈ دیتے ہیں۔"

"کنواری لڑکی بیوہ کیسے ہو سکتی ہے؟"

میں نے سوچ سوچ کر پوچھا۔

پتاجی مسکرائے۔ بولے۔

"جس دن شانو کی شادی ہوئی تھی اس دن لگن منڈپ ہی میں اس کا خاوند مر گیا تھا، اس لئے یہ کنواری بیوہ ہے!"

"تو کیا اس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں!"

"کیوں نہیں؟"

"بس ایسا دستور تھا۔"

"یہ کیا دستور ہے؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

ماں جی اگر اس وقت ہوتیں تو ضرور مجھے اس سوال پر مارتیں کیونکہ میرے اوندھے سیدھے سوال کرنے کی شروع سے عادت تھی، لیکن پتاجی مجھے کبھی نہ ٹوکتے۔ اکثر خوش ہوتے تھے لیکن اس وقت میرے سوال کا جواب وہ بھی نہ دے سکتے تھے، اور ہولے ہولے گنگنانے لگے یہ ان کا پیٹنٹ طریقہ تھا جب وہ کسی سوال کا جواب نہ دینا چاہتے تھے تو اسی طرح بیچ میں سے بات چھوڑ کر گنگنانے لگتے تھے۔

"اگر اس کے سر پہ بال ہوں تو وہ اور بھی اچھی لگے گی۔"

آخر میں نے کہہ دیا۔

پتہ نہیں باپ نے اپنے بیٹے کے حسنِ ذوق کو کس نظر سے دیکھا مگر انھوں نے اس پر بھی مجھ سے کچھ نہیں کہا بدستور گنگناتے رہے اتنے میں گھر آ گیا اور ہم لوگ کھانے کی میز پہ چلے گئے۔ اور بات آئی گئی ہو گئی۔

مگر اس دن میں نے کمپونڈر موتی رام کو اپنے دوست پورن مل شاہ سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔

"شاہ جی! کچھ معلوم ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو شانو سے دلچسپی — ہو گئی ہے۔"

"ایں؟ یہ سچ ہے؟"

"بالکل۔ آج میں نے اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا وہ شانو سے کہہ رہے تھے کہ تو اپنے سر پر بال بڑھا لے، وہ دیر تک انکار کرتی رہی۔ مگر وہ برابر اصرار کرتے رہے، آخر وہ راضی ہو گئی اور راضی کیسے نہ ہوتی، اور جب وہ راضی ہو گئی تو ڈاکٹر صاحب مجھے الگ کمرے میں لے جا کر بولے "بال مونڈے جانے سے اس عورت کے اعصاب پر برا اثر پڑا ہے یہ عورت اپنے آپ کو عورت ہی نہیں سمجھتی، میں اس کے اندر عورت پن جگانا چاہتا ہوں تاکہ اس کی زندگی میں تھوڑی سی خوشی آ سکے، اور یہ اپنے مرض کا مقابلہ زیادہ شگفتہ دلی سے کر سکے" یہ ایک نفسیاتی راز ہے موتی رام!"

"ڈاکٹر صاحب بڑے ماہر نفسیات ہوتے جا رہے ہیں!" پورن مل شاہ نے طنزاً کہا۔

"ابھی آگے دیکھو اور کن کن امور میں یہ اپنی مہارت دکھاتے ہیں۔ ہی ہی ہی!"

موتی رام ہنس کر بولا۔ اس کی ہنسی میں بے حد تلخی تھی جو مجھے ذرا بھی اچھی نہ لگی۔ اگر پتاجی نے شانو سے بال رکھنے کے لئے کہہ دیا تو کیا برا کیا ایک بچہ بتا سکتا ہے کہ عورت کے سر پر بال اچھے لگتے ہیں اور میری ماں جی اپنے بالوں میں جوڑا کر کے جب اس میں کبھی کبھار ایک پھول لگا لیتی ہیں تو اور بھی اچھا لگتا ہے۔ یہ موتی رام کی عقل کو کیا ہوا ہے؟۔

موتی رام مجھے اپنے پاس کھڑے دیکھ کر اور اپنے دوست کی باتیں سنتے دیکھ کر کچھ اداس ہو گیا۔ مگر اس نے ڈھٹائی سے میرا کان پکڑ لیا اور بولا۔

"بچو! اپنی ماں کو تار دے کر بلا لے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب ہاتھ سے چلا!"

یہ کہہ کر اس نے میرا کان چھوڑ دیا۔ اور اپنے دوست پورن مل شاہ کے ساتھ اپنے چھوٹے سے بنگلے کی طرف چلا گیا۔

پتا ہے شانو کو دن میں چار مرتبہ دیکھنے جاتے تھے، ایک تو صبح اٹھ کر جب وہ سارے وارڈوں کا راؤنڈ کرتے تھے پھر دوپہر کا کھانا کھانے سے پہلے، شام کے چار بجے جب دوسری مرتبہ ہسپتال کھلتا تھا، پھر رات کا کھانا کھا کر، اور اکثر اس وقت گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک اس کے پاس بیٹھے رہتے، اور شانو کو ان کی آمد کے لیے بےچینی تھی اور انہیں دیکھ کر نہال ہو جاتی تھی۔ دو تین مرتبہ اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ڈاکٹر صاحب اپنے ہاتھ سے کھانا بنا کر کھلائے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے منع کر دیا۔

"جب تک تیرا بخار نہیں اتر جاتا میں تیرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

اور شانو نے اپنی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا یہ شرط بھی منظور ہے۔"

اس واقعے کے ڈیڑھ دو ہفتے بعد شانو کا بخار بھی اتر گیا اور میرے پتا جی نے اس کے ہاں کھانا منظور کر لیا۔ شانو آج ڈاکٹر صاحب کو کھانا کھلا کے بہت خوش تھی، اور کھانا کھلا کے فرطِ مسرت سے ان کے پاؤں دبانے جاتی تھی اور اردلی لوگ جن کا کام ڈاکٹر صاحب کے پاؤں دبانا ہی تھا ڈاکٹر صاحب کی اس حماقت پر سخت حیران تھے۔

پھر شانو ڈاکٹر صاحب کے لیے سوئیٹر بننے لگی، پھر ہسپتال میں دھیرے دھیرے نرس کا ہاتھ بٹانے لگی تو نرس بھی جل کر خاک ہو گئی۔ اب ہسپتال کا سارا عملہ اردلی، چپراسی اور نرس سے لے کر سینیئر کمپونڈر تک شانو کے خلاف ہو چکے تھے، مگر شانو سب سے بےخبر، ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ میں گم روز بروز صحت مند ہوتی جاتی تھی۔

یہ ماحول تھا جب ماں جی صحت یاب ہو کر لاہور سے لوٹیں۔ ابھی شاید وہ صحت یاب ہو کر ایک ماہ اور لاہور میں اپنے رشتہ داروں کے یہاں رہتیں لیکن موتی رام کا خط پاتے ہی انہوں نے فوراً واپس آنے کی ٹھان لی، اور بلا اطلاع آ دھمکیں، ماں جی کی آمد سے میں اور پتا جی دونوں خوش ہوئے اور میں تو گویا نہال ہو کر ناچنے لگا۔

انہوں نے مجھے اپنی گود میں بٹھا کر بہت بہلایا، پیار کیا۔ لیکن پتا جی سے وہ بڑی سرد مہری سے پیش آئیں۔ جس کا اس وقت پتا جی نے بھی خیال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہسپتال چلے گئے اور ماں جی گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئیں، آج وہ خواہ مخواہ نوکروں کو ڈانٹ رہی تھیں۔

کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کا سارا گھر چوپٹ ہو گیا۔ رات کو سوتے وقت ماں جی نے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اچانک پتا جی سے پوچھا۔

"یہ شانتی کی بچی کون ہے؟"

"کون شانو؟"

پتا جی نے پوچھا۔

"شانو تو ہوگی تمہارے لئے! میرے لئے تو وہ شانتی کی بچی ہے۔ کب سے اس نے تمہارے دل پر سکہ جمایا ہے؟ ہیں؟"

"کیا بات کرتی ہو کالے دی ماں؟"

"ٹھیک کہتی ہوں۔ مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔ دن بھر کا کرے موتی رام کا اس کے گھر چاند سا بیٹا ہو۔ اس کی بیوی کی مراد بر آئے۔ اس بھلے آدمی نے مجھے سب کچھ لکھ دیا ہے۔"

"موتی رام نے؟"

"ہاں ہاں موتی رام نے! اور موتی رام کیا چھپا ہے سارا ہسپتال تم پر ہنس رہا ہے۔ سارا علاقہ تم پر تھو تھو کر رہا ہے۔ راج دربار تک تمہاری کرتوتوں کی خبر چلی گئی ہے۔"

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔" ماں جی طنز بھرے پیرایہ میں پتا جی کی بات دہراتے ہوئے بولیں۔ "آپ سے پہلے وہ جنم جلی پیرن کا نائی تھی، اس سے پہلے وہ چھوکری گھر میں آئی تھی، اب یہ شانو سر کھاتو کہیں سے آ گئی ہو، میں کہتی ہوں کہاں تک تمہیں روکتی رہوں گی۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟"

"کسی کا علاج کرنے میں شرم کیا ہے۔"

"کسی کے بالوں میں پھول لگانا علاج ہے۔ کسی کے ہاتھ کا پکا کھانا علاج ہے۔ کسی کے پاس ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹے بیٹھ کر خوش گپیاں کرنا علاج ہے؟ اگر یہ علاج ہے تو جانے عشق کس کو کہتے ہیں؟"

"کالے دی ماں!" پتا جی گرج کر بولے، "زبان سنبھال کر بات کرو۔"

ماں جی بستر سے اٹھ بیٹھیں اور پاؤں پٹک کر بولیں۔

"میں نہیں مانوں گی۔ میں نہیں مانوں گی۔ جب تک وہ کلموہی اس جگہ سے رخصت نہیں ہو جائے گی میری زبان بند نہ ہوگی۔"

"جب وہ اچھی ہو جائے گی تو خود بخود چلی جائے گی۔"

ہے، چاہے وہ بیوہ ہو یا شادی شدہ۔ امیر ہو یا غریب۔ دھرتی کی لعنت وہ لوگ ہیں جو پندرہ برس کی کنواری بیواؤں کو شادی کرنے سے روکتے ہیں، سماج کی گندگی وہ لوگ ہیں جو غریب عورتوں کا حق ملتے ہیں اور وہی لوگ اس زندگی پر بوجھ ہیں جو کسی دوسرے کو خوش نہیں دیکھ سکتے، شانو نے اس مہربان مرد کی نگاہیں دیکھیں اس کی میٹھی باتیں سنیں۔ اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ جب وہ اس کی نبض ٹٹولتا تھا تو ہولے ہولے اس کے بجھے ہوئے دل میں ایک شعلہ سا ابھرنے لگتا تھا۔ جینے کی خواہش بیدار ہونے لگی اور لحاف کے اندر راتوں کے سناٹے میں کسی کی تصویر اسے پرستش کرنے پر مجبور کرنے لگی۔ اس کی کھانسی روز بروز کم ہوتی گئی۔ بخار کی شدت گھٹتی گئی۔ اور سپید دھندلے گالوں پر سرخی کی گلابی لہر دوڑنے لگی، میرے پتاجی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس دھندلی مٹی ہوئی تصویر میں رنگ بھر رہے ہیں۔ جیسے وہ ڈاکٹر ہی نہیں مصوّر بھی ہیں۔ جب شانو کے بال کندھوں تک آنے لگے تو اس نے ایک روز شرما کر ڈاکٹر صاحب سے ایک آئینے اور ایک کنگھی کی فرمائش کی۔ عورت جس سے پیار کرتی ہے اس پر اپنا حق جتائے بغیر نہیں رہ سکتی، مرد جس سے پیار کرتا ہے اس پر حکومت جتائے بغیر نہیں رہ سکتا

ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا۔

"اس شرط پر آئینے اور کنگھی لاکر دوں گا کہ تم خوشبودار تیل بھی استعمال کیا کرو!"

"ہائے خوشبودار؟ میں ایک بیوہ خوشبودار تیل کیسے استعمال کر سکتی ہوں؟"

"کر سکتی ہو۔ کرنا پڑے گا" ڈاکٹر صاحب بولے "اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو زندگی اور اس کی مہک اور اس کے تمام دلفریب چیزوں سے پیار کرنا ہوگا۔ وہ لوگ کس قدر غلط فہم ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جاتا ہے تو اس کی بیوہ کا جسم بھی مر جاتا ہے کتنی خواہشیں، کتنی تمنائیں، کتنے ارمان روح اور جسم کے تقاضے زندہ رہتے ہیں۔"

شانو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"وہ جب مرے تھے تو میں کچھ بھی نہ جانتی تھی، میں نے تو ٹھیک طرح سے ان کی صورت بھی نہ دیکھی تھی، میں انھیں پہچانتی تک نہ تھی لیکن لوگوں نے مجھے بتایا کہ میں بیوہ ہو گئی ہوں، میں کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب! کہ میرے دل کی کوئی آرزو بیوہ نہ ہوئی تھی! یقین کیسے آتا، لیکن پندرہ سال تک لوگ مجھے یقین دلاتے رہے رکھ کر، طعنے دے کر، مار پیٹ کر مجھے رات دن کچلتے رہے اور میں کی طرح سب کے پاؤں تلے روند ڈالی گئی۔ جس سے اناج کا دانا بھی نکال لیا گیا ہو۔ کیونکہ شاستروں میں ایسا ہی لکھا ہے!"

"زندگی سے بڑا شاستر کوئی نہیں ہے۔"

"رام رام! کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب!" شانو گھبرا کر بولی باتیں نہ بولو۔ پرلے آجائے گی!"

"میں تو ہر روز یہی بولتا ہوں۔ پھر پرلے کیوں نہیں آتی!"

ڈاکٹر صاحب اتنا کہہ کر ہنستے ہوئے باہر چلے گئے۔

لیکن ان کے جانے کے بعد شانو گھبرا کر شری رام کی تصو سامنے جو اس کے کمرے میں لگا رکھی تھی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہے بھگوان! ان کو معاف کر دو، یہ تو ایسے ہی ہیں۔ ان کا جو قصور ہو اس کی سزا مجھے دے دو!"

یہی تو مصیبت ہے، اور اسی وجہ سے عورت پر اکثر مصیبت آتی ہے کہ وہ جس سے پیار کرتی ہے اس کا ہر قصور۔ ہر الزام اپنے سر لے لیتی ہے اور مرد جس سے پیار کرتا ہے اس کا کوئی قصور معاف نہیں کر سکتا۔

جس دن ڈاکٹر صاحب نے شانو کے لئے آئینہ، کنگھی اور خوشبودار تیل منگا دیا اس دن ہسپتال میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ موتی رام نے اپنے دوست پورن مل شاہ سے کہا۔

"حد ہو گئی یار! آج جب شانو کنگھی چوٹی کر کے اپنے کمرے سے باہر نکلی تو ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے بالوں میں ڈھلیا کا سرخ پھول لگا دیا!"

"مگر لونڈیا کو بھی تو دیکھو، کیسی گدرائی ہوئی ناشپاتی کی طرح بھر گئی ہے"

"ارے جسے اچھا سے اچھا کھانے کو ملے، پہننے کو ملے، ایک خوبصورت کمرہ رہنے کو ملے وہ لونڈیا ناشپاتی تو کیا سیب کی طرح سرخ ہو جائے تو اس میں کیا تعجب ہے؟"

پھر میری طرف دیکھ طرف دیکھ کر آگے بڑھا اور میرے کان کھینچ کر بولا۔

"بچو اب بھی کہتا ہوں اپنی ماں کو بلا لے، ورنہ ڈاکٹر تو گیا ہاتھ

کا مرض بڑھتا جا رہا تھا اور وہ دن بدن گھلتے جا رہے تھے۔

ماں جی نے گنڈے تعویز، جھاڑ پھونک، منتر جنتر سب آزمالئے حکیم شمس الدین کی یونانی دوائیں بھی کھلائیں۔ وید خیرو رام کے کشتے اور جڑی بوٹیاں بھی آزما ڈالیں۔ ڈاکٹر گردھاری لال نے جو میرے پتاجی کی جگہ آیا تھا، اس بے چارے نے بھی ہر طرح کے جتن کر ڈالے، لیکن میرے پتاجی کسی طرح تندرست ہونے میں نہ آتے تھے۔ اور روز بروز کمزور ہوتے چلے جاتے تھے۔ ان کی پسلیوں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں، آنکھیں جو کبھی نہایت خوبصورت تھیں اب سیاہ گڑھوں میں گدلے پانی کی طرح دھنسی تھیں اور ان کے پیروں پر ورم آچلا تھا۔

ماں جی شب و روز خدمت گزاری میں منہمک رہتیں۔ باقی وقت پوجا پاٹ میں گزارتیں۔ کبھی کبھی پلو میں منہ ڈال کر سسک سسک کر رو دیتیں، مگر میں نے انھیں کبھی پتاجی کے سامنے روتے نہیں دیکھا۔ چہرے پر ہر وقت ایک زہر بھری مسکراہٹ رکھتیں۔ وقت پر کھانا کھلاتیں، وقت پر دوا دیتیں۔ ضرورت کے وقت پاؤں دباتیں، رات کو جس وقت پتاجی کروٹ لے کر جاگتے ماں جی کو ہر وقت پائنتی پر جاگتے ہوئے پاتے ماں جی کب جاگتی تھیں، کب سوتی تھیں اس کا کسی کو پتہ نہ تھا۔

پتاجی سب کچھ دیکھتے تھے مگر چپ رہتے تھے، وہی بجھی بجھی پیلی پیلی بے نور آنکھیں۔ پھیکے خشک ہونٹ اور ہاتھوں کی انگلیاں کانپتی ہوئی۔ دن کو تو وہ سوتے ہی نہ تھے، رات کو بھی انھیں بہت کم نیند آتی تھی، وہ لوگوں سے بہت کم بات کرتے تھے، اکثر اوقات بس چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے اندر جینے کی خواہش دب گئی ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو بیماری کے حوالے کر دیا ہے۔ ڈاکٹر گردھاری لال مایوس ہوتا تھا۔ گھر میں گہری اداسی کے تاریک سائے منڈلانے لگے، چلتے پھرتے کام کرتے ایک دم یوں چوکنے ہو جاتے جیسے موت کی آہٹ سن رہے ہوں، اگر کبھی کتے کے رونے کی آواز آتی تو ماں جی کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگتا۔ اور وہ دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپا کر اس طرح خاموشی سے روتیں کہ ان کا سینہ درد اور خوف سے پھٹنے لگتا، دھاڑیں مار مار کر رو لینے سے جی ہلکا ہوتا ہے۔ مگر چپکے چپکے رونے سے دل پر وہ کاری ضرب پڑتی ہے کہ روح کے اندر تک اس کی دھمک سنائی دیتی ہے۔

اسی زمانے میں ایک رمتا جوگی ایک ہاتھ میں چمٹا اور ایک ہاتھ میں ترسول تھامے اور کندھے پر ایک بڑی پوٹلی لٹکائے بھیک مانگتے ہوئے برآمدے کے باہر آیا۔ ماں جی نے اس کی جھولی میں بہت سا آٹا ڈال کر اس سے اپنی چتا کہی۔ وہ ہر ایک کو پتاجی کی بیماری کا حال سناتی تھیں اور کسی نئی دوا یا جڑی بوٹی کا نام سننے کے لئے بے تاب رہتی تھیں۔

جوگی نے سب حال سن کر کہا۔

"ہم بچے کو دیکھیں گے۔ دو چار جڑی بوٹیاں ہمارے پاس ہیں اگر ان میں سے کوئی کام آگئی تو ہم دیکلیان کریں گے۔"

جوگی نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ کی انگلیاں دیکھیں، ان کے ناخن دیکھے پھر ان کے ناخن دیکھے، آنکھیں دیکھیں، کان کی لویں دیکھیں، رنگ دیکھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو آشیرواد دے کر باہر چلا گیا، اور سر ہلا کر ماں جی سے بولا۔

"اس کا روگ ہمارے بس کا نہیں ہے۔"

ماں جی روتے روتے ہاتھ جوڑ کر جوگی کے پاؤں پڑ گئیں۔

رندھے ہوئے گلے سے بولیں۔

"کچھ تو کیجئے مہاراج۔"

"نہیں بچی اس کا روگ ہمارے بس کا نہیں ہے۔ اسے بھگوان ہی بچائیں۔ مجھے تو اس کی آنکھوں میں یم دوت آتے دکھائی دیتے ہیں۔"

ماں جی ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ شعلہ بار نگاہوں سے جوگی کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"یم دوت آئے تو سہی۔ ٹانگیں چیر دوں گی ان کی۔ میں بھی کشتری ہوں۔ میں نے پرن کیا ہے میرے جیتے جی موت ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔"

"تم موت کو کیسے روک سکو گی بچی؟"

جوگی نے پوچھا۔

"ان کے مرنے سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گی۔ میرے جیتے جی موت ان کو نہ چھو سکے گی یہ میں نے پرن کیا ہے۔"

ماں جی کا چہرہ غصہ کی شدت اور ارادے کے استحکام سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ میں نے ماں جی کو ایسے جلال میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

جوگی ان کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ بولا۔

"بچی! میں تیرا ارادہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ویسے اس روگی کا

"وہ کہاں جائے گی" ماں جی غصے سے بولیں "وہ جلانے کے لئے آئی ہے۔ وہ تو رہنے کے لئے آئی ہے، ابھی تو وہ نرس کا کام سیکھ رہی ہے۔ پھر نرس کی جگہ لیتے ہوئے اسے کیا دیر لگتی ہے۔ اپنے خصم کو کھا کر یہاں آئی ہے، اب میرا سہاگ بھی کھانا چاہتی ہے۔ ڈائن! میں اس کی ...یں نہ چیر ڈالوں گی۔ دیکھو جی! اب میں تم سے صاف صاف کہے دیتی ہوں اس چڑیل کو فوراً یہاں سے نکال دو۔ ورنہ کل سے اس گھر میں میرا ان جل حرام ہے!"

دوسرے دن سے ماں جی نے فاقہ کشی شروع کر دی، دن میں دو مرتبہ نمک ملا پانی موتی رام کے گھر سے منگا کر پیتی تھیں۔ اور بس۔ اور ...ر رو رو کر ہلکان ہو جاتا تھا۔ اور بار بار پتا جی سے کہتا تھا کہ وہ ماں ... کو منا لیں، اور پتا جی تھے کہ غصے سے سانپ کی طرح پھنکار دیتے تھے۔ وہ کسی طرح شانو کو ہسپتال سے نکالنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ اسی لڑائی جھگڑے میں پہلا دن گزر گیا۔ دوسرا دن گزر گیا۔ تیسرا دن گزر گیا۔ چوتھے دن ماں جی بہت نحیف اور کمزور ہو گئیں ان کے منہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی، ابھی اتنی لمبی بیماری سے اٹھ کر وہ لاہور سے لوٹی تھیں کہ ...تے ہی یہ افتاد پڑی۔ پتا جی غصہ میں جھلائے ہوئے پنگ پانگ کا بلا اور گیند لے کر برآمدے کی دیوار سے پنگ پانگ کھیلنے کی کوشش کرنے لگے، اتنے میں ایک نوکر نے ماں جی سے آ کر کہا۔

"شانو آپ سے ملنے کے لئے آئی ہے۔"

اور پیشتر اس سے کہ ماں جی کوئی جواب دیتیں شانو سر جھکائے ہوئے آنکھوں میں آنسو لئے کالے کنارے والی بھگی دھوتی پہنے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اندر آ گئی۔ اور ماں جی کے چرن چھو کر بولی۔

"میں تو جنم جنم کی پاپن ہوں۔ ورنہ میرا سہاگ کیوں اجڑتا۔ میں یہاں کیوں آتی۔ تمہارے گھر آگ کیوں لگاتی۔ اب تم مجھے معاف کر دو۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں اور اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔"

ماں جی چپ چاپ بستر پر لیٹی اس کے چھوٹے سے گھونگھٹ کے اندر اس کا سپید ستا ہوا چہرہ دیکھتی رہیں، اس کے بے رنگ کانپتے ہونٹ، ڈوبتی ہوئی آنکھیں، وہ دھندلائے ہوئے مدھم ہوتے ہوئے نقش، جیسے تصویر پھر بگڑ رہی ہو، ایک اضطراری حرکت سے شانو نے اپنے پلو میں لپٹے ہوئے سوئٹر کو نکالا اور روندھے ہوئے گلے سے بولی۔

"یہ میں ان کے لئے بن رہی تھی جو میرے لئے ہمیشہ دیوتا سے اونچے رہیں گے اگر تمہارے دل میں کسی عورت کے درد کو سمجھنے کی خواہش پیدا ہو تو اسے اپنے ہاتھوں سے مکمل کر دینا بس میں تم سے اتنا ہی مانگتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر شانو نے وہ ادھ بنا سوئٹر ماں جی کے بستر پر ڈال دیا اور اپنے ہونٹوں کو زور سے بھینچتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے یکایک وہ دہلیز کی چوکھٹ سے ٹکرائی اور اس دھوتی کا پلو اس کے سر سے اتر گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کا سر منڈا ہوا تھا پتہ نہیں کیوں میں اس کے منڈے ہوئے سر کو دیکھ کر رونے لگا۔

شانو کے جانے کے بعد پتا جی کچھ چپ چپ سے رہنے لگے۔ کچھ بجھ سے گئے۔ اس کے بعد میں نے کئی مہینے تک ان کے منہ سے ان کا پسندیدہ گیت نہ سنا۔ وہی گیت جس سے ماں جی کو اتنی چڑ تھی۔ اب اسی گیت کو ان کے ہونٹوں سے سننے کیلئے ماں جی ترستی تھیں۔ جب بھی ماں جی اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتیں پتا جی کے منہ پر کچھ ایسی چپ سی لگ جاتی کہ ماں جی ان کا چہرہ دیکھ کر اپنی بات دل ہی دل میں رکھ لیتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شانو کے موضوع پر پتا جی کوئی بات سننا نہیں چاہتے تھے۔

شانو کے جانے کے کوئی چھ ماہ بعد پتہ چلا کہ شانو اپنے گاؤں میں تپ دق سے مر گئی۔ شانو کا جیٹھ کسی کام سے یہاں آیا تھا اور ہسپتال آ کر ڈاکٹر صاحب کو بتا گیا تھا۔ اسی شام کو ڈاکٹر صاحب کو اتنے زور کا لرزہ چڑھا کہ رات ہوتے ہوتے ایک سو پانچ درجے بخار ہو گیا ماں جی رات بھر بیٹھی تیمارداری کرتی رہیں۔ لیکن بخار دوسرے دن بھی نہ اترا بعد میں معلوم ہوا کہ ٹائیفائیڈ تھا۔ پورے اکیس روز بعد اترا۔ لیکن جب بخار اترا تو پتا جی بے حد نحیف و نزار ہو چکے تھے۔ ان کے جگر کا فعل خراب ہو گیا تھا۔ اور دونوں آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں۔ یرقان کا شدید حملہ تھا۔

ماں جی نے تیمارداری میں رات دن ایک کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ پتا جی کے پلنگ سے چپک کر رہ گئی ہیں۔ خود ماں جی کی صحت پر اس بیماری کا بہت اثر پڑا۔

راجہ جی ڈاکٹر صاحب پر بہت مہربان تھے۔ اس لئے انھوں نے ان کے علاج کے لئے دوسرے ڈاکٹر کو بھی بلا دیا تھا جو ہسپتال میں کام کرنے کے علاوہ دن رات ان کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ نرس بھی اپنا بہت سا وقت ان کی خبرگیری میں گزارتی تھی۔ لاہور سے بہت سی دوائیں بھی منگائی گئی تھیں مگر پتا جی کے یرقان

پھسل کر کھنڈ میں گرنے کا خوف ہے۔ جہاں میں نہیں پہنچ سکتا وہاں
 کس طرح گرتے گرتے پہنچ جاتی تھی۔ دہائی ہے، میں چالیس دن
کیسے جاؤں گا۔ تیری ماں کے سر تو جن سوار ہے، مجھ سے یہ کام نہ ہو
گا۔ میں تو نوکری چھوڑ دوں گا۔"

وہ اسی طرح بکتا رہا۔ مگر اس کے بعد بھی دوسرا دن گیا۔ تیسرا
گیا۔ چوتھے دن گیا، پانچویں دن ہار گیا۔ ماں جی اس دن جگت تک
پنے ساتھ لے گئیں، پانچ دن تک وہ بھی ساتھ جاتا رہا۔ آخرکار وہ
ار گیا۔ گیارھویں روز ماں جی فیروز اور دلی کو ساتھ لے گئیں۔ اس
پہلے یہ دستور ہوتا تھا کہ ماں جی پو پھٹنے سے پہلے گھر سے چلی جاتی تھیں
کو ساتھ لے کر اور سورج نکلنے سے ایک گھنٹہ، کبھی آدھ گھنٹہ پہلے آ
تیں بہر حال انہوں نے اپنے معمول میں کبھی ناغہ نہ کیا تھا اور وہ
وز سورج نکلنے سے پہلے پھپھالو کی اوس اور اس کا رس پتا جی
دیتی تھیں۔

کئی بار نوکروں نے ان سے کہا۔

"ماں جی! آپ کے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تو پھپھا
اس کی اوس جنگل سے اکٹھی کر کے لے آئیں گے۔"

تو ماں جی سر ہلا کر جواب دیتیں۔

"اور اگر تم کسی دن نہ جا سکے یا کسی دن تم سستی کر گئے۔ اور
الو کی اوس کے بجائے ندی کے پانی کے دو گھونٹ لے آئے تو میں
وں گی؟ نا بھائی۔ اس سلسلے میں میں کسی پر وشواس نہ کروں گی۔"

گیارھویں دن ماں جی جنگل سے دیر تک نہ لوٹیں۔ فیروز آیا
تک لوگ ان کا انتظار کرتے رہے۔ پھر سورج نکل آیا پھر سورج
ڑوں میں گز بھر اونچا ہو گیا۔ ماں جی پھر بھی نہ آئیں، پتا جی نے دو
بار دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر خاموشی سے نگاہیں چھت کی
لگا لیں، جب سورج دو گز اونچا ہو گیا اور نوکروں کے چہرے
ائیاں اڑنے لگیں تو وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ اور پولیس
لاع دینے کی سوچنے لگے۔ تو ہم سب نے برآمدے میں کھڑے ہو کر
ن کے جنگل کی طرف دیکھتے ہوئے ٹیکریوں کے جھاڑ کے پیچھے کی
ڈی سے فیروز کو دور سے آتے دیکھا۔ ماں جی کو اس نے کندھے پر
کھا تھا۔ بہت سے لوگ فیروز کی طرف دوڑے۔ تیز تیز چلنے کے
ے فیروز کی کمر دوہری ہو گئی تھی۔ اور دم ٹوٹ رہا تھا۔ جید اور

کر پانے جا کر فیروز نے کا بوجھ ہلکا کیا اور ماں جی کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ میں
نے دیکھا کہ ان کی ساری جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اور ان کے ہاتھوں
اور پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ ایک
طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ میں زور زور سے رونے لگا۔ جید اور کرپلے
ماں جی کو پتا جی کے سامنے دوسرے پلنگ پر لٹا دیا۔

میرے زور زور سے رونے کی آواز سن کر پتا جی نے چھت
سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں اور بولے۔

"کیا ہوا؟"

بڑے فیروز نے کہا۔

"ماں جی کھنڈ میں گر گئیں۔ بڑی خطرناک ڈھلوان تھی بڑی گہری
اور تاریک اور نیچے جا کر پھپھا کی بیل پر چار پانچ پھپھالو لگے ہوئے تھے۔
اور آج جنگل سے پھپھالو بہت کم لے تھے، میں نے ماں جی کو بہت کہا
لیکن وہ نہیں مانیں۔ میں سرکار اب بہت بوڑھا ہو گیا۔ اتنی گہری
کھنڈ میں جانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اترتے اترتے ان کا پاؤں جو
پھسلا تو بس سمجھو جان کسی طرح بچ گئی۔ گر چوٹیں بہت آئی ہیں۔"

پتا جی کسی نہ کسی طرح بستر سے اٹھے۔ اور میری ماں جی کے پلنگ
کے قریب پہنچے۔ ماں جی پلنگ پر بے سدھ پڑی تھیں۔ الجھے الجھے
نیچے لٹکتے بال جن میں تیل نہ کنگھی، ماتھے پر لہو کی پپڑیاں، پیلے پیلے
گال، بھنچے دانتوں سے دھند لائے ہوئے، پتلی سوکھی باہوں پر چوٹیں
تیل اور خراشیں، ٹانگوں سے لہو بہتا ہوا۔ وہ نہایت کمزور، نحیف اور
بے جان سی لگ رہی تھیں۔

پتا جی نے دھیرے سے کہا۔

"جانکی! جانکی۔!!"

ماں جی بے سدھ پڑی تھیں۔ یکایک بھرائی ہوئی آواز میں
ایک چیخ مار کر پتا جی اس بے سدھ ماں سے لپٹ گئے "میں نے تیرے ساتھ
بڑا ظلم کیا ہے جانکی! مجھے معاف کر دے، میں قسم کھاتا ہوں اب کبھی
نہیں۔ ۔ ۔ ۔ اب کبھی نہیں۔"

ماں جی نے اپنے سوامی کی گود میں آنکھیں کھولیں اور کانپتے
ہوئے ہاتھ کی انگلیوں سے میرے پتا جی کی کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی
کو چھو کر کہنے لگیں۔۔۔ "معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے۔ میں نے سمجھا تم تاڑو
سے محبت کر رہے ہو، حالانکہ تم اسے صرف زندگی دے رہے تھے

علاج ہے۔ مگر اتنا کٹھن ہے۔ اس کے لئے دھیرج اور بہت ارادے کی ضرورت ہے۔"

"آپ بتایئے تو سہی مہاراج!" ماں جی بڑی مضبوطی سے بولیں "اس علاج کو پورا کرنے میں سارے زیور بیچ دوں گی۔ اور اپنی جان کی بازی لگا دوں گی۔"

"اس علاج کو برتنے میں ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوگا۔ ہاں مگر بہت کٹھن کام ہے تمھارا ارادہ دیکھ کر تمھیں بتائے دیتا ہوں۔ جنگلوں میں ایک بیل ہوتی ہے۔ اسے بھپالو کی بیل کہتے ہیں، کبھی کبھی کھیتوں میں بھی مل جاتی ہے، مگر جنگلوں میں عام ہوتی ہے، سب کسان لوگ اسے جانتے ہیں، اس بیل میں ایک پھل لگتا ہے۔ بھپالو کہتے ہیں، یہ پھل ٹماٹر سے چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن شکل و صورت میں ٹماٹر ہی سے بہت ملتا ہے، اس کا ذائقہ کسی قدر میٹھا اور ترش ہوتا ہے۔"

"ہاں میں نے بھپالو کھیتوں میں دیکھا ہے" ماں جی پر امید ہو کر بولیں، "بچے اسے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔"

"بس وہی ہے" جوگی بولا "مگر آج کل کھیتوں میں نہیں ملے گا۔ اور ملے گا تو جنگلوں کے ان علاقوں پر جہاں دھوپ کا گزر نہیں ہوتا، کیونکہ یہ بہت سرد پھل ہوتا ہے، اب تم ایسا کرو کہ اس علاج کو کسی دوسرے پر مت چھوڑو۔ اس کے لئے تمھیں خود سویرے اٹھ کر جنگل میں جانا ہوگا اور بھپالو کے پھلوں کی اوس جو صبح سویرے ان پر موجود ہوتی ہے، اسے اکٹھا کر کے ایک برتن میں جمع کرنا ہوگا اور بھپالو بھی الگ سے جمع کرنے ہوں گے۔ وہ اوس اکٹھی کر کے اسے سورج چڑھنے سے پہلے اپنے پتی کو پلادو۔ پھر اس کے آدھے گھنٹے کے بعد بھپالو کا رس نکال کر اور اسے الگ کر کے پلادو۔ لیکن یہ سب کام صبح نکلنے سے پہلے ہونا چاہیئے۔ اگر چالیس دن تک تم یہ دوا کھلاؤ گی تو سمجھو مہاراج کی کرپا سے تمھارے سوامی اچھے ہو جائیں گے۔"

ماں جی نے جوگی کے پاؤں چھوئے اور انھیں دس روپے کا نوٹ نذر کیا۔ مگر جوگی نے لینے سے انکار کر دیا۔

"آج کے وقت کی روٹی تمھارے گھر سے مل گئی بس اس سے زیادہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر جوگی چمٹا بجاتا ہوا۔ گاتا ہوا ہمارے ہاں سے رخصت ہوگیا۔

دوسرے دن ماں نے اپنی ملازم کرپارام کو اپنے ساتھ لیا اور ڈرینوں کے جنگل کی طرف چل دیں۔ اور ابھی ٹھیک کی طرح سے اجالا نہ ہوا تھا کہ وہ بھپالو کے پھل اور بھپالو کی اوس ایک کانسی کے ڈھکنے دار برتن میں اکٹھی کر کے لے آئیں وہ اتنی ہوشمند تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر گردھاری لال کو فوراً بلا بھیجا۔ وہ بیچارہ ابھی سو رہا تھا ماں جی کی اطلاع پاتے ہی فوراً چلا گیا۔ اچانک نیند سے اٹھنے کی وجہ سے کچھ تلخ مزاج بھی ہو رہا تھا۔ لیکن جب اس نے بھپالو دیکھے تو ایک دم بھڑک گیا۔ بولا۔

"یہ تو وہی ذلیل بھپالو ہیں جنھیں پہاڑی بچے ہر روز جنگل سے توڑ کر کھایا کرتے ہیں!"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں" ماں جی بڑی دل جمعی سے بولیں "مگر آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ ان کا رس کسی طرح کا نقصان تو نہ کرے گا؟"

"نقصان نہیں کرے گا تو فائدہ بھی کیا کرے گا؟" گردھاری لال نے جل کر کہا۔ "وہ تو پلانے سے معلوم ہوگا۔"

"جیسے آپ کی مرضی!"

گردھاری لال نے اب پتا جی کی حالت سے مایوس ہو کر سب کچھ ماں جی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ علاج اب بھی کرتا تھا۔ لیکن اسے پتا جی کے اچھے ہونے کی امید نہ تھی۔

ماں جی نے اس کے دو گھونٹ میرے والد کو پلا دیئے۔ پھر آدھے گھنٹے کے بعد بھپالو کا رس بھی پلا دیا یہ سب کام ہو جانے کے کہیں ایک گھنٹہ بعد سورج نکلا۔ ماں جی کو بڑا اطمینان ہوا۔

بنگلے کے پچھواڑے ریلنگ کے قریب ایک پتھر پر کرپارام بیٹھا سوالے کر اپنے کانٹے نکال رہا تھا اور کوستا جا رہا تھا۔ کیسا کانٹے دار جنگل ہے، کیسی خطرناک ڈھلانیں ہیں، جہاں بھپالو ملتے ہیں۔ کسی سیدھی اور سپاٹ جگہ پر تو ملتے ہی نہیں۔ کسی کھوہ کے پاس کسی ڈھلان پر، کسی کھڈ میں، خطرناک چٹانوں کے گہرے سایوں میں جہاں بکری بھی نہ پہنچ سکے۔ وہاں یہ بیل اگتی ہے۔ میرے تو پاؤں چھل گئے ہیں۔ اور پاجامہ بھی پھٹ گیا ہے۔ اور صبح کیسی کڑاکے کی سردی تھی کمبل اوڑھ کر گیا تھا۔ پھر بھی راستے بھر دانت بجتے رہے۔ تیری ماں تو شیرنی ہے خیرتی کا کہ! اسے تو جنگل میں کسی کا ڈر نہیں، کیسی چٹان

راجندر سنگھ بیدی

ببل

درباری لال شام سے گھر میں ہی بیٹھا تھا۔ سیتا کے ساتھ بیکار ہو رہا تھا —— کسی کے ساتھ بے کار ہوتا اس حالت کو کہتے ہیں جب آدمی دیکھنے میں "ایوننگ نیوز" یا غالب کی غزل پڑھ رہا ہو۔ لیکن خیالوں میں کسی سیتا کے ساتھ غرق ہو —— سیتا نے تو کہا تھا، وہ ٹھیک ۷ بجے اروڈ اسینما کی طرف سے آگے والی سڑک کے موڑ پر کھڑی ہوگی۔ اس کی ساڑی کا رنگ کاسنی ہوگا۔ لیکن

درباری گگ سرکل میں رہتا تھا جس کا نام اب ہسٹوری کارڈن ہو گیا تھا۔ وہ لاؤڈ اسپیکروں کی ایک فرم میں کام کرتا تھا۔ آمدنی تو کوئی خاص نہیں تھی۔ پیسے کی کوئی کمی بھی نہ تھی۔ باپ مہتا گردھاری لال نے ایک ہی دن کی فارورڈ ٹریڈنگ میں تین چار لاکھ روپے بنا لیے تھے۔ اور پھر یکایک ہاتھ کھینچ لیے جواب تک خرچ ہوئے تھے۔ آج بھی کاٹن اسٹیکسچینج میں ان کا کوئی ساتھی مہتا صاحب کے کمشن میں سے بال کی طرح سے نکل جانے پر گالیاں دیتا۔ تو وہ جواب میں ہنس دیتے۔ ایسی ہنسی، جو آدمی تین چار لاکھ روپے اندر ڈال کر ہی ہنس سکتا ہے۔

پھر بڑے بھائی بہاری لال کی شادی مارواڑیوں کے گھر میں ہوئی تھی، جنھوں نے بیس سیر سونے کے کڑے اپنی لڑکی کے ہاتھوں میں ڈال دیے۔ اور یوں اسے درباری لال کی بھابی بنا لیا۔ ایک برس بعد بہاری لال کی اپنی بہن ستونتی ایک اسماعیلی صابر محمد کے ساتھ بھاگ گئی، اور نکاح کر لیا۔ گلی محلے، پورے شہر میں ہنگامہ ہوا۔ برسوں مہتا صاحب نے لڑکی اور داماد دونوں کو اپنے گھر "پریم کٹیا" میں گھسنے نہیں دیا۔ آخر میں باہمی سمجھوتہ ہو گیا۔ لڑکی کے رشتہ دار کہتے تھے لڑکی کو مشرف بہ اسلام کیا گیا ہے۔ اور اس کا نام کنیز فاطمہ ہے۔ اور مہتا صاحب کہتے تھے لڑکے کے شدھ کرنے کے بعد اس کا نام سرداری موہن رکھا گیا ہے لیکن سرداری موہن یا صابر محمد اپنا نام ہمیشہ ایس، ایم نواب ہی لکھا کرتا چونکہ لڑکی کی اس پست حرکت پر غصہ نکالنے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا اس لیے درباری لال —— کی لعنتی شوہر سے ملتے تو یوں کہتے —— "کیوں بے —— صابر —— ؟"

آج صابر یا سرداری اور ستونتی دونوں گھر پر تھے اور ان کے دو بچے بھی —— اس پر بھائی بہاری لال اور بھابی گومتی نے مل کر درباری کی شادی کا شگوفہ چھوڑ دیا۔ عورتیں نکلی مرد اور مرد نکلی عورتوں کی باتیں کرتے کرتے آپس میں الجھنے لگے۔ درباری برآمدے میں بیٹھا اپنے بارے میں ساری گفتگو سن رہا تھا۔ یکلخت وہ لپکا، اور اپنے منہ کے لاؤڈ اسپیکر کو کھڑکی میں سے اندر کرتے ہوئے بولا "میں درباری لال مہتا ولد گردھاری لال مہتا ساکن بمبئی ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا۔" سب اس کی آواز پر چونک گئے۔

درباری لال واپس اپنی جگہ پر آ کر "ایوننگ نیوز" کے ورق الٹنے لگا۔ اور پھر اروڈ اسینما کی سمت سے گھر کو مڑتی ہوئی سڑک پر دیکھنے لگا جہاں اسے کاسنی رنگ کی ساڑی کی تلاش تھی۔

اندر سب ہنس رہے تھے۔ ماں بھی ان میں آ کر شامل ہو گئی تھی، درباری گھر بھر کا بانکا تھا۔ جس طریقے سے وہ بالوں میں ہیرٹانک لگاتا محنت سے ان کو بٹھاتا، کنگھی ملے کر آئینے میں گھنٹہ گھنٹہ دو دو گھنٹے مونچھوں کی نوک نکالنے میں صرف کرتا، سب اسی کی دلیلیں ہی تو تھیں —— بات دراصل یہ ہے کہ شادی سے پہلے عمر کے اس حصے میں لڑکے لڑکیوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔

مجھے بہت دیر بعد احساس ہوا، کہ اس وقت وہ مر چکی تھی۔ اس کی موت اور تمہارے دکھ کی ذمہ دار میں ہوں، جو گنہگار ہوتے ہیں وہی تو معافی مانگتے ہیں۔"

ماں جی آنسو بہا کر شرمائیں۔ سب نوکر سر جھکا کر باہر چلے گئے۔ پتا جی نے ایک ہاتھ سے مجھے اور دوسرے ہاتھ سے میری ماں کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا: "ان دنوں کو بھول جاؤ۔ اب کبھی نہیں بس اب کبھی نہ ہوگا۔ اب تک میں کبھی تیرا اتنا نہ ہوا تھا جتنا آج سے ہو گیا ہوں، بس اب کچھ باقی نہیں رہا۔" ماں جی نے خوشی اور غم سے پتا جی کے سینے میں سر چھپا لیا اور رونے لگیں پتا جی بھی رونے لگے میں بھی رونے لگا۔ کیونکہ ہم ہندستانی رونے والی قوم ہیں اور ہم ہر جگہ اور ہر وقت رو سکتے ہیں!۔

دوپہر کے وقت ماں جی اپنے پلنگ پر بیٹھی کچھ کاڑھ رہی تھیں گردھاری لال ایک کرسی پر پتا جی کے پلنگ کے قریب بیٹھے تھے اور پتا جی پلنگ پر بڑے بڑے تکیے لگائے نیم دراز حالت میں بیٹھے تھے اور ہولے ہولے گنگنا رہے تھے، گردھاری لال نے پوچھا "اب کیا علاج شروع کریں؟" پتا جی ہنس کر بولے: "اب اگر ندی کا پانی پلا دوگے تو اچھا ہو جاؤں گا۔" ان کے چہرے پر امید کی گہری جھلک تھی، ڈاکٹر گردھاری لال حیرت سے میرے پتا جی کی طرف دیکھنے لگا۔ میری ماں سر جھکائے کچھ کاڑھنے میں مصروف تھیں۔ "یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟" پتا جی نے ماں جی سے پوچھا۔ ماں جی اپنے پلنگ سے اٹھیں۔ اور پتا جی کو اپنے ہاتھ میں لپٹی ہوئی اون دکھلاتے ہوئے بولیں۔

"سوچتی ہوں شانو والا سوئیٹر اب پورا کر دوں۔"

دھیرے سے پتا جی نے اس نامکمل سوئیٹر کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دھیرے سے انھوں نے اس پر انگلیاں پھیریں اور بولے۔

"ہاں اب اسے پورا کر ڈالو۔"

لیکن ان کے لہجہ میں کوئی حسرت یا دکھ نہ تھا۔

اور لڑکیاں لڑکوں کی سی، پھر شادی ہو لی ہے، آپس میں ملتے ہیں تب کہیں جا کر اپنا اپنا کام سنبھالتے ہیں۔ درباری کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گھر کی عورتیں کہتی تھیں یہ سب شادی کی نشانیاں ہیں، اور مرد کہتے بربادی کی۔

برآمدے میں سکھ بڑھئی نے جالی لگانے کا کام آج ہی شروع کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بدشکل بے ڈول اور کھردری لکڑی کا ٹکڑا اس پر رندہ کرتا رہا تھا، اور اس لئے سارے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور چیلیاں بکھری ہوئی تھیں اور پیروں میں لگ رہی تھیں تب ہی سامنے پاس کے اسکول میں گھنٹی بجی اور سپید سپید قمیض اور نیلی نیلی نیکریں پہنے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہوسٹل کے کمروں سے نکلے، شاید وہ شام کی دعا کے لئے گرجا جا رہے تھے، اسکول کے گراؤنڈ میں لمبا سا فرغل پہنے ابھی تک فادر بچوں کو فٹ بال کھلا رہا تھا، اس نے بھی سیٹی بجا دی، کھیل ختم کر دیا، مگر سیتا نہ آئی، سیتا کی بجائے اندر کی طرف سے مصری چلی آئی ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی گود میں ببل تھا۔۔۔۔ گول مٹول نرم نرم۔۔۔۔ جیسے آٹے کا بنا ہوا، اس مسوڑوں تو کئی دانت نکل آئے تھے، لیکن نیچے کے دو دانت اور دن کی نسبت بڑے سے تھے کبھی ہنستا تو وہ الٹے ٹوزلی کا نرم گوشت معلوم ہوتا، آج تک کوئی ایسا نہیں دکھائی دیا جو۔۔۔ ببل کو ہنستے دیکھ کر بے اختیار نہ ہنس دیا ہو۔

"ببل" درباری نے پکارا۔ اور ہاتھ بچے کی طرف بڑھائے۔ میں تو کہتا ہوں سورج کی کرن بھی کسی گلزار پر اس طرح سے نہیں کھلتی جیسے مسکراہٹ بچے کے چہرے پر کھل جاتی۔ مسکراتے ہوئے ببل نے درباری کی طرف دیکھا۔ اور اندر کی کسی بے بسی تحریک پر درباری کی طرف تکنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنی ماں مصری کے سنبھالا نہ جا رہا تھا۔

"ٹھہرو!" درباری نے کہا اور کرمرا لینے کے لئے اندر لپک گیا، اور بھول ہی گیا کہ سیتا آئے گی اور چلی جائے گی۔

"بچے اس صبر کو نہیں جانتے جو تہذیب کے ساتھ آتا ہے" ببل کے چہرے پر ایک سیدھی سچی مایوسی کی لہر دوڑ گئی، اور پل بھر میں وہ یہ محسوس کرنے لگا، گویا کہہ رہا ہو ۔۔ "یہ ساری دنیا دھوکہ ہے" پھر وہ جیسے مایوس ہوا تھا، ویسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

ببل کی ماں ایک بھکارن تھی، تنگی کی وجہ سے اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ببل کو بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا۔ بازار میں جاتی تو وہ بابو قسم کے کسی بھی آدمی کے پیچھے ہو جاتی، اور ببل ایک گمشدہ ہوئے ایکٹر کی طرح اس آدمی کی دھوتی یا قمیض کو کھینچے لگتا۔ اور اس چیز کی طرف اشارہ کرنے لگتا جس کی اسے خواہش ہوتی، آدمی دیکھتا نظریں بچاتا، پھر دیکھتا اور بے اختیار وہ چیز خرید کر ببل کے ہاتھ میں رکھ دیتا، مصری بابو کے چلے جانے کے بعد ببل کے ہاتھ سے وہ چیز لے لیتی اور دکان دار کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتی ببل روتا بلکتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ ببل اور اس کی ماں کا برتاؤ دوسرا تھا۔ کرمرا لے کر اسے بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، کرمرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دو دنی یا چونی مل جاتی تھی، جس سے ببل کو کوئی دلچسپی نہ تھی، اسے تو اپنا کرمرا چاہیئے تھا، جسے ماں نہیں چھینتی تھی، اور نہ کسی دکان دار کو دیتی تھی، کرمرا وہ سیدھا منہ میں ڈال لیتا، اور دانتوں میں بھولتے ہوئے ٹھمک ٹھمک کر اچھل اچھل کر اپنی مسرت کا اظہار کرتا۔ آج جب درباری نے ببل کو گود میں اٹھایا تو ایک ہی مرتبہ مٹھی بھرتے ہی وہ ماں کی طرف لوٹنے لپکنے لگا، درباری چونکا ۔۔ کہتے ہیں نا آدمی اچھا ہے یا برا بچے کو سب پتہ چل جاتا ہے، ایک لمحے کے لئے درباری نے سوچا "میرے من میں کیا پاپ ہے؟" ببل اسے جانتا تھا، درباری نے ببل کو بہت روکا، پیار دلار کی کوشش کی، لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا، اور بلادوں کرتا ہوا وہ تو بچہ ماں کی طرف گرا ہی جا رہا تھا۔

درباری نے کہا "ٹھہرئیے ۔۔ سالے ۔۔!"

اندر سے مالک یا سرداری کی آواز آئی ۔۔ "کیا حکم ہے، حضور؟"

"آپ سے عرض نہیں کیا فیض گیمور!" درباری نے اندر کی طرف منہ کرتے ہوئے جواب دیا، اور پھر ببل کے پیارے دلارے گالوں پر چپت لگاتے اور اس کی ماں کی طرف لوٹاتے ہوئے بولا: "اتنا خود غرض ۔۔ سلام نہ دعا، شکریہ نہ دھن باد، کام نکل گیا تو

اور لڑکیاں لڑکوں کی سی، پھر شادی ہوتی ہے، آپس میں ملتے ہیں، تب کہیں جا کر اپنا اپنا کام سنبھالتے ہیں۔ درباری کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گھر کی عورتیں کہتی تھیں یہ سب شادی کی نشانیاں ہیں، اور مرد کہتے بربادی کی۔

برآمدے میں بڑھئی نے جالی لگانے کا کام آج ہی ختم کیا تھا۔ وہ دن بھر ایک بدشکل بے ڈول اور کھردری لکڑی کو چھیلتا اس پر رندہ کرتا رہا تھا، اور اس لئے سارے گھر میں لکڑی کے چھلکے اور چیلیاں بکھری ہوئی تھیں اور پیروں میں لگ رہی تھیں تب ہی سامنے والے اسکول میں گھنٹی بجی اور سپید سپید قمیض اور نیلی نیلی نیکریں پہنے ہوئے لڑکے ایک دوسرے پر گرتے گرتے ہوسٹل کے کمروں سے نکلے، شاید وہ شام کی دعا کے لئے گرجا جا رہے تھے، اسکول کے گراؤنڈ میں لمبا سا فرغل پہنے ابھی تک فادر بچوں کو فٹ بال کھلا رہا تھا، اس نے بھی سیٹی بجا دی، کھیل ختم کر دیا، مگر سیتا نہ آئی، سیتا کی بجائے الٹی طرف سے مصری چلی آئی ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی گود میں بچہ تھا.... گول مٹول نرم نرم...... جیسے اسفنج کا بنا ہوا، اس کے یوں تو کئی دانت نکل آئے تھے، لیکن نیچے کے دو دانت اوروں کی نسبت بڑے تھے کبھی ہنستا تو والٹ ڈزنی کا خرگوش معلوم ہوتا، آج تک کوئی ایسا نہیں دکھائی دیا ہو —— ببل کو ہنستے دیکھ کر بے اختیار ہنس دیا تھا۔

"ببل!" درباری نے پکارا۔ اور ہاتھ بچے کی طرف بڑھا دئے: "میں تو کہتا ہوں سورج کی کرن بھی کسی گلزار پر اس طرح سے نہیں کھلتی جیسے مسکراہٹ بچے کے چہرے پر کھل جاتی۔" مسکراتے ہوئے ببل نے درباری کی طرف دیکھا۔ اور اندر کی کسی بے بس تحریک پر درباری کی طرف ہمکنا شروع کر دیا۔ اب وہ اپنی ماں مصری کے سنبھالا نہ جا رہا تھا۔

"ٹھہرو!" درباری نے کہا اور کرمرا لینے کے لئے اندر لپک گیا، اور بھول ہی گیا کہ سیتا آئے گی اور چلی جائے گی۔

"بچے اس صبر کو نہیں جانتے جو تہذیب کے ساتھ آتا ہے" ببل کے چہرے پر ایک سیدھی سچی مایوسی کی لہر دوڑ گئی، اور پل بھر میں وہ یہ محسوس کرنے لگا، گویا کہہ رہا ہو "یہ ساری دنیا دھوکہ ہے!" پھر وہ جیسے مایوس ہوا تھا، ویسے ہی درباری کو آتے دیکھ کر خوش بھی ہو گیا۔

ببل کی ماں بھیک بھکارن تھی، تنگی کی وجہ سے اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے ببل کو بھیک مانگنے کا فن سکھا دیا، بازار میں جاتی تو وہ بابو قسم کے کسی بھی آدمی کے پیچھے پڑ جاتی، اور ببل بلکتے ہوئے ایکٹر کی طرح اس آدمی کی دھوتی یا قمیض کو کھینچ کھینچ کر اس چیز کی طرف اشارہ کرنے لگتا جس کی اسے خواہش ہوتی، اور وہ دیکھتا نظریں بچاتا، پھر دیکھتا اور بے اختیار وہ چیز خرید کر ببل کے ہاتھ میں رکھ دیتا، مصری بابو کے چلے جانے کے بعد ببل کے ہاتھ سے وہ چیز لے لیتی اور دکان دار کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتی ببل روتا چلاتا رہ جاتا۔

لیکن درباری کے ساتھ ببل اور اس کی ماں کا برتاؤ دوسرا تھا۔ کرمرا لے کر اسے بیچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، کرمرے کے ساتھ مصری کو سیدھے دونی یا چونی مل جاتی تھی، جس سے ببل کو کوئی دلچسپی نہ تھی، اسے تو اپنا کرمرا چاہیے تھا، جسے ماں نہیں چھینتی تھی، اور نہ کسی دکان دار کو دیتی تھی، کرمرا وہ سیدھا منہ میں ڈال لیتا، اور دانتوں میں ہولے ہولے ٹھک ٹھک کر، اچھل اچھل کر اپنی مسرت کا اظہار کرتا۔ آج جب درباری نے ببل کو گود میں اٹھایا تو ایک ہی مرتبہ سسکی بھرتے ہی وہ ماں کی طرف لٹکنے لپکنے لگا، درباری چونکا —— کہتے ہیں نا آدمی اچھا یا برا، بچے کو سب پتہ چل جاتا ہے، ایک لمحہ کے لئے درباری نے سوچا "میرے من میں کیا پاپ ہے؟" ببل اسے جانتا تھا، درباری نے ببل کو بہت روکا، پیار دلار کی کوشش کی، لیکن وہ بھلا کہاں ماننے والا تھا، اور ہاؤں کرتا ہوا وہ تو بس ماں کی طرف گرا ہی جا رہا تھا۔

درباری نے کہا "کچھنے —— سالے ——!"

اندر سے مالی یا سرداری کی آواز آئی —— "کیا حکم ہے، حضور؟"

"آپ سے غرض نہیں کیا فیض گھور!" درباری نے اندر کی طرف منہ کرتے ہوئے جواب دیا، اور پھر ببل کے پیارے والے گالوں پر چپت لگاتے اور اس کی ماں کی طرف لوٹاتے ہوئے بولا: "اتنا خود غرض —— والسلام نہ دعا، شکریہ نہ دھن باد، کام نکل گیا تو

تولہ کی فوارہ ہے!"

"فوارہ!"

"ہاں!" سیتا بولی ـــــ "تم چھینکتے ہو تو مجھے بڑے اچھے لگتے ہو!"

درباری نے سیتا کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی کسی پاگل کی طرف دیکھتا ہے۔ سیتا نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور کہنے لگی ـــــ "یاد ہے، پہلی مرتبہ تم مجھے کہاں ملے تھے؟"

"یاد نہیں!" درباری نے سر ہلاتے ہوئے کہا ـــــ "صرف اتنا پتہ ہے تم سے پہلی مرتبہ ملا تھا!"

"وہاں" سیتا نے سامنے دیا شما گاندھی سوئمنگ پول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ "تم نہا رہے تھے اور چھینک رہے تھے، میرے ساتھ تین چار لڑکیاں اور بھی تھیں، اس دن دفتر میں نصف دن کی چھٹی ہو گئی تھی، ہم یوں ہی گھومتے گھامتے ادھر جا نکلے۔"

"ادھر کیوں؟"

"یوں ہی،" سیتا نے کہا ـــــ "چھٹی ہوتے ہی ہم سب لڑکیوں کو نہ جانے کیا ہونے لگتا ہے، ہم گھر بیٹھ ہی نہیں سکتے، ایسے ہی باہر نکل جاتے ہیں، جیسے کچھ ہونے والا ہے، پھر ہوتا ہواتا کچھ نہیں، تبھی پتہ چلتا ہے ـــــ ہم کو کولاپی رہے ہیں ـــــ"

سیتا ہنسی، تو ساتھ ہی درباری بھی ہنس دیا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی ـــــ "ہم سب تمھاری طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے، کیونکہ تم چھینکتے ہوئے پورے فوارے تک اور فوارے سے کنارے تک نہا رہے تھے، اور ایسا کرنے میں سر سے پیر تک دوہرے ہوئے جاتے تھے۔ بچوں کی طرح میرا جی چاہا بھاگ کر تمھیں پکڑ لوں، تولیے سے تمھاری ناک پونچھوں اور پیچھے سے ایک چپت لگا کر کہوں ـــــ اب جاؤ کھیلو!"

درباری جیسے ایک ہی بات سوچ رہا تھا: "دوسری لڑکیاں کون تھیں ـــــ؟"

"ایک تو کمود تھی" سیتا بولی ـــــ "دوسری جولی ـــــ وہاں کھار ڈی کے پاس ماؤنٹ میری کے قریب رہتی ہے، تیسری ـــــ" پھر دفعتہً رکتے ہوئے کہنے لگی: "تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ایسے ہی۔" درباری نے جواب دیا ـــــ "تمھاری سہیلیاں تمھاری جو تی کی بھی ریس نہیں کر تیں۔"

"تم نے دیکھی ہیں نا؟"

"دیکھی تو ہیں!"

سیتا کا چہرہ، جو تھوڑا کھل اٹھا تھا، پھیکا پڑ گیا۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی ـــــ "آج دن ڈھ بتا ہی نہیں۔"

سمندر میں جوار شروع ہو چکا تھا۔ لہریں کناروں کی طرف بڑھ رہی تھیں، اور اپنے ساتھ بعض پورنی کی بے شمار تھیلیاں لکڑیاں اور مونگ پھلی کے چھلکے، ناریل کے خول لا رہی تھیں، درمیان میں کہیں کوئلے بھی دکھائی دیتے تھے، جو دور اندر اسٹیم بوٹوں اور بڑے بڑے جہازوں نے اپنا غم ہلکا کرنے کے لیے سمندر میں پھینک دیے تھے، تیل کا ڈرم بھی خشکی پر ڈال دیا تھا، اور ان کا خالی کیا ڈیزل ریت پر پہنچ کر اس کے ایک بڑے سے حصے کو چکنا اور سیاہ بنا رہا تھا۔ سیتا نے مڑ کر دیکھا ـــــ درباری کچھ عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، سایوں کے جھنڈ اس کے چکنے چہرے پر چھوٹ رہے تھے۔

دن ڈوب رہا تھا ـــــ اس نے اپنے لمبے لمبے بازو دنیا کے دونوں کناروں سے سمیٹے اور انھیں بغل میں دبا کر ایک گہرے کنویں۔ رنگ کی گھڑی سی بنا دو، مغرب کے گہرے پانیوں میں اتر رہا تھا، کچھ دیر میں اس کا جلال زمین کی گولائیوں میں گم ہو گیا۔ اب کنارے اور اس پر کے مکانوں اور اس میں رہنے والوں پر وہی روشنی تھی جو آسمان کے آوارہ بادلوں پر سے ہوتی ہوئی نیچے زمین پر پڑتی ہے، اور جو ہولے ہولے دھیرے دھیرے بڑے پیار سے اندھیرے کو اپنی جگہ دیتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو ـــــ "لو اب تمھارا راج ہے۔ جاؤ موج اڑاؤ!"

وہی چھینک جس نے درباری کو بہت سے کوس دور پھینک دیا تھا، ایک ہی بار میں اس کے بہت ہی قریب لے آئی سیتا کانپنے لگی، اور درباری بھی اسی وقت گویا دیوار میں سے آواز آئی ـــــ "درباری!"

"اس کا مطلب ہے!" درباری نے کہا ـــــ "تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں!"

"تیرا مرد ———؟"

"ہاں!" مصری نے بٹل کو سنبھالا، جو اپنی ماں کے سر پر سے پلو کھینچ رہا تھا، اور کہنے لگی ——" یہ ابھی سے کیا نام ہے، تب میں کھاتی ہوں!"

مصری بہت باتونی ہے' وہ اور بھی بہت کچھ کہتی، بٹل اور بھی کچھ کرمرانا کھتا، لیکن درباری کو ان شرارتوں کے پرے کالی رنگ لہراتا ہوا نظر آیا، اس نے جلدی سے مصری کے آبنوسی حسن [redacted] گوری جیسی معصومیت کو جھٹک دیا، اور ——" میں چلا صالح بھائی ——— اچھا بھابی ——" کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل آیا، ابھی وہ سڑک پر پہنچا بھی نہ تھا کہ پتلون کے پائنچے میں اسے مکڑی کے چھلکے اڑے ہوئے دکھائی دیے جنھیں درباری نے باہر پھینکا، اور سیتا کے پاس پہونچا۔

شیوا جی پارک میں سمندر کے کنارے کلب اور کھیل پوری والوں سے کچھ دور ہٹ کر درباری اور سیتا ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔

سیتا اٹھارہ انیس برس کی ایک لڑکی تھی، جس کی ماں تو تھی مگر باپ مر چکا تھا، گھر کی حالت کوئی اتنی خراب بھی نہ تھی، کیونکہ مکان اپنا تھا، جس کے کرایہ داروں سے کبھی کرایہ وصول ہوتا تھا، کبھی نہیں، سیتا کی ماں لکشمن دیبی، یوں تو اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتی تھیں، لیکن شادی سے زیادہ اسے اس بات کا خیال تھا کہ کوئی ایسا آئے جو ہر مہینے اپنے رعب سے کرایہ وصول کرے، تاکہ سیتا کے کہنے کے مطابق دروازے پر جو ہر مہینے بھیڑیا دکھائی دیتا ہے نظر نہ آئے، جینا آسان ہو جائے۔ لکشمن دیبی سے سیتا نے درباری کی بات بھی کی، پہلے تو وہ شک و دسوسہ کا اظہار کرنے لگی، لیکن جب اسے پتہ چلا کہ درباری کا پورا نام درباری لال ہتا ہے تو اس نے جھٹ سے اجازت دیدی، کیونکہ جو لوگ بمبئی میں مکانوں کا کرایہ اُگاتے ہیں انھیں ہتا بولتے ہیں، سیتا کا قد درمیانہ تھا، لیکن چہرے کی کھٹن ایسی تھی، جو مردوں کے دل میں جذبے جگا دیا کرتی، اور کوہان سے خود سی بیٹھ اس کے ہونٹوں پر چلی آتی، چہرے کی تراش خراش اچھی تھی، لیکن اس کا نزدیک آنے سے ہی پتہ چلتا تھا، پلکیں کچھ نم سی رہتی تھیں، کیونکہ سیتا کی آنکھیں کچھ اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، اس کے بچاؤ کے لیے پلکوں کو جھکاتا رہتا تھا، لیکن یہ ان دھنسی ہوئی آنکھوں کی وجہ سے ہی تھا کہ سیتا مرد کے دل میں بہت دور تک دیکھ سکتی تھی، وہ کسی کو کچھ کہے یا نہ کہے یہ الگ بات تھی، لیکن جانتی وہ سب تھی۔

ہاں سیتا کے بال بہت لمبے تھے، جن کے سبب درباری اس سے پوچھا کرتا تمہارے گھر میں کوئی کسی بنگالن کو بھی بیاہ کر لایا تھا، اور سیتا کہتی میں خود جو ہوں بنگالن ——— میرا نام سیتا موز مدار ہے ——— اور پھر وہ ہنسنے لگتی۔

سیتا خوش تھی۔ اس کا قد صرف اتنا ہے جس سے وہ اپنے تین کالے چمکیلے اور گھنے بالوں والے سر کو درباری کی چھاتی پر رکھ سکتی ہے اور اپنے ضمیر کی روح کو کسی کو پیش کر کے اپنے سارے دکھ بھول سکتی ہے اور تھوڑے سے فرق سے وہ پتی اور پتا کو ایک کر سکتی ہے۔

دیوار کی اوٹ میں بیٹھا ہوا درباری سیتا سے پیار کر رہا تھا، سیتا نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کا پیار حد سے گزر جائے کہ گود یا تو پڑتے ہی سیتا چوکنی ہونے لگی، اس نے درباری کو باتوں میں لگانا چاہا، بلاؤز میں سے اس نے ایک چھوٹی سی ہو نہ کی ڈبیا نکالی، اور درباری کے پاس منہ کرتے ہوئے بولی۔ "دیکھو، میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں؟"

"کیا لائی ہو ———؟" درباری نے پوچھا۔ اور بے خبری میں سیتا کی کمر سے ہاتھ نکال کر ڈبیا کی طرف بڑھا دیا، سیتا نے ڈبہ کو پرے ہٹا لیا۔ بولی ——" ایسے نہیں، میں خود دکھاؤں گی!" اور پھر اسے درباری کی ناک کے پاس کرتی ہوئی بولی "سونگھو!"

بدقسمتی سے درباری نے ڈبیا کو سونگھ لیا، اسے چھینکیں آنے لگیں۔

محبت کا سارا کھیل رک گیا اور درباری چھینک پر چھینک مار رہا تھا، اور جیب سے رومال نکال کر بار بار اپنی ناک کو پونچھ رہا تھا۔ سیتا پاس بیٹھی ہنستی جا رہی تھی۔

"——— یہ ——" درباری نے کہا، اور پھر چھینکتے ہوئے بولی ——" کیا مذاق ہے؟"

سیتا کہنے لگی ——" تم اسے مذاق کہتے ہو، میں روپے

لیکن اس حد تک نہیں، جس حد تک سیتا کرتی تھی، سیتا تو جیسے اس دنیا میں اپنے نام کو اسم بامسمّیٰ ثابت کرنے کے لئے آئی تھی اور اب اشوک باٹیکا میں پڑی دیکھ رہی تھی کوئی اس پار سے پیغام کی صورت انگوٹھی پھینکے۔ لیکن رام جی کے زمانے سے آج تک دنیا میں کیا کچھ ہو گیا تھا، اب تو انگریزی "فن" پھیل گیا تھا، جس سے دوہرا لطف اٹھایا جاتا تھا۔

گھر میں جالی لگی تھی، تین دن خوب پریشان کرنے کے بعد بڑھئی چھٹی کر گیا تھا، ۔ ۔ ۔ ۔ صاف ستھرے برآمدے میں بیٹھا ہوا درباری سونی سونی نگاہوں سے سڑک کے اس موڑ کو دیکھ رہا تھا جہاں کبھی کاسنی اور کبھی دھانی اور کبھی جوگیا رنگ لہرایا کرتے ــــــ

اسی وقت اڈوڈر اسٹیشن سے آنے والی موڑ پر نارنگی رنگ دو تین بار لہرایا، درباری نے جلدی سے کپڑے درست کئے اور باہر نکل گیا۔

موڑ پر سیتا کھڑی تھی، اس نے ایک مرتبہ درباری کی طرف تاکا اور پھر پرے دیکھنے لگی، اس کی آنکھیں کچھ اور بھی اندر کی طرف دھنس گئی تھیں، پلکیں کچھ اور بھی نم ہو گئی تھیں۔

"کہیے حضور ــــــ کیا حکم ہے؟"

سیتا نے کوئی جواب نہ دیا، درباری کو یوں لگا جیسے سیتا کچھ کانپ سی رہی تھی، درباری کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اور "اگر چپ ہی رہنا ہے تو پھر ــــــ" اور وہ لوٹنے لگا۔

"سنو!" سیتا یکایک مڑتی ہوئی بولی ــــــ "مجھے معاف کر دو، اس دن مجھ سے بڑی بھول ہو گئی ــــــ"

درباری نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بولا "اب تو نہیں ہو گی ــــــ"

سیتا نے "نا" میں سر ہلا دیا۔

"جہاں کہوں گا میرے ساتھ چلو گی ــــــ؟"

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے۔ کرتے ہوئے پلو کے کونے سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں، درباری کے جسم پر گویا خون کا دباؤ دفعتہً تیز ہونے لگا۔ اس نے اپنے کھردرے ہاتھ پھیلا کے اور سیتا کا نرم سا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا "تو تو ایسے ہی ڈر رہی ہے۔ تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی بڑا بد اخلاق آدمی ہوں!"

سیتا جیسے یہی سننا چاہتی تھی۔ بولی "نہیں نہیں ــــــ ایسا کیوں؟"

درباری اور سیتا وہیں پہنچ گئے، نیو ابی پارک میں دیوار کے نیچے ــــــ دن ڈوب چکا تھا، آج آسمان پر کوئی بادل بھی نہ تھا جو زمین کی گولائیوں سے آسمان پر ظاہر ہونے والی روشنی کو ادھر ادھر زمین پر پھینک دیتا۔ اس لئے اندھیرے نے جلد ہی دنیا کو ڈھک لیا۔ سامنے پھیلا تاتا گاندھی سوئمنگ پول کے ارد گرد بنے ہوئے جگنے لفوروں میں بنے اور گم ہو گئے۔

درباری کے بڑھتے ہوئے پیار کے سامنے سیتا خاموش بیٹھی تھی، درباری ایک دم جھلا اٹھا۔ اور بولا "کچھ منہ سے بولو بھی نا ــــــ"

سیتا کو ہنسنا پڑا۔

درباری نے سیتا کی کھوکھلی ہنسی کی نقل اتاری، اور سیتا بیچ بیچ ہی ہنس دی۔

درباری حوصلہ پا کر بولا "تمہیں کیا سچ مچ مجھ پر اعتماد نہیں؟"

"یہ بات نہیں" سیتا بولی ــــــ "تم مجھ سے شادی کر بھی لو گے تو بھی مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھو گے، سمجھو گے میں ایسی ہی تھی"

"نہیں سیتا، میں نہیں سمجھوں گا۔ کبھی نہیں سمجھوں گا"

اسی وقت کچھ لوگ لوہے کی سلاخیں لیے چلے آئے، درباری چونکا ــــــ اسے تسلی ہوئی جب انھوں نے سلاخیں ریت میں مارنی شروع کر دیں۔ وہ بوڑھے نکے اس پوشیدہ خزانے کو دیکھ رہے تھے جو دو ایک دن پہلے انہوں نے دبایا ہوگا۔ اور اب سمندر میں جوار آنے سے پہلے اسے برآمد کر کے کام میں لانا چاہتے تھے،

درباری اور سیتا اٹھ کر ذرا پرے دیوار کے دوسرے کنارے پر جا بیٹھے، مڑ کر دیکھا تو دیوار کے اوپر بمبئی کے برتن مانجھنے والے راما لوگ بیٹھے تھے اور آپس میں مذاق کر رہے تھے۔

درباری نے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہا۔ سیتا گھبرا رہی تھی

"پیار کا مطلب یہ تھوڑی ہوتا ہے!"

"میں سب جانتا ہوں۔" اور درباری اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اور اپنے لباس درست کرنے لگا۔ سیتا نے اسے روکنے کی کوشش کی اور منت بھرے لہجے میں بولی — "کیا کر رہے ہو چاند؟" اور پھر پڑی ہوئی سیتا درباری کے پیروں سے لپٹ گئی، جو غصہ سے کانپ رہا تھا۔

درباری نے ایک پیر ایک جھٹکے کے ساتھ چھڑا لیا، اور بولا — "بیچ! بڑی پاکیزہ بنتی ہے، سمجھتی ہے —"

"میں کچھ نہیں سمجھتی!" سیتا نے گھٹنوں کے بل گھسٹ کر درباری کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری ہوں چاند! — تن من پورا تمہاری، مگر میں ایک بیوہ ماں کی بیٹی ہوں مجھ سے شادی کر لو۔"

"کوئی شادی وادی نہیں!" درباری بولا۔ "تم سے جو کہہ دیا کیا وہ کافی نہیں، کیا منتر پھیرے ضروری ہیں — قانون کی پکڑ — اس کی اوٹ ضروری ہے؟"

اور درباری لال رنگ گیا — جیسے ابھی اسے امید تھی

"ہاں ضروری ہے" سیتا روتے ہوئے بولی — "یہ دنیا میں نے یا تم نے نہیں بنائی۔"

درباری کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔

"میں اس پیار کو نہیں مانتا، جس کے درمیان کوئی بھی پردہ — کوئی بھی شرط ہو، روحوں کا اتصال ضروری ہے، تو جسموں کا بھی، اس میں تو بھگوان ہوتے ہیں۔ ایسا شاستروں میں لکھا ہے۔"

"لکھا ہوگا۔" سیتا بولی۔ "سب تمہاری طرح اس بات کو مانتے ہوں گے۔"

"میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔" درباری نے غصہ سے پیر زمین پر مارتے ہوئے کہا، جو ریت میں دھنس گئے، اور پھر وہ انہیں کھینچتے، ریت نکالتے ہوئے چل پڑا — سیتا پیچھے لپکی — "سنو" ابھی درباری نے دیوار کی سد نہیں پھاندی تھی۔ اب بھی وہ اس کے سہارے بیٹھ سکتے تھے، اندھیرے میں گلے لگ سکتے تھے۔

ایک دو لڑکے ماحول کی دلچسپی دیکھ کر رک گئے تھے پھر چنے والا آیا، جس کی پھیری میں آگ سمندر کی طرف سے آنے والی تیز ہواؤں میں ہر دم بڑھتی جا رہی ہے۔

ایک بار سیتا نے نہ صرف درباری کے پیر پکڑے، بلکہ اپنا سر اور بنگالی زلفیں ان پر رکھ دیں، اور نم آنکھیں بھی ہونٹ بھی، درباری پیروں تک جل رہا تھا، پیر چومتی ان پر آنسو گراتی ہوئی سیتا نے تھوڑا اٹھ کر درباری کی طرف دیکھا، اور کہنے لگی "تو تم سمجھتے ہو میں کسی برف کی بھیتر کی بنی ہوں! میرا تن من گھل جانے کو جی نہیں چاہتا، اگر تم کیا جانو ایک عورت کا دکھ؟"

اور پھر کسی انجانے ڈر سے کانپتی ہوئی بولی "میں نہیں کہتی یہ دکھ تم نے دیے ہیں، یہ بھگوان نے دیے ہیں، بھگوان ہی نے عورت کے ساتھ بے انصافی کی ہے!"

"میں سب جانتا ہوں!" درباری نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "مرد سب برداشت کر سکتا ہے، توہین برداشت نہیں کر سکتا!"

"کس کی توہین؟"

درباری نے جواب دینے کی بجائے سیتا کو ٹھوکر مار دی اور وہ پیچھے کی طرف جا گری، خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈیونی کی طرف نکل گیا۔

سیتا ایک ایسے ڈر سے کانپے جا رہی تھی جو اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں اس نے کبھی دیکھا نہ تھا، جس کا تجربہ اس نے اپنے پتا کی موت پر بھی نہ کیا تھا، ماں کی چھاتی میں منہ چھپا کر وہ بھول گئی تھی، جیسے جلتے ہوئے پھوڑے کے گرد ہلکی ہلکی انگلیاں پھیرنے سے ایک طرح کا سکھ، ایک قسم کا آرام آتا ہے۔ ایسے ہی ماں کے سر پر ہاتھ پھیرنے سے اس کے سارے دکھ دور ہو گئے تھے، وہیں ریت پر پڑے پڑے سیتا دبی دبی سسکیاں لیتی رہی، درمیان میں وہ کبھی کبھی سر اٹھا کر دیکھ لیتی کوئی دیکھ تو نہیں رہا، مدد کے لئے تو نہیں آ رہا۔ جیسے مصیبت میں پڑی ہوئی عورت کے لئے اس ملک کا ہر نوجوان مرد پہنچ آتا ہے سامنے دئے کی لو میں کوئی چیز چمکی، سیتا نے اٹھائی تو وہ مانڈی کی ڈبیا تھی جو نیچے جا گری تھی، اور اب اس میں ریت چلی آتی تھی۔

یہ حقیقت تھی کہ درباری سیتا سے پیار ضرور کرتا تھا،

پھر دیکھنے لگی ، اور جب اسے اس بات کی تسلی ہو گئی کہ ببل خوش ہے تو جلدی جلدی چلی گئی ، پھر دور جا کر اس نے بٹنے سے ں کا نوٹ نکالا ، اور اس کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی اپنے ہر کی طرف دیکھتا ہے۔

درباری ببل کو لئے اندر آیا ، ببل کو کمرے کی بہت سی یز وں میں دلچسپی پیدا ہو گئی ، ہر چیز اس کے لئے نئی تھی ، ہر ہر چیز کو ڈال کر ایک نیا تجربہ کرنا چاہتا تھا ۔ ایسا تجربہ جس کی کوئی ر نہیں ، ایسا سودا جس کی کوئی انتہا نہ رہی ۔ اسی وقت ماں اندر ی آئی ، اور درباری کے ہاتھ میں بچے کو دیکھ کر حیران ہو اٹھی ل پر انگلی رکھتے ہوئے بولی ـــ "ہائے رام یہ کیا ـــ؟"

"ببل ـــ ماں ، مصری کا بیٹا ـــ!" درباری بولا ـــ "بڑا پیارا لگتا ہے!"

"اس کی ماں کہاں ہے؟"

"گئی ـــ میں نے تھوڑی دیر کھیلنے کو لے لیا ہے۔"

سار ایک بار پھر ماں کا کیا کام ـــ؟" درباری نے ماں کی دیکھتے ہوئے کہا۔

"جا ارے جا ـــ" ماں بولی ـــ پھر آنکھ میچتے ـــ کسی کی نی دولت ہوتی ہے ، پھر جیسے اپنے آپ تیرے جیسے لونڈے ما نہیں۔"

"اچھا ماں!" درباری نے کہا ـــ "میں اسے یو د ار کالج سامنے والے میدان میں لے جاؤں گا ، جہاں پارک ہے ، بچے جھگڑتے ہیں بچے لوٹتے ہیں ـــ تو ذرا اسے بھجوا دے"

ماں نے پھر جھرجھری لی ـــ "ہاں گندہ!" اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی ـــ "میں تو اسے ہاتھ نہیں لگاؤں!"

بھابی جو کچھ دیر پہلے کھڑی ہوئی تھی بولی ـــ "اتنا شوق ہے تو اپنا ہی کیوں نہیں لے آتے ، شادی کر لیتے!"

درباری نے بھابی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا "مجھے دوسروں کے ہی بچے اچھے لگتے ہیں!"

بھابی نے ٹھنڈی سانس لی ـــ "اب بھگوان نہ دے تو کوئی کیا کرے؟"

درباری نے ببل کو نیچے فرش پر بٹھا دیا ، جہاں اس کا دھیان جرمن سلور کے ایک چمچے نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا ۔ چمچہ خود اندر چلا گیا ، اور ببل چمچے کو منہ میں ڈالے چوستا رہا ۔ شاید وہ کچھ اور بھی دانت نکال رہا تھا۔

یکایک ببل کو اپنی تنہائی محسوس ہوئی ، اس نے اپنے ہاتھ پہلے ماں ، پھر بھابی کی طرف پھیلا دئے ۔ ماں تو "چھی چھی" کرتی ہوئی اندر چلی گئی ، بھابی لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکی ـــ پھر ضمیر کے کسی ابال نے اسے مجبور کر دیا اور لپک کر اس نے ببل کو اٹھا لیا اور اسے سینے سے لگا کر ہلانے لگی ، جیسے کسی بے اندازہ سکون اور طمانیت کے جھولے میں پڑ گئی ہے ، ببل اسے گندہ نہیں لگ رہا تھا ، دل ہی دل میں اس نے ببل کو نہلا دھلا کر ایک بنگالی کے بیٹے سے کسی رانی کا بیٹا بنا لیا تھا ، اس نے سینکڑوں ریشمی اور سوتی فراک بنا ڈالے تھے ، اور سوچ رہی تھی ، اتنا خوبصورت ہے ، میں اس کے لئے لڑکیوں والے کپڑے بنواؤں گی۔

اندر پہونچ کر درباری نے سوٹ کیس نکالا ، اس میں کچھ کپڑے رکھے ، اور پھر اس کے اوپر ٹیگور ، پریم چند اور لارنس کی کچھ کتابیں ، پھر دھیرے سے سوٹ کیس بند کیا ۔ اور کمرے کی طرف مڑا۔

کمرے میں پہونچا تو ببل ہنس کی طرح چھاتیوں میں سر دیے ہوئے تھا ، درباری کے پہونچتے ہی اس نے منہ نکالا ، اور فاتح کی طرح درباری کی طرف دیکھنے لگا ۔ پھر اگلے ہی پل جانے کس جذبے کے تحت اس نے اپنے دونوں ہاتھ درباری کی طرف پھیلا دیے ۔ درباری نے بڑھ کر ایک ہاتھ میں ببل کو اٹھایا اور دوسرے میں سوٹ کیس تھاما ، اور "اچھا بھابی" کہہ کر باہر نکل گیا۔

وادر پہونچ کر ـــ ریڈی میڈ کپڑوں کی دوکان سے درباری نے ببل کے لئے ایک قمیض خریدی ، اور ـــ نیکر بھی ، قمیض تو جیسے تیسے ببل نے پہن لی ، لیکن نیکر پہنتے وقت اس نے باقاعدہ شور مچانا یعنی چلانا شروع کر دیا ۔ جتنی دیر بھی وہ کھڑا رہا تھا برابر اپنی ٹانگوں سے سائیکل چلاتا رہا ـــ اتنی جھٹکا ، پھر گرا ـــ درباری ایک ہاتھ سے پکڑتا تو دوسرے ہاتھ کی طرف لڑھک جاتا ، اور پھر منہ اٹھا کر درباری کی طرف حیرانی سے دیکھتا ۔ جیسے کہہ رہا ہو "عجیب آدمی ہو ، ایک بچہ بھی پکڑنا نہیں

بیمار ہی تھی، پسینہ پسینہ ہو رہی تھی، وہ پورے طور پر درباری کے ہاتھوں میں تھی آج اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ تھا، وہ تو کسی روٹھے کو منانا چاہتی تھی، اور اس کے لئے کوئی بھی قیمت دینے کو تیار تھی

اسی وقت کچھ منچلے "اے میرے دل کہیں" گاتے ہوئے پاس ہی سے گزرے، پھر ایک پولیس مین آیا اور درباری چوکنا ہو کر اٹھ گیا۔ اس نے خونی آنکھوں سے آس پاس کے منظر کو دیکھا، اور انگریزی میں، ایک موٹی سی گالی دی اور بولا "چلو سیتے یہاں نہیں، جو ہو چلیں گے۔"

"جو ہو؟"

"ہاں، اٹھو، کیڈل روڈ سے ٹیکسی لیتے ہیں۔"

سیتا چپ چاپ اٹھ کر درباری کے ساتھ چل دی۔

سیتا اور درباری جو ہو کے بیچ پر ادھر ادھر ہو سکتے تھے، کیونکہ اس میں خطرہ تھا، روز کوئی نہ کوئی واردات ہوتی رہتی تھی، ابھی چند ہی دن ہوئے ایک قتل ہوا تھا چند غنڈوں نے ایک میاں بیوی کو زندگی کے دو کناروں پر جا کھڑا کیا تھا، لیکن اس دن جو ہو کے ہوٹل اور کاٹیج کا ہکور سے بھرے پڑے تھے، کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد درباری اور سیتا ورٹ کی سمت جا رہے تھے، راستے میں سیتا کوئی بات کرتی تھی، درباری کوئی اور ہی جواب دیتا تھا۔ دیتا بھی تھا تو اکھڑا اکھڑا، بے سر پیر کا، زبان میں ایک عجیب طرح کی ہکلاہٹ تھی، گویا کوئی نشہ آور شے منہ میں رکھ لی ہو جس سے زبان پھول گئی۔

ٹیکسی حاجی علی سے ہوتی ہوئی تاردیو میں داخل ہوئی، وہاں سے اوپرا ہاؤس ہوتی ہوئی پارن بی روڈ پر پہونچی جس کا نام اب مہاتما گاندھی روڈ ہو گیا ہے۔ وہاں پہونچ کر ایک ہوٹل کے منیجر سے پوچھا "کوئی کمرہ خالی ہے؟"

منیجر نے غور سے درباری کے چہرے کی طرف دیکھا، جس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا گویا کوئی واردات کر کے آیا ہے، یا کرنے جا رہا ہے۔ پیچھے سیتا کھڑی زمین کی طرف دیکھتی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی، دونوں گناہوں کے ہاتھوں میں گرفتار، دیوانے ہو رہے تھے، ـــــــ اسی وقت منیجر نے پوچھا "آپ کہاں سے آ رہے ہیں ـــــ؟"

"جی!" درباری نے یکلخت سوچتے ہوئے کہا "اورنگ آباد سے!"

"خوب!" منیجر نے پیچھے سیتا کی طرف اور پھر درباری کے سیاہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"جی، سامان تو نہیں ہے۔"

"معاف کیجئے!" منیجر نے درباری کی طرف یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی نہایت ہی گندی اور ذلیل شے ہو، اور پھر بولا۔ "اپنے پاس کوئی روم نہیں!" منیجر کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"کیا مطلب"؟ ابھی تو ٹیلی فون پر ـــــــ"

بیرہ ۴۹ جو ایک ٹرے پر وے فر، مونگ کی دال سوڈے کی بوتلیں اور چاپ لے کر جا رہا تھا، بول پڑا "یہ ہوٹل معزز لوگوں کے لئے ہے صاحب!"

درباری کچھ کہہ نہ سکا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا، اس بیرے کا ٹپ ایک روپیہ سے زائد نہ ہوگا، اور قبلہ منیجر صاحب کی عزت پانچ روپے ـــــــ اور آج یہ سب کے سب نیکی، عزت اور شرافت کے ٹیلے بنے بیٹھے تھے، وہ عزت و شرافت کے ٹیلے تھے یا نہیں، لیکن ایک بات طے تھی کہ زندگی میں جو کچھ بھی کر گزرنے کے لئے بڑا پُرفن ہونے کی ضرورت ہے، ننگا ہونا ہوں میں پوری پیشہ ورانہ بے خوفی، بے باکی اور بے حیائی لانی پڑتی ہے، جس کے سامنے ان کی شرافت اور پاکیزگی چھوٹی پڑ جاتی ہے، درباری اپنے اندر کہیں گر وہ کہیں بزدل تھا، وہ ایک ناتراشیدہ ہیرا تھا۔

لوٹتے ہوئے وہ گالی بک رہا تھا، انگریزی میں، جیسے وہ ہوٹل کے منتظموں کو سنانا بھی چاہتا تھا اور ان سے چھپانا بھی،

"چلو سیتا ـــــ!" درباری نے کہا "پھر کبھی سہی!"

اور دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر کی طرف چل دیے۔

زندگی بدمزہ ہو گئی تھی، اتنی بڑی شکست کا گمان درباری کو کبھی نہ ہوا تھا۔

آج اس کا کہیں جانے کا ارادہ نہ تھا، حالانکہ ایک کلرک

ببل ہے" اور سیتا دل میں اتنا سا بھی شک لئے بغیر چل دی پھر ٹیکسی کو دیکھتے ہوئے بولی — "اس پر چلیں گے؟"

درباری نے سر ہلا دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور جو اکتا رہا تھا، خوش ہو گیا۔ پشت کی طرف لپک کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ اور ببل اور سیتا اور درباری بیٹھ گئے، اسی وقت سیتا کی نگاہ سوٹ کیس پر پڑی ایک شک کی پرچھائیں اس کے چہرے پر سے گزری۔

"یہ سوٹ کیس ——؟"

"ہاں ——" درباری نے کہا۔

"دیدی کے یہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں بھی جا رہا ہوں، تمھیں اس سے کیا؟" پھر ایک غصہ بھری نگاہ سیتا پر پھینکتے ہوئے بولا —— "تم نے کہا نہیں تھا جہاں میں لے جاؤں گا جاؤ گی!"

سیتا کو کچھ باتیں سمجھ میں آنے لگیں، درباری کے چہرے کی رنگت سوٹ کیس —— بچہ —— اس نے ڈر کے عالم میں ببل کو سیٹ پر بٹھا دیا۔ اور منہ چھلاتے ہوئے بولی —— "ہاں کہا تھا!"

سیتا نے پھر ایک تیز سی نظر درباری پر پھینکی اور پھر اپنی نگاہ چرا لی۔ اسے اپنا آپ جیسے کچھ گندا لگا، ساری کے پلوسے اس نے اپنا سرخ ہوتا ہوا چہرہ پونچھا —— درباری نے خمار بھری نگاہیں سیتا پر پھینکتے ہوئے کہا —— "سیتا تم پھر لگی ہو اس دن کی طرح کرنے۔"

سیتا ڈر گئی —— "نہیں تو —" وہ بولی۔

ٹیکسی حاجی علی سے جا رہی تھی —— آج سمندر کا وہی رنگ تھا جو مون سون سے پہلے ہوتا ہے، میلا، کچیلا —— گندا اور گیلا —— شاید دور کہیں برسات شروع ہو چکی تھی۔ اور بے شمار گندے نالے اور ندیاں سمندر میں آ پڑی تھیں۔

پھر وہی سفر —— تاردیو سے اوپرا ہاؤس، جہاں تھا کا مرشیل روڈ، فلورا فاؤنٹین اور ایک ہوٹل، آج وہ ہوٹل نہیں تھا جہاں اس دن گئے تھے۔

سامنے ایک بیرہ کھڑا تھا —— درباری سیتا اور ببل کو دیکھ کر لپکا۔ بڑی عزت، بڑے احترام کے ساتھ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا —— درباری اترا ٹیکسی والے کو پیسے دیئے اور پھر بیرے کو سوٹ کیس اتارنے کا اشارہ کیا۔ سیتا اتری، اس کی آنکھیں کچھ کچھ جھکی ہوئی تھیں اور ببل کو اپنے بازوؤں میں بھینچنے سے اسے ہچکچاہٹ سی ہو رہی تھی۔

"اٹھاؤ نا —" درباری نے ببل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا —— "یہ بوجھ عورت اٹھاتی ہے۔"

سیتا نے کچھ دیر بے بسی کے عالم میں ببل کی طرف دیکھا، جیسے ابھی وہ اٹھانا نہ چاہتی تھی، لیکن درباری اور اس کے غصے سے ڈرتی تھی، مرد اور اس کی دہشت سے سہمی تھی، اس نے ببل کو اٹھا تو لیا، مگر اس سے پیار نہ کر سکی تھی، اسے کچھ کچھ، گھٹی گھٹی، گندی گندی ڈکار سی آنے لگی تھی،

ہوٹل اوپر تھا —— درباری نے یہ بھی تو نہ پوچھا —— "کمرہ ہے ——؟" اب کوئی ضرورت نہ تھی، وہ اپنی نگاہوں میں وہی پیشہ وروں کی سی بے باکی پیدا کر چکا تھا، جس کی اب ضرورت نہ تھی۔

سیتا نے دیکھا۔ سیڑھیوں پر جیسے کسی نے تیل اور گھی کے ڈرم کے ڈرم لنڈھا رکھے تھے، رستا، جس کی مدد سے نہ جانے کتنے لوگ اوپر گئے تھے، ہاتھوں کے لگنے سے میلا اور گندہ لگ رہا تھا، پورے ماحول سے کسی باسی پھول کی بو آ رہی تھی۔

رستے کو ہاتھ لگائے بغیر ہی سیتا درباری کے پیچھے پیچھے اوپر پہنچ گئی۔

منیجر صاحب نے تینوں کو آتے دیکھا، تو اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی چمک آئی، وہ عجلت سے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا، اور دونوں ہاتھ کمر کی طرف موڑتے ہوئے بولا: "ویل کم سر!" آج سب کمرے کے دروازے سیتا اور درباری کے لئے کھلے تھے،

درباری نے منیجر سے کہا —— "ہم پلی مورا سے آئے ہیں۔ رات گیارہ بجے دالی پنجاب میل سے آگرہ جائیں گے، جہاں تاج محل دیکھیں گے، جو شاہجہاں نے اپنی بیوی ممتاز کے لئے بنوایا تھا، دراصل اسے ممتاز سے اتنی محبت نہ تھی جتنا جرم کا احساس

آنچل

پھر دفعتہً بجلی کے ایک قمقمے نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی، وہ اوپر کی طرف ہمکا، بجلی کے ڈبے سے درباری نے ہاتھ اوپر کیا ہی تھا کہ ببل نے پاس پہنچتے ہوئے ٹیبل فین کی جالی میں اپنی انگلی جا ڈالی، دکان دار نے لپک کر ہاتھ ہٹا لیا۔ نہیں تو جناب کی انگلی اڑ گئی تھی، جھٹکے سے ہاتھ پرے کرنے پر اس نے رونا شروع کر دیا۔ اور جب درباری نے اسے گود میں اٹھایا تو وہ شکایت آمیز نظروں سے پہلے درباری اور پھر دکان دار کی طرف دیکھ رہا تھا، اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر جیسے کہہ رہا تھا "اس نے مجھے مارا۔"

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ببل کچھ جھلا سا گیا۔ دراصل اسے نیکر کی وجہ سے تکلیف ہو رہی تھی، وہ زندگی بھر یوں کسا نہ گیا تھا۔ درباری نے اسے سیٹ پر بٹھانے کی کوشش کی، لیکن وہ تیلے کی طرح اکڑ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو ____ "تم گاڑی پر بیٹھو، میں تم پر بیٹھوں گا۔ مجھے لے چلو ____ بازار میں جہاں لوگ آ جا رہے تھے، پھر اس نے زور سے اوپر نیچے ہو کر آخر نیکر نکال ہی دی اور اس پر کودتے ہوئے اسے یوں چور چور کر دیا کہ کوئی عورت اس کے بل سیدھے نہ کر سکتی تھی، اور اب نیکر نکال دینے کے بعد وہ خوش تھا، ایک عجیب قسم کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا اسے، جب وہ کھڑکی میں کھڑا ساری دنیا کو دیکھ اور دکھا رہا تھا!

درباری جب سیتا کے یہاں پہونچا، تو وہ گھر پر نہ تھی درباری نے سر پیٹ لیا ____ ماں نے بتایا، وہ پربھا دیوی میں کمود سے ملنے گئی ہے۔ پربھا دیوی کا علاقہ کوئی دور نہ تھا، لیکن کمود کے گھر کا کیسے پتہ چلے، پوچھتا تو ماں کہتی "کیوں، کام کیا ہے؟" اس لئے خاموش رہنا ہی اچھا ہے۔

اس سے پہلے کہ ماں پورے طور پر درباری پر حاوی ہو جاتی، سیتا چلی آئی، بہار کے ایک جھونکے کی طرح ____ دامن میں پتے ہی پتے، پھول ہی پھول لئے۔ اس نے ایک گہرے رنگ کی ایک چولی جست کی ہوئی تھی، اور نیچی یا دلوں کے کلر کی سی ہینڈلوم ساڑھی لپیٹ رکھی تھی، جو جسم کی ساری رعنائیوں کو ایک آزاد ایک طوفانی سے بہاؤ میں لے آئی تھی، خود وہ بہار کا جھونکا تھی۔ لیکن درباری کے لئے خزاں کا پیغام اس کے اندر کے پھول پتے ایک ایک کر کے خشک ہونے، گرنے اور پھر آندھیوں کے ساتھ اڑنے لگے، اور جو ڈال پر رہ گئے تھے سوکھ کر آپس میں ٹکرانے، دل کو دھڑکانے لگے۔

سیتا نے آتے ہی پہلے ببل کو دیکھا اور آنکھیں پھیلائیں ____ "یہ کس کا ہے؟" اور پھر لپک کر بچے کے پاس جا پہونچی ____ ہائے کتنا پیارا ہے ببلو سا!

"ہاں!" ____ درباری نے کہا ____ "ببل ہی اس کا نام ہے۔ تمھیں کیسے پتہ چلا؟"

"مجھے کیا معلوم؟" سیتا نے تالی بجاتے اور ببل کو اپنی گود میں بلاتے ہوئے کہا ____ "ہر بچے کی شکل سے ہی اس کے نام کا پتہ چل جاتا ہے ____ تمھیں نہیں چلتا ____؟"

ببل نے پہلے شک و شبہ کی نظر سے سیتا کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔ جیسے برسوں سے جانتا ہو، اور پھر ترازو کے انداز میں بازو اٹھا دئے۔ سیتا نے اسے اٹھا لیا، چھاتی سے لگا لیا اور سب عورتوں کی طرح تھوڑا جھول گئی۔ بس رشتہ قائم ہوتے ہی ببل نے چھوٹی الماری پر پڑی ہوئی کی ٹوکری کی طرف اشارہ کیا۔ اور "اوں ____ اوں" کرنے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو "اس میں کچھ ہے میرے لئے؟"

درباری کی نگاہوں میں خواب تھے، اور جب سیتا نے دیکھا تو اس کی نظروں میں جیسے اور بچے ____ شاید ببل سیتا کی نظروں میں اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ درباری نے کچھ اتاولا ہو کر کہا: "گھنٹے بھر سے میں تمھاری راہ دیکھ رہا ہوں، دیدی نے بلوایا ہے۔"

سیتا نے ماں کی طرف دیکھا ____ "ماں!"

"ہاں بیٹا!" ماں نے اجازت دیتے ہوئے کہا ____ "ٹھہرو میں اس کے لئے کچھ بسکٹ ......"

درباری نے اور بے صبری سے کہا ____ "چھوڑتے رہو گے، تم چلو، میرے پاس اتنا سا بھی وقت نہیں ہے ____!"

اور سیتا ببل کے گال سے اپنے گال رگڑتی ہوئی چل دی ____ کہتی ہوئی ____ "اے تو، چھوٹا سا، موٹا سا، گولا

سیتا چونکی۔ وہ باہر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے ہاتھ اور ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔

درباری کی ڈانٹ کے بعد ببّل نے ایک دہشت کے عالم میں چلانا شروع کر دیا۔ درباری ایک دم آگ بگولا ہو گیا، وہ پلا کو یا بچے کا گلا گھونٹ دے گا، مرد اور عورت کے درمیان اس بے معنی آواز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دے گا۔ ببّل کے پاس پہونچتے ہی اس نے ایک زور سے تھپڑ ببّل کو مار دیا۔ وہ لڑھک کر دور جا گرا۔

"شرم نہیں آتی —؟" کہیں سے معصری کی آواز آئی

درباری نے پلٹ کر دیکھا — معصری نہیں سیتا تھی جو کسی غیر مرئی طاقت کے آجانے سے نیم برہنہ حالت میں ببّل کے پاس چلی آئی تھی اور اسے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ ببّل سیتا کی چھاتیوں میں سر دئے سو رہا تھا سسکیاں لے رہا تھا، پھر اس نے اپنا منھ اٹھایا اور بندھی گھگیوں کے باوجود درباری کی طرف اشارہ کرنے لگا جیسے کہہ رہا ہو "اس نے مجھے مارا۔"!

اب درباری کو پتہ چلا، وہ کس قدر ذلیت، کس قدر کمینہ اور کس قدر وحشی ہے۔ وہ سیتا سے اتنا شرمندہ نہ تھا جتنا ببّل سے —" آنے والی نسلوں کو وہ کیا جواب دے گا —؟" لیکن اپنے آپ کو حق بجانب کہنے کو اس کے پاس ابھی بہت سی دلیلیں تھیں۔

اسی وقت درباری نے اپنا سر کسی دلدل سے اٹھایا اور ببّل کی طرف دیکھنے لگا، وہ سیتا کی طرف دیکھ نہ سکتا تھا، کیونکہ کچھ کپڑے اس کے بدن پر نہ تھے، اور جو درباری کو دنیا کا سب سے بڑا بد اخلاق انسان سمجھ رہی تھی، اور جو اس کمینی حد تک اتر سکتا تھا۔ پھر وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔

شرمساری، ندامت اور شرمندگی سے درباری نے اپنا ہاتھ ببّل کی طرف بڑھا دیا۔ سیتا کا بس چلتا تو وہ کبھی ببّل کو درباری کے ہاتھوں میں نہ دیتی، لیکن وہ کیا کرتی، ببّل خود لپک کر درباری کے بازوؤں میں چلا گیا، اب درباری کے پاس کوئی دلیل نہ تھی اور نہ سیتا کے پاس،

"سیتا —!" درباری نے کہا۔

سیتا کچھ نہ بولی۔

"سیتا —!" درباری پھر بولا "تم کبھی بھی مجھے معاف کر سکو گی؟" اور پھر ایک ہاتھ سے جا کر سیتا کی برہنگی ڈھک دی اور دوسرا بازو بڑے پیار کے انداز میں اس کے گرد ڈال دیا۔ اور کہنے لگا "ہم پہلے شادی کریں گے۔"

اب سیتا درباری سے لپٹ گئی اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں میں اب درباری کے آنسو بھی شامل ہو گئے تھے دونوں کے دکھ ایک ہو گئے تھے اور سکھ بھی —

اور بیچ میں سالا ببّل یوں ہنس رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں!

تھا، کیونکہ اس نے سولہ اٹھارہ بچے پیدا کئے تھے، اور اپنی اس زیادتی کا اسے صلہ دینا چاہتا تھا ـــــ مگر ان باتوں کی ضرورت ہی نہ تھی، پھر بیرا سر کرتا رہا۔ ضرورت پڑنے پر ہنستا بھی اور ضرورت سے زیادہ بھی ہنستا، سر بھی ہلاتا، جھک جھک کر آداب بھی بجا لاتا۔

رجسٹر پر دستخط کرنے کے بعد، درباری کمرے میں پہنچا تو ببل کے ہاتھ میں بسکٹ تھے۔

"یہ کس نے دیے؟"

"بیرے نے!" سیتا بولی۔

"اور یہ آئس کریم کون ـــــ؟"

"پڑوس کا ایک مہمان دے گیا ہے!"

اور بیرا بچے کے لئے کٹوری میں دودھ لا رہا تھا جیسے وہ صدیوں سے بیکار تھا، آج یکایک اسے کوئی کام، ایسا روزگار مل گیا تھا جو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا۔ جس میں کبھی تخفیف نہیں ہوتی۔ اس کے سامنے ٹپس کی آمدنی اور مشاہرہ کوئی معنی نہ رکھتے تھے، وہ خوش تھا اور دودھ کی کٹوری ہاتھ میں تھامے ہوئے۔ وہ یوں کھڑا تھا۔ جیسے وہ کسی کو نہیں کوئی اسے حکم دے رہا ہے: وہ جانا ـ ملنا نہ چاہتا تھا۔

"اچھا بیرا ـــــ" درباری نے بڑی ہی سے بیرے کو چھیڑ کر کہتے ہوئے کہا۔ "ہم تھک گئے ہیں، دیکھو نا آپ ست چلے ہیں، اب تھوڑا آرام کریں گے۔"

"جی ـــــ!" بیرا بولا۔ "میری ضرورت پڑے صاحب"

درباری نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ اور اندر سے چٹخنی چڑھا دی۔ وہ سچ مچ تھک گیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اسے سیتا کا ببل کو دودھ پلانا برا لگ رہا تھا، لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ کہتا تو برا لگتا بہت ہی برا۔

اسی وقت اپنے کھلونے سے ببل نے کٹوری کو ہاتھ مارا اور دودھ نیچے گر گیا ـــــ "ہائے تیرا اگ کا ـــ!" سیتا نے کہا اور رومال سے اس کا منہ پونچھنے لگی۔ اور جب تک تولیے سے فرش صاف کرے، ببل کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ وہ سیتا کی بانہ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

سیتا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔ درباری کچھ شرمندہ سا نظر آنے لگا تھا۔

"یہ ہوٹل کوئی اتنا اچھا نہیں ہے ـــ" وہ محض بات رکھنے کے لئے بولا۔

"ٹھیک ہے ـــ!" سیتا بے پرواہی سے بولی۔

پھر درباری نے ناک سکوڑ کر ادھر ادھر سونگھا۔ اور کہنے لگا ـــ "کوئی بو سی آ رہی ہے ـــ" اور پھر اس نے شرمندگی کا عرق اپنی پیشانی سے صاف کر دیا۔ اور بے صبری کی حالت میں بولا ـــ "تم اسے چھوڑ دو بھی!"

سیتا نے ببل کو اٹھانے کی کوشش کی، لیکن وہ نڈھال ہو گیا درباری نے ایک ایش ٹرے ببل کے پاس لا کر رکھ دی اور ببل اسے کھلونا سمجھ کر لپکا۔ وہ بیٹھ گیا اور کھیلنے لگا۔

پھر آگے بڑھ کر درباری نے ایک اناڑی بے ڈھنگے اور بھونڈے انداز میں سیتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھگوان کے لئے ـــ" سیتا بولی، اور اس نے ببل کی طرف اشارہ کیا، لیکن درباری کی آنکھوں پر جیسے کوئی چربی چھائی ہوئی تھی۔ اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ صرف ایک ہی احساس تھا کہ وہ ہے اور ایک تر و تازہ شاداب لڑکی، وہ تیزی سے سانس لے رہا تھا، اس نے جب اپنے بازو سیتا کے گرد ڈالے تو وہ گوشت پوست کی نہیں لوہے کے معلوم ہو رہے تھے، سیتا کے نرم اور گدگدے جسم میں جیسے جا رہے تھے، سیتا نے کوئی روک ٹوک نہ کی، درباری کی بانہوں میں کانپتی ہوئی وہ ہر لحظہ بے دم ہوئی جا رہی تھی، آج وہ خود بھی بے سہارا ہونا چاہتی تھی۔

ببل نے ڈر کر دونوں کی طرف دیکھا۔

سیتا کو ابھی تک روتے دیکھ کر درباری سیتا سے کہہ رہا تھا ـــ "یہی مطلب ہوا نا، تم مجھ سے پیار نہیں کرتیں"۔

"میں تم سے پیار نہیں کرتی ـــ میں تم سے ـــ"

ببل نے ایش ٹرے کی خاک منہ پر مل لی تھی، اور اب رونے لگا تھا۔

"چپ بے!" درباری نے نفرت اور غصے کے ساتھ کہا

حیات اللہ انصاری

سربستہ راز

بیوگی کی سفید ساری میں ملبوس للتا ننگے پاؤں سردی سے کانپتی ہوئی اپنے گھر کے دروازے پر آئی اور اس کو دھکا دیا۔ وہ بلا آواز کے کھل گیا۔ اس نے ستیش کو اشارہ کیا اور ستیش نے گلی کی مٹیالی روشنی سے گزر کر للتا کی اندھیری ڈیوڑھی میں پاؤں رکھا۔ پھر دروازہ بند ہو گیا ـــــ للتا کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور ستیش اس کی آواز سن رہا تھا۔ خود اس کا بھی دل دھڑکنے لگا تھا کہ دیکھنا چاہیے کس راز کا انکشاف ہوتا ہے۔ اس کے یہاں آنے میں للتا کی التجاؤں کا اتنا دخل نہیں تھا جتنا تجسس کا ـــــ

ڈیوڑھی پار کرنے سے پہلے ستیش نے للتا کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ـــــ

"پہلے دیکھ لو کہ کوئی ہے تو نہیں!"

"تم گھبراؤ نہیں، کوئی نہیں ہے سوائے بہری مہراجن کے۔"

"مگر وہ بہری ہے، اندھی تو نہیں ہے۔"

"ہاں اندھی نہیں ہے لیکن اس سردی میں وہ رسوئی سے باہر نہیں آئے گی۔"

"اگر لوگ بیاہ سے جلدی لوٹ آئے؟"

"ابھی تو وہ پہنچے بھی نہ ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز بھول گئے ہوں؟"

"میں نے سب ضروری چیزیں یاد دلا دلا کر ساتھ کر دی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ کسی کی گرم چادر یا کمبل رہ گیا ہو؟ یا بچے کا موزہ وغیرہ ـــــ"

"واہ واہ ـــــ اتنی سی بات کے لئے وہ لوگ آٹھ آنے رکشا کے خرچ کریں گے۔" للتا کو یقین تھا کہ اس کا حساب کتاب بالکل ٹھیک ہے اور تنہائی کے دو تین گھنٹے ان دونوں کے پاس صاف صاف بچتے ہیں۔

گھر کے اندر بالکل اندھیرا تھا۔ صرف ایک لالٹین تھی جو سامنے کے دالان کے بیچ کے در میں بے حد ٹمٹماتی ہوئی جل رہی تھی۔ اس کی چندھی روشنی میں دالان کے تینوں دروں کے علاوہ گھر میں جتنے در اور دروازے تھے سب سربستہ راز معلوم ہو رہے تھے۔ ستیش کو یہاں آ کر بے چینی محسوس ہونے لگی ـــــ اس نے پوچھا "مہراجن جی رسوئی کس طرف ہے؟"

للتا ایک اندھیرے در میں گھس کر زینہ پر چڑھنے لگی اور دیاسلائی جلا کر ستیش کو روشنی دکھائی۔ جب ایک دیاسلائی بجھ گئی تو دوسری جلا دی۔ زینے سے گزر کر یہ لوگ ایک بہت ہی چھوٹے در اور ایک الماری والے کمرے میں پہنچ گئے۔ للتا نے تیسری دیاسلائی جلا کر ایک لالٹین جلائی۔ اور پھر ستیش کو بہت محبت سے زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر کمبل ڈال کر بٹھا دیا اور خود الماری کھول کر ایک بستہ نکال لائی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی ـــــ

"یہی وہ چیز ہے جو لالہ جی مرتے سمے مجھے سونپ گئے ہیں۔ جب بھی ان کو ہوش آتا تھا اور میرے سوا کوئی نہ ہوتا تو یہی کہتے تھے کہ اپنوں میں سے کسی کو نہ دکھانا۔ میں نے سب کو آزما دیکھا ہے ـــــ ان میں سے کوئی ایسا غمخوار نہیں ہے،

ں کو مٹا دیا گیا۔ جانچنے والوں کو کافی روپیہ دیکر فیصلہ کرا لیا گیا
رام پور ہے۔ جس خط کا تذکرہ ہے وہ اس فائل میں موجود
۔ اگر محدّب شیشے سے دیکھا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ جیم
مٹایا گیا ہے۔ یہ تحریر ایسی ہے کہ اگر عدالت میں پیش کر دی جائے تو
راجہ صاحب کو سزا ہو سکتی ہے۔

آخر میں کہا گیا تھا کہ کوئی شخص جا کر راجہ صاحب سے
ملے اور ان سے کہے کہ ان کا وہ خط جس میں "راج پور" کو
رام پور" بنایا گیا تھا میرے پاس ہے اور پندرہ ہزار روپیہ
واپس کیا جا سکتا ہے ــــــ راجہ صاحب اپنا فائل منگوا
دیکھیں گے۔ جب معلوم ہوگا کہ خط غائب ہے تو چپ چاپ
پندرہ ہزار روپیہ دیدیں گے ــ

جس ریاست کا نوٹ میں حوالہ دیا گیا تھا اس میں
لالہ جی چھ سات سال ملازم رہ چکے تھے۔ اور ریاست داری
سرٹیفکیٹ پا چکے تھے اور راجہ صاحب ان پر کافی مہربان تھے
ستیش کا یہ تحریر پڑھ کر جی متلانے لگا۔ کیا ایسے ہی
کاموں کیلئے لالہ جی کو ایماندار آدمی کی تلاش تھی۔ للتا اس وقت
سے تھی۔ تاکہ اگر کوئی شخص دروازہ کھٹکھٹائے تو وہ آکر جلدی
سے ستیش کو بغلی دروازے سے باہر نکال دے۔

ستیش سوچنے لگا کہ یہ عالم تھا ان لالہ جی کا جو
اپنی دیانت داری کے لئے مشہور تھے۔ اس نے اس فائل کو
آگے نہیں پڑھا۔ خط مذکورہ فائل سے نوچ کر نکال لیا اور
نیچے چلا آیا ــــ للتا اس کو اتنی جلدی واپس ہوتے ہوئے دیکھ
کر حیرت زدہ ہو گئی۔

"ستیش بابو! کیا تم نے سب کچھ پڑھ لیا؟"
"اس میں پڑھنے کے لائق کچھ نہیں ہے۔ سب واہیات
ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ لالہ جی نے ایسی حرکتیں کیں۔"
ستیش نے دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔

(۲)

پندرہ ہزار۔ نہ دس نہ بیس، نہ سو نہ دو سو۔ نہ ہزار نہ
دو ہزار۔ ایک دم سے پندرہ ہزار۔ پندرہ ہزار، پندرہ ہزار
میں کیا نہیں ہو سکتا۔ مکان بن سکتا ہے ــــ کاروبار کیا
جا سکتا ہے۔ بیوی کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ لڑکے کے لئے جوتا
خریدا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک دم سے حیثیت بدل سکتی ہے۔ جو
لوگ آج مجھے ذلیل سمجھتے ہیں وہ عزت دار سمجھنے لگیں گے۔ اور سب
کو ان سے بہتوں کو ذلیل سمجھنے کا حق مجھے مل جائے گا۔ اس کی
آنکھوں کے سامنے اپنے پڑوسیوں، دفتر والوں اور افسروں
کی تصویر سی گھومنے لگی۔

پندرہ ہزار ــــ پندرہ ہزار!
ستیش خط کو اس فائل سے اس غرض سے نکال لایا تھا
کہ اس کو پھاڑ کر پھینک دے گا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی سوچنے
لگا کہ مجھے عزت کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ اس طرح کہ میں
ایمانداری دکھلا کر یہ خط پھاڑ کر پھینک دوں، یا اس طرح کہ
ان سے پندرہ ہزار روپیہ وصول کر لوں۔ میری زندگی کس
صورت میں بہتر رہے گی۔ اسی صورت میں کہ میں اس پندرہ ہزار
کی رقم پر لات مار دوں، یا اس طرح کہ اس پر ہاتھ مار لوں۔
اگر اس کے دل میں کوئی خیال نہیں تھا تو یہ کہ راجہ صاحب
سے اس رقم کو وصول کر کے ایمانداری سے للتا کو دیدوں،
تاکہ وہ دھرم شالہ یا مندر بنوا کر شان سے رہے۔

نوٹ :۔ اب سوال یہ ہے کہ ستیش کیا کرے گا؟ اس سوال پر ہمارا افسانہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ
دونوں باتوں کا یکساں امکان ہے۔ ایک طرف اس کے سامنے اپنے پتا جی کی دیانت داری کا تصوّر
ہے تو دوسری طرف لالہ جی کی دیانت داری کا۔ ایک طرف للتا کی قلبی مسکراہٹ ہے تو دوسری طرف
اپنے بیوی بچوں کا خیال۔ ناظرین اپنے دل کو ٹٹول کر فیصلہ کریں کہ ستیش کیا کرے گا۔۔۔۔۔۔

وہ تم کو دھوکا دے کر رقم اڑا لے جائیں گے۔ میں کہتی تھی کہ میں غیروں سے کیسے ملوں گی؟ وہ کہتے تھے کہ گھبراؤ نہیں بھگوان تمھاری مدد کرے گا۔ ان کا بڑا وشواش تھا بھگوان پر۔ ایک دن کہنے لگے کہ انیل بابو کا بیٹا ستیش بڑا کھرا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکے تو اس سے کام لینا۔ مگر دیکھو چاہے کچھ ہو جائے اس بستے کو اپنے کمرے سے کہیں اور نہ لے جانا — بات یہ ہے ستیش بابو! لالہ جی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اور ان کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ میرے سوتیلے بیٹے اور بھتیجے میرا ذرا بھی خیال کرتے ہیں۔ اس لئے یہ دولت صرف میرے لئے چھوڑی ہے۔ کہتے تھے کہ تم اس دولت سے کوئی دھرم شالہ یا مندر یا دھوا آشرم کھول کر وہاں اپنی مرضی کے مطابق رہنا

للتا بستے کو سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز کانپ رہی تھی — لالہ جی نے دوسرا بیاہ کیا تھا اور للتا کو جب گھر لائے تھے اس وقت بھی وہ اتنی ہی دبلی پتلی اور ہلکی پھلکی تھی اور اس کی آنکھوں میں لجاجت تھی۔ وہ آئی تو تھی گھر کی مالکن بن کر۔ لیکن اپنے ساتھ مشکل سے ڈھائی تین تولے سونا لائی تھی۔ اس حقیر سرمائے کی وجہ سے وہ اپنے سوتیلے بیٹوں اور بہوؤں کی نظروں سے گری ہے تو پھر اس کی آٹھوں پہر کی خدمت ہو یا پیار بھری لجاجت کوئی چیز بھی اس کو اٹھا نہ سکی — ستیش بچپن ہی سے گھر میں جاتا رہتا تھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

لالہ جی کے مرنے کے کچھ دنوں بعد للتا کا ستیش سے سامنا ہوا تو وہ رونے لگی اور کہنے لگی کہ تم مجھے کیوں بھول گئے۔ یہاں سے پرانے تعلقات تازہ ہو گئے اور ستیش جانے آنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد للتا نے ستیش کو بتلایا کہ میرے لئے لالہ جی ایک سر بند بستہ چھوڑ گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ اس معاملے میں صرف ستیش سے مدد لی جائے۔

اس وقت بستہ دیکھ کر اور للتا کے جذبات محسوس کر کے ستیش کے دل میں لالہ جی اور للتا کی عزت بہت بڑھ گئی سوچنے لگا کہ لالہ جی کو اپنی کم سن بیوی کے آرام کا کتنا خیال تھا کہ وہ مرنے سے پہلے ایسا انتظام کر گئے۔ مگر یہ بھی کیسی افسنا

بات ہو کہ ان کو اپنے خاندان میں ایک آدمی بھی ایماندار نہ ملا۔ بیٹا جو کام کرنا دیانت سے کرنا۔ اسی میں عزت ہے اور اسی میں بھگوان ملتا ہے۔ ایماندار کا لفظ سن کر ستیش کو اپنے پتا جی کی نصیحت یاد آ گئی۔ پتا جی بڑے دیانت دار تھے۔ تنخواہ کے علاوہ انھوں نے کبھی ایک پیسہ بھی کہیں سے نہ لیا تھا۔ ان کے چاروں طرف پیسے چلتے رہتے تھے۔ اس جیب سے نکل کر اس جیب میں گئے۔ ان کا حصہ بانٹ ہوا، دعوتیں ہوئیں، بوتلیں کھلیں اور ناچ گانا ہوا لیکن پتا جی کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور بلا پیسوں اور ان بوتلوں اور ناچ رنگ کے بھی ہر وقت ہنستے اور مسکراتے رہتے تھے۔ معلوم نہیں ان کی خوشی کا سوتا کیا تھا۔ ستیش کو نوکر ہوئے چھ سال ہو گئے تھے۔ اس نے بھی کبھی ایک پیسہ کسی سے نہیں لیا تھا۔ لیکن اس میں اور پتا جی میں بڑا فرق تھا۔ پتا جی کو دوسروں کی رائے کی فکر نہ تھی اس کو بھی پتا جی کچہری پیدل جاتے اور آتے تھے۔ مگر ستیش اکے پر آتا جاتا تھا۔ اور دو آنے اور خرچ کرتا تھا۔ پتا جی صبح و شام ایک پیسے کی تمباکو حقہ میں پیا کرتے تھے۔ لیکن ستیش ایک آنے روز کی سگریٹ جلا کر خاک کر دیتا تھا۔ اس قسم کی سب باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ستیش ہر وقت فکر مند رہتا تھا بیوی بیمار تھی۔ اس کے علاج کے لئے ایک پیسہ نہ تھا۔ بچہ ننگے پاؤں اسکول جاتا تھا اور اس کے ساتھی اس پر ہنستے تھے۔ عزیزوں کی شادی بیاہ کے موقع کو ستیش کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ دوستوں کا یہ مقروض تھا۔ اس وجہ سے ان سے آنکھیں چراتا تھا۔

للتا نے بستہ ستیش کو دے دیا اور اس نے گھر میں کھول کر کاغذوں کا ایک فائل نکالا۔ اس میں چھ سات مسلیں بھی تھیں جن کے اوپر جگہ جگہ پرچوں پر نوٹ لکھ کر چپکا دئے گئے تھے۔ ستیش ایک مسل کھول کر پڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ جو نوٹ تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ فلاں ریاست نے کس طرح ٹیکس کی چوری کی۔ پہلے واقعہ کو تفصیل سے سمجھایا گیا تھا اور پھر یہ بتایا گیا تھا کہ اس سارے معاملہ کی کنجی راجہ صاحب کا ایک خط ہے جس میں پہلے "راج بود" کا لفظ تھا۔ لیکن ماخوذ ہو جانے کے بعد راج کو رام کر دیا گیا۔ اس غرض سے جیم کے اوپر کے سرے اور نیچے کی

علی عباس حسینی

لچھمی کا عجائب گھر

لچھمی بڑھیا کو گاؤں والے عام طور پر لکھی کہتے تھے کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کی عمر کیا ہے بوڑھے کھوس بھی یہی کہتے کہ ہم نے اسے سدا سے ایسا ہی دیکھا۔ یہی سفید الجھے ہوئے بال۔ یہی پیشانی پر موٹی موٹی لکیریں، یہی جھریاں پڑا پوپلا منھ اور یہی سوکھی لمبی ٹھوڑی۔ بس ابھی یاد میں اتنا فرق آیا ہو کہ پہلے یہ پٹ سن جیسے بال فرادانے باندھ اور کسیلے ہوئے تھے اب وہ چھوٹے ہو کر دونوں طرف سے کٹ گئے ہیں مگر چلی آرہی ہے یہ بڑھیا اور اسکی کھوپس کی جھونپڑی پرکھوں کے سمے سے۔

جھونپڑی گاؤں کے ایک کونے پر تھی لیشت پر ایک ٹیلا سامنے شلث نما ایک کھیت ان کی اغل بغل کھیں۔ جھونپڑی کیا تھی۔ مٹی رونا لگی ہوئی دیواروں پر پھوس کے چھپر سے ڈھکی ہوئی ایک کوٹھری تھی۔ اندر جانے کے لیے بس ایک پانچ فٹ اونچا، گز بھر چوڑا دروازہ نہ کوئی کھڑکی نہ موکھا داخل ہوتے ہی ہوا کا بھی دم گھٹنے لگتا۔ یہی کال کوٹھری۔ لکھی کا گودام بھی تھی۔ رسوئی گھر بھی اور آرام کمرہ بھی۔ یہی اس کی نہ تجوری تھی جس کے پر ہونے کی وجہ سے وہ لکھی کہلاتی تھی

اس کوٹھری کا سارا سامان دیکھنے کے قابل تھا۔ ایک جھلنگا پلنگ۔ پر ایک میلا چیکٹا گدا۔ اس کی پائنتی ایک موٹا کھردرا گاؤں کے گندے کا بنا ہوا کمبل۔ ایک الگنی پر ایک پیوند لگی ساڑی اور کھادرے کا ایک شلوکا۔ ایک کونے میں مٹی کے دو مٹکے اور تین گھڑے ان میں کچھ اناج آٹا اور دالیں رکھی ہوئی۔ دروازے کی بغل میں رسوئی کا سامان، مٹی کا ایک چولھا۔ لوہے کا ایک تگرا۔ ایک جگہ جگہ سے پچکا ہوا لمبی ٹونٹی کا لوٹا، مٹی کی ایک ہانڈی، ایک توا، ایک تھالی، ایک چمٹا۔ دوسری بغل میں ایک چھپر کھٹ۔ ایک ڈلیا میں کچھ کتا ہوا سوت اور تھوڑی سی دھنکی ہوئی روئی۔

کوٹھری کا چھپر دروازے کے رخ پر دو گز آگے نکلا ہوا تھا۔ یہیں گویا برآمدہ تھا۔ لکھی نے اس حصہ کو آس پاس کی مٹی سمیٹ کر کوٹ کوٹ کر باندھا تھا جس سے ایک چبوترہ بن گیا تھا۔ اس چبوترہ پر دن میں وہ خود بیٹھ کر چرخا چلاتی یا چٹائی بچھا کر لیٹی رہتی۔ رات میں وہ اس کے پالتو جانوروں کا بسیرا بن جاتا۔ یہیں ایک بکری سی بیٹھ کر جگالی کرتی، اور کھی اور کان پھٹ پھٹا کر اپنے منھ کے قریب بھنکنے والی مکھیوں کو بھگاتی یہیں لکھی کا نیم وحشی کتا جھبرا بیٹھا اونگھا کرتا۔ یہیں اس کی سرمئی رنگ کی بی خیلا آنکھیں بند کیے خرخر کرتی اور یہیں برسات میں اس کا مرغ بانکے خاں اپنے سارے محلوں کے ساتھ بیٹھ کر کڑکڑاتا رہتا۔ اس عجائب گھر کا ایک اور رکن بالک رام، کوٹھری کی چھت میں بانس اور پھونس کے درمیان بیٹھا لکھی کی تجوری کی نگہبانی کرتا۔ اس کے ارد گرد بانس کے تھکے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی لکھی کی چھوٹی بڑی رقمیں رکھی رہتی۔ ان تک سوائے لکھی کے کسی کی رسائی ناممکن تھی۔ وہ لکھی کی سوکھی انگلیوں کی خوشبو سے مانوس تھا دن تو اس کے لیے مٹی کا دودھ ایک چینی میں ہر روز صبح شام اپنے مسکھٹ کے نیچے رکھ دیتی تھیں۔ اس احسان نے زہر کو امرت میں بدل دیا تھا۔ ناگ بالک بن گیا تھا اور لکھی ماتا۔

لکھی کی آمدنی کے کئی ذریعے تھے۔ وہ کئی کھیتوں کی مالکہ تھی جو اس نے بٹائی پر اٹھا رکھے تھے۔ ان میں گیہوں چنا، جو ہٹر اور ارہر کی کاشت ہوتی تھی۔ فصل کٹنے پر لکھی کا حصہ ایمان داری سے مچان بنا کر ہر کاشتکار اس کے گھر پہنچا جاتا تھا۔ یہ ایمان داری کسی خدا ترسی یا رحم کا نتیجہ نہ تھی بلکہ پورے گاؤں پر لکھی کا ڈر چھایا ہوا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ وہ جادو گرنی ہے اور وہ دلیل میں پیش کرتے اس کے زندہ عجائب گھر کو۔

وہ کہتے کون نہیں جانتا کہ ہر ہری چیز کو دیکھ کر بکری کے منھ میں پانی

ی۔ نسلوں سے آتی ہوئی پرانی دشمنی لاپچ پہنچ پاگئی۔ نیولے نے انڈا منہ
ے گرا دیا اور پینترے بدل کر وہ سانپ پر حملہ کرنے لگا۔ اس دوڑ بدل
ا جو کھٹ پٹ ہوئی تو جبرا آنکھ کھول کر غرایا۔ لکھی بڑبڑائی "ارے
اسود (؟) دیکھنا یہ کوٹھری میں کیا ہو رہا ہے!" قبل اس کے کہ جبرا
زدائی لے کر کوٹھری کی طرف بڑھے، خیلا نے چھلانگ ماری اور اندر
ج گئی۔ نیولے نے جیسے ہی اس نئے محافظ کی صورت دیکھی وہ کوٹھری
نکل کر بھاگا۔ بڑھیا نے جبرا کو للکارا "پکڑ لا!" بس اب کیا تھا نیولے
کے تیں دنڈ ہونے لگی (؟)۔ نیولا جھکائیاں دینے میں بہت ہوشیار تھا
ا جبرا ہوتا تو وہ غالباً اسے نہ پکڑ سکتا۔ مگر خیلا نے بھی اس دوڑ میں
۔ یا اور وہ لڑنے، گھومنے، جسم کو سمیٹنے، اعضا کو گھما لینے میں نیولے سے
دو قدم آگے تھی۔ نیولا اس کے جھپٹنے کی چوٹ سے اپنے کو بچانے کے سلسلے
ایک کانٹے دار پودے سے ٹکرایا اور قلابازیاں کھا گیا۔ جبرا نے لپک کر
ے منہ میں پکڑی اور اسے لا کر بڑھیا کے سامنے ڈال دیا اور اس طرح دم
نے لگا جیسے مجرم کو پکڑنے میں اس نے انتہائی کامیابی حاصل کی ہو
لا اپنے حصے کو آسانی سے نظر انداز کر دیئے جانے پر تیار نہ تھی اس نے
کی سوکھی پنڈلیوں پر اپنی پیٹھ رگڑ کر اس مہم میں اپنے حصے کی طرف متوجہ
کی۔ اس نے اپنی کیچڑ بھری آنکھوں سے اسے مسکرا کر دیکھا اور سر لاتی
نیولے پر جھک پڑی۔

34156

وہ تھر تھر کانپ رہا تھا اس کی باچھوں میں انڈے کی جگہ خون بھرا
ا۔ گرنے میں اس کے تیز دانتوں نے اس کی زبان کو مجروح کر دیا تھا۔
چھوٹی چھوٹی آنکھیں دہشت سے جلد جلد گھما رہا تھا۔ گویا موقع کی
یں تھا کہ ان سپاہیوں کی ذرا آنکھ جھپکے اور وہ اچک کر نکل بھاگے
نے اس کی گردن پکڑ کر لے ہلکے ہلکے دو طمانچے لگائے۔ "تم نے چوری
۔ڈالا! پکڑے گئے نا؟ اب کہو جبرا کو حکم دے دوں نہیں تکے
ڈالے؟ میرے جانوروں کے ساتھ بھائی بھائی بن کر رہتا تھا
حرکت!" جبرا غرایا۔ خیلا نے سخت کر کے زمین پر پنجہ مارا، لکھی نے
ہوئے نیولے کو پھر ایک طمانچہ مارا "اچھا جاؤ، اب کے چھوڑتے
ں، پھر کبھی کوٹھری میں نہ گھسنا۔" اور اس نے نیولے کو چھوڑ دیا۔ جبرا
ے جھڑکا۔ خیلا نے پھر زمین پر پنجہ مارا اور نیولا اچھل کر بے تحاشا

اپنے ٹیلے کی طرف بھاگ گیا۔

دست راحلہ آمد ایک گیدڑ تھا۔ یہ جھونپڑی کی داہنی جانب جو جنگل کا حصہ تھا اس میں اکثر راتوں کو "ہیاں، وہاں" کی پکار پر اپنے ہم جنسوں کو اکثر دعوت شعر خوانی دیا کرتا تھا۔ ایک رات جب زور کی بارش ہو رہی تھی اور اس کا دیوان خانہ بھی گرد ہیا کی شور … آرہا تھا تو وہ ہمت کر کے جھونپڑی کے برآمدے تک پہنچا۔ کوٹھری کے چھوٹے دروازے سے تاک جھانک دیکھ کر اور اس کے پاس ہی مرغیوں کی کابک سونے دبے پاؤں اندر داخل ہو کی سماعت کی۔ وہاں جو نظر ڈالی تو لکھی سوتی دکھائی دی۔ کتا اور بلی دکھائی نہ دیتے۔ البتہ سامنے ہی کئی مرغیاں نظر آئیں۔ کئی دن کا بھوکا تھا منہ سے رال ٹپک پڑی۔ وہ بے ساختہ ایک مرغی پر جھپٹ پڑا۔ مرغی کی دم ہی منہ میں آئی اور وہ چیخ کر پھڑ پھڑائی۔ بانکے خاں نے اٹھ کر پورے زور سے لات ماری سو اپنی … ہاتھ کے … کرنے میں لگی۔ جو کھلا کر بیٹھا۔ ویسے ہی جبرا نے پلنگ کے نیچے سے نکل کر … پر حملہ کیا۔ گیدڑ اچھلا، لکھی اٹھ رہی تھی۔ وہ اس کے سینے پر گرا۔ بڑھیا آہ کر کے گری اس کا سر پائے سے ٹکرایا اور وہ قریب بیہوش ہو کر بے سدھ ہو گئی۔ ادھر خیلا اور بانک نے ایک ساتھ گیدڑ پر حملہ کیا۔ خیلا کے پیچھے سے جبڑے کے پاس سے ایک بوٹی نوچ لی۔ وہ پلنگ سے نیچے کود کر دالان دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ بانکے خاں نے پھر لڑ کر لات ماری ادھر منی نے اس زور کی ٹکر لگائی کہ دروازے سے اچھل کر برآمدے کے باہر کیچڑ میں جا کر گرا اور کیچڑ سے لت پت کانپتا بے تحاشا بھاگا۔

بانک پھبکاری مارتا ہوا پلنگ پر سرسراتا ہوا چڑھا اور لکھی کے جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر رینگنا۔ جبرا خوں سے بھبھوکا اور لکھی کا منہ چاٹنے لگا خیلا نے خرخر کرتے اس کے جھریوں دار گالوں پر پیٹھ اور دم رگڑی۔ ان کے بال لکھی کے نتھنوں میں گھسے اور وہ چھینکتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ بانکے نے پر کھیٹ پھڑا کر نعرۂ فتح بلند کیا اور منی نے بھی خوشی میں "میں میں" کہکے ساز ملایا۔ لکھی نے ڈانٹا۔ "کیا شور مچا رکھا ہے! جیو چلو اپنی اپنی جگہ۔"

بانک سرکا، خیلا دبکی، جبرا دم دبا کر کھسکا، منی کان پھٹ پھٹا کر کونے میں بیٹھ گئی۔ بانکے خاں ایک پر تکا کر ایک مرغی کے گرد ناچا۔ لکھی نے اپنے کنبے پر پیار کی نظر ڈالی اور اطمینان کی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک اہم اعلان کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۸۰

پھر آتا ہو۔ وہ ہری کھیت اسے چرے گی۔ مگر بوڑھیا کی منی نہ تو ارد گرد کے لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھتی ہے اور نہ خود لکھی نے جو جھونپڑی کے سامنے ترکاریاں لگا رکھی ہیں اس کی ایک پتی تو نگتی ہے وہ تو کھیتوں میں گھس کر نکائی کا کام کرتی ہے۔ یعنی وہی گھاس کھاتی ہے جو پودوں کو بڑھنے اور پنپنے سے روکتی ہے بکری کیا ہے کہ کوئی ملائے مسجد ہے کہ ہر قدم پر جائز ناجائز، حلال حرام دیکھتی چلتی ہے۔ کتے کا رات بھر پہرا اور رہتی ہو۔ مگر لکھی کا جبرا، صبح شام روٹی دال پر قناعت کرتا ہے اور سوائے مخصوص دنوں کے کسی نے اسے گاؤں میں اندھیرے اجالے کسی کتیا سے رومان لڑاتے بھی نہیں دیکھا۔ لکھی کا برآمدہ ہی اس کے لیے دو محبوب ہے۔ وہ ننگ آسمان پر بستر رکھے وہیں پڑا رہتا ہے بلی کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں کوئی کہتا جن ملا ہے۔ آنکھ خونخوار ہے کہ کتا تک اس سے ڈرتا ہے۔ کوئی کہتا اس پر کسی جن یا پریت کا سایہ ہو گیا۔ بلی کا بیر دنیا بھر میں مشہور ہو۔ یہاں یہ حالت ہے کہ کتا جب زمین دم سے جھاڑ کر لیٹ جاتا ہے تو بی خیلا خرخر کرتی آتیں اور اس کے سینے سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ اپنی تیلی زبان نکال کر اپنا منہ اور پنجے چاٹ کر صاف کرتیں اور یوں گویا غسل فرما کر اور بن سنور کر ٹھسکتی ہوئی چلتیں اور دودھ پلانے والی منی کی گود میں جا کر لیٹ رہتیں۔

بانکے خاں اور ان کی بیوی کی عادت تھی کہ وہ برسات کے علاوہ سامنے والے نیم پر رات کو بسیرا کرتے اور دن میں آس پاس کے کھیتوں میں چگتے رہتے۔ جب کسی مرغی کے دو دو انڈے ٹھٹے تو وہ کڑاکڑاتی کوٹھے مٹکاتی بلی کو کنکھیوں سے دیکھتی بوڑھیا کی کوٹھری میں چلی جاتی اور وہیں اپنا تحفہ رکھ کر باہر چلی آتی۔ واپسی میں برآمدے کو وہ دبے پاؤں پار کرتے۔ ہاں جبرا کے کنارے پہونچتے ہی وہ خوشخبری کا نقارہ پیٹتی اڑتی ہوئی اپنے ہم جنسوں کے پاس پلٹ جاتی۔ نذر چڑھانے کے علاوہ مرغ[illegible]ں کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی اگر وہ بغیر اطلاع راج محل میں داخلے کی کوشش کرتیں تو خیلا جھپٹ کر سامنے آجاتی اور مرغی چیختی چلاتی، پھڑپھڑاتی بھاگتی۔ جب کبھی ایسا حادثہ پیش آتا تو بانکے خاں دوسرے محلوں کو چھوڑ کر بے تحاشا دوڑ پڑتے اور پر پھڑپھڑا کر اور گردن پھلا کر [illegible] کا مقابلہ کرنے کے لیے جھک جاتے دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے کے لیے پینترے بدلتے ہی ہوتے کہ جبرا بھونک کر بیچ میں آجاتا اور بوڑھیا چونک کر ڈانٹتی، "کیا شور مچا رکھا ہے [illegible]

[illegible] کر برآمدے میں آ بیٹھتی اور بانکے خاں کٹ کٹ کر کے سارے محلے کو پاس بلا لیتے اور بلی کو زہریلی نگاہوں سے دیکھتے۔ گردن ٹیڑھی کیے پنجوں کے بل چلتے کھیتوں کی طرف نکل جاتے۔

مرغیوں کے انڈے گاؤں کے ٹھاکر صاحب روزانہ منگا لیا کرتے اور یہ لکھی کے مستقل آمدنی کے ذریعہ تھے۔ زائد غلہ کی فروخت اور انڈوں کے پیسوں کے علاوہ لکھی کو کھادی بھنڈار سے بھی کچھ آمدنی تھی اس کے کارندے لکھی کو روئی دے جاتے اور وہی اس کا کاتا ہوا سوت ہر ہفتے آکر لے جایا کرتے۔ ان ذریعوں سے اسے جو کچھ ملتا وہ اسے چیتھڑوں میں لپیٹ کر پلنگ کے پیچھے والی تجوری میں رکھ دیتی جہاں بالک رام کا پہرہ تھا اور کسی دوسرے کی دسترس ممکن ہی نہ تھی۔

گاؤں کے تاڑی خانے میں بدمستی کی حالت میں اکثر لکھی کی دولت کے متعلق کھسر پھسر ہوتیں۔ سال میں دو چار سو ضرور۔ باقی چلی آتی ہو کیا کرے گی یہ سب روپیہ۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ پھر بعض منصوبے بھی بناتے۔ "چلو کسی اندھیری رات میں کتا۔ بلی ایک ایک ہاتھ میں ختم کیے جا سکتے ہیں۔ بوڑھیا کا گلا گھونٹ دینا کون سی بڑی بات ہو پھر اس نے جو کچھ گاڑ چھپا رکھا ہے وہ سب یاروں کا ہی ہے۔" دو ایک شاطروں نے جھونپڑی کے قریب تک جانے کی ہمت بھی کی مگر وہاں پہونچتے پہونچتے نشہ ہرن ہو جاتا۔ ایک نامعلوم سا ڈر دل پر چھا جاتا اور ایک دوسرے کو [illegible] پلٹ آتے۔

مگر جھونپڑی کے ہمسایے میں دو جانور بھی تھے۔ ان کا لالچ ان کے ڈر پر غالب آگیا۔ ان میں سے ایک تو نیولا تھا جو جھونپڑی کی پشت والے ٹیلے پر رہتا تھا۔ یہ بانکے خاں اور ان کے حرم کو ہمیشہ للچائی نظروں سے دیکھتا۔ اس کو ان انڈوں کی بڑی فکر تھی۔ وہ بھی فطرتاً ان کا رسیا ہے ایک دن نیولا انڈوں کی ٹوہ لگاتا برآمدے تک پہنچ گیا۔ اس وقت لکھی اپنی چارپائی پر لیٹی سو رہی تھی اور جبرا اور خیلا بھی اونگھ رہے تھے نیولے نے موقع کو غنیمت جانا اور جھپٹ کوٹھری میں جا گھسا۔ وہاں سامنے ہی کھٹ کے نیچے ایک ڈلیا میں چار انڈے دکھائی دیے۔ چور کا دل آدھا ہوتا ہے مگر نیولا نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اس نے جھپٹ کر ایک انڈے پر منہ مار دیا۔ اسے خبر نہ تھی کہ کوئی اوپر والو ٹکٹکی باندھے اسے گھور رہا ہے نیولے نے انڈا دانت سے کتر کر ذرا سی سپیدی چاٹی ہی تھی کہ بالک رام نے میٹ سے اپنے کو کھٹ پر گرا کر زور سے پھنکاری

خواجہ احمد عباس

سلمہ اور سمندر

مرض

"سلمہ۔"

"ہوں۔"

"خوش ہو؟"

"ہوں۔"

"کتنی خوش ہو؟"

"اتنی خوش ہوں...... اتنی خوش ہوں... کہ بتا نہیں سکتی۔"

سلمہ کا کیمبرج میں یونانی فلسفہ پڑھا ہوا شعور سوچ رہا تھا کہ دم اور حوا سے لے کر آج تک ہر زمانے میں ہر زبان میں شادی کی ت کو دولہا دلہن ایسی ہی بے معنی باتیں کرتے ہیں۔ مگر اس شعور ے نیچے چھپی ہوئی عورت سوچ رہی تھی کہ کاش رات بھر ہم ایسی ی بے معنی باتیں کرتے رہیں اور یہ سوچ کر عورت آپ ہی آپ رادی۔

اور بڑی بڑی کالی آنکھیں جو کاجل کی غیر ضروری لکیروں کے بھی بہت خوبصورت تھیں، آہستہ آہستہ پلکوں کے پردے میں پتی گئیں، جیسے غلافی پپوٹے اتنی محبت اتنی مسرت کا بوجھ سنبھال پاتے ہوں۔

(" ایشیائی سیاہ آنکھیں، جن کے بارے میں ایک نوجوان زی شاعر نے ایک سانیٹ لکھا تھا۔ جہاں دیدہ آنکھیں جنہوں ندن کا ویسٹ منسٹر اور روم کا سینٹ پال اور پیرس میں لی ٹاور اور قاہرہ کے اہرام مصر اور نیویارک کے فلک بوس سکائی پیر دیکھے تھے، مگر جن میں محبت کی میٹھی آگ آج پہلی بار اگی تھی۔)

انوار نے جھک کر اپنی بیوی کی نیند آنکھوں کو چوم لیا۔

سلمہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی بڑے ہی خوبصورت اور سریلے احساس کی نرم نرم لہریں اُس کے اوپر سے گزر رہی ہیں۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی ہستی کو اس احساس کے سپرد کر رہی ہے، وہ نرم نرم لہریں اس پر سے گزر رہی ہیں۔ وہ اُن میں ڈوب رہی ہے وہ ان میں ڈوب جانا چاہتی ہے۔

نرم نرم لہریں۔ اس کے تخیل کے کسی کونے میں جہاں شعور اور لاشعور کی سرحدیں ملتی ہیں ایک عجیب سی گونجتی سرگوشیاں کر رہی تھی، جیسے شہد کی مکھیاں بھیروں کا الاپ گنگنا رہی ہوں۔ نہیں۔ یہ شہد کی مکھیاں نہیں، یہ بھڑیں ہیں۔ لاکھوں بھڑوں کی افق تک پھیلی ہوئی لہر اور ان ڈنکوں کے میٹھے زہر میں وہ ڈوب رہی ہے ڈوب جانا چاہتی ہے۔ مر رہی ہے اور مر جانا چاہتی ہے۔

اور پھر ایک مدھم شور ماضی کے افق سے سرسراتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں کا شور، نرم نرم ریت پر متواتر پانی کی محبت بھری مار کا شور۔ مگر دیر تک محبت کے سمندر میں ڈوبی ہوئی عورت یہ نہ سمجھ سکی کہ یہ شور ان کے مکان کے باہر ہے یا خود اس کے من کے اندر ہے۔ شاید یہ میرے برانگیختہ دماغ کا واہمہ ہے اس نے سوچا۔ شاید میرے عمر بھر کے خوف اور خدشے اس عظیم اور عمیق مسرت کے لمحے میں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لیے یہ شور کر رہے ہیں۔ میں آج ان کی آواز نہیں سنوں گی۔ میں ان سے کبھی نہیں ڈروں گی، نہیں ڈروں گی، نہیں ڈروں گی۔

اس کے دل کی دھڑکن کی لے تیز ہو رہی تھی۔ نہیں سنوں گی۔ نہیں ڈروں گی۔ نہیں سنوں گی۔ نہیں ڈروں گی۔ مگر سمندر کی طوفانی

"یہ مکان چھوڑ دو گے۔ سمندر کے اتنے قریب میں نہیں رہ سکتی۔"

"میری جان تو دوسرا مکان تلاش کریں گے۔ لیکن سمندر سے تمہیں اتنی نفرت کیوں ہے۔"

"مجھے سمندر سے ڈر لگتا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس مجھے سمندر کے خیال ہی سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔"

"بڑی ہی عجیب بات ہے۔"

مکان کے باہر اور اس کے من کے اندر سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ سلمہ کا منہ چڑا رہی تھیں۔ تم ہم سے بچنے کے لیے اپنے شوہر کی آغوشِ محبت میں چھپ جانا چاہتی تھیں نا؟ مگر ہم نے تمہیں وہاں بھی ڈھونڈ نکالا۔ تم ہم سے نہیں بچ سکتیں۔ نہیں بچ سکتیں۔ نہیں بچ سکتیں۔ ہم تمہارے شوہر کو بھی تم سے چھین لیں گے، ہم تم دونوں کی محبت کا گلا گھونٹ دیں گے، سمندر کی طاقت بے پناہ ہے۔"

اور انور سوچ رہا تھا۔ "سلمہ بہت حسین ہے، بہت ذہین ہے، بہت اچھی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت جو میں نے آج تک کسی سے نہیں کی۔ لیکن کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ سکیں گے؟ مجھے سمندر کے قریب رہنا پسند ہے اور اسے سمندر کی آواز سے بھی ڈر لگتا ہے۔ کیوں نہ ہو وہ سر عظیم اللہ کی بیٹی ہے۔ جو ہائی کورٹ کے جج تھے اور جنھوں نے لاکھوں روپے بیرسٹری سے کمائے تھے۔ جنھوں نے اکلوتی بیٹی کو انگریز نرسیں رکھ کر پالا تھا اور بچپن ہی سے اسے انگلستان کے اسکولوں میں اور پھر کیمبرج یونی ورسٹی میں تعلیم دلوائی تھی۔ سلمہ میں سب اچھائیاں ہیں وہ مجھ سے محبت بھی کرتی ہے لیکن اس کا خاندانی ماحول مجھ سے کتنا مختلف ہے۔ وہ سنگِ مرمر کے فرش اور سنگِ سیاہ کے ستونوں والی محل نما عظیم عمارت میں پیدا ہوئی اور میں پیدا ہوا راجہ صاحب بکرم پور تعلقہ دار کے ہاتھی کے اصطبل میں۔ وہ بچپن میں کھیلی انگریز کمشنر صاحب کے بچوں کے ساتھ اور میں کھیلا راجہ صاحب کے سائیسوں، پالکی برداروں، اور کہاروں کے بچوں کے ساتھ۔" اور اپنا بچپن یاد کر کے وہ آپ ہی آپ مسکرا دیا۔

"کیوں کیا سوچ کر مسکرا رہے ہو۔؟" سلمہ نے انور کے بازو پر سر رکھتے ہوئے نظر اٹھا کر پوچھا۔ "میں سمندر سے ڈرتی ہوں۔ اس لیے تم مجھے بیوقوف اور ڈرپوک سمجھتے ہو نا؟ شاید تم مجھے پاگل بھی سمجھتے ہو؟ شاید تم سوچتے ہو ایک دن اس پگلی کے دماغ کا آپریشن کرنا پڑے گا۔"

"نہیں میری جان!" اس نے سلمہ کے گھونگھریالے کٹے ہوئے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔" اور وہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بدستور رہی۔

وہ سوچ رہا تھا۔ میں بھی تم سے کم تھوڑا ہی ہوں۔ تم نے بچپن میں مسوری اور نینی تال میں گھوڑے کی سواری کی ہے تو میں نے ہاتھی کی سواری کی ہے۔ جب تمہارے پاپا ولایت میں بیرسٹری پڑھنے گئے ہوئے تھے ان دنوں میرے بابا راجہ صاحب کے مہاوت تھے۔ ان کی ہتھنی لکشمی اور اس کے بچے راجہ کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ راجہ کی اور میری ایک ہی عمر تھی۔ جب میں گھٹنیوں چلتا تھا اس وقت سے میں اصطبل میں اس کے ساتھ کھیلتا تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو جب میرے بابا مہاوت رمضان علی اپنی پیلی پگڑی باندھ کر لکشمی کو راجہ صاحب کی سواری کے لیے تیار کرتے، سنہری جھول پہناتے، چاندی لگا ہودہ کستے، تو میں بھی کود کر راجہ پر سوار ہو جاتا اور بالکل جیسے بابا لکشمی کو لوہے کی انکس سے کود کر چلاتے میں بھی ایک نیم کی ٹہنی کو توڑ کر راجہ کے ماتھے میں چبھوتا اور کہتا۔ "چل رے ہاتھی کے بچے۔ چل، چل۔"

پھر کسی دکھ بھری یاد نے اس مسکراہٹ کو اس کے چہرے سے سمیٹ لیا۔ انور کی سانولی کشادہ پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔

سلمہ نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں اپنے شوہر کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں اور سوچ رہی تھی۔ "اپنے خیالات میں کھو کر نہ جانے یہ کہاں چلے جاتے ہیں، مجھ سے دور۔ بہت دور۔ شاید اپنے ماضی میں جس کے بارے میں وہ کئی بار کہہ چکے ہیں کہ میں تمہیں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں مگر میں ماضی سے ڈرتی ہوں۔ اپنے ماضی سے بھی اور ان کے ماضی سے بھی۔ اس پُر اسرار تہ خانے کا دروازہ بند ہی رہے تو بہتر ہے۔ ایک بار کھل گیا تو نہ جانے ماضی کی کیسی کیسی یادوں کے

لہروں کی لے بھی اتنی ہی تیز ہوتی جارہی تھی۔ اب وہ لہریں نرم ریت ہی پر نہیں پھیل رہی تھیں، اب وہ چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان کا شور بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اب وہ لہریں خود اُن کے مکان کی دیواروں پر دستک دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں سمندر، اس کا پرانا دشمن، جو کب سے اس کی جان کے درپے تھا اس کے کمرے میں آن پہنچے گا اور سلمہ کو، اس کے شوہر کو اور ان کے مسرّت بھرے اس لمحے کو بہا کرلے جائے گا اور ان کا گلا گھونٹ کر اپنی ہیبت ناک کالی گہرائی میں ہمیشہ کے لیے سلا دے گا۔

محبت اور مسرت کے لمحے کی گہرائی سے سلمہ کی چیخ نیم اندھیرے کمرے میں گونجی اور پھر لہروں کے شور میں کھو گئی۔

"سلمہ! میری جان! کیا ہوا؟ ڈر گئیں؟"

انور نے سرہانے رکھے ہوئے لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی کی اور اس نے دیکھا کہ سلمہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ اس کی پیشانی پسینے سے چمک رہی ہے اور اس کے ہاتھ تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ اور اس نے تھرتھراتے ہوئے نرم اور نازک چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ ایسے لگے جیسے دو سہمے ہوئے کبوتر کے بچوں نے بڑے ڈر کر اس کے پَروں میں پناہ لے لی ہو۔

انور نے سوچا "کتنے ملائم، کتنے نازک ہیں سلمہ کے ہاتھ۔ ان ہاتھوں نے کبھی ترکاری نہیں چھیلی، کبھی مصالحہ نہیں پیسا، کبھی باورچی خانے کے برتن نہیں مانجھے، کبھی کپڑے نہیں دھوئے۔ ان ہاتھوں نے تو پارکر اور شیفر قلم سے فلسفے کے لیکچر نوٹ ہی لکھے ہیں۔ یہ ہاتھ صرف پیانو کے پردوں پر ہی پڑے ہیں۔ ان کی انگلیاں ستار کی مضراب سے زخمی نہیں ہوئیں۔

اور سلمہ نے سوچا انور اتنا پڑا اڈا کرے ہے لیکن اس کے ہاتھ تو ایسے مضبوط اور کھردرے ہیں جیسے کسی لوہار کے ہوں، کسی کان کن یا سڑک کوٹنے والے کے۔ جب ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس نے اندھیرے میں انور سے صرف ہاتھ لایا ہوتا اور اس کے حساس چہرے کی نرم مسکراہٹ نہ دیکھی ہوتی، اس کی آواز نہ سنی ہوتی، اس کے سلجھے ہوئے دماغ کی تلوار جیسی کاٹ کا زخم نہ کھایا ہوتا تو وہ کبھی ایسے غیر شاعرانہ ہاتھوں میں اپنی زندگی اور اپنی محبت نہ سونپتی مگر کتنی پُر یقین محبت تھی ان سخت ہاتھوں کی گرمی میں،

کتنی پُرسکون عافیت، کتنا پُرخلوص استرار اور عہد۔

ٹھنڈے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ٹھہر گئی۔ دھڑ دھڑ کرتے ہوئے دل کی لے پُرسکون ہوتی گئی۔ اور انور کی آواز سلمہ کو ایسے لگی جیسے زخم پر کوئی پھاہا رکھ دے (کیوں نہ ہو۔ اس نے سوچا۔ میرا شوہر ڈاکٹر جو ہے۔۔)

"کیا ہوا؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا، کیا؟"

"خواب نہیں۔ سمندر۔"

"سمندر۔؟"

"ہاں مجھے سمندر اچھا نہیں لگتا۔"

"لہروں کے شور سے ڈر گئیں؟ تم سچ مچ بچی ہو!۔"

سلمہ نے سوچا انور میری جان۔ پیارے شوہر تم تم سے محبت کرتی ہوں۔ تب ہی تو میں نے نہ جانے کتنے رئیسوں لکھ پتیوں، کرنیلوں، ادیبوں اور شاعروں کو چھوڑ کر تم سے شادی کی ہے۔ مگر خدا کے لیے مجھے "بچی" نہ کہا کرو۔ مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ میں بچی نہیں ہوں۔ میری عمر تیس برس ہے۔ میں نے کیمبرج سے فلسفے میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ میں اکیلی ساری دنیا میں گھوم چکی ہوں میں نے بین الاقوامی شہرت کے عظیم ترین فلسفیوں کی کانفرنس میں شرکت کی ہے۔ میری تقریر سن کر ایک جرمن فلسفی نے مجھ سے کہا تھا کہ "تم ایشیائی نوجوانوں کے دماغ کتنے سنجیدہ اور پُرسکون اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ تمہارے مقابلے میں ہمارے نوجوان فلسفی تو بالکل بچے لگتے ہیں۔" میں دنیا کے بڑے بڑے دانشوروں اور ادیبوں اور فلسفیوں اور آرٹسٹوں سے مل چکی ہوں اور اُن میں سے ہر ایک سے اس ہی کی دماغی سطح پر بات چیت کی ہے۔ اور تم مجھے بچی کہتے ہو۔ اور جس طرح تم مجھے "بچی" کہتے ہو اس میں مجھے مذاق نہیں رحم اور ہمدردی کا جذبہ معلوم ہوتا ہے بلکہ ہلکی سی حقارت کا شبہ بھی ہوتا ہے۔ جیسے تمہاری رائے میں میں کم فہم ہوں، ناتجربہ کار ہوں، اور ضدی بھی ہوں۔

مکان کے باہر اتنا خود سلمہ کے من کے اندر لہروں کا شور بڑھتا جارہا۔

"انور مجھ سے ایک وعدہ کرو۔۔"

"جو تم کہو۔۔"

"ڈاکٹر صاحب میں کیسے چل سکتی ہوں ؟ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری ٹانگوں میں دم ہی نہیں ہے۔ چلنا تو کیا مجھ سے تو کھڑا ہوا بھی نہیں جائے گا۔" اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔ "یہ سب بکواس ہے، چلو اٹھو۔" اور اس کے بولنے کے انداز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ سلمہ سچ مچ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے وارڈ کے کنارے تک چلی گئی تھی اور وہاں سے بلا سہارے واپس بھی آ گئی تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ ڈاکٹر کے قریب آئی اس کو اپنی ٹانگوں میں دفعتاً لڑکھڑاہٹ اور کمزوری محسوس ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والی تھی کہ انور نے اسے سنبھال لیا اور سلمہ کو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی میں اسے سہارا دینے والے ہاتھ یہی ہیں۔ دو ہفتے بعد ان کی شادی ہو گئی تھی اور انور بیوی کو اپنے چھوٹے سے نئے مکان میں لے آیا تھا، جو اس نے کئی ہزار روپے قرض لے کر بالکل سمندر کے کنارے لیا تھا۔ مگر اس وقت اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ سمندر کی قربت سلمہ کے لیے اتنی بڑی سوہانِ روح ثابت ہوگی۔

"مگر کیوں؟" اس نے پوچھا، سلمہ سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔

"کیوں کیا ؟"

"سمندر سے تم کیوں ڈرتی ہو۔ ؟"

اور اس وقت ان کے گھر کے باہر، سمندر کے کنارے، بنے ہوئے پتھروں کے بند سے ایک لہر اتنے زور سے آکر ٹکرائی کہ سلمہ اچھل پڑی۔

"میں نے کہا نہ کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس ڈر لگتا ہے۔"

"کوئی وجہ تو ہونی چاہیے، کیا تم نے کبھی کسی سائیکاٹرسٹ سے بات کی ہے۔"

"ہاں جب میں کیمبرج میں پڑھتی تھی۔ ایک نوجوان انگریز سائیکاٹرسٹ نے میرا نفسیاتی معائنہ کیا تھا۔"

"اور اس کی کیا رائے تھی ؟"

"اس کا کہنا تھا کہ لاشعور کی دنیا میں سمندر علامت ہے جنسی فعل کی، اور اس کا خیال تھا کہ ضرورت سے زیادہ شریفانہ ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے میں اس قدرتی فعل سے خائف ہوں اور اس لیے سمندر سے ڈرتی ہوں۔"

"اور کیا یہ سچ تھا۔ ؟"

"نہیں، وجہ صرف اتنی تھی کہ وہ خود مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"کیوں ؟"

"وہ بہت خوبصورت تھا۔ سنہری گھونگھریلے بال تھے اس کے باتیں بھی بڑی اچھی کرتا تھا۔ مگر۔"

"مگر ؟"

"مگر شراب اور سگریٹ بہت پیتا تھا۔ اس کے دانت پیلے اور گندے تھے اور اس کے منہ سے پائپ کی بو آتی تھی۔"

"اور کسی سے شادی کیوں نہیں کی ؟"

"کوئی پسند نہیں آیا۔ کسی سے میں محبت کر سکتی تھی لیکن اس کی عزت نہیں کر سکتی تھی کسی کی عزت کر سکتی تھی لیکن اس سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ جب مجھے ایسا آدمی مل گیا جس سے میں محبت بھی کر سکتی ہوں اور اس کی عزت بھی کر سکتی ہوں تو اس سے شادی کر لی۔ بس اتنی حقیقت ہے میری نفسیاتی الجھنوں کی۔"

"لیکن سمندر سے ڈر۔ یہ بھی تو ایک نفسیاتی الجھن ہے۔"

"ہوگی۔ مگر اب مہربانی کر کے سمندر کا ذکر مت کرو، کوئی اور بات کرو۔"

"تو سنو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں سلمہ اگر میں ڈاکٹر نہیں، شاعر ہوتا تو خوبصورت الفاظ میں تمہیں بتاتا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔"

"اور ہماری محبت میں کبھی کوئی حائل نہیں ہوگا ؟" سلمہ نے پوچھا۔ اور اس کے ذہن میں وہ لمحے تھے جب انور نہ جانے کن خیالات میں کھو جاتا تھا۔

"نہیں میری جان ! دنیا میں کوئی ہماری محبت میں حائل نہیں ہو سکتا۔"

اور اسی وقت گڑگڑاتی، پھنکارتی، چنگھاڑتی، ایک لہر آئی اور اتنے زور سے ٹکرائی کہ سارا مکان ہل گیا اور چھینٹے ان کی کھڑکیوں تک پر پڑے۔

سلمہ کا چہرہ ایک بار پھر پیلا پڑ گیا۔

"انور مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے شوہر کی آغوش میں چھپ

جن اور بھوت آزاد ہو کر ہماری خوشی اور محبت کو تہ و بالا کر دیں۔ نہیں انور پیارے میں تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" مگر پھر اس عورت نے جو کیمبرج کی پڑھی ہوئی یونانی فلسفہ کی ماہر کے لاشعور میں چھپی بیٹھی تھی اس کے کان میں گھس پھسایا۔" ہو سکتا ہے یہ کسی اور عورت کے بارے میں سوچتے ہیں۔ شاید کوئی ڈاکٹرنی جو ان کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہو۔ شاید کوئی اسپتال کی نرس۔ یہ نرسیں بھی تو بعض بڑی حسین ہوتی ہیں۔ اور پھر انھوں نے تو ایڈنبرا میں بھی پڑھا ہے۔ وہاں ضرور کسی بھورے بالوں والی انگریز یا اسکاٹ لڑکی سے معاشقہ کیا ہوگا۔ اس وقت انھیں اس کی یاد تو نہیں آرہی ؟"

انور سوچ رہا تھا۔ "کہ زندگی کے واقعات کا تسلسل بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ آج سے پچیس برس پہلے اگر اس دن لکشمی نے مست ہو کر راجہ صاحب کے بڑے لڑکے راجندر کا رخ نہ کیا ہوتا جو نیل خانے کے باہر کرکٹ کھیل رہا تھا، اگر انور کے بابا رمضان علی مہاوت راجندر کی جان بچانے کے لیے اپنی جان نہ دی ہوتی، اگر راجہ صاحب نے یتیم انور سے یہ نہ پوچھا ہوتا، کیوں بیٹا تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اور اگر نو برس کے بچے نے نہ جانے کیسے یہ نہ کہا ہوتا کہ راجہ صاحب میں پڑھنا چاہتا ہوں تو آج وہ کسی سرکس میں ہاتھیوں کی دیکھ بھال کرتا ہوتا یا کسی اصطبل میں کسی سیٹھ کے ریس کے گھوڑوں کی مالش کرتا ہوتا اور اس کی ایک تھکی ہوئی مرجھائے ہوئے جسم کی بیوی ہوتی اور آدھے درجن بچے ہوتے اور حسین سلمہ کا سر آج کسی اور کی آغوش میں ہوتا، مگر راجہ صاحب نے مرتے ہوئے مہاوت سے اپنا وعدہ پورا کیا تھا اور انور اسکول سے کالج، کالج سے میڈیکل کالج اور میڈیکل کالج سے اسکالرشپ لے کر ایڈنبرا یونیورسٹی اور لندن کے اسپتال تک ہو آیا تھا۔ اب اس کا شمار ملک کے بہترین نوجوان سرجنوں میں ہوتا تھا مگر لوگ سمجھتے تھے ڈاکٹر انور علی کے دماغ کا کوئی اسکرو ڈھیلا ہے کہ ہزاروں روپے کے پرائیوٹ پریکٹس کرنے کے بجائے سرکار اسپتال میں سات سو روپے ماہوار پر جنرل وارڈ میں پڑے مریضوں کے مفت آپریشن کرتا ہے۔

اور ایک دن اسی اسپتال میں اس کے پاس سلمہ آئی تھی اپنڈکس کا آپریشن کرانے اور اس نے کہا تھا۔ "میں تو اس آپریشن کے لیے جنیوا یا لندن جانے والی تھی مگر گورنمنٹ ایکسچینج نہیں دیتی۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے کہ آپ اپنڈکس کا آپریشن کرتے ہیں تو چوتھے دن مریض خود چل کر گھر چلے جاتے ہیں۔ جس نرسنگ روم میں آپ کہیں میں داخلہ لے لوں۔" اور ڈاکٹر انور نے بتایا تھا کہ اگر مجھ سے آپ کو آپریشن کرانا ہے تو آپ کو اسی گورنمنٹ اسپتال کے جنرل وارڈ میں داخلہ لینا ہوگا۔ اور سر عظیم اللہ مرحوم کی نفاست پسند اور نازک مزاج بیٹی جنرل وارڈ کے خیال ہی سے کانپ اٹھی تھی اور اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ میں مر بھی جاؤں گی لیکن اس گندی مزدورنوں اور بھنگنوں کے ساتھ جنرل وارڈ میں نہیں رہوں گی۔ پھر بھی ڈاکٹر انور علی سے معائنہ کروانے میں کوئی ہرج نہیں۔ اور جب معائنے کے دوران میں انور کی سخت کھردری ڈاکٹری انگلیوں نے سلمہ کے پیٹ کو چھوا تھا تو ان کے درد آشنا لمس میں ایسی عجیب سی ٹھنڈک، ایسی عجیب تسکین اور شفا تھی کہ سلمہ نے فیصلہ کر لیا کہ اب تو آپریشن کراؤں گی تو اسی ڈاکٹر سے۔

اور جب وہ آپریشن کی میز پر لیٹی تھی اور کلوروفارم کے اثر سے بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر انور علی کی آنکھیں سرجن کی سفید نقاب میں سے مسکرا رہی ہیں اور یہ دیکھ کر اس نے اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور پھر کلوروفارم کے بادل اس کے شعور پر چھا گئے تھے مگر ان بادلوں میں بھی وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کو گھور رہی تھیں۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ جنرل وارڈ میں اسی دوسری مریض عورتوں کے درمیان پڑی تھی اور اس کے بیابر والی بیڈ کے چاروں طرف پہیوں والی سفید پردے دار دیواروں کو کھڑا کیا جا رہا تھا کیونکہ ایک بڑھیا بھکارن، جو کسی کی موٹر کے نیچے آگئی تھی، چل بسی تھی۔ اور دوسری طرف ایک نوجوان مزدورنی، جس کے شوہر نے جوش رقابت میں اس کی ناک کاٹ لی تھی، اسی شوہر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اسے تسلی دے رہی تھی۔ اور تین دن تک وہ اس ماحول میں پڑی رہی۔ اور انتظار کرتی رہی کہ ڈاکٹر انور علی اسے دیکھنے آئے گا، مگر دوسرے جونیئر ڈاکٹر آتے رہے اور وہ نہیں آیا، کیونکہ سنا تھا کہ وہ کئی بڑے نازک، دل کے، آپریشن کر رہا ہے۔ پھر چوتھے دن وہ آیا اور اس نے سلمہ کو ڈانٹ کر کہا تھا۔ "یہ کیا ؟ پلنگ پر کیوں لیٹی ہو؟ اٹھو، اور وارڈ کے اس کنارے تک چل کر جاؤ۔"

اور بیچاری بچی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹنے لگی اور مس میری نے لال منہ والے کو ڈانٹ کر کہا۔ "مسٹر ولیم ادویٹ از ویری بیڈ۔ آپ ایک بے بی کو ڈراتا ہے۔ ویری بیڈ۔ کم آن ڈارلنگ" اور وہ بچی کو کیبن میں لے گئی اور اس کو تصویروں والی کتاب دی کہ یہاں بیٹھ کر تصویریں دیکھو۔

"مس صاحب!"

"یس مائی ڈیر!"

"یہ جہاز گھر کب پہنچے گا۔؟"

"یہ جہاز گھر نہیں جائے گا بے بی یہ تو ساؤتھ ہیمپٹن جائے گا۔ وہاں سے ہم لوگ لنڈن جائیں گے۔"

"لندن کیوں جائیں گے؟"

"اس لیے کہ تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں کہ تم ادھر فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو۔ ادھر بہت انگریز بے بی لوگ ہوگا۔"

"مگر میں تو جھنیا کے ساتھ پڑھنا چاہتی ہوں مس صاحب۔"

"جھنیا؟ وہ سائیس کا چھوکری؟ چھی چھی چھی۔ ڈرٹی لٹل گرل۔ تمہارا جیسا ہائی کلاس بے بی ایک سائیس کا گندہ چھوکری کے ساتھ کس مافک پڑھتا ہے؟ تمہارا ڈیڈی نہیں چاہتا کہ تم ایسا بچہ لوگ کے ساتھ کھیلے۔ اسی واسطے تم کو ہمارے ساتھ انگلینڈ پڑھنے کو بھیجتا ہے۔"

"تو پھر جھنیا کو بھی لے چلو، مس صاحب۔"

"ہم بولا بے بی کہ وہ ڈرٹی چھوکری ہے، ایک دم گندا۔"

"تو ادھر لندن میں اسے نہلائیں گے مس صاحب۔ باتھ ٹب ہوگا نا اُدھر؟"

"ایسا چھوکری کا ڈرٹ باتھ ٹب میں نہیں دھو سکتا، مائی ڈیر۔"

"تو پھر میں لندن نہیں جاتی۔ میں تو گھر جاؤں گی۔ جھنیا کے ساتھ کھیلوں گی۔"

"گھر ادھر سے چار ہزار میل ہے، بے بی۔"

"مگر کدھر ہے؟"

"ادھر جہاز کے پیچھے۔ سمندر کے پار۔"

اور جب دوپہر کے کھانے کے بعد مس میری سو گئیں تو بچی دبے پاؤں کیبن سے نکلی اور ڈیک کی پچھلی طرف ریلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ہاتھ میں اس کے گڑیا تھی اور دوسرے ہاتھ میں دو کیلے۔ وہ جانتی تھی کہ جھنیا کو کیلے بہت پسند ہیں۔

"آہا ہا۔" اس نے سوچا، "سو یہ ہے گھر جانے کی سڑک۔" جہاز کے پیچھے، جہاں پانی کٹ رہا تھا۔ سفید جھاگوں کی ایک لمبی سڑک بنتی جا رہی تھی، جو دور تک چلی گئی تھی۔ حدِ نظر تک بچی کے گھر تک۔

بچی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لال منہ والا انگریز اپنی کرسی پر بیٹھا بیٹھا سو رہا تھا اور اس کا سگار منہ میں لگا ہوا سلگ رہا تھا اور اس کی راکھ کے سفید سوٹ پر گرتی جا رہی تھی، اور کئی مسافر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ جہاز کے نیچے اس کے پیٹ میں سے انجنوں کی دھڑ دھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جہاز چلا جا رہا تھا، ساؤتھ ہیمپٹن کی طرف، لندن کی طرف، اس اسکول کی طرف، جہاں جھنیا نہیں ہوگی۔

جھنیا! اپنی سہیلی کا خیال آتے ہی بچی مسکرا دی۔

جھنیا جو کالی تھی مگر جس کے چھوٹے چھوٹے دانت ایسے چمکتے تھے جیسے سچے موتی، جھنیا، جس کا شلوکہ اور لہنگا ہمیشہ گندا اور پھٹا ہوا ہوتا تھا۔ جس کی آنکھوں میں ہمیشہ چیپڑے لگے رہتے تھے اور جس کے چہرے اور ٹانگوں پر ہمیشہ گرد کی تہہ جمی رہتی تھی۔ مگر جو ہمیشہ ہنستی رہتی تھی، کھیلتی کودتی اور شور مچاتی رہتی تھی۔ اور جب اس کا باپ گھوڑوں کو نہلاتا یا ان کی مالش کرتا تو وہ ضد کر کے گھوڑے پر بیٹھ جاتی اور کہتی "چل میلے گھوڑے چل، چل، چل۔"

دو برس ہوئے بچی کو ٹائی فائڈ ہو گیا تھا۔ جب ڈیڑھ مہینے کے بعد اس کا بخار ٹوٹا تو اتنی کمزور ہو گئی کہ ڈاکٹروں نے ہدایت کی کہ ابھی مہینے بھر تک چلے پھرے نہیں، پلنگ پر لیٹی رہے۔ سو کتنے ہی دن تک وہ لیٹے لیٹے چھت میں لگے ہوئے بجلی کے پنکھے کے پروں کو گنتی رہتی، ایک، دو، تین، چار، پانچ، بیس، اٹھائیس، بیالیس، تین سو دس۔ آٹھ سو بارہ اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ پنکھے کے پروں کا ایک ایسا چکر ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ نہ جانے کہاں سے ایک کے بعد ایک پنکھے کے پر ہوا میں سے نکلتے ہی آتے تھے۔ مگر وہ اس کھیل سے اکتا

کی طرح منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

انور نے اپنے سینے پر گرم گرم آنسوؤں کو محسوس کیا۔ سلمیٰ رو رہی تھی۔

"میری بچی پیاری! میری جان!" وہ کہے جا رہا تھا لیکن اس کا ڈاکٹری دماغ اس عجیب و غریب خوف کی تشخیص کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باہر سمندر غرّا رہا تھا، چنگھاڑ رہا تھا، دھاڑ رہا تھا۔ ایک بپھرے ہوئے دیو کی مانند۔

اندر سلمیٰ خوف سے کانپ رہی تھی، بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ایک سہمی ہوئی بچی کی طرح۔

دیو غرّاتا رہا، چنگھاڑتا رہا، دھاڑتا رہا۔

بچی کانپتی رہی، روتی رہی، سسکیاں بھرتی رہی۔

یہاں تک کہ سمندر تھک کر ساحل سے لوٹ گیا۔

یہاں تک کہ بچی روتے روتے سو گئی، مگر سوتے سوتے بھی وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ شاید خواب میں بھی وہ ڈر رہی تھی۔

تشخیص

بچی جہاز کی ڈیک کے کٹہرے کے سہارے کھڑی لہروں کو گن رہی تھی، جو جہاز سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔

"ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔"

ایک لہر کے بعد دوسری۔ ہر لہر پانی کی بنی ہوئی تھی، لیکن ہر لہر ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ کوئی اونچی، کوئی نیچی، کوئی مچھلی کی طرح سڈول، کسی کا اونٹ کی طرح کوہان نکلا ہوا۔ کوئی رینگتی ہوئی آتی تھی، کوئی دوڑتی ہوئی۔ کوئی جھاگوں سے بنا ململ کا سفید دوپٹہ اوڑھے، کوئی مس میری کی طرح نیلا فراک پہنے تھی تو کسی پر سورج کی روشنی سے ستارے جگمگا رہے تھے، جیسے اماں کے کامدانی ڈوپٹے پر۔ جب اماں زندہ تھیں اور انور میاں کے ہاں نہیں سدھاری تھیں۔

"چھ۔ سات۔ آٹھ۔ نو۔ دس۔ گیارہ۔"

بچی سوچ رہی تھی کہ اتنی بہت سی لہروں کو اللہ میاں کون سے اصطبل میں رکھتے ہوں گے؟ ہمارے گھر میں تو تین ہی گھوڑے ہیں۔ ایک فٹن میں جوتا جاتا ہے اور دو، جو سواری میں آتے ہیں۔ اور اُن کے لیے تین ہی اصطبل الگ الگ بنے ہوئے ہیں۔ تو پھر جتنی لہریں یہ سمندر میں کو دتی پھاندتی پھر رہی ہیں ان کے لیے بھی اتنے ہی اصطبل چاہیں۔ اور پھر جیسے ہر گھوڑے کو کھانے کے لیے دانہ چاہیے پینے کو پانی چاہیے تو ان لہروں کو کھانا پینا کون دیتا ہے؟ پینے کو تو پانی سمندر میں بہت ہے، مگر یہ لہریں کھاتی کیا ہیں؟ ابھی بچی اس اہم مسئلے پر غور کر ہی رہی تھی کہ مس میری اپنا نیلا فراک پہنے، اپنی موٹی موٹی، چھوٹی چھوٹی ٹانگیں مارتی آ گئیں۔ بچی نے ان کے قدموں کی آہٹ سن کر مڑ کر دیکھا کہ سمندر کی ہوا مس میری کے نیلے فراک کو ان کے موٹے موٹے چربی چڑھے گھٹنوں سے اوپر لے جا رہی ہے اور ان کے کھچڑی جیسے بال ہوا میں اڑ رہے ہیں۔

"مس صاحب!" بچی نے اپنی انگریز گورنس سے کہا۔

"یس سلمیٰ!"

"مس صاحب سمندر میں اتنا بہت پانی کہاں سے آتا ہے؟"

"یہ سب واٹر ندی اور دریا میں سے آتا ہے، مائی چائلڈ۔"

مس میری نے جواب دیا اور جغرافیہ کی کتاب میں سے سمندر اور دریاؤں والا باب زبانی دہرایا۔

"تو پھر ہم سمندر میں چلتے چلے جائیں تو دریا آ جائے گا۔"

"یس۔"

"وہی دریا جو ہمارے گھر کے پاس سے بہتا ہے۔"

"یس وہ بھی آ جائے گا۔"

"مس صاحب ایک بات اور پوچھنی ہے۔"

"پوچھو مائی چائلڈ۔"

"یہ اتنی ساری لہریں جو سمندر میں، یہ کھاتی کیا ہیں؟"

مس میری، جنھوں نے اس سوال کا جواب کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا، سوچ میں پڑ گئیں۔ لیکن ایک موٹا، لال منہ کا مسافر، جو دن بھر ڈیک چیئر پر لیٹا یہ موٹا سگار پیتا رہتا تھا، ایک خوفناک قہقہہ مار کر بولا۔ "ویل ویل۔ بے بی ہم تم کو بتاتا ہے۔ یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کو کھانا مانگتا ہے۔ تم ریلنگ سے ہٹ کر کھڑا رہو، نہیں تو لہر تم کو بھی کھا جائے گا۔"

گھومتی پھرتی ہے۔ کوئی اسے نہیں روکتا۔ دس دس دن نہاتی نہیں۔ کوئی اسے زبردستی ٹب میں بٹھا کر صابن مل مل کر زبردستی نہیں نہلاتا۔ جو اس کا جی چاہتا ہے کھاتی ہے۔ جب جی چاہتا ہے درختوں پر چڑھ جاتی ہے۔ اسے دنیا کے بارے میں بھی کتنا کچھ معلوم ہے۔ وہ جانتی ہے کہ گھوڑی کے نال کیسے لگائے جاتے ہیں اور پن چکی پر آٹا کیسے پیا جاتا ہے، اور نوٹنکی میں لال پری کیسے ناچتی ہے اور کالا دیو کیسے دہاڑتا ہوا آتا ہے اور اسے اٹھا کر لے جاتا ہے، اور مالی کا بیٹا کلو، جس کا پچھلے برس ہی بیاہ ہوا تھا، کیسے شراب پی کر اپنی بہو کو پہلے مارتا ہے اور پھر پیار کرتا ہے۔ اور.... اور.... جھنیا، جس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی، یہ سب باتیں سلمہ کو سناتی رہتی اور سلمہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ ایک سنسان ٹاپو میں قید ہے، زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف زندگی کا سمندر پھیلا ہوا ہے اور اس سمندر میں جھنیا مزے سے چھینٹے اڑا رہی ہے، تیر رہی ہے، ڈبکیاں لگا رہی ہے۔

ایک دن دیر کر کے آئی تو سلمہ نے پوچھا۔ "اری تو کہاں رہی؟ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔"

"چھوٹی بی بی میں جب اصطبل میں گئی تھی۔ آپ کی گھوڑی ہے چنبیلی؟ اس کے بچہ ہونے والا ہے۔"

"بچہ کیسے ہوتا ہے؟"

"یہی تو میں دیکھنے گئی تھی، چھوٹی بی بی۔"

"پھر دیکھا نہیں؟"

"نہیں بابا کہوے ہیں کہ ابھی تھوڑی دیر ہے پر چنبیلی بڑے زور سے سانس لے رہی ہے میں تو سمجھی تھی مر رہی ہے۔ وہ مری چت کبری کتیا تھی نا؟ وہ جب مری تھی تو وہ بھی ایسے ہی سانس لے رہی تھی۔"

"تو کیا چنبیلی بھی مر جائے گی؟"

"نہیں چھوٹی بی بی۔ فکر نہ کرو۔ بابا کہوے ہیں کہ مر کے ہی جنا ہوئے ہے۔ اچھا اب میں چلوں۔ پھر آؤں گی۔"

"اے جھنیا!"

"ہاں چھوٹی بی بی۔"

"میں بھی چلوں تیرے ساتھ؟ دیکھوں گھوڑی کا بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔"

"اور جو کسی نے دیکھ لیا تو بڑے صاحب مجھے ہنٹر دیں گے۔"

"نہیں نہیں۔ تو فکر مت کر۔ ابا تو کورٹ گئے ہوئے اور مس میری اپنے کمرے میں پڑی سو رہی ہیں۔"

سو وہ کھڑکی سے کود گئی اور اس کا ناٹ گاؤن کانٹوں میں الجھ کر کئی جگہ سے پھٹ گیا اور اس کا ٹخنہ چھل گیا، مگر اس کا دل ایک نامعلوم مسرت اور ایک عجیب خوف سے دھڑک رہا تھا، جیسے وہ دونوں باغ کی کیاریوں میں سے نہیں بلکہ گھنے اندھیرے جنگل میں سے ہو کر پریوں کے دیس کی طرف جا رہی ہوں۔ بالکل جیسے مس میری کی کہانیوں کی شہزادیاں جاتی تھیں۔ پھر وہ دونوں اصطبل کے بالکل سامنے تھیں اور اندر سے چنبیلی کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی، بلکہ ایک بار تو وہ اتنے درد بھرے انداز میں ہنہنائی کہ سلمہ ڈری کہ شاید اس کی پیاری گھوڑی سچ مچ مر رہی ہے اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اصطبل کا دروازہ کھلتے ہی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے خوفناک راز اس پر آشکار ہو جائے گا۔ اور اس کا دل اور بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔

لیکن اصطبل کا دروازہ نہیں کھلا۔ اس وقت نہیں کھلا، زندگی بھر نہیں کھلا۔ پیچھے سے ان کی بیوک کار کا ہارن سنائی دیا اور جب سلمہ اور جھنیا نے گھبرا کے مڑ کر دیکھا تو سر عظیم اللہ موٹر سے اتر کر ان کی طرف آ رہے تھے۔ بدن پر کچہری والا کالا کوٹ اور دھاریوں والی پتلون، سر پر ہیٹ۔ اور سلمہ نے دیکھا کہ ان کے ڈیڈی کی مونچھیں جو ولایتی موم سے نکیلی بنائی جاتی تھیں اور ہمیشہ نہ صرف چڑھی بلکہ اکڑی رہتی تھیں، اس وقت غصے سے ہل رہی ہیں، جیسے شکار کو دیکھ کر ان کے شکاری کتے شیرو کی دم ہلنے لگتی ہے۔

سلمہ کو پھر اس کے کمرے میں قید کر دیا گیا۔ جھنیا کے بابا کو کہہ دیا کہ اس چھوکری نے پھر کبھی چھوٹی بی بی سے بات کی تو اس کی ہنٹر سے خبر لی جائے گی۔ اگلے ہی ہفتے سلمہ کو مسوری پڑھنے کے لیے بھیج دیا گیا اور ایک برس بعد مس میری کی تجویز پر ان کے ساتھ اسے انگلستان کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ اور صرف جب ان کی بیوک کار احاطے سے باہر سڑک پر آئی تو سلمہ نے دیکھا کہ جھنیا پیچھے دوڑتی

گئی اور دیواروں پر دوڑتی ہوئی چھپکلیوں کی دوڑ بھاگ میں دلچسپی لینے لگی۔ یہ چھپکلیاں بالکل سرکس کے مداری کی طرح تھیں۔ نہ دیواروں پر سیدھی اوپر چڑھ جاتی تھیں، مگر تھیں بہت گندی۔ کیڑے مکوڑے، مکھی مچھر کھاتی رہتی تھیں، جن کو دیکھ کر بچی کا جی متلانے لگا۔ اور آخرکار اس نے سوچا کہ میں اپنی کھڑکی میں بیٹھ کر باغ ہی کی سیر کروں۔

باغ میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے اور تتلیاں ہوا میں اڑ رہی تھیں، اور دور لان پر ان کا بوڑھا مالی گلاب کی کیاریوں میں فوارے سے پانی دے رہا تھا، اور نیم کے پیڑ پر لال لال چونچ والے طوطے بیٹھے تھے، اور دور آم کے پیڑوں میں ایک کوئل کوکو کر رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں ان سب چیزوں سے بچّی کا جی اکتا گیا، کیونکہ وہ چاہتی تھی کسی سے بات کرنا، اور بات کرنے کی اسے ڈاکٹر بینرجی کی طرف سے سخت ممانعت تھی۔ اسی لیے تو اس کے ڈیڈی نے مس میری کو ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی کو بچّی کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ دی جائے۔ اور کیونکہ بچّی خود بہت باتونی تھی اور مس میری سے ہر وقت اوٹ پٹانگ سوال کرتی تھی اور ڈیڈی سے اصرار کرتی تھی کہ مجھے کوئی پریوں کی کہانی سنایئے۔ اس لیے ڈاکٹر اور ڈیڈی دونوں کے حکم سے اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند رکھا جاتا تھا اور صرف دوا اور کھانے کے اوقات پر مس میری چند منٹ کے لیے اندر جاتی تھیں۔

جب اس نے باغ میں اپنی ہم عمر ایک بچّی کو دوڑتے بھاگتے دیکھا تو سلمہ بے اختیار چلا پڑی۔ "اے۔ اے۔ ادھر آ۔"

"سلام چھوٹی بی بی۔"

"تم مجھے جانتی ہو۔؟"

"ضرور جانتی ہوں۔ یہ فراک جو میں پہنے ہوں، یہ تمہارا ہی تو ہے چھوٹی بی بی۔" اور سلمہ نے پہچان لیا کہ بیل اور پھندوں کے نیچے جو نیلی دھاریوں کا فراک ہے وہ واقعی کبھی اس کا ہی تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جھنیا۔"

"اور میرا نام ہے سلمہ۔"

"نہیں، تمہارا نام ہے چھوٹی بی بی۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"بابا نے۔"

"تمہارے بابا کیا کرتے ہیں؟"

"آپ کے گھوڑوں کو دانہ کھلاتے ہیں، ان کی مالش کرتے ہیں۔"

"تو تم سائیں رام دین کی بیٹی ہو؟"

"ہاں۔"

"تم اسکول پڑھنے نہیں جاتیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں۔؟"

"بابا کہتے ہیں سائیسوں کے بچے اسکول نہیں جاتے۔"

"پھر تم دن بھر کیا کرتی ہو؟"

"کھیلتی ہوں اور بابا کہیں تو گھوڑوں کو پانی پلا دیتی ہوں۔"

"اور جب تمہیں بخار آتا ہے تب کیا کرتی ہو؟"

"جب بخار آتا ہے تو میں خوب دھوپ میں بھاگتی ہوں۔ پسینہ آ کے بخار آپ سے آپ بھاگ جاتا ہے۔ پر چھوٹی بی بی! آپ کیوں کمرے میں بند رہتی ہو؟"

"ڈاکٹر اور ڈیڈی کا حکم نہیں ہے باہر نکلنے کا۔"

"ڈاکٹر بہت برا آدمی ہے چھوٹی بی بی۔"

"کیوں؟"

"وہ سوئی لگاتا ہے۔ ایک بار میرے سوئی لگائی تھی تو تین دن تک بانہہ سوجی رہی تھی۔"

ان کی دوستی ہو گئی۔ میلے پیوند لگے فراک پہننے والی سائیس کی بیٹی جھنیا، اور نائیلون کا نائٹ گون پہننے والی سر عظیم اللہ کی بیٹی سلمہ، سہیلیاں بن گئیں۔

روز جھنیا سلمہ کے لیے باغ سے چرا کر پھول، کبھی کیریاں اور کبھی پکے امرود لاتی، اور ان کے بدلے میں سلمہ اسے اپنے بالوں میں لگانے کے ریشمی ربن اور رنگین تصویروں والی کتابیں اور بولنے والی گڑیا دیتی۔ سلمہ گھنٹوں کھڑکی میں بیٹھی جھنیا سے باتیں کرتی رہتی۔ سلمہ اکثر سوچتی، جھنیا کتنی خوش قسمت ہے۔ دن بھر

علاج

سمندر میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ لہروں میں کشتی ڈول رہی تھی اور کشتی میں ایک سرے پر انور بیٹھا اور دوسرے پر سلمہ۔

سلمہ سوچ رہی تھی، کہتے ہیں ایسے بھی سچے عاشق ہوتے ہیں جو محبت کی خاطر اپنی جان دے دیتے ہیں۔ چلو جی، انور میاں، آج تمہاری خاطر ہم بھی جان دیئے دیتے ہیں۔

اور انور سوچ رہا تھا، ڈاکٹر باسو ٹھیک ہے تو بڑا قابل آدمی اور نفسیات کا مانا ہوا استاد۔ مگر بڈھے میاں نے کہیں الٹا سبق تو نہیں پڑھا دیا۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔

سمندر میں لہریں اٹھ رہی تھیں اور ہر اٹھتی لہر کے ساتھ سلمہ کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتی تھی تو اس کا تخیل اسے سمندر کی اندھیری گہرائی میں لے جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا اور جب ڈر کے مارے وہ آنکھیں کھول دیتی تو دیکھتی کہ ایک لہر کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری لہر منہ پھاڑے اس کو نگلنے کے لیے چلی آ رہی ہے۔

"ہائے اللہ!" اس نے سوچا۔ میں نے کمزوری کے کس لمحے میں اس کشتی میں بیٹھنا منظور کر لیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں پہلے ہی کہہ دیتی کہ جاؤ بھائی تم ناپو پر جا کر مچھلی کا کچھ جو اؤ، اس کا آپریشن کرو جو چاہو کرو۔ تم کہو گے، تو جہنم میں چلی جاؤں گی مگر اس کشتی میں نہیں بیٹھوں گی۔ سمندر کم بخت میں طوفان آ رہا ہے۔ ہائے اللہ؟ تو کیا میں اللہ کو جانتی ہوں؟ کون جانتا ہے شاید مانتی ہوں۔ کیمبرج میں پڑھا ہوا فلسفہ تو کہتا ہے اللہ صرف ایک واہمہ ہے مگر یہاں سمندر کی خونخوار لہروں میں تو مجھے ہر طرف خدا کا قہر ہی نظر آ رہا ہے نہ جانے کون کون سے گناہ میرے نامۂ اعمال میں لکھے ہوئے ہیں جن کی سزا میں مجھے اس سمندری لہر میں آج دفن کیا جائے گا۔ مگر کیا منکر نکیر سمندر کی تہہ میں پڑے ہوئے مردوں سے بھی سوال جواب کرتے ہیں۔

اور انور سوچ رہا تھا کمال ہے سلمہ سوئٹزرلینڈ کی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی خطرناک ڈھلوانوں پر کئی بار SKIING کر آئی ہے، درجنوں بار ہوائی جہاز میں سفر کر چکی ہے، خود ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے، لیکن ایک کشتی میں دو میل کے سمندری سفر سے اس کی رنگت پیلی پڑ گئی ہے سمندر کی یہ ہیبت تو اس کے تحت الشعور میں چھپی بیٹھی ہے نہ جانے کتنے برسوں سے۔ کیا اس ہیبت کو کوئی بھی وہاں سے نکال سکتا ہے؟۔ شاید محبت نکال سکتی ہے۔ آج بیچاری میری خاطر اس کشتی میں بیٹھ ہی گئی نا! بڑا ظلم کیا ہے میں نے اس کے ساتھ۔

اس دن سویرے جب وہ سو کر اٹھے تھے تو انور کو یقین نہیں تھا کہ سلمہ اس کے ساتھ آنے کو تیار ہو جائے گی۔

ناشتے کی میز پر سلمہ نے حسب معمول پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"ڈارلنگ! وہ فلیٹ ہمیں کب تک مل جائے گا؟"

اور حسب معمول انور نے جواب دیا تھا۔ "بہت جلد، شاید اگلے مہینے ہی ہم شفٹ کر جائیں۔ شاید۔"

"یہ شاید کیوں؟"

"اس لیے کہ شاید اس عرصے میں تمہارے دل سے سمندر کی ہیبت نکل جائے اور تم سمندر سے ڈرنا چھوڑ دو۔"

"کون کہتا ہے میں سمندر سے ڈرتی ہوں۔؟"

"تو پھر یہ گھر کیوں چھوڑنا چاہتی ہو؟"

"بس مجھے سمندر پسند نہیں۔"

یہ انور کے لیے ایک اور حیرت کی بات تھی۔ بات کہ وہ سمندر سے ڈرتی تھی لیکن دن کے اجالے میں وہ اس خوف کا اقرار کرنے کو تیار نہیں تھی۔

"بس مجھے سمندر پسند نہیں۔" وہ کہے جا رہی تھی۔ "مجھے سمندر میں کوئی دلچسپی نہیں مجھے تمہارا سمندر بور کرتا ہے۔" اس کی آواز اونچی ہوتی گئی تھی، اس میں ہسٹریا کی ایک کیفیت آتی گئی تھی۔ اور انور نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک ایسے خوف کی چمک ہے جیسے دن دہاڑے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔

دھیرے دھیرے چمچہ چلاتے ہوئے انور نے کہا۔ "سلمہ تم نے وہ پکچر دیکھی تھی؟"

"کونسی پکچر؟"

"کیا نام تھا اس کا؟ ہاں اب یاد آیا

"Leave her heaven"

ہوئی آ رہی ہے۔ سلمہ چلائی "ڈیڈی، ڈیڈی! میں جھنیا سے مل لوں۔" مگر پھر عظیم اللہ نے ڈرائیور کو کار نہ روکنے دی اور جھنیا موٹر کے پہیوں سے اُڑتی دھول کے بادلوں میں کھو گئی اور اس کے بعد صرف سڑک ہی سڑک رہ گئی، جو ہر لمحہ کھلنے والی جیبی فیتے کی طرح لمبی ہی ہوتی جا رہی تھی۔

اور اب یہ سڑک جہاز کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی اور ہر لمحہ سلمہ اور جھنیا کے درمیان کا فاصلہ لمبا کرتی جا رہی تھی۔

مگر بچی نے سوچا۔ یہ سڑک یہاں سے ہمارے گھر تک جاتی ہے۔ اگر میں یہاں سے اس سڑک پر چلنا شروع کروں اور چلتی رہوں، چلتی رہوں۔ اس وقت سے لے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک چلتی رہوں، راستے میں ایک بار بھی نہ رکوں تو ابھی اصطبل کے پچھواڑے، مرغی خانے میں، مرغے اذان دے رہے ہوں گے کہ میں گھر پہنچ جاؤں گی۔ اور پیچھے سے جا کے سوتی ہوئی جھنیا کی آنکھیں بند کر لوں گی اور کہوں گی، "جھنیا ری جھنیا، بول تو سہی میں کون ہوں؟" اور جب وہ میری آواز پہچان کر میرے پیچھے بھاگے گی تو میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوں گی اور سارے باغ میں اسے دوڑاؤں گی اور اس کے ہاتھ نہ آؤں گی۔ مگر اس وقت تو ڈیڈی وہاں اپنا بھورے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن پہنے ٹہل رہے ہوں گے۔ تو پھر کیا ہوا؟ میں اُن سے کہہ دوں گی۔ ڈیڈی میں لندن وندن نہیں جاؤں گی۔ میں تو یہاں رہوں گی اور جھنیا کے ساتھ کھیلوں گی اور اس کے ساتھ اصطبل میں جا کر دیکھوں گی کہ ہماری چنبیلی کے بچہ کیسے ہوتا ہے۔

جہاز کے پیچھے پیچھے پانی پر سفید جھاگوں کی سڑک صبح کے سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ سلمہ کو ایسا لگا جیسے سڑک اسے بلا رہی ہے، جیسے سڑک کہہ رہی ہے۔

"چل سلمہ میں تجھے جھنیا سے ملا دوں۔"

بچی نے اس کی طرف قدم بڑھا ہی دیا، مگر وہ سڑک نہیں تھی۔ وہ ایک کنواں تھا۔ اندھیرا اور ٹھنڈا اور دم گھونٹنے والا اندھا کنواں۔

وہ نیچے جا رہی تھی اور اس کے کان میں ایک لال منہ والے انگریز کی آواز گونج رہی تھی۔ "یہ سمندر کا لہر چھوٹا چھوٹا بے بی کھا جاتا ہے۔"

اور اب وہ خوفناک لہریں، جو ہاتھی کی طرح موٹی تھیں اور اونٹ کی طرح اونچی تھیں اور شیر کی طرح دہاڑتی تھیں اور کہانیوں والے اژدھے کی طرح پھنکارتی تھیں، بچی کے چاروں طرف شیطانوں کی طرح ناچ رہی تھیں، چلا چلا کر کہہ رہی تھیں۔ "ہم تمہیں کھا جائیں گے، ہم تمہیں کھا جائیں گے۔" اور نہ جانے کہاں سے ان کے اصطبل کا دروازہ بہتا ہوا وہاں آ گیا اور جب بچی نے وہ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ چنبیلی گھاس پر لیٹی ہوئی زور زور سے سانس لے رہی ہے اور اس کا پیٹ کسی نے کاٹ ڈالا ہے، اور پیٹ میں سے اور بھی بھیانک سمندری لہریں باہر نکل رہی ہیں۔ اور پھر ایک سمندر اور دوسرا سمندر اور تیسرا سمندر سب ایک ہو گئے، اور سب مل کر بچی کا گلا گھونٹنے لگے اور اس کے دماغ پر اندھیرا چھانے لگا۔ مگر اس اندھیرے میں گم ہوتے ہوتے اس نے محسوس کیا کہ دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پکڑ لیا ہے اور اب وہ کنویں میں نیچے کی طرف جا رہی ہے، کسی زینے پر چڑھتی ہوئی اوپر کی طرف جا رہی ہے۔

جب کئی گھنٹے بعد بچی کو ہوش آیا اور لہروں کے جہاز کے ٹکرانے کی آواز سنائی دی تو اس نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور دہشت زدہ آواز میں چلائی۔ "مس صاحب! مجھے سمندر سے بچاؤ۔"

"ارے بھئی یہ مس صاحب کون ہیں جنہیں آواز دے رہی ہو؟"

سلمہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ دھوپ کمرے میں پھیل چکی ہے اور انور اپنی پیار بھری نگاہوں سے اسے چوم رہا ہے۔

"پیاری بچی! خواب میں پھر ڈر گئیں!"

"نہیں۔" اس نے شوہر کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "تم میرے پاس رہو گے تو میں کسی چیز سے نہیں ڈروں گی۔"

"سمندر سے بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

مگر نہ جانے کیوں انور کو محسوس ہوا کہ اس "نہیں" میں یقین اور قطعیت کی کسی قدر کمی تھی۔

ہے وہ مر رہی ہو۔
سلمہ باہر کھڑی دروازے کی ریخ میں سے جھانک رہی تھی
خوف سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔
"سلمہ اندر آجاؤ۔" اور پھر انور نے مراٹھی میں مچھیرن سے
کہا۔
بیس برس سے جس دروازے کے باہر وہ کھڑی تھی کھڑی
اسے کھول کر آج وہ اس کے اندر چلی گئی۔
مچھیرن پسینے میں شرابور ہو رہی تھی، اس کے چہرے پر
سے گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں مگر سلمہ کو دیکھ کر اپنی
نسکیرا وجود وہ مسکرادی اور اندھیرے جھونپڑے میں اس
ت ایسے کھلے جیسے سمندر کی تہہ میں سیپ کے موتی۔ پھر اس نے
میں کچھ کہا۔
انور نے ترجمہ کیا۔ "وہ کہہ رہی ہے بھگوان کرے یہ
تمہیں جلدی نصیب ہو۔"
اور مچھیرن پھر اپنے حیات آفریں کرب میں مبتلا ہوگئی۔
پسینہ، خون، اور پھر جیسے مداری ٹوپی میں سے خرگوش
نے ہیں، انور کے ہاتھ میں گوشت کا ایک لوتھڑا۔ مگر بیجان
حرکت نہیں، کوئی آواز نہیں، ماں کی آنکھیں بھی بند

شاید وہ مر گئی۔ اور پھر ڈاکٹر نے اس گوشت کے لوتھڑے کو
زور سے تھپڑ مارا، اور جھونپڑے میں ایک ننھی سی آواز نے نئی
زندگی کا اعلان کیا۔ مری ہوئی ماں کی آنکھیں بھی کھل گئیں،
خوشی سے چمک اٹھیں، ڈاکٹر سے اس ننھے سے زندہ پتلے
کو لے کر اس نے اپنے سینے سے چپٹا لیا۔
سلمہ نے اپنے گال پر گرم گرم آنسوؤں کو محسوس کیا۔
"مر کے ہی زندگی پیدا ہوتی ہے۔" وہ آنسوؤں کو پیتے
ہوئے بولی۔ "جھنیا کے بابا یہ کہتے تھے۔"
"ماز ہے بابا؟" مچھیرن نے مراٹھی سے سوال کیا۔
اور اب سلمہ نے زمین پر بیٹھتے ہوئے مچھیرن کا سیاہ مگر
چکنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا۔
"بہن تمہارا نام کیا ہے؟"
"ماز ہا نام؟" اس نے دہرایا اور سلمہ نے خوشی اور محبت اور
تشکر کی ایک گرم اور نرم لہر کو اس کے ہاتھ سے اپنے ہاتھ میں
ہوتے محسوس کیا اور اسے ایسا لگا کہ جیسے اپنے بچپن سے اس
کا بیس برس پہلے کا ٹوٹا ہوا رشتہ آج پھر قائم ہو گیا ہے۔ پھر
مچھیرن بولی۔ "ماز ہا نام؟ جھنیا!"

اور اگلی لہر جو سس میری کی طرح سروقد تازی تھی مچوتی جاتی اس کی طرف آئی تو اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس سے کہہ رہا ہو۔
"ادھر کہاں جا رہی ہو۔ بے بی۔ تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں کہ ادھر لندن میں فرسٹ کلاس انگلش اسکول میں ایجوکیشن حاصل کرو"
مگر سلمہ اس لہر کے تھپیڑوں میں یہ سوچتی ہوئی صاف نکل گئی۔
"ٹاٹا صاحب۔ مگر میں تو اب گھر جاؤں گی اور جھنیا کے ساتھ کھیلوں گی۔"

اور پھر ایک اور لہر آئی۔ اس کیمبرج والے سائیکاٹرسٹ جارج رسل کی طرح وہی چال چلتی ہوئی "سلمہ ڈارلنگ۔ یو آر ریپڈ۔ انڈرہٹ لو آر

تم قدرت کی گنہگار ہو کیونکہ تم جنسی اختلاط سے ڈرتی ہو!"
اس لہر کے ادپسے تو وہ ایسی آسانی سے گزر گئی جیسے اسکی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ "جاؤ، جاؤ۔ جیورجی یو اسے پہلے اپنے ماتوں کے پائیریا کا علاج کرا لے آؤ پھر ذرا انڈسے میرے سائیکاڈانالی سس کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا۔"
اور پھر لہروں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور وہ ٹاپو کے ساحل پر پایا۔ پانی میں کھڑی ہوئی اپنے بھیگے ہوئے، تھکے ہوئے، چوٹ کھائے ہوئے بدن میں ایک نئی طاقت ایک نئی تازگی محسوس کر رہی تھی۔ سامنے سرسبز ٹاپو تھا، ناریل کے کمان کی طرح بل کھائے ہوئے پیڑ تھے، ساحل پر مچھیروں کے جال سوکھ رہے تھے اور دور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔
"دنیا کتنی خوبصورت ہے۔" اس نے سوچا۔ "آج سے پہلے تو مجھے کبھی اتنی خوبصورت نہ لگی تھی۔"
پھر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سمندر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پر لہریں دوڑ بھاگ کر رہی تھیں جیسے باپ کے سینے پر بچے کھیلتے ہیں۔
کیا یہی وہ سمندر ہے جس سے وہ کبھی ڈرتی تھی؟ کیوں ڈرتی تھی؟ مگر اسے اس کی کوئی وجہ یاد نہ آئی۔
زمین خوبصورت تھی اور آسمان پر بکھرے ہوئے بادل خوبصورت تھے، نیلا سمندر خوبصورت تھا جس کے اس پھیلاؤ میں سب ایک ہی لگی تھی۔ اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔

انور!
ہائے اس ظالم نے مجھے ڈبونے کی کوشش میں کہیں خود تو جان نہیں دے دی؟
اسی دم سامنے سے آتی ہوئی ایک لہر ٹوٹی اور اس میں سے ایک گھنے سیاہ بالوں والا سر نکلا، اور دو چوڑے چکلے شانے نکلے، اور ایک لمبا تڑنگا جسم نکلا ہائے اللہ! یہ سمندر کتنا اچھا ہے کہ اس میں سے آج میرے انور نے جنم لیا ہے!
"انور ڈارلنگ!"
اور وہ بھاگ کر اس سے چمٹ گئی۔
"تو تم میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے؟ اور میں سمجھی تم مجھے ڈوبنے کے لیے چھوڑ کر چل دیے!"
"ارے تم رو رہی ہو؟"
"خوشی کے مارے۔"
"سچ مچ بچی ہو۔"
"اب جو چاہو کہو، میں بچی کہلانے سے نہیں چڑتی"
"کیوں؟"
"اس لیے کہ اب میں بچی نہیں رہی۔ آج میں جوان ہو گئی ہوں۔ اچھا ہی ہوا وہ کشتی ڈوب گئی۔"
"اسے ڈوبنا ہی تھا۔ پورے ڈیڑھ سو روپے دیے تھے۔"
"تو تم نے جان بوجھ کر یہ سارا ڈھونگ رچایا تھا؟"
"سمندر سے تمہاری دوستی جو کرانی تھی۔"
"اور جو سچ مچ ڈوب جاتی؟"
"جس پانی میں تم ڈوبنے والی تھیں وہ صرف چار فٹ گہرا ہے اور تمہارا قد ساڑھے پانچ فٹ ہے۔"
"اور یہ مچھیرن کی زندگی کا بہانہ؟ یہ سب فرضی تھا۔ تمہارا تو ڈاکٹری بیگ بھی ڈوب گیا۔"
"وہ تو خالی تھا۔ اصل بیگ تو میرا اسسٹنٹ پہلے ہی یہاں آ چکا ہے۔"
"تم بڑے فراڈ ہو۔"
"بڑا فراڈ تو فرائیڈ ہے۔"
مچھیرن کے زور زور سے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی،

عصمت چغتائی

ہندستان چھوڑدو

صاحب مرگیا؟ جینت رام نے بازار سے سودے کے ساتھ یہ خبر لا کر دی۔

"صاحب! کون صاحب؟"

"وہ کانڑیا صاحب تھا نا"

"وہ کانا صاحب جیکسن۔ بیچارا" یہ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ کائی لگی پرانی جگہ جگہ سے کھونڈی ہنسی کی طرح منہدم ہوتی ہوئی دیوار کے اس پرے اُدھڑے ہوئے سیمنٹ کے چبوترے پر سلوما بائی پیر پسارے میٹھی مراہٹی زبان میں بین کر رہی تھی۔ اس کے پاس سپو اکڑوں بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ پٹو میں پیشر کالے گورے میل کا نادر نمونہ تھا۔ اس کی آنکھیں جیکسن صاحب کی طرح نیلی اور بال بھورے تھے رنگ گندمی تھا۔ جو دھوپ میں جل کر بالکل تانبے جیسا ہو گیا تھا۔

اسی کھڑکی میں سے میں برسوں سے عجیب و غریب خاندان کو دیکھتی آئی ہوں۔ یہیں بیٹھ کر میری جیکسن سے پہلی مرتبہ بات چیت شروع ہوئی تھی۔ سن بیالیس کا "ہندستان چھوڑ دو" کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ گرانٹ روڈ سے دادر تک کا سفر ملک کی بے چینی کا ایک مختصر مگر جاندار نمونہ ثابت ہوا تھا۔ ہیگن روڈ کے ناکے پر ایک بڑا بھاری سا الاؤ جل رہا تھا۔ جس میں راہ چلتوں کی ٹائیاں ہیٹ اور کبھی سوٹ آ جاتا تو پتلونیں اتار کر جلائی جا رہی تھیں۔ سین کچھ بچکانا سہی مگر دلچسپ تھا۔ بیل دار ٹائیاں نئے طرح دار ہیٹ، اسٹرا کی چوڑی پتلونیں بڑی بے دردی سے آگ میں جھونکی جا رہی تھیں۔ بچے جو چیتھڑے پہنے آتش باز تھے نئے نئے کپڑوں کو نہایت بے تکلفی سے آگ میں جھونک رہے تھے۔ ایک لمحہ کو بھی تو کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آ رہا تھا کہ نئی گیبرڈین کے پتلون کو آگ کے منہ میں جھونکنے کے بجائے اپنی ننگی سیاہ ٹانگوں پر ہی چڑھا لے۔

اتنے میں ملٹری آ گئی تھی جس میں سے لال بھبھوکا تھوتھنیوں والے گورے ہاتھوں میں مشین گنیں سنبھالے دھڑا دھڑ کود پڑے۔ مجمع ایک دم تتر بتر ہو کر نہ جانے کہاں اڑ گیا تھا۔ میں نے یہ تماشہ میونسپل دفتر کے محفوظ احاطے سے دیکھا تھا۔ اور مشین گنیں دیکھ کر میں جلدی سے اپنے دفتر میں گھس گئی تھی۔

ریل کے ڈبوں میں بھی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ بمبئی سنٹرل سے جب ریل چلی تھی تو ڈبے کی آٹھ سیٹوں میں سے صرف تین سلامت تھیں لوئر پریل تک وہ تینوں بھی اکھیڑ کر کھڑکیوں سے باہر پھینک دی گئیں۔ اور میں راستے بھر کھڑی کھڑی دادر آئی۔ لیکن ان چھوکروں پر ذرا بھی کوئی غصہ نہیں آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا یہ ساری ریلیں، ٹائیاں، پتلونیں ہماری نہیں دشمن کی ہیں۔ ان کے ساتھ تو ہم دشمن کو بھی بھون رہے ہیں۔ اٹھا کر پھینک رہے ہیں۔ میرے گھر کے قریب ہی سڑک کے بیچوں بیچ ٹریفک روکنے کے لیے ایک پیڑ کا لمبا سا گدا تھا سڑک پر لمبا لمبا ڈال کر اس پر کوڑے کرکٹ کی اچھی خاصی دیوار کھڑی کی تھی۔ میں یہ مشکل اسے پھلانگ کر اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہونچی ہی تھی۔ کہ ملٹری کا ٹرک رک گیا۔ اور جو پہلا گورا اسٹین گن لیے دھم سے کودا تھا جیکسن صاحب ہی تھا۔ ٹرک کی آمد کی خبر سنتے ہی سڑک پر روک باندھنے والا دستہ ادھر ادھر بلڈنگوں میں سٹک گیا تھا۔

دیکھتے دیکھتے جل گئے جو اس ہولناک آگ میں پھنس گئے تھے وہ تو میرے گھر میں چھپ گئے تھے۔ بڑے صاحب سے گھن آنے لگی تھی۔ برٹش سامراج کا جیتا جاگتا ہتھیار میرے سامنے کھڑا ان بے گناہوں کے خون کا مذاق اڑا رہا تھا جو اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ میرا جی چاہا اس کا منھ نوچ لوں۔ اس کی کون سی آنکھ شیشے کی تھی یہ اندازہ لگانا میرے لیے مشکل تھا۔ کیونکہ وہ شیشے والی آنکھ ولایتی تھی کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ اس میں ساری جیکسن کی سفید قوم کی چالبازی بھری ہوئی تھی۔ احساس برتری کا زہر دونوں ہی آنکھوں میں برابر رچا ہوا تھا۔ میں نے دھڑسے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔

مجھے سکھو بائی پر بہت غصہ آتا تھا۔ تو رکی بھی سفید قوم کے ذلیل کتے کا ترنوالہ بنی ہوئی تھی۔ کیا خود اس کے ملک میں کوڑھیوں اور حرامزادوں کی کمی تھی جو وہ ملک کی عزت نیلام پر تلی گئی تھی۔ روز جیکسن شراب پی کر اس کی ٹھکائی کرتا۔ ملک میں بڑے بڑے معرکے سر کئے جا رہے تھے۔ سفید حاکم بس چند دنوں کے مہمان تھے۔

"بس اب چل چلاؤ ہے ان کی حکومت کا۔" کچھ لوگ کہتے۔

"ابھی یہ شیخ چلی کے خواب ہیں۔ انھیں نکالنا مذاق نہیں؟" دوسرے لوگ کہتے۔ اور میں ملک کے نیتاؤں کی لمبی چوڑی تقریریں سن کر سوچتی، کوئی جیکسن کانے صاحب کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ وہ مزے سے سکھو بائی کے جھونٹے پکڑ کر پیٹتا ہے۔ فلو ینا اور ریٹو کو مارتا ہے جے ہند کے نعرے لگانے والے اس کمبخت کا کچھ فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔

مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بجھوا الٹے شراب بنتی تھی۔ مجھے معلوم تھا سب کچھ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سنا تھا اگر غنڈوں کی رپورٹ کر دو تو یہ جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ ویسے مجھے یہ بھی تو نہیں معلوم تھا کہ کس سے رپورٹ کر دوں۔ ساری بلڈنگ کے نل دن رات ٹپکتے تھے۔ موریاں سڑ رہی تھیں۔ مگر مجھے قطعی نہیں۔ معلوم تھا کہ کہاں اور کس سے رپورٹ کی جاتی ہے اس پاس رہنے والوں میں بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اگر کوئی بد ذات عورت اوپر سے سر پر کوڑے کا ٹین الٹ دے تو کس سے شکایت کرو۔ ایسے موقعوں پر عموماً جس کے سر پر کوڑا گرتا وہ منہ اونچا کر کے کھڑکیوں کو گالیاں دیتا کپڑے جھاڑتا اپنی راہ لیتا۔

میں نے موقع پا کر ایک دن سکھو بائی کو پکڑا۔

"کیوں کمبخت! یہ پاجی تجھیں روز پیٹتا ہے تجھے شرم بھی نہیں آتی؟"

"روج کبھی مارتا بائی؟" وہ بحث کرنے لگی۔

"خیر وہ مہینے میں چار پانچ دفعہ تو مارتا ہے نا!"

"ہاں مارتا ہے بائی۔ سو ہم بھی سالے کو مارتا ہے۔" وہ ہنسی۔

"چل جھوٹی۔"

"ارے پٹو کا سوگند۔ ہم تھوڑا مار دیا سالے کو پرسوں۔"

"مگر تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ سفید چمڑی والے کی جوتیاں سہتی ہے؟" میں نے ایک سچے وطن پرست کی طرح جوش میں آ کر اسے لیکچر دے ڈالا۔ "ان لٹیروں نے ہمارے ملک کو کتنا لوٹا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

"اے بائی کیا بات کرتا تم۔ صاحب سالا کوئی نہیں لوٹا۔ یہ جو موالی لوگ ہے نا یہ بچارے کو دن رات لوٹتا میم صاحب گیا پیچھے سب کنٹری تھیلڑ کا بیرا لوگ پار کر دیا۔ اکھا یا مون کوٹ، ہیٹ، اتا فسٹ کلاس جوتا۔ سب ختم دیکھو جل کے بنگلے میں کوچ بھی نہیں چھوڑا۔ تم کہتا چور ہے صاحب۔ ہم بولتا ہم نہیں ہو دے تو سالا اس کا بوٹی کاٹ کے لے جاوے اے لوگ۔"

"مگر تجھیں کیوں اس کا اتنا درد ہے؟"

"کا ہیکو نہیں ہو دے درد وہ ہمارا مرد ہے نا بائی۔" سکھو بائی مسکرائی۔

"اور میم صاحب؟"

"میم صاحب سالی بکی چھنال ہاں۔" سکھو بائی نے فیصلہ کیا۔ "ہم اس کو اچھی طرح جانتا۔ ہاں۔ لندن میں

"میرا فلیٹ چونکہ سب سے نچلی منزل تھا لہٰذا بہت سے چھوکرے ایک دم ریلا کر کے گھس آئے۔ کچھ باورچی خانے میں گھس گئے کچھ غسل خانے اور ٹھا اس میں دبک گئے۔

چونکہ میرا دروازہ کھلا تھا اس لیے جیکسن مع دو مسلح گارڈوں کے مجھ سے ہی جواب طلب کرنے آگے آیا۔

"تمھارے گھر میں بدمعاش چھپے ہیں انھیں ہمارے سپرد کرو"

"میرے گھر میں تو کوئی نہیں۔ صرف میرے نوکر ہیں" میں نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"کون ہیں تمھارے نوکر؟"

"یہ تینوں" میں نے تین آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو تن کر کھڑے ہو کر رہے تھے۔

"غسل خانے میں کون ہے؟"

"میری ساس نہا رہی ہیں" میری ساس نہ جانے اس وقت کہاں ہوں گی!

"اور پاخانے میں؟" اس کے چہرے پر شرارت کی جھلکی آئی...

"میری ماں ہوگی یا شاید بہن ہو۔ مجھے کیا پتہ میں تو ابھی باہر سے آئی ہوں"

"پھر تمھیں کیسے معلوم ہوا غسل خانے میں تمھاری ساس ہے؟"

"میں داخل ہوئی تو انھوں نے آواز دے کر مجھ سے تولیا مانگا تھا"

"ہوں۔ اپنی ساس سے کہہ دو سڑک روکنا جرم ہے!" اس نے دبی آواز میں کہا اور اپنے ساتھیوں کو جنھیں وہ باہر کھڑا کر آیا تھا واپس ٹرک میں جانے کو کہا۔

"ہوں! ہوں ہوں" وہ گردن ہلا کر مسکراتا ہوا چلا گیا اس کی آنکھوں میں پُر معنی جگنو چمک رہے تھے۔

جیکسن کا بنگلہ میرے احاطے سے ملحقہ زمین پر تھا۔ مغربی رخ پر سمندر تھا۔ اس کی میم صاحب مع دو بچوں کے ان دنوں ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ بڑی لڑکی جوان تھی اور چھوٹی بارہ تیرہ برس کی۔ میم صاحب صرف چھٹیوں میں تھوڑے دنوں کے لیے ہندوستان آ جاتی تھی۔ اس کے آتے ہی بنگلے کا حلیہ بدل جایا کرتا تھا۔ نوکر چاق چوبند ہو جاتے۔ اندر باہر صفائی ہوتی، باغ میں نئے گملے مہیا کیے جاتے جو میم صاحب کے جاتے ہی پاس پڑوس کے لوگ چرانا شروع کر دیتے۔ کچھ مالی بیچ ڈالتا۔ اور دوبارہ جب میم صاحب کی آمد کا غلغلہ مچتا تو صاحب پھر وکٹوریہ گارڈن سے گملے اٹھوا لاتا۔

جتنے دن میم صاحب رہتی۔ نوکر باوردی نظر آتے۔ صاحب بھی یونیفارم ڈانٹے رہتا یا نہایت عمدہ ڈریسنگ گاؤن پہنے صاف ستھرے کتوں کے ساتھ پھولوں کا بالکل اس طرح معائنہ کرتا پھرتا گویا وہ سو فیصد صاحب لوگوں میں سے ہے۔

مگر میم صاحب کے جاتے ہی وہ اطمینان کی سانس لے کر دفتر جاتا۔ ڈیوٹی کے بعد نیکر اور بنیان پہنے چبوترے پر کرسی ڈالے بیئر پیا کرتا۔ اور شاید اس کا ڈریسنگ گاؤن اس کا بیرا چرا لے جاتا۔ کتے تو میم صاحب کے ساتھ ہی چلے جاتے۔ دو چار بیڑی کتے بنگلے کو یتیم سمجھ کر احاطے میں ڈیرا ڈال دیتے۔

میم صاحب جتنے دن رہتی ڈنر پارٹیوں کا زور رہتا۔ اور وہ صبح ہی صبح بیچ سُروں میں اپنی آیا کو آواز دیتی۔

"آیو دوو!"

"جی میم صاحب!" آیا اس کی آواز پہ تڑپ کر دوڑتی۔ مگر جب میم صاحب چلی جاتی تو لوگوں کا کہنا تھا کہ آیا بیگم بن بیٹھتی تھی۔ وہ اس کی غیر حاضری میں عیوضی بھگتایا کرتی تھی۔ فلومینا اور رشید اسی آرضی راج کے مستقل ثبوت تھے۔

"کچھ ہندوستان چھوڑ دو" کا ہنگامہ اور کچھ میم صاحب کھٹا گئی تھی۔ اس گندے بچیاتے ملک اور اس کے باسیوں سے اس لیے وہ جلد ہی وطن سدھار گئی۔ انھیں دنوں پھر میری ملاقات جیکسن سے اسی کھڑکی کے ذریعے ہوئی۔

"تمھارا ساس نہا چکا؟" اس نے بمبئی کی زبان میں بدذاتی سے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں صاحب۔ نہا چکا۔ خون کا غسل کیا اس نے!" میں نے تلخی سے کہا۔ چودہ چودہ برس کے چند بچے کچھ ہی دن پہلے ہری نواس پر جب گولی چلی تھی۔ ایسے مارے گئے تھے۔ مجھے یقین تھا۔ کہ ان میں کچھ

لڑکوں کے جلوس کو مشین گنوں سے درہم برہم کیا تھا۔ وہ سب بھول چکے تھے۔ بس اتنا یاد تھا کہ نئی کالوں اور نیلی آنکھوں والی چھوکری کی کمر میں غضب کی لچک ہے۔ موٹے موٹے گدرائے ہوئے ہونٹوں کی جنبش میں موتی رلتے ہیں۔

ایک دن سکھو بائی جھولی میں پرساد لیے بھاگی... بھاگی آئی۔

"ہمارا صاحب آگیا"۔ ان کی آواز لرز رہی تھی۔ آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے۔ کتنا پیار تھا اس لفظ "ہمارا" میں۔ زندگی میں بار کسی کو پوری جان کا دم نچوڑ کر اپنا لینے کا موقع مل جائے تو پھر جنم لینے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

"اچھا ہو گیا۔؟"

"ارے بائی پاگل کبھی تھا؟ ایسا ہی صاحب لوگ پکڑ کرے گیا تھا، بھاگ آیا"۔ وہ رازداری کے لہجے میں بولیں۔

میں ڈر گئی کہ لو بھئی ایک تو ہارا ہوا انگریز اوپر سے پاگل خانہ سے بھاگا ہوا۔ کس کو رپورٹ کروں بمبئی کی پولیس کے لفڑے میں کون پڑتا پھرے۔ ہوا کرے پاگل میری بلا سے۔ کون مجھے اس سے میل جول بڑھانا ہے۔

لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ مجھے میل جول بڑھانا پڑا۔ میرے دل میں کھد بد ہو رہی تھی کہ کسی طرح پوچھوں جیکلین انگلستان اپنے بیوی بچوں کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ بھلا ایسا بھی کوئی انسان ہوگا جو فردوس کو چھوڑ کر یوں ایک کھولی میں پڑا رہے۔ اور ایک دن مجھے موقع مل ہی گیا۔ کچھ دن تک تو وہ کوٹھری سے باہر ہی نہ نکلا۔ پھر آہستہ آہستہ نکل کر.. چوکھٹ پر بیٹھنے لگا۔ وہ سوکھ کر مرغ ہو گیا تھا اس کا رنگ جو پہلے بندر...... کی طرح لال چقندر تھا جھلس کر کتھئی ہو گیا تھا۔ بال سفید ہو گئے تھے۔ چارخانہ کی لنگی باندھے میلا بنیان چڑھا وہ بالکل ہندوستان کی گلیوں میں گھومتے پرانے گورکھوں جیسا لگتا تھا۔ اس کی نقلی اور اصلی آنکھ میں فرق معلوم ہونے لگا تھا۔ شیشہ تو اب بھی ویسا ہی چمکدار شفاف اور "انگریز" تھا۔ مگر اصلی آنکھ گدلی بے رونق ہو کر ذرا دب گئی تھی۔ عموماً شیشے والی آنکھ کے بغیر ہی گھوما کرتا تھا۔ ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو وہ جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑا کھوئے کھوئے انداز میں کبھی زمین سے کوئی کنکر اٹھاتا اور اسے بچوں کی طرح دیکھ کر مسکراتا پھر پوری طاقت سے اسے دور پھینک دیتا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور سر ہلانے لگا۔

"کیسی طبیعت ہے صاحب؟" تجسس نے اکسایا تو میں نے پوچھا

"اچھا ہے۔ اچھا ہے"۔ وہ مسکرا کر شکریہ ادا کرنے لگا۔

میں نے باہر جا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ جلد ہی وہ مجھ سے باتیں کرنے میں بے تکلفی سی محسوس کرنے لگا۔ پھر ایک دن میں نے موقع پا کر کریدنا شروع کیا۔ کئی دن کی جانفشانی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ایک شریف زادی کا ناجائز بیٹا تھا۔ اس کے نانا نے ایک کسان کو کچھ روپے دے دلا کر پالنے پر راضی کر لیا۔ مگر یہ معاملہ اس صفائی سے کیا گیا کہ اس کسان کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس خاندان کا ہے۔ کسان بڑا جابر تھا۔ اس کے کئی بیٹے تھے۔ جو جیکلین کو طرح طرح سے زک پہنچایا کرتے تھے۔ روز پٹائی ہوتی تھی۔ مگر کھانے کو اچھا ملتا تھا۔ اس نے بارہ تیرہ برس کی عمر سے بھاگنے کی کوشش کرنا شروع کی۔ تین چار سال کی مسلسل کوششوں کے بعد وہ لڑھکتا پڑھکتا دھکے کھاتا لندن پہنچا۔ وہاں اس نے دنیا بھر کے پیشے باری باری اختیار کئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ اتنا ڈھیٹ مکار اور خودسر ہو گیا تھا کہ دو دن سے زیادہ کوئی نوکری نہ رہتی۔

وہ شکل صورت کا وجیہہ تھا اس لئے لڑکیوں میں کافی ہردلعزیز تھا۔ ڈارتھی اس کی بیوی بڑے نک چڑھے خاندان کی لڑکی تھی۔ کم رو اور کم ظرف بھی تھا۔ اس کا باپ بارسوخ آدمی تھا۔ جیکلین نے سوچا اس خانہ بدوشی کی زندگی میں بڑے جھنجھٹ ہیں آئے دن پولیس اور کچہری سے واسطہ پڑتا ہے کیوں نہ ڈارتھی سے شادی کر کے عاقبت سنوار لی جائے۔

ڈارتھی اس کے باس کے باہر تھی کی دسترس سے باہر

اس کا بوت یاد ہے"۔ یہاں سکھو بائی نے موٹی سی گالی دے کر کہا: "وہیں مری رہتی ہے۔ آتی نہیں، ین آتی تو دن صاحب سے کھٹ کھٹ تو کر لوگ سے کھٹ کھٹ"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب انگریز ہندستان سے جا رہے ہیں۔ صاحب بھی چلا جائے گا۔ مگر وہ قطعی نہیں سمجھی۔ یہی کہتی رہی کہ "صاحب بھی چلا جائے گا بائی اس کو ولایت اکدم پسند نہیں"۔

کچھ سال کے لئے مجھے پونا رہنا پڑا۔ اس عرصہ میں دنیا بدل گئی۔ پھر واقعی انگریز چلے گئے۔ ملک کا بٹوارہ ہوا۔ سفید حاکم کی ہوئی چال چل گیا اور ملک خون کی لہر میں نہا گیا۔

جب بمبئی واپس آئی تو بنگلہ کا حلیہ بدلا ہوا تھا صاحب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بنگلہ میں ایک ریفیوجی خاندان آ بسا تھا۔ باہر نوکروں کے کوارٹروں میں سے ایک کوٹھری میں سکھو بائی رہنے لگی تھی۔ نیلو مینا خاصی لمبی ہوگئی تھی۔ پڑھ اور وہ ماہم کے قریب ایک یتیم خانے میں پڑھنے جاتی تھی۔

جیسے ہی سکھو بائی کو میرے آنے کی خبر ملی فوراً ہی ہاتھ میں دو چار مونگنے کی پھلیاں لئے آن دھمکی۔

"کیسا ہے بائی؟"۔ انھوں نے رسًا میرے گھٹنے دبا کر پوچھا۔

"تم کیسا ہے۔ صاحب کہاں ہے تمھارا؟۔ چلا گیا نا لندن؟"

"نہیں بائی"۔ سکھو بائی کا منھ سوکھ گیا۔ "ہم بولا بھی جانے کو پر نہیں گیا۔ اُس کا نوکری بھی کھلاس ہو گیا تھا۔ آڈر بھی آیا پر نہیں گیا"۔

"پھر کہاں ہے؟"

"ہسپتال میں!"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"ڈاکٹر لوگ بولتا۔ کہ دارو بہت پیا اس کا دن سنک پھر گیا۔ ادھر پاگل صاحب لوگ کا ہسپتال ہے۔ اچھا ایک دم فرسٹ کلاس ادھر اس کو ڈالا"

"مگر وہ تو واپس جانے والا تھا"

"کتنا سب لوگ بولا ہم لوگ بولا بابا چلا جاؤ"۔ سکھو بائی رو پڑیں "پن نہیں، ہم کو بولا سکھو ڈارلنگ تیرے کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے"!

نہ جانے سکھو بائی کو روتے دیکھ کر مجھے کیا ہو گیا میں بالکل بھول گئی کہ صاحب ایک غاصب قوم کا فرد ہے جس نے فوج میں بھرتی ہو کر میرے ملک کی غلامی کی زنجیروں کو چوہرا کر دیا تھا۔ جس نے میرے ہم وطن بچوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ بہتے لوگوں پر مشین گنوں سے آگ برسائی تھی۔ برٹش سامراج کے ان گھناؤنے کل پرزوں میں سے تھا جس نے میرے دیس کے جانبازوں کا خون سڑکوں پر بہایا تھا۔ صرف اس قصور میں کہ وہ اپنا حق مانگتے تھے عزت سے جینا چاہتے تھے۔ مگر مجھے اس وقت کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ سکھو بائی کا "مرد" پاگل خانہ میں تھا مجھے اپنے جذباتی ہونے پر بہت دکھ تھا کیونکہ ایک قوم پرست کو جابر قوم کے ایک فرد سے قطعی کسی قسم کی ہمدردی یا لگاؤ نا محسوس کرنا چاہیئے۔

میں ہی نہیں سب ہی بھول چکے تھے۔ محلے کے سارے لونڈے نیلی آنکھوں والی نیلو مینا پر بغیر یہ سوچے سمجھے فدا تھے کہ وہ کیڑا جس سے اس کی ہستی وجود میں آئی سفید تھا یا کالا۔ جب وہ اسکول سے لوٹتی تو کتنی ہی ٹھنڈی سانسیں اس کے جلو میں ہوتیں۔ کتنی ہی نگاہیں اس کے پیروں تلے بچھائی تھیں...... کسی لونڈے کو اس سے عشق کرتے سر دھنتے وقت قطعی یہ یاد نہ رہتا تھا کہ یہ اسی سفید درندے کی لڑکی ہے جس نے ہری تو اس کے ناکے پر چودہ برس کے بچے کو خون میں ڈبو کر مارا تھا۔ جس نے ماہم چرچ کے سامنے نہتی عورتوں پر گولیاں چلائیں تھیں۔ کیونکہ وہ نعرے لگا رہی تھیں۔

جس نے چوپاٹی کی ریت میں جوانوں کا خون نچوڑا تھا۔ اور پیکر نڑائٹ کے سامنے سوکھے مارے ننگے بھوکے

بہاڑن اور نٹنی دونوں نے اس کی ہندوستانی پتی ورتا استریوں کی طرح خدمت کر کے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ سال میں صرف دو مہینے کے لئے آنے والی بیوی بھی بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔ پھر اس کے سامنے جیکسن کو تکلفات برتنا پڑتے تھے۔ ایک دن نشے میں اس نے کچھ بہاڑن اور نٹنی کے انداز محبت کا اپنی بیوی سے بھی مطالبہ کر دیا۔ وہ ایسی سیخ پا ہوئی کہ جیکسن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے بہت چوں چرا کی بہت کہا کہ "کہیں تم بھی دوسرے بے غیرت اور نیچ انگریزوں کی طرح لوکل عورتوں سے میل جول تو نہیں بڑھانے لگے ہو۔" جیکسن نے قسمیں کھائیں اور ڈارلنگ کے اتنے پیار لئے کہ وہ اس کی پارسائی کی قائل ہو گئی۔ اسے بڑا ترس آیا اور بڑے اصرار سے وہ اسے جبل پور لے آیا۔ مگر وہ وہاں کی مکھیوں اور گرمی سے بوکھلا کر نیم پاگل ہو گئی۔ اور تو سب جھیل جاتی مگر جب اس کے غسل خانے میں دو موئی نکلی تو وہ اسی وقت سامان باندھنے لگی۔ جیکسن نے بہت سمجھایا کہ یہ سانپ نہیں اور کاٹتا بھی نہیں۔ مگر اس نے ایک نہیں سنا۔ اور دوسرے دن دہلی چلی گئی۔

وہاں سے اس نے زور لگا کر اس کا تبادلہ بمبئی کا کروا دیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی۔ نٹنی کی جدائی اور ڈارلنگ کا بمبئی میں مستقل قیام سوہان روح بن گیا۔ سکھو بائی بچوں کی آیا کا ہاتھ بٹانے کے لئے رکھی گئی تھی۔ مگر جب بارش سے جی چھوڑ کر ڈارلنگ مع بچوں کے وطن گئی تو جیکسن کی نظر عنایت اس پر پڑی۔ اف کس قدر الجھی ہوئی داستان تھی صاحب کی۔ کیونکہ سکھو بائی اصل میں گینت ہیڈ بیرے کی رکھیلی عورت تھی۔ وہ اسے پونہ سے بھگا لایا تھا۔ ویسے بیوی بچوں والا آدمی تھا۔ بوجھ سے بچنے کے لئے اسے بہ طور رکھائی کے بچوں کی آیا کے نیچے رکھوا دیا تھا۔ سکھو بائی اپنی اس نوکری سے جس میں زمین پونچھنے، برتن دھونے کے علاوہ گینت کے ناز اٹھانا بھی شامل تھا۔ کافی مطمئن تھی۔

گینت اسے کبھی اپنے کسی دوست کو بھی از راہ کرم یا قرضہ کے عوض میں دے دیا کرتا تھا۔ مگر بڑی چالاکی سے کہ بہت دن تک سکھو بائی کو پتہ بھی نہ چلا۔ وہ پینے سے تو پہلے ہی سے کچھ واقف تھی۔ گینت کی صحبت میں پابندی سے شام کو ٹھرا چڑھانے لگی۔ گینت گاہک کو اپنی کوٹھری میں لے آتا۔ جیکسن کا ڈر تو کسی کو تھا نہیں۔ سب کام کاج چھوڑ کر نوکر مزے سے جوا کھیلتے، ٹھرا پیتے بلکہ سارے شیواجی پارک کے عزیز ڈارلنگ کے جاتے ہی صاحب کے بنگلے پر ٹوٹ پڑتے۔ اور رات گئے تک ہڑا مچا رہتا۔

شراب جب خوب چڑھ جاتی تو وہ سکھو بائی کو اس آدمی کے پاس چھوڑ کر کسی بہانے سے چلا جاتا۔ سکھو بائی سمجھتی وہ... گینت کو الو بنا رہی ہے اور آہستہ آہستہ وہ صاحب کی خدمت کرتے کرتے بیوی کی عیوضی بھی بھگتنے لگی۔ اس طرح گینت کے چکر سے چھٹی ملی۔ وہ کمبخت الٹا اس کی ساری تنخواہ اینٹھ لیا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں گینت فوج میں بیرے کی حیثیت سے مڈل ایسٹ چلا گیا اور سکھو بائی مستقل میم صاحب کی جگہ جم گئی۔ بس جب چھٹیوں میں میم صاحب آتیں تو وہ اپنی کھولی میں منتقل ہو جاتی۔ اور جب وہ اپنی کوک دار آواز میں۔

"ایو... دو دٹ" پکارتیں تو وہ فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کے "یس میم صاحب!" کہہ کر لپکتی۔ یوں تو میم صاحب میم صاحب سکھ کر وہ اپنے آپ کو بڑی انگریزی داں سمجھنے لگی تھی۔ انگریزی زبان میں یس۔ نو۔ ڈیم فول۔ سو آئین کے سوا اور رہی ہے کیا؟ حاکموں کا ان چند الفاظ میں ہی کام نکل جاتا ہے۔ چوڑے ادبی جملوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تانگے کے گھوڑے کو ٹخ ٹخ اور چابک کی زبان ہی کافی ہوتی ہے۔ مگر سکھو بائی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ انگریزی گاڑی میں جتا ہوا مریل گھوڑا الف ہو کر گاڑی لوٹ چکا تھا۔ اور اب اس کی لگامیں دوسرے ہاتھوں میں تھیں۔ اس کی دنیا بڑی محدود تھی۔ وہ خود اس کے دوکے اور اس کا "مرد"۔

جب میم صاحب ہندوستان آیا کرتی تھیں جب بھی.. سکھو بائی بڑی فراخ دلی سے عیوضی چھوڑ کر پھر بیتی کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے لگتی۔ اسے میم صاحب سے قطعی کوئی حسد نہ تھا۔ میم صاحب مغربی حسن کا نمونہ ہو تو ہو۔ ہندوستانی معیار حسن کے

تھی۔ وہ اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کی عادی تھی۔ مگر جیکسن کی اس وقت دونوں آنکھیں اصلی تھیں۔ یہ تو جب ڈارتھی سے لڑ کر وہ شراب خانوں کا ہو رہا۔ وہاں کسی سے مارپیٹ میں آنکھ جاتی رہی۔ جب تک اس کی صرف بڑی بیٹی پیدا ہوئی تھی

"ہاں تو تم نے ڈارتھی کو کیسے گھیر کر پھانسا۔؟" میں نے اور کریدا۔

"جب میری دونوں آنکھیں سلامت تھیں"۔۔۔۔

جیکسن مسکرایا۔

کسی نہ کسی طرح ڈارتھی میرے چڑھ گئی۔ کمبخت کنواری بھی نہیں تھی مگر ایسے فیل مچائے کہ باپ کی مخالفت کے باوجود شادی کر لی۔

باپ نے بھی لڑکی کی مجبوریوں کو سمجھ لیا۔ نیز بیوی کے روز روز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسے ہندستان بھجوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر نکما انگریز ہندستان کے سر منڈھ دیا جاتا تھا۔ خواہ وہاں وہ جوتے گانٹھتا ہو یہاں آتے ہی صاحب بن بیٹھتا تھا۔

جیکسن نے حد کر دی۔ وہ ہندستان میں بھی ویسا ہی نکما اور لاابالی ثابت ہوا۔ سب سے بڑی خرابی جو اس میں تھی وہ اس کا چھچھوراپن تھا۔ بجائے صاحب بہادروں کی طرح رعب داب سے رہنے کے وہ نہایت بھونڈے پن سے ٹیٹو لوگوں میں گھس مل جاتا تھا جب وہ بستی کے علاقے میں جنگلات کے محکمہ میں تعینات ہوا تو کلب کے بجائے نہ جانے کن چنڈو خانوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ آس پاس صرف چند انگریزوں کے بنگلے تھے بدقسمتی سے زیادہ تر لوگ معمر اور بردبار تھے۔ سنان کلب میں جہاں ہندستانیوں اور کتوں کو آنے کی اجازت نہ تھی زیادہ تر الو بولا کرتا تھا۔ سب ہی افسروں کی بیویاں اپنے وطن میں رہتی تھیں۔ جب کبھی کسی افسر کی بیوی ہندستان آتی تو وہ اسے بجائے جنگل میں لانے کے بجائے خود چھٹی لیکر شملہ یا نینی تال چلا جاتا۔ پھر بیوی ہندستان کی غلاظت سے عاجز آکر واپس چلی جاتی اور اس کا صاحب ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر بیوی کی حسین یاد لئے لوٹ آتا۔ صاحب لوگ ویسے

اپنا کام ٹیٹو عورتوں سے چلا لیا کرتے تھے۔ اس قسم کے تعلقات سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ حساب بھی سستا رہتا تھا ہندستان کا بھی فائدہ تھا اس میں ایک تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد بادامی اور کبھی خاص گوری بھی ہوا کرتی تھی۔ دوسرے یہ اولاد باقی ٹیٹو لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتی تھی کیونکہ ان کے بارسوخ باپ ان کے لئے یتیم خانے اور اسکول بھی کھول دیتے تھے۔ سرکاری خرچ پر ان کی دوسرے ہندستانیوں سے بہتر تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ اینگلو انڈین خوش شکل طبقہ انگریزوں سے بس دوسرے نمبر پر تھا۔ لڑکے ریلوے، جنگلات اور نیوی میں بڑی آسانی سے کھپ جاتے تھے۔ جو معمولی شکل کی لڑکیاں ہوتیں انھیں ہندستانی لڑکیوں کے مقابلے میں بہتر نوکریاں مل جاتی اور وہ اسکولوں، دفتروں اور ہسپتالوں کی رونق بڑھاتیں۔۔۔۔ جو زیادہ حسین ہوتیں وہ بڑے بڑے شہروں کے مغرب زدہ بازارِ حسن میں بڑی کامیاب ثابت ہوتی تھیں۔

جیکسن صاحب جب ہندستان آیا تو اس میں کانے شخص کے تمام عیب بڑی افراط سے موجود تھے۔ شراب اس کی عادت ثانی بن چکی تھی۔ ہر جگہ اس کی کسی نہ کسی سے جل جاتی اور اس کا تبادلہ ہو جاتا۔ جنگلات سے ہٹا کر اسے پولیس میں بھیج دیا گیا۔ جس کا اسے بہت ملال تھا۔ کیونکہ وہاں ایک پہاڑن پر اس کا بے طرح دل آگیا تھا۔ جبل پور پہونچ کر وہ اسے ضرور بلوا لیتا مگر وہاں اسے ایک سٹنی سے عشق ہو گیا۔ ایسا شدید عشق کہ اس کی بیوی ساری چھٹیاں نینی تال میں گزار کر واپس چلی گئی اور وہ نہ گیا۔ کام کی زیادتی کا بہانہ کرتا رہا چھٹی نہ ملنے کا عذر رکیا۔ مگر ڈارتھی کے ڈیڈی کے کتنے ہی دوست تھے جن کے رسوخ کی وجہ سے اسے زبردستی چھٹی دلوائی گئی جب وہ نینی تال پہونچا تو اس کا وہاں قطعی دل نہ لگا۔ ایک تو ڈارتھی اس کی جدائی میں اس پر بے طرح عاشق ہو گئی تھی اور چاہتی تھی دوبارہ ہنی مون منایا جائے۔ دوسری طرف اسے جیکسن کے طریقہ عشق سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ وہ اتنے دن ہندستان میں رہ کر بالکل ہی اجنبی ہو چکا تھا۔

آنکھ دور افق پر اس ملک کی سرحدوں کو تلاش کرتی جہاں نہ کوئی گورا ہے نہ کالا نہ کوئی زبردستی جا سکتا ہے نہ آسکتا ہے۔ اور نہ وہاں بدکار مائیں اپنے ناجائز بچوں کو تیری میری جو کھٹ پر جن کو خود اپنی باوقار دنیا بنا لیتی ہیں۔

سکھو بائی آس پاس کے گھروں میں کمائین کا کام کرتی اچھا خاصا کما لیتی۔ اس کے علاوہ وہ بانس کی ڈلیاں، میز کرسی وغیرہ بنا لیتی تھی۔ اس ذریعہ سے کچھ آمدنی ہو جاتی.. جیکسن کبھی اگر نشے میں نہ ہوتا تو الٹی سیدھی بے ہینڈے کی ٹوکریاں بنایا کرتا۔ شام کو سکھو بائی اس کے لئے ایک کٹورے کا ادھا لا دیتی جو وہ فوراً اجڑھا جاتا اور پھر اس سے لڑنے لگتا۔ ایک رات اس نہ جانے کہاں سے ٹھرے کی پوری بوتل حاصل کر لی اور ساری رات پیتا رہا۔ صبح دم دہنی کھولی کے آگے پڑ کر سو گیا۔ فلومینا اور پیٹو اس کے اوپر سے.. پھلانگ کر اسکول چلے گئے۔ سکھو بائی بھی تھوڑی دیر اسے گالیاں دیکر چلی گئی۔ دوپہر تک وہ وہیں پڑا رہا۔ شام کو جب بچے آئے تو وہ دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اسے شدید بخار تھا۔ جو دوسرے دن بڑھ کر سرسام کی صورت اختیار کر گیا۔ ساری رات نہ جانے وہ کیا بڑبڑاتا رہا۔ نہ جانے کسے یاد کرتا رہا۔ شاید اپنی ماں کو جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جو شاید اس وقت کسی شاندار ضیافت میں شریک "اخلاقی اصلاح بندی" پر تبصرہ کر رہی ہوگی یا وہ باپ یاد آرہا ہو۔ جس نے نسل چلانے والے سانڈ کی خدمات ادا کرنے کے بعد اسے اپنے جسم سے بہی ہوئی غلاظت سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور جو اس وقت کسی دوسرے محکوم ملک میں بیٹھا قومی اقتدار قائم رکھنے کے منصوبے بنا رہا.. ہوگا۔ یا ڈارتھی کے طعنوں بھرے احسان یاد آرہے تھے جو بے رحم کسان کے ہنٹروں کی طرح ساری عمر اس کے احساسات پر برستے رہے گن سے بے گناہوں کے پیٹ کر اس کی روح کو ڈستی رہی تم چلاتا رہا... سرپٹختا رہا... چیختا رہا

دیوار نے پکار... پکار کر کہا۔

"تیرا کوئی ملک نہیں۔ کوئی نسل نہیں۔ کوئی رنگ نہیں۔"

تیرا ملک اور نسل سکھو بائی ہے جس نے تجھے بے پناہ پیار دیا۔ کیونکہ وہ بھی تو اپنے دیس میں غریب الوطن ہے۔ بالکل تیری طرح۔ ان کروڑوں انسانوں کی طرح جو دنیا کے ہر کونے میں پیدا ہوتے ہیں۔ نہ ان کی ولادت پر شادیانے بجتے ہیں۔ نہ موت پر ماتم ہوتے ہیں!۔

پو پھٹ رہی تھی۔ ملوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی تھیں اور مزدوروں کی قطاروں کو نگل رہی تھیں۔ تھکی ہاری رنڈیاں اپنے رات بھر کے خریداروں کے چنگل سے پنڈ اچھڑا کر انہیں رخصت کر رہی تھیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو!"

"کوئٹ انڈیا"

طعن اور نفرت میں ڈوبی آوازیں اس کے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار حسرت سے اپنی عورت کی طرف دیکھا جو وہیں پٹی پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ فلومینا رسوئی کے دروازے میں ٹاٹ کے ٹکڑے پر سو رہی تھی۔ پیٹو اس کی کمر میں منہ گھسائے پڑا تھا۔ کلیجے میں اک ہوک سی اٹھی اور اس کی اصلی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر میلی دریچی میں جذب ہو گیا۔

برطانوی راج کی مٹتی ہوئی نشانی ایرک ولیم جیکسن نے ہندوستان چھوڑ دیا۔

ترازو میں اسے تولا جاتا تو جواب صفر ملتا۔ اس کی جلد کھرچے ہوئے شلغم کی طرح کچی کچی تھی جیسے اسے پوری طرح پکنے سے پہلے ڈال سے توڑ لیا گیا ہو۔ یا ٹھنڈی بے جان اندھیری قبر میں برسوں دفن کرنے کے بعد نکالا ہو۔ اس کے چھدرے میلی چاندی کے رنگ کے بال بالکل بڑھیوں کے بالوں کی طرح لگتے تھے۔ اس لئے سکھو بائی کے درجے کے لوگ اسے بڑھیا سمجھتے تھے۔ یا پھر سورج مکھی جسے ہندوستان میں بڑا قابل رحم سمجھا جاتا تھا۔ جب وہ منہ دھوئے ہوتی تو اس کی پنسل سے بنائی ہوئی بھویں غائب ہوتیں۔ چہرہ ایسا معلوم ہوتا گویا کسی نے تصویر کو سستے ربڑ سے بگاڑ دیا ہو۔

پھر ڈارتھی سرد تھی، اجنبی تھی۔ جیکسن کا وجود اس کے لئے ایک گھناؤنی گالی تھا۔ وہ اپنے کو نہایت بدنصیب اور مظلوم سمجھتی تھی۔ اور شادی کو ناکامیاب بنانے میں وہ حق بجانب تھی۔ خواہ جیکسن کتنے ہی بلند عہدے پر پہنچ جاتا وہ اس پر فخر نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سارے عہدے خود ڈارتھی کے باپ کے دلائے ہوئے ہیں جو کسی بھی احمق کو دلا دئے جاتے تو وہ آسمان کو چھو لیتا۔

اس کے برخلاف سکھو بائی اپنی تھی۔ گرما گرم تھی۔۔۔
اس نے یوں پٹ پر الاؤ کی طرح بھڑک کر ہزاروں کے ہاتھ تاپنے کا سامان مہیا کیا تھا۔ وہ گینت کی رکھیلی تھی جو اسے اپنی پرانی قمیص کی طرح دوستوں کو ادھار دے دیا کرتا تھا۔ اس کے لئے جیکسن صاحب دیوتا تھا۔ شرافت کا اوتار تھا۔ اس کے اور گینت کے پیار کے طریقے میں کتنا فرق تھا۔ گینت تو اسے منہ کا مزا بدلنے کے لئے چبا چبا کر تھوکتا۔ اور صاحب ایک مجبور ضرورت مند کی طرح اسے امرت سمجھتا اس کے پیار میں ایک بچے جیسی لاچاری تھی۔

جب انگریز اپنا ٹاٹ ملانی لے کر چلے گئے تب وہ نہیں گیا۔ ڈارتھی لے اسے بلانے کے سارے جتن کر ڈالے دھمکیاں دیں۔ مگر اس نے استعفیٰ دے دیا اور نہیں گیا۔

"صاحب تمہیں اپنے بچے بھی یاد نہیں آتے؟" میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔

"بہت یاد آتے ہیں۔ فلو شام کو دیر سے آتی ہے اور ٹموٹو لڑکوں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا ہے میں چاہتا ہوں وہ کبھی میرے پاس بھی بیٹھیں۔" وہ اڑن گھائیاں بتانے لگا۔

"ٹموٹو اور فلو میتا نہیں انیتھر اور للذا۔" میں نے بھی ڈھٹائی لادی . . . .

"نہیں۔ نہیں۔" وہ ہنس کر سر ہلانے لگا۔ "پلے طرف کتیا سے مانوس ہوتے ہیں اس کتے کو نہیں پہچانتے جو ان کے وجود میں ساجھے دار ہوتا ہے۔" اس نے اپنی اصلی آنکھ مار کر کہا۔

"یہ جاتا کیوں نہیں یہاں پڑا سڑ رہا ہے۔" یہ میں ہی نہیں آس پاس کے سب ہی لوگوں کو بے چینی سی ہوتی تھی۔

"جاسوس ہے، اسے جان بوجھ کر یہاں رکھا گیا ہے۔ تاکہ یہ ملک میں دوبارہ برطانوی راج کو لانے میں مدد دے۔"

کچھ لوگ یوں بھی سوچتے۔ گلی کے لونڈے جب وہ دکھائی دیتا یہی پوچھتے . . . .

"صاحب ولایت کب جائے گا؟"

"صاحب کوئٹ انڈیا کاہے کو نہیں کرتا؟"

"ہندوستان چھوڑ دو صاحب!"

"انگریزی چھورا چلا گیا۔"

"وہ گورا گورا چلا گیا۔"

"پھر تم کاہے کو نہیں جاتا؟" سڑک پر آوارہ گھومنے والے لونڈے اس کے پیچھے ڈھیری لگاتے آوازیں کستے۔

"ہوں۔ ہوں ہوں۔ جائے گا۔ جائیگا بابا!" وہ سر ہلا کر مسکراتا اور اپنی کھولی میں چلا جاتا۔

تب مجھے اس کے اوپر بڑا ترس آتا۔ کہاں ہیں دنیا کے رکھوالے۔ جو ہر کمزور ملک کو تہذیب سکھاتے پھرتے ہیں۔ ننگوں کو پتلون اور فراکیں پہناتے پھرتے ہیں۔ اپنے سفید خون کی برتری کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ ان کا ہی خون ہے جو جیکسن کے روپ میں کتنا ننگا ہو چکا ہے۔ مگر اسے کوئی شرمی ڈھانکنے نہیں آتا۔

اور جب گلی کے لفنگے تھک ہار کے چلے جاتے تو وہ اپنی کھولی کے سامنے بیٹھ کر بیڑی پیا کرتا۔ اس کی اکلوتی اصلی

قدرت اللہ شہاب

ماں جی

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہو سکا۔

جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لئے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو "بار" کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ برسوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلا نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے، کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہئے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے۔ اور نہر کی کھدائی میں مزدوری کرنے لگے۔

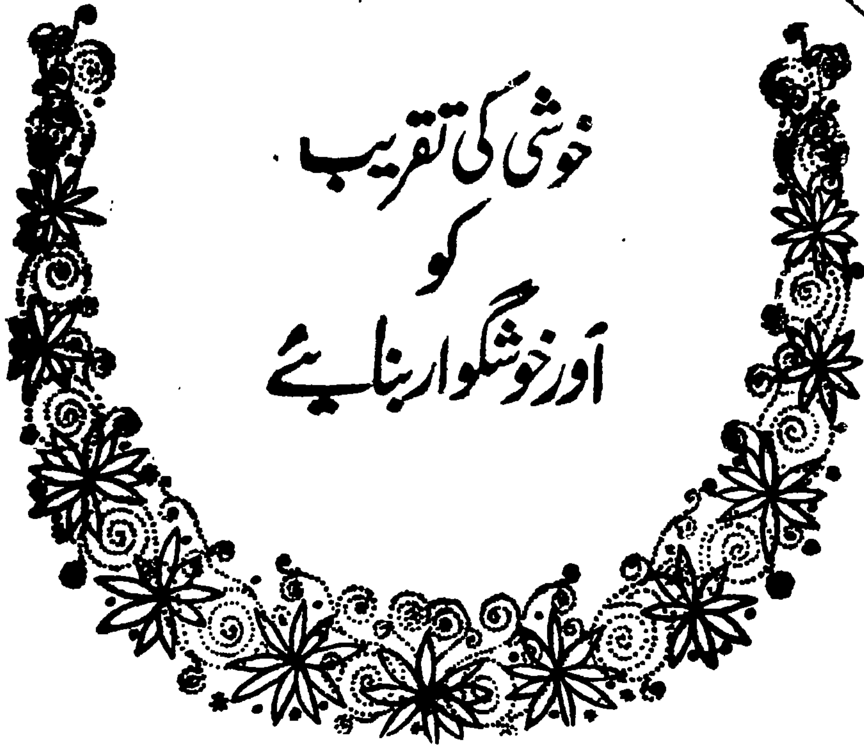
انہی دنوں پتہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آباد کاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائلپور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی، اس لئے پاپیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے۔ یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں۔ یا مکانوں کے فرش یا دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا۔ جگہ جگہ بھٹکتے تھے۔ اور پوچھ پاچھ دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال تھے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی چرخہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں۔ جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے انہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دیئے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ دن بھر میں ایک آدھ روٹی نمک مرچ کی چٹنی کے ساتھ میسر آ جائے تو مزید نقدی کس کام آتی ہے؟ یہ فلسفہ ساری عمر ماں جی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا۔

عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی ان کے پاس گیارہ پیسے پورے ہو جاتے وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو وہ اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا۔ جن کے چراغ



نیک خواہشات بھیجنی ہوں یا مبارک باد کا پیغام — تہنیتی تار (گریٹنگز ٹیلی گرام) سے بھیجئے۔ مبارک باد کے تار باتصویر فارم پر اور دلکش لفافے میں پہنچائے جاتے ہیں۔ مختلف ذاتی اور سماجی تقریبات کے لئے بہت سے موزوں جملوں کی ایک فہرست موجود ہے۔ اس میں سے آپ اپنی پسند کا جملہ بخوبی منتخب کر سکتے ہیں۔ مبارک باد کے عام تار کی کم سے کم فیس ۵۰ نئے پیسے ہے۔ ہر اضافی لفظ کے لئے پانچ نئے پیسے مزید ادا کرنے پڑتے ہیں۔

مبارکباد
گریٹنگز
یا
ڈی لکس تار
سے بھیجئے

ڈی لکس سروس

اگر آپ اپنے تار میں زیادہ اثر اور خلوص پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں تو ڈی لکس سروس سے فائدہ اٹھائیے۔ تار میں آپ جو چاہیں تحریر کریں مگر ہدایات کے خانہ کالم میں لفظ ڈی لکس ضرور لکھئے۔ تب آپ کا پیغام ایک تہنیتی فارم پر پہونچایا جائے گا۔

محکمہ ڈاک و تار

کاشت کی تیاری کر رہے تھے ابھی دونوں محکمۂ مال کا عملہ پڑتال کے لئے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹمنٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انھیں چک سے نکال دیا گیا۔ اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کر لئے۔ عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروا لیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی جس سے ماں جی کے بائیں کان کا زیریں حصہ بری طرح سے پھٹ گیا۔

چک نمبر ۲۹۲ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لئے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آتا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگو لیتیں تاکہ پیاس لگنے پر اپنے چھوٹے بھائیوں کو چساتی جائیں۔

اس طرح چلتے چلتے وہ چک نمبر ۵۰۷ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آباد کار نے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لئے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انھیں اتنا مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھا سکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھا لیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ ایک روز کہیں سے توڑیے اور کلتھے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آگیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھیں۔ ماں جی نے ساگ چولھے پر چڑھایا جب پک کر تیار ہو گیا۔ اور ساگ کو اپلن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا۔ اور سارا ساگ بہہ کر چولھے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولھے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں پر چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آباد کاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربعہ زمین بھی مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور دو تین سال میں ان کا شمار [illegible] کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی تو انھیں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزرنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوبِ چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انھوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس زنانہ ڈبے میں بہت خوش رہتی تھیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستہ کے گرد و غبار کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں ایک دو بار جب انھیں مجبوراً ایئر کنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہو گئیں۔ اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

منیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز و اقارب کو تحائف دیئے۔ دعوتیں ہوئیں۔ اور پھر ماں جی کے لئے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لئے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں نانا جی کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نانی جی انھیں روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لئے ماں جی بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں: "ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا تک دوبھر ہو گیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جا رہی ہے دیکھئے کون سا خوش نصیب اسے بیاہ کر لے جائے گا۔"

"ماں جی، آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا؟" ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

"توبہ توبہ پُت" ماں جی کانوں کو ہاتھ لگاتیں "میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہو سکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دو حرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی

اب بھی تیل سے روشن ہوتے ہیں۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لئے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ بھی جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے۔ ایک جوڑا ربڑ کے چپل۔ ایک عینک ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز۔ ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن۔ دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیئے کے نیچے رکھا رہتا تھا تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لئے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لئے انھیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ لگتے تھے کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انھیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اونی فرد اور گرمیوں میں ململ کے دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہئے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی انھوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیئے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو

کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے آخری اور سب سے لمبے سفر پر روانہ ہوگئیں۔ جس خاموشی سے دنیا میں رہی تھیں اسی خاموشی سے عقبےٰ کو سدھار گئیں۔ غالباً ایسے ہی موقعہ کے لئے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالےٰ ہاتھ پاؤں چلتے چلاتے اٹھالے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے......

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی دھنیئے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں

چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ کہ سب کا بھلا سب کے بعد ہمارا بھی بھلا۔ خاص اپنے بچوں کے لئے انھوں نے براہ راست کچھ نہیں مانگا۔ پہلے دوسروں کے لئے دعا مانگتی تھیں اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انھوں نے اپنی زبان سے کبھی "میرے بیٹے" یا "میری بیٹی" کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ اللہ کو اللہ کا مال کہہ کرتی تھیں۔

کسی سے کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کام کر دیتا تو انھیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں۔ تو انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ انھیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں۔ کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ صورت بزرگ کا تھا۔ جو کہیں سر راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کر رہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائل پور کے علاقے میں پا پیادہ بھٹکتا رہا لیکن کسی راہ گزر پر انھیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آکر انھوں نے چک نمبر ۳۹۲ میں جوان دنوں میں نیا نیا آباد ہو رہا تھا ڈیرے ڈال دئے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آکر آباد ہو رہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر زمین کا ایک قطعہ تلاش کر کے

زندگی کے میلے میں بھی عبداللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انھوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبداللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ۔ وسیع باغ۔ نوکر چاکر۔ دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ جب عبداللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا۔ لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرہ بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدوں پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انھوں دیکھا کہ وہ فراک پہنے ہوئے تھیں۔ اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انھوں نے لیڈی ہیلی سے کہا۔ "تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر ہی گئی ہے۔ اب اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔" یہ کہہ کر انھوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا۔ سینا پرونا، برتن مانجھنا۔ کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچنر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے بھی اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچنر نے اپنی تقریر میں کہا: "مسٹر گورنر جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں۔ براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں۔"

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں و شاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک گوشے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا "اگر لارڈ کچنر فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟"

"میں" ماں جی تنک کر بولیں۔ "میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟"

"میں" عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا: "میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمھیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا۔ جیسے سر سید کے ہاں سے بھاگا تھا۔"

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار۔ صرف ایک بار — ماں جی بھی رشک و حسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات "گورنری" کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہونچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

"بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!"

عبداللہ صاحب علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے۔ رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا "بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے گورنری تو دراصل تمہاری سوکن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے۔"

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاپ سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر آیا۔ ماں جی نے مہارانی کو اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آ گئی: "ہائے ہائے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں۔"

جب یہ مقدمہ مہاراج پرتاپ سنگھ تک پہونچا تو انھوں نے عبداللہ صاحب کو بلا کر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ صاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آ پڑی۔ لیکن معاملے کی تہہ تک پہونچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا۔ کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کا نام

مہربانی ہوگی۔"

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لئے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کر دیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبداللہ صاحب سے ہو گئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انھوں نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کر لیا۔ جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کر کے اور دو دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی کے میٹرکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانہ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرسیّد کے کانوں میں پڑ گئی جو اس وقت علیگڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انھوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا۔ اور عبداللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ صاحب نے خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا۔ ایف اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لکچرر ہو گئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں میں جائیں چنانچہ انھوں نے عبداللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا کہ وہ انگلستان جا کر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کر دیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انھوں نے وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسیّد کو بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔

انھوں نے لاکھ سمجھایا بجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

"کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟" سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

"جی ہاں" عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر سرسید آپے سے باہر ہو گئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انھوں نے عبداللہ صاحب کو لاتوں، مکوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا، اور کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا: "اب تم ایسی جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں"

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے اتنے سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انھیں سب سے دور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ وہ ناک کی سیدھ گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی انہی دنوں عبداللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہو گئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تاکہ عبداللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔

ماں جی کی سہیلیوں نے انھیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لئے۔ عبداللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کئے۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ جب اصرار بہت بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

"اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی؟" عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

"اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈلوا دوں گی۔" ماں جی نے جواب دیا۔

احمد ندیم قاسمی

بھاڑا

میں نے اسے بچپن میں بھی دیکھا تھا۔ مگر بچپن میں تو بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ بہت کم ایسے ہوں گے جن کے اعضا جوانی کی آنچ میں پھیل نہ جائیں یا لٹک نہ پڑیں۔ ملکھاں انہی بہت کم لوگوں میں سے تھی۔ جو دہ پندرہ برس بعد میں اسے دیکھتے ہی محقق بن گیا ہوں...... یہ ملکھاں دراصل ملکاں کا بگاڑ ہے اور ملکاں بہ حقیقت ملکہ ہے۔ اور اگرچہ ملکاؤں میں بعض بڑی بدہیئت شخصیتیں بھی گزری ہیں مگر ملکہ کے ساتھ حسن کا وصف عموماً بڑی شدت سے وابستہ رہا ہے۔ یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ لاکھوں کروڑوں عورتوں میں سے اگر ایک عورت کو منتخب کرنا ہو تو بدذوق سے بدذوق بادشاہ سے بھی حسنِ انتخاب سرزد ہو سکتا ہے۔

ملکھاں فقط حسن کے معاملے میں ملکہ تھی ورنہ دراصل وہ جھیورن تھی۔ میں نے اسے پندرہ برس کے بعد اس وقت دیکھا جب اس کے سر پر پانی سے لدے ہوئے دو گھڑے تھے اور وہ بائیں ہاتھ کو اوپر والے گھڑے کے ابھار پر رکھے اور دائیں ہاتھ کو تلوار کی طرح لہراتی، ایک گلی کی بلندی طے کر رہی تھی۔ مگر اس لمحے میں وہ مجھے اتنی خوبصورت لگی کہ اس کے جسم کے خطوط اور چہرے کے نقوش کی طرف میرا دھیان ہی نہ گیا۔ اب سوچتا ہوں تو بس اتنا یاد آتا ہے کہ اس کے اٹھے ہوئے بازو پر سے سیاہ کرتے کی کھلی آستین اس کے کندھے تک ڈھلک گئی تھی۔ اور اس کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا اور اس کی ناک کی نوک اور ٹھوڑی پر پسینے کے دو بڑے بڑے قطرے ٹپکنے کے لئے بیقرار تھے۔

مگر جب میں نے دو دن بعد اسے تنور کے سامنے بیٹھے دیکھا تو اس کے حسن نے اپنی تفصیل بیان کر دی۔ زمین میں دھنسے ہوئے بہت کھلے دہانے والے بڑے سے تنور کے پاس وہ یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پیچھے دیوار تھی۔ سامنے تپا ہوا تنور تھا اور تنور کے تین طرف کچے سے کھلے چبوترے پر گاؤں کی ایک ڈیڑھ درجن عورتیں صحنکوں میں گندھا ہوا آٹا رکھے، اپنی اپنی باری کی منتظر تھیں۔ ملکھاں نے اپنے سر، چہرے، سینے اور دائیں بازو پر موٹے میلے کپڑے کی چوڑی چوڑی پٹیاں لپیٹ رکھی تھیں تاکہ جب روٹی لگانے کے لئے وہ تنور میں جھکے تو اس کے جسم کے یہ حصے جھلسنے نہ پائیں۔ یوں پٹیوں میں لپٹے ہوئے اس کے چہرے پر اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اور یہی آنکھیں اس کے حسن کی تفصیل تھیں۔

ملکھاں کے بچپنے کے بعد میں نے گذشتہ پندرہ برس میں چند بار اسے ضرور دیکھا ہو گا ورنہ میں اسے پہچانتا کیسے! مگر یہ دیکھنا کچھ اس قسم کا دیکھنا تھا جیسے ایک مسافر چیت کے مہینے میں کھیتوں کی... مینڈوں، سبزہ زاروں کی پھریوں اور پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزر رہا ہو اور دیکھ رہا ہو کہ ہر طرف جنگلی پھول اگ رہے ہیں، اگ نہیں رہے ہیں۔ امنڈ رہے ہیں۔ گلابی اور بسنتی، نیلے اور پیلے...... موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ننھے ننھے ذرا ذرا سے پھول۔ جنہیں دیکھ کر مسافر کو اپنا سفر گلگشت معلوم ہوتا۔ لیکن جو منزل پر پہنچ کر ان پھولوں کی کوئی تفصیل بیان نہ کر سکے۔ میں مسافر ہی تو تھا جو سال دو سال میں اپنے گاؤں کا ایک آدھ چکر لگا لیتا تھا اور ملکھاں ہزاروں جنگلی پھولوں میں سے ایک پھول تھی اور میں ان پھولوں کے بارے میں یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ یہ پھول چار اور

سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگِ آزادی تک گلگت میں یہی گاڑھی اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلا کر خوشخبری سنائی کہ مہاراجہ نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

"اب تم دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پھلو" مہارنی نے کہا "کبھی ہمارے لئے بھی دعا کرنا"

مہاراجہ اور مہارانی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔ ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر صبر و شکر تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیبی کے پردے میں کتنے دکھ کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصے بعد یکے بعد دیگرے فوت ہو گئیں۔ سب سے بڑا بیٹا عین عالم شباب میں انگلستان جا کر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا۔ اللہ نے لے لیا لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوں گی؟

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی پر بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے پھر یکایک وہ سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے "بھاگوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمہیں گیارہ پیسے دئے تھے۔ کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟"

ماں جی نے نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت سے خیال امڈ آئے "ابھی وقت کہاں آیا ہے سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہا اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنائی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لئے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا۔ ہلایا۔ چمکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی "بچہ۔ رونا مت۔ تمہارے ابا جس آرام سے رہے تھے اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہونچے گی"

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا اور نہ ان کو تکلیف پہونچے گی۔ لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں

ایک الھڑ دلہن سمجھا اور جس نے "گورنری" کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں۔ جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔

ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے۔ لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہونچے۔ اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

ہو گئی ۔ فوراً بعد وہ ابھری ، پھیلے ہوئے ہاتھ پر دوسرا پیڑا لیا چٹاخ پٹاخ روٹی بنائی اور پھر سے تنور میں جیسے اتر گئی ۔

ایک بار نیا پیڑا لینے میں اسے ذرا سی دیر لگی تو میں نے دیکھا کہ تنور میں جھکتے ہی وہ تپش سے بچنے کے لئے اپنی آنکھیں بھینچ کر ان پر پلکیں پھیلا دیتی ہے اور جب تنور سے ابھرتی ہے اور بھینچی ہوئی آنکھیں کھولتی ہے تو ایسا لگتا ہو جیسے ان میں آگ بھر لائی ہو ۔

روٹی کو دائیں ہاتھ پر رکھتے ہی وہ گھٹنوں کے بل اٹھتی تھی اور بائیں ہاتھ سے تنور کی منڈیر تھام کر آدھے دھڑ کو تنور کے حوالے کر دیتی ہے میں نہیں جانتا کہ زمین میں دھنسے ہوئے اتنے کھلے اور اتنے گہرے تنور کے اوپر سینچے جا کر روٹیاں لگاتے ہوئے وہ اپنا توازن کیسے قائم رکھتی تھی ۔ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میرا دل بار بار کیوں ڈوبتا اور ملکھاں کے شوہر کو یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی کہ "جا لڑکے ۔ اندر سے لوٹا اٹھا لا اور میاں جی کو جھل ۔ پسینے پسینے ہو رہے ہیں دیکھئے میاں جی ۔ روزی کی بات ہو ورنہ میں تو آپ کی منت کرتا کہ شہر گولی ماریئے ۔ دیکھئے تو آپ کیسے پیلے پیلے بالکل ہلدی سمان رہے ہیں ۔"

لڑکا بیچ بیچ میں پنکھا جھلنے لگا اور ملکھاں بار بار جھکتے ہوئے تنور میں ڈوبتی ابھرتی رہی ۔ ایک عورت سے اس کی تکرار بھی ہو گئی ۔ ہر عورت پیڑے دے چکنے کے بعد گندھے ہوئے آٹے کا بھاڑا ملکھاں کے حوالے کرتی تھی ۔ بھاڑا پانی والی ورود کے پاس رکھی ہوئی بڑی سی ایک صحنک میں جمع ہو رہا تھا ۔ بھاڑا روٹیوں کی تعداد کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا تھا مگر اس عورت نے جو پیڑے دینے کے بعد ملکھاں کو جو بھاڑا دیا وہ اتنا کم تھا کہ دوسری عورتیں بھی حیران رہ گئیں ۔ ملکھاں نے بھاڑا ہاتھ میں لے کر اسے ایک مہر کی طرح انگلیوں کی پوروں میں گھمایا اور بولی "لڑکیاں گڑیوں کے لئے جو روٹیاں پکاتی ہیں ۔ ان کا پیڑا بھی اس بھاڑے سے تو بڑا ہی ہوتا ہو ۔ دیکھو بہن ۔ میرے بچوں کا باپ دن بھر جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر جھاڑ جھنکار کے ڈھیر لاد لاتا ہے ۔ اس سے میں تنور تپاتی ہوں ۔ پھر اپنے آدھے دھڑ کو ہاڑ کی اس گرمی میں ، اس دوزخ میں بار بار جھونکتی ہوں ۔ اس پر بھی اگر مجھے اپنی محنت کا یہ بھاڑا ملے تو بہن ... اس سے تو اچھا یہ ہے کہ تو مجھے بھاڑا نہ دیا کر ، میرے بچوں کے لئے دعا کر دیا کر ۔"

عورت چلا اٹھی " تو کیا میں فقرنی ہوں کہ تجھ سے مفت میں روٹیاں پکواؤں ؟"

ملکھاں نے جواب دیا " فقیر ہم بھی نہیں ہیں بی بی ۔ ہم بھی اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہیں ، بھیک نہیں مانگتے ۔"

عورت نے پھر کوئی جواب دیا ۔ دوسری عورتیں بھی بولنے لگیں ۔ ملکھاں نے بھی کوئی بات کی مگر پھر اس نے پوروں میں تھمے ہوئے آٹے کو بھاڑے والی صحنک میں دے مارا اور نئے پیڑے کے لئے ہاتھ یوں تیزی سے پھیلایا جیسے میان سے تلوار نکالی ہے ۔ خاموشی چھا گئی ۔ صرف ملکھاں کی آنکھیں بولتی رہیں ۔ وہ کنپٹیوں کو چھوتی ہوئی لمبی کالی ، سوچتی ہوئی آنکھیں جو کسی ملکہ کے چہرے پر ہوتیں تو سلطنت کی تقدیر بن جاتیں ۔

تنور کی سب روٹیاں اتر گئیں تو ملکھاں اٹھی ۔ عورتیں چبوترے کے کنارے تک ہٹ گئیں اور ملکھاں کے شوہر نے صحن کے گوشے میں پڑے ہوئے جھاڑ جھنکار کے ایک انبار پر ہاتھ مارا ۔ ایک ڈھیر اٹھا کر تنور میں جھونک دیا ۔ شعلہ ایک دھماکے کے ساتھ بلند ہوا ۔ لکڑیاں جیسے چٹکیاں بجانے لگیں ۔ چنگاریوں کا ایک فوارہ آسمان کی طرف چھوٹا اور تنور پھر سے تپنے لگا ۔

ملکھاں جو دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی ۔ یکایک وہاں سے ہٹی اور اپنے چھوٹے بچے کے پاس آ گئی ۔ میں نے صرف آنکھیں دیکھنے کے لئے اس سے پوچھا ۔ اس کا کیا نام رکھا ہے ؟

" بازا " اس نے میری طرف دیکھ کر کہا اور اس کے ہونٹوں نے جو بتیوں میں چھپے ہوئے تھے ۔ اپنی مسکراہٹ اس کی آنکھوں کے حوالے کر دی ۔ اللہ اکبر ! یہ آنکھیں تو خدا کے وجود کا ثبوت تھیں ۔

میں نے اس سے بڑے بیٹے کا نام پوچھا ۔ پھر یہ پوچھا کہ کیا انھیں پڑھاؤ لکھاؤ گی ؟ پھر یہ کہ تمھارا دیور لائل پور کی

وہ پھول پانچ پتیوں پر مشتمل ہو یا اس پھول کی پتیوں کے کنارے گول اور اس کے دندانے دار ہیں۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک مجھ سے ملکھاں کی آنکھیں کیسے چھپی رہ سکتی تھیں۔ انسان کے جسم کا سب سے بلیغ حصہ اس کی آنکھیں ہیں۔ زبان سے جذبات کا اظہار ادھورا بھی ہو سکتا ہے اور جھوٹا بھی۔ لیکن آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں کسی انسان سے ملتا ہوں تو سب سے پہلے میری آنکھیں اس کی آنکھوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ ان آنکھوں میں کہیں مجھے سمندر نظر آئے ہیں اور کہیں صحرا۔ کہیں ان میں تارے چمکے ہیں اور کہیں چراغ بجھتے ہیں۔ ایسی آنکھیں بھی ہوتی ہیں کہ غور سے نہ دیکھو تو گناہ کا احساس ہونے لگے اور غور سے دیکھو تو ڈوب جاؤ۔

اس کے باوجود پندرہ برس بعد جب میں نے ملکھاں کو گلی کی بلندی طے کرتے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں تک پہنچنے میں خاصی دیر لگی اور جب تک میں اس کی آنکھوں میں جھانکتا وہ "دور بلائیں دور بلائیں" کے خیر مقدمی الفاظ بولتی میرے قریب سے نکل گئی تھی۔ لیکن دو دن بعد جب میں نے اسے تنور کے سامنے حفاظتی پٹیوں میں لپٹا ہوا دیکھا تو جس طرح اس روز اس کا حسن خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا۔ اسی طرح آج اس کا سارا حسن اس کی آنکھوں میں رچ گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو اس کے سارے پیکر سے الگ کر کے دیکھا تو مجھے ان میں دونوں جہاں نظر آ گئے۔ وہی ابہام جو خمار حسن بھی ہے اور خمار آور بھی۔ اور جب اس نے پلکیں جھپکائیں تو جیسے صدیاں گزر گئیں۔

بوڑھی عورتوں جوان لڑکیوں اور کم سن بچیوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ بعض آٹا بھی گوندھ رہی تھیں اور غیر ہموار زمین پر ان کی صحنکیں بج رہی تھیں اور چوڑیاں کنگنوں سے بج رہی تھیں اور بالیاں بالیوں سے بج رہی تھیں۔ اس مدھم منتشر مسلسل موسیقی میں گھرا ہوا تنور دہک رہا تھا اور دہکتے تنور میں روٹی لگائی جائے تو پھیل جاتی ہے یا لٹک کر گر پڑتی ہے۔ اسی لئے آنچ میں کمی کا انتظار ہو رہا تھا اور ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔

"بس اتنی سی دیر لگی کہ بچہ ہوا تو سب بھگیں بھاگاں مر گئی۔ اور جب بھاگاں نے آنکھیں کھولیں تو بچہ مر چکا تھا"

"ہا۔۔۔ بیچاری کا تیسرا تھا"

"تیسرا کیوں بہن؟ چوتھا کہو۔ شادی سے پہلے والا بھی۔۔۔ تو گنو"

"خدا کے لئے ماسی" ملکھاں پہلی بار بولی۔ مگر اس کے ہونٹ بھی پٹیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اس لئے اس کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "خدا سب کے پردے رکھے۔ آہستہ بولو۔ مرد لوگ بیٹھے ہیں"

میں تنور کے چبوترے سے جڑے ہوئے چھپر کے نیچے مرد لوگوں ہی کے پاس بیٹھا تھا۔ ملکھاں کے شوہر نے مجھے اپنے بھائی کا خط پڑھنے کے لئے گلی میں سے بلا لیا تھا اور اگرچہ میں خط کب کا پڑھ چکا تھا مگر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ یہ نوجوان جمعیت یوں مٹیا سے حقے کے کش لگا کر دھوئیں کو اپنی گھنی مونچھوں میں سے گزارتا تھا جیسے تنور کے کنارے اس کی بادر دی بیوی نہیں بیٹھی ہو ایک مشین گوندھا ہوا ڈھیر سا آٹا اٹھا کر اس کے سامنے لا ڈالے گی۔ وہ جب حقے کا دھواں نکالتا تو قریب ہی کھڑا ہوا اس کا بڑا بیٹا دھوئیں میں سے بار بار ہاتھ گزار کر دھوئیں کو کاٹنے کی کوشش کرتا اور کھرّے کھٹولے پر لیٹا ہوا اس کا چھوٹا بچہ زور سے کلکاریاں مارتا۔ مرد لوگ "بس ابھی چار نفوس پر مشتمل تھے۔

ملکھاں نے قریب رکھی ہوئی وردی میں سے چلو بھر پانی لے کر تنور کے چار طرف بار بار چھڑکا تو تنور اژدہے کی طرح بار بار پھنکارا۔ ملکھاں کے قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت نے صحنک میں سے آٹے کا پیڑا اٹھا کر ملکھاں کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور ملکھاں بولی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"۔

پیڑے کو دونوں ہاتھوں میں چٹاخ چٹاخ بجاتے ہوئے ملکھاں نے کہا "ذرا چھوٹا پیڑا بنایا کر بہن۔ بڑے پیڑے کی روٹی موٹی ہوتی ہے۔ کچی رہ جاتی ہے اور پھر تم نام دھرتی ہو" پھیلی ہوئی روٹی کو دائیں ہاتھ پر پھیلا کر ملکھاں گھٹنوں کے بل ذرا سی اٹھی۔ پھر جھکی اور تپے ہوئے تنور میں جیسے غائب

تیل ڈلوا کر نکلی تو ادھر سے میں گزر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولی: "دور بلائیں دور بلائیں" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے لمحے کو ذرا سا طول دینے کے لئے پوچھا: "چراغ میں تیل ڈلوایا ہے؟" جواب میں اس نے "جی" کہا مگر یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھیں جھکا لیں اور میں جیسے تنور میں اتر گیا۔

دوسری بار میں ایک بھونڈا سا بہانہ بنا کر ملکھاں کے ہاں اس وقت جا نکلا۔ جب عورتیں سروں پر چنگیروں سے ڈھکی ہوئی صحنکیں رکھے روٹیاں پکوانے جا رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اس کا شوہر گھر میں نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے اسے چوپال کی گلی میں سے جاتا ہوا دیکھ آیا تھا مگر میں نے آتے ہی اسی کا پوچھا۔ ملکھاں تنور کے سامنے پیڑوں میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی اور تنور کی آنچ میں کمی کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے آنکھیں جھکا لیں اور بولی: "جی وہ روضے شریف پر سے خاک پاک لانے گیا ہے۔ منے کو چٹانے کے لئے۔ کل سے اسے عجیب سی... کھانسی اٹھ رہی ہے۔"

"اچھا" میں نے کہا۔ اس سے زیادہ کہنے کا مقدور ہی نہیں تھا اور اگر میں کچھ کہنے کی ہمت کر بھی لیتا تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا تھا کہ یوں آنکھیں نہ جھکا لیا کرو۔ اس طرح آسمان بالکل سر پہ جھک آتا ہے۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے سوچا کہ کچھ کہنے کا یارا نہیں تو پلٹ کر دیکھ ہی لوں۔ مگر میری یہ حرکت میرے بہانے سے بھی زیادہ بھونڈی ہوتی۔ سو چلا آیا۔ مگر اب یہ مشکل آ پڑی ہے کہ جب بھی ملکھاں کی آنکھوں کو تصور میں لاتا، انھیں جھکا ہوا ہی پاتا۔ میں اپنے آپ سے لڑتا رہا کہ آخر ایسا بھی کیا۔ آخر میں نے اس کی کھلی آنکھوں کو بھی تو دیر تک، اور اتنے قریب سے دیکھا ہے اور ان میں وہ کچھ پایا ہے جو پوری زندگی میں نہیں پایا۔ پھر جب میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو وہ منہ کیوں چھپا جاتی ہیں۔ میں نے طے کیا کہ کل شام اس کے ہاں جا کر بے حیاؤں کی طرح بیٹھ جاؤں گا اور اس سے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں کروں گا۔ اور جب وہ اپنی آنکھوں کی پوری نمائی اور گہرائی سے مجھے ایک بار دیکھ لے گی تو میں فوراً وہاں سے اٹھ آؤں گا تاکہ ان پوری آنکھوں کے تصور سے میرا ذہن ہمیشہ جاگتا رہے۔

دوسرے دن شام سے پہلے مجھے ایک معقول بہانہ بھی سوجھ گیا۔ آخر اس کا بچہ بھی تو بیمار تھا۔ اور جب میں بچے کی مزاج پرسی کروں گا تو اس کی آنکھیں یقیناً جھکنا بھول جائیں گی۔

میں گھر سے نکلا۔ ابھی ملکھاں کے گھر سے کوئی سو گز کے فاصلے پر ہی تھا کہ یکایک بہت سی عورتوں کی چیخیں ایک طوفان کی طرح اٹھیں۔ پھر آس پاس کی گلیوں میں سے لوگ بھاگتے ہوئے آئے اور ملکھاں کے گھر میں گھس گئے۔ پھر مردوں کی اونچی اونچی آوازیں آنے لگیں اور عورتوں کی چیخیں بلند ہوتی چلی گئیں۔

میں بھاگا اور ملکھاں کے گھر میں داخل ہو گیا۔

ملکھاں کے سر، چہرے، سینے اور بازوؤں پر لپٹی ہوئی پٹیوں کو نوچ کر پھینک دیا گیا تھا اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا اور عورتیں ایک نو وارد عورت کو بتا رہی تھیں: "تنور ان سے بھڑا، لے کر اس نے صحنک میں رکھا۔ پھر ایک پیڑے کی روٹی بنا کر تنور میں جھکی تو تنور کی منڈیر پر لوٹ گئی۔ اور وہ سر کے بل تنور کی تہہ میں جا گری۔ مگر ادھر گری۔ ادھر اس کا گھر والا بجلی کی طرح آیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے نکال لیا۔ قدرت خدا کی جو حصہ انگاروں پر گرا اس پر پٹیاں بندھی تھیں اس لئے بچ گئی۔ بس یہ ہوا ہے کہ بیچاری کی آنکھیں جھلس گئی ہیں۔"

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غالب

کس دل میں طلاطم ہے اور تمھارے شوہر کو کچھ بھیجتا ہو یا جو کماتا ہو وہ کھا جاتا ہے؟ ان سوالوں کا مجھے صرف ایک ہی جواب درکار تھا، یہ جواب اس کی آنکھیں تھیں۔

میں نے ان چند لمحوں میں بڑی تفصیل سے اس کی... آنکھوں کا مطالعہ لیا۔ میں "بڑی تفصیل" کی جگہ "جی بھر کر" کے الفاظ بھی استعمال کر سکتا تھا اگر ایسا کرتے میں جھوٹ بھی بولتا اور ان آنکھوں کی ہتک کا بھی مرتکب ہوتا۔ اگر ان آنکھوں کو جی بھر کر دیکھا جا سکتا تو وہ عام آنکھیں ہوتیں مگر وہ عام آنکھیں نہیں تھیں۔

ان آنکھوں کی پتلیاں اتنی سیاہ تھیں کہ اگر رات اتنی سیاہ ہوتی سورج کو طلوع ہونے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی۔ سفید حصہ اتنا سفید تھا کہ ہلکا نیلا ہو رہا تھا۔ ڈوروں کا گلابی رنگ تنور کی آنچ کی وجہ سے سرخی میں بدل گیا تھا۔ ان آنکھوں پہ لمبی لمبی گھنی گھنی پلکوں کی چھاؤنی چھا رہی تھی۔ پلکوں کی یہ توپیں جیسے آنکھوں کے خزانے پر کمانیں تانیں پہرہ دے رہی تھیں۔ وہ پلکوں کو بہت نرمی سے جھپکتی تھی۔ نہایت آہستہ، جیسے اسے نیند آ رہی ہے مگر وہ نیند کو روک رہی ہے۔

میرے سوالوں کی بوچھار کا جواب دیتے ہوئے آخر میں اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور جھکائے رکھیں۔ مجھے اپنے تیز بننے سے دوہری کوفت ہوئی۔ ایک اس لئے کہ وہ کسی حد تک میرا مقصد بھانپ گئی تھی۔ اور دوسرے اس لئے کہ وہ جھکی ہوئی... آنکھیں لے تنور کی طرف پلٹ گئی۔

شعلے بیٹھ گئے تھے اور تنور کی دیواریں دہکنے لگی تھیں ملکھاں تنور کی طرف چل دی تھی اور اس کی جگہ اس کا شوہر میرے پاس آ گیا تھا۔ تنور کے کنارے بیٹھ کر اس نے ماتھے کی پٹی کو بھنوؤں تک کھینچا۔ اور دائیں بازو کی پٹی کی لٹکتی ہوئی دھجی کو وہیں کہیں اڑس کر تنور میں جھانکی اور شوہر سے بولی "حقہ تازہ کر کے میاں جی کو بھی پلا۔ اتنی دیر سے بیٹھے ہیں۔ کیا کہیں گے؟"

چوپال پر آ کر میں نے تنور میں روٹیاں لگانے کے سلسلے میں جھیورنوں کی بے پناہ مشقت کا ذکر چھیڑا تو سب میرے پیچھے پڑ گئے۔ سب کو شکایت تھی کہ جھیورنیں تو مفت کا بھاڑا لیتی ہیں........" اور پھر جو کچھ کماتی ہیں وہ اتنا بہت سا ہوتا ہے کہ پورا کھا بھی نہیں سکتیں۔ بڑے گھروں کی وہ عورتیں جو آٹا گوندھنے کا وقت نہیں نکال سکتیں۔ کہلوا بھیجتی ہیں کہ اتنی روٹیاں پکوا دو۔ یہ روٹیاں اسی بھاڑے سے پکتی ہیں اور بدلے میں مہینے آدھ مہینے بعد جھیورنیں ہر گھر سے من من آدھ آدھ من گندم سمیٹ لے جاتی ہیں۔ پھر بھی آٹا بچ جاتا ہو اور وہ الٹے مٹکوں پر آٹے کی موٹی موٹی ریوڑیوں کی سی سویاں بٹتی ہیں اور انھیں گرا کے بھاڑ بیچتی ہیں۔ آپ شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کیا جانیں کہ یہ جھیورنیں، موچی، لوہار، کمہار ہمیں کس کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں!"

ملکھاں کے دونوں ہاتھ میرے سامنے ابھرے۔ آٹے میں سنے ہوئے ہاتھ جو پیڑے کو روٹی میں بدلنے کے لئے حرکت میں آئے تو جیسے کائنات تخلیق ہونے لگی۔ ملکھاں کا دایاں بازو کندھے تک چیتھڑوں میں لپٹا ہوا تھا اور اسی ہاتھ پر پھیلی ہوئی روٹی تھی۔ بایاں ہاتھ تنور کی منڈیر کو جکڑے ہوئے تھا اور تنور کی دیوار تانبا ہو رہی تھی اور نیچے تہ میں انگارے دہک رہے تھے۔ پھر ملکھاں گھٹنے ٹیکے جھکی اور اس کا آدھا دھڑ تنور میں غرق ہو گیا اور اس کا بیٹا پرے پنکھا جھلنے لگا۔ اور چوپال پر سے آواز آئی کہ جیسی گرمی اب کی سال پڑی ہے ویسی پچھلی ایک صدی سے نہیں پڑی۔ پھر جب ملکھاں اٹھی اور چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے چہرے پر اس کی سہمی ہوئی آنکھیں کھلیں تو جیسے وہ شعلے پی آئی تھیں۔ یہ آنکھیں جنھیں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ سلگ رہی تھیں اور ان کے ڈوروں میں چنگاریاں بھر گئی تھیں اور ان کے پپوٹوں پر کاجل کی بجائے راکھ کے ذرے بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے گوندھے ہوئے آٹے کے ذرا ذرا سے بھاڑ سے کے گولے ناچ رہے تھے۔

لوگ جب گرم گرم روٹیاں کھاتے ہیں تو اگر ملکھاں کے ہاتھوں کو یاد نہیں رکھ سکتے تو اس کی ان آنکھوں کو کیسے بھول جاتے ہیں جو اگر ملکھاں کی بجائے ان کی ماں، بہن، بیوی یا بیٹی کے چہرے پر ہوتیں تو وہ دنیا کے سارے تنکے اپنی آنکھوں میں بھر لیتے تاکہ ان کے پیاروں کی آنکھیں محفوظ رہیں۔

گاؤں میں قیام کے دوران میں ملکھاں کو میں نے اس کے بعد دوبارہ دیکھا۔ ایک بار وہ ٹین کے ٹکڑے سے چراغ میں مٹی...

قرۃ العین حیدر

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار

گہرے رنگ کی طویل لکڑی کی کوچ چیک [illegible] کی بے رونق عمارت کے نیچے منتظر کھڑی تھی۔ سمندر کی ہوائیں کھجور کے پتوں سے ٹکراتی ہیں تو ان سے چھنتی ہوئی سورج کی کرنوں میں اس کی شفاف سطح جھلملا اٹھتی۔ بارک کے خیمے سے نکل کر چند وردی پوش کھٹ کھٹ کرکے سڑک پر آئے اور اچک کر ایک ٹرک میں بیٹھ گئے۔ جیٹی کی سمت سے آتے ہوئے گروہ کو دیکھ کر کوچ کا اکیڑ نما ڈرائیور نکسن رومال سے اپنی باریک مونچھیں صاف کرتا ہوا چاٹ خانے سے لوٹا اور بڑے اہتمام سے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ سڑک کے دوسری طرف ایک اجاڑ سے رہائشی بلاک کی ایک بالکنی میں دروازہ کھلا اور سیاہ فراک میں ملبوس ایک موٹی عورت نے باہر جھانکا اور اخبار کا بڑا سا پرزہ بنا کر نیچے پھینک دیا جو ہوا میں آہستہ آہستہ تیرتا ہوا آکر فٹ پاتھ پر گر پڑا۔

جیٹی کی سیڑھیوں پر سے یہ سارا منظر سلو موشن کی خاموش فلم معلوم ہو رہا تھا۔

الویرا اچھل کر نچلی سیڑھی پر آگئی۔ رشنا ان کے آگے آگے چلتے ہوئے کسی بات پر بچوں کی طرح ہنسی اور اروندھتی اپنا بیگ اور دتی کی انگلی پکڑ کر اوپر چڑھنے لگی۔

شیخ [illegible] ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ کر کوچ کا دروازہ کھولا اور جب وہ سب اندر داخل ہونے لگے تو بار بار خم کرکے اوپر چڑھنے لگی۔

وہ امریکن وضع کے سوٹ میں ملبوس تھا اور آنکھوں پر اس نے بہت پھیلے ہوئے گوگلز لگا کر رکھے تھے۔ اس کا مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا اسسٹنٹ جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور جو اپنی چمکتی ہوئی پھیلی چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے بہت زندہ دل اور خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ سب سے آخر میں تقریباً سجدہ کرتے ہوئے آکر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

الویرا اور رشنا، میں اس سے پچھلی سیٹ پر ٹک گئی تھیں اور اروندھتی اور دتی ان کے برابر دوسری طرف بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر رائے چودھری سب سے پیچھے جا کر اخبار میں مشغول ہو چکے تھے۔ ٹھاکر موہن سنگھ الویرا کے پیچھے براجمان تھے۔ جب کوچ روانہ ہوئی تو انھوں نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا۔ "جب میں [illegible] میں یہاں آیا تھا۔"

ٹھاکر موہن سنگھ بات بات پر سب کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ یہ ان کا دوسرا سفر ہے۔ ایک عاقل اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے سیاح کی حیثیت سے وہ بڑے سرپرستانہ انداز میں اناڑی مسافروں کو اپنے پچھلے بحری سفر کے واقعات سناتے اور مشوروں سے مستفید کرتے۔

الویرا نے اروندھتی کا بیگ جو سیٹ کے نیچے رکھا تھا ہاتھ بڑھا کر اوپر کھینچا۔ اس میں اور دتی کے درکوک اور ونسٹن چرچل کی وہ ضخیم تصنیف جو ڈاکٹر رائے چودھری کل سے پڑھ رہے تھے۔ نیٹنگ کی اون کے ساتھ ٹھنسی ہوئی تھی۔ مایوس ہو کر الویرا نے چاروں طرف دیکھا۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ جھک جھک کر اہرام کا بونگا بناتے ڈرائیور کے شانے کو اس سے کھٹ کھٹا رہا تھا اور ریلیے ایجنٹ سے کچھ کہتا جاتا تھا۔ اس نے ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی جس میں سیاہ پتھر پڑا تھا۔

الویرا نے پیچھے دیکھا۔ مسٹر سنگھ کے برابر بیٹھی ہوئی مسز کم ڈالمیا ایک زنانہ امریکن رسالہ گود میں بچھا کر آرام سے سگریٹ جلا رہی تھی۔ رسالے کے سنٹر اسپریڈ پر ایک سخت رومینٹک والا ہیرو ایک پوڈل کٹ بالوں والی ہیروئن کی آنکھوں میں بڑی لجاجت سے جھانک رہا تھا۔ الویرا پیچھے مڑ کر بیٹھ گئی اور سیٹ کے پشت پر بازو رکھ کر

چاند کے نیچے دیکھا۔ "نیویارک کی ادھیڑ عمر خاتون نے اٹلانٹک سٹی کی ادھیڑ عمر خاتون سے کہا جو انڈین ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کے شائع کردہ "سیاحت کے لیے ہندوستان آئیے" کے رنگین اور چمک دار باتصویر کتابچوں کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔

محل اب پہاڑیوں کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ یک بیک سب خاموش ہو گئے۔ اخباروں اور رسالوں کے اوراق کھڑکھڑاتے رہے۔ دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک گہرا نیلا سمندر عین آنکھوں کے سامنے لگا۔ شفاف ٹھنڈا نیلگوں پانی۔ صحرا کی زرد تپتی ہوئی ریت کے مقابل میں اس کی نیلاہٹ اور زیادہ بھلی اور فرحت بخش معلوم ہوئی۔

"ہم لوگ اتنی دور نکل آئے مگر ابھی تک سمندر کے کنارے کنارے چل رہے ہیں۔" شارمین نے اظہار خیال کیا۔ لمبے ایجنٹ نے ریڈیو آن کرنا شروع کیا۔

"ام کلثوم کے گانے آ رہے ہیں؟" الویرا نے دریافت کیا۔

"آپ ام کلثوم کو بھی جانتی ہیں؟" مونچھوں والے اسسٹنٹ نے اسی مسرت کے ساتھ پوچھا۔ "کل شام انھوں نے قاہرہ سے گایا تھا۔"

سمندر اب بہت قریب آ گیا۔ پھر دفعتاً غائب ہو گیا۔

"ہم لوگ اب تک ساحل کے قریب ہیں؟ قاہرہ کتنی دور ہے؟" الویرا نے ایجنٹ سے دریافت کیا۔

"یہ سمندر نہیں تھا۔ سراب تھا۔" ایجنٹ نے اطمینان سے جواب دیا ——— "اوہ۔ سراب!!" شارمین نے کہا۔

سراب۔ سراب۔ سراب

قاہرہ کے باہر ہیلیوپولس کی شاندار عمارتیں سورج کی روشنی میں نہا رہی تھیں۔ کوچ شاہ فاروق کے بکنگھم پیلس کی نقل میں بنوائے ن کے سامنے سے گزری تو لمبے ایجنٹ نے قہقہہ لگایا۔

"یہ ہمارے بے چارے بادشاہوں کے احساس کمتری کی بہترین مثال ہے۔" نیل کی لہروں پر پاشاؤں کے شکارے ساکت کھڑے تھے۔ نائل ہلٹن کی دیواروں پر قدیم مصری فریسکوز کے چربے بنے ہوئے تھے۔

کاش ہم نے مشرقی لوگ تجدید کے جوش میں اپنے اجدادوں

اور اپنے اہراموں کو اس طرح Commercialize نہ کرتے۔" شارمین نے مسٹر سنگھ سے کہا۔ "اب نٹ راج کے ذکر پر محض بمبئی کے نٹ راج ہوٹل کا خیال آتا ہے۔"

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟" الویرا نے تیوری پر بل ڈال کر اس سے استفسار کیا۔

"میں جب ۱۹۵۸ء میں یہاں آیا تھا۔" ٹھاکر موہن سنگھ نے موقعہ غنیمت جان کر کہنا شروع کیا۔

الویرا کو پھر جیوتسنا یاد آ گئی۔ جب وہ دونوں تین دن تک قاہرہ کے بازاروں میں گھومتی پھری تھیں۔ اوکسفرڈ سے نکلی ہوئی دو معصوم اکیس برس کی لڑکیاں، جن کے سامنے دنیا میں صرف امیدیں تھیں۔ دس سال میں بچے جوان ہو جاتے ہیں۔ جوان۔ ادھیڑ اور ادھیڑ بوڑھے ہو چکے ہیں دس سال، دس سال۔ دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار۔

وہ اسکندریہ گئی تھیں یونیورسٹی جا کر شہزادی دینا حمید سے ملی تھیں جو کیمبرج میں ان کے ساتھ رہ چکی تھی جیوتسنا اہرام کے اندر نہیں گئی تھی۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔ تنگ جگہوں میں مجھے لگتا ہے جیسے مر رہی ہوں۔ میں مرنا بالکل نہیں چاہتی تھی بھئی۔ اس نے کہا تھا۔ آج جیوتسنا کو خودکشی کیے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔

شام کو چائے پینے کے لیے وہ سب ایک قہوہ خانے میں گئے۔ صحن میں دور دور تک کرسیاں اور میزیں لوگوں سے گھری ہوئی تھیں۔ تینوں لڑکیاں اور ڈاکٹر رلٹے چودھری اور ان کی بیوی کونے کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اور مسز ڈاؤ ویٹر کا انتظار کرنے لگے۔

دفعتاً اروان دھتی نے کہا "ادھر دیکھو۔ کیا ہو رہا ہے"

الویرا اور شارمین نے فوراً مڑ کر دیکھا۔

صحن کے شمالی سرے پر ایک بے حد حسین اٹھارہ انیس سالہ لڑکی سبز رنگ کی فراک میں ملبوس سبز ہیٹ لگائے بہت سے مردوں کے ہجوم میں گھری بیٹھی تھی۔ لمبا ایجنٹ بھی وہیں پہنچا تھا اور اس کی کرسی کا طواف کر رہا تھا۔

"کس قدر خوبصورت لڑکی ہے۔" اروان دھتی نے کہا۔

"یہ ماڈل ہے یا ٹیلی ویژن ایکٹرس۔" شارمین نے شرلک ہومز کے انداز میں اطلاع دی۔

"لگتا ہے جیسے ووگ کے صفحوں سے نکل کر آ گئی ہے۔" الویرا

مسز ہامڈنگ کے فراک پر چھپے ہوئے مور گننے لگی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ یقیناً انھوں نے یہ کپڑا کھادی گرام ادیوگ سے خریدا ہے۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ "کیا گن رہی ہو۔" مسز مک ڈانلڈ نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" الویرا نے بڑے تحمل سے مسکرا کر جواب دیا۔

پھر اس نے اچک کر مسز مک ڈانلڈ کی گود میں رکھے ہوئے چمکیلے زنانہ باتصویر امریکن رسالے کی کہانی کو الٹی طرف سے پڑھنا شروع کیا۔ جب میں ایک نوجوان لڑکا تھا تو میری ماں نے مجھ سے کہا تھا ڈکی پیارے۔ تم ساری عمر پرچھائیوں کی تلاش کرو گے جب میں یونیورسٹی پہنچا تو شرلی نے مجھ سے کہا تھا ڈکی ہنی، تم چاند کے تمنائی ہو۔ مجھ سے شرلی نے کہا تھا تم پتنگے ہو اور ستاروں کے خواب دیکھتے ہو۔ لیکن میں سوچتا گیا۔ شاید۔ اس کے بعد۔ اور آگے بڑھ کر کہیں کسی نکڑ پر کسی شہر میں پہنچ کر۔ کسی دروازے سے باہر ہو کر نکل جائے اس وقت تک اپنی آنکھیں انتظار میں بند رکھو۔ اور زیادہ اکتاہٹ کے ساتھ الویرا پھر سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کوچ میں باتوں کی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ چاروں انگریز مشنری خواتین۔ پاکستان کے انجینیر لاہور کی لیڈی ڈاکٹر جو نئی دلہن تھی اور بہت بھڑکیلا شلوار قمیص کا سوٹ پہنے تھی اس کا منحنی سا شوہر "میں چارٹرڈ اکاؤنٹنسی پڑھنے جا رہا ہوں جی۔" ایک روز جب الویرا نے اس سے جرح کی تھی کہ آپ انگلینڈ جا رہے ہیں تو اس نے بے حد نیاز مندی سے سہمے سے لہجے میں جواب دیا تھا مع نو دولہا دلہن دس سال لندن کے رہنے کے ارادے سے مصروف سفر تھے، موٹا خوبصورت انگریز اور اس کی لمبے لمبے دانتوں والی سیاہ فام مدراسی بیوی، کوچ کے آخری سرے پر۔ نک سا رست مانوس سر کھڑکی سے نکالے باہر دیکھ رہے تھے۔ بمبئی سے آئی ہوئی نرگس کی ہم شکل بوہرہ بچی نے جو ہمیشہ بے حد اسمارٹ فراک یا جینز پہنتی تھی اونچے سروں میں۔

Hand down your head
Tom dooley

گانا شروع کر دیا تھا۔

کوچ اب اسوان کے شہر سے نکل کر ریگستان میں داخل ہو چکی تھی افق کے کنارے دو پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں جن میں سے ایک کی شکل ایک ممی کی ایسی تھی۔ جس کا پروفائیل آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور جس کے پاؤں جنوب کی سمت پھیلے تھے۔ دفعتاً ایجنٹ کی آواز نے الویرا کو چونکا دیا۔

"آپ لوگ جب دس سال بعد یہاں آئیں گے اس وقت تک انشاء اللہ ہمارا اسوان ڈیم تیار ہو چکا ہو گا اور قاہرہ تک یہ اسی میل کا صحرا دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں شامل ہو جائے گا۔"

"انشاء اللہ" الویرا نے بے ساختہ دہرایا۔

"ہمارے ایک بادشاہ نے جو ہمارے سب بادشاہوں سے زیادہ بے ہودہ تھا پچھلی صدی میں یہ محل بنوایا تھا" ایجنٹ نے جو مسافروں کی طرف رخ کیے ہاتھ میں مائیکروفون لیے بیٹھا تھا۔ باہر اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ خشک بے رنگ پہاڑیوں کے دامن میں بنی ہوئی ایک بھدی سی عمارت دھوپ میں بری طرح چمک رہی تھی۔ "ہمارے اس نامعقول بادشاہ نے ایک کسان لڑکی کو یہاں بھیڑیں چراتے دیکھا اور فوراً اس پر عاشق ہو گیا۔ اس کے لیے لاکھوں پونڈ کی مالیت کا یہ محل بنوایا گیا جبکہ ہمارے غلامین ریگستان کی بھوک میں مرا کیے۔ اور ریتیلی زہر آلود ہوائیں ان کو اندھا کرتی رہیں۔"

"طٰہٰ حسین۔" الویرا کی زبان سے نکلا۔

پگڑیوں والے نے مڑ کر خوشی سے دیکھا۔ "آپ طٰہٰ حسین کو جانتی ہیں مادموزیل؟"

"ان کے مضمون پڑھے ہیں۔" اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

"پھر وہ حسین چرواہی ملکہ بن کر اس کے محل میں رہا کی۔" ایجنٹ کہتا رہا۔

نوری اور جام تماچی۔ فرح دیبا اور شاہ ایران۔ مارگریٹ اور ٹونی۔

شہزادی اور فوٹوگرافر کا سنسنی خیز رومان۔ رائل گورلس کی لکھی ہوئی دوسری قسط اس شمارے میں پڑھیے۔ "مسز مک ڈانلڈ نے رسالے کا دوسرا ورق الٹا۔

نرگس کی ہم شکل لڑکی نے پچھلے مہینے کا فلم فیئر لیڈی ڈاکٹر دلہن کے حوالے کیا جو بڑے شدید اشتیاق سے اس کی تصاویر دیکھنے لگی۔ نرگس۔ سنیل دت۔ مدھوبالا۔ اور کشور کمار۔ دلیپ کمار اور وجینتی مالا۔

اور جیٹ کے رومان۔ آہ افسانوی مشرق۔ اور پراسرار ہندوستان۔

میں اتنی خوش نصیب ہوں کہ میں نے تاج محل جے پور۔

"ہاں۔" اس نے چونک کر جواب دیا۔ "خوب! بہت خوب! یہاں 'کرنہ' نہیں کہا جاتا۔ سیدھی سیدھی بات کہتے ہیں اہل مصر کی یہ راست گوئی قابل تعریف ہے۔" پھر وہ دکان کے شیشے سے ہٹ آئی۔

"اسپیڈ کو۔" ڈاکٹر رلٹ چودھری قریب آکر پائپ منھ سے نکالتے ہوئے مختصراً بولے "ہمیشہ اسپیڈ ہی کہنا چاہیے۔"

اب سورج ڈھل رہا تھا۔ اہرام کے چاروں طرف حدِ نظر تک خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ متوسط طبقے کی شہری سائیکلوں اسکوٹروں اور موٹروں پر لد کر ہوا خوری کے لیے آئے ہوئے تھے۔ چیختے چلاتے گنگناتے منزور شہر کے کنارے پر سارے اہرام صبر کے ساتھ چپ چاپ کھڑے تھے اور شہر کی اونچی اونچی جدید عمارتوں کے بعد کمبخت چھوٹے چھوٹے کھلونے ایسے معلوم ہو رہے تھے۔ یہ بے چاری تلونی عمارتیں سیاحوں کا لایا ہوا زرمبادلہ متحدہ عرب جمہوریہ کے خزانے میں بھرنے کے علاوہ قاہرہ کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے مقبول ترین راں دے وو[1] کا فرض بھی انجام دیتی تھیں۔ ان کے علاوہ ان گنت ٹیڈی بوائز اور ٹیڈی گرلز تنگ موری کی پتلون پہنے اور برجی باردو کی طرح بال رکھائے اہرام کی ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے اس کی چوٹی کی طرف جا رہے تھے۔ یا اوپر سے اتر رہے تھے۔

"میں آپ کو اندر جانے کی رائے نہ دوں گا۔ اندر بے حد گھٹن ہے اور اوپر تک چڑھنا بڑی ہمت کا کام ہے۔"

"واہ ہم تو ضرور جائیں گے۔" شارمین نے کہا۔

جیوتسنا زیم۔

اہرام کے دروازے پر ایک خشمناک طویل القامت عبا پوش گائیڈ نے انھیں آلیا۔ گڈ ایوننگ میڈم۔ ای جپٹ لائیک انڈیا۔ ویری اولڈ کنٹری۔ ویری اینشنٹ سولائزیشن کم آن اِن میڈم۔ کم آن اِن۔"[2]

مسز مک ڈانلڈ اور دونوں امریکن خواتین بے حد اشتیاق گائیڈ کے قریب آگئیں۔ اندر نیم تاریک ڈیوڑھیوں میں ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ غلام گردش میں کچھ دور جا کر شارمین نے گھبرا کے کہا۔ "میرا تو دم گھٹ جائے گا۔ تنگ جگہوں میں لگتا ہے جیسے مر رہی ہوں۔ میں تو مرنا نہیں چاہتی۔ لاحول ولا قوۃ۔" اور وہ الٹے پاؤں باہر بھاگ گئیں۔ "ٹھہرو ہم بھی آتے ہیں۔" الویرا نے کہا مگر ہجوم نے پیچھے سے دھکا دے کر اسے آگے بڑھا دیا۔ اس نے بادل ناخواستہ زینہ چڑھنا شروع کیا۔ پتلی پتلی آہنی سیڑھیاں جو ایک سرنگ کی طرح اہرام کی چوٹی کی طرف جاتی تھیں ان کے دونوں جانب لوہے کی ریلنگ تھی۔ نیچے سنگلاخ فرشوں اور چکنی مرمری سنگلاخ دیواروں والے منزل در منزل اور تہ در تہ تاریک اور نیم تاریک کمرے تھے اور تینوں طرف سے دیواریں اس طرح جھکی آ رہی تھیں۔ جیسے ابھی دم گھونٹ دیں گی۔ دیواروں میں برقی روشنی کے ٹیوب لگے تھے ان دیکھے موکھوں میں سے ہوا کی ذرا سی رمق اندر آ جاتی تھی۔ چاروں ہاتھوں پیروں پر جھکے۔ تاکہ سر چھت سے نہ ٹکرائے، لوگ ہانپتے کانپتے اوپر چڑھ رہے تھے۔ مگر زینہ ختم ہوتے ہی نہ آتا تھا۔ آگے اور پیچھے ایک خلقت بھیڑ وہاں اوپر جانے کے لیے کوشاں تھی۔ یا نیچے اتر رہی تھی۔ الویرا اگر جنگلے سے ذرا کی ذرا رک کر سانس لینے کی کوشش کرتی تو ریلا اسے دھکا دے کر پھر آگے بڑھا دیتا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ایک شدید وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہے جس طرح کا خواب اس نے سوتے میں اکثر دیکھا تھا کہ ایک اندھا کنواں ہے جس میں گرتی جا رہی ہے یا قبر میں زندہ دفن کر دی گئی ہے۔

آدھی چڑھائی چڑھ کر اسے بے حد کمزوری محسوس ہوئی اور اس کی ہمت بالکل ٹوٹ گئی۔ اس نے واپس جانا چاہا لیکن انگریز مشنری خواتین جو بڑے جوش و خروش سے اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں اس سے کہتی رہیں "بڑھی چلو۔ جب آدھی دور آگئی تو واپس جانا کیسا۔" الویرا نے پھر لشتم پشتم اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔

بالآخر وہ اوپر "کنگز چیمبر" تک پہونچ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر دلہن دونوں انجینیر لڑکے گائیڈ سمیت وہاں پہلے سے پہونچ چکے تھے۔ اس سنگی مرمری دیواروں والے چھوٹے سے کمرے میں جو بڑے صندوق کی طرح چاروں طرف سے بند تھا۔ ایک طرف پتھر کا خالی تابوت رکھا تھا۔ کمرے میں ناقابل برداشت حبس تھا۔ گائیڈ نے اپنی

Egypt like India very old country, very old civilization — come on in madame, come on in.

RENDEVOUS 1

نے کہا۔

تینوں لڑکیاں حیرت اور دلچسپی سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ بڑی تمکنت کے ساتھ گویا تخت پر بیٹھی تھی اور اس کے عشاق کما کے سامنے درباریوں کی طرح کھڑے تھے لمبے ایجنٹ سمیت کئی ایک نے جھک جھک کر اسے پیار کیا۔

"ڈل الیٹ میں بے ہودگی کی انتہا ہے۔ واقعی" شارمین نے کہا۔ ڈاکٹر رائے چودھری کی موجودگی کی وجہ سے جھینپتے ہوئے اس نے نظریں دوسری طرف کر لیں اور جلدی سے چائے بنانے لگی۔ سن رسیدہ اور خاموش طبیعت ڈاکٹر رائے چودھری جو اپنی نوجوان بیوی کی سہیلیوں سے بہت کم بات کرتے تھے۔ شفقت سے مسکرائے "میں اس خوش گوار نتیجہ پر پہونچا ہوں" انھوں نے کہا۔ کہ ہندوستانی عورت کتنی ہی جدید اور آزاد خیال نہ بن جائیں۔ اصلیت میں رہیں گی۔ وہی ہندوستانی عورت !!۔"

کافی دیر بعد ایجنٹ ان کی طرف آیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔ اور ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی جس کا آدھا تنا بار روم میں شامل تھا۔ بار پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکرائے۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔ ایک درشت چہرے والی عورت جس نے بے تحاشا نقلی زیور پہنا ہوا تھا۔ تیز تیز قدم رکھتی پاؤڈر روم سے نکلی، ساری میں ملبوس لڑکیوں کو غور سے دیکھا اور کھٹ کھٹ کرتی پہلو کی اندھیری گلی میں اتر گئی۔

باہر چوڑی سڑک بالکل سنسان تھی وہ تینوں کوچ میں جا کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئیں۔

اس وقت انھوں نے پہلی مرتبہ اس سرخ بالوں والی عورت کو دیکھا۔

وہ سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی جہاں مونچھوں والا اسسٹنٹ بیٹھا تھا۔ اس نے کتھئی رنگ کے بہت معمولی کپڑے کا کوٹ اور اسکرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ لڑکیوں کو دیکھ کر ایک دفعہ مسکرائی۔ اس نے پپوٹوں پر گہرا سبز رنگ اور پلکوں پر سیاہ روغن لگایا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں بہت بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے سراپا میں سب سے زیادہ ممتاز چیز اس کے بال تھے۔ آگ کی طرح دہکتے ہوئے سرخ بال۔ اس کی عمر پینتیس سے چالیس سال رہی ہوگی۔ ممکن ہے اس سے کم رہی ہو۔ مگر جس قسم کی زندگی وہ بتا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ زیادہ عمر رسیدہ معلوم ہو رہی تھی اور اس کے خاصے حسین چہرے پر عجیب طرح کی سختی آگئی تھی نوجوانی میں یہ عورت بھی سبز فراک والی ماڈل کی مانند بے انتہا دلکش رہی ہوگی۔

اب سبز فراک والی لڑکی بھی اندر آگئی اور لمبے ایجنٹ کے پاس بیٹھ گئی۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ سرخ بالوں والی کے پاس آن بیٹھا۔ کوچ روانہ ہوئی۔ سرخ بالوں والی عورت نے تیز تیز لہجے میں مونچھوں والے سے عربی میں کچھ کہنا شروع کیا۔ مونچھوں والا ہنس ہنس کے جواب دیتا رہا ———— پھر اس نے مڑ کر الویرا اور شارمین سے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے۔" اس پر عورت اور زیادہ خفا ہوئی اور اس نے مزید عربی بولی۔ الویرا اور شارمین جھینپ گئیں۔

ڈاؤن ٹاؤن قاہرہ میں پہونچ کر وہ سب ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور کے سامنے اتر گئے۔ اردن، دمشق خریداری کرتی پھری۔ الویرا اور شارمین پیدل چلتے چلتے نڈھال ہو گئیں۔ سب لوگ تتر بتر ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد لمبا ایجنٹ باقی لوگوں کی قیادت کرتا ہوا دوسری فٹ پاتھ پر سے آتا نظر آیا۔ ایک ایونیو پر وہ ان تینوں سے آن ملا۔ سبز فراک والی حسین لڑکی اس کے ہمراہ تھی۔

"یہ کون خاتون ہیں ؟" آخر شارمین سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

"اوہ —— یہ ؟ —— یہ میری بیوی ہے ——" لمبے ایجنٹ نے حسب معمول اطمینان سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

الویرا گرد و پیش کی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے ان سارے مناظر، ان سارے چہروں کا عکس ذہن میں محفوظ کر لینا چاہتی ہو۔ شارمین نے اسے مخاطب کیا مگر وہ ایک دکان کے سامنے ٹھٹھک کر ونڈو شاپنگ میں محو تھی۔

"ارے بھئی اب آگے بڑھ چکو۔ تم تو قدم قدم پر اس طرح ٹھٹک جاتی ہو جیسے یہ چیزیں کبھی دوبارہ دیکھو گی نہیں۔" شارمین نے جھنجلا کر کہا۔

"کیا معلوم —— یہاں پھر کبھی نہ آنا ہو۔" الویرا نے بے خیالی سے جواب دیا اور دکان کے شیشے سے ناک چپکائے اندر رکھی ہوئی سینڈلز کو تکتی رہی۔

"تم نے ایجنٹ کی بات سنی ؟" شارمین نے پوچھا۔

کیا میں نے تیری پہیلی بوجھ لی ہے ابو الہول اسفنکس۔؟

"بڑے میاں"

"دیوتاؤں ۔۔!!"

"بھاگو نہیں بڑے میاں۔"

"بڑے میاں! میں ٹولیسے سیزر ہوں۔"

"بڑے میاں۔"

"اسفنکس! تم اپنی صدیوں کی عمر چھپاتی ہو۔ میں تم سے کہیں چھوٹا ہوں۔ مگر تمہاری آواز لڑکیوں کی ایسی ہے۔"

"جلدی سے اوپر آ جاؤ۔ ورنہ رومن تمہیں کھا جائیں گے۔"

"تم کون ہو؟"

"کلیو۔۔۔"

"ہلو ۔۔۔" کسی نے پیچھے سے آ کر بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چونک کر پلٹی۔

"اوہ۔۔ مادموزیل۔ مجھے معاف کر دیجیے۔" ایک دل کش سنجیدہ چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والا مصری نوجوان بے حد گھبرا کر کہہ رہا تھا "میں۔ میں آپ کو اپنی ایک شناسا خاتون سمجھا۔ للّٰہ ۔۔ براہ کرم میری اس غلط فہمی کو در گزر کیجیے۔"

"کوئی بات نہیں ۔۔" الویرا نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔

"لیکن ڈر ضرور گئی۔" اس بے چارے کی ندامت کم کرنے کے لیے اس نے گفتگو جاری رکھی۔ کیونکہ وہ ابھی اس "بد تمیزی" کی وجہ سے بری طرح گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "میں سمجھی کہ توت عنخ آمون کی روح نے مجھے آ دبوچا۔ کیونکہ ابھی ابھی اہرام سے باہر نکل کر میں نے موصوف کی شان میں بہت گستاخی کی تھی۔ اور پتہ نہیں وہ توت عنخ آمون تھے یا کوئی اور۔"

وہ آہستہ سے مسکرایا۔ "ماضی میں سب کے نام ایک سے ہوتے ہیں ہے نا ۔۔؟" اس نے پوچھا۔ اور بڑی عجیب بات تھی کہ اس کے لہجے میں کسی پرانے دوست کی سی اپنائیت تھی۔ دنیا کے سارے اجنبی مخلص دوست ہیں محض اگر ہم انہیں جان سکیں وہ سوچ رہی تھی۔ "جی ہاں۔" اس نے با آواز بلند جواب دیا۔ "مثال کے طور پر الفرڈ ہی کو لیجیے۔"

وہ پھر مسکرایا گویا الویرا کا مطلب سمجھتا ہو۔

"اور جب انسان مر جاتا ہے تو وہ اور آج سے پانچ ہزار قبل مرے ہوئے لوگ ایک ہو جاتے ہیں۔ ہم جب زندہ ہوتے ہیں محض اس وقت تک ہی نئے اور مختلف اور جدید رہتے ہیں۔ بہت خوفناک خیال ہے۔" یہ الویرا نے بلند آواز میں اظہار خیال کیا۔

اس شخص نے اپنا تعارف کرانے کی اجازت چاہی۔ یوسف مراد جو کہ قاہرہ کی ایک یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتا ہے۔ اس کے بعد اگلے چند منٹوں تک انھوں نے پنڈت نہرو، کمال عبد الناصر اور تازہ ترین بین الاقوامی صورت حال پر تبادلہ خیالات کیا۔ شاید وہ قبطی عیسائی تھا۔ اور بہت اینگلو فائل قسم کا اور جوشیلا عرب نیشنلسٹ معلوم ہوتا ہے۔

"غالباً آپ کے ساتھی آپ کے متلاشی ہیں او موزیل۔" سڑک کی دوسری طرف بڑھتے ہوئے اس نے الویرا سے کہا۔ اور دو دلکش اور شادین دور سے آج سے ان کی طرف آ رہی تھیں۔

"جی ہاں۔ ہم لوگ انگلستان تک اکٹھے سفر کر رہے ہیں۔ یہ دونوں نوجوان خواتین میرے ساتھ آکسفورڈ میں پڑھتی تھیں۔ ان میں سے ایک اب لندن میں رہتی ہیں اور دوسری اپنے شوہر کے ساتھ جنوبی امریکا میں مقیم ہیں۔"

"جنوبی امریکہ ۔؟ وہ تو بہت ہی دور ہے ۔؟"

"جی ہاں۔ بہت ہی دور ہے۔ واقعی ۔! مسز رلسٹ پودھریا جارج ٹاؤن میں رہتی ہیں۔ برٹش گیانا۔"

"اور آپ ۔ مادموزیل ۔؟"

بھلا وہ اس بے چارے کو کیا بتاتی کہ وہ اپنی موت کی طرف گامزن ہے۔ اس کے کسی ہم سفر کو اس لرزہ خیز حقیقت کا علم نہیں۔ خدا وندا۔ کیا دنیا میں کوئی چیز انسانی زندگی سے زیادہ مہمل ہے؟ کیا یہ خلیق سنجیدہ مصری پروفیسر سوچ سکتا ہے کہ اس وقت وہ جس خوش شکل نوجوان متبسم لڑکی سے باتیں کر رہا ہے وہ خون کے ایک تقریباً لا علاج مرض میں مبتلا ہے اور جانتی ہے کہ شاید سال بھر کے اندر ختم ہو جائے گی۔ اور گو یہ صحیح ہے کہ زندگی اور موت دونوں مہمل ہیں مگر وہ جب تک زندہ ہے زندہ انسان کی طرح ہنستے کھیلتے زندگی گزارے گی۔ اور آخری سانس تک اپنی قسمت سے نبرد آزما رہے گی۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں اسپین جا رہی ہوں۔"

داستان شروع کی۔ مگر انویرلعد سے زیادہ دہشت زدہ ہو کر الٹے پاؤں واپس بھاگی۔

دیوار اور سیر ھیوں کے درمیان جو پتلی سی جگہ تھی اس کے کونوں کھدروں میں نوجوان مصری جوڑے اطمینان سے ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے گویا یہ لرزہ خیز دم گھوٹنے والا اہرام نہیں تھا لندن انڈر گراؤنڈ کی برقی سیڑھیاں تھیں۔ افتاں و خیزاں غلام گردش تک پہنچ کر انویرا باہر نکلی۔

باہر دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ نیلا آسمان۔ پرندے۔ ہرے بھرے درخت ہوا۔ تازہ ہوا۔ خداوندا۔ ہوا کتنی بڑی نعمت ہے۔

آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔" اس نے منڈیر پر کھڑے ہوئے ڈاکٹر راۓ چودھری کا بازو پکڑ کر غصے سے کہنا شروع کیا۔ "کہ میں پانچ ہزار برس کی تاریکی اور دہشت اور گہرائی اور بُعد اور تنہائی کا سفر طے کر کے آ رہی ہوں۔ اور اہرام مصر انتہائی عظیم الشان فراڈ ہیں۔"

"مگر کیا انجینئرنگ کا کمال ہے صاحب۔ کہ عقل گم ہو جاتی ہے۔" دوسری طرف مسٹر موہن سنگھ چھڑی ٹیکے دوستوں کے مجمع سے مخاطب تھے۔ "جیسے ہمارے یہاں کے ستوپ۔ میں جب سانچی گیا..."

دھوپ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ سیّاحین اور دن ڈھلتے مجمع میں غائب تھیں۔ ڈاکٹر راۓ چودھری پائپ سلگا کر خاموشی سے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹیلا اتر کر سڑک پر آئی جس کی دوسری جانب گلزرنگ آسمان کے مقابل میں یک لخت ابوالہول نظر آ گیا وہ شفق کی روشنی میں اور زیادہ پراسرار اور پُرسکون اور عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی شکستہ مسکراہٹ میں نرمی تھی اور دردمندی اور جھنجھلاہٹ بھی۔ ہزاروں برس سے وہ دنیا کا اسی طرح نظارہ کر رہا تھا یا تھی۔ ویسٹ اینڈ کے نائٹ کلب (پیلیس) کی مانند۔

I, Tiresias,
Perceived the scene and
foretoled the rest. I too awaite
_d the expected guest.
And I tiresias have fore
_suffered all.

آس پاس چھوٹے اہراموں کے چاروں طرف شہر کے اعلیٰ طبقے کے لڑکے اور لڑکیاں شہسواری کے لیے آئے ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ سورج ابوالہول کے پیچھے ریت میں ڈوب گیا (اس کے پنجوں کے درمیان لالے کے پھولوں کے ڈھیر پر چھوٹی سی کلوپیٹرا لیٹی ہوئی ہے۔ چاندنی رات (سینوا بند کلوپیٹرا۔ برنارڈشا) اور پھر جنوب کی سمت سے ایک انسان دبے پاؤں آیا۔ اور اسفنکس کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔

لبیک اسفنکس۔ جولیس سیزر کا سلام قبول کر۔

اس دنیا میں پیدا ہونے کی وجہ سے جن دنیاؤں سے مجھے جلاوطن ہونا پڑا ان کی، اور ایسے انسانوں کی تلاش میں، جیسا میں خود ہوں۔ میں ملکوں ملکوں گھوما ہوں۔ مجھے ریوڑ اور چراگاہیں آدمی اور شہر دکھائی دیے، لیکن کوئی دوسرا سیزر نہ ملا۔ کوئی انسان اپنا جیسا میسر نہ ہوا جو دن کو سیزر کے کارنامے انجام دیتا اور رات کو سیزر جیسے خواب دیکھتا۔ سامنے کی چھوٹی سی دنیا میں اے اسفنکس میرا مرتبہ اتنا ہی بلند ہے جتنا تیرا اس صحرا میں ہے۔ نقطہ میں مارا مارا پھرتا ہوں تو ایک جگہ بیٹھی ہے۔ میں فتح کرتا ہوں۔ تو برداشت کرتی ہے میں عمل کرتا ہوں اور متحیر رہتا ہوں۔ تو دیکھتی ہے اور منتظر ہے۔ میں اوپر نگاہ اٹھاتا ہوں اور میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ نیچے نظر کرتا ہوں اور اندھیرے میں ڈوب جاتا ہوں۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں اور ششدر ہوتا ہوں جبکہ تو مسلسل سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھی ہے۔ دنیا سے باہر کھوئی ہوئی دنیاؤں کی طرف اس گہوارے کی سمت جہاں سے نکل کر ہم بھٹک گئے۔ اسفنکس تم اور میں نسلِ انسانی کے لیے اجنبی ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں۔ کیا مجھے ساری عمر تمہارے وجود کا احساس نہیں رہا؟ روما ایک دیوانے کا خواب ہے یہ میری حقیقت ہے۔ یہ ستاروں کے ایسے تمہارے چراغ میں نے گال میں، برطانیہ میں، ہسپانیہ میں، تھسلی میں، ہر جگہ دیکھے ہیں۔ یہ چراغ جو تحت الثریٰ میں چھپے ہوئے کسی ابدی نگہبان کو اہم رازوں سے باخبر کر رہے ہیں۔ اس ابدی نگہبان کا مقام میں کبھی نہ پا سکا۔ وہ ہا آخر یہاں موجود ہے۔ میری زندگی کے مستقل اور زندہ جاوید حصے کا پرتو — خاموش، سوچتا ہوا، نقرئی صحرا میں تنہا۔ اسفنکس میرا یہاں آنا قسمت میں لکھا تھا۔ کیونکہ میں وہ ہوں جس کی جینیس کی تو علامت ہے۔ جو بیک وقت جوان بھی ہے۔ عورت بھی اور خدا بھی

کتاب، افسانہ نمبر

میرے وطن آئیے۔"

"ضرور۔ ضرور۔" یوروپین نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔
ذوالفقار کے زینے پر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ان کے یہاں شام کی دعوت کا انتظام ہو رہا ہے۔ حمیدہ باہر آئی اور چیخ مار کر الویرا سے لپٹ گئی۔

"ہمارا ارادہ تھا کہ تمہارے یہاں بیٹھ کر ذرا سستائیں گے مگر۔ مگر یہاں بھی ہنگامہ بپا ہے۔" الویرا نے کہا۔

"ہمیں آئے دن یا ڈنر دینا پڑتا ہے یا ڈنر کھانا پڑتا ہے۔ اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ اتنی اسنوب نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کیا پئیں گے۔؟" حمیدہ نے اپنی سفارتی مسکراہٹ ... آئے ہوئے ڈاکٹر رائے چودھری کی طرف مڑ کر دریافت کیا۔

"کیا خوفناک زندگی ہے تمہاری۔" الویرا نے صوفے پر گر کر اظہار خیال کیا۔

کچھ دیر بعد مہمان آنے شروع ہوگئے۔ کھانا شروع ہوا۔
"گیارہ بجے۔" پلیٹ اٹھاتے ہوئے شارتین نے بڑی معروف سوسائٹی لیڈیز کی سی شکل بنا کر حمیدہ سے کہا۔ "ہمیں شپرڈز پہنچنا ہے۔" ذوالفقار لڑکیوں کی طرف آیا۔

"کس واسطے کہ اس وقت ہمیں لمبا ایجنٹ ملے گا۔ شپرڈز ہوٹل کے لاؤنج میں اس سے ہمارا اپوائنٹمنٹ ہے۔" الویرا نے بھی ذرے پراسرار انداز میں کہا۔

"ہم لوگ ایک نہایت بیہودہ نائٹ کلب جا رہے ہیں۔" اروتی نے بڑی خوشی سے اطلاع دی۔

"کیا چبلاپن ہے۔" ذوالفقار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "رات کو ہمیں آرام سے سوؤ۔ صبح سویرے تمہیں سوئیز پہنچا دیں گے اور جہاز چھوٹ گیا تو اور بھی اچھا ہے پورٹ سعید سے سوار کرا دیں گے۔"

اتنے میں منقش سلائیڈنگ ڈور کا پٹ ایک طرف کو کھسکا اور۔۔ سلمان ۔۔ اندر داخل ہوا۔

ارے۔۔ الویرا متحیر رہ گئی۔ مضطرب۔ متحیر۔ خوف زدہ۔
یہ کیا ہوگا۔
کچھ نہیں ہوگا۔ اصل زندگی مہمل ہے۔ لایعنی۔ اور کس طرح وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور ہوتا رہے گا۔ اگر تم زندہ بھی رہ گئیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

"الویرا۔ شارتین۔ اروتی۔ دیکھو کون آیا ہے۔" حمیدہ نے اناؤنس کیا۔

وہ تینوں کے سامنے باری باری جھکا۔ تھوڑا سا تھیٹریکل تھوڑا سا شولرسا۔

"ان کو پہچانے۔۔؟ یہ جیوتسنا مرحوم کے دوست ہیں۔" حمیدہ نے اس سے کہا۔

"آداب۔"

اس سے کیا کہا جائے۔۔؟ اس سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ساری زندگی مہمل ہے۔

"... جیوتسنا کے متعلق سن کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔" اس نے قریب کے ایک صوفے پر ٹک کر الویرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گہری آواز میں کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کہہ سکتی تھی؟ بہت ممکن ہے اگلے سال ہی اسی صوفے پر ٹک کے اسی طرح کسی نئے لعد وشر سے۔ دوران میں وہ حمیدہ سے کہہ رہا ہو۔ "بے چاری الویرا کے متعلق سن کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔"

دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میز کی طرف چلا گیا۔

واپسی میں وہ ذوالفقار اور ڈاکٹر رائے چودھری کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا۔ اور راستے بھر تینوں آدمی آپس میں باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ کبھی کبھی شارتین اور حمیدہ بھی گفتگو میں شامل ہو جاتیں۔ الویرا سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ گویا اس کی موجودگی ہی سے بے خبر ہو۔

وہ یورپ سے لوٹتے ہوئے دو دن کے لئے قاہرہ ... میں ٹھہرا تھا اور صبح سویرے ہی دہلی واپس جا رہا تھا۔ ہوٹل پر اتر کر اس نے سب کو سرسری سا خدا حافظ کہا اور کوٹ کندھوں پر پھیلاتا سیڑھیاں چڑھ کر اندر چلا گیا۔

لیکن نہیں خواہاں کوئی یاں جنس گراں کا

مزنسک دونوں طرف ہرے رنگ کی کوچ شیپرڈز کے سامنے

"آپ اب وہاں پڑھتی ہیں ؟"

"جی - جی ہاں"

"کس جگہ ؟"

اس نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا - " بوسٹن "

ہسپتال جس میں وہ داخل ہونے جا رہی تھی بوسٹن میں تھا - وہ ہسپتال جس میں سے غالباً زندہ باہر نہیں نکلے گی۔

" میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں " شارمین اردن چلتی ٹہلتی ہوئی قریب آ گئیں - ڈاکٹر رائے چودھری سر جھکائے پائپ پیتے اور دینا کی انگلی پکڑے دوسری طرف سے آ رہے تھے -

تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو مصری نوجوان نے بڑے خلوص سے کہا " مادام - مے موزیل - دکتور - آپ سب میرے مکان پر چلئے اور رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے - میری بیوی آپ سب سے مل کر بہت خوش ہوگی - وہ بھی ہندوستان کی ہے - حیدرآباد کی "

البریا نے کچھ بے معنی فقرے دہرا کر معذرت چاہی کہ رات کا کھانا انھیں شارمین کے ایک عزیز کے یہاں کھانا ہے جو یہاں سفارت خانے میں تعینات ہیں کہ جب وہ پھر کبھی قاہرہ سے گزری تو ان دونوں سے ملنا ہرگز نہیں بھولے گی - کسی نہ کسی کو ہی کبھی آنا چاہیئے - کیا اس کا دل ڈوب رہا تھا - تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا - اس نے پھر یہ محسوس کیا - مسز ماس ڈانلڈ کے زمانہ رومانی رسالے میں اس قسم کی صورت حال تفصیل سے بیان کی جاتی ہے - جب اسے اس بات کا خیال آیا تو اس کا دل چاہا کہ زور سے چیخے - اس کا سانس اب تک تیز تیز چل رہا تھا جیسے وہ بڑی مشکل سے سمجھیا ٹھٹھی تھی - غالباً اسے اہرام پر ہرگز نہ چڑھنا چاہیئے تھا - مگر وہ زندہ انسانوں کی طرح زندگی گزار رہی ہے - اور اس کے علاوہ فرق کیا پڑتا ہے - اس نے اپنے پاس کھڑے ہوئے دوستوں کے گروہ کو دیکھا اور ایک عجیب کمینے قسم کے احساس برتری نے اسے بے حد مسرور کیا - اسے ان سب لوگوں پر فوقیت حاصل ہے - کیونکہ یہ بے چارے نہیں جانتے کہ ان کی زندگیوں میں آئندہ کیا ہونے والا ہے - مگر وہ جانتی ہے صرف اسے اپنے مستقبل کا علم ہے -

شارمین کی آواز پر وہ چونکی - جو مصری نوجوان سے کچھ پوچھ رہی تھی - پھر انھوں نے اسے خدا حافظ کہا - ڈاکٹر یوسف مراد بجنے کیا -

بجنے کیا - عربی ناموں کا تلفظ کس قدر انٹرسٹنگ ہوتا ہے - ماہ کنعاں - چاہ بابل - اور کہا تھا - ؟ صبر ایوب کیا گریہ یعقوب کیا - اور اس کے بعد -

عشق کی مجبوریاں پوچھے زلیخا سے کوئی
مصر کے بازار میں یوسف کا سودا کر دیا

خدا حافظ ڈاکٹر مراد -

BONVOYAGE مادموزیل -

شارمین کے چچا زاد بھائی ذوالفقار کے گھر جاتے ہوئے راستے میں انھوں نے جامع محمد علی کی منڈیر سے شہر کا نظارہ کیا - پھیلا ہوا خوبصورت عظیم شہر ، مغربی افق پر ابھی ہلکی سی سرخی باقی تھی - الازہر کی عمارت - قبطی کلیساؤں کے برج " ہیوکا پیرو " کے محلات ، پستان ، باجیرت ، دلآویز مسجد کے حسین دیوانوں کے اندر بیش قیمت قالین بچھے تھے - بڑے بڑے جھاڑ فانوسوں میں سے نکلتی ہوئی روشنی فواروں اور دریچوں نازک جالیوں میں سے چھن چھن کے باہر آ رہی تھی - مسجد کے احاطے میں سیاحوں کے لئے آمون رع اور زیر آئیسس کی مورتیاں بک رہی تھیں - اذان کی آواز بلند ہوئی اور تاہم سکے آسمان کے نیچے شفق رنگ ، بسیط فضا میں دیر تک لرزاں رہی جس طرح شفاف گلابی پانی میں بلوریں سنگریزہ پھینکنے سے لہروں کا دائرہ دور تک پھیلتا چلا جائے -

افطار کا وقت ہو چکا تھا " آج روزہ رکھا ہوتا تو کتنا مزہ آتا " شارمین نے البریا سے کہا - دونوں ساری سے سر ڈھانپے نئے پاکستانی اسلامی جوش کے مارے صحن میں سب سے آگے آگے چلی جا رہی تھیں -

" میرے ملک کی مسجدیں اس سے کہیں زیادہ شاندار ہیں " پیچھے سے آتی ہوئی اردن دھنی کسی یورپین ٹورسٹ سے کہہ رہی تھی - ان بنگالیوں کے شادمنشر ہتنے ناک میں دم کر رکھا ہے " شارمین نے چپکے سے اظہار خیال کیا -

" لیکن ہمارے پاکستان کی مسجدوں کے مقابلے کی ان میں ایک بھی مسجد نہیں " ایگنیٹر نے اوردن دھنی کی بات کاٹی - اردن دھنی جب آگے بڑھ گئی تو ایگنیٹر نے یورپین سے کہا " یو سی - انڈیا از اے ہندو کنٹری - اگر آپ کو مسلم کلچر کی اصل شان و شوکت دیکھنا ہو تو

اب سارے دروازے مقفل ہیں۔
گلی تو چاروں اور بند ہو گئی۔ میں اپنے وطن کیسے جاؤں۔
"ہم نے بھی کیا کیا ایڈونچر کئے ہیں" شارمین مسٹر سنگھ کو بتلا رہی تھی "ایک مرتبہ ہم لوگ کلکتہ میں سونا گاچی دیکھنے گئے۔ اوفوہ کس قدر لرزہ خیز"

اس لمحے سے میری عقوبتوں میں اضافہ ہوگا۔ میرا ان دیکھا عقوبت رساں مجھے مرتے دم تک کوڑے مارتا رہے گا۔ خداوندا۔ تو جو رحیم و کریم ہے تونے مجھے کس لئے پیدا کیا کہ میں اس طرح زندہ رہوں۔ اور کس طرح مروں۔۔؟ میری زندگی میں وہ خدائے ذوالجلال تو جانتا ہے کہ بیشتر وقت ایسے آئے ہیں میں نے کہا ہے کہ یہ میری زندگی کا بدترین مشکل ترین، خوفناک ترین لمحہ ہے۔ مگر آج کی رات۔۔۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا؟۔ اور گو میں موت کے سایوں کی وادی میں چلتی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے میرا پیالہ لبریز ہے۔ میرا خدا میرے دشمنوں کے سامنے میرا سر جھکاتا ہے۔

خوبصورت زرد فراک میں ملبوس زلیخا بائی ماچس والا پچھلی سیٹ پر بیٹھی "ٹام ڈولی" آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہے۔

Hand down your Head Tom dooley
Hand down your head and cry
Hand down your head Tom dooley
Poor boy you're bound to die

الوداع لیسبئے۔ کی تجی کی اپیچ کے قبر۔ فرانت کی تاریکی میں کرسیاں اور میزیں بچھی تھیں۔ اسٹیج پر آرکیسٹرا والے بہت مغموم شکلیں بنائے بیٹھے تھے رقص شروع ہو چکا تھا۔ ایک دبلی پتلی رقاصہ "بیلی ڈانس" کے باریک لہنگے میں نیم ملبوس اپنی ٹانگیں ہوا میں اچھالنے میں مصروف تھی لڑکیوں نے اسٹیج کے کنارے ایک میز کے گرد بیٹھتے ہوئے ٹرے اسٹائل سے قہوہ منگوایا گویا ان کی ساری عمر اسی طرح بیلی ڈانس دیکھتے اور تقاہرہ کے نائٹ کلبوں میں راتیں گزارتے بسر ہوئی ہے۔ ان میں بچوں کا سا کسائیٹ دیکھ کر ڈاکٹر رائے چودھری بزرگانہ شفقت سے مسکراتے رہے۔ بیلے کے بعد ایک بہت ساری رقاصاؤں نے آن کر اپنے "فن" کا مظاہرہ کیا۔ ان سب کے پیٹ سفید جالی سے ڈھکے ہوئے تھے۔ یہ سفید جالی اچھا خاصا یونیفارم معلوم ہو رہی تھی۔

"لیکن یہ لوگ اپنے پیٹ نہیں ہلا رہی ہیں" شارمین نے مایوسی سے کہا "بیلی ڈانس میں پیٹ ہی تو ہلاتے ہیں نا۔۔؟"

"ہم سنا ہے جب سے پریذیڈنٹ ناصر حکم دئے ہیں۔ ان لوگ اپنا بدن کور کریں" منے اپنا بدن پہلے جتنا کتی چھپانا تھا اب جاستی چھپائیں۔ اس لئے نہیں سکتیں"۔ اروندھتی نے بڑی سنجیدگی سے بنگالی اردو میں جواب دیا۔

"کیا نہیں سکتیں" شارمین نے دریافت کیا۔

"پیٹ نہیں ہلانے سکتیں" اروندھتی نے جواب دیا۔

"بے چاریوں کو سخت فرسٹریشن ہوتا ہوگا۔ کہ پیٹ ہی نہیں ہلا سکتیں" الویرا نے کہا۔

"رمضان کے مہینے میں یہ بیہودگیاں ۔۔۔ لاحول ولا قوۃ" شارمین نے غصے سے کہا۔ "اور مشرق وسطیٰ کو اسلام کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں اسلام کہیں اپنی اصلی حالت میں زندہ ہے تو برصغیر میں۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ کوئی ہندوستانی یا پاکستانی رقاصہ اس طرح ناچ گی۔؟" اس نے خطیبانہ انداز میں الویرا سے سوال کیا۔

"تالیاں" الویرا نے کہا۔

"ہونہہ۔ لاحول ولا قوۃ۔" شارمین نے غصے سے پہلو بدلا۔

"جب میں یہاں ۱۹۴۸ء میں آیا تھا۔ تب یہ بیلی ڈانسر لوگ ایک دم شفاف اور مختصر ترین لباس پہنتی تھیں۔ کیا زمانے تھے وہ بھی۔" مسٹر موہن سنگھ آہ بھر کر برابر کی میز پر کسی سے مخاطب تھے۔

اتنے میں قریب کی دوسری میز پر کھڑبڑ ہوئی اور چار دون مشنری خواتین اس رقص کی تاب نہ لا کر خفگی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور کرسیوں کے درمیان سے گزرتی پاؤڈر روم کی طرف چلی گئیں۔ وہ شام انھوں نے پاؤڈر روم میں بیٹھ کر انجیل مقدس پڑھنے میں گزاری۔

اس کے بعد دو لڑکیاں اور آئیں جن میں سے ایک چارلس اول کی ہم شکل سے بے حد معصوم، ذہین اور حساس معلوم ہوتی تھی۔

"کسی اچھے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہے بے چاری" الویرا نے بیدھیانی سے اظہار خیال کیا۔

"فاس، مڈل کلاس ردعمل۔ کیا دقیانوسی جہالت کی باتیں

ان کی منتظر کھڑی تھی۔ پانی کے سارے افراد کھانا ختم کر کے ہوٹل سے برآمد ہوئے۔ سب سے آخر میں سرخ بالوں والی عورت اپنی جگہ پر آن بیٹھی۔ اور اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ دو خوبصورت اور نفیس تھی۔

"یار مجھے تو ڈر لگ رہا ہے" اوبرا نے چپکے سے کہا۔

تمہارا وہ کالج کے زمانے والا بزدلا پن نہیں گیا" شارمین نے غصے سے کہا حالانکہ وہ خود بھی کافی نروس معلوم ہوتی تھی" ایک نشے میں دعوت قاہرہ کی طوائف کے ہمراہ آدھی رات کے وقت سفر۔ کس قدر ایڈونچر بات ہے" اس نے مزید کہا کوچ نیل پر پہنچی۔

میری پرنانی کی پرنانی سیاہ بلی تھی۔ سفید مقدس بلی کی بچی۔ اور دریائے نیل نہلے رہتے اپنی ساتویں ہوئی جایا۔ اسی لئے میرے بالوں میں اتنی لہریں ہیں۔ اور اسی لئے میں من مانی کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میری رگوں میں نیل کا پانی دوڑ رہا ہے۔[1]

دریا پر سے گزرتے ہوئے اگلی سیٹ پر نیم دراز سرخ بالوں والی عورت کے بال ہوا میں اڑنے لگے اور اس نے ان کی مصنوعی لہروں پر ہاتھ پھیرا۔

"اب ہم" الف سیلا" جا رہے ہیں" ہیلے ایجنٹ نے مائیکروفون اٹھا کر اناؤنس کیا۔

"آہا۔ تحیہ کمال۔" اوبرا نے مڑ کر نوالی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں تحیہ کمال" موٹے چہرے والے اسسٹنٹ نے مڑ کر ای انہاک سے جواب دیا۔

ریڈیو پر "چاچاچا" شروع ہو گیا۔

سلوی — جہاں وہ ناچی — رقص میں ہیلے رہی۔ بچتی رہے، موتے رہے۔ ہیں ہلاک جارج سدری۔ عزیزہ۔ نخاس پاشا جندیو ڈوریا شفیق۔ پرنہرار۔ عبدالوہاب۔ سراب۔ سراب۔

عہد نامہ جدید۔ یسوع ناصری خباب مریم کی گود میں بیٹھے ان جیسے پر سوار ہیروڈ کے ظلم سے بچنے کہ نئے مصر بھاگ چلے آتے ہیں بیت لحم کا ستارہ ظلم سے بچنے کے لئے لوگ ہیں کہ مستقل ادھر سے ادھر بھاگے ہوئے ہیں۔ اور ملکوں اور شہروں کی سرحدوں کی دیواریں ہیں کہ اونچی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ یوگی اینڈوی کو میار — یروشلم اور برلن۔ فلسطین سے مصر مصر

سے اسرائیل۔ اسرائیل سے جورڈن۔ مصر کے بازار میں یوسف کا بیوپار کر دیا۔

شارمین او دن دھنی ہے کہہ رہی تھی "یہ سلیمان جو ہے تمہارا، یہ کس قیامت کا دلکش آدمی ہے۔ واہ — واہ۔ طبیعت خوش ہو گئی"

دل نہیں آیا قیامت آگئی — ایک کافر پہ — ایک کافر پہ — مائی نیم جانکی بائی الہ آباد —

میرا دل — میرے دل کا دوزخ جس کے ساتوں طبق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آتشیں ہیں لیکن کوئی دانتے کبھی آ کر ان کی سیر نہ کرے گا۔ آرزوئیں — اور کش کینگیاں۔ خداوند تعالے جو بدقسمتوں کو کہیں نہیں ملتا اور صوفیوں کے لئے ہر شے کی انتہا ہے اور ہر شے میں ہے میرا خدا جو میرا گڈریا ہے جو مجھے خاموش پانیوں کے کنارے کنارے لے جاتا ہے جو مجھے گھاس پر آرام کراتا ہے۔ اور گو میں موت کے سائے کی وادی میں چلتا ہوں۔[2] خدایا۔ مجھ پر رحم کر۔ خداوندا میں تیرے اسرار سمجھنے سے انکار کرتی ہوں میں تیرے قہر اور تیرے جلال اور تیرے غضب کے آگے ایک ذلیل کتیا کی طرح خاک میں لوٹ رہی ہوں۔ آندھی کے پتے کی طرح لرزاں ہوں سزائے موت کے اس قیدی کی طرح جو جلاد کی دستک کا منتظر بیٹھا ہو خداوندا میں تیرے سامنے حاضر ہوں۔

میرا دل — جو کالی کا مندر ہے۔ جس میں خلقت اٹا ٹوٹ گھسی ہوئی ہے جس کے تنگ صحن میں چلاتے ہوئے بکری کے بچوں کا سر کلہاڑی سے جدا کیا جا رہا ہے۔ کالی کی تین سرخ آنکھیں سامنے دیکھ رہی ہیں جدھر جہنم ہے کالی کی مورتی سو سو سال سے زمین میں آدھی دفن ہے۔ ماں۔ اس کے مندر کے فرش پر کتوں کے پلے لوٹتے پھر رہے ہیں عورتیں بکروں کا سرخ سرخ گوشت کاٹ رہی ہیں ماں — ماں —

میرا دل سوناگاچی کی تاریک گلی ہے جس میں آرزوئیں، میری دیوانیاں، میری حسرتیں پاؤڈر سے لپی پتی سستی ساڑیوں میں لپٹی کونوں کھدروں میں غلیظ دیواروں سے لگی کھڑی ہیں اور آنے والوں کو تک رہی ہیں۔ ہر آرزو یہ سوچتی ہے کہ اب کا آنے والا مکتی لائے گا اس گلی سے نکال لے جائے گا۔

میرا دل سوناگاچی کی وہ سرخ ساری والی خوبصورت معصوم کمسن لڑکی ہے جو اپنے دروازے کے اندر چپ چاپ بیٹھی مسکراتی ہے جس کے سامنے موٹر رکتی ہے مگر دو منٹ ٹھہر کر آگے بڑھ جاتی ہے

---

[1] برنارڈ شا — سیزر اینڈ کلوپیٹرا۔ [2] عہد نامہ قدیم۔ تیسواں لحن داؤدی

جانے والے تیس۳۰ مرد اور عورتیں کمبلوں میں لپٹے آنکھیں بند کئے یا سو رہے تھے یا غنودگی کے عالم میں جہاز پر واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اور صبح کا، اور بریکفاسٹ کے سرچے باجے کا۔ اور روشن سمندر اور اپنے ہم سفروں اور عزیزوں کے مانوس چہروں کا جو دوبارہ ان کا احاطہ کر لیں گے۔ وہ سب اس وقت سے کچھ پہلے کھو گئے تھے۔ اجنبی شہر، آسیب زدہ صحرا اور رات اور تکان اور نیم خوابی کا یہ سحر بہت مختصر تھا۔ ابھی یہ ٹوٹ جائے گا۔

سحر ٹوٹ گیا۔ سوئز کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ دور سے اپنا جہاز دکھائی دیا جسے دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی گویا وہ اپنا گھر تھا۔ نیچے اتر کر وہ اپنے پاسپورٹ لینے کے لئے چیک پوسٹ کی طرف بڑھے۔ کوچ خالی ہو گئی۔ سرخ بالوں والی عورت سب سے پہلے اتر کر ایک طرف کو کھڑی ہو گئی تھی۔

کسی نے اس کو خدا حافظ نہیں کہا۔ اس نے کسی کو خدا حافظ نہیں کہا۔

نہ کسی کو دیکھ کر مسکرائی بھی نہیں۔ الویرا اپنا بیگ سنبھال کر جیٹی کی طرف جانے لگی، تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر فرنچ میں کہا۔ "مادموزیل۔ آپ نے ایک پیکٹ گرا دیا۔"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ"۔ الویرا نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

جواباً اس نے سر ذرا خم کیا۔ گویا وہ مصر کی ملکہ تھی۔ مقدس دریا کی بیٹی۔ جس کی رگوں میں نیل کا پانی دوڑ رہا رہتا۔ مصر کی پراسرار راتوں کی، اداس، روتی ہوئی آنکھوں والی ملکہ۔ جو اپنے شاہی وقار اور تمکنت کے ساتھ باہر کی دنیا سے آئی ہوئی ہوئی ایک اجنبی، حیرت زدہ، معصوم، بے وقوف اسانولی لڑکی کا شکریہ قبول کرتی ہو۔

وہ انجن کے پاس اس طرح کھڑی رہی۔ کہرے میں اس کے سگریٹ لائیٹر کی لو ایک سکنڈ کے لئے چمکی۔

مسافر سیڑھیاں اتر کر لانچ میں جا بیٹھے۔ وہ کوچ کے پاس کھڑی رہ گئی۔ وہ اور اس کے دونوں ساتھی۔ لمبا ایجنٹ جو ہر ہفتے صبح و شام اسی طرح جہازوں پر آ کر غیر دلچسپ، دولتمند، احمق، سیانے، عقلمند، قنوطی، بے تکے، بھانت بھانت کے سیاحوں کو ایک ہی انداز، ایک ہی الفاظ، ایک ہی تعارف کے ساتھ اپنے شہر کی سیر کراتا ہے۔ جس کی خوبصورت اور کمسن محبوبہ شہر میں ایک عالی مقام طوائف ہے جسے وہ مذاقاً بیوی کہتا ہے۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ۔ سرخ بالوں والی عورت۔ وہ تینوں اسی میل کا صحرائی فاصلہ طے کر کے قاہرہ واپس جائیں گے۔ کس قسم کے گھر، کس قسم کی صبحیں، کس قسم کی زندگیاں ان کی منتظر ہوں گی۔

لیکن کر اب پو پھٹ رہی تھی۔ سمندری ہوا بہت سرد تھی۔ جہازوں اور کشتیوں کی روشنیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔ لڑکیوں کا جہاز دور کھلے سمندر میں ایک باوقار، مضبوط، مہیب چٹان کی مانند کھڑا تھا۔ اس پر لہراتے ہوئے یونین جیک نے الویرا کو یقین دلانا چاہا کہ دنیا میں ابھی پائیداری باقی ہے۔ سوئز کے باوجود۔

کرتی ہو۔ اچھا خاندان ۔ برا خاندان ۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کی برکتیں ہیں بی بی۔ جہاں اس دھڑلے سے عورت کی تجارت جاتی ہے کیا تمہیں معلوم ہے کہ ماسکو میں نائٹ لائف ہوتی ہی نہیں سرے سے۔؟" شارمین نے کاندھا ہوا میں لہرا کر جواب دیا۔ شارمین ان لوگوں میں سے تھی جنھیں لیفٹ ونگ انٹیلکچوئیل کہا جاتا ہے۔

"نسوانی اناٹومی کے اس مسلسل مظاہرے سے" مسز مک ڈانلڈ نے برابر کی کرسی سے جھک کر کہا۔ "طبیعت خراب ہوگئی۔"

"جب ہی تو میں کہتا ہوں مائی ڈیر کہ تم لوگوں کو ایسی جگہوں نہیں آنا چاہیئے تمہاری تفریح میں بھی خلل انداز ہوتی ہو" مسٹر مک ڈانلڈ نے جواب دیا اور میٹھی ہوئی آوازیں خود ہی ہنسے۔

ایک گداز سی پختہ عمر عورت نے آکر "یا مصطفےٰ۔ یا مصطفےٰ" یہ گانا شروع کیا۔ اور ساری رقاصائیں اسٹیج پر لوٹ آئیں اور اس کے ساتھ اس مقبول گیت میں شامل ہوگئیں۔

اب رات کے دو بج رہے تھے۔ تینوں لڑکیاں باہر نکلنے سے پہلے پاؤڈر روم میں گئیں تو انھوں نے مشرقی خواتین کو صوفوں پر نیم خم سوتے پایا۔ ادھیڑ عمروں کی بد شکل، بے رنگ خواتین عینکیں لگاتی تھیں اور تازہ ترین فیشنوں اور عطریات کے استعمال سے بے نیاز تھیں اور مسیحی ناصری کی انجیل کا پیغام لے کر ملایا کے جنگلوں اور ہندوستان اور پاکستان کے دور افتادہ علاقوں میں گئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک تیس سال سے مرزاپور میں رہتی تھی۔ ایک نے عمر عزیز کے پچیس سال سیالکوٹ کے ایک گرد آلود قصبے میں گزار دیئے تھے۔ اپنی زندگیوں میں کیا کھویا تھا۔ کیا پایا تھا۔؟ یہ بھی عورتیں تھیں۔ ادھر وہ چالیس سالہ خرانٹ گلیمرس مغنیہ جو سیاہ جالی کا چمکدار گاؤن پہنے اسٹیج پر "یا مصطفےٰ۔ یا مصطفےٰ" گا رہی تھی۔ وہ بھی عورت تھی۔ اس نے کیا کھویا تھا۔؟ کیا پایا تھا۔؟

"مس گرڈن۔ اٹھئے" الویرا نے صوفے کے قریب جا کر غیر شعوری طور پر اپنی پرانی "اسکول گرل آواز" میں احترام اور دردمندی سے کہا: "اٹھئے۔ ہم لوگ واپس چل رہے ہیں"۔

وہ چاروں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ مس گورڈن نے آنکھیں چندھی کر کے چاروں طرف گلابی اور نقرئی ساٹن کی دیواروں والے پاؤڈر روم پر نظر ڈالی اور انہیں یاد آگیا کہ وہ کہاں ہیں۔

عینک ناک پر جمانے سے پہلے آنکھیں ملتے ہوئے ایسا لگا جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہی ہوں۔ میں یہاں کیا کر رہی ہوں۔؟

وہ سب باہر نکل آئے۔ رات خنک تھی۔ اندر رقص اسی طرح سے جاری تھا۔ یہ جمال عبدالناصر کے حسین دار السلطنت کا سب سے بڑا نائٹ کلب تھا اور مشرق وسطیٰ اور بحیرہ روم کے ساحلوں کی حسین ترین رقاصائیں یہاں ناچتی تھیں۔ پارٹی کے سارے افراد تھکے ہارے سڑک پر آکر کوچ میں سوار ہوئے۔ سرخ بالوں والی عورت پہلے سے آن بیٹھی تھی۔ اتنی دیر بعد اسے دیکھ کر بڑی عجیب سی یگانگت محسوس ہوئی۔ گویا وہ پرانی دوست ہو۔ ان نیم عریاں اور رقاصاؤں کے مقابلے میں تو وہ اچھی خاصی مولین معلوم ہو رہی تھی اس نے دروازہ زور سے بند کر کے الویرا کو دیکھا اور قہقہہ لگایا۔ الویرا سہم گئی۔ کوچ روانہ ہوگئی۔

اب سڑکیں خاموش تھیں۔ بازار سنسان ہو چکے تھے۔ جدید قاہرہ۔ پرانا شہر۔ غرباء کے محلے۔ کوچ نے بڑی سلامت سے آبادی چھوڑ کر صحرا کا رخ کیا۔ صبح کا تین بج رہا تھا۔ سویز اسی میل دور تھا۔ لوگ سونے کے خیال سے سیٹوں پر نیم دراز ہوگئے۔ سناٹا چھا گیا۔ لمبا ایجنٹ ڈرائیور کے نزدیک فرش پر بیٹھ گیا۔ سرخ بالوں والی عورت آگے کو جھک گئی۔ اور اس کے منہ کے قریب منہ لے جا کر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ وہ غالباً بہت تفصیل سے اسے کچھ بتا رہی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک اسی طرح جھکی وہ لمبے ایجنٹ سے سرگوشی میں مصروف رہی۔ اس کے بعد سیٹ سے ٹک کر بیٹھ گئی۔

پھر یکلخت اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ دیر تک اسی طرح روتی رہی لمبا ایجنٹ اور مونچھوں والا اسسٹنٹ

اطمینان سے بیٹھے۔ سگریٹ پیتے رہے۔ پھر اس نے بھی ایک سگریٹ جلایا اور آنسو پونچھے۔ اور سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔

سب لوگ سو چکے تھے۔ کوچ صحرا کے عمیق سناٹے میں بے آواز خیال کی طرح گزر رہی تھی۔ چاروں طرف وسعت اور تاریکی اور ریت کے ذرے تھے۔ کول تار کی سیدھی سڑک پر سے گزرتی ہوئی بند شیشوں کوچ کے اندر مختلف قومیتوں اور رنگوں اور نسلوں کے مختلف دنیاؤں سے آئے ہوئے اور مختلف دنیاؤں کی سمت

ممتاز شیریں

کفّارہ

ایک کاغذ بالکل سادہ اور سپید میرے آگے بڑھایا گیا میری کور ہوتی ہوئی آنکھیں جو تاریک خلا میں بھٹک بھٹک کر تھک رہی تھیں اس مکمل سپیدی پر جم کر رہ گئیں۔

اچانک میری نظر کے آگے اس سپیدی پر کالا رنگ انڈیل دیا گیا، گہرا، قطرہ بہ قطرہ گرتا اور پھیلتا ہوا۔ پھر یہ کالا رنگ خشک ہو کر سفید کاغذ پر ایک چوڑی سی پٹی کی شکل میں محیط ہو گیا......

مشیت کے ہاتھوں نے لکھا اور نقطوں کی لکیر کی طرف اشارہ کیا۔ جبر و قہر کی آواز آئی!

"اس پر دستخط کر دو"

سیاہی کی گنجان چوڑی پٹی کے نیچے میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے دستخط کر دیئے۔

میں نے اپنی موت کے فرمان پر دستخط کر دیے تھے

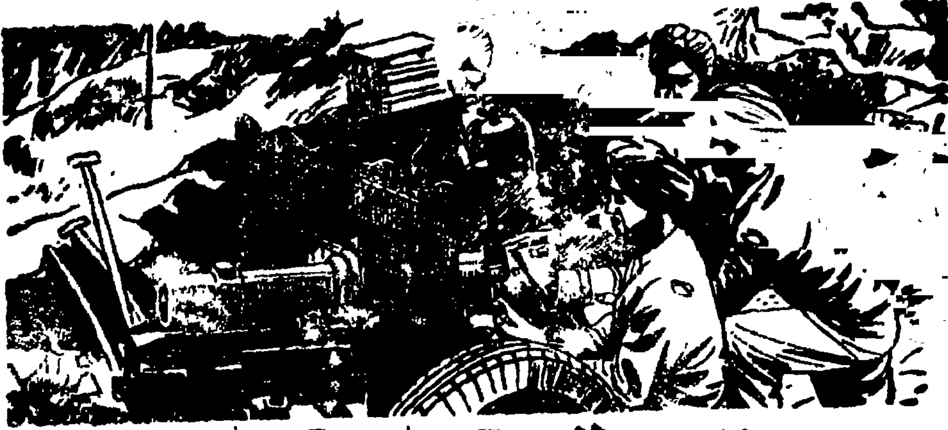
موت دیکھنے میں ننگی ہوئی مجھ سے ذرا سا دور کھڑی تھی اور مجھے اپنے عشوہ و انداز سے للچا رہی تھی وہ ہیجان خیز اور شہوت انگیز تھی بھری بھری گدرائی ہوئی رانیں، کولھوں کی گولائیاں جلد سے چپکے ہوئے اسکرٹ سے پھٹی پڑ رہی تھیں اس کے چہرے پر ریوے لان یا ہیلینا روبنسٹائن کا میک اپ چڑھا ہوا تھا۔ دہکتے ہوئے سرخ ہوس ناک ہونٹوں پر حقارت اور سفاکی کا تبسم لئے وہ کہہ رہی تھی "یہ زندہ نہیں رہے گی"

"نہیں، نہیں ڈاکٹر سیانا کورن ایسا مت کہو" سفید براق فرشتۂ رحمت نے چیخ کر کہا۔ اس نے تیزی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تاکہ میں اس کی چیخ نہ سننے پاؤں، وہ سرگوشی میں ملتجیانہ انداز سے کہہ رہی تھی: "نہیں ڈاکٹر اسے بچا لو، ہم سب کو اس سے بڑا لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ کیسی پیاری موہنی سی ہے...... اس نے تکلیف سہنے میں کس خاموش طاقت اور قوت برداشت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تین دن یہ درد کی اذیت میں مبتلا رہی اور مسکراتی رہی۔ ایک نہ چیخ، ایک کراہنے کی آواز تک اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلی۔"

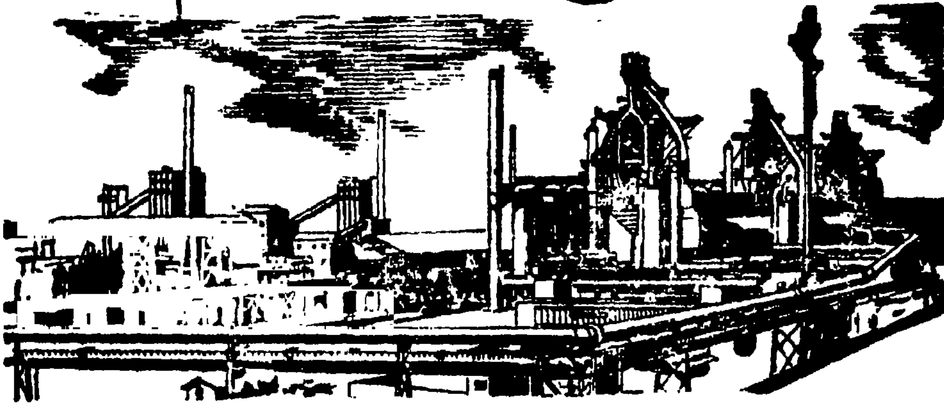
گہرے پنسل سے کھنچی ہوئی مصنوعی ابروؤں کی کمانیں تن گئیں۔ درشت آواز نے کہا "تم لڑکیاں کتنی جذباتی بن سکتی ہو۔ علاج میں جانبداری یا تعلق سے کام نہیں لیا جاتا، سمجھیں! ضابطہ کی پابندی میں جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ امراض کا علاج ایک سائنس ہے۔ تمہیں ہر مریض پر مکمل بے تعلقی سے، خالی از جذبات ہو کر توجہ دینی چاہیئے۔ اس مریضہ میں یا کسی اور مریضہ میں تمہارے لئے کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس مریضہ کا معاملہ زیادہ خطرناک اور پیچیدہ ہے۔ زندگی کی امید بہت کم ہے۔" کوئی جاتے جاتے یہ الفاظ سن کر رک گیا جیسے اسے سخت تکلیف ہوئی ہو اور مڑ کر تلخ لہجے میں پوچھا "کیا انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے؟ یہ مریض تمہارے لئے صرف ایک "کیس" ہے؟ خدا کا شکر ہے ڈاکٹر سیانا کورن کہ یہ کیس، تمہارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسٹنگلر اس مریضہ کو بچانے کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑیں گے اور ہر قیمت پر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کریں گے۔ میرے لئے یہ زندگی بہت قیمتی ہے۔ بہت عزیز۔"

اور وہ جو موت تھی، اس نے بے پروائی سے اپنے

دفاع اور



ترقی کا کام



ساتھ ساتھ چلتا ہے

پلان کے ترقیاتی منصوبے ملکی دفاع کا اہم جزو ہیں۔ ہنگامی حالات کے پیش نظر اب نئی ترجیحات مقرر کی گئی ہیں۔ انجینیری اور دھاتی صنعتیں مثلاً اسکوٹر اور فولاد، مشین، خصوصی اوزار، بجلی کا ساز و سامان، کوئلے کی کان کنی اور ریلوے جیسی بنیادی صنعتوں کے ترقیاتی پروگرام پر تیزی سے عمل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

طاقت کی ٹھوس بنیاد پر ہی دفاع کی تیاری کا انحصار ہے۔ ہمارے مسئلے کا ایک یہی حل ہے۔

اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹائیں۔ کروڑوں جیالوں کی بے غرض خدمت اور ان تھک کوشش کی بدولت ہی بھارت اپنی دفاعی طاقت کو بڑھا سکتا ہے۔



پلان کو
کامیاب
بنائیے

بھارت کے دفاع کو مضبوط کیجئے

دوبارہ حاصل کر رہا تھا اور مجھ میں زندگی واپس آ رہی تھی۔
زندگی میرے پاس مسکراتی ہوئی۔ محبت کی مضطرب اور بےچین نظروں کو ڈھارس بندھاتی ہوئی کھڑی تھی۔

ایک ممنون طمانیت کے ساتھ دو نرم، محبت بھرے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو تھپتھپایا۔ ایک ہاتھ نے بڑھ کر شفقت کے ساتھ میرے ماتھے سے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

"تم ٹھیک ہو جاؤ گی" زندگی کے فرشتے کے ہونٹوں سے ایک مہربان مسکراہٹ کی شعاعیں پھوٹیں۔ "تم طاقت ور ہو۔ تم میں بحرانی کیفیتوں کے شدائد برداشت کرنے کی طاقت ہے۔ خطرے کو بڑھانے والی چیزیں تو خوف اور لاعلمی ہوتی ہیں۔ اس پورے وقفے میں تم نے بڑی بہادری سے کام لیا ہے اور ہم سے پورا پورا تعاون کیا ہے۔ تمہیں صورت حال کا صحیح شعور ہے اور اس صورت حال پر قابو پانے کیلئے جو ارادے کی قوت چاہیئے وہ بھی تم میں موجود ہے اور تم یقیناً اس پر قابو پا جاؤ گی۔"

میں نے پرسکون اور راضی بہ رضا مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں، ڈاکٹر اسپنگلر۔"

اور پھر میں نے محبت کے چہرے کو کھلے ہوئے دبیز دروازوں میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا جو اس کے پیچھے بند ہو گئے۔ یہ آرفیوس کا چہرہ تھا، جو روشنی کی دنیا میں غائب ہو گیا۔

ایک ان دیکھی جبری طاقت مجھے تاریکی کی ابدیت میں کھینچ لے گئی۔

پھر بھی یہ موت نہیں تھی جو میرے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ یہ زندگی کا فرشتہ تھا۔ اس کے سفید دانت ایک دلآویز اور مسحورکن مسکراہٹ میں ایک ثانیہ کے لئے چمکے اور پھر ایک سفید نقاب میں روپوش ہو گئے۔ سنہرے بالوں والا سر ایک سفید ٹوپ میں چھپ گیا اور نیلی آنکھیں جو شفقت سے جگمگاتی تھیں اب سنجیدہ اور متفکر ہو گئی تھیں۔

سفید لبادے اور سفید ٹوپ میں ڈھکے ہوئے کئی ایک خاموش سایوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

میں نے اپنی زندگی خدا کے ہاتھوں میں دیدی تھی۔

ریڑھ کی ہڈی کے دہانے پر اعصابی مرکز میں اترتی ہوئی سوئی کے ساتھ موت مجھ میں داخل ہوئی اور اس کے بعد میرے سارے عضلات، میرا پورا بدن بے حس، سرد اور بے قوت ہوتا گیا۔

میں نے ساکن اور بے جان پیکر کو میز پر سفید چادر میں لپٹا ہوا چھوڑ دیا۔

میں نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ ایک دم آزاد اور بے قید، جیسے میں اپنے جسم کے زنداں سے رہا ہو کر ایک بے حد، بے کراں وسعت میں داخل ہو گئی تھی۔

میرے چاروں طرف وسیع زمین پھیلی ہوئی تھی۔ بنجر اور ویران زمین، دفعتاً میرے پیروں کے نیچے زمین کانپنے لگی۔ زمین کانپتی لرزتی رہی اور اس طرح تشنج میں مبتلا رہی جیسے دردِ زہ سے گزر رہی ہو۔ زمین نے اپنے اندر سے بیش بہا خزانے کا دفینہ باہر اگل دیا لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی۔ زمین کو ایک صاف، لمبے شگاف میں چاک کیا گیا۔ زمین کا بطن ایک کھلا ہوا خون ریز کچا زخم تھا جس سے لہو ڈھل ڈھل کر نکل رہا تھا اور جذب ہو رہا تھا۔

"اسکرین ٹیڑھی ہو گئی ہے۔" ایک دبی ہوئی سرگوشی نے جلدی سے کہا۔

"اسکرین ٹھیک کرو۔ ریڑھ کی ہڈی میں دیا ہوا بے ہوشی کا انجکشن ذہن کو مکمل طور پر ماؤف نہیں کر دیتا۔ چند ایک حصے جزوی طور پر زندہ اور ہوشیار رہتے ہیں۔"

زمین سے خون مسلسل بہہ رہا تھا، لیکن زمین کے بطن سے کوئی زندگی نمودار نہیں ہوئی... زمین کا بطن مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا گیا۔ اس پر تمام زندگی کا راستہ بند کر دیا گیا۔

ساری زندگی اجاڑ اور بنجر تھی۔ ایک ویران خرابہ میرے چاروں طرف تنہائی اور سنسان ویرانی تھی... میں اس ویران خرابے کی وسعتوں میں بکھری ہوئی بے مقصد... گھومتی رہی۔

اچانک نہ جانے کہاں سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ ابھر

کندھے سکوڑ کر بات سنی ان سنی کر دی۔ "زیادہ سے زیادہ دس فی صد امکان ہو اس کے زندہ بچنے کا" اس نے حرف آخر کے طور پر اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ کلینزرا کے ہاتھ تھے جن کے ناخنوں سے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

جواب کی سفاکی سے مجروح ہو کر پیار میری طرف اس طرح بڑھا جیسے وہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر موت کے آگے سپر بن جائے گا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور موت کا انتظار کرتی رہی۔ . . . . . میری زندگی سبکدوش ہو کر گردبادِ مرگ کا انتظار کرتی رہی۔

چنانچہ مجھے مرنا تھا۔ ایک بے معنی اور بے مصرف زندگی ناگہاں اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔ میں نے زندگی میں کوئی معرکہ سر نہیں کیا۔ کسی چیز کی تخلیق نہیں کی، کوئی ایسا کام نہیں کیا جو میری اب تک کی زندگی کا کوئی جواز بن سکتا لیکن اب ایک نئی زندگی کی تخلیق شاید میری زندگی کا جواز بن جائے

میں نے آنکھیں کھولیں اور محبت کے چہرے پر نگاہ کی اس لمحہ مجھ پر منکشف ہوا کہ مجھے کتنا چاہا گیا ہے۔ میری کتنی قدر کی گئی ہے۔ میری زندگی بے کار اور بے مصرف ہوتے ہوئے بھی ان کے لئے بہت اہم اور قیمتی تھی جو مجھ سے محبت کرتے تھے۔ اس لمحہ، جب موت کا سرد ہاتھ مجھ پر منڈلا رہا تھا یہ خیال بڑا اطمینان دہ تھا۔

محبت کا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس چہرے پر. اندرونی کرب، اضطراب، اور پریشانی کے نشانات مرتسم تھے درد کو چھپانے کی کوشش میں ایک ایک نس پر ناقابلِ برداشت بار پڑ رہا تھا اور محبت کے چہرے کو دیکھتے وقت موت کا عرفان میرے بہت قریب تھا۔

کیا موت گناہ کی قیمت اور کربِ جرم کا کفارہ تھی؛ میں تو گناہ سے ناآشنا تھی، یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے گناہ کی جھلک دیکھ لی ہو۔ خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو؟ اور پھر گناہ کو چھوٹا بڑا قرار دینے کا پیمانہ کس کے پاس ہے؟

محبت کے چہرے کو دیکھتے ہوئے موت کا عرفان میرے بہت قریب تھا۔

محبت نے مجھے موت سے بچانے کے لئے اپنا بازو بڑھا رکھا تھا۔ اندر گڑی ہوئی نشتر کی سوئی لال لال قطرے چوس رہی تھی۔ سیّال سرخی بتدریج بڑھ رہی تھی اور جب سرنج بھر گئی تو سوئی نکال لی گئی۔

. . . . . سوئی میرے ہاتھ کی باریک رگ کو ٹٹولتی رہی بے شمار مرتبہ سوئی میری کلائی میں داخل ہوئی اور کہنی کے نیچے نیلی رگوں کے پھیلے ہوئے جال میں سرگرداں رہی۔ میرے پلنگ کے پاس لگے ہوئے دہشت ناک سلنڈروں سے گلوکوس کا محلول سوئی کے ذریعے میرے جسم میں داخل ہوتا رہا۔

پھر کسی خطرناک دوا کا محلول قطرہ بہ قطرہ آہستہ آہستہ میری رگ میں اترتا رہا۔

اور جب میں تھکن سے خستہ ہو کر، آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی ہوئی تھی تو میں نے ایک خوف زدہ کرنے والی آواز کو سرزنش کرتے ہوئے سنا:۔

"یہ بہت خطرناک اور بہت طاقتور عرق ہے اسے بدن میں بہت آہستہ جانا چاہیئے۔ اگر بہاؤ تیز ہو گیا یا زیادہ مقدار بدن میں چلی گئی تو شدید انقباض پیدا ہو جانے اور اندرونی حصے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خطرہ ہے۔ ذرا سی لاپروائی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ ساری رات مستقل نگہداشت کی ضرورت ہے"۔

ساری رات نگہداشت کی جاتی رہی اور لمحہ بہ لمحہ میری تکلیف اور درد کا امر لخ ہوتا رہا۔

وہ دوسری رات تھی۔ خوفناک اور ڈراؤنی

اور یہ تیسری رات۔ . . . . . .

اب میری رگوں میں گرم انسانی خون ٹپک رہا تھا بلڈ بینک کے یخ خانوں سے لیا ہوا خون نہیں بلکہ محبت کے بازو سے نکلا ہوا تازہ اور زندہ خون . . . . . جیسے جیسے یہ خون میرے جسم میں داخل ہو رہا تھا میرا بدن اپنی کھوئی ہوئی حرارت

نے اصلی اور حکایاتی جنگوں کے مناظر سے منقوش دیواروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے سوچا۔ خوں ریزی کے مناظر موت اور تباہی کے مناظر...... اور یہ جہنم تھا، ادی سی، کبھی نہ بجھنے والی آگ سے بھرا ہوا الاؤ جو انسانی جسموں کے ایندھن پر جل رہا تھا۔ شعلوں کی تیز زبانیں کہکشاؤں کے تعاقب میں لپک رہی تھیں۔

نٹ راجا دیوانہ وار اپنا وحشیانہ موت کا ناچ ناچ رہا اور پھر اپنی ایک ٹانگ رقص کے انداز میں فضا میں معلق کئے ہوئے دوسری ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا پیر انسان کی گردن پر تھا اور انسانی زندگی اس کے پیر کے نیچے دم توڑ رہی تھی۔

ہندستانی نٹ راجا، شیوا کے زیادہ تیغی کرتوتوں پیکر میں ڈھل گیا۔ اس کے موٹے ہونٹوں پر ایک مہربان ملکوتی تاک تبسم تھا۔ اس کے سر پر بالوں کی جٹائیں بل کھاتے ہوئے سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی تھیں، جن پر نصف چاند کا ہالہ سجا ہوا تھا۔ شیوا تخریب کا دیوتا تھا اور اسی لئے تخلیق کا بھی دیوتا تھا کیونکہ موت ہی کی کوکھ سے زندگی نکلتی ہے۔

اور وشنو نے اپنے ساتھ سینکڑوں دیوتاؤں اور راکششوں کو لے کر دودھ کے ساگر دل کو آب حیات کے لئے متھ ڈالا۔

کلدانی تصویروں کی گیلری سے گزرتی ہوئی میں اوپر چڑھنے لگی، مرکزی برج کی عبادت گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اینگ کور کا مندر درجہ بہ درجہ بلند ہوتے ہوئے اتنا حسین اور متناسب لگتا تھا۔ جیسے پتھر میں موسیقی منجمد ہو گئی ہو۔ چار گوشوں کے چار برجوں کی منزلیں۔ مصری اہرام کے سے تکون بناتے، مرکزی برج کے کنول نما سر بفلک مینار کیلاش یا میرد کے پہاڑ کا اسم تھا۔ کیلاش، جو دیویوں دیوتاؤں کا مسکن اور ساری کائنات کا مرکز تھا۔

لیکن اوپر راستہ تنگ اور تاریک تھا۔ سیڑھیاں نچی اور جھکی تھیں۔ عبادت گاہ سے ایک تیز بھبکا اگربتیاں۔

تھامے ہوئے جو طاق میں جلائی جاتی ہیں، نیچے اتر رہی تھی زعفرانی رنگ کی عبائیں ملبوس جو روحی جوگنی کی طرح ڈھالی تھی۔ اس نے مندر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک اور شہ نشین پر بدھ کے مجسموں کی قطار بنی ہوئی تھی۔ یہ منظر بنگکوک کے مشہور رنگ مرمر کے مندر کے جانے پہچانے منظر میں تبدیل ہو گیا۔ بدھ کی سنہری مجسموں کی قطاریں، بیٹھے ہوئے مراقبہ میں مستغرق، لیٹے ہوئے اٹھاؤ ہاتھ اٹھا کر سمندروں کو پرسکون کرتے ہوئے۔

دنیاؤں کی لاعلمی سے بہت اوپر،
موسموں کے تغیر و تبدل کے سایوں سے بہت آگے،
بدھ کا آئین چمک رہا ہے، اس طرح جیسے
چاند موسم خزاں کے آسمان پر چمک کر
کائنات کو اپنی محبت کی کرنوں سے پوتر بنا کر آغوش میں لے لیتا ہے۔

جسم ایک بار دوش ہے ہر طرح کی غلاظت اور گندگی کا گھر......

جاننے والے کے لئے زندگی
ایک ننھے سے دیئے کی لرزتی ہوئی لو ہے،
جو ہوا کے ایک جھونکے میں بجھ جاتی ہے۔

وہ مقدس اور تمثیلی درخت سامنے تھا جس کے گھنے سائے تلے بدھ کو روشنی ملی تھی۔ میں نے درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی نہیں تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ عظیم الشان کھمیر تہذیب کے ان شاندار کھنڈرات میں تنہا بھٹکتی ہوئی بڑھتی ہوئی تاریکی سے میں خوفزدہ ہونے لگی۔ راستے سکڑ کر دوبارہ ایک بھول بھلیاں میں بدل گئے۔ ہوا رک گئی تھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔

"آکسیجن کی جالی ٹھیک کرو۔ سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے" کہیں قریب کسی نے تیزی سے سرگوشی میں کہا۔ "آکسیجن...... آکسیجن"

ہوا میں تازگی تھی۔ میرے اردگرد روشنی تھی، میرے

آیا۔ ان کی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی برف پوش چوٹیاں نیلے آسمان کے پس منظر میں سمندر کی منجمد لہریں معلوم ہو رہی تھیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں سارے عناصر کے مقابلے میں۔ امیدوں کی طرح سربلند کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان خوف کی تاریک اور گہری کھائیاں تھیں۔ میں امید و بیم کے درمیان، ایک گہری کھائی کے کنارے مشیت کی دیوار کو مضبوطی سے تھامے کھڑی تھی۔ اور پہاڑ مل کر ایک ناقابلِ اندازہ اونچی اور ناقابلِ گذار دیوار میں تبدیل ہو گئے تھے۔ کیا یہ دیوار موت اور زندگی کے درمیان خطِ فاصل قائم کرنے والی دیوار تھی؟

ناقابلِ یقین طور پر، معجزانہ طور پر میں نے یہ دیوار پار کر لی اور اپنے آپ کو دیوار کی دوسری طرف پایا اور یہاں پھیلی ہوئی کھلی زمین کے بجائے بھول بھلیوں کی طرح تنگ راستے تھے۔ میں ان راستوں میں گم ہو گئی۔ بھول بھلیاں پیچ در پیچ کھلتی گئیں اور غلام گردشوں، صحن خانوں اور اونچے اونچے ستونوں میں پھیل گئیں۔

اب میں انھیں پہچان سکتی تھی۔ وہ طویل کٹہرا جس کے سرے پر کئی سروں والے ناگ اپنے حسین پھن اٹھائے گویا جھوم رہے تھے۔ یہ سنگ بستہ راستے، یہ صحن خانے، یہ اونچے ستون "انگکور" کے تھے۔

میں اپسراؤں کی قطاروں کے درمیان چلتی گئی۔ ان اپسراؤں کے سنوارے ہوئے لمبے لمبے بال، مرصع کندنی زیور اور نازک حسین بدن اپنے ہوش ربا خموں کے ساتھ رقص کے انداز میں جھکے ہوئے دیواروں پر ابدی نقوش میں مرتسم تھے۔

اس کے جمال کے کھلتے ہوئے گلاب کی کشش سے

کھینچ کر۔

اس کے آموں سے لدے ہوئے درخت کی طرح

حسین جسم کے پھلوں کی طرف۔

جس کسی نے نظر اٹھائی، پھر اس کی نظر اس نظارہ

سے پلٹ کر واپس نہ آ سکی۔

باغ میں بہتے ہوئے چشمے کے سکون کی طرح،

پونم کی چاندرات کی طرح،

وہ سرمستی اور رعنائی کا پیکر بن کر جاگ اٹھی ہو۔

ایک ایک گوشے سے اپسرا زندہ ہو کر نیچے اتر

اور سب مل کر رقص میں شامل ہو گئیں۔

آسمانی جل پریاں ناچتے ناچتے یک بیک دودھیا

فضا میں پہونچ گئیں۔

ان کی ملکوتی جسموں کی تابناکی میں روحانی عظمت کے

چراغ روشن تھے۔

یہ آسمانی اپسرائیں صرف درباری ناچنے والیاں نہیں ناچ فن کاروں اور مخصوص کھمیر و منغ کا تھا۔ ساری اپسرائیں اسی طرح ناچ رہی تھیں جس طرح صدیوں پہلے سوریہ ورمن کے دربار میں انھوں نے ناچا ہوگا۔ نازک ہاتھ، مختلف زاویے بناتی ہوئی مخروطی انگلیاں، بل کھاتے ہوئے اعضا لوچ، نرم و نازک ہتھیلیاں جو جوڑ کر کھلتے ہوئے کنول بن رہی تھیں...... جو اپسرا ناچتی ہوئی گزرتی اس کی طرف جان لیوا ہیرے کی انگلی اٹھتی، جو شیوا نے بدصورت اور ناقص الخلقت بونے کو بخش دی تھی۔ اور تمام اپسرائیں ایک ایک کر کے مردہ ہو کر گرتی گئیں۔

ننھی دبلی پتلی اور نازک جل پریاں برف کی طرح حسین پُر وقار، سرو قد اور راج ہنسوں جیسی BALLERINAS میں بدل گئیں۔ جو جھیل کے سحر سے آزاد ہو کر چاندنی رات میں چائیکوفسکی کی مسحور کن موسیقی پر ناچ رہی تھیں۔

راج ہنسوں کی شہزادی سب سے الگ ہو کر اکیلی اپنا آخری رقص کرتی رہی۔ فضا میں اس کی آواز ابھری وہ اپنی موت کا نغمہ گا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی حرکات مضمحل ہوتی گئیں اور وہ فرش پر گر پڑی اس کے نازک بدن میں ایک آخری تھرتھراہٹ پیدا ہوئی اور اسی طرح تمکنت کے ساتھ وہ موت کی آغوش میں سو گئی۔

موت میں بھی ایک وقار اور حسن ہوتا ہے۔

نہیں، نہیں، موت تو بدصورت اور مضحک تھی۔ میں

ہوئی۔ ہونٹوں پر ایک ٹھر پر مسکراہٹ لئے ہوئے'.... محبت سے بے قابو ہو کر میں نے اس کی طرف اپنی باہیں پھیلا دیں۔ لیکن میری ننھی "ریشمیں" گریز پا نکلی۔ وہ روشنی کے تخت پر سوار ہو کر آسمانوں میں غائب ہو گئی۔ میری باہیں خالی کی خالی رہ گئیں۔

ساری ویرانی اور بچھڑپن، ساری تنہائی میرے اپنے اندر تھی۔ سارا درد اور کرب پھر جاگ اٹھا۔ یہ درد اذیت دہ تھا۔ لاشعور کی وسعتوں میں آزادانہ گھومتا ہوا ذہن تکلیف دہ آگہی کے ایک نوکیلے نقطہ پر مرکوز کر دیا گیا۔ روح اپنی لاحاصل تلاش کے سفر سے لوٹ کر دوبارہ اپنے زندان میں داخل ہو گئی، جو میرا جسم تھا۔

میں نے آہستہ آنکھیں کھولیں۔ روشنی میری کمزور... آنکھوں کو تکلیف دے رہی تھی۔ "روشنی" آپریشن کی میز پر... پڑتی ہوئی خیرہ کن، بے رحم اور آنکھوں کو اندھا بنانے والی روشنی تھی۔ "طمانیت" مارفیا یا کوئی اور خواب آور دوا تھی جو میرے درد کی شدت کو کم کرنے کے لئے دی گئی تھی لیکن کوئی مارفیا اس درد کو مٹا نہیں سکتا تھا جو میرے اپنے اندر موجود تھا، میرے وجود کی گہرائی میں زندہ تھا۔

میرے نفس نے آزاد ہو کر عالمگیر ویرانی اور تنہائی کا جو تصور دیکھا تھا وہ دراصل میرے اپنے شدید اندرونی احساس کا اظہار تھا۔ جیسے جیسے، آہستہ آہستہ، میرے حواس مجتمع ہوتے گئے، ویرانی اور اجاڑپن کا کائناتی احساس سمٹ کر ایک شدید ذاتی المیے میں ڈھل گیا۔

جیسے ہی دروازہ کھلا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر اذیت دہ انتظار کا اعصابی تشنج ختم ہوا اور وہ اندر داخل ہوئے لیکن ڈاکٹر نے معالجانہ انداز میں ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور الگ لے گیا میں ڈاکٹر کی سرگوشیانہ لہجے میں گفتگو سن سکتی تھی۔ "مجھے افسوس ہے، بے حد افسوس ہے بچہ کو بچا نہیں سکے۔ ہم نے دل کے مساج کا طریقہ بھی آزمایا کرنے کا... اس لمحہ تک ہم نے اس کے دل کی دھڑکن پر کان لگائے رکھے۔ وہ زندہ تھا۔ موت پیدائش کے فوراً بعد ہوئی۔ ایک طرح سے پیدائش اور موت دونوں ایک ساتھ ہی واقع ہوئیں۔"

صمیم دل سے مانگی ہوئی آخری دعا نے شاید یہ ننھی زندگی ایک دوسری "زیادہ قیمتی" زندگی کے بدلے میں بھینٹ دے دی تھی۔

کیا دل کی گہرائیوں سے مانگی ہوئی وہ دعا قبول ہوئی تھی؟ ان کی کربناک اور مضطرب آنکھیں میری طرف پلٹیں۔

ڈاکٹر نے جلدی سے انھیں اطمینان دلانے کی کوشش کی "اب یہ ٹھیک ہیں، آہستہ آہستہ ہوش آ رہا ہے۔ جلد ہی انھیں ان کے اسپیشل وارڈ میں منتقل کر دیا جائے گا اور آپ ان سے بات کر سکیں گے۔ اس ابتلا سے وہ بڑی ہمت سے گزری ہیں بڑا پیچیدہ اور خطرناک کیس تھا۔ لیکن اب خطرے کی سرحد پار ہو گئی ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سیزیرین آپریشن زیادہ خطرناک نہیں ہوتا گو کہ بڑا آپریشن ہے کیونکہ نشتر براہ راست پیٹ کے اندر اترتا ہے۔ لیکن آج کل سلفا ڈرگس اور اینٹی بائیوٹیکس کے اس دور میں سمیت پھیلنے اور موت کے خطرات بالکل دور ہو گئے ہیں۔ آپ کی بیوی خطرے سے باہر ہیں۔ ابھی ان کی حالت بہت نازک ہے اور انتہائی حفاظت اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ بچہ کی موت کے بارے میں انھیں ابھی نہ بتایا جائے تو بہتر ہو گا۔"

میرے دل پر ایک سردی کی تہہ سی چڑھ گئی۔ میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ میرے سینے میں جو نئی محبت کا شعلہ بھڑکا تھا وہ سرد ہو گیا۔

موت مجھے چھوتے ہوئے گزر گئی لیکن جاتے جاتے وہ تاوان میں اس ننھی سی زندگی کو لے گئی جو میرے اندر متحرک تھی۔ وہ ننھا وجود جو اپنی نشو و نما کی ساری منزلوں میں، میرے تخیل میں اتنا واضح طور پر موجود تھا، اس کی تقدیر میں صرف ایک لمحہ کی زندگی تھی۔

میں نے زندگی کو نہیں، موت کو جنم دے کے۔

باقی صفحہ ۱۰۷ پر

اوپر کھلتی ہوئی محرابیں شاندار تھیں، ستون سفید مرمر کے بنے ہوئے۔ سنگِ مرمر تقدس اور پاکیزگی کی ایک ملکوتی فضا کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ یہاں نہ کندہ کی ہوئی شکلیں تھیں، نہ مجسمے اور نہ تصویریں، لیکن پھر بھی اس سادگی اور پاکیزگی کا ایک اپنا متحیر خیز حسن اور جمال تھا۔ یہاں مورتیاں نہیں تھیں، خاص ہی علامات نہیں تھے کوئی "واسطہ حسن قبول" نہ تھا لیکن ایک غیر مرئی برتر و بالا وجود جاری و ساری تھا۔ اپنے خالق سے۔۔ ایک خالص اور بالراست تعلق کا احساس تھا۔

سفید بیضوی گنبد، مرمر کے ستون، پھیلی ہوئی محرابیں اور شفاف فانوس۔ یہ یقیناً بادشاہی مسجد تھی ان جانی، اجنبی راہوں پر بھٹک کر، میں گھر لوٹ آئی تھی۔ مرکزی قبے کے نیچے میں سجدہ میں گر گئی اور خشوع و خضوع سے نماز پڑھنے لگی میرا سارا وجود ایک عجیب اور انوکھی مسرت سے لبریز تھا۔ بالآخر مجھے سکون مل گیا۔

میں نے اٹھ کر اپنے اردگرد سراسیمہ ہو کر نظر ڈالی میں کہاں تھی؟ ایسا معلوم ہو رہا تھا زماں و مکاں جہت اور پیمانے سے محروم ہو کر اپنا مفہوم کھو بیٹھے تھے اور میں گویا زماں و مکاں سے گزر کر ابدیت میں داخل ہو رہی تھی یا اس کے برعکس ابدیت سے نکل کر "اب" اور "موجود" کی دنیا میں واپس آ رہی تھی؟

تمام وقت ازلی اور ابدی "حال" ہے۔
جن راستوں سے ہم نہیں گزرے،
وہاں کے قدموں کی چاپ،
بازگشت بن کر یادوں میں گونجتی ہے۔

یہ نہ اینگکور کے مرمریں ستون تھے اور نہ بادشاہی مسجد کے سنگِ مرمر کے ستون بلکہ معمولی عام قسم کے گول ستون تھے جن پر سفید اور خاکستری روغن چڑھا ہوا تھا۔۔۔۔ سنگِ مرمر کی بجائے، شفاف سپیدی صرف اسپتال کی۔ دیواروں میں جڑی ہوئی چمک دار ٹائلز میں تھی۔ اور یہ بینگ کوک کا سیونتھ ڈے اڈونٹسٹ سینی ٹے ریم ہاسپٹل تھا میں، گویا، ابدیت کی لامتناہی وسعت کے دھندلکوں سے کھینچ کر قریبی اور متعین زماں و مکاں میں واپس لائی گئی

اسپتال کی لفٹ سے آئی اور اس سے کوئی باہر نکلا، زعفرانی عبا نہیں، سفید لباس پہنے ہوئے۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ عیسائی مشن کی عورت تھی جو روزانہ مریضوں کے پڑھنے کے لئے اپنے مشن کا لٹریچر لاتی تھی۔ اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ کاغذ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔

"خدا کی بادشاہت قریب ہے۔
مسیح موعود کا نزول قریب ہے"

آرمیگڈان کی بین الاقوامی جنگ، دنیا کی تمام قوموں کے درمیان زبردست ٹکراؤ، اور تقریباً پوری دنیا کے تہس نہس ہونے کے بعد زخموں سے نڈھال زمین کو سکون اور امن نصیب ہوگا۔

مسیح موعود کی آمد قریب ہے
مسیح کا نورانی شعاعوں میں زمین پر نزول ہوگا۔۔۔

یہ الفاظ ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئے اور میرے ذہن میں دوسری کتابوں کے الفاظ رینگنے لگے جن میں۔۔۔۔ مسیح کی۔۔ دوبارہ آمد، ان کی حکومت میں امن اور خوشحالی، یوم حساب کی نزدیکی، مردوں کا زندہ ہو اٹھنا، روز جزا کا آخری دن، جی اٹھے ہوئے مردوں کا ایک لامتناہی اندھیرے سے نکل کر حیران و سراسیمہ، الوہی نور کی خیرہ کن روشنی کے سامنے جمع ہونا۔۔۔۔ سب مذکور تھا۔

مجھے شہادت کی آرزو نہیں،
مجھے آخری دید کی تمنا نہیں،
مجھے صرف نفسِ مطمئنہ بخش دے۔

میرے سامنے پھیلا ہوا خلا ایک سادی روشنی سے معمور ہو گیا۔ طمانیت کا احساس میرے وجود میں پھیل گیا۔ روشنی کے ایک دھارے میں میری ننھی "رشیں" میرے سامنے آئی، نو مولود بچے کی شکل میں نہیں بلکہ میرے تصور کی "رشیں" کے پیکر میں۔ گھنگریالے بالوں والی گڑیا گلابی جھالروں کے فراک میں سر جھکا کر اپنے خوبصورت بالوں کے گھونگر ہلاتی

تھا نہ ـــ اب ہم انسانوں سے ملنے جا رہے ہیں ۔ کتوں سے اب ہماری دوستی ختم سمجھو ۔"

کتا کھڑا کوں کوں کرتا رہا ـــ دم ہلاتا رہا، کندھے تھرتھراتا رہا! "اچھا دیکھو دیکھتے ہیں" نورد طاق کی طرف مڑا!

اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر، کتا سٹ سے اس کی ٹانگوں سے کترا کر اندر گھس گیا اور کوٹھری کے ایک کونے میں اس طرح بیٹھ گیا، جیسے وہ اس کا ہی تو بسیرا تھا ـــ دم پھٹاپھٹ زمین پر مارتے ہوئے وہ برابر نورد کو گھورے جا رہا تھا ـــ آس لگائے امید باندھے!

نورد نے ادھر، ادھر ڈھونڈا، اور جب اسے کچھ نہیں ملا تو وہ کھسیا کر بگڑ گیا "نکل ۔ اب کہاں سے تیرے نئے کچھ لاؤں؟ صبح کیوں نہیں آیا جب چائے بنی تھی؟ ۔ کہاں تھا؟ ہیں؟ اب نکل، چل اب کوٹھری بند کرنی ہے، چل نکل۔"

اس نے کونے میں رکھی ہوئی پتلی سی سنٹی اٹھائی، جو اس نے کل ڈپٹی صاحب کے یہاں سواری پہونچا کے ان ہی کے احاطے میں لگے ہوئے نیم سے توڑی تھی!

کتے نے اس کو حیران نظروں سے دیکھا ۔ ایک بار منہ کھولا اور پھر بند کیا، سر ہلا کے کوں کی ایک آواز نکالی اور پچھلی ٹانگوں میں دم دبا کے الٹے پاؤں دروازے کی طرف آہستہ آہستہ کھسکنے لگا ۔ کھسکتے کھسکتے وہ ہاتھ میں سنٹی اٹھائے ہوئے نورد کو بڑی حسرت سے تکتا جا رہا تھا ۔ اس کے باہر نکلنے کی رفتار اتنی سست تھی کہ نورد اور بھی کھسیا گیا، زور سے اگلا پیر زمین پہ پٹک کر بولا "نکل، دھت۔"

کتے نے ایک کرتی پڑتی جست لگائی اور باہر نکل گیا!

نوردنے دروازے میں تالا بند کیا اور سامنے ٹین پر پڑے ہوئے چھپر کے نیچے سے اپنا رکشہ نکالنے چلا ۔ اس نے ایک الٹی لات چلائی "نکل ۔ دھت۔"

مجبوراً نے ایک سکنڈ اسے تعجب سے دیکھا ۔ پھر اپنی جگہ رک کر دم ہلانے لگا!

نورد نے رکشہ گھسیٹا، کندھے پر سے انگوچھا اتار کے اسے ادھر ادھر سے جھاڑا پاس لگے ہوئے گیندے میں سے دو، تین پھول توڑ کر، ان کا گلدستہ بنایا ۔ اسے رکشے کے ہینڈل میں اٹکایا، اچک کے رکشے پہ بیٹھا اور روانہ ہو گیا ۔ پیڈل مارتے، مارتے ایک بار اس نے جیب ٹٹول، دیکھی ـــ اس کے پاس پندرہ روپے کچھ آنے تھے!

جوڑیوں کے علاوہ سب خریداری کر کے اسے ایک ایسی سواری مل گئی جو نخاس گنج جانا چاہتی تھی، وہ خود بھی نخاس گنج جانا چاہتا تھا ۔ وہاں اس نے کل رات کو ایک دکان پر بہت اچھی اور کافی سستی جوڑیاں دیکھی تھیں ۔

کاٹھ کے پل پر اس نے پیڈل سے دونوں پاؤں الگ الگ کر کے پھیلا دیئے ۔ رکشہ ڈھال پر چھوڑ دیا اور گنگنانے لگا!

ایک دم پیچھے سے آواز آئی "ابے نورد ـــ لائسنس نہیں ہو تو آگے مت جانا ـــ چیکن ہو رہی ہے! پانچ سے کم نہیں بھرنے پڑیں گے"۔

یہ اس کے ایک دوست کی آواز تھی، جو رکشہ ہی چلایا کرتا تھا، مگر اس وقت ایک خاکی رنگ کا تھیلا کندھے پر ڈالے مٹھی میں دبی بیڑی کے کش انگوٹھے کے پاس سے کھینچتا اینڈتا ہوا اطمینان سے گھوم رہا تھا!

نورد کا دل دھک سے رہ گیا!

لائسنس تو اس کی کالی بش شرٹ کی جیب میں تھا آج جب اس نے یہ لال قمیض پہنی اور اس کی جیب میں روپے رکھے تو وہ کالی بش شرٹ کوٹھری میں کیل ہی پر ٹنگی رہ گئی تھی! ـــ جب تک وہ پیڈل پر پاؤں جماتا اور کچھ سوچ پاتا ۔ رکشہ تیزی سے ڈھال پر خود ہی ڈھلکتا ہوا ٹھیک اسی جگہ پہونچ گیا جہاں چیکنگ ہو رہی تھی!

وہ پھنس چکا تھا!

بڑی حسرت سے اس نے رکشہ میں بیٹھے، سوٹ پہنے، پان چباتے ہوئے بابو جی کی طرف دیکھا اور بھیں سے بولا ۔

"بابو جی، اگر آپ گواہی دے دیں کہ میرے پاس لائسنس ہے تو میں چھوٹ جاؤں گا۔"

"پر مجھے کیا معلوم کہ تمھارے پاس لائسنس ہے؟" بابو جی غرائے اور رکشہ سے اتر گئے!

رضیہ سجاد ظہیر

سنٹی

عید کے دس بارہ روز پہلے ہی سے نورو نے دوکانوں میں جھانکنا شروع کر دیا تھا!

اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے پندرہ سولہ روپے بچائے تھے۔ کسی کا دینا کچھ تھا ہی نہیں، اور بارہ بنکی کے ایک گاؤں میں جانے کے بھی ایسے کون سے بہت سے پیسے لگتے تھے۔ پچھلی عید پر وہ گھر نہیں گیا تھا کیونکہ عید سے کچھ ہی دن پہلے وہ چچا سے لڑ کر لکھنؤ آیا تھا، تو کیسے جاتا ؟

اس کی نظر طاق میں رکھے ہوئے پوسٹ کارڈ پر پڑ گئی جو اسے ابھی دو ہی دن ہوئے ملا تھا، چچا کی طرف سے لکھا تھا:-

"سب بڑوں کو سلام چھوٹوں کو دعا۔ اور اللہ کے فضل سے ہم سب روزے رکھ رہے ہیں اور یہ رمضان شریف کا مبارک مہینہ ہے، جب اللہ کی رحمتیں اپنے گناہ گار بندوں پر آسمان سے اترتی ہیں، اس لئے غصّہ کو تھوک دو، اور عید پر اب کی چلے آؤ۔ ہمارا نہیں تو اپنی بیوہ ماں اور ننھی سی بہن کا خیال کرو، جو ہر گھڑی تم کو یاد کرتی ہے اور تھوڑے لکھے کو بہت سمجھنا اور خط کو تار سمجھنا۔"

نورو کی آنکھوں کے سامنے وہ ننھی سی فراک منڈلانے لگی جو نکڑ والی پنجابی کپڑے کی دوکان میں بہت سے ہی ٹنگی لہراتی دیکھی تھی ۔۔۔ نیلی، چمک دار جس پر لال پیلے کے پھول ٹنگے تھے۔ ہرے چمک دار کپڑے کی بو گلے کے پاس بنی تھی۔ اور سفید پلاسٹک کے بٹن لگے تھے۔ وہ اس کی ننھی بہن کو بالکل ٹھیک آئے گی۔

ڈھائی روپے کی وہ فراک، اور دو آنے کا ایک گز ربن چوٹی کے لئے، دو آنے کی مہندی اور چار آنے کی چوڑیاں ۔۔۔ اماں کے لئے بارہ آنے سیر والی سوئیاں، اور ایک روپے کی سیر بھر شکر، چچا کے لئے نماز پڑھنے کے واسطے ایک ٹوپی ۔۔۔ پھر اس کی نظریں یکایک اپنی چپل پر پڑ گئیں ۔۔۔ اگر ایک چپل نئی آجاتی تو بڑا اچھا ہوتا۔ لیکن گھر جاتے وقت کچھ نقدی بھی ساتھ ہونی ضروری ہے ورنہ لینے پرائے کہیں گے کہ شہر گئے بھی اور چار پیسے بھی ہاتھ میں نہیں دکھ رہے ہیں ۔۔۔ چلو اسی کو پالش کرا لیں گے ۔۔۔ ہوگا! عید ہے۔ دیکھا جائے گا! اس وقت جوڑا بن جائے یہی بہت ہے ۔۔۔

وہ اٹھا ۔۔۔ ادھر ادھر دیکھ کے طاق میں سے ایک پڑیا اٹھائی، اس میں کچھ نگین سیپ تھے، ان کا بھنا لگا کے گوشے میں سے پانی پیا، صندوق کھول کر روپے نکالے، گن کر لال قمیص کی جیب میں رکھے اور اپنے ٹخنے خاکی پتلون کی پیٹی کس ہی رہا تھا کہ دروازے پر کھر کھر ہونے لگی۔ پھر کوں کوں کی آواز آئی!

اس نے دروازہ کھول دیا، اور بولا "اوہو، پھر آ گئے تم یار، تم کو دو چار دن چائے کیا پلا دی کہ تم تو جان ہی کو آ لگ گئے۔"

ایک دبلا پتلا، سوکھا سا بھورے رنگ کا کتا منہ اٹھائے اسے بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔

"بھئی آج تو تمھارے لئے کچھ ہے نہیں بھورو! اب بات یہ ہے کہ ہم جا رہے ہیں گھر، اماں سے ملنے، ننھی کو پیار کرنے اور ان بڑھو کو سلام کرنے، جن سے ہمارا جھگڑا ہو گیا

ابراہیم جلیس

پردیس

سورج ڈوبے بڑی دیر ہو چکی تھی۔ اندھیرا بھی بہت گہرا ہو گیا تھا۔

مگر... رات... کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اور کراچی سے ہزاروں میل دور مجید خاں ہانگ کانگ کی سڑکوں پر بڑی دیر سے رات ہی کو ڈھونڈ رہا تھا

جوان مرد کی زندگی میں سورج ڈوبنے کے بعد کوئی عورت نہ ہو۔ یا جوان عورت کی زندگی میں سورج ڈوبنے کے بعد کوئی مرد نہ ہو... تو پھر غروب آفتاب سے طلوع آفتاب کے درمیان رات نہیں ہوتی صرف اندھیرا ہوتا ہے

جبھی تو اندھیرے میں عورت اور مرد کے پہلے ملن کو "پہلی رات" کہا جاتا ہے۔

پہلی رات... !گویا اس سے پہلے اس کی زندگی میں صرف اندھیرے طلوع ہوتے تھے۔!!

عورت ہو تو اندھیرا رات ہے۔

عورت نہ ہو تو رات محض اندھیرا ہے۔

اور جوانی کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد..

مجید خاں کی زندگی میں پہلی بار غروب آفتاب کے بعد رات نہیں آئی تھی بلکہ اندھیرا گھس آیا تھا اور اس نے گھس آیا تھا کہ اس کی سہانی رات ۔ کلثوم ۔ کراچی میں رہ گئی تھی

جب تک مجید خاں کراچی میں تھا اس کی زندگی میں کلثوم کے سوائے اور کوئی رات طلوع نہیں ہوئی تھی۔

اس لئے عورتوں کے معاملے میں مجید خاں اپنے مضبوط کردار کا نوجوان سمجھا جاتا تھا کہ کلثوم کے علاوہ ہر جوان عورت بڑی بیباکی کے ساتھ اس کی آنکھوں... میں آنکھیں ڈال کر بھی بات کر لیتی تھی ۔

لیکن مجید خاں کے دل کا چور اکیلے میں اس سے یہ پوچھ کر اسے تنگ کر دیتا تھا کہ کیا واقعی عورت کے بارے میں تمہارا کردار مضبوط ہے۔؟؟؟

اور کیا سوائے آدمؑ (اور پیغمبروں اور بزرگان دین) کے دنیا کے کسی بھی مرد کا کردار مضبوط رہا ہے؟۔

اور آدمؑ کا کردار بھی اس لئے مضبوط تھا کہ اس وقت دنیا میں حوا کے سوائے اور کوئی عورت تھی ہی نہیں۔

مگر جیسے ہی دنیا میں ایک سے زائد عورتیں پیدا.. ہوئیں مرد کے اندر چھپا ہوا جانور باہر آ گیا اور دنیا میں انسان کا پہلا خون عورت ہی کے ملنے بہایا گیا۔

یہ مضبوط کردار کیا ہے ــ؟

مضبوط کردار کا یا شرافت کا اپنا الگ سے کوئی وجود نہیں ہے ۔

یہ صرف "جاننے پہچاننے والی نظروں کی زنجیروں کی قید" ہوتی ہے جس میں انسان جکڑا رہتا ہے لیکن چونکہ.. نظروں کی زنجیریں نظر نہیں آتیں اسی لئے اسے "قیدی" نہیں کہا جاتا بلکہ "شریف" اور مضبوط کردار کا انسان کہا جاتا ہے ۔

اگر انسان پہچاننے والی نظروں کی زنجیروں میں جکڑا نہ رہے تو پھر انسان ایک دوسرے کے لئے جانور ہو۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی گناہ ہوتے ہیں

"بابوجی، میرے پاس ہے لائسنس، میں ابھی لاکے دکھا سکتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں تو بس آپ کا دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا، یہیں بالکل پاس ہے میرا گھر، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آج چیکن ہو رہی ہے، ورنہ روز تو میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ہیں بابوجی؟ موڑلوں رکشہ؟"

مگر بابوجی رکشہ سے اتر چکے تھے!۔ اس جگہ سے ذرا سا آگے کے لئے انھوں نے آٹھ آنے طے کئے تھے، پر موقع سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ایک چونی نکالی اور اس کی طرف پھینک کر نو دو گیارہ ہو گئے! مثل ہے بندہ ہر طرح سے بچتا ہے!

عید کی صبح تھی ـــــ نورو کوٹھری کا دروازہ اندر سے بھیڑے ہوئے، سر جھکائے بیٹھا تھا ـــــ ایک طرف کونے میں آڑی بندھی ہوئی ستلی کی الگنی پر ایک نئی دھاری دار قمیص اور ایک چھتّا لٹھے کا پاجامہ لٹک رہا تھا، دوسری طرف ایک پیلی چمک دار فراک لہرا رہی تھی اور اسی کے پاس ربن جھول رہا تھا، ہرے رنگ کی ٹوپی گلابی پتلے کاغذ میں لپٹی پوسٹ کارڈ کے پاس طاق میں رکھی تھی۔ شاید اس کے رکھے جانے ہی سے پوسٹ کارڈ کا ایک کونا ذرا باہر کو کھسک آیا تھا جس پر لکھا تھا:

"اور یہ رمضان کا مبارک مہینہ ہے، جب اللہ کی رحمتیں اپنے گناہ گار بندوں پر آسمان سے اترتی ہیں۔"

دودھ والا نورو کو صبح کو پاؤ بھر دودھ حسب دستور دے گیا تھا، اس نے اماں کو دے جانے والی سویوں میں سے تھوڑی سی سویاں بھی ابال لی تھیں، مگر یہ سب کچھ پیالے میں بھرا کونے میں رکھا تھا ـــــ اس نے کھانے کی کوشش تو کی تھی مگر اکیلے کیا کھایا جاتا ـــــ آس پاس کے دو ایک ساتھی نماز پڑھنے چلے گئے تھے، مگر اس نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا ـــــ!

دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے ایک بار پھر پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ دروازے پر کھڑ کھڑ ہوئی، پھر کوں کوں کی آواز آئی پھر بھورو نے اپنے منہ سے دروازہ ذرا سا کھول دیا۔ اگلے پنجے اندر رکھے اور گردن اٹھا کے نورو کا منہ تکنے لگا جیسے آنے کی اجازت مانگ رہا ہو!

نورو مسکرا پڑا!!

بھورو فوراً اس کی مسکراہٹ کو سمجھ گیا، آدھا اندر آ گیا اور منہ اٹھا کر کندھے تھرتھراتے ہوئے کوں کی سے آواز نکالی!

"آؤ ـــــ آؤ دوست" نورو نے کہا ـــــ اور پھر وہ مٹی کی رکابی لینے اٹھا، جس میں وہ بھورو کو چائے دیا کرتا تھا!

نورو کو اٹھتے دیکھ کر کتا کونے میں دبک گیا، دم پچھلی ٹانگوں میں سمیٹ لی اور اس کی نمناک آنکھیں، خوف کی پرچھائیاں لئے کونے میں رکھی ہوئی نیم کی سنٹی پر جم گئیں!

نورو نے ایک دم آگے بڑھ کر سنٹی اٹھائی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہر پھینک دیا۔

پھر اس نے پیالے سے اوپر اوپر کا دودھ رکابی میں "انڈیلا" اپنا پیالا اپنے ہاتھ میں لیا اور دودھ کی رکابی بھورو کی طرف کھسکاتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا ـــــ پیٹھ دیوار سے لگائی اور بولا: "آؤ دوست ـــــ ہم دونوں کھائیں ـــــ آؤ"

بھورو نے اسے ایک پل حیران ہو کر دیکھا، پھر سر ہلایا کندھے تھرتھرائے، ذرا سا جھجکا۔ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

نورو نے بھی پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ اور میٹھی سویوں میں کچھ نمک کا مزہ بھی شامل ہوتا جا رہا تھا۔

ایک اہم اعلان کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۸۰

اور مجید خاں اندھیرے میں گھر گیا تھا۔

کچھ ارادی اور غیر ارادی طور پر مجید خاں ہانگ کانگ کی سڑکوں پر ڈھونڈ رہا تھا۔ کہ کسی اندھیرے نکڑ، کسی رکشہ والے، کسی ٹیکسی ڈرائیور، کسی "راتوں کے بیوپاری" سے یا کسی اسٹریٹ لیمپ کے کھمبے تلے اسے ایک رات مل جائے تاکہ اس ٹھنڈے، بے، اجنبی اندھیرے سے اسے نجات ملے۔

مجید خاں نے اپنے ایک جاپانی جہاں گشت دوست سے جو بار بار ہانگ کانگ جا چکا تھا یہ سن رکھا تھا کہ سورج ڈوبنے کے بعد ہانگ کانگ کی اسٹریٹ لیمپوں کے نیچے ملک ملک کی راتیں جمع ہوتی ہیں۔

ہانگ کانگ راتوں کا شہر ہے۔ بین الاقوامی راتوں کا شہر۔ کیونکہ مشرق میں ہانگ کانگ مغرب کا آخری دھبّہ ہے۔ آخری داغ۔

مشرق میں انگریزوں کی آخری کالونی......

بحرالکاہل میں انگریزوں کا آخری فوجی اڈّہ...... جس کی سنگینوں اور توپوں کے رخ پہلے جاپان کی طرف تھے اب چین کی طرف ہیں۔

ہانگ کانگ چین کا دروازہ ہے۔ جہاں اپنی دانست میں انگریزوں اور امریکیوں نے چینی کمیونزم کو روک رکھا ہے۔

مشرق میں انگریزوں کا سورج صرف ہانگ کانگ کی پہاڑیوں سے طلوع ہوتا ہے۔ باقی سارے مشرق میں انگریزوں کا سورج گنگا، میرا، راوی میں میکانگ میں کبھی کا ڈوب چکا ہے۔ اور اب ہی لاکھوں کروڑوں انگریز سپاہی بحرالکاہل کے اس پہاڑی جزیرے ہانگ کانگ میں سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کا سورج ہانگ کانگ کے دریائے پرل میں ڈوبنے نہ پائے۔

لاکھوں، کروڑوں سپاہی۔ اپنی اپنی بیویوں، اپنی اپنی منگیتروں اور اپنی اپنی محبوباؤں سے ہزاروں میل دور اور موت سے بہت قریب۔

اور ان دونوں کے درمیان عورتیں۔

عورت، زندگی کی سب سے بڑی للک۔ اور اسی للک کے جال میں ملک ملک کے سپاہی بھی جکڑے ہوئے ہیں اور ملک ملک کی عورتیں بھی۔

آغوش میں عورت ہو تو مرد موت سے بھی نہیں ڈرتا اسی لئے ہانگ کانگ میں سپاہی بھی ہزاروں ہیں اور عورتیں بھی ہزاروں۔

فوج سے جنگ لڑی جاتی ہے اور جنگ سے دنیا میں بیوگی پھیلتی ہے۔ اور پھر جیسے ہی سورج ڈوبتا ہے عورت طلوع ہوتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم نے بھی ہانگ کانگ کو دنیا بھر کی راتوں کا شہر بنا دیا ہے۔

اور کوئنس روڈ پر سے ملک ملک کی راتیں گزر رہی ہیں۔ اور مجید خاں یہ فیصلہ نہیں کر پایا ہے کہ کون سی رات خوبصورت ہے۔ چینی رات، جاپانی رات، ملائی رات، فلپائنی رات، سیامی رات، برمی رات، انگریزی رات، امریکن رات،

کوئنس روڈ پر سے جتنے بھی مرد گزر رہے تھے۔ وہ مجید خاں کے لئے سارے کے سارے اجنبی ہیں۔ لیکن عورت کوئی اجنبی نہیں۔ وہ کسی عورت کو نہیں جانتا لیکن کوئی عورت بھی اجنبی نہیں ہے۔

کتنا ہی دور دراز کا پردیسی ہو مرد سب سے پہلے عورت کو پہچان لیتا ہے...... آدم سے لے کر مجید خاں تک دنیا کی کوئی عورت کسی مرد کے لئے کبھی اجنبی نہیں۔ صرف اس کا نام، اس کی قومیت، اس کی وطنیت اجنبی ہوتی ہے۔ عورت اجنبی نہیں ہوتی۔

چنانچہ جب ایک لیمپ پوسٹ کے ساتھ لگی کھڑی ایک پستہ قد گڑیا جیسے چھوٹے۔ گول اور سیدھے چہرے والی لڑکی نے مسکرا کر مجید خاں کی طرف دیکھا تو مجید خاں خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا گیا اور اب وہ اس کے قریب پہنچ گیا تو لڑکی نے چھوٹتے ہی کہا۔

"ٹونٹی ڈالرز"

مجید خان نے انگریزی میں اس سے کہا۔

وہ سب سورج ڈوبنے کے بعد اور سورج نکلنے تک ہوتے ہیں۔ کیونکہ اندھیرے میں آدمی جاننے پہچاننے والی زنجیروں سے آزاد ہوجاتا ہے۔ وہ دلیر ہوجاتا ہے کہ

"اب مجھے کون دیکھنے والا ہے؟ کون پہچاننے والا ہے ـــــ؟"

مجید خاں بھی جب تک کراچی میں تھا اسی لئے شریف یا مضبوط کردار کا نوجوان تھا کہ وہ جاننے پہچاننے والی نظروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اور جب اس کی شرافت اور مضبوط کردار کی شہرت شہر میں عام ہو گئی تو اسے مجبوراً کلثوم سے شادی کرنا پڑی۔ اور پھر وہ قوم کے نوجوانوں کے کردار کی اصلاح کرنے والی تحریک کا صدر بھی چن لیا گیا

اس تحریک کا صدر چن لئے جانے کے بعد ملک جلسوں اور اخباروں میں چھپنے والی ان تصویروں کے باعث وہ جیسے شہر بلکہ ملک کی ساری نظروں میں جانا پہچانا جانے لگا۔ . . پھر تو وہ اپنی قوم کی ان گنت جاننے پہچاننے والی نظروں کی زنجیروں میں ایسا جکڑا گیا کہ پھر اندھیرا بھی نظروں کی ان زنجیروں کو چھپا نہ سکا۔ چنانچہ ایک بار جب آدھی رات کے قریب وہ اپنے ایک کنوارے دوست کے ساتھ گھر لوٹ رہا تھا اور ایک اندھیری گلی میں اسے ایک عورت کھڑی نظر آئی اور اس کا کنوارا دوست اس عورت کے پاس پہونچ گیا۔ تو مجید خاں کا دل ایک دم زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جاڑوں کی بے حد ٹھنڈی رات کے باوجود وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں تھر تھر کانپنے لگیں۔ لیکن اس کے دل کا برسوں سے سویا ہوا چور ہڑبڑا کر جاگ پڑا۔ اور اسے بڑھاوے دینے لگا۔

"کیوں گھبرا رہا ہے؟ بڑا گہرا اندھیرا ہے۔ کون تجھے پہچانے گا؟ کون تجھے دیکھ رہا ہے؟"

اس بڑھاوے نے اس کے قدم اس عورت کی طرف بڑھا دیئے۔ لیکن عین اسی وقت دور ایک گلی سے ایک کار اسی گلی میں مڑ گئی اور گلی میں اجالا پھیل گیا۔

اجالا تیزی سے قریب آرہا تھا۔ اسی لئے مجید خان گھبرا کر، دوڑ کر ایک اور گلی میں گھس گیا۔ اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اجالے نے اسے گناہ سے بچا لیا۔ لیکن اس کا شکر ادا کرنا ایسا ہی تھا جیسے کھسیانا بلّا کھمبا نوچ رہا ہو۔

اس ایک واقعہ کے علاوہ مجید خاں جب تک کراچی بلکہ پاکستان میں رہا رات کے اندھیرے میں بھی اس کے لئے کلثوم کے سوائے کراچی بلکہ سارے پاکستان میں اور کوئی عورت نہیں رہتی تھی۔

عورت ہے تو صرف کلثوم۔۔ رات ہے تو صرف کلثوم۔

مگر جب کلثوم سے ہزاروں میل دور ہانگ کانگ کی پہاڑیوں کے عقب میں سورج غروب ہو گیا تو اچانک کوئنس روڈ پر اندھیرے نے مجید خاں کو گھیر لیا۔

وہ جب کراچی کے ہوائی اڈے سے اڑا تھا تو اسی وقت جاننے پہچاننے والی نظروں کی ساری زنجیروں سے آزاد ہو چکا تھا۔

اور اب وہ کوئنس روڈ پر بھی بالکل آزاد کھڑا تھا۔

اسے کوئی جاننے والا نہیں، کوئی پہچاننے والا نہیں۔

وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے۔

برسوں کا قیدی جب آزاد ہوتا ہے تو اس کی سب سے پہلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ جلد سے سورج ڈوب جائے۔

چنانچہ سورج ڈوبے بڑی دیر ہو چکی تھی۔ رات کا کہیں کوئی پتہ نہ تھا۔ اور مجید خان اس اجنبی اندھیرے میں بوکھلا گیا۔

پردیسی کو اندھیرا بہت پریشان کرتا ہے۔

پردیس کا اندھیرا۔

اور اندھیرا بھی جاڑوں کا اندھیرا۔۔۔ جو اس وقت اور بھی زیادہ لمبا اور۔۔۔ اور بھی زیادہ کٹھن ہو جاتا ہے۔ جب کہ آدمی اپنے ملک سے ہزاروں میل دور ایک اجنبی سرزمین پر اکیلا اور جاننے پہچاننے والی نظروں سے بالکل آزاد ہو۔

پھر بھی مجید خاں گناہ سے ڈر رہا تھا۔

"کیوں ـــــ؟"

رات گناہ کی ماں ہے۔

گناہ اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔

میں نہیں بلکہ قحبہ خانے میں بھی بڑی قوم اور چھوٹی قوم ہے۔
مجید خاں بڑا اداس آہستہ آہستہ چلنے لگا۔
ایک ہوائی جہاز کمپنی کے بہت بڑے اشتہاری بورڈ کے سائے میں ایک سفید وسرخ عورت کھڑی تھی وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ مجید خاں اس کے قریب پہونچ کر رکا لیکن اس عورت نے منہ پھیر لیا۔ مجید خاں بڑی دلیری کے ساتھ اس کے قریب گیا اور انگریزی میں بولا۔
"رات فٹ پاتھ پر کھڑے ہونے کیلئے نہیں ہوتی۔"
مگر اس عورت نے ماتھے پر تیوریاں چڑھا کر کہا
"یو۔ آر۔ بلیک۔ اینڈ آئی ڈونٹ لائیک۔ بلیک پیپل"
عورت یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ مجید خاں کو بڑا دکھ ہوا۔
گناہ میں بھی پالٹیکس ہوتی ہے۔؟
عجیب اور انوکھا تجربہ۔!
رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی مجید خاں کا جی چاہا کہ اندھیرے ہی کو گلے سے لگا کر سینے سے چپٹا کر اپنے ہوٹل کے بستر پر گر کر سو جائے۔
مگر ہانگ کانگ ہوٹل سے قریب اندھیرے میں اسے ایک سسکی بلکہ ایک بے آواز سیٹی سنائی دی۔
مجید خاں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک بند دکان کے شوکیس کی آڑ میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ خدوخال سے چینی معلوم ہوتی تھی مجید خاں اس کے قریب آگیا، اب اسے رات کی نہیں صرف اندھیرے کی تلاش تھی ـــــ اسلئے مجید خاں بادل ناخواستہ اس لڑکی کے قریب گیا اور اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے بولا۔
"آئی ڈونٹ وانٹ یو"
لڑکی نے حیرت سے پوچھا۔
"وہائی ـــ؟"
مجید خاں نے کہا۔
"کیونکہ تم وہ سب کچھ نہیں سمجھ سکو گی جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں"
لڑکی نے بڑی رواں انگریزی میں کہا۔
"میں انگریزی بہت اچھی طرح جانتی ہوں پچھلی جنگ سے پہلے میرا مرد ایک انگریز تھا۔ وہ مجھے لندن لے گیا تھا۔ میں۔ میں تو شیکسپیئر کے ڈرامے بھی پڑھ سکتی ہوں"
شیکسپیئر کی انگریزی۔! انگریزی کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے بکنگھم پیلیس اور وائٹ ہاؤس سے لے کر دنیا کے ہر قحبہ خانہ تک ـــــ صرف انگریزی ہی لین دین کی زبان ہو گئی ہے۔!
مگر انگریزی کا دم غنیمت ہے۔ اگرچہ انگریزوں کا سورج صرف ٹیمز کے پانیوں میں ڈوبتا ہے لیکن انگریزی کبھی نہیں ڈوبتی ـــ اور انگریزی نہ ہو تو پردیس میں انسان بالکل گونگا ہو جائے۔
وہ چینی لڑکی واقعی بڑی رواں انگریزی بول رہی تھی وہ ایک انگریز کی وجہ سے بیوہ ہوئی تھی۔ اور اب انگریزی کے باعث ہر رات سہاگن ہو جاتی تھی۔ اس نے صرف دس ڈالر مانگے تھے۔ مجید خاں اسے بیس ڈالر دے رہا تھا۔ اور اسے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔
"میں ایشیا کو ویشیا نہیں دیکھنا چاہتا"
لڑکی نے بھی بڑی "خودداری" کے ساتھ جواب دیا
"اور میں ایشیا کو بھکاری نہیں دیکھنا چاہتی"
مجید خاں آگے بڑھ گیا۔ لڑکی شاید یورپ اور امریکہ کا انتظار کرتی رہ گئی۔
مجید خاں کاؤلون ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا جو چینی مین لینڈ پر واقع تھا۔ چینی مین لینڈ اور ہانگ کانگ کے درمیان دریائے پرل بہتا ہے۔
جب مجید خاں بلیک پیئر پر پہونچا تو اسے معلوم ہوا کہ ہانگ کانگ سے مین لینڈ آخری فیری (لانچ) ایک بجے رات کو جاتی ہے اور اس وقت دو بج رہے تھے۔
مجید خاں پریشان سا ہو گیا۔ کہ اب وہ کیا کرے کہاں جائے۔ اور کہاں سوئے۔

ڈالرز جتنے چاہو دوں گا۔ ڈالرز کی فکر نہ کرو لیکن..

لڑکی نے بات کاٹ کر کہا۔

"نو انگلش... جاپانیز"

مجید خاں جاپانی نہیں جانتا تھا۔ لڑکی انگریزی نہیں جانتی تھی۔ دکاندار بھی موجود۔ گاہک بھی موجود۔ دکان کا پتہ نہیں تھا۔

لڑکی شاید جاپانی زبان میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں تمہارے ہوٹل نہیں جا سکتی اور مجید خاں یہ چاہتا تھا کہ اس کے ہوٹل چلے۔ یا پھر وہ لڑکی ہوٹل چلنے کے لئے بھی تیار ہو۔ مگر مجید خاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجید خاں نے جھنجلا کر کہا۔

انسان ایک دوسرے کے قریب ہیں مگر زبان بھی عجیب ظالم ہے جو ایک دوسرے سے قریب انسان کو بھی ایک دوسرے سے کتنی دور کر دیتی ہے۔!

لڑکی نے کہا۔

"نو ٹاک۔ ٹوینٹی ڈالرز۔ ٹو۔ آدرس"

مجید خاں نے جواب دیا۔

"ایگریڈ"

مگر عین اسی وقت ایک ٹیکسی کار ان کے قریب آ کر رکی۔ اس ٹیکسی کا ڈرائیور بڑی عجیب نظروں سے مجید خاں کو دیکھتا ہوا قریب آیا اور اس سے چیاؤں میاؤں کرنے لگا۔ مجید خاں کے پلے صرف ایک لفظ پڑا۔

"امریکن"

مجید خاں نے ٹیکسی کی طرف دیکھا تو ایک امریکن نشہ میں دھت سر جھکائے پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لڑکی نے جھک کر ٹیکسی کی طرف دیکھا اور بڑی خوشی سے بولی۔

"ہائی۔۔۔ اچھے ری کین!"

اور وہ مجید خاں کی طرف دیکھے بغیر پکا سودا توڑ کر ٹیکسی کی طرف دوڑی اور دروازہ کھول کر اس امریکن کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کے سر کے بال پکڑ کر اسے نشے سے جگانے لگی۔ مجید خاں کو بڑا غصہ آیا اور وہ ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ مگر ٹیکسی چلی گئی۔

مجید خاں رک گیا اور اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پاکستان امریکہ کے مقابلے میں کتنا پسماندہ ملک ہے۔

کاش وہ لڑکی انگریزی اچھی طرح جانتی اور مجید خاں اسے سمجھا سکتا کہ "تم جاپان کی آبرو، ایشیا کی آبرو امریکہ کو کیوں بیچ رہی ہو۔؟"

مگر وہ فوراً ہی سوچ کر جھینپ گیا کہ یہ رقابت کا کیا گھٹیا جذبہ ہے۔ کیا وہ خود امریکن رقیب کی طرح ایک غیر ملکی نہیں تھا؟ کیا وہ خود ایک ایشائی ہو کر ایشیا کی آبرو نہیں خرید رہا تھا؟ کیا وہ خود جاپان کی آبرو نہیں خرید چکا تھا مگر... وہ لڑکی جاپان کی آبرو، ایشیا کی آبرو ہی کب رہی!

جو عورت آبرو بیچ دیتی ہے اس کا کہاں کوئی ملک ہوتا ہے۔ کہاں کوئی مذہب ہوتا ہے۔ کہاں کوئی قومیت ہوتی ہے! جو عورت عصمت کھو دیتی ہے وہ اپنی وطنیت کھو دیتی ہے وہ اپنی قومیت بھی کھو دیتی ہے۔ وہ صرف ایک جسم ہوتی ہے اور جسم دنیا کے سارے ملکوں اور ساری قوموں کے انسانوں کے جسم ایک جیسے ہوتے ہیں۔

جاپان کی آبرو تو اس وقت ٹوکیو، ناگاساکی ہیروشیما وغیرہ کے گھروں میں اپنے اپنے شوہروں کی آغوش میں محفوظ ہو گی

یہ عورت کہاں ایشیا کی آبرو ہے۔!

مجید خاں کو اپنے امریکن رقیب پر غصہ تو بہت آ رہا تھا۔ لیکن جس طرح بے عصمت عورت کی کوئی قومیت اور کوئی وطنیت نہیں ہوتی اسی طرح سورج ڈوب جانے کے بعد اور پردیس میں مرد کی بھی کوئی قومیت اور کوئی وطنیت باقی نہیں رہتی۔

سورج ڈوبنے کے بعد اور پردیس میں مرد نہ امریکن ہوتا ہے نہ انگریز، نہ جاپانی نہ پاکستانی، سب کے سب محض مرد ہوتے ہیں۔ صرف جنسی جانور۔ مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ بڑی قوم اور چھوٹی قوم صرف یونائیٹڈ نیشنز کے اجلاس ہی

ٹیکسی ڈرائیور نے پوری بتیسی کھول کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ ٹو مچ۔ ٹو مچ۔ تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ فرینڈ۔ اینڈ۔ گڈ نائٹ۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے تین مرتبہ جھک کر اسے تعظیم دی اور چلا گیا۔

بوڑھی عورت بھی اندر چلی گئی اور مجید خاں گوتم بدھ کے ننھے مجسمے کو گھورنے لگا۔ کیپل دستو سے کولمبو، اور کولمبو سے رنگون، بنکاک اور ہانگ کانگ تک بحرالکاہل کے ساحل پر جگہ جگہ گوتم بدھ کے مجسمے کھڑے ہیں لیکن بدھ کا عرفان کہیں بھی نہیں ہے۔

اتنے میں اسے محسوس ہوا کہ کمرے میں "پیرس کی شام" مہک رہی ہے۔ اس نے چہرہ موڑ کر دیکھا تو ایک بھرے بھرے جسم کی لمبی سانولی سلونی جوان عورت شلوار قمیص میں ملبوس صوفے کے پاس کھڑی ہے۔ مگر اس کے سر پر یا گلے میں دوپٹہ نہیں تھا۔ لیکن اسے دوپٹے کی ضرورت ہی کیا تھی!

عورت کو دوپٹے کی ضرورت صرف اسی وقت ہوتی ہے جب تک کہ اس کی زندگی میں صرف ایک ہی مرد ہو

وہ عورت بھی عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جیسے اس نے پہلی بار کوئی ہندستانی دیکھا ہو یا بڑے لمبے عرصے کے بعد اپنے جیسے رنگ اور اپنی مٹی کے انسان کو دیکھا ہو۔ اس کے چہرے پر جذباتیت کی ہلکی سی پرچھائیں آ گئی تھی۔ لیکن وہ فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے خالص دکان دارانہ لہجہ میں بولی۔

"ڈرائیور سے میں نے تیس ڈالر کہے تھے۔"

مجید خاں نے کوئی جواب نہیں دیا اور جیب سے اس نے تیس ڈالر نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے اس نے مسکراتے ہوئے تیس ڈالر کے نوٹ اپنی انگلیاں میں۔ اڑس لیے اور بولی۔

"کچھ پیو گے؟"

مجید خاں نے جواب دیا۔

"نہیں۔ میں کچھ نہیں پیتا۔"

عورت نے پوچھا۔

"ہندو ہو یا مسلمان ہو؟"

مجید خاں کے دل پر جیسے گھونسہ لگا۔

مذہب قحبہ خانہ میں بھی گھس آئے ہیں۔

لیکن مجید خاں نے جواب دیا۔

"نہ ہندو نہ مسلمان ــ آدمی جب گناہ کے راستے پر قدم رکھتا ہے تو مذہب اس کا ساتھ چھوڑ کر الٹے پاؤں لوٹ جاتا ہے۔"

یہ سن کر عورت کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ معاً سنجیدہ ہو گئی۔ اور اس نے بڑی عجیب نظروں سے مجید خاں کو گھورنا شروع کیا۔ اسے بڑی الجھن محسوس ہو رہی تھی مجید خاں کو جیسے شرارت سوجھی اور اس نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

مجید خاں کا اندازہ صحیح نکلا کہ وہ مجید خاں کو ہندستانی سمجھ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کی توقع کے عین مطابق یہ کہا

"مسلمان ــ میرا نام کلثوم ہے۔"

کلثوم کا نام سن کر مجید خاں کو چونک پڑنا چاہیے تھا لیکن وہ بڑی معنی خیز مسکراہٹ سے گوتم بدھ کے مجسمے اور گاندھی جی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"بڑی تجربہ کار دکان دار ہو۔ یہ تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ عورت گناہ کی لذت کو بڑھا دیتی ہے۔ مگر میں بھی تمہاری طرح بڑا گھاگ گاہک ہوں۔ کبھی کوئی دکان دار مجھے دھوکا نہ دے سکا اس لئے تم بھی مجھے دھوکا نہیں دے سکیں کہ تم کلثوم یا مسلمان ہو۔"

عورت بڑی چکرائی اور اس کی وہی حالت تھی جو کسی جھوٹے کی جھوٹ پکڑے جانے پر ہوتی ہے۔ وہ ہلکی سی ناراضگی سے بولی ـــ...

عجیب آدمی ہے۔!

اور پھر اس نے یہ جاننے کے لئے کہ یہ کس قسم کا آدمی

اتنے میں ایک ٹیکسی ڈرائیور اس کے پاس آیا۔ پتہ نہیں چینی تھا یا جاپانی۔ مگر تھا دبلا پتلا، پستہ قد، کرنجی آنکھیں اور پیلے چہرے والا۔ مگر وہ بھی بڑی رواں انگریزی بولتا تھا
انگریزی جہاں حصول علم کے لئے سب سے بڑی زبان ہے وہاں انگریزی "دھندہ" چلانے کی بھی سب سے بڑی زبان ہے۔

اس ٹیکسی ڈرائیور نے مجید خاں کے کچھ کہنے سے پہلے کہا۔

"باقی رات گزارنا چاہتے ہو۔؟"

مجید نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا۔

ٹیکسی چلتی رہی۔ اور ڈرائیور کی زبان بھی چلتی رہی۔ اور وہ ہانگ کانگ کی عورتوں کی باتیں کرتا رہا اور اس سے پوچھ رہا تھا کہ اسے کس ملک کی عورت پسند ہو

مجید خاں نے بہت مختصر ساری آپ بیتی سنا دی۔ ٹیکسی ڈرائیور بہت تاجرانہ انداز میں افسوس کر رہا تھا۔ یا پھر وہ سچ مچ بڑا اجلا بھلا تھا۔ بڑبڑانے لگا۔

"فری ورلڈ۔ فری ورلڈ۔ ڈیموکریسی!۔ بلیک اینڈ وائٹ۔ بگ فور۔ یو این۔ اسمال نیشنز۔ میگاٹن بم——

پتہ نہیں وہ کیا کیا بکے جا رہا تھا۔ مجید خاں کا جی تو چاہا کہ چیخ پڑے کہ اپنی بکواس بند کرو۔ کہاں ہے فری ورلڈ؟ گناہ کے بازاروں میں، انسان رنگ نسل قوم، وطن، بڑی قوم چھوٹی قوم کی زنجیروں میں جکڑے ایک دوسرے سے دور، ایک دوسرے سے متنفر اور منتشر ہیں۔ تم یہ کیا فری ورلڈ۔ فری ورلڈ کی بکواس کئے جا رہے ہو۔

مگر مجید خاں بہت اداس اور بہت سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔

"وہ جگہ کتنی دور ہے جہاں تم مجھ کو لے جانا چاہتے ہو؟"

"بہت ہوم سک، فیل کر رہے ہو بابو۔ وہ جگہ بھی آ گئی۔ ایسی جگہ لایا ہوں جہاں پہونچ کر تم یوں محسوس کروگے جیسے انڈیا پہونچ گئے ہو۔ ہی ہی ہی۔ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم انڈیا جانا چاہتے ہو۔ ہی ہی ہی...."

وہ مجید خاں کو ہندستانی سمجھ رہا تھا۔ مجید خاں بھی اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ ہندستانی نہیں ہے۔

ٹیکسی ایک تنگ سی گلی میں جا کر رک گئی۔ سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

تین منزلہ بلڈنگ تھی جس کے سیکنڈ فلور کے ایک فلیٹ کی صرف دو کھڑکیوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ باقی ساری بلڈنگ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے مجید خاں سے سرگوشیانہ لہجہ میں کہا

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"

مجید خاں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کر اس فلیٹ پر پہونچ گیا۔ جس میں روشنی اور غالباً کوئی عورت بھی جاگ رہی تھی۔

ڈرائیور نے دروازے پر بہت آہستہ سے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھی عورت نے جو برمی یا ملائی معلوم ہوتی تھی دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہو گئے۔

چھوٹا سا کمرہ بلکہ ڈرائینگ روم تھا جس میں ایک چھوٹا سا صوفہ سیٹ تھا۔ ایک کونے میں ایک ریڈیو سیٹ پر چھاتا گوتم بدھ کا ایک سیاہ آبنوسی چھوٹا سا مجسمہ —— دیوار پر چند نیم عریاں تصویروں کے علاوہ گاندھی جی کی بھی ایک بڑی تصویر تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور مجید خاں کو صوفے پر بٹھا کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ اور پھر واپس آ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

آل رائٹ۔ اب میں جاتا ہوں۔

مجید خاں نے جیب سے بیس ڈالر نکال کر اسے دیتے ہوئے پوچھا۔

"اینف ——؟"

"نیو میمن مسجد" کو کیوں چھوڑ گئیں؟۔

مجید خاں کے اس جملہ سے وہ چونک پڑی۔ وہ پھر کراچی سے ہانگ کانگ لوٹ آئی تھی۔ جھینپ کر مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کیا وہاں آسن لی اوجھا، روڈ اور گنگارام بلڈنگ ابھی تک موجود ہیں؟"

مجید خاں نے کہا۔

"سب موجود ہیں۔ صرف تم نہیں ہو"

وہ شرما گئی اور اچانک اٹھ کر تیزی سے دوڑتی ہوئی اندر کمرے میں گئی۔

اور تھوڑی بعد وہ آئی تو اس کا سر دوپٹے سے بھرپور اوڑھا ہوا تھا۔ اور اس کی ہتھیلیوں میں بہت سے چنبیلی کے پھول تھے۔

وہ مجید خاں کے قریب آکر اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور اس نے سارے پھول اس کے قدموں میں بکھیر دیے۔

مجید خاں نے حیران ہو کر اپنے پیر سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تم بھول رہی ہو کہ میں مسلمان ہوں"

لیکن اس عورت نے مجید خاں کے قدم مضبوطی سے پکڑ لئے اور بولی۔

"تم مسلمان نہیں۔ تم کراچی ہو۔ کراچی جہاں پر گنگارام بلڈنگ ہے۔ گنگارام بلڈنگ جس کے ایک کمرے میں تیس سال پہلے کملا گیان چندانی پیدا ہوئی تھی۔ کملا گیان چندانی جو ہانگ کانگ آکر رہ گئی"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سر مجید خاں کے گھٹنوں پر جھکا دیا۔

مجید خاں نے بڑے پیار سے کملا گیان چندانی کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں تو بند تھیں لیکن مجید خاں نے محسوس کیا جیسے کراچی کے آغوش میں آجانے سے کملا گیان چندانی جی اٹھی ہو۔

سے مجید خاں سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

اب کے مجید خاں کو غلط فہمی ہوئی اور اس نے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میں مسلمان ہوں"

یہ سنتے ہی جیسے اس عورت کے تن بدن میں اچانک آگ سی لگ گئی اور اس نے صوفے سے ایک دم اٹھ کر جیسے چیختے ہوئے کہا۔

"میں مسلمانوں سے نفرت کرتی ہوں۔ سخت نفرت ابھی ابھی یہاں سے نکل جاؤ۔"

اس کی حالت اس وقت ایک زخمی شیرنی جیسی ہو رہی تھی۔ مجید خاں نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"تم چاہو تو چلا جاؤں گا۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولتا اس لئے تمہیں میری اس بات پر بھی یقین کرنا چاہیئے کہ میں یہاں تمہارے "جسم" کے لئے نہیں، صرف "بستر" کے لئے آیا تھا۔ اچھا میں جاتا ہوں۔

مجید خاں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ عورت اپنے آپ جیسے بڑبڑائی۔

"جسم" کے لئے نہیں "بستر" کے لئے آیا تھا۔؟"

مجید خاں اس عورت کے قریب جا کر بولا۔

"تمہارے لئے یہ نئی بات سہی لیکن عورت اور مرد کے درمیان گوتم بدھ کا مجسمہ بھی ہو تو پھر جسم اور بستر میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔"

عورت کچھ نہیں سمجھی۔ مجید خاں دروازے کی طرف جانے لگا۔ عورت نے بڑی عجیب نظروں سے اسے دروازے کی طرف جاتا دیکھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ یا پھر اس لئے کہ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم بستر نہیں ہے۔ اس کا دل اندر ہی اندر پگھل سا گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ مجید خاں کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

مجید خاں دروازے سے نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ٹھہرو ــــ!"

مجید خاں رک گیا۔ اور اس نے صرف منہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آئی اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا زیادہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اب تم کہاں جاؤ گے۔؟"

مجید خاں نے جواب دیا۔

"نہیں جانتا کہاں جاؤں گا۔ بالکل اجنبی اور پردیسی ہوں۔ تین چار روز تک ہانگ کانگ میں ٹھہر کر واپس کراچی چلا جاؤں گا۔"

وہ عورت جیسے اچانک چیخ پڑی۔

کیا کہا ــــ کراچی۔!؟

اور اس نے بے اختیار مجید خاں کے دونوں کندھے مضبوطی سے پکڑ لئے اور انہیں جھنجھوڑ کر چیخنے لگی "کراچی ــ کراچی۔ کراچی ــ!"

اور پھر تیزی سے ڈوبتے ابھرتے سینے سے نکلتی ہوئی تیز تیز آواز سے اس نے کہنا شروع کیا۔

"تم نے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا کہ تم کراچی سے آئے ہو۔ میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ آؤ ــ اندر آؤ ــ آؤ ــ آؤ۔"

وہ جیسے خوشی سے ایک دم دیوانی ہو گئی اور مجید خاں کو ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے پھر صوفے کے پاس لے گئی اور اسے صوفے پر ڈھکیل دیا اور ایک دم جیسے ساکت ہو گئی اور کھڑکی سے باہر پتہ نہیں کتنی دور، پتہ نہیں کراچی تک دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔

گنگارام بلڈنگ ... آسٹن ہال اور جہانداد بلڈنگ، بندر روڈ سوامی نرائن کا مندر، ڈینسو ہال، لکشمی بلڈنگ، گوردھن داس مارکیٹ ......

مجید خاں نے مسکرا کر شرارت سے کھنکارتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

لکشمی بلڈنگ، اور گوردھن داس مارکیٹ کے درمیان

کچھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تنور سے روئیں مگر عورتیں ان کی گریہ وزاری کے بیچ میں کود پڑیں۔

"چنیا بیگم کیوں روتی ہو، اللہ تم کو دنیا میں ہی جنت دے گا۔"

"ہیں تو مصیبت سے بچا لیا ہے۔ تیری میری کوٹھیوں کے چکر کاٹتے، نوکروں کے دھکے کھاتے۔ تب کہیں ایک باٹی پانی نصیب ہوتا۔"

"نصیب تو ہو جاتا مگر اتنی دور سے لانے میں ہاتھ ٹوٹ جاتے۔"

چنیا بیگم کے آنسو پونچھ کر عورتیں چولھے ہانڈی کی فکر میں بھاگیں لیں لڑکے تھے کہ وہیں منڈلا رہے تھے۔ چنیا بیگم نے چھڑی اٹھا لی۔ لڑکے تو بڑوں بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے، چھڑی سے کیا ڈرتے۔ ہینڈ پمپ کی ہتی کو چھو کر چھوڑا۔ چنیا بیگم نے چھڑی اٹھائی تو ہنس ہنس کر آپس میں دھکم پیل کرنے لگے۔

چنیا بیگم نے ساری رات آنکھوں میں گزار دی اور خوشی اور خطرے دونوں ہی نے نیند بھگا دی تھی۔ پاس سے کتا بھی گزرتا تو اچھل کر چھڑی والا ہاتھ اونچا کر دیتیں۔ وہ یہی سمجھتیں کہ کہیں کوئی لڑکا نہانے نہ آگیا ہو، اسی خطرے کی وجہ سے تو انھوں نے اپنا پلنگ ہینڈ پمپ سے لا کر بچھایا تھا۔ لڑکا تو خیر کوئی نہ آیا۔ مگر یہ کتے مصیبت بن گئے تھے۔

"ہے ناس جائے، کہیں منڈیر پر چڑھ کر پیشاب نہ کردے"

وہ چھڑی لے کر کتے کو احاطے سے باہر تک نکال آئیں۔ اس محنت میں گھٹنے کا جوڑ جوڑ ٹوٹنے لگا مگر پھر تھوڑی دیر بعد ایک چھوڑ کئی کئی کتے آکر ان کے سامنے ٹہلنے لگتے۔ ادھر بارہ کے قریب چاند نکلا تو ان کم بختوں نے منہ اٹھا اٹھا کر رونا شروع کر دیا۔

"لو آج ہی تو ہینڈ پمپ بنا ہے اور آج ہی یہ رو رہے ہیں، ہے کیسا منحوس لگتا ہے۔" چنیا بیگم بڑبڑاتی ہوئی اٹھیں اور لپک کر ایک کتے کو چھڑی سے پیٹ ڈالا۔ کتوں کو شاید غیرت آ گئی تھی جو پھر پلٹ کر نہ آئے اور چنیا بیگم بڑے سکون سے اپنی داتا کی بش عش کرتی رہیں ——— "تو بھلا اگر یہ روپے ابھی بیٹھے بیٹھے جاتے تو پھر کیا ہوتا۔ اس کمبخت نے تو گھٹنے توڑ دیے ہیں۔ اپاہج سمجھ کر خیرات دینے لگے۔ اب عزت تو رہ گئی، کوئی آج تو نہ کہے گا۔ لونڈا آتے وقت خوامخواہ ہائے دیا مچا رہا تھا،

خطوں میں بھی یہی رونا ہوتا کہ اب واپس آجاؤ۔ ڈھلتی عمر میں کیا کرو گی، اسے پتہ نہیں اپنی اماں کا، ارے بٹیا اماں نے تو ہمیشہ اپنی محنت کی کمائی کھائی ہے۔ بس یوں ہی باتیں بناتا تھا کبھی چار پیسے نہ بھیجے، میں لیتی کب، صدقے کر کے پھینک دیتی — چنیا بیگم کوئی ایسی ویسی نہیں۔"

چنیا بیگم بڑے طنز سے ہنسیں۔ حقیقت تو یہی تھی کہ چنیا بیگم کوئی ایسی ویسی کم ہمت نہ تھیں۔

بڑی چھوٹی سی تھیں کہ ان کے ابا چل بسے۔ اماں کو جوانی کی بیوگی نے ایسا جھلا بنا دیا کہ بس ادھر کوئی بولا اور انھوں نے کاٹا۔ چنیا بیگم نے ذرا سی شرارت کی اور انھوں نے دھنکا۔

"منحوس کا کھا کھا کے مٹانی ہے، باپ کو کھا لیا، اب مجھے بھی کھائے گی، خدا غارت کردے۔"

چنیا بیگم بھی آخر اپنی ماں کی بیٹی تھیں۔ نو سال کی عمر میں وہ کوسنے دیتیں کہ سننے والے کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ جب کوئی سمجھاتا کہ ایسا نہیں کرتے تو اسے بھی قائل کر دیتیں۔

"پھر یہ ہمیں کیوں کوستی ہیں، جیسا کہیں گی ویسا سنیں گی، نہ کھلائیں روٹی۔"

دس سال کی عمر میں انھوں نے ایک گھر میں جھوٹے برتن مانجھنے کی نوکری کر لی۔ دو روپے مہینہ تو اس زمانے میں بہت ہوتے تھے اماں کو معلوم ہوا تو کلیجہ پھاڑ کر روئیں کہ بے باپ کی بچی ابھی سے نوکری کر رہی ہے چنیا بیگم کی مرمت بھی کی مگر وہ یہی سمجھتی رہیں کہ اماں تو جلتی ہیں۔ اب چنیا بیگم یہ سب کیسے سمجھتیں کہ کون اپنی اولاد سے محبت نہیں کرتی۔ انھیں تو بس مرحوم شوہر سے شکایت تھی جو بھری جوانی میں داغ لگا گئے۔ داغ جلتا تو قریبی لوگوں کو بھی آنچ محسوس ہوتی اور چنیا بیگم تو بہت قریب تھیں، انکی اپنی اولاد۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو اماں ضرور کسی نہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر جوانی کے کٹھور دن گزارنے کا سہارا کر لیتیں مگر اب یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ چنیا بیگم سوتیلے باپ کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ اپنا گوشت کاٹ کر کتے کے آگے ڈال دیا جائے۔

اماں کی عمر ڈھلی تو داغ کی بو تک باقی نہ رہ گئی۔ وہ تو بس بیٹی کے لیے جی رہی تھیں۔ ان کا سب کچھ بیٹی کا تھا۔ ساری

خدیجہ مستور

ہینڈ پمپ

شام ڈھلنے کے قریب تھی۔ ہینڈ پمپ لگ چکا تھا۔ اور اس وقت اس کے گرد منڈیروں والا فرش کیا جارہا تھا۔ بس ایک دو کرنیاں پھیرنے کی کسر رہ گئی تھی۔ احاطے کی ساری عورتیں اپنے کام کاج چھوڑ، ٹھٹ لگائے کھڑی تھیں لونڈے ہمک ہمک کر ہینڈ پمپ کی ہتی پکڑنا چاہتے مگر جینا بیگم فوراً ہی ہیں ہیں کرکے روک دیتیں۔

"لو ابھی کچا ہے، ابھی نہ چلانا، اکھڑ جائے گا، خبردار جو ہاتھ لگایا۔"

لڑکے اپنے ہاتھوں کی چُل کو مل مل کر رہ جاتے۔

"اماں کوئی بازو ہے جو اکھڑ جائے گا، جتنا پانی چاہو کھینچ لو۔" مستری نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"تم اپنا کام کرو جی، فرش کچا ہے، اکھڑے گا نہیں؟" جینا بیگم نے مستری کو قائل کردیا۔ مائیں چیخ چیخ کر اپنے بے قابو بچوں کو روکنے لگیں۔

"ارے کمینوں الگ رہو، ایک تو بیچاری نے پانی کا آرام دیا ہے اس پر سے نقصان بھی جھیلیں، اب آگے بڑھے تو ہاتھ توڑ دوں گی۔"

لڑکوں سے نپٹ کر ساری عورتیں جینا بیگم کی شان میں قصیدے پڑھنے لگیں۔

"جینا بیگم تو سچ مچ کی فرشتہ ہیں۔"

"سچ ہے نیکی کے فرشتے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔"

"مغل خاندان کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، ورنہ کون ہے جو اپنی محنت دوسروں کے آرام پر خرچ کرے، یہ تو نیک بندوں کا کام ہے۔"

"ابے ہٹ جاؤ حرام زادو، لاش نکلے، شیطانوں کی" لڑکے ہینڈ پمپ کی طرف بڑھ کر ہجو بھی کرتے جاتے۔

"احاطے کا مالک تو ایسا کنجوس ہے کہ اس سے کہہ کہہ کر زبان سوکھ گئی مگر اک ایک ہینڈ پمپ لگوا کر نہ دیا، جب کہو تو ٹکا سا جواب دے دیتا ہے، کہ چندہ کرکے لگوا لو نہ سب لوگ۔"

"دیکھ لینا اس کی دولت پر سانپ بیٹھے گا۔"

"مگر ہائے جینا بیگم کو دیکھو، کس کا ہوگا ایسا دل؟"

"میں تو کہتی ہوں یہ مریں گی نہیں شہید ہوں گی، دیکھ لینا۔"

قصیدے کا آخری حصہ سرگوشیوں میں ادا ہوا۔ مارے خلوص کے کئی عورتوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

مستری نے اپنا سامان سمیٹا اور تہبند جھاڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اب شام سنولا چکی تھی۔ جینا بیگم نے پاجامے کے نیفے میں کھسے ہوئے بٹوے کو نکال کر مزدوری دی اور پھر بٹوا جھاڑ کر ٹھونس لیا۔

"جینا بیگم کی تو نے ہی عزت رکھی ہے ——" منڈیر کے پاس بیٹھ کر جینا بیگم نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔ "مولا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے، تو نے کسی کی محتاجی نہ دی، قربان جاؤں تیری ذات کے ——" انھوں نے پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ لیے۔ اس وقت پرندے بسیرے کی تلاش میں سرپٹ اڑے جارہے تھے۔ سارے دن کی مزدوری سے لوٹے ہوئے مرد اب احاطے میں داخل ہونے شروع ہوگئے تھے۔

"آہ! ذات باری" — جینا بیگم نیلے آسمان کے اُس پار

کی دہلیز پر جابیٹھیں۔ یہیں تو ان کی اماں کھانا پکاتے پکاتے جوانی کا سارا ایندھن جلا بیٹھی تھیں۔

بڑی بیگم نے جو چینیا کو روتے دھوتے دیکھا تو خود ہی تخت سے اتر کر پاس آگئیں۔

"ہے، یہ تو اپنی شبراتن کی لونڈیا ہے؟" بیگم نے مارے وضع داری کے بلک کر پوچھا۔ چینیا بیگم نے شروع سے آخر تک سب حال کہہ سنایا۔

بس اسی وقت سے چینیا بیگم نے اپنی ماں کی جگہ سنبھال لی اور باورچی خانے کی الماری میں جہیز کا لوٹا کٹورا سجا دیا۔

رات کا کھانا پکا کر جب چینیا بیگم تھکی ہاری صحن میں آکر بیٹھیں تو ٹھنڈی ہوا اور کھلی ہوئی چاندنی میں میاں یاد آگئے۔ ادھر پیٹ میں بھی کوئی ننھی سی چیز بار بار پھدک رہی تھی۔ وہ رنجیدہ ہو گئیں۔

"ارے چینیا ذرا پلنگ ڈال کر لیٹ رہو، کچے دنوں میں الکسی آتی رہتی ہے، بھوک لگی ہو تو تم پہلے ہی کھا لو، ان دنوں میں تو بس پیٹ خندق ہو جاتا ہے، جب دیکھو بھوک لگی ہے۔" بیگم صاحب نے بڑے پیار سے کہا اور چینیا بیگم جیسے خوشی سے نڈھال ہو گئیں۔ سسرال میں تو خدمت کر کے کبھی ایک پھلکا چین سے نصیب ہوا۔ مفت کی خدمت بھی اور رہی اور رہ جاتی ہے محنت کے جب تک چار پیسے نہ نصیب ہوں کوئی عزت نہیں۔

ویسے تو وہ بچپن سے اپنی روزی خود کمانے لگی تھیں۔ مگر اب انھیں کچھ عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ اپنی محنت سے پیٹ بھرنے میں کیا مزہ ہوتا ہے۔ میاں کی یاد کو انھوں نے دھتکارنے کی کوشش کی۔ "ارے اس رشتے کا کیا، بس کمربند کی محبت ہوتی ہے۔" انھوں نے اپنے جی کو ڈھارس دی۔

دوسرے دن دوپہر میں اماں سے مل آئیں۔ انھیں ہدایت دی کہ خبردار جو کسی نے سسرال والوں سے میل کرانے کی سوچی۔ اس مٹو کے ساتھ رہنے سے تو یہ اچھا ہے کہ کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دیں۔

آتے وقت دوپٹے کے پلو سے دو روپے بھی کھول کر دے آئیں۔ یہ روپے انھیں منہ دکھائی میں ملے تھے اور ان دو روپوں کو انھوں نے اتنے دن تک کپڑوں کی تہوں میں چھپا چھپا کر رکھا تھا۔ ہر وقت ڈرتیں کہ کہیں میاں ان سے بھی ہنڈولا کا شوق نہ پورا کرنے لگیں۔ چلتے چلتے اماں سے یہ بھی کہہ آئیں کہ روپیوں کی طرف سے پریشان نہ ہونا۔ اب تو وہ اس لائق ہیں کہ دس کو کھلا کھائیں۔

حویلی میں دس سال گزر گئے۔ لڑکا پونے دس سال کا ہو گیا۔ بیگم صاحب نے قرآن شریف کے آٹھ پارے ختم کرا دیئے تھے۔ اماں مر کھپ گئیں، میاں کی دوسری شادی کی خبر بھی سن لی۔ سال کے بے تحاشہ موٹے ہونے کی اطلاع بھی۔ چینیا بیگم کی جوانی کی آگ چولھے کی آگ کے آگے مدھم ہو گئی تھی۔ میاں کبھی بھولے بھٹکے پردیسی کی طرح ذہن میں آتا اور چلا جاتا۔ چینیا بیگم اسے رہنے کے لیے اصرار بھی نہ کرتیں۔ محنت کے نشے میں آرام طلبی کا سارا حسن کھو کر رہ گیا تھا۔

مگر ایک بار جب چینیا بیگم دکان پر کھڑی سبزی خرید رہی تھیں تو میاں پر نظر پڑ گئی۔ جھومتے جھامتے کہیں چلے جا رہے تھے۔ کلیجے پر ہوک سی اٹھی، جی چاہا کہ بڑھ کر کلائی تھام لیں، اسے بے وفائی کا طعنہ دیں۔ لیکن جلد ہی اپنے پر قابو پا لیا۔ بیتی ہوئی دردناک باتیں یاد آگئیں۔ انھوں نے میاں کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

راستے بھر وہ سوچتی چلی آئیں کہ وہ بھی کوئی زندگی تھی، میاں کماؤ کھاؤ، جب بھی عورت محتاج رہتی ہے۔ اپنی محنت سے کھانے کمانے میں کیا سکھ ملتا ہے۔

پھر بھی گھر آکر انھیں جانے کیا ہوا کہ لڑکے کو کلیجے سے لگا کر بیٹھ گئیں اور — خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ بیگم صاحب نے بڑی مشکلوں سے تسلیاں دے دیکر چپ کرایا۔ اس دن کے بعد جوانی کی آگ پھر کبھی نہ بھڑکی جذبات بجھ کر راکھ بن گئے۔

زمانے کے پروں کی اڑان کتنی تیز تھی۔ بیگم صاحب کے دانت ٹوٹنے لگے۔ بیٹوں کے آدھے آدھے درجن بچے آبادی میں اضافہ کر رہے تھے۔ چینیا بیگم کا لڑکا جوان ہو گیا تھا۔ میاں صاحب نے اسے اپنے دکان پر نوکر رکھ لیا تھا اور بیگم صاحب نے ایک اچھے ناک نقشے کی یتیم لڑکی سے نکاح بھی کرا دیا تھا۔

بہو کے آتے ہی چینیا بیگم کو جانے کیوں اس سے نفرت ہو گئی۔

ناکامیاں، ساری حسرتیں بیٹی کی خوشیوں میں تبدیل ہوگئیں۔

"اری نامراد تو نوکری چھوڑ دے، میں مرجاؤں تو کیجیو۔" اماں جب حویلی والوں کے ہاں سے کھانا پکاکر آتیں تو بیٹی سے لڑ پڑتیں۔

"ہنہ! بیٹھے بیٹھے کس سے کھایا جائے گا۔" چنیا بیگم تو اپنی کمائی کی چاٹ پڑ گئی تھی۔ جوان ہوگئیں مگر اماں کی بات نہ اٹھائی تھی نہ مانی۔ دیکھتے دیکھتے پانچ روپے مہینے پر اسی گھر میں کھانا پکانے لگیں۔ عورتیں کنواری بالی کو نوکریاں کرتے دیکھتیں تو انگلیاں اٹھاتیں چنیا بیگم کا پیٹ کودتیں۔

"محنت کر کے کھانا بے حیائی ہے، اور بیٹھے بیٹھے کھانا بڑی عزت کی بات ہے، اپنی جائیوں کو کلیجے سے لگا کر کھلاؤ۔ ہم سے کیا واسطہ، ہم تو محنت کر کے کھاتے ہیں، کوئی محتاج ہیں۔"

ان کی اماں کو گٹھیا نے ستایا تو کام سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ جوڑوں میں طاقت ہی نہ رہ گئی تھی جو پورے کے پورے خاندان کو روٹیاں ٹھونک کر کھلاتیں۔ پاس چار پیسے جمع تھے، ایک بیٹی کے علاوہ دوسرا بوجھ نہ تھا۔ جلدی سے اس کا رشتہ پکا کر دیا۔ زندگی کا کیا بھروسہ اس لیے اپنے ہاتھوں یہ کام کرنا چاہتی تھیں۔

جب رشتے کی بات ہوئی تو چنیا بیگم کانوں پر ہاتھ رکھتیں مگر اس دن جب انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ خان صاحب کی لڑکی شادی کے دوسرے دن میاں کے زانو پر سر رکھے نخرے کر رہی ہے، چنیا بیگم چائے لے کر اندر گئیں جب بھی اس نے پردا نہ کی۔ انھیں اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے اللہ میاں ماماؤں کو پتھر سے بناتے ہیں۔

جب وہ چائے پلا کر کمرے سے باہر نکلیں تو جی چاہا کہ کوئی زانو مل جائے اور وہ بھی لمبی تان کر پڑ رہیں۔ اسی دن انھوں نے اماں سے شادی کا اقرار کر لیا مگر نکاح سے دو دن پہلے تک کام کرتی رہیں۔

سسرال جا کر انھیں پہلی ہی رات معلوم ہو گیا کہ میاں چنڈو کے نشے سے دل لگائے ہوئے ہے۔ کس کے زانو پر سر رکھیں، کس سے نخرے کریں۔ بس بھرے تکیے پر سر رگڑ رگڑ کر رات بیت گئی۔

سسرال میں سارا دن محنت کرتیں۔ ابھی برتن صاف ہو رہے ہیں۔ ابھی گوبر سے آنگن لیپا جا رہا ہے۔ کوٹھری کے کونے میں گڑھی ہوئی چکی پر ڈھیروں دال دل کر پیٹھی جا رہی ہے۔ اس کے بعد بھی جب نوالہ اٹھاتیں تو ساس نندیں اور جٹھانی مفت کھانے کے طعنے دیتیں۔ چنیا بیگم کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ جاتی۔

"مفت کھاتا ہے تمہارا بیٹا! ہم تو سارا دن کی محنت کے بعد نوالہ توڑتے ہیں، اس کے سر پر جوتے مارو کہ چنڈو میں پیسے نہ اڑائے، تم لوگوں کے ہاتھ پر لا لٹکائے۔"

ایسی کچی باتیں سن کر سب کو ان کی صورت سے اور بھی نفرت ہو جاتی۔ حد تھی کہ وہ اپنے شوہر کی چنڈو پینے والی عادت کی خود ذمے دار نہ بنتیں، نہ میاں کے نکھٹو پن ہی کو اپنا گناہ سمجھتیں۔

اس وقت چنیا بیگم کا کلیجہ مسلتا جب جٹھانی اپنے میاں کی لائی ہوئی چاندی کی موتی سی ہنسلی پہن کر اتراتی۔ انھوں نے بڑا زور لگایا کہ میاں چنڈو چھوڑ دے اور جو پیسہ ہو ماں کے ہاتھ میں رکھے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک دن بہت بیگی کے دم میں آیا تو چنڈو سے توبہ کر لی مگر عالم یہ ہوا کہ شام تک پلنگ سے لگ گیا، آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ساس نندوں نے جو یہ حالت دیکھی تو چنیا بیگم پر پلہ بول دیا۔

"ارے یہ چنیا تو میرے بچے کو کھا لے گی۔ لال اپنی جان کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی ہے۔" ساس نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے دو آنے کھول کر دیے اور ہدایت کی باہر جا کر نشہ کر آئے۔

میاں کے جسم میں جان آ گئی پیسے لے کر باہر بھاگا۔ چنیا بیگم نے جب یہ رنگ دیکھے تو شیر کی طرح بپھر اٹھیں۔

"اچھا، نشے کے لیے بھی اماں خرچ کریں اور نکھٹو ہونے کے طعنے مجھے دیں، بس باز آئی یہاں رہنے سے مجھے تمہارے بیٹے کی لال ایسی جان نہیں چاہیے، توبہ توبہ اسے تو قبر نہ پوچھے گی۔"

ادھر پانچ اور ادھر چنیا بیگم اکیلی، پھر بھی کسی کے بال کھسوٹے، کسی کا منھ نوچا اور کسی کے لات جڑ دی مگر ذرا ہی دیر میں پانچوں نے مل کر انھیں سبزی کے چھلکوں کی طرح گلی میں پھینک دیا۔

چنیا بیگم گندی گندی گالیاں بکتی پھر اندر گھس گئیں اور اپنے جہیز کا لوٹا، کٹورا اور صندوقچہ اٹھا کر باہر نکل آئیں۔ ابھی تو لوٹے کٹورے کی قلعی تک میلی نہ ہوئی تھی۔

بچپن دہلی کی گلیوں میں گزرا تھا۔ تیزی سے راستہ طے کرتی حویلی

سے گزرے ہیں۔

"ارے کوئی دوسرے ملک جا رہی ہوں، جب جی گھبرایا تو آجاؤں گی، خط لکھ کر تجھے بلا لوں گی۔"

گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ گئی تو لڑکا وہیں سر سے پر کھڑے آنسو پونچھتا رہا۔ چنیا بیگم کھڑکی سے سر نکالے اسے دیکھتی رہیں۔

کتنے اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ انھوں نے کسی سودے والے کو آواز دی۔ دوسری عورتیں جانے کیا کچھ کھا پی چکی تھیں۔

عورتیں ان سے پوچھتی رہیں کہ کہاں سے آ رہی ہو، کہاں جا رہی ہو مگر چنیا بیگم نے کسی بات کا جواب نہ دیا وہ تو بہری بنی بیٹھی رہیں۔

لاہور آ کر انھوں نے کئی دن دھکے کھائے، گھر گھر جھانکتی مگر کوئی نوکر نہ رکھتا۔ ایسی محنتی عورتیں کہ خود ہی بیٹھی ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کر کپڑے دھو رہی ہیں۔ بالٹیاں بھر بھر کر صحن دھل رہے ہیں، کھانا پک رہا ہے۔

"لو بھلا یہ فقیرنیاں کاہے کو نوکر رکھیں گی، ہے یہ کیسی جگہ ہے جہاں اپنی دلی جیسی بیگمیں نظر نہیں پڑتیں۔" ہر گھر سے نکل کر وہ پہروں بڑبڑائیں۔

ذرا اور بڑے گھروں میں جھانکا تو جواب ملا کہ ضمانتی لاؤ، وہ ہر ایک سے کہتیں کہ لونڈے کو دلی خط لکھ کر پوچھ لو۔ پھر دیکھیں گے کہہ کر بات ٹال دی جاتی۔

سارا دن پاؤں توڑ توڑ کر چنیا بیگم کی ہمت جواب دینے لگی مگر دل چھوٹا نہ ہوتا آخر پھرتی پھراتی شہر کے اس حصے میں آگئیں جہاں شہر کی سی ہماہمی نہ تھی۔ چوڑی صاف شفاف سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت کھڑے اونگھ رہے تھے۔ کوٹھیوں کے پھاٹک کھلے ہوئے تھے اور کہیں کہیں کوئی آیا بچوں کو سمیٹے گھاس پر بیٹھی نظر آجاتی۔

بڑی ہمت کے بعد انھوں نے ایک پھاٹک میں قدم رکھ ہی دیا۔ سامنے ہی آیا سال کے بچے کو کندھے سے لگائے ٹہل ٹہل کر اسے سلا رہی تھی۔ سلام دعا کے بعد دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد معلوم ہو گیا کہ یہ جگہ نوکروں کے لیے بڑی سازگار ہے۔ کام کم اور پیسے زیادہ۔ لاٹ صاحب قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے کپڑا لتا بھی خوب ملتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی چوری بھی آرام سے ہو سکتی ہے۔

چنیا بیگم دل ہی دل میں توبہ کرتی رہیں مگر اس عورت کو تو اپنا ضمانتی بنانا تھا اس لیے کچھ نہ کہا۔

جب وہ دونوں باتیں کر رہی تھیں تو بچے نے رونا شروع کر دیا اور آیا نے جھلا کر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ چنیا بیگم مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گئیں۔ آیا کی ضمانت کو بھاڑ میں ڈالا اور بچے کو گود سے چھین کر زور زور سے چیخنے لگیں۔

"تم کو تنخواہ اسی بات کی ملتی ہے کہ بچے کو خوش رکھو، تم نے مارا کیوں؟"

آیا بچے کو چھین کر انھیں پھاٹک سے نکالنا چاہتی تھی مگر چنیا بیگم اس سے زیادہ طاقت ور نکلیں۔ بچے کو کلیجے سے لگائے کمروں میں گھستی بیگم صاحب کے پاس پہنچ ہی گئیں۔ اور بچے کو ان کی گود میں دے کر پھولی ہوئی سانس ٹھیک کرنے لگیں۔

"آیا کی پورے مہینے کی تنخواہ کاٹ لیجیے، لو بھلا حد ہو گئی زور سے بچے کو تھپڑ مارا ہے کہ اب تک میرا کلیجہ کانپ رہا ہے۔ ایمانداری تو اس دنیا سے اٹھ گئی ہے، بیگم صاحب دوسری آیا کا انتظام کیجیے، یہ نہ سمجھیے گا کہ آیا کو نکلوا کر مجھے نوکری چاہیے۔"

چنیا بیگم جانے کو مڑ گئیں۔ بیگم صاحب نے انھیں روک لیا۔ غصہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ آیا کو فوراً طلب کیا اور اسی وقت نکال دیا۔ چنیا بیگم بڑی مشکل سے اس کی جگہ رہنے کو راضی ہوئیں۔ چلو ضمانت کا قصہ بھی پاک ہو گیا۔ ایسی خوشامدیں کرکے انھیں نوکری دی گئی اور جب صاحب نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے بڑے غرور سے چنیا کے بجائے چنیا بیگم کہا۔ دوسرا شہر تھا ویسے بھی کون جانتا تھا کہ ان کا نام کیا ہے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ وہ خود کو بیگموں سے کہیں بڑا سمجھتی تھیں۔ لوتھ بیگمیں جو ساری زندگی محتاجی کے ساتھ گزار دیتی ہیں۔

بیگم صاحب جب انھیں چنیا بیگم کہہ کر پکارتیں تو وہ خوشی کے مارے پھولی نہ سماتیں۔ محنت و مشقت نے انھیں یہ دن دکھایا تھا کہ وہ سچی بیگم کہلانے لگیں۔ اسی وقت انھیں یہ بھی خیال

گھر سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ بیگم صاحب جب کسی کام سے آواز دیتیں تو چنیا بیگم کے بجائے بہو کا نام لیتیں۔ ادھر بہو تھی کہ گھونگھٹ الٹا کر ساس کے کاموں پر پلی پڑتی۔ وہ اسے لاکھ ٹالتیں مگر اس کی سمجھ ہی میں نہ آتا۔ چنیا بیگم کو ہر وقت احساس ہوتا کہ بہو ان کا حق چھینے لیتی ہے۔ کچھ دن بعد وہ یہ سمجھے گی کہ اپنی محنت سے ساس کا پیٹ بھر رہی ہے۔

شروع شروع میں تو وہ اسے جھڑکیاں دیتی رہیں بعد میں زبان گالیوں پر کھل گئی۔ بہو کٹورا سی آنکھیں کھول کر حیرت سے دیکھتی کام کرتے ہوئے ہاتھ رک جاتے۔ اور چھم چھم کرتے موتی رخساروں پر لڑھکنے لگتے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر کس بات پر گالیاں پڑ رہی ہیں۔

"ارے چنیا ہوش کی دوا کرو، ناحق مظلوم کو ستاتی ہو، وہ تو تمہارے آگے پیچھے پھرتی ہے اور تم اسے برا بھلا کہتی ہو" بیگم صاحب بہو کی حمایت کرتیں تو چنیا بیگم خاموش ہو جاتیں مگر کلیجہ پھنکتا رہتا۔ جس گھر میں اٹھارہ سال گزارے تھے وہیں سے طبیعت بیزار ہو گئی۔ وہ سب سمجھ گئیں تھیں۔ بیگم صاحبہ کا خیال ہے کہ اب ان کی ہڈیوں میں دم نہیں رہا، اسی لیے بہو کی حمایت ہوتی ہے۔

انھیں دنوں انھوں نے سنا کہ میاں کا انتقال ہو گیا۔ ہاتھوں میں پڑی ہوئی موٹی موٹی کانچ کی چوڑیاں بٹے سے توڑ ڈالیں۔ اس دن انھوں نے کوئی کام نہ کیا، سارا دن کوٹھری پر پڑی رہیں۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ بہو کئی بار کھانا لے کر آئی۔ مگر انھوں نے لوٹا دیا۔

"جب کام نہیں کیا تو روٹی کیسے کھاؤں، لے جا، کل سے کام کروں گی تو کھاؤں گی" — وہ منہ لپیٹے پڑی رہیں اور جانے کتنی بہت سی حسرت ناک باتیں یاد کرتی رہیں۔

دوسرے دن صبح صبح اٹھیں تو بہو پہلے سے کام شروع کر چکی تھی۔ انھوں نے اسے وہ گالیاں سنائیں کہ کٹورا سی آنکھوں نے مشکوں پانی بہا دیا۔

بیگم صاحب نے سمجھ لیا کہ چنیا بیگم کا دماغ چل گیا ہے۔ انھوں نے بہت سمجھایا کہ اب وہ اللہ اللہ کریں اور بہو کو خدمت کرنے دیں — چلو بات صاف ہو گئی۔ بیگم صاحب انھیں محتاجی کی گزارنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ وہی زندگی جو انھوں نے سسرال میں گزاری تھی۔ چنیا بیگم تو اس زندگی کو خود ہی ختم کرنے کو سوچ رہی تھیں۔ اچھا ہوا جو انھوں نے خود ہی نکال دیا۔ جس نے دس سال کی عمر سے اپنی محنت سے کما کر کھایا، وہ بھلا کسی کا محتاج ہو سکتا ہے۔ چنیا بیگم اپنی ساکھ میں کب فرق آنے دیتیں۔

"اللہ کسی کا محتاج نہ کرے بیگم صاحب —" انھوں نے دو بات کر دی، "کھائیں گے تو اپنی محنت کا، نہیں تو بھوکے مر جائیں گے۔ لیجئے اب رخصت کی اجازت دیں، حساب صاف کر دیں ایک دن کی تنخواہ کاٹ لیں، میاں مر گیا تھا تو اس دن کام نہیں کیا تھا۔"

بیگم ہائیں ہائیں کرتی رہ گئیں۔ مگر چنیا بیگم اپنے جہیز کا لوٹا کٹورہ اور صندوقچیا بغل میں دبا کر کھڑی ہو گئیں۔ آخر بیگم صاحب کو کرتے ہی بن پڑی۔ انھوں نے پوری تنخواہ دے دی مگر چنیا بیگم نے ایک دن کے دام تخت کے کونے پر رکھ دیئے۔

جب سلام کر کے چلیں تو بیگم صاحب کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ بھلا چنیا بیگم جیسا دیانت دار اور کون ہو سکتا ہے اٹھارہ سال میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ دھیلے کی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے۔

بہو ننگے پاؤں گلی تک بھاگی گئی۔ بٹیا اسٹیشن تک دوڑ اگر مگر چنیا بیگم کا تو اس شہر سے ہی جی بھر گیا تھا۔ ایک بات نہ سنی، ٹکٹ لے کر لاہور جانے والی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ لڑکا پلیٹ فارم پر کھڑے منتیں کرتا رہا کہ اب بھی مان جاؤ اس عمر میں کہاں دھکے کھاؤ گی پردیس بُری بلا ہے۔

"ارے چل، بڑا آیا میری فکر کرنے والا۔ تیری عورت دو کام کر کے یہی سمجھے گی کہ میں اس کی محنت سے پیٹ بھرتی ہوں" — زور سے ہنسیں اور پھر نیفے میں کھسے بٹوے کو نکال کر دس روپے لڑکے کی طرف بڑھا دیئے — "لے پکڑ، اس سے کپڑے بنوا لیجیو، لتے لگائے پھرتا ہے۔" لڑکے پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اس کے اچھے سے کپڑوں کو لتّا بنائے دے رہی تھیں۔

گاڑی چھوٹی جب بھی لڑکا ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ چنیا بیگم ایک دم ایسا محسوس ہوا کہ گاڑی کے سارے پہیئے ان کے سینے

پائیں، حرام زادیاں مفت کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیتی ہیں، پانی کے دام نہیں دیتیں، میرے راج میں کسی نے ایک کٹورا پانی نہیں لیا ہے، ہاں۔"

پھاٹک سے نکل کر قریب کے درخت کے نیچے جا بیٹھیں۔ یہاں اس ایک گھر میں زندگی کے پانچ سال گزرے تھے اور وہ بھی بڑی عزت کے ساتھ ایسا لگتا کہ آگے بڑھتے ہوئے پاؤں رک رہے ہیں۔

درخت کے نیچے بیٹھے بیٹھے سائے ڈھل گئے تو پھر سامنے مزدوروں کے احاطے میں چلی گئیں۔ کئی کوٹھریاں خالی پڑی تھیں۔ مالک کی کوٹھی پر جاکر ایک روپیہ پیشگی کرایہ کا دیا اور کوٹھری پر قبضہ کرکے سامان رکھ دیا۔

احاطے والے تو سب جانتے پہچانتے تھے۔ ان کے راج میں کوئی پانی نہ لے سکتا تھا۔ مارے نفرت کے کسی نے ان کو منہ نہ لگایا۔

دوچار دن اکیلے پڑے پڑے گزر گئے تو چینا بیگم خود ہی سب کی کوٹھریوں میں جھانکنے نکل کھڑی ہوئیں۔ ان کے اقوال اور نصیحتوں نے جلد ہی سب کو رام کر لیا۔ ایک عورت نے احاطے کے حکیم سے بھی ملوا دیا۔ اس حکیم کے بڑے بڑے معجزے مشہور تھے۔

"جانان کی اماں کا دم نکل رہا تھا، حکیم جی نے عرق کا ایک چمچا پلایا تو پٹ سے باتیں کرنے لگی۔"

"شبراتن کے بچے کا تو کفن تک خریدنے چلے گئے تھے، اب دیکھو دس سال کا ہو رہا ہے۔"

چینا بیگم نے فوراً ہی علاج شروع کر دیا۔ مگر یہاں کچھ الٹا معاملہ تھا جوں جوں علاج ہوتا گٹھیا سر چڑھتی جاتی۔ حکیم صاحب کا یہ خیال پختہ ہوتا گیا کہ کسی بدروح کا سایہ ہو گیا ہے۔ اس لیے دوا کے ساتھ ساتھ عمل بھی شروع ہو گئے۔

چینا بیگم نے فوراً پڑے پڑے اکتا جاتیں۔ گھبرا کر درختوں کی چھاؤں میں جا بیٹھتیں اور پھر احاطے کی عورتوں سے دنیا بھر کے معاملات پر بحث کرکے انھیں حیران چھوڑ دیتیں۔

علاج سے بس یونہی سا فائدہ ہو رہا تھا۔ آدھے سے زیادہ روپے خرچ ہو چکے تھے۔ انھوں نے کئی بار سوچا کہ شہر میں جا کسی اچھے سے ڈاکٹر سے علاج کرائیں مگر نہ تو کوئی سہارا تھا اور نہ اتنی دولت۔ ان کی بیگم بچوں کا علاج کرانے جاتیں تو بیس پچیس روپے ٹھنڈے ہو جاتے۔

کم بخت مرض تو انھیں نیچا دکھانے پر تلا ہوا تھا۔ نہ کوسنے سے جاتا اور نہ علاج سے پیچھا چھوڑتا۔ اب تو ان کا یہ جی چاہنے لگا تھا کہ اپنے لونڈے کو خط لکھ دیں کہ آ کر لے جائے۔ پیسے بھی ختم ہو گئے تو پھر کیا کریں گی۔ محنت کرنے کے لائق نہیں، پیروں پر ہلکا ہلکا ورم رہتا ہے۔

ہر دم جی پھڑکا کرتا کہ اب کیا کریں گی، محتاجی کے نام سے دل خون ہونے لگتا۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں کے پھیر میں وقت گزرتا رہا۔ سارے جاڑے دھوپ میں پاؤں پھیلا کر بیٹھے بیٹھے گزر گئے۔ ادھر لڑکے کا بھی کوئی خط نہ آیا۔ پاکستان بننے کے بعد کتنے بہت سے لوگ آئے گئے۔ احاطے میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہ گئی تھی۔ دلی والوں سے لڑکے کا حال پوچھتیں تو سب لاعلمی کا اظہار کرتے۔ ان کا لڑکا کوئی لیڈر تو تھا نہیں جو ہر ایک کو اس کا پتہ معلوم ہوتا۔ انھوں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ یا تو کسی نے فساد میں مار دیا یا پھر بہو کم بخت نے ساس کی یاد دل سے نکلوا دی۔

چینا بیگم کئی بار کلیجہ پھاڑ پھاڑ کر رو دیں اور احاطے کی ساری عورتیں جمع ہو کر اپنے آنسو پونچھتی رہیں۔ سب ان کی خدمت کرنے کو کہتیں مگر چینا بیگم بھلا کب کسی کو پیچھے پر ہاتھ دھرنے دیتیں۔

"اللہ نے بہت دے رکھا ہے خدا کسی کا محتاج نہ کرے، غم تو اپنی مرضی کا ہے۔" چینا بیگم حقیقت چھپا جاتیں۔ اللہ کا دیا تو حکیم کھا گیا تھا اور جو بچ رہا تھا وہ دو چار مہینے کا ساتھ تھا۔ انھوں نے علاج چھوڑ دیا۔ جب درد بڑھتا تو پانی روئی گرم کرکے گھٹنے سینک لیتیں۔

احاطے کی آبادی جو بڑھی تو ایک نئی مصیبت آ پڑی۔ ہجوم کے ہجوم تیرے میرے ہینڈ پمپوں پر ٹوٹتے تو کسی کو بھی ڈھنگ سے پانی نہ ملتا۔ چینا بیگم نے ایک ایک بالٹی میں دو دو دن گزارے۔ ادھر یہ خرچ بھی تھا کہ شبراتن کو چار بالٹیوں کا ایک پیسہ دینا پڑتا وہ تو لاکھ لاکھ نہیں نہیں کرتی پر چینا بیگم کسی سے مفت محنت کرائیں کب۔

کرشنا رہے جو بہو کے چلتر میں نہیں پھنسی اور بیٹے کی ماتا کو پتھر کی
ن بنالیا۔

چند ہی دن میں چنیا بیگم کا ڈنکا بجنے لگا۔ بچے ان کو بھول کر
ان کے گلے کا ہار ہوگئے۔ گھر کی ہر چیز میں سلیقہ آگیا۔ خانساماں کھانے
نے کی چیزیں چراتے ڈرتا چنیا ڈائن تاک میں ہوئی، ادھر کوٹھی کے
قبضے میں سناٹا چھا گیا۔

چنیا بیگم دوپہر میں پھاٹک بند کرا دیتیں ورنہ ساری دوپہر احاطے
ے مزدوروں کی عورتیں باغیچے کے ہینڈ پمپ سے پانی بھرتی رہیں۔
آبادی چھاؤنی سے کوئی دو تین میل ادھر تھی۔ یہاں کارپوریشن
کے نل نہ تھے۔ کوٹھیوں میں یا تو ٹیوب ویل لگے ہوتے یا پھر ہینڈ
پمپ۔ باقی آبادی پانی کے لیے ادھر ادھر دھکے کھاتی پھرتی۔
احاطے کی عورتوں کو یہی کوٹھی نزدیک پڑتی اور کوئی روک ٹوک
بھی نہ تھی۔ مگر چنیا بیگم نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ "غضب خدا کا مفت
ے پانی پر ٹوٹی پڑتی ہیں، اپنا ہینڈ پمپ لگوائیں یا پھر پانی کے دام
اکریں بیگم صاحب کو۔"

چنیا بیگم مہینے کے مہینے اپنے لڑکے کو خط لکھواتیں اور پانچ روپے
منی آرڈر بھی کراتیں۔ ان کے خط میں بیگم صاحبہ کی تعریف ہوتی،
بچوں کا ذکر، اپنی صحت اور طاقت کا ناز۔ پھر آخر میں وہ یہ ضرور
لکھواتیں کہ کلیجہ ہے لیتے لگا کرنہ پھر بہو، تیری ایسی کہاں کی کمائی۔
نے کی ضرورت ہو منگوا بھیجیو۔

بس جواب میں لڑکا ایک ہی رٹ لگائے رکھتا کہ بس تم چلی
، بڑھوتی وقت ہے کوئی اپنا پاس نہیں، مجھے روپے مت بھیجا
، خود تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ بہو سلام کہتی ہے بال بچہ
ہونے والا ہے۔

چنیا بیگم خط پڑھ کر زور سے ہنستیں۔ کبھی کچھ بھیج نہ دیا، زبانی
بات کرنا چاہتا ہے۔ ضرورت نہیں تو پھر منی آرڈر واپس کر دیا کرے نا۔
اری بات تو یہ ہے کہ اپنا اور اپنی عورت کا محتاج بنانا چاہتا
ہے۔ میں کوئی ایسی الو ہوں۔ محتاجی کی زندگی گزارنی ہوتی تو اپنا
بال کیوں چھوڑتی۔

کبھی کبھی وہ بیگم صاحبہ کے سامنے اپنے اقوال زریں دہراتیں
وہ بڑے غور سے سنتیں اور معنی خیز انداز سے سر ہلاتیں۔

ادھر کچھ دنوں سے وہ اپنی ہڈیوں میں ہلکا ہلکا درد محسوس کر رہی
تھیں۔ کام کرتے ہوئے کاہلی محسوس ہوتی۔ پھر بھی وہ پکی اصول
کی پکی، کام پورا کر کے ہی خود کو تنخواہ کا حقدار سمجھتیں۔ جوڑوں
کے درد کو طرح طرح سے ٹالتیں مگر جب تکلیف بڑھ جاتی تو تڑپ
دکھ سے بپھر اٹھتیں۔

"اے حرام زادے تو ماں کی گود سے اٹھ کر کہاں آن مرا،
ناس جائے تیرا۔" چنیا بیگم لمبی لمبی آہیں بھرتیں۔

کچھ دن بعد یہ حال ہو گیا کہ میلے کپڑوں کی گٹھری دیکھ کر جی
ہولنے لگا۔ کپڑے دھونے بیٹھیں تو پھر اٹھا نہ جاتا۔ بچوں کو گود میں
اٹھاتیں تو ذرا دیر میں گھٹنے جواب دے جاتے۔ پھر بھی ان کی
ہمت تھی جو کام چلا رہی تھیں۔ کوئی کام رہ بھی جاتا تو بیگم صاحب کبھی
نہ پوچھتیں۔ وہ تو چنیا بیگم کی دیانت داری اور جفاکشی کی وجہ سے
الٹی غلام بن گئی تھیں۔ ویسے کبھی کبھی حیران ضرور ہوتیں کہ اب چنیا
بیگم کو کیا ہو گیا ہے۔ کپڑے میلے دھلتے۔ بچوں کو گود میں لینے سے
کتراتیں۔ آخر ایک دن پوچھ ہی بیٹھیں کہ انہیں کیا تکلیف ہے اب
کام میں جی کیوں نہیں لگتا۔

"بیگم صاحب میں تو پہلے ہی سوچ رہی تھی کہ کام چھوڑ دوں،
مفت کھانا حرام ہے، پر اب کیا کروں، یہ جوڑوں کا درد ایسا آن
لگا ہے کہ کوئی کام نہیں کرنے دیتا، اچھا اب اجازت دیجئے، میں
آپ کا دوسرا بندوبست کر دوں گی"—— چنیا بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں
—— "بیگم صاحب چنیا بیگم نے تو ہمیشہ اپنی محنت سے پیٹ بھرا
ہے۔"

بیگم صاحب منہ دیکھتی رہ گئیں اور چنیا بیگم دوسری آیا کا انتظام
کرنے چلی گئیں۔ دو گھنٹے بعد واپس آئیں تو دوسری آیا ساتھ تھی۔

"دوسری آیا تو کام کرے گی مگر تم نہیں جا سکتیں، میں تمہارا
علاج کروں گی، میرا تمہارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے، یہاں سے تو
تمہاری لاش ہی نکلے گی۔" بیگم صاحب نے چنیا بیگم کا ہاتھ تھام
لیا مگر وہ تو جلدی سے اپنا لوٹا کٹورا اور صندوقچیا بھی اٹھا لائیں۔
رخصت ہوتے وقت بچوں کو لپٹا لپٹا کر روئیں، نئی آیا کو گھر کا کام
سمجھایا پھر ڈانٹ ڈانٹ کر ہدایتیں دیتی رہیں۔

"بس خیال رکھیو، مسٹنڈی عورتیں یہاں سے پانی بھرنے نہ آنے

"آج کل دنیا میں کوئی فرشتہ نہیں، سب شیطان بستے ہیں۔"
"کبھی کسی ایمیل نے بھی پانی بیچا ہے؟"
"بنی پھرتی ہے بیگم، چمارن ہے، بھنگن ہوگی۔"

عورتیں جب دور دور سے پانی بھر کر آرہی تھیں تو جینا بیگم کو سنا سنا کر باتیں کرتی جاتیں۔ انھوں نے اسی طرح منہ پھیر لیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"چاند نکلتا ہے تو کتے بھونکتے ضرور ہیں" ــــ انھوں نے اس طرح کہا جیسے اپنے آپ کو سنا رہی ہوں ــــ "کبھی اللہ طاقت دے تو چار چار میل سے پانی بھر کر لادو، کسی نے منع تھوڑی کیا ہے۔"

ہینڈ پمپ سے لگے پندرہ دن گزر گئے۔ جینا بیگم سارے دن اسکے پاس بیٹھی رہتیں۔ وہیں کھانا کھاتیں، وہیں پلنگ ڈال کر سوتیں۔ کوٹھری میں دھول اڑ رہی تھی، کب سے اس کو صاف نہ کیا تھا۔ بس ہر وقت یہ خطرہ رہتا کہ کہیں کوئی پانی نہ بھرلے، کہیں لڑکے ہلانے نہ لگیں۔ وہ تو کہو کہ ہینڈ پمپ پر گھنے درخت کا سایہ تھا ورنہ دھوپ میں پگھل کر پانی کی طرح بہہ جاتیں۔ رات اس وقت سوتیں جب اپنا اطمینان کرلیتیں کہ احاطے میں سب کو موت کی نیند آگئی ہے۔

چاروں روپے ختم ہوگئے۔ جینا بیگم کو تو یہ امید تھی کہ بیس پچیس روپے کی آمدنی ہوجائے گی۔ کھانے کپڑے اور شبراتن کی تنخواہ دینے کے بعد وہ اپنا علاج بھی کرتی رہیں گی مگر بات چار روپوں سے آگے نہ بڑھی۔ وہ اس بات سے مایوس نہ تھیں ان کا خیال تھا کہ لوگ ان کے ساتھ ضد کر رہے ہیں۔ مفت کا پانی پینے کی عادت پڑ گئی ہے۔ آخر کوئی کہاں تک خیرات کا پانی پلاتا رہے گا۔ ایک دن تو مڑ کر سب ادھر ہی آئیں گے۔ دیکھو تو جو چار گھران سے پانی لے رہے ہیں وہ سب خوش ہیں جیسے مزے کی بات ہے کہ روپے مہینے میں بھرا بھرایا پانی مل جاتا ہے۔ وہ یہ دیکھ ہی نہ پاتیں کہ جس وقت وہ دھیرے دھیرے ہتی گھماتی ہوتیں تو پانی لینے والا بڑی بیزاری سے کھڑا ہوتا۔

آج صبح سے جینا بیگم نے کچھ نہ کھایا تھا۔ کچھ تھا ہی نہیں کھانے کا سامان بھروایا تھا وہ سب ختم ہوچکا تھا۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو منڈیر پر رکھے ہوئے کوڑے میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بھر کر پی لیتیں۔

"آہ ہائے! کیسا ٹھنڈا پانی ہے" ــــ پانی پی کر وہ لمبی سی ڈکار لیتیں۔ بھوک کی کمزوری کبھی کم ہوجاتی پھر بھی شام ہوتے ہوتے بھوک سے نڈھال ہوگئیں۔ رات کو نو بجے چاروں گھروں کی آخری بالٹیاں اور گھڑے بھرنے کے بعد تو انھیں ایسا محسوس ہوا کہ بس جان نکلی جاتی ہے۔

رات جیسے تیسے سو کر گزر گئی۔ صبح جب لوگ پانی بھرنے آئے تو باوجود کوشش کے وہ اٹھ نہ سکیں۔

"میاں خود بھر لو پانی، مگر دیکھو ہتی دھیرے دھیرے چلانا جوتا اتار کر فرش پر پاؤں رکھنا سیمنٹ اکھڑ نہ جائے۔ اللہ جانے تم لوگ اتنے بھاری جوتے کیوں پہنتے ہو۔"

صرف شبراتن کو پتہ تھا کہ روٹی نہ ملنے سے یہ حال ہے۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ اس کے گھر کی روٹی کھالیں مگر وہ کیوں قبول کرتیں۔

"دیکھے جاؤ شبراتن اللہ بہت دے گا" ــــ جینا بیگم کھاٹ سے اٹھ کر گھسٹتی ہوئی ہینڈ پمپ کے پاس آگئیں۔ "کسی سے کہو مت شبراتن کہ کل سے روٹی نہیں کی۔" جینا بیگم نے ہدایت کی۔

ذرا دیر میں سارے احاطے والوں کو معلوم ہوگیا کہ جینا بیگم بھوکی پڑی ہیں۔ دو گھر محض ہمدردی کی وجہ سے پانی بھرنے آگئے۔ جینا بیگم میں ایک دم جان آگئی۔ جلدی سے اٹھ کر پانی بھرنے لگیں۔

شبراتن کو آواز دے کر سودے کا حساب بتایا۔ دو گھنٹے کے اندر اندر وہ ان کی دو موٹی موٹی روٹیاں الٹ لائی۔

جینا بیگم کے پیروں کا ورم بڑھ گیا تھا۔ جانے کتنی مدت سے علاج کی نوبت نہ آئی تھی۔ اب تو بڑی دقت سے دو چار قدم چل پاتیں۔ بس بیٹھے بیٹھے ہینڈ پمپ کی ہتی گھمایا کرتیں۔ پانی لینے والوں کو ترس آتا، لاکھ ضد کرتے کہ ہم خود بھر لیں گے مگر جینا بیگم ہاتھ نہ لگانے دیتیں ــــ لو ہتی بھی ٹوٹ جائے تو اور مصیبت، ان مسٹنڈوں کا کیا، کون سے اپنی گرہ سے دام خرچ کئے ہیں جو درد ہوگا۔

بس ان ہی دنوں تو ان کی سمجھ میں یہ ترکیب آگئی کہ آج اپنی محتاجی کے بھوت جیسے خیال کو دھکا دے دیا تھا اور اب آرام سے پلنگ پر لیٹی سہانی باتیں سوچ رہی تھیں۔

چھاؤنی کی طرف سے کوچ کے بگل کی آواز آرہی تھی، ادھر کہیں قریب کی مسجد میں موذن کی آواز اونچی ہوتی جاتی۔ جینیا بیگم بستر سے اٹھ بیٹھیں صبح آج بھی ہمیشہ کی طرح تھی لیکن آج تو انھیں اللہ کا نور برستا نظر آرہا تھا۔

جینیا بیگم نے عجیب سی سرشاری کے عالم میں ہینڈ پمپ کی ہتی گھمائی، پانی کی سفید سوتی سی دھار پکے فرش پر بہہ گئی۔ جینیا بیگم نے بڑے چاؤ سے کلی کی۔ منہ دھویا اور خالی پیٹ میں ٹھنڈا ٹھنڈا دو گھونٹ پانی پی لیا۔

بیگم کے ہینڈ پمپ کا پانی بھی اتنا ٹھنڈا نہ ہوتا تھا ـــــ اور جو پانی شبراتن لائی وہ تو کسی کام کا نہیں تھا۔ انھوں نے بڑے غرور سے ہر طرف دیکھا۔ کوٹھریوں کے آگے قطار سے بچھے ہوئے پلنگوں پر لوگ ابھی تک سوئے پڑے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اسی لیے تو دنیا میں تباہیاں آرہی ہیں۔ کانوں میں صبح کی اذان پڑ جائے تو اللہ ہر بلا سے محفوظ رکھتا ہے۔ ان کا جی چاہا کہ جا کر سب کو جھنجھوڑ کر جگا دیں۔ ارے بھئی سب کو پانی بھی تو لینا ہے۔ اللہ کیسی موٹی دھار نکلتی ہے۔

ذرا دیر بعد لوگ جاگے تو پہلا کام یہی تھا کہ عورتیں اور مرد گھڑے اور بالٹیاں اٹھا کر ہینڈ پمپ کی طرف دوڑے۔ مرد اس چاؤ سے ہینڈ پمپ کی طرف آرہے تھے کہ جیسے آج تو بغیر نہائے دھوئے مزدوری پر نہ جائیں گے۔ ادھر عورتوں کو ہانڈی روٹی کی جلدی تھی۔ سب ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں تھے۔

"واہ! ٹھہرو بھئی۔" جینیا بیگم نے پہلے ہی بالٹی کو پکڑ لیا۔ ساری عمر گزر گئی نہ کبھی کسی کا مفت کھایا پیا نہ کسی کو کھلایا پلایا۔ دو روپیہ مہینہ لگالو، جتنا پانی چاہو بھر والو، مگر یہ خیال رہے کہ ادھر کوئی نہائے گا نہیں۔ لونڈے ایک شریر، ہتی توڑ دیں گے، سمنٹ اکھڑ جائے گی، اور ہاں ہتی میں خود چلاؤں گی، محنت کے بغیر تو جینیا بیگم نے کبھی نوالہ نہیں اٹھایا۔"

قطار سے آگے بڑھتی ہوئی بالٹیاں جہاں تھیں وہیں رک گئیں

"کیا کہا جینیا بیگم، ایک روپیہ مہینہ، ارے کچھ تو خدا کا خوف کرو کبھی کسی نے پانی بھی بیچا ہے۔" ایک آدمی چنگھاڑا۔

"لو، پانی تو اپنی حکومت تک بیچتی ہے، مجھے خود بیگم صاحب نے بتایا تھا کہ شہر میں سارے لوگ پانی کا "ٹیکس" دیتے ہیں، میاں یہ مفت کی بات نہیں چلتی، شبراتن سے ایک بالٹی پانی منگائی تو پیسہ ہاتھ میں رکھا دیتی۔ پھر ہتی تو مجھ ہی کو چلانا ہے۔" جینیا بیگم ہینڈ پمپ سے لپٹی بالکل دیوانی نظر آرہی تھیں۔ "روپیہ روپیہ جمع کرا دو۔" مستری کو دام ادا کرنے کے بعد بٹوا جھاڑ دیا تھا۔ اب صبح صبح جو خالی معدے میں پانی پیا تو اب تک کاٹ رہا تھا۔ وہ تو کھانے ہینڈ پمپ تھا ورنہ کہیں اور کا ہوتا تو جینیا بیگم درد کی شدت سے تڑپ اٹھتیں۔ کل شام سے ایک نوالہ نہ نصیب ہوا تھا۔

چار روپے ٹھن سے سمنٹ کے فرش پر آکر گرے اور چار بالٹیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ باقی بالٹیاں اور گھڑے ہمیشہ کی طرح سڑک پر دوڑنے لگے۔ جینیا بیگم نے گردن موڑ کر اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ کب تک اس طرح مفت کا پانی پیو گے، آخر تو ادھر ہی آنا ہے۔

وہ تیزی سے ہتی گھمانے لگیں اور بھری ہوئی بالٹیاں گھڑوں میں خالی ہو کر دوبارہ آگئیں۔

بارہ بالٹیاں بھرنے کے بعد وہ وہیں منڈیر پر بیٹھ گئیں۔ احاطے کے بچے آس پاس منڈلا رہے تھے۔

"کتے کے پلّے، ہاتھ توڑ دوں گی جو ذرا آگے بڑھے۔ اماں باوا یونہی پیدا کر کر کے چھوڑ دیتے ہیں" ـــــ جینیا بیگم مارے خطرے کے بڑبڑا رہی تھیں ـــــ وہیں بیٹھے بیٹھے انھوں نے شبراتن کو آواز دی اور سودے کا ایک روپیہ دے کر حساب بتانے لگیں۔ باقی تین روپے بٹوے میں رکھ کر سینے میں کھونس لیے۔

"شبراتن میری دو روٹیاں اپنے توے پر الٹ دینا، مزدوری میں تم یہاں سے پانی لے لینا، اب مجھے کہاں فرصت، پھر یہ لونڈے" ـــــ انھوں نے غصے سے دانت کٹکٹائے ـــــ "میں تو اب ایک منٹ کو ادھر سے نہیں ہٹ سکتی۔"

شبراتن چلی گئی تو وہ پاؤں پھیلا کر گھٹنے کے جوڑوں کو سہلانے لگیں۔ اس وقت درد محسوس ہو رہا تھا ورنہ کل سے آج صبح تک تو وہ اپنا درد بھی بھولی رہی تھیں۔

"اب کیا تو ہی رہ گئی ہے جس سے خیرات لوں۔ اللہ اب تو عزت کے ساتھ اٹھالے۔" بشراتن اپنا سا منھ لے کر چلی گئی۔

چنیا بیگم کو آج اپنا لڑکا بے تحاشہ یاد آگیا۔ اگر وہ ہوتا تو کس کی مجال تھی جو کوئی یوں مفت پانی بھرتا۔ لڑکے کو یاد کر کے وہ دیر تک روتی رہیں۔ جب ذرا جی ٹھہرا تو پانی پینے کے لیے ہینڈپمپ کی طرف رینگتیں۔ المونیم کا بڑا سا کٹورا بھر کر چڑھا گئیں۔ پھر جانے کیا ہوا چکرا کر گر پڑیں۔

ذرا دیر بعد ہوش آیا تو اپنی کوٹھری میں لیٹی تھیں اور احاطے کی بہت سی عورتیں کوٹھری میں ٹھنسی کھڑی تھیں۔ چنیا بیگم نے ان نفرت انگیز عورتوں کو دیکھ کر منھ پھیر لیا۔

شام پانچ بجے سے پہلے پہلے سکینہ کی اماں دو روٹیوں پر دال اور چٹنی رکھ کر لے آئی۔ چنیا بیگم میں لڑنے کے لیے جان آگئی۔

"اپنی اماں بہنوں کو دو خیرات، مجھے محتاج سمجھا ہے جو دو روٹیاں لے کر آئی ہو، پانی کے دام ادا کرو، اللہ نے چاہا تو دنیا ہی میں بدلہ ملے گا، بھاگ جاؤ یہاں سے اپنے منھ پر مار لو یہ روٹیاں، چنیا بیگم محتاج نہیں جو خیرات کھائے۔"

سکینہ کی اماں بالکل چپ رہی، اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ بکس پر رکھی ہوئی تامچینی کی پلیٹ میں دال روٹی رکھ چلی گئی۔ چنیا بیگم بڑی دیر تک کمزور سی آواز میں چیختی رہیں،

"ارے کمبختو، یہ اٹھانے جاؤ، اسے کتّے کو ڈال دو، اپنی اماں بہنوں کو کھلاؤ۔"

شام ہو گئی۔ کوٹھری کے اندھیرے میں مچھر بھنبھنانے لگے۔ چنیا بیگم مارے نقاہت کے اندر ہی لیٹی رہیں۔ چھاؤنی کسے دالسی کے گل کی دردناک آواز آرہی تھی۔ چنیا بیگم نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر بکس کی طرف دیکھا۔ چنے کی دال اور اچار کی بھینی بھینی خوشبو اڑ رہی تھی۔

"حرام زادی۔" وہ جیسے اپنی ساری طاقت سمیٹ کر باہر نکل آئیں اور ہینڈپمپ کی طرف جھپٹیں۔

"نکالو پانی کا کرایہ، یوں کسی نے ایک کٹورا پانی لیا تو ہاتھ توڑ دوں گی۔"

ہینڈپمپ کے پاس بوڑھے بوڑھے مرد سے کھڑے تھے، چنیا بیگم کی دھمکی پر سب ہنس دیئے۔

"ارے چنیا بیگم، ہم کو پتہ ہے تم مجبور ہو، سارے احاطے والوں نے مل کر فیصلہ کر لیا ہے، سارے باری باری تمہاری خدمت کریں گے۔"

"مجبور ہوگی تمہاری بہنیں، ان کی خدمت کرو، انھیں خیرات دو، اِن نکالو پانی کے دام۔"

وہ تو پانی بھر کر چلے گئے۔ چنیا بیگم کو ایسا محسوس ہوا کہ گری پڑتی ہیں جیسے تیسے کوٹھری میں آئیں اور چراغ جلا کر لیٹ گئیں۔ معدے میں بھوک سے کیسی بے چینی تھی۔ جیسے کوئی بے دردی سے مروڑ رہا ہو۔ پھر پھر اٹھو پڑیں۔ اندر کیسی گرمی تھی۔ انھوں نے کھاٹ کو کھینچ کر بڑی مشکل سے باہر نکالا اور جب چراغ بجھانے لگیں تو روٹیوں کی پلیٹ کو اٹھا لیا۔ اسے دیکھا اور پھر رکھ کر چراغ بجھا دیا۔ کوٹھری میں تالا لگا کر چپکے سے لیٹ گئیں۔

رات کروٹیں بدل بدل کر گزر گئی۔ صبح ہاتھ ہلانے کی طاقت بھی ختم ہو چکی تھی۔ سرہانے رکھے ہوئے کٹورے کو اٹھا کر بچا ہوا پانی پیا تو کچھ جان آگئی۔

کوٹھری کھول رہی تھیں تو اللہ رکھے کی بیوی تیل کی لٹیا میں چائے اور ایک روٹی لیے آگئی۔ چنیا بیگم نے اس کی طرف دیکھا اور بکس پر بیٹھ گئیں۔

"کٹورا اٹھا کر اس میں چائے انڈیل دو، روٹی اس پلیٹ میں رکھو۔" ان کی آواز میں بڑا تحکم تھا۔ "اور یہ دودھ اتنا ذرا سا ڈالا ہے اور روٹی میں گھی بھی نہیں چپڑا، پانی تو اتنا بھرتی ہو کہ حد نہیں، اب ذرا خیال رکھیو ہاں۔"

کام کرنے کی استعداد

لگن کے ساتھ کام کرنے والے ایک فرد کی استعداد محض دلچسپی رکھنے والے ۹۹ افراد کے کام کرنے کی استعداد کے برابر ہوتی ہے۔

جان اسٹارٹ مل

جون کا مہینہ تھا۔ لڑکے گرمی سے بلبلا بلبلا کر ہینڈ پمپ پر ہلّہ بولتے۔ وہ تو کہو چینیا بیگم کا پہرہ سخت تھا ورنہ جانے کیا ہوتا۔ مجال تھی جو وہاں سے ٹل جائیں۔ زمین میں گڑا ہوا دوسرا ہینڈ پمپ معلوم ہوتیں۔ بس فرق اتنا تھا کہ اس پمپ سے پسینہ بہتا رہتا۔

"ارے مردودو! اپنے ابا سے کہو کہ دو پیسہ مہینہ خرچ کریں پھر خوب نہاؤ، کون سی بڑی دولت ہے جو بھوکے مرجائیں گے خرچ کرتے —— وہ لڑکوں کو بھڑکاتیں —— "پھر خوب نہاؤ، ایسا ٹھنڈا پانی کہ گھنٹوں سردی لگے۔"

آج لڑکوں کا موڈ بڑا خطرناک ہو رہا تھا۔ وہ سب لنگوٹیاں کس کر آئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ان کی مائیں کام کاج سے تھک کر ذرا اونگھ گئی تھیں۔ لڑکوں نے موقع غنیمت جانا اور ہینڈ پمپ پر ٹوٹ پڑے۔ ایک لڑکا ہتّی چلاتا اور دوسرا نیچے بیٹھ کر نہاتا۔ مدتوں کے ترسے ہوئے جسم پانی پڑتے ہی اہلہا اٹھے۔ چینیا بیگم انھیں دھکے مار مار کر تھک گئیں۔ کوئی کوسنا نہ چھوڑا، کشتی تک نوبت آگئی۔ شور کی آواز سنکر سارے احاطے کی عورتیں جمع ہو گئیں۔ لڑکوں کو ڈانٹنا شروع کیا مگر اس طرح جیسے شہ دے رہی ہوں۔

چینیا بیگم کشتی لڑتے لڑتے تھک کر ہانپتی کانپتی بیٹھ گئیں۔ لڑکے جلدی میں تھے اس لیے ایک کی جگہ چار چار نہا رہے تھے، کسی کا جسم بھیگتا، کسی کا سر کچھ یونہی سوکھے کھڑے آپس میں کشتی کر رہے تھے۔

"اب لاؤ اپنے لاڈلوں کے نہانے کے دو دو آنے دو، دور سے کھڑی تماشہ کیا دیکھ رہی ہو۔" چینیا بیگم کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"ہم کہاں سے دیں، انھیں حرام زادوں سے لو، کوئی ہم نے کہا تھا کہ نہاؤ، تم خود روک کیوں نہیں لیتیں۔"

اس کے بعد تو چینیا بیگم کا پہرہ کمزور پڑ گیا۔ لڑکوں کو راہ سوجھ گئی، اِدھر دوپہر ہوئی اور انھوں نے زبردستی نہانا شروع کیا۔ عورتیں اپنے بچوں کو روکتے روکتے دو چار بالٹیاں مفت میں بھر لیتیں۔ چینیا بیگم ہاتھ پھیلا پھیلا کر کوستیں، گالیاں دیتیں۔ دھکے مار مار کر کلائیاں سوجا ہو جاتیں۔ ساروں کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ بس چلتا تو ان "پانی حراموں" کو زندہ گاڑ دیتیں۔

وہ گھر جنھوں نے ایک ایک روپیہ دیا تھا وہ بھی اب سرکشی پر اتر آئے تھے۔ شروع میں تو وہ گھڑے اور بالٹیاں چینیا بیگم سے بھروالتے مگر اب ان کے ہاتھ سے ہتّی چھین کر خود ہی بھرنے لگے۔

"اتنی دیر لگاتی ہو چینیا بیگم، آدھا دن تو کھڑے کھڑے گذر جاتا ہے۔" وہ بڑی بے دردی سے ہتّی چلاتے۔

"ارے ہتّی اکھڑ جائے گی ظالمو!" وہ فریاد کرتی رہتیں۔

مہینہ ختم ہوا پھر انھوں نے بھی روپے نہ دیئے۔ سب زبردستی مفت میں پانی بھرنے لگے۔

"ایک ایک روپیہ دو، بے ایمانوں کا مرتے وقت منہ بھی سؤر کا ہو جاتا ہے۔"

"اللہ اللہ کرو چینیا بیگم، روپے قبر میں لے جاؤ گی۔"

اب تو چینیا بیگم کا بس ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ سارا دن بیٹھی گالیاں اور کوسنے دیتی رہیں۔ ان سے نہ تو کوئی پانی بھرواتا نہ دام ادا کرتا۔ پھر بھی وہاں سے اٹھنے کا نام نہ لیتیں۔ جوڑوں کے پاس ایسا ورم ہوا کہ شیشے کی طرح چمکنے لگے۔ کبھی پاؤں پھیلاتیں کبھی سکیڑ لیتیں کسی طرح چین نہ پڑتا۔ آخر ایک دن دوپہر میں اپنی کوٹھری میں لیٹ گئیں۔ کھلے دروازوں سے باہر دیکھتی رہتیں۔ جب کوئی پانی لینے آتا تو چیخنے لگتیں۔

"کمبختو پانی کے دام ادا کرو، پھوٹ پھوٹ کر نکلے گا مفت کا پانی، مرتے وقت منہ کالا ہو گا۔"

سب ان کی گالیاں سنکر ہنستے، بوڑھی ہیں۔ دماغ چل گیا ہے جو چاہیں کہتی رہیں۔ پانی بھی تو مفت کا مال ہے۔ کوئی پلٹ کر جواب نہ دیتا۔

دوپہر میں جب لڑکے نہاتے تو منوں پانی بہہ جاتا۔ ہینڈ پمپ کے آس پاس دلدل جیسی حالت ہو گئی تھی۔ ایسی بے دردی سے ہتّی چلاتے کہ لگتا اکھڑ کر ہاتھ میں آجائے گی، کوستے کوستے تھک کر وہ کوٹھری کا دروازہ بھیڑ لیتیں۔ "اسے اپنی آنکھوں سے تو یہ منظر نہ دیکھوں۔"

کل صبح سے کھانے پینے کا سامان پھر ختم ہو گیا تھا۔ آج مارے کمزوری کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی، ہتّی چلانے کی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ شبراتن نے کئی چکر کاٹے۔ اپنی روٹی کھلانے کی ضد بھی کی، مگر چینیا بیگم نے ایک نہ سنی۔

جیلانی بانو

بزدل

"تا نا نا نا دھیم — تا نا نا نا دھیم —"
کمرے میں سدھا نتا کی ساس آنتو یا اپنا سبق یاد کر رہی تھی ایسے وقت جب دونوں میاں بیوی اپنی چھوٹی لڑکی شاملا کے حسن کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ سدھا نتا کو ساس کی یہ کومل تانیں بڑی پیاری لگیں۔

"اصل میں ہمارے بچوں کی یہ خوبصورتی پدما سے آئی ہے" سدھا نتا نے کہا۔

"پدما سے! وہ کیسے" بھگونتم نے چونک کر پوچھا۔ پدما کونسی خوبصورت ہیں۔! اپنا نام لیتے ہوئے کیوں شرماتے ہو۔؟ اس نے بھری رومانی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا مگر وہ ذرا بھی نہ لجائی درحقیقت پدما کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ کچھ اور سن ہی نہیں سکتی تھی۔

"واہ آپ کو پدما اچھی نہیں لگتیں! مجھے تو وہ بڑی اچھی لگتی ہیں، ان کا حسن تو صرف پرکھا جائے۔ وہ تو ساری دنیا کے پھولوں کی مہک ہیں —" وہ بڑبڑائے گئی۔ اس وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ سدھا نتا ساس کی تعریف کر رہی ہے یا کوئی نئی کویتا لکھ رہی ہے۔

بھگونتم صحافی تھا اور سدھا نتا شاعر۔ اس لئے جب کبھی دونوں ایک دوسرے کی تعریف کرنا چاہتے تھے تو متواز جاتا سدھا نتا کو ہر بات اور ہر چیز اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنے من کی بات سنانے کیلئے گھنٹوں بکتے چلی جاتی اور بھگونتم بس دو ٹوک فیصلہ کر دیتا۔ اور پھر جب آفس کا وقت قریب ہو تو کون قصیدہ خوانی کرے گا! اس وقت بھی جب وہ اپنی دانست میں بڑی شاعری کر رہا تھا۔ سدھا نتا کی اپروائی سے بجھ گیا۔ اس نے اپنا سارا جوش شیشی کو کس کس کے پیار کرنے میں صرف کر دیا۔ اب مجبوراً سدھا نتا کو بھی اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔

"پدما کہتی ہیں شیشی آپ پر گیا ہے"

"اوہ پدما تو پگلی ہیں — دراصل بھگونتم کو اپنی ماں رقیب معلوم ہونے لگی تھی۔ ایک وہ مرد ہوتے ہیں جو اپنی ماں کی برائیاں بیوی سے سنتے سنتے خودکشی کی سوچتے ہیں ایک بھگونتم تھا جس کی بیوی اس سے زیادہ اس کی ماں پر مرتی تھی۔ سدھا نتا اس بات کی پرزور تردید کرنے والی تھی مگر عین اسی وقت گھر میں ایک ہنگامہ مچا اور پدما اپنی دیوانگی کا ثبوت دینے کمرے سے باہر آ لی۔

سنکیسر کے پیڑ کے نیچے جو موری بہتی تھی۔ وہاں محلے بھر کے بچے جمع تھے۔ نالی میں جھانک جھانک کر دیکھتے اور آنگن قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ شرنارتھیوں کی طرح اپنے پیاروں سے بچھڑا ہوا ایک بلی کا بچہ موری کے راستے اندر بھٹک آیا تھا۔ کیچڑ میں لتھڑا ہوا خارش زدہ میاؤں میاؤں کرتا تھا تو پسلیاں تک کھال سے باہر نکل جاتیں۔ بچوں نے اس حقیر کان بکڑ کے اچھالنا شروع کیا اور وہ، نرم روئی کی گیند بن کر کھیلا جانے لگا۔

مگر اس گھر میں دکھ سہنے کا ٹھیکہ تو صرف پدما نے لیا تھا پھر دوسروں کو یہ حق کیسے دیتی۔؟ اس نے بچوں کے چنگل سے نکال کر پدما اسے رسوئی میں لے گئی۔

اب اسے پالا جائے گا۔ سدھا نتا نے سوچا اور اپنی ساس کے اس بیہودہ تصور کو جھٹک کر وہ بھگونتم کے اور قریب سرک گئی۔

پدما نے سچ مچ اسے نہلایا۔ اسے پیٹ بھر کے دودھ پلایا اور شیشی کے جوڑ پر اس کا نام چیتی رکھا۔ اسے ہدایت کر دی گئی کہ آج سے وہ شیشی کا دوست ہے۔

پھر تو چیتی سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا کبھی دودھ کی دیگچی میں منہ ڈال رہا ہے۔ کبھی بسکٹ لے بھاگا۔ صراحی کا پانی پی لیا،

صرف یہی ایک بات کیا! اُسے سنگ کتا کبھڑوں میں ملنے کا بڑا ارمان تھا۔ ساٹھ برس کی عمر میں وہ میٹرک کا امتحان دے رہی تھی۔ پوتیوں کے ساتھ گڑیوں کے بیاہ میں زور شور سے حصہ لے رہی ہے اپنی پوتی کے ساتھ سنگیت سیکھ رہی تھی اور اپنی بہو کے ساتھ سہیلیوں کی طرح مذاق کرنے پر بھی تیار رہتی تھی ان کی پڑوسنوں کے ہاں مہمان عورتیں آتی تھیں تو وہ انسویا کو دکھانے لاتیں "زو" میں رکھے ہوئے نئے جانور کی طرح وہ سب کو بڑی دلچسپ لگتی تھی۔ وہ ایسی خوش قسمت ماں تھی جسے اس کے بچے پیروں کی بیڑی نہیں سمجھتے تھے۔

" تم نے دیکھا بھگوتی! سنکیسر میں کلیاں آ رہی ہیں!
اس نے یوں اپنے بیٹے کو خوشخبری سنائی جیسے آج اخبار کے لئے یہ سب اہم خبر ہو سکتی ہے۔ جب کوئی اہم بات ہوتی تھی تو وہ بے تاب ہو جاتی۔ جیسے من بھر وزنی بوری اُٹھائے اُٹھائے پھر رہی ہو۔ مگر نتیجہ ہمیشہ ایک ہی نکلتا تھا۔ اس کا بھڑکتا ہوا لہجہ چہرے کا سُرخ رنگ اور خبر کی ناقابلِ یقین نوعیت اس کے صحافی بیٹے کے لئے بھیگی ہوئی آتشبازی بن گئی۔

" اچھا ____ " اس نے یوں کہا جیسے اس کی بلا سے پدما کے آنگن بن کتنی ہی کلیاں چٹکیں دنیا کے آنگن میں تو دیپ بجھتے جا رہے تھے۔

انسویا نے بُرا نہ مانا۔ وہ سمجھ گئی۔ دفتر سے تھکا ہارا آنے کے بعد اس کا بیٹا بہو سے ہنسنا بولنا چاہتا۔ وہ دوسرے کمرے میں جا کر مشین چلاتے وقت تلگو کا ایک پرانا گیت گانے لگی۔ اس گیت میں ایک امید والی ماں آدھی رات کو اپنے آنگن میں چاند نکلا دیکھتی ہے اور سب کو جگاتی پھرتی ہے۔ تاکہ بے چارے لوگ چاندنی کے دیدار سے محروم نہ رہ جائیں۔

چولھے کے سامنے بیچ آنگن میں اس نے سنکیسر کا پیڑ بڑے چاؤ سے لگایا تھا۔ شروع گرمیوں میں جب سنکیسر کے نازک نازک سبز ____ پتوں میں لال لال کلیاں چمکتی تھیں تو انسویا کی ہنسی کسی طرح نہ رکتی۔ دنیا بھر کے جوڑ بے جوڑ گیت اس کی زبان پر ناچنے لگتے تھے۔ اور جب شام کی خنک ہواؤں سے سنکیسر کے سُرخ سُرخ پھولوں کی بوچھار ہوتی تھی تو وہ زبردستی

سدھا نتا کو لا کر پیڑ کے نیچے کھڑا کر دیتی۔ اس بھاگ دوڑ میں خود اس کے سفید بالوں میں بھی سُرخ پھول اٹک جاتے تھے بچے خوشی کے مارے تالیاں پیٹنے لگتے۔ مگر وہ پھول یوں ہی اٹکے رہنے دیتی جس موسم میں پھول کھلتے تھے تو اس کا کام اور بڑھ جاتا تھا۔ روز صبح اٹھ کر سب سے پہلے نیچے گرے ہوئے پھول اٹھانا پڑتے تھے۔ ورنہ کہیں بچے پاؤں سے روند ڈالیں تو انسویا کو بڑا دکھ ہوتا۔ ایک بار اس کی نانی نے کہانی سنائی تھی کہ پھول تو اصل میں پریاں ہیں جو آنکھ مچولی کھیلتے وقت رنگ برنگے کپڑے پہن کر درختوں سے نکلتی ہیں۔ جب کوئی ایک پھول توڑتا ہے تو ایک پری مر جاتی ہے۔
انسویا نے یہ کہانی اپنے سب پوتوں پوتیوں کو سنائی تھی۔
" اور فاختہ کون ہوتی ہے پدما۔ شاما پوچھتی تھی۔
" فاختہ پہلے ایک عورت تھی ایک دن اس کا میاں فاقوں سے تنگ آ کر کمانے کے لئے کہیں گیا اور راستے میں موت کسی شکاری کی بندوق سے نکلی اور اسے جھپٹ لے گئی۔ بیوی بے چاری نے اس کے لئے کھانا پکایا۔ بستر بچھایا اور انتظار کرتی رہی۔ آخر تھک ہار کے اس نے فاختہ کا جوگ لیا اور اب آبادی میں اسے ڈھونڈنے کے لئے گاتی پھرتی ہے۔ ہائے آیا نہ تو اے دوست تو ____ اے دوست تو ____ کہانی سنانے کے بعد بڑی دیر تک انسویا اپنے آنسو پونچھے جاتی تھی۔ بڑی دیر تک بے جوڑ مصرع آہستہ آہستہ کہے جاتی ____ اے دوست تو ____ اے دوست تو ____
معلوم نہیں یہ کہانیاں سچ سچ انسویا نے کسی سے سنی تھیں یا بس یوں ہی دل سے جوڑی تھیں۔ مگر ان کہانیوں نے اسے بڑا توہم پرست۔ اور وہمی بنا دیا تھا۔
اگر صبح ہی کوا منڈیر پر آ بیٹھے تو ضرور سنجیوا کا خط آئے گا اور خط نہ آتا تھا تو رات بھر فکر کے مارے کروٹیں بدلتی تھی۔ نہ جانے سنجیوا نے کس ضروری بات کے لئے خط بھیجا ہو گا جو ڈاک میں کہیں کھو گیا۔ کسی کے جوتے پر جوتا سوار ہو تو سفر تیار ہے شیشہ گر کے ٹوٹ جائے تو دل کو صدمہ پہنچے گا اور پھول اوپر گرے تو پریاں بچوں کی سلامتی چاہتی ہیں۔
لوگ اس کی باتوں پر بالکل کان نہ دھرتے تھے خصوصاً صبح کے وقت تو کسی کو فرصت نہ ملتی تھی کہ بیٹھ کر پدما کے خواب

بچوں کا بستر گندہ کر گیا۔ سارا گھر لعنت بھیج رہا ہے۔ اور انسویا یوں شرمندہ ہو رہی ہے جیسے مجیوا کی نالائقیاں تو اُسی ہو، چاول صاف کرتے میں گھنٹوں اُسے اپنے پاس بٹھا کے سلیقے اور عقل کی باتیں سمجھاتی اور آئندہ فرمانبردار رہنے کا وعدہ بھی لیتی تھی۔ تھوڑی دیر تو وہ یوں آنکھیں بند کئے مراقبے میں رہتا جیسے اپنی غلطی پر شرمندہ ہو، پھر دیکھئے تو وہی اول جلول حرکتیں۔

بچے بچے سب ایک، چاہے وہ بلی کے ہوں یا آدمی کے۔

وہ سدھانتا کو بگڑے موڈ میں دیکھ کر سمجھاتی۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ تم دیکھنا میں اسے کیسا سلیقہ مند بناتی ہوں۔"

اور پھر سچ مچ تھوڑے دنوں کے بعد اس کے جسم پر وہ خوبصورتی اور صحت آ گئی جو ماں کی شفقت بھرے ہاتھوں سے سنواری جاتی ہے۔ صبح کے وقت جب انسویا چکی کے کھونٹے کی طرح گھومتی پھرتی تو چٹی اُس کے پیچھے پیچھے دوڑتا۔ بار بار اُس کے پاؤں چھو کر بھاگ جاتا۔ ذرا بھی دم لینے کی فرصت ملتی تھی تو انسویا جلدی سے پردے کے پیچھے چھپ جاتی۔ پہلے تو چٹی ننھے چوہے کرکے اُس کی خوشبو کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا۔ پھر جب گھبرا کے زور سے چلانے لگتا تو پدما دوڑ کر اُسے گلے سے لگا لیتی۔ اس کی پلکیں نم ہو جاتیں۔ بچہ تو چاہے آدمی کا ہو یا بلی کا ماں کی چھاتی سے لگے بغیر اسے چین کیسے ملے گا!

سدھانتا اپنی ساس کو بلی کے بچے پر اتنا مہربان دیکھ کر ہنس پڑتی تھی۔ اُسے اپنی ساس بُری نہ لگی۔ حالانکہ بیاہ کے رنگین سپنوں کو ساس کے تصور نے بڑا بھیانک بنا دیا تھا۔ کیونکہ اس نے اپنا پتی خود چنا تھا پھر جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کی ساس نے بھگوتم کو بڑی مصیبتیں سہہ کر پالا ہے تو سدھانتا کانپ گئی تھی۔ بھگوتم نے اُسے اپنے گھر کا رتی رتی حال بتا دیا تھا۔ اُس کے باپ نے جوانی میں بیوی بچوں کو چھوڑ دیا تھا اور اُس نے بڑی دلیری سے زندگی کا مقابلہ کیا ہے۔ وہ اپنے بچوں کے لئے ہر قربانی دے سکتی ہے۔ یہ سن کر سدھانتا پر اور وحشت سوار ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی جو عورت جتنا ظلم سہتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ ساس بنتی ہے، پھر جب بہو بن بلائے آ جائے تو ساس کی جوتیاں اُس کے لئے وقف ہو جانا ضروری ہیں۔

اسی لئے بھگوتم سے سول میرج کرنے سے پہلے اس نے اپنی کویتاؤں کی کاپی پرانی الماری میں پھینک دی۔ دوستوں سے قطع تعلق کر لیا۔ سر پہ پلو ڈالنے اور نگاہیں نیچی رکھنے کی مشق شروع کر دی بلکہ اُس نے تو چاول ابالنے اور "سوم" بنانے کے ارادے بھی کر لئے تھے۔ بھگوتم جیسے ہیرے کو پانے کے لئے وہ ہر چٹان توڑنے کو تیار تھی مگر انسویا کے گھر اُسے یوں لگا جیسے وہ روئی میں دھنسی جا رہی ہو۔ پدما کتنی فراخ دل ہے۔؟ دس برس کے ساتھ میں بھی سدھانتا کو پتہ نہ چلا۔ سوتیلی ماں کے کڑوے سلوک نے اُسے ماں کا بھی کوئی میٹھا تصور نہ دیا تھا۔ اسی لئے وہ مقابلے کی کوشش چھوڑ کر صلح کی جھنڈی دکھانے کا ارادہ کر بیٹھی تھی۔ مگر پدما نے اسے کبھی اتنی دور نہ ہونے دیا کہ وہ درمیان میں کوئی چیز لاتی۔ دو برس تک وہ پدما کے اس بے معنی پیار کو معنی پہناتی رہی، اس طوفان کی منتظر رہی جو اچانک ایک دن پھٹ پڑے گا اور پدما اپنا معصوم چہرہ میٹھی زبان اور بچوں کے سے قہقہے بھول کر اپنے اصلی روپ میں نکلے گی۔

پتنگوں میں پیچ سے پڑ رہے تھے سدھانتا نے ساس پر کنکر بھی پھینکے اور کچوکے بھی دیئے۔ پھر اُس نے ہار مان لی۔ بڑھاپے نے اس کی شگفتگی ذرا بھی نہ چھینی تھی۔ نہ جانے وہ کیسے زندگی بھر دُکھ اٹھاتی رہی اور مسکرانا بھی نہ بھولی۔ پھر رفتہ رفتہ پدما نے سدھانتا سے یوں دوستی بڑھائی کہ انھوں نے اپنے درمیان سے ساس بہو کے رشتے کو نکال پھینکا۔

اس گھر کی فضا عجیب تھی۔ ان کے پڑوسی چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ محلے کی بہوئیں جب ساس کے ظلم سہہ سہہ کر روتی ہیں تو لوگوں کو بالکل ترس نہیں آتا۔ یہ تو ہر عورت کا پیدائشی حق ہے تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر یہ بہو بھی اپنے بیٹے کی دلہن لائے گی اور اسے یوں ہی رولایا کرے گی۔ یہ عورت جو زندگی بھر ساس اور شوہر کی فرمانبرداری کرتی ہے صرف اسی دور میں ڈکٹیٹر بن جاتی ہے۔ لوگ اس سلسلے میں مطمئن تھے۔ مگر بوڑھی انسویا نے اس روایت کو توڑ دیا تھا۔ اس گھر میں ساس اور بہو ہر وقت قہقہے لگاتی تھیں یہ بات کتنی انہونی بات تھی۔

روٹھا گیا!

صرف انسویا رہ گئی جسے نہ سینا پرونا تک نہ آتا تھا نہ پڑھنا لکھنا۔ حد ہو گئی اسے مرچوں کا اچار ڈالنا بھی نہ آیا جس کے بغیر کوئی ریڈی کھانا نہیں کھاتا۔ لڑکیوں کو گنونتی بنانے کا فائدہ ہی کیا تھا! سارے گن تو روپے میں چھپے ہوتے ہیں مگر انسویا اپنی بہنوں کی طرح لیتروں پر اینڈنے کے بجائے ہر کام میں ٹانگ اڑاتی اور دھتکار دی جاتی۔ کھیت کی مینڈ پر بیٹھی وہ ان چڑیوں کو دیکھتی تھی جو ہمیشہ ساتھ ساتھ اُڑتی چلی جائیں پھر اس کی نگاہ نرم اور گیلی کھیت کی مٹی پر جاتی تھی جس کی ٹھنڈک میں بیجوں کو دبا دیا گیا تھا۔ یہ بیج زمین کے سینے سے پودا بن کر کیسے نکلتے ہیں!

"اب پدما لوگوں کو بڑھاپا کیسے آجاتا ہے؟"

"پدما پھول کیوں کھلتے ہیں!"

"پدما لڑکیوں کو جہیز کیوں دیا جاتا ہے!" وہ چوبیس گھنٹے اپنی دادی کی جان کھائے جاتی تھی۔ سب کے اصرار پر اس کے باپ نے دو روپے مہینے کے حساب سے اس کی پڑھائی کا خرچ جوڑا اور وہ کاغذ پھاڑ کے پھینک دیا۔ اتنے روپے ڈال کر تو زیور بھی قیمتی سا دولہا آسکتا ہے۔ دوسرے کام سکھانا بھی فضول ہی تھے۔ پہلے پہن پہنا سلواؤ تو خراب گا۔ ناچ سکھلانے کے لئے نبیلوں کی تنخواہ ہو۔ گانا سکھانے لئے ہارمونیم چاہئے۔ البتہ کھلانے پلانے میں کمی نہ کی کیونکہ لگاتے وقت لڑکیوں کے جسم پر بکریوں کی طرح گوشت تولا جاتا تھا۔ اتنی کفایت کرنے پر بھی پانچویں بیٹی کا نمبر آتے آتے اس کا باپ "بین" ہو گیا اور صرف سات ہزار میں انسویا کے لئے ایک چلتا پرزہ ڈھونڈھ لایا۔ گاؤں کے مقابلے میں شہر کے لڑکے بہت سستے مل جاتے ہیں، کیونکہ شہر میں ان کی مانگ نہیں رہتی۔ انسویا نے بھی یہاں کبھی کھیتوں کی ہریالی دیکھی نہ تازہ دہی کھایا۔ یہ سات ہزار روپے جیب میں ڈال کر اس کا پتی تو اپنے ارمان پورے کرنے نکل گیا اور بوجھ اس کے پلے پڑی۔

اگر دنیا میں جھوٹ نہ پیدا ہو جائے تو سچائی کی پرکھ کیسے ہوتی! اگر ہر عورت انسویا بن جائے تو ظلم کہاں سر پھوڑتا پھرے گا! اسی لئے انسویا کی ساس نے اس روایت کو سختی سے نبھایا۔ اس دروازہ کو بھی بند دیکھ کر انسویا نے اپنے بچوں کے آگے جھولی پھیلا لی۔ اور اسے پناہ مل گئی۔ ہر لڑکی کی طرح وہ بھی جبین نیاز میں شوہر کے لئے تڑپتے سجدے لئے بیٹھی رہی مگر وہ کبھی لباس مجاز میں نظر نہ آیا۔ تھوڑے دنوں تک آنکھ مچولی کھیلی گئی اور وہ ایسا چھپا کہ انسویا کی آنکھیں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پتھرا گئیں۔

اس نے پتی کے ظلم بھلا دیئے اور پتی کی مار بھی۔ اس نے اپنی روح پر لگے ہوئے سارے گھاؤ بھلا دیئے۔ مگر اس کے جسم کے چمکتے ہوئے سفید داغ ابھی تک وہ زمانہ نہیں بھولے تھے البتہ جب کوئی انسویا سے ایک کان غائب ہونے کی وجہ سے پوچھتا تھا تو شرمندہ سی ہو جاتی تھی۔ ایک بار اس کے پتی نے انسویا کے کان سمیت اس کے بالیاں کسی رنڈی کی خدمت میں پیش کی تھیں پھر بھی انسویا نے کوئی احتجاج نہ کیا تو اگلا کہ وہ مستقل طور پر اس رنڈی کے ہاں جا پڑا۔ یہ خبر سن کر انسویا گھنٹوں کرشن جی کی مورتی کے آگے پڑی رہی پھر اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ اپنی ساس کو تسلی دی اور کمر پہ ساری کا پلو کس کر کام دھندے میں لگ گئی۔

ایسی عورتیں دنیا میں تو کمیاب ہیں! سدھا نہ تو سوچتی تھی نہ جانے یہ رونے کی بات ہے یا ہنسنے کی!

اُسے اپنی ساس پر بڑا غرور تھا۔ جب کبھی عورت کا ذکر ہوتا تو وہ اپنی ساس کی مثال ضرور دے آتی۔ "پدما تو مجھے میرا معلوم ہوتی ہیں جن پر نہ تو سانپ کے کاٹے کا اثر ہوتا ہے نہ بِس کے پیالے کا! دنیا کی ہر ناانصافی کو سہہ کر ہنسنے والے لوگ تو اب صرف بھگوت گیتا میں ملتے ہیں"

سدھا نا کا جی چاہتا تھا کہ وہ پدما کو پھر سے پا لے۔ ان کے سارے ارمان پورے کرے۔ اور پدما ہنس ہنس کر بہو کے احکاموں کی تعمیل کو دوڑتی تھی۔ بہو کے ہر مشورے میں اسے لاکھوں فائدے نظر آتے تھے۔ وہ اپنے بچوں کو ہمیشہ اپنے آپ سے زیادہ عقلمند مانتی آئی تھی پتی کا سلوک اور بچوں کی فوج دیکھ کر اس کی ساس نندیں بھی دور ہٹ گئی تھیں اپنے دل میں ارمانوں کو گھٹاتے

سنے جاتیں سدھانتا بچوں کو اسکول بھیجنے میں لگی ہوتی۔ سدھانتا کی بڑی لڑکی درّا لکشمی سنگار بناؤ میں غرق، بھگونتم کو اخبار اور نامس کی فائلوں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ البتہ اس کا ہمیشہ بیمار رہنے والا پوتا شنّی دادی کی سرگرمیوں میں برابر کا شریک رہتا تھا۔ بلکہ وہ تو چاہتا تھا کہ پدماں اُسے گود سے ہی نہ اتارے۔ لیکن وہ صبح کے وقت کام کی زیادتی سے بدحواس دوڑتی پھرتی تھی۔ کھانے کی میز سے چولھے تک سیکڑوں چکر کاٹنے پڑتے، سب جانے والوں کو کھلا پلا کے ہنسی خوشی دن بھر کے لئے رخصت کرنا اس کا بیحد ضروری کام تھا۔ ورنہ دل پر خلش سی رہتی تھی کہ آج سدھانتا نے "بچو" نہیں لگایا۔ بھگونتم نے ٹھنڈی چائے پی ہے درّا لکشمی کی کتاب نہیں ملی اور وہ اسکول میں پٹے گی!

ایسے وقت کوئی گھر میں جھانک کر دیکھتا تو اُسے رنگا رنگ آوازوں کی تال پر رقص کرتی ہوئی ایک سفید سر والی عورت نظر آتی۔ اُس کے سفید بالوں کا جوڑا اس کے سر سے بھی بڑا تھا۔ معمولی سی ملگجی سی ساڑی یوں اس کے جسم پر لپٹی رہتی تھی کہ چولی کا رنگ کبھی نظر نہ آتا تھا۔ یہ اُس کا پچھلا حصّہ تھا۔

مگر اس کے سفید بال پلو میں چھپے ہوئے ہوں تو اس کا، گٹھیلا جسم پچیس تیس برس سے زیادہ نہ معلوم ہوتا۔ رات کو جب وہ اپنی پوتیوں کے ساتھ پتلون سنگیت سیکھتی تھی اور سہو کے پاس بیٹھی میٹرک کی اسٹڈی کرتی تھی تو اُس کے چہرہ پر سترہ اٹھارہ برس کی لڑکیوں والی تازگی اور تجسس ہوتا ہر نئی بات کو سن کر وہ بچوں کی طرح آنکھیں جھپکاتی۔ دل اپنی رفتار تیز کر دیتا اور اس کے قہقہے کسی طرح نہ کم ہوتے۔ جنہوں اُس کے پڑوس میں رہنے والے کالج کے لڑکوں نے انتویا کے گھنگھروں سے اپنے جوڑ جوڑ میں درد محسوس کیا اور اس کی آواز کی مٹھاس نے پکی دیوار دل کو کھود کر پھینک دیا تھا تاکہ وہ اس سنہری آواز والی مغنیہ کو دیکھ کر اپنے سلسلہ عشق کو طول دے سکیں۔ مگر اس کے سفید بالوں نے کالج کے لڑکوں کو وہاں سے بھگا دیا تھا۔

بڑھاپے نے پہلا وار اُس کے بالوں پر کیا تھا۔ اس کے بعد اس کی نگاہ پر اور یہاں سے آگے بڑھنے کا راستہ ہی نہ ملا۔ ایک جسم پر اتنی مختلف آب و ہوا کے خطے بڑے تعجب خیز لگتے تھے

عورت کے برِ عظیم میں مسکراہٹ کی بارش تو چند لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ ورنہ جدھر دیکھئے تپتے ہوئے میدان اور جھلسے ہوئے صحرا پھیلے نظر آتے ہیں۔ ایسا جسم تو وہی عورتیں رکھ پاتی ہیں جو زندگی کا آئینے کے گرد بیٹھی رہیں۔ مگر اُسے دوسروں کے دکھ پڑھنے سے فرصت ہی کب ملتی تھی جو اپنا منہ دیکھتی!

انتویا تلنگانہ میں پیدا ہوئی تھی۔ ریڈی قوم جتنی مہذب کہلاتی ہے اتنی ہی شدّت سے اپنی روایتوں کی پھانسی گلے میں اٹکائے رکھتی ہے انتویا کی چار بڑی بہنیں اور تھیں۔ ریڈیوں میں پانچ بیٹیوں کا باپ خودکشی کرے تو پولیس کا انسپکٹر بھی پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ کیونکہ زندہ رہنے کے لئے اُسے ڈاکوؤں کی ٹولی میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ برادری میں تو ٹکے اور اپاہج لڑکے بھی دس بیس ہزار سے کم میں نہیں ملتے۔ پندرہ بیس ہزار میں بے عیب لڑکا مل جائے تو جانئے دولہا لوٹ لیا۔

انتویا کا باپ درختوں پر چڑھ کر سیندھی تاڑنے کی مزدوری کرتا تھا پانچ بیٹیوں کی خبر سن کر زمین آتر آیا۔ مگر ڈوب مرنے کو کوئی جگہ نہ ملی۔ جتنے تالاب تھے سرکار کی ملکیت، جتنے کنوئیں تھے جاگیردار کے کوئی ڈوب مرتا تو اس کے وارثوں کو اپنے خرچ سے کنواں صاف کروانا پڑتا۔ اسی لئے تو تلنگانے میں ڈاکوؤں کی اتنی کثرت تھی اونچی نیچی پہاڑیوں میں سیکڑوں اُچکے دبکے رہتے تھے جو زیادہ سنجھ جاتے وہ چھپنے کے بجائے بیچ کھیت میں کھڑے ہو کر دوسروں کی کمائی چھین لیتے تھے۔ انتویا کے باپ کو بھی لوٹنے والی ٹولی میں ملنا پڑا پہلے وہ کسانوں کے ڈھکے چھپے راز بتا کے انعام پانے لگا۔ پھر اُسے پیٹنے پر ... نالی پھر اُس نے نیا چھپر ڈالا۔ پھر خالی آنگن میں بھینس آئی اور آس پاس پکی اینٹوں کا احاطہ کھینچ کر وہ اندر جا

اس عرصہ میں انتویا کے باپ نے کچھ نہ کیا صرف مسکرانا سیکھ لیا کرتا! ریڈیوں میں پانچ بیٹیوں کے باپ کو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح اُس نے کسی لڑکی کے لئے پچاس ہزار میں میٹرک پاس دولھا خرید لیا۔ کسی کے لئے پچیس ہزار میں مڈل فیل کا رشتہ۔ اور رفتہ رفتہ پانچوں بیٹیاں ٹھکانے لگا دیں۔ اس نے اپنی بیٹیوں کو اور کچھ نہ دیا یہاں تک کہ وداع کے سمئے اُس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا یہ لڑکیاں تو اُس کے دل میں چھپی ہوئی برچھیاں تھیں اُن کی جدائی پر

باری گھر سکے ہر آدمی سے پڑھوا کر سنتی۔ احساس کی شدت کا ایک لمحہ وہ بھی آتا ہے جب انسان مبہوت ہو جائے۔ بالکل خالی خالی الذہن۔ دماغ کے ساتھ ساتھ جسم بھی دھنکی ہوئی روئی کی طرح فضا میں اڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی چائے میں نمک ڈال رہی ہیں کبھی بیچوچارے "میں اعلیٰ غائب، شاملا کو پکار رہی ہیں اور طوطے سے کچھ کہنا ہو تب بھی سنجیوا کا نام لب پہ چلا آ رہا ہے۔ پھر دوسرے دن اچانک ہی کسی نئی چیز کا شوق ہوتا۔ سدھا نتا ننگ سیکھتیں یا پھر کوئی نیا جانور پالا جاتا اور ادھ کھلی کلیوں کو یوں ہی کھلی ہوائی میں رکھ دو تو گھنٹوں تازہ رہتی ہیں۔ انسویا نے بھی اپنی کچی امنگوں کو سینت کر رکھ دیا تھا اور اب وہ ہر نئی چیز کو دیکھ کر بچوں کی طرح چھونے کی کوشش کرتی تھی۔

ایکدن وہ یوں ہی سنجیوا کا خط تھامے کھڑکی میں کھڑی کاٹی زمین کی گہرائیاں ناپ رہی تھی کہ اس کی نگاہ پڑوس میں چگتے ہوئے مرغی کے چوزوں پر گئی اور جی مچل اٹھا۔ ان چوزوں کو اپنے ہاتھ سے چھونے کے لئے وہ بے قرار ہو گئی۔ اس دن نہ تو ہوم ورک ہوا نہ اُس نے چھٹی کو اٹھا کے پیار کیا۔

شام کو بازار سے لوٹی تو ساتھ میں ایک چیختی چلاتی مرغی تھی اور ایک ٹوکری میں انڈے تھے۔

"اب یہ گندگی گھر میں پھیلے گی ــ؟" نکھو نتم نے دبے لہجہ میں بیوی سے شکایت کی۔

"کیوں فضول میں کام بڑھاتی ہو پدما ــ؟ سدھا نتا کو بھی ساس کا یہ نیا شوق ذرا نہ بھایا۔ مگر شاملا اور شنی نے پدما کو رائے نہ بدلنے دی۔ انھیں بھی ننھے ریشمی چوزوں کو اپنے ہاتھ سے چھونے کا بڑا ارمان تھا۔

تینوں نے مل کر لوگوں کی پروا کئے بغیر سنکلیسر کی چھاؤں تلے مٹی جمع کرنا شروع کر دی۔ شنی نے پانی لانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ شاملا پدما کو مٹی گوندھ گوندھ کر دیتی گئی اور چند گھنٹوں میں مرغی کے لئے ایک شاندار بنگلہ تیار ہو گیا۔ اس میں روشندان بھی تھے اور کھڑکیاں بھی۔ تاکہ چوزوں کا دم نہ گھٹ جائے۔

"پدما اپنے جوڑے کو تو میں بستے میں ڈال کر اسکول لے جایا کروں گی۔" شاملا نے ابھی سے پلان بنا لیا تھا۔

"ہائے کہیں ایسا نہ کرنا۔ بستے میں ڈالنے سے تو وہ مر جائیں گے۔ وہ تو بہت نازک ہوتے ہیں۔"

"کتنے نازک ــ ؟" شاملا چاہتی پدما اس موضوع پر بولنا کبھی ختم نہ کریں۔

"جیسے پھول ہوتے ہیں۔ تم نے وہ پھولوں اور پریوں والی کہانی سنی تھی۔ ! بس ننھے چوزے بھی ایسے ہی پھول ہوتے ہیں اگر ایک چوزہ مر جائے تو سمجھو ایک آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی پری کام آگئی۔"

"ہے ہے ــ" شنی گھبرا جاتا تھا۔ شاملا دیکھ خبردار جو کبھی تو نے چوزے کو چھوا۔

اور پھر وہ دونوں بڑے اداس ہو گئے۔ چھوئے بغیر چوزوں کو پالنے میں کیا خاک مزہ آ جائے گا ــ ؟

صبح وہ تینوں چپکے چپکے اٹھ کر سنکلیسر کے نیچے جمع ہو گئے اپنی دُم سے آنگن میں کھیلنے والا جیمی بھی پدما کے اس اہم کام کو خاموشی سے دیکھنے لگا۔ اس وقت ان کے چہروں پر بڑی سنجیدگی تھی دونوں بچے ذمہ دار کمپوڈروں کی طرح پدما کی مدد کر رہے تھے۔ پدما نے انڈے گھاس پر رکھ کر مرغی کو چھوا تو وہ ڈھونگ رچانے والی عورتوں کی طرح شور مچانے لگی۔ مگر انڈے دیکھ کر پدما کو گالیاں دینا بھول گئی۔ یوں پرائے مال پر قبضہ جما کر بیٹھ گئی جیسے ایک ایک انڈا اس نے اپنی جان پر صدمے سہہ کر دیا ہو۔

انسویا نے ڈربے کی دیوار پر مرغی بٹھلانے کی تاریخ لکھ دی تھی ہر روز شنی اور شاملا کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ آج پہلے وہ لکیر بڑھا دیں۔ مگر دونوں لڑ پڑتے۔ اگر بچے نکلنے کی تاریخ یاد نہ رہی تو سبا لیکن وہ تاریخ تو انسویا کے دل پر لکھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی خوشیوں اور غموں کا ساتھی کبھی کسی کو نہ بنایا تھا۔ یہ بیج تو وہ خود ہی بوتی، خود ہی سینچتی اور خود ہی آگ لگا دیتی تھی۔ لوگوں کو خبر تک نہ ہوتی تھی کہ اس کے اندر کیا ہو رہا ہے!

جب کوئی کام نہ رہتا تھا تو وہ جیمی کو سینے سے لگا لے کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی۔ اس بلی کے بچے کو سینے سے لگا کے اُسے بہت سے بچھڑے ہوئے یاد آ جاتے تھے۔ بڑی لڑکی تو بھاگلپتی جو دیجے واڑہ میں اپنے پتی کے گھر چلی گئی تھی اور سنجیوا جو کسی اندھیری کوٹھری میں بیٹھا جوار کا گنگا گھا رہا ہو گا۔ اور چھوٹی بیٹی کرشنا

گنگناتے وہ اب بچوں کو ڈانٹتے ہوئے بھی کانپ جاتی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنا چاہی جو اس کے اختیار میں تھی۔ سلائی کرتے کرتے رات اس کی آنکھوں میں مستقل طور پر آن بسی۔ اس کے بچوں کو بے نتھے بیل کہا جاتا تھا۔ اس کی لاپروائی مثال بنا کر دکھائی جاتی۔ مگر وہ ہر اعتراض سن کر مسکرائے گئی۔ محنت کے غازے سے چمکتے ہوئے چہرے پر اداسی بہت کم پھیلتی تھی۔ اس کی خود اعتمادی سے برادری کو ایسی گھٹن لگی کہ وہ دودھ کی مکھی بنا کر نکال دی گئی۔ بے قابو اولاد تو جب ہوتی کہ اس کے روکے سے نہ رکتی۔ مگر اس نے کبھی اُن کے آگے بند نہ باندھے۔ پھر جب ایکدن لوگوں نے سنا کہ اس بد تمیز بھگونتم نے ایم۔ اے پاس کر لیا ہے تو سب نے مار باندھ کے اسے نوکری کے جوے میں کسنا چاہا۔ مگر جب بھگونتم انسویا کی گود میں سر رکھ کر خوب رویا تو اس نے قسم کھائی کہ اپنے بیٹے سے کبھی نوکری نہ کروائے گی۔

پھر بھگونتم اپنے اصولوں کو سینے سے لگائے ایک تلگو اخبار نکالنے لگا جسے زندہ رکھنے کے لئے انسویا رات میں بھی سلائی کرنے لگی اور روز روز عدالت سے بھگونتم کو بلاوے آنے لگے۔ پھر ایکدن اُس کے اخبار میں کام کرنے والی ایک لڑکی اُن کے ہاں آئی اور ایک دن بھگونتم اسے اپنی بیوی بنا کر لے آیا۔ بہو سمجھی شاید اس کی تنخواہ کے چار سو روپیوں نے ساس کو خوش کر دیا ہے۔ مگر انسویا کے دل پہ تو بھگونتم کے مسکراتے ہوئے چہرے کا عکس پڑ رہا تھا۔ بیٹے کو اتنا خوش دیکھ کر اُس کے قہقہے بھی کسی طرح نہ رکتے وہ تو اپنے چھوٹے بیٹے سنجیوا کو بھی اسی طرح بہلانے کا مشورہ دینے والی تھی۔ جو سدھا نتا کی طرح، پنے میاں کے کام میں ہاتھ بٹائے کالج میں لڑکوں کو پڑھائے۔ بچے پالے اور اس کو "کنگ پراکر" پڑھا سکے۔

مگر سنجیوا دن رات بھائی سے بحث کرتے کرتے جانے کیا کیا سوچنے لگا۔ ایک دن خبر آئی کہ کالج سے اسے پولیس پکڑنے گئی ہے۔ انسویا بھونچکا سا ہو گیا۔ پھر وہ واپس آیا تو ایکدم بدلا ہوا۔ بھگونتم اور سدھا نتا بھی بحث کر کے ہار گئے۔ ایک دن جب وہ بڑی لمبی جیل کاٹنے کو جا رہا تھا تو اس نے ماں کے پاؤں چھو کر کہا۔ "اگر تم مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہو تو مجھے جاتے وقت مت روکنا"

اس دن سدھا نتا بڑی مضطرب سی رہی۔ یوں جیسے آج وہ پدما کی ہار دیکھنے کو تیار نہ ہو۔ آج اسے بھگونتم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ماں عورت کا سب سے کمزور پہلو ہے۔ سنجیوا کی اس حرکت پہ نہ صرف برادری ناراض ہوئی بلکہ حکومت نے بھی انسویا کی جان کھالی۔ دونوں دہ عدالت میں گھسٹتی پھری۔

پھر وہ اپنے اس بیٹے کو بھی بھول گئی جو ماں کے ہاتھ سے کھانا کھائے بغیر کالج نہ جاتا تھا۔ اپنی پوتیوں کے ساتھ کھیل میں یوں مشغول ہو گئی جیسے زندگی کی تلخی کبھی اس کے ہونٹوں کو بالکل نہ لگی ہو۔ اس کی پوتیاں برابر والیوں کی طرح اس سے مقابلہ کرتی تھیں۔ ماسٹر آکر بیٹھے تو سبق فر فر یاد۔ تلگو میں سب سے آگے۔ حساب زبانی رٹا ہوا۔

"ذرا پدما کو دیکھو کیسی جلدی سبق یاد کر لیتی ہیں" ماسٹر صاحب بچوں کو شرم دلاتے۔ ذرا لکشمی حسد بھری نظروں سے پدما کو دیکھتی تھی بھلا بھگوان کی مہربانی تھی کہ پدما ان کے ساتھ اسکول نہیں جاتی۔ ورنہ سب شکستیں ہی شکستیں قسمت میں لکھ جاتیں۔ مشکل بات یہ تھی کہ پدما کا دل کبھی پڑھنے سے اچاٹ نہ ہوتا تھا۔

جب بہو ورک کے ساتھ گھر کے کام دھندے بھی نپٹ جاتے تو وہ اپنی بہو کے پاس آ بیٹھتی۔

"سدھا نتا یہ۔ این۔ او میں کیا کام ہوتا ہے؟"

"سدھا نتا ریڈیو میں سے آواز کیسے آتی ہے؟"

ایک دن شانتا نے سے "پتھر پاشا" کھیلنے پر راضی کر لیا۔ مگر اسی وقت سنجیوا چاچا کا خط آیا۔ اور جس دن سنجیوا کا خط آتا تھا تو وہ کسی سے نہ ملتی۔ جیسے عمر بھر کی پڑھائی اُڑ ھی جا چکی ہے جیسے ساری دنیا کے کام ختم ہو چکے ہیں۔ ہنسی روٹھ کر پنے میکے چلی گئی ہے بچے تعجب سے پدما کو دیکھتے تھے۔ سنجیو اچا چا جانے کس نوکری پر گئے بیٹھے۔ کبھی مہینوں میں گھر آتے تو آدھی رات کو دروازے کے بجائے دیوار پھاند کر صبح کو کیچڑ میں بھرے ہوئے میلے کپڑے کاغذوں کے انبار۔ جھوٹے برتن اور پدما کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ رات کون آیا تھا۔ جس دن سنجیوا کا خط آتا تھا۔ تو وہ کسی سے بات نہ کرتی پچاسیوں بار خط پڑھا جاتا۔ پھر باری

اس شہد آگیں آواز والی حسینہ کی یاد میں لوٹنے لگے۔

ابھی وہ ٹھیک طرح سے بھی نہ آئی تھی کہ حسبِ معمول ششی بخار کی شدت سے اُٹھ بیٹھا اور وہ تنبورہ رکھ کر شن جی کی مورتی کو سلام کئے بغیر بھاگی۔

پھر اُس کے کام شروع ہو گئے۔ ششی کو دودھ گرم کر کے دینا، گرم کپڑے پہنانا، چیکی کو پیار کرنا، آنگن میں گوبر کا چھڑکاؤ کر کے چونے سے بیل بوٹے بنانا۔ اس وقت سارا گھر سو رہا تھا سوائے چیکی کے جو اپنی دُم کو چھونے کے لئے گول گول چکر کاٹ رہا تھا۔ جب انوّیا اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی تھی تو وہ دوڑتا ہوا اُس کے قدموں میں آگرتا۔ مگر آج انوّیا کے ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے۔ وہ اُجالے کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی اسی لے دے میں دودھ کی پیالی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ گئی اور اس کا جی ڈوب گیا سویرے ہی یہ کیسی بدشگونی ہوئی۔ نہ جانے آج کیا ہو!

روتے ہوئے ننھی کو بہلانے [illegible] یاد تھے سب بھول گئی۔ چیکی بار بار اُس کے پاؤں میں لوٹ کر پیار کرنے کا تقاضا کر رہا تھا، اب تو اچھا خاصہ اُجالا ہو گیا۔

اُس نے دودھ کی ہانڈی انگیٹھی پر رکھی اور ڈربے کے قریب جا بیٹھی۔ اندر بہت ہی واضح چوں چوں شروع ہو چکی تھی اچھا تو بچہ نکل آیا! خوشی کے مارے وہ یہ خبر سنانے کے لئے تیزی سے دوڑی۔ پھر ایک ادھورا دائرہ بنا کے ڈربے کے پاس آ بیٹھی۔ چیکی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

بڑی بے بسی کے ساتھ اُس نے سوتے ہوئے ننھی کو دیکھا پھر بند کمروں کو۔ اس لازوال مسرت میں کوئی بھی تو اُس کے ساتھ شریک نہیں تھا!

چپکے چپکے اُس نے شا ملا اور ننھی کو جگا دیا۔

"جلدی سے اٹھو بڑی بابو آگئے۔ تم سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں"

پھر جب وہ دونوں آنکھیں ملتے، ناردھاد ھند ڈربے کی طرف بھاگے تو اس نے روک دیا۔

"آہستہ آہستہ چلو کہیں مرغی نہ ڈر جائے۔ بچوں والی مرغی کو بڑا ڈر لگتا ہے"

دھڑکتے دل سے مرغی کے شدید احتجاج کے باوجود انوّیا نے چوزہ باہر نکالا۔ سفید روئی کے گالے کی طرح ننھا سا چوزہ تیز روشنی میں آکر سہما جا رہا تھا۔ ششی کی بتائی ہتھیلی پر رکھ کر وہ چوزہ کے ریشمی رووں کو چھونے ہی والی تھی کہ چیکی نے ایک جھپٹا مارا اور ششی کی ہتھیلی خالی رہ گئی۔

انوّیا نے ننھی سی جان کی چیخیں سنیں اور اس کی ماں کی دل خراش آہیں بھی۔

سب اُٹھ بیٹھے مگر انوّیا بے خبر سو رہی تھی۔ بالکل کہانی والی پری کی طرح [illegible] جیسے پھول کسی نے توڑ لیا ہو۔ اُس کے چہرے پر وہ پشیمانی تھی جو گناہ عظیم کے اعتراف سے چھا جاتی ہے۔

اپنے بڑے بوڑھوں سے پہ مالی اس اچانک موت کے بارے میں کہتے وقت سدھا نتا کو بڑی شرمندگی ہو رہی تھی۔

کیسے کمزور دل کی نکلی اس کی ماں بھی، جو ایک چوزے کی موت برداشت نہ کر سکی۔ نہ جانے اس بات پر رونا چاہیئے یا نہیں؟

جو فلموں میں کام کرنے کے لئے ایک مسلمان لڑکے کے ساتھ مدراس بھاگ گئی تھی، پھر وہ اپنے پتی کو یاد کرتی تھی جو اپنے بیوی بچوں میں گھر بیٹھا ہو گا۔ ہوا کے جھونکوں کی طرح یہ سب اُس کے ہاتھ سے نکل کر بھاگ گئے تھے۔ اگر وہ چاہتی تو کوٹھی کی دہلیز سے باہر قدم نہ رکھ سکتی۔ مگر زندگی نے اُسے زہر پلایا تھا اور یہ زہر وہ دوسروں کو پلانے کی ہمت نہ کر سکی۔ اب لوگ چاہتے تھے کہ کرشنا مسلمان کے ساتھ بھاگ گئی تو اُسے یا کیوں زندہ بیٹھی رہے!

ہر وقت طعنوں کی گرم سلاخوں سے اس کے دل پر نقش و نگار بنائے جاتے تھے۔ مگر کہاں تک! وہ اپنے بچوں کے اوپر چھپر بن گئی تھی۔ ان کے سارے دکھوں اور برائیوں کو اوپر ہی اوپر سہارنے کے لئے تیار۔ آخر لعنت ملامت کے ہتھیار کند ہو گئے جب کوئی شرم ہی بیچ کھائے تو کیا ہو سکتا ہے!

اس بھیانک اندھیارے میں اس نے کبھی مدد کے لئے کسی کو نہ پکارا۔ اس کی دوسری دل کی تکلیف سن کر دوڑی ہوئی جانے لگی۔ پھر جب اس کی لڑکیاں محلے کے بچوں کو پڑھانے لگیں ان کے ٹیچر سے مس کرتی ... جگو نتم بے روزگاروں کی سفارش منشیوں سے کرانے لگے ... ان کے دوست بن گئے۔

"سنا ہے ... ہو تو پانچ سو تنخواہ ملتی ہے!" ایک دوسری سے کہتے وقت یوں سر پر پلو ڈال لیتی تھیں جیسے بھگوت گیتا سنا رہی ہوں۔

تھوڑے دن کے جگو نتم کے دوست بھی شریف آدمی دکھائی دینے لگے۔ اب ان گھر جو آئے دن پولیس کی دوڑ دیکھ کر چوروں کا اڈہ مشہور ہو گیا تھا، فریادیوں کا ٹھکانا بن گیا۔ ہر ایک کی غرض یہیں سے پوری ہوتی۔ چاہے بچوں کی فیس معاف کروانا ہو نوکری ڈھونڈنا ہو، آپس کے جھگڑے طے کرنا ہوں یا قرض لینا ہو انسوؤں سب کے ساتھ بیٹھ کر روتی اور دوڑ دوڑ کر ان کا استقبال کرتی تھی۔

جب گھر میں کوئی اس کی بات سننے کو نہ ملتا تھا تو وہ تتلی کو گود میں بٹھا کے سب سے زیادہ اپنے آپ کو سناتی تھی کہ سب سے پہلے کیسے ٹھنکے گا۔ اس وقت جوزہ کتنا چھوٹا ہو گا! اسے کیا کھلائیں گے!

پھر ایک دن وہ پولٹری فارم سے کئی کتابیں خرید لائی۔ اُس کے بستر پر ایک جانب تنا ملا لیٹی ایک طرف شتی، جیجی بیٹھ پر بیٹھا تتا ... دونوں سے کھیلتا رہا اور وہ سب کو کتاب پڑھ کر سنانے لگی۔ تنا ملا نے جوار کے دانے کوٹ کر رکھ لئے تھے تاکہ ننھے چوزوں کو دانا نگلنے میں مشکل نہ ہو۔ شتی نے اپنی دودھ کی کٹوری چوزوں کو پانی پلانے کے لئے دے دی تھی۔

"اب جیجی چوزوں کے ساتھ خوب کھیلا کرے گا۔ کیوں بد"

"ہاں بھئی اب تم اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنا۔" اس نے بلی کے بچے کو سمجھایا۔ مگر اُن سے لڑنا مت، وہ بے چارے تو ابھی بہت چھوٹے ہوں گے۔"

جب وہ جیجی کے نرم بالوں پر ہاتھ پھیر کر بات کہتی تو وہ آنکھیں بند کرکے اُس کے مشورہ کو قبول کر لیتا تھا۔

ان دنوں وہ ہر وقت تلگو کا ایک گیت گنگناتی پھرتی تھی جس میں ایک امید والی ماں آدھی رات کو اپنے آنگن میں چاند نکلا دیکھتی ہے اور لوگوں کو جگاتی پھرتی ہے۔ تاکہ بیچارے لوگ کہیں چاندنی کے دیدار سے محروم نہ رہ جائیں بالکل ویسی ہی میٹھا درد اس کے جوڑ جوڑ میں تیر رہا تھا۔ جگو نتم کے پیدا ہونے سے پہلے اُسے بے چین کئے رہتا تھا۔ وہ کیسا ہو گا —؟ یہ خیال اس کے دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتا تھا۔ مسرت کے مارے وہ کانپنے لگتی تھی اُن اوچھی ماؤں کی طرح جو اپنے بچے کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتی ہیں وہ ڈربے کے آس پاس گھوما کرتی تھی۔ دل کی طرح دھڑکتے ہوئے انڈے کو اٹھا کر کانوں سے لگاتی تو اندر ننھی سی جان اپنی زندگی کا یقین دلاتی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی چیز رینگنے لگتی یہ ننھی منی جانوں کا دنیا میں آنا بھی کچھ جان جوکھوں کا کام ہے!

صبح ہونے سے پہلے وہ بڑی بے تابی سے اٹھی۔ ویسے آدھی رات سے وہ جاگ رہی تھی۔ شام کو ایک انڈا ذرا سا تڑخ گیا تھا اور انسویا نے اندازہ لگا لیا تھا کہ صبح تک چوزہ نکل آئیگا روزانہ کی طرح اس دن بھی اس نے کرشن جی کی بڑی سی تصویر پر ... کی مالا ڈال کر تنبورہ پر بھجن گایا۔ اور اس کے ... میں رہنے والے ... زدہ لڑکوں کے ہاتھ پاؤں

"ہاں۔" بے سوچے سمجھے ماری بول اٹھی ۔۔ "بہت سردی ہے۔"

"اور کتنا عجیب بات ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "کہ میرے پاس ایک بھی گرم کپڑا نہیں ہے۔ محض ایک بوسیدہ سی پتلون اور پھٹا پرانا کوٹ۔"

ماری چپ رہی۔

"بھلا ایسے باس میں سردی کیا کم ہوگی!"

"اگر آپ دروازے سے ہٹ آئیں تو میں کنڈی چڑھا دوں۔" ماری سردی سے کانپتی ہوئی بولی۔

"کیوں کنڈی چڑھانا بہت ضروری ہے۔!" اور ایسا کہتے کہتے وہ دروازے کے پاس سے ہٹ آیا۔ "اندھیرے میں کچھ نہیں سوجھ رہا مادام آپ کے ہاں روشنی نہیں ہے؟"

ماری وہیں دروازے سے لگی لگی بولی۔ "آپ کے سوال کرنے کا انداز بھی کچھ عجیب سا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" اجنبی کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"بہت آسان سا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ اگر میرے پاس موم بتی ہوتی تو میں اندھیرے میں یوں بیٹھی رہتی ۔۔؟"

"نہیں ۔۔ نہیں۔" وہ محجوب سا ہو گیا۔ "یہ بات نہیں میں سمجھا شاید آپ جلد سونے کی عادی ہوں گی، اس لیے سرِ شام اندھیرا کیے بیٹھی ہوں گی۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر وہ بول اٹھا۔ "اور میرا ایسا سمجھنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اکثر لوگ جلدی سونے کے عادی ہوتے ہیں ۔۔ ہیں نا۔؟"

"مگر میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔" ماری نے رکھائی سے جواب دیا۔

مرد اس کا لہجہ بھانپ گیا اور معذرت کے سے انداز میں بولا "آپ میری بات کا برا مان گئیں۔ لعنت ہے میری زندگی پر!"

"اوہ" ماری سٹ پٹا کر بولی۔ "میرا مطلب یہ کہاں تھا۔ میں ۔۔ تو ۔۔" وہ چپ رہ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔

"آپ بات سمجھے نہیں اور برا مان بیٹھے۔ اپنی غریبی پر بعض وقت اتنا جھلاتی ہوں کہ یہ تک نہیں سوچتی کہ یہ ....."

"کہ میرا مخاطب ایک اجنبی ہے۔" مرد نے جملہ مکمل کر دیا۔

پہلی بار ماری ہنسی۔ "اوہ آپ!!" وہ خاموش رہ گئی۔

"غریبی کوئی ایسی چیز بھی نہیں جس پر نادم ہوا جائے۔ مجھے دیکھیے میں کیا ہوں ۔۔ میرے پاس کیا ہے ۔۔ مگر کوئی ندامت نہیں کوئی شرمندگی نہیں۔ مزے سے جی رہا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جینے کے لیے ۔۔ زندگی کے لیے محبت کی ضرورت ہوتی ہے ۔۔ وہ بھی میسر نہیں۔ مگر پھر بھی جیتے ہیں۔ بس مگن ہیں ۔۔!"

"آپ جھوٹ کہہ رہے ہیں۔" ماری سنجیدگی سے بولی۔

"میں ۔۔؟" مرد حیرت زدہ ہو کر چیخا۔

"جی ہاں آپ ۔۔ آپ ہرگز مگن نہیں ہیں ۔۔ مگن تو وہ ہوتا ہے جس کے دل میں کوئی آرزو، کوئی تمنا نہ ہو۔ مگر سچ بتائیے کیا ابھی ابھی آپ کے دل میں یہ تمنا نہیں ابھری تھی کہ کاش آپ کے پاس اتنی رقم ہوتی کہ آپ اس کمرے میں اجالا کر سکتے اور یوں اپنی میزبان کو دیکھ سکتے۔ جس دل میں آرزو ہے وہ برباد ہے۔"

مرد کوئی جواب نہ دے سکا۔ ماری گویا تسلی دینے کے سے انداز میں بولی۔

"خیر کوئی بات نہیں، ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر چلیں تو زندگی اجیرن ہو جائے۔ مجھے صرف اتنا بتائیے کہ آپ کو میری بات سے کوئی دکھ تو نہیں پہنچا۔؟"

"دکھ؟" ۔۔ مرد ہنسا ۔۔ "بجا نہیں ۔۔ مگر ایک بات ہے کہ آپ کی باتیں سیدھی دل میں اتر گئیں۔ دیکھیے یہ احساس بھی ایک نعمت ہے کہ کوئی میرے دل کا درد بھی بھانپ سکتا ہے!"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" ماری نے دھیرے دھیرے اس کے قریب آتے ہوئے کہا ۔۔ "آئیے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی "پلنگ پر بیٹھ جائیے۔"

وہ ایک فرمانبردار بچے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلا آیا۔

"آپ بھی بیٹھ جائیے نا! یوں کب تک کھڑی رہیں گی۔"

"صرف کھڑی ہی نہیں ہوں بلکہ کچھ سوچ بھی رہی ہوں۔" ماری ہنس کر بولی۔

"ہو سکتا ہے آپ بھی وہی کچھ سوچ رہے ہوں۔"

واجدہ تبسّم

عورت

اُس نے گھوڑی کو کھونٹے سے باندھ کر اس کی پیٹھ تھپتھپائی گھوڑی نے منھ اٹھا کر احسان مند نظروں سے اسے دیکھا اور پھر جبڑے ہلانے میں مشغول ہو گئی۔

شدید سردی سے ماریا کے ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھنے سے اسے احساس ہوا کہ آج رات ضرور بارش ہو گی شام کا اندھیرا کچھ پھیل چکا تھا۔ وہ اپنی کوٹھری میں داخل ہوئی تو اسے کچھ بھی نظر نہ آرہا تھا۔ بھرپور اندھیرے نے ہر چیز پر قبضہ جما رکھا تھا۔ کونے میں جہاں چھوٹا سا اسٹول رکھا رہتا تھا۔ کھڑکی سے تھوڑی سی روشنی پڑ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بکس اٹھایا موم بتیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو کوس ڈالا۔

"راستے میں یاد بھی نہیں آئی — ایک پیکیٹ لے آتی تو اندھیرے سے چھٹکارا تو ملتا۔

ڈھیلے ڈھالے کوٹ میں اسے سخت سردی محسوس ہو رہی تھی۔ آتش دان کے قریب پہونچ کر وہ رکی۔ تھیلے میں سے کوئلے ٹٹول کر اس میں ڈالے اور ماچس بکس کے لیے ہاتھ بڑھایا اور دوسرے لمحے جھنجھلا کر بکس دور پھینک دیا۔

"سبھی چیزوں کو آج ہی ختم ہونا تھا۔"

اب تک شام ہو چکی تھی۔ اور ہر سو اندھیرا چھا چکا تھا۔ ماریا کھڑکی تک آئی ڈولی کی کھولی اس کی اپنی کوٹھری سے زیادہ دور نہ تھی۔

"ذرا سی آگ مانگ لاؤں۔" اس نے دل سے پوچھا۔ مگر اتنی سردی میں اس کی ہمت نہ ہوئی کہ باہر نکلے۔ دروازہ بند کر کے وہ چھوٹے چھوٹے قدموں چلتی اپنے بستر تک آئی اور بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔ پھر لیٹ گئی — "کتنی شدید سردی ہے۔" اس نے اپنے گھٹنے پیٹ میں سکیڑ لیے۔ "کوئی چارہ نہیں جس سے گرمی پیدا کی جا سکے۔"

لیٹے لیٹے اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان سیاہ تھا۔ اس نے آنکھیں میچ لیں۔ کبھی کبھی آسمان بھی کتنا ڈراؤنا محسوس ہوتا ہے

"دھپ، دھپ، دھپ۔"

ماریا چونک پڑی۔ یہ کون دروازہ پیٹ رہا ہے — خوف اور سردی سے وہ کانپ گئی۔

دروازہ پر مسلسل دستک ہوتی رہی۔

"کون؟" اب کے وہ بہت ہی باریک آواز سے بولی۔

"مسافر!" ایک تھکی تھکی سی آواز آئی۔

ماریا چپ چاپ پڑی رہی۔ "کھول دوں۔؟"

"کوئی لٹیرا نہ ہو۔" اگر کوئی لٹیرا آ بھی گیا تو کیا لوٹ لے جائے گا۔؟"

وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"دھپ، دھپ۔"

"مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ انسان ہو کر۔"

دوسرے لمحے وہ دروازے کے پاس تھی۔

سائیں۔ سائیں کرتا ایک جھونکا آیا اور دل کے پار ہو گیا۔

"شکریہ" مرد بول رہا تھا۔

ایک لمحے کو وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اس کے جواب میں کیا کہے

"کس قدر سردی ہے۔" وہ بولا۔ ماریا نے محسوس کیا کہ وہ ایسا کہتے وقت اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔" مرد بالکل بچوں کے سے انداز میں بولا۔

"تو سو جائیے نا — آپ پلنگ پر ہی تو بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہیں سو جائیے۔"

"اور آپ کہاں سوئیں گی؟"

"میں۔ میں یہیں زمین پر!"

"واہ، تو کوئی انصاف نہ ہوا۔ اور زمین کتنی سرد ہوگی؟"

"پلنگ بھی بہت گرم نہیں ہے، اس کی امید نہ رکھیے۔"

"بدتمیزی نہ سمجھئے تو ایک التجا کروں؟"

"وہ کیا —" ماری سردی سے کانپتی ہوئی بولی۔

"کہ — کہ —" وہ اٹک کر بولا — "آپ اور میں اسی پلنگ پر سو جائیں!"

دوسرے ہی لمحے وہ بڑی بے باکی سے بولا — "کوئی ایسی بری بات نہیں ہے مادام۔ آپ کیا سوچتی ہیں۔ میں آپ کو ...."

"نہیں کچھ بھی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "بہت اچھی بات ہے۔"

"مرد اندھیرے میں اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے بولا: "آئیے آپ بھی آجائیے۔"

ماری پلنگ پر چڑھ گئی — "لیٹ جائیے نا۔" وہ اسے بیٹھا ہوا دیکھ کر بولا۔

"آپ لیٹ جائیے۔" ماری اکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔

"اوڑھنے کے لیے کیا کچھ بھی نہیں ہے؟" مرد کانپ کر بولا۔

"مجھے افسوس ہے۔ میں بہت غریب ہوں۔" ماری کی آواز غم اور سردی سے کانپ گئی۔

"اوہ کوئی بات نہیں۔ ایک بات کہوں؟"

"کہیے —" وہ سیدھے سادے انداز میں بولی۔

"ہم سردی سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ مگر شاید آپ منظور نہ کریں" اس کی آواز میں شک و شبہ کی آمیزش تھی۔

"ہو سکتا ہے میں اسے منظور کرلوں۔ مگر آپ کہیں تب نا۔ یہاں سردی سے جان نکلی جا رہی ہے۔"

"میں کہہ رہا تھا ہم ذرا قریب قریب کیوں نہ ہو جائیں۔ کیا خیال ہے؟"

ماری تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ کا مطلب ہے —" وہ اٹک گئی۔

"میرا مطلب کسی خرابی سے نہیں ہے۔ صاف سیدھی سی بات ہے۔" وہ پرسکون لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "اس سردی میں جبکہ ہمارے پاس کوئی چیز نہیں۔ کوئی گرم کپڑا نہیں۔ اگر بیہودگی کی قید سے آزاد ہو کر ایک دوسرے کو گرمی پہنچائیں تو۔"

ماری پھر لیٹ گئی۔

"میں بری نیت سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اور آپ کو مجبور بھی نہیں کر رہا ہوں۔ سیدھی سادی سی تجویز تھی۔ آپ نے رد کر دی بہت اچھا —" اور وہ کروٹ لے کر سکڑ گیا۔

"آپ کو بہت سردی لگ رہی ہے؟" ماری بولی۔

مرد ہنس کر بولا۔ "آدم و حوا دنیا میں بھیجے گئے تو ان کے بدن پر لباس کہاں تھا۔ پھر اس وقت سردی کا کیا ہوتا ہوگا۔؟"

ماری کچھ نہ بولی۔

مرد نے اپنا کوٹ سنبھالنا چاہا، تو اس کا ہاتھ ماری کے گال سے جا ٹکرایا۔

"اوہ معاف کیجئے۔" وہ نادم سا ہو کر بولا۔

"کوئی بات نہیں۔" ماری بھی پرسکون تھی۔

"میں سمجھتا ہوں۔" وہ ذرا بے تکلفی سے بولا — "کہ اس عمر میں بھی آپ کافی تنومند ہیں۔"

"یہ اندازہ آپ نے کیسے لگا لیا بھلا۔"

"صاف بات یہ ہے۔ یہاں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ میں نے آپ کو بالکل نہیں دیکھا۔ مگر ابھی جو میرا ہاتھ آپ کے گال سے ٹکرایا تو میں نے محسوس کیا کہ آپ کو زیادہ سردی نہیں لگ رہی ہے۔ اور مجھے اس بات پر حیرت ہے۔"

"یہ ایسی کوئی بات نہیں جس پر حیرت کی جائے۔ میری ماں کہتی تھی کہ بچے عورت کی زندگی کو حسن بخشتے بھی ہیں اور چھین بھی لیتے ہیں لیکن چونکہ مجھے بچے پیدا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی، اس لیے میں ابھی تک اس حسن کی مالک ہوں۔"

"آپ کے بچے نہیں ہیں؟"

"جی نہیں —" وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"میرا دماغ اس وقت خالی ہے۔ میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہوں۔ اگر سوچنے کی طاقت ہوتی تو صرف یہ سوچتا کہ پیٹ کیسے بھرا جائے؟۔"

ماری بولی۔ "میں بھی اسی الجھن میں ہوں۔!"

"تو پھر اس کا کوئی حل بھی ہے؟"

"مجھے افسوس ہے۔" اس کا مختصر سا جواب تھا۔

"بات یہ ہے" وہ پھر بولنے لگی۔ "دراصل فرصت ہی نہیں ملتی کہ کھانے پکانے کے بارے میں کچھ سوچ سکوں۔ بھوک لگتی ہے تو بس یوں ہی کھا لیتی ہوں۔ ویسے کبھی کبھار پکا بھی لیتی ہوں۔"

"بھوک لگتی ہے تو بس یوں ہی کھا لیتی ہو۔؟" مرد اس کا جملہ دہرا کر قدرے تعجب سے بولا۔ "مگر کیسے ـــ کہاں سے؟؟"

"کسی بھی ہوٹل یا ریسٹورنٹ سے اور کہاں سے؟" وہ ہنسی۔

وہ قدرے بے باکی سے بولا ـــ "معاف کیجئے عجیب سی بات ہے کچھ یعنی آپ عورت ہو کر ہوٹل سے کھانا کھاتی ہیں۔"

"ایسی کوئی بہت عجیب بات بھی نہیں۔ اگر کھانا پکاتی رہوں تو بھوکوں نہ مر جاؤں ..... اور ..... "

مرد بات کاٹ کر بولا۔ "تو پھر دن بھر کیا کرتی ہیں آپ؟"

ماری ہنسی ـــ "ٹم ٹم چلاتی ہوں اور کیا ـــ"

"آپ۔" وہ حیرت سے چیخا۔ ماری نے محسوس کیا وہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑا ہوا ہے۔

"مجھے آپ کی حیرت پر حیرت ہو رہی ہے اس میں تعجب کی کیا بات ہے مسٹر۔"

"عورتوں کو ٹم ٹم چلاتے آج ہی سنا ہے۔" پھر تھوڑی دیر رک کر بولا۔ "اچھی طرح ہانک لیتی ہیں آپ؟ حادثے وغیرہ تو نہیں ہوتے؟"

"اوہ بالکل نہیں" ـــ وہ ہنسی ـــ "اور یہ کوئی آج کل کی بات نہیں۔ متواتر پندرہ برسوں سے یہی دھندا کر رہی ہوں۔"

"پندرہ برس ـــ مادام ـــ؟" وہ ذرا جھجک کر بولا۔ "میں آپ کی عمر پوچھ سکتا ہوں۔"

"بتیس برس۔" وہ سپاٹ سی آواز میں بولی۔

"تعجب ہے!"

پھر خاموشی چھا گئی۔

"کل میں نے گھر ہی پر کیک بنائے تھے۔ دیکھتی ہوں شاید بچ رہے ہوں۔"

وہ تھوڑی دیر اندھیرے میں کھٹ پٹ کرتی رہی۔ پھر پلنگ کے پاس آکر بولی۔

"لیجئے الجھن دُور ہو گئی میری۔"

"اور آپ؟" وہ شکر گزاری کے انداز سے بولا۔

"مگر یہ الجھن تو آپ ہی کے لیے تھی جناب۔!"

"پھر بھی۔!"

"اوہ ـــ" وہ بے بسی سے بولی ـــ "آپ نہیں مانیں گے یہ دکھ کیا کم ہے میرے لیے کہ میں اپنے مہمان کے لیے کچھ نہیں کر پا رہی ہوں، اوپر سے آپ ہیں کہ شرمندہ کئے جا رہے ہیں۔ کھا لیجئے نا!"

"اُف ـــ کس قدر سردی ہے ـــ" ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تو مرد بول اٹھا۔

"ہم غریبوں پر خدا کی مار ہی تو ہے یہ بھی۔" ماری بولی۔

"میرے بدن پر صرف ایک کوٹ ہے۔ وہ بھی گرم نہیں۔"

"اور میرے جسم پر صرف ایک اسکرٹ، جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا ہے ـــ"

"ظلم ہے ظلم ـــ!" اُس نے پلیٹ زمین پر رکھ دی۔ ماری نے پلیٹ اٹھانے کو ہاتھ بڑھائے تو اندھیرے میں اس کے ہاتھ مرد کے پیروں سے چھو گئے۔ "اُف آپ تو برف ہو رہے ہیں۔" وہ ہمدردی سے بولی۔

"آپ کے ہاتھ خود برف بن گئے۔" وہ ہنسا۔ "آپ کے پاس آتشدان ہوتا تو کیا بات تھی۔"

"آتشدان تو ہے لیکن ماچس نہیں۔"

"ڈھونڈھنے سے شاید مل جائے۔"

"ڈھونڈھ چکی ہوں۔ سب ختم ہو چکی ہیں۔"

"اوہ ـــ میں نے تو سنا ہے کہ عورتیں بڑی سگھڑ ہوتی ہیں۔ آڑے وقتوں کے لیے کچھ نہ کچھ بچا رکھتی ہیں۔"

ماری جھینپی ہوئی ہنسی ہنس کر بولی۔ "اسے اتفاق کہہ لیجئے۔"

"یاد ہی نہ رہی!"

سردی سے اس کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔

ہوں۔"

"اوہ یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔" وہ اس کے پاؤں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ "تم مجھے اتنا نیچ نہ سمجھو۔" ایک دم اس کے ہاتھ میں ایک لٹ آگئی۔ اندھیرے میں اسے ہاتھ سے چھو کر بولا۔ "میں سمجھتا ہوں عورت ہو کر تم ٹم ٹم چلاتی ہو۔ کتنی اچھی معلوم ہوتی ہوگی۔ لوگ ضرورت نہ پڑنے پر بھی تمہاری گاڑی میں بیٹھ جاتے ہوں گے!"

ماری ہنس کر بولی۔ "پھر بھی مجھے اتنا نہیں ملتا کہ ٹھیک سے زندگی ہی بسر کر لوں۔ پھر گھوڑی بھی تو ہے۔ اور زندگی کتنی مہنگی ہوتی جا رہی ہے ان دنوں! فلالین کا ایک ٹکڑا تک نہیں خرید سکتی کہ سردی سے بچ جاؤں۔" وہ درد بھرے انداز سے ہنس کر بولی۔ "پھر بھی مجھے یہ زندگی پیاری ہے — وہ آئے گا نا! پھر مجھے کسی فلالین کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس کی گرم باتیں مجھے سردی سے بے نیاز کر دیں گی!"

گرجا گھر کے گھڑیال نے چھ بجائے تو ماری ہڑبڑا گئی۔ اجنبی مرد اس کے پلنگ پر سو رہا ہے اور وہ جھٹ سے اٹھ گئی۔ وہ بھی اٹھ بیٹھا۔

"سورج نکلے گا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے! میری میزبان میں تمہارا یہ احسان تا عمر یاد رکھوں گا۔"

"ضروری نہیں ہے کہ سورج نکلے۔ کئی کئی دن سورج نہیں نکلتا" ماری بولی۔

"پھر بھی نکلتا تو ہوگا ہی۔"

"ہاں اجالا تو ہوگا ہی۔" وہ جملے کی خوبصورتی میں ڈوب کر بولی۔

"آخری بار ایک التجا اور۔" مرد گھگھیا کر بولا۔

"وہ کیا ہے؟"

مرد کچھ سوچ کر رک گیا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔"

پھر بھی عورت نے بڑے ملائم لہجے میں پوچھا۔

مرد بڑے صاف اور معصوم لہجے میں بولنے لگا۔ "مجھے ایسا لگ رہا کہ ساری عمر میں میں نے جتنے لوگوں سے محبت کی ہے وہ تمام کا عشر عشیر بھی نہیں تھی جو صرف ایک رات بھر میں تم سے کر ڈالا ہے۔ تمہیں پیار کرنا چاہتا ہوں اے مہربان عورت، محبت والی! تم نہ ہوتیں تو میں مر جاتا۔"

"نہیں یہ حق صرف تمہاری ماں کو پہنچتا ہے۔" وہ پلنگ سے اور بالوں کو درست کیا اور لپک کر دروازہ کھول دیا۔ ٹھنڈی سانس سہما سہما اجالا بھی کمرے میں گھس آیا۔

مرد بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مرد کی نگاہوں میں کوئی جذبہ نہ تھا مگر عورت کی آنکھیں سے بھری ہوئی تھیں۔

"اچھا تو میں چلوں — اللہ تمہارا محافظ ہو۔ تم بہت اچھی ہو۔ میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔" اور بھاری بھاری قدم اٹھاتا اس سے دور ہونے لگا۔

ہوا کا ایک کٹیلا جھونکا آیا اور وہ پوری طرح کانپ گئی۔ چلائی۔ "سنو، سنو!"

مرد نے پلٹ کر دیکھا اور اپنے سینے پر انگلی ٹکا کر ذرا استعجاب سے پوچھا۔ "مجھے پکارا؟" جب وہ اس کے قریب آکر رکا تو اس نے د کے ساتھ اپنے ہونٹ مرد کے ہونٹوں سے ملا دیئے۔ بڑی دیر بعد الگ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "ابھی ابھی جب تم سر جھکائے جا رہے تھے تو اچانک میرے دل میں پیار کا سوتا پھوٹا جو اس سے پہلے کبھی پھوٹا تھا۔ میں کتنی بدنصیب ہوں ایک پیار سے کبھی تمہاری خاطر نہ تھی۔" وہ رونے لگی۔ "خدا نے مجھے ممتا کی لذت سے محروم رکھا ہے اس کا یہ گناہ کبھی نہ معاف کروں گی۔ جب تمہیں پیار کیا تو جانا کہ محبت صرف ایک ہی تو روپ نہیں ہے۔ کاش آج میری اولاد ہوتی تو مجھے وہی سکون ملتا۔"

ماری نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔
اس کی سسکیاں رکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

ایک اہم اعلان کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۸۰

"وہ کیوں — ؟" اس نے بے ڈھب سا سوال کیا۔

"آپ کا مطلب ہے میں آوارگی میں زندگی بسر کرتی ؟"

"اوہ —" مرد گھبرا کر بولا — "میرا مطلب ہرگز یہ نہ تھا۔ میں نے تو پوچھا تھا کہ آپ کے بچے کیوں نہیں ہیں ؟"

"وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ مرد ہی نہیں تو بچے کہاں سے آتے۔"

"تو آپ کا مرد کیوں نہیں ہے ؟" وہ بھولے پن سے بولا

"مرد کیوں نہیں ہے —" وہ دھیرے دھیرے لہجے میں اس کا سوال دہراتی گئی — "یہاں نہیں ہے، مگر کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ بیس برس سے میں اس کو یاد کر رہی ہوں۔ بیس سال کی عمر میں مجھے چھوڑ کر وہ جنگ پر چلا گیا تھا۔ مگر مجھے امید ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔

"وہ چلا کیوں گیا تھا۔ ؟"

"اوہ یہ بہت درد بھری کہانی ہے اجنبی — اب سونا چاہیئے۔"

اس نے کروٹ لی تو مرد کا ہاتھ اس کی پنڈلی سے جا ٹکرایا۔!

"اوہ کوئی بات نہیں۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

بہت دیر خاموشی رہی۔

آج کئی برسوں بعد میں کسی مرد کے ساتھ اکیلی رہی ہوں۔"

ماری نے خاموشی توڑی — "اور یہ بھی ..."

مرد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھ گئے ہیں۔ ہم بیہودہ نہیں۔"

جذبات سے عاری لہجے میں ماری بولی۔ "بات کچھ بھی ہو — خیر ہمیں الجھنا نہیں چاہیئے۔ یہ بتایئے آپ کی سردی میں کچھ کمی ہوئی ؟"

"یہ جواب آپ مجھ سے بہتر دے سکتی ہیں۔" مرد بولا۔

ماری نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ "آج نہ جانے مجھے کاہے کی یاد اتنی شدت سے آ رہی ہے کہ میں سو نہیں پا رہی ہوں۔"

"آپ کے کہنے کے مطابق آپ کا ماضی تو بہت اندوہناک ہے ایسی باتوں کو یاد کر کے فائدہ۔!"

"نہیں ایسی بات نہیں — مجھے یاد آ رہا ہے۔ میں نہ جانے کب سے تنہا ہوں — اکیلی — اکیلی — خود ہی جاگتی ہوں۔ مگر میں نے کتنی بار چاہا کہ ان یادوں کو ذہن سے جھٹک دوں۔ مگر ہر لمحہ وہ یاد آتی رہتی ہے۔"

"تمہیں اپنے شوہر کی بہت یاد آتی ہے۔ ؟" مرد کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

"یہ سوال بہت بے کار سا ہے۔"

"تم اس کے انتظار میں پاکباز ہو!" اچانک اس نے بے ڈھب سا سوال کر دیا۔

"کیا مطلب ؟" ماری چونک پڑی۔

"یہی کہ کیا تم نے اب تک کسی اور مرد کے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ ...."

ماری تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ "تمہیں ایسا سوال کرتے شرم آنی چاہیئے۔"

مرد سادگی سے بولا — "شرم کی بات نہیں۔ سیدھا سادا سا سوال ہے یہ تو۔"

"سیدھا سادا سا جواب یہ ہے کہ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی ہو تو ایسے لمحے ذہن میں دھنس جائیں۔"

مرد ہنسا۔ "تمہاری بات میں سچائی کہاں تک ہے ؟"

ماری ہنسی — "اس بات کا کیا جواب دوں۔"

"اچھا" مرد تیکھا ہو کر بولا۔ "تم جو میرے ساتھ سو رہی ہو تو کیا میں نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کیوں کے ساتھ سوتی رہی ہوگی۔"

"یہ محض ہمدردی ہے اور کچھ نہیں — میں نے اگر کچھ سوچ کر بھی تمہارے ساتھ سونا چاہا ہو تو یہ رات بھی مجھ پر حرام ہو جائے تمہارے کہنے پر میرے دل میں کوئی خیال نہیں۔ بس یہی خیال تھا کہ اگر تم سردی کھاتے رہے تو مر جاؤ گے۔ کیا اس ہمدردی کے جذبے کو تم بدمعاشی کا نام دو گے۔ کیا ایک ماں اپنے بچے کو باہوں میں لے کر اسے گرمائش نہیں پہنچاتی۔ کیا تم ....."

مرد نے اپنا جلتا ہوا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"اوہ —" ماری خوشی سے بولی۔ "تمہارے ہاتھ تو کافی گرم ہو چکے ہیں۔"

مرد نے اس کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور بولا

"اب سو جاؤ۔ اب رات جا رہی ہے۔"

"میں تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ تم کون ہو — ؟ تمہارا نام کیا ہے ؟ حالانکہ یہ سب کچھ مجھے پہلے ہی پوچھنا چاہیئے تھا مگر" وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔ "تم نے ضرور سوچا ہوگا۔ میں کتنی غیر مہذب

میں مکھیہ بھاگ لیا۔ اسی لئے انھیں تمام فسادوں اور منتریوں کا سہیوگ حاصل تھا۔ ان کا کہا کوئی کیونکر ٹال سکتا تھا۔ پرانتیہ کے ہر کام کو وہ کیندر سے چٹکیوں میں کرا کر لے آتے، جہاں دوسرے پرانتوں کے مکھیہ منتریوں کو مہینوں کوششیں کرنا پڑتیں۔ وہ جتنا مہد کتنے ہو سکتے۔ وہ پردھان منتری کی طرح ہی سوتنترتا سے لے کر مرتے وقت تک پرانتیہ کے مکھیہ منتری کی گدی سنبھالے رہے جبکہ دوسرے پرانتوں میں ہر چناؤ کے بعد بلکہ اس کے مدھیہ کال میں بھی مکھیہ منتری بدلتے رہتے۔ ناگر جی خود شکل جی کے داہنے ہاتھ تھے کم مقبولیت نہ ہونے کے کارن ان کا سارا دھیان پارٹی کے کاموں میں لگا رہتا۔ انھوں نے ہر چناؤ میں اپنی جان تک لڑا دی تھی اور اسی کارن وہ پارٹی کے پردھان بھی بنائے گئے تھے۔

لیکن ادھر کچھ عرصہ سے پاٹھک جی بھی اپنے پاؤں پھیلا رہے تھے جب سے گرہ منتری بنے تھے تب سے وہ ہائی کمانڈ کی نظروں میں چڑھ گئے تھے۔ ان کا ہاتھ تو اسی روز مضبوط ہو گیا تھا جبکہ ان کے ہوتے ہوئے وہ منتری منڈل میں کیندریہ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں خاص طور پر منتخب کئے گئے تھے۔ لیکن اس وقت انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ ورکنگ کمیٹی کو چونکہ دیش کی گرہ سمسیا کے بارے میں چند مشورے کرنے تھے اس کارن وہ شاید اسی ارادے سے بلائے گئے تھے۔ اور یہ بات اچت بھی پرتیت ہوتی تھی کیونکہ پاٹھک جی نے جس پرکار سامپردایک اندولن کو دبایا تھا وہ دیش میں ہی کوئی کوئی کر سکتا تھا۔ ناگر جی کو تو ان دنوں خطرہ ہونے لگا تھا کہ کہیں اس اندولن میں ان کے چھپے ہوئے ہاتھ کا بھانڈا ہی نہ پھوٹ جائے۔ دراصل یہ اندولن بھی ایک حد تک پاٹھک جی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو روکنے کے لئے ہی کرایا گیا تھا۔ ان سب کے کارن اگر مکھیہ منتری بننے کے راستے میں کوئی کانٹا تھا تو وہ پاٹھک جی ہی ہو سکتے تھے۔ پاٹھک جی شکل جی کو بھی بہت پریہ تھے کیونکہ ان کے کارن شکل جی کا سر بھی بہت جگہ اونچا ہوا تھا۔ اور اب وہ ودھان سبھا کے ممبروں میں بھی کافی لوک پریہ ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن چناؤ کے دو تین ماہ پہلے تک نہ جانے کیا ہوا تھا، سیٹھی سے لے کر ادھیکش تک سب ہی کو معلوم تھا۔ اسی کارن پاٹھک جی کبھی انھیں اپنا گرو مانتے تھے!

ناگر جی جب کمرے کے اجلے فرش سے ہو کر باہر آنے لگے تو خواب گاہ کے کمرے میں لگے ہوئے بلند شیشے کے پاس اگر ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گئے گویا شیشہ ان کا راستہ روک کر کہہ رہا ہو۔ یہ ہیں نئے مکھیہ منتری۔ کمرے کے کونے میں لگی ہوئی روشنی میں ان کا سایہ بھی نہایت لمبا ہو گیا تھا۔ ناگر جی کا چہرہ ایک انوکھی مسکان سے کھل اٹھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ بالکل سنجیدہ ہو گئے۔ باہر آ کر انھوں نے گیراج سے موٹر نکالی اور کار اشارٹ کرتے ہوئے انھیں ایک دم خیال آیا کہ دو چار روز بعد ہی وہ خود کار چلانے کے بجائے کسی نئی خوش نما کار کی پچھلی سیٹ پر اخبار پڑھتے بیٹھے ہوں گے اور ان کی سیٹ پر ایک چست وردی میں ملبوس کوئی شوفر ہوگا!

وہ شہر کے اندرونی حصہ میں رہتے تھے اور یہ خیال کہ انھیں جلد ہی مکھیہ منتری کے بنگلے میں اٹھ جانا ہوگا، ان کی روح کو ایک عجب تسکین دے رہا تھا۔

جب وہ شکل جی کے بنگلہ پر پہونچے تو انھیں یہ جان کر نہایت خوشی ہوئی کہ وہ شہر بھر میں پہلے پرسدھ آدمی تھے جو مکھیہ منتری کی مرتیو پر پہونچے تھے۔ ابھی وہ کار سے اترے ہی تھے کہ پریس والوں نے انھیں گھیر لیا۔ ان سے اس مہان درگھٹنا کے بارے میں اور شکل جی کے جیون چرتر کے بارے میں کچھ کہنے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے رکتے رکتے نہایت ناپ تول کے انداز میں کہا

"میں نے جب سے یہ شوک سماچار سنا ہے میں اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکا۔ میرے لئے یہ وشواس کرنا کہ شکل جی اس دنیا میں نہیں رہے، اسمبھو ہے۔ شکل جی کے بارے میں کچھ بھی کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے!"

اتنا کہنے کے بعد وہ اندر برآمدے میں چلے گئے جہاں شکل جی کا مردہ جسم بیچ درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ چاروں طرف ان کے عزیز و اقارب بیٹھے ہوئے تھے، خاموش غمگین۔ کہیں کہیں کسی کے سسکیاں لینے کی آواز آ رہی تھی۔ شکل جی کی بیوی کافی عرصہ ہوا مر چکی تھی۔ ان کے لڑکے، لڑکیاں بھی بیاہے جا چکے تھے۔ بیماری کی خبر سن کر ان کا سارا پریوار اکٹھا ہو گیا تھا۔ اسی پریوار میں ان کے کچھ جانے پہچانے چہرے تھے اور کچھ نئے۔ انھوں نے سسکیاں لیتے ہوئے ایک عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بہن جی جو ہونا تھا ہو گیا۔ آپ کو تو اس بات پر گورو ہونا چاہیے کہ آپ کے پریوار کے شکل جی نے دیش سیوا میں اپنی آہوتی دی۔ ایسا نصیب تو کسی کسی کو ہی ملتا ہے!" اور پھر وہ شکل جی کے لڑکوں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے اور انھیں دلاسا دیتے ہوئے مردہ جسم کے پاؤں کے قریب فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھ گئے۔

شکل جی کا جسم سینہ تک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کے سر کے دونوں طرف اگربتی۔ دھوپ جل رہا تھا۔ ایک طرف چند عورتیں گیتا کا پاٹھ کر رہی تھیں۔ اب اجالا ہو رہا تھا آنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ اور شکل جی کا مردہ جسم آہستہ آہستہ پھولوں اور ہاروں سے ڈھکتا جا رہا تھا۔ آنے والے شکل جی کو شردھانجلی پیش کر کے بڑی نمرتا سے ناگر جی کو نمسکار کرتے۔ شاید طلوع ہونے والا سورج ڈوبتے ہوئے سورج سے زیادہ

ستیش بترا

چنگاری

رات کے اندھیرے میں ٹیلیفون کی گھنٹی پھر لگاتار بجنے لگی۔ سوتے ہوئے ناگر جی کے کانوں نے بھی نیند سے بوجھل پلکوں میں اس گھنٹی کو محسوس کیا تھا پہلی بار انھوں نے صرف بستر پر کروٹ بدلنے پر ہی اکتفا کی تھی۔ لیکن گھنٹی بجتی گئی بجے ہی جا رہی تھی۔ اب انھوں نے گھنٹی کی چیختی ہوئی آواز محسوس کر کے آنکھیں کھول دیں۔ گھنٹی گویا بار بار انھیں تنبیہہ کر رہی ہو۔ اٹھئے موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے۔

ناگر جی نے نیند کے عالم میں ہی چپل کو پیروں سے محسوس کیا اور پھر الٹی چپلیں پہنے ہی آہستہ آہستہ ٹیلیفون کے پاس لگے ہوئے بجلی کے سوئچ کے پاس پہونچے اور اندھیرے میں اسے ٹٹولتے ہوئے روشنی کر دی۔ یکایک روشنی ہو جانے کی وجہ سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ چھت پر سے آتی ہوئی روشنی نے ان کا بے ڈول بھاری بھرکم سایہ کچھ فرش پر اور کچھ دیوار پر پھیلا دیا۔ انکی نگاہ گھڑی پر گئی۔ چار بجنے میں دس منٹ تھے۔ انھوں نے ٹیلیفون اٹھا لیا۔

"ہیلو میں ناگر بول رہا ہوں۔" ان کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا، ایک رچاؤ تھا۔ ان کے ہر الگ الگ بولے لفظ سے ایک خود اعتمادی جھلکتی تھی۔ یہی چیز تھی جس کی وجہ سے وہ دھان سبھا یا پارٹی کے اجلاسوں میں انکے ہر تقریر نہایت خاموشی اور پوری دلچسپی کے ساتھ سنی جاتی۔ وہ پارٹی کے لیڈر تھے لیکن ان کی تمام تر شخصیت ان کے آہستہ آہستہ لیکن پر وقار لہجہ سے ظاہر ہوتی۔

"ناگر جی! میں شکل جی کا پی اے بول رہا ہوں۔ بہت شوک سے کہنا پڑ رہا ہے شکل جی کا ابھی ابھی دیہانت ہو گیا ہے!" شکل جی پردیش کے مکھ منتری تھے ان کی لت کئی دنوں سے خراب تھی۔ ناگر جی رات کو بھی دیر تک شکل جی کے پاس ہی بیٹھے رہے تھے۔ رات کو ساڑھے ۹ بجے دہلی سے آئے کرنل کپاڈیا نے ان کا ٹی کتری معائنہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ شکل جی کی حالت پہلے سے کچھ بہتر ہے اگر سارا دارومدار ان کی رات اچھی طرح گذر جانے پر ہے۔

"لیکن یہ اچانک کیسے ہو گیا؟ رات کو تو کرنل کپاڈیا ان کی حالت پہلے سے بہتر بتا رہے تھے!" ناگر جی نے الٹی چپلیں ٹھیک سے پہنتے ہوئے کہا۔

"جی کیا بتا دوں تین بجے تک شکل جی سوتے رہے لیکن پھر اچانک ہی انھیں کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کے ساتھ ہی ان کا سانس اکھڑ گیا۔ کرنل کپاڈیا کو فوراً ٹیلیفون کیا گیا۔ دوسرے ڈاکٹروں نے انھیں آکسیجن دینا شروع کر دی۔ ساڑھے تین بجے تک کرنل کپاڈیا بھی آ گئے تھے لیکن ان کے آنے کے فوراً بعد ہی ان کے پران چھوٹ گئے۔ ہم سب یتیم ہو گئے ناگر جی!"

"دھیرج رکھو کرپا نرائن۔ یہ آپتی سارے دیش کی ہے۔ شکل جی اپنا سارا جیون دیش کو ارپن کر دیا تھا!" ان کی آواز میں بے حد دکھ تھا "تم نے پردھان منتری جی کو اور پارٹی کے پردھان جی کو بھی ٹیلیفون کر دیا ہے نا۔ کیا تھا وہ یاد کر رہے ہیں؟ آپنے مجھ سے کہا ہوتا۔ اچھا میں ابھی آ رہا ہوں!" اور انھوں نے ٹیلیفون رکھ دیا۔

چند لمحے پہلے جہاں میں شکل جی کی موت کی خبر سننے سے ایک دیوار سی ڈھ جانے کا احساس پیدا ہوا تھا، اس نے ان کے اندر مکھیہ منتری بننے کی امید کو گدگدا یا تھا لیکن یہ اچانک پاٹھک جی کے ذکر نے انھیں ایک نئی خلا سے آگاہ کیا تھا۔ کرپا نرائن نے انھیں پہلے ٹیلیفون کیوں نہیں کیا؟ شاید کیا ہوگا! کچھ ایسے جان پڑا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پہلے بھی بجی تھی لیکن انکی آنکھ رات کو دیر سے سونے کے کارن کھل نہیں پائی۔ شاید اسی لئے کرپا نرائن نے پاٹھک جی کو فون کر دیا۔ اچھا ہوتا اگر وہ شکل جی کی موت کا سماچار خود پردھان منتری اور پارٹی کے پردھان کو دیتے!

وہ جلدی سے تیار ہونے لگے ان کا دماغ اس دوران میں کچھ عجب ادھیڑبن میں لگا رہا۔ اب شکل جی کے چلے جانے کے بعد ان کے مکھیہ منتری بننے کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ شکل جی کا پارٹی کی کنڈیہ ورکنگ کمیٹی میں ایک بہت اونچا استھان تھا۔ وہ دیش کے پرانے نیتاؤں میں سے تھے جنھوں نے سوتنترتا سنگرام

پوشیدہ عینک کو کیس میں بند کرتے ہوئے کہا "سنہا جی یہ تو آپ ساتھیوں پر نربھر ہے۔"

"ناگر جی ہم لوگ تو آپ کے ساتھ ہیں!"

ناگر جی نے دل ہی دل میں سنہا صاحب کے ساتھیوں کا حساب لگاتے ہوئے کہا "اور ٹنڈن جی!"

"جی۔ ان کو تو میں منا ہی لوں گا۔ جیوتی بابو، بینی پرشاد اور سنگھ صاحب کے ساتھی تو آپ کے ساتھ ہیں ہی!"

ناگر جی ان ناموں کا ذکر آتے ہی دل ہی دل میں ان کی طاقت کا حساب لگانے میں لگ گئے۔

"لیکن ہاں سریواستو جی، اگروال بابو اور اسلم صاحب ہیں جن کے بارے میں نشچے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا!" سنہا جی نے مزید معلومات دیتے ہوئے کہا۔

"وہاں ان کا سکھوں اور مسلمانوں کو بھی دیکھ لیں گے!" ناگر جی نے مسکراتے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"اب رہ گئے کنور سورج پرشاد اور بیگم جی۔ بیگم جی کے بیٹے ذہین کیندریہ منتری جی ایا وعدہ مجھ سے ٹیلیفون کروا دوں گا۔ وہ تو ان کی مٹھی میں ہیں۔ ہار کنور جی بس! دیکھیں یہ کیا چاہتے ہیں؟" اور پھر وہ رکتے ہوئے بولے

"سنہا جی کیندر میں رام چندرن جی اور چیٹر جی کے کانوں سے بھی تو نکال دو آپ کل ہی لوگ تو ہیں جو پارٹی کا ڈنڈا اٹھائے جگائے بیٹھے ہیں۔ چیٹر جی سے تمہاری کافی چھنتی ہے۔ تمہارے سمبندھ بھی اچھے تو ہیں۔ ذرا گرو نانک سے بات ایا وعدہ بھی تو ہمیں SUPPORT مل کر سکتے ہو۔ اب ذرا رام چندرن جی جب

"ہاں وہ بھی پاٹھک جی کو بہت چاہتے ہیں۔ بس یہ سمجھتا ہوں کیا لعن لگے پر پاٹھک جی میں! اور ناگر جی کنور رتن سنگھ جی کو مت بھولئے بہت گڑ آدمی ہیں۔ پارٹی کمان ان کی بات سننے لگا ہے۔"

"ہاں بھائی کیوں نہیں۔ پارٹی کو تو اب سنگھار کی چاہئے اس کا راجیہ سنگھ اور گڑھ کے دوارہ انتظام کر رہے۔ آخر کنور جی کی لڑکی راجہ صاحب کے گھر ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" سنہا صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

"سنہا جی" ناگر جی ہنستے ہوئے بولے "ہم بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلے"

استقبال کر رہے تھے۔

رام چندرن جی کے آنے کا خیال تو ناگر جی کو آیا بھی نہ تھا۔ وہ شاید ابھی ہوائی جہاز سے اترے ہوں گے۔ بھلا دلی سے آنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ پاٹھک جی نے جمع صدر سے انھیں بھی ضرور ٹیلیفون کیا ہوگا! ناگر جی بھی سوچتے ہوئے رام چندرن جی کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں وہ مسکرا کے سب کو نمسکار کر رہے تھے۔ ناگر جی نے آگے بڑھ کر رام چندرن جی کو نہایت جھک کر نمسکار کیا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے اور پھر وہ ایک طرف پاٹھک جی کی کمر پر ہاتھ دھرے اور دوسری طرف ناگر جی کا سہارا لئے آگے بڑھے۔ ناگر جی کو رام چندرن جی کا یہ انداز بہت بھلا لگا۔ لوگوں کی بھیڑ ان کو راستہ دینے کے لئے پھٹ گئی۔

شکل جی کی ارتھی کا جلوس نہایت دھوم دھام سے نکلا۔ ارتھی ایک فوجی گاڑی پر رکھی گئی تھی اور راستے پھولوں اور ہاروں سے سجایا ہوا تھا۔ ... کی بھی سواری تھی۔ ارتھی والی گاڑی پر شکل جی کا بڑا فوٹو لگا تھا۔ ناگر جی، پاٹھک جی اور رام چندرن جی بیٹھے تھے۔ سبھی شکل جی کے بارے میں نعرے لگا رہے تھے۔ ادھر رام دھن جاری تھی۔ جا بجا بلڈنگوں پر قومی جھنڈے سرنگوں لہرا رہے تھے۔ تمام راستہ میں پھولوں کی بارش ہوتی رہی۔ ناگر جی اپنی ہی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ موت کس طرح راستے ہموار کر دیتی ہے۔

شام تک یہ چل گیا کہ منتری منڈل کی حمایت کے بارے میں پارٹی کے جلسے میں پارٹی کمانڈ کی طرف سے رام چندرن جی نگرانی کریں گے۔ نئے مکھیہ منتری کا چناؤ ایک ہفتہ بعد ہونا تھا اور یہ سبھا نئے چناؤ کے لئے رکھی گئی تھی۔

ان چالیس گھنٹوں میں ٹیلیفون کی گھنٹیاں متواتر ودھان سبھا کے ممبروں کے گھروں میں بجتی رہیں۔ ہر دو طرف ... جاتے رہے۔ منتری منڈل کے عہدے کئی لوگوں میں بٹے جاتے رہے۔ منتری منڈل کی تعداد بڑھانے گھٹانے کے بارے میں ... کتنے منسٹر آف اسٹیٹ کتنے ڈپٹی منسٹر اور کتنے پارلیمانی سکریٹری ہوں، مشورے ہوتے رہے جیسے کوئی لوٹ کا مال ... تقسیم ہو رہی تھی۔ لوگ خیالوں میں پارلیمانی سکریٹری سے ڈپٹی منسٹر، ڈپٹی منسٹر سے منسٹر آف اسٹیٹ اور کیبنٹ منسٹر بنا گئے۔ چند ایک نے تو کچھ لوگوں کے بارے میں بھی اپنی پسند ناپسند بتا دی اور اپنی اپنی راستے کا اندازہ کر لیا۔ رام چندرن جی کے دروازے پر دونوں گروپوں کے نمائندوں کی قطاریں لگی ہوتی تھیں۔ لیکن رام چندرن

گنجائش رکھتا ہے۔

ناگرجی سوچ رہے تھے کہ شکل جی اپنی زندگی میں ہمیشہ پھولوں سے لدے رہے۔ کتنا اجلال تھا ان کے چہرے پر! ان کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات پتھر کی لکیر ہوتی۔ ان کا ہر فیصلہ نپا تلا لیکن اٹل ہوتا۔ ان کی موت میں بھی ایک عجب وقار تھا! وہی رعب، وہی دبدبہ! وہ سفید مونچھیں جیسے ابھی ان کے بولنے سے ہلنے لگیں گی، ان کی آواز جیسے پل بھر میں کوٹھی میں گونج جائے گی۔ اس آواز کے سامنے کوئی چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یکایک کوئی خیال ناگرجی کے دماغ میں لہرایا۔ کیا شکل جی ان کے دل کی خواہش کو جانتے تھے؟ کیا انھیں معلوم تھا کہ پچھلے دنوں کا سا پردھانیک اندر بھی اسی خواہش کی ایک کرن تھی! اور ناگرجی کو شکل جی کے چہرے پر پھیلی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ سے ایسے معلوم ہوا کہ جیسے وہ سب کچھ جانتے تھے! لیکن اگر وہ جانتے تھے تو وہ اب اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

یکایک ناگرجی کے دماغ میں کئی اور خیالات آنے لگے۔ انھیں پرانتیہ پارٹی کے پردھان ہونے کی حیثیت سے پارٹی کی طرف سے شکل جی کو شردھانجلی پیش کرنی تھی۔ انھیں نئے بننے والے مکھیہ منتری کے ناطہ سے پتہ لگانا چاہیے تھا کہ گورنر، چیف جسٹس، انسپکٹر جنرل پولیس اور پرانتیہ کے دوسرے افسران کو ان کی اطلاع دی گئی یا نہیں۔ انھیں پھر ارتھی کے جلوس کے سلسلہ میں سرکاری سوگ کے سلسلہ میں اور دوسرے انتظامات کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر جا کر کسی سے کرپا نارائن کو بلانے کے لئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد کرپا نارائن اور پنڈت بشمبر ناتھ دونوں آگئے۔ بہت دیر تک ان سے صلاح و مشورے ہوتے رہے۔ پھر ناگرجی نے پارٹی کے سکریٹری اور دوسرے ساتھیوں سے ٹیلیفون پر بات چیت کی۔ اتنے میں پاٹھک جی بھی اپنی چھڑی ٹیکتے آگئے۔ انھوں نے آتے ہی ناگرجی کو نہایت تپاک سے نمسکار کیا۔ ان کے ساتھ دو ایک منتری اور بھی تھے۔ ناگرجی کو ان اور دوسرے منتریوں وغیرہ کے رویہ سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پہلے ہی سے انھیں مکھیہ منتری تسلیم کر چکے ہوں۔ ناگرجی دل ہی دل میں بہت خوش تھے۔

اتنے میں خبر ہوئی کہ گورنر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ ناگرجی گورنر صاحب کو لینے کے لئے آگے بڑھے۔ گورنر صاحب نے نمسکار کرنے کے بعد نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا۔ ناگرجی سے ہاتھ ملا چکنے کے بعد گورنر صاحب کا ہاتھ ایک دوسری طرف بڑھا۔ اب پاٹھک جی ان سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

ناگرجی گورنر صاحب کو اندر پہونچانے کے بعد پھر باہر آگئے۔ لوگوں کی بھیڑ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لوگوں کی ایک لمبی لائن جو کہ گیٹ سے باہر تک دکھائی دے رہی تھی اب آہستہ آہستہ شکل جی کے انتم درشن کرنے کے لئے بڑھ رہی تھی۔ ایک دوسری طرف سے ہائی کورٹ کے جج، یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ایم۔ ایل۔ اے صاحبان اور دیگر ممتاز لوگ لائن لگائے پھولوں کے ہار اور بڑے بڑے گوندھے ہوئے ہاروں کے گچھے بطور عقیدت لئے ارتھی کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہے تھے۔

اتنے میں سنہا جی نے جو پارٹی کی ایگزیکٹیو (EXECUTIVE) کے ممبر بھی تھے اور ایم۔ ایل۔ اے بھی، اخبار کا تازہ سپلیمنٹ ناگرجی کے سامنے یہ کہتے ہوئے پیش کر دیا "ناگرجی اب کچھ ہمارا بھی خیال رکھنا!"

ناگرجی نے ایک لمحہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے دوہرے کئے ہوئے سپلیمنٹ پر ایک نگاہ ڈالی۔ آدھے صفحہ میں سیاہ کالے حاشیہ کے درمیان شکل جی کی موت کی خبر اور ان کا جیون چرتر تھا۔ پھر انھوں نے جلدی سے اس کالم پر نگاہ ڈالی جس میں اس موت پر چند لیڈروں کے فوری تاثرات بھی تھے۔ ان کی نظریں موٹے ٹائپ میں چھپے ہوئے ان کے صبح کے انٹرویو والے الفاظ پر آکر جم گئیں جو اس کالم کی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ ناگرجی کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکان آئی جیسے وہ اس خبر کو پڑھ کر نہایت خوش ہوئے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ اخبار کے ایڈیٹر جیا بھی بخوبی سمجھتے تھے کہ نیا ابھرنے والا سورج کون ہے!

لیکن اس کے فوراً بعد ہی جب انھوں نے دوہرے کئے سپلیمنٹ کا دوسرا حصہ دیکھنے کے لئے پلٹا تو ان کا دل دھک سے بیٹھ گیا۔ ایک طرف ان کا فوٹو تھا تو دوسری طرف پاٹھک جی کی تصویر بھی چھپی تھی، اور ان دونوں کے درمیان نہایت جلی حروف میں لکھا تھا "چیف منسٹر کی گدی کے دو جانشیں!"

ایک لمحہ کے لئے یہ حروف ان کی آنکھوں میں دھندلے ہو گئے۔ انھوں نے جلدی سے جیب میں سے عینک نکالی اور ہر حرف کو نہایت غور سے پڑھنے لگے۔ ان کی تصویر کے نیچے ان کی تمام خدمات کا ذکر تھا اور ادھر پاٹھک جی کے فوٹو کے نیچے ان کی خدمات کا۔ اور آخر میں ان دونوں تصویروں کے نیچے لکھی ہوئی ترتیب سے الگ موٹے ٹائپ میں ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ "دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے!"

یکایک ناگرجی کو دھیان آیا کہ سنہا جی انھیں نہایت غور سے دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے چہرے کے جذبات کو سرد مہری کا لبادہ پہنانے

ھوں نے اپنے آپ کو پھر بہت جلدی سنبھال لیا۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ عین لیمپ لٹکے ہوئے لیمپ کی روشنی میں ان کا سایہ شکر ملکر رہ گیا تھا۔

ساتھیو۔ آج کا دن ہمارے پرانتیہ کے لیے بہت شبھ دن ہے میں اپنے متر اور نئے مکھ منتری پاٹھک جی کو ہاردک بدھائی دیتا

ں۔ پاٹھک جی کی جے!" اور اس کے ساتھ فضا میں کئی آوازیں گونج اٹھیں۔

اور ایسا معلوم ہوا جیسے سلگتی ہوئی چنگاری ایک لمحے کے لیے مدھم پڑ گئی ہو ——— اور دوبارہ سلگنے کے لیے ہوا سے کسی اور جھونکے کا انتظار کرنے لگ گئی ہو۔

جی نے نہایت انکساری سے دونوں فریقین سے کہہ دیا کہ مکھیہ منتری کا فیصلہ تو آپ لوگوں ہی کو کرنا ہے۔ کہیں سے یہ سننے میں ملا کہ تنکل جی نے اپنا جانشین پاٹھک جی کو مقرر کیا تھا اور جس کا ذکر انھوں نے ہائی کمانڈ اور رام چندرن جی سے بھی کیا تھا۔ دوسرے گروپ کی طرف سے یہ کہا جا رہا تھا کہ مکھیہ منتری وہ ہونا چاہیے جو پارٹی کو جنتا کے قریب لے جائے اور اس کا دن اس لئے یہ تو کیول ناگر جی تھے جو لوگ کسی وجہ سے شہر میں نہ تھے انھیں ٹیلیفون یا اور دیگر ان کے شہروں اور گاؤں سے بلا لیا گیا۔

میٹنگ ہونے سے پہلے تک سرگوشیوں میں، اشاروں میں، دبی زبان سے ناگر جی کا اور پاٹھک جی کا چرچا ہوتا رہا۔ میٹنگ ودھان سبھا کے ہال میں تھی۔ پاٹھک جی خود اپنی کار میں پانچ چھ ایم۔ ایل۔ اے کو بٹھا کر لائے تھے ناگر جی کے ساتھی بھی اس معاملہ میں کچھ کم نہ تھے۔ انھوں نے بھی اس سلسلہ میں کئی کاروں کا انتظام کر رکھا تھا۔ ناگر جی جب پاٹھک جی سے سیڑھیوں پر ملے تو انھوں نے معنی خیز نگاہوں سے لیکن نہایت گرم جوشی سے ایک دوسرے کا سواگت کیا۔ اتنے میں رام چندرن جی کی کار آگئی اور دونوں مل کر نہایت عزت و تپاک سے انھیں اندر لے گئے۔

ہال میں سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پاٹھک جی بیچ والے راستہ کے بائیں طرف اور ناگر جی دائیں طرف پہلی قطار میں بیٹھ گئے۔ رام چندرن جی نے سامنے والا میز سنبھال لیا۔ ان کے دیکھتے ہی کمرہ میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ رام چندرن جی نے تنکل جی کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس حادثہ کی اہمیت کو جتایا اور پھر اس کے بعد انھوں نے اس چناؤ کے طور طریق سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد ناگر جی اور پاٹھک جی کے نام ان کے ساتھیوں نے پیش کئے۔ ان ناموں کا اعلان کرنے کے بعد رام چندرن جی نے ممبروں کو چناؤ کی پرچیاں تقسیم کرنی شروع کیں۔ ہر شخص کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ایک طرف لگے ہوئے سکرین کے پیچھے جا کر پرچی پر حسب منشا نام کے آگے نشان لگا کر میز پر پڑے ہوئے بکس میں ڈال دے۔

فضا میں ایک عجیب خاموشی تھی جس میں کبھی کبھی کوئی سرگوشی سنائی دے جاتی۔ پاٹھک جی نہایت خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کے ہتھے سے کھیل رہے تھے۔ ناگر جی بظاہر کوئی رپورٹ پڑھ رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں ہر ووٹ ڈال کر آنے والے کے چہرے کا جائزہ لیتیں۔ کئی ممبر تو اس خیال سے کہ ان کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہو اس طرح کا سنجیدہ منہ بنا کر باہر نکلتے گویا وہ کسی عزیز کو دفن کر کے آ رہے ہوں

کچھ کے چہرے اس طرح کھلی کتاب کی طرح ہوتے جیسے وہ کسی سرکس کے رنگ ماسٹر کے اشارہ کے مطابق کام کرنے کے بعد اس سے داد طلب کر رہے ہوں۔ کچھ چہرے ایسے بھی تھے جو یا زمین میں یا چھت پر گڑے ہوتے تاکہ کوئی ان کے بارے میں کسی قسم کا شبہ نہ کرے۔

تقریباً تین گھنٹے کے بعد ووٹوں کی گنتی جانے لگی۔ فضا میں گویا کھچاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ناگر جی کے عین سر پر ایک بجلی کا لیمپ لٹک رہا تھا جو پنکھے کی ہوا میں آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ روشنی کا یہ دھبہ ان کے وجود کو ایک عجب طرح سے اجاگر کر رہا تھا جیسے اسٹیج پر کسی اہم کردار پر روشنی ڈالی جا رہی ہو۔ ناگر جی اب عینک اتار کر صاف کرنے لگے۔ ان کی آنکھیں اب نہایت تیزی سے جھپک رہی تھیں۔ پاٹھک جی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کے دستے کو اب تیزی سے گھما رہے تھے۔

ووٹ گننے کے بعد جب نتیجہ رام چندرن جی کے سامنے لایا گیا تو سب کی نظریں ان پر گڑ گئیں۔ رام چندرن جی نے ووٹ گننے والے شخص سے سرگوشیانہ لہجہ میں کچھ پوچھا اور پھر دونوں نے سر ہلا دیا۔ رام چندرن جی نتیجہ کا اعلان کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"دو سو چھیانوے ووٹوں میں پندرہ ووٹ ایسے نکال دیے گئے ہیں جو کہ قاعدے کے مطابق ٹھیک نشان نہ لگنے کی وجہ سے رد کئے گئے ہیں۔ باقی دو سو اکیاسی ووٹوں میں ناگر جی کے حق میں ایک سو چھیالیس ووٹ ہیں اور پاٹھک جی کے حق میں ایک سو پینتیس۔ اس لئے ...." اور رام چندرن جی کی آواز شور و غل میں کھو گئی۔ جیسے ہال ایک دم زندہ ہو گیا ہو اور کئی آوازیں گھبرا کر اٹھی ہوں۔

"پاٹھک جی کی جے۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے! ناگر جی ..."
"نئے مکھیہ منتری کی جے!"
"ناگر جی نئے مکھیہ منتری ......"

اور ناگر جی کو ایک لمحہ کے لئے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے دل کی دھڑکن رک گئی ہو۔ گویا ان کے سر پر جھولتا ہوا لیمپ بھی رک گیا ہو
"خاموش ہو جائیے، پلیز خاموش ہو جائیے۔" رام چندرن جی نے میز تھپتھپاتے ہوئے کہا، "ساتھیو! آپ کو نیا مکھیہ منتری مبارک ہو۔ میں چاہوں گا کہ ناگر جی سب سے پہلے پاٹھک جی کو مبارک باد پیش کریں"
ناگر جی اس غیر متوقع فرمائش کے لئے بالکل تیار نہ تھے لیکن

گو رحیا بچ رہا لیکن دل میں ایسا ہول بیٹھا کہ پھر پاڑ پر چڑھنا تو درکنار اس نے پیشے کرنی کو ہاتھ لگانا تک چھوڑ دیا۔ لوگ ایک ایک کر کے اس پیر کاریگر کے اوزار لے گئے اور نہایت فخریہ انداز سے انکیں کام میں لانے لگے۔

اس کی زندگی میں پیالے کا عمل دخل اور بڑھ گیا۔

اس کے ملنے جلنے والوں میں نبی بخش۔ بالی والے کا پہلا نمبر تھا نبی بخش۔ بالی والا شہر کا سب سے مشہور کبابیا تھا۔ جب اس نے رحیے کو بیکار دیکھا تو دوستی کا حق ادا کرنا چاہا۔ اسی کے گھر کے پاس اسے چھوٹا سا اڈہ بنوا دیا اور اسے کبابوں کا وہ خاص مصالحہ بھی بتا دیا جس کا نسخہ اس کے خاندان کا سربستہ راز تھا۔ اگرچہ یہ نسخہ بڑی چیز تھا اور رحیا اچھا خاصا بھی بن گیا لیکن قسمت کی بات ہے دال نہ گلی۔ اتنی سی بستی میں کیا دھرا تھا۔ نیا شہر تعمیر ہوا تھا۔ اسی کے طفیل مزدوروں کا گریلی نے بھی ذرا فاصلے پر جھونپڑے ڈال لیے تھے۔ کچھ اجڑے کچھ بسے مہاجر بھی آ رہے تھے۔ تھوڑے بہت کباب بستی میں لگ جاتے۔ کبھی کبھار کوٹھی والوں میں سے کوئی آ کر لے جاتا۔ روٹی تو چل پڑی تھی۔ لیکن وہ ٹھہرا امنگوں کا پتلا۔ اسے تو خواب محل کی پڑی تھی۔ یہاں تعمیر کی صورت پیدا نہ تھی۔

رحیے نے دھندا بڑھانے پھیلانے کی تدبیر بہت کم کی۔ بیشتر وقت تو پیالے کی نذر ہو جاتا۔ ادھر صبح ہوئی اور ادھر اس کی نظر کونڈی ڈنڈے پر پڑی۔ وہ اور گوہراں مل بیٹھتے اور بوٹی گھوٹتے۔ وہ سمجھتے کہ بوٹی کے ساتھ ساتھ زمانے کو بھی گھوٹتے۔ جب بوٹی گھٹ چکتی تو وہ تھک کر چور ہو جاتے اور ایسا لگتا جیسے بوٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی گھٹ گئے ہوں۔ پھر پیالہ پیتے تو سمجھتے کہ زمانہ کی مشکلیں گھوٹ کر پی رہے ہیں۔ ہولے ہولے تکان آلودستی رگ و پے میں سرایت کرتی۔ ہولے ہولے حدت و حرارت گھٹتی اور ہولے ہولے ان کے خیالات لڑکھڑانے لگتے۔ پھر ایسا محسوس ہوتا جیسے دھنکوں کی کھائی میں گر پڑے ہوں اور نیم جاں ہو کر ڈوبنے لگے ہوں۔ پھر کچھ دیر بعد وہ سمجھتے کہ انھوں نے پیالہ نہیں اپنے آپ کو پیا ہو۔

جب تک پوری طرح چت نہ ہو جاتے اکھڑی اکھڑی باتیں کرتے بات بات پر ہنستے اور کبھی تو ہنستے ہنستے ان کی پسلیاں بھی دکھنے لگتیں۔ ان کی ہنسی کے سامنے کوئی چیز نہ ٹھہرتی۔ کائنات اپنی لامحدود وسعتوں کے باوصف ہیچ یا اتنا وہ معدوم ہوتی۔ ان کے نزدیک زندگی پیالے کی ہم شکل تھی۔ گول اور گہری۔ مختصر اور معمولی۔ جتنی اس میں بوٹی پڑتی اتنی ہی آدمی کے تن میں جان ہوتی اور پھر ہر ایک اتنی ہی بوٹی پیتا جتنی اس میں جان ہوتی۔ پیالے ہی کی طرح آدمی ناپائیدار ٹھہرا جب چاہے پیالہ ٹوٹ جائے۔

جوں جوں پیالے کا رنگ نکھرتا توں توں دنیا ان کی نظر میں غیر معتبر ہو جاتی اور ایسے میں کبھی کبھی وہ کوٹھے پر چڑھ کر غیر معتبر دنیا کا نظارہ کرتے بستی دھوئیں کے بدبودار غلافوں میں چھپی ہوئی دکھائی دیتی۔ یہاں بچوں کی چیخوں اور بوڑھوں کی کھوں کھوں سے کہرام مچا رہتا۔ پھر جب ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوتی اور وہ دھوئیں کا حصار چیر کر آگے دیکھتے تو چکتی دمکتی، لہکتی مہکتی اور تر و تازہ عمارتوں کا شہر سامنے آتا۔ ان عمارتوں کی ہر وقت نوک پلک سنورتی رہتی رنگ روغن اور غازہ چڑھتا رہتا۔ نئے دن لباس بدلتا رہتا۔ ہر آن ان کے اجلے بنٹے نکھرتے۔ اور ان کی شفاف بلوری آنکھیں سے لال اور دودھیا کرنیں پھوٹتیں۔ پھر ان کے دیکھتے دیکھتے بیدار اور سرا جوان عورتوں کی کوکھ میں سے قہقہوں اور نغموں کا شور اُبلتا۔ رات گئے دیر تک یہ عمارتیں جگمگ جھلکتی رہتیں اور موٹریں ادھر سے ادھر گیت برساتی پھرتیں جیسے شاہی محل کی خواصیں تعمیل ارشاد میں مصروف ہوں۔ پھر رحیا بڑے فخریہ انداز میں گوہراں کو انگلی کے اشارے سے وہ عمارتیں دکھاتا جو اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا حاصل تھیں لیکن اس کے خواب محل سے کمتر۔ پھر جب خواب محل کی تعمیر کے امکانات ماند پڑتے دکھائی دیتے تو وہ جسمانی ہنسی ہنستا اور گوہراں سے کہتا، "دنیا کتنی بھولی ہے لوگ کس آس پر دنیا نے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں ان اونچی اونچی بڑیوں سے کیا بنتا ہے؟ بھلا کہیں کچے سائیں کا حکم بھی ٹلا ہو؟ آدمی لاکھ جتن کرے ایک سانس نہیں بڑھ سکتا اور یہ ماڑیاں؟ بھلا یہ مرنے سے بچا سکتی ہیں؟ مالک کریم کا حکم سب پر ایک برابر لاگو ہوتا ہے۔ میری بچی سرکار بڑی بے پروا ہے۔"

رحیا اور گوہراں مل کر ہنستے اور قہقہے لگاتے۔ دیر تک ان کی ہنسی اور قہقہوں سے فضا گونجتی۔ پھر ایسے میں وہ اپنے جھونپڑے کو دیکھتے اس کا شکستہ زینہ یاد دلاتا کہ رحیے کی کروٹ کر رہ گئی ہے اور اس کی آرزو ملبے تلے دب گئی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک روز وہ زندگی پیالے کی طرح زمین پر ڈھیر ہونے کو ہو۔

رحمان مذنب

ملنگ

پیالے کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے؟ دو ٹکے کا پیالہ لیکن اس کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا۔

پیالہ پیا تو ہلکی ہلکی ترنگ —— اس کی نگاہوں میں ڈولنے لگی۔ پھر گھر کی چہار دیواری کی طنابیں ناپائدار بھی ڈولنے لگا۔ ادھر ادھر ہر اک لڑکھڑاتی ہوئی موجوں پر جیسے شکاف زدہ کرنیں ثبت ہو رہی تھیں اور سمجھے ہیں اپنی اپنی راہ لگ رہے تھے جیسے دن ڈھلے پرندے بسیروں کی سمت رواں ہوں۔ وہ گوہراں کے پاس تھا خالی پیالے میں لست یارڈ ڈھونڈ رہا تھا انگلیوں سے پیالے کی تلچھٹ گوہراں کو چٹانے اور خود بھی چاٹنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ خفرے ٹوٹ گئے اور دنیا نے اس کی خاطر ڈول ڈول کر سارا بوجھ ادھر ادھر پٹک دیا سوئے کے سوا اور کوئی بوجھ نہ رہا۔

ٹوٹے پیالے کی جگہ چار اینٹیں رکھ کر اس نے کھاٹ کو ناکارہ ہونے سے بچا لیا۔ گوہراں نے دری اٹھا کر الگنی پر ڈال دی۔ اب وہ کس مصرف کی تھی؟ پھٹ پھٹا کر چیتھڑوں کا ڈھیر بن گئی تھی۔ اس سے تو کھڑی پر لیٹنا ہی غنیمت تھا۔

کھاٹ تو اس نے جیسے تیسے ٹھیک کر لی۔ زینہ کون ٹھیک کرے؟ چھادٹ بنے مدت ہوئی لیکن جو زینہ ایک بار ٹوٹا تو پھر نہ بنا چھت پر چڑھنے کے لیے لکڑی کے زینے سے کام لیا جاتا۔ زینے کے علاوہ باہر والی دیوار بھی نیوٹ ہو گئی لیکن وہ بیٹھے ہوئے زرکش طرح بیٹھا رہا۔

وہ خود بیرکاریگر تھا۔ استاد کے بعد سارے شاگردوں نے مل کر اسے دستار باندھی۔ چاولوں کی دیگ چڑھائی۔ قوالی مجرا بھی ہوا۔ اسے باقاعدہ طور پر جانشین مقرر کیا گیا۔

اس کے ہاتھ میں بلا کی صفائی تھی۔ استاد میں بھی وہ بات نہ تھی جو اس میں تھی۔ اس کی عمارتیں بولتیں ہنستیں۔ مسکراتیں اور صاف ناز کا نام نہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسروں کی عمارتیں گونگی ہوتیں۔ وہ اپنے کام کا بادشاہ تھا۔

اس کے جی میں تھا کہ اپنے لیے مکان بنائے۔ بےشک گارے چونے ہی کا ہو۔ مگر ایسی نوک پلک کہ مغل کاریگر بھی مات کھائیں وہ اپنے خواب محل سے ساری صناعیاں کھپا دینا چاہتا تھا۔

ایک دن جب اس نے گوہراں کے بھائی پیر محمد سے اپنے خواب محل کی بات کی تو وہ بولا "بھائی جی! وہ مکان تو پھر لاجواب ہوگا۔ اونچے دام اٹھ جائیں گے۔"

رحیمے نے ہنس کر کہا۔ "برادر! کبھی کوئی اپنے آپ کو بھی بیچتا ہے؟ اس مکان کے لیے تو آسمان سے بھی حکم آئے تو میں نہ بیچوں۔"

وہ اکثر پیالی پی کر اور حقے کے لمبے لمبے کش لگا کر اپنے خواب محل میں کھو جاتا۔

ایک چھوٹا سا مکان اس کی زندگی کا تاج محل بن گیا اور وہ بڑے چاؤ سے اپنی آرزو کی پرورش کرنے لگا لیکن کچھ عرصے کے بعد سارا طلسم ٹوٹ گیا۔

ایک دن اس نے بہت تیز پیالہ پیا اور کام پر چلا گیا۔ ایک حویلی بن رہی تھی اور وہ باڑھ پر چڑھ کر دیوار پر گل بوٹے بنانے لگا۔ اپنی طرف سے تو اس نے باڑ خوب مضبوطی سے بندھوائی تھی لیکن کہیں کچھ رسی کا کوئی پیچ ڈھیلا رہ گیا اور باڑ دفعتاً ایک طرف سے کھسک گئی۔ سنبھلنے سے سنبھل ہی گیا اور بانس پر ہاتھ ڈال کر اس سے چمٹ رہا۔ تسلہ تیشہ اور کرنی نیچے جا پڑے۔

تو کیا کروں گا؟"

"تیرا غلام کس لیے ہے؟ داتا کی قسم! پیسہ بڑی چیز ہے۔ کوئی چھوٹی ڈھیری لیتا ہے کوئی بڑی ڈھیری۔ بس اب آگے منہ نہ کھلوا۔ تو دھندا شروع کر۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔"

"مولا تجھے خوش رکھے!"

"بس تو فٹا فٹ اڈہ بنا۔ اڈہ!"

مطیع اللہ سے مل کر رحیمے نے ایسا محسوس کیا جیسے اسے زندگی کا سراغ مل گیا ہے۔ کام پسند آیا۔ اس میں دست غیب کارفرما تھا۔ مطیع اللہ کے پاس ایسے کاموں کی کیا کمی تھی۔ انہی کے طفیل سے تو اس نے اتنی عزت و ناموس پائی۔

گھر آتے ہی رحیمے نے تکیے کے لیے جگہ تلاش کی۔ یوں تو جگہ کی کمی نہ تھی لیکن ہر جگہ تکیہ نہ بن سکتا تھا۔

آس پاس کے کھنڈروں میں ایک پرانا کنواں تھا۔ نہ یہاں چرخی تھی۔ نہ رسی نہ بوکا۔ جانے کب سے یوں ویران پڑا تھا۔ منڈیر اور چبوترے کی حالت خستہ تھی پاس ہی نیم کا پیڑ تھا۔ ملبے کا ڈھیر تھا۔ بستی والے یہیں کوڑا کرکٹ پھینکتے۔ رحیمے نے یہ جگہ بہت پسند کی۔ گوہر کو دکھائی۔ اسے بھی پسند آئی۔ رحیمے نے کنوئیں کی مرمت کی۔ چبوترہ پھر سے بنایا۔ برابر میں غسل خانہ بڑھایا۔ چرخی اور رسی بوکے کا انتظام کیا۔ گارنکلوائی۔ اندر دھو کر دایا۔ ہر طرف باڑ لگائی۔ جھنڈا بانس سے ٹانگ کر نیم کی ڈال سے باندھ دیا۔

تکیہ کھلتے ہی بستی میں جان پڑ گئی۔ گویا بستی میں کلب کھل گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بستی پہلے ادھوری تھی اب مکمل ہو گئی۔ کنوئیں پر ہر وقت عورتوں اور مردوں کا ہجوم رہتا۔ اکثر اٹھتے بیٹھتے صبح شام چہل پہل دکھائی دینے لگی۔ تکیے کے اندر ہر وقت منڈلی جمی رہتی، تاش، چوسر اور شطرنج کی بازی لگتی۔ اسلامی تاریخی ناول پڑھے جاتے۔ چرس اور پیالے کا دور چلتا۔

چرس بیچنا اسے راس آیا۔ مطیع اللہ کی سرپرستی نے غضب کام کیا وہ جادوگر بیٹوں کی چرس تو وہ کان میں یوں دبائے رہتا جیسے کان کی میل ہو اور چونی اٹھنی دانوں کو دھیں بھگتا دیتا۔ چرس کا ایک بڑا ڈھیلا کونے میں بند کر کے اس نے ملبے تلے دبا دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کر اس میں سے چرس نکالتا رہتا۔ تھوک کا مال اس نے ایک ٹوٹی مکان میں چھپا یا کوئی بڑا گاہک آتا تو مطیع اللہ کا ساتھ گرد اسے بھگتا دیتا۔ دل اور ہاتھ کا پکا تھا۔ خوب ہوشیاری سے کام کرتا۔ دراصل کاروبار کا دارومدار بیشتر اسی پر تھا۔ رحیما تو بس پیالے ہی کا ہو رہتا۔

کاروبار بڑھا تو تکیے میں توسیع ہوئی۔ ایک طرف چار دل کھونٹ پر بانس کھڑے ہوئے۔ ان پر بانس کی کھپچیاں چڑھیں اور گاد کی بیل چڑھی۔ سائبان ہو گیا۔ ملبہ اٹھ گیا۔ مینہ اور جاڑے میں رحیما گھر نہ جاتا تو یہیں رہتا۔ سائبان کے گھاس پھوس میں چرس چھپا رکھتا۔

جب سے چرس کا دھندا چلا تھا۔ دو وقت گوشت روٹی پکنے لگی تھی اور وہ سب سے کہنے لگا تھا کہ مدت کے بعد اس کا گھر مسلمان ہوا ہے دلدار دو وقت گوہراں کا پیالہ دے آتا۔ کبھی کبھی رحیما سہ پہر کو گھر جاتا تو پیالہ اور دودھ ملائی بھرا کر منڈل لے جاتا۔

پیالہ رحیمے کی زندگی بن گیا۔ ایک گونہ بے خودی دن رات میسر تھی۔ خوب سرور کیفیت میں وقت گزرتا۔ تکیے میں بڑی بڑی ہستیاں آنے لگیں۔ بعض پیالہ کے بادشاہ اور ان کے وزیر ہوتے۔ جوئے کا بادشاہ جیب کتروں کا بادشاہ، نوسربازوں کا بادشاہ، نوچیوں کا بادشاہ ویسے تو یہ بادشاہ اور کہیں نہ سماتے لیکن تکیے میں سما جاتے۔

ایک دن بادشاہوں کے اس نامور گروہ میں شہنشاہوں کا اضافہ ہوا۔ آبادی میں ایک ملنگ آیا۔ تکیے میں آکر اس نے پیالہ پیا۔ ایسا زبردست پیالہ پیا کہ ہر کوئی نہ پی سکتا۔ رحیمے نے ملنگ کے پیسے میں بیٹھ دی ہوئی بوٹی رگڑ کر پلائی۔ پیالہ پلانے کے بعد وہ ملنگ کی عظمت کا قائل ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جھپک اٹھیں۔ اسے سچا رہبر مل گیا اور اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

ملنگ کی کھچڑی داڑھی کا ہر بال سینا اور الجھا ہوا تھا معلوم ہوتا زندگی کو کھیار کر اس میں نہ کھلنے والی گرہیں ڈال دی ہیں۔ اس کی طویل جٹائیں طویل زمانوں کی مخفی داستانیں اپنے شبو طابچوں میں لیے ہوئے تھیں ناخن غیر معمولی طور پر لانبے تھے آنکھیں بہت بڑی بڑی تھیں ان میں سدا مستی سوئی رہتی۔ صورت سے دہشت ٹپکتی۔ لیکن رحیمے کی رائے میں جلال برستا۔ یوں تو ہر بادشاہ نے اسے شہنشاہ تسلیم کیا ہے۔ لیکن رحیما کچھ زیادہ ہی معتقد ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ ملنگ سائیں جس پر نظر سیدھی کر دیں گے وہ سونا بن جائے گا وہ گویا بستی کی بستی

سنتے نے، پاپ اور یتیم روز دریا میں تھپیڑے کھاتے کھاتے اور زندگی کے کڑوے کسیلے گھونٹ پیتے پیتے رحیا اور گوہراں نیند ساگر میں جا پہنچے۔

پھر رات چپ چاپ گزر جاتی۔

گوہراں کوئی حرافہ عورت نہ تھی سیدھی سادی طبیعت رکھتی اور خاوند کے ساتھ گزارہ کیے جاتی۔ نو سال ہو گئے رحیمے کے گھر آئے اولاد نہ ہوئی رحیمے نے اولاد کی چنداں خواہش نہ کی۔ وہ تو یہی کہتا جس مردار دنیا میں جینا حرام ہو وہاں کوئی اولاد کو لے کر کیا کرے؟ وہ دونوں تو ویسے ہی مر مر کر جی رہے تھے بچے ہوتے عذاب بڑھ جاتا۔ کم تو نہ ہوگا۔ یہی سچ کہ اس نے بے اولادی کا غم نہ کیا اگر یہ رحیا کی بات ہو۔ گوہراں کا تو جی چاہتا تھا کہ اس کے یہاں اولاد ہو۔ گھر میں رونق آئے۔ اس کے نزدیک تو اولاد برکت کی علامت تھی۔ اولاد کی خاطر وہ نہایت پابندی سے جمعرات بٹے پیر کی درگاہ پر دعا مانگنے جاتی اور تعویذ گنڈے کراتی رہتی۔

گوہراں کو غمگین دیکھ کر رحیا کہتا، "گوہراں سچے سائیں بڑے بے نیاز ہیں۔ چاہیں تو پتھر میں سے کیڑا پیدا کر دیں اور بے جان میں جان ڈال دیں۔ نہ چاہیں تو کیا ہو سکتا ہے؟ اولاد قسمت سے ملتی ہے۔ اب کیا معلوم کس کی کیسی ہے۔ کس کی چنگی ہے کس کی مندی ہے؟ مالک کی مرضی سے سب کچھ ہوتا ہے۔ ہم تو کھلونے ہیں گوہراں! مالک کا کھیل دیکھتی جا! دیکھ مولا کا کرم کیا کرتا ہے! اس کا بھید وہی جانے؟"

گوہراں یہ سن کر چپ رہتی لیکن دل میں گرہ بیٹھ گئی۔ اسے یقین تھا کہ اولاد نہ ہونے کی سب سختیاں ہیں۔ باڑ کا کھسکنا، رحیمے کا معمار کا پیشہ ترک کرنا۔ اور نان کباب کی دکان کا نہ چلنا بے اولادی کے باعث تھا، سوچتی، وہ کیسے نامراد ہیں کہ ایک بچہ بھی نہیں ہے۔ چپکے چپکے غم کھاتی اور رحیمے سے کچھ نہ کہتی۔ دل ہی دل میں کہتی کہ اس زندگی سے کیا فائدہ جس کا انت نامرادی ہو۔ بندہ و بشر اسی لیے ہے کہ چراغ سے چراغ روشن کرے۔

ادھر نان کباب کا دھندا مٹ ہوا اور ادھر بیاہے کا زور بڑھ گیا۔ بوٹی کی مقدار پہلے سے دگنی ہو گئی۔ رحیا تو بے غم تھا اور اس نے اپنا خواب محل بھی ڈھا دیا تھا۔ لیکن گوہراں کو غم کھائے جاتا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح گاڑی چلے اور مشکل آسان ہو۔ وہ بھی چار دن سکھ دیکھے آخر اس نے رحیا کو کوئی نیا دھندا چلانے پر مجبور کیا۔ رحیا اس بار ایک دوسرے لنگوٹیے یار مطیع اللہ کے پاس گیا۔ جو بڑا تیز اور ہنرمند تھا اس کی بابت طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا مٹی سے سونا بنا لیتا ہے کوئی کہتا دست غیب سے فیض پاتا ہے۔ پانچ سات برس کے اندر اندر اس کی کایا پلٹ گئی یہ تو کوئی نہ جانتا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ کہاں سے لاتا ہے۔ لیکن اس بات کو ہر شخص تسلیم کرتا پیسے کمانے کے اسے خفیہ گر یاد تھے اس نے اوپر تلے چار حویلیاں کھڑی کی۔ چار بیاہ کیے بڑے بڑے معززوں سے رسوخ پیدا کیا۔ شان دار موٹر خریدی۔ گھوڑے تانگے بنائے اگرچہ اب وہ بہت بڑا آدمی بن چکا تھا۔ لیکن رحیمے سے وہ بڑی چاہ سے بولا۔ اس کی کم آمیزی کا شکوہ کرتے ہوئے رحیمے نے کہا۔

"برادر! اب تو بڑا آدمی ہے تانگوں موٹروں والا ہے۔ بیٹھک بنی اچھی ہوگی تبھی تو تیرے پاس اتنا مال ہے۔"

مطیع اللہ اس پر بے اختیار ہنسا بولا۔ "ارے رحیمے! تجھے تو کچھ پتہ ہی نہیں۔ تو تو وہی پرانی باتیں کرتا ہے۔ اب بیٹھک کا دھندا انہیں جوئے میں کیا رکھا ہے۔ اب تو میں بڑے بڑے بیوپار کرتا ہوں۔ تو بتا کر رہا ہے وہی راجگیری یا کوئی اور دھندا؟"

"میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔"

"ہاں، یار کتنے ہی لوگ آج کل کچھ نہیں کرتے۔ پر مزے میں رہتے ہیں سنا لگ گیا کہیں سے مال؟"

"برادر تو کس خیال میں ہے؟ میں تو فاقوں مر رہا ہوں۔"

"یار بیر تو تو بڑا بدھو نکلا۔ دنیا مار دھاڑ میں لگی ہے سو رستے ہیں اور تو کہتا ہے کہ فاقے مر رہا ہوں۔"

"مجھے کوئی اچھے سے کام پر لگا دے تیرا بھلا ہو!"

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آج سے تجھے ماما غنی کے ساتھ جوڑ ہوں بورڈ پر رہنا اور دھیں پر اپنا لین دین کرنا۔"

"یار یہ تو مشکل کام ہے۔ کوئی سہل سا ٹوٹکا بتا، گھر بھی نہ بیٹھو ہڈی بھی نہ ٹوٹے اور کام بھی فروٹ ہو۔"

"پھر ایک ہی کام ہے۔ کوئی سطبل کا۔ اس میں زیادہ جی داری ضرورت نہیں۔ میں تجھے ایک بڑا دوں گا نوکر سے جا!"

"وہ کیا؟"

"گھر کے پڑے تیرے کبھی تکیہ بنا لے! مجھ سے چرس لے جا۔ دس بیس کی کار روز کر لیا کرتا۔"

"برادر کام تو تو نے کلاس بتایا ہے تو نے۔ پر یہ بتا! پکڑ دھکڑ ہو

ایسا نام نکلا کہ ہر طرف حمزہ ہی حمزہ ہونے لگا۔

نتھو کا کھوتی والا بڑا محتاط تھا۔ ہر وقت نگلے کی دو ڈبیاں حاضر رکھتا۔ روپیہ ڈبیہ بھی کوئی دیتا تو وہ ان ڈبیوں کو ہاتھ لگانے نہ دیتا۔ ادھر ملنگ مسکراتا مسکراتا آیا اور ادھر اس نے ڈبیا آگے رکھا۔ اگر کبھی نتھو کا دکان پر نہ ہوا تو ملنگ چپ چاپ کھڑا رہا۔ کچھ نتھو کے حسن سلوک کا نتیجہ تھا اور کچھ سگریٹ کی کشش کے باعث۔ اس نتھو کے کاروبار پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ سب نے ملنگ کی تقلید شروع کر دی۔ اور نگلے کے تین ڈبے ہر روز بکنے لگے۔ چوری تو اب کسی دوسرے سگریٹ کو ہاتھ ہی نہ لگاتے۔

رحیمے کا یہ دستور کہ پہلا پیالہ ملنگ کی نذر کرتا اور اگر وہ کبھی کچھ چھوڑ دیتا تو رحیما اسے ساری کونڈی میں ملا دیتا اور پھر سب لوگ تبرک کی بوٹی پیتے۔ جب ملنگ اٹھ کر چلا جاتا تو رحیمے تکیے والوں سے اس کے اوصاف بیان کرتا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن ملنگ اپنی زبان مبارک کھولے گا۔ اور اس کا بیڑا پار لگائے گا۔ ضرور اسے اسم اعظم معلوم ہے ملنگ اسی کی خاطر آیا ہے مرنے سے پہلے ملنگ اسے اپنے راز سے آگاہ کرے گا اور خلیفہ بنائے گا۔

ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ملنگ بھرپور جلال میں رونق افروز ہے سفید براق لباس زیب تن کر رکھا ہے۔ چہرہ چمک رہا ہے اور گرد نور کا ہالہ ہے۔ صورت پر نظر نہیں ٹکتی۔ آپ مسکرا رہے ہیں اور رحیمے کو شانے سے پکڑ کر ہلا رہے ہیں۔ جب وہ بیدار ہوا تو فرمانے لگے۔ "رحیمے اٹھ! ہوشیار ہو! ہماری گھڑی مل گئی۔ اب تیرہ پھیر ہے۔ ہماری گدی سنبھال۔ دیکھ ہم نے سفید کفنی پہن لی ہے۔ اب ہم اس تیری نامراد دنیا میں نہیں رہتے۔ ہم وہاں رہتے ہیں جہاں ہر وقت پیالہ ملتا ہے سدا سرور رہتا ہے۔ لے پی! ہم تیرے لیے بھی ایک پیالہ لائے ہیں۔ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ بس ہمیں اتنا ہی حکم تھا کہ تجھے پیالہ پلا دیں اور پھیرہ سنا دیں۔"

اتنا کہا اور دامن میں سے چاندی کا پیالہ نکلا جو جواہرات سے جگمگا جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ رحیمے نے پیالہ پیا اور غٹاغٹ پیا بے حد مزیدار تھا پیالہ۔ ایسا مزا اس سے پہلے اسے کبھی نہیں ملا جی ہوا اتنا تھا کہ عمر بھر ایسے ہی پیالے پیتا رہے بڑا سرور آیا اسے مستی میں جھوم جھوم گیا۔ ملنگ نے تھپکی دی اور رخصت ہو گیا۔

خواب تمام ہوا اور آنکھ کھلی کھلی۔ لیکن پیالے کے سرور کی بجائے پچھلی رات کے نشے کا بوجھل اور تکان آلود ردعمل تھا۔ طبیعت بے کیف اور مضمحل تھی۔ بدن ٹوٹ رہا تھا آنکھیں بے رونق تھیں جیسے کسی تازہ مردے کی ہوں۔ ڈھیلوں کے نیچے گڑھے پڑ گئے تھے۔ سر بھاری تھا۔ کھوپڑی میں ٹوٹتے ہوئے نشے کے دھیمے دھیمے دھماکے پڑ رہے تھے اس نے پھٹی پھٹی بے نور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ برابر کی چٹائی پر یار بکھرے پڑے تھے لیکن ملنگ غائب تھا اس نے دل ہی دل میں کہا کہ خواب ضرور سچا ہے اور وہ ضرور خلیفہ بن گیا ہے۔

مرغ نے اذان دی تو وہ سمجھ گیا کہ خواب اچھے وقت آیا ہے گو دماغ ابھی طرح کام نہ کر رہا تھا۔ پھر بھی خواب کے نقوش خاصا گہرا اثر چھوڑ گئے تھے۔ اس نے گھر کی راہ لی تاکہ اپنی خلافت کی خبر سب سے پہلے گھر والوں کو سنائے۔ گھر پہنچا تو اس نے اپنا دروازہ کھلا پایا آنکھیں ملیں۔ پل بھر توقف کیا۔ گھر میں سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ رات کے سارے راز عیاں ہو گئے تکیے میں رحیمے نے سب کو سنا سنا کر کہا۔ "برادر! فقیری بڑی دور ہے ملنگ بننا اور پہاڑ کاٹنا ایک برابر ہے کوئی کیا ملنگ بنے گا؟ برادر! میں ملنگ بن کے دکھاؤں گا۔ کوئی بستی ملنگ سے خالی نہیں رہ سکتی۔"

اس نے بڑی امنگ کے ساتھ پیالے کو دیکھا۔ اور اس کے گھلتے ہوئے ہاتھ بے اختیار کونڈی ڈنڈے پر پڑے۔

تفصیلات سے گریز

ایک عورت نے دوسری عورت سے کہا: میں مزید تفصیلات میں نہ جاؤں گی ویسے سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے زیادہ تمہیں بتا چکی ہوں جتنا میں نے سنا تھا۔

کوسنے کی بستی بنانے آئے تھے ۔ رحیمے کے خیال کے مطابق بستی کی قسمت بیدار ہو گئی۔

اب وہ کہنے لگا۔ "ملنگ سے کوئی بستی خالی نہیں۔ دنیا میں ملنگ نہ ہوں تو گھڑی بھر کی بادشاہی نہ رہے۔ دھرتی ایک دم خاک سیاہ ہو جائے۔ آخر غریبوں کا بھی کو وارث ہے ملنگ شاہ آگئے ہیں۔ ہمارے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔ لوگو! ہماری سنی گئی۔"

اور پھر پیالے کا دور اس زور سے چلتا کہ بستی بھر کو خبر ہو جاتی نعرے پر نعرے لگتے۔ بوٹی گھوٹنے والے وجد میں آجاتے تکیے کے ہر مکین کی روح تن سے جدا ہو کر بہتے کھنچنے لگتی ۔ ایک دور سے دوسرے دور تک نوبت پہنچتی اور مستوں کی محفل اپنے مسلک کا اعلان کرتی رہتی ۔

لیکن ملنگ شاہ کی ادا سب سے نرالی تھی ۔ اسے نعروں اور ہنگاموں سے سروکار نہ تھا۔ وہ تو حپپ کا بادشاہ تھا۔ زبان ہلانا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہ تھا اور جیسے اس نے سکھا کا دیدار وقتاً فوقتاً صرف پیالے کا ذائقہ چکھنے کے لیے تھا ۔ وہ کبھی سوال نہ کرتا ۔ پھر بھی جب کبھی کسی کے پاس جا کر کھڑا ہوتا تو اس کے لیے سب سے بڑا سوال بن جاتا ۔ سارے کام چھوڑ اسے پہلے حل کرنا پڑتا ۔

لوگ مٹھائی کے ٹوکرے اور کھانے کے خوان لوٹا کر ہی لے جاتے ۔ کپڑے میلے ہو جائیں ، کلیاں بنائیں ۔ اس کی بلا سے ۔ کوئی آکر نیا جوڑا پہنا جائے تو اور بات ہے ورنہ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اس کے نزدیک ننگے رہنے اور تن ڈھانپنے میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس کی خاموشی اور بے نیازی نے دنیا کو قائل کر دیا اور وہ سچا فقیر تسلیم کیا جانے لگا ۔

عورتوں کو خبر ہوئی وہ ٹوٹ پڑیں ۔ دو ہی دن میں دور دور تک اطلاع پہنچ گئی ۔ دور دور سے عورتیں آنے لگیں ۔ ان کے تکیے پر ہر وقت میلہ لگنے لگا۔ اب تو گوہراں سے بھی رہا نہ گیا اس نے بھی بڑی خانقاہ میں جانا ترک کر دیا۔ وہ ملنگ ہی کے گھٹنے پکڑنے لگی اسے یقین ہو گیا کہ اب نامراد بے اولاد نہ رہے گی۔ یہ فرشتہ تو جیسے اسی کی خاطر نازل ہوا تھا ۔

آرزوؤں کی پہیلیاں اور مشکلات کی ترجمانی کا پیدائشی حق رکھنے والی پہیلیاں یوں ملنگ سے چمٹیں جوں گڑ سے مکھیاں چمٹی ہوں۔ انھوں نے عشق و معاشقہ کے افسانے، شادی بیاہ کے قصے نامرادیاں اور زندگی کے مخفی سے مخفی مسئلے آن واحد میں اس پر تشریح کر کے رکھ دیئے۔ جن دفینوں کو زمانے بھر سے چھپائے چھپائے اور سینے سے لگائے لگائے پھرتی تھیں آج وہ ملنگ کی ٹھوکروں میں پڑے تھے ۔

عورتوں کے جمگھٹے سے اکتا کر ملنگ بستی کا رخ کرتا ۔ مارا مارا بھوک پیاس لگتی یا سگریٹ کا نشہ ٹوٹ جاتا تو کسی دکان پر جا کھڑا ہوتا اگر دکاندار نے صورت دیکھتے ہی سوال پورا کر دیا تو فبہا ورنہ وہ بڑھ گیا۔ فقیر جب آگے بڑھتا ہے تو پیچھے نہیں ہٹتا ، دنیا اگر مشرق یا مغرب پھر جائیں۔ فقیر کا رخ نہ بدلے۔ جس دن بدقسمتی سے کسی دکان سے ناکام لوٹتا تو بستی بھر میں غل مچ جاتا۔ پھر کوئی لاکھ دکان ہی لا کر قدموں میں ڈال دیتا ۔ ملنگ قبول نہ کرتا ۔ رحیما تکیے سب کو سنا سنا کر کہتا ۔ "آج اس بدبخت کا بیڑا کٹ گیا۔ جس کی دکان سے ہمارا شہنشاہ ناکام پھرا قسم رب سچے سائیں کی۔ دیکھ لینا اس کا برا حشر ہو گا ۔ نہ وہ یہاں سکھ پائے گا نہ وہاں ۔"

اگر دکاندار پر کوئی آفت نہ ٹوٹتی تو رحیما کہتا ۔ "ملنگ سائیں اپنے وقت کا حاکم ہے جس کی چاہے پکڑ کرے اور جسے چاہے معاف کرے ۔ اس مرتبہ تو جیسے کیسے بچ گیا ہے پھر یہی حرکت کی تو خیر نہ ہو گی ۔"

حمزہ تنور والے سے ایک دن بڑی چوک ہوئی۔ ملنگ آیا تو اس نے ہاتھ کا پیڑا جھٹ سے پھینک کر ملنگ کا سوال پورا نہ کیا۔ گو چار گھڑی کی بات ہوئی لیکن ملنگ ہی رکا چل پڑا ۔ حمزہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ پیڑا اچھوٹ کر تنور میں جا پڑا ۔ سالن کی ہنڈیا روٹیاں دھری کی دھری رہیں پیچھے بھاگا ۔ لیکن ملنگ نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جب وہ بہت پیچھے پڑا تو ملنگ نے اینٹ اٹھا کر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا ۔

رحیمے نے پیالہ چڑھا کر ترنگ میں آکر تکیے والوں کو سنایا "ملنگ نے اینٹ نہیں ماری پھول مارا ہے سو لاجانے حمزہ کا گناہ کٹ گیا ۔ اب اس پر کوئی آفت نہ ٹوٹے گی ۔"

اس کے بعد حمزہ تنور والے کے کاروبار کو چار چاند ہی تو لگ

کم تھی اور پھر جب سارا بندوبست خود اماں کر رہی ہوں ۔ چنانچہ کھڑے کھڑے انھوں نے تاریخ بھی طے کر کے احمد بابو کو شادی ۔ ہاجرہ اب تک جا چکی تھی چنانچہ انھوں نے ذرا کھلی ہوئی آواز میں افتیا میہ کہا " دو چار جوڑے کپڑوں کے اور دو ایک زیور بنا لینا اور شادی کرتے ہی ساتھ لے جانا "

بہو نے یہ سنا تو اس کی نظروں میں ایسا تیکھا طنز ابھر آیا کہ اماں دیکھ پائیں تو باقی عمر یہ نظر ان کے دل میں کانٹا بن کر کھیلتی رہی ۔ جہاں تک بہو کو یاد پڑتا تھا اماں کو اس دن سے ہاجرہ سے کد ہوئی تھی جب وہ پہلی مرتبہ برقع اوڑھ کر ان کے ہاں آئی تھی ۔ یوں تو ہاجرہ پہلے دن سے ان کے ہاں آ رہی تھی ۔ شروع میں ننگے پاؤں ننگے سر دھپ دھپ کرتی آتی تھی ۔ چند سال بعد دوپٹے کے نام کی ایک پتلی سی دھجی زمین پر گھسٹتی آنے لگی پھر ایک دن برقع اوڑھ کر آئی ۔ کام کرتے ہوئے وہ بیٹھے کا نیچے کا حصہ پہنے پھر رہی تھی اور گلابی ڈوپٹہ برقعے کے اندر سے ہو کر اس کے کانوں اور بالوں کو ڈھانکتا ہوا پھر برقعے کی سیاہی میں ڈوب گیا تھا ۔ برتن دھونے کے بعد جب وہ ننھے کے کپڑے دھو کر دھوپ میں پھیلا رہی تھی تو بہو نے اپنے کمرے سے ہانک لگائی " ہاجرہ ، ذرا اماں کے کمرے میں جھاڑو لگاتی جا ، صبح سے پڑا پھنک رہا ہے ۔ لگے ہاتھ یاد بھی کر ۔ " کمرے سے انتہائی ہمدردی کے جو کھلا طنز اس جملے میں اماں کی آرام طلبی پر تھا وہ اُن سے چھپا نہ رہ سکا اور انھوں نے اونھ کر کے اپنی پلنگڑی پر کروٹ بدل لی ۔ ہاجرہ آئی اور پھلیدی جلد جھاڑو دینے لگی ۔ پھر گلابی ڈوپٹے کی جھلک اور کچھ اس کی پھرتی نے جیسے اس کے بھرے بھرے گالوں پر گلال پھیر دیا تھا ۔ ان کم بخت سوکھے ٹکڑے کھانے والیوں کے رنگ تو دیکھو ۔ جیسے انار کے دانے اماں نے لیٹے لیٹے سوچا جب وہ کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں اٹھا باہر رکھنے جاتی تو اس کے بھاری قدموں کی ہر دھاپ جیسے اماں کے نازک دل پر پڑتی ۔ نگوڑی ماریوں کی تندرستیاں ہیں کہ ذرا سے زمین پر پاؤں مار دیں تو پانی نکل آئے ۔ اماں ہمیشہ سے دھرتی پر پھونک پھونک کر قدم رکھتی آئی تھیں ۔ زمین زور سے چلنے والوں کے خلاف حشر میں فریاد کرے گی ۔ اگر یہ بات بچپن میں اماں کو نہ بھی بتائی جاتی تو بھی ان میں اتنی طاقت ہی کہاں تھی کہ وہ زمین کو ایسا سوتا دیتیں ۔

بچپنا سے ہی چھوئی موئی کا پودا تھیں وہ تو ۔

ہاجرہ جھاڑو دے کر میاں جی کی کرسی کے پاس جا کھڑی ہوئی تو انھوں نے اسے استفساریہ نظروں سے دیکھا ۔ اس کے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر میاں جی کرسی کھسکا کر ایک طرف جا کھڑے ہوئے ۔

" آپ برآمدے میں چلے جائیں ۔ کم بخت ماری کمرے میں دھول ہی دھول بھر گئی " اماں نے میاں کو نصیحت کی ۔ روز جب کلو دیتا تھا تو وہ اسی طرح کرسی چھوڑ کر ایک طرف جا کھڑے ہوتے تھے اور اپنی میز کرسی کے پاس سے صفائی ہوتے ہی وہ کرسی پر بیٹھ اپنے کام کا سرا جوڑ دیتے تھے آج نہ معلوم کیوں ان کا جب اماں کی لا بھیپھڑوں پر لوٹ کر پیار آ گیا تھا ۔ میاں جی چپ چاپ جا کر برآمدے میں کھڑے ہو گئے ۔ اماں کھلی آنکھوں سے ہاجرہ کے جلدی جلدی چلتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں جیسے گویا کوزے لیکا رہے ہوں ۔ غیر شعوری طور پر وہ اپنے کچھی اپنے ہاتھوں کو سہلانے لگیں ۔ پھر ہاجرہ کو اسمیٹ سامنے برآمدے تک جا پہنچی ۔ اندر آتے ہوئے میاں جی نے بے پروائی سے اس سے پوچھ لیا " تیرا بھائی اور دیتے نہیں آتا آج کل ؟ "

" اس نے کام چھوڑ دیا میاں جی " ہاجرہ نے کہا ۔

" کام کیوں نہ چھوڑ دے گا ۔ بہنیں جو تیرے میرے گھر سے بھر بھر اسمیٹ لاتی ہیں " بیوی نے بدلے تیور میاں جی کو یوں لگے جیسے انھوں ہی نے بہنوں کو تیرے میرے گھر جانے کی نصیحت کی تھی ۔ وہ گھسیٹ جلدی سے اپنے کام میں جٹ گئے ۔ باورچی خانے سے گوشت کے جلنے کی بو آ رہی تھی لیکن وہ اپنے نزلہ زکام کے سہارے پڑی رہیں بیٹھی سی بات ہے کہ جب اماں کو نزلہ زکام ہو تو ناک میں دم آ گیا تھا ۔ تھوڑی سی بھی ناک میں پہلے گئی ہو گی ۔ بہوا نے کمرے سے چیخ کر " ہاجرہ دیکھنا ، گوشت جلا ۔۔۔ " بیں ذرا تھکے کر ۔۔۔ بیدار وہ ہاجرہ کو نہیں اماں کو سنا رہی تھی ۔ یہ بات نہ اسے خوب معلوم تھا نہ اس کی آواز بڑا برے کمرے سے ہی جانے گی پر آمدے میں ہاجرہ تک نہیں پہنچے گی ۔ اماں اس پر ہاجرہ تیز سے بھنا کر چپل پہنتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بھاگیں لگے ہوئے گوشت کو دوسری دیگچی میں ڈالنے اور پہلی دیگچی میں پانی بھر کر

رضیہ فصیح احمد

آنکھ کا کانٹا

آخر تنگ آکر اماں نے احمد بابو کو بلا بھیجا —

یہ بیچارے پاکستان بننے پر جب اس محلے میں آباد ہوئے تھے تو لونڈوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ لیکن اسسٹنٹ گورنمنٹ میں کلرک ہو کر ایسے ٹھاٹ سے احمد بابو بن گئے تھے۔ اپنے لانبے تاڑ سے جسم پر چھوٹا سا سر اور چہرہ نہایت بردباری سے اٹھائے پھرتے تھے۔ ان کے جھکے ہوئے کندھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ پیشن کورٹ بلڈنگ کی (جہاں وہ کام کرتے تھے) ساری فائلوں کا بوجھ اس ترازو سمیت جو اس عمارت کی پیشانی پر لٹک رہا ہے احمد بابو کے کاندھوں پر دھرا ہے۔ وہ خالص بابویانہ انداز میں جسم سے لپٹا ہوا سوٹ پہن کر نکلتے تھے اور خاص خاص موقعوں پر ٹائی بھی لگاتے تھے۔ پھر سارے محلے کو حالات حاضرہ سے باخبر رکھنے کی ذمہ داری انھوں نے لے رکھی تھی۔ دکانداروں اور سڑک کے دونوں طرف بکھری ہوئی جھگیوں کی بوڑھیوں کے خط پتر بھی لکھ دیتے چنانچہ پورا محلہ جس میں اماں بھی شامل تھیں احمد بابو کی عزت کرتے تھے جو ان کی ہر دلعزیزی کا ثبوت تھا۔

احمد بابو آئے تو اماں نے کچھ یونہی ادھر ادھر کی باتیں کر کے گھر کی خیر خیریت پوچھی۔ اماں کا محلہ کی لڑکیوں سے کچھ ایسا بیر تھا جیسا ان لڑکیوں کا محلہ والوں سے ہوتا ہے جو یہیں پیدا ہو کر جوان ہوتی ہوں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دفعتاً وہ پکار اٹھیں "اے میں نے کہا تم جانے سے پہلے شادی کرتے جاؤ وہاں پردیس میں کہاں لڑکیاں ملیں گی۔"

احمد بابو ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو دارالخلافہ تبدیل ہونے کے بعد پہلی اسپیشل سے پنڈی آ رہے تھے۔ احمد بابو اس بات کو بے وقت کی راگنی سمجھ کر کھسیانی ہنسی ہنس دیے اور رسماً کہہ دیا "آپ کہیں کرا دیجیے، میں تیار ہوں۔"

اماں نے آواز دبا کر نہایت رازداری سے کہا —

"ہاں، ہے تو ایک لڑکی یہیں پڑوس میں رہتی ہے۔ اے بیٹے تم نے بھی دیکھی ہوگی یہ اپنی ہاجرہ۔" اور انھوں نے انجان بن کر دروازے کا پٹ کچھ اس طور کھولا کہ مسالہ پیستی ہاجرہ سامنے نظر آئے۔ احمد بابو دھوپ میں بیٹھی ہوئی ہاجرہ کے تمتماتے گال اور کھلی آستینوں سے جھانکتی ہوئی باہوں کو دیکھ کر کچھ کسمسا سے اٹھے۔ اماں نے بات جاری رکھی "صورت شکل بھی اچھی ہے۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی ہے اور سلیقہ مند ہے، دلی میں اچھے خاصے درمیانے درجے کے لوگ تھے یہاں بے چاروں پر مصیبت پڑ گئی، لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ لڑکی میں کوئی عیب نہیں۔"

احمد بابو نے ہاجرہ کو پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ لڑکی بری نہیں تھی لیکن ایک جھگی میں بارات لے کر جانا ذرا ہتک کی بات تھی۔ یہ بات ہکلا کر ٹوٹے پھوٹے جملوں میں انھوں نے اماں کے گوش گزار کی۔ اماں اس اعتراض کے لیے پہلے سے تیار تھیں پھر بھی وہ لمحہ بھر سوچتی رہیں۔ "آخر کار ہو لیں؟ یہ شادی ہمارے گھر سے ہو جائے گی، عورتیں اندر بیٹھ جائیں گی، مردوں کے لیے باہر شامیانہ لگ جائے گا۔ جہیز میں بھی میں مدد کر دوں گی تم فکر نہ کرنا۔"

یہ بات سن کر احمد بابو کی باچھیں کھل گئیں۔ شکریے کے لیے الفاظ بھی نہ ملے صرف ہکلا کر رہ گئے۔ ان کی اماں سدا کی روگی تھیں خود لڑکی تلاش کرنا ان کے بس میں نہ تھا تو ان کی طرف سے اعتراض کی گنجائش ہی

ساس یا بہو کا دل پسیجنے کی دعا کرتی رہتی تھی یا آج تو بجے سے ہی کھلا بند کر رہی تھی۔ برتن دھلنے دھلائے سجے تھے، آٹا گوندھا رکھا تھا اور اماں پیڑھی پر بیٹھی ترکاری بنا رہی تھیں کہ ہاجرہ آئی۔

"چل دور ہو، آگئی اپنی منحوس صورت لے کر۔" اماں نے اسے ڈانٹا اور بہو سے مخاطب ہوگئیں "بہو، میں نے سارا کام کر دیا ہے تم ہانڈی بھون کر روٹی ڈال لینا۔ مت منھ لگاؤ اس کلموہی کو۔ روز چار چھ آنے بٹورنے کے لیے آن مرتی ہے۔" بہو نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن پیٹھ کے پیچھے اشارے اشاروں میں جانے کیا کہا کہ وہ فوراً ہی دوپٹے سے منھ چھپائے ہنستی ہوئی چلی گئی۔ چند منٹ بعد جب غسل خانے سے چھپا چھپ کی آواز آئی تو بہو نے نہایت صفائی سے چونک کر کہا "کم بخت کو کتنا ہی منع کرو، مانتی ہی نہیں۔ آپی آپ۔ ننھے کے کپڑے نکال کر لے گئی ہوگی۔ میں بھی آج ایک پیسہ نہیں دوں گی کم بخت کو۔"

"تم نے سر پر جو چڑھا لیا ہے۔" اماں کا پارہ ایک دم چڑھنے لگا۔ "ہر چیز میں بغیر پوچھے گچھے ہاتھ ڈال دیتی ہے۔ کل کلاں کو کوئی چیز غائب ہوگئی تو سر پکڑ کر روؤ گی۔" دفعتاً اماں کا غصہ کچھ اس طرح قابو سے باہر ہوا کہ وہ ترکاری سے ہاتھ کھینچ جا کر اپنی پلنگڑی پر پڑ رہی۔

ہاجرہ روز اسی طرح کسی نہ کسی بہانے سے آتی رہی۔ اماں کا داؤں چل جاتا تو اسے نکال دیتیں۔ ایک آدھ گھنٹہ بعد وہ پھر آن دھمکتی۔ کبھی روپے کی ریزگاری چاہیے، کبھی آپا جی کو دکھانے کے لیے ٹھیلے والے سے بندے اور چوڑیاں لیے چلی آ رہی ہے۔ جب سے اس پر برقعے کی تہمت چڑھی تھی اور آزادانہ باہر نکلنے کی پابندی ہوگئی تھی وہ گھر سے نکلنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ اماں کے سارے طعنے تشنے وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی تھی۔ کبھی بہو سے شکایت کرتی یہ عجیب بات تھی کہ پہلے تو وہ ان کے دل کو بڑے معقول نظر آتے لیکن کہہ چکنے کے بعد وہ ان کے اپنے کانوں کو بھی پھسپھسے معلوم ہوتے اور وہ کوئی ٹھوس بہانہ تلاش کرنے لگتیں۔ ایک دن اسی طرح جب وہ ہاجرہ کو گدگدی لگانے اور نہ پڑھنے لکھنے کے جرم میں مؤاخذہ کر رہی تھیں کہ دفعتاً میاں جی چیخے "یہ کیا ٹرٹر لگا رکھی ہے، تم نے کام ہی نہیں کرنے دیتیں، تمھیں کیا وہ پڑھے یا نہ پڑھے۔" اس کڑکتی آواز کو سن کر ہاجرہ تو برقع سنبھال گھر سے نکل کھڑی ہوئی لیکن اماں نے رو رو کر زمین آسمان ایک کر دیا۔ میاں جی چھتری سنبھال گھر سے نکل کھڑے ہوئے، تب بہو اماں کو تسلی دینے آئی۔ لیکن اماں تھیں کہ ایک سانس رو رہی تھیں کہ انھوں نے دو کوڑی کی چھوکری کے آگے میری بے عزتی کی۔ اب اس گھر میں گھسی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔ بہو نے دم دلاسا دیا کہ اب اس کی کیا مجال ہے جو اس گھر میں قدم رکھے۔ ان کو چائے بنا کر پلائی اور اس طرح وہ سارا دن بہو کا باورچی خانے میں اور اماں کا پلنگڑی پر پڑے گزرا۔

چند دن تک ہاجرہ نے شکل نہ دکھائی۔ اماں برابر باورچی خانے میں بہو کا ہاتھ بٹاتیں۔ اور ہر آئے گئے سے کسی ملازمہ چھوکری کے لیے کہتیں۔ لیکن کراچی جیسی جگہ میں کھانا پکانے والوں کی قلت کا اندازہ کسی کو نہ تھا۔ رفتہ رفتہ ساس اماں نے زیادہ کام بہو پر چھوڑنا شروع کر دیا۔ کمزور ہڈیوں کی وجہ سے آئے دن سر اور کمر میں درد رہتا تھا اور ایک دن جب اماں کے سر میں سخت درد تھا اور بہو کو ذرا بھی فرصت نہ تھی بہو نے ہاجرہ کو بلوایا کہ ذرا اماں کے سر میں تیل ٹھونک جائے۔ اماں کو یہ بات بھلی تو نہ لگی لیکن وہ ٹال گئیں۔ گئی گزری بات پر فضیحتہ کرنا جب کہ میاں جی سے صلح ہو چکی تھی انھیں کچھ مناسب معلوم نہ ہوا۔ یوں بھی میاں جی اس وقت موجود نہ تھے اس لیے انھیں ہتک کا احساس بھی زیادہ نہ ہوا اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہاجرہ سر میں تیل اتنی اچھی طرح لگاتی تھی کہ اس کے تیل ٹھونکنے کے خیال سے ہی بدن میں سرسری ہونے لگتی تھی لیکن ان کی اس وقت کی ڈھیل کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔ یوں وہ پھر اس ڈھٹائی اور بے شرمی سے دن میں کئی کئی چکر لگانے لگی۔ اب اماں کو احساس ہوا کہ اگر اس دن تیل لگوانے کے بجائے اسے ڈانٹ کر بھگا دیتیں تو پھر اس کی اتنی ہمت نہ ہوتی لیکن ان سے غلطی ہو چکی تھی جس کا فائدہ ہاجرہ اور بہو دونوں اٹھا رہی تھیں۔ آخر ایک

نانی کے پاس لا ہو کا دینے کے بعد جب وہ کمرے میں آئیں تو ہاجرہ کھڑی میاں جی سے ایک سادہ کاغذ اور لفافے کا سوال کر رہی تھی۔ یہ منظر جانے کیوں انھیں بے حد کھٹکا۔

"کیوں کسی کو خط لکھنا ہے؟" انھوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ میاں جی نے کاغذ اور لفافہ میز کے پرلے کونے میں سرکا دیا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ ہاجرہ نے دونوں چیزیں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اماں لاہور بڑے بھائی کو خط لکھوا رہی ہیں۔"

"دو دو مشٹنڈے بھائیوں اور باپ کے ہوتے ہوئے کنواری لڑکیاں تیرے میرے گھر کی خواری کرتی پھرے ہیں۔" اماں بڑبڑائیں۔ یہ دیکھ کر کہ آج اماں کو کنواری بہنوں پر بے تحاشا ترس آ رہا ہے ہاجرہ ان سے چار آنے پیسے مانگ بیٹھی۔

"بس یہ چلتر بازیاں ہیں۔ ایک کمرے میں جھاڑو دی ایک لفافہ اینٹھا، اب چار آنے پیسے مانگنے لگی۔"

"ایک کمرے میں جھاڑو لگائی ہے بس، اور راتے برتن اندر پھر گئے جو دھو کر آ رہی ہوں۔" "تو میں کیا کروں بہو سے مانگ جا کر،" اماں نے ایک لخت کروٹ بدل لی اور وہ بہو کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے پیسے اور ایک پرانی قمیض بغل میں دبا کر جب وہ رخصت ہو گئی تو اماں نے بہو کے پاس جانا ضروری سمجھا بہو نے ساس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر سوتے ہوئے بچے کے ایک دھپ جمایا "سو جا کم بخت" اور پھر اسے خواہ مخواہ تھپکنے لگی۔ گہری نیند میں سویا ہوا بچہ کسمسا کر رہ گیا۔ اماں نے یہ سب دیکھا اور سمجھا مگر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں کیوں کہ اگر ابھی وہ کچھ کہہ دیتیں تو جھگڑے اور تو تو میں میں کا سلسلہ ساڑھے نو بجے سے جا کر ملتا جب ایک کے سر کا تاج اور ایک کے جگر کا لخت دن بھر کی کرسی کا ستایا، ٹریفک کے ہنگامے سے پریشان گھر میں داخل ہوتا۔ اس وقت ننھا اس کی ٹانگوں سے چمٹا شام کی فرمائش کر رہا ہوتا اور ان کے لیے یہ ثابت کرنا کہ وقت فساد ننھا دراصل سویا ہوا تھا ناممکن تھا۔ اس کے علاوہ انھیں یاد آ گیا کہ ایسے وقت خود ان کی ساس کو ہمیشہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو جانا پڑا تھا جب کہ وہ امجد کو سلانے کے بہانے کئی کئی گھنٹے کی نیند کھینچ لینے کے علاوہ دوپہر کا بہت سا کام ساس سے کروا لیتی تھیں۔

"بہو! تم نے ہاجرہ کو بلوایا تھا؟" ماں نے نرم لہجہ میں پوچھا لہجے کی نرمی نے بہو کو اپنی جگہ محتاط کر دیا کیوں کہ یہ ہمیشہ کسی بڑے حملے کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تھا۔

"جی ہاں۔ پھر کیا کرتی۔ جب سے کلو گیا ہے کمرے باسی تھے، برتن الگ پڑے بھنک رہے تھے۔"

"مگر اب ہاجرہ بڑی ہو گئی ہے اسے نہ بلوایا کرو اور بہت چھوٹی موٹی لڑکیاں جھگیوں میں ہیں۔ آخر جوان جوان لڑکے گھر میں ہیں۔"

اماں اپنا وار کر، جوابی حملے سے پہلے ہی واپس چلی گئیں۔

"ہونھ،" بہو بڑبڑائی "کون جوان جوان لڑکے گھر میں ہوتے ہیں اس وقت احمد بے چارہ صبح کا گیا چھ بجے لوٹتا ہے۔ صمد کلب سے آ کر کھانا کھاتے ہی سو جاتا ہے تو شام کی خبر لاتا ہے ساس دفتر تو گھر میں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ سوائے بڑے میاں کے —" جب کوئی بات ساس سے نہ کہہ سکتی تو در و دیوار کو اپنی دلیلوں سے قائل کیے بغیر کبھی نہ چھوڑتی۔

دوسرے دن جب بہو نے ہاجرہ کو بلوایا تو پہلے ہی سمجھا دیا اماں سے نہ کہنا میں نے بلوایا ہے۔ کہہ دینا میں کسی کام سے خود آئی تھی۔ ہاجرہ اب بچی نہ تھی۔ گھروں کی یہ چھوٹی موٹی مکاریاں وہ سمجھتی تھی۔ اب وہ آتے ہی یہ بتانے کے لیے یہ بلائی نہیں گئی ہے سب سے پہلے اماں کے پاس جا کر کبھی ابا کے لیے پان منگوانے یا کی فرمائش کرتی، کبھی کسی بہانے دو چار آنے مانگتی اور اماں کی آواز سنتے ہی بہو بڑی معصوم سی آواز میں پکارتی "ہاجرہ اب آ گئی ہو تو ذرا سا یہ کام کرتی جا —" ذرا سا یہ کام کتنی گھنٹے نکال دیتا اور اماں بہو کی سینہ زوری پر دل ہی دل میں کھولتی رہتیں اور جھنجھلا کر کسی ٹھیلے والے سے، کبھی پان والے سے اور کبھی خود میاں جی سے لڑ کر ڈھیر کر دیتیں۔

ان ہی دنوں اچانک ایک دن بہو نے ساس میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کی۔ دیکھتی کیا ہے کہ اماں دل و جان سے باورچی خانہ کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ کہاں تو گیارہ بجے تک ہانڈی چڑھنے کے

خود باورچی کی تلاش میں پھرتے پھرے یہ باتیں ایسی دقتیں جن کو ہزاروں بار تقریباً دہرایا جاتا۔ احمد بابو بھی خوش تھے عمر کے کئی سوکھے سال گزار دینے کے بعد انھیں ایک خوش شکل، چنچل سی دلہن یوں اچانک مل گئی تھی جیسے آسمان سے ان کی جھولی میں ٹپک پڑی ہو۔ ہاجرہ کی ماں کی خوشی کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ وہ جب چلتی تو معلوم ہوتا کہ اماں کے احسانوں کے بوجھ ہی سے اس کی کمر جھکی ہوئی ہے۔ اماں کو ایک عجیب قسم کا روحانی سکون میسر آیا تھا جیسے قبر میں پاؤں لٹکائے بوڑھے حج کر لینے کے بعد محسوس کرتے ہیں۔ بہو کی مسرت تھی تو مادی قسم کی اس میں شک نہیں، لیکن، لیکن اماں سے کچھ کم نہ تھی کیوں شاید اس کی آخری دنوں کی کارگزاری سے خوش ہو کر اماں نے زیور کی صندوقچی جوں کی توں رکھ لی تھی۔

آج اس بات کو دو ڈھائی ماہ گذر چکے تھے نہ اتنے کم کہ یہ قصہ گلی گلی، کوچے کوچے دہرایا جا سکے نہ اتنے زیادہ کہ لوگ بھول بسر گئے ہوں کہ آشی کی ماں آن پہونچی یہ اپنی بیٹی کے ساتھ کچھ دن پڑوس کی ایک جھگی میں رہی تھی پھر کسی دور دراز علاقے کے کسی سرونٹ کوارٹر میں بس گئی تھی پرانے ملنے والوں کے ذریعے اس محلہ کی ایک ایک بات کی اطلاع اس کو ہوتی رہتی، چنانچہ ہاجرہ کی شادی میں اماں نے جو کچھ کیا تھا اور جو کچھ اس کے کانوں تک پہونچا تھا اسے دو سے ضرب دے کر اس نے ماں کے گوش گزار کیا اور انھیں یقین دلایا کہ اس ایک نیک کام کے صلے میں ان کے نام کا "نوری محل" جنت میں تعمیر ہو رہا ہوگا بعد ازیں اپنے مطلب پر آ کر اس نے بتایا کہ آشی اب شادی کے قابل ہے بات پکی ہو گئی ہے لیکن اس کے پاس شادی کرنے کو کچھ نہیں باتوں باتوں میں اس نے یہ بھی جتا دیا کہ آشی کا حق ہاجرہ سے کہیں زیادہ ہے کیوں کہ وہ یتیم ہے، اس کے بھائی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اماں کو شادی ٹھہرانے یا اپنے گھر سے شادی کرنے کی تکلیف بھی نہیں دینا چاہتی صرف تھوڑی سی مالی امداد چاہتی ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دے۔ اتنی دور سے اپنی بوڑھی ٹانگیں توڑتی وہ اماں سے آس لگائے آئی تھی جو بوڑھی ماؤں اور کنواری لڑکیوں کا آخری سہارا تھیں۔ اماں یہ سب نہایت صبر سے سنتی رہیں پھر بولیں۔ "بھئی اب تو میرے پاس کچھ نہیں ہے ہاجرہ کی شادی میں بہت کچھ اٹھ گیا۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ بہو پردے کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ یک لخت اماں نے کمر بند سے چونی کھول کر نیچے ڈال دی "بس اب واپس چلی جاؤ" یہ کہہ کر کروٹ بدل آنکھیں موند لیں کہ ان پر نیند کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ آشی کی ماں چہرے پر نا امیدی کا جھریاں سمیٹے یوں دعائیں دیتی جا رہی تھیں کہ اس کا لہجہ اس کی نیت کی چغلی کھا رہا تھا۔ "سدا سکھی رہو، ایمان سلامت رہے" جیسے وہ کہہ رہی ہو "سدا دکھی رہو۔ بے ایمان مرو..... آج اسے اماں کی فراخ دلی کی ساری داستانیں سفید جھوٹ معلوم ہو رہی تھیں اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ اماں ابھی تک وہی کنجوس مکھی چوس اماں ہیں جنھیں ان کے محلے میں رہتے ہوئے وہ پہلے بھی کئی مرتبہ آزما چکی تھی۔

چند لمحے بعد جب بہو وہاں سے گزری تو بڑے بھولپن سے بولی "اے ہے یہ چونی کیسی پڑی ہے زمین پر، وہی تو نہیں جو آپ نے آشی کی ماں کو دی تھی"

"وہی ہوگی" اماں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ پھیلا دیا اور بڑبڑائیں "سارے جہان کی کنواریوں کا میں نے ٹھیکہ لیا ہے کیا"

اور چونی احتیاط سے کمر بند میں ڈال کر گرہ لگا لی۔

زندگی

زندگی ایک پیاز کی مانند ہو۔ آپ ایک وقت میں ایک پرت اتارتے ہیں اور کبھی کبھی آنسو نکل آتے ہیں۔

دن جب ہاجرہ صحن میں بیٹھی مسالہ پیس رہی تھی اور میاں جی عین سامنے بیٹھے اپنا کام کر رہے تھے، تنگ آ کر انھوں نے احمد بابو کو بلوا بھیجا۔

احمد بابو سے بات چیت کر لینے کے بعد انھوں نے ہاجرہ کی ماں کو بلا کر یہ مژدہ سنایا جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ جائے اس نے اماں کے پاؤں تھام لیے۔ اور دعاؤں کا طومار باندھ دیا آج نہ جانے کتنے سال بعد اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں مسرت کی لہر جھلملائی۔ پھر جب کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا تو وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "اماں ایک بات کہوں چھوٹی کی تو پھر بھی ہو جائے گی، پہلے بڑی کی ہو جاتی آپ جانیں اس کی عمر ڈھلے جا رہی ہے۔"

یہ بات سن کر اماں نے پاؤں کھینچ لیے اور تیوریوں پر چڑھا کر کروٹ بدل لی "تم جانو بھئی، پہلے بڑی کی کرو پر احمد تو بڑی سے کرنے سے رہا۔ آخر بابو ہے جانے کس کس عقل سے تو میں نے اسے راضی کیا ہے۔ اپنی چیز بھی تو دیکھنی چاہیے۔ بڑی میں کیا ہے نہ صورت نہ شکل آئے دن بیمار الگ۔" اور جب وہ منہ پھیر کر لیٹ رہیں اور بڑی دیر تک کچھ نہ بولیں تو ہاجرہ کی ماں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آخر آدھ گھنٹے کی خوشامد کے بعد بات اسی خوشگوار موڑ تک پہونچی جہاں سے چلی تھی۔ اماں نے اسے کچھ سنہری اصول سمجھائے، اور کہا۔ "جیسے بھی ہو تھوڑا بہت سامان تیار کر لو سسرال کے سامنے ہیٹی نہ ہو۔ ہاجرہ کو گھر میں بٹھا کر کچھ کام کروا دو۔ اب دھیٹر دھیٹر ادھر ادھر بھاگتے دیکھا تو یہی بات ہے میں اس شادی کے بیچ میں نہ پڑوں گی، ویسے جو کچھ ہو سکا میں بھی مدد کر دوں گی۔"

اب جوں جوں یہ بات پھیلتی گئی کہ ہاجرہ کا بیاہ اماں کر رہی ہیں ان کی دلچسپی جو ضمنی تھی بنیادی بنتی چلی گئی اور اماں ہاجرہ کے جہیز میں اسی طرح جٹی نظر آنے لگیں جیسے ان کی اپنی بیٹی کی شادی ہو۔ اپنا ایک نیا دوپٹہ دے، اچھا خاصا قابل بہو کے ٹھسٹ کا ٹکٹ ریشمی غرارہ کاٹ انھوں نے ہاجرہ کے لیے دلائی تیار کر ڈالی پرانے لحافوں کی روئی آج تک سینت سینت کر رکھ رہی تھیں نکیوں کے لیے نکال کر دے دی۔ ان کے وہ برتن جو بہو کے کئی مرتبہ مانگنے پر بھی نہ نکلے تھے صندوق سے نکال قلعی کے لیے دے دیئے گئے اور تو اور بہو کے دن بھر کے کاموں میں یہ کہہ کر اضافہ کر دیا گیا۔ "بہو یہ دو قمیصوں کا کپڑا ڈالے جا رہی ہوں ذرا فرصت ملے تو ہاجرہ کی قمیص بھی سی دینا۔" اللہ اللہ یہ انہماک! بہو نے یہاں تک دیکھا کہ زنگ آلود ٹرنک سے نوٹ نکل کر ہاجرہ کی ماں کے ہاتھوں میں جا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر بہو تو کچھ اور ہی [illegible] لگا ہی خوف ستانے لگا اور وہ ایک دن اپنے میاں سے یوں گویا ہوئیں "پتہ نہیں کیسے یوں ایکا ایکی ان کا دل کھل گیا کبھی ننھے کے ہاتھ دو آنے پیسے بھی نہ رکھے، ہاجرہ نے جب بھی مانگے خالی ہاتھ رہی لیکن اب تو خوب دریا دلی سے خرچ کر رہی ہیں مجھے تو ڈر ہے کہ اپنا سارا زیور نہ دے ڈالیں۔" اور احمد میاں نے جو آخر انھیں اماں کے سپوت تھے یہ کہہ کر جلتی پر تیل ڈال دیا "دیتی ہیں تو دے، ان کے زیور ہیں کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔" اب تو روز رات بہو کو خواب دکھائی دیتے کہ ہاجرہ دلہن بنی ہوئی ہے اور اماں نے ایک ایک زیور صندوقچی سے نکال کر ہاجرہ کو پہنا دیا ہے اور وہ اس کی ننھی بوچی خالی صندوقچی کی طرح منہ پھاڑے حیران پریشان کھڑی رہ گئی ہیں۔

اب بہو کو اپنی گذشتہ دھاندلیاں بھی ایک ایک کر کے آ رہی تھیں۔ واقعی ایک ذرا سے ہاتھ بھر کے آرام کی خاطر اس نے اماں کا دل کئی مرتبہ دکھایا تھا۔ کئی بار موقع مل جانے پر انھیں دیدہ جلایا بھی تھا۔ جیسے اب یہی ہاجرہ والا معاملہ لے لو، کہیں اماں اسے جلانے ہی کے لیے تو یہ سب کچھ نہیں کر رہیں؟؟؟ — جو کچھ ہو چکا تھا وہ تو اب میٹ نہیں سکتی تھی اپنے طور پر اس کی تلافی یوں کی تھی کہ تینوں وقت بلا چوں و چرا کھانا تیار کر دے اور اماں کی بات مان لے۔ اماں جو کو سو فی صدی امید تھی کہ بہو ہاجرہ کے سلسلے میں ہر ممکن روڑا اٹکائے گی یہ خوشگوار تبدیلی دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ آج کل اماں کا موڈ خاص طور پر شگفتہ اور میاں جی کا زیادہ وقت اماں کی دی ہوئی فہرست کے سامان بازار میں کٹتا تھا۔

آخر شادی ہو گئی، اور اچھی ہو گئی۔ سارے محلے میں اماں نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ اماں نے بہ نفس نفیس کھانا کھلایا اور

ہوں جس کو نہ اب دیوار محصور کئے ہوئے ہے نہ تراشی ہوئی بادام
مسافر بنگلے کی پچھلی جانب وہ گیٹ جوں کا توں کھلا ہے جس سے ہو کر مجھے ریل کی پٹریوں تک جانا ہوگا۔ پھر ان پٹریوں کو عبور کر کے میں پلیٹ فارم پر پہونچ جاؤں گا۔ پھر اسٹیشن کے احاطے سے نکل کر میدان میں آجاؤں گا۔ پھر اس کے بعد سیدھی سڑک، اور یہ سڑک مجھے اپنے بچپن تک لیجائیگی۔

میں نے اپنی فریز کار بڑے جتن سے اس درخت کے نیچے ٹھہرا دی ہے، جس درخت کے نیچے میں گھنٹوں بیٹھا جانے کیا کیا سوچا کرتا تھا۔

میں نے مسافر بنگلے کے خادم کو اشارہ کیا۔ اور اس نے بنگلے کے دریچے اور دروازے اس طرح میرے لئے کھول دیئے جیسے یادوں کی گٹھریاں کھول کھول کر رکھ رہا ہو۔

"صرف ایک ہی کرسی اور وہ بھی اسی طرح ٹوٹی ہوئی؟"

"نیا فرنیچر کچھ ہی دن میں سپلائی ہونے والا ہے صاحب"

"اور یہ بلبس کیوں غائب ہیں؟ فٹنگ تو بالکل نئی اور مکمل معلوم ہوتی ہے"

"کنکشن بھی آگیا ہے صاحب بلب بھی بس آج کل ہی میں سپلائی ہونے والے ہیں"

لیکن سفید سفید لمبی لمبی گداز موم بتیوں کی خوابناک فضا میں سارا بنگلہ اس طرح سانس لینے لگا جس طرح میرے اطراف سجی ہوئی یادوں کی ایک چھوٹی سی دنیا میں میرا اپنا وجود سانس لے رہا تھا۔

مجھے مسافر بنگلے کی وہ راتیں یاد آئیں جب فانوس میں جلتی ہوئی کسی موم بتی کو میرے نرم ہاتھ آہستہ سے بڑھ کر فانوس سے جدا کر دیتے تھے۔ اور پھر موم بتی کے گرم آنسوؤں کی حدت میں کبھی اپنی انگلیوں پر، کبھی ہتھیلی پر، کبھی اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس کرتا تھا۔ مجھے موم بتی کے ان اشکوں کو جمع کرنے کا عجیب شوق تھا، جو سرد ہو کر موتی بن جاتے ہیں، اپنے ہاتھ کی ارتعاش سے کانپتے ہوئے شعلے کو بچاتے بچاتے میں

ہاتھ میں موم بتی کے گداز جسم کو تھامے میں جب میز کی سطح پر پچھلی رات بہائے ہوئے اس کے اپنے اشکوں کے نشانات تلاش کرتا تو وہ سسک سسک کر آنسو بہاتی۔ یہاں تک کہ اس کا وجود اشک بن کر بہہ جاتا۔ اور پھر یہ آنسو موتیوں کی طرح چن لئے جاتے۔ اور میری خوبصورت سی ڈبیہ میں محفوظ ہو جاتے۔ جنہیں میں شامی کو تحفے کے طور پر دیتا اور وہ ان موتیوں سے کھیلتی۔

اس وقت شامی میرے ساتھ ہے، ہمارے تینوں بچے بھی ساتھ ہیں۔

شامی مجھ سے کہتی ہے۔

"آپ یہاں آکر کچھ کھو سے گئے ہیں"

شامی سچ ہی تو کہتی ہے، میں اسے نہیں جھٹلاتا ہوں۔

"تم لوگ ذرا سستا لو، میں بستی میں گھوم آؤں"

"تنہا کیوں جائیے گا۔ چلئے موٹر ہی پر چلتے ہیں"

تم سن بھی لو۔۔۔ اس موسم میں پیدل قدمی کا لطف ہی اور ہے"

وہ ہر ساتی میری طرف بڑھا دیتی ہے۔ اور بچوں کے ساتھ مسافر بنگلے کے برآمدے میں چلی جاتی ہے۔

چھوٹو مجھے ٹوکتا ہے۔ ساتھ چلنے کے لئے ضد کرتا ہے۔ شامی اسے پچکارتی ہے، اور میں چپکے سے نکل جاتا ہوں مسافر خانے کا پچھلا گیٹ پار کرنے کے بعد میں پلٹ کر دیکھتا ہوں۔ شامی چھوٹو کو شنٹنگ کرتی ہوئی مال گاڑی دکھلا کر بہلا رہی ہے۔

میں ریلوے لائن پار کر کے پلیٹ فارم پر پہونچ گیا ہوں۔ یہاں مجھے میرا اپنا بچپن مل گیا ہے جیسے وہ برسہا برس سے میرا منتظر تھا۔ میں بڑھ کر اس کو تھام لیتا ہوں۔ لیکن وہ ضد کرتا ہے۔ میں اسے گود میں اٹھا لیتا ہوں۔ وہ پھر بھی ضد کیے جاتا ہے۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ آخر کیا چاہتا ہے ۔۔۔ وہ میری آنکھیں بھینچ دیتا ہے۔ میں اگر

اقبال متین

بچا ہوا لمحہ

یہاں ایک چھوٹی سی احاطے کی دیوار تھی، یا پھر ہری بھری ترشی ہوئی باڑھ تو تھی ہی، اور یہ دیوار یا باڑھ بھی سڑک سے متصل تھی۔ لیکن آج سڑک پکی ہو گئی ہے، اور احاطے کی دیوار یا احاطے کی باڑھ کچھ بھی نہیں رہی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسافر بنگلے کو سڑک کے قرب سے زمانے نے جبراً گھسیٹ کر دور کر دیا ہو

موڑ آگے بڑھ گیا تھا تو میں نے اس مقام کو پہچانا بھی نہیں۔ پھر کسی نے بریک لگا دی۔ وہ یاد جو چھپی ہوئی کہیں میرے دل و دماغ میں سو رہی تھی بر وقت چونک کر اٹھ بیٹھی —— بالکل اسی طرح جیسے کوئی مسافر عین وقت سفر میں بیدار ہو جاتا ہے جبکہ ٹرین اس کی منزل سے آگے گزر رہی ہوتی ہے۔

پچھلی جیپ کار کے ایک شکاری نے مجھے ٹوکا جس نے دونالی بندوق اپنے برابر رکھ لی تھی۔ اور سینے پر اتنے ٹوٹے آویزاں کئے ہوئے تھا کہ انھیں دیکھنے سے گھائل ہرنیوں کا خیال آتا تھا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں کا خیال آتا تھا، ایک ہچکی کا خیال آتا تھا، ایک اکھڑتی ہوئی سانس کا خیال آتا تھا، اور میں نے اپنے اطراف یادوں کی جو رنگا رنگ محفل سجا رکھی وہ ان تصورات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

میں نے اس سے نرمی سے کہا ــــ " بریک میں نے نہیں لگائی۔"

" پھر آپ ہی تو کار چلا رہے تھے۔"

" مجھے کب انکار ہے لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو کار چلا رہا ہو بریک لگانا بھی اسی کے بس میں ہو۔"

وہ مسکرایا۔ کہنے لگا ــ " کیا بات ہوئی؟"

" بات یہ ہوئی، کہ کار چلاتے وقت آپ کار ہی کی سڑک پر نہیں ہوتے ہیں۔ آپ کا ذہن آپ کو کہاں کہاں لئے ہے۔ جس منزل کے لئے آپ روانہ ہوتے ہیں، اس منزل کبھی کبھی آغاز سفر سے پہلے ہی جا لیتے ہیں۔ اور جب منزل پہونچتے ہیں تو منزل ہی کے تصور میں منزل پہچانی نہیں جاتی ایسے میں کوئی چپکے سے نکل آتا ہے جو کہیں دل میں چھپا ہو اور ہر ایک لگا دیتا ہے۔ بتائیے کہ وہ بھی تو ایسا ہی ہوتا ہوں خود میں بڑی مشکل سے پہچان پاتا ہوں۔"

وہ مسکرایا۔ کچھ سوچ کر اس نے کہا ــ " آپ ٹھیک ہیں۔ میں رات کے سناٹے میں، غنودگی کے عالم میں آ ــ ڈی کی پکی سڑک پر اپنی جیپ دوڑاتا رہتا ہوں، لیکن مقامات پر، جہاں سے مجھے " ایڈیٹر" میں جانا ہوتا ہے جیپ کے پہیے جیسے خود بخود جام ہو جاتے ہیں۔ اور ایک انچ آگے نہیں بڑھتی۔"

" او ــ کے ــ!" اس نے ہاتھ ہلایا۔ اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

وہ سارے درخت جیسے سکڑ دیکے ہیں، گھبیر گھبیر، چپ چاپ، بادل کی حصار اب بھی گردن کر رہی ہے۔ میں مسافر خانے کے احاطے میں داخل

اس بہن نہ بنانے میں کیا کچھ نہ بنا لینے کا جذبہ تھا میں بھانپ گیا تھا۔ میں تاڑ گیا تھا۔ طوفان کی آمد آمد کو میں نے پہچان لیا تھا نا۔!

میں نے اس سے پوچھا تھا۔

"کیا بنائے گا پھر؟"

اس نے مجھے جھکی جھکی شریر نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے اتنی خوبصورت جھکی جھکی نظریں آج تک نہیں دیکھی ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے خود اس کی بھی ایسی جھکی جھکی نظریں پھر کبھی نہیں دیکھیں۔

وہ ایک دن کھیلتا کھیلتا مجھ سے، شامی سے اپنی موٹی بہن اور چھوٹے بھائیوں سے جدا ہو گیا۔ اس طرح جدا ہو گیا۔ جیسے کوئی آنکھ مچولی کھیلنے کیلئے لمحہ بھر کے لئے چھپ جانا چاہتا ہو، پھر سامنے آنے کے لئے۔ لیکن وہ لمحہ ہی ٹھہر گیا جس لمحے وہ چھپا تھا۔

لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے

میں سوچتا ہوں۔ کاش ایسا ہی ہوتا، شاید وقت اس زخم کو مندمل نہیں کر سکتا۔ جو وقت کے ٹھہر جانے سے انسان کے دل پر لگتا ہے۔

میرا بچپن جسے میں ابھی ابھی بستی میں چھوڑ آیا ہوں، دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا ہے پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لئے۔ مجھے غور سے دیکھا۔ کیا تم وہی ہو جنھوں نے مجھے ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ دیا؟ کیا تم میری تلاش میں یہاں تک نہیں آئے تھے؟ میں نے منہ پھیر لیا، تو اس نے میرے ہاتھ جھٹک دیے۔ ٹھیک ہی، آج سے میں بھی اسی کو ڈھونڈوں گا جس کی تمھیں تلاش ہو لیکن کیا اس تلاش میں ہم پھر کبھی ایک دوسرے کو پہچان سکیں گے؟ میں پلٹ کر دیکھے بغیر آگے نکل آیا ہوں۔ چھوٹو ضد کر رہا ہوگا۔ نہ دو۔ بھیا۔ میں خوب چوسوں گا۔ لیکن عین اسی وقت کوئی اپنا گال بھی میرے ہونٹوں پر رکھ دے تو؟ میری اور شامی کی محبت کا پہلا حق دار تو آج بھی وہی ہونا۔ میرے بے تحریر ان بوسوں کی حسرتوں کا کون سا رنگ ابھرے گا؟

کاش یہ دروازے ایک بار میرے لئے کھل سکتے۔ یہ بائیں ایک بار میرے لئے وا ہو سکیں۔ پتہ نہیں میں پھر کبھی ادھر آ بھی سکوں گا یا نہیں۔ میں اپنی آنکھیں دروازوں سے لگا دیتا ہوں لیکن کوئی روزن در نہیں جو مجھے اندر کی خاموشیوں میں بسی ہوئی دنیا کا نظارہ کرا سکے۔ جس کو اب اس بستی بھر میں صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں۔ کتنی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میرا بچپن بڑا شریر ہے، بڑا ظالم۔ اس نے البم سے نکال کر ساری کی ساری تصویریں میرے اوپر ہوا میں اچھال دی ہیں۔ اور میں دیوانوں کی طرح ایک ایک تصویر پر جھپٹ رہا ہوں۔ جو میرے اطراف زمین پر ڈھیر ہو رہی ہیں۔ لیکن میں جھک کر دیکھتا ہوں تو زمین پر کوئی تصویر نہیں ہے۔ عمر رفتہ کا کوئی نقش پا نہیں ہے۔

مقفل دروازے پر چلڈرن ویلفیر سنٹر کی تختی لگی ہے۔ میں اسی آنے والی نسل کو اپنا البم سونپ کر لوٹ رہا ہوں جس کی تصویریں نوچ لی گئی ہیں۔

باہر نکلتا ہوں تو بارش شروع ہو چکی ہے۔ لیکن ایک نوجوان بند کھڑکی کے سائبان کے نیچے کھڑا اپنا چہرہ کھڑکی کے پٹ پر جمائے روزن میں سے جھانک رہا ہے۔ مجھے اپنی برساتی کہیں بھول آیا ہوں۔ ادھر ادھر دیکھتا ہوں برساتی صدر دروازے کے شہ نشین پر دھری ہوئی مل جاتی ہے۔ میں اسے اوڑھ کر باہر نکل آیا ہوں — نوجوان بے خبر ہے۔ جب میں اس کے قریب سے نظریں جھکائے گزرتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ کھڑکی کے اندرونی پٹوں پر بھی کسی کے جلتے ہوئے گال رکھے ہوئے ہیں۔ تپتے ہوئے ہونٹ رکھے ہوئے ہیں۔ میرے دبے دبے قدموں کی چاپ سن کر نوجوان میری طرف دیکھے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کی ناک اور گالوں پر کھڑکی کا ہرا رنگ نمایاں طور پر لگ گیا ہے یہ ان بوسوں کی حسرتیں ہیں، جو نہیں لئے جا سکے۔ نوجوان اس بات سے بے خبر ہے کہ اس کی یہ حسرتیں اس کے چہرے پر ابھر آئی ہیں۔ جیسے اس راہ گیر نے دیکھ لیا ہو جس سے اس کی آنکھیں ابھی ابھی چار ہوئی تھیں۔ اور وقت میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔

شامی میری منتظر ہو گی۔ مجھو تو میرے لئے ضد کر رہا ہو گا۔ ممّو اور بٹیا اسے بہلا رہی ہوں گے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا مسافر بنگلے کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ میں نے اپنے بچپن کو جو اسٹیشن سے بستی تک میرے ساتھ آیا تھا، یہیں چھوڑ دیا ہے۔ میں پھر اداس ہو گیا ہوں، جی چاہتا ہے سارے آنسو شامی کے دامن کی بھینٹ چڑھا کر خاموش ہو جاؤں، پھر خیال آتا ہے خود اس کے پاس ان آنسوؤں کی کمی نہیں، میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ جو شامی کو دے سکوں — موم بتی کے آنسوؤں سے کھیلنے والی یہ لڑکی اپنے دامن میں آنسوؤں کی کتنی بڑی دولت سمیٹے ہوئے ہے جو موتی تو نہیں بن جاتے۔ اس کی آنکھوں میں کنکر بن کر بن کر کھٹکتے ضرور ہیں۔

اس غم کی اساس کیا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ لیکن پھر کسی کی یاد میرے ذہن میں، میرے دل میں، میری روح میں اپنا زہر قطرہ قطرہ کر کے ٹپکا رہی ہے۔ ایسا زہر جو اب میری نس نس میں سرایت کر کے مجھے پیارا ہو گیا ہے۔ ہر وہ غم جو زندگی کے کسی رخ سے بھی مجھ تک پہونچتا ہے۔ پھر پھر کر اسی ایک یاد سے وابستہ ہو جاتا ہے جسے میں نے بڑے جتن سے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے یہ بھی ایک بارہ سالہ کھلنڈرے شریر لڑکے کی یاد ہے۔ یہ وہ لڑکا نہیں ہے جو اسٹیشن سے بستی تک میرے ساتھ تھا۔ اور جس کو میں ابھی ابھی بستی میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں۔ یہ لڑکا تو اس لڑکے کی زندگی بھر کی تنہائی ہے۔ یہ لڑکا تو اس لڑکے کی تکمیل کا نام ہے۔ جو نہ ہو سکی نہ ہو سکے گی۔ یہ لڑکا میرا بچہ ہے۔ میرا بیٹا۔ میری جان۔ . . . .

اس لڑکے نے اپنا بارہ سالہ خوبصورت ماضی مجھے سونپ دیا ہے۔ اور اس ڈھنگ سے سونپا ہے کہ یہی بارہ سالہ ماضی اس کا حال بھی ہے اس کا مستقبل بھی۔ اس کے سوا اس کا نہ کوئی حال ہے، نہ کوئی مستقبل۔

مجھے یاد ہے، ایک بار اس نے اپنے پڑوس کی ساتھ کھیلی ہوئی لڑکی سے کہا تھا۔

"منی، میں تجھے اپنی بہن نہیں بناؤں گا"

بول جائے۔ اس کے ششماہی امتحانات چل رہے تھے۔
ا امی آج ابھی تک نہیں اٹھی تھیں۔ عفت کو گھبراہٹ شروع
۔ بجے چائے پینے کے لیے باورچی خانے ہی میں آکر جمع ہو گئے
نے پتیلی ہی میں چائے کی پتی اور دودھ شکر ڈال دی اور
پتیلی ہی میں چائے بنا کر اس نے تمام چینی کے پیالوں میں
کر بانٹنا شروع کیا۔ باہر سے ابا میاں نے زور سے پکارا۔
زدہ ہو گئی۔ اگر ان کو اخبار آنے کے وقت تک چائے نہ
پڑھ کر کے تمام حالات وہ دو ہی منٹ کے اندر پورے محلے
ر کرنے والے تھے۔

وہ اٹھی۔ ایک چینی کی پیالی دھوئی اور اس میں چائے لے
میاں کی طرف جانے لگی کہ امی نے لیٹے لیٹے پانی مانگا۔ ان
ملا رہا تھا اور کمرے کے کچے فرش پر برابر تھوکے جا رہی تھیں۔
می کی طبیعت خراب ہونے کے معنی تھے۔ باورچی خانے کے
ی کی بھی دیکھ بھال کرنا اور پھر دوسرے سب بچوں کی
رہبری کرنا عفت کا دل بیٹھ گیا۔ اب امتحان میں شرکت
سوال ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔

امی کی طبیعت کچھ ٹھیک ہوئی تو انھوں نے تھوڑا بہت گھر
موں میں عفت کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ ان کے دبلے پتلے
پاؤں کبھی کچھ نہ تھا اور اب تو وہ بھی زرد زرد ہو کر رہ گئی
عفت کبھی ان پر ترس کھاتی۔ کبھی اس کو ان پر سخت غصہ
وہ بس یہی سوچتی۔ کہ اب گھر میں نویں ممبر کا اضافہ ہونے والا
اخراجات بڑھیں گے قرضہ بھی بڑھے گا۔ اور ابا میاں کی
یحیائیں بھی اس کے ساتھ بڑھے گی۔

ابا میاں کی یہ اچھی زبردستی تھی کہ سو روپے لا کر امی کے ہاتھ پر
دیتے اور کہتے کہ تو مہینے بھر چلاؤ۔ اوپر سے جو کبھی چھپ چھپا
ادھر ادھر سے قرض ادھار لے لیتیں تو اس پر ان کو ڈانٹتے
رہتے اور محلے بھر کے لوگوں کو گھر کے بجٹ کی ایک ایک بات
معلوم ہو جاتا۔

اب تک تو جیسے تیسے گزر رہی تھی مگر اب کیا ہوگا۔ اس خیال
دونوں ماں بیٹیاں پریشان تھیں اور ابا میاں دفتر کے
زیادہ وقت نمازوں اور وظیفوں میں گزارتے رہتے۔ بڑی

درویشی صفت عادت پائی تھی۔ روزمرہ کے مسائل سے بڑے
بے نیاز تھے اور تمام مالی پریشانیوں کے باوجود بھی جب کبھی کوئی
مزاج پوچھتا۔ تو ایک خاص شان مجذوبی سے سر ہلا کر کہتے۔
"اللہ کا شکر ہے۔ اس کا احسان ہے۔ دو وقت کی روٹی
تو مل جاتی ہے۔"

ہلکی ہلکی گرمی پڑنے لگی تھی اور عفت نے ادھر کی بغیر گھی دی
ہوئی دال کے ساتھ امی کو آم کی چٹنی دے کر۔ اور تمام بھائی
بہنوں سے چھٹی پاکر ذرا اپنی کتابوں کی طرف توجہ دی۔ اب سالانہ
امتحانات کا زمانہ تھا۔ مگر اتنے ہی میں پڑوس کے حاجی صاحب
کی بیوی آ گئیں اور امی کو دیکھ کر بولیں۔

"اے ہے کتنی دبلی ہو گئی ہو۔ یہ دن تمہارے آرام کرنے اور
کھانے کے ہیں اور تم بیٹھی ہوئی دال روٹی کھا رہی ہو۔۔۔ کچھ
تھوڑا میوہ وغیرہ استعمال کرو۔ کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑی ہو۔"

"امی تو چپ رہیں مگر عفت کتاب پھینک کر اور جل کر بولی۔
"بات یہ ہے خالہ کہ امی اور ابا میاں کو روپیہ جوڑ جوڑ کر
رکھنے میں مزہ آتا ہے۔ پتہ نہیں کتنا روپیہ گڑا ہوا ہے مگر خرچ کے
نام پر ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

اس لہجے میں جو زہر تھا۔ اس کی تلخی کو پڑوسن سمجھ گئیں مگر نیکی
کے دم میں تھیں۔ لہٰذا لڑنے کے بجائے مسکرا کر بولیں۔
"لے میں اب اتنی بے خبر نہیں ہوں۔ جانتی ہوں بڑی پریشانی
ہے تم لوگوں کو۔ مگر پھر بھی ....."

عفت اٹھ کر چلی گئی۔ حاجی صاحب کی بیوی نے سوچا کہ اس
سے زیادہ وہ عفت اور اس کی ماں کو کسی وقت بھی ذلیل کر سکتی
ہیں خاص طور پر مہینے کی آخری تاریخوں میں۔ آئیں گی آخر ماں یا
بیٹی میں سے کوئی روپیے قرض لینے تب ہی سمجھ لیں گے۔"

اور یہی ہوا بھی۔ عفت نے طے کر لیا کہ وہ حاجی صاحب کی
بیوی کے پاس روپے قرض مانگنے نہیں جائے گی نہیں جائے
گی۔ ماں نے بہت سمجھایا بھی مگر وہ نہ مانی۔ آخر میں امی خود ہی
جانے کو تیار ہو گئیں۔

حاجی صاحب کے گھر جانے کے لیے مکان میں ایک چھوٹی سی
کھڑکی تھی جس سے نکلنے میں عفت کی امی کو بڑی دقت ہوئی۔ ان

قیصر تمکین

اللہ کے بندے

پپّو نے سوتے میں پھر لحاف گھسیٹا۔ گُردو سری طرف شمّو کے پیر کھل گئے، سوتے ہی میں اس نے بھی لحاف کھینچنا چاہا مگر اس کھینچا تانی میں دونوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ عفت نے جلدی سے اٹھ کر لحاف اس طرح برابر کیا کہ دونوں کے پورے بدن اچھی طرح ڈھک گئے مگر اب خود عفت کا آدھا بدن سردی سے ٹھٹھرنے لگا۔ وہ اٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور صرف پیروں پر لحاف پڑا رہنے دیا۔ دونوں ہاتھوں کو سینے پر اوپر (؟) طرح باندھ کر اس نے قدرے گرمی محسوس کی اور پھر اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔

اس اندھیرے اور نیچی چھت کے کمرے کے باہر دسمبر کی تیز اور یخ بستہ ہوا اندر دل سے چل رہی تھی اور کمرے کے ایک طرف سادُھر روئی کی ایک ڈلیا اور چینی کے دو چار برتنوں کے برابر ہی جمعو لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے ایک دلائی اوڑھ رکھی تھی جس کے اوپر سے ایک بڑا پرانا چیتھڑا پڑا ہوا تھا مگر سردی پھر بھی کم نہیں ہو رہی تھی اور جب وہ بدن سکوڑ کر اپنے کو چیتھڑے میں سمیٹنے کی کوشش کرتا تو پٹاؤ کے لکڑی کے تختے چرمرا اٹھتے اور عفت پھر چونک اٹھتی۔

اس مختصر سے کمرے میں ایک تخت بھی تھا جس پر عفت کی ماں ایک دودھ پیتے بچے اور عفت کے ایک اور چھوٹے بھائی کو لیے ہوئے لیٹی تھی وہ تینوں بھی ایک پھٹی ہوئی رضائی میں دبکی ہوئی پڑی تھیں اور روئی نہ سہی تو ددئی کے ہی ذریعے سردی کم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

ہلکی ہلکی سی آواز آئی۔ عفت نے غنودگی سے چونکنے کی کوشش کی۔ عفت کے ابّا میاں تخت کے پاس چوروں کی طرح کھڑے ہوئے تھے انھوں نے بیوی کے پیر کا انگوٹھا ہلایا۔ بیوی ذرا ذرا سی بیدار ہوئیں اور بیوی ہوں ہاں کر کے پھر کروٹ لینے والی تھی۔

ابّا میاں بولے۔ "یہاں آؤ۔"

عفت سمجھ گئی۔ لالٹین کی بہت ہی مدھم روشنی میں اس نے یہ سب دیکھا۔ ایک دم اس کا پورا دماغ حرکت میں آ گیا۔ مگر اس طرح پڑی رہی گویا بے خبر گہری نیند میں ہو۔

ایک دو منٹ میں سی کو ہلکے ہلکے تھپتھپا کر امّی ابّا میاں کے ساتھ باہر کے کمرے میں چلی گئیں۔ عفت پھر اٹھ کر بیٹھی اور دیوار سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی۔ "ہم سب ملا کر چار بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ ابّا میاں کی سو روپے کی تنخواہ میں یوں ہی پورا نہیں پڑتا۔ پھر اوروں کا خرچ کس طرح برداشت ہو گا۔ یہ امّی اور ابّا آخر نا سمجھ ہیں کیا؟ —"

اس کے تن بدن میں جیسے آگ لگ رہی ہو مگر سوچنا لاحاصل تھا۔ منی نے کروٹ بدلی اور ماں کو پاس نہ پا کر رونے لگی۔ عفت جلدی سے گھبرا کر اٹھی اور منی کو گلے لگا کر ٹہلانے لگی۔

ہوا اور بھی زوروں سے چیخ رہی تھی۔ پپو اور شمو آپس میں لحاف کے لیے پھر کھینچا تانی کر رہے تھے اور عفت ننگے پاؤں منی کو گود میں لیے ہوئے ٹہل رہی تھی۔ ؟

عفت چولھے کے پاس بیٹھی چائے تیار کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ خالی چولھے پر دال بھی چڑھا دے اور پھر جلدی سے آٹا گوندھ کر آدھا کام نپٹا دے تاکہ وقت سے ... اسے ہی بیکار

"کیا ۔" عفت بے خیالی میں بولی ۔

"یہی کہ ان کے یہاں کچھ کام کیا جائے ۔"

"کیا مطلب ۔ یعنی امی آپ کو ہو کیا گیا ہے ۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آخر کام کرنے میں کیا برائی ہے ۔ اگر دس روپے مہینہ بھی مل جائے تو ....."

"میں اپنا سر پھوڑ لوں گی امی ۔ اگر اب کی آپ نے اس بابت میں سوچا ۔" عفت کو غصہ تو بہت تھا ۔ مگر جب امی نے کہا ۔ "تو کیا کروں ۔ مجھ سے تو روز روز میں فاقوں سے نہیں رہا جائے گا ۔ پھر ہزار خرچ اور بھی ہیں ۔ قرض کہاں سے ملے گا ۔ اور کوئی کس بنیاد پر قرض دے گا ۔" تو عفت کو ترس آ گیا ۔ باوجود ضبط کے بولی ۔ "ہائے یہاں آخر بچوں کی کون سی کمی ہے جو اللہ میاں برابر ایک کے اوپر ایک دیئے جا رہے ہیں ۔"

امی چپ رہیں ۔ عفت پھر بولی "بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے کبھی اولاد نہیں ہوتی ۔ جن کو تمنا ہے اولاد کی ۔ ان کے یہاں ہوں ۔"

امی اب کی بھی چپ رہیں ۔ عفت کی ہمت اور بڑھی اور کچھ پھر بولی ۔ "کچھ لوگ ہیں جن کا اپنا جب جی چاہتا ہے تبھی بچے ہوتے ہیں اب انور بھائی کو لیجئے ۔ انھوں نے کہا کہ میرے ایک ہی بچہ کافی ہے ۔ ان کے یہاں بس ایک ہی بچہ ہے ۔ حالانکہ نو برس شادی کو ہو چکے ہیں ۔"

امی بھولی نہ تھیں عفت کا اشارہ سمجھ گئیں ۔ مگر بڑے روایتی انداز میں بولیں ۔ "ارے یہ سب خدا کی مرضی ہے اس میں کسی کا کیا دخل ۔"

"یہ اللہ کی مرضی آخر ہم لوگوں کی مرضی کے ہمیشہ خلاف ہی کیوں ہوتی ہے ——" عفت نے جل کر کہا ۔

امی نے پرانے کپڑوں سے تھا تھکا نکالا ۔ کامدانی کے دو ایک دوپٹوں سے تار کھینچ کھینچ کر اور تانبے کے دو چار پرانے اور غیر ضروری برتن بیچ کر کچھ روپے جمع کر لیے ۔ عفت یہ سب کچھ دیکھتی رہی ۔ مگر اس نے ادھر ان سب باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لی ۔

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں اور کھانے کو کچھ نہ تھا ۔ ذرا ذرا سی دالیں بچی تھیں ۔ ان سب کو ملا کر عفت نے چولھے پر چڑھا دیا بچوں کو کچھ آسرا ہوا کہ شاید کچھ کھانے کا انتظام ہو رہا ہو ۔ جنت نے ذرا سمجھداری سے کام لیا اور ایک پیالے میں دال نکال کر پی اور چپکے اسکول کھسک گیا ۔ مگر ابا میاں بگڑنے لگے ۔ "آخر ساری تنخواہ کیا ہوتی ہے ۔ ابھی سے فاقہ شروع ہو گیا ۔ مہینہ ختم ہونے میں پورے چار دن باقی ہیں ۔"

اس ڈانٹ پھٹکار کا صرف ایک فائدہ تھا اور وہ یہ کہ بچے جو بھوک سے بلبلا رہے تھے سہم کر کونوں میں چھپ گئے ۔ ورنہ پتہ نہیں کہ ابا میاں کے غصے کے سامنے کسی کی شامت آ جاتی ۔

وہ ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے اور شیروانی کے بٹن لگاتے ہوئے گئے عفت باورچی خانے میں بیٹھی تھی ۔ وہ پھر بولے ۔ "پتہ نہیں دونوں ماں بیٹیاں مل کر کیا کرتی ہیں ۔ ساری تنخواہ لا کر دے دیتا ہوں ۔ پھر بھی ہر مہینے فاقہ کرنا پڑتا ہے ——"

امی بہت ہی کمزوری کی حالت میں کھرّے پلنگ پر پڑی تھیں ۔ وہ پورے دنوں سے تھیں ۔ زندگی میں شاید پہلی دفعہ بولیں ۔ "آپ کو نہیں معلوم تنخواہ کیا ہوتی ہے ۔ ہم دونوں آپ کے دفتر جانے کے بعد ترمال پکا کر کھاتے ہیں ۔"

"ابا میاں آگ بگولہ ہو کر بولے ۔ "دماغ خراب ہو گیا ہے کیا تیرا جاہل بدتمیز ——"

"ہاں دماغ ہی خراب ہو گیا ہے یہی سہی ۔ ذرا سی عقل بھی چھو کر نہیں گئی ہے ۔ جو بیس گھنٹے جائیں جھائیں کرنے کے سوا کچھ آتا بھی نہیں ہے ۔" "نہ دیجئے گا مجھ کو تنخواہ اب کی سے خود گھر چلایا کیجئے ——"

"میں کہتا ہوں تو چپ رہے گی یا .....؟"

"یا کیا ؟ کیا کیجئے گا آپ ۔ کر ہی کیا سکتے ہیں ۔ سنبھالیے اپنا گھر ۔ رکھیے اپنی تنخواہ اپنے پاس ۔ اور لائیے کوئی دوسری کر کے جو بڑی سگھڑ ہو ۔ اور دکھا دے سو روپے میں گھر چلا کے ——"

"تو چپ رہے گی یا میں جوتا اٹھاؤں ۔" ابا میاں آج شائستگی کی ساری حدیں طے کر کے آگے بڑھنے والے تھے ۔

"ہاں ، ہاں ۔ اب یہ بھی ہو جائے ساری باتیں کمینوں کی سی ہو چکیں ۔ اب یہ کیوں رہ جائے ۔ ہم میں اور کمینوں میں فرق کیا رہا ہے ——"

کا پیٹ بہت بڑھ چکا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے جھک کر اور ایک طرف کو ٹیڑھی ہو کر کھڑکی سے نکلیں۔ اور آدھے گھنٹے کے بعد خاموش خاموش چلی آئیں۔

عفت نے کچھ پوچھا ــــ

امّی نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے خود ہی کہا

"حاجی صاحب کی بیوی کہہ رہی تھیں کہ ہم لوگ آمدنی بڑھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

عفت فوراً بولی ـــ "کچھ طریقے بھی بتائے انھوں نے ...؟"

"ہاں۔ ! کہہ رہی تھیں کہ میں ہی اِدھر اُدھر کچھ کام کروں۔ پھر کہنے لگیں کہ ہمارے یہاں ہی کام بہت ہے۔ آپ یا عفت اگر اوپر کا کچھ کام کر دیا کریں تو دس پانچ ....؟"

"بس بس۔ امی۔ میں منع کر رہی تھی۔ آخر آپ گئی ہی کیوں تھیں اس کمینی کے پاس ذلیل ہونے ــــ" عفت غصہ میں کانپنے لگی۔ پاس سوئی ہوئی ننھی جاگ پڑی اور رونے لگی۔

امی بولیں۔ "کیا کیا جائے۔ خدا ہی کو ذلیل کرنا مقصود ہو تو ہم کیا کریں۔"

عفت جلبلا کر بولی۔ "خدا خدا۔ اچھا خدا ہے آپ لوگوں کا۔"

امّی سہم گئیں۔ جلدی سے ڈانٹ کر بولیں۔ "پاگل ہو گئی ہے کیا ــــ؟"

برسات شروع ہو چکی ہے۔ باورچی خانے کے ٹین پر بوندوں کی آواز سے مستقل ایک موسیقی پیدا ہو رہی ہے۔ اور عفت کبھی لکڑیاں پھونکتے پھونکتے اندھی ہوتی جا رہی ہے اس کی آنکھوں میں کتنے خواب تھے۔ کتنے راز تھے۔ اس کے رخساروں پر کتنی شادابی تھی۔ وہ جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بہت ہی خوابناک اور فسوں بیز منزلوں کی طرف ــــ مگر نہیں ــــ"

روز و شب کی لعنت اور فکروں نے اس کو جوانی کا راستہ کاٹ کر براہ راست بڑھاپے کی طرف پیش قدمی پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوتی تھیں۔ رخساروں پر ہمہ وقت ایک مضمحل زردی چھائی رہتی تھی اور ہاتھوں کی انگلیوں میں حنا کی سرخی کے بجائے گندھے ہوئے آٹے کے ذرے لگے رہتے تھے۔

لالٹین کی چمنی ٹوٹی ہوئی تھی اس لیے بتی کی لپک سے بالکل کالی ہو گئی تھی۔ پانی زور زور سے برس رہا تھا۔ اور عفت باورچی خانے میں اکیلی بھیگی ہوئی لکڑیاں سلگانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

سب بچے دبکے بیٹھے تھے ایک کپی کی روشنی میں منو اور شمو اپنی سیٹوں پر جھکے ہوئے پہاڑے لکھ رہے تھے۔ اور پپو بھوک سے روتا ہوا سو گیا تھا۔

ابّا میاں نے زور سے اپنی بیٹھک سے چلّا کر کہا۔

"یہ آخر کیا ہو رہا ہے۔ کھانا آج نہیں پکے گا۔ کون سا بڑا پلاؤ زردہ پکتا ہے۔ یعنی نو بج چکے ہیں۔"

عفت غصے سے بلبلا اٹھی اور بے اختیار اس کے دل سے دعا نکلی۔ اللہ کرے یہ سب مرد تھوڑے دنوں کے لیے عورت بنا دیئے جائیں تب مزہ آئے گا گھر بار کرنے کا ــــ"

مگر اس نے اللہ میاں سے دعا کیوں مانگی۔ وہ تو اللہ میاں سے خفا ہے۔ "میں کبھی اللہ میاں سے دعا نہیں مانگوں گی۔" اُس نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔

ایک دم زور سے بجلی چمکی اور عفت کی آنکھیں چوندھیا گئیں وہ سہم کر ایک طرف کو کھسک سی گئی کہ ایک خوفناک آواز کے ساتھ بادل کڑکا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ یا اللہ۔ یا کریم یا اللہ رحم کر ــــ"

"عفت! عفت!" امی نے جلدی سے اُسے پکارا۔ "ارے یہاں آؤ۔ چھوڑو بھاڑ میں جائے کھانا۔ یہاں آ کر بیٹھو ــــ"

اونگھتے کو جیسے ٹھیلتے کا بہانہ مل گیا ہو۔ وہ دوپٹے سے سر ڈھک کر جلدی سے بھاگتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ جس کا کچا فرش بالکل بھیگ گیا تھا۔ اس وقت گرج چمک سے بالکل سہم گئی تھی۔ اور اب اس کو ابّا میاں کے غصے کا بھی خیال نہ تھا۔

منو اور شمو ٹھنکنے لگے۔ "امی بھوک لگی ہے۔" اور امی تنک کر بولیں "تو لو میری بوٹیاں کھاؤ۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ ابّا میاں اپنے کمرے میں عشاء کی نماز میں مصروف ہو گئے۔ اور امّی کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگیں۔ "میرے خیال میں تو حاجی صاحب کی بیوی نے ہماری ہمدردی میں ہی کہا تھا"

رتن سنگھ

ذرّے

اس نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا۔ اور دوسرے لمحے اس کے جانی دشمن کی گردن زمین پر لڑھک گئی۔ لاش چٹاخ کرتی ہوئی زمین پر گری اور چاروں طرف خون کے چھینٹے بکھر گئے

جب بھی کبھی اس نے اسے قتل کرنے کا تصوّر کیا تھا تو اس نے دانت کٹکٹاتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ سوچتے ہی سوچتے غصّے کے مارے اس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ سانس پھولنے لگتی تھی۔ اور وہ سوچا کرتا تھا کہ اس کی لاش کو دیکھ کر وہ قہقہے لگا کر ہنسے گا۔ زوردار قہقہے۔ لیکن اس وقت وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ قہقہے لگانے کی بات اسے سوجھی بھی نہیں۔ یہ حادثہ اچانک ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ تو شام کو اپنے گاؤں کی طرف واپس جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اس پر پڑ گئی جو چند قدموں کے فاصلے پر منہ دوسری طرف کئے درختوں کے اس جھنڈ میں اکیلا ایک پیڑ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نیند کے مارے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ بس اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چپکے سے گیا۔ آہٹ بھی نہ ہونے دی۔ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اور اب اس کی لاش اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ رہی تھی۔

اس نے جلدی سے خون سے لت پت تلوار مقتول کے ہی کپڑوں سے پونچھی۔ اور پھر نیام میں رکھ لی۔ پھر اس نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا۔ بڑے معمولی سے دو تین دھبّے تھے خون کے اور بس۔ ہاتھوں پر البتہ تلوار صاف کرتے ہوئے خون لگ گیا تھا۔

ہاتھوں کو زمین پر رگڑ کر اس نے اپنی گردن کو سہلایا۔ جہاں زخم کی وجہ سے دو انگل گہرا گڑھا بنا ہوا تھا۔ اس گڑھے پر ہاتھ پڑتے ہی اس کا غصّہ پھر عود کر آیا۔ یہ گڑھا اسی دشمن کے گنڈاسے سے آج سے سات سال پہلے پڑا تھا۔ وہ تو اپنی طرف سے اسے مار کر ہی پھینک گیا تھا لیکن اس کی قسمت میں یہ بدلہ چکانا باقی تھا۔ اسی لئے بچ گیا تھا۔ پھرتی سے وہ لاش کی طرف بڑھا۔ اور اسے پاؤں سے ٹھوکریں مارنے لگا۔ گرم لاش اور زیادہ پھڑکنے لگی۔ لاش جس قدر تڑپ رہی تھی اتنا ہی اس کے دل کو سکون مل رہا تھا۔ پھر وہ ذرا ہٹ کر پڑے ہوئے سر کے قریب گیا۔ اسے بھی پاؤں سے ٹھوکریں مارتا ہوا وہ لاش کے قریب لے آیا۔ اس سے بھی اس کے انتقام کی آگ نہ بجھی تو اس کے کٹے ہوئے سر کو بالوں سے پکڑ کر دو تین دفعہ زمین پر زور سے پٹخ دیا۔ پھر اس نے جوتے کی نوک سے سر کو لاش کے قریب کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چاروں طرف سے خون بہہ بہہ کر اب منجمد ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لاش اب بالکل ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک ایک پیڑ سے ٹوٹ کر ایک سوکھا پتہ لہراتا ہوا اس کے سر پر آ کر گرا تو وہ خوف کے مارے کانپ کانپ گیا۔ جیسے کسی نے اسے قتل کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔

دیوانگی کے عالم سے نکل کر اب پھر وہ ہوش میں آ رہا تھا اس نے ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی۔ مقتول کے سر کو اٹھا اٹھا کر پٹخنے سے اس کے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے پڑ گئے تھے اسے اپنی حماقت پر غصّہ آیا اور وہ وہاں سے بھاگ

باقی صفحہ ۱۷۰ پر

ابّا میاں غصے میں آگے بڑھے۔ ان کے ہاتھ میں چھڑی تھی عفت نے آگے بڑھ کر چھڑی پکڑ لی۔ ابّا میاں کا غصہ اور بڑھا۔ انھوں نے جھٹکا دے کر چھڑی چھڑائی۔ اور عفت دھم سے نیچے گر پڑی مگر وہ پھر اٹھی۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔

میں کہتی ہوں مجھے مار ڈالیے۔ مجھ سے یہ سب نہیں سہا جاتا۔ مار ڈالیے مجھ کو مار ڈالیے۔ وہ زور سے دیوار سے اپنا سر پھوڑنے لگی۔ ابّا میاں باہر چلے گئے۔ امّی نے لپک کر عفت کو روکنے کی کوشش کی۔ وہ اٹھیں۔ مگر چکرا کر پلنگ میں گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔

عفت برابر اپنا سر پیٹے جا رہی تھی۔ مجھے مار ڈالو۔ مجھے مار ڈالو میں مر جاؤں گی۔ مجھے مار ڈالو۔ مجھے مار ڈالو۔

منی رو رہی تھی۔ منو، ننھو اور پپو بھی سسکیاں بھرنے لگے۔ پورا گھر جیسے ایک ماتم کدہ بن گیا تھا۔ رونے والوں ایک بالکل ہی نئی آواز بھی مل گئی تھی ــــ

صفحہ ۱۰۱ کا بقیہ

لئے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ میں ندامت اور غم کے احساس میں ڈوب گئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں، آنسوؤں کے پاس بھی اس درد کا علاج نہیں تھا۔

میں تنہا تھی، اپنے کرب اور غم کے ساتھ بالکل تنہا۔

میں اس ساری قیامت سے موت کے لئے گزری تھی یا پیدائش کے لئے؟

پیدائش ہوئی یقیناً لیکن ....

یہ پیدائش میرے واسطے موت کی طرح سخت اور تلخ اذیت بن گئی۔

یہ بہت بڑا کفارہ تھا۔ اس کفارے کے لئے مجھے کیوں منتخب کیا گیا؟

صفحہ ۱۷۱ کا بقیہ

جانا چاہتا تھا۔ احتیاط کے طور پر اس نے جھنڈ کے باہر اِدھر اُدھر

نگاہ ڈالی۔ دور دور تک اسے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا اس نے خود کو محفوظ سمجھا۔ تلوار کو اٹھا کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے وہ وہاں سے چلنے ہی والا تھا، کہ اچانک اسے یاد آیا کہ جب یہ دشمن آج سے سات سال پہلے اسے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر بھاگا تھا تو لوگوں کے کہنے کے مطابق وہ اس کے جسم کو گھسیٹ کر ایک کھائی میں ڈال گیا تھا۔ اپنے جسم کے گھسیٹے جانے کا خیال آتے ہی اس نے سوچا کہ اگر اس کی لاش کو ویسے ہی زمین پر گھسیٹا نہ گیا تو جیسے اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ مطمئن ہو کر تلوار کو ایک پیڑ کے سہارے رکھ دیا۔ اسے یاد آیا کہ درختوں کے اس جھنڈ میں ایک پرانا کنواں ہے کیوں نہ اس لاش کو اسی میں ڈال دیا جائے۔ نشان بھی نہ ملے گا۔ یہ سوچ کر پہلے وہ سر کو اٹھا کر کنویں میں پھینک آیا۔ اس کا دل تو چاہتا تھا کہ سر کو اٹھانے کے بجائے گیند کی طرح پیروں سے ٹھوکر مار کر لے جائے۔ لیکن اندھیرا بڑھ رہا تھا اور اس کا وہاں زیادہ رکنا مناسب نہیں تھا۔

پھر اس نے لاش کو پاؤں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا کنویں کی طرف لے چلا۔ وہ الٹے پاؤں چل رہا تھا۔ لیکن پھر بھی بار بار گھوم کر پیچھے دیکھ لیتا تھا تا کہ گر نہ پڑے یا کسی پیڑ سے ٹکرا نہ جائے۔ اچانک اس کی نظر چیونٹوں کی ایک قطار پر پڑی جو بل تک پہونچنے کے لئے اس راستے سے چل رہی تھیں۔ اس نے دیکھا۔ زمین کا اتنا حصہ چیونٹوں سے کالا ہو رہا تھا۔ یک لخت اس کے قدم رک گئے۔ اور اس خیال سے کہ اس کے پاؤں اور لاش کے نیچے دب کر چیونٹیاں مر نہ جائیں اس نے راستہ بدل لیا۔ اور دوسرے راستے سے لاش کو کنویں میں ڈال کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

"میں نے چوری کی ہے کسی کی۔ میں تو کھیل رہا ہوں۔" اور یہ کہتے کہتے واقعی اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی۔

مگر پھر بھی اس کے بھائی نے کہا۔ "تو نے ضرور کوئی حرکت کی ہے۔ چل اماں پاس۔" اور اس ہاتھ سے جس سے وہ اسٹیج کا لوٹا نہیں پکڑے تھا بھائی نے اس کے دائیں ہاتھ کی آستین پکڑ لی۔

"جاؤ۔ نہیں جاتا۔" اس نے جھٹکا دے کر آستین چھڑا لی۔۔۔

"اچھا۔ ٹھیر۔ ابھی کہتا ہوں اماں سے۔"

"ہاں ۔۔۔ کہہ دو۔"

وہ اور اکڑ گیا اور اس کا بھائی اسٹیج کے لوٹے میں بچے ہوئے پانی سے مٹی کے فرش پہ نہریں بناتا ہوا برآمدہ پار کر کے ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

"دیکھو اماں۔۔۔۔۔"

اتنی دور جا کر چلایا۔ وہاں۔ ڈیوڑھی کے اس سرے پر۔ زیادہ تر تو نہیں سے چلاتا ہے۔ گھر میں گھستے ہی۔ اور پھر ڈانٹ پڑتی ہے۔ مت گلا پھاڑا کر، پاس آ کر نہیں کہہ سکتا جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ کیسی شکل ہو جاتی ہے اس کی جب اماں ڈانٹ پلاتی ہیں۔۔۔ اور اس وقت کے راتھا اماں سے کہہ دوں گا۔ کہہ دو۔ ہنہ! میں کوئی ڈرتا ہوں اماں سے! میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ ابا سے بھی نہیں۔

گلی کے اس موڑ سے جو قبرستان کی طرف تھا ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور نیم کے سایہ دار درخت کے نیچے پڑے ہوئے کھلنگے کی پٹی پر بیٹھ کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ آوازیں آہستہ آہستہ قریب آتی گئیں اور بلند ہوتی گئیں۔ اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جو غول وہ قبرستان میں چھوڑ آیا تھا وہی آندھیوں کا طوفان بن کر اس کے سر پر پھٹنے والا ہے۔ پھٹا کرے۔ میں کوئی ڈرتا ہوں۔ میں نے کوئی بڑی بات تھوڑی کی ہے۔ اور نہیں تو کیا۔ کون اس بچارے کو

دروازے کے سامنے بدمست ہاتھی جھوم کر ساکت ہو گیا۔ اور پھر سناٹے کو چیرتی ہوئی آواز آئی۔

"بابو جی!"

جیسے کوئی فریاد کر رہا ہو

"بابو جی!"

نڈھال۔ مری ہوئی آواز۔

"نہیں ہیں بابو جی!"

"بابو جی!"

بابو جی! بابو جی!۔ اس وقت نہیں یاد آئے تھے بابو جی۔ اب آیا ہے شکایت کرنے۔ بابو جی کا بچہ!

"کہہ دیا نہیں ہیں بابو جی۔"

"دروازہ تو کھولو۔"

یہ بادشاہ ہے۔ اسے بادشاہ کون کہتے ہیں؟ قبریں کھودتا ہے۔ بھیک مانگتا ہے۔ براتوں میں جھیم جھیم باجا بجاتا ہے۔ بادشاہ!۔ نام تو شاید امیرا ہے!

"بھاگ جاؤ۔ نہیں کھولتے۔"

"کنڈی کھٹکھٹا دی۔" کسی نے رائے دی اور لوہے کی موٹی کنڈی دروازے پر بجنے لگی۔ وہ جھلنگے پر سے اٹھا اور جھپٹ کر دروازے کے پاس آ گیا۔

"جاتے ہو کہ نہیں۔"

"ہم تو بابو جی کے پاس آئے ہیں۔"

کنڈی زور سے بجنے لگی۔ اور کھٹ کھٹ کے شور کے ساتھ کئی اور آوازیں گڈمڈ ہو گئیں۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ شاید وہ سارے لونڈے لپاڑے جن کے ساتھ وہ تھوڑی دیر پہلے کھیل رہا تھا جلوس بنا کر تماشہ دیکھنے ساتھ ساتھ آئے تھے۔ کچھ لوگ اونچی آواز سے باتیں کر رہے تھے۔

پھر شور ایک دم گھٹ گیا۔ اور ایک ساتھ کئی آوازیں آئیں "بندگی لالہ جی۔"

"ہرے رام۔ ہرے رام۔ کا بھیو اسے؟"

مگر قبل اس کے کہ وہ لالہ جی کے سوال کا جواب سن

ضمیرالدین احمد

پہلی موت

گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے رک کر اپنے سانس کو قابو میں کیا۔ وہ بھاگا تو نہیں تھا مگر تیز تیز ضرور چلا تھا کیونکہ اس کا سانس قدرے پھولا ہوا تھا۔ پھر اس نے گلی پر ایک نظر ڈالی۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھ کر دروازے سے کان لگایا۔ اندر بھی سناٹا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ صحن میں اور اس کے بعد جو برآمدہ تھا اس میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ مگر جو پاخانہ صحن سے ملحق تھا اس میں ضرور کوئی تھا کیونکہ پاخانے کی موری میں سے بہہ بہہ کر پانی اس نالی میں گر رہا تھا جو گلی کے بیچوں بیچ بہتی تھی۔

اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ بڑے سے دروازے کے سامنے جو بڑا سا نیم کا پیڑ لگا ہوا تھا اس کے پتوں میں کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر ساکت ہو گیا پھر پاخانے کے دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور وہ تیزی سے کھلے ہوئے دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں ہو گیا۔

اس نے دروازے کی درز میں سے جھانکا تو اسے اس کا بڑا بھائی ایک ہاتھ سے استنجے کا لوٹا پکڑے اور دوسرے سے آزار بند اڑستے ہوئے برآمدے کی طرف جاتا نظر آیا۔ مگر فوراً ہی بظاہر بلاوجہ بھائی نے رک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ توقف کیا اور پھر اپنا رخ دروازے کی طرف موڑ دیا۔

"سلام علیکم"

بھائی نے گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی شناسا کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!"

موٹے چاچا ہیں۔ اس نے دروازے کے پیچھے سے اندازہ لگایا انھیں پتہ چلے گا تو کتنے خوش ہوں گے۔ ہمیشہ کہتے ہیں کہ ــــــ

"دروازے کے پیچھے کیوں چھپا کھڑا ہے؟"

بھائی کی آواز نے اس کے ذہن کو موٹے چاچا کی نصیحت سے ہٹا کر اس سوال کے حل کی تلاش میں لگا دیا کہ انھیں کیسے پتہ چلا کہ میں اس دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا ہوں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دروازے کی اوٹ مکمل تھی۔ پھر اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ لکڑی کے تختوں کا وہ پردہ جس کے پیچھے وہ چھپا تھا زمین تک نہیں آتا تھا۔ اور اس لئے اس کے کرمچ کے جوتے باہر سے صاف نظر آ رہے ہوں گے

"ہم آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں!" اس نے پردہ ہٹا کر باہر آتے ہوئے کہا۔

"آنکھ مچولی کھیل رہا ہے!" بھائی نے اس کے چہرے پہ ایک شک بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو کیا!"

"چہرہ دیکھو جا کر شیشے میں۔ پیلا پڑا ہوا ہے۔ جیسے دم نکلا جا رہا ہو ڈر کے مارے۔"

"کس کا؟ میرا؟"

"اور نہیں تو کیا میرا!"

"میرا کیوں نکلنے لگا دم۔" اس نے سینہ پھلا کر کہا۔

چلا رہا تھا اور یہ اسے مارے جارہا تھا۔ جوتے سے۔ اور پلے گھسیٹ بھی رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے اور یہ پھر بھی مارتا رہا اسے۔ آتے بڑے آدمی کو۔ سب کے سامنے سڑک پر۔"

"تجھے تو نہیں مارا؟" ماں نے پوچھا۔

"نہیں۔ کرمدن کو مارا۔ جوتوں سے۔ وہ بچارا چلا رہا تھا اور یہ اسے اتنے اتنے بڑے کنکروں پر گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے سارے کپڑے پھٹ گئے۔ اور کئی جگہ خون بھی نکلا۔"

"میاں ٹھیک کہتے ہیں۔" کئی لونڈوں نے ایک ساتھ نعرہ بلند کیا۔

"بر بی بی جی اس سالے ---"

"اس سے کہو یہاں گالی نہ بکے۔" ماں نے بھائی سے کہا

"کہہ رہی ہیں یہاں گالی نہ بکو۔"

"غلطی ہوگئی بی بی جی۔ میں کہہ رہا تھا مدن پر میرے دس روپے جاتے ہیں اور وہ حرامی دینے کا نام نہیں لیتا آج پیچھے چڑھ گیا۔ میں نے تقاضا کیا تو ٹال مٹول کرنے لگا۔"

"میں نے خود سنا۔ وہ کہے رہا تھا بقر عید کے چاند میں ضرور دے دوں گا۔" اس نے ماں کو مخاطب کر کے کہا۔

"مگر تجھے ان کے جھگڑے میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ تیرا لگتا ہے مدن!؟" ماں نے اسے ڈانٹ پلائی

یہ سمجھتی کیوں نہیں۔ کہ جو راہوں کے لیے مردود عنتوا اسے مار رہا تھا اور وہ بھی دس روپوں کے لیے۔ دس روپے کیا ہوتے ہیں۔ منے کی سلمانی میں بیس روپوں کے لڈو بانٹے گئے تھے۔ خود کے دی تھیں۔ میں اتنا بڑا ہوتا تو کمّا تھوڑی مارتا۔ خود ٹھکا کائی کرتا اس عنتوا کے بچے کی اور مدن کو بچا لیتا۔ اسے کسی نے بچایا بھی نہیں۔ اتنے سارے لوگ تھے

"ہاں بی بی جی۔ بھلا میاں کو اس حرامی سے کیا مطلب" عنتوا نے کہا۔ "اپنے دس روپے بھی گئے اور سر پھٹا اوپر سے۔"

"سیروں خون بہہ گیا ہوگا۔" بلادا نے کہا۔

"اور نہیں تو کیا!" بادشاہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی ---

"سیروں خون نکل گیا ہوتا تو یہاں نظر نہ آتے!" اس کے بھائی نے چڑ کر کہا۔

جھوٹا کہیں کا!

"خیر سیروں نکلا یا چھٹانک دو چھٹانک نکلا ضرور۔ مگر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہم کیا کر سکتے ہیں سوائے۔" ماں نے اسے قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کی خبر لینے کے۔"

وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"بر بی بی جی۔ اس کا کیا بنے گا۔" بادشاہ نے عنتوا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو پینے اوپر غشی طاری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ تو گیا کام سے نہ جانے کتنے دنوں کے لئے۔ قبر کھودنا تو الگ اس سے پھوڑا تک نہ اٹھے گا۔"

"اور دوا دارو پر جو خرچ ہوگا وہ کہاں سے آئے گا!" بلادا نے بات آگے بڑھائی۔ ماں کی نظروں میں اور قہر بھر گیا۔ انھوں نے ٹیفے کو ٹٹول ٹٹول کر چاندی کا ایک روپیہ برآمد کیا اور اسے بھائی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "دے دو اسے۔"

بھائی نے روپیہ عنتوا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اس سے کیا بنے گا بی بی جی" عنتوا ممنایا۔

"اس سے جیادہ تو مرہم پٹی پر کھرچ ہو جائے گا۔" بلادا بولا۔

اور داگدر صاب دودھ پینے کو جو بتلائیں گے "بادشاہ نے کہا۔

ماں سوچنے لگیں کہ اگر وہ پانچ روپے جو منے کے ابا نے آج ہی صبح خالص گھی کے لئے دیئے تھے اس نیچر کو دے دیئے تو گھی کہاں سے آئے گا۔ اور گھی نہیں ہوگا تو ان کی دال کیسے بگھرے گی۔ اور دال نہیں بگھرے گی تو ضرور انھیں پتہ چل جائے گا کہ روپئے کہاں گئے۔

بھائی ماں کے تردد کو سمجھ گیا۔ "جاؤ۔ اور نہیں ملے گا۔ ایک روپیہ بہت ہوتا ہے۔"

اس بار بادشاہ اور بلادا دونوں ایک ساتھ بولے

لگے۔ اس کے کانوں میں اس کی ماں کی آواز آئی ۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں" اس نے زیر لب کہا اور دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا ۔

"میں پوچھ رہی ہوں کیا بات ہے؟" ماں نے برآمدہ عبور کرتے ہوئے سوال دھرایا "یہ تو کیسا ہے؟ ۔ بہرا ہو گیا ہے تو کیا!"

جواب میں وہ جوتے سے پکی نمکولیوں کو کچلنے لگا۔

"میں کہہ رہا تھا یہ ضرور کچھ کر کے آیا ہے!" اس کے بڑے بھائی نے اس کی ماں کے پیچھے برآمدہ عبور کر کے صحن میں آتے ہوئے کہا ۔

"چھوٹا کیوں نہیں!" ماں نے بالکل اس کے سامنے آ کر کہا ۔

وہ اب بھی چپ رہا مگر اس کی آواز شاید باہر تک پہونچ گئی تھی کیونکہ اب کنڈی بجنا بند ہو گئی تھی اور کئی حلق بیک وقت "بی بی جی ۔ بی بی جی" کا نعرہ لگا رہے تھے

"کیا بات ہے؟" ماں نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے باہر والوں سے پوچھا ۔

"میاں نے سر پھوڑ دیا۔"

"ہائیں! ۔ کس کا؟"

"عنتوا کا۔"

ماں نے اس کی طرف ایسے دیکھا گویا انھیں باہر والوں کی بات کا یقین نہ آیا ہو ۔ پھر انھوں نے دروازے کی درز میں سے باہر جھانکا اور ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا ۔

"سچ تو کہتا ہے" انھوں نے آہستہ سے کہا...

"لہو لہان ہو رہا ہے"

بھائی نے جو ماں کے پاس ہی کھڑا تھا ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھول دی اور ماں نے ان سے کہا ۔

"ان سے پوچھو ہوا کیا تھا"

بھائی دروازے کا ایک پٹ کھول کر چوکھٹ پر آ گیا ۔ سامنے عنتوا کھڑا ہوا تھا ۔ اس کے سر کے دائیں حصے سے خون ٹپک رہا تھا ۔ خون کے دھبے اس کے کالے کرتے اور چوخانے کی لال تہمد پر نظر آ رہے تھے ۔ دو آدمی اسے سہارا دیئے ہوئے تھے ۔ ان کے پیچھے اور ادھر ادھر وہ لونڈے لپاڑ تھے جن کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے وہ کھیل رہا تھا ۔ ان میں سے کچھ ہمہ تن توجہ تھے ۔ کچھ ہنس رہے تھے، کچھ کھسر پھسر کر رہے تھے ۔ کچھ سنجیدہ تھے مگر ان کے چہروں پر عنتوا سے ہمدردی کے آثار نہیں تھے ۔

"اس سے کہو بیٹھ جائے" ۔ ماں نے دروازے کی آڑ سے اس کے بھائی سے کہا ۔

"اس سے کہو بیٹھ جائے" ۔ ماں نے دروازے کی

"ہوا کیا تھا؟"

"میں بتاؤں" ایک لونڈے نے جھٹ سے پیشکش کی ۔

"چپ رہ بے" ۔ ان دو آدمیوں میں سے ایک نے جو عنتوا کو سہارا دیئے ہوئے تھا اسے ڈانٹ دیا ۔

یہ وہی مردود بادشاہ ہے ۔ اس نے ایک اور نمکولی کچلتے ہوئے سوچا ۔

"ہوا کیا تھا ۔ میاں قبرستان میں کھیل رہے تھے ۔ اتنا بڑا کنکر اٹھا کر مار دیا عنتوا کے ۔ سر پھٹ گیا۔"

"جھوٹا کہیں کا! ۔ یہ نہیں بتاتا کہ پہلے کیا ہوا تھا ۔ اور یہ بلادا کا بچہ تو وہاں تھا بھی نہیں اس وقت"

"نہیں پہلے عنتوا نے مارا تھا" اور ایک لونڈا بولا ۔

اور ماں اور بھائی کا چہرہ لال ہو چلا ۔

"اس نے مارا میرے لڑکے کو ۔ اس فقیرنے!" ماں دروازے کی اوٹ میں تلملائی ۔

"جھوٹ بولتا ہے حرامی ۔ بی بی جی" عنتوا نے لونڈے کو غصیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میں نے چھوا بھی ہو میاں کو تو جو چور کی سجا سو میری"

"اور اس نے بدن کو جو مارا تھا" ایک اور لونڈے نے ہانک لگائی ۔

"ہاں ۔ مارا تھا اس نے" وہ کئی نمکولیاں ایک ساتھ کچلتا ہوا ماں کی طرف بڑھا "بدن کو ۔ جوتوں سے ۔ وہ بچارا

اس کی آنکھوں کے سامنے تارے بکھر دیئے۔ سارے بدن کا خون کھنچ کر اس کے چہرے میں جمع ہو گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے رخساروں میں شعلے لپک رہے ہیں اس کی آنکھیں بھیگ چلیں مگر وہ رویا نہیں ۔

"جب دیکھو قبرستان میں۔ ابھی سے یہ اطوار ہیں تو بڑا ہو کر نہ جانے کیا قیامتیں ڈھائے گا۔"

ایک اور تھپڑ پڑا مگر اس بار اس کا دماغ جھنجھنایا نہیں اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جو خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا تیزی سے بدن کے دوسرے حصوں میں واپس جا رہا ہے۔ اس کا بدن تننے لگا اور جب اس نے تیسرے تھپڑ کو روکنے کے لیے سر اٹھا کر اور سینہ تان کر اپنا بایاں ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کا اٹھا ہوا ہاتھ تھا مگر اس کے ذہن کے سامنے ایک تصویر تھی جس میں بوڑھا ایک آدمی، پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس۔ بیبد کنکروں کی سڑک پر کھنچا جا رہا تھا۔ وہ بار بار کبھی دایاں اور کبھی بایاں ہاتھ اوپر اٹھا رہا تھا تاکہ اپنے چہرے اور سر کو ان جوتے کی زد سے بچا سکے جو پے در پے اس کے اوپر برس رہا تھا۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹا تو ماں نے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا: "جاتا کہاں ہے۔ بول پھر کرے گا ایسی حرکت؟"

اس نے جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑا لیا اور اس کے منہ سے نکلا "ہاں" جسے سن کر اس کے کان اور اس کا ذہن بھونچکے رہ گئے۔

"تیری یہ مجال!"

ماں اس کی طرف لپکیں تو وہ برآمدے کی طرف بھاگا۔ اور جب ماں نے دیکھا کہ وہ ان کی زد سے باہر ہو چکا ہے تو دائیں پیر کی سلیپر اتار کر اس کا نشانہ بنایا۔ وہ برآمدے میں داخل ہو رہا تھا جب سلیپر اس کے سر پر پڑی اور وہ جیسے جم کر رہ گیا۔ جو کام دو سخت تھپڑ نہ کر سکے تھے وہ سلیپر نے کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ رونے لگا حالانکہ سینہ پھیلتی ہوئی پڑی تھی ۔

"بہت ہو گیا بیٹی"۔ نانی نے تسبیح رکھتے ہوئے کہا: "جوتوں سے کسی کو نہیں مارتے۔ کتابوں میں لکھا ہے۔"

"اس کی حرکتیں نہیں دیکھتیں۔ اس کا سر پھوڑ دیا اور کہتا ہے 'ہاں'۔ کل کلاں کو کچھ اور کر کے بیٹھے گا۔ کوئی اس سے پوچھے کیا پڑی تھی بڑے بیٹے میں سر اڑانے کی۔"

میں تو اڑاؤں گا۔ میں تو اڑاؤں گا۔ میں تو اڑاؤں گا
اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ مگر اس کا گریہ بے صدا تھا۔

"بالشت بھر کا ہے اور ملیے تڑنگے آدمیوں کے سر پھوڑتا پھرتا ہے۔ ابھی سے یہ حال ہیں۔"

میں تو پھوڑوں گا۔ میں تو پھوڑوں گا۔ میں تو پھوڑوں گا

"مجھے روپیوں پر پانی پھروا دیا منحوس نے۔ آنے دو انھیں۔ ایسی ٹھکائی کرواؤں گی کہ پھر نام نہیں لے گا باہر جانے کا۔"

میں تو جاؤں گا۔ میں تو جاؤں گا۔ میں تو جاؤں گا۔

لیکن "ان کے" ذکر نے آنسوؤں کی رفتار میں کمی پیدا کر دی۔ اور وہ جا کر نانی کے پاس تخت پر بیٹھ گیا۔

"بیٹھ جا نانی کے کولھے سے لگ کر۔ لیکن یہ یاد رکھ کہ آج تجھے کھانا ہرگز نہیں ملے گا۔" ماں نے سلیپر میں پیر ڈالتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہ ڈیوڑھی میں سے ہوتی ہوئی بکتی جھینکتی اندر چلی گئیں اور کھانا باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کے باپ گھر میں داخل ہوئے ترکی ٹوپی کا سیاہ پھندنا ہلاتے اور چھڑی گھماتے حسب معمول وہ سیدھے اندر چلے گئے۔ وہ نانی کے کولھے سے لگا ان کو کنکھیوں سے ایسا دیکھتا رہا گویا پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو اس کے کان ان آوازوں پر لگ گئے جو مکان کے اندرونی حصے میں ان کی موجودگی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی تھیں۔ چپل جھاڑنے کی آواز۔ پیک تھوکنے کی آواز، منہ دھونے میں غلاصے کرنے کی آواز۔ اور ماں سے باتیں کرنے کی آوازیں۔ پھر برتن کھنکنے لگے اور وہ اندازہ لگانے لگا کہ اب ان کی میں

"یہ تو ظلم ہوگا۔ سراسر ظلم۔ بیچارے کا سر پھوڑ دیا اور صرف ایک روپیہ دیتی ہو"۔
غنتوا کڑا۔

ماں نے بھائی کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ اور دروازے کے بیٹ کو مخاطب کرکے بولیں "اس وقت اور پیسے نہیں ہیں۔ پھر لے لینا"۔

"پر ضرورت تو ابھی ہے بی بی جی۔ دوا دارو کے لئے۔ پھر کیا ہوگا"۔

ماں پھر سوچ میں پڑ گئیں اور اس نتیجے پر پہونچیں کہ یہ لوگ ایک روپیہ پر قناعت کرنے والے نہیں۔ وقت کم ہے۔ منّے کے ابا کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ ان بلاؤں کو اس وقت تو کسی نہ کسی طرح ٹالنا ہی پڑے گا ـــــ

انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے بھائی کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ نعمتی پاندان میں کتھے کی کلھیا کے نیچے ایک پانچ روپے کا نوٹ رکھا ہے۔ وہ نکال لاؤ۔

بھائی نے غنتوا کے ہاتھ پر جب پانچ روپے کا نوٹ رکھا تو تینوں فقیروں نے ایک بار پھر احتجاج کیا کہ پانچ روپے تو بہت کم ہوتے ہیں۔ کم از کم دس تو ہونے چاہیئے مگر اس بار ان کا احتجاج کمزور تھا اور ماں اور بھائی کی بس زور دار اس لئے معاملہ ہو گیا۔ اور آگے آگے تینوں فقیر اور اس کے پیچھے لونڈے لپاڑے ایک جلوس کی شکل میں روانہ ہو گئے۔

"ٹھیر۔ تو چلا کدھر"

وہ بھاگنے یا فرار ہونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا ہوا یہ تھا کہ جب بھائی نے دروازہ بند کرکے کنڈی لگا دی تھی تو اس کی نظریں نہ جانے کیوں برآمدے کی طرف اٹھ گئیں تھی۔ جہاں اسے تخت پر نانی بیٹھی نظر آئی تھیں۔ نانی کے پاس گھس کر بیٹھنا اسے ہمیشہ سے پسند تھا خاص کر ایسے موقعوں پر جب ڈانٹ ڈپٹ یا مار پٹائی کا خطرہ ہوتا۔ حالانکہ یہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر وہ اس کی زیادہ مدد کرنے سے قاصر رہتی تھیں کیونکہ اماں اور ابا دونوں کی۔ خاص کر ابا کی تاکید تھی کہ اس قسم ناجائز لاڈ پیار سے لڑکے کو خراب نہ کیا جائے۔ اور بیچاری کا کوئی بھی نہیں۔ تبھی تو ڈرتی ہیں ابا سے ـــ اس کے قدم آپ ہی آپ برآمدے کی طرف اٹھ گئے تھے نانی تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھاگنے یا فرار ہونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

وہ رک گیا اور کنکھیوں سے ان ٹانگوں کو تکا جو ماں کے تنگ پاجامے میں لپٹی ہوئی تھیں اور سلیپروں میں پڑے ہوئے پیروں کی مدد سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"اب بتا!" ماں نے اس کے ایک کان کو اینٹھ کر کہا "کیوں پھوڑا تو نے اس کا سر!"

"کے جو دیا" اس نے جلتے ہوئے کان کو چھڑانے کی کوشش کئے بغیر کہا۔

"کیا کہہ دیا ـــ" بھائی نے کہا جو آکر بالکل اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"بول۔ کیا کہہ دیا!" ماں نے کان کی گرفت کو پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈانٹا۔

ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ پھر بتانے سے فائدہ لیکن پھر بھی اس نے اتنا تو کہہ ہی دیا "میں نے کو جو مار رہا تھا۔ جوتوں سے۔ اور ـــ"

"پھر وہی بکواس" ماں نے کان چھوڑ کر تھپڑ مارتے ہوئے کہا "تیرا کون سا لگتا ہے وہ مؤذن کا بچہ!"

"ان لونڈوں کے ساتھ کھیل کے اس کی عادتیں خراب ہو گئی ہیں"۔ بھائی بولا۔

یہ بلا دیتے ہیں سارے ایسی نیچ میں۔ بڑے ہو کر کیا بنیں گے۔

"اتنی دفعہ منع کیا مت کھیلا کر ان دھنے جلاہوں کے لونڈوں کے ساتھ مگر اس کو تو چین نہیں پڑتا بغیر ان۔ چوتڑوں میں گھسے۔ کمبخت کہیں کا"۔

اور ساتھ ہی چٹاخ سے ایک تھپڑ پڑا جس ـــ

"ساری یوسف زلیخا سنا ڈالے گا اور یہ نہیں بتائے گا کہ اس نے کیا کیا۔" ماں بیچ میں بول پڑیں۔

"کیا کیا اس نے؟"

باپ ابھی تک ٹہل رہے تھے۔ لیکن وہ اب ان ...م نہیں لا رہا تھا۔

"سر پھوڑ دیا اس عنتو اکا اور کیا کیا۔"

باپ ایک لمحے کے لئے رکے۔ "سچ!"

"اور نہیں تو کیا۔"

"کیسے؟"

"اٹھا کے گمادے مارا اس کے سر پر۔"

"کیوں؟"

"وہ مدن کو جو مار رہا تھا۔ بڑا آیا مدن کا لگا۔"

"غلطی سے لگ گیا ہوگا۔"

"نہیں وہ شکایت لے کر آیا تھا۔ میں نے خود دیکھا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اور میں نے ڈانٹا تو کہنے لگا میں پھوڑ دوں گا اس کا سر۔"

اتنی بڑی ہو کر بھی اماں جھوٹ بولتی ہیں۔ میں نے کب کہا تھا۔ میں نے تو صرف ڈانٹا تھا۔

"مگر ابا اتنے بہت سے لوگ تھے لیکن مدن کو کوئی نہیں بچا رہا تھا۔"

"تو تو اقرار کر رہا ہے کہ تو نے مدن کا سر پھوڑا۔"

وہ خاموش رہا۔ باپ کی آواز میں اب تلوار ...ی تھی۔

"بول"

وہ پھر بھی چپ رہا۔

"اور اوپر سے سینہ زوری کرتا ہے۔ اور پھوڑوں ...س کا سر۔ وہ اگر رسید کر دیتا دو، چار جانے تو عزت خاک میں مل جاتی کہ نہیں۔ وہ مدن کو مار رہا تھا تو مارنے دیتا۔ چاہے اسے جان سے مار ڈالتا۔ تجھے اس سے کیا مطلب۔ ...ت بھر کا ہوا نہیں اور ابھی سے لفنگوں لچوں کی عادتیں ...ے لگا۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں کہ اگر ابھی سے سختی نہیں کی گئی تو بالکل بگڑ جائے گا۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ آج کھانا نہیں ملے گا۔"

"ایک وقت کھانا نہ ملنے سے کیا ہوگا۔ مرغا بنا دو اسے۔"

وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ "چل۔ بن جا مرغا۔"

اور جب وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا تو باپ نے اپنی آواز میں کئی بادلوں کی گرج بھر کر ڈانٹا۔ "چلتا ہے کہ —"

وہ سہم گیا۔ باپ نے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ وہ جا کر دالان میں مرغا بن گیا۔

چراغ جل گئے۔ سب سوائے نانی کے کھانا کھا چکے۔ باپ اور ماں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور وہ مرغا بنا رہا۔ اس کے ہاتھ دکھنے لگے۔ اس کی کمر دکھنے لگی۔ اس کے کان جلنے لگے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ وہ دبا نہیں۔ سزا نے اس شے کو جو اس کے اندر کہیں چھپی ہوئی تھی اور جو کبھی کبھار پگھل پگھل کر اس کی آنکھوں کے راستے بہا کرتی تھی سخت کر دیا تھا۔ دو ایک بار اسے یہ خیال آیا کہ چپکے سے باورچی خانے میں سے کچھ نکال کر کھائے۔ خالی روٹی ہی سہی اور پھر مرغا بن جائے مگر اس نے اس خیال کو زیادہ دیر اپنے ذہن میں نہیں ٹھہرنے دیا۔ کوئی چیز اس کے اندر کمان کی طرح کھنچ گئی تھی جو اس فعل کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ کوئی چیز جو اس سے کہہ رہی تھی کہ میرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ مجھ پر ظلم ہو رہا ہے۔ تو اس ظلم اس ناانصافی کا مقابلہ چاہے کسی طرح کر چوری کر کے نہ کر — ہاں چوری! بھیا جو آرام سے بستر میں گھسا کتاب پڑھ رہا ہے کیا کہے گا! اور نانی کیا کہے گی جو نہ جانے کیوں چپ ہیں۔ جو نہ جانے کیوں لیٹی نہیں۔ جو بیٹھی ہوئی نہ جانے کیا سوچ رہی ہیں!۔

لیکن اس کے جسم میں ایک اور شے بھی تھی جو پہلے تو آہستہ آہستہ اس کے معدے کو کھرچ رہی تھی اور اب گویا نکوے چاقو ؤں سے اس میں ہزاروں نہیں لاکھوں چھید کر رہی تھی اور آہستہ آہستہ یہ شے اس کے اندر کی دنیا کی دیگر تمام اشیا پر حاوی ہو گئی۔ اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

باقی صفحہ ۱۹۲ پر

سے لوکی کا بھرتہ نکال کر تام چینی کی رکابی میں رکھ دی ہیں اور
اب چولھے پر سے ماش کی گھی میں گھٹی ہوئی دال کی دیگچی اٹھا
کر اس چارپائی کی طرف اور اب روٹی نکالنے کیلئے انھوں
نے بھگونہ کھولا ہے اور اب وہ سینی اٹھا کر اس چارپائی کی طرف
چلی ہیں جس پر بیٹھ کر ابا کھانا کھاتے ہیں۔

قبرستان کی طرف جانے سے پہلے اس نے باورچیخانے
کا ایک چکر لگایا تھا اور ماں کو لوکی کا بھرتہ بنانے اور ماش
کی دال گھوٹتے دیکھا تھا۔ اسے یہ دونوں چیزیں بہت پسند
تھیں۔ لوکی کا بھرتہ میں پٹنے کی مرچوں کے بڑے بڑے
ٹکڑے پڑے ہوتے تھے اور ماش کی اجلی دال جسے خالص گھی
میں خوب گھوٹا جاتا تھا۔ بھرتے اور دال کا خیال آتے
ہی اسے بھوک لگ آئی مگر یہ سوچ کر کہ ابھی تو اماں ابا کو کھانا
کھلا رہی ہوں گی اس نے اپنی بھوک کا ذکر نانی تک سے نہیں کیا
اور تھوک نگل کر ان آوازوں کا انتظار کرنے لگا جو اسے
بتائیں گی کہ اب ابا کھانا کھا چکے۔

جب کلی کرنے اور دوبارہ برتن کھٹکنے کی آواز
آئی تو اس سے نہ رہا گیا اور وہ دبے قدموں ڈیوڑھی کی
طرف چلا۔ نانی نے جو وظیفہ پڑھتے وقت منہ میں گنگنایا
کرتی تھیں "ہوں" کی تو وہ لمحہ بھر کے لئے رکا مگر اس کی سمجھ
میں اس "ہوں" کا مطلب نہ آیا اور وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوگیا

ڈیوڑھی کا دوسرا دروازہ اس دالان میں کھلتا
تھا جس میں کئی پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ دالان سے ملحق باورچیخانہ
تھا جو اس جگہ سے صاف نظر آرہا تھا جہاں وہ ڈیوڑھی میں
کھڑا ہوا تھا۔ اور دالان کے سامنے چوکور صحن تھا جو باہر والے
صحن سے چھوٹا تھا۔ صحن کے بعد ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں
باپ اور ماں منے کے ساتھ سویا کرتے تھے اور جس کا دروازہ
اکثر بھڑا رہا کرتا تھا۔ دروازہ اس وقت بھی بھڑا ہوا تھا۔
صحن میں اس کے باپ بغیر کالر کی قمیص کے اندر ہاتھ ڈالے
ٹہل ٹہل کر پیٹ سہلا رہے تھے۔ اور اس کی ماں باورچیخانے
میں کھٹر پٹر کر رہی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ دالان پار کر کے باورچیخانے میں
گھس گیا اور ماں کے سامنے بت بن کر کھڑا ہوگیا۔

"کیوں آیا ہے یہاں!" ماں نے غصّہ سے مگر آہستہ سے کہا۔

"بھوک لگی ہے۔"

"لگا کرے۔ میں نے کہہ دیا آج نہیں ملے گا تجھے کھانا۔"

"بہت بھوک لگی ہے۔" وہ گڑگڑایا۔

"کچھ بھی ہو۔ آج تجھے بھوکا ہی سونا پڑے گا۔ تیری
یہی سزا ہے۔"

"کیا بات ہے؟" باپ نے ٹہلنا جاری رکھتے ہوئے ایک
لمبی ڈکار لے کر پوچھا۔

ان کی آواز میں گرج تو وہی تھی جس سے وہ سہم جایا
کرتا تھا مگر غصّے کی تلوار نہیں تھی ـــــ ابا اتنے برے نہیں
اماں بلاوجہ ڈرایا کرتی ہیں۔ پیار بھی کرتے ہیں۔ کل لیمونس
لاکر دیئے تھے ـــــ

وہ لاڈ میں آگیا ـــ "دیکھو ابا۔ اماں کھانا نہیں دے
رہی ہیں۔"

"کیوں نہیں دیتیں کھانا لال بیٹے کو؟"

اب دیکھیں کیسے نہیں دیتیں کھانا۔ لال بیٹا! ـــ
میں تو کالا ہوں۔ مگر ابا مجھے ہمیشہ لال بیٹا کہتے ہیں۔

"میری شکایتیں کرنے چلا ہے۔" ماں اٹھ کھڑی ہوئیں
"اور اپنے کرتوت نہیں بیان کرتا۔"

"ہوا کیا؟"

"دیکھو ابا۔" وہ صحن میں آگیا اور باپ سے قدم ملانے
لگا۔ "وہ ننھوا ہے نا وہ ننھوا۔"

"ہوں!"

"..... تو وہ ننھوا اس کتّے کو مار رہا تھا۔ جوتوں سے۔"

"کیوں؟"

"..... کہتا تھا میرے ...ن روٹی نہیں دیئے کتّے"

"یہ کمبخت فقیر ہر وقت لڑا کرتے ہیں۔"

"...... ہاں ـــ اور ابا وہ اس بیچارے کو کنکروں پر گھسیٹ رہا تھا اور اس کے......"

"ہوں۔"

آمنہ ابوالحسن

میری مَیّا

دھول کے بگولے کے ساتھ وِنایک میدان میں نمودار ہوا تو انجور کترتی ہوئی ریشمی بڑے ضابطے سے بولی۔

"کمائی ——؟"

وِنایک نے جواب دینے کے بجائے تھیلا ایک طرف کھڑا کیا، ترازو اور بٹیوں کا صندوق اندر کوٹھری میں لے گیا، باہر آکر تہبند جھٹکا۔ پھر ٹاٹ پر بچھے ہوئے گندے بورے پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

ریشمی نے پھر اپنا سوال دہرایا "آج کی کمائی —؟"

ریشمی یہ سوال بڑی باقاعدگی سے پوچھا کرتی تھی۔

اسی سوال سے تھک کر اس کا بڑا بچہ بابو اس سے الگ ہو چکا تھا اور اب وِنایک تھا جو راستے کی دھول کی طرح اس سوال کا بوجھ چپ چاپ برداشت کر رہا تھا۔ مگر جب اس سوال کی گونج کم نہ ہوئی تو وہ جھنجھلا کر بولا۔

"چپ رہ۔ بڑے بھائی کو بھگا کر چین نہیں ملا؟"

لیکن ریشمی اس دھمکی سے خاموش نہیں ہوئی۔

"باپ کی کمائی نہیں، کھی ہوئی ہے۔"

اس نے اپنے کس بل والے جسم کو جو اب عمر کی وجہ سے ڈھلک گیا تھا تیز حرکت دی۔

"باپ کا نام مت لے ورنہ ......"

"برابر لوں گی۔ سو دفعہ لوں گی بھگوڑا بھگوڑا۔"

"تو نے ہی تو اسے بھگایا اور اب الٹا بکھان کرتی ہے۔"

بورے سے اٹھ کر وِنایک نے ماں کے بال پکڑ لئے، پھر پیروں کے چکروں کے ساتھ ساتھ دھول کے بڑے بڑے مرغولے میدان میں پھیلنے لگے اور راہ چلتے ہوئے لوگ تماشہ دیکھنے کی غرض سے آ جمع ہوئے۔

ارے رے رے۔ بوڑھی کو مارتا ہے —

کیسا بیٹا ہے تو، ماں پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔

کیسا زمانہ آگیا یارو ——

بڑی جنگلی قوم ہے، شہر میں آکر بھی ....

ان کی باتوں سے بے پرواہ وِنایک ماں کو دھڑا دھڑ پیٹتا رہا۔

"اگر ابکی تو نے میرے باپ کو بھگوڑا کہا تو ......"

اور ریشمی بیچ بیچ میں وِنایک کی جیب ٹٹولتی رہی —

"بتا کتنا لایا ہے آج —"

کالے بابو نے آکر پہلے تو تماش بینوں کو بھگایا، پھر ماں بیٹے کا تصفیہ چکایا

"مت لڑ موسی، کیوں تماشہ بنتی ہے۔"

"میں اپنے مرد کو گالیاں دے رہی ہوں اس کا کیا بگڑتا ہے"

"تیرا مرد میرا باپ ہے۔"

وِنایک پھر اس کی طرف جھپٹا، لیکن ریشمی اس بار آگے بڑھ گئی۔ وِنایک کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ اس نے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لیا تھا۔ بدن کے ایک ایک جوڑ کو سہلاتے ہوئے اس نے انجور کی تر بتر ڈھیری ٹوکری میں جمع کی، پھر ٹوکری اندر رکھ آنے کے بعد دکھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نکال پیسے —— دارو پیوں گی۔"

شوکت تھانوی نمبر اور افسانہ نمبر کے بعد

ماہنامہ کتاب کا

ایک اہم اعلان



جو

اسی سال پیش کیا جائے گا

۳۰۰ صفحات کے اس ضخیم نمبر میں ۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے اُن تمام ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی غیر مطبوعہ اور نمائندہ تخلیقات شامل ہوں گی جو انھیں اردو مصنفین میں ایک نئی تخیل، نئی فکر اور نئی آواز کا مقام بخشتی ہیں۔

اس نمبر کو

اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہوگی

تفصیلات کے لیے آئندہ شمارہ دیکھئے

پان کلّے میں دبایا، اندھیرے سے اس کی آنکھیں خوب مانوس ہو چکی تھیں۔ اس لئے بغیر کسی دقت سے سوکھی گھاس کی آڑیوں میں سے پکے پکے آم ٹٹول کر نکالے بڑے بڑے پیلے آم چھانٹے۔ ٹھیلے پر رنگین کاغذ بچھا کر سنہری آموں کی ننھی ننھی ڈھیریاں لگائیں، پھر ترازو اور پیسوں کا صندوق ٹھیلے پر ایک کونے میں رکھا۔ اتنا کر کے اس نے دیوار سے اپلے چن کر چولھا گرم کیا، جوار کی موٹی موٹی روٹیاں گوندھیں، لہسن اور ہری مرچ کی چٹنی کوٹی، تب دنایک کے پاس آئی۔

"او بھتیا رے اٹھتا کیوں نہیں"

"بھتیارے نے اٹھنے کے بجائے ایک زوردار جمائی لی، پھر کروٹ بدل کر اطمینان سے سو گیا۔ تڑ تڑ — رشیمی نے اس کی کمر پر دو تین گھونسے رسید کئے۔

"اٹھ صبح ہو گئی"

دنایک نے آنکھیں کھولیں تو صبح واقعی مسکرا رہی تھی، اس مسکراہٹ کی تازگی نے اس کے انگ انگ میں پھرتی بھر دی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر نل پر کلّی کی، جوار کی روٹی چٹنی اور پیاز سے کھانے کے بعد ٹھیلہ ڈھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا رشیمی نے ایک خاموش سکون کے ساتھ اسے راستے کی دھول میں گم ہوتا دیکھا۔ پھر بچی کیریوں کی ڈھیری سمیٹ کر اچار کاٹنے بیٹھ گئی۔ ڈھیر دں اچار سوکھا ہوا اس کی کوٹھری میں محفوظ تھا۔ جب آموں کا موسم ختم ہو جاتا تو لال مرچ اس کی جگہ لے لیتی یا پھر بھاؤ نہ بننے کی صورت میں جنگل تو تھا ہی — تیتر بٹیر اور لوے پکڑ کر شہر میں بیچتی۔ اس کی ساری زندگی کا انحصار محنت پر تھا اور محنت کے معاملے میں رشیمی بڑی اکھنڈ — زمانے کی چکی میں گھس پس جانے کے بعد بھی وہ جوان لڑکیوں کی طرح جی دار تھی۔ بیٹے کی ذرا سی کاہلی برداشت نہ کر پاتی اپنے جوان بیٹے کے بیٹے کے ساتھ سوکھے مارے کالے بابو کو دیکھ کر وہ بری طرح ترس کھاتی۔

"او رے تو بھی اب گھر کر لے" وہ اس کی جان کھاتی

"نہیں موسی"

کالے بابو کو سلاخوں کے پیچھے بیمار باپ اور بھٹکتے ہوئے بہن بھائی یاد آجاتے۔

"تو میری فکر مت کر"

وہ بڑے چاؤ سے پہننے لگتی چاندی کی زنجیر، دو جوڑہ ہاتھ کے کڑے، دو جوڑی کان کی گنٹیاں، دو جوڑی پیر کے چھلے دو جوڑی — لیکن کالے بابو اس کی گنتی کا سارا مزہ کرکرا کر دیتا۔

"مجھے نہیں کرنا ہے گھر"

"کب تک اپنا پیٹ دیکھے گا۔ بہو نہیں لائے گا ماں کی خدمت کے لئے"

کالے بابو فکر میں ڈوب جاتا۔

"تیری ماں تو ڈائن ہے، کوئی لڑکی اسے پسند نہ آئے گی۔ تھو" وہ زمین پر تھوک دیتی۔

"ماں کو مت بول موسی" کالے بابو کی آنکھیں بھر آئیں

"ڈائن ہوتی تو بچوں کی مونڈیاں مروڑ کر دوسرے کے ساتھ بھاگ نہ جاتی، محنت مزدوری کر کے تکلیف اٹھا کے بچوں کو کیوں پالتی" اسے یکایک گھر کی یاد آجاتی اور پھر کوس کا فاصلہ قدموں تلے پھولوں کی طرح سرک جاتا۔ پھر جب گندے لڑاکو بہن بھائیوں اور کوٹھو میں جتی ہوئی ماں سے دل بھر جاتا تو کالے بابو سر میں خوشبو دار تیل ڈالنے، سنیما میں وجینتی مالا، مدھوبالا کا ناچ دیکھنے، گھاٹ سے بیڑیاں اڑانے پھر شہر لوٹ آتا۔ کبھی کبھی وہ جیل کی طرف بھی نکل جاتا، تب لوہے کا بڑا سا پھاٹک اور اس کے قریب بیٹھے ہوئے دربان کو دیکھ کر اس کا جی چاہتا کلہاڑی یا کیریاں کاٹنے والے چاقو سے دربان کا سر آلو موٹی کی طرح چھیل کر رکھ دے۔ لیکن فوراً ہی سلاخیں آگے بڑھتی ہوئی نظر آتیں اور دو اڑھائی کوس پرے سے اس کی ماں کمزور آواز میں چلاتی۔

"پہلے مجھے مار ڈال — پہلے مجھے مار ڈال۔

کالے بابو چپ چاپ لوٹ آتا اور دنایک کے بازو میں گر کر سستے تیل کی تیز خوشبو اپنے نتھنوں میں کھینچنے لگتا جیسے

ونایک نے ایک بار اسے گھور کر دیکھا، پھر تہبند کی گرہ سے آٹھ آنے نکال کر اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"میں تو پورا روپیہ لوں گی۔"

رشمی دھاروں دھار رونے لگی اور ونایک نے پورا ایک روپیہ ماں کی ہتھیلی پر دھر دیا۔

"منہ کالا کر"

پھر وہ بورئیے پر چت لیٹ گیا جیسے انتہا تھک گیا ہو۔ دن بھر گلی گلی گھومنے کے بعد اس ورزش نے اس کا عضو عضو تھکا دیا تھا۔ یکایک اس نے بازو میں بیٹھے ہوئے کالے بابو سے کہا۔

"چل آج ذرا سی نشا دیکھیں۔"

کالے بابو نے بیڑی کا دھواں اپنے کھوکھلے سینے سے باہر اگل کر کہا۔

"نہیں۔ موسی گالیاں دے گی۔"

"چولھے میں جائے موسی، ڈرتا کیوں ہے"

"تو اسے بہت مارتا ہے یار۔" کالے بابو نے دفعتاً شکایت کی۔

"نہ ماروں تو وہ ناگن میری ہڈیاں تک ڈس لے۔"

"لیکن اس کے بڑھاپے کا تو خیال کر۔"

"بوڑھی ہو گئی، پیسے کا لالچ کم نہ ہوا، آخر کہاں تک بھرتا جاؤں۔"

"پیسہ ہی تو انسان کی کمزوری ہے، سچ کہتا ہے۔"

کالے بابو کو یکایک اپنا باپ یاد آ گیا۔ جس نے بڑے بیشمار مریض بچوں کو پیدا کرنے کے بعد اس کے باپ نے حالات سے مجبور ہو کر چوری شروع کر دی تھی۔ کالے بابو نے کتنی بار سمجھایا۔ تو فکر مت کر میں سب کو پالوں گا۔ لیکن اس کے باپ نے چوری نہ چھوڑی۔ اب سلاخوں کے پیچھے بند دنیا کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا اور یہ نگاہ کبھی کالے بابو کے ذہن سے محو نہ ہوتی تھی۔

"چل یار" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وجینتی مالا کی پکچر دیکھ کر جب وہ واپس لوٹے تو کوٹھڑی کے سامنے رشمی شیرنی کی طرح چوکس بیٹھی ہوئی تھی۔

"حرامی پھر سنیما گیا تھا نا۔۔۔؟"

"ہاں گیا تھا"

اس بار رشمی نے کس کر ایک جھانپڑ ونایک کے منہ پر مارا۔

"مجھے پیسے نہیں دیتا، سنیما میں کیا تیرا سالا بیٹھا ہوا ہے آخر تیری شادی کے لئے کپڑے لتے کس طرح بناؤں۔"

شادی کے ذکر پر ونایک کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ رشمی کا ہاتھ مروڑتے ہوئے بولا۔

"اچھا اچھا اب بڑ بڑ نہ کر مجھے سونے دے۔"

"میں کہتی ہوں حساب بتا"

"دے لے"

ونایک نے اپنی خالی جیب الٹ دی تہبند کی گرہ کھول کر دکھائی، تب رشمی خالی ڈبے کی طرح زمین پر لڑھک گئی"

"سب پیسے ختم ہو گئے اور آج کی بچت میں کچھ نہیں، میری میاں۔۔۔" وہ زور سے چلا کر رونے لگی

"میں اس چھوکرے کو کیسے سمجھاؤں۔۔۔"

"بھلوان کے لئے موسی چپ رہ" کالے بابو نے پیروں تلے مسل ڈالی۔

"وہ وار دو تک تو نہیں پیتا۔ چپ ہو جا دن بھر محنت کرنے والوں کی نیند خراب نہ کر۔"

لیکن رشمی برابر چلاتی رہی"

"اٹھنے دے سب لوگوں کو میں ان سے کہوں گی بیٹا غنڈہ، بد معاش، لفنگا ہو گیا ہے۔ کمائی کر کے سب اڑا دیتا ہے، میرے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہیں لا کر رکھتا۔ میری میاں باپ کے قدم بہ قدم چل رہا ہے" وہ چلاتی رہی اور ونایک اس چیخوں اور کالے بابو کی خوشامدوں سے بے خبر بورئیے پر گرگرا کر خراٹے لینے لگا۔ خوب شور مچانے کے بعد رشمی نے جسم کے دکھتے ہوئے حصوں کو ہلدی اور چونے کا لیپ لگایا۔ پھر خود بھی بورئیے پر اس کے بازو پڑ رہی۔ صبح جب چڑیوں نے چہچہانا شروع کیا تو وہ سب سے پہلی اٹھی۔ میونسپلٹی کے نل پر کلی کر کے

ململ کے پیلے کرتے اور سلک کے سرخ تہبند میں اس کا جسم شہتا ہوں کی طرح اکڑنے لگا۔ نقلی ریشم کی سرخ دستی بکھرے ہوئے بالوں پر مرصع تاج کی طرح کس کر اس نے اڑان بھری اور ناچتے ہوئے لوگوں کے دائرے میں آ گیا۔ ڈھول کی لے تیز ہو گئی۔ ناچ رے مورا.... زمین آسمان چاند تارے سب ناچنے لگے! اور اس تیز دھمک کی تاب نہ لا کر جب وہ رکا تو پولیس اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا چکی تھی۔

"جمعدار جی" ریشمی زخمی ناگن کی طرح لپکی آئی۔ ناچ رک گیا۔

"کیا بات ہو بھائی" کالے بابو نے تھوک نگل کر رسان سے پوچھا۔

"بہت معمولی" جمعدار ہنسا

اس کڑوی ہنسی نے کچھ دیر کے لئے ہر طرف زہر گھول دیا۔

"تو پھر بتاتا کیوں نہیں منہ سے پھوڑ، پھوٹ گیا ہے کیا"؟

"چپ رہ ری" کالے بابو نے ریشمی کو پرے ڈھکیل دیا۔

"کیا بات ہے جمعدار جی"

"تھانے چل کر خود ہی پتہ چل جائے گا"

"پھر بھی کچھ تو بتاؤ"

"اسی سے پوچھ لو"

کالے بابو نے آہستہ سے دنایک کے کندھے پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔

"ہاں" دنایک بولا "میں نے اس کا خون کر دیا اس نے شکنتلا پر الزام لگایا تھا"

"نہیں" کالے بابو چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔

"جھوٹ بالکل جھوٹ" ریشمی لوگوں کی گرفت سے آزاد ہو کر چلائی۔

"ہی ہی ہی" جمعدار دانت نکوس کر ہنسا۔

"بول سچی سچی بول" ریشمی نے دنایک کی کمر پر دھڑ

جائے۔

"بولے گا کیا خاک۔ خونی۔ چل چل"

ریشمی نے آگے بڑھ کر جمعدار کی کلائی میں اپنے دانت گڑو دیئے لوگوں نے بمشکل اسے الگ کیا۔ جمعدار نے اسی زخمی کلائی سے کس کر ایک چھاپڑ ریشمی کے گال پر رسید کیا—

"خونی بیٹے کو جن کر اتنا غرور۔ پیروں میں بیڑیاں ڈال کر بٹھایا کیوں نہیں گھر میں"

"وہ بے دردی سے دنایک کو کھینچتا ہوا لے چلا— کالے بابو مبہوت کھڑا رہ گیا—

ہا.... ریشمی چکرا کر زمین پر گر گئی۔

ڈھول کے مرغولوں میں دنایک اپنے تنومند جسم کے ساتھ کٹے ہوئے پیڑ کی طرح کھنچا چلا گیا۔ اس کی دھندلائی ہوئی صورت چلاتی رہی ——"بروا مت کر، شکن میں جیل کاٹ کر واپس آؤں گا پھر تو اور میں مل کر دادو بیس گے، ڈھول کی گت پر ناچیں گے اور ہاں میرے پیچھے ماں کا خیال رکھنا بھی...

پھر اس کی دور ہٹتی ہوئی صورت تیزی سے چکراتی ہوئی دھول میں غائب ہو گئی اور دنیا بھر کی لال مرچیں بوروں سے اڑ اڑ کر ریشمی کی آنکھوں میں بھر گئیں۔ میری میّا۔ میری میّا وہ جلن کی تاب نہ لا کر سینہ کوٹ کوٹ کر چلانے لگی۔ اور آگ بھڑا ہوا کوئلہ دفعتاً بجھ کر راکھ ہو گیا۔ شیشے کا کیس جھٹکے سے پھوٹ گیا اور ساری کانچ شکن کے مضبوط توانا جسم میں کھچاکھچ چبھ گئی۔

نقلی ریشم کی سرخ دستی دھول میں اٹی پڑی تھی شکن نے لپک کر اٹھا لی پھر اسے سینے سے بھینچ بھینچ کر رونے لگی "اتنی سی دستی سے اتنا سارا خون کس طرح خشک ہو گا۔ میری میّا... میری میّا........!"

اسکے بازو میں ونایک نہیں سینما کی کوئی ہیروئن آلیٹی ہو۔ یہ وقت کتنا خوش گوار اور قیمتی ہوتا۔ "نکال بیڑی" وہ بڑے تحکم سے کہتا اور ونایک حیران ہو کر سوچتا۔ اس کے لہجے میں اتنا تحکم کہاں سے آ گیا۔ کہیں زمانے نے اسکے کان میں کوئی ہمت کی بات تو نہیں کہہ دی۔ تب اسے یقین ہو جاتا، سوکھے سینے والا مریل کالے بابو ابھی مر نہیں سکتا، کبھی مر نہیں سکتا، بیڑی سلگا کر وہ بڑی دلجمعی سے باتیں کرنے لگ جاتا۔ ان کا واحد موضوع سینما تھا۔ ہیرو، ہیروئن، ولن اور ویمپ۔ بڑے بڑے مفکروں اور مدبروں کی طرح دونوں ہر ہر سین پر اپنی اپنی رائے دیتے۔ پھر حقیقی زندگی سے ان کا تقابل کرتے، پھر جب وہ تھک جاتے تو گرم گرم روٹیوں کی مہک سونگھ کر سر سے پیر تک کمبل تان لیتے۔

رشیمی دارو کے نشے میں بری طرح آوازیں نکالتی یا ماضی کی یاد میں لمبی لمبی تانیں اڑاتی۔

"رنگ لیجائے گیمرد ـــ سیفالی آبرو رنگ لیجا۔"

کمبل کے اندر ونایک اور کالے بابو بھی ہلتے، عورت کا کچھ حصہ عمر کے ہر حصے میں جوان رہتا ہے، جیسے اس وقت رشیمی کا ذہن ـــــ اور بے سری تانوں کی گونج میں جھم جھم کرتی نیند ان کی آنکھوں میں اتر آتی۔ جب رشیمی گا گا کر تھک جاتی اور اسے یقین ہو جاتا کہ دونوں سو گئے تو وہ چپکے سے اٹھتی، دبے دبے قدم اٹھاتی کوٹھری میں جاتی، پھٹے پرانے کپڑوں کے گودام میں میلی میلی گدڑی کی گرہیں کھولتی، پھر آہستہ آہستہ زمین کے اندر ایک کونے پر کوئلے سے پکڑیں کھینچتی ـــــ ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی ملگجی روشنی میں اس کے بے ترتیب دانت کوندے کی طرح لپک اٹھتے، اس سال ضرور نفع ہو گا۔ ضرور گہنے تیار ہو جائیں گے۔ گھر میں بہو آ جائے گی۔ بہو کے تصور کے ساتھ ہی کیلوں کی ڈھیری بغیر ہاتھ لگائے کٹے ہوئے ایجو رمیں تبدیل ہو جاتی۔ پکے پکے آم خود ہی ٹوکریوں میں جا بیٹھتے پھر ٹھیلے پر چڑھ جاتے۔ سڑتے ہوئے آم خود بخود گھورے پر جا پڑتے۔ دھوپ میں سوکھتی ہوئی لال مرچ ادھکھلی میں جا گرتی، چوڑیاں بجتیں پسینے کے قطرے ٹپکتے اور پھر مٹی میں جذب ہونے کے بجائے چاندی بن کر اس کی ہتھیلی پر آ کر ہتھیلی میں جمع ہو جاتے، اتنا سارا پیسہ ہاتھ ہلائے بغیر اسے مل جائے گا۔ اسی خیال کے ساتھ ساتھ پھر دنیا جہان کا پیار امنڈ پڑتا۔ مضبوط جسم والی شکن۔ کوئلے کی طرح کالی لیکن فولاد کی طرح سخت، خوبصورتی نظر کی چیز ہے اور نظر کی غریبوں میں کوئی اہمیت نہیں۔

ونایک نے سنا تو صاف منحرف ہو گیا، لیکن کالے بابو نے پھر سمجھایا۔

"عورت گوری ہو یا کالی خوبصورت ہو یا بدصورت عورت ہی ہوتی ہے اور ہماری اندھیری کوٹھریوں میں وجنتی مالا یا مدھو بالا نہیں رہ سکتیں۔ سیتا، شکنتلا ہی رہ سکتی ہیں" تب۔۔ ونایک مان گیا۔ کالے بابو کی بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ پھر نظر کی تسکین کے لئے سینما کا پردہ تو ہے ہی۔ اس نے ماں کی ہتھیلی پر ایک دم پچاس روپے دھر دیئے۔ ماں ناچ اٹھی۔

پھر کیلوں کے سبز جھنڈوں تلے، ہرے بھرے منڈپ میں ہلدی سے اٹے پیلے پیلے ہاتھوں سے اس کی شکن کا سرخ سرخ پاؤ تھام لیا۔ بھر بھر ہاتھ سبز چوڑیاں اور زرد ساڑھی میں سیاہ روپ نکھر آیا تھا۔ جیسے کوئلے نے ایک دم آنچ پکڑ لی ہو یا کسی بدصورت بدنما چیز پر مول بڑھانے کے لئے کانچ کا نازک کیس چڑھا دیا گیا ہو۔

ونایک نے شکنتلا کی صورت نہیں دیکھی۔ اس کے جسم پر چڑھے ہوئے اپنے پچاس روپیوں کی چمک دیکھتا رہا۔ تب یکایک ڈھول بجنے لگا۔ ڈھم ڈھم ڈھم اور پھاوڑوں جیسے چوڑے چکلے بے ہنگم پاؤں دھرتی کے ملائم سینہ پر جنمی پھوار کی طرح برسنے لگے، اور ڈھول کے بڑے بڑے مرغولوں میں دارو نے تڑپ تڑپ کر ہرنوں کی طرح کلیلیں بھریں۔

"تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے چشم بد دور
۔۔۔ اور سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔۔۔

نئے پرانے گیتوں کا خوب خوب قیمہ بنا۔ ونایک نے پہلی بار دارو چکھی اور ساری دھرتی گھوم کر اپنے مرکز سے ہٹ گئی۔

جسم کو اٹھا کر دیوار کے پیچھے اچھال دیا۔ اب کون جانے یہ کب تک اس حال میں پڑے رہے اور کب رینگ کر باورچی خانے کی نالی میں آ پڑے۔

ان تمام معلومات کے بعد وہ بچہ مع ڈبے اور روئی کے پھل کے ان کو دیا گیا کہ یہ تو زندہ ہے اور آپ اس کو رکھ لیں۔ وہ ہنسنے "اسے بیٹا یہ مرنے کو پڑے ہیں بھئی ہم سے تو اس کی سیوا نہیں ہو سکتی۔ اب اس کو تم ہی رکھو۔" تحرکا۔۔۔ اس وقت حال اور بھی پتلا ہو چکا تھا۔ اس لئے ڈبہ لا کر ایک طرف ڈال دیا۔ مگر علّو کو اس کی برابر فکر رہی۔ اور وہ بار بار اس کو فرمائش کر کر کے جھنکواتی رہی۔ اور چلتے وقت تاکید کرتی گئی کہ سب مل کر بچے کا خیال رکھنا بھی نہ بھولے جائے۔

اور دوسری صبح بچے صاحب زندہ ہی نہ تھے بلکہ خاصے چونچال بھی نظر آ رہے تھے۔ اور اب چونکہ ان حضرت کا مرنے کا کوئی ارادہ ہی نہ تھا اور ان کے اصلی مالک نے بھی ان کو واپس لینے سے انکار کر دیا تو ظاہر ہے کہ ان کی ساری ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی تھی اور ہم سب مل کر ان کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

ابلے ہوئے چاولوں کو مسل کر چھوٹی چھوٹی گولیاں بنائی گئیں۔ پھر آماں نے بیٹھ کر بڑی محنت سے ان کو بھرایا۔ چار پانچ ہی دن کے بعد روئی کے پھل کی ضرورت باقی نہ رہی۔

اب سینچے ہوئے ننگے اور گنجے جسم پر پر بھی نکلنا شروع ہو گئے تو علّو نے تجویز کی کہ ان کا نام جمن رکھا جائے اس لئے کہ یہ جمعہ کے دن ملے تھے۔ ہم لوگوں کو اگرچہ یہ نام پسند نہ تھا۔ جمن نام کے ساتھ ہی ایک بیحد بیگلے بہت سے میلے منھ والے ملازم کا خیال آتا تھا۔ لیکن چونکہ یہ بچہ اٹھا کر لانے والی علّو ہی تھی۔ اس لئے اس کا نام رکھنے کا سب سے زیادہ حق اسی کو تھا۔

یوں تو جمن ہر طرح ٹھیک ٹھاک تھے لیکن ان کے کچلے ہوئے پیر میں بہت تکلیف تھی۔ وہ سوجا اور جھولا ہوا تھا۔ اور ذرا سی ٹھیس لگنے پر جمن صاحب لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ ان کی سرجری کا علاج ہمارے بھائی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ بانس کی کھپچیاں چھیل کر دو کھپچیاں پیر کے دونوں طرف باندھیں اور ایک کھپچی پنجے کے نیچے رکھ کر ہر طرف جکڑ دیا۔ دن بھر میں کئی مرتبہ کیلشیم کی گولی پیس کر اور گھول کر پلائی جاتی اور گھر میں جو بھی ٹانک موجود تھے ان کا ایک چمچہ ان کو گٹکھوا دیا جاتا۔ خدا جانے ان دواؤں کا اثر تھا یا ابلے ہوئے چاولوں کا کہ جمن نے آندھی اور طوفان کی طرح بڑھنا شروع کر دیا۔ خود ہم لوگوں کو بھی یقین نہ آتا تھا کہ چمک دار سفید سیاہ اور نیلے پروں والا اتنا بھاری اور چوڑا چکلا سمٹ۔ (زبلو کی ایک قسم) یہی ادھ موا بچہ ہے۔ ان کی ٹانگ اب تک بندھی ہوئی تھی اور چلتے میں

ایک پیر سے بڑی پیاری کھٹ کھٹ کی آواز نکلا کرتی۔ ان کی ٹانگ کے اوپری حصوں پر پٹی کی مالش بھی ہوا کرتی تھی۔ اور اب علّو دن کے دس بجے کے قریب ہاتھ میں ایک ننھی سی ٹوکری سنبھالے ان کے لئے قصائی سے چھیچھڑے لینے کے لئے جاتی تو وہ ضد کرتے کہ میں بھی ساتھ چلوں گا۔ اور جدھر وہ نکلی اور یہ جدھر بھی ہوتے فوراً ٹھمکتے ہوئے ہولئے چلتے۔ اس کے پیچھے روانہ ہو جاتے۔ وہ کئی کئی بار لا کر ان کو اندر کرتی پھر بھی نہ مانتے تو وہ ٹوکری زمین پر رکھ کر بیٹھ جاتی اور اس کے گلے میں اپنے ننھے منے ہاتھ ڈال کر اپنی چمکتی ہوئی خوب صورت آنکھوں سے اس کو دیکھ کر کہتی "ارے جمن یسنے مان بھی جا۔ ارے تو گاڑیوں تلے کچلا جائیگا ارے تجھے کتا پکڑ لے گا۔" وہ سب یہی کچھ تو کہتی۔ مگر جمن ایک ہی ہٹیلے۔ ضدی انھوں نے تو موت سے بھی ضد کی تھی۔ اس کی ایک نہ سنتے اور ٹھمکتے ہوئے اس کے ساتھ ہو جاتے۔ آخر وہی ہار جاتی۔ اب یہ دستور تھا کہ ہر روز جمن ٹھمکتے ہوئے ناؤں تاؤں کرتے قصائی کی دکان تک جاتے اور آتے۔ وہ آتی تو راستے میں ان کی کی ہوئی شرارتوں کا حال بیان کرتی اور ہم سب ہنستے ہم میں سے جو بھی گھر سے باہر جاتا اور واپس آتا تو سب سے پہلے یہی پوچھتا جمن کدھر ہے۔ رات کو سب مل کر بیٹھتے تو ضرور جمن کی کسی نئی حرکت پر باتیں ہوتیں۔ اب تو جمن رات کو بھی کمرے میں سوتے۔ بلی کی کیا مجال تھی جو ان کی طرف نگاہ بھی اٹھاتی۔ اور یوں جمن اب خاندان کی ایک مستقل فرد بن گئے تھے۔ ہمارے گھر میں بھی ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا جو کام کرنے کے بعد فضول پھرا کرتا تھا وہ بھی جمن کا بڑا ناز کرتا۔ شملے سے ہماری بہن آئیں اور جب واپس گئیں تو ہر خط میں باقاعدگی سے جمن کی خیریت پوچھوائیں۔ صرف ایک شخص تھا جو جمن کے خلاف تھا اور وہ تھا بابا۔ کھانا پکا رہا ہے اور پاس کھڑے جمن سے لڑ رہا ہے۔ ہم کہتے ہیں آگی ر آگی اس کا نکلا، تھا تم بڑے لاڈلے ہو۔ روز آتی تمھارے خاطر چاول ابالیں وغیرہ وغیرہ اور یوں پورا ایک سال گزر گیا۔ کچھ یوں لگتا تھا کہ جمن اور ہم سب یوں ہی ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں۔ اور پھر آٹھ دس مہینے گذر گئے۔ ایک اگست اور آ گئی اب دو مہینے بعد جمن کو آئے دو سال ہو جائیں گے۔ اس مرتبہ یہ طے ہوا کہ جمن کی سالگرہ منائی جائے گی مگر اکتوبر تو بہت دور میں آتا ہے۔

اگست میں بہت ہلچل سی مچنے لگی۔ سب لوگ کہنے لگے پاکستان بن گیا۔ انگریز چلے گئے۔ بظاہر کچھ نہ ... جشن کا ... دن پاکستان بنا خوشی کے مارے ہماری آماں کے آنسو بہنے لگے۔ ... نے ہماری زندگی میں اسلامی ریاست بنا دی۔ مبارک کم بخت کو نہ جانے کیا آفت تھی ہر وقت کہتا میں بھی اب پاکستان چلے بیگم صاحب یہاں جی نہیں لگتا۔

الطاف فاطمہ

جسمن

یہی اکتوبر کے سہانے سہانے دن تھے۔ ساون بھادوں کی لگاتار بارشوں سے پیچھا چھوٹ چکا تھا۔ اب وہ دم گھوٹنے والا حبس بھی ختم ہو چکا تھا۔ دھلے ہوئے نیلے آسمان تلے اکتوبر کی سنہری اور نرم نرم دھوپ میں نکھرے اور نہائے دھوئے ہرے ہرے اور دھانی دھانی پودے مسکرانے لگے تھے۔ کامنی اور گلاب کی جھاڑیوں کے ارد گرد شوخ اور رنگ برنگی پروں والی تتلیاں منڈلایا کرتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پرستان سے جوق در جوق پریاں اتر تی چلی آتی تھیں کہ ہر شخص کونوں کھدروں میں پڑا سہے۔

یہ بھی دوپہر ہی کا وقت تھا، ہم لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے اور اماں کی چوکی کے قریب ایک چھوٹے سے اسٹول پر بڑے خوبصورت سے کالے رنگ اور چمکتی چمکتی آنکھوں والی، یہ بھی کہ لڑکی عکو بیٹھی سلیٹ پر املا لکھ رہی تھی۔

"بیگم صاحب، بی بی آ دُں" اس نے پوچھا۔

جاؤ۔ اماں نے اس کی کتاب رکھ دی اور اپنی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگیں اور پڑھنے میں انھیں دھیان بھی نہ رہا کہ عکو پانی پلا کر ان کے پاس آنے کے بجائے باورچی خانے والے صحن کی طرف رینگ گئی ہے۔

خاصی دیر کے بعد اس کی ایک خوشی سے لرزتی ہوئی چیخ پر ہم سب اپنی اپنی طرف سے نکل کر اس اسٹول کے گرد جمع ہو گئے۔ اس لئے کہ وہ اب اسی اسٹول پر بیٹھی تھی، اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں کوئی چیز تھی جس کو وہ بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی۔

"اری پھلنک۔ یہ بطخ کا مرا ہوا بچہ کہاں سے سمیٹ لائی" اماں نے اس سے کہا۔ اور جواب میں اس نے بطخ کا ننھا سا خوش بچہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا جو بالکل ننگا تھا۔ پروں کے بجائے ان کے تنکے سے پھوٹ رہے تھے اور اس کی ایک ٹانگ بالکل پچکی ہوئی تھی۔ "ارے بار، ابھی جی رہا ہے" انھوں نے اس کے جسم کی گرمی محسوس کر کے کہا۔ اور پھر دونوں ہاتھوں سے اس کو خوب سہلایا۔ آنا فانا لیمپ کی گرمی پا کر اس کے جسم کو حرکت ہونے لگی۔ اماں کو حرکت کرتے دیکھ کر پھر اس کے انتظام میں لگ گیا۔ اسی وقت جوتے کا ایک خالی ڈبہ تلاش کیا گیا اور پرانی کا ایک پھل بچھایا گیا اور کچھ دیر بعد اس ادھ موئے بچے کو اس میں دبکا کر لٹا دیا گیا۔

"ارے یہ کہاں سے مل گیا عکو سے" سب نے بیک وقت سوال کیا۔

"یہ باورچی خانے کی نالی میں باہر سے رینگ کر آ گیا تھا اور وہاں ہی میں پڑا تھا میں لائی۔" وہ اپنے کارنامے پر بہت خوش تھی، اور ہم سب اس طرح خوش تھے جیسے کوئی خزانہ مل گیا ہے۔

"ارے کبھی معلوم تو کرو کہ یہ بچہ کس کا ہے"۔ اماں نے کہا۔ تقریباً آدھے دن کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ کالج کے چپراسی خاں صاحب نے کچھ تمدو ں کے مرغی کے انڈوں کے ساتھ جو بطخ کا انڈا بٹھایا تھا وہ وقت پورا ہونے پر بھی کا توں ٹھس پڑا رہا اور جب کبوتری مرغی کے بچے نکال چکی تو اس نے بطخ کا وہ بس انڈا چھوڑ دیا۔ خاں صاحب کی بیوی نے اس انڈے کو اٹھا کر پھینکتے پھینکتے ہاتھ روک اور اٹھا کر گیہوں کے مٹکے میں ڈال دیا۔ آٹھ دس دن انڈا گیہوں کے دانوں میں پڑا رہا، پھر ایک دن مٹکے کے قریب سے آتے ہوئے چوں چوں کے شور کو سن کر اس کو آیا کہ اس نے مٹکے میں ایک انڈا ڈال دیا تھا اور مٹکا کھولنے پر معلوم ہوا کہ بچہ کچھ اس طرح نکلنے کی کوشش فرما رہے تھے کہ سر اور ٹانگیں ایک ساتھ آ نکلیں اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سر اور ٹانگیں باہر تھیں اور دھڑ چھلکے کے کوٹ پھنسا ہوا تھا۔ اس نے بے اختیاری سے بچے کو اٹھا کر دیکھا اور چھلکے کا کو توڑ کر اس کو آزاد کیا۔ آٹھ دس دن اور گزر گئے۔ اور بچہ خود بخود دبلا رسا ہو گیا اور اٹھا سلجھ گیا۔ دیکھتے دیکھتے وقت بالکل گنجا کیا ننگا ننگا لگنے لگا اور دوپہر کا یہ قصہ ہے اس دن یہ ہوا کہ بے دھیانی میں ساڑھے چھ فٹ خوب جوڑے چکلے خاں صاحب کھڑاویں پہنے ہوئے کھٹ کھٹ کرتے جو گھر میں گھسے تو ان کا ایک پیر ان کی کھڑاؤں تلے بالکل کچلا گیا۔ یہ اسی وقت پوٹ ہو گئے۔ ان کی ماں تو تھیں نہیں جو ان کے یوں چیل جھپٹے پر تا ئیں، کر کے گھر سر پر اٹھا لیتی۔ بس اتنا ہوا کہ خاں صاحب نے ان کے ننھے

رفعت نواز

اجنبی خیالوں کی ڈگر

کمرہ میں داخل ہوتے ہی میں نے میز کی طرف دیکھا۔ ہمیشہ باہر سے آتے ہی میز کی طرف دیکھتا۔ یہ کوئی ایسا پراسرار راز تو نہیں کہ آپ پر ظاہر نہ کر دوں۔ میز پر نوکر بڑے سلیقہ سے ڈاک رکھ دیتا تھا۔ اور باہر سے آتے ہی میں سب سے پہلے ڈاک دیکھتا تھا۔ جو میری روحانی تسکین کا باعث تھی۔

آج کی ڈاک میں ایک رسالہ اور ایک نیلا لفافہ تھا، بڑا خوبصورت، چھوٹا سا۔ میں نے پہلے لفافے کو سونگھا، بھینی، بھینی، گلاب کی مہک تھی۔ میں نے اسے بڑی احتیاط سے چاک کیا۔ اندر سے ہلکا نیلا کاغذ نکلا۔ جس پر باریک نسوانی تحریر تھی۔ اور مجھے پیارے کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ میں تحریر پہچان گیا۔ بالکل وہی تحریر تھی۔ چھوٹے چھوٹے گول گول حروف، انتہائی روشن بلیو بلیک روشنائی یہ تحریر سنیتا ہی کی تھی۔

پیارے روی۔

تمہیں خط پڑھ کر حیرت تو ہوگی اور ہونی بھی چاہیئے کوئی پانچ سال بعد تمہیں خط جو لکھ رہی ہوں۔ میں اپنی تعلیم اور دیگر مصروفیات میں ایسی الجھی رہی کہ بہت چاہتے ہوئے بھی تمہیں کچھ نہ لکھ سکی۔ (اس میں میری کاہلی کو بھی دخل ہے) یقین ہے تم میری اس غلطی کو معاف کر دوگے۔ نہ جانے کیوں (کبھی کبھی ایسا ہوتا ضرور ہے) آج تم یاد آگئے۔ میں ایک ضروری کام کے سلسلہ میں پرسوں رات کو ٹرین سے نظام آباد جا رہی ہوں۔ اور تمہارے مستقر سے بھی ٹرین گزرے گی۔ کیا تم اسٹیشن پر مجھ سے ملنے آؤگے۔ ملاقات ہو جائے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہیں پانچ سال بعد دیکھ لوں گی۔ اور باقی باتیں ملاقات پر۔

میں خط پڑھ کر خوشی سے پاگل ہو اٹھا۔ میں جو پچھلے تین سال سے ایک دفتر میں کلرکی کر رہا ہوں۔ جس کے خو صلے پست ہو چکے ہیں، جس کی امیدیں راکھ ہو چکی ہیں جو زندگی کو ایک بوجھ سمجھتے ہوئے گزار رہا ہے، میں جو اپنے آپ کو بہتر سمجھتا ہوں یا اور جو ذہنی طور پر مشکوک ہے جسے دوسروں کی بات پر کم ہی یقین آتا ہے۔ یہ امید بھرا خط پڑھ کر میں ایک بار پھر جھوم جھوم اٹھا۔ میں آج کل بالکل بھول گیا۔ ایک ہی لمحہ میں وہ دن، وہ شامیں، وہ راتیں میری گرفت میں آگئیں جنہیں میں بھول تو نہیں گیا تھا مگر جن پر وقت کی، ایک ایسے وقت کی جو بڑی تکلیف میں گزر رہا تھا گرد جم گئی تھی۔ اور عرفان کے اس ایک لمحے میں مجھے وہ تمام باتیں یاد آگئیں جنہیں میں نے پچھلے دو تین سال میں بہت کم یاد کیا تھا

ابتدائے جولائی کی بات تھی۔ کالج میں الکشن کا ہنگامہ تھا۔ میں سیکرٹری شپ کے لئے کھڑا تو نہیں ہوا تھا مگر رویندر کی طرف سے کینوسنگ ضرور کر رہا تھا۔ اور اس سلسلہ میں کالج کی تمام لڑکیوں سے بات چیت کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ اور خصوصیت سے فرسٹ ایر کی لڑکیوں سے زیادہ ہی۔ یوں بھی فرسٹ ایر کے لڑکے لڑکیاں اپنے سینیئر لوگوں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی سنیتا کی بات ہی نرالی تھی۔ میں نے جب اس سے پہلی بار رویندر کو ہی ووٹ دینے کے لئے کہا۔ تو وہ بڑی شوخی سے بولی۔ "آخر مگر کیوں" مرضی کا سوال ہے یہ تو، ہم جسے چاہیں ووٹ دیں، ہاں جب آپ کہتے ہیں۔ تو غور ضرور کر دوں گی۔

پھر دو چار بار سنیتا سے الکشن کے ہنگاموں میں بات چیت ہوئی۔ کبھی کامن روم میں، کبھی لائبریری میں، کبھی کینٹین میں، اور

تمھارا کون وہاں بیٹھا ہے۔ ہم لوگوں کو اس کی باتوں سے جلن آنے لگی تھی
کاہے کو اپنا گھر چھوڑ کر جائیں۔ "میرا وہاں سب کوئی ہے ارے ہم نے رات
دن سجدوں میں پڑ پڑ کر دعائیں مانگی ہیں۔ وہاں جا کر میں اس کی مٹی کو پیار
کروں گا۔ اس زمین پر سجدہ کروں گا۔" وہ کم بخت رونے لگتا۔

"ارے مبارک تجھے اپنا گھر نہیں یاد آئے گا"

"میرا گھر وہیں ہے اس گھر پر سے اپنی جان قربان۔" وہ پھر رونے لگتا،
"عجب پاگل ہے ایک ان دیکھی جگہ پر سے اپنی جان قربان کئے دے رہا ہے"
ہم لوگ اور گھبراتے۔

اماں اس کو سمجھاتیں "ارے مبارک بس بہیں بیٹھ کر خیر منائیں گے"
مگر رفتہ رفتہ گھر کا چین اڑنے لگا۔ پتہ نہیں کچھ ہر وقت گھر اکھڑا اکھڑا
سا نظر آتا کئی دن سے اماں بہت خاموش اور پریشان تھیں اور ہم انکو
چپ دیکھتے تو جمن کی شرارتوں کا ذکر شروع کر دیتے۔ ابھی جمن کی باتیں شروع
کر دیتیں۔ کئی ہفتے گذر گئے شملے سے ہماری بجی کا خط نہیں آیا تھا۔ اور
وہاں بڑی گڑبڑ تھی۔ اس لئے اب جمن بے چارہ بالکل چپ چپ الگ الگ
پھرتا تھا۔ اس کو کوئی چمکارتا بلاتا ہی نہ تھا۔ ہم سب بہت پریشان تھے
ننھیالے میں بھی گڑبڑ تھی اور وہاں بھی ہماری زمینیں اور سب کچھ تھا
وہاں سے خطوں کے جواب نہیں آتے تھے۔ اماں تو بس نماز اور قرآن شریف
پڑھ لیتیں اور خاموش بیٹھی رہتیں، مبارک خود ہی الٹا سیدھا کھانا پکا لیتا اور
ہر وقت اماں کو ورغلاتا رہتا سب باتوں کا ایک ہی علاج ہے پاکستان چلیو
وہاں تیری ننھیا بھی مل جائیں گی۔ اور ایک دن واقعی شملے سے ایک بہت
دن پرانا خط ملا سخت پریشانی کے عالم میں بجی نے لکھا تھا کہ ہم لوگ نہ معلوم
کدھر جا رہے ہیں۔ اس پریشان خط کے آخر میں بھی جمن کی خیریت پوچھی تھی
سب نے مڑ کر جمن کو دیکھا ارے ہم سب تو اس کو بھولتے جا رہے تھے۔
مبارک کے تقاضے اور بڑھ گئے تھے اور اس کمبخت نے ایک دن چولھا
توڑ کر پھینک دیا کہ اب پاکستان جا کر چولھا بناؤں گا۔ اور اب ان ٹوٹوں پر
کھانا پکا لیا کرو!

جس وقت گھر اجاڑ کر روانگی کا سامان شروع ہوا تو ہم کو معلوم تھا
مبارک پر ہی تھا۔ یہ اماں کو ورغلا کر لئے جا رہا ہے۔ مگر وہ آج تک یہی کہتی ہیں
کہ اس کے ورغلانے سے نہیں بلکہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے آنا ہوا۔
جمن تو بھی چلیگا ہمارے ساتھ ہم میں سے کوئی نہ کوئی برابر جمن سے

مطلب: جمن۔ اور مبارک کا کہنا تھا۔ آگئی یہ جمن ہی رو کے مونے ہے
سب کو۔ میں اس کا قورمہ بنا کر ساتھ لے چلوں گا۔ اور جس دن اس کو معلوم
ہوا کہ آج شام کو نوجی اسپیشل سے جانا ہے اس دن اس نے دوپہر کو باورچی
خانے کے صحن کی گندگی سی لگا لی اور کافی دیر کے بعد ہنستا ہوا بہت بڑا پتیل کا
طسلہ لایا جس پر دسترخوان ڈھکا ہوا تھا اور بولا آگئی آتا گوشت نکلا کہ آگئی
میں تو حیران ہوں اور کہہ کر دسترخوان ہٹا لیا واقعی پورا طسلہ بھرا ہوا تھا۔
ہم سب جمن کو اس حال میں دیکھ کر بہت روئے "آگئی دنیا چھٹی
جا رہی ہے تو کچھ نہیں اور یہ لوگ بیٹھے جمن کو رو رہے ہیں"۔ وہ طسلہ واپس
لے گیا۔

راستے بھر ہم لوگ بھوکے رہے جمن کا قورمہ کھانے کی ہمت نہ ہوئی
آخر دو دوسرے نوجیوں کو دیکھا ان سے وہ سونگھ لگی، ہنسی روٹی لے کر
کھائی جس کو اگر ہوں کھاتے تو ہرگز نہ کھائی جاتی
اس بات کو اتنی مدت گذر گئی ہے لیکن آج تک جب بھی کبھی کوئی
چمکتی ہوئی موٹی تازی سیاہ سفید اور نیلے پروں والی بطخ مٹک مٹک کر ہل ہل
کر چلتی نظر آتی ہے تو جمن کا خیال اس قدر اچانک آتا ہے جیسے کل ہی مبارک
نے اس کو ذبح کیا۔

وہ مٹکتی ہوئی بطخ اور اس کے ساتھ وقت کا تمام فاصلہ نہ جانے
کدھر چلا جاتا ہے۔ اس کی جگہ پر ہل ہل کر مٹک مٹک کر چلتا ہوا اصیلی اور
ہٹیلا جمن نمودار ہوتا ہے اور جس کے ساتھ ساتھ وہ چھوٹا سا خاموش اور
پرسکون گھر چپکے چپکے سرکتا چلا آتا ہے۔ جس میں ایک بار اپنے چار بچوں کے
ساتھ بڑا اچھا اور بے فکر وقت گزار رہی تھی۔ جس گھر میں کسی کی باتیں یا
برائیاں نہ ہوتی تھیں۔ ہر طرف کتابیں تھیں کہانیاں تھیں کبوتر تھے، بگلے تھے
مگو اور جمن تھا یوں لگتا ہے جیسے اب بھی ہمارے تمام کھیل اسی طرح رکھے
ہوں گے اور الماریوں میں سکول اور پیام تعلیم کے فائل سجے
ہوں گے۔ میزوں پر کورس کی کتابیں۔ تکیوں اور تتلیوں کے ذخیرے
رکھے ہوں گے۔ باورچی خانے کی چھت پر پھیلی ہوئی انگور کی بیل
میں گلہریاں پھدک رہی ہوں گی اور ایک دوسرے پر پھیلی ہوئی مالتی
پہ بہار آئی ہوگی۔ لیموں اور شہتوت میں اب بھی بور آتا ہوگا۔ اور دنیا
وہیں ہماری اور معصوم ہوگی۔

نے بہت اصرار کیا کہ چائے پی لی جائے۔ اس لئے دیر ہو گئی۔

ہم دونوں کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھ گئے۔ انتہائی خاموش۔ ہم نے کافی پی۔ پھر تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر سنیتا نے آہستہ سے کہا: "معمولی سی بات تو ہے۔ تم یوں ہی منہ پھلائے بیٹھے ہو۔"

میں بھرا تو تھا، کہہ اٹھا، "ہاں غلطی تو میری ہی ہے۔ مجھے تمہارے معاملات میں دخل ہی نہ دینا چاہیئے۔ میں تو بیوقوف ہوں کہ ہر ایک سے خلوص کی امید رکھتا ہوں۔"

"تم ایسا سوچتے ہی کیوں ہو۔ ہر شخص کو اس کے احساسات اور خیالات کو ظاہر کرنے کا پورا حق ملنا چاہیئے اور تم منہ سے یہ کیوں کہلوانا چاہتے ہو کہ کوئی تم سے کتنا خلوص رکھتا ہے؟"

بات بڑھ گئی تھی اور میں غصہ میں چلا آیا تھا۔ رات بھر بے چین رہا۔ دوسرے دن بھی گھر سے نکلا نہیں۔ شام کو مجھے اپنے کئے پر بہت افسوس ہوا، اور میں سنیتا سے معافی مانگنے کے خیال سے نکلا۔ ابھی چند ہی قدم گیا ہوں گا۔ کہ سنیتا تیز تیز قدم اٹھاتی آتی نظر آئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو دونوں خاموش تھے۔ اس کا چہرا بھی اترا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ بہت روئی ہے۔ ہم دونوں بنا کچھ کہے بازار کی طرف جا رہے تھے۔ ایک خاموش سے پرسکون ہوٹل میں ہم نے چائے پی۔ وہ بھی خاموش تھی۔ میں بھی چپ تھا۔

بہت دیر کے بعد میں نے بمشکل کہا تھا۔ "معاف کرنا سنیتا میں نے تمہیں کل تخت و سست کہہ دیا میں کل سے بے حد بے چین رہا اور بار بار اپنے کئے پر پچھتا تا رہا۔"

اس نے جھکی جھکی نگاہیں اٹھائیں اور میرے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ تم سمجھتے ہو کیا میں چین سے رہی، میں بھی بہت پریشان رہی ہوں۔"

میں نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔ ہماری دوستی میں یہ پہلا جسمانی لمس تھا۔ وہ خاموش رہی۔ میں نے زیادہ زیادہ ڈالا۔ تو اس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کیا تم سب ساتھیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہو؟"

"میں نے کہا تھا۔ "نہیں"

"پھر تم میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کرتے ہو؟ لو گ روئی ہیں تو مر جاؤ گی۔" اور وہ رونے لگی۔

میں نے کہا تھا: "پگلی اتنی معمولی سی بات تو ہوئی ہے۔ تم خواہ مخواہ روتی ہو۔ چلو آنسو پونچھ ڈالو، آج ہم ایک عہد اور کریں۔ کہ ایک دوسرے کو پریشان نہیں کریں گے۔ اور اس عہد کی استواری کے لئے ایک ایک کپ چائے پی لیں۔

پھر کبھی ہم ایک دوسرے سے خفا نہیں ہوئے وہ دن، وہ شامیں، وہ راتیں، پورے طلاپ کی تھیں۔ ان میں جدائی کا نام تک نہ تھا۔ نہ کوئی رقیب تھا نہ کوئی مخالفت نہ بندش ——

مگر نومبر کا وہ سرد سا، ابر آلود دن مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ رونندر کے نوکر نے ایک سبز لفافہ لا کر دیا تھا۔ جس میں سنیتا کی خوبصورت اور واضح تحریر تھی۔ بلو بلیک روشنائی سے لکھی ہوئی۔ "پتا جی کی طبیعت اچانک خراب ہونے کے کارن میں انکے پاس ابھی جا رہی ہوں وقت بہت کم ہے۔ اس لئے تم سے نہ مل سکی۔ میں تمہیں وہاں سے ضرور خط لکھا کروں گی۔"

اور وہ جدائی کے دن میں نے کس طرح گزارے۔ ان کا تصور کرتا ہوں۔ تو رونا آتا ہے۔ وہ بے مصرف دن، بیکار شامیں اور بے مقصد راتیں، وہ کچھوے کی چال چلتا، رینگتا ہوا ظالم وقت سنیتا کی جدائی نے مجھ سے زندگی تو نہیں چھینی، زندگی کی رنگینی اور امنگ ضرور چھین لی تھی۔ میں آگے نہ پڑھ سکا۔ دو سال یونہی آوارہ گردی کرنے کے بعد ایک دفتر میں ملازم ہو گیا۔ اور کسی طرح دن گزارنے لگا۔ ماں، باپ سے دور، دوست احباب سے دور ایک چھوٹے سے شہر میں اجنبیوں کی طرح ——

اور آج جب سنیتا کا خط ملا۔ تو میں پھر کا اٹھا ہوں۔ وہ دن مجھے پھر یاد آ گئے ہیں، میں حیران ہوں کہ اسے میرا نیا پتہ کس طرح معلوم ہوا، یقیناً اس نے کسی سے میرے متعلق تمام باتیں معلوم کر لی ہوں گی۔ وہ میرا اب بھی کتنا خیال رکھتی ہے —— میں نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ بڑا بے رونق لگ رہا تھا۔ میں نے بڑی محنت اور سلیقہ سے داڑھی بنائی۔ جسم رگڑ رگڑ کر نہایا۔ اپنے سب سے اچھے کپڑے پہنے اور پھر آئینہ دیکھا۔ بالکل بدلا ہوا چہرا نظر آیا۔ میں نے ایک کپ چائے پی کر سب پروگرام طے کر لیا۔ نوکر سے میں نے گھر صاف کرنے اور اچھا سا کھانا پکانے کو کہا

کبھی کالج کے کبھی جانب کے سنسان پورچ میں، وہی باتوں میں شوخی، اور آخر میں آپ کہتے ہیں تو مگر دان کی ـــــ

الکشن میں اس نے رونندر کا بہت ساتھ دیا۔ وہ لڑکوں لڑکیوں میں کینوسنگ کرتی پھری، اس نے گھنٹوں بیٹھ کر پوسٹر لکھے اور اشتہار بازی کے نت نئے طریقے نکالے۔ میں نے جب کبھی اس سے غیر معمولی دلچسپی کے متعلق پوچھا ـــــ تو اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "یہ سب آپ کے لئے، آپ کی خاطر کر رہی ہوں۔"

مگر راز تو رونندر کے منتخب ہونے کے بعد غیر مقدمی پارٹی میں کھلا، وہ رونندر کی پھوپی زاد بہن تھی اور رونندر کے یہاں رہتی تھی پھر تو ہم اکثر ملنے لگے، کبھی کافی ہاؤس میں، کبھی گرانڈ ہوٹل میں کبھی کلب میں، کبھی پارک میں اور کبھی سنیما میں! ـــــ مگر کالج میں وہ مجھ سے کم بات کرتی۔ اور جب کبھی کالج میں بات کرنے کا موقع آتا، بہت مختصر، شوخی اور چبھتے ہوئے لہجے میں بات کرتی۔ ہاں دوسری جگہوں پر وہ بہت سنجیدگی سے میری باتیں سنتی اور بڑے ترمیلے انداز سے، گہرائے لہجے میں خود بھی خوب باتیں کرتی

اور اس روز ہم گیارہ بجے رات تک گرانڈ ہوٹل میں مختلف موضوعات پر میٹھی باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ بہت خلوص سے اور انتہائی معصومیت سے میری باتیں سن رہی تھی۔ باہر بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ اور ہم چائے پر چائے چڑھا رہے تھے جب پانی ذرا تھما۔ تو ہم باہر نکلے۔ مگر سنیتا کے گھر تک پہونچے ہوں گے کہ پانی اور بڑھ گیا۔ میرا گھر اور تھوڑی دور رہا۔ سنیتا نے اس کے گھر کی گلی کے موڑ پر مجھ سے کہا تھا۔

"رو دی میں تمہیں گھر سے اپنی چھتری لا دیتی ہوں۔ ہاں تم اس دوکان کے شیڈ میں ٹھہر جاؤ۔ چونکہ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں اور تمہارا اس وقت میرے یہاں آنا ٹھیک نہیں لگتا۔ برا تو نہیں لگا تمہیں؟"

اس نے بہت قریب آکر کہا تھا۔ کتنا خلوص کتنی اپنائیت تھی، اس کے لہجے میں۔ جلد ہی وہ چھتری لے آئی تھی۔ "اچھا کل شام کو ملیں گے۔" اس نے چھتری میرے حوالے کی۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتے گھر چل دی۔

میں نے چھتری کھولی۔ تو ایک۔۔ خوشبو کا جھونکا سا آیا، اور راستے بھر میں اس کی مہکتی مہکتی چھتری کی خوشبو سے محفوظ ہوتا رہا پھر اکثر ایسا ہوا کہ ہم رات کے بارہ بجے تک ساتھ رہتے جاتے وقت اس کی وہی گھبراہٹ اور جلدی ہوتی۔ ان دنوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ ہم دونوں کی پسند ایک جیسی تھی، ایک جیسی کتابوں کا ہم مطالعہ کرتے۔ ایک دوسرے کی پسند سے چیزیں خریدتے اور ایک دوسرے کو تحفے دیتے۔

گرمیوں کی طویل چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔ روزانہ کے چھ بجے وہ اپنے گھر کے ورانڈے میں میری منتظر ہوتی۔ شام کو نہا دھو کر وہ ہلکا پھلکا لباس پہنتی اور تھوڑا سینٹ بھی کپڑوں پر لگا لیتی، ایک مست کن خوشبو اس کے جسم سے پھوٹا کرتی، جب وہ بڑی سنوری وقار سے آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلتی تو میرا سر غرور سے اٹھ جاتا۔ اور میں دیکھتا کہ راہگیر رک کر اسے ضرور دیکھتے اور کچھ تو ایسے بھی تھے جو روزانہ اسے دیکھنے کے لئے ہی ایسی جگہ ٹھہرتے جہاں سے وہ گزرتی۔ مگر وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کتنے اس کی آرزو میں تڑپتے ہیں۔

وہ وعدہ کی بڑی پابند تھی۔ جب بھی وعدہ کرتی ضرور ملتی۔ مگر ایک دن میں ہمیشہ کی طرح شام کے چھ بجے سنیتا کے گھر گیا، رونندر کی چھوٹی بہن منی نے کہا کہ "دیدی تو راہل کے ساتھ باہر گئی ہیں۔"

مجھے منی کی بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

راہل سنیتا کا ہم جماعت تھا اور تعطیلات میں اپنے وطن چلا گیا تھا۔ اور جانے کیوں آج آگیا کم بخت۔ مجھے سنیتا پر راہل پر اور اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ اور میں اسی جھلاہٹ میں تیز تیز قدم اٹھاتا گرانڈ ہوٹل کی طرف جانے لگا ـــــ راستہ میں ہی سنیتا اور راہل مل گئے۔ راہل نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا اور خیریت پوچھی۔ سنیتا نے رک رک کر میرے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "راہل آگئے تھے۔ ہم پروفیسر منجریکر کے مکان تک چلے گئے تھے۔ میں چھ بجے سے پہلے ہی گھر پہونچ جاتی۔ مگر راہل

رام لعل

سورج کا بوجھ

"لے بھئی نورے، سنبھال یہ کپڑے۔ املی کے نیچے جو ترے پر جو خالی مٹکا رکھا ہے اسی میں چھپا دینا۔"

"چاچا" اس نے ساون کے تیل سے چپڑے ہوئے بدن پر ہاتھ پھیرا اور بولا "بالکل سانپ کی طرح پھسلا پڑتا ہے۔ قسم خدا کی چاچا اگر کبھی دشمنوں نے گھیر بھی لیا تو ان کے ہاتھوں میں سے پانی کی طرح بہتے ہوئے چلے آؤ گے۔"

ساون مسکرایا۔ بولا "لا دیکھوں تیری بھی جلد' واہ! یہ تو ہاتھ میں رکتی ہی نہیں۔ جیسے پارہ ہو' پارہ' لے' گیا تیرا بازو۔ ٹھہر ذرا۔ گردن پر بھی ہاتھ رکھنے دے۔ واہ بھئی نورے واہ۔ اچھا جا اب۔ اپنے اور میرے کپڑے جلدی سے چھپا کر آجا۔ میں چلتا ہوں کربلا کی طرف۔ حاجی کی قبر سے گوڈک اور رپی لیکر سکھوں کی گلی کو چل دوں گا۔"

"چاچا آج اندھیرا بڑا زوردار ہے..... ہے نا؟"

"ہاں بہت ہی پیارا ہے۔ مہینے میں ایک ہی دن تو ایسا مبارک اندھیرا نصیب ہوتا ہے۔ وہی سب کا رازق ہے سب کو روزی دینے والا ہے۔"

نورا کپڑوں کی پوٹلی لے کر جابیر کے مندر کی طرف چلا گیا۔ اور ساون قبرستان کے اندر بھوت کی طرح داخل ہو گیا۔ سیاہ چھریرا اچڑا ہوا بدن' کسی ہوئی لنگوٹ' لمبے لمبے سنبھلے ہوئے ڈگ۔ وہ کہیں کہیں اچھل اچھل کر بڑھا۔ سیاہ آسمان پر حد نظر تک تارے ہی تارے جڑے ہوئے تھے۔ کسی قبر کی اوٹ میں کسی جانور کے ہڈی چبانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

وہ سیدھا حاجی لنگڑے کی کچی قبر کے پاس پہونچا۔ دو سرخ سلیٹیں دھیرے سے کھسکائیں۔ پھر اندر پورا بازو لے جاکر گھاس پھوس باہر نکال دیا۔ اس کے بعد لوہے کی ایک مضبوط اور وزنی چھینی' سلاخ اور ایک دستے والی نوکیلی رپی' دونوں کو ایک ایک ہاتھ میں لئے قبرستان کی پست قد دیوار پھاند گیا۔ اس طرف ایک تنگ سی گلی تھی' کوڑھی بھیک منگے' رکشے والے اور ریلوے یارڈ سے کوئلہ بیننے والے سبھی اپنی اپنی جھونپڑیوں کے اندر سو رہے تھے جنوری کی ٹھنڈی ہوا سے جھونپڑوں کے ٹٹر لڑکھڑا رہے تھے۔ گرمیوں میں یہ لوگ ساری گلی میں بکھر کر سوتے تھے۔ گزرنا ہی مشکل ہو جاتا تھا۔ یہاں ناجائز کوئلے کا پورا ڈپو قائم تھا۔ کوڑا پھینکنے کے احاطے میں سوروں کی سوں سوں سنائی دے رہی تھی گڑ اور تیل کے سیو بنانے والے رام روپ کا کھوکھا بھی ٹٹر سے بند تھا۔ ساون سامنے گزرا تو اس کے نتھنوں میں گڑ اور تیل کی بو گھس گئی۔

سرد ہوا کے کئی جھونکے لگاتار آئے۔ اس نے اپنے بدن کو مدافعت کے لئے تیار کر لیا۔ ایک لمبی سانس لے کر بدن کو پھر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب وہ گلی کے سرے پر پہونچ گیا تھا۔ یہاں سے وہ نالے میں اتر گیا۔ یہ نالہ سطح زمین سے پچیس تیس فٹ کی ڈھلان کے درمیان واقع تھا۔ سارے شہر کی گندگی لے کر چلتا تھا۔ بڑی بدبو اٹھ رہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر چلتا رہا۔ نالے کے کنارے کنارے سیمنٹ سے بنا ہوا صاف سیدھا راستہ تھا۔ ایک جگہ ڈھلان پر مکان کا کوڑا کرکٹ بہتا پھیلتا ہوا نالے کے کنارے تک جمع ہو جاتا تھا۔ وہاں بھی سور جمع تھے۔ اس کے قدموں کی

میں طے جو کر چکا تھا کہ سنیتا کو اگلی ٹرین سے بھجوا دوں گا۔ اور پھر میں نے کچھ اور بھی تو سوچا تھا۔ میں نے کتنی بار اپنی تنخواہ کا حساب لگایا تھا۔ سب ملا کر دو سو روپے کے قریب ہوتی تھی۔ یقیناً یہ تنخواہ ایک جوڑے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ پھر وہ کتنی سلیقہ شعار ہے وہ ضرور میرے ساتھ اچھی زندگی بسر کر سکے گی۔ میں اسے کسی تکلیف کا احساس نہ ہونے دوں گا۔

میں آدھ گھنٹہ پہلے ہی اسٹیشن پہونچ گیا۔ دو تین بار میں نے نوٹس بورڈ دیکھا۔ ریل وقت پر آنے والی تھی، لیٹ نہیں تھی۔ بک شال سے میں نے سنیتا کے پسندیدہ رسائل لئے ——— دور سے گاڑی دھواں اگلتی چلی آ رہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ اور میرا جسم کانپنے لگا۔

میں سنیتا کے تصور میں ہی تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ میں ڈبوں میں جھانک جھانک کر سنیتا کو تلاش کرنے لگا۔ سکینڈ کلاس کی کھڑکی سے ایک عورت باہر دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نگاہیں ملتے ہی وہ مسکرائی اور کھنسنے لگی۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا۔ تو سنیتا ہی تھی۔ وہ ذرا موٹی ہو گئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں پر پیاری سی سنہری فریم والی عینک بھی چڑھی تھی۔ میں دوڑا دوڑا اس کے ڈبے تک گیا۔ اور نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔ وہ مسکراتی رہی۔ وہی محبوب سی مسکراہٹ!

اس نے میری صحت، میری موجودہ نوکری اور دیگر حالات کے بارے میں آہستہ آہستہ بہت کچھ پوچھ لیا۔ وہی لہجہ تھا۔ وہی آواز تھی ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

سنیتا چلو اترو تم اگلی ٹرین سے جاؤ گی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم بنا کچھ کھائے یہاں سے چلی جاؤ۔"

جواب دینے سے پہلے ہی ایک بچہ ڈبے میں چلانے لگا۔ اور سنیتا معاف کیجئے کہہ کر پلٹی۔ وہ تین سال خوبصورت سا بچہ گود میں اٹھائے آئی۔ اور سنیتا نے بچہ سے کہا ———

"بیٹے یہ تمہارے رو تمی انکل ہیں انہیں سلام کرو۔"

بقیہ صفحہ ۱۷۹ کا

پھر نانی بستر پر سے اٹھیں اور اس کے پاس آئیں۔ انھوں نے پہلے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے مرغے سے انسان بنا دیا۔ اور جب یہ انسان اکڑی ٹانگوں پر کھڑا ہوتے ہوتے لڑکھڑایا تو انھوں نے اسے سہارا دیکر اپنی ٹانگوں سے لگالیا۔

"بہت بھوک لگ رہی ہے نانی"۔ اس نے سسکی کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہے میرے لال"۔ انھوں نے اس کے سر پر دوبارہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "جاؤ۔ جاکر ابا سے معافی مانگ لو۔ وہ ضرور معاف کر دیں گے"۔

نانی! اس کے حلق میں جیسے ایک گولا پھنس گیا۔ کاہے کی نانی! نانی تم بھی!

اور نانی نے گویا اس کے بے آواز احتجاج کو سمجھ لیا "ورنہ کھانا نہیں ملے گا اور مرغا الگ بننا پڑے گا"۔ کئی ہزار لمحات میں تنگ آنگن کو پار کر کے جب وہ اس سے بھی تنگ کمرے کے اس دروازے پر پہونچا جو اکثر بھڑا رہا کرتا تھا۔ اندر سے حقے کی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ کئی ہزار لمحات تک وہ بلا وجہ اس گڑگڑاہٹ پر کان لگائے رہا۔ اور پھر وہ اپنے آنسوؤں پر بدقت تمام قابو پاکر اس لے بھرے ہوئے دروازے سے منہ لگا کر کہا۔ ابا معاف کر دیجئے اب ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ ابھی آخری لفظ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا کہ اس کے اندر وہ تنے جو کمان کی طرح کھنچی ہوئی تھی چٹاخ سے ٹوٹ گئی اور آنسوؤں اور سسکیوں کا ایک بڑا سیلاب اسے ایک حقیر تنکے کی طرح بہالے گیا۔

کتاب آپ کے فرصت کے لمحات کا بہترین ساتھی ہے۔

بھی تھا۔ ہاتھ بڑھا کر ذرا دھوتی کو ایک طرف کیا۔ جیسے اسٹیج پر سے پردہ اٹھ گیا ہو۔ وہ سفید چکنے جسم پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کی لمبی سیاہ چوٹی کو اپنی گردن کے گرد لپیٹ کر مسکراتا اور اسے گدگداتا تھا۔ ساون کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ اس نے پردہ گرا دیا۔ اس کا دل اس قدر زور سے اچھل رہا تھا۔ جیسے ابھی دیوار توڑ کر باہر آ پڑے گا۔ وہ دیوار سے پیٹھ لگائے آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا۔ اس کے آس پاس اینٹوں اور ملبے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ چوڑیوں کی ہلکی ہلکی کھنکھناہٹ اس کے کانوں میں شہد کا قطرہ قطرہ بن کر ٹپک رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے پھر پردہ اٹھایا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ساون انھیں گھورتا رہا۔ جیسے کوئی ڈرامہ دیکھ رہا ہو ــــ زندگی میں پہلی بار ایسا انوکھا ڈرامہ دیکھنے کو ملا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ کر اتنی بڑی بڑی ہو گئی تھیں۔ سارا جسم دیوار کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔

اچانک اس کے پاس آ کر کسی نے اسے چھو لیا، تو وہ لرز گیا۔ جیسے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو۔ پھر اس کا ہاتھ لنگوٹ کی ڈب پر گیا جس میں پسی ہوئی سرخ مرچیں تھیں۔ لیکن وہ تو نورا تھا۔ کوئی اور چھوٹے دل کا ہوتا تو اس کی جان ہی نکل گئی ہوتی اس نے نورے کے سرگوشی کرنے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دونوں اوزار ہاتھ میں لے کر اسے بازو سے کھینچتا ہوا دور لے گیا "چل چل نورے۔ یہاں سے بھاگ چلیں۔"

نورا گھبرایا گھبرایا سا اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ پھر راستے بھر ان دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ واپسی کا راستہ بھی وہی تھا۔ نالے کے کنارے کنارے سیمنٹ کا پکا راستہ۔ کوڑھیوں اور بھک منگوں کی گلی اور پھر قبرستان کی پست قد دیوار دونوں اسے پھاند کر قبرستان میں چلے گئے۔ پھر وہاں سے بہاء پیر کے مندر کے چبوترے پر چڑھ گئے۔

"چاچا کیا ہوا تھا۔ جاگ گئے تھے کیا؟" نورے نے پہلی بار پوچھا۔

"نہیں جلدی سے کپڑے نکال دو۔"

"وہ کپڑے لیکر آ گیا۔ گوڈک اور رتی ابھی تک ساون کے ہاتھ میں تھی۔

"انھیں کہیں نہیں چھپایا؟" نورے نے حیرت ظاہر کی۔

ساون جلدی جلدی کپڑے پہننے لگا۔ لمبی چلی دھوتی۔ جو ٹانگوں کے بیچ سے ہو کر نکلتی تھی ــــ اور کمر کے گرد بھی لپٹ جاتی تھی۔ نیلا ریشمی کرتا جس کے بٹن کالے پلاسٹک کے تھے۔

"نورا تو اب گھر جا۔"

"تم کہاں جاؤ گے؟"

"میں بھی کہیں جاؤں گا۔ کل ہوٹل میں ملیں گے تو بات ہوگی۔ دیکھو بجاری کھانسنے لگا ہے۔ کہیں باہر نہ آ جائے۔"

ساون نے دونوں اوزار ایک کپڑے میں چھپا لئے۔ وہ جلدی جلدی سڑک پر پہنچنے والے راستے پر ہو لیا۔ نکڑ پر ایک رکشہ والا بیٹھا ہوا کمبل میں رکشا کے اندر سو رہا تھا۔ اس نے اسے آہستہ سے جگایا۔ ایک روپیہ دیا اور کہا "بارود خانے لے چل جلدی۔"

یہ راستہ ویران نہیں تھا۔ بجلی کے دو رویہ قمقمے جل رہے تھے۔ کہیں کہیں رکشے اور سائیکل سوار بھی راستہ میں ہو۔ تین بج چکے تھے۔ سارا شہر سردی میں ٹھٹھرا ہوا تھا۔ ناکے پر اس نے نکھو چورائیے کو رکشا کے اندر بیٹھے بیٹھے تاکا۔ وہ پان اور سگریٹوں سے بھرے ہوئے کھوکھے میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

ساون بارود خانے سے پہلے ہی اتر گیا۔ ایک گلی سے ملی ہوئی کئی گلیاں تھیں۔ جو کسی جال کے تانے بانے کی طرح مکانوں کے ارد گرد بکھری ہوئی تھیں۔ وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی بڑا محتاط سا ہو کر جا رہا تھا۔ ایک مکان کے گرے ہوئے ملبے پر چڑھ کر وہ دوسری طرف پھاند گیا۔ وہاں ایک دالان میں گائے اور بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ اس مکان کے رہنے والے دروازے بند کر کے سوئے ہوئے تھے۔

وہ ایک یک منزلہ مکان کی پشت پر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کپڑے میں چھپائے ہوئے اوزار نکالے اور پھر صابن کی ٹکیاں نکالنے لگا۔ ایک کے بعد ایک بڑی سرعت کے ساتھ بڑی صفائی سے۔ بڑی لگن سے۔ اب اس نے کپڑے نہیں اتارے جسم پر ملے ہوئے تیل کی چکناہٹ اور پھیلن کو تازہ نہیں کیا۔ بس جلدی جلدی ٹکیاں اتار کر اتار اپنے آس پاس لگاتا رہا۔ جیسے کوئی

آہٹ سنتے ہی ریں ریں چلاتے ادھر ادھر بھاگ نکلے۔

اس سارے راستے پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ اسی راستے سے آتا جاتا تھا۔ یہ راستہ شہر کے بیچوں بیچ گزرتا تھا۔ اس کے قدموں کی ٹیڑھا میڑھا، بہتی ہوئی گندگی اور بدبو کا راستہ۔

اسپتال کے نکڑ پر رک کر اس نے نالے کے پچیس فٹ اونچے کناروں پر نگاہ ڈالی۔ کچھ لمحوں تک گھورتا رہا۔ پھر اوپر چڑھنے لگا۔ قدم جما جما کر۔ اوپر پہونچ کر ایک مکان کی پشت پر دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ جہاں پوشیدہ بیماریوں کے علاج کا ایک بہت بڑا اشتہار لگا ہوا تھا۔ نالے کے اطراف جتنے مکانوں کی پشت تھی۔ سب پر اشتہار لگے ہوئے تھے۔ جنھیں پل پر سے گزرنے والے اور کوٹھیوں والی گلی میں سے گزرنے والے پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔

اس نے دیوار کے ساتھ بیٹھے بیٹھے تیس فٹ اونچے دونوں روشن دانوں کو دیکھا۔ وہ صاحب مکان کی طرح آنکھیں بند کئے سو رہے تھے۔ یہ وقت سب کے لئے سونے کا تھا۔ صرف گندگی میں لوٹنے والے سو رہی جاگ رہے تھے۔ یا پھر وہ ساون اور نورا۔

اس نے نورے کا آدھ گھنٹہ انتظار کیا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ وقت کا اندازہ اس نے آسمان کو دیکھ کر لگایا۔ تاروں کی چمک اور بڑھ گئی تھی۔ پھر وہ دیوار کو انگلیوں سے ٹٹولنے لگا۔ سوچا نورے کے آنے تک کچھ صابن کی ٹکیاں نکال کر نیچے رکھ دوں۔ وہ دیوار میں چنی ہوئی اینٹوں کو صابن کی ٹکیاں کہتا تھا۔

دن میں اس نے ردی تولتے تولتے اس کمرے کے کونے میں ٹرنکوں کی ایک قطار دیکھی تھی۔ گوڈک اور ردی سے کوئی آواز پیدا کئے بغیر اس نے کئی ٹکیاں نکال نکال کر اپنے آس پاس لگا دیں۔ بڑی احتیاط سے ایک کے اوپر ایک، ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ جوڑ کر۔ جیسے بچے اپنے کھیل میں ایک گھر توڑتے ہیں دوسرا بناتے ہیں۔ پھر اسے بھی توڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔

اندر سے راستہ بنانے میں صرف ایک اور ٹکیہ کھسکانے کی کسر تھی۔ اڑھائی اینٹ کی مضبوط دیوار کے پاٹ میں کہنی ٹکا کر اس نے گردن گھمائی۔ اپنے پیچھے کے اندھیرے میں نظریں گڑا کر نورے کو تلاش کیا۔ وہ ابھی تک نہیں پہونچا تھا۔ کہیں دھر نہ لیا گیا ہو۔ وہ کچھ دیر تک سانس روکے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ایک ٹکیہ اور سرکائی۔ اس کے نکلتے ہی کالک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ روشنی ابل پڑی۔ جیسے گھر والے جاگ اٹھے ہوں۔ اس کا سارا وجود لرز گیا۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی اینٹ کو آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ گوڈک اور ردی سنبھال کر بھاگنے کے لئے گھٹنوں کو حرکت دی۔ لیکن پھر رک گیا۔ جہاں سے آخری ٹکیہ نکالی تھی اس کے آگے ایک کپڑا لٹک رہا تھا۔ کوئی زنانہ دھوتی تھی۔ بالکل پردے کا کام دے رہی تھی۔ اندر سے آنے والی آوازوں سے اسے معلوم ہوا تھا کہ انھیں سیندھ کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کوئی دروازہ کھول کر فرش پر ربڑ کی چپل سے ہلکی ہلکی آواز پیدا کرتا ہوا تھوڑی دیر کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ پھر لوٹ بھی آیا تھا۔ ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے جسم کا ہر ذرہ کان بن گیا تھا۔

"منو کو کیوں اٹھا رہے ہو جی؟"

"ادھر الگ سلاتا ہوں۔"

"رہنے دو۔ رو دے گا اکیلا۔"

"تھوڑی دیر بعد پھر یہاں لٹا دوں گا۔"

"مجھے سونے دو ۔۔۔ ہوں!"

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ ساون کا سارا خون ایک جگہ جمع ہو رہا تھا۔ دماغ میں۔

کچھ دیر خاموش رہ کر بولا "سنو۔"

"توبہ! سونے نہیں دو گے۔"

"ذرا منہ تو پھیر ادھر۔"

"میں کہتی ہوں سونے دو مجھے۔ بڑی مشکل سے آنکھ لگی تھی۔"

"لیکن مجھے جو نیند نہیں آتی اس کا کیا ہوگا۔"

چند منٹ تک پھر خاموشی رہی۔ ساون کے جسم کی ساری رگیں تن گئی تھیں۔ اندھیرے میں وہ اپنے آپ مسکرایا!

عابد سہیل

وہ ایک لمحہ

شوکت بیگم نے مغرب کی نماز ختم کر کے اپنی بھانجی منزہ اور بھانجے تسلیم کو بلا کر پھونک ڈالی اور بیٹی نگارش کو ’ہوں‘ کر کے اشارہ کیا تو نگارش جو ابھی ابھی نماز پڑھ کر پیچھے مسہری پر آ کے بیٹھی تھی اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔ انھوں نے بیٹی کے دودھ سے دھلے سفید چہرہ کو ایک نظر دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر کی طرف بڑھا دئے۔ ان کی انگلیوں نے پہلے اس کی کنپٹیاں چھوئیں۔ پھر کان، پھر آنکھیں اور پھر دہانے کے بیچوں بیچ ناک کی سیدھ میں آ کر ان کے دونوں ہاتھ مل کر رک گئے۔ شوکت بیگم نے اسی طرح بیٹی کے چہرہ پر پھونک ڈالی اور پھر ان کے ہاتھ دھیرے دھیرے واپس لوٹ گئے۔ کنپٹیوں کے قریب پہنچ کر ان دونوں ہاتھوں نے اس کے چہرہ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ لوگ ٹھیک ہی تو کہتے تھے۔ ماں بیٹیاں بس بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ ویسی ہی سیدھی ستواں ناک، چھوٹا سا دہانہ ایسا کہ جیسے کبھی بول ہی نہ پھوٹے ہوں۔ ذرا سے غصہ میں لال ہو جانے والی لویں۔ گورا رنگ، خوبصورت آنکھیں اور کشادہ پیشانی۔ ان آنکھوں نے یہ سب کچھ ایک ہی بار میں دیکھ لیا اور پھر ان کی نظریں بیچ پیشانی پر مانگ کے قریب آ کر اٹک گئیں۔ اے اللہ ایسی مشابہت بھی کیا۔ نگارش بھی انہیں کی طرح سیدھی مانگ نہ نکال پاتی۔ بیچوں بیچ جھول رہتا اور کنگھی چاہے کتنی ہی دبا کے کیوں نہ کریں مانگ ذرا سی ٹیڑھی ہو ہی جاتی۔

شوکت بیگم نے اسی طرح چہرہ ہاتھ میں تھامے تھامے ایک بار پھر بیٹی کی طرف دیکھا۔ انھیں ایسا لگا جیسے پچیس چھبیس سال ادھر آئینہ دیکھ رہی ہوں، اور پھر اس آئینہ نے بہت سے عکس دکھائے۔

وہ پچیس سال ادھر گرمیوں کی ایک خوش گوار شام کو جب دونوں طرف بجلی کے پنکھے لگے ہونے کے باوجود سارا جسم پسینے سے تر بتر ہو رہا تھا، بیاہ دی گئی تھیں۔ شوہر خوش اخلاق اور منکسر المزاج، خاصے وجیہ اور رئیس ہیں۔ ایک بات ذرا سی دلچسپ تھی لیکن اس بات سے تو یہ کھلتی مکرانی کی پہلے ہی واقف تھی اور انھوں نے بھی پہلی ہی ملاقات میں شاید گفتگو کا آغاز اس طرح کیا تھا۔

”بیگم اتنا بڑا لق و دق مکان ہے۔ اسے دیکھنے والا بھی کوئی نہیں۔ خدا کا دیا گھر میں سب کچھ ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ بس میں مقروض ہوں اور یہ قرض آپ ہی ادا کر سکتی ہیں۔“

اور وہ خاموش رہی تھیں۔

”بولئے اس قرض کی ادائیگی میں آپ میری مدد کیجئے گا؟“

اب کے بھی شوکت بیگم کے منہ سے جو اس وقت گھر میں شگو کہلاتی تھیں، ایک بول بھی نہ پھوٹا تھا۔

”بولئے نا۔ کیا میں سمجھوں کہ آپ کو میری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں؟“

اب وہ بڑی مشکل سے بول سکی تھیں ”ہے کیوں نہیں۔“

”تو پھر بتائیے آپ اس سلسلہ میں میری مدد کریں گی؟“

”آپ اور مقروض!“

”جی ہاں بیگم میں مقروض ہوں۔ [illegible]

دوکان دار اپنا سامان سجاتا ہے۔

اس نے اتنا بڑا سوراخ کر لیا تھا کہ ایک آدمی بڑی آسانی سے اندر آجا سکے۔ ابھی پو نہیں پھٹی تھی۔ ابھی خاصا اندھیرا تھا۔ وہ اپنے اوزار ایک طرف رکھ کر اندر گھس گیا۔

باہر کی طرح اندر بھی اندھیرا تھا۔ ایک کمرے میں کئی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ گھر کے سب لوگ گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ کچھ لمحوں تک ساکت سا کھڑا رہا۔ پھر ایک ایک پر جھک کر دیکھنے لگا۔ ایک شخص کے کان کے پاس منھ لے جا کر بہت آہستہ سے کچھ کہا۔ ایک بار، دو بار، پھر تیسری بار دھرایا۔ جب اس نے چونک کر سر اٹھایا تو وہ جلدی سے کھسک کر باہر چلا آیا۔ اسی سیندھ والے راستے سے۔

باہر آکر وہ صابن کی سجی ہوئی ٹکیوں کے بیچ سوراخ کے دہانے پر پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر بڑی احتیاط سے دیکھا چھپروں کے نیچے دودھ دینے والے جانوروں کی آنکھیں اور سینگ چمک رہے تھے۔ آسمان پر تاروں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ سرد ہوا بھی تیز ہونے لگی تھی ــــ لیکن اس کی رگوں میں گرم گرم خون بہت تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت نے چھاتی کے بل لیٹ کر باہر نکالا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ ساون نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا بہت دھیرے سے بولا: "شاباش جلدی سے آجا باہر توشی! آج میں بہت بیقرار ہوں۔"

"میں باہر نہیں آؤں گی۔" وہ آہستہ سے مگر غصہ دکھا کر بولی۔ "تم نے سیندھ کیوں لگائی۔ ابھی تک چوریاں کرتے پھرتے ہو۔ شرم نہیں آتی! میں چلا کر سب کو جگاتی ہوں۔"

"دہ نہ ایسا غضب مت کر توشی! تجھے میری قسم ــــ جلدی سے آجا نہیں تو روشنی ہو جائے گی۔ میں تیرے کانے کو دوکان پر بیٹھا اونگھتا ہوا دیکھ آیا ہوں۔ اچھا یہ بتا ــــ میں اگر چوریاں کرنا چھوڑ دوں تو کیا سب کے سامنے اٹھ کر میرے ساتھ چل دے گی؟ بول!"

مسکرادیے۔ شوکت بیگم نے مسکراہٹ کا جواب ہلکے سے تبسم سے دیا۔ گرد و غبار سے اٹے ہوئے جاوید بھائی تھوڑی دیر میں منہ ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ شوہر کا کھانا پہلے ہی دوکان پر جا چکا تھا۔ انتظار کا کوئی سوال نہ تھا۔ شوکت بیگم بھی مہمان کا ساتھ دینے بیٹھ گئیں۔ کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شوکت بیگم نے دور دور کے رشتہ ناطہ داروں کی خیر خیریت پوچھ ڈالی۔ منیرہ بی بی اب کیسی ہیں کیا اب بھی کام کرنے آتی ہیں۔ اب تو ان کے بال سب سفید ہو گئے ہوں گے۔ کنویں کے پاس والے گولر کے درخت کے نیچے جو سنار رہتا تھا اس کی لڑکی تو اب خوب بڑی ہو گئی ہو گی۔ لڑکیوں کے اسکول میں ان کون کون پرانی استانیاں رہ گئی ہیں اور اسی طرح کے نہ جانے کتنے سوالات......

نوکر نے میز پر سے برتن اٹھائے اور لڑکے نے دالان کے بائیں در میں سلفچی رکھ کر جاوید بھائی کے ہاتھ دھلائے اور ٹاٹ کے پردے گرا دئے گئے۔ جب سے نگارش کو نوکری ملی دس بجے سے ہی دالان کے پردے گرا دئے جاتے تھے۔ آج نہ جانے کیسے اب تک کسی کو خیال نہ آیا تھا ـــــ جاوید بھائی نے تولئے سے ہاتھ پونچھے اور ریڈیو پر رکھی ہوئی فرخندہ کی رنگین تصویر دیکھنے لگے۔ ابھی وہ تصویر دیکھنے ہی میں محو تھے کہ اندر جھولے پر نگارش رو دی۔ نگارش اس وقت بمشکل سال بھر کی ہو گی۔ جاوید بھائی نے کان کھڑے کئے۔ شرارت بھرے انداز میں مسکرانے سے پھر بولے۔

"واہ بھائی آپ نے یہ کارنامہ کب کر ڈالا"

جاوید بھائی بھی عجیب لاابالی انسان تھے۔ شادی کے نام سے رسی تڑاتے۔ باپ جب تک زندہ رہے اسی امید پر جئے کہ بیٹے کا سہرا دیکھیں گے، مرے تو سہرا دیکھنے کی تمنا اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔ اب ماں بے چاری رہ گئی تھی۔ دکھیاری نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن جاوید بھائی نے ہاں کر کے نہ دی جب بات چلتی ٹال جاتے۔ آخر ماں غریب نے بھی ہار مانی۔ باپ نے اچھی خاصی جائداد اور نقد روپیہ چھوڑا تھا۔ اکلوتی اولاد تھے۔ پیسے کی کبھی تنگی نہ ہوئی لکھنؤ میں رہتے۔ دن بھر ہوٹلوں اور کافی ہاؤس کے چکر لگاتے۔ شام کو کسی دوست یار کے یہاں سو رہتے۔ دوست آدمی تھے جس محفل میں بیٹھتے جان محفل بن جاتے جس کے یہاں رہتے یار شاطر بن کے رہتے۔ جب جی چاہتا گھر لوٹتے گھر جا کے اور لے آتے۔ ان کی اس طرح کی زندگی کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا جوانی میں کسی کو دل دے دیا تھا وہ بے وفائی کر گئی۔ اور یہ اب تک اس غم کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کسی دھندے کو جھونک لیا ہے کوئی کچھ۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں لیکن ایسا لگتا کہ جاوید بھائی ان باتوں پر ذرا بھی کان نہ دھرتے۔ ابھی کافی ہاؤس میں اس ٹیبل پر بیٹھے قہقہے لگا رہے ہیں تو ابھی اس ٹیبل پر غرض دن یونہی گزر جاتا بلکہ کہنے والے تو یہاں تک کہتے کہ صبح آکے کافی ہاؤس کھلواتے ہیں، اور رات کو اپنے سامنے بند کرا کے جاتے ہیں۔

شوکت بیگم بس مسکرا کر رہ گئیں تو جاوید بھائی نے اپنا سوال دہرایا۔

"آپ تو خوب خفیہ ہی خفیہ کارنامے کر ڈالتی ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی" اور یہ کہہ کر وہ ایک ہی جست لگا کر اندر کمرہ میں پہنچ گئے اور نگارش کو گود میں لے کر باہر دالان میں آ گئے۔ بچی تھی کہ چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ گود میں لے کر بہلایا۔ طرح طرح سے پچکارا۔ پیار کیا۔ جھنجھنا بجایا مگر چپ نہ ہونا تھا نہ ہوئی... شوکت بیگم نے اصرار بھی کیا لیکن جاوید بھائی نے نگارش کو گود سے نہ چھوڑا.......

"ایسا ہی بچہ کھلانے کا شوق ہے تو شادی کیوں نہیں کر ڈالتے" شوکت بیگم نے کہا۔ پھر دوپٹہ کو سینے پر سلجھاتے ہوئے بولیں "شادی کر ڈالئے پھر دو سے تین ہوتے کتنے دن لگتے ہیں"

جاوید بھائی پہلے تو مسکرائے پھر ہنسے۔ پھر زور سے قہقہہ لگایا۔ پھر ایک دم چپ ہو گئے۔ بولے

"کیا کہا بھابی۔ شادی کر ڈالوں"

"کیوں کیا بری بات کہی" بھابی مسکرائیں "اب کب تک جہانیاں جہاں گشت بنے پھرو گے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی

یت کی تھی۔ وصیت کیا، مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں فرخندہ کو اس بات کا احساس بھی نہ ہونے دوں گا کہ اس کی ماں مر گئی ہے۔ مرحومہ کی اس خواہش کی تکمیل میرے اوپر قرض ہے اور یہ قرض آپ ہی ادا کر سکتی ہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن انھوں نے شوکت بیگم اور نگار سے کم کسی لفظ سے خطاب ہی نہیں کیا، شکوّ یا اس قسم کا کوئی اور لفظ سننے کے لئے اس کے کان ترس گئے۔ نئی نویلی دلہن نے شروع شروع میں تو خود کو خوش فہمیوں میں مبتلا رکھا۔ شوہر کی دسمبر جنوری کی ٹھنڈے پانی سے نہلاتی ہوئی گرم جوشی کا کچھ بڑھ چڑھ کر بھی جواب دیا لیکن یہ جواب ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی امتحان کے پرچے میں خود ہی سے سوال قائم کر کے جواب لکھ آئے... یہ جواب خود اپنا منہ چڑھا کے رہ جاتا اور اس کے لال لال رخسار اور پنکھڑی ایسے ہونٹوں پر سرِ شام ہی اداسی کی ایک تہہ جم جاتی اور یہ تہہ شوہر کی اپنی بساط بھر کوششوں کے باوجود بھی نہ اتر پاتی۔ خواب دیکھے تھے ہم سنی کے مردوں کے اور یہاں ملا مشفقانہ برتاؤ۔ کبھی کبھی تو وہ سچ مچ رو دیتی۔

آئینہ نے ذرا سا رخ بدلا اور اب سامنے ایک اور تصویر تھی۔ فرخندہ نے ساتواں درجہ پاس کر لیا ہے اور اس کا داخلہ دوسرے اسکول میں ہو رہا ہے۔ جاڑوں کی چھٹیوں کے بعد اس نئے انگریزی اسکول میں وہ پہلی بار جا رہا ہے۔ بستہ میں کتابیں پنسل اور کاپیاں شوکت بیگم نے خود اپنے ہاتھ سے رکھی ہیں۔ بستہ کمر میں لٹکائے فرخندہ مسہری کے پاس کھڑا ہے۔ ماں نے بوسہ دیا۔ فرخندہ نے جواباً ماں کی پیشانی کو چوما۔ "ممی ٹاٹا۔ ممی ٹاٹا" ان تین چار برسوں میں اسے اپنی مرحوم ماں کا شاید ایک بار بھی خیال نہیں آیا۔

شادی کے بعد آٹھ برساتیں گزرنے پر نگارش اس دنیا میں آئی اور اس کی سب کچھ بن کے رہ گئی۔ شوہر صبح صبح اٹھ کر دکان چلے جاتے۔ شادی کے بعد کچھ دنوں تک تو دوپہر کا کھانا کھانے گھر آتے رہے۔ پھر کبھی کبھی دکان پر ہی منگانے لگے اور دھیرے دھیرے یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ اب دوپہر کو ان کا گھر آنا ہی ختم ہو گیا۔ شام کو دکان سے واپس آتے تو تھکے تھکائے نڈھال۔ تجوری کی چابی اور نوٹوں کی تھیلی بیوی کے حوالہ کر دیتے اور وہ روپے تجوری میں رکھ دیتیں۔ ویسے ایک چابی ہمیشہ شوکت بیگم کے پاس رہتی۔ کتنا کس کو دیا۔ کیا کیا خرچ کیا۔ شوہر نے ایک بار بھی نہ پوچھا تھا۔

اور اب وہ اوپر کے کوٹھے پر سونے لگے تھے۔ بچی رات کو دو ایک بار ضرور روتی۔ آنکھ کھل جاتی تو گھنٹوں نیند نہ آتی اور دن کو دکان کے کام کا حرج ہوتا۔ اب ملاقات کے بس دو ایک ہی مواقع رہ گئے تھے۔ صبح چائے کی میز پر۔ رات کے کھانے پر یا جمعرات کے دن جب دکانیں بند ہوتیں۔ شوہر کی یہ ذمہ داریاں تھیں ہی کیا۔ کہ ان میں کمی ہوتی۔ البتہ نگارش نے فرخندہ کے لاڈ پیار میں سے تھوڑا سا حصہ بٹا لیا تھا۔ اب وہ اسکول سے لوٹ کے آتا اور شوکت بیگم نگارش کو دودھ پلا رہی ہوتیں تو کریمن بوا میز پر کھانا لا کر رکھ دیتیں۔ شروع شروع میں تو فرخندہ نے اس تبدیلی کو خاصا محسوس کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے عادی ہو گیا۔ کھانا کھانے کے بعد جھولے کے پاس کھڑے ہو کر سیٹی بجاتا تو نگارش غوں غوں کر کے ہاتھ پیر مارتی اور مسکراتی۔

اب ایک اور تصویر تھی۔

گرمیوں کی ایک چلچلاتی دوپہر کو ایک تانگہ گھر کے سامنے آ کر رکا اور نوکر نے اطلاع دی کہ جاوید صاحب آئے ہیں۔ جاوید شمیم صاحب کا رشتہ کا بھائی تھا۔ شادی سے پہلے ہی سے شوکت بیگم اور جاوید کے گھر والوں میں آنا جانا تھا اور شوکت بیگم کے یہاں کوئی خاص پردہ بھی نہ تھا اس لئے جاوید سے پردہ کرنے کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا لیکن ایک تو شادی کے بعد اتفاق سے دونوں کا اب تک سامنا نہیں ہوا تھا اور دوسرے شوہر کی خواہش کے مطابق اب وہ پردہ بھی کرنے لگی تھیں اس لئے پہلے تو ذرا جھجکیں پھر جلدی سے سر پر دوپٹہ ڈال کے باہر کے دالان میں مہمان کے استقبال کے لئے جا کھڑی ہوئیں۔

جاوید بھائی جو شادی میں شریک نہ ہوئے تھے لیکن جنھیں یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی بھابی کتنی جلدی "شکو" سے شوکت بیگم بن گئی ہیں۔ اندر داخل ہوئے۔ رشتہ ہی مذاق کا تھا....

بھی میں اپنی خالہ کے پاس شملہ چلا گیا تھا۔ جاوید بھائی دھیرے دھیرے دالان میں ٹہلنے لگے۔ گھر میں موت کا سا سناٹا طاری تھا کبھی کبھی اندر کمرہ میں ہچکیوں کی آواز ضرور سنائی دیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جاوید بھائی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ انھوں نے کمرہ کا رخ کیا۔ دہلیز کے پاس جا کر کچھ سوچا۔ پلٹے پھر اندر چلے ہی گئے۔ شوکت بیگم اسی طرح بے سدھ پڑی تھیں۔ جاوید بھائی مسہری کے سرہانے کچھ دیر کھڑے رہے پھر بولے . . .

"بھابی"

کوئی جواب نہ ملا

"بھابی سنیے تو"

شوکت بیگم نے ہچکی لی۔

"بھابی مجھے معاف کر دیجئے۔ میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ویسے میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا" جاوید بھائی نے شوکت بیگم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بھابی میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا۔ اچھا اب جا رہا ہوں . . . خدا حافظ"

قدموں کی بھاری چاپ۔ پھر ذرا رکی۔ پھر جیسے کسی نے سوٹ کیس اٹھایا۔ ابھی جاوید بھائی دروازہ تک ہی پہونچے تھے کہ کوئی پیچھے کھڑا تھا۔ مڑ کے دیکھا تو شوکت بیگم تھیں۔ ننگے سر۔ ننگے پیر۔ سینہ سے دوپٹہ غائب۔ آنکھیں سرخ اور بال بکھرے ہوئے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کے دیکھا . .

شوکت بیگم ایک دم پھوٹ پڑیں "جاوید میاں اب کبھی یہاں نہ آنا۔ ویسے ہی تم کب خط لکھتے تھے۔ اب اور نہ لکھنا۔ میں تمھاری کوئی خاطر تواضع نہ کر سکی۔ جاؤ خدا حافظ" شوکت بیگم نے جاوید بھائی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں کے درمیان جیسے سورج تھا۔ دونوں نے نظریں جھکا لیں۔ پھر جاوید بھائی نے اپنا ہاتھ شوکت بیگم کے سر پر رکھا اور خدا حافظ کہہ کر دروازہ سے باہر نکل گئے۔ شوکت بیگم نے دھیمے سے کہا خدا حافظ۔ لیکن الفاظ جیسے ان کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔ پھر خود ہی دروازہ بند کیا اور زنجیر چڑھا دی اسی طرح دروازہ سے ٹیک لگائے کھڑی رہیں اور نہ جانے کب اندر آ گئیں۔

سیٹھ صاحب جب شام کو گھر لوٹے تو وہ بخار میں پھنک رہی تھیں۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا۔ تین چار دن میں بخار اترا تو شوکت بیگم بالکل بدل گئی تھیں۔ ویسے پہلے ہی گھر میں کون تھا۔ جس سے باتیں کیا کرتیں۔ پر اب بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔ صبح شام تلاوت کلام پاک ہوتی۔ پانچوں وقت کی نماز کے علاوہ تہجد اور وظیفے . . . . وہ دن اور آج کا دن کسی دن کی نماز قضا نہ ہوئی . . . کوئی روزہ نہ چھوٹا۔

یہ تصویر بڑی اجاگر اور مفصل تھی۔ جاوید بھائی کی بڑی بڑی لیکن خاموش آنکھیں۔ ان آنکھوں پر چھجے کی طرح چھائی ہوئی گہری سیاہ بھنویں۔ بے تحاشہ قہقہہ مارنے۔ زندگی کو کھلواڑ سمجھے لیکن ذرا سی بات پر پریشان ہو جانے کی عادت . . . پھر اس وقت کی اپنی زندگی۔ شوہر سال بھر کی نگارش، سارے نقش ایک ایک کر کے سامنے گزر گئے۔ شوکت بیگم کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی . . . اور نگارش جو ماں کے اس برتاؤ سے حیرت زدہ سی ہو گئی تھی اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ شوکت بیگم نے جزدان میں سے دعائے گنج العرش نکالی۔ پڑھ کے اپنے اوپر دم کیا تب جا کے کہیں انھیں سکون نصیب ہوا۔

جب سے نگارش کو کچھ سن گن لگی تھی کہ پھوپھی جان اس کے رشتہ کے سلسلے میں آنے والی ہیں وہ ماں باپ کے سامنے ذرا کم ہی آتی تھی۔ رات کا کھانا عام طور پر سب ساتھ ہی کھاتے تھے۔ لیکن اب نگارش اسے بھی ٹال جاتی اور پرسوں جب شوکت بیگم نے یہ دیکھنے کے لئے کہ کسی چیز کی کمی تو نہیں رہ گئی ہے جہیز کے سارے زیورات اور سلے اور بغیر سلے کپڑوں کو مسہریوں پر سجا دیا تھا تو وہ دن بھر اپنے کمرے میں سے نہ نکلی تھی۔

یوں تو بات چیت کئی گھرانوں سے چل رہی تھی۔ دو ایک لڑکے پاکستان کے بھی زیر غور رہے لیکن ماں باپ

ہے۔ دن بھر ہوٹلوں کے چکر کاٹنے شام کو کسی کے یہاں گھر کالی

جاوید بھائی خالی خالی نظروں سے بھابی کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر نگارش کو پیار تو اس نے باپ کی طرف دیکھ کر ایک ہچکی لی۔ جاوید بھائی نے اس کے منہ میں بیدھے ہاتھ کی ایک انگلی ڈال دی تو وہ اسے چوسنے لگی۔ وہ بولے۔

"اب کیا شادی کروں۔ کرنا ہوتی تو کب کا کر چکا ہوتا۔"

"کیوں اب کیا ہو گیا... کیا بوڑھے ہو گئے ہیں؟"

یہ بات اس وقت شوکت بیگم نے یونہی کہہ دی تھی لیکن اس کے پیچھے لاشعور میں ان کی ازدواجی زندگی تھی.. جاوید بھائی اب بھی تیاس کے پیٹے میں ہوں گے جبکہ خود ان کی شادی دس سال قبل جمیم صاحب سے ہوئی تھی تو وہ کسی طرح بینتالیس سے کم نہ تھے۔ پھر بھی ان کی شادی شدہ زندگی کامیاب ہی تھی۔ ان دس برسوں میں ایک بار بھی ان کی شوہر سے لڑائی نہ ہوتی تھی۔ لڑائی تو دور کی بات ہے اختلاف کی نوبت تک نہ آئی تھی۔ اور لڑائی ہوتی بھی تو کیسے۔ دونوں کے راستے الگ الگ بلکہ متوازی تھے۔ کہ ان میں کسی ٹکراؤ کا امکان ہی نہ تھا۔ جو جمیم صاحب کے پاس تھا اسے دینے میں انھوں نے کبھی انکار نہ کی تھی۔ جو ان کے پاس نہ تھا اس کی شوکت بیگم نے کھل کر کبھی پروا نہ کی تھی۔ انھوں نے خود انگاروں سے ہاتھ سینکے تو نہ تھے لیکن دوسروں کو سینکتے دیکھا اور سنا ضرور تھا۔ یہاں آگ ہی نہ تھی تو انگارے کہاں سے ہوتے۔ اور بھوبل کے سامنے خواہ مخواہ ہاتھ پھیلانے سے کیا حاصل؟ دوسری طرف کی ٹھنڈی راکھ نے ان کے دل کے انگاروں کو تقریباً بجھا دیا تھا۔ کبھی کبھی اس راکھ میں ایک آدھ چنگاری سلگ اٹھتی لیکن وہ خود اس کے لئے تیار نہ ہوتیں اور قبل اس کے کہ ان کے دل کے پاس سے ایک کوندا لپکے وہ چنگاری اپنی موت آپ مر چکی ہوتی۔ اس وقت یہ تمام باتیں شعوری طور پر شوکت بیگم کے ذہن میں نہ تھیں اور نہ انھوں نے اس سلسلہ پر اس طرح کبھی غور ہی کیا تھا لیکن بے زبان احساسات کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ وہ ہمارے آپ کے طور

طریقوں کے پابند نہیں ہوتے۔

اپنے سوال کے جواب میں جاوید بھائی کو خاموش دیکھ کر شوکت بیگم بول اٹھیں۔

"شادی تو اب بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے اس وقت کیسے کیسے رشتے آ رہے تھے۔ لیکن جناب کے مزاج ہی نہ ملتے تھے۔"

"اس وقت کی بات چھوڑو بھابی اب مجھ بوڑھے سے کون شادی کرے گا۔" جاوید بھائی کی آواز جیسے کسی خالی ڈبہ سے نکل رہی تھی۔

"کیوں کرے گا کیوں نہیں، کوئی بھی کر لے گا۔" بھابی نے مسکرا کے جواب دیا۔

"آپ کر لیجئے گا۔؟"

شوکت بیگم کو ہوش آیا تو انھوں نے خود کو جاوید کے بالکل قریب کھڑا پایا۔ نگارش کو گود سے لینے کی کوشش کرتے وقت ان کا ہاتھ جاوید بھائی کے بازوؤں کی مضبوط مچھلیوں کے پاس ٹھہر گیا تھا۔ سانس زور زور سے چل رہی تھی اور کانوں کی لوؤں میں جیسے چیونٹیاں کاٹ رہی تھیں۔

گرم ہوا کا ایک تھپیڑا آیا اور منہ پر ایک چانٹا رسید کر کے چلا گیا۔ کان کے پاس سے ایک گولی سن سے نکل گئی۔ کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجئے گا... کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجئے گا... کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجئے گا... کیا آپ مجھ سے شادی کر لیجئے گا... شوکت بیگم پاس بچھی ہوئی مسہری پر گر پڑیں، خاموش، بے سدھ، بے حس۔ جاوید بھائی بھی وہیں کھڑے تھے۔ ساکت و صامت، اگم، چپ چاپ....

نگارش جو تھوڑی دیر قبل جاوید بھائی کی گود میں زور زور سے ہلکان ہوئی جا رہی تھی نہ جانے کب کی خاموش ہو چکی تھی۔ شوکت بیگم کچھ دیر تو اسی طرح بے سدھ پڑی رہیں۔ پھر ادھر ادھر دیکھے بغیر اندر کمرہ میں جا کر مسہری پر گر پڑیں اور تکیہ میں چہرہ اڑس لیا۔

باہر آنگن میں مئی جون کی لو چل رہی تھی۔ نوکرانی کھانا پکا کے جانے کب کی کوٹھری میں پڑ رہی تھی۔ ملازم لڑکا بھی کہیں کونے کھدرے میں سو رہا ہو گا۔ فرخندہ شروع گرمیوں

حسینی ۔ جی نہیں ایسا نہیں ہیں نے اپنی کہانیوں میں جہاں مستقبل کی نشاندہی کی ہو وہاں اس میں رنگ بھی بھرے ہیں۔

عابد سہیل ۔ جناب صدر میں دفتر سے اٹھ کر آیا تھا اور مجھے اب واپس جانا ہو۔ آپ کی اجازت چاہوں گا۔

ملاّ ۔ میرا خیال ہے کہ یہ گفتگو اب ختم کی جائے۔

رام لعل ۔ جی ہاں بات چیت کافی ہو چکی ہے۔ ویسے ہنوز نامکمل ہو اور شاید کبھی بھی مکمل نہ ہو سکے۔ جناب صدر اور حسینی صاحب کا شکریہ۔

عابد سہیل ۔ ملاّ صاحب اور حسینی صاحب کا بے حد شکریہ۔ ہم سب کی تمنا ہے کہ حسینی صاحب کو عمر خضر نصیب ہو اور ہم دس سال بعد ان کی ۵ کیرٹ جوبلی اور پھر صد سالہ جشن منائیں۔

اکلوتی بیٹی کو دور دیس بھیجنے کے خیال ہی سے کانپ کانپ جاتے۔ یہاں جن گھرانوں سے رشتے آئے تو ان میں سے کچھ کی مالی حالت ایسی تھی کہ نازوں پلی بیٹی کو ان کے پلے باندھنے کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ کچھ کھاتے پیتے گھرانے تھے تو ان کی ذات کا پتہ نہ خاندان کا۔ غرض میاں بیوی اسی ادھیڑبن میں تھے کہ شوکت بیگم کی نند مسرور ی بیگم نے ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔

ڈرائنگ روم خوب اچھی طرح جھاڑا پونچھا گیا۔ دروازوں کھڑکیوں کے پردے تبدیل کئے گئے اور اوپر کا کمرہ مہمانوں کے لئے آراستہ کیا گیا۔ مسروری بیگم خود مہمانوں کو لے کر آرہی تھیں۔ فرخندہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا۔ خود سیٹھ صاحب کیا اسٹیشن جاتے۔ ان کے علاوہ گھر میں تھا ہی کون جو پیش قدمی کرتا لیکن جب مہمان اسٹیشن سے باہر نکلے تو شوفر کار لئے موجود تھا۔

شوکت بیگم نے جو شادی کے بعد شوہر کی خواہش پر باقاعدہ پردہ کرنے لگی تھیں لڑکے کو دروازے کی آڑ سے دیکھا اور نند کی زبانی سلام کا جواب کہہ دیا۔ نند نے بہت اصرار بھی کیا لیکن وہ کسی طرح سامنے آنے پر راضی نہ ہوئیں۔ شروع میں جس پابندی سے خاصی الجھن ہوئی تھی وہی اب زیب عادت بن گئی تھی۔ ہماری فطرت ایسی ہی عادتوں اور ترکے میں ملی ہوئی روایات کا نام ہو جنھیں ہم نے نہ جانے کیسے کیسے مقدس نام دے دیئے ہیں۔

شام کو کھانے کی میز پر صغرا اور تسلیم کے علاوہ صرف تین افراد بیٹھے مسروری بیگم۔ جسیم الدین اور انور۔ نگارش نے اپنی سہیلیوں سے ذکر ضرور کیا ہوگا جبھی تو شمیم، عذرا، پروین اور خورشید صبح ہی سے آگئی تھیں بلکہ عذرا نے تو ابھی سے مذاق بھی شروع کر دیا تھا اور جب اسے انور میاں کو مرچوں دار پان کھلانے میں کامیابی ہو گئی تو اس نے نگارش سے چٹکی کاٹ کے کہا۔

"میاں جی سٹ پٹا گئے ہوں گے، پر منہ ایسا بنایا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"

اس پر لڑکیوں نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا تو مسروری بیگم بولیں۔

"دیکھنا تم سب کی ایسی ٹھمس لگائے گا کہ ساری ہنسی ٹھٹھول بھول جاؤگی۔"

کئی بار بلوانے پر بھی جب نگارش اپنے کمرہ سے باہر نہ نکلی تو شوکت بیگم نے دالان سے آواز دی

"آؤ بیٹی کھانا کھالو۔"

"ابھی آئی امی۔" نگارش کی پتلی سی آواز سنائی دی۔

اور جب نگارش کمرہ سے باہر نکلی تو شوکت بیگم جو اکلوتی بیٹی کو جدا کرنے کے خیال سے ویسے ہی دل برداشتہ تھیں۔ سناٹے میں آگئیں۔ یہ وہی نگارش تھی جو بہنیوں کے آنے پر مکان بھر میں ادھم چوکڑی مچایا کرتی تھی۔ وہی دوپٹہ جو گھر میں کھیل کود میں اتار کر الگنی پر ٹانگ دیا جاتا تھا۔ اب سر پر اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ ایک بال بھی نہ دکھائی دیتا تھا۔ نگارش نے جیسے تیسے تھا دو چار لقمے کھائے پھر سہیلیوں کے ساتھ کمرے میں چلی گئی۔ شوکت بیگم نے جو باہر دالان میں بیٹھی بیٹی کو ٹک ٹک دیکھے جا رہی تھیں دوپٹہ کے کونے سے آنسو پونچھے اور "یا اللہ" کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہونے والی سسرال کی خاطر مدارات اور نئی قطعہ بنا کر خوش اخلاق ساس۔ سیٹھ جسیم الدین کی دولت بڑا نام بڑا اور پھر نگارش ایسی لڑکی جس کی تصویر مسروری بیگم پہلے ہی دکھا چکی تھیں۔ انور میاں رستہ خطمی ہو گئے۔ ادھر سیٹھ جسیم الدین کو بھی لڑکے میں کوئی خرابی نظر نہ آئی..... لاکھوں میں نہ سہی ہزاروں میں ایک تو ضرور تھا۔ پڑھا لکھا قبول صورت۔ شریف خاندان اور وکالت بھی اچھی خاصی چلتی تھی۔ انھوں نے تو پہلی ہی نظر دیکھ کر فیصلہ کر لیا تھا۔ بیگم اندر آکر بولے۔

"لو اللہ نے خود ہی انتظام کر دیا۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ جو مسروری کی پسند وہی میری بھی۔ اور پھر لڑکا بھی گھر ہی کا ہے۔ جاوید کا بھائی ہی ہے ـــــ وہی خلوص، وہی سنجیدگی اور خاموش طبیعت۔"

ڈاکٹر وزیر آغا

اُردو افسانے کے تین دَور

اردو افسانے کے ہر دور میں دیکھنے کے دو زاویے مسلط اور مقبول رہے ہیں۔ ان میں سے ایک زاویہ تو ارضی رجحان کا علمبردار ہے اور اس کے تحت افسانہ نگار نے زندگی کے مظاہر کو بہت قریب سے دیکھا ہے — یوں کہ مظاہر کا کھردرا پن سب سے پہلے اس کے شعور کی گرفت میں آیا ہے۔ یہ انداز نظر گویا خوردبین کی مدد سے ماحول اور اس کے کرداروں کا جائزہ لینے کی ایک صورت ہے اور اسے بآسانی SHORT-RANGE VIEW کا مماثل قرار دیا جاسکتا ہے۔ دوسرا زاویہ نگاہ تخیلی رجحان کا داعی ہے اور اس کے زیر اثر افسانہ نگار نے تخیل کی بلندی پر سے گردوپیش پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی ہے اور یوں کسی خاص مقام یا نقطے پر اس کی نگاہیں مرتکز ہو کر رک نہیں گئیں بلکہ سارے ماحول کا احاطہ کرتی چلی گئی ہیں۔ یہ انداز دوربین کی مدد سے ماحول کا جائزہ لینے کی ایک صورت ہے اور اسے اگر LONG-RANGE VIEW کا نام دیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اردو افسانے کے آغاز ہی میں دیکھنے کے یہ دونوں انداز رائج ہو گئے تھے تاہم پہلے دور میں بحیثیت مجموعی تخیلی رجحان نسبتاً زیادہ قوی تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو افسانہ داستان گوئی کی اس روایت سے منسلک تھا جس میں تخیل کی پرواز کو تمام تر اہمیت حاصل تھی۔ بیشک روزمرہ کی زندگی کو نظر انداز کرنا داستان گو کا مسلک ہرگز نہیں تھا اور یہ اس لئے کہ وہ خود ایک گوشت پوست کا انسان تھا اور ماحول کے ان مظاہر کی نفی نہیں کرسکتا تھا جو اس کے چاروں جانب بکھرے ہوئے تھے اور اس کے شعور پر ہر لحظہ اثر انداز ہو رہے تھے تاہم چونکہ سینکڑوں برس کے تیاگ اور درویشی کے رجحانات نے اس کے ہاں زمینی مظاہر سے کنارہ کش ہونے کے میلان کو ابھار دیا تھا اس لئے وہ حقیقت کی عکاسی بھی غیر ارضی مظاہر کے وسیلے سے کرنے پر مجبور تھا۔ چنانچہ اردو ادب میں داستان گو کے ہاں اگرچہ اپنے معاشرے کی عکاسی کا رجحان موجود ہے تاہم یہ رجحان روایت کے قوی تر رجحان کے زیر اثر ایک غیر ارضی فضا کی عکاسی کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اردو افسانہ نے داستان گوئی کی اس روایت کے زیر اثر تربیت حاصل کی تھی اس لئے لامحالہ اس نے آغاز کار میں تخیلی انداز نظر دوڑانے کا مسلک اپنا لیا۔ چنانچہ سجاد حیدر یلدرم، ل احمد، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں حقیقت نگاری کی بہ نسبت تخیل آفرینی کے رجحان نے زیادہ شدت حاصل کی اور انھوں نے افسانے کا جو پیکر تراشا اس میں ارضی مظاہر کے ساتھ افسانہ نگار کا رابطہ کچھ ایسا مضبوط نہیں تھا۔ یہ سب افسانہ نگار ایک تخیلی فضا میں سانس لے رہے تھے اور محبت کے افلاطونی نظریے کی عکاسی، حسن کے غیر ارضی تصور کی نقاب کشائی اور مظاہر پر ایک جھلکتی سی نظر دوڑانے کے عمل میں مصروف تھے۔ شاید اسی لئے ان کے ہاں کردار نگاری کا عمل ناپید ہے اور انھوں نے کردار کے بجائے مثالی نمونے TYPE کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ گویا انھوں نے ماحول کی ہر کروٹ یا رجحان کو ایک علامتی مظہر سے واضح کیا ہے اور اسی لئے کردار کی بجائے مثالی نمونے کی پیشکش تک خود کو محدود رکھا ہے۔ بعض اوقات تو اعلیٰ انسانی قدروں میں مثلاً حسن، سچائی، محبت وغیرہ کو بھی علامتی مظاہر سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ نہیں کہ اس انداز نظر کے تحت ان افسانہ نگاروں نے فن پارے کی اعلیٰ نمونہ پیش ہی

ے جب اس نے روز کی طرح مغرب کی نماز کے وقت دم کرتے وقت اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا وہ ان دو آنکھوں میں عجیب سی بے چینی اور کرب دیکھ رہی تھی ایسا کرب جو اس نے ماں کی آنکھوں میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس نے ایک بار ہمت کر کے کنکھیوں سے ماں کا چہرہ دیکھا لیکن آنکھیں لانے کی ہمت نہ ہوئی وہ چپ چاپ اٹھی اور اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

رات گئے تک میاں بیوی کمرہ میں نہ جانے کیا کھسر پھسر کرتے رہے لیکن صبح جب سیٹھ صاحب ناشتہ کی میز پر آئے غصہ سے ان کا منہ پھولا ہوا تھا۔ رات شوکت بیگم نے ان کی نظروں کے سامنے سے فریب کے نہ جانے کون کون سے پردے اتار کر خود کو ننگا کر دیا تھا۔ کہ ان کے چہرہ کی طمانیت غائب ہو گئی تھی نور میاں اور بہن سے رخصت انھوں نے دوکان جاتے وقت ہی لے لی اور نند کو رخصت کرتے وقت ان کے بے حد منع کرنے پر بھی شوکت بیگم نے صغرا اور تسلیم کی جیب میں دس دس کے دو نوٹ رکھتے ہوئے جس خط کے لکھنے کا وعدہ کیا تھا وہ خط کبھی نہ بھیجا گیا۔

نے ریل کی کھڑکی، ہوٹل کی بالکنی یا پہاڑ کی چوٹی پر سے انبوہ اور سماج کی بیشتر کروٹوں پر ایک گہری نظر ڈالی ہے۔ دراصل انبوہ کا جزو بننے، زندگی کی چکی میں پسنے اور زندگی کے مسائل سے متصادم ہونے کی روش ایک بالکل جداگانہ نوعیت کی حامل ہے اور اس روش کے تحت زندگی کے کھردرے پن کا ایک شدید احساس ابھرتا ہے۔ کرشن چندر مزاجاً اس انداز نظر کا علمبردار نہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک تخیل پرست ہے اور اگرچہ کرشن چندر کی یہ ایک بہت بڑی عطا ہے کہ اس نے تخیل محض کی فضا سے افسانے کو باہر نکالا اور تخیل سے اپنا رابطہ قائم رکھتے ہوئے بھی زندگی اور معاشرے کی کروٹوں پر ایک گہری نظر ڈالی تاہم زندگی اور اس کے حقائق سے براہ راست متصادم ہونے کا انداز کچھ کرشن چندر کے ہاں زیادہ ابھر نہیں سکا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کرشن چندر نے نیچے بازار میں دوسروں کے قدموں سے قدم ملانے کی بجائے مکان کی کھڑکی میں سے بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ کو سنا ہے۔ دوسرے کرشن چندر کے ہاں کردار نگاری کا رجحان کچھ زیادہ توانا نہیں۔ کردار نگاری کا عمل اس وقت وجود میں آتا ہے جب آپ چھت سے اتر کر بیچ بچ کے کرداروں سے متصادم ہوتے اور ان کی ابھری ہوئی نوکیلی ہڈیوں کو اپنے جسم میں چبھتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اپنے اور ان کرداروں کے درمیان تخیل، رومان یا احساس برتری کی ایک چلمن آویزاں کر دیں تو یہ فاصلہ آپ کو کرداروں کے بجائے بہت سے مثالی نمونوں کے وجود کا احساس دلائے گا۔ یہی کچھ کرشن چندر کے ساتھ بھی ہوا۔ اس نے اپنے اور کلبلاتی ہوئی زندگی کے مابین ایک قدم کا فاصلہ ضرور قائم رکھا اور یوں اپنے افسانوں میں کرداروں کی بجائے لالہ جگی محرر، کسان، پٹواری، سپاہی اور آرٹسٹ، بھنگی وغیرہ مثالی نمونے پیش کرتا چلا گیا۔ بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر نے اگرچہ اپنے سماج اور اس کی مختلف کروٹوں پر نظریں مرکوز رکھیں تاہم اس نے ہمیشہ ایک بلند ٹیلے پر سے سماج کو دیکھا اور یوں اس کی کرخت سطح اور نوکیلے کرداروں کا نباض بننے کی بجائے سماج کے وسیع تر دھند کا ناظر بن کر نمودار ہوا۔ اس طریق کار کی بدولت کرشن چندر کی افسانہ نگاری کو کچھ تو فائدہ پہنچا اور کچھ نقصان! فائدہ یوں کہ معاشرے کی عکاسی کے درمیان میں بھی اس نے تخیل اور سوچ سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا (جیسا کہ حقیقت پسندی کی رجحان کے تحت عام طور سے ہوتا ہے) اور یوں افسانے کو سپاٹ پن سے بچا لیا۔ نقصان یوں کہ اس کی نظروں سے حقیقت کے کھردرے کنارے اوجھل ہی رہے نتیجۃً کرشن چندر کے یہاں تخیل اور حقیقت کا وہ امتزاج پوری طرح وجود میں نہ آ سکا جو ادب عالیہ کی تخلیق کے لئے از بس ضروری ہے۔ اس سب کے باوجود اردو افسانہ میں کرشن چندر کی عظمت سے انکار ناممکن ہے۔

افسانے کے اس دوسرے دور میں تخیلی رجحان کے ساتھ ساتھ ارضی رجحان کے شواہد بھی ملتے ہیں لیکن یہاں بھی مزاج کی ایک اہم تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ پریم چند کے دور میں حقیقت نگاری سماج کے مسائل کو کرداروں کی مدد سے پیش کرنے اور ایک اصلاحی نقطۂ نظر کو ہمہ وقت ملحوظ رکھنے کی سعی کا نام تھا۔ اور بس! لیکن افسانے کے دوسرے دور میں نگار نے اس ارضی رجحان کے تحت زندگی کو پریم چند کی بہ نسبت زیادہ قریب سے دیکھا اور ہر قسم کے مقصد یا اصلاح کے تصور کو تج کر زندگی کی ہو بہو تصویر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اپنے اس اقدام میں افسانہ نگار نے جذباتیت سے اپنا دامن چھڑا لیا اور ایک بے رحم تجرباتی عمل کی مدد سے زندگی کے داغوں اور دھبوں کو ننگا کرنے لگا۔ حقیقت نگاری کی اس روش نے دو اہم صورتیں اختیار کیں ایک وہ جس میں زندگی کی عام سطح منعکس ہوئی دوسری وہ جس میں افسانہ نگار نے خود کو سطح تک محدود نہ رکھا بلکہ غوطہ لگا کر کردار کے چھپے ہوئے پہلوؤں کی نشان دہی کو اپنا مسلک بنایا۔ اول الذکر کے علمبرداروں میں بیدی، منٹو، عصمت، احمد علی، اختر اورینوی اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کا نام لیا جا سکتا ہے اور موخر الذکر کے سلسلے میں ممتاز مفتی اور حسن عسکری کے نام ہیں۔ جہاں تک زندگی کی کھردری سطح کو پیش کرنے کے رجحان کا تعلق ہے۔ اس دور کے افسانوں میں حقیقت نگاری

نہیں کیا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بعض عصر کے افسانے لکھے ہیں جو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں لیکن اکثر و بیشتر یہ انداز نظر کچھ زیادہ ہی تخیلی اور افسانہ نگار کا ردِ عمل کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا ہے۔ اور نتیجۃً زندگی کی کھردری سطح سے افسانہ نگار کا مضبوط رابطہ قائم نہیں رہ سکا۔ ان افسانہ نگاروں کے اسلوب بیان میں بھی ایک ایسی جذباتی کیفیت ابھری ہے جو ذہنی پختگی کے موجودہ ایام میں کچھ زیادہ قابل قبول نہیں۔

اردو افسانے کے اس ابتدائی دور میں دوسرا انداز نظر حقیقت پسندی کا وہ رجحان تھا۔ جس اہم ترین علمبردار پریم چند ہے۔ پریم چند زمین کی سوندھی سوندھی باس سے بہت قریب تھا۔ چنانچہ اس نے تخیل کی رفعتوں کے بجائے زندگی کے ارضی پہلوؤں اور سماج کی واضح کروٹوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس لئے پریم چند کے ہاں پہلی بار کردار کے نقوش پوری طرح ابھرے ہوئے آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اخلاقی یا اصلاحی مسلک کے تحت پریم چند نے اپنے بیشتر کرداروں کی تشکیل میں ایک شعوری موڑ پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں اس کے ہاں کردار کا سراپا زخمی بھی ہوا تاہم کردار نگاری کی طرف پریم چند کا رجحان ایک نہایت اہم رجحان تھا اور اس کے تحت اردو افسانہ تخیلِ محض کی فضا سے نکل کر زمینی فضا سے قریب تر ہونے میں یقیناً کامیاب ہوا۔ لیکن ایک خالص تخیلی رجحان کی طرح ایک خالص ارضی رجحان بھی عظیم فن کی تخلیق کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہیں۔ عظیم فن تو آسمان اور زمین، تخیل اور جذبے کے ربطِ باہم کی پیداوار ہے پریم چند اردو افسانے کے معماروں میں ایک مقام امتیاز کا مالک ہے۔ اور اس نے حقیقت پسندی کے رجحان کو اختیار کر کے اردو افسانے کی بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ اس سب کے باوصف اگر اس کے ہاں اردو افسانہ دنیا کے عظیم افسانوی ادب کے معیار تک نہیں پہونچا تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ پریم چند نے "زمین" کی عکاسی میں تخیل کی لطافت اور سوچ کی روشنی کو پوری طرح شامل نہیں کیا اور اس کے ہاں افسانہ قصہ گوئی سے اوپر اٹھ کر انکشافِ ذات اور عرفانِ کائنات کے مدارج تک نہیں پہونچ پایا۔

اردو افسانے کا دوسرا دور ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ شروع ہوا اور تقسیم ملک کے واقعہ کو اس کی آخری حد قرار دینا مناسب ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "انگارے" کی اشاعت کو اس دوسرے دور کی خشتِ اول قرار دینا چاہیئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ "انگارے" کی اشاعت سے قبل ہی اس نئے دور کے تمام نقوش واضح ہو چکے تھے۔ حصولِ آزادی کے اقدامات، مغربی ادب اور معاشرے کے اثرات، ۱۹۲۹ء کا اقتصادی بحران اور یورپ میں دوسری جنگِ عظیم کی تیاری نے نئے دور کے افسانے کے لئے زمین ہموار کر دی تھی اور تخیل محض کی فضا سے افسانہ نگار کو باہر نکال بہت سے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی موضوعات سے قریب تر کر دیا تھا۔ تاہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ اردو افسانے کے دوسرے دور میں بھی دیکھئے کے وہ دونوں انداز برابر قائم رہے جو پہلے دور کا طرۂ امتیاز تھے البتہ اب ان میں سے تخیلی رجحان نے اپنی صورت اس طور بدلی کہ اس میں اصلاحی یا مقصدی ادب پیدا کرنے کی روش ایک بڑی حد تک ختم ہو گئی۔ دوسرے اب تخیل محض کی فضا میں رہنے کی بجائے افسانہ نگار نے تخیل کو سماجی کروٹوں اور ارضی بندھنوں کی پرکھ کے سلسلے میں ایک حربے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا دوسرے لفظوں میں جہاں پہلے دور کے افسانہ نگار نے آسمانی رفعتوں کو اس طور پر اپنایا تھا کہ زندگی کے ارضی پہلو ایک بڑی حد تک اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے وہاں دوسرے دور کے افسانہ نگار نے زاویۂ نگاہ تو وہی اختیار کیا یعنی بلندی پر سے ماحول کو دیکھنے کا زاویہ تاہم اب اس نے بلندی پر سے مزید بلندی کو دیکھنے کی بجائے اپنی نظریں جھکا لیں اور زمین اور معاشرے کی کروٹوں کو دیکھا گیا۔ یہ انداز نظر اس دور کے سب سے بڑے افسانہ نگار کرشن چندر سے عبارت ہے۔ کرشن چندر نے اپنے افسانوں میں زندگی سے براہِ راست متصادم ہونے اور اس کے ارضی پہلوؤں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ایک صاحبِ بصیرت تماشائی کی طرح اس

کے دوسرے رجحان کا علمبردار ممتاز مفتی ہے۔ ممتاز مفتی نے نہ صرف کردار کے مخفی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کی اور زندگی کی بہت سی الجھنوں کو سطح پر لانے کی کوشش کی بلکہ اس نے کردار کی تعمیر میں بھی نظر کی کشادگی اور وسعت کو ملحوظ رکھا۔ چنانچہ ممتاز مفتی کے افسانوں میں اگرچہ کردار کے بے رحم تجزیے کا رجحان موجود ہے تاہم اس کے یہاں یہ رجحان "سپاٹ پن" کو وجود میں لانے کا باعث ثابت نہیں ہوا۔ اور اسی لئے ممتاز مفتی کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔

اردو افسانے کے اس دوسرے دور میں خالص تخیلی یا خالص ارضی رجحان کے علاوہ ایک تیسرا رجحان بھی ابھرا جو دراصل ان دونوں کے خوش گوار امتزاج کی ایک صورت تھی اور جو اردو افسانے کے پہلے دور میں موجود نہیں تھا۔ اس رجحان کے علمبردار وہ فن کار تھے جنھوں نے سطح زمین پر اتر کر زندگی کو نہایت قریب سے دیکھا تھا لیکن جن کے فن میں زندگی کی ارضی کیفیات ایک انوکھی لطافت سے ہم آہنگ ہو کر نمودار ہوئیں۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں جذباتیت کے بجائے تحمل، مثالی نمونوں سے شناسائی کے بجائے زندہ کرداروں کا مطالعہ اور سپاٹ پن کے بجائے ایک انوکھی فنی لطافت اور ملائمت کی روش ابھر آئی۔ گویا تخیلی اور ارضی رجحانات کے اہم ترین اوصاف ان کے یہاں یکجا ہو گئے۔ ان افسانہ نگاروں میں سے دو یعنی مسعود شاہد اور شمس آغا نے افسانوں کا صرف ایک ایک مجموعہ پیش کیا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئے۔ غلام عباس نے اردو افسانے کے تیسرے دور میں بھی تخلیق کا عمل جاری رکھا اور آج ہم اسے اردو کے ایک اہم افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

اردو افسانے کا تیسرا دور تقسیم ملک کے بعد شروع ہوا۔ تقسیم سے قبل حصول آزادی کی تحریک نے فضا میں ایک عجیب سی بیقراری اور تحرک کو جنم دے دیا تھا اور ایک اونچے پلیٹ فارم سے انبوہ کو مخاطب کرنے کا رجحان بہت عام ہو گیا تھا۔ چنانچہ جس طرح حصول آزادی کی تحریک میں ایک شعلہ بیان مقرر کی نظریں کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ پگھلتے اور اڑتے ہوئے انبوہ کا جائزہ لیتی تھیں بعینہٖ اس دور کے افسانہ نگاروں نے بھی عام طور سے فرد کے سراپا کے بجائے انبوہ کی کروٹوں کو نگاہ کا مرکز بنایا۔ کرشن چندر اس دور کے اس مقبول عام طریق کار کا علمبردار تھا اور اگرچہ کردار نگاری کا رجحان بھی اس دور کے اردو افسانے میں موجود ہے تاہم بحیثیت مجموعی اس پر کرشن چندر کے فن کی چھاپ ہی ثبت ہے۔ لیکن تقسیم کے بعد حصول آزادی کی تگ و دو یکلخت ختم ہو گئی، ہجوم منتشر ہو گیا اور افسانہ نگار کی نظریں انبوہ کے بجائے فرد کو اپنی گرفت میں لینے کی طرف مائل ہونے لگیں۔ پھر تقسیم کے واقعے نے افراد کو نقل مکانی پر بھی مجبور کیا اور انھیں ایک زبردست انسانی المیہ سے دوچار کر کے مثالی نمونے کے بجائے کردار کے پیکر میں ڈھال دیا۔ المیہ (TRAGEDY) فرد کے نوکیلے پہلوؤں کو ابھار دیتا ہے اور وہ اپنے ماحول سے برسرپیکار ہو کر کردار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تقسیم ملک نے معاشرے میں لاتعداد کردار پیدا کر دیئے اور افسانہ نگار کی نظریں ان پر مرکوز ہونے لگیں۔ چنانچہ اردو افسانے کے اس دور میں ارضی رجحان کو تحریک ملی اور کردار نگاری کی ایک بھرپور روش وجود میں آ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے ارضی پہلوؤں کو قریب سے دیکھنے کا رجحان بھی عام ہو گیا یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس دور کا افسانہ نگار چھت سے اتر کر کمرے میں آ گیا اور وہاں اجسام کی قربت سے بری طرح متاثر ہوا۔ اس ارضی رجحان کے علمبرداروں میں راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، میرزا ادیب، رام لعل، منٹو، اشفاق احمد، رحمان مذنب، جیلانی بانو، ہاجرہ، خدیجہ، دیوندر ستیارتھی، ہندر ناتھ، ستیش بترا، صادق حسین، قرۃ العین حیدر، یونس جاوید (یہ فہرست قطعاً نامکمل ہے) کے نام خاص طور پر اہم ہیں۔ ان میں سے کئی افسانہ نگاروں نے تو اردو افسانہ کے دوسرے دور ہی میں نام پیدا کر لیا تھا لیکن تقسیم کے بعد بھی ان کی تخلیق کی رفتار مدھم نہیں ہوئی اور انھوں نے کردار نگاری کے رجحان کو زندہ رکھا۔ کردار نگاری کے سلسلے میں نئے دور کے نئے افسانہ نگاروں میں رام لعل اور رحمان مذنب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان میں سے رام لعل نے نہ صرف وسیع تر سنجیدگی سے اپنے کردار

کا عمل اپنے عروج پر نظر آتا ہے اور زندگی کے گھناؤنے پہلو ابھر کر منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔ بے شک اصل کو بعینہٖ پیش کرنے کا یہ رجحان مستحسن ہے اور اسے فن کار کی دیانت اور صاف گوئی کی ایک قابلِ قدر کاوش کا نام دیا جا سکتا ہے تاہم فن کا تقاضہ یہ ہے کہ "حقیقت" سپاٹ اور بے رنگ ہو کر لطافت اور رعنائی سے محروم نہ ہو جائے۔ کہانی لکھنے کا فن یقیناً اس بات کا متقاضی ہے کہ نہ صرف قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا جائے بلکہ اسے جمالیاتی حظ کی تحصیل کا موقع بھی بہم پہنچایا جائے لیکن جب حقیقت نگاری کو ایک "مقصد" قرار دے کر فن کے تقاضوں سے منہ موڑ لیا جاتا ہے تو یہ عمل بجائے خود ایک شعوری کاوش کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اختر اورینوی اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کو اسی لئے ایک بڑی مشکل پیش آئی جب وہ ماحول کی عکاسی میں سپاٹ پن کی حد تک حقیقت نگار بن گئے البتہ منٹو نے حقیقت نگاری کی روش کے باوصف سپاٹ پن سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ منٹو نے اپنے لئے ایک ایسا میدان منتخب کیا جو ایک عام قاری کے لئے بے حد دلچسپ تھا۔ اس میدان میں جب منٹو نے کردار کے جنسی پہلو کو اجاگر کیا اور زندگی کے ارضی پہلوؤں کو بطورِ خاص ابھارا تو اسے بے حد کامیابی حاصل ہوئی اور اس کی آواز کو قطعاً منفرد قرار دے دیا گیا۔ تاہم اس بات کو عام طور سے فراموش کر دیا گیا کہ منٹو نے نہ صرف ایک محدود سے میدان کو اپنے لئے منتخب کیا تھا بلکہ زندگی کو بھی محض ایک خاص زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو نے زندگی کو دیکھنے کے لئے "روشندان" دروازہ کھڑکی — ان سب کو ترک کر کے غسل خانے کے "روزن" کو استعمال کیا ہے اور اس لئے اسے زندگی کا صرف ایک خاص پہلو ہی ابھرا ہوا دکھائی دیا ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس خاص پہلو کی عکاسی میں منٹو نے دیانت، خلوص اور گہری نظر کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ اردو افسانے کے ارتقا میں منٹو کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کہنا ممکن ہے کہ منٹو کے ہاں زندگی کا صرف ایک پہلو نمودار ہوا ہے۔ یعنی زندگی کا ارضی پہلو! چنانچہ قاری کو منٹو کے افسانے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے نڈر اور بیباک شخص سے کہانی سن رہا ہے، جس نے بہت سے پردے نوچ کر الگ کر دیئے ہیں تاہم اسے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ شخص انکشاف و عرفان کے مراحل سے بھی آشنا ہے اور زندگی کی مخفی کروٹوں کا نباض بھی ہے۔

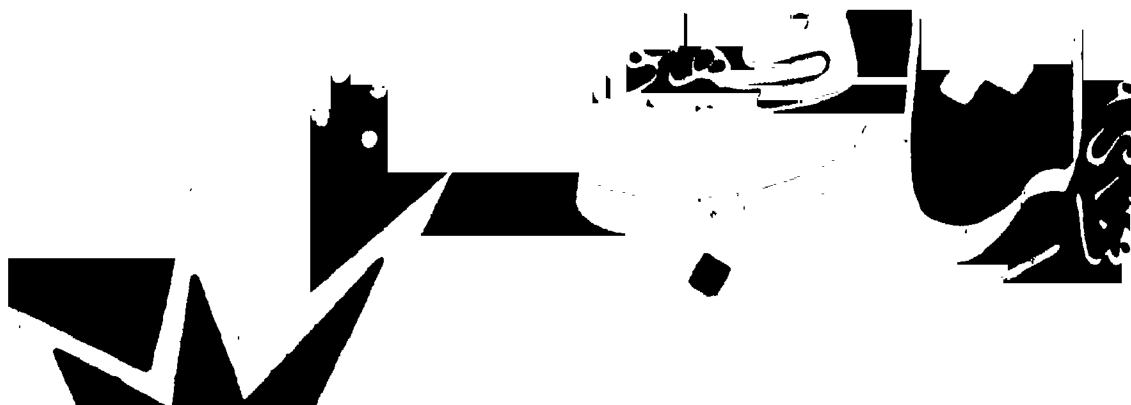
اس دور میں حقیقت پسندی کی دوسری روش نفسیاتی مطالعہ کا رجحان تھا۔ کردار کے نفسیاتی مطالعہ کو حقیقت نگاری کے تحت شمار کرنے کی وجہ جواز یہ ہے کہ جس طرح عام زندگی کے رخ سے تمام پردے نوچ کر الگ کرنے اور یوں داغوں اور دھبوں کو مرکزِ نگاہ بنانے کا نام حقیقت نگاری ہے یونہی کردار کے نفس لاشعور میں غوطہ لگا کر اس کے سراپا سے لپٹے ہوئے بہت سے نقابوں کو اتار پھینکنے کا اقدام بھی حقیقت نگاری کے زمرے ہی میں آتا ہے۔ دراصل نفسیاتی مطالعہ میں بھی تجرباتی طریق کار ہی اہمیت کا حامل ہے اور افسانہ نگار جب کردار کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو دائرہ نور میں لاتا ہے تو وہ بھی وہی کام سرانجام دیتا ہے جو زندگی کے کھردرے کناروں کو منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں سرانجام پایا تھا۔ اردو افسانے کے اس دوسرے دور میں کردار کے نفسیاتی مطالعہ کے بھی دو رجحان منظرِ عام پر آئے۔ ان میں سے ایک رجحان تو سپاٹ پن کی حد تک حقیقت نگاری کا رجحان تھا۔ اس کا سب سے بڑا علمبردار حسن عسکری تھا۔ حسن عسکری نے کردار کی سوچ کا سہارا لے کر اور آزاد تلازمۂ خیال کے طریق کار کو اختیار کر کے چند کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا لیکن حقیقت نگاری کے مقصد کو سامنے رکھ کر افسانے کو ضرورت سے زیادہ سپاٹ اور بوجھل بنا دیا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ کردار میں قاری کی دلچسپی قائم نہ رہ سکی بلکہ افسانے سے جمالیاتی حظ کی تحصیل کے امکانات بھی روبہ زوال ہو گئے۔ بے شک حسن عسکری نے اردو افسانے میں ایک بالکل نئی روش اختیار کی اور اس لئے اسے اردو افسانے کے ارتقا میں ایک خاص اہمیت بھی حاصل ہے۔ تاہم اس کے افسانوں میں فنی لطافت اور رعنائی کی وہ کیفیت پوری طرح ابھر نہیں سکی جو اچھے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ نفسیاتی مطالعہ

کے ایک ناقص نمونے کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

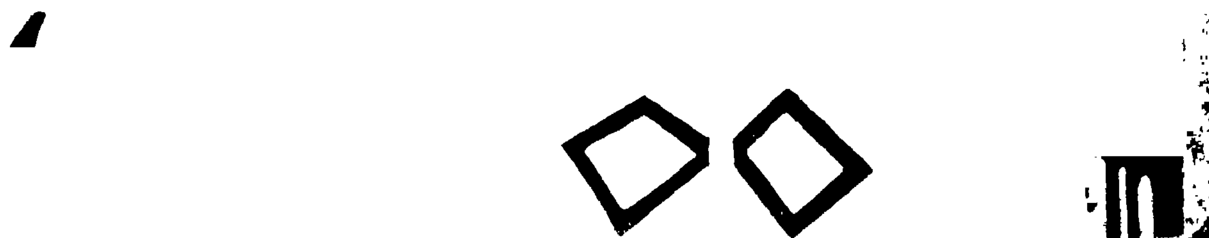
اردو افسانے کے نئے دور میں یوں تو بہت سے ایسے افسانے لکھے گئے ہیں جو تخیلی اور ارضی رجحانات کے امتزاج کا خوبصورت نمونہ ہیں اور اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ اب زندگی اور اس کی کروٹوں کو پرکھنے کے لئے ایک متوازن انداز نظر ابھرنے لگا ہے تاہم اس نئے دور میں چند افسانہ نگاروں کے یہاں یہ انداز کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے۔ اس سلسلے میں غلام عباس کا نام اوپر آیا ہے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی اور غلام الثقلین نقوی کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے اردو افسانے کے دوسرے دور میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن دراصل اس کے فن کو تیسرے دور میں عروج حاصل ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی زندگی کے ایک نہایت زیرک ناظر ہیں اور ان کا فن زندگی کے ارضی پہلوؤں کا ایک خوبصورت عکس پیش کرتا ہے۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہو کہ ان کے یہاں تخیل کی لطافت، رفعت اور ملائمت بھی ہمہ وقت قائم رہتی ہے۔ اسی لئے ندیم کے تازہ افسانوں میں تخیل اور حقیقت کا ایک انوکھا امتزاج رونما ہوا ہے۔ دوسرا نام غلام الثقلین نقوی کا ہے۔ نقوی صاحب افسانے کے میدان میں نووارد ہیں لیکن ان کے افسانوں میں ابھی سے وہ توازن ابھرنے لگا ہے جو فن کار کو طویل ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے اور جو اعلیٰ فن کی تخلیق کے لئے ازبس ضروری ہے۔

منتخب کئے ہیں بلکہ کردار کا نفسیاتی مطالعہ کرتے ہوئے بھی خود کو محض چند پہلوؤں تک محدود نہیں رکھا ہے۔ مثلاً جنسی پہلو! رام لعل نے اپنے افسانوں میں واقعات کا اہتمام اس طور پر کیا ہے کہ ہر کردار کا اہم ترین شخصی پہلو ابھر کر قاری کے سامنے آگیا ہے یوں رام لعل متعدد کرداروں کے ایک ہی پہلو کی نقاب کشائی کرتا نظر نہیں آتا بلکہ ہر کردار کو پرکھتا اور اس کی ممتاز ترین جہت کو نمایاں کر کے پیش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے! دوسری طرف رحمان مذنب نے اپنی تگ و تاز کے لئے وہی میدان منتخب کیا ہے جو منٹو کا تھا لیکن ایک مضبوط گرفت، نیز وسیع ترین منظر کو ملحوظ رکھ کر اس خاص میدان میں منٹو کی بہ نسبت بہتر فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی نظر آتی ہے لیکن ان دونوں افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا تقابلی مطالعہ کریں تو بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً منٹو کی طرح رحمان مذنب نے بھی طوائف کے کردار کو پیش کیا ہے لیکن جہاں منٹو کے یہاں طوائف اور عورت کا تصادم سطح تک ابھرا ہوا ملتا ہے اور منٹو نے اس تصادم کے ڈرامائی عناصر سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے (جو ایک نسبتاً آسان بات ہی) وہاں رحمان مذنب نے طوائف کے کردار کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے اور "تصادم" تک خود کو محدود نہیں رکھا۔ دوسرے لفظوں میں جہاں منٹو کا آخری قدم رکا ہے وہاں سے رحمان مذنب نے اپنا پہلا قدم اٹھایا ہے اور ایک نسبتاً مشکل زمین میں تخلیق کے نقوش کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے علاوہ منٹو کے یہاں لذت کوشی کا عنصر نمایاں ہے۔ جب کہ رحمان مذنب نے طوائف کے تدریجی تنزل کو نمایاں کر کے اس کے گھناؤنے کردار سے کبھی نفرت اور کبھی ترحم کے جذبات کو ابھارا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ منٹو نے زیادہ تر طوائف کے کردار کو پیش نظر رکھا ہے لیکن رحمان مذنب نے اس سارے پس منظر کو اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے جو طوائف کے کردار کا خالق بھی ہے اور اس کی مخلوق بھی اور یوں منٹو کے مقابلے میں مذنب نے ایک نسبتاً کشادہ کینوس پر اپنے فن کے نقوش کو ابھارا ہے۔

زندگی کی ارضی سطح اور زندہ اور توانا کرداروں سے ہم آہنگی کے ایک عام رجحان نے اردو افسانے کے نئے دور میں بڑی اہمیت حاصل کی ہے تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تخیلی رجحان اب ناپید ہو گیا ہے۔ بیشک تخیلی رجحان کی وہ صورت جو ل۔ احمد اور دوسرے افسانہ نگاروں سے مختص تھی یا کرشن چندر کا وہ انداز جو افسانے کے دوسرے دور پر مسلط تھا اب باقی نہیں رہا (نئے دور میں انور اور اے حمید کو کرشن چندر کے مقلدین میں شمار کرنا چاہیئے) تاہم اس سے یہ مراد بھی نہیں کہ تخیلی رجحان قطعاً ختم ہو گیا ہے۔ نئے دور میں جاوید جعفری کے بعض افسانے اور خلیل احمد کی تخلیقات کو اسی رجحان کے تحت شمار کرنا چاہیئے کہ ان میں تخیل آفرینی کا رجحان حقیقت نگاری کی بہ نسبت زیادہ قوی ہے لیکن چونکہ اب حالات نے افسانہ نگار کو زندگی کی ارضی سطح سے قریب تر کر دیا ہے اور اسے قدم قدم پر مثالی نمونوں کے بجائے سچ مچ کے کرداروں سے متصادم ہونا پڑا ہے، اس لئے تخیلی رجحان کے باوصف ان افسانہ نگاروں کے یہاں کردار نگاری کی روش موجود ہے اور انھوں نے اپنے عام زندگی کے مابین کوئی کشادہ خلیج حائل نہیں ہونے دی۔ دراصل نئے دور میں تخیلی رجحان اسلوب کے ایک خاص لطیف پیکر اور پلاٹ کی ایک نیم رومانی کیفیت کے طور پر ابھرا ہے۔ اب اس میں مکانی بعد کا وہ عالم موجود نہیں جو پہلے ادوار میں بہت مقبول تھا۔ جاوید جعفری نے تو صرف چند ایک افسانے ہی لکھے ہیں لیکن خلیل احمد نے اس سلسلے میں بعض معرکے کی تخلیقات سپرد قلم کی ہیں۔ خلیل احمد کے اسلوب میں ایک انوکھی دلکشی اور قوت ہے اور اس کے یہاں وہ کسک بھی موجود ہے جو نہ تو ابل کر رقت کی صورت اختیار کرتی ہے اور نہ مدھم ہو کر جذبے سے بے اعتنائی کی روش میں ڈھل جاتی ہے۔ نئے دور میں تخیلی رجحان کی ایک اور صورت انتظار حسین کی افسانہ نگاری ہے۔ لیکن انتظار حسین نے تخیل کے مثبت پہلوؤں سے دامن چھڑا کر محض ماضی کی نیم تاریک تخیلی فضا میں خود کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ویسے یہ عجیب بات ہے کہ اس افسانہ نگار کے یہاں اگرچہ غالب رجحان "حقیقت" سے فرار حاصل کرنے کا ہے تاہم اس کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا سب سے بڑا نقص یعنی سپاٹ پن بھی موجود ہے اور یوں اس کے افسانے تخیلی رجحان







فون نمبر (امین آباد) ۲۲۴۶۲
مکان: ۲۶۵۴۰
تار کا پتہ
کھتری

ساڑیوں اور تیار شدہ ملبوسات کے لیے سالگ رام کھتری کی دو دکانیں

امین آباد (ہیڈ آفس)

شادیوں کی ساڑیاں
کنجیورم
دھرماورم
شانتی نکیتن
چندیری
بنارسی
ساڑیاں بکفایت حاصل کرنے کے لیے
ریشمی، اور ہینڈلوم
شادی کی ساڑیوں کا
سب سے بڑا مرکز

نظیر آباد (شاخ)

ٹیرالین کی ارسٹوڈ قمیص
ونگس کی اسپورٹس قمیص
ریمنس کے پتلون
سویٹر، کارڈیگن
خوبصورت ٹائیاں، موزے
فراک
اور بابا سوٹ

سالگ رام کھتری
نمبر ۴۴ امین آباد پارک، لکھنؤ

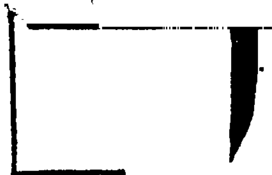
سالگ رام کھتری
نظیر آباد، لکھنؤ



























ایک شخصیت، کئی روپ






ٹیلی فون پر
آپ کا تار ہے

ماہنامہ کتاب لکھنؤ

فروری ۱۹۶۴ء

● —— ۲ مضامین

● —— ۶ افسانے

● —— ۱۱ منظومات

● —— نئی کتابوں پر تبصرے

● —— شام و سحر کے درمیان

● —— طنز و مزاح

—— اور ——

● —— ادبی مسائل پر فکر انگیز خطوط

اس شمارہ میں

حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی
قاضی عبد الستار، راہی معصوم رضا، ڈاکٹر
صفدر آہ، احمد جمال پاشا، وجاہت علی سندیلوی
تاج سعید، شہریار یوسف اختر اور دوسرے

جلد (۳) نمبر (۲)

زرِ سالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں
۶½ روپے
قیمت
۵۰ نئے پیسے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

مجلسِ مشاورت
سید احتشام حسین
حیات اللہ انصاری
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر: سید جمیل احمد
مطبوعہ: نظامی پریس لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: کتاب، چوک، لکھنؤ

پاکستان آفس:-
مسٹر ضمیر اکبر خاں، الائڈ فوٹوگرافرس پاکستان لمیٹڈ
۱۴/۲ ۔ ۲۲ محل، کمرشیل ایریا ڈھاکہ

۲۰۰۰ افسانے

اردو افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۲ میں
دو ہزار افسانے تخلیق کیے

اور ماہنامہ **کتاب** لکھنؤ نے ان میں سے
۲۷ منتخب افسانے آپ کی خدمت میں پیش کیے

مرتب:۔ رام لعل ۔ عابد سہیل

ضخامت ۲۱۲ صفحات .... قیمت عام کاغذ .... ایک روپے ۶۰ نئے پیسے
سفید چکنا کاغذ ۲ روپے .... مجلد گلیز کاغذ ۳ روپے

زرسالانہ ۶ روپے بھیج کر آپ یہ نمبر اور اس سال شائع ہونے والے دوسرے خاص نمبر مفت حاصل کرسکتے ہیں، ہر خاص نمبر رجسٹری سے حاصل کرنے کے لیے ۵۰ پیسوں کے ٹکٹ بھیجئے۔ ڈاک سے گم ہونے کی صورت میں خاص نمبر دوبارہ نہیں بھیجے جاتے

ماہنامہ **کتاب** لکھنؤ

کتاب، لکھنؤ

ماہنامہ کتاب کے دو دستاویزی نمبر

شوکت تھانوی نمبر

(ایک روپیہ)

اور

۱۹۶۲ کے بہترین افسانے

(ایک روپیہ ساٹھ پیسے)

اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں

اور اب ——— اپریل ۱۹۶۴ ——— میں

کتاب

ہندی افسانہ نمبر

اور سال رواں کے آخر میں

نئی نسل نمبر

پاک و ہند کے ۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے ممتاز فنکاروں کے تعاون سے

پیش کرنے کا اعلان کرتا ہے

زر سالانہ ۶ روپے بھیج کر یہ نمبر مفت حاصل کیجئے

کے بموجب تمام مسلمانوں کو پاکستان بھیج کر اور ہندوؤں کو ہندوستان بلا کر اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا اور نہ حکومت ہمیشہ ہر ہر محلہ میں فوج و پولیس لگا کر گولی کے زور پر اس کا کوئی دیرپا علاج نکال سکتی ہے۔

یہ زہر بغیر مسلسل جد وجہد کے نہیں نکل سکتا اور مسلسل جد وجہد بھی ایسی جو سیاسی لیڈروں کے نعروں جیسی نہ ہو بلکہ ایسا جنون چاہتی ہے جس کی منزل حشر دور کے پرے ہے۔

کیا اب وہ وقت نہیں آگیا ہے کہ ادیب فرقہ واریت کے خلاف جہاد شروع کریں؟

افسانہ نمبر - اپنے خاص نمبروں کی تعریف اور مقبولیت کے بلند بانگ دعووں اور آسمان و زمین کے قلابے ملانے کی وبا کچھ ایسی پروان چڑھ گئی ہے کہ ہم کو ۱۹۶۲ء افسانوی ادب انتخاب کے بارے میں لب کشائی کی ہمت نہیں پڑتی۔ پھر بھی ہم یہ ضرور کہیں گے اس خاص نمبر کو جس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا گیا وہ ہماری توقعات سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ ہم ان ادیبوں اور قارئین کے بھی شکرگزار ہیں جنھوں نے ہماری اس کوشش کو سراہا اور ان کے بھی جنھیں اس میں اضطراب پرور گردہ بندی، اور روایت پرستی کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔

افسانہ نمبر عام شماروں سے کہیں زیادہ تعداد میں چھاپا گیا تھا۔ اسکے باوجود اب تقریباً ختم ہو چکا ہے اور ہم کتب فروش حضرات کی مزید فرمائش پوری نہ کرسکیں گے۔ دفتر میں فائل کے علاوہ تھوڑی سی جلدیں رہ گئی ہیں زر سالانہ ۶ روپئے بھیج کر آپ یہ خاص نمبر حاصل کر سکتے ہیں۔

سرورق - اس بار ہم سرورق پر لکھنؤ کے نوجوان مصور رائے کی چاند کے پس منظر کی رنگین تصاویر کے سلسلے کی ایک کڑی دو رنگوں میں چھاپ رہے ہیں۔ رائے کی ان تصاویر کو فن مصوری میں اپنے قسم کی پہلی کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ پورے چاند کی رات کی خاموشی، سکون اور حسن کو رائے نے اپنی ان چھ تصاویر میں پوری طرح گرفت میں لے لیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کوشش، یہ تجربہ رائے کے فن کو نئی عظمت اور پہنائیوں سے روشناس کرے گا۔

افسانہ نمبر کا سرورق جسے بے حد سراہا گیا فہر کے ممتاز فنکار ریحے جکرورتی کے موقلم کا نتیجہ تھا۔ افسوس کہ ہماری کوتاہی سے افسانہ نمبر میں اس کا کوئی اعلان نہ ہو سکا۔

قطب مینار - گزشتہ چند برسوں سے اس بارے میں کہ قطب مینار کس نے بنوایا ایک خواہ مخواہ کی بحث بعض ایسے لوگوں نے شروع کر رکھی ہے جن کو تاریخی صداقت سے زیادہ معاصر عزیز ہیں۔ ہم قطب مینار کی تاریخی حیثیت کے متعلق ایک اہم مضمون مارچ کے شمارے میں شایع کر رہے ہیں۔

"کتاب لکھنؤ"

اپنی باتیں

کھلنا ـــــ کلکتہ ـــــ ڈھاکہ ـــــ فسادات کا ایک لامتناہی اور گھناؤنا چکر ہے جو چل رہا ہے اور رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اسی چکر نے جس کی ذمہ داری کبھی انگریز کے سر ڈالی گئی کبھی مسلم فرقہ پرستی کے سر اور کبھی ہندو فرقہ پرستی کے سر اس دور میں برصغیر ہند و پاک کے چہرے پر ایک ایسا داغ لگا رکھا ہے جو مٹنے ہی کا نام نہیں لیتا۔

یہ مسئلہ غالباً ہندستان اور پاکستان کے لیے خصوصاً شمالی ہندستان اور پاکستان کے لیے اس نصف صدی کا مسئلہ رہا ہے۔ اسی کے پیدا کیے ہوئے زہر نے ملک کی تقسیم کرائی اور تقسیم کے بعد وہ ہولناک خوں ریزی اور اس بڑے پیمانہ پر تبادلہ آبادی کرایا کہ جس کی مثال تاریخ نہیں دے سکتی۔ مصر سے موسیٰ و قوم موسیٰ کا سفر بھی ایسا نہ تھا۔ اسی کے زہر نے اردو کو مسلمان کی زبان اور ہندی کو ہندو کی زبان کا لقب دینے کی سازش کی اور گاندھی کی جان لی۔ غرض ہماری تمام سیاست، ہماری تمام فکر اس چکر کے پیٹ میں آ گئی۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف دو فرقے ہیں ایک ظالم و غالب و حاکم کا اور دوسرا مظلوم و مغلوب و محکوم کا۔ ہماری جدید تاریخ میں حملہ اہرمن اگر کسی تازیانے کو ہاتھ میں لیے ہر یزداں پر حملہ آور ہیں تو یہی فرقہ پروری و فسادات کا تازیانہ ہے۔ شیطان کی انگلی کی طرح کسی ایک جگہ شہد لگا دینے کا شوشہ ہر سال ایک نہ ایک مرتبہ دونوں ملکوں میں ہنگامہ پیدا کرتا ہے کہ جس کی مثال ناممکن ہے۔

ادیب اگر حسن کا خالق ہے تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ ان اہرمنوں سے نپٹے کسی ایک گروہ یا دوسرے گروہ کا نمائندہ نہ ہو خود اپنا ! حسن کاروں کے جرگے کا نمائندہ ہو۔ پچھلے پندرہ برس میں اس المیہ پر اردو ادب میں کچھ نہیں لکھا گیا اگر کچھ لکھا گیا ہے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے بروقت فرقہ واریت کے سبب سے بحث کرنے کا نہیں دراصل یہ بحث ہے بھی قابل اعتنا نہیں، کم از کم ادیب کے لیے تو نہیں۔ ادیب کے لیے صرف سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ فرقہ واریت گندی و گھناؤنی چیز ہے۔ اس لیے اس سے لڑنا ضروری ہے۔ اس کا قلم ہر ظلم اور ہر گھناؤنی چیز کے خلاف جد و جہد کرتا ہے۔

ترقیات و وطن پروری کے نعرے ہم نے بہت لگائے ہیں لیکن اپنے دل کو ٹٹولا بہت کم ادیبوں نے ہے۔ ان فسادات کے المیہ پر کڑھنا، اور جلنا ابھی ہمارے ادیبوں نے شروع نہیں کیا ہے ابھی اس بدی کی بیخ کنی کے خواب دیکھنا بھی شروع نہیں کیے ہیں۔ ابھی دراصل ہمارے ادیبوں نے زندگی پر اس کے جذباتی اثرات کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے۔

لیکن کیا اب وہ وقت آ نہیں گیا ہے کہ تمام ادیب وہ خواہ کسی فرقے کے ہوں، کسی مذہب و مکتب خیال کے پیرو ہوں اپنا ایک الگ فرقہ بنائیں اور ایک ایسی شمع روشن کریں جس کی ضیا کعبہ اور بتکدے میں یکساں ہو کیونکہ ظاہر ہے کہ یو پی کے دویدی صاحب کی خواہش

پولیس کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔

"ٹیلی فون کی شاید ضرورت نہ پڑے، وہ مجھے تلاش کر رہی ہے اور شاید یہاں آنے ہی والی ہے۔"

کیوں تلاش کر رہی ہے۔

"ایک دکان جب لوٹی جا رہی تھی تو میں وہاں سب سے آگے کھڑا ہوا تھا۔"

تم دکان لٹوا رہے تھے!

جی لٹوا تو نہیں رہا تھا۔ مگر اس میں خود بھی کچھ حصہ لگایا۔

(جیب سے ایک سگریٹ لائٹر نکال کر) "بس صرف یہ"

زیادہ چیزیں کیوں نہیں لیں؟

"کیا بتلاؤں۔ میں بھی اپنے سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں اور پچھتا رہا ہوں۔ اچھا حضور اب کوئی سگرٹ دیجیے تو یہ لائٹر استعمال کروں۔"

کیا اس لائٹر میں پٹرول ہے۔؟

کیا اس میں پٹرول بھی پڑتا ہے؟

اس کے بغیر جلے گا کیسے۔

تو پھر یہ دکان والوں کے کام کی چیز ہے آپ لے لیجیے۔ مگر دس روپیہ سے کم میں نہیں دوں گا۔

تم بڑے سوداگر بنو گے شاید۔

جب میں دیوار پھاندتا ہوا ادھر سے اس طرف بھاگا ہوا آ رہا تھا اور پھر چھت سے بہت ہلکی جست میں آپ کے فلیٹ میں آ گیا، تو میں یہی سوچ رہا تھا کہ لاحاصل اسٹوڈنٹ لائف سے اچھا ہے کہ شاندار چور، یا مشہور ڈاکو بن جاؤں۔"

"تمہاری اسٹوڈنٹ لائف لاحاصل کیوں ہے۔؟"

آپ اس بات کو کیا سمجھ سکیں گے؟ مجھے تو اپنے بڑوں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو ان باتوں کو سمجھ سکتا۔

ایک مرتبہ اور کہہ کر دیکھ لو۔

میری ماں بیمار، باپ ریٹائرڈ اور بدمزاج کئی بھائی اور بہن جو بہت کم پڑھے ہوئے ہیں اور روٹی اور محبت کے بھوکے رہتے ہیں گھر میں کوئی جگہ نہیں جہاں بیٹھ کر کتاب دیکھ سکوں، کتابیں بھی نہ دار اور گھر کا کام ماں باپ کا کام اور بھائیوں کا کام وقت کرنا پڑتا ہے۔

"تم فیس کہاں سے دیتے ہو۔"

"ٹیوشن سے فیس دیتا ہوں اور اسی سے بش شرٹ اور خریدتا ہوں اور سینما دیکھتا ہوں۔ لیکن فیس دیتا ہوں تھیں؛ تھا۔

کیا مطلب؟

"میں یونی ورسٹی سے نکال دیا گیا۔"

"کیوں؟"

سب باتیں ایک مرتبہ آنا نہ پوچھ ڈالیے گا؟

پھر اب کیا کروگے؟

ایک اسٹرائک کرانا ہے۔ اگر جیل نہ گیا تو دوسری کراؤں گا اور پھر اگر ڈاکو نہ بن گیا۔ تو کسی ایسی سیاسی پارٹی میں جاؤں گا یونی ورسٹی کی مکاریوں اور چالبازیوں کے سب پول کھول کر رکھ دوں افسوس میں نے سائنس نہیں لی۔

"اگر سائنس لی ہوتی تو؟"

"تو بم بناتا اور کیا کرتا ــــ بس اب آگے کچھ نہ پوچھیے۔ میں کسی کو بتلانا نہیں چاہتا تھا ان میں سے بھی آپ کو کچھ بتلا دیا، بات یہ کہ میں دو مہینوں سے، جب سے کہ یونی ورسٹی سے نکالا گیا ہوں بھرا بیٹھا ہوں۔ بڑوں میں ایک آدمی بھی تو نہ ملا جو اس طرح سب باتیں سن لیتا آپ پہلے ہمدرد ملے ہیں آپ بتلائیے میں آپ کی کچھ سیوا کر سکتا ہوں۔

تمہارا نام کیا ہے۔

"نام۔ یہ تو آپ نہ پوچھتے تو اچھا تھا۔ اس وقت تو میں پولیس سے بھاگا ہوا ہوں۔"

"جانے دو۔ تو سگریٹ پیو اور پھر کسی طرح اس لائٹر کو پیک کر دو۔"

ہوں اسے پیک کرنا ہے۔ اس کے لیے دس بارہ اخبارو کی ضرورت ہوگی۔

اخباروں میں پیک ہو جائے گا۔"

"خوب پھر گرے گا بھی تو ٹوٹے گا نہیں۔ مگر یہ ہے کیا؟

کتاب۔ لکھنؤ

حیات اللہ انصاری

ڈاکو مان سنگھ

رمیش نے باندھے ہوئے سامان پر ایک نظر ڈالی اور کہا، بظاہر سب کچھ ٹھیک ہے اور یقین ہے کہ ٹرک کے دھکے مال کو خراب نہیں کریں گے۔ اچھا بیج ناتھ اب تم قلی بلا کر یہ سامان لے جاؤ۔ اور ٹرک پر اچھی طرح رکھوا دو، جو کچھ رہ گیا ہے وہ میں سوٹ کیس میں رکھ لاؤں گا۔"

آپ کے آنے میں کچھ دیر لگے گی کیا؟

اب کام ہی کیا رہ گیا ہے، میں یہ دو چار چیزیں سوٹ کیس میں رکھ کر نہاؤں گا، کپڑے پہنوں گا اور پھر آجاؤں گا۔ ریل سے ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔

بیج ناتھ قلی بلانے گیا اور رمیش تینوں کمرے کی الماریوں کو اس نظر سے دیکھنے لگا کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی ہے، اتنے میں اس کی نظر ٹیبل میٹر پر پڑی جو ایک خانے میں رکھا ہوا تھا۔

"بیج ناتھ"

مگر وہ جا چکا تھا۔ رمیش سوچنے لگا کہ اس چیز کو کیسے پیک کیا جائے اس کے لیے ایک بکس اور کاغذ کی بہت سی کترنوں کی ضرورت ہو گی۔ اور یہ دونوں چیزیں اور سامان کے پیک کرنے میں صرف ہو چکی تھیں۔

بیج ناتھ نے واپس آکر کہا کہ قلی مل گیا ہے لیکن ابھی فوراً جانا مناسب نہیں ہے کیونکہ ابھی ابھی پولیس اور اسٹوڈنٹس میں تصادم ہو گیا ہے اور اسی کی وجہ سے کچھ ہل چل سی ہے۔

رمیش نے پیک کیے ہوئے سامان پر ایک نظر ڈالی اور "دو دو ہے ان کو لے جا کر نیچے رکھو اور پھر آؤ۔"

"وہ ہم لوگوں کے نیچے ڈاکو مان سنگھ بنیں گے کیا؟ بہت افسوس کی بات ہے۔ اچھا سامان تم آدھے گھنٹے کے بعد لے جانا لیکن یہ دیکھو ٹیبل میٹر رکھنے کو رہ گیا ہے اس کے لیے ایک چھوٹا سا بکس اور کترنیں چاہیئے۔"

"مگر دکانیں تو سب بند ہو گئیں۔"

"پرانی سڑک کی دکانیں تو کھلی ہوں گی، وہاں جا کر دیکھ لو۔

بہتر ہے۔ جاتا ہوں۔ قلی نیچے بیٹھا ہے اسے رخصت نہیں کروں گا ورنہ ہو سکتا ہے کہ اب قلی بھی نہ ملے۔

ادھر بیج ناتھ گیا اور ادھر ایک ہلکا سا دھماکا ہوا۔ کون؟

"جی سرکار قلی"

"یہ ایک نوجوان قلی تھا جو بہت تنگ پتلون اور تنگ بش شرٹ پہنے تھا۔"

"تم قلی ہو۔"

"جی مگر ابھی اس کام کے قابل صورت نہیں بنوا سکا۔"

"جملے میں کافی گستاخی تھی لیکن رمیش اس پر مسکرا اٹھا۔

"صرف صورت ہی بنوانا کافی نہ ہو گا، بات چیت بھی۔"

وہ بھی ہو جائے گی سرکار"

تم قلی ہونے کے ساتھ اور کیا کام کرتے ہو۔

اسٹوڈنٹ ہوں

"بی اے کے پہلے سال میں ہو یا دوسرے۔"

"پہلے سال میں۔"

یہاں کیونکر آئے۔؟

قلی ہوں۔

میں پوچھتا ہوں یہاں کیوں کر آئے؟ فوراً جواب دو۔ ورنہ

قاضی عبدالستار

پیتل کا گھنٹہ

آٹھویں مرتبہ ہم سب مسافروں نے لاری کو دھکا دیا اور ڈھکیلتے ہوئے خاصی دور تک چلے گئے۔ لیکن انجن گنگنایا تک نہیں۔ ڈرائیور گردن ہلاتا ہوا اتر پڑا۔ کنڈکٹر ڈامر کی سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے سوچتے درخت کی جڑ پر بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ مسافروں کی آنکھیں گالیاں دینے لگیں اور ہونٹ بڑبڑانے لگے۔ میں بھی ایک پیڑ کے سائے میں رومال بچھا کر بیٹھ گیا۔ اور سگریٹ بنانے لگا۔ ایک دم نگاہ اٹھی تو دور کاہی باغوں کی چوٹیوں پر مسجد کے مینار کھڑے تھے میں سگریٹ سلگا ہی رہا تھا کہ ایک مضبوط کھردرے دیہاتی ہاتھ نے میری چٹکی سے جلتی ہوئی تیلی نکال لی۔ میں اس بے تکلفی پر ناگواری کے ساتھ چونک پڑا مگر وہ اطمینان سے اپنی بیڑی جلا رہا تھا۔ وہ میرے پاس ہی اکڑوں بیٹھ گیا اور بیڑی پینے لگا۔ یا بیڑی کھانے لگا۔

"وہ کون گاؤں ہے" میں نے میناروں کی طرف اشارہ کرکے پوچھا

"او؟..... او بھساول ہے!"

بھساول کا نام سنتے ہی مجھے اپنی شادی یاد آگئی، میں اندر سلام کرنے جا رہا تھا کہ ایک بزرگ نے ٹوک کر روک دیا۔ وہ بانات کی اچکن اور بہت چوڑے پائنچوں کے پائجامے پر ترکی ٹوپی دیئے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر ان کی پوری مونچھیں اور حکومت سے کھنچی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے خدمت گار کے ہاتھ سے پھولوں کی "بدھیاں" لے لیں۔ اور مجھے پہنانے لگے میں نے بل کھا کر اپنی پرشین ہمرو کی جھلملاتی ہوئی شیروانی کی طرف اشارہ کرکے تلخی سے کہا "کیا یہ کافی نہیں تھی؟" وہ میری بات پی گئے۔ "بدھیاں" برابر کیں میرے ننگے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا کر کہا۔ "اب تشریف لے جایئے" میں نے ڈیوڑھی میں کسی سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ تھے۔ بتایا گیا کہ یہ بھساول کے قاضی انعام حسین ہیں۔ بھساول کے قاضی انعام حسین! جن کی حکومت اور ثروت کے افسانے میں اپنے گھر میں سن چکا تھا۔ میرے بزرگوں سے ان کے جو مراسم تھے مجھے معلوم تھے۔ میں اپنی گستاخی پر شرمندہ تھا۔ میں نے اندر سے آکر بڑے جتن سے ان کی چھوٹی موٹی خدمتیں کیں اور اپنے ضمیر کو مطمئن کیا جب بارات رخصت ہونے لگی تو میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے بھساول آنے کی دعوت دی اور کہا کہ اس رشتے سے پہلے بھی تم میرے بہت کچھ تھے لیکن اب تو داماد بھی ہو گئے ہو۔ اس قسم کے رسمی جملے سبھی کہتے ہیں مگر ان کے لہجے میں خلوص کی ایسی گرمی تھی کہ کسی نے یہ الفاظ میرے دل پر لکھ دیئے۔ آج دس برس بعد بھی ان حرفوں کی روشنائی تازہ تھی۔ میں نے میتاپور کا جانا ملتوی کیا۔ اس موقع کو غنیمت جانا اور لاری کے "بونٹ" میں دھنسے ہوئے ڈرائیور کو دیکھتا ہوا اپنے بیگ کو جھلاتا ہوا کھیتوں میں اٹھلاتی ہوئی چکنی پگڈنڈی پر چلنے لگا۔

سامنے وہ شاندار مسجد کھڑی تھی جسے قاضی غلام حسین آف بھساول نے اپنی نوجوانی میں بنوایا تھا۔ جالیاں بگڑ گئی تھیں، پلاسٹر گر گیا تھا۔ کلس ٹوٹ گئے تھے۔ میناروں پر کائی جم گئی تھی۔ گنبدوں کی درازوں پر گھاس اگ آئی تھی۔ لیکن جلال اسی طرح برس رہا تھا جیسے کوئی سابق تعلقدار پھٹے پرانے کپڑے پہنے "بانڈ" لینے کے لئے تحصیل کے دروازے پر کھڑا ہو، مسجد کے سامنے میدان کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا سلسلہ تھا۔ جن میں شاید کبھی بھساول کے جانور رہتے ہوں گے۔ ڈیوڑھی کے سامنے دو دادیچے بام کے درخت "ٹریفک کانسٹبلوں" کی طرح چھتری لگائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے جل گئے تھے

پنچ میٹر۔ پہلے یہ باہر سے آتا تھا۔ لیکن۔ اب ہماری فرم نے اپنا بنایا ہے اور یہ امریکا اور یورپ کے بنے ہوئے میٹر سے زیادہ نازک ہے۔"

"کیا میں یہ نہ سمجھ سکوں گا کہ اس سے کیا کام لیا جاتا رہا ہے۔"

"کیوں نہیں بہت آسانی سے دیکھو اس میں سات چھلے ہیں، پہلا بڑا ہے دوسرا چھوٹا اور تیسرا اس سے چھوٹا اس طرح ہر چھلا پہلے سے چھوٹا ہوتا گیا ہے آخر والا سب سے چھوٹا۔ یہ سب چھلے ایک سیدھ میں ایک ایک انچ کے فاصلے پر جڑے ہوئے ہیں اور ان کے آخر میں ایک انچ پر یہ دیوار ہے اب دیکھو یہ لوہے کی لمبی اور پتلی سلاخ ہے۔ اس کے دستے کو پکڑ کر سلاخ کو اس طرح چھلوں سے گزارنا ہے کہ ایک ایک کر کے ساتوں چھلوں سے اس طرح گزر جائے کہ کسی سے مس نہ ہو اور جا کر سیدھی دیوار سے لگ جائے۔ اگر یہ سلاخ کسی چھلے کی دیوار سے لگے گی تو فوراً گھنٹی بجے گی اور لال بلب جل اٹھے گا۔ اگر سلاخ ساتوں چھلوں سے مس ہوئے بغیر جا کر سامنے کی دیوار کو چھولے گی تو سبز بلب جل جائے گا۔

"اس اپریٹس سے کیا فائدہ۔"

"اس سے لوگوں کے اعصاب کی طاقت کی پیمائش کی جاتی ہے انسان کے اعصاب جتنے مضبوط ہوں گے وہ اتنے ہی چھلے پار کر سکے گا۔

"ڈاکو مان سنگھ بننے کے لیے کتنے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہے۔"

"ایسے شخص کو کم سے کم چار چھلے تو پار ہی کر لینا چاہیے۔ اور سرجن وغیرہ صرف وہ شخص بن سکتا ہے جو پانچ چھلے پار کر سکے۔"

"اور سات چھلے؟"

"سات! یہ تو شاید ہی کروڑوں میں سے کوئی ایک انسان کر سکے۔

میں ٹرائی کروں۔

"کرو۔ میں بجلی لگاتا ہوں۔"

رمیش نے بجلی لگا دی اور نوجوان فیتہ ابدل کر اپریٹس کے سامنے کھڑا ہو گیا سلاخ کا دستہ ہاتھ میں پکڑ لیا، اور چھلوں کو اس نظر سے دیکھنے لگا جیسے بلی حملہ کرنے سے پہلے چوہے کو دیکھتی ہے۔ وہ نوجوان نے اپنے پتلے بازوؤں کی طرف دیکھ کر کہا، ہاں، مان سنگھ چار چھلے تو ضرور ہی پار کر لیتا ہے۔

سلاخ چلی۔ نہ بہت آہستہ آہستہ اور نہ بہت تیز۔ ایک، دو، تین چھلے گزر گئے۔ گھنٹی بجی اور نہ لال بلب جلا۔ پھر چوتھا چھلا آیا اور سلاخ اس سے بھی گزر گئی۔

رمیش ایک دم سے سناٹے میں آ گیا۔ وہ کبھی نوجوان کو دیکھتا اور کبھی اپریٹس کو۔ مگر نوجوان کو اب سوائے چھلوں کے اور کسی بات کا ہوش نہیں تھا اس کی آنکھیں بہت تیز بلب کی طرح جل رہی تھیں، ہونٹ ایک دوسرے پر بھنچے ہوئے تھے اور چہرا پتھر کی طرح سخت تھا۔

پانچواں چھلا بھی گزر گیا، نہ گھنٹی بجی اور نہ لال بلب جلا،

اب نوجوان کی آنکھوں کے بلب ساٹھ سے سو پاور کے ہو گئے، چہرے پر اعتماد اور سختی اور بڑھ گئی۔

رمیش اپنی جگہ بت کی طرح جم گیا۔ اس کی بھی اب صرف آنکھیں حرکت کر رہی تھیں اور وہ کبھی نوجوان کے چہرے کی طرف جاتیں اور کبھی اپریٹس کی سلاخ کی طرف۔

چھٹا چھلا بھی گذر گیا۔ اب بھی نہ گھنٹی بجی اور نہ لال بلب جلا۔

نوجوان کے چہرے کی سختی تو پہلے ہی کی سی رہی، لیکن اس پر کامیابی والے تبسم کا ہلکا سا غازہ پھر گیا، آنکھوں کے بلبوں کی پاور کئی گنا بڑھ گئی اس کی روشنی میں چاند بھی چمکنے لگا۔

ساتواں چھلا بھی گزر گیا۔ اور پھر وہی ہوا کہ نہ گھنٹی بجی اور نہ لال بلب جلا۔

نوجوان کا چہرا اب چودھویں کا چاند تھا جس سے خود اعتمادی اور فخر کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور رمیش کا چہرا حیرت تھا سراپا حیرت۔ حیرت جس میں نہ خوشی تھی اور نہ رنج بس حیرت اور صرف حیرت تھی۔ سلاخ نے ساتوں چھلے کے بعد والی دیوار چھو لی۔ سبز بلب جل اٹھا۔

نوجوان نے سلاخ کو دیوار سے دبایا اور تھوڑی دیر تک اپنے ہاتھ دیکھتا رہا اور پھر پلٹ کر رمیش کی طرف دیکھا۔

"ڈارلنگ ـــــ تم نے کمال کر دیا۔" رمیش نے لپک کر نوجوان کو لپٹا لیا اور اس کے سر پر ایک بوسہ دے دیا اور پھر بچوں کی طرح بھاگ کر ٹیلی فون پر پہنچا جلدی سے نمبر ملا کر کہا۔

[باقی صفحہ ۴۳ پر]

قاضی صاحب کا گھنٹہ جو انہ کا اعزاز بحال کرا لیا گیا۔ میں اس وزنی گھنٹے کو دیر تک اٹھائے دیکھتا رہا۔ جب ہاتھ دکھنے لگے تب دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ جب نہا کر باہر نکلا تو وہ دالان سے پیٹھ پر لاد کر پلنگ لا چکے تھے۔ قاضی انعام حسین آن بھاول اسٹیٹ...... جن کی گدی نشینی ہوئی تھی۔ جو بندوقوں کے لائسنس سے مستثنیٰ تھے۔ جنھیں ہر عدالت طلب نہیں کر سکتی تھی وہ قاضی انعام حسین خدمت گاروں کی طرح دونوں ہاتھوں پر طباق اٹھائے ہوئے آئے۔ مختلف رنگوں کی طشتریوں میں مختلف رنگوں کی دو پیالیاں "لب سوز" "لب بند" چائے سے لبریز رکھی تھیں۔ ایک بڑی سی بیضاوی پلیٹ میں دو ابلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے گئے تھے۔

شروع اکتوبر کی خوش گوار ہوا کے ریشمی جھونکوں میں بیٹھے ہوئے ہم دونوں خاموشی سے "مزے دار" چائے پی رہے تھے کہ ڈیوڑھی پر کسی بوڑھی آواز نے ہانک لگائی۔

"مالک"

"کون"

"ہتر ہے آپ کا...... ساہ جی کا بلاتے لائے ہیں"

دادا نے گھبرا کر اپنی پیالی طباق میں رکھی اور جوتے گھسیٹتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اپنے پچھلے دنوں میں شاید کمشنر کی آمد سن کر بھی اس طرح نہ دوڑے ہوں

میں ایک لمبی ٹہل لگا کر واپس آیا۔ ڈیوڑھی میں مٹی کے تیل کی ڈبیا جل رہی تھی۔ دادا باورچی خانے میں بیٹھے چولھے کی روشنی میں لالٹین کی چمنی جوڑ رہے تھے۔ میں ڈبیا اٹھا لایا اور اصرار کر کے ان سے چمنی لا کر جوڑنے لگا۔

ہاتھ بھر اونچی لالٹین کی تیز گلابی روشنی میں وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میرے بزرگوں سے اپنے تعلقات بتاتے رہے ان کی اور اپنی جوانی کے قصے سناتے رہے۔ اپنے دونوں لڑکوں کے پاکستان بھاگ جانے پر کڑھتے رہے "کسٹوڈین" کی دھاندلی پر ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔ ان زمینوں کا رونا روتے رہے جو ایگریکلچرل ٹیکس کی ادائگی میں نیلام ہو گئی تھیں۔ ان چھوٹے باغوں کے تاجی آموں کا مزہ یاد کرتے رہے جو کسٹوڈین اور انکم ٹیکس کے مقدموں میں بک گئے تھے۔ ان کھونٹے سے کھیتوں کا ماتم کرتے رہے جن کی تیار فصلوں کو دشمن کاشت کاروں کے جانور دن دہاڑے چر لیا کرتے تھے۔ اور جن سے وہ ایک ایک مقدمہ ہار چکے تھے۔

کوئی آدھی رات کے قریب دادی نے زمین پر چٹائی بچھائی اور دسترخوان لگایا۔ بہت سی قیمتی چینی کی بیضاوی۔ گول اور چوکور پلیٹوں میں بہت سی قسموں کا کھانا چنا ہوا تھا۔ شاید میں نے آج تک اتنا نفیس کھانا نہیں کھایا تھا۔

رات بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ مکان میں چاروں طرف گرے پڑے ٹوٹے پھوٹے ویران درجوں پر وحشت برس رہی تھی۔ دادی باورچی خانے میں کھٹر پٹر کر رہی تھیں۔ دادا ایک جھلنگا پلنگ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میرے پلنگ کے مچھر دان میں پیوند لگے تھے۔ بغیر چادر کی دری بچھی تھی۔ بغیر غلاف کا تکیہ رکھا تھا جس سے تیل کی خوشبو آ رہی تھی۔ مچھر دان کے پردے گرے ہوئے تھے۔ اور میں اس قبر میں زندہ لیٹا ہوا تھا۔

صبح میں بہت دیر سے اٹھا۔ دیکھا ایک تخت پر یہاں سے وہاں تک ناشتہ چنا ہوا تھا۔ یعنی دادی نے رات بھر ناشتہ پکایا تھا۔ میں جب اپنا جوتا پہن چکا تو رات کی طرح اس وقت بھی دادا نے آنسو بھری آواز میں مجھے روکا۔ میں معذرت کرتا رہا۔ دادی چپ چاپ کھڑی رہیں۔ جب دروازے پر یکہ آ گیا اور میں شیروانی پہن چکا۔ تب دادی نے آگے بڑھ کر میرے بازو پر امام ضامن باندھ دیا۔ ان کے چہرے پر چونا پتا ہوا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ انھوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اکیاون روپے تیری سلامی کے ہیں... اور دس کرائے کے"

"ارے...... ارے..... دادی آپ کیا کر رہی ہیں۔ میں میں"

میں نے جیب میں جاتے ہوئے روپیوں کو پکڑ لیا۔

"تو چپ رہ .... تیری دادی سے اچھے تو کنجڑے قصائی ہیں...... جو جس کا حق ہوتا ہے دے تو دیتے ہیں۔.. زندگی میں پہلی بار تو اس گھر میں آیا.... اور مجھے تیرے جوڑے کے

جگہ جگہ مٹی بھری تھی۔ ڈیوڑھی کے دونوں طرف عمارتوں کے بجائے مکانوں کا ملبہ کھڑا تھا۔ پڑا تھا۔ وہاں نہ کوئی آدم تھا نہ جانور۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ دروازے سے قاضی صاحب طلوع ہوئے۔ لمبے قد کے جھکے ہوئے قاضی صاحب ڈوریے کی قمیص، میلا گھٹنا، موٹر ٹائر کے تلوں کا پرانا لیے رنگ ٹیپ پہنے آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے گھور رہے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ جواب دینے کے بجائے وہ میرے پاس آ گئے، اور جیسے ایکدم کھل گئے۔ مجھے لپٹا لیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر ڈیوڑھی میں گھس آئے۔ ہم اس جگہ دالان میری کوٹھری سے گزر رہے تھے جس کی اونچی چھت کی کمان کی طرح جھکی ہوئی دھنیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہتیر روکے ہوئے تھے۔ وہ وہیں سے چلائے۔

"ارے سنتی ہو.......... دیکھو تو کون آیا ہے..." میں نے کہا کہ اگر صندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کر لو جلدی سے" لیکن دادی تو سامنے ہی کھڑی تھیں۔ ڈھلے ہوئے گھڑوں کی گھڑونچی کے پاس۔ قاضی صاحب ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ وہ بھی شرمندہ سی کھڑی رہیں۔ پھر لپک کر الگنی پر پڑی مارکین کی کوری دھلی چادر گھسیٹ لی۔ اور دوپٹے کی طرح اوڑھ لی۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر لیا تھا کہ کرتے میں لگا ہوا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند ذرا چھپ گیا۔ اس اہتمام کے بعد وہ میرے قریب آئیں۔ کانپتے ہاتھوں سے بلائیں لیں۔ سکھ اور دکھ کی گنگناتی آواز میں دعائیں دیں۔ دادی کانوں سے میری باتیں سن رہی تھیں ہاتھوں سے جن کی جھریوں بھری کھال جھول گئی تھی دالان کے اکلوتے ثابت پلنگ کو خالی کر رہی تھیں۔ جس پر میلے کپڑے کتے چھونے کی کلیاں اور پان کی ڈلیا وغیرہ ڈھیر تھیں۔ اور آنکھوں سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ مجھے اس پلنگ پر بٹھا کر دوسرے جھلنگا پلنگ کے نیچے سے وہ پنکھا اٹھا لائیں جس کے چاروں طرف کالے کپڑے کی گوٹ لگی تھی۔ اور کھڑی ہوئی اس وقت تک جھلتی رہیں جب تک میں نے ان کے ہاتھ سے چھین نہ لیا۔ وہ باورچی خانے چلی گئیں جو تین لمبے چوڑے دروں کا دالان تھا۔ بیچ میں مٹی کا چولھا بنا تھا۔ الومونیم کی دو چار پتیلیاں ادھر ادھر لوٹ رہی تھیں۔ کچھ پیپوں ڈبوں، شیشی بوتلوں اور ڈلیوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ میری طرف پشت کیے چولھے کے سامنے بیٹھی تھیں دادا (قاضی صاحب) نے کونے میں کھڑے ہوئے سوکھے سڑے حقے سے بدرنگی چلم اتاری اور دادی کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔ میں ان دونوں کی گھٹی گھٹی کرتی ہوئی سرگوشیوں کو کانوں سے جھاڑتا رہا۔ دادا کئی بار جلدی جلدی باہر گئے اور آئے۔ میں نے اپنی شیروانی اتاری اور چھ دروازوں والے کمرے کے اکیلے کواڑ پر ٹانگ دی۔ کواڑ کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ جگہ جگہ لوہے کی پتیاں لگی تھیں۔ لیکن اوپر سے نیچے تک ہاتھی دانت کا باریک کام تھا چونے اور میل کے دھبوں میں جگمگا رہا تھا۔ بیگ کھول کر میں نے چپل نکالے۔ تولیہ کندھے پر ڈالا اور جب تک میں اٹھوں دادا گھڑونچی پر سے گھڑا اٹھا کر اس بارہ دری نما کمرے میں رکھ آئے جس کے کواڑ غائب تھے اور کھرے جھک آئے تھے۔ میں جب نہانے گیا تو دادا نے الومونیم کا لوٹا پکڑا کر مجرموں کی طرح کہا کہ تم بیٹھے اطمینان سے نہاؤ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ پردے تو میں ڈلوا دوں لیکن اندھیرا ہوتے ہی چمگادڑیں اندر گھس آئیں گی اور تم کو دق کر دیں گی میں گھڑے کو ایک کونے میں اٹھا لے گیا وہاں دیوار سے لگا ابھی خاصی سینے کے برابر پیتل کا گھنٹہ کھڑا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ گھنٹے کے پیٹ میں مکڑیوں کی بار سے داغ پڑ گئے تھے۔ دو انگل کا حاشیہ چھوڑ کر جو سوراخ تھا اس میں سوت کی کالی رسی بندھی تھی۔ اس سوراخ کے برابر ایک بڑا سا ہلال تھا اس کے اوپر ہشت پہل ستارہ تھا۔ میں نے تولیے کے کونے سے جھاڑ پونچھ کر دیکھا۔ تو وہ چاند تارہ بھادل اسٹیٹ کا مونوگرام نکلا۔ خط نسخ میں کندہ کی ہوئی عبارت تھی "قاضی انعام حسین، تعلقدار بھادل اسٹیٹ۔ ادھم" یہی وہ گھنٹہ تھا جو بھادل کی ڈیوڑھی پر اعلان ریاست کے طور پر تقریباً ایک صدی تک بج چکا تھا۔ اس گھنٹے کی ایک تاریخ تھی۔ دادا کے باپ قاضی اکرام حسین سے سیتاپور کا کلکٹر ڈیوس آدھم کسی بات پر بگڑ گیا۔ اور گھنٹہ ضبط کر لیا۔ آدھم کے حکم کے خلاف قاضی صاحب گھنٹہ بجواتے رہے۔ آدھم نے سو روپیہ جرمانہ کر دیا۔ قاضی صاحب نے جرمانہ داخل کر دیا روز گھنٹہ بجتا رہا۔ روز سو روپیہ جرمانہ داخل ہوتا رہا۔ آخر ادھم کے بڑے بڑے رئیس بیچ میں پڑے اور کئی مہینوں کے بعد

کتاب، لکھنؤ

ہرچرن چاولہ

واپسی

آج میرے گھر میں چاچا مکتا پرشاد، دادا، دادی، چاچی، پتاجی اور ماتاجی جمع ہیں۔ سب کے چہروں پر رنج و فکر کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بات ہی کچھ ایسی ہے۔ جو حادثہ ہمارے ساتھ ہوا ہے اس نے ہمارے خاندان کا منہ کالا کر کے رکھ دیا ہے بات یہ ہے کہ چاچا مکتا پرشاد کی لڑکی شانو آج دو دن سے گھر سے غائب ہے۔ وہ اپنے ساتھ کچھ زیور بھی لے گئی ہے مگر چاچا مکتا پرشاد زیور کے ذکر سے گریز کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسے اشونی نے اغوا کیا ہے کیونکہ وہ بھی دو دن سے غائب ہے ان کا خیال ہے کہ وہ ضرور اسے بمبئی لے گیا ہے کیونکہ وہ فلموں کا بے حد شوقین ہے۔ شاید وہ اس حسین سہارے کے ذریعے اس چمکتی دنیا میں بھرنا چاہتا ہے۔ ورنہ ان کی بیٹی تو ایسی بھولی بھالی اور نادان گڑیا ہے کہ اسے تو بیگن کے رنگ کا بھی ابھی تک نام نہیں آتا —— وہ بدمعاش اس بھولی بھالی اور کچی بدھی کی جوان کنیا کو سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ وہ آج نہیں تو کل خود ہی واپس آجائے گی مگر چونکہ معاملہ لڑکی کا ہے اس لئے سارے خاندان میں اندر ہی اندر ایک بےچینی کی لہر سی دوڑ گئی ہے۔ اگر ایک دو دن میں لڑکی برآمد نہ ہوئی تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی اور تمام بنی بنائی عزت مٹی میں مل جائے گی اور اس کی جو زندگی برباد ہوگی وہ الگ۔

یہ خیالات میرے چاچا کے ہیں اور میری چاچی سو فی صدی ان سے متفق ہیں کہ شانو جیسی سیدھی اور شریف لڑکی اس خاندان کی تو بات چھوڑیئے سارے شہر میں چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی ..... شانو عادتوں میں بالکل اپنے پتا مکتا پرشاد پر گئی ہے یہی وجہ ہے کہ میں ..... میں خود ایک لڑکی کا باپ ہوں بخلاف چاچا کا دکھ سمجھ سکتا ہوں مگر نہ جانے کیوں شانو کے متعلق چاچا کے خیالات سے مجھے اختلاف ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اشونی نے شانو کو نہیں شانو نے اشونی کو اغوا کیا ہے۔ میں نے اشونی کو دیکھا ہے وہ خوبصورت تو ہے مگر چالاک نہیں اور شانو تو اسے چرا سکتی ہے کیونکہ شانو جب بولتی ہے تو اچھے اچھوں کی عقل گھاس چرنے نکل جاتی ہے۔

میں نے بمبئی فلم انڈسٹری میں بطور اسسٹنٹ ڈائرکٹر دو سال کام کیا ہے تاہم اپنے تمام رشتہ داروں سے زیادہ ہی مجھے بمبئی کی فلم لائن اور شہر سے واقفیت ہے تمام رشتہ داروں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آج ہی دوپہر کے دو بجے روانہ ہونے والے جہاز سے بمبئی کے لئے پرواز کر جاؤں اور وہاں پہونچ کر بمبئی سنٹرل اسٹیشن پر اس وقت ان کو گھیر لوں جب وہ دہرہ دون ایکسپریس سے اتریں اور پھر شانو کو لے کر فوراً گھر لوٹ آؤں۔ یہ بات ابھی شہر میں اور دوسرے دور کے رشتہ داروں اور محلہ والوں کو معلوم نہیں مگر شانو اگر جلدی واپس نہیں آجاتی تو آج نہیں تو کل بات پھیل ہی جائے گی۔ وہ مجھے جہاز سے بھیجنے پر بضد ہیں اور میں نہ چاہنے کے باوجود بھی جانے پر مجبور ہوں کیونکہ خاندان کی عزت کا سوال ہے اور یہ معاملہ لڑکی کا ہے۔ لڑکا ہوتا تو دوسری بات تھی کیونکہ بقول چاچا مکتا پرشاد لڑکے تو سونے کا دانہ ہوتے ہیں۔ صاف شفاف۔ دھلے دھلائے اور چمکدار جن پر کسی قسم کی آنچ نہیں آسکتی۔

نام پر ایک چیٹ بھی نہ جڑی۔ اللہ کی شان ہے...... اللہ کی شان ہے"

معلوم نہیں کہاں کہاں کے ٹانکے کھل گئے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور ان کے بالوں کی طرح سفید خون کی لکیریں آنکھوں سے نکل کر میلی موٹی قمیض میں کھو گئی تھیں۔ دادا میری طرف پشت کئے جھکے کھڑے ہوئے جلدی جلدی حقہ پی رہے تھے۔ وہ مجھے رخصت کرنے ڈیوڑھی تک آئیں۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولیں۔ میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اور گردن ہلا کر رخصت کر دیا۔ دادا قاضی انعام حسین آف کھاٹ ول مسجد تک میرے ساتھ آئے۔ لیکن نہ میرے قریب آئے نہ مجھے خدا حافظ کہا۔ نہ میرے سلام کا جواب دیا۔ نہ یکے والے کو کوئی ہدایت کی۔ انتہا ہے کہ مجھ سے نگاہ تک نہ ملائی کھڑے کھڑے داہنے کندھے کی طرف ذرا سی گردن جھکائی اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں یکے پر سوار ہو گیا۔ جب تک وہ مجھے نظر آتے رہے میں انھیں دیکھتا رہا۔ وہ وہیں اسی طرح کھڑے تھے۔

سدھولی جہاں سے سیتاپور کے لیے مجھے بس ملتی ابھی دور تھا۔ میں سر جھکائے اپنے خیالوں میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ میری شیروانی کی داہنی جیب میں اکسٹھ بچھو کلبلا رہے تھے۔ میرا یکہ رک گیا۔ سڑک کے کنارے ایک یکہ کھلا ہوا کھڑا تھا۔ اس کا دبلا گھوڑا ابالی میں منھ ڈالے دُم سے مکھیاں اڑا رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ریشمی کرتا اور میلی دھوتی پہنے بیٹھا تھا! اور مٹھی میں سگریٹ دبائے دم لگا رہا تھا۔ میرا یکے والا انتہائی لجاجت سے مجھ سے کہہ رہا تھا

" میاں ای ساہ جی کھاٹ ول کے ساہوکار ہیں ان کے یکے کا بم ٹوٹ گوا ہے آپ برا نہ مانو تو ای بیٹھ جائیں۔ ان کا بھی سیتاپور والی بس پکڑے کا ہے"

میری اجازت پا کر اس نے ساہ جی کو آواز دی ساہ جی آئے اور یکے کے دوسری طرف بیٹھ گئے۔ اور ان کے یکے والے نے ساہ جی کے اور میرے سامنے پیتل کا بھاری گھنٹہ دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر رکھ دیا۔ گھنٹے کے پیٹ میں مگریوں کی مار سے داغ پڑ گئے تھے۔ دو انگل چھوڑ کر جو حاشیہ تھا اس میں سوت کی کالی رسی بندھی تھی۔ اس سوراخ کے برابر ایک بڑا سا ہلال تھا اس کے اوپر ہشت پہل ستارہ تھا۔ وہ چاند تارہ کھاٹ ول اسٹیٹ کا مونوگرام تھا۔ میں گھنٹے کو دیکھ رہا تھا۔ ساہ جی مجھ کو دیکھ رہے تھے اور میرا یکے والا ہم تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے ٹیڑھی آنکھوں سے اور بھنچے ہوئے لہجے میں پوچھ ہی لیا۔

تو ساہ جی تم مانیو نائیں... خریدلیو میاں سے آخر"

" ہاں... کل سام کا معلوم نائیں کا وخت آن پڑا میاں پر کہ بلائے کے دے دہین..."

.... اے گھنٹے کا اب تک کلیجے سے لگائے رکھے رہیں"

" ہاں وخت وخت کی بات ہے ساہ جی... نائیں تو یو گھنٹہ... چل بے گھوڑے کی دم۔ ترپ کی چال چل" اس نے گھوڑے کے کولھے پر سڑاپ سے ایک چابک جھٹکا ر دیا۔ میں میاں کا برا دقت چور کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ چابک گھوڑے کے نہیں میری پیٹھ پر پڑا ہے۔ اور میری داہنی جیب میں کلبلاتے ہوئے اکسٹھ بچھوؤں نے ایک ساتھ مجھے کاٹ لیا۔

لاجو کی عمر لگ بھگ اٹھارہ سال اور پھر نند داور گنگا بالترتیب سترہ اور تیرہ سال کے تھے۔ اسکول سے چھٹی ہوتے ہی ہم دونوں بھائی گھر میں بستے پٹک کر لالہ سوہن لال جن کو ہم تایا جی پکارتے تھے، کے گھر بھاگ جاتے۔ شام تک نند داور گنگا کے ساتھ کھیلتے ہماری گلیاں جدا جدا تھیں مگر مکانوں کی چھتیں پیچھے سے صرف ایک چوبارہ کی چھت پھلانگنے کے بعد مل جاتی تھیں۔ یعنی ہماری چھت سے ملحق ہمارے پڑوسی کے چوبارے کی چھت تھی جس پر ایک لکڑی کی سیڑھی لگی رہتی۔ سیڑھی چڑھی اور چوبارہ کی چھت سے تایا جی کی سیڑھیوں کی مٹی اتر کر ان کی چھت پر پہونچ جاؤ۔ اس لئے اگر کبھی اسکول سے آنے کے بعد ہماری ماتا جی گھر پر نہ ہوتیں اور جالی میں ہمیں روٹی نہ ملتی تو ہم بلا کھٹکے اوپر ہی اوپر سے ہم تایا جی کے گھر پہونچ جاتے اور وہاں ہمیں روٹی مل جاتی۔ یہی بات نند داور گنگا کی تھی۔ ....

.... والدین ہمارا ایک دوسرے کے گھر سے کھانا مانگ کر کھا لینے پر کبھی بھی اعتراض نہ کرتے۔ بلکہ جب کبھی سبزی یا ترکاری ہماری پسند کی گھر میں نہ بنتی تو ماتا جی خود ہمیں ان کے گھر سے ترکاری وغیرہ لے آنے کو کہتیں، اور ہم جھٹیں پھلانگتے ہوئے تایا جی کے گھر سے ترکاری کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ساگ، مکھن۔ لسی۔ دہی۔ اچار۔ مکئی کی روٹی۔ گڑ کی بھیلی یا مولی گاجر تک بھی لے آتے۔ اسی طرح نند داور گنگا بھی ہمارے گھر آکر بلا جھجک چیزیں مانگ لے جاتے۔ کبھی کسی دن شام کو یا رات کو یا شرادھوں کے دن ہمارا پورا گھرانہ ان کے گھر مہمان ہوتا... اسی طرح کبھی کبھی وہ لوگ ہمارے گھر کھانا کھانے کے بعد رات گئے تک گپیں مارتے رہتے۔

مجھے اور میرے بھائی سرن کو ایک ایک آنہ جیب خرچ ملتا تھا اگرچہ ان دنوں یہ رقم کوئی معمولی چیز نہیں تھی مگر پھر بھی ایک دفعہ خرچ ہو جانے کے بعد ہمیں اور پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔ یہ ضرورت سرن تو چاچا جی سے مانگ کر پوری کر لیتا تھا مگر میرے مانگنے پر بھی چاچا جی مجھے ایک پیسہ بھی نہ دیتے۔ سرن کو اسکول سے ملا ہوا کام کروانے کے علاوہ بھی وہ وقت دے کر اسے پڑھاتے مگر مجھ پر تو ذرا بھی توجہ نہ دیتے۔ میری انگریزی کافی کمزور تھی مگر اس میں بھی رتی بھر بھی وہ میری مدد نہ کرتے۔ مجبوراً میں اپنی مشکلات نند د سے دور کرتا۔ یا اپنے ہم جماعت ساتھی گنگا کی کاپی سے نقل کرتا... سوالات نقل کرتے ہوئے مجھے بڑی کوفت ہوتی مگر مجبوری تھی کیا کرتا۔ جس طرح میں نند داور گنگا سے مدد لے لیا کرتا تھا۔ اسی طرح وہ بھی چاچا سے کبھی کبھی مدد لے لیا کرتے۔ ان کی بڑی بہن لاجو تکیوں پر کاڑھنے کے لئے نئے نئے پھولوں کے نمونے چاچا جان سے پوچھتی رہتی تھی۔ چاچا جی نے چونکہ دسویں تک ڈرائنگ پڑھی تھی۔ اس لئے وہ اسے بہتر سے بہتر نمونے ٹریس کر کے دیتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ نمونے سرن کے ہاتھ چاچا جی سے منگواتی تھی اور چاچا جی اچھے اچھے ڈیزائن ٹریس کر کے سرن ہی کے ہاتھ اسے بھجوا دیتے۔ جب بھی کوئی نمونہ سرن لاجو کو پہونچا کر واپس آتا تو میں اسے چوتھو کی دکان کی طرف جاتے دیکھتا۔ اسی طرح وہاں سے کوئی کاغذ جس پر کہ نمونے میں کوئی ردوبدل کرنی ہوتی وہ چاچا کے پاس پہونچانے کے بعد چوتھو کی دکان کی طرف بھاگتا اور میں اسے جلیبیوں، کھٹی میٹھی گولیوں مونگ پھلیوں، ریوڑیوں اور الائچی دانوں کی دعوتیں اڑاتے دیکھتا اور دور ہی دور سے اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتا ہے بھوکی نظروں سے دیکھتا رہتا۔ کبھی اس کے دل میں رحم آجاتا تو وہ ایک آدھ دانہ میری ہتھیلی پر رکھ کر کہتا: "جا عیش کر"۔

ایک دن اسکول سے واپس آنے کے بعد سرن نے پنڈلی میں درد کی شکایت کی اور پھر شام ہوتے ہوتے اسے بخار چڑھ آیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر نے بتایا کہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے احتیاط ضروری ہے۔ ہفتے بھر تک ٹوٹ جائے گا۔ نہ جانے کیوں سرن کو چارپائی پر مجبور اور بے بس پڑے دیکھ کر میرے دل میں آیا کہ وہ جلدی ٹھیک نہ ہو اور شاید بھگوان نے میری سن لی۔ ہفتے بھر بعد اس نے بدپرہیزی کر لی اور اسے پھر چارپائی سے لگ جانا پڑا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ کب چاچا جی مجھے کوئی نمونہ لاجو کو پہونچانے کو کہیں اور میں وہاں سے انعام حاصل کر کے چوتھو کی دکان کی طرف بھاگوں مگر چاچا جی نے تو میری پرواہ تک بھی نہ کی۔ میں تایا جی کے گھر جا کر لاجو کے آس پاس بھی

آپ پوچھیں گے کہ مجھے اپنے چاچا اور تمام دوسرے رشتہ داروں سے اختلاف کیوں ہے اور اسی خاندان کا فرد ہوتے ہوئے مجھے یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ مگر میں نے کہا ہے کہ شانو کی سب علتیں میرے چاچا سے ملتی ہیں اس لئے اس کے فرار ہونے کا ذمہ دار نہ شانو ہے نہ اشونی، بلکہ چاچا کا وہ خون ہے جو اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو سنئے مگر ٹھہریئے پہلے ذرا میری چال دیکھئے۔ ہاں تو کیا نوٹ کیا آپ نے۔ جی بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے۔ یہ جو میں ذرا سا لنگڑا کر چلتا ہوں اس کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ اس کہانی کا شانو کے فرار سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟! اس کے جواب میں بس ذرا صبر سے آپ پہلے میری کہانی سن لیجئے۔ بات خود بخود واضح ہو جائے گی۔ میں یہ کہانی شاید کب کا بھول گیا ہوتا اگر میرا یہ لنگ مجھے یہ کہانی بھولنے نہیں دیتا یہ لنگ، زندگی بھر مجھے یہ کہانی بھولنے نہ دے گی۔

میں اس وقت ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ عمر یہی ہوگی کوئی دس گیارہ برس۔ میں بہت بھولا بھالا نادان سا بچہ تھا۔ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں میرے پتاجی ایک بڑے اسٹیشن پر تعینات تھے۔ شہر بھی کافی بڑا تھا۔ جہاں کالجوں اور سکولوں کی بھرمار تھی، ان ہی دنوں چاچا کنتا پرشاد نے میٹرک پاس کیا تھا۔ پتاجی نے انھیں مزید تعلیم دینے کے لئے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ چاچا بھی یہیں ہمارے پاس رہنے اور کالج میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ہمارے محلے کے نزدیک ہی ایک مڈل اسکول تھا اس کی بہت بڑی گراؤنڈ میں شام کو محلے کے سب چھوٹے بڑے لڑکے اکٹھے ہوتے۔ گراؤنڈ کے ایک کونے میں چار کھجور کے درخت تھے گراؤنڈ کے پرے ایک چھوٹی سی نہر تھی جس کے پار۔ آموں، جامنوں، کھجوروں اور اناروں کے باغات تھے۔ کھیتوں میں موسم کے مطابق گاجر، مولی، خربوزے، تربوز اور گنے بوئے جاتے تھے۔ نہر میں بڑی عمر کے لڑکے پل سے چھلانگیں لگا لگا کر تیرا کرتے اور نیچے کنارے ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑا اڑا کر "ہی بلو" "ہی بلو" کھیلا کرتے۔ چاندنی راتوں میں کھیلوں کے مقابلے ہوتے۔ گراؤنڈ میں کبڈی کھیلی جاتی یا چاچا اور ان کے عمر کے لڑکے نہر میں کسی مار دھاڑ کی فلم کے ہیرو کی طرح "ہے" کی لمبی آواز سے درخت سے بندھی لٹکتی ہوئی رسّی سے پکڑ کر چھلانگتے اور اس پار جا کر گنوں، خربوزوں، اناروں یا آموں کی دعوتیں اڑاتے اور اگر کبھی جی میں آتا تو آدھ پھل ہماری طرف بھی اچھال دیتے ورنہ میں اور مجھ جیسے دوسرے چھوٹے لڑکے اس پار گراؤنڈ میں باجرے کے ایک ایک بھٹے کو ترستے رہتے۔ میرا بڑا بھائی سرن جو مجھ سے صرف دو سال بڑا تھا وہ اور ان کے برابر کے دوسرے لڑکوں کی ٹولی میں شامل رہتا۔ چاچا سائے کی طرح ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتے۔ جو کچھ خود کھاتے اسے ضرور کھلاتے۔ اپنے ساتھ کھیلوں میں شامل کرتے جان کا ڈرامے ناٹک یا کی فلمیں دکھلاتے۔ نہر میں اپنی ہتھیلیوں پر لٹا کر تیرنا سکھاتے۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر اس کی قسمت پر بہت رشک آتا۔ مگر نہ جانے چاچا کی کون سی کمزور رگ اس نے قابو میں کر رکھی تھی کہ وہ اس کے بغیر کھانا تک کھانا گوارا نہ کرتے۔ میں نے اس کی کمزور رگ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر میں اسے نہ پا سکا۔ کیونکہ میرے بھائی کے بس میں ہونے میں خود چاچا کی مرضی کو بھی دخل تھا۔

شہر میں اسٹیشن کے نزدیک محلہ چاہ پیپل والا میں ہمارا کرایہ کا مکان تھا۔ اسٹیشن روڈ سے محلہ میں داخل ہو کر دو چار گلیاں آنے کے بعد ایک چوک تھا۔ چوک میں چوتھو رام حلوائی کی دکان تھی۔ چوتھو رام حلوائی بھی تھا، پنساری بھی، کتب فروش بھی، کیمسٹ بھی، تقریباً ضرورت کی ہر چیز اس دکان سے مل جاتی۔ محلہ میں چوتھو رام کی دکان خوب چلتی تھی۔ شام کو میرے چاچا ان کے ہم عمر نوجوان دوست چوتھو رام کی دکان پر اکٹھا ہو کر محفل جماتے۔ دودھ اور جلیبیاں کھاتے۔ گپ شپ اور بحث مباحثہ کرتے۔ شرطیں باندھتے۔ چوتھو کی دکان سے کچھ آگے جا کر ہماری گلی بند ہو جاتی تھی۔ باقی سب گلیاں دوسری گلیوں میں جا ملتی تھیں۔ یوں سمجھئے کہ چوتھو کی دائیں طرف ہمارا مکان پانچویں نمبر پر تھا۔ اور چوتھو کی سامنے والی گلی میں لالہ موہن لال کا مکان چوتھے نمبر پر۔ چونکہ اپنے گھروں اور ضلع سے ہم لوگ کافی دور اس شہر میں مقیم تھے۔ اس لئے لالہ سوہن لال کے گھر ہمارا اچھی ہی پریت تھی۔ ویسے بھی اس محلہ میں ہمارے شہر کے صرف یہی دو گھر تھے۔ سوہن لال کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ پہلی لڑ

میں چٹھی اونچی اونچی آواز میں پڑھنے لگا تو وہ بولی
"کاکا ہولے ہولے۔"

پھر مجھے روک کر وہ لپک کر سیڑھیوں کی طرف گئی اور پھر میرے پاس آکر خط سننے لگی۔ پہلے تو وہ خط بھی سنتی جا رہی تھی اور سیڑھیوں کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھی مگر پھر وہ خط میں اس قدر کھو گئی کہ اسے سیڑھیوں کا خیال تک نہ رہا۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے سے اچانک کسی نے جھپٹا مارا۔ اور میرے ہاتھ سے خط چھین لیا۔ پھر میں نے دیکھا نندو اور لاجو بری طرح ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ نندو کے ایک ہاتھ میں خط تھا اور دوسرے میں لاجو کے بڑے بڑے بال۔ مگر لاجو کے دونوں ہاتھ صرف خط واپس حاصل کرنے میں کوشاں تھے۔ نندو نے چلا چلا کر آوازیں دیں۔

"ماتا جی۔ ماتا جی۔ اوپر آنا۔ اوپر آنا۔"

مگر اس کی آواز تائی اور گلی کی دوسری عورتوں کی گپوں کے نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر دب گئی۔ تائی جی نیچے گلی میں اپنی دنیا میں مست رہیں۔ "یہ مرجائے بہن بھائی تو روز ہی لڑتے ہیں۔ میں کہاں تک ان کے پیچھے پیچھے بھاگتی پھروں۔"

آخر لاجو نے نندو کی انگلیاں مروڑ ڈالیں اور چٹھی اس کی انگلیوں سے نیچے زمین پر گر گئی۔ اب نندو کے دونوں ہاتھ لاجو کے ہاتھوں میں تھے۔ وہ چلا کر بولی "کاکا بھاگ جا چٹھی لے کر۔"

میں نے لپک کر چٹھی اٹھائی اور پھر جیسے میرے پر لگ گئے۔ میں کود کر ممٹی پر چڑھا پھر ایک چھت سے ہوتا اپنے پڑوسی کی چھت پر تھا۔ دل میں ایسا دھڑکا بیٹھا ہوا تھا جیسے نندو پیچھے بھاگا آرہا ہو اور مجھے پکڑ کر میری آنکھیں، ناک اور گردن نوچ ڈالے گا۔ جب میں نے چوبارے کے جنگلے سے جھانک کر دیکھا تو سیڑھی نظر آ رہی تھی میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سیدھی چوبارے سے اپنی چھت پر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت تو مجھے زیادہ تکلیف نہ ہوئی اور میں نے چٹھی چاچا کو پہنچا کر تمام بات سے آگاہ کر دیا۔ چاچا کے منہ سے نکلا۔

"کاکا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔"

شام تک کولھے کے درد سے میں بے حال ہو اٹھا اور چارپائی پر پڑ گیا مگر چاچا نے مجھے ایک روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "کاکا چٹھی والی بات کسی سے نہ کہنا۔ کوئی پوچھے تو کہنا اسکول میں نہر پھاندتے ہوئے گر گیا۔"

مجھے تکلیف تو کافی تھی مگر بڑی مشکل سے ہاتھ آیا ہوا یہ موقع میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے پتا جی اور ماتا جی سے میں نے یہی بہانہ بنایا۔ چاچا اب باقاعدہ گرم تیل سے میرے کولھے پر مالش کرتے۔ میں ٹھیک تو جلدی ہو گیا۔ مگر میری چال میں اب لنگ آ چکا تھا۔

ایک دن پھر چاچا نے مجھے ایک چٹھی اور رشوت کی چوّنی دیتے ہوئے کہا۔

"کاکا۔ یہ چٹھی جیب میں لے جا۔ جب لاجو خود مانگے تو دے دینا اور کہنا۔ یہ وہی چٹھی ہے جس پر نندو اور لاجو کی لڑائی ہوئی تھی۔"

سردی کا موسم تھا۔ لاجو۔ اس کے ماتا پتا اور دونوں بھائی رسوئی گھر میں چٹائیوں پر انگیٹھی کے نزدیک بیٹھے تھے۔ میں بھی رسوئی گھر میں اس کے نزدیک جا بیٹھا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کب لاجو کہے اور میں چٹھی اس کے حوالے کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی نندو چلایا "جیتو۔ تو پھر ہمارے گھر آیا ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔ نہیں تو ٹانگیں چیر ڈالوں گا۔"

لاجو بڑے لاڈ سے تایا جی کے بازو پر سر رکھتے ہوئے کہا "پتا جی دیکھو۔ نندو پھر گندی باتیں کر رہا ہے۔"

تایا جی نے نندو کو جھاڑ پلاتے ہوئے کہا "پگلا۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ اپنی بہن پر تہمت لگاتے۔" پھر وہ لاجو کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "نالائق۔ میری بیٹی تو ایسی بھولی بھالی اور گؤ ہے کہ اسے تو بینگن کے رنگ کا بھی ابھی تک نام نہیں آتا۔"

لاجو تایا جی کے بازو سے جھولتے ہوئے مجھ سے بولی۔ "کاکا اور اڈ کے وہ۔ چٹھی تو لے آ۔"

میں دوڑ کر باہر نکلا پھر واپس ہوئی گھر پہنچا اور ہنس کر

پھرتا رہا اس کے پاس بیٹھا بھی رہا مگر اس نے مجھے چاچا جی کے لئے کوئی بھی کام نہ کہا۔

ایک دن میں جب کوٹھے پر چڑھا تو دیکھا لاجو چولہ کی چھت پر کھڑی نیچے ہمارے مکان کی چھت پر کھڑے چاچا سے پھولوں کے نمونے پوچھ رہی تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ میری ضرورت انھیں اسی لئے نہیں پڑی تھی کیونکہ اب وہ خود اوپر ہی اوپر ایک دوسرے سے مل لیتے تھے۔ مگر آخر ان کے ملنے کا یہ وسیلہ بھی ختم ہو گیا یہ تو مجھے اس وقت سمجھ میں نہیں آیا کہ انھیں اب ملنے میں کیا رکاوٹ آگئی تھی صرف ہمارے پڑوسی کا بوڑھا باپ ہی تو اوپر چوبارے پر رہنے لگا تھا جو بیماری کی وجہ سے دن رات بھر کھانستا اور جاگتا رہتا تھا۔

لاجو کئی دنوں سے چاچا جی سے نئے ڈیزائن پوچھنے کے بارے میں نہیں مل سکی تھی اور نہ چاچا ہی ادھر جا سکے تھے ایک دن لاجو نے مجھے بلا کر کہا۔ "جیتو کا کا۔ ذرا بات سن۔"

میں چپ چاپ ان کے پاس جا کھڑا ہوا، اس نے دوپٹہ کے اندر سے ایک کاغذ نکالا اور کہا۔ "کاکا! یہ لے جا۔ اپنے چاچا کو دے آ۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اکنی میرے ہاتھ میں گھسیڑ دی۔ اکنی دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ دنیا میری آنکھوں میں رنگین نظر آنے لگی۔ کاغذ چاچا کے پاس پہنچانے کے بعد میں سیدھا چوتھو کی دکان پر پہنچا اور اکنی اس کی طرف پھینکتے ہوئے بڑے شاہانہ انداز میں حکم دیا۔ "چوتھو۔ لا ایک پیسے کی ریوڑیاں۔ ایک پیسے کی ٹانگری۔ ایک پیسے کی مونگ پھلیاں اور ایک پیسے کا لاچی دانہ۔"

چوتھو سے چار مختلف پڑیاں پکڑتے ہوئے میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اور بھگوان سے سچے دل سے دعا مانگی کہ سرن کبھی ٹھیک نہ ہو۔

دوسرے دن اسکول سے آتے ہی چاچا جی نے مجھے آواز دی۔ "کاکا۔ ادھر آ تو ذرا۔"

میں چپ چاپ فرماں بردار بچے کی طرح ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ... وہ بولے۔

"نکال تو ذرا اپنی اردو کی کتاب"

پہلے تو میں ڈرا۔ یا خدا یہ ماجرا کیا ہے؛ بجائے کاغذ دینے کے یہ کتاب کا ذکر کیا۔ خیر میں اردو بہت اچھی جانتا تھا۔ میں نے کتاب نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔ چاچا نے ایک ان پڑھ آدمی کی طرح کتاب کو کھولا اور جہاں سے بھی کھل گئی۔ مجھے حکم دیا کہ پڑھو۔ سبق تھا۔ "دلی کی سیر" جب میں نے سارا سبق فرفر سنا دیا تو چاچا نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"یہ لاجو کو پہنچا دینا۔ دیکھنا جب وہ اکیلی ہو۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک اکنی بھی میری مٹھی میں گھسیڑ دی، جب میں چل پڑا تو وہ بولے۔

"اور ہاں۔ اگر وہ کہے تو پڑھ کر سنا بھی دینا اسے۔ تم تو اردو بہت اچھی پڑھ لیتے ہو۔"

میں جب تایا جی کے گھر پہنچا تو تائی جی گلی میں چھوٹی سی چارپائی پر بیٹھی دوسری عورتوں کے ساتھ گپوں میں مست تھیں۔ نند دا اور گنگا اندر تھے۔ میں بلا جھجک اندر چلا گیا۔ کچھ دیر نند دا اور گنگا کے پاس کھڑا رہا۔ مگر لاجو کہیں نظر نہیں آئی۔ نجانے میرے دل میں کیا چور تھا کہ میں لاجو کے بارے میں نند دا یا گنگا سے بھی نہ پوچھ سکا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھنے اور انتظار کرنے کے بعد بھی جب لاجو مجھے کہیں نظر نہیں آئی تو میں سیڑھیوں کی راہ چھت پر چڑھ گیا۔ دیکھا تو لاجو ایک چارپائی پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ لفافہ مجھ سے لے کر وہ سیڑھیوں کی طرف گئی۔ نیچے جھانکا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی کوئی اوپر تو نہیں آ رہا اور جب اسے تسلی ہو گئی کہ اوپر کسی کے آنے کا امکان نہیں تو وہ لفافہ کھول کر پڑھنے لگی۔ میں اکنی کی لالچ میں پاس ہی کھڑا رہا مگر مجھے اکنی دینے کی بجائے اس نے کہا۔

"کاکا پڑھنا تو کیا لکھا ہے؟ مجھ سمجھ نہیں آیا۔"

میں نے چٹھی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "دیدی دونی لوں گا۔"

وہ ہنس دی اور بولی۔ "اچھا۔ اچھا۔ تو پڑھ تو۔"

وجاہت علی سندیلوی

میرا باپ

مجھے اس سے نفرت تھی! ایک ناقابل بیان خوف آمیز نفرت اس کا خیال آتے ہی... اور یہ خیال اکثر آتا... میرے سارے جسم میں غم اور غصّے کی ایک برقی سی لہر دوڑ جاتی.. کتنا ذلیل، کمینہ اور بے شرم تھا وہ؟ مجھے اپنی اس بے بسی پر بے اختیار رونا آجاتا کہ میں اس سے اپنا رشتہ، جو میرے لئے کلنک کا ٹیکہ بلکہ میری روح کا ایک رستا ہوا ناسور تھا، اپنی کسی کوشش سے توڑ نہیں سکتی تھی وہ رشتہ قانون قدرت کی طرح امٹ اور اٹل تھا۔

وہ میرا باپ تھا! مجھے اس دنیا میں لانے کا ذمّہ دار! میں اکثر اس تصور ہی سے کانپ اٹھتی اس کا ناپاک اور نجس خون میری رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے اور اس وقت مجھے خود اپنے آپ سے گھن اور کراہیت محسوس ہونے لگتی۔ لیڈی میکبتھ کے ہاتھوں سے خون ناحق کی صرف چند چھینٹیں چھڑانے کے لئے جب ساری دنیا کے سمندروں کا پانی ناکافی تھا تو پھر میں اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے گندے خون کو کہاں صاف کرسکتی تھی؟

میرا باپ نادر، شہر کے دریا پار علاقے کا سب سے مشہور اور شورہ پشت غنڈہ اور بدمعاش تھا۔ اس کی چوری، سینہ زوری، رہزنی، مارپیٹ، چاقو زنی، آبرو ریزی اور سر بازار شریفوں کی پگڑی اچھالنے کی وارداتوں کے قصّے شہر بھر میں گھر گھر مشہور تھے۔ چھ سات دفعہ وہ جیل میں چھوٹی بڑی مدتوں کی سزائیں بھی کاٹ چکا تھا۔ عورتیں اس کے نام سے کانپتیں، بھلے آدمیوں کا اس کی صورت دیکھتے ہی خون خشک ہونے لگتا پولیس اس سے حد سے زیادہ پریشان تھی۔ وہ اس کی پکڑ دھکڑ اور چالان کرتے کرتے عاجز آچکی تھی۔ لیکن اس کی ہوشیاری اور دہشت کے باعث بیشتر اس کے خلاف عدالت میں کافی ثبوت بہم پہونچانا ناممکن سا ہو جاتا اور وہ قانون کے چنگل سے بچ نکلتا...

اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے اپنے جرائم پیشہ شاگردوں کا جو اسے "استاد" کہتے ایک گروہ بنا رکھا تھا اور پوری منصوبہ بندی کرنے کے بعد زیادہ تر وارداتوں کے موقعوں پر وہ خود موجود نہ ہوتا۔ شاگردوں کو بھی اطمینان رہتا کہ اگر "استاد" جیل سے باہر ہے تو پکڑے جانے پر ان کے مقدموں کی پیروی، ان کے خلاف گواہوں کے توڑنے کے کام اور ان کے متعلقین کی پرورش کے انتظام میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

میری ماں فاطمہ، نواب بیگم کی جو نواب دلاور جنگ کی دوسری اور بہت چہیتی بیوی تھیں۔ بہت دور کی غریب اور لاوارث رشتے دار تھیں۔ میرے نانا اور نانی مر گئے تو نواب بیگم اپنے میکے سے میری ماں کو نواب صاحب کی حویلی میں جو چھتّے والی محل سرا کہلاتی لے آئی تھیں اور وہیں اس کی پرورش کی تھی۔ نواب بیگم بڑی فیاض نیک اور رحم دل بی بی تھیں۔ وہ میری ماں کو بہت چاہتی اور ہمیشہ اس کے ساتھ بڑی بہن جیسا سلوک کرتیں۔ وہ ہر وقت انھیں اپنے ہی پاس رکھتیں۔ ساتھ کھلاتیں، اچھے سے اچھا پہناتیں اور سب لوگوں سے ان کا تعارف اپنی رشتے کی بہن ہی کی حیثیت سے کراتیں انھیں میری ماں پر بڑا بھروسہ تھا۔ ان سے اپنی کوئی بات نہ چھپاتیں اور اپنے خاص بکسوں کی کنجیاں جنھیں وہ ہر دم اپنے پاس رکھتیں صرف میری ماں کے سپرد کرتیں۔ نواب بیگم کے ان احسانات کے جواب میں میری ماں بھی ان پر دل وجان سے مٹی ہوئی تھیں اور جہاں ان کا پسینہ گر جاتا وہاں اپنا خون بہا دینے کیلئے تیار رہتیں۔

بولا۔ "وہ چٹھی۔ وہ تو یہ رہی اس دن سے میری جیب میں پڑی ہے۔"

لاجو نے چٹھی لے کر تایا جی کے ہاتھ میں دے دی۔ تایا جی نے مروڑی ہوئی اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی چٹھی کھولی اور اونچی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ کچھ نئے پھولوں کے نمونے چھپے ہوئے تھے اور کچھ لکھنے کا وعدہ تھا۔ میں نے محسوس کیا ... کہ وہ چٹھی پہلی چٹھی سے بالکل مختلف تھی۔ جو میں نے لاجو کو پڑھ کر سنائی تھی۔

تایا جی بولے "لاجو کی ماں۔ دیکھی اس بیوقوف کی حرکت اپنی گئو جیسی بہن پر شک کرتے اسے لجا نہیں آئی۔"

تائی بولی "عقل تو اسے چھو ہی نہیں گئی۔"

اس واقعہ کے بعد چاچا جی اور لاجو چھت پر ملنے لگے اب چونکہ وہ خود ہی ایک دوسرے سے مل لیتے تھے۔ اسلئے انھیں میری ضرورت نہ رہتی تھی مگر نہ جانے پھر بھی کیوں کبھی لاجو اور کبھی چاچا جی مجھے اور میرے بھائی سرن کو جواب ٹھیک ہو چکا تھا۔ ایک ایک آنہ دیتے تھے۔ ایک دن جب اچانک میں کوٹھے پر چڑھا تو دیکھا کہ چاچا جی لاجو کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لئے کہہ رہے تھے۔

"تو فکر کیوں کرتی ہے میں سب ٹھیک کر دوں گا۔"

کچھ دن بعد اچانک تایا جی ہمارے گھر آئے ان کے چہرے پر جیسے کسی نے زردی مل دی تھی۔ انھوں نے پتا جی سے چاچا جی کے متعلق پوچھا۔ تو پتا جی بولے "صبح سے کہیں گیا ہے۔ شاید سیر کرنے گیا ہو۔ وہیں کسی دوست کے گھر ٹھہر گیا ہوگا۔ بولو کیا کام ہے؟"

تایا جی بولے "گیارہ بجے کو آئے۔ صبح پانچ بجے میری آنکھ کھلی تھی۔ لاجو گھر میں نہیں ہے۔"

"کیا کہا۔ لاجو صبح سے گھر میں نہیں۔" پتا جی نے گھبرا کر پوچھا پھر پتا جی اور تایا جی میں کچھ دیر کھسر پھسر ہوتی رہی۔

مجھے اور سرن کو پتا جی نے چاچا کی تلاش میں دوڑا دیا۔ ہم نے چوکھو کی دکان۔ محلہ کی گلی گلی اور چاچا کے دوستوں کا گھر گھر چھان ڈالا مگر چاچا جی ایسے غائب ہوئے تھے کہ کہیں بھی نظر نہ آسکے۔ ادھر پتا جی۔ ماتا جی تایا اور تائی جی بھی بھاگے پھرے۔ مگر ان دونوں کا نہ ملنا تھا نہ ملے۔ دوسرے دن پتا جی دفتر سے چھٹی لے کر آگئے اور تایا جی اور وہ چاچا جی کی تلاش میں نکل پڑے۔ تین چار دن بعد پتا جی لاجو کو لے کر واپس آگئے مگر چاچا جی ان کے ساتھ نہیں تھے۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ پتا جی انھیں اپنے گھر چھوڑ آئے تھے۔ اس سے دوسرے دن تائی لاجو کو لے کر کہیں چلی گئی اور جب کوئی ایک ماہ بعد لوٹی تو میں نے دیکھا، جیسے لاجو کے جسم سے کسی نے سیروں خون نکال لیا تھا۔ وہ خزاں زدہ پتے کی طرح زرد ہو گئی تھی اور آپ جانتے ہیں خزاں زدہ پیلے پتے زیادہ دیر شاخ پر قائم نہیں رہتے۔ لاجو بھی اس دنیا کی شاخ سے خزاں زدہ پتے کی طرح ٹوٹ کر کسی اور دنیا کی اور چلی گئی۔

آج جب چاچا اشونی کو قصوروار ٹھہرا کر اپنی بیٹی کو بھولی بھالی۔ نادان گئو۔ اور جانے کیا کیا بتاتے ہیں تو ان کی زندگی کا وہ واقعہ میرے دماغ کے اسکرین پر ایک فلم کی طرح چلنے لگتا ہے اور وہ فلم جسے بچپن میں میں نہیں سمجھ سکتا تھا اب بخوبی مجھے سمجھ آتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ قصوروار اشونی ہے یا شانو۔ مجھے چاچا جی سے کوئی بغض نہیں۔ ہو سکتا ہے اشونی نے شانو کو بھگانے جانے کی ہمت کر ہی ڈالی ہو ... مگر پھر بھی نجانے کیوں میرا دماغ اکیلے اشونی کو اس فرار کا ذمہ دار نہیں مانتا اور آج جب چاچا جی کہتے ہیں کہ شانو نادان گئو ہے تو مجھے ان کی محبوبہ لاجو کی شکل یاد آجاتی ہے۔ جس کے والدین اتنا ہی نادان سمجھتے تھے جتنا آج چاچا جی اپنی بیٹی کو سمجھ رہے ہیں۔

ہاتھوں اپنے بیٹوں کو ڈھکیلنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

نادر، سوتیلے باپ کے گھر سے بھاگ نکلنے کے متعلق اکثر سوچ چکا تھا لیکن ماں کے خیال سے اس کے پیر دل میں بیڑیاں سی پڑ جاتیں لیکن جب آج خود ماں نے اس کے پنجرے کی کھڑکی کھول دی تھی تو وہ کسی رہائی کے لئے بے کل چڑیا کی طرح فوراً اڑ گیا۔ وہ رات کو چودھری کی چوپال پر بھی نہیں رکا بلکہ سنسان آدھی رات میں فوراً اپنے گھر کی طرف جو دس کوس سے کم دوری پر نہ تھا چل پڑا۔ رات میں راستہ بھٹکنے کے بعد وہ دوسرے روز دوپہر دن میں بھوکا پیاسا، تھکا ہارا لیکن اپنے بھولے سے دل میں امیدوں اور آرزوؤں کی ایک دنیا سمیٹے اپنے چچا کے گھر پہونچ گیا۔ خلاف توقع وہاں نہ کسی نے اس سے سیدھے منہ بات کی اور نہ کھانے کو پوچھا۔ جیسے تیسے وہ دو مہینے اپنے چچا کے گھر میں رہا۔ کھانے کے وقت موجود ہوتا تو بچی کھچی روٹی اس کو بھی مل جاتی ورنہ کوئی نہ پوچھتا۔ چچا جان بوجھ کر اسے اپنی کھیتی کے کسی کام میں ہاتھ نہ لگنے دیتا۔ ایک رات نادر نے اپنی چچی کو کہتے سنا "اس کی ڈائن ماں نے اس کو تمھاری کھیتی میں حصّہ لگانے کے لئے بھیجا ہے" چچا نے جھلا کر جواب دیا "بھائی کا کام کاج میں نے کیا، زمیندار کی بقایا میں نے چکائی، مہاجن کا قرضہ میں بھر رہا ہوں۔ بڑا آیا ہے وہاں سے حصّہ بٹانے؟ میرے کھیتوں کی طرف نگاہ بھر کے بھی دیکھ لے تو آنکھیں نکال لوں۔"

اور اسی وقت سے نادر نے سمجھ لیا کہ چچا کے گھر میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے دن سے وہ اپنی روزی کی تلاش میں آوارہ پھرنے لگا۔ کبھی کسی کا چارہ کاٹتا، لکڑیاں بیچتا، گھاس چھیلتا، کبھی کسی کے مکان کی مرمت یا کھیتی کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا، کبھی بزاز کے کپڑوں کی گٹھری لاد کر اس کے پیچھے گاؤں گاؤں مارا مارا پھرتا اور کچھ نہ ہوتا تو باغوں اور کھیتوں میں گھس کر فصل کی کچی پکی چیزیں چراتا اور کسی نہ کسی صورت اپنا پورا نہ سہی آدھا پیٹ بھر لیتا اور رات میں جہاں کہیں سر چھپانے کی جگہ ملتی پڑ رہتا۔ اور اس طرح اپنے آبائی گاؤں میں اس نے اپنی زندگی کے چار یا پانچ سال جانور کی طرح گزار دئے تھے اور پھر جب مالی ممتاز نے اسے نواب صاحب کے باغوں میں کئی دفعہ

نقصان کرتے پکڑ لیا تو آخری دفعہ انھوں نے صرف مار پیٹ پر اکتفا نہیں کی بلکہ مزید سزا کے لئے اسے نواب صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے اس بھوکے اور ننگے لڑکے کو بلک بلک کر روتے دیکھا تو انھیں ترس آ گیا اور انھوں نے اسے کوئی تنبیہ کرنے کے بجائے اپنے یہاں ڈیوڑھی کے اوپری کاموں کے لئے نوکر رکھ لیا۔

دو سال تک نادر، نواب صاحب کی ڈیوڑھی پر بڑی مستعدی سے کام کرتا رہا۔ اس عرصہ میں اس کی وضع قطع بالکل بدل گئی۔ اس نے انگریزی بال رکھے اور ہر وقت سر میں تیل چپڑے مانگ نکالے رہتا، بیڑی پینے لگا۔ اچھا خاصا گانا بھی سیکھ لیا، میلوں ٹھیلوں میں جانا اور جو کچھ بچے سنیما دیکھنا اس نے اپنا معمول بنا لیا۔ اور اس طرح ایک چھیلا بن کر اس نے رفتہ رفتہ میری ماں فاطمہ پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے۔ وہ بیچاری چھتے والی محل سرا کی محدود اور محفوظ فضا میں پلی ہوئی ایک بھولی بھالی لڑکی تھی لہٰذا نادر جیسے صورت شکل اور ہاتھ پیر کے اچھے بانکے نوجوان کا جو بڑا باتونی اور چالاک بھی تھا بہت جلد دم بھرنے لگی۔ دوسری طرف نواب صاحب کے لڑکے یاور جنگ جنھیں محل سرا میں سب چھمّن میاں کہتے میری ماں پر بُری طرح لٹو تھے اور ہر وقت بنے ٹھنے ان کے پیچھے پڑے رہتے۔ محل سرا کے ولیعہد کے سامنے اس بیچاری کی کیا حیثیت تھی۔ ان کو اپنی عزت بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ نواب بیگم سے میری ماں کوئی بات نہ چھپاتی تھیں۔ انھوں نے اس کی مجبوری اور کشمکش دیکھی تو باوجود اس کے کہ وہ اپنی رشتہ دار کی حیثیت سے ان کی شادی کہیں اچھی جگہ کرنا چاہتیں، انھوں نے انہی کی خوشی کو مقدم سمجھا اور ایک روز خاموشی سے ان کا نادر کے ساتھ نکاح پڑھوا دیا اور محل سرا سے ملے ہوئے پائیں باغ میں ان دونوں کو رہنے کے لیے ایک چھوٹی سی کوٹھری دے دی۔ میں شادی کے ایک سال بعد اپنے والدین کی پہلی اور آخری اولاد میں پیدا ہوئی۔

چھمّن میاں اس شادی سے جل کر کباب ہو گئے اور نہ صرف میرے باپ اور ماں سے بلکہ خود اپنی سوتیلی ماں نواب بیگم سے جن سے ان کی کبھی نہ بنتی انتقام لینے پر تُل گئے۔ نواب صاحب پر فالج گر چکا تھا اور وہ صاحب فراش تھے ہمارے گھر میں چھمّن میاں کی حکومت تھی۔ انھوں نے کئی دفعہ چوری اور بے ایمانی کے جھوٹے الزامات

نواب صاحب پرانے زمانے کے بڑے وضعدار اور شاہ خرچ رئیس تھے۔ ان کی ڈیوڑھی پر ملازمین کے علاوہ بیسیوں دوسرے لوگوں کی بھی پرورش ہوتی۔ ان کی اور نواب بیگم کی عمر میں کافی فرق تھا۔ بڑی بیگم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور ان سے صرف ایک لڑکا یاور جنگ تھا۔ نواب بیگم سے کوئی اولاد نہ تھی، اور اس وجہ سے اور بھی ان کی دل جوئی میں لگے رہتے اور انھیں کے خیال سے میری ماں کو بھی بہت مانتے تھے۔ اکثر بہنوئی اور سالی کے رشتے سے ان کے درمیان ہلکا پھلکا مذاق بھی رہتا۔ ایک دفعہ ہولی کے موقع پر میری ماں نے نواب بیگم کے ایما سے نواب صاحب پر رنگ ڈالا تھا تو انھوں نے ان کو ایک جوڑ سونے کے کنگن انعام میں دئے تھے۔

اور اس طرح میری ماں نے اپنی زندگی کے سولہ سترہ سال بڑے اطمینان اور بےفکری سے بسر کئے تھے۔ اور پھر ان کی زندگی کے افق پر میرے باپ کا منحوس ستارہ طلوع ہوا! وہ ایک لڑھکتا ہوا پتھر تھا جو میری ماں جیسے نازک اور نوخیز پودے کو کچلتا اور پیستا ہوا آگے بڑھتا اور دوڑتا چلا گیا تھا۔

میرا باپ نادر، ایک غریب کاشت کار کا بیٹا تھا۔ ابھی پورے دس سال کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دفعتاً سانپ کے ڈس لینے سے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے باپ کی پیار بھری آنکھیں پتھرا گئیں۔ بیوہ ماں جو کل تک گھر کی مالک سمجھی جاتی اب اپنے بچوں یعنی میرے باپ اور اس سے کچھ سال بڑی بہن کی پرورش کے لئے اپنے دیور اور دیورانی کا سمٹا ہوا ہاتھ دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ اور ابھی قبر میں باپ کا کفن بھی نہ میلا ہوا تھا کہ جوان بہن نے یہ گل کھلایا کہ قریب کے گاؤں میں ماں اور دوسری عورتوں کے ساتھ نوٹنکی دیکھنے گئی اور وہیں سے کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ چچا دل میں تو خوش ہوا کہ گھر سے ایک کھانے والا کم ہو گیا لیکن دکھانے کے لئے سارا الزام ماں کے سر تھوپ کر اتنا چیخا چلایا اور وہ کہرام مچایا کہ دوسرے ہی دن منہ اندھیرے وہ اپنے بچہ کو لے کر اپنے میکے چلی گئیں۔

میرے باپ کے ننہال میں لے دے کر صرف ایک ماموں تھا جو خود اپنی کھیتی سے بےدخل ہو جانے کی وجہ سے اب دوسروں کی محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا۔ لہٰذا آئے دن گھر میں فاقے ہوتے رہتے۔ بھاوج نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن بہن خود سمجھ گئی کہ ڈوبتی ہوئی کشتی کے لئے ایک تنکے کا بوجھ بھی بہت ہوتا ہے ـــ چند ہی مہینوں بعد اس نے ایک دور کے رشتہ دار سے جس کی پہلی بیوی مر چکی تھی اور جوان اولادیں موجود تھیں نکاح کر کے اس کے ساتھ چلی گئی۔ سوتیلا باپ بڑا تندخو اور ظالم تھا اسے میرے باپ کو اپنے گھر میں رکھنا اور روٹی دینا گوارا نہیں تھا وہ ہر وقت اس سے سخت سے سخت کام لیتا اور ذرا ذرا سی بات پر اسے بڑی بیدردی سے مارتا۔ سوتیلے بھائی بہنوں میں بھی وہ نکو تھا۔ وہ جلی کٹی باتیں سنانے کے علاوہ اسے ہر وقت اپنے لات گھونسوں کا شکار بنائے رکھتے۔ ماں بےبس تھی، وہ گھر والوں کی آنکھیں بچا کر اس کے آنسو پونچھ دینے یا چوٹیں سہلا دینے یا کبھی کبھار کھانے کی کوئی چیز دینے کے علاوہ کر ہی کیا سکتی ہ وہ اس کی طرفداری کرتی تو اس کے خلاف سارا گھر ایک ہو جاتا اور میرے باپ پر اپنی ماں سے لگائی بجھائی کرنے کے الزام میں اور زیادہ مار پڑتی۔

ایک روز جب سوتیلا باپ بیلوں کو ٹھیک سے پانی نہ پلانے کے قصور میں اسے گھر ہی میں مار رہا تھا تو ماں سے نہ رہا گیا اور اس نے لپک کر اسے بچانے کی کوشش کی لیکن اس پر سوتیلے باپ کو اور بھی طیش آ گیا۔ اور اس نے نادر کو چھوڑ کر ماں کو دھنک کر رکھ دیا اسی رات کو جب سارا گھر سو گیا تو ماں دبے پیروں چوپال میں جہاں نادر اکیلا سو رہا تھا آئی اور اسے جگا کر اسے ستو کی ایک پوٹلی دی، اور اس کے شلوکے کے نیچے اس کی باہنہ پر کپڑے کی ایک چیٹ میں پلٹے ہوئے روپے کو باندھتے ہوئے کہا "نادر تو یہاں سے چلا جا! تو سمجھ لے تیرے باپ کے ساتھ تیری ماں بھی مر گئی۔ تو اسی وقت جا کر چودھری کی خالی چوپال پر پڑ رہنا اور سویرا ہونے سے پہلے ہی اپنے چچا کے گاؤں چلے جانا۔ اس کے کھیتوں میں تیرے باپ کا بھی آدھا حصہ ہے" اور جب صبح کو نادر آنکھیں ملتا ہوا چوپال سے نکلا تو ماں نے اسے بے اختیار سینے سے لگا لیا اور اس کے چہرے کو اپنے خاموش آنسوؤں سے بھگوتے ہوئے کہا "اور ہاں نادر تو بڑے قاعدے سے رہنا! تو کس کے بل بوتے پر راہ سے بےراہ ہو گا؟" اور ماں کے حلق سے بےاختیار سسکیاں پھوٹ نکلیں۔ نادر چل پڑا اور چند ہی قدموں بعد رات کے اندھیرے میں ماں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور لیکن وہ بڑی دیر تک اس اندھیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی جس میں وہ خود اپنے

یہ کہتے ہوئے مجھے اپنی گود میں اٹھالیا "سکینہ تیری ماں نہیں، میری بہن مری ہے، تیری ماں میں نواب بیگم تو ابھی زندہ ہوں۔" اور واقعی انھوں نے جیسا کہا تھا کر دکھایا۔ دنیا میں جب تک نواب بیگم جیسی ایثار پیشہ اور پرخلوص ہستیاں موجود ہیں ہزاروں نادر اور لاکھوں گھمن سیال، انسانوں کو تو بیس کر ختم کر سکتے ہیں لیکن انسان کا انسانیت پر ایمان ہرگز نہیں مٹا سکتے وہ ابدی اور لازوال ہے۔

میری ماں کے مرنے سے کچھ دیر پیشتر جب وہ بڑی الجھن اور اضطراب میں مبتلا تھیں نواب بیگم نے ان کا سر اپنے زانو پر رکھ کر بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا تھا، "فاطمہ تم نادر کو تو نہیں یاد کر رہیں کہو تو اسے بلوا بھیجوں۔ سنا ہے اب وہ کچھ سدھر گیا ہے۔" میری ماں نے آنکھ اٹھا کر نواب بیگم کو تعجب اور خاموشی سے دیکھا اور جب انھوں نے اپنی بات پھر دہرائی تو جلدی سے "نہیں" کہہ کر اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا لیکن بے اختیار دو آنسو ان کی آنکھوں سے چھلک کر رخساروں پر آ کر رک گئے یہ آنسو مرنے کے بعد بھی ان کے چہرہ پر چمک رہے تھے۔ غالباً نادر بدمعاش اب بھی ان کے دل کا چور تھا۔

اس وقت میری عمر قریب چھ سال کی تھی۔ خود نواب بیگم چھتیس سنتیس سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ اب گھر وہ صرف وہ تھیں اور میں۔ انھوں نے اپنی ماں، مامتا اور محبت کے سارے خزانے مجھ پر لٹا دیے اور میرے لاڈ پیار کی کوئی انتہا نہ رکھی۔ اتفاق سے چھپّے والی محلسرا کے بالکل ہی سامنے لڑکیوں کا ایک ہائی اسکول تھا۔ انھوں نے اسی میں میرا نام لکھا دیا۔ انھیں مجھے پڑھانے کی بڑی امنگ تھی۔ غالباً وہ تعلیم کے صابن سے میری رسوائی کی وہ غلاظت دھو ڈالنا چاہتیں تھیں جو مجھے اپنے باپ سے ترکے میں ملی تھی۔

اپنے باپ نادر سے نفرت،

جو، ایک طرح سے میری گھٹی ہی میں پڑی تھی اور پھر آئے دن اس کی بدمعاشیوں اور بدنامیوں کے کارنامے سن سن کر اس میں اور بھی شدت اور خوف کی آمیزش ہوتی گئی۔ میرے اور اس کے درمیان صرف میری ماں کی نعش ہی نہیں تھی بلکہ وہ میرے لیے مستقل رسوائی اور بدنامی کا باعث بنا ہوا تھا۔ میں چھوٹے درجوں میں تھی تو میری ہم جماعت لڑکیاں کسی بھی موٹے تازے بدہیئت شخص کو اسکول کے پاس سے گزرتا دیکھتیں تو مجھے چڑاتیں "سکینہ وہ دیکھ تیرا باپ تجھ کو پکڑنے آ رہا ہے۔" میں کچھ اونچے درجوں میں پہونچی تو میں نے محسوس کیا کہ بعض لڑکیاں مجھ سے گفتگو کرتے اور میرے پاس آتے جھجکتیں۔ اکثر جب میں ان کے پاس سے گزرتی تو وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم سے خاموش ہو جاتیں اور میں یہ سمجھ کر کہ وہ میرے رسوائے زمانہ باپ ہی کا تذکرہ کر رہی ہوں گی مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی میں خود اپنے احساس کمتری کے باعث سب سے الگ تھلگ رہتی اور اپنی بدقسمتی پر دل ہی دل میں رویا کرتی۔ کچھ بدزبان لڑکیاں مجھ پر کھلی کھلی چوٹیں کرنے سے بھی نہ چوکتیں۔ درجے میں کسی کی کوئی چیز کھوتی تو میری طرف اشارہ کر کے کہتیں "چرائی ہوگی کسی ڈاکو کی بچی نے۔" میں ایک دفعہ ایک نیا پھولدار جمپر پہن کر اسکول گئی تو ایک طرار لڑکی بولی "سنا ہے پرسوں سیٹھ گوبند پرشاد کے یہاں جو چوری ہوئی اس میں بہت سے کپڑے بھی چور اٹھا لے گئے تھے۔" اور پھر لڑکیوں کی ایک پوری ٹولی مجھے دیکھ کر قہقہے لگانے لگی۔ میں یہ ذلتیں خاموشی سے برداشت کرتی اور ان کا تذکرہ نواب بیگم تک سے نہ کرتی۔ جب کوئی لڑکی میری دوست بن کر مجھ سے میرے باپ کے متعلق ہمدردی جتاتی اور مجھے قابل رحم سمجھتی تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے میری روح کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برس رہے ہوں۔ ایک دفعہ ایک ایسی ہی گفتگو کے درمیان میں سسکیاں بھرتے ہوئے چیخ اٹھی تھی "ہاں! ہاں! میرا باپ ایک غنڈہ ہے بدمعاش ہے لیکن میں کسی کی کوئی ہمدردی نہیں چاہتی۔ خدا کے لیے مجھ پر ترس مت کھاؤ بلکہ ہو سکے تو اس کے بجائے مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکا دو!"

ایک روز نواب بیگم برآمدے میں تخت پر بیٹھی مشین پہ میری شلوار سی رہی تھیں اور میں ان کے قریب ہی لیٹی ان کو کوئی افسانہ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ دفعتاً وہ ہڑبڑا کر اٹھیں اور مجھے گھسیٹتے ہوئے صحن میں جا کر کھڑی ہوئیں۔ میں نے متعجب ہو کر دیکھا تو جہاں وہ بیٹھی تھیں اس کے قریب ہی دو چھپکلیاں دیوار پر رینگ رہی تھیں۔ نواب بیگم چھپکلیوں سے بہت ڈرتیں اور ان کو دیکھ کر اکثر اس قسم کی اچھل کود مچایا کرتیں۔ اس وقت میرے سامنے ہی ایک ڈنڈا پڑا تھا۔ میں اسے اٹھا کر چھپکلیوں کی طرف بڑھی تو نواب بیگم بے اختیار چیخیں "نہیں! سکینہ نہیں!" میں نے ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک وار سے ایک اور دوسرے سے دوسری چھپکلی مار گرا دی۔ نواب بیگم میری اس بے خوف سفاکی کی تاب نہ لاتے

پر نادر کو پٹوایا اور پھر کچھ ایسی ریشہ دوانی کی کہ اس کا محلے کی ایک ڈکیتی میں چالان اور پھر عدالت سے اسے دو سال قید با مشقت کی سزا ہو گئی۔ عدالت سے جیل جاتے ہوئے اس نے میری ماں سے پکار کر کہا تھا "تم اس چھمن کے بچے کی محلسرا میں ہرگز نہ رہنا۔ میں واپس آتے ہی اس حرامزادے کا قیمہ بنا کر نہ رکھ دوں تو میرا نام نادر نہیں!"

میری ماں نواب بیگم کو چھوڑ کر اور مجھ چند مہینوں کی جان کو لے کر کہاں جاتی؟ وہ چھٹے والی محلسرا ہی میں رہتی رہیں البتہ ایک مرتبہ چھمن میاں نے کوئی پیش دستی کی تو جھولن نے ان کو للکارتے ہوئے کہا "غریبوں کی بھی اپنی عزت ہوتی ہے میاں! آپ میرے جسم میں نہیں صرف میری لاش ہی میں ہاتھ لگا سکتے ہیں۔" اور اس کے بعد چھمن میاں محلسرا کے انقلابات میں ایسے گھرے کہ پھر انھیں میری ماں کی طرف متوجہ ہونے کی غالباً فرصت ہی نہ ملی۔

نادر اپنی سزا کاٹ کر جیل سے لوٹا تو چھتے والی محلسرا کی زمین آسمان ہی دوسرا تھا۔ نواب دلاور جنگ کا انتقال ہو چکا تھا۔ انھوں نے نواب بیگم کے حق میں اپنی آبھی جائیداد کی جو دستاویز لکھی تھی وہ کسی قانونی سقم کی بنا پر عدالت سے ناجائز قرار دی جا چکی تھی۔ نواب صاحب کی کل جائیداد اور املاک پر چھمن میاں بلا شرکت غیرے قابض اور متصرف ہو چکے تھے۔ نواب بیگم کو صرف سو روپیہ ماہوار گزارہ اور سر چھپانے کو محلسرا کے ایک ایسے گوشے میں پناہ ملی تھی جہاں پہلے ان کی مرغیاں اور کبوتر رہتے۔ ان کے چاروں طرف نوکرانیوں اور ملیچھ خدمتوں کا جو میلا سا لگا رہتا وہ باد مخالف کے پہلے ہی جھونکے میں ان کے پاس سے اڑ کر چھمن میاں کی بیوی نواب دولہن کے پاس پہونچ چکا تھا۔ اس نازک وقت میں جب کہ کوئی اپنا نہیں بلکہ سب پرائے ہو چکے تھے۔

نواب بیگم کی تنہا رفیق اور غمگسار میری ماں تھیں جن کی گود میں، میں لدی ہوئی تھی۔ وہ اکیلی گھر کا کام کرتیں، بازار سے سودا لائیں، کھانا پکاتی اور نواب بیگم کی معمولی سے معمولی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے انھیں خود پل کر پانی بھی نہ پینے دیتیں۔ انھوں نے جہاں تک بھی ہو سکا انھیں کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ اب ان کے پاس دس خادمائیں نہیں بلکہ صرف ایک ہی۔

میرا باپ جیل سے سیدھا چھتے والی محلسرا پہونچا تو پہلے تو چھمن میاں کے ملازمین نے اس کو پھاٹک کے اندر گھسنے ہی نہ دیا۔ کئی روز کی کوششوں کے بعد ایک رات نہیں معلوم کیسے وہ چھپتے چھپاتے میری ماں تک پہونچا تو اس نے ان کی صورت دیکھتے ہی فوراً مطالبہ کیا کہ وہ اسی وقت محلسرا چھوڑ کر اس کے ساتھ چل نکلیں میری ماں بیچاری نے اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ایسے نازک وقت میں نواب بیگم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہیں۔ بلکہ گڑگڑا کر منت و سماجت کی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے رک جائے، وہ اس عرصے میں نواب بیگم کو راضی کر لیں گی کہ وہ محلسرا چھوڑ کر کسی کرائے کے مکان میں اٹھ چلیں تاکہ وہ بھی ان کے ساتھ رہ سکیں لیکن میرا باپ ایک نہ مانا اور اس کے غصے کا پارا اوپر ہی چڑھتا چلا گیا۔ بات زیادہ بڑھی اور میرے باپ نے میری ماں کو چھمن میاں سے ناجائز تعلقات رکھنے کا طعنہ دیا تو وہ بھی غصے میں آ کر آپے سے باہر ہو گئیں اور انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی محسنہ نواب بیگم کو چھوڑ کر اس کے جیسے بدمعاش کے ساتھ، جو اس پر بھروسہ بھی نہیں کرتا ہرگز نہیں جائے گی۔

میرا باپ یہ سن کر تلملا اٹھا اور اس نے چاقو نکال کر میری ماں پر حملہ کرنا چاہا میری ماں کی چیخ پر نواب بیگم دوڑ پڑیں اور درمیان میں آ گئیں ورنہ نہ معلوم وہ ظالم کیا کر بیٹھتا۔ وہ دیوار پھاند کر بھاگ نکلا اور اس نے ہم لوگوں سے اس کا کوئی واسطہ اور تعلق باقی نہیں رہا۔ لیکن اس کے وجود کی منحوس پرچھائیں ہم سب کا ہمیشہ تعاقب کرتی رہی۔

اس کے بعد ہی شہر میں نادر کی بدمعاشیوں کے قصے مشہور ہونا شروع ہو گئے اور اس کو رہزنی کے الزام میں پھر سزا ہو گئی۔ میری ماں اس ذلت اور کوفت کی تاب نہ لا سکیں اور دو سال کے اندر ہی انھیں دق ہو گئی۔ نواب بیگم نے ان کے دوا علاج میں بے دریغ روپیہ صرف کیا۔ شہر کے بہتر سے بہتر ڈاکٹر کو دکھلایا، ان کی قیمتی سے قیمتی دوا استعمال کرائی پہاڑوں پر گئیں، سینیٹوریم میں بھرتی کرایا اور اس طرح ڈیڑھ برس تک انھوں نے اپنا زیور بیچ بیچ کر میری ماں کو مرنے نہ دیا۔ میری ماں ان کو اکثر سمجھاتیں "نواب بیگم میں بچوں گی نہیں۔ آپ میری وجہ سے اپنا گھر نہ برباد کیجیے کچھ اپنے آنے والے دنوں کے متعلق بھی سوچیے۔ ابھی آپ کو میری سکینہ کی پرورش کرنا ہے۔" لیکن نواب بیگم نے ایک نہ مانا اور بالآخر موت نے ان کی بات بھی نہیں مانی اور ایک روز میری ماں، مظلوم فاطمہ، جو دیکھنے میں ابھی ایک لڑکی سی معلوم ہوتیں نواب بیگم اور مجھے روتا ہوا چھوڑ کر نادر جیسے بدمعاش اور چھمن میاں جیسے عیاش انسانوں کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے چل بسیں میں چیخ مار کر ان کی لاش سے لپٹنے لگی تو نواب بیگم

میرے معقول تنخواہ پر ملازم ہو جانے سے گھر کی عام پریشانیاں دور ہو گئیں تھیں نواب بیگم اور میں اب ایک نے آرام دہ مکان میں منتقل ہو کر ایک ملازمہ کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب اگر نواب بیگم کو کوئی فکر تھی تو میری شادی کی اور مجھے کوئی تشویش تھی تو اس خیال سے کہ ہم دونوں نے اتنی قربانیوں کے بعد اپنی عزت اور ناموس کا جو ننھا سا شیش محل بنا لیا ہے اُسے میرے باپ کی کوئی نئی رسوائی ٹھوکر مار کر پاش پاش نہ کر دے۔ شہر کے ایک کونے پر جس نو آباد حصے میں ہم لوگ اب کئی سال سے سکونت پذیر تھے وہاں ابھی تک شاید کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ میں نادر بدمعاش کی لڑکی ہوں۔ اس تمام مدت میں جس میں کہ نواب بیگم اور میں نے مخالف حالات اور اس کی لائی ہوئی بدنامیوں کا انتہائی صبر و استقلال سے مقابلہ کیا تھا اور جن کے درمیان میری ماں فاطمہ کو اپنی جان کی قربانی بھی دینا پڑی تھی میرے باپ نادر نے اپنی غنڈہ گردیوں اور بدمعاشیوں میں خوب خوب نام پیدا کیا تھا اور جرائم پیشہ دنیا میں وہ اپنے جیتے جی ایک روایت بن کر رہ گیا تھا۔ کیا ستم ظریفی تھی واقعات کی کہ جس اخبار میں میری تقرری کی اطلاع تھی اسی میں میرے باپ کو ایک بلوے کے سلسلے میں تین ماہ قید سخت دیے جانے کی بھی خبر چھپی تھی۔

میں طالب علمی کے زمانے سے کالج رکشے پر جایا کرتی۔ راستے میں آئے دن سیکڑوں ہی انسانوں کو دیکھا کرتی لیکن نہیں معلوم کیوں رفتہ رفتہ میرے شعور میں یہ بات ابھرنے لگی کہ میں ایک لانبے چوڑے جسم کے گندمی رنگ والے شخص کو جس کی بڑی بڑی آنکھیں اور بھری بھری مونچھیں تھیں اور جو ہمیشہ تہمد پہنا کرتا اور اس پر پھولدار واسکٹ پہنتا اور ترچھی دوپلی ٹوپی لگاتا اور ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا پکڑے رہتا ہر پندرہویں بیسویں دن اپنے کالج کے دروازے کے قریب ضرور دیکھتی۔ ایک روز میں کالج سے نکلی تو میں نے دیکھا کہ وہی شخص میرے رکشے والے سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ مجھے نظر بھر کر دیکھتے ہی وہ رکشے والے کے پاس سے ہٹ کر فوراً دوسری طرف چلا گیا۔ میں رکشے پر بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوئی تو میں نے راستے میں رکشے والے سے پوچھا کہ وہ کون شخص تھا۔ اور کیا پوچھ رہا تھا۔ پہلے تو اس نے ٹالنا چاہا لیکن پھر میرے اصرار پر اس نے بتایا۔ "وہ نادر استاد تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ یہ لڑکی اتنے دنوں سے پڑھتی ہی چلی جا رہی ہے! آخر کیا پڑھتی ہے؟ کیا اس کو کبھی کوئی پاس نہیں کرتا؟ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ بی بی سب درجے پاس کر چکی ہیں اور اب پڑھتی نہیں بلکہ پڑھاتی ہیں۔"

میرا سارا جسم جھنجھنا سا اٹھا جیسے خوب کسے ہوئے تاروں کو کسی نے مضراب سے چھیڑ دیا ہو۔ تو یہ تھا میرا سوائے نام کا باپ! کیا وہ مجھے پہچانتا تھا؟ کیا اسے میری فکر تھی؟ کیا اس کے پتھر جیسے دل کو کسی کونے میں میری محبت بھی چھپی تھی؟ کیا وہ صرف میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے برسوں سے کالج کے دروازے پر کھڑا ہوا کرتا تھا؟ لیکن میں مجھے اس سے بے پناہ نفرت تھی، اس کے حق میں کوئی بات تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ وہ مجھے پہچان کیسے سکتا تھا؟ میرے متعلق اس کی باتیں بنادی گئیں! کالج آتا ہوگا۔ کتنا عبرت انگیز انتقام ہوگا میرا اس سے کہ جب وہ مجھے ایک غیر لڑکی سمجھ کر اغوا کرنے کی کوشش کرے اور میں اسے اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے بتاؤں کہ میں اسی کی بیٹی سکینہ ہوں!

لیکن میں کیا بتاؤں؟ جب سے میں نے اس اجنبی شخص میں اپنے باپ کو دیکھا تھا اس کا وہ چہرہ اور ڈیل ڈول میری آنکھوں کے سامنے آکر گھوما کرتا میں ارادہ کر کے اس سے نفرت کرنا چاہتی لیکن عجیب نفرت تھی یہ؟ میری آنکھوں سے چنگاریوں کے بجائے آنسو پھوٹ پڑتے اور مجھے اپنے یہ آنسو اُن آنسوؤں کے دھارے سے ملتے ہوئے نظر آتے جو اسی شخص کی یاد میں میری ماں کے رخساروں پر اس کی موت کے بعد بھی خشک نہیں ہوئے تھے!

چند روز بعد میں نے اپنے رکشے والے سے انجان بنتے ہوئے پوچھا "تمہارے استاد کے، کیا نام ہے اس کا؟ کوئی بیوی بچے ہیں؟" رکشے والے نے جواب دیا "جی ہاں نادر استاد کہتا تھا کہ اس کی شادی ہوئی تھی بیوی مر گئی بس ایک لڑکی ہے لیکن وہ اس سے خود ہی دور ہی دور رہتا ہے تاکہ وہ بیچاری اس کی بدنامیوں سے بچی رہے۔" میں اپنے منہ پر رومال رکھ کر اپنی سسکیوں کو بڑی مشکل سے ضبط کر سکی تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے رکشے والے سے کہا "تم اپنے استاد نادر سے کہہ دینا کہ وہ یہاں لڑکیوں کے کالج کے دروازے پر نہ آیا کرے۔"

اور پھر مجھے نادر کبھی کالج کے دروازے پر نظر نہیں آیا۔ میں کچھ شرمندہ سی ہو گئی اور پھر نہیں معلوم کیوں کالج کے دروازے میری آنکھیں کسی کو ڈھونڈتی رہ جاتیں! اگر مجھ پر آئے دن پڑنے والی سیکڑوں نگاہوں میں کبھی کبھی وہ نگاہیں میرے باپ کی بھی ہوتیں تو میرا کیا بگڑ جاتا؟

نومبر کا مہینہ تھا گلابی جاڑوں کی ہلکی چاندنی رات تھی مکان کے اندر

ہوئے کچھ جھنجھلا سی گئیں اور ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "آخر ہے تاکس باپ کی بیٹی! ؟" نواب بیگم میری زندگی کی آخری پناہ تھیں۔ ان کے منہ سے یہ جملہ سنتے ہی میں تیورا کر فرش پر ایسی گری جیسے کسی نے مجھے گولی مار دی ہو۔ نواب بیگم نے

لپک کر مجھے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ وہ سخت نادم تھیں اور کئی روز تک مجھ سے آنکھ ملاتے ہچکچاتی رہیں۔ اور میں ان کی ندامت پر شرمندہ تھی وہ جان بوجھ کر مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہونچا سکتی تھیں لیکن میرے لیے یہ خیال ہی بڑا جان لیوا تھا کہ نواب بیگم کی بے لوث اور پرخلوص محبت کے شفاف چشمے میں بھی نادر کا منحوس چہرہ دکھائی پڑ سکتا تھا کتنا عجیب رشتہ ہوتا ہے باپ اور اولاد کا؟ اس کی زنجیروں سے جسم تو کیا روح بھی آزاد نہیں ہوسکتی! مجھے خود اپنا وجود ہی اپنی اور اپنی مظلوم ماں کی شکست اور اپنے باپ کی فتح معلوم پڑتا۔ میرے ہر قطرۂ خون پر اس کے گندے نام کی مہر لگی ہوئی تھی اور سب سے بڑی حقیقت کے سامنے کہ میں ایک بدمعاش کی بیٹی ہوں میری زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بالکل ہیچ اور بے معنی دکھائی پڑتیں۔

میں اپنے پڑوس میں کسی باپ کو اپنے بچّے کے دلار کرتے یا کسی بچّے کو اپنے باپ سے ضد کرتے دیکھتی تو مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ مجھے منہ چڑا رہے ہوں۔ میں اکثر سوچتی انسان تو انسان حیوانوں کو بھی اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے۔ کیا میرا باپ بھی کبھی میرے متعلق سوچتا ہوگا کیا سوچتا ہوگا؟ کیا وہ نہیں جانتا ہوگا کہ میں اس کی بدنامی کے غلاظت کے بوجھ سے پسی جارہی ہوں؟ لیکن اس سنگ دل کے پاس میرے لیے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں تھی! میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو پتا چلا کہ میری اس سے نفرت کی بڑی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ایک مشہور بدمعاش تھا بلکہ وہ بے اعتنائی اور سرد مہری تھی جو اس نے مجھ سے برتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی شہر میں رہتے لیکن آج تک میری یاد میں نہ اس نے میری صورت دیکھی تھی اور نہ مجھے اپنی صورت دکھلائی تھی۔ کبھی کبھی اپنے باپ کے دیکھنے کا ایک ناقابل فہم اشتیاق میرے دل میں چٹکیاں سی لینے لگتا۔ آخر میں دیکھوں تو سہی کون ہے وہ، جو میری غم زدہ تاریک زندگی میں خوشی کی معمولی سی معمولی کرن بھی آنے نہیں دیتا اور میری ہر رہگزر میں ایک ہیبتناک چٹان کی طرح میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں، مہینے برسوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ میں بچّی سے لڑکی اور لڑکی سے نوجوان عورت میں تبدیل ہوگئی تھی۔ میں نے اپنے بچپن میں نواب بیگم کی کنپٹی پر چاندی کے مہین تاروں کی طرح چند سفید بال دیکھے تھے اور جنھیں میں اکثر ان کے پاس لیٹ کر توڑا کرتی۔ اب ان کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہوگئے تھے۔ ان کے چہرے کی سرخی اب زردی مائل ہو چکی تھی لیکن یہ تبدیلیاں ان کے پر وقار چہرے پر بڑی دیدہ زیب معلوم ہوتیں۔ اگر ان کی پیشانی اور رخساروں کی جھریاں ان فکروں کی نشان دہی کرتیں جو انھیں میری وجہ سے لاحق تھیں ان کے لبوں کا بات بات پر کوندے کی طرح لپکتا تبسم اور ان کی آنکھوں کی مقناطیسی چمک، اس بات کی بھی غمازی کرتی کہ میری پرورش کی ذمہ داریوں نے ان کی زندگی کو با مقصد بنائے رکھا تھا اور مصیبتوں کے کانٹوں میں گھرے ہونے کے باوجود ان کی زندہ دلی کا پھول کمھلا نہیں پایا تھا۔

میں نے ہائی اسکول کیا تو مجھے سرکاری وظیفہ ملا پھر میں نے ڈگری کالج میں داخلہ لیا۔ میں آئندہ بھی امتیازی نمبروں سے پاس ہوتی رہی اور مجھے وظیفے ملتے رہے۔ بی۔ اے اور ایل۔ ٹی کرنے کے بعد میں اسی کالج میں بحیثیت لکچرار ملازم بھی ہوگئی اور میں پرائیویٹ ایم اے کرنے کی تیاریاں کرنے لگی۔ اس سولہ سترہ سال کے عرصے میں پچھتے والی محلسرا میں ایک دوسرا انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ چھمن میاں کی جائیداد اور محلسرا قرضے کی علت میں نیلام ہوگئی۔ مجبوراً نواب بیگم اور میں محلسرا کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں اٹھ آئے تھے۔ چھمن میاں نے نواب بیگم کا گزارہ کئی برسوں سے بند کر رکھا تھا اور میری تعلیم کے آخری مدارج اور ساتھ ہی ساتھ گھر کے اخراجات نواب بیگم نے اپنے باقی زیور اور گھر گرہستی کی چیزیں بیچ کر پورے کیے تھے۔ انھوں نے بڑے ناز و نعم میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کی تھی اور دادو دہش کے علاوہ نہیں معلوم کتنے اچھے سے اچھا کھانا اور قیمتی سے قیمتی کپڑا دوسروں کو کھلا اور پہنا دیا تھا۔ میں جب انھیں گھر کا چھوٹے سے چھوٹا کام خود اپنے ہاتھوں کرتے! بہت معمولی کھانا کھاتے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے دیکھتی تو اکثر میرا دل بے اختیار بھر آتا لیکن جب وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ کر مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ لیتیں تو مجھے محسوس ہوتا کہ نواب بیگم جتنی خوش اور مطمئن اب ہیں اتنی کبھی نہیں تھیں۔ زندگی کی حقیقی لطافت کسی مقصد یا لگن میں ہوتی ہے۔ ان کا مقصد اور لگن میں تھی!۔

کسی بھی حصے میں نہیں دیکھا۔ غالباً وہ ایک ہی شہر میں ایک ساتھ اور ایک باپ بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے اپنے باپ کا دیا ہوا صندوقچہ کھولا تو اس میں کئی تہیں نکلیں جن میں کبھی کبھی عطر لگانے کی بھی کوشش کی گئی تھی لیکن عطر کی خوشبو پر پسینے اور غالباً آنسوؤں کی بو حاوی تھی۔ اور آخری تہہ میں چھپا ہوا وہ میلا زنگ آلود روپیہ تھا جو ایک اندھیری رات میں ایک مظلوم ماں نے اپنے یتیم بچے کو اپنے آپ سے ہمیشہ کے لیے جدا کرتے وقت دیا تھا۔ ایک ماں کی کتنی آہیں اور سسکیاں اس سکے میں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں اکثر تنہائی میں بے اختیارانہ طور سے اس روپے کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگا لیتی۔ اور غالباً اس طرح میرے آنسو میری دادی کے آنسوؤں میں حل ہو گئے تھے۔ اور مجھے اپنی ماں کے وہ آنسو بھی یاد آجاتے جو نادر کے مرنے کے بعد بھی اس کے رخساروں پر چمک رہے تھے۔ تین نسلیں ایک ہی انسان کے لیے رو رہی تھیں ایک ماں کی حیثیت سے، ایک بیوی کی حیثیت سے، دوسرا ایک بیٹی کی حیثیت سے، کیا وہ انسان واقعی اس ہمدردی کا مستحق تھا۔؟

دو سال گزر گئے ــــــ نادر کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ شہر کے لوگ اسے رفتہ رفتہ بھول چکے تھے انھوں نے سمجھ لیا کہ وہ کہیں کھپ گیا۔ اور سوائے میرے جو کبھی کبھی رات کی تنہائیوں میں اس بدنصیب انسان کے لیے اپنی آنکھوں میں اپنے آنسوؤں سے دو چھوٹی چھوٹی قندیلیں روشن کر لیا کرتی، نہ کوئی اسے یاد کرتا اور نہ کسی کو اس کا انتظار رہتا۔ اس عرصے میں میری شادی ایک ڈاکٹر سے ہو گئی تھی اور میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اپنے کالج کی وائس پرنسپل ہو گئی تھی۔ اور پھر مجھے ایک روز سویرے الٰہ آباد کے سرکاری اسپتال کے انچارج کا یہ خط ملا "نادر سخت زخمی حالت میں ہمارے اسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔ اس کی جیب سے نکلے ہوئے ایک پرزے پر آپ کا پتہ تحریر تھا۔"

ہم لوگ اسی وقت موٹر سے روانہ ہو کر سہ پہر تک الٰہ آباد پہنچ گئے۔ میرا باپ بری طرح زخمی تھا اور جنرل وارڈ کے ایک پلنگ پر کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر کئی گہری چوٹیں آئی تھیں۔ دو پسلیاں اور داہنے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ قریب قریب اس کے سارے جسم پر پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ چہرہ تک پٹیوں سے ڈھکا تھا صرف آنکھ، ناک اور منھ کھلا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے یہاں شہر میں چائے کی ایک دکان کھول رکھی تھی کئی روز ہوئے سڑک پر ایک چھوٹی بچی کو موٹر کی زد سے بچانے کی کوشش میں وہ خود موٹر کے نیچے آ گیا تھا اور نیم مردہ حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ اس کو کئی مرتبہ خون بھی دیا گیا تھا جو اس کے محلے والوں نے اس کے لیے بخوشی فراہم کر دیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ ان کے درمیان کافی مقبول بھی تھا۔

میرے شوہر نے کوشش کر کے اسے جنرل وارڈ سے پرائیوٹ وارڈ کے ایک کمرے میں منتقل کر دیا تھا وہ ایک بوسیدہ کمبل اوڑھے بے سدھ پڑا تھا البتہ کبھی کبھی اس پر کرب و اضطراب کا ایک دورہ سا پڑ جاتا اور وہ اپنے سر کو دائیں بائیں ہلانے اور اپنے ہاتھ ہلا کر کمبل کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ ڈاکٹر کی رائے میں اس کی حالت نازک تھی لیکن اس کا مضبوط جسم اور غیر معمولی قوت برداشت دیکھ کر اس کے جانبر ہو جانے سے بالکل ناامیدی بھی نہیں تھی۔ اسے کبھی کبھی ہوش بھی آجاتا اور وہ کچھ باتیں بھی کرتا لیکن میرے سامنے ابھی تک ایسا کوئی موقع نہیں آیا تھا۔

ڈاکٹر نے پہلے تو نرس کے علاوہ مجھے اس کے پاس رہنے سے منع کر دیا لیکن پھر جب میں نے بتایا کہ کتنی مدت کے بعد میرا بچھڑا ہوا باپ مجھے ملا ہے تو اس نے مجھے اس کے سرہانے ایک کرسی پر خاموش بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اور میں نے ساری رات اس امید موہوم میں کہ شاید اسے ہوش آجائے یوں ہی بیٹھ کر گزار دی تھی۔

بجلی کی دھیمی روشنی میں میرے باپ کے چہرے کا وہ حصہ جو پٹیوں سے کھلا ہوا تھا بالکل پیلا بلکہ کچھ سفید دکھائی پڑتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی بند آنکھیں لمبی ستواں ناک اور ابھرے ہوئے ہونٹ اور اس پر ابھی ہوئی چھوٹی داڑھی بڑی جاذب نظر معلوم ہوتی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور کچھ پچکے ہوئے سے گالوں پر آڑی ترچھی شکنیں صاف بتاتیں کہ اس نے زمانے کا بہت گرم و سرد دیکھا ہے اور زندگی اس کے ساتھ کبھی نرمی اور ملائمت سے پیش نہیں آئی تھی۔ میں اس کے چہرے کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی اور آہستہ آہستہ اس کے خدوخال میرے ذہن میں اس طور سے جذب ہو تے جاتے جیسے روشنائی بلاٹنگ میں۔

رفتہ رفتہ میرے تخیل کے پردے پر کچھ تصویریں سی ابھرنے لگیں شروع میں نادر مجھے ایک چھوٹا سا بچہ دکھائی پڑا جسے باپ کی موت نے مبہوت کر دیا تھا پھر بڑی بہن نے گھر سے بھاگ کر اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا۔ پھر ماں نے دوسری شادی کر کے اس کے لیے اپنی ممتا کے چشمے کو گدلا کر دیا! پھر سوتیلے بھائی، بہن اور باپ نے اس مظلوم یتیم کے رگ و ریشے کے معصوم

سامنے برآمدے میں نواب بیگم اور میں سو رہی تھی۔ دفعتاً کسی مبہم شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ شور بڑھتا اور قریب آتا معلوم ہوا جیسے کئی آدمی دوڑتے ہوئے چیخ رہے ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں نے نواب بیگم کی طرف دیکھا تو وہ بڑی بے خبری سے سو رہی تھیں۔ ان کی نیند میں خلل ڈالنے کو جی نہ چاہا۔ شور کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے میں اٹھ کر برآمدے کے باہر صحن میں کھڑی ہو گئی۔ اب آوازیں کچھ صاف آ رہی تھیں "چور! چور!" "اس طرف چھت سے کودا ہے!" "وہ بھاگا جا رہا ہے۔" "لینا پکڑنا۔" وغیرہ وغیرہ

اچانک مجھے اپنے برو سے اور باورچی خانے کی چھت پر جو پڑوس کے کئی مہینوں سے خالی مکان کی چھت سے ملی ہوئی تھی۔ ایک دوڑتا ہوا سایا نظر آیا اور پھر یہ سایا ایک مضبوط انسان بلکہ خونخوار چور میں تبدیل ہو کر پلک جھپکاتے باورچی خانے کی برساتی پر آ رہا۔ یہ برساتی کمزور اور ٹوٹی ہوئی تھی۔ چور نے جیسے ہی اس کے اوپر سے نیچے صحن میں پھاندنا چاہا وہ ایک تراقے سے ٹوٹ کر نیچے گر گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ بھی کچھ بے سدھ ہو کر زمین پر آ رہا۔ خلاف توقع وہ اٹھ کر بھاگا نہیں بلکہ پڑا ہی رہا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اور اس کی ناک سے نکلتے ہوئے خون سے اس کے منھ کے قریب ایک چھوٹا سا سرخ دائرہ بن گیا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان صرف چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ اس کے تعاقب کرنے والوں کا شور اور آوازیں اب اور بھی قریب ہوتی جاتیں۔

یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو گیا تھا۔ میں خوف اور دہشت سے بے حس کیوں نہیں تھی؟ ایک چیخ نہیں، کئی چیخیں میرے حلق سے ابھریں لیکن منھ سے نکلتے نکلتے وہ سسکیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس کو میں نے کبھی اچھی طرح دیکھا بھی نہیں تھا لیکن اس ہلکی چاندنی میں بھی پہچان گئی تھی وہ میرا باپ نادر تھا! میں بے اختیار جھپٹ کر اس پر جھک گئی اور اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "اٹھیے! اٹھیے! آپ کے چوٹ تو نہیں لگی" اور جب وہ نہیں اٹھا تو پاس ہی رکھے ہوئے گھڑے سے اپنے دوپٹے کا پلو تر کر کے اس کے چہرے پر پھیرنے اور اس کی ناک سے خون پونچھنے لگی۔ اور اسی وقت کسی نے صحن کی بجلی جلا دی۔ غالباً نواب بیگم جاگ پڑی تھیں اور بجلی جلا کر میرے پاس آ گئی تھیں جس کی اس وقت مجھے کوئی خبر نہیں ہوئی تھی۔ میرے باپ نے لیٹے لیٹے سر اٹھایا اور مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا "فاطمہ!"

اور اس طلسمی نام نے میرے اور اس کے بیچ کا آخری بند بھی توڑ دیا۔ "فاطمہ اب کہاں؟ میں آپ کی بیٹی سکینہ ہوں!" میں نے اسے اٹھنے کے لیے سہارا دیتے ہوئے کہا لیکن میرے الفاظ سے جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ وہ ایک ہی جست میں خود ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھ سے آنکھ ملائے بغیر اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "سکینہ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ تمہارا گھر ہے۔ میں جا رہا ہوں۔" اور اس نے سامنے والی دیوار پر غالباً اسے پھاند جانے کی نیت سے نگاہ دوڑائی۔

تعاقب کرنے والوں کا شور اب بالکل میرے دروازے ہی پر آ گیا تھا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا "نہیں اب ایسے میں آپ کہاں جائیے گا۔" اس کے سارے جسم میں ایک کپکپی سی تھی لیکن اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "نہیں! میں جاؤں گا۔"

کئی آوازیں میرے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے چیخ رہی تھیں "ادھر چور آیا ہے" نواب بیگم نے آگے بڑھ کر دروازے کے قریب جاتے ہوئے کہا "نہیں ادھر کوئی نہیں آیا ہے۔" اور تعاقب کرنے والوں کا گروہ چیختا ہوا دوسری طرف بھاگا چلا گیا۔

میرا باپ صرف ایک بنیائن اور نیکر پہنے ہوئے تھا لیکن اس سردی میں بھی اس کا سارا جسم پسینے سے تربتر تھا۔ اس کے گھٹنے اور کہنیاں چھلی ہوئی تھیں اور اس کے نتھنوں سے نیچے تازہ خون کا ایک لوتھڑا سا جم گیا تھا۔ میں نے اس کو اپنے دوپٹے سے پونچھنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ روک دیا "سکینہ میں جاؤں گا" کہتا ہوا وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔

میں نے اپنے دل کی ایک دبی ہوئی دیرینہ حسرت نکالتے ہوئے اسے "ابا" کہا۔ وہ چونک کر ٹھٹھک گیا۔ میں اس کے قریب جا کر بولی "اب آپ میرے ساتھ رہیے" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ کتنی آسودگی تھی میرے لیے اس ہاتھ میں جو میری رگ رگ میں دوڑتی اور ناچتی ہوئی چلی گئی! پھر اس نے اپنے نیکر کی جیب سے ایک چیتھڑے میں بندھا ہوا ایک روپیہ نکالا اور میری مٹھی میں رکھ کر اسے بند کرتے ہوئے کہا "سکینہ یہ تمہاری دادی کا دیا ہوا روپیہ ہے جو میں نے آج تک اپنے پاس ہی رکھا تھا۔" میں نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس نے اسے ایک دفعہ آہستہ سے دبایا اور پھر دروازے کی کنڈی کھول کر سنسان رات میں غائب ہو گیا۔

اس رات کے بعد سے کسی نے نادر کو دریاپار علاقے میں یا شہر کے

کتاب۔ لکھنؤ

پرکاش سکسینہ

شوکیس

ناتھن میرا پڑوسی ہے۔ پچھلے چار سال سے ڈرگ ریسرچ کالونی کی اوپری منزل پر میرے پڑوس والے فلیٹ میں رہ رہا ہے۔ دفتر میں اسے لوگ سوامی ناتھن کے نام سے جانتے ہیں پورا نام کسی کو نہیں معلوم... بقول سبھاکر، شاید ناتھن کو خود بھی نہیں معلوم — حاضری کے کالم میں ایس۔ ایس ایس۔ سوامی ناتھن لکھا ہے۔

کالا بھجنگ رنگ اور بولنے کا مخصوص مدراسی انداز... سلیقے اور ڈسپلن کا سخت پابند ہے۔ اس نے اپنا ڈرائنگ روم بڑے سلیقے سے سجا رکھا ہے، قرینے سے لگی کتابیں، اس کے اپنے سائز کا چھوٹا سا اسپرنگ بیڈ۔ ایک ریڈیو اور چوڑے فریم میں جڑی دو تصویریں... دونوں اس کی اپنی...... ایک پنسل اسکیچ اور ایک کنووکیشن کی تصویر...... کول گیٹ یا پوڈر کے خالی ڈبوں کو بڑی خوبصورتی سے تراش کر ان میں منی پلانٹ کی بیلیں لگا دی گئی ہیں۔ ڈبوں کو اتنے عمدہ طریقے سے تراشنا ناتھن کا اپنا پرسنل آرٹ ہے۔ کافی وہ بغیر دودھ اور چینی کے پیتا ہے۔

ایک دن نچلی منزل کے سات نمبر والے اکاؤنٹس کلرک بیچ بھان سنگھ نے ٹوکا تو ناتھن بپھر اٹھا... "سور دارجی! تم لسی پیو جا کر... تم کو (کو کو مدہ کدہ کہتا ہے) کافی ڈائجیشن میں نہیں آنے کو!"......

کبھی کبھی جھلّا اٹھنے کے باوجود بھی لوگ ناتھن کو پسند کرتے ہیں۔

شام کے پانچ بجے سے ہی کالونی میں گہما گہمی کی لہر دوڑ جاتی ہے... آفس سے لوٹ کر اکثر لوگ اپنے اپنے گھروں کے کچن سے اڑتی مرچوں کی دھانس اور بچوں کی چیخ پکار سے بچنے کے لئے ناتھن کے کمرے میں آبیٹھتے ہیں... صاف ستھرا اور پرسکون......

ناتھن کو کالونی کے بچوں سے پیار ہے۔ بچے اسے مدراسی انکل کہتے ہیں۔ چھٹی کے دن السٹریٹیڈ ویکلی کی رنگین تصویریں جمع کرنے کی لالچ میں اس کا کمرہ بچوں سے بھرا رہتا ہے... وہ انھیں کہانیاں سناتا ہے، ٹافیاں دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی دالان میں ان کے چھم کا چھم، چھم ددنی بارہ...... کے کورس میں ان کا ہم آواز بن جاتا ہے۔

سروس کے ہر پہلو کو جتنی سنجیدگی سے ناتھن نے سوچا ہے اتنا شاید کالونی میں اور کسی نے نہیں... ٹھیک ساڑھے نو بجے کھڑکھڑاتی سفید قمیض اور پتلون میں چمکا سیڑھیوں سے نیچے اتر جاتا ہے، دفتر کے ڈسپلن کو فلسفے کی طرح اپنی زندگی میں تحلیل کر چکا ہے۔ کالونی سے فرلانگ بھر دور بنے ہوٹل میں ناتھن کے گھستے ہی ویٹروں میں ایک عجیب بھاگ دوڑ مچ جاتی ہے... پچھلے چار سال سے وہ اسی ہوٹل میں کھانا کھا رہا ہے جتنی پیاز کی پلیٹ دیر سے پہونچنے پر وہ ٹھیک اسی طرح بگڑتا ہے جیسے سپرنٹنڈنٹ صاحب فائل دیر سے لانے پر اس کے اوپر بگڑتے ہیں......

تھالی سامنے آتے ہی ایک گہری نفرت اور چڑچڑاہٹ اس کے آبنوسی ہونٹوں پر بکھر جاتی ہے۔ ایک کٹوری میں چمچ ڈال کر ہلاتا ہے۔ اور چکھنے کے بعد بڑبڑانے لگتا ہے...

خون میں بے رحمی کا زہر گھول دیا!

اور پھر مجھے نادر ایک لڑکا نظر آیا جو ایک اندھیری رات میں اپنی دکھیاری ماں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا تھا! جو صرف ایک روپیہ اور ستو کی ایک پوٹلی لے کر سنسان رات کے انجانے راستوں پر چچا کی شفقت موہوم امیدوں کا چراغ لیے جا رہا تھا۔ اور جسے چچا کی بے مروتی نے ایک ہی پھونک میں بجھا کر اسے انسان کی انسانیت سے مایوس کر دیا تھا۔ اور پھر ایک بے یار و مددگار فاقہ زدہ لڑکا کھیتوں اور باغوں میں چوریاں کر کے پیٹ کی دوزخ بھر رہا تھا! جس کے سامنے زندگی نے خود غرضی اور چھین جھپٹ کے علاوہ اپنے کوئی دوسرے اقدار پیش ہی نہیں کیے تھے۔

اور پھر مجھے نادر ایک نوجوان دکھائی پڑا جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے نواب دلاور جنگ کی عالی شان محلسرا اور اس کی ہما ہمی دیکھ رہا تھا اور جو اپنے چیتھڑوں میں ایک خوف زدہ چور کی حیثیت سے نواب صاحب کے حضور میں پیش کیا جا رہا تھا۔ نواب صاحب کی ہمدردی کے ذرا سے سہارے نے اسے اپنی زندگی کی پچھلی تلخیوں کا بدلہ چکانے پر آمادہ کر دیا اور پھر وہ ایک بانکا سجیلا عاشق بن کر میری ماں پر اپنی محبت کے ڈورے ڈالنے لگا!

اور پھر مجھے نادر ایک جوان دکھائی پڑا جس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا انعام یعنی میری ماں فاطمہ کا دل جیت لیا تھا لیکن جسے اس انعام کو اپنا اور صرف اپنا کہنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ میری ماں اس کی بیوی ہونے سے پہلے نواب بیگم کی منہ بولی بہن تھی۔ وہ بیچارا اس لطیف حسن سے یکسر محروم تھا جو میری ماں اور نواب بیگم کی معصوم محبت کی لطافت کی قدر کر سکتا! اور پھر اس نے چھمن میاں کو ایک مہیب بادل کی طرح میری ماں اور اپنی خوشی کے ٹمٹماتے ہوئے تارے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر جب قید خانے کی ویران راتوں میں اس نے اپنے تخیل کے پردے پر اپنے اور اپنی چہیتی بیوی کے درمیان نواب بیگم اور چھمن میاں کی پرچھائیاں دیکھیں تو اپنی بے بسی کے احساس نے اسے نفرت اور حقارت کا ایک دہکتا ہوا انگارا بنا دیا۔ نواب بیگم کی دولت اس کی بیوی کو خرید سکتی تھی چھمن میاں کی مارت اس کی بیوی کو مجبور کر سکتی تھی۔ اس کے پاس اس ناانصافی کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی حربہ تھا۔ اس کا چاقو!

اور پھر مجھے نادر ایک غنڈا نظر آیا۔ زندگی سے متنفر، انسانیت سے مایوس، سماج کا دشمن اور زمانے کا باغی! وہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ مصلح قوم؟ مذہبی رہنما؟ وکیل؟ ڈاکٹر؟ سائنسداں؟ اس کا قصور فقط صرف یہ تھا کہ وہ زندگی کے تازیانے کھا کر خاموش کیوں نہیں رہا وہ زندگی کے ہاتھوں سے تازیانہ چھین کر اسی پر کیوں جھپٹ پڑا؟ اس نے کوئی متعفن سا گوشۂ عافیت کیوں نہیں تلاش کر لیا؟ وہ انتقام لینے کی غرض سے مرنے اور مارنے کے لیے میدان میں کیوں کود پڑا؟

اور پھر رات کی تاریکیوں میں اس کا چاقو چمکا! عالیشان حویلیوں میں اس نے ڈاکے ڈالے۔ قحبہ خانوں میں اس کے قہقہے گونجے، قمار خانوں میں اس نے بازیاں پلٹیں، شراب خانوں میں اس کے ساغر چھلکے اور بدمعاشیوں کے میدان میں وہ سب سے آگے نکل گیا۔ اور اپنے امکان بھر اس نے اپنی بہن، ماں، سوتیلے باپ، چچا، بیوی، نواب بیگم اور چھمن میاں قسم کے لوگوں سے اپنی بربادیٔ زندگی کا بدلہ چکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

اس کی ہمدردی کے، پیاسے جسم کو عورت کی بڑی تلاش رہی — اسے عورتوں کے جسم تو ملے لیکن اُن کی روح کو وہ کبھی چھو نہ سکا! اسے ماں کی ممتا نہیں ملی! بہن کی شفقت نہیں ملی، بیوی کی محبت نہیں ملی، محبوبہ کا پیار نہیں ملا اور پھر اس بدنصیب کو خود اپنی بیٹی کی عزت بھی نہیں ملی۔

اور پھر میں نے اسی نادر کو، جسے پولیس کی دہشتیں اور ڈنڈے، جیل خانے کی تنہائیاں اور سختیاں، زمانے بھر کی ذلتیں اور رسوائیاں، ہر کس و ناکس کی لعنتیں اور ملامتیں بھی اپنی بدمعاشی کے راستے سے ہٹا نہیں پائی تھیں محض اپنی بیٹی کے "ابا" کہہ دینے سے ایک شریف آدمی بننے کی کوشش کرتے دیکھا —— اور ہاں اس روز وہ موٹر کی زد سے اپنی بیٹی سکینہ ہی کو تو بچا رہا تھا!

میرے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی اور میں نے دوڑ کر اپنے باپ کے پیروں پر سر رکھ دیا اور ہچکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا جیسے اس مظلوم اور معصوم انسان کی مجبوریوں پر تنہا میں ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت رو رہی ہو۔

نرس نے جھپٹ کر مجھے اس کے پیروں سے علٰحدہ کیا۔ دفعتاً اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے پہچان کر اس نے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں اس

[باقی صفحہ ۴۳ پر]

تھوک کر منھ دھونے چلا گیا۔

آج پونے دس پر ناتھن دفتر جا رہا تھا۔ میں نے چھیڑتے ہوئے پوچھا۔ ..... "ہوٹل چلی دیا کھانا کھانے؟"

ناتھن کے دانت چمک کر باہر آ گئے — "نائیں! اب ادھر نائیں جائے گا۔ اب گھر والا فسٹ کلاس کھانا کھائے گا۔ کل ساتھ میں لے آیا تھا —"

"ہمارا دعوت کب ہوگا؟"

"آج شام کو سب میٹریل اکٹھا کرے گا۔ مارکیٹ جائے گا، سب سامان خریدے گا۔ پھر بڑھیا والا کھانا بنے گا۔ کبھی آپ کو بھی انوائٹ کرے گا —"

شام کو شاید دونوں بازار گئے تھے۔ دروازے پر قفل لٹک رہا تھا۔

اندھیرا ہوتے ہی فلیٹ کھل گیا۔ بتی جل گئی۔ پیار کی سرگوشیاں چاہے تامل میں ہوں یا فارسی میں ..... انداز ایک ہی ہوتا ہے — دھیما، مترنم، ہوا کے جھونکے کی طرح ناتھن کی زندگی کے ریگستانی ماحول میں محبت کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ میں ان کی بات چیت نہیں سمجھ پا رہا تھا — لیکن دبے دبے قہقہے، ادھورے فقرے، سرسراہٹ اور ان میں لپٹی مسز ناتھن کی سریلی آواز — جیسے گھنگھروؤں کی چھن چھن۔

دس بجتے بجتے ساری کالونی نیند میں ڈوب گئی۔ ناتھن کے فلیٹ کی بتی ابھی جل رہی تھی .....

اچانک پیار کی ندی میں طوفان آ گیا۔ کنارے کٹنے لگے ..... آوازیں ..... ایک میٹھی، ایک تیز ..... آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں ..... ادھر ادھر کی کھڑکیاں کھلنے لگیں ..... غیر جانبدارانہ گردنیں باہر تن گئیں۔ مگر ناتھن اور اس کی بیوی کی تو تو میں میں کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے باوجود بھی ساری ہمدردی مسز ناتھن کے لئے تھی، ناتھن اندر جانے کیا کیا بک رہا تھا۔ کھٹاک! پلیٹ ٹوٹنے کی آواز .....

میں چادر اوڑھ کر آگے بڑھا۔ ناتھن کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی ..... آواز دی۔

"کون؟ مسٹر دیال؟"

"جی ہاں، دروازہ کھولو۔ کیا بات ہو گئی؟"

"یہ ہمارا پرسنل معاملہ ہے مسٹر دیال۔ آپ کو بولنے کا ضرورت نائیں —"

"ساری کالونی کی نیند خراب ہو گئی، مسٹر ناتھن۔ اب معاملہ پرسنل نہیں رہا —"

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ ناتھن بنیائن اور تہمد پہنے کھڑا ہانپ رہا تھا۔ دروازے سے سمٹ کر بیوی اس کی سسک رہی تھی۔ میں ہاتھ پکڑ کر ناتھن کو اپنے کمرے میں لے آیا — پیچھے پیچھے اس کی بیوی بھی آ گئی۔

"ارے گدھے، ایسی بیوی تمھاری پردادا کو بھی نہ ملی ہوگی — اور تو پہلے ہی دن جھگڑا کرنے لگا؟"

"کیا کرے گا ایسا بیوی کو — بالکل ریلی —"

"مگر تو تو کہتا تھا کہ گریجویٹ ہے، اچھی خاصی ہے پڑھی لکھی ہے، خوبصورت، اور کیا چاہیئے؟"

"نان سینس! خوبصورتی کیا کرے گا ..... کھانا بنانا تک نہیں آتا۔ بولتی ہے نوکر رکھ لو۔ ہم اپنا گھر کھانا کبھی نہیں بنایا ..... تم جانتا مسٹر دیال، ہم کاہے کا واسطے شادی بنایا؟ —

سالا ڈوسا ٹم اچھا فوڈلے گا ..... اور اس کو دیکھو کچھ کام کا نائیں ..... روٹی جلا کر رکھ دیا ..... یہ دیکھو اب سالا خوبصورت ہے تو شوکیس میں رکھے گا ایسا وائف؟

میں نے سگار سلگایا اور آہستہ قدموں سے اپنے فلیٹ میں لوٹ آیا ..... مسز ناتھن اب بھی سسک رہی تھی اور وہ تامل میں بڑبڑائے جا رہا تھا .....

میں بالکنی میں آ گیا ..... نیلگوں بادلوں میں چھپا چاند کسی خوبصورت شوکیس میں سجی ادھ جلی روٹی جیسا نظر آ رہا ہے ....

"کیا ہے یہ؟ یہ سالا ہوٹل ہے — اس کو ڈال بولتا ہے پیچ بی کر کے ادھر رکھ دے گا، اور بولے گا دال ہے رائس کا پلیٹ کہاں ہے؟ مفت کا پیسہ ہے نا دینے کو.....!"

نوکر ادھر ادھر کترا جاتے ہیں۔ ناتھن چاول مسل مسل کر کھانا شروع کر دیتا ہے۔ دو چار لقمے چبانے کے بعد میری طرف دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے....... "مسٹر دیال، ہم چار سال سے کھانا ادھر لے رہا ہے، مگر سالا لوگ کبھی ٹھیک اسٹف نہیں دیا......"

"ہوٹل ہوٹل ہی ہے مسٹر ناتھن۔ اس کے کچن میں بیوی کا ہاتھ ہے نہیں......"

'بیوی' لفظ پر وہ زیرِ لب مسکرایا۔ پھر بولا "ہاں! وہ ٹیسٹ کیسے ملے گا۔"

واش بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے چیف کلرک شرما جی نے فقرہ کسا "گھر پر بھی اچھا کھانا نہیں ملتا پیارے... وہاں پانچ کٹوری، دہی، نمبو، پاپڑ، رائس سب نہیں ملے گا۔ بیوی گیارہ کے پہلے اتنا سب نہیں بنا سکتی.."

چاول میں دھنسی کنکری تھوکتے ہوئے ناتھن نے گلا صاف کیا.......

"ارے گھر کا ایک پلیٹ میں وہ ٹیسٹ ہے شرما جی؟ سالا ادھر پانچ کٹوری میں ناہیں۔ تم کو کیا معلوم —"

"پر بیٹا موٹے تو یہاں کا ہی کھا کھا کر ہوتے جا رہے ہو" شرما جی کوٹ پہن کر باہر نکل گئے۔ ناتھن سے میری دوستی گہری نہیں ہے۔ صبح شام کی برسوں سے چلی آ رہی ہے

میں اکیلا رہتا ہوں۔ ناتھن مجھ سے بھی زیادہ اکیلا ہے شہر میں اس کی کوئی کمپنی نہیں... ساری شام یا تو گومتی کے کنارے ٹھنڈی ریت پر ٹہل کر گزار دیتا ہے یا اپنے تنہا کمرے میں بند بستر میں دھنسا الٹر پٹر ڈ وِسکی کے مسلسل سپ کرتا رہتا ہے (پر پیتا کبھی نہیں)۔ کھوکھلی ہنسی، چڑچڑا پن اور کھوکھلی مسکراہٹ...... کھینچنے والی زنجیر صرف دفتر کی ہے جہاں وہ ٹھیک وقت پر پہونچ جاتا ہے۔

اس دن ہوٹل کے ذکر پر دل نے ٹھنڈی سانس لی

جب سننے میں آیا کہ مدراسی بابو دو مہینے کے لئے اپنے دیس جا رہا ہے۔ مجھ سے ملا تو لپک کر ہاتھ ملایا اور بولا "مسٹر دیال ہم جا رہا ہے میڈراس کو۔"

"اچھا! آپ جا رہے ہیں؟"

"کل چلا جائے گا۔ ہمارا چھٹی گرانٹ ہو گیا۔"

"واپس کب آئے گا؟"

"منیمم دو مہینہ..... فرسٹ آف نومبر کو جوائن کرے گا"

دوسرے دن صبح جب میں اٹھا تب شاید رات کی گاڑی سے وہ جا چکا تھا...... کچھ دنوں تک سیڑھیوں، بالکنی اور ہوٹل کا سونا پن مجھے کھٹکتا رہا۔ آہستہ آہستہ ناتھن کی یاد پر وقت کی پرتیں چڑھتی گئیں، دیوار پر کھرچے ہوئے ایک دھندلے نشان کی طرح جس پر سفیدی چڑھا دی گئی ہو ہم ناتھن کو بھول گئے......

پھر اچانک ایک دن کالونی میں سنسنی پھیل گئی — ایک ایسی سنسنی جیسے فٹ پاتھ پر چلتی کسی جوان لڑکی کے ننگے بازو کے لمس سے پھیلتی ہے ___ ناتھن تانگے سے اترا تو اس کے ساتھ ایک سانولی سی لڑکی بھی تھی۔ ٹھنڈی دھوپ میں پکا ہوا رنگ، دہکتے رخسار، اور شباب کی سرمستیوں میں بھیگی معصومیت... گہرے سبز رنگ کی دبیز مدراسی ساڑھی میں لپٹی ہوئی.... کالونی میں جس نے دیکھا اسے اپنی عمر تیزی سے گھٹتی محسوس ہونے لگی......

سب ناتھن سے ملنے آئے۔ کانگریٹس دیئے، نہ بلانے کی شکایت کی اور نہ مٹھائی طلب کی۔

صبح جب میں کھڑکی میں بیٹھا برش کر رہا تھا، ساتھ نمبر والے سیٹھ بھان سنگھ نے آنکھ دبا کر رازدارانہ انداز میں کہا — "دیال بابو، ہم سمجھتے تھے مدراسی ذات کالا ہوتا ہے مگر واہگورو قسم! یہ ناتھن کی عورت تو بلا کی چیز ہے، کیا لذیذ حسن پایا ہے۔ یہ سالا ایسا مال کہاں سے ٹانچ لایا؟" — بغل کی کھڑکی میں کھڑی مسز ناتھن ایئر رنگ میں پیا پرو رہی تھیں......

"چھپر پھاڑ کر دینا اسی کو کہتے ہیں یا اللہ" — میں تو ٹیسٹ

کے رہنے والے اس بات پر متفق تھے کہ اس عورت کو ایک چاہنے والے کی تلاش تھی ۔ ۔ ۔ ۔ مگر شکاگو کو جاننے والے یہ بخوبی جانتے ہیں کہ وہاں اس قسم کی ضرورتیں بہت آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں ۔ لیکن لی رائے کا دوسرا ہی خیال تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اتنی سی بات ہوتی تو پھر کوئی کہانی جنم ہی نہیں لے سکتی تھی!

اس کے بعد لی رائے نے اس عورت کے متعلق کچھ اہم باتیں بتائیں ۔ جیسے جب بھی کوئی آدمی اس عورت سے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا تو وہ بے حد گھبرا اٹھتی تھی، اسے تھیٹر چلنے کی پیش کش کی گئی ، دعوتوں میں مدعو کیا گیا۔ اس سے ہنس کر، مسکرا کر باتیں کی کرنے کی کوشش کی گئی لیکن یہ تمام کوششیں عورت کی بے حسی پر ختم ہو گئیں ۔

اس کے ایک کلرک دوست نے کچھ زیادہ جرأت کی۔ ایک روز اس نے زینہ طے کرتے ہوئے جذبات سے مغلوب ہو کر اس عورت کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ لیکن وہ عورت دیکھتے ہی دیکھتے سسکیاں بھرنے لگی نوجوان کلرک نے اسے اور قریب کھینچ کر کچھ سمجھانے کی کوشش کی تو اس کا جسم کانپنے لگا۔ اور وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "مجھ سے دور رہو!"

اور یہ سب کچھ اس طرح ہوا کہ راہ گیر رک کر تماشہ دیکھنے لگے۔ یہ دیکھتے ہی کلرک بوکھلا کر بولا: "میں نے اس عورت کو کوئی تکلیف نہیں پہونچائی ہے" اور وہ پاؤں پٹکتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہ واقعہ سن کر لوگ اس سے اور چڑھنے لگے ۔ ۔ ۔ ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ آخر وہ کیا چاہتی ہے لیکن یہ سچ تھا کہ وہ کسی کی منتظر تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو نوجوان کلرک اس کا پیار حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا اس نے برافروختہ ہو کر مکان مالکہ سے اس کی شکایت کر دی اور پھر مکان مالکہ نے ایک زوردار ڈانٹ پلانے کے بعد اس عورت کو اسی دن مکان خالی کرنے کا حکم دے دیا۔

لی رائے مکان مالکہ کی زیادتی کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی اپنے اصولوں کے لئے وقف کر دی تھی۔ اب وہ ضعیف سا ایک کمزور انسان تھا یوں اس کی آمدنی کافی تھی۔ مگر پھر بھی اب تک اس کی زندگی میں کوئی عورت بہار بن کر نہیں آئی تھی ۔

جس شام مکان مالکہ نے اس عورت سے کمرہ خالی کرنے کو کہا تھا اسی شام وہ عورت ڈرتے ڈرتے لی رائے کے کمرے میں آئی اور لی رائے کے سامنے دو زانو ہو کر کانپتی ہوئی آواز میں بولی: "مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے، تم مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دو"۔ اور اس وقت اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو رواں تھے ۔

کچھ دیر بعد جب مکان مالکہ دوبارہ کچھ کہنے کے لئے آ تو لی رائے نے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ اس عورت سے کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ اب وہ اس کو شریک حیات بنانے جا رہا ہے ۔

اور پھر جب وہ باہر آئی تو اس کا دایاں ہاتھ کے ہاتھ میں تھا اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم رقص کر رہا تھا ۔

در اصل وہ عورت اپنی زندگی کی یکسانیت سے اک چکی تھی۔ دن بھر موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے اور شام کو ا دو چار مخصوص سہیلیوں سے ملنے کے یکساں پروگرام نے اس کی روح میں ایک عجیب سی اداسی بھر دی تھی ۔ گھر پر بھی ما اور بہنوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا ۔ جوان ہوتے ہی ہر کے بعد اس کے دل میں ایک خاص کشش سی محسوس ہونے لگ تھی اور اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ شوہر کی شکل میں ا کوئی پیار کرے لیکن جو کچھ وہ چاہتی تھی اسے کہنے کی اس م جرأت نہیں تھی ۔ اور جب وہ اپنے دل کے بار کو برداشت نہ کر سکی تو اس نے لی رائے کا سہارا لیا۔

کہانی ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر نے فاتحانہ انداز میں ہنس کر کہا: "ہم لوگ اپنے آپ پر زیادہ اعتماد کر کے زندگی فطری رفتار کو روک دیتے ہیں۔ دیکھا تم نے - وہ عورت

اینڈرسن شیروڈ

پیار کی تعریف

پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر تھا۔ اور برسوں سے وہ لوگوں کا جس طریقے سے علاج کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ہم نفسیاتی طریقہ علاج کہہ سکتے ہیں۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اور چہرے کی گھنی داڑھی کی وجہ سے وہ بہت ہی پراسرار معلوم ہوتا تھا۔ اس سے جب بھی گفتگو ہوتی تو وہ ہمیشہ گھبرا کر یہی کہتا: "میں باہر سے تھک کر یہاں آیا ہوں۔ گرچہ میں جسمانی طور پر نہیں تھکا۔ لیکن میری روح پر بے کیفی سی طاری ہے۔ میں آرام اور سکون کی تلاش میں ہوں۔"

ایک دن دوران گفتگو میں نے اس سے پوچھا: "ڈاکٹر! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"... "ہاں" اس نے جواب دیا۔ "یہی مناسب طریقہ ہے جس کے ذریعہ میں تہہ تک پہونچ سکتا ہوں۔ مجھے محبت کا ڈھونگ رچانا ہی پڑتا ہے قربت کا پہلا زینہ پیار ہی سے شروع ہوتا ہے۔"

مجھے یہ ڈاکٹر بہت ہی عجیب وغریب لگتا تھا کبھی کبھی اس کی باتیں عقلمندوں جیسی ہوتیں اور کبھی بالکل احمقوں کی سی۔ لیکن میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بات جو بھی ہو مگر اس شخص کی اداسی اور مایوسی کی تہہ میں کافی گہرائی ہے۔ پھر بھی میں اس پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میرے اندر بھی کچھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہے، اس لئے جب ایک بار ہم دونوں گاؤں کی گرد آلود سڑک سے گزر رہے تھے تو میں نے کہا: "ڈاکٹر! مجھ سے تمھاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ تم زندگی کے طویل راستے پر اس طرح نہیں چل سکتے۔ زندگی کو تماشہ سمجھنا اور کسی کی زندگی سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔ تم وہ کام کرنا چاہتے ہو جو آج تک کسی سے نہ ہو سکا۔ کیا تم پیار پڑھنا اور پرکھنا چاہتے ہو؟"

پہلے وہ چند ساعت تک میری طرف بغور دیکھتا رہا پھر تیزی سے کچھ دور جا کر چلایا: "تمھارا یہ خیال کہ تم چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہو، قطعی بے بنیاد ہے۔ تم کچھ نہیں سمجھے۔ جسے تم ناممکن سمجھتے ہو، وہ ناممکن نہیں ہے۔ انسانی زندگی تو جنگل کے خودرو پودے کی مانند ہے۔ لیکن جب اندھے یقین اور غلط رسم و رواج کی بیلیں ان پودوں کو چھپا لیں تو اس کا زندہ رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں خوب جانتا ہوں۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا ایک پتا بننا چاہتا ہوں۔ میں مرنے کے بعد پھر نئی زندگی کا خواہاں ہوں۔ میں تھک گیا ہوں اور اپنی تکان کو دور کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے بعد اس نے ایک واقعہ سنایا......

اس شہر شکاگو میں باہر سے ایک عورت آئی۔ اور وہ مغربی ڈھلوان کے قریب والے ایک مکان میں ایک کمرہ لے کر رہنے لگی۔ وہ تقریباً ستائیس سال کی تھی۔ یہاں وہ موسیقی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئی تھی۔

اس مکان میں ٹھیک اس کے کمرے کے سامنے والے حصے میں ایک نوجوان رہتا تھا، بہت ہی خاموش طبع اور نیک مزاج۔ مصوری سے اسے والہانہ عشق تھا۔ اور یہی اس کا ذریعہ معاش بھی تھا۔ اس کا نام لی رائے تھا۔

اس مکان میں وہ عورت تین ماہ تک مقیم رہی اس کے متعلق مختلف قسم کی افواہیں پھیل گئی تھیں۔ لیکن اس بار

کتاب - لکھنؤ

اضیٰ عبدالستّار

نثر کا عہد

جب ذوق جیسے شاعر غالبؔ کے منہ آنے لگے تب غالبؔ نے ملاکر سلجوقی ترکوں کی طرح رجزیہ انداز میں نعرہ لگایا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ منست

تقریباً ساری انیسویں صدی اس نعرے سے گونجتی رہی لیکن مخصوص تاریخی اور تہذیبی انقلاب کے زیراثر بیسویں صدی نے دوسکر میں غالبؔ کو دریافت کیا اور ان کی شاعرانہ عظمت کا انحصار مجموعہ اردو پر رکھا جسے غالبؔ بیرنگ بتا چکے تھے۔ اس کا امکان تیزی سے بدلتی ہوئی اس صدی کے اواخر میں غالبؔ دوبارہ دریافت کیے جائیں اور ان کی عظمت ان خطوط میں ڈھونڈ لی جائے جن سے اردو عالیشان دار آغاز ہوا ہو۔

غالبؔ کے خطوط محض خطوط نہیں ہیں بلکہ اس نثر کی ابتدا ہو جس نے بیسویں صدی میں پہلی بار شاعری کے حریف کی طرح سر اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے چھا گئی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف اس عہد کے سب سے بڑے شاعر فراقؔ نے بھی اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ فراقؔ نے اس عہد کو اردو شاعری کا عہد زرّیں کہا ہے۔ جو ینچے اٹھارویں صدی کو انگریزی شاعری کا عہد زرّیں کہا تھا۔ لیکن انیسویں صدی میں انکشاف ہوا کہ اٹھارویں صدی نثر کی صدی تھی۔ میرا ایمان ہے کہ جب کے بیان کی طرح تاریخ فراقؔ کے دعویٰ کو بھی جھٹلا کر دکھا دے گی۔ فراقؔ نے اس مضمون میں دو پتے کی باتیں کہی ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ عہد بھی ان کے اور جوشؔ کے بعد مر جائے گا۔ دوسری بات انھوں نے بے دھیانی میں ان کے قلم سے ٹپک پڑی ہے۔ یعنی انھوں نے (فراقؔ نے) صرف شاعری ہی نہیں لکھے ہیں۔ نثر بھی لکھی ہے۔ بات کہنے کا یہ انداز اس عہد کے سب سے بڑے شاعر کے دل میں چھپے ہوئے اس اندیشے کا غماز ہو کہ کہیں نثر کے چڑھتے ہوئے سیلاب میں اس کے دیوان بہہ نہ جائیں۔ بچپن اٹھاتے ہوئے اس اندیشے کو فراقؔ یہ کہہ کر کچل دیتے ہیں کہ میں نرا شاعر ہی نہیں ہوں میں نے نثر بھی لکھی ہے۔

غالبؔ کے بعد اردو شاعری کو اقبالؔ کی بہترین نظموں کیلئے تقریباً ستّر اسّی برس تک انتظار کرنا پڑا ہے۔ اردو شاعری کے پیشتر اسّی سال چھوٹے موٹے شاعروں کی بھنبھناہٹ سے آباد ہیں۔ اس فقرے پر بھڑکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حالیؔ نے جس شاعری کو سنڈاس سے بدتر کہا ہے وہ اس عہد میں پھلتی پھولتی نظر آتی ہے۔ لیکن غالبؔ کی نثر کے بعد اردو نثر کو پوری تنظیم اور ترتیب کے ساتھ نثر نگاروں کا ایسا قیمتی سلسلہ میسّر آجاتا ہے۔ جس کی ایک ایک کڑی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کی گمشدگی اردو نثر کے لئے ناقابل تلافی نقصان بن سکتی ہے۔ غالبؔ کے ساتھ ہی میر امّنؔ اور رجب علی بیگ سرورؔ کے علاوہ محمد حسین آزادؔ، سرسیّدؔ اور حالیؔ پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر شبلیؔ، سرشارؔ، رسواؔ اور نذیر احمد وارد ہوتے ہیں۔ دوسرے اہم نثر نگاروں کے علاوہ پریم چندؔ کی عظیم الشان دیو پیکر شخصیت جنم لیتی ہے۔ جس طرح شاعر غالبؔ سے اقبالؔ تک اردو شاعری کا ایک عہد ہے۔ اسی طرح نثر نگار غالبؔ سے پریم چندؔ تک ایک یگ بنتا ہے۔ جو اپنی شاندار نثر سے اپنے عہد کی بے مغز شاعری کا ازالہ کرتا نظر آتا ہے۔ اقبالؔ اپنے باب کے ساتھ بڑی شاعری کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ لیکن پریم چندؔ اپنے نام کے ساتھ نئی اور بڑی نثر کا آغاز کرتے ہیں۔ یہاں اس اہم نکتے کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ اقبالؔ کی ذات میں بڑی شاعری سمٹ کر آ گئی تھی اس لئے فوراً ہی چھا لی گئی۔ لیکن بڑی نثر ایک فن کار میں جمع ہو جانے کے بجائے پورے

صرف عاشق ہی نہیں چاہتی تھی بلکہ وہ ایک اچھے ہم سفر کی تلاش میں تھی جو زندگی کے طویل راستے پر اس کے دوش بدوش چل سکے۔"

پھر کچھ دیر رک کر ڈاکٹر نے کہا "ہم لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی ہمیں پیار کرے . . . . ہمیں کسی کی محبت ملے۔ لیکن آج دنیا میں یہی شے جنس گراں کی مانند نایاب ہے — ہم خشک زمین پر پڑے ہوئے ایسے دانے کی طرح ہیں جسے پانی چاہئے۔ زیادہ ملے یا کم۔ ہمدردی اور محبت کا کچھ نہ کچھ حصہ تو ہر ایک کو ملنا ہی چاہئے!!"

انگریزی سے ترجمہ عشرت صدیقی

صفحہ ۲۸ کا بقیہ

پر جھکی۔ میرا سر اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ میرے ماتھے اور آنکھوں پر

پیار کرنے لگا۔ میں بھی بے اختیار اس کے چہرے کو چوم رہی تھی۔ پھر وہ کراہتے ہوئے مسکرا کر بولا "سکینہ روتی کیوں ہے؟ تیرا باپ اچھا تو ہے!"

غالباً اسے اب بھی نہ کسی کی ہمدردی کی توقع تھی اور نہ ضرورت تھی۔

آہٹ سن کر میں پیچھے گھومی تو دروازہ میں کھڑے نواب بیگم اور میرے شوہر بھی زار و قطار رو رہے تھے اور ڈاکٹر انہیں ہٹاتا ہوا کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے میرے باپ کے دو انجکشن لگائے جس سے وہ دوبارہ غافل ہو گیا اور پھر نو بجے سویرے آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب نرس لپک کر ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے میرے باپ کا معائنہ کر کے اس کے چہرے کو کمبل سے ڈھانپ دیا اور میرے قریب آتے ہوئے وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا "مریض ختم ہو گیا!"

صفحہ ۴۴ کا بقیہ

بیان سے بھرپور ہوتی ہیں! اگرچہ جدید شعراء کے درمیان میرے خیال سے غزل کی حیثیت گردش کے اس مرکز کی ہے جہاں بقول کرسچین ہوجن Christian Huygens

At the exact centre of rotation there is no

ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوتی۔

صفحہ ۸ کا بقیہ

سر میں میش دل رہا ہوں ایک نوجوان ایسا آ گیا ہے جس نے پانچ اپریٹس کے ساتوں چھلے — جی نہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

آرٹ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ دو مہینے ہوئے یونی ورسٹی سے نکال دیا گیا ہے — نہ نام معلوم ہے اور نہ کوئی اور بات —

نوجوان ٹارزن کی طرح جھومتا ہوا آیا اور اپنی تنگ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بڑی شان سے اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

رمیش نے شیلی ذہن رکھ کر پھر نوجوان کا جائزہ لیا۔

"سروس کرو گے؟"

کیا تنخواہ دو گے۔ سو سوا سو سے کم نہیں لوں گا۔

اس کا دگنا دوں گا۔

نوجوان کو یقین نہیں آیا، وہ رمیش کے منھ کی طرف تکنے لگا۔

"ابھی تو دہلی سے چلوں گا، اور وہاں سے دو مہینے کے بعد ماسکو چلوں گا جہاں کی نمائش میں ہمارا پویلین ہوگا۔ روس جانے پر تم کو ڈھائی سو ماہوار الاؤنس بھی ملے گا۔ اب کہو کہ ڈاکو مان سنگھ ہو گے نا —"

کوئی اور ڈاکو مان سنگھ کو — مگر میرا اصلی نام بھی مان سنگھ ہے۔ اور یہ سگریٹ لائٹر پولیس کو دیدو۔ اور ہاتھ ملاؤ۔ تم دنیا کے سب سے اچھے آدمی ہو مسٹر رمیش۔ میں آپ کا بہترین ماتحت ثابت ہوں گا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں بہت بہت مشکور ہوں آپ نے میری زندگی

ابھی ایک منٹ پہلے والا ٹارزن کرسی پر گر پڑا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

---

rotation at all.

میرزا غالب نے غزل کو جس معراج و کمال پر پہونچایا اس سے آگے تو کیا جدید شعراء وہاں تک بھی نہ پہونچ پائے۔ پھر بھی فیض کی غزلیں نسل جدید کے شعراء کی غزلوں میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں اور ان میں بھی فیض کی پوری انفرادی شان اپنے سارے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

تھے اور مومن سے بڑے تھے اور ظفر سے بڑے تھے بلکہ ہم یہ بھی کہتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ غالب، رجب علی بیگ سرور سے بڑے تھے۔ میرامن سے بڑے تھے اور سرسید سے بڑے تھے یہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ شاعر غالب نثر نگار غالب سے بڑا تھا یعنی ہم لاشعوری طور پر نظم و نثر کا مقابلہ کرتے آئے ہیں اور جب ہم ایسا کرنے آئے ہیں تو اقبال کا پریم چند سے مقابلہ کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ شاعر غالب سے نثر نگار غالب کا موازنہ کیوں نہیں کیا جا سکتا؟۔

نثر نگار غالب شاعر غالب سے بڑا ہے۔ اس لیے کہ غالب کی شاعری کا جواب میر کی شاعری دے سکتی ہے (اثر لکھنوی نے بڑی مدلل بحث کی ہے) نثر نگار غالب کی نثر آج تک بے بدل ہے۔ پریم چند اقبال کے برابر کے فن کار ہیں۔ لیکن بدنصیب فنکار ہیں اس لئے کہ وہ اس عہد میں پیدا ہوئے جو ایک طرف تو "نو دریافت غالب" کے تجمل سے گونج رہا تھا۔ دوسری طرف اقبال کے جلیل آہنگ سے گونج رہا تھا۔ پریم چند غالب سے بھی بدنصیب ہیں۔ ان کو آج تک کوئی حالی اور بجنوری نہیں ملا جو ان کی عاقبت کو چراغاں کر دیتا۔ نقاد جن کی زبانیں شاعری کے چٹخارے نے خراب کر دی تھیں ان کے سیدھے سادے مضبوط اور طاقتور طرز تحریر کے متحمل نہیں ہو سکے۔ آنکھیں ..... جو نقلی محبوبوں کے کاغذی شبستانوں کی جھوٹی چکاچوند سے اندھی ہو چکی تھیں پریم چند کی عظمت کو پڑھ نہ سکیں۔ ان پر یہ راز نہ کھل سکا کہ اقبال کی اچھی نظمیں، بڑی نظمیں، سب ایسی نظمیں ہیں جو ہندستان کے علاوہ ایران، انڈونیشیا، مغربی ایشیا، سعودی عربیہ، ترکی، اور افریقہ کہیں بھی بیٹھ کر کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن پریم چند کے ناول، افسانے صرف ہندستان میں لکھے جا سکتے تھے۔ پریم چند کے شاہکاروں کا مقامی آب و رنگ دوامی آب و رنگ ہے اور اقبال کے فن پارے اس مخصوص دوامی آب و رنگ سے عاری ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ شعرائے کرام نے زبان کی بڑی خدمت کی، محاوروں کا استعمال سکھایا۔ روزمرہ کا برتنا بتایا۔ تشبیہ کا قرینہ اور تلمیح کا سلیقہ دیا۔ ایک مضمون اور ایک لفظ کو دس دس طریقے سے ادا کرنے کا گر بتایا ہے۔ یہ سچ ہے، لیکن کیا آپ کے خیالِ مبارک میں سرشار نے اکیلے سرشار نے اس سے کچھ کم کام کیا ہے۔ فسانۂ آزاد میں تشبیہ اور تلمیح کے دریا بہائے ہیں روزمرّہ اور محاورے کے چمن کھلائے ہیں۔ امیروں اور فقیروں درباریوں اور بازاریوں کی زبان کو آداب سکھاتے ہیں۔ سرسید اور ذکاء اللہ وغیرہ نے اس سے بھی بڑا کام کیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان میں علوم کے لئے دروازے کھولے ہیں اور راستے بنائے ہیں لیکن ان کی خطا یہ ہے کہ ان کو کوئی پڑھتا نہیں۔ پڑھتے تو لوگ شعرائے متاخرین کو بھی نہیں ہیں لیکن ان کے نام ضرور یاد کرتے ہیں۔ اردو ادب میں اردو نثر نگاروں کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تقریباً تمام نثر نگاروں نے شاعری پر للچائی ہوئی نگاہ ڈالی ہے۔ یہ لالچ ایک نفسیاتی گرہ ہے جس کا کھولنا ضروری ہے۔ یہ لالچ، یہ مرض مشاعروں کی دین ہے۔ مشاعرہ ایک ایسا ادارہ تھا جن کا سلسلہ دربار سے خانقاہ تک اور خانقاہ سے بازار تک پھیلا ہوا تھا۔ اس ادارے کے اس اسٹیج سے بلند کی ہوئی آواز کو اپنی ساری کم مائیگی کے باوجود انتہائی قلیل مدت میں قبولِ عام کا انعام مل جایا کرتا تھا (اور مل جایا کرتا ہے) اسے اس طرح سمجھئے کہ ایک بہترین صلاحیت رکھنے والا ادیب دس برس کے ریاض کے بعد ایک کتاب لکھتا ہے۔ جسے پڑھے لکھے لوگوں کی بہت چھوٹی اقلیت پڑھتی ہے اس اقلیت میں بھی بہت کم لوگ ایسے نکلتے ہیں جو اپنی پسندیدگی کے اظہار کو تحریر کی صورت میں مصنف تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح مصنف کو اپنے کارنامے کا اجر بڑی دیر میں اور چھوٹی مقدار میں نصیب ہوا کرتا ہے۔ دوسری طرف معاملہ برعکس ہے یعنی ایک تیسرے درجے کی صلاحیت رکھنے والا شاعر ایک مشاعرے میں غزل پڑھنے جاتا ہے۔ مشاعرہ میں بادشاہ اور مرشد اور شہزادی اور بزازی سب شامل ہوتے ہیں۔ مشاعرہ داد دینے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس لئے کہ اوسط درجے کے اشعار پر بھی داد دینا مشاعرے کے آداب میں شامل ہے۔ شاعر اپنے بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور خوردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان کے دلوں میں چھپے ہوئے جذبات، مروت اور محبت کو مہمیز کرتا ہے۔ بھرا والکٹرو کی طرح جسم کے مختلف حصّوں کو مختلف قسم کے حرکات سکھا کر گئے

ایک عہد کو لپیٹ کر چلی ہے۔ یعنی پریم چند کے عہد پر پھیل کر چلی ہے یہی وجہ ہے کہ ہماری ان آنکھوں سے اوجھل رہی ہے۔ جن پر شعری ذوق کے پردے پڑے ہیں۔ پریم چند کے عہد میں جن نثر نگاروں نے اپنے نام کے ڈنکے بجائے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، ان بزرگوں کی آنکھیں دیکھ کر ادیبوں کی پوری نسل کھڑی ہو گئی جس میں بڑے بڑے نام ملتے ہیں۔ مثلاً نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، پطرس بخاری، فراق گورکھپوری، حیات اللہ انصاری، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، ڈاکٹر اختر رائے پوری، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عابد حسین ندوی، کلیم الدین احمد، سید احتشام حسین، محمد حسن عسکری، سجاد ظہیر منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین، کرشن چندر، کنہیا لال کپور اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ ان نثر نگاروں کے سائے میں نئے نثری ادب کے معماروں کی نئی فصل تیار ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ابھی بن رہے ہیں۔ انھوں نے ابھی کارنامے نہیں انجام دیئے ہیں۔ لیکن کارناموں کے امکانات ضرور روشن کئے ہیں ان لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک زمانے سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔۔۔ خورشید الاسلام، عابد علی عابد، ڈاکٹر محمد حسن، ممتاز حسین، وقار عظیم عبادت بریلوی، بلونت سنگھ، انتظار حسین، شوکت صدیقی، اشفاق احمد، حیات احمد گدی، واجدہ تبسم، رامعت کربانی، رتن سنگھ، انور عظیم، اے حمید، رام لعل، جیلانی بانو اقبال متین، ضمیر الدین احمد، ممتاز شیریں، وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، سلیم احمد، شمیم احمد، مسیح الحسن رضوی، ستیش بترا، عابد سہیل، قیصر تمکین، جوگندر پال، احمد جمال پاشا، وغیرہ۔ ایسے نام ہیں جن کی شمولیت کے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح نثر نگار غالب کے عہد سے اس زمانے تک نثر کی جو تصویر بنتی ہے جو سلسلہ بنتا ہے اس میں کہیں دھبہ نہیں ہے۔ کہیں کھانچہ نہیں ہے۔

جب کلیم الدین کو اردو شاعری کے محبوب کی کمر کی طرح تنقید نظر نہیں آتی تو در حقیقت اس کے یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ تذکروں کے عہد سے اس لمحے تک ہماری تنقید غزل کی جادوگری کا شکار رہی ہے۔ تذکروں کا ذکر کیا۔ اس زمانے میں بھی تجزیاتی تنقید نا پید ہے۔ اردو تنقید کے ایام جاہلیت کے کرشمے دیکھئے کہ حالی کی ناقدانہ شہرت و بصیرت کا دار و مدار مقدمۂ شعر و شاعری پر ہے۔ شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کے بعد لکھا بھی تو المامون اور الفاروق، سید سلیمان ندوی بھی اس وادی میں مارے گئے۔ غالب کے خطوط، سرسید کے مضامین، محمد حسین آزاد کی انشاپردازی، سرشار کا فسانۂ آزاد، رسوا، شرر، اور نذیر احمد کے ناول اور پریم چند کے کارنامے ایسی چیزیں تھیں کہ ان پر تنقیدی ادب کا کھلیان لگ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ فسانۂ آزاد کی وہ تلخیص جو ۱۹۱۰ء میں کی گئی تھی آج تک ہماری تنقید کا وسیلۂ تنقید بنی ہوئی ہے، رسوا پر خورشید الاسلام نے ایک چھوٹی موٹی کتاب لکھ دی ہے لیکن وہ "تنقیدیں" میں ایک مضمون کی طرح شامل ہے۔ شرر اور نذیر احمد کو چھوڑیئے۔ خود پریم چند پر آج تک کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی وہ تو بھلا ہو قمر رئیس کا کہ پریم چند پر تھیسس لکھ دی۔ ہنس راج رہبر کا ذکر اس لئے اہمیت نہیں رکھتا کہ انھوں نے پریم چند کا تعارف کرایا ہے۔ اردو کے تمام بڑے بڑے نقادوں کی تنقیدی مجموعے دیکھ جایئے تو پتہ چلے گا کہ ان کی ساری توجہ شاعری پر صرف ہوئی ہے۔ حالی سے لیکر آج تک صرف ایک نقاد خورشید الاسلام کے مجموعے میں نثری ادب پر لکھے گئے مضامین کی تعداد بھی بھاری ہے اور وزن بھی زیادہ ہے۔

یہ معمولی بات نہیں ہے کہ ہمارے نقادوں نے نثر کے شاہکاروں کی موجودگی میں ایران کے غیر ملکی شاعروں اور اردو کے دوسرے درجے کے شاعروں کی شاعری کو پرکھنے میں اپنی عمریں غارت کر لیں، اس حقیقت کے پیچھے اردو تنقید کی پوری غیر ذمہ داری کی تاریخ ہے۔ اس پر کچھ کہنے سے پہلے میں ایک بات ایک ڈھکوسلے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

بہت سی جھوٹی حقیقتوں کی طرح اس وہم کو بھی عام کر دیا گیا ہے کہ نثر کا نظم سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ میرے ناچیز خیال میں یہ سراسر غلط ہے کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غالب اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے تو ہم صرف یہی نہیں کہتے کہ غالب ذوق سے بڑے

۱ے فراق اس عہد کے سب سے بڑے شاعر ہو سکتے ہیں لیکن اردو شاعری کی تاریخ میں ان کا نام صف اول کے شاعروں کے ساتھ نہیں لیا جا سکتا۔

مشتاق احمد یوسفی، اور احمد جمال پاشا کی نثر کے سامنے پھیکی اور سیٹھی معلوم ہوتی ہے۔ شاعری کی بہت سی اصناف کہن نئے زمانے میں جل کر راکھ ہو گئیں اور نثر کی زمین میں اصناف کے نئے نئے باغ لہلہانے لگے۔ یعنی شاعری کی زمین میں گرنے والے دریاؤں نے اپنے رُخ موڑ لیے اور نثر کو شاداب کرنے لگے اور شاعری سوکھنے لگی۔ یہ سب کچھ اسی عہد اسی مہذب عہد میں ہوا ہے۔ اس لئے اس کا نام نثر کا عہد ہے۔

کل جب شاعری کا زمانہ تھا تب ایسی نثر لکھی جا رہی تھی جس میں قافیے کھنکتے تھے اور ردیفیں بجتی تھیں تشبیہیں گاتی تھیں اور تلمیحیں ناچتی تھیں۔ آج نثر کا عہد ہے اس لئے شاعری شاعری سے معرّا ہو گئی۔ بیوہ کی سوکھی کلائی کی طرح سونی ہو گئی آج کی شاعری Prose poem ہو گئی ہے۔ نثر سے قریب ہو گئی ہے۔ اگر آپ اقبالؔ فانیؔ، فراقؔ اور جوشؔ کی شاعری کے سامنے ن، م، راشدؔ، فیضؔ، سردار جعفری، مخدوم، خورشید الاسلام، منیب الرحمٰن، اختر الایمان، اور آل احمد سرورؔ کے کلام کو رکھیں تو معلوم ہوگا کہ موخر الذکر شعراء کی تخلیقات میں شعریت کا رنگ ہلکا ہے لیکن اگر ان موخر الذکر شاعروں کے مقابلے میں بالکل جدید شاعری کے اہم ناموں وارث کرمانیؔ، باقر مہدی، حسن نعیم، منظر سلیم، بلراج کومل، شاذ تمکنت، انور معظم، عتیق حنفی، قاضی سلیم بشر بدر، فاروق، محبوب خزاں، محمد علوی، وغیرہ کی تخلیقات دیکھیں تو جدید شاعری کے ان نمائندہ ناموں کے کلام پر نثریت غالب نظر آئے گی۔ یہ کھردری سپاٹ اور سخت شاعری نثر کے دور کی صلاحیت، قوت اور نمو کرنے کا نتیجہ ہے۔

کچھ شاعروں نے جو چالیس کے پیٹے میں آچکے ہیں لیکن اپنے کو جدید ترنسل میں ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کچھ مضامین لکھے ہیں ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ شاعروں کے مجموعے چھپتے نہیں۔ اگر چھپتے ہیں تو بکتے نہیں اور اگر بک بھی جاتے ہیں تو پڑھے نہیں جاتے، اس "زیادتی" کی ذمہ داری نقادوں کے سر ہے۔ اس جرم میں "جاہل عوام" بھی برابر کے شریک ہیں۔ ان شاعروں نے نقادوں کو کچھ سمجھاؤ دیئے ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ یعنی نقاد ان شاعروں کا چھپا ہوا کلام غور سے پڑھیں۔ پھر اسی سطح کے تنقیدی میزان نصب کر میں اور ان کی پوری شاعری کو موتیوں میں تول دیں یہی نہیں بلکہ نقاد ان شاعروں کی اہمیت جتلانے کے لئے یہ بھی تسلیم کریں کہ جس طرح انگلستان اور امریکہ کا ادب الگ ہے۔ اسی طرح ہندستان اور پاکستان کا اردو ادب بھی جدا ہے پھر ہندستانی نقاد ہندستانی شاعروں نہیں ہندستان کے جدید نسل کے شاعروں پر قلم اٹھائیں اس طرح منافع یہ ہوگا کہ پاکستان کے شاعروں کی ساری جدید نسل کٹ جائے گی اور نقاد جھک مار کر ان چھوٹے چھوٹے شاعروں کو اپنے اپنے کندھے پر بٹھالیں گے۔ چونکہ یہ فاسد رجحان بھی اس اعلان نامے کا ضمیمہ ہے کہ اردو ادب پر نثر کا تسلط شروع ہو چکا ہے اس لئے اس کی طرف توجہ ضروری ہے۔

آج کے اہم اور مستند نقاد وہ لوگ ہیں جنھوں نے ۱۹۳۶ء میں نئے ادب کی تبلیغ کی تھی۔ رجعت پرستوں سے معرکے لڑے تھے اور فتوحات کے پرچم اڑائے تھے یہ وہ ہیں جن کے خون میں نئی تخلیقات کو قبول کرنے کی صلاحیت شامل ہے، جی نہیں۔ نئی شاعری کو قبول کرنے کی صلاحیت شامل ہے۔ اس لئے کہ ان عہد آفریں نثر نگاروں نے دوسرے اور تیسرے درجے کی شاعری کو پرکھنے میں اپنی قوت برباد کر دی۔ اب اگر یہی نقاد جو غزل گوؤں اور شاعروں کے عاشق ہیں جدید تر نسل کی شاعری کے متحمل نہ ہو پائے تو ان چھوٹے چھوٹے شاعروں کو چاہیئے کہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ ان قدآدم نقادوں کے گریبان سے ہٹالیں اور غور کریں کہ کیا واقعی انھوں نے کوئی ایسی چیز لکھی ہے جو ان رہنماؤں کی نظر میں اعتبار حاصل کر سکتی ہے۔ جو فراقؔ، جگرؔ، جوشؔ، راشدؔ، فیضؔ اور مجازؔ وغیرہ کے کارنامے پئے بیٹھے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ انگلستان کو نظر انداز کر کے امریکہ نے اپنا ادب پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ ادب ایک مخصوص تاریخی، تمدنی، معاشی، سماجی، اور جغرافیائی مسائل کی آویزش کے علاوہ تقریباً ایک صدی کی مدت اور فاصلے کے بعد وجود میں آیا ہے۔ تاریخ اور تہذیب اور ادب کا طالب علم جانتے ہیں کہ ہندستان اور پاکستان کا مسئلہ امریکہ اور انگلستان کے معاملات سے قطعاً مختلف ہے۔ جہاں تک عوام کا سوال ہے تو مشاعرے کے دلدادہ عوام

میں گھنگھرو باندھ کر تیسرے درجے کی غزل پڑھتا ہے۔ کسی صفِ اوّل کے سامع نے اگر غلطی سے بھی داد کر دی تو کم فہم لوگ (جن کی اکثریت ہوتی ہے اور نقالی جن کا وطیرہ ہوتی ہے) اس صفِ اوّل کے سامع کی تقلید میں چیخ اٹھتے ہیں اور مشاعرے میں ایک غلغلہ مچ جاتا ہے اور سارا مشاعرہ داد سے بھر جاتا ہے اور شاعر راتوں رات مشہور ہو جاتا ہے۔ بادشاہوں اور مرشدوں اور حامیوں کی نگاہ میں بڑھ جاتا ہے۔ پھر جب دوسرے مشاعرے میں یہی تیسرے درجے کا شاعر انھیں سامعین کے سامنے پہنچتا ہے تو سامعین کی آنکھوں میں اس شاعر سے وابستہ داد ناچ جاتی ہے۔ اور وہ فطری طور پر پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو کر سنتے ہیں اور واہ واہ کرتے ہیں۔ اس ہنگامے میں وہ خوش فہم لوگ بھی جبلّی طور پر شامل ہو جاتے ہیں جو مشاعرہ سننے جاتے ہیں۔ تمغے بانٹنے نہیں جاتے۔ پھر یہی خوش فہم لوگ جو ادب میں دخل رکھتے ہیں۔ اپنی بخشی ہوئی داد کی خاطر اس تیسرے درجے کے شاعر کو ادب کی محفل میں شریک کر لیتے ہیں۔ مشاعرہ تبلیغ کا اتنا بڑا اسٹیج رہا ہے کہ صوفیائے کرام نے دل سے شعر کی منزلت نہ کرتے ہوئے بھی اپنے پیغام کے ابلاغ کے لئے اسے اختیار کیا ہے یہ مشاعرے کا ہی جادو تھا جس نے سرسیّد کے نام کے پیچھے "آہی" کا دم چھلا لگا دیا۔ محمد حسین آزاد نے تخلص کا ارتکاب کیا۔ شرر سے شاعری سرزد ہوئی۔ شبلی شعر کہتے پائے گئے۔ رسوا اور سرشار تک اس حمام میں ننگے ہو گئے۔ وہ تو اگلے وقتوں کے لوگ تھے۔۔۔۔ آج سیّد احتشام حسین صاحب غزلیں موزوں کر رہے ہیں اور سجاد ظہیر نظمیں لکھ رہے ہیں۔

پریم چند کا عہد اردو ادب کی تاریخ میں پہلا عہد ہے جس میں ایسے نثر نگاروں کا ہجوم ہے جو صرف نثر نگاری کے بل بوتے پر اردو ادب میں داخل ہوئے اور سارے زمانے کی نگاہیں اٹھ گئی ہیں۔ ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ل احمد، یلدرم، حیات اللہ انصاری، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، نیاز فتح پوری، محمود شیرانی وغیرہ کے ناموں اور کاموں سے ساری دنیا واقف ہے۔ اس زمانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اردو ادب کی زمام ان ہاتھوں میں آ گئی ہے۔ جو یا تو نثر نگار ہیں یا شعر کا چسکا رکھنے کے باوجود نثر نگاری کرتے ہیں اور اس میدان میں فتوحات حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً یہ نام دیکھئے۔ نیاز، مجنوں، فراق، سرور، احتشام حسین، عابد حسین، رشید احمد صدیقی، خورشید الاسلام، ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن، کلیم الدین، حسن عسکری، وقار عظیم، عبادت، نورالحسن ہاشمی، خواجہ احمد فاروقی، عصمت، منٹو، قرۃ العین، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، بلونت سنگھ، انتظار حسین، شوکت صدیقی، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، عزیز احمد، خواجہ احمد عباس، انور عظیم، ڈاکٹر احسن فاروقی، ممتاز شیریں، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، وزیر آغا، غیاث احمد گدی، رام لعل، منظر سلیم، عابد سہیل، ستیش بترا، جوگندر پال، احمد جمال پاشا، وارث کرمانی وغیرہ۔

اردو کی وہ تنقید جو شاعری کی بولی بولتی ہے، وہ یہ بھی کہتی ہے کہ نثر کو سلیس ہونا چاہیئے۔ سادہ ہونا چاہیئے۔ سلاست اور سادگی پر زور اس لئے نہیں دیا جاتا ہے کہ کہیں نثر رمز و ایما، ایجاز و اختصار، حسن و تاثیر، آرائش و زیبائش، سے اس طرح مسلح ہو کر سامنے نہ آجائے کہ شاعری جس کی ادائیں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ شکست کھا جائے

اردو کا طالب علم جانتا ہے کہ محمد حسین آزاد، اردو کے سب سے بڑے صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں اور محمد حسین آزاد کی نثر ان تمام ہتھیاروں سے لیس ہے۔ جن پر شاعری کا وار نہیں چلتا۔ محمد حسین آزاد کو چھوڑیئے اور نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، خورشید الاسلام رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، پطرس بخاری، عصمت چغتائی قرۃ العین اور کرشن چندر کی زبان پڑھیئے تو آج کے اچھے اچھے شاعروں کی شاعری تلخ معلوم ہونے لگے گی۔ یہ شاعری کے زوال کی علامت ہے یہ نثر کے عروج کی ضمانت ہے۔ نثر شاعری کے میدان فتح کرتی چلی آ رہی ہے۔ وہ دن دور نہیں جب شاعری غنائیت تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔

ابھی کل کی بات ہے۔ جب مذہب، فلسفہ، تصوف، ڈرامہ اور طنز و مزاح سب شاعری کی بیساکھی لگا کر ادب میں داخل ہوتے تھے لیکن جیسے جیسے اردو ادب ترقی یافتہ ہوتا گیا نثر پھیلتی گئی۔ نظم سمٹتی گئی۔ دوسرے مضامین کا کیا ذکر ڈرامہ تک شعر کی قبا پہن کر آتا ہے تو مسخرہ معلوم ہوتا ہے، طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں، شوکت تھانوی

کتاب نمبر

قمر اعظم ہاشمی

فیض اور راشد

(تقابلی مطالعہ)

ادب رخِ حیات کا وہ جبیں درخشاں ہے جس پر فرد، قوم اور انسانیت کے ماضی، حال اور استقبال کی لکیریں روشن ہیں۔ عہدِ گذشتہ کی تمام بلندیاں و پستیاں، عہدِ رواں کے تمام نشیب و فراز اور عہدِ آئندہ کے تمام روشن و تیرہ امکانات ادب و فن میں موجود ہوتے ہیں۔ ادب زندگی ہے اور زندگی ادب! جس طرح ادب کے حیطۂ فکر میں زندگی کی تمام پیچیدگیاں ہیں بعینہٖ زندگیوں میں ادب و فن کا عکس مکمل موجود ہوتا ہے۔ ادب کسی خاص شعبۂ حیات سے مختص نہیں — ادب زندگی اور پوری زندگی کا مطالعہ پیش کرتا ہے رہگزارِ حیات کی ساری صعوبتیں اور آزمائشیں ساری مسرتیں اور آسائشیں ادب میں جلوہ فگن ہوتی ہیں۔ ادب زندگی کے کسی شعبے سے کوئی اختصاصی تعلق نہیں رکھتا۔ زندگی نہ کافری ہے نہ مسلمانی نہ اشتراکی ہے نہ مارکسی اور نہ فطائی ہے نہ گاندھی وادی۔ زندگی محض زندگی ہے اور بس! ہاں یہ ممکن ہے کہ انسانوں کے الگ الگ گروہ مختلف طریقہ ہائے فکر... کی وجہ سے جذباتی یا ذہنی طور پر کسی خاص طریقۂ عمل سے دور اور دیر تک کیلئے وابستہ ہو جائیں۔ لیکن اس سے زندگی کی آفاقیت پر کوئی حرف نہیں آتا...

ٹھیک اسی طرح ممکن ہے کہ فن کار یا ادیب ذہنی یا جذباتی ہم آہنگی اور مطابقت کی وجہ سے کسی ایک طریقۂ زندگی کو اپنے لئے مخصوص کرلے۔ اس سے ادب کی آفاقی قدریں مضروب نہیں ہوئیں بشرطیکہ ادیب فن کے ساتھ پرخلوص [illegible] فن کو ذریعہ نہ بنالے اور فن و ادب کی آفاقی قدروں کو گرفتار اپنے نظریے میں محبوس نہ کرلے۔

جدید شعراء میں فیض کی حیثیت نجوم میں ماہتاب کی ہے فیض نے زندگی سے بہت کچھ سیکھا، اس سے بہت سے تجربات لئے اور بڑی دیانت داری سے ان سب کو ادب و فن میں منتقل کر دیا۔ خلوصِ فن ان کے ہم عصر شعراء میں انھیں امتیازی تخصیص بخشتا ہے۔ فیض کی شاعری اس کے اشتراکی ہونے کے باوجود محض جذبات و احساسات کی شاعری ہے۔ کلیم الدین احمد نے یہ بالکل درست کہا ہے کہ "فیض شعوری طور پر ترقی پسند شاعر ہیں" لیکن فن کے بنیادی تقاضے انہیں اپنی طرف کھینچ لے جاتے ہیں اور محض اسی وجہ سے فیض کی شاعری "زبان و حقیقت کا سنگم" ہو جاتی ہے۔ وہ دوسرے ترقی پسند شعراء کی طرح نعرۂ اشتراکیت بلند کرتے ہوئے میدانِ ادب میں نہیں آئے بلکہ مسائلِ عصرِ حاضر کی پیش کش کی فکر کے ساتھ فن و ادب کے لوازم اور تقاضوں کو برتنے کی بھی کامیاب سعی کرتے ہیں۔ ان کا موضوعِ سخن محض اشتراکی نعرہ نہیں بلکہ —

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنی ہے یہی

کبھی کبھی ان کے اشعار کی اس دنیا کی کیفیت رخنہ اندازی

تاج محل کی یاترا کرتے ہیں۔ سڑک کے کنارے بھیڑ لگا کر کرتب دکھانے والوں کے کرتب دیکھتے ہیں۔ بھاکڑہ ننگل کی عظمت اور افادیت کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ لیکن یہی عوام جدید نسل کے شاعروں کے کلام بلاغت نظام کو نہ صرف یہ کہ نہیں سنتے ہیں بلکہ مذاق اڑاتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ آج کے عوام ایک معنی میں ایک حد تک فیقہ کی بصیرت سے آشنا ہو چکے ہیں۔ مہذب ہو چکے ہیں، شاعری کا بدل پا چکے ہیں۔ نثر نے شاعری سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ ان کے حواس کی تسکین کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ یہی عوام جن سے یہ شاعر نالاں ہیں۔ نثر کی کتاب پڑھنے کے لئے اردو سیکھتے ہیں

اس جدید تر نسل کے شاعروں کے رونے دھونے کے پس منظر میں اگر ہم جدید تر نسل کے نثر نگاروں کا حال ملاحظہ کریں تو تصویر اور واضح ہو جاتی ہے۔ یہ نئے نثر نگار ہر قسم کی آبرو باختگی سے محفوظ ہیں۔ انتہائی خاموشی اور کامیابی کے ساتھ اپنے کام میں مگن ہیں، اپنی لگن میں گم ہیں، ان فن کاروں کا ذکر نہیں جن کی ادبی حیثیت مسلم ہو چکی ہے۔ بلکہ وہ لوگ جو ابھی تھوڑے دن قبل ادب میں داخل ہوئے ہیں اور آتے ہی آتے چھا گئے ہیں۔ ان میں سے کسی نے اپنے فن پر مضامین نہیں لکھے کوئی اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنا کسی نے بزرگوں پر کیچڑ نہیں اچھالا کسی نے عوام کو حقارت سے نہیں دیکھا اس لئے کہ یہ پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات پر سر دھنے جاتے ہیں ان میں کچھ نام تو ایسے ہیں جنھیں راتوں رات شہرت ملی ہے اور ضرورت سے زیادہ مل گئی ہے۔ اس ضرورت سے زیادہ شہرت نے ان کے فن کے ارتقا کی رفتار مدھم کر دی ہے اس کی بہترین مثال واجدہ تبسم ہیں۔ ان نثر نگاروں میں کچھ نام ایسے ہیں جن کا ایک ایک صفحہ ہندستان کی چار چار پانچ پانچ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور ان زبانوں کے بہترین ادبی جرائد میں شائع ہو چکا ہے۔ اور ان زبانوں کے چوٹی کے نقادوں سے ان کی تخلیقات کو ہندستان کے فکشن میں اضافہ بتایا ہو۔ یہ اعتراف ہوٹلوں کے گوشوں میں نہیں ادبی محفلوں میں ہوا ہو رسالوں کے صفحات پر ہوا ہے۔ یہ سب کچھ اسی عہد میں ہوا ہے ہو رہا ہے اسلئے اس عہد میں زندہ رہنے والوں کو یہ حق پہونچتا ہو کہ یہ عہد نثر کا عہد ہے۔

ہیں۔ جنسیات کی رو ادب اردو میں جب چلی تو بزرگانِ فن نے تو اپنی آنکھیں بند کرلیں لیکن نوجوانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور جدید شعراء کی نسل میں اگر کوئی اس جنس زدگی سے محفوظ ہے تو وہ فیض ہی ہیں۔

ادب و شعر کے معاملہ میں فرائڈ کے جنسی نظریہ نے بڑے غلط رجحانات کی رو چلائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنسی عمل بھی ایک جبلی عمل (INSTINCTIVE) ہے۔ لیکن جس طرح اشتراکیت کی نعرہ بازی یا کسی خاص مذہب کی تبلیغ فن کی اعلیٰ قدروں کی نمایندگی نہیں کرتی اسی طرح محض جنسیاتی مسائل سے ادب و شعر کا مقصد حل نہیں ہوتا ——— بہرحال راشد کی شاعری کا کینوس مسئلہ جنس ہی تک محدود ہے اور یہ جنس بھی صحت مندانہ نہیں مریضانہ ہے۔

راشد کے بارے میں پطرس نے یہ کہہ کر کہ "ہمارے یہاں وطنی شاعر بھی ہوئے ہیں اور قومی شاعر بھی، اخلاقی بھی، اشتراکی بھی لیکن جہاں تک میری نگاہ پہونچتی ہے ایشیائی شاعر ان کے سوا کوئی نظر نہیں آتا" صحت بیان کا ثبوت نہیں دیا ہے! راشد ذہنی طور پر مریضانہ علامات کے حامل ہیں۔ ہمہ وقت زندگی کی ناپائداری کا خیال، موت کی قربت کا خوف اور فرصتِ وقت کا فقدان ان کے پیش نظر ہے اور پھر ذاتی پریشانیوں، مصیبتوں، کرب، درماندگی اور بے چینی کے وہ شکار ہیں ان کے نزدیک ان سب سے حصول نجات کا واحد ذریعہ جنسی آلودگی ہے۔ احساس شباب اس شدت سے ہے کہ صرف شباب کے لئے بے چین اور مضطرب ہیں مبادا وقت گذر جائے اور تکمیل خواہش نہ ہو سکے۔ محبوب کی نرم نرم باہیں، گداز جسم اور گھنیری زلفیں ہی ان کیلئے زندگی کا مقصد ہیں

تیرے رنگین اس بھرے ہونٹوں کا مس
جس سے میرا جسم طوفانوں کی جولانگاہ ہے
جس سے میری زندگی میرا عمل گمراہ ہے
میری ذات اور میرے شعر افسانہ ہیں

اور پھر لمس طویل
جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد
میں نے جو اب تک بسر کی ہی نہیں
اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ

وہی نا آشنائی۔ یہی جنسی تشنگی، محرومی و ناکامی راشد کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ "محبوبہ کے ہونٹوں کا لمس طویل" ہی اگر ایشیائی شاعری کی نمایندگی کے لئے کافی ہے تو بہتر، ویسے حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے تتبع میں دنیا کی ہر چیز اور ہر واقعہ کو شیشۂ جنس میں دیکھنا اچھی بات ہے بشرطیکہ یہ عمل نظارہ صحت مند ہو۔ یہ بات نہیں کہ یہ میلان جنس محض راشد ہی میں ہے۔ دوسرے شعراء میں بھی موجود ہے لیکن جو اس جبلت جنس اور جبلت جمال کی صحیح روح سے باعلم ہیں ان کا فن کسی جنسی آلودگی سے مبرا ہے بہت ممکن ہے کہ محرکات شاعری محض جذبات جنسی ہوں.... تجربۂ فن بھی جنس ہی سے متعلق ہو۔ لیکن شعور کی تمام داخلی گذرگاہوں کو طے کر لینے کے بعد قوت متخیلہ اور سماجی و معاشرتی میلانات سے مل کر وہ تجربۂ فن ایک نادر اور حسین شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تجربہ اور اظہار فن کا ایک صحت مند میلان فیض کے یہاں جابجا نظر آتا ہے۔ فیض پر جنسیت کی ذرا بھی چھاپ نہیں۔ ہاں! رومان کے باریک اور سنہری پردوں کی تصویر کشی ضرور ملتی ہے۔ راشد کی شاعری محض تھکے تھکے سے کسی محروم جنس کی کہانی ہے جس کے احساس میں پیکیج ہے جذبے میں اشتعال ہے اور خواہش نفس میں اضطراب اور جو ستی لذتیت سے بھی گریز کرنے کا روادار نہیں سو

یاد ہے اک رات زیر آسمان نیلگوں
یاد ہے مجھ کو وہ تابستاں کی رات
چاند کی کرنوں کا بے پایاں فسوں۔ پھیلا ہوا،
سرمدی آہنگ برساتا ہوا ——— ہر چار سو،
اور میرے پہلو میں تو ———!
میرے دل میں یہ خیال آنے لگا ———

کی شکار بھی ہوئی ہے اور وہ اپنے اس موضوع سے وقتی طور پر علیحدہ ہو کر کچھ "تقاضائے دوست" پورا کرنے لگ جاتے ہیں ۔

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

ان اشعار میں وہ سبک پن، وہ نزاکت و لطافت اور وہ بے ساختگی و برجستگی نہیں ہے جو پہلے بند میں ہے اس کا احساس صرف قاری ہی کو نہیں خود فنکار کو بھی ہوا ہے اس لئے لوٹ کر وہ پھر اپنی لاشعوری کیفیت کو آخر میں یوں ظاہر کرتا ہے ۔

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

یہی حساس موضوعِ سخن ہے جس نے فیض کے کلام میں وہ جادو جگایا ہے جسے اس کے بیشتر ہمعصر نہ پا سکے۔ بعض تو نعرہ بازی میں الجھے رہے اور بعض بھونڈی اور بھدی نقل نویسی میں۔ فیض نے نشانِ منزل دیکھ اور سمجھ لیا ہے اگرچہ شعوری طور پر فیض "سرخیٔ مے" سے "دردِ بام و درم" کی تزئین و آرائش کا خواہاں ہے لیکن ابھی تک اس کی قوتِ ارادی اتنی زبردست نہیں ہوئی ہے کہ لاشعور کے خوفناک تموج کو وہ بھی مکمل طور پر دبا سکے۔ اور اسی لئے زیادہ تر وہ اعلیٰ اقدار کے حامل فن پارے نہایت حسین اور مکمل صورت میں پیش کرتا ہے۔ جن سے اس کے ذہنی رجحان کا صحیح اندازہ ہوتا ہے "تمہارے حسن کے نام" ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں بڑی دلکش تصویر Imagery ہے۔ شاعر نے صاف، سادہ، شستہ، سجل اور رواں دواں الفاظ سے جادوگری کی ہے۔

بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی دوپہر کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لئے دل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریٔ عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

فیض کی بڑی خوبی یہ ہے کہ نسلِ جدید کے دوسرے شعراء کی طرح انھوں نے اپنے افکار و خیالات کو محبوس نہیں کیا ہے۔ اگرچہ اردو ادب میں نظریات کی مختلف دھارائیں بڑی شد و مد سے اپنی پوری تیزی و تندی کے ساتھ بہہ رہی ہیں اور ہر ایک جدید شاعر "دیدۂ بیدار" کی... ذرا سی بھی شہہ پا کر بہتا یا کسی دھارے میں کود پڑتا ہے اور اپنے ہاتھوں ادب و فن کی بنیادی قدروں کو پامال کرتا ہے۔ لیکن فن فیض کی یہ زبردست خوش قسمتی ہے کہ وہ کسی ایک نظریہ میں مکمل طور پر مقید نہ ہوا۔ فی الحال فن و ادب کے وسطی دھارا کے دائیں بائیں جنسیات اور اشتراکیت پس آئینہ کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ان کے ایک ایک نمائندہ شاعر سے فیض کا تقابلی مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔

ادب کی جنسیاتی قدروں کے علمبرداروں میں ن۔ م۔ راشد کا نام نمایاں ہے۔ جدید شعراء جیسا کہ قبل عرض کیا جا چکا ہے کسی نئے نظریہ کے گویا منتظر رہتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں آتے ہی اس کی تقلید میں فن کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر ذہنی، جذباتی اور عملی طور پر اس سے وابستہ ہو جاتے

سحر انصاری

آنکھیں

جب نیلی نیلی آنکھوں کے
دو نرمل نرمل اشکوں نے
دو کومل کومل پھولوں کو
شاداب کیا، اس وقت مجھے
اس دل نے بہت بیتاب کیا

اور میں نے اپنی آنکھوں میں
اُن آنکھوں کو آباد کیا
جن آنکھوں کی گہرائی نے
ان آنکھوں کو برباد کیا

پھر نیند کہاں تھی آنکھوں میں
وہ آنکھیں تھیں ان آنکھوں میں
اک جادو تھا جن آنکھوں میں

پھر میں نے سوچا وہ آنکھیں
جب آنکھوں میں کھو جاتی ہیں

وہ آنکھیں تو سو جاتی ہیں
اور سونے والی آنکھوں سے
ان جاگنے والی آنکھوں کا
ہر رشتہ ٹوٹنے لگتا ہے

پر دل نے ہنس کر ٹال دیا
اور ان آنکھوں پر مچل گیا
وہ آنکھیں پا کر بہل گیا
جیسے وہ آنکھیں میرے لیے
آنکھوں کی ریت بدل دیں گی
برہا کے گیت بدل دیں گی
جیون سنگیت بدل دیں گی

اب میں ہوں اور میری آنکھیں
آنکھوں کی اس آبادی میں
کھو جانے والی آنکھوں کو
پھر ڈھونڈھ رہی ہیں آنکھوں میں

غم کا بحرِ بیکراں ہے یہ جہاں
میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے
سطحِ شور انگیز پر اس کی رواں
ایک ساحل ایک انجانے جزیرے کی طرف
اس کو آہستہ لیے جاتا ہوں میں

جذبۂ جنس کی شدت ایک ایک سطر سے پھوٹ رہی ہے.... بالخصوص کشتیٔ جسمِ محبوب میں سوار ہو کر ایک جزیرۂ موہوم کی طرف جانے کی خواہش یقیناً صحت مند فکر نہیں ہے۔

راشد کہتے ہیں کہ "جدید شاعری مقفیٰ ہو یا آزاد نئے زمانے کے تقاضوں کا جواب ہے" دراصل یہ جنسی تقاضے نئے زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں۔ دورِ وحشت میں بھی یہ تقاضے کارفرما تھے اور آج عہدِ صنعت میں بھی ہیں۔ راشد جو کہنا چاہتے ہیں وہ پورے طور پر کہہ نہیں پاتے۔ یہ جنسی محرومی اور تشنگی ہی ہے جو ان کو گریز و فرار پر مائل کرتی ہے اور خواہشِ موت   پر اکساتی ہے جس کی وجہ سے وہ غیر شعوری طور پر اس ذہنی مرض کے شکار ہو جاتے ہیں: "خودکشی" کے حسبِ ذیل مصرعے خاص طور سے قابلِ غور ہیں:

کر چکا ہوں آج عزمِ آخری
رات کو جب گھر کا رخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
منہ بسورے، رہگزاروں سے بھٹے سوگوار
گھر پہونچتا تھا میں انسانوں سے اکتایا ہوا
میرا عزمِ آخری ہے یہ کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج....

یہی ساتویں منزل سے کود جانے کی مریضانہ خواہش راشد کی شاعری میں جابجا مختلف رنگوں میں نظر آتی ہے وہ زندگی کو پیچ در پیچ متنوع صورتوں میں دیکھنے کی بجائے جنس کی مخصوص عینک لگا کر دیکھتے ہیں اور زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے آنکھیں بچا کر نکل بھاگنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور اسی جھنجھلاہٹ میں خام ذہن کی طرح خواہش مرگ کرنے لگتے ہیں۔

البتہ ہیئت اور فارم میں (اس کی کامیابی یا ناکامیابی سے قطع نظر) راشد نے نئے گوشوں کی تلاش کی ہے۔ راشد کے مقابلے میں فیض میں انتخاب تجربہ کی بڑی زبردست قوت ہے۔ فیض نے راشد کی طرح روایتوں سے بغاوت کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ فیض کی شاعری میں فرسودہ علامات اور روایتی تلمیحات اور استعارات بہ کثرت ملتے ہیں۔ لیکن فیض نے ان قدیم پیمانوں میں نئی شراب بھر دی ہے اسی لئے اس کی لذت بھی نئی اور انوکھی ہو گئی ہے۔ عشق و حسن، رقیب، حبیب، وصال و ہجر اور زلفِ پرخم و چشمِ میگوں وغیرہ فیض بھی اکثر استعمال کرتے ہیں لیکن نئی معنویتوں، رنگینیوں اور دلکشیوں کے ساتھ۔ فیض نے محض آزاد نظموں، در فارم...... کی تلاش میں اپنی فنی صلاحیتوں کو رائیگاں نہیں کیا۔ جب تک طبیعت موزوں رہی۔ مضامین آتے رہے، اور آمد کی ایک خاص کیفیت طاری رہی۔ فیض شعر کہتے رہے لیکن جب تخلیق کا سوتا خشک ہوا۔ انھوں نے شعر گوئی بند کر دی۔ اگر وہ کیفیت پھر طاری ہوئی تو شعر خود بخود ڈھلنے لگے۔ خود کہتے ہیں۔!

" آج سے کچھ برس پہلے ایک معین جذبہ کے زیرِ اثر اشعار خود بخود وارد ہوتے تھے لیکن اب مضامین کیلئے تجسس کرنا پڑتا ہے"

اور اسی لئے ان کے فن میں وہ تازہ خیالی اور غیر معمولی تجربات ہمیں ملتے ہیں جو دوسروں کے یہاں نہیں ملتے۔ راشد کے یہاں مضامین کی تجسس کی بجائے ہیئت اور فارم کی تجسس نمایاں ہے۔ اور اس تجسس کے پیچھے وہ اپنے ورثہ قدیم سے حتی الوسع اجتناب کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اسی لئے دلی بے رغبتی اور انحراف نے فنونِ لطیفہ کی نہایت لطیف ترین صنفِ سخن "غزل" کو صحیح طور پر اپنانے اور برتنے کا ان کو موقع نہ دیا۔ برخلاف اس کے فیض نے آزاد شاعری کے ساتھ ساتھ غزل کو بھی برتا۔ ان کی غزلیں تازہ کاری و جدتِ تخیل اور ندرت

[باقی صفحہ ۴۴ پر]

کتاب۔ لکھنؤ

ڈاکٹر صفدر آہ

رباعیات

لو ڈوب گیا صبح کا تارا جاگو
پو پھوٹ رہی ہے اب خدارا جاگو
کمھلائے پڑے ہیں شب کے مسلے ہوئے پھول
اب صبح ہوئی ہو لے دل آرا جاگو

دل ہے کہ مسرتوں کا گہوارہ ہے
گھر آیا ہوا مرے وہ مہ پارہ ہے
آنکھوں کو نہیں پلک جھپکنے کا وقت
کل عید تھی آج عید نظارہ ہے

محروم وصال محو لذات رہے
شبنم کی یہ شبنمی یہ برسات رہے
اے رات دراز کر دے زلفیں اپنی
کچھ دیر تو یہ لطف ملاقات رہے

خاموش یہ رات سہمے سہمے بادل
یہ چاند دھندھلا دھندھلا سا تارے بوجھل
آغوش میں ہیں مری وہ کھوئے کھوئے
گستاخ ہوا اڑا رہی ہے آنچل



شب آج لیے تازہ حیات آئی ہے
گردوں پہ کواکب کی برات آئی ہے
وہ حسن سراپا ہے مرے پہلو میں
اللہ اللہ یہ کیسی رات آئی ہے

یوسف اختر

تلاش

رہ گزر دھوپ میں کملائی ہوئی
جیسے ویران سا کھنڈر چپ چاپ
گرد بکھری ہوئی بے دم سی ہوئی جاتی ہے
کھڑکیاں اور سبھی دروازے
ادھ کھلی آنکھیں لیے
چور تھکن سے جیسے ——
ایک سنولائی ہوئی دھوپ سے
نازک عورت
زلف بکھری ہوئی تنکوں کی طرح
ہونٹ سوکھے ہوئے چہرہ معدوم
بیچ میں راہ کے
معصوم نگاہوں کو لیے
جانے کب سے کسی 'تلاش' کی متلاشی ہے

امیر عارفی

"فاصلہ"

(عثمان ساگر حیدرآباد کا ایک تاثر)

پھر وہی رات، وہی چاند، وہی موسم گل
ہاں وہی یاد، وہی یاد کے مٹتے ہوئے ماضی کے نقش
پھر وہی میں ہوں، وہی جھیل وہی ناؤ بھی ہے
ہر کوئی کرتا ہے پھر آج وہی ایک سوال!
"کیوں نہیں آتے ہو اس جھیل پہ کیا بات ہوئی"
کیسے سمجھاؤں انھیں
تم وہی، میں بھی وہی، دل بھی وہی، وقت وہی
وہی دنیا ہے، وہی ریت، وہی کوہ کنی
پھر وہی شہر غزالاں ہے، وہی رات بھی ہے۔
دل سے آنکھوں سے برستی ہوئی برسات بھی ہے
فاصلہ!
چند قدم
تم اجالوں کی بنی ہو زینت
"میری قسمت میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں!"

کتاب۔ لکھنؤ

خلیل الرحمٰن اعظمی

غزل

تو بھی اب چھوڑ دے ساتھ اے غمِ دنیا میرا
میری بستی میں نہیں کوئی شناسا میرا

شبِ غم! پار لگا دے یہ سفینا میرا
صبح ہو گی تو اُتر جائے گا دریا میرا

مجھ کو معلوم نہیں نام ہو اب کیا میرا
ڈھونڈھنے والے مجھے! چھوڑ دے پیچھا میرا

میں نے دیکھی نہیں برسوں سے خود اپنی صورت
میرے آئینے سے اُٹھا ہے سراپا میرا

تو بھی خوابوں میں ملی، میں بھی دھندلکوں میں تجھے
زندگی! دیکھ کبھی غور سے چہرا میرا

گھر سے نکلا ہوں تو اب دور کہیں جانے دے
روک اے گردشِ ایام نہ رستا میرا

دو قدم دوڑ کے آوازِ جرس بیٹھ گئی
چل پڑا میں تو کہیں پاؤں نہ ٹھہرا میرا

میرے دامن میں رہی خاکِ غریب الوطنی
رہ گیا دیکھ کے منھ دامنِ صحرا میرا

کتاب. لکھنؤ

مسیتاج سعید

دوھے

پنگھٹ سونا دیکھ کے گوری کاہے تو گھبرائے
اک پل یہ اُجڑے تو دوجے پل میں پھر بس جائے

گوری کے جوڑے میں بندھے ہیں پریم لتا کے پھول
سدا جھکتے رہیں یہ بھگون ان پہ پڑے نہ دھول

اُس گوری کے دیس میں اونچے پربت، گھور گھٹائیں
جہاں پہونچ کے من کے دُکھڑے بنت دونے ہو جائیں

ماتھے پر یوں بندیا چمکے جوں امبر میں تارا
اس تارے پر آس لگائی بیت گیا جگ سارا

پَوَن جھکورا پوچھ رہا ہے اس کا گھور ٹھکانہ
جس گوری کی پائل ہر دم چھیڑے نیا ترانہ

کتاب لکھنؤ

شہریار

غزل

لاکھ خورشید سرِ بام اگر ہیں تو رہیں
ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائیں گے

ہر گلی کوچے میں رسوا ہوئے جن کی خاطر
کیا خبر تھی کہ وہی لوگ بدل جائیں گے

ان کے پیچھے نہ چلو، ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

قافلے نیندوں کے آئے ہیں انھیں ٹھہرا لو
ورنہ یہ دُور بہت دُور نکل جائیں گے

راہی معصوم رضا

غزل

ہیں کیا چیز یہ منزلِ شوق کی راہیں بھی
ہانپ رہی ہیں بیٹھی تیز نگاہیں بھی

اے دُنیا ہم ہی تیرے مقتول بھی ہیں
اور اے دُنیا ہم ہی تجھے سراہیں بھی

غیر سے کیوں لگتے ہو تم معلوم نہیں
یوں تو ہیں گردن میں حمائل باہیں بھی[1]

پڑ جائیں کے اک صحرا سے گزرتی ہیں
روپ نگر کو جانے والی راہیں بھی

پیار کے قصے میں کچھ تو تبدیلی ہو
آؤ۔ ہم کچھ دن یہ پیار نباہیں بھی

سب کہتے ہیں غیر نے اس کو جیت لیا
اُڑتی ہیں کیسی کیسی افواہیں بھی

راہی منزل کی دُھن میں یہ بھول گئے
ناگن بن کر ڈس لیتی ہیں راہیں بھی

[1] مجھے اس قافیہ کی صحت پر اصرار نہیں ہے۔

احمد جمال پاشا

چھوٹا قد

چھوٹے قد کا آدمی نظر آتے ہی لوگوں کے منہ کھل جاتے ہیں اور دبائیں چلنے لگتی ہیں۔ لڑکوں کے ہاتھ تو اچھا خاصہ تماشا آجاتا ہے تماشائی ہنس ہنس کر آوازے کسنا شروع کر دیتے ہیں۔

"میاں بالشتیے — !"

"سرکس کے جوکر — !"

"نوشیاں — !"

"دیکھو یہ فلم میں بونے کا پارٹ ادا کرتا ہے!"

"اماں چھپکلی — !"

"بس کی گانٹھ — !"

"فلسرلی — !"

"یہ دیکھنے میں جتنا چھوٹا ہے اصلیت میں اتنا ہی کھوٹا ہے۔"

"حرزوں کا بنا ہوا ہے — !"

"ذرا اس کی چلت پھرت تو دیکھو — "

"جیبی ہے جیبی — !"

"اسے کم نہ سمجھنا، جتنا زمین کے اوپر دکھائی دے رہا ہے اتنا ہی زمین کے نیچے بھی تھا۔"

"اماں ادھر تو آؤ، ارے مذاق صاحبزادے!"

"لڑکے ... ی [illegible]"

ایسی صورت میں بے چارہ چھوٹے قد کا آدمی کسی ظالم شوہر کی مظلوم بیوی سے بھی زیادہ مجبور نظر آتا ہے۔

چھوٹے قد کے آدمی کے ساتھ صرف یہی مصیبت نہیں، بلکہ اس غریب کی بات بھی کوئی نہیں سنتا، لوگ اس کی ہر بات یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ "بری بات! بڑوں کے بیچ میں نہیں بولتے — !"

"میاں تم ابھی بچے ہو — !"

"یوں بزرگوں کی طرح چبا چبا کر بات نہ کرو لڑکے!"

والدین اور لڑکیوں کے بچہ سمجھنے کی وجہ سے شادی تو شادی محبت تک نوبت نہیں آنے پاتی۔ اس سلسلے میں چھوٹے قد کا آدمی قسمت کو، کوسنے اور انتہائی صبر کے ساتھ سب کی باتیں سننے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے — ؟

قد کا چھوٹا ہونا ایک ایسی مصیبت ہے جس سے زندگی میں نجات ممکن نہیں، جیسے آدمی دبلا ہو تو حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کر کے اپنے آپ کو موٹا کر سکتا ہے۔ بے وقوف ہو تو خاموش رہ کر اپنا شمار عقلمندوں میں کروا سکتا ہے۔ جاہل ہو تو پڑھ لکھ کر عالم فاضل تک ہو سکتا ہے۔ مگر کبھی قد نہیں بڑھا سکتا۔ قد کے غم میں گھٹ کر بالشتیہ ہو سکتا ہے اور قد بڑھانے کی آرزو میں خوشی سے موٹا ہو کر زیادہ سے زیادہ کارٹون معلوم ہو سکتا ہے۔ بغرض یہ مرض لاعلاج ہے۔

اوروں کی بات چھوڑیے، مجھے دیکھیے آخر میں بھی تو چھوٹے قد کا ہوں۔ بہت عرصہ تک میں بھی قد بڑھا لینے کے چکر میں رہ چکا ہوں۔ اس سلسلے میں، میں نے پہلے قد بڑھانے والی اشتہاری دوائیں کھائیں، پھر میں نے قد بڑھانے والی ورزشیں شروع کر دیں۔ کثرت کے نتیجے میں ہمارا قد تو نہیں بڑھا البتہ ہم گول مٹول ضرور ہو گئے اور دور ہی سے دیکھنے میں بالکل کارٹون معلوم ہونے لگے۔ کسی نے یہ بتا دیا کہ "لمبے آدمی کی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں نہ کہ اوپری دھڑ" لہٰذا پیر لمبے کرنے کے لیے گھنٹوں پیروں کے بل الٹے لٹکنے لگے۔

ایک دن خاں صاحب کی جو ہم پر نظر پڑی تو "یا دحشت" کہہ کر بھائی صاحب سے پوچھ ہی بیٹھے۔

عبدالصمد تپش

غزل

اس جہانِ مہ و پرویں سے پرے اور بھی ہیں
کچھ ٹھکانے مری نظروں کے لیے اور بھی ہیں

صرف زندان و سلاسل ہی پہ موقوف نہیں
حق پرستوں کے لیے کتنے صلے اور بھی ہیں

ایک ہم ہی تو نہیں مہر بہ لب بیٹھے ہیں
کتنے لب تیری رفاقت میں سلے اور بھی ہیں

اُن کی زلفوں کا فسوں کم تو نہیں تھا لیکن
سلسلے گردشِ دوراں سے ملے اور بھی ہیں

وقت پڑنے پہ ہمیں ایک نہ انجان ملے
اجنبی بن کے کئی دوست ملے اور بھی ہیں

مصلحت کا یہ تقاضہ ہے کہ چپ ہوں ورنہ
مجھ کو کچھ اپنے رفیقوں سے گلے اور بھی ہیں

اُف ری شادابیٔ گلشن کہ بہ ایں دورِ خزاں
کتنے پتے ابھی شاخوں میں ہرے اور بھی ہیں

نَے کے سینے میں فقط دردِ محبت ہی نہیں
نَے کے سینے میں کئی درد پلے اور بھی ہیں

مدحتِ گیسو و رخسار میں اُلجھیں نہ تپش
مسئلے وقت کے عنوان دیے اور بھی ہیں

سعید اختر کسکی

غزل

رنگ تصویرِ غمِ عشق نے بھرنے نہ دیا
اس کا رونا ہے لہو دیدۂ تر نے نہ دیا

میں نے ہی خود کو کبھی خود سے گزرنے نہ دیا
ورنہ کیا اذن مجھے تیری نظر نے، نہ دیا

شکریہ نشترِ دلدوز نگاہی کا تری،
آج تک زخمِ جگر کو مرے بھرنے نہ دیا

خود مری بے عملی کی ہی گھٹاؤں نے ندیم
میری قسمت کے تاروں کو ابھرنے نہ دیا

روشنی جتنی امیدِ شبِ تاریک میں تھی
ہائے اتنا بھی اجالا تو سحر نے نہ دیا

ورنہ کانٹے بھی تھے ہم رنگِ گلِ ترا اے دوست
اس کا موقع ہی ترے ذوقِ نظر نے نہ دیا

کبھی آمادۂ لطف اور کبھی مائل بہ کرم
اک جگہ تجھ کو تلوّن نے ٹھہرنے نہ دیا

تشنگی بجھ نہ سکی پھر بھی تری خاکِ وطن
خون کتنوں کے تجھے لختِ جگر نے، نہ دیا

اتنی نفرت بھی نہ کرنا تھی تجھے اختر سے
اپنی یادوں کی بھی گلیوں سے گزرنے نہ دیا

"سلسلۂ خدمتِ ادب"

احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ چوک لکھنؤ

انعامی مُقابلہ

پہلا انعام ۔۔۔ ۳۰۰ روپیہ   دوسرا انعام ۔۔۔ ۲۰۰ روپیہ   تیسرا انعام ۔۔۔ ۱۰۰ روپیہ

زردہ تنباکو پر بہترین افسانے یا کہانیاں

شرائط انعامی مقابلہ :-

(۱) ہر اردو اور ہندی کا مصنف اس مقابلے میں حصہ لے سکتا ہے، کسی قسم کی فیس داخلہ نہیں ہے، اردو مصنفین کو انعامات افسانے پر علیحدہ دیے جائیں گے اور ہندی مصنفین کو کہانیوں پر علیحدہ

(۲) ہر وہ افسانہ یا کہانی مقابلہ میں بھیجی جا سکتی ہے جس کا مرکزی خیال یا پس منظر "زردہ تنباکو" ہو

(۳) افسانہ یا کہانی چار ہزار الفاظ سے زائد نہ ہونا چاہیے۔

(۴) افسانے یا کہانیاں ایک ادیب اپنے نام سے ایک یا کئی بھیج سکتا ہے مگر الگ الگ لفافوں میں۔

(۵) مقابلے کے افسانے یا کہانیاں ایک بورڈ کے سامنے پیش کر دیے جائیں گے۔ بورڈ جن افسانوں یا کہانیوں کو انعام کے لائق تجویز کرے گا وہ انعامات کے مستحق قرار پائیں گے۔ بورڈ کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا۔

(۶) جو افسانے یا کہانیاں کارخانہ کو وصول ہوں گی وہ کارخانہ کی ملکیت قرار پائیں گی۔ ان تمام افسانوں اور کہانیوں کے جملہ حقوق بنام کارخانہ محفوظ شمار ہوں گے، البتہ اگر کارخانہ ایسے افسانوں یا کہانیوں کو شائع کرے گا یا براڈکاسٹ کرے گا یا اپنے اشتہارات میں استعمال کرے گا تو جن مصنفین کی تخلیقات استعمال کی جائیں گی ان کو پندرہ روپے (۱۵؍) فی کہانی یا افسانہ معاوضہ کے دیے جائیں گے۔ مگر یہ معاوضہ ان مصنفین کو نہیں ملے گا جو انعام یافتہ ہوں گے۔

(۷) مقابلے کے افسانے یا کہانیوں کے بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۲ مارچ ۱۹۶۴ء ہوگی۔

(۸) کارخانے کے ملازمین یا متعلقین اس مقابلہ میں حصہ نہیں لے سکتے ہیں۔

(۹) ہر لفافہ یا خط پر جس کا اس انعامی مقابلے سے تعلق ہو مندرجہ ذیل پتہ لکھنا ضروری ہے۔
"سلسلۂ خدمت ادب" معرفت احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ، چوک، لکھنؤ

المشتہر

منیجر احمد حسین دلدار حسین پرائیوٹ لمیٹڈ
تاجر تنباکو خوردنی، چوک لکھنؤ

"میاں یہ چمگادڑ کہاں سے پکڑ لائے؟"۔
اس کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

پھر کسی نے مشورہ دیا کہ "انسانی جسم ربڑ کی طرح ہوتا ہے۔ جتنا اس کو دبایا جائے گا، اتنا ہی بڑھے گا۔" ـــــــ لہٰذا ہم نے اس اصول کو فوراً تسلیم کرتے ہوئے پہلے تو اس قسم کی کسرتیں کیں، جن میں ہم خود گیند معلوم ہوتے تھے اور آخر میں "شیرشی آسن" لگانے لگے، سر کے بل کھڑے ہونے سے چہرے پر خون ضرور چھلکنے لگا، مگر قد جوں کا توں رہتا۔ اس سے بھی مایوس ہونے کے بعد پھر دعا، تعویذ، گنڈے، جھاڑ پھونک اور ٹونکے شروع کر دیئے۔

دوا علاج کرتے کرتے تھک چکے تھے اور گھر پر دواخانے کا دھوکا ہونے لگا تھا۔ لہٰذا ہم نے پہلے تو کباڑی کو بلا کر ساری شیشیاں بوتلیں اور ڈبے اس کے حوالے کئے اور پھر خالی گھر میں چلہ کشی شروع کر دی۔ ایک بہت پہنچے ہوئے فقیر کی، "تاثیرک انگوٹھی" منگوائی جس کے بارے میں دعوا کیا گیا تھا کہ اس کو پہننے کے بعد ـــــــ بوجیا ہو گئے، وہی ہو گا۔ مگر جب انگوٹھی بھی ہمارا قد نہ بڑھا سکی، تو شکایت کرنے کے لیے ان فقیر صاحب کے پاس پہنچے۔ لیکن دور ہی سے یہ دیکھ کر کہ شاہ صاحب کا قد تو ہم سے بھی چھوٹا ہے فوراً الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ اور مجبوراً ہائی اسکول کے سرٹیفکیٹ کی مدد سے ہم کو بچہ سمجھنے والوں کو یقین دلانے لگے کہ "اس میں دی ہوئی تاریخ پیدائش کے اعتبار سے اب میں بالکل جوان ہوں۔" ساتھ ہی ہر بات بہت سوچ سمجھ کر اور ناپ تول کر کہتے تاکہ لوگ بچہ سمجھ نہ سکیں، مگر مخاطب ہمیشہ یہ کہہ کر ہنسی میں اڑا دیتے کہ

"میاں تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔"

اور ہم پھر گھٹ کر رہ جاتے ـــــــ

تقدیر کی خوبی تو دیکھئے کہ یونیورسٹی میں بی اے پاس کرنے کے بعد میں نے ایم اے کرنے کے لیے "تاریخ" کے مضمون کا انتخاب کیا۔ تاریخ سے عام دلچسپی کے تحت تاریخ سے متعلق کتب بھی میرے مطالعے میں رہنے لگیں۔ اسی دوران میرے ہاتھ وہ کتاب بھی لگ گئی جس نے میری دنیا بدل دی۔ اس کتاب کا نام تھا۔

"بونوں کی خدائی ـــ"

اس کتاب کے لیے قد مصنف نے بڑی قابلیت کے ساتھ یہ ثابت کیا تھا کہ:-

"چھوٹے قد کے لوگوں نے دنیا کو جہاں تہ و بالا کیا وہاں اسے تہذیب و تمدن، فلسفہ و سائنس اور علم و ادب سے مالا مال بھی کیا۔"

اس کتاب میں سقراط، نپولین، کانٹ، لینن اور چرچل جیسے بے شمار عظیم انسانوں کی تقدیریں اور کارنامے درج تھے۔ اس پڑھنے کے بعد فخر سے میری گردن بلند ہو گئی اور سینہ چوڑا ہو گیا۔

بس صاحب وہ دن ہے اور آج کا دن مجھے اپنے قد کے چھوٹے ہونے پر ناز ہے۔ اس کا اعتراف میں بڑی مسرت کے ساتھ کرتا ہوں اور اس وقت مجھے تمام لمبے قد والے بے ڈول انسانوں کی کم عقلی پر بڑا ترس آتا ہے۔ اپنے قد کے چھوٹے ہونے پر میں اب اس طرح فخر کرتا ہوں جیسے لوگ اپنے گھرے سید ہونے پر ـــــــ اب کسی کی ہمت نہیں کہ مجھے ٹوک کر اپنی ہنسی اڑوائے۔ اور تو اور میری اس انقلابی تبدیلی کے بعد سے میرے والدین نے اب میری شادی کی بھی ٹھان لی ہے اور اب تک میں کئی رشتے اس لیے نامنظور کر چکا ہوں کہ ان لڑکیوں کا قد چھوٹا نہیں تھا۔

ہنکوٹنے لگتے ہیں۔

"دور، دور ہٹو" کہیلے لوگوں کی لمبی قطار میں سے ایک پچیس تیس سال کا گبرو جوان جاگ کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ کہتے "ایک نظر عاجزانہ اس پر ڈال کر جھگیوں کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ جوان انہیں گالی دے کر پھر لیٹنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ جھگیوں کی طرف سے آنے والی ہوا عورت کے جسم کی خوشبو اس تک لے آتی ہے۔ وہ تھوڑا اور سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ دیر تک ارد گرد کے اندھیرے کو گھورتا رہتا ہے۔ لیکن خوشبو کے علاوہ کوئی دوسرا سراغ نہ پا کر نیچے کے مصنوعی ٹیلوں اور ان میں سے بہتے پانی کی طرف بے بسی سے ٹانگیں پھیلا دیتا ہے۔

اسی لمحہ اسے ہوا میں چوڑیوں کی ہلکی جھنکار سنائی دے جاتی ہے۔

اس کے سر کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں تقریباً پھٹنے لگتی ہیں۔ ناک ہوا کی ہر خوشبو کو سونگھنا ہی نہیں، نگل لینا چاہتی ہے۔ ترکمان گیٹ کے باہر کوئی گھوڑا ہنہنا اٹھتا ہے۔

وہ جیب سے بیڑی نکالتا ہے اور غصے میں تیلی کو ماچس پر رگڑنے لگتا ہے۔ دو بار، چار بار، چھ بار بھی گھسنے پر گیلی تیلی سلگنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ ماچس پھینک کر بیڑی کو مسل دے اور بانس کی کھپنی سے چولھا سلگاتے ہوئے گاڑی بان سے اس کا بانس چھین لے۔ پھر اس بانس سے سب کتوں اور گھوڑوں کی پٹائی کرے، ایسی پٹائی کہ وہ زندگی بھر کے لیے غرانا اور ہنہنا بھول جائیں۔ حرامزادے رات بھر پریشان کرتے ہیں اور دوسروں کو سونے نہیں دیتے۔

اسی وقت جھگیوں کی طرف سے ایک مہین آواز کانوں کو سہلا جاتی ہے۔

اس کی ماچس جل اٹھتی ہے اور بیڑی سلگ جاتی ہے۔ بیڑی کے لمبے لمبے کش کھینچتا ہوا وہ دوری کی خلکیں مٹانے لگتا ہے۔ محسوس کرتا ہے کہ کانوں کے بالکل نزدیک جو دھوکن جیسی آواز سنائی دے رہی ہے وہ اس کی اپنی سانسوں کی ہے۔ وہ آواز سے بچنے کے لیے پیچھے پیڈسٹل سے ٹیک لگا لیتا ہے۔

ترکمان گیٹ کے باہر بھیا لوگوں کی منڈلی کیرتن شروع کر دیتی ہے۔

بندرا بن چند بھجو!
رادھے گووند بھجو!
او بندرابن چند بھجو!
رادھے گووند بھجو!
بندرا بند چند بھجو!

اس کا دھیان پیڈسٹل سے باہر نکلی ہوئی دو سلاخوں پر اٹک جاتا ہے معلوم ہوتا ہے سلاخیں آسمان کے پیٹ میں گدگدی کر رہی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آسمان گدگدی سے پریشان ہو کر ہنس دے گا اور بھیا لوگوں کی آوازیں اس ہنسی میں ڈوب جائیں گی۔

یہ بھی خوب مذاق تھا سلاخیں تو پیڈسٹل سے باہر نکال دیا اور ان کا بت غائب کر دیا۔ کیا وہ بت تھیں اور بڑا کھڑا رہا تھا؟ یا سلاخیں؟ وہ کیا رات رات بھر آسمان میں ان پتھر کے پیروں کو ہی نہیں ڈھونڈھتی تھیں جو ان کے لیے بنے تھے، لیکن وہاں سے اکھاڑ کر نہ جانے کس تہہ خانے میں بند کر دیے گئے تھے۔

او بندرابن
چند بھجو!
رادھے
گووند بھجو!
بندرابن
چند بھجو!
رادھے
گووند بھجو!
بندرابن چند بھجو!
نند بھجو، نند بھجو!

اچانک دھول اڑنے لگتی ہے۔

ایونگ نیوز کا ایک پھٹا ہوا ورق دلی گیٹ کی طرف اڑتا ہے پلاؤ سینانگ جزیرہ میں قیدیوں کی بغاوت، روس چین گفت و شنید میں تعطل، چینی فوجوں کا ہندستان کی سرحد پر حملہ، ....

پھٹا ہوا ورق اڑتا جاتا ہے، اڑتا جاتا ہے جیسے دھول کا بونڈر اس کا دشمن ہو اور وہ جیسے کسی نہ کسی طرح اپنے کو بچا لینا چاہتا ہو۔

موہن راکیش

شام و سحر کے درمیان دہلی

ایسا بیہودہ شہر ہے کہ کوئی بات قاعدے سے نہیں ہوتی۔ دن ابھی بیت نہیں پاتا کہ اچانک رات ہو جاتی ہے۔

رات قاعدے سے ہوتی ہے، تو پہلے زمین آسمان کے رنگ بدلتے ہیں۔ پانی کی سطح پر رنگین جالیاں بن جاتی ہیں، ہوائیں جھینگے کی آوازیں تیرتی ہیں، ہلکی گہری خوشبوئیں اٹھتی ہیں گرجا اور مندر کی گھنٹیاں پایل کا بھونپو سنائی دیتا ہے۔ دو چڑیاں چہکتی ہیں یا چار مزدور مل کر کوئی گیت چھیڑ دیتے ہیں۔ اور کچھ بھی نہ ہو تو تھوڑی دیر کے لیے ایک خاموش وقفہ رہتا ہے۔ مگر یہاں.... یہاں دفتر سے نکل کر کیو میں سرکتے ہوئے بس کے اندر داخل نہیں ہو پاتے کہ رات ہو جاتی ہے۔

زیادہ تر لوگوں کے لیے دن کے خاتمے کا یہی ایک ثبوت ہے کہ دفتر بند ہو جاتے ہیں۔ دفتروں کے بعد دوکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ دوکانوں کے بعد ایک ایک کر کے گھر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اس کے بعد رات کی زندگی شروع ہو جاتی ہے ———

کتوں کے بھونکنے اور پہرہ داروں کے آواز لگانے سے "جاگتے رہو۔ "جاگتے رہو۔" اور کر دھر دو کچھ نہیں۔ چارپائی پر پڑے پڑے کروٹیں بدلو۔ کوئی کتاب (ادھار مانگ کر لائی ہوئی) پڑھنے کے لیے اٹھاؤ اور تکیہ کے نیچے رکھ دو۔ ریڈیو کی سوئی گھماؤ اور بیوی کو دفتر کے قصے سنانے لگو۔ پاس کے گھر سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں سنو اور آسمان میں صلیب بناؤ۔ ایک بار چارپائی سے اٹھ کر ٹہلو، دو بار پانی پیو۔ پھر لیٹ کر حساب لگاؤ کہ دن میں کتنا خرچ کیا۔ کون کون سا لاچائے اور کافی کا چونا لگا گیا پھر پروگرام بناؤ کہ دوسروں کو چونا لگانے کے لیے کیا تگڑ میں کرنی چاہئیں۔ آخر اس حقیقت تک پہونچو کہ لوگ بہت کمینے ہیں، انھیں چونا نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر دوسروں کے خراٹوں کی آواز پر جھلاتے ہوئے خود خراٹے لینے لگو۔

نو بجے بھونکنا شروع کر کے زیادہ تر کتے گیارہ بجے خاموش ہو جاتے ہیں۔ جو زیادہ وفادار ہیں، یا جن کی کتیاں انھیں داغ مفارقت دے گئی ہیں وہ بارہ ایک تک اور شام بھونک لیتے ہیں۔ جب بھونکنے کی طاقت بالکل نہیں رہ جاتی، تو اپنے اپنے صحن میں ٹانگیں پسار لیتے ہیں۔ کچھ دیر لیٹے لیٹے متوسط طبقہ کی مجبوریوں پر غور کرتے ہیں، پھر ٹانگیں آسمان کی طرف اٹھا کر اکیلے پن کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ سڑک پر ذرا بھی آہٹ معلوم ہوتی ہے تو کان کھڑے کر کے سننے لگتے ہیں جب آہٹیں بالکل رک جاتی ہیں تو اپنی سانسیں گنتے سو جاتے ہیں۔

مگر سب نہیں سو پاتے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو تمام رات جاگ کر رام لیلا گراؤنڈ میں کروٹیں بدلتے ہیں۔ آٹھ بجے سے گراؤنڈ کی ہری گھاس پر لوٹنا شروع کرتے ہیں، لیکن گھاس اپنی ساری ٹھنڈک دے کر بھی ان کے اندر کی تپش کو نہیں مٹا پاتی۔ وہ بار بار گھاس سونگھتے جاتے ہیں، مٹی سے اپنا تھوتھن رگڑتے ہیں اور خشک زبان لپلپاتے ہوئے ہوا میں دانت گڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر جب گراؤنڈ میں کسی طرح راحت نہیں ملتی، تو جھگیوں کی قطار کے پیچھے پیپل چبوترے پر چڑھ جاتے ہیں اور وہاں اکیلے لیٹے لوگوں کے پیروں

کتاب ، لکھنؤ

ایک اینچ اور بس ۔ بس ، بالکل بس !

ہر شخص کو جلدی ہے ۔ ہر شخص کی گاڑی چھوٹنے والی ہے ۔
آسمان کا رنگ پیلا پڑنے لگا ہے ۔ لگتا ہے کہ ابھی اٹھ کر ابھی ہر
ایک چیز کی رفتار کو قید کرے گی ۔
پہیے اور تیز گھومنے لگتے ہیں ۔ اس سے پہلے کہ راستے دھندلے ہو جائیں
کسی نہ کسی طرف سے باہر نکل جانا چاہیئے ۔ کوئی چوٹ کھا جائے ، یا کچل جائے
اس کے لیے رکا نہیں جا سکتا ۔ پیڈل زور سے مارو ۔ ایکسیلیٹر زور سے دباؤ ۔
چابک زور سے چلاؤ ۔ جو پیر سامنے آئے وہ پیر کاٹ دو ۔ جو پہیہ سامنے پڑے
وہ پہیہ توڑ دو ۔ جلدی کرو جلدی ۔ گاڑی چھوٹ جائے گی ۔

پہلے آسمان کو سفید کرتی ہوئی انجن کی بھاپ کنڈلی لیتی ہے ۔ گاڑی
چھوٹنے والی ہے ۔ انجن کے فولادی جسم میں چھپی ہوئی چیخ ہوا کو چیر دینے کے
لیے بے چین ہے ۔
اور گاڑی کے ڈبوں میں سیٹ بھیڑ انتظار کر رہی ہے ۔ ڈبوں کے باہر
پلیٹ فارم پر بھیڑ انتظار کر رہی ہے فرسٹ کلاس کے بھیڑ ویٹنگ روم میں
ہے ۔ باہر احاطہ میں بھیڑ سڑک پر ہے ۔ فٹ پاتھوں پر ہے ۔ یہ ساری بھیڑ
انتظار کر رہی ہے سگنل ملتے ہی گاڑی چل دے گی ، بھاپ کے گولے
آسمان کو داغنے لگیں گے ......
مگر ابھی گاڑی رکی ہوئی ہے ۔ چیخ انجن کے فولادی سینہ میں بند ہے
صرف بھاپ کے ہلکے ہلکے مرغولے ہیں جو آسمان سے سر کھجلا رہے ہیں ۔

ہر چیز پر گرد کی پرتیں جم گئی ہیں ۔ ہوا رک رہی ہے ۔
فٹ پاتھوں پر خوانچے والوں نے خوانچے سمیٹ کر بستر بچھا لیے ہیں ۔
بستر یعنی دریاں ، چٹائیاں ، بانہیں اور ہاتھ پیر ۔ ہوا رکنے کے ساتھ
ساتھ سب کی قمیضیں اور بنیائیں اتری جاتی ہیں ۔ پسینہ میں غرق کپڑے
برداشت نہیں ہوتے ۔ کپڑے اتر جانے سے پسینہ میں غرق جسم برداشت
نہیں ہوتے ۔ دل چاہتا ہے کہ اگر اور کچھ ہو تو اسے بھی اتار دیا جائے

کھال کے اندر سے پسینے بھیگے ہوئے اپنے آپ کو نکال کر باہر
پھیلا دیا جائے ۔ سب کچھ ترتر ہے گلے کی آواز ، جسم کی بھوک ۔ کسی طرح
ان سب کو نچوڑ کر کہیں ڈال دیا جائے ......

" بشن داس ! "
" ہوں ۔ "
" یار ، معلوم ہوتا ہے اس سال آسمان میں پانی ہی نہیں رہا
" سارا پانی اپنے اندر جذب کر لیا ہے ۔ "
" یار لاہور میں تجھے قناعت کو کھاٹ ڈال کر سوتو رہتے تھے
" لاہور میں دو دکانداری کرتے تھے یہاں بادشاہی کرتے ہیں ۔
" تجھے لاہور کی یاد نہیں آتی ؟ "
جواب خاموشی ۔
" گھر کی یاد نہیں آتی ؟ "
جواب کسمساہٹ ۔
" گھر والی اور بال بچوں کی یاد نہیں آتی ؟ "
جواب جھنجھلاہٹ ۔ " چھوڑ یار کوئی اور بات کر ۔ "
" لوگوں نے یہاں آکر جھونپڑوں کے محل بنا لیے اور اپن لوگ ...
" چھوڑ نا ! وہ ای کی لڑکی تھی نہ بنارسی ..... ! "
" ہوں ۔ "
" ایک دن اسکوٹر میں اسے کسی کے ساتھ دیکھا تھا ۔ "
" پھر ؟ "
" پھر کچھ نہیں ۔ بس دیکھا تھا ۔ "

آسمان سیاہ اور صاف ہے ۔ اس کی پیشانی پر پسینہ کی بوندیں
چمک رہی ہیں ۔ سڑک کے بیچ میں کھدی ہوئی نالی میں سے ایک بلی
کا بچہ میاؤں میاؤں کر کے سر نکالتا ہے نالی کے باہر آکر دزدیدہ نظروں
سے ادھر ادھر دیکھتا ہے ، پھر نالی میں لوٹ جاتا ہے ۔
ایک آدمی اسے گالی دے کر موٹر سائیکل سے اترتا ہے ۔ غلیظ سے
بھری نالی کو تختے پر سے پار کر کے وہ سامنے کے کوٹھے کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے

منظر کو چیرتی ہوئی وہ روشنیاں تیزی سے اسے لپیٹتی ہیں اور ایک پہیا اسے کچل کر سڑک کے پگھلے ہوئے تارکول سے چپکا دیتا ہو۔ پچکا ہوا وقت چیتھڑے چیتھڑے ہو جانے پر بھی پھڑپھڑاتا رہتا ہے ہندوستان کے حفاظتی قانون میں فی الحال کوئی ترمیم نہیں ہوگی۔

وقت کو کچل کر نکلی ہوئی گاڑی تیزی سے آصف علی روڈ پار کر جاتی ہے، پھر پاگلوں کی طرح دلی گیٹ کے پاس سے روڈ آئی لینڈ کا چکر کاٹ کر واپس لوٹ پڑتی ہے۔ سڑک خالی نہیں ہے۔ موٹر ہیں، ٹرک ہیں، ٹیکسیاں ہیں، سائیکلیں ہیں اور پیدل چلتی مخلوق ہے۔ مگر گاڑی شرابیوں کی سی چال سے، سب کے دائیں بائیں ہو کر آگے نکلتی جاتی ہے۔ مرد کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر ہے، دوسرا ساتھ میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے کندھے پر۔ ایکسیلیٹر پر دباؤ کم کر کے وہ اسے چومنے کے لیے اس کے ہونٹوں پر جھک جاتا ہے۔ اسی وقت پیچھے سے تیز روشنی دونوں پر پڑتی ہے اور زوردار ہارن چیخ اٹھتا ہے۔ مرد سیدھا ہو کر ایکسیلیٹر دبا دیتا ہے۔

"ڈیم سوائن!"

"دیکھو اب کافی دیر ہو رہی ہے۔"

"صرف ساڑھے نو بجے ہیں۔"

"مجھے گیارہ تک واپس پہنچ جانا ہے۔"

"کیوں؟"

"یوں ہی!"

"لیکن ابھی تو ....."

"تو تم بھیڑ سے باہر کیوں نہیں نکل چلتے؟"

"کوئی بھی جگہ ہے جہاں بھیڑ نہ ہو....."

"جگہیں بہت سی ہیں۔"

"جیسے؟"

"تم نہیں جانتے؟"

"نا۔"

"یہاں نئے آئے ہو۔"

"دو مہینے سے ہوں۔"

"دھیرے دھیرے سب جان جاؤ گے۔"

"کب تک؟"

وہ پھر لڑکی کے ہونٹوں پر جھک جاتا ہے پیچھے سے ہارن اور زور سے بجتا ہے۔ کار گولا مارکٹ کے پاس سے گھوم کر اجمیری گیٹ سے داخل ہو جاتی ہے۔

"یہ کدھر چلے آئے؟"

"بس ادھر ہاتھ گھوم گیا۔"

ہر چیز کسی دوسری چیز کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ ہر چیز کسی چیز سے بچنے کے لیے پریشان ہے۔ ہر چیز کسی حادثہ کے سلسلے میں چلی رہتی ہے ایسا لگتا ہے کہ حادثہ صرف ایک فٹ کے فاصلے پہ ہے۔ بچنے کے لیے ضروری ہے کہ جتنا تیز ہو سکے چلا جائے۔ پیڈل، ایکسیلیٹر..... جو جتنا تیز چل سکے۔ حادثات سیکڑوں شکلوں میں سامنے آجاتے ہیں۔ گدھے کی ٹانگوں سے لپٹ کر۔ بھینس کے سینگوں پر سوار ہو کر۔ ہر پہیہ والی گاڑی کے پہیوں میں گھومتے ہوئے۔ ہر موٹر کے اندر سے ہارن دیتے ہوئے۔ ہر سائیکل کے ہینڈل پر سے گھنٹی بجاتے ہوئے۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر سمت سے صرف ایک فٹ کے فاصلہ پر لٹکا آتا ہے۔ ٹرن ٹرن..... گر گر --- ہواں ہواں....."

"او اور..... کیوں بریک کھینچ کا بیڑہ غرق کرنے پر تلا ہے؟"

"تیری ناک بہت چاؤں چاؤں کر رہی ہے! ابھی ایک گھونسہ دوں گا، تو تین دن نکسیر پھوٹتی رہے گی۔"

"سور کے بچے۔ زیادہ بک بک مت کر، نہیں تو دونوں پہیے نکال کر گلے میں ڈال دوں گا۔"

"ابے جا، جا کر ماں کی خیر منا۔ پتہ نہیں کتنی منت مرادوں اولاد ہو گا۔!"

"تو کیا اپنی ماں کو کوڑے میں پڑا ملا تھا؟"

"ٹھہر جا تیری....."

ٹرن ٹرن --- گر گر..... ہواں ہواں.....

تیز، تیز اور تیز۔ دھیمے چلنے سے فاصلہ ایک فٹ بھی نہیں رہے گا۔ راستہ جہاں سے ملے، جدھر سے ملے، نکل جاؤ۔ نکل جاؤ اور سوچو نہیں۔ سوچا نہیں کہ فاصلہ ایک فٹ

کتاب، لکھنؤ

ژنمر کا آدمی بار بار کرڈھ کر گانے والوں کی طرف دیکھتا ہے اور
ہی دل میں گالی دیتا ہے۔ پھر سونے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر
ا ہے اور پھر گالی دیتا ہے نیچے سڑک پر بچھی ہوئی چارپائی پاس
کا بھی بار بار اسی طرح کڑھتا ہے اور دل میں باپ کو گالی دیتا
۔باپ کی طرف سے اسے نو بجے سونے کا حکم ہے جبکہ اس کا دل
نا ہے کہ وہ بھی عرق گاؤزبان پی کر بارہ بجے تک سڑکوں پر ٹہلے
دوسرے جھومنے والوں کے ساتھ جھوم جھوم کر انھیں کی طرح
پھرے

روٹھنے والی مری بات سے مایوس نہ ہو
بہکے بہکے سے خیالات سے مایوس نہ ہو
ختم ہوگی نہ کبھی تیرے میرے ساتھ کی رات ۔۔۔۔

وہ بار بار آنکھیں جھپکاتا ہے اور آوازوں کی ٹوہ لیتا ہے۔
ے کی آوازیں دور چلی جاتی ہیں تو سامنے والے مکان کی بند کھڑکی
ن لگا لیتا ہے۔ کھڑکی کے پیچھے کی ہر آہٹ اسے کسی کے پیروں کی
معلوم ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا رہتا ہے اور سوچتا ہے کہ اب کھڑکی
گی۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ کھڑکی کھل گئی ہے اور دو پتلی پتلی
یاں سلاخوں پر جھک آئی ہیں۔ نیند کا جھونکا آتا ہے۔ وہ آنکھیں
لیتا ہے۔ مایوسی کھڑکی اسی طرح بند ہے۔ کواڑوں کے پیچھے
ہٹیں بھی رک گئی ہیں۔ لیکن دوسری بار اونگھنے پر آہٹ پھر
ئی دیتی ہے، کواڑ پھر کھل جاتے ہیں، کلائیاں پھر جھک
تی ہیں۔ ۔۔۔۔۔
اور اس کا باپ نیند میں بھی اسی طرح بڑبڑا کر گالیاں دیئے
ہے۔

اڈے کے سامنے ٹی ہاؤس کی بھیڑ آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔
اندر زور کا قہقہہ لگتا ہے۔ تو باہر نکلتے ہوئے ادیب ٹھٹھک
جاتے ہیں پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے ہیں کہ ہنستے ہوئے لوگوں کی نظریں انکی
طرف تو نہیں ہیں۔
پان والے کے پاس پہونچتے پہونچتے اور زور کا قہقہہ لگتا ہے۔
اسی وقت کوئی راہ گیر اس سے پوچھ لیتا ہے۔ "ارے آپ؟
ٹی ہاؤس میں؟"
"ہاں بھئی! سوچا نئے زمانہ کے لوگوں کے ساتھ بھی تھوڑا بہت
اٹھنا بیٹھنا چاہیے۔ یہ لوگ کہتے ہیں پرشن آف مائنڈ ٹی ہاؤس
میں آنے سے ہی ہوتا ہے۔"
"ارے واہ! آپ اور پرشن آف مائنڈ۔۔۔۔"
"ایسا تو نہیں۔ لیکن ہم نے سوچا اس میں بھی کچھ نہ کچھ مسالہ تو
ڈھونڈا ہی جا سکتا ہے۔ ہم تو ان لوگوں کے پرشن آف مائنڈ پر ایک
افسانہ لکھنا چاہتے ہیں۔ پرشن آف مائنڈ کے معنی ہیں فری لو ایک
ایسے آدمی کی کہانی پلان کر رہے ہیں جو ادیب ہے اور جس کا عقیدہ
فری لو ہے۔ وہ بیوی کو چھوڑ رکھا ہے پرشن آف مائنڈ کے لیے۔"
قہقہہ اب دروازے کے پاس آجاتا ہے اور کچھ لوگ ہنستے ہوئے
باہر نکل آتے ہیں۔
"ارے آپ ابھی یہیں ہیں؟"
"ہم جا رہے تھے لیکن انھوں نے پکڑ لیا۔ اب رکنے کے علاوہ کوئی
دوسرا راستہ نہیں رہا۔ اب جہاں رکنا ہی راستہ ہے وہاں چلنا اور
جانا راستہ کی رکاوٹ ہیں۔ جب انھوں نے ہم سے پوچھا آپ ۔۔۔"
اسی وقت کسی اور بات پر ایک اور قہقہہ بلند ہوا۔ ادیب کو کسی
صورت سے پرشن آف مائنڈ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

پلیس والی آنکھ جھپکنے لگتی ہے، لیکن لائٹ اینڈ میوزک
آنکھ کھلی رہتی ہے۔ غراتی ہوئی بسیں اور رینگتے ہوئے اکوڑ
برج کی طرف بھاگتے جاتے ہیں۔ آصف علی روڈ اور منٹو برج
زدن کے پار ... اس کے پرزوں کی آواز بدلنے لگتی ہے، چال
ق آجاتا ہے۔ اوڈین اور سندھیا ... پار ... رنگ ... پہونچتے
پہنچتے سارا منظر بدل جاتا ہے۔

"سلی!" گیلارڈ کے باہر کھلی کار میں ایکسپریسو کافی پیتی ہوئی
خاتون بھویں چڑھا لیتی ہے۔ "جیسے کوا دوں کی طرح ہنستے ہیں یہ
لوگ!"
"کافی اچھی ہے؟" اس کا شوہر چڑھ کر پوچھتا ہے۔
"ایک دم کرادی! یرانین!"

"موسی جی!"

دو بار اور کنڈی کھٹکھٹانے پر دروازہ کھلتا ہے۔ ایک جھنجھلائی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے: "کون ہیں آپ؟ کس سے ملنا ہے؟"

"موسی جی سے۔"

"یہاں کوئی موسی جی نہیں رہتیں۔"

"اس مکان کا نمبر کیا ہے؟"

"آپ کو نمبر سے مطلب؟"

"یہاں سات بٹا اکیس ہیں ......"

"سات بٹا اکیس وہ ساتھ میں ہے۔ موسیاں بھانجیاں سب اسی میں رہتی ہیں۔"

دروازہ زور سے بند ہو جاتا ہے۔ ساتھ بڑبڑاہٹ سنائی دیتی ہے: "چلے آتے ہیں ایک کے بعد ایک۔ موسی سے ملنا ہے۔"

ایک منٹ بعد چرمر کی آواز کے ساتھ سات بٹا اکیس کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

"موسی جی ہیں؟"

"آپ کون ہیں؟"

"میں ... میں ... ہوں ... موسی جی کو بلا دیجیے وہ مجھے جانتی ہیں۔"

"موسی جی نہیں ہیں"

"زلا جی؟"

"وہ بھی باہر گئی ہیں۔"

"شنو جی بھی نہیں؟"

"وہ سو رہی ہیں۔"

"اچھا موسی جی آئیں تو کہہ دیجیے گا کہ ...... میں آیا تھا۔"

"کہہ دوں گا۔"

اور اس چرمر کے ساتھ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ موٹر سائیکل غلیظ رستے واپس ہو جاتی ہے اور بلی کا بچہ پیرا پر آکر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے۔ "میاؤں میاؤں میاؤں!"

فلپس فار لائٹ اینڈ میوزک ——— آصف علی روڈ پر لگا ہوا نی آن سائن ایک نظر پرانی اور ایک نظر نئی دلی کو دیکھ لیتا ہے ......

فلپس والی آنکھ سے اسے ترکمان گیٹ کے اندر سڑک پر بچھی ہوئی چارپائیاں نظر آتی ہیں اور لائٹ اینڈ میوزک والی آنکھ سے منٹو برج کے اس پار کی مسکراہٹ، جس کے سامنے اس کو اپنا وجود پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ایک آنکھ جذبۂ ہمدردی سے اداس ہو جاتی ہے اور دوسری نفرت سے۔

دوکانیں بند ہونے کے ساتھ ساتھ گیٹ کے اندر سے چارپائیوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ سڑک سڑک نہیں رہتی ایک پرانی حویلی کا آنگن بن جاتی ہے۔ ایک چارپائی پر چار آدمی تاش کھیلتے ہیں، دوسری پر کچھ لوگ سیاست کی کھال نوچتے ہیں۔ گھروں کے اندر سے دودھ اور پانی کے گلاس وہیں چارپائیوں پر پہنچا دیے جاتے ہیں، پان کے بیڑے تین تین چارپائیاں آگے تک پیش ہوتے ہیں۔ حلوائیوں اور پنواڑیوں کی دوکانوں کے باہر چار چار، چھ چھ اکٹھا ہو کر ریڈیو سنتے ہیں، شعر و شاعری کرتے ہیں۔ کچھ مکانوں کی نیچی کھڑکیوں سے جھانکتی لڑکیاں مسکراتی رہتی ہیں۔ شعر و شاعری کا مطلب سمجھ میں نہ آئے۔ اشعار ضرور ان کی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ بھس بھس بھس کی آواز سے سوڈے اور کوکو کولا کی بوتلیں کھلتی ہیں اور نمک مرچ ملا کر نیمو نچوڑ کر گھروں کے اندر بھیج دی جاتی ہیں۔ باہر کے لیے اصلی عرق گاؤ زبان میں اصلی زعفران ملایا جاتا ہے۔ ایسے میں کچھ لوگ باہوں میں باہیں ڈالے کانوں میں عطر کی پھریری لگائے یہاں سے وہاں جھومتے پھرتے ہیں۔

دیکھو ہمیں آواز نہ دینا

او بے درد زمانے

معلوم ہوتا ہے یہ سب کے سب حویلی کے مہمان ہیں۔ ایسے مہمان جنھیں اپنی مہمان نوازی خود کرنا ہوتی ہے۔ حویلی کا مالک کوئی نہیں ہے۔ سیکڑوں برسوں سے نہیں ہے۔ مہمان آئے ہوئے ہیں اور ڈٹے ہوئے ہیں۔ انتظار میں ہیں کہ ایک نہ ایک دن حویلی کا کوئی وارث آئے گا اور آ کر ان کا حال چال پوچھے گا۔ اس دن وہ سب اس سے شکایت کریں گے۔ سب مانگیں پوری کروا لیں گے پچھلے کھاتے وصول کر لیں گے۔

اور سڑک پر دوسرا کورس شروع ہو جاتا ہے۔

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ایک انجان مسافر سے ملاقات کی رات

اپنی دوکان کے اونچے چبوترے پر چارپائی لگا کر لیٹا ہوا ایک

ادارہ

شام و سحر کے درمیان
بھوپال

(پس منظر پیش منظر)

شام و سحر کے درمیان —— بھوپال۔ شائع ہوتا تھا کہ بھوپال کے علمی اور ادبی حلقوں سے احتجاج، افسوس، مصنف پر اعتراضات اور اس کی نیت پر شبہ کے اظہار کے خطوط کی دفتر کتاب میں یورش شروع ہو گئی۔

دراصل "کتاب" نے یہ سلسلہ مانگے کا اجالا، کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ ہاں یہ خیال ضرور تھا کہ اس سلسلہ کے چند اچھے مضامین مستعار لیکر چھاپنے کے بعد اردو کے ادیبوں سے ایسے شہروں پر مضامین لکھائے جائیں گے جن کی نمائندگی نہیں ہو سکی ہے۔

عروس البلاد بھوپال اپنے تہذیب تمدن، ادب، شعر و شاعری، جامع مسجد، مسجد آصفیہ اور تاج المساجد ایسی عظیم الشان مسجدوں، بھوپال تال، شملہ ایسی خوبصورت بستی، شری بھوپالی، اور تخلص بھوپالی ایسی زبردست ادبی شخصیتوں، رشید ایسے ہاکی کے کھلاڑیوں اور جگر مرحوم کے طویل تعلق اور متعدد دیگر وجوہ کی بنا پر ملک کا ایک ممتاز اور پُر وقار شہر ہے۔

شرد جوشی کا اپنے مضمون کے ناخوشگوار حصوں پر اظہار افسوس کرنا اور اس چھوٹی خود داری اور انا کو دیوار نہ بننے دینا جو ایسے موقعوں پر کہیں سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، بھوپال کی عظمت اور وسیع القلبی کا ایک اور ثبوت ہے۔

زیر نظر مضمون پر غور و خوض کرنے کے لیے بھوپال کے ڈیڑھ سو ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور سماجی کارکنوں کا ایک جلسہ مشہور افسانہ نگار حضرت کوثر چاند پوری کی صدارت میں ہوا جس میں شرد جوشی نے اپنے مضمون کی وضاحت پیش کی۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنی کا نہایت صدق دلی سے جائزہ لیا۔ اور اہل بھوپال نے نہ صرف اس وضاحت کو تسلیم کیا بلکہ اس بات کا بھی اعتبار کیا۔ جہاں تک شری شرد جوشی کی نیت اور فنکاری کا سوال ہے، شرکائے جلسہ کی بڑی بھاری اکثریت نے اس پر شک و شبہ کرنے سے گریز کیا ہے اور اس کو تلخ و تند کے ساتھ شیریں بھی تسلیم کیا ہے —— (شعلہ حیات۔ بھوپال)

ہم ذیل میں شرد جوشی کے تحریری بیان کے بعض حصے پیش کر رہے ہیں۔ اس امید کے ساتھ۔

آملیں سینہ چاکان وطن سے سینہ چاک
اس طرح ہم ایک ہو جائیں کہ سب دیکھا کریں

میں پوری طرح محسوس کرتا ہوں کہ جس موضوع پر میں لکھنے بیٹھ گیا تھا، میں اس پر اتھارٹی نہیں ہوں، مجھے بھوپال میں آئے پانچ سال کا عرصہ ہوا۔ کسی شہر کو صحیح روپ میں سمجھنے کے لیے یہ عرصہ بہت کم ہوتا ہے۔ اور کسی شہر کے اتہاس، سماجی اور تہذیبی زندگی کی گہرائیوں کا اتنی جلدی مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طرف اس ناتجربہ کاری

کے ساتھ ہی مجھے اس شہر سے بہت گہرا پریم ہو گیا جس محبت سے مجھے یہاں کے سماج نے خاص طور سے اردو کے ساہتیہ نے، میرے مسلمان دوستوں نے مجھے اپنے پاس جگہ دی وہ میرے لیے عزت کی بات تھی بلکہ میرے فن کے اس وشواس کو مضبوط بناتی تھی کہ انسان سب سے بہتر ہیں لیکھکوں کی کوئی ذات

"گرم تو ہے ؟"

"ہاٹ پیچ ۔"

"تمہیں کوئی چیز پسند بھی آتی ہے ؟"

"تم اس طرح چلاتے کیوں ہو ؟"

"میں چلاتا ہوں ؟"

"اور نہیں تو میں چلاتی ہوں ؟"

"کسی سے پوچھو کون چلا رہا ہے ۔ تمہارے سر پر اچانک بھوت کیوں سوار ہو جاتا ہے ؟"

"بھوت سوار ہو جاتا ہے یا تم سوار ہو جاتے ہو ۔"

"اچھا اب تم کافی ختم کر دو ......"

"مجھے نہیں پینا ہے کافی ۔ یہ رہی کافی ۔" اندر واپس گئی "کافی واپس ہو جاتی ہے ۔ گاڑی چل دیتی ہے ۔ ایوننگ اِن پیرس میں ملی جلی پیڑول کی خوشبو گلاب اور موتیا کے گجروں پر بیٹھنے لگتی ہے ۔ گجرے بیچنے والا لڑکا ایک ہاتھ میں ٹوکرا سنبھالے دوسرے ہاتھ میں ایک گجرا لہراتا ہوا بھونچکا سا گاڑی کی لال روشنی کو دور جاتے دیکھتا رہتا ہے ۔ پھر فضا میں لمبی سانس لے کر چیختا ہے "گلاب موتیا، موتیا گلاب !"

دوسرے شو کی بھیڑ سینما گھروں سے نکل کر چلی جاتی ہے اور چمکتی ہوئی سرمئی سڑکیں رات بھر کے لیے خاموش اداسی میں ڈوب جاتی ہیں ۔

صرف کہیں کہیں آرکسٹرا کی دھن سنائی دیتی ہے گھنے جنگل میں آدی واسیوں کے سنگیت کی طرح ۔ ہرنیوں کے جوڑے آواز کے اس جادو کی طرف کھنچے آتے ہیں اندھیرے سے اجالے میں بھیڑ بڑھتی جاتی ہے ۔ بھری ہوئی میزوں پر خالی پیالیاں نظر آتی ہیں اچھلتے ہوئے لکڑی کے فرش پر تھرکتے ہوئے پیر ....

ٹوِسٹ ، ٹوِسٹ ، ٹوِسٹ ....

پیروں کو ٹوِسٹ کرو ۔ بانہوں ، کندھوں اور ٹانگوں کو ٹوِسٹ کرو ....

"یہ لڑکی .... ؟"

"...... سفارت خانہ میں کام کرتی ہے ۔"

"اور اس کا پارٹنر .... ؟"

"اسے نہیں جانتے ؟ .... منسٹری میں انڈر سکریٹری ہے تقسیم سے قبل لاہور میں ٹریڈ یونین اِسٹ تھا ۔ آج کل اس کی مسٹر ایکس سے بڑی دوستی ہے ۔"

"مسٹر ایکس کون ؟"

"اخبار نہیں پڑھتے ؟ مسٹر ایکس جو دہلی کے ڈاکٹر وارڈ ہیں ۔"

"یعنی ....."

"ڈاکٹر وارڈ آف کیپٹل اینڈ پروفیومو فیم ....."

"آسی سی ۔"

"تم کیا لوگے ؟ سم تھنگ ہاٹ لائک کیلر ؟"

"تو سم تھنگ کولڈ لائک پروفیومو ۔"

خاموش سڑکوں پر سے کبھی کبھی اکا دکا ٹیکسیاں اور موٹریں گذر جاتی ہیں ۔ کسی ٹیکسی سے پھینکی ہوئی بیئر کی خالی بوتل بجلی کے کھمبے سے ٹکرا جاتی ہے ۔ تمہارے ڈرائی ڈے کی ایسی کی تیسی ..... دن میں ہوسٹل کے لوہے کے پھاٹک کے باہر ایک کمزور آواز دستکیں دیتی ہے ۔

"چوکیدار ! .... چوکیدار !"

جواب میں سڑک پر لگے پیڑوں پر پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی ہے ۔ مہین آواز تیز ہو جاتی ہے ۔

"چوکیدار ! ..... چوکیدار !"

اور ہمایوں کے مقبرے سے اڑ کر چمگادڑ نئی دہلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے روڈ سائن پر آ بیٹھتا ہے ۔

اپنے باذوق دوستوں کے پتے ہمیں ارسال کیجیے ، ہم انہیں نمونہ کا پرچہ بھیجیں گے اور کتاب کی خریداری قبول کرنے کی درخواست بھی کریں ۔

کروں گا مجھے کوئی ہندو روک نہیں سکتا۔ مجھے کوئی مسلمان بھی غلط سمجھے ......

میں جانتا ہوں کہ یہاں کی زندگی کا وہ پہلو جو سماجی اخلاقیات اور جنس سے تعلق رکھتا ہے اس بارے میں میری ساری جانکاری کانوں سنی ہے۔ میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میں نے جو سنا وہ سچ مان لیا یہ میری غلطی ہے۔ مجھے کسی ذمہ دار آدمی سے تصدیق کرنا چاہیے تھی اور اس سے بھی ضروری تھا کہ میں لکھنے سے قبل سوچتا۔ کیا وہ سب دینا ضروری ہی ہے، اس پر غور کرتا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں ایک شہر کے سوشل اور جنسی اخلاقیات کے نازک پہلو پر یوں لکھ گیا۔ جیسے اختیاری ہوں اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے کہ وہ صرف مسلم فرقے سے متعلق معلوم ہونے لگا۔ یہ میری بے وقوفی ہے جسے بدنیتی سمجھا جا رہا ہے۔ میں ان سب باتوں کو پرے ہٹا کر بھی بھوپال کی رات کا ذکر کر سکتا تھا، مجھے یہ ہیرشن۔ رہ گیا کہ کسی نے کہا تھا بھوپال کی بیگموں کے بارے میں کہ ان کے یوں قصے تھے، مگر یہ ضروری تھا کہ میں سوچتا کہ جب لکھوں گا تو اس میں وہ قدسیہ بیگم بھی آجائیں گی جو گنگا کی دھارا کے سمان مقدس تھیں۔ اس میں وہ شاہ جہاں بیگم بھی آجائیں گی جو رادھا کرشن پر بدرجہ عقیدت تھیں اور ہندی کا مہان کوی بہار تیند دجن کا نام سمان سے لیتا تھا میرے لکھے ایک پیراگراف کا تعلق کتنا گہرا ہو سکتا تھا، اس کا میں نے اندازہ نہیں لگایا تھا۔

خواتین برقعوں میں کھٹکتی ہیں، میرے لکھنے میں کوئی ایسا سیدھا جملہ نہیں آیا ہو پر اشارہ یہ نکلتا ہے کہ ان کا کھٹکنا کوئی خاص معنی رکھتا ہے، یہ غلطی ہے۔ ایسا مطلب اس میں نہیں آنا چاہیے تھا مگر آگیا اس کا مجھے سخت افسوس ہے، کل بیٹی بہنا بھی شام کو بازار سے گزرے گی یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے گی، تب اگر اس کے آنے جانے کو کوئی بدنام کرے گا تو مجھے چوٹ لگے گی۔ وہ سب جو گزرتی ہیں وہ سب کسی کی بیٹی ہیں، کسی کی بہن ہیں کسی کی ماں ہیں ......

لکھنا تلوار کی تیز دھار پر چلنے کے مترادف ہے، اس میں چوک ہونا کم خطرناک نہیں۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں، میں شرمندہ ہوں اور مجھے بہت افسوس ہے کہ مجھ جیسے ایک ایسے لیکھک سے جو ابھی تنگ ذہن سے نہیں سوچتا۔ ایک بھول ہو گئی۔ مگر میرا وشواس ہے کہ بھوپال کا سماج غلط نہیں ہے، وہ اس نوجوان لیکھک کو معاف کر دے گا۔ جو ابھی لکھنا سیکھ رہا ہے۔

آپ لوگ آج سب جمع ہیں۔ میری درخواست ہے آپ اس انجمن میں پڑھ گئے۔ مجھے پوری امید ہے جب آپ اپنے گھروں کو لوٹیں گے تو آپ کے من میں وہی مقدس بھاونا ہوگی جو ایک غلطی کو معاف کر دینے کے بعد ہر بڑے دل میں آتی ہے۔

اس جلسہ میں جو ادارہ مرکز ادب، بزم صبح ادب کے بینر کے تحت ہوا، کوثر چاندپوری کی صدارت میں ہوا تھا۔ شفا گوالیاری۔ مولانا وحید الحسینی (قاضی شہر) پروفیسر اکھلیش کمار۔ محمود الحسینی (مدیر روزنامہ ندیم) ایم عرفان (جنرل سکریٹری صوبائی انجمن ترقی اردو) جگموہن راوت (ہندی شاعر) اختر سعید (ایڈوکیٹ) دشینت کمار (ہندی شاعر) (اسسٹنٹ ڈائرکٹر لینگویجز) آصف شاہمیری (صدر سوشل ورکرس یونین) بابو متھرا پرشاد (کمیونسٹ رہنما) اظہر سعید (ایڈوکیٹ) اشتیاق عارف (مدیر روزنامہ افکار) دامودر سدن (ہندی لیکھک) قمر جمالی (مدیر ہفت روزہ بھوپال ٹائمز) محمد علی تاج، مقصود عمرانی، شاہد اختر، مقصود عرفان، اسلام الحق ارمان، شرد جوشی، عشرت قادری اور واحد پریمی اور شہر کے دیگر ممتاز افراد نے شرکت کی۔

نہیں ہوتی، وہ سب ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں یہاں آکر اردو ادب کا میرا مطالعہ بڑھا جس سے ہندی میں میری تحریروں کو طاقت ملی اور ساتھ ہی اردو کے ادب پاروں سے میں نے کئی باتیں سیکھیں۔ میری زندگی میں اس سے زیادہ تکلیف کا کوئی وقت نہیں ہو سکتا کہ آج میں خود ہی اس بات کے لیے الزامی ٹھہرایا جاؤں کہ میں نے اس خوبصورت اور پیارے شہر کی شان کے خلاف کوئی بات لکھی۔ جس سماج نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی میں نے اس کو ٹھیس پہونچائی؟ اور جن بہناؤں نے مجھے ماں اور بہن کے پیار سے دیکھا انھیں میں نے بدکردار سمجھا۔ پچھلے دنوں شہر میں گھومتے سمے مجھے عزیز دوستوں سے اس بارے میں بات کرنے کا موقع ملا ـــــ مجھے بدھائی دینے والے بھی ملے۔ اور اجنبی سے، تلاش اور رد کھی نظر ڈال کر گذر جانے والے بھی ایک بھی ایسی تلاش نظر کے سامنے مجھے ملی بدھائیاں بے کار ہیں۔

آج آپ جب یہاں میٹنگ میں آئے ہیں تو حالانکہ میرے من کو بہت چوٹ لگی ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ میری رچنا پر وچار کرنے والے آپ سب کا یہاں آنا قدرتی بات ہے آپ ہی لوگوں نے میری ابھی، رچناؤں پر میری پیٹھ ٹھونکی ہے اور میرے افسانوں کی تعریف کی ہے جو پریم کرتے ہیں۔ انھیں ہی ناراض ہونے کا حق ہے۔ مجھ سے اگر لکھنے میں بھول ہوئی ہو تو آپ ہی ہیں جو اس کی طرف اشارہ کریں گے۔ ہر ایسا سماج جو بیدار ہو کر وہ سوچتا ہے، وہی سماج لیکھک کو راستہ دکھاتا ہے۔ لیکھک کا درجہ بڑا ہوتا ہے پر وہ سماج سے بڑا نہیں ہوتا۔

آج میرے بارے میں وچار کرتے سمے میرا وشواس ہے کہ آپ اپنی پرخلوص زندہ دلی کو قائم رکھیں گے۔ ناراضی کے بھاؤ میں آپ ویسی ہی بھول نہ کر بیٹھیں گے جیسی کہ یہ رچنا لکھتے سمے مجھ سے ہو گئی ہے۔

یہ مضمون لکھنے کے لیے میں ایک رات تین بجے تک اور دوسری رات بارہ بجے تک بھٹکا اور میں نے یہ کوشش کی کہ میں یہاں کی رات کی سچی اسپرٹ کو پکڑ سکوں اور اس کی ماحول کی تصویر کشی کروں۔

برسات کی اس رات میں پاگلوں کی طرح بھٹکتے ہوئے میں نے اس شہر کو مختلف زاویوں سے دیکھا تالاب، دور سے چمکتی روشنیاں، ڈھلوان راستے، تنگ گلیاں، محرابیں، گنبد، پیڑ اور رفیقوں کے جلوس یہ سب اسی دن کے عکس میں جو میرے دماغ پر پڑے پر اسی کے ساتھ وہ دوسری باتیں جو میں نے وقت بوقت بھوپال کی راتوں کے بارے میں سنی تھیں میرے دماغ میں ابھرنے لگیں۔ ان سب کے ساتھ میرے میلوں بھٹکنے کی تھکن، قلم ہاتھ میں لیتے وقت میرے من پر آشکارا جو چیز چھا رہا تھا اس میں تھا ایک پرسکون حال، اندھیرے اور روشنیوں کے بکھرے نظارے، مسجد اور محرابیں کے آثار، ایک شہر کے جان دار اتیت کی یاد، فیوڈل ازم۔ اس کے اثرات غریبی، شاعری، لطیفے، قہقہے، بے کاری، بیماری اور اس کے بیچ میں اپنی شخصیت قائم کرنے کا جذبہ۔

شاید یہ میری ناتجربہ کاری ہے کہ سندرتا کا بیان کرتے وقت میں بہک گیا۔ اور زیادہ لکھ بیٹھا، پر میرے دماغ میں جو کینوس تھا اس میں اس کھوئی کی بھی تصویر تھی جو ٹھنڈی رات میں کانٹے ڈالے بیٹھا ہے، اس ماسٹر کی بھی جو پلیٹ فارم پر بیٹھا ہے اور ان لڑکیوں کی بھی جو نیگور رال سے ہوسٹل کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ ان ساری تصویروں میں جو کچھ تھا صحیح ـــــ غلط میرا آرٹسٹ ہی تھا۔ میں اس پورے وقت ایک لمحے کو کسی ذات، دھرم یا طبقے کے خلاف نہیں رہا۔ میں نے بھوپال کو مجموعی طور پر سمجھنے کی کوشش کی اور ہندو مسلمان کی بات ذرہ بھر میرے دماغ میں نہیں آئی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر کوئی مسلمان ادیب اجین کی راتوں پر لکھے تو وہاں اسے مندر کی گھنٹیاں، شپرا کے گھاٹ، سادھوؤں کے ہٹ جھونپڑیاں، کنگورے، بھکاری، چلم، گانجا، بھنگ اور وہ سب باتیں لکھنا پڑیں گی۔ اس میں وہ پجاریوں اور پنڈتوں کی خود غرضی سے بھی اپنی نفرت آسانی سے ظاہر کر دے گا۔ اس وقت اگر کوئی قاری صرف ہندو بن کر سوچے اور اس مسلمان لیکھک کو گالی دے تو وہ اس لیکھک میں چھپے آرٹسٹ کو سمجھنے میں گہری بھول کرے گا۔ آرٹسٹ جسے مندر کی گھنٹیاں اچھی لگتی ہیں، جسے کلس سہانے لگتے ہیں مگر جو کسی پجاری سے پیسہ نوچنے پاکھنڈی کو دیکھ کر ناراض ہو جاتا ہے، اس کمبخت شرد جوشی کو بھی روز دفتر سے پیدل لوٹتے وقت وہ ادھ بنی مسجد بہت پیاری لگتی ہے، میں انسان ہوں اور کسی چیز کو محبت سے دیکھنا میرا حق ہے۔ میں اس حسن کا بیان

اندازہ ہوگا کہ کشمیری دیپ اور ان کے جیسے دوسرے سائنس داں افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کو ایک نیا رخ نیا پہلو دیا ہے جس سے تو انہی ہی کے الفاظ میں "ان تمام تجربات کو ایک ساتھ رکھ کر مجموعی شعور انسانی کائنات کو زیادہ وسیع پس منظر میں دیکھ سکتا ہے"

عثمان غنی

شکستِ شب محسن بھوپالی | صفحات ۱۲۰ ، قیمت ۲ روپیہ ، ملنے کا پتہ "نکہت" امن۔ ٹھنڈی سڑک، حیدرآباد (پاکستان)

محسن بھوپالی ان شاعروں میں ہیں جو شاعری میں نئی تجربات سے زیادہ صحت مند ترقی پسندانہ خیالات کے اظہار کو اہمیت دیتے ہیں لیکن ایسا کرتے وقت فن کی نزاکتوں اور خوبیوں کا بھی احترام کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے اس پہلے شعری مجموعہ میں جو گزشتہ دس بارہ برسوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہو تقریباً تمام نظمیں، غزلیں اور قطعات سیاسی نوعیت کے ہیں جبھی وہ ایک ایسے نظام پر طنز یا نکتہ چینی کرتے ہیں جو عوام کے استحصال کو جائز تصور کرتا ہو اور کبھی ان لوگوں کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں جنھیں اس نظام کے جبر و تشدد کا شکار ہونا پڑتا ہو۔ یہ سیاسی شاعری جیسے ممتاز حسین صاحب نے جن کی مختصر رائے کتاب کے شروع میں شامل ہو شعوری شاعری کہا ہے زیادہ اعلیٰ معیار کی نہیں لیکن دو باتیں خاص طور سے ایسی نظر آتی ہیں جن سے توقع ہوتی ہے کہ آگے چل کر اس رنگ میں زیادہ گہرائی اور وسعت پیدا ہو جائے گی۔ ایک تو جذبے کی صداقت اور بے پناہ خلوص جو ہر نظم میں موجود ہے اور دوسری بات یہ کہ ادھر تین چار برس کی نظمیں اور غزلیں ان کی ابتدائی دور کی نظموں اور غزلوں سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان میں نعرہ بازی کی فضا کم اور فکر و نظر کی سنجیدگی اور گہرائی زیادہ ملتی ہے خاص طور سے "میری نگارگیتی"۔ "دشتِ تنہائی"۔ اور "مایوس اندھیرا" جیسی نظموں میں۔

منظر سلیم

موصولات ہند پونڈ ساگر، ستیش بترا • آواز تو پہچانو، رام لعل • نوائے کفر، منور لکھنوی • اشرف المخلوقات ڈاکٹر سید اختر احمد • گلشن گفتار، نکات الشعرا کی اہمیت اور تذکرۂ میر، ایم کے فاطمی • ورق ناخواندہ، ملک موج اور ساحوی عبدالعزیز خالد

پوسٹ مارٹم اور شیطان جاگ اٹھا۔ تخلص بھوپالی

کتاب، لکھنؤ

تبصرے

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کاجل اور دھواں ۔ مصنف بشیشر پردیپ لکھنؤ
افسانے
ناشر ادارہ ترقی اردو امین آباد
ملنے کا پتہ ۔ صدیق بک ڈپو لکھنؤ ۔ قیمت ½۲ روپیہ

"انسان کائنات پر زمان و مکان کے اس لمحہ اور مقام سے ہی نظر ڈال سکتا ہے جہاں وہ کھڑا ہے اور وہ اس لحاظ سے خود مرکزیت پر مجبور ہے کیونکہ یہی قیمت ہے جو وہ جاندار ہونے کی ادا کرتا ہے ۔ اس لئے اس کی نظر محدود اور داخلی ہونا لازمی ہے اور اگر تمام انسان ایک دوسرے کی ہو بہو نقل ہوتے جیسے کسی مشین کے ڈھلے ہوئے پرزے تو ہی نوع انسان کا ادراکِ حقیقت بہت محدود ہوتا۔ لیکن خوش قسمتی سے ہماری درماندگی اتنی شدید نہیں کیونکہ فطرت انسانی کی یکسانیت کا رزار ان کی شخصیات کے تنوع سے ہوتا ہے ۔ ہر شخصیت اپنے میں کوئی جز عدیم المثال رکھتی ہے اور ہر شعبۂ زندگی اپنا الگ تجربہ، نظریہ اور رویہ مثلاً کائنات کے بارے میں ایک رویہ ڈاکٹر کا ہو سکتا ۔ ایک ریاضی داں کا ایک بحر پیما کا، ایک کسان کا تاجر کا، اور ایسے ہی ہزاروں قسموں کے رویہ ہو سکتے ہیں۔"

مندرجہ بالا طویل اقتباس برطانی مورخ اور دانشور ٹوائن بی کی کتاب "مذہب مؤرخ کے نقطۂ نظر سے" لیا گیا ہے ۔ اور اس کو نقل کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس تجربے کی اہمیت کو اجاگر کیا جا سکے جو بشیشر پردیپ اور ان کے قبیل کے دوسرے افسانہ نویس اردو میں کر رہے ہیں ۔ یہ تجربہ ہے سماجی حقائق کے سائنسی ادراک اور ان کے اظہار کی۔

بشیشر پردیپ کا پیشہ ہی سائنس ہے اور ان کی ذہنی تربیت ایک سائنس داں کی طرح ہوئی ہے ۔ جو روایتی ادبی تربیت سے خاصی مختلف ہے ۔ ان کا شغل افسانہ نویسی ہے۔ "کاجل اور دھواں" ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو پہلے مجموعہ کی اشاعت کے لگ بھگ ۲ برس بعد شائع ہوا ہے ۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ۔ یہ افسانے سائنسی ادراک اور جذباتی احساس سے پیدا ہوئے ہیں ۔ چنانچہ ہم کو ان کے افسانوں میں اکثر و بیشتر فطرت انسانی کی گتھیوں، اس کے تعصبات، توہمات پر، جو صدیوں کے سفر کی گھٹی ہوئی گرد ہے، ایک تفصیلانہ نظر ملتی ہے ۔ "دشمن" ہی کو لے لیجئے ۔ جدید ادوار میں دولت اکٹھا کرنے کے نئے جنون اور اس جنون کے محرک سماجی حالات نے انسان کو فطرت اور قوانین فطرت سے مقابلے پر اور خود اپنے سے لڑنے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ نیند تک کو اپنا دشمن سمجھنے لگا ہے ۔ اس سوال پر بشیشر پردیپ نے اپنی تمام سائنسی سمجھ اور جمالیاتی حسن کے ساتھ نظر ڈالی ہے اور کامیاب نظر ڈالی ہے ۔ "خون کی بوتل" "مصنوعی آنکھ" وغیرہ بھی اسی رویہ کا نتیجہ ہیں ۔

اگر بشیشر پردیپ کو بحیثیت مجموعی اردو افسانے سے الگ کر کے دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نظر ان معنوں میں محدود ہے جن میں ٹوائن بی نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے ۔ لیکن اگر پورے افسانوی سرمایہ پر نظر ڈالیے تو یہ

کتاب، لکھنؤ

توجہ دیں تو خواہ اردو کو فائدہ نہ پہونچ سکے یہ طے ہے کہ وہ خود خسارے میں نہ رہیں گے۔

شمیم حنفی - الہ آباد

سابقہ شماروں سے بہتر

اس بار نومبر کا شمارہ مجھے بڑی دیر میں ملا۔ پہلا مضمون جناب رام لعل صاحب کا افسانہ — "مائی مراداں" نظر سے گزرا۔ صاحب نگارش نے سیدھے سادے لفظوں میں انسانی فطرت کے گوشوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ فسادات نے کس کس طرح کے انقلابات سے انسانوں کو دوچار کیا۔ اس کی تفصیل بہت طویل اور عبرتناک ہے۔ اس کے تصور ہی سے روح انسانی کانپ جاتی ہے۔ افسانے کی ترتیب میں بعض جگہ اسلوب بیان نے الجھاؤ پیدا کرنا چاہا مگر افسانہ نگار کا چابکدست قلم ایسے خطرناک موڑ پر پہونچ کر پھر سنبھل گیا۔ مثلاً "ایک لڑکی اپنی بالٹی کا سوراخ درست کرانے سندر کے پاس آتی ہے۔ اس کا خوبصورت مکھڑا سونے کی طرح دمک رہا ہے، اس کے عارض نازک آگ کے انگاروں کی مانند دہک رہے ہیں۔ سندر نے اس کو غور سے دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کے گال پر چٹاخ سے ایک — چمی — لے پھر پہلے ہی وہ شعور جاگا جو تھا کہ کھڑی ہو لیکن اس نے اپنی اس خواہش کو دبا کر اس کا کام کر دیا۔"

قاری کو یہاں پہونچ کر غیر مہذب الفاظ کے بے ڈھنگے پن پر ایک جھٹکا سا لگتا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ذرا ہی مضمون نگار — عزت نفس کا باز مقام کر فضا کو تبدیل کرنے کے لیے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے اخلاص آگیں جذبے کو شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس نے جس طرح محسوس کیا۔ اس کو سیدھی سادی زبان میں اظہار کر دیا۔ یہی فنکار کی ذاتی شخصیت اور مطالعہ کا ایک لطیف پہلو ہے جس کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نفسیاتی لحاظ سے کہانی دلچسپ ہے افسانے کا ارتقائی سلسلہ اپنے موضوع کی صحیح نشاندہی کرتا آخر تک چلا جاتا ہے۔ نفسیاتی تحلیل ایک مشکل فن ہے۔ جسے ہر افسانہ نگار نہیں نبھا پاتا لیکن رام لعل صاحب نے اس چیز کو ہاتھ جانے نہیں دیا ہے۔ یہی افسانے کی تکنیک ہے۔

حصہ نظم بھی خوب ہے۔ البتہ رسالے کا افسانوی پلڑا دوسرے مضامین پر بھاری ہے۔ شہزاد منظر کا مضمون "ہندستان کا لسانی مسئلہ" بڑا فکر انگیز مضمون ہے۔ طنز و مزاح بھی اپنی اپنی جگہ اچھے اور دلچسپ مضامین ہیں۔ جناب آثر لکھنوی کی غزل میں وہ سب کچھ ہے جو ایک غزل گو شاعر کے کلام میں ہونا چاہیے۔ صادق موہلی کی پیروڈی دلچسپ ہے۔ جناب آنند نرائن ملا کی نظم — "اندھیر نگر میں دیپ جلیں" ایک ایسی نظم ہے۔ جو حقائق سے لبریز ہے۔ ذہن انسانی ایک مرکز پر قائم نہیں رہتا۔ وقت کے ساتھ زندگی کے طویل لمحات میں کروڑوں نئے نئے خیالات پیدا کرتا رہتا ہے۔ شاعر کے جذبات انہیں الفاظ کا جامہ پہناتے رہتے ہیں۔ نئی پرانی قدریں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں جس کا اثر شاعر کے ذہن پر مختلف طریقوں سے پڑتا ہے۔ ملا صاحب بھی اس جذبے سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ اس آزاد نظم میں انھوں نے "اندھیر نگر" کو منور کرنے کے لیے جن خیالات کے دیپ جلائے ہیں۔ کاش ہمارے دیش کے باسی ان کی رہنمائی میں قدم اٹھا سکیں

ملا صاحب کی شاید اس طرز جدید کی یہ پہلی نظم ہے جو میری نظر سے گذری ہے۔ نظم قافیہ و ردیف کی مستقل شرمندۂ احسان نہیں ہے البتہ جہاں جہاں قافیہ، ردیف باہم دگر ہوئے ہیں۔ کچھ کانوں کو اچھے نہیں لگتے۔ قصہ مختصر "کتاب" کے تمام مضامین معیاری ہیں۔ نومبر کا شمارہ ہر حیثیت سے اپنے سابقہ شماروں سے بہتر اور ممتاز ہے۔ میری نیک خواہشات "کتاب" کے ساتھ ہیں۔

آخر میں پھر گزارش کروں گی کہ قصے کہانیوں کے مقابلے میں تنقیدی اور معلوماتی مضامین زیادہ شائع فرمائیں خواہ وہ افسانوی ادب سے متعلق ہوں یا شعر و شاعری — یا سفرناموں سے ؟؟!

شاید بہ در ملے تو گفتم حکایتے
یکبار عرض حال ہمی تواں کشید

صہبا اختر صدیقی - ردولوی

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے۔

جس کی بہار یہ ہو

انتخاب کی دشواریوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ساتھ ہی لیکن اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ۱۹۶۲ء کے جملہ مطبوعہ افسانوں کا آپ کے سامنے ہونا قریب قریب ناممکن تھا، پھر اپنی اپنی پسند اور معیار میں اختلاف ہونا بھی ناگزیر ہے، تاہم اگر ۱۹۶۲ء کے آپ کے خیال میں یہی بہترین افسانے ہیں تو یقیناً اردو کے افسانوی ادب کے لیے یہ سال بڑا ہمت شکن اور صبر آزما تھا۔

تلخ — تند — شیریں

طفلانہ جذباتیت

یہ قاضی عبدالستار، اختر الایمان، جرم راوی، "یادیں"، نظم اور نثر کی بحث اب مضحکہ خیز شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ بعض اوقات یہ دیکھ کر واقعی ہنسی آتی ہے کہ بظاہر اچھے خاصے سمجھدار لوگ بھی ہر مسئلے پر غور کرتے وقت بڑی طفلانہ جذباتیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق یہ حضرات "اپنی ناک سے پرے" دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔

دن بہ دن رونما ہونے والی سائنسی ایجادات، سیاسی شعبدہ بازیوں اور علمی و تہذیبی رشتوں نے جغرافیائی اعتبار سے اچھی خاصی بڑی نظر آنے والی یہ دنیا بہت مختصر کر دی ہے۔ ہم سب ایک بڑی انسانی برادری میں شامل ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمیں کوشش یہ کرنی ہے کہ اپنی زبان و ادب کی معذوریوں اور حدود کے احساس سے افسردہ دل شکستہ ہونے کے بجائے اسے اس منزل تک لائیں جہاں کچھ تو اپنے پجاریوں کی ریاضت اور کچھ اپنے دیوتاؤں کی عنایت کے باعث دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانیں اور ان کے ادب پہونچ چکے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں نظم و نثر دونوں طرف توجہ کرنی ہے۔ نظم ہماری زبان کو حسین بنائے گی لیکن اسے سنجیدہ، پائدار، پرشکوہ اور باوقار بنانے کے لیے ہمیں نثر کا سہارا لینا ہوگا۔ اردو کو ہمیں محض ادبی نہیں بلکہ علمی زبان بنانا ہے۔ اس اعتراف میں شرمندگی تو ہوتی ہے لیکن اس سے بھلا انکار کیونکر ہو سکتا ہے کہ جدید دور (ہندستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) سے پہلے اردو کو علمی زبان بنانے کے سلسلے میں جو کوششیں کی گئیں وہ ناقص بھی تھیں اور ناکافی بھی۔ زندگی کی رفتار تیز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس دور میں نئے نئے علوم نے بھی آنکھیں کھولی ہیں۔ آخر ہم کب تک اس ابدی غنودگی میں مبتلا رہیں گے جس نے ہمیں کاہل اور سست رفتار بنا کر علوم کے اس تیزی سے پھیلتے ہوئے دائرے سے آنکھیں چرانے پر مجبور کر دیا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے میں تو اکثر و بیشتر اس خیال میں اپنے ذاتی تجربے کی تائید بھی شامل ہے۔) یہی محسوس کیا ہے کہ اکثر لوگ ادبی جریدے تو بڑے ذوق و شوق سے لیتے ہیں مگر جہاں کہیں سنجیدہ، سپاٹ، خشک اور پیچیدہ و معقول علمی و سائنسی تحریریں نظر آنے لگیں۔ ہمیں نظم کی طرف سے یقیناً غفلت نہیں برتنی چاہیے کیونکہ شاعری زبان سے پیار کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے لیکن تقاضا کہ نظم زندگی کے ان سارے مسائل و موضوعات کا احاطہ نہیں کر سکتی جن کی طرف توجہ دیے بغیر ہم اردو کو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کا ہم پلہ نہیں بنا سکتے۔

یہ بات کہ زندگی کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی قدروں نے ہمیں اختصار پسند بنا دیا ہے اور چونکہ اختصار نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے اس لیے لوگ نثر کے مقابلے میں نظم کی طرف اور اس طرح ناول کے مقابلے میں افسانہ یا مختصر افسانے کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں، میں اس سے متفق نہیں۔ ادھر بڑی تیزی سے خاصے ضخیم ناول لکھے گئے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک برابر جاری ہے۔ آگ کا دریا۔ خدا کی بستی۔ آنگن۔ اداس نسلیں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں اور حیات اللہ انصاری "لہو کے پھول" لکھ رہے ہیں۔ یوں بھی ہم گزشتہ دس پندرہ سال کے نثری سرمائے پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ اس عرصے میں ناول نویسی کی رفتار ہمیشہ کے مقابلے میں تیز تر رہی۔ یہی بات نظم اور غزل کے تقابلی مطالعے میں بھی سامنے آتی ہے۔ غزل کی بہ نسبت نظم سے زیادہ لوگ متاثر ہو رہے ہیں اور مشاعروں میں ذوق اور میر کی، احسان دانش اور مظفر شاہ جہاں پوری سے غزلیں سنانے کی فرمائش کے بجائے مینا بازار، وشنو اوتار، خوشبو کی قید اور شعور آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ساحر سے ہزاروں دفعہ کی سنی ہوئی نظم پرچھائیاں کا تقاضا ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ "یادیں" پر ساہتیہ اکاڈمی کا انعام صحیح ہے یا غلط اس سلسلے میں میں تو بس یہ سوچتا ہوں کہ اکاڈمی کے فیصلے پر مستقل اور لاحاصل غور و فکر میں سر کھپانے کے بجائے قاضیان شہر (خدانخواستہ یہ اشارہ کسی فرد واحد کی طرف نہیں ہے۔) کسی تخلیقی اور تعمیری کام کی طرف

...کے افسانے بے مثل ہیں بہی وہ سحر طراز اہل قلم ہیں جن کی نگارشات
...ت اردو افسانے نے ادب عالم میں اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔
(ڈاکٹر صفدر آہ)

افسانہ نمبر نے ثابت کر دیا ہے کہ اب ہمیں
...ب **تمنائیں** پاکستانی رسالوں کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا خدا
...ے آپ "کتاب" کو اور خوبصورت بنا سکیں۔ تنویر نیر

"کتاب" کا افسانہ نمبر بہت خوب ہے دلی مبارکباد۔
...راُت **سوال** مگر کیا میں اس بات کو پوچھنے کی جرأت کر سکتی
...ے کہ طنزیہ و مزاحیہ افسانوں کو کیوں نہیں جگہ مل سکی؟ راجندر
...ہ بیدی اور خدیجہ مستور کے افسانے بھل، اور ہینڈ پمپ بہت
...ند آئے۔ عابد سہیل صاحب کا افسانہ "وہ ایک لمحہ" بہت
...ا ہے لیکن کچھ الجھا ہوا ہے۔ نورجہاں طلعت، لکھنؤ

عابد سہیل اور رام لعل سے
...اہ کی **بصیرت، روایت کی ڈگر** بھی وہی غلطی ہوئی ہے
...مدیران گرامی کا بالعموم اور نقادوں کا بالخصوص پیشہ ہے۔ یعنی
...کہ انتخاب کا پہلا افسانہ "شانو" (کرشن چندر) ہے حالانکہ
...۱۹۶ کی بہترین کہانی "ہینڈ پمپ" ہے۔ اور "شانو" سے
...ہیں بہتر۔ بات ساری شخصیت پرستی کی ہے ظاہر ہے یہ لازمی
...ہی لیکن جب بات بے لاگ انتخاب کی ہو تو اس سے گریز
...ہی لازم ہے۔

کرشن چندر، ایک قد آور افسانہ نگار ہیں، پریم چند کے
...بعد وہی ایک عظیم افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اردو افسانے کا قیع النظر
...بنایا ہے لیکن پچھلے دنوں ان کی بسیار نویسی نے ایک ریکارڈ بلاشبہ
...قائم کیا ہے اور خود اپنی ہی عظمت شکنی کا بہت ہی برا فعل انجام
...دیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نگاہ بصیرت" کے ساتھ ساتھ
آپ حضرات نے روایت کی ڈگر ہی پر چلنا ضروری سمجھا ہے اور
اور یہ بھی سچی بات ہے کہ روایت شکنی خواہ مخواہ کیوں کی جائے۔ لیکن
صرف عمدگی کی بنیاد پر ترتیب بھی استوار ہوئی تو سچ جانیئے اس انتخاب
کی قدر و قیمت میں جرأت و ہمت کا رنگ بھی شامل ہو جاتا۔ جو اس

کو ایک مشعل راہ بھی بنا دیتا۔ باوجودیکہ یہ سقم کم از کم مجھے کھٹکتا ہے
یہ حقیقت ہے کہ آپ نے انتخاب میں حسن ذوق کا ثبوت اور بے لاگ
فیصلوں سے کام لیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے، اور میں شاید الفاظ
کی وساطت سے اپنے جذبات تحسین کا اظہار نہ کر سکوں۔ ۱۹۶۲ء
کے بہترین افسانے کا عنوان اس انتخاب پر سجتا ہے اور آنے والے
دور کا ہر قاری اس کی ادبی حیثیت (آپ برا نہ مانیں تو کہوں کہ
علمی حیثیت بھی) کے ساتھ ساتھ دستاویزی اہمیت کو تسلیم کرے گا
اور لقدر ظرف استفادہ کرے گا۔
سال کے بہترین انتخابات، کے بیشتر مجموعے یہاں لاہور سے بھی
اکثر آتے رہتے ہیں، لیکن "ملاوٹ" کی اتنی ریل پیل ہوتی ہے کہ
جی گھٹتا ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے جو لکھا ہے وہ میری قاری صفت نقد و نظر کی
صلاحیت کے لیے ایک تازیانے سے کم نہیں، کون ظالم رحمان
مذنب اور منٹو کو ایک تھان سے باندھے گا؟
مشہود انور۔ حیدرآباد

بات شخصیت پرستی کی نہیں، اور اد کے تعین کی ہے کرشن چندر
کا ادبی مقام ان کی کہانی سر فہرست دینے کا محتاج نہیں ہے۔
مرتبین

"کتاب" کا افسانہ نمبر تو آپ نے واقعی خوش
دلی مبارکباد اسلوبی سے نکالا۔ وہ چھپ، وہ سج دھج
کہ ماشاءاللہ۔ انتخاب بھی اچھا ہے گو بعض کہانیوں کی کمی
اور بعض کہانیوں کی شمولیت کے بارے میں اختلاف رائے
ہو سکتا ہے۔ پھر بھی مجموعی طور پر نمبر اچھا ہے طباعت اور
کاغذ بھی بہتر ہو گیا ہے اس کارنامے پر دلی مبارکباد قبول کیجیے
(ڈاکٹر) محمد حسن

تلخ، تند، شیریں کے صفحات
تنقیدی اور فکر انگیز خطوط کے لیے حاضر ہیں۔
ادارہ

کتاب، لکھنؤ

جس کی بہار یہ ہو، پھر اس کی خزاں نہ پوچھ،
میری رائے میں اس نمبر کا عنوان "۱۹۶۲ء کے بہترین افسانے" کے بجائے "۱۹۶۲ء کے ہمارے پسندیدہ افسانے" ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔

آپ نے ستائیس افسانے بقول اپنے قریب دو ہزار افسانوں سے انتخاب کئے ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی مزاحیہ، جاسوسی، یا قومی جنگ، فرقہ وارانہ یکجہتی یا ملک کے دوسرے اہم سماجی اور اقتصادی مسائل سے متعلق نہیں ہے۔ میں افسانوں کو صرف وقتی موضوعات کے پروپیگنڈے کا آلہ کار نہیں بنانا چاہتا ——

لیکن بہرکیف اپنے گرد و پیش کے اہم مسائل سے ایک افسانہ نگار کو متاثر ہونا ہی چاہیئے۔ افسانہ نمبر کے بیشتر افسانے مختلف کرداروں کی ذہنی الجھنوں کے ترجمان ہیں جن میں سماجی شعور کی وسعت اور انسان دوستی کی ہمہ گیری شکل ہمارے نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں زیادہ تر کردار نمائندہ نہیں بلکہ صرف "انفرادی" ہیں۔ یہ رجحان غلط نہیں ہو لیکن اسکی اہمیت ضرور کھٹکتی ہے۔ لیکن اگر ۱۹۶۲ء میں صرف اسی قسم کے افسانے شائع ہوئے جیسے کہ آپ نے انتخاب کئے ہیں تو پھر آپ کے انتخاب کی غلطی نہیں کہا جا سکتا بلکہ خود افسانوی ادب کی بے بضاعتی۔

یہ سب کچھ لکھنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ افسانہ نمبر کا کوئی افسانہ مجھے پسند ہی نہیں آیا۔ جی نہیں۔ ہندوستان چھوڑ دو بل، اللہ کے بندے، پروس پسنٹ، ہینڈ پپ، ماں جی، بھاڑ، عورت، ہنگ آنکھ کا تماشا، بزدل اور شانز (صرف اس حد تک جہاں شانز چلی جاتی ہے) بڑے دلآویز افسانے ہیں اور اپنی دوسری زبانوں کے مقابلے میں بلا جھجک پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس صف میں ہماری بہنیں اپنے بھائیوں کے صرف دوش بدوش نہیں بلکہ ان سے کچھ آگے ہی نظر آتی ہیں۔

رام لعل کا سورج کا بوجھ، عابد سہیل کا وہ ایک لمحہ، خواجہ احمد عباس کا سلمہ اور سمندر، ستیش بترا کا چنگاری، آمنہ ابوالحسن کا میری مینا بھی دلچسپ افسانے ہیں۔

حیات اللہ انصاری ہمارے بڑے بلند پایہ افسانہ نگار ہیں۔ ان کا افسانہ "سربستہ راز" جس کے ساتھ پرچہ ترکیب استعمال شامل ہیں۔ شائع کرکے میں تو یہی کہوں گا کہ آپ نے خود ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ ان کا کوئی دوسرا افسانہ لیا جا سکتا تھا۔ ممتاز شیریں کے افسانے کفارہ کے ساتھ "شرح دیوان" قسم کی کوئی چیز منسلک ہونی چاہیے تھی ورنہ "مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا" والا مضمون ہو جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا افسانہ "لے جا کے مجھے مصر کا بازار" ایک رنگین دھواں چھوڑنے والے کی طرح سر پر سے گزر جاتا ہے اور ہمارے پلے صرف اس قدر "اچھا افسانہ نگار صاحبہ مصر بھی ہو آئی ہیں! زہے نصیب۔

رتن سنگھ کا افسانہ "ذرے" اور ضمیر الدین احمد کا افسانہ موت، شائد اس مثال کے لیے اچھے نمونے ہیں کہ بہت سے بہت کا ماحول بگاڑ کر اسے کہاں سے کہاں پہونچایا جا سکتا ہے۔

ان تمام اعتراضات کے بعد بھی میں آپ کو قابل مبارکباد [سمجھتا] ہوں۔ دنیا سازی سے نہیں خلوص دل سے ناکردن یک عیب و صد عیب۔ لیکن میری نظر میں ناکردن کا ایک عیب کردن کے صد عیب پر بھاری ہوتا ہے۔ آپ نے ہمت کرکے ایک بات کی تو اب اگر لوگوں کو کچھ عیب نظر آتے ہیں تو آیا کریں۔ وجاہت علی سندیلوی

سطحی بات

آپ نے سہیل عظیم آبادی۔ اختر اورینوی اور بیگم اختر اورینوی غالباً بھلا نہ دیا ہوگا۔ یوں تو ایڈیٹران اب صرف خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی۔ اور راجندر سنگھ بیدی کے نام ورد ہی عبادت سمجھتے ہیں۔

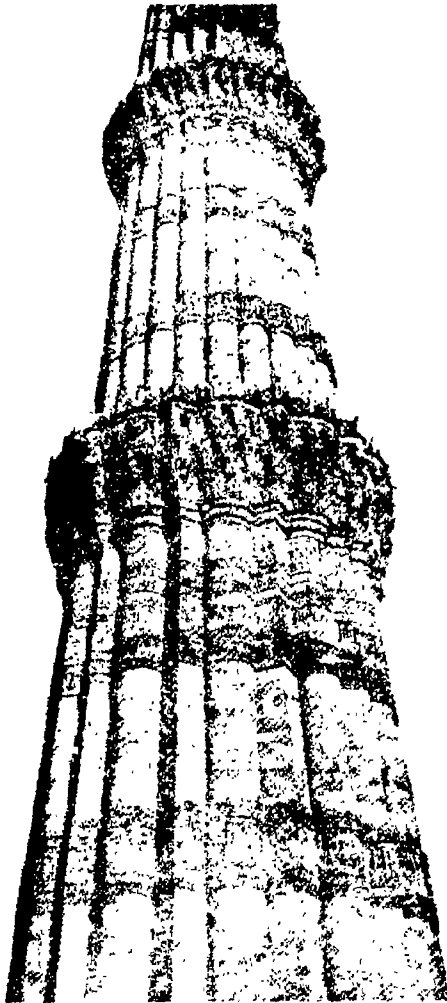
اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے اپنے دوستوں کے ردّی افسانوں کو افسانے سمجھ کر شائع کیا ہے تو یقیناً آپ بھی اسے بہت سطحی بات سمجھنے ہوں گے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے رام لعل اور رحمان مذنب کا منٹو سے موازنہ کرکے غلط فیصلہ دیا ہے۔ شہاب قاضی پور

معجزہ

کتاب کے افسانہ نمبر سے میں بے حد متاثر ہوا۔ لکھنؤ کے پرچوں سے اتنا باوقار نمبر نکلنا مجھے تو ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ افسانوں کے اس حسین انتخاب اور حسین تدوین پر آپ، رام لعل اور عابد سہیل مستحق مبارکباد ہیں۔ یوں تو اس پرچے کی ہر کہانی ایک نیا زاویہ لیے ہوئے ہو لیکن عباس، کرشن، بیدی، قرۃ ا

لکھنؤ

۳/۳



50nP.

اس شمارہ میں

قطب مینار

وج یا ھندستان میں پہلی مسجد کا ماڈنا

فراق گورکھپوری کو

سمپورنانند کا

جواب اور

فراق کا جواب الجواب

Registered with the Registrar of Newspapers at

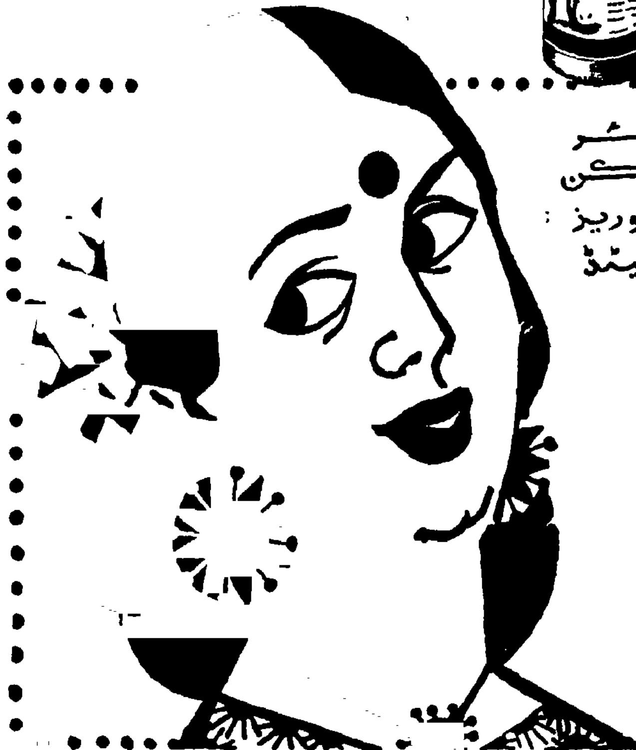
THE 'KITAB' MONTHLY,

February. LUCKNOW-3

REG. L-178 196







ماہنامہ کتاب لکھنؤ

مارچ ۱۹۶۴ء

فراق گورکھپوری کو سمپورنانند کا جواب
اور فراق کا جواب الجواب

قطب مینار، وشنو دھوج یا — آذنہ۔

۶ افسانے

۱۳ منظومات

شام و سحر کے درمیان

طنز و مزاح

اور

ادبی مسائل پر فکر انگیز خطوط

اس شمارہ میں

فراق گورکھپوری۔ سمپورنانند۔ شاد عارفی
اثر لکھنوی۔ زبیر رضوی۔ قیصر تمکین
عابد سہیل۔ امرتا پریتم۔ حسن کمال
صادق مولی۔ اور
عبدالمجیب سہالوی

اشاعت کا تیسرا سال

جلد (۳) نمبر (۳)

زر سالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں...... ۶½ روپے
قیمت......... ۵۰ نئے پیسے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

مجلس مشاورت
سید احتشام حسین
حیات اللہ انصاری
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر: سید جمیل احمد
مطبوعہ: نظامی پریس لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
کتاب، چوک لکھنؤ ۳

پاکستان آفس:-
مسٹر نعیم اکبر خاں، الائڈ فوٹوگرافرز
(پاکستان لمیٹڈ) 5/6 موتی جھیل
کمرشل ایریا، ڈھاکہ

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

شہر کا جو فرق سمپورنانند جی نے بتایا ہے وہ اگر اردو کے شاعروں کے پیش نظر ہوتا تو میر نے شاید یوں کہا ہوتا۔

دل وہ شہر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

کہ دل سب سے بڑی بستی ہے۔

متروک کے سلسلہ میں سب سے اہم کسوٹی عوام ہیں۔ یہ عوام ہی ہیں جنھوں نے راتری کو رات اور بدی کو بدھا دیا ہے۔ انہی عوام نے شہنشاہوں اور سلطانوں، گواہوں اور کتابوں کو شہنشاہاں، سلاطین، گواہاں اور کتب اسی طرح کر دیا جیسوں کے مقابلہ میں سہل اور زبان زد بنا دیا ہے۔ متروک کا اصل اصول یہ ہے۔ اسمیں تلوار کی وہ کاٹ ہے جو اس جوابی مضمون میں بھی سمپورنانند جی تک سے جن کے دور حکومت میں بنارس کو بدل کر وارانسی بنایا گیا تھا بنارس کہلوانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

کوئی مولوی، کوئی پنڈت اردو اور ہندی کو عربی فارسی اور سنسکرت کے نامانوس الفاظ سے بوجھل بنانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اردو میں اب ایسے لوگ تلاش کے باوجود نہیں ملتے۔ رہا ہندی کا سوال تو ہندی کے عوام ایسی کوششوں سے خود نپٹ لیں گے۔

عابد سہیل

پچھلے دو مہینے اردو کے لیے نہایت سخت گزرے اور اس دوران اردو کے دو کہنہ مشق شاعر شوق بہرائچی اور شاد عارفی انتقال کر گئے۔

شوق بہرائچی اردو کے ایک نہایت ممتاز مزاح نگار شاعر تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۰۰ سال کی تھی۔

شاد عارفی صاحب کہنہ مشق شاعر اور غزل میں ایک انفرادی رنگ کے مالک تھے جسمیں طنز کا پہلو خاص طور سے نمایاں تھا۔ ان کا کلام ہند و پاک کے ممتاز ادبی رسائل میں قدر و منزلت کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۱ برس تھی۔

انتقال سے تھوڑے دنوں قبل انھوں نے اپنی ایک غزل ماہنامہ کتاب کو بھیجی تھی۔ جو اس بار آپکی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ ممکن ہے یہ شاد مرحوم کی آخری غزل ہو۔

ان دونوں حضرات کے انتقال سے اردو شاعری میں جو جگہ خالی ہوئی اسکی تلافی ممکن نہیں۔

اپنی باتیں

ہندی کو مشکل بنانے اور اسے عوامی بول چال کی زبان سے دور کرنے کے رجحان کے خلاف چند ماہ قبل ہندی کے مشہور شاعر اور ادیب ایس۔ بی راؤ نے صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ اردو کے مشہور شاعر اور عالم فراق گورکھپوری نے بھی ادھر چند انگریزی مضامین میں اس رجحان کی مخالفت کی اور اردو اور ہندی کو قریب لانے اور ان کی قربت سے ایک خوبصورت اور جاندار زبان کی تشکیل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ بی راؤ نے جہاں ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا وہاں فراق نے یہ بھی دعوا کیا کہ آج اردو ادیب و شاعر ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کے مقابلہ میں بہتر ہندی کا استعمال کرتے ہیں۔

یہ بات ہندی کے بعض پریمیوں کو بہت بری لگی۔ ہندی کے مشہور ادیب اور اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ سمپورنانند نے فراق کے مضمون کا جواب لکھا اور متروک کا سوال اٹھا کر یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اردو کے ادیب و شاعر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو کمتر اور فارسی اور عربی کے الفاظ کو بلند مرتبہ چیز سمجھتے ہیں۔ اور عربی اور فارسی کے الفاظ کو مقامی الفاظ پر جو عموماً سنسکرت ہوتے ہیں ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے اس دعوے میں ایک منطقی سقم تو یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو آج اردو میں ہندی فعل کے علاوہ اسم، صفت اور ضمیر کے تمام الفاظ صرف فارسی اور عربی کے ملتے اور اس کا دامن ۷۰ فیصدی ہندی اور سنسکرت کے ان الفاظ کے ذخیرہ سے خالی ہوتا جن پر اردو کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ کسی پنڈت کا۔

ہندی کے الفاظ کو کم وقعت سمجھنے اور انھیں فارسی اور عربی کے مقابلہ میں کمتر درجہ کا سمجھنے کے سلسلے میں سمپورنانند جی نے دو مثالیں دی ہیں۔ نگر اور ندی کی۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو والے بڑی بستی کو شہر کہتے ہیں، اور چھوٹی بستی کو نگر، بڑا ہو تو دریا کہتے ہیں، چھوٹا ہو تو ندی۔ الفاظ کے انتخاب کے وقت اردو کے ادیبوں نے اگر اس ہٹ دھرمی سے کام لیا ہوتا تو کرشن چندر، بیدی، احمد عباس، حیات اللہ انصاری، فراق، جگر، اور ان سے کہیں کمتر درجے کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات صرف رسم خط بدلنے کے بعد ہندی میں بے پناہ مقبول نہ ہوتیں ——— ندی اور دریا ہم معنی ہیں، ان میں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، لیکن کہیں جملہ کی ساخت، موقع اور محل کے اعتبار سے دریا کا استعمال زیادہ مناسب ہوتا ہے اور کہیں ندی کا۔ بالکل ویسے ہی جیسے شبنم[1] گلاب کے کٹورے بھر دیتی ہے اور سبزہ[2] اوس کھا کھا کر ہرا ہو جاتا ہے ——— نگر اور

۱۔ شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے (دبیر) ۲۔ کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا (انیس)

"نہیں نہیں میرے بیٹے ایسا نہ کہو۔ زندگی ایک امانت ہے اسے تم ہر حال میں سنبھال کر رکھو ورنہ مقدس باپ تم کو خیانت کا مجرم ٹھہرائے گا۔ ——"

"خیر یہ سب دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ بہرحال میں نے کچھ گناہ کئے ہیں۔ گناہ تو میں نے ہزاروں کئے ہیں۔ مگر دو ایک چھوٹی چھوٹی باتیں جن کی وجہ سے میرا ضمیر مجھ کو ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔ میں اس بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کو اپنے دکھ بتانا چاہتا ہوں جو ہمدردی سے سن سکے۔ میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ امید ہے تم سنو گے ——"

"ضرور شوق سے۔ مگر تم کو ٹھنڈک لگ رہی ہے خالی سوئٹر اور باریک قمیض میں تو تم ٹھٹھرے جا رہے ہو۔ ٹھہرو میں تمہارے لیے کوکو منگواتا ہوں ——"

"نہیں۔ نہیں۔ فادر بات یہ ہے کہ ——"

"کہو کہو۔ رک کیوں گئے ——"

"اگر۔ کوکو کے بجائے، دو ایک ٹوسٹ منگوا دو تو مجھ میں رات بھر زندہ رہنے کی تو طاقت آ ہی جائے گی۔"

فادر پارسن کانپ اٹھا۔ "اف یہ ایشیائی بھوک کہاں کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ یہ نوجوان اور خوبصورت لڑکا جو لاکھوں کام کر سکتا ہے اور اس دنیا کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں چھوٹا موٹا حصہ لے سکتا ہے محض اس وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہے۔ بھوک کا بھوت اس کو بھی اپنی زد میں لے بیٹھا ہے اس کو ایسا لگا جیسے پورے ایشیا میں بھوک ایک کینسر کی صورت میں چھپی بیٹھی ہے اور چپ چاپ اپنے سیکڑوں پیر پھیلائی رہتی ہے۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور اس نے اپنی میز پر لگا ہوا گھنٹی کا بٹن بجایا۔ دروازے پر جا کر اس نے ملازم سے کچھ لانے کو کہا اور پھر دروازہ بند کر کے اپنی کمرہ نما لائبریری میں ٹہلنے لگا تنویر کی نظریں کتابوں کی خوبصورت جلدوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دو موٹی موٹی جلدوں پر سنہرے لفظوں میں لکھا تھا "ہولی قران"

تھوڑی دیر بعد فادر پارسن نے پھر گھنٹی بجائی اس کے بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی پارسن نے ملازم کو اندر نہیں دیکھنے دیا بلکہ دروازے ہی پر سے کشتی لے لی اور تنویر کے سامنے ایک چھوٹی میز پر رکھ دی۔ اس میں کچھ ٹوسٹ ایک پلیٹ میں سوپ اور کافی کا سامان رکھا تھا۔

فادر پارسن نے سوچا کہ اس کی موجودگی میں تنویر کو کھانے میں کچھ جھجک ہوگی اس لیے وہ وہاں سے ہٹ گیا اور پردے کی آڑ میں کھڑا ہو کر کتابیں دیکھنے لگا۔

پہلی بات تو یہ کہ مجھ کو اپنی بہن سے معافی مانگنا تھی۔ مگر وہ یہاں سے بہت دور پاکستان میں اپنے شوہر کے پاس ہے اور خوش ہے۔ اور بات ایسی معمولی ہے کہ میں اس کو خط بھی نہیں لکھ سکتا وہ مجھ کو جذباتی سمجھ کر ہنسے گی اور یہ محسوس بھی نہیں کرے گی کہ واقعی میرے دل پر کتنا بھاری بوجھ ہے۔

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی بعض وقت بڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔"

"بہت دنوں کی بات ہے لگ بھگ سترہ برس پہلے کی جب میں اپنی بہن کے ساتھ کھیلتا تھا وہ صرف ۸ یا ۹ برس کی تھی اور میں شاید نو دس برس کا تھا۔ ہم دونوں میں بڑی محبت تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے ——" فادر پارسن بہت توجہ سے سن رہا تھا۔

"ایک دن ہم دونوں لڑ پڑے۔ بات یہ تھی کہ مجھے اپنے پڑوس کی ایک لڑکی بہت پسند تھی ایک دن میں نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر اس کو پیار کر لیا۔ میری بہن نے دیکھ لیا۔ وہ لڑکی تو بھاگ گئی مگر بہن نے مجھ کو چھیڑنے کے لیے کہا کہ وہ یہ بات سب سے کہہ دے گی۔ فادر تمہیں معلوم ہے کیا ہوا۔؟"

"نہیں ——" بہت ہی مشینی طور پر فادر پارسن کے منہ سے خودبخود نکلا۔

"میں نے اپنی بہن کے سر پر زور سے ایک رول مارا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر بھاگتے میں میری نظر اس کے چہرے پر پڑ گئی وہ جس طرح بلبلا کر روئی ہے وہ مجھے آج تک نہیں بھولا میں دن بھر ادھر ادھر چھپتا پھرا مگر مجھے حیرت ہوئی کہ کسی نے مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کی۔ بعد میں پتہ چلا کہ بہن نے کسی کو بتایا ہی نہیں کہ میں نے اس کو مارا تھا لوگ یہ سمجھے کہ اس کو کہیں گرنے سے چوٹ آگئی۔ رات کو میں نے دیکھا وہ بے خبر سو رہی تھی

قیصر تمکین



منگل کی شام کو سروس ختم ہونے کے بعد فادر پارسن نے اطمینان کی سانس لی اور چرچ کے پیچھے اپنی چھوٹی سی لائبریری میں جانے لگا۔ وہ آج کل ادعائی دینیات پر ایک بڑا معرکۃ آرا مقالہ لکھ رہا تھا اسی سبب اس کا زیادہ وقت مطالعے میں گزرتا تھا جب وہ پشت کے جنگلے کی طرف سے گزرنے لگا تو تیز اور یخ بستہ ہوا میں اس کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ سرسرانے لگا اس کی تسبیح اور مقدس صلیب بھی ہلنے لگی۔

فادر پارسن ابھی حال ہی میں دور دراز کے ایشیائی ممالک سے تبدیل ہو کر یہاں آیا تھا آس پاس کے لوگوں میں اس کی علمی قابلیت اور زور خطابت کی دھوم مچ گئی تھی۔ اس میں صرف ایک بڑی خامی تھی اور وہ یہ کہ وہ شام کی سروس کے بعد اپنی ذاتی لائبریری میں مطالعے کے لیے جب جاتا تو پھر کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔

ایسے ہی وقت اس کو تنہائی اور نیم تاریکی میں سامنے کی طرف سے ایک دبلا پتلا آدمی آتا دکھائی دیا۔ فادر پارسن نے پہلے سوچا کہ چرچ کے آس پاس کے کوارٹروں میں رہنے والا کوئی ملازم ہوگا مگر قریب آتے ہی نووارد نے فادر پارسن کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگریزی میں کہا۔

"فادر میری مدد کرو۔"

پارسن نے بہت ہی سکون کے ساتھ پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹا۔؟"

"میں اعتراف کے لیے آیا ہوں۔"

پارسن نے بہت ہی نمایاں طور پر غیر خوشگوار لہجے میں کہا "یہ وقت اعتراف کا نہیں ہے۔ جب تک کہ کوئی شخص بستر مرگ پر نہ ہو میں شام کی سروس کے بعد اعترافات نہیں سنتا ہوں۔ کیا تم صبح نہیں آسکتے ہو۔؟"

آنے والے نے بے بسی سے کہا ـــ "کل بہت دیر ہو جائے گی۔"

پارسن نے چند لمحوں تک توقف کیا اور پھر بولا "اچھا میرے ساتھ آؤ ـــ"

لائبریری میں پہونچ کر فادر پارسن نے دروازہ بند کر لیا اور سامنے لگا ہوا بلب روشن کر دیا یہ اس بات کا نشان تھا کہ فادر مطالعے میں معروف ہے اور کسی کو غیر ضروری طور پر اس کے پاس نہیں آنا چاہیے۔

نووارد نے کہا ـــ "میرا نام تنویر ہے اور میں مسلمان ہوں ـــ"

فادر پارسن کو تعجب تو ضرور ہوا مگر اس نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔" وہ آگے چلا اور اس کے پیچھے پیچھے تنویر بھی لائبریری میں داخل ہوا۔

"میں نے مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ زندگی کی ہر مہم اور ہر منزل میں ناکام ہونے کے بعد اب میرے پاس یہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔ اور اس مہم میں مجھے ناکامی نہیں ہوگی۔" اس کی آواز کمزور تھی۔

قیصر تمکین :- اردو کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں کے عنوانات بھی ان کی کہانیوں ہی طرح خوبصورت ہوتے ہیں لیکن زیر نظر کہانی کے عنوان میں وہ الجھ گئے اور انھوں نے فیصلہ ادارہ پر چھوڑ دیا۔ ادارہ نے یہ 'کار نیک' آپ کے حوالہ کر دیا کہ آپ ہی ہر تخلیق کی پسند، ناپسند کی آخری کسوٹی ہیں ــــــ آپ اپنی پسند کا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو عنوان پوسٹ کارڈ پر لکھ کر ماہنامہ کتاب۔ چوک۔ لکھنؤ ۳ کو بھیج دیجئے۔ ۲۲ مارچ تک موصول ہونے والے سب سے اچھے عنوان کو ۶ ماہ کے لیے اور دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوانات پر تین تین ماہ کے لیے ماہنامہ کتاب مفت جاری کر دیا جائے گا ــــــ ادارہ

عابد سہیل

بفاتن

بفاتن قسم پاک پروردگار کی کھا کر کہتی کہ اس نے رات گئے ماجد میاں کے کمرے سے ملے ہوئے دالان سے سفید شفاف، دودھ ایسے کپڑے پہنے ایک بزرگ درویش کو کئی بار نکلتے دیکھا تھا۔

خالہ امی پانی کی نکی کے پاس شہتوت کے درخت کے نیچے چھوٹی سی چوکی پر جانماز بچھائے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا مانگا کرتیں رحم کیجیو پروردگار، اس گھر پر غلطی انجانے میں ہو گئی تھی اور اس کی بہت بڑی سزا بھگت چکی ہوں، اس گھر کے چراغوں کو روشن رکھیو......

ایک تو خالہ امی کا گورے لٹھے ایسا سفید رنگ، اس پر جب صاف شفاف کپڑے پہن کر وہ دوپٹہ اپنے ہاتھوں پر پھیلا لیتیں تو بالکل فرشتہ معلوم ہوتیں، دعا مانگتے مانگتے جب وہ ربنا اغفر لی ولوالدی پر پہنچتیں تو ان کی نظریں غیر ارادی طور پر سامنے والے دالان کی طرف اٹھ جاتیں۔ پھر وہ چوکی کے کونے پر رکھا ہوا نقشی کٹورا اٹھاتیں، زیر لب کچھ پڑھ پڑھ کر اس پر دم کرتیں اور پھر جزدان میں لپٹے ہوئے مجبور رحل سے اسے ڈھک دیتیں۔ اب ہم لوگوں کی باری آتی۔ ہم لوگ نہایت سعادت مندی سے لائن لگا کر کھڑے ہو جاتے، سب سے آگے ایاز، اس کے بعد میں اور سب سے بعد رشیدہ۔ خالہ امی اپنے دودھ ایسے شفاف ہاتھ ہمارے چہروں پر پھیرتیں، سر سے لے کر سینے تک پھونک ڈالتیں، دم کیا ہوا تھوڑا تھوڑا پانی پلاتیں اور دعائیں دیتے ہوئے ہم تینوں کو رخصت کر دیتیں۔

"اپنے بیٹے کو کتنی دیر تک پھونکتی رہیں۔" میں ایاز کو چڑھاتی۔

"اور دم کیا ہوا پانی بھی خوب بہت سا پلاتی ہیں۔" رشیدہ کہتی۔

اور ایاز ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم، چپ چاپ کھڑا ہم دونوں کی جملہ بازی سنا کرتا، جیسے اسے ہماری ان باتوں سے کوئی غرض ہی نہ ہو۔ پھر جونہی ہم دونوں کی توجہ کسی اور طرف ہوتی وہ ایک ایک دھپ رسید کر کے چمپت ہو جاتا۔ خالہ امی مسکرا کر ہماری طرف دیکھتیں اور تسبیح کے دانے گننے میں مشغول ہو جاتیں۔

"تمہیں جن صاحب سمجھیں۔" رشیدہ اپنے نزدیک سب سے بڑی بد دعا دیتی۔

"ہوں ــــ" خالہ امی ہم لوگوں کی طرف زہر آلود نظروں سے دیکھتیں۔ اور ہم لوگ ان کی نظروں کے سامنے سے ہٹ کر ایاز کو خوب کوستے کاٹتے۔

خالہ امی اس قدر عبادت کرتی تھیں کہ بس کیا کہوں۔ پوری پوری لمبی لمبی آیتیں، نہ جانے کیسے کیسے وظیفے، دعائے گنج العرش ان کو زبانی یاد تھی۔ پھر جب سورج تین بالشت اوپر چڑھ جاتا اور دھوپ نعمت خانہ سے کھسک کر لکڑیوں کے پاس آ جاتی تو خالہ امی جانماز پلٹ کر اٹھتیں، آنگن کے چاروں کونوں پر کچھ پڑھ کر دم کرتیں اور پھر دالان کے پاس والی کھڑکی میں منہ ڈال کر، جو تحصیلدار صاحب کے یہاں کھلتی تھی پکارتیں۔

"بہو! ارے بہو کیا کر رہی ہو۔"

"چھنس نکال لوں، ابھی آئی۔" بہو مہین آواز میں جواب دیتیں۔

اور تھوڑی دیر بعد بہو آ جاتیں، پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہتیں، اور اس دوران بھی ہوں ہاں کرتے کرتے خالہ امی عجیب پراسرار نظروں سے سامنے والے دالان کی طرف ایک آدھ بار دیکھ لیتیں۔ پھر وہ کہتیں۔

اور اس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔

"اپنے غرور کی بنا پر میں نے اس سے کبھی معافی نہیں مانگی ہم میں کبھی اس واقعے کا ذکر ہی نہیں ہوا۔ مگر میرے دل پر ایک بوجھ ہے۔ وہ اس کا بلبلا کر رونا اور بے بسی اور مایوسی سے میری طرف دیکھنا جب بھی مجھے یاد آتا ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔"

فادر پارسن خاموش رہا اس کی سنجیدگی اور مسئلے پر غور کرنے کا انداز ایسا تھا جس سے تنویر کو ذرا تقویت ہوئی۔

"میرے ذہن پر ایک اور بھی بوجھ ہے۔ میں نہیں جانتا کہ انسان کو اپنی غلطیوں اور گناہوں کی سزا کسی دوسری دنیا میں ملتی ہے یا نہیں۔ پھر بھی سوچتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی ایسا طریقہ ضرور ہونا چاہیے جس سے ہم اپنے گناہوں کی پاداش جھیل کر اپنے دل کو ہلکا کر سکیں۔"

"ایک اور بہت ہی چھوٹی سی بات ہے اور ایسی کہ شاید آپ اس پر ہنسیں مگر میں اس کو اپنے سنگین گناہوں میں گنتا ہوں اس کا ذکر بھی ضرور کروں گا اور امید ہے کہ آپ ہمدردی سے سنیں گے۔" تنویر نے ایک خود ردی کے انداز میں کہا اس کے لہجے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ کسی بڑے مجمع کے سامنے برہنہ ہو رہا ہو۔

فادر پارسن نے سنجیدگی سے کہا۔ آج میرا سارا وقت تمہارے لیے ہے۔ تم کہو۔ میں سن رہا ہوں ہو سکتا ہے کہ تمہارا اپنے آپ پر ملامت کرنے کا جذبہ ہی تمہاری نجات کا سبب بن جائے۔

"یہ بھی میرے بچپن کی بات ہے ہمارے یہاں کچن میں گھر کی عورتیں کام کرتی ہیں اور صبح سویرے ہی سب بچے آ کر چولہے کے پاس جمع ہو جاتے تھے جہاں ان کو پیالوں میں چائے بانٹ دی جاتی تھی۔ صبح ناشتے کی میز پر بیٹھ کر کیتلی سے چائے انڈیلنے کا دستور متوسط درجے کے مسلمان گھرانوں میں نہیں تھا۔

"ایک دن بہت ہی سویرے میں باورچی خانے میں بیٹھا تھا سردی اتنی سخت تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ میرے سامنے چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور ایک بڑی سی پتیلی میں چائے تیار ہو رہی تھی۔ مٹی کے چولہے کے پاس ہی ایک ذرا سا مینڈک اپنے پیروں پر بیٹھا تھا۔ وہ ٹھنڈک اور کہرے پالے سے پریشان ہو کر یہاں آیا تھا اور ہلکی گرمی میں سکون سے بیٹھا تھا۔ تمہیں معلوم ہے فادر مجھے کیا شرارت سوجھی!"

"نہیں ۔۔۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"میں نے دست پناہ اٹھایا اور اس میں مینڈک کو دبا کر سلگتی ہوئی آگ کے اندر رکھ دیا۔۔۔۔"

فادر پارسن کے چہرے پر ہلکے سے کرب کے آثار پیدا ہوئے مگر چند ثانیوں بعد اس کا فطری سکون واپس آ گیا۔

تنویر کی دونوں مٹھیاں بند تھیں اور وہ کسی ناقابل بیان اذیت میں مبتلا تھا۔ "فادر۔ ایک مینڈک کی جان کی کوئی اہمیت نہ تھی اور نہ کبھی ہوگی۔ مگر میں اس حیوانیت پر شرمسار ہوں جس سے میں مغلوب ہو گیا تھا یہ شرارت نہیں تھی فادر ہم انسانوں کے اندر چھپا ہوا حیوان کبھی نہ کبھی جاگ اٹھتا ہے بعض لوگوں میں یہ حیوان دیر میں جاگتا ہے مجھ میں یہ جلد ہی پیدا ہوا۔ چونکہ میں چھوٹا تھا اسی لیے لڑکپن کا اثر ابھی یاد ہے۔

"بہر حال خدا رحم کرنے والا ہے۔ وہ سب گناہوں کو معاف کرنے والا ہے ۔۔۔"

"فادر میں نے زندگی میں لاکھوں گناہ کیے ہیں۔ مجھے ان گناہوں پر کوئی شرم نہیں ہے کیونکہ گناہ انسان کی فطری کمزوری ہے۔ مگر وہ گناہ جن میں انسانیت سے گرا ہوں مجھ کو ہر وقت بے چین و مضطرب رکھتے ہیں۔

"مجھے دنیا میں صرف ایک ہی سے محبت رہی اور وہ میری ماں تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہر ماں اپنے بیٹے کے لیے ہر ممکن قربانی کرتی ہے اور ہر بیٹا اپنی ماں کو راحت پہنچانے کی کوشش کرتا ہے مگر پھر بھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم مجبور رہتے ہیں نہ جانے کہاں کی چھپی ہوئی کمینگی ہم پر غالب آ جاتی ہے۔ ۔۔۔۔

وہ تھوڑی دیر چپ رہا۔ اور پھر بولا۔ فادر میں پچھلے تین چار برس سے بے روزگار ہوں۔ کبھی کبھی کہیں نوکری ملتی ہے۔ کچھ روپیہ مل جاتا ہے اور کچھ کام چل جاتا ہے مگر مستقل نوکری مجھ کو کبھی نہیں ملی۔

ان تین چار برسوں میں میری ماں بہت مذہبی ہو گئی ہے۔ اور ہمیشہ روزہ رکھنے لگی۔ فادر تم نہیں جانتے کہ ہمارے یہاں جب مائیں خود کچھ نہیں کھاتی ہیں اور بچوں کو کھلا دیتی ہیں تو بچہ ہمیشہ حیران ہو کر پوچھتا ہے "ماں تم نہیں کھاؤ گی" اور ماں جواب دیتی ہے "بیٹا میں روزہ سے ہوں"

"فادر ۔ روزہ ہمارے یہاں فاقہ کشی کی برہنگی کو چھپانے کے

باقی صفحہ ۶۶ پر

پر مار سکے۔۔

"اور پیار کیا تھی۔۔" بہو پوچھتیں۔

"اے پیاری کیا، میں منع کرتی تھی، اس طرف پیر کرکے نہ سوئیو، کبھی بستر پر بیٹھی ہو تو نہ اٹھائیو، پر یہ مانتی ہی نہ تھی، لحاف کے نیچے لیٹی تھی، یہ آکے دھم سے بیٹھ گئی، عزرا کے بھائی تو میں نے سر پیٹ لیا، تھوڑی ہی دیر بعد پھلا کے بخار چڑھ آیا۔"

خالہ امی ان بزرگ کی کرامات اور ان کے جلال کے بارے میں طرح طرح کے قصے سنایا کرتیں اور ان قصوں کا سلسلہ خالو ابا کی موت پر آکے ختم ہوتا۔ خالو ابا کو بلیوں سے خدا واسطے کا بیر تھا، جہاں بلی دیکھی 'بل بل' شروع کر دیتے اور وہ کالی بلی تو ان کو ایک آنکھ بھی نہ بھاتی۔ وہ سال ادھر گرمی کے دن تھے، دفتر سے جلے بھنے آئے تھے اس دن کچھ غصے میں بھی معلوم ہوتے تھے۔ صراحی سے پانی انڈیلنے کے لیے منہ موڑا ہی تھا کہ بلی خالہ نے گوشت کی پلیٹ میں منہ ڈال دیا، خالو ابا نے ہاتھ کا گلاس کھینچ کر مارا جو سر پہ لگا اور بلی خالہ وہیں لوٹ پوٹ ختم ہوگئیں ——— شام ہوتے ہوتے خالو ابا کو بخار چڑھا دوا دی گئی پر کچھ اثر نہ ہوا، ڈاکٹروں کا تو خیال تھا کہ سخت لو لگ گئی۔ پر بفاتن اور خالہ امی کہتیں یہ سب جن بزرگ کے جلال کا نتیجہ ہے، خالہ امی نے بارہ یتیموں کو کھانا کھلانے اور ۲۱ روزے رکھنے کی منت مانی پر کسی کی آئی ٹلا ہی ہے۔ صبح چار بجے خالو ابا سدھار گئے۔

اس واقعہ کے بعد سے، یہ روزانہ کا معمول ہوگیا کہ آدھ سیر بالائی دار گاڑھا دودھ ایک صاف پیالہ میں انڈیل کر روزانہ کمرہ میں رکھ دیا جاتا اور صبح پیالہ صاف ملتا۔ چینی کی پرچ اسی طرح پیالہ پر ڈھکی رہتی اور دودھ کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرتا۔ جاڑوں کے دنوں میں تو خالہ امی تھوڑی سی شکر ڈال کر پیچھے بھی بھگو دیتیں اور دودھ آدھ سیر کے بجائے تین پاؤ کر دیتیں۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ دونوں بچوں کی اور میری سلامتی کی دعائیں مانگتیں اور دعا مانگتے مانگتے من الجنۃ والناس تک آتے آتے ان کی نظریں آپ ہی آپ دالان کی طرف اٹھ جاتیں۔

لیکن ایک ہفتہ قبل یہ سب ختم ہوگیا تھا۔ دالان کے اندر کا پڑا ہوا کوڑا کرکٹ نکال کر باہر پھینک دیا گیا تھا اور وہ چوکی جس پر بفاتن نے بہنگ کو نماز پڑھتے دیکھا تھا آنگن میں ایک کنارے کھڑی ہوئی تھی۔ اور گھر کا کام کرنے سے بفاتن کے بجائے ایک دوسری نوکرانی رکھ لی گئی تھی۔

سات دن ادھر ایک رات خالہ امی کی آنکھ جو کھلی تو دالان کے اندر کمرہ میں مدھم مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ جل تو جلال تو پڑھتی وہ دالان میں پہنچیں تو کیا دیکھتیں ہیں کہ کمرہ میں لوبان سلگ رہا ہے، موم بتی روشن ہے، پاس ہی دیا سلائی پڑی ہے اور بفاتن کھڑی غنٹ غنٹ دودھ چڑھا رہی ہے۔

"اے بفاتن نے تمہے اپنی آنکھوں سے دیکھا —— صاف شفاف کپڑے نورانی صورت ۔" اور بہو کا سر عقیدت سے جھک جاتا۔

"اور نور کا عالم تو دیکھو —— سچ کہتی ہوں اس دالان اور کمرہ میں کوئی تین سال ادھر سفیدی کرائی تھی اور آج بھی ایسی آب تاب ہے جیسے کل ہی کرائی ہو اور اس دالان کو لے لو" خالہ امی دوسرے دالان کی طرف اشارہ کر کے کہتیں "ابھی شب برات میں ہی قلعی کرائی تھی پر ایسا لگتا ہے جیسے کاٹنے کھا رہا ہے —— میں تو پہلے ان باتوں کو مانتی وانتی نہیں تھی پر وہ باتیں ایسی ہو گئیں کہ ایمان لانا ہی پڑا۔"

اور قبل اس کے کہ تحصیلدار صاحب کی دوسری بیوی جو ہمارے گھر میں کرایہ دار تھیں اور خالہ امی کی بالکل ساس کی طرح عزت کرتی تھیں کچھ سوال کریں، وہ خود ہی کہتیں۔

"بفاتن کو اس گھر میں آئے تین اوپر دس سال ہو گئے، اس نے تو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ ہو نہ ہو یہاں کوئی بزرگ ہیں ضرور، پر موئی نگوڑی مت کی ماری نے اس کان سنا اس کان اڑا دیا"

خالہ امی ایک بار اور دالان کی طرف دیکھتیں۔

"اور میں تو مان بھی جاتی، پر وہ اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے بڑے صاف گو تھے اور ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ میں نے جب ان سے بزرگ کی بات کہی تو ہنس کر بولے۔ "تمہاری بفاتن تو بڑی پہنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے، ارے ایسی اللہ والی سے گھر کا کام لیتی ہو۔"

یہ کہتے کہتے خالہ امی کے چہرے پر ایک غمگین مسکراہٹ پھیل جاتی۔

"پھر ایک دن بولے" وہ خالو ابا کے بارے میں کہتیں "ہاں ایک بزرگ رہتے تو ہیں —— میں تو بہت دنوں سے جانتا ہوں، پر ہیں بڑے جید اور غصور —— اگر ایک بار کسی سے خفا ہو جائیں تو بس سات پیڑھیوں تک خاندان تباہ ہو جاتے۔"

"اور تم نے تو کہی تھیں" تحصیلدار صاحب کی بیوی خالہ امی کا جملہ پورا ہونے کا انتظار بھی نہ کرتیں۔

"لو وہ تو بالکل میرے سامنے ہی کھڑے ہیں، واللہ کیا نورانی صورت پائی ہے، بالکل فرشتوں جیسی۔"

اب خالہ امی کی مسکراہٹ جس میں اداسی پہلے ہی سے شامل بالکل ختم ہو جاتی، سفید بھوؤں کے نیچے جھکی ہوئی آنکھوں کے کنارے پر آنسوؤں کے دو قطرے نمودار ہوتے اور وہ دوپٹے کے کونے سے انھیں پونچھ ڈالتیں۔

"یا اللہ بخشش تو ہمیں تیرے کرم پر ہے، ویسے نماز روزہ کے پابند تو نہ تھے پر جیتے جی کبھی کسی سے جھوک کے بات نہ کی محلہ یا دفتر میں کسی سے لڑائی نہیں ہوئی، بالا دیں چپراسی تک گھر آتا تو اس سے آپ آپ کر کے بات کرتے ..." اب خالہ امی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی تار لگ چکی ہوتی۔

آنسو جب ذرا تھمتے تو وہ کہتیں۔

"پہلے پہل جب بفاتن نے کہا تو میں نے ہنس کے ٹال دیا، اس بفاتن بولی کہ اگر بزرگ سچے ہوں گے تو آپ ہی ثابت ہو جائے گا، ایک نہ ایک دن ضرور خواب دیں گے اور پھر تین روز بعد ایک رات میں نے انھیں خواب میں دیکھ ہی لیا —— پر بہو یہ تو خواب کی باتیں تھیں، ایک دن تو میں نے جاگتے میں دیکھا، اپنی ان آنکھوں سے" خالہ امی کہتیں "کسی کام سے اس دالان میں گئی، کمرہ کا دروازہ کھولا چراغ لے کر اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جانماز بچھی ہے، لوبان سلگ رہا ہے، خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہے۔"

وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس دالان کی طرف دیکھتی جاتیں اور کہتیں۔

"...... اور بہو ایسا لگتا جیسے نور برس رہا ہو نور، ہو کا عالم پر خاموشی ایسی کہ اٹھنے کو جی ہی نہ چاہے اب وہاں برسوں سے کوئی گیا ہی نہ تھا، پھر بھلا لوبان کون سلگاتا، جانماز کون بچھاتا، خواب کی بات ہوتی تو جھوٹ مان بھی لیتی پر اپنی آنکھوں سے دیکھے پر بھلا کوئی شک کر سکتا ہے۔ اور اس بات تو بفاتن نے ان بزرگ کو اپنی آنکھوں سے باہر نکلتے دیکھا۔"

"یہ بیمار پڑی تو" خالہ امی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہتیں "بس میں نے شام کو گڑگڑا کے انھیں کے توسط سے خدا سے دعا مانگی، دودھ بھرا پیالہ کمرہ میں رکھوا دیا اور کہاں تو بخار اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اور کہاں اگلی صبح جو آنکھ کھلی تو بھلی چنگی، دوا حکیم سب بیکار میں تو مان گئی، مولا کا کرم، بزرگوں کی کرامات کے بغیر مجال نہیں جو یہ مرہ

موسی جی! اس وقت اچھا موقع ہے۔ دفتر میں آج ہی کل میں
، ہونے والی ہیں۔ آپ ذرا سفارش کر دیں تو میں بھی اپرڈ ویژن
سکتا ہوں ــــــ"

"کوئی بات نہیں بیٹا! شام کو اپنا گردھاری آئے گا تو میں ضرور
روں گی ـــ"

یہ اپنا گردھاری ڈپٹی کمشنر ہے۔ ڈپٹی کمشنر گردھاری لال گوئند
ردھاری کیسے بن جاتا ہے، یہ جاننے کے لیے آپ کو بہت دور
سے گا یعنی اس ناکے تک جانا پڑے گا، جہاں ایک آدمی مشین
باردں میں گیس بھر کے بچوں کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ یہ غبارے
ہت پرانا گھاگ ہے یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وقت سے اس
پر مشین لیے بیٹھا ہے۔ اس لیے یہ بات اور بھی مشکل بن جاتی
۔ آپ کو اپنی درخواست لے کر کمپنی کی حکومت تک جانا پڑے
مگر روایت یہ ہے کہ کمپنی سرکار مر کھپ گئی ہے۔

اس مشین سے رنگ برنگے غبارے گیس بھروا کے نکل آتے ہیں اور
بچوں کے سروں پر گدھوں کی طرح منڈلاتے ہیں۔ بچے کچھ نہیں کر سکتے
بکہ کسی نے کہا ہے اور فارسی میں کہا ہے کہ اپنے کیے کا کوئی علاج
ں ہوتا۔ اس لیے اس بات کو فی الحال یہیں رہنے دیجیے۔

ایک دن جبکہ میں بالکنی میں بیٹھا موٹروں کے نمبر یاد کر رہا تھا تو
ے سڑک پر گزرتے ہوئے ایک بچے کے ہاتھ سے غبارے کا دھاگہ
وٹ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے غبارہ بالکنی کی ریلنگ سے ٹکرا گیا اور
سمان کی طرف لپکنے لگا۔ مگر ایک عجیب اتفاق ہو گیا۔ غبارہ آسمان
طرف نہ جا سکا کیونکہ اس کی ڈور بالکنی کی ریلنگ میں پھنس گئی۔
ـــ شریر کہیں کی! پکڑ لیا نا اپنے محبوب کو ـــــ میں نے جھک کر
یچے دیکھا تو وہی گول مٹول سرخ و سفید چہرے والا بچہ اوپر دیکھ رہا
تھا اور اس کی ماں بھی اوپر دیکھ رہی تھی۔

"ٹھہرئے! میں غبارہ لے کر نیچے آتا ہوں ـــــ" میں نے
آواز لگائی۔

"نہیں نہیں! آپ تکلیف مت کیجیے ـــ ہم ہی اوپر آتے ہیں"
بچے کی ماں نے کہا اور میری بات سنے بغیر اوپر آ گئی۔

"انکل جی کو نمستے کرو۔" بچے کی ماں نے کمرے میں قدم رکھتے ہی
اپنے بچے کو ہدایت دی۔ بچے نے انکل جی کو یعنی مجھے نمستے کہی۔

"تشریف رکھیے! ـــ" میں نے بچے سے کہا اور دونوں ماں
بیٹے بیٹھ گئے۔

"آپ کو تکلیف کرنا پڑی۔ میں غبارہ لے کر خود نیچے آنے والا
تھا ـــ"

"آپ کیوں تکلیف کرتے۔ قصور تو ٹینی کا تھا ـــ" بچے کی
ماں نے جواب دیا۔

"جی نہیں قصور در اصل ٹینی کا بھی نہیں۔ قصور تو اس مشین کا ہے
جو غباروں میں گیس بھرا کرتی ہے ـــ"

یہ سن کر ماں زور سے ہنس دی اور بچہ اٹھ کر کمرے میں بکھرے ہوئے
رسالوں میں تصویریں تلاش کرنے لگا

"آئیے! بالکنی میں بیٹھتے ہیں۔" بچے کی ماں نے کہا اور ہم اٹھ
بالکنی میں آ گئے۔

"بڑی خوبصورت بالکنی ہے آپ کی۔ یہاں بیٹھے بیٹھے تو تمام لوگوں
سے ملاقات ہوتی ہوگی۔"

"جی ہاں۔! اس میں کیا شک ہے۔"

"اس سامنے والے مکان میں کون رہتا ہے۔؟ وہ نیلی کھڑکی
والا، جس پر رنگین پردے لٹک رہے ہیں ـــ؟"

"آپ کو نہیں معلوم؟ وہاں تو شریمتی دیاونتی رہتی ہیں۔"

"اچھا! شریمتی دیاونتی اسی مکان میں رہتی ہیں؟ بھئی کمال ہے۔
پھر تو آپ خوش نصیب ہیں کہ دیاونتی جی کے ہمسایہ ہیں ـــ"

"جی بے شک۔ اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔"

اس طوطے کی کہانی تو آپ نے ضرور پڑھی ہوگی، جو اس میں کیا شک ہے
بڑی صاف زبان میں بولتا تھا۔ تو آئیے! مجھے پنجرے میں بند کر دیجیے۔

ٹینی نے ایک تازہ رسالے کو ورق ورق کر دیا۔ میں نے کنکھیوں
سے اس کی طرف دیکھا، مگر اس کی ماں مسز سنگھ کریچ کریچ ہی زبان
چلا رہی تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے میں اس زبان کی کریچ کریچ کو سنتے سنتے
تنگ آ گیا ہوں۔ اب تو ان ماں بیٹوں کا معمول ہو گیا ہے کہ شام کو سیر

پشکرناتھ

غبارے

اس کہانی کا ہیرو ایک گول مٹول، لال رنگ کا چمکنے گالوں والا غبارہ ہے۔ اور ہیروئن دودھیا رنگ کی، نازک سی تیکھے نقش ونگار والی ایک بالکنی ہے۔ ان دو کا ملن کیسے ہوا، یہ جاننے کے لیے آپ اتنے ہی بے قرار ہیں، جتنا میں یہ جان کر حیران ہوں۔

ٹھہریئے! میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ میں اس بالکنی کا سرپرست ہوں مجھے بھی اس بالکنی سے محبت ہے میں بھی۔ روز شام کو اس بالکنی میں بیٹھ کر سامنے سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھا کرتا ہوں میں نے بھی! اس بالکنی میں کھڑے ہو کر سامنے والی نیلے رنگ کی کھڑکی کے رنگین پردوں کو گھنٹوں ٹکٹکی لگا کر دیکھا ہے۔ ان پردوں میں کبھی کبھی جنبش بھی ہوتی ہے اور ایک آدھا کھلا، آدھا پردے میں چھپا ہوا چہرا بھی نظر آتا ہے۔ میں نے شائد اس آدھے چھپے ہوئے چہرے سے محبت کی ہے۔ آپ میری آنکھوں میں جھانک کر تو دیکھ لیجئے! محبت کا ایک ہلکا سا عکس شائد ان میں ضرور موجود ہوگا ——

اس دن میں یہی ہلکا سا عکس آنکھوں میں لیے بالکنی میں بیٹھا تھا کہ یکایک ایک گول مٹول، سرخ وسفید چہرے والے بچے کے ہاتھ سے غبارے کا دھاگا چھوٹ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے گیس بھرا ہوا غبارہ اونچا ہوتا ہوا میری بالکنی کی خوبصورت ریلنگ سے ٹکراتا ہوا آسمان کی جانب لپکا۔ یہ غبارے اور بالکنی کی پہلی ملاقات تھی۔ گول مٹول، سرخ وسفید چہرے والے بچے نے حسرت سے اڑتے ہوئے غبارے کی جانب ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر مجھے بالکنی میں بیٹھا دیکھ کر ذرا سا مسکرا دی اور بچے کا ہاتھ تھام کر آگے نکل گئی۔

بس! اس ذرا سی مسکراہٹ نے مجھے دغا دی ——

یہ جو نیلے رنگ کی کھڑکی والا مکان ہے، اس میں شریمتی دیاوتی رہتی ہے۔ بڑی دیالو قسم کی عورت ہے۔ روایت ہے کہ دیاوتی تمام بڑے افسروں کو جانتی ہے۔ نہ صرف جانتی ہے، بلکہ ان کے ساتھ بے تکلف ہے۔ ہر شام اس مکان کے باہر چند موٹریں کھڑی نظر آتی ہیں۔ میں ان موٹروں کو پہچانتا ہوں۔ دن کو یہ کاریں سرکاری دفتروں کے کار پارکوں میں ہوتی ہیں اور شام کو دیاوتی کے مکان کے باہر۔ ہرے رنگ کی فی۔ غبلے گاڑی ڈائرکٹر کی ہے، پیلے رنگ کی شتوی کمشنر کی ہے، کالے رنگ کی ایمبیسڈر ڈپٹی کمشنر کا ہے ـــ کریم کلر کی مرسڈیز ڈپٹی منسٹر کی، وغیرہ وغیرہ۔

عجیب عورت ہے یہ دیاوتی بھی۔ صبح ہی صبح اس کے مکان میں مجھ جیسے بے کار لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ دیاوتی کی سفارش کبھی بے کار نہیں جاتی۔ ایک دن تو میں بھی دیاوتی کے پاس گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی پان چبا رہی تھی۔ اور اس کے سامنے چھوٹی اور بڑی بیٹھی تھیں۔ چھوٹی اور بڑی کو دیکھ کر میں اپنا کام بھول ہی گیا اور ادھر ادھر کی دو ایک باتیں کر کے چلا آیا۔ چھوٹی اور بڑی دیاوتی کی لڑکیاں ہیں۔

ابھی دربار لگنے کا وقت نہیں آیا تھا شاید، ورنہ دربار کے وقت چھوٹی اور بڑی کا ڈرائنگ روم میں موجود رہنا خلاف قانون تھا کیونکہ صبح کے دربار کے وقت زیادہ تر چھوٹے ہی لوگ آتے تھے۔ اور دیاوتی کا قول تھا کہ چھوٹے لوگوں سے ملنے میں مضائقہ نہیں البتہ اپنے اور اُن کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ یہ لوگ تو سر پر چڑھ آتے ہیں ——

اور ان چھوٹے لوگوں کے کام بھی تو چھوٹے موٹے ہی ہوتے تھے ——

آج صبح وہ نیلے رنگ کی کھڑکی کھل گئی جیسے کسی ہرن نے اپنی غزالی آنکھ کھولی ہو۔ پہلے رنگین پردوں میں تھوڑی سی سرسراہٹ ہوئی۔ پھر پردوں کے بیچ میں ایک درازسی بن گئی۔ پھر ایک آدھا کھلا آدھا پردے میں چھپا ہوا چہرہ نظر آیا —— پھر اس چہرے نے مجھے حسب معمول اپنی بالکنی میں بیٹھا ہوا پایا۔ اور فوراً ہی اس چہرے نے میری آنکھوں میں جھانک کر کچھ دیکھا اور عجیب سا منھ بنا کر پردوں میں چھپ گیا۔ جیسے کہہ رہا ہو، دغاباز ہو! آج وہ کہاں ہے جس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے راز و نیاز کرتے تھے۔

"—— ؟"

ہاں! میں تو بھول ہی گیا۔ مسز سنگھ دس بارہ روز سے دکھائی ہی نہیں دی تھی۔ میں نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔ خدا خدا کر کے ایک موذی بیماری سے نجات مل گئی تھی۔ میں نے اندر ہی اندر اطمینان کی سانس لے کر نیچے سڑک کی طرف جھانکا ——

"انکل جی ہم آ گئے ——"

نیچے سے ٹینی نے آواز دی۔ اُف! دونوں ماں بیٹے اوپر دیکھ رہے تھے۔

"آؤ! اوپر آ جاؤ ——"

دونوں ماں بیٹے اوپر آ گئے۔

"انکل جی کو نمستے کرو۔" اس کی ماں نے حسب معمول حکم دیا اور ٹینی مجھے نمستے کر کے کسی بیکار کتاب کی تلاش میں لگ گیا، جواب تک آپریشن سے بچ گئی ہو۔ اور مسز سنگھ نے زبان کا ایٹم بم چلانا شروع کیا۔

"مردوں پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے ——"

"جی ہاں! اس میں کیا شک ہے۔"

"بھگوان کے لیے یہ جملہ آپ میرے سامنے مت بولا کیجیے۔ یہ جملہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔"

"تو پھر میں کیا بولوں —؟ آپ ہی کہیے۔"

"آپ میری ہر بات کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ میری کوئی بات آپ کو غلط دکھائی ہی نہیں دیتی۔"

"دیکھیے! بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے واقعی آپ کی کوئی بات غلط دکھائی نہیں دیتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے بھلا ایک اسسٹنٹ سکریٹری کی مسز کبھی غلط بول سکتی ہے۔"

مسز سنگھ نے میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف منھ پھلائے بیٹھی رہی۔ میں نے موقعہ غنیمت جان کر چوری چھپے ایک نظر سامنے نیلے رنگ کی کھڑکی کی طرف پھینک دی۔ مگر پردہ ساکت تھا۔

"آپ میری طرف دیکھیے۔"

"جی —؟؟ ——"

"میں نے کہا آپ میری طرف دیکھیے۔ میرا چہرہ آپ سے کیا کہہ رہا ہے۔"

"آپ کا چہرہ ——؟؟ ——"

"ہاں ہاں! کیا میں آپ کو دبلی نہیں دکھائی دیتی؟ کیا میرا چہرہ اترا ہوا نہیں ——؟ کیا میری آنکھیں آپ کو سوجی ہوئی نظر نہیں آتیں۔"

"جی ہاں! بے شک۔ یعنی —— دکھائی تو دے رہا ہے ——"

"پھر آپ نے کبھی یہ پوچھنے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔؟"

میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

"کاش آپ نے مجھے پہلے دیکھا ہوتا —— لوگ کہتے تھے کہ میں بہت خوبصورت عورت ہوں ——"

یہ کہہ کر مسز سنگھ نے نظریں جھکائیں، گویا شرما گئی۔

"جی ہاں! اس میں کیا ——"

"بس ان تین مہینوں میں میری یہ حالت ہو گئی۔"

"کن تین مہینوں میں؟"

"جب سے مسٹر سنگھ معطل ہیں ——"

"معطل ہیں؟ یعنی مسٹر سنگھ؟"

"ہاں! اور آپ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آپ میری کچھ مدد کریں۔ یہاں شریمتی دیا ونتی کے پاس سارے افسر لوگ آتے رہتے ہیں آپ چاہیں تو وہ کل صبح بحال کیے جا سکتے ہیں۔"

"مگر —— مگر ——"

کہتے کرتے میری بالکنی تک آجاتے ہیں، پھر پہلے ٹینی بالکنی کی طرف دیکھ کر ذراسا مسکرا دیتا ہے، اس کے بعد اس کی ماں مسز سنگھ بالکنی کی طرف دیکھ کر ذراسا مسکرا دیتی ہے، اور پھر وہ جملہ سنائی دیتا ہے۔

"چلو ٹینی! تیرے انکل جی کے پاس چلتے ہیں۔"

اور ٹینی جست لگا کر میرے دروازے کی طرف لپک آتا ہے۔

مسز سنگھ نے اس دوران میں اپنے بارے میں، مسٹر سنگھ کے بارے میں اور ٹینی کے بارے میں مجھے کئی ایک باتیں بتا ڈالی تھیں۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے مسٹر سنگھ کے ساتھ کس طرح لو میرج کی ہے۔ اور کس طرح مسٹر سنگھ ایک کلرک سے ترقی کرتا ہوا، اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے تک پہنچا ہے۔ مجھے اُن کڑیوں کو جاننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، مگر مسز سنگھ کی زبان کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ وہ مجھے ان راتوں کے بارے میں بتاتی رہی، جب مسٹر سنگھ کسی امتحان کی تیاریاں کر رہا تھا، اور وہ بستر پر پڑے پڑے کس طرح اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔ اُس نے مجھے لو میرج کے چند نقائص بھی اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر بتائے۔ اُس نے مجھے یہ بات بھی بتائی کہ مسٹر سنگھ کتنا بھولا ہے اور دنیا کی اونچ نیچ سے ناواقف۔ کہ کس طرح اس کو خود ہی اُن پارٹیوں کا بندوبست کرنا پڑتا تھا، جن میں زیادہ تر مسٹر سنگھ کے بڑے آفیسر مدعو کیے جاتے تھے۔

"اب آپ ہی بتائیے کیا یہ کام ایک عورت کے کرنے کے ہیں ——؟"

"ہرگز نہیں ——"

"مگر میں یہ سب کام کر رہی ہوں۔ مسٹر سنگھ بہت بھولے ہیں۔ آخر اسسٹنٹ سکریٹری بن کے اس عہدے کو نبھانا بھی تو پڑتا ہی۔"

"جی ہاں! اس میں کیا شک ہے۔"

"کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ اصل اسسٹنٹ سکریٹری تو میں ہی ہوں —— اور مسٹر سنگھ کچھ بھی نہیں ہے۔"

"جی ہاں، درست سوچتی ہیں آپ۔"

دراصل مسز سنگھ دو چیزوں کے لیے شاید اٹیمک انرجی استعمال کرتی ہے۔ ایک اپنی سلائیاں چلانے کے لیے، جن سے وہ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی چیز بنتی رہتی ہے اور ایک اپنی زبان چلانے کے لیے، جسے میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی خاموش نہیں دیکھا ہے ——

مسز سنگھ کے کہنے کے مطابق اُس کے اسسٹنٹ سکریٹری پتی ہر کام اس کے ساتھ ڈسکس کرنے کے بعد ہی کرتے ہیں۔ یعنی اسکے ماتحتوں کو چھٹی بھی مسز سنگھ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ہی ملتی ہے۔ اور جس دن مسز سنگھ حکم دیں اسی دن چپراسی کاغذات لے کر گھر آسکتا ہے، ورنہ نہیں۔

رفتہ رفتہ مسز سنگھ کی باتوں نے ایک تصویر میرے ذہن میں بنائی۔ مسٹر سنگھ کی تصویر۔ اس تصویر میں ایک تیس پینتیس برس کا آدمی ہے جس نے ایک گرم سوٹ پہن رکھا ہے۔ اس کے گلے میں گہرے سرخ رنگ کی ٹائی لٹک رہی ہے۔ اس کے چہرے سے گہری سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ بات بات پر کپڑے سے باہر ہو جاتا ہے۔ قدم قدم پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اور فائل پر کچھ لکھتے وقت بار بار سر کھجاتا، پانی پیتا ہے، سگریٹ پیتا ہے اور آخر کار فائل بند کر کے ٹیلی فون اٹھا کر گھر کا نمبر ملاتا ہے۔

"میں نے کہا، آج میں چند کاغذات گھر لا رہا ہوں ——"

"نہیں نہیں! آج تو ہم لوگ سریواستوا جی کے ہاں جا رہے ہیں۔"

"مگر ڈارلنگ! کاغذات ضروری ہیں۔"

"اگر ایسے ہی ضروری ہیں تو سوچ لو، سریواستوا جی ناراض تو نہ ہو جائیں گے ——"

مسز سنگھ کا کہنا ہے کہ اس کا پتی اس کے بغیر دو قدم بھی نہیں چل سکتا ہے۔

"جی ہاں! اس کیا شک ہے۔"

"یعنی یہ کیا بات ہوئی۔ آپ ہر بات کا جواب یہی دیتے ہیں۔ لگتا ہے آپ کی اپنی کوئی رائے نہیں۔"

"جی ہاں! اس میں بھی کیا شک ہے۔ دراصل میری اپنی رائے ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ نہ میں اسسٹنٹ سکریٹری ہی ہوں اور نہ شادی شدہ ہی۔"

اس دن مسز سنگھ مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی۔ اُس نے اپنے بیٹے کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا، جو ایک کتاب کا آپریشن کر کے اسے کلوروفارم سنگھا رہا تھا، یعنی ٹوتھ پیسٹ کا ٹیوب اس کے زخموں پر مل رہا تھا۔

"چل ٹینی! یہ تمہاری ممی کا مذاق اڑاتا ہے۔"

ت: المجیب سہالوی

مکان کی تلاش

بزرگوں سے سنا تھا کہ تلاش شرط ہے ڈھونڈھنے سے خدا مل ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ ممکن ہے ڈھونڈھنے سے خدا مل جائے شہر میں مکان نہیں مل سکتا۔ مکان کے بارے میں ہمارے ایک ست کا کہنا ہے کہ ایک دن وہ گھر کی تلاش میں یہ عہد کر کے نکلے کہ مکان ڈھونڈھ کر لوٹیں گے یا پھر لامکاں ہونے پر خود لاپتہ ہو جائیں لیکن نہ مکان ملا نہ خود لاپتہ ہوئے بلکہ ہوا یہ کہ ہر بند مکان پر للچائی یں ڈالنے سے پولیس والے چور کے شبہ میں چوکی پکڑ لے گئے۔

چوں کہ "یہ طے کر کے نکلے تھے کہ مکان ڈھونڈھ کے لوٹیں گے اس ہے وہ یہ خیال کیے بغیر کہ شک و شبہات کی اس دنیا میں لوگ اپنے پر رکھنے کے بجائے دوسروں پر نظر رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں اور وقت دیکھنے والوں کی نظر دیکھا کرتے ہیں جس مکان میں تالا دیکھتے لپک پڑتے اور یہی گمان ہوتا کہ ہو نہ ہو مکان خالی ہے۔ دیر نا ٹھیک نہیں دیر آید درست آید اس زمانے کی بات ہے جب لوگ پیدل یا بیل گاڑی پر سفر کرتے تھے، مکان ڈھونڈھنے کے بجائے کرایہ دار ڈھونڈھا کرتے تھے محلوں میں ہر دسویں بارھویں مکان پر ٹولٹ صاحب (TO LET) کی تختی لٹکی نظر آتی تھی۔ اور اب لوگ "مکان چاہیے" کے اشتہارات اخبارات میں شائع کراتے ہیں، دوستوں سے خوشامد اور رشتہ داروں کو دھمکی دیتے ہیں کہ مکان دلوائیے ورنہ خاکسار مع بوریا بستر دولت کدہ پر حاضر ہو کر آسن جمائے گا۔ اور گھر سے باہر نکلنا دشوار کر دے گا۔ اس لیے وہ لوگوں سے پوچھ کچھ میں دیر لگانے کے بجائے براہ راست تاک جھانک شروع کر دیتے کبھی کواڑ دبا کر دراز سے مکان کا حلیہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے، کبھی کھڑکیوں کی سلاخیں پکڑ کر شیشوں سے جھانکتے کبھی مکان کے پیچھے کولیا میں جا کر مکان کی چوحدی کا اندازہ کرتے۔ اسی طرح جب کسی مکان میں قفل پڑا دیکھتے تو اچھل پڑتے اور ان کی للچائی نظریں قفل پر اس طرح پڑتیں کہ دیکھنے والوں کو قطعی یہ شبہ ہوتا کہ یہ مکان کی تلاش میں نہیں بلکہ قفل شکنی کی غرض سے نکلے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بیچارے قفل شکنی تو بڑی بات ہے آج تک کسی کی دل شکنی کی جرأت نہ کر پائے جو قفل شکنی سے کہیں زیادہ آسان ہے اسی لیے اس کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں لیکن رپورٹ ایک بھی درج نہیں کرائی جاتی کیونکہ یہ جرم قابل دست اندازی پولیس سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔

اسی کم ہمتی کی وجہ سے ہمارے ان بے گھر دوست کو آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ ورنہ ایک عرصہ سے یہ ایک مکان میں مزے سے رہ رہے تھے مکان اچھا اور کرایہ کم تھا۔ مکان دار خوش اخلاق بھی تھا اور ہوشیار بھی وہ مکان خالی کرانا چاہتا تھا لیکن پرانے کرایہ دار سے مقدمہ بازی کے نتائج سے واقف تھا اس لیے اس نے مقدمہ بازی کے بجائے چال بازی کو ترجیح دی۔ وہ اپنے کرایہ دار کی کمزوری سے واقف تھا۔ یہ گھر چھوڑ سکتے ہیں لیکن دل نہیں توڑ سکتے۔ وہ ایک دن رونی صورت بنائے آئے اور تھرتھراتے لب اور دھڑکتے دل سے گڑگڑا کر ان سے کہا کہ اب عزت آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ بڑی لڑکی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے آپ سے کیا چوری جو آیا پیٹ کی نذر ہو گیا۔ دان دہیز کے لیے کچھ جمع کیا جاتا تو کیسے؟ لڑکی کا معاملہ ہے شادیاں ٹھہرتی ہی کہاں تھیں قسمت سے لڑکا بھی اچھا ملا ہے لیکن اب تک پیسے کا کوئی انتظام نہیں بہت دوڑ دھوپ کی لیکن ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اب آپ ہی کا سہارا ہے اگر آپ نے بھی مایوس کر دیا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا میری دنیا اندھیری ہو جائے گی۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"اس میں اگر مگر کی کیا بات ہے۔ ؟ کیا آپ شریمتی دیاوتی سے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ؟ آپ کو بہت مانتی ہے وہ ——"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چل مجبورے! بند کر اپنے اس میاں مٹھو کو پنجرے میں۔

"چل ٹینی! مردوں پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔"

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ ٹینی کا بازو تھام کر کمرے سے چلی گئی۔ اور کمرے میں صرف اس رسالے کی لاش پڑی رہی جس کا شیرازہ ٹینی نے اس دوران میں بکھیر دیا تھا۔

آج صبح ہی صبح میں شریمتی دیاوتی کے مکان میں گیا تھا۔ سوچا کہ اس کے سامنے اپنی جھولی پھیلا کر مسٹر سنگھ کی بحالی کی بھیک مانگوں گا۔ ایک بوجھ سا دل پر محسوس ہو رہا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں مسز سنگھ کا مردوں پر سے واقعی اعتبار نہ اٹھ جائے، دل بیٹھا جا رہا تھا۔

شریمتی دیاوتی حسب معمول اپنے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھی پان چبا رہی تھی۔ اور اس کے سامنے چھوٹی اور بڑی بیٹھی تھیں۔ اب میں کیا کروں؟ میں جب بھی شریمتی دیاوتی کے ہاں جاتا ہوں، تو یہ دونوں کم بخت وہاں موجود ہوتی ہیں۔ اور دربار عام کا ماحول ابھی شروع نہیں ہوا ہوتا ہے۔

"کہو بیٹا کہاں رہے اتنے دن؟"

"یہاں ہی تھا موسی۔ مجھ جیسے لوگ شریمتی جی کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

"ممی! آجکل مسز سنگھ ان کے ہاں اکثر آتی رہتی ہے۔"

چھوٹی نے پٹاخہ چھوڑ دیا۔ جانے اس جاسوس کی بچی کو کیسے معلوم تھا۔

"کون مسز سنگھ؟ وہی تو نہیں۔ اس اسسٹنٹ سکریٹری چھبو کرے کی بیوی —؟"

"ہاں ممی! اور میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ یہ آج اسی کی سفارش کرنے آئے ہیں۔"

چھوٹی نے دوسرا پٹاخہ چھوڑا۔ اور میرے آگے پھلجڑیاں ناچنے لگیں۔ شریمتی جی نے اشارہ کر کے چھوٹی اور بڑی کو کمرے سے بھگا دیا۔ کمرے میں اب میرے اور شریمتی دیاوتی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ وہ برابر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے کانوں کی لویں دھیرے دھیرے سرخ ہونے لگیں۔ کاش میں آیا ہی نہ ہوتا۔ یہ کم بخت تو سب کی سب جادو گرنیاں لگتی ہیں۔ کیا عجب کہ یہ جاسوسی کر کے دل کا حال بھی جانتی ہوں۔ اچانک مجھے بہت ساری باتوں کا خیال آیا۔ اس مدھرمن کا خیال جو ایک گول مٹول، لال رنگ کے چکنے گالوں والے غبارے اور دودھیا رنگ کی نازک سی، تیکھے نقش و نگار والی ناگن میں ہوا تھا ——— نیلے رنگ کی اس کھڑکی کا خیال آیا جس کے رنگین پردوں میں گھنٹوں ٹکٹکی لگا کر دیکھتا ہوں ——— اس آدھے کھلے اور آدھے پردے میں چھپے ہوئے چہرے کا خیال آیا۔ ہنہہ! جاسوس چہرہ!!

"کیا سوچ رہے ہو بیٹا —؟" شریمتی جی پوچھ رہی تھیں۔

"ہوں؟ کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں ——"

"بڑے بھولے ہو تم بھی۔ بھلا ایسی باتیں کبھی چھپی رہتی ہیں —؟" میرا ماتھا ٹھنکا۔

"کونسی باتیں موسی جی —؟"

"یہی مسز سنگھ وغیرہ والی۔ حرافہ ہے وہ تو۔ سب طرف سے مایوس ہو کر اب تمہارے پاس آگئی۔ غلطی دراصل میری ہے۔ ایک دن میں چند لوگوں کے سامنے تمہاری تعریف کر رہی تھی، اور اس نے سن لیا —"

"میری؟ میری تعریف؟ کیوں شرمندہ کر رہی ہو موسی جی — میں — میں — تو دراصل یونہی چلا آیا تھا۔"

میں بوکھلا گیا۔ اور پسینے کے یہ قطرے اب میرے گال پر سے گر گرنے لگے۔

"دیکھ بیٹا! بات دراصل یہ ہے کہ مسٹر سنگھ اب کبھی اپنے عہدے پر بحال نہیں ہو سکتا — بلکہ چند دنوں کے بعد ڈیپارٹمنٹل انکوائری ختم کر اس کا کیس منظوری کے لیے اوپر بھیج دیا جائے گا —"

"یعنی مسٹر سنگھ؟ تنزل ہوگا اس کا؟ —"

"ہاں! یہی ایک صورت تھی —"

اب تو پسینہ بہنا بھی بند ہو گیا۔ کانوں کی لویں بھی سرخ ہونا بھول گئیں۔ آنکھیں پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ اور زبان تالو سے لگ گئی۔

"چھوٹی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"چھوٹی؟ یعنی؟ میں سمجھا نہیں موسی جی —"

باقی صفحہ ۶۶ پر

صبح سویرے میں آنکھیں بند کیے ہوئے بیگم کے کمرے میں گیا اور کہا اوہ اچھا آج تو میں تمہارا منہ دیکھ رہا ہوں جلدی ناشتہ لاؤ مجھے مکان کی تلاش میں نہیں مالک مکان کو ہموار کرنے جانا ہے۔ گھر سے ناشتہ کرکے نکلا تاکہ نسیٹھہ نہ ہو اور مالک مکان، مکان ہی پر مل جائیں۔ اتفاق کی بات کہ مل بھی گئے، میں نے ان سے صاف صاف کہا دیکھئے آپ کا وہ مکان جس میں میرے فلاں عزیز رہتے تھے وہ مجھے اپنے ایک دوست کے لیے چاہیے ہے۔ آپ کو مکان کا کرایہ ڈیوڑھا اور دو ماہ کا پیشگی ملے گا مگر شرط یہ ہے کہ مکان خالی ہونے سے پہلے میرے دوست کا سامان وہاں پہونچ جائے گا۔ اگر آپ کو یہ بات منظور ہے تو خیر ورنہ مکان میرے عزیز کے مرنے کے باوجود آپ کی زندگی بھر خالی نہ ہوگا۔ ان کے نام سے کرایہ میں ادا کروں گا اور ان کے سامان کی حفاظت کے نام سے میرے دوست اس میں قیام کریں گے۔ اس کے بعد وہ راضی ہی نہیں بلکہ مشکور بھی ہوئے۔

میں نے اپنا کام پورا کرکے اپنے دوست کو مطلع کر دیا اور سر کا بار ہلکا کرکے کام میں لگ گیا۔ دن گزرتے گئے اور چالیسیں کے بعد میرے عزیز کی بیوہ نے اطلاع دی کہ اب وہ دیہات جا رہی ہیں مکان کا جو انتظام کرنا چاہیں کر دیں۔ میں نے فوراً اپنے دوست کو خوش خبری دی جس سے میرے دوست سے زیادہ میرے دوست کے دوست خوش ہوئے جن کے سر پر وہ اب تک سوار تھے۔ اور انھوں نے بڑی مستعدی سے میرے دوست کا سامان اور ان کی بیوی کو میرے عزیز کے مکان میں پہونچا دیا۔

الاٹمنٹ کے بارے میں معلوم ہوا کہ میرے دوست اپنے کسی شناسا کی سفارش کے ساتھ رنٹ کنٹرول آفس گئے تھے اور بات اگر بالکل پکی نہیں تو ایسی کچی بھی نہیں ہے جس سے انھیں کوئی خطرہ ہو۔ مکان پر قبضہ تو تھا ہی انھیں بھی کوئی زیادہ فکر نہیں ہوئی۔

وہاں دفتر میں متعلقہ کلرک نے میرے دوست سے زیادہ اپنے ایک دوست کو مستحق خیال کیا اس لیے اس نے کہہ سن کر میرے دوست کے بجائے اپنے دوست کے نام اس بنا پر مکان الاٹ کرا لیا کہ اس کے دوست کی درخواست آئی تو بعد کو تھی لیکن اندراج پہلے سے تھا۔ اور ایک سہانی صبح جب ہمارے دوست یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ دروازے پر چپراسی کھڑا الاٹمنٹ کا پرچہ دے کر انعام مانگ رہا ہے۔ دروازے پر کسی نے دستک دی اور یہ جھپٹ کر باہر پہونچے اور خوشی سے پرچہ ہاتھ میں لے لیا اور بغیر کچھ انعام کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی والے تھے کہ پرچے پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ وہ الاٹمنٹ آرڈر نہیں تخلیہ مکان کا نوٹس ہے جس میں لکھا تھا کہ مکان فلاں ولد فلاں کو الاٹ ہو چکا ہے۔ آپ مکان پر ناجائز طور پر قبضہ کیے ہوئے ہیں اس لیے مکان میعاد نوٹس ختم ہونے سے پہلے خالی کر دیجیے۔ ورنہ پولیس کے ذریعہ مکان خالی کرایا جائے گا۔ اس کے بعد ایک اداس شام کو خاکی وردی پہنے پولیس والوں نے آکر انھیں گھر بدر کر دیا اور یہ سامان اور بیوی سڑک پر چھوڑ کر خود ہمارے دروازے آکر کھڑے ہو گئے۔

——— ہم نے ان کی بیوی کو میکے پہونچا دیا اور ان کے لیے اپنے کمرے کی کتابیں ہٹا کر جگہ نکالی جب سے یہ ہمارے سر پر سوار اور مکان کی تلاش میں پھر سرگرداں ہیں ایک دن میں نے ان کے مستقل قیام اور ان کی بیوی کے مسلسل پیام سے عاجز آکر کہا دوست! تم نے یہ بنیادی غلطی کی کہ شادی پہلے اور مکان بعد کو تلاش کیا ورنہ اس کا امکان تھا کہ شادی کے ساتھ خانہ آبادی کا بھی انتظام ہو جاتا۔

اس پر وہ برہم ہو کر بولے بھائی میں کیا کروں، آگ لینے کو جاؤں پیمبری مل جائے، تمہیں بتاؤ! اس میں میری کیا خطا تھی گھر کی تلاش میں نکلا تھا۔ گھر ملا نہیں گھر والی مل گئیں خیال تھا ٹکنے کی جگہ بھی مل جائے گی لیکن جو کچھ تھی جب گئے، تو معلوم ہوا کہ شادی میں اتنی عجلت صرف اس لیے کی گئی تھی کہ گھر میں گنجائش کم ہونے کی وجہ سے بیوی کے بھائی کی شادی رکی ہوئی تھی اسی لیے شاید ہمارے ہونے والے خسر نے ہمیں مکان تلاش کرنے میں مدد دی اور انھیں کے کہنے سننے سے ہزار احسان رکھ کر ہمارے سابق مکان دار نے مکان کا ایک حصہ ہمیں کرائے پر دے دیا تھا۔

یہ سن کر میرے حواس گم ہو گئے اور میں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو آپ کی بیوی شاید زیادہ دن میکے میں نہ رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن رات تلاش مکان کے پیامات میرے پاس بھیجا کرتی ہیں۔ ابھی مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ آپ کی بیوی

یہ بیچارے مکان دار کا یہ حال دیکھ کر گھبرا گئے اور کہنے لگے میں کس لائق ہوں۔ بہرحال میرے لائق جو خدمت ہو میں حاضر ہوں۔ مکان دار نے خوش ہو کر کہا آپ جیسے نیک دل انسان سے توقع بھی اسی کی تھی۔ بات یہ ہے کہ اب روپیہ فراہم ہونے کا اور کوئی سہارا نہیں بس صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ مکان فروخت کر دیا جائے، خریدار تیار ہے اور منھ مانگے دام دے رہا ہے لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ پورا مکان خالی دیا جائے جس حصہ میں ہم لوگ ہیں وہ تو ہم شادی کے چوتھے پانچویں دن خالی کر دیں گے۔ اب اگر آپ اتنی عنایت کریں کہ اپنا والا حصہ پرسوں، پہلی کو خالی کر دیں تو سمجھیے کہ آپ نے مکان نہیں خالی کیا بلکہ ہمیں خرید لیا ہم زندگی بھر آپ کا احسان نہ بھولیں گے۔ اسکے بعد یہ رحم دل کرایہ دار پہلی کے بجائے تیس ہی کو اپنے ایک دوست کے یہاں منتقل ہو گئے لیکن مکان خالی ہونے کے بعد نہ تو لڑکی کی شادی ہوئی اور نہ مکان فروخت ہوا بلکہ ان کے حصّہ میں ایک نیا کرایہ دار، رشتے دار کی حیثیت سے رہ کر جو پگڑی رقم کرائے کے نام سے نہیں لڑکی کے جہیز کے لیے امداد کے طور پر دے رہا ہے اور بیچارے ہمارے دوست دل شکنی کے گناہ سے بچ کر قفل شکنی کے شبہ میں چوکی کی سیر کے بعد اپنے دوست کے سر پر بدستور سوار ہیں۔

مرنا جینا تو لگا ہی رہتا ہے کسی مرنے والے شاعر کے بقول سہ

موت سے کس کو رستگاری ہے

آج وہ کل ہماری باری ہے

ایک منحوس صبح جب ہم منہ دھو کر بلا ناشتہ کیے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور ناشتے کا انتظار کر رہے تھے کہ ہمارے ایک دُور کے عزیز ملنے ایک قریب کے عزیز کے انتقال کی خبر لائے جو ہمارے بھی دور کے عزیز ہوتے تھے اور کہنے لگے کہ میں جا رہا ہوں رکشا کھڑا ہے چلنا ہو تو ساتھ ہی چلے چلو اب اس کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرے لیے سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ بھوکا پیاسا تعزیت کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ ابھی تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ مکان کے مارے ہمارے دوست تعزیت کے لیے نہیں مکان کی تلاش میں جاتے ہوئے راستے میں مل گئے اور رکشا روک کر خیریت پوچھنے کے بجائے مکان کا رونا رونے لگے لیکن میرے پاس بیٹھے میرے عزیز کو روتا دیکھ کر انھوں نے اپنا رونا بند کر دیا اور کہا اچھا جائیے مکان کا خیال رکھیے گا۔

چناں چہ تعزیت کے بعد ہم نے باتوں باتوں میں معلوم کرنا شروع کر دیا کہ مرحوم کے پسماندگان کا اب کیا ارادہ ہے پسماندگان میں ایک بیوہ اور بچی تھی ان کے علاوہ ایک بھائی بھی تھے جو دیہات میں رہتے تھے ایسی شکل میں ظاہر ہے کہ بیوہ اور بچی یہاں تنہا کیسے رہ سکتی تھیں۔ مکان چھوٹا تھا لیکن ہمارے دوست کے لیے کافی تھا۔ اس لیے ہم تعزیت سے فراغت کے بعد اپنے گھرانے کے بجائے اپنے دوست کے گھر چلے گئے جہاں مکان کے متلاشی ہمارے دوست عارضی طور پر مقیم تھے۔ اور ان سے کہا کہ اس دنیا کی عجیب ریت ہے ایک کا گھر اجڑتا تو دوسرے کا گھر بستا ہے۔ گھر کا نام سنتے ہی وہ اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے میں اپنے عزیز کے اجڑے ہوئے گھر میں انھیں بسانے کے لیے آیا ہوں۔ میں نے کہا بیٹھیے میں گھر تلاش کرنے نہیں گیا تھا تعزیت کے لیے گیا تھا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ مرحوم کے بال بچے زیادہ دنوں تک اب شہر میں نہیں رہ سکیں گے۔ اس لیے اگر تم چاہو تو ان کے مکان کو الاٹ کرانے کی کوشش کر سکتے ہو۔

الاٹمنٹ کے سلسلے میں انھیں کافی تلخ تجربات ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے کہا کہ الاٹمنٹ کی تو میں کوشش آج ہی سے شروع کر دوں گا لیکن مہربانی کر کے مکان خالی ہونے سے پہلے ہی میرا سامان مکان میں کسی طرح رکھوا دیجیے۔ اس لیے کہ دخانہ خالی را دیو می گیرد، کی مثل تو آپ نے صرف سنی ہو گی اور مجھے تلاشِ مکان کے سلسلہ میں اس کا بارہا تجربہ ہو چکا ہے اس لیے مکان ایک منٹ بھی خالی نہیں رہنا چاہیے۔ میں نے کہا تو پھر اس کے لیے مرحوم کی بیوہ کے علاوہ مکان کے مالک کو بھی ہموار کرنا ہو گا۔ اس پر وہ بولے اسے ہموار ہی نہیں ایک دو ماہ کا پیشگی کرایہ بھی ادا کرنا ہو گا۔ یہ سب کام آپ کریں گے اور الاٹمنٹ کے لیے دوڑ دھوپ میں کروں گا اس تقسیم کار کے بعد میں نے گھر میں آکر صبح کے ناشتے کے بجائے رات کا کھانا کھایا جب جان میں جان آئی تو بڑی رازداری سے پوچھا بیگم بتاؤ آج صبح صبح میں نے کس کا منھ دیکھا تھا اس پر وہ منھ بنا کر بولیں آئینے سے پوچھیے مجھ سے کیا پوچھتے ہیں آپ کے کمرے میں آئینے اور کتابوں کے علاوہ آدمی کا کہاں گزر ہے۔ اس کے بعد میں نے چپ رہنا ہی مناسب خیال کیا اور لیٹ کر سو رہا۔

گئے تو انھوں نے کرایہ لینا بند کردیا اور بجلی کا کنکشن کاٹ دیا ایک آدھ بار نے اپنے بچاؤ کے لیے منی آرڈر کیا۔ نہ لینے پر ہم بھی خاموش ہوگئے اور یہ کارو پیہ جمع کرکے نیا کنکشن الگ لے لیا اس کے بعد لالہ جی نے یہ لینا اور دھونس دینا شروع کردیا لیکن نہ ہم دھونس میں آئے نہ ن خالی کیا۔ مستعدی سے کرایہ دیتے اور صبر کے ساتھ دھونس سہتے ہے۔ لالہ کے لالچ کے ساتھ مکان کی خستگی بڑھتی جارہی تھی بارسات ر پرآگئی تھی اور مرمت کا کوئی ذکر نہ تھا ہم نے مکان کی مرمت کے لیے جی کی وہ خوشامدیں کیں کہ جو کوئی بے روزگار بڑے بابو سے ملازمت لیے بھی نہ کرتا لیکن لالہ جی نے نہ تو خود مرمت کرائی اور نہ ہمیں جازت دی اس کے بعد ہم نے کرایہ دینا بند کردیا اور مرمت کی نوٹسیں ینے لگے کچھ دن بعد لالہ نے تخلیہ مکان اور ہم نے مرمت مکان کا دعوا ائر کردیا اور گھر کا مقابلہ عدالت پہونچ گیا۔ ہم نے کتابیں طاق پر رکھ کر کاغذا ستہ بغل میں دبایا اور اسکول میں بچوں کو پڑھانے کے بجائے عدالت میں مقدمہ ی پیروی شروع کردی۔ کچہری اور وکیل جن کا منھ کبھی نہ دیکھا تھا اب وزانہ اٹھ کر انھیں سلام کرنے لگے۔ ہم مقدمہ کی پیروی میں لگے ہوئے تھے اور لالہ ہمارے صحن کی چھت اندر ہی اندر کول کرنے میں لگے تھے۔ مقدمہ کی سماعت سے پہلے صحن کی چھت زمین سے لگ گئی وہ تو کہیے کہ ہم پہلے سے ہوشیار بھی تھے اور رات بارش کی وجہ سے بال بچے سب اندر کمرے میں لیٹے تھے ورنہ لالہ جی نے ہم لوگوں کو مکان سے منتقل کرکے قبرستان پہونچا دینے کا پورا انتظام کردیا تھا۔

تھوڑے دنوں تک ہم اپنے بے در و دیوار کے نہیں بے چھت کے مکان میں سیڑھی لگا کر اس طرح آتے جاتے رہے جیسے ہم اپنے مکان میں خود چوری کرنے جارہے ہیں کیونکہ اتفاق سے زینے کا دروازہ صحن کی چھت پہ تھا اور جب چھت ہی نہ رہی تو زینہ کس کام کا۔ ایک رات جب ہم اپنے مکان میں سیڑھی لگا کر چڑھ رہے تھے تو پولیس والے نے زور زور سے کھکھارنا شروع کردیا ابھی اپنے حواس بھی بجا نہ کرپائے تھے کہ وہ سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو بلانے لگا۔ ادھر پاؤں ڈگمگائے اور ہم لڑھک کر سڑک پر آگئے اس کے بعد گھر والے چیخنے، محلے والے ہمدردی کرنے اور پولیس والے تحقیقات کرنے لگے۔ صورت حال معلوم کرنے کے بعد ہمارے ساتھ پولیس والے بھی شرمندہ ہوئے اور ہدایت کی کہ بانس کی سیڑھی کے بجائے لکڑی کا زینہ لگایئے ورنہ کہیں کسی دن مکان جانے کے بجائے جیل!

اسپتال نہ جانا پڑے اس کے بعد ہم بانس کی سیڑھی کی جگہ لکڑی کا زینہ لگا کر آنے جانے لگے اور اب اتنی مشق ہوگئی ہے کہ اگر مکان خالی کرنا پڑتا تو اس زینے کے ذریعہ چاند پر پہونچ سکتے تھے جہاں مکان کی ابھی اتنی قلت نہیں۔

لیکن یہ معلوم کرکے آپ کو خوشی ہوگی کہ لالہ جی کی تخلیہ کی درخواست خارج ہوگئی کیوں کہ ہم اس مکان کے اتنے پرانے کرایہ دار ہیں جتنا کہ پرانا مکان ہے اور جس طرح مکان دار پرانے مکان کی مرمت نہیں کراتا اسی طرح قانون پرانے کرایہ دار کو گھر سے نہیں نکالتا۔ چناں چہ نہ گھر کا تخلیہ ہوسکا اور نہ مکان کی مرمت دوسرا سال شروع ہو رہا ہے اور ہماری مرمت مکان کی درخواست نے صرف اتنا سفر طے کیا ہے کہ وہ عدالت کی میز سے اتر کر کمیشن کے ہاتھ میں آگئی ہے جو فیس پہلے لے گا اور موقعہ کا معائنہ بعد کو کرلے گا اور خیال یہ ہے کہ رپورٹ اس وقت پیش کرے گا جب ہمارا جنازہ کچہری کے سامنے سے ہوتا ہوا قبرستان جارہا ہوگا۔ اس کے بعد وہ مراسلہ میز پر رکھ کر اس طرح واپس ہوئے جیسے لوگ مٹی دے کر قبرستان سے واپس ہو رہے ہیں اب جو میں نے گھوم کر دیکھا تو میرے دوست بھی غائب تھے۔

بعد کو پتہ چلا کہ مکان والے کے مظالم کا حال سن کر انھوں نے تلاش مکان کا خیال ترک کردیا اور لامکاں یعنی لاپتہ ہوگئے۔ جو صاحب ہمارے گم شدہ دوست کا پتہ لگا کر ہمیں مطلع کریں گے ہم انھیں مکان الاٹ کرانے کی پوری کوشش کریں گے اب ملنا نہ ملنا خدا کے ہاتھ ہے اس معاملہ میں ہم آپ سے کچھ ہی کم بدقسمت ہیں کیونکہ مکان تو ہے اور رہ بھی رہے ہیں لیکن ایسا ہے کہ رہنے کو دل نہیں چاہتا۔

ایک گزارش

اپنے باذوق دوستوں کے پتے ہمیں ارسال کیجئے، ہم انھیں نمونہ کا پرچہ بھیجیں گے، اور اگر آپ اجازت دیں گے تو آپ کی طرف سے "کتاب" کی خریداری قبول کرنے کی درخواست بھی کریں گے۔ منیجر ماہنامہ کتاب۔ چوک۔ لکھنؤ-۳

برعکس میں وردولوش اپنے باپ کے مکان سے منتقل ہو کر چچا غالب کے اس بے در و دیوار گھر میں منتقل ہو جائیں جو فقیر کے بعد سے اب تک آپ اور آپ کی بیوی کے انتظار میں خالی پڑا ہے۔

ابھی ہم نے یہ جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ ایک صاحب نے ایک مراسلہ مکان دار کے مظالم کی جلی سرخی کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا اور پیغام زبانی کے طور پر فرمایا کہ جناب بے در و دیوار کے مکان میں رہنے کا مزا تو ابھی میں نے چکھا نہیں ہے لیکن بے چھت کے مکان میں معلق رہنے کا حال بتا سکتا ہوں اس پر میرے بولنے سے پہلے ہی میرے دوست اس طرح بے تاب ہو کر بول اٹھے جیسے کہ کہنا چاہتے ہوں کہ ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے چھت پکار میں چلاؤں ہائے گھر

اسکے بعد بے چھت کرایہ دار نے اپنی بپتا اس طرح برہم ہو کر ہمیں سنانی شروع کر دی جیسے ہمارے سر پر مکان دار انھیں ستا رہا ہو ہم نے ان کا شبہ رفع کرنے کی غرض سے کہا کہ آپ کیا جانیں ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

یہ ہمارے دوست بھی مکان دار کے مارے ہوئے ہیں اور اس پر وہ بولے بیچارے مرزا غالب کو اس کا تجربہ نہ تھا کہ معشوق کے ناوک سے گھائل ہو کر آشیانے میں مرغ قبلہ نما کی طرح الٹنا پلٹنا آسان ہو لیکن بے چھت کے مکان میں مکان دار کے مظالم سے تنگ آ کر تڑپنا مشکل کیوں کہ اس کا مطلب اپنے گھر سے لڑھک کر مکان دار کے صحن میں پہونچ جانا ہو۔

میں نے کہا کہ میں اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا مطلب آپ اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ کو اخبار کے دفتر سے میرے گھر نہ منتقل کر دیا جائے اس پر میرے دوست بے تاب ہو کر بولے انھیں گھر لے جا کے کیا کیجیے گا۔ یہ تو ماشاء اللہ سے خود ہی گھر والے ہیں لیکن میں بے گھر ہوں مجھے پناہ دینا کار ثواب کے علاوہ ایک نوجوان کو خودکشی سے بچانا بھی ہو۔ خودکشی کے نام پر ان صاحب نے ذرا کان کھڑے کیے اور کہا کیا آپ بھی مکاندار کے

مارے ہوئے ہیں اس پر میرے دوست نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ میں مکان دار کا مارا بھی ہوں اور مکان کا متلاشی بھی۔

انھوں نے کہا کہ اگر آپ مکان کی تلاش میں ہیں تو میں اپنے تجربہ کی بنا پر ایک نیک مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بھول کر بھی اوپر کا مکان نہ لیں اور اگر مجبوراً لینا پڑے تو پہلے یہ معلوم کر لیں کہ نیچے کے حصے میں مکان دار یا اس کا کوئی عزیز تو نہیں رہتا ہے اگر ہو تو آپ اس مکان میں رہنے کے بجائے بہتر ہے کہ کوئی چھوٹا موٹا جرم کر کے جیل چلے جائیں وہاں جگہ بھی مل جائے گی اور مکان دار کے مظالم کی زد سے بھی بچے رہیں گے۔

آپ کو معلوم نہیں میں مزے میں ایک پرانے رئیس کے پرانے مکان کے بالائی حصہ میں عرصۂ دراز سے رہ رہا تھا مکان بڑا اور کرایہ کم تھا۔ پرانے وضع دار رئیس کو نہ کبھی کرایہ بڑھانے کی فکر ہوئی اور نہ ہم کو زیادہ کرایہ دینے کی توفیق لیکن خاتمہ زمینداری کے بعد زمین حکومت کی طرف اور مکانات لالہ مکندی لال کی طرف قرضے میں منتقل ہو گئے اور اب ہمارا پالا ایک وضع دار رئیس کے بجائے ایک نفع باز مہاجن سے پڑا جب سے ہماری جان ضیق میں ہے نیچے کا مکان جو پہلے پرانے رئیس کے مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا اب لالہ صاحب نے اپنے خاص عزیز کے ذریعہ کرایہ پر دے دیا پہلے تو لالہ جی اپنے خاص عزیز کے ذریعہ ہمیں یہ نیک مشورہ دینے کی کوشش کی کہ مکان پرانا ہو بال بچوں کا ساتھ ہو، بارش آ رہی ہے اس میں رہنا خطرے سے خالی نہیں بہتر ہے کہ برسات سے پہلے ہم کہیں منتقل ہو جائیں ہم نے بہت ادب سے کہا کہ ہم غربت کے باوجود اپنی جان بچانے اور لالہ جی کی آمدنی بڑھانے کی خاطر موجودہ کرایہ سے دوگنا کرایہ دینے کو تیار ہیں لیکن دوسرا مکان تلاش کرنے کی ذمہ داری لالہ جی کے سر ہے جس دن وہ مکان تلاش کر دیں گے اس کے صبح ہی ہم منتقل ہو جائیں گے لیکن نہ لالہ جی مکان تلاش کر سکے اور نہ ہم دوسرے مکان میں منتقل ہو سکے۔

پہلے لالہ جی اور اُن کے خاص عزیز نے بول چال بند کر دی اس کے بعد حقہ پانی یعنی نیچے کا نل دن رات کھولے رہتے تاکہ اوپر پانی نہ جائے اور ہم نہ پانی پی سکیں نہ حقّہ تازہ کر سکیں لیکن جب ہم بے تازہ کیے حقّہ پینے اور بے نل کے پانی فراہم کرنے کے عادی

پہلے سال کی چھٹیاں تو ہنسی کھیل میں گزر گئی تھیں ۔ بات صرف ہی مختلف تھی کہ شہر سے گاؤں جاتے وقت کشور نے ماں سے تھا، میں تمہاری حکم عدولی نہیں کرتا لیکن اتنا بتائے دیتا ہوں یں گاؤں میں زیادہ دن رہ نہ سکوں گا ! یہ بات کشور کو یاد نہیں ی ۔

گاؤں میں بہت سے آم کے باغ تھے ایک باغ اماکڑی کا ں تھا۔ کشور پورے دن آم کے اس باغ میں بیٹھا رہتا تھا۔ وہیں بیٹھ پڑھتا تھا اور دوپہر میں پلنگ ڈال کر آم کے پیڑوں کے سایہ میں سو یا تھا۔ دوپہر میں لو سے زمین گرم ہو جاتی لیکن گھڑوں کا پانی ٹھنڈا جاتا تھا۔ اماکڑی نے اپنے باغ میں اس کے لیے ایک کورا گھڑا ھ دیا تھا اور ڈھکن کی جگہ پر کانسے کا ایک چمکتا کٹورا اوندھا دیا ا۔

کشور کو بار بار پیاس لگ رہی تھی ۔ پیاس کا سبب دوپہر کی ، گھڑے کی سوندھی سوندھی خوشبو، کانس کے کٹورے کی چمک جھپاک تا تھا۔ اور جب آم کے پیڑوں کی رکھوالی کرتی ہوئی اماکڑی سے نی پلانے کے لیے کہتا تھا، تو اماکڑی ہر بار اس سے کہتی تھی "کشور تو تمہیں ہر وقت پیاس ہی لگی رہتی ہے !" اور اماکڑی کی ہنسی س کے ہاتھ کی چوڑیاں کی طرح کھنک اٹھتی تھی ۔

کشور کو مجسم اماکڑی آم کی ایک ٹہنی جیسی لگتی تھی۔ اماکڑی کچے رے رنگ کی قمیض پہنتی تھی، جو کشور کو ٹہنی کے ہرے پتوں جیسی لگتی تھی۔ اماکڑی کسی دن وہ قمیض بدل لیتی تو کشور اسے اس قمیض کی یاد دلاتا؛ پھر دوسرے دن اماکڑی اسی قمیض کو دھو بنا کر پہن لیتی ۔

بس، اس طرح پہلے سال کی چھٹیاں ہنسی کھیل میں ہی گزر گئی تھیں ۔ کشور شہر لوٹ آیا تھا اور شاید کیسی ننھی سی، کومل سی اماکڑی کا تصور بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا جسے اس نے صرف اس وقت محسوس کیا جب اگلے سال گرمی کی چھٹیاں ہوئیں اور کشور پھر ننہال چلا گیا تھا۔

اس بار جب اس نے گاؤں جا کر اماکڑی کو دیکھا، اسے لگا کہ پچھلے سال جو کچی سی اور سانولی سی اماکڑی آم کی ٹہنی سی لگتی تھی، اس بار وہ پورا آم کا پیڑ بن گئی تھی گھنے پتوں جیسے بال اماکڑی کے ماتھے پر گر رہے تھے اور اس بار اس کی آنکھیں بالکل ایسی تھیں جیسے کسی نے آم کی پھانکیں کاٹ کر اس کے چہرے پر رکھ دی ہوں ۔

کشور اماکڑی کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا اور کشور کو اس وقت ہوش آیا جب اماکڑی نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ڈھک لی تھیں ۔ آم کی پھانکیں ڈھک لی تھیں اور پھر جلدی سے آموں کے باغ سے بھاگ گئی تھی ۔

بس دوسرے دن کشور نے دیکھا تھا کہ پیڑوں کے سایہ میں اس کے لیے ایک نیا پلنگ پڑا تھا اور پلنگ کے پائے کے پاس اس کے لیے پانی سے بھرا ایک نیا کورا گھڑا رکھا تھا۔ اس دن جب اماکڑی باغ میں آئی تو وہ کچے ہرے رنگ کی قمیض پہنے تھی اور اس کے ہاتھ میں سبز رنگ کی کانچ کی چوڑیاں تھیں ۔

ان چھٹیوں میں اماکڑی کے لیے کشور کی بھوک جاگ گئی تھی اور پھر یہ بھوک اس کی آنکھوں میں سلگنے لگی تھی ۔ اس بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک دن کشور نے اماکڑی کی سڈول باہیں پکڑ لیں تھیں لیکن اماکڑی نے بانہہ چھڑا کر کہا تھا "کشور بابو! آم کی اس پھانک کو کھا کر تمہارا کیا بھلا ہوگا۔" اماکڑی نے اپنا منھ موڑ لیا تھا اور کشور کا منھ بھوک سے تڑپتا رہ گیا تھا ۔

یہ چھٹیاں ہنسی کھیل میں نہیں بلکہ آنسوؤں کی تیاری میں گزری تھیں ۔ اس بار جب کشور شہر لوٹا تھا تو کچھ آہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا اور کچھ آہیں وہ اماکڑی کو دے آیا تھا ۔

اور پھر وہ اگلے سال کی گرمیوں کا انتظار نہ کر پایا تھا۔ موسم سرما کی تعطیل مختصر تھی لیکن وہ کانپتے پیروں سے اپنے ننہال پہنچ گیا تھا وہ اپنی جیب میں سارے زمانہ کے عہد و پیمان بھر کر لے گیا تھا۔ اس بار اماکڑی نے اپنے دل کی پھانک چیر کر اپنے تن کی تھالی میں پیش کر دی تھی ۔

اور پھر اگلے سال جب گرمی کی چھٹیاں ہوئی تھیں، کشور ننہال گیا تھا اور اس نے اماکڑی کی آم کی پھانک کو اپنی دونوں آنکھوں سے چوس کر کہا تھا "آج تمہارے گھنگھریالے بال مجھے شہد کے چھتے سے دکھائی دیتے ہیں اور تمہارے ہونٹ کورا شہد۔"

" اور میری آنکھیں ؟" "یہ شہد کی مکھیاں نہیں لگتی ہیں ؟ چھتے پر سنبھال کر ہاتھ ڈالنا !" اماکڑی نے جواب دیا تھا۔ کشور کو واقعی ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آنکھیں شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے دل پر چپک گئی ہوں اور اب اس کے دل پر ایک سوجن چڑھی جا رہی ہے ۔

آم کی پھانک کو شہد کا چھتہ بنے [illegible] تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ کشور نے ایک دن اس کے تانبے ڈھلے بالوں کو سونگھ کر اس نے کہا

امرتا پریتم
ترجمہ لطیف صدیقی

(پنجابی کہانی)

اماکڑی

کشور کے ہونٹ جوانی کے نشہ میں سرشار، مدہوشی کے گرم پانی میں ابل رہے تھے اور ان ہونٹوں سے جب اس نے اپنی شادی کی پہلی رات اپنی بیوی کے جسم کو چھوا تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ ایک کچا شلجم کھا رہا تھا۔

کشور کے باپ نے ساری کوٹھی کو بجلی کے قمقمے لگا کر بقعۂ نور بنا دیا تھا لیکن کشور کے سونے کے کمرے کو آج ساری حویلی سے مختلف روشنی دینے کے لیے کشور کی بہنوں اور کشور کی بھابیوں نے (جن میں اس کے دوستوں کی بیویاں بھی شامل تھیں، جن کے ساتھ اس کے دوست بھی ملے ہوئے تھے) روایتی انداز میں کافوری شمعیں روشن کر دی تھیں۔

کشور نے موم بتیوں کی روشنی میں اپنی بیوی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی بیوی کے گورے مکھڑے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ پھر کشور نے موم بتیوں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ موم بتیوں کے گلے پر پگھلتے ہوئے موم کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور کشور کے دل نے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو جھنجھوڑ کر کہے کہ دیکھ ـــــ ان موم بتیوں کے سارے آنسو تمہاری ایک مسکراہٹ کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔

کشور نے اپنی زبان دانتوں کے نیچے دبالی۔ اسے محسوس ہوا جیسے ابھی اس کی بیوی کھلکھلا کر ہنسے گی اور کہے گی کہ آج اس حویلی کا ٹھٹھکا تو دیکھ! اگر ایک کونے میں ریڈیو گرام پڑا ہے تو دوسرے کونے میں ریڈیو رکھا ہے، تیسرے کونے میں کپڑوں سے بھرے ٹرنک پڑے ہیں اور جو تھا کمرہ پلنگوں اور الماریوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور حویلی کے دروازے پر کھڑی موٹر یہ سب چیزیں تمہارے دل کی مت چکا رہی ہیں۔

کشور نے ایک ایک کر کے ساری موم بتیاں بجھا دیں جیسے اس نے ان کے آنسو پونچھ لیے ہوں۔ اور پھر اسے لگا کہ اس اندھیرے نے اپنے رومال سے اس کی بیوی کی مسکراہٹ کو ڈھک دیا تھا۔

کافی دیر کے بعد جب کشور نے محسوس کیا کہ گھر کے سب لوگ اس کی بیوی کی طرح سو گئے تھے تو وہ آہستہ آہستہ اپنے بستر سے اٹھا اور آہستہ سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے حویلی کے بیچ باغ میں چلا گیا۔

حویلی کا ماتھا بجلی کے قمقموں سے چمک رہا تھا۔ بڑے مالک کے حکم کے مطابق یہ روشنی پوری رات اسی طرح رہتی تھی۔ کشور بغور حویلی کو دیکھنے لگا اور پھر دیکھتے دیکھتے اسے اماکڑی کے گلے میں پڑی ہوئی کرتی یاد آ گئی ـــــ کالے کپڑے کی چھوٹی سی کرتی جو سیپ کے سفید بٹنوں سے بھری ہوئی تھی۔

کشور کو اپنا ننہال یاد آیا اپنے ننہال کے گاؤں کا اجڑا جاٹ یاد آیا اور اس اجڑے جاٹ کی لڑکی اماکڑی یاد آئی۔

کشور جب کالج میں پڑھتا تھا۔ ایکبار اپنی ماں کے اصرار پر گرمی کی چھٹیوں میں ننہال گیا تھا اور پھر اس نے تین سال تک ساری چھٹیاں اپنے ننہال ہی میں گزاریں۔

"اماکڑی ـــــ آخر تمہارے ماں باپ نے یہ کونسا نام رکھا ہے؟" کشور نے اس سے پوچھا۔

"ہمارے گاؤں میں آم بہت ہوتے ہیں۔ لوگ انھیں چوستے بھی ہیں ان کا اچار بھی ڈالتے ہیں، ان کا مربّہ بھی بناتے ہیں اور ان کی پھانکیں سکھا کر کھٹائی سے مرتبان بھر لیتے ہیں...... میری ماں نے مجھے بھی آم کی ایک پھانک سمجھ لیا اور میرا نام اماکڑی رکھ دیا تھا۔" اس تیکھی، دبلی اور سانولی لڑکی نے بڑے بھولے پن سے کشور کو جواب دیا۔

عادت نہیں۔

کشور جب کارخانہ سے اٹھ کر دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گھر آتا تو اس کی بیوی ٹھنڈے کمرے میں آرام کرنے کو کہتی۔ کشور نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا ——— میں ایک مرد نہیں بیل ہوں۔ میں تمام عمر خاموش رہ کر شلجم چرتا رہوں گا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسی جگہ پر گھومتا رہوں گا جہاں میری بیوی مجھے گھمائے گی۔ اس لیے کشور نے کبھی اپنی بیوی کی مخالفت نہیں کی تھی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سارے اعضاء سوتے جا رہے ہیں۔ وہ اگر تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنے پلنگ پر لیٹتا تو سارے دن پڑا رہتا۔ اب اسے اماکرہی بھی یاد نہیں آتی تھی اس کا لہو ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے جذبات مردہ ہوتے جا رہے تھے وہ برف کا ایک تودہ بنتا جا رہا تھا۔

کشور کی صحت کی سب کو فکر ہوئی۔ ایک ڈاکٹر آتا تو ایک جاتا۔ بڑی گرم دوائیاں کشور کے گلے سے اترتیں وہ بھی گلے سے اترتے ہی برف کی گولیاں ہو جاتیں۔

پھر ایک بار ——— کشور کے ننہال سے خط آیا کہ کشور کو شاید گاؤں کی کھلی ہوا موافق آ جائے اور اس کے ننہال والوں نے اسے بلا بھیجا۔ کشور نے خط پڑھا لیکن اس کے مردہ جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی لیکن اس رات کشور نے ایک خواب دیکھا۔ اس کا پلنگ آم کے پیڑوں کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ پلنگ کے پائے کے پاس ایک کورا گھڑا رکھا ہوا تھا۔ گھڑے پر کانس کا کٹورا اوندھا ڈھکا تھا اور جب اماکرہی کٹورے میں پانی انڈیل کر کشور کو دینے لگی، کٹورا اس کے ہاتھ سے گر گیا اور ساتھ ہی اماکرہی کوئل بن کر اس کے پاس سے اڑ گئی۔

کوئل کی کوں کوں سے کشور کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے یخ بستہ ہاتھوں سے جب کشور نے اپنے منہ کو ٹٹولا تو گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

کشور گھبرا کر بیٹھ گیا اور اس نے سوچا کہ اگر وہ اسی وقت اسی لمحہ اس کمرے سے نہ نکلا تو یہ نکلتے ہوئے آنسو اس کی ہڈی کی طرح، اس کے گھٹنوں کی طرح اور اس کے خیالوں کی طرح جم جائیں گے ...... اور پھر وہ اسٹیشن کی طرف چل پڑا ——— اس طرف چل پڑا جس طرف سے کوئل کی کوک آ رہی تھی۔

دوسرے دن جب کشور آم کے باغوں میں پہونچا، اس جگہ ایک پلنگ پڑا ہوا تھا وہ جگہ جو اس کے لیے پورے تین سال تک محفوظ رہی تھی۔ کشور کے قدم ٹھٹھک گئے، نہ جانے میری جگہ اس پلنگ پر آج کون لیٹا ہوا ہے!

اور پھر پلنگ پر جو لیٹا ہوا تھا اس نے کروٹ بدلی اور کشور کے کانوں میں چوڑیاں کھنک اٹھیں۔ کشور نے آگے بڑھ کر اماکرہی کے پاؤں کو چھوا اور جب اماکرہی نے چونک کر اپنے پیر ہٹائے تو کشور نے دیکھا کہ اماکرہی اب آم کی پھانک نہیں تھی، آم کا چھلکا تھا۔ اماکرہی اب شہد کا چھتہ نہیں تھی۔ شہد کی مکھی تھی۔ اور اماکرہی اب شراب کی صراحی نہیں تھی، صراحی کا ٹھیکرا تھی۔

"کشور بابو ......" اماکرہی نے کوئل کی کوک کی طرح کہا۔

کشور اکڑوں بیٹھ گیا اور سر پلنگ پر رکھ دیا۔

"اب تو یہاں کس لیے آیا؟" اماکرہی نے پھر کر پوچھا۔

"ٹھنڈی یخ دنیا میں میں جم گیا ہوں۔ میں گرم لو کی تلاش میں آیا ہوں ......" کشور نے پلنگ سے سر اٹھا کر کہا اور پھر اماکرہی کے ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا "آخر میں ایک انسان ہوں۔"

"ایک انسان، ایک مرد!" اماکرہی نے دھیرے سے کہا۔

"ایک انسان، ایک مرد!" کشور نے اماکرہی کے لفظوں کو دہرایا۔

"جو محبت کے تخت سے اٹھ کر شادی کے منڈپ میں جا بیٹھے انسان ہوتا ہے! وہ مرد ہوتا ہے!" اور اماکرہی نے کشور کی بانہہ پر ایک جانور کی طرح جھپٹ کر اپنے سارے دانت گڑا دیے۔

کشور اپنی بانہہ پر ابھرے خون کے پھول کو دیکھنے لگا اور تھکی ہوئی، ٹوٹی اماکرہی سرہانے سر رکھ کر کہنے لگی۔ "یہ انار کا پھول نہیں، زہر کا پھول ہے۔ مجھے جنگلی بلی کہا کرتا تھا نا، باؤلی بلی۔"

"مجھے سچ سچ تمہارے مست ہونٹوں کا زہر چڑھ گیا ہے ——— اماکرہی اس دنیا میں میری کوئی دوا نہیں۔" کشور نے تڑپ کر کہا۔

"کوئی پاگل جانور کاٹ جائے تمہیں معلوم ہو کہ چودہ ٹیکے لگ جاتے ہیں ——— ابھی تو تم نے ایک ہی ٹیکہ لگوایا ہے۔ ابھی تو تم نے ہی شادی کی ہے نا، کم سے کم چودہ تو کر لو ......"

اور اماکرہی کی آنکھیں بورا گئیں۔

"شراب میں نے کبھی پی نہیں، لیکن تمہیں دیکھتے ہی میرے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں۔"

املکڑی کا روپ اس کے لیے ایسا ہو گیا تھا جیسے وہ آموں کے رس کو، شہد کی بوندوں کو اور شراب کے گھونٹوں کو ملا کر کھا گیا ہو۔

اس بار جب کشور املکڑی سے رخصت ہونے لگا تھا، املکڑی کی باہیں اس کے بدن سے چھٹتے وقت اینٹھ گئی تھیں۔ اور باوری املکڑی نے کشور کی باہوں پر جگہ جگہ اپنے دانت گڑا کر لال نشان بنا دیئے تھے اور کہا تھا۔ "یہ انار کے پھول جتنے دن تمہاری باہوں پر کھلے رہیں گے، مجھے اتنے روز تو یاد کرو گے!"

"میری جنگلی بی، میری باولی بلی!" اور کشور نے اپنی باہوں پر ابھرے ہوئے لال پھولوں کو چوم کر ایک آم کی پھانک کا، ایک شہد کے چھتے کا اور ایک جام طور میں کا ایک نیا رنگ دیکھا تھا۔

ان گرمیوں میں برسات ذرا جلدی شروع ہو گئی تھی اور اس دن املکڑی نے شام کی ہلکی سردی میں اپنے گلے میں کالے سیپ کی وہ کرتی پہن رکھی تھی جس کی پوری چھاتی سیپ کے سفید بٹنوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

املکڑی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں اور ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں۔ بس یہی مٹھی بھر بٹنوں کا، تولہ بھری چاندی کا اور تھوڑے سے کانچ کا سنگھار کیے املکڑی کھڑی تھی۔ اس دن پہلی بار کشور کو الھڑ گنوارن لڑکی کے سنگھار کا اور پڑھی لکھی شہری لڑکیوں کے سنگھار کا فرق سمجھ میں آیا۔ اسی دن سے کشور کو اپنے شہر اور اپنے کالج کی سبھی لڑکیاں ہینگروں پر ٹنگے کوٹوں جیسی دکھائی دینے لگیں تھیں، جیسے ہینگر پر طرح طرح کے فیشنوں کے کپڑے سی کر ڈال دیئے جاتے ہیں۔

پھر کشور اور املکڑی کے دل کی یہ خوشبو گاؤں سے اڑتی اڑتی شہر میں آ پہونچی تھی، اور جب کشور کے باپ کو اس بات کا علم ہوا تھا تو اس نے کشور کی ماں کے پاس بیٹھ کر کہا تھا "ایک بار اگر کوئی محبت کے کنوئیں میں گر پڑے پھر وہ کسی سے بھی نہیں نکالا جاتا۔ یوں ہی بیٹے کو نہ گنوا دینا۔ جلدی سے اس کے گلے میں شادی کا رسہ ڈال دو۔ اور اس کنوئیں میں سے نکال لو۔"

ایسی بات نہیں تھی کہ کشور نے ہاتھ پاؤں نہ مارے ہوں لیکن اس کے ماں باپ کی ضد ایک پیراک کی طرح ہاتھ میں شادی کا رسہ لے کر اس کنوئیں میں اتر پڑی تھی اور کشور کو جکڑ کر اس کنوئیں میں سے نکال لائی تھی۔

آج شادی کی پہلی رات تھی اور کشور املکڑی کو اس طرح یاد کر رہا تھا جیسے کنوئیں کی جگت پر کھڑا ہو کر کنوئیں میں جھانک رہا ہو۔ اب اسے معلوم تھا کہ اگر وہ چاہے بھی تو وہ لوٹ کر اس کنوئیں میں نہیں گر سکتا تھا۔ کیونکہ اب اس کی گردن میں اس کی شادی کا رسہ بندھا ہوا تھا۔ پھر بھی وہ کنوئیں کی جگت سے اتر نہیں پا رہا تھا۔ شاید اس کنوئیں کا جو پانی اس نے پیا تھا وہ اس کی رگوں میں اپنا حق مانگ رہا تھا

رات شاید ختم ہونے پر آئی تھی۔ حویلی کی بتیاں ایک ایک کر کے بجھنے لگی تھیں۔ اور کشور کو لگا کہ املکڑی کے گلے میں پڑی ہوئی کرتی سے کوئی سیپ کے بٹنوں کو ایک ایک کر کے نوچ رہا تھا۔

صبح جب کشور کی بہنوں اور بھابیوں نے رات کے جاگنے سے کشور کی سرخ آنکھیں دیکھیں تو وہ ہنسی سے نڈھال ہو ہو کر کشور کو چھیڑنے لگیں "اپنی ہی دلہن تھی، کہیں بھاگی تو نہیں جاتی تھی! کیا ضرورت تھی ساری رات شب بیداری کرنے کی!" کشور نے منہ نہیں کھولا۔ اور پھر جب کشور کی بہنوں نے جہیز کے فرج کو کھولتے ہوئے بڑے چاؤ سے کشور سے پوچھا تھا "دولہا صاحب! آج اس میں کون کون سی چیزیں رکھیں؟" تو کشور کا بھینچا ہوا منہ کھل گیا "اس میں شلجم رکھ دو۔" کشور نے جواب دیا اور ایک طرف چلا گیا۔

کتنے ہی دن بیت گئے۔ آموں کا موسم آیا گھر کے سب لوگوں نے آموں کو دل بھر کے فرج میں ٹھنڈا کیا لیکن کشور نے آموں کو منہ نہیں لگایا صبح کی چائے کے وقت اگر میز پر شہد ہوتا کشور بغیر چائے پیئے کمرے سے چلا جاتا۔ کشور کے دوست آتے، فرج میں شراب کی بوتلیں رکھتے لیکن کشور نے قسم کھانے کو ایک گھونٹ بھی نہیں دیکھا —— اور جب ایکبار اس کی بہن جھنجھلا گئی، اس کی بھابیاں غصہ ہو گئیں اور اس کے دوست اس پر برس پڑے تو صرف ایک بار کشور کے منہ سے نکلا "تم مجھے اور کوئی چیز کھانے کو نہ دیا کرو بس شلجم دے دیا کرو، شلجم! میں صرف شلجم کھانے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔"

پھر گرمیاں آگئیں کشور کی سسرال والوں نے کشور اور اس کی بیوی کا کمرہ ایرکنڈیشن کروا دیا۔ انھوں نے کہا تھا ہماری گلو کو گرم کمرے میں رہنے

باندھ کر لے جائے گی — اور ان کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل کے ساتھ لگا کر رکھے گی۔ انہی یادوں کو اپنی زندگی کا آسرا خیال کرے گی۔

یہ سب سوچتے سوچتے جیسے اس کی سوچیں بھی بھاری ہو گئیں۔ آنکھوں سے جھرنے ابل پڑے۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ بیہوش ہوتی جا رہی ہو۔ دیوار کو اس نے زور سے تھام لیا۔ لیکن اچانک آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ آخر اسے دوبارہ وہیں بیٹھ جانا پڑا۔

چاند کافی اوپر آچکا تھا۔ گھاٹی پر چاندنی کی چاندی اور بھی زیادہ پھیل گئی تھی۔ چیل کے درختوں سے گزرتی ہوا کی سرسراہٹ سانپ کی پھنکار سی لگ رہی تھی۔ دور نیچے بہتے ہوئے نالے کا شور بڑھ رہا تھا اور راجاں —— ان پہاڑوں کی بیٹی راجاں ویسے ہی گھٹنوں پر سر ٹکائے روتی رہی۔

بہت دیر کے بعد جب وہ پھر اپنی کوٹھری میں گئی تو برآمدے میں اس کا بابو جھنت رام پہلے کی طرح سویا ہوا تھا۔

دوسرے دن بابو نے اسے بدا کرتے ہوئے کہا، "بیٹی میں تمہیں جلدی بلا لوں گا۔" لیکن اس نے بابو کی آواز جیسے سنی ہی نہیں۔

آنگن سے نکل کر راجاں کی ڈولی جب نیچے گھاٹی میں پہنچی تو نہ جانے کہاں سے ایک مولا آکر ڈولی کی پھنگی پر بیٹھ گیا۔ اور عجیب سروں میں چہکنے لگا۔ اندر بیٹھی ہوئی راجاں کا دل جیسے اچھل کر باہر آنے لگا۔ گھر کے نیچے والے چشمے کے قریب ہی مولوں کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ یہ مولے آج راجاں کو وہاں نہ پا کر اس کی ڈولی پر آبیٹھے۔ راجاں کا جی چاہا کہ ڈولی کا پردا سرکا وہ مولے کو آخری بار دیکھ لے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ اگر باہر جھنت رام دیکھ لے تو؟

گھاٹی سے گزر کر ڈولی جب اوپر چوٹی پر پہنچی تو مولا اپنی آواز میں نہ جانے کیا کہتا اڑ گیا۔

اسی طرح درختوں کے درمیان سے گزرتے، پہاڑوں کو پار کرتے راجاں کی ڈولی اسی روز شام کے وقت سسرال کے گاؤں میں آپہنچی۔ موٹے موٹے کپڑوں میں لپٹی، چھوٹی سی کوٹھری میں دیکھنے کے لیے آئی ہوئی عورتوں کے درمیان گھری ہوئی راجاں کا دم گھٹنے لگا۔ چھاتی بھاری ہو گئی اور گلا سوکھنے لگا۔ وہ کسی سے اتنا بھی نہ کہہ پائی کہ اسے پیاس لگی ہے۔

رات کو جب جھنت رام نے اس کا گھونگٹ اٹھایا تو اچانک نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ جھنت رام نے آگے بڑھ کر آنسو پونچھ ڈالے اور چھاتی سے لگا لیا۔ اس چھاتی میں نہ جانے پیار کی کیسی حدت تھی کہ راجاں کے دل کا بوجھ برف کی مانند گھلنے لگا۔ اور آنسو بن کر باہر آنے لگا۔ آخر اس کا من ہلکا ہوا۔ آنسوؤں کا سیلاب تھم گیا۔ جھنت رام نے کہا۔ "رونے سے کیا فائدہ؟ میں تمہیں جلدی بابو کے پاس چھوڑ آؤں گا۔"

جھنت رام کی آواز میں کچھ ایسی یگانگت تھی کہ اس میں ذرا سے جھوٹ کی گنجائش نہ تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے پھر اس کے دور پہاڑوں پر بسے گاؤں میں چھوڑ آئے گا۔ جھنت رام اسے دیوتاؤں کی طرح لگنے لگا۔

ویسے بھی وہ بہت خوبصورت اور تنومند جوان تھا۔ کھڑا ہو تو راجاں کو گردن اٹھا کر دیکھنا پڑے۔ چھوٹے چھوٹے گھنگھرالے بال، کانوں میں مرکیاں پڑی ہوئی اور گلے میں تعویذ۔ راجاں کا جی چاہا کہ جھنت رام کی چھاتی پر سے کبھی بھی سر نہ اٹھائے۔ اس پردیس میں اجنبی لوگوں کے درمیان وہی تو اس کا سہارا تھا۔ اور جھنت رام سوچ رہا تھا کہ راجاں کتنی خوبصورت ہے — بھولی —— نادان۔

دو تین دنوں کے بعد جھنت رام نے راجاں کو بتلایا کہ اس کے بابو کا سندیش آیا ہے کہ وہ اتوار کو یہاں آکر لے جائے گا۔ یہ سن کر راجاں کی خوشی کی حد نہ رہی لیکن دوسرے ہی لمحہ اسے اپنا دل کچھ بدلا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے۔ اسی رات جب جھنت رام کی گود میں سر ٹکائے لیٹی تھی تو جھنت رام نے پوچھا۔ "تجھے اپنا گاؤں بہت پیارا لگتا ہے۔" راجاں نے شرماتے ہوئے جھجک بھرا جواب دیا۔ "ہاں۔"

"ایسا کیا ہے وہاں؟ کیا بابو اکیلا ہے اس لیے؟"

راجاں سوچنے لگی کہ وہ کیا جواب دے۔ اس کے بابو نے اسے کبھی گلے نہیں لگایا۔ مگر یہ بھی کیسے کہے کہ اسی گھاٹی، انہیں پہاڑوں، انہیں جھرنوں اور درختوں میں اس کے پران بستے ہوئے ہیں۔ اسے کیسے بتلائے کہ اس کا سب کچھ وہیں ہے۔

جھنت رام نے اس سے پوچھا۔ "اس بیابان جنگل میں کیا ہے جو

وید راہی

ترجمہ: لیش سروج

(ڈوگری کہانی)

پربت یہ میرے ہیں

راجان کو نیند نہیں آ رہی تھی۔

کوٹھڑی میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ باہر شاید برف بھی پڑی تھی، مگر اتنی سردی میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے موتی ابھرتے آ رہے تھے دل میں جیسے آگ سلگ رہی تھی، گلا سوکھ رہا تھا اسے زوروں کی پیاس لگی۔

لیکن وہ اٹھ کر باہر کیسے آئے؟

باہر بڑے کمرے میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا۔ اور وہاں اس کا باپو اور ساتھ میں مہنت رام اس کا خاوند سویا ہوا تھا۔

آخر اس سے رہا نہیں گیا۔ دھیرے سے اٹھی، دبے پاؤں دروازے کے نزدیک آئی، اور سنبھل کر اہستہ دھیمے سے دروازہ کھولنے لگی تاکہ کہیں ذرہ کی آہٹ نہ ہو۔

بڑے کمرے میں اتنا اندھیرا تھا کہ وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن پھر بھی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اسے پتہ تھا کہ اس کے باپو اور اس کا خاوند وہاں سوئے ہوئے ہیں۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے دونوں کھاٹوں پر کھیس بچھائے تھے۔

وہ جلدی سے بڑے کمرہ میں سے نکل کر آنگن میں آ گئی۔ گھڑے کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اس پر بھی کہیں بڑا کٹورا پانی پینے سے پیاس بجھی۔ پانی پی کر گھٹنوں پر منہ ٹکائے، وہ دیر گئے تک وہاں بیٹھی رہی۔

اس وقت برف پڑنے کے آثار تو دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن ہوا برف سے زیادہ سرد تھی۔ پھر وہ وہاں سے اٹھی اور آنگن کی دیوار کے سہارے آکھڑی ہوئی۔

پونم کی رات تھی۔ سامنے پہاڑ کے پیچھے سے چاند آہستہ آہستہ اگ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ساری گھاٹی پر چاندنی پھیل گئی تھی۔ دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سوچا اگر اس کا گورا جسم چاندی کی طرح پگھل کر اس چاندنی میں جذب ہو جائے۔ اور پھر اس پہاڑ کے ہر ایک درخت کے ایک ایک پتے اور ذرے ذرے کے گلے لگ جائے تو کتنا اچھا ہو۔ تب مہنت رام اسے کل ڈولی میں بٹھا کر یہاں سے دور ـــــ میدانوں کی طرف اپنے گاؤں میں کیسے لے جائے گا۔

آنسو اس کے گالوں پر پھسلنے لگے۔ بے ماں کی بیٹی راجان کو اس گھاٹی نے ہی پیار دیا تھا۔ اس کا باپو دور نچلی پن چکی کا مالک تھا۔ اسے سارا دن وہاں سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اکیلی راجان گائے بکریاں کو چراتے ہوئے ٹیلے پربتوں پر جا چڑھتی۔ اونچی آواز میں گیت گانے لگتی۔ ان پہاڑوں کا ایک ایک درخت اس کا جانا پہچانا تھا۔ پہاڑوں کی پھنگیوں پر پھولوں کے گچھے اس کے جسم کی خوشبو پا کر جھومتے تھے۔ گھاٹی کا ایک ایک چشمہ اس کے ساتھ باتیں کرتا تھا زندگی کے سونے پن سے جب وہ گھبرا جاتی تو یہ چشمے ہی اس کے ساتھی اور رازدار بن کر اس کی تنہائی کو دھو ڈالتے اور اس کی مایوسی کو بہا کر لے جاتے۔

ان پہاڑوں کی گود میں پرورش پا کر ہی وہ اتنی بڑی ہوئی تھی۔ یہیں اس نے بچپن کی حدوں کو لانگھ کر جوانی میں اپنا قدم رکھا تھا۔ لیکن اس کو کیا علم تھا کہ جوانی ہی اس کی دشمن نکلے گی۔ چار دن پہلے باپو نے اس کی شادی کر دی تھی۔ آج گونا بھی ہو گیا۔ کل ہمیشہ کے لیے اسے مہنت رام کے ساتھ چلے جانا ہے۔ یہ پربت ـــــ یہ گھاٹی ـــــ یہ جھرنے ان سب کی جدائی کا غم لے کر کل وہ اپنے آنچل کے ساتھ

اردو اور ہندی

پچھلے ۲ ماہ سے دہلی کے انگریزی اخباروں میں اردو اور ہندی کے بارے میں ایک زوردار بحث چل رہی ہے۔ اس بحث کا آغاز ۲۲ر دسمبر کو، روزنامہ پیٹریٹ میں فراق گورکھپوری کے ایک مضمون سے ہوا۔ اس مضمون پر پیٹریٹ کے علاوہ دوسرے انگریزی اخباروں خاص طور سے ہندستان ٹائمز میں خطوط کا تانتا بندھ گیا جن میں اردو اور ہندی دونوں طرف کے وکیلوں نے اپنے اپنے نقطہائے نظر کا صاف اعلان کیا۔

اس مناظرہ میں گرمی اس وقت پیدا ہو گئی جب اترپردیش کے سابق وزیر اعلیٰ، سابق وزیر تعلیم، سابق گورنر راجستھان اور ٹنڈن جی اور راجندر پرشاد جی کے بعد ہندستان میں ہندی کے سب سے بڑے پریمی شری سمپورنانند میدان میں اترے۔ انھوں نے ۱۹ر فروری کے پیٹریٹ میں ایک مضمون فراق کے جواب میں لکھا۔

سمپورنانند جی نے اپنے مضمون میں اردو کے ساتھ "جیسے کو تیسا" کا سلوک کرنے کا جواز پیش کیا اور ساتھ ہی ساتھ اردو کے متروکات کو ہندی دشمنی کی سب سے بڑی علامت قرار دیا۔

فراق نے دوبارہ ۲ر فروری کے پیٹریٹ میں سمپورنانند کے جواب میں ایک اور مضمون لکھ کر متروکات کے اس جھوٹے نظریہ کا جواب دیا۔

فراق اور سمپورنانند کے اس مباحثہ اور مناظرہ کے دوران اخبارات میں متروک کے نظریہ سے قطع نظر اردو اور ہندی کے تمام موضوع پر ایک بحث عوامی سطح پر چلتی رہی جو اردو کے نقطۂ نظر سے بڑی حوصلہ افزا تھی کیونکہ باوجود اردو سے غلط فہمیوں، اس سے بعض جائز و ناجائز شکایات کے ان خطوط لکھنے والوں کی نظر میں اردو کا ایک احترام معلوم ہوتا ہے جو بڑا خوش آیند ہے۔

سمپورنانند جی نے فراق کے دوسرے مضمون کے بعد بڑی بلندی سے بولتے ہوئے ایک خط میں فرمایا کہ وہ اس نیچی سطح پر نہیں اترنا چاہتے جس پر فراق صاحب اتر آئے ہیں چنانچہ وہ فراق کے مضمون کا جواب نہ دیں گے۔ اس طرح غالباً بحث کا یہ سلسلہ اب بند ہو گیا لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم "متروکات" کے بارے میں شری سمپورنانند جی کو جو غلط فہمی ہے اس کو رفع کیا جائے۔

ہم بالغ نظر اور صاحب رائے اردو دانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ علمی سطح پر اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔ ہمارے صفحات تو حاضر ہی ہیں لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ انگریزی اور ہندی میں اس موضوع پر اظہار خیال کیا جائے۔

ہم فراق صاحب کے دونوں مضامین اور سمپورنانند جی کے مضمون کے ترجمے شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

تم مجھے بھی تنہا چھوڑ جانا چاہتی ہو۔

"نہیں تم سے دور نہیں جانا چاہتی۔" دفعتاً راجاں کے منہ سے نکل پڑا۔ مہنت رام اس کی بات سن کر خوش ہوا لیکن بولا کچھ نہیں۔

آخر راجاں نے ہی کہا۔ "میں پہلے کبھی اس گاؤں سے باہر نہیں گئی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا سب کچھ وہیں رہ گیا۔ وہ ٹیلے، وہ پربت، وہ چیڑ اور دیودار کے درخت وہ سب مجھے اچھے لگتے تھے، بڑے پیارے۔" یہ سب کہتے ہوئے راجاں جیسے کھو سی گئی ———— بچپن کے اصلی روپ میں اس کی آنکھیں بند ہو گئیں (

) مہنت رام راجاں کی یہ باتیں سن کر حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ یہ الھڑ سی پہاڑی لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟

باپو کے آنے میں دو دن باقی تھے۔ راجاں کو اب ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مہنت رام کے بغیر نہ رہ سکے گی۔

اس نے کہا۔ "تم میرے ساتھ نہیں جا سکو گے؟" مہنت رام یہ سن کر ہنس پڑا اور بولا۔ "تم بڑی بھولی ہو؟"

"کیوں؟"

"میں تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں؟"

"کیوں؟"

"مجھے بڑے شہر میں جانا ہے۔"

"کس لیے؟"

"نوکری کرنے کے لیے۔"

راجاں حیران رہ گئی ———— اسے زندگی میں پہلی بار اسی کا پیار ملا تھا۔ ڈر لگا کہیں مہنت رام ناراض نہ ہو گیا ہو۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں باپو کے ساتھ نہ جاؤں تو نہیں جاتی۔"

"نہیں، نہیں تمہیں تو جانا ہی پڑے گا۔ تمہارا جانا تو ضروری ہے۔"

"کیوں؟" راجاں کسی اندیشے سے خوف زدہ تھی۔

مہنت رام کچھ لمحوں کے لیے سوچ میں ڈوبا رہا پھر آہستہ لہجے میں بولا "تمہیں کسی بات کا بھی علم نہیں؟"

"نہیں۔"

"تمہارے لیے میں نے تمہارے باپو کو پانچ سو روپے دیے تھے تین سو تو میرے پاس تھے دو سو ادھار لینے پڑے۔ یہ ادھار چکانے کے لیے مجھے بڑے شہر جانا پڑے گا۔ وہاں ایک دو سال کہیں نوکری کرنی پڑے گی۔ تمہارے باپو کو تمہیں لے جانے کا حق تو نہیں ہے کیونکہ تم یہاں اداس ہو جاؤ گی۔ اس لیے جب تک میں نہ آؤں باپو کے پاس ہی رہو۔"

اتنا کہنے کے بعد اس نے راجاں کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے راجاں کی جان ہی نکل گئی ہو۔ منہ کا رنگ کالا پڑ گیا۔ مہنت رام کو ڈر لگا۔ اس نے راجاں کو جھنجھوڑا۔ راجاں پتھرائی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔

الاؤ او کو باپو آیا تو بہت کہنے سننے کے بعد بھی راجاں اس کے ساتھ نہ گئی۔

اور جب مہنت رام شہر جانے لگا تو راجاں نے کہا۔ "تم میرے لیے ہی مجھ سے دور جا رہے ہو، اس بات کے لیے مجھے معاف کرنا، وہ پربت میرے نہیں جنھوں نے مجھے بیچ دیا۔ میں یہاں رہ کر تمہاری راہ دیکھوں گی، جب تک تم لوٹ نہیں آؤ گے۔"

ان بنیادی اور عالیشان اور ہمہ گیر تصورات کا فقدان ہو تب کا اسمان شدہ ستے ہوئے سورج کی روشنی، سمندروں کی ہمہ گیر وسعت، زمین کا سرسبز فرش، حیات بخش ہوا اور انسان کا ذہن ہے۔" لیکن بار بار یہ ایک خواہش ابھرتی تھی کہ کاش اردو میں یہ چیزیں اور ہوتیں۔ کاش وہ مسیحا نفسی اور ہوتی کہ جو معاملات انسانی میں آنسو کی اہمیت سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ شانتی رس اور پریا درس نے کہ جو ہندی ادب کی سب سے دقیع روایت ہو ابھی تک اردو میں پورا دخل نہیں حاصل کیا تھا۔ اردو کا لہجہ، مزاج و آہنگ ایک ایسے ہیجان و تلاطم کا آئینہ دار رہا کہ جس میں ہند کلچر کا سکون، شانتی، توازن و ثبات موجود نہ تھا۔ احساس رہا کہ فطرت، بچپن سے متعلق شاعری، استری دھرم کا ہندستانی تصور، مادی دنیا کے تقدس کا احساس، عالم و زندگی پر اعتقاد بہترین ہند ادب کی پرسکون فضا، انسان دوستی، گھریلو انداز، قربت و بے تکلفی کا احساس مادی اور روحانی دنیا کے ایک ہونے کا فطری احساس، حسیات و ماورائے حسیات کی دنیاؤں کی قربت کا احساس، ان تمام روایتوں کو ابھی اردو میں پوری طرح سمویا جانا تھا۔

مسلم تصوف اور ہند و بھگتی کے تصورات میں خاصی قربت رہی۔ لیکن پھر بھی مسلم تصوف آریہ کاس کے تصوف کی پوری تصویر نہیں تھا۔ اردو میں اپنی بھی بعض خصوصیات رہیں، برجستگی، چمک دمک، زور بیان اور طنز۔ اردو ادب یہ کہا جاسکتا ہے یورپی ادب کے نوکلاسکی یا آگستی عہد کے آدرشوں سے مشابہ رہا نہ کر بالکل کلاسیکی یونانی آدرشوں سے کہ جس کی خصوصیات ایک سہ بعدی جسامت اور ٹھوس و باوزن انداز تھیں۔ اردو میں اکثر یہ ہوا کہ بنیادی ترین جذبات کو بھی پیش کرنے کے لیے الفاظ کی چستی ضروری سمجھی گئی اور جملہ کا حسن پر زیادہ اہمیت دی گئی۔ اردو میں ایک ہند و نشاۃ الثانیہ کی بہت دنوں سے ضرورت تھی۔ ہند و مسلم کلچروں کے انجذاب کو اور بھی پائیدار و مضبوط ہونا تھا زیادہ ہمہ گیر ہونا تھا اور ہند و نقطہ نظر سے اور زیادہ مہذب ہونا تھا تاکہ یہ حقیقت سے اور قریب ہو۔ نامکمل انجذاب یا ادھورا اتحاد کافی نہیں تھا۔

ہندی کی تحریک انھیں باتوں کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ یہ ایک صحت مند اور ضروری ردعمل تھا کہ جس سے ہمدردی کرنا درست تھا۔ لیکن نہ ہندی والوں نے اور نہ اردو والوں نے اس بغاوت کے اسباب کو معقول و دلنشیں انداز میں پیش کیا۔ بجائے اس کے کہ یہ ایک فکر انگیز ثقافتی بحث بنتی صرف کیچڑ اچھالنے کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔ جس چیز کو تعمیری اور مثبت ہونا تھا وہ تخریبی اور منفی بن کر رہ گئی۔

یہ زبردست غلطی اس شعبہ میں بھی کی گئی جو قسمتوں کو بنا یا بگاڑ سکتا ہے یعنی تعلیم کے شعبے میں۔ اردو اور ہندی کی تعلیم میں ہمارے اسکولوں میں ایک صدی سے زیادہ سے علاحدگی اور نہ ملنے کا رجحان رہا ہے۔ اردو اور ہندی کی تعلیم کو علاحدہ کر دینا ایک مہلک غلطی تھی۔ دونوں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی اور اب دونوں کے درمیان ایک سمندر حائل ہے۔ ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا اب تقریباً ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں کا خون نچوڑ دیا گیا ہے دونوں زخمی ہیں۔

اس میں اردو سے کہیں زیادہ ہندی کا نقصان ہوا ہے۔ اردو کا صرف یہ نقصان ہوا کہ اس سے سنسکرت کے چند الفاظ و محاورات چھن گئے۔ لیکن ہندی کا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہے اور آج یہ ایک ایسی زبان ہے جس کا دیوالیہ نکل چکا ہے۔ ہندی اب نہ ہند و طرز حیات کے آدرشوں کی آئینہ داری کرنے کے قابل رہ گئی ہے۔ اور نہ متحدہ قومی زندگی کے آدرشوں کی عکاسی۔ لوگ یہ بھول گئے کہ ہندی اس وقت تک اپنی بہار پر آسکتی اور نہ کامیاب ہو سکتی ہے جب تک کہ اس ہندی پر قدرت حاصل کرے جو ۹۵ فیصدی سے بھی زیادہ اردو ہے۔

ہندی (موجودہ) نے اپنا کام اس مقصد سے شروع کیا کہ زبان و ادب کو "غیر ملکی فارسی و عربی الفاظ سے پاک کیا جائے اور اب حالت یہ ہے کہ ہندی ہزاروں خالص ہندی الفاظ و محاورات سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے اور ۲۰ کروڑ ہندی بولنے والوں کی دل کی دھڑکنوں سے دور ہو چکی ہے اس طرح اردو عوام کے اظہار و احساس کا سب سے طاقتور ذریعہ بن گئی ہے۔

ہندی تحریک ایک صدی ہوئے شروع ہوئی اس وقت سے اب تک صرف چند مستثنیات کے علاوہ ہمارے جن ہم وطنوں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا ان کو کھڑی بولی کی تحریر و تقریر اور گرامر سے شد بد بھی نہ تھی۔ اس کی مثال اس اسکول کے بچے کی سی ہے جو کسی نصابی کتاب سے انگریزی گرامر کے چند موٹے اصول سیکھنے کے بعد جان بوجھ کر انگریزی کی بہترین نظم و نثر کو ترک کر دے اور لاطینی کی لغت کی مدد سے انگریزی اور بجائے ایک نیا طرز پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

فراقؔ گورکھپوری

اُردو ہندی کو زیادہ مؤثر بنا سکتی ہے

فطرت انسانی کی ایک عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہم اکثر کسی چیز سے اس وقت تک محبت نہیں کر سکتے جب تک کہ کسی چیز کو اس کا مخالف سمجھ کر اس سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ نسل انسانی کی تاریخ مخالف اشیا کی آمیزش کی راہ میں حائل مشکلات کی کہانی ہے۔ اور آمیزش کی راہ میں حائل یہی مشکلات کبھی کم اور کبھی زیادہ قوموں اور تہذیبوں کی زندگی کے لیے ایک خطرہ رہی ہیں۔

یہ مشکلات وہ درد ہیں جو ارتقا کی شرط ہے اور جیسا کہ نیٹشے نے کہا ہے "تمام ترقی و ارتقا در اصل درد و تکلیف کو سوز و گداز کی منزل تک پہونچا دینے کی داستان ہے۔" اسی سوز و گداز میں تاریخ کے اس عمل کا تمام راز پنہاں ہے جس میں متضاد اشیا کی آمیزش سے نئی اور ترقی یافتہ شے برآمد ہوتی ہے۔ اس آمیزش کو ہر قدم پر آویزش سے خطرہ لاحق ہے۔

یہ درد و تکلیف اس مسئلہ میں بھی نمایاں ہے جس کو ایک ہی زبان کی دو شکلوں یعنی اردو اور ہندی کا تنازعہ کہا جاتا ہے۔

پچھلی صدی کے وسط تک اردو نے اپنے کو نظم و نثر کی زبان کی حیثیت سے اور نظم و نسق کی زبان کی حیثیت سے تسلیم کروا لیا تھا۔

اردو نے خود کو پورے شمال ہند میں پشاور سے لے کر بہار تک اور سری نگر سے لے کر مدھیہ پردیش تک تجارتی لین دین کی زبان کی حیثیت سے، ہندستانی کلچر کی زبان کی حیثیت سے اور شہری زندگی کے آداب و رسوم کی زبان کی حیثیت سے تسلیم کروا لیا تھا۔ بنگال میں ڈھاکہ اور مرشد آباد اردو کے اہم مراکز بن گئے تھے، بمبئی میں، جنوبی ہند میں یہاں تک کہ نیپال و کھٹمنڈو میں غرض ہر اہم شہری مرکز میں اردو کلچر اور بین الصوبائی روابط کی زبان بن گئی تھی۔

اس علاقے کی شہری و مضافاتی زندگی میں سماجی ضروریات کی ایک زبان کے ارتقا میں ہندو پہل نہ کر سکے۔ لیکن اس پر حیرت ہونا چاہیئے اور نہ اس حقیقت سے بھڑکنا چاہیئے۔ مسلم حکومت ایک ایسی زبردست طاقت تھی جس نے شہریت اور جدیدیت اور اتحاد کی بنیاد رکھ دی اور اردو کو پھیلا در اصل اسی متحد کرنے والی طاقت کا سبب بھی تھا اور نتیجہ بھی۔ اپنی سیل روانی میں اردو نے ہندی کی پوری لغت اس کے محاورات، روزمرہ، بول چال کے جملوں اصطلاحات اور کھڑی بولی کے دوسرے بولتے ہوئے فقروں کو لپیٹ میں لے لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے دہلی کی ابھرتی ہوئی زبان کے بھی تمام الفاظ و محاورات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

لیکن اردو اپنے تمام حسن و دولت کے باوجود ہندوؤں کی گہری امنگوں ان کی یادوں کے درد کی بنیادی آرزوؤں کی پوری طرح تکمیل نہ کر سکی۔ ہندو جمالیات کی چاشنی اکثر اردو میں نہ ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگوں میں وہ کیفیت پیدا ہو گئی جس کی تشبیہ گھر کی یاد سے دی جا سکتی ہے۔

اس بے اطمینانی و الجھن سے ہم دردی اور ہمدردانہ رویہ کی ضرورت تھی۔ اردو ادب میں لوگ سنسکرت الفاظ کے مخصوص تلفظ اور ان کے حسن کو نہ پاتے تھے۔ جب اردو کے لیے فارسی رسم خط استعمال کیا گیا تب ہندوؤں کے دلوں میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا رسم خط ناگری ہوتا۔ ہندستانی حکایتیں و داستانیں ہندو ادب اور ہندو فکر کی اشاریت ہندو رسوم و رواج، ہندوؤں کی خانگی و سماجی زندگی کی روایتیں اور آدرش ہندوؤں کی کلچرل فضا اور دنیا کے بارے میں ہندوؤں کے احساسات، میلوں ٹھیلوں کے بارے میں ہندوؤں کے اعتقادات ——— ان سب باتوں کو ابھی اردو میں پوری طرح جذب ہونا تھا۔

اردو میں جمالیاتی حسن و ترقی کی کمی نہیں، مسرت سے نہلائے ہوئے ان الفاظ و اشعار میں سکون و ثبات کی کمی نہیں اور نہ ان میں وجد کے

پٹریٹ اخبار کے ۲ر دسمبر کے شمارہ میں میرے دوست فراق گورکھپوری کا ایک مضمون شایع ہوا ہے جس کا نام "اردو ہندی کو زیادہ موثر بنا سکتی ہے" بظاہر ان کے پاس جگہ بہت کم تھی ورنہ اس موضوع سے جس پر وہ لکھ رہے تھے اور خود اپنے سے انصاف کرنے میں وہ اس بری طرح ناکام نہ ہوتے جس طرح کہ بدقسمتی سے ہوئے ہیں۔

اس مضمون سے میرا مقصد ان سے زور آزمائی کرنا ہرگز نہیں۔ میں صرف چند ان نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جن کا تذکرہ فراق صاحب غالباً "سہواً" نہیں کر سکے ہیں۔ اپنے مضمون میں فراق صاحب نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جن کا شاید کچھ لوگ جواب دینا چاہیں مثلاً فراق صاحب کہتے ہیں "چند مستثنیات کے علاوہ ہمارے وہ ہم وطن جنھوں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا۔ کھڑی بولی کے محاورات اور گرامر سے بہت مبتدیانہ اور معمولی واقفیت رکھتے تھے۔" یا مثلاً وہ کہتے ہیں "اگر آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہندی کو کتنا بے جان، مردہ، بدصورت بے ہودہ، عامیانہ اور دسویں درجہ کی چیز بنایا جا سکتا ہے تو آج، کل اور پرسوں کے ہندی شعراء کو پڑھیے۔ (مستثنیات ہو سکتے ہیں لیکن اس میں بھی شبہ ہے۔) اس آخری نکتہ پر زور دینے کے لیے وہ یہ بھی کہتے ہیں "عوام میں سے کوئی بھی کھڑی بولی کی وہ تصنیف نہیں خریدتا جو ہندی میں ہو۔"

مجھے یقین ہے کہ جو زبان انھوں نے استعمال کی ہے وہ اردو ادبی تنقید کے اعلا معیار کی زبان نہیں ہے۔ بہرحال مجھے توقع ہے کہ کوئی ہندی پریمی ان چھوٹی باتوں میں نہیں پڑے گا جن سے دلیل کا وزن کچھ نہیں بڑھتا اور جذبات کی کشیدگی بڑھ جاتی ہے۔ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ پرشاد، نرالا، پنت اور مہادیوی جیسے شعراء کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بکی ہیں۔ فراق صاحب کے فضل سے میری غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ ان شعراء کے ناشرین بے چارے اب تک تو دیوالیہ ہو گئے ہوں گے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں میرا مقصد صرف بعض ان حقائق کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے جن کا تذکرہ فراق نے نہیں کیا ہے۔ اور موضوع کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے جن کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ فراق نے کہا کہ ہندی کی تحریک تقریباً ایک صدی قبل شروع ہوئی ہے' ہم اس تاریخ کو تسلیم کر لیں۔ تحریک کا آغاز دراصل ایک تاریخی ضرورت تھی

پہلے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ صرف افسروں اور اہلکاروں خوشحال زمینداروں اور وکیلوں کے ایک محدود طبقے پر مشتمل تھا اور ان میں سے بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ لیکن پچھلے سو برس میں اس طبقہ کے افراد کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ایک تو سرکاری ملازمین کی تعداد ہی بڑھ گئی ہے اور ظاہر ہے کہ ان میں بڑی اکثریت ہندوؤں کی ہے اور جو ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کا مسلم بادشاہوں کے درباروں سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے ان کا ذہنی پس منظر اردو کا نہیں ہے۔ ہندی کی تحریک کے فروغ کے لیے آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی نے بھی بڑا کام کیا۔

متوسط طبقہ کے یہ نئے افراد اردو کی ان خرابیوں کا ظاہر ہے کہ احساس رکھتے تھے جن کی طرف فراق نے اپنی خوبصورت و شاعرانہ زبان میں اشارہ کیا ہے۔ اردو زبان میں ایک خصوصیت ہے جو میرے خیال میں کسی دوسری زبان میں نہیں ہے۔ کوئی ایسی مہذب زبان نہیں ہے جو دوسری زبانوں کے الفاظ قبول نہ کرتی ہو لیکن جب الفاظ ایک زبان سے دوسری زبان میں جاتے ہیں تو اپنی گرامر چھوڑ جاتے ہیں۔ اردو میں ایسا نہیں ہوتا۔ عربی اور فارسی کا تقریباً ہر لفظ اپنی گرامر اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرتا ہے صرف چند مثالیں کافی ہوں گی جب ضلع کا لفظ لیا گیا تو اضلاع کا آنا بھی ضروری تھا۔ جب سلطان آیا تو سلاطین کا آنا بھی ضروری تھا۔ صرف شاہ نہیں لیا گیا شاہان بھی اس کے ساتھ آیا۔ اس سے زبان ظاہر ہے کہ غیر فطری اور غیر متوازن ہو گئی۔

اس کے برخلاف ہندی وہی اصول استعمال کرتی ہے جو ہر جگہ استعمال کیا جاتا ہے خواہ وہ الفاظ اصلاً سنسکرت ہی کیوں نہ ہوں۔ مثلاً راجا کی جمع راجا ہے، جنگل کی جمع جنگلوں ہے ماتا کی جمع ماتائیں ہے لیکن اگر کوئی ہندی ادیب ان جمع کو استعمال کرے تو اس کو ادبی دنیا سے باہر نکال دیا جائے گا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ فراق نے "متروک" کے زہریلے نظریہ کا بھی تذکرہ نہیں کیا۔ اس لفظ کے معنی ہیں وہ جو ترک کر دیا گیا ہو جس کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ اردو کے اہم ترین ادیبوں نے "متروک" کا جو اصول بنایا ہے وہ مختصراً یہ ہے۔

(۱) عربی اور فارسی کے الفاظ کو مقامی الفاظ پر، جو عام طور سے اصلاً سنسکرت ہوتے ہیں ترجیح دی جانا چاہیے۔

ہم کو ایک نئی زبان دینے کی کوشش میں ہندی کا حشر یہ ہوا ہے کہ اب وہ زبان ہی کہلانے کی مستحق نہیں اور اس سلسلے میں سب سے بڑے ملزم کھڑی بولی ہندی کے شاعر ہیں۔ اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہندی زبان کتنی بے جان و مردہ، بے صورت و بے ہودہ، بازاری اور دسویں درجہ کی چیز بنائی جا سکتی ہے تو آج، کل اور پرسوں کے ہندی شعرا کو پڑھیے (ممکن ہے کہ چند مستثنیات ہوں لیکن اس میں بھی شبہ ہے) ہندی نثر کا بھی کم و بیش یہی حال ہوا۔

جو چیز عربی و فارسی کے مشکل الفاظ کے بائی کاٹ سے شروع ہوئی تھی وہ ہزاروں ہندی کے جاندار الفاظ و محاورات کی گردن زدنی پر ختم ہوتی ہے اردو نظم و نثر کے کسی ادب پارے کے دس صفحات لے لیجئے اور ہندی کی کسی نظم و نثر کی کتاب کے دس صفحات لے لیجئے اور آپ دیکھیں گے کہ اول الذکر میں آخر الذکر کے مقابلے میں پانچ سے دس گنے تک زیادہ ہندی الفاظ ہیں۔

تقریباً ایک ربع صدی سے میں انتہائی تکلیف و درد کے ساتھ یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندی کے چاہنے والے اردو سے واقعی نفرت کرتے ہیں اور اردو کے چاہنے والے جن اردو کو ہندی کا دشمن سمجھ لیا گیا ہے، ہندی سے محبت اپنے دل کی گہرائیوں سے کرتے ہیں۔ ہندی الفاظ و محاورات ہندی ادب میں غیر موثر انداز میں استعمال کئے جاتے ہیں اور اردو ادب میں وہی ہندی الفاظ اپنے پوری فطری حسن کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں خواندگی کی شرح ۵ فیصدی ہونے کے باوجود ہندی پڑھنے والوں کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی کہ انگلستان میں انگریزی پڑھنے والوں کی اور ہندی شاعری کا یہ حال کہ اگر اس کو نصاب میں رکھ کر طلبا پر لادا نہ جائے تو اس کے پڑھنے والوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں جبکہ انگلستان میں انگریزی شاعری پڑھنے والوں کی تعداد کا پچاسواں حصہ بھی نہیں۔ جو اا کوئی بھی کھڑی بولی ہندی شاعری کی ایک بھی کتاب نہ کیونکہ یہ کتاب ایک ایسے بچہ کی مانند ہوتی ہے جو مردہ ہوا ہو یا جو پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے۔

اس کا علاج کیا ہے؟ ہندی کی الجھنوں کو دور کرنا ایک مشکل کام ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے درجات سے اونچی تعلیم ہندی اور اردو کی تعلیم کو الگ الگ کر دینے کی مہلک خلط کر دینا چاہیئے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہندی کے الگ الگ محکموں کو ایک دوسرے میں ضم کر دینا اردو یا ہندی میں سے کسی ایک کو لینے کے اختیار کو ختم کر دینا ہندی اور اردو کو ملا کر جو شعبہ بنے اس میں اردو اور ہندی تفریق نہ ہو اور دونوں کی تعلیم لازمی ہو۔ اساتذہ کے لیے قرار دیا جائے کہ وہ کھڑی بولی کی دونوں شاخوں یعنی ہندی سے برابر واقف ہوں دونوں کے ادب سے واقف اور دونوں رسم خط سے واقف ہوں۔

صرف اسی طریقہ پر عمل کرنے سے وقت گزرنے پر ہندی سے ایک واحد ادب پیدا ہو سکتا ہے۔ صرف اسی طور پر ہم ایسے پیدا کر سکیں گے جو اپنے ادب پاروں کو ان بہترین روایات مالا مال کر سکیں گے جن کو ہم اردو ادب اور ہندی ادب کی روایتیں کہتے ہیں۔ تعجب کی بات یہی ہے کہ مستقبل کی ہندی کو اور ہی زیادہ موثر بنا سکتا ہے نہ کہ وہ چیز جس کو آج کل ہندی نظم کہا جاتا ہے۔ صرف یہی طریقہ ہے کہ جس سے ہندی کے علاقے دفع ہو سکے گا۔ اسی وقت ہندی ہندی ہو سکے گی جب وہ ہندستانی توانائی اور وسائل کو اپنے میں سمو لے گی۔

سمپورنانند

مسئلہ کے وہ پہلو

جن کو فراق پیش کرنا بھول گئے

کبھی تو مجھے ان پر افسوس اور رحم آتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہو کہ فری فراق کو اردو پریمیوں میں ہندی سے نفرت کرنے والا کوئی نہیں ملا لیکن مجھ جیسے افراد کی یہ بدقسمتی رہی ہے کہ ان کو ہندی سے نفرت کرنے والے بہت سے افراد سے سابقہ پڑا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب فراق عوامی سرگرمیوں میں بہت حصہ لیا کرتے تھے۔ کیا انھوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کسی جلسہ میں مولاناؤں کی اونچی اردو یعنی عربی اور فارسی سے بھری ہوئی اردو کی تقریروں کو ہندی جانتے والوں کا طبقہ بڑے صبر و سکون سے سنتا۔ ہاں لیکن جب کسی نے ہندی کے چند ایسے الفاظ بھی بولے جو اصلاً سنسکرت میں کو بنارس جیسے شہر میں بھی جہاں اردو جاننے والوں کی تعداد بہت کم ہو یہ شور مچنا شروع ہوا کہ آپ کیا بول رہے ہیں، ہم نہیں سمجھ رہے ہیں سیدھی زبان بولیے۔

یہ طریقہ تو دونوں زبانوں کی خلیج پر کرنے کا نہیں ہو۔

میں ایک مرتبہ پھر کہنا چاہتا ہوں کہ میرا مقصد فراق جیسے عالم کو جواب دینا نہیں ہے لیکن جب تک تمام پہلوؤں کو سامنے نہ رکھا جائے صورت حال کا پورا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کا کوئی معقول حل پایا جا سکتا ہو۔

فراق گورکھپوری

متروک کا فرسودہ نعرہ

آج اتوار ہے۔ ۱۹ر جنوری کی صبح ہو اور اخبار والے نے ابھی ابھی آج کے اخبار ڈالے ہیں۔ پیٹریٹ اخبار (دہلی) میں شاہ سرخیوں کے ساتھ چھپے والے ایک مضمون پر میری نظر پڑتی ہے جسے ڈاکٹر سمپورنانند نے لکھا ہو اور جو ہندی کے بارے میں میرے چند خیالات کا جواب ہو۔ مجھے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

خیال یہ پیدا ہوا کہ شاید میرے خیالات کو غلط ثابت کر دیا گیا ہو لیکن مضمون پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔

ہر غلط بات صحیح بات کی انجانی دوست ہوتی ہو کیونکہ وہ صحیح بات کو زیادہ روشن اور واضح کر دیتی ہے اس لیے میں اُن کے آگے سر عقیدت خم کر دیتا ہوں کیونکہ انھوں نے اپنے بھولے پن میں میرے بازوؤں کو قوت بخشی ہے۔ میں چند ایسے سوالات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جن کا جواب شاید ان کو شش و پنج میں مبتلا کر دے۔

کیا یہ بات حقیقت ہو یا نہیں کہ سو فیصدی ہندی بولنے والے اشخاص بھی جو الفاظ استعمال کرتے ہیں ان میں عربی فارسی کے الفاظ کی تعداد تت سم سنسکرت اور تت بھو ہندی الفاظ کی مشترکہ تعداد سے تین گنی اور چار گنی ہوتی ہے؟ جب کہ تت بھو ہندی کے الفاظ کی پوری لغت اردو کا بھی اسی قدر حصہ ہو جس قدر ہندی کا اس کے علاوہ کیا جدید کھڑی بولی ہندی ادب کے مقابلے میں اردو ادب میں وہ الفاظ، محاورے، فقرے اور روزمرہ بہت زیادہ گنا استعمال نہیں کیے جاتے رہے ہیں اور کیے جا رہے ہیں جو خالص ہندی ہیں۔ پھر یہ مسئلہ صرف تعداد و مقابلہ کا نہیں بلکہ ان الفاظ کے زیادہ موثر خوبصورت اور برمحل استعمال کا بھی ہو۔

اردو اور ہندی الفاظ کے استعمال کو اس کسوٹی پر کسیے تو کون زیادہ چمکتا ہے اردو یا ہندی؟ کیا اردو زبان و ادب کے تخلیقی کارناموں میں زور و حسن و وقار عربی و فارسی کے چند الفاظ کے استعمال کی مہارت سے آیا ہو یا ہندی پر ان کی قدرت سے؟

ڈاکٹر سمپورنانند کو بظاہر میرے اس دعوے پر حیرت ہے کہ عملاً کوئی شخص گپتا، پنت، پرشاد، نرالا، مہادیوی اور دوسرے ہندی شعراء کے کلام کی پرواہ نہیں کرتا۔ کاش وہ ہندی کے ان "اکابرین" کی کتابوں

(۲) جہاں کسی وجہ سے دونوں قسم کے الفاظ کو استعمال کرنا ضروری ہے وہاں غیر ملکی لفظ کو مقامی لفظ کے مقابلے میں بلند تر حیثیت دی جائے مثلاً بڑی بستی ہو تو شہر کہلائے چھوٹی بستی ہو تو نگر کہلائے۔ بڑا ہو تو دریا کہلائے چھوٹا ہو تو ندی۔

(۳) جہاں سنسکرت اصل کے الفاظ استعمال کرتا ہوں وہاں ان کو اصل تلفظ کے ساتھ استعمال نہ کیا جائے بلکہ ان کو اردو کے طریقے کے تلفظ کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ یہ اردو کا تلفظ بنانے کا طریقہ ایک پراسرار طریقہ ہے۔ میں نے اردو کے عالموں سے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے لیکن کوئی نہ بتا سکا کہ اردو کا تلفظ بنانے کا طریقہ کیا ہے۔ میں ایک مثال دے سکتا ہوں۔ لفظ دیش کو ہمیشہ اردو میں دیس بولا جاتا ہے لیکن غیر ملکی یعنی عربی و فارسی الفاظ ہمیشہ اپنے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔

کوئی سمجھنا چاہے تو خود ہی سمجھ سکتا ہے کہ "متروک" کے اس اصول کا حساس ذہنوں پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ تاریخ کے سو برس کا یہ زمانہ قومیت کے زبردست عروج کا زمانہ رہا ہے۔ یہ قوم پرستی سیاسی، سماجی اور ثقافتی رہی ہے اور اسی لیے سنسکرت میں اور اس زبان میں لکھے گئے ادب میں دلچسپی بے حد بڑھ گئی ہے۔ اس لیے یہ فطری بات تھی کہ سنسکرت کو نیچا دکھانے کی یہ کوشش جو متروک کے اصول کو اپنا کر بالکل عیاں کر دی گئی، سنسکرت پریمیوں کو اپنی ذلت محسوس ہوئی۔

میرے بہت سے دوستوں نے جو ہندی کے نامور ادیب ہونے کے علاوہ اردو بھی جانتے ہیں انھوں نے بار بار اس تفریق کی شکایت کی ہے جو اردو ادیب سنسکرت الفاظ سے برتتے ہیں۔ اکثر یہ بات کہی گئی ہے کہ ث، ق، ز، اور ج کے حروف سے جو آوازیں نکلتی ہیں سنسکرت کی آوازوں سے بالکل کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ اگر دیش کا تلفظ اردو تلفظ کی روح کے خلاف ہے تو سنسکرت ہندی، گجراتی، مرہٹی اور بنگالی کی روح ان غیر ملکی حروف (ث، ق، ز اور ج) کی آوازوں کے خلاف ہے۔ اور جن الفاظ میں یہ حروف آتے ہیں ان کو اس طرح ادا کرنا چاہیے مثلاً پھکیر (فقیر کے بجائے) گریب (غریب کے بجائے) راجی (راضی کے بجائے) اگر یہ کر دیا جائے تو اردو داں اس املا و تلفظ کے بارے میں کیا کہیں گے۔ اس تجویز سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے ہم وطنوں کی ایک بہت بڑی تعداد اردو میں متروک کے اصول کے استعمال کے بارے میں کیا سوچتی ہو۔

فراق کی تجویز ہے کہ اردو اور ہندی کی علاحدہ علاحدہ تعلیم بالکل ختم کر دی جائے۔ میرا خیال ہو کہ ماہرین تعلیم کے لیے اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنا ممکن نہ ہوگا لیکن ایک بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے اپنی موت سے تقریباً ایک برس پہلے مہاتما جی نے بنیادی تعلیمی سنگھ کا جلسہ پٹنہ میں کرایا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اس میں شریک ہوں۔ سہ پہر کو ہم چند لوگوں نے ان سے ملاقات کی انھوں نے اچانک مجھ سے پوچھا "سمپورنا نند جی آپ ہندستانی کا کیوں ورودھ کرتے ہیں۔" میں نے ان کو بتایا کہ جہاں تک نام کا تعلق ہے مجھے کوئی اختلاف نہیں اگر صرف قومی زبان کو ہندستانی کا نام دینے سے مشکلات حل ہو جائیں تو میں اس پر تیار ہوں لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کی تشریح کی جائے کہ اس زبان کی ماہیت کیا ہوگی۔

عام طور سے ہندستانی کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہند کے شہروں میں عوام بولتے ہیں۔ یہ زبان عام سماجی ضروریات کے لیے کافی ہے لیکن وہ کون سی زبان ہوگی جس کو ہندستان کے آزاد ہونے کے بعد بین اقوامی خط و کتابت میں استعمال کیا جائے گا؟ کس زبان میں وزیر مالیات اپنی بجٹ تقریر کریں گے۔ معاشیات کے کوئی لکچرار صاحب کس زبان میں اپنے درجہ کو پڑھائیں گے۔ اتر پردیش کے بازار کی زبان میں ان ضروریات کے لیے کوئی الفاظ نہیں۔ اس، کے لیے الفاظ کہیں سے لینا ہوں گے اور اس سلسلے میں میرے ذہن میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اگر کہیں باہر سے الفاظ لینا ہیں تو وہ سنسکرت سے لیے جائیں۔ اور صرف اسی وقت جب کسی وجہ سے سنسکرت سے لفظ لینا ناممکن ہو جائے تب کسی دوسری زبان سے الفاظ لیے جائیں۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو میں نام کے بارے میں کوئی جھگڑا نہ کروں گا۔ اس پر کوئی فیصلہ تو نہیں کیا گیا لیکن مہاتما جی نے میری دلیل کو پسند کیا۔"

کوئی بھی ہندی اور اردو کی خلیج کو اور بھی چوڑا نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن حقائق سے روگردانی بھی نہیں کی جا سکتی۔ شری فراق کہتے ہیں کہ انھوں نے ہندی کی وکالت کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد میں اردو کی طرف سے نفرت پائی۔ اگر ایسے لوگ ہیں اور شاید ہوں

سمپورنا نند یہ کہتے ہیں کہ اس طبقہ کا تعلق کھڑی بولی کی اردو کی شکل سے نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے بالکل شروع میں پورے اعتماد کے ساتھ دعویٰ کیا ہے۔ سو فیصدی ہندی بولنے والے افراد سنسکرت الفاظ اور ہندی کی پوری لغت کے الفاظ کی مجموعی تعداد سے کہیں زیادہ عربی اور فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اردو زبان یہی ہے۔ (جو یہ نیا متوسط طبقہ استعمال کرتا ہے۔) نہ اس سے کچھ کم ہے نہ اس سے کچھ زیادہ۔ ہاں یہ اب حقیقت ہے کہ ہندی بولنے والوں کی بڑی تعداد فارسی رسم خط سے ناآشنا ہے۔

ڈاکٹر سمپورنا نند کی اطلاعات ان الفاظ کے بارے میں جن کو اردو نے اپنے ارتقا میں متروک الاستعمال کر دیا ہے۔ ایک ایسی بےخبری کا پتہ دیتی ہیں جس کی بنیاد بے ہوشی ہے۔ آہستہ آہستہ پرانے الفاظ کا استعمال ترک کرنا ہر زبان کی ترقی اور ارتقا میں ایک مشترک عمل رہا ہے۔ اردو میں متروک کرنے کے عمل کا مطلب اکثر مثالوں میں ہندی الفاظ کی پرانی شکل کو نئی اور جدید شکل میں ڈھالنا رہا ہے۔ ایسے الفاظ مثلاً کھلانا۔ تبلانا: ملک۔ بدل کر دکھانا۔ بتانا اور بیک ہو گئے۔ اسی طرح ان سے۔ انھوں نے ہو گیا ہے۔ جایا ہے۔ جاتا ہے۔ ہو گیا ہے۔ ہم کیا۔ ہم نے کیا۔ ہو گیا ہے۔

پرانے ہندی ادیب مثلاً۔ گردھر۔ میرا۔ اور حتیٰ کہ سور تلسی اور کبیر کا جہاں تک تعلق ہے انھوں نے بھی ہندی میں متروک کرنے کے اصول کو اپنایا ہے۔

متروکات کے بارے میں شکایت اس وقت بالکل مضحکہ خیز ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بنارس کے سنسکرت جاننے والے پنڈت بھی وید کے بجائے "بید" اور شاستر، کے بجائے ساستر اور سمرتی کے بجائے اسمرتی بولتے ہیں۔ کیا ڈاکٹر سمپورنا نند اس عیاں حقیقت سے اپنی ناواقفیت ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ معدودے چند مستثنیات کے علاوہ ہندی کی پوری لغت سنسکرت الفاظ کا غلط تلفظ کرنے (اپبھرنش) یا ان کو بہ ستا کرنے سے بنی ہے۔ رومن رسم خط میں شری اروند گھوش اپنے نام کا تلفظ کیسے ادا کرتے تھے؟ کوئی بنگالی ( ) یا "س" کا تلفظ ٹھیک ادا نہیں کر سکتا۔ سنسکرت کا حرف ( ) کھا بن جاتا ہے۔ راتری۔ راتی ہو جاتی ہے۔ بدی۔ بدھ بن جاتا ہے۔ اور سیکڑوں خالص سنسکرت الفاظ کا تلفظ ہر بنگالی غلط ادا کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی شرم و حیا بھی محسوس نہیں کرتا۔

اگر ہندی کا ہر لفظ اپنی اصل سنسکرت شکل میں بولا اور لکھا جائے تو ہندی کدھر جائے گی۔ متروک کا نعرہ ایک مہمل اور از کار رفتہ نعرہ ہے۔ متروک ہو اور چاہے نہ متروک حقیقت یہی ہے کہ پورے اردو ادب میں ہندی الفاظ و امثال۔ بالا اور حاوی رہے ہیں۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اردو ادب اپنی تمام طاقت و توانائی۔ اظہار کی تمام خوبصورتی اپنا پورا موثر انداز ہندی الفاظ و امثال کے قاعدانہ استعمال سے حاصل کرتا ہے۔

عربی و فارسی کے الفاظ تزئین و زینت ہیں یہی حقیقت ہے جس نے اردو کے مشاعرے اور فلم کو ہمارے ملک کے عوام میں اس قدر مقبول بنا دیا ہے۔ یہی حقیقت ہے جس کی وجہ سے عام قارئین میں دیوناگری میں چھپی ہوئی اردو کی کتابیں ہندی کی شاعری کی کتابوں سے پچاس گنا زیادہ بکتی ہیں۔ کسی کے آنکھیں ہوں اور وہ دیکھنا نہ چاہے۔ کان ہوں اور سننا نہ چاہے۔ تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ متروک کرنے کا عمل دراصل زبان کو آہستہ آہستہ صاف کرنے کا عمل ہے۔ اور اس کو ایک زہریلا نظریہ کہنا کمزور ترین دلیل کو سخت ترین الفاظ میں ادا کرنے کی مثال ہے۔ یہ نام نہاد اعتراض ان برے دنوں کی یادگار ہے جب ہندی کے پرچارکوں نے اس نعرہ کو اختیار کیا تھا۔ ڈاکٹر سمپورنا نند اپنی ایک اور شکایت کو مجروح معصومیت کے لہجہ میں پیش کرتے ہیں وہ غالباً کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جدید ہندی سے اردو پرستوں کی لاگ اور اردو سے ہندی پرستوں کی لاگ دراصل جیسے کو تیسا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو بڑا افسوسناک جیسے کو تیسا ہے۔ اردو پسند جدید ہندی کے انداز سے اس واسطے نامانوس ہیں کیونکہ وہ کھڑی بولی کی تراکیب اور روزمرہ کے خلاف ہے اس لیے نہیں کہ وہ دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہیں یا اس میں سنسکرت کے کچھ الفاظ ہوتے ہیں (ممکن ہے پہلے ایسے بھی رہا ہو۔) ان کو اس واسطے بھی الجھن ہوتی ہے کیونکہ ہندی کے جملوں کی ساخت نہایت بدآہنگ ہوتی ہے

کی فروخت کے اعداد و شمار حاصل کر سکتے اور یہ دیکھتے کہ ان شعراء کی کتنی کتابیں جبراً طلبا خریدتے ہیں یا سرکاری اور سرکاری امداد سے چلنے والی لائبریریاں چاپلوسی میں خرید کر ہندی کو ایک مصنوعی اہمیت دیتی ہیں۔ اس کا کوئی تعلق صاحبان ذوق کی پسند و ترجیح سے نہیں۔

مجھے پوری طرح معلوم ہے کہ مہادیوی کی کتابیں حیرت انگیز تعداد میں بکیں اور بھی لائبریریاں کی زینت ہیں لیکن ان کے چند اشعار بھی زبان زد نہ ہو سکے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر سمپورنا نند کا سر لیزلی اسٹیفن کے اس فیصلے کے بارے میں کیا خیال ہے کہ "میں، تو صرف اسے شاعری سمجھتا ہوں جو زبانی یاد ہو جائے۔ بعض نظمیں ایسی ہوتی ہیں جو چھا جاتی ہیں اور ذہن میں گونجتی رہتی ہیں۔ ایسی ہوتی ہیں جو ایک مرتبہ ذہن کے دریچوں میں داخل ہو جائیں تو ہمیشہ کے لیے مرتسم ہو جاتی ہیں اور برسوں تک ذہن میں خوابیدہ رہنے کے بعد اکثر یا اچانک ہمیں ان کا آہنگ ذہن میں اچانک بیدار ہو جاتا ہے اور اس کی خاموش سطح پر لہریں پیدا کر دیتا ہے۔ یہ نظمیں جب بھی یاد آتی ہیں ویسی ہی تر و تازہ ہوتی ہیں جیسی کہ پہلی قرأت کے وقت تھیں اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ نظم جس طرح لکھی گئی ہے بس اسی طرح لکھی جا سکتی تھی اور کسی دوسرے کی لکھی کوئی نظم کبھی اس طرح نہیں لکھی جا سکتی۔"

میتھلی شرن گپتا کی نظم کچھ دنوں تک بڑی تعداد میں بکی لیکن آریہ سماج کی نظموں کا مجموعہ جس کا نام "سنگیت رتن پرکاش" تھا اور بریلی کے شری رادھے شیام کی نوٹنکی کی نظمیں اس سے بھی کہیں زیادہ بکتی تھیں۔ یہ تمام چیزیں نیم تعلیم یافتہ افراد کی نیم تعلیم یافتہ تک پہنچیں تھیں اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ "نرالا" کی ایک کتاب چھاپنے پر ایک ناشر دیوالیہ ہو گیا۔ 'پنت' اور 'پرشاد' کی کتابوں کی سالانہ رائلٹی ہندی کی مصنوعی اہمیت سے پہلے اتنی بھی نہ تھی کہ دس دن گزر بسر ہو سکے۔ مجھے اقرار ہے کہ شاعری چند مستثنیات کے علاوہ ہمیشہ کم بکتی ہے شاعری کی اصل کسوٹی وہی چیز ہے جس کو قطعیت کے ساتھ سر لیزلی اسٹیفن نے بیان کر دیا ہے۔

مجھے اس دلیل پر حیرت ہے جو ڈاکٹر سمپورنا نند نے اردو میں عربی الفاظ کی عربی جمع کے استعمال کے سلسلے میں پیش کی ان کا اس تقریباً ناموجود طریقہ پر نفرت ہم کو اپنے مکتب کے دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ جب مولوی صاحب عربی الفاظ کی عربی جمع رٹاتے تھے یہ عربی الفاظ (ان کی جمع نہیں) اردو ہندی دونوں میں یکساں طور پر [illegible] ہیں۔ ان کی اس دلیل سے ہندی کے ان وکیلوں کی [illegible] آتی ہے جو علمی جلسوں میں عربی جمع کا مضحکہ اڑانے میں بر[illegible] محسوس کرتے ہیں۔ یقیناً یہ بات صحیح ہے کہ جب الفا[ظ] [ایک زبان] سے دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہیں تو وہ اپنی گرامر [illegible] آتے ہیں۔ لیکن مستثنیات اس میں بھی ہیں۔ اور گاہے [گاہے] نثر و نظم میں عربی جمع بھی استعمال ہوتی ہے۔ انگریزی لفظ Millanium کی جمع Millonia ہے Phenomenon کی جمع Phenomena ہے Laeuna کی جمع Laeunae — اور پھر ہمارے سامنے Intelligentia اور ایسی ہی بہت سی دوسری اور جمع ہیں جو لاطینی اور یونانی کی بنیاد پر بنائی گئی ہیں۔ ہندی میں ہم کرشل۔ کشیا۔ اتم۔ ادھمیک۔ اور آج کل تو سنسکرت کے ایسے بے شمار الفا[ظ] استعمال کرتے ہیں جن میں کچھ ترمیم کر دی گئی ہے یا جن کو ہندی کی [گرامر] کے مطابق نہیں بلکہ ایک مردہ سنسکرت زبان اور ایک مردہ [سنسکرت] گرامر کی غلامانہ تقلید کے جذبہ کے تحت بدل دیا گیا ہے۔

کیا ڈاکٹر سمپورنا نند اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہیں کہ کھڑی بو[لی] [illegible]

ہندی الفاظ کی تمام جمع اردو اور صرف اردو کے ادیبوں نے [بنائی] ہے ایسی جمع مثلاً باتوں۔ راتوں۔ مثالوں۔ غزلوں۔ عورتوں؛ اور اردو جمع کی دوسری شکلیں مثلاً راتیں۔ باتیں۔ عورتیں۔ مثا[لیں]۔ غزلیں۔ رباعیاں۔ اچھائیاں۔ برائیاں۔ اور ایسی ہی دوسری جمع صرف اردو ادیبوں نے بنائی ہیں۔ غلط باتوں سے حقیقت دبا کر معقولیت اور ایمان داری کا گلا گھونٹنا مناسب نہیں۔ اردو [illegible] صرف اردو نے ہندی کو اس کی تمام جمع دی ہے۔

ڈاکٹر سمپورنا نند کی یہ بات نیم درست ہے کہ پچھلے تیس چالیس برسوں میں متوسط طبقہ میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا بڑا حصہ ان ہندو[ؤں] کا ہے جو دیہاتوں سے آئے ہیں اور جو پوری طرح سے یا تقریباً پوری طرح سے کسانوں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے یہاں تک بات حق ہے لیکن نیم حقیقت اس وقت در آتی ہے۔ جب ڈاکٹر

عبدالحلیم

قطب مینار

(وشنو دھوج ـــــ یا مآذنہ)

قطب مینار کو عالم وجود میں لانے والا کون ہے؟ قطب الدین یا پرتھوی راج چوہان، سمدرگپت یا کوئی اور ہندو راجہ ـــــ اس بلند و بالا فن پارے کی تعمیر کے پیچھے کون سی مقصدیت ہے؟ یہ گپت عہد کی رصدگاہ کا کوئی اہم حصہ ہو یا ہندستان پر پہلی پرتو کی اولین یادگار اور دلی کی جامع مسجد قوت الاسلام کا فلک بوس مآذنہ؟ ـــــ یہ عظیم مینار قطب صاحب کی لاٹھ ہے یا در اصل قدیم وشنو دھوج کا نیا نام ـــــ؟

انگریزوں کی آمد اور قبضہ دلی سے قبل اس مینارے کو قطب صاحب سے معنون کیا جاتا تھا جن کی ابدی آرام گاہ قریب ہی واقع ہے اور اس کے بنوانے والے حکمرانوں میں کبھی معزالدین محمد بن سام (شہاب الدین محمد غوری) کا نام لیا جاتا تھا اور کبھی قطب الدین ایبک یا شمس الدین التمش کا۔ مگر ۱۹ویں صدی کے اوائل میں جب دلی پر انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا اور انھوں نے محکومین کی معاشرت اور فنی صلاحیتوں میں دلچسپی لینا شروع کی تو ان میں بہت سے مستشرق پیدا ہوگئے۔ ان میں سے کوپر (COOPER) اور سلی مین (SLEEMAN) نامی دو مستشرقین نے پہلی بار قطب مینار کو ہندو فنی روایات سے متعلق کیا اور اس طرح اس عظیم مینارے کے خالق اور اس کے مقصد کے متعلق ایک بے معنی اور ناخوش گوار بحث کی داغ بیل پڑ گئی جو موجودہ صدی میں بھی جاری رہی۔ مقالے اور جوابی مقالے لکھے گئے، آخر بڑی تگ و دو اور عرق ریز تحقیق کے بعد یہ طے پایا کہ اس مینارے کو جو در اصل ہندستان میں اسلامی فتح کی یادگار تھا اور مسجد قوت الاسلام کے مآذنہ ہونے کے باعث جسے افادی حیثیت بھی حاصل ہوگئی تھی قطب الدین ایبک نے شروع کرایا تھا مگر اس کی تکمیل التمش کے دور حکومت میں ہی ممکن ہوسکی۔ بظاہر یہ بحث ختم ہوگئی ہے مگر اس کی صدائے بازگشت اب بھی باقی ہے اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو قطب مینار کے ہندو فنی ماخذ کے مردہ گھوڑے کو چابک مار مار کر زندہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

کوپر، سلی مین اور بعدہٗ بگلر (BEGLAR) کے نظریہ کی تائید سر سید احمد خاں نے بھی آثار الصنادید کے پہلے ایڈیشن میں کی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک قطب مینار کا داخل دروازہ شمال رو ہے جب کہ اسلامی طریقہ کے مطابق اسے مشرق رو ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اسلامی روایات کے مطابق اس کو اونچی کرسی دے کر بنانا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں سطحی قسم کی ہیں جب کہ قطب مینار کا فنی ماخذ ہندو ثابت کرنے کیلئے زیادہ ٹھوس دلائل کی ضرورت ہو۔ مسلمانوں کو فتح اور قبضۂ دلی کے بعد ہی فوری طور پر ایک جامع مسجد کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ وہ اپنے مذہبی فرائض باجماعت ادا کرسکیں چونکہ اولین مسلمانوں میں محض شہسوار ہی ہندستان میں آئے تھے اور علما اہل فن اور معماروں نے بعد میں ہجرت کی، اس لیے نئے فاتحین کو ہندو کاریگروں اور صناعوں کا سہارا لینا پڑا۔ اگر اسلامی عمارات میں مدخل کا شرق رو ہونا بھی ضروری ہے تو بھی ہندو معماران باریک نکات کو کیسے سمجھتے ہاں بعد کی عمارات مثلاً علائی مینار کی تعمیر میں ان تمام باتوں کا خیال رکھا گیا۔ اس کے علاوہ ان حضرات کی باریک بین نگاہیں اس معمولی سے نکتے کو نہ پرکھ سکیں کہ یہ مینار در اصل مسجد کا منفصل مآذنہ تھا جو قطبی مسجد

اور سنسکرت کے الفاظ کا ایک سیلاب ہوتا ہو۔ جن کا بعید غلط استعمال
ہوتا ہے اور جو ہندی کی دھرتی۔ (آہنگ) میں بالکل نہیں آتے۔ ہندی
میں "متروک" کرنے کا طریقہ اس طرح استعمال کیا گیا ہو کہ خوبصورت
ہندی الفاظ کو نکال باہر کیا ہو۔ اور سنسکرت الفاظ کو ایک جنون میں
اس طرح بھر دیا گیا ہو کہ زبان کے لباس کی دھجیاں اڑی جاتی ہیں۔
ہر وہ شخص جس کو ہندی کا عاشق کہا جاتا ہے دراصل ہندی الفاظ و محاورات
کا سب سے بڑا دشمن ہو۔ اس لیے اس طرح جہاں تک متروک کا سوال
ہے۔ غلطی ہندی میں ہے اردو میں نہیں اصل ہندی نثر و نظم کو ہر شخص روز
بروز متروک کرتا جارہا ہو۔ اور اب جو ہندی نثر و نظم ہے اس کا سر ہے
نہ پیر۔ اگر اردو کا ہر طالب علم نیچے سے لے کر اوپر تک کے درجات میں
عربی اور فارسی کا ایک لفظ سیکھتا ہے تو ہندی کے طالب علم کو دس مشکل
اور ہندی کے سیاق و سباق میں بدنما سنسکرت الفاظ یاد کرنے
پڑتے ہیں ہندی کی درسی کتابوں میں ہندی سے زیادہ سنسکرت کے الفاظ پائے
جاتے ہیں۔ ہندی کی مثال ایک ایسی کمپنی کی ہے جس میں دس ہزار
چھوٹے چھوٹے حصہ دار ہوں اور ایسے حصے دار گنتی کے چند ہوں۔ جن
کی واقعی اہمیت ہو اور جو حصّوں کی بڑی تعداد پر قابض ہوں۔
اردو میں تو ہندی کے الفاظ بالا دستی رکھتے ہیں اور سرگرم حصّہ دار
کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ہندی میں خود ہندی الفاظ کی حیثیت
حقیر حصہ داروں کی ہو۔

جدید ہندی میں ہندی الفاظ و محاورات کی حیثیت ہریجنوں
کی سی ہو۔ تمام اہمیت ان برہمنوں کو دی جاتی ہے جو ہندی لغت
پر لاد دیے گئے ہیں۔ یہ برہمن سنسکرت کے الفاظ ہیں جن کا لہجہ یہ
ہے کہ "مجھے چھونا نہیں۔" اور جن کا رویہ یہ ہو کہ ہندی الفاظ و
محاورات ہرگز نہ لینا۔

تقریباً نصف صدی گزری پنڈت بال کرشن بھٹ نے برسرِ عام
یہ اعلان کیا تھا کہ عربی اور فارسی کے الفاظ ہندی کے الفاظ سے
سنسکرت کے الفاظ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خوبصورتی سے اور
فطری طور سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ آنجہانی پنڈت مدن موہن
مالوی، سنسکرت زدہ ہندی کو تلمی ہندی کہا کرتے تھے۔ جس
میں سنسکرت کے الفاظ کا تیل ہندی الفاظ کے پانی سے نہیں مل سکتا تھا
ہندی پرستوں کو اردو سے جو الجھن ہوتی ہے وہ ایک خاص

قسم کی فارسی زدہ اردو سے ہو۔ لیکن اردو کا عام اظہار سے
مرزاؤں اور مولاناؤں کی اردو، اردو ادب کے عظیم معیار وا
اردو نہیں ہے۔ کسی ہندی دوست کے
میں اردو کے برتنے کے طریقہ سے الجھن نہیں پیدا ہوتی۔ نہ
ننانوے فیصدی اردو الفاظ و محاورات سے ہوتی ہو جو
ادب میں مستعمل ہیں اور جو نہ ہندی قومیت کے خلاف ہیں ا
ہندو کلچر کے۔ ایک آدھ جگہ شاید کوئی قابل اعتراض بات
تو ہو۔ ہندوؤں کی ناقابل علاج زنگ آلودیت۔ ان نئی آو
اور صوتی اقدار پر معترض ہے جو اردو کی دین ہیں۔ ان میں
تقریباً ہر آواز دنیا کی تقریباً ہر ایک مہذب زبان کی آوا
سے ملتی جلتی ہے۔ ڈاکٹر سمپورنا نند نے کم از کم ایک بڑی خد
کی ہے۔ ان کی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے لاکھوں ایسے لوگ
اور کالجوں سے نکل کر زندگی میں داخل ہوئے ہیں جو
(Should) کو سڈ بولتے ہیں اور (Zeal)
جیل لکھتے ہیں۔ Foul اور Fair کو پھیر اور پھیا
کہتے ہیں۔ اور Faizabad کو بیج آباد کہتے
"ہندی زندہ آباد۔"

ہندی کی مہلک غلطی یہ ہو کہ اس نے یہ سمجھا کہ اردو سے اس کو پورا
کرنا ہو انتخابی سودا نہیں۔ پوری اردو لینا ہو یا پوری اردو ترک کرنا ہو اگر ہندی
اس طرح پیش آتی کہ اس سے لین دین کرنا ہو اگر ہندی اپنے سرکاروں میں الفا
طرز کے تناسب کا احساس پیدا کرتی ہو تو اردو اور ہندی کا تنازعہ اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا۔ تکلیف
دہ دست درازیاں اور ٹکسالی بولی کے محاوروں کا بے جا استعمال اور سنسکرت
کے الفاظ کا بدنما استعمال جو آج ہندی کے نثر و نظم کے نعال
ہے شاید تب، نہ ہوتا۔

ہمارے پاس ہندی کے ایسے ادیب ہوتے جن کی کمر ہی
کے لامحدود وسائل پر دیسی ہی مضبوط گرفت ہوتی جیسی اردو کے
مثلاً میر انیس۔ غالب۔ چکبست۔ سرور۔ حالی۔ جوش اور ا
اور ان کے ہزاروں پیروکاروں کی ہو جنھوں نے کھڑی بولی
عظیم طاقت بنا دیا ہے کہ جو آج وہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہندی
تو لیکن تعمیر کے لیے نہیں تخریب کے لیے۔ اس نے ہوائیں بوئی
اور اب آندھیاں کاٹ رہی ہو۔

کے نام پائے جاتے ہیں بخصوصیت جون پور کی شرقی مسجدوں اور گجراتی سلاطین کی عمارتوں میں عام ہو

ایک اور ناگری کتبہ

پرتھوی راج چوہان کو قطب مینار کا خالق بتانے والے اب ایک اور کتبے پر تکیہ کرنے لگے ہیں۔ قطب مینار کے اندرونی حصہ میں ایک جگہ ناگری رسم خط میں لفظ "پرتھی" جو ایک غیر معروف جگہ پر کندہ ہے ان کے نزدیک نہایت معنی خیز ہے۔ ظاہر ہو کہ صرف ایک لفظ "پرتھی" جو ایک غیر معروف جگہ پر کندہ یہ وتنہا کھدا ہے اتنی عظیم عمارت کے خالق کے نام ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قطب مینار، اس سے ملحقہ مسجد قوت الاسلام صرف مقامی مندر کی جگہ بنا پر نہیں بلکہ ۲۷ دوسرے مندروں کے ملبے سے بنی ہیں۔ اس طرح کے بے ربط اور الگ تھلگ کتبے مسلمانوں کی اولین دور کی عمارتوں میں اکثر نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور بات زیادہ قابل غور ہو یہ کتبہ حال ہی کی دریافت ہے اس پہ نہ تو کبھی بیلی مین، اور بگلر وغیرہ نے مطلق دھیان دیا (حالانکہ ان کے دعوے کو زیادہ تقویت ملتی) اور نہ ہی کننگھم، والٹر الیٹ ای۔ ٹامس اور سر سید احمد خاں کو یہ کتبہ نظر آیا۔ حالانکہ اپنی تحقیقات اور کتبوں کے مطالعے میں ان اصحاب نے جھینکوں، خوردبینوں اور دوربینوں کا استعمال کیا تھا۔ اس حقیقت کے پیش نظر کننگھم نے بہت سے مٹے مٹائے اور بے ربط کتبوں کا ذکر اپنی رپورٹ میں کیا ہے یہ قیاس برمحل ہو کہ "یہ ایک پرفریب چال ہو جو ماضی قریب میں چلی گئی ہے تاکہ چیزوں کی موجودہ ترتیب میں شک پیدا کیا جائے اور انھیں درہم برہم کر دیا جائے۔"

قطب مینار بحیثیت دشنو دھوج اور سمدر گپت

حال ہی میں کچھ مفروضوں کی بنا پر اس بحث کو پھر زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس منارے کی قدامت بہت پیچھے یعنی گپت دور حکومت میں لے جائی گئی ہو اس نئے نظریہ کے ماتحت سمدر گپت نے دشنو دھوج کے نام سے یہ مینار تعمیر کرایا تھا اور در اصل یہ مینار گپت عہد کی نامی رصدگاہ کا ایک اہم حصہ تھا۔ تاریخ کی تحقیق و تدوین میں نئے نئے نظریات کا آنا کوئی غیر صحت مند علامت نہیں لیکن تاریخ کے طالب علم کو ہر نئے نظریہ کو ہم عصر عمارات اور فنی روایات، اعتقادات اور نفسیاتی تحریکات، تاریخ کی کتابوں اور بیرونی شہادتوں کی کسوٹی پر پرکھنا پڑتا ہو۔ ان سبھی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ہی کوئی نظریہ تاریخ کی زبان میں امر حقیقی بن پاتا ہو۔

یہ نظریہ اپنی تردید خود کرتا ہے ایک طرف دعویٰ ہے کہ قطب مینار دشنو دھوج تھا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں اس کو کسی ایسے مندر سے متعلق ہونا چاہیئے تھا جس میں دشنو کی پوجا ہوتی ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ دشنو دھوج گپت عہد کی مشہور رصدگاہ کا ایک اہم حصہ تھا جہاں سے ستاروں کا مشاہدہ کیا جاتا تھا ——— ان دونوں باتوں میں ایک ہی چیز صحیح ہو سکتی ہو۔

گپت عہد کی رصدگاہ

جہاں تک رصدگاہ کا تعلق ہے دلی جیسی دور افتادہ جگہ میں ایسی عمارت کا ہونا ناممکنات میں سے ہے (دلی کی آبادکاری بعد میں اندر پرستھ سے قطع نظر تومروں نے ۱۲ ویں صدی عیسوی میں کی تھی۔) گپت عہد میں تکشلا، نالندہ، اجین، بنارس، وکرم شلا اور دیگر مشہور شہر تھے۔ جہاں درس و تدریس کے لیے دار العلوم موجود تھے، اگر کوئی ایسی رصدگاہ ہوتی تو وہ آخر الذکر مقامات پر ہوتی نہ کہ دلی میں جو زیادہ سے زیادہ اس زمانے میں قصبہ رہا ہوگا جہاں نہ تو فکر و فن کا چراغ روشن رہا ہوگا اور نہ اسے کوئی سیاسی اہمیت حاصل رہی ہوگی۔ اگر گپت دور میں اس جگہ کوئی رصدگاہ ہوتی تو اس کا حوالہ ضرور ملتا۔ ورہا مہرا اور آریہ بھٹ گپت عہد کے مایہ ناز ماہر فلکیات اور ریاضی داں تھے، انھوں نے اور ہرش عہد کے برہم گپت نے اپنے سدھانتوں میں کسی ایسی رصدگاہ کا ذکر نہیں کیا جہاں ستاروں کے مطالعے کے لیے اتنا اونچا مینارہ موجود ہو۔ بیرونی شہادتوں میں ہیون سانگ نہایت مستند مانا جاتا ہے اس نے ہر علم و فن کے مرکز کا رخ کیا اور وہاں کے جملہ حالات قلمبند کئے مگر تعجب ہے کہ "دلی کی مشہور رصدگاہ" کے بارے میں وہ بھی خاموش ہے حالانکہ یہ مقام اس کے میزبان راجہ ہرش کی راجدھانی تھانیشر کے پاس ہی تھا۔

گپت تعمیرات

گپت عہد کی مندر سازی کا فن کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں دشنو دھرم نے بدھ مذہب پر غلبہ حاصل کر لینے کے بعد اپنے دیوی دیوتاؤں کے لیے عظیم مندر تعمیر کئے۔ بھرہت سے سانچی تک، سارناتھ اور گوالیار سے کراجنتا اور باگھ کے غاروں تک گپت عہد کی عظیم فنی روایات آج بھی زندہ ہیں کھجراہو اور متھرا کے سنگ پارے گپت فن کے لیے ہم سے آج بھی

کے صدر دروازے کے جنوب میں الگ تھلگ واقع ہو اس کا داخلہ شمال رو رکھنے میں محض موذن کی سہولت ملحوظ رہی ہوگی۔

قطب مینار ایک چوہان کی تخلیق

اسلامی روایات سے صرف اتنے سے انحراف کی بنا پر قطب مینار کو وگرہ راج چوہان کی تومروں پر فتح سے منسوب کر دینا یا اس کے پوتے پرتھوی راج چوہان کی تخلیق کہہ دینا سراسر تاریخی حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے۔ رائے پتھورا سے قطب مینار کا تعلق ظاہر کرنے میں یہ تاویل پیش کرنا کہ اس نے اپنی محبوبہ اور رانی سنجوگتا کے تفریحی مقصد کی بنا پر یہ مینار بنوایا تھا۔ محض واہمہ ہے نہ صرف چوہان راجہ اور راٹھور شہزادی کے رومان کی توثیق تاریخ سے نہیں ہوتی بلکہ پرتھوی راج کی سنجوگتا نامی کسی رانی کا حوالہ تک تذکروں میں نہیں ملتا۔ ـــ ایسی محتاج ثبوت ہستی سے کسی بھی عمارت کو منسوب کرنا دیانت دار مورخوں کا کام نہیں۔

سرسید احمد خاں کے نزدیک رائے پتھورا کی بیٹی ”سورج مکھی“ فرقہ سے تعلق رکھتی تھی اور اسی کے مذہبی اعتقاد کی بنا پر اس نے یہ بلند ترین مینار بنوایا تھا تاکہ راجکماری روز جمنا ندی کے درشن کر سکے جو اس کے نزدیک سورج کی بیٹی تھی۔ محض درشن کی بنا پر قطب مینار کا عالم وجود میں آنا بھی قیاس کے علاوہ اور کچھ نہیں اور محض دریا کو دیکھنا مذہبی فریضہ قطعاً نہیں کہا جا سکتا ہاں ندی کا اشنان واقعی مذہبی فرائض میں داخل ہے۔ پھر ایک راجکماری کے لیے روز ندی جانا جو قریب ہی واقع ہے کوئی مشکل بات نہ تھی، سرسید احمد خاں کی تاویلات ان کی روشن ضمیری اور رواداری کی مثال بن سکتی ہیں مگر تاریخ میں ان کی کوئی جگہ نہیں اس سے پہلے کہ کننگھم (CUNNINGHAM) اور والٹر ایور (WALTER EWER) ان تاویلات کا مدلل جواب دیتے سرسید نے خود اپنے نظریے کو اپنی زندگی میں بدل دیا چنانچہ آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۹۵ء نولکشور پریس میں انھوں نے قطب مینار کو ماذنہ تسلیم کر لیا ہے۔

ناگری رسم خط میں ہندو سمبت کی موجودگی

بگلر کے دریافت شدہ تین ناگری ہندسوں میں سمبت ضرور ہیں، مغالطہ میں مبتلا کرتے ہیں، پہلا سمبت باہری کرسی پر کندہ ہے جبکہ دوسرا زیریں سنگ توس (SOFFIT) میں ثبت ہو ان کتبوں میں ۱۲۵۶ سمبت لکھا ہے لیکن تیسرے سمبت میں جو کہ داخلی دروازے کے اندر بائیں طرف ہے ۱۲۵۶ اس تاریخ دی ہوئی ہے۔ اسی کتبہ پر بگلر کے نظریہ کا انحصار ہے۔ جنرل کننگھم نے جن کی نگرانی میں عمارات کا معائنہ ہو رہا تھا بگلر کے ”۲۵۶ سمبت“ کا پہلا اٹا ہوا ہندسہ لگا دینے کو کہہ دیا اور [illegible] لئین نے صحیح کہا ہو کہ وہ حذف شدہ ہندسہ سوائے ”۱“ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس طرح یہ تینوں سمبت باہم ایک ہی سن عیسوی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کہ ۱۱۹۹ء ہے یہ وہ سال ہو جب ترک حکمراں قطب الدین ایبک نے دلی پر مکمل اقتدار جما لیا تھا یہ سال غالباً قطب مینار کی تاریخ تاسیس ہی ہوگی یا پہلے درجہ کا سال تمام تکمیل کہ آخر الذکر بات صحیح ہوگی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی عمارت میں سمبت کی آخر کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے کہ مسلم نگرانوں کی موجودگی میں مسجد قوت الاسلام اور ملحقہ عمارات کی تعمیر کا کل بار ہندو معماروں اور سنگتراشوں پر تھا۔ اس وقت تک مسلمان عرب کے طریقے کی بنا پر ہندسے استعمال کرنا نامناسب سمجھتے تھے اگر ان کو تاریخ دینی ہی ہوتی تو اس کو عبارت کرتے تھے جیسا کہ مسجد قوت الاسلام کے جنوبی در کے بائیں بازو پر کیا گیا ہو۔

”این حصار را فتح کرد و این مسجد جامع را بساخت بتاریخ فی شہور سنہ سبع و تسعین و خمسمائہ امیر اسفہ سالار الاجل کبیر قطب الدولہ والدین امیر الامرا ایبک سلطانی۔“

ہندو نقاشوں کو جو کتبوں کی تیاری میں لگائے گئے تھے یہ معلوم نہ تھا اسی لیے انھوں نے اپنے طور پر ہندسوں میں سمبت سال رواں کندہ کر دیا اور اپنا نام تک کھدوا دیا جیسا کہ کننگھم کے دریافت شدہ پانچویں منزل کے دو کتبوں سے ظاہر ہے پہلا کتبہ ۱۴۲۵ (۱۳۶۸ء) ہے اور ناگری رسم خط میں پیروج شاہ (فیروز شاہ) کندہ ہے دوسرے نیم حذف شدہ کتبے کا متن یوں ہے۔

”...... سری وسوکرما پرساد رچتر ...... نچیلی ......“

قطب مینار ہندوستان میں واحد اسلامی عمارت نہیں جس میں ہندی ہندسوں میں سمبت یا ناگری رسم خط میں شب کا معماروں سنگتراشوں،

یہ لاٹھ لال کوٹ اور رائے پتھورا کے مندر کی زینت بنی رہی وہ بت بھی قائم رہا مگر مندر کی جگہ پر مسجد قوت الاسلام کی تعمیر کے بعد اس ستون کو اس کے امتیازی بت سے محروم کر دیا گیا جب کہ لاٹھ جیوں کی تیوں برقرار رہی۔

جہاں تک اس لاٹھ کے سر ستون کا تعلق ہے اس کی گڑھائی گپت فن کا نمونہ ہے صرف اس بنا پر پوری لاٹھ کو آنکھ بند کر کے گپت عہد کا قرار دینا دانشمندی کے منافی ہے اس لیے کہ آج کی تعمیرات میں بھی قدیم روایات کسی نہ کسی شکل میں مل جاتی ہیں۔

اب صرف راجہ "چندر" کے ساتھ "گپت" کی ترمیم کا سوال رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر سجاد ذاجی اس لاٹھ اور اس کے کتبے کو زیادہ سے زیادہ پانچویں صدی کے آخر مانتے ہیں۔ اس لیے کہ گپت عہد کے رسم خط میں الفاظ کے اوپر افقی لکیریں نہیں کھینچی جاتی تھیں جو اس عبارت میں موجود ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کتبہ ہر نسب کی تعیین کی ہوئی قدامت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب سے ایڈورڈ ٹامس (EDWARD THOMAS) جیسے فہیم اور صائب ماہر فن تعمیرات بھی پوری طور پر متفق ہیں اور ان کو فاضل پنڈتوں کی تائید بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کا دعویٰ علم الخط اور لسانیات کے اصولوں پر بھی صحیح اترتا ہے ڈاکٹر موصوف نے اپنے مقالے (مطبوعہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بامبے ۱۴ اپریل [illegible]ء) میں صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ یہ راجہ چندر گپت فرمانروا نہیں ہو سکتا بلکہ نرملا راجاؤں میں سے ایک تھا جن کی عملداری میں (چھٹی صدی عیسوی) متھرا، آگرہ اور گوالیر کے علاقے تھے جن کے سکے کننگھم نے دریافت کیے ہیں اور ان سے متعلق ایک مقالہ بھی لکھا ہے۔

اب یہ بھی صاف کر دینا بہتر ہوگا کہ یہ آہنی ستون اپنی اصلی جگہ پر نہیں ہے ظاہر ہے کہ مسجد قوت الاسلام اور قطب مینار میں کام آنے والے تمام پتھر جین، بودھ اور وشنو دھرم سے متعلق ایسے مندروں کے ہیں جو نویں اور دسویں صدی سے قبل کے ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔ بے حد جستجو اور تحقیق کے باوجود ایک بھی پتھر چھٹی صدی عیسوی کا نہیں مل سکا گپت دور تو بہت دور کی بات ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ستون متھرا کے وشنو مندر سے اکھاڑ کر تومر خاندان کے اولین فرمانروا اننگ پال اول عرف بلیل دیو نے اپنی نئی راجدھانی لال کوٹ (جس علاقے میں اب قطبی باقیات ہیں۔) میں نصب کرایا اور مندرجہ ذیل یک سطری کتبہ کھدوا دیا۔ اس امر کی شہادت چند بردائی مصنف پرتھوی راج راسو بھی دیتا ہے۔

"سمبت دہلی ۱۱۰۹، انگ پالی بائی":

(سمبت ۱۱۰۹ مطابق ۱۰۵۲ء میں انگ پالی نے دلی آباد کی)

قصہ مختصر اگر وشنو دھوج کے نظریہ کا دار و مدار صرف لوہے کے ستون پر ہی ہے تو پوری بحث دو باتوں پر ختم ہو جاتی ہے اول یہ کہ یہ ستون واقعی گپت عہد کا ہے تو اپنی اصلی جگہ پر نہیں ہے کیونکہ وشنو پد گری کہیں اور رہی ہوگا اور اس حالت میں اس کے کتبے اور خود ستون کو بھی قطب مینار سے متعلق نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر یہ بعد کی تعمیر ہے تو قطب مینار نہ تو وشنو دھوج ہے اور نہ سمدر گپت کے دور حکومت میں بنایا گیا ہے۔

خطرناک رجحان

قطب مینار کو ہندو فنی ماخذ ثابت کرنے والے ہر مرتبہ ایک نئے ہندو راجہ سے منسوب کرتے ہیں۔ واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کرنا تاریخ نویسی میں بے حد خطرناک رجحان ہے اسی لیے یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ قطب مینار کی تخلیق کا سہرا محض پرتھوی راج، رگھو راج یا سمدر گپت میں سے کسی ایک کے سر بندھا رہے گا۔ اگر یہ رجحان موجود رہا تو تعجب نہیں کہ کسی وقت بھی یہ نظریہ بھی پیش کیا جائے کہ یہ ہمالیہ آسمان در اصل آریہ قوم نے دراوڑوں پر فتح کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا۔ اس سلسلے میں نواب ضیاء الدین دانی لوہارو کا جملہ آج بھی کانوں میں گونج جاتا ہے کہ "اب اس سے زیادہ جاندار اور بہتر ثبوت پیش نہیں کیے جا سکتے تعجب ہے کہ خود قطب مینار کا خالق ہی مردوں کی صف میں آگے نہ چلا آئے اور اپنی تخلیق کے بارے میں کوئی حلفیہ بیان نہ دے ڈالے ..." لیکن مردے نہ تو بول سکتے ہیں اور نہ ان کے لبوں کی مہر خموشی توڑی جا سکتی ہے ہاں وقت کی گزرگاہ پر ان کا چھوڑا ہوا دائمی نقش آج بھی قطب مینار اور اس سے ملحق مسجد قوت الاسلام کے روپ میں موجود ہے ان دونوں عمارتوں کی ترتیب، وضع، مزاج اور ان کے کتبوں سے ہی ان کے خالق کی کھوج لگائی جا سکتی ہے اور یہ بات یقینی طور پر ممکن ہے کیونکہ ہر عمارت کے پس پشت ایک گہری نفسیاتی اور معاشرتی تحریک کارفرما رہتی ہے ہم عصر زمانے کی مخصوص فنی و تہذیبی حالات اور ضروریات اس تحریک

خارج تحسین لیے بغیر نہیں رہتے گو ان مندروں کی اہمیت فن تعمیر سے اتنی متعلق نہیں جتنی کہ فن سنگ تراشی اور صنعت آذری سے۔ گپت فن کاروں نے انسانی عادات و خصائل اور جذبات کو تو بے جان پتھروں میں ڈھال دیا۔ انسانی اجسام کے اظہار میں معراج کی حدوں کو تو چھو لیا لیکن فن تعمیر کا نمونہ پیش نہ کر سکے اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ان کو چنائی اور اینٹوں کی جڑائی کا اچھا اور پائدار مصالحہ معلوم نہ تھا جس کی مدد سے وسیع اور عریض عمارتیں بنائی جاتیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے فن کے اظہار میں غاروں کا سہارا لیا کیونکہ وہاں چنائی سے بخوبی گریز کیا جا سکتا تھا۔ اسی لیے ہم کو گپت عہد کے مندروں کے رخ زیادہ تر یک سنگی ملتے ہیں۔ اس عہد کے جنوبی ہند کے مندر اہرام جیسے ہوتے ہیں جہاں ان کی درجہ بندی محض اوپر نیچے بھاری پتھروں کے وزن سے کی گئی ہے اور وہاں قسم کے ان مندروں میں اہرامی کیفیت پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔

شمالی ہند میں پائے جانے والے مندر بھی فن تعمیر کے بہ نسبت سنگتراشی کے اعلا نمونے ہیں ان مندروں کا بلند ترین حصہ انکا شکھر (مخروطی گنبد) ہوتا ہے۔ یہاں بھی ہندو معماروں کی جڑائی کے مصالحوں کی عدم واقفیت ظاہر ہو جاتی ہے کیونکہ انھوں نے اپنے شکھر بغیر جڑائی کے مسالے کے پتھروں کے بڑے بڑے شہتیر عمودی طور پر رکھ کے دیوگڑھ (جھانسی) کا گپت مندر انہی اصولوں پر بنا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں قطب مینار کی ساخت کو دیکھا جائے تو اس کے طرز اور گپت فن کا فرق از خود معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال اس ضمن میں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قطب مینار کی تعمیر میں چنائی کا کام ہے نہ کہ گپت عہد کی بھاری پتھروں کے وزن کا سہارا لے کر اہرامی درجہ بندی سے ___

"آہنی ستون" موجو نظریہ کی اساس

جدید نظریہ کے علمبردار مسجد قوت الاسلام کے صحن میں نصب لوہے کی لاٹھ کے کتبے پر اپنے نظریہ کی بنیا رکھتے ہیں۔ اس لیے آہنی ستون کا مختصر بیان ضروری ہو جاتا ہے۔ جہاں تک اس کی قدامت کا تعلق ہے آثار الصنادید کے مطابق یہ لاٹھ راجہ دھاوا عرف میدھاوا نے والی سندھ پر فتح کی یادگار میں تیار کرائی تھی اور چونکہ اس پر سن سمبت بھی نہیں ہے اس لیے سرسید احمد خاں اس کو قبل از ذکر سمبت ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں ان کے نزدیک یہ لاٹھ نویں صدی ق م کی ہے۔ جیمس پرنسپ (JAMES PRINSEP) نے بھی سرسید کے خیال کو اپنایا ہے اور اس کے سنسکرت کتبہ کا ترجمہ بھی کیا ہے بہتر ہے اشکال نمبر ۳ کو نقل کر دیا جائے بقیہ دو کتبے غیر متعلقہ ہیں اور ستون کے خالق کی مدح سرائی میں ہیں۔

"...وہ جس (راجہ) نے خود اپنی طاقت بازو سے اس دنیا کا اقتدار اعلا غیر مشترک طور پر ایک بڑی مدت کے لیے حاصل کر لیا جس کے اوصاف میں چاند اور سورج کی خوبیوں کا امتزاج ہے جس کا مکھڑا چاند کی مانند دمکتا ہے، اسی راجہ دھاوا نے جس نے اپنے سر کو وشنو کے پیروں میں باندھ لیا ہے اور اپنا ذہن اس کی طرف مکمل طور پر رجوع کر لیا ہے اس عظیم ہاتھ کو وشنو کی یادگار میں نصب کر دیا ___"

یہاں پر ایک اور ڈاکٹر بھاؤ داجی کے خیالات کا ذکر بھی اشد ضروری ہو جاتا ہے انھوں نے بمبئی کی ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسہ میں ۱۸۷۵ء میں ایک مقالہ پڑھا جس میں نہ صرف آہنی ستون کی متعین کردہ قدامت پر مدلل اعتراضات کیے بلکہ کتبے کا ترمیم شدہ ترجمہ بھی کیا تھا۔ جو حسب ذیل ہے۔

"....جس نے اپنی فوج کی جوانمردی اور شجاعت سے مدت دراز کے لیے ایک وسیع سلطنت قائم کی جس کی مثال دنیا میں محال ہے، جس کا مکھڑا چاند کی طرح دمکتا تھا چندر نے جو اس دنیا کا مالک ہو [illegible] اور وشنو پر ایمان رکھتے ہوئے اپنے خیالات کو [illegible] کے جھنڈے کے ستون کے لیے یہ لاٹھ وشنو پد گری (وشنو کے پیروں کے پہاڑ) میں نصب کر دی ___"

اس بحث کو از سر نو زندہ کرنے والے اور قطب مینار کو وشنو دھوج کہنے والوں نے دونوں ترجموں سے فائدہ اٹھایا ہے ان کے نزدیک پہلے متن کا "عظیم ہاتھ" اور دوسرے ترمیم شدہ ترجمہ کا "جھنڈے کا ستول" لحاظ وشنو دھوج (قطب مینار) کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی حالانکہ "جھنڈے کا ستول" سے مراد وشنو دھوج یعنی قطب مینار نہیں بلکہ بذات خود آہنی ستون ہے اس لیے کہ تذکروں کے مطابق اس لاٹھ کے گپت اضع کے سر ستون پر گرڑ کا بت بنا تھا جو وشنو کی سواری کہی جاتی ہے جیسا کہ

"اس حصار را فتح کرد و ایں مسجد جامع را بنا نست
بتاریخ فی شہور سنہ سبع ثمانین و خمسمانہ، امیر اسفہا
اراجل کبیر قطب الدولہ والدین امیر الامرا
ایبک سلطان عز الله انصاره و بستہ و بیست
الہ تبخانہ تہر کنی ....."

ترجمہ:- سپہ سالار افواج، جلیل و کبیر، دین اور دنیا کے قطب
امرائے ایبک سلطان نے اس قلعہ کو فتح کیا اور اس جامع مسجد کو
پھر ۱۱۹۱ء میں بنوایا جس میں ۲۷ بت خانوں کا مال صرف
......"

اس کتبہ سے نہ صرف مسجد کا سن تعمیر معلوم ہوتا ہے بلکہ تعمیر کار کی
ـہ سے قطب الدین ایبک کا نام بھی منظر عام پر آجاتا ہے اور ہم
کے القاب و خطابات سے بھی روشناس ہو جاتے ہیں۔ یہاں
قابل غور طلب بات یہ ہے کہ اس مسجد میں ۲۷ مندروں کا مال صرف
ہے بالفرض محال اگر قطب مینار رصد گاہ یا وشنو دھوج کی حیثیت سے
ی سے موجود ہوتا تو یقیناً مسلم تعمیر کار اپنی مسجد کا مأذنہ بنانے میں
سوس کرتا اور اس یادگار میں ضرور کہیں نہ کہیں کتبہ لگوا دیتا۔

فی تولیت العبد فضل بن ابی المعالی

یہ کتبہ مسجد کے غربی دالان کے ایک ستون پر موجود ہے جس سے صاف
ـہ ہے کہ فضل بن ابی المعالی کو اس مسجد کا متولی بنا دیا گیا۔ اب
ـب مینار کے کتبہ کا مطالعہ یقیناً نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

(متولی) ابن منارہ و فضل بن ابو المعالی بودہ است۔
یعنی اس مینارے کا متولی فضل بن ابی المعالی کو بنا دیا گیا یہ کتبہ

قطب مینار کو مسجد قوت الاسلام سے متعلق کر دینے کے لیے کافی ہے کیونکہ
دونوں کو ایک ہی شخص کی تولیت و نگرانی میں دے دیا گیا ہے اس کے
علاوہ یہ کتبہ قطب مینار کی تعمیر کو مسجد کی تاریخ تعمیر سے کم و بیش ہم کنار
کر دیتا ہے۔

۱۸۲۸ء میں قطب مینار کی مرمت انگریزوں نے پہلی بار کرائی
جس کے نگراں میجر اسمتھ تھے چونکہ ان کو آثار قدیمہ میں سوجھ بوجھ نہیں تھی
اور ماہرین سے صلاح و مشورہ بھی نہیں کیا تھا اس لیے مرمت کے دوران
کتبوں کی تختیاں الٹ پلٹ گئیں حالانکہ انھوں نے تلف شدہ تختیوں کو
از سر نو تیار کرایا۔ ان تختیوں کو پڑھنے میں کافی دقت ہوتی ہے پھر بھی پہلی
منزل پر مندرجہ ذیل کتبہ ملتا ہے
(الامیر الامرا الاسفہار الاجل
الکبیر الدولہ قطب۔)
یہ کتبہ مسجد کے کتبہ کی
نقل ہے اور سپہ سالار افواج،
امیر الامرا، جلیل و کبیر وغیرہ
قطب الدین ایبک کے ہی
خطابات ہونا ایک بار پھر ثابت
ہو جاتا ہے۔ کیونکہ غوری افواج
کا وہی سپہ سالار تھا اور دلی
میں سلطان کی نیابت بھی اسی
کو حاصل تھی۔ اپنے آقا کے
حکم پر اس نے مسجد اور مینارے
کو بنوانا شروع کرایا تھا اور
چونکہ قطب مینار سے اس
کو دونوں کام لینا تھے یعنی
ایک طرف
تو اسلامی
فتوحات کی شاندار یادگار مقصود تھی
تو دوسری طرف جامع مسجد کو پرشکوہ مأذنہ بھی فراہم
کرنا تھا ظاہر ہے کہ ایبک کی قدر و منزلت غوری سلطان کی
مرہون منت تھی اس لیے اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے اس

کی بنیادیں ہوا کرتی ہیں اور عمارت کے آئینے میں اس کے خالق کی شخصیت، ذہنی کیفیت اور عقائد بھی نظر آجاتے ہیں اور قطب مینار جیسا بلند و بالا فن پارہ بھی اس کلیہ سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی فن تعمیر اور مینارے

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہند معماروں نے بلند قامت فن پاروں میں سوائے یک سنگی ستونوں کے کوئی بھی ایسی عمارت نہیں تعمیر کی جس پر مینار کا شبہ ہوسکے۔ اس کے برخلاف مسلمانوں نے اپنے شہروں کی زینت کے لیے جو عمارتیں بنوائیں ان میں وسیع گنبدوں، کشادہ محرابوں اور سربفلک میناروں کو جگہ دے کر ان کو اور بھی باوقار اور پرشکوہ بنا دیا۔ اموی خلفاء کا دمشق، فاطمیوں کا قاہرہ، عباسی بغداد، عثمانی قسطنطنیہ، اسپین کے غرناطہ، قرطبہ اور اشبیلیہ سے لے کر ایران کے شہروں اور سمرقند و غزنی تک غرضکہ اسلامی علوم و فنون کے تمام مراکز اس ایک بات کی نشاندہی ہیں۔ برڈوڈ (BIRDWOOD) کے نزدیک بھی مینارے اسلامی فن تعمیر کے اہم رکن ہیں۔ نفسیاتی اعتبار اور عقیدے کی نظر سے دیکھا جائے تو بھی مغربی ایشیا خصوصی طور پر اور قوم اسرائیل خصوصی طور پر جو صیہونیت، عیسائیت اور اسلام تینوں مذہبوں کا سرچشمہ ہی ہے کے نزدیک خدا کی ذات انسانی زندگی سے بہت بلند مرتبہ ہے اور انسان اخلاقی اور روحانی طور سے بلند ہونے کے بعد ہی اس کا قرب حاصل کرسکتا ہے۔ اسی لیے ان کے عقیدے کے مطابق انسانوں کے مرنے کے بعد انھیں سے پاک روحیں خدا سے قریب ہوجاتی ہیں لیکن بت پرست اقوام اور آوتہ تصور اپنے معبودوں کو اسی مادی دنیا میں بلا لیتا ہے وہ یہاں عام انسانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جنگ اور پیار حسد و نفرت غرض کہ ہر انسانی جذبہ ان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس بنا پر مغربی فن تعمیر میں میناروں کی موجودگی چنداں تعجب خیز نہیں سمجھ نہیں۔ بہت پہلے کلیدی بادشاہوں کے بنوائے ہوئے زگورت، خوارساباد اور بابل جیسے میناروں کو آج بھی بنی نوع آدم نہیں بھولی ہے۔ ساسانیوں نے بھی مینار سازی کو اپنایا جس کی زندہ مثالیں گجرا اور فیروزآباد کی باقیات میں اس وقت بھی موجود ہیں۔ اس کے بعد کی مثالوں میں طوق، دامغان، محدان وغیرہ کے میناروں

کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ مینار سازی کا فن مسلمانوں کو بھی بطور وراثت ملا اور انھوں نے اس فن کو بے پناہ ترقی دے کر اپنے مخصوص فن تعمیر میں ایک اگزیر جگہ دے دی اس سے انھوں نے مذہبی کام بھی لیا۔ چنانچہ میناروں سے اذانوں کا کام لے کر غیر مسلم رعایا کے دلوں میں اپنے معبود کی ہیبت بٹھا دی۔ اذانوں کے اولین نمونے ہم کو سامرہ اور ابن طولون کی مسجدوں میں ملتے ہیں۔ مینار شکوہ، ہیبت اور جلال کا مظہر ہوتا ہے اور بنوانے والے کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس فوری طور پر ہونے لگتا ہے اسی لیے مینار فتح کی یادگار کا مقصد بھی پورا کرتے ہیں۔ غزنی کے مینار اسی بات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ دلی کا قطب مینار اور اشبیلیہ کا تقریباً ہم عصر بلند ترمنارے کا مقصد بھی تقریباً ایک سا ہے یہ دوسری بات ہے کہ لاشعوری طور پر ان دونوں کے مابین پورا عالم اسلام آگیا تھا۔ غرض کہ اسلامی عقیدوں کے مطابق مینار ایمان، حریت، اقتدار اعلیٰ اور عدل و انصاف کا محور ہے اور خصوصاً قطب مینار اپنے قرآنی کتبوں کے ساتھ واقعی خدا کی بے پناہ قوتوں کا مظہر بن کر سامنے آجاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے سرجان مارشل کے نزدیک اس مینار کی ضرورت ہندوؤں کو قطعاً نہ تھی جبکہ اس عظیم اور پرشکوہ تعمیر کے علاوہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کا مظہر کوئی اور عمارت نہیں ہوسکتی تھی۔

قطب مینار کے کتبے

اس مینار کی بیرونی سطح کو مدور اور کونی کھانچوں (FLUTES) سے توڑا گیا ہے اور خاموش کیفیت میں جذبات دلانے کے لیے قرآنی اور تاریخی کتبے بھی موجود ہیں۔ ان کتبوں کے پڑھنے میں ڈاکٹر ایڈورڈ ای ٹامس، سر سید احمد خاں اور ڈاکٹر غلام یزدانی نے سخت محنت کی ہے یہ کتبے آج بھی کم و بیش اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں جن پر بعد کی پیوندکاری کا الزام دنیا سراسر بہتان ہے اور خود اپنے کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔ ان کتبوں کے مطالعہ کے بعد ہم کننگھم کے اخذ شدہ نتیجے پر پہونچ جاتے ہیں کہ قطب مینار کی تاریخ انھی کے کتبوں میں مضمر ہے۔

سب سے پہلے مسجد قوت الاسلام کے دو کتبوں کا مطالعہ یقیناً مددگار ثابت ہوگا۔ اول کتبہ کی نقل سرورق پر دی ہوئی ہے۔

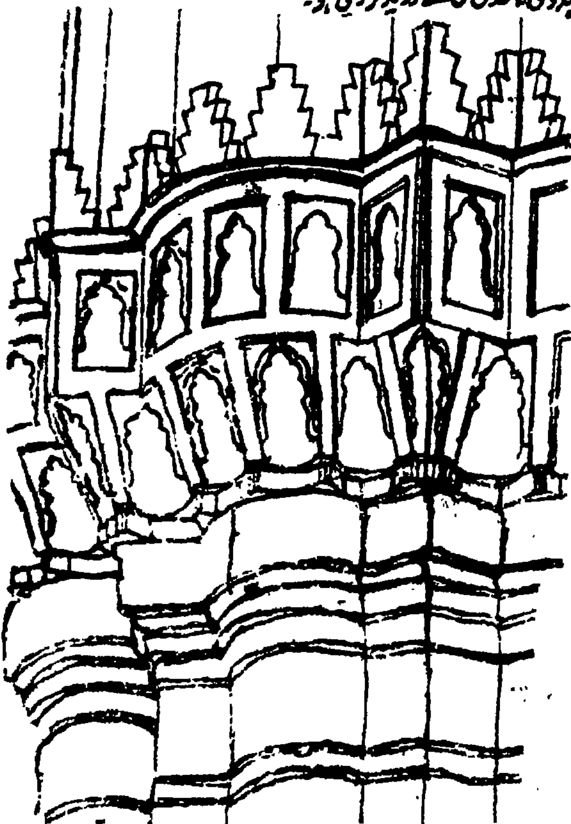
غزنی سے حاصل کر لیا تھا۔ مندرجہ بالا کتبوں سے بات
ہے کہ قطب الدین ایبک نے نہ صرف قطب مینار بنانے
تھا بلکہ پہلی منزل کی تعمیر میں اس کا اصلی حصہ تھا چنانچہ محض
خاطر اپنے آقا سلطان غوری کے نام سے معنون کر کے
ے کو خانہ خدا کے حوالے کر دیا تاکہ اس سے اذان کا کام
سکے۔ اس طرح اس نے اپنے معبود کی بارگاہ میں بھی
ر کا وسیلہ ڈھونڈھ نکالا اس لیے کہ وہ خدا ہی کی ذات
نے اس کو ادنیٰ غلام سے اٹھا کر حکمرانی بخشی اور غیر
ن کے اوپر فتح یاب کیا۔ گو کہ ایبک سلطان اپنا
یٔ حیات میں پورا کر سکا پھر بھی اس کو التمش میں صحیح
ا جس نے سیاسی طور پر مسلمانوں کی ہندستانی حکومت کو مستحکم
تی میدان میں بھی اپنے آقا کے خواب کو قطب مینار
ا پورا کر دکھایا۔

عمیر کار بددیانت تھے

اب صرف مسلم فاتحین کے خلاف
بددیانتی کا الزام ہی لگایا جا سکتا
یٔ مینار جو وشنو دھوج یا دھجے استمنب کی حیثیت سے پہلے ہی
تھا۔ ایبک نے اس کی اصلی رخ بندی " (CASING) ہٹا کر
لامی جامہ پہنایا یہ بات صرف ایسا قیاس ہے جس کا کوئی ثبوت
ث کے اس پہلو کو بھی آر این منشی کی زبان میں ایک
یٔ لغویت " کہہ کر نظر انداز نہیں کر دینا چاہیئے۔ مسلم حکمرانوں
ایک " مذہبی تشدد " ضبط تحریر ہے۔ ان کی بت شکنی "
ت محض مذہبی جوش میں سرزد ہوئے جو دقتی ایت ابھی سے
یاں " ہر جگہ اور ہر زمانے میں ہوتی آئی تھیں عیسائی دنیا
ہی جوش جنون کی حدوں کو بھی توڑ گیا بہت سے کیتھولک
سٹنٹوں نے غصب کر لیے اور خود ہندستان میں بھی بہت سی
تقا ہوں پر وشنو دیوی دیوتاؤں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ گول
بہ کا مندر اور نیم شارا ٹنا کا تیرتھ استھان اس کا زندہ ثبوت ہیا۔
ن نے کبھی بھی ایمان داری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ورنہ بڑے فخر
قل میں کتبے نصب کرائے جو قدیم پہلے سے بنی تھیں۔ اگر وہ اتنے ہی
تعصب اور تنگ نظر ہوتے تو قطب مینار کے بالکل قریب نصب
ہنی ستون پر آج سنسکرت کے کتبے نہ ملتے اور فیروز شاہ کوٹلہ میں
لائی ہوئی اشوک کی لاٹھ واقعی خط کوفی و نسخ سے مزین ہوتی۔

قطب مینار کا طرز تعمیر

بعض مثال قطب مینار کی رخ بندی اگر آج اپنی اصلی حالت میں
نہیں ہے تو بھی اس کے پس پشت کار فرما عقائد، مذہبی فلسفہ اور نفسیاتی
تحریک اس وقت بھی من وعن موجود ہے جس پر بہر حاصل بحث کی جا چکی
ہے اور ناقابل تردید نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ہندستان کا مزاج اور آریہ فلسفہ
مینار سازی کے لیے سازگار نہ تھا اسی لیے ہندو صناع قبل از ورود
اسلام ایک بھی رفیع الشان مثال نہیں پیش کر سکے۔ اس کے برعکس
مسلمانوں نے مینار سازی کی روایت خوشی خواہ بطور ورداثت قبول کی تھی۔
قطب مینار میں طریقہ تعمیر بھی ہندو طریقوں سے بالکل مختلف ہے جس کا ذکر
پہلے ہی ہو چکا ہے اتنی کم جگہ میں اتنی بلند عمارت محض پتھروں کے تھپروں
کو عمودی طور پر رکھ دینے سے تیار نہیں کی جا سکتی اور نہ پائدار ہی ہو سکتی ہے۔
جبکہ بھاری پتھروں کے وزن پر قائم کی جانے والی عمارت کا حجم بڑھنا ضروری ہو جاتا
ہے۔ اسلامی فن تعمیر دراصل بازنطینی فن کی رنگی روایات اور ایرانی فن کی خشتی روایات
چین اور باشعور امتزاج ہے اینٹوں کی جڑائی کا معاملہ دراصل ایران کی دین ہے یہی
طریقہ قطب مینار کی تعمیر میں اپنایا گیا ہے۔ یہاں چونے کی بھرپور موجودگی ہی قطب مینار کے
ہندو فنی ماخذ کی سختی سے تردید کر دیتی ہے۔



مینارے کو اسی کے نام معنون کر دیا جیسا کہ اسی منزل کے ایک دوسرے کتبے کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے حالانکہ غوری سلطان کے ان گنت القاب کندہ کر کے یہ کتبہ بے حد طویل ہو گیا پھر بھی مدعا ظاہر کرنے والے انتخاب کی نقل حاضر ہے۔

سلطان البر والبحر مورد ما الدنیا مظهر کلمة الله العلیا اسکندر الثانی ابو المظفر محمد بن سام ناصر امیر المومنین خلد ملکه وسلطانه وجعل آخره و...

اپنے سلطان کا نام لینے کے بعد ایبک نے اپنا نام کمال عاجزی سے نہ دیا بلکہ محض ان خطابات پر اکتفا کی جو مسند عالی سے جاری کیے گئے ہوں گے۔ جیسا کہ سبھی لوگوں کو علم ہوگا کہ اس مینارے کو التمش نے مکمل کیا۔ اس امر کی تصدیق دوسری منزل کے کتبے سے ہو جاتی ہے۔

امر باتمام هذه العمارة الملك المویدمن السماء شمس الحق والدین ایلتمش السلطانی ناصر امیر المومنین

(اس عمارت کی تکمیل تائید خداوندی سے عمل کرنے والے دین اور صداقت کے آفتاب امیر المومنین کے حامی و مددگار سلطان التمش کے حکم سے عمل میں لائی گئی۔)

اسی قسم کی دوسری تحریریں ہم کو تیسری اور چوتھی منزل پر بھی ملتی ہیں۔ تیسری منزل کے دروازے کے پہلو میں ایک اور کتبہ دریافت کیا گیا ہے جس سے صاف طور پر عیاں ہو جاتا ہے کہ یہ مینار بالکل نئی تعمیر ہے جس کو کسی قدیم عمارت یا کسی ترمیم سے دور کا واسطہ نہیں۔

تمت هذه العمارة فی نوبت العبد المذنب محمد امیر کوه

ترجمہ: اس عمارت کی تکمیل گنہگار اور غلام محمد امیر کوہ کی نگرانی میں ہوئی۔

ہم عصر شہادتیں

قطب مینار کی مسلم تعمیر کی تصدیق ہم عصر تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ شمس سراج عفیف تاریخ فیروز شاہی وغیرہ میں اس کی تعمیر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور ابو الفدا نے اپنی تاریخ مختصر (۱۳۳۱ء) میں صاف صاف بیان کیا ہے۔ "یہ آذان سنگ سرخ کا بنا ہے اور بہت بلند ہے اس میں بہت سے پہلو اور ۳۶۰ زینے ہیں —" ظاہر ہے کہ اس بیان کا اطلاق قطب مینار کے علاوہ کسی اور مینار پر نہیں ہو سکتا سبھی کو معلوم ہے کہ موجودہ طور پر ۳۷۹ زینے ہیں یعنی مزید ۱۹ زینوں کا اضافہ اور بقیہ دو منزلیں فیروز شاہ کی تعمیراتی سرگرمیوں (۱۳۶۸ء) کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ محمد تغلق اور سکندر لودی کے کتبے بھی نصب ہیں اور سبھی قطب مینار کی مسلم تعمیر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ ہم عصر شہادتیں اس مینار کو التمش سے منسوب کرتی ہیں اور انھیں کی بنیاد پر کار۔ اینی بنٹی نے التمش کو ہی اس مینارے کا خالق بنایا ہے۔ اس سلسلے میں کننگھم کی دلیل قابل تسلیم ہے کہ "...... یہ بیانات (ہم عصر حوالے) صرف عوام الناس کی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور یقیناً ان بیانات کو وہی وزن نہیں دیا جا سکتا جو بنیادی منزل کے کتبوں کو جن میں محمد بن سام کے القاب موجود ہیں میرا خیال ہے کہ نچلی منزل کے کتبہ میں التمش کا نام نہ ہونا اس بات کا حتمی ثبوت (Conclusive Proof) ہے کہ التمش خود بھی اس مینار کے اپنی تعمیر ہونے کا مدعی نہ تھا —" تھوڑی دیر کے لیے مانا جا سکتا ہے کہ التمش نے بپاس تشکر نچلی منزل میں اپنا نام نہ دیا بلکہ اپنے آقا یعنی ایبک کے جملہ خطابات کندہ کر دیے لیکن پھر سلطان محمد غوری کے بلند بانگ اور طویل القاب کا کوئی جواز نہیں رہتا اس لیے کہ التمش غزنی یا غور کا پابند نہ تھا بلکہ خود مختار سلطان تھا اور امیر المومنین کا

زبیر رضوی

اجنبی

تم مرے یار ہو بچپن کے مرے ساتھی ہو
ساتھ کھیلے ہو مرے ساتھ پڑھے ہو میرے
ایک ہی پیڑ کی چھاؤں میں پلے ہیں دونوں
ایک ہی گاؤں کی مٹی سے بنے ہیں دونوں
ہم کبھی باغوں، کبھی کھیتوں، کبھی گلیوں میں
تپتی دوپہر میں آوارہ پھرا کرتے تھے
ماں مری تم کو بہت پیار کیا کرتی تھی
میرے ابا تمھیں شہزادہ کہا کرتے تھے
اپنی ذاتوں میں عقیدوں میں کوئی فرق نہیں
مجھ کو پہچانو کہ مجھ میں تو کوئی فرق نہیں

یہ نئے لوگ، نئے روپ، نئے قول وقسم
یہ نئے ربط، نئے نام، نئے لطف وکرم
یہ نئے عشق، نئے پیار، نئے اپنے صنم
کس کو فرصت ہو جو ماضی سے پلٹ کر بولے
تم مرے یار نہ بچپن کے مرے ساتھی ہو
ساتھ کھیلے ہو نہ تم ساتھ پڑھے ہو میرے!!

ہندو طریقے کے برعکس ہر منزل کی وضاحت بجائے ڈوڈوں (BRACKETS) کے خالصتاً اسلامی طریقے پر یعنی توڑے دار چنائی کے ذریعے چھوٹے چھوٹے قوسی طاقوں سے کیگئی ہے اور چھجوں کو سہارا دیا گیا ہے۔ اس طرح کے چھجے اسلامی دور سے پہلے کسی بھی ہندو عمارت میں نہیں پائے جاتے ہیں ہاں ان کے ماخذ کے طور پر قصر الحمرا اور مصری میناروں کا نام آسانی سے لیا جا سکتا ہے اس قسم کی توڑے دار چنائی عمارتوں میں بطور تعمیراتی کاوش کے کام میں لانے والا پہلا معمار شیر خلہ۔ تھا مسجد قلعۂ کہنہ کے معود (SQUINCH) اسی تہہ کے چھتے کے اصول پر اٹھائے گئے ہیں۔ گو کہ قطب مینار کی توڑے دار چنائی والے چھجے بالکل اسلامی اصول پر مبنی نہیں ہیں اور ان میں مندروں کی اندرونی درجہ بندی کی جھلک آگئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان نگراں ہندو معماروں کو زبانی طور پر اصول سمجھا دیتا تھا اور وہ لوگ ان اصولوں کا اظہار اپنے طور پر کرتے تھے۔

قطب مینار کی ہر منزل میں جنگلوں اور کٹہروں کے طور پر اول اول کنگورے بنائے گئے تھے جن کو ۱۸۲۸ء کی مرمت میں ختم کر دیا گیا۔ ان کنگوروں کے نمونے اب بھی داخل دروازے کے پیچھے پڑے مل جاتے ہیں جن کا ہندو اصل ہونا محض خام خیالی ہے ہاں ان کی مثال قدیم زمانے کے اشرقی محلات واقع سارگان اور فراسا باد (۲۲۲-۶۰۵ ق م) میں مل جاتی ہے ان کنگوروں کی ہیئت سے ہی عسکری مزاج ٹپکا پڑتا ہے مصر کی تقریباً ہم عصر عمارت جامع ازہر (۱۲۰۰ء) اور مقبرۂ سلطان قلاوس (۱۲۸۴ء) میں اسی مشابہت کے کنگورے ملتے ہیں۔ اس سے ایک بار اور ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ فلک بوس عمارت در اصل اسلامی فن کی مرہون منت ہے۔

اس منارے کا ارضی مطالعہ (GROUND PLAN) اور اقلیدسی اٹھان بھی اس کو ہندو طرز سے غیر متعلق کر دیتی ہے۔ اس کی مخروطی وضع قطع فریب نظر پیدا کرتی ہے اور یہ مینار اور زیادہ بلند معلوم ہوتا ہے۔ ارضی مطالعہ کے اعتبار سے اس کی مدور اور کمرخی نلکیں (FLUTES) قطب مینار کو غزنی کے فتح کے ستارہ نما میناروں سے نہ صرف قریب تر بلکہ ان کی ترقی یافتہ صورت بھی پیش کرتی ہیں۔ ہندو مینار سازی کی بہترین مثالیں چتوڑ اور مانڈو میں ہے جن طرز پر مبنی یہ مینار سیدھے سیدھے اٹھائے گئے ہیں اور بے باک تزئین سے بھرپور ہیں۔ ان میں نہ تو رفعت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور نہ طرز میں وہ وقار آپایا ہے۔ ان میں ظاہری شان و شوکت تو ہے لیکن جلال کا احساس نہیں۔ یہ دونوں مینار بلا شبہ اپنے وقت کی راجپوت راجاؤں کے کھوکھلے وقار کا آئینہ ہیں اس کے علاوہ چونکہ یہ مینار قطب مینار سے بہت بعد کی تعمیرات ہیں اس لیے ان کا تخلیقی محرک سوائے قطب مینار کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ان میناروں کے مقابلہ میں قطب مینار بے حد باوقار اور پرشکوہ ہے۔ اس کی زیبائش میں اعتدال پسندی سے کام لیا گیا ہے اس کے طرز کی پاکیزگی، وضع کے بھاری بھرکم پن اور مجموعی تاثر کی عظمت اسلامی تعمیر کی بنیادی خصوصیات سے مطابقت رکھتی ہے۔

یہ خصوصیات قطب مینار کی بنیادی تعمیراتی خصوصیات ہیں جن سے حسن اور تاثر بیک وقت حاصل کیا گیا ہے۔ ان تعمیراتی عناصر کو بعد کی پیوندکاری نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی شمولیت قطب مینار کی درجہ بدرجہ تعمیر کے ساتھ ہی ممکن تھی۔

اسلامی فن تعمیر میں عمارت کی خاموشی اور بے جان کیفیت کو ختم کرنے کے لیے تعمیراتی کاوشوں کے علاوہ مسلمان رنگین پتھروں کا استعمال بھی کرتے تھے۔ کاشی کاری (TILE WORK) بھی اسی مقصد کے لیے کی جاتی تھی۔ اس غرض سے مسلمانوں نے ایران، مصر اور دمشق کی عمارات میں لازوال رنگ آمیزی کی جس میں یروشلم اور حلب کے رنگین پتھروں سے کام لیا۔ ہندستان میں یہ چیزیں عنقا تھیں پھر بھی قطب مینار کی ہر منزل کی تقسیم گہرے اور ہلکے سرخ پتھروں سے نہایت واضح طور پر کی گئی ہے۔ قطب مینار کی تزئین کاریاں اور حسن کاری تمام تر جین اور بدھ طرز سے براہ راست متاثر ہے مگر بے حد اعتدال کے ساتھ اگرچہ ہم ہیول کی اس بات کو نہیں مانتے کہ قطب مینار ہندو فن میں عربی ترمیم کا دوسرا نام ہے پھر بھی دو عظیم فنی روایات کا حسین سنگم مظہر ہے۔ قطب مینار میں مقامی عناصر کی شمولیت در اصل فن تعمیر کا ایک انوکھا باب ہے جس نے آگے ترقی کر کے ہندو مسلم فن تعمیر کے نام سے ایک علاحدہ مکتب فن قائم کر لیا لیکن یہ مقامی عناصر اتنے شدید نہیں کہ قطب مینار کے ہندو فنی ماخذ کے کسی بھی نظریہ کا بار اٹھا سکیں۔

اس مضمون کے بارے میں ہم آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔ —— ا ح ۷ ۷

چندر پرکاش شاد

ایک مشورہ

تند اور تیز ہوا سے کہہ دو
اپنی رفتار گھٹا دے اسے کم تر کر دے
یوں درختوں کو تھپیڑوں سے پریشاں نہ کرے
چمن سے بیٹھے پرندوں کو ہراساں نہ کرے
خاک آلود کوئی دل کوئی داماں نہ کرے
در و دیوار کو یوں
نذرِ سعتی طوفاں نہ کرے

تند اور تیز ہوا سے کہہ دو
ساحرہ بن کے چلے
جس طرح صبح ہوا چلتی ہے ——
نرم و آہستہ خرام
ہر طرف پھول کھلا دیتی ہے
ذرّے ذرّے کو جِلا دیتی ہے

تند اور تیز ہوا سے کہہ دو
اپنی رفتار گھٹا دے اسے کم تر کر دے
تاکہ یہ سلسلۂ شوق نگوں تک جائے
اور ہر دور کرے اس کا سواگت دل سے
ورنہ یہ تیز ہوا
چند لمحوں میں گزر جائے گی
وقت سے پہلے ہی مر جائے گی
خود کو بدنام بھی کر جائے گی ——!
تند اور تیز ہوا سے کہہ دو!!

مدن موہن

آخری لمحے

پھولوں کے چہرے
داغ داغ
چاند، رات
اُداس اُداس
پتھر جیسے
پگھل رہے ہوں
راہیں جیسے
سمٹ رہی ہوں
سُن کر تیرا
درد میں ڈوبا
لرزاں لرزاں راگ
بجھ جائیں دیپک سارے
کفن اٹھائے نکلیں تارے
اُف پتوں کے یہ انبار
پیڑوں کے زہریلے آنسو
دھرتی پہ یہ بوجھ
آگ کے پہرے
موت کی آندھی
جیون شاید بجھ جائے گا

شہاب شمسی

"صدائے نفسِ سوختہ"

کتنے ناخواندہ و نادیدہ و نادانستہ
غیر محسوس خلاؤں کا ضمیر بے تاب
دم بخود، مہر بلب، سر بہ گریباں ہے آج
اب ہے ہر غنچۂ لب بستہ، ویژہ رنگ و انکار زدہ
روکشِ صحنِ گلستانِ بہشتِ موعود
قسمتِ تیرگیِ بام و درِ کاخِ وجود
آئینہ دارِ جمالِ دلِ یزداں ہے آج
سرنگوں زہرہ و مریخ کا ایواں ہے آج

اب غبارِ کفِ رہرو ہے حریفِ مہ و مہر
جامِ جمشید ہے ہر سنگ سرِ راہ گزر
خلوتِ حسنِ ازل کا رگِ عزمِ صفات
ایک اک کر کے کئے بند نقابِ رخِ ذات
یہ تب و تاب، یہ ہنگامۂ مشتِ خاکی
ریزہ ریزہ ہے وہ دیرینہ حصارِ کمیں
اب نہ وہ فاصلۂ وقت نہ وہ بُعدِ مکاں
مٹ گئے سارے خم و پیچ دمِ سلسلۂ بود و نبود
اپنی معراج کی منزل میں ہوں جلوہ فشاں

پھر ہے آمادہ پہ دارو گگٹ و تاز جنوں
کون فاراں کی چوٹی پہ کھڑا ہے دیکھو!
ہر بنِ مو مرا کہتا ہے کہ میں ہوں میں ہوں!
مرکزِ کون و مکاں ارض و سماوات کی روح
جاگ اٹھی ہے خودی قطرۂ آوارہ کی
بحرِ ناواقفِ ساحل سے ہے اب پنجہ کناں
لے چلو مجھ کو اندھیروں سے تجلّی کی طرف
(تمسو ما جیوتر گمیہ)[1]
اور فناگاہِ زمانہ سے بہ آغوشِ سحرِ صبحِ ابد
(مرتیو رما امرت گمیہ)[2]
رہگزاروں میں یہ آواز سنی جاتی ہے
ذرّے ذرّے سے 'انا الحق' کی صدا آتی ہے

اب کہاں ہیں یہ خدایانِ زمیں، دو حریفانِ ملل
عصرِ نو کے ہبل والی تقدیرِ جہاں
اپنی دنیا کے یہ خود ساختہ لات و منات
آج پھر قتل گہِ ناز سجائیں آ کر
اہتمامِ رسن و دار کریں جشن منائیں آ کر
میرے وجدان کو سولی پہ چڑھائیں آ کر!

(نوٹ: ۱، ۲ سنسکرت سے ماخوذ ہیں)

شاد عارفی

خلوتِ حسن کی "رنگیں یادو" دلِ مغموم کو۔ "مت ایذادو"
درِ گلشن پہ۔ "ستم ایجادو" "راستہ بند ہے" .... یہ لکھوادو
جن مسائل میں وطن الجھا ہے "ہاتھ لکھتا ہوں".... اگر سلجھادو
ذہن خود صاف نہیں جس بابتہ چاہتے ہو کہ.... ہمیں سمجھادو
کفر ہے دل شکنیٔ خوباں ورنہ تم اور ہمیں بہکادو
کون سنتا ہے فغانِ درویش اپنے آپے میں رہو۔ فریادو
کوئی مصرف نہیں دولت کا اگر دوسرا تاج محل بنوادو
"جیل"...."ٹکسال سے باہر ہوا بھی" ہم کو فی الحال ۔ قفس پہونچادو

قطعہ بند

اے وہ اردوئے معلیٰ نہ سہی شاد کی بات سنو ۔ اُستادو
عشق "شیرینِ غزل" کی خاطر نہر میں "ڈوب مرو فرہادو"

قطعہ

شہِ شطرنجِ غزل سے ہرگز نہ کہو ۔ "شعر عطا فرمادو"
"اِس کو" ساقی کا دلادو" بوسہ" "اُس کو" ۔ بازار سے "جنگل لادو"

شاد مستقبل روشن کیلئے
"حال" ماضی کی طرف ٹھکرادو

سعید اختر نعمانی

رباعیات

آلام کی گرد رُخ سے چھٹ جاتی ہے
عمرِ غمِ زندگانی گھٹ جاتی ہے
تنہائی جلاتی ہے جو یادوں کے چراغ
تاریک شبوں کی چھاتی پھٹ جاتی ہے

میخانہ سے مول زندگی لیتا ہوں
کچھ اور اسی بہانہ جی لیتا ہوں
آلامِ جہاں جو تجھ پہ پڑتی ہے نگاہ
کچھ اشک تو کچھ شراب پی لیتا ہوں

سرمایہ کا قصہ پاک کر سکتا ہے
زردار کا سینہ چاک کر سکتا ہے
دہقاں کو اگر نہ ہو قناعت کا خیال
دُنیا کو جلا کے خاک کر سکتا ہے

میکش کو اگر خمار مل جائے تو خوب
بیمار کو جو قرار مل جائے تو خوب
جو عاشقِ مہجور ہیں اُن کو اخترؔ
اک لمحۂ انتظار مل جائے تو خوب

پینے کو جو ساقی دے وہ پی لیتا ہوں
دے زہر اگر تو زہر ہی لیتا ہوں
یہ سوچ کے ٹوٹے نہ بھرم ساقی کا
چُپ چاپ لبوں کو اپنے سی لیتا ہوں

مایوس نہ ہو غُبار چھٹ جائے گا
جو وقت پڑا ہے آج کٹ جائے گا
امید کی زرتار شعاعوں کی قسم
انسان بڑھے گا سایہ گھٹ جائے گا

اثر لکھنوی

جس نے بھی تیری آرزو کی ہے / آخر اپنی ہی جستجو کی ہے

چار سو چھا گیا ہے سناٹا / کوئل اس طرح بن میں کوکی ہے

تو ہو وہ گل کہ شوق میں تیرے / غنچہ تصویر آرزو کی ہے

میکدے میں ہمیشہ واعظ نے / بہکی بہکی سی گفتگو کی ہے

ابھی وعدہ کیا، ابھی بھولا / بات کیا اپنے حیلہ جو کی ہے

اُٹھ گیا کون تشنہ لب ساقی / مئے گلگوں میں بو لہو کی ہے

تو کہے جائے وہ سنے جائے / کوئی حد اے دل آرزو کی ہے

اپنی ہستی سے بے خبر ہونا / انتہا تیری جستجو کی ہے

اُس سے کیا کیا نہیں سنو گے اثرؔ
مشفقِ من ابھی تو تُو کی ہے

فراق گورکھپوری

تڑپ کر جگر منھ کو آ جائے ہے
اسے دیکھ کر کب رہا جائے ہے
کسو نے نہ اب تک بتایا ہمیں
غمِ ہجر میں کیا کیا جائے ہے
محبت میں اے موت، اے زندگی
جیا جائے ہے یا مرا جائے ہے
رموزِ بہاراں جو پوچھو ہو تم
گل اپنے لہو میں نہا جائے ہے
مجھے پا کے تنہا مری بے کسی
سرِ شام بستر لگا جائے ہے
مجھے گھر ہی کا نہیں کوئی شوق
ترے گھر کو ہر راستہ جائے ہے

کیلاش ماہر

لہو نہ آنکھ سے ٹپکا نہ زخمِ دل ابھرے
بھری بہار کے یہ دن بہت گراں گزرے!

حسین لمحے مری زندگی کے لوٹ لئے
جو آرزو میں کٹے تیری یاد میں گزرے

وہ پُر فریب نگاہیں وہ اعتماد کی موت!
نہ جانے ذہن پہ ماضی کے نقش کیوں اُبھرے

سوالِ ترکِ وفا تم نے خود اُٹھایا تھا
اُداس کیوں ہیں نگاہیں یہ بال کیوں بکھرے!

جنوں نواز نگاہوں کی رہ نمائی ہے
نہ جانے قافلۂ زندگی کہاں ٹھہرے!

نہ جانے آج ہی کیوں دل کی نبض ڈوب گئی
ترے دیار سے ہم یوں تو بارہا گزرے

عتیق تابش

رحم کر اے زندگیٔ سرگراں
یہ جہاں ہے سنگریزوں کا جہاں
اب کہاں کچھ گرمیٔ تابِ توان
دل ہے بے پروائے ہر سود و زیاں
بند ہیں دروازے چپ ہیں کھڑکیاں
سوچتا رہتا ہوں اب جاؤں کہاں
زندگی کو ڈھونڈتے تو ہیں مگر
زندگی اپنے نصیبوں میں کہاں
راستے سے لوٹ آئے قافلے
اک اندھیرا تھا کراں تا بہ کراں
ہر نفس سوداگروں کے ہاتھ ہے
کیا دل، کیسی نظر، کیسی زباں
دیکھیں یہ انداز کیا لاتا ہے رنگ
نالہ برلب، چشم خوں نابہ فشاں
ہم نے اک عالم کے تیور دیکھ کر
دل کو رکھا ہے سبک سر کو گراں
ڈر ہے اس حرص و ہوس کے دور میں
لٹ نہ جائے کوچۂ لالہ رخاں
کون کام آتا ہے دیکھیں اے عتیق
مانگتے پھرتے ہیں زلفوں کا دھواں

حسن کمال

چلو خزاں ہی سہی پیرہن کو تار کریں
اب اور کتنا بہاروں کا انتظار کریں

ہیں یاد تیری وفائیں تجا بھی دیں لیکن
اب اتنا ہوش کہاں زخمِ دل شمار کریں

کسی کی آنکھ میں آنسو کسی کے ہاتھ میں ڈھول
سچلے ہیں لوگ کہ نظارۂ بہار کریں

جہاں ہر ایک طرف پتھروں کی بارش ہو
وہیں یہ حکم کہ شیشوں کا کاروبار کریں

جب اپنے دل ہی نے گھبرا کے ساتھ چھوڑ دیا
تو کون دوست بچا جس پہ اعتبار کریں

جو گل بداماں تھے ان کا نظام دیکھ لیا
ہیں اب جو تیغ بکف ان کو شہریار کریں

ستارے ڈوب چلے آسماں کے دامن میں
اب اور کس کو حسن اپنا راز دار کریں

مظفر حنفی ہسوی

سوچ کر کہ اب کسی کا نام کیا اچھالیے
زخمِ دل ہمیں نے جان بوجھ کر چھپالیے

وہ کچھ اس طرح نظر جھکا کے مسکرا
پھر کوئی نہ کہہ سکا کہ "بات کو نہ ٹالیے"

گھوم پھر کے خاک آپ ہی کے سر پہ آئے گی
خواہ جس طرح بھی آفتاب پر اچھالیے

حسبِ حکم ہم سنبھل گئے مگر جناب
آپ زاویہ نگاہ کا ذرا سنبھالیے

اعتبار کچھ نہیں کہاں یہ بھید کھول دیں
بزم سے ہر اک نظر شناس کو نکالیے

شکوہ سنج ہو نہ پائے اُن کی اس دلیل پر
"گفتنی نہیں ہر ایک بات، خاک ڈالیے"

بابِ عشق میں "مظفر" فارست بھی"
کہہ گیا کہ سانپ آستین میں نہ پالیے

بلونت سنگھ

شملہ
شام و سحر کے درمیاں

آنے والی رات کا اڑتا آنچل آکاش پر پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ سورج آدھے سے زیادہ غروب ہو چکا تھا، صرف اس کی چمکتی ہوئی پیشانی دکھائی دے رہی تھی۔

میں لالہ لاجپت رائے کے بت کے پاس ہی کھڑا تھا ——— بت کی پشت پر شملہ کی مشہور رج تھی اور داہنے ہاتھ پر مال روڈ، جہاں اس وقت خاصی ریل پیل تھی۔

جب میں چھوٹا تھا تو اسکول میں ہماری انگریز استانی ہمیں یونان کے دیوتا اے پیلو کی کہانی سنایا کرتی تھی۔ دیوتا کا پورا نام فی بس اے پیلو تھا۔ جب صبح کی دیوی اروراسورج کا پھاٹک کھولتی، تو فی بس اے پیلو سورج کا رتھ ہانکتا ہوا آسمان کی بلندیوں میں اٹھنے لگتا۔ سارا دن سفر کرنے کے بعد شام کو اس کی ڈیوٹی ختم ہوتی۔ ایسی ہی ایک شام کو وہ تھکا ہارا لوٹ رہا تھا، تو اس کی نظر ایک دوشیزہ ڈافنے پر پڑی، جس سے اسے پیار ہو گیا۔ حالانکہ اے پیلو مردانہ حسن کا دیوتا مانا جاتا تھا لیکن ڈافنے اس سے نفرت ہی کرتی رہی۔ آخر بے تاب ہو کر اے پیلو نے جب ایک شام کو اسے اپنی بانہوں میں جکڑنے کی کوشش کی تو دیوتاؤں کی دعاؤں سے ڈافنے ایک پیڑ بن گئی اور اس طرح اس کی آبرو بچ گئی۔

بچپن کی سنی ہوئی کہانی دل کی گہرائیوں میں کچھ اس طرح اتر گئی کہ اب بھی اکثر سورج ڈھلنے کے وقت بے چین ہو اٹھتا ہوں۔ خاص کر پہاڑی جگہ پر تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یقینی اے پیلو اور ڈافنے کی ناکام داستان الفت کا ناٹک کسی پہاڑی کی اوٹ میں کھیلا جا رہا ہوگا ...... اسی انجانی بے چینی کے تاثر میں مستغرق میں لالہ لاجپت رائے کے بت سے آگے برج کی طرف بڑھا۔ دھیرے دھیرے، پنجے تلے قدم اٹھاتا ہوا میں اب ذرا اور اونچائی پر پہنچا تو سامنے رج کی مرتفع کشادگی نظر آنے لگی۔ رج کی دوسری طرف پہاڑ کی ڈھلان پر میونسپلٹی کی بنچیں نظر آ رہی تھیں جہاں بیٹھنے کے لیے دو پیسہ دینا پڑتے تھے۔ دائیں طرف شاندار گرجا گھر دکھائی دے رہا تھا، اور بائیں طرف وہ سڑک جو لکڑ بازار سے ہوتی ہوئی اجگر کی طرح بل کھاتی دو ڈھائی میل آگے سنجولی تک چلی جاتی ہے۔

رج سے چاروں طرف پھیلے ہوئے دور دور تک کے منظر دکھائی دیتے ہیں شاید یہیں کھڑے ہو کر کسی یورپین نے کہا تھا کہ شملہ کی شامیں جس قدر خوبصورت ہوتی ہیں اتنی دنیا میں کہیں اور نہیں لیکن آج رج پر کوئی رونق نظر نہیں آتی تھی۔ میں کچھ دیر تک ٹہلتا رہا۔ آکاش میں چڑیوں کے جھنڈ اپنے گھونسلوں کو واپس جا رہے تھے اور ایک آدھ ستارا بھی نظر آنے لگا تھا۔

کچھ دنوں سے مجھے روزانہ شام کو وہاں ایک لڑکی دکھائی دیا کرتی تھی۔ ادھر شام ہوتی ادھر یہ جگمگاتی ہوئی لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پہنچ جاتی۔ ہماری ملاقات تو کیا، کبھی آنکھیں بھی چار نہیں ہوئی تھیں پھر بھی وہ اس سمے کا ایک اٹوٹ جز ہو گئی تھی۔ آج اس کے نہ آنے سے ایک بڑی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ دل کی ویرانی اور بڑھی تو میں رج کے کنارے والے جنگلے پر دونوں ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ میرے سامنے شملہ پھیلا ہوا تھا جیسے ٹھنڈے ٹھنڈے دھندلکے پر لیٹا ہوا۔ چھوٹے بڑے مکان ایک دوسرے سے کھچڑی ہو رہے تھے جوں جوں نظر آگے بڑھتی یہ مکان بھی پھیلتے جاتے۔ یہاں تک کہ بہت آگے پہنچ کر کہیں کہیں اکا دکا بنگلہ بھی دکھائی دیتا تھا۔

طنز و مزاح

صادق موبلی

آواگون

شادی کرکے کیا پایا ہے؟
اک بیوی
دبلی پتلی سی
دن بھر جھک جھک کرنے والی
دن بھر لڑنے بھڑنے والی
اور شادی کا پھل، یعنی اک درجن بچے
بچے دل بہلانے والے
بچے رونے گانے والے
بچے شور مچانے والے
آدھی تنخواہ کھانے والے
جن کو دیکھ کے دل کہتا ہے
"بول رے او مجنوں کے بیٹے"
اسی لیے کیا تو نے اس سے
عشق کیا ___ اور شادی کی تھی؟؟
میں ہوں ایک کلرک سوا سو تنخواہ والا
میں اپنی سب تنخواہ لے کر
اجرت لے کر
رشوت لے کر
اپنا حق محنت لے کر
سب خرچے پورے کرتا ہوں
صاحب کو دعوت دیتا ہوں
دھوبی کا بل بھی دیتا ہوں
درزی کا بل بھی دیتا ہوں
"بس" کا کرایہ بھی دیتا ہوں
گھر کا بھاڑا بھی دیتا ہوں
اور اگر پیسے بچ جائیں
بچوں کو بہلا پھسلا کر
گھر میں سلا کر
بیوی کو "پکچر" بھی لے جاتا ہوں اکثر
میں اپنے بچوں کی خاطر
بھلے برے سب کام کروں گا
لیکن ان کو پال پوس کر
بڑا کروں گا
خود ان کے پیروں پہ ان کو
کھڑا کروں گا
اور بڑے ہو کر پھر اک دن
وہ بھی کسی سے عشق کریں گے
کوشش کر کے
شادی بھی کرلیں گے اپنی
وہ بے چارے
شادی کرکے کیا پائیں گے؟
اک بیوی
دبلی پتلی سی
دن بھر جھک جھک کرنے والی
دن بھر لڑنے بھڑنے والی
اور شادی کا پھل
یعنی اک درجن بچے......

ملتا ہوا بولا "ارے میرا بٹوہ تو کہیں گر گیا!"

یہ بھونڈا سا بہانہ بنا کر میں وہاں سے بھاگا۔ دوکان کے دروازے سے نکلتے وقت ایک اچٹتی ہوئی نظر اد ھر ڈالی ——— لڑکی اور اس کی ماں دونوں عجیب اور ناامید نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

ایک دم رومانٹک آکاش میں اڑتے اڑتے میں حقیقت کی دھرتی پر آن گرا۔ اس وقت تو یہی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ ماں بیٹی میرا پیچھا نہ کریں۔

میں لمبے لمبے قدم لیتا ہوا چند قدم ہی بڑھا تھا کہ ایک رکشا میرے قریب آکر رکا، جسے پانچ آدمی کھینچ کر لائے تھے۔ اس میں سے ایک بہت ہی بدہیئت آدمی اترا۔ اس نے رکشے والوں کو پیسے دیئے، تو وہ جھک کر دہرے ہو گئے۔ "سلام راجکمار صاحب سلام!"

اتنے میں رکشا والوں نے مجھے دیکھا اور ایک نے پوچھا "حضور کہیں چلیں گے؟"

مجھے کہیں نہیں جانا تھا لیکن ان عورتوں سے دور بھاگ جانے کا یہ اچھا ذریعہ تھا۔ میں کود کر رکشا میں بیٹھ گیا۔ انھوں نے رکشا میرے ہاتھ کے اشارہ پر کھا لیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب میں جاؤں کہاں کہ اتنے میں ایک بزرگ کی یاد آگئی۔ وہ بڑے مزے کے آدمی تھے اور اپنے پرانے قصے چٹخارے لے لے کر سنایا کرتے تھے، چنانچہ میں نے انھیں کے گھر کا پتہ بتلا دیا۔

رکشا والے بھاگے جا رہے تھے ——— پانچ آدمی ایک آدمی کو کھینچے لے جا رہے تھے۔ راستہ میں جہاں کہیں چڑھائی آتی، ان سب کے پسینے چھوٹ جاتے۔ میرے دماغ میں الجھن ہونے لگی ——— جب چڑھائی پر میں آسانی سے اوپر چڑھ سکتا ہوں، وہاں ان بیچاروں کو چوٹی سے ایڑی تک پسینہ کیوں بہانا پڑ رہا ہے؟

پھر میرا ذہن اس راجکمار کی طرف گیا، جو دیکھنے میں اتنا بدصورت اور خبیث تھا کہ اسے قبریں کھودنے کا کام کرنا چاہیئے تھا، مگر جو راجکمار بنا پھرتا تھا۔ ایک آدھ بار پردہ اٹھا کر میں نے پیچھے کی طرف بھی نظر دوڑائی کہ کہیں وہ ماں بیٹی میرا پیچھا نہ کر رہی ہوں، کیونکہ مجھے دوکان میں کھڑی ان دونوں عورتوں کی پریشانی اب تک یاد آ رہی تھی اور اس خیال سے ہی آرام سے بیٹھے بیٹھے بھی میرا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔

آخر میں منزل پر پہنچ گیا۔ کرایہ پوچھا، تو انھوں نے ڈھائی روپے مانگے۔ مجھے ڈھائی روپیہ بہت زیادہ لگے، لیکن ان میں سے ایک نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور، ہم پانچ آدمی ہیں، ہم میں سے ہر ایک کو آٹھ آنہ ہی تو ملے گا۔"

اب میں نے بحث نہیں کی، کرایہ دے کر میں بنگلہ میں گھسا، تو پتہ چلا وہ دوست یعنی سول راج، گھر پر نہیں تھے۔ اس کی بیوی کے بتانے پر مجھے یاد آیا کہ شام کو تو وہ اکثر گھومنے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اپنی بوکھلاہٹ میں مجھے یہ بات اس سے پہلے یاد ہی نہیں آئی۔

ناامید ہو کر باہر نکلا، تو رکشا والے کچھ الگ ہٹ کر ایک پیڑ کے نیچے پڑے ہانپ رہے تھے۔ اگرچہ اب میں ڈھائی روپیہ خرچ کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھا۔ اس لیے میں پیدل ہی لوٹ پڑا۔ یہ سڑک کافی سنسان تھی۔ کہیں کہیں کوئی صورت نظر آجاتی، ورنہ سب ہی طرف خاموشی کا ہی راجیہ تھا۔ دائیں بائیں، اوپر نیچے پیڑوں کے جھنڈ تھے، جن پر چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں۔ پتوں اور ٹہنیوں کے بیچ میں سے آکاش میں کچھ تارے بھی جھلملاتے نظر آ رہے تھے۔ میں ان سب کا لطف لیتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ لیکن کچھ وقت پہلے دماغ کو جو دھکا لگا تھا، اس کا اثر ابھی دور نہیں ہوا تھا۔

جوں جوں میں بازار کے قریب پہنچ رہا تھا، توں توں رونق بڑھتی جا رہی تھی، اتنے میں پیچھے سے آواز آئی۔ "نمستے!"

میں نے ایک دم گھوم کر دیکھا۔ ایک لڑکی ہاتھ جوڑے نمستے کر رہی تھی۔ اس نے بھو مانی کپڑے پہن رکھے تھے، لیکن صورت سے گنوار نہیں، بالکل شہری نظر آ رہی تھی۔ میں اسے نہیں جانتا تھا ——— شاید وہ کسی اور کو نمستے کر رہی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ لڑکی ایک ادائے معصومانہ سے مسکرا کر بولی "میں آپ ہی کو نمستے کر رہی ہوں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"میں آپ کو پہچانتی ہوں۔ میں نے آپ کو دیکھا ہے....."

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا "تو پھر آپ نے کسی رسالہ میں میرا فوٹو دیکھا ہوگا۔ مجھے لکھنے لکھانے کا کچھ شوق ہے۔"

آج رج پہ رونق کیوں نہیں ہے؟ اس کا جواب ملتے ہی یہ سوال میرے دماغ میں اٹھا۔ یعنی جواب پہلے ملا اور سوال صاحب بعد میں تشریف لائے۔ نیچے مال روڈ پر اس کا بازار پھیلا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اتنی بھیڑ کیوں ہو گئی تھی؟ روزانہ کی رونق سے کہیں زیادہ دکانوں کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں اور روشنی کے اس گلال میں رنگ برنگی اوڑھنیاں ہوا میں تڑپ تڑپ کر الگ اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ رج سے ایک چوڑا زینہ مال روڈ کی طرف جاتا تھا۔ میں نے جنگلے سے ہاتھ اٹھائے اور اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونس کر انھیں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اترنے کا انداز یہ تھا کہ پہلے ایک پیر نیچے لٹکا دیتا جب وہ دھیرے دھیرے زینوں کی اینٹوں سے ٹکرا جاتا تو دوسرا پیر لٹکا دیتا۔ ٹانگوں سے زیادہ میری آنکھیں چوکنی ہو رہی تھیں۔ بھیڑ اس قدر زیادہ تھی کہ میں زینہ کے نیچے تک پہنچ ہی نہ پایا۔ بھیڑ میں کھو جانے کا موڈ ابھی نہیں تھا، اس لیے ذرا اوپر ہی رک گیا۔ لوگوں کی باتوں سے پتہ چلا کہ آج کوئی کانگریسی نیتا ادھر سے گزرنے والے ہیں اور یہ بھیڑ بھاڑ بھی اسی لیے تھی۔

اس شور اور بھیڑ میں یکایک کسی ناواقف لڑکی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ کہہ نہیں سکتا کہ اس نے پہلے میری طرف دیکھا تھا یا میں نے لیکن نظریں چار ہوتے ہی اُس نے پیشانی پر گہرے بل ڈال لیے، اپنا سرخ نچلا ہونٹ عجیب انداز سے ذرا آگے کو بڑھایا اور کندھے کو جھٹکا دے کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ لڑکی خوبصورت تھی، لیکن اس قسم کی وہاں اور بھی کئی لڑکیاں موجود تھیں۔ البتہ وہ ایسی حرکتیں نہ کرتی تو شاید ہی میرا دھیان اس کی طرف جاتا۔ لیکن اب میں اس میں دلچسپی لینے لگا۔ پل بھر بعد پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں مسکرا دیا۔ مسکرانے کا مطلب یہ تھا کہ تم جیل کا استعمال نہیں کر سکتیں۔ ہم دونوں کے بیچ میں کافی بھیڑ تھی اور پھر میرے بھاگ نکلنے کا راستہ بھی تو کھلا تھا۔ اس بار اس نے اپنے سر کو لاپرواہی سے کچھ ایسا جھٹکا دیا کہ زلفیں بارش کی بوچھار کی طرح ادھر ادھر بکھر گئیں اور دو تین ننھی ننھی لٹیں اُس کے ماتھے کو چومنے لگیں۔ میں نے ایک کندھا دیوار کے ساتھ ٹیک دیا اور ایک ٹانگ سیدھی رکھتے ہوئے دوسری ٹانگ ٹیڑھی کر کے بوٹ کی نوک زمین پر ٹکا دی۔

میں جب اس طرح مرلی والے کا پوز بنا کر کھڑا تھا، تو اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ اب اس کا چہرا بہت گمبھیر تھا۔ ماتھے پر بل کم ہو گئے تھے آنکھیں میں مل گئی تھیں اس بار کچھ دیر تک وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ میں پھر مسکرا دیا۔ اس نے جھٹ منہ پھیر لیا۔ اتنے میں شور! نیتا جی گزر گئے، بھیڑ چھٹنے لگی۔ اور اس لڑکی نے چوتھی بار میری طرف دیکھا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جوتے اتار کر بھاگوں یا جوتے سمیت، وہ پھر مسکرا دی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، تو وہ کھل کھلا کر ہنسی اور اپنی ادھیڑ عمر کی موٹی ماں کے ساتھ ہنس ہنس کر نہ جانے کیسی باتیں کرتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ مگر وہ بار بار گھوم کر میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

میں بھی اپنی نک ٹائی کی گانٹھ کو ٹھیک کرتا ہوا پیچھے پیچھے ہو لیا۔ دونوں کپڑے کی ایک بڑی دکان میں جا گھسیں اور قمیض کے لیے کپڑ دیکھنے لگیں میں پاس ہی کھڑا انگڑائی لیتا رہا، کیونکہ بار بار اس کی نگاہیں میری طرف اٹھ جاتی تھیں بہت قریب سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ اب لڑکی نہیں رہی تھی، پھر بھی مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟ یہ سوچ کر میدان میں ڈٹا رہا..... کون کون ترکیبوں سے اس نے مجھے اداؤں دکھائیں ـــــــ ماں سے چوری، سب کی نظریں بچا کر....

آخر اس کی ماں نے ایک کپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہاری قمیض کے لیے یہی اچھا رہے گا۔"

لڑکی نے کپڑا میری طرف سرکا کے چپکے سے کہا۔ "آپ کو پسند ہے یہ کپڑا؟"

یہ سوال دونوں کے لیے تھا ـــــــ یعنی ماں کے لیے بھی اور میرے لیے بھی میں نے دھیرے سے کہا "ہاں پسند ہے۔"

اس کی ماں کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس نے پھر کہا "پسند ہو تو چھ قمیضوں کا لے لو؟"

"ضرور لے لیجیے۔"

اس پر اس لڑکی یا عورت نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "جیب میں پیسہ تو ہیں، نا۔"

بجلی کی چمک کی طرح خیال میرے دماغ میں کوند گیا۔ ایک پردہ سا ایک دم ہٹ گیا۔ میں کچھ اور نہ سوچ پایا۔ جلدی سے جیبوں پر ہاتھ

بھی کچھ بال باہر کی طرف جھانک رہے تھے۔ کپڑوں سے بڑے رئیس نظر آتے تھے۔ ہم دونوں کا تعارف ہوا، تو میرا ہاتھ ان کے پنجے میں غائب ہو گیا اور جب باہر نکلا تو اس میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ سردار صاحب نے قہقہہ کے مینھ برساتے ہوئے کہا۔ "آؤ مول راج سلاد کے لیے تھوڑے سے ٹماٹر لے لیں۔"

سبزی کی دوکان پر مجھے اپنے کان میں ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں بات سمجھ نہیں پایا۔ بائیں طرف گھوم کر دیکھا، تو چودہ سال کا بہت حسین لڑکا دکھائی دیا ——— رنگ گورا ناک نقشہ گڑھا گڑھایا صرف چہرے پر پیلا پن اور آنکھوں میں اداسی جھلک رہی تھی۔ اس نے دھیرے سے پھر پوچھا۔ "صاحب قلی چاہیئے؟"

"قلی؟" ——— میں چلا دینا چاہتا تھا "تم اتنے حسین، اس قدر جوان، اور اتنے پیارے! ..... تم قلی ہو؟ اور وہ الو کا پٹھا جس کی شکل دیکھ کر نفرت ہوتی تھی، جس کے منھ سے شراب کی بدبو آتی تھی، جس کے منحوس نتھنوں سے کیچوے ٹپکتے تھے، وہ راج کمار تھا! وہ پرنس تھا!"

میرے بجائے سردار صاحب نے جواب دیا "نہیں بھائی، دو سیر ٹماٹر ہی تو لیے ہیں! اس کے لیے قلی کی کیا ضرورت؟"

جب ہم وہاں سے چلے تو شملہ کی ساری اداسیاں اس لڑکے کے چہرے پر آ کر بکھیرنے لگیں۔ کاش، میرے بس میں کچھ ہوتا تو میں لال لال ٹماٹروں کا دمکتا ہوا ایک تاج بنا کر اسے پہنا دیتا اور اس سے کہتا "چلو پرنس! ..... چلو راجکمار!"

مال روڈ کے کنارے ہی سردار موہن سنگھ کی شاندار حویلی تھی جب ہم اوپر پہنچے تو ایک شاندار ڈرائنگ روم میں سردار صاحب نے صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ گئے۔ وہ ٹماٹر اندر لے چلے گئے۔ کمرے کی آرائش، سامان اور رکھ رکھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ واقعی سردار صاحب بڑے فائن ٹیسٹ کے آدمی ہیں۔ صرف فرش پر بچھا قالین اتنا قیمتی تھا کہ جس کی قیمت سے قلی لڑکے، یا مشتے از لڑکی یا پارچہ والے ماں بیٹی کی سال بھر کی روٹیاں چل سکتی تھیں۔ سردار صاحب بڑی پھرتی سے ہاتھ ملتے ہوئے ڈرائنگ میں پہنچے آتے ہی انھوں نے اخروٹ کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک خوبصورت الماری کے پٹ کھول دیے۔ الماری میں رکھی ہوئی شراب کی بوتلیں ہیں آنکھ مارنے لگیں۔ سردار صاحب نے پہلے داڑھی کھجلائی اور پھر بڑی بڑی

مونچھوں کو پھر ٹیڑھا کر کے بولے "کیا پیو گے؟"

شری مول راج نے پھر ایک آنکھ بند کر کے کہا "وہی!"

"وہی!" کہتے کہتے سردار صاحب نے بھی ایک آنکھ بند کر لی۔ وہ اس شراب کا نام نہیں لے رہے تھے، جیسے نام لے دینے سے دیوی کا چہرہ ہرن ہو جائے گا۔

تنگ منھ کے چھوٹے چھوٹے بلوری پیالوں میں آگ چھلک رہی تھی۔ اپنے ساتھیوں سے پیالہ ٹکرانے کے بعد میں اسے اپنے لبوں کے قریب یوں لے چلا جیسے ایک ہی گھونٹ میں اسے حلق سے نیچے اتار لوں گا۔ اس پر شری مول راج نے میرے بازو پر آہستہ سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا ذرا سنبھال کر! یہ پینے کی چیز نہیں ہے۔"

"یعنی؟"

"یہ چکھنے کی چیز ہے۔"

واقعی جب میں نے اس پیالے کے لبوں کا ہلکا سا بوسہ لیا تو ایک بہت ہی ہلکی سی گرمی میرے چہرے پر پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ میرے پاؤں کے ناخنوں تک پہنچ گئی اور پھر ایسا لگا جیسے میں نے شراب پی نہیں بلکہ شراب میں ڈوب گیا۔

اب شری مول راج کے نیک اور شریف دوست نے اپنے شکستہ دل کی عظیم داستان سنانا شروع کی ——— سونا وہ اسمگل کرتے تھے، گھڑیاں، کیمرے اور فوٹوگرافی کا سامان وہ الٹے سیدھے طریقوں سے حاصل کر کے بیچتے تھے۔ پورے ہندوستان میں ٹرک ان کے چلتے تھے۔ اس صاف ستھرے کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انھوں نے ہاتھ کی جو جو صفائیاں دکھائی تھیں ان کا انھوں نے بڑے فخر سے ذکر کیا قدم قدم پر مول راج جی ہاتھ پھینک کر داد دے رہے تھے جیسے حضرت غالب اپنے منتخب اشعار سنا رہے ہوں۔

اس طرح بات میں بات نکلتی گئی۔ جب مول راج جیسے قدردان سامنے بیٹھے ہوں تو بھلا سردار صاحب کو سہارا کیوں نہ ملتا! ایک بار تو مجھے بھی اپنی زندگی کے چھچھورے پن پر رونا آ گیا۔ آدمی ہو تو سردار جی جیسا۔ ٹھگ ہوں تو سردار جی جیسے، اور قدردان ہو تو شری مول راج جیسا۔

اتنے میں ایک گوری چٹی دوشیزہ ٹھٹھک کر اندر آئی اور جیسے مرلی بجاتی ہوئی بولی۔ "ڈیڈی، ڈنر تیار ہے۔"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔"

"آپ ہندی تو اچھی بول لیتی ہیں، لیکن آپ کے لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ......"

"میں بھوٹان کی رہنے والی ہیں، لیکن یہاں شملہ میں پڑھتی ہوں کئی سالوں سے یہاں پڑھ رہی ہوں ....."

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی ....."

"میں جھنگے پر جھکی کھڑی تھی۔ آپ نے تو کچھ خیال نہیں کیا، لیکن میں نے اچانک پہچان لیا ....."

میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر لوگ مجھے اسی طرح پہچان لیتے ہیں۔ انجانے میں ہی ہم ایک ساتھ ٹہلتے ہوئے بازار کے قریب پہنچ گئے ــــــ کچھ شملہ کی باتیں، کچھ موسم کی، کچھ ادھر ادھر کی غپ شپ استنے میں کافی ہاؤس کا بورڈ دیکھ کر میں نے کہا "مس نیلی آپ کافی تو پی لیتی ہیں؟"

تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں بیٹھے تھے اور گرم گرم کافی کے پیالے ہمارے سامنے رکھے تھے اور ان ں سے بھاپ اٹھ اٹھ کر کافی کی خوشبو ہمارے نتھنوں تک پہنچا رہی تھی۔

جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس لڑکی کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی ہیں ہے اور نہ اس کو ادب کے سر پیر کا کچھ علم ہے۔ اب میرے ماغ میں الجھن ہونے لگی نیلی نے میز کے نیچے میرے پاؤں کو اپنے دل سے دبایا۔ وہ پہلے بھی دو بار یہی حرکت کر چکی تھی میں سمجھا انجانے سا ایسا ہو گیا، لیکن اب ایسا سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کافی پیسہ دے کر میں باہر نکل آیا یکایک میرے تیور دیکھ کر وہ بھی گھبرائی ہوئی میرے پیچھے پیچھے چلی آئی اور بجلی کی تیز روشنی میں میں نے یکھا کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں تب مجھے احساس ہوا کہ اس ما اس کا کیا قصور تھا؟ اس نے تو صرف مسنتے کی ہیں نے ہی اسے یا کہ میرے فوٹو چھپتے ہیں۔ بڑا عجیب سا لگا۔ میں نے چپ چاپ بٹوے سے پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا "ابھی تو یہی مدد کر سکتا ہوں۔"

اس نے نوٹ لے لیا اور اپنے چھوٹے سے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بھاری آواز میں بولی "یہ بھی چلے گا! ....." اس نے

پھر میری طرف میلی آنکھوں سے دیکھا۔ "آپ کا اپنا کوئی کمرہ ہے یا؟" میں نے اسے اشارہ سے سمجھا دیا کہ ابھی مجھے فرصت نہیں ہے اور پھر میں جلدی جلدی سے دوسری طرف چل دیا۔

میرا دماغ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ تھوڑے ہی وقت کے اندر میں نے زندگی کے دو بہت خوبصورت پردوں کو ہٹایا، تو مجھے انسانیت کی لاش نظر آئی۔ کیا اس دنیا میں سیدھی سادھی بھولی بھالی لڑکیاں ختم ہو چکی تھیں جو بغیر کپٹ کے دو میٹھی باتیں کر سکیں، جن کے جسم کنوارے ہوں؟ ..... میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کسی نے یکایک میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے قدم رک گئے ــــــ بغل میں سٹری مول راج کھڑے مسکرا رہے تھے۔ وہ مسکراہٹ ہونٹوں سے آگے بڑھ کر گالوں پر سے پھیلتی ہوئی سارے چہرے پر پھیل رہی تھی۔ انھوں نے ایک آنکھ بند کر کے دھیرے سے پوچھا "کہو برخوردار بہت اونچے اڑنے لگے ہو!" یہ کہتے کہتے انھوں نے ہونٹوں کا اشارہ کیا۔ میں نے ادھر دیکھا، وہی لڑکی جنگلے کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ شاید وہ پھر کسی ایسے ناواقف آدمی کی تلاش میں تھی، جسے نہ جانتے ہوئے بھی وہ جانتی تھی۔

میں جھینپ گیا۔ جلدی سے بات کا رخ بدلتے ہوئے بولا "ابھی میں تو آپ کے بنگلہ پر گیا تھا۔ آپ ملے ہی نہیں، میں آپ سے ملنا چاہتا، نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا آپ سے ملنے کو ....."

میری بے تکی باتیں سن کر وہ دھیمے سے بولے "بڑبڑانے کی کوئی بات نہیں، برخوردار! ہر آدمی کی زندگی میں اس طرح کا موسم آتا ہے۔ پھر بھی واہیات لڑکیوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔"

سٹری مول راج دوست کے دوست اور بزرگ کے بزرگ تھے، یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے! اس لیے کبھی کبھی تعلیم بھی دینے لگتے۔ جلدی ہی انھوں نے بات کا رخ پلٹ دیا۔ "اچھا ہوا تم مل گئے۔ یہاں میرے ایک دوست ہیں ــــــ سردار موہن سنگھ۔ بڑے بھلے اور نیک آدمی ہیں آج رات انھیں کے یہاں بیٹھک رہے گی ...... وہ دیکھو، چلے آ رہے ہیں۔"

استنے میں ایک قوی ہیکل سردار صاحب جھومتے جھامتے ہمارے پاس پہنچے۔ عمر کوئی اڑتالیس سال، موٹے موٹے گال نیچے لٹکی ہوئی آنکھیں۔ گھنی گھنی داڑھی اور مونچھوں کے علاوہ ناک کے چوڑے نتھنوں سے

جب ہم کھانے کی میز پر پہنچے تو وہاں پہلے تو سردارنی جی سے ملاقات ہوئی۔ سردارجی جیسی تھے، تو وہ ایسی، یعنی تنگر خاصا بھاری تھا۔ ورنہ اس دیو کو کوئی اور ہی پری لے اڑی ہوتی۔ کچھ اور گلابی، گلابی ہونٹوں والی لڑکیوں اور لڑکوں سے ملاقات ہوئی۔

خوب پیٹ بھر کر کھایا ـــــ نرگسی کوفتے، دوپیازہ اسپشل، ہرن کا اچار، سور کا اچار، خرگوش کا اچار، ...... یہ سب سردارجی کے اچار تھے۔

وہاں سے اتنا پیٹ بھر کے اٹھے کہ یہی نہیں پتہ چلتا تھا کہ اب اگلی سانس لے سکیں گے یا نہیں۔ سردارجی، سردارنی جی اور باقی بچے اور بچیاں نیچے تک آئے۔ انھوں نے ہاتھ جوڑے اور ہم نے ان کی جان چھوڑی۔

اب میرا اور سول راج کا ساتھ چھوٹنے والا تھا، کیونکہ وہ رج والی پہاڑی پر رہتے تھے اور میں چھوٹے شملہ میں۔ بازار کی رونق خاصی کم ہو چلی تھی۔ دوکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اب سڑکوں پر قلیوں غریبوں اور رکشوں کا راج شروع ہونے والا تھا۔ شری سول راج نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا، "کہو برخوردار! مزا آیا کچھ؟"

"کچھ؟ ..... اجی، میں تو مزے میں غرق ہو رہا ہوں۔"

نہ جانے اپنے دل کا کونسا بوجھ ہٹانے کے لیے وہ میرا بازو تھپتھپاتے ہوئے بولے، "دیکھو ہماری کاروبار میں بہت کچھ پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں، مگر دیسے سردارجی سولہ آنے کھرے آدمی ہیں ....."

"جی ہاں، کھرے، نیک، بھولے، شریف ـــــ بہت سے صفات ہیں ان میں۔"

جیبوں کا ایک عیب اس میں یہ تھا کہ وہ دولت مند نہیں تھا۔ ابھی وہ ڈھائی سو روپے پا رہا تھا اس کو یقین تھا کہ وہ کمپیٹیشن میں بیٹھ کر کامیابی حاصل کرے گا اور کوئی اچھی نوکری حاصل کرے گا لیکن سردارجی اس کی ہوائی باتوں میں نہیں آئے۔ انھوں نے اسے سمجھایا کہ وہ باز آ جائے، لیکن وہ محبت کی مقدس ڈگر سے نہیں ہٹا، تو سردارجی کو مجبوراً ـــــ سمجھو!"

میری دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی میں نے تعجب سے پوچھا، "یہ کیا؟"

شری سول راج نے بائیں دائیں آنکھیں گھمائیں اور بولے، "ان کے ایک ڈرائیور نے اس پر ٹرک چڑھا دی۔ وہ فوراً ہی مر گیا۔ ڈرائیور کو چھ مہینہ قید بھگتنا پڑی سردارجی نے پوری تنخواہ کے علاوہ اسے کئی ہزار روپیہ انعام میں دیے ـــــ کچہری میں سردارجی کے وکیل نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک ایکسیڈنٹ تھا۔"

اس کے بعد شری سول راج دوسرے دن شام کا پروگرام بناتے رہے مجھ سے ملنے کے لیے کہا ـــــ وہ رخصت ہوئے۔ لیکن میں جنگلے کے پاس کھڑا کھڑا اور بازار کو جانے والی سنسان گیری سڑک کو دیکھتا رہا ـــــ اور پھر کچھ دیر کے بعد بوجھل قدموں سے نیچے کی طرف اترنے لگے۔ اور بازار بھی سنسان پڑا تھا۔ کتے تھے سونگھتے پھرتے تھے۔ بند دوکانوں کے پیڑوں پر۔ بھکاری، قلی اور بوٹ پالش کرنے والے چھوکرے اپنے گھٹنے سینہ سے چپکائے سونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے انڈے بیچنے والے دوکانیں بڑھا گئے تھے لیکن کچھ سڑے گلے انڈے وہیں پھینک گئے تھے جن پر کیڑے مکوڑے ٹہل رہے تھے۔

شری سول راج نے ایک دم آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے بالکل گمبھیر پا کر دوستانہ انداز میں میری گردن اپنے بازو کے گھیرے میں لی اور پھر آہستگی سے دبی آواز میں بولے "دو سال پہلے ان پر بھی بھاری مصیبت آ گئی تھی ـــــ ان کی سب سے بڑی لڑکی، جو ہم لوں کو ڈرائنگ روم میں بلانے کے لیے آئی تھی، کسی نوجوان سے محبت کرنے لگی تھی۔ وہ بھی سردار تھا، لڑکی کی طرح ہی خوبصورت، تندرست، محنتی، پڑھا لکھا، نیک، ایمان دار، لیکن سو

میں اور نیچے اترا تو گردوارے سے شبد کیرتن کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے پہلے اس سڑک پر پہنچنا تھا جو گردوارے کے سامنے سے ہوتی ہوئی چھوٹے شملہ کو جاتی تھی۔ سڑک تک پہنچ کر شبد کے بول صاف سنائی دینے لگے۔

ساڈے گروں جہاز بنایا
او جھنے پار لگنا

(ہمارے گرو نے ایک جہاز بنایا ہے، جسے پار جانا ہو چلا آئے۔)

میں کچی سڑک پر ایڑیاں رگڑتا ہوا تیزی سے آگے بڑھنے لگا جب

فوٹو چھپا تھا۔ اس فوٹو میں جو افسانہ نگار تھے وہی افسانہ نمبر میں چھاپ
نے دو ہزار افسانوں میں صرف ۲۰ افسانے منتخب کئے ہیں ان میں

۲۰ افسانوں میں گیارہ افسانے تو قطعی طور پر ۱۹۶۲ء کے بہترین افسانوں
میں شامل کئے جانے کے لائق نہیں۔ مگر شاید آپ نے دوست نوازی میں انہیں
لائق قرار دیا ہو۔

عابد سہیل، رفعت نواز۔ الطاف فاطمہ، منیر الدین، رتن سنگھ،
قیصر تمکین، رضیہ فصیح احمد، رحمان مذنب، ستیش بترہ اور رضیہ سجاد ظہیر کے
افسانے اس لائق نہیں کہ یہ ۱۹۶۲ء کے بہترین افسانوں میں شامل کئے
جائیں۔ رضیہ سجاد ظہیر اس سے پہلے اچھے افسانے لکھ چکی ہیں۔ "سنٹی" ان
کے اچھے افسانوں میں نہیں ہے۔

واجدہ تبسم کی کہانی بڑی اچھی ہو۔ مگر کہانی کا ہیرو اتنا نیک اور شریف
ہو کہ یقین نہیں آتا۔ ابراہیم جلیس، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور
بیدی کے افسانے واقعی افسانے ہیں۔

پرکاش رومانی۔ جمشید پور

بغیر پاسپورٹ کا سفر:- سب سے پہلے تو آپ کے رسالے نے مجھے آنسوؤں سے رلایا۔ اس لیے کہ اس دن
پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ جس شہر اور جگہ کا ذہن میں کوئی خاص خیال موجود
ہی نہ تھا اس کی یاد بے طرح دل میں موجود تھی۔ رسالے کے ورق پلٹے
اور جگہ جگہ حضرت گنج، امین آباد، سرفراز پریس، ہیوٹ روڈ اور نہ جانے
کون کون سی روڈیں جن کے نام تک قطعی بھول چکے تھے دیکھ کر بڑا قلق
ہوا کہ ہم تو وہاں پہونچ نہیں سکے اور یہ کہانی رنگیتی رنگیتی وہاں پہونچ گئی۔

اب میں اپنی عزت افزائی کے سوا اس کو اور کیا کہوں کہ آپ نے
میری کہانی کو اس رسالے اور بڑے بڑے اونچے لکھنے والوں کی تحریروں
میں شامل کر لیا۔ سچ مچ اتنے اعلیٰ درجے کے افسانوں کی معیت میں
اس کو دیکھ کر اور بھی شرم آئی۔ خیر جو کچھ بھی ہو آپ نے یہ کتنا بڑا کام کیا کہ
بغیر ویزا یا پاسپورٹ اور کسی سفر کے مجھے لکھنؤ اور میرے گھر پہونچا دیا۔
سچ مچ ہفتہ بھر تک ہر بھولی ہوئی چیزیں پیش نظر رہیں جیسے میں یہاں
موجود ہی نہ ہوں۔ الطاف فاطمہ۔ لاہور

گراں بہا تحفہ:- خاص نمبر کے تزئین و آرائش اور افسانوں
کے انتخاب و ترتیب میں جس حسن و سلیقہ سے
کام لیا گیا ہے یہ کچھ آپ ہی لوگوں کے ذوق حسن کا کام تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ افسانہ نمبر اردو افسانہ کے ارتقائی
سفر کے سمجھنے میں بڑا مددگار ثابت ہوگا۔ اہم خوبی یہ ہو کہ گزشتہ
نصف صدی سے آج تک کے تقریباً تمام افسانوی رجحانات کے نمائندے
موجود ہیں۔ اس جہت کتاب کا یہ نمبر اردو دنیائے افسانہ کے لیے ایک
گراں بہا تحفہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس حد تک اس کی قدر دانی ہوتی ہے؟
قمر اعظم ہاشمی۔ پٹنہ

گروپ بندی کا شکار:- افسانہ نمبر کے سلسلے میں ہمیں کتاب
کے لائق اڈیٹر اور مجلس مشاورت
کے لوگوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں مگر مطالعہ کے بعد ساری امیدیں
خاک میں مل گئیں ـــــ ادب میں اتنی دھاندلی ہے۔ کتاب کے افسانوں
کو پڑھنے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہو کہ سوائے چند کے سبھی افسانے ۱۹۶۲ء
کے بوگس افسانے ہیں۔ خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس، واجدہ تبسم وغیرہ
کے افسانے نمبر کی جان ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ رام لعل اور عابد سہیل نے
اپنی لوگوں کے افسانوں کو بہترین افسانے قرار دیا ہے جن سے ان کے تعلقات
اچھے ہیں اور جن سے وہ متاثر ہیں ـــــ آہ! کتاب ایک اچھا رسالہ بھی
"گروپ بندی" کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اور سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہو
کہ بہار سے کسی افسانہ نگار کو افسانہ نمبر میں شریک نہ کیا جا سکا ـــــ کیا
میں پوچھ سکتی ہوں کہ بہار کے کسی ادیب کا افسانہ اس قابل نہیں تھا کہ نمبر
میں شریک کیا جا سکتا؟ تھا اور ضرور تھا۔ سہیل عظیم آبادی۔ اختر اورینوی۔ ل۔م
شاہد۔ ذکی انور۔ ش منظفر پوری شکیلہ اختر اور بہار کے بہت سے دوسرے
ادیبوں کو نظر انداز کر دیا گیا حالانکہ ان ادیبوں نے ۱۹۶۲ء میں بڑے
اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ایس خاتون۔ بی۔ اے۔ جمشید پور

سنگ میل:- اتنا نمائندہ افسانہ نمبر نکالنے کے لیے عابد سہیل اور
رام لعل میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ دو ہزار
افسانوں کے ذخیرے سے ۲۰ افسانوں کا انتخاب واقعی اتنا کڑا
مرحلہ تھا کہ آپ لوگوں پر جو بھی بیتی ہو کم ہے دو چار افسانوں کے لیے لب
کشائی کی گنجائش نکل آئے بھی تو یہ انتخاب ہر لحاظ سے ۱۹۶۲ء میں افسانوی
ادب کا مقام متعین کرنے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے
مند نشیں نقاد جنھیں صرف جمود ہی ادب میں نظر آرہا ہو وہ کتاب کے
اس نمبر کے اوراق پر اپنی نظریں جھکانے کی زحمت کریں تو کم از کم افسانوی
ادب میں انھیں ایسی کوئی بات نظر نہ آئے گی۔ اقبال متین۔ حیدر آباد

تلخ — تند — شیریں

نثر کے عہد کے طلوع کا منظر: افسانہ نمبر ملا۔ پڑھا جی خوش ہو گیا۔ پہلی بار نئے لکھنے والوں کی اچھی چیزیں بھرپور انداز میں سامنے آئی ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کا احساس ہوا۔ اس نمبر کے در و دسے اس عہد کے قدموں کی دھمک سنائی دی جو نثر کے عہد کی تقدیر لکھے گا۔ اس نمبر کا مطالعہ ان لوگوں کے ذوق کی تہذیب کے لیے ضروری ہے جو نئے افسانے کے امکانات سے مایوس ہو چکے ہیں۔ اردو افسانہ اس مقام پر آ چکا جہاں پہاڑی ندیوں کے شور و غل کے بجائے سمندروں کا سکون اس کے کردار کا جزو بن چکا ہے۔ ادب کی رفتار پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ مقام کون سا ہے۔ میں اس کامیابی پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں میری مبارکباد اس لیے بھی مخلص ہے کہ میری کوئی چیز اس میں شامل نہیں ہے یعنی میں نے ۱۹۶۲ء میں کوئی افسانہ نہیں لکھا تھا۔

تنقید صرف حکم لگا کر ادب کی رہنمائی نہیں کرتی بلکہ کبھی کبھی کر کے بھی ہم ادب کی منزلیں آسان کرتی ہے۔ اس طرح آپ نے تنقیدی خدمت بھی انجام دی ہے۔ یہ انتخاب ان لوگوں کی گرے گا جو اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر انتخابات شائع اور رسوا ہوتے ہیں۔ یہ نمبر مثال نثر کے دور کے طلوع کا منظر ہے۔

قاضی عبدالستار علیگ

چائے کی کرامات: کتاب کا افسانہ نمبر نظر سے گزرا۔ نمبر دیکھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نمبر پر خاص طور پر محنت نہیں کی ہے۔ اور انتخاب میں دشواریوں کا بھی سامنا کرنا نہیں پڑا ہوگا۔ کیونکہ اس انتخاب میں نگار نظر آ رہے ہیں۔ جو اکثر آپ کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں خیال ہے کہ اس سے پہلے کتاب کے کسی شمارے میں ایک

میں کافی دور نکل آیا اور داہنے ہاتھ کی موڑ پر گھوم گیا، تو میں رک گیا اور پلٹ کر ایک بڑے کچھوے کی طرح اوپر کو اٹھے ہوئے اس پہاڑ کو دیکھا، جس پر شملہ بسا ہوا ہے۔ اب یہاں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آکاش پر تارے تھے۔ اوپر نیچے بنے ہوئے مکانوں میں بجلی روشنی بہہ بہہ کر نکل رہی تھی، جیسے اس کچھوے پر کسی نے پگھلی موم بتیوں کی چادر چڑھا دی ہو۔ اب اس شملہ اور میرے درمیان ایک گہرا کھڈ آگیا تھا۔ میں کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا، کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر خیال آیا سب سے اچھی ترکیب یہ ہو کہ جلد سے جلد اپنے نرم اور گرم بستر میں جا گھسوں۔

ذرا تھوڑی دور بڑھا تو ایک بڑے سے پتھر پر انگریزی میں تارکول سے لکھے مٹے ہوئے لفظ دکھائی دیے ——— باسکٹ میکر

——— یعنی ٹوکری بنانے والا۔

میں یہ سمجھا کہ یہ الفاظ کسی چھوکرے نے لکھ دیے ہوں گے لیکن دو ہی قدم آگے بڑھا، تو چٹان کی اوٹ میں ایک آدمی دکھائی دیا، جو لالٹین کی روشنی میں ٹوکریاں بنا رہا تھا۔ یہ وہی ٹوکریاں اور ٹوکرے تھے جنھیں شملہ کے قلی سر پر رکھے یا پیٹھ پر لٹکائے گھوما کرتے تھے ٹوکری والے کو دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کسی رشی منی کے درشن ہو گئے ہوں۔ بیشک یہ بھی غریب تھا۔ لیکن سب سے الگ تھلگ پرسکون ماحول میں بیٹھا سوچ اتار رہا تھا۔ مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں نے قریب جا کر ادھر ادھر کی دو چار باتیں پوچھیں، لیکن اسے مجھ سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تب میں نے اسے ایک سگریٹ پیش کیا۔ وہ خوش ہو گیا اور سب کام چھوڑ کر اطمینان سے دھواں اڑانے لگا۔ میں نے پوچھا

"تم یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں گڑھوال کا۔"

"لیکن تمہاری بیوی اور بچے تو یہیں رہتے ہوں گے؟"

"میری بیوی تو بھاگ گئی۔"

"کیوں؟"

"پہلے میں فوج میں تھا۔ میری نوکری چھوٹ گئی۔ آمدنی بہت کم تھی، عورت کو کوئی اور پھسلا کر لے گیا۔"

"عجیب عورت تھی جو پھسلانے میں آگئی! .... لیکن تم نے فوج کی نوکری کیوں چھوڑ دی؟"

"ایک بار گڑھوال میں پیڑ کاٹ رہا تھا، تو کلہاڑی بڑے زور سے میرے گھٹنے پر جا لگی ....."

یہ کہہ کر اس نے نیچے سے نکال کر بغیر پیر کی ٹانگ دکھائی۔ ——— شاید بیوی کے بھاگ جانے کا ایک سبب یہ بھی رہا ہو۔ میں نے پوچھا "اب تمہارا کوئی نہیں اس دنیا میں؟"

"میری ماں ہے۔ وہ گڑھوال میں رہتی ہے پچھلے دس سال سے مجھے بلا رہی ہے، لیکن مجھے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"میرے پاس کم سے کم چالیس پچاس روپیہ تو ہونے چاہئیں .... میں وہاں کیا منھ لے کر جاؤں گا؟ لوگ کہیں گے اتنے سال پردیس میں رہا پھر بھی ننگا بھوکا لوٹا ——— اتنا بھی تو نہیں کہ روپیہ بھیج کر ماں کو بلوا لوں مجھ پر تو ہر دم قرضہ ہی چڑھا رہتا ہے۔"

سگریٹ ختم ہو چکی تھی اس نے اس کی ڈبیا پرے پھینک دی اور ایک بار پھر باسکٹ میکر بن گیا۔ وہ ٹوکری میں گھسا جا رہا تھا جیسے خود بھی ٹوکری بن جانا چاہتا ہو۔ میں کچھ دیر تک اس کی ناک کے قریب ابھرے ہوئے مسّے کو دیکھتا رہا لیکن کچھ دیر کے بعد مجھے اس کا سارا چہرہ ایک بڑے مسّے کی طرح دکھائی دینے لگا جیسے مجھے اپنے گھر کا راستہ ہی نہ مل رہا ہو۔

بھلا ہو بہاری موتیوں والی ویلفیئر سرکار کا، جس نے سڑک کے کنارے کنارے بجلی کی بتیوں کا کیسا اچھا انتظام کر رکھا ہے میں نے یکایک اپنا پیر پکی سڑک پر پٹک کر دل ہی دل میں کہا، کیا ہوا، اگر یہ بدمعاش باسکٹ میکر دیے نہ ہونے کی وجہ سے اپنی ماں تک نہیں پہنچ سکتا! کم سے کم میں تو موتیوں والی ویلفیئر سرکار کی لگائی ہوئی بجلی کی بتیوں کی روشنی میں اپنے نرم گرم بستر تک بڑی آسانی سے پہنچ سکتا ہوں!

یہ سوچ کر میں بڑے مستانہ انداز سے پھر اپنی منزل کی طرف چل دیا، لیکن ذرا جھوم کر کسی گیت کا بول گانا چاہا، تو آواز بھرّا گئی یا شملہ کے بے پناہ حسن پر مسکرانا چاہا، تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

افسانہ نمبر نظر نواز ہوا۔ دیکھا اور پڑھا۔ کون

صاحب کتاب ہے۔ کافر آپ کی محنتوں اور کاوشوں کی داد دیئے بغیر رہے گا۔ عرصہ کے بعد افسانوں کا یہ شان دار انتخاب پڑھنے کو آیا۔ اب دیکھتا ہوں کہ "کتاب خواں" حضرات کو آپ "صاحب کتاب" بنا کر رہیں گے۔ مجھ کو آپ کا انتخاب بہت بہت پسند آیا۔!!

یوسف اختر۔ رانچی

فروری کے شمارے میں قاضی

پیتل کا گھنٹہ سونے کی گھنٹیاں ہے۔ عبدالستار صاحب کا پیتل کا گھنٹہ بہت پسند آیا اگرچہ بعض مقامات پر جہاں رمز و کنائے سے تاثرات میں زیادہ شدت پیدا ہو سکتی تھی انھوں نے راز ہائے درون پردہ کو بالکل سامنے لا کر رکھ دیا ہے۔ اکثر پڑھنے والوں کو یہ بھی غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اس افسانے میں گذری ہوئی زمینداریوں کا ماتم کیا جا رہا ہے حالانکہ افسانہ نگار صرف پرانے رئیسوں کی فیاضی اور وضعداری دکھانا چاہتا ہے۔

بہر کیف افسانہ بہت خوب ہے۔ موہن راکیش کا "شاعر بے گھر درمیان دلی" ایک قابل قدر مضمون ہے۔ انھوں نے بڑی دلچسپ اور فکر انگیز تصویر کھینچی ہیں اور ماہر فن کار کی طرح چند ہی ہلکے پھلکے نقوش سے ایک پیچیدہ موضوع کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

قاضی عبدالستار صاحب کا مقالہ "نثر کا عہد" وقت کی ایک اہم پکار ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ قاضی عبدالستار صاحب نے پیتل کے گھنٹے کے ساتھ ہی ساتھ ایک ہی شمارے میں سونے کی گھنٹیاں بھی سجا دی ہیں۔ واقعی ہمارے بیشتر مروجہ موضوعات شاعری حتیٰ کہ ان سے متعلق تشبیہیں اور استعارے تک حد سے زیادہ فرسودہ اور بوسیدہ ہو چکے ہیں۔ ہماری غزل ابھی تک طوطا مینا ہی ہوئی ہے اور اس کا تانا بانا اپنی ابتدا کی طرح ایک انحطاطی دور اور بیمار ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔ غزل کی مقبولیت ہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کا تعجب خیز اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ ہمارے مزاج اور خمیر میں ایسی رچ گئی ہے کہ بجائے اس کے کہ دیگر اصناف سخن کی طرح یہ ہماری زندگی کے تقاضوں سے متاثر ہوتی یہ الٹا ہمارے زندگی کے تقاضوں کو متاثر کرتی ہے اور ہمیں ایک بے حقیقت دنیا کی موہوم فضا میں معلق کئے ہوئے ہے جہاں سوائے غم جاناں اور طول شب فراق، قفس کی تیلیوں اور ٹوٹے ہوئے جاموں کے کچھ بھی نہیں ہے۔ غزل کا عاشق نہ صرف جیتا پھرتا یتیم خانہ ہے بلکہ جنسی اپیل تو اسے چھو تک نہیں گئی ہے۔ کون معشوق بقید ہوش و حواس ایسا شریک حیات بنانے پر تیار ہو سکتا ہے۔

میں غزل کا مخالف نہیں بلکہ میرا روئے سخن غیر فطری اور یک موضوعات غزل سے ہے۔ غزل میں اب بھی بڑے تنوع اور وسعت کی گنجائشیں ہیں اور اس کی جیسی جاندار صنف سخن میں زندگی کے تقاضوں کی ہم نوائی کرنے کی بھرپور صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے کم ہی غزل گو شعرا اس "آنچل" سے "پرچم" بنا دینے کے لیے آگے آتے ہیں۔

میں اپنی رو میں قاضی صاحب کے مقالے "نثر کا عہد" سے کچھ بھٹک سا گیا ہوں۔ ان کا فرمانا بالکل درست ہے کہ اب نظم سے زیادہ نثر پر توجہ دینا چاہیے۔ نثر ادب کی بنیاد ہوتی ہے نظم صرف اس کے نقش و نگار، گنبد اور برجیوں کا کام دیتی ہے۔

قاضی صاحب کے اس خیال سے جس سے انھوں نے اپنے مقالے کی ابتدا کی ہے یعنی غالب اپنے اردو کے مجموعہ کلام کو بے رنگ سمجھتے تھے اتفاق نہیں ہے غالب ہی نے کہا ہے ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

منشی نبی بخش حقیر کو غالب نے اپنی غزل بھیجی تھی ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

تو ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا "خدا کے واسطے داد دینا اگر ریختہ یہ ہے تو میر و مرزا (سودا) کیا کہتے تھے۔ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔؟"

اسی طرح انھیں صاحب کو اپنی ایک دوسری غزل بھیجتے لکھا تھا "داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہ صورت ہوگی یا کچھ اور؟"

جب تک کسی فن کار کے دل میں خود اپنے فن کی عظمت کا یقین نہیں ہوتا وہ بڑا فن کار نہیں بن سکتا۔ غالب نے محض جل کر ذوق سے کہہ دیا تھا۔

ع بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اسی قطعے میں انھوں نے آگے بڑھ کر کہا ہے۔ ع

ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

غالب نے اپنے خطوط کے متعلق بھی ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ان کی اشاعت سے میرے "شکوہ سخنوری" کو صدمہ پہنچ جانے کا احتمال ہے لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد انھوں نے ان کی قدر و قیمت پہچانی تو دوستوں سے مانگ مانگ کر اپنے خطوط اشاعت کے لیے اکٹھا کرنے لگے۔

وجاہت علی سندیلوی

خلوص اور جرأت:- قاضی عبد الستار کا افسانہ بہت اچھا ہے مگر مضمون میں ان کی رائے سے مکمل متفق ہونا ذرا مشکل ہی ہے۔ نثر کی تمام خوبیوں اس کی مقبولیت اور بڑھا کے باوجود شعر سے بالکل منہ موڑ لینا کچھ ایسی بات ہے کہ جی کو لگتی نہیں ہے کتنی ہی مصروف زندگی کیوں نہ ہو کبھی کبھی صرف ایک مصرعہ ہی تڑپا دیتا ہے۔ اب مثال کے طور پر فراق کا ایک تازہ ترین شعر سنئے۔

آج آنکھوں میں کاٹ لے شب ہجر
زندگانی پڑی ہے سو لینا

کبھی کبھی یاد آتا ہے تو مستقل سر دھنتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ یا ایک بہت ہی پرانا مصرعہ لیجیے!

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی

صرف اس مصرعہ نے نہ جانے کتنے اکیلے لمحات میں میرا ساتھ دیا ہے میں جب بھی اس کو یاد کرتا ہوں ایک عجیب خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے پھر نثر سے متاثر جو نظمیں ہیں وہ بھی بہت ہی "جیون ساتھی" قسم کی ہیں میں آپ کو مثال کے طور پہ دو مصرعے حسین مشیر علوی کے سناؤں گا بالکل سادی، نثر میں ہیں مگر کتنے اثر انگیز

میں یہ سوچتا ہوں۔
کہ خوشبو بھی کیا آئینہ دیکھتی ہے پلٹ کر۔

پوری نظم یاد نہیں اسی طرح کی آسان نثر نما انداز میں ہے مگر بہت ہی دلنشیں اور فکر انگیز ـــ میرے خیال میں زیادہ تر مضامین اور افسانے

اس بھرپور انداز میں ہمارے محسوسات کو گدگداتے یا ہماری ذہن و فکر کو اس طرح جھنجھوڑ کر نہیں رکھ دیتے ہیں ـــ مگر قاضی صاحب کے پورے مضمون میں جو چیز غور و فکر کی دعوت دیتی اور قاری کو متاثر کرتی ہے وہ ان کا خلوص ہے اور [illegible]

سے لکھ دیئے ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ انتہا سے زیادہ منقطعت بین نقادوں کے "نشانۂ رانی" میں شامل ہو چکی ہے یہ بات بھی بڑی غنیمت ہے۔

قیصر تمکین دہلی

فارم ۱۷ حسب قاعدہ ۸ بابت کتاب لکھنؤ۔

۱۔ مقام اشاعت:- چوک لکھنؤ
۲۔ وقفہ اشاعت:- ماہنامہ
۳۔ پرنٹر کا نام:- سید جمیل احمد، قومیت ہندستانی۔ پتہ:- کتاب لکھنؤ
۴۔ پبلشر کا نام:- سید جمیل احمد، قومیت ہندستانی۔ پتہ:- کتاب لکھنؤ
۵۔ ایڈیٹر کا نام:- سید جمیل احمد، قومیت۔ ہندستانی۔ پتہ:- کتاب لکھنؤ
۶۔ مالک کا نام و پتہ:- ایم۔ ایچ۔ انصاری عبد العزیز روڈ لکھنؤ۔

میں سید جمیل احمد تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں

۱۲ر فروری ۱۹۶۴ء

دستخط۔ سید جمیل احمد
پبلشر

صفحہ ۸ کا بقیہ

لیے ایک دبیز چادر کا کام دیتا ہے۔ ہاں تو پچھلے ہفتے میری ماں نے ایک ساتھ تین چار دن کا روزہ رکھ لیا اور میں اسی مدت میں ایک جگہ سے ایک ڈبل روٹی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

"میں نے پہلے دو ٹکڑے کھائے پھر چار اور پھر آٹھ۔ آخر میں صرف دو ٹکڑے بچے پرسوں جب ماں کمزوری سے نڈھال لیٹی تھی تو میں نے وہ دو ٹکڑے بھی نکال لیے۔ ماں کی نظر پڑ گئی۔ وہ روزہ تھی اور شام ہی کو کھا سکتی تھی۔ اس نے بہت ہی بے چارگی سے ایک انگلی کا اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ میں ایک سلائس اس کے لیے شام کے لیے رہنے دوں۔

"فادر۔ مجھے بہت زور سے بھوک لگی تھی معلوم ہوتا تھا کہ پیٹ میں کوئی میکینکس اگ آیا ہو۔ میں نے ایک سلائس کھایا اور دوسرا ماں کو پکڑا دیا۔ وہ روزہ نہیں توڑ سکتی تھی اس لیے سلائس ہاتھ میں لیے۔ شاید وہ شام ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کھاؤ ——" وہ کچھ نہیں بولی۔

"کھالو اسے ——" میں چلایا۔

وہ چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے غصے اور جھنجھلاہٹ میں کہا۔

"لاؤ سلائس مجھے دو۔" میں جوان ہوں مجھے ابھی زندہ رہنا ہے۔

"تم بڈھی ہو گئی ہو ——"

ماں کے چہرے پر سکرات کا سا عالم طاری ہو گیا۔ اس ہڈیوں کے پنجر میں سے کوئی آواز نہیں آئی۔ ہاں روٹی کا ٹکڑا ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ میں نے جھپٹ کر سلائس منہ میں رکھ لیا اور بغیر چبائے ہوئے نگل گیا ——"

"میں گھر سے بھاگ آیا ہوں۔ ماں کے آخری رسوم ادا کر دیے گئے ہوں گے مگر میں کسی نئے مذہب اور نئے خدا کی تلاش میں نکلا ہوں۔ مجھے یقین ہے فادر پارسن کہ وہ خدا جس کے لیے میری ماں روزہ رکھتی تھی تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔"

* * *

پارسن خاموش بیٹھا تھا بہت سی کتابیں اس کے سامنے رکھی تھیں دو ایک کھلی بھی تھیں مگر وہ کچھ پڑھ نہیں رہا تھا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی پارسن نے بے خیالی کر دروازہ کھولا تیز اور برفیلی ہوا کے ایک جھونکے سے اس بدن کانپ گیا۔

"تو یہ پھر کھڑا تھا —— فادر مجھے معاف کرنا —— یہ لو کا نوٹ تم اپنے پاس رکھو۔ اور ہاں سن لو ایک اور اعتراف تم سے جو کچھ بھی کہا تھا سب جھوٹ تھا۔ سمجھے تم کہ نہیں ——

وہ پانچ کا نوٹ فادر پارسن کے چغے میں گھونس کر نکل گیا۔

صفحہ ۱۶ کا بقیہ

میری کا بوکھلاہٹ پر شرمیتی ودیاوتی زور سے ہنس دی۔ اس کی کسی حد تک میرا تناؤ کم کر دیا۔

"تم چھوٹی کو واقعی پسند کرتے ہو؟"

"جی؟ میں —— آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں اب کبھی میں نہیں بیٹھوں گا ——"

"چل شریر کہیں کا! آ گیا مجھے بنانے —— میں سب جانتی ہوں۔ بہت جلد تم دونوں کی شادی کرنے والی ہوں۔ بس صرف بات رہ گئی تھی۔ اب اس مہینے کے آخر تک تم کو مسٹر سنگھ کی جگہ کیا جائے گا۔ اور اس کے بعد کرائی صورت دیکھ کر ——"

یک لخت میرے کانوں نے سننے سے انکار کیا، میری آنکھوں دیکھنے کا عمل بند کیا۔ میری زبان نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔

گیس کی مشین والے بوڑھے کے مکار چہرے پر ایک زہریلی پھیل گئی۔ اس نے ایک رنگین غبارے میں گیس بھر دی اور اس کو میں تھام کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ بڈھا بہت پرانا گھاگ ہے۔ انڈیا کمپنی کے وقت سے اس تاکے پر مشین لیے بیٹھا ہے۔ اور روایت یہ ہے کہ کمپنی سرکار مر کھپ گئی ہے۔

جلنے لگی کے وہ شریر بچے کہاں گئے ہیں، جو غباروں میں سوراخ سے چھید کر کے ساری ہوا نکالتے تھے۔



فون نمبر: را

امر



ماہنامۂ

کتاب لکھنؤ

اپریل ۔ مئی ۱۹۶۴ء

- ۲ مضامین
- ۷ افسانے
- ۱۶ منظومات
- نئی کتابوں پر تبصرے
- شام و سحر کے درمیاں
- طنز و مزاح

اور

- ادبی مسائل پر فکر انگیز خطوط

لکھنے والوں میں

رام لعل ۔ کوثر چاند پوری ۔ سربنواس لاھوتی
راج نرائن راز ۔ حسن کمال ۔ منظر حنفی ھنسوی
باقر مھدی ۔ جوھر میر ۔ دلاور فگار ، تاج سعید
تقی حیدر ۔ مشھود انور ۔ شریمتی وجے چوھان

جلد (۳) نمبر (۴)

زر سالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں
۶½ روپے
قیمت :- ۵۰ نئے پیسے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

مجلس مشاورت
سید احتشام حسین
حیات اللہ انصاری
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر :- سید جمیل احمد
مطبوعہ :- نظامی پریس لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ ، کتاب ۳ چوک ، لکھنؤ

پاکستان آفس
مسٹر نعیم اکبر خاں
الائڈ فوٹو گرافرس ، (پاکستان لمیٹڈ)
۴/5 موتی جھیل کمرشل ایریا ڈھاکہ

ماہنامہ کتاب لکھنؤ

کتاب، لکھنؤ

ظاہر ہے کہ پاکستانی شعراء کے نہ آنے سے نہ بزم شنکر و شاد کا مشاعرہ سونا ہوا اور نہ ادب کا کوئی نقصان ہوا۔ ہندستان میں اردو کے اتنے اچھے شاعر زندہ اور سامعین موجود ہیں کہ خوبصورت مشاعرے یہاں بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ ہوتے ہیں ہاں اردو کے نام پر ایک داغ لگ گیا کہ کیا اردو والے ایسے بھی ہوتے ہیں!

نئی ہندی کہانی نمبر انسان جب بھی حقائق سے آنکھیں چرا کر خوابوں کی دنیا میں کھو جانا چاہتا ہو کہانیاں اس کا سہارا بنتی ہیں۔ یہ کہانیاں چاہے وہ ایسے ایسے ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ قسم کی ہوں یا جدید جو بظاہر حقائق سے گریز کا ایک طریقہ نظر آتی ہیں، ہوتی ہیں در اصل انہیں کا پرتو اور عکس۔ ایسا نہ ہو تو کسی کہانی یا کہانی کے کسی پہلو کو ناممکن قرار دیا جائے۔ کہانیاں، سچ تو یہ ہے، ہماری کامیابیوں اور ناکامیوں، خوابوں اور شکست خواب، زندگی کے سارے حسن اور بدصورتی اور انسانی روح کے بلند اور پست ترین لمحات کا آئینہ ہوتی ہیں — افسانوی ادب کا عمل دخل اس جگہ سے شروع ہوتا ہے جہاں عمرانی علوم کی حکومت ختم ہو جاتی ہے۔

اردو کہانی کو آنکھ کھولے کچھ ایسے زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن اسے صحت، پڑھے لکھوں، کی گلی اور وہ کمسنی ہی میں دیکھی، باتیں کرنے لگی۔ اسے نئے رجحانات سے باخبر کرانے اور اسکے منہ میں عقل کی زبان رکھنے والا ایک ایسا شخص تھا جسے ہندی والے بھی اپنا سب سے اہم افسانہ نگار کہتے ہیں۔ اس اتفاق اور دونوں زبانوں کے بولنے اور لکھنے والوں کے کم و بیش مشترک علاقہ اور حلقہ کے پیش نظر یہ مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک ہی اتالیق کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے والے وہ فخر خاندان، پوتوں نے جنہیں لگ بھگ ایک ہی ماحول تربیت کے لئے ملا اپنے اس ورثہ کو کیسے نبھایا اور اس میں کیا اضافہ کیا۔

اسی خیال کے پیش نظر "کتاب" نے نئی ہندی کہانی نمبر کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نمبر میں جو (۱۰۰) سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہوگا ہندی کے جدید افسانہ نگاروں کی دس نمائندہ کہانیوں کے علاوہ اردو اور ہندی کے افسانوی ادب سے متعلق تین اہم مضامین بھی ہوں گے۔ — یہ خاص نمبر جسے ہندی کے مشہور افسانہ نگار ٹھاکر پرساد ترتیب دے رہے ہیں، ۱۲ مئی ۱۹۶۶ء کو آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔

یہ خاص نمبر آپ زر سالانہ ۶ روپے (پاکستان میں ۶ روپے) بھیج مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

اپنی باتیں

اس سال دہلی میں بزم شنکر و شاد کے ہند و پاک مشاعرہ میں صرف ۳ پاکستانی شعراء شرکت کے لیے آئے اگرچہ مدعو ہمیشہ کی طرح متعدد شعرا کو کیا گیا تھا۔ شعرا کا نہ آنا کوئی ایسا اہم واقعہ نہ تھا کہ قابل غور ہوتا لیکن جب ان کا نہ آنا ہند و پاک تعلقات کی کشیدگی کی وجہ سے ہو تو معاملہ اہم اور قابل غور ہو جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ پاکستان کی رائٹرس گلڈ نے، جو ایک نیم سرکاری ادارہ ہے یا کم از کم سرکار کے حلقۂ اثر میں ہے، شعراء پر یہ پابندی لگادی تھی کہ وہ ہندستان نہ جائیں۔

رائٹرس گلڈ کے اس اقدام کو صرف ہند و پاک روابط کے وسیع ترین منظر میں سمجھا جا سکتا ہے اور جس طرح پاکستان کی حکومت نے ہر بین اقوامی محفل میں ہندستان کا بائیکاٹ کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح غالباً اس نے رائٹرس گلڈ کے ذریعہ ہندستان و پاکستان کے شعرا کو مل بیٹھنے اور ایک دوسرے کو اپنی تخلیقی کاوشوں سے آگاہ کرنے سے باز رکھا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندستان و پاکستان کے تعلقات کشیدہ ہیں پھر سوال یہ ہے کہ اس کشیدگی میں دونوں ملکوں کے ادیبوں، خصوصاً اردو ادیبوں کا کیا فرض ہے۔ کیا دونوں ملکوں کی حکومتوں کے اختلافات، ان کی پالیسیوں کے اختلافات، اب اس نوعیت کو پہونچ چکے ہیں کہ کلچرل سطح پر تفریق و تقسیم شروع ہو جائے۔ کیا گنگا جمنا کے دوآبہ کی اس تہذیب کو بھی جس کو مغلیہ اور ناموں کے اردو کلچر کہہ کر بھی پکارا گیا اب دو حصوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔

اگر ادب بلکہ ہر تخلیقی عمل کا مقصود اس اقتدار و ہوس کی کشاکش سے بلند ہو کر اس دنیا میں ایک ہم آہنگی، حسن اور سکون پیدا کرنا ہے تو پاکستانی شاعروں نے رائٹرس گلڈ کی صلاح پر عمل کر کے بحیثیت ادیب اپنے بنیادی فرض سے کوتاہی کی ہے۔

اگر ادب و شعر بھی سیاسی آویزشوں کے پابند ہو گئے ہیں تو ادب کو مردہ سمجھ لینا چاہیئے۔ خوشنما فقرے کہنے والے تو سیاستداں بھی ہوتے ہیں ادیب صرف حسین کلام کی تک بندی پر نہیں حسن کی تخلیق پر مامور ہوتا ہے "وصل کردن" شاعر و ادیب کا بنیادی فرض ہے۔

ہندستان و پاکستان کے اختلافات نازیوں اور جمہوریت پروروں کے اختلافات سے زیادہ تو سنگین نہیں لیکن دوسری جنگ عظیم کے دوران یورپ کی کلچری وحدت برقرار رکھنے کے لیے، محبت کی ایک جوت جگائے رکھنے کے لیے نازی حکومت کے محکوم، ادیبوں، سائنس دانوں اور شاعروں نے کبھی حسن و علم کی بین اقوامیت کو مقامی نہیں کیا۔ وہ ادیب بھی جو نازی حکومت سے بھاگے نہیں تہذیب کی شمع جلاتے رہے۔

دیئے ہیں جن میں سے ایک تو بالکل ہی حماقت پر مبنی تھا۔ اس نے اپنی حماقت کا بڑی فراخدلی سے اعتراف کرلیا ہے۔ جس پر دلارا خوب کھل کھلا کر ہنسی ہے ۔۔۔ دوسری محبت ذرا سنجیدہ قسم کی تھی لیکن عباس اس کی شدت سے اب بھی محروم ہے ۔ اس کا ذکر بھی اس نے ہنستے ہنستے ہی کیا تھا۔ اور ایسا کرتے وقت دلارا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے جسے وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد سختی سے دباتا بھی رہا ہے۔ وہ اس عورت کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت کہتا ہے۔ جو اس کی زندگی میں خوشی لے آئی ہے۔ خوشحالی لے آئی ہے اور اطمینان بھی۔

وہ ایک اعلیٰ درجے کے ریسٹوران کے سامنے پہنچ کر رکشا رکوا لیتے ہیں۔ سولہ سال پہلے بھی یہ عمارت اتنی ہی شاندار تھی۔ یہاں اب بھی بھیڑ بھاڑ کی کمی نظر نہیں آتی خوبصورت چہرے، اچھے خوش رنگ لباس اور دل کو لبھانے والی آنکھوں کی چھیڑ چھاڑ۔ !

وہ دونوں بھری ہوئی میزوں کرسیوں کے درمیان جگہ کی تلاش میں جب کھڑے رہ جاتے ہیں۔ بیرے سر جھکائے جگہ خالی نہ ہونے کے لیے افسوس ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن عباس دلارا کو ایک میز کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں صرف ایک ہی شخص بیٹھا ہے۔ تنہا۔

وہ وہیں اس کے ساتھ بیٹھنے کا فیصلہ کرتے ہیں دھیرے دھیرے پروقار چال سے ادھر بڑھتے ہیں۔

وہ چالیس برس کا ایک بھرے پرے جسم کا آدمی ہے نظر کے چشمے میں سے ان کی طرف دیکھتا ہے۔ انھیں کھوئے سے ساتھ بیٹھنے کی اجازت دے دیتا ہے لیکن وہ دلارا کی طرف دیکھتے ہی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ دلارا بھی تصویر حیرت بنی اسے دیکھ رہی ہے۔ یقین نہیں آتا۔ دونوں کو یقین نہیں آرہا ہے!

ان کی یہ کیفیت دیکھ کر عباس بھی حیران ہونے لگتا ہے۔

شاید آپ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں؟

عباس ملے مسکرا کر دیکھتا ہے اور پھر کرسی پر بیٹھتا ہوا اپنا تعارف کراتا ہے ۔۔۔ "میرا نام احمد عباس ہے۔ یہ میری بیگم ہیں۔ ہم لاہور سے آئے ہیں۔ آپ کی تعریف؟"

وہ اجنبیوں سے ملتے وقت اکثر اپنا وطنیت کے بارے میں نہیں بتاتا ہے۔ ہندوستانی پاکستانیوں سے مل کر زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا کرتے لیکن اس کے سامنے وہ سب کچھ کہہ بیٹھا ہے۔ چاہتا ہے جس میز پر اس نے بیٹھنے کی اجازت حاصل کی ہے وہاں اس کی وطنیت کا بھی احترام کیا جائے۔

"میرا نام نثار احمد ہے میں بھی پاکستان سے آیا ہوں۔ آپ کے لیے کیا منگاؤں؟ کافی؟ چائے؟"

اس نے بجھا ہوا سگار دانتوں کے درمیان داب لیا ہے۔ اسے پھر سے سلگا رہا ہے۔

عباس کے چہرے پر حیرانی کی کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اسی طرح مسکرانے کے لیے بھی کوشاں ہے۔ نثار ہندوستانی ہوتا تو خوشی سے اس کی باچھیں بار بار کانوں تک پہنچ رہی ہوتیں۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ نثار احمد نے بڑی کوشش سے دلارا کے چہرے پر سے نگاہیں ہٹا رکھی ہیں۔ اور دلارا بھی جان بوجھ کر گردن کو ذرا سا ٹیڑھا کیے ادھر دیکھ رہی ہے ۔۔۔ ادھر خوش پوش لڑکیوں کی طرف جو ایک کونے میں بڑا ادھم مچائے ہوئے ہیں۔

میز پر کافی آگئی ہے کھانے کے بہت سارے لوازمات بھی کھانے پینے کے ساتھ ساتھ باتوں کا دور بھی چل رہا ہے۔ نثار بڑے جوش سے گردھیرے دھیرے اسے بتا رہا ہے۔ "میں نے لکھنؤ تقسیم کے وقت ہی چھوڑا تھا لیکن میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ میں کوئٹہ سے سال میں ایک بار ضرور یہاں آتا ہوں وہاں میں انکم ٹیکس میں ہوں۔"

دلارا ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی ہے۔ نثار کے سامنے آتے ہی وہ اپنی فطری شوخی سے بھی محروم ہو گئی ہے۔ وہ اس مسرت کو بھی کھو بیٹھی ہے جو اسے امین آباد کی رہائش گاہ سے کھینچ کر یہاں تک لے آئی ہے۔ لیکن اس کے اندر اس جرأت کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ اپنے شوہر سے فوراً یہاں سے چل دینے کے لیے کہہ سکے گی۔ وہ ایک بار اپنی گھبراہٹ دکھا چکی ہے تو اب اس پر قابو پا لینا بھی اسے بہت عجیب سا لگتا ہے۔ وہ اسی طرح گردن، بیٹھی رہے گی۔ وہ دوسری بار کے لیے دوسری بار کافی انڈیلتی ہے تو دونوں اسے گھور کر دیکھتے ہیں بعد کافی کے پاٹ کا ڈھکن کھل سے ایک پیالے میں جا گرتا ہے۔

"اوہ! ساری!"

"کوئی بات نہیں۔"

تینوں مسکراتے ہیں۔ لیکن دلارا کی مسکراہٹ میں گھبراہٹ، گھرا ہوا تعجب

رام لعل

راستوں کی الف لیلیٰ

دلارا عباس امین آباد کے ایک اوسط درجے کے ہوٹل کے برآمدے میں کتنی ہی دیر سے چپ کھڑی ہے۔ عباس کمرے کے اندر خوب گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کے خراٹوں کی آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ دوپہر کے پرتکلف کھانے کے بعد انھوں نے ڈھیر سارے دسہری آم چوسے ہیں۔ آموں کا وہ شیدائی ہے۔ جب تک یہاں نہیں آیا تھا اس کی زبان پر آموں کا ہی ذکر رہتا تھا۔ اور یہاں آکر پچھلے دو ماہ سے وہ آم ہی چوس رہا ہے۔ آم چوسنے میں دلارا بھی اس کا ساتھ دیا کرتی ہے۔ اگرچہ اس نے ہاتھ منہ اچھی طرح دھو لیے ہیں لیکن اس کے گالوں پہ ابھی تک ایک میٹھی زردی جھلک رہی ہے۔

ہلکی ہلکی بارش سے پارک اور سڑکیں بھیگ گئی ہیں۔ رکشے اور تانگے والوں کی رنگین کی چھتریں چمک رہی ہیں۔ لوگ بارش میں بھی گھومنے پھرتے ہیں۔ وہ بے حد مسرور دکھائی دیتے ہیں۔

اچانک دلارا کے دل میں ایک لہر اٹھتی ہے۔ مسرت اور نشاط کی لہر۔ اور وہ تیزی سے پلٹ کر اندر چلی جاتی ہے۔ عباس کو جھنجھوڑ کر جگانے لگتی ہے۔

"اٹھیے اٹھیے اب تک پڑے سوئیے گا؟"

عباس ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ حیرت سے بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر مسکرا دیتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے وہ کتنی دیر تک سویا رہا ہے۔ دلارا جاگتی ہی رہی ہے۔ اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی ہے۔ وہ اس کی طرف محبت سے ہاتھ بڑھاتا ہے۔

"کیا بجا ہے؟"

دلارا اس کے ہاتھ میں آنے کی بجائے اسے صرف وقت بتاتی ہے اور وہ اس پر نظر بچائے مسکراتا ہوا پیروں سے فرش پر سلیپر ٹٹولنے لگتا ہے۔

"اللہ! اتنی جلدی چار بج گئے!"

"جی۔ اب چلیے ذرا گھوم آئیں۔"

"چلتے ہیں۔ پہلے چائے بلوا دو۔" عباس اس کی طرف ابھی تک محبت سے دیکھ رہا ہے۔

"چائے حضرت گنج میں کیوں نہ پئیں!"

تیس سال کی چھریرے لمبے قد کی عورت میں ابھی تک کنواری لڑکیوں کی سی معصومیت ہے۔ آنکھوں کے کونوں میں افسردگی کی جھلک بھی ہے لیکن وہ اداس نظر نہیں آتی۔ صبر، اطمینان اور شکرانے کے جذبے سے سرشار۔ بس سرشار۔

بارش رک گئی ہے۔ وہ ایک کھلے رکشا میں حضرت گنج جا رہے ہیں۔ عباس نے کالی پتلون کے ساتھ سفید ٹیری لین شرٹ پہن رکھی ہے ایک خوبصورت پھولدار ٹائی بھی باندھ رکھی ہے جس پر سونے کا پن چمک رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں سب سے قیمتی سگریٹوں کا ٹین ہے۔ ایک سگریٹ ہونٹوں میں دبی ہوئی ہے، ہلکا ہلکا خوشبودار دھواں چھوڑتی ہوئی۔ صحت مند۔ مطمئن۔ دو مہینے بستی ضلع کے ایک دور دراز کے گاؤں میں اپنے عزیزوں کے ساتھ گزار کر بیوی کے ساتھ اب لکھنؤ چلا آیا ہے۔ صرف چند روز کے لیے۔ پچھلے چند روز اس نے اپنے پرانے واقفکاروں سے ملنے میں گزارے ہیں۔ اخبار کے دفتر میں، سکریٹریٹ میں، ریلوے میں، یونیورسٹی میں اور ان لوگوں کے گھر بھی پہنچے ہیں۔ وہ سب اس کے ساتھ کے پڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر اس نے جو جو شرارتیں کی تھیں ان کی ایک ایک تفصیل اس نے دلارا کو بتائی ہے۔ اس نے اپنی محبت کے بھی وہ قصے اسے سنائے

کوثر چاند پوری

اک قدم تمنّا کا

اللہ رکھی لمبے قد اور چھریرے بدن کی بڑی چھبیلی عورت تھی اس کے بال ادھیڑ عمر میں بھی لمبے اور کالے تھے چوٹی کمر کے نیچے تک لٹکتی رہتی تھی اور کھنچی سی پتلی پنڈلیوں پر ارہوان پاجامہ خوب چُھٹا رہتا تھا کانوں سے سونے کی جھمکیاں کبھی الگ نہ ہوتی تھیں، اس کی بھنویں کمان کی طرح خمیدہ اور بال کی طرح باریک تھیں، بائیں آنکھ بیٹھ گئی تھی: اس نے اللہ رکھی کے گول چہرے، پتلے پتلے ہونٹوں اور لمبی پلکوں کا سارا حسن غارت کر دیا تھا، یہ آنکھ اس کی ابروؤں کے نیچے چاند کا داغ بن کر رہ گئی تھی، پہلی نظر میں وہ بڑی عجیب سی لگتی مگر جب باتیں شروع کر دیتی اور خوب کھل کر ہنسنے لگتی تو اس کے اندر خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہو جاتی عورتیں سویرے سویرے اس کی صورت دیکھنے سے کترایا کرتی تھیں، ان کا خیال تھا کہ دن نکلتے ہی اللہ رکھی کی شکل دیکھ لی جاتی ہے تو پورا دن پریشانی اور الجھن میں گزرتا ہے ایسی ایسی منحوس خبریں کانوں میں پڑتی ہیں کہ دل اداس ہو کر رہ جاتا ہے وہ بھی گھر سے نکلتی تو دوپٹے کا پلو اس انداز سے منہ پر ڈال لیتی کہ پورا چہرہ چھپ جاتا، وہ پانی بھرنے اس وقت کنویں پر جاتی جب وہاں کوئی نہ ہوتا، بہت سی سہاگنیں جن کے میاں پردیس میں ہوتے اللہ رکھی سے یوں بچ کر نکلتیں جیسے وہ ناگن ہو، جو دوڑ کر انھیں ڈس لینا چاہتی ہو، اللہ رکھی کو ان باتوں کی کوئی پرواہ نہ تھی مگر جگنا بنیے سے وہ بہت جلتی تھی جو کانا ہو کر بھی اس کا منھ دیکھنے سے بچا کرتا تھا، اور ایک مرتبہ اس نے بڑی طرح اللہ رکھی کو ڈانٹ دیا تھا۔

سورج کی کرن بھی اچھی طرح نہیں پھوٹتی کہ تو گھر سے نکل پڑتی ہے، بولتی بھی نہیں کہ آگئی کوٹھے مٹکاتی!

مفت نہیں لوں گی پیسے دوں گی، اور تو کیوں اتنا بگڑتا ہے، صورت دیکھ کبھی آئینے میں، جیسا تو ویسی میں۔

جگنا نے اپنی اس آنکھ کی پلکیں جلدی جلدی جھپکانی شروع کر دیں جس میں بہت بڑا ٹینٹ تھا، اور یہ حرکت وہ اس وقت کیا کرتا تھا جب بہت زیادہ غصہ میں ہوتا۔

کیا کہا میں تو دریا میں، ہٹ پرے سامنے سے ترازو پھینک کر ماروں گا، دوسری بھی پھوٹ جائے گی تیرا میرا کیا مقابلہ، قسائی کہیں کی۔

اللہ رکھی کو کانا کہلایا جاتا تو وہ ذرا نہ بگڑتی مگر قسائی کا لفظ سن کر آگ بگولہ ہو جاتی تھی ـــــــ خون بکرا کاٹنے سے بھی بہتا ہے اور بچہ جنانے سے بھی، پر دونوں میں موت اور زندگی، بربادی اور آبادی کا سا فرق ہے اس کا شوہر ضرور قسائی تھا مگر وہ تو دائی ہے، نسل اور آبادی دونوں میں اضافہ کرتی ہے۔

جگنا ہمیشہ اللہ رکھی کو دیکھ کر اپنا عیب بھول جایا کرتا تھا یوں بھی ادھار لینے والے اسے کانا نہیں کہا کرتے تھے اور سورج نکلنے سے پہلے اس کی صورت دیکھنے کو منحوس نہیں سمجھتے تھے۔

محلہ میں صرف شیخوں کی حویلی ایسی تھی جہاں اللہ رکھی جس وقت چاہتی بے تکلف چلی جاتی، اور وہاں سب ہنسی خوشی اس کا سواگت کرتے اس حویلی میں زاہدہ بیگم کی حکومت تھی اور وہ آئے دن وہ اس سے پیٹ ملوایا کرتی تھیں پاؤں ذرا نیچا اونچا پڑ جاتا تو فوراً ان کی ناف ٹل جاتی اور اللہ رکھی کو بلانے نوکروں کی لائن ڈوری لگ جاتی، شکور، غفار اور قادر سب آگے پیچھے دوڑنے لگتے، اللہ رکھی بیگم صاحبہ کی ناف کو وہ اہمیت دیتی تھی جو انجینئر بھاکڑہ ننگل کی دیوار کو بھی نہیں دیتے

ہے۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہی ہے۔ وہ متوازن کیوں نہیں ہے؟ کیوں نہیں ہے؟ کیوں نہیں ہے؟

انھیں کافی دے کر وہ تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر باتھ روم میں چلی جاتی ہے۔ عباس اسے جاتا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں مسکراتا ہے۔ اندر جا کر وہ خوب روئے گی۔ خوب روئے گی۔ جب جی ہلکا ہو جائے گا تو منھ دھو کر واپس آجائے گی۔

دلارا کے جاتے ہی وہ اطمینان کی سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔

وہ نثار احمد کے چہرے پر بھی ویسا ہی اطمینان ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ مسرور ہونا چاہتا ہے لیکن نثار احمد دلارا کے وہاں سے ہٹ جانے کے بعد گھبراہٹ دکھانے لگا ہے۔ وہ اس کے ساتھ نظریں ملانے سے بھی احتراز کر رہا ہے۔ شاید ڈرتا ہے وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا شروع نہ کر دے!

عباس صرف ایک ہی سوال پوچھتا ہے۔ "کیا آپ ہی نثار صاحب ہیں۔ جنھیں بلند شہر کے ڈپٹی کمشنر حسین کی بہن سے شدید محبت تھی؟"

نثار اس بات کا اعتراف کر لینے میں دیر نہیں لگاتا۔ کافی کا آخری گھونٹ بہت تیزی سے حلق کے اندر پھینکتا ہے اور پھر بجھتے ہوئے سگار کے جلدی جلدی کش کھینچنے لگتا ہے۔

عباس کے چہرے پر صاف دکھائی دیتا ہے کہ وہ اس کی تائید سے ناخوش نہیں ہوا ہے۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح بول رہا ہے جیسے دونوں کسی قبر کے کنارے آمنے سامنے کھڑے مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر پھینکنے والے ہوں۔!

"کل میں شاہو کے ایک خالی مکان پر قبضہ کرنے کے لیے میں ایک چھت پر سے کود کر اندر گیا تو وہاں مجھے ایک پھٹے ہوئے کلنڈر کی طرح فرش پر پڑی ہوئی نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر خوف زدہ بھی نہیں ہوئی۔ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک ایک کمرہ کھول کر دکھایا جیسے اس کا اپنا گھر ہو! پھر دروازے سے باہر جھانکتی ہوئی بولی۔ اندر سے بند کر لیجیے! لیکن وہ آج تک میرے ساتھ ہے۔ ہم اسی مکان میں رہ رہے ہیں۔ شاید آپ اسے تھوڑی سی دیر کے لیے لاہور اسٹیشن پر چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد آپ دونوں پھر نہیں مل سکے۔"

دونوں گردن گھما کر دلارا کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ دھیرے سے ان کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی ناک بھی سرخ ہے اور آنکھیں بھی۔ اس کے بیٹھتے ہی عباس معذرت خواہ ہو کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے حیران رہ جاتے ہیں۔ انھیں ایسی توقع نہیں تھی۔

بہت سارے لمحے خاموشی میں گزر جاتے ہیں۔ پھر نثار ہی اس خاموشی کو توڑتا ہے ——— "یہ تو سوچا بھی نہیں تھا ہم اچانک کبھی مل جائیں گے!"

دلارا کے ہونٹ تھرتھرانے لگتے ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ نثار اسی کو دیکھ رہا ہے۔ آخر وہ کیا کہنا چاہتی ہے؟ وہ کچھ بھی نہیں کہہ پاتی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ پھر سر جھکا کر آنکھیں پونچھنے لگتی ہے۔

کتنی دیر ہو گئی ہے۔ عباس واپس نہیں آیا۔ دونوں اسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ دونوں کے چہروں سے گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا ہے۔ وہ آخر کہاں چلا گیا؟ وہ جا بھی کہاں سکتا ہے؟ دلارا اب اس کرب کی کیفیت سے آزاد ہو رہی ہے جو تھوڑی دیر پہلے تک اس کا گلا گھونٹے دے رہی تھی۔ لگتا ہے وہ عباس کو دیکھتے ہی اس پر برافروختہ ہو جائے گی

(باقی صفحہ ۶۲ پر)

بھی، برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں، آسمان پر بادلوں کے پرچم لہرا رہے تھے، اللہ رکھی دبے پاؤں باہر آئی اور زاہدہ بیگم کے پوچھنے پر بولی۔ سب ٹھیک ہے، بس حکم کی دیر ہے، درد مندا پڑ گیا ہے، چھوٹی بیگم کی آنکھ لگ گئی، صبح صادق تک دیکھنا زاہدہ بیگم چپکے سے موم کا پیالہ پانی ہیسے ہوئے کونڈے میں ڈلنے راشدہ کی پائنتیں رکھ آئیں، انگیٹھی پر چائے کی کیتلی رکھی سنا رہی تھی اللہ رکھی نے اس طرح گردن ٹیڑھی کر کے کیتلی کو دیکھا جیسے کانی مرغی بازو پر پڑے ہوئے گیہوں کے دانے کو دیکھا کرتی ہے جو اس کی قسمت سے چڑیوں کی زد سے بچ رہتا ہے۔

کیا چائے پیو گی؟ زاہدہ بیگم نے پوچھا۔

ہاں کلیجہ کانپ رہا ہے اور دونوں ہاتھ ٹھٹھرے جا رہے ہیں بڑے غضب کی سردی ہے۔

زاہدہ بیگم نے ایک پیالی میں چائے ہمدردی اللہ رکھی بھی بار بار کر پینے لگی، جیسے منھ سے جتا رہی تھی اور ادھر پیالی سے انجرات اٹھ رہے تھے، ایک دم سے پرا الو بول اٹھا۔

یا اللہ رحم! ــــــ

اے چپ رہو نوکرانی نے پیالہ نیچے رکھ کر ٹوٹ کر، اٹھ کر ذکر کر رہا ہے تیری نسیم زیبی ضرب لگی کہ دل ہل گیا۔

رات کی خاموشی اور ڈراؤنی فضا میں الو کی آواز بادل کی طرح گرجتی، کھجوروں اور اونچے اونچے پیڑوں کی پھنگیوں سے ٹکراتی ہوئی دور تک چلی گئی۔

اللہ خیر کرے! ــــــ اونگھتی ہوئی نوکرانی کے منھ سے نکلا۔ الو بولے ہی جا رہا ہے۔

وہ تو روز ہی بولتا ہے زاہدہ بیگم نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

آج کی بات اور ہے۔

چپ رہو، زاہدہ بیگم جل گئیں۔

کوڑا ڈالو نا مُوئے اس پیڑ کو ــــــ اے ہاں نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری، اللہ رکھی نے پیالی زمین رکھتے ہوئے کہا۔

کیا ہوتا ہے اور چڑیاں بھی تو دن رات بولتی رہتی ہیں الو بول گیا تو کیا ہوا وہ بھی ایک چڑیا ہے۔

کہتے ہیں جہاں چالیس دن لگاتار بولتا ہے وہاں ویرانا ہو جاتا ہے، الو چڑیا ضرور ہے مگر اور چڑیوں کی طرح نہیں مجھے دیکھو بیگم میں بھی عورت ہوں مگر یہ لگائیاں مجھ سے کیوں بھیتی ہیں اللہ رکھی بولی۔

اور جہاں اب بول رہا ہے وہاں کون سی آبادی ہے ــــــ کہنے کی باتیں ہیں جگہیں اجڑتی بستی رہتی ہیں یہ قدرت کا قانون ہے اس میں الو اور مینا کا کوئی قصور نہیں، اور جو تگائی تم سے ڈرے وہ نری پاگل ہے۔

زاہدہ بیگم منھ سے یہ باتیں ضرور کہہ رہی تھیں، دل ان کا بھی دھڑک رہا تھا، پہلی ہی آواز میں چھاتی دہل گئی تھی، آپ ہی آپ کہا تھا کس وقت بولا ہے نگوڑا ــــــ ایسے وقت میں جب بچہ ہو رہا ہے الو کا بولنا خود ان کے نزدیک کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

اوں ہوں! ــــــ یہ بات میں نہیں مانوں گی اللہ رکھی بولی الو کے بولنے سے سچ مچ ادبار آتا ہے، میری آزمائی ہوئی بات ہے، عین میری شادی کی رات کو گھر کی منڈیر پر الو بولا تھا جیسے تیسے دو ہی پہر گزرے، ہو لوٹ پوٹ ہو گئے، وہ چاول کھا کر سوئے رات کو ایسا درد اٹھا کہ چیخیں نکلنے لگیں، اسپتال گئے اور وہیں ختم ہو گئے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ آنت میں بل پڑ گیا ہے پیٹ چیرا جائے گا۔

کیا اسپتال میں مرے تھے تمہارے میاں۔؟

ہاں، ــــــ ہوا یہ کہ ڈولی میں ڈال کر لوگ لے گئے، وہاں جاتے ہی چپ چاپ ہو گئے، روتے روتے میرا برا حال ہو گیا، مہینہ بھر تک آنکھ کا آنسو نہ تھما۔

کیا آنکھ بھی رو کر ہی کھوئی تم نے؟ زاہدہ بیگم نے پہلی مرتبہ اس کی بیٹھی ہوئی آنکھ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

نہیں، یہ تو بچپن میں دکھنے آئی تھی، ماں کہتی تھی دس دن تک تو نے آنکھ نہ کھولی تھی، اور جب کھولی تو ایک چوٹ تھی۔

نوکرانی کو ہنسی آ گئی وہ کھلکھلا کر ہنس دی، اللہ رکھی کو اس کی بیہودگی پر غصہ آ گیا، اس کی ٹمٹماتی پلکیں اس طرح بیٹھی ہوئی آنکھ کے گڑھے پر جھپکنے لگیں جیسے دھنسی ہوئی قبر پر چیلیں اڑ رہی ہوں۔

دوسرا بیاہ نہیں کیا تم نے، بہاری جوانی رنڈاپے میں

خبر ملتے ہی وہ آدھا گھونگھٹ نکالے کالے سلیپر پہنے آتی اور دیر تک اندھیرے کمرے میں زاہدہ بیگم کی ٹلی ہوئی ناف ٹھیک کرتی رہتی، ناف بھی اس کالی کلوٹی پہچانتی تھی، ہاتھ لگتے ہی اپنی جگہ آ بیٹھتی۔ زاہدہ بیگم نے کبھی اس کی آنکھ کے بارے میں نہیں پوچھا اور نہ اس کی شکل دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی، وہ یا تو شگون کی قائل ہی نہ تھیں یا اللہ رکھی کے کام کی اتنی قدر کرتی تھیں کہ نحوست اور ادبار کے تصور کو اس سے وابستہ کرنا برا جانتی تھیں اس پاس نئے اور گھر والوں میں بھی اسے بلایا جاتا تھا، مگر ذرا دن چڑھے۔ اور اگر کسی گھر میں کسی کے زچگی کا درد شروع ہو جاتا تو وقت کی قید آپ ہی آپ اٹھ جاتی، زچہ کا جسم لیتا تو ساری عورتیں ایک زبان ہو کر کہتیں۔

سچ مچ اللہ رکھی بڑی سبز قدم ہے۔ نوج!

اللہ رکھی اکیلی ہی تھی، آگے پیچھے کوئی نہ تھا، گھر والا بہت دن ہوئے جنت کو سدھار چکا تھا، بچہ کوئی ہوا ہی نہ تھا، وہ دوسری ہاتھ بیوہ عورتوں کی طرح سفید [illegible] نہیں پہنتی تھی، چیر نکا دوپٹہ اوڑھتی، کبھی ہلکے رنگ کا کرتہ پہنتی پاجامہ [illegible] سیاہ، ہاتھ دونوں ننگے رہتے چوڑیاں کبھی اس کی کلائیوں میں نہیں دیکھی گئیں، باہیں اتنی سڈول تھیں کہ بغیر چوڑیوں کے چندن کی ڈالیوں کو شرماتی تھیں۔

زاہدہ بیگم کی دیورانی راشدہ بیگم بیوہ ہوئے دونوں سے نکلیں تو اللہ رکھی روز ہی انھیں دیکھنے شیخوں کی حویلی میں آنے لگی وہ زاہدہ بیگم کی چھوٹی بہن تھیں اور انھیں کی کوشش سے ان کے دیور سے منسوب ہوئی تھیں، اللہ رکھی کے دروازے میں قدم رکھتے ہی راشدہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے سب کو دیکھتی کمرے میں چلی جاتیں، پیچھے پیچھے اللہ رکھی چلی جاتی، ذرا دیر بعد وہ آستین چڑھائے نکلتی اور دالان پر آ کر وہیں بیٹھ جاتی زاہدہ بیگم آپ ہی پانی اور صابن لے کر آتیں، اس کے ہاتھ دھلاتیں، اور منہ ہی منہ میں کچھ کہتیں۔

ایک اٹھوارہ اور لگے گا بیگم، اللہ رکھی ذرا مش کرتی ہے جگہ چھوڑتا جا رہا ہے۔۔۔۔ سرک کر گھس گیا تھا، میں نے ٹھیک کر دیا ہے، میں پوچھتی ہوں چھوٹی بیگم داہنا پاؤں پہلے اٹھاتی ہیں یا بایاں۔

میں کیا جانوں؟ زاہدہ بیگم ہنس کر کہتیں۔

لے ذرا دھیان رکھا کرو بیگم۔

اللہ رکھی ہاتھوں کو جھٹک کر پانی جھاڑتی اور پھر دوپٹے سے پونچھتی اسٹول پر جم جاتی، ذرا دیر بڑی بیگم سے کانا پھوسی کرتی، خوب آنکھیں مٹکاتی، ہنستی، زاہدہ بیگم کے منہ پر جھک آجاتی اور آنکھوں میں دیئے سے جل اٹھتے، پاندان کھول کر پوری دیسی پان بناتیں اور اپنی ڈبیہ میں سے تمباکو ڈال کر اللہ رکھی کے ہاتھ میں تھما دیتیں، وہ پان منہ میں دبا لیتی اور چھالیہ کے دانے بائیں ہتھیلی پر رکھے سمٹ جاتی رہتی پان خوب گھل جاتا تو چھالیہ پھانک لیتی، اب بات کرنی مشکل ہو جاتی۔ وہ منہ اللال کر کچھ کہتی تو ایسی آوازیں نکلتیں جیسے صراحی سے شراب الٹی جا رہی ہو یا جیسے کوئی پاس بیٹھا خالی حقہ گڑگڑا رہا ہو الفاظ صاف ادا نہ ہونے تو ناک پر تھوک آتی، اگالدان میں تھوکنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا، ایک دن [illegible] زاہدہ بیگم کے پیار سے اس کی طلبی ہوئی تھوڑا ہانپتا کانپتا پہنچا۔

ہاں جی ۔۔۔ [illegible] جی!

کیا ہے گھوسی [illegible] پڑھنے تو دوڑ رہا ہے۔

بڑی بیگم نے بلایا ہے، [illegible] کھانا ہے کھانا دو دال لگا دو تو کلی یہاں آ کر کر دو۔۔۔۔۔۔ پھر پکار کر انھوں نے کہا ہے جیسی بیٹھی ہو ویسی ہی چلی آؤ۔

وہ کالی چادر [illegible] اندھیری رات کی طرح غفورا کے پیچھے یوں چلی جیسے ڈوبتے سورج کے پیچھے دھندلکا دوڑ رہا ہو، چادر میں سے آدھا چہرا عید کے چاند کی طرح چمک رہا تھا، یہ چمک اس کے حسن کی نہیں تھی، شاید اس آفتاب کی تمنا تھی جس کے ہاتھوں طلوع ہونے والا تھا، جب ہی تو وہ رات بن کر گھر سے نکلی تھی، وہ اندر پہونچی ہی تھی کہ راشدہ کمرے سے بھاگ گئی دونوں دیر تک وہیں رہیں، اللہ رکھی کواڑوں سے منہ نکال کر کہتی رہی۔

گرم پانی تیار رکھو بیگم۔

چاقو، اور ریشم کی لچھی بھی ابلتی رہے۔

روئی لگا لینا ذرا سی!

اور زاہدہ بیگم اس کے اشاروں پر دوڑتی پھر رہی تھیں نوکرانی سے بھی نہ کہتیں سارا کام خود ہی کرتیں، گھنٹہ بھر کے اندر ہی راشدہ کے منہ سے ہلکی ہلکی چیخیں نکلنے لگیں رات اندھیری تھی، اور ٹھنڈی

پار پانچ لڑکیوں کے بھال ڈالے تھے، کسی میں ہجری سن سے نکلتی تھی کسی میں عیسوی سے، ان کا عقیدہ تھا کہ تاریخی نام تقویم اور آگے بڑھا دیتے ہیں، ان سے دنیا کی عمر کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی ہے۔

فضل میاں کو اندر بلایا گیا زاہدہ بیگم نے نرم گرم کپڑوں میں لپٹی ہوئی ننھی سی جان ان کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

اذان کہیئے!

ہے کیا، لڑکا، لڑکی؟

لڑکا! ——— اللہ رکھی بولی اور فضل میاں کو ایسا لگا جیسے اس کی کانی آنکھ سے سورج نکل آیا اور آس پاس کا اندھیرا رہ گیا۔ ان کا جی چاہا اللہ رکھی کے ہاتھ چوم لیں۔

نام نکلا کوئی؟ ——— زاہدہ بیگم نے اپنے شوہر فضل میاں سے پوچھا۔

تو ہاں ایک نہیں، کئی۔

کون سا نام رہے گا۔

آفتاب علی! فضل میاں نے نوٹ بک کھول کر کہا

مجھے ——— بہت بوڑھا نام ہے، پھر دھوپ میں پودے جل جاتے ہیں۔

چراغ حسن کیسا رہے گا۔

دنیا میں بجلی جگمگاتی رہتی ہے اور آپ نام رکھنے چلے ہیں چراغ! ——— پتہ نہیں پڑوسن کے پوتے کا نام چراغ دین ہے۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے بیگم!

جلتا ہوگا، میں تو بجلی سے جلاؤں گی۔ ——— آپ آپ سگریٹ ماچس سے کیوں جلاتے ہیں۔

یوں ہی سہی! ——— فضل میاں نیازمندی سے بولے۔

اولاد علی، رکھ لیجیے۔

اے سبحان اللہ نہ جانے آپ کی عقل کہاں چلی گئی ہے حضرت علی کے دونوں بیٹے شہید ہوئے تھے۔

چلیے مہتاب حسن ہی!

جی نہیں، اس نام کا قلعی گر آتا ہے برتنوں پر قلعی کرنے

تو آپ خود ہی بتائیے!

ہاں میرے ذہن میں ایک نام ابھر رہا ہے، آبادالہی!

——— بچہ کا نام یہی رہے گا۔

فضل میاں نے سر تسلیم خم کر دیا اور آگے پیچھے، شیخ ——— سید وغیرہ جوڑ جاڑ کر فصلی نام نکال دیا۔

ٹھیک ہے، فصلی سن نکل آیا، بڑا مبارک ہوتا ہے، آبادی اور فصل میں بہت گہرا تعلق ہے، پھر بیگم بھی چاہتی ہے کہ اگلی نسل کے لیے کوئی ایسا راستہ نکالیں، جو دیر و حرم سے دور دور ہوتا ہوا آبادمنزلوں کی طرف بڑھے۔

زاہدہ بیگم ہنس پڑیں، ساری دنیا ان کے ساتھ ہنستی محسوس ہوئی۔

کاٹ دی۔

کیا کرتی دوسرا کرکے؟ ـــــ مرنے والا پیٹ میں اپنی ننھی سی نشانی چھوڑ گیا تھا وہ بھی چھن گئی، کلی ڈال سے گر پڑی، بڑی شدت کا درد اٹھا مگر وہی کا ہاتھ لگتے ہی کافور ہو گیا اسی دن سے جی میں سمائی کہ میں بھی یہی پیشہ کروں گی، بچے جنایا کروں گی، دوسرا تیسرا بچہ جنانے ہی مردوں سے مجھے گھن آنے لگی، بیٹھے بٹھائے عورت کیا سے کیا بن جاتی ہے، مگر بیگم بچہ جنا کر دل ایسا خوش ہوتا ہے کہ سارے غم دور ہو جاتے ہیں۔ اس کی پہلی چیخ کانوں میں پڑتی ہے تو ایسا لگتا ہے نہ جانے کتنی اجڑی بستیاں آباد ہو گئیں، یہ ضرور ہے کہ عورت کی جان پر بن جاتی ہو سچ پچ اس کا دوسرا جنم ہوتا ہے زمین پر بھی میں دیکھتی ہوں کہ مرد وئے اسے مارتے ہیں گالیاں دیتے ہیں اور خود وہی کیڑے جنھیں وہ جنتی ہیں بڑے ہو کر اس کا احسان بھول جاتے ہیں، ـــــ سچ کہتی ہوں بیگم عورت پوجا کرنے کے قابل ہے۔

ٹھیک کہتی ہو زاہدہ بیگم اور نوکرانی نے ایک ساتھ کہا اور نوکرانی کا گھر والا روز ہی اسے مارتا تھا، اللہ رکھی کی زبان سے یہ نیک کلمے سن کر اس نے سوچا ہو نہ ہو یہ لگتی کوئی بہت اللہ والی ہے، ولیوں کی سی باتیں کرتی ہے، کون کہتا ہے کانے منحوس ہوتے ہیں' دجال پر لعنت اسی لیے نہیں بھیجتے کہ وہ کانا ہے اس کے کرتوت ہی ایسے ہوں گے۔

کیا کرتے تھے تمہارے میاں؟ زاہدہ بیگم نے پوچھا۔

بکرے کاٹا کرتے تھے، بکر قصاب تھے، بکروں کی گردنیں کٹتیں تو تھل تھل خون بہتا، ایسا لگتا کوئی دنگا ہو گیا ہو بہت بڑا، کٹے ہوئے سروں پر لگی ہوئی آنکھیں ایسی چمکتیں کہ میں انھیں دیکھ کر ڈر جاتی، دس دفعہ کہا کوئی اور دھندا کر لو، اور وہ کر بھی لیتے، مگر ہنکھ جھپکاتے آپ ہی چل بسے۔

اللہ رکھی اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ راشدہ بیگم جاگ پڑی درد بڑھ گیا تھا وہ دوڑ کر ان کے پاس جا بیٹھی، زاہدہ بیگم کواڑوں کی درازوں سے جھانکتی رہیں، جلد ہی ایک معصوم اور ننھی سی مہین آواز نے فضا میں نغمہ سا گھول دیا۔

ہوں آں، ہوں آں،

ہزاروں دیئے جل اٹھے، جگنو سے چمکنے لگے، جیسے ایک نئی دنیا بس گئی، اُلّو نے برسوں الٹی سیدھی بولیاں بول کر جس بستی کو اجاڑنے کے جتن کئے تھے اسے پل بھر میں اس پیاری کومل سی آواز نے رونق سے بھر دیا، ایسا لگا جیسے زمین سے پودے ہی پودے ابل پڑے دنیا ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہری بھری کیاری بن گئی۔

اُلّو پھر بولا

یا بدوح!

ادھر بچہ کی چیخ بلند ہوئی۔

ہوں آں!

اوپر جا کر دونوں آوازیں گتھ گئیں، تھر زور سے تحریب ٹکرائی اُلّو کی آواز کا پیام بدل سا گیا، وہ بچہ سے ڈر گیا زاہدہ بیگم کا دل نہیں دھڑکا اور اللہ رکھی کو پیڑ کھڑکانے کا دھیان تک نہیں آیا وہ اپنے کام میں مشغول رہی، زاہدہ بیگم نے دھیمی آواز میں پوچھا

کیا ہوا اللہ رکھی؟

لڑکی! ـــــ اس نے نتھنے منے، جیسے جاگتے اور ہنستے لڑکے کو نظر بد سے بچانے کے لیے کہا۔

سچ!

بالکل!

پانی کا گگرا چولھے پر چڑھا ہوا تھا پتیلی میں فضل میاں کا قلم تراش کھول رہا تھا اسی میں ریشم کی لچھی پڑی تھی، اللہ رکھی کے مانگتے ہی سب چیزیں بھیج دی گئیں۔

بچہ ایک بار اور رو دیا۔

ہوں آں، ہوں آں۔

ویرانی کو جیسے ایک اور جھٹکا لگا، آبادی مسکرائی۔

نال کہاں گڑے گا؟ اللہ رکھی نے پوچھا جہاں نال گڑھتا ہے اس جگہ سے آدمی کو بڑی محبت ہوتی ہے، وہی اس کا وطن ہوتا ہے۔

زاہدہ بیگم نے گلاب کی جڑ میں نال گاڑنے کا مشورہ دیا، اور اللہ رکھی اپنے اجاڑ طعلے پر نقاب ڈالے ذرا سی دیر میں اس کام سے بھی فارغ ہو گئی۔

صبح کو نام کی بات چلی، فضل میاں نوٹ بک لیے بیٹھے تھے، سورج کا اجالا پھیلنے تک انھوں نے دو تین نام لڑکوں کے

تو صرف بہنی کی گفتگو اور اس کی پٹائی ہی ہماری دلچسپی کا سامان نہ تھے۔ مگر جوں جوں دن گزرتے گئے، اور بہنی ہمارے گھر آنے جانے لگی تو اسی رفتار سے دلچسپی کے کھلونوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔

ہم اپنے غموں، اپنی الجھنوں، اپنے دکھوں اور اپنے جھگڑوں کو بھول سے گئے۔

کیوں کہ اس عجیب و غریب پڑوسن سے ہمیں کثیر تعداد میں قہقہے، مسکراہٹیں، اور دلچسپ موضوعات مل جاتے تھے۔

کبھی کبھی ہم کو سنجیدہ ہونا پڑتا تو یہ خیال طرب آشنا اور انبساط طلب شعور کے کسی دریچہ سے جھانکتا۔

"دوسروں کے مضحکہ خیز غم، اور نکھری الجھنیں، ہمارے لیے غم نیاہ ہیں، اور یہ سب کتنا عجیب اور کتنا انوکھا ہے ——"

یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ان میاں بیوی کے درمیان ایسے تعلقات ہیں، جو زن و شوہر کے رشتے کے بجائے ان پر سوتیلے بہن بھائی ہونے کا رشتہ بندھاتے ہیں۔

کبھی کبھی ہمیں اس کے شوہر کو دیکھ کر اچنبھا ضرور ہوا۔ وہ خاصہ بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بڑا ہی سنجیدہ، گوارہ صورت اور کافی حد تک دیدہ زیب۔ قمیض پتلون تو اس پر بھلی لگتی تھی۔ بہت دن تک تو ہم نے اس کی آواز تک نہ سنی، صبح سویرے وہ اپنی روزی کمانے نکل جاتا، کبھی کبھی دوپہر میں آجاتا ورنہ رات گئے گھر واپس لوٹتا کچھ دن تک تو ہم اس شبہ میں مبتلا رہے کہ بہنی کا کوئی شوہر ہے بھی یا یہ خواہ مخواہ کسی خیالی مخلوق کے بارے میں محبت بھری کفر اور نفرت بھری محبت کا رونا رویا کرتی ہے۔ پھر ہم نے اس خاموش طبع، سنجیدہ اور گوارا صورت کو دیکھا تو سوچ میں پڑ گئے کہ بہنی کو مارنے پیٹنے کا غیر سنجیدہ عمل یہ کیسے کرتا ہوگا؟!!

ہم نے اپنی حیرت کو یہ کہہ کر دور کیا کہ اس جہان فانی میں ہر شے ممکن ہے ——

بہنی خود کہتی۔

"کھدا کسم بہنی۔ سکل سے کوئی کا کہیئے کہ یہ مرد وا ایسا مردار بیٹا ہوئیے۔ سچ کہت رہیں، موت ہیں بھولی سکل والے زلاد بھی ——"

وہ دن تو بہنی کی زندگی کا حسین ترین حادثہ ہوتا جب وہ اس سے کوئی میٹھی بات کر لیتا، اس روز ہمارے یہاں آ کر بہنی اس طرح چہکتی کہ بولتی مینا بھی کیا شور مچائے گی! خوشی اس کے استخوانی چہرے کو یکم آلود بنا دیتی، اس کے میلے کچیلے کپڑوں سے اس کے بدن کا ارتعاش، چھپائے نہ چھپتا۔ اس کی باتوں میں ابلتے ہوئے چشمے کا سا جوش ہوتا، اور اس کی باتیں ہمارے جسم ہی نہیں روح تک میں گدگدی کرنے لگتیں، ہم بے اختیار قہقہے لگانے لگتے۔

وہ اپنی دانست میں، ساری کائنات کا سلیقہ سمیٹ کر کہتی۔

"بہنی۔ کا کہوں۔ سچی بات ہے۔ سورت، سکل کے علاوہ وہ دل کے بھی اچھے ہیں مگر اوئی کم بکھت۔ نرگس وانے کھراب کردیا ان کو۔ ورنہ لاکھوں میں ایک ہیں۔" خوشی کے بہتے آبشاروں میں یہ دیہاتی الفاظ، عجیب سا سماں پیدا کردیتے

پھر بہنی کے ساتھ ساتھ "اوئی کم بکھت نرگس وا" کے قصے بھی ہمارے لیے دلچسپی اور تفریح طبع کا سامان بن گئے۔ کون سا دن خالی جاتا جب بہنی اس کا ذکر کوسنوں، گالیوں اور عجیب و غریب کہاوتوں کے ساتھ نہ کرتی۔

غیر شعوری طور پر اس کہانی میں اب ہمارا رول صرف تماشائی کا ہی باقی نہ رہا۔ بلکہ اس سے بلند اور قریب تر ہو گیا۔ ہمیں اب نرگس کو دیکھنے کا بھی اشتیاق پیدا ہو گیا۔

ایک دن کیا ہوا کہ آفت آ گئی۔

بہنی کی تیز تیز آواز کہیں دور کھوئی ہوئی تھی۔ اس کی جگہ سرگوشیوں نے لے رکھی تھی۔ اور اسی اخلاق اور وہ بڑے ہی رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔

اس کے چہرے کی زردی اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ لو لگا ہوں میں، اداس اداس صحرا سے جاگ پڑے تھے۔ مہرن حسب معمول خاموش ڈری، ڈری اور معصوم معصوم بہنی کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

راز یہ تھا کہ نرگس آرہی تھی۔ میاں نے حکم دیا تھا کہ اس کے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرو۔ دن بھر رہ کر شام کو اس کے جانے کا پروگرام تھا۔ اور یہ سب کچھ نرگس کی اپنی خواہش کا نتیجہ تھا۔

وہ بہنی سے ملنے کی آرزو مند تھی۔

خالہ نے بڑے ہی تمسخرانہ انداز میں اس کے چلے جانے کے بعد تائی سے کہا ... —— وہ نرگس شاید اس "چڑیا خانہ" کو دیکھنے کے لیے

مشہود انور

بہنی

"دل جلا، جل کر کھاک بھیا، دئی کھاک میں کا رکھا ہو۔"

وہ خالہ سے بڑے عاشقانہ انداز سے کہتی، جس میں درد کا گداز بھی شامل ہوتا۔

خالہ، امّی اور گھر کے دیگر افراد اُس کی اسی ادا پر، اس کی عدم موجودگی میں قہقہہ بلند کرتے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ جاتے لیکن جب وہ موجود ہوتی تو اس کی صورت، اس کی باتوں کا انداز، آس کا گنوار لہجہ، ہم سب کو صرف مسکرا لینے کی ہی اجازت دیتا۔

اس کی ہیئت بھی کچھ عجیب۔ وہ اس کا مختصر سا، پرانی لکڑی کی طرح زرد جسم، اس پر دیہاتی تراش کے کپڑے، چہرے کے ... کرتے ہوئے نقوش، مری ہوئی جو ہیّا جیسی ... کے ساتھ گندھی ہوئی۔ ہر نقی کی گود میں ... اس کے جسم پر منڈھا ہوا سیاہ برقعہ۔ اور سب سے بڑھ کے بقول خالہ اس کی دم کے ساتھ "بیٹی" ہوئی ایک مختصر سی لڑکی۔ جو اس کی ڈپلی کیٹ معلوم ہوتی۔ مگر وہ پھٹکار سی جو اس کے چہرہ کا خاصہ تھی اس ننھی منی ۷۔۸ سال کی لڑکی پر جو غالباً اس کی بھانجی تھی، نظر نہ آتی، بلکہ ایک ڈری ڈری معصومیت چھائی رہتی۔ اور اس کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہمدردی ہونے لگتی۔

وہ ہمارے کوارٹر سے بالکل ملحق کوارٹر میں اپنی اس بھانجی جس کو وہ مہرن کے نام سے پکارتی، کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کا شوہر کہیں انشورنس ایجنٹ تھا جو دن بھر غائب رہتا۔ اور رات کو جب واپس آتا تو اکثر اس کی سسکیاں ہمارے گھر کی چہل پہل سے آٹکراتیں اور خالہ اور امّی میں کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔ ہم سمجھ لیتے کہ آج اس کی پٹائی ہو رہی ہے۔

ان دونوں میاں بیوی میں بنتی ہی نہ تھی۔ اور بہنی کے ساتھ اکثر یہی ہوتا تھا کہ وہ جلی کٹی باتیں کرتی اور اس کے میاں اس کی زبان درازی کے جواب میں اپنے ہاتھ یا ہاتھوں میں جوتے لے کر استعمال کرنا شروع کر دیتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ اس کا شوہر رات کہیں باہر گزارتا تو سناٹے میں کوارٹر کے اندرونی حصّوں سے مہرن کی ہلکی ہلکی سسکیاں ہمارے کانوں سے آٹکراتیں اور ہمیں اس عورت سے تنفّر سا ہو جاتا۔ امّی کہتیں۔

"یتیم بچّی پر ظلم کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ آ کر دھنتا ہے۔ خدا کرے خوب پٹا کرے، بہنی کی بچّی ——"

وہ رات جب اس کا شوہر خوب اسے مار پیٹ لیتا تو دوسرے دن بہنی ہمارے گھر آ کر گھنٹوں بیٹھی اپنا دکھڑا رویا کرتی —— اور منھ بنا بنا کے کہتی ——

"ہم سوچت ہیں بہنی اللہ میاں ہم کا کاہے پیدا کیے رہن۔ کا یہی روج روج جوتے کھانے لا ہئی۔"

یہ واقعات ہمارے لیے روز کی دلچسپیوں کی مثال تھے۔

خالہ سے اس کی خوب چھنتی تھی وہ ان کو "بہنی" سے خطاب کرتے ہوئے، اپنے مخصوص پوربیہ لہجہ میں جلی کٹی سناتی رہتی، اپنی قسمت اور شوہر دونوں کو کوسا کرتی۔

اور ردِ عمل یہ ہوا کہ گھر کے بچّے تک پوربیہ بولی میں اظہارِ کلام کرنے لگے۔ اور سچی بات بھی یہی ہے کہ ان بچوں نے ہی اوّل اوّل اس کو "بہنی" کہنا شروع کیا تھا۔ اور تب سے یہ نام اتنا عام ہو گیا تھا کہ اس کے اصلی نام سے واقف ہونے کی جی بھی نہ چاہتا تھا۔

شروع شروع میں جب ہم لوگ اس کے پڑوس میں آباد ہوئے

میں سرخی اُبلی پڑ رہی تھی، جیسے پر بڑا عیا اپنک جسم تڑپ رہا تھا اس نے سپناتے ہوئے کہا کہ آج وہ اسرار کو اس کی سزا دلوائے گی۔ کیونکہ رات بھر وہ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ارمانوں کا گلا گھونٹتا رہا تھا۔

"آج جیت گئے سسرکا۔" وہ یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

خالہ نے اسی کے لہجے میں کہا "امی۔ کرمو کا بھتی ــــ ہے مگر جواب میں صدائے بازگشت بھی نہ ملی۔

رات کا ایک بجا ہوگا۔ ہم سب ابھی نیند میں غرق تھے۔ خنک ہواؤں کی پھوار میں میٹھے میٹھے سپنے جاگ رہے تھے کہ اچانک دیں سے تیز تیز رونے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہماری نیند ٹوٹ گئی ہائے سپنے سو گئے۔

بھنی اور مہرن دونوں بری طرح چیخ چیخ کر رو رہی تھیں جیسے کوئی مر گیا تھا۔ ہم سب ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

"کیا بات ہے مہرن ــــ؟" خالہ نے نیند میں ڈوبی آواز کو سنبھالتے ہوئے آواز دی رونے کی آوازیں، ذرا دیر کے لیے رکیں اور پھر جاری ہو گئیں۔

ہم لوگ بھی قدرے پریشان ہو گئے تفصیل معلوم کرنے کی سعی کی تو پتہ چلا کہ ہم جس کہانی سے لطف لیا کرتے تھے اس کا بنیادی کردار ٹریجڈی کا شکار ہو گیا ہے۔

بھنی نے بتلایا کہ اسرار ابھی تک نہیں آیا۔ اور اب اس کے آنے کی امید بھی نہیں کیونکہ دن میں بھنی کا کوئی بھائی آیا تھا۔ جو "معقول بھنی، ملنگو باز۔ گنڈا آدمی۔" تھا۔

بھنی تو دن میں بھری بیٹھی تھی، اس نے روتے ہوئے جب اس کو اسرار کا ردیہ بتلایا تو وہ قسم کھا کر چلا گیا کہ اس کو زندہ نہ چھوڑوں گا ــــ

"ہائے اب کون سجا نپٹ رہا ہے۔ کون انتجار کرا ہی یئے۔ کون مو کا پیٹے ــ"

اس کی آواز میں اتنی درد بھری کیفیت تھی کہ ہماری آنکھوں میں بھی آنسو لرز اٹھے۔

ہم ایک گمبھیر خاموشی میں ڈوب گئے۔

اور کتنی ہی دیر یہ تاثر قائم رہا۔ وقت گزرتا ہی رہا۔

خنک رات، سناتی ہوئی خاموشیاں جگا رہی تھی۔ مہرن اور بھنی کی آہ و زاری اس سناٹے کو اور بھی گہرا کر رہی تھی۔

"مہرن ــــ" ایک مردانہ آواز گونجی۔ ہمارے دل ہماری زبانوں پر آ گئے۔ مانی گریہ کی جیسی کسی نے گردن دبوچ لی۔ یہ آواز اسرار کی تھی۔

نہ جانے کس نے دروازہ کھولا۔

پڑوس میں بالکل ہی خاموشی چھا گئی۔ قبرستان کی جیسی خاموشی!

ہم سب منتظر رہے کہ اب کیا ہوگا۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ ہم سونے کے لیے دوبارہ خود کو آمادہ کرنے لگے۔

کچھ دیر کے لیے ہلکی ہلکی باتوں کی آوازیں پڑوس سے آئیں اور ہم کو نیند کے سرور نے گرفت میں لیا ہی تھا کہ ترڑ ــــ دھڑ ــــ دھڑ ترڑا خاموشی کے گہرے سمندر میں جیسے طوفان آ گیا۔

مہرن کی روں روں پھر جاری ہو گئی۔ اور اس کے ہمراہ بھنی کی سسکیاں ــــ

لیکن الحمد للہ ان سسکیوں میں بڑا ہی اطمینان تھا ــــ سارا ماحول تبدیل ہو کے رہ گیا۔

خالہ نے مزاحیہ انداز میں امی کو نیند سے بیدار کرتے ہوئے کہا ــــ "دل جلا۔ جل کر کھاک ہوا۔ اری کھاک میں کا رکھا ہے۔"

امی نے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا ــــ "پیسری۔ کوئلہ بھی نہ راکھ ــــ"

غزل اردو کی آبرو ہے
غزل کی آبرو
"نوائے کفر" منوّر لکھنوی
کی غزلیات کا پہلا انتخاب قیمت ڈھائی روپے
چار رنگا سرورق کتابت طباعت اعلیٰ
ملنے کا پتہ:- اورنگ کتاب گھر، ۲۹-۲۸-۲ فیض گنج دریا گنج دہلی

بجاب ہوگی۔"

بہنی بڑی فکر مند تھی، اس نے خالہ اور امی سے مشورہ کیا تھا کہ کیا پکایا جائے، کیا پہنا جائے، گھر کو صاف ستھرا کس ڈھب سے کیا جائے۔ میاں کو تو کبھی اس کے ہاتھ کا کھانا نہ پسند آیا اور نہ کبھی اس کے کپڑے میں جاذبیت نظر آئی۔ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں نرگس کے سامنے اس کی بےعزتی نہ ہو جائے۔

خالہ اور امی کے مشورہ پر اس نے کئی قسم کے کھانے پکائے۔ اور اس کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ تو بے چاری چنے، ماش اور مسور کی دال ہی ابالنے میں ماہر تھی۔ اور یہ بھی ایک سبب ہوتا کہ اس بے ذائقہ کھانے پر وہ روئی کی طرح دھنک دی جاتی۔ خیر وہ تو آپس کا معاملہ تھا لیکن نرگس کی موجودگی میں ذرا کرکری بھی ہو گئی تو حد درجہ ناقابل برداشت ہوگی۔

"اس دن بہنی نے احتیاط سے سینت کر کھا ہوا اچکن کا جوڑا پہنا۔ مہرن کو نہلایا دھلایا، اس کو بھی جھلی ضید کا سلا ہوا جوڑا زیب تن کرایا۔

بس یوں معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی کسی اسٹیج سے اتر آئیں ہیں یہ دونوں۔

نرگس جب آئی تو بچوں نے پہلے ہی ادھم مچا دیا "بہنی کے میاں کے ساتھ کوئی عورت آ رہی ہے۔"

افسوس پڑوس کے کئی دروازے نیم وا ہوئے اور پھر جھٹ سے بند ہو گئے۔

وہ خاصے سڈول جسم کی بے برقعہ عورت تھی سفید شلوار اور سفید جمپر میں ملبوس کھٹتے کے ساتھ وہ بہنی کے میاں کے ساتھ آ رہی تھی، دور سے خاصی سنور لگ رہی تھی، قریب آئی تو معلوم ہوا یہ دوشیزگی مصنوعی تھی۔

نرگس نام کے اعتبار سے خاصی کومل مگر صحیح معنوں میں سخت اور تیمر علی واقع ہوئی تھی۔

اس کے چہرے مہرے سے تو زیادہ دلکشی کا احساس نہیں ہوتا تھا لیکن آواز اور لب و لہجہ میں یقیناً ایک جادو تھا شستہ، مہذب اور نرم گفتگو ہر مخاطب کو موہ لینے کے لیے کافی تھی۔ آخر تھی بھی

کسی اسکول کی استانی۔

وہ دن اور رات خیر سے گزر ہی گئے۔ کیونکہ ہمارے کوئی خاص ہنگامی حالات ظاہر نہیں ہوئے۔ بلکہ اچھا خاصہ سکوت طاری رہا۔

دوسرے دن، بہنی خالہ سے کہہ رہی تھی۔ "بہنی ہم ابھی ہوئی گولہ ہے کہ تنک ہم ہو' اردو پڑھ لے ای کل میونسپلٹی میں داخلہ کرا دیو۔ لونڈیا لوگ ہنسیں تو کہ بوڑھی تو تا پڑھے پر کر میں کا؟"

یہ کہتے کہتے وہ کسی گہرے سوچ میں ڈوب گئی۔

خالہ اس کا قریب کے پرائمری اسکول میں داخلہ کرا آئیں۔ ہم لوگ رات گئے تک اس بات پر ہنستے رہے کہ بہنی پڑھے الف سے آم۔ ب سے بکری۔ کاف سے کلم۔ ہم لوگوں نے ان کی زبان میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

نرگس کے جانے کے بعد جہاں یہ تبدیلی ہوئی کہ بہنی نے اسکول میں داخلہ لے لیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ بہنی کی روزانہ پٹائی ہونے لگی اور مہرن پر بہنی کے استوانی ہاتھ اٹھنے لگے۔

ہر رات ہمارے کانوں میں رونے پیٹنے کا شور رہتا۔

ایک دن شام ہوتے ہوتے معلوم ہوا کہ نرگس آئی ہے میں جیسے زندگی مچل اٹھی۔ نرگس کے انداز، اس کا آرائش جمال کچھ ناقابل برداشت ثابت ہونے لگے۔

رات گئے تک نرگس اور بہنی کے شوہر کے سارا احمد کے قہقہے، اس کے کوارٹر میں رقصاں رہے، کبھی کبھی بہنی کی آواز بھی ابھر آئی۔ غالباً نرگس بہنی کے پڑھنے والی خبر سے ہوئی تھی اور اب بہنی سے لطف لے رہی تھی۔

ہمارے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے اور ان کا ایک آدھ ہی ان کے درمیان کی تمام گفتگو سے نقاب اٹھا دیتا۔ ہم بھی دیر تک باتیں کرتے رہے قہقہے بلند کرتے رہے۔

رات کافی خنک تھی۔ نیند کے جھونکے آنے لگے۔ ا... سو گئے۔

صبح ہوتے ہوتے رات کی رونق، اسرار کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی، اسکول جاتے ہوئے بہنی ہمارے گھر آئی۔ تو اس

اور اب وہ خاموشی سے خلاؤں میں گھورتا رہا۔ پھر اس نے شیلا کی سمت نظر کی۔ یہاں اس کی بیوی شیریں کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ ایڈیوکلب کی موسیقی کانوں میں رس گھولنے لگی شیریں مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خلوص جھانک رہا تھا اور حیا ٹپک رہی تھی۔ لگنے لگا کہ ابھی شیریں کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے نکلے گا "سترانج!"

مگر اچانک شیریں کی مسکراہٹ گدھ کے پروں کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کے جنازے پر کئی گدھ پارسیوں کی آخری مذہبی رسم پوری کر رہے تھے ..... اور اس بوڑھے کی ویران آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ شیریں آج اس دنیا میں نہیں تھی۔ رستم جی نے بنگلور میں اپنی بزنس قائم کر لی تھی اور بہت کم ممبئی آیا کرتا تھا۔ چند مرتبہ وہ ممبئی آیا مگر وہ اپنے بوڑھے باپ سے ملاقات کئے بغیر جلد ہی واپس چلا گیا۔

اور وہ بیچارہ اپنے گھر میں اکیلا پڑا رہا۔ اس کا نوکر پیٹر اور ایک "گھاٹن" اس کی خدمت کے لیے تھی۔ جب کبھی اس کا دل گھبرا جاتا تو وہ سمندر کے کنارے آجاتا۔ اور آج وہ ساحل کی دیوار پر بیٹھا بیقرار موجوں کو دیکھ رہا تھا۔

اس کا جسم ٹکرائے ہوئے سفینہ کی طرح شکستہ تھا۔ اس کے لانبے بال سمندر کی جھاگ کی طرح سفید تھے اور اس کے گورے چہرے پر جھریوں کے نشان اس طرح ابھر آئے تھے جیسے سمندر کی لہروں میں روشنی کا عکس۔

یکایک اس کے دل نے محسوس کیا، "یہ دنیا ..... یہ نظارے میرے بعد بھی رہیں گے۔"

چند برس بعد میں اس دنیا میں نہ رہوں گا ..... گدھ میرا جسم نوچ نوچ کر کھا رہے ہوں گے ..... لیکن! ..... لیکن میں کیوں اب تک زندہ ہوں؟ ..... اے معبود! ..... اے آتش ..... تیری کیا مرضی ہے ..... مجھ سے کیا کام لیا جائے گا ..... میں! ..... میں تو کسی کام کا بھی نہیں ..... صرف! صرف ..... بینک کے سود پر اپنا خرچ چلا رہا ہوں۔ میں زندہ رہ کے کیا کروں گا؟ ..... کیا کروں گا۔

اسے ان سوالات کا جواب نہ پاکر اور بھی کوفت ہوئی ..... اس نے خود سوچا کہ اسے ایسے سوالات نہ سوچنا چاہئے ورنہ پریشانی اور بڑھ جائے گی ..... وہ تو یہاں سکون حاصل کرنے آیا ہے ..... اور وہ کافی دیر تک اپنے جذبات کو دباتا رہا۔

دفعتاً اس کے دل میں خیال ابھر آیا ..... سکون؟ ..... وہ سکون کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ سکون کب حاصل ہوتا ہے اور وہ اسی عنوان پر سوچنے لگا اور آخرکار اس نے نتیجہ نکالا کہ سکون اس وقت حاصل ہو جاتا ہے جب انسان اپنی خواہش پوری کر لیتا ہو۔

"لیکن میری تو اب کوئی خواہش نہیں۔"

مگر اسے خود ہی جواب ملا "نہیں! ..... تمہارے دل کی خواہش آج بھی حسرتوں کی شکل میں موجود ہے۔ کیا تمہارے دل میں یہ حسرت نہیں کہ بحری جہاز ڈوب جانے سے تمہاری مصوری کے مشہور پورٹریٹ نذر ہو گئے؟ ..... کیا تمہارے دل میں یہ حسرت نہیں کہ جولی کی شادی کریم بھائی شیشہ والا کے بجائے دستور کے دل سے ہوتی؟ ..... کیا تمہاری یہ حسرت نہیں کہ شیریں اس دنیا سے نہ جاتی اور اسے گدھوں کے حوالے نہ کیا جاتا .....

..... کیا تمہارے دل میں یہ حسرت نہیں کہ رستم جی تم سے ملنے آتا اور پیار کے دو میٹھے بول کہہ دیتا ..... کہو! ..... کہو!

..... جواب دو پالن جی!

اور جواب میں پالن جی کی پلکوں سے دو قطرے سرد ہو کر گر پڑے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا تم ٹھیک کہتے ہو دوست! مجھے واقعی سکون نہیں۔ آج میرے دوست اس دنیا میں نہیں۔ کہیں جانے کو بھی دل نہیں چاہتا ..... اکثر بیمار سا رہتا ہوں ..... کہاں دل بہلاؤں! ..... اف! مجھے سکون نہیں۔

وہ اپنی کسٹن میں آکر بیٹھ گیا اور کار کو لابہ کونڈوے کی طرف موڑ دی۔ اور اپنے فلیٹ جا پہنچا "گھاٹن" واپس جا چکی تھی اور پیٹر سینما دیکھنے کی اجازت مانگ کر پہلے ہی جا چکا تھا۔ اس نے خود اکتا کر پانی پیا اور کمرے میں جاکر اپنی پرانی پینٹنگس کو دیکھنے لگا۔ کسی پورٹریٹ میں غریب بچہ رو رہا تھا کہیں ٹرک چٹان سے ٹکرا گیا تھا۔ کہیں دیہات میں تین چار بوڑھے دوپہر کے وقت درخت کے سائے میں بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ کہیں سوئٹزرلینڈ کی پہاڑی پر کوئی لڑکی سکیٹنگ کر رہی تھی۔ لندن کے چیرنگ کراس پر عاد

قاضی سید عارف الدین



سورج ڈوب چکا تھا اور چوڑی چوڑی سڑکوں پر مرکری لیمپ نگینوں کی طرح چمک رہے تھے۔ گیٹ وے آف انڈیا پر ابھی خاصی بھیڑ تھی۔ پورے گیٹ وے آف انڈیا پر ہلکی روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ یہ روشنیاں سمندر میں بھی چل رہی تھیں۔ سامنے تاج محل ہوٹل کے پورچ سے غیر ملکی آفیسر اتر اتر کر اپنی اپنی امپالا، کرائیسلر، جاگوار، بیوک، پون ٹیک جیسی کاروں میں روانہ ہو رہے تھے۔ یہ کاریں ایک اسٹین کر پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئیں اور وہ اسٹین گیٹ وے آف انڈیا کی سمت آ کر بہت سی کاروں کے بیچ رک گئی۔ اس میں سے ایک بوڑھا شخص نمودار ہوا۔ اس نے نہایت آہستگی سے کار کا دروازہ بند کیا اور گیٹ وے کی طرف آیا۔ یہاں کوئی نشست خالی نہ تھی۔ کچھ لوگ چادر بچھا کر گیٹ وے کے فرش پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے مختلف قسم کے چھوٹے بڑے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ وہ بوڑھا شخص ان کے درمیان سے ہوتا ہوا اور جگہ تلاش کرتا ہوا دور تک سمندر کے کنارے کنارے چلا گیا۔ آخر وہ رجا کردہ ساحل کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اس نے نیچے سمندر کی لہروں کو دیکھا جو چاند کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہی تھیں۔ کوئی لہر چاند کو زور سے گدگداتی اور ادھر سے چاند کے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی۔ چاند مچل مچل جاتا اس کے بعد دوبارہ خاموشی چھا جاتی۔ کبھی کبھی کوئی دور سے آواز لگاتا۔ ناریل والا۔ ناریل پانی والا۔

اس نے دائیں طرف نگاہیں اٹھائیں۔ دور ریڈیو کلب میں دائمن۔ پیانو اور گارڈین پر Summer Place کی دھن بج رہی تھی اور اس موسیقی پر مولین جھوم جھوم کر ریڈیو کلب کے پایوں سے ہم آغوش ہو رہی تھیں۔ مگر اس حسین ماحول کی تاثیر اس بوڑھے کے لیے ماضی کا فسانہ تھی۔

ہاں! ماضی کا فسانہ جس میں سیٹھ زید۔ جولی۔ اور رستم کھڑے مسکرا رہے تھے۔

وہ آسمان کی ہلکی روشنیوں میں گھورنے لگا۔ انہیں جولی کے مدھم نقوش ابھر آئے۔ جولی مسکرا رہی تھی۔ لیکن یکایک جولی کی مسکراہٹ ختم ہو گئی۔ کیونکہ لوپیرج کے بعد اس کی مسکراہٹ پر کریم بھائی شیشہ والا کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنی جولی کی شادی پارسی خاندان کے ابھرتے ہوئے نوجوان دستور سے۔ اپنے سے کرانا چاہتا تھا۔ لیکن!.... لیکن!.... لیکن!

قاضی سید عارف الدین اردو کے ایک نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ یہ شاید ان کا پہلا افسانہ ہے جو کسی "صاحب حیثیت" ماہنامہ میں شائع ہو رہا ہے۔ ان کی کہانی کے عنوان سے ادارہ متفق نہ تھا اسے بلا عنوان شائع کیا جا رہا ہے۔ اور یہ کارنیک، آپ کے حوالے کیا جا رہا ہے ——— آپ اپنی پسند کا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو عنوان پوسٹ کارڈ پر لکھ کر ماہنامہ کتاب۔ چوک۔ لکھنؤ۔۳ کو بھیج دیجیے! ۱۰ مئی تک موصول ہونے والے سب اچھے عنوان کو ۶ ماہ کے لیے اور دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والے عنوانات پر تین تین ماہ کے لیے ماہنامہ کتاب مفت جاری کر دیا جائے گا۔ ——— ادارہ

شری متی وسبے ہان
ترجمہ: عشرت صدیقی

قصّہ حاتمِ ثانی

منیر شامی سو جان سے حسن بانو پر فدا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک فوٹو گرافر دوست کی مدد سے حسن بانو کی ایک تصویر بھی حاصل کر لی تھی۔ جسے وہ ہر وقت اپنے پورٹ فولیو میں رکھتا تھا۔ یہ پورٹ فولیو منیر شامی کے ایک دوست کا تھا، جو پرانا ہو جانے پر منیر شامی کو بطور تحفہ ملا تھا جسن بانو کا قول تھا کہ وہ محبت کے بغیر شادی نہیں کرے گی لیکن وہ اسی سے محبت کرے گی۔ جو کم عرصے میں شارٹ کٹ راستے سے کامیابی کی منزل پر پہنچ کر دکھائے گا۔

منیر شامی نے حسن بانو سے کئی بار کامیابی کا راز دریافت کیا مگر وہ ہر بار اپنے شانوں کو جھٹک کر کہتی "تم عجیب کنڈیڈیٹ ہو، جو امتحان سے قبل ہی پرچے کی ساری عبارت جان لینا چاہتے ہو۔ میں تمہیں چھ ماہ کی مہلت دیتی ہوں، کیونکہ میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد فوراً ہی شادی کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ خدا کا شکر بجا لاؤ کہ میں نے تمہیں حاتم بادگرد کی خبر لانے کے لیے نہیں بھیجا، مرغابی کے انڈے کے برابر موتی نہیں مانگا اور سات کاموں کے بجائے صرف ایک ہی کام سونپا ہے۔ اب تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

منیر شامی بے حد پریشان تھا۔ اس نے اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں سے رائے لی۔ سبھوں نے یہی کہا کہ چھ مہینے میں کامیابی حاصل کرنے کا نسخہ انہیں نہیں معلوم۔ صرف منشیات یا سونے اور جواہرات کی اسمگلنگ سے ہی یہ ممکن ہے لیکن اس کام میں دھر لیے جانے کا اندیشہ ہے۔ سرکار کھایا پیا سب اگلوا لیتی ہے۔ رسوائی اور قید الگ سے بھگتو۔

ایک دن خوش قسمتی سے کافی ہاؤس میں منیر شامی کی ملاقات حاتم طائی سے ہو گئی۔ حاتم عوامی خدمت گار تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی بھلائی کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ خدمت خلق ہی اس کا پیشہ تھا۔ وہ کسی کے لیے ملازمت کا انتظام کرتا تو کسی کو ملک سے باہر سیر و تفریح کے لیے بھجوا تا۔ کئی عشق زدہ مجنوؤں کی مشکلات بھی اس نے آسان کی تھیں۔ اس کی فیاضی کا شہرہ دور دور تک تھا۔ حاتم نے منیر شامی کے لیے کافی منگوائی اور بڑے اشتیاق اور ہمدردی سے اس کی داستان سنی پھر کہا۔ "تم بڑے نیک اور ذہین نوجوان معلوم ہوتے ہو۔ اب میں تمہارا ہی کام انجام دینے کے لیے نکلا ہوں۔ اور جب تک تمہاری محبوبہ سے تمہاری شادی نہ کرا دوں، چین نہ لوں گا۔"

منیر شامی سوچ رہا تھا ۔۔۔ اب بھی فرشتے دنیا سے ناپید نہیں ہوئے ہیں۔

حاتم نے پوچھا "شہزادے! تم نے یہ نہیں بتایا کہ کون سی لائن میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو آیا سیاست میں یا بزنس میں؟ ویسے میری رائے میں تو سیاست سے زیادہ سہل کامیابی کی کوئی دوسری لائن نہیں ہے۔"

منیر شامی نے کہا۔ "میرے لیے سب لائنیں برابر ہیں۔ آپ جو مشورہ دیں گے، میں اسی پر عمل کروں گا۔"

"تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے اور اب تک کس کس ملازمت کے لیے کوشش کر چکے ہو؟"

منیر شامی نے بتایا کہ اس نے چار سال قبل ایم اے پاس کیا تھا۔ پھر آئی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں دو بار شریک ہوا لیکن دونوں بار ناکام رہا۔ ایک کالج میں پڑھانے کی نوکری ملنے والی تھی، وہ کسی پی۔ ایچ۔ ڈی کو دے دی گئی۔ پچھلے ہفتے ایک دفتر میں کلرکی کے انٹرویو میں گیا تھا۔ مگر وہاں بھی کسی دوسرے آدمی کی سفارش چل گئی۔

"برخوردار! یہ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ آج کل مقابلہ امیدواروں میں نہیں بلکہ سفارشوں میں ہوتا ہے۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے ایم اے پاس ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔"

ہو گیا تھا ...... اور پھر اس کے بعد ایک گیارہ برس کی لڑکی اپنی اسکول بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھی۔ یہ جولی تھی۔ سفید اسکرٹ۔ سفید رِبن سفید موزے اور سفید جوتے پہنے وہ صبح کی دھوپ میں بالکل پری لگ رہی تھی۔

وہ اپنی اس مصوری کو غور سے دیکھتا رہا۔ یہ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) آرٹ کی مثالی تصویر تھی۔ اس میں نقوش ہو بہو اتارے گئے تھے۔ صبح کی دھوپ میں ننھی جولی کے خوبصورت چہرے پر بہت عمدہ شیڈ نظر آ رہے تھے۔ اسے اچھی طرح یاد ہو کہ اس تصویر نے بین اقوامی مقابلہ میں دوسرا انعام پایا تھا۔ اس تصویر کے لیے اس نے (Renaissance) آرٹ کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور اب وہ خود بھی کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے نزدیک یہ آرٹ کا سب سے سنہری دور تھا۔ یہی وہ دور تھا جبکہ فن مصوری اپنا نیا انداز اختیار کر رہا تھا۔ بلکہ یہی وہ دور ہے جس کے بعد ہر فن نے اپنا ایک نیا انداز پیدا کیا۔ زمانہ بدلتا گیا۔ وقت کی ناگن کنڈلی پھیلا رہی تھی چلی گئی اور اس کی جھرّیاں نکھرتی گئیں۔ زمانہ ترقی کرتا چلا گیا۔ بڑے بڑے پلان اور پروجیکٹ بنے۔ سائنس کی ترقی کی رفتار بہت تیز تیز ہو گئی۔ راکٹ فضاؤں میں اڑنے لگے زمانے کی عمر بڑھتی چلی گئی ...... بڑھتی چلی گئی ...... جیسے جولی کی عمر آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی ...... اور ننھی جولی کا خیال آتے ہی اس کے خیالوں کے تانے بانے ٹوٹ گئے۔ اس نے غور سے جولی کی طرف دیکھا۔ اس کو ایسے لگا جیسے ننھی جولی بس کے انتظار میں نہیں بلکہ اپنے پریمی کے انتظار میں کھڑی ہے۔ اسے بہت غصہ آیا۔

اس نے جولی کی تصویر کو اٹھا کر دوسری تصویروں پر دے مارا اور کمرے سے باہر چلا آیا۔ سامنے گیلری کے پاس آ کر اس نے سرد ہوا میں گرم گرم سانس چھوڑ کر سوچا "اف! مجھے سکون میسر نہیں۔"

دل نے اسے سمجھایا "تجھے ہی نہیں، کسی کو بھی نہیں۔"

"کیوں! کیوں سکون نہیں؟" اس کی خاموشی میں چیخ تھی۔

اس نے فٹ پاتھ پر دیکھا کہ ایک فقیر کو پیسے مانگنے پر کس کس کے جوتے پڑے۔ وہ گڑگڑا رہا تھا اور تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا ...... نہ مارو! ارے باپ ...... مر گیا ...... نہ مارو ...... نہ مارو بابو!

دو دن کے بھوکے اندھے کو نہ مارو۔ بابو! ...... ہائے مر گیا ...... ارے مر گیا ...... بابو ...... بابو!

مگر بابو نشے میں تھا۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے اندھے کو الگ کیا۔ وہ رو رو کر اپنی لکڑی ٹٹول رہا تھا۔ کسی نے اس کا جی خوش کرنے کے لیے اٹھنی دے دی تھی۔ مگر وہ اندھا ابھی بھی ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

پالن جی اپنی گیلری سے یہ منظر نہ دیکھ سکا۔ اس کا دل چیخ اٹھا۔ "آہ! یہ سب کیا ہے۔"

وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ ایک الماری کے قریب آیا۔ اس نے الماری کھولی اور رم کی بوتل منھ سے لگا لی۔ پوری بوتل خالی کر کے وہ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد فلیٹ کی ہر چیز اس کا مذاق اڑانے لگی۔ ریڈیو گرام گھوم گھوم کر ناچ رہا تھا۔ ریفریجریٹر کے چلنے میں بونگو کی تال تھی۔ ٹیپ ریکارڈ سے گیت نکلنے کے لیے بے قرار تھے۔ صوفہ سیٹ سرگوشیاں کر رہا تھا اور قالین کے پھول اس پر قہقہہ لگا رہے تھے۔ ریشمی پردے ہنس ہنس کے بل کھا رہے تھے۔ وہ سب چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ "ہم تمہیں سکون نہیں دے سکتے ...... تم سکون کو دولت سے نہیں خرید سکتے ...... تم سکون جیسی عظیم چیز کو نہیں پا سکتے ...... اس لیے کہ تم نے سکون کو اونچی اونچی عمارتوں میں ڈھونڈا ...... تم نے سکون کو سائنس کی ایجادات میں چھان مارا ...... تم نے سکون کو اونچی اونچی عمارتوں اور ہوٹلوں کی ڈانس پارٹیوں میں تلاش کیا ...... لیکن سکون کہیں بھی نہیں!"

اور پالن جی تصویر غم بنا، ان صداؤں کو سنتا رہا ...... آہ! بیچارہ پالن جی! ...... معاشیات کے اصولو! دولت کمانے کے یہ کیسے گُر بتا رہے ہو جو امیروں کی تجوریاں دولت سے بھر دیں مگر ان کا دل خالی ہو گا ...... رئیسوں کی عمارتیں بلند ہو جائیں گی مگر ان کے کردار پست ہو جائیں گے ...... بڑے بڑے قابل لوگ عوام کی خوشحالی کی ترکیبیں سوچیں گے اور لوٹنے والے رشوت کے ایک داؤں سے ان کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیں گے ...... وہ دولت سے اپنے کام نکالیں گے۔ اگر دولت نہ مل گئی تو طاقت کام

(باقی صفحہ ۴۰ پر)

اور پلپر کو کس بات کا خطرہ ہے؟"

"واہ! اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ اس انگریز پرست زاد کی باتیں تم نے نہیں سنیں؟ اس ملک کی سرکار پلانوں کے ذریعہ ہر شئے پر قابو پانا چاہتی ہے۔ ان اشیاء پر بھی جو لوگوں نے اپنی محنت سے حاصل کی ہیں۔ پھر تم نے اپنے جگری دوست مہاراج باگھ پور کی مثال پیش کی۔ جو آزادی سے قبل سال میں آٹھ ماہ یورپ میں گزارتے تھے، اب مجبوری میں پڑے مر رہے ہیں۔ یورپ جانے تک کے لیے فارن ایکسچینج نہیں ملتا۔ جو پریوی پرس ملتا ہے اس سے کسی شریف آدمی کا گزارہ ہونا قطعی ناممکن ہے۔ ملک میں اتنی آزادی نہیں کہ لوگ بغرض تفریح ملک سے باہر جا سکیں۔ مجھ سے تو ان بندگانِ خدا کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ میں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ سب اس ظلم کے خلاف احتجاج کریں۔ اس خطرے سے تو ہمیں اور تمہیں جنگ کرنا ہے تم دستخط کر دو تاکہ بات آگے چلائی جا سکے۔"

منیر شامی نے فارم پر دستخط کر دیا۔

تب حاتم نے پوچھا۔ "تم اخباروں میں مضامین لکھ سکتے ہو؟"

"جی مجھے تو لکھنے لکھانے کا شوق کبھی نہیں رہا۔ لیکن میں کوشش کروں گا۔ کس قسم کے مضامین؟"

"اسی خطرے کے بارے میں جس کا ابھی میں نے ذکر کیا۔ میں تمہیں انگریزی رسائل کی ایک فہرست دیتا ہوں۔ ان میں تمہیں سارا مصالحہ مل جائے گا اور ہاں بہتر ہوا اگر اس درمیان میں تمہاری ایک آدھ کتاب شائع ہو جائے۔ تم نے ذکر کیا تھا کہ تمہارے کسی دوست نے ایک ناول لکھا ہے۔ اور وہ بہت مفلس ہے۔ اسے دو ہزار دے کر راضی کر لو کہ وہ ناول تم اپنے نام سے شائع کراؤ گے۔"

"جی، وہ تو بڑا خوددار آدمی ہے، ہرگز رضامند نہ ہوگا۔"

"وہ نہ سہی۔ اور بہتیرے مل جائیں گے۔ فی الحال تمہیں ترجمے کے لیے کتابیں مل جائیں گی۔ اور انٹرنیشنل ریٹ سے پیسے ملیں گے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے ادیبوں کو ترجمے کے لیے اتنی رقم نہیں ملتی۔"

"لیکن مجھے ترجمہ کرنا نہیں آتا۔؟"

"نہیں آتا تو حسن بانو سے شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ صلاحیت کے زور پر آگے بڑھنا چاہتے ہو تو پھر کامیابی کے چکر میں کیوں پڑے ہوئے ہو؟ جاؤ، کہیں جا کر کلرکی کر دو یا اسٹری کرو۔

دو زنانی گھوم رہی [illegible]

منیر شامی راضی ہو گیا۔ حسن بانو کی خاطر تو وہ آسمان سے تارے بھی توڑ لا سکتا تھا۔!

اب بڑے بڑے اخبارات میں منیر شامی کے نام سے مضامین شائع ہونے لگے۔ وہ تمام قومی مسائل پر اڈیٹروں کو لمبے لمبے خطوط لکھتا، جسے اڈیٹر نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ ہر ہفتے اسے ایک سیکریٹری سارے مضامین کئی زبانوں میں تیار کر کے دے جاتی تھی اور منیر شامی انھیں اپنے نام سے اخبارات میں بھیج دیتا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد منیر شامی نے حسن بانو کو اطلاع دی کہ اس نے چار سو روپے ماہوار پر ایک عالی شان فلیٹ لے لیا ہے۔ فی الحال تو اسکوٹر سے کام چل رہا ہے۔ مگر جلد ہی وہ کار کا انتظام کرے گا۔

اور اس خبر سے حسن بانو بہت مسرور ہوئی۔

بہت دنوں سے منیر شامی کی حاتم طائی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حاتم ایک خط لکھ کر چھوڑ گیا تھا کہ وہ ایک بدنصیب نوجوان کی امداد کے لیے دھیا چل پہاڑ کی جانب جا رہا ہے۔ اس نوجوان کی معشوقہ نے، جو ایک بڑے بزنس مین کی لخت جگر تھی، نوجوان سے کہا تھا کہ وہ اگر ایم پی ہو جائے تو وہ اس سے شادی کرے گی۔ مگر جب نوجوان نے اس کے گھر کے سامنے بھوک ہڑتال کی تب جا کر اس کا دل پسیجا اور وہ اس بات پر رضامند ہو گئی کہ وہ کم از کم ایم پی ہو جائے تاکہ کبھی منسٹری کا چانس مل سکے۔ نوجوان نے یہ شرط منظور کر لی اور حاتم کے پاس جا کر گڑگڑایا کہ اب میری عزت آپ کے ہاتھ ہے اگر میں کامیاب نہ ہوا تو خودکشی کر لوں گا۔ حاتم نے اسے دلاسہ دیا۔ اور اسے اپنے ساتھ اس حلقے میں لے گیا، جہاں سے وہ نوجوان کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اس نوجوان نے اس سے قبل اس حلقے میں کبھی اپنی صورت بھی نہیں دکھائی تھی۔ اور اپنے شہر میں بھی وہ کافی بدنام تھا۔ اس کے کردار کے بارے میں مختلف قسم کی افواہیں سننے میں آتی تھیں۔ اس نے کئی پریوں سے بیوفائی کی تھی۔

خیر حاتم لوگوں سے ملا۔ اس نے امراء سے وعدہ کیے کہ وہ پنج سالہ پلان کو رد کرا کے دم لے گا۔ اس نے ذات پات اور ہندو مسلم کا سوال اٹھا کر سینکڑوں جیپوں اور ٹرکوں کا بندوبست کیا۔ ایک مخالف کو بڑی رقم دے کر بٹھا دیا۔ ووٹروں میں مٹھائیاں، دودھ کے ڈبے، کمبل اور

اتنے میں ایک پری اور ایک پری زاد وہاں آئے۔ اور حاتم کو وِش کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ حاتم نے منیر شامی سے ان کا تعارف کرایا۔ اور بتایا کہ یہ ماہ رخ حسنہ پری ہے۔ اور اس کے ساتھ انگلستان کا پری زاد آرتھر دین ہے۔ جو ایک بار ادیب ہے جو ساؤتھ سے چلا ہے۔ اور وہ ان دنوں ہندوستان سیاحت کی غرض سے آیا ہوا ہے۔

منیر شامی نے آرتھر دین سے پوچھا "کیا میں آپ سے دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کو کس بات پر غصہ ہے؟"

حسنہ پری نے انداز تفکرانہ کہا "غصہ تو انہیں اپنے آپ سے ہونا چاہیئے۔!"

آرتھر دین نے جواب دیا۔ "غصے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مثلاً جب سے میں ہندوستان آیا ہوں، مجھے ہر بات پر غصہ آتا ہے یہاں کی گرد پر، گندگی پر، گرمی پر، بھکاریوں پر، آپ کی سرکار پر، ہیلیکوپٹر پر، آپ کے جنسی آرٹ پر اور سب سے زیادہ اپنے آپ پر۔ کیوں کہ مجھے یہ سارے نظارے دیکھنے پڑتے ہیں۔"

حسنہ پری نے زوردار قہقہہ بلند کیا۔ "دس بارہ سال بعد یہ گندگی کم ہو جائے گی۔"

"معاف کیجیئے، جس رفتار سے آپ کے ملک کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور لوگ جس ڈھنگ سے نالی میں کلبلاتے ہوئے کیڑوں کی مانند رہتے ہیں، اسے دیکھ کر تو ایک جرمن ادیب نے درست ہی کہا ہے کہ ہندوستانیوں کو فولاد کے کارخانوں کی بجائے گیس چیمبرز کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے کوئی یہودی تو نہیں؟ گیس چیمبرز کی بات سے یہودی بہت بھڑکتے ہیں۔"

اس کے بعد ہندوستان کی خارجہ پالیسی، پنج سالہ پلان کی ناکامی اور ہندوستانیوں کی جہالت کے متعلق باتیں ہوئیں۔

کافی پی کر پری اور پری زاد جانے لگے تو حسنہ پری نے حاتم سے کہا۔ "گزشتہ ایک ہفتے سے میں آپ کو مسلسل فون کر رہی ہوں۔ کہاں غائب ہو گئے تھے۔"

"ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے مدراس گیا ہوا تھا۔"

"آپ میری کتاب کب تک شائع کرا رہے ہیں؟" حسنہ پری نے پرس کے اندر سے آئینہ نکالا۔ لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

"میں نے ایک جگہ گفتگو کی ہے۔ امید ہے کام بن جائے گا۔"

"مگر دیکھیئے۔ کتاب پر دو چار بڑے آدمیوں کی رائے ضرور چھپنی چاہیئے۔"

جب پری اور پری زاد چلے گئے تو حاتم نے بتایا کہ حسنہ پری ایک لکھ پتی کی بیوی ہے ـــــ اور ادیب بننے کی بے حد خواہشمند ہے۔ ایک سال کے اندر اس نے تقریباً سو کہانیاں اور دو ڈھائی سو گیت لکھے ہیں مگر کوئی پبلشر انہیں شائع کرنے کو تیار نہیں وہ بڑے بڑے ادیبوں کے گھروں کے چکر لگا چکی ہے۔ سب اس سے کتراتے ہیں ایک ادیب نے اس کی اعانت کا وعدہ کر کے چار مہینے تک اس کی کار اپنے پاس رکھی تھی۔

منیر شامی نے پوچھا۔ "اس کا شوہر اس کی کتابیں کیوں نہیں چھپوا دیتا۔؟"

"وہ اپنے کام میں مصروف رہتا ہے اور وہ اسے خبطی سمجھتا ہے یہ کہتی ہے کہ اس کا شوہر آرٹ اور ادب کو سمجھنے کا شعور نہیں رکھتا یہ اپنے شوہر سے سخت نفرت کرتی ہے۔"

"تو پھر اسے طلاق کیوں نہیں دے دیتی؟"

"شہزادے! تم ابھی بھولے ہو۔ طلاق دے کر زندگی کیسے بسر کرے گی؟ ابھی اس روز میری ملاقات ایک مشہور ادیب سے ہوئی تھی جسے میں نے ایک ڈیلی گیشن کے ہمراہ پیرس بھجوایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آرام سے زندگی بسر کرنے کے صرف دو طریقے ہیں ـــــ یا تو خود کسی پیسے والے کے مرید بن جایئے یا کوئی پیسے والا آپ کا مرید بن جائے ...... اچھا، چھ بجے میرا ایک اہم اپائنٹمنٹ ہے۔ کل شام میں ہیں ملاقات ہو گی۔"

اگلے دن حاتم نے منیر شامی کو ایک فارم دیتے ہوئے کہا "برخوردار! تم اسے کو پر کر دو۔ اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔"

اس وقت حاتم کے چہرے پر فرشتے کی سی مسکراہٹ تھی۔

منیر شامی نے دیکھا، فارم میں مختلف قسم کے سوالات تھے ـــــ آپ کے سیاسی خیالات کیا ہیں؟ اسکول یا کالج کے زمانے میں آپ نے کسی ہڑتال میں حصہ تو نہیں لیا؟ آپ کے دوستوں یا رشتے داروں میں کوئی ٹریڈ یونین کا ورکر یا لیڈر تو نہیں ہے؟ ادیب کی آزادی اور کلچر کی حفاظت کے لیے آپ ہر قسم کا سیاہ و سفید کرنے کو تیار ہیں یا نہیں۔؟

منیر شامی نے کہا۔ "میں نے آخری سوال کا مطلب نہیں سمجھا۔ آزادی

ابراھیم رضوی

پانڈے جی

پانڈے جی اپنے کمرہ میں چارپائی پر آکڑوں بیٹھے ہوئے کچھ بڑبڑا رہے ہیں، بدن پر صرف ایک پائجامہ ہے اور وہ بھی محض دنیا کی شرم کی وجہ سے۔ ہر گلے میں ایک تعویذ پڑا ہوا جس کا ڈورا وہ اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہیں اور مستقل ہل رہے ہیں۔ ہونٹ چل رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بزرگ مراقبہ میں بیٹھا ہوا کچھ ورد کر رہا ہو، فرق یہ ہے کہ پانڈے جی کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور بزرگ کی بند ہوتی ہیں۔ مگر آنکھ کسی نوزائیدہ بچے کی طرح کسی چیز پر ٹھہرتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آنکھ سے دکھائی تو ضرور دے رہا ہو مگر کسی چیز کی شناخت نہ کر پا رہے ہوں۔ اور اس طرح سے ان کی دماغی الجھن کا پتہ چلتا ہے، پانڈے جی کے سامنے کوئی کتاب یا کاپی کھلی ہوئی رکھی ہے اور بے شمار کاپیاں، کتابیں بستر پر بکھری ہوئی ہیں۔ چہرہ رنج و الم کی تصویر بنا ہوا ہے۔ خود بہت کم بولتے ہیں اور دوسروں کو ان کے کمرہ میں سانس لینے تک کی اجازت نہیں ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک نظر سامنے کتاب یا کاپی پر ڈال لیتے ہیں اور دو تین سکنڈ کے لیے ان کے ہونٹ بند ہو جاتے ہیں۔ ہلنا رک جاتا ہے مگر فوراً ہی پورے جوش کے بڑبڑانے لگتے ہیں اور دگنی رفتار سے ہلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور آنکھیں ادھر ادھر بے خیالی میں گردش کرنے لگتی ہیں۔ یہ حالت پانڈے جی کی دن بھر اور رات کے بیشتر حصہ میں رہتی ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں یہ صرف تین، چار گھنٹے سوتے ہیں اور سونے سے پہلے گھڑی کا الارم لگانا نہیں بھولتے کہ کہیں آنکھ لگ نہ جائے اور یہ چھ، سات گھنٹے نیند میں ڈوبے نہ رہیں۔ ارے ہاں کوئی مذاق ہے، امتحان قریب ہو اور وہ بھی معمولی نہیں انگریزی ادب میں ایم، اے کا آخری سال ہو۔

پانڈے جی نے ایم، اے میں ہمارے ساتھ داخلہ لیا تھا۔ میری ان سے سب سے پہلے ملاقات تقریباً نصف سیشن کے بعد ہوئی تھی۔ انھوں نے مشکل انگریزی الفاظ بول کر مجھے متاثر کرنے کی کوشش کی تھی مگر دھیرے دھیرے یہ معلوم ہوا کہ پانڈے جی انگریزی کے الفاظ بولنے کا شوق خبط کی حد تک ہے۔ جانسن اور شیکسپیر والی انگریزی بولنا یہ اب بھی فخر سمجھتے ہیں۔ خیر تو میرے اور پانڈے جی کے تعلقات اس سال یونہی رسمی سے رہے زیادہ ربط و ضبط نہ ہو سکا مگر یہ ضرور معلوم ہو گیا یہ ہاسٹل میں رہتے ہیں اور بھلے آدمی ہیں۔

ایم، اے کے دوسرے سال میں ان سے تعلقات بڑھنے شروع ہوئے اور کافی ہو گئے۔ ہم لوگ ساتھ ہی گھومنگ کرنے لگے۔ ہلکی ہلکی سردی ہونے لگی تھی۔ پانڈے جی اپنا نیلا اور سفید چارخانہ کا سوئٹر پہنے ہوئے، ٹہلتے ہوئے گنج میں ملنے لگے۔ بڑے بڑے بال جن میں تیل پڑا ہوا، کتابی چہرہ دونوں کلوں میں پان دبا ہوا۔ ہونٹوں پر لالی جمی ہوئی۔ دبلے پتلے، گندمی رنگ، دبتا ہوا قد، ہمارے پانڈے جی۔ جب بھی گنج میں مل جاتے فوراً پیک تھوک کر بڑے تپاک سے ملتے، یہ پیک تھوکنے کا سلسلہ مستقل جاری رہتا چاہے وہ گنج میں ٹہل رہے ہوں یا سائیکل چلا رہے ہوں، بلا تفریق رذیل و شریف آپ چھپاک سے پیک تھوک دینے کے قائل تھے ان کی پان کی عادت کی وجہ سے ان کے مقابل بات کرنے والے آدمی کو کافی احتیاط رکھنا پڑتی تھی۔

پانڈے جی کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی ہے۔ اکثر فرمائش کے

روپے تقسیم کئے۔ مخالف امیدوار کے کارکنوں کو رشوتیں دیں اور وہ نوجوان الیکشن میں کامیاب ہو گیا۔ محبوبہ سے اس کی شادی ہو گئی!

اس درمیان میں ایک نیا مسئلہ پیش آیا۔ حسن بانو نے منیر شامی کو بتلایا کہ اس کا ایک پرچہ خراب ہو گیا ہے۔ اس میں زیادہ نمبر ملنے کی توقع تھی۔ اب وہ کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ منیر شامی ہی اسے رسوائی سے بچا سکتا ہے۔ "تم جا کر یہ پتہ چلاؤ کہ میرا پرچہ کہاں گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں لوگوں سے مدد لو۔"

منیر شامی نے حاتم کو ٹرنک کال کیا۔ اور ساری بات بتائی۔ حاتم ممتحن کی تلاش میں چل پڑا۔ حاتم جانوروں اور پرندوں کی زبان بھی سمجھتا تھا۔ ایک چڑیا نے اسے بتایا کہ وہ پرچہ شہر لکھنؤ کے فلاں محلے کے فلاں پروفیسر کی الماری میں بند ہے۔ حاتم نے منیر شامی کو ایک خط دے کر لکھنؤ روانہ کیا۔

لکھنؤ پہنچ کر منیر شامی نے پروفیسر کے دروازے پر دستک دی۔ ایک بچے نے دروازہ کھولا اور پوچھا "آپ کون ہیں اور کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

منیر شامی نے بتایا "میں شاہ آباد سے تمہارے ابا کے نام ایک خط لایا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے چاندی کی طشتری میں چند اشرفیاں اندر بھجوائیں۔

پروفیسر نے منیر شامی کی بہت خاطر و مدارات کی۔ اور الماری کے اندر سے حسن بانو کا پرچہ نکال کر دکھایا جس میں دو سوالوں کے جواب بھی غائب تھے۔ ایک سوال کے جواب میں ڈائیلاگ اور گیتوں کے ساتھ ایک فلم کی پوری کہانی درج تھی! اور آخری صفحے پر ممتحن صاحب کی شان میں چند اشعار قلم بند کئے گئے تھے۔

پروفیسر نے کہا "آپ بے فکر رہیں۔ آپ حاتم طائی کا خط لائے ہیں جن کی فیاضی کا شہرہ دور تک ہے۔ کبھی مجھ پر بھی مصیبت آ سکتی ہے۔ اس وقت وہ میری بھی مدد کریں گے۔" پھر پروفیسر نے اس کاپی کو اتار کر دوسری کاپی میں لگا دیا۔ جس میں تمام سوالوں کے جواب اچھی طرح سے لکھے ہوئے تھے۔

جب نتیجہ نکلا تو حسن بانو کامیاب ہو گئی تھی۔

کچھ عرصے بعد منیر شامی نے ایک شاندار میگزین نکالا۔ اس کے دفتر میں چھ ایرکنڈیشنڈ کمرے تھے۔ اس نے کار بھی خریدی تھی۔ میگزین نہایت ہی نفیس کاغذ پر شائع ہوتا تھا۔ روپے کا انتظام خود بخود ہی ہو جاتا تھا۔ نہ خریدار بنانے کی دردسری تھی نہ حصول اشتہار کی پریشانی۔ نہ ہی مضمون اور افسانے کے لیے فکر و تردد۔ تمام چیزیں منیر شامی کو تیار شدہ مل جاتی تھیں!

جب چھ ماہ کی مدت پوری ہو گئی تو منیر شامی نے حسن بانو کی انگلی میں پلیٹینم کی جواہرات سے مرصع انگشتری پہنا کر کہا۔

"اے حسینہ! میں نے تیری شرط پوری کر دی، اب تو بھی ایفائے عہد کر۔"

حسن بانو نے بڑے انداز سے جواب دیا۔ "اے جوان! میں تو کب کی تیری ہو چکی ہوں۔"

پھر دھوم دھام سے دونوں کی شادی ہوئی کئی دن تک دعوتیں اور جلسے ہوتے رہے۔ حاتم اور بہت سے پری زاد بھی ان دعوتوں میں شریک ہوئے۔

منیر شامی کو ایک فاؤنڈیشن کی طرف سے تین سال کے لیے غیر ممالک کے ادیبوں اور فنکاروں سے ملنے اور کنٹیکٹ بڑھانے کے لیے گرانٹ مل گئی۔

حسن بانو نے بھی اپنا پاسپورٹ بنوا لیا اور دونوں سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔

ادھر حاتم کو خوشی تھی کہ اس نے "آزادیٔ انسان" کی خاطر ایک اور روح کو بچا لیا تھا!!

ایک گزارش

اپنے باذوق دوستوں کے پتے ہمیں ارسال کیجئے۔ انھیں نمونہ کا پرچہ بھیجیں گے۔ اور اگر آپ اجازت دیں گے تو آپ کی طرف سے "کتاب" کی خریداری قبول کرنے کی درخواست بھی کریں گے۔ "منیجر ماہنامہ کتاب" چوک۔ لکھنؤ

کنور نارائن
ترجمہ:- ہرچرن چاولہ

پرچھائیوں کا گھیرا

اس کمرے کی چار دیواری میں کچھ ایسی فطری اپنائیت ہے جس میں کوئی خوف نہیں بس بھی آزادی ہی آزادی ہے۔ چاہے سب سوتا رہوں کوئی نہیں جگائے گا۔ چاہے جدوجہد کروں۔ ان دیواروں سے یا اپنے سے ہو سکتا ہے کچھ ٹوٹے، مجھ میں یا مجھ سے دونوں ہی کیفیتوں میں جو لگے گا وہ اپنی ایک نئی پہچان ہو سکتی ہے یا نیا موقع کہ اپنے کو کہیں سے شروع کرکے کہیں بھی ختم کر دوں۔ اس طرح بھی جی سکتا ہوں کہ بہت سی ایسی چیزوں کو مجھے آزمانے کا موقع ہی نہ ملے جن سے میں متفق نہیں۔ اپنے کو دھوکا دے سکتا ہوں اس طرح کہ باہر کہیں بھگوان کی موت ہو جائے نہ سورج چمکے نہ چاند نہ تارے اور یہ دنیا محض جھوٹ لگے۔

ہوا شاید دھیرے دھیرے کواڑ کھٹکھٹاتی ہے۔ اداسی میں یہ مداخلت اچھی لگتی ہے میں اٹھ کر دروازہ کھول دیتا ہوں۔

"میں اندر آسکتی ہوں؟"

اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں وہ بلا جھجک کمرے میں گھس کر اپنے لیے مناسب جگہ ڈھونڈھنے لگتی ہے۔ یہاں۔ وہاں کہیں بھی۔ بیچ میں میں پڑھتا ہوں تو کبھی بال بکھیر دیتی ہے کبھی چوم لیتی ہے کبھی گدگدا کر خود ہی ہنس پڑتی ہے۔ ڈھیٹ اور بے شرم۔

اپنی اداسی سے کہوں تھوڑی جگہ اور دے تو اس کو بھی اندر بلالوں۔

"وہ کھڑکی کی طرف اشارہ کرتی ہے"۔ ایک چمکتا ہوا ہنس مکھ چہرہ کھڑکی کے شیشے سے جھانک رہا تھا۔ کوئی شرارتی بچہ؟ نہیں شاید تھوڑی سی روشنی ڈھیر سے اندھیرے میں۔ کچھ الجھتے ہوئے میں نے کھڑکی بھی کھول دی وہ کود کر کمرے میں آگیا، اتنی پھرتی سے جیسے وہ کمرے میں ہی تھا۔ کچھ سوچ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کے آنے میں نے کوئی گرم جوشی کیوں نہیں دکھائی؟ اس کا آنا کوئی نئی بات جیسے ہی نہ ہو۔ خوشی کی بات تو تھی ہی — وہ شاید کمرے کی ہر چیز سے کھیلنا چاہتا تھا اور میری طرف سے خاموش اجازت چاہ رہا ہو جیسے بچے اپنا حق سمجھتے ہوں۔ مجھے کچھ کہنا نہیں تھا صرف اس کے لڑکپن کے سامنے بے خبر ہو جاتا تھا لیکن مجھ سے آج اتنا بھی نہ ہوا اور میں جو اس کی ضد کے آگے مجبور ہو جایا کرتا تھا پتھر بنا بیٹھا رہا۔ میں نے اسے نہ دھتکارا نہ اس کا خیر مقدم کیا۔ صرف اس خوشی کے لیے جو وہ لایا تھا اس طرح پیش آیا جیسے کوئی اس کی اہمیت ہی نہ ہو کیونکہ وہ روز کا معمول ہو۔ وہ روشنی جو سارے کمرے میں پھیلنے کے لیے بے چین تھی۔ ضد کرنے لگی میں نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی اور محسوس کیا کہ جیسے میری اپنی ہی ہیٹی ہوئی ہو۔ ہوا نے شاید برا مانا کیونکہ وہ چپ چاپ دروازے اڑکا کر باہر چلی گئی۔ میں نے اس خاموشی کو غنیمت سمجھا جو آخر میرے اور دوسروں کے بیچ ممکن ہے اور اسی رات ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس کا کوئی امکان نہ تھا۔ پڑوس میں ایک بچہ کی موت ہو گئی۔

میری اداسی عجیب سا عذاب بن جاتی ہے۔ وہ کون تھا؟ وہی تو نہیں جو یہاں تھا؟ میں کس ناطے سے اس کے بارے میں بار بار سوچ رہا ہوں؟ وہ یہاں تھا، بس اس ناطے۔ یہ تصویریں جو بناتا ہوں۔ محض لکیریں اور رنگ۔ یا وہ سپنے جو بن جاتے ہیں ایک دوسرے میں الجھی ہوئی شکلیں، وہ کہتی، "سمجھ میں نہیں آتیں۔"

میں کہتا۔ یہ تصاویر ہوا اور روشنی کی ہیں۔ اور ویسی ہیں جیسی کہ وہ ہوتی ہیں، پر سمجھ میں نہیں آتیں اس کے وجود کو سمجھنے سے پہلے اپنانا پڑتا ہے۔ یہی تو اس بچے کی ضد تھی، جو نہ جانے کیوں آج میری اداسی کی

اچھے کئے ہوں۔ تمہاری قسم امتحان کا کوئی خیال ہی دل میں نہیں ہے۔" میں نے کہا "مبارک ہو۔ آج آئے آپ ڈھنگ پہ۔ اب آپ ضرور سکنڈ ڈویژن پا جائیں گے۔" اور پھر میرے انکار کے باوجود مجھے پکڑ کر چائے پلانے لے گئے۔ مگر پانڈے جی کا یہ موڈ بہت عارضی ثابت ہوا اور پھر ان کی وہی کیفیت ہو گئی۔

دوسرے دن انھوں نے مجھے کسی طرح نہ آنے دیا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد انھوں نے کہا "آؤ پان کھا آئیں۔" ہم لوگ پان کی دکان پر پہونچے وہاں دو تین آدمی پہلے ہی سے کھڑے تھے۔ پانڈے جی نے چند لمحہ تو بے چینی سے انتظار کیا۔ پھر دو پیسے دکان پر رکھ کر واپس ہو لیئے۔ میں نے یہ دیکھ لیا تھا چنانچہ پوچھا "پانڈے جی آپ نے پان نہیں لیا؟ کیا وہ پیسے پان والے کے باقی تھے؟" پانڈے جی بے خیالی میں بولے "کیسے پیسے؟" پھر اک دم چونکتے ہوئے بولے "ہاں یار پیسے دے دیئے اور پان لیا ہی نہیں واپس چلو ورنہ کوئی پیسے بھی مارے جائے گا۔" یہ سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ پانڈے جی بے کسی سے میرا منہ تکنے لگے۔

ہاسٹل والوں کو یہ شکایت ہو گئی تھی کہ پانڈے جی آجکل ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتے جب ایک بار میں نے اس کا تذکرہ ان سے کیا تو غصے سے بولے "کیا ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ میرا امتحان ہونے والا ہے۔" میں نے کہا "بے شک" تھوڑی دیر بعد ہم نے ان کو چھیڑنے کے لیے کہا "پانڈے جی! غالب کا ایک شعر....." پھر گئے صاحب کہنے لگے "یار ہماری تو یہ حالت یعنی امتحان صرف دو دن رہ گئے ہیں اور آپ کو شعر و شاعری سوجھی ہے۔ کیا آدمی ہیں آپ۔"

آخر امتحان شروع ہو گیا۔ پانڈے جی نے پہلا پرچہ بہت اچھا کیا۔ اور بہت خوش باہر نکلے۔ کہنے لگے "یار تمہاری قسم پرچہ دیکھ کر سب یاد آ گیا۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔" میں نے کہا "آپ کے کیمپین چل رہے ہیں۔" بولے "یعنی اب ایسا بھی کیا۔ ابھی تین پرچے باقی ہیں۔"

پانڈے جی نے سب ہی پرچے بہت اچھے کئے۔ اب یہ بات اور ہے کہ امتحان کی رات وہ گھبرا کے رو ضرور لیتے تھے۔

جب سارا امتحان ختم ہو چکا تو وہ شام کو اچھلتے کودتے گنج گئے۔ پانڈے جی کا وائی وا (زبانی امتحان) بھی بہت اچھا ہوا تھا اور ہر ایک کو پکڑ پکڑ کر اس کی تفصیل بتا رہے تھے۔ جن سے سلام دعا بھی نہیں تھی ان سے گلے مل رہے تھے اس دن مارے خوشی کے پانڈے جی نے بھنگ کھائی۔ خوب خوب شعر سنے اور سنائے کیفے ڈی پھونس میں بیٹھ کر چائے پی، چائے پیتے ہوئے بولے "نارضوی صاحب آج میں پورے پچیس دن کے بعد گنج آیا ہوں۔ تمہاری قسم بڑی طبیعت خوش ہے۔" ہم لوگ رخصت ہوئے اور پانڈے جی سکنڈ شو فلم دیکھنے چلے گئے۔

امتحان کے بعد دو تین دن تک پانڈے جی لکھنؤ میں ٹھہرے ایک دن میں نے پوچھا "یاد ہے آپ کو امتحان کے زمانے میں آپ کی کیا حالت تھی۔" کہنے لگے "ہاں اب سوچتا ہوں تو ہنسی معلوم ہوتی ہے لیکن یار ایک بات ہو۔" میں نے پوچھا "وہ کیا؟" فکرمند لہجے میں بولے "میں نے امتحان میں ایک نئے قلم سے لکھا تھا۔ رائٹنگ خراب گئی ہے۔ کہیں اس کے مارکس نہ کٹ جائیں۔ کیوں تمہارا کیا خیال ہے۔" میں نے کہا "پانڈے جی میں ایک ماروں گا اگر آپ نے اس طرح الٹی سیدھی باتیں مجھ سے کیں۔" پانڈے جی ہنسنے لگے۔

سری نواس لاہوٹی

مشہور کتابیں — پریم پچیسی

ہر دور میں اور دنیا کی ہر زبان میں افسانوی ادب کو اہمیت حاصل رہی ہے اگر دنیا کے اعلیٰ ترین ادب کا جائزہ لے کر سب سے زیادہ مشہور صنف ادب کی فہرست تیار کرائی جائے تو اس میں افسانوی ادب کا حصہ دوسرے اصناف پر بھاری رہے گا۔ اس کے باوجود جدید اردو افسانہ دیر سے وجود میں آیا اور اس لحاظ سے بلا پس و پیش منشی پریم چند کو جدید اردو افسانہ نویسی کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔ پریم چند اردو اور ہندی میں مساوی طور پر مشہور ہیں۔ ان کا اصلی نام دھن پت رائے تھا لیکن آگے چل کر انھوں نے اپنا قلمی نام پریم چند رکھ لیا اور دنیائے ادب میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ پریم چند ۱۸۸۰ء میں ایک کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں انھوں نے وفات پائی۔ وہ چالیس سال تک مسلسل لکھتے رہے اور اس دوران میں انھوں نے اٹھارہ ناول اور تقریباً (۲۲۴) افسانے لکھے۔ اس کے علاوہ ان کا نثری سرمایہ مضامین کی شکل میں علیحدہ موجود ہے۔ پریم چند نے زندگی کا آغاز (۲۰) روپیہ ماہوار کی سرکاری ملازمت سے کیا اور ۱۹۲۱ء میں انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور ادبی خدمت ہی کو ذریعہ معاش اور سرمایہ حیات بنا لیا۔ ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" کے نام سے شائع ہوا تھا لیکن حکومت وقت نے اس پر پابندی لگا دی۔ ان کا آخری شاہکار "منگل سوتر" جو ادھورا ہی رہا اور ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ پریم چند کے ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معمولی کسان اور مزدور سے لے کر زمیندار اور تاجر کی زندگی سے واقف تھے اور ان دونوں کی زندگی میں جو تفاوت ہے اس کو بنیاد بنا کر انھوں نے ادب کی تخلیق کی۔ اس لیے پریم چند کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مقصدی ادیب تھے۔

ان کی تحریریں قومی آزادی کے ابال کی تخلیقات ہیں ان کا ادب تحریک کی کمزوریوں اور سمجھوتے بازیوں کے خلاف ایک زبردست احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی وہ ہندی اور اردو کے سب سے بڑے ادیب مانے گئے ہیں اور ان کی اہمیت صرف ان دو زبانوں کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کے ادب نے ہندوستان گیر حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پریم چند نے اپنے ادب میں جس حقیقت نگاری کی بنیاد رکھی تھی وہ بڑی صحت مند تھی اور اس اعتبار سے پریم چند کی عزت مسلم ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کے انقلاب کے بنیادی سوال کو اپنے ادب کا مرکزی نکتہ بنایا اور وہ مرکزی نکتہ کسانوں اور مزدوروں کا سوال تھا جسے انھوں نے فنکارانہ انداز میں پیش کیا اس لیے بھی ان کا ادب عظیم مانا جاتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے زمانہ کے بنیادی طبقوں کے طریقہ زندگی کو سمجھ لیا تھا اور ان کو حرکت و ارتقاء کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے اپنے قلم کی روشنائی کو آخری دم تک استعمال کرتے رہے اور جب موت نے ان کی زندگی کی کلائی پر راکھی باندھی تو انھیں "قلم کا سپاہی" کا خطاب عطا کیا گیا۔

جدید اردو افسانہ نویسی کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز سے ہوئی ہے اور منشی پریم چند نے بھی اسی دور میں لکھنا شروع کیا تھا مگر منشی پریم چند کے قابل ذکر افسانے ۱۹۱۰ء کے بعد سے وجود میں آئے۔ اور "پریم پچیسی" اس لحاظ سے ان کی پہلی اور قابل قدر تصنیف ہے جس میں پچیس افسانے شامل ہیں جو ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۶ء کے درمیان عالم وجود میں آئے۔ اس کتاب کے عالم وجود میں آنے کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ وہ خود اپنے ایک خط مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۱۳ء میں مرحوم منشی دیا نارائن نگم کو جبکہ وہ پریس قائم کرنا چاہتے تھے مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

کی لاش رکھ گیا ـــــ وہ جو میری تصاویر کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ اور انھیں غیر ضروری نہیں سمجھتا تھا......

ان دیواروں میں ایک کسر نفسی ہے کیونکہ یہ میرے نظریہ کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتیں جو اادر لکشنی کو جن کے آتے ہی کمرہ بدل جاتا ہے باہر روکا جاسکتا ہے۔ میں اپنے کو کہیں سے بھی شروع کرسکتا ہوں اس طرح کہ نہ پیار ہو، نہ احساس اور نہ امید ـــــ زندگی کے معنی ہیں بہت سی چیزیں، کوئی ایک چیز نہیں ـــــ اور تبھی ایسا لگا کہ کمرے کی چیزوں نے مل کر میرے سامنے ایک ایسی زندگی رکھی جس میں نہ اچھائی تھی نہ برائی تھی ـــــ کیونکہ اس میں نہ ضرورتیں تھیں، نہ فرائض۔ محض ایک ایسا تسلسل تھا جس میں کہیں خود کو ثابت کرنے کی مجبوری نہ تھی۔

باہر ہوا چیختی چلاتی رہی جیسے اس کا کوئی مرگیا ہو۔!

یہ ساحلیں بند راہیں۔ سربپٹ دوڑتی بھاگتی ضرورتیں جو اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر ہانک رہی ہیں ـــــ کیوں یقین کروں کہ اس طرح نہیں جینا! نہیں جینا ہے؟ ایک کشمکش وہ بھی جو اپنی ضرورتوں سے جیتنے کے لیے کی جاتی ہے۔

لیکن وہ جو باہر سرپٹ رہی ہے، محض ہوا ہے۔ میری بات نہ سمجھے گی۔ لیکن میں اس کے ناطے کچھ اس طرح زندہ ہوں کہ مجھے اس کی بات سمجھنا پڑے گی.....

میں اٹھ کر چپ چاپ کواڑ کھولتا ہوں اور اس قدیم جنگلی طوفانی کو سینے سے چپکا لیتا ہوں۔

"کتاب" کے مارچ کے شمارہ میں قیصر تمکین کا ایک افسانہ بلاعنوان شائع کیا گیا تھا۔ یہ ایک شخص تنویر کی کہانی تھی جو ایک عیسائی پادری فادر پارسن کے پاس اعتراف گناہ کے لیے آتا ہے۔ گناہوں کے اعتراف کے ساتھ وہ بھوک کا اظہار کرتا ہے۔ پادری اس کو کھانے کو دیتا ہے۔ اعتراف کرتے ہوئے تنویر نے بتایا کہ اس کی ماں جو اس کو کھانا دینے کے لیے خود روزہ پر روزہ رکھتی تھی بھوک کی تاب نہ لاکر ختم ہوگئی اور مرنے سے قبل اس نے جو روٹی کا ایک ٹکڑا اپنے لیے رکھا تھا وہ بھی تنویر چھین کر کھا گیا۔ ضمیر کی ملامت سے بچنے کے لیے وہ فادر پارسن کے پاس آیا ہے۔ فادر پارسن نے ترس کھا کر اس کو ۵ روپیہ دیا۔ اس کی اس حرکت نے تنویر کا ضمیر بیدار کردیا۔ اور روپیہ حاصل کرنے کے لیے اس نے جو تمام جھوٹے اعتراف کیے تھے ان پر شرمندگی کے ساتھ اس نے یہ روپئے فادر پارسن کو لوٹا دئے۔

ججوں نے اس کہانی کے موصول ہونے والے تمام عنوانات پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور پر محترمہ رئیسہ اقبال ۱۵۰، خیالی گنج لکھنؤ کے تجویز کئے ہوئے عنوان "روح کے زخم" کو اول انعام دینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرا انعام ججوں نے متفقہ طور پر جناب اسلم پرویز صاحب کوٹ دل داڑھنگی ڈورنڈہ ڈاک گھر ہینو۔ رانچی کو دینے کا فیصلہ کیا جن کا تجویز کردہ عنوان تھا "باتوں کے بیوپاری"۔ تیسرا انعام سلمان احمد صاحب محلہ بابو پور حکم پور کو دینا منظور کیا جنھوں نے افسانہ کا عنوان "ضمیر کی بیداری" تجویز کیا۔

محترمہ رئیسہ اقبال کو ۶ ماہ کے لیے اور اسلم پرویز صاحب اور سلمان احمد صاحب کو تین تین ماہ کے لیے رسالہ کتاب نذر کیا جارہا ہے۔

اس کے علاوہ ججوں کو عطاء الرحمان رضوی دربھنگہ کا عنوان "نقش فریادی" مسز فاخرہ صاحبہ سیتاپور کا عنوان "فریب لطیف" یش سروج صاحب جموں کا عنوان "کفارہ" حسینی عباس لکھنؤ کا عنوان "منزل ہے کہاں تیری" اطہر حسن علوی، فرنگی محل لکھنؤ کا عنوان "تجلی" بلال الدین، فتح پور کا عنوان "من کی دنیا" بھی پسند آئے۔

عام طور سے عنوان تجویز کرنے والوں نے "اعتراف" کی رعایت سے عنوان تجویز کئے ان میں ایم سلے انصاری آگرہ کا "گنہگار اور اعتراف" "دو اعتراف" سید امتیاز کریم باد گنج پٹنہ کا "اعتراف" عبدالمعید تھانہ سوپارہ کا عنوان "اعتراف ناکردہ گناہ" بھی قابل ذکر ہیں۔

محترمہ نکہت نور، دربھنگہ نے "انوکھا مجرم" اور مسٹر کے کے آغا، بلگام نے "کچھ کا افسانہ نگار" نام تجویز کئے ہیں۔ جو اپنی حقیقت پسندی کی وجہ سے پسند کئے گئے۔

تقی حیدر

کہانی کیا ہے؟

کہانی کیا ہے؟ اگر کسی اور نے مجھ سے یہ سوال کیا ہوتا تو فوراً میں جواب دیتا کہ ایک وسیلہ ہے جس سے بعض صورتوں میں شہرت اور منزلت حاصل ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں دوسرے ذریعوں سے حاصل کی ہوئی روزی میں تھوڑا بہت اضافہ، اور بعض صورتوں میں دونوں۔ اور یہ وسیلہ کارگر ہوتا ہے یا نہیں اس کا انحصار کچھ استعداد پر ہوتا ہے اور کچھ ظرف پر۔ لیکن جب یہ سوال میں خود اپنے آپ سے کرتا ہوں تو اتنا جواب کافی نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ اس جواب سے بھی بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ "استعداد" اور "ظرف" جیسی چیزیں کچھ معنی بھی رکھتی ہیں یا نہیں۔ اگر ہاں تو کیا؟ اور اس کا اظہار کہانی میں کس طرح ہوتا ہے؟ وہ کون سی چیز ہے جس کے ہونے سے ایک کہانی لکھنے والے کو شہرت اور منزلت بھی ملتی ہے اور اس کی کہانی یا کہانیوں کا معاوضہ بھی تو دوسرے کو دو میں سے کوئی ایک چیز اور تیسرے کو کوئی بھی نہیں۔ اور جب کمی کی وجہ سے کوئی کہانی لکھنے والا ان دونوں چیزوں سے محروم رہ جاتا ہے، اس کمی کے باوجود اس کی کہانی کو کہانی کہا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو کہانی کن چیزوں سے بنتی ہے؟

اور اس آخری سوال کا روایتی جواب یہ ہے کہ کہانی بنتی ہے واقعہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ اور زبان سب کے تال میل سے لیکن انہیں سب چیزوں سے ناول بھی بنتا ہے اور کافی ڈرامہ بھی۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم جب کہانیوں کی باتیں کرتے ہیں تو اکثر متضاد باتیں کہہ جاتے ہیں اور مختلف کہانیوں کے بارے میں ہم وقتاً فوقتاً جن رایوں کا اظہار کرتے ہیں ان سب کو اگر جمع کیا جائے تو یا تو ہم اپنی ہی رائے ماننے سے انکار کر دیں گے یا پھر تاویلات کا وہ سلسلہ شروع ہوگا جو دلیلوں کی بدولت نہیں زور زبان بلکہ منہ زوری کی بدولت ختم ہو۔ کرتا ہے کہانی لکھنے والوں سے جو مطالبے کیے جاتے ہیں اگر ان کو یکجا کیا جائے تو بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فن و ادب کی کوئی صنف ان کو پورا نہیں کر سکتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعہ، پلاٹ، کردار اور مکالمہ ایک حد تک ڈرامہ، ناول اور کہانی کے مشترک اجزائے ترکیبی ہیں لیکن ادب کی ان اصناف کو جو چیز ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے ان چار عناصر کا تناسب اور ان کے استعمال کا مقصد۔ اس آخری جملے کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان چاروں عناصر کو الگ الگ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

کوئی واقعہ بجائے خود ان معنوں میں مکمل نہیں ہوتا کہ نہ اس کا اس سے پہلے کے واقعوں سے کوئی تعلق ہو اور اس کے بعد کے واقعوں سے۔ ہر واقعہ نتیجہ بھی ہوتا ہے اور سبب بھی۔ اور بجائے خود بہت سے چھوٹے بڑے سانحوں سے مل کر بنتا ہے۔ یہی دونوں پہلو اسے اہم، کم اہم یا غیر اہم بناتے ہیں۔ اور کسی ایک واقعے کو کہانی کے مقاصد کے لیے بامعنی بنانا، ان تمام چھوٹے بڑے سانحوں کو، جن سے مل کر وہ واقعہ بنتا ہے، اس طرح ترتیب دینا کہ وہ واقعہ ان لوگوں کو بھی جنھیں اس کا ذاتی تجربہ نہیں ہے، قابل وقوع اور قرین قیاس معلوم ہونے لگے، یہ ہے پلاٹ، جس میں ترتیب کے علاوہ لازمی طور پر انتخاب کا ایک اصول بھی کارفرما ہوتا ہے، انتخاب کے اس اصول ہی کی بدولت پلاٹ صرف ایک دلچسپ قصہ نہیں رہ جاتا بلکہ زندگی کا ایک نظریہ بن جاتا ہے۔ جن چھوٹے بڑے سانحوں سے مل کر کوئی واقعہ بنا ہے ان میں سے کن کا انتخاب کیا جائے کہ واقعے میں ایک خاص معنی، ایک خاص تاثر، ایک خاص وزن پیدا ہو ——— یہی وہ مقام ہے جہاں سے کہانی لکھنے والا اپنا

"پریم پچیسی" اس پریس کا پہلا کارنامہ ہوگا۔ ۲۰ قصوں سے زائد ہو چکے ہیں۔ دو تین ماہ میں پچیس قصے ضرور ہو جائیں گے۔ ہاں۔ کتاب کسی قدر ضخیم ہو جائے گی۔ ۔ ۔ ۴۰۰ صفحہ سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ میں مضامین کی ترتیب دیدوں گا مگر ترتیب کیونکر دوں ابواب کی علاحدہ میں نہیں آتے۔ ورنہ میں نے چاہا تھا کہ شجاعت، بہادری۔ خودداری ایثار۔ وغیرہ کے عنوان سے ترتیب دوں۔ کیونکہ آج وطن کو ان ہی کی ضرورت ہے۔"

۱۹۱۴ء کے اواخر میں یہ کتاب عالم وجود میں آئی سارے مجموعہ کی تین کہانیاں رانی سارندھا، راجہ ہردول۔ اور آلہا راجپوتی شان وشوکت کی کہانیاں ہیں جو منشی جی نے مہوبا کے دوران قیام میں مقامی لوک کہانیوں کو بنیاد بنا کر لکھی تھیں۔ ان کہانیوں کی ساری فضا، داستانوں کی تخیلی اور شاعرانہ فضا سے مستعار ہے اور ان سے فرد اور قوم دونوں شدت کے ساتھ متاثر ہوتے ہیں اس مجموعے کی ایک اور کہانی "بڑے گھر کی لڑکی" ہے اس کہانی کا تانا بانا بالکل گھریلو انداز میں بنا گیا ہے۔ دیور بھابھی کی لڑائی کی عکاسی کی گئی ہے اور جب گھر پھوٹنے کی نوبت آتی ہے تو بھابی تمام جھگڑوں کو بھول کر دیور کو گلے لگا لیتی ہے۔ کہانی کا یہ انجام بہت ہی متاثر کن ہے۔ ۱۹۱۲ء میں منشی پریم چند ہمیر پور ضلع میں محکمہ تعلیمات کے ڈپٹی انسپکٹر تھے اس دور میں انھوں نے اس مجموعہ کی ایک اور کہانی "سفید خون" کے نام سے لکھی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ جادو رائے کا لڑکا سادھو حالات کے چکر میں پڑ کر پادریوں کے ساتھ چلا جاتا ہے اور کئی برس تک ان کے ساتھ رہتا ہے وہ لوگ اس کو عیسائی بنا لیتے ہیں جب اس کو ماں باپ کی یاد آتی ہے تو وہ اپنے گھر پہنچتا ہے ماں باپ اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں تو درمیان میں برادری آجاتی ہے اور تبدیلی مذہب کے بعد بھی جب اس کو برادری اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے تو وہ یہ کہتا ہوا واپس چلا جاتا ہے کہ جن کا "خون سفید" ہے ان کے درمیان زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ اس افسانے میں مذہب کے ٹھیکے داروں پر کاری چوٹ ہے منشی پریم چند ابتدا میں عملی سیاسیات سے بالکل الگ رہ کر خاموشی سے کام کرتے رہے لیکن ان کے آنکھ اور کان کھلے ہوئے تھے اور وہ ملک میں ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر تھے اسی لیے انھوں نے سامراجی جھوٹ کے مقابلہ میں سچائی اور حقیقت کی آواز بلند کی چاہے ان کی آواز کتنی ہی اکیلی اور کمزور کیوں نہ ہو چنانچہ انھوں نے "ایک ہی آواز" کے نام سے کہانی لکھی جو کہانی کی تکنیک کے اعتبار سے تو کمزور ہے لیکن اس کہانی کی بنیاد سچائی پر رکھی گئی ہے۔ اس سے "وکرمادت" کے نام سے انھوں نے جو کہانی لکھی وہ سچائی اور انصاف کی تائید میں اٹھنے والی اس تلوار کی کہانی ہے جسے ہم ضمیر کی آواز کا نام دے سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے پریم چند نے ایک بلند قومی مقصد کی حمایت اور پاسداری کا بیڑا اٹھا کر کبھی شاعرانہ اور جمالیاتی منصب کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیں جو ایک داستان سراہ اور افسانہ گر پر عائد ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کی کہانی "نمک کا داروغہ" بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ "پریم پچیسی" کی کہانیوں میں پریم چند نے معاشرے کی گندگی اور جکڑے ہوئے معاشی نظام میں پیدا ہوئے اور پرورش پانے والے انسانوں کی زندگی کے خارجی اور داخلی کو انوکھا بیان کئے ہیں۔ جن میں مشاہدہ، فکر وتخیل کی تیزی۔ گہرائی اور وسعت نے مل کر اور پوری طرح سے ہم آہنگ ہو کر اپنا فرض پورا کیا ہے جو ایک بڑے فنکار کا سماج کے تعلق سے ہوا کرتا ہے۔ میں اس مجموعے کے فنی پہلو سے قطع نظر یہ کہنا چاہوں گا کہ پریم چند کے ان ابتدائی افسانوں کے مجموعے میں حیات انسانی کی اہم ترین گتھیاں سلجھائی گئی ہیں۔ نفسیات کے پیچیدہ مسئلے حل کئے گئے ہیں اس مجموعے کی کہانیوں میں امنگوں اور خواہشوں کے متصادم طوفان بھی اٹھے ہیں لیکن فنکار کی فنکارانہ چابکدستی نے انسانیت کے دامن کو نہیں چھوڑا ہے اور یہی "پریم پچیسی" کے کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

پریم چند نے عورت کے حسن کو دولت و ثروت آرائش وزیبائش اور جسم وکاکل کے چنگل سے نکال کر اسے اس مسند پر لا بٹھایا جہاں وہ مخالف صنف کی زندگی کے مسائل میں شریک اور اس کے دکھ درد کی بھی ساتھی بن گئی۔ ان کے نزدیک عورت کا حسن اس کے جسم کے کسی مخصوص حصہ میں نہیں اس کی پوری شخصیت، اس کے پورے کردار میں مضمر ہے۔

عابد سہیل

پس رکیس کا قصہ آپ کو یاد ہو، کرداروں کے نام آپ نہیں گنا سکتے۔ لیکن اس کے برعکس ہملیٹ، اوتھیلو، شائلاک کو ریولینس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں لیکن قصہ شاید ہی یاد ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار سال سے زیادہ کی مدت بیت چکی تھی اور ایلزبتھ کے انگلستان میں انسان کو اپنے بلوغ کا احساس ہو رہا تھا۔ اب وہ مجبور محض نہ تھا، وہ نئی دنیائیں دریافت کر رہا تھا۔ زمین پر خدا کے نمائندے سے اس نے لڑائی لڑی تھی اور میدان اس کے ہاتھ رہا تھا۔ اپنے گردوپیش پر وہ تحیر اور تجسس کی پر عزم نظر ڈال رہا تھا، انسان کے سربستہ کے منکشف ہونے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

لیکن مغربی ادب کی ایک حیران کن خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس پر بار بار یونانی اصولوں کا، کلاسیکیت کا دورہ پڑتا ہے چنانچہ ڈرامے، ناول اور پھر کہانی میں متعدد بار یہ ہوا کہ تکنیک اور اصولوں کی بات چلی اور پلاٹ کو مصنوعی طور پر سبقت و اہمیت دی گئی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تجربہ ہوتا رہا اور جو ہماری اس وقت کی بات کے لیے زیادہ اہم ہو کہ ان تین میں سے کسی صنف میں کسی بڑے ادیب نے منطقی تسلسل والے پلاٹ کا کوئی ڈرامہ، ناول، یا کہانی نہیں تخلیق کی کہانی میں تو خاص طور سے جو بھی نئے ادیب سامنے آئے، جو نئے تجربے ہوئے، کہانی کی صنف میں جو نئے پہلو پیدا ہوئے وہ کردار کے مطالعے، شخصیت کی ہو شگافیوں، کردار کی ذہنی یا نفسیاتی الجھنوں، کردار کے سماجی اور ذاتی مسئلوں ہی کی سمت میں ہوئے ہیں۔

اس کے بعد لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تکنیک کے مطابق فن کی تخلیق نہیں کرتی ہے تو پھر تکنیک کی یا صنف کی تخصیص کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ایک ضرورت تو سماجی ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ کوئی صنف یا ہیئت بالعموم سماج کی ضرورتوں اور زمانے کے مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جہاں عام لوگوں کو اپنی کم علمی یا لاعلمی کا احساس اور اعتراف ہوا، ادیبوں کی ارسٹوکریسی بنی اور ذاتی رائے اور تاثرات کی وقعت مسلم ہوئی وہاں [illegible] کی صنف کو رواج ہوا لیکن جب چیزوں کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کا جذبہ بیدار ہوا اصلیت اور تفصیلات کی تلاش ہوئی تو وہ صنف ختم ہو گئی۔ اور اب Stream of Consciousness والی کہانیاں بھی معدوم ہو چکی ہیں۔ اس سے

تکنیک کی فنی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ فنکار اپنی نئی بات کو بھی یوں کہنا چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرے اور اس لیے وہ تخلیق شروع کرتا ہے ایک تکنیک کو ذہن میں رکھ کر۔ اب یہ اور بات ہے کہ اسے موپاساں کی طرح بعد میں معلوم ہو کہ اس کے موضوع نے پرانی ہیئت میں دراڑیں ڈال دیں اور ایک طرح سے نئی ہیئت اختیار کر لی۔ فنی نقطۂ نظر سے تکنیک کا علم، اس کی وسعت اور تنگی سے واقفیت ضروری ہے جس میں اس سے انحراف بھی کیا جا سکتا ہے اور اسے رد بھی کیا جا سکتا ہو۔

اس کے علاوہ تکنیک کی قدرے کم اہم ضرورت پڑھنے اور سننے والوں کے نقطۂ نظر سے بھی ہے ادب تخلیق کی منزل سے گزر کر جب پڑھنے والوں تک پہونچتا ہے تو سب سے پہلے اس کی ہیئت انھیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ پڑھنے والا موضوع کو اسی وقت قابل توجہ سمجھتا ہے جب ہیئت اس کی جانی پہچانی ہو اور اپنے آپ کو وہ ہیئت سے جتنا زیادہ مانوس پائے گا اتنا ہی زیادہ ان قدروں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گا جو اس ادب کا موضوع ہیں۔

میں نے اس ضرورت کو کم اہم کہا ہے کہ ہمیشہ یہ ممکن نہ رہا ہے نہ ہو گا کہ جانی پہچانی ہیئت میں اہم یا نیا موضوع نظر آئے یا یہ کہ ہیئت میں اتنی ہی تبدیلی ہو کہ تبدیلی کے باوجود وہ پہچانی جا سکے۔ اگر یوں ممکن ہوتا تو نہ نئی ہیئتیں کبھی وجود میں آتیں اور نہ بہت سے بڑے ادیب اپنے زمانے میں مقبولیت سے محروم رہ جاتے ہیں موضوع کی اہمیت فنکار کو مجبور کر سکتی ہے اور کرتی رہی ہے کہ وہ رائج و مقبول ہیئت کو یک قلم رد کر دے۔ اس لیے کہ فنکار ہیئت کا نہیں، موضوع کا پابند ہوتا ہے۔ ہیئت کی پابندی سے خواجہ وزیر کی غزل اور پوپ کی نظم، ڈاکٹر جانسن کا ناول اور ڈرائڈن کا ڈرامہ انگریزی میں اور چیپ جی ڈیزی کی کہانیاں اور ہمارے ادب میں اس قسم کی کہانیاں وجود میں آتی ہیں جو بیسویں صدی میں بھی چھپتی ہیں اور جن کے لیے مجھے اردو میں کوئی لفظ نہیں ملا انگریزی میں انھیں Standardisation and Mediocrity کہیں گے۔

"عورت کے آنسو دنیا کی سب سے بڑی آبی قوت ہیں"
——— ڈوگلر

ادبی سفر شروع کرتا ہے۔

دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ جن سانحوں کو اس نے منتخب کیا ہے ان کو وہ ایک سلسلے میں کس طرح پروئے؟ ایک کے بعد ایک رونما ہونے والے دو چار سانحوں کو بیان کر دینے سے بھی پلاٹ نہیں بنتا۔ اس کے لیے تنظیم و ترتیب کی ضرورت ہوتی ہے اور ترتیب کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ یہ تمام سانحے ایک ہی کردار کو پیش آتے ہیں اور اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ ان سانحوں کی بدولت کردار کی شخصیت کے نئے پہلو ہمارے سامنے آتے ہوں یا اسے سمجھنے میں ہمیں کوئی مدد ملتی ہو۔ دوسری صورت ترتیب کی یہ ہو سکتی ہے کہ تمام سانحے کسی ایک ہی خیال کی آئینہ داری کرتے ہوں اور تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ان سانحوں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ہر سانحہ اپنے سے پہلے والے سانحے کا منطقی نتیجہ اور اپنے بعد والے سانحے کا منطقی سبب معلوم ہو۔ اس آخری صورت کو تنقید نگاروں نے اچھے اور مضبوط پلاٹ کا نام دیا ہے۔ لیکن کہانی کی وحدت پہلی دو صورتوں میں قائم رہتی ہے پہلی میں کردار کی وجہ سے دوسری میں موضوع کی وجہ سے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کہانیوں کو جن میں ترتیب کی پہلی دو صورتیں پائی جاتی ہیں ان کو بغیر پلاٹ کی کہانی کہیں یا کہانی ہی نہ کہیں۔

یہ سچ ہے کہ پلاٹ کی جو تعریفیں ارسطو سے اخذ کی گئی ہیں ان کی روشنی میں تو پلاٹ منطقی تسلسل (Causal Sequence) ہی کا نام ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس عالم و ذہین یونانی فلسفی نے فن و ادب کے سلسلے میں جو اصول وضع کیے ہیں ان کی حیثیت یہ نہ تھی کہ "یوں ہونا چاہیے" اور بس۔ بلکہ ان اصولوں کی حیثیت یہ تھی کہ "یوں ہے" یا "یوں عام طور سے دیکھا جاتا ہے۔" یونانی فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں کے دستور اور اسالیب کا غائر مطالعہ اور مشاہدہ کر کے اس نے کچھ نتائج اخذ کیے اور انھیں قلم بند کر دیا۔ معلوم نہیں یورپ کے تنقید نگاروں اور ان کی وجہ سے آدھی دنیا کے تنقید نگاروں کو، کب اور کس طرح یہ خوش فہمی ہو گئی کہ وہ تخلیق فن کے لیے ایسے اصول گڑھ سکتے ہیں کہ جن سے سرمو انحراف، ادیب کو، ادیب سے کچھ اور بنا دیتا ہے۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ بات ہے کہ یہ مغالطہ تنقید نگاروں، نیم ادیبوں اور متشاعروں نے کچھ اس شد و مد سے پھیلایا کہ فنکاروں، ادیبوں اور شاعروں نے کم از کم قول کی حد تک تو اس کی صداقت کو تسلیم بھی کر لیا، یہ اور بات ہے کہ عملاً ہر بڑے فنکار نے اس کی تردید ہی کی، اپنے لیے خود ہی نہ صرف یہ کہ رائج اصناف میں سے کسی ایک صنف ادب کا انتخاب کیا بلکہ یہ بھی طے کیا کہ وہ اس صنف کے موجود اور روایتی اصولوں سے کس حد تک انحراف کرے گا یا یہ کہ متروک صنف ادب کو ذریعہ اظہار بنائے گا، یا یہ کہ اپنے لیے کوئی بالکل نئی صنف ایجاد کرے گا۔

اور وہ کیا فیصلہ کرتا ہے اس کا دارومدار اس کی رفتار طبع پر نہیں بلکہ اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور کس سے کہنا چاہتا ہے؟ موضوع جتنا نیا اور اچھوتا ہے ہیئت بھی آپ کو اتنی ہی بدلی ہوئی نظر آئے گی۔

ہیئت، اصناف ادب، تکنیک یہ ساری چیزیں آخر وجود میں آتی کس طرح ہیں؟ بھلا اس بات سے کون انکار کرے گا کہ یہ تمام اصناف ادب اور ان کے جملہ لوازمات اسی لیے تو وجود میں آئے تھے کہ فنکاروں نے ان کی ضرورت محسوس کی تھی اور فنکار جس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے وہ وہی چیز ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے خیال اور احساس کو موثر ترین اور مکمل ترین طریقے سے ان لوگوں تک پہنچا سکے جن سے وہ مخاطب ہے۔ ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک صنف سخن ایک زمانے میں مقبول ہوتی ہے دوسرے میں اس کی بدلی ہوئی شکل نظر آتی ہے اور پھر وہ بھی زمانہ آتا ہے کہ اس کے نام لیوا کم سے کم روایت پسند ورنہ رجعت پسند کہے جاتے ہیں۔ کوئی شاعر اگر صلے کی تمنا میں کسی کی تعریف کرنا چاہے تو وہ آج بھی قصیدہ ہی کہے گا، آزاد نظم میں مدح سرائی کامیاب ہو گی نہ صلے کی تمنا پوری ہو گی لیکن اس وقت ہم کہانی کی بات کر رہے ہیں۔

منطقی تسلسل والا پلاٹ جو یونان میں رائج تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ یونانی فلسفے اور مذہب میں انسان مجبور محض تھا جو مافوق البشر طاقت کے منشا کے مطابق عمل کرتا تھا۔ اس کی کوئی حیثیت نہ تھی اس لیے کہ وہ تو کٹھ پتلی تھا، اس کے اعمال اہم تھے کہ اعمال منشاء یزدی کا مظہر تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قلم کی کوئی اہمیت نہیں جس سے میں نے یہ لکھا ہے، جو کچھ لکھا ہے وہ اہم ہے اس لیے کہ وہ میرے منشا کی نمائندگی کرتا ہے تو یونانی ادبی تخلیق میں، رزمیہ میں بھی اور ڈرامے میں بھی، کردار کو نہیں، پلاٹ، یا سانحات کے منطقی تسلسل کو اہمیت حاصل ہے۔ ایدی

کتاب ٹھنڈ

کبھی کبھی لگتا ہے ہوائیں چلتی بھی ہیں اس طور
گلا جھوم اٹھا جیسے اب دکھ نہ ملے گا اور
ارمانوں کی شوخ ندی میں ڈوبا غم کا شور
تھوڑی ٹھنڈک جب پائی تو سدھ بدھ بھول گیا
دھوپ میں الفت کا سایہ پایا تو بھول گیا

ماضی کچھ موہوم لکیریں مٹی مٹی اک دم
حال بہت ہی دھندلا جیسے برکھا کا موسم
مستقبل ہے کبھی تو روشن اور کبھی مدھم
رات یہاں ہیں کون یہ جانے صبح کہاں ہوں گے
کچھ بدلیں گے یا ہوں گے برباد جہاں ہوں گے

زرداری کے دور میں اپنے دل کو ڈالا تول
چاندی سونے کی دنیا میں شیشے کا کیا مول
تھوڑی دیر میں روح تھی ننگی باقی تھا اک خول
شیشے ٹوٹے، سپنے بکھرے، ارماں اُڑ گئے
ذہن کی ریت پہ خواب محل جو بنے تھے بگڑ گئے

ہستی کیوں اتنی کالی ہے جیسے آنکھ کا کاجل
جد و جہد کے رُخ پر بکھرے ہیں کیوں غم کے بادل
سوچ سوچ کے ہوا جا رہا ہے دل بھی اب پاگل
کیا یہ دھوپ نہ اترے گی کیا مل نہ سکے گا سایا
جیون ریگستان رہے گا سکھ کی نہ ہوگی چھایا

پھر اتنی ہی تیز دھوپ تھی جیون کی راہوں پہ
دل میں گرد تھی اور ویرانی پیاسی سی باہوں پہ
وہی قناعت وہی صبر تھا پھر سے اب آہوں پہ
سر کو جھٹک کے بھیڑ میں دنیا کی وہ بالک کھویا
ہاں دل میں اک کسک تھی اتنی کیا کاٹا کیا بویا

ہاتھوں میں محنت کے تیشے مکھ پر غم کی دھول
دل کے اندر سوکھ چلے ہیں ارمانوں کے پھول
دل کہتا ہے کبھی کہ اب تو سارے دکھڑے بھول
بس اتنا ہی سوچ کے یہ دن کبھی تو مٹ جائیں گے
لیکن دکھ کہتے ہیں پگلے! ہم تو پھر آئیں گے

پیٹ کو خواہش روٹی کی، تن کو کپڑے کی آس
وہی پرانا چکر پھر تھا، وہی روح کی پیاس
اُسی پرانے گیت کی دھن پھر اُس کو آئی راس
بھوک، غریبی، بیکاری، ماں باپ، بہن بھائی
ایک رُوح اور اتنے صدمے کس کی ملے دہائی

میں نے کہہ دی ساری کہانی ختم ہے میرا کام
اب تم جانو اب تم سمجھو کیا ہوگا انجام؟
یہ بھی پوچھو بھلا کہ اس بالک کا کیا ہے نام؟
وہ آگے بھی دکھ پائے گا یا ہنس کر جی لے گا
بدلے گا رسم میخانہ یا پھر وِش پی لے گا

نظروں کی تسنیم کی تہمت بھوک کی لیکن فکر
الفت کے سبزہ زاروں میں عزت کا ہی ذکر
کبھی تو اونچی اونچی باتیں کبھی دھمال دھمسہ
عزت کا دستور بدلنے کا ہے کبھی ارادہ
کبھی زیست شمشیر و خنجر، کبھی جام و بادہ

لو اتنا میں اور بتا دوں جس کا ذکر ہوا
اپنے دیس کے گھر گھر میں ہے اس کا ہی دکھڑا
ہو سکتا ہے میں ہوں، تم ہو، یا کوئی دوجا
لیکن سب کی ایک کہانی سب کا ایک سا حال
چلو یہ مانا میں نے وہ بالک ہے حسن کمال

حسن کمال

ایک کہانی، ایک پہیلی

دھوپ تھی بیحد تیز تھا سورج جیسے آگ کا تھال
جلسے پیڑ تھے سوکھی ندی دھرتی تھی بے حال
دور دور تک پڑا ہوا تھا برکھا رُت کا کال
پیاسے پنچھی زباں نکالے تکتے تھے آکاش
انساں یوں بے حس تھا جیسے چلتی پھرتی لاش

دیوار و در سہمے سہمے ٹھٹکا تھا موسم
لو کے تھپیڑے دیو کی صورت چلتے تھے پیہم
آندھی یوں چلتی تھی جیسے کرتی ہو ماتم
سوکھے پتے یوں تھے پریشاں جیوں شاعر کی سوچ
دھوپ کے کارن جھلس گیا تھا ارمانوں کا لوچ

ایسے میں اک گھر کے بیحد چھوٹے سے کمرے میں
اک عورت یوں پڑی تھی جیسے پنچھی ہو پنجرے میں
جیسے پودا سوکھ رہا ہو گر کر اک گملے میں
آنے والا تھا اس گھر میں ایک نیا مہمان
کون کہے اب آنے والا خدا تھا یا شیطان

باہر آندھی کے جھکڑ تھے اندر سخت گھٹن
نیچے دھرتی لال دھوپ سے اوپر آگ گگن
حبس، اُمس، بے چینی، گرمی، تپش، جلن، اُلجھن
ایسے میں وہ بالک جنما جس کا تھا یہ نام
لیکن نام بتائیں ہم کیوں نام سے ہو کیا کام

وہ بالک اس تیز دھوپ سے بیاکل ہو رہا تھا
پاس کے اونچے محلوں میں جب ہر بچہ سوتا تھا
جو دستور ہے آج بھی قائم تب بھی وہی ہوتا تھا
کسی کو پھول کی سیج میسر کسی کو بس پتھر
کسی کا بستر نرم گدیلا کسی کا دھرتی بستر

وہ بالک جب بڑا ہوا پڑھنے کی آئی باری
اپنے چھوٹے من میں اُس نے کی بیحد تیاری
لیکن پہلی بات سُنی یہ فیس کی ہے دشواری
روپیہ پیسہ وہ کیا جانے کون سی شے ہوتی ہے
وہ تو اس منزل پر تھا جب انگارا موتی ہے

لیکن اک دن دھیرے دھیرے سمجھ گیا یہ حال
رفتہ رفتہ جان گیا وہ گھر کا سب جنجال
بھوک، غریبی، روٹی، کپڑا، مہنگائی اور کال
اس کی معلومات بڑھیں وہ سب کچھ جان گیا
دُنیا کتنی سخت تھی ہستی کٹھن تھی مان گیا

وہ دن اور آج کا دن ہے اس کی رام کتھا
دُکھ کا ایک بہا ساگر ہے، جس کا انت بھلا
کہاں ہے یہ معلوم ہے کس کو، دُکھ کی یہ گاتھا
ختم نہ تب تھی، ختم نہ اب ہے، ختم نہ شاید ہو
چڑھتی جائے بڑھتی جائے جیوں ارماں کی رَو

منظرؔ حنیفی ھسوی

گفتنی — ناگفتنی!

(استاد محترم حضرت شادؔ عارفی کی موت پر)

شادؔ عارفی کا نام مرے روبرو نہ آئے!
یہ طنز یہ کلام مرے روبرو نہ آئے!
اب اور کوئی تلخ اشارہ نہ کیجیے
اس طنز گو کا ذکر خدارا نہ کیجیے!
جس کی تمام عمر کٹی انتشار میں
جس کو کہیں جگہ نہ ملی کوئے یار میں!
اپنوں میں جس کا نام پکارا نہیں گیا
جو دشمنوں کے ہاتھ سے مارا نہیں گیا!
جو پتھروں میں پھول کھلا کر چلا گیا
"طنز و غزل کی چول ملا کر" چلا گیا!
جو ظلمتوں کی راہ میں حائل رہا، وہی
جو عمر بھر خلوص کا قائل رہا، وہی
مشکوک باغباں سے رہا خار کے لیے!
جس نے "بہار و گل" کے معانی بدل دیے

مجنوں صفت رہا جو بصد آگہی، وہی
جس نے "غزل کرائے کے گھر" پر کہی، وہی!
سب اُس سے بدگمان تھے، وہ یار سب کا تھا
حالانکہ اُس کے طنز کا نشتر غضب کا تھا!
وہ دوسروں کے واسطے زندہ رہا مگر
بونوں کو دیوزاد نہیں آسکا نظر!
منسوب اُس کے ساتھ روایات ہیں کئی
"ناگفتنی سے" اور بھی حالات ہیں کئی!
دَر زندگی کے بند تھے اُس "بدمزاج" پر
ہے اُس کی موت طنز مجسم سماج پر!

بچنے کا کوئی اور بہانہ تو ہے نہیں!
(آنکھوں کے پاس کوئی خزانہ تو ہے نہیں،
پلکوں پہ آنسوؤں میں کہاں تک لہو آئے)
شادؔ عارفی کا ذکر مرے روبرو نہ آئے

راج نرائن رازؔ

مہاتما

میز کی اُس جانب بیٹھے تم
سوچ میں ڈوبے، فکر میں گم سم
آگے پیچھے دائیں بائیں، اک دیوار خیالوں کی ہے
ریشمی تار کے ہالوں کی ہے

اَن دیکھی دُنیا کو دیکھو
اِس دُنیا میں آ کر دیکھو
اِن ہالوں کو توڑ کے نکلو، اس دیوار کو ڈھا کر دیکھو
عِلم کی آنکھ اُٹھا کر دیکھو

خاموشی کے خول سے باہر
ننھی بوندیں نغمہ سرا ہیں
رِم جھم
رِم جھم
جیسے کسی پازیب سے گھنگرو
چھن چھن چھن
چھن
ٹوٹ گئے ہوں

کتاب، لکھنؤ

تاج سعید

گیت

چُپ کا بندھن ٹوٹا

پت جھڑ بیتا، بگیا میں پھر مست پَون لہرائی
سُر سنگیت کا جادو پھیلا، کلی کلی مسکائی
پھُول کھِلے جب بھنورے آئے
ڈال ڈال پنچھی منڈلائے

جاگا ہر گل بوٹا
چُپ کا بندھن ٹوٹا

رُت نے جب سنگھار کیا، جیون نے لی انگڑائی
گیان کے سونے کنج سے آخر بھاگ پڑی تنہائی
ٹوٹے دھیان کے بندھن سارے
جاگے سوئے بھاگ ہمارے

گیانی گیان سے چھوٹا
چُپ کا بندھن ٹوٹا

وہاب دانش

رات کی مورت

ڈھلتے دن کے ہات نے
اپنے ساتھ ہر اک چنچل چھایا کو باندھ لیا ہے
کرنوں کی ساری ہمدردی
دلجوئی اور اپناپن
جو دن بھر گھیرے ڈالے بیٹھے تھے آنگن میں
لمحہ لمحہ
ایک ایک کرکے
بن بولے ہی
دیواروں، چھت اور منڈیروں پر دو پل رُک کر
آگے ہی سرک رہے ہیں۔
اونچے گنبد پر بیٹھا خاموش اُجالا
اک کالے سے بھنور میں ڈوبا
سونے در کو
ہر آہٹ پر
اپنے من کا بوجھ سنبھالے یوں تکتا ہے
جیسے کوئی پھول ہوا کے بھنور میں پھنس کر
گرتے گرتے رہ جائے

یا درپن
عکس دکھا کر دھوپ کا بوسہ
رُخ سے
جھٹک کر پھر مدھم پڑ جائے
تنہا گھر میں
رات کی مورت
اپنی مانگ پہ افشاں بھر کے
تاریکی کی ہر سرحد کو
چھو لیتی ہے

اقبال صفی

"تابوت بردوش"

یہ راستوں کی سیاہی یہ منزلوں کا سراب
یہ زندگی کی چتائیں یہ آگ و خون کی بات

غبار و گرد کی لپٹیں یہ گھری دھول کے جال
اُفق پہ صبح کی پرچھائیاں پریشاں حال

زمیں کے چہرے پہ یہ خون کی دبیز تہیں

یہ روشنی کے جنازے یہ تیرگی کی برات
شکستہ قصرِ تمدن شکستہ سازِ حیات

نشاط و کیف کے نغمے میں کس طرح چھیڑوں
حیات موت بنی ہے ذرا ٹھہر جاؤ!

باقر مہدی

غزل

غریب شہر کے میں کام آیا — مصائب کو پتہ اپنا بتایا
غموں کو پھینک کے سایہ ہو جیسے — خوشی کی جستجو میں دکھ اٹھایا
نہ تھا میں اتنا سرکش لیکن اک دن — الجھ کر زندگی سے سر اٹھایا
خفا ہو کر بہت دنیا سے آخر — دلِ ناداں کو کچھ ہنسنا سکھایا
زمانہ کس کو دیتا ہے جنوں بھی — کرم ان کا کہ میں نے کچھ تو پایا
جزیرے ڈوب کر طوفاں سے ابھرے — "اکیلی بستیوں" میں گھوم آیا
بہاریں چھپ کے شب خوں مارتی ہیں — "خزاں"[1] کو میں نے اک قصہ سنایا
محبت کو کئی رنگوں میں دیکھا — جو پردہ گر چکا تھا وہ اٹھایا

اسے کیوں فکر آسائش ہو باقر
یگانہ کا ہو جس کے سر پہ سایا

[1] محبوب خزاں

دلاور فگار

کیونکہ اپنے ملک کی مٹی بہت زرخیز ہے
اس لیے رفتار پیدائش بھی کافی تیز ہے
اب حکومت کو بنانا چاہیے یہ ایکٹ لا
بے اجازت کے نہ پیدا ہو کوئی بچہ نیا
پہلے اک درخواست دی جائے پرنٹیڈ فارم پر
میں کہ فخرالدین بننا چاہتا ہوں اکسٹ پدر
ساتھ اک درخواست کے یہ بانڈ بھی ہو ان ڈیٹیل
میرا یہ لڑکا بی، اے کرکے نہیں بیچے گا تیل
یہ جواں ہو کر نہیں کہلائے گا ننگ وطن
جعفر از بنگال ہوگا اور نہ صادق از دکن
ملک میں بے روزگاری کو نہ پھیلائے گا یہ
کچھ نہ بن پایا تو پھر شاعر ہی بن جائے گا یہ
مجھ کو ملنا چاہیے پرمٹ برائے نونہال
کیونکہ نزدیک آگئی ہے میری تاریخ وصال
بعد مردن بے قراری کو قرار آیا تو کیا
باپ کے مرقد پہ بیٹا لے کے ہار آیا تو کیا
ایکٹ بچہ کا مجھے پرمٹ اشو کر دیجئے
آج ہی پوری یہ میری آرزو کر دیجئے

عادل منصوری

دنیا کی بے وفائی کا شکوہ فضول ہے
ہم باوفا ہوئے یہ ہماری ہی بھول ہے

اُس سے بچھڑ کے میں تو پریشاں ہی تھا مگر
لوگوں سے یہ سُنا ہے کہ وہ بھی ملول ہے

گمراہ کہہ رہے ہیں اُنھی کو یہ ہوشمند
منزل بھی جن دوانوں کے قدموں کی دھول ہے

لب چومنا تو کوئی بڑا جرم بھی نہیں
اچھا اب آپ جو بھی سزا دیں قبول ہے

عادل بدن ہے اس کا کوئی یا لچکتی شاخ
چہرہ ہے اُس کا یا کوئی رنگین پھول ہے

تاراجِ حیرت

تسلیم ان آنکھوں کا اعجاز مسیحائی
لیکن یہ بتا ہمدم کس کس نے شفا پائی

اس کش مکشِ غم میں ایسا بھی ہوا اکثر
جینے سے بھی شرمائے مرتے بھی حیا آئی

ویرانۂ حسرت میں تم کیسے چلے آئے
ہو جائے نہ پھر برہم مجھ سے مری تنہائی

آشفتہ مزاجوں نے کب اپنا چلن بدلا
ساغر بھی ہزار اُچھلے آنکھوں نے بھی چھلکائی

آخر دلِ وحشی نے انداز ترے سیکھے
اپنوں سے تجاہل ہے غیروں سے شناسائی

کیا بات کریں اپنی ہم لوگ وہ ہیں جن پر
تقدیر بیابانی، فطرت چمن آرائی

تفسیرِ جنوں حیرت موضوع ہی کچھ ایسا تھا
دنیا مری باتوں پر مشکل سے یقیں لائی

طفیل ہوشیارپوری

غزل کا نیا روپ٭

شام سویرے نین بچھا کر راہ تکوں میں ساجن کی
رام ہی جانے کب چمکے گی قسمت میرے آنگن کی

گھر گھر میری پریت کا چرچا گھر گھر میرے پریم کی بات
پنکھ بنا ہی اُڑ جاتی ہے بات دِلوں کے بندھن کی

جب سے انکھیاں نین بنی ہیں پوچھ نہ دل کا حال سکھی!
انگ انگ سے پھوٹ پھوٹ کر خوشبو نکلے چندن کی

پردیسی کے ساتھ گئی تھی بھول نہ جائے راہ کہیں!
لوٹ کے آنا بھول گئی ہے جوت ہمارے نینن کی

نین چرا کر جب سے سیاں دور کہیں پردیس گئے
برہن کی انکھین سے برسے بن ساون رُت ساون کی

ماتھے پر صندل کا ٹیکہ بن کر من کا دیپ جلے
نینن میں دو دو کر کجرا لکھے کہانی برہن کی

سب سکھیوں نے سہاگ منایا گھر گھر پریم کا رس رچا
میرے گھر میں گیت نہ آئے اور نہ کبھی پائل چھنکی

پیتم کا من میرا من ہے اس کی آشا میری ہے
پی کے نیناں میرے نیناں داسی ہوں میں سوتن کی

٭ ماہنامہ کتاب میں فراق کے مضامین سے متاثر ہو کر۔

غزلیں

واحد پریمی

ذرّوں کو تم مثالِ مہ و کہکشاں کرو
اے دوستو زمین ہی کو آسماں کرو

مٹنے کے بعد ملتی ہو یارو حیاتِ نو
تم بڑھ کے خیر مقدمِ برقِ تپاں کرو

دیوانو احترامِ بہاراں کا وقت ہے
دامانِ عقل و ہوش کی اب دھجیاں کرو

گر اپنے ہمنوائی کریں، کچھ نہیں کمال
ہے بات جب کہ غیروں کو بھی ہمزباں کرو

اے جاں نثارِ حسن کی سرکار میں بہ شوق
تم نذرِ دل تو کر چکے اب نذرِ جاں کرو

حور و قصور کی تو بہت فکر ہو چکی
اب تھوڑی دیر واعظو ذکرِ بتاں کرو

واحدؔ تلاشِ خام سے کچھ فائدہ نہیں
منزل پہ تم پہونچنے کا عزمِ جواں کرو

مضطرب بلیاوی

اس سے پہلے کہ مزاج اپنا شبِ غم بدلے
دل نے اے دوست کئی شوق کے عالم بدلے

دل کو تھامے ہوئے بیٹھے ہیں سرِ شام سے ہم
کیا خبر، یاد تری کون سا عالم بدلے

صرف اک جرمِ تبسم تھا تری پرسش پر
ہم سے کن کن کے لیے درد نے پیہم بدلے

دل کے زخموں کو بہ صد شوق کریدا ہم نے
اس سے پہلے کہ زمانہ کوئی مرہم بدلے

ہائے اس ڈر سے کہ ہو رازِ محبت نہ عیاں
میری آشفتہ سری نے کئی محرم بدلے

لاکھ چاہا غمِ دوراں نے بدلنا لیکن
میرے تیور، مرے انداز بہت کم بدلے

نور الزماں

وحشتِ رنگِ بہاراں کو ادھوری پاکر
بوئے محبوب صبا لائی ہو ویرانے میں

کیسی ناشکری کہاں تشنہ لبی کے شکوے
ہم تو بدمست ہیں ساقی ترے میخانے میں

جذبۂ جوشِ جنوں اہلِ خرد سے ہشیار
راز کچھ منہ سے نکل جائے نہ گھبرانے میں

جوہر میر

غزل

آسماں سے بھی کسی دن کوئی تارا ٹوٹے
کیا قیامت ہو کہ دل روز ہمارا ٹوٹے

یوں اُتر جائے گی شاید مری آنکھوں کی تھکن
تیری انگڑائی اگر بن کے نظارا ٹوٹے

اُٹھ رہے ہیں تہِ دل درد کے طوفاں لاکھوں
جانے کب صبر کا بے نام کنارا ٹوٹے

کون پھر رات گئے زخمِ ندامت جھیلے
ٹوٹنا ہے تو سرِ شام سہارا ٹوٹے

گاڑ دیتا ہوں وہی دل میں دعاؤں کی صلیب
پھول جو دستِ صبا سے یہاں پیارا ٹوٹے

کیا چھپائیں تپشِ غم کہ ستاروں کی طرح
طاقِ مژگاں پہ جن اشکوں کو سنوارا، ٹوٹے

خشک ہو جاتی ہیں بھیگی ہوئی آنکھیں جوہر
شاخ بن کر جو کوئی درد کا مارا ٹوٹے



محبوب اللہ مجیب

غزل

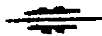
جانے وہ کیسا شہر تھا جس میں روشنی ملی
اوروں کا ذکر چھوڑیئے، ہم کو تو تیرگی ملی

چاہا تھا تم کو، بس یہی میرا قصور تھا
جس کے لیے یہ خاک بسر زندگی ملی

تم سے بچھڑ کے ایک جہاں تنگ ہو گیا
پھر کوئی شے ہمیں نہ کسی کام کی ملی

یہ شہرِ عاشقاں ہے اسے رُک کے دیکھئے
یہ وہ ہیں جن کو کہتے ہیں دیوانگی ملی

اے اہلِ کارواں! یہ نہ پوچھو مجیب سے
اُس کو حیات سے یہی درماندگی ملی



پریاگ شکل

شام و سحر کے درمیان — حیدرآباد

کلکتہ سے حیدرآباد جانے کے لیے کسی غلط فہمی میں میں نے مدراس ایکسپریس میں برتھ ریزرو کرالی تھی اس کا ذکر نہ کرکے میں صرف یہی کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اس کو بدلوانے کے لیے میں دوبارہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا میری بات سن کر کاؤنٹر کے آدمی نے بنگلا میں کہا تھا، نہیں یہ اب کیونکر ہوگا تم نے تو انڑی کرلی ہے۔ میں نے جب ان کو بتایا کہ اس گاڑی سے سفر کر لیے پر میں حیدرآباد رات دس بجے پہونچوں گا میں وہاں پہلی بار جا رہا ہوں ...... انھوں نے ہنس کر کہا تھا، حیدرآباد کیا چھوٹی جگہ ہے ...... رات دس بجے بس ٹیکسی، رکشا سب ملے گا ...... بہت بڑی جگہ ہے ...... لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک بالکل اجنبی شہر رات کو دس بجے پہونچوں میرے زور دینے پر اسسٹنٹ کمرشیل سپرنٹنڈنٹ کو ایک خط لکھ دینے کو انھوں نے کہا اور فوراً ہی اس پر دستخط کردا کے مدراس ایکسپریس میں جگہ دے دی۔ اس طرح میں حیدرآباد رات کو نہ پہنچ کر دوپہر کو پہنچ گیا تھا۔

یہ چار مہینہ پہلے کی بات ہے لیکن اس دن رات میرے لیے ایک دم آگئی تھی ...... میں شام کو اپنی چھوٹی بہن کی نگو بولنے والی سہیلی سے جو کچھ ہی دن پہلے کلکتہ سے اپنے گھر آئی تھی ملنے گیا تھا۔ اگرچہ کلکتہ کی ان کی ملاقات دو ہی چار بار کی تھی لیکن انھوں نے کلکتہ کا تذکرہ کچھ ایسا شروع کیا کہ جب ان کے یہاں سے باہر نکلا تو اندھیرا چھا چکا تھا ...... ان کے یہاں سے نکل کر رکشا کرنے کی خواہش نہیں ہوئی اور میں پیدل ہی راستہ پوچھتا ہوٹل آیا ...... اور کاؤنٹر والے دوست کی یہ بات مجھے بالکل صحیح معلوم ہوئی، بہت بڑی جگہ ہو ...... ڈبل ڈیکر بسیں، ٹیکسیاں، آٹو رکشا سب سواریاں گزر رہی تھیں ـ رات کو بھی ان سہولتوں کا احساس ہوا۔

کسی شہر کے دن اور رات میں کیا فرق ہوتا ہے! ...... کسی شہر میں دن کی بھیڑ بھاڑ سے، جگہوں کی ساخت اور بناوٹ سے، وہاں آنے والے یا رہنے والے لوگوں کے طرز زندگی سے ان سب کو باقاعدہ دیکھ لینے کی وجہ سے ہم ان سب چیزوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن رات کو ...... تب یہ کھلاپن، نہیں رہتا ہے اور اگر کہیں رہتا بھی ہے تو اس کی صحیح شکل پہچانی ہوتی ہے یعنی، رات کا کھلاپن، بھی کچھ اور ہی ہوتا ہے ...... ہوسکتا ہے کچھ اور گوشے ہوں، کوئی اور پوشیدہ حقیقت ہو جو اب تک پوشیدہ رہی ہو ......

ایک صاحب سے میں نے پوچھا "رات کو حیدرآباد کیسا لگتا ہے؟" وہ بہت آہستگی سے بولے "کیسا لگتا ہے ...... چاروں طرف سکون رہتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "یہ تو سب ہی شہروں میں مشترک ہے" "لیکن نہیں، یہ حیدرآباد کی بھی بات ہے ......" اسی طرح اگر کسی رکشے والے سے پوچھا جائے تو وہ شاید کہے گا "آجکل، یعنی سردی کے موسم میں سواریاں کم ملتی ہیں" پان والے یا مزدور سے پوچھا جائے تو ان کے جوابات بھی مختلف ہوں گے کسی ریٹائرڈ افسر سے پوچھا جائے تو اس رات کی تصویر ان کی آنکھوں میں دیکھی جا سکتی ہے جس رات کو انھیں ڈیوٹی کرنا پڑتی تھی۔ یا اگر اس نے رات کی ڈیوٹی نہ کی ہو تو اس کی آنکھوں میں ان راتوں کی تصویر مل سکتی ہے جو اس نے شاید کسی کلب میں گزاری ہوں ...... رات کی ڈیوٹی پر رہنے والے ڈاکٹروں، نرسوں، پولیس کے اہلکاروں کے علاوہ جنھوں نے اسپتال میں لمبی بیماریوں کے دن گزارے ہوں، وہ جو غم روزگار چھاتی میں دفن کیے لیٹے رہے ہیں، شاعر جو خیال اور الفاظ کی تلاش میں ڈوبے رہے ہوں، رقاصائیں جن کی پائل رات میں بھی چھن چھن کرتی رہی ہو، عاشق و محبوب جن کی آنکھوں

صفحہ ۲۰ کا بقیہ

دے گی ...... اور پھر گولی کسی گاندھی کو لگی ہوگی ـــ کسی عیسیٰ کو سولی ملی ہوگی ...... کوئی سقراط زہر کا پیالہ پی رہا ہوگا ...... کوئی کینیڈی کے خون کی دھاروں میں تڑپ رہا ہوگا ـــ اور اس وقت! اس وقت ہمارا راکٹ تیزی سے خلا میں جا رہا ہوگا ... مگر شراب کی بوتلوں کے کاگ بھی اڑ رہے ہوں گے ... ملوں میں پہیے تیزی سے گھوم رہے ہوں گے ...... لیکن طوائف کے گھنگھروؤں کی جھنکار ان کو مات کر رہی ہوگی ...... لیبارٹری میں کالا شیال کسی دوشیزہ کی ناک سے شرما کر لال ہو رہا ہوگا ...... ٹیلی ویژن پر پروگرام ہو رہے ہوں گے ...... مگر لوگ جوئے میں مشغول ہوں گے ...... کرو! اور ترقی کرو ... . ہاں! شاید خدا کو بھی تم پر رحم آجائے اور وہ تم کو سکون دے دے لیکن موت کے بعد! ...... نہیں! تم کو موت کے بعد بھی سکون نہ ملے گا۔

پالن جی کا دماغ چکرا رہا تھا ...... وہ کچھ بڑبڑانے لگا تھا ...... اس نے اپنے آپ کو آئینے کے قریب کھڑا پایا ...... کچھ دیر وہ خود کو احمقوں کی طرح دیکھتا رہا۔ اور پھر! ...... یکایک کمرے میں قہقہہ گونجا! اس نے آئینے میں خود کو مخاطب کر کے کہا دیکھ! یہ دنیا دولت مند بننا چاہتی ہے۔ ہر ملک دولت مند بننا چاہتا ہے ...... مگر میرا دوست سکون! ہاہاہا! تو ان کے پاس کبھی نہ آئے گا ...... میں سمجھ گیا۔ میں

تجھے سمجھ گیا ...... تو ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ کیونکہ ان کی خواہش کبھی ختم نہ ہوں گی ...... یہ خواہشوں میں تڑپتے رہیں گے ...... یہ اور خواہش کریں گے ...... اور تڑپیں گے ...... میں سمجھ گیا! تو ان ذلیل چیزوں میں نہیں" پالن جی نے کمرے کی چیزوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"امریکا کو سکون نہیں مل سکتا۔ یہاں لنکن اور کینیڈی خون کی دھاروں میں تڑپتے ہیں۔ برطانیہ کو سکون نہیں مل سکتا۔ یہاں کرسٹین کیلر کا وارڈ ایک جنسی مذہب بنانے کی اسکیم سوچتا ہے۔ روس کو سکون نہیں مل سکتا یہاں ہنگری پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ اس ہندستان کو سکون نہیں مل سکتا یہ رشوت کا رسیا ہے۔" پالن جی اب چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز فلیٹ کے باہر سنائی دینے لگی "امریکہ کے بچے! کما لے۔ کما لے جتنا کمانا ہو ...... تو ہزاروں ٹن گیہوں سمندر میں ڈال دیتا ہے نا! ڈال دے۔ مگر تو دنیا کے بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کو نہیں دے سکتا ...... اس لیے کہ تو اپنی مارکیٹ value کم نہیں کرنا چاہتا ...... اور اسی لیے میرا دوست سکون تیرے پاس نہیں آئے گا۔ جا! جو کرنا ہے کر لے! کر لے!! کر لے!!" پالن جی نے چیخ چیخ کر کہا۔

اس کی آنکھیں بے حد خوفناک ہو گئیں۔ اچانک اس کے ہاتھ میں حرکت ہوئی اور لائٹر سے لو نکلی۔ ہر قہقہہ لگانے والی شے اب تھرتھرا رہی تھی۔ شیشے جھل جھل کے کہہ رہے تھے نہیں! نہیں! نہیں۔ صوفہ سٹ ہاتھ اٹھا کر فریاد کر رہا تھا۔ قالین خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کتابیں بک شیلف میں کانپ کانپ کر کہہ رہی تھیں۔ ہم کو نہ جلاؤ! ہم کو نہ جلاؤ ہم بیکار نہیں۔ تم نے ہمارا استعمال غلط کیا ہے۔ تم نے اچھے محل سے دنیا نہیں بلکہ دنیا سے محل کی تعمیر کی ہے اس میں ہمارا کیا قصور ...... کیا قصور ؟ ۔

مگر پالن جی پاگل ہو چلا تھا۔ اس کے لائٹر سے لو تیزی سے نکلنے لگی۔ اس کا بوڑھا چہرہ کافی وحشت ناک ہو گیا تھا۔ وہ بالکل خونی نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک کتاب لائٹر کے قریب لا کر نعرہ لگایا۔ ہاہاہاہا! میرا دوست سکون زندہ باد ...... میرا دوست سکون! زندہ باد!

اور اس کے بعد کتاب جل رہی تھی ...... کمرہ جل رہا تھا ...... پالن جی جل رہا تھا Renaissance آرٹ کی تصویریں جل رہی تھیں ...... ان میں ایک تصویر تیزی سے شعلہ پکڑنے لگی۔ یہ تصویر جولی کی تھی جو اپنی اسکول بس کا انتظار کر رہی تھی۔

...... پیچھے پیچھے میں بھی جاتا ہوں ..... ڈبیا، تیل، ماچس، کاغذ کی تیلیاں، سب کچھ تو اس چھوٹی سی دوکان میں ..... اس دن کے بعد اب ہر رات ہر چوراہا ہر موڑ پر ایسی ہی کتنی چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں لڑکوں کو بیٹھے ہوئے دیکھتا ہوں..... جو دوکانیں دن کو نظر نہیں آتی لیکن رات ہوتے ہی سج جاتی ہیں ..... حیدرآباد کے تمام سائیکل رکشوں اور سائیکلوں کے لیے یہ چھوٹی چھوٹی دوکانیں ...... کم سرمایہ اور کم آمدنی کی ..... اندھیرے میں، سردی میں، سمٹے سکڑے بیٹھے لڑکوں کی نظریں دوڑتی رہتی ہیں ــــ کس رکشے یا سائیکل کی بتی بجھ گئی ہے......

ایسی ہی بہت سی دوکانیں ہیں، آلو، پیاز اور سبز مرچ کی ٹکوریوں کی ...... اور کیلوں سنتروں کی..... جو رات کے گیارہ بارہ بجے تک سڑکوں پر چار پہیوں کی گاڑیوں میں سجی رہتی ہیں ۔

آج دیر ہو گئی ۔ پونے دس بجے کے بعد تاج محل میں کھانا نہیں ملتا..... میں زینہ چڑھ کر اوپر پہنچتا ہوں ۔ کوپن بیچنے والے صاحب مجھے دیکھ کر مسکراتے ہیں .....

ہال کی صفائی ہو رہی ہے ... سوکھی ہوئی کیلے کے پتوں کی پتلیں اور تھالیاں سمیٹی جا رہی ہیں ......

نیچے اتر کر دیکھتا ہوں ..... ایک محترمہ اپنی لڑکی کے ساتھ کھڑی ہیں ...... شوہر کار سے سامان اتروا رہے ہیں ......
قریب کے کسی شہر سے راجدھانی کا سفر کار میں .....

باہر آکر سامنے کی جھونپڑیوں کی سمت مڑتی ہوئی ایک چلتی پھرتی کیلے کی دوکان سے کیلے خریدتا ہوں ..... جھونپڑیاں ڈھیر بان گھاس پھونس اور دوسری چیزیں جنھیں الگ الگ دیکھنا اور پہچاننا مشکل ہے ..... ایک رات یہاں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا تھا ..... مرد اور عورتیں اپنے اپنے کام میں لگے تھے ..... کوئی استری کر رہا تھا، کوئی کپڑے باندھ رہا تھا اور ایک لڑکا کانپ رہا تھا اور چیخ چلّا رہا تھا، لیکن پتا جیسے معمول ہو، کسی کا دھیان اس طرف نہیں ..... نیشنل ہٹس یونین..... چار پہیوں والی کیلے سنتروں کی دوکان میں ایک جھنڈی بنا کر نکلا لاگیا جلوس ایک دن دیکھا تھا یعنی یہ جھونپڑیاں بھی نعمت ہیں ......

اندھیرا پھیل چکا ہے۔ ڈھل پٹ کے پاس سے رکشا گزر رہا ہے چھوٹے چھوٹے گھر، جھونپڑیاں اور گندی گلیاں ــــ سوچتا ہوں کہ شاید ایسی بستیاں ہندوستان کے ہر شہر میں ہیں ..... یہ بستی کانپور کی بھی ہو سکتی ہے، اور کلکتہ کی کسی نواحی آبادی کی بھی .....

پھر بڑے بڑے پرانے مکان اور گھر ..... صدیوں کی، زندگی، جیسے یہاں ٹھہری ہے ..... خاموشی ..... ایک اداس سنگیت جو بجتا رہتا ہے اگر غور سے سنو تو سنائی دیتا ہے ..... آندھیوں میں گرتے ہوئے اڑتے پتے، چڑیاں، ساکت ہوا، پیڑ پودوں کی خوشبو، ہلکی روشنی ..... ایک زندگی جوان کے زندہ رہنے یا ڈھلنے کے لیے چھوڑ دی جاتی ہے جو جینا نہیں جانتے، اور جدید و قدیم کی کشمکش میں ٹوٹتے رہتے ہیں ..... کچھ ٹوٹ کر الگ ہو جاتے ہیں، کچھ اداس سنگیت کا جز بن کر رہ جاتے ہیں......

چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بنے ہوئے گھر..... اپنے ڈھنگ کا۔ آرکیٹیکچر ..... کچھ دنوں پہلے ہمایوں کبیر نے حیدرآباد کو ہندوستان کا سب سے خوبصورت شہر کہا ہے ..... چار مینار، ہائی کورٹ، عثمانیہ اسپتال، سٹیٹ لائبریری، اور نہ جانے کتنی چھوٹی بڑی عمارتیں!

رات کو چار مینار کے پاس سے ڈبل ڈیکر ..... بس میں چڑھا ہوں ..... ادھر دو دن رہا تھا، ابھی دونوں ایک لانڈری میں کچھ کپڑے دیئے تھے، انھیں لے کر لوٹ رہا ہوں ..... چار مینار پر کبھی چڑھا نہیں ہوں، بس کے اوپری حصے میں بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں پرانا حیدرآباد ..... چار کمان ..... تھم گئی ..... پرانے انداز کے مکان اور دوکانیں ......

دو دن تو چار مینار کے پاس رہا تھا .... اچھے اور خوبصورت باغیچہ کی لاج میں ..... لیکن رات ہوئی تو پاس کے ایک الیکٹرک سب اسٹیشن کی "گوں گوں" آواز گونج اٹھی ..... آواز رات کے سناٹے میں بہت تیز معلوم ہونے لگی ..... نیند نہیں آئے گی اور لکھنا پڑھنا کیسے ہوگا ..... باغیچہ کے دوسرے سرے پر جھونپڑے نما ایک کمرے میں میرا سامان پڑا تھا، دوسرے دن اس کمرے میں لے رکھنا تھا ..... میں بھی وہیں چلا گیا تھا ..... ہلکی روشنی ۔ باغ کے نالی کی ایک منڈیا پڑی تھی، چاول کے دانے اور چیونٹیاں ..... میری کتابیں بکھری پڑی تھیں ..... این کا دنسٹ..... ماڈرن نہیں .....

کی نیند اڑ گئی ہو ——— سب کے جواب اور تاثرات الگ اور مختلف ہو سکتے ہیں ...... یعنی رات، وہ بھی کسی شہر کی رات، بہت سے زاویوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔

عابد شاپ اور سلطان بازار! ہر چھوٹے بڑے شہر میں ہونے والے اپنے اپنے ڈھنگ کے چمک دمک والے بازاروں کی طرح حیدرآباد کے دو بازار ہیں! چہل پہل بھیڑ بھی، لیکن کوئی جلدی نہیں۔ نی آن سائن سے چمکتی ہوئی دو کانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اچھا لگتا ہے۔ واقعی خوبصورت دو کانیں۔ گاڑیاں پارک یہ جگہیں خالی ہیں؟ کرکے لوگ بڑے اطمینان سے خریداری کرتے ہیں۔ اور شناساؤں سے گفتگو۔ ظاہر ہے میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا اور شائد اسی احساس کی وجہ سے اپنے طریقہ پر ان کو جاننے کی کوشش کرتا ہوں ....

مراد نگر کی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھ کر حیدرآباد کا ایک حصہ دیکھا تھا ——— پرانے اور نئے بنگلے، باغات، افسروں، ریٹائرڈ افسروں یا پھر زمین دار جاگیر داروں کے مالکوں کے .....

شاید ان کی گاڑیاں بھی یہاں پارک کی ہوئی ہیں ——— اس کنارے سے اس کنارے کے بیچ کی گلیاں، سڑکیں، چھوٹے چھوٹے مکان، عمارتیں ..... لمبے پتلی نام پلیٹ ..... متوسط خاندانوں کے ..... ساری چمک دمک کے درمیان ایک دھند لکا آتا ہے .....

میں دھیرے دھیرے کوٹھی کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں۔ دروازے کو دھیرے سے دھکا دے کر اندر رکھتا ہوں .... جیوک باکس میں کوئی ریکارڈ بج رہا ہے۔ اندر جا کر کنارے کی ایک ٹیبل پر بیٹھ جاتا ہوں ..... شیشے کی دیوار سے باہر وہیں پارک کی ہوئی گاڑیاں اور خوبصورت دو کانیں دکھائی دیتی ہیں، اور ٹرافک ....

"ایسپریسو کافی" میں بیرا کے آنے پر کہتا ہوں۔ پھر سامنے بیٹھے ہوئے ان لڑکے اور لڑکیوں کی طرف دیکھتا ہوں جو یقیناً مقامی ہیں اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں ..... اور اب گرتے ہوئے، دوسرے ریکارڈ کی طرف دیکھ رہے ہیں ..... بس ریکارڈ بجنا شروع ہو جائے گا اور پتہ نہیں کون سی مانوس یا غیر مانوس دھن اور گیت سنائی کر ایسے میں جب بھی شام ڈھلے .....!

وہ سب بہت خوش ہیں۔

دھیرے دھیرے بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے اور وہ چہرے دکھائی دے رہے ہیں جنہیں دیکھ کر میں یہ اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ان کے لیے شام کو یہاں آنا روز کے معمول میں داخل ہے۔ میں ایک غیر متعارف شخص سے متعارف ہونے کے لیے کھڑا ہو جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک چاروں طرف دیکھتا ہوں ——— نہیں یہ ریسٹوران کسی بھی بڑے شہر کا ہو سکتا ہے ......

باہر .... ایسے ماحول سے نکلنا کسی حد تک ایسا ہی ہے جیسے کسی سینما ہال سے تاریخی فلم دیکھ کر نکلنا ——— یعنی قدموں میں ایک طرح کی سستی سی آجاتی ہے۔ تصورات اور خیالات کا تاثر باہر نکل کر ہلکا ہو جاتا ہے۔

چورا ہے کے بعد ڈھال پر سڑک کے کنارے دو کانیں دور دور تک پھیلی ہیں ...... بہت ساری باتیں یاد آتی ہیں ..... چورنگی پر اس وقت بہت بھیڑ ہوگی، اور کناٹ پلیس پر ..... نہیں، چورنگی کی طرح یہاں بھی نہیں ..... یہاں بھیڑ اتنی نہ ہو لیکن چمک دمک یہاں ابھی کم نہیں ..... حیدرآباد ..... سرکاری کاغذات پر اب بھی دن بھر کا شہر ہے! ڈھال کی سڑک پر کچھ آگے چل کر ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہوں ..... پیڑوں کے پیچھے ہلکی روشنی سے درختاں گھڑی کے اوپر نیلے رنگ میں نی آن سائن کا کراس ..... وقت کے اوپر ٹنگا ہوا کراس ..... اور نزدیک آ کر پڑھتا ہوں ..... سینٹ جارجیٹ چرچ ..... یہاں اندھیرا ہے اور گھنے پیڑوں میں خاموشی ......

ایک عرصے سے سائیکل نہیں چلائی تھی ..... اس لیے سائیکل اور سونی سی سڑک ہاتھ لگتے ہی سائیکل چلانے کے جذبہ کو نہ دبا سکا ...... دوسرے احباب رکشوں میں بیٹھے ہیں ..... طے ہوا تھا، ایک ہی رکشا کیا جائے گا۔ دو آدمی رکشے میں بیٹھیں گے اور ایک سائیکل پر چلے گا ....

"سامنے چوراہا ہے ..... ارے اترئیے، بتی بجھ گئی ہے ...... رکشے والا کہتا ہے ..... بتی بجھ گئی ہے، یعنی سگنل نہیں ہو تو اب اس پر بیٹھ کر نہیں چلا جا سکتا لیکن احباب رکشے سے اتر مجھ سے سائیکل سے کرنٹ پاتھ بیٹھے ایک رکشے کے پاس چلے جاتے ہیں۔

عورتیں بوتلیں لیے بیٹھے ہیں ..... سنا ہے ایسی اور کیسی جگہیں جہاں سیندھی اور تاڑی بکتی ہے ..... دن بھر کے تھکے ہارے مزدور مرد اور عورتیں یہاں آتی ہیں .....

نمائش میں، برک بانڈ کے اسٹال سے ہم چائے کی آخری پیالیاں پیتے ہیں ..... آخری پیالیاں، یعنی دس بج رہے ہیں اور اب چائے بھی نہیں ہے ہمارے بعد آنے والے لوگ ناامید لوٹ جاتے ہیں ..... نمائش بند نہیں ہوئی ..... اسٹال کھلے ہیں اور نی آن سائن چمک رہے ہیں ..... ہاں، بھیڑ چھٹ گئی ہے .....

میں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیتا ہوں۔ زیادہ ٹھنڈک نہیں ..... بس کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ سردی کا زمانہ ہو ——— ہر سال یہ نمائش جنوری، فروری میں ہوتی ہے ——— آل انڈیا انڈسٹریل ایگزی بیشن، ہینڈ لوم کے کپڑوں کی دوکانیں، ششی ادم پرکاش نرنل اور میرے ہم عمر شاعر مصحف اقبال توصیفی بیڈ شیٹس اور ٹیبل کلاتھ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں۔ اور میں پڑھ رہا ہوں یہ اسٹال کس شہر کا ہے، یا مالک تیرا ہی بھروسہ ہے! اسٹال پر ایک صاحب مال اٹھا کر رکھتے ہوئے کہتے ہیں، ایک دس بارہ سال کا لڑکا ایک کونے میں کپڑے پر سو رہا ہے ..... حیدرآباد میں پچھلے دنوں کے لیے بسی ہوئی یہ نئی بستی ہے اور اب یہاں رات بھیگ رہی ہے اور شہر میں بھی یعنی باہر نکلنے پر بھی دو ایک کھلی ہوئی دوکانیں دکھائی دیں گی ——— اور سڑکوں کی بھیڑ چھٹ گئی ہوگی .....

باہر آکر ہم گن فاؤنڈری کے ایک ہوٹل میں بیٹھ جاتے ہیں ..... ایک کیبن میں، توصیفی سے ان کی کوئی نظم سنی ہے۔ توصیفی جھجکتے ہوئے شروع کرتے ہیں ———

میں تجھے بھول گیا ایسی کوئی بات نہیں .....
جانے کیوں تیری ملاقات سے جی ڈرتا ہو .....
ورنہ پہلے تو شب و روز کا معمول سا تھا
کیا کہیں ہم رخِ مہتاب ترے غم کے طفیل
یوں کٹی رات کہ اب رات سے جی ڈرتا ہے .....

رات سے جی ڈرتا ہے ..... یعنی تمام خیالوں سے گھری ہوئی راتیں جب اندھیرے میں بھی تمام مناظر ابھرتے ہیں، یا بغیر ابھرے ہوئے بھی ایک سکھ یا غم دے جاتے ہیں۔

بریانی اور تندوری روٹی کی آوازیں کم ہو رہی ہیں شدت اور زیادہ محسوس کرتے ہیں ..... چائے ختم کر کے ہم باہر نکل آتے ہیں۔ توصیفی میرے لیے ایک رکشے والے سے بات چیت کرتا ہے۔

"ہمایت نگر ..... ایک سواری ..."

"بارہ آنہ ..... " ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا کہتا ہے

"بھائی ہم یہیں کے ہیں ....." توصیفی ہنس کر کہتے ہیں۔

"دس چھ آنے"

"سات آنے" لڑکا جواب دیتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" توصیفی میری طرف مڑ کر دیکھتے ہیں۔

.... رکشا بڑی تیزی سے بھاگ رہا ہو۔ "بھائی اتنی جلدی کیوں ہے؟" ——— "صاحب آپ کو چھوڑ کر سینما کی سواری لینا ہے۔" لڑکا کہتا ہے ...... ان سینما گھروں میں یہاں آخری شو سوا بارہ یا ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے ..... تیز اور تیز ..... لیکن چین اتر گئی ہے ..... چاروں طرف کتنا سناٹا ہے ..... صرف کتوں کے بھونکنے کی آواز ..... سڑک کی بتیوں سے لگتا ہے کہ مدھم شہر یہ ہے ..... اور سامنے سے ایک کار تیزی سے بھاگی آ رہی ہے .....

سلطان بازار کے بس اسٹینڈ کے پاس سرکتے ہوئے رکشے ..... ایک کے بعد دوسرا ..... "رکشا لاؤں صاحب ..."

"صاحب صرف تین آنے۔ بڑی چڑھائی ہے پانچ آنے صاحب"

"رکشا لاؤں صاحب ....."

ایک بند دوکان کی سیڑھیوں پر بیٹھا کوئی گلاس میں چائے پیتے ہوئے کہتا ہے۔ "کیوں پوچھ رہے ہو، تمھیں جینے کا کوئی حق نہیں ..... میں مڑ کر دیکھتا ہوں، یہ شخص چائے پی رہا ہے یا شراب ..... لیکن زندگی کبھی کبھی چائے کو بھی شراب بنا دیتی ہے .....

آندھرا بینک کا نام نیلے رنگ میں نی آن سائن میں چمک رہا ہے ..... دکنیں یونی ورسٹی کا ہک پر اندھیرا اور گہری خاموشی ..... صرف چائے کی دو ایک دوکانیں کھلی ہوئی ہیں ... بسوں کے انتظار میں گھومتے ہوئے کچھ لوگ ہیں ..... رات کو ان گھیرا ہے

بہار ترسے ہیٹکوسے، کافکا ... کافکا ... دی ٹرائل، اور کیمیو، ... جنگی ادب .... اور نہ جان پانے کا دکھ یا اپنے ڈھنگ سے جان پانے کا دکھ ....

رکشوں میں پڑے ہوئے پردے ..... صرف رکشوں میں ہی نہیں، ٹیکسیوں اور کاروں میں بھی اور سینما ہال میں خواتین کے لیے مخصوص نشستوں پر پڑا ہوا پردہ جو ہال میں اندھیرا ہو جانے پر ہی اٹھتا ہے ——— صرف انھیں چیزوں اور جگہوں پر نہیں، شہر کے گنجان علاقوں کو چھوڑ کر ایک عجیب و غریب سا پردا جیسے شہر کی ساخت اور ماحول پر بھی پڑا ہے .... اندھیرے میں بھی ایک پردے کی آڑ میں اترتی ہوئی۔

سڑک پر پیدل اور رکشے میں کئی بار گزرتا ہوں ...... اندھیرے اجالے کے درمیان سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے مکان .... سب اپنے میں کھوئے اور خاموش ..... محسوس کرتا ہوں کہ ہر چیز تکلف ہے۔ ضرورت پڑے تو دوسری چیزوں سے منسلک ہو جاتی ہے، نہیں تو اپنے ہی میں کھوئی رہتی ہے ......

رات کے گیارہ بجے ہیں، میں ایک رکشے میں لوٹ رہا ہوں، رکشا ان جگہوں اور سڑکوں پر بھاگ رہا ہے جو میرے لیے غیر مانوس ہیں .... ایک دم میں سنبھل کر بیٹھ جاتا ہوں .... کیا سڑک پر پھول بچھے ہیں .... اتنی خوشبو، جیسے اس خوشبو کو چھو سکتے ہیں ..... سرد ہوا اتنی بھاری اور خوشبو سے ٹھہری ہوئی ..... دونوں طرف عالیشان مکانات ..... لیکن خوشبو کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے .... چھوٹے چھوٹے گھر، کہیں کہیں روشنی نہیں تو چاروں طرف خاموشی ہے ..... درزیوں کی ایک آدھ دکان کھلی ہوئی ہے، یعنی وہ کام کر رہے ہیں .... یہاں خوشبو نہیں ہے لیکن ہوا یہاں بھی ٹھہری ہوئی ہے اور بھاری ہے ——— خاموش سی ......

حیدرآباد میں مکانات بلند نہیں ہیں، یعنی ایک یا دو منزل والے زیادہ مکان ہیں ... متوسط طبقہ اور نچلے متوسط طبقہ کے علاقوں کو چھوڑ کر سب مکانوں کے ساتھ باغ باغیچے ہیں .... پیڑ، پودے اور پھول ..... جن کی خوشبو کا احساس رات کو کم نہیں ہوتا۔

فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کی دکانیں ..... سڑک کی روشنی سے منور۔ پرانی کتابوں کے نام پڑھنے کے لیے جھک کر دیکھنا پڑتا ہے ... ان دوکانوں پر بھیڑ نہیں ہوتی، یعنی کبھی کبھار ہی کوئی دکھائی دیتا ہے ——— ڈیتھ ان وینس، اور گریٹسٹ کیڈیو۔ ڈیتھ ان وینس۔ مجھے ایک عجیب سی خوشی ہوتی ہے کسی غیر مانوس جگہ پر کسی شناسا سے ملاقات ہو جانے والی خوشی۔ سڑک سے ٹریفک گزر رہی ہے، لدا بڑھتے اندھیرے میں میں آگے بڑھنے لگتا ہوں ..... مان کی کہانیاں

.... ڈیتھ ان وینس، ٹونیو کروگر اور ترستان .... خارجی زندگی کے ساتھ داخلی متوازن کہانیاں ...... رچی ہوئی چیزوں کو اپنے ڈھنگ سے پہچاننے اور سمجھنے کی خوشی .... اندھیرا، رزم، فنوطیت کے ساتھ خارجی نا امیدی جس پر اپنا پرتو ڈالتی رہتی ہے ... آگے شاید شاپ کے چوراہے پر بھیڑ ہے ..... بس اسٹینڈ کے پاس ایک اسٹال ہے، سستے رسائل اور کتابوں سے بھرا ہوا ہے ..... فلمی رسالے اور جگمگی ہوئی تپائیاں ......

نوبت پہاڑ پر کبھی چڑھا نہیں ہوں ..... باغ کے اندھیرے سے اس پہاڑ کی چوٹی پر اترتی پرچھائیاں دکھتی ہیں .... سنا ہے وہاں سے رات کو شہر بہت اچھا لگتا ہے ..... روشنی ہاروں کی طرح معلوم ہوتی ہے ..... نیچے سے شہر جتنا جگمگاتا ہوا نہیں دکھائی دیتا اس سے زیادہ اوپر سے دکھائی دیتا ہے ...

حیدرآباد اور سکندرآباد ——— انگریزی اخبار اپنی ٹوِن سیٹیز لکھتے ہیں ——— جڑواں شہر۔ سچ مچ جڑواں شہر! مکانوں اور شاہراہوں میں کوئی خاص فرق نہیں ..... اچھے ہوٹل اور سینما ہال سکندرآباد میں شاید زیادہ ہیں اور کینٹونمنٹ ..... اتوار کی ایک رات کو بالکل اجنبی شاہراہوں سے پیدل گزرتا ہوں .... پان کی دوکانوں پر سستے رسائل .... نئے پرانے گھر ..... لگتا ہے یہاں کوئی رہتا نہیں ..... نہیں، لوگ رہتے ہیں، کہیں اندر اور الگ ... شور، دھکم اور چہل پہل بالکل نہیں ہے۔ صرف بسیں گزرتی ہیں اور بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے اکا دکا لوگوں کے لیے رک جاتی ہیں ...

ایک صاحب پان کی دوکان سے سوڈے کی بوتل لیتے ہیں اور جھومتے ہوئے چلے جاتے ہیں ——— جڑواں شہر، شاید شراب کی دوکانیں اور بار .....

معظم جاہی مارکٹ کے پیچھے کھلی جگہ اور فٹ پاتھ پر مرد اور

تبصرے

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گنجینۂ گوہر

مصنف، شاہد احمد دہلوی۔ صفحات ۲۷۲
ناشر مکتبہ نیا دور کراچی ۵۔ قیمت ۶ روپیہ

غالب کا وہ مصرع کہ ؎ "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" شاہد احمد کے ان خاکوں ہی کے لیے کہا گیا تھا کیسی کیسی شخصیتیں اور کیسا ان کے خاکہ نگار کا اسلوب۔

اپنے دادا مولوی نذیر احمد دہلوی سے لے کر خود اپنے تک رنگا رنگ شخصیتوں کی ایک ایسی قوس و قزح ہے کہ بس دیکھتے جایئے مولوی صاحب تو اگلے وقتوں کے بزرگ تھے خود شاہد احمد صاحب نے اپنے بارے میں جو لکھا ہے آیئے اس کو ہی پہلے دیکھیں۔

ہماری تہذیب کی ایک قدر یہ بھی تھی کہ نہ خود اپنی عظمت کے ترانے گائے جاتے تھے نہ اپنے دکھ کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔ شاہد احمد اُسی تہذیب میں رچے بسے بھلا اس قدر سے دامن کیسے چھڑا سکتے تھے چنانچہ وہ ترکیب نکالی کہ بس فن کا رہی کا حصہ ہے۔ اپنے اوپر جو خاکہ لکھا ہے اس میں سیدھے سادھے الفاظ میں لیکن بامحاورہ زبان میں اپنے ابتدائی حالات لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "محاسبۂ نفس بڑی مشکل چیز ہے اور میرے لیے خود ستائی اس سے بھی زیادہ مشکل لہٰذا آپ کرم فرما کے ۲ خطوط کے اقتباس درج کرتا ہوں تاکہ آپ کو میرے کچھ وہ حالات بھی معلوم ہو جائیں جنھیں میں خود بیان نہیں کر سکتا۔ یہ خطوط راجہ مہدی علی خاں کے ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں کے ان دونوں خطوط میں شاہد احمد نے وہ سب بیان کروا دیا ہے جو وہ بیان کر نہیں سکتے تھے۔ یہ ہے ان کی تکنیک کا کمال۔

شاہد احمد دہلوی کی اس کتاب میں ۱۷ خاکے شامل ہیں مولوی نذیر احمد جیسے مولوی سے لے کر منٹو و میراجی جیسے رند مشرب۔ حکیم کیف جیسی دل چسپ لیکن ناشناختہ شخصیت سے لے کر خواجہ حسن نظامی تک اپنی مثال آپ کردار۔ بندو خاں جو موسیقی نواز بھی موجود ہیں تو جوش ملیح آبادی پر "دیدہ و شنیدہ" وہ مضمون بھی جس نے ایک ایسا ہنگامہ برپا کیا ہے جس کی چھینٹیں اب تک اڑ رہی ہیں۔

لیکن اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ شاہد صاحب کی کتاب پڑھ کر کیا پایا تو جواب یہی دوں گا کہ زبان۔ زبان ایسی دھلی ہوئی لکھی ہے کہیں آورد کا نام نہیں کسی کو برا بھلا بھی کہا ہے تو اس طرح کہ "بے مزہ نہ ہوا۔"

شاہد صاحب میں ایک ادیب کی پوری انا موجود ہے ان کو اپنی اور اپنے خاندان کی بڑائی کا بھی احساس ہے اپنے بیتے ہوئے اچھے دن بھی ان کو یاد آتے ہیں اور ہر خاکہ میں ان کے یہ احساسات تڑپ تڑپ کر سامنے آجاتے ہیں لیکن ان کی شخصیت بڑی کڑھی ہوئی ہے ایک ایسی تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہے جس میں افراط و تفریط اور رطب و یابس گناہ تھا۔ شاہد صاحب نے کسی خاکہ میں اپنے ماڈل کو نہ مسخ کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ خود کو اس پر حاوی کرنے کی۔ بڑے ستھرے خاکے لکھے ہیں بڑے حسین خاکے لکھے ہیں ہاں اگر کسی کو اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے تو وہ جوش صاحب واللہ کہ ہے پاس کی بات دوسری ہو۔

عثمان غنی

سب رس زر و ر نمبر

نگراں پروفیسر عبدالحمید صدیقی۔ ناشر ادارہ ادبیات اردو خیرت آباد حیدر آباد دکن ۴
صفحات ۲۹۴۔ قیمت ۶ روپیہ

سب رس کا زرو ر نمبر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اپنے بانی ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کو رسالہ کا خراج عقیدت ہے۔ ۱۹۳۸ء سے جب مرحوم ڈاکٹر زور نے اس رسالہ کی بنا ڈالی آج تک ہر ماہ یہ رسالہ اردو ادب اور علم کی خدمت کرتا رہا ہے اور خصوصاً اردو کے دکن اسکول کا ترجمان رہا ہے۔

اردو کے دکن اسکول کی تاریخ مرتب کرنے میں ڈاکٹر زور کا جو

چلنا یا کھڑا ہونا کتنا عجیب لگتا ہے، دن میں جہاں چلنے یا کھڑے ہونے کے لیے جگہ بنانا پڑے .....

کبھی کبھی عابڈ شاپ سے پیدل حایت نگر آتا ہوں ـــــ تاج محل، میتھوڈسٹ چرچ، کنگ کوٹھی، سمیرہی ..... سناٹے کا بھی ایک سماں۔ نہیں ذرا آگے چلیں۔ کسی گیت کے بول تیر رہے ہیں ...... ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتا ہوں ...... ریکارڈ بج رہے ہیں ـــــ ایک ختم ہوتا ہے تو دوسرا لگا دیا جاتا ہے ..... میرے خیال میں بہت کم شہروں میں فلمی گیتوں کی اتنی بھرمار رہتی ہوگی ـــــ

رات کو کبھی کبھی بس، ساڑھے دس بجے خط لکھنے کی خواہش ہوتی ہے، کیوں نہ انھیں ابھی پوسٹ کر دیا جائے ..... سویرے پانچ بجے نکل جائیں گے ..... خطوط کو سمیٹتا اور لفافوں پر پتہ لکھتا ہوں ..... پونے گیارہ ..... کمرے میں تالا ڈال کر برآمدے میں آجاتا ہوں ..... میں ہمشہ سویرے خط نکل جائیں گے ایسا تو ہے ہی، خطوط لکھ لینے کے بعد اپنے پاس رکھنا میرے لیے بہت مشکل ہے ..... جلد از جلد انھیں پوسٹ کر دینا میری پرانی کمزوری ہے ..... گھروں میں سکوت ہے ..... صرف مکانوں کے احاطوں میں ایک آدھ بلب روشن ہے ..... جن کی ہلکی روشنی میں پودوں، دیواروں یا کھڑی ہوئی کاروں کی قسمت چمک رہی ہے .....

سیڑھیوں پر اندھیرا ہے ..... میں سنبھل سنبھل کر سیڑھیاں اترنے لگتا ہوں۔

لاج کے سامنے میں ایک لیٹر بکس ہے۔ اس میں خط ڈال کر میں چاروں طرف دیکھتا ہوں ـــــ ہنہ، سچ مچ کافی رات ہو گئی ہے لیکن ایک پیالی چائے پینے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میں آگے بڑھنے لگتا ہوں، گھر، جھونپڑیاں، تاج محل ..... پڑولپمپ، لکڑی کوئلے کے ٹال، موٹر ورکس ..... چولہے کے پاس دو ایک دکانیں کھلی ہوئی ہیں اور شائد سکندرآباد کے لیے آخری بس چوراہے پر مڑ رہی ہے ..... ہوٹل میں ریکارڈ بج رہے ہیں ..... اور ہوٹل کے لڑکے تندوری روٹی اور بریانی لیتے ہوئے دوڑ رہے ہیں .....

چائے پیتا ہوا میں ادھر ادھر دیکھ رہا ہوں ـــــ ہوٹل میں سجے ہوئے طرح طرح کے صابن، منجن، بسکٹ، مٹھائیاں۔

جو دس گیارہ سال کا لڑکا مجھے چائے دے کر گیا تھا وہ اب یقیناً ایک ہوٹل میں بیٹھا ہوا تندوری روٹی کسی چیز میں بھگو بھگو کر کھا رہا ہے۔ ہوٹل کے دوسرے لڑکے اسے چڑھانے کے لیے پلیٹ پر رکھی ہوئی روٹی کے ٹکڑے لے لے کر بھاگتے ہیں اور پھر واپس رکھ دیتے ہیں۔

ایک لڑکا ریکارڈ بدل رہا ہے ـــــ آنکھوں سے جو اتری ہے دل میں ..... ہے شمع جسے خود ڈھونڈ رہی، کیا بات ہے اس ویرانے کی ....،

پیسے دے کر باہر آجاتا ہوں ....، دیپک محل کے آگے رکشوں کی بھیڑ ہے، حالانکہ ابھی شو کے چھوٹنے میں تھوڑی دیر ہے۔

نئی اور پرانی عمارتوں کا شہر ..... نئی اور پرانی تہذیب کا شہر ..... رومانی موسموں اور شاعرانہ تصورات کا شہر ..... گویا رات بھی مختلف طریقوں سے بٹ جاتی ہے .....

سکندرآباد کا کٹا ..... پل پر پڑی ہوئی بنچوں کا منظر اور جھلملاتی روشنیاں ..... بلب عام کا اندھیرا اور اجالا ..... شہر کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں بنی ہوئی عالیشان عمارتیں ..... اور باغات رات میں تیزی سے دوڑتی ہوئی کاریں اور نشیبی سڑکوں پر کھسکتے ہوئے رکشے ..... نیلی چاندنی اور ڈبیاں ..... ہوٹل ..... بار اور جھونپڑیوں کے پاس کی چائے کی دوکانیں ..... فلمی سنگیت اور خاموشیاں، تنہائیاں ..... رات کو سنائی دینے والی ریل کی سیٹیاں اور چلوؤں کے گھونگھرو ..... لڑکوں کی معصوم آنکھیں ..... نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں ..... نیند سے بھری آنکھیں ..... بیتی ہوئی یادیں، باتیں اور ان کی پرچھائیاں ..... سکھ کی گرماہٹ اور غم کا اندھیرا ..... خواب اور آنکھوں سے اڑی ہوئی نیند ..... پرانی عمارتوں کا اجاڑ ..... پھولوں کی خوشبو .....

رات کیا کچھ دیکھتی ہے، سنتی ہے اور انگیز کرتی ہے۔

عورت مستقبل دیکھتی ہے، مرد حال اور زمانہ صرف ماضی

تلخ ... تند ... شیریں

بہترین انتخاب :- پچھلے دو ماہ سے کتاب کا افسانہ نمبر حسبِ حسبِ پڑھ رہا ہوں۔ واقعی ایک ایک افسانہ مرتبین کی دن رات کی محنت کا زندہ ثبوت ہے۔ بعض افسانے تو اب تک کے اردو ادب کا بہترین انتخاب ہیں۔ ان کے لیے مرتبین کی محنت کے لیے داد نہ دینا سخت ناانصافی ہوگی۔ مثلاً جبل (راجندر سنگھ بیدی) ہندستان چھوڑ دو (عصمت چغتائی) ماں جی (قدرت اللہ شہاب) بزدل (جیلانی بانو) چنگاری (ستیش بترہ) اور رحمن (الطاف فاطمہ) اختلاف کی گنجائش تو ہمیشہ رہتی ہی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کسی انتخاب میں مختلف رجحانات کی پوری نمائندگی ہو سکی ہے یا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ذمہ داری کو مرتبین نے نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔

شہاب قاصی پوری۔ مئو دانوز۔ پرکاش رومانی۔ اے ایس

خاتون وغیرہ کے خطوط بھی نظر سے گزرے۔ انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے خود ہی آنکھوں پر تعصب کی عینک لگا رکھی ہے۔ انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ شاید افسانوں کا انتخاب نہیں مرکزی کابینہ زیر تشکیل ہے جس میں ہر صوبے کا ایک ایک نمائندہ رکھنا ضروری ہو۔ میں رام لعل اور عابد سہیل نے کسی طرح بھی کسی جانبداری کا ثبوت نہیں دیا۔ کیونکہ ان کے مخلص دوستوں میں خاکسار کے علاوہ قاضی عبدالستار کوثر چاندپوری۔ جوگندر پال۔ غلام ثقلین نقوی۔ سہیل عظیم آبادی۔ بلونت سنگھ۔ انتظار حسین۔ انور خواجہ۔ عوض سعید۔ سریندر پرکاش موہن یادو۔ غیاث احمد گدی۔ انور عظیم۔ اکرم جاوید۔ ہیرانند سوز وغیرہ بھی شامل ہیں مگر جن کی تخلیقات انتخاب میں شامل نہیں ہیں۔

ہرچرن چاولہ۔ دہلی

نئی نسل نمبر :- آپ کی مساعی جمیلہ رنگ لا رہی ہیں۔ یہ پرچہ بڑا وزنی اور خوبصورت ہے۔ پھر آپ کے عزائم بھی کچھ ایسے دیکھے گیا کہ بڑے بڑے چونک پڑیں گے۔

"ہندی افسانہ نمبر" اور پھر "نئی نسل نمبر" یقیناً معرکۃ الآرا نمبر ہوں گے۔ "نئی نسل" نمبر کے لیے تو میں آپ کو پیشگی مبارکباد دیئے دیتا ہوں کیونکہ یہ نسل بزرگوں کے ہاتھوں احتراماً صرف جوتیاں کھانے کو رہ گئی تھی اور ان مظلوموں نے تو جیسے تمام عمر اسی احترام میں گزار دینے کی قسم بھی کھا رکھی تھی۔ اب آپ کی کوشش سے شاید اس مردہ مٹی کے بھی نصیب جاگ اٹھیں اور اس ڈھیر پر بھی کوئی پھولوں کی چادریں چڑھائیں۔

جوہر میر۔ پشاور

قطب مینار :- فراق کے ترجمے اور قطب مینار پر تحقیقی مقالہ کی شمولیت نے کتاب کی جامعیت، اہمیت اور افادیت میں جو اضافہ کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ اخبارات میں قطب مینار کے بارے میں بہت کچھ پڑھ چکا ہوں آپ نے ایک Current Topic پر اتنا وقیع اور تحقیقاتی مقالہ حاصل کر لیا یہ بات حیرت انگیز بھی اور قابلِ ستائش بھی۔ اگر اس کا انگریزی میں ترجمہ کروا کے پیٹریٹ، فری پریس جرنل اور انڈین ایکسپریس میں بھی شائع کروا دیا جائے تو کسی حد تک بڑا مناسب ہوگا اور یوں بھی اردو حلقے سے زائد ہندی اور انگریزی کے پڑھنے والوں کے لیے اس کا نفسِ مضمون ضروری ہے۔

صادق سولی صاحب کی نظم پڑھ کے کافی محظوظ ہوا۔ وہ دن دور نہیں جب سولی طنز و مزاح کے میدان میں اپنا انفرادی مقام حاصل کر لیں گے۔ حسن کمال، شاد عارفی فراق اور زبیر رضوی حصہ نظم میں نہایت کامیاب رہے۔

عتیق تابش۔ اجین

جوش و شاہد :- ابھی حال میں مجھے ساقی کا جوش نمبر دیکھنے کا موقع ملا۔ پڑھنے کے بعد چند باتیں ذہن میں آئیں جن کی جانب "تلخ، تند، شیریں" کے صفحات کے ذریعہ، چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کو متوجہ کروں جو فن اور شخصیت کے مسائل پر غور کرتے ہیں۔

عام خیال یہ ہو کہ جوش سے دو بڑی غلطیاں ہوئیں۔ ایک مہذب نثر

حصہ رہا ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں لیکن زور صاحب محض دکنی اردو کے مورخ ہی نہ تھے۔ ہاں دکنی اردو کے واحد مورخ بھی نہ تھے۔ ان کی پہلو دار اور تہ دار شخصیت اتنی گوناگوں کیفیات لئے میں سموئے ہوئے تھی کہ وہ صرف اردوئے دکن کے مورخ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ مورخ، ادیب، شاعر، صاحب سجادہ، استاد ہونے کے ساتھ ساتھ زور صاحب کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو ان کا ایک باعمل انسان ہونا تھا۔ اور ان کی شخصیت کے اسی پہلو نے ان کا نام زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو اور ایوان اردو اس کی زندہ مثال ہے۔

سب رس نے اپنے بانی کی یاد میں جو یہ نمبر شایع کیا وہ اردو کے تقریباً تمام اہم افراد کے مضامین و اشعار پر مشتمل ہے۔ بعض نے شخصی بعض نے ادبی اور بعض نے بغیر کسی تعارف کے زور صاحب کے بارے میں اپنے خیالات و تاثرات قلم بند کئے ہیں ان میں سے بعض کا لہجہ کچھ تنقید آمیز بھی ہے اور بعض کا پرستارانہ بھی لیکن ہر شخص کا مضمون بہرحال اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ایک جان دار شخصیت ان کی نظروں کے سامنے ہے۔

رسالہ میں زور مرحوم کی شخصیت پر ۲۳ اور ان کے فن پر ۱۳ مضامین شامل ہیں، ۴۲ افراد نے ان کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ سو سے زیادہ صفحات میں مرحوم کی نثری و شعری تخلیقات کا ایک اچھا انتخاب بھی شامل کیا گیا۔ صرف ایک بات یہ کھٹکتی ہے کہ زور صاحب کی حیات پر کوئی مضمون شامل نہیں ہے۔

آسمان ادب پر ستارے طلوع ہوتے ہیں ہمیشہ ہوتے رہیں گے ان میں سے بعض شہاب ثاقب کی طرح ایک چمک دکھا کر گزر جاتے ہیں بعض اپنی تابانی سے ایک مدت تک دل و دماغ کی راہیں منور کر کے غروب ہوتے ہیں لیکن دونوں ایک روشنی ایسی چھوڑ جاتے ہیں جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ مشعل راہ رہتی ہے۔ زور صاحب کی زندگی بھی ایک ایسا ستارہ تھی کہ جو گو کہ غروب ہو گیا ہے لیکن جس کی روشنی صدا جگمگاتی رہے گی۔

عثمان حسنی

نادر کے بے مثال کردار معصوم کردار نے نہ جانے کتنوں کو رلایا ہوگا میرا باپ پڑھ کر اس قدر جذباتی ہو گئی کہ آپ خط کو بے ربط پائیے گا ..... !

ارے ہاں ..... عابد سہیل صاحب کی بغاوتیں تو خوب ہی رہیں ..... قاری کو آخری پیراگراف سے پہلے اس بات کا شبہ تک نہیں ہوتا اتنا خوبصورت ماحول انھوں نے طاری کیا کہ ..... پڑھنے والا تھوڑی تھوڑی دیر بعد ادھر ادھر دیکھ لیتا ہے۔

طاہرہ فیضی۔ لکھنؤ

بزم راوی :- بزم راوی کے سالانہ جلسہ میں جو آرٹس فیکلٹی علی گڑھ یونیورسٹی، کے کیمٹی روم میں پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں ہوا افسانوں کے انعامی مقابلے کا نتیجہ سنایا گیا۔ کرن راج کو پہلا، عمر افضل کو دوسرا، اور سید عارف الدین کو تیسرا انعام ملا۔ صدر محفل پروفیسر آل احمد سرور نے قاضی عبدالستار اور انجمن کے دوسرے کارکنوں کو اس "آغاز" پر مبارکباد دی اور توقع ظاہر کی کہ راوی اس طرح ترقی کی منزلیں طے کرتی رہے گی۔ آخر میں راوی کے صدر قاضی عبدالستار نے پروفیسر آل احمد سرور اور دوسرے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

جلسے میں اسلوب احمد انصاری، مسعود علی ذوقی، وارث کرمانی، نسیم قریشی، نعمان احمد صدیقی، اطہر پرویز، اولاد احمد صدیقی ڈاکٹر نبی ہادی، ڈاکٹر وہ سیندر کھبومر، ڈاکٹر ایم لے شاستری، ڈاکٹر اسحاق، ڈاکٹر گوپی، رفیق نقوی، زکا الرب رباب، انوار علی گڑھی توصیف چغتائی، تنویر نیر، کرن راج، طاہرہ، جلیل، انجمن آرا انجم، نازش انصاری، ظفر مسعود، رنی، شاہد قمر افریدی، نعیمہ خان قیصر، سید عارف الدین اور تسکین وغیرہ نے شرکت کی۔

موضوعات کی رنگا رنگی :- میں اس قدر ..... تھا کہ میں نے سوچا ذرا طبیعت کو اطمینان ہو جائے تو کچھ لکھوں۔ سچ پوچھیے تو حالیہ برسوں میں ہندستان کے کسی بھی رسالے میں اتنا اچھا انتخاب نظر سے نہیں گزرا۔ پہلے کبھی ہوا ہوگا تو میں نہیں کہہ سکتا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ بہت سے افسانے پڑھے ہوئے تھے مطالعہ پڑھنے میں ایک خاص لطف آیا۔

اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ رام لعل اور عابد سہیل۔ بڑی ایمانداری اور غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ جبھی ہی افسانے ایسے بھی جن کے بارے میں شک گزرتا ہے کہ شاید یہ مروتاً منتخب کر لیے گئے ہیں۔ مگر اسے ہرگز بھی کیا جا سکتا ہے۔

ایک بات جو مجھے خاص طور سے اچھی لگی وہ یہ کہ افسانوں کے انتخاب میں موضوعات کی رنگا رنگی کا خیال رکھا گیا ہے انسانی فطرت اور ماحول اور سماج کے قریب قریب تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہوئے افسانے لیے گئے ہیں اور کوئی بھی دو افسانے ایک موضوع یا ایک قسم کے ماحول کی نمائندگی کرنے والے نہیں ہیں۔ بلکہ ہر افسانہ ایک نئی تصویر سامنے لے کر آتا ہے۔

ظاہر ہے اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے افسانوں کے انتخاب میں کافی گہری نظر کی ضرورت ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس نمبر کے بعد کتاب نے اردو کے ممتاز ترین رسالوں کی گیلری میں اپنی جگہ محفوظ کرالی ہے۔

پرکاش فکری۔ رانچی

تخلیقی توجہ :- جنیاتی رجحان - یہ درست ہے کہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے مگر سادن ایسا انسان۔ جو مدن کی کمیاں، نکلنے اور گرنے اور .... کے استعمال میں ماہر ہو اور ایک مقصد کے تحت سب کچھ کر رہا ہو۔ جنوری کی سرد رات میں گندے نالے سے گزر کر دیوار کی پشت تک پہنچتا اور صرف ذرا سی گفتگو اور ایک منٹو ٹائپ منظر اتنا منتشر ہو جاتا ہے کہ اپنے مقصد اپنے فن کی بات بھی بھول جاتا ہے۔ تعجب ہے رام لعل اچھے افسانہ نگار ہیں۔ یہ کہانی ان کے فن کی نمائندہ کہانی نہیں کہی جا سکتی۔ اور اس کا انتخاب کرتے وقت انھوں نے اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

احسان قریشی .... لکھنؤ

جنسی افسانے :- معلوم ہوتا ہے کہ مرتبین نے جنسیات کے موضوع کو سامنے رکھ کر افسانے منتخب کیے ہیں ضروری نہیں ہے کہ جنسیات کے موضوع کے افسانے ہی بہترین ہوں۔ عام ذہنی سطح کے لوگ ہی اس روش کو پسند کرتے ہیں۔

انتخاب میں اگر وسیع النظری سے کام لیا جاتا اور دوسرے موضوعات کو بھی جگہ ملتی تو پرچہ اور بھی نکھر جاتا۔

چھوڑتا اور دوسری شاہد صاحب کے مضمون کا جواب لکھنا۔ اگر جوش نے سرزمین پاکستان پر قدم نہ رکھا ہوتا تو احساس کمتری کے شکار ان چند ادیبوں کو کیچڑ اچھالنے کا موقع نہ ملتا جو یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی بزم میں ایک ہزار داستاں یادسکے ملب کی آمد نے ان کی اپنی حیثیت کے جھلملاتے ہوئے چراغوں کو اور مدھم کر دیا ہے اور اگر وہ شاہد صاحب کے مضمون کا جواب لکھنے سے گریز کر جاتے تو شاہد صاحب کے مضمون کا طوفان بھی اسی طرح دم توڑ دیتا جس طرح نیاز صاحب قبلہ کے ان مضامین کو لوگ بھول چکے ہیں جو انھوں نے جوش کے حیدرآباد کے دوران قیام میں ان کی کسی حرکت سے خفا ہو کر لکھے تھے۔

مجھے یہ سوچ کر واقعی ندامت ہوتی ہے کہ ہجو گوئی کی وہ روایت جو جاگیردارانہ نظام کے ساتھ ساتھ دم توڑ چکی تھی شاہد صاحب نے از سر نو زندہ کر دی۔ ہمارے شاعر اپنی چند غلط کاریوں اور بے راہ روی کی وجہ سے یوں بھی معاشرے کی نکتہ چینیوں کے شکار ہوتے رہتے ہیں، اور جب چاروں کی طرف سے مخالفتوں کی بارش ہو رہی ہو ایسی صورت میں گھر کے اندر اس قسم کی خانہ جنگی اور قیامت ڈھائے گی۔ جوش کی ذات میں تو ہزار نو سو ننانوے خرابیاں سہی پھر بھی ان کی زندگی کو موضوع بنا کر خاص نمبر نکال دینا کون سا اچھا فعل ہے؟ اگر شاہد صاحب نے سامرسٹ مام یا آندرے موروا یا ارونگ اسٹون کے سے فنکارانہ انداز میں جوش کی شخصیت کو موضوع بنا کر ایک جامع ناول لکھ ڈالا ہوتا تو اور بات تھی لیکن ان کے اس فعل میں بغض و عناد کی لہریں جس شدت کے ساتھ تڑپتی نظر آ رہی ہیں انھیں ادب کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ یہ گھن صرف جوش ہی کو نہیں لگے گا، ایک وبائی مرض کی طرح ادب کی ساری فضا میں بھی پھیل سکتا ہے۔

ایک شاعر نے تو کمال کر دیا۔ (ان کے چھ سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں پھر بھی یہ گمنام ہیں۔) اپنے مضمون میں ان حضرت نے اس شاعر کی لسانی غلطیاں گنائی ہیں۔ اور وہ بھی اس بھونڈے طریقے سے کہ اس کے اشعار کا مقابلے میں اپنے اشعار پیش کر کے پڑھنے والوں سے یہ سوال کیا ہے کہ:-

"بتاؤ صاحبو! میں بڑا شاعر ہوں یا جوش؟"

جوش نے افکار کے جوش نمبر کے دوسرے ایڈیشن میں شاہد صاحب کے مضمون کا جو جواب لکھا تھا اس کی آخری چند سطروں میں فرسودگی اور

دل کی شکستگی کا جو احساس اور معاصرت کی جو کوشش نظر آتی ہے اس کے پیش نظر شاہد صاحب تو خیر بہت بڑے آدمی ہیں، معمولی اخلاقی قدروں کا حامل انسان بھی انھیں سچے دل سے معاف کر سکتا تھا۔

ہمارے ہندوستان کے ادیبوں نے بھی جوش نمبر میں بڑے گل کھلائے ہیں۔ جوش جب تک یہاں رہے انھوں نے اپنے ہونٹوں پر تالے کیوں لگا رکھے تھے؟ اس نمبر میں کتنے شرکا ایسے ہیں جن کے نام اس سے پہلے ہم میں سے اکثر (یا ہو سکتا ہے کہ صرف میری) کی نظروں سے نہیں گزرے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود نمائی کی خیرات بٹورنے کے لیے یہ حضرات دوڑ پڑے۔ کم از کم ایک بڑے شاعر کو گالیاں دے کر ایک بڑے ایڈیٹر کے گلے سے لگنے کا موقع تو مل گیا! یوں ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان شرکا میں بہتوں کا وجود نہیں، صرف شاہد صاحب کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

ساقی کا جوش نمبر ایک گھناؤنی اور غلیظ روایت کو از سر نو زندہ کرنے کی ناپسندیدہ کوشش ہے۔ بائیاں احول پر جلد اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ آگے بڑھا تو ہمارے کتنے شاعر اور ادیب اس حمام میں ننگے دکھائی دیں گے۔

رہی بات ان مولویوں کی جو جوش کے منہ سے دوزخ کی بھبک کو محسوس کر کے چراغ پا ہو رہے ہیں، ان کے بارے میں بس اتنا عرض کروں گا کہ انھوں نے سر سید کو، نذیر احمد کو، غالب کو، اور اقبال کو کب بخشا تھا جو اس آوارۂ کوئے بتاں کو بخش دیں گے جسے جوش کہتے ہیں۔

اچھا فنکار اگر اچھا انسان بھی ہو تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن اگر وہ ان دونوں میں سے صرف ایک ہی خوبی کا حامل ہو تو ہم اس کی اس خوبی کی طرف توجہ کرنے کے بجائے دوسرے رخ پر اتنا غور کیوں کریں اور اتنا چنیں چلائیں؟

شمیم حنفی۔ الہ آباد

میرا باپ اور رفاقتیں:— وجاہت صاحب ایک مزاح نگار ہیں اور میں "مجبیل امون" پڑھنے کے بعد بھی (جو کتاب میں ہی چھپا تھا) ان کی اس قدر قائل نہ تھی کہ وہ مسکراہٹوں کے پیچھے اتنا ناقابل بیان درد اور انسانیت کا تڑپتا شعلہ رکھتے ہیں.....!

گوشہ: واقعی جانفزا ہو لیکن اگر آپ نے اس کا نام "۱۹۶۲ء کے بہترین افسانے" کی جگہ "۱۹۶۲ء کے بہترین جنیاتی افسانے" رکھا ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا

جمال اختر گل۔ بمبئی

دو دو خاص نمبر:— آپ نے اتنے کم عرصہ میں دو نمبر نکالے اور پھر بھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔

آپ کا انتخاب بہت ہی پسند آیا۔ چند کہانیاں پڑھ چکا تھا، مگر زیادہ تر پہلی بار پڑھنے کو ملیں جیلانی بانو اور عابد سہیل کی کہانیاں نہ پڑھتا تو اپنے علم میں کمی رہ جاتی۔

وحید الحسن۔ رانچی

تنقیدی مضمون کی کمی:— نمبر بہت خوب ہے اور اس کے لیے رتعیم اور عابد سہیل دونوں قابل مبارکباد ہیں ۱۹۶۲ء کے افسانوں کا اس سے بہتر انتخاب ممکن نہ تھا۔ خدا کرے آئندہ بھی آپ لوگ اس طرف توجہ دیں۔ واقعی بڑی محنت کی ہے آپ لوگوں نے تمام افسانے سر کیے ہیں۔ ہاں اس میں افسانوں سے متعلق اگر تنقیدی مضمون شامل کر لیتے تو نمبر اور بھی دقیع ہو جاتا۔

یونس مارہروی۔ کراچی

معجزہ:— مارچ کا تازہ شمارہ بنارس کے ایک بک اسٹال میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ واقعی کتاب کا بنارس پہنچ جانا معجزہ ہی ہے۔ گزشتہ پانچ سال سے اس شہر میں ادبی جرائد دستیاب نہیں ہوتے ـــــ کم از کم میرا تجربہ یہی کہتا ہے ـــــ میں نے کتاب کے پچھلے کئی شمارے اسٹول ہی سے خریدے تھے ـــــ ۱۹۶۲ء کے بہترین افسانے بھی دیکھ چکا ہوں۔ انتخاب بھرپور نہیں کہا جا سکتا ـــــ پھر بھی آپ کی کوشش کامیاب ہے۔ جمشید پور سے ایس خاتون بے۔ اے صاحبہ نے بہار کے جن افسانہ نگاروں کے نام گنوائے ہیں انھوں نے سچ تو یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں کوئی اچھی کہانی نہیں لکھی ـــــ البتہ اس سال جناب غیاث احمد گدی کی کئی اچھی کہانیاں لاہور کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوئی تھیں ـــــ بہر حال اس بنا پر گروپ بندی کا الزام لگانا درست نہیں۔

ہلال جعفری

کتاب کے افسانہ نمبر پر

چند رائیں

کتاب نما:— "کتاب" کے اس افسانہ نمبر میں ۲۷ افسانے شامل ہیں اور بیشتر کے خالق ہمارے چوٹی کے افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگاروں کے نام گنانا اور ان کے افسانوں کی فرداً فرداً خوبیاں بیان کرنا مشکل ہے یہ اس لیے بھی کہ انتخاب اتنا جامع اور مکمل ہے کہ اگر چند افسانوں کی تعریف کے بعد مجبوراً بقیہ کو نظر انداز کیا تو یہ ناانصافی ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ انتخاب کے آخر میں "اردو افسانے کے تین دور" کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کے بصیرت افروز مضمون نے اس انتخاب کو اور بھی جاندار بنا دیا ہے۔ کتابت اور طباعت بھی معیاری ہے اور رنگین ٹائیٹل جاذب نظر ہے۔

پرچم ہند:— اس نمبر کے تمام افسانوں پر تبصرہ کرنے کے لیے تو ایک دفتر درکار ہے لیکن بہت ہی اختصار کے ساتھ یہ بات بڑے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۶۲ء میں طبع ہونے والی ہزاروں کہانیوں میں سے جو کہانیاں منتخب کی گئی ہیں خصوصی معیار کی حامل ہیں اور "کتاب" کا یہ نمبر افسانوی ادب کی بہترین دستاویز ہے جو علمی اور ادبی حلقوں میں قدرتی طور پر پسند کی جائے گی۔

قومی آواز:— ان افسانوں کی تعداد جو "کتاب" کے "افسانہ نمبر" کی زینت ہیں دو درجن سے زیادہ ہے اور لکھنے والوں میں ہند و پاکستان کے نمائندہ افسانہ نگار، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، جیلانی بانو، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر، ابراہیم جلیس، اتیش بترہ، واجدہ تبسم، رتن سنگھ وغیرہ نیز دونوں مرتبین بھی شامل ہیں، آخر میں ڈاکٹر وزیر آغا کا ایک مضمون "اردو افسانے کے تین دور" بھی ہے۔

ماہنامہ "کتاب" نے اپنی چھوٹی سی عمر میں (صرف دو سال میں) ادبی محفل میں اچھی جگہ بنالی ہے یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔

۲۰۰۰ افسانے

اردو افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۲ء میں
دو ہزار افسانے تخلیق کیے

اور ماہنامہ کتاب لکھنؤ نے ان میں سے
۲۷ منتخب افسانے آپ کی خدمت میں پیش کیے

مرتب :۔۔۔۔ رام لعل ۔۔۔۔ عابد سہیل

ضخامت ۲۱۲ صفحات ۔۔۔۔۔۔ قیمت عام کاغذ ۔۔۔۔۔ ایک روپے ۶۰ نئے پیسے
۔۔۔۔ سفید چکنا کاغذ ۲ روپے ۔۔۔۔۔۔ مجلد گلیز کاغذ ۳ روپے ۔۔۔۔

زر سالانہ ۶ روپے بھیج کر آپ یہ نمبر اور اس سال شائع ہونے والے دوسرے خاص نمبر مفت حاصل کر سکتے ہیں، ہر خاص نمبر رجسٹری سے حاصل کرنے کے لیے ۵۵ پیسوں کے ٹکٹ بھیجیے، ڈاک سے گم ہونے کی صورت میں خاص نمبر دوبارہ نہیں بھیجے جاتے۔

صفحہ ۰ کا بقیہ

کی طرح چپت پڑے گی۔

بیرا بل لے کر آتا ہے۔ وہ بیرے کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتی ہے۔ جیسے اس کے چلے جانے کے بعد وہ وہاں بیٹھے نہیں رہ سکیں گے۔ بہت سے لوگ خالی میزوں کے لیے منتظر کھڑے ہیں۔ نثار بیرے کا بل ادا کر دیتا ہے۔ وہ بھی ایک عجیب کش مکش میں ہے۔ جیسے سوچ رہا ہے عباس اگر نہ لوٹا تو اس عورت کو پہنچانے اسے کہاں جانا پڑے گا!

اچانک عباس ہنستا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ وہ گردن گھما گھما کر ایک ایسے شخص کی طرف دیکھ کر ہنستا رہتا ہے جو دور کونے میں بیٹھا اسی کی طرح ہنس رہا ہے۔

"معاف کیجیے گا ایک بہت ہی پرانے واقف کار سے ملاقات ہو گئی"!

دلارا جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ عباس حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر نثار کی طرف دیکھتا ہے جیسے کہنا چاہتا ہو کتنی عجیب عورت ہے"!

"بیٹھو، بیٹھو۔ ابھی کچھ زیادہ نہ بیٹھیں گے۔"

لیکن بوڑھی کا اصرار دیکھ کر وہ بھی اٹھ پڑتا ہے۔ تینوں آگے پیچھے چپ چاپ باہر نکل رہے ہیں۔ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر رک جاتے ہیں سڑک پر بڑی چہل پہل ہے۔ دونوں طرف حد نظر تک لوگ گھوم رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے راستوں سے جو سڑک کے ساتھ آکر مل گئے ہیں لوگ آتے ہیں اور شاہراہ کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں۔

دیر تک ـــ بڑی دیر تک وہ تینوں اس چہل پہل کو دیکھتے رہتے ہیں پھر نثار جانے کی اجازت چاہتا ہے، جانے سے پہلے پوچھتا ہے ـــ "کل ملاقات ہو گی۔"

"ہم آج ہی رات کو جا رہے ہیں۔ آپ تو ابھی یہیں یہاں کچھ عرصہ اور؟"

"جی نہیں میں بھی پرسوں نقل مکانی کروں گا۔ یہاں سے دلی، دلی سے کراچی اور پھر وہاں سے کوئٹہ۔"

نثار دونوں پر الوداعی نظریں ڈالتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔

وہ انھیں کچھ دور تک جاتا ہوا دکھائی دیتا رہتا ہے پھر بھیڑ میں کھو جاتا ہے۔ عباس اور دلارا ایک دوسرے کی طرف خاموش نظروں سے دیکھتے ہیں پھر وہ بھی ایک دوسری سمت روانہ ہو گئے۔ اسی بھیڑ والی سڑک پر بھیڑ دھیرے دھیرے حرکت کر رہی ہے۔ آگے بھی اور پیچھے کی طرف بھی کسی گاڑھے گاڑھے بہتے ہوئے مواد کی مانند جو بہت سست رفتار سے پھیلتا ہے، سمٹتا ہے اور بہنے لگتا ہے۔

تبسم زیر لب

ایک دکاندار تھکا ماندہ گھر لوٹا۔ اس کے دونوں بچوں نے گھر میں اودھم مچا رکھا تھا۔ اس نے انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر سلا دیا۔ دوسرے دن جب وہ اٹھا تو اس کے سرہانے ایک رقعہ رکھا تھا جس پر لکھا تھا۔

'اپنی اولاد سے نیک سلوک کرو تاکہ وہ تم سے بھی اچھی طرح پیش آئے'۔

راقم اللہ میاں

میاں بیوی دونوں اپنے رشتہ داروں کو خط لکھ رہے تھے یکایک خاوند نے لکھنے سے ہاتھ روک لیا۔ اس کی بیوی نے پوچھا "رک کیوں گئے؟"

"کم بخت ابھی میری زبان پر تھا پتہ نہیں کہاں گیا۔"

"کوئی بات نہیں پھر آجائے گا۔"

"آئے گا کہاں سے۔ یہ تو تیرہ پیسے کا ٹکٹ تھا۔"

"میں چونکہ غلام بننا پسند نہیں کرتا، اس لیے آقا بھی نہ بنوں گا۔"

ـــــــ ابراہم لنکن

فون نمبر: (امین آباد) ۲۶۴۲۲
مکان: ۲۶۵۴۸

تار کا پتہ
کھتری

سا ڑیوں اور تیار ملبوسات کے لیے

سالگ رام کھتری کی دو دکانیں

امین آباد ——— (ہیڈ آفس)

شادیوں کی ساڑیاں
کنجیورم
دھرمادرم ، شانتی نکیتن
چندیری ، بنارسی
ساڑیاں
بکفایت حاصل کرنے کے لیے
ہینڈلوم ، ریشمی ، اور
شادی کی ساڑیوں کا
سب سے بڑا مرکز

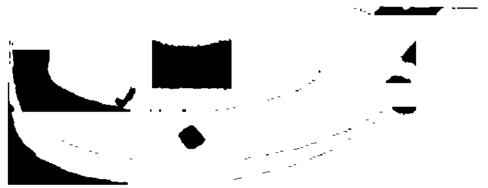
نظیر آباد ——— شاخ

ٹیرالین کی ارسٹو قمیصیں
ونگس کی اسپورٹس قمیصیں
ریمنڈ کے پتلون
سوئٹر ، کارڈیگنس
خوبصورت ٹائیاں ، موزے
ٹراک
اور
ابا سوٹ

Aristo
REGD.
MEN'S WEAR

سالگ رام کھتری
نمبر ۴۴ امین آباد پارک لکھنؤ

سالگ رام کھتری
نظیر آباد ، لکھنؤ



ماہنامہ کتاب لکھنؤ

جون ۱۹۶۴ء

۲۷ رمئی کو

ایک دل جو ایک عہد تھا، روشنی کا ایک مینار تھا۔
آخری بار دھڑکا اور خاموش ہو گیا۔
برصغیر ہند و پاک، سارے ایشیا اور افریقہ اور ساری دنیا کی ساری آبادی کے دل ایک بار زور سے دھڑکے اور جیسے خاموش ہو گئے۔

... ...

یہ ایک فرد کی موت نہیں
ایک عہد، ایک نسل،
شرافت، رواداری، انسان دوستی کی
علامت کی موت ہے۔

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

—— ادارہ

جلد ۳ ... ... نمبر ۶

زر سالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں
۶½ روپے
قیمت :- .... ۷۰ نئے پیسے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

مجلس مشاورت
سید احتشام حسین
حیات اللہ انصاری
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر :- سید جمیل احمد
مطبوعہ :- نظامی پریس لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ
کتاب، چوک، لکھنؤ ۳

پاکستان ایجنٹ
مسٹر نعیم اکبر خاں
الائیڈ فوٹو گرافرس، (پاکستان لمیٹڈ)
4/5 موتی جھیل، کمرشل ایریا، ڈھاکہ

کتاب، لکھنؤ

شکیل بدایونی

آہ نہرو

خامشی ہے وطن کی محفل میں
ساز ٹوٹا ہے راگ اجڑا ہے
تیرے اٹھنے سے اے جواہر لال
زندگی کا سہاگ اجڑا ہے

دولتیں کتنی تجھ سے پائی ہیں
ہم نہ بھولیں گے تیرے لطف و کرم
جاتے جاتے بھی تو نے اے نہرو
دے دیئے ہم کو اپنے نقش قدم

آج بھی تو ہمارے سامنے ہے
صبر لازم ہے غم رسیدوں کو
ہم تجھے کس لیے کہیں فانی
موت آتی نہیں شہیدوں کو

عبدالماجد دریابادی

جواہر لال نہرو

۱۸۸۹ء تا ۱۹۶۴ء

پنڈت جی کے مذہبی عقیدوں سے یہاں بحث نہیں۔ ان کی لادینی عالم آشکار تھی۔ یہاں ذکر ان کی بلند کرداری اور شرافت نفس کا کرنا ہے وہ ایک بڑے شریف و کریم باپ کے بڑے شریف و کریم فرزند تھے تعلیم اعلیٰ سے اعلیٰ پائی۔ پرورش بڑی ہی خوشحالی اور انتہائی ناز و نعمت کے ماحول میں ہوئی۔ آزادیاں ہر قسم کی، کیا ہندستان اور کیا انگلستان میں میسر رہیں۔ بے فکری سے جس طرح چاہتے خوب پیتے پلاتے یا آشناؤں کے ساتھ گل چھرے اڑاتے۔ ہر طرح داد عیش دیتے، کچھ نہ ہوا۔ شروع ہی سے زندگی پاکیزہ، سنجیدہ، شریفانہ رہی۔ اور ظرف بڑا ہی عالی رہا۔ پڑھنے لکھنے میں ترقی، تمنا بلندیوں کے شیدا ملک کی آزادی اور وطن کی خدمت ہی کو شروع سے اپنا مقصود زندگی بنا لیا، اور اس لگن کو آخر تک نباہ دیا۔ نہ دنیا کا لالچ کیا، نہ مال و جاہ کی محبت کو سینے میں جگہ دی۔ نہ اپنے کو بڑا ماننا کسی پر اپنا تفوق جتایا، خدمت لینے نہیں۔ خدمت کرنے کی دھن سوار رہی۔ دنیا نے خادم کی جگہ انھیں مخدوم بنا دیا۔ اور اپنے سر اور آنکھوں پر جگہ دینا شروع کر دی جوانی میں بڑی سختیاں جھیلیں۔ خدا معلوم جیل ہی میں کتنی مدت کاٹی۔ دوستوں کی بے وفائی، طوطا چشمی، غداری کے شکار آخر تک رہے۔ انھیں ہلکے تیر پہ تیر کھلتے رہے صحت بھی آخر عمر میں اتنی گر گئی تھی، انھیں منحوس خصے سے کہیں زیادہ دخل ان مسلسل دل شکنیوں اور شدید مایوسیوں کو تھا۔

مسلمانوں سے ہمیشہ خوب بنی۔ پوشاک۔ کھانے پینے۔ بول چال۔ بلکہ طرز معاشرت و تمدن میں، دوسرے کشمیری پنڈتوں کی طرح مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو بالکل اپنائے ہوئے تھے۔ اور اپنے والد پنڈت موتی لال کے قدم بقدم تھے۔ رفیقوں، دوستوں، مخلصوں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ مولانا محمد علی مولانا ابو الکلام۔ ڈاکٹر سید محمود حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر انصاری عبدالمجید خواجہ چودھری خلیق الزماں۔ تصدق احمد خاں شروانی سے گہرے تعلقات تھے اور رفیع احمد قدوائی تو جیسے ان کے عزیز قریب ہی تھے خدا جانے کتنے نوجوان مسلمانوں کو اپنے خرچ سے پڑھوایا۔ ملازمتیں دلائیں روزگار سے لگایا۔ اور کتنے سن رسیدہ مسلمانوں کو اپنے ہاں سے مالی امداد کی۔ جوانی کی زندگی کا کوئی بھی ساتھی اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد بدل گیا تو اس کی آؤ بھگت اسی پرانے طریقہ پر کی۔ یہ پتا بھی نہ چلنے دیا کہ وہ اس وقت وزیر اعظم ہند سے مل رہا ہے۔ غریبوں، ضعیفوں مصیبت زدوں کی امداد میں ملکۂ خاص حاصل تھا غرض جوہر انسانیت کا ایک نمونہ تھے۔ اور ایک ہی وقت میں مدبر بھی مفکر بھی صاحب علم بھی، صاحب عمل بھی۔ پرانی اردو میں ایک لفظ "وضعداری" آتا ہے وہ گویا ان پر ختم تھی عام مسلمانوں کے لیے اب بھی ایک بڑا سہارا بنے ہوئے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک —— مزاج میں تواضع و فروتنی اتنی تھی کہ ۱۹۲۳ء میں جب میں نے مولانا محمد علی سے پوچھا کہ گاندھی جی کا جانشین آپ کے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟ تو انھوں نے جھٹ سے نام جواہر لال کا اور صرف انھیں کا لیا۔ اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ان میں اگر کمی ہے تو بس یہ کہ وہ اپنے کو نیچے ہی بہت رکھتے ہیں۔ مولانا ہی نے اپنے زمانہ صدارت کانگریس ۱۹۲۳ء میں انھیں کانگریس کا جنرل سکریٹری بنایا۔ اور اور طریقوں سے بھی آگے بڑھایا۔

منظور سلیم

قافلہ سالار

چمن کی روح، وطن کا دماغ، قوم کا دل
امیرِ قافلہ، تصویرِ جادہ و منزل

نئی حیات کا مژدہ، نئے زمانے کا خواب
نئی سحر کی امنگوں کا، ولولوں کا شباب

نئے نظام کے سورج کی سب سے شوخ کرن
نئی بہار کے دامن میں سب سے پیارا گلاب

چراغِ فکر و نظر، ظلمت توہّم میں
کہیں ستارہ کہیں کہکشاں کہیں مہتاب

تصوّرات و عقائد کے ریگ زاروں پر
پیامِ جہد و عمل کی گھٹا، یقیں کا سحاب

جنوں کے ہاتھ میں آئینۂ شعورِ حیات
خرد کی بزم میں میخانۂ جنوں کی شراب

فلک کے چہرے پہ تعمیر و ارتقا کا جلال
زمیں کے سینے میں تخلیق کا دلِ بیتاب

فضائے تیرہ میں ہنگامۂ نشاط کی موج
سفینۂ غم و آلامِ وقت کا ساحل

چمن کی روح، چمن کی بہار پر قرباں
ہر ایک پھول پہ، ہر ایک خار پر قرباں

ہر ایک غنچے سے واقف، ہر اک کلی پہ نظر
ہر ایک ذرّے کے سینے کی دھڑکنوں کی خبر

روش روش کو سجانے کی آرزو میں مگن
روش روش پہ نچھاور متاعِ قلب و جگر

یہ فکر بھی کہ تغیّر کسی پہ بار نہ ہو
کہ رائیگاں نہ کہیں جائے خونِ دیدۂ تر

کسی کا دل نہ دکھائے تبسّمِ گلِ نو
کسی کی راہ نہ روکے خرامِ بادِ سحر

یہ فکر بھی کہ نشاطِ بہار سب کو ملے
کہ پھول برسیں تو برسیں ہر ایک دامن پر

کہ چپّے چپّے پہ ہو رقصِ شوق، رقصِ جنوں
کہ ذرّے ذرّے کو چمکائے آفتابِ سحر

کہ جاوداں ہو بہارِ چمن کی آرائش
کہ وہ جواں ہو اسی اک نگار پر قرباں

ہیں کم نہیں ہے۔ مگر اس زندگی میں جواہر لال نہرو نے کیا کچھ نہیں کیا۔ تلاش ہند میں ۱۹۴۶ء میں انھوں نے لینن کا یہ قول نقل کیا تھا۔

"انسان کی سب عزیز متاع زندگی ہے اور چونکہ اس کے مقدر میں ایک ہی دفعہ جینا ہے۔ اس لیے اسے اس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے کہ مرتے وقت وہ کہہ سکے میری ساری زندگی اور ساری قوت دنیا کے سب سے بڑے مقصد کے لیے وقف تھی یعنی بنی نوع انسان کو غلامی سے نجات دلانا۔"

انسانیت کی تاریخ میں اس مقصد کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کر دینے کی اور مثالیں بھی مل جائیں گی۔ اٹھتے بیٹھتے، سفر میں یا حضر میں، خوشی یا غم میں اس مقصد کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینے کی مثالیں اور بھی ملیں گی، مگر ہمارے ملک میں کم ہیں۔

اس صدی میں تو گاندھی جی کے علاوہ ہندستان میں کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آتا جو جواہر لال نہرو کی طرح اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد اور مشن کے لیے وقف کر دے۔

پھر جواہر لال نہرو نے آزادی کو معنی و مقصد عطا کیا۔ آزادی سے پہلے جب بہت سے دوسرے غیر ملکی سامراج سے نجات پانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے اور آزادی کے بعد کا نقشہ ان کے ذہن میں نہ تھا اور نہ اس کو وہ ضروری سمجھتے تھے، جواہر لال نہرو نے منصوبہ بندی کا ایک کمیشن بنایا اور مستقبل کا ایک ڈھانچہ تیار کیا۔ آج ہماری جمہوریت کا جو قصر بلند ہے اس کی ہر اینٹ جواہر لال کی رکھی ہوئی ہے۔ جمہوریت، غیر مذہبی ریاست اور سوشلزم کے تصور کو ..... جواہر لال نے نہ صرف زبان سے منوایا بلکہ دلوں میں بٹھایا۔ انھیں کی مسلسل تعلیم کے طفیل آج ہمیں یقین ہے کہ جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کے تصور کو ہندستان کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اور اپنے طور پر سوشلزم کی منزل کی طرف برابر بڑھتا رہے گا۔

جواہر لال نہرو نے دنیا کے سیاسی معاملات میں طرفداری کے بجائے کن نیچی سکھائی۔ انھوں نے سب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن وہ کبھی کسی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوئے۔ انھوں نے ہمیشہ قوم کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی تلقین کی۔ انھوں نے دوسروں سے بھیک مانگنے کے بجائے خود کفالتی ہونے پر زور دیا۔ ہاں انھوں نے ایسی دوستانہ امداد بڑی خوشی سے قبول کی جس کے پردے میں کوئی سنہری زنجیر نہ تھی صرف اچھے کام میں تعاون کا جذبہ تھا۔

اور ہندستان کا یہ محبوب رہنما اور دنیا کا چوٹی کا مدبر اور لیڈر، کیسی دلآویز شخصیت رکھتا تھا۔ اس میں کیسی شان محبوبی تھی۔ اس کا وہ تبسم جو گرد و پیش کی ہر کثافت اور دلوں کے ہر غبار کو دور کر سکتا تھا۔ جس سے پتھر بھی پگھل جاتے تھے، جس میں چاندنی کی سی لطافت اور دلاسائی تھی اور نسیم سحری کی سی تازگی اور رحمت و راحت۔ اس کی بچوں سے گہری دلچسپی، جس کے پیچھے انسانیت کی معصومیت اور اس کے مستقبل کے امکانات سے لگن پوشیدہ تھی۔ اس کی حسن اور حسن کاری کے ہر جلوے اور ہر ادا سے محبت، بڑے سے بڑے بیرونی مہمان کی موجودگی میں بھی ادبی مجلسوں میں شرکت کے لیے وقت نکالنا، پارلیمنٹ سے سیدھے ساہتیہ اکاڈمی کے جلسے کے لیے دوڑنا، سیاست کے پیچ و خم سلجھاتے ہوئے کسی ادیب کی مدد، کسی شاعر کی ہمت افزائی، کسی مصور کی سرپرستی، کسی فن کار کی دیکھ بھال کے لیے وقت نکالنا، سب کے دکھ درد میں شریک ہونا، سب کا دل رکھنے کی کوشش کرنا، غریب طالب علموں کی مدد کرنا اور ان کے زندگی بھر ان پرانے ساتھیوں کے بال بچوں تک کی سرپرستی کرنا جن سے سیاسی اختلاف تھا۔ ہر ظلم اور زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہونا، ہر تعصب اور تنگ نظری کا مقابلہ کرنا، خطروں سے کھیلنا، فسادیوں کے مشتعل ہجوم میں کود پڑنا اور ان کی خبر لینا۔ اس کی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ ہر کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہیں جگہ یہیں ہے۔

میرے ذہن میں جواہر لال نہرو کی ایک نہیں بہت سی تصویریں ابھرتی ہیں۔ [illegible] میں جے پور کی پی۔ ای۔ این کانفرنس میں ان سے ملاقات اور ان کی تقریر، ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں ان کا وہ درد میں ڈوبا ہوا مگر ایک عزم لیے ہوئے چہرہ، گاندھی جی کی شہادت پر ان کی حزیں آواز کہ "ہماری روشنی چلی گئی آج ہر طرف اندھیرا ہے" مولانا آزاد میموریل لیکچر دیتے ہوئے ہندستان کے مسائل پر بصیرت افروز تقریر، ساہتیہ اکاڈمی کے جلسوں میں ادبی مسائل پر اظہار خیال، اردو کانفرنس دہلی میں آزادی کے بعد اردو کتابوں کی نمائش دیکھ کر ان کا تبصرہ، چینی حملے کے وقت گھبراہٹ میں ہندستانیوں کو متحد ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت، گزشتہ سال انجمن ترقی اردو ہند کے ایک وفد سے ان کی ملاقات جس میں انھوں نے اپنے کمرے کے دروازے پر وفد کا استقبال کیا اور ہر ممبر کا نہایت محبت سے خیر مقدم کیا۔ گزشتہ

آل احمد سرور

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

آخر وہی ہوا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ جواہر لال نہرو دہرہ دون میں تین دن آرام کرنے کے بعد دہلی واپس آئے۔ رات کو آرام سے سوئے صبح معمول کے مطابق اٹھے چھ بج کر بیس منٹ پر انھوں نے کچھ تکلیف محسوس کی اور بے ہوش ہو گئے۔ دو بجے دن کو ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

صرف ان کی زندگی کا چراغ گل نہیں ہوا۔ ہندستان میں اندھیرا ہو گیا۔ ایشیا کی روشنی جاتی رہی۔ دنیا پر غم کے بادل چھا گئے۔ ہندستان کا یہ محبوب رہنما صرف ہندستان کا رہنما نہیں تھا۔ وہ ساری دنیا کا رہنما تھا۔ اس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں صرف ہندستان کو آزاد نہیں کرایا، کتنے ہی غلام ملکوں میں آزادی کی ایسی تڑپ پیدا کی کہ ان کی زنجیریں ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گئیں۔ اس نے ہندستان کی آزادی کی لڑائی اس طرح کامیابی سے لڑی کہ دوست دشمن سب کے سر احترام میں جھک گئے۔ اس نے سیاست کو اخلاق سکھایا۔ اس نے اندھیری راتوں میں افق پر روشنی کی ننھی کرن سے لو لگانا سکھایا۔ اس نے زندگی کے آداب سکھائے۔ اس نے موت کے آداب سکھائے۔ وہ ہندستانی تھا۔ وہ مشرقی تھا۔ وہ مغربی تھا۔ وہ عالمی ذہن رکھتا تھا اس میں متضاد عناصر اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ اس میں صدی میں ہر "انسان" کی ایک خیالی تصویر نظر آ گئی تھی۔

وہ ہندستان کی ننگی بھوکی جنتا کے دل کی ہر دھڑکن کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ عوام کے چہروں پر ان کے جذبات پڑھ سکتا تھا۔ عوام ہی سے اسے طاقت اور گرمی ملتی تھی۔ وہ ان کا عاشق تھا اور عوام اس کے عاشق تھے۔

اس عظیم الشان ملک میں، جہاں پینتالیس کروڑ انسان بستے ہیں جہاں ہر طرح کی آب و ہوا، ہر طرح کا طرز زندگی، ایک درجن سے اوپر قومی زبانیں اور سیکڑوں چھوٹی چھوٹی بولیاں ہیں جس کی بڑی شاندار تاریخ ہے۔ جس نے انسانیت کے غیر فانی کارناموں کے ساتھ بربریت کے افسوسناک مظاہرے بھی دیکھے ہیں، مگر ایک شاندار مستقبل جس کا انتظار کر رہا ہے۔ ایک جواہر لال ایسا تھا جو سب کی زبان سمجھتا تھا، سب کے درد سے آشنا تھا جس کے یہاں مذہب، زبان، علاقے عقیدے کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تھا جسے ہندستان کی پوری تاریخ سے محبت تھی، جو اس کے جلوہ صد رنگ کی ہر کرن کو عزیز رکھتا تھا، جو سب کا تھا، اور سب کے لیے تھا۔ ہندستان میں بڑے بڑے فاتح، مدبر، عالم، دانشور بزرگ، ادیب، شاعر، مفکر، گزرے ہیں۔ مگر ایسا جامع حیثیات آدمی ہماری سرزمین سے کوئی نہیں اٹھا جو بیک وقت خوابوں کا پجاری، حقائق کا رمز شناس، جنگ آزادی کا سورما، اور آزادی کے بعد قوم کا معمار اعظم، ادیب، مورخ، دانشور، مدبر، عمل کا مرد میدان، حال کے پیچ و خم کو سنبھالنے والا اور مستقبل کے ہر بستہ راز کا محرم ہو۔

ہم ہندستانی کنوئیں کے مینڈک کی سی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں جواہر لال نہرو نے ہمیں عالمی افکار و اقدار کا محرم بنایا۔ دور دراز ملکوں میں آگ لگی تو انھوں نے اس کی چنگاری اپنے دل میں محسوس کی اور ہمیں بھی دوسروں کے درد سے آشنا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم ہی اس گراں بہا متاع کے لٹ جانے پر ماتم نہیں کر رہے ہیں، ساری دنیا اپنے ایک رہنما کا ماتم کر رہی ہے۔

یوں تو جواہر لال نہرو نے ہندستان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اس کی تفصیل ایک دفتر چاہتی ہے، مگر ان کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ انھوں نے بامعنی اور بامقصد زندگی کا مفہوم سمجھایا۔ ساڑھے چوہتر سال کی زندگی

پرل بک

جواہر لال نہرو

ایک مصنف کے تاثرات

اس کرۂ ارض پر نسل انسانی کی تاریخ کے ہر صد سالہ دور میں کچھ ایسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی رہی ہیں جو ہم سب لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ جواہر لال نہرو ایک ایسی ہی ہستی تھے جنھوں نے گزشتہ برسوں میں مشرق و مغرب کے ملکوں کے سبھی باشندوں کو جس قدر متاثر کیا ہے اور جس طرح ہمیشہ ہماری بھلائی کے لیے ہم پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں اس کی دوسری کوئی مثال نہیں دی جا سکتی۔ حتیٰ کہ بعض اوقات جن لوگوں نے اجلاس میں ان پر بے جا نکتہ چینی کی تو انھیں بھی وہ برابر متاثر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ان کی آزادروی کے پیش نظر آج دنیا بھر میں ان کی قدر و منزلت کی جاتی ہے اور اپنی دیانتداری اور شخصیت کی بدولت آج وہ محبوب عالم بنے ہوئے ہیں۔

وہ ایک پیدائشی قائد تھے اور انھوں نے ہمیشہ ہی قیادت کی۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان کی مداح اس وقت سے ہوں جب وہ گاندھی جی کے ایک نوجوان پیروکار تھے۔ میں مہاتما گاندھی کا بڑا احترام کرتی تھی اور مجھے مہاتما گاندھی کی قوت و فکر کا اندازہ تھا اور میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز امر تھا کہ جواہر لال نہرو نوجوان ہونے کے باوجود گاندھی جی کے لیے ہر طرح کی عزت و احترام رکھتے ہوئے لگاؤ اور محبت کے ساتھ اپنی ذہنی اور ارادی انفرادیت کو کیسے برقرار رکھا۔ کسی کا پاس اور لحاظ رکھنا اور اپنی بات پر بھی قائم رہنا ایک ایسی قابلیت ہے جو آگے چل کر بڑے واضح طور پر ان کی عظمت کا مظہر ثابت ہوئی۔

بعض اوقات میرے ملک کے لیڈروں نے وزیر اعظم پنڈت نہرو کے تئیں عدم مفاہمت کا اظہار کیا اور مجھے اس پر زبردست افسوس بھی ہوا لیکن اس کے برعکس مجھے ان کی عظمت کا اور بھی قائل ہونا پڑا کیونکہ انھوں نے نہ تو کوئی انتقامی کارروائی کی اور نہ کسی قسم کی تلخی کا اظہار کیا۔ مزید برآں وقت نے ان کے سیاسی موقف پر درست ہونے کی مہر ثبت کر دی ہے۔

ان کی سرکردگی میں ہندوستان مشرق اور مغرب کے درمیان ایک محور کا کام دیتا رہا اور ہندوستان کے عوام دونوں طرف کی قوموں کو یکساں سمجھتے رہے۔ تاریخ انسانی کے اس انتہائی نازک دور میں جواہر لال نہرو نے اپنے عوام کے درمیان یگانگی اور یک جہتی پیدا کر کے انھیں ایک اس قدر مضبوط اور طاقتور قوم ملک بنا دیا ہے کہ آنے والی صدیوں میں اس کا استحکام برقرار رہے گا۔

میں جواہر لال کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں، جاذب و پرکشش شخصیت، فہم و ادراک، شان و شوکت اور آداب وغیرہ کو فراموش نہیں کر سکتی۔ میں یہ جانتی ہوں کہ اگر ہمارا یہ زمانہ غدر کے بجائے امن و امان کا دور ہوتا تو وہ ایک مصنف کے طور پر دنیا کے سامنے آتے کیونکہ ان کا اسلوب بیان منفرد تھا اور ان کے تخیل کی پرواز اعلیٰ و ارفع تھی۔ مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ اگر انھوں نے اپنی سیاسی زندگی میں اپنی صلاحیتیں اپنے ملک کے لیے وقف نہ کی ہوتیں تو ان کے قلم سے جو کتابیں معرض ظہور میں آتیں آج دنیا ان کتابوں سے محروم ہو گئی ہے۔ تاہم انھوں نے جو چند کتابیں لکھی ہیں مجھے ان سے بے حد تسکین ہوئی ہے کیونکہ ان کی سبھی تصانیف بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ مگر میں یہ بھی محسوس کرتی ہوں کہ ہندوستان کو کتابوں کی نسبت ان کی روزانہ اور عملی قیادت کی زیادہ ضرورت تھی۔

جواہر لال نہرو کو کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے گاندھی جی کے زیر سایہ اپنی زندگی کا آغاز کیا لیکن جلد ہی وہ اپنے طور پر افق پر پورے جلال کے ساتھ ابھر آئے۔ وہ جدید ہندوستان کی عظیم شخصیت ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ساری دنیا کے چند ایسے عظیم افراد میں سے ایک تھے جو ہمیشہ زندہ رہے ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجھے ان سے ذاتی طور پر تبادلہ خیالات کا موقع حاصل ہوا اور میں نے ان کی زندہ جاوید آواز کو سنا۔ میرا یہ تجربہ میری زندگی کا ایک انمول خزانہ ہے۔

۱۹۰۵ء میں لال قلعے میں بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی کے جشن میں ان کی شرکت۔ ہر تصویر ان کی رنگا رنگ شخصیت کے کسی ملا و یز نقش کو ظاہر کرتی ہو۔ ہر تصویر میں اچھے اور بڑے تصورات سے محبت، زندگی کی بہترین قدروں کی ترجمانی، تہذیب اور انسانیت پر مٹنے والا عزم، رحم، دل سوزی، دل داری کے لازوال نقش ہیں۔

کیا جواہر لال نہرو واقعی مر گئے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ان کا جسم خاکی منور شعلوں کی نذر ہو گیا۔ وہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر کشمیر سے کاویری تک اور آسام سے کاٹھیاواڑ تک اس سرزمین کے چپے چپے پر ان کے قدموں کے نشان ہیں، اس کی فضا میں ان کی آواز گونج رہی ہے۔ اس کے پینتالیس کروڑ باسیوں کے خوابوں میں ان کی حکایتی ہوئی کرنیں ہیں۔ وہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ ان کی نکالی ہوئی اور ہموار کی ہوئی ہے تقریباً پچاس برس تک ہندستان کی زندگی کے ہر موڑ میں وہ شریک رہے۔ آج ہم جو کچھ ہیں انھیں کی وجہ سے ہیں وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ہندستان کو اور اونچا لے جانے کے ان کے خواب زندہ رہیں گے جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کے استحکام کے لیے ہماری ہر کوشش میں ان کی یاد دلائے گی اور مشکلات میں ڈھارس دے گی۔ سوشلزم کی طرف ہر قدم میں ان کی للکار سنتے رہیں گے مشترک تہذیب کے ہر رنگ سے وفاداری کے لیے ہمیں ہر وقت ان کی مثال کو سامنے رکھنا ہوگا، ہر قومی زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع دینے کے لیے ہمیں ان کے ہر مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔ ماضی کی شاندار اور صالح روایات کو اپناتے ہوئے نئے شفق دور کی بساط میں اپنی جگہ محفوظ کرنے کے لیے ہمیں جواہر لال کے بنائے ہوئے خطوط کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یک جہتی اور اتحاد و اتفاق کے ترانے گانے کے لیے ان کے الفاظ نئے سرے سے لینے ہوں گے، بیرونی خطروں سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لیے ملک کو طاقتور بنانے کے مشن میں ان کا عزم، ان کا حوصلہ، یاد آئے گا۔ رزم ہو یا بزم دونوں میں پاک دلی و پاک بازی کے لیے بھی ان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔

جواہر لال نہرو نے ہندستان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ رہتی دنیا تک ان کا کام اور نام زندہ رہے گا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اب تک جب بھی ملک پر وقت پڑا انھوں نے ہماری رہنمائی کی اور ہر مشکل کا مقابلہ کیا۔ اب ہمارا فرض ہو کہ ان کے نقطہ حیات، ان کے سماجی اقدار، ان کے اخلاقی جربے، ان کی جامعیت، ان کی ان تھک اور گرم و گداز طبیعت کو اپنا رہنما بنائیں۔ ان کی طرح اپنی زندگی ہر لمحے کو ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کی تعمیر کو ایسا مستحکم کر دیں کہ کوئی آندھی اسے زیر و زبر نہ کر سکے۔ سوشلزم کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھیں اور ملک کی یک جہتی کو ہر حال میں قائم رکھیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ جواہر لال کے لیے ہمارا سوگ جذباتی رسمی ہو کر رہ جائے ان کی جدائی پر رنج قدرتی ہے اس غم میں آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری نہ ہو تو تعجب ہے۔ مگر ہمیں آنسو پونچھ کر جواہر لال کے مشن کی تکمیل میں لگ جانا ہے کیونکہ یہی جواہر لال کے ساتھ ہماری محبت کا حقیقی ثبوت اور یہی ان کی گراں قدر خدمات کا صحیح اعتراف ہوگا۔

جواہر لال نہرو نے ہمیں جے ہند کہنا سکھایا تھا۔ اس لیے جے ہند پر ہی ہم اس اکھڑی اکھڑی اور بے ربط تحریر کو ختم کرتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا سانحہ ہے کہ ابھی اپنے حواس مجتمع کرنا کم از کم میرے ہی بس میں نہیں تو کیا، ان سب لوگوں کے بس میں نہیں، جن کے لیے ان کا وجود زندگی کے ہر موڑ پر ایک مشعل کا ساتھا، جن کے لیے جواہر لال کی شخصیت تسکین اور تقویت کا باعث تھی اور جو ان سے اس طرح محبت کرتے تھے ہر رشتہ اس رشتے کے سامنے ہیچ تھا۔ جواہر لال نہرو زندہ باد۔ جے ہند۔

ایک ماورائی طاقت.....

"اگر مجھے اس کا موقع دیا جائے کہ میں اپنی موجودہ معلومات اور تجربوں کے ساتھ ایک بار پھر زندگی کا نیا آغاز کروں تو بلاشبہ اپنی نجی زندگی میں بہت کچھ تبدیلیوں کی کوشش کروں گا اور کوشش کروں گا کہ جو کچھ پہلے کیا ہے اس سے بہتر طریقے پر کام کروں مگر عوامی معاملوں میں میرے بڑے فیصلے غیر متاثر رہیں گے یقیناً میں ان کو بدل ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہیں اور ایک مجھ سے ماورا طاقت نے وہ فیصلے مجھ سے صادر کرائے تھے۔"

—— جواہر لال نہرو

شاہدہ حیدری

انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

" پنڈت جواہر لال نہرو کا انتقال ہو گیا۔" اچانک آصف نے یہ خبر سنائی۔

قلب و ذہن پر ایک زبردست دھکا لگا مگر نہ جانے کیوں کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

کیا بک رہے ہو۔" خدا نہ کرے۔"

" اسے آپ یقین کیجئے بھابی۔ یہ خبر جھوٹی نہیں ہے۔" آصف کے چہرے پر انتہائی پریشانی تھی۔

" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ دل سے ایک بپھری ہوئی آواز آئی۔ نہیں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ غلط خبر ہے۔ میں نہیں مانوں گی۔" ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی ریڈیو کے قریب پہونچی۔ ریڈیو آن کیا تو خاص اعلان سنایا جا رہا تھا۔ وزیر اعظم کی موت کا۔ آہ۔ یہ کیا ہوا!

مجھ میں اور کچھ سننے کی تاب نہ تھی۔ واپس اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ " بھارت اناتھ ہو گیا۔" بھارت اناتھ ہو گیا۔" کی صدائیں ریڈیو سے آ رہی تھیں۔ اور اس اناتھ بھارت کی سرزمین کا ذرہ ذرہ جیسے چیخ رہا تھا۔ " تم نے کیوں مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ تمہیں تو اپنے بھارتیوں سے بے انتہا پیار تھا۔ تم نے تو ان کی خطائیں معاف کی تھیں۔ لغزشوں پر ٹوکا تھا۔ پیار سے ڈانٹا تھا۔ آج کیوں ان سب سے روٹھ گئے؟ تمہارے جاتے ہی اس باغ کی ساری رونق چھن گئی ہے۔ پھول مرجھا گئے ہیں۔ بچے بلک رہے ہیں۔ عورتیں آنچل میں آنسوؤں کے موتی رول رہی ہیں۔ جوانوں کی اٹھی ہوئی گردنیں دکھ کے بوجھ سے جھک گئی ہیں۔ تم ان سب کے پیارے تھے۔ اور یہ سب تمہیں پیارے تھے۔ کیا پیاروں سے پیارے جدا ہوتے ہیں۔ سرخ گلاب کا ننھا پھول اب ہمیشہ کے لیے تمہارے بدن کی خوشبو سے محروم ہو گیا ہے۔ سرخ گلاب محبت کی نشانی جس کے تم علمبردار تھے تم سراپا محبت تھے۔ سراپا امن تھے۔ سراپا سچائی تھے۔ آج موت کے ظالم ہاتھوں نے تمہیں ہم سب سے چھین لیا۔ مگر کیا وہ نور جو تمہارے چاروں طرف ایک ہالہ بنائے ہوئے ہے۔ کیا اسے کوئی ہم سے چھین سکتا ہے۔؟"

میرے آنسو تھمتے نہ تھے۔ اور دکھ کے اس سیلاب میں میرا ملا وجود بہا جا رہا تھا۔ کمرے میں سامنے کی طرف رکھی ہوئی پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ یادگار تصویر تھی جس میں وہ میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ میں نے سر اٹھا کر بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اور ایک ایک کر کے ماضی کے اوراق اسی طوفان کے جھونکے کے ساتھ پلٹنے لگے۔

۱۹۶۱ء میں دلّی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ پنڈت جی کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کی تمنا نہ جانے کب سے جنم لے چکی تھی۔ بچپن میں گھر کے کرٹ نیشنلسٹ ماحول میں میں نے گاندھی، آزاد، اور نہرو کے چرچے سنے تھے۔ یہی نہیں۔ اپنے خاندان کے پیارے افراد کو اس آگ کی لپیٹ میں جلتے دیکھا تھا جس نے ہندوستان سارے ہندوستان میں پھیل کر انگریزوں کے کاغذی محل کو جلا کر بھسم کر دیا۔ اگرچہ میں اس وقت چھوٹی سی تھی مگر مجھے کچھ کچھ یاد آتا ہے ۱۹۴۷ء کے واقعات میں ابا نے جو مصیبتیں جھیلی تھیں ان کی وجہ سے گھر کا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ ایک کامیاب اور شہر کے گنے چنے ہوئے نامور ڈاکٹروں میں شمار کیے جانے کی وجہ سے ابا کی ذمہ داری دوہری تھی۔ اور میں اسے نہیں بھول سکتی کہ انھوں نے اس دوہری ذمہ داری کو نبھانے میں اپنا

آہستہ سے کہا۔ "وہ دیکھیے پنڈت جی آ گئے۔" مڑکر دیکھا تو پنڈت جی دروازے کے پاس بے حد وقار اور دبدبے کے ساتھ ٹہلتے ہوئے ہم لوگوں کے قریب آ رہے تھے۔

ہونٹوں پہ ایک مہربان مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں زمانے بھر کا درد اور خلوص سمایا ہوا تھا۔ سرخ و سپید رنگت سے مقدس نور پھوٹ رہا تھا۔ سفید پائجامہ ہلکے بھورے رنگ کی گرم شیروانی اور ٹوپی میں ملبوس تھے ننھا سا سرخ گلاب بڑی نفاست سے بٹن ہول میں سجا ہوا تھا۔ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی فضا پہ ایک پیغمبرانہ وقار چھا گیا۔

پنڈت جی ہلکی مسکراہٹ لیے ———— ہر آدمی سے مل رہے تھے۔ ان کی پرسکون پرخلوص مسکراہٹ سے وہ انوکھا پیار امڈا پڑتا تھا جو انھیں اپنے بھارت کے عوام کے ساتھ تھا وہ بے لوث پیار جس میں فرشتوں کا تقدس تھا جس میں ممتا کی معصومیت تھی۔

اپنی آنکھوں کی خوش نصیبی پر آج میں نازاں تھی۔ لمحہ بھر کو یہ بھی محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کوئی خواب ہو۔ کیا سچ سچ میں پنڈت جی کو اتنا قریب سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ خیال کسی لمحہ نہ چھوڑتا تھا۔ اگر دو سرے چہروں کے درمیان وہ چھپ جاتے تو میں اپنی جگہ سے ذرا آگے کو کھسک جاتی تاکہ انہیں اچھی طرح جی بھر کر دیکھ پاؤں

ہر ایک سے ملتے ہوئے وہ ہم لوگوں کی طرف آ رہے تھے جب وہ میرے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک شخص کے پاس آکر کھڑے ہوئے تو میں سب کچھ بھول کر ایک ٹک انھیں دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے کئی بار میری طرف دیکھا اور پھر جلدی ہی میرے پاس آکر رک گئے۔ میں نے سر جھکا کر دونوں ہاتھ پرنام کے لیے جوڑ دیے اور بتایا کہ میں بہار سے آ رہی ہوں۔

پنڈت جی کے چہرے پر شفقت امڈ آئی انھوں نے ہنس کر ایک چپت میرے گال پر لگائی اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کہا۔

"مگر بہار سے تو بوڑھیاں آتی ہیں۔"

کلام چودھری نے کہا "جی ہاں۔ بوڑھیاں اور ان پڑھ"

پنڈت جی بڑے پیار سے میری پیٹھ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "مگر بھئی۔ یہ تو پڑھی لکھی ہیں۔ کافی پڑھی لکھی ہیں۔"

دیر تک وہ میرے کندھے پر اپنا شفیق ہاتھ رکھے میری باتیں سنتے رہے اور مسکرا مسکرا کر باتیں سنتے رہے اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے رہے۔ میں اپنے ساتھ ایک مزدوری کا غذ لیتی گئی تھی جس کے بارے میں سوچا تھا کہ پنڈت جی کو دے دوں گی۔ مگر وہاں پہونچ کر پنڈت جی کے بے پناہ محبت آمیز برتاؤ کے جادو نے مجھے سب کچھ بھلا دیا۔ کاغذ رومال کے ساتھ لگا ہوا میرے دونوں ہاتھوں کے درمیان میرے ہی پاس رہ گیا۔ جب پنڈت جی چلے گئے تو مجھے اس کا خیال آیا۔

اب ہمیں واپس لوٹنا تھا دل چاہتا تھا کہ ایک بار پھر ان کے درشن کر لوں۔

پنڈت جی باہر لان میں غالب شاعروں کو ایک بھاشن دینے کے بعد اندر جا چکے تھے ان کے ڈرائنگ روم کے پاس والے کمرے میں کچھ لوگ جمع تھے۔ میں وہاں جاکر کھڑی ہوئی۔ پنڈت جی کی گاڑی پورٹیکو میں لگ گئی تھی مجھے امید ہوئی کہ وہ باہر جانے سے پہلے ادھر سے ضرور گزریں گے۔ اور میں وہیں کھڑی رہی۔ کافی دیر لوگ جمع تھے کہ اچانک پنڈت جی تیزی کے ساتھ آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف جا رہے تھے مجھ پر نظر پڑی تو ذرا سا رکے اور انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے مجھے وہ پرچہ دیا۔"

"اندرا بہن کو دے دیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا پھر ملنا" پنڈت جی نے سر کو جنبش دیتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا۔

اس کے بعد وہ کار کی طرف چل دیے اس کاغذ کی دوسری کاپی بھی ہم لوگوں کے پاس موجود تھی۔ مجھے خیال آیا کیوں نہ دے دوں میں اسے لے کر گاڑی تک گئی تو کار وہاں کافی بھیڑ تھی۔

ایک بوڑھی عورت پنڈت جی کا ہاتھ پکڑے انھیں نہ جانے کیا سمجھا کر کہہ رہی تھی۔ پنڈت جی کے پاس پہونچی تو مجھے دیکھ کر وہ مسکرائے اور جب میں نے وہ کاغذ دینا چاہا تو انھوں نے گاڑی کے اندر سے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ اور مسکراتے ہوئے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا ہاتھ جوڑ کر میں نے پرنام کیا اور واپس چلی آئی۔

میں اپنی زندگی کے قیمتی ترین لمحے گزار کر آئی تھی۔ جس دیوتا کے صرف درشن کی آس تھی اس نے اس داسی پر عنایت اور کرم کی بارش کر دی تھی مجھے لگا جیسے میرا جسم ہلکا ہو گیا ہو۔ اپا دھیائے جی نے

خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ ایک طرف بیماروں کو حیات و موت کی کشمکش سے نکالنا۔ اور دوسری طرف بیرسٹر یوسف امام صاحب اور پروفیسر عبدالباری مرحوم جیسے ساتھیوں کی نگہبانی میں رات دن بغیر تھکے کام کرتے جانا۔ ہڑتال اور بدیسی چیزوں کے خلاف پروپیگنڈہ کرکے خطروں سے کھیلنا، جلسے، پرجوش تقریروں، بدیسی حکومت کے خلاف کارروائیوں میں شریک ہونا۔ ان ساری باتوں کا بہت ہی دھندلا سا عکس ذہن پر موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس ساری ہلچل کے پیچھے کوئی واضح بات سمجھ میں نہ آتی تھی پھر بھی اتنا ضرور سمجھ میں آتا تھا کہ ہر شخص کی زندگی اسی شور و ہنگامے سے وابستہ ہے!

مسلم لیگی مسلمانوں کی طرف سے ابا کے لیے شدید نفرت کا اظہار تو کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے جو مجھے اچھی طرح یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ اسی نفرت کی بنا پر مسلم لیگیوں نے انھیں "کافر" کے خطاب سے نوازا تھا۔ ابا یہ کٹر فرقہ پرست ذہنیت ہی کا نتیجہ تھا کہ شہر سے دور اپنے گاؤں میں بھی (جہاں ہمارا آبائی مکان ہے۔) اس آگ کے شعلے پہونچ چکے تھے۔ اور وہاں کا ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو مسلم لیگی ذہنیت رکھتا ہو۔ وہاں یہ چنگاری ابا اور بڑے چچا جان ہی کی بدولت پھیلی تھی غرض جتنا پیچھے کی طرف مڑکر دیکھتی ہوں بس یہی کچھ نظر آتا ہے۔ اپنے ان پیارے رہنماؤں کے لیے وہ جذبہ جس کی بنیاد قربانی اور پرستش پر ہے نہ جانے کب سے دل میں جاگزیں تھا نہرو جی سے ملنے کی آرزو بھی اتنی ہی پرانی تھی جتنی میرے ماضی کی یہ داستان۔

دلّی گئی تو یہ آرزو اور بھی تازہ ہو اٹھی آخر وہ دن آگیا جب ابا دھیا جی - ایم - پی - کی محبت کے طفیل نہرو جی سے ملاقات کے لیے اپوائنٹ منٹ ملی۔ دوسرے دن صبح کے سات بجے کا وقت دیا گیا تھا جوش عقیدت سے میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی ڈر تی کہ اتنی عظیم شخصیت کا سامنا ہونے پر جانے لب بھی کھل سکیں گے یا نہیں کبھی ان کے ہنستے ہوئے شاداب چہرے اور عوام سے ان کی اتھاہ محبت کا خیال کرکے یہ محسوس کرتی جیسے میں اپنے کسی قریب ترین ہمدرد اور سرپرست سے ملنے جا رہی ہوں۔

وہ کیسی شبھ گھڑی ہوگی جب میں انھیں اپنے آپ سے مخاطب پاؤں گی۔ وہ دنیا کا بڑا آدمی۔ بھارت کا سچا محافظ، ہم عام انسانوں کے دکھ درد کا مداوا ڈھونڈنے والا نگہبان، کیا یہ میرے نصیب ہو گئے کہ اس عظمت کے دروازے پر اپنی جبین نیاز جھکا سکوں گی۔ تقدس اور وقار کا دبدبہ میرے احساس پر چھاتا جا رہا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"کل سات بجے صبح، پنڈت نہرو سے ملنا ہے۔" بس یہی خیال سارے خیالوں پر حاوی تھا۔

دوسرے دن ساڑھے چھ بجے تیار ہو کر روانہ ہوئی کلام حیدری صاحب میرے ساتھ تھے۔ حسن نعیم صاحب نے گیٹ تک رہبری کی۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سردی کڑاکے کی تھی۔ اور آج نہ جانے کیا بات تھی کہ کچھ زیادہ ٹھٹھرک گر رہی تھی۔ میں نے سیاہ گرم شال اپنے جسم سے لپیٹ لیا۔

تھوڑی دیر میں ہماری گاڑی وزیر اعظم کی شاندار جائے رہائش کے سامنے رک گئی وہاں پہلے ہی پروانوں کا ایک ہجوم موجود تھا۔ اسی بیچ سے گیٹ میں داخل ہو کر بہت ہی وسیع، پرفضا اور سجے ہوئے باغ کے بیچ سے ایک چوڑا راستہ گزرتا تھا جس پر چل کر ہم وزیر اعظم کے مکان کے پورٹیکو میں داخل ہوئے۔

ابا دھیا جی ایم۔ پی ساتھ تھے۔ یہ عمر رسیدہ اور بے حد شفیق بزرگ تھے۔ انھوں نے بڑے خلوص کا اظہار کیا۔ اور ہمیں وزیر اعظم کے ڈرائنگ روم میں جا کر بٹھا دیا۔ مجھ سے کہا ——— "دیکھو بیٹی تم لوگ یہیں ٹھہرنا۔ یہیں تمہاری ملاقات نہرو جی کے ساتھ نہایت اطمینان سے ہو سکے گی۔ میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے پھر فوراً لوٹ آئے اور برابر ہمارے ساتھ ساتھ رہے ان کی یہ محبت میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم میں اور کچھ دوسرے ملنے والے بھی جمع ہو گئے۔ میری بے تابی بڑھتی جا رہی تھی بار بار میں اس دروازے کی طرف دیکھتی جدھر سے نہرو جی آنے والے تھے۔ اچانک میں نے دیکھا آل انڈیا ریڈیو کے فوٹوگرافر نے اپنا کیمرہ ٹھیک کرنا شروع کیا مجھے یقین ہو گیا کہ اب جلد ہی نہرو جی آرہے ہیں ——— ہم لوگ سب ایک طرف کو کھڑے ہو گئے۔ کئی منٹ گزر گئے یکایک کسی نے

ساوتری پرکاش

شخصیت کی چند جھلکیاں

[ابھی چند روز قبل کی بات ہے کہ پنڈت نہرو تعطیل منانے دہرہ دون گئے تھے تو وہاں سری پرکاش جی سے خاص طور پر ملنے اور دہرہ دون سے قریب ہی ان کی زیر تعمیر قیام گاہ دیکھنے گئے تھے۔ سری پرکاش جی نے جو پنڈت نہرو سے بہت قریب رہے ان کے متعلق مندرجہ ذیل تاثرات کا اظہار کچھ عرصہ قبل کیا تھا۔]

پنڈت جواہرلال نہرو کی ذہنی جرأت قابل تعریف ہے وہ اپنے قریبی دوستوں اور ساتھیوں کے خلاف بھی اپنی ذاتی اصلی رائے دینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے ہیں جن لوگوں نے آزادی سے قبل کانگرس کی ورکنگ کمیٹیوں کی اندرونی کارروائیاں دیکھی ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ انھیں اپنی اس جرأت کی وجہ سے کتنی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن وہ اپنی صاف بیانی سے کبھی نہیں رکے۔ کلکتہ میں ۱۹۲۸ء میں ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے اپنے والد تک کی مخالفت کی تھی اسی طرح ان کی جسمانی ہمت کی بھی جتنی تعریف کی جائے وہ تھوڑی ہے۔ بڑی سے بڑی مخالف بھیڑ میں بھی وہ چوٹ چپیٹ کی پروا کئے بغیر گھس جاتے ہیں۔ رائے بریلی میں جب گولیاں چل رہی تھیں تب وہ ان کے سامنے تھے لکھنؤ میں جب لاٹھی چارج ہوا تب وہ اس کا وار سہنے کے لیے خود آگے بڑھ آئے تھے۔ الہ آباد پولیس کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ سنگم میں کود پڑے تھے۔ مجھے تو اکثر معلوم پڑتا ہے انھیں ڈر بھی نہیں لگتا۔ ان کی یہ خصوصیت مجھے بہت پسند ہے، ہم میں یہ خصوصیت نہیں ہے۔ ہمارے ملک کے اور لوگوں میں بھی اس کی ضرورت ہے، مزے کی بات تو یہ ہے کہ جواہرلال نہرو کبھی یہ محسوس نہیں کرتے کہ انھوں نے کوئی خاص کام کیا ہے جب کوئی تعریف کرتا ہے تو انھیں تعجب ہی ہوتا ہے۔ ہمت کے کام کرکے وہ اس طریقے سے اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں یا ہنسنے کھیلنے لگتے ہیں کہ سب کو یہی محسوس ہوتا ہے گویا وہ سب باتیں بھول گئے ہیں۔ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا ہے۔ ان کو نہیں۔ ہر طرح کے ہوائی جہاز۔ ریل موٹر۔ جہاز۔ گھوڑا۔ سائیکل سب کا وہ برابر استعمال کرتے ہیں کسی سے بھی گھبراہٹ محسوس نہیں کرتے تھے انھیں سب کی عادت ہے۔ سب حالتوں میں وہ یکساں رہنے والے انسان ہیں۔

جواہرلال کی دوسری صفت مجھے بھلی معلوم ہوتی ہے وہ ان کی طفلانہ عادتیں ہیں وہ کسی سے بھی ایک عرصہ تک ناراض نہیں رہ سکتے ہیں۔ یکایک ابل پڑتے ہیں لیکن پھر خاموش ہو جاتے ہیں افسوس کرنے لگتے ہیں۔ تلخی ان میں ذرا بھی نہیں ہے۔ عمر کے اس حصے میں رہنے کے بعد بھی ان میں طفلانہ عادتیں موجود ہیں۔ جسمانی اعتبار سے بھی وہ تندرست ہیں اور ان کا دل ہر وقت خوش رہتا ہے۔ ان کی عادتیں بچوں کی سی ہیں ان سے باتیں کیجئے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی اہم شخصیتوں میں سے ایک ہیں بچوں سے دھول دھپا کرتے ہیں عورتوں سے مذاق کرتے ہیں۔

ان میں پرستش کا جذبہ بالکل نہیں ہے۔ سب سے وہ یکساں طور پر ملتے ہیں۔ جلسوں میں انھیں خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کا شوق نہیں ہے کہیں بھی وہ بیٹھ جانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ کسی کو وہ نباہتے ہیں اور آدمی کو پہچانتے ہیں ہجوم میں اپنی زندگی گزارتے ہوئے بھی وہ تنہائی کو پسند کرتے ہیں نہ وہ کسی کے مرید ہیں اور نہ کسی کو اپنا مرید بناتے ہیں اپنی ذات میں لیڈری کے بہت سے صفات موجود ہوتے ہوئے بھی وہ دوسروں سے کام لینے کا ہنر نہیں جانتے

ٹھیک ہی کہا تھا۔

"بیٹی - تم نے تو مار بھی کھالی - اب سنبھل ہو تم۔"

مجھے اپنی قسمت پر آپ ہی رشک آرہا تھا۔ اس کے بعد پنڈت جی جب بھی پٹنہ یا گیا آئے ہم ان سے بار بار ملتے رہے۔ ایک بار الیکشن کے سلسلے میں پنڈت جی گیا آئے تو بہت تھکے ہوئے پریشان سے تھے۔ گیا کے ناہموار موسم کی وجہ سے انھیں زکام ہو گیا تھا اور گلے میں شاید تکلیف تھی۔ دلی میں پنڈت جی کو جتنا شگفتہ اور بچوں کی طرح بشاش اور ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اتنا ہی یہاں نڈھال نظر آئے مگر فطرت میں جو چستی تھی اس نے تھکان میں بھی وہ پرسکون پرخلوص مسکراہٹ ماند نہ ہونے دی تھی جو اپنے پیارے عوام کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر پھیل جاتی تھی۔ میں ان کی یادداشت پر دنگ رہ گئی جب انھوں نے گیا میں مجھ کو اور کلام حیدری کو کافی لوگوں کے درمیان کھڑا دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ ! میں نے ان کے لیے گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا جس میں اپنے کمپاؤنڈ کے وہ سارے گلاب سجائے تھے جو ایک مخصوص بہترین ورائٹی کے گلاب ہیں اور کئی بار گلابوں کی نمائش میں بھیجے گئے ہیں اور اوّل رہے ہیں۔

پنڈت جی کے آگے جب میں نے بڑی بڑی پنکھڑیوں والے ان گلابوں کا دستہ پیش کیا تو انھوں نے اسے بے حد سراہا۔ اور علیحدہ اپنے پاس رکھا اپنی اس چھوٹی سی پیش کش کی یہ قبولیت دیکھ کر میرا دل کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ ! پنڈت جی کے چہرے پر اس وقت بھی ہم دونوں کو دیکھ کر وہی محبت ابھر آئی تھی جو اس سے پہلے ان سے ملنے پر ہمیں نصیب ہو چکی تھی۔ میں سوچنے لگی کیسی پیاری شخصیت - ایسی سادگی ! ایسی ساحری کیسی پیغمبری ہے اس عظیم شخصیت میں وہ مسکراتا ہوا شفیق چہرہ ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

اچانک رلا دینے والی موسیقی کی آواز چیرتی ہوئی میرے دل کو چھو گئی۔ ایک جھٹکے میں ماضی کی ساری تصویریں دھندلا گئیں ریڈیو ہر لمحہ اس کڑوی سچائی کا یقین دلا رہا تھا۔

تم کہاں گئے نہرو چاچا - تم کیوں چلے گئے۔ اس ذہین و فرزند ہندستان کو کس پر چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم زندہ نہیں ہیں، آزاد نہیں ہیں خدا ہی نہیں ہیں۔ سب کا بدل ایک تم تھے۔ مگر آج تم بھی نہیں ہو اب کون مرہم کو پیار سے دم سے رکھے گا۔ کون ہے جو طوفانی طاقتوں کے آگے سینہ سپر ہو گا۔ تمہاری ایک مسکراہٹ سیکڑوں دکھوں کے گھاؤ پر مرہم رکھتی تھی۔ دل کے ہزار زخم اپنے لب کھولے ہوئے تمہیں پکار رہے ہیں۔ اور تم وہاں چلے گئے ہو جہاں تک ہماری نظریں نہیں جا سکتیں۔

آنکھوں والا ہو تو تم کو دیکھ سکتا ہے۔ تم اس ہندستان میں کہاں نہیں ہو - تم ہر جگہ تو ہو۔ تم بھاکڑہ ڈیم میں ہو۔ تم بھلائی اور درگاپور کی مشینوں کے دلوں میں حرارت بن کر دوڑ رہے ہو۔ یہ نہروں سے تر و تازہ ہوتے ہوئے کھیتوں کے پودے کس کے خون جگر کی لالی پی کر کھڑے ہوئے ہیں۔

یہ اسکول، یہ مدرسے ، یہ کالج ، یہ یونیورسٹیاں - یہ علم سے سرشار نوجوان نسل - یہ نہرو نہیں تو اور کون ہے۔ چترنجن میں بننے والے قوی ہیکل انجن کی گونج میں کس کی صدائے بازگشت ہے۔

کون ہے جو ساری دنیا کے لبوں پر لفظ امن بن کر گونج رہا ہے۔

غم مت کرو
غم مت کرو
میرے ہم وطنو
غم مت کرو

سینہ تان کر دنیا کی قوموں میں رہو کہ نہرو کی گردن تمہارے شانوں پر ہے۔ ایک نہرو نے مر کر کروڑوں نہرو پیدا کیے ہیں۔ تم سب نہرو ہو۔

ہم وطنو
مت رو‌ؤ
غم مت کرو

میں اپنے ان آنسوؤں کو کیسے کروں جو چلے آ رہے ہیں،

ہم نہرو کے وارث ہیں۔ ہم اپنی وراثت کی حفاظت میں جان کی بازی لگا دیں گے۔ ہم نہرو کی تعلیمات کو، اصولوں کو، خلوص کو، جرأت و بے باکی کی روایات کو زندہ رکھیں گے۔

غم مت کرو۔
غم مت کرو۔

کیفی اعظمی

سقراط ۔ روسو ۔ لنکن ۔ جواہر

معلوم نہیں دُنیا پنڈت جواہر لال نہرو کا سوگ کیوں منا رہی ہے، وہ تو پہلے بھی کئی بار مر چکے ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے جب انھوں نے ایتھنس میں نوجوانوں کو بیدار کرنا شروع کیا تو حکمراں جماعت گھبرا گئی، حکمراں جماعت کا بیداری سے گھبرا جانا قدرتی بات ہے، اس نے پنڈت جی کو قید کر لیا اور اُن سے کہا ہم جانتے ہیں" تم ہم سب سے زیادہ شریف، عقلمند اور نیک نفس انسان ہو" ہم نے تمہارے لئے بڑے اہتمام سے زہر تیار کیا ہے" لو یہ پیالہ مُنہ سے لگاؤ اور زہر پی جاؤ" پنڈت جی حکمراں جماعت کی اس ذہنی یتیمی پر مسکرائے، اُنھوں نے زہر پیا اور مر گئے۔ اس وقت ان کا نام سقراط تھا۔

اسکے بہت دن بعد فرانس میں جہاں اقتدار اشرافیہ کے ہاتھ میں تھا پنڈت جی "معاہدہ عمرانی" لئے ہوئے پھر نمودار ہوئے اور اُنھوں نے کہا" انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن ہم ہر جگہ اسے زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتے ہیں" بہ ظاہر کتنا سادہ فقرہ ہے، کتنی معمولی بات۔ لیکن یہی معمولی بات فرانس بلکہ دُنیا کے فکری انقلاب کی بنیاد بن گئی، نیا دور شروع ہو گیا آزادی، برابری اور بھائی چارے کا دور۔

تاریخ کو ایک خاص سمت میں موڑ دینے کے بعد آتما کے لیے جسم بدل دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ جیسے انسان کے لئے کچھ دیر کے بعد کپڑے بدلنا، پنڈت جی بھی ایک دور کو جنم دے کے ایک نیا عہد پیدا کر کے مر گئے، اور اب کی اُن کا نام "روسو" تھا۔

اور اس کے بہت دنوں بعد اس نو دریافت دنیا میں جسے امریکہ کہتے ہیں پنڈت جی پھر نظر آئے۔ اور اُنھوں نے پھر ایک عجیب و غریب بات کہی، ایسی عجیب و غریب بات جو اس وقت تک دُنیا نے کبھی نہ سُنی تھی اور نہ کبھی اس کا تصور کیا تھا، انھوں نے کہا" عوام کی حکومت۔ عوام کے لیے حکومت۔ عوام کے ذریعہ حکومت" بھلا یہ کوئی کہنے کی بات تھی۔ عوام جو محنت کش ہوتے ہیں۔ عوام جن کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ حکومت تو ہمیشہ خواص کرتے ہیں لیکن پنڈت جی نے خواص کی کوئی خاص پرواہ نہیں کی، اور پرواہ کرتے کیوں، ان کا کہنا تھا" چونکہ مجھے کسی کا غلام بن کے رہنا منظور نہیں اس لیے میں کسی کا آقا بننے کو بھی تیار نہیں ہوں" وہ آقا بننے پر تیار نہیں تھے۔ پھر بھی آقاؤں کے اشارے پر آقاؤں کے مفاد کے لیے آقاؤں کے ایک آدمی نے اُن کو گولی مار دی اور وہ مر گئے۔ اب کی اُن کا نام "ابراہیم لنکن" تھا۔

لیکن اب کی جب پنڈت جی نے ہندوستان میں جنم لیا، ہندوستان کی رہنمائی کی اور اُسے آزاد کرایا، اور اس کو سوشلزم کی طرف لے کے چلے تو ایسے موڑ پر اُنھوں نے ہم کو چھوڑ دیا جب ہمیں ان کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت تھی۔

—— وہ اپنا کام سب خود کر لیتے ہیں۔
بلا سوچے وہ کچھ ایسا کہہ دیتے ہیں یا کر جاتے ہیں جس سے دیگر لوگ ناخوش ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ ان کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہیں وہ ان کی باتوں کا برا نہیں مانتے ہیں۔ وہ اپنی اس برائی کو جانتے ہیں لیکن اپنی عادت سے مجبور ہیں۔ اپنے کو وہ سنبھالنا چاہتے ہیں لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کسی موقع پر ایک بار جب میں ان سے جھگڑ بیٹھا تو انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم تو مجھے جانتے ہو تم ناراض کیوں ہوئے میرے ایسے شخص پر نظر کرم ہی رکھو تب سے پھر نہ میں نے ان سے کبھی کوئی شکایت کی اور نہ اس سے ناخوش ہوا۔

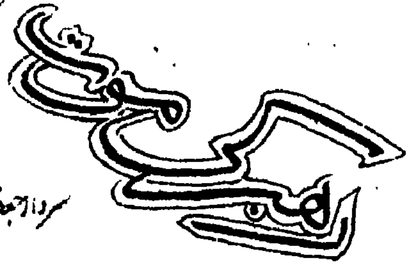
جواہر لال بڑے ہی سچے آدمی ہیں ان سے کسی کو بھی کسی بھی بات میں بھی چاہے وہ بڑی ہو یا چھوٹی دھوکا نہیں ہو سکتا ہے۔ معمولی چالاکیوں اور چالبازیوں سے بھی وہ ہمیشہ دور رہتے ہیں ان کا سب کام صفائی سے ہوتا ہے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی جن میں دنیا کے عام اچھے آدمی جھوٹ کو جھوٹ نہیں مانتے ہیں جواہر لال کا طریقہ کار پاک اور صاف رہا ہے گندگی ان کے قریب سے گزر نہیں سکتی ہے جلد بازی کے ساتھ ان میں اطمینان ہے غصہ کے ساتھ ان میں عفو بھی ہے حلم کے ساتھ ان میں برداشت کی طاقت ہے وہ لیڈر نہ ہوں لیکن وہ جم کر کام کرنے والے آدمی ہیں وہ مذہبی نہ ہوں لیکن وہ قول کے سچے اور فرض شناس ہیں۔ وہ مہاتما نہ ہوں لیکن انسان ضرور ہیں۔ جو انھیں اچھی طرح جانتے ہیں جنھیں ان کی دوستی حاصل ہوئی ہے جن پر ان کو اعتماد رہا ہے۔ ان کے دلوں میں ان کی محبت اور تعریف ہمیشہ جاگزیں رہے گی اور وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھیں گے کہ انھوں نے جواہر لال کو اتنے قریب سے دیکھا اور پرکھا۔

عزیزاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری

"دوستو ساتھیو"

حسن کمال

ہاں زورِ جنوں ختم نہ ہو...... بھول نہ جانا
دامان و گریباں سے رہی ہاتھوں کو اک عمر جو نسبت
یک لحظہ و یک لمحہ نہ یہ بات بھلانا
ہے کام ان آنکھوں کا فقط خون بہانا
بھولے کبھی نکلے نہ کبھی دھیان سے یہ بات
گلشن سے ذرا دور ہے دار اور رسن بھی چلنا ہے ابھی
آنے کو تو آئیں گے رقیبوں کے زمانے
ہر دور میں ہر عصر میں کچھ دیر کو ان کی بھی بن آئی
منسوب رہی عشق کی دیرینہ روایت خون شہدا سے
فرہاد سے مجنوں سے کوئی چھین نہ پایا تقدیس و بلندی
ہر دور میں کھوتے رہے عشاق خزینے
سجتے رہے راہوں میں درخشاں مہ و اختر
ہر دور میں دیوانوں نے راہوں میں مگر دل بھی جلایا
پھر آج اندھیرا ہے جو راہوں میں تو کیا ہے
دیوانوں کا دل اور جگر تو ہے سلامت
باقی ہے ابھی خون جگر دلوا! دل بھٹکیں نہ نگاہیں
ہاں بجھنے نہ دینا وہ چراغوں کی قطاریں
دیوانے جلاتے ہیں جسے خون جگر سے
پھیلے نہ اندھیرا
سمٹے نہ اجالا
ہاں زورِ جنوں ختم نہ ہو...... بھول نہ جانا



سردار جعفری

اپنا رہبر جنگ کے میداں میں کام آیا ہے آج
وہ وطن کی آبرو، اہلِ وطن کا افتخار
اشتراکیت کی جمہوری روایت کا نقیب
محفلِ انساں میں انسانیت کا تاجدار

"ایک مردہ لاش؟" یہ توہین کر سکتا ہے کون
پاؤں پھیلائے ہوئے سوئی ہے گلشن میں بہار
اپنی سرد آہوں کی چادر ہی اڑھائیں گے اسے
کیا بچھا دو ہم کریں گے اس پہ صرف اشکوں کے ہار

کیا زمانے سے کہیں گے جا کے بس اتنی سی بات
مر گیا ہے وہ تو اس کے غم میں ہیں ہم سوگوار
یوں تو مر سکتا نہیں اب دل کے طوفانوں کا گیت
کند ہو سکتی نہیں یوں عشق کے خنجر کی دھار

اب ہماری آنکھ میں ہے اس کی بند آنکھوں کا نور
اب ہمارے جسم میں ہے اس کی روح بے قرار
اس کا پرچم لے کے میداں میں نکلنا ہے ہمیں
"فرشِ گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں"

اس کی منزل کے لیے جینا ہے، مرنا ہے ہمیں
نامکمل صبح کی تکمیل کرنا ہے ہمیں



محمد خلیق صدیقی

سرو خاموش، فضا تنگ، ہر اک پھول اداس
عالم اک دیدۂ حیراں ہے کہ اب کیا ہوگا
پائے افلاک نے اک پھول مسل ڈالا ہے
منفعل گردشِ دوراں ہے کہ اب کیا ہوگا
اب کہاں نور کو مل پائے گا پیراہنِ شمع
روشنی سر بگریباں ہے کہ اب کیا ہوگا
اب گلابوں میں بھی باقی نہ رہا ذوقِ نمو
کھل کے ہر پھول پشیماں ہے کہ اب کیا ہوگا
کون اب ہوگا "حریفِ مے مرد افگنِ عشق"
ساقیِ میکدہ حیراں ہے کہ اب کیا ہوگا

دفعتاً آئی یہ آواز کہ اے قلبِ حزیں
یوں ہی آباد جہانِ گزراں رہتا ہے
خونِ دل ہی سے تو سینچا ہے تمنا کا چمن
نخلِ امید اسی طرح جواں رہتا ہے
کہیں انساں، کہیں نغمہ، کہیں رنگینیِ گل
جلوۂ شوق بصد رنگ عیاں رہتا ہے
کہیں صدیوں میں کوئی برق چمک جاتی ہے
جس کی گرمی سے ہر اک قلب تپاں رہتا ہے

رہنما صرف دکھا دیتے ہیں راہِ منزل
آگے خود قافلۂ شوق رواں رہتا ہے

غلام ربانی تاباں

پھول رنجیدہ، صبا غمگیں چمن افسردہ ہے
آج تاباں، انجمن کی انجمن افسردہ ہے

ایک دیوانہ تھا، وہ بھی اپنے رستے چل دیا
سوگ میں ڈوبا ہے صحرا، اور بن افسردہ ہے

جس کے دم سے وادیِ گنگ و جمن تھی پُربہار
اس کے غم میں وادیِ گنگ و جمن افسردہ ہے

دفعتاً دیر و حرم پر ایک حسرت چھا گئی
شیخ کی آنکھوں میں نم ہے، برہمن افسردہ ہے

صدرِ محفل اُٹھ کے اِس محفل کو سونا کر گیا
غم برستا ہے فضاؤں سے وطن افسردہ ہے

سولت تھانوی نمبر ←→ اور ←→ افسانہ نمبر

قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے — قیمت ایک روپیہ ۶۰ نئے پیسے

کے بعد

اب کتاب کا اگلا شمارہ

نئی ہندی کہانی نمبر

ہوگا

جس میں ہندی افسانوی ادب کو نئی آوازیں عطا کرنے والے ادیبوں کی تخلیقات شامل ہوں گی — فنیشور رینو، موہن راکیش، کملیشور، راجندر یادو، رگھویر سہائے، نرمل ورما، امرکانت اور کئی دوسرے

اور تین اہم مضامین

(۱) ہندی کی نئی کہانی
(۲) اُردو کے افسانہ نگاروں کا ہندی پر اثر
(۳) اُردو اور ہندی کہانی کا نیا اُفق

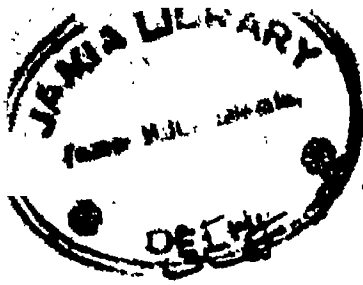
مُرتّب ←→ ہندی کے مشہور کہانی کار ٹھاکر پرشاد سنگھ

صفحات ایک سو سے زائد — قیمت صرف ایک روپیہ، زرِ سالانہ ۶ روپے بھیج کر آپ یہ نمبر مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ ایجنٹ حضرات اپنے خصوصی آرڈر سے مطلع کریں

منیجر "ماہنامہ کتاب" چوک لکھنؤ ۳







ماہنامۂ

نیا دور

جولائی ۱۹۶۴ء

نئی ہندی کہانی نمبر

ضخامت
۱۱۲ صفحات

قیمت
ایک روپیہ

ماہنامہ کتاب
چوک ، لکھنؤ ، ۳

پاکستان آفس
مسٹر نعیم اکبر خاں ، الائڈ فوٹو گرافرس (پاکستان لمیٹڈ)
4/5 موتی جھیل ، کمرشل ایریا
ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

جلد (۳) نمبر (۷)

زر سالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں
۶½ روپے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

مجلس مشاورت
سید احتشام حسین
حیات اللہ انصاری
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر : سید جمیل احمد
مطبوعہ : نظامی پریس لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ :
کتاب ، چوک ، لکھنؤ ۳

اپنی باتیں

نئی ہندی کہانی نمبر حاضر ہے۔ یہ کیسا ہے اسکا فیصلہ آپ ہی کریں۔ ہم نے اسے نئی ہندی کہانی کا ایک نمائندہ انتخاب بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کہانیوں کے انتخاب اور ان کے حاصل کرنے کیلئے بھاگ دوڑ سے لیکر اس وقت تک ہمیں اس سلسلہ میں کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑے ان کا ذکر کرکے ہم آپ کی طبیعت مکدر نہیں کرنا چاہتے۔ نہ ان چیزوں کو ہم تاخیر سے حاضر ہونے کا جواز ہی بنانا چاہتے ہیں۔

کتاب اپنی ڈیڑھ سال کی زندگی میں علاوہ پچھلے دو شماروں کے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ آپ کی پسندیدگی اور تعاون اسکی زندگی کی ضامن ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس فروگذاشت کو آپ نظر انداز کر دیں گے۔

اپنی مختصر سی زندگی میں کتاب کا یہ تیسرا خاص نمبر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ شوکت تھانوی نمبر اور افسانہ نمبر کی طرح یہ [illegible] شمارہ بھی مقبول ہوگا۔ کتاب کا اگلا خاص شمارہ بنگلا کہانی نمبر دسمبر میں شائع ہوگا۔

آج کے دور میں ادبی پرچہ نکالنا اور پھر اُسے جاری رکھنا کس قدر مشکل کام ہے اس کا آپ کو ناممکن ہے کہ اندازہ نہ ہو۔ اچھی تخلیقات کے حصول سے لے کر ان کے قدردانوں کی تلاش تک کا ایک طویل اور صبر آزما سلسلہ ہے۔ آپ کتاب کو باذوق لوگوں سے متعارف کراکے اس صبر آزما سلسلہ کو مختصر کر سکتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کتاب کے پڑھنے والوں کے حلقہ کو وسیع تر بنانے میں ہماری مدد کریں گے۔

ہم اس تاخیر کے لیے ایکبار پھر معذرت خواہ ہیں۔

جون ۱۹۶۴ء اردو کے لیے بڑا سخت گزرا۔ اور ۲۲ر جون کو پروفیسر حامد حسین قادری اور ۱۴ر جون کو مولانا صلاح الدین احمد ایسی ہستیوں سے محروم ہو گئے۔

پروفیسر قادری نے اپنا ادبی سفر شاعری سے شروع کیا تھا لیکن ادبی شہرت آپ کو محقق، نقاد اور بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے ملی۔ مولانا صلاح الدین احمد کی موت سے اردو منجملہ دوسری چیزوں کے ایک ایسے مدیر سے محروم ہو گئی جس نے ادبی دنیا کو ایک تحریک اور ایک انجمن بنا دیا تھا۔ مولانا نے ایسے متعدد ادیبوں کو جو آج چھائے ہوئے ہیں اردو دنیا سے متعارف کرایا، اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نئے ادیبوں کو پیش کیا۔

یہ دونوں موتیں ایسی ہیں جن کو آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔

نئی ہندی کہانی نمبر

چند مسائل —— چند سوال

کہانیاں

ٹھاکر پرساد سنگھ

اردو ہندی کہانی — چند مسائل

اردو اور ہندی کا افسانوی ادب پچھلے پچاس برسوں سے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بنگلا کہانیوں کو چھوڑ کر ہندی کہانی پر سب سے بڑا اثر اردو کہانی کا پڑا ہے۔ یہ اثر بھارتندو، بابو ہریشچندر اور مہابیر پرشاد دویدی کے زمانہ میں بھی دیکھا جا سکتا تھا لیکن میری اس بات کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھنے کے لیے پریم چند کی کہانیوں کو سامنے رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ پریم چند نے ابتدا اردو سے کی تھی لیکن پھر وہ دھیرے دھیرے ہندی کی طرف آ گئے۔ ان کی شروع کی کہانیوں کی زبان اردو تھی جس میں فارسی ترکیبوں اور فارسی الفاظ کی بھرمار ہے لیکن بعد میں وہ اردو اور ہندی کے بیچ کی ایک خاص زبان حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہی زبان مستقبل کی ہندی اور اردو کہانی کی بنیاد بنی۔

اردو اور ہندی کے ایک دوسرے کے قریب آنے کا خواب صحیح معنوں میں سب سے زیادہ پریم چند ہی نے دیکھا تھا اور انھوں نے اس سلسلہ میں شمالی ہندستان کی زمین سے اگنے والے نئے ادب کی بنیاد ڈالی تھی۔ پریم چند کے قلم کے جادو کا راز ان کی یہی زبان ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا، کہ جس ادب میں اس ملک کے رہنے والوں کے چہرے ہرے بھرے نہ ابھریں وہ ادب کسی بھی معنی میں سچا ادب نہیں کہا جا سکتا، اور دیس کے لوگوں کے چہرے ابھارنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان کی کہانی انھی کی زبان میں کہی جائے پنجاب سے لے کر بہار کے مشرقی کنارے تک پھیلے لمبے چوڑے میدانوں میں جو بول چال کی زبان ہے وہی پریم چند کے افسانوں کی زبان بھی ہے۔ آج جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں وہ قریب قریب وہی بات کہتے ہیں جو پریم چند نے کہی تھی یا جس پر انھوں نے اپنے افسانوں میں عمل کیا تھا۔

پریم چند کے بعد دونوں زبانوں کے درمیان کشیدگی کی وجہ سے نکرو زبان کی ہم آہنگی اتنی دور تک نہیں چل سکی جتنی کہ امید تھی لیکن اس ملک کے ترقی پسند ادیبوں نے پریم چند کے دکھائے ہوئے راستہ پر چلنے کی پوری کوشش کی اور اس بات میں شک نہیں کہ اس دوران دونوں زبانوں میں ایسی کہانیاں لکھی گئیں جنھیں ہم آسانی سے اس ملک کی سچی کہانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی کہانیوں کو اردو اور دیوناگری رسم الخط کی کہانیوں کو ہندی کی کہانی کہا جاتا تھا لیکن ان دونوں کی جڑیں صحیح معنوں میں ایک ہی زمین میں تھیں۔

آزادی کے بعد کچھ دنوں تک دلوں پر غبار چھایا رہا لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد جب مطلع صاف ہوا اور لوگوں کی فکر بنیادی مسائل کی طرف گئی تو باتیں آہستہ آہستہ صاف ہونے لگیں۔ اردو کے ممتاز ادیبوں اور نقادوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اردو میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے دیوناگری رسم الخط میں بھی پیش کیا جانا چاہیے اسی طرح ہندی کی اچھی چیزوں کو فارسی رسم الخط میں پیش کر کے ان لوگوں تک پہنچانا چاہیے جو ہندی سے واقف نہیں۔

جب اردو کے ادیبوں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا تو انھیں محسوس ہوا کہ جیسے وہ ایک چھوٹے دائرے سے نکل کر بڑے دائرہ میں آ گئے ہیں اور ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اس وقت انھیں پریم چند کی یاد آئی۔ آج امیندر ناتھ اشک اور سدرشن ایسے پرانے لکھنے والے ہی نہیں بلکہ سلام صدیقی ایسے نئے افسانہ نگار کی تخلیقات بھی اردو اور ہندی میں ساتھ ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی اب ہندی ہی کے ادیب معلوم ہوتے ہیں

منظر سلیم

راہ نما کے پھول

راہ نما کے ان پھولوں کو
روتی ندیوں کے دھاروں پر
سورج میں ڈوبے کہساروں پر
آہیں بھرتے گلزاروں پر
ریگستانوں، صحراؤں میں
سارے شہروں میں گاؤں میں
کھیتوں، باغوں، کھلیانوں پر
فکر و نظر کے میخانوں پر
لاکھوں کروڑوں انسانوں پر
راہ نما کے ان پھولوں کو
کانپتے ہاتھوں سے برسا دو
ان کی رنگت، ان کی خوشبو
دیش کے ہر کونے میں بسا دو
ساری دھرتی پر پھیلا دو

راہ نما کے ان پھولوں سے
روتی ندیوں کے دھاروں کو
راحت کا پیغام ملے گا
سورج میں ڈوبے کہساروں کو
عظمت کا پیغام ملے گا
آہیں بھرتے گلزاروں کو
دیدۂ تر کی ساری دولت
خونِ جگر کی ساری دولت
سارے وطن کا پیار ملے گا

راہ نما کے ان پھولوں سے
ریگستانوں، صحراؤں میں
محنت کے چشمے پھوٹیں گے
رُت بدلے گی، پھول کھلیں گے
سارے شہروں میں گاؤں میں
کھیتوں، باغوں، کھلیانوں میں
راہ نما کے سب شیدائی
پربت کا سر توڑنے والے
دریا کا رُخ موڑنے والے
ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے
سارے اہلِ آبلہ پا ڈھونڈیں گے
سارے اہلِ وفا پائیں گے
اسکے خوابوں کی تعبیریں
اسکے سپنوں کی تصویریں

راہ نما کے ان پھولوں کو
لاکھوں کروڑوں انسانوں کو
اس کے ذوقِ نظر کی عظمت
اس کے شوقِ سفر کی عظمت
اسکے خوابِ سحر کی عظمت
اسکے دل کا درد ملے گا
راہ نما کے ان پھولوں کو
روتی ندیوں کے دھاروں پر
سورج میں ڈوبے کہساروں پر
آہیں بھرتے گلزاروں پر
کانپتے ہاتھوں سے برسا دو
ان کی رنگت ان کی خوشبو
دیش کے ہر کونے میں بسا دو
ساری دھرتی پر پھیلا دو

عابد سہیل

برسبیل تذکرہ

پچھلے دس برسوں سے اردو کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے ہندی میں اور ہندی کی اعلیٰ تصانیف کے ترجمے اردو میں نہایت تیزی سے کیے جا رہے ہیں۔ اس سے دونوں زبانوں کو فائدہ پہونچا ہے۔ مخالفت اور اجنبیت کی دیواریں ٹوٹی ہیں اور دونوں زبانوں کے ادیب، اپنی اپنی معذوریوں سے بھی واقف ہوئے ہیں۔

چونکہ رسائل کے زیادہ تر صفحات پر کہانیاں پھیلی ہوتی ہیں اس لیے کہانیوں کے ترجمے سب سے زیادہ ہوئے ہیں اور اردو اور ہندی کے ممتاز افسانہ نگاروں کے نام اب ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہ گئے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب صورت حال یہ ہے تو کتاب کے ایک خصوصی شمارہ کو صرف ہندی کہانیوں کے لیے وقف کرنے کے کیا معنی ہیں؟

بات دراصل یہ ہے کہ دونوں زبانوں میں ترجمے کے لیے دوسری تمام اصناف سخن کی طرح کہانی کا انتخاب بھی ذاتی پسند اور ناپسند اور مصنف کی شہرت اور بازار میں "فروخت" کے امکانات کے پیش نظر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کے "بکھرے" انتخابات سے نہ تو کسی زبان کی کسی صنف سخن کی مکمل تصویر ابھر کر سامنے آ سکتی ہے، نہ کسی تحریک یا رجحان اور اس کے حسن و قبح کا اندازہ ہی ممکن ہے۔

ادھر ایک عرصہ سے جدید اردو کہانی موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آزادی کے بعد اس میں پہلا سا "کھرا" حسن اور ندرت برقرار نہیں اور اس پایہ کے نئے افسانہ نگار نہیں پیدا ہو رہے ہیں جو پرانی نسل کی جگہ لے سکیں۔ برخلاف اس کے دوسرے گروہ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ آج بھی اردو کہانی پہلے ہی کی طرح ترقی پذیر صنف سخن ہے اور مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

انفرادی تخلیقات کے بارے میں اس طرح کے اختلافات تو ادب میں ہمیشہ رہے ہیں لیکن کسی پوری صنف سخن کے بارے میں اس طرح کا بنیادی اختلاف بلا وجہ نہیں ہو سکتا۔ ذاتی پسند اور ناپسند کو اس طرح کے اختلافی نقطۂ نظر کا ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں دو سوال خاص طور سے قابل غور ہیں۔ (۱) کہیں ایسا تو نہیں کہ نئی زندگی کے تقاضے، مطالبات اور مسائل بدل گئے ہوں اور ہم اب بھی افسانہ کو اسی پرانے معیار پر تولتے چلے آ رہے ہوں (۲) کہیں یہ تو نہیں کہ ہم نے کہانی بننے، اسے خوبصورت بنانے میں یعنی افسانویت پیدا کرنے کے فن میں خوب ترقی کر لی ہو لیکن ہمارے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی نیا خیال، نیا مسئلہ، نئی آواز نہ ہو۔

اصل میں یہ دونوں باتیں ہی درست ہیں۔ اور اسی وجہ سے بعض لوگوں کی اردو کہانی سے مایوسی بھی بجا ہے اور دوسروں کی اس مایوسی سے دل برداشتگی بھی۔

سیاسی مسائل سے قطع نظر آزادی سے معاشی طور پر سب سے زیادہ فائدہ دیہی علاقہ کی آبادی کو پہونچا ہے جہاں تک اردو کی بات ہے تو یہ ہے کہ اردو کے حلقہ اثر سے باہر ہے۔ اسی وجہ سے کہ ان کی معاشرت اور اس کے مضمرات اور افسانوی ادب میں اس کے عکس سے اردو کا دامن خالی ہے۔ برخلاف اس کے شہر کے حصہ میں جو اب بھی اردو کے ادیبوں اور پڑھنے والوں کے مرکز ہیں بے روزگاری، گرانی، اعلیٰ معیار زندگی کے مطالبات، نظریاتی اور جذباتی خلا اور تفکرات کے لمبے سلسلے آئے ہیں اور ادیب، جن کے رشتے بڑی حد تک صرف شہروں اور اس کی ایک تک ہی محدود ہیں عام طور سے اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنے کی تمنا تو ہے لیکن ان میں اس کی

اور ادبی مسائل پر بات چیت کے دوران جہاں لوگ ہندی افسانہ نگاروں کے نام لیتے ہیں وہاں جھجکتے ہی ان لوگوں کے نام بھی لے لیا کرتے ہیں۔

بلونت سنگھ اور بھیروں پرشاد جو ایک ہی شہر اور ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہیں اور ساتھ ساتھ اردو اور ہندی میں چھپتے ہیں ان کی کہانیاں پڑھ کر کوئی یہ فیصلہ کیسے کرے گا کہ بلونت سنگھ اردو کے لکھنے والے ہیں اور بھیروں پرشاد ہندی کے۔ ایک ہی راستے کے مسافر اور زندگی کے مسائل کا بوجھ ایک ہی طرح محسوس کرنے والے دو ادیبوں کو محض اس لیے تو بانٹا نہیں جا سکتا کہ ان میں سے ایک ہندی میں لکھتا ہو اور ایک اردو میں۔ زبان کا یہ فرق اس وقت اور بھی غیر اہم ہو جاتا ہے جب ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اکثر مخصوص ماحول کی عکاسی کے لیے ایک خاص طرح کی زبان ضروری ہو جاتی ہے۔ مثال کے لیے قاضی عبدالستار کی ان کہانیوں ہی کو لے لیجیے جو انھوں نے اودھ کے تعلقداروں کی زندگی سے متعلق لکھی ہیں۔ اگر ہندی کا کوئی ادیب اس ماحول کی عکاسی کرتا تو آخر وہ زبان کیسے نہ استعمال کرتا جو قاضی عبدالستار نے استعمال کی ہے۔ یہی بات جیلانی بانو، شفیق الرحمان اور دوسرے افسانہ نگاروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

یہاں میں ایک بالکل ہی دوسری بات پر زور دوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اردو کہانی پر ہندی کہانی کا اثر پڑا ہے یا نہیں اور اگر پڑا ہے تو کس حد تک لیکن اردو کی جو کہانیاں ہندی کے رسالوں میں چھپ کر آئی ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کہانی پر ترقی پسند کہانی کا اب بھی کافی اثر باقی ہے۔

کرشن چندر اور بیدی کے بعد جو نئے نام ابھر کر سامنے آئے ہیں ان کی تکنیک میں کوئی ندرت نظر نہیں آتی جبکہ ہندی کہانیوں میں ۱۹۵۰ء کے بعد ایک زبردست موڑ آیا۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک اور اس کے بعد آج تک ہندی میں کم از کم دس ایسے نئے افسانہ نگار انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جنھیں یشپال، اشک یا اس عمر کے لکھنے والوں سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے اور جن کی اپنی انفرادیت ہے۔

برخلاف اس کے اردو کہانی اس دوران قصہ گوئی کے فن میں مہارت حاصل کرتی رہی اور پڑھنے والوں کی آسودگی کے لیے رومانی نسخوں سے کام چلاتی رہی۔ نئے پن کی کمی کو انھوں نے کچھ اس قسم کی چیزوں سے پورا کیا جنھیں ہم ٹیکنیک کہہ سکتے ہیں۔ ادھر اردو میں جو نئے نام سامنے آئے ہیں وہ کبھی اس بات کی تائید کرتے ہیں لیکن اس قصہ گوئی یا کہانی کو دلچسپ بنانے کی تکنیک سے ہندی کہانی متاثر نہیں ہوئی کیونکہ پچھلے چند برسوں میں ہندی کہانی زیادہ سے زیادہ intellectual ہو گئی۔ ایسی حالت میں اردو اور ہندی کہانی کے درمیان سمجھوتہ ناممکن تھا۔ اردو کے نئے لکھنے والوں کے ہندی کی طرف آنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ جس طرح کی کہانیاں لکھنا چاہتے تھے اس کے لیے ماحول اردو میں نہیں بن پایا۔ ہمارے اردو کے افسانہ نگاروں کو اپنی توہین نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہمارا ادب اپنے پڑوسی ادب سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ہندی شاعری نے اردو شاعری سے بہت کچھ سیکھا ہے، اسی طرح ہندی کہانی پر بھی بنگلہ اور اردو کہانی کا خاصا اثر ہے لیکن اگر پچھلے چند برسوں میں ہندی کہانی اردو سے آگے بڑھ گئی ہے تو اردو والوں کو ہندی کہانی کی بناوٹ (Texture) پر توجہ دینی چاہیے اور اگر ضرورت سمجھیں تو اپنے لکھنے کے طریقہ میں تھوڑی سی تبدیلی بھی کرنی چاہیے۔

ہندی کی نئی کہانیاں اسی نقطۂ نظر سے پیش کی جا رہی ہیں کہ اگر اردو کے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو میری اس بات میں کوئی سچائی نظر آئے تو وہ اس طرف قدم بڑھا کر کچھ اچھی کہانیاں ہندستانی ادب کو دیں۔

شمال اور جنوب، اتر اور دکھن کے لوگ الگ الگ چاہے کچھ بھی لکھیں لیکن ہم سب ہی جس نئے ادب کا خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ ہے ہندستانی ادب۔ انگریزی، فرانسیسی اور روسی ادیبوں کے مقابلہ میں ہم جو ادب پیش کریں گے وہ محض ہندی، اردو یا بنگلہ یا تامل تیلگو کا ادب نہیں ہوگا۔ دیوناگری رسم خط میں پورے ملک کا ادب جلد ہی شائع ہوگا۔

اپریل اور مئی کے

شمارہ میں

قاضی عارف الدین کی بلا عنوان کہانی کے عنوان

اور

انعام کے نتیجہ کے لیئے اگست کا شمارہ

ملاحظہ فرمائیے

نہرو نمبر اور نئی ہندی کہانی نمبر کی وجہ سے تاخیر ناگزیر ہو گئی

مدیر - ماہنامہ کتاب لکھنؤ ۳

جرأت نہیں اور وہ مکمل «معقل» بنے آج بھی محوِ تماشائے لبِ بام ہیں۔

آج کے اردو کے افسانہ نگاروں میں اپنے پیشروؤں کی طرح شدت اور تیزی نہیں۔ یہ تیزی اور شدت کسی خاص قدر اور نظریۂ حیات پر مکمل یقین سے پیدا ہوتی ہے جو اس دور میں مفقود ہے۔ اور جب کسی نظریۂ حیات پر ایمان نہیں تو ظاہر ہے خود کو اور اپنے پڑھنے والوں کو اس منزل سے ہم کنار کرنے یا اس منزل تک رسائی کی جدوجہد میں حصہ لینے کی امید ہی بیکار۔

آج کا اردو افسانہ نگار ایک ایسے راستے پر کھڑا ہے جہاں سے سیکڑوں راستے پھوٹتے ہیں۔ ان میں سے ہر راستہ جتنا روشن ہے اتنا ہی تاریک بھی ہے کیونکہ ماضی کی وہ سڑک کہیں کھو گئی ہے جس سے ہم سراغ لگائیں کہ ہماری منزل کہاں ہے اور ہمیں ان میں سے کس شاہراہ پر چل کھڑا ہونا ہے۔ ایک دنیا جو کل تک اپنی تمام خوش سامانیوں کے ساتھ ہمیں مسحور کئے ہوئے تھی آج تار تار لباس زیب تن کئے اس طرح کھڑی ہے کہ اس پر نظر بھی نہیں جمائی جاتی اور مستقبل میں ابھی اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ تخلیق کا کرب برداشت کرکے ہمارے سامنے آ کھڑا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم میں ہی اتنی سکت نہیں ہے کہ ہم اس مستقبل کی تخلیق میں حصہ لے سکیں۔

یہ گم کردہ راہی، بے راہروی، اور مایوسی بھی فالِ نیک بن سکتی ہے بشرطیکہ آج کا افسانہ نگار خود میں شک کا وہ صحت مند رجحان پیدا کرے جو اگر ایک دنیا مٹاتا ہے تو اسی کے ملبے سے دوسری دنیا کی تعمیر بھی کرتا ہے، جو اگر اپنے باہر کی دنیا پر شک و شبہ کرتا ہے تو اپنے وجود پر بھی یقین نہیں رکھتا کیونکہ اپنی ذات، اپنے وجود پر شبہ کرنا ہی اپنے وجود اور اپنے عقائد کو تسلیم بھی کرنا ہے —— Cogito Ergo Sum میں سوچتا ہوں اس لیے میں موجود ہوں۔

اسی تکنیک کے بطن سے Fathers and Sons کے بزاروف نے جنم لیا ہے۔ اگر ہمارا افسانہ اس «بے منزلی» میں بھی ایسا ایک کردار تخلیق نہ کر سکے تو یہ زمانہ کا نہیں خود اس کا قصور ہے۔

لیکن یہ بات صرف اردو کہانی تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندی کہانی بھی جسے نہ اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ ایک ایسی زبان میں لکھی جائے گی جس کا سمجھنے والا مخاطب کل نہ مل سکے اور نہ جس کے پڑھنے والوں کا حلقہ ہی روز بروز تنگ ہوتا جا رہا ہے جدید دور کے نئے مسائل، نئی اقدار سے دوچار ہونے اور انہیں افسانوی رنگ روپ دینے کے مسائل سے دوچار ہے۔ اسی کشمکش و پیچ میں کبھی اس کے ہاتھ سے مسائل کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور کبھی افسانویت کا۔ زیرِ نظر شمارہ میں دونوں طرح کی کہانیاں شامل ہیں۔ یہ انتخاب نئی ہندی کہانی تک محدود ہے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان افسانہ نگاروں کو ہی شامل کیا جائے جن کے پاس کہنے کے لیے کوئی نئی بات ہو یا کہنے کا نیا ڈھنگ۔ اس طرح یہ نمبر نئے ہندی افسانوی ادب کا ایک چھوٹا سا آئینہ ہو سکتا ہے کہ سارے خط و خال اس میں واضح نہ ہو سکیں لیکن ایک «صاحبِ نظر» اس میں مکمل تصویر بھی دیکھ سکتا ہے۔

اسی آئینہ میں، بلکہ انہی کہانیوں میں ہم اردو کہانی کی تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تصویر کا دوسرا رخ نہیں بلکہ ایک دوسرے زاویہ سے کھینچی گئی تصویر ہوگی۔ لیکن زاویہ کا فرق بس اس قدر ہے کہ اکثر تفصیل بین نظروں کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔

اس نمبر کی ترتیب اور کہانیوں کے انتخاب کے سلسلہ میں ہمیں ہندی کے متعدد ممتاز افسانہ نگاروں کا تعاون حاصل رہا۔ ہماری درخواست پر ٹھاکر پرشاد سنگھ نے جو خود بھی ہندی کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں اس نمبر کے لیے دو مضامین بھی سپردِ قلم کئے۔ ان مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان سے عام طور سے اختلاف ممکن نہیں۔ اردو اور ہندی کہانیوں کی جن معذوریوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ درست ہیں لیکن اردو کہانی کے بارے میں ان کی رائے ایسی ہی کہانیوں سے بنی ہے جو ہندی رسائل میں چند مصلحتوں کے پیشِ نظر شائع ہوتی ہیں۔ ان کا یہ کہنا بھی بڑی حد تک ٹھیک ہے کہ اردو کہانی رومانویت کی طرف واپس جا رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے ادب کی چاشنی سے خود کو اتنا دور نہیں کر لیا ہے کہ ہندی کی بعض نئی تجرباتی کہانیوں کی طرح اسے پڑھنے کے لیے باقاعدہ جدوجہد کرنی پڑے لیکن اردو والے اس خیالِ خام میں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتے کہ نئے مسائل اور نئی زندگی سے دور رہنے کے باوجود چونکہ ان کی کہانی میں افسانویت ہوتی ہے اسلئے وہ زندہ رہے گی۔ یہ افسانویت ہو سکتا ہے کہ کچھ اور دنوں تک اس کا ساتھ دے لیکن اگر نئے مسائل کو اس نے اپنے دامن میں جگہ نہ دی تو نئی زندگی اور اس کے مسائل اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔ یہ تمام مسائل ہی نئی ہندی کہانی نمبر کے پیش کرنے کا جواز تھا۔

فنیشور رینو
ترجمہ: رتن سنگھ

تیسری قسم

ہرامن گاڑی بان کی کمر میں گدگدی سی لگتی ہے۔

پچھلے بیس سال سے گاڑی ہانکتا ہے ہرامن۔ بیل گاڑی۔ سرحد کے اس پار مورنگ راج نیپال سے دھان اور لکڑی ڈھو چکا ہے۔ کنٹرول کے زمانے میں چور بازاری کا مال اس پار سے اس پار پہنچایا ہے۔ لیکن کبھی تو ایسی گدگدی نہیں ہوئی کمر میں۔

کنٹرول کا زمانہ - ہرامن کبھی بھول سکتا ہے اس زمانے کو۔ ایک بار چار ڈھیر سیمنٹ اور کپڑے کی گانٹھوں سے بھری گاڑی جوگ بنی سے برات نگر پہنچانے کے بعد ہرامن کا کلیجہ جل گیا تھا۔ فاربس گنج کا ہر چور بیوپاری اس کو پکا گاڑی وان مانتا۔ اس کے بیلوں کی تعریف بڑی گدی کے بڑے سیٹھ جی خود کرتے اپنی زبان میں!...

گاڑی پکڑی گئی پانچویں بار سرحد کے اس پار ترائی میں۔

مہاجن کا منیم اسی گاڑی پر گانٹھوں کے بیچ دبکا ہوا چھپا ہوا تھا۔ داروغہ صاحب کی ڈیڑھ ہاتھ لمبی چوربتی کی روشنی کتنی تیز ہوتی ہے، ہرامن جانتا ہے۔ ایک گھنٹے کے لیے آدمی اندھا ہو جاتا ہے، اگر ذرا بھی پڑ جائے آنکھوں پہ۔ روشنی کے ساتھ کڑکتی ہوئی آواز۔ "اے یہ گاڑی روکو سالو گولی مار دوں گا۔"

بیل گاڑیاں ایک ساتھ کچکچا کر رک گئیں۔ ہرامن نے پہلے ہی کہا تھا۔

داروغہ صاحب اس کی گاڑی میں دبکے ہوئے منیم جی پر روشنی ڈال کر زہریلی ہنسی ہنسے، ہاہاہا۔ منیم جی۔ ای ای ای۔ ہی ہی۔ ہی ہی۔ لے یہ سالا گاڑی بان منہ کیا دیکھتا ہے اے رے اے۔ کمبل ہٹاؤ اس بورے کے منہ پر سے۔ ہاتھ کا چھوٹا ڈنڈا منیم جی کے پیٹ میں مارتے کہا تھا "اس بورے کو۔ س سالا۔"

بہت پرانی دشمنی ہوگی داروغہ صاحب اور منیم جی میں۔ نہیں تو اتنا روپیہ قبولنے پر بھی پولیس داروغہ کا دل نہ ڈگمگائے گا بھلا۔

چار ہزار تو گاڑی پر بیٹھا بیٹھا ہی دے رہا تھا۔ ڈنڈے سے دوسری بار ٹہوکا مارا داروغہ جی نے۔ "پانچ ہزار" پھر ٹہوکا۔ اترو پہلے۔

منیم کو گاڑی سے نیچے اتار کر داروغہ نے اس کی آنکھوں پر روشنی ڈال دی۔ پھر دو سپاہیوں کے ساتھ سڑک سے بیس پچیس گز دور جھاڑی کے پاس لے گئے۔ گاڑی بان اور گاڑیوں پر پانچ پانچ بندوق والے سپاہیوں کا پہرہ۔ ہرامن سمجھ گیا اس بار خیریت نہیں.... جیل؟ ہرامن کو جیل کا ڈر نہیں لیکن اس کے بیل؟۔ نہ جانے کتنے دنوں تک بنا چارہ پانی کے سرکاری پھاٹک میں پڑے رہیں گے۔ بھوکے پیاسے پھر نیلام ہو جائیں گے۔ بھیا اور بھوجی کو وہ منہ نہ دکھا سکے گا کبھی۔

نیلام کی بولی اس کے کانوں کے پاس گونج گئی۔ ... ایک - دو - تین۔ داروغہ اور منیم کی بات طے نہیں ہو رہی تھی شاید۔

ہرامن کی گاڑی کے پاس تعینات سپاہی نے اپنی زبان میں دوسرے سپاہی سے دھیمی آواز میں پوچھا — کا ہو؟ معاملہ گول ہو گی کا؟ پھر کھینی تمباکو دینے کے بہانے اس سپاہی کے پاس چلا گیا.....

ایک دو تین۔ تین چار گاڑیوں کی آڑ۔ ہرامن نے فیصلہ کر لیا۔ اس نے دھیرے سے اپنے بیلوں کے گلے کی رسیاں کھول لیں۔ گاڑی پر بیٹھے بیٹھے دونوں کو اکٹھا باندھ دیا۔ بیل سمجھ گئے انہیں کیا کرنا ہے۔ ہرامن اترا۔ جتی ہوئی گاڑی میں بانس کی ٹکٹی لگا کر بیلوں کے کندھوں کو آزاد کیا۔ دونوں کے کانوں کے پاس گدگدی کی۔ اور من ہی من میں بولا۔

ہرامن نے داہنے بیل کو چھڑی سے پیٹتے ہوئے کہا۔ سالا۔ کیا سمجھتا ہے۔ بورے کی لدنی ہے کیا؟

"ا۔ ماردست"

ان دیکھی عورت کی آواز نے ہرامن کو حیرانی میں ڈال دیا۔ بچوں کی بولی جیسی مہین باریک بولی؟

متھرا موہن نوٹنکی کمپنی میں لیلا بننے والی ہیرابائی کا نام کس نے نہیں سنا ہوگا بھلا۔ لیکن ہرامن کی بات نرالی ہے۔ اُس نے سات سال تک میلوں کی لدنی لادی ہے کبھی نوٹنکی، تھیٹر یا بائیسکوپ سنیما نہیں دیکھا۔ لیلا یا ہیرابائی کا نام بھی اس نے نہیں سنا۔ کبھی دیکھنے کی کیا بات۔ سو میلا ٹوٹنے کے پندرہ دن پہلے آدھی رات کو کالی اوڑھنی میں لپٹی عورت کو دیکھ کر اس کے من میں ڈر ضرور لگا تھا۔ بکس ڈھونے والے نوکر نے بھاڑے میں مول تول کرنے کی کوشش کی تو اوڑھنی والی نے سر ہلا کر منع کر دیا۔ ہرامن نے جوتتے ہوئے نوکر سے پوچھا۔ کیوں بھیا کوئی چوری چکاری کا مال وال تو نہیں؟ ہرامن کو پھر حیرانی ہوئی۔ بکسا ڈھونے والے آدمی نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی ہانکنے کو کہا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہرامن کو میلے میں تمبا کو بیچنے والی بوڑھی کی کالی ساڑھی کی یاد آئی تھی......

ایسے میں کوئی کیا گاڑی ہانکے۔

ایک تو پیٹھ میں گدگدی لگ رہی ہے۔ دوسرے رہ رہ کر چمپا کا پھول کھل جاتا ہے اس کی گاڑی میں۔ بیلوں کو ڈانٹے تو اس بس کرنے لگتی ہے اس کی سواری...... اس کی سواری۔ عورت اکیلی۔ تمبا کو بیچنے والی بوڑھی نہیں۔ آواز سننے کے بعد وہ بار بار مڑ کر ٹپر میں ایک نظر ڈال دیتا ہے۔ انگوچھے سے پیٹھ جھاڑتا ہے۔ بھگوان جانے کیا لکھا ہے اس بار اس کی قسمت میں۔ گاڑی جب پورب کی طرف مڑی۔ چاندنی کا ایک ٹکڑا اس کی گاڑی میں پھیل گیا۔ سواری کی ناک پر ایک جگنو جگمگا اٹھا۔ ہرامن کو یہ سب کچھ اچنبھے میں ڈال رہا ہے۔ سامنے چمپا نگر سے سندھیا گاؤں تک پھیلا ہوا میدان کہیں کوئی ڈائن تو نہیں؟

ہرامن کی سواری نے کروٹ لی۔ ہرامن نے سامنے سڑک کی طرف منھ کر لیا اور بیلوں کو چمکارا۔ وہ زبان کو تالو سے لگا کر ٹِٹ ٹِٹ کی آواز نکالتا ہے۔ ہرامن کی زبان نہ جانے کب سے سوکھ کر لکڑی جیسی ہو گئی تھی۔

"بھیا تمہارا نام کیا ہے؟"

ہو بہو پھینو گلاس۔ ہرامن کے روم روم بج اٹھے۔ منھ سے بول نہیں نکلے۔ اس کے دونوں بیل بھی کان کھڑے کر کے اس بولی کو پہچانتے ہیں۔

میرا نام...... میرا نام ہے ہرامن!

اس کی سواری مسکراتی ہے۔ مسکراہٹ میں خوشبو ہے۔

"تب تو میتا کہوں گی۔ بھیا نہیں۔...... میرا نام بھی ہیرا ہے۔"

اس س!۔ ہرامن کو معلوم نہیں۔ مرد اور عورت کے نام میں فرق ہوتا ہے۔

"ہاں جی میرا نام بھی ہیرابائی ہے۔"

کہاں ہرامن اور کہاں ہیرابائی۔ بہت فرق ہے۔

ہرامن نے اپنے بیلوں کو جھڑکی دی۔ کان کھڑے کر کے گپ سننے سے ہی تیس کوس منزل کٹے گی کیا۔؟ اس بائیں نائے کے پیٹ میں شیطانی بھری ہے۔ ہرامن نے بائیں بیل کو ہلکی سی چھڑی لگا دی۔

"ماردست۔ دھیرے دھیرے چلنے دو۔ جلدی کیا ہے؟"

ہرامن کے سامنے سوال یہ تھا۔ وہ کیا کہہ کر گپ کرے ہیرابائی سے؟ "تو ہیں" کہے یا "اہاں"۔ اس کی زبان میں بڑوں کو "اہاں" یعنی "آپ" کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ کچ ماہی بولی میں دو چار سوال جواب چل سکتا ہے۔ دل کھول کر گپ تو گاؤں کی بولی میں ہی کی جا سکتی ہے کسی سے۔

آسون کاتک مہینوں کی صبح میں چھا جانے والے کہرے سے ہرامن کو پرانی چڑھ ہے۔ بہت بار وہ سڑک بھول کر بھٹک چکا ہے۔ مگر آج کی صبح کے اس گھنے کہرے میں بھی وہ خوش ہے۔ ندی کے کنارے پھیلے ہوئے کھیتوں سے دھان کی خوشبو آتی ہے۔ اس کی گاڑی میں پھر چمپا کا پھول کھلا۔ اس پھول میں ایک پری بیٹھی ہے "دہے بھگوتی۔" ہرامن نے کنکھیوں سے دیکھا۔ اُس کی سواری میتا...... ہیرابائی کی آنکھیں ٹکر ٹکر اس کو دیکھ رہی ہیں۔ ہرامن کے دل میں کوئی انجانی راگنی بج اٹھی۔ سارا جسم ناچ رہا ہے۔ وہ بولا— "بیل کو مارتے ہیں تو آپ کو برا لگتا ہے۔"

چلو بہن جان نکچے گی تو ایسی گاڑیاں بہت ملیں گی ۔ ایک دو تین ۔ نو دو گیارہ ۔

گاڑیوں کی آڑ میں سڑک کے کنارے دور تک گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں دم سادھ کر تینوں نے جھاڑیوں کو پار کیا ۔ بے کھٹک ۔ بے آواز ۔ پھر ایک ۔ دو ۔ دلکی چال ۔ دونوں بیل سینہ تان کر ترائی کے گھنے جنگلوں میں گھس گئے ۔ راہ سونگھتے ۔ ندی نالا پار کرتے ہوئے بھاگے پونچھ اٹھا کر ۔ پیچھے پیچھے ہیرامن ۔ رات بھر بھاگتے رہے تھے تینوں ۔

گھر پہنچ کر دو دن تک بے سدھ پڑا رہا ہیرامن ۔ ہوش میں آتے ہی اس نے کان پکڑ کر قسم کھائی تھی ـــــ اب کبھی ایسی چیزوں کی لدنی نہیں لادیں گے ۔ چور بازاری کا مال ؟ توبہ توبہ ۔ پتہ نہیں منیم جی کا کیا ہوا ۔ بھگوان جانے اس کی گاڑی کا کیا ہوا ۔ اصلی لوہے کی دھری تھی ۔ دونوں پہیے تو نہیں ایک پہیہ تو بالکل نیا تھا ۔ گاڑی میں رنگین ڈوری کے پھندے بڑی محنت سے باندھے گئے تھے ۔

دو قسمیں کھائی تھیں اس نے ۔ ایک چور بازاری کا مال نہیں لادیں گے دوسری بانس ۔ اپنے ہر بھاڑے دار سے وہ پہلے ہی پوچھ لیتا ہے چوری چکاری والی چیز تو نہیں ؟ اور بانس ؟ بانس لادنے کے لیے پچاس روپے بھی دے کوئی ۔ ہیرامن کی گاڑی نہیں ملے گی ۔ دوسرے کی گاڑی دیکھیے ۔ .....

بانس لدی گاڑی ۔ گاڑی سے چار ہاتھ آگے بانس کا سر نکلا رہتا ہے ۔ اور پیچھے کی طرف بھی چار ہاتھ ۔ قابو کے باہر رہتی ہے گاڑی ہمیشہ ۔ سو بے قابو والی لدنی اور فربیسا شہر والی بات ۔ بانس کا اگلا سرا پکڑ کر چلنے والا بھاڑے دار کا بے وقوف نوکر اسکول کی لڑکی کی طرف دیکھنے لگا ۔ بس ، موڑ پر گھوڑا گاڑی سے ٹکر ہو گئی ۔ جب تک ہیرامن بیلوں کی رسی کھینچے ، تب تک گھوڑا گاڑی کی چھتری بانس کے اگلے سرے میں پھنس گئی ۔ گھوڑا گاڑی والے نے تڑاتڑ چابک مارتے ہوئے گالی دی تھی ! .....

بانس کی لدنی ہی نہیں ہیرامن نے فربیسا شہر کی لدنی بھی چھوڑ دی اور جب فاربس گنج میں موڑنگ کا بھاڑا ڈھونا شروع کیا تو گاڑی ہی پار ۔ کئی برس تک ہیرامن نے بیلوں کو آدھے پیٹ پر جوتا ۔ آدھا بھاڑا گاڑی والے کا اور آدھا بیل والے کا ۔ گاڑی بانی کرو مفت ۔ آدھی کمائی میں بیلوں کے ہی پیٹ نہیں بھرتے ۔ پچھلے سال ہی اس نے اپنی گاڑی بنوائی ہے ۔

دیوی ماتا بھلا کریں اس سرکس کمپنی کے شیر کا ۔ پچھلے سال اسی مہینے میں شیر گاڑی کو ڈھونے والے دونوں گھوڑے مر گئے ۔ چمپا نگر سے فاربس گنج آنے کے وقت سرکس کمپنی کے منیجر نے گاڑی بانوں کی ٹولی میں اعلان کر کے کہا ۔ سو روپیہ بھاڑا ملے گا ۔

ایک دو گاڑی بان راضی ہوئے ۔ لیکن اُن کے بیل شیر گاڑی سے دس ہاتھ دور ہی سے ڈر سے چلانے لگے ۔ باں ۔ آں ۔ رسی تڑا کر بھاگے ۔ ہیرامن نے اپنے بیلوں کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا ۔ دیکھو بھین ۔ ایسا موقعہ پھر ہاتھ نہیں آوے گا ۔ یہی موقعہ ہے اپنی گاڑی بنوانے کا ۔ نہیں تو پھر آدھے داری ..... ارے پنجرے میں بند شیر کا کیا ڈر ؟ مورنگ کی ترائی میں دہاڑتے ہوئے شیروں کو دیکھ چکے ہو ۔ پھر پیٹھ پر میں تو ہوں ! .....

گاڑی بانوں کی ٹولی میں تالیاں بج اٹھی تھیں ۔ ایک ساتھ ۔ سبھی کی لاج ۔ رکھ لی ہیرامن کی جوڑی نے ۔ ہمک کر آگے بڑھ گئے اور شیر گاڑی میں جٹ گئے ایک ایک کر کے ۔ صرف داہنے بیل نے جتنے کے بعد ڈھیر سا پیشاب کیا تھا ۔ ہیرامن نے دو دن تک ناک سے کپڑے کی پٹی نہیں کھولی تھی ۔ بڑی گدی کے بڑے سیٹھ کی طرح ناک پر کپڑا باندھے بنا شیر کی بدبو برداشت نہیں کر سکتا کوئی ۔

..... شیر گاڑی بانی کی ہے ہیرامن نے کبھی ایسی گدگدی نہیں لگی پیٹھ میں ۔ آج رہ رہ کر اس کی گاڑی میں چمپا کا پھول مہک اٹھتا ہے ۔ پیٹھ میں گدگدی لگنے پر وہ انگوچھے سے پیٹھ جھاڑ لیتا ہے ۔

ہیرامن کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دو سال سے چمپا نگر میلے کی بھگوتی میا اس پر مہربان ہے ۔ پچھلے سال شیر گاڑی جٹ گئی ۔ نقد ایک سو بھاڑے کے علاوہ ، چائے ، بسکٹ اور راستے بھر بندر بھالو اور جوکر کا تماشہ دیکھا پھوکٹ میں ۔

اور اس بار یہ زنانی سواری ۔ عورت ہے یا چمپا کا پھول جب سے گاڑی میں بیٹھی ہے گاڑی مہک مہک رہی ہے ۔

کچی سڑک کے ایک چھوٹے سے گڈھے میں گاڑی کا داہنا پہیا بے ترتیب ہچکولا کھا گیا ۔ ہیرامن کی گاڑی سے ایک ہلکی سی سی کی آواز آئی ۔

دیکھا نہیں بنا ہے..... مات کیسے گیا۔ بڑی درد ناک کہانی ہے۔ سنتے ہیں گھر میں دیوتا نے جنم لے لیا۔ کیسے بھلا۔ دیوتا آخر دیوتا ہے ہوئی نہیں۔ اس نے آسن چھوڑ کر دنیا میں جنم لے لیا تو اس کا نور سنبھال سکتا ہے کوئی۔ سورج مکھی پھول کی طرح ماتھے کے پاس نو کھلا رہتا۔ لیکن نظر کا پھیر۔ کسی نے نہیں پہچانا۔ ایک بار اسٹیشن میں لاٹ صاحب مع لاٹنی کے آئے تھے۔ ہوا گاڑی سے لاٹ نے بھی نہیں پہچانا۔ آخر لاٹنی نے۔ سورج مکھی سا نور دیکھتے ہی بول اٹھی۔ اے مین راجہ صاحب۔ سنو۔ یہ آدمی کا بچہ نہیں ہے۔ دیوتا ہے۔

ہرامن نے لاٹنی کی بولی کی نقل اتارتے ہوئے خوب ڈیم فیٹ پٹ کہا۔ ہیرا بائی دل کھول کر ہنسی۔ ہنستے ہوئے اس کا سارا جسم جتا ہے۔

ہیرا بائی نے اپنی اوڑھنی ٹھیک کر لی۔ تب ہرامن کو محسوس ہوا کہ..... محسوس ہوا کہ۔

تب اس کے بعد کیا ہوا استیا؟۔

اس س۔ کہانی سننے کا بڑا شوق ہے آپ کو..... لیکن کالا لا راجہ کیا ہمارا راجہ بھی ہو جائے رہے گا کالا آدمی ہی۔ صاحب جیسی عقل کہاں سے پاوے گا۔ ہنس کر بات اڑا دی سبھی نے۔ رانی کو بار بار سپنا دینے لگا دیوتا۔ سیوا نہیں کر سکتے تو جانے دو۔ رہیں گے تمہارے یہاں۔ اس کے بعد دیوتا کا کھیل شروع ہوا۔ پہلے دانتوں والے دونوں ہاتھی مرے پھر گھوڑا ما نگ۔ ما نگ کیا؟

ہرامن کا من پل پل میں بدل رہا ہے۔ دل میں سات رنگ اندھیرے دھیرے کھل رہا ہے اسے محسوس ہوتا ہے۔ اس پر اسپیرا سوار ہے۔ دیوتا آخر دیوتا ہے۔

بیٹ بیا تنگ۔ دھن دولت، مال مویشی۔ سب صاف۔ دیوتا سب چلا گیا۔ ہیرا بائی نے اوجھل ہوتے ہوئے مندر کے کنگورے دیکھ کر لمبی سانس لی۔

لیکن دیوتا نے جاتے جاتے کہا۔ اس راج میں کبھی ایک چھوڑ بیٹے نہیں ہوں گے۔ دولت ہم اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں گن جاتے ہیں۔ دیوتا کے ساتھ سبھی دیو دیوی چلے گئے صرف ستیا رہ گئیں۔ اسی کا مندر ہے۔

دیسی گھوڑے پر پاٹ کے بوجھ لادے ہوئے بنیوں کو آتے دیکھ کر ہرامن نے ٹپر کے پردے کو گرا دیا۔ بیلوں کو للکار کر بدیشیا ناچ کا بند نا گیت گانے لگا۔ "جے میا سرسوتی۔ سوجی کرت بانی۔ ہمرا پر ہو کھو سہائی ہے مہیا۔ ہمرا پر ہو کھو سہائی۔"

گھوڑے لدے بنیوں سے ہرامن نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ کیا بھاؤ خریدتے ہیں مہاجن؟"

لنگڑے گھوڑے والے بنیے نے اپنی زبان میں جواب دیا۔ "نیچے ستائیس۔ اٹھائیس، اوپر تیس بھیا مال دیکھا بھاؤ۔"

جوان بنیے نے پوچھا۔ میلے کا کیا حال چال ہے بھائی۔ کون نوٹنکی کمپنی کا کھیل ہو رہا ہے۔ روتا کمپنی یا متھرا موہن؟

میلے کا حال میلے والے جانیں۔ ہرامن نے پھر چھتا پور پچیرا کا نام لیا۔

سورج دو بانس اوپر آگیا تھا۔ ہرامن اپنے بیلوں سے بات کرنے لگا۔ ایک کوس زمین ذرا دم باندھ کر چلو۔ پیاس کا وقت ہو گیا نہ۔ یاد ہے اس بار تیگچھیا کے پاس سرکس کمپنی کے جوکر اور بندر نچانے والے صاحب میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ جوکر ٹھیک بندر کی طرح دانت نکال کر کیکیاتے لگا تھا۔ نہ جانے کس کس دیس تلک کے آدمی آتے ہیں۔

ہرامن نے پھر پردے کے سوراخ سے دیکھا۔ ہیرا بائی ایک کاغذ کے ٹکڑے پر آنکھ گڑا کر بیٹھی ہے۔ ہرامن کا دل آج ہلکے سر میں بندھا ہے۔ اس کو طرح طرح کے گیتوں کی یاد آئی ہے۔ بیس پچیس سال پہلے بدیشیا، بلواہی، چھوکرا ناچ والے ایک سے ایک غزل گاتے تھے۔ اب تو بھونپا میں بھونپو بھونپو کر کے کون گیت گاتے ہیں لوگ۔ جا رے زمانہ۔ چھوکرا ناچ کے گیت کی یاد آئی۔

سجنوا دیری ہو گئے ہمار و۔ سجنوا۔

ارے جیٹھیاں ہو تو سب کوئی باتے۔ جیٹھیاں ہو تو.....

ہائے کرم وا، ہائے کرم وا۔ کرم وا۔

کوئی نہ باچے ہمارو۔ سجنوا۔ ہو کرم وا

گاڑی کی بلی پر انگلیوں سے تال دے کر گیت کو کاٹ دیا۔ ہرامن نے چھوکرا ناچ کے منوا سنوا کا منہ ہیرا بائی جیسا ہی تھا۔ کہاں چلا گیا وہ زمانہ۔ ہر مہینے گاؤں میں ناچ والے آتے تھے۔ ہرامن نے چھوکرا ناچ کے چلتے اپنی بھابھی کی نہ جانے کتنی بولی ٹھولی سنی تھی۔ بھائی نے گھر سے

ہیرا بائی نے جان لیا۔ ہرامن سچ مچ ہیرا ہے۔

چالیس سال کا ہٹا کٹا، کالا کلوٹا دیہاتی نوجوان اپنی گاڑی اور اپنے بیلوں کے سوائے دنیا کی اور کسی بات میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ گھر میں بڑا بھائی ہے۔ کھیتی کرتا ہے۔ بال بچے والا آدمی ہے۔ ہرامن بھائی سے زیادہ بھابھی کی عزت کرتا ہے۔ بھابھی سے ڈرتا بھی ہے۔ ہرامن کی بھی شادی ہوئی تھی۔ بچپن میں ہی۔ گونے کے پہلے ہی دلہن مر گئی۔ ہرامن کو اپنی دلہن کا چہرا یاد نہیں۔ دوسری شادی...... نہ کرنے کے کئی وجہیں تھیں۔ بھابھی کی ضد کنواری لڑکی سے ہی ہرامن کی شادی کروائے گی۔ کنواری کا مطلب ہوا پانچ سات سال کی لڑکی۔ کون مانتا ہے شاردا قانون؟ کوئی لڑکی والا دو بیاہو کو اپنی لڑکی غرض پڑنے پر ہی دے سکتا ہے۔ بھابھی اس کی ضد کرکے بیٹھی ہے سو بیٹھی ہے۔ بھابھی کے آگے بھیا کی بھی نہیں چلتی۔ اب ہرامن نے طے کر لیا ہے۔ شادی نہیں کرے گا۔ کون بلا مول لے۔ بیاہ کرکے پھر گاڑی بانی کیا کرے گا کوئی۔ اور سب کچھ چھوٹ جائے۔ گاڑی بانی نہیں چھوڑ سکتا ہرامن۔

ہیرا بائی نے ہرامن جیسا صاف اور سیدھا آدمی بہت کم دیکھا ہے۔ پوچھا آپ کا گھر کون ضلع میں پڑتا ہے؟ کان پور نام سنتے ہی جو اس کی ہنسی چھوٹی تو بیل بھڑک اٹھے۔ ہرامن ہنستے ہوئے سر نیچا کر لیتا ہے۔ ہنسی بند ہونے پر اس نے کہا۔ واہ رے کان پور۔ تب تو ناک پور بھی ہوگا۔؟ اور جب ہیرا بائی نے کہا کہ ناک پور بھی ہے تو وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔

واہ رے دنیا۔ کیا کیا نام ہوتا ہے۔ کان پور۔ ناک پور۔ ہرامن نے ہیرا بائی کے کان کے پھول کو غور سے دیکھا۔ ناک کی کیل دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ لہو کی بوند۔

ہرامن نے ہیرا بائی کا نام نہیں سنا کبھی۔ نوٹنکی کمپنی کی عورت کو وہ بائی جی نہیں سمجھتا ہے۔ کمپنی میں کام کرنے والی عورتوں کو وہ دیکھ چکا ہے۔ سرکس کمپنی کی مالکن سیر کو چارہ پانی دیتی تھی۔ پیار بھی کرتی تھی خوب۔ ہرامن کے بیلوں کو بھی ڈبل روٹی بسکٹ کھلایا تھا بڑی بیٹی نے۔ ہرامن ہوشیار ہے۔ کہرا ہٹتے ہی۔ اپنی چادر سے ٹپر کو پردہ کر دیا —— بس دو گھنٹہ۔ اس کے بعد راستہ چلنا مشکل ہے۔ کاتک کی صبح کی دھوپ آپ برداشت نہ کر سکیں گی۔ کجری ندی کے کنارے تیگچھیا کے پاس گاڑی لگا دیں گے۔ دوپہری کاٹ کر......

سامنے سے آتی ہوئی گاڑی کو دور سے ہی دیکھ کر وہ ہوشیار ہو گیا لیک (راستہ) اور بیلوں پر دھیان لگا کر بیٹھ گیا۔ راہ کاٹتے ہوئے گاڑی بان نے پوچھا۔ میلہ ٹوٹ رہا ہے کیا بھائی۔؟

ہرامن نے جواب دیا۔ وہ میلے کی بات نہیں جانتا۔ اس کی گاڑی پر "بیداگی" نہریا سسرال جاتی ہوئی لڑکی ہے۔ نہ جانے کس گاؤں کا نام بتا دیا ہرامن نے۔

"چھتا پور، پچیرا کہاں ہے؟"

"کہیں ہو یہ جان کر آپ کیا کریے گا؟" ہرامن اپنی عقلمندی پہ ہنسا۔ پردہ ڈال دینے پر بھی پیٹھ میں گدگدی لگتی ہے۔

ہرامن پردے کے سوراخ سے دیکھتا ہے۔ ہیرا بائی ایک دیاسلائی کی ڈبیا کے برابر آئینے میں اپنے دانت دیکھ رہی ہے...... مدن پور میلے میں ایک بار بیلوں کو چھوٹی چھوٹی کوڑیوں کی مالا خرید دی تھی ہرامن نے چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی کوڑیوں کی مالا۔

تیگچھیا کے تینوں پیڑ دور سے ہی دکھائی پڑتے ہیں۔ ہرامن نے پردے کو ذرا سرکاتے ہوئے کہا۔ دیکھیے یہی ہے تیگچھیا۔ ایک برگد کا پیڑ ہے اور ایک...... اس پھول کا کیا نام ہے۔ آپ کے کرتے پر جیسا پھول چھپا ہوا ہے ویسا ہی۔ دو کوس دور تک خوشبو جاتی ہے۔ اس پھول کو تمباکو میں ڈال کر پیتے بھی ہیں لوگ۔

"اور اس امرائی کی آڑ سے کئی مکان دکھائی پڑتے ہیں۔ وہاں کوئی گاؤں ہے یا مندر؟"

ہرامن نے بیڑی سلگانے کے پہلے پوچھا۔ "بیڑی پئیں؟ آپ کو بدبو تو نہیں لگے گی؟" "وہی ہے نام ڈیوڑھی۔ جس راجہ کے میلے میں ہم لوگ آ رہے ہیں اسی کا داد گوتیا ہے...... جارے زمانہ......"

ہرامن نے جارے زمانہ کہہ کر بات کو چاشنی میں ڈال دیا۔ ہیرا بائی نے ٹپر کے پردے کو ترچھا کھونس دیا!..... ہیرا بائی کی دانتوں کی لڑی......

"کون زمانہ" ٹھڈی پر ہاتھ رکھ کر اس نے پوچھا۔ نام نگر ڈیوڑھی کا زمانہ! کیا تھا۔ اور کیا سے کیا ہو گیا۔ ہرامن گپ لڑانے کا بھید جانتا ہے۔ ہیرا بائی بولی: "تم نے دیکھا تھا وہ زمانہ؟"

دن ڈھل گیا۔ شہر میں سوئی ہیرا بائی اور دین پوری بھائے کر سوئے ہیرامن کی نیند ایک ہی ساتھ کھلی۔ جیسے کی طرف جانے والی گاڑیاں تیگچھیا کے پاس رکی ہیں۔ بچے کچر پچر کر رہے ہیں۔

ہیرامن ہڑبڑا کر اٹھا۔ گاڑی میں بیلوں کو جوتتے وقت اس نے گاڑی بانوں کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی ہانکتے ہوئے بولا۔ سرپور بازار کے اسپتال کی ڈاکڈنی ہے۔ روگی دیکھنے جا رہی ہے۔ پاس ہی کڑا گام۔

ہیرا بائی چھتاپور پچیرا کا نام بھول گئی۔ گاڑی جب کچھ دور آگے بڑھ آئی تو اسے ہنس کر پوچھا۔ چھتاپور پچیرا؟

ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ہیرامن کے۔ چھتاپور پچیرا! ہا ہا! وہ لوگ چھتاپور پچیرا کے ہی گاڑی بان تھے۔ ان سے کیسے کہتا ہی ہی۔

ہیرا بائی مسکراتی ہوئی گاؤں کی طرف دیکھنے لگی۔

سڑک تیگچھیا گاؤں کے بیچ سے نکلتی ہے۔ گاؤں کے بچوں نے پردے والی گاڑی دیکھی تو تالیاں بجا بجا کر گیت گانے لگے۔

لالی لالی ڈولیا میں
لالی رے دلہنیا
پان کھائے ......!

ہیرامن ہنسا۔ دلہنیا ...... لالی لالی ڈولیا۔ دلہنیا پان کھاتی ہے۔ دولہا کی پگڑی میں منہ پونچھتی ہے۔ او دلہنیا تیگچھیا گاؤں کے بچوں کو یاد رکھنا لوٹتی بار گڑ کے لڈو لیتی آئیو۔ لاکھ برس تیرا ساجن جیے۔ کتنے دنوں کا حوصلہ پورا ہوا ہے ہیرامن کا۔ ایسے کتنے سپنے دیکھے ہیں اس نے وہ اپنی دلہن کو لے کر لوٹ رہا ہے۔ ہر گاؤں کے بچے تالیاں بجا کر گا رہے ہیں۔ ہر آنگن سے جھانک کر دیکھ رہی ہیں عورتیں۔ مرد لوگ پوچھتے ہیں کہاں کی گاڑی ہے گاڑی کہاں جائے گی۔ اس کی دلہن ڈولی کا پردہ تھوڑا سرکا کر دیکھتی ہے۔ اور کتنے سپنے۔

گاؤں سے باہر نکل کر اس نے کنکھیوں سے ٹپّر کے اندر دیکھا ہیرا بائی کچھ سوچ رہی ہے۔ ہیرامن بھی کسی سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گنگنانے لگا۔

سجن رے جھوٹ مت بولو۔ خدا کے پاس جانا ہے۔
نہیں ہاتھی۔ نہیں گھوڑا۔ نہیں گاڑی۔
وہاں پیدل ہی جانا ہے۔ سجن رے۔

ہیرا بائی نے پوچھا کیوں میتا تمہاری اپنی بولی میں کوئی گیت نہیں کیا؟

ہیرامن اب بے کھٹک ہیرا بائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ کمپنی کی عورت بھی ایسی ہوتی ہے۔ سرکس کمپنی کی مالکن میم تھی۔ لیکن ہیرا بائی۔ گاؤں کی بولی میں گیت سننا چاہتی ہے۔ وہ کھل کر مسکرایا گاؤں کی بولی آپ سمجھیے گا۔

ہوں۔ اوں۔ اوں۔ ہیرا بائی نے گردن ہلائی۔ کان میں جھمکے ہل گئے۔

ہیرامن کچھ دیر تک بیلوں کو ہانکتا رہا چپ چاپ۔ پھر بولا گیت ضرور ہی سنیے گا۔ نہیں مانیے گا؟ اس س۔ اتنا شوق گاؤں کا گیت سننے کا ہے آپ کو۔ تب لیک چھوڑنی ہوگی۔ چالو راستے میں کیسے گیت گا سکتا ہے کوئی۔ ہیرامن نے بائیں بیل کی رسی کھینچ کر داہنے کو لیک سے باہر کیا اور بولا۔ ہری پور ہو کر نہیں جائیں گے تب۔

چالو لیک کو کاٹتے دیکھ کر ہیرامن کی گاڑی کے پیچھے والے گاڑی بان نے چلا کر کہا۔ "کاہے ہو گاڑی بان۔ لیک چھوڑ کر بے لیک کہاں ادھر۔"

ہیرامن نے ہوا میں چھڑی گھماتے ہوئے جواب دیا۔ کہاں ہے بے لیک؟ وہ سڑک ننت پور تو نہیں جائے گی۔ پھر اپنے آپ بڑبڑایا۔ اس ملک کے لوگوں کی یہ حالت بہت بری ہے۔ راہ چلتے ایک سو جرح کریں گے۔ ارے بھائی تم کو جانا ہے جاؤ۔ دیہاتی بھچ سب۔

ننت پور کی سڑک پر گاڑی لا کر ہیرامن نے بیلوں کی رسی ڈھیلی کر دی۔ بیلوں نے دلکی چال چھوڑ کر قدم چال پکڑی۔

ہیرا بائی نے دیکھا سچ مچ ننت پور کی سڑک بڑی سونی ہے۔ ہیرامن اس کی آنکھوں کی بولی سمجھتا ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ سڑک بھی فارس گنج جائے گی۔ راستے کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ رات کے پہلے پہر تک ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔

ہیرا بائی کو فارس گنج پہنچنے کی جلدی نہیں۔ ہیرامن پر اس کو اتنا بھروسہ ہو گیا ہے کہ ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ ہیرامن پہلے دل ہی دل

نکل جانے کو کہا تھا۔

آج ہرامن پر ماں سرسوتی سہائے ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔

ہیرا بائی بولی۔

"واہ کتنا اچھا گاتے ہو تم۔"

ہرامن کا منھ لال ہو گیا۔ وہ سر نیچا کر کے ہنسنے لگا۔

آج تیگچھیا پر رہنے والے مہاویر سوامی بھی ہر بات میں ہرامن پر۔ تیگچھیا کے نیچے ایک بھی گاڑی نہیں۔ ہمیشہ گاڑی اور گاڑی بانوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے وہاں پر۔ صرف ایک سائیکل والا بیٹھ کر سستا رہا ہے۔ مہاویر سوامی کا نام لے کر ہرامن نے گاڑی روکی۔ ہیرا بائی پردا ہٹانے لگی۔ ہرامن نے پہلی بار آنکھوں سے بات کی ہیرا بائی سے سائیکل والا ادھر ہی ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا ہے۔

بیلوں کو کھولنے سے پہلے بانس کی ٹیکھٹی لگا کر گاڑی کو ٹکا دیا۔ پھر سائیکل والے کی طرف بار بار گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے لیلا؟ کہاں سے آنا ہو رہا ہے؟ لبن پور سے۔ بس اتنے ہی دور سے تھم تھا کر تھک گئے؟ ـــ جا رے جوانی!

سائیکل والا دبلا پتلا نوجوان منمنا کر کچھ بولا اور بیڑی سلگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ہرامن دنیا بھر کی نگاہ سے بچا کر رکھنا چاہتا ہے۔ ہیرا بائی کو اس نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھ لیا۔ کہیں کوئی گاڑی یا گھوڑا نہیں۔

کجری ندی کی دبلی پتلی دھارا تیگچھیا کے پاس آ کر پورب کی طرف مڑ گئی ہے۔ ہیرا بائی پانی میں بیٹھی ہوئی بھینسوں اور ان کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے بگلوں کو دیکھتی رہی۔

ہرامن بولا۔ جائیے گھاٹ پر منھ ہاتھ دھو آئیے۔

ہیرا بائی گاڑی سے نیچے اتری۔ ہرامن کا کلیجہ دھڑک اٹھا۔ نہیں نہیں، پاؤں سیدھے ہیں ٹیڑھے نہیں۔ لیکن تلوا اتنا لال کیوں ہے؟ ہیرا بائی گھاٹ کی طرف چلی گئی۔ گاؤں کی بہو۔ بیٹی کی طرح سر نیچے کیے۔ آہستہ آہستہ۔ کون کہے گا کہ کمپنی کی عورت ہے۔ عورت نہیں لڑکی۔ شاید کنواری ہی ہے۔

ہرامن ٹکیٹی پڑی گاڑی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹپر میں جھانک کر دیکھا ایک بار ادھر ادھر دیکھ کر ہیرا بائی کے تکیے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر تکیے پر کہنی ڈال کر جھک گیا۔ جھکتا گیا۔ خوشبو اس کے جسم میں بس گئی۔ تکیے کے غلاف پر کڑھے پھولوں کو انگلیوں سے چھو کر اس نے سونگھا ارے رے ہائے۔ اتنی خوشبو۔ ہرامن نے محسوس کیا جیسے ساتھ پانچ چلم گانجا پی کر بہک گیا ہو۔ ہیرا بائی کے چھوٹے آئینے میں اس نے اپنا منھ دیکھا۔ آنکھیں اس کی اتنی لال کیوں ہیں۔

ہیرا بائی لوٹ کر آئی تو اس نے ہنس کر کہا۔ اب آپ گاڑی کا پہرا دیجیے، میں آتا ہوں ترنت۔

ہرامن نے اپنی سفری جھولی سے گنجی نکالی۔ گمچھا جھاڑ کر کندھے پر رکھا اور ہاتھ میں بالٹی لٹکا کر چلا۔ اس کے بیلوں نے باری باری ہونک ہونک کر کچھ کہا۔ ہرامن نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔ ہاں ہاں پیاس سبھی کو لگی ہے۔ لوٹ کر آتا ہوں تو گھاس دوں گا۔ بدمعاشی مت کرو۔

بیلوں نے کان ہلائے۔

نہا دھو کر کب لوٹا ہرامن۔ ہیرا بائی کو معلوم نہیں۔ کجری کی دھارا دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں رات کی اچٹی ہوئی نیند لوٹ آئی۔ ہرامن پاس کے گاؤں سے جل پان کے لیے دہی چوڑا چینی لے آیا۔

"ـــــــــــ اٹھیے، جل پان کر لیجیے۔"

ہیرا بائی آنکھ کھول کر حیرانی میں پڑ گئی۔ ایک ہاتھ میں مٹی کے برتن میں دہی، کیلے کے پتے۔ دوسرے ہاتھ میں بالٹی بھر پانی۔ آنکھوں میں گزارش۔

اتنی چیزیں کہاں سے لے آئے؟

اس گاؤں کا دہی مشہور ہے۔ چائے تو فاربس گنج جا کر ہی پائیے گا۔ ہرامن کے جسم میں گدگدی ہونے لگی۔ ہیرا بائی نے کہا۔ تم بھی پتل بچھاؤ۔ کیوں؟ تم نہیں کھاؤ گے تو سمیٹ کر رکھ لو اپنی جھولی میں۔ میں بھی نہیں کھاؤں گی۔

اس س۔ ہرامن شرما کر بولا۔ اچھی بات۔ آپ کھا لیجیے پہلے پیچھے کیا۔ تم بھی بیٹھو۔

ہرامن مان گیا۔ ہیرا بائی نے اپنے ہاتھ سے اس کا پتل بچھا دیا۔ پانی کا چھینٹا دیا۔ چوڑا نکال کر دیا۔ اس س۔ دھنیہ ہے۔ دھنیہ ہے۔ ہرامن نے دیکھا۔ بھگوتی میا بھوگ لگا رہی ہے۔ لال ہونٹوں پر گورس کے رس سے ..... پہاڑی طوطے کو دودھ بھات کھاتے دیکھا؟

رات ڈھل گیا۔ تیسرے پہر سوئی ہیرابائی اور دن چڑھے تک سوتی رہی۔ جاگی تو دیکھا کہ ہیرامن کی نیند ایک ہی ساتھ کھلی۔ میلے کی طرف جانے والی گاڑیاں تیگھیا کے پاس رکی ہیں۔ بچے کچر پچر کر رہے ہیں۔

ہیرامن ہڑبڑا کر اٹھا۔ گاڑی میں بیلوں کو جوتتے وقت اس نے گاڑی بانوں کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ گاڑی ہانکتے ہوئے بولا۔ سرپور بازار کے اسپتال کی ڈاکٹرنی ہے۔ روگی دیکھنے جا رہی ہے۔ پاس ہی کڑا گام۔

ہیرابائی چھتاپور پچیرا کا نام بھول گئی۔ گاڑی جب کچھ دور آگے بڑھ آئی تو اس نے ہنس کر پوچھا تپاپور پچیرا؟

ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے ہیرامن کے۔ تپاپور پچیرا۔ ہا۔ ہا۔ وہ لوگ چھتاپور پچیرا کے ہی گاڑی بان تھے۔ ان سے کیسے کہتا ہی ہی۔

ہیرابائی مسکراتی ہوئی گاؤں کی طرف دیکھنے لگی۔

سڑک تیگھیا گاؤں کے بیچ سے نکلتی ہے۔ گاؤں کے بچوں نے پردے والی گاڑی دیکھی تو تالیاں بجا بجا کر گیت گانے لگے۔

لالی لالی ڈولیا میں

لالی رے دلہنیا

پان کھائے......!

ہیرامن ہنسا۔ دلہنیا..... لالی لالی ڈولیا۔ دلہنیا پان کھاتی ہے۔ دولہا کی پگڑی میں منہ پونچھتی ہے۔ او دلہنیا تیگھیا گاؤں کے بچوں کو یاد رکھنا لوٹتی بار گڑ کے لڈو لیتی آئیو۔ لاکھ برس تیرا دولہا جیے۔ کتنے دنوں کا حوصلہ پورا ہوا ہے ہیرامن کا۔ ایسے کتنے سپنے دیکھے ہیں اس نے وہ اپنی دلہن کو لے کر لوٹ رہا ہے۔ ہر گاؤں کے بچے تالیاں بجا کر گا رہے ہیں۔ ہر آنگن سے جھانک کر دیکھ رہی ہیں عورتیں۔ مرد لوگ پوچھتے ہیں کہاں کی گاڑی ہے گاڑی کہاں جائے گی۔ اس کی دلہن ڈولی کا پردہ تھوڑا سرکا کر دیکھتی ہے۔ اور بھی کتنے سپنے۔

گاؤں سے باہر نکل کر اس نے کنکھیوں سے ٹپّر کے اندر دیکھا ہیرابائی کچھ سوچ رہی ہے۔ ہیرامن بھی کسی سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گنگنانے لگا۔

سجن رے جھوٹ مت بولو۔ خدا کے پاس جانا ہے۔
نہیں ہاتھی۔ نہیں گھوڑا۔ نہیں گاڑی۔
وہاں پیدل ہی جانا ہے۔ سجن رے۔

ہیرابائی نے پوچھا کیوں میتا تمہاری اپنی بولی میں کوئی گیت نہیں کیا؟

ہیرامن اب بے کھٹک ہیرابائی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ کمپنی کی عورت بھی ایسی ہوتی ہے۔ سرکس کمپنی کی مالکن میم تھی۔ لیکن ہیرابائی۔ گاؤں کی بولی میں گیت سننا چاہتی ہے۔ وہ کھل کر مسکرایا گاؤں کی بولی آپ سمجھیے گا۔

ہوں۔ اوں۔ اوں۔ ہیرابائی نے گردن ہلائی۔ کان میں جھمکے ہل گئے۔

ہیرامن کچھ دیر تک بیلوں کو ہانکتا رہا چپ چاپ۔ پھر بولا گیت ضرور ہی سنیے گا۔ نہیں مانیے گا۔؟ اس۔ اتنا شوق گاؤں کا گیت سننے کا ہے آپ کو۔ تب لیک چھوڑنی ہوگی۔ چالو راستے میں کیسے گیت گا سکتا ہے کوئی۔ ہیرامن نے بائیں بیل کی رسّی کھینچ کر داہنے کو لیک سے باہر کیا اور بولا۔ ہری پور ہو کر نہیں جائیں گے تب۔

چالو لیک کو کاٹتے دیکھ کر ہیرامن کی گاڑی کے پیچھے والے گاڑی بان نے چلّا کر کہا۔ "کاہے ہو گاڑی بان۔ لیک چھوڑ کر بے لیک کہاں ادھر۔"

ہیرامن نے ہوا میں چھڑی گھماتے ہوئے جواب دیا۔ کہاں ہے بے لیک؟ وہ سڑک ننت پور نہیں جائے گی۔ پھر اپنے آپ بڑبڑایا۔ اس ملک کے لوگوں کی یہ عادت بہت بری ہے۔ راہ چلتے ایک سو جرح کریں گے۔ ارے بھائی تم کو جانا ہے جاؤ۔ دیہاتی بھچ سب۔

ننت پور کی سڑک پر گاڑی لا کر ہیرامن نے بیلوں کی رسّی ڈھیلی کر دی۔ بیلوں نے دلکی چال چھوڑ کر قدم چال پکڑ دی۔

ہیرابائی نے دیکھا سچ مچ ننت پور کی سڑک بڑی سونی ہے۔ ہیرامن اس کی آنکھوں کی بولی سمجھتا ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ سڑک بھی فاربس گنج جائے گی۔ راستے کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ ایک رات کے پہر تک ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔

ہیرابائی کو فاربس گنج پہنچنے کی جلدی نہیں۔ ہیرامن پر اس کو اتنا بھروسہ ہو گیا ہے کہ ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں۔ ہیرامن پہلے دل ہی دل

نکل جانے کو کہا تھا۔

آج ہیرامن پر ماں سرسوتی سہائے ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔

ہیرا بائی بولی۔

"واہ کتنا اچھا گاتے ہو تم۔"

ہیرامن کا منہ لال ہو گیا۔ وہ سر نیچا کر کے ہنسنے لگا۔

آج تیگھیا پر رہنے والے مہاویر سوامی بھی مہربان ہیں ہیرامن پر۔ تیگھیا کے نیچے ایک بھی گاڑی نہیں۔ ہمیشہ گاڑی اور گاڑی بانوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے وہاں پر۔ صرف ایک سائیکل والا بیٹھ کر سستا رہا ہے۔ مہاویر سوامی کا نام لے کر ہیرامن نے گاڑی روکی۔ ہیرا بائی پردا ہٹانے لگی۔ ہیرامن نے پہلی بار آنکھوں سے بات کی ہیرا بائی سے سائیکل والا ادھر ہی ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہا ہے۔

بیلوں کو کھولنے سے پہلے بانس کی ٹکٹکی لگا کر گاڑی کو ٹکا دیا۔ پھر سائیکل والے کی طرف بار بار گھورتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے لیلا؟ کہاں سے آنا ہو رہا ہے؟ بسن پور سے۔ بس اتنے ہی دور سے تھم تھا کر تھک گئے؟ — جا رے جوانی!

سائیکل والا دبلا پتلا نوجوان منمنا کر کچھ بولا اور بیڑی سلگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ہیرامن دنیا بھر کی نگاہ سے بچا کر رکھنا چاہتا ہے۔ ہیرا بائی کو اس نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھ لیا۔ کہیں کوئی گاڑی یا گھوڑا نہیں۔

کجری ندی کی دبلی پتلی دھارا تیگھیا کے پاس آ کر پورب کی طرف مڑ گئی ہے۔ ہیرا بائی پانی میں بیٹھی ہوئی بھینسوں اور ان کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے بگلوں کو دیکھتی رہی۔

ہیرامن بولا۔ جایئے گھاٹ پر منہ ہاتھ دھو آیئے۔

ہیرا بائی گاڑی سے نیچے اتری۔ ہیرامن کا کلیجہ دھڑک اٹھا۔ نہیں نہیں، پاؤں سیدھے ہیں ٹیڑھے نہیں۔ لیکن تلوا اتنا لال کیوں ہے؟ ہیرا بائی گھاٹ کی طرف چلی گئی۔ گاؤں کی بہو بیٹی کی طرح سر نیچا کیے آہستہ آہستہ۔ کون کہے گا کہ کمپنی کی عورت ہے۔ عورت نہیں لڑکی۔ شاید کنواری ہی ہے۔

ہیرامن ٹکٹکی پڑی گاڑی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ٹپر میں جھانک کر دیکھا ایک بار ادھر ادھر دیکھ کر ہیرا بائی کے تکیے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر تکیے پر کہنی ڈال کر جھک گیا۔ جھکتا گیا۔ خوشبو اس کے جسم میں بس گئی۔ تکیے کے غلاف پر کڑھے پھولوں کو انگلیوں سے چھو کر اس نے سونگھا ہائے رے ہائے۔ اتنی خوشبو۔ ہیرامن نے محسوس کیا جیسے ساتھ پانچ چلم گانجا پی کر بہک گیا ہو۔ ہیرا بائی کے چھوٹے آئینے میں اس نے اپنا منہ دیکھا۔ آنکھیں اس کی اتنی لال کیوں ہیں۔

ہیرا بائی لوٹ کر آئی تو اس نے ہنس کر کہا۔ اب آپ گاڑی کا پہرا دیجئے، میں آتا ہوں ترنت۔

ہیرامن نے اپنی سفری جھولی سے گنجی نکالی۔ گمچھا جھاڑ کر کندھے پر رکھا اور ہاتھ میں بالٹی لٹکا کر چلا۔ اس کے بیلوں نے باری باری ہونک ہونک کر کچھ کہا۔ ہیرامن نے جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔ ہاں ہاں پیاس سبھی کو لگی ہے۔ لوٹ کر آتا ہوں تو گھاس دوں گا۔ بدمعاشی مت کرو۔

بیلوں نے کان ہلائے۔

نہا دھو کر کب لوٹا ہیرامن۔ ہیرا بائی کو معلوم نہیں۔ کجری کی دھارا دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں رات کی اچٹی ہوئی نیند لوٹ آئی۔ ہیرامن پاس کے گاؤں سے جل پان کے لیے دہی چوڑا چینی لے آیا۔

"— اٹھئے نیند توڑیئے۔ دو مٹھی جل پان کر لیجئے۔"

ہیرا بائی آنکھ کھول کر حیرانی میں پڑ گئی۔ ایک ہاتھ میں مٹی کے نئے برتن میں دہی، کیلے کے پتے۔ دوسرے ہاتھ میں بالٹی بھر پانی۔ آنکھوں میں آتم گزارش۔

اتنی چیزیں کہاں سے لے آئے؟

اس گاؤں کا دہی مشہور ہے۔ چائے تو فاربس گنج جا کر ہی پایئے گا۔ ہیرامن کے جسم میں گدگدی ہونے لگی۔ ہیرا بائی نے کہا۔ تم بھی پتل بچھاؤ۔ کیوں؟ تم نہیں کھاؤ گے تو سمیٹ کر رکھ لو اپنی جھولی میں۔ میں بھی نہیں کھاؤں گی۔

اس س۔ ہیرامن شرما کر بولا۔ اچھی بات۔ آپ پا لیجئے پہلے پیچھے کیا۔ تم بھی بیٹھو۔

ہیرامن مان گیا۔ ہیرا بائی نے اپنے ہاتھ سے اس کا پتل بچھا پانی کا چھینٹا دیا۔ چوڑا نکال کر دیا۔ اس س۔ دھنیہ ہے۔ دھنیہ۔ ہیرامن نے دیکھا۔ بھگوتی میا بھوگ لگا رہی ہے۔ لال ہونٹوں پر گورس کے رس سے .... پہاڑی طوطے کو دودھ بھات کھاتے دیکھا ہے۔

اس بار ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہوا نے خود کو پکڑا دیا ہے۔ خود ہی پکڑ میں آگئی ہے۔ اس نے ہوا کو چھو لیا ہے۔ پا لیا ہے اس کی تھکن دور ہو گئی ہے۔ پندرہ برس سال تک امڈی ہوئی ندی کی الٹی دھار سے تیرتے ہوئے اس کے دل کو کنارا مل گیا ہے خوشی کے آنسو روکے نہیں رکتے۔

اس نے ہیرا بائی سے اپنی گیلی آنکھیں چھپانے کی کوشش کی۔ مگر ہیرا بائی تو اس کے دل میں بیٹھی نہ جانے کب سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ ہرامن نے اپنی کانپتی ہوئی بولی کو قابو میں لا کر بیلوں کو جھڑکی دی ـــــ اس گیت میں نہ جانے کیا ہے کہ سنتے ہی دونوں ٹھٹھکنے لگتے ہیں جیسے سو من بوجھ لاد دیا ہو کسی نے۔

ہیرا بائی لمبی سانس لیتی ہے۔ ہرامن کے ہر انگ میں ایک امنگ پیدا ہوتی ہے۔

"تم تو استاد ہو مینتا۔"

اس بس بس۔

آسوج کا تک کا سورج دو بانس دن رہتے ہی نرم پڑ جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی ننت پور پہنچنا ہے۔ ہرامن اپنے بیلوں کو سمجھا رہا ہے۔ قدم کھول کر اور کلیجہ باندھ کر چلو۔ اے۔ چھ بڑے بھین۔ لے۔ لے۔ اے۔ ہے۔ ہے۔

ننت پور تک وہ اپنے بیلوں کو للکارتا رہا۔ ہر للکار کے پہلے وہ اپنے بیلوں کو بیتی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ـــــ یاد نہیں چودھری کی بیٹی کی بارات میں کتنی گاڑیاں تھیں، سب کو کیسے ہرایا تھا۔ ہاں۔ وہی قدم نکالو۔ لے۔ لے۔ لے۔ ننت پور سے فارس گنج تین کوس۔ دو گھنٹے اور۔

ننت پور کے ہاٹ میں آج کل چائے بھی بکنے لگی ہے۔ ہرامن اپنے لوٹے میں چائے بھر کر لے آیا۔ کمپنی کی عورت کو جانتا ہے وہ۔ سارا دن تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے پیتی رہتی ہیں۔ چائے ہے یا جان۔

ہیرا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہی ہے۔ ارے۔ تم سے کس نے کہہ دیا کہ کنوارے آدمی کو چائے نہیں پینا چاہیئے۔

ہرامن شرما گیا۔ کیا بولے وہ۔ شرم کی بات۔ لیکن وہ بھگت چکا ہے ایک بار سرکس کمپنی کی میم کے ہاتھ کی چائے پی کر اس نے دیکھ لیا ہے۔ بڑی گرم تاثیر۔

"پیجیئے گورو جی" ہیرا ہنسی۔

اس۔ س۔ س۔

ننت پور ہاٹ میں دیا بتی جل چکی تھی۔ ہرامن نے اپنی سفری لالٹین جلا کر پیچھے لٹکا دی۔ آج کل شہر سے پانچ کوس دور گاؤں والے بھی اپنے کو شہری سمجھنے لگے ہیں۔ بنا روشنی کی گاڑی کو پکڑ کر چالان کر دیتے ہیں۔ سو جھگڑے۔

"آپ مجھے گورو جی مت کہیئے۔"

"تم میرے استاد ہو۔ ہمارے شاستر میں لکھا ہوا ہے، ایک لفظ سکھانے والا بھی گورو۔ ایک راگ سکھانے والا بھی استاد۔

اس۔ س۔ س۔ شاستر پران بھی جانتی ہے..... میں نے کیا سکھایا..... ؟ میں کیا..... ؟

ہیرا ہنس کر گنگنانے لگی۔ ہے۔ آ۔ آ۔ آ ساونان، بھادوا کے رہ۔

ہرامن حیرانی سے گونگا ہو گیا۔ اس۔ س۔ س۔ اتنا تیز ذہن۔ ہو بہو مہوا گھٹوارن۔

گاڑی سیتا دھار کی ایک سوکھی دھارا کی اترائی پر گڑ گڑا کر نیچے کی طرف اتری۔ ہیرا بائی نے ہرامن کا کندھا پکڑ لیا ایک ہاتھ سے۔ بہت دیر تک ہرامن کے کندھے پر اس کی انگلیاں پڑی رہیں۔ ہرامن نے نظر گھما کر کندھے پر دیکھنے کی کوشش کی کئی بار۔ گاڑی چڑھائی پر پہنچی تو ہیرا کی ڈھیلی انگلیاں پھر سخت ہو گئیں۔

سامنے فارس گنج شہر کی روشنی جھلملا رہی ہے۔ شہر سے کچھ دور ہٹ کر میلے کی روشنی۔ ہرامن کی لالٹین کی روشنی میں سایہ ناچتا ہے۔ آس پاس ڈبڈبائی آنکھوں سے ہر روشنی سورج مکھی پھول کی طرح دکھائی پڑتی ہو۔

فارس گنج تو ہرامن کا گھر دوار ہے۔

نہ جانے کتنی بار وہ فارس گنج آیا ہے۔ میلے کی لدنی لادی ہے کسی عورت کے ساتھ ؟ ہاں ایک بار۔ اس کی بھابی جس سال آئی تھی بدائی میں۔ اسی طرح ترپال سے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیر کر پردہ بنایا گیا تھا.....

ہرامن نے اپنی گاڑی کو ترپال سے گھیر رہا ہے۔ گاڑی بان پٹی میں صبح ہوتے ہی روتا تو ٹنکی کمپنی نے منیجر سے بات کر کے بھرتی ہو جائے گی ہیرا بائی ـــــ پرسوں میلا کھل رہا ہے۔ اس بار میلے میں پال چٹی خوب ہے جی

مسکرایا۔ کونسا گیت گائے وہ ؟ ہیرا بائی کو تکلیف اور کہانی دونوں کا شوق ہے ..... اس س س ہمو اگھوڑارن ؟ وہ بولا ــــ " اچھا آپ کو اتنا شوق ہے تو سنیئے مہوا گھوڑارن کا گیت۔ اس میں گیت بھی ہے کہانی بھی۔

..... کتنے دنوں کے بعد بھگوتی نے یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ ہے بھگوتی۔ آج ہرامن اپنے دل کے ارمان نکال لے گا۔ وہ ہیرابائی کی تھمی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھتا رہا۔

سنیئے آج بھی پرمان ندی میں مہوا گھوڑارن کے کئی پرانے گھاٹ ہیں۔ اسی ملک کی تھی مہوا۔ تھی تو گھوڑارن لیکن خوبصورتی میں لاکھوں میں ایک تھی۔ اس کا باپ دارو تاڑی پی کر دن رات بیہوش پڑا رہتا۔ اس کی سوتیلی ماں تو ڈائن تھی ڈائن۔ بہت بڑی چالاک۔ رات میں گانجا دارو افیم چرا کر بیچنے والوں سے لیکر طرح طرح کے لوگوں سے اس کی جان پہچان تھی۔ سب سے گہرا سنبدھ۔ مہوا کنواری تھی۔ لیکن کام کراتے کراتے اس کی ہڈی نکال دی تھی ڈائن نے .... جوان ہو گئی تو کہیں شادی بیاہ کی بات بھی نہیں چلائی۔ ایک رات کی بات سنیئے ہرامن نے آہستہ آہستہ گنگنا کر گلا صاف کیا۔

" ہے اے اے۔ ساوتاں، بھادوا۔ کے ر .... اڈل ندیا گے سے یو او ادے یوگے اپن بھادن ہے اے اے۔ ملے " ترہ کا ترکے دھرکے کرنیا آم مورا کہیوں ہے باری ناہنی رے اے اے اے۔ "

" او ماں۔ ساون بھادوں کی اڈی ہوئی ندی۔ ڈراؤنی رات، بجلی کڑکتی ہے۔ میں کنواری ننھی بچی۔ میرا کلیجہ دھڑکتا ہے اکیلی کیسے جاؤں گھاٹ پر ؟ سو بھی ایک پردیسی راہی، مسافر کے پیر پر تیل لگانے کے لیے۔ سوتیلی ماں نے کھڑکی بند کر لی۔ آسمان میں بادل گرج اٹھے اور زور کی بارش ہونے لگی۔ مہوا رونے لگی اپنی مری ماں کو یاد کر کے۔ آج اس کی ماں زندہ ہوتی تو ایسے ڈراؤنے دن میں کلیجے سے لگا کر رکھتی اپنی مہوا بیٹی کو۔ گے میّا۔ اسی دن کے لیے یہی دکھانے کے لیے تم نے کوکھ میں رکھا تھا ؟ مہوا کی اپنی ماں پر غصہ آیا۔ کیوں وہ اکیلی مر گئی۔ جی بھر کر کوستی ہوئی بولی۔

ہرامن نے دیکھا۔ ہیرابائی تکیے پر کہنی رکھے گیت میں گم ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی ہے ..... کھوئی ہوئی صورت کیسی بھولی لگتی ہے۔

ہرامن نے گلے میں کپکپی پیدا کی۔

" ہوں اوں۔ رے دامیا میا۔ مودی۔ ای۔ ای تو تو اچھا کاہے نائیں۔
بادل ساری گھر .... اہیہ دنوا خاطر جیو گھیا ہتوں پوسل کہ نینوں دو دم اگن۔ "

ہرامن نے سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ " بھاشا بھی سمجھتی ہیں کچھ یا خالی گیت ہی سنتی ہیں۔ ؟ "

ہیرا بولی۔ سب سمجھتی ہوں۔ اگن کے معنی آگ۔ جو جسم میں لگاتے ہیں۔

ہرامن نے حیران ہو کر کہا۔ اس س س۔ " سورو نے دھونے سے کیا ہوتا ہے۔ سوداگر نے پورا دام چکا دیا تھا مہوا کا۔ بال پکڑ کر گھسیٹتا مہوا ناؤ پر چڑھا اور مانجھی کو حکم دیا۔ ناؤ کھولو۔ پال باندھو۔ پال والی ناؤ، پروں والی چڑیا کی طرح اڑ چلی۔ رات بھر مہوا روتی چھٹپٹاتی رہی۔ سوداگر کے نوکروں نے بہت ڈرایا دھمکایا۔ چپ رہو نہیں تو پانی میں پھینک دیئے گے۔ بس مہوا کو بات سوجھ گئی۔ صبح کا تارا بادل کی آڑ سے ذرا باہر آیا، پھر چھپ گیا۔ ادھر مہوا بھی چھپاک کود پڑی پانی میں۔ سوداگر کا ایک نوکر مہوا کو دیکھتے ہی عاشق ہو گیا تھا مہوا کے پیچھے وہ بھی کود گیا۔ الٹی دھارا میں تیرنا کھیل نہیں۔ سو بھی بھری بھادوں کی ندی میں۔ مہوا اصل گھوڑارن کی بیٹی تھی۔ مچھلی بھی بھلا تھکتی ہے پانی میں۔ سفری مچھلی کی طرح پھڑ پھڑاتی، پانی کو چیرتی بھاگی چلی جا رہی ہے۔ اور اس کے پیچھے سوداگر کا نوکر پکار پکار کر کہتا ہے۔ مہوا ذرا رکو۔ تمہیں پکڑنے نہیں آ رہا، تمہارا ساتھی ہوں۔ زندگی بھر ساتھ رہیں گے ہم لوگ۔ لیکن .....

ہرامن کا من پسند گیت ہے یہ۔ مہوا گھوڑارن گاتے ہوئے اس کے سامنے ساون بھادوں کی ندی امڈنے لگتی ہے۔ اماوس کی رات اور گھنے بادلوں میں رہ رہ کر بجلی چمک اٹھتی ہے۔ اسی چمک میں لہروں سے لڑتی ہوئی کنواری مہوا کی جھلک اسے مل جاتی ہے۔ سفری مچھلی کی چال اور تیز ہو جاتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود سوداگر کا نوکر ہے۔ مہوا کوئی بات نہیں سنتی ضد کیا نہیں کرتی۔ پلٹ کر دیکھتی بھی نہیں۔ اور وہ تھک گیا ہے تیرتے تیرتے۔

مینا باجار! مینا باجار تو رنڈیوں کے اڈے کو کہتے ہیں...
کیا بولتا ہے یہ بوڑھا میاں؟ لال موہر نے ہرامن کے کان میں پھسپھسا کر کہا۔ "تمہارا جسم گلاب کی طرح مہک رہا ہے۔ سچ۔"

لہسنوا لال موہر کا نوکر گاڑی بان ہے۔ عمر میں سب سے چھوٹا ہے۔ وہ رہ رہ کر ماحول میں کچھ سونگھتا ہے ناک سکوڑ کر۔ ہرامن نے دیکھا لہسنوا کا چہرہ تمتایا ہے! کون آرہا ہے دھڑدھڑاتا ہوا؟ کون پلٹ داس؟ کیا ہے؟

پلٹ داس آکر کھڑا ہو گیا چپ چاپ۔ اس کا منہ بھی تمتایا ہوا تھا۔ ہرامن نے پوچھا کیا ہوا؟ بولتے کیوں نہیں؟

کیا جواب دے پلٹ داس! ہرامن نے اس کو ہوشیار کر دیا تھا۔ گپ شپ ہوشیاری سے کرنا۔ وہ چپ چاپ گاڑی کی گدی پر جاکر بیٹھ گیا، ہرامن کی جگہ پر۔ ہیرابائی نے پوچھا۔ تم بھی ہرامن کے ساتھی ہو؟ پلٹ داس نے گردن ہلا کر حامی بھری۔ ہیرابائی پھر لیٹ گئی ——— چہرہ مہرہ اور بولی دیکھ کر سن کر پلٹ داس کا کلیجہ کانپنے لگا ——— نہ جانے کیوں۔ ہاں۔ رام لیلا میں سیتا جی اسی طرح تھکی لیٹی ہوئی تھیں ——— جے ——— سیارو رام چندر کی جے۔ پلٹ کے دل میں جے جے کار ہونے لگا۔ وہ داس ویشنو ہے۔ بچاری ہے۔ تھکی ہوئی سیتا مہارانی کے پیر دابنے کی خواہش ظاہر کی اس نے، ہاتھ کی انگلیوں کے اشارے سے جیسے ہارمونیم کی سروں پر بجا رہا ہو۔ ہیرابائی غصے میں اٹھ کر بیٹھ گئی ——— ارے پاگل ہے کیا؟ جاؤ ——— بھاگو!......

پلٹ داس نے محسوس کیا جیسے ناراض ہوئی کمپنی کی عورت کی آنکھوں سے چنگاری نکل رہی ہے۔ چھٹک چھٹک! وہ بھاگا۔

پلٹ داس کیا جواب دے۔ وہ میلے سے بھی بھاگنے کا بہانہ سوچ رہا ہے۔ بولا کچھ نہیں۔ ہم کو بیوپاری مل گیا۔ ابھی ہی ٹیشن جاکر مال لادنا ہے۔ بھات میں تو ابھی دیر ہے۔ بس لوٹ آتا ہوں تب تک۔

کھاتے ہوئے دھنی رام اور لہسنوا نے پلٹ داس کی ٹوکری بھر نندا کی ..... چھوٹا آدمی ہے۔ کمینہ ہے۔ پیسے پیسے کا حساب جوڑتا ہے۔ کھانے پینے کے بعد لال موہر کے گروہ نے اپنا ڈیرا توڑ دیا۔ دھنی رام اور لہسنوا گاڑی جوت کر ہرامن کے ڈیرے پر چلے گالی کے نشان پر۔ ہرامن نے چلتے چلتے رک کر لال موہر سے کہا۔ "ذرا میرے اس کندھے کو سونگھو تو۔ سونگھ کر دیکھو نہ!" لال موہر نے کندھا سونگھ کر آنکھیں موند لیں۔ منہ سے آواز نکالی۔ اے ہے۔

ہرامن نے کہا۔ "ذرا سا ہاتھ رکھنے پر اتنی خوشبو! سمجھے۔"

لال موہر نے ہرامن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کندھے پر ہاتھ رکھا تھا: سچ؟..... سنو ہرامن۔ نوٹنکی دیکھنے کا پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں لگے گا ہاں!

تم بھی دیکھو گے۔

لال موہر کی بتیسی چوراہے کی روشنی میں جھلملا اٹھی۔ ڈیرے پر پہنچ کر ہرامن نے دیکھا۔ ٹپر کے پاس کھڑا باتیں کر رہا ہے کوئی ہیرابائی سے۔ دھنی رام اور لہسنوا نے ایک ساتھ کہا۔ "کہاں رہ گئے پیچھے پیچھے؟ بہت دیر سے کھوج رہی ہے کمپنی ——— !

ہرامن نے ٹپر کے پاس جاکر دیکھا ارے یہ تو وہی بکسا ڈھونے والا نوکر ہے جو چمپا نگر میلے میں ہیرابائی کو گاڑی پر بٹھا کر اندھیرے میں غائب ہو گیا تھا۔

آ گئے ہرامن! اچھی بات۔ ادھر آؤ۔ یہ لو اپنا بھاڑا اور یہ لو اپنی دچھنا۔

ہرامن نے محسوس کیا جیسے کسی نے آسمان سے ڈھکیل کر زمین پر گرا دیا ہو۔ کسی نے کیوں اس بکسہ ڈھونے والے آدمی نے۔ کہاں سے آ گیا؟۔ اس کی زبان پر آئی ہوئی بات زبان پر ہی رہ گئی۔ اس س س۔ "دچھنا" وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔

ہیرابائی۔ بولی۔ لو پکڑو۔ اور سنو۔ کل صبح روتا کمپنی میں آکر مجھ سے ملنا۔ پاس بنوا دوں گی ...... بولتے کیوں نہیں۔

لال موہر نے کہا۔ "انعام بخشیس دے رہی ہیں مالکن سے لو ہرامن" ہرامن نے غصے سے لال موہر کی طرف دیکھا۔ بولنے کا ذرا بھی ڈھنگ نہیں اس لال موہر کو۔

دھنی رام کی بات سبھی نے سنی ہیرابائی نے بھی۔ گاڑی ہاتھ بیل چھوڑ کر نوٹنکی کیسے دیکھ سکتا ہے میلے میں؟

ہرامن نے رو پیہ لیتے ہوئے کہا ——— "کیا بولیں گے۔ اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ کمپنی کی عورت کمپنی میں جا رہی ہے۔ ہرامن کا کیا! بکسا ڈھونے والا راستہ دکھاتا ہوا آگے بڑھا۔ ادھر سے

ہوگی۔ بس ایک رات۔ آج رات بھر ہرامن کی گاڑی میں رہے گی وہ ...... ہرامن کی گاڑی میں، نہیں گھر میں۔

کہاں کی گاڑی ہے؟ — کون ہرامن؟ کس میلے سے؟ کس چیز کی لدنی ہے؟

گاؤں سماج کے گاڑی بان ایک دوسرے کو ڈھونڈھ کر آس پاس گاڑی لگا کر ڈیرا ڈالتے ہیں۔ اپنے گاؤں کے لال موہر، دھنی رام اور پلٹ داس وغیرہ گاڑی بانوں کے گروہ کو دیکھ کر ہرامن ہچکچا گیا۔ ادھر پلٹ داس ٹپر میں جھانک کر بھڑکا۔ جیسے قیر پر نظر پڑ گئی۔ ہرامن نے اشارے سے سبھی کو چپ کرایا۔ پھر گاڑی کی طرف گھمی مار کر سمجھایا — چپ کمپنی کی عورت ہے۔ نوٹنکی کمپنی کی۔

کمپنی کی۔ ای۔ ای۔ ای!

!...... * * ...... ؟؟ ...... ؟؟

ایک نہیں اب چار ہرامن۔ چاروں نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ کمپنی نام میں کتنا اثر ہے۔ ہرامن نے اشارہ کیا۔ تینوں ایک ساتھ دم سادھ لیے — لال موہر نے ذرا دور ہٹ کر بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اشارے سے ہی۔ ہرامن نے سر کی طرف منہ کر کے کہا — ہوٹل تو نہیں کھلا ہوگا کوئی۔ حلوائی کے ہاں سے پکا کھانا لے آویں۔

"ہرامن ذرا ادھر سنو...... میں کچھ نہیں کھاؤں گی ابھی۔ لو تم کھا آؤ —

کیا ہے پیسہ؟ اِس س س۔ پیسہ دے کر کبھی ہرامن نے کچا پکا نہیں کھایا۔ اس کے گاؤں کے اتنے گاڑی بان ہیں۔ کس دن کے لیے؟ وہ چھو نہیں سکتا پیسہ۔ اس نے۔ ہیرا بائی سے کہا "بیکار میلا بازار میں حجت مت کیجئے۔ پیسہ رکھیے۔" موقعہ پا کر لال موہر بھی سر کے پاس آگیا۔ اس نے سلام کرتے ہوئے کہا "چار آدمی کے بھات میں دو آدمی خوشی سے کھا سکتے ہیں۔ ڈیرے پر بھات چڑھا ہوا ہے۔ ہے۔ ہے۔ ہے۔ ہم لوگ ایک ہی گاؤں کے ہیں۔ ہم لوگوں کے رہتے ہوئے ہوٹل میں کھائے گا ہرامن؟

ہرامن نے لال موہر کا ہاتھ روک دیا۔ "بیشی بچر بچر مت رو۔"

گاڑی سے چار رسی دور جاتے جاتے دھنی رام نے اپنے کلبلاتے ہوئے دل کی بات کھول دی۔ اس س س! تم بھی خوب ہو ہرامن! اُس سال کمپنی کا شیر۔ اس سال کمپنی کی زنانہ۔

ہرامن نے دبی آواز میں کہا — بھائی رے — یہ ہم لوگوں کے ملک کی زنانہ نہیں کہ لٹ پٹ بولی سن کر بھی چپ رہ جائے۔ ایک تو پچھم کی عورت اور پھر کمپنی کی!

دھنی رام نے اپنا شک ظاہر کیا۔ لیکن کمپنی میں تو سنتے ہیں۔ رنڈیاں رہتی ہیں۔

"دھت۔" سبھی نے ایک ساتھ اس کو دھتکار دیا۔ کیسا آدمی ہے! رنڈی رہے گی کمپنی میں بھلا۔ دیکھو اس کی عقل۔ !..... سنا ہے۔ دیکھا تو نہیں ہے کبھی۔

دھنی رام نے (بیچ) غلطی مان لی۔ پلٹ داس کو ایک بات سوجھی — "ہرامن بھائی۔ زنانہ ذات اکیلی رہے گی گاڑی پر؟ کچھ بھی ہو۔ زنانہ آخر زنانہ ہی ہے۔ کوئی ضرورت ہی پڑ جائے۔

یہ بات سبھی کو اچھی لگی۔ ہرامن نے کہا — بات ٹھیک ہے۔ پلٹ تم لوٹ جاؤ۔ گاڑی کے پاس ہی رہنا۔ اور دیکھو۔ گپ شپ ذرا ہوشیاری سے کرنا! ہاں!

..... ہرامن کے جسم سے عطر گلاب کی خوشبو نکلتی ہے۔ ہرامن قسمت کا دھنی ہے۔ اس بار مہینوں تک اس کے جسم سے بیل کی بدبو نہیں گئی۔ لال موہر نے ہرامن کا انگوچھا سونگھ لیا۔ اے ہے!

ہرامن چلتے چلتے رک گیا۔ کیا کریں لال موہر بھائی۔ ذرا کہو تو۔ بڑی ضد کرتی ہے۔ کہتی ہے نوٹنکی دیکھنی ہی ہوگی۔

پھوکٹ میں ہی۔؟

اور گاؤں نہیں پہنچے گی یہ بات۔؟

ہرامن بولا۔ نہیں جی! ایک رات نوٹنکی دیکھ کر زندگی بھر بولی ٹھولی کون سنے؟ دیسی مرغی۔ ولائتی چال۔

دھنی رام نے پوچھا۔ "پھوکٹ میں دیکھنے پر بھی تمہاری بھوجائی بات سنائے گی؟"

لال موہر کے ڈیرے کے بغل میں، لکڑی کی دو کان لاد کر آئے ہوئے گاڑی بانوں کا ڈیرا ہے۔ ڈیرے کے گاڑی بان میاں جان بوڑھے نے سفری گڑگڑی پیتے ہوئے پوچھا — "کیوں بھائی مینا بازار کی لدنی لاد کر کون آیا ہے؟"

ہاں پہلے گر سو قسم کھائی ہوگی سب کو کہ گاؤں، گھر میں یہ بات ایک پنچھی بھی نہ جاننے پائے۔

لال موہر نے غصے سے کہا۔ "کون سالا بولے گا۔ گاؤں میں جا کر؟ پلٹا نے اگر بدمعاشی کی تو اگلی بار سے پھر ساتھ نہیں لاؤں گا۔"

ہرامن نے آج اپنی تھیلی ہیرا بائی کے ذمہ کر دی ہے میلے میں کیا ٹھکانا۔ قسم قسم کے پاکٹ کاٹ لوگ ہر سال آتے ہیں۔ اپنے ساتھی سنگیوں کا بھی کیا بھروسہ! ہیرا بائی مان گئی۔ ہرامن کی کپڑے کی کالی تھیلی کو اس نے اپنے چمڑے کے بکس میں بند کر دیا۔ بکسے کے اوپر بھی چمڑے کا گول اور اندر بھی جھلمل ریشمی استر۔ ہرامن کا دل خوش ہو گیا۔

لال موہر اور دھنی رام نے مل کر ہرامن کی عقل کی تعریف کی۔ اس کی قسمت کو سراہا بار بار اس کے بھائی اور بھابھی کی نندا کی۔ دبی زبان میں۔ ہرامن سا ہیرا بھائی ملا ہے اس لیے۔ کوئی دوسرا بھائی ہوتا تو......

لہسنوا کا منہ لٹکا ہوا ہے۔ اعلان سنتے سنتے نہ جانے کہاں چلا گیا کہ شام ہونے کے بعد لوٹا ہے۔ لال موہر نے ایک مالکانہ جھڑکی دی ہے۔ گالی کے ساتھ۔ سالا کہیں کا۔

دھنی رام نے چولھے پر کھچڑی چڑھاتے ہوئے کہا "پہلے یہ فیصلہ کرو گاڑی کے پاس کون رہے گا۔"

"رہے گا کون، یہ لہسنوا۔ کہاں جائے گا۔؟"

لہسنوا رو پڑا۔ ہے۔ اے اے مالک ہاتھ جوڑتے ہیں ایک ملا۔ بس ایک جھلک۔

ہرامن نے فراخدلی سے کہا ۔۔۔ "اچھا اچھا ایک جھلک کیوں۔ گھنٹہ دیکھنا۔ میں آ جاؤں گا۔"

نوٹنکی شروع ہونے کے دو گھنٹے پہلے ہی نگاڑا بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور نگاڑا شروع ہوتے ہی لوگ پتنگوں کی طرح ٹوٹنے لگتے ہیں۔ ٹکٹ گھر کے پاس بھیڑ دیکھ کر ہرامن کو بڑی ہنسی آئی۔ لال موہر دیکھو کیسی دھکم دھکی ہو رہی ہے۔

ہرامن بھائی!

کون پلٹ داس۔ کہاں کی لدنی لاد آئے؟ لال موہر نے پرائے آدمی کی طرح پوچھا۔

پلٹ داس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے معافی مانگی۔ "قصور وار ہیں جو سزا دو تم لوگ سب منظور ہے۔ لیکن سچی بات کہوں کہ سیتا مائی بڑی!"

ہرامن کا دل نگاڑے کی تال پر خوشی سے ناچ رہا ہے۔ بولا "دیکھو پلٹا۔ یہ مت سمجھنا کہ گاؤں گھر کی زنانہ ہے۔ دیکھو تمہارے لیے بھی پاس دیا ہے۔ پاس لے لو اپنا تماشا دیکھو۔"

لال موہر نے کہا ۔۔۔ "لیکن ایک شرط پر پاس ملے گا۔ بیچ بیچ میں لہسنوا کو بھی......"

پلٹ داس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ لہسنوا سے بات چیت کر آیا ہے ابھی۔

لال موہر نے دوسری شرط سامنے رکھی۔ "گاؤں میں اگر یہ بات معلوم ہوئی کسی طرح......"

"رام رام" دانت سے زبان کو کاٹتے ہوئے کہا پلٹ داس نے۔

پلٹ داس نے بتایا۔ اٹھنی کا پھاٹک ادھر ہے۔ پھاٹک پر کھڑے دربان نے ہاتھ سے پاس لے کر ان کے چہروں کو باری باری سے دیکھا بولا۔ "یہ تو پاس ہے۔ کہاں سے ملا؟"

اب لال موہر کی شہری بولی سنے کوئی۔ اس کے تیور دیکھ کر دربان گھبرا گیا ۔۔۔ "ملے گا کہاں سے؟ اپنی کمپنی سے پوچھ لیجیے جا کر چار ہی نہیں دیکھئے ایک اور ہے۔" جیب سے پانچواں پاس نکال کر دکھایا لال موہر نے۔

ایک روپیے والے پھاٹک پر نیپالی دربان کھڑا تھا۔ ہرامن نے پکار کر کہا ۔۔۔ "اے سپاہی بھائی صبح کو ہی پہچنوایا تھا اور ابھی سے بھول گئے؟"

نیپالی دربان بولا۔ "ہیرا بائی کا آدمی ہے سب۔ جانے دو۔ پاس ہے تو پھر کاہے کو روکتا ہے؟"

اٹھنیا درجہ!

تینوں نے کپڑے کے گھر کو اندر سے پہلی بار دیکھا۔ سامنے کرسی بینچ والے درجے ہیں۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا پردے پر بنی ہوئی رام، سیتا، لچھمن اور کرشن جی کی تصویر کو۔ جے ہو۔ جے ہو۔ پلٹ داس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ہرامن نے کہا ۔۔۔ "لال موہر یہ چل رہی ہیں یا کھڑی ہیں؟"

لال موہر اپنے بغل میں بیٹھے تماشہ دیکھنے والوں سے پہچان کر چکا

ہیرابائی جاتے جاتے رک گئی۔ ہرامن کے بیلوں کو مخاطب کرکے بولی ـــــ "اچھا میں چلی بھیّن۔!"

بیلوں نے بھیا لفظ پر کان ہلائے !

!..... * * ..... ؟؟ ..... ؟؟

ـــــ بھائیو، آج رات ! دی روتا سنگیت نوٹنکی کمپنی کے اسٹیج پر ! گلبدن دیکھیے، گلبدن۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ متھرا موہن کمپنی کی مشہور ایکٹریس مس ہیرا دیوی جس کی ایک ایک ادا پہ ہزار جان فدا ہیں، اس بار ہماری کمپنی میں آ گئی ہیں۔ یاد رکھیے۔ آج رات۔ مس ہیرا دیوی گلبدن۔

نوٹنکی والوں کے اس اعلان سے میلے کے ہر ڈیرے میں سرگرمی پھیل رہی ہے..... ہیرابائی ؟ لیلا۔ گلبدن ؟۔ فلم ایکٹریس کو مات کرتی ہے.....

تیری بانکی ادا پر میں خود ہوں فدا تیری چاہت کا دلبر بیاں کیا کروں یہی خواہش ہے تو مجھ کو دیکھا کرے، اور دل و جان میں تم کو دیکھا کروں

کر۔ ر۔ دھن دھنا۔ دھن دھن .... دھڑام

ہر آدمی کا دل نگاڑا ہو گیا ہے۔

لال موہر دوڑتا، ہانپتا ڈیرے پر آیا۔ اے۔ اے ہرامن۔ یہاں کیا بیٹھے ہو۔ چل کر دیکھو۔ کیسا جے جے کار ہو رہا ہے۔ باجا گاجا۔ ہیرابائی کی جے جے کار ہو رہی ہے۔

ہرامن ہڑبڑا کر اٹھا۔ لہسوا نے کہا ـــ دھنی کاکا۔ تم ڈیرے پر رہو۔ میں بھی دیکھ آؤں۔

دھنی کی بات کون سنتا ہے۔ تینوں آدمی نوٹنکی کمپنی کی اعلان والی پارٹی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ہر نکڑ پر رک کر باجا بند کر کے اعلان کیا جاتا ہے۔ اعلان کے ہر لفظ پر ہرامن کھل اٹھتا ہے۔ ہیرابائی کا نام۔ نام کے ساتھ ادا فدا وغیرہ سن کر اس نے لال موہر کی پیٹھ تھپتھپا دی۔ دھن ہے۔ دھن ہے۔ ہے یا ں؟ ـــ

لال موہر نے کہا ـــ "اب بولو۔ اب بھی نوٹنکی نہیں دیکھو گے ـــ ؟"

صبح سے ہی دھنی رام اور لال موہر سمجھا رہے تھے۔ سمجھا کر چکے تھے۔ کمپنی میں جا کر ملاقات کر آؤ، جاتے جاتے پوچھ گئی ہے

لیکن ہرامن کی بس ایک بات۔ دھت۔ کون ملاقات کرنے جائے۔ کمپنی کی عورت، کمپنی میں گئی۔ اب اس سے کیا لینا دینا۔ پہچانے گی بھی نہیں۔"

دونوں آپس میں صلاح کرکے روتا کمپنی کی طرف چلے۔ خیمے کے پاس پہنچ کر ہرامن نے لال موہر کو اشارہ کیا۔ پوچھ تاچھ کرنے کا بھار لال موہر کے سر۔ لال موہر شہری بولی جانتا ہے۔ لال موہر نے ایک کالے کوٹ والے سے کہا۔ بابو صاحب۔ ذرا سنیے تو۔

کالے کوٹ والے نے ناک بھوں چڑھا کر کہا ـــ کیا ہے؟ ادھر کیوں۔

لال موہر کی بولی لڑکھڑا گئی۔ تیور دیکھ کر بولا۔ "گل گل" نہیں نہیں "بل بل" نہیں..... ہرامن نے جھٹ سے سنبھال لیا۔ "ہیرا دیوی کدھر رہتی ہے۔ بتا سکتے ہیں؟"

اس آدمی کی آنکھیں ایک دم لال ہو گئیں۔ سامنے کھڑے نیپالی سپاہی کو کہا۔ "ان لوگوں کو کیوں آنے دیا ادھر؟"

"ہرامن" وہ مدھری آواز کدھر سے آئی۔ خیمے کے پردے کو ہٹا کر۔ ہیرابائی نے بلایا ـــ یہاں آ جاؤ ـــ اندر ـــ دیکھو بہادر۔ اس کو پہچان لو۔ یہ میرا ہرامن ہے سمجھے!

نیپالی دربان ہرامن کی طرف دیکھ کر ذرا مسکرایا اور چلا گیا۔ کالے کوٹ والے سے جا کر کہا۔ "ہیرابائی کا آدمی ہے نہیں روکے" بولا۔"

لال موہر پان لے آیا۔ نیپالی دربان کے لیے ـــ کھایا جائے۔

ـــ اس اس اس۔ ایک نہیں پانچ پاس۔ چاروں اٹھنی کے بولی کہ جب تک میلے میں ہو۔ روز رات میں آکر دیکھنا۔ سب کا خیال رکھتی ہے۔ بولی کہ تمہارے اور ساتھی ہیں۔ سبھی کے لیے پاس لے جاؤ۔ کمپنی کی عورتوں کی بات ہی نرالی ہوتی ہے! ہے یا نہیں۔؟

لال موہر نے لال کاغذ کے ٹکڑوں کو چھو کر دیکھا ـــ پاس واہ رے ہرامن بھائی! لیکن پانچ پاس لے کر کیا ہوگا؟ پلٹ واں تو پھر پلٹ کر آیا ہی نہیں ہے ابھی تک۔

ہرامن نے کہا ـــ "جانے دو بدقسمت کو۔ تقدیر میں لکھا نہیں،

آتے ہی پوچھا ــــ "مالک کون آدمی کیا بول رہا تھا۔ بولیے تو ذرا۔ شکل دکھلا دیجئے۔ اس کی ایک جھلک۔

لوگوں نے لہسنوا کی چوڑی اور سپاٹ چھاتی دیکھی۔ جاڑے کے موسم میں بھی ننگی چھاتی۔ ــــ پٹھے جانوں کے ساتھوں میں یہ لوگ۔

لال موہر نے لہسنوا کو چپ کرایا۔

...... تینوں چاروں سے مت پوچھیے کوئی نوٹنکی میں کیا دیکھا۔ قصہ کیسے یاد رہے۔ ہیرامن محسوس کر رہا تھا کیسے ہیرا بائی شروع سے ہی اسی کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھ رہی ہے۔ گا رہی ہے۔ ناچ رہی ہے۔ لال موہر کو ایسے لگتا تھا "ہیرا بائی اسی کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ سمجھ گئی ہے۔ ہیرامن سے بھی زیادہ پاور والا آدمی ہے لال موہر۔ پلٹ داس قصہ سمجھتا ہے ...... قصہ اور کیا ہو گا ــ رامائن کی ہے بات۔ وہی رام۔ وہی سیتا۔ وہی لکشمن اور وہی راون۔ سیتا سکماری کو رام جی سے چھیننے کے لیے راون طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر آتا ہے۔ رام اور سیتا بھی روپ بدل لیتے ہیں۔ یہاں بھی تخت ہزارہ بنانے والے مالی کا بیٹا رام ہے گلبدن سیتا سکماری ہے۔ مالی کے لڑکے کا دوست لکشمن ہے اور سلطان ہے راون..... دھنی رام کو بخار ہے تیز۔ لہسنوا کو سب سے اچھا جوکر کا پارٹ لگا ہے۔ وہ اس جوکر سے دوستی کرنا چاہتا ہے نہیں کرے گا دوستی جوکر صاحب؟؟

ہیرامن کو ایک گیت کی آدھی کڑی ہاتھ لگی ہے۔ مارے گئے گلفام! کون تھا یہ گلفام؟ ہیرا بائی روتی ہوئی گا رہی تھی۔ اجی ہاں۔ مارے گئے گلفام۔ ٹڑ بیچارا گلفام!

تینوں کو پیاری واپس کرتے ہوئے پولیس کے سپاہی نے کہا ــــ "لا ٹھی ریانی لے کر ناچ دیکھنے آتے ہو۔؟

دوسرے دن میلے بھر میں یہ بات پھیل گئی۔ متھرا موہن کمپنی سے بھاگ کر آئی ہے ہیرا بائی۔ اس لیے اس بار متھرا موہن کمپنی نہیں آئی ہے۔ اس کے غنڈے آتے ہیں۔ ہیرا بائی بھی کم نہیں ــــ بڑی چی دار عورت ہے تیرہ تیرہ دیہاتی لٹھ باز پالتی ہے ...... "واہ میری جان۔ کبھی کہے تو کوئی۔ مجال ہو۔

دس دن۔ دس رات! ......

دن بھر بھاڑا ڈھوتا ہیرامن۔ شام ہوتے ہی نوٹنکی کا نگاڑا بجنے لگتا۔ نگاڑے کی آواز سنتے ہی ہیرا بائی کی پکار کانوں کے پاس منڈلانے لگتی۔ بھیا۔ میتا۔ ہیرامن۔ استاد۔ گرو جی! ہمیشہ کوئی نہ کوئی باجا اس کے من میں بجتا رہتا۔ دن بھر۔ کبھی ہارمونیم کبھی نگاڑا۔ کبھی ڈھولک اور کبھی ہیرا بائی کی پازیب۔ انہیں سازوں کے تال پر ہیرامن اٹھتا بیٹھتا۔ چلتا۔ پھرتا۔ نوٹنکی کمپنی کے منیجر سے لے کر پردہ کھینچنے والے تک اس کو پہچانتے ہیں ــــ ہیرا بائی کا آدمی ہے۔

پلٹ داس ہر رات نوٹنکی شروع ہوتے وقت ادب سے اسٹیج کو نمسکار کرتا رہا تھا جوڑ کر۔ لال موہر ایک دن اپنی بولی سنانے گیا تھا ہیرا بائی کو۔ ہیرا بائی نے پہچانا ہی نہیں۔ تب سے اس کا دل چھوٹا ہو گیا ہے۔ اس کا نوکر لہسنوا اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے نوٹنکی کمپنی میں بھرتی ہو گیا ہے۔ جوکر سے اس کی دوستی ہو گئی ہے۔ دن بھر پانی بھرتا ہے۔ کپڑے دھوتا ہے۔ کہتا ہے گاؤں میں کیا کرنے جاؤں گا۔ لال موہر اداس رہتا ہے۔ دھنی رام گھر چلا گیا ہے بیمار ہو کر۔

ہیرامن آج صبح سے تین بار لدنی لاد کر اسٹیشن آ چکا ہے۔ آج نہ جانے کیوں اس کو اپنی بھوجائی کی یاد آ رہی ہے۔ دھنی رام نے کچھ کہہ تو نہیں دیا ہے بخار کی جھونک میں! یہیں کتنا فضول بک رہا تھا ــ گلبدن، تخت ہزارہ! لہسنوا موج میں ہے۔ دن بھر ہیرا بائی کو دیکھتا ہو گا۔ کل کہہ رہا تھا ہیرامن مالک۔ تمہارے اقبال سے خوب موج میں ہوں۔ ہیرا بائی کی ساری دھونے کے بعد ٹب کا پانی عطر گلاب ہو جاتا ہے۔ اس میں اپنا انگوچھا بھگو کر سوکھنے ڈال دیتا ہوں۔ سونگھو گے؟ ہر رات کسی نہ کسی کے منہ سے سنتا ہے وہ ــ ہیرا بائی رنڈی ہے۔ کتنے لوگوں سے لڑے وہ۔ بنا دیکھے ہی لوگ کیسے کوئی بات بولتے ہیں۔ راجا کو بھی لوگ پیٹھ پیچھے گالی دیتے ہیں۔ آج وہ ہیرا بائی سے مل کر کہے گا نوٹنکی کمپنی میں رہنے سے بہت بدنام کرتے ہیں لوگ۔ سرکس کمپنی میں کیوں نہیں کام کرتیں؟ سب کے سامنے ناچتی ہو تو ہیرامن کا کلیجہ غصے سے جلتا رہتا ہے اس وقت سرکس کمپنی میں

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

ہے۔ اس نے کہا۔ "کھیل ابھی پردے کے اندر ہے۔ ابھی لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے نگاڑا بج رہا ہے۔

ملپٹ داس ڈھولک بجانا جانتا ہے۔ اس لیے نگاڑے کے تال پر گردن ہلاتا ہے اور دیا سلائی پر تال کاٹتا ہے۔ بیڑی پلا کر ہرامن نے بھی ایک آدھ جان پہچان کر لی۔ لال موہر کے واقف آدمی نے چادر سے جسم کو ڈھکتے ہوئے کہا — ناچ شروع ہونے میں ابھی دیری ہے۔ تب تک ایک نیند لے لیں۔ سب درجوں سے اچھا اٹھنی کا درجہ۔ سب سے اونچی سب سے اونچی جگہ پر ہے۔ زمین پر گرم گھاس ہے۔ ہے۔ کرسی بنچ پر بیٹھ کر اس سردی کے موسم میں تماشہ دیکھنے والے ابھی اٹھیں گے چائے پینے۔

اس آدمی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "کھیل شروع ہونے پر جگا دینا۔ نہیں۔ نہیں۔ کھیل شروع ہونے پر نہیں۔ ہیرا جب اسٹیج پر اترے تب جگا دینا۔

ہرامن کے کلیجے میں کچھ آنچ سی لگی۔ ہیرا۔ بڑا خراب آدمی معلوم پڑتا ہے۔ اس نے لال موہر کو آنکھ کے اشارے سے کہا۔ "اس آدمی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔

گھن گھن گھن۔ دھڑام۔ پردہ اٹھ گیا ہے۔ اے۔ ہے لے ہیرابائی شروع سے ہی اتر گئی اسٹیج پر۔ کپڑے کا گھر کھچا کھچ بھر گیا ہے۔ ہرامن کا منہ حیرانی سے کھل گیا۔ لال موہر کو نہ جانے کیوں ہنسی آ رہی ہے۔ ہیرابائی کے گیت کے ہر بول پر وہ ہنستا ہے۔ بے وجہ۔

گلبدن دربار لگا کر بیٹھی ہے۔ اعلان کر رہی ہے۔ جو تخت ہزارہ بنا کر لا دے گا۔ منہ مانگی چیز انعام میں دی جائے گی۔ اجی ہے کوئی ایسا فنکار تو ہو جائے تیار۔ بنا کر لائے تخت ہزارہ آ۔ کڑ کڑ کر۔ وہ ناچتی ہے۔ کیا گلا ہے۔ معلوم ہے۔ یہ آدمی کہتا ہے کہ ہیرابائی پان بیڑی سگریٹ زردا کچھ نہیں کھاتی۔ ٹھیک کہتا ہے۔ بڑی نیم والی رنڈی ہے۔ کون کہتا ہے کہ رنڈی ہے دانت میں مسی کہاں ہے۔ پاؤڈر سے دانت دھو لیتی ہوگی۔ ہرگز نہیں..... کون آدمی ہے بے بات کی بات کرتا ہے۔ کمپنی کی عورت کو رنڈی کہتا ہے۔ تم کو غصہ کیوں آیا؟ کون ہے رنڈی کا بھڑوا مارو سالے کو۔ مارو۔ تیری..... !

ہو ہلے کے بیچ ہرامن کی آواز کپڑے کے گھر کو پھاڑ رہی ہے۔ "آؤ ایک ایک کی گردن توڑ دیں گے۔

لال موہر اپنی چھڑی سے پٹاپٹ پیٹتا جا رہا ہے سامنے کے۔ ملپٹ داس ایک آدمی کی چھاتی پر سوار ہے۔ سالا۔ سیتا گالی دیتا ہے۔ سو بھی مسلمان ہو کر؟

دھنی رام شروع سے ہی چپ تھا۔ مار پیٹ شروع ہوتے ہی وہ کپڑے کے گھر سے باہر بھاگا۔

کالے کوٹ والے کمپنی کے منیجر نیپالی سپاہی کے ساتھ دوڑے آئے۔ داروغہ صاحب نے ہنٹر سے پٹائی شروع کی۔ ہنٹر کھا کر تلملا اٹھا۔ شہری بولی میں تقریر کرنے لگا۔ "داروغہ صاحب مار دیے۔ کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ پاس دیکھ لیجیے۔ ایک پاس میں بھی ہے۔ دیکھ سکتے ہیں حضور۔ ٹکٹ نہیں پاس۔ تب ہمارے سامنے کمپنی کی عورت کو کوئی بری بات کہے تو کیسے چھوڑ دیں۔ کمپنی کے منیجر کی سمجھ میں آ گئی ساری بات۔ اس نے داروغہ کو سمجھایا — حضور میں سمجھ گیا۔ یہ ساری بدمعاشی متھرا موہن کی ہے۔ تماشے میں جھگڑا کھڑا کر کے کمپنی کو بدنام..... نہیں ان لوگوں کو چھوڑ دیجیے۔ ہیرابائی کے آدمی ہیں۔ بیچاری کی جان خطرے میں ہے۔ حضور سے کہا تھا نہ!

ہیرابائی کا نام سنتے ہی داروغہ نے تینوں کو چھوڑ دیا۔ تینوں کی چھڑیاں چھین لی گئیں۔ منیجر نے تینوں کو ایک روپے درجے میں کرسی پر بٹھایا — "آپ لوگ یہیں بیٹھیے۔ پان بھیجتا ہوں۔ کپڑے کے گھر میں شانتی ہوئی اور ہیرابائی اسٹیج پر لوٹ آئی۔ نگاڑا پھر دھن دھنا اٹھا۔

تھوڑی دیر بعد تینوں کو ایک ہی ساتھ دھنی رام کا خیال آیا۔ ارے دھنی رام کہاں گیا؟

"مالک۔ او مالک! لہسنوا تماشہ گھر کے باہر چلا رہا ہے۔

"او لال موہر مالک!"

لال موہر نے اونچی آواز میں جواب دیا — "ادھر سے۔ ایک روپے والے پھاٹک سے۔ سبھی تماشہ دیکھنے والے لال موہر کی طرف مڑ کر دیکھا۔ لہسنوا کو نیپالی سپاہی لال موہر کے پاس لے آیا۔ لال موہر نے جیب سے پاس نکال کر دکھایا۔ لپ

موہن راکیش

مترجمہ : انیس نصرت

گلاس ٹینک

میٹھے پانی کی مچھلیاں ، کارپ نسل کی ، دیر دیر تک میں انھیں دیکھتی رہتی۔ شوبھا پیچھے سے آکر چونکا دیتی۔ کہتی "گولڈ فش جیسی گولڈ فش کو دیکھ رہی ہے۔"

میں جانتی وہ میرے بھورے سنہرے بالوں کی وجہ سے ایسا کہتی ہے۔ مسکراکر میں ٹینک کے پاس سے ہٹ جاتی۔ ظاہر کرنا چاہتی کہ ایسے ہی چلتے چلتے رک گئی تھی شوبھا صوفے پر پاس بٹھالیتی۔ کہتی "یہ گلاس ٹینک تیرے ساتھ بھیج دیں۔"

مجھے اس کی انگلیوں کا لمس اچھا لگتا ہے۔ انھیں ہاتھ میں لے کر دیکھتی۔ پتلی پتلی انگلیاں، نیلی نیلی لکیروں کی طرح ابھری ہوئی رگیں جی ہوتا اس کے پوروں کو ہونٹوں سے چھولوں۔ مگر خود کو روک لیتی۔ ڈر لگتا وہ پھر کہہ دے گی "یو سنسوئس (Sensuous) گرل۔ تو زندگی میں بھلا کیسے پاٹے گی؟"

اس کی انگلیوں میں انگلیاں الجھائے بیٹھی رہتی۔ صوفے کے کھردرے ریشوں پر وہ اور بھی ملائم لگتیں۔ سیوار میں تیرتی ننھی ننھی مچھلیاں۔ اپنا ہاتھ جال کی طرح لگتا۔ کانپتی ہوئی مچھلیاں جال میں سمٹ آتیں۔ کچھ دیر کانپنے کے بعد بے جان ہو جاتیں یا معمولی سی کوشش سے چھوٹ جاتیں۔

"تو خوش رہے گی نا؟" میں ایسے پوچھتی جیسے کسی چیز کا انحصار میرے اس سوال پر ہی ہو۔ وہ ایک کومل ہنسی ہنس دیتی —— ایسی ہنسی، جو وہی ہنس سکتی ہے۔ ہوا میں ذرے بکھر جاتے۔ میرے اندر بھی ذرے بکھرنے لگتے۔ میں اس کا ہاتھ پھر ہاتھ میں کس لیتی چپ چاپ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہتی۔ مگر کہیں سیوار نظر نہ آتی۔ اس کی آنکھیں بھی ہنستی سی لگتیں۔

"خوشی تو من کی ہوتی ہے۔" وہ کہتی "اپنے سے ہی اپنی ہوتی ہے۔ باہر سے کون کسی کو خوشی دے سکتا ہے؟"

"بالکل فطری طریقہ سے، کہتی، مگر مجھے لگتا جھوٹ بول رہی ہے اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں بھیگی ہوئی سی لگتیں۔ ایک سرد لہر میری انگلیوں میں اتر آئی۔

"وہ آجکل کہاں ہے؟" میں پوچھ لیتی۔

"کون؟" وہ پھر جھوٹ بولتی۔

"وہی سنجیو"

"کیا پتہ؟"

اس کی بھنوؤں کے نیچے ایک ہلکی سی چھایا کانپ جاتی مگر وہ اسے آنکھوں میں نہ آنے دیتی۔ "سال بھر پہلے کلکتہ میں تھا"

"ادھر اس کا کوئی خط نہیں آیا؟"

"نہیں۔"

"تو نے بھی نہیں لکھا؟"

"نا"

"کیوں"

وہ ہاتھ چھڑا لیتی۔ دروازہ کی طرف دیکھتی جیسے کوئی ادھر سے آ رہا ہو۔ پھر اپنی کلائی میں کانچ کی چوڑیوں کو ٹھیک کرتی۔ آنکھیں موندنے کو ہوتیں پر اپنی کوشش کرکے کھول لیتی۔ مجھے لگتا اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی سلوٹیں پڑ گئی ہیں۔

"وہ سب بے وقوفی کی باتیں تھیں" وہ کہتی۔

من ہوتا اس کے ہونٹوں اور آنکھوں کو اپنے بہت پاس لے آؤں اس کی ٹھوڑی پر ٹھوڑی رکھ کر پوچھوں "مجھے وشواس ہو تا تو خوش

گھر پر نہ ہوں۔ ماسن کر کام میں لگ جاتیں۔ سبھاش کو آنے کے لیے لکھا یا خود انھوں نے تھا۔ بچپن سے اسے جانتی تھی۔ جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے یہاں لے آئی تھی وہ اس وقت کافی بڑا تھا۔ بی اے میں پڑھتا تھا۔ ہم لوگ بہت چھوٹے رہے ہوں گے۔ ہمیں اس کی یاد نہیں۔ ماما سے ذکر سنا کرتے تھے۔ وہ مہینہ بھر رہا تھا۔ اس وقت سترہ سال کا تھا۔ پر باتوں سے لگتا تھا جیسے بہت بڑا ہو۔ ڈیڈی کے ساتھ فلسفہ کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ماما اسکی باتیں سنتے ہوئے کام کرنا بھول جاتی تھیں۔ ڈیڈی غصہ ہوتے۔ ماما کو دکھ ہوتا کہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں ایسی ایسی باتیں کیوں کرنے لگا ہے۔ اتنا پڑھتا نہیں تھا جتنا سوچتا تھا۔ بات کرتے ہوئے بھی لگتا ہے جیسے بول نہ رہا ہو سوچ رہا ہو۔ اپنے گھنگھرالے بالوں کو انگلیوں سے سلجھایا کرتا تھا۔ کھانے کو جو بھی مل جائے کھا لیتا تھا۔ پوچھا جائے کہ نمک کم یا زیادہ تو چونک پڑتا "یہ تو میں نے نوٹ ہی نہیں کیا۔ ابھی بتاتا ہوں۔" اور بتانے کے لیے چیز نئے سرے سے چکھتا تھا۔ ماما جب بھی اس کا ذکر کرتیں ان کی آنکھیں بھر آتیں۔ اس لڑکے کو زندگی میں موقع ملتا تو جانے کیا بنتا۔ جب پتہ چلا کہ وہ ایسے۔ بی آفس میں کلرک بن گیا ہے تو ماما سے ایک دن کھانا نہیں کھایا گیا۔

"ممی سبھاش ہم لوگوں کا کیا لگتا ہے۔؟" ہم تھوڑا بڑے ہوئے تو ماما سے پوچھا کرتے تھے۔ ماما مجھے اور دیپ کو بانہوں میں لیے ہوئے کہتیں "وہ تم لوگوں کا وہ لگتا ہے جو اور کوئی نہیں لگتا" میں اور دیپ بعد میں اندازہ لگایا کرتے مگر کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ پاتے۔ آخر دیپ کہتا "وہ ہم لوگوں کا کچھ بھی نہیں لگتا۔"

اس پر میری اور اس کی لڑائی ہو جاتی۔

بعد کے برسوں میں کبھی کبھی اس کی خبر آیا کرتی۔ ماما بتاتیں کہ پرائیوٹ ایم اے کر کے اب وہ لیکچرر ہو گیا ہے۔ اسے باہر جانے کے لیے اسکالرشپ مل رہا تھا مگر اس نے نہیں لیا... کہتا ہے کہ جس مضمون کے لیے وظیفہ مل رہا ہے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہر سال گزرتے جاتے تھے۔ ماما اسے تین تین خط لکھتیں تو اس کا ایک جواب آتا۔ وہ نرم ہے۔ گرمیوں کی دوپہر کو اکثر اسکی باتیں کرتی رہتیں پھر سنبھال کر رکھ دیتیں۔ وہ خط ناتیں تو میں بھی پڑھ لیتی۔ جب میں بڑی ہو گئی۔ دیپ کہتا "اس نام کا کوئی آدمی ہے ہی نہیں۔ ماما خود ہی لکھ کر اپنے نام ڈال دیتی ہیں۔" ڈیڈی سنتے ہوئے بھی نہ سنتے۔

اخبار یا کتاب میں آنکھیں گاڑے رہتے۔ کبھی کبھی ان کی بھویں تن جاتیں اور اکتاہٹ چھپانے کے لیے وہ اٹھ جاتے۔ میں ماما سے پوچھتی "ممی یہ خط تو لکھ دیتے ہیں ہمارے یہاں کبھی آتے کیوں نہیں؟"

"کوئی ہو تو آئے" دیپ کہتا۔

ماما بگڑ اٹھتیں۔ انہیں لگتا کہ وہ بدشگونی کر رہا ہے۔ دیپ ہنستا ہوا منطق بگھارنے لگتا۔ "ممی کسی چیز کے ہونے کا ثبوت....."

"وہ چیز نہیں آدمی ہے۔" لگتا ممی اس کے منہ پر چپت مار دیں گی۔

میں بانہہ پکڑ کر دیپ کو دوسرے کمرے میں لے جاتی کہتی "دیپ تو اتنا بڑا ہو کر ممی کو کیوں تنگ کرتا ہے"؟

دیپ مسکراتا رہتا جیسے ڈانٹ یا پیار کا اس پر کوئی اثر نہ ہو کہتا "چڑھانے میں مجھے مزا آتا ہے۔"

"اور وہ جو روتی ہیں۔"

"اسی لیے تو چڑھاتا ہوں کہ رونے کے بجائے ہنسنے لگیں۔"

دو سال ہوئے ماما سبھاش کے بیاہ کی خبر لائی تھیں۔ ٹیومر کے علاج کے لیے دلی گئیں تھیں تو اچانک اس سے بھینٹ ہو گئی تھی۔ ٹیکسی میں وہ اپنی دلہن کے ساتھ وہاں آیا ہوا تھا۔ ماما نے اس کی دلہن کو دور سے دیکھا تھا۔ وہ شاپنگ کر رہی تھی۔ سبھاش نے ان سے ملنے میں کوئی خاص جوش و خروش نہیں دکھایا۔ بے رخی سے رخصت ہو گیا۔ بس اتنا کہا کہ خط لکھے گا۔

ماما بہت خفا ہوئیں۔ کہتیں کہ سبھاش اب وہ سبھاش نہیں رہا۔ بالکل بدل گیا ہے۔ جسم بھر گیا ہے مگر آنکھوں کے نیچے سیاہی اتر آئی ہے۔ بات چیت کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ کھویا کھویا سا لگتا ہے مگر وہ اگلا سا کھلا پن نہیں ہے۔ کہیں اپنے اندر رکا ہوا بندھا ہوا سا لگتا ہے۔ ماما کے پوچھنے پر کہ اس نے شادی کی خبر کیوں نہ دی وہ ٹال گیا۔ ایک ہی چھوٹا سا جواب سب باتوں کا دیا..... خط لکھے گا۔

ماما کئی دن اس بات کو نہ بھول پائیں۔ ٹیومر سے زیادہ یہ چیز انھیں پریشان کرتی رہی سبھاش ــــ وہ سبھاش جسے وہ جانتی تھیں، جسے وہ گھر لائی تھیں۔ جسے وہ خط لکھا کرتی تھیں۔ جس کی وہ باتیں کیا کرتی تھیں ــــ وہ تو ایسا نہیں تھا..... ایسا اسے ہونا نہیں چاہیے تھا..... تیرہ سال ہو گئے تھے دیکھتے ہوئے، ملے ہوئے پھر بھی ــــ

ہے گی ؟" مگر میں کچھ نہ کہہ کر چپ چاپ اسے دیکھتی رہتی۔ وہ مسکراتی کوئی دھن گنگنانے لگتی۔ پھر یکایک اٹھ جاتی۔ "ممی مجھے ڈھونڈھ رہی ہوں گی" وہ کہتی۔ "ابھی آتی ہوں تو تب تک مچھلیوں سے دل بہلا۔ انڈے سے کہنا پڑے گا کہ اب تیرے لیے بھی ——"

میرے لیے کیا ؟

"ابھی سے کہوں گی، تو کیوں پوچھتی ہو ؟"

وہ چلی جاتی تو سجا ہوا ڈرائنگ روم سونا ہو جاتا۔ میں کھڑکی پاس چلی جاتی۔ کھڑکی کے پردے کوار سب کھنڈے لگتے۔ سانس رکتی سی معلوم ہوتی۔ جلدی جلدی سانس لیتی کہ کہیں پرانکائٹس سی کوئی اور بیماری نہ ہو جائے شاردا کی یاد آتی۔ برانکائٹس کا دورہ تھا تو اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

لان میں گنی اور بو کھیل رہے ہوتے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ریاں بھرتے ہوئے۔ گنی کو گرا کر بو اس کے پیٹ پر سوار ہو جاتا۔ اٹھنے کے لیے چھٹپٹاتی ہاتھ پیر پٹکتی مگر وہ اس کے کندھوں کو ہاتھوں دبائے اسے زمین سے چپکائے رہتا۔ جتنی وہ کوشش کرتا اتنا دبا دیتا۔ گنی چیخنے لگتی تو یکایک چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ گنی ہوئی اٹھتی، فراک سے آنسو پونچھتی اور پل بھر رہانسی رہ کر اس کے پیچھے دوڑنے لگتی۔ بو اسے دھمکاتا۔ وہ منہ چڑا دیتی۔ پھر دونوں لگتے۔ ایک چڑیا گھاس توڑ توڑ کر منہ میں بھرتی جاتی ——

شوبھا سے کتنی کتنی باتیں پوچھا کرتی تھی۔ وہ مچھلیاں کیسے زندہ رہتی ہیں ؟ جو کھانے کو انھیں دیا جاتا ہے، کیسے دیا جاتا ہے ؟ ان کی زندگی کتنے دنوں کی ہوتی ہے ؟ انڈے کہاں ہیں ؟ اور ایک بار پوچھ لیا تھا۔ "یہ پانچ چھ مچھلیاں ایک ایک ہی تو ہیں۔ ان کی جذباتی زندگی —— کی۔"

شوبھا نے ہنس کر پھر وہی بات کہہ دی تھی۔ "ارے میں تو انھیں بتانا ہی بھول گئی۔ اب ضرور کہہ دوں گی کہ جلدی سے تیرے لیے ..."

مجھے یہ مذاق اچھا نہ لگتا۔ وہ نہ جانے کیا سوچتی کہ میں ٹینک کے دیر تک کیوں کھڑی رہتی ہوں۔ میں اسے کیا بتاتی کہ میں پانی دیکھنے جاتی ہوں۔ کپی کورنگ کے پودوں کی تھک ؟ بلکہ بو دیکے جبڑوں کا ملنا اور بند ہونا۔ بوری پانی میں تیرتی ہوئی سنہری یاں اچھی لگتی تھیں، مگر ہر بار دیکھ کر من میں اداسی بھر جاتی تھی۔

سوچتی کیسے یہ پانی ہیں یہ ؟ کھلے پانی کے لیے کبھی ان کا جی نہیں ترستا ؟ کبھی انھیں محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک ایک اور اکیلی ہیں۔ ایک دوسرے کے اوپر نیچے اور آس پاس گزرتے ہوئے ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتی ہیں یا کبھی شیشے سے اس لیے ٹکراتی ہیں کہ شیشہ ٹوٹ جائے۔ شیشے کے اور آپس کے بندھن سے یہ آزاد ہو جائیں۔ شوبھا کہتی۔ "وہ دیکھیے اورنڈا ہے۔ یہ فین ٹیل ہے۔ سال میں ایک بار بسنت میں انڈے دیتی ہے۔ صرف دو سال ان کی زندگی ہوتی ہے۔ ہوا انھیں ریڈیمی ریئر سے دی جاتی ہے۔ پانی کا ٹمپریچر پچاس سے ساٹھ ڈگری فارن ہائٹ کے بیچ رکھنا ہوتا ہے۔ کھانے کو انھیں ڈرائی فوڈ دیتے ہیں، پر یہ بھی کھا لیتی ہیں۔ نیچے سمندری گھاس اس لیے بچھائی جاتی ہے کہ

میرے منہ سے سرد آہ نکل پڑتی۔ جانے وہ اس کا بھی کیا مطلب لیتی تھی ؟ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے ساتھ سٹائے کچھ سوچتی کھڑی رہتی۔ اس دن اس نے پوچھ لیا "سچ سچ بتا تو کسی سے پیار تو نہیں کرتی۔"

مجھے شیطانی سوجھی۔ کہا "کرتی ہوں"

اس نے میرے گال اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا "کس سے ؟"

میں ہنس دی۔ کہا "تجھ سے، ماما سے، مچھلیوں سے"

اس کے ناخون گالوں میں چبھنے لگے۔ وہ اسی طرح مجھے دیکھتی رہی۔

میں نے ہونٹ کاٹ کر پوچھا "اور تو ؟"

اس نے ہاتھ ہٹائے تو لگا جیسے میرے گال چھیل دیے ہوں۔ اس کی بھووں کے نیچے وہی ہلکی سی چھایا کانپ گئی، مگر اتنی ہلکی نہیں۔

اس نے سرگوشی سے کہا "کسی سے بھی نہیں"

"جانے کیوں میرا من بھر آیا۔ چاہا اس سے کہوں شادی کر لے۔ مگر کہا نہیں گیا۔ سوچا اس کی شادی سے ایک روز پہلے ایسی بات کہنا جرم ہوگا۔"

سبھاش کو آنا تھا۔ لوٹنے کی جلدی تھی بار بار ماما کو یاد دلا دیتی تھی کہ جمعرات کو ضرور چل دینا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آ جائے اور ہم لوگ

آئی آل ویز تھاٹ دا بوائے ہیڈ سوسائیڈل ٹنڈینسیز
(I always thought the boy had suicidal tendencies)

سہاش کا نیا پتہ امی نے انہی سے لیا تھا۔ ڈیڈی کئی دن بلا وجہ امی پر بگڑتے رہے۔ بگڑتے پہلے بھی تھے پر اتنا نہیں۔ امی چپ چاپ ان کی بات سن لیتیں۔ ان سے بحث نہ کرتیں۔ بحث کرنا انھوں نے تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ سخت سے سخت بات خاموشی سے سن لیتیں اور کام میں لگ جاتیں۔ کوئی کام ڈیڈی کی مرضی کے خلاف کرنا ہوتا تو اس کے لیے بھی بحث نہ کرتیں، چپ چاپ کر ڈالتیں۔ ڈیڈی سے کچھ کہتے یا مانگتے ہوئے جیسے ان کی ذات گھٹ جاتی۔ گھر کے خرچ تک کے لیے وہ کچھ نہ کہتیں۔ ڈیڈی خود سے جو دے دیں، دے دیں۔ کم پڑتا تو کم نا لیتیں یا مجھ سے کہہ لیتیں۔ مگر مجھے بھی ڈیڈی سے مانگنے نہ دیتیں۔

سہاش کو شکریہ کا خط خود نہیں لکھا۔ مجھ سے لکھایا۔ جو کچھ لکھا تھا مجھے بتا دیا۔ میرے خط کو سدھار بھی دیا۔ لکھا تھا ہم لوگ حادثہ کی خبر سن کر پریشان ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ایک بار وہ آکر مل جائے۔

خط پورا کر کے میں نے ماما سے پوچھا۔

"امی تم خود کیوں نہیں دیکھنے چلی جاتیں۔؟"

ماما نے سر ہلا دیا۔ میرے کہنے سے پہلے ایک بار ڈیڈی کے کمرہ کی طرف دیکھ لیا۔ ڈیڈی کسی سے بات کر رہے تھے "اسے آنا ہوگا آجائے گا"۔ ماما نے بے دلی کے ساتھ کہا۔ شاید ان دنوں ہاتھ زیادہ تنگ تھا۔ اس لیے گھر کا خرچ وہ بہت مشکل سے چلا رہی تھیں۔ انہی دنوں شوبھا کی شادی میں جانا تھا۔ اس کے لیے بھی پیسہ کی ضرورت تھی۔

جواب جلدی ہی آ گیا۔ پہلا خط جو کسی اجنبی نے مجھے لکھا تھا۔ لکھا تھا نزدیک ہی آؤں گا۔ اور مجھے ——— براؤن کیٹ تو اتنی بڑی ہو گئی کہ مجھے انگریزی میں خط لکھنے لگی۔

براؤن کیٹ وہ تب بھی مجھے کہا کرتا تھا۔ ماں جی کہتیں بلی کی طرح ہی گود میں لٹائے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہتا تھا۔ میں خاموش لڑکی تھی۔ دم گھٹنے لگتا تو بھی مخالفت نہ کرتی تھی، بہت ضد کرتی

ہے۔ میں نہیں کرتی تھی۔ ذرا سی بات پر وہ چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی ہے۔ آٹھ سال کی ہو پر پانچ سال کے بچوں کی طرح روتی ضد کرتی ہے۔ ماما اس کا بڑا لاڈ کرتی ہیں۔ کہتی ہیں "اس کی اپنی ضرورت ہے۔ اس کوئی چھوٹا بچہ نہیں ہے ایک وہی ہے جس سے وہ جی بہلا سکتی ہیں"۔ اچھا نہیں لگتا۔ کتنی ڈال (گڑیا) کی طرح پیاری لگتی ہے پر سوچتی ہوں کہ اگر بڑی ہو کر بھی ڈال بنی رہی تو؟ کانونٹ میں ایک ایسی لڑکی ساتھ پڑھتی تھی نام بھی تھا ڈالی۔ اس کی عادتوں سے سب کو چڑھ ہوتی تھی، مجھے خاص طور سے اچھے بھلے ہاتھ پیر، تندرست، اور گھوم رہے ہیں ڈال بنے۔ چھی۔

پر ماما نہیں مانتیں۔ بحث کرنے لگتی ہیں۔ دل میں شاید سوچتی ہیں کہ منی سے جلتی ہوں ——— میں بھی اور وہ بھی۔ کیونکہ دیر سے منی کے گال مسل کر اسے رلا دیتا ہے اس کی کاپیاں، پنسلیں چھین کر چھپا دیتا ہے۔ میں اسے بنا نہائے ناشتہ نہیں دیتی۔ خود سے کنگھی کرنے کو کہتی ہوں۔ ماما طعنہ دے دیتی ہیں تو برا لگتا ہے۔ اکثر وہ کہہ دیتی ہیں "تم لوگوں کے وقت حالات اچھے تھے۔ تجھے کانونٹ میں پڑھا دیا سب کچھ کر دیا۔ اس بیچاری کے لیے کیا کر پاتی ہوں۔" یہ بات بری لگتی ہے۔ پر چپ رہتی ہوں۔ "میں جو ایم اے کرنا چاہتی تھی وہ" ڈرتی ہوں ماما رونے لگیں گی۔ دن میں کسی نہ کسی سے کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہو جاتی ہے جس سے وہ رو دیتی ہیں۔ میں جان بوجھ کر ان کو رلانا نہیں چاہتی۔

سہاش کی گاڑی رات کو دیر سے پہونچی۔ دیر سے لانے کے لیے اسٹیشن پر گیا تھا۔ ہم لوگ تقریباً ناامید ہو گئے تھے۔ دو بار اس نے پروگرام بدلا تھا ہم لوگ گھر کی صفائی کر رہے ہوتے کہ تار آجاتا "چار دن کے لیے امبالہ چلا آیا ہوں۔ ہفتہ تک آؤں گا۔" پھر "کام سے دلی رکنا ہے، دوسرا تار دوں گا۔" مجھے بہت الجھن ہوتی، غصہ بھی آتا، اس سے زیادہ اپنے پر اور ماما پر ——— شوبھا کی شادی کے بعد ہم لوگ ایک دن بھی وہاں نہیں رکے، پہلی گاڑی سے ہی چلے آئے۔ آکر مکان کی صفائی کرنے میں ماں نہیں دکھالیں اور آپ ہیں کہ امبالہ جا رہے ہیں، دلی رک رہے ہیں، اس دن تار ملا پنجاب میل سے

"بیوی سندر مل گئی ہوگی۔" میں نے ماں سے کہا۔ "تبھی نہ آدمی سب ناتے رشتے بھول جاتا ہے ـــــ"

ماں پل بھر میری طرف دیکھتی رہیں جیسے اچانک انھیں لگا کہ میں بڑی ہوگئی ہوں، سیانی بات کر سکتی ہوں، انھوں نے بالوں کو سہلایا اور کہا۔ "ناتا رشتہ نہیں ہے پھر بھی میں سوچتی تھی کہ..."

"سچ اس کی سندر ہے نا" میں نے پھر پوچھ لیا۔

"ٹھیک سے دیکھا نہیں ـــــ" ماں بے رخی سے بولیں۔

"دور سے لگا تھا کہ سندر ہے۔"

تبھی .... "لفظ پر اپنی اٹھارہ سال کی عمر کا اتنا بوجھ میں نے ڈال دیا کہ ماں اس موڈ میں بھی مسکرا دیں۔

دو سال کوئی خط نہیں آیا۔ ماں نے بھی کوئی خط نہیں لکھا۔ اس بار ملنے کے بعد ان کا من کھنچ سا گیا تھا باتیں کبھی کر لیتیں مگر یہ ضرور کہتیں کہ خط نہیں لکھیں گی۔ ویسے مذاق میں کہہ دیتا۔ سبھاش کا خط آیا ہے۔ ماں جانتے ہوئے بھی شبہ کا اظہار نہ کر پاتیں پوچھ ہی لیتیں۔ "سچ مچ؟" میں الجھتی کہ وہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ ویرے جھوٹ بولتا ہے۔ ماں خاموش ہو رہتیں۔ اکیلے میں مجھ سے کہتیں۔ "جانے کیا ہو گیا ہے میں مناتی ہوں کہ خوش ہو، خوش ہو۔ اس دن ٹھیک سے بات کر لیتا تو اتنی پریشانی نہ ہوتی ......"

میں سرہانے اور تتلیاں گنتی رہتی۔ ان دنوں عادت سی ہو گئی تھی جب بھی ماں کے پاس بیٹھتی۔ اچس کھول لیتی اور تتلیاں گننے لگتی۔

اس دن کوئی باہر سے آیا تھا۔ ماں اور ڈیڈی کے اس زمانے کے شناسا تھے جب وہ سیالکوٹ میں تھے۔ شاید سب ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ یہاں اپنی ایجنسی دیکھنے آئے تھے۔ ڈیڈی کو پتہ چلا تو کھانے پر بلا لائے۔ کچھ کام بھی تھا شاید ان سے۔ ماں اس بات سے خوش نہیں تھیں۔ سیالکوٹ میں شاید وہ اتنے بڑے آدمی نہیں تھے۔ ماں ان دنوں کی نظر سے ہی انھیں دیکھتی تھیں۔

وہ آئے اور کافی دیر بیٹھے رہے۔ بہت دنوں بعد ڈیڈی نے اس دن وہسکی پی خوب گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ پہلے کمرے میں دونوں اکیلے تھے پھر انھوں نے ماں کو بھی بلا لیا۔ ماں تھوڑی دیر کو بیچ میں جا بیٹھی۔ پانی یا پاپڑ دینے کے لیے میں بیچ بیچ میں اندر جاتی تو مجھے دیکھ کر انھوں نے کہا۔ "یہ بالکل ویسی ہی نہیں لگتی جیسی کشل یا ان دنوں لگا کرتی تھی۔ اتنے سال نہ بیت گئے ہوتے تو میں باہر اسے کہیں دیکھ کر یہی سوچتا کہ ـــــ"

مجھے اچھا لگا ـــــ ماں ان دنوں کی اپنی تصویروں میں بہت سندر لگتی تھیں تبھی ماں سے کہا بھی کرتی تھی کہ میں بھی آپ جیسی لگتی ہوں۔ یہ مجھ سے پہلے کسی نے نہیں کہا تھا۔

ایک بار اندر گئی۔ تو وہ کسی ڈاکٹر شمبھو ناتھ کا ذکر کر رہے تھے کہہ رہے تھے پارٹیشن میں ڈاکٹر کا سارا خاندان تباہ ہو گیا۔ ایک لڑکے کو چھوڑ کر جس دن ایک مسلمان نے گلیں دیکھ کر لوٹتے ہوئے ڈاکٹر کو چھرا گھونپ کر مارا ـــــ

ماں نبی کو سلانے کے بہانے اٹھ گئیں۔ جو پہلے ہی سو گئی تھی۔ پر لوٹ کر نہیں آئیں گم سم سی پائینتی بیٹھی رہیں میں نے پاس جا کر کہا "ماں" تو ایسے چونک اٹھیں جیسے اچانک کیل پر پیر آ گیا ہو۔

کھانے کے وقت پھر وہی ذکر شروع ہو گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ شمبھو ناتھ کا لڑکا بھی کوئی خاص ترقی نہیں کر پایا۔ بیوی کے مرنے کے بعد شمبھو ناتھ نے کس طرح اسے پالا تھا کیا لال اور گول مٹول بچہ تھا ادھر اس کا بھی ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"سبھاش کو ایکسیڈنٹ ہوا ہے ـــــ؟" ماں جو بات کو ان سنا کر رہی تھیں یکایک بول اٹھیں۔ ڈیڈی نے خالی ڈونگا مجھے دے دیا کہ اور گوشت لے آؤں۔ ان کے چہرے سے مجھے لگا جیسے یہ بات پوچھ کر ماں نے کوئی جرم کیا ہو۔

میں گوشت لے کر پہنچی تو ماں روہانسی ہو رہی تھیں۔ وہ صاحب بتا رہے تھے ـــــ "..... سنا ہے کہ گھر میں کچھ ایسا ہی سلسلہ چل رہا تھا۔ اصلیت کیا ہے کیا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں ان کے ایک خاص دوست نے مجھے بتایا کہ وہ جان بوجھ کر چلتی موٹر کے سامنے ـــــ"

ڈیڈی نے مجھے پھر باورچی خانے بھیج دیا۔ اس بار میز پر چاول اور روٹیوں کی ضرورت تھی واپس پہنچی تو ڈیڈی کو کہتے سنا۔

اسے کیسے پہچانا۔ کہتا "یہ گاڑی سے اتر کر ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں اور میں ان کے پاس کھڑا مسکرا رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں کہ کب مایوس ہو کر چلنے کو ہوں تو ان سے بات کروں۔ یہ اور سب لوگوں کو تلاش کرتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مجھے ہی نہیں دیکھتے ہیں جو ان کے پاس ان سے سٹ کر کھڑا ہے میں اترنے سے پہلے سے جانتا ہوں کہ مجھے لینے آیا ہوں وہ بھی پریشان حال آدمی ہے۔"

ماما ٹوکتیں، کسی اور کو بھی بات کرنے دے مگر دیرے اپنی بات کہے جاتا۔ ہم سب ہنسنے لگتے پر سباش گمبھیر بنا رہتا۔ تھوڑا مسکرا دیتا بس۔ کبھی مجھے لگتا کہ وہ بن رہا ہے مگر اس کی آنکھوں میں دیکھتی تو لگتا کہ وہ کسی گہرائی میں ڈوبا ہے جہاں سے ابھر نہیں پا رہا ہے اس کا ہاتھ بار بار ادھڑے ہوئے کالر کو ڈھانکنے کے لیے پہونچ جاتا۔

"قمیض صبح پہن لو، دیدیا، کا دھلی دے گی۔" ماما نے کہا تو وہ جھینپ گیا۔ پہلی بار آنکھ بھر کر اسنے دیرے کی طرف دیکھا۔ پھر کھڑے ہوئے کالر کو ڈھکنے کی اس نے کوشش نہیں کی۔

حیران تھی کہ سب سے زیادہ باتیں ڈیڈی نے کیں۔ انھوں نے ہی اس سے سب کچھ پوچھا۔ ایکسیڈنٹ کیسے ہوا؟ اسپتال میں کتنے دن رہنا پڑا۔؟ زخم زخم گہرا تو نہیں —— اور دہ، آجکل کہاں ہیں؟ شادی شدہ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ ماما کو اچھا لگا کہ یہ سب کچھ انہیں ہی پوچھنا پڑا۔ انھیں تو ڈر تھا کہ ڈیڈی اس بار زیادہ بات چیت نہیں کر پائیں گے۔ دس منٹ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اٹھ جائیں گے۔ پھر صبح پوچھ لیں گے۔ "ناشتہ کمرے میں کرنا چاہو گے یا باہر میز پر؟"

اسے بھی شاید ڈیڈی سے ہی بات کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ ہم سب طرف سے ایک طرح سے مایوس تھا۔ ہم میں سے کوئی بات کرے تبھی وہ اس کی طرف دیکھتا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ ماما اسے ایک ٹک دیکھ رہی ہیں جیسے آنکھوں سے ہی اس کے ماتھے کے زخم کو سہلا دینا چاہتی ہوں۔ بیچ میں اٹھیں اور ساتھ کے کمرے سے اپنا شال لے کر آ بولیں۔ "ٹھنڈ ہے، اوڑھ لو۔ اوڑھ کر بات کرتے رہو۔"

اس نے شال بھی کچھ کہے بغیر اوڑھ لیا۔ ڈیڈی جو کچھ پوچھتے رہے اس کا جواب دیتا رہا۔ ڈرائیور اچھا تھا —— شاید برک بھی —— دماغ پر چوٹ نہیں آئی ہے۔ ڈسکارڈ سے ٹکر تھی، پہیہ اوپر نہیں گیا —— زخم دس دن میں بھر جائے گا۔ بائیں ہاتھ کی کہنی ٹھیک سے نہیں اٹھتی —— ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس میں پانچ چھ مہینے لگیں گے اس کے بعد بھی پوری طرح شاید ہی ٹھیک ہو۔

اس وقت بھی مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اندر ہی کہیں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے ہونٹ رہ رہ کر کسی خیال سے کانپ جاتے تھے۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس سے یہ تمام باتیں نہ پوچھی جائیں، اسے چپ چاپ سو جانے دیا جائے۔ اس کا بستر بچھا ہوا تھا، اسی پر وہ بیٹھا تھا۔ پھر بھی مجھے لگا کہ تکیہ کا غلاف ٹھیک نہیں ہے، بیچ سے سلا ہوا ہے۔ میں چپ چاپ تکیہ اٹھا کر غلاف بدلنے چلی گئی۔

دھلا ہوا دوسرا غلاف نہیں ملا۔ سارا ٹرنک چھان مارا۔ ایک کورا غلاف تھا۔ کڑھا ہوا۔ ان دنوں کا جب نئی نئی کڑھائی شروع کی تھی۔ آخر وہی چڑھا کر تکیہ باہر لے آئی۔

آ کر دیکھا تو اس کا چہرہ بدلا ہوا لگا۔ ماتھے پر شکنیں نہیں اور سگرٹ کے چھوٹے سے ٹکڑے سے وہ جلدی جلدی کش لے رہا تھا۔

ماما کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ ڈیڈی بہت گمبھیر ہو کر سن رہے تھے وہ ایک ایک لفظ کو جیسے چبا رہا تھا نہیں تو —— نہیں تو میرے ہاتھوں اس کا قتل ہو جاتا —— یہ نہیں کہ میں سمجھتا نہیں تھا —— اسنے مجھ سے کہہ دیا ہوتا تو بات دوسری تھی —— ہر انسان کو اپنی زندگی جینے کا حق ہے —— مگر اس طرح —— مجھے اس سے زیادہ اپنے سے نفرت ہو رہی تھی ——"

ماما نے گہری نظر سے مجھے دیکھا کہ میں وہاں سے چلی جاؤں۔ مگر میں انجان بنی رہی جیسے اشارہ سمجھا ہی نہ ہو۔ پیروں میں کھنچاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ پیروں کو دری پر رگڑنے لگوں بل اوور کے نیچے بغلوں میں پسینہ آ رہا تھا سوچنے لگی کہ صبح نہائی تھی یا نہیں —— پر نہائی تو تھی ——

کمرے میں خاموشی چھائی تھی دیرے یوں آنکھیں جھپک رہا تھا۔ جیسے اچانک اس پر تیز روشنی آن پڑی ہو۔ اس کے ہونٹ کھلے تھے۔ ڈیڈی ڈریسنگ گاؤن کے اندر سے اپنی بانہوں کو دبا رہے تھے۔

کر رہا ہوں۔" تو میں نے ماما سے کہہ دیا کہ میں گھر ٹھیک نہیں کروں گی، میری بلا سے کوئی آئے نہ آئے"۔ دیرے کہہ رہا تھا۔ "ضرورت بھی نہیں ہے ابھی دوسرا تار بھی آ جائے گا"۔ ——— دوسرا تار تو نہیں آیا پر دیرے کو ایک بار اسٹیشن جا کر لوٹنا ضرور پڑا۔ پنجاب میل اس دن چھ گھنٹہ لیٹ تھی۔

ماما کو برا نہ لگے اس لیے گھر میں نے ٹھیک کر دیا مگر خود سونے چلی گئی۔ ڈیڈی بھی اپنے کمرے میں جا کر سو گئے رہتے۔ ماما کنی کو سلا کر میرے پاس آ کر لیٹ گئیں شاید مجھے جگائے رکھنے کے لیے۔ میں کنمنا کر کہتی رہی نہ "ممی اب مجھے سو جانے دو" ——— حالانکہ نیند آئی نہیں تھی۔ ماما نے بہت دنوں بعد بچوں کی طرح میرا دلار کیا۔ میرے گال چومتی رہیں۔ نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہیں۔ "میری رانی بچی ——— اچھی بچی" "میری رانی ماں اچھی ماں" مجھے گدگدی سی لگی اور میں اٹھ کر بیٹھ گئی، کہا ——— "کیا کہہ رہی ہو ممی؟" ماما نے جیسے سنا ہی نہیں آنکھیں بند کئے پڑی رہیں صرف ایک ٹھنڈی سانس لی۔

ٹاپوں اور گھنگھروؤں کی آواز سے ہی مجھے لگ گیا تھا کہ تانگہ سیھاش کو لے کر آ رہا ہے۔ اور کئی تانگے سڑک سے گزرے تھے مگر ان کی آواز سے یہ احساس نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ آواز سنائی اس وقت دی جب سچ مچ آنکھوں میں نیند بھر آئی تھی۔ آنکھیں کھول کر ہوشیار ہوئی تو دیرے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ وہ سائیکل سے آیا تھا۔ ماما جلدی اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئیں۔

عجیب سا لگ رہا تھا مجھے، بیٹھک میں جانے سے پہلے کچھ دیر پردے کے پیچھے رکی رہی، جیسے کسی اونچے پل سے دریا میں چھلانگ لگانی ہو۔ کانونٹ کے دنوں میں کافی بہادر تھی ہر ایک کے سامنے بے جھجک چلی جاتی تھی۔ جھجک بناوٹی معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس وقت نہ جانے کیوں میں پس و پیش میں تھی یہ شاید اپنے ذہن کی پیداوار تھی۔ اس نام سے ایک آدمی کو پہلے سے جان رکھا تھا ——— سنی سنائی باتوں سے، کتنے ہی مجھے اس آدمی کے ساتھ بتائے بھی تھے ——— ماما کی ڈبڈبائی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ——— اس کی ایک تصویر ذہن میں نقش ہو گئی تھی۔ جو ڈر تھا اب ٹوٹنے جا رہا تھا ——— کوئی بھی آدمی ویسا کیسے ہو سکتا ہے جیسا ہم سوچ کر اسے جانتے ہیں؟ ویسا ہوتا تو پردہ اٹھنے پر میں ایک لمبے آدمی کو سامنے دیکھتی جس کے بال بکھرے ہوتے، داڑھی بڑھی ہوتی اور جو مجھے دیکھتے ہی کہتا۔ "براؤن کیٹ (Brown Cat) تو تو سچ مچ لڑکی نظر آنے لگی ———"

مگر جسے دیکھا وہ منجھلے قد کا گورا آدمی تھا۔ اس طرح کھڑا تھا جیسے کٹہرے میں بیان دینے آیا ہو۔ ماتھے پر زخم کا گہرا نشان تھا، قمیض کا کالر نیچے سے ادھڑا تھا جسے وہ ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا۔ ڈیڈی سے وہ کہہ رہا تھا ——— "میں نے نہیں سوچا تھا کہ گاڑی اتنی دیر سے پہنچے گی۔ ایسے غلط وقت آ کر آپ سب کی نیند خراب کی۔

میں نے ہاتھ جوڑے تو پریشان سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔ پوچھا بھی نہیں، یہ نیرو ہے؟

آدھی رات بنا سوئے نکل گئی۔ ڈیڈی بھی ڈرائنگ روم میں سکڑ کر بیٹھے رہے۔ میں نے دو بار کافی بنا کر دی۔ دیرے کچن میں جا کر مجھ سے کہتا "ایک پیالی میں نمک ڈال دے، میٹھی کافی ایسے آدمی کو اچھی نہیں لگتی۔"

"تو نے تو ساری زندگی ایسے آدمیوں کے ساتھ گزاری ہے نا" میں اسے ہٹاتی کہ بھاپ اس کی یا میری انگلیوں سے نہ چھو جائے۔

"ساری نہ سہی، تجھ سے تو زیادہ گزاری ہے۔" وہ انگلی سے میرے کیتلی والے ہاتھ پر گدگدی کرنے لگتا۔ "وہ اسٹیشن سے اکیلا ساتھ لے کر آیا تھا۔"

"ہٹ جا کیتلی گر جائے گی۔" میں اسے جھڑک دیتی، دیرے منہ بنا کر اسی کمرے میں چلا جاتا۔ کہتا۔ "دیکھئے صاحب اور باتیں بعد میں کیجئے گا۔ پہلے اس لڑکی کو تھوڑی تمیز سکھائیے۔ بڑے بھائی کی عزت کرنا یہ نہیں جانتی۔ اس سے سال بھر بڑا ہوں مگر مجھے ایسے جھڑک دیتی ہے جیسے سکینڈ اسٹینڈرڈ میں پڑھتا ہوں۔ کہہ رہی تھی کہ آپ کافی میں چینی کی جگہ نمک پیتے ہیں میں نے منع کیا تو مجھ پر بگڑنے لگی۔

دیرے نہ ہوتا تو شاید وہ بالکل نہ کھل پاتا۔ کبھی دیرے کالج کا کوئی قصہ سنانے لگتا، کبھی ہنسانے لگتا کہ اس نے اسٹیشن پر

کی ——— "جہاں تک حقیقت کی تلاش کا سوال ہے ——"

مگر بات آگے نہیں بڑھی۔ سبھاش نے جیسے کچھ اور سوچتے ہوئے ان کی ہر بات کی حمایت کر دی۔ ڈیڈی نے ہر ایک سے ایک ایک بار کہا "آج سگار پی رہا ہوں تو اچانک لگ رہا ہے میں اس کا ٹیسٹ ہی بھول گیا تھا۔"

شام کو ویرے اسے گھمانے لے گیا۔ ماما اس وقت منڈی جا رہی تھی۔ میں بھی ان لوگوں کے ساتھ باہر نکلی روز ویرے اور میں گھومنے جاتی ہوں۔ سوچا آج بھی ساتھ جاؤں گی۔ ڈیڈی سگار کے دھوئیں میں گھرے بیٹھک میں اکیلے بیٹھے تھے۔ مجھے باہر نکلتے دیکھ کر بولے۔ "تو بھی جا رہی ہو نیرو؟"

میری زبان اٹک گئی کسی طرح کہا "ماما کے ساتھ مندر جا رہی ہوں۔" احاطے سے باہر آ کر ماما کے ساتھ بڑھ گئی۔ راستہ بھر سوچتی رہی کہ کیوں نہ کہہ سکی کہ ویرے کے ساتھ گھومنے جا رہی ہوں۔ کہہ دیتی تو کیا ڈیڈی جانے سے منع کر دیتے۔

ویرے لوٹ کر آیا تو بہت پرجوش تھا۔ کہہ رہا تھا "میں آپ کو پڑھنے کے لیے بھیجوں گا۔ آپ پڑھ کر لوٹا دیجئے"

بٹوین یو اینڈ می (Between you and me)

دونوں بیٹھک میں تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر ویرے خاموش ہو گیا جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر مجھ سے بولا "تیرے لئے نیرو آج ایک بال پائنٹ دیکھ کر آیا ہوں۔ تو کتنے دنوں سے کہہ رہی تھی کل جاؤں گا تو لیتا آؤں گا یا تو میرے ساتھ چلنا۔"

سوچا یہ مجھے رشوت دے رہا ہے ——— کس بات کی۔؟

ویرے اپنا ماؤتھ آرگن لے آیا۔ ایک کے بعد ایک دھن بجانے لگا۔ "دِس از مائی فرینڈز فیورٹ۔" (This is my friends favourite)

ایک دھن سنا چکنے کے بعد اس نے کہا۔ پر سبھاش اس وقت میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" ویرے کو لگا سبھاش نے اس کا مطلب نہیں سمجھا۔ "وہی فرینڈ جس کا میں نے ذکر کیا تھا مائی اونلی فرینڈ" (My only friend)

میں چاہ رہی تھی کہ کوئی اور بھی اس سے کہے کہ وہ ایک دن رک جائے۔ مگر کسی نے نہیں کہا۔ ماما نے بھی نہیں۔ مندر سے آ کر شاید ڈیڈی سے ان کی کچھ بات ہوگئی تھی۔ میں اس وقت رات کے لیے تلیاں بنا رہی تھی۔ سب کہتے تھے کہ میں تلیاں اچھی بناتی ہوں۔ پر مجھے لگ رہا تھا کہ آج اچھی نہیں بنیں گی۔ جل جائیں گی یا کچی رہ جائیں گی۔ تبھی ماما ڈیڈی کے پاس سے اٹھ کر آئیں نل کے پاس جا کر منہ دھویا۔ ایک گھونٹ پانی پیا اور تولیہ ڈھونڈتی چلی گئیں۔

کھانا کھلاتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا "تلیاں اچھی بنی ہیں؟"

وہ چونک پڑا۔ اسی طرح جیسے ماما بتاتی تھیں۔ آدھی کھائی ہوئی تلی پلیٹ سے اٹھاتا ہوا بولا "ابھی بتاتا ہوں۔"

کھانا کھانے کے بعد وہ سامان باندھنے لگا۔ سوٹ کیس میں چیزیں بھر رہا تھا تو میں پاس چلی گئی۔ "مجھے بتا دیجئے میں رکھے دیتی ہوں ———" میں نے کہا۔

"ہاں ..... اچھا۔" کہہ کر وہ سوٹ کیس کے پاس سے ہٹ گیا۔

"کیسے رکھنا ہے، بتا دیجئے۔"

"کیسے بھی رکھ دو۔ ایک بار کچھ نکالوں گا تو سب کچھ الجھ جائے گا ———"

"میں نے صبح کچھ بات کہی تھی" میری آواز بیٹھ گئی۔

"کیا بات؟"

"رکنے کے بارے میں ...."

"ہاں رک تو جاتا مگر ———"

ویرے پھر اچانک ہوا آ گیا "آپ کہہ رہے تھے طبیعت گھبرا رہی ہے" وہ بولا "یہ نمبو لے لیجئے۔ راستہ میں کام آئے گا۔ ایک کاغذ میں نمک مرچ بھی ہے نیرو کو دے دیتا ہوں۔ اس لڑکی کے ہاتھ کا کھانا کھا کر کسی کی بھی طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔"

ماما کالے شال میں آگے کو ایسے جھک گئی تھیں جیسے کبھی کبھی ٹیومر کے درد کے مارے کیا کرتی تھیں۔ باہر بھی خاموشی تھی۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے آتی ہوئی ہوا پردے میں سے جھانک کر لوٹ جاتی تھی۔

تبھی ڈیڈی نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب سو جانا چاہیے" انھوں نے کہا "تین بج رہے ہیں"

صبح جو چہرہ دیکھا اس نے مجھے اور چونکا دیا۔ بڑھی ہوئی داڑھی، سنولایا ہوا رنگ ——— ایک ہاتھ سے اپنے گھنگھرالے بالوں کو سلجھاتا ہوا وہ اخبار پڑھ رہا تھا۔

"آپ کے لیے چائے لے آؤں۔" پہلی بار میں نے اس سے سیدھے کچھ پوچھا۔

"ہاں ہاں" اس نے کہا اور اخبار سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ میں کئی لمحوں تک اس کی آنکھوں کا سامنا کیے رہی۔ یقین نہیں تھا کہ وہ دوسری بار بھی اس طرح میری طرف دیکھے گا۔

"رات کو ہم لوگوں نے خواہ مخواہ آپ کو جگائے رکھا۔" میں نے کہا "آج رات کو ٹھیک سے سوئیے گا۔"

اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آئی جیسے اس سے مذاق کیا گیا ہو۔

"گاڑی میں خوب گہری نیند آتی ہے نا" اس نے کہا۔

"آپ آج چلے جائیں گے۔؟"

اس نے سر ہلایا "ایک دن کے لیے بھی مشکل ہی سے آیا ہوں۔"

"وہاں ضروری کام ہے؟"

"بہت ضروری نہیں۔ لیکن کام ہے۔ پہلی نوکری چھوڑ دی ہے۔ دوسری کے لیے کوشش کرنی ہے۔"

"ایک دن بعد جا کر کوشش نہیں کی جا سکتی؟" یکایک مجھے لگا کہ میں یہ سب کیوں کہہ رہی ہوں۔ ڈیڈی سنیں گے تو کیا کہیں گے۔

"پرسوں ایک جگہ انٹرویو ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ تو پرسوں ہے نا کل تو نہیں ———" اور میں باہر چلی آئی۔ اس کی آنکھوں میں اور دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

اس نے وہ بات بھی کہہ دی جو میں چاہتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کنّی کو گود میں بٹھائے ہوئے اس نے کہا "ان دنوں نیرو اس سے چھوٹی تھی۔ میں بالکل براؤن کیٹ لگتی تھی۔ ایسے خاموش رہتی تھی جیسے منھ میں زبان ہی نہ ہو۔"

"میں بھی تو خاموش رہتی ہوں۔" کنّی مچل اٹھی۔ "میں کب بولتی ہوں؟"

اس نے کنّی کو پیٹ کے بل گود میں لٹا لیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ میں نے سوچا تھا کنّی اس پر شور مچائے گی، ہاتھ پیر پٹکے گی۔ مگر وہ گم سم ہو کر پڑی رہی۔ میں دیکھتی رہی کہ کیسے اس کے ہاتھ پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اوپر جاتے ہیں پھر نیچے آتے ہیں۔ کمر کے پاس ہلکی سی گدگدی کرتے ہیں اور کولھے پر چپت لگا کر پھر سر کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی کنّی سے اس طرح پیار جتاتا تو وہ اسے نوچنے کو ہو جاتی۔ سہلاتے ہاتھ کے تو اس نے جھک کر کنّی کے بالوں کو چوم لیا اور کہا "یہ بچی تو بہت خاموش لڑکی ہے۔" کنّی اسی طرح پڑی پڑی ہنستی۔ اور بھی کتنی دیر وہ اس کی پیٹھ سہلاتا رہا۔ بیچ بیچ میں اس کی آنکھیں مجھ سے ٹکرا جاتیں۔ مجھے لگتا جیسے وہ دور کسی بیابان میں دیکھ رہا ہو۔ مجھے اپنا آپ ہی اپنے سے دور بیابان کھویا سا لگتا۔ یہ بھی لگتا کہ میری آنکھوں سے کہہ رہی ہوں کہ جسے تم سہلا رہے ہو وہ براؤن کیٹ نہیں ہے۔ میں یہاں سے دور، براؤن کیٹ میں ہوں۔ اندھیرے میں کھڑی ہوں۔ چاہ رہی ہوں کہ کوئی مجھے آکر دیکھ لے اور گود میں اٹھا لے۔

ڈیڈی دن بھر گھر میں رہے۔ کام پر نہیں گئے۔ اس کمرہ سے اس کمرہ میں جاتے، اس کمرہ سے اس کمرہ میں چلے آتے۔ بہت دنوں سے سگار پینا چھوڑ رکھا تھا۔ اس دن پرانے ڈبے میں سے سگار نکال کر پیتے رہے۔ دو ایک بار انھوں نے اس سے بات چھیڑنے کی کوشش

میں چپ چاپ چیزیں سوٹ کیس میں رکھتی رہی۔ وہ ویسے کے ساتھ ڈیڈی کے کمرے میں چلا گیا۔

اس نے چلنے کی بات کہی تو مجھے لگا کہ جیسے کسی نے کپڑے اتار کر مجھے ٹھنڈے پانی میں دھکیل دیا ہو۔ ڈیڈی سگار کا ٹکڑا پیالی میں بجھا رہے تھے۔ وہ ڈیڈی کے پاس چارپائی پر بیٹھا تھا۔ ماما دیرے اور میں سامنے کرسیوں پر تھے۔ کتنی کچھ دیر رد کر ڈیڈی کی چارپائی پر ہی سو گئی تھی۔ سونے سے پہلے چلا رہی تھی "ہم پھر شو بھابھی کی شادی میں جائیں گے۔ ہمیں وہاں سے جلدی کیوں لے آئیں تھیں۔ وہاں ہم بیو کے ساتھ کھیلتے تھے۔ یہاں سب لوگ باتیں کرتے ہیں۔ ہم کس کے ساتھ کھیلیں۔؟"

"سوئی ہوئی کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ میں سوچنے لگی میں جب اتنی بڑی تھی تب میں کیسی لگتی تھی؟"

وہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ رکتے ہوئے اس نے کتنی کے بالوں کو سہلا دیا۔ پھر ایک بار بھری بھری نظروں سے مجھے دیکھ لیا۔ مجھے لگا میں نہیں، میرے اندر کوئی اور چیز ہے جو سہم گئی ہے۔

تانگہ کھڑا تھا۔ بیرے پہلے سے لے آیا تھا۔ ہم سب نکل کر احاطہ میں آ گئے۔ بیرے نے سائیکل سنبھال لی۔

"انٹرویو کا پتہ دینا" وہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ماما نے کہا۔

اس نے سر ہلایا اور ہاتھ جوڑ دیا۔

میں ہاتھ نہیں جوڑ سکی۔ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ تانگہ موڑ پر پہنچا تو مجھے لگا کہ اس نے ایک بار پھر مجھے انہی نظروں سے دیکھ لیا ہو۔ ماما عادت سے مجبور اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ڈیڈی اندر چلے گئے تھے۔ میں کمرہ میں پہنچی تو لگا جیسے اب تک گھر کے اندر تھی اب گھر سے باہر چلی آئی ہوں۔

رات کو ماما پھر میرے پاس آئیں۔ مجھے انھوں نے باہوں میں لپیٹ لیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اسے گاڑی میں سونے کی جگہ ملی ہوگی یا نہیں۔ نہ جانے مجھے کیوں لگ رہا تھا کہ اسے نیند کبھی نہیں آتی وہ نیند سے بچھڑا جا چکا ہے۔ تب بھی اس کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور اندھیرے کی پرتوں میں کچھ تلاش کرتی رہتی ہیں۔

ماما مجھے پیار کر رہی تھیں پر ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں "ماما رو کیوں رہی ہو۔" میں نے بڑوں کی طرح انھیں پچکارا "تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ حادثہ اتنا زبردست نہیں ہوا۔ دنیا میں ایک عورت ایسی نکل آئی تو ——"

پر ماما کا رونا اور بڑھ گیا۔ مجھے بھرم ہوا کہ شاید رو میں رہی ہوں خاموش ماما کرا رہی ہیں میں نے اپنے اور ان کے جسم کو ایک بار چھو کر دیکھ لیا۔

"نیرو ——" ماما کہہ رہی تھیں "تو میری طرح مت ہونا —— تیری ماما —— تیری ماما ——"

میں نے انھیں بہلایا جیسے انھیں دورہ پڑا ہو۔ "ایسا کیوں کہہ رہی ہو ماں؟" میں نے کہا "تمہارے جیسے دنیا میں کتنے لوگ ہیں؟ —— میں اگر تمہارے جیسی ہو سکوں تو ——"

ماما نے میرے منھ پر ہاتھ رکھ دیا "نہ نیرو ——" وہ بولی "اور جیسی بھی ہونا اپنی ماما جیسی کبھی نہ ہونا۔"

میں ماما کے سر پر تھپکیاں دینے لگی۔ جب ان کی آنکھ لگی ان کا سر میرے ہاتھ پر تھا۔ کمبل تین چوتھائی ان پر تھا اس لیے مجھے ٹھنڈک لگ رہی تھی۔ یا نہ جانے ہاتھ سن ہو گیا تھا۔ پر میں بنا ہلے ڈلے اسی طرح پڑی رہی پہلی بار مجھے لگا کہ اندھیرے کی کچھ اپنی آوازیں ہوتی ہیں۔ گہری رات کی خاموشی بے جان خاموشی نہیں ہوتی۔ اپنے سن ہاتھ کو میں اس طرح دیکھتی رہی جیسے میرے جسم کا حصہ نہ ہو کر وہ اور کوئی ہاتھ ہو —— اور نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ ماما کی آنکھ میں ایک آنسو اب بھی اٹکا ہوا تھا میں نے دوپٹے سے اسے پونچھ دیا۔ بہت آہستہ سے تاکہ ماما کی آنکھ نہ کھل جائے اور ان کے سر پر اسی طرح تھپکیاں دیتی رہی۔

میں نے جو طرز فغاں کی ہے چمن میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے

وشا پریم ودا

ترجمہ: عابد سہیل

سوال اور جواب

میک نے میں منہ پھلائے بیٹھی ہوں۔ ہنہ، وسوینس۔ بس ہر
ت سب کی ڈانٹ کھاتے رہو۔ کہیں ساتھ جانے کو کہو تو سب جھڑک
یں گے۔ تو کیا کرے گی؟ بڑے لوگوں کے بیچ نہ بولا کر۔ ہم جو سنیما
یکھنے جا رہے ہیں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ساتویں درجے
ں فرسٹ آئی ہوں۔ انگریزی میں سب سے زیادہ نمبر ملے ہیں۔ نہ مانو
بوا سے پوچھ لو۔ کیوں بوا، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ ہماری ٹیچر
سنہا لوبی نے نہیں کہا تھا کہ تمہاری زبان پڑھنے میں بڑی تیز ہو
ر اپنے درجہ کی سب سے اچھی لڑکی ہو۔ اب بھلا بوا کیوں نہیں
؟ بس کیشی بھیا سے باتیں کئے جائیں گی۔ باپ رے۔ ان
دونوں کی باتیں کبھی ختم بھی ہوں گی۔ میں ذرا سا بھی بولوں تو سارا
ر چلانے لگے گا اور خود ہیں کہ آدھی آدھی رات تک چھت پر بیٹھی
شی بھیا سے باتیں کرتی رہیں گی۔ تھکتی بھی تو نہیں۔ صبح اٹھیں گی
بھی پیاری پیاری لگیں گی جیسے جوہی کے پھول۔ سچ ان بوا
بھی کبھی بڑا غصہ آتا ہو۔ پر جہاں انھوں نے مسکرا کر ایک بار دیکھا
ا غصہ غائب ہو گیا۔ وہ باہیں پھیلا دیں گی اور میں دوڑ کر ان
سے لپٹ جاؤں گی۔ کیسا نرم نرم جسم ہے بوا کا۔ کتنی پیاری مہک
ہے اس سے۔ کل چرا کر ان کا صابن لگا لیا تھا۔ پھر نہیں کا
لم پاؤڈر۔ کیشی بھیا کی چائے دے کر گئی تو انھوں نے مسکرا کر کہا
تا تمہارے سے تو آج بڑی پہچانی سی خوشبو آ رہی ہے۔"

اور میں خوش ہو گئی۔ ان سے وعدہ لینے کے بعد میں نے بتا دیا کہ
ج میں بنتی بوا کے صابن سے نہائی ہوں۔ کیشی بھیا ایسے دیکھنے
تو بڑے اچھے لگتے ہیں۔ وہ کچھ بھی کہیں گے تو نہایت میٹھے

لہجہ میں۔ بے مطلب باتیں پوچھنے پر جھنجھلائیں گے نہیں۔ ابھی دن
بنو بوا ہنس کر کہہ رہی تھیں کہ تصویر بنا کر کسی کی زندگی گزر رہی ہے۔
کہیں کام دھام کریں۔ ٹھکانے سے لگیں۔ منجھلی بھابھی تم اپنے بھیا سے
کہتی کیوں نہیں کہ کچھ کریں؟ منجھلی بھابھی نے تڑاک سے کہا، میرے
بھائی کی فکر میں تم دبلی نہ ہو بنو بی بی۔ تم بس اپنی عاقبت سنوارو۔"
میں نے دیکھا کہ بنو بوا تلملا کر رہ گئیں۔ بنو بوا ہمارے گھر بہت دنوں
سے ہیں۔ سنتے ہیں پھوپھا نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ اماں کہتی ہیں پھوپھا
ولایت گئے تھے وہیں سے میم لے آئے اور انھیں میکے پٹک دیا۔
کیا کہتے بیچارے ان کی زبان سے پریشان تھے۔ میں سوچتی ہوں کہ
کیا پتا جی نے بھی ماں کو چھوڑ دیا؟ وہ بھی تو باہر رہتے ہیں اور بہت بہت
دنوں میں آتے ہیں۔ رات کو میں ماں کے پاس سوتی ہوں۔ اس بات دیر
تک ماں کے چہرہ کو دیکھتی رہی۔ ماں گوری ہیں اور ان کا چہرہ گول
لمبا ہے لیکن کیشی بھیا سے مختلف۔ ماں کم بولتی ہیں۔ اس گھر کی وہ
سب سے بڑی بہو ہیں۔ چاچی کا کچھا دادی کے پاس رہتا ہے پر دیکھ بھال
وہی کرتی ہیں۔ کیا انھیں بھی پتا جی نے چھوڑ دیا ہے۔ میں ماں سے
پوچھنا چاہتی ہوں پر ہمت نہیں ہوتی۔ ماں ہر وقت جھنجھلائی جھنجھلائی
سی رہتی ہیں۔ میں تو ڈرتی ہی رہتی ہوں کہ کس وقت ڈانٹ نہ پڑ جائے
اس وقت ماں خاموش ہیں۔ میں ان سے چپکنے لگتی ہوں پر ماں مجھے
دور ہٹا دیتی ہیں۔ کہاں چپک رہی ہو تا دور ہٹ، گرمی تجھے تو اب
لگ رہی نہیں؟

مجھے برا لگ جاتا ہے۔ صرف بنو بوا اس منجھلی بہن جی کو اپنے
پاس سلا سکتی ہیں پر تم مجھے ......"

کہتے ہیں ویسے ہی ہم سبھی ننّی کو پیار کرتے ہیں۔

"کہاں" میں نے پیر پھیلاتے ہوئے کہا۔ "ننّو بوا تو پیار نہیں کرتی۔ نہ ان کی سہیلی مسز ماتھر۔ نہ ہماری مہری کی لڑکی رضیہ ـــــ ننّو بوا تو ہر دم ان کی برائی کرتی رہتی ہیں۔ وہ مسز ماتھر کہہ رہی تھیں کہ کیٹی ننّی کو پیار کرتے ہیں"

کیٹی بھیا نے مڑ کر میرے دوسرے گال پر بھی رنگ لگا دیا اور کہا۔ "وہ سب بے وقوف ہیں۔"

ننّو بوا بے وقوف ہیں، یہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ہاں ـــ ں۔ جانے کیا سمجھتی ہیں اپنے آپ کو ننّو بوا تو ہر وقت جی جی جی کیا کرتی ہیں۔ اور ننّو بوا سیدھے منہ بولتی نہیں۔ جولائی میں جب پہلی بار ننّی بوا ہمارے گھر آئی تو ننّو بوا نے بڑی ناک بھوں چڑھائی۔ ننّی بوا کے پتا ہمارے بابا کے چچیرے بھائی تھے، خاندان بڑا اور پیسہ کم۔ پھر بھی ننّی بوا کو پڑھانے میں انھوں نے کمی نہ کی۔ دادی کہتی ہیں کہ ایسی لڑکی پورے خاندان میں نہیں ہے۔ تبھی تو وہ ننّی بوا کو اپنے پاس رکھنے پر راضی ہو گئیں جب مجھے پتہ چلا کہ ننّی بوا میرے ہی اسکول میں نوکری کریں گی تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کیونکہ ننّی بوا نے پہلے ہی دن مجھے موہ لیا۔ ننّی بوا سے بڑی چار بہنوں کی شادی کرنے میں ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ بوا جب بیٹھ کر مٹی کے برتنوں کو رنگتیں یا ان پر بیل بوٹے بناتیں تو میں انھیں دیکھ کر یہی سوچا کرتی کہ میں ان کی طرح کب ہو پاؤں گی۔ انھوں نے تو آ کر ہماری کایا ہی پلٹ دی۔ میرے کپڑے بنانے بال سنوارنے کا سارا کام اپنے سر لے لیا۔ دادی کے لیے ڈھیر سی دھوتیاں کاڑھیں، تایا جی اور چاچا جی کے لیے سوئیٹر بنے چھٹی کے دن رسوئی میں چلی جاتیں اور کوئی نہ کوئی ایسی چیز پکا ڈالتیں کہ سارے لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

ابھی اسی روز انھوں نے چاچی سے کہا کہ چھپی ہوئی ساڑی کے ساتھ چھینٹ کا بلاؤز نہیں پہننا چاہیئے تو ننّو بوا نے منہ سکوڑ لیا ننّی بوا کبھی سے چلا کر رہا کرتی ہیں۔ اوپر سے چھوٹی چاچی کی خوشامد کیا کرتی ہیں۔ چھوٹے چاچا جی نوکری پر ہیں نا۔ اور ساتھ ہی من میں گڈ بڈ بھی ہوا کرتی ہے۔ ایک دن پیار سے کہنے لگی "لتا

جا کے دیکھ تو چاچا چاچی کیا کر رہے ہیں۔" میں آ کر بتا ہی رہی تھی کہ اماں یکایک اندر سے نکل کر مجھے دھادھم کوٹنے لگیں۔ مجھے ایسا دھکا دیا کہ میں زمین پر گر پڑی۔ ساری کہنی چھل گئی۔ پھر چیخ کر بوا سے بولیں "تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں بی بی، میری لڑکی کو یہ گن ابھی سے نہ سکھاؤ۔" میں وہیں پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہی کہ میں نے ایسا کیا کیا کہ اماں مجھے اس طرح مارنے لگیں۔

بوا نے بڑے سخت لہجے میں کہا "میرا منہ نہ کھلواؤ بھابی، تم ایسی نہ ہوتیں تو میرے بڑے بھائی پردیس میں نہ پڑے رہتے۔ جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔"

اماں کا روپ اب بھی میرے سامنے ہے۔ ننّو بوا کو جھنجھوڑتے ہوئے انھوں نے کہا "بھابی سے نہیں ڈرتی ننّو بی بی۔ پھر ایسی بات کہی تو ان ہی ہاتھوں سے تمہارا گلا دبا دوں گی۔"

کیا تھا یہ سب۔ چاچا کے کمرہ میں جھانکنے پر بھی اتنا جھگڑا کیوں؟ ان کے پاس دیر تک بیٹھے رہنے پر اماں اتنا ناراض نہیں ہوتی تھیں چاچی فراک کے کپڑے لاتی ہیں اور چاچی میرے لیے ٹافی، پھر کمرے میں جھانکنے پر کیوں مارنے لگیں۔ میں ننّی بوا کی طرف چلی گئی۔ انھوں نے میرے آنسو پونچھ دیئے۔ "تو ننّو جیجی سے نہ بولا کرنا۔ کیوں گئی تھی چھوٹی بھابی کے کمرہ میں جھانکنے" ـــــ

میری سسکیاں دھیرے دھیرے کم ہوتی گئیں۔ پر مجھے ننّو بوا نے جس اندھیرے میں دھکیل دیا تھا اس سے میں ابھر نہ سکی۔

کیٹی بھیا نے پوچھا۔ "کیوں تم نے سگرٹ پی ہے کبھی؟" میں سسکیوں کے بیچ مسکرا دی۔ ایک دن چوری سے کیٹی بھیا کی سگرٹ پینے کی کوشش کی تھی۔ تو کھانستے کھانستے دم نکل گیا تھا گلے میں ایسا پھندا سا لگا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کیٹی بھیا خوب ہنسے تھے اور میری پیٹھ پر خوب دھول لگائے تھے۔

ننّی بوا اسی وقت پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ کیٹی بھیا پوری بات سن کر بوا سے انگریزی میں بولے۔ "لتا تو بڑی ہو رہی ہے۔ جیلوسی میں اسے سب کچھ بتا دینا چاہیئے۔" جیسے سمجھتے ہیں مجھے انگریزی نہیں آتی۔ سال بھر میں درجہ میں فرسٹ آئی ہوں۔ میں نے بے چینی سے ننّی بوا کی طرف دیکھا اور بوا کچھ شرما سی گئیں پھر انھوں نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور کچھ کہے بنا کھینچے چلی گئیں۔

تڑپتے اماں کا چانٹا میرے گال پر لگا میں منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھتی رہ گئی۔ "پھر کبھی ایسی بات کی تو منہ کچل دوں گی۔" اماں دانت پیس کر کہتی ہیں اور میں مار سے بچنے کے لیے کود کر ان کے پاس سے اتری اور باہر بھاگ گئی۔ برتن مانجھتی رتو مجھے دیکھ کر کھی کھی ہنستی ہے۔ ظالم کہیں کی۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر مجھ سے گندی گندی باتیں کرتی ہے۔

میں سیدھی دھڑ دھڑاتی ہوئی چو منزلے کی چھت پر چلی جاتی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ نشی بوا وہیں ہوں گی۔ اندھیری اور چکردار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے اس وقت ذرا بھی ڈر نہیں لگتا۔ بوا اور کیشی بھیا دیوار کے سہارے بیٹھے ہیں پاس پاس۔ میں جا کر دھم سے بوا کے پاس بیٹھ جاتی ہوں۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" بوا ہنسی ہو کر پوچھتی ہیں۔

میں شکایت کرتی ہوں۔ بوا کے ہونٹ گیلے گیلے سے ہیں ڈھیلے بال ان کے گالوں اور ماتھے پر جھول رہے ہیں۔ میں ان کے کندھے پر سر ٹکا کر آنکھیں موند لیتی ہوں۔ یہاں بیٹھ کر لگتا ہے کہ ہم لوگ تاروں کے کتنے قریب ہیں۔ گھر والوں کی چیخ پکار سے الگ۔ نیچے کی تین منزلوں میں دادی، تین چاچا اور ان کا خاندان رہتا ہے۔ ہر وقت لڑنے والی ننھو بوا، ان کی سہیلیاں اور سلائی اسکول کی ماسٹرنی۔ اس چھت پر کوئی نہیں آتا۔ تیسری منزل کا حصہ منجھلی چاچی کے پاس ہے اور گھر میں کسی کو فرصت نہیں ہے کہ اتنی ڈھیر ساری سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ شاید بوا سمجھتی ہیں کہ میں سو گئی۔ وہ بڑی آہستہ سے کہتی ہیں "ابھی نہ جاؤ کیشی، گرمی کی چھٹیوں میں چلے جانا۔ تمہارے ہی آسرے تو میں یہاں رہ رہی ہوں۔" میں ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہوں کیشی بھیا نے بوا کا ہاتھ لے کر اپنی آنکھوں سے لگایا۔ انھیں اس وقت کیسا لگا ہوگا میں بوا کا دوسرا ہاتھ لے کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیتی ہوں۔ بالکل کیشی بھیا کی طرح اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں شرما گئی۔ پھر بھی بوا کی بھیگی ہوئی ہتھیلی پکڑے ہی رہی۔ بوا نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

آسمان میں آدھا چاند ہے۔ ہوا میں ہلکی سی ٹھنڈک ـــــ بوا کا چہرہ اس وقت کیشی بھیا کی برش سی پینٹنگ ہے۔ بوا اسی کو دیکھ رہی ہیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا، پگھلتا ہوا سا احساس ہے، اور چہرے پر بڑی ملائمت۔ یکایک وہ مجھے اپنے قریب بلا کر بھینچ لیتی ہیں۔

"تو گرمیوں میں میرے ساتھ چلے گی نا؟ میں تجھے پہاڑ پر لے جاؤں گی۔ رانی کھیت چلے گی نا؟" میں جواب دیے بغیر انھیں دیکھتی رہتی ہوں۔ عجیب ہیں یہ سب بڑے لوگ۔ بغیر کسی بات کے ماں جھڑک دیں گی اور بلا سبب نشی بوا اندھا دھند پیار کرنے لگیں گی۔ میں ان کے سینے میں منہ چھپا لیتی ہوں۔ بوا کی اپنی بھینی بھینی خوشبو۔ بوا کے وجود کی خاموشی میں ڈوبے ہوئے مجھے یہ خیال آتا ہے کبھی میں بھی بڑی ہوں گی۔ انہی کی طرح، اور میرے ننھا منا بچہ ہوگا، چھوٹی چاچی کی طرح، اسے ـــــ دھت، یہ کیا سوچنے لگی میں؟ ابھی تو میں چھوٹی ہوں۔ چھوٹی۔ حالانکہ ننھو بوا نے مجھے اسی دن ڈانٹ دیا تھا، "فراک کے بٹن کیوں نہیں بند کرتی لتا؟ بڑی ہو گئی، شعور نہیں آیا۔"

"کیا کروں بوا۔ نہ جانے کیوں یہ آگے کے دو بٹن بند ہی نہیں ہوتے" میں نے کہا۔

چھوٹی چاچی ہنس دی اور ننھو بوا نے ماں سے کہا "اب اسے شلوار قمیض پہنایا کرو بھابھی۔ بارہ سال کی تو ہو گئی لڑکی، پر عقل ذرا بھی نہیں آئی۔ سوچا کیوں؟ ساتویں درجے میں فرسٹ آئی ہوتی۔ پھر ٹال گئی۔ کون ان کے منہ لگے۔ کودتی پھاندتی اوپر چلی گئی اور کیشی بھیا سے سٹ کر بیٹھ گئی "کیوں کیشی بھیا ایک بات بتائیے گا۔ میں بڑی ہوں کہ چھوٹی۔"

"تو نہ بڑی ہے نہ چھوٹی۔ تو بس لتا ہے" کہہ کر کیشی بھیا نے میرے گال پر لال رنگ لگا دیا۔ کیشی بھیا کا کمرہ مجھے اچھا لگتا ہے رنگوں کی مہک، گندی دیواروں کے سہارے ٹکے کینوس۔ میں بیٹھی بیٹھی انھیں دیکھتی رہی۔ پھر میں نے پوچھا "اچھا کیشی بھیا۔ آپ نی بو کو پیار کرتے ہیں۔" مجھے جب بوا پر پیار آتا ہے تو میں انھیں نی بو کہتی ہوں۔ نی سے نشی اور بو سے بوا۔

کیشی بھیا ویسے ہی جھکے ہوئے پینٹنگ نائف سے رنگ لگاتے رہے۔ پھر انھوں نے پوچھا "تم، تم نہیں اپنی نی بو کو پیار نہیں کرتیں۔ جیسے سارے پھول سورج کو پیار کرتے ہیں ویسے ہی سبھی نشی کو پیار

اسکول کے پریسیڈنٹ کی تھی اور ان کے بیٹے سارا راستہ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے بہت زور دیا کہ ہم لوگ گھر اترنے سے پہلے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی لیں ہوٹل ــــ میری آنکھیں چمکنے لگیں، پر بوا مانی ہی نہیں۔ خیر مفت میں جو موٹر کی سیر ہو گئی وہی غنیمت تھی۔ حالانکہ بوا کی ہٹ پر مجھے بہت غصہ آیا۔

بوا مسکراتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ بنو بوا نے میری بانہہ کھینچ کر پوچھا "کیوں ری ــــ کس کے ساتھ آئی ہے؟"

"نشی بوا سے پوچھو" میں نے کہا۔ بڑی آئی پہلے تو ٹوہ لگاتی پھر آ جاتی ہے جاسوسی کرنے۔ تھوڑی دیر میں دادی نے نشی بوا سے پوچھا "کیوں نشی کس کی گاڑی تھی؟"

بوا نے بچوں کی طرح ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پوچھا "کیوں چاچی؟"

دادی نے کہا "ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔"

"وہ چاچی ہمارے کالج کے پریسیڈنٹ ہیں نا، ان کی گاڑی تھی۔ کالج میں میں نے ڈانس کرایا تھا۔ وہ ان سب کو بہت پسند آیا۔ آج ان کے بیٹے کالج آئے تھے۔ تو مجھے ان سے ملایا گیا اور گھر تک چھوڑنے آئے تھے۔"

دادی کو نشی بوا کی کامیابی کی خبر سن کر خوشی ہوئی، گھر میں سب نے الگ الگ نشی بوا سے وہی سوال پوچھا۔ صرف کیشی بھیا نے کوئی سوال نہ کیا۔ بوا کالج سے آنے کے بعد ہماری مجھلی چچی کے پاس چائے پیتی تھیں۔ کیشی بھیا نے ابھی تک چائے نہ پی تھی۔ ایک کینوس پر رنگ لگائے جا رہے تھے۔

"یہ کیسا گھر ہے کیشی بھیا۔" میں نے کینوس کو دیکھ کر پوچھا۔ بھیا میری بات ٹال گئے۔ نشی بوا کے ہاتھ سے پیالہ تھام کر دیر تک ان کے چہرہ میں کچھ تلاش کرتے رہے۔ پھر چائے کی پیالی رکھ کر اپنے کام میں لگ گئے۔

کیشی بھیا نے جب بوا کی شادی کی بات سنی تب بھی وہ چپ چاپ گھٹ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا "کیشی بھیا آج اسکول میں لڑکیاں کہتی تھیں کہ نشی دیدی کی شادی پنا لال کے لڑکے کے ساتھ ہوگی جن کی موٹر میں ہم لوگ آئے تھے میں نے کہا بالکل نہیں بھیا کسے نے مانا ہی نہیں۔ بوا نے خود ہی سنر لڑکی کو بتایا تھا۔

ان کی نند کہہ رہی تھیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کیشی بھیا وہ کتنے امیر ہیں۔ کپڑے کی کئی ملیں ہیں ان کی۔ پر کیشی بھیا اگر ایسا ہو تو کیسا اچھا ہوگا ہم بھی موٹر میں بیٹھیں گے۔ اور شان جتائیں گے کہ ہماری بوا کی شادی بڑے آدمی سے ہوئی ہے۔

"کیوں لتا بڑا آدمی کون ہوتا ہے؟"

"جس کے پاس خوب روپیہ ہو، موٹر ہو، ڈھیر سے نوکر ہوں ــــ" میں نے جوش سے کہا۔

"تب تو مجھ سے کوئی بھی لڑکی شادی نہیں کرے گی ــ میرے پاس نہ روپیہ ہے نہ پیسہ، نہ موٹر، نہ نوکر۔"

کیشی بھیا کی بات پر میں پہلے تو کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ پھر میں نے کہا۔ "واہ اتنے اچھے جو ہیں۔ پنا لال جی کے بیٹے چاہے کتنے امیر ہوں آپ کی برابری تھوڑی ہی کر پائیں گے۔" کیشی بھیا مسکرا کر چپ ہو گئے۔

پر لڑکیوں کی بات سچ نکلی۔ پنا لال جی کے لڑکے کو ہماری نشی بوا بے حد پسند آ گئی تھیں۔ چھوٹے لالہ جی آئے اور سب سے بات چیت کر کے انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ بڑے خالی ہی نہیں لڑکی دلہن بن کر رہے گی۔ ہم بھی جا کر اس کوٹھی کو دیکھ آئے جہاں رانی بن کر رہیں گی ہماری بوا۔ وہ پھول باغیچہ، شیشہ کا دروازہ، ہم سے بھی صاف کپڑے پہنے نوکر انیاں ــــ میں تو دیکھتی ہی رہ گئی۔

صرف رتن لال بھو بھا نہیں گئے، یہ سوچ کر مجھے تھوڑا سا دکھ ہوا اگر کیشی بھیا کے پاس یہ سب کچھ ہوتا اور بوا کی ان سے شادی ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں نے بوا سے یہی بات کہی۔ انھوں نے ایک لمبی سی سانس لی اور کہا "میری قسمت میں کیشی نہیں تھے لتا۔"

"کیوں ــــ؟" میں نے پوچھا۔

"تو نہیں سمجھے گی۔" بوا نے کہا۔ "بس سو بات کی ایک تو نہیں سمجھے گی۔ سمجھانے سے ہی تو سمجھ میں آئے گا۔ کوئی بھی سوال بنا سمجھائے کیسے کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا بوا ــــ" میں نے بوا کا پلو پکڑ کر جھٹک دیا۔

"جاؤ جا ــ مجھے تنگ کرو۔"

لو اب نشی بوا بھی ایسی بات کرنے لگیں، اماں کی طرح بڑ بولا

میں کیشی بھیا کو اکیلا پاکر خوش ہو گئی۔ جولائی میں جب سے ہوا کو گئیں کیشی بھیا جیسے بیگانے ہو گئے تھے۔ مجھے پیار کرتے تو تھے لیکن مجھے ہر وقت لگتا جیسے انھیں اسپیشل پیار ملتا ہو۔ اس وقت میں نے سوچا کہ پوچھوں "مجھے کیا سب کچھ جاننا چاہیئے۔" پر مجھے یکایک اپنے کلاس کی لڑکیوں کی وہ اچانک، اشاروں کنایوں کی وہ باتیں یاد آگئیں اور میں چپ رہ گئی۔ کلاس میں تین چار بڑی لڑکیوں کا گروپ پیپڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر جانے کیا کیا باتیں کرتا ہے۔ میں اگر وہاں پہونچ جاؤں تو سب چپ ہو جاتی ہیں یا ہنس کر کہتی ہیں "تو بالکل بے وقوف ہے۔"

میں کیشی بھیا سے کیا پوچھوں؟ مجھے لگ رہا تھا کہ مکڑی کے سے لاتعداد جالوں میں گھری چلی جا رہی ہوں۔ اور پھر مجھے ایسا لگا کہ مجھے نے کر ابھی جو حادثہ ہوا ہے وہ بڑا ہی گھنونا تھا اور اسے بھول جانا ہی اچھا ہے۔ پر چاچا ——؟

اس وقت تو بھیا پینٹ بھی نہیں کر رہے تھے۔ تخت پر بیٹھے اپنے دو کینوسوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک تصویر پوری بھی نہیں ہوئی تھی۔

"بھیا یہ کیا بنایا ہے؟"

"رنگوں اور لکیروں کے ذریعہ ایک موڈ کو ایکسپریس کیا گیا ہے۔"

"آپ آج خالی کیوں بیٹھے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"رنگ کے ٹیوب ختم ہو گئے ہیں۔"

"بازار سے لے آئیے۔" میں نے مشورہ دیا۔

"پیسے نہیں ہیں پگلی۔" کیشی بھیا مسکرائے اور میری چوٹی کو جھٹکے دینے لگے۔

"ہائے ہائے" میں نے مصنوعی غصہ سے کہا۔ پر کیشی بھیا کی اسپیشل مسکراہٹ دیکھ کر فوراً پگھل گئی۔

"میرے پاس پانچ روپے ہیں۔ چاہیے" میں نے ایسے سر میں کہا جیسے میرے روپے لے کر بھیا میرے اوپر بڑا رحم کریں گے۔

"لاؤ دو روپے۔" میں نے دوہرایا۔

"نہیں لتا تم نائیلون کا دوپٹہ خرید لینا۔ اب جاؤ رات ہو گئی ہے۔"

"میں کو دتی کا ودی نیچے اتری۔ ننھے بھیا کا دالان بند تھا جہاں چاچا کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ اماں ابھی چوکے کا کام نپٹا رہی ہوں گی۔ بڑے چاچا کے کمرہ میں اندھیرا تھا۔ پر میرے دیکھتے دیکھتے چھوٹی کی لڑکی رضو وہاں سے نکل کر ادھر ادھر دیکھتی باہر آئی اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ بڑے چاچا اکیلے رہتے ہیں۔ بڑی چاچی دو سال ہوئے مر گئیں۔ بڑے چوکنے رضو، اکیلے کمرہ میں ضرور پیسے چرا رہی ہوگی۔ پہلے بھی میری گڑیوں کے ریشمی دو پٹے چرا لے جاتی تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کی مٹھی کھولی تو دو روپیہ کا تڑا مڑا نوٹ اس کی ہتھیلی میں تھا۔

"چور کہیں کی۔ ابھی دادی سے تیری شکایت کرتی ہوں۔" میں نے بڑے رعب سے کہا۔

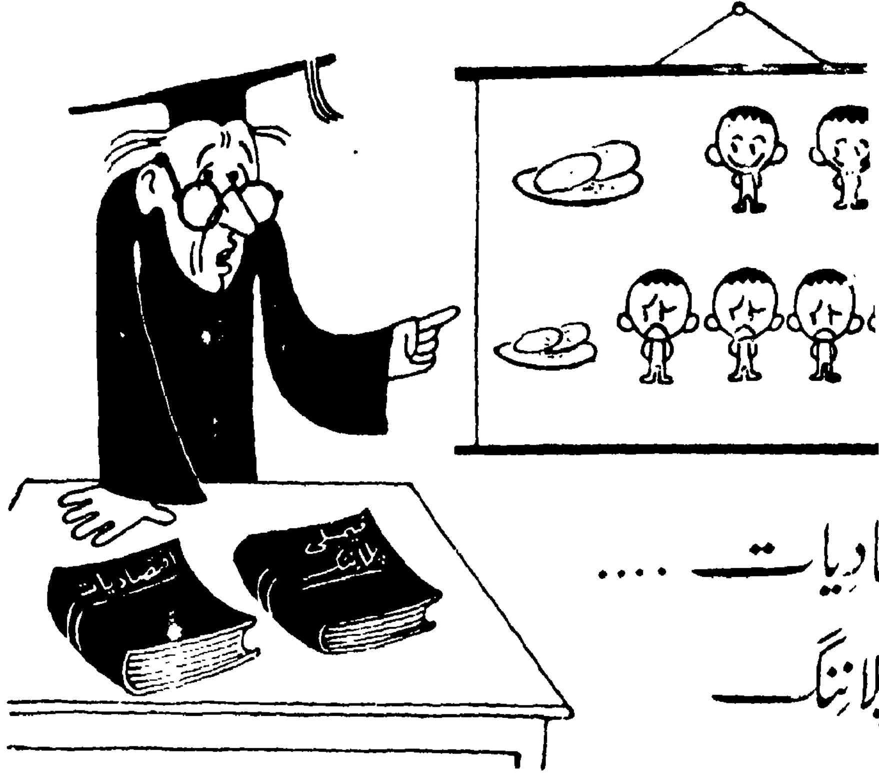
رضیہ گڑگڑانے لگی۔ "مر جاؤں گی لتا بی بی۔ اماں گلا کاٹ دیں گی۔ لتا بی بی معاف کر دو۔"

آخر بڑے چاچا اتنے روپیوں کا کریں گے بھی کیا؟ رضیہ غریب نے دو روپے لے بھی لیے تو کیا ہوا؟ مجھے اس پر رحم آگیا۔ اسی وقت کمرہ میں بڑے چاچا کی کھنکھار سنائی دی۔ چاچا کے ہوتے ہوئے بھی روپے چرا لائی۔ پچھلے امتحان میں کاش پیچھے بیٹھی ہوا کتنا کہتی رہی کہ سوال کا جواب بتا دو، میری تو ہمت ہی نہیں ہوئی۔

ننھی بوا کی چارپائی پر ان کے ساتھ لیٹ گئی۔ ان کا موڈ دیکھ کر لگا کہ اس وقت شاید وہ میرے ان ڈھیر سے سوالوں کا جواب دیں جو میرے دل میں تڑپا کرتے ہیں۔ وہ میری بات سن کر تھوڑی دیر چپ رہیں پھر بولیں "یہ سب باتیں سمجھانے سے نہیں آتیں۔ ایک دن بغیر بتائے تو سب کچھ جان جائے گی۔ تتلی کو کوئی اڑنا نہیں سکھاتا۔ اسے اڑنا خود بخود آجاتا ہے۔ یوں سمجھ لے کہ تو ابھی کیڑا ہے۔ ابھی اڑنے کو تیار نہیں ہے۔ اس لیے تو کچھ نہیں سمجھ پا رہی"

"میں کیڑا ہوں۔" یہ سوچ کر مجھے نیند آگئی۔

جس دن ننھی بوا کالج سے ریشمی موڑ میں آئیں ہماری گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ ساتھ میں میں بھی تھی۔ مجھے تو اس موٹر میں بیٹھ کر بڑا مزا آیا۔ کیسی بڑھیا گدیاں تھیں۔ میں جب اس موٹر میں بیٹھی تو میرے درجہ کی ساری لڑکیاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہ گئیں۔ موٹر بہانے



،، اقتصادیات کا ہماری زندگی میں بڑا دخل ہے۔ ہم میں سے بیشتر کی آمدنی محدود ہوتی ہے !! اسی
.نی سے گھر بھر کے سبھی لوگوں کے لئے ڈھنگ سے رہنے سہنے، کھانے پینے اور پہننے کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔
م اور تفریح کے اخراجات بھی اسی آمدنی سے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ اور اگر ہو سکے تو تھوڑی بہت بچت بھی
نا ہوتی ہے۔ لیکن جیسے جیسے کنبے بڑے ہوتے ہیں آمدنی زیادہ لوگوں میں بٹ جاتی ہے اور اس طرح ہر شخص کا
نہ نسبتاً گھٹ جاتا ہے۔

ا سمجھ دار ماں باپ ہمیشہ یہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اُن کے اتنے ہی بچے ہوں گے، جن کی پرورش و دیکھ بھال وہ ٹھیک
ننگ سے کر سکتے ہیں۔ بچوں کو تعلیم دی جانی چاہیئے، انہیں خوراک اچھی اور مناسب مقدار میں ملنی چاہیئے اور یہ بھی
.وری ہے کہ اُن کے رہن سہن کے حالات بہتر اور صحت مندانہ ہوں۔

کنبے کو محدود بنانے کے لئے آپ معلومات اور مشورہ مفت حاصل کر سکتے ہیں۔ کسی قریبی فیملی ویلفیئر
انگ سینٹر میں تشریف لائیں۔

یاد رکھیئے: چھوٹا کُنبہ ۔ خُوش حال کُنبہ

کی طرح - ان کا چہرہ تو دیا ہی تھا، پیارا سا، پھر وہ کہاں سے کدھرسے بدل گئیں ؟

اور پھر شادی کے دن نشی بوا نے چپ چاپ ہتھیلیوں پر مہندی بھی رچوالی، بال بھی گندھوا لیے اور سسرال سے آئی گوٹی دہ نسیمی تی ساڑی بھی پہن لی جس میں بارڈر بھی تھا، چار خانہ بھی اور چار خانہ میں بوٹیاں پڑی تھیں - وہ ساڑی دیکھ کر منجھلی چاچی نے کہا تھا ہائے ہائے کیسی گنوارو ساڑی ہے۔ نشی تو اسے چھوئے گی بھی نہیں لیکن نشی بوا کو وہ ساڑی اور ساٹن کا اوپر کیلا پیٹی کوٹ پہننے میں کوئی الجھن نہیں ہوئی - بوا نے کانوں میں گھر جو رانیاں پہن لیں اور گلے میں موتی کا ست لڑا، ہیرے اور پنے کا ست لڑا۔

ہمارے پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی - بنو بوا تر کاری کاٹتی نوکرانیوں پر چیخنے لگیں - اماں نے کھڑے ہو کر گھر ڈوں سونٹھ بنوا ڈالی اور جب بھیجی کی ساس نندیں ہمارے گھر آئیں تو بنو بوا کی سہیلی سرلا کمر ہرمونیم پر گانے لگیں "تمہیں جانے زمانہ ارے سمدھنو، تمہاری ریشم کی ساڑی ارے سمدھنو، لیٹا چھینٹی میں پھٹ گئی ———" اور اتنا گا کر انھوں نے باجا چھوڑ دیا اور خود ہنستے ہنستے لوٹ گئیں۔

اماں نے خواہ مخواہ بنارسی ساڑی پہنا دی تھی جو رہ رہ کر پیروں میں پھنستی تھی - میں نے کیشی بھیا کے کمرہ میں جھانکا - کمرہ اندھیرا پڑا تھا۔ صرف لنٹائل کی مہک وہاں منڈلا رہی تھی۔

نشی بوا لوگوں کی سہیلیوں سے گھری بیٹھی تھیں - کوئی ان کی روپہلی چوڑیاں چھو رہی تھی تو کوئی ساڑی سنبھال رہی تھی اور کوئی ان کی قسمت کے گیت گا رہی تھی۔

مجھے نہ جانے کیوں نشی بوا پر خوب ہی غصہ آرہا تھا - جی چاہ رہا تھا کہ سب کو کھانا پینا چھوڑ دوں جب تک نشی بوا مجھے خود نہ منائیں میں حیران بھی کہ جن باتوں کا وہ مذاق اڑاتی تھیں وہی سب اب خود کر رہی تھیں - وہ بھڑکیلی ساڑی، کہنیوں تک زیور - نئی بہو بن کر بیٹھنے کے وہ سب غمزے اور انداز - کیا سچ مچ یہ وہی بوا تھیں جنھیں میں نے پوجا تھا - شام سے بوا نے مجھ پر ایک نظر بھی نہ ڈالی تھی - اور یہ تھی کہ بنارسی ساڑی کا بوجھ لادے ان کے اردگرد منڈلا رہی تھی غصہ سے بھری میں کیشی بھیا کے کمرہ کی طرف چل پڑی - اس کے ساتھ مجھے یہ سالک یہ بھی خیال آرہا تھا کہ بوا چلی جائیں گی اور چوتھی منزل کی سنسان

چھت پر کیشی بھیا ہاتھ پیچھے باندھے سر جھکائے اکیلے گھنٹوں ٹہلا کریں گے، جیسے پچھلے دنوں وہ ٹہلا کرتے تھے، جب بوا اپنے کمرہ میں بلاؤز وں پر بٹن ٹانکا کرتی تھیں - صبح صبح آنکھیں کھولتے ہی نشی بوا کا مسکراتا چہرہ نہیں دکھائی دے گا - وہ بدشکل بھو بیا رتن لال آنکھ کھولیں گے تو جوہی کے پھول سی بوا ان کے پاس بیٹھی مسکرائیں گی

شادی سے پہلے کیشی بھیا نے بوا سے ایک سوال پوچھا "اگر رتن لال کسی اسکول میں ماسٹر ہوتے تو بھی تمہیں ان میں یہ نظر آتیں - وہ کتنے ہی شریف ——— ہوتے کیا تم ان سے شادی کر لیتیں۔"

نشی بوا چپ رہ گئی تھیں - بالکل چپ - اور اب رتن لال کے لیے کتنا سارا زیور لاتے تھے، بوا اوپر سے نیچے تک جا تیں - پر میں ان سے رسٹ کر نہ بیٹھ سکی تھی - جب میں ان کا چہرہ دیکھتی، مجھے کیشی بھیا کا اندھیرا کمرہ یاد آ جاتا۔

اس رات بڑی دھوم دھام رہی - سب کے ساتھ باراتیوں پر میں نے پھول برسائے - بوا کو چنری اڑھا دی اور منڈپ میں لے جا کر بٹھا دیا - وہاں کھڑی نہ رہ سکی - پیروں میں پھنسی بنارسی ساڑی میں نے اتار کر پھینکی اور جی چاہا کہ کیشی بھیا سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں - ان کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی لنٹائل کی بو میری ناک میں بھر گئی۔

"کیشی بھیا" میں نے روندھے ہوئے گلے سے پکارا اور کوئی نہ پا کر بتی جلا دی - کیشی بھیا تخت پر جیسے اندھے بیٹھے تھے - میں گئی - ان کا کندھا ہلا کر میں نے روتے ہوئے کہا "کیشی بھیا"

کیشی بھیا نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا بال ان کی پیشانی پر آئے - گہرے غم میں ڈوبی ان کی کالی آنکھیں - میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا - میں خاموشی سے ان کے سرہانے بیٹھ گئی - پھر میں نے پوری سے ان کا سر اٹھایا اور اپنے سینے میں گڑا لیا - کیشی بھیا جیسے ایک بے حد دکھی بچہ تھے اور میں ان کی قابل رحم ماں۔

اس لمحہ میں ایک دم بڑی ہو گئی - مجھے کسی سے کچھ بھی پوچھنا باقی نہیں رہا - نیچے پنڈتوں نے شادی کے منتر پڑھنا شروع کر دیے تھے۔

گھوم کر دیکھا تو ڈاکٹر کو سامنے پایا۔ بولے "میں کچھ فوٹو لایا ہوں تم کو دکھانے کے لیے۔"

میں کچھ کہوں اس کے پہلے ہی ڈاکٹر نے تین ایکسرے فوٹو میرے سامنے کر دیے اور روشنی کے سامنے گھما کر دکھانے لگا: "یہ ہے باپ کی چھاتی کا فوٹو اور یہ اس کے بیٹے کا فوٹو اور یہ اس کے بیٹے کے بیٹے کا فوٹو۔ تینوں میں ایک ہی جگہ خرابی ہے۔ بڑی مشکل سے تینوں فوٹو لے ہیں۔ لگتا ہے ان سالے کیڑوں کو چھاتی کا یہ والا حصہ ہی" اس فوٹو کے ایک خاص حصے پر انگلی گھماتے وہ بولے "پسند ہے۔ پر اب زیادہ دن نہیں چلے گا ان کیڑوں کا اندھیر۔" میرے چہرے کو تیور سا دیکھ ڈاکٹر بولا۔ "کہو تو ایک دن تمہاری جانچ کروں پروفیسر" پھر ہنسا "جانے کس کس طرح کے کیڑے ہیں تمہارے جسم میں۔ کہیں یہاں مت پھیلا جانا" ڈاکٹر کو دراہی تھا اور میں نے کہنیاں میز پر ٹکا لیں اور دونوں ہاتھ سر پر اس طرح رکھ لیے جیسے میرے من کے اندر ابھی کسی کی موت ہو گئی ہو۔

یہاں آکر وقت کے معنی ہی بدل گئے ہیں جو کٹ جائے اسے میں وقت کہتا ہوں اور جو نہ کٹے، وہ دن ہو چاہے رات ہے تو بوردم ہی۔ ایک دن اس بوردم کا ہندی لفظ ڈھونڈنے لگا۔ چار اور چار آٹھ منٹ میں ہی اتنا بور ہو گیا کی ڈکشنری ایک کونے میں زور سے پھینک دی۔ جی چاہ رہا تھا کچھ کروں۔ پر کروں تو کیا کروں؟ سو بار میں نے ایک ناول پڑھنے کا ارادہ کیا ہزار بار من لگایا کہ کچھ نہیں تو اردو کے کچھ اشعار ہی پڑھوں اور لاکھوں کوششیں کیں کہ اور کچھ نہیں تو سو ہی لوں ——— کچھ وقت تو ایسے کٹتا ہی ہے ——— نیند ٹوٹتی ہے اور جاگ کر گھڑی میں وقت دیکھنے پر جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سے چار تک یعنی دو گھنٹے سو لیا تو چٹکی بجاتے ست پڑے کے ایک پہاڑ کو پار کر لینے کے سکھ محسوس کرنے میں ایک گھنٹہ اور یوں ہی کٹ جاتا ہے۔۔۔

۔۔۔۔ پر نہ نیند آتی ہے اور نہ ہی جاگتے رہنے میں چین ہی ملتا پھر کریں تو کیا کریں؟ کوئی کام نہیں، کوئی بھی کام نہیں، کوئی کام ہے ہی نہیں۔ چہل قدمی کو باہر آیا تو دیکھا کہ جہاز اور پرندوں والی چھپائی کی ہینڈلوم اسکرٹ پہنے وہ لڑکی رسی کود رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا جیسے کوئی بڑی بڑی پر چڑھ آئے۔ پھر اچانک ہی جھٹکے سے اتر کر ٹھیک ہو جائے، ایسا ہی کچھ مجھے لگا۔ میرے چہرے پر مکان کا گول چکر بنا ——— ٹھیک گھومتی ہوئی رسی کی طرح میری خوشی کی لڑکی ——— جیسے اچھل اچھل کر کودنے لگی۔

"ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ بارہ ۔۔۔"

یہ جگہ جیسی ہے، ہے مجھے اس سے کیا؟

میں ٹھیک سے رہوں۔ چار گملے خرید لوں اور گلاب کے پودے لگا دوں ان میں۔ کوئی پیارا سا ناول پڑھوں اور پھر اگلے دس دن تک اسے یاد کر کر کے مزا لوں ——— ارے، اکیلا رہنا بھی کیا برا ہے؟ خوب کھاؤ کودو بیڈمنٹن کھیلو، ٹیبل ٹینس کھیلو، دو تین میل تک گھوم آؤ اور رات کو اپنی محبوبہ کے سپنے دیکھو ...... اس سے میٹھا اور کیا ہوگا؟ ......

جہاز اور اڑتے پرندوں کی چھپائی والی ہینڈلوم اسکرٹ پہنے وہ لڑکی کی بار ہنسے سو، تک پہنچ گئی اور پھر اک دو، پر آگئی تھی جی چاہا کہ جاؤں اور اس لڑکی سے اس کا نام پوچھوں کہوں کہ تیرے ربن کا رنگ تو لال ہے۔ وہ جھگڑے گی۔ کہے گی "نہیں پیلا ہے۔" میں کہوں گا "نہیں یہ تو لال ہے" وہ مجھے مارنے دوڑے گی میں بھاگوں گا وہ ہنسے گی تو میں کھل کھلا کر ہنس پڑوں گا ...... اور مزہ آ جائے گا۔ میں اٹھا۔ میں نے جیب میں پرس رکھ لیا۔ سوچا بازار لے جاؤں گا اور ڈھیر سی سوئیٹس خرید دوں گا۔ اس کی بات بات کو طرح دوں گا۔ میرا ہر لمحہ خوشی کا ہوگا، ہر لمحہ۔

میں اس کی طرف بڑھا پر مجھے کسی نے پکارا ——— گھوم کر دیکھا تو ڈاکٹر تھا ——— میں نے (شاید پہلی بار) خوش ہو کر ڈاکٹر کا سواگت کیا، "ہلو ڈاکٹر۔ کہاں تک آئی ریسرچ؟"

"ارے"

"کیوں ایسے چونک کیوں پڑے" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"ایکسپائر ہو گئے بھائی!" وہ جہاز اور اڑتے پرندوں کی چھپائی والی ہینڈلوم اسکرٹ پہنے اسی لڑکی کی طرف منہ کیے بولا "اس نے شرط بدی تھی کہ چاچا جی کو کبھی ہنستے دکھا دو تو ایک ہزار روپے دوں گا اور آج تم ہنس رہے ہو، سچ ایسے میں خوب اچھے لگتے ہو۔"

ہم ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ جہاز اور اڑتے پرندوں والی ہینڈلوم کی اسکرٹ پہنے رسی کودتی لڑکی کی طرف بڑھے

یوں لگا جیسے کچھ کیڑے میرے کمرے میں چھوڑ دیا گیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے خود بخود احساس ہوا کہ کہنیاں میز پر ٹکی ہیں اور دونوں ہاتھ سر پر اس طرح رکھے ہوئے ہیں جیسے کسی نے میری بھول اسی ہتھیلیوں پر اپنا سر رکھ دیا ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ جگہ کتنی سڑی ہے۔ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے گھر دو گھڑی جا سکوں۔ کچھ وقت گزار سکوں۔ نہ کوئی پارک ہے، نہ ندی کنارا، نہ کوئی پھول پودوں کی جھاڑی کہ مدھیارے سے پھول توڑ لائیں اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہوں تو بٹن ہول میں لگا لیں۔ اور کچھ نہیں تو بھینی بھینی مہک کی گاگریں ہی بھر لیں اور سانسوں کی پنہارن کے پیر اس وزن سے ڈگمگا جانے دیں۔ میری آنکھیں اپنے آپ بھیگ گئیں۔ تیز تیز پلکوں سے میں اپنی پتلیوں کے سامنے پانی کے دو آئینوں کو کانپتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ سسکیاں بھر لوں۔ اپنے بائیں ہاتھ سے آنسو پونچھوں اور داہنے ہاتھ سے اپنی ہی پیٹھ سہلاؤں کہ جیسے کوئی دوسرا ہمدردی کا اظہار کر رہا ہو۔ تبھی وقت مستی میں جھومتی ہوئی۔ جہاز اور اڑتے پرندوں والی چھپائی کی ہینڈلوم اسکرٹ پہنے ہوئے ڈاکٹر کی لڑکی ہاتھ میں کھلونوں کی ٹوکری لیے آ گئی۔

"دیکھو نہ چاچا جی، یہ تیز چلنے والی ٹرک ہو گی۔ یہ ہوائی جہاز ادھر سے چاہی بھر دو تو ادھر کو تین چکر کاٹے گا ———" وہ کہتی جا رہی تھی اور میں بے حد اداس سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا ہنستا ہوا پھول ایسا چہرہ کھلا کھلا تھا۔ میرے من کو جانے کیا ہو گیا تھا کہ اس پر مسکراہٹ کی کوئی تصویر ہی نہیں بن رہی تھی۔ ڈاکٹر کی شرط یاد آ رہی تھی کہ ایک ہزار روپے دو گے پروفیسر، کسی دن اگر اداس بنا دو اسے پانچ منٹ کے لیے بھی۔

"دیکھو جی چاچا جی؟ یہ ریل کی سیٹی اور یہ ریل، یہ رہا اس کا بل، یہ ہے گا سر ہلانے والا ڈاکو۔" میں چپ کا چپ بنا رہا تو اس نے پوچھا "کیا ہوا چاچا جی؟"

اتنا ہی کہا میں نے "موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ تم جاؤ۔" کچھ دیر تک وہ ہنستی رہی پھر خود بخود چلی گئی۔ ہوا میں اس کی اسکرٹ کے دو حصے کچھ اس طرح ہل گئے کہ سارے پرندے جہاز کے اوپر ہی اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

پردیس میں ڈاک ایک آسرا ہے۔ کسی دور یا قریب کے دوست کا خط آ جائے تو پل دو پل موڈ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آج صبح شام دونوں ڈاک دیکھ چکا، پر کسی کا کوئی خط نہیں۔ ان لیے اکیلا پن سو گنا ہو گیا۔ آن کیا تو روشنی چبھنے لگی آف کر دیا تو مارے اندھیرے کے دم گھٹنے لگا۔ ہوا تیکھی تھی، سویٹر تک اپنے آپ کو ڈھک لیا پر شال کے اوڑھنے کی برداشت نہ ہوئی۔ لگتا رہا جیسے کسی بیمار بھیڑیے کے نزدیک بیٹھا ہوں اور اس کے کیڑے، ڈاکٹر کے مطابق، رینگ رینگ کر میری بدن میں گھسے جا رہے ہوں۔ میں اٹھ گیا۔ جی ہوا کہ جیسے کبھی نے ایک جیسے اکیلے پن کی رکھوائی توڑ پھینکوں۔ میری اداسی مجھے گرم کوٹ کی جمی گرد جیسی لگی۔ من ہوتا ہے کہ برش سے صاف کر دوں اس دھول کو۔

وہ گیا تو سینما دیکھنے چلا گیا۔ بالکونی میں صرف ایک اکیلا آدمی — صرف میں۔ انڈین نیوز بھی آدھی ہی دیکھ پایا، اٹھا اور گھر لوٹا، اتنے دھیمے دھیمے جیسے کسی کے آخری سفر میں کندھے دیتے چل رہا ہوں۔ دروازے پر بیٹھی تھی وہی جہاز اور اڑتے پرندوں والی چھپائی کی ہینڈلوم اسکرٹ پہنے ڈاکٹر کی لڑکی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کاپی تھی۔

"دیکھو نہ چاچا جی۔ یہ میری بنائی تصویریں ہیں گیں۔ یہ امرود، یہ موٹر، یہ سامنے والی گاڑی۔ یہ ہے گا خرگوش، پر بابو جی کہتے ہیں گے کہ اس کے سینگ نہیں ہوتے۔ ایک سینگ تو میں نے برش سے مٹا دیا، دوسرا بھی مٹا دوں کیا چاچا جی؟" وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں کھویا ہوا تھا۔

جہاز اور اڑتے پرندوں والی چھپائی کی ہینڈلوم اسکرٹ پہنے وہ لڑکی ہنسے جا رہی تھی۔ بولی "چاچا جی یہ آدمی بنایا ہے گا میں نے پر اس کی ناک نہیں بنی ٹھیک سے۔ ناک کسی کی لمبی ہو چاچا جی تو کیسے بنائیں گے؟"

میں نے اس سوال کو بھی سنا ان سنا کر دیا۔ وہ کاپی الگ رکھ کر مجھ سے جھول گئی۔ مجھے لگا کہ مجھے زندگی کا وہ حصہ کھینچ رہا ہے جو مجھے مل نہیں سکتا۔ میں نے اپنے جسم سے اس کے ہاتھ چھڑا لیے اور بولا "پھر کبھی یہ تصویریں دکھانا۔ ابھی تو موڈ ٹھیک نہیں ہے۔"

تبھی اس کی کسی سہیلی نے سڑک پر سے پکارا اور وہ چلی گئی۔ میں نے

کملیشور

ترجمہ: رام لعل

قصبے کا آدمی

صبح پانچ بجے گاڑی ملی، اس نے ایک کمپارٹمنٹ میں اپنا بستر لگا دیا، ٹھیک وقت پر گاڑی نے جھانسی چھوڑا اور چھ بجتے بجتے ڈبے میں صبح کی روشنی اور ٹھنڈک بھرنے لگی، ہوا نے اسے کچھ گدگدایا باہر کے مناظر صاف ہو رہے تھے جیسے کوئی بنائی ہوئی تصویر پر سے دھیرے دھیرے ٹریسنگ پیپر ہٹتا جا رہا ہو، اسے یہ سب بہت بھلا سا لگا، اس نے اپنی چادر ٹانگوں پر ڈال لی، پیر سکوڑ کر بیٹھا ہی تھا کہ آواز سنائی دی: "پڑھو پٹے ستارام — ستا آ آ آ رام!"

اس نے مڑکر دیکھا تو بولنے والے کی پیٹھ دکھائی دی۔ کوئی خاص بھاڑا تو نہیں تھا پر طوطے کا۔ ایک روئی کا کوٹ جس پر برفی کا سلائی پڑی تھی اور ایک تنگ موہری کا پاجامہ پہنے نظر آیا۔ سر پر ٹوپا بھی تھا اور سیٹ کے سہارے ایک موٹا سا سونٹا بھی ٹکا تھا۔ پر نہ تو ان کی شکل ہی دکھائی دے رہی تھی اور نہ طوطا۔ پھر وہی آواز گونج اٹھی: "پڑھو پٹے ستارام۔ ستا آ آ آ رام!"

سبھی لوگوں کی آنکھیں ادھر ہی تاکنے لگ گئیں، آخر اس سے نہ رہا گیا، وہ اٹھ کر انھیں دیکھنے کے لیے کھڑکی کی اور بڑھا۔ وہاں طوطا بھی تھا اور اس کا پنجرا بھی، اور ان کے ہاتھ میں آٹے کی گولی بھی، جس سے وہ پھرتی سے گولیاں بناتے جا رہے تھے اور پنجی کو پچکار پچکار کر کھلاتے جا رہے تھے، پر طوطا پورا الو طوطا چشم ہی تھا، ان کی بار بار کی منت کے باوجود اس کا حلق نہیں چھوٹتا، گولیاں تو وہ نگلتا جا رہا تھا لیکن ایشور کا نام اس کی زبان سے نہیں چھوٹ رہا تھا، لوٹتے میں ایک نظر اس نے ان پر اور ڈالی تو لگا، جیسے چہرہ پہچانا ہوا ہے۔

وہ اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا، ذہن پر بہت زور ڈالا پر یاد نہیں آیا، تبھی اس نے طوطے پر سے نظر ہٹا کر شوراج کی طرف دیکھا، انگوٹھا اور ترجنی مسلسل ایک رفتار سے اب بھی گولی بناتے جا رہے تھے۔ ماتھے پر لکیریں ڈالتے ہوئے اور آنکھیں گول کر کے کچھ عجیب ادا سے سامنے ہٹا کر وہ شوراج کو مخاطب کرتے ہوئے بولے "شبنو — شوراج ہے نا تو؟"

اور اپنا نام ان کے منہ سے سنتے ہی اسے سب یاد آگیا، یہ تو چھوٹے مہاراج ہیں۔

وہ ذات کے ویش تھے لیکن دھندے کے لحاظ سے مہاراج پکارے جانے لگے تھے، میونسپلٹی کی دکانوں کی پاس والی املی کے نیچے بیٹھ کر وہ پانی پلایا کرتے تھے، قصبے کی سب سے بارونق جگہ وہی تھی، وہیں کنوئیں پر چھوٹے اپنی ٹانگیں توڑے، ران تک دھوتی چڑھائے جنیو ڈالے، چوٹی لہرائے، ننگے بدن ٹین کی ٹوٹی کرسی پر جمے رہتے گاؤں والے پانی پی کر ایک آدھ پیسہ ان کے پیروں کے بیچ اسی کرسی پر رکھ کر چل دیتے، پیسہ پا کر وہ اوقات کے مطابق آشیرواد دیتے، جب ایک کو آشیرواد کرنے لگتے تو دوسری طرف زور ڈالنے کے لیے تھوڑا سا کسماتے اور اس میں اگر کہیں کرسی نے کھال داب لی تو تین چار منٹ لگاتار کرسی کو گالیاں دیتے رہتے نیچ لگے ہاتھوں ننکو حلوائی کو بھی کوستے جس نے پیاؤ کے لیے یہ کرسی دی۔

تب چھوٹے مہاراج کی عمر کوئی ایسی خاص نہیں تھی، یہی پینتیس چھتیس کے قریب رہی ہوگی، چھوٹے مہاراج کے باپ دادا سونے چاندی کا کام کرتے تھے، کافی پرانا گھر تھا، ماں تھی لیکن جب باپ مرے تو چھوٹے کی عمر بہت کم تھی، ماں پہلے ہی سدھار چکی تھیں، باپ کے مرنے کے بعد دور کے رشتے کی ایک بھابی

تو ڈاکٹر بولا "ریسرچ میں ایک عجیب چیز ملی ہے پروفیسر"
میں نے پوچھا "کیا؟"

"کالرا کا ایک مریض اسپتال میں بھرتی ہوا تھا۔ جو نرس اسے اٹینڈ کر رہی تھی اسے فلو تھا عجیب نرس ہے کسی کو بتایا تک نہیں، فلو میں ہی کام کرتی رہی" ڈاکٹر کچھ رک کر بولا "اور کالرا اور فلو دونوں ہی چھوت کی بیماریاں ہیں۔

"سو تو معلوم ہے، پھر ہوا کیا، اصل بات تو بتاؤ" میں نے اس کی بات کو موڑ دیتے ہوئے کہا۔

"بڑا امپارٹنٹ کیس ہے، جب مریض کالرا سے صحت یاب ہوا تو اسے فلو ہو گیا" ڈاکٹر نے ریسرچ کی خوشی میں کہا۔ "سالے کیڑے نے گھر بدل دیا۔"

میں ہنستا سا بولا "اور یہی بیماری مجھے لگ گئی۔"

"کونسی بیماری" ڈاکٹر بیماری کے لیے ہمیشہ تیاری بیٹھا رہتا ہے ——— کچھوے کی طرح، مچھلی کے ہونٹوں سے کانٹے کو چھوا نہیں کہ دیا جھٹکا۔

میں نے اس کی بے چینی کا مزا لیتے ہوئے کہا "اس جہاز اور پرندوں کی چھپائی والی ہینڈلوم اسکرٹ پہنے تمہاری بے بی کو جو ہنسنے مسکرانے کی چھوت کی بیماری ہے۔ وہ لگ گئی ہے مجھے۔"

"اچھا" ڈاکٹر نے بیٹھے بیٹھے تھپتھپائی اور اپنی زبان میں بولا "تو مسکراہٹ کے کیڑے بے بی کے جسم سے تمہارے جسم میں داخل ہو گئے ہیں۔"

"ہاں یہی ہوا۔" میں نے کہا ——— اور ہم دونوں تیزی سے اس کے پاس پہونچے۔ اس نے کودنا بند کر دیا۔ میں کہنے ہی کو تھا کہ بے بی میری اداسی سدا کو مل گئی ہو، میرا موڈ اب کبھی خراب نہیں ہوگا۔ جہاز اور اڑتے پرندوں کی چھپائی والی ہینڈلوم کی اسکرٹ پہنے وہ [illegible] اندر بھاگ کر ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کا چہرہ زرد ہوا جا رہا تھا جیسے چنبیلی کی بیل سے سب پھول چن لینے پر وہ خالی خالی لگتی ہے۔ ٹھیک ویسی ہی وہ مرجھائی لگ رہی تھی۔

دل نے سوال کیا۔ کہاں گیا وہ اس کا ہنسنا مسکرانا؟ میں آگے بڑھا۔ میں نے مسکرا کر اسے پیار سے اپنی بانہوں میں اٹھایا تو اس نے سنجیدگی سے خود کو مجھ سے چھڑا لیا۔ بولی۔ "تو، بولو مت، چاچا جی۔ موڈ ٹھیک نہیں ہے۔" بالکل میری ہی طرح اداس تھی۔ اس نے کہنیاں میز پر ٹکالیں اور دونوں ہاتھ سر پر اس طرح رکھ لیے جیسے میرے اداس موڈ نے اس کی مسکراہٹ کو ڈس لیا ہو۔

" یہاں ایک شادی تھی، اس میں گئے تھے، آنا پڑا، اپنی کہو،
ن دیکھ کر پہچانا کیسا؟ نظر کمزور ہے للا، پر اپنے گلی کوچے کے پیلے
ئے لوگوں کی تو بھنک بہت ہوتی ہے" اور وہ دھیرے دھیرے
دن ہلانے لگے، انگلیوں کے درمیان گولی اب بھی ناچ رہی تھی،
ر پنجرے میں بیٹھا سنتو گولی کے ناچ سے نہ کھولتا، آنکھیں بند کرتا
بولتا نہیں تھا۔

بدن تو آپ کا ایک دم ڈھلک گیا ہے۔ پہلے سے چوتھائی بھی نہیں
، شوراج بولا۔ اسے کچھ دکھ سا ہو رہا تھا، جب اس نے پچھلی مرتبہ
یکھا تھا تب کتنے ہٹے کٹے تھے، یوں عمر کا اتار تو تھا لیکن اتنا فرق
بہت ہے، بھلا عمر بنے بنائے آدمی کو اتنی جلدی بھی توڑ سکتی ہے؟
گاڑی کی چال دھیمی پڑ گئی، چھوٹے مہاراج نے سنتو کے پنجرے
ذرا اوپر اٹھایا، اس کی طرف پیار بھری نظر سے دیکھتے رہے
طا کچھ بولا، چھوٹے مہاراج کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی
ی محبت سے پچکارتے ہوئے شوراج کو بتانے لگے " اس کا نام سنتو
، یعنی سنت۔ جب بولے تو بانی بولے، ہاں سنت بانی سنتا رہتا!
ا کہتے کہتے وہ اپنی ہی بات میں ڈوب گئے۔

گاڑی رکی، کوئی معمولی سا اسٹیشن تھا، چھوٹے مہاراج نے
ٹ پر ہاتھ پھیرا اور سر ہلاتے ہوئے بولے۔" دیکھو شیو، کچھ کھانے
نے کا ڈول ہے یہاں؟"

مٹھائی والا پاس سے گزرا شوراج نے روک لیا، چھوٹے
راج بولے، " کچھ ٹھیک ٹھاک ہو تو پاؤ آدھ پاؤ "
مٹھائی لے کر پیسے شوراج نے دے دیے، دونوں ہاتھوں
دونا پکڑ کر شوراج کے سامنے کرتے ہوئے بولے " لو شیو،
ھو تو ذرا، اچھی ہو تو پاؤ بھر اور لے لو "

اور اس سے پہلے کہ شوراج چکھتے انھوں نے خود پوپلے منہ
ا ایک ٹکڑا ڈالتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کر دی " ہے تو
ی۔ بلاؤ اسے "

شوراج کو بات کھٹک گئی، وہ چپ ہی بیٹھا رہا، اچانک کر
ٹھائی والے کو بلانے کی کوئی دکھاوے کی کوشش بھی اس نے
ہ کی، لیکن جیسے ہی مٹھائی والا گزرا ان کی نظر پڑ گئی۔
ے روکتے ہوئے بولے " ہاں بھائی، ذرا پاؤ بھر اور دینا

تو " پھر شوراج کی طرف مخاطب ہو کر بولے " لے پٹھو، اصل
میں بات یہ ہے کہ مجھ سے اب کوئی ایسی ویسی چیز تو کھائی نہیں جاتی
دانت ہی نہیں رہے۔ کھویا وویا تھوڑا آسان رہتا ہے نا "
کہہ کر انھوں نے بے تکلفی سے کھانا شروع کر دیا۔

پیسے اس نے پھر دیے، کھاتے سمے چھوٹے مہاراج کا
منہ اور ایک دم سٹ جانے والے جبڑے دیکھ کر اسے رحم آگیا۔ ان
کی جھکی گردن، بار بار پلکوں کا جھپکنا اور ذرا ذرا کر کے کھانا، جیسے
سارے کام اور تن کی ساری حرکتوں میں لاچاری تھی، انھوں نے
ایک ٹکڑا پنجرے میں ڈال دیا، طوطے نے کھا لیا، پچکارتے ہوئے
انھوں نے پھر ایک ٹکڑا ڈال دیا۔ وہ خود کھاتے رہے اور سنتو
کو کھلاتے رہے، پھر بات چل نکلی اور اسی کے درمیان ان کا
اسٹیشن بھی آگیا۔

اسٹیشن سے باہر آنے پر شوراج اور چھوٹے مہاراج
ایک ہی یکے میں بیٹھ گئے، دو سواریاں اور بیٹھ گئیں، یکہ چلا تو ہچکولا
لگا، چھوٹے مہاراج اپنے طوطے کے پنجرے کو پیڑ سے باہر لٹکائے
کسی طرح بیٹھے رہے، اسپتال کے پاس وہ یکے سے اتر پڑے، سنتو
کا پنجرہ پیڑی پر رکھ دیا اور جھولے میں سے کچھ نکالتے ہوئے کہنے
لگے " میں یہیں اتر جاتا ہوں، چاچی کو بیاہ کا حال چال بتا کر
کوٹھری پر آؤں گا، ہاں تم سے ایک کام ہے یہ ایک کپڑا ہے سلک کا،
وہیں شادی میں ملا تھا، میرے تو بھلا کیا کام آئے گا، تم اپنے کام
میں لے آنا " بات ختم کرتے کرتے انھوں نے وہ کپڑا جھولے سے
نکال کر شوراج کی گود میں رکھ دیا۔

شوراج نے لینے سے انکار کر دیا، پر وہ نہیں مانے،
شوراج بھی جب نہیں مانا تو بہت جھنجھلا کر کپڑا یکے میں پھینک کر
سنتو کا پنجرہ، جھولا اور سونٹا لے کر بڑبڑاتے چل دیے " ارے پٹھو
میرے کسی کام کا ہو تو ایک بات بھی ہے، زندگی بھر میں ایک چیز دی
اس کے لیے بھی انکار ــــ سب وقت کی باتیں ہیں، رحم کھاتے ہیں
مجھ پر، تیرے باپ ہوتے تو ابھی اسی بات پر جھنجھٹ ہو جاتی، پھر مڑ کر
اونچی آواز میں بولے ــــ " پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔ یکے والے
کو دے دینا " اور وہ زنانے اسپتال کے پھاٹک میں گم ہو گئے۔
دوسرے دن سویرے چھوٹے مہاراج اپنی کوٹھری میں

آکر سب دیکھ بھال کرنے لگیں پھر بہت بڑی سی چوری ہوئی اور چھوٹے کا گھر تباہ ہو گیا، چاچی کو تیرتھ کی سوجھی اور چھوٹے کو ساتھ لیکر چل دیں، خرچے کی ضرورت پڑنے پر ایک مختار سے جب تب روپے منگواتی رہیں، چھوٹے ساتھ تھے، وہ رسید بھیجتے رہے آخر جب تیرتھ سے واپس آئے تب پانچ چھ برس اسی مکان میں اور رہنا ہوا، پھر مختار نے اصل اور سود کے بدلے ایک دن مکان قرق کرا لیا، گواہی میں چھوٹے کے ہاتھ کی رسید میں پیش کر دیں اور لونے بدلنے میں مکان جھاڑ دیا، تب سے ان کی چاچی نے زنانے اسپتال میں نوکری کر لی اور چھوٹے بسکٹوں کا ٹھیلا لگانے لگے، اور گھوم گھوم کر بازار کی سڑکوں پر چیخنے لگے "ایک پیسے میں پچاس، پچاس بسکٹ انعام۔ جتنا لگاؤ گے، اتنا پاؤ گے"۔

ٹھیلے پر ایمدہ کے چھوٹے چھوٹے بسکٹوں کا ڈھیر لگا رہتا، ایک کونے پر ایک بڑی سی پھرکنی رکھی رہتی جس پر نمبر کے خانے بنے رہتے اور اس پر ایک سوئی ناچتی رہتی، جب کوئی پیسہ لگا کر گھمانے والا نہ ملتا تو کھڑے کھڑے خود ہی گھماتے رہتے، جتنا نمبر آتا اتنے بسکٹ گنتے اور پھر ڈھیر میں ملا کر اناج کی طرح رولتے رہتے، کبھی کڑا دے کر ادھے بیس پچیس چھانٹ لیتے، سوئی گھماتے انٹی سے ایک پیسہ نکال کر پیسہ رکھنے والے پیتول کے کٹورے میں چھن سے مارتے اور جتنا نمبر آتا "اتنے گن کر" باقی ڈھیر کے سپرد کر کے چل پان کر لیتے۔

لیکن اس طرح پیٹ کیسے پلتا، پھر ہومیو پیتھک ڈاکٹر کی دکان روز صبح کھولنے اور جھاڑنے پونچھنے کا کام لے لیا، دو چار گھروں کا پانی باندھ لیا، تڑکے اٹھ کر چار چار ڈول کھینچ کر نل آتے اور ڈاکٹر کی دکان کی صفائی وغیرہ کر کے کونے میں پڑے مونڈھے پر عزت سے دوپہر تک بیٹھے رہتے، ڈاکٹر صاحب کی غیر حاضری میں مریضوں کے حال چال پوچھ لیتے، کچھ دیسی دوائیوں کے نسخے بتاتے اور جرمن دوائیوں کی اہمیت سمجھاتے۔

تبھی سے چھوٹے اپنے کو بہت کچھ، ایک چھوٹا موٹا وید سمجھنے لگے تھے، مریض کی شکل دیکھتے ہی مرض کا اعلان کر دیتے، تمام بیماریوں کے علاج میں انھیں دخل کا دعوا تھا جب موتیا بند ہو جانے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو دکان بند کر دینی پڑی تو چھوٹے اپنی کوٹھری میں ہی ایک چھوٹا سا دواخانہ کھولنے کا منصوبہ بنانے لگے، رتن لال عطار کے یہاں سے آٹھ دس آنے کی جڑی بوٹیاں بھی بندھوا لائے جنھیں کوٹ پیس اور کپڑچھان کر کے سفید شیشوں میں بھرا اور طاق میں سجا دیا۔ فصلی بخار، ہرے پیلے دست، ناک کان، سر درد کی حکمی دوائیاں بانٹنے کا اعلان بھی کر دیا، لیکن گلی کے لوگوں کا تعاون نہ ملنے کی وجہ سے انھوں نے اس نیک کام کو بھی چھوڑ دیا، ساری حکمی دوائیوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے چورن کی پڑیوں میں ملا کر انھوں نے آخر پیسے سیدھے کر لیے۔

اس طرح کے نہ جانے کتنے گھریلو دھندے انھوں نے چلائے جنم سے ویش ہوتے ہوئے بھی قطرتاً دوسروں کے بھی خواہ ہونے کی وجہ سے انھیں برہمنیت بھی حاصل کرنا ہی تھی اس لئے جب گلی ٹولے کے لڑکوں نے انھیں پیاؤ پر بیٹھتے دیکھا اور چمک دار کالی پیٹھ پر جنیو دکھائی پڑا تو ذات پات کے خیال سے بے خبر، دھندے کی مجبوریوں کے تعلق سے انھیں مہاراج پکارنے لگے، تبھی سے چھوٹے لال چھوٹے مہاراج ہو گئے۔

جس املی کے نیچے وہ بیٹھتے تھے اس پر بھگوان کی کرپا سے شہد کی مکھیوں نے چھتہ بنا لیا تو ایک دن اندھیری رات میں جا کر اسٹیشن کے پاس کنجڑا پکڑ لائے، چھتہ بٹائی پر طے ہو گیا، لیکن چھوٹے مہاراج شہد کا کیا کرتے، چلتے وقت اسے کس دیا کہ آدھے دام کل آجائیں گے پر مہینہ بھر ٹل گیا، جھونپڑی پر تقاضہ کرنے پہنچے نقد پیسے تو ملے نہیں ابھی ڈانٹ لگا کر پیسوں کے بدلے میں طوطا چھانٹ لیا، کنجڑ کی منت کی کہ تینوں طوطے بشکی دا موں کے ہیں۔ اس بار جائے گا تو ان کے لئے بھی پکڑ لائے گا مگر چھوٹے نہ مانے، دو چلد گالیاں سنا دیں، طیش میں بولے "میرے پیسے کیا حرام کے تھے؟ وہ بھی تو بشکی میں سے ہی ہیں، لا نکال جلدی اس ٹوئیاں کو!"

اور تبھی سے یہ طوطا ان کے پاس ہے جسے جان کی طرح چپکائے رہتے ہیں۔

شیو راج نے خوش ہو کر انھیں دیکھا "پالاگی مہاراج" کہہ کر بولا — "ادھر نکل آئیے مہاراج۔ بہت جگہ ہے"۔

جب وہ پاس آکر بیٹھ گئے تو اس نے پوچھا "مہا نسا کس کے یہاں گئے تھے؟"

رگھوویر سہائے

ترجمہ: عابد سہیل

میرے اور ننگی عورت کے بیچ

اوروں کی طرح میں بھی کسی غیر معمولی شخص کو دیکھ کر متاثر ہو جاتا ہوں لیکن یہ تاثر کبھی بھی مجھے اس بات پر آمادہ نہیں کر پاتا کہ میں اسے ایک کردار کا روپ بخش سکوں۔ ایسا کرنا مجھے اس شخص کی بے عزتی کرنا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے غیر معمولی پن کو مجھے کسی جذبے سے دیکھنے کا حق نہیں ہے، نہ رحم سے، نہ محبت سے، نہ غصہ سے، نہ بے تعلقی سے۔ اس کے باقی سب سے الگ ہونے کو تسلیم کرنا ہی یا تو باقی سب کی خامیوں کو تسلیم کرنا ہے یا اپنی عظمت کو یا دونوں کا اعلان کرنا، اور یہ بات میری انسانیت سے بعید ہے۔

ہاں یہ تو ممکن ہے کہ اس کی غیر معمولیت کو میں دیکھنا ہی نہ چاہوں جیسے کوئی لولا ہے تو میں یہ نہ دیکھوں کہ اس کے ایک ہاتھ نہیں ہے بلکہ صرف یہ دیکھوں کہ وہ ایک آدمی ہے جس کے ایک ہاتھ کا نہ ہونا ہی اس کے جسم کا ایک حصہ ہے اور باقی سب اس کا چھوڑ دوں۔ وہ خود اپنے کو کیسے دیکھتا ہے، یا پھر میں اسے کیسے دیکھنا چاہوں گا، یہ سب میرے لیے غیر اہم ہو جائیں، نہیں یقینی طور سے ہتک آمیز بن جائیں۔

یہ تو ہوئی میرے فنکار کی غیرت، پر اس سے الگ ایک میری اپنی بپتا بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ غیر معمولی شخص کو عام شخص بناتے وقت جو طریقہ اپناتا ہوں اسے اپنے لیے غیر معمولی طور سے اہم مانتا ہوں۔ اس لیے لمحے کبھی یاد رکھ لینے کی بھی کوشش کرتا ہوں بدقسمتی یہ ہے اسی جگہ سے کہانی بننا شروع ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اس رعنا رات کو بھی ہوا۔ میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کہانی لکھوں۔ میں نے تو یہ بھی نہ چاہا تھا کہ سفر کروں اور یہ تو طے ہی ہے کہ اس کے میرے سامنے بیٹھے ہونے میں میری خواہش کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔

ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں اکیلا تھا سوائے اس مخصوص قسم کی گرمی کے جو جاڑوں کے موسم میں کافی دور تک آدمی کا ساتھ دیا کرتی ہے ـــــ گرمیوں میں تنہائی کا احساس کم ہی ہوتا ہے بالکل تنہا ہونے کی وجہ سے غیر محفوظ رہتا ہوں ـــــ لیکن اس بار وہ گرمی بھی ایک تنی ہوئی گرمی تھی، ٹوٹنے لٹنے کو نہیں، اس حالت میں پہونچنے سے کافی پہلے ٹھنڈ میں ملا ہوا عدم تحفظ کا ایک ہلکا سا احساس۔

ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں اکیلا تھا اور دیسی ڈھنگ کے گرم کپڑوں کے اوپر میں نے بھاری اوورکوٹ پہن رکھا تھا (مجھے ہمیشہ اس طرح اوورکوٹ پہنے میں لگتا ہے کہ وہ بھی کوئی دیسی پوشاک ہے۔) پچھلے تین چار سال سے کانوں اور پیروں میں زیادہ ٹھنڈ لگنے لگی تھی۔ اس لیے میں نے ایک ملائم گلوبند اور ہاتھ کا بنا موزا بھی پہن رکھا تھا۔ جس کا رنگ بدقسمتی سے ہرا تھا۔ (اس لیے میں موزے کو معاف کرنے میں مجھے کافی زور لگانا پڑا لیکن پھر آخر میں وہ مجھ سے گھل مل گیا۔)

میں کافی آرام سے تھا اتنا ہی جتنا کہ عدم تحفظ کے ایک ہلکے سے احساس کے باوجود کوئی ہو سکتا ہے اس سے کہیں کم ایک نہ ٹوٹنے والا الاپ تو رہتا ہے۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ وہ بالکل ننگی ہے۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر اور اتنا آگے کو جھک کر بیٹھی تھی کہ اگر ننگی نہ ہوتی تو اس طرح بیٹھ ہی نہ پاتی۔ پہلے تو لگا کہ اس کا سر پیر ہی نہیں ہے۔ پر پھر میں نے دیکھا کہ اس کے سر پر چھوٹے چھوٹے کترے ہوئے بال تھے۔ اور وہ ننگی نہیں تھی صرف لگتی تھی جیسے کہ اس حالت میں وہی بات اس کے لیے بالکل فطری ہو۔

دکھائی دیئے، دہری پر بیٹھے بیٹھے کراہ رہے تھے: کبھی کبھی بری طرح سے کھانس اٹھتے، سانس کا دورہ پڑ گیا تھا، گلی سے شوراج نکلا تو پچھلے دن والی بات کے کارن اس کی ہمت کچھ کہنے کی نہیں پڑی، سوچا، کترا کر نکل جائے لیکن پیر ٹھٹک رہے تھے، تبھی ہانپتے ہانپتے چھوٹے مہاراج بولے۔ "ارے شبو!" پھر کراہ کر ٹکڑے ٹکڑے کرکے کہنے لگے، "دورہ پڑ گیا ہے۔ کل رات سے۔ ہاں، اب کون دیکھے سنتو کو۔ بڑی خراب عادت ہے اس کی ۔۔۔ گردن سلاخ سے باہر کر لیتا ہے، رات بھر بلی چکر کاٹتی رہی بیٹا، چھن بھر کو پلک نہیں لگی، اپنے ہوش حواس ٹھیک نہیں تو کون رکھوالی کرے اس کی، اپنے گھر رکھ لو، بے فکر ہو جاؤں۔"

اور اتنا کہہ کر وہ بری طرح ہانپنے لگے، گلے میں کف چھینا تو اوندھے ہو کر لیٹ رہے، پھر بری طرح اٹھ بیٹھ رہی تھی، شوراج اچھا کہہ کر پنجرہ اٹھا کر چلنے لگا، طوطے تو ایک بار پوری آنکھ کھول کر انھوں نے تاکا، ان کی گدلی گدلی آنکھوں میں ایک عجیب فراق زدہ اطمینان تھا، جیسے کسی بوڑھے باپ نے اپنی لڑکی بدا کر دی ہو، سر نیچا کر کے انہوں نے ایک گہری سانس کھینچی، جیسے بہت بھاری قرض سے نجات پا گئے ہوں۔

تین چار دن ہو گئے تھے، چھوٹے مہاراج کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی، اکیلے کوٹھری میں پڑے رہتے، کوئی پاس بیٹھنے والا بھی نہیں تھا، چوتھے دن حالت کچھ ٹھیک نظر آئی، سرک کر دہری تک آئے، گھٹنوں پر کہنیاں رکھے اور ہتھیلیوں سے سر کو سہارا دیئے کچھ ٹھیک سے بیٹھے تھے، کبھی کراہ اٹھتے، دھانس لگتی تو کھانس اٹھتے۔ لیکن ان کے چہرے پر گہرے دکھ کا سایہ لرز رہا تھا جیسے کسی بھاری غم میں ڈوبے ہوں، ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تھی، جیسے کسی نے انھیں گہرا دھوکہ دیا ہو، ان کے کانوں میں بار بار سنتو کی وہ دکھ بھری آواز گونج رہی تھی جو انھوں نے دوپہر سنی تھی۔

دوپہر سنتو کی بیقرار آواز جب شوراج کے برد ٹھے سے سنائی دی تو وہ گھبرا گئے تھے کہ کہیں بلی کی گھات تو نہیں لگ گئی بڑے پریشان رہے پر اٹھنا تو بس میں نہیں تھا۔ شوراج کے گھر کی طرف بہت دیر آس لگائے رہے نہ کوئی نکلے تو پتہ چلے۔

کافی دیر بعد منوا طوطے کے دو تین ہرے ہرے پنکھوں کا گٹھا ماتھے سے باندھے، دو تین بچوں کے ساتھ گھومتا دکھائی پڑا، دیکھتے ہی سکتے میں آگئے۔ سنتو کی دم کے لمبے لمبے پنکھ، کسی طرح پوچھا تو پتہ چلا کہ منوا کو راجہ بننا تھا اس لئے اس نے سنتو پکڑ لی۔ بات کی بات میں دو تین پنکھ نوچ آئے۔

چھوٹے مہاراج کا جیسے سارا اعتماد اٹھ گیا، یہ لڑکا اسے مار ڈالے گا، اس وقت طبیعت کچھ ٹھیک معلوم ہوئی، بمشکل سے انہوں نے اپنا ڈنڈا پکڑا۔ ہلتے کانپتے شوراج کے یہاں پہنچے اور اپنا طوطا واپس مانگ لائے، کوٹھری میں اس کی ننجی پونچھ دیکھتے رہے، لیکن منہ سے کچھ نہیں بولے، کوئی بیچارا تک نہیں۔

شام ہو آئی تھی، تراہے پر لالٹین جل گئی تھی، پورا گلی میں اداس اندھیرا بھرتا جا رہا تھا، انھوں نے سنتو کے پنجرے کو اندر رکھ کر کوٹھری کے دروازے اڑکا لیے اور پھر نہیں اندر کچھ دیر کھٹ پٹ کرتے رہے، پھر رات کوئی آواز نہیں سویرے شوراج ادھر سے نکلا تو کوٹھری کی اوپر ڈالی، دروازے اسی طرح بھڑے تھے، اس نے دھیرے سے کھول کر جھانکا، دیکھا مہاراج سو رہے تھے، چپ چاپ دبے سے دروازہ بند کرنے لگا تو گلی کے رام نارائن بول پڑے "کیوں آج نہیں اٹھے مہاراج ابھی تک؟"

اور اتنا کہتے انھوں نے پورا دروازہ کھول دیا دونوں نے غور سے دیکھا۔ طوطے کا پنجرہ سرہانے رکھا تھا۔ جس پر کپڑا ڈھکا تھا کہ کہیں بلی کی گھات نہ لگ جائے، مگر چھوٹے مہاراج کا پنجرہ خالی پڑا تھا، پنچھی اڑ گیا تھا۔

چھوٹے مہاراج نے خود تو نہیں پڑھا تھا لیکن رام لیلا وغیرہ میں سننے کی وجہ سے یہ ان کا پختہ یقین تھا کہ آخری وقت اگر رام نام کانوں میں پڑ جائے تو مکتی مل جاتی ہے، پتہ نہیں ان کے آخری لمحات میں بھی سنتو طوطے کی بانی پھوٹی تھی یا نہیں ا

ہم زیر نظر شمارہ کے بارے میں آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

ادارہ

میں محسوس کر رہا ہوں کہ اسے اڑھا دینا ہے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ عورت کون ہے، کیا اسے سردی لگ رہی ہے؟ اور کیا وہ میری مدد قبول کرنے سے انکار تو نہ کرے گی۔

سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہو؟

ہاں!

تو جاؤ اڑھا دو۔

...... پر کیسے؟ اتنے لوگ ہیں سب دیکھیں گے کہ میں بیٹھ رہا ہوں اور وہ لے رہی ہے اور ہمارے درمیان تعلق قائم ہو گیا ہے۔ یہ میں نہ ہونے دے پاؤں گا نہ برداشت کر سکوں گا۔

تعلق۔ کیسا تعلق۔ تم نے اسے بمشکل بیس منٹ قبل ہی تو دیکھا ہے۔

وہ تم نہیں سمجھ سکتے تم صرف باپ چاچی، بھائی بہن، بھتیجے اور دوست کا رشتہ ہی جانتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت میرا اور اس کا رشتہ ہے کیونکہ ہم دونوں ایک ہی تجربہ کے دو حصے ہیں۔

تجربہ کیا۔ اس نے تو تم سے کچھ مانگا بھی نہیں۔ نہ میں نے ہی پوچھا ہے کہ تم کیا لوگی؟ یہی تو ہمارا تعلق ہے۔

یہ کہہ کر میں نے کمبل کو کس کر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ کس کر کیوں؟ کیا میں مذبذب تھا؟ کیا کوئی کمزوری تھی۔ میں نے تہہ کیا ہوا وہ کپڑا اپنے پیروں پر سے اٹھا لیا اور اسے اس عورت پر ڈالنے کے لیے اونچا کیا ....

نہیں میں کسی کو یہ دیکھنے نہیں دے سکتا۔ میرے اندر کوئی چلا اٹھا۔ میں اپنے تعلق کو ایک عام تعلق کی سطح پر اتارے جاتا نہیں دیکھ سکتا۔

پر تم خود ہی ایسا نہیں کر رہے ہو۔

ہاں میں نہیں کر رہا ہوں پر جس لمحہ میں اپنا کام کروں گا وہ غلط سمجھ لیا جائے گا۔

سیل اور بتیل سے چکنی سیٹوں پر لوگ سو رہے ہیں یا آدھے جاگ رہے ہیں۔ ایک کھاتا پیتا آدمی جس کے چہرہ پر چربی چھا جانے سے اب اس پر کسی جذبہ کی کوئی لکیر نہیں بن سکتی اوپر لیٹا میری طرف دیکھ رہا ہے۔ گاڑی کے چلنے سے اس کا سر ہلتا ہے۔ ہاں ہاں اڑھا دو پن ہوگا۔

ایک لمبی داڑھی والا نوجوان، پان سے جس کے ہونٹ کالے ہیں، دونوں پیر سیٹ پر رکھ کر اونگھ رہا ہے۔ وہ چونک کر دیکھتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔ سوتے میں وہ مسکراتا ہے۔ دل پسیج گیا ہوگا؟

اس ڈبہ میں اور بہت سے لوگ بھی ہیں۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ ایک دھندلی روشنی میں اونگھتے ہوئے اور کسی بھی نئے واقعہ پر فوراً چونک پڑنے پر تیار ....

وعدہ کرو کہ تم چونکو گے نہیں، میں اس عورت کو یہ کمبل اڑھا دینا چاہتا ہوں۔ میں اسے تلوؤں اور کانوں کے نیچے کمبل دبا کر اسے آرام سے سلا دینے کی حد تک نہیں جاؤں گا ـــــ صرف اس پر ڈال دوں گا جہاں تک بھی میں اس کی عزت کا احترام کرتے ہوئے جا سکتا ہوں۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے کس کر کمبل کو پھر اٹھایا۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ اس عورت کے پاس جو آدمی بیٹھا ہے وہ میرے کام آ سکتا ہے۔

اگر میں اپنی مرضی سے اپنے اور اس عورت کے درمیان دنیا کو ڈال دوں تو ہمارا رشتہ بھی پیدا ہو سکتا ہے اور دنیا ہمارے رشتہ کو اپنے ڈھنگ سے سمجھ بھی رہ سکتی ہے (یہ دنیا ایک استعمال ہے جو میں اکثر کرتا ہوں) اگر یہاں میرا کوئی دوست ہوتا تو میں اس کا بھی استعمال کر سکتا تھا ـــ وہ میری طرف سے ہوتا، اس وقت یہ آدمی اس عورت کی طرف سے ہوگا۔

"یہ لڑکی تمہارے ساتھ ہے؟"

اس نے منہ گھما کر سر ہلا دیا "نا"

"کوئی بات نہیں" میں نے ہنس کر کہا "میں یہ کھیل کھیل ہی ڈالوں گا۔ دنیا میرے تمہارے درمیان سے گئی ہی۔ میں ہی اس کی گہرائی میں بھی اتر لیتا ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے اپنے کو دو حصوں میں بانٹ لیتا ہوں تاکہ ہمیشہ ایک بنا رہ سکوں۔

چاروں طرف دیکھ کر میں نے پوچھا "کہاں جاؤگی؟"

یہ سوال اس عورت سے کیا گیا تھا۔ جب میں نے اپنی آواز سنی

وہ بالکل ساکت و ساکت تھی، کانپ نہیں رہی تھی۔ نہ ہلو ہی ڈول رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کی پیٹھ اور اس کے کپڑے مل کر ایک ہو گئے ہوں۔

معلوم نہیں کیوں میں مڑ کر کئی آنکھوں سے اس کی چھاتیاں تلاش کرنے لگا۔ (تب تک میں یہی سمجھتا تھا کہ عورت کا جسم ان کے بغیر پورا نہیں ہوتا) نہ، بہت کوشش کرنے پر بھی وہ تصور میری آنکھوں کے سامنے نہ آ سکا جو میں ایک چیز کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس میں کر رہا تھا۔ عورت کے روپ سے متعلق کئی چالو تصور میرے ذہن میں لائے لیکن ان میں تصویر بن سکنے کی طاقت نہ تھی۔ وہی جسم، وہی ڈھیر، وہی گھماؤ اور وہی ملاوٹ مجھے اپنے چاروں اور کے آکاش میں پھوٹ کر نکلتا ہوا سا دکھائی دیتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس میں جو تلاش کر رہا تھا وہ قطعاً بیکار تھا، غیر ضروری تھا اور صاف طور سے جہل تھا۔

(یہاں میری کہانی ختم ہو جانی چاہیے۔ پر اسی وقت میرے ان خیالوں کو جڑ سے اکھاڑتا ہوا ایک ریلا آتا ہے اور میں یکایک تسلیم کرتا ہوں کہ یہ حسینہ ایک زندہ جسم ہو بلکہ میں اسے اس طرح دیکھ ہی نہیں سکتا ہوں کہ وہ ایک زندہ جسم ہے، کچھ دیر کے لیے ساکت و ساکت، نیند اور اپنے خون کی گرمی سے مل کر اپنے نئے روپ میں ڈھل جانے پر قادر ____ شاید ابھی اگلے ہی لمحہ۔ جو روپ میں دیکھ رہا ہوں وہ کتنا جیتا جاگتا ہوا اٹھا ہو۔ کیا اس لیے نہیں کہ وہ انسانی جسم کا روپ ہے ؟)

اچانک اسے کوئی گرم کپڑا اوڑھا دینے کے لیے میں بے چین ہو گیا۔ ٹھیک، ٹھیک، ٹھیک، ٹھیک، میرے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ساتھ میرے دماغ نے کہا ہر دم ٹھیک بات پر ہی ہو۔ جو کچھ میں نے اس حسینہ میں دیکھا ہو وہ غلط نہیں ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ عورت ٹھنڈ سے ٹھٹھر رہی ہو میں اسے اپنا کمبل اوڑھا دوں ؟

ہم دونوں پھر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اس بار وہ کپکپاتے جاڑے میں بغیر کسی دوسرے کپڑے کے ٹھٹھری ہوئی ایک عورت تھی۔ اور میں اپنے کوٹ کی گرمی میں مطمئن ایک مرد جس کے دل میں صرف ایک خواہش تھی ____ خیال تھا، یا احساس یہ نہیں جانتا ____ یہ جو کچھ بھی تھا وہ یہی تھا کہ "اسے اوڑھا دوں" اپنا کمبل، یہ میں نے بعد میں جانا جب دیکھا کہ اپنا کمبل میں نہیں اوڑھا ہوں۔ بعد میں میں نے یہ بھی جانا کہ جس خواہش سے پورا جسم اور من مل ایک ہو گیا ہو اور جو میری زندگی کے پورے تجربوں سے ہو وہ اگر خود نہیں ہو ____ جس لمحہ ان تجربوں کو عملی شکل ملے وہ کیسے ہو جائیں گے میں نے اطمینان سے کہا۔

اسی وقت میری [illegible] کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے والی وہ بات شروع ہو گئی جسے آپ میری کہانی کہہ سکتے ہیں ____ کیسے اس نے پہلے مجھے چکنا چور کر دیا اور پھر آخری بار میں جو کہ مجھے بکھیر دے سکتا تھا اس نے مجھے ایک بھی جوڑ والے بغیر ایک کر دیا۔

ناشکرے کی طرح میں نے پوچھنا شروع کیا۔ میں اسے کمبل کیوں دینا چاہ رہا ہوں۔ کیا مجھے اس پر رحم آ رہا ہے کیونکہ کمبل میرے پاس ہے اور اس کے پاس نہیں ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اپنی پچھلی کہانی کی یاد دلائی ____ ایک شخص کو دوسرے پر رحم کرنے کا کیا حق ہے۔ پیار میں کر سکتا ہوں پر کیا میں سچ مچ پیار کر رہا ہوں۔ دیا بالکل نہیں، کیا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔

نہیں میں کمبل اسے اس لیے دے رہا ہوں کہ مجھے اس وقت اس کی ضرورت نہیں۔ پر یہ کتنا گھٹیا سبب ہو اور اس طرح دینے سے اچھا ہے نہ دینا۔ کم سے کم جہاں تک میری روح کا سوال ہو ایسے دینے اور نہ دینے میں کوئی فرق نہیں۔

لیکن ٹھہرو اس بات کا کیا ثبوت ہو کہ اسے سردی لگ رہی ہو یا اتنی سردی لگ رہی ہے کہ وہ تم سے کمبل لینا قبول کر سکتی ہو۔ کیا تمہارے اور اس کے کپڑوں میں جو واضح فرق ہے اس سے تم سمجھ رہے ہو کہ اسے سردی لگ رہی ہو؟

شاید جہاں تک صرف سمجھنے کا تعلق ہو۔

تب وہ دو کپڑے پہنے بیٹھی ہوتی تو تم گرمائے بیٹھے رہتے شاید اسے سچ مچ ٹھنڈ لگتی رہتی۔ نہ ____ نہیں ____ پتا نہیں!

اور کیا دوسرے شخص کو مکمل طور سے آزاد مانتے ہوئے بھی تم یہ ممکن نہیں مان سکتے کہ باہر سردی ہوتے ہوئے بھی اسے نہیں لگ رہی ہے۔

ہاں۔ جو بھی ہو۔ میرے لیے صرف یہ بات اہم ہے کہ میرے جسم پر جو کچھ بیت رہا ہے اسے مجھے ظاہر کر دینا چاہیے ____ اور

نرمل ورما
ترجمہ: بیر راجہ

پرندے

اندھیرے گلیارے میں چلتے ہوئے لیتکا ٹھٹک گئی۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے لیمپ کی لو بڑھا دی۔ سیڑھیوں پر اس کا سایہ ایک بے ڈول کٹی پھٹی شکل کھینچنے لگا۔ سات نمبر والے کمرے سے لڑکیوں کی بات چیت، ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں۔ لیتکا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شور اچانک بند ہو گیا۔

"کون ہے؟"

لیتکا چپ کھڑی رہی۔ کمرے میں کچھ دیر تک کھسر پھسر ہوتی رہی۔ پھر دروازے کی چٹخنی کے کھلنے کی آواز آئی۔ لیتکا کمرے کی دہلیز سے کچھ آگے بڑھی۔ لیمپ کی جھپکتی لو میں لڑکیوں کے چہرے سنیما کے پردے پر ٹھہرے ہوئے کلوز اپ کی طرح ابھرنے لگے۔

"کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟" لیتکا کی آواز میں ہلکی سی جھڑکی کا احساس تھا۔

"لیمپ میں تیل ہی ختم ہو گیا ہے میڈم"

یہ سدھا کا کمرہ تھا اس لئے اسے ہی جواب دینا پڑا۔ ہوسٹل میں شاید وہ سب سے زیادہ ہر دل عزیز تھی ہمیشہ چھٹی کے وقت یا رات کو ڈنر کے بعد آس پاس کے کمروں میں رہنے والی لڑکیوں کا جمگھٹ اسی کے کمرے میں لگ جاتا تھا۔ دیر تک گپ، ہنسی مذاق چلتا رہتا۔

"تیل کے لئے کریم الدین سے کیوں نہیں کہا؟"

"کتنی بار کہا میڈم، لیکن اسے یاد رہے تب تو۔"

کمرے میں ہنسی کی پھوار ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ لیتکا کے کمرے میں آنے سے ڈسپلن کی جو گھٹن گھر آئی تھی۔ وہ اچانک بہہ گئی۔ کریم الدین ہوسٹل کا نوکر تھا۔ اس کی کاہلی اور کام میں ٹال مٹول کے قصے ہوسٹل کی لڑکیوں میں پیڑھی در پیڑھی چلے آتے تھے۔

لیتکا کو ایکدم کچھ یاد آ گیا۔ اس نے اندھیرے میں لیمپ گھماتے ہوئے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ کمرے میں وہ چاروں طرف گھیرا بنا کر بیٹھی تھیں — پاس پاس ایک دوسرے سے سٹ کر۔ سب کے چہرے جانے پہچانے تھے لیکن لیمپ کی پیلی مدھم روشنی میں جیسے کچھ بدل گیا تھا۔ یا جیسے وہ انھیں پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

"جولی، اب تک تم اس بلاک میں کیا کر رہی ہو؟"

جولی کھڑکی کے پاس پلنگ کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس نے چپ چاپ آنکھیں نیچی کر لیں۔ لیمپ کی روشنی چاروں طرف سے سمٹ کر اب صرف اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"نائٹ رجسٹر پر دستخط کر دیئے؟"

"ہاں میڈم۔"

"پھر...." لیتکا کی آواز سخت ہو گئی۔ جولی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

جب سے لیتکا اس اسکول میں آئی ہے اس نے محسوس کیا ہے کہ ہوسٹل کے اس قاعدہ پر عمل ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود نہیں ہو رہا ہے

"میڈم کل سے چھٹیاں شروع ہو جائیں گی۔ اسی لئے آج رات ہم نے مل کر......" اور سدھا پوری بات نہ کہہ کر ہیمنتی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔

"ہیمنتی کے گانے کا پروگرام ہے آپ بھی کچھ دیر بیٹھئے نا!"

لیتکا کو الجھن معلوم ہوئی۔ اس وقت یہاں آ کر اس نے ان کا

تو مجھے لگا کہ میں اس سے غصہ ہوں یا اس سے نفرت کر رہا ہوں؟ اور بہت زور سے چیخ رہا ہوں ــــ ایک مکمل طور سے بے معنی آواز۔

پھر عورت نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ اس نے میری طرف گردن گھما کر دیکھا، بس دیکھنے بھر کو اس نے گردن گھمائی۔ وہ مسکرائی اور پھر اس نے گھٹنوں میں سر دے دیا اور ویسے ہی ہو گئی۔ جیسے تھی۔

کیا وہ پاگل ہے؟ مجھے خود بخود ہنسی آنے لگی۔ وہ بھی اگر میری ہی طرح دنیا کے رشتے نہیں مانتی تب تو میری یہ ترکیب بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ کوئی بات نہیں، بنا ترکیب ہی سہی۔ اب میں اس پر کمبل ڈال ہی دوں گا۔ تب پھر یہ سوچ کر ہنسی روکے نہ رک سکی کہ وہ کہیں شور نہ مچانے لگے۔

میں نے دیکھا کہ میں ایک ایسی حالت میں آ گیا ہوں جب اپنی عدم تکمیل کی کہانی لکھ ڈالنا اسے کمبل اڑھا دینے سے آسان ہو گیا ہے۔ میں چوکنا ہو گیا۔

تب میں نے کچھ دیر خود کو سمیٹ لینے میں لگائی۔ اتنی دیر میں میرے پیروں پر پڑا کمبل گر گیا۔

کتنا مشکل ہے بالکل اپنے آپ کچھ کرنا۔ میں اپنے ایک تجربہ کا آسان زبان میں اظہار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور نقادوں نے اپنے تجربات کے اظہار کو اتنا آسان بتایا ہے پھر بھی نہیں کر پا رہا ہوں میں یہ سوچ کر رک نہیں جاتا کہ اگر میں اسے آج سردی نہیں کھانے دوں گا تو کل اور کل کے بعد آنے والی ہزار راتوں کو یہ گرم رہے گی یا نہیں ــــ یا یہ کہ میرے دیس کے لاکھوں نیم برہنہ لوگ یہ جاڑا کیسے کاٹیں گے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں اس پر ترس نہیں کھا رہا ہوں، نہ خیرات کر رہا ہوں، نہ اس نے مانگا ہے، نہ میں نے دینے کا اعلان کیا ہے، نہ اسے میں جانتا ہوں، نہ غریبوں کی میں عام طور سے مدد کیا کرتا ہوں۔ براہِ مہربانی میرے اوپر اعتماد کیجئے۔ میں ایک اجنبی ہوں اور میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا اس عورت سے کوئی تعلق نہیں ہے، مجھ سے ہی ہے اور اس عورت کا بھی مجھ سے ایک تعلق ہے پھر وہ آپ نہیں جان سکتے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جس لمحہ میں اپنا کام کروں گا وہ مر جائے گا اور اس وقت بھی آپ یہ نہیں سوچ رہے ہیں کہ میں مکمل ہوں اور آپ نہیں ہیں، اس کا کیا ثبوت ہے۔ مان لیجئے میں بغیر کسی سبب کے ایک آسان تجربہ کو ظاہر نہیں ہونے دے رہا ہوں اور اپنے، غیر سماجی مزد کے سبب جیون کا اصل لطف نہیں لے پا رہا ہوں، پر پھر

اب سہی، اب میں اسے اڑھا دوں گا۔ میں اسے اڑھاؤں گا۔ جو میں کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے آپ کی زبان میں یہی الفاظ ہیں۔ اصل میں میں یہاں سے اٹھوں گا اور اپنے جسم کی ایک حرکت سے وہ فاصلہ طے کروں گا جو میرے اور اس عورت کے درمیان دنیا نے پیدا کر دیا ہے۔

میں نے کمبل کو اٹھایا۔ وہ پھول جیسا ہلکا تھا، لیکن بار آنکھ بھر کر میں نے دیکھا وہ جیسے اپنے حسن اور بناوٹ کے نشہ میں سرشار تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے چاروں اور کے آکاش سے پھوٹ کر میری طرف آنگن سے بڑھا میں نے اس عورت پر کمبل ڈال دیا۔

ریل گاڑی کی متوازن آواز یکا یک سنائی دینے لگی۔

سارا ڈبہ گہری نیند سو گیا تھا۔ ابلے آلو جیسے چہرہ والے آدمی کا منہ کھلا تھا۔ اور اس پر گھنی پیلی روشنی پڑ رہی تھی جیسے وہ مرنے کی ایکٹنگ کر رہا ہو اور اس کے ہونٹوں کے کناروں سے رال چو رہی ہو۔

عورت کو کچھ نہ ہوا۔ دو لمحوں بعد وہ ہلی اور اس نے خود کو اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ پھر ہل کر وہ پہلے سی ہو گئی۔

لیکن نہیں کمبل نے اپنی طرح طرح کی سلوٹوں سے اس کو ڈھک کر وہ روپ کا رہا بکل مٹا دیا جو تھوڑی دیر قبل میں نے آنکھ بھر کر کھڑی بار دیکھا تھا۔

پر اس سے بھی زیادہ انوکھی ایک اور بات ہوئی۔ میں نے یہ کہانی بھی لکھ ڈالی اور اسے کمبل بھی اڑھا دیا۔

جبکہ حقیقت، اصل حقیقت یہ ہے کہ قبل اس کے کہ میں مکمل خود اظہاری کے لیے خود کو آزاد کر پاتا سڑک کے کنارے کا ایک چھوٹا اسٹیشن آ گیا اور وہ عورت اتر کر کسی قصبہ کی اندھیری رات میں کھو گئی تھی۔

یا یہ امکان آپ کو پسند نہ ہو تو مان لیجئے کہ جس آدمی نے اسے اڑھایا تھا اس کا اسٹیشن آ گیا اور اس نے سوتی عورت پر سے اپنا کمبل کھینچ کر اتار لیا اور چلا گیا ٹھیک یہی میں نے کیا تھا۔

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے

اہل دل کے لیے سرمایہ جاں ہوتا ہے

جگر مراد آبادی

ناک اور چھوٹی چھوٹی چنچل آنکھوں سے بھی ظاہر تھی۔ برما پر جاپانیوں کے حملے کے بعد وہ اس چھوٹے سے پہاڑی شہر میں آ بسے تھے۔ پرائیوٹ پریکٹس کے علاوہ وہ کانونٹ سکول میں ہائی جین اور فزیالوجی بھی پڑھاتے تھے اسی لئے ان کو سکول کے ہوسٹل ہی میں ایک کمرہ رہنے کے لئے دے دیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ برما سے آتے ہوئے راستے میں ان کی بیوی کی موت ہو گئی لیکن اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ خود ڈاکٹر کبھی اس بیوی کا ذکر نہ کرتے۔

باتوں کے دوران ڈاکٹر اکثر کہا کرتے۔ "مرنے سے پہلے میں ایک بار برما ضرور جاؤں گا" اور تب ایک لمحہ کے لئے ان کی آنکھوں میں نمی چھا جاتی۔ لینا چاہنے پر بھی ان سے کچھ پوچھ نہ پاتی۔ اسے لگتا کہ ڈاکٹر یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان سے متعلق ان سے کچھ بھی پوچھے یا ہمدردی کا اظہار کرے۔ دوسرے ہی لمحہ اپنی سنجیدگی کو دور بھگاتے ہوئے وہ ہنس پڑتے ــــ ایک سوکھی بجھی ہوئی ہنسی۔

ہوم سکنس بھی ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔

چھت پر میز کرسیاں ڈال دی گئیں لیکن اندر کمرے میں پرکولیٹر میں کافی کا پانی چڑھا دیا گیا۔

"سنا ہے اگلے دو تین برسوں میں یہاں بجلی کا انتظام ہو جائے گا" ڈاکٹر نے اسپرٹ لیمپ جلاتے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو پچھلے دس برسوں سے سننے میں آ رہی ہے، انگریزوں نے بھی کوئی لمبی چوڑی اسکیم بنائی تھی پتہ نہیں اس کا کیا ہوا" ہیوبرٹ نے کہا۔ وہ آرام کرسی پر لیٹا ہوا باہر لان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

لینا کمرے سے دو موم بتیاں لے آئی۔ میز کے دونوں طرف پر ٹکا کر انھیں جلا دیا گیا۔ چھت کا اندھیرا موم بتی کی پھیکی روشنی کے ارد گرد سمٹنے لگا۔ اور گھنی خاموشی چاروں طرف گھرنے لگی۔ ہوا میں چیڑ کے درختوں کی سائیں سائیں دور دور تک پھیلی پہاڑیوں اور گھاٹیوں سے سیٹیوں کی گونج سی چھوڑتی جا رہی تھی۔

"اس بار شاید بہت جلدی گرے گی۔ ابھی سے ہوا میں ایک سرد خشکی سی محسوس ہونے لگی ہے" ڈاکٹر کا سگار اندھیرے میں لال نقطہ سا چمک رہا تھا۔

"پتہ نہیں مس وڈ کو سپیشل سروس کا کون سا حصہ پسند آتا ہے چھٹیوں میں گھر جانے سے پہلے کیا یہ ضروری ہے کہ لڑکیاں فادر ایلمنڈ کا سرمن سنیں" ہیوبرٹ نے کہا۔

پچھلے پانچ سال سے میں سنتا آ رہا ہوں ــــ فادر ایلمنڈ کے سرمن میں کہیں ہیر پھیر نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر کو فادر ایلمنڈ ایک آنکھ نہیں سہاتے تھے۔

لینا کرسی پر آگے جھک کر پیالوں میں کافی انڈیلنے لگی۔ ہر سال سکول بند ہونے کے دن یہی دو پروگرام ہوتے ہیں چیپل میں اسپیشل سروس اور اس کے بعد دن میں پکنک لینا کو پہلا سال یاد آیا جب ڈاکٹر کے ساتھ پکنک کے بعد وہ کلب گئی تھی۔ ڈاکٹر بار میں بیٹھے تھے۔ بال روم کا ایمنی رجمنٹ کے افسروں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک بلیرڈ دیکھنے کے بعد جب وہ واپس بار کی طرف آ رہے تھے تب اس نے دائیں طرف کلب کی لائبریری میں دیکھا۔ مگر اسی وقت ڈاکٹر مکرجی پیچھے سے آ گئے تھے۔ "مس لتیکا یہ میجر گریش نیگی ہیں۔" بلیرڈ روم سے آتے ہوئے قہقہوں کے بیچ یہ نام دب سا گیا تھا۔ وہ کسی کتاب کے بیچ میں انگلی رکھ کر لائبریری کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ "ہیلو ڈاکٹر" ــــ وہ پیچھے مڑا ــــ تب اس لمحہ.....

اس لمحہ نہ جانے کیوں لتیکا کا ہاتھ کانپ گیا اور کافی کی کچھ گرم بوندیں اس کی ساڑی پر چھلک آئیں۔ اندھیرے میں کسی نے نہیں دیکھا کہ لتیکا کے چہرے پر ایک سونا پن گھر آیا ہے۔

ہوا کے جھونکے سے موم بتیوں کی لو پھڑکنے لگی۔ چھت سے بھی اونچی کاٹھ گودام جانے والی سڑک پر یو۔ پی روڈ ویز کی آخری بس ڈاک لے کر جا رہی تھی۔ بس کی ہیڈ لائیٹس میں آس پاس پھیلی ہوئی جھاڑیوں کے سائے گھر کی دیوار پر سرکتے ہوئے غائب ہونے لگے۔

"مس لتیکا اس سال بھی آپ چھٹیوں میں یہیں رہیں گی" ڈاکٹر نے پوچھا۔

ڈاکٹر کا سوال فضا میں ٹنگا رہا۔ اسی لمحہ پیانو پر شوپاں کا

سارا مزا کرکرا کر دیا تھا۔ اس چھوٹے سے ہل اسٹیشن پر رہتے اسے خاصا عرصہ ہو گیا تھا لیکن کب وقت پت جھڑ اور گرمیوں کا گھیر اپار کر کے سردی کی چھٹیوں کی گود میں سمٹ جاتا ہے اسے کبھی یاد نہیں رہتا۔

چوروں کی طرح وہ چپ چاپ دہلیز سے باہر ہو گئی۔ اس کے چہرے کا تنا ؤ ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ مسکرانے لگی۔

"میرے ساتھ اسنو فال دیکھنے کوئی نہیں ٹھہرے گا؟"

"میڈم چھٹیوں میں کیا آپ گھر نہیں جا رہی ہیں؟" سب لڑکیوں کی آنکھیں اس پر جم گئیں۔

"ابھی کچھ معلوم نہیں ہے ـــــ آئی لو دی سنو فال"

لیتکا کو لگا یہی بات اس نے پچھلے سال بھی کہی تھی اور شاید پچھلے سے پچھلے سال بھی۔ اسے لگا جیسے لڑکیاں اسے شبہ کی نظر سے دیکھ رہی ہیں جیسے انھیں اس کی بات پر یقین نہیں۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ جیسے بادلوں کا سیاہ بھرمٹ کسی انجانے کونے سے اٹھ کر اسے اپنے میں ڈبو لے گا۔ وہ تھوڑا سا ہنسی، پھر دھیرے سے اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

"جولی، تم سے کچھ کام ہے اپنے بلاک میں جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا ـــــ ویل گڈ نائٹ"۔ لیتکا نے دروازہ بند کر دیا۔

"گڈ نائٹ میڈم، گڈ نائٹ، گڈ نائٹ......"

گلیارے کی سیڑھیاں نہ اتر کر لیتکا ریلنگ کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ لیمپ کی بتی کو نیچے گھما کر کونے میں رکھ دیا۔ باہر دھند کی نیلی تہیں بہت گھنی ہو چلی تھیں۔ ان پر لگے ہوئے چیڑ کے پتوں کی سرسراہٹ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی تیز کبھی دھیمی ہو کر اندر بہہ آتی تھی اور ہوا میں سردی کا ہلکا سا احساس پا کر لیتکا کے دماغ میں کل سے شروع ہونے والی چھٹیوں کا دھیان بھٹک آیا۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ اسے لگا کہ جیسے اس کی ٹانگیں بنس کی لکڑیوں کی طرح اس کے جسم سے بندھی ہیں، جس کی گانٹھیں دھیرے دھیرے کھلتی جا رہی ہیں۔ سر کی چکراہٹ ابھی مٹی نہیں تھی بلکہ اب جیسے وہ اندر نہ ہو کر باہر پھیلی ہوئی دھند کا حصہ بن گئی تھی۔

سیڑھیوں پر بات چیت کی آواز سن کر لیتکا جیسے سوتے سے جاگی۔ شال کو کندھوں پر سمیٹا اور لیمپ اٹھا لیا۔ ڈاکٹر مکرجی مسٹر ہیوبرٹ کے ساتھ ایک انگریزی دھن گنگناتے ہوئے اوپر آ رہے تھے۔ سیڑھیوں پر اندھیرا تھا اور ہیوبرٹ کو بار بار اپنی چھڑی سے راستہ ٹٹولنا پڑتا تھا لیتکا نے دو چار سیڑھیاں اتر کر لیمپ کو نیچا جھکا دیا۔

"گڈ ایوننگ ڈاکٹر، گڈ ایوننگ مسٹر ہیوبرٹ۔"

"تھینک یو مس لتیکا" ہیوبرٹ کی آواز میں احسان مندی کا احساس تھا۔ سیڑھیاں چڑھنے سے اس کی سانس تیز ہو رہی تھی اور وہ دیوار سے لگے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ لیمپ کی روشنی میں ان کے چہروں کا پیلا پن کچھ تانبے کے رنگ جیسا ہو گیا تھا۔

"یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو مس لتیکا؟" ڈاکٹر نے ہونٹوں کے اندر سے سیٹی بجائی۔

"چیکنگ کر کے لوٹ رہی تھی۔ آج اس وقت اوپر کیسے آنا ہوا مسٹر ہیوبرٹ؟"

ہیوبرٹ نے مسکرا کر اپنی چھڑی ڈاکٹر کے کندھے سے چھوا دی ـــــ "ان سے پوچھو یہی مجھے زبردستی گھسیٹ لائے ہیں۔"

"مس لتیکا ہم آپ کو دعوت دینے آ رہے تھے۔ آج رات میرے کمرے میں ایک چھوٹا سا کنسرٹ ہو گا جس میں مسٹر ہیوبرٹ شوپاں اور چائیکوسکی کے کمپوزیشن بجائیں گے اور کریم کافی پی جائے گی۔ اور اگر اس کے بعد وقت رہا تو پچھلے سال ہم نے جو گناہ کئے ہیں ہم سب ایک دوسرے کے سامنے ان کا اقبال کریں گے۔" ڈاکٹر مکرجی کے چہرے پر بھرپور مسکان کھیل گئی۔

"ڈاکٹر مجھے معاف کریں، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"چلئے یہ ٹھیک رہا۔ پھر تو آپ ویسے بھی میرے پاس آتیں۔" ڈاکٹر نے دھیرے سے لتیکا کے کندھے کو پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف موڑ دیا۔

ڈاکٹر مکرجی کا کمرہ بلاک کے دوسرے سرے پر چھت سے جڑا ہوا تھا۔ وہ آدھے برمی تھے۔ یہ بات ان کی کسی قدر دبی ہوئی

فکری پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کی موت آخر تک پہیلی بنی رہتی ہے.... شاید وہ زندگی سے بہت امید لگاتے ہیں، اسے المناک ہی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آخری دم تک انہیں مرنے کا احساس نہیں ہوتا......"

"ڈاکٹر، آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں؟" ہیوبرٹ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

ڈاکٹر کچھ دیر تک چپ چاپ سگار پیتا رہا۔ پھر مڑ کر وہ موم بتیوں کی بجھتی ہوئی لو کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے۔ کبھی لینا بلا ناغہ کلب جایا کرتی تھی۔ ہریش نیگی سے ان کا تعارف وہیں ہوا تھا۔ کشمیر جانے سے ایک رات پہلے اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں اب تک لیکا سے اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکا ہوں، لیکن اس رات کون جانتا تھا کہ وہ واپس نہیں لوٹے گا۔ اور اب... اب کیا فرق پڑتا ہے۔ بیٹ دی ٹو یڈ ڈالی۔" ڈاکٹر کی سوکھی ہنسی میں کھوکھلا خالی پن سا ابھرا تھا۔

"کون ہریش نیگی۔؟"

"کمایوں رجمنٹ میں کرنل تھا۔"

"ڈاکٹر کیا لیکا......" ہیوبرٹ سے آگے کچھ نہیں کہا گیا اسے یاد آیا وہ خط جو اس نے لیکا کو بھیجا تھا..... کتنا بے معنی اور مضحکہ خیز تھا۔ اب جیسے اس کا ایک ایک لفظ اسکے دل میں کچوکے لگا رہا ہو۔ اس نے دھیرے سے پیانو پر سر ٹکا لیا لیکا نے اسے کیوں نہیں بتایا۔ کیا وہ اس کے لائق بھی نہیں تھا؟

"لیکا..... وہ تو بچی ہے، پاگل، مرنے والے کے ساتھ کہیں خود بھی مرا جاتا ہے۔"

کچھ دیر چپ رہ کر ڈاکٹر نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ "لیکن ہیوبرٹ، کیا تم نیتی پر وشواس کرتے ہو؟"

ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے موم بتیاں ایک بار جل کر بجھ گئیں۔ ٹیرس پر ہیوبرٹ اور ڈاکٹر اندھیرے میں ایک دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہے تھے پھر بھی وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کانونٹ اسکول سے کچھ دور میدانوں میں بہتے پہاڑی نالے کی آواز آ رہی تھی۔ جب بہت دیر بعد کمایوں رجمنٹ سینٹر کا بگل سنائی دیا تو ہیوبرٹ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"اچھا چلتا ہوں، ڈاکٹر، گڈ نائٹ"

"گڈ نائٹ ہیوبرٹ..... مجھے معاف کرنا میں سگار ختم کر کے اٹھوں گا......"

صبح کی بدلی چھائی ہوئی تھی۔ لیکا کے کھڑکی کھولتے ہی دھند کا غبارہ سا اندر گھس آیا جیسے رات بھر دیوار کے سہارے سردی میں ٹھٹھرتا ہوا وہ اندر آنے کا انتظار کر رہا ہو۔ سکول سے اوپر چیپل جانے والی سڑک بادلوں میں چھپ گئی تھی۔ کیول چیپل کا "کراس" دھند کے پردے پر ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی پنسل کی لکیر ملا سا دکھائی دے جاتا تھا۔

لیکا نے کھڑکی سے آنکھیں ہٹائیں تو دیکھا کریم الدین چائے کی ٹرے لئے کھڑا ہے۔ کریم الدین ملٹری کا اردلی رہ چکا تھا۔ اس لئے ٹرے میز پر رکھ کر "اٹین شن" کی حالت میں کھڑا ہو گیا۔

لیکا جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ صبح سے آلس میں کتنی بار جاگ کر وہ سو چکی ہے۔ اپنی کھسیاہٹ مٹانے کے لئے لیکا نے کہا۔

"بڑی سردی ہے آج، بستر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"اجی میم صاحب۔ ابھی کیا سردی آئی ہے — بڑے دنوں میں دیکھنا کیسے دانت کٹکٹاتے ہیں۔" اور کریم الدین اپنے ہاتھوں کو بغلوں میں ڈالتے ہوئے اس طرح سکڑ گیا جیسے ان دنوں کے صرف تصور سے ہی جاڑا لگنا شروع ہو گیا ہو۔ کھچڑی سر کے دونوں طرف سے اس کے بال خضاب لگانے سے کتھئی اور بھورے ہو گئے تھے۔ بات چاہے کسی موضوع پر ہو رہی ہو وہ ہمیشہ کھینچ تان کر اسے ایسے حلقے میں گھسیٹ لاتا تھا جہاں وہ بے جھجک اپنے خیالات کا اظہار کر سکے۔

"ایک دفعہ تو یہاں لگاتار اتنی برف گری تھی کہ بھوالی سے لیکر ڈاک بنگلے تک ساری سڑکیں جام ہو گئی تھیں اتنی برف تھی میم صاحب کہ پیڑوں کی ٹہنیاں تک سکڑ کر تنوں سے لپٹ گئی تھیں — بالکل ایسے..." اور کریم الدین نیچے جھک کر مرغا سا بن گیا۔

"کب کی بات ہے؟" — لیکا نے پوچھا۔

"اب یہ تو جوڑ حساب کر کے ہی پتہ چلے گا میم صاحب..... لیکن اتنا یاد ہے کہ اس وقت انگریز بہادر یہیں تھے۔ کنٹونمنٹ کی عمارت

فوکرن ہیوبرٹ کی انگلیوں کے نیچے سے پھسلتا ہوا دھیرے دھیرے چھت کے اندھیرے میں گھلنے لگا — جیسے پانی پر کوئی خوابی لہریا مجنوروں کا جھلملاتا جال ملتی ہوئی دور دور کناروں تک پھیلتی جا رہی ہوں۔ لیتکا کو لگا جیسے کہیں بہت دور برف کی چوٹیوں سے پرندوں کے جھنڈ نیچے انجانی بستیوں کی طرف اڑے جا رہے ہوں — دھاگے میں بندھے چمکیلے لٹوؤں کی طرح وہ ایک لمبی ٹیڑھی میڑھی قطار میں اڑے جاتے ہیں۔ پہاڑوں کی سنسان خاموشی سے پرے ان عجیب شہروں کی طرف جہاں شاید وہ کبھی نہیں جائے گی۔

لیتکا آرم چیئر پر اونگھنے لگی۔ ڈاکٹر مکرجی کا سگار اندھیرے میں چپ چاپ جل رہا تھا۔ ڈاکٹر کو حیرانی ہوئی لیتکا نہ جانے کیا سوچ رہی ہے اور لیتکا سوچ رہی تھی — کیا وہ بوڑھی ہوتی جا رہی ہے؟ اس کے سامنے اسکول کی پرنسپل مس وڈ کا چہرہ گھوم گیا — پوپلا منھ، آنکھوں کے نیچے جھولتے ہوئے گوشت کی تھیلیاں، ذرا ذرا سی بات پر چڑھ جانا، کرخت آواز میں چیخنا — سب اسے "اولڈ میڈ" کہہ کر پکارتے ہیں۔ کچھ برسوں کے بعد وہ بھی ہو بہو ویسی ہی بن جائے گی... لیتکا کے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی جیسے انجانے میں اس نے کسی غلیظ چیز کو چھو لیا ہو۔ اسے یاد آیا کچھ مہینے پہلے اچانک اسے ہیوبرٹ کا پریم پتر ملا تھا جذبات اور التجاؤں سے بھرا ہوا خط جس میں اس نے نہ جانے کیا کیا لکھا تھا جو کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اسے ہیوبرٹ کی اس بچکانہ حرکت پر ہنسی آئی تھی لیکن اندر ہی اندر مسرت بھی ہوئی تھی — اس کی عمر ابھی بیتی نہیں ہے، اب بھی وہ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے ہیوبرٹ کا خط پڑھ کر اسے غصہ نہیں آیا، آئی تھی صرف ممتا۔ وہ چاہتی تو اس کی غلط فہمی کو دور کرنے میں دیر نہ لگتی لیکن کوئی طاقت اسے روکے رہتی ہے۔ اس کی وجہ سے اپنے پر اعتماد رہتا ہے اپنے سکھ کا بھرم جیسے ہیوبرٹ کی غلط فہمی سے جڑا ہے...

ہیوبرٹ ہی کیوں، وہ کیا کسی کو بھی چاہ سکے گی۔ اس احساس کے ساتھ جو اب نہیں رہا ایک چھایا سی اس پر منڈلاتی رہتی ہے جو نہ خود مٹتی ہے نہ اسے مکتی دے پاتی ہے۔ اسے لگا جیسے بادلوں کا جھرمٹ پھر اس کے ذہن پر دھیرے دھیرے چھانے لگا ہے اس کی ٹانگیں پھر بے جان، سن سی ہو گئی ہیں۔

وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی — "ڈاکٹر معاف کرنا مجھے بہت تکان لگ رہی ہے..." فقرہ پورا کئے بغیر ہی وہ چلی گئی۔

کچھ دیر تک ٹیرس پر سناٹا چھایا رہا۔ موم بتیاں بجھنے لگی تھیں ڈاکٹر مکرجی نے سگار کا کش لیا — "سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں — بیوقوف اور سینٹی مینٹل۔"

ہیوبرٹ کی انگلیوں کا دباؤ پیانو پر ڈھیلا پڑ گیا — آخری سروں کی سہمی سی گونج کچھ لمحوں تک ہوا میں تیرتی رہی۔

"ڈاکٹر آپ کو معلوم ہے...... مس لیتکا کا رویہ پچھلے کچھ عرصے سے عجیب سا لگتا ہے۔" ہیوبرٹ کی آواز میں لاپرواہی کا عنصر تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لیتکا کے بارے میں اس کی خواہشات کا ہلکا سا احساس بھی کسی اور کو ہو سکے۔ جس نرم و نازک احساس کو وہ اتنے عرصے سے متاع عزیز بنائے ہوئے تھا، ڈاکٹر اسے ایک قہقہے میں مضحکہ بنا دے گا۔

"کیا تم نیتی میں وشواس کرتے ہو ہیوبرٹ؟" ڈاکٹر نے کہا۔

ہیوبرٹ دم روکے انتظار کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی بات کہنے سے پہلے ڈاکٹر کو فلاسفائز کرنے کی عادت تھی۔ ڈاکٹر ٹیرس کے جنگلے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پھیکی سی چاندنی میں چیڑ کے درختوں کے سائے لان پر گر رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی جگنو اندھیرے میں ہری روشنی چھڑکتا ہوا غائب ہو جاتا۔

"میں کبھی کبھی سوچتا ہوں انسان زندہ کس لئے رہتا ہے — کیا اسے کوئی اور بہتر کام کرنے کو نہیں ملا۔ اپنے ملک سے دور میں یہاں پڑا ہوں — یہاں کون مجھے جانتا ہے۔ یہاں میں شاید مر بھی جاؤں گا۔ ہیوبرٹ کیا تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ ایک اجنبی کی حیثیت سے پرائی زمین پر مر جانا کیسی خوفناک بات ہے......"

ہیوبرٹ حیران سا ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ پہلی بار ڈاکٹر مکرجی کے اس رخ سے روشناس ہوا تھا۔ اپنے بارے میں تو وہ خاموشی ہی اختیار کئے رہتے تھے۔

"کوئی پیچھے نہیں ہے، یہ بات مجھ میں ایک عجیب قسم کی بے

سیٹیں ریزرو کرانے کے لئے چپراسی کو دوڑا دیتے ہیں۔ جو سامان ہوسٹل کی لڑکیاں چھوڑے جا رہی ہیں اسے گودام میں رکھوانا ہوگا۔ کبھی کبھی تو چھوٹی کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ پیکنگ کروانے کے کام میں بھی اسے ہاتھ بٹوانا پڑتا تھا۔

وہ ان کاموں سے اوبتی نہیں۔ دھیرے دھیرے سب نپٹتے جاتے ہیں، کوئی غلطی ادھر ادھر رہ جاتی ہے، سو بعد میں سیدھی ہو جاتی ہے ـــــ ہر کام میں کچھ نہ کچھ رہتی ہے، پریشانی اور دقت ہوتی ہے۔ لیکن دیر سویر اس سے چھٹکارا مل ہی جاتا ہے۔ لیکن جب لڑکیوں کی آخری بس چلی جاتی ہے تب من اچاٹ سا ہو جاتا ہے خالی کاریڈار میں گھومتی ہوئی وہ کبھی اس کمرے میں جاتی ہے اور کبھی اس میں۔ وہ نہیں جان پاتی کہ اپنے سے کیا کرے۔ دل کہیں ٹک نہیں پاتا۔ ہمیشہ بھٹکا بھٹکا سا رہتا ہے۔

اس سب کے باوجود جب کوئی ٹھہرے انداز سے پوچھ بیٹھتا ہے "مس لتیکا چھٹیوں میں آپ گھر نہیں جا رہی ہیں" تب ..... وہ کیا کہے؟

ڈنگ ڈانگ ڈنگ ..... سپیشل سروس کے لئے سکول چیپل کے گھنٹے بجنے لگے تھے۔ لتیکا نے اپنا سر کھڑکی کے اندر کر لیا اس نے جھٹ پٹ ساڑی اتاری اور پیٹی کوٹ میں ہی کندھے پر تولیہ ڈالے غسل خانے میں گھس گئی۔

لیفٹ۔ رائٹ۔ لیفٹ ..... لیفٹ .....

کنٹونمنٹ جانے والی پکی سڑک پر چار چار کی قطار میں کمایوں رجمنٹ کے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی مارچ کر رہی تھی۔ فوجی بوٹوں کی بھاری کھردری آوازیں چیپل کی دیواروں سے ٹکرا کر اندر پریئر ہال میں گونج رہی تھیں۔

"بلیسڈ آر دی میک" ..... فادر ایلمنڈ ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کھنکھناتی آواز میں "سرمن آف دا ماؤنٹ" پڑھ رہے تھے۔ یسوع مسیح کے مجسمے کے نیچے "کینڈل بریم" کے دونوں طرف موم بتیاں جل رہی تھیں جس کی روشنی آگے بنچوں پر بیٹھی لڑکیوں پر پڑ رہی تھی۔ پچھلی بنچیں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھیں، جہاں لڑکیاں دعا کے لئے سر جھکائے ایک دوسرے سے کھسر پھسر کر رہی تھیں مس وڈ سکول سیزن کے کامیابی کے ساتھ ختم ہو جانے پر طلبا اور استاف کے ممبروں کو الوداع کہہ چکی تھیں ـــــ اور اب فادر کے پیچھے بیٹھی اپنے من میں کچھ بڑبڑا رہی تھیں جیسے دھیرے دھیرے فادر کو "پرامپٹ" کر رہی ہوں۔

"آمین" فادر ایلمنڈ نے بائبل میز پر رکھ دی اور "پریئر بک" اٹھالی۔ ہال کی خاموشی لمحہ بھر کے لئے ٹوٹ گئی۔ لڑکیوں نے کھڑے ہوتے ہوئے جان بوجھ کر بنچوں کو پیچھے دھکیلا ـــــ بنچیں فرش پر رگڑ کھا کر سیٹی بجاتی ہوئی پیچھے کھسک گئیں۔ ہال کے کونے سے ہنسی پھوٹ پڑی۔ مس وڈ کا چہرہ تن گیا تھا ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ پھر اچانک سناٹا چھا گیا ـــــ ہال کے اس گھٹے ہوئے دھندلکے میں فادر کی تیکھی پھٹی آواز سنائی دینے لگی ـــــ

"جیسس سیڈ آئی ایم دا لائٹ آف دا ورلڈ ـــــ ہی دیٹ فالوتھ می شیل ناٹ واک اِن ڈارک نیس، بٹ شیل ہیو دا لائٹ آف لائف ....."

ڈاکٹر مکرجی نے اکتاہٹ بھری جمائی لی "کب یہ قصہ ختم ہوگا؟" اس نے اونچی آواز میں لتیکا سے پوچھا کہ وہ اداس ہو کر دوسری منزل کی طرف دیکھنے لگی۔ سپیشل سروس کے وقت ڈاکٹر مکرجی کے ہونٹوں پر طنز آمیز مسکان کھیلتی رہتی اور وہ دھیرے دھیرے اپنی مونچھوں کو کھینچتا رہتا۔

فادر ایلمنڈ کی پوشاک دیکھ کر لتیکا کے دل میں گدگدی سی دوڑ گئی۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اکثر یہ بات سوچ کر حیران ہوا کرتی کہ کیا پادری لوگ سفید چغہ کے نیچے کچھ نہیں پہنتے اگر اتفاق سے وہ اوپر اٹھ جائے تو؟

لیفٹ ..... لیفٹ ..... لیفٹ ..... مارچ کرتے ہوئے فوجی بوٹ چیپل سے دور ہوتے جا رہے تھے ـــــ صرف ان کی گونج ہوا میں باقی رہ گئی تھی۔

"ہِم نمبر ۱۱۷ ـــــ" فادر نے عبادت کی کتاب کھولتے ہوئے کہا۔ ہال کی ہر لڑکی نے ڈیسک پر رکھی ہوئی ہِم بک کھول لی۔ صفحوں کے الٹنے کی کھڑکھڑاہٹ پھیلتی ہوئی ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی۔

آگے کی بنچ سے ہیوبرٹ اٹھ کر پیانو کے سامنے سٹول

پر ترنگا نہیں لگا تھا۔ بڑے جابر تھے یہ انگریز۔ دو گھنٹوں میں ساری سڑکیں صاف کروادیں۔ ان دنوں ایک سیٹی بجاتے پچاس گھوڑے جمع ہوجاتے تھے۔ اب تو سارے شیڈ خالی پڑے ہیں۔ وہ لوگ اپنی خدمت بھی کروانا جانتے تھے۔ اب تو سب اجاڑ ہوگیا ہے" کریم الدین اداسی سے باہر دیکھنے لگا۔

آج یہ پہلی بار نہیں ہے جب لتیکا کریم الدین سے ان دنوں کی باتیں سن رہی تھی جب "انگریز بہادر" نے اس جگہ کو سورگ بنا رکھا تھا۔

"آپ چھٹیوں میں اس سال بھی یہیں رہیں گی میم صاحب۔"

"لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے کریم الدین — تمھیں پھر پریشان ہونا پڑے گا۔"

"کیا کہتی ہیں میم صاحب۔ آپ کے رہنے سے ہمارا بھی من لگ جاتا ہے۔ ورنہ چھٹیوں میں تو یہاں کتے لوٹتے ہیں۔"

"تم ذرا مستری سے کہہ دینا کہ اس کمرے کی چھت کی مرمت کر جائے۔ پچھلے سال برف کا پانی دراروں سے ٹپکتا رہتا تھا۔"

لتیکا کو یاد آیا کہ پچھلی سردیوں میں جب بھی برف گرتی تھی تو اسے پانی سے بچنے کے لئے رات بھر کمرے کے کونے میں سمٹ کر سونا پڑتا تھا۔

کریم الدین چائے کی ٹرے اٹھاتا ہوا بولا "ہیوبرٹ صاحب تو شاید کل ہی چلے جائیں — کل رات ان کی طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ آدھی رات کے وقت مجھے جگانے آئے تھے۔ کہتے تھے چھاتی میں تکلیف ہے۔ انھیں یہ موسم راس نہیں آتا۔ کہہ رہے تھے لڑکیوں کی بس میں وہ بھی کل ہی چلے جائیں گے۔"

کریم الدین دروازہ بند کرکے چلا گیا۔ لتیکا کا دل چاہا کہ وہ ہیوبرٹ کے کمرے میں جاکر ان کی طبیعت کے بارے میں دریافت کر آئے لیکن پھر نہ جانے کیوں سلیپر پیروں میں ٹنگے رہے اور وہ کھڑکی کے باہر بادلوں کو اڑتا ہوا دیکھتی رہی۔ ہیوبرٹ کا چہرہ جب اسے دیکھ کر سہما سہما اور قابل رحم ہو جاتا تب لگتا ہے کہ وہ اپنی خاموش معصوم گڑگڑاہٹ میں اسے کوس رہی ہے — نہ وہ اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کر پاتی ہے نہ اسے اپنی مجبوری ہی میں شریک کر پاتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس جالے سے باہر نکلنے کے لئے وہ دھاگے کے جس سرے کو پکڑتی ہے، وہ خود ایک گرہ بن کر رہ جاتا ہے...

باہر بوندا باندی ہونے لگی تھی — کمرے کی ٹین کی چھت "کھٹ کھٹ" بولنے لگی۔ لتیکا پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کو تہا کر بچھایا۔ پھر پیروں میں سلیپروں کو گھسیٹتے ہوئے وہ بڑے آئینے تک آئی اور اس کے سامنے اسٹول پر بیٹھ کر بالوں کو کھولنے لگی۔ کچھ دیر تک کنگھی بالوں میں الجھی رہی اور وہ گم سم شیشے میں اپنا دیکھتی رہی۔ کریم الدین سے یہ کہنا یاد ہی نہیں رہا کہ ڈھیر سے جلانے کی لکڑیاں جمع کرے۔ ان دنوں سستے داموں پر سوکھی لکڑیاں مل جاتی ہیں۔ پچھلے سال تو کمرہ دھوئیں سے بھر جاتا تھا جس کے کارن کپکپاتے جاڑے میں بھی اسے کھڑکی کھول کر ہی سونا پڑتا تھا۔

آئینے میں لتیکا نے اپنا چہرہ دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ سال اپنے کمرے کی سیلن اور ٹھنڈ سے بچنے کے لئے کبھی کبھی وہ مس وڈ کے خالی کمرے میں چوری چھپے سونے چلی جایا کرتی تھی۔ مس وڈ کا کمرہ بنا آگ کے بھی گرم رہتا تھا۔ ان کے گدیلے صوفے پر لیٹتے ہی آنکھ لگ جاتی تھی۔ کمرہ چھٹیوں میں خالی پڑا رہتا ہے لیکن مس وڈ سے اتنا نہیں ہوتا کہ دو مہینوں کے لئے اس کے حوالے کر جائے۔ ہر سال کمرے میں تالا ٹھونک جاتی ہے۔ وہ تو پچھلے سال غسل خانے کو اندر سے بند کرنا بھول گئی تھیں جسے لتیکا چور دروازے کے روپ میں استعمال کرتی رہی تھی۔

پہلے سال اکیلے میں اسے بڑا ڈر سا لگتا تھا۔ چھٹیوں میں سارے اسکول اور ہوسٹل کے کمرے سائیں سائیں کرنے لگتے ہیں۔ ڈر کے مارے اسے جب بھی نیند نہ آتی تو وہ کریم الدین کو رات گئے دیر تک باتوں میں الجھائے رکھتی۔ باتوں میں کھوئی کھوئی جب وہ سو جاتی، کریم الدین چپ چاپ بجلی بجھا کر جاتا۔ کبھی کبھی بیماری کا بہانہ کرکے وہ ڈاکٹر کو بلوا بھیجتی تھی اور بعد میں ضد کرکے دوسرے کمرے میں ان کا بستر لگوا دیتی۔

لتیکا نے کندھے سے بالوں کا گچھا نکالا اور اسے باہر پھینکنے کے لئے وہ کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ باہر چھت کی ڈھلان سے بارش کے پانی کی موٹی سی دھار برابر لان پر گر رہی تھی۔ بادلوں سے گھرے آکاش میں سرکتے ہوئے بادلوں کے پیچھے پہاڑیوں کے جھنڈ کبھی ابھر آتے تھے کبھی چھپ جاتے تھے جیسے چلتی ہوئی ٹرین سے کوئی انھیں دیکھ رہا ہو۔ لتیکا نے کھڑکی سے باہر نکال لیا، ہوا کے جھونکے سے اس کی آنکھیں جھپ گئیں۔ اسے جتنے کام یاد آتے ہیں اتنا ہی آلس بڑھتا جاتا ہے۔ بس کا

لیکا
گریش نے اسے چڑھاتے ہوئے کہا — مینا ایڈ آف کیاولا — (اس کا یہ نام گریش نے اسے چڑھانے کے لئے رکھا تھا) ... وہ ہنسنے لگی۔

"لیکا ...... سنو" گریش کی آواز کیسی ہو گئی تھی۔

"نہ ..... میں کچھ بھی نہیں سن رہی۔"

"لیکا ..... میں کچھ مہینوں میں واپس لوٹ آؤں گا ..."

"نہ ..... میں کچھ بھی نہیں سن رہی ..... لیکن وہ سن رہی ہے — وہ نہیں جو گریش کہہ رہا ہے، بلکہ وہ جو نہیں کہا جا رہا ہے جو اس کے بعد کبھی نہیں کہا گیا ....

لیڈ کائنڈلی لائٹ ......

لڑکیوں کی آواز پیانو کے سروں میں ڈوبی ہوئی گر رہی ہے، اٹھ رہی ہے ..... ہیوبرٹ نے سر موڑ کر لیکا کو ایک لمحہ بھر دیکھا — آنکھیں موندے محو خیال پتھر کے بت سی بلا حرکت کھڑی تھی۔ کیا یہ جذبہ اس کے لئے ہے؟ کیا لیکا نے ایسے ہی دنوں میں اسے اپنا ساتھی بنایا ہے؟ ہیوبرٹ نے ایک گہری سانس لی اور اس سانس میں ڈھیر سی تکان امڈ آئی۔

"دیکھو ..... مس وڈ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو رہی ہے۔" ڈاکٹر ہونٹوں میں پھسپھسایا۔ یہ ڈاکٹر کا پرانا مذاق تھا کہ مس وڈ استغراق کے بہانے آنکھیں موندے ہوئے نیند کی جھپکیاں لیتی ہیں۔

فادر ایلمنڈ نے کرسی پر پھیلے اپنے گاؤن کو سمیٹ لیا اور پریئر بک (PRAYER BOOK) بند کر کے مس وڈ کے کانوں میں کچھ کہا۔ پیانو کی آواز دھیمی پڑنے لگی۔ ہیوبرٹ کی انگلیاں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ سروس کے ختم ہونے سے پہلے مس وڈ نے آرڈر پڑھ کر سنایا۔ بارش ہونے کے ڈر سے آج کے پروگرام میں کچھ ضروری تبدیلیاں کرنی پڑی تھیں۔ پکنک کے لئے جھولا دیوی کے مندر جانا ممکن نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے سکول سے ...را میڈوز' میں ہی سب لڑکیاں ناشتے کے بعد جمع ہوں گی۔ سب لڑکیوں کو دوپہر کا لنچ، ہوسٹل کچن سے ہی لے جانا ہوگا۔ صرف شام کی چائے 'میڈوز' میں بنے گی۔

پہاڑوں کی بارش کا کیا بھروسہ؟ کچھ دیر پہلے دھواں دھار بادل گرج رہے تھے۔ سارا شہر پانی میں بھیگا ٹھٹھر رہا تھا — اب دھوپ میں نہاتا نیلا آکاش دھند کی اوٹ سے باہر نکلتا ہوا پھیل رہا تھا۔ لیکا نے چیپل سے باہر آتے ہوئے دیکھا — ویپنگ ولوز کی بھیگی شاخوں سے دھوپ میں چمکتی ہوئی بارش کی بوندیں ٹپک رہی تھیں .....

لڑکیاں چیپل سے باہر نکل کر چھوٹے چھوٹے غول بنا کر کاریڈار میں جمع ہو گئی تھیں۔ ناشتہ تیار ہونے میں ابھی پون گھنٹہ پڑا تھا اور ان میں سے ابھی کوئی بھی لڑکی ہوسٹل جانے کی خواہش مند نہیں تھی۔ چھٹیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں لیکن شاید اسی لئے وہ ان چند بچے کھچے لمحوں میں ڈسپلن کے گھیرے کے اندر بھی آزاد ہونے کا بھرپور لطف اٹھا لینا چاہتی تھیں۔

مس وڈ کو لڑکیوں کا یہ غل غپاڑہ اکھرا لیکن فادر ایلمنڈ کے سامنے وہ انھیں ڈانٹ ڈپٹ نہ سکی۔ اپنی جھنجھلاہٹ دبا کر وہ مسکراتے ہوئے بولی — "کل سب چلی جائیں گی۔ سارا اسکول ویران ہو جائے گا۔"

فادر ایلمنڈ کا لمبا جوشیلا چہرہ چیپل کی گھٹی ہوئی گرمی سے لال ہو اٹھا تھا۔ کاریڈار کے جنگلے پر اپنی چھڑی لٹکا کر وہ بولے "چھٹیوں میں ہوسٹل میں کون رہے گا؟"

"پچھلے دو برسوں سے مس لیکا ہی رہ رہی ہے ....."

"اور ڈاکٹر مکرجی؟" — فادر کا اوپر والا ہونٹ کچھ کھنچ آیا۔

"ڈاکٹر تو سردی گرمی یہیں رہتے ہیں۔" مس وڈ نے حیرانی سے فادر کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں سکیں کہ فادر نے ڈاکٹر کا ذکر کیوں چھیڑ دیا ہے۔

"ڈاکٹر مکرجی چھٹیوں میں کہیں نہیں جاتے؟"

"دو مہینے کی چھٹیوں میں برما جانا بہت مشکل ہے، فادر" مس وڈ ہنسنے لگی۔

"مس وڈ پتہ نہیں آپ کیا سوچتی ہیں۔ مجھے تو مس لیکا کا ہوسٹل میں اکیلے رہنا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

پر بیٹھ گیا۔ میوزک ٹیچر ہونے کی وجہ سے ہر سال سپشل سروس کے موقعہ پر اسے "کاتھیڈرل" کے ساتھ پیانو بجانا پڑتا تھا۔ ہیوبرٹ نے اپنے رُومال سے ناک صاف کی۔ اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے ہیوبرٹ ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ کنکھیوں سے ہال کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریڈ بک کھولی۔

لیڈ کائنڈلی لائٹ .....

پیانو کے سرد بے جھجکے سے ملنے لگے۔ گھنے بالوں سے ڈھکی ہیوبرٹ کی لمبی پیلی انگلیاں کھلنے سمٹنے لگیں۔ "کائیر" میں گانے والی لڑکیوں کی آواز ایک دوسرے سے گتھ کر نرم جھکتی لہروں میں بندھ گئی۔

لتیکا کو لگا، اس کا جوڑا ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ جیسے گردن کے نیچے جھول رہا ہے۔ مس ووڈ کی آنکھ بچا کر لتیکا نے چپ چاپ بالوں میں لگے کلپوں کو کس کر کھینچ دیا۔

"بڑا جھکی آدمی ہے ..... صبح میں نے ہیوبرٹ کو یہاں آنے سے منع کیا تھا پھر بھی چلا آیا" ڈاکٹر نے کہا۔

لتیکا نے سر ٹیڑھا کر کے ہیوبرٹ کے چہرے کی ایک جھلک پانے کی ناکام کوشش کی۔ اتنے پیچھے سے کچھ بھی دیکھ پانا مشکل تھا۔ صرف پیانو پر جھکا ہوا ہیوبرٹ کا سر دکھائی دے رہا تھا

لیڈ کائنڈلی لائٹ ..... سنگیت کے سُر جیسے ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ کر ہانپتی ہوئی سانسوں کو آکاش کی لامحدود خلا میں بکھرتے ہوئے نیچے اتر رہے ہیں۔ بارش کی ملائم دھوپ چیپل کے لمبے چوکور شیشوں پر جھلملا رہی ہے۔ جس کی ایک باریک رنگ عیسیٰ مسیح کے مجسمہ پر ترچھی پڑ کر گر رہی ہے۔ موم بتیوں کا دھواں دھوپ میں پتلی سی لکیر کھینچتا ہوا ہوا میں تیرنے لگا ہے پیانو کے لمحاتی 'پوز' میں لتیکا کو پتوں کا جانا پہچانا سَرسَر کہیں دور انجانی سمت سے آتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اسے لگا جیسے چیپل کا پھیکا سا اندھیرا اس چھوٹے سے "پیریش ہال" کے چاروں کونوں سے سمٹتا ہوا اس کے آس پاس گھر آیا ہے — جیسے کوئی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے یہاں تک لایا ہو۔ اور اچانک اس کی آنکھیں کھول دی ہوں، اسے لگا جیسے موم بتیوں کے دھوئیں سے ساری دنیا میں کچھ بھی دھوئیں

حقیقت نہ رہا ہو — چیپل کی چھت دیواریں، ڈیسک پر رکھا ہوا ڈاکٹر کا سُگھڑ سڈول ہاتھ — اور پیانو کے سُر ماضی کی دھند کو چیرتے ہوئے خود اس دھند کا حصہ بنتے جا رہے ہوں .....

ایک پگلی سی یاد۔ ایک مشکوک خواہش — چیپل کے شیشوں کے پرے۔ خشک پہاڑی ہوا، ہوا میں جھکی ہوئی دیپنگ دلوز کی کانپتی ٹہنیاں، پیروں تلے کچلے پتوں کی دھیمی سی جانی پہچانی کھڑ ..... کھڑ ..... وہیں پر گریش ایک ہاتھ میں ملٹری کا خاکی ہیٹ لئے کھڑا ہے — چوڑے، اٹھے ہوئے مضبوط کندھے، اپنا سر وہاں ٹکا دو تو جیسے سمٹ کر کھو جائے گا .....

چارلس بوئیر، یہ نام اس نے رکھا تھا وہ جھینپ کر ہنسنے لگتا ہے "تمہیں آرمی میں کس نے چن لیا، میجر بن گئے ہو، لیکن لڑکیوں سے بھی گئے گزرے ہو ..... ذرا ذرا سی بات پر چہرہ لال ہو جاتا ہے" یہ سب وہ کہتی نہیں صرف سوچتی ہی تھی — سوچا تھا کبھی کہوں گی۔ وہ "کبھی" کبھی نہیں آئی .....

بُرونس کا پھول لائے ہو۔

"نہ ہی"

"جھوٹے"

خاکی قمیض کی جس جیب پر بیج چمکتے تھے اسی جیب میں سے چپلنا ہوا بُرونس کا پھول نکل آیا۔

چھی سارا مُرجھا گیا۔

ابھی کھلا کہاں ہے؟

(ہاؤ کلزی)

اس کے بالوں میں گریش کا ہاتھ الجھ رہا ہے — پھول کہیں ٹک نہیں پاتا۔ پھر اسے کلپ کے نیچے پھنسا کر اس نے کہا — "دیکھو"

وہ مڑی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی گریش نے اپنا ملٹری کا ہیٹ دھپ سے اس کے سر پر رکھ دیا وہ ساکت وجامد سی ویسے ہی کھڑی رہی۔ اس کے سر پر گریش کا ہیٹ ہے۔ ماتھے پر چھوٹی سی بندی ہے۔ بندی پر اڑتے بال ہیں۔ گریش نے اس بندی کو اپنے ہونٹوں سے چھوا ہے اس نے ننگے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا ہے —

بھی گلاب کے کچھ دھبے ادھر ادھر بکھرے رہ گئے ہوں۔

"ان لڑکیوں کے نام نوٹ کرنے تھے جو کل جا رہی ہیں اس لئے مجھے رکنا پڑا۔ آپ بھی تو کل جا رہے ہیں مسٹر ہیوبرٹ؟"

"ابھی تک تو یہی ارادہ ہے۔ یہاں رک کر کروں گا بھی کیا آپ اسکول کی طرف جا رہی ہیں؟"

"چلئے......"

پکی سڑک پر لڑکیوں کی بھیڑ جمع تھی۔ اس لئے وہ دونوں پولو گراؤنڈ کا چکر کاٹتے ہوئے پگڈنڈی سے نیچے اترنے لگے۔

ہوا تیز ہو چلی۔ چیڑ کے پتے ہر جھونکے کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر پگڈنڈی پر ڈھیر لگاتے جاتے تھے۔ ہیوبرٹ راستہ بنانے کے لئے اپنی چھتری سے انھیں ہٹا کر دونوں طرف بکھیر دیتا تھا لتیکا پیچھے کھڑی ہوئی دیکھتی رہتی تھی۔ الموڑہ کی طرف سے آتے ہوئے چھوٹے بادل ریشمی رمالوں سے اڑتے ہوئے سورج کے منہ پر لپٹے سے جاتے تھے پھر ہوا میں بہہ نکلتے تھے۔ اس کھیل میں دھوپ کبھی پھیکی سی پڑ جاتی تھی اور کبھی اپنا اجلا آنچل کھول کر سارے شہر کو اپنے میں سمیٹ لیتی تھی۔

لتیکا کچھ آگے نکل گئی۔ ہیوبرٹ کی سانس چڑھ گئی اور وہ دھیرے دھیرے ہانپتا ہوا پیچھے سے آگے آ رہا تھا۔ جب وہ پولو گراؤنڈ کے پویلین کو چھوڑ کر سیمٹری کے دائیں طرف مڑے تو لتیکا ہیوبرٹ کا انتظار کرنے کھڑی ہو گئی۔ اسے یاد آیا، چھٹیوں کے دنوں میں جب کبھی کمرے میں اکیلے بیٹھے بیٹھے اس کا من اوب جاتا تھا، تو وہ اکثر ٹہلتے ہوئے سیمٹری تک چلی جاتی تھی۔ اس سے سٹی ہوئی پہاڑی پر چڑھ کر وہ برف پر ڈھکے دیودار کے درختوں کو دیکھا کرتی تھی جن کے نیچے ! زمانہ جانے والی سڑک پر بچے سلیج پر پھسلا کرتے تھے۔ وہ گھڑی گھڑی برف میں چھپی ہوئی اس سڑک کا اندازہ لگایا کرتی تھی جو فادر ایلمنڈ کے گھر سے گزرتی ہوئی ملٹری ہسپتال اور ڈاک گھر سے ہو کر چرچ کی سیڑھیوں تک جا کر گم ہو جاتی تھی جو مزا ایک پیچیدہ پہیلی کو سلجھانے میں آتا ہے وہی لتیکا کو برف میں کھوئے راستوں کو کھوج نکالنے میں آتا تھا۔

"آپ بہت تیز چلتی ہیں مس لتیکا —" تھکان سے ہیوبرٹ کا چہرہ کمہلا گیا تھا۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھلک آئیں۔

"کل رات آپ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی؟"

"آپ نے کیسے جانا؟ کیا میں بیمار نظر آ رہا ہوں؟" ہیوبرٹ کی آواز میں معمولی سی الجھن کا احساس تھا۔ سب لوگ میری صحت کو لے کر کیوں بات شروع کرتے ہیں۔ اس نے سوچا۔

"نہیں، مجھے تو پتہ بھی نہ چلتا۔ وہ تو صبح کریم الدین نے باتوں ہی باتوں میں ذکر چھیڑ دیا تھا۔" لتیکا کچھ اداس سی ہو گئی۔

"کوئی خاص بات نہیں وہی پرانا درد شروع ہو گیا تھا — اب بالکل ٹھیک ہے" اپنی بات کو تقویت بخشنے کے لئے ہیوبرٹ چھاتی سیدھی کر کے تیز قدم بڑھانے لگا۔

"ڈاکٹر مکرجی کو دکھلایا تھا؟"

"وہ صبح آئے تھے۔ ان کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ ہمیشہ معما باتیں کرتے ہیں۔ کہتے تھے کہ اس بار مجھے چھ سات مہینے کی چھٹی لے کر آرام کرنا چاہئے۔ لیکن اگر میں ٹھیک ہوں تو بھلا اس کی کیا ضرورت ہے؟"

ہیوبرٹ کی آواز میں درد کا عکس لتیکا سے چھپا نہ رہ سکا ہنسی کو ٹالتے ہوئے اس نے کہا —"آپ تو ناحق فکر کرتے ہیں مسٹر ہیوبرٹ آج کل موسم بدل رہا ہے اچھے بھلے آدمی تک بیمار ہو جاتے ہیں۔"

ہیوبرٹ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس نے لتیکا کو غور سے دیکھا۔ وہ اپنے دل کا خوف مٹانے کے لئے بے فکر ہو جانا چاہتا تھا کہ لتیکا اسے تسلی دینے کے لئے ہی تو جھوٹ نہیں بول رہی۔

"یہی تو میں سوچ رہا تھا مس لتیکا۔ ڈاکٹر کی صلاح سن کر تو میں ڈر ہی گیا تھا۔ بھلا چھ مہینے کی چھٹی لے کر میں اکیلا کیا کروں گا۔ سکول میں تو بچوں کے ساتھ من لگا رہتا ہے۔ سچ پوچھو تو دلی میں یہ دو مہینوں کی چھٹیاں کاٹنا دوبھر ہو جاتا ہے....."

"مسٹر ہیوبرٹ...... کل آپ دلی جا رہے ہیں....؟"

لتیکا چلتے چلتے ایکدم ٹھٹھک گئی۔ سامنے پولو گراؤنڈ پھیلی تھی۔ جس کے دوسری طرف ملٹری کی ٹرکیں کنٹونمنٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ ہیوبرٹ کو لگا جیسے لتیکا کی آنکھیں آدھی کھلی، آدھی بند ہیں، جیسے پلکوں پر ایک پرانا بھولا سا خواب سرک آیا ہے۔

"مسٹر ہیوبرٹ..... آپ دلی جا رہے ہیں" — اس بار لتیکا نے سوال نہیں دہرایا — اس کی آواز میں صرف ایک لاچار

"نہیں فادر" مس وڈ نے کہا۔ "یہ تو کانوینٹ سکول کا اصول ہے کہ کوئی بھی ٹیچر چھٹیوں میں اپنے خرچ پر ہوسٹل میں رہ سکتی ہے۔"

"میں فی الحال سکول کے اصولوں کی بات نہیں کر رہا..... مس لیتا ڈاکٹر کے ساتھ اکیلی ہی رہ جائیں گی اور سچ پوچھئے تو مس وڈ ڈاکٹر کے بارے میں میری رائے کچھ بہت اچھی نہیں ہے۔"

"فادر آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں..... مس لیتا بچہ نہیں ہیں۔"

مس وڈ کو ایسی امید نہ تھی کہ فادر ایلمنڈ اپنے دل میں ایسے دقیانوسی خیال کو جگہ دیں گے۔

فادر ایلمنڈ کچھ مذبذب سے ہو گئے۔ بات پلٹتے ہوئے بولے۔

"مس وڈ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ تو جانتی ہیں مس لیکا اور اس ملٹری افسر کو لے کر ایک اچھا خاصہ سکینڈل بن گیا تھا، سکول کی بدنامی ہونے میں کیا دیر لگتی۔"

"وہ بیچارہ تو اب نہیں رہا۔ میں اسے جانتی تھی فادر، خدا اس کی روح کو سکون دے۔"

مس وڈ نے اپنی دونوں ہاتھوں کو کراس کیا۔

فادر ایلمنڈ کو مس وڈ کی معصومیت پر اتنا رنج ہوا کہ ان سے آگے اور کچھ نہیں بولا گیا۔ ڈاکٹر مکرجی سے ان کی کبھی نہیں بنتی تھی اس لئے وہ مس وڈ کی آنکھوں میں ڈاکٹر کو نیچا دکھانا چاہتے تھے لیکن مس وڈ لیتا کا رونا لے بیٹھیں۔ آگے بات بڑھانا بیکار تھا انھوں نے چھڑی کو جھٹکے سے اٹھایا اور اوپر صاف کھلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "پروگرام آپ نے یوں ہی بدلا مس وڈ، اب بارش کیا ہوگی۔"

ہیوبرٹ جب چیپل سے باہر نکلا تو اس کی آنکھیں چکا چوند سی ہو گئیں۔ اسے لگا۔ جیسے کسی نے اچانک ڈھیر سی چمکیلی ابلتی ہوئی روشنی مٹھی میں بھر کر اس کی آنکھوں میں جھونک دی ہو۔ پیانو کے سنگیت کے سُر روئی کے چھوٹے موٹے ریشوں کی طرح اب تک اس کے دماغ کی تھکی ماندی نسوں پر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ کافی تھک گیا تھا۔ پیانو بجانے سے اس کے پھیپھڑوں پر ہمیشہ بھاری دباؤ پڑتا، دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ سنگیت کے ایک نوٹ کو دوسرے نوٹ میں اتارنے کی کوشش میں وہ ایک اندھیری کھائی پار کر رہا ہے۔

آج چیپل میں میں نے جو محسوس کیا وہ کتنا پراسرار کتنا عجیب تھا، ہیوبرٹ نے سوچا۔ مجھے لگا، پیانو کا ہر نوٹ خاموشی کے اندھیرے غار سے نکل کر باہر چمکیلی نیلی دھند کو تراشتا ہوا معصوم سے مسی پیدا کر رہا ہے۔ گرتا ہوا ہر نوٹ ایک چھوٹی سی موت ہے جیسے گھنے چھایادار درختوں کے کالے سایوں میں کوئی پگڈنڈی گم ہو گئی ہے۔ ایک چھوٹی سی موت جو آنے والے سُروں کو اپنی بچی کھچی گونجوں کی سانس پیش کر جاتی ہے..... جو مر جاتی ہے لیکن مرتی نہیں، باقی رہتی ہے، اس لئے مر کر بھی زندہ ہے، دوسرے سُروں میں گم ہو جاتی ہے.....

"ڈاکٹر کیا موت ایسے ہی آتی ہے؟" اگر میں ڈاکٹر سے پوچھوں تو وہ ہنس کر ٹال دے گا۔ مجھے لگتا ہے وہ پچھلے کچھ دنوں سے کوئی بات چھپا رہا ہے ـــــ اس کی ہنسی میں جو ہمدردی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آج اس نے مجھے سپیشل سروس میں آنے سے روکا تھا ـــــ وجہ پوچھنے پر وہ چپ رہا۔ کون سی ایسی بات ہے جسے مجھ سے کہنے سے ڈاکٹر کتراتا ہے۔ شاید میں شکی مزاج ہوتا جا رہا ہوں، اور بات کچھ بھی نہیں ہے۔

ہیوبرٹ نے دیکھا لڑکیوں کی قطار سکول سے ہوسٹل جانے والی سڑک پر نیچے اترتی جا رہی ہے۔ اجلی دھوپ میں ان کے رنگ برنگے ربن، ہلکی آسمانی رنگ کی فراکیں اور سفید پیٹیاں چمک رہی ہیں۔ سینیر کیمبرج کی کچھ لڑکیوں نے چیپل کے باغیچے سے گلاب کے پھول توڑ کر اپنے بالوں میں لگا لئے ہیں۔ کنٹونمنٹ کے تین چار سپاہی لڑکیوں کو دیکھ کر فحش مذاق کرتے ہوئے ہنس رہے ہیں اور کبھی کبھی کسی لڑکی کی طرف ذرا سا جھک کر سیٹی بجانے لگتے ہیں۔

"ہیلو مسٹر ہیوبرٹ!" ہیوبرٹ نے چونک کر پیچھے دیکھا تھا ایک موٹا رجسٹر ساعتی میں دبائے کھڑی تھی۔

"آپ اکیلے کہاں ہیں؟" ہیوبرٹ کی نظر لیتا پر ٹکی رہی، وہ کریم رنگ کی پوری بانہوں کی اونی جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ کماؤں کی لڑکیوں کی طرح لیتا کا چہرہ گول تھا دھوپ کی تپن سے پکا ہوا گندمی رنگ کہیں کہیں ہلکا گلابی ہو آیا تھا۔ جیسے بہت دھونے پر

یہیں پر کاٹھ کے تختوں کا بنا ہوا اوٹا سا پل ہے، جس پر لڑکیاں ہچکولے کھاتے ہوئے چل رہی ہیں۔

"ڈاکٹر مکرجی آپ تو سارا جنگل جلا دیں گے۔" مس وڈ نے اپنی اونچی ایڑی کے سینڈل سے جلتی ہوئی دیا سلائی کو جو ڈاکٹر نے اپنا سگار سلگا کر چیڑ کے پتوں کے ڈھیر پر پھینک دی تھی مسل دیا۔ وہ نالے سے کچھ دور ہٹ کر چیڑ کے دو پیڑوں کی گھنی ہوئی چھایا کے نیچے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک چھوٹا سا راستہ نیچے پہاڑی گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ جہاں پہاڑ کی گود میں شکر پاروں کے کھیت ایک دوسرے کے نیچے بچھے ہوئے تھے۔ دوپہر کے سناٹے میں بھیڑ بکریوں کے گلوں میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آواز ہوا میں بہتی ہوئی سنائی دے جاتی۔

گھاس پر لیٹے لیٹے ڈاکٹر سگار پیتا رہا۔

"جنگل کی آگ کبھی دیکھی ہے مس وڈ..... ایک متوالے نشے کی طرح دھیرے دھیرے پھیلتی جاتی ہے۔"

"آپ نے دیکھی ہے ڈاکٹر؟" مس وڈ نے پوچھا "مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے"۔

"بہت سال پہلے شہروں کو جلتے ہوئے دیکھا تھا" ڈاکٹر لیٹے ہوئے آکاش کی طرف تک رہا تھا۔ "ایک ایک مکان تاش کے پتوں کی طرح گرتا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ایسے موقعے دیکھنے میں بہت کم آتے ہیں۔"

"آپ نے کہاں دیکھا ڈاکٹر؟"

"لڑائی کے دنوں اپنے رنگون شہر کو جلتے ہوئے دیکھا تھا"۔ مس وڈ کی آتما کو ٹھیس لگی لیکن پھر بھی ان کی آتما شانت رہی۔

"آپ کا گھر ــــ کیا وہ بھی جل گیا تھا؟"

ڈاکٹر کچھ دیر تک چپ چاپ لیٹا رہا۔

"ہم اسے خالی چھوڑ کر چلے آئے تھے ــــ معلوم نہیں بعد میں کیا ہوا؟" اپنی نجی زندگی کے متعلق کچھ بھی کہنے میں ڈاکٹر کو سخت مرحلہ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

"ڈاکٹر کیا آپ کبھی واپس برما جانے کی بات نہیں سوچتے؟" ڈاکٹر انگڑائی لی اور کروٹ بدل کر اوندھے منہ لیٹ گئے۔ ان کی آنکھیں

مندگئیں۔ ماتھے پر بالوں کی لٹیں جھول آئیں۔

"سوچنے سے کیا ہوتا ہے مس وڈ..... جب برما میں تھا تب کیا کبھی سوچا تھا کہ یہاں آکر عمر کاٹنی ہوگی؟"

"لیکن ڈاکٹر کچھ بھی کہہ لو۔ اپنے دیش کا سکھ کہیں اور نہیں ملتا۔ یہاں تم چاہے کتنے ہی برس رہ لو۔ اپنے کو ہمیشہ اجنبی ہی محسوس کروگے۔"

ڈاکٹر نے سگار کا دھواں دھیرے دھیرے ہوا میں چھوڑ دیا۔

"دراصل اجنبی تو میں وہاں بھی سمجھا جاؤں گا مس وڈ۔ اتنے برسوں بعد وہاں مجھے کون پہچانے گا۔ اس عمر میں نئے سرے سے رشتے جوڑنا کافی دردسری کا کام ہے..... کم سے کم میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر آپ کب تک اس پہاڑی قصبے میں پڑے رہیں گے ــــ اسی دیش میں رہنا ہے تو کسی بڑے شہر میں پریکٹس شروع کر دیجیے؟"

"پریکٹس بڑھانے کے لیے کہاں کہاں بھٹکتا پھروں گا مس وڈ۔ جہاں رہو وہیں مریض مل جاتے ہیں۔ یہاں آیا تھا کچھ دنوں کے لیے ــــ پھر رک گیا۔ جب کبھی جی اوبے گا، کہیں چلا جاؤں گا۔ جڑیں نہیں جمتیں، تو پیچھے بھی کچھ نہیں چھوٹ جاتا۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں مس وڈ، میں سکھی ہوں۔"

مس وڈ نے ڈاکٹر کی بات پر خاص دھیان نہیں دیا۔ وہ ہمیشہ ڈاکٹر کو لاپرواہ اور سنکی سمجھتی رہی ہے لیکن ڈاکٹر کے کردار پر اسے اعتماد ہے۔ نہ جانے کیوں ڈاکٹر نے انجانے میں اس کا کوئی ثبوت دیا ہو۔ یہ اسے یاد نہیں پڑتا۔

مس وڈ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ ہمیشہ یہ سوچتی تھی کہ اگر ڈاکٹر آلسی اور لاپرواہ نہ ہوتا تو اپنی قابلیت کے بل پر کافی چمک سکتا تھا۔ اسی لیے اسے ڈاکٹر پر غصہ بھی آتا تھا اور دکھ بھی ہوتا تھا۔

مس وڈ نے اپنے بیگ سے اون کا گولا اور سلائیاں نکالیں پھر اس نے نیچے سے اخبار میں لپٹا ہوا چوڑا کافی کا ڈبہ اٹھایا جس میں انڈوں کی سینڈوچیں اور ہیمبرگر دبے ہوئے تھے۔ تھرماس سے

دوری کا احساس گھر آیا تھا۔

"بہت عرصہ قبل میں بھی دلی گئی تھی، مسٹر ہیوبرٹ۔ تب میں بہت چھوٹی تھی — نہ جانے کتنے برس ہو گئے۔ ہماری موسی کا بیاہ وہیں ہوا تھا۔ بہت سی چیزیں دیکھی تھیں، لیکن اب تو سب کچھ دھندلا پڑ گیا ہے۔ اتنا یاد ہے کہ ہم قطب پر چڑھے تھے۔ سب سے اونچی منزل سے ہم نے نیچے جھانکا تھا — نہ جانے کیسا لگا تھا۔ نیچے چلتے ہوئے آدمی چابی بھرے ہوئے کھلونے سے لگتے تھے۔

ہم نے اوپر سے ان پر مونگ پھلیاں پھینکی تھیں لیکن ہم بہت نراش ہوئے تھے۔ کیونکہ ان میں سے کسی نے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ شاید ماں نے مجھے ڈانٹا تھا۔ اور میں صرف نیچے جھانکتے ہوئے ڈر گئی تھی۔ سنا ہے اب تو دلی اتنی بدل گئی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی —"

وہ دونوں پھر چلنے لگے، ہوا کی تیزی اب کم ہونے لگی تھی۔ اڑتے ہوئے بادل اب سستانے لگے تھے۔ ان کے سائے نندا دیوی اور پنچ چولی کی پہاڑیوں پر گر رہے تھے۔ سکول کے پاس پہونچتے پہونچتے چیڑ کے درخت پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ کہیں کہیں خوبانی کے درختوں کے آس پاس بروس کے لال پھول دھوپ میں چمک جاتے تھے۔ سکول تک آنے میں انھوں نے پولو گراؤنڈ کا لمبا چکر لگا لیا تھا۔

"مس لیتکا، آپ کہیں چھٹیوں میں جاتی کیوں نہیں۔ سردیوں میں تو یہاں سب کچھ ویران ہو جاتا ہوگا؟"

"اب مجھے یہاں اچھا لگتا ہے"۔ لیتکا نے کہا۔ "پہلے سال اکیلاپن کچھ اکھرا تھا — اب عادی ہو گئی ہوں۔ کرسمس سے ایک رات پہلے کلب میں ڈانس ہوتا ہے، لاٹری ڈالی جاتی ہے اور رات کو دیر تک ناچ گانا ہوتا رہتا ہے۔ نئے سال کے دن کمایوں رجمنٹ کی طرف سے پریڈ گراؤنڈ میں کارنی وال کیا جاتا ہے برف پر سکیٹنگ ہوتی ہے۔ رنگ برنگے غباروں کے نیچے فوجی بینڈ بجتا ہے فوجی افسر فینسی ڈریس میں حصہ لیتے ہیں۔ ہر سال ایسا ہی ہوتا ہے مسٹر ہیوبرٹ۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ونٹر اسپورٹس کے لئے انگریز ٹورسٹ آتے ہیں۔ ہر سال میں ان سے متعارف ہوتی ہوں واپس لوٹتے ہوئے وہ ہمیشہ وعدہ کرتے ہیں کہ اگلے سال بھی آئیں گے میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں آئیں گے، وہ بھی جانتے ہیں کہ نہیں آئیں، پھر بھی ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر.... پھر کچھ دنوں بعد پہاڑوں پر برف پگھلنے لگتی ہے۔ چھٹیاں ختم ہونے لگتی ہیں۔ آس پاس لوگ اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے ہیں — اور مسٹر ہیوبرٹ پتہ بھی نہیں چلتا کہ چھٹیاں کب شروع ہوئی تھیں کب ختم ہو گئیں...."

لیتکا نے دیکھا کہ ہیوبرٹ اس کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ سٹپٹا کر چپ ہو گئی۔ اسے لگا جیسے وہ اتنی دیر سے پاگل سی انٹ شنٹ بک رہی ہو۔

"مجھے معاف کرنا مسٹر ہیوبرٹ...... کبھی کبھی میں بچوں کی طرح باتوں میں بہک جاتی ہوں۔"

"مس لیتکا......" ہیوبرٹ نے دھیرے سے کہا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا تھا۔ لیتکا ہیوبرٹ کی بھاری آواز سے چونک سی گئی۔

"کیا بات ہے مسٹر ہیوبرٹ؟"

"وہ خط.... اس کے لئے میں شرمسار ہوں۔ اسے آپ واپس لوٹا دیں سمجھ لیں کہ میں نے اسے کبھی نہیں لکھا تھا۔"

لیتکا کچھ نہ سمجھ سکی۔ ہکا بکا کھڑی ہیوبرٹ کے پیلے اداس چہرے کو دیکھتی رہی۔

ہیوبرٹ نے دھیرے سے لیتکا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کل ڈاکٹر نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو..... تو ....." ہیوبرٹ ہکلانے لگا۔

"مسٹر ہیوبرٹ....." لیکن لیتکا سے آگے کچھ نہیں کہا گیا اس کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔

دونوں چپ چاپ کچھ دیر تک سکول کے گیٹ کے باہر کھڑے رہے۔

"میڈوز..... پگڈنڈیوں، پتوں اور چھاؤں سے گھرا چھوٹا سا جزیرہ، جیسے کوئی گھونسلہ دو ہری گھاٹیوں کے بیچ دبا ہو۔ اندر گھستے ہی پکنک کے کالے آگ سے جھلسے ہوئے پتھر، ادھ جلی ٹہنیاں بیٹھنے کے لئے بچھائے گئے پرانے اخباروں کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے دکھائی دے جاتے ہیں۔ اکثر ٹورسٹ پکنک کے لئے یہاں آتے ہیں۔ میڈوز کو بیچ میں کاٹتا ہوا ٹیڑھا میڑھا برساتی نالا بہتا ہے جو دور سے دھوپ میں چمکتا ہوا سفید ربن سا دکھائی دیتا ہے۔

[illegible] نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔

"جولی ابھی تم بہت چھوٹی ہو......" جولی کے ہونٹ کانپے —— اس کی آنکھوں میں معصوم التجا کا احساس گھر آیا۔

"اچھا ابھی جاؤ...... تم سے چھٹیوں کے بعد باتیں کروں گی ——"

جولی نے للچائی نظر سے لفافے کی طرف دیکھا، کچھ بولنے کی خواہش ہوئی، پھر بنا کچھ کہے چپ چاپ واپس لوٹ گئی۔

لتیکا دیر تک جولی کو دیکھتی رہی، جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ کیا میں کسی کھوسٹ بڑھیا سے کم ہوں؟ اپنی محرومی کا بدلہ کیا میں دوسروں سے لے رہی ہوں؟ شاید...... کون جانے ...... شاید جولی کا یہ پہلا تعارف ہو۔ اس انوبھوتی سے جسے کوئی بھی لڑکی بڑے چاؤ سے سنبھال کر اپنے میں چھپائے رکھتی ہے۔ ایک ناقابل بیان سکھ جو دکھ سے ہے۔ دکھ اور سکھ کو ڈبوتی ہوئی اٹھتے جوار کی خماری ...

...... جو دونوں کو اپنے میں سمو لیتی ہے ...... ایک درد جو آنند سے پیدا ہوتا ہے اور دکھ دیتا ہے......

یہی اس دیوار کے نیچے اسے بھی لگا تھا، جب گریش نے پوچھا تھا —— "تم چپ کیوں ہو؟" وہ آنکھیں موندے سوچ رہی تھی —— سوچ کہاں رہی تھی زندہ کر رہی تھی اس لمحہ کو جو ڈر اور حیرانی کے بیچ دبا تھا —— بیکار سا پاگل لمحہ۔ وہ ابھی پیچھے مڑے گی تو گریش کی "نروس" مسکراہٹ دکھائی دے جائے گی۔ اس دن سے آج دوپہر تک کا ماضی ایک دکھ کے سپنے کی مانند ٹوٹ جائے گا۔ رہی دیودار جس پر اس نے اپنے بالوں کے کلپ سے گریش کا نام لکھا تھا —— جب کبھی کوئی لفظ بگڑ کر ٹیڑھا میڑھا ہو جاتا تھا تب وہ ہنستی تھی اور گریش کا کانپتا ہاتھ اور بھی کانپ جاتا تھا......

لتیکا کو لگا کہ جو وہ یاد کرتی ہے، وہی بھولنا بھی چاہتی ہے لیکن جب سچ مچ بھولنے لگتی ہے تب اسے ڈر لگتا ہے کہ جیسے کوئی اس کی کسی چیز کو اس کے ہاتھوں سے چھینے لیے جا رہا ہو کیا کچھ جو سدا کے لئے کھو جائے گا۔ بچپن میں جب کبھی وہ اپنے کسی کھلونے کو کھو دیتی تھی تو وہ گم سم سی ہو کر سوچا کرتی تھی خود کو دھوکا دیتی کہ ابھی کھویا ہی کہاں ہے میں نے۔ جب بہت دوڑ دھوپ کرنے پر کھلونا مل جاتا تو وہ بھی اس کی تلاش میں لگی رہتی۔ جس جگہ کھلونا رکھا ہوتا جان بوجھ کر اسے چھوڑ کر گھر کے دوسرے کونوں میں اسے ڈھونڈھا کرتی۔ تب کھوئی ہوئی چیز یاد رہتی اس لئے بھولنے کا خوف نہیں رہتا تھا......

آج وہ اس بچپن کے کھیل کا بہانا کیوں نہیں کر پاتی؟ — بہانا... شاید کرتی ہے۔ اسے یاد کرنے کا بہانا، جو بھولتا جا رہا ہے...... دن جیسے بیت جاتے ہیں، اور وہ ابھی رہتی ہے انجانے میں گریش کا چہرہ دھندلا پڑ جاتا ہے، یاد وہ کرتی ہے لیکن جیسے کسی پرانی تصویر کے دھول سے بھرے شیشے کو صاف کر رہی ہو۔ اب ویسا درد نہیں ہوتا۔ صرف اس کو یاد کرتی ہے۔ جو پہلے کبھی ہوتا تھا —— تب اسے اپنے سے نفرت ہوتی ہے وہ پھر جان بوجھ کر اس گھاؤ کو کریدتی ہے جو بھرتا جا رہا ہے، خود بخود، اس کی کوششوں کے باوجود بھرتا جا رہا ہے۔

دیوار پر کھلے ہوئے ادھ مٹے نام لتیکا کی طرف خاموش اور معصوم انداز میں دیکھ رہے تھے۔ میڈوز کے گھنے سناٹے میں نالے پار سے کھیلتی ہوئی لڑکیوں کی آوازیں گونج جاتی تھیں۔

واٹ ڈو یو وانٹ؟ واٹ ڈو یو وانٹ؟

تتلیاں، جھینگر، جگنو...... میڈوز پر اترتی ہوئی سانجھ کے سایوں میں پتہ نہیں چلتا، کون آواز کس کی ہے؟ دوپہر کے وقت جن آوازوں کو الگ الگ کر کے پہچانا جا سکتا تھا، اب وہ ایک ہی نہ ٹوٹنے والی لے کی رو میں گھل گئی تھیں۔ گھاس سے اپنے پیروں کو پونچھتا ہوا کوئی رینگ رہا ہے۔ جھاڑیوں کے جھرمٹ سے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا جھپٹ کر کوئی اوپر اڑ جاتا ہے...... لیکن اوپر دیکھو تو کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ میڈوز کے جھرنے کی گڑگڑاتی آواز...... جیسے اندھیری سرنگ میں تیزی سے ٹرین گزر گئی ہو اور دیر تک اس میں سیٹیوں اور پہیوں کا شور گونجتا رہا ہو......

پکنک کچھ دیر اور چلتی لیکن بادلوں کی تہیں ایک دوسرے پر چڑھتی جا رہی تھیں۔ پکنک کا سامان بٹورا جانے لگا۔ میڈوز کے چاروں طرف بکھری ہوئی لڑکیاں مس وڈ کے ارد گرد جمع ہونے لگیں

پیالوں میں کافی انڈیلتے ہوئے مس وڈ نے کہا — "ڈاکٹر کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے ...."

ڈاکٹر لیٹے لیٹے بڑبڑایا۔ مس وڈ نے نیچے کھسک کر دیکھا۔ وہ کہنی پر سر ٹکائے چپ چاپ سو رہا تھا۔ اوپر کا ہونٹ ذرا سا پھیل کر مڑ گیا تھا۔ جیسے کسی نے مذاق کرنے سے پہلے پکڑ لیا ہو۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا سگار نیچے جھکا ہوا لٹک رہا تھا —

"میری۔ میری، واٹ ڈو یو وانٹ، واٹ ڈو یو وانٹ۔ ....." دوسرے اسٹینڈرڈ میں پڑھنے والی میری نے اپنی چنچل آنکھیں اوپر اٹھائیں — لڑکیوں کا دائرہ اسے گھیرے ہوئے کبھی پاس آتا تھا کبھی دور کھنچا جاتا تھا۔

"آئی وانٹ .... آئی وانٹ بلیو —" دونوں ہاتھوں کو ہوا میں گھماتے ہوئے میری چلائی۔ دائرہ پانی کی طرح ٹوٹ گیا۔ سب لڑکیاں ایک دوسرے پر گرتی پڑتیں کسی نیلی چیز کو چھونے لپکنے بھاگ دوڑ کرنے لگیں۔

لنچ ختم ہو چکا تھا۔ لڑکیوں کے چھوٹے چھوٹے دل سیڈوز میں بکھر گئے تھے۔ اونچی کلاس کی کچھ لڑکیاں چائے کا پانی گرم کرنے کے لئے پیڑوں پر چڑھ کر سوکھی ٹہنیاں توڑ رہی تھیں۔

دوپہر کی اس گھڑی میں میڈوز الساپا، اونگھتا سا جان پڑتا تھا ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا .... چیڑ کے پتے کھڑکھڑا اٹھتے تھے۔ کبھی کوئی پرندہ اپنی سستی مٹاتے جھاڑیوں سے اڑ کر نالے کے کنارے بیٹھ جاتا تھا۔ پانی میں سر ڈبوتا تھا، پھر اوب کر ہوا میں دو چار بے مقصد چکر کاٹ کر دوبارہ جھاڑیوں میں دبک جاتا تھا۔

لیکن جنگل کی خاموشی شاید کبھی چپ نہیں رہتی۔ گہری نیند میں ڈوبے سپنوں سی کچھ آوازیں خالی پن کے ہلکے جھینے پردے پر سلوٹیں بچھا جاتی ہیں ..... — لہروں سی ہوا میں تیرتی ہیں .... جیسے کوئی دبے پاؤں جھانک کر اوجھل اشارے کر جاتا ہے ... دیکھو میں یہاں ہوں ......"

لتیکا نے جولی کے "باب ہیر" کو سہلاتے ہوئے کہا "تمھیں کل رات بلایا تھا؟"

"میں پہلے لگی تھی — آپ اپنے کمرے میں نہیں تھیں۔"

لتیکا کو یاد آیا کل رات وہ ڈاکٹر کے کمرے کے ٹیرس پر دیر تک بیٹھی رہی تھی — اور اندر ہیوبرٹ پیانو پر شوپاں کا نوکٹرن بجا رہا تھا۔

"جولی تم سے کچھ پوچھنا تھا۔" اسے لگا، وہ جولی کی آنکھوں سے اپنے کو بچا رہی ہے۔

جولی نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی بھوری آنکھوں سے کوتوہل جھانک رہا تھا۔

"تم آفیسرز میس میں کسی کو جانتی ہو۔؟"

جولی نے غیر ارادی طور پر سر ہلایا۔ لتیکا کچھ دیر تک جولی کو ٹک ٹک گھورتی رہی۔

"جولی مجھے وشواس ہے، تم جھوٹ نہیں بولوگی" کچھ لمحے پہلے جولی کی آنکھوں میں جو حیرانی تھی، وہ خوف میں بدلنے لگی۔

لتیکا نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک نیلا لفافہ نکال کر جولی کی گود میں پھینک دیا۔ جولی نے لفافہ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر ایک لمحے کے لئے اس کا ہاتھ کانپ کر ٹھٹھک گیا — لفافے پر اس کا نام اور ہوسٹل کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

"تھینک یو میڈم، میرے بھائی کا خط ہے — وہ جھانسی میں رہتے ہیں"۔ جولی نے گھبراہٹ میں لفافے کو اپنی اسکرٹ کی تہوں میں چھپا لیا۔

"جولی ذرا لفافہ مجھے دکھلاؤ" لتیکا کی آواز تیکھی، کرخت سی ہو گئی۔

جولی نے ان منے انداز سے لتیکا کو خط دے دیا۔

"تمھارے بھائی جھانسی میں رہتے ہیں۔؟"

جولی اس بار کچھ نہیں بولی۔ اس کی پریشان، اکھڑی سی آنکھیں لتیکا کو دیکھتی رہیں۔

"یہ کیا ہے"

جولی کا سفید چہرہ فق پڑ گیا۔ لفافے پر کمایوں رجمنٹل سنٹر کی مہر اس کی طرف گھور رہی تھی۔

"کون ہے یہ ......" لتیکا نے پوچھا۔ اس نے پہلے بھی ہوسٹل میں اڑتی ہوئی افواہ سنی تھی کہ جولی کو کلب میں کسی ملٹری افسر کے ساتھ دیکھا گیا تھا لیکن ایسی افواہیں اکثر اڑتی رہتی تھیں اور

"مس لتیکا کیا بات ہے، آپ تو بہت ڈری ڈری سی معلوم پڑتی ہیں؟"

"کچھ نہیں ڈاکٹر...... مجھے .... مجھے کچھ یاد آگیا تھا...."

وہ دونوں پھر چلنے لگے کچھ دور جانے پر ان کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں۔ پرندوں کا ایک بیڑا نیلے آکاش میں تکون بناتا ہوا پہاڑوں کے پیچھے سے ان کی طرف آرہا تھا۔ لتیکا اور ڈاکٹر سر اٹھا کر ان پرندوں کو دیکھتے رہے۔ لتیکا کو یاد آیا ہر سال سردی کی چھٹیوں سے پہلے یہ پرندے میدانوں کی طرف اڑتے ہیں، کچھ دنوں کے لئے بیچ کے اس پہاڑی سٹیشن پر بسیرا کرتے ہیں۔ انتظار کرتے ہیں برف کے دنوں کا، جب وہ اجنبی انجانے دیشوں میں اڑ جائیں گے......

کیا وہ سب ہی انتظار کر رہے ہیں؟ وہ، ڈاکٹر مکرجی، مسٹر ہیوبرٹ —— لیکن کہاں کے لئے، ہم کہاں جائیں گے۔

لیکن اس کا کوئی جواب نہیں ملا —— اس اندھیرے میں میڈوز کے جھرنے کی مدھم آواز اور چیڑ کے پتوں کی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

لتیکا ہڑبڑا کر چونک گئی۔ اپنی چھڑی پر جھکا ہوا ڈاکٹر دھیرے دھیرے سیٹی بجا رہا تھا۔

"مس لتیکا جلدی کیجئے، بارش شروع ہونے والی ہے۔"

ہوسٹل پہنچتے پہنچتے بجلی چمکنے لگی تھی، لیکن اس رات بارش دیر تک نہیں ہوئی۔ بادل برسنے بھی نہیں پاتے تھے کہ ہوا کے تھپیڑوں سے ڈھکیل دیئے جاتے تھے۔ دوسرے دن تڑکے ہی بس پکڑنی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر کے جانے کے بعد لڑکیاں سونے کے لئے اپنے کمروں میں چلی گئی تھیں۔

جب لتیکا اپنے کمرے میں گئی تو اس وقت کماؤں رجمنٹ سنٹر کا بگل بج رہا تھا۔ اس کے کمرے میں کریم الدین کوئی پہاڑی دھن گنگناتا ہوا لیمپ میں گیس پمپ کر رہا تھا۔ لتیکا ان ہی کپڑوں میں تکیے کو دوہرا کر کے لیٹ گئی۔ کریم الدین نے اڑتی ہوئی نظر سے لتیکا کو دیکھا پھر اپنے کام میں جٹ گیا۔

"پکنک کیسی رہی میم صاحب؟"

"تم کیوں نہیں آئے، سب لڑکیاں تمھیں پوچھ رہی تھیں؟"

لتیکا کو لگا دن بھر کی تکان دھیرے دھیرے اس کے جسم کی پسلیوں پر چپکتی جا رہی ہے۔ اچانک اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے جھپکنے لگیں۔

"میں چلا آتا تو ہیوبرٹ صاحب کی تیمارداری کون کرتا۔ دن بھر ان کے بستر کے سرہانے بیٹھا رہا...... اور اب وہ غائب ہوگئے ہیں۔"

کریم الدین نے کندھے پر لٹکتے ہوئے میلے کچیلے تولئے کو اتارا اور لیمپ کے شیشوں کے گرد پونچھنے لگا۔

لتیکا کی ادھ موندی آنکھیں کھل گئیں۔ "کیا ہیوبرٹ صاحب اپنے کمرے میں نہیں ہیں؟"

"خدا جانے اس حالت میں کہاں بھٹک رہے ہیں، پانی گرم کرنے کچھ دیر کے لئے باہر گیا تھا واپس آنے پر دیکھتا ہوں کہ کمرہ خالی پڑا ہے۔"

کریم الدین بڑبڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ لتیکا نے لیٹے لیٹے پلنگ کے نیچے چپلوں کو پیروں سے اتار دیا۔

ہیوبرٹ اتنی رات گئے کہاں گئے؟ لیکن لتیکا کی آنکھیں پھر جھپک گئیں، دن بھر کی تھکان نے سب پریشانیوں، سوالوں پر کنجی لگا دی تھی، جیسے دن بھر آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اس نے اپنے کمرے میں "دیا" کو چھو لیا تھا۔ اب وہ محفوظ تھی، کمرے کی چار دیواری کے اندر اسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ دن کے اجالے میں وہ گواہ تھی، مجرم تھی، ہر چیز کا اس سے تقاضا تھا۔ اب اس اکیلے پن میں کوئی گلہ نہیں، کوئی شکوہ نہیں، سب کھینچا تانی ختم ہوگئی ہے، جو اپنا ہے وہ بالکل اپنا سا ہوگیا ہے، اس کا دکھ نہیں، اپنانے کی فرصت نہیں......

لتیکا نے دیوار کی طرف منہ گھما لیا۔ لیمپ کی پھیکی روشنی میں ہوا سے کانپتے پردوں کے سائے ہل رہے تھے۔ بجلی کڑکنے سے کھڑکیوں کے شیشے چمک چمک جاتے تھے۔ دروازے چٹخنے لگتے تھے، جیسے باہر سے کوئی دھیمے دھیمے کھٹکھٹا رہا ہو۔ کاریڈار سے اپنے اپنے کمروں میں جاتی ہوئی لڑکیوں کی ہنسی، بات چیت —— پھر سب کچھ شانت ہوگیا لیکن پھر بھی دیر تک کچی نیندوں میں وہ لیمپ

اپنے ساتھ وہ کچھ سینڈوچ بھی بیچ میں جوڑ لائی تھیں۔ کوئی کسی جھاڑی کے ڈونے پنکھ کو بالوں میں لگائے ہوئے تھی۔ کسی نے پیڑ کی ٹہنی کو چاقو سے چھیل کر چھوٹی سی بینت بنا لی تھی۔ اوپری درجوں کی کچھ لڑکیوں نے اپنے اپنے رومالوں میں نالے سے پکڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی بالشت بھر کی مچھلیوں کو دبا رکھا تھا۔ جنھیں وہ مس وڈ سے چھپا کر ایک دوسرے کو دکھا رہی تھیں۔

مس وڈ لڑکیوں کی ٹولی کے ساتھ آگے نکل گئیں۔ میڈوز سے پکی سڑک تک تین، چار فرلانگ کی چڑھائی تھی، لتیکا ہانپنے لگی۔ ڈاکٹر مکرجی سب سے پیچھے آ رہے تھے۔ لتیکا کے پاس پہونچ کر وہ ٹھٹھک گئے، ڈاکٹر نے دونوں گھٹنوں کو زمین پر ٹیکتے ہوئے سر جھکا کر ایلزبتھ کے زمانے کی انگریزی میں کہا — "میڈم آپ اتنی پریشان کیوں نظر آ رہی ہیں۔۔۔؟"

اور ڈاکٹر کی ڈرامائی کیفیت دیکھ کر لتیکا کے ہونٹوں پر ایک تھکی سی ڈھیلی ڈھیلی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"پیاس کے مارے گلا سوکھ رہا ہے۔۔۔۔ اور یہ چڑھائی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔"

ڈاکٹر نے اپنے کندھے پر لٹکتے ہوئے تھرماس کو اتار کر لتیکا کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا — "تھوڑی سی کافی بچی ہے شاید کچھ مدد کر سکے۔"

"پکنک میں تم کہاں رہ گئے ڈاکٹر کہیں دکھائی نہیں دیے؟"

"دوپہر بھر سوتا رہا — مس وڈ کے ساتھ۔ میرا مطلب مطلب ہے مس وڈ پاس لیٹی تھیں۔"

"مجھے لگتا ہے مس وڈ مجھ سے محبت کرتی ہیں۔" مذاق کرتے وقت ڈاکٹر اپنی مونچھوں کے کونوں کو چبانے لگتا ہے۔

"کیا کہتی تھیں؟" لتیکا نے تھرماس سے کافی کو منھ میں انڈیل لیا۔

"شاید کچھ کہتیں لیکن بدقسمتی سے بیچ میں ہی مجھے نیند آ گئی۔ میری زندگی کے کچھ خوبصورت اور حسین لمحے اسی کمبخت نیند کے کارن ادھورے رہ گئے ہیں۔"

اور اس دوران میں جب دونوں باتیں کر رہے تھے ان کے پیچھے میڈوز اور موٹر روڈ کے سنگ چڑھتی ہوئی چیڑ اور باغ کے درختوں کی قطاریں سانجھ کے گہرے اندھیرے میں ڈوبنے لگیں۔ جیسے پرارتھنا کرتے ہوئے انھوں نے اپنے سر جھکا لئے ہوں۔ انہی درختوں کے اوپر بادلوں میں گرجے کا کراس کہیں الجھ پڑا تھا۔ اس کے نیچے پہاڑیوں کی ڈھلان پر بچھے ہوئے کھیت بھاگتی ہوئی گلہریوں سے لگ رہے تھے جیسے کسی کی ٹوہ میں خاموش ٹھٹھک گئی ہوں۔

"ڈاکٹر — مسٹر ہیوبرٹ پکنک پر نہیں آئے۔؟"

ڈاکٹر مکرجی ٹارچ جلا کر لتیکا کے آگے آگے چل رہے تھے۔

"میں نے انھیں منع کر دیا تھا۔"

اندھیرے میں پیروں کے نیچے دبے ہوئے پتوں کی چرچراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ ڈاکٹر مکرجی دھیرے سے کھانسے۔

"پچھلے کچھ دنوں سے مجھے شبہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہیوبرٹ کی چھاتی کا درد شاید معمولی درد نہیں ہے۔" ڈاکٹر تھوڑا سا ہنسا جیسے اسے اپنی ہی سنجیدگی ناواجب لگ رہی ہو۔ ڈاکٹر نے انتظار کیا کہ شاید لتیکا کچھ کہے گی۔ لیکن لتیکا چپ چاپ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

"یہ میرا محض شک ہے شاید میں بالکل غلط ہوں، لیکن یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ایک پھیپھڑے کا ایکس رے کرا لے — اس سے کم سے کم کوئی بھرم تو نہیں رہے گا۔"

"آپ نے مسٹر ہیوبرٹ سے اس بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"ابھی تک کچھ نہیں کہا — ہیوبرٹ ذرا سی بات پر فکرمند ہو اٹھتا ہے اس لئے تندرست نہیں ہو پاتا۔"

ڈاکٹر کو لگا، اس کے پیچھے آتی ہوئی لتیکا کے پیروں کی آواز ایک دم بند ہو گئی ہے۔ انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، لتیکا بیچ سڑک پر اندھیرے میں سایہ کی طرح چپ چاپ ساکت کھڑی ہے۔

"ڈاکٹر ......" لتیکا کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے مس لتیکا ..... آپ رک کیوں گئیں؟"

"ڈاکٹر — کیا مسٹر ہیوبرٹ ....."

ڈاکٹر نے اپنی ٹارچ کی روشنی لتیکا پر ڈال دی .... اس نے دیکھا لتیکا کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا ہے۔ اور وہ رہ رہ کر پتے کی طرح کانپ جاتی ہے۔

ابھی ایک دو مریضوں کے گھر جانا تھا۔ کچھ دیر تک انھیں ٹالنے کے ارادے سے وہ کاری ڈار میں کھڑے رہے۔

نیچے اپنے کوارٹر میں بیٹھا ہوا کریم الدین ماؤتھ آرگن پر کوئی پرانی فلمی دھن بجا رہا تھا۔

"آج دن بھر بادل چھائے رہے لیکن کھل کر بارش نہیں ہوئی..."

"کرسمس تک شاید موسم ایسا ہی رہے گا" کچھ دیر تک دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ کانونٹ سکول کے باہر پھیلے لان سے جھینگروں کی نہ ٹوٹنے والی آواز نے چاروں طرف پھیلی خاموشی اور بھی زیادہ گہری بنا دی تھی۔ کبھی کبھی اوپر موٹر روڈ پر کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی پڑ جاتی تھی۔

"ڈاکٹر..... کل رات آپ نے مسٹر ہیو برٹ سے کچھ کہا تھا۔ میرے بارے میں؟"

"وہی جو سب لوگ جانتے ہیں اور ... ہیو برٹ جسے جاننا چاہتا تھا، نہیں جانتا تھا...."

ڈاکٹر نے لتیکا کی طرف دیکھا۔ وہ بلا حرکت جڑی سی ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔

"ویسے ہم سب کی اپنی اپنی ضدیں ہوتی ہیں، کوئی چھوڑ دیتا ہے کوئی آخر تک ان سے چپکا رہتا ہے۔" ڈاکٹر مکرجی اندھیرے میں مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں سوکھا سا احساس بھرا تھا۔

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں مس لتیکا کسی چیز کو نہ جاننا اگر غلط ہے تو جان بوجھ کر نہ بھول پانا، ہمیشہ جونک کی طرح اس سے چپٹے رہنا — یہ بھی غلط ہے۔ برما سے آتے ہوئے جب میری بیوی کی موت ہوئی تھی مجھے اپنی زندگی بیکار سی لگی تھی آج اس بات کو عرصہ گزر گیا ہے اور جیسا کہ آپ دیکھتی ہیں، میں جی رہا ہوں امید ہے کہ کافی دنوں اور جیوں گا۔ زندگی کافی دلچسپ معلوم ہوتی ہے، اور اگر عمر کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید دوسری شادی کرنے میں بھی نہ ہچکچاتا۔ اس کے باوجود کون کہہ سکتا ہے کہ میں اپنی بیوی سے پریم نہیں کرتا تھا — آج بھی کرتا ہوں...."

"لیکن ڈاکٹر....." لتیکا کا گلا رندھ آیا تھا۔

"کیا مس لتیکا...."

"ڈاکٹر — سب کچھ ہونے کے باوجود کیا چیز ہے جو ہمیں چلائے چلتی ہے — ہم رکتے ہیں تو بھی اپنے ریلے میں وہ ہمیں گھسیٹ لے جاتی ہے" لتیکا کو لگا کہ وہ جو کہنا چاہ رہی ہے کہہ نہیں پا رہی جیسے اندھیرے میں کچھ کھو گیا ہو جو مل نہیں پا رہا ہے، شاید کبھی نہیں مل پائے گا۔

"یہ تو آپ کو فادر ایلمنڈ ہی بتا سکیں گے مس لتیکا"

ڈاکٹر کی کھوکھلی ہنسی میں ان کا پرانا سنکی پن ابھر آیا تھا۔

"اچھا چلتا ہوں مس لتیکا، مجھے کافی دیر ہو گئی ہے" ڈاکٹر نے دیا سلائی جلا کر گھڑی کو دیکھا۔

"گڈ نائیٹ مس لتیکا"۔

"گڈ نائیٹ ڈاکٹر...."

ڈاکٹر کے جاتے پر لتیکا کچھ دیر تک اندھیرے میں ریلنگ سے سٹی کھڑی رہی۔ ہوا چلنے سے کاری ڈار میں جما ہوا کہرا بھر اٹھا تھا شام کو سامان باندھتے ہوئے لڑکیوں نے اپنے کمرے کے سامنے جو پرانی کاپیوں، اخباروں اور ردی کے ڈھیر لگا دیئے تھے سب اب اندھیرے کاری ڈار میں ہوا کے جھونکوں سے ادھر ادھر بکھرنے لگے تھے۔

لتیکا نے لیمپ اٹھایا۔ اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ کاری ڈار میں چلتے ہوئے اس نے دیکھا جولی کے کمرے میں روشنی کی ایک پتلی لکیر دروازے کے باہر کھنچ آئی ہے۔ لتیکا کو کچھ یاد آیا۔ وہ کچھ لمحوں تک سانس روکے جولی کے کمرے کے باہر کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ لتیکا نے دبے ہاتھوں سے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ جولی لیمپ بجھانا بھول گئی تھی۔ لتیکا دبے پاؤں دھیرے دھیرے جولی کے پلنگ کے پاس چلی آئی۔ جولی کا سوتا ہوا چہرہ لیمپ کے پھیکے آلوک میں پیلا سا دکھ رہا تھا۔ لتیکا نے اپنی جیب سے وہی نیلا لفافہ نکالا اور اسے دھیرے سے جولی کے تکیے کے نیچے دبا کر رکھ دیا۔

کی دھیمی سی، سی، سی کی آواز سنتی رہی۔ کب وہ آواز بھی خاموشی کا حصہ بن کر گم ہوگئی، اسے پتہ نہ چلا۔

کچھ دیر بعد اس کو محسوس ہوا سیڑھیوں سے کچھ دبی آوازیں اوپر آ رہی ہیں۔ بیچ بیچ میں کوئی چلا اٹھتا ہے اور پھر اچانک آوازیں دھیمی پڑ جاتی ہیں۔

"مس لتیکا ذرا اپنا لیمپ لے آیئے"—— کاری ڈار کے زینے سے ڈاکٹر مکرجی کی آواز آئی تھی۔

کاری ڈار میں اندھیرا تھا۔ وہ تین چار سیڑھیاں نیچے اتری لیمپ نیچے کیا۔ سیڑھیوں سے سٹے جنگلے پر ہیوبرٹ نے اپنا سر رکھ دیا تھا۔ اس کا ایک بازو جنگلے کے نیچے لٹک رہا تھا اور دوسرا ڈاکٹر کے کندھے پر جھول رہا تھا۔ جسے ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا۔

"مس لتیکا لیمپ ذرا نیچے جھکا دیجئے...... ہیوبرٹ... ... ہیوبرٹ......" ڈاکٹر نے ہیوبرٹ کو سہارا دے کر اوپر کھینچا۔ ہیوبرٹ نے اپنا چہرہ اوپر کیا۔ وہسکی کی تیز بو کا جھونکا لتیکا کے سارے شریر کو جھنجھوڑ گیا۔ ہیوبرٹ کی آنکھوں میں سرخ ڈورے کھنچ آئے تھے قمیض کا کالر اوپر اٹھ گیا تھا۔ اور ٹائی کی گانٹھ ڈھیلی ہو کر نیچے کھسک آئی تھی۔ لتیکا نے کانپتے ہاتھوں سے لیمپ سیڑھیوں پر رکھ دیا۔ اور خود دیوار کے سہارے کھڑی ہوگئی۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

"ان اے بیک لین آف دی سٹی، دیر از اے گرل ہو لوز می۔...." ہیوبرٹ ہچکیوں کے بیچ گنگنا اٹھتا ہے۔

"ہیوبرٹ پلیز...... پلیز" ڈاکٹر نے ہیوبرٹ کے لڑکھڑاتے جسم کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

"مس لتیکا آپ لیمپ لے کر آگے چلئے......" لتیکا نے لیمپ اٹھایا۔ دیوار پر ان تینوں کے سائے ڈگمگانے لگے۔

"ان اے بیک لین آف دی سٹی دیر از اے گرل ہو لوز می"...... ہیوبرٹ ڈاکٹر مکرجی کے کندھے پر سر ٹکائے اندھیری سیڑھیوں پر الٹے سیدھے پیر رکھتا چڑھ رہا تھا۔

"ڈاکٹر ہم کہاں ہیں؟" ہیوبرٹ ایکدم اتنی تیزی سے چلایا کہ اس کی لڑکھڑاتی آواز سنسان اندھیرے میں کاری ڈار کی چھت سے ٹکرا کر دیر تک ہوا میں گونجتی رہی۔

"ہیوبرٹ......" ڈاکٹر کو ایک دم ہیوبرٹ پر غصہ آگیا۔ پھر اپنے غصے پر ہی اسے کھیج سی ہوئی اور وہ ہیوبرٹ کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

"کچھ بات نہیں ہے ڈیر ہیوبرٹ ڈیر تم صرف تھک گئے ہو" ہیوبرٹ نے اپنی آنکھیں ڈاکٹر پر گاڑ دیں۔ اس میں ایک سہمے ہوئے بچے کی سی بزدلی جھلک رہی تھی۔ جیسے ڈاکٹر کے چہرے سے وہ کسی سوال کا جواب پا لینا چاہتا ہو۔

ہیوبرٹ نے کمرے میں پہونچ کر ڈاکٹر نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ ہیوبرٹ نے بنا کسی مخالفت کے چپ چاپ جوتے موزے اتروا دیئے۔

جب ڈاکٹر ہیوبرٹ کی ٹائی اتارنے لگا تو ہیوبرٹ اپنی کہنی کے سہارے اٹھا۔ کچھ دیر تک ڈاکٹر کو اپنی آنکھیں پھاڑتے ہوئے گھورتا رہا۔ پھر دھیرے سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ڈاکٹر کیا میں مر جاؤں گا؟"

"کیسی بات کرتے ہو ہیوبرٹ۔" ڈاکٹر نے ہاتھ چھڑا کر دھیرے سے ہیوبرٹ کا سر تکیے پر ٹکا دیا۔

"گڈ نائٹ ہیوبرٹ......"

"گڈ نائٹ ڈاکٹر" ہیوبرٹ نے کروٹ بدلی۔

"گڈ نائٹ مسٹر ہیوبرٹ......" لتیکا کی آواز لہرا گئی——

لیکن ہیوبرٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کروٹ بدلتے ہی اسے نیند آگئی تھی۔

کاری ڈار میں واپس آکر ڈاکٹر مکرجی، ریلنگ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے آکاش میں پھیلے بادلوں کی پرتیں جب کبھی اکہری ہو جاتیں تب ان کے پیچھے سے چاندنی بجھتی ہوئی آگ کے دھوئیں سی آس پاس کی پہاڑیوں پر پھیل جاتی تھی۔

"آپ کو مسٹر ہیوبرٹ کہاں ملے؟" لتیکا کاری ڈار کے دوسرے کونے میں ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔

"کلب کی بار میں انھیں دیکھا تھا۔ میں نہ پہونچتا تو نہ جانے کب تک بیٹھے رہتے۔" ڈاکٹر مکرجی نے سگریٹ جلائی۔ انھیں

جانے کی خواہش ..... پلٹ کر گاڑی کے خالی ٹیپر کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی ہے۔ پیٹھ میں آج بھی گدگدی لگتی ہے۔ آج بھی رہ رہ کر میا کا پھول کھل اٹھتا ہے اس کی گاڑی میں ایک گیت کی ٹوٹی کڑی پھڑپھڑا کا تال کٹ جاتا ہے۔ بار بار !....

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بورے بھی نہیں۔ بانس بھی نہیں۔ ٹپر بھی نہیں ..... پری .... دیوی .... میا ..... ہیرا دیوی .... مہوا گھٹوارن ..... کوئی نہیں .... پلنے واقعات گونگی آواز میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ہیرامن کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ شاید وہ تیسری قسم کھا رہا ہے ــــ کمپنی کی عورت کی لدنی .... !

ہیرامن نے اچانک اپنے دونوں بیلوں کو جھڑکی دی۔ پرانی سے مارتے ہوئے بولا۔ ریلوے لائن کی طرف الٹ الٹ کر کیا دیکھتے ہو ؟" دونوں بیلوں نے قدم کھول کر چال پکڑی۔ ہیرامن گنگنانے لگا ــــ "اجی ہاں، مارے گئے گلفام .... !"

صفحہ ۸۳ کا بقیہ

وہ ماکا سے پوچھے گا کیا ؟

"ساری۔ آپ کو یوں گھسیٹ لائے ہم لوگ۔"

اور اس بار تیز نگاہوں سے دیکھنے کی وجہ کی باری تھی۔

اتنا غلط سمجھتے ہیں آپ ــ

چار پانچ سال ہو گئے۔ لیکن بات کتنی تازی ہو آئی ہے۔ وہ دیکھ ــ راکا اور من من اسی طرح لوٹ رہے تھے۔ چپ چاپ اداس اور منحوس .... شام کا بجرارات کا کنارا بھی نہ لگا تھا جیسے کئی برسوں کی طوفانی یاترا سے وہ تینوں لوٹ کر آ رہے ہوں۔ پیڑوں اور عمارتوں پر پرچھائیاں خوب لمبی لمبی چوڑی دھاریوں کی طرح پھیلی گئی تھیں۔ بجلی اور لان کی ہریالیاں عجب بشکلی ہو اٹھی تھیں۔ ہریالی کے سرمئی دھندنے کا کانچ پر سفید پھول جھپک آئے تھے۔

میرا کے جھنجے کے شیشوں میں جھانکتی پرچھائیں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اُسے وہ یاد تازہ ہو گئی تھی۔ دبی تاریخ جو اس دن حرمن میں

آسانی بجا دھڑکے پیچھے سے جھانک رہا تھا اور اپنے آپ سے رٹتے ہوا دیو اسے تبا رہا تھا۔ آج اگر دیو ہوتا کیا جواب دیتا ؟ تو کیا وہ بھی اسی طرح جدا ہو رہے ہیں ۔۔ ؟

ایک دم چونک کر اس نے میرا کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے اس نے کچھ کہا ہے۔ "کچھ کہہ رہی تھیں کیا۔ ؟"

"میں ؟ ــــ نہیں تو۔" پھر وہی سکوت اور گھٹتی ہوئی اداسی کا

معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ ہے جس کا ایک سرا میرا پکڑے ہے اور دوسرا وہ۔ اور اسے چپ چاپ دونوں رات کے سناٹے میں کہیں دفنانے لیے جا رہے ہوں ــــ ڈرتے ہوں کہ کسی کی نگاہیں نہ پڑ جائیں ــــ کوئی جان نہ لے وہ ہتھیارے ہیں ــــ کہیں کسی جھاڑی کے پیچھے لاش کو پھینک دیں گے۔ خوشبودار رو مالوں سے کس کر خون پونچھتے ہوئے چلے جائیں گے ــــ پھر اپنے گھر جائیں گے۔ جیسے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے ڈر لگتا ہو ــــ کہیں کچھ اظہار کرتی ہوئی آنکھیں ہتھیا کا اقرار کرنے کے لیے مجبور نہ کر دیں۔

باہر وہ دونوں تانگے لیں گے۔ جھٹکے سے موڑ لیتا ہوا تانگا ڈھال پر دوڑ پڑے گا۔ لعدتاج محل پیچھے چھوٹتا جائے گا ــــ اور پھر "اچھا" کہہ کر۔ خشک ہونٹوں کے بھرے لہجے پر مسکراہٹوں کا کفن لپیٹ کر ایک دوسرے سے جدا ہوں گے۔

صفحہ ۸۹ کا بقیہ

اور اس لمحہ انہیں ایسا لگا کہ دل کے اندر کسی نے اپنے اٹھے پھنے ڈنک گھونپ دیے ہوں۔ اس تکلیف سے تلملا کر وہ اٹھ جانا چاہتے تھے لیکن لگا کہ اس سے بھی بڑی طاقت کے ہاتھوں ان کا جسم کچھ کرنے سے مجبور ہو گیا ہو۔ بالکل۔

صفحہ ۲۳ کا بقیہ

میٹر کو پھاڑے گی۔ ٹیشر کے پاس جانے کی ہمت کون کرے گا۔ محفوظ رہے گی ہیرابائی..... کدھر کی گاڑی آرہی ہے؟

——— ہرامن۔ اے ہرامن بھائی۔ لال موہر کی بولی سن کر ہرامن نے گردن گھما کر دیکھا۔ "کیا لاد کر لایا ہے لال موہر؟

"تم کو ڈھونڈھ رہی ہے ہیرابائی اسٹیشن پر۔ جارہی ہے۔" ایک ہی سانس میں سنا گیا وہ۔ لال موہر کی گاڑی پر ہی آئی ہے میلے سے۔

جارہی ہے؟ کہاں؟ لال موہر ریل گاڑی سے جارہی ہے؟

ہرامن نے گاڑی کھول دی۔ مال گودام کے چوکیدار سے کہا۔

"بھیا ذرا گاڑی بیل دیکھتے رہیو۔ آرہے ہیں۔"

استاد! زنانہ مسافر خانے کے پھاٹک کے پاس ہیرابائی اوڑھنی سے منہ ہاتھ ڈھکے کھڑی تھی۔ تھیلی بڑھاتی ہوئی بولی ——— لو۔ ہے بھگوان۔ ملاقات ہوگئی۔ چلو۔ میں تو امید کھو چکی تھی۔ تم سے اب ملاقات نہیں ہو سکے گی ..... میں جارہی ہوں گرو جی!"

بکسا ڈھونے والا آدمی آج کوٹ پتلون پہن کر بابو صاحب بن گیا ہے۔ مالکوں کی طرح قلیوں کو حکم دے رہا ہے۔ "زنانہ درجہ میں چڑھانا! اچھا؟

ہرامن ہاتھ میں تھیلی لے کر چپ چاپ کھڑا رہا۔ کرتے کے اندر سے تھیلی نکال کر دی ہے ہیرابائی نے ..... چڑیا کے جسم کی طرح گرم ہے تھیلی۔

گاڑی آرہی ہے۔ سامان ڈھونے والے نے منہ بناتے ہوئے ہیرابائی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر آئی بات صاف ہے۔ اتنا زیادہ کیا ہے؟"

ہیرابائی چنچل ہوگئی۔ بولی۔ "ہرامن ادھر آؤ۔ اندر۔ میں پھر لوٹ کر جارہی ہوں متھرا موہن کمپنی میں۔ اپنے دیش کی کمپنی ہے ...... بنیلی کے میلے آؤ گے نا؟

ہیرابائی نے ہرامن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس بار داہنے کندھے پر پھر اپنی تھیلی سے روپیہ نکالتے ہوئے بولی ——— ایک گرم چادر خرید لینا ———

ہرامن کی بولی پھوٹی۔ اتنی دیر کے بعد ——— اس س س۔ ہر دم "پیسہ پیسہ۔ سکھیے رد پیہ..... کیا کریں گے چادر؟

ہیرابائی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے ہرامن کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر بولی ——— تم بہت اداس ہو۔ کیوں گیا؟ ..... مہوا گھٹوارن کو سوداگر نے خرید جو لیا ہے گرو جی۔

گلا بھر آیا ہیرابائی کا۔ سامان ڈھونے والے نے باہر سے آواز دی گاڑی آگئی۔ ہرامن کمرے سے باہر نکل آیا۔ سامان ڈھونے والے نے جوکر جیسا منہ بنا کر کہا۔ پلیٹ فارم سے باہر بھاگو۔ بنا ٹکٹ کے پکڑے گئے تو تین مہینے کی ہوا۔

ہرامن چپ چاپ پھاٹک سے باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ٹیشن کی بات ریلوے کا راج ہے نہیں تو اس سامان ڈھونے والے کا منہ سیدھا کر دیتا ہرامن۔

"ہیرابائی ٹھیک سامنے والی کوٹھری میں چڑھی۔ اس س س گاڑی میں بیٹھ کر بھی ہرامن کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ٹکر ٹکر۔ لال موہر کو دیکھ کر جی جل اٹھتا ہے۔ ہمیشہ پیچھے پیچھے۔ ہر دم حصہ داری سوجھتی ہے۔

گاڑی نے سیٹی دی۔ ہرامن کو ایسا لگا جیسے اس کے اندر سے کوئی آواز نکل کر سیٹی کے ساتھ اوپر کی طرف چلی گئی۔ کو۔ او۔ او۔ اس س س چھی۔ چھک! گاڑی ہلی۔ ہرامن نے اپنے داہنے پیر کے انگوٹھے کو بائیں پیر کی ایڑی سے کچل لیا۔ کلیجے کی دھڑکن ٹھیک ہو گئی ——— ہیرابائی ہاتھ کے ہرے رومال سے چہرہ پونچھتی ہے۔ رومال ہلا کر اشارا کرتی ہے۔ اب جاؤ ..... آخری ڈبہ گزرا۔ پلیٹ فارم خالی۔ سب خالی۔ کھوکھلے ..... مال گاڑی کے ڈبے۔ دنیا ہی خالی ہو گئی جیسے! ہرامن اپنی گاڑی کے پاس لوٹ آیا۔

ہرامن نے لال موہر سے پوچھا ——— "تم کب تک لوٹ رہے ہو گاؤں؟

لال موہر بولا ——— "ابھی گاؤں جا کر کیا کریں گے؟ یہی تو بھاڑا کمانے کا موقعہ ہے۔ ہیرابائی چلی گئی۔ میلا اب ٹوٹے گا۔"

لال موہر نے ہرامن کو سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ہرامن نے اپنی گاڑی گاؤں کی طرف جانے والی سڑک کی طرف موڑ دی ..... اب میلے میں کیا رکھا ہے۔ کھوکھلا میلا!

ریلوے لائن کی بغل سے بیل گاڑی کی کچی سڑک گئی ہے۔ دور تک ہرامن کبھی ریل پر نہیں چڑھا ہے۔ اس کے دل میں پھر ایک پرانی خواہش جاگی۔ ریل گاڑی پر سوار ہو کر گیت گاتے ہوئے جگن ناتھ دھام

[ر]اجندر یادو

[تر]جمہ: آفتاب اختر

چھوٹے چھوٹے تاج محل

وہ بات نہ میرا نے شروع کی اور نہ اس نے ملنے سے پہلے یہ ضرور ں ہوا تھا کہ کوئی بہت ہی اہم بات ہے جس پر دونوں کو بات[یں] ینا چاہیے۔ لیکن جیسے ہر لمحہ اسی بات کے ڈر سے اسے ٹالتے ۔بات ۔۔۔ آ کر رہ گئی کہ وہ ایک بار پھر میرا سے پوچھے۔ کیا ارف کو دائمی شکل نہیں دی جا سکتی؟ لیکن نہیں پہلے کی طرح ت[ھ]کا تو۔۔۔۔؟ اس کے بعد دونوں میں کتنا کھنچاؤ اور دوری

نہ جانے کیوں اُسے تاج کبھی اچھا نہیں لگا۔ دھوپ میں جگ ۔۔۔ اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، اسی لیے وہ بیٹھ[ا] تھا لیکن یہ چکا چوندھ میرا کو بھی تو ہو سکتی ہے؟ ہو سکتا ہے ے سندر ہی معلوم ہوتا ہو۔ پرچھائیں تو ادھر جمنا کی طرف ادھر تو بس سپاٹ دھوپ میں جھلمل کرتا سنگ مرمر ہی ہے۔ اس جلنے میں پاؤں کے جھلسنے کے خیال سے ہی اس کے سارے ر جھرجھری سی دوڑ گئی۔

ن سال بعد ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ دیکھ کر صرف مسکرائے تہ طور پر۔ ہاں دونوں ہیں۔ اور ویسے ہی ہیں۔ میرا کچھ نکھر اور شاید وہ۔۔۔۔ وہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ نہ جانے کے جیسے۔ سوال و جواب من ہی من میں میرا کو بٹھا کر بولے ل کے کتنے ہی خاکے بنائے تھے۔ اور اب بس۔ صرف کھسیانی سی مسکرا کر ہی استقبال کیا تھا۔ اسے اسی لمحے سے ملاقات کے بے کار ہونے کا احساس ہونے ۔۔۔۔ جانے کیوں ۔۔۔۔ کیا ایسے گے وہ جو اکثر نہیں کر چکے ہیں ۔۔۔؟ سال چھ مہینے میں

ایک دوسرے کی خیر و عافیت معلوم ہی کر لیتے ہیں۔

بیٹھے ہوئے گھٹنوں کے پاس لان کی گھاس پر میرا کا ہاتھ چپ چاپ رکھا تھا۔ میں انگلیاں اس طرح اٹھ کر گر رہی تھیں جیسے کسی بہت نازک ساز پر آہستہ آہستہ گم سم سی سنگیت کی تال کو باندھ رہی ہوں۔ میرا نے لوہے کا چھلا ڈال رکھا تھا۔ شاید سنیچر کے اثر کو دور کرنے کے لیے اس نے دھیرے سے اس کی چھوٹی انگلی میں اپنی انگلی ہک کی طرح اٹکالی تھی۔ پھر ہاتھ اٹھا کر دونوں ہتھیلیوں میں دبا لیا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے باتوں کا دھارا اچھوٹ پڑا تھا۔

دیپک نے دیکھا ۔۔۔۔ بڑی بڑی مونچھوں والا کوئی چھوٹا سا کیڑا میرا کی گردن اور بلاؤز کے سرے پر آ گیا تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا کہ خود جھاڑ دے یا اسے بتا دے۔ اس نے اپنا سر دوسری طرف پھیر لیا۔ داخلی دروازے کی سیڑھیاں جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئیں تھیں۔ صرف اوپری حصہ نظر آ رہا تھا۔ ہچکچاتے ہوئے کیرم کے اسٹرائیکر کی طرح اس نے کیڑے کو دور جھٹک دیا۔ نسوں میں سنسناہٹ اترتی چلی گئی۔ انگلیوں سے وہ جگہ یوں ہی جھاڑ دی جیسے گندی ہو گئی ہو۔ میرا اسی لہجے میں اپنی سہیلی کی شادی کی پارٹی میں آئے لوگوں کا ذکر کر رہی تھی ۔۔۔۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔

اس نے وہاں دیپک کا رکھا ہوا ہاتھ بھی نہیں ہٹایا۔ تبھی تو دیپک نے یکبار گی میرا احتیاطاً ادھر ادھر دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کی دونوں کنپٹیوں کو ہتھیلیوں سے دبا کر اپنے پاس کھینچ لیا ۔۔۔ نہیں میرا نے اسے روکا نہیں۔ جیسے وہ انتظار کر رہی ہو کہ یہ وقت ضرور آئے گا۔ لیکن پہلے اس کے ماتھے پر شکن لکیروں کی پرچھائیاں ابھریں اور پھر شکی مسکراہٹ کی لہروں میں بدل گئیں ۔۔۔۔ ایک عجیب نکھرتی سی سمٹتی سی جھو

رکر دیکھے گا تو وہ آ رہی ہوگی۔ لیکن دو تین بار ایسا کر چکنے کے بعد بھی وہ نہیں آئی جب دوسری طرف منہ موڑے ہونے کے باوجود کنکھیوں سے ادھر دیکھنے کی کوشش کرتا تو خود اپنے ہی اوپر ہنسی آجاتی۔ اچھا سیڑھیاں اتر کر آنے والے تین آدمیوں کو وہ اور دیکھے گا اور اگر ان میں بھی میرا نہ ہوئی تو دھیان لگا کر کتاب پڑھے گا جب آنا ہو آجائے۔ ایک دو تین! ہو سکتا ہے اگلی وہی ہو۔ ہش نہیں آتی تو جائے جہنم میں۔ اچھا آؤ تب تک یہی سوچیں کہ میرا ان تین برسوں میں کیسی ہو گئی ہوگی۔ کیسے کپڑے پہن کر آئے گی؟ ایک دوسرے کو دیکھ کر وہ کیا کریں گے؟ ہو سکتا ہے جذبات میں لپٹ جائیں۔ کچھ بول نہ پائیں۔ اس کے ساتھ ایسا ہوتا نہیں لیکن کون جانے جذبات......

آخر وہ آئی تو۔ وہ اسے آتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ ہر بار وہ اُدھر سے نگاہیں ہٹانے کی کوشش کرتا تاکہ اسے یوں نہ دیکھے پاس آنے ہی پر دیکھے اور اچانک ملنے کی ڈرامائیت کو محسوس کرے۔ لیکن وہ دیکھتا رہا تھا۔ اور نہایت ہی سنجیدگی سے بولا تھا "نمستے میرا جی۔" میرا جھینپ کر مسکرا پڑی تھی۔ دھوپ میں چہرا لال پڑ گیا تھا۔ پھر دونوں اس لان میں آ بیٹھے تھے۔ ایسے پرسکون ایسے غیر جذباتی جیسے روز ملتے ہوں۔

"میں نے سوچا شاید تم نہ آؤ۔ یاد نہ رہے۔"

"آپ نے لکھا تھا تو یاد کیسے نہ رہتا۔ لیکن ٹائم بڑا عجیب ہے۔"

"ہاں پورس کی چاندنی رات تو نہیں ہے۔" اپنے بیکار کے مذاق کو اس نے خود محسوس کیا تھا۔ سنجیدہ ہو کر بولا۔ "اس وقت یہاں ذرا تنہائی ہوتی ہے۔"

سچ مچ عجیب ٹائم تھا۔ میرا کے ساتھ ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا۔ دوپہر کی دھوپ اور ——— اور دو پیار کرنے والے انسان! 'دو پریم کرنے والی روحیں' اس نے پھر دوہرایا۔ یہ پیار تھا؟ جیسے برسوں بعد ملنے والے دو دوست ہوں۔ جنھیں باتیں کرنے کے موضوع ختم ہو چکے ہوں۔ سفید سنگ مرمر پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ اس لیے ادھر پیٹھ کر لی تھی۔ وہ رہ کر جھنجھلاہٹ ہوتی۔ کسی بدذوق نے ہمارے خون کو چادر کر دیا ہے؟ آخر یہ ہیں ہو کیا گیا ہے؟ کوئی گرمی نہیں۔ کوئی جذبات اور امنگ نہیں۔ کیا بدل گیا ہے ہمیں؟ ہاں۔ میرا کا رنگ کچھ کھل گیا ہے جسم نکھر آیا ہے۔

واپسی کے وقت بھی اس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ یہ وجہ یہ کھنچاؤ کیا ہے۔ دونوں یوں ہی گھاس پر کانٹ سرخ لال پتھروں کی جالی پر قدم قدم ٹہلتے ہوئے سیڑھیوں تک جائیں گے۔ یہاں تک میں بیٹھے ہوئے گائیڈ (رہبروں) اور دربانوں کی تیز اور بھری نگاہوں کی طرح جھلانے، بجری پر خر خر کرتے ہوئے تانگے یا رکشے میں جا بیٹھیں گے۔ اور ایک بار مڑتے ہی سب کچھ پیچھے چھوٹ جائے گا۔ کل وہ لکھے گا۔ میری میرا۔ تمہیں کل کے میرے طرز عمل پر تعجب ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے برا بھی لگا ہو۔ لیکن۔ لیکن... اور پھر شیشے کے شیشوں میں جھانکتا ہوا تاج محل پوری طرح ابھر آیا۔ رتمہاری پلکوں پر تیرتے ہوئے تاج محل۔ کتنا خوبصورت جملہ ہے (یہ تو نئی شاعری ہو گئی) ٹیگور نے دیکھا ہوتا تو وقت کے رخساروں پر ڈھلک آنے والی بوند، کبھی نہ کہتے ——— کہتے رخسار پر ڈھلک آنے والے آنسوؤں میں جھانکتے تاج محل کی رو پہلی جھلملاتی پرچھائیاں۔ لیکن اسے تو میرا کی آنکھوں میں نمی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ہم لوگ کتنے عجیب ہو گئے ہیں آجکل۔ وہ کل والے خط میں لکھے گا۔ کہنے کی نقل نہیں اتار رہا ہوں۔ نہ جانے کیوں تاج محل مجھے کبھی خوبصورت نہیں لگا۔ لیکن جب ہی بار میں نے تمہاری پلکوں پر تاج کی پرچھائیاں دیکھیں تھیں تو دیکھتا رہ گیا تھا ——— گزشتہ دنوں کی ایک عجیب بات مجھے اس لمحہ یاد آ گئی۔

ارے ہاں۔ اب یاد آیا مجھے کہ وہ کیوں اچانک اس طرف سست ہو گیا تھا۔ اس بات کو بھی کبھی بھلایا جا سکتا ہے؟ ہاں میرے لیے تو وہ بات ہی بھی ——— وہ لکھے گا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا ہے۔ جیسے خط لکھ رہا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ چلنے والی یہ میرا نہیں ہے۔ وہ تو کوئی اور ہے۔ کہیں دور۔ بہت دو۔ دو۔ ر وہی میرا تو اس کی اصلی دوست اور ساتھی ہے ——— یہ ——— یہ اس سے تو جب جیب لا ہے۔ اسی طرح اداس ہو گیا ہے۔

لیکن اس میرا سے ملنے کی کشش اسے اس کے پاس کھینچ لاتی ہے

چھاؤں مسکراہٹ۔ وجے کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ریگستان میں بھٹکتے ہوئے پیاسے کی طرح دونوں ہاتھوں سے صراحی کو پکڑ کر اس مسکراہٹ کی شراب کو پاگلوں کی طرح پیتا چلا جائے۔ پیتا چلا جائے۔ غٹ غٹ اور پھر لڑکھڑا کر گر پڑے۔ پتلے پتلے ہونٹوں میں ایک نامعلوم سی لرزش تھی۔ اس رومانی بیہوشی میں بھی وجے کو یہ خیال آیا کہ پہلے ایک ہاتھ سے میرا کا چشمہ اتار لے۔ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ تب اس نے دیکھا ہریالے فواروں جیسے مورپنکھیوں کے دو تین پیڑوں کے پیچھے پورے پورے دو تاج محل چشمے کے شیشوں میں اتر آئے ہیں وہ دھیا ہاتھی دانت کے بنے ہوئے دو سفید ننھے ننھے کھلونے۔

معلوم نہیں کیوں اسے تاج محل کبھی اچھا نہیں لگا۔ اسے لگا کسی بوڑھے شخص کی طرح تاج محل پیچھے کھڑا دیکھ رہا ہو۔ باتوں کے درمیان وہ اسے کئی بار بھول گیا تھا لیکن دانتوں میں پھنسے تنکے کی طرح اچانک ہی اسے یاد آیا تھا کہ وہ اس کے سایہ میں بیٹھے ہیں جو عظیم ہے۔ جو مہان ہے۔ جو...... ؟ اتنی بڑی عمارت! اس کے بے پایاں حسن کا وہ ایک ساتھ کبھی تصور بھی نہیں کر سکا تھا۔ ایک ایک حصہ دیکھنے میں وہ اسے کبھی حسین نظر نہیں آیا تھا۔ شاید لوگوں کے اپنے من ہی شاعرانہ احساس اور حسن ہوتا ہے جسے وہ اس میں دیکھ لیتے ہیں۔

کبھی موقع ملا تو وہ ہوائی جہاز سے اس کے مجسم حسن کا جائزہ لینے کی کوشش کرے گا۔ اس نے اس طرح کی کئی بے ہنگم تصویریں تو دیکھی ہیں۔ اور تب سارے ماحول کے درمیان کوئی بات لگی تھی۔ مگر یہ چشمے کے شیشوں میں جھلملاتے۔ دھوپ میں چمکتے تاج ...... کھلونے وہیں کم ہو گیا۔ انھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے غیر ارادی طور سے گہری سانس لی اور اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ "آہستہ سے۔ یہیں یہاں نہیں۔ کوئی دیکھ لے گا۔" یہ اسے کیا ہو گیا؟

ایک دم میرا ہوش میں آ گئی۔ ایک دم بند کر آنے والی لاج کو چھپانے کے لیے سمٹ کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی بھی نہیں تھا۔ پاس والی لال لال اونچی دیوار پر ابھی ابھی راج مزدور جیسے معلوم ہوتے تھے۔ شاید آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے گئے ہیں۔ بندر کی طرح دیوار پر دوڑنے کی انھیں مشق ہے

روش کے پاس ٹیوبوں کے لان میں دو تین مالی پائپ گھماتے پانی دے رہے تھے۔ وہ بھی اب نہیں ہیں۔ گم گئے ہوں گے۔ میرا نے بغل سے ساری کھینچ کر کاندھے کر لیا۔ پھر وجے نے اپنے طور پر گھاس کا ایک پھول آنکھوں کے آگے انگلیوں میں گھمانے لگا۔ میرا نے چشمہ اتار جاہی لی اور ساری سے شیشے صاف کیے کانوں کے پیچھے لٹوں کو ڈال لیا۔ چشمہ لگا کر کلائی کی گھڑی دیکھی۔

بڑی بوجھل خاموشی چھا گئی تھی۔ وجے کو محسوس ہوا بولنا چاہیے ورنہ خاموشی کا یہ بوجھل پن ان دونوں کے درمیان نہایت نازک شے کو میں رہا لے گا۔ ہتھیلی پر یوں ہی اس نے زاویے بناتا ہوا وہ الفاظ کو ٹھیل کر بولا "تو پھر اب چلیں۔ ہو رہی ہے۔"

میرا نے سر ہلا دیا۔ لگا جیسے وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ منتظر ہو کر وجے کچھ کہنا چاہتا ہو پر کہہ نہ پا رہا ہو۔ پھر تھوڑی رہی۔ کوئی نہیں اٹھا۔ تب پھر اس نے مرے مرے ہاتھوں سے کے نیچے کے اخبار میں رکھے سنترے اور مونگ پھلی کے چھلکے سمیٹنے کے لیے بچھائے گئے رومال سمیٹے گئے اور دونوں ٹہلتے پتنگ کی طرح چلے آئے۔

تین بجے ہوں گے۔ ہاتھ میں گھڑی ہوتے ہوئے بھی اندازہ لگایا۔ دھوپ اب بھی بہت تیز تھی۔ ایک آدھ بار اس نے گلے اور کنپٹیوں کا پسینہ پونچھا۔ آتے وقت تو بارہ بجے تھے۔ اسے ہنسی آ رہی تھی۔ ملنے کا وقت بھی ان لوگوں نے کتنا عجیب رکھا ہے۔

جیسے اس وقت سے بہت دور کھڑے ہو کر اس نے دوبارہ ...... بجے۔ جون کا مہینہ اور تاج محل کا لان۔ وہ پہلے اور انتظار کرتا رہا تھا۔ اس وقت کیسی بے چینی کیسی پریشانی اور تھی۔ یہ وقت گزرتا کیوں نہیں ہے؟ بہت دنوں سے گھڑی کی نہ ہر پائی اس لیے شاید سست ہے۔ ابھی تک نہیں آئی۔ ان لڑکیوں کو اسی بات سے سخت جھلاہٹ ہوتی ہے۔ کبھی وقت کا خیال نہیں۔ جانے انتظار کرنے میں کیا مزا آتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر ادھر آنے والے رستہ کی طرف سے منہ پھیرے تھا۔ میرا کہا تھا کہ شاید جب وہ

مسٹر دیو۔

"سچ مچ آپ نے بہت ہی سندر بجایا تھا۔ بڑی اچھی پریکٹس ہے۔" دیو نے اس کے بیٹھتے ہی کہا۔ رومال سے باجے کو اچھی طرح پونچھ کر جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ چونک گیا۔ راکا کے چہرے پر تاسّف کے آثار پیدا ہو گئے تھے اور یوں ہی کپ کے اوپر ہتھیلی ٹیکے وہ ایک ٹک میز کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ کی چائے تو پانی ہو گئی ہو گی۔ اور منگاتا ہوں۔ بیرا۔ سنو ادھر۔"

اس کے منع کرنے پر بھی چائے اور آ گئی۔ "چھٹیوں میں گھومنے آئے ہیں ۔۔۔؟" "اچھا کیا لگا کلکتہ آپ کو ۔۔۔" "جی ہاں۔ گندہ تو ہے مبمبئی کے مقابلہ میں ۔۔۔ لیکن ایک بار من لگ جانے پر چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔" پھر تعریف و توصیف کا تبادلہ۔ تعارف اور رات کو دیر تک اُن کے لوور سرکلر روڈ کے فلیٹ پر باتیں۔ کھانا۔ کافی اور سنگیت۔ راکا کو ستار کا شوق ہے۔ دیو کسی غیر ملکی کمپنی کے ایکسچینج منیجر کے ساتھ غیر ملکی Symphony ریکارڈ پسند کرتے ہیں۔ اس کا ماڈرن انگلش سننے کے بعد راکا جی نے ستار سنایا تھا۔ اور پھر دیو نہایت ہی خوبصورت پلاسٹک کے لفافوں میں بند غیر ملکی کمپنی کے ریکارڈ لائے تھے۔ ایک ایک ریکارڈ آدھ گھنٹہ تک چلتا تھا۔ اور ان میں تین تین دھنیں تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا لیکن بیٹھا ہوا لفافوں پر لکھی ہوئی عبارتوں اور موسیقار کی تصویر کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی چایکوسکی یا کچھ بینگر تھا۔ جس کا نام وہ بار بار لے رہے تھے۔ ایک ایک ریکارڈ چالیس پچاس روپے کا تھا۔ بیچ بیچ میں۔ "کبھی آگرہ ضرور آئیں گے۔ بہت بچپن میں ایک بار دیکھا تھا۔ شاید دماغ میں جو نقشہ ہے اس سے کوئی مطابقت ہی نہ ہو۔ شادی کے بعد ایک بار دیکھنے کا پروگرام بہت دنوں سے بنا رہے ہیں یہ تو ہر چیز میں پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ جی نہیں انھوں نے نہیں دیکھا ہے۔ ان کے فادر وغیرہ سب ادھر ہی رہے اب تو آپ وہیں ہیں نا ۔۔۔" اس روز وہ دونوں اس تاخیر کے لئے بار بار معافی مانگتے ہوئے دیو کیا نند روڈ تک چھوڑنے آئے تھے۔ راستے بھر بات چیت کے ٹکڑے۔ ستار کی گونج اور Symphony کی کوئی ڈوبتی سی لہراتی گونج سر پر چھائی رہی۔ کیسے عجیب ڈھنگ سے تعارف ہوا ہے۔ کتنا کچھ جڑتا ہے۔ اسے بہت ہی خوشی ہوئی تھی۔ پھر بعد میں آیا۔ اس کا نام منّن ہے۔

دیو بتا رہے تھے۔ "نمائش میں ہمارا اسٹال لگا ہے نا۔ سو ہم لوگ بھی دلی آئے تھے۔ اتنے پاس سے یوں بنا ملے لوٹنا اچھا نہیں لگا۔ آپ کو یوں ہی گھسیٹ لائے۔ کوئی کام تو ۔۔۔"

"نہیں نہیں۔" فوراً کہا۔ ہے اور تو سب باتیں یاد آ رہی تھیں لیکن یہ یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان مسٹر دیو کے آگے پیچھے کیا لگتا ہو گا بھیجی تھی۔ کیسے جانے؟ بس۔ اس ملاقات کے بعد پھر کبھی ملنا ہی نہیں ہوا۔ ان لوگوں کی یادداشت اچھی ہے۔ "آپ نے یاد تو رکھا۔" اس ملاقات میں ایسی کوئی خاص بات بھی تو نہیں تھی۔

"جب بھی ہم لوگ تاج کی بات کرتے۔ آپ کی بات یاد آ جاتی۔ اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب تاج کی بات نہ ہوئی ہو۔" پھر راکا جی کی طرف دیکھ کر خود ہی بولے۔ "آج ہماری شادی کا ساتواں سال پورا ہوا ہے ۔۔۔ آپ کے سامنے یہ منّن نہیں تھا۔"

"منّن تم نے انکل جی کو نمستے نہیں کیا؟ کہو انکل جی نمستے۔ پاپا۔ ڈیڈی کی شادی کی سالگرہ ہے۔" راکا جی اس کے ہاتھ جوڑتی ہوئی بولیں۔ "یہ بہت ہی شیطان ہے۔ مجھے دن بھر خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کسی روز کچھ کر کرا نہ لے۔"

"تب تو آپ کو مبارک باد دینی چاہیے۔" لیکن اس وقت دور سے مجھ کو محسوس ہوا کہ کہیں گھٹن ہے جو نظروں سے نہاں کہرے کی مانند گہری ہوتی ہوئی چھائی ہے۔ اس سے رہا نہیں گیا۔ پوچھا۔ "آپ کچھ سست ہیں ۔۔۔ طبیعت ۔۔۔"

"نہیں جی۔" انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ایک کلپ ٹھیک کیا اور صحت مند ڈھنگ سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پانچ گھنٹے ہو گئے۔ ایک گھنٹے سے تو یہاں آپ کو ہی تلاش کر رہے ہیں۔"

"سچ مچ۔ یہ تو بہت زیادتی ہے آپ کی۔" ممنونیت کے لہجے میں وہ بولا۔ "کم سے کم راکا جی آپ منہ ہاتھ تو دھو ہی لیتیں۔"

"سب ٹھیک ہے۔ لوٹنا بھی تو آج ہی ہے۔"

پھر سب نے خوب گھوم گھوم کر تاج دیکھا تھا۔ منّن کا ایک ہاتھ دیو کے ہاتھ میں تھا ایک راکا جی کے ہاتھ میں۔ کبھی کبھی تو تینوں

اس کی تو جانے کتنی باتیں ہیں جو اسے قطعی پسند نہیں جیسے ؟ وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے اسے یہ کیا پسند نہیں ہے؟ جیسے اس وقت اسے اسی بات پر جھنجھلاہٹ آ رہی ہو کہ میرا نیچے بنی ہوئی سبالی کے پتھروں پر پاؤں رکھ کر کیوں نہیں چل رہی بیچ بیچ میں گھاس پر کیوں پاؤں رکھ دیتی ہے۔

اور اس سب کے بعد دونوں کان لگائے رہتے کہ دوسرا کچھ کہے۔ ایک بات سوچ کر وہ خود ہی اچانک مسکرا پڑا۔ جب وہ لوگ بہت بڑے بڑے ہو جائیں گے سمجھو، چالیس پچاس سال کے تو ہنس ہنس کر دوسروں کو اپنی بیوقوفیاں سنایا کریں گے۔ کیسے وہ چھپ چھپ کر تاج محل میں ملا کرتے تھے۔

اس بات کو چار پانچ سال ہو گئے ہوں گے۔ فضا اس کے دل کی گہرائیوں پر چھایا رہا۔ یہ سب وہ اس خط میں لکھے گا نہیں۔

وہ صرف اس بہانے الفاظ کی لڑیوں میں اس سارے واقعہ کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے وہ — وہ ۔ راکا جی اور مسٹر اسی طرح تو لوٹ رہے تھے۔ چپ چاپ۔ اداس اور خوش شام تھی۔ اسی لیے پرچھائیاں پیچھے کی طرف خوب لمبی لمبی چلی گئی تھیں۔

اچھی طرح یاد ہے۔ ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا۔ کالج سے آکر چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ کسی نے بتایا۔ "آپ کو کوئی صاحب بلا رہے ہیں۔"

وہ بغیر کھائے بے دلی سے اٹھا۔ کون آ گیا اس وقت!

"ارے آپ؟"

"پہچانا آپ نے یا نہیں؟"

"ارے صاحب خوب۔ آپ کو نہیں پہچانوں گا۔" لیکن سچ مچ اس نے پہچانا نہیں تھا۔ دیکھا کہیں ضرور ہے۔ شاید کلکتہ میں۔ ایسا کئی بار ہوا ہے۔ لیکن وہ پوری طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ پہچان رہا ہے۔ اور بات چیت سے ملاقات کے سرے پکڑ کر یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ "آئیے، اندر۔"

"نہیں مسٹر اطہر۔ بیٹھوں گا نہیں۔ گلی کے باہر میری وائف اور بچہ کھڑے ہیں۔" انھوں نے معافی طلب لہجے میں کہا۔ "آپ کچھ کر رہے ہیں کیا؟"

"لیکن انھیں وہاں؟ یہیں بلا لیجیے نا۔"

"نہیں دیکھیے ایسا ہے کہ ہم لوگ تاج دیکھنے آئے تھے۔ آپ بھی تو یہیں رہتے ہیں۔ جگہ یاد نہیں تھی۔ سو ایک دو جگہ بھٹکنا پڑا۔ خیر آپ مل گئے۔ اب اگر کچھ کام نہ ہو تو —— سبب یہ کہ آج ہی لوٹ جانا ہے۔" وہ سیڑھی پر ایک پاؤں رکھے تھے۔ "آپ کسی طرح کی فکر نہ کیجیے۔" چپل پہنیے اور چلیے۔

گلی کے باہر گاڑی کھڑی تھی۔ پیچھے کا دروازہ کھلا تھا کو پکڑے پچھلے مڈگارڈ سے ٹکی ہوئی ایک عورت کھڑی تھی۔ ریشمی بنگلوری ساری۔ بنگالی ڈھنگ کا جوڑا جوڑا جوڑا اور بچہ جگمگاتا ہوا ہشت پہلو بتاما۔ مڈگارڈ پر چھوٹا سا چار پانچ برس کا بچہ جوتوں کو جیسے تیسے روکے بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سنبھالے ہوئے وہ اس کی کلائی پکڑے چھوٹی سی انگلی سے دلار لیے ہوئے مڈگارڈ پر ٹکا رہی تھی۔ پھر اسے —— جوتوں کی سے چونک کر مڑی اور استقبال کے لیے مسکرائی۔ بچے کو سنبھال کر پھر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ پھر خود ہی بولیں۔ "دیکھیے آپ سے کہا تھا کہ ——"

"حضرت آ ہی نہیں رہے تھے۔" وہ درمیان میں ہی بات کر بولے۔ پھر اچانک بولے۔ "اچھا راکا۔ اب بیٹھو ورنہ اندھیرا ہو جائے گا تو دیکھنے کا مزہ بھی نہیں رہے گا۔"

راکا —— راکا —— ہاں۔ کچھ یاد تو آ رہا ہے۔ ڈرائیور رکا میں بیٹھ کر اس نے ایک آدھ بار گھوم کر دیکھا۔ جیسے یہیں کہیں نام بھی لکھا ہوا مل جائے گا۔

"کیسے ہیں؟ بہت دنوں بعد ملے ہیں۔ یاد ہے آپ کو کہاں ہم لوگ ملے تھے —— ؟ —— اس روز ہم لوگوں نے کتنی دیر کی تھی۔" سنہرا رنگ کانوں میں گول کنڈل بہت ہی ہلکی لپ اسٹک ساری کا پلو روکنے کے لیے کمر کی پر ٹکی ہوئی تھی۔

ارے ہاں اب یاد آیا —— ان سے تو ملاقات بڑے عجیب ڈھنگ سے ہوئی تھی۔ نیو مارکٹ کے ایک ریسٹوراں میں بیٹھا ہوا شوقیہ اپنے سنگیت کلا کا مظاہرہ کرنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا من میں آیا کہ خود اٹھ کر پاؤ تھا آرگن پر دیر تک سینما کی دھنیں نکالتا رہا۔ اس چھوٹے سے اسٹیج سے ہٹ کر جس میز پر یہ بیٹھا تھا اسی پر یہ لوگ بیٹھے تھے۔ یہ راکا جی اور مسٹر —— کیا —— ہاں

من من راکا کے پاس چلا گیا تھا۔
نچلی سیڑھیاں اترتے ہوئے اچانک دیو نے وجے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ لرزے۔ "آپ کو نیا سے وجے!" وجے اس کے لہجے اور طرزِ ادا سے چونک پڑا تھا۔
"نہیں کچھ نہیں۔" اوپر ہری ساری کی جھلک دکھائی دی اور دونوں سیڑھیاں اتر آئے۔ جوتے پہنتے ہوئے بولے۔ "آپ کو تعجب ہوگا کہ ہم آپ کو اچانک لے آئے!"
"نہیں تو۔ اس میں ایسی کیا بات ہے۔؟" وجے نے جواب دیا۔
"ہاں بات کچھ نہیں ہے۔ لیکن بہت بڑی بات ہے۔" پھر گہری ں۔
اب وجے کو محسوس ہوا کہ سچ مچ کوئی بہت بڑی بات ہے۔ جو کے سینے سے نکلنے کے لیے مچل رہی ہے۔ تب پہلی بار اس کا دھیان ان کی نزاکت کی طرف گیا۔ بیچ کے چبوترے تک دونوں بالکل خاموش ہے ۔۔۔ چبوترے کے خوبصورت کونے والے حوض میں آگ لگ تی ۔۔۔ گہرے سانولے آسمان میں لال لال گلابی بادلوں کے بگولے آئے تھے۔ اور نیچے تاج کا عکس دم توڑتے سانپ کی طرح کے قدموں پر مہین لکیک ٹیک کر لہرا رہا تھا۔ دھوپ اوپر برجیوں سمٹ گئی تھی۔ اس پر دیو آنکھیں لگائے بڑی دیر تک یوں ہی دیکھتے رہے۔ سامنے من من کو لیے راکا چلی آ رہی تھی لیکن جیسے کسی کو نہ دیکھ رہا ہو ۔۔۔ ہاں وجے کبھی اسے اور کبھی اسے یا لیے آتے ہوئے کشتی کو دیکھتا رہا۔ ٹپ ٹپ سانپ کی لہراتی ہیں اس کی انگلیوں سے ٹپک رہی تھیں۔ بڑی ہمت کر کے لفظوں میں ڈھیل کر دیو بولے۔ "یہ سارا ماحول ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ ٹوٹ جانے حد تک آ جانے والا تناؤ ۔۔۔ موت سے قبل کے یہ قہقہے ۔۔۔ روشنی کا یہ ٹھنڈا اور نیلا کفن ۔۔۔ شاید ہم میں سے کوئی تمہارے سے پاگلوں کی ضرورت تھی جو ادھر سے تمہارا دھیان بٹائے رکھے ۔۔۔ اس انجام کا گواہ رہ سکے۔"
"میں سمجھ نہ سکا مسٹر دیو۔" گھبرا کر وجے نے دریافت کیا۔
بوٹ کے دونوں بنچوں پر ذرا سا زور دے کر دیو نہایت ہی اطمینان دھیرے سے بیٹھے۔ "آپ ۔۔۔ آپ ۔۔۔ وجے صاحب بار کا آخری [illegible]

انھوں نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے اور راکا نے فیصلہ کیا ہو کہ ہم لوگوں کو علیحدہ ہو ہی جانا چاہیے ۔۔۔ دونوں طرف شاید برداشت کرنے کی حد ہو گئی ہے ۔۔۔ نسوں کا یہ تناؤ مجھے یا اسے پاگل بنا دے۔ یا کوئی ایسی ویسی بیہودگی کرنے پر مجبور کر دے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ دونوں الگ ہی رہیں۔ چاہے تو وہ کسی کے ساتھ چلی ہو جائے۔ وہ من من کو رکھنا چاہتی ہے۔ رکھے۔ ویسے جب بھی وہ اسے بوجھ یا رکاوٹ محسوس ہو۔ بنا سوچے میرے پاس بھیج دے۔"
وجے کا سر جھنا اٹھا۔ وہ چپ چاپ حوض کی گہرائی میں تاج کے لرزتے ہوئے عکس کو دیکھتا رہا۔
"لیکن آپ دونوں" وجے نے کہنا چاہا۔
دیو نے ہاتھ پھیلا کر روک دیا۔ "وہ سب ہو چکا۔ سارے مراحل ختم ہو چکے۔ ہم نے طے کیا کہ کیوں نہ اپنی آخری شام ہنسی خوشی کا سا ۔۔۔ دوست بن کے ہنستے ہنستے جدا ہوں۔"
پھر کچھ دیر چپ رہ کر کہا۔ "راکا کی تاج دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ اس نے تو شادی کی پہلی رات ہی کو یہ چاہا تھا کہ ہنی مون یہیں ہو لیکن ۔۔۔ لیکن" پھر ہاتھ جھٹک دیا۔ "عجیب ملاپ ہے نا یہ بھی۔"
لیکن وجے کو محسوس ہوا تھا جیسے کسی ڈیم کی ریلنگ پر جھکا کھڑا ہو اور نیچے سے لاکھوں ٹن پانی دھڑ دھڑ گرتا۔ گرتا چلا جا رہا ہے۔ گرتا چلا جا رہا ہے ۔۔۔ اور اس کا سر چکرا اٹھا۔ نہیں۔ اس سے کسی نے کچھ بھی کہا۔ یہ سب تو صرف وہ سوچ رہا ہے۔ نہیں ویسی ناقابلِ قیاس بات
اس کا دھیان دیو کی آواز سے ٹوٹا۔ "اسے روکو راکا۔ مالی وغیرہ منع کریں گے۔ نہیں من من۔" لہجہ بہت ملائم تھا۔ پھر دیو نے دوڑ کر بڑے پیار سے من من کو دونوں بانہوں میں اٹھا لیا۔ اور اس کے پیٹ میں اپنا منھ گاڑ دیا۔ من من کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ آنکھوں میں لاڈ بھرے راکا جی مسکراتی رہیں۔ نہیں ابھی اس نے جو کچھ سنا تھا وہ ان لوگوں کے آپسی تعلقات کے بارے میں نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔
وجے نے متعدد بار راکا کا چہرہ دیکھنا چاہا لیکن محسوس ہوا۔ وہ چاروں طرف کے ماحول کو پینے ہی میں مشغول ہے۔ چڑیاں چہچہانے لگی تھیں۔
انھیں جالیوں پر کسی طرح تو وہ لگے مل رہے تھے کہ پاس آ کر دیو نے دھیرے سے کہا تھا۔ "راکا سے کچھ مت پوچھیے گا۔"

(باقی صفحہ ۵۶۷ پر)

آپس میں ہی ایسے کھو جاتے کہ وجے کو لگتا وہ بیکار ہی ان لوگوں کے درمیان دیوار بنا رہا ہے۔ اوپر عمارت کے سفید کالے چبوترے پر دیو بڑی دیر تک بیٹھا کر اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے بچے کو کھلاتے رہے۔ اور وجے کے ساتھ راکا جی جالیوں کی بناوٹ دروازوں پر لکھی قرآن کی آیتوں اور بوٹوں کی نقاشی دیکھتی رہیں۔ شام کی پیلی پیلی سنہری دھوپ تھی۔ لان کی خرمی سنولا گئی تھی۔ موتیا چمپئی اور چوڑے اونچے تاڑ جیسے پیتل کے گنبد سنا رنگ موم بتی کی ہری سنہری لو جیسے لگتے تھے۔ جیسے خوشی میں پھولے کبوتر ہوں اور کبھی بے تحاشا پھڑپھڑائیں گے تو چنگاریوں کی طرح سرخ پھول ادھر ادھر بکھر پڑیں گے۔ وہ لوگ اندر قبروں کے پاس اپنی آواز کی بازگشت پیدا کرتے رہے — کبھی لرزتی اور کبھی ہرنی سی چلی جاتی ہے۔ جیسے بہت ہی مہین ریشوں کا بنا ہوا۔ گھڑی میں لگے ہوئے بال اسپرنگ کی طرح کی بڑی سی کوئی چیز ہو۔ جو کبھی پھیل جاتی ہے تو کبھی سکڑ کر سمٹ جاتی ہے۔ دیو کی آواز تھی "راکا - راکا - ر - ا - کا۔" ایک دوسرے پر یلغار کرتے ہوئے لفظ۔ دور کھوتے ہوئے۔ کسی انجانی وادیوں کی گہرائی میں — "من من — م - ن - م - ن -" دیو دیر تک ڈوبا ہوا اس کھیل کو کھیلتا رہا تھا۔ لگتا تھا اس کے اندر کچھ ہے جو اس کھیل کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ راکا اور من من کا نام لے دیتا اور دیر تک اندھیرے میں ان لفظوں کو ڈوبتا کھوتا سنتے رہتے۔ جیسے ہاتھ بڑھا کر انھیں واپس پکڑ لینا چاہتے ہوں۔ انھیں قبروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بڑی دیر کے بعد بہت مشکل سے جب وہ اسی ماحول سے جدا ہو کر باہر نکلے تو بہت اداس اور کھوئے کھوئے سے تھے۔ وجے کے پاس سے من من کو لے کر اس نے چھاتی سے بھینچ لیا۔

باہر نکلے تو دیکھا کہ ندی کے کنارے والی برجی کے پاس کھڑی ہوئی راکا چپ چاپ دور شہر — پل کی طرف دیکھ رہی ہے۔ سیندوری آسمان کے گہرے سلیٹی بادلوں کے جو گچھے میں داغ کلر کی طرح پھیل گئے ہیں۔ برجی سے لیکر درمیانی مقبرے تک چبوترے کی کالی سفید شطرنج کو کشتی ہوئی دھوپ نے ترچھا بانٹ لیا ہے۔ ہوا سے ساری جسم سے چپک گئی ہے۔ اور کانوں کے اوپر کی لٹیں بکھر گئی ہیں۔ دیو بہت دیر تک اسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ جیسے وہ اسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ اور اس پورے ماحول میں۔ سفید پتھروں کے عالیشان قید خانے میں جیسے کسی سحرزدہ جل پری کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔ یہ جگہ یہ ماحول کچھ ہے ہی ایسا۔ وجے نے اپنے آپ سے کہا۔ اور جان بوجھ کر دوسری طرف ہٹ آیا۔ شاید راکا ممتاز کی محبت کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ اپنے مرنے کے بعد ایسی ہی یادگار چاہتی ہو۔ یا کچھ بھی نہ سوچ رہی ہو۔ یا یہیں پل سے گزرتی ریل کی کھڑکی سے جھانکتی ہوئی تاج کو دیکھ کر حسن اور تخیل کی بلندیوں میں کھو گئی ہو۔

من من اپنی چھاتی کے برابر تیجے کی اونچی دیوار سے جھانکتا ہوا ہاتھ ہلا ہلا کر نیچے روتے ہوئے بچوں کو بلا رہا تھا۔ کوّے کاؤں کاؤں کرنے لگے تھے۔ وہ من من کے پاس سنگ مرمر کی دیوار پر جھک کر ہتھیلیاں ٹکائے سامنے کی قطار اور پیڑوں کی گھنی پتیوں کو دیکھتا رہا جانے کب دیو بھی آ کر اس کے برابر ہی کھڑے ہو گئے — کافی فاصلے سے۔ اسی طرح برجی کے پاس جھکی ہوئی راکا — ہوا سے ہلتی ہوئی ساری کو ہاتھ سے پکڑ کر روکے ہوئے ......

"اندر کی آواز اور گونج کو سن کر بڑا عجیب سا محسوس ہوتا ہے — ہوتا ہے نا؟ جیسے کہیں ویران جنگلوں اور پہاڑیوں میں آپ کا کوئی بہت ہی قریبی ساتھی کھو گیا ہے اور آپ کی بے صبرت آوازیں اسے پکارتی چلی جاتی ہیں — چلی جاتی ہیں اور کھو جاتی ہیں — نہ وہ ساتھی ہی لوٹتا ہے اور نہ وہ آوازیں ہی۔ جیسے صدیوں کی بھٹکتی روح سے پکارتی رہی ہو۔ اور وہ ہے کہ ان آوازوں کی گونج ہی میں گھل گھل کر بکھر جاتا ہے — ڈوب جاتا ہے، حل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی کوئی شکل نہیں بن پاتی۔"

ندی میں تاج کی گھٹی گھٹی پرچھائیاں لہروں میں ٹوٹ پھوٹ جاتی تھیں جانے کیوں پھر دیو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" وجے نے یہ اپنے آپ سے کہہ کر اس موقع کو الفاظ کا جامہ پہنا کر سمجھنے کی کوشش کی۔ "جب کوئی کسی کو بہت پیار کرے۔ بہت پیار کرے اور پھر ایسی خوبصورت جگہ آ جائے تو کچھ ایسے ہی وسوسے دل میں آتے ہیں۔ ابھی لان پر چلیں گے۔ من من کے ساتھ کلکاریاں ماریں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دیو نے سن لیا۔ گہری سانس لی اور تیز نگاہوں سے وجے کی طرف

ملاقات نہیں ٹلتی۔ باڑے کے بس اسٹاپ پر جب بس نمبر دو کے انتظار میں وہ کھڑے ہوتے ہیں، دو چار منٹ کے بعد چیٹی بھی آجاتا ہے۔ اور پھر اپنی مرضی کچھ نہیں رہ جاتی۔ ملنا بھی پڑتا ہے، کھل کر بات بھی کرنی ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ بس پکڑ کر مرار تک سفر بھی۔

پینسٹھ ستر کے بعد بھی آدمی کیا اتنا نوجوان اور امنگ بھرا رہ سکتا ہے؟" چیٹی کی باتیں سن کر اکثر پربھاکر جی سوچنے لگتے ہیں۔ "ہر وقت خوش وخرم اور چنچل، ہر وقت بے فکر اور نوجوانوں کی سی باتیں ــــ"

"اس شلوار والی کو دیکھو" بس میں چڑھتی ہوئی کسی عورت کی طرف اشارہ کر کے چیٹی کہتا پربھاکر جی پلٹ کر جلدی سے اس کی طرف دیکھتے، ایک دو ساعت تک دیکھتے بھی رہتے۔ پھر جیسے چیٹی کا دل رکھنے کے لیے مسکراتے۔ چیٹی ان سے اپنے جمالیاتی ذوق کی تعریف کا متمنی ہوتا۔ پہلے یونہی، صرف دل رکھنے کے لیے اور بعد میں عادتاً پربھاکر جی مسکرا دیتے۔ کبھی کبھی ایک دو لفظ اوپری دل سے کہہ بھی دیتے لیکن دھیرے دھیرے انہیں لگا کہ وہ بھی ان سب میں تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگے ہیں۔ بس میں چڑھتی ہوئی عورتوں کی طرف ویسے تو پہلے بھی ان کی توجہ رہتی تھی پر ان کی نگاہ میں یہ بات نہ تھی۔ کہیں نہ کہیں جھجک رہتی تھی اور آنکھوں میں سجا ناکا وہ پردہ چڑھا رہتا تھا جو جنم جنم سے انہیں ملا تھا۔ چیٹی نے ہی جیسے وہ پردہ اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر الگ کر دیا اور پربھاکر جی کی ڈھکی ہوئی کھڑکی بے پردہ ہو کر ابھر آنے کا ایک بہانہ مل گیا۔

"اب تو اپنے دن لد گئے چیٹی صاحب" ایک دن انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ شاید اس بہانہ کو وہ اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ لینا چاہتے تھے۔

"کون کہتا ہے؟" چیٹی نے تلملا کر جواب دیا۔ "یہ تو اپنے پہیے کو دونوں کو کہتے وہ تک کھینچ لے جا سکتے ہیں۔ آدمی جسم نہیں، دل سے بوڑھا یا جوان ہوتا ہے۔"

"اور دیکھنے والے کیا ہوتا ہے چیٹی صاحب جنہیں آپ دیکھتے ہیں وہ تو آپ کی طرف دیکھتے ہی منہ پھیر لیتی ہیں۔"

یہ بات سن کر چیٹی صاحب قہقہہ مار کر ہنستا پڑا تھا اور کچھ اس طرح کی بات کہی تھی کہ کچھ بنے نہ بنے لیکن بگڑتا بھی کیا ہے۔ اسے اپنے دیکھنے سے مطلب ہے دوسروں سے نہیں۔

اور اس دن پربھاکر جی کے کانوں میں چیٹی کی وہ بات رہ رہ کر گونجتی رہی تھی۔ انہوں نے چیٹی کے بارے میں جو رائے قائم کر رکھی تھی وہ کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ چیٹی شروع میں فوج میں رہا پھر سرکاری نوکری میں آ گیا اور ادھر ریٹائرمنٹ کے بعد کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کئے ہوئے ہے۔ یوں خاندان چھوٹا نہیں، بیوی ہے تین تین لڑکے ہیں، پر بہوؤں کے آ جانے کے بعد بھی چیٹی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مزاج کی زندہ دلی اور مستی جوں کی توں بنی ہوئی ہے۔ اب بھی کھانے سے پہلے وہ سب کے سامنے بے جھجک پیتا ہے اور یہ بات کسی سے نہیں چھپاتا۔

"سالا خوش نصیب ہے، سو اتراتا ہے۔" پربھاکر جی من ہی من میں تلملا کر کہتے "کہیں زندگی کے مسائل ہوتے، بڑھاپے کی دو چار اولادیں ہوتیں، یا سینہ پر کوئی جوان بیٹا بیاہنے کو بیٹھی ہوتی تو پتہ چلتا کہ زندگی واقعی ہوتی کیسی ہے۔"

بس اب قلعہ کے نیچے سے گزر رہی تھی، داہنی طرف بڑے احاطہ والا پھول باغ پڑتا تھا۔ روز کی طرح پھول باغ میں سیکڑوں مرد عورت سیر سپاٹے میں مگن نظر آ رہے تھے۔ چیٹی نے کھڑکی سے باہر اپنا سر نکال لیا تھا اور چہلے پر گننے کا رس پیتی ہوئی دو اینگلو انڈین لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

پربھاکر جی نے دھیرے سے اپنا سر ٹیک دیا اور آنکھیں موند کر تھکاوٹ دور کرنے لگے۔

اب وہ شام کو لوٹتے میں سچ مچ تھک جاتے ہیں۔ پینتیس برس کی ہندی اخبار نویسی نے چوسی ہوئی گنڈیری کی طرح انہیں بیکار کر کے پھینک دیا ہے۔ جیسے تیسے ایک ہندی روزنامہ میں وہ آج بھی زندگی گزار رہے ہیں، پر نہ وہ پہلے جیسا جوش خروش ہے اور نہ جسم میں وہ کس بل ہی جس کے بل پر کبھی وہ غرور کیا کرتے تھے۔ اسی گھمنڈ نے کسی ایک جگہ مجبوراً بہت دیر تک ٹک کر انہیں رہنے نہ دیا۔ جوانی کی دہلیز چڑھنے کے وقت سے لے کر اس گھڑی تک جب ساری عمر ان کی جدوجہد

شانی
ترجمہ: عابد سہیل

تیسرے پہر کی دھوپ

ملدہ گنج کے بس اسٹاپ پر کنجیورم کی ساری والی عورت بھی اترنے لگی۔ پربھاکر جی اس وقت اپنی بغل میں بیٹھے جینٹی سے بات کر رہے تھے۔ آدھی بات روک کر وہ یکایک ادھر دیکھنے لگے۔ پھر کھڑکی کے باہر سر نکال لیا۔

"کیسے کیسے بدصورت اور سڑیل پرماتما نے گڑھے ہیں۔" اس عورت کے دور کھسکتے ہوئے اور ہر قدم کے ساتھ کانپتے ہوئے چہرہ پر آنکھیں جما کر انھوں نے سوچا۔ دراصل ان کے دل پر بھی پہلے کی الجھن گاڑھی ہو کر اب اداسی میں بدلنے لگی تھی اور انھیں یہی لگ رہا تھا کہ گھر پہنچتے پہنچتے وہ بے حد اداس ہو جائیں گے۔

"گئی" تبھی یکایک ان کی داہنی جانگھ پر دھیرے سے ہاتھ ٹھپک کر جینٹی نے کہا جس کے معنی یہ تھے کہ پربھاکر جی کو اب اس کی طرف مخاطب ہونا چاہیے۔

پربھاکر جی چونکے ضرور تھے، پر انھیں یہ مناسب نہ معلوم ہوا کہ ان کی اس حیرت کا اس وقت اظہار ہو۔ دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے وہ جینٹی کی طرف بامعنی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"کون تھی جانتے ہو؟" جینٹی نے پوچھا۔

پربھاکر جی نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"مینجر چوہان کی بیٹی ہے۔" جینٹی نے رازداری سے کہا۔ "کم بخت کو جب بھی دیکھو بڑھاپا یاد ہی نہیں رہتا۔ کیوں؟"

پربھاکر جی دھیرے سے مسکرائے اور جینٹی کی طرف گھورتے ہوئے سے دیکھنے لگے۔ خود ان کے دل میں بھی یہی بات تھی لیکن وہ کہہ نہیں پائے اور یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا۔ ہر بار یہی ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی بات نہایت شدت سے وہ بھی محسوس کرتے ہوتے ہیں، کہنا بھی چاہتے ہیں لیکن ان سے پہلے جینٹی ہی اسے کہہ دیتا ہے اور موقع کھو دینے کا افسوس لیے وہ تاکتے رہ جاتے ہیں۔ "جتنی بے پروائی اور ایمانداری سے جینٹی کہہ جاتا ہے وہ کیوں نہیں کہہ پاتے۔" انھوں نے سوچا۔ کیا کہیں عمر کی سنجیدگی؟ لیکن دیکھا جائے تو عمر کے لحاظ سے بھی وہ چھوٹے پڑتے ہیں۔ جینٹی کچھ نہیں تو کم سے کم دس سال تو بڑا ہوگا۔ سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے برسوں گزر گئے۔ دانت ایک بھی ثابت نہیں بچا لیکن کاٹھی ہی ایسی ہے کہ وہ پربھاکر جی سے بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ "کیوں بھائی کہاں ہو؟" یکایک ان کے کندھے کو ہلا کر جینٹی نے کہا اور انھیں گھورنے لگا۔ ایسے موقعوں پر پربھاکر جی پہلے ہڑبڑا جایا کرتے تھے لیکن ادھر انھوں نے اپنی عادت بدل دی ہے۔ مسکرا کر بولے "کہیں نہیں بالکل یہیں ہوں آپ کے پاس۔"

"اچھا۔ میں نے سوچا کہ میجر چوہان کی بیوی تمھیں اپنے ساتھ لے گئی۔" یہ کہہ کر جینٹی ہو ہو کرتا ہوا ہنسنے لگا۔ پربھاکر جی سیدھے اس کے چہرہ کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ اور فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ جینٹی کے دانتوں سے خالی مسوڑھوں کو وہ ایک لمحہ سے زیادہ نہ دیکھ سکے۔

ایک عجیب سی بے چینی ان کے دل میں بھر گئی۔ بات چاہے سچ کیوں نہ ہو۔ اکثر جینٹی کا ہنسنا انھیں بالکل نہیں بھاتا۔ ایسے ہر موقعے پر وہ طے کرتے ہیں کہ آئندہ ایسے آدمی سے دوستی کا رشتہ رکھیں گے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اپنا عہد خود بھی نہیں نبھا پاتے۔ اپنی طرف سے وہ چاہے لاکھ کوشش کریں جینٹی اور ان کی دوز

کانوں میں ایسی ہی کوئی دور سے آتی اور بھینی بھینی سی آواز گونجتی وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیتے یا گھبرا کر اٹھ بیٹھتے کہاں ؟ ۔ کہیں کچھ نہیں ہوتا ۔ بھرم ، صرف بھرم ۔ وہ لیٹ جاتے ۔ " اب کچھ تو شرم کرو ـــــ " آخری دنوں میں بیوی یہی بات ہمیشہ کہا کرتی تھی ۔ ایسے عمر کا نہیں تو کم سے کم بچوں کا ہی خیال کرو ۔ " اور یہ کہہ کر بیوی اس قدر بے رحم طریقے سے مسکراتی کہ پربھاکر جی پہلے سے کئی گنا زیادہ پیار اور جذبات میں کانپنے لگتے ۔ پیڑ کی لمبی لمبی اور بوڑھی جڑیں دھیرے دھیرے کانپتیں ، سوکھی بارش کے آس پاس کے سایہ میں کوئی گلہری جیسے دار دم اٹھا کر بھاگتی اور ان کی دیوار پر چڑھی دیمک کی تیلی پر میں بغیر کسی آواز کے چپ چاپ جھڑ جاتیں ۔

" کچھ تو شرم کرو ـــــ "

بیوی کا یہ جملہ پہلے بس کے سفر کے دوران بھی گونجا کرتا تھا ۔ خاص طور سے اس وقت جب وہ کسی عورت کی سیٹ کے پیچھے بیٹھ جاتے اور سامنے کی صاف کھلی گردن اور کسی ہوئی پیٹھ ان کی آنکھوں میں چبھنے لگتی ۔ شاید ایک لمحہ کے لیے وہ سہم جاتے پھر دل خود بخود ڈوب کر اداس ہو جاتا ۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ خوف جاتا رہا ۔ صرف اداسی رہ گئی ۔ اور اداسی کا وہ باریک غلاف بھی چینٹی کے ساتھ کب ، کہاں اور کیسے اتر گیا ، یہ خود انھیں بھی یاد نہیں ۔ مشکل سے گزرے ہوئے ان دنوں کے بیچ اچانک ایک دن انھوں نے محسوس کیا کہ صبح دفتر جانے کی تیاری اب وہ جوش و خروش سے کرنے لگے ہیں ور اس سے بھی زیادہ بے چینی اور جوش و خروش سے انتظار کرنے لگا ہو بس کا (کیا صرف بس کا ؟ وہ بس کے رکتے ہی سب سے پہلے کیوں دوڑ پڑتے تھے ؟ پیچھے کی چاہے ساری سیٹیں خالی ہی کیوں نہ پڑی ہوں اگلی سیٹوں کے آس پاس ہی وہ کیوں اڑے رہنا چاہتے تھے)

" ابھی بوڑھا جسم ہے ، دھکے سے ڈر لگتا ہے ، کیوں پربھاکر جی " بنٹی نے ایک دن ہنس کر ان کی طرف دیکھ کر مزا لیتے ہوئے کہا تھا ، اور پربھاکر جی جانتے سمجھتے ہوئے بھی لاجواب سے رہ گئے تھے ، جیسے دل ہی دل میں اس دلیل کے وزن کو تول رہے ہوں ۔ اور کیا یہی بڑھاپے کی دلیل ان کے دل میں اس دن بھی

نہیں ابھری تھی جب فاٹک بازار میں تنگ شلوار اور تنگ فراک اور کھلی باہنوں والی وہ لڑکی آکر کھڑی ہوئی تھی ۔

اس دن کسی وجہ سے وہ آدھ گھنٹہ پہلے نکل آئے تھے ۔ بس میں بے حد بھیڑ تھی ۔ لوگ فٹ بورڈ تک لٹکتے ہوئے تھے اور بس میں داخل ہونا یا نکلنا بے حد مشکل تھا ۔ ایسے میں اگلی سیٹوں کے آس پاس پھنسے ہوئے پربھاکر جی بھی کھڑے ہوئے تھے کہ کوئی سیٹ خالی ہو تو راحت ملے پر ہائی کورٹ تک انھیں کھڑے کھڑے ہی آنا پڑا ۔ اچھا ہوا اس دن چینٹی نہیں تھا ورنہ دو عورتوں کے بیچ پھنسا ہوا دیکھ کر وہ کوئی نہ کوئی پھبتی ضرور کستا ان کا عجیب حال تھا ، سامنے ایک گدرائے جسم کی پنجابی عورت کھڑی تھی اور پیچھے رہی لڑکی ۔ جب بس جھٹکے دیتی ہوئی رکتی یا چلنے لگتی تو ایک لمحہ کے لیے ان کا جسم سامنے والی عورت کے جسم سے بالکل سٹ جاتا ۔ اور اسی چھونے سے لمحہ میں ان کے جسم میں ایک گرم گرم دباؤ محسوس ہوتا (چینٹی ہوتا تو کہتا ـــــ کیوں پربھاکر جی دونوں ہاتھوں میں لڈو ۔)

لیکن یہ صورت حال دو چار منٹ سے زیادہ نہیں چلی ۔ اگلے بس اسٹاپ پر بازو کی دو سیٹیں ایک ساتھ خالی ہو گئیں اور سامنے والی عورت سیٹ گھیرنے کے لیے لپکی اس کے سر کے ہٹنے اور جگہ چھوڑنے کی کوشش میں کئی لوگ ادھر ادھر ہوئے اور پربھاکر جی کے جسم کے اگلے حصہ پر اپنے نوجوان جسم کا بیش بھرا اور گہرا دباؤ چھوڑتی ہوئی وہ عورت سیٹ پر جا بیٹھی ۔

پیچھے والی لڑکی کھڑی ہی رہ گئی ۔ پربھاکر جی کو سیٹ پہلے ملی اور تھوڑی دیر بعد اپنی بغل کی سیٹ خالی ہوتے ہی انھوں نے اس لڑکی کو تحکمانہ انداز میں بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا ۔

بس تعلق کیا صرف اتنا ہی تھا ؟ عجیب بات ہو کہ اسی نوجوان لڑکی کو اس قدر بے پروائی سے بلاتے ، پاس بٹھاتے اور چہک چہک کر باتیں کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے بھی انھیں جھجک نہیں ہوئی ۔ کیا اس وقت بھی ان کے دل میں یہی بڑھاپے کی دلیل تھی ۔ لڑکی آر ۔ جی کالج کے فرسٹ ایر میں پڑھتی تھی ۔ کسی حیثیت دار باپ کی بیٹی تھی ۔ اور اسے لکھو جانا تھا ۔ باڑے تک پہونچنے سے پہلے اسی دن پربھاکر جی نے کئی آسن بدلے ۔ کئی بار ان کی ایک بانہہ پشت پر لمبی تک چلی گئی اور دیر تک وہیں پڑی رہی ۔ دو تین بار انھوں نے

ہی میں گزری تو کوئی کیا کرے۔

"کیا ہوا؟"

تبھی پچھلی سیٹوں سے دو تین لوگ جھک کر اتنے زور سے چلائے کہ وہ چونک پڑا۔ عجیب احمق لوگ ہیں، سامنے بے پرواہی سے دیکھتے ہوئے انھوں نے سوچا۔ اسمیں چلانے کی بات ہی کیا تھی۔ حسب دستور بس پڑاؤ والے چوراہے پر رکی تھی۔ کنڈکٹر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بس ٹھاکر پور ہوتی ہوئی مراد جائے گی اس لیے جے۔ سی۔ مل گوالیار یا ہجیرے کی سواریاں نہ بیٹھیں۔ کچھ لوگوں نے بات نہ مانی، زبردستی بس پر چڑھ گئے تھے، اس لیے بس رکوا کر کنڈکٹر انھیں اتار رہا تھا، بس۔

ایک معمولی سی شرمندگی کے بعد انھوں نے پھر سے اپنی پیٹھ ٹیک دی۔ اور آرام سے نیم دراز ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ چینٹی بے دلی سے اب بھی باہر دیکھ رہا تھا۔ یوں بھی بس کے اندر دلچسپی لی جائے ایسا وقت نہ تھا۔ ڈھنگ کی سواریاں یاد دکھنے والے لوگ پڑاؤ تک آکر اتر جاتے ہیں اور پھر وہاں سے مراد تک کا راستہ بغیر کسی خوبصورت سواری کے بنجر جیسا لگتا ہے۔ خواہش کے باوجود چینٹی جی نے پربھاکر جی کی طرف نہیں دیکھا۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں چینٹی نے بات شروع کر دی تو لگاتار بولتا ہی چلا جائے گا۔ وہ بے حد تھک گئے تھے اس لیے بالکل چپ رہنا چاہتے تھے ــــ بالکل خاموش اور نڈھال۔

لیکن کیا یہ اداسی صرف تھکاوٹ کی تھی؟ ایمانداری سے سوچنے پر خود انھیں لگا۔ تنہائی کی یہ اداسی جو بیوی کے گزر جانے کے بعد سال بھر سے ایک طرح سے ان کی ساتھی بن گئی تھی۔ سال بھر پہلے انھیں گمان بھی نہ تھا کہ یوں آدھے راستہ میں بیوی دغا دے جائے گی اور وہ اکیلے رہ جائیں گے ــــ صرف اس تجربہ کے لیے بڑھاپے میں کسی جوڑے کا ٹوٹنا درحقیقت کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ پہلے پہل تو وہ بھونچکے سے رہ گئے تھے۔ پھر کسی اجنبی سی گھبراہٹ نے انھیں جکڑ لیا۔ جب تک بیوی زندہ تھی بار بار اس یاد دلانے کے باوجود کہ بیٹی کی فکر انھیں ابھی سے کرنی چاہیے

وہ کبھی پریشان نہ ہوئے۔ پتہ نہیں کس بنیاد پر وہ اطمینان سے تھے کہ وقت پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حالانکہ ان کے پاس نہ کوئی دھن تھا نہ جوان بیٹا۔ شاید بیوی پر سارا بوجھ ڈال کر وہ مطمئن ہو گئے تھے اور شاید اسی لیے وہ زخم انھیں گہرا لگا۔

شروع کی تنہائیوں کو وہ زخم کے ہرے ہونے کا نتیجہ سمجھ کر برداشت کر گئے۔ اسی امید پر کہ وقت مرہم لگا ہی دے گا لیکن عجیب بات تھی کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، بیوی کے نہ ہونے کا درد چاہے کم ہو گیا ہو پر اپنے اکیلے ہونے کا احساس بڑھتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ بات بات میں انھیں اپنا وجود بے معنی لگنے لگا۔ سال بھر پہلے جب بڑھاپے کو ظاہرداری کے لیے انھوں نے اوپری طور پر سے محسوس کیا تھا وہ نہ جانے کیسے اتنے کم دنوں میں چپ چاپ ان کے اندر آکر بیٹھ گیا اور وہ اندر ہی اندر ٹوٹتے چلے گئے۔

پچھلے پانچ سات برسوں سے انھوں نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وجہ کوئی خاص نہ تھی سوائے اس کے کہ خود کو دیکھ کر کوفت ہوتی تھی۔ بیوی نے مرتے مرتے جیسے ان کے ہاتھ میں شیشہ پکڑا دیا اور ان کے سامنے جس پربھاکر کی تصویر ابھری اس کا سر گنجا تھا، دانت نہ ہونے کی وجہ سے گال پچکے ہوئے تھے اور آنکھوں کا رنگ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

اور پھر لگا کہ ناحق صبح ہوتی ہے اور ناحق شام کیونکہ دونوں میں سے کسی میں بھی جان نہیں رہ گئی تھی۔ صبح کا وقت اسی خیال میں کاٹتے کہ انھیں تیاری کرکے دفتر جانا ہے، جیسے تیسے وہ کٹ بھی جاتا لیکن گہری شام کا سونا پن انھیں کاٹنے کو دوڑتا۔ گھر میں ایما ہوتی لیکن تھوڑے سے دکھاوے اور من رکھنے والے پریم کے بعد وہ کانٹوں کی سوکھی باڑھ کے پاس بیٹھے یا لیٹے رہتے۔ آنکھیں کھلی ہوں یا بند، دل پر بھی وہی جانا پہچانا درد برف کی طرح پگھلتا اور کئی بار ان کی آنکھیں چھلچھلا جاتیں۔

گئی رات کے اندھیرے یا نیم اندھیرے میں جب کالونی اونگھنے لگتی اور بیٹی کی ہلکی چھوٹی جرکوں پر سناٹے کو خاموشی میں تاکتے تو انھیں لگتا کہ کانٹوں کی سوکھی باڑھ کے پاس بیوی کی پرچھائیں آکر یکایک ٹھٹھک گئیں۔

"میں نہ کہتی تھی کہ ......"

میں اچھی لگتی ہیں وہی دو آدمیوں کے سامنے بری لگنے لگتی ہیں یا جو سب کے سامنے بری لگتی ہیں وہی تنہائی میں اچھی اور پرلطف بن جاتی ہیں۔ جیسے خود ان کا دوپہر کے وقت دور دور نکل جانا اور خاص کر کسی تالاب یا جھیل کے کنارے "بے تعلقی" سے چلنا —— صرف اسی خیال سے کہ شاید تنہائی پاکر کپڑے بدلتی کوئی عورت کہیں برہنہ یا نیم برہنہ نظر آجائے۔ ایسے موقعوں پر جتنی محبت کے ساتھ وہ ان عورتوں کو گھورتے تھے وہ اکیلے ہی میں ممکن تھا۔ کوئی اور ان کے ساتھ ہوتا —

کافی دھیرے دھیرے اور تھکے تھکائے وہ گھر لوٹے اور چند ضروری کاموں کے بعد آنکھیں موند کر سوکھی باڑھ کے کنارے لیٹ گئے۔ اندر ان کی بیاہی بیٹی اپنا چھوٹے بھائیوں کو سلا کر کھانا پکانے میں لگی تھی ضروری کاموں سے فارغ ہوکر اسے سوتے میں روز ہی دس گیارہ بج جاتے ہیں اور شاید تھکاوٹ ہی کی وجہ سے وہ بے حد بے خبر سوتی ہے۔ کچھ بھی ہو، تھوڑی دیر بعد پربھاکر جی نے سوچا لوگ ان کی لڑکی کے بارے میں چاہے جیسی باتیں کریں، دو ایک لڑکوں کو لے کر چاہے کتنا ہی بدنام کریں، اور بھلے ہی ایک آدھ بات کے سچ ہونے کا خود انھیں بھی علم ہو لیکن اس سے کیا؟ بھول چوک کس سے نہیں ہوتی رہتی؟ اور اسی سے اپنا کے انکسار اور وفا میں کہاں فرق پڑا۔؟ انھیں لگا کہ اپنا کے ساتھ سچ مچ زیادتی ہوتی رہی ہے اور اپنا ہی کیوں اپنے کسی بھی بچہ کو باپ کا جتنا پیار ملنا چاہیے، انھوں نے شاید نہیں دیا۔ نہ وہ اچھے شوہر ہو سکے اور نہ اچھے باپ۔ لیکن ایسا کیوں نہ ہو سکا؟ اور اچھے شوہر اور اچھے باپ نہ ہوکر وہ کیا ہوئے —— کیا نیے —؟

بڑی دیر بعد، شاید ایک آدھ نیند یا جھپکی لے کر وہ باڑھ کے پاس سے اٹھے۔ جانے کتنی رات بیت چکی تھی ساری کالونی اندھیرے میں منہ ڈھانکے سو رہی تھی اور پاس کے کوارٹر سے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ اور کوئی دن ہوتا اور وہ اتنی رات گئے اٹھے ہوتے تو اندھیرے میں اس جگہ دیر تک کھڑے وہ پڑوسیوں کی چھتوں، کھڑکیوں یا تار کی جالیوں کی طرف ایسے تاکتے جیسے کسی بھی لمحہ کہیں بھی معجزہ ہو جائے گا۔

پھر آج بہت سنبھلے ہوئے انداز سے اٹھ کر وہ اندر کی طرف چلے انھیں حیرت ہو رہی تھی کہ وہ خود کو کیا بدلا بدلا محسوس کر رہے ہیں۔ شام کی وہ اداسی کہاں گئی؟ اکیلے پن کے اس احساس کا کیا ہوا؟ روح کے اندر تک نہ کوئی الجھن تھی نہ کوئی پریشانی کہاں گئی بند تالاب کی وہ پانی اور بدبودار کائی جس کے بوجھ سے وہ خود کبھی کبھی ڈر جایا کرتے تھے۔ جیسے پہاڑی ندی کا آرپار دکھنے والا اچھلا کنارہ ہو —— ریتیلا اور نرم۔

اور اندر کی دہلیز پار کرتے ہوئے انھیں لگا جیسے بہت دن بھٹکنے کے بعد وہ گھر لوٹ رہے ہوں۔ اندر کے کمرہ میں اپنا دونوں بچوں کے بیچ گہری نیند سو رہی تھی —— ہمیشہ کی طرح گہری اور بے خبر نیند۔ پربھاکر جی کے دل میں گناہ کا احساس ایک بار پھر گھنا ہو گیا۔

"میرا ایسا کمینہ اور خود غرض بھلا کون —— ہوگا۔؟"

بغیر آواز کے جیسے انھوں نے خود سے کہا پھر محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنا کے بستر تک، چلے گئے اور بیڈ لیمپ کی روشنی میں اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد اسے چادر اڑھانے کے لیے جیسے ہی وہ پائنتی کی طرف جھکے بے طرح چونک کر رہ گئے۔ اپنا کے ایک پیر کی ساڑی گھٹنوں تک سرک گئی تھی اور پوری کی پوری پنڈلی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے سانپ پر پیر پڑ گیا ہو اس طرح آنکھیں ہٹا کر پربھاکر جی نے اپنا منہ پھیر لیا اور چاہا کہ اس طرف دیکھے بغیر ہی چادر کھینچ کر اپنا کو اڑھا دیں پر کئی بار کی کوشش کے بعد بھی وہ یہ نہ کر سکے اور ان کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ اور انھیں لگا جیسے مدت سے اندر بیٹھی خاموش اور موت سی کسی چیز نے بچھو کی طرح اپنے ڈنک اٹھا لیے ہوں۔ گھبرا کر وہ اپنا کے سوئے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگے، جیسے نظروں کو ادھر ادھر بھٹکنے سے روکنے کے لیے وہاں باندھ دینا چاہتے ہوں لیکن عجیب بات ہے کہ کم ہونے کے بجائے خوف اور بڑھ گیا۔ وہاں اپنا کے بالوں میں لگے ہوئے ربنوں کو دیکھ کر یکایک انھیں بے ساختہ اس لڑکی کی یاد آگئی۔ وہ چند لمحوں تک اس طرح دیکھتے رہے انھیں حیرت ہو رہی تھی کہ اپنا کا چہرہ بیوی سے کتنا ملتا جلتا ہے —— وہی آنکھیں وہی ہونٹ، اور وہی چھوٹی سی ٹھوڑی۔ جب وہ بیاہ کر آئی تو ایسی ہی تھی، ہو بہو ایسی۔

(باقی صفحہ ۸۵ پر)

کسی جانے سے کھڑکی سے باہر نکالا اور ایسا کرنے میں ــــــ وہ ہو گیا ــــ " بڑے میں اتر کر بس کی طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے بڑبڑایا " آج تو فیصلہ ہی ہو گیا ۔"

اس دن پھول کی طرح ہلکے ہو کر وہ دفتر پہنچے تھے ۔ خوب دل لگا کر کام کرتے رہے اور اگرچہ ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہ پھوٹا لیکن ایسا لگا جیسے ان کے ہونٹ دن بھر گنگناتے رہے ہوں اسی رات غنودگی کے عالم میں ایک سوال ان کے دل میں ابھرا تھا ــــ کس کا فیصلہ ہو گیا ؟ کیسے ؟ کہاں ؟ پر جواب کے لیے پریشان ہونا انھیں بیکار لگا ۔

اور دوسرے روز سے خاموشی سے ان کا پروگرام بدل گیا پہلے گیارہ سے پہلے وہ بس اسٹیشن نہیں پہنچ پاتے تھے لیکن اب وہ آدھ گھنٹے پہلے ہی چلے آتے ۔ بس جب تک فاٹکے بازار نہیں پہنچ جاتی وہ بے دلی سے بیٹھے رہتے ۔ طے شدہ وقت اور جگہ پر وہ لڑکی بس میں آ جاتی ۔ پربھاکر جی با معنی نظروں سے دیکھتے تو مسکرا دیتی کئی بار ایسا بھی ہوا کہ وہ پربھاکر جی کی بغل والی سیٹ پر بیٹھ گئی ۔ روزانہ فاٹکے بازار سے باڑے تک کا ساتھ بھی ہوتا لیکن اس کے بعد ــــ ؟ " اتنے دنوں تک کہاں جاتی ؟ " ابھی وہ ایک روز پہلے چیٹی نے پکتے ہوئے پوچھا تھا اور پربھاکر جی لمحہ بھر کے لیے ٹپٹا گئے تھے ۔ انھیں سوجھا ہی نہیں کہ کیا جواب دینا چاہیے ۔ دراصل اب وہ پرانی حالت میں لوٹ آئے تھے چیٹی سے وہ کس طرح بتلاتے کہ وہ کہاں تھے ؟ کیا وہ بات کہی جانے والی تھی ؟ انھیں پھر سے بیوی کا وہ قول یاد آ گیا ۔ پریم پریم کوئی بھی سے تو کیا سکے کہ دیکھنے میں تو ان کی یہ عمر آئی اور ــــ

" تھا تو نہیں چیٹی صاحب " سنبھل کر مسکراتے ہوئے انھوں نے جواب دیا " لیکن ملاقات نہیں ہوئی ۔ بات یہ ہو کہ میرے آنے جانے کا وقت تھوڑا سا بدل گیا تھا شاید اس لیے ــــ "

اس پر چیٹی نے کیا کہا یہ انھوں نے نہیں سنا ۔ وہ اپنی حیات کی بات سوچنے لگے تھے اور اسی وقت کیوں ، ادھر وہ تین دن سے وہ یہ سب کچھ سوچ رہے تھے ۔ آدمی چاہے جتنا عقلمند یا ہوشیار ہو جائے کہیں نہ کہیں بے وقوفی چپکی رہ ہی جاتی ہے ۔ کیا جذبات عمر کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتے اور ان کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی رہ جاتا ہے ؟

آج بھی ان دنوں کی تصویر آنکھوں میں ابھر آتی ہے تو شرمندگی سی محسوس ہوتی ہو ۔ کیسے ان کی حالت بچوں کی سی تھی ۔ انھیں کیا ہو گیا تھا ۔ اتنی معمولی اور صاف سی بات ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی کہ صبح اور تیسرے پہر کا کوئی میل نہیں ہوتا انھیں اس دن کی اپنے دل کی حالت یاد آ گئی جب کئی ہفتے کے بعد معمول میں اچانک تبدیلی آئی ۔ فاٹکے بازار سے بس آگے تک آ گئی لیکن بس میں کوئی نہیں آیا پھر ایسا اکثر ہونے لگا ۔ پھر ایک دن وہ آئی تو اس کے ساتھ ایک تندرست اور خوبصورت نوجوان تھا جس کے ساتھ وہ مصری کی ڈلی کی طرح گھلی جا رہی تھی ۔ پربھاکر جی اس دن بھی بس میں پرامید بیٹھے تھے اور سیٹ خالی تھی لیکن آخر تک وہ خالی ہی رہی ــــ اور کچھ دنوں میں پربھاکر جی نے جان لیا کہ ان کی بغل والی سیٹ کبھی نہ بھرے گی کیونکہ اس نے ایک آدھ بار اس کی لڑکی کو ایک نوجوان کے اسکوٹر پر بھی دیکھا تھا ۔ اور اس نے بس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا ــــ

" اے حرامی ــــ "

اچانک کالونی کے آخری سرے والے کوارٹر سے یہ بھی گالی سیدھے آ کر پربھاکر جی کو چونکا گئی ۔ وہ آواز کسی عورت کی تھی اور کسی قدر جانی پہچانی تھی ۔ جب تک کہ پربھاکر جی پلٹیں یا لوٹ کر پہچاننے کی کوشش کریں اس گالی میں کئی بھدی پھوہڑ اور گندی گالیاں جڑ گئیں تو وہ سناٹے میں آ گئے ۔ کیا کسی جوان عورت کے منہ سے انھوں نے ایسی گالیاں اس سے پہلے سنی تھیں ؟ کیا عورتیں بھی ایسی باتیں اپنی زبان پر لا سکتی ہیں ؟ اور یہ سب کچھ سن کر پربھاکر جی کو کیسا لگا تھا ۔ ایک لمحہ کو ان کے دل میں یہ کیسی خواہش ابھر آئی کہ کاش شام کے دھندلکے یا پیڑ پودوں کی آڑ کی وجہ سے وہ عورت انھیں نہ دیکھ پائے اور اس کے منہ سے کچھ اور بھی گالیاں سننے کو ملیں ۔ کچھ اور جو پچھلی قسم کا لیوں سے بھی زیادہ ننگی ، فحش ، اور بری ہوں اور یہ کتنی غیر معمولی بات ہو ۔ انھوں نے سوچا کہ جو باتیں تنہائی

دیکھتا رہے وقت کہیں کے ۔ مجھے یکایک شیکسپیر کے کچھ مصرعے یاد آ گئے، شائد اس طرح ہیں۔

"I am tied to a stake,
I can not fly,
But bearlike I must fight the co

بے چارے کاغذ کے باقی ورق جو سب کچھ کہتے ہوئے بھی بے بس ہیں ——— سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھ ہیں۔ مجھے لگا کہ آدمی کا مقدر ایک پرانی سرکاری فائل ہے۔ آدمی اس سے بندھا ہے، وہ بھاگ نہیں سکتا، صرف جانور کی طرح ہاتھ پیر مار سکتا ہے یا خاموشی سے جان دے سکتا ہے۔

گھنٹی بجی ——— جیسے کسی نے بلا سبب کسی کو ڈانٹا۔ گھنٹی کی آواز میری بیوی کی آواز سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے۔ بیوی کی آواز بھی مدھر ہو سکتی تھی اگر اس میں جھنکار نہ ہوتی۔ میرے خیال سے اب میں بلایا جانے والا ہوں۔ چپراسی حضور نکلے۔ ہم لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ جیسے گائے بھینسوں کو گن رہے ہوں۔ اور پھر اندر لوٹ گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ افسر کتنا مصروف ہوگا جب چپراسی ——— اب کی چپراسی آیا تو میری خود داری نے سپر ڈال دی۔ غرّا کر شائد ایسا کچھ کہہ ڈالا ہوگا "میری راہوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں ——— میرا حاصل میری تقدیر بتا دے مجھ کو۔"

"اب کی آپ کی باری ہے۔"

اور سچ مچ میں افسر کے کمرہ میں تھا۔ لیکن کمرے سے آسمان نہیں نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس کا بڑا افسوس تھا۔ دراصل وہاں کوئی ایسی چیز نہیں نظر آئی تھی جو افسر سے ذرا بھی بڑی ہو۔ لیکن کیا وہی افسر افسر تھا؟ ناممکن۔ یہ معمولی آدمی جو میرے پاس بیٹھا ہے۔ افسر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ آدمی جو باہر سے افسری کا بڑا زرہ بکتر پہنے ہے اندر سے ایک ڈرا ہوا بچہ ہے جو اپنے باپ کی طاقت پر اکڑ رہا ہے۔ اس میں خود اعتمادی نہیں ہے صرف خود کو تسلی دیتے رہتا ہے۔ ایک بے وقوف آدمی جو ہوشیاری کا ڈھونگ رچائے ہوئے اس سے بڑا اس کا چپراسی نظر آتا ہے۔ خیر ہوگا مجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے لیے تو افسر ہے۔ آدمی سے کیا لینا دینا۔ یہ تو میری نادانی تھی کہ میں افسر کی جگہ افسر معلوم ہونے والے آدمی سے اکھڑ گیا تھا جو اس وقت وہاں نہیں تھا۔ اور وہاں صرف پون گھنٹے کے لیے بیچ میں حاضر ہوتا ہے۔ جب گھر سے کھانا آتا ہے۔ یہ دفتر تھا کسی کا گھر تو تھا نہیں۔ وہاں آدمی سے پہلے ڈسپلن زیادہ ضروری تھا۔

میں نے ان کی کرسی کو نمسکار کی شائد، کیونکہ کوئی جواب نہیں ملا۔ افسر کچھ لکھنے میں مصروف تھا اور یہ بات صاف تھی کہ اس کا خیال کسی فضول چیز کی طرف نہیں ہے میں ڈرتے ڈرتے آہستہ ایک قریبی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کسی فضول چیز کی طرح۔ کرسی نے ٹھنک ا صرف غرا کے رہ گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کچھ اطمینان بھی۔ افسر نے سر اٹھایا۔ میں نے ہاتھ۔ افسر نے سر ہلایا میں خوش ہو گیا۔ "کہیے ———"

"جی ———"

"بات یہ ہے ———"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور قریب دس منٹ کے لیے افسر سے میرا ناتا ٹوٹ گیا۔ افسر کے بات چیت کے ڈھنگ سے لگ رہا تھا کہ وہ ضرور کہیں دور کسی بہت طاقتور چیز سے بات کر رہا۔ میرا وہاں ہونا ایسا ہی تھا جیسے دنیا کی بہت سی چیزوں کا ہونا بہر حال، وہ ٹیلی فون والی طاقت موجود نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ اس طرح ماحول میں گھل مل گئی تھی کہ پہلی بار مجھے ایسا لگا کہ اس کمرہ میں افسر سے بڑی بھی کوئی چیز ہے، چاہے وہ خدا کی طرح نظر نہ آنے والی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی وقت یہ بھی خیال آیا کہ اگر ذرا کوشش کروں تو سامنے والی کھڑکی سے آسمان کا ایک حصہ دکھائی پڑ سکتا ہے، میرا جی چاہا کہ ایک بار دل کھول کر زور سے ہنسوں، لیکن ماحول نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس ڈر سے کہ کہیں افسر پہچان نہ جائے۔ میں چپ چاپ الماری کی طرف دیکھتا رہا جس میں یقیناً فائلیں بند تھیں اور جن پر افسر کا بلا شرکت غیرے قبضہ تھا۔

ٹیلی فون رکھ کر افسر کسی گہرے خیال میں ڈوب گیا۔ میرا دل ان کے لیے عزت سے بھر گیا۔ کیونکہ میں نے سنا ہو کہ فلسفی بھی اسی طرح کے خیالوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ماحول بے پروا۔ لیکن یہ خاموشی ہندستانی زیادہ ہے، پرانے یونانی فلسفی تو بڑے باتونی تھے۔ سقراط، افلاطون، ارسطو سب گھنٹوں ٹہلتے رہ یا طالب علموں سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ لیکن افسر چپ تھا۔ اس سے میں نے کسی

کنور نارائن
ترجمہ: عبدالحلیم

افسر

دفتر کے باہر انتظار کرتے کرتے شام ہو گئی۔ اس بیچ بہت کچھ ہوا جس کی کوئی قائل نہیں ہی۔ مجھے افسر سے جو کچھ کہنا تھا وہ وقت پر منحصر نہیں تھا اور نہ افسر کے سننے ہی پر۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا اس کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ بات ایسی تھی جس کا تعلق ابدیت سے تھا۔ اگرچہ میں اس طرح کی بات کرنے کے ارادہ سے نہیں گیا تھا، اسے کہیں بھی، کسی وقت بھی کہا جا سکتا تھا۔ اور اس کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ اس بات کو کہنے کا ڈھنگ یا فیشن بدل جائے گا۔ میرے پاس بہت وقت ہو گا، وہ بڑے سے بڑے آدمی کے ذریعہ بھی کہی بات ہو سکتی ہے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے لیے بھی معنی رکھے گی، ورنہ افسر سے بیکار بات کرنے سے فائدہ؟

آخر مجھے جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ بیکار بیٹھے بیٹھے مجھ سے ہر چیز نے بیکار بحث شروع کر دی۔ سامنے کی دیوار پر ٹنگا کلینڈر سب سے پہلے بولا کہ آج دس تاریخ ہے مارچ کا مہینہ ــــ میں نے پوچھا نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا۔ مگر وہ بار بار اسی فضول خبر کو دہراتا رہا۔ میں نے اکتا کر دوسری طرف منھ پھیر لیا۔ اسی وقت ہوا کمرہ میں داخل ہوئی اور میرے سامنے ایک اخبار پھیلا گئی ــــ پرانا اخبار۔ میں نے گردن اٹھا کر چھت کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ہوا شاید دوسرے دروازے سے نکل گئی تھی۔ اس کمرہ میں پھول نہیں تھے، پردے تھے جن پر پھول بنے تھے جیسے کہ پردے آپس میں کھیل رہے تھے۔ میں نے اس کھیل میں دلچسپی لینی چاہی لیکن شاید وہ کھیل بالکل نہیں آتا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور گھڑی نے اشارے سے مجھے وقت بتا دیا۔ اس بات کی معافی مانگی کہ اس سے زیادہ میرے لیے اور کچھ کر نا اس کے بس میں نہیں۔ میں نے برا نہیں مانا، صرف اس وقت پر غور کرنے لگا جو گھڑی کے حساب سے انتظار میں گزر گیا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ اسی وقت میں اور بہت سی ایسی چیزیں ہو رہی تھیں جن سے میں اس وقت بچا ہوا تھا جیسے پیدائش، موت، دکھ، پاگل پن، وغیرہ۔ ایک طرح سے میں خوش قسمت تھا۔ ان سب سے محفوظ۔ کسی بااختیار افسر سے ملنے جیسی معصوم چیز کا انتظار کر رہا تھا۔ ورنہ اسی وقت میں تمام ایسی چیزیں ہو سکتی تھیں کہ میں دونوں ہاتھ جوڑ کر دل سے مناتا کہ ہے بھگوان اس سے کہیں اچھا ہوتا اگر تو مجھے کسی خطرناک، خوفناک افسر کا صبح سے شام تک انتظار کرواتا۔ ایک چپراسی کمرہ میں نمودار ہوا۔ "آپ ہی شری ــــ ہیں؟"

"ہوں ــــ چلوں؟"

"نہیں۔ رکیے۔"

اور چپراسی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میرے ٹھیک سامنے آسمان دکھائی دے رہا تھا کیونکہ کھڑکی تھی جس میں سے دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر اس طرف بھی دیوار ہوتی، اگر میرے چاروں طرف بھی دیوار ہوتی تو میں یقینی طور سے نہ کہہ پاتا کہ باہر آسمان ہے یا نہیں لیکن مجھے بھگوان پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے کہ افسر اندر ہیں اور افسر پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے کہ مجھے کبھی نہ کبھی اس کے درشن ضرور ہوں گے۔ میں نے آسمان سے کچھ نہیں کہا، سوچا۔ اس سے لمبی باتیں ہوں گی ابھی نہیں۔ ابھی اتنا وقت نہیں اور آسمان جیسا ہے کہ اس چیز کی بات سوچنا پاگل پن کہا جائے گا لیکن میں اتنا سنجیدہ ضرور ہو گیا کہ بیسرویٹ اٹھا کر ایک رسالہ کے اڑتے ہوئے ورق پر رکھ دیا۔ اس کے صفحات پھڑپھڑاتے رہے اور میں بادشاہ کی طرح اطمینان سے سینہ پر دونوں ہاتھ رکھے انھیں

ٹھاکر پرشاد سنگھ

ترجمہ: انیس نصرت

کھوٹا سکہ

گجراج سنگھ کے پاس تھوڑی سی کھیتی زمین ہے اور آم کا اجڑا ہوا باغیچہ اپنی پہلوانی کے بل بوتے پر حاصل کی ہوئی شہرت اور بدنامی اور شاگردوں کا ایک دل بھی۔ جب تک طاقت نے ساتھ دیا انھوں نے پچاس کوس تک دھاوا مارا اور کوئی بھی دنگل ان سے چھوٹا نہیں۔ پہلے وہ دنگل خود لڑتے تھے۔ بعد میں جب کمزور پڑ گئے تو دوسروں کو لڑانے لگے۔ اب اکھاڑے کی منڈیر پر بیٹھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ جہاں وہ فیصلہ کرتے ہیں وہاں فیصلہ کشتی لڑنے والوں کے ہاتھ میں نہیں۔ انہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ جیت چاہے جو بھی ہو۔ پر گجراج سنگھ چاہیں تو جیتنے والے کو ہرا دیں اور ہارے ہوئے کو جتا دیں۔ اور اپنی اس خصوصیت کے سبب کمزور کشتی والوں کے وہ ہیرو ہیں داؤں پیچ کے بادشاہ ہیں اور منتظمین کے عزیز۔ بات بگڑتی ہو تو بنا دیں، بنتی ہو تو بگاڑ دیں۔ دس ہزار کی بھیڑ جنگلی بجاتے بھاگ کھڑی ہو اور جہاں پرندہ بھی پر نہ مار سکے وہ میلہ لگا دیں۔ ضرورت صرف گجراج سنگھ کو اعتماد میں لینے کی ہے۔ پھر ان کے اکھاڑے کی تعریف خود پریم چند تک نے کی ہے۔ ہنس کے کاشی نمبر میں ۱۹۳۲ء میں۔

لیکن اب یہ باتیں داستان پارینہ بن کر رہ گئی ہیں۔ گجراج سنگھ اور کافی لٹک گئے ہیں۔ آنکھ بھی جواب دے گئی ہے اور ساتھی بھی۔ دھڑ کا دھادا انہیں بول سکتے اور پنچایتوں میں اب ان کی زوردار آواز بھی نہیں سنائی دیتی۔

پچھلے ہفتے گجراج کا سب سے چھوٹا لڑکا بھی بمبئی بھاگ گیا۔ پہلے تین لڑکے تو پورے خاندان کے ساتھ باہر ہی تھے۔ اس بار چھوٹے نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ عورت باپ سے ملے ہوئے ترکے پر گاؤں سے دس میل دور کھیتی کراتی ہے اور رہنے بھی وہیں لگی ہے۔ گجراج سنگھ نے اس سے پہلے سوچا بھی نہ تھا، اتنی فرصت ہی نہ تھی۔ لڑکے اکثر ان کی مرضی کے خلاف کام کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کے ساتھ ہاتھا پائی تک کی نوبت آجاتی تھی۔ لیکن گجراج سنگھ ماہر پیراک کی طرح پانی میں اپنے دھرے سے ہاتھ پیر مارتے چلے گئے۔ سب زندگی کی ندی میں خوب پانی تھا اس لیے انھیں فکر نہیں ہوتی۔

چھوٹے لڑکے کے جانے کے پہلے سے ہی انھیں پانی کے کم ہونے کا احساس شروع ہو گیا تھا پر اس کے جانے کے بعد سے تو وہ ایک دم ریت پر آگئے۔ ریت ایسی کہ دانتوں اور آنکھوں میں آکر اڑ رہی ہے اور جتنی بار مٹھیاں باندھتے ہیں۔ ریت ہی نکلتی ہے۔

جس دن صبح ہی سے گجراج سنگھ کا دل اداس تھا۔ گاؤں کے باہر تالاب کے کنارے بھومی دان کی زمین پر بنائی ہوئی دالان میں کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مجبوراً خود ہی کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ وہاں لوگوں نے حسب دستور انھیں سلام بجالانا شروع کیا۔ اس سے ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ان کے پیر آپ ہی آپ بازار کی طرف اٹھ گئے۔ اڈے پر ذرا دم لگا لیں گے تو آنکھ ہی کھل جائے گی۔ راستے میں کئی پرزن کن داس ملے۔ انھیں بھی للکار کر بلا لیا اور بتیاتے ہوئے دونوں بچے دل خوش کن تجربات کی باتیں کرتے ہوئے وہ بازار پہنچ گئے۔ انھیں دیکھ کر پان والے، گانجے والے اور حلوائی ذرا چونکے۔ پر جلدی ہی ان سب نے اپنی توجہ ان کی طرف سے ہٹا لی۔ گجراج سنگھ کی دھر جو حالت تھی اس کے چلتے بازار میں ان کا سکہ چلتا تھا پر اس کی قدر و قیمت کافی گھٹ گئی تھی۔ لوگ بھی سلامی دیتے تو ضرور تھے پر وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ اب اس سلامی کے پیچھے پہلے والا خوف اور دہشت نہیں رہ گئی تھی۔ یہ قیمت جاتی رہی تھی، صرف نظر کا بھرم رہ گیا تھا۔ جس کے بل پر

بات چیت کی خواہش سے دلچسپی نہیں تھی۔ لوگ بھگوان کو بھی خوش کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھگوان کے آدمی کی روزانہ کی زندگی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ کاش، وہاں آنے سے پہلے میں افسر کو خوش کرنا ہی سیکھ کر آیا ہوتا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے تو بھگوان کو خوش کرنا بھی ٹھیک سے سیکھا۔ سچ پوچھا جائے تو خوش کرنا ایک فن ہے جس کے لیے مستقل مشق ضروری ہے۔ بھگوان یا آدمی تو ایک بہانہ ہے۔

یکایک افسر کو خیال آیا کہ میں وہاں بیٹھا ہوں۔ بہت رعب سے بولا۔ "آپ کو جو کام ہو جلدی سے کہیے۔ مجھے ایک ضروری کام سے ابھی باہر جانا ہے۔ صرف پانچ سات منٹ ہی رک سکتا ہوں۔"

"احسان مند ہوں۔" میں نے شکر گزاری سے کہا، "میں نے ایک عرضی دی تھی جس پر

میں نے دوسری عرضی دی جس پر غور ہونے کو تھا لیکن عرضی کھو گئی۔ تیسری عرضی دی ہے جس پر کچھ وقت سے غور ہو رہا ہے اس کے بارے کچھ جاننا چاہتا ہوں۔"

ایک منٹ تک سناٹا رہا۔ افسر نے کوئی پرزہ دیا چپراسی آ موجود ہوا۔ افسر نے کچھ منتر سا پڑھا۔ چپراسی غائب ہو گیا اور اس کی جگہ فائل لیے ایک کلرک نمودار ہوا میں اس پر دنگ تھا۔ افسر اور کلرک کے درمیان کسی خفیہ زبان میں بات چیت ہوئی۔ حکم ہوا۔ "آپ کو دس دن کے اندر اطلاع مل جائے گی۔"

"یہی تو آپ نے پچھلی بار کہا تھا۔ آج بیس دن ہوئے۔" میں نے ہاری ہوئی آواز میں کہا۔

افسر میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھ پر ترس کھا کر وہ کسی قدر ہمدردی کے لہجہ میں بولا۔ "دیکھیے جناب، جہاں تک میرے اور آپ کے بیچ کی بات ہے میں اتنا بتا دوں کہ میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ بیکار اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

"تو آپ مجھے یہ لکھ کر کیوں نہیں دے دیتے" میں نے مایوس ہوتے ہوئے پوچھا۔

کیونکہ قانوناً آپ کی مانگ جائز ہے لیکن موجودہ سرکاری پالیسی کی نظر سے نہیں۔ میں صاف "نہ" نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی "ہاں"

کرنا بھی مشکل ہے۔ کچھ رک کر مسکراتے ہوئے افسر نے اپنی بات "مجھے خفیہ طور سے سرکاری حکم ملا ہے کہ اس طرح کی درخواست ہوشیاری نپٹائی جائیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

مجھے لگا کہ یہاں افسر نے ایک ایسی غلطی کر ڈالی ہو جس کا نتیجہ اسے کسی شکل میں جلد ہی بھگتنا پڑے گا۔

"تو آخر میرے معاملہ میں کیا ہوگا۔؟"

"غور ــ" افسر نے سختی سے جواب دیا۔

"کب تک ــ؟"

"جب تک معاملہ کی بڑھاپے سے موت نہ ہو جائے۔"

"یا میری موت نہ ہو جائے" میں نے چڑھ کر کہا۔

"میرے لیے ایک ہی بات ہوگی۔" افسر نے شائد طنز کیا۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ بات کو بچوں کی طرح کھینچتے ہوئے کہا "ار کی ــ" افسر بھی مجھ سے کھیلنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اطمینان سے بولا "[illegible] کی موت کبھی نہیں ہوتی۔" میں ہار گیا تھا۔ افسر سے پار پانا مشکل [illegible] بالکل معمولی انسان کی طرح سے پوچھا "اس طرح کا برتاؤ اگر ایک انسان دوسرے انسان سے کرے تو جانتے ہیں اسے کیا کہا جائے گا۔"

"بے ایمان"

"اگر سرکار کرے تو؟"

"ہوشیاری۔" میں افسر کی حاضر دماغی پر جلے کٹے بغیر نہ رہ سکا غصہ کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہم لوگ جس مہذب طریقے سے بات چیت کر رہے تھے وہاں گرم ہو جانا جہالت اور اجڈپن ہوتا۔ میں نمسکار کر کے اٹھنے ہی والا تھا کہ میرے اندر ایک آزاد ملک کے آزاد شہری نے آواز لگائی کہ میرے بھی کچھ حقوق ہیں۔ اگر تم کچھ کر نہیں سکتے تو کچھ کہہ تو سکتے ہی ہو۔ ٹھیک میں نے اپنے حق کا آخری تیر چلایا۔ "یہ کسی باعزت ملک کی وفادار حکومت ہے یا مکاروں اور جھوٹوں کا گروہ۔"

افسر نے فوراً مسکرانا بند کر دیا اور خود کو بڑی کوشش سے سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ سب اگر آپ پارلیمنٹ یا اسمبلی میں کہیں تو سننے لائق باتیں ہونگی۔ یہاں کہا تو میرا فرض ہوگا کہ چپراسی کے ذریعہ آپ کو کمرے سے باہر نکلوا دوں۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

ٹھاکر کو الاہنا دیا "سرکار ناراض ہیں کیا، ؟ ادھر نظر نہیں ہوتی۔"

ٹھاکر نے حقارت سے اسے دیکھ کر کہا "کیا ہے رے دکان میں تمہاری ——— دے ڈال ایک کنگھی، بابا زنجن اپنی داڑھی ٹھیک کریں گے۔" انھوں نے گھوم کر ساتھ کے زنجن داس کی طرف دیکھا۔

زنجن نے آنکھ مٹکائی اور ہاتھ بڑھا کر کنگھی لے لی۔

ہیرامن نے دیکھا کہ ٹھاکر صاحب کا ہاتھ جیب کی طرف دیکھا اور وہ چپ رہا ٹھاکر نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا اور جیسے جیب میں روپیہ کھوجتے رہے۔"

"تین آنے ہوئے سرکار"

ہیرامن خوشامد میں ہنسا۔

گجراج سنگھ نے روپیہ اس کے ٹاٹ پر پھینک دیا۔ اور باقی ریزگاری کے لیے ہاتھ پھیلائے۔

ہیرامن نے پوری تیزی سے تیرہ آنے پیسے ان کے ہاتھ پہ رکھے اور روپیہ گلے میں پھینک کر ہاتھ جھاڑ لیے۔

گجراج آسمان سے گرے۔ "روپیہ ٹھیک ہے۔" وہ تڑپے

"ہاں سرکار۔ بھلا روپیہ خراب کیسے ہوگا؟ ———"

ہیرامن نے بانہیں چڑھائیں۔

"روپیہ پہچاننا آتا ہے" زنجن بھڑکے۔

"بابا لڑکوں سے تو اچھا آتا ہے ؛؟"

ہیرامن ایک دم شہیدانا انداز دکھاتے ہوئے بولا اور دکان سے نیچے اتر آیا۔ گجراج سنگھ لڑنا چاہتے تھے۔ پر انھیں لگا کہ مہینہ بھر پہلے کی ان کی کمزوری ایک دم سے لوٹ آئی ہے۔ وہ بازی بھی پٹ گئی اور انھوں نے ہار مان لی۔

بازار سے باہر نکلے تو ایسے چلے کہ جیسے ان کے اکلوتے لڑکے کی موت ہو گئی ہو۔

خالی جیب میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے جیب الٹ دی اور کھوٹے سکے کی یاد میں ان کی آنکھ بھر آئی۔

صفحہ ۹۲ کا بقیہ

افسر کے چہرے پر بے حد اطمینان تھا۔ اس نے شطرنج میں مجھے بیجا طرح پیٹ دیا تھا لیکن مجھے اپنے ہارنے کا اتنا غم نہیں تھا جتنا اس کے جیتنے کا۔ وہ جیت جس کے لیے میرے دل میں صرف رحم اور غم تھی۔ جب وہ جانے لگا تو جانے کیا سوچ کر افسر نے کہا "امید ہے آپ میری باتوں کو ذاتی سطح پر نہ لیں گے۔ میں تو صرف سرکاری نوکر ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ بات یقینی طور پر آپ کے حق میں مفید نہیں لیکن ملک کے مفید ہے" مجھے لگا کہ افسر جیتی ہوئی بازی یکا یک ہار گیا۔ وہ افسر سے انسانیت کی سطح پر اتر کر اس نے ایک بہت بڑی غلطی کر ڈالی تھی۔ افسری کے ساتھ وعدہ خلافی کر کے اس نے خود کو بالکل کمزور کر لیا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کوئی بات نہیں مجھے دکھ اس بات کا نہیں کہ آپ اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکے، دکھ اتنا ہی ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے آپ نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ نوکر ہو کر آپ نے افسری جیسی بات چیت کی۔ رہی ملک کے فائدہ کی بات، تو مجھے بھی آپ ہی کی طرح اس عظیم ملک کے ایک ذمہ دار شہری ہونے کا فخر حاصل ہے اور ملک کے فائدہ کے لیے کی جانے والی باتوں کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں، ایک فردی فائدہ کی باتوں کو وقت نہ دینے کے لیے بہت بہت شکریہ۔ نمسکار۔

کوئی خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ یہ بات بھی گجراج سنگھ اچھی طرح سے جانتے تھے۔ وہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ سب کا جواب دیتے ہوئے وہ لکشمی نارائن پان والے کے شیشے کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ اسی درمیان ایک پرانے دماغ دار لوگ پچھلے دنوں کا خیال کرکے ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔ وہ بھی پان کی دکان پر کھڑے ہو گئے۔ ایک دوکان پر گجراج سنگھ پچھلے چالیس سال سے کھڑے ہوتے آ رہے ہیں۔ انھوں نے پہلے کی طرح اپنی دھندلی آنکھیں شیشے پر ٹکائیں اور ہاتھ خود بخود مونچھ تک گئے۔ پیچھے سے کسی نے ٹہوکا دیا ——— ٹھاکر بال پک گئے لیکن بل گیا نہیں۔ حضور کی مونچھوں کے لیے ہاتھ کی کیا ضرورت۔ وہ تو یونہی قردلی ہو رہی ہیں۔

گجراج نے ہنستے ہوئے انھیں دیکھا اور احسانمندی سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ لوگوں پر ان کی دہشت چھا گئی اور خود ان پر اس دہشت کا نشہ۔

لکشمی نے پان دینا شروع کیا اور گجراج سنگھ جھک جھک کر سب کو آداب بجا لائے۔ انھیں محسوس ہوا کہ پچھلی زندگی ایک بار پھر ان کے اندر سر اٹھا رہی ہے۔ پان کھانے کے بعد انھوں نے جیب سے روپیہ نکال کر ٹن سے پان کی چوکی پر پھینکا اور دوسری طرف باتیں کرتے ہوئے باقی پیسوں کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑے رہے۔

لکشمی نے حیرانی سے اس روپیہ کی طرف دیکھا۔ پھر گجراج سنگھ کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھ کر کہا ——— "ٹھاکر یہ روپیہ رکھ لو۔ پیسے پھر آ جائیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

گجراج سنگھ گھوم پڑے۔ "کیا روپیہ خراب ہے؟"

لکشمی نے عاجزی سے ہاتھ جوڑے اور کہا۔

"مالک روپیہ تو بالکل خراب ہے۔ پر کوئی بات نہیں۔ پیسے آ جائیں گے۔"

گجراج سنگھ کے اندر رکے کچلے ہوئے سانپ کو جیسے ہوا نے چھیڑ دیا اور اس نے کھلا ہوا پھن پھر سے لہرانے کی کوشش کی۔ ان کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں اور دہشت اور تشدد کے پرانے نشے سے ان کی نسیں جھنجھنا اٹھیں۔

"اچھا ہے پیسے بھجوا دوں گا۔" وہ پرانے انداز میں چڑھ گئے۔ "ابھی بازی ایک دم نہیں ہار گیا ہوں۔" ان کے کہا ٹینٹ میں پیسہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے دیا نہیں اور لے کر آگے بڑھ گئے۔ جب اکیلے ہو گئے تو ان کے ہونٹوں پرانی گنگناہٹ پھوٹ پڑی۔ بساطی کی دوکان پر کانا ہیرا ہوا تھا۔ گجراج کو دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ اس کی دوکان کی طرف بڑھ گئے اور بغیر کچھ سوچے لال تاگولا مانگ بیٹھے۔

تاگا مل جانے پر انھوں نے مسکرا کر پھر وہی روپیہ پھینکا۔ اس نے اسے جھٹکے سے اٹھایا پر جلدی ہی اس کی آنکھ بجھ گئیں۔ اس تھکے ہوئے انداز میں کہا ——— "ٹھاکر کسی سالے نے آپ کو دیا۔ پیسے کل لے لوں گا" ——— وہ روپیہ لوٹا کر کھسیایا سا چلا گیا۔

بازار سے باہر آنے پر گجراج نے کھل کر سانس لی اور دھیمے گلے سے گانا شروع کیا۔ کندھے پر گمچھے میں کافی سامان بندھا تھا اور جیب کا روپیہ بڑے ہی بھروسہ سے ان کی بغل تھپتھپاتا چل رہا تھا۔ چار بیٹوں کے باپ گجراج اتنے خوش کبھی نہیں ہوئے تھے۔

بازار میں بنیوں کی حالت خراب تھی۔ سب اپنی اپنی جگہ پر تھے اور پورے بازار میں قریب قریب چار سو روپے ٹھاکر گجراج پر چڑھ گئے تھے۔ روز شام کو وہ بازار میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور اعتماد کے ساتھ ایک ایک دکان پر رکتے سامان اٹھاتے آگے بڑھ جاتے۔ اب تو روپیہ نکالنے کی بھی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ جیب کی طرف ہاتھ جاتے ہی لوگ کہہ اٹھتے تھے "پیسے پھر آ جائیں گے۔"

لیکن یہ ہمیشہ تو چل نہیں سکتا تھا۔ کانے ہیرامن نے آج ٹھاکر کے غصہ کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر کسی اور بازار میں سب نے عہد لے لیا کہ اگر کچھ ہو گیا تو سب ایک رہیں گے۔

ٹھیک وقت پر کئی درباریوں سے گھرے ہوئے ٹھاکر گجراج بازار میں داخل ہوئے۔ وہ ہیرامن کو چھوڑ کر آگے بڑھے جا رہے تھے لیکن ہیرامن نے تو سر پر کفن باندھ رکھا تھا۔ اس نے للکار کر

کلدیپ بابو وہ ایک لمحہ خاموش رہے، پھر انہیں ہاتھ کو اوپر نیچے ہلا کر بولے ــــــــ "پھر اس کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ اس مرتبہ بابو صاحب لے ہی لیے جائیں گے؟ معمولی سی اے جی آفس کی کلرکی میں تو پوچھے نہیں گئے، ڈپٹی کلکٹری میں کون پوچھتا ہے؟ آخر آپ میں کیا خوبی ہے صاحب کہ آپ ڈپٹی کلکٹر ہو ہی جائیں گے؟ تھرڈ کلاس بی اے ہیں، جو بیسوں گھنٹے مٹر گشتی کرتے ہیں، دن لگا سگریٹ پھونکتے ہیں۔ آپ میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں؟ بڑے بڑے بہہ گئے، گدھا پوچھے کتنا پانی۔ پھر کرم کرم کی بات ہوتی ہے۔ بھائی، سمجھ لو تمہاری قسمت میں نوکری لکھی ہی نہیں۔

اور ہاں، سالے کے ماسٹر بن گئے تو ہانڈی کون چاٹے گا؟ ڈپٹی کلکٹری، ڈپٹی کلکٹری! سچ پوچھو تو ڈپٹی کلکٹری نام سے ہی مجھے نفرت ہو گئی ہے ــــــــ" اور ان کے ہونٹ پچک گئے۔ جمنا نے نرم لہجے میں ان کی مخالفت کی ــــــــ "ایسی بدشگونی منھ سے نہیں نکالنی چاہیے۔ ہمارے لڑکے میں نقص ہی کون سا ہے؟ لاکھوں میں ایک ہے۔ صبر کی سو دھار، میرا دل کہتا ہے کہ بوا اس بار سے ہی لیے جائیں گے۔ پھر پہلی بھوک پیاس کا بڑ کاہے، ماں باپ کا سکھ تو اس نے جانا ہی نہیں۔ اتنا بھی نہ ہوا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ یوں ہی نہ جانے کیوں ہر وقت اداس رہتا ہے، ٹھیک طرح کھاتا پیتا بھی نہیں، بولتا نہیں۔ نہ ہی پہلے کی طرح گاتا گنگناتا ہے۔ نہ معلوم میرے لاڈلے کو کیا ہو گیا ہے!" آخر کار اس کا گلا بھر آیا اور دوسری طرف رخ کر کے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

جمنا کو روتے دیکھ کر کلدیپ بابو آپے سے باہر ہو گئے! غصہ اور طنز سے منھ چڑھاتے ہوئے بولے ــــــــ "لڑکا ہے تمہارے کرجا تو۔ ساری خرافات کی جڑ تم ہی ہو۔ تم مجھے زندہ نہیں رہنے دینا چاہتیں۔ جس دن میرا دم نکلے گا، تمہارا سینہ ٹھنڈا ہو گا۔" وہ ہانپنے لگے۔ انھوں نے جمنا پر بڑی بے رحمی سے ایسا زبردست الزام لگایا تھا جسے وہ برداشت نہ کر سکی۔ روتی ہوئی بولی ــــــــ "اچھی بات ہے۔ اگر میں ہی ساری خرافات کی جڑ ہوں، تو میں کمینی کی بچی، جو آج سے کوئی بات......" روندھے گلے سے وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کلدیپ بابو خاموش بیٹھے رہے۔ ان کا چہرا تن گیا تھا اور گردن ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد زمین پر پڑے ہوئے بوسیدہ پرانے اخبار کو یوں پڑھنے لگے گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ یوں ہی پڑھنے کے بعد وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے تہبند کی طرح لپٹی ہوئی دھوتی کھول کر ٹھیک طرح باندھی اور اوپر سے اپنا پارسی کوٹ ڈال لیا۔ کوٹ میلا ہو چلا تھا۔ اور اس پر جا بجا دو چار پیوند بھی لگے تھے۔ اپنا پرانا چپل پہن کر، ہاتھ میں چھڑی سنبھالی اور وہ ایک مرتبہ کھانس کر باہر نکل گئے!

خاوند کی بات سے جمنا کے دل پر گہرا صدمہ پہونچا تھا۔ کلدیپ بابو کو باہر جاتے اس نے بھی دیکھا مگر خاموش رہی۔ چپ چاپ منھ پھلائے سر جھکائے کام کرتی رہی اور ایک گھنٹے بعد کلدیپ بابو آ لوٹے تو اس کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ پھر بھی وہ خاموشی سے سبزی کاٹتی رہی۔

کلدیپ بابو نے کھانس کر کہا ــــــــ "سنتی ہو، یہ ڈیڑھ سو روپے رکھ لو۔ تقریباً سو روپے بوا کی فیس میں کام آجائیں گے پچاس روپے وقت ضرورت کے لیے الگ رکھ چھوڑنا۔"

جمنا نے ہاتھ بڑھا کر روپے لے لیے مگر بولی کچھ نہیں۔

کلدیپ بابو بے حد خوش تھے۔ امنگ بھرے لہجے میں بولے ــــــــ "سو روپے بوا کو دے دینا، آج ہی فیس بھیج دے۔ ہو گا، ضرور ہو گا، بوا یقیناً ڈپٹی کلکٹر ہو گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ نہ چنا جائے۔ لڑکے کے ذہن میں کوئی خرابی تھوڑے ہی ہے... ... نہیں، نہیں، فکر کی کوئی بات نہیں! نارائن جی اس مرتبہ بھگوان کی مہربانی سے ڈپٹی کلکٹر ضرور ہو گا!"

جمنا اب بھی خاموش تھی۔ چپ چاپ اٹھی اور روپے ٹرنک میں رکھنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کلدیپ بابو کچھ دور اپنے کمرے کی طرف جا کر واپس لوٹ پڑے اور جس کمرے میں جمنا گئی تھی اس کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر جمنا کو ٹرنک میں روپے رکھتے ہوئے دیکھتے رہے

امرکانت

ترجمہ۔ پرکاش سکسینہ

ڈپٹی کلکٹری

شکلدیپ بابو تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس لوٹے۔ مکان میں داخل ہونے سے قبل ڈیوڑھی سے ملے ہوئے کمرے میں جھانکا۔ کوئی موکل نہیں تھا اور محرر صاحب بھی غائب تھے۔ وہ اندر چلے گئے اور اپنے کمرے کے سامنے برآمدے میں کھڑے ہو کر بندر کی طرح آنکھیں جھپکا کر رسوئی گھر کی طرف دیکھا۔ اُن کی بیوی، جمنا، باورچی خانے کے پاس بیٹھی ہونٹ دبائے سبزی کاٹ رہی تھی، دھیمے دھیمے مسکراتے ہوئے وہ اپنی بیوی کے پاس گئے۔ ان کے چہرے پہ ایک غیر معمولی اطمینان، یقین، اور احساس کا جذبہ نمایاں تھا۔ ایک گھنٹہ قبل ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

بات کچھ یوں شروع ہوئی شکلدیپ بابو صبح کلی داتون سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں بیٹھے ہی تھے کہ جمنا نے ایک تشتری میں دو جلیبیاں ناشتے کے لیے اُن کے سامنے رکھ دیں۔ بغیر کچھ بولے ہی وہ ناشتہ کرنے لگے۔

جمنا ایک آدھ منٹ تو خاموش رہی، پھر خاوند کے چہرے پہ ایک اچٹتی نظر ڈال کر بات چھیڑ بیٹھی ——— "دو تین روز سے بوا کچھ اداس اداس رہتے ہیں۔"

"کیا ہے ———" سر اٹھا کر شکلدیپ بابو نے پوچھا اور ان کی بھوئیں تن گئیں۔

ایک بے معنی سی مسکراہٹ چہرے پہ لا کر جمنا بولی ——— "کل کہنے لگے، اس سال ڈپٹی کلکٹری کی بہت سی جگہیں ہیں مگر بابو جی سے کہتے ڈر لگتا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ دو چار روز میں فیس داخل کرنے کی تاریخ بھی نکل جائے گی۔"

شکلدیپ بابو کا بڑا لڑکا، نارائن، گھر میں بوا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ تقریباً چوبیس سال کا تھا۔ گزشتہ تین چار سال بہت سے امتحانات میں شریک ہوا۔ مگر ایم۔ اے۔ لے لوگوں دروازے کھٹکھٹانے اور ایڑی چوٹی کا زور استعمال کرنے کے بھی اب تک نوکری سے محروم رہا۔ دو بار ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں بھی بیٹھ چکا تھا، مگر بد قسمتی ہی ہاتھ لگی۔ ایک آخری موقع اور ملنے والا تھا، جسے وہ چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے پورا یقین کہ چونکہ اس بار جگہیں کافی ہیں، اس لیے وہ جی توڑ محنت کرے گا بہت ممکن ہے کہ وہ چن لیا جائے۔

شکلدیپ بابو مختار تھے۔ مگر پچھلے دو تین سال سے مختاری کی گاڑی اُن کے بس کی نہیں رہ گئی تھی۔ بڑھاپے سے ان کے جسم نہ وہ تڑپ رہ گئی تھی نہ ہی وہ طاقت یا چال کی اکڑ۔ اسی وجہ سے موکل کم ہی پھٹکتے تھے۔ کچھ ایک تو آتے ہی بھڑک جاتے تھے۔ حالت میں بھگوان کا نام لے کر کچہری جاتے تھے۔ کبھی کبھار کچھ مل جاتا تھا اور اسی کے دم پر دو وقت چولھا جل جاتا تھا۔

جمنا کی بات سن کر وہ ایک دم بگڑ گئے۔ غصے سے ان کا منہ تمتما اٹھا اور سر کو جھٹکتے ہوئے پاگل کتے کی طرح گرجے ———

"تو میں کیا کروں؟ میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ تم سب میری جان لینے پر آمادہ ہو۔ صاف صاف سن لو، میں تین مرتبہ کہتا ہوں، مجھ سے نہیں ہوگا، مجھ سے نہیں ہوگا، مجھ سے نہیں ہوگا۔"

جمنا خاموش رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح غصہ ہو اٹھنا اس کے خاوند کی خصلت میں داخل ہے۔

اس سے پہلے شنکلدیپ بابو رادھا سوامی عقیدے کے ماننے والوں کی کڑی تنقید کرتے تھے۔ اسی بات کے زیر اثر اکثر گھر کی عورتوں میں رونے پیٹنے تک نوبت جا پہنچتی تھی۔ آج جو شنکلدیپ بابو نے پھر پوجا پاٹھ کی بات چھیڑی تو جمنا سمجھ گئی کہ وہ طنز کر رہے ہیں۔ اس نے بھی جملہ چست کر دیا —— "ہم لوگوں کو پوجا پاٹھ سے کیا مطلب؟ ہم کو تو نرک میں جانا ہی ہے جنھیں سورگ جانا ہو، وہ کریں۔"

"لو بگڑ گئیں" شنکلدیپ بابو مسکرائے۔ "میں مذاق تھوڑے ہی کر رہا تھا۔ میں خود غلطی پر تھا۔ رادھا سوامی پنتھ والے تو واقعی باثر ہوتے ہیں۔"

جمنا تنک گئی۔ بولی —— "رادھا سوامی والوں کو کیا سمجھتے ہو؟ رادھا سوامی کوئی دیوتا نہیں ہیں۔ وہ بذات خود پرمیشور ہیں۔ ان کا لوک سب سے اوپر ہے۔ اُن کے نیچے برہما، وشنو، مہیش کا لوک بنا ہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ پوجا پاٹھ بھی کرو گی؟ سنتے ہیں کہ سچے دل سے رادھا سوامی کی پوجا کرنے سے ساری خواہش پوری ہو جاتی ہیں ——" شنکلدیپ بابو کے کانپتے لبوں پر ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ کھیل گئی۔

جمنا نے دوبارہ اپنے عقیدے کی تائید کی —— "اس میں دھادھما تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ من ہی من میں نام لیا جاتا ہے۔ سبھی آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں اور مرنے کے بعد آتما پرماتما میں مل جاتی ہے۔ چوراسی جونیاں نہیں بھگتنی پڑتیں۔"

شنکلدیپ بابو عزم بھرے لہجے میں بولے —— "ٹھیک ہے۔ نیت اصل بات ہے۔ ذرا اور سویرے اٹھ کر نام لیا کرو۔ صبح نہانے سے طبیعت دن بھر صاف رہتی ہے۔ کل سے تم بھی شروع کر دو۔ میں تو بدقسمت تھا جو آج تک میری آنکھیں بند رہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے، کل سے تم بھی سویرے چار بجے اٹھ جانا۔"

انھیں ڈر تھا کہ کہیں جمنا ان کی ہم خیال نہ ہوئی تو؟ اسی لیے اتنا کہہ کر وہ پیچھے کھسک چلے لیکن اچانک واپس لوٹے اور بیوی کے پاس آکر مسکراتے ہوئے بولے —— "بیوا کے لیے ناشتے کا کیا انتظام کرو گی؟ ——"

"جو روز ہوتا ہے وہ ہی ہوگا۔ اور کیا ہوگا؟ ——" جمنا ابھی تک سنجیدہ تھی۔

"ٹھیک ہے۔ مگر آج حلوہ کیوں نہیں بنا لیتیں؟ گھر کا بنا سامان اچھا ہوتا ہے۔ کچھ میوے بھی منگوا لو۔"

"حلوے کے لیے گھی نہیں ہے۔ پھر اتنے پیسے کہاں ہیں؟" جمنا نے مجبوری ظاہر کی۔

"بچاس روپے تو رکھے ہیں نا۔ اس میں سے خرچ کرو۔ دانے پانی سے ہی جسم بنتا ہے۔ لڑکے کو معقول کھانا پینا نہ ملا تو امتحان کیا دے گا۔ روپے پیسے کی فکر نہ کرو، میں ابھی زندہ ہوں۔"

وہاں سے ٹلنے سے پہلے بیوی کو ہدایت دیتے گئے ——

"ایک بات اور کرو۔ تم لڑکوں بچوں سے ڈانٹ کر کہہ دینا کہ باہر والے کمرے میں بازار نہ لگائیں، ورنہ اس کی پڑھائی میں خلل انداز ہونگے۔ دوسری بات یہ کہ بیوا سے کہہ دینا کہ باہر کے کمرے میں اطمینان سے بیٹھ کر پڑھے۔ میں باہر صحن میں بیٹھ لوں گا۔"

شنکلدیپ بابو صبح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باہر والے کمرے میں بیٹھتے تھے۔ اسی کمرے میں وہ وکلوں کا انتظار کرتے اور انھیں سمجھاتے بجھاتے تھے۔

اس دن سے واقعی انھوں نے مکان کے باہر نیم کے سائے میں ایک میز اور چار کرسیاں ڈلوا کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ جان پہچان کے لوگ وہاں سے گزرنے تو انھیں وہاں بیٹھے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ سڑک پر گزرتے ہوئے جب بن لال پھیکا رنے اس کا سبب دریافت کیا تو وہ زور سے چلا کر بولے —— "اندر بڑی گرمی ہے ——" اور جوکر کی طرح اپنا منہ بنا دیا۔ اتنی زور سے کھل کھلے جیسے کوئی —— بہت بڑا مذاق کر دیا ہو۔ شام کو روزانہ جلد ہی کچہری سے لوٹ آتے تھے۔ اس دن دیر سے لوٹے۔ بیوی کے ہاتھ میں چار روپے تو دیئے ہی، ساتھ ہی دو سیب اور قینچی سگریٹ کے پانچ پیکٹ بھی بڑھا دیئے۔

"سگریٹ کیا ہوگی؟" بیوی نے حیرت سے دریافت کیا۔

"تمہارے لیے ہے" شنکلدیپ بابو نے آہستہ سے کہا اور

پھر بولے ——— "غلطی کسی کی نہیں ہے۔ سارا قصور میرا ہے۔ میں باپ ہوکر کہتا ہوں کہ لڑکا نالائق ہے۔ نہیں نہیں، ساری خرافات کی جڑ میں ہی ہوں، اور کوئی نہیں۔"

ایک دو منٹ تک جمنا کو خاموش دیکھ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور کپڑے اتارنے لگے۔ نارائن نے اسی روز ڈپٹی کلکٹری کی فیس اور فارم روانہ کر دیا۔

دوسرے روز خلاف معمول ہی کلدیپ بابو کی نیند اچٹ گئی۔ بڑبڑا کر آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر ڈیوڑھی میں آکر جھانکنے لگے۔ گھر کے سب لوگ گہری نیند میں تھے۔ سوتے ہوئے لوگوں کی سانسوں کی آواز اور جھینگروں کا ترنم سنائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ مگر باہر کے کمرے سے دھیمی روشنی چھن رہی تھی۔ کلدیپ بابو چونک پڑے اور دبے پاؤں کمرے کی جانب بڑھے۔

ان کی عمر پچاس کے اوپر ہی رہی ہوگی۔ گورے، لمبے قد اور دبلے پتلے۔ چہرے پر لاتعداد لکیروں کا جال بنا تھا اور ہونٹوں و گردن پر کھال جھول رہی تھی۔

دروازے کے پاس پہونچ کر پنجے کے بل کھڑے ہو کر، ٹ دبا کر اندر جھانکا۔ ان کا لڑکا نارائن میز پر رکھی لالٹین سامنے سر جھکائے غور سے کچھ پڑھ رہا تھا۔

کلدیپ بابو کچھ دیر تک آنکھوں کو حیرت سے پھیلائے ے کو دیکھتے رہے، جیسے کسی پرسکون راز کا اچانک پتہ لگا ہو۔ پھر آہستہ سے پیچھے ہٹ گئے اور زیر لب مسکراتے ہوئے می کے کنارے کھڑے ہو کر بے چینی سے آسمان کی سمت رنے لگے۔

ان کی عادت چھ ساڑھے چھ کے قبل اٹھنے کی نہیں تھی۔ اٹھ گئے تھے پھر بھی طبیعت کو ناگوار نہیں گزرا۔ آسمان روں کی شوخی ابھی برقرار تھی اور چھت کے کھپروں کا لمس ہوئی انجانی سی ہوا انھیں سکون پہونچا رہی تھی۔ دوبارہ ے سے مسکرا کر زیر لب بولے ——— "چلو، اچھا ہی ہے۔"

اچانک نہ معلوم ان میں کہاں سے ایک غیر معمولی توانائی آ گئی اور اس وقت انھوں نے دتون کرنا شروع کر دی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد بھی اندھیرا ہی رہا تو انھوں نے بالٹی میں پانی بھرا اور غسل خانے میں جا کر نہانے لگے۔ نہا کر باہر نکلے تو انھیں اپنے جسم میں نئی تازگی اور جوش کا احساس ہو رہا تھا۔

حالانکہ انھوں نے اپنا کام خاموشی سے نپٹانے کی کوشش کی تھی، پھر بھی جسم کی کمزوری کی وجہ سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی اور ان کی بیوی کی نیند کھل گئی۔ جمنا کو پہلے تو چور کا اندیشہ ہوا لیکن جھٹ پٹ قریب آ کر دیکھا تو حیرت میں آ گئی۔ کلدیپ بابو آنگن میں کھڑے آسمان گھور رہے تھے۔

جمنا نے متفکر لہجے میں پوچھا ——— "اتنی جلدی نہانے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنے سویرے تو کبھی نہیں اٹھتے تھے۔ کچھ ہو ہوا گیا تو؟"

کلدیپ بابو جھینپ سے گئے۔ کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے بولے ——— "دھیمے بولو بھاگی، بیٹا پڑھ رہا ہے۔"

جمنا بگڑ گئی ——— "دھیرے کیوں بولوں؟ اسی چھین سے پچھلے سال بیمار پڑ گئے تھے۔"

کلدیپ بابو کو تکرار بڑھنے کا اندیشہ ہوا اور اسی لیے خاموش ہو گئے اور چپ چاپ اپنے کمرے میں لوٹ آئے اور لالٹین جلا کر رامائن کا پاٹھ کرنے لگے۔

پوجا ختم کر کے جب وہ باہر نکلے تو چاروں طرف اجالا پھیل چکا تھا۔

جمنا بھنڈار گھر میں کھڑ بڑ کر رہی تھی۔ کلدیپ بابو جمنا کا موڈ تاڑ گئے اور بھنڈار کے دروازے پر کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اپنی بیوی کو کنستر سے چاول نکالتے دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد بولے ——— "نارائن کی اماں، آجکل تمہارا پوجا پاٹھ نہیں ہوتا؟ ———" اور خود بخود جھینپ کر مسکرا دیئے۔

کلدیپ بابو پریاگ راج سے آئے ہوئے ایک سادھو مہاراج سے منتر لے کر گرو دیکشت ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گھر کی عورتیں بھی بابا سے منتر لے کر گرو دیکشت ہو جائیں گی۔ مگر جیسا کہ کہا گیا ہے، عورت ذات کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ان کی بیوی ایک بوڑھی چاچی کے وعظ سے متاثر ہو کر رادھا سوامی پنتھ اختیار کر چکی تھیں۔

کچھ دیا بھی تو نہیں۔ لڑکا ہی تو ہے۔ طبیعت ہوئی، کھا لیا۔ میں نے لے پیا بھی بہت۔ اس کی جان تو لے نہیں دوں گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ کھاؤ تم اور تمہارے لڑکے۔ خوب مزے سے کھاؤ۔ لعنت ہے ایسے کھانے پر ـــــــ" وہ غصے میں کانپتے ہوئے بیچ پڑے اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ غصے اور بے عزتی کے احساس میں جمنا رونے لگی۔ کھانا نہیں کھایا اور چارپائی پر منہ ڈھانپ کر پڑی رہی۔

دوسرے روز صبح تک شکلدیپ بابو کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ نہانے دھونے اور پوجا پاٹھ کرنے کے بعد نرائن کے جاگتے ہی اسے اپنے کمرے میں بلایا اور جواب طلب کیا۔ اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو بدھو پن سے تاکنے لگا۔ شکلدیپ بابو نے ہاتھ جوڑ کر جانے جوڑ دیے۔

ڈپٹی کلکٹری کا امتحان الہ آباد میں ہونے والا تھا۔ روانگی کے دن قریب آ گئے۔ اس بیچ نرائن نے جی توڑ محنت کی تھی کہ سبھی محو حیرت تھے۔ روزانہ اٹھارہ انیس گھنٹے پڑھتا تھا اس کی پڑھائی میں کوئی مداخلت بھی نہیں ہونے پاتی تھی۔ کمرہ، بستر وغیرہ صاف ملتا تھا۔ دال، چاول ترکاری دودھ گھی کا معقول انتظام تھا۔ ناشتے کے لیے صبح حلوہ دودھ وغیرہ اور شام کو میوہ پھل ملتے تھے۔ لڑکے کی طبیعت نہ اچاٹ ہو اس لیے شکلدیپ بابو نے سگریٹ کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ سگریٹ ختم ہوتے ہی جمنا چار پانچ پیکٹ رکھ آتی تھی۔

جس روز نرائن کو الہ آباد جانا تھا شکلدیپ بابو کی چھٹی تھی۔ وہ صبح سیر کو نکل گئے۔ کچھ دیر کمپنی باغ میں گھومنے پر طبیعت نہ لگی تو ندی کے کنارے پہونچ گئے۔ وہاں بھی دل نہ بہلا تو اپنے عزیز دوست کیلاش بہاری مختار کے ہاں چلے گئے۔ کافی دیر گپ شپ چلتی رہی۔ گاڑی کا وقت نزدیک آتے ہی وہ جلدی جلدی گھر لوٹ آئے۔

گاڑی نو بجے چھوٹتی تھی۔ جمنا اور نرائن کی بیوی نرملا نے صبح صبح اٹھ کر کھانا بنا لیا۔ نرائن نے کھانا کھایا اور سب کو پرنام کر کے اسٹیشن چل دیا۔ شکلدیپ بابو بھی اسٹیشن تک اس کے ہمراہ گئے۔

نرائن کو رخصت کرنے اس کے چار پانچ دوست بھی گئے تھے۔ جب تک گاڑی نہیں آئی، نرائن اسٹیشن پر دوستوں سے گپ شپ کرتا رہا۔ شکلدیپ بابو علیحدہ کھڑے یوں دیکھ رہے تھے گویا نرائن کوئی اجنبی ہو۔ گاڑی آتے ہی نرائن دوستوں اور والد کی مدد سے سامان لے کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ شکلدیپ بابو آہستہ سے کھسک آئے اور وہیلر اسٹال پر جا کھڑے ہوئے۔

بک اسٹال والا جان پہچان کا تھا۔ ہنستے ہوئے بولا ـــــ "کہیے مختار صاحب، آج کیسے آنا ہوا؟" ـــــــ

شکلدیپ بابو نے فخر سے مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "لڑکا الہ آباد جا رہا ہے، ڈپٹی کلکٹری کا امتحان دینے۔ شام تک پہونچ جائے گا۔ ڈیوڑھے درجے کے پاس والے ڈبے میں ہے۔ نیچے کھڑے چار پانچ لڑکے اس کے دوست ہیں۔ ہم لوگ بوڑھے ٹھہرے۔ سوچا کہ لڑکے امتحان وغیرہ کی باتیں کر رہے ہوں گے، اس لیے میں ادھر چلا آیا ـــــ" ان کی آنکھیں مسخرانہ انداز سے سکڑ گئیں۔

کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد تار گھر کے سامنے کھڑے بڑے بابوؤں کو دیکھتے رہے اور ٹائم ٹیبل پڑھنے لگے۔ نرائن نے جھٹ پٹ نیچے اتر کر ان کے پاؤں چھوئے۔ گاڑی چھوٹنے کی گھنٹی بجی تو وہ جھٹ پٹ کر نرائن کے دوستوں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ اچانک ان کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں گیا۔ جیب سے کوئی چیز نکال کر وہ آگے بڑھے، مگر نہ معلوم کیا سوچ کر رک گئے۔ چہرہ تمتما اٹھا اور جلد جلد ادھر ادھر جھانکنے لگے۔

سیٹی بجا کر گاڑی چل دی۔ شکلدیپ بابو چونک اٹھے۔ جیب سے وہ چیز نکال کر مٹھی میں دبائی اور نرائن کو دینے کے لیے دوڑنے لگے۔

ضعیف و لاغر تن تھا، تیز کہاں دوڑ پاتے۔ جسم میں پھرتی پیدا کرنے کے لیے وہ اپنے ہاتھوں کو تیزی سے گھمانے لگے۔ ان کے پیروں سے کھٹ کھٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ چہرے پر پریشانی جھلک رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر موجود لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے وحشت میں آ کر انھیں للکارا، کچھ نے کلکاریاں ماریں اور کچھ لوگ انھیں دیکھ کر بے تحاشہ ہنسنے لگے۔ گاڑی نے ابھی رفتار نہیں پکڑی تھی۔

دوسری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

جمنا نے پیشانی پر ساڑی کا آنچل سنوارتے ہوئے کہا ——— "یہ بھی سگریٹ پی بھی ہے کہ آج ہی پیوں گی؟ اس عمر میں مذاق کرتے شرم نہیں آتی؟"

شکلدیپ بابو ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پھر سنجیدہ ہو کر آہستہ سے بولے ——— "بوا کو دے دینا"، اور فوراً وہاں سے کھسک گئے۔

جمنا بھونچکی ہو کر کچھ دیر ان کی طرف دیکھتی رہی۔ آج تک تو نارائن کے سگریٹ پینے کی کتنی مخالفت کرتے رہے۔ کئی بار اسی بات پر لڑکے کو ڈانٹ ڈپٹ بھی چکے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور یہ سوچ کر مسکرا دی کہ بڑھاپے میں شکلدیپ بابو سٹھیا گئے ہیں۔

نارائن دن بھر پڑھنے لکھنے کے بعد ٹہلنے گیا ہوا تھا۔

شکلدیپ بابو جھٹ پٹ کپڑے تبدیل کرکے، جھاڑو لے کر باہر کے کمرے میں پہونچ گئے۔ دھیرے دھیرے اچھی طرح کمرہ جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیا۔ میز پوش کئی بار جھٹک کر جھاڑا اور قاعدے سے بچھا دیا۔ نارائن کے بستر کی ایک ایک چیز قرینے سے لگا کر ٹھیک کر دی۔

اتنے میں جمنا آکر نرم لہجے میں بولی ——— "کچہری سے آنے پر یہی کام رہ گیا ہے کیا؟ بستر تو روز بچھ ہی جاتا ہے، اور کمرے کی صفائی بھی مہرن کر ہی دیتی ہے ———"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں اپنی طبیعت سے کر رہا ہوں۔ کوئی زبردستی نہیں ہے۔" شکلدیپ بابو کے چہرے پر جھینپ کے آثار نمایاں تھے۔ بیوی کی طرف رخ نہ کرتے ہوئے بھی کچھ ایسی آواز میں بولے گویا کوئی حیرت انگیز کام انجام دیا ہو۔

کچہری سے واپس آنے پر ان کا معمول تھا کہ ناشتہ کرکے چارپائی پر دراز ہو جاتے تھے۔ اکثر نیند بھی آجاتی تھی اور آٹھ بجے تک سوتے رہتے تھے۔ اگر نیند نہ بھی آئی تو یوں ہی چپ چاپ پڑے رہتے تھے۔

"ناشتہ تیار ہے" ——— جمنا اعلان کرکے چلی گئی۔

کمرے میں بستر لگانے، کرسیوں کو قرینے سے سجانے اور کمرے کو چمکا دینے کے بعد شکلدیپ بابو آنگن میں آکر کھڑے ہو گئے اور بے مطلب ہنستے ہوئے بولے ——— "اپنا کام ہمیشہ اپنے ہاتھوں ہی کرنا چاہیئے۔ نوکروں کا کیا اعتبار؟"

نگران کی بات پر کسی نے توجہ نہ دی اور نہ ہی کوئی جواب ملا۔

آہستہ آہستہ دن گزرتے گئے، اور نارائن جی توڑ محنت کرتا رہا۔

کچھ دنوں سے شکلدیپ بابو شام کے وقت مکان سے تقریباً ایک میل پر واقع شیوجی کے مندر میں بھی جانے لگے تھے۔ مندر میں عموماً بھگتوں کا ہجوم بنا رہتا تھا۔ کچہری سے واپس لوٹنے پر نارائن کا کمرہ جھاڑ پونچھ دیتے اور ناشتہ کرکے مندر چلے جاتے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مندر میں گزارنے کے بعد دس بجے کے قریب واپس لوٹتے تھے۔

ایک روز مندر سے لوٹے تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ دبے پاؤں ڈیوڑھی میں داخل ہوئے اور پنجوں کے بل اچک اچک کر نارائن کو پڑھتے دیکھتے رہے۔ پھر اندر جاکر چھڑی رکھی اور ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانے کے لیے رسوئی گھر میں جا بیٹھے۔ بیوی نے کھانا پروس دیا۔

ایک لقمہ چباتے ہوئے بولے ——— "بوا کو میوے دیئے تھے؟" شام کو کچہری سے لوٹتے وقت میوے لیتے آئے تھے۔ میوے بیوی کے سپرد کرتے ہوئے انھوں نے تاکید کر دی تھی کہ صرف نارائن کو ہی دیئے جائیں، اور کسی کو نہیں۔

جمنا کو جھپکی آرہی تھی۔ خاوند کی بات سن کر چونک پڑی ——— "کہاں؟ میوہ ٹرنک میں رکھ دیا تھا۔ سوچا تھا کہ بوا سویرے لوٹے گا۔ تو چپکے سے دے دوں گی۔ مگر لڑکے تو جنوں کے ساتھی ہیں۔ کونا کونا جھانک آتے ہیں۔ ٹن ٹن نے پتہ لگا لیا سب صفایا کر گیا۔"

ٹن ٹن شکلدیپ بابو کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ بارہ برس کا سن، حد درجہ شوخ ———

"کیا؟" شکلدیپ بابو چیخ پڑے۔ منہ کھل گیا تھا اور زبان پر روٹی کا ٹکڑا چپکا نظر آرہا تھا۔

جمنا خاموش رہی۔

غصے میں بیوی کا منھ چڑھاتے ہوئے شکلدیپ بابو بولے ——— "کھا گیا، کھا گیا۔ تم نے کیوں نہ کھا لیے؟ تم لوگوں کے کھانے کے لیے ہی لاتا ہوں نا؟ ہنھ، کھا گیا ———"

جمنا بھی بپھر اٹھی ——— "تو کیا ہو گیا؟ بیچاروں کو میوہ مسری کبھی ملتا نہیں۔ لڑی جوتی کھا کر بسر کرتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں خرید کر کبھی

اُس کا چناؤ یقینی ہے۔

دوسرے روز کچہری میں وکیلوں اور مختاروں نے پھر شکلدیپ بابو کو مبارک باد دینا شروع کر دی۔ نارائن نے چناؤ میں اپنے ... یقین کا مظاہرہ کیا۔ شکلدیپ بابو مسکرا کر شکریہ ادا کرتے اور نارائن کی بچی زندگی کا کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں کہتے تھے ——

"آپ سے کہتا ہوں پہلے مجھے بھی شبہ تھا پر آپ لوگوں کی دعا سے اب وہ شبہ دور ہو گیا ہے۔"

جب وہ گھر لوٹے تو دیکھا کہ نارائن، گوری اور کمل دروازے کے سامنے کھڑے بات چیت کر رہے تھے۔ نارائن انٹرویو کے بارے میں ہی کچھ بتا رہا تھا۔ باپ کو آتے دیکھ کر دھیرے دھیرے بولنے لگا۔ شکلدیپ بابو خاموشی سے وہاں گزرے۔ جب دو تین گز دور رہ گئے تو ان کے کانوں میں بھنک پڑی گوری کہہ رہا تھا —— "تمہارا ہو گیا۔ اب تم موج" ——

اتنے سنتے ہی شکلدیپ بابو دھپ سے گھوم پڑے اور لڑکوں کے پاس آکر بولے —— "کیا؟" —— ان کی آنکھیں سکڑ گئیں اور چہرے پر ایسے آثار نمایاں ہونے لگے گویا کسی محفل میں زبردستی گھس آئے ہوں۔

لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ کر بیتر سے مسکرائے۔ گوری نے اپنی بات دہرائی —— "میں نارائن سے کہہ رہا تھا بابوجی کہ اس کا چناؤ یقینی ہے۔"

شکلدیپ بابو نے سڑک پر گزرتی ہوئی ایک موٹر غور سے دیکھ کر کہا —— "ہاں دیکھئے، وہاں جہاں ایک سے ایک دھرندھر پہنچتے ہیں، وہاں ہر ایک سے بیس ہی منٹ انٹرویو ہوتا ہے اور ان سے پورے پچاس منٹ۔ اگر نہیں لینا ہوتا تو پورے پچاس منٹ کیوں تنگ کرتے۔ پانچ دس منٹ پوچھ کر کے ...."

گوری نے سر ہلا کر ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ کمل بولا —— "پہلے کا زمانہ ہوتا تو کہا بھی نہیں جا سکتا، لیکن اب تو بے ایمانی ویمانی بھی نہیں ہوتی۔"

شکلدیپ بابو نے آنکھیں سکوڑ کر ہلکی ہلکی آواز میں پوچھا —— "بے ایمانی نہیں ہوتی نا؟"

"ہاں اب نہیں ہوتی۔ پہلے کی بات دیگر تھی۔ وہ زمانہ اب لد گیا" —— گوری نے جواب دیا۔

شکلدیپ بابو اچانک اپنی آواز پر زور دے کر بولے —— "اب کیسی بے ایمانی صاحب، گولی ماریئے۔ اگر بے ایمانی ہی کرنی ہوتی تو اتنی دیر تک انٹرویو ہوتا؟ انٹرویو میں بلایا ہی نہ ہوتا، اور اگر بلاتے بھی تو دو چار منٹ یوں ہی پوچھ پاچھ کر رخصت کر دیتے۔"

سب خاموش رہے۔ وہ مسکرا کر گھر میں چلے گئے۔

گھر پہنچتے ہی جمنا سے بولے —— "ببوا ابھی سے ہی کسی افسر کی طرح معلوم پڑتا ہے۔ دروازے پر ببوا، گوری، کمل باتیں کر رہے تھے۔ میں نے دور سے ہی غور سے دیکھا۔ نارائن بابو بولتے ہیں تو ان کے بولنے اور ہاتھ ہلانے میں افسری کی شان ٹپکتی ہے۔ ان کے دوستوں میں وہ بات کہاں۔"

"آج دوپہر مجھ سے کہہ رہے تھے کہ تجھے موٹر میں گھماؤں گا۔" جمنا نے خوشخبری سنائی۔

شکلدیپ بابو خوش ہو کر ناک سکیڑتے ہوئے بولے —— "ارے تو کیا اسے موٹر کی کمی ہوگی؟ گھومنا جی بھر کر۔" وہ یکایک چپ ہو گئے اور گم سم سے یوں مسکرانے لگے جیسے کوئی لذیذ شے کھانے کے بعد من ہی من اس کا مزا لے رہے ہوں۔

کچھ دیر بعد بیوی سے بولے —— "کیا کہہ رہا تھا، موٹر میں گھماؤں گا؟"

جمنا نے پھر وہی بات دہرا دی۔

شکلدیپ بابو نے آہستہ سے دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے مسکرا کر کہا —— "چلو اچھا ہے" —— ان کے چہرے پر ایک ایک سکون تھا۔ سات آٹھ روز میں نتیجہ نکلنے والا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ نارائن لے لیا جائے گا اور سبھی نتیجے کے منتظر تھے۔

اب شکلدیپ بابو اور بھی مشغول رہنے لگے۔ پوجا پاٹھ کا معمول ویسے ہی چلتا رہا۔ لوگوں سے بات چیت کرنے میں انہیں لطف آنے لگا تھا۔ بات چیت کے دوران میں وہ ایسی کیفیت پیدا کر دیتے تھے کہ لوگوں کو نارائن کے چناؤ کا پورا یقین ہو جاتا تھا۔ گھر میں چھپ چھپ کر نارائن کے دوستوں کی باتیں سنتے تھے اور زبردستی

آخرکار ان کی یہ مزاحیہ کوشش کامیاب ہوئی اور انھوں نے ڈبے کے سامنے پہنچ کر گاڑی کے باہر سر نکالے ہوئے نارائن کے ہاتھ میں ایک پڑیا پکڑاتے ہوئے کہا ——— "بیٹا اسے عقیدت سے سنبھال کر رکھنا۔ یہ بھگوان شنکر کا پرساد ہے۔"

پڑیا میں کچھ بتاشے تھے جو کل شام انھوں نے مندر میں چڑھائے تھے اور نہ جانے کیوں نارائن کو دینا بھول گئے تھے۔ نارائن کے دوست مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جب پاس آ گئے تو ایک پوچھ بیٹھا ——— "باوجی، کیا بات تھی، ہم سے کہہ دیتے ———"

شکلدیپ بابو یہ کہہ کر ٹال گئے کہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ محض چند روپے دینا تھے۔

امتحان ختم کر کے نارائن واپس لوٹ آیا۔ پرچے واقعی اچھے ہوئے تھے۔ گھر والوں سے اس نے اعلانیہ کہہ دیا کہ اگر بے ایمانی نہ ہوئی تو انٹرویو میں ضرور بلایا جائے گا۔ گھر والوں کی بات دیگر، جب محلے پڑوس والوں نے سنا تو انھیں یقین نہیں ہوا۔ لوگ طعنے دینے لگے ——— "ہر سال یہی کہتے ہیں بچو۔ وہ دوسرے ہوتے ہیں جو انٹرویو میں بلائے جاتے ہیں۔"

بات نارائن نے جھوٹ نہیں کہی تھی۔ ایک روز اس کے پاس خبر آ گئی کہ الہ آباد میں صوبائی تقرری کمیشن کے روبرو اسے انٹرویو دینا ہے۔

یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ کئی سال بعد اس شہر سے کوئی لڑکا ڈپٹی کلکٹری کے انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

شام کے وقت کچہری سے لوٹ کر شکلدیپ بابو آنگن میں آ کھڑے ہوئے اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ کھونٹی پر کوٹ ٹانگتے وقت لپک کر آتی ہوئی جمنا سے بولے ——— "اب کرو نہ راج۔ ہمیشہ شور مچائے رہتی تھی کہ یہ نہیں، وہ نہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ بیٹا انٹرویو میں بلایا گیا ہے۔ بس آیا ہی سمجھو۔"

"جب آ جائے تب ———" جمنا نے کنجوسی سے مسکرا کر کہا۔

شکلدیپ بابو کھل اٹھے۔ بولے ——— "تمھیں گویا اب بھی شک ہے۔ بیٹا ضرور لیا جائے گا، ضرور لیا جائے گا، ضرور لیا جائے گا۔ نہ لیا گیا تو میں اپنی مونچھیں منڈوا دوں گا۔ اور کوئی کہے یا نہ کہے، میں تو یہ بات پہلے سے ہی جانتا ہوں۔ ارے میں ہی کیا، سارا شہر کہتا ہے۔ امبیکا بابو وکیل مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہنے لگے کہ انٹرویو میں بلائے جانے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اگر انٹرویو کچھ اچھا ہو گیا تو بس چناؤ یقینی ہے۔ پیکو ناک میں دم آ گیا، جس نے سنا مبارکباد دینے چلا آیا۔"

"محلے کے لڑکے مجھے بدھائی دے گئے۔ جانکی، کمل اور گوری تو ابھی ابھی گئے ہیں۔" جمنا نے خوابیدہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے اطلاع دی۔

"تمھاری کوئی معمولی ہستی ہے۔ تم ڈپٹی کلکٹر کی ماں جو ہو۔" شکلدیپ بابو نے زوردار قہقہہ لگایا۔

جمنا آہستہ سے زیر لب مسکرا کر رہ گئی۔

جوتے نکال کر چارپائی پر بیٹھے ہوئے شکلدیپ بابو بولے ——— "ارے بھائی ہمیں تمھیں کیا لینا ہے۔ ایک گوشے میں بیٹھ کر رام نام جپیں گے۔ مگر میں تو ابھی کچھ سال اور مختاری کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ یہی مناسب رہے گا ———" گلا پھلا کر انھوں نے دو ایک مرتبہ مونچھوں پر تاؤ دیا۔

جمنا نے ان کے منصوبے کی مخالفت کی ——— "لڑکا مانے گا تھوڑے ہی۔ کھینچ لے جائے گا۔ ہمیشہ یہ دیکھ کر اس کی چھاتی پھٹتی رہی ہے کہ باوجی اتنی محنت کرتے ہیں اور وہ کچھ بھی مدد نہیں کر پاتا ہے ———"

"کچھ کہہ رہا تھا؟" ——— شکلدیپ بابو نے آہستہ سے پوچھا۔ بیوی کی جانب رخ نہ کر کے وہ دروازے کی طرف منہ پھلا کر دیکھنے لگے۔

جمنا نے تسلی دی۔ "میں جانتی نہیں کیا؟ اس کا چہرہ گواہی دیتا ہے۔ آپ کو اتنی محنت کرتے دیکھ کیا اسے اچھا لگتا ہے۔"

نارائن پندرہ روز بعد انٹرویو دینے گیا۔ انٹرویو بھی اچھا رہا۔ گھر واپس آیا تو اس کے چہرے سے ایک نیا عزم جھلک رہا تھا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ جہاں دوسرے لڑکوں کا انٹرویو محض پندرہ بیس منٹ ہوا وہاں اس سے پورے پچاس منٹ سوال و جواب ہوتا رہا اور اس کے جواب تسلی بخش رہے تو سب نے ایک رائے ہو کر مان لیا کہ

پڑے گا۔

شکلدیپ بابو بے فکری سے بولے "فکر نہ کرو۔ معمولی دست دستجار ہے۔ میں تو کچہری جانے والا تھا" مگر یہ سوچ کر رک گیا کہ مختاری تو اب چھوڑنی ہے۔ تھوڑا بہت آرام ہی کر لیا جائے۔"

"مختاری جب چھوڑنی ہوگی تب ہوگی۔ ابھی تو دو وقت کی دال روٹی کا انتظام کرنا ہے" ـــــ وہ جیسا متفکر تھی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہماری بیماری تو لگی ہی رہتی ہے۔ کوئی مٹی کا ڈھیلا تھوڑے ہی ہوں۔ بیماری اگر سخت ہوتی تو بھلا ایسے ٹھیک کر بولتا؟ ـــــ شکلدیپ بابو مسکرانے لگے۔

دو تین روز وہ بے چینی کے عالم میں رہے۔ کمزوری اس قدر تھی کہ دو چار قدم چلنے کے بعد ہی لیٹ جاتے تھے۔ شام کو اطلاع ملی کہ کیلاش بہاری مختار ملنے آئے ہیں۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھے۔ جھٹ پٹ چادر اوڑھی اور چھڑی لے کر بیوی کے منع کرنے کے باوجود بھی باہر آ گئے۔ بخار ابھی تھا۔ مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا۔

انھیں دیکھتے ہی کیلاش بہاری بولے ـــــ "ارے تم کہاں باہر آ گئے، مجھے ہی اندر بلوا لیتے۔"

"کچھ ہوا تھوڑے ہی ہے۔ آرام کرنے کی عادت ڈال رہا ہوں۔" ـــــ شکلدیپ بابو معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

حال چال پوچھنے کے بعد کیلاش بہاری نے سوال کیا۔ "نارائن نہیں نظر آ رہے ہیں۔ کیا کہیں، گھومنے گئے ہیں؟"

شکلدیپ بابو نے بناوٹی اداسی کے ساتھ جواب دیا۔ "ہاں گئے ہوں گے۔ لڑکے پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ کہیں لے گئے ہوں گے۔"

"خوب بھئی خوب۔ میں بھی اس لڑکے کو دیکھ کر اکثر سوچا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ تو دیکھنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے۔ چال ڈھال، طور طریقے ہی کچھ...... چلئے ہم سب ہی خوش قسمت ہیں" ـــــ کیلاش بہاری نے تعریف کی۔

ادھر ادھر دیکھ کر ـــــ شکلدیپ بابو بولے ـــــ "کہاں تک بتاؤں بھائی صاحب، اپنے منھ سے کیا کہوں۔ میں نے ایسا سیدھا لڑکا دیکھا ہی نہیں۔ مجھے بیسوں گھنٹے پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔ منھ کھول کر کوئی چیز مانگتا ہی نہیں۔"

کیلاش بابو نے بھی اپنے لڑکوں کی تعریف کی ـــــ "لڑکے تو میرے بھی سیدھے ہیں، مگر منجھلا لڑکا شو نا تھ بالکل گئو ہے۔ نارائن بابو جیسا ہی۔"

"نارائن تو اس زمانے کا کوئی رشی معلوم ہوتا ہے" شکلدیپ بابو نے تائید کی ـــــ "بس ایک ہی عادت ہے۔ میں اس کی ماں کو میوہ دے دیتا ہوں اور وہ اسے رات میں جگا کر کھاتا ہے۔ تم سے بتاتا ہوں بھائی، کہ بچپن میں ہم نے اس کا نام بنا لال رکھا تھا۔ ایک روز ایک مہاتما گھومتے پھرتے ہمارے گھر آئے۔ نارائن کا ہاتھ دیکھ کر بولے کہ اس کا نام بنا لال رکھنے کی ضرورت نہیں۔ بس آج سے نارائن کہو۔ اس کی قسمت میں راجہ ہونا لکھا ہے۔ پہلے زمانے کی بات دیگر، آجکل راجہ کا کیا مطلب ہے؟ ڈپٹی کلکٹر تو ایک معنی میں راجہ ہی ہوا ـــــ آنکھیں مٹکا کر انھوں نے مسکرانے کی کوشش کی اور ہانپنے لگے۔

دونوں دوست کافی دیر تک اپنے لڑکوں کی تعریفوں کے پل باندھتے رہے۔

گھر کے لوگ شکلدیپ بابو کی بیماری سے پریشان تھے مگر وہ یوں ہی کہہ کر ٹال دیتے تھے ـــــ "کچھ نہیں، دو ایک روز میں اچھا ہو جاؤں گا۔" ایک وید کی سستی دوا کھا کر دو تین روز میں وہ اچھے ہو بھی گئے، مگر کمزوری بہت تھی۔

جس روز ڈپٹی کلکٹری کا نتیجہ نکلا، اتوار کا دن تھا۔ شکلدیپ بابو صبح ناشتہ دیر جا پاٹھ سے فارغ ہو کر مندر چلے گئے۔ چھٹی کے دن وہ تین چار گھنٹے مندر میں رہتے تھے۔ آٹھ بجے وہ مندر پہونچ گئے۔ جس گاڑی سے نتیجہ آنے والا تھا وہ دس بجے پہونچتی تھی۔

پہلے تو کچھ دیر مندر کی سیڑھی پر بیٹھ کر وہ سستاتے رہے۔ جب اوپر آئے تو نند لال پنڈے نے جو جیسے ان گھس رہا تھا، نارائن کے نتیجے کے بارے میں پوچھ تاچھ کی۔ شکلدیپ بابو وہاں کھڑے ہو کر غیر معمولی تفصیل کے ساتھ سب کچھ بتانے لگے۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اندر جا کر بھگوان شنکر کے پنڈ کے سامنے انھوں نے ماتھا ٹیک دیا۔ کافی دیر تک وہ اسی حالت میں پڑے رہے۔

اُن کے دلوں میں گھسنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی کبھی نارائن کو اپنے باپ کی یہ حرکت بہت ناموزوں معلوم ہوتی تھی۔ رات میں شنکلدیپ بابو چونک کر اٹھ بیٹھتے تھے اور باہر آ کر کمرے میں لڑکے کو خوابیدہ حالت میں دیکھنے لگتے تھے یا آنگن میں کھڑے ہو کر آسمان کی جانب گھورنے لگتے تھے۔

ایک دن انھوں نے صبح ہی سب کو سنا کر زور سے کہا ——"نارائن کی ماں، میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ دیکھا کہ نارائن بابو، ڈپٹی کلکٹر ہو گئے ہیں ——"

جمنا رسوئی کے برآمدے میں بیٹھی چاول بین رہی تھی اور اس کے قریب ہی نارائن کی بیوی نرملا دال پھٹک رہی تھی۔

جمنا نے سر اٹھا کر سوال کیا —— "سپنا سویرے دیکھا تھا کیا؟"

"سویرے کے نہیں تو کیا شام کے سپنے کے بارے میں کہنے آؤں گا؟ بالکل برہم مہورت میں دیکھا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اخبار میں نتیجہ نکل گیا ہے اور اس میں نارائن بابو کا بھی نام ہے۔ اب یہ یاد نہیں کہ کون سا نمبر تھا، مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نام کافی اوپر تھا ——"

"اماں جی، سویرے کا سپنا بالکل سچا ہوتا ہے نا؟" نرملا نے آہستہ سے جمنا سے کہا۔

شاید نرملا کی آواز شنکلدیپ بابو نے سن لی تھی۔ مسکرا کر بولے ——"کون بول رہا ہے، ڈپٹیائن ہیں کیا؟" اور ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔

"ہاں، کہہ رہی ہے سویرے کا سپنا سچا ہوتا ہے ——" جمنا نے جواب دیا۔

نرملا شرم سے سکڑ گئی۔ بدن کو سکوڑ کر اور پیٹھ نیچے جھکا کر اپنے چہرے کو دونوں گھٹنوں میں چھپا لیا۔ اگلے روز شنکلدیپ بابو نے دوبارہ ویسے ہی سپنے کی اطلاع دی۔

"سویرے کا سپنا ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔" جمنا بولی۔ "جب ببو کو لڑکا ہونے والا تھا، میں نے سویرے سویرے سپنا دیکھا کہ سورگ سے کوئی دیوی ہاتھوں میں لڑکا لیے آسمان سے آنگن میں اتر رہی ہے۔ بس، میں نے سمجھ لیا کہ لڑکا ہی ہے، اور لڑکا ہی نکلا ——"

شنکلدیپ بابو نے جوش میں آ کر کہا —— "اور ہاں، جھوٹ ہے، تو یہ سپنا ایک دن دکھائی پڑتا، دوسرے دن بہو ویسا ہی سپنا کیوں دکھائی دیتا؟ ——"

"بہو نے بھی ایسا ہی سپنا آج سویرے دیکھا ہے۔"

"ڈپٹیائن نے بھی؟ ——" شنکلدیپ بابو نے چٹکی لی۔

"ہاں، ڈپٹیائن نے بھی۔ ٹھیک سویرے انھوں نے دیکھا کہ ایک بنگلے میں ہم لوگ رہ رہے ہیں اور ہمارے دروازے پر موٹر کھڑی ہے۔" جمنا نے جواب دیا۔

شنکلدیپ بابو کھڑے کھڑے مسکراتے رہے۔ پھر بولے —— "اچھی بات ہے، اچھی بات ہے۔"

ایک دن رات میں تقریباً ایک بجے شنکلدیپ بابو نے اٹھ کر بیوی کو جگایا اور اس کو الگ لے جاتے ہوئے بولے —— "کہو بھائی، کچھ کھانے کو ہوگا؟ بہت دیر سے نیند ہی نہیں آ رہی ہے۔ پیٹ کچھ مانگ رہا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ جانے دو بھلا یہ کوئی کھانے کا وقت ہے مگر بن نہ پڑا تو تمہیں جگایا۔"

جمنا حیرت زدہ خاوند کو تک رہی تھی۔ اتنی لمبی ازدواجی زندگی میں آج تک شنکلدیپ بابو نے اس طرح اسے جگا کر کھانا نہیں مانگا تھا۔ جھنجھلا کر بولی —— "ایسا پیٹ تو کبھی نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہ رسوئی گھر میں کچھ ہے بھی یا نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم سو جاؤ۔ بھوک نہیں ہے، یوں ہی مذاق کیا تھا ——"

ابھی کمرے میں لیٹے ہی تھے کہ جمنا ایک تشتری میں ایک روٹی اور تھوڑا سا گڑ لے آئی۔ شنکلدیپ بابو اٹھ بیٹھے۔ پوجا پاٹھ، کچہری، اِدھر اُدھر مٹرگشتی کے بعد اب شنکلدیپ بابو اکثر کچھ نہ کچھ کھانا مانگ بیٹھتے تھے۔ کبھی روٹی گڑ، کبھی چنے چبینے اور کبھی شکر ہی پھانک جاتے تھے۔ کبھی کھچڑی کی فرمائش کرتے، کبھی ستو پیاز کی۔ فالتو وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کی سوجھتی رہتی تھی۔ اس بدپرہیزی اور کشمکش میں بیچارے بیمار پڑ گئے۔ دست و بخار میں مبتلا رہنے لگے۔

ان کی بیماری سے گھر والے فکرمند ہو گئے۔ جمنا گلوگیر آواز میں بولی —— "بار بار کہتی تھی کہ اتنی محنت نہ کرو۔ اب بھگتنا

سانس گلے میں اٹک اٹک جارہی تھی پہلے انھوں نے ڈیوڑھی سے ہی سر بڑھا کر کمرے میں جھانکا۔ باہر کا دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ پہلے تو کچھ نظر نہ آیا اور ان کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کچھ آگے بڑھ کر غور سے دیکھا ——— چارپائی پر کوئی دونوں ہاتھ باندھے چت لیٹا تھا۔ وہ نارائن ہی تھا۔

آہستہ سے دبے پاؤں چوروں کی مانند وہ کمرے میں داخل ہوئے میز کے پاس چپ چاپ کھڑے ہو کر ایک کتاب الٹنے لگے۔ وہ ایک منٹ بعد تیزی سے بیٹھ گئے اور چارپائی کے نیچے جھانک کر دیکھنے لگے۔ نارائن کی چپل اٹھا کر الٹتے پلٹتے رہے پھر وہیں رکھ دی۔ آخرکار سانس روک کر آہستہ سے اس طرح اٹھے جیسے کسی شے کی تلاش کرنے آئے تھے مگر اس میں ناکامیاب ہو کر واپس لوٹ رہے ہوں۔ کھڑے ہوتے وقت نارائن کا چہرہ آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ وہ چپ چاپ پڑا تھا۔ شکلدیپ بابو ڈر گئے اور کلپتے دل سے اپنا بایاں کان نارائن کے منھ کے بالکل قریب کر دیا۔ اس وقت ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا جب اپنے لڑکے کی سانس چلتی پائی۔

اب وہ چپ چاپ جیسے آئے تھے ویسے ہی باہر نکل آئے! نہ معلوم کب سے جمنا دروازے پر کھڑی اندر جھانک رہی تھی۔ خاوند کا چہرہ دیکھ کر گھبرا کر پوچھا ——— "کیا بات ہے؟ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے؟"

شکلدیپ بابو نے اشارے سے اسے بولنے کو منع کر دیا اور اسے ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

کمرے میں پہونچ کر جمنا نے خاوند کو فکرمندانہ نظروں سے دیکھا۔ شکلدیپ بابو خوشی سے بولے ——— "بوا سو رہے ہیں۔"

وہ آگے کچھ نہ بول سکے۔ ان کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگے۔

تیری اجڑی ہوئی جنت کا بسانے والا
وہی غصّہ میں نکالا ہوا انساں نکلا
(آنند نرائن ملّا)

اس کے بعد چاروں طرف گھوم گھوم کر گھنٹے بجائے اور زور زور سے منتر پڑھے گئے۔ باہر نکلے تو کہا سرجنگ بہادر سنگھ مل گئے۔

شکلدیپ بابو کو دیکھ کر حیرت سے بولے ـــــ "ارے مختار صاحب گھر نہیں گئے؟ ڈپٹی کلکٹری کا نتیجہ تو نکل گیا۔"

شکلدیپ بابو کا دل دھک سے رہ گیا۔ ان کے ہونٹ کانپنے لگے اور بڑی مشکل سے مسکرا کر پوچھا ـــــ "اچھا، کب آیا؟"

"ارے دس بجے کی گاڑی سے آیا۔ نارائن بابو کا نام ہے تو ضرور مگر ...... " وہ کچھ آگے نہ بول سکے۔

شکلدیپ بابو کا دل زوروں سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اپنے سوکھے لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے بڑی نحیف آواز میں بولے ـــــ "کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان کا نام تو ہے ہی، یہ ہے کہ ذرا نیچے ہے۔ دس لڑکے لیے جائیں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا نام سولھواں سترہواں پڑے گا۔ لیکن کوئی فکر کی بات نہیں۔ کچھ لڑکے تو کلکٹری میں چلے جاتے ہیں اور کچھ میڈیکل میں نہیں آتے۔ اس طرح پوری امید ہے کہ نارائن بابو ہی لیے جائیں گے۔"

شکلدیپ بابو کا چہرہ فق پڑ گیا۔ ان کی ٹانگوں کی قوت جیسے سلب ہو چکی تھی۔ جنگ بہادر سنگھ مندر میں چلے گئے، وہ کافی دیر تک سر جھکائے یوں کھڑے رہے گویا کوئی معمولی بات یاد کر رہے ہوں۔ پھر چونک پڑے اور تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ دھیمے لہجے میں تیزی سے ان کی زبان سے شیو شیو نکل رہا تھا۔ آٹھ دس گز آگے بڑھنے پر انھوں نے اپنی چال اور تیز کر دی۔ جلد ہی بے حد تھک گئے اور ایک پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔ چار پانچ منٹ ستانے کے بعد پھر چلنا شروع کر دیا۔ ہلکے سے جھونکے کی زد میں اڑنے والے تنکے کی طرح وہ ڈگمگاتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے سلام بھی کیا مگر انھوں نے دیکھا نہیں۔ کچھ لوگوں نے انھیں دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں مگر وہ بے خبر رہے۔ انھیں گھر پہنچنے کی دھن تھی۔

گھر پہنچ کر اپنے کمرے میں چارپائی پر دھم سے بیٹھ گئے۔ منہ سے صرف اتنا ہی نکلا ـــــ "نارائن کی اماں" ـــــ "سارے گھر پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے صحن میں گندا پانی، مٹی اور اُدھر سے اڑ کر آئے ہوئے سوکھے پتے اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ نالی کی بدبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ دہلیز میں پرانی بانس کی چارپائی پر ڈھیروں میلے کپڑے پڑے تھے اور رسوئی گھر سے اٹھتا ہوا دھواں دم گھونٹ رہا تھا۔ کہیں کوئی کھڑبڑ کی آواز نہیں تھی جیسے سارا گھر عالمِ تنہائی میں ڈوبا ہو۔

جلد ہی جمنا کمرے میں آئی اور گھبرا کر پوچھا ـــــ "طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

شکلدیپ بابو نے قدرے جھنجھلا کر جواب دیا ـــــ "مجھے کیا ہوا ہے؟ پہلے یہ بتاؤ کہ نارائن جی کہاں ہیں؟"

جمنا نے باہر کے کمرے کی جانب اشارہ کر کے بتایا ـــــ "اسی میں پڑے ہیں۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ کچھ سنتے ہیں۔ میں نزدیک گئی، تو گم سم بنے رہے۔ میں تو ڈر گئی ہوں۔"

شکلدیپ بابو نے مسکراتے ہوئے تسلی دی ـــــ "ارے کچھ نہیں، سب ٹھیک ہو گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ بوا سے تم نے یہ تو نہیں بتایا کہ ان کی فیس اور کھانے پینے کے لیے میں نے چھ سو روپے قرض لیے ہیں؟ میں نے تمھیں منع کر دیا تھا کہ کسی بھی صورت میں بوا کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے ـــــ"

"میں ایسی بیوقوف تھوڑے ہی ہوں"، جمنا بولی۔ "لڑکے نے ایک دو مرتبہ کھود کھود کر پوچھا بھی تھا کہ اتنے روپے کہاں سے آتے ہیں؟ ایک مرتبہ تو اس نے یہاں تک کہا تھا کہ پھل، دودھ، میوہ وغیرہ بند کر دو۔ بابو جی بیکار میں اتنی فضول خرچی کر رہے ہیں۔ مگر میں نے یہ سمجھا کر ٹال دیا کہ تم محنت کرتے رہو بس۔ بابو جی کو ادھر کافی نقدے مل رہے ہیں۔"

شکلدیپ بابو بچے کی طرح خوش ہو کر بولے ـــــ "بہت اچھا۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ بھگوان سب کلیان کریں گے۔ بوا کمرے ہی میں ہیں نا؟" ـــــ

جمنا نے سر ہلا دیا۔

شکلدیپ بابو مسکراتے ہوئے اٹھے۔ ان کا چہرہ دبلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں دھنس گئی تھیں اور مونچھیں چہرے پر جھاڑو جیسی بکھر کر بے ڈھنگی ہو گئی تھیں۔ جمنا سے یہ کہہ کر "میں ابھی آیا"، وہ دبے پاؤں باہر کے کمرے کی طرف بڑھے۔ ان کے پاؤں کانپ رہے تھے اور سارا جسم لرز رہا تھا۔

ٹھاکر پرساد سنگھ

۱۲ کہانیاں

اردو کی کہانیاں پڑھنے والوں کے سامنے آج جب میں ہندی کی کچھ کہانیاں پیش کر رہا ہوں تو میرے دل میں کئی طرح کے خیال اٹھ رہے ہیں۔ ابھی اس دن اردو کی ایک خاتون افسانہ نگار سے اسی مسئلہ پر بات چیت کر رہا تھا تو بات ہی بات میں دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو والوں کے سامنے ہندی کہانی کیا کچھ لے کر حاضر ہو۔

جہاں تک قصہ گوئی کا سوال ہے اردو والے کسی بھی حالت میں ہندی والوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سب کہانیاں اردو والے اچھی لکھ لیتے ہیں۔ پر یہاں جو کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں وہ کسی بھی حالت میں بہت دلچسپ کہانیاں نہیں ہیں۔ خاص طور سے ایسی کہانیاں جو اردو کے ادیبوں نے ادھر چند برسوں سے ہندی کے رسالوں میں چھپوائی ہیں، ویسی تو یہ کہانیاں ہرگز نہیں، پچھلے چند برسوں میں اردو کی جو کہانیاں میں نے پڑھی ہیں ان میں اس رجحان کی بہتات سے میں کسی قدر گھبرا بھی گیا ہوں۔ میرے خیال میں اردو کی یہ کہانیاں ہندی کی کہانی سے الگ تو ہیں ہی لیکن وہ راجندر سنگھ بیدی ایسے لکھنے والوں سے بھی دور چلی گئی ہیں اور ان روایات کے دائرہ سے بھی باہر جا پڑی ہیں جنھیں ترقی پسند کہا جاتا ہے۔

یہاں تک تو خیر ٹھیک ہے کیونکہ ہندی کہانی بھی اوپیندر ناتھ اشک کی طرح کے افسانہ نگاروں کے سایے سے الگ ہو گئی ہے اور پرانے ادیبوں کا اثر بھی کم سے کم رہ گیا ہے۔ لیکن اردو کہانی کی طرح وہ رومانی خیالات کی طرف نہیں مڑ گئی ہے، اس نے اپنی نظر مستقبل کی طرف رکھی ہے اور اس پر گزرے ہوئے کل کے ہاتھ سے چھوٹ جانے کا غم بھی طاری نہیں ہوا ہے۔ ہندی کہانی پچھلے دس پندرہ سال سے بڑی سنجیدگی سے آگے بڑھی ہے اور انہیں ماضی یا حال کے مقابلے میں جو کچھ سامنے ہے اس کو گہرائی تک سمجھنے کی کوشش ابھر کر کافی حد تک سامنے آگئی ہے۔

نئی ہندی کہانی نمبر میں جہاں فنیشور ناتھ رینو کی طرح لکھنے والے بھی ہیں جو اپنی کہانی کا تانا بانا بالکل نئی طرح بنتے ہیں، وہاں امرکانت جیسے لکھنے والے بھی ہیں جو پریم چند کی ہی زمین پر اپنی تخلیق کی بنیاد رکھتے ہوئے مڈل کلاس کی ٹریجڈی کو اپنے قلم کی طاقت سے اور موثر بنا کر پیش کرتے ہیں۔ گاؤں کی زندگی کا ایک پہلو وہاں میری کہانی میں ابھرتا ہے۔ جہاں ایک روٹھا ہوا آدمی ماضی کے تحفظ کے لیے آخری لڑائی لڑ رہا ہے۔ یہ لڑائی اپنے میں اتنا معاشی گہرائی اور گیرائی نہیں رکھتی جو اس ٹریجڈی کو ابھارنے میں گاؤں کا ایک بہت بڑا طبقہ برداشت کر رہا ہے۔ اسی طرح راجیندر یادو، رمیش بخشی، موہن راکیش، کم و بیش ایک ہی طرح کی شہری زندگی کی باریکیوں پر غور کرتے ہیں اور آدمیوں کے اس گھنے جنگل کو جسے ہم شہر کہتے ہیں اپنی خوردبین کے سامنے لے آتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی طرف سے کوئی فیصلہ دیے بغیر کہانی بیچ ہی میں ختم کر دیتے ہیں لیکن اس سے پڑھنے والوں کو بات سمجھنے میں کوئی خاص دقت نہیں ہوتی۔ اس طرح کی سب سے اچھی کہانیاں رگھوویر سہائے اور کنور نارائن نے لکھی ہیں۔ آدمی آدمی کے آپس کے رشتوں کو لے کر جس سطح پر ہندی کہانی سوچ بچار کر رہی ہے میرے خیال میں ابھی اردو کہانی کی نظر اس طرف نہیں گئی ہے۔ میرے اور منگر عورت کے بیچ" نامی کہانی پر آپ غور فرمائیں۔ اس کہانی کو پہلی نظر میں دیکھتے ہی آپ چونکیں گے لیکن پوری کہانی پڑھنے کے بعد آپ کو محسوس ہوگا کہ جیسے رگھوویر سہائے نے آپ سے ایک غلط نام دے کر ایک کہانی پڑھوالی ہے اور آپ کو بالکل دھوکا ہو گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جسم سے متعلق ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی کہانیوں کے مقابلے میں چھوٹی سی کہانی ذرا غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ یہ بات آپ کے دل کی ہے کہ نہیں۔ ہم دھیرے دھیرے چل کر اب جہاں تک پہنچ گئے ہیں اور ہمارے رشتے جس حد تک بن یا بگڑ گئے ہیں ان کو صحیح طور سے دیکھنے پرکھنے کی جتنی ضرورت ہندی کہانی محسوس کر رہی ہے اتنی شاید نہ تو ہندی شاعری کر رہی ہے اور نہ ہندی ناول۔

سچ پوچھیے تو ہندی کی آج جو کچھ بھی نئی زبان ادھر بنی ہے اس کے بننے یا بگڑنے کی بہت بڑی ذمہ داری ہندی کہانی پر ہے۔ میری بات اسی وقت سمجھ میں آئے گی جب آپ یشپال اور کنور نارائن کی ایک ایک کہانی کو الگ الگ رکھ کر پڑھیں۔ ہندی کہانی کی یہ

ماہنامہ کتاب لکھنؤ

شوکت تھانوی نمبر

مرتب: احمد جمال پاشا

کا

ایک خاکہ

- شوکت تھانوی کا ایک غیر مطبوعہ ڈرامہ۔
- شوکت تھانوی کے کارٹون، تصاویر اور عکس تحریر۔
- شوکت تھانوی کے مضامین، افسانوں، پیروڈی، خاکوں، ڈراموں، لطیفوں اور سنجیدہ نظم و نثر کا باغ و بہار انتخاب
- شوکت تھانوی کے فن اور شخصیت پر مولانا عبدالماجد دریابادی، سید احتشام حسین، ابراہیم جلیس، عشرت رحمانی، محمد طفیل (مدیر نقوش)، نسیم انہونوی، عابد سہیل اور احمد جمال پاشا اور ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر انگیز مضامین
- خوبصورت سرورق، ۱۲۰ صفحات۔

قیمت صرف ایک روپیہ

شوکت تھانوی نمبر

مفت حاصل کرنے کے لیے مد رسالہ ۶ روپے بھیج کر آج ہی خریدار بن جائیے۔

صرف شوکت تھانوی نمبر حاصل کرنے کے لیے ایک روپے کے ٹکٹ بھیجیے۔

مینیجر ماہنامہ کتاب چوک لکھنؤ ۳

غزل اُردو کی آبرو ہے
غزل کی آبرو

"نوائے کفر" منوّر لکھنوی

کی غزلیات کا پہلا انتخاب قیمت ڈھائی روپے
چار رنگا سرورق کتابت طباعت اعلیٰ

ملنے کا پتہ:- آدرش کتاب گھر، ۲۹-۲۸ فیض گنج دریا گنج دہلی ۶

ایک گزارش

اپنے باذوق دوستوں کے پتے ہمیں ارسال کیجئے۔ ہم انھیں نمونہ کا پرچہ بھیجیں گے۔ اور اگر آپ اجازت دیں گے تو آپ کی طرف سے "کتاب" کی خریداری قبول کرنے کی درخواست بھی کریں گے۔

مینیجر ماہنامہ "کتاب" چوک لکھنؤ ۳

بہت بڑی دین ہے اور آزادی کے بعد تھوڑی بہت جو خصوصیتیں ہندستانی ادب میں ابھری ہیں ان میں سے یہ ایک ہے۔

کوئی بھی ترجمہ اصل مضمون کی تمام خصوصیات کا آئینہ دار نہیں ہو سکتا چاہے وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اگر ان کہانیوں میں آپ کو اصل کی ایک ہلکی جھلک بھی مل سکی تو آپ میری بات کی تائید کریں گے۔

ہندی کہانی پہلے کے مقابلہ میں پڑھی بھی کم نہیں جا رہی ہے۔ اس کا بازار ادھر کافی جما ہوا ہے۔ اور کم سے کم دس رسالے ہندی کے ایسے ہیں جو صرف کہانیاں چھاپتے ہیں۔ ان رسالوں کے خریدنے والوں کی تعداد کل ملا کر کسی بھی حالت میں پانچ لاکھ سے کم نہیں ہے اس کے علاوہ بھی کچھ ایسے اخبار ہیں جو زیادہ تر کہانیاں ہی چھاپتے ہیں اور وہ بھی خوب بکتے ہیں۔ کہانی لکھنے والوں کی بازار میں مانگ بھی ہے اور جو کچھ بھی بھلا برا لکھا جاتا ہے وہ کھپ بھی جاتا ہے۔ اس بھیڑ بھاڑ سے ہندی کہانی کو ایک خطرہ بھی درپیش ہے اور وہ یہ کہ اس طرح سے لکھی جانے والی کہانیوں کا معیار بہت بلند نہیں ہے اور لوگ کہنے لگے ہیں کہ ہندی کے مشہور لکھنے والوں کی چیزیں زیادہ پڑھی نہیں جاتیں لیکن یہ بات ابھی پورے طور سے صاف نہیں ہوئی ہے۔ ہم اگلے برسوں میں اسی بات پر نئے سرے سے غور کریں گے۔

ماہنامہ

نیا دور

لکھنؤ

جلد (۳) نمبر (۴)

زرِ سالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں
۶½ روپے
قیمت
۵۰ نئے پیسے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

مجلس مشاورت
حیات اللہ انصاری
سید احتشام حسین
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر: سید جمیل احمد
مطبوعہ: نظامی پریس، لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: کتاب، چوک لکھنؤ ۳

پاکستان آفس
مسٹر نعیم اکبر خاں، الائڈ فوٹوگرافرس (پاکستان لمیٹڈ)
۲/۶، موتی جھیل، کمرشل ایریا۔ ڈھاکہ

ماہنامہ کتاب لکھنؤ

اگست ۱۹۶۴ء

اپنی باتیں

اس بار ہم جشن آزادی پہلی بار پنڈت نہرو کے بغیر منا رہے ہیں۔

ابھی پنڈت جی کو ہم سے بچھڑے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں کہ ہم اس بات کا جائزہ لے سکیں کہ ہم ان کے بتلائے ہوئے راستے پر چل رہے ہیں یا نہیں تاہم یہ اندازہ تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ اس دوران ہم نے جو اقدام کیے ہیں، جو فیصلے کیے ہیں اور اپنے لیے جس منزل کا تعین کیا ہے وہ پنڈت نہرو کے خواب سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہے۔

لیکن اس مختصر سے وقفہ میں کچھ ایسی باتیں بھی ہوئی ہیں جن سے اس ثابت قدمی، استقامت اور دلجمعی کی بو باس نہیں آتی جس کی توقع کی جاتی تھی۔ اگر ہم نے اپنی اس کمزوری پر جلد ہی قابو پا لیا تو وہ طاقتیں جو اب تک پنڈت نہرو ایسی مقبول شخصیت کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں ہمارے سارے خواب مسمار کر دیں گی۔

۱۵ اگست اپنے کارناموں پر بجا طور سے فخر کرنے، اپنی خامیوں کے احتساب اور سوشلسٹ اور جمہوری ریاست کے قیام کی کوششوں اور تمام فرقوں سے مساویانہ سلوک کے عہد کے اعادہ کا دن ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر خود ہم نے اپنے خوابوں سے بدعہدی نہ کی تو جلد ہی منزل خود ہمارے قدم چھو لے گی۔

کتاب، لکھنؤ

بہار کے وزیر اعلا شری کرشنا ولبھ سہائے نے ریاستی اسمبلی میں الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ میرے بیٹوں نے میری پوزیشن سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا ———— آپ خوش قسمت ہیں آپ کے بیٹے کیرون کے بیٹوں سے زیادہ سمجھ دار نکلے ————

راجستھان اسمبلی میں غذائی قلت پر مباحثہ کے دوران ایک ممبر اسمبلی نے بتایا کہ خوشحال گڑھ تحصیل میں لوگ گیہوں کے بجائے گھاس کھا رہے ہیں ———— اندازہ لگائیے کہ اور تحصیلوں کا کیا حال ہوگا؟

ایک خبر کے مطابق ملنے کے تاجر سپاری ہوئی دھنیا میں لید ملا کر فروخت کر رہے ہیں ———— یعنی آزادی کا ایک معمولی کرشمہ۔

سیاسی سرجن

پوسٹ مارٹم

یو پی کانگرس کے منتخب صدر مسٹر ترپاٹھی، مرحوم صدر مسٹر سی، بی گپتا سے انتخاب کے بعد ملنے گئے۔ ——— یعنی "مرے پہ سو دُرّے"

مسٹر ترپاٹھی نے مسٹر گپتا کو تین ووٹ سے شکست دینے کے بعد اپنی ایک تقریر میں عہد کیا کہ وہ یو پی کانگرس سے گروہ بندی ختم کر کے دم لیں گے۔
——— جی ہاں!

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

لکھنؤ میں مسلم اکابرین کے اجتماع میں اتحاد کی اپیل کے فوراً بعد شیعہ سنی جھگڑا ——— اتحاد معکوس کا اعلیٰ نمونہ۔

یو پی کے نائب وزیر رام نرائن پانڈے نے یو پی کونسل میں خوشخبری سنائی کہ ۶۵-۱۹۶۴ء میں یو پی کی ڈیڑھ ہزار دیہی بستیوں میں بجلی پہونچانے کا منصوبہ ہے ——— یو پی کی پسماندگی کو روشنی میں لانے کے لیے

دہلی سے یو پی میں گیہوں اور شکر کی اسمگلنگ کرتے ہوئے گزشتہ چند ہفتوں میں تین سو آدمی گرفتار کیے گئے ——— یعنی "الٹے بانس بریلی جائیں"

وزیر داخلہ شری نندا نے کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کے جلسے میں کہا کہ وزیروں کی بدعنوانی کی فوری تحقیقات کانگرس کو بدنامی سے بچانے کے لیے ضروری ——— لیکن وزیروں کو ہارٹ فیلیور سے بچانے کے لیے اختلاج کا علاج اس سے زیادہ ضروری۔

سرکاری تجارت اور منصوبہ بندی ملک کے لیے مضر، چیمبر آف کامرس کے صدر مسٹر دیپا گھوش کا سالانہ کانفرنس میں خطبہ ——— تاکہ آزاد تجارت کے نام پر آزادی سے لوٹ کھسوٹ ہو سکے۔

کتاب، لکھنؤ

بارش سے ٹھیک پہلے پیاسی دھرتی کا عالم انتظار، پہلے چھینٹے کے بعد بھیگی مٹی کی سوندھی خوشبو، ہری ہری گھاس میں زندگی کی لہر، سیاہ بادل جن سے صبح کا آسمان دھندلا جاتا ہے اور جو شام کے سایوں میں جادو بھر دیتے ہیں، رات کے سناٹے میں بارش کی رم جھم رم جھم یہ اور دوسری تصویریں ان کی حسین شاعری میں جاگ اٹھتی ہیں۔ انھوں نے فطرت اور انسان کو ایک کر دیا ہے۔ زمین سے کبھی اپنی شدید محبت کا اظہار کیا ہے اس لحاظ سے وہ ورڈس ورتھ کا ہم پلہ ہے۔ انھوں نے دھرتی کو اس لئے پیار کیا کہ وہ آدمی کا وطن ہے انسانی دل کی شاید ہی کوئی تمنا اور خواب ہو جس نے ان کے تخیل و وجدان میں تھرتھری نہ پیدا کر دی ہو۔ اپنی نظم ارض شیریں کی خاک میں انھیں جذبات کا اظہار کیا ہے سے یہ جنت ارض خوشگوار ہے، میں نے دل میں اسے اتار لیا ہے۔ یہ جہاں مشترکہ زندگی کی آواز ہے"!

نئی بارش ان کی بڑی پیاری نظم ہے "بے چین آسمان کی طرف امنگوں کے ساتھ دیکھنا نہ جانے کس سے کچھ مانگ رہا ہے۔ دل میرا ناچتا ہے آج مور کی طرح ناچتا ہے، دوڑتی آ رہی ہے بادلوں کی دھارا۔ نئے دھان کے سب پودے جھوم رہے ہیں"!

ٹیگور نے دنیا کو محض ایک اسٹیج نہیں سمجھا وہ کوئی سنیاسی اور تارک الدنیا نہیں تھے ایک نظم میں کہتے ہیں "چھوڑوں گا نہیں میں گھر، نکلوں گا نہیں باہر، تارک الدنیا سنیاسی ہو کر۔

وہ بڑا شاعر ہی نہیں موجودہ عہد کا بہت بڑا مشرقی صوفی بھی تھا اس کا تصوف اس کے کلام میں جاری و ساری ہے "میرے مالک

میرے مطرب مطرباں، تیرے حضور میں

میری شاعرانہ نخوت مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی ہے"

وہ ایک ایسا شاعر اور مفکر تھا جس نے شاعری کو رنگ و نسل کے امتیاز اور فرقہ پرستی کے قدموں میں ڈال کر ذلیل نہیں کیا!" کے موضوع پر گیتانجلی میں اس کا بڑا خوبصورت گیت "زیارت گاہ ہند" ہے۔ وہ ایسا صوفی تھا جس نے دنیا سے کبھی رشتہ نہ توڑا۔ وہ ویراگ کا دشمن تھا۔

"مندر کے ایک تاریک ویران گوشہ میں سارے دروازے بند کیے تو کس کی عبادت کر رہا ہے۔ آنکھیں کھول اور دیکھ کیا تیرا خدا تیرے سامنے موجود نہیں۔ وہ وہاں ہے جہاں مزدور زمین کھودتا ہے، وہ وہاں ہے جہاں سڑک بنانے والا پتھر پھوڑ رہا ہے وہ دھوپ اور بارش میں انھیں کے ساتھ ہے۔ تو اپنے مقدس لباس کو اتار پھینک اور اسی کی طرح غبار آلود زمین پر اتر آ"!

جذبات کی بڑی سچی اور جاندار تصویریں ان کے گیتوں میں ہوتی ہیں "خواب آبشار" اپنی دلکش موسیقی اور تاثر کی وجہ سے دنیا کے حسین ترین گیتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اس میں کائنات اور انسان کو وحدت اور یکتا کے رشتے میں منسلک کر دیا گیا ہے۔

"کھلکھلا کر ہنستے ہوئے، جھنکار بھرے گیت گاتے ہوئے ہر تال پر تالیاں بجاؤں گا۔ کتنی داستانیں ہیں، کتنے گیت ہیں، کتنی کسک بھری امنگیں ترنگیں ہیں، کتنے سکھ ہیں" کتنی آرزوئیں ہیں، خواب ٹوٹ چکا ہے روح جاگ چکی ہے۔

شروع میں سنسکرت کی تلمیحات اور صوفی جھنکار کا استعمال ملتا ہے آخری دور کے گیت نرم اور آسان زبان میں ہیں۔ قوت احساس، بیان اور روحانی خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ اس کی بصارت افروزی تعجب میں ڈال دیتی ہے گیتانجلی کے علاوہ "گارڈنر" "ماہ نو" اور "حلقہ بہار" مشہور ہوئے۔ گیتانجلی کی نظموں کا موضوع روزمرہ زندگی اور عام تجربات سے لیا گیا ہے۔ انھوں نے جس مخصوص تجربہ کو چھوا وہ نیا ہو گیا۔ غلط روایات کے خلاف طنزیہ نظمیں لکھیں جن میں انسان دوستی نمایاں ہے۔ حب وطن سے لبریز نظموں میں بھی نوع انسانی کی تمناؤں اور آرزوؤں کا ذکر ہوا ہے۔ بنی نوع انسان میں وحدت کا احساس جتنی خوبصورتی کے ساتھ ہمارے قومی ترانے جن گن من میں ہوا ہے۔

نجمہ محمود

ٹیگور — ایک شاعر، ایک مغنی

بڑا شاعر، بڑا فنکار مدتوں بعد جنم لیتا ہے۔ ہزاروں سال جب نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے تب چمن میں کوئی دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔
فنکار کا یہ فرض ہے کہ وہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے، بیداری اور جوش کے گیت گائے اور شاعری کو پیمبری کا جزو بنائے ٹیگور ایک ایسا
ہی فنکار تھا۔ ہندوستان ہی نہیں وہ ساری دنیا کا شاعر تھا وہ انسانیت کے گیت گانے والا مغنی تھا۔ شلی کہتا ہے "شاعر ایک بلبل ہے جو
تاریکی میں بیٹھتا ہے اور اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے بڑی میٹھی آواز میں گیت گاتا ہے۔" ٹیگور کے نغموں میں وہی مٹھاس ہے، وہی
شیرینی اور درد ہے جو بلبل کے نغموں میں ہوتی ہے۔

وہ ایسا شاعر ہے جس کو مشرق و مغرب کی تہذیبوں سے سیراب ہونے کا موقع ملا ہے۔ اس کی شخصیت میں قدیم و جدید کا سارا حسن اپنی
تمام دلفریبیوں رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ وہ بنگالی برہمنوں کے اس خاندان کا چشم و چراغ ہے جہاں ہندو مذہب اور اسلام، سنسکرت
فارسی، انگریزی، وید، اپنشد، حافظ و رومی، بائرن و شیلی کے اثرات جذب ہیں۔

ٹیگور کی شخصیت کی ہمہ گیری اس کے فن میں جھلکتی ہے۔ اس کی پہنچ ان بلندیوں تک ہے جہاں بڑے سے بڑے آدمی نے قدم رکھا
ہوگا۔ وہ اپنے عہد سے متاثر ہے اور اس نے اپنے عہد کو متاثر بھی کیا ہے۔ اس نے قدیم ہندوستانی روایات کو ترک کیے بغیر جدید تہذیب کو اپنایا۔
پدما ندی کے کنارے قیام نے بھی ان کو اپنی قومی زندگی سے وابستہ کیا۔ اس علاقہ کی تہذیب قدیم ہندوستانی تہذیب کا بہترین مرقع تھی اس طرح
ان کی رسائی عوامی زندگی کے اس وسیع خزانے اور تہذیب کی اس منزل تک ہوئی جس نے ان کی تخلیقی قوت کو اس درجہ بیدار کر دیا۔
ٹیگور وحدت کے قائل تھے۔ وہ فن اور زندگی کو ایک ہی سمجھتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام انھوں نے جو پیغام بھیجا تھا اس سے
اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ٹیگور نے سماج کی نبض پر ہاتھ رکھا، اس کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہم حسن
اور سچائی کے متلاشی ہیں تو ہم کو پہلے "انا" کی کینچلی اتار پھینکنا چاہیے۔ حسن زندگی کا سب سے بڑا مظہر ہے جس کا بہترین نمونہ ان کے نزدیک فطرت ہے۔
فطرت سے ان کو بچپن سے عشق تھا۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مجھے فطرت سے بے انتہا عشق تھا۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو جاتا تھا جب دیکھتا تھا کہ آسمان پر کالے کالے بادل
ایک کے بعد ایک گزر جاتے ہیں۔ فطرت ایک غمگسار دوست کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہتی تھی اور تازہ حسن کا انکشاف
کیا کرتی تھی۔"

شیلی کا خیال ہے کہ شاعری ہر اس چیز کو لافانی بنا دیتی ہے جو حسین ترین اور بہترین ہے فطرت اس دنیا کی حسین ترین شے ہے اور ٹیگور
اسے اپنی شاعری کے ذریعہ امر بنا دیا ہے ...... ان کے اشعار میں فطرت کا حسن اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ موجود ہے۔
شب و روز کی ہر کیفیت، موسم کی دلفریبیاں بڑی خوبصورتی سے بیان ہوئی ہیں۔ بنگال کے حسین فطری مناظر کی تصویر کشی لاجواب ہے۔

کرن ب، لکھنؤ

شبنم قیوم

دل زخم زخم

بادل کی اوٹ سے چاند نکل رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا بے چارہ سورج ابھی ابھی تو ڈوب رہا تھا۔ ابھی ابھی اس پہاڑی پر اس کی آخری سرخ کرنیں پڑ رہی تھیں، پھر اتنی جلدی یہ تاریکی کیوں پھیل گئی۔ جب کتے بھی بھونکنے لگے تو مجھے وقت کا کچھ صحیح اندازہ ہونے لگا۔ مجھے یاد آگیا جب شام ہو رہی تھی۔ اس وقت میں بھرے بازار میں مصروف تھا۔ حالات حاضرہ پر تبصرے کیے گئے تھے۔ ادب اور سیاست پر چٹکیاں بھی چھیڑی گئی تھیں۔ جو کبھی کسی مرحلے تک پہنچی نہیں تھیں۔

میں کھانا کھا کر ریڈیو پر فلمی گانے سننے لگا۔ اور پھر کچھ دیر بعد پر بستر میں آکر دراز ہو گیا اور صبح سے لے کر شام تک کے ہنگامے اور مصروفیات میری نظروں کے سامنے سے گھوم گئے۔ صبح چائے کے دو کپ اڑا کر میں نے اپنی نئی سائیکل کو صاف کیا اور پھر اس پر سوار ہو کر گنگنانے لگا۔ میری سائیکل بلوار روڈ کی طرف مڑ کر دھیمی پڑ گئی۔ میں نے اپنی سائیکل کو دل ہی دل میں برا بھلا کہا لیکن جب نیلی نیلی جھیل سے نگاہیں ہٹا کر غور کیا تو سائیکل کا قصور نہیں اپنی ٹانگوں کا نظر آیا جو پیڈل گھمانے کی سکت سے محروم ہو گئی تھیں۔ بلوار روڈ پر آکر ایسا ہی ہوتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس قرمزی رنگ کی لمبی کار کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ اگر یہ تارکول کی صاف اور چمکیلی سڑک کٹ دو نہ ہوتی تو نہ جانے یہاں پر کتنے گھونگھٹ میں کتنے حادثے ہوتے۔ ایک روایت کے مطابق اس سڑک کو حادثات کا خون بھی بالکل اس طرح کم لگتا ہے جیسے نیلی جھیل کو جان لینے سے نفرت ہو۔ دراصل اس جھیل میں جس کا بے پناہ حسن، جس کی انتہائی جاذبیت اور جس کا پرکشش منظر مردہ دل میں بھی زندگی کا نور بھر دیتا ہے، اس میں کوئی اپنی لاش ڈال کر اسے گندہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں سائیکل پر سے اتر گیا اس کی محرک بھی وہی کشش اور جاذبیت تھی جس نے سائیکل کی رفتار، ڈرائیور کے کار کی رفتار اور کوچوان کے گھوڑے کی رفتار کو سست کر دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بس بھی اب آہستہ آہستہ چلنے لگی ہے۔ اور اس کے اندر بیٹھی ہوئی سب سواریاں کھڑکیوں سے سر نکال کر دیکھ رہی ہیں۔ یہ سواریاں بھی وہی دیکھ رہی ہیں۔ جو میں دیکھ رہا ہوں ـــــ اور یہ سب دیکھنے کے لیے ہیں اکتوبر سے مارچ تک ایک بھولا ہوا انتظار رہتا ہے۔ اپریل نومبر تک کا زمانہ پلک جھپکاتے میں بیت جاتا ہے اور دل سیر بھی نہیں ہو پاتا۔

اس سڑک پر کوئی بھی شخص چاہے وہ پیدل چل رہا ہو گاڑی یا موٹر میں سوار ہو، ٹانگے پر ہو یا بائیسکل پر سوار ہو سامنے دیکھتے ہوئے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کیونکہ سامنے تو سڑک ہے۔ بائیں کو جھیل ہے۔ جو وادی کے سارے حسن، خوبصورتی اور نزاکت کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور دائیں جانب پہاڑی ہے۔ سرسبز اور شاداب پہاڑی جو اس حسن، خوبصورتی اور نزاکت کو جلا بخش دیتی ہے۔

اب لوک گیتوں کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی یہ انہی ہاؤس بوٹوں کو صاف کرتے اور دھوتے ہوئے مستی سے بھرپور ایک ہی ایک ہی لے میں گاتے ہیں۔ رنگین قیمتی ہاؤس بوٹوں کی یہ لمبی قطار اپنے مہمانوں کے انتظار میں گویا چشم براہ ہے ان ہاؤس بوٹوں کی TO LET کی یہ تختیاں اب ایک ایک کرکے اٹھ جائیں گی۔ مارچ سے اکتوبر تک اٹھ جائیں گی اور پھر نومبر سے مارچ تک اسی طرح لٹکتی رہیں گی۔ پھر اپریل میں نیا سال شروع ہوگا تو یہ تختیاں اٹھانے کی رسم پھر منائی جائے گی پھر گیت گنگنائے جائیں گے۔ پھر یہاں سے گزرنے والوں

ان کی یہ انسانی محبت غیر شعوری طور پر خدا کے لئے محبت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے ہاں جو سچائی ہے وہ ذاتی احساس و تجربہ کے بغیر ناممکن ہے سچائی، نیکی اور حسن کا بڑا خوبصورت امتزاج ہے ان کی شاعری۔

"باغباں" میں اسی محبت کی داستانیں ہیں جن سے ہماری شاعری آباد ہے "گیتا نجلی" کو اگر ٹیگور کی مناجاتیں کہا جائے تو اس مجموعہ کو اس کی غزلیں کہا جائے گا۔ ان کے اس دور کی شاعری بانسری کا میٹھا راگ ہے جو سننے والوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ "ماہ نو" اپنی جدت موضوع اور وسعت خیال کے اعتبار سے بالکل نئی اور عجیب چیز ہے۔ اس میں دکھایا گیا کہ بچہ کا ہمارے خیالات، جذبات اور معاشرہ پر کیا اثر پڑتا ہے انھوں نے بتایا کہ بچہ دنیا کی حسین ترین آرائش ہے اور تمام محاسن اخلاق اسی کی ذات سے وابستہ ہیں۔ "علقہ بہار" لریکل ڈرامہ ہے اور دوسرے ڈراموں کی طرح اسرار کا حامل "سونار قاری" کی اشاعت سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کا رجحان مجاز سے حقیقت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ جب تخلیقی قوتیں تھک جاتی ہیں تو پھر آرٹ روحانی تشنگی کو بجھا نہیں سکتا۔ اسی لئے انھوں نے مذہب کے دامن میں پناہ لی۔ مشہور امریکی ناول نگار پرل بک لکھتی ہیں "اس کی شاعری اور شاعرانہ نثر میں بے حد گہرائی اور بلندی ہے کیونکہ اس نے ہم کو ذہن و روح سے آشنا کرایا اور خدا کے حضور تک انسانی روح کی رہنمائی کی ہے"

ٹیگور نے شاعری کی تکنیک کو بھی نئے ڈھنگ سے پیش کیا۔ "تھکے شعور کی شام" میں زبان اور انداز بیان کی پختگی قابل دید ہے۔ "حسن کی خوشگوار دعا" اور "ارض شیریں کی خاک میں" موت کی گھاٹی کی چھاؤں میں زندگی کی فتحیابی کی دعا ہے۔ اس کی شاعری میں احساس، جذبہ اور تخیل کا بڑا حسین امتزاج ہے اس کی شاعری۔ اس کے نغمے خلیل جبران کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ خلیل جبران جو فنکار میں معرفت، فنکاری اور اثر آفرینی کا قائل ہے۔ ٹیگور کی نظموں میں الفاظ کے ترنم کی معرفت ہے سادگی، بے ساختگی اور اثر آفرینی کا فن ہے اور قارئین کو گرویدہ بنا لینے کا زبردست جادو بھی!

اتنی طویل عمر میں اپنی شاعری و وجدان کو انھوں نے جس طرح زندہ رکھا وہ انھیں عظیم ترین غیر فانی شعرا کی صف میں بٹھا دیتا ہے انھوں نے اپنی شخصیت میں ان تمام عناصر کو سمو لیا تھا۔ جس سے آج کے ہندوستان کی مخلوط تہذیب کی تعمیر ہوئی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی زندگی کے تمام رخوں کو روشن کر دیا۔ ویشنو گیتوں کی شعریت اور تصوف کے حقائق کو متحد کرنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ بنگالی دیہاتوں کے مناظر اور عوام کے جذبات کی عکاسی کی بنگالی ادب میں یورپین آدرشوں اور طرز فکر کا حسین امتزاج انھیں نے کیا۔

ٹیگور سبھی زبانوں اور تہذیبوں کا حقدار ہے۔ اس کی نظمیں اور گیت سارے زمانہ کے لئے ہیں۔ وہ آفاقی شاعر ہے۔ وہ ہمارا ہی شاعر نہیں ساری دنیا کا شاعر ہے۔ وہ ایسی بلبل ہے جس کے نغمے سبھی کے کانوں میں رس گھولتے ہیں..... جو سب کے لئے ہیں۔ وہ ایسی ہستی ہے جو مر کر بھی زندہ رہتی ہیں....... وہ لافانی ہے..... وہ امر ہے!

یہ سمجھانے کی بھی بات نہیں ——— آپ شاید یہاں کے رہنے والے نہیں ہیں۔ پھر بھی آپ ہر سال یہاں آکر یہاں کی خوبصورتی کی تصویریں کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ آپ اسی جھیل کے بند پر بیٹھ کر اپنے آرٹ کو نکھارتے ہیں آپ اس جھیل، جھیل کے شکارے، ہاؤس بوٹ، وہ قطعہ اراضی پربت، یہ شنکر اچاریہ کی دلفریب پہاڑی، وہ نہرو پارک اور اس کے ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ کا محل کینوس پر منتقل کرتے ہیں جہاں مہاجہ کا محل یقیناً شاندار ہے۔ یہاں نشاط، شالیمار، چشمہ شاہی، نگین، کبوتر خانہ کے ساتھ ہاری پربت اور وہ محل بھی ایسی ہی یادگاریں ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی بہت ساری یادگاریں ہیں اور بھی بہت کچھ ہے جس سے مسرت کے بجائے حسرت ٹپکتی ہے۔ جس میں خوشی نہیں بلکہ مایوسی ہے۔ آپ انھیں نہیں دیکھتے آپ انھیں اپنے آرٹ میں منتقل کیوں نہیں کرتے۔ یہاں سے صرف چند گز کے فاصلے پر — آپ اب یہ شور سن رہے ہیں نا یہ پانی کے گرنے کا شور ہے۔ جو جھیل سے نکل کر ندی میں ایک پھاٹک لگا کر جاتا ہے۔ لیکن آپ کی نظریں صرف اس جھیل پر لگی ہیں۔ اس ندی تک نہیں پہونچ پاتیں جس میں جھیل کا پانی جاتا ہے۔"

"اس ندی میں کیا ہے؟"

"——— دیکھیے وہ صاف و شفاف پانی یہاں آکر کتنا گندہ ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔"

"کیوں ہو گیا ہے؟ اس کا جواب آپ کو اسی آرٹ کے ذریعے دینا ہوگا۔ جس پر آپ کو عبور ہے ——— یہ ندی بھی یہاں کی یادگار ہے۔ اس گندی ندی کی یہ گندی بستی آپ دیکھ رہے ہیں نا؟"

"———"

"یہ تضاد کیوں ہے۔ پانی ایک ہے جو جھیل سے نکل کر ندی میں آتا ہے۔ اس جھیل میں رنگین قیمتی ہاؤس بوٹ ہیں اور اس ندی میں ٹوٹے پھوٹے ڈونگے اور نادیہ ہیں ان ہاؤس بوٹوں میں غیر ملکی لوگ حسن اور زندگی پاتے ہیں اور اس ڈونگے میں یہاں کی عورت جسم کے ایک ایک عضو کو ڈھکنے کے لیے پیوند لگاتی ہے۔ اس کا شوہر ڈل کے سنگھاڑے بھون رہا ہے۔ یہ سنگھاڑے ہم پاؤ پاؤ بھر کھا جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ یا کوئی غیر ملکی ایک بھی ——— کھالے تو اس کا پیٹ خراب ہو جائے ——— شاید اس مچھیرن کو دیکھ رہے ہو جس کی جسم سے آتی ہوئی سڑاندھ سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ یہی مچھیرن غیر ملکی سیاحوں کے لیے مچھلی پکڑ کر اسے زندہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے جن کے پوڈر کی بو ہمارے دماغ کو فرحت بخش رہی تھی۔ آپ نے ہاؤس بوٹ کی تصویر میں اس غیر ملکی عورت کے وجود کو تسلیم کر لیا لیکن اس مچھیرن کو بھول گئے آخر کیوں ——— ؟ شاید اس لیے کہ آپ کا آرٹ گندا ہو جاتا ———

——— آرٹسٹ خاموش اور تلملا ہو گیا میں نے سائیکل سنبھالی اور امیراکدل کی طرف روانہ ہو گیا۔

مطلع صاف ہے۔ دھوپ چمک رہی ہے میں دھیرے دھیرے سائیکل چلا رہا ہوں۔ پل کے قریب پہنچ کر میں نے گھنٹی بجائی تاکہ سپاہی مجھے ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کو کہے مگر یہ کمبخت سپاہی میری طرف بالکل دھیان نہیں دیتا کیوں کہ یہ آواز سائیکل کی گھنٹی کی ہے موٹر کے ہارن کی نہیں۔

اس کے بعد میں گھر واپس لوٹ آیا۔ اور کچھ دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی قوت مجھ میں نہ رہی۔ شام اداسی میں گزر گئی یہاں تک کہ رات آگئی۔

کی رفتار دھیمی پڑ جائے گی۔ اور گنڈولک، شیننگ اشارہ، وائٹ روز اور ہیلی کوپٹر نامی ہاؤس بوٹوں پر بیٹھ کر یہ دور دراز کے مہمان جو اس نظارے کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ وادی کی خوبصورتی کا اعتراف تو کریں گے۔ مگر میرے زخم کا مرہم نہیں بن سکتے اس جھیل میں کتنے گیت اور کتنی غزلیں جنم لے کر اسی میں کھو جاتی ہیں۔ ابھرتی اور پھر کھو جاتی ہیں۔ اس نیلی جھیل کو جیسے رہا ہوں۔ یہ میری شاعری، موسیقی ادب اور آرٹ کا گہوارہ بھی ہے۔

موسیقی کی اس دلفریب تان کے ساتھ وہ ٹیکسی شکارا جا رہا ہے۔ چپو پانی کے ساتھ ٹکرا رہا جا رہا ہے۔ پانی میں ارتعاش ہونے لگتا ہے۔ گویا مضراب ستار کے تاروں کو چھیڑ رہا ہے۔ شکارے کے سرنگ سیٹوں پر سرخ رنگ کے چہرے والا انگریز اور اس کے پہلو میں اس کی اپنی محبوبہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس دلفریب خوبصورتی کا نظارہ کرتے ایک دم جذباتی ہو جاتے ہیں۔ بے حد جذباتی۔ پیچھے سے ہانجی نے ایک آہ بھری۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کا چپو پانی میں گیا۔ موسیقی ٹھہر گئی۔ شاید وہ اپنی محرومیوں پر اداس ہو گیا۔ لیکن محرومیاں اسے بہت دور تک لے جا بھی نہیں سکیں۔ یہ غیر ملکی لوگ جو اس کے ملک میں آکر اس سے زیادہ وہاں کے حسن اور خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اسے روپے دیتے ہیں۔ اور جو روپے دیتے ہیں بے شرم نہیں ہوتے ہیں۔ جو روپے دیتے ہیں وہ دغاباز اور جالباز بھی نہیں ہوتے ہیں۔ کیونکہ روپے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں روپے کپڑوں سے ڈھکتے ہیں۔ روپے سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس کی بھی ایک بیوی بن جاتی ہے۔ مگر اس بیوی کو وہ ٹیکسی شکارے میں کر سیر نہیں کرا سکتا۔ وہ ہر سال بس ایک بچے کا اضافہ کر سکتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہ سوچے گا کہ اس کی غربت اور مفلسی کا راز کیا ہے۔ وہ صرف یہ سوچے گا کاش زیادہ غیر ملکی سیاح اس کے حصہ میں آتے کیونکہ ان غیر ملکیوں کی فیاضی ہی اس کی زندگی ہے اور جب یہ فیاضی نہ ہو تو قناعت ـــــــ ٹیکسی ہانجی بجاتی ہے۔ میں سوچ کی دنیا سے لوٹ آیا ہوں۔ سڑک پر ایک ٹیکسی کار رک گئی۔ اس میں سے ایک دوسرا انگریز اس کی بیوی اتری۔ ان کے ساتھ سفید چہرے اور کھلے بالوں والی چھوٹی بچی بھی ہے۔ انگریز خاکی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے۔ اور اس کی بیوی چست اسکرٹ میں ہے۔ چھوٹی بچی سمیت یہ تینوں شکارے میں اترے تو چپو چلنے لگا۔ پانی میں ارتعاش پیدا ہوا موسیقی نے تان چھیڑی۔

اتنی دیر تک کھڑے کھڑے میری ٹانگیں سن سی ہو گئیں اور میں سائیکل پکڑ کر موسیقی اور شاعری کے درمیان آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ڈل اگیٹ کے قریب پہنچ کر میں پھر رک گیا۔ ایک مصور اپنے برش کی مدد سے، زندگی اور حسن کی تخلیق کر رہا تھا۔ نہ جانے اس نے کتنی بار اس حیات افروز مسرور کن نظارے کو اپنے کینوس پر منتقل کیا ہوگا۔ اس کے کینوس پر جھیل کی وسعتیں، اس کا حسن اور ساری جاذبیت منتقل ہو گئی تھی۔ "کیا خوب تصویر ہے" آرٹسٹ نے میری طرف دیکھا اس کے چہرے پر وہی رنگ نکھر آیا جو ایک پرخلوص تعریف سے نکھر آتا ہے۔

"کیا آپ کو یہ تصویر پسند ہے۔" اس نے پوچھا۔

میں نے اس تصویر کو دیکھا پھر اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے بولا۔ "آپ کے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہ کیا کشمیر واقعی خوبصورت ہے؟"

"ہاں میرے خیالوں سے بھی زیادہ۔"

"اگر ایسا ہو تو میرے زخم مندمل کیوں نہیں ہو جاتے؟"

"کون سے زخم؟"

"پھر کبھی دکھاؤں گا فی الحال آپ کے سوال کا جواب دے کر یہی کہوں گا کہ مجھے آپ کی یہ تصویر بہت پسند آئی۔ آپ یقیناً بڑے فنکار ہیں لیکن آپ کشمیر کے دوسرے رخ کی تصویر کیوں نہیں کھینچتے؟"

"میں سمجھا نہیں"

وہ پیر دبا رہی تھی۔
ڈگری شاہ کی تھکن دور ہوتی گئی۔
اور پیر دبانے والوں کے گروہ میں اضافہ ہوتا گیا۔
"اے مائی اٹھو نا ——— دوسروں کو بھی موقع دو۔"
آخر مزار کے ایک نگراں کو بھیڑ بھاڑ دیکھ کر صبر نہ ہو سکا اس نے ٹوک ہی دیا۔
وہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ گئی۔
اس کے اٹھتے ہی کئی عورتیں قبر پر ٹوٹ پڑیں وہ پیر دبانے میں ایسی مشغول ہوئیں کہ انھیں اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا۔
ان عورتوں کے درمیان ایک مرد بھی ہوا تھا جو بڑے مزے سے پیر دبا رہا تھا۔
ایک کونے میں مزار کا خادم بیٹھا تھا جو بتاشوں پر جلدی جلدی فاتحہ پڑھ رہا تھا۔
چند سکنڈ اس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے ——— خدا جانے وہ فاتحہ پڑھ رہا تھا یا چند گالیاں دے کر آدھے بتاشے واپس کر رہا تھا آدھے بتاشے وہ فاتحہ پڑھنے کی اجرت لے رہا تھا۔
اچانک ایک کار مزار کے سامنے آکر رکی۔
اور اس میں سے ایک شخص اترا ——— بھرے چہرے پر کالی داڑھی سر پر عمامہ، کانوں میں بڑے بڑے بالے، جسم پر ململ جبہ پیروں میں سلیم شاہی جوتے۔
ان سب چیزوں نے اس کی شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔
لوگوں نے مزار کا دروازہ چھوڑ دیا اور ادھر ادھر کھڑے ہو گئے ان کے درمیان ایک تنگ گلی سی بن گئی جس سے وہ گزرنے لگا۔
"یہ کون ہیں۔"
کہانی کار نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔
"یہ میاں ہیں۔"
اس نے کانا پھوسی کی۔
"میاں تو عورتوں کے ہوتے ہیں۔"
کہانی کار نے مذاق کیا۔
"شش ——— ایسا نہ کہو یہ بڑے پہنچے ہوئے میاں ہیں۔"
"اچھا۔"
کہانی کار نے حیرت ظاہر کی۔
"ہاں ——— انھوں نے ہی تو ڈگری شاہ کا اتنا اچھا مزار بنوایا ہے۔"
"ہم۔"
وہ سوچ میں ڈوب گیا۔
"اور یہی ہر سال یہاں عرس کرتے ہیں۔"

اعجاز ملک

ڈھکوسلہ

آج جمعرات تھی۔

اور ہر جمعرات کی طرح ڈگری شاہ کے مزار پر آج بھی بھیڑ تھی۔ اس بھیڑ میں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں۔

عورتوں میں ـــــ جوان لڑکیاں بھی تھیں، پڑھنے والیاں بھی۔ ساری والیاں بھی تھیں۔ دھوتی والیاں بھی۔ طوائفیں بھی تھیں آوارہ بھی تھیں، بیباک بھی تھیں، شریف بھی تھیں۔

مردوں میں ـــ جوان بھی تھے بڈھے بھی۔ بچے بھی۔ رکشا والے بھی۔ کلرک بھی۔ بھاری جیبوں والے بھی۔ غنڈے بھی، دادا بھی تھے، ہیرو بھی تھے۔ نقشے باز بھی تھے۔

کون ایسا تھا جو یہاں موجود نہ تھا۔

کوئی فاتحہ پڑھنے آیا تھا تو کوئی چادر یا بتاشے چڑھانے کوئی منت مانگنے آیا تھا تو کوئی تاک جھانک کرنے۔

اس وقت ڈگری شاہ کے مزار کی رونق عروج پر تھی سب اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

کچھ غنڈے اور بے فکرے اس تنگ پل پر کھڑے تھے اور بار بار اپنے ہاتھ کسی لڑکی کے جسم سے ٹکرانے کی کوشش کر رہے تھے کچھ فقرے چست کر رہے تھے۔ کچھ معنی خیز انداز میں کھانس رہے تھے۔

حالانکہ پل کے قدموں میں ہی پولیس چوکی تھی اور نیچے ڈگری شاہ کا مزار۔

مزار کے سامنے کچھ ہیرو قسم کے لڑکے کھڑے تھے جو بال سنوار سنوار کر لڑکیوں کو گھور رہے تھے۔ ـــ کچھ بچے بھی تھے جو مزار سے نکلنے والے ہر شخص سے مکھیوں کی طرح چمٹ جاتے تھے اور بتاشے لے کر ہی ہٹتے تھے کسی عورت کے ہاتھ میں بتاشے دیکھ کر، کبھی کبھی ان میں شامل ہو جاتے تھے۔

مزار کے اندر کچھ جوان لڑکیاں دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھیں اور نقاب کھولے باہر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اور ان کی مائیں یہ دعا کر رہی تھیں۔

"اے ڈگری شاہ۔ میری لڑکی پہ اپنا سایہ رکھنا۔ اس کو نیک راہ پر چلانا بری سے بچانا اور اس کی جلدی اسے کہیں شادی کرانا۔"

کچھ طوائفیں یہ دعا کر رہی تھیں۔

"اگر میرے گاہکوں میں اضافہ ہو گیا تو میں ایک ریشم کی چادر چڑھاؤں گی۔

ایک دھوتی پوش، ادھیڑ عمر عورت ڈگری شاہ کے پیر دبا رہی تھی۔ کئی عورتیں اور مرد اس انتظار میں کھڑے تھے کہ کب یہ ہٹے اور ہم پیر دبائیں مگر عورت تھی کہ ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ کبھی قبر کے اس کونے کو کبھی دوسرے کونے کو چادر کے اوپر سے آہستہ آہستہ دبا رہی تھی

وہ پیر دبا رہی تھی۔
ڈگری شاہ کی تھکن دور ہوتی گئی۔
اور پیر دبانے والوں کے گروہ میں اضافہ ہوتا گیا۔
"اے مائی اٹھو نا ـــــ دوسروں کو بھی موقع دو۔"
آخر مزار کے ایک نگراں کو بھیڑ بڑھتی دیکھ کر صبر نہ ہو سکا اس نے ٹوک ہی دیا۔
وہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ گئی۔
اس کے اٹھتے ہی کئی عورتیں قبر پر ٹوٹ پڑیں وہ پیر دبانے میں ایسی مشغول ہوئیں کہ انھیں اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا۔
ان عورتوں کے درمیان ایک مرد بھی تھا جو بڑے مزے سے پیر دبا رہا تھا۔
ایک کونے میں مزار کا خادم بیٹھا تھا جو بتاشوں پر جلد جلد فاتحہ پڑھ رہا تھا۔
چند سکنڈ اس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے ـــــ خدا جانے وہ فاتحہ پڑھ رہا تھا یا چند گالیاں دے کر آدھے بتاشے واپس کر رہا تھا آدھے بتاشے وہ فاتحہ پڑھنے کی اجرت لے رہا تھا۔
اچانک ایک کار مزار کے سامنے آ کر رکی۔
اور اس میں سے ایک شخص اترا ـــــ بھرے چہرے پر کالی داڑھی سر پر عمامہ، کانوں میں بڑے بڑے بالے، جسم پر ململ جبہ پیروں میں سلیم شاہی جوتے۔
ان سب چیزوں نے اس کی شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔
لوگوں نے مزار کا دروازہ چھوڑ دیا اور ادھر ادھر کھڑے ہو گئے ان کے درمیان ایک تنگ گلی سی بن گئی جس سے وہ گزرنے لگا۔
"یہ کون ہیں۔"
کہانی کار نے اپنے پاس کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔
"یہ میاں ہیں۔"
اس نے کانا پھوسی کی۔
"میاں تو عورتوں کے ہوتے ہیں۔"
کہانی کار نے مذاق کیا۔
"شش ـــــ ایسا نہ کہو یہ بڑے پہنچے ہوئے میاں ہیں۔"
"اچھا۔"
کہانی کار نے حیرت ظاہر کی۔
"ہاں ـــــ انھوں نے ہی تو ڈگری شاہ کا اتنا اچھا مزار بنوایا ہے۔"
"ہم۔"
وہ سوچ میں ڈوب گیا۔
"اور یہی ہر سال یہاں عرس کراتے ہیں۔"

انور علیگ

ڈھکوسلہ

آج جمعرات تھی۔

اور ہر جمعرات کی طرح ڈگری شاہ کے مزار پر آج بھی بھیڑ تھی۔ اس بھیڑ میں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں۔

عورتوں میں ——— جوان لڑکیاں بھی تھیں، پڑھنے والیاں بھی۔ ساری والیاں بھی تھیں۔ دھوتی والیاں بھی۔ طوائفیں بھی تھیں آوارہ بھی تھیں، بیباک بھی تھیں، شریف بھی تھیں۔

مردوں میں ——— جوان بھی تھے بڈھے بھی۔ بچے بھی۔ رکشا والے بھی۔ کلرک بھی۔ بھاری جیبوں والے بھی۔ غنڈے بھی، دادا بھی تھے، ہیرو بھی تھے۔ لفنگے باز بھی تھے۔

کون ایسا تھا جو یہاں موجود نہ تھا۔

کوئی فاتحہ پڑھنے آیا تھا تو کوئی چادر یا بتاشے چڑھانے کوئی منت مانگنے آیا تھا تو کوئی تاک جھانک کرنے۔

اس وقت ڈگری شاہ کے مزار کی رونق عروج پر تھی سب اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

کچھ غنڈے اور بے فکرے اس تنگ پل پر کھڑے تھے اور بار بار اپنے ہاتھ کسی لڑکی کے جسم سے ٹکرانے کی کوشش کر رہے تھے کچھ فقرے چست کر رہے تھے۔ کچھ معنی خیز انداز میں کھانس رہے تھے۔

حالانکہ پل کے قدموں میں ہی پولیس چوکی تھی اور نیچے ڈگری شاہ کا مزار۔

مزار کے سامنے کچھ ہیرو قسم کے لڑکے کھڑے تھے جو بال سنوار سنوار کر لڑکیوں کو گھور رہے تھے۔ ——— کچھ بچے بھی تھے جو مزار سے نکلنے والے ہر شخص سے مکھیوں کی طرح چمٹ جاتے تھے اور بتاشے لے کر ہی ہٹتے تھے کسی عورت کے ہاتھ میں بتاشے دیکھ کر، کبھی کبھی وہ ان میں شامل ہو جاتے تھے۔

مزار کے اندر کچھ جوان لڑکیاں دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھیں اور نقاب کھولے باہر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اور ان کی مائیں یہ دعا کر رہی تھیں۔

"اے ڈگری شاہ۔ میری لڑکی پر اپنا سایہ رکھنا۔ اس کو نیک راہ پر چلانا بدی سے بچانا اور اس کی جلدی سے کہیں شادی کرانا۔"

کچھ طوائفیں یہ دعا کر رہی تھیں۔

"اگر میرے گاہکوں میں اضافہ ہو گیا تو میں ایک ریشم کی چادر چڑھاؤں گی۔"

ایک دھوتی پوش، ادھیڑ عمر عورت ڈگری شاہ کے پیر دبا رہی تھی۔ کئی عورتیں اور مرد اس انتظار میں کھڑے تھے کہ کب یہ ہٹے اور ہم پیر دبائیں مگر عورت تھی کہ ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ کبھی قبر کے اس کونے کو کبھی دوسرے کونے کو چادر کے اوپر سے آہستہ آہستہ دبا رہی تھی

کتاب، کھنڈ

"تم جھوٹ بولتے ہو ـــــ سچ سچ بتاؤ۔"
"سچ سچ بتاؤں ـــــ جھوٹ پسند نہیں کرتے کیا۔"
"مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔"
"حالانکہ تمہاری کہانیوں میں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"
"میری کہانیوں کے پیچھے نہ پڑو ـــــ اصلی بات بتاؤ۔"
"تو تم اصلی بات سننا چاہتے ہو۔"
"ہوں۔"
"سنو۔"
کار نے ایک طویل موڑ لیا اور پھر سیدھی چلنے لگی۔
"یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ بی۔اے میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا۔
"ہاں مجھے یاد ہے۔"
"گریجویشن کے بعد کیونکہ میرے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا کہ آگے تعلیم جاری رکھتا۔ اس لیے میں نے نوکری کے لیے درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔

میں نے دفتروں میں چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ چپلیں گھس گئیں مگر نوکری نہ ملی۔
اس غم میں میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گیا۔ اپنے شہر کو چھوڑا دوسرے شہروں کی خاک چھانتا پھرا لیکن نوکری نہ ملنی تھی نہ ملی۔ شاید میری قسمت کے کھاتے میں خدا نوکری کا خانہ پر کرنا بھول گیا تھا۔
کئی دفعہ سوچا خودکشی کر لوں۔ کئی دفعہ خیال آیا بھیک مانگنے لگوں۔ مگر یہ دونوں ہی ذلیل کام تھے۔ ایک خدا کی نظر میں اور دوسرا دنیا کی نگاہ میں۔"
وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ سوچنے کے انداز میں اس نے انگلیوں کو پیشانی پر رگڑا اور پھر بولا۔
ایک دن میں پل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے دماغ میں ایک خیال کوندا۔ ترکیب بڑی شاندار تھی۔ میں نے اتنی اچھی ترکیب سوچنے پر اپنے دماغ کی مالش کرائی اور اسی رات سے اس پر عمل کرنے کی ٹھانی۔
دوسرے دن جب لوگوں پل کے نیچے ایک قبر بنی دیکھی تو حیرت میں پڑ گئے۔ میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ میں رات کو اس پل پر سے گزر رہا تھا کہ اچانک نیچے ایک بزرگ نظر آئے وہ اوپر سے نیچے تک سفید لباس میں لپٹے ہوئے تھے میں نے کوئی جن جان کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ ابھی دس قدم نہ چل پایا تھا کہ کسی نے میری بانہیں تھام لیں۔ آنکھیں کھلیں تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سامنے وہی بزرگ کھڑے تھے۔
"تم میرا ایک کام کر دو گے۔" وہ بولے
"کک ـــــ کیسا کام۔"
میں کانپ گیا۔
"دیکھو ـــــ میری قبر مٹ گئی ہے ... تم اس پر مٹی چڑھا سکتے ہو۔"
"کہاں ہے آپ کی قبر"
"وہ نیچے جہاں میں ابھی کھڑا تھا"

وہ بغیر کچھ جواب دیئے آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ مزار کے اندر کیا کر رہا ہے۔ کہانی کار نے جالیوں میں سے اندر جھانکا تو وہ حیران رہ گیا اس نے دیکھا کہ وہ شخص سجدے میں پڑا بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا ہے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی روتا رہا۔ پھر اٹھا آنسو پونچھے اور دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھائیے۔ اس کے ہونٹ ہلتے رہے اور چند سیکنڈ بعد اس کے ہونٹ ہلنے بند ہو گئے۔ وہ باہر کی طرف بڑھا۔

اسے باہر آتا دیکھ کر لوگوں نے پھر اس کے لیے جگہ چھوڑ دی۔

ایک تنگ گلی سی اس کی کار تک بن گئی۔

کار میں بیٹھتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ کوئی دوسرا آدمی اس کے بغل میں آ بیٹھا ہے۔

مگر وہ خاموش رہا۔

کار اسٹارٹ ہوئی۔

"ہم آٹھ سال بعد مل رہے ہیں۔"

آخر کہانی کار نے خاموشی کے دل میں خنجر اگھونپا۔

"ہاں۔"

مختصر سا جواب ملا۔

"تو تم مجھے پہچان گئے۔"

"ہاں اپنے جگری دوست کو کون بھول سکتا ہے۔"

"یہ سب کیا ڈھکوسلہ ہے"

"کونسا ڈھکوسلہ"

"یہی ڈگری شاہ"

ڈگری شاہ ایک بزرگ ہے۔"

تمہارا ان سے کیا تعلق تھا؟"

میں ان کا مرید تھا۔"

پھر۔"

وہ انتقال فرما گئے۔"

اور تم نے مزار بنوا دیا۔"

ہاں۔"

کیا کرتے ہو۔"

نہیں ـــــ اپنے پیر کی یاد میں کھویا رہتا ہوں۔"

تمہارے نام کوئی لاٹری کھلی تھی۔"

نہیں۔"

یہ بہترین لباس اور کار کہاں سے آئی۔"

سب ڈگری شاہ کی دین ہے۔"

احسان قریشی

"شاہکار"

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ کار کے حادثے میں ایک جوان کی موت کا ذکر مقامی روزنامے میں کہیں بھی نہیں چھپا۔ اسٹاف رپورٹر نے اتنے بڑے شہر کے تمام غیر اہم واقعات کو پوری طرح کور کیا تھا۔ مگر اس حادثے پر کچھ لکھنا تو دور سرسری طور پر اس کا ذکر بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ حالانکہ یہ حادثہ اسی اخبار کے دفتر کے سامنے دن دہاڑے پیش آیا تھا۔ اور وقتی طور پر "اصلی سلاجیت" بیچنے والے خان نے بڑے جتن سے لگائی ہوئی بھیڑ بھی منتشر ہو گئی تھی۔ اسی اخبار کے دفتر کے سامنے فٹ پاتھ پر فرصت میں لڑتے ہوئے رکشے والے بھی اپنی دھینگا مشتی بھول گئے تھے۔ دونوں پیروں سے بے نیاز بابا جی۔ جو زور زور سے چیخ کر بھیک مانگ رہے تھے بوکھلا سے ہو کر رہ گئے تھے۔ اور ان کی آواز حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے لاتعداد رینگتے ہوئے چیونٹیوں کی طرح سائیکلوں کی قطاریں تھم سی گئی تھیں۔ رکشوں پر بیٹھی ہوئی عورتوں نے تاسف کی چچ چچ کی آوازیں منہ سے نکالیں تھیں۔ اور پھر دفعتاً سب کام یوں شروع ہو گیا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو ..... کوئی ذرا سی بھی تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ "اصلی سلاجیت" بیچنے والے خان کے گرد ویسی ہی۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بھیڑ اکٹھی ہو گئی تھی۔ بابا جی اور بھی اونچے سروں میں چیخنے لگے تھے۔ رکشے والے زیادہ زور دار گھونسے بازی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ اور سائیکلوں کی قطاریں ویسے ہی رینگ رہی تھیں۔ رکشوں پر بیٹھی عورتیں پان چبا رہی تھیں۔ اور فیشن زدہ لڑکیاں۔ سر پر اونٹ کے کوہان ٹائپ بال بنائے گزر رہی تھیں۔ ماحول سے لاپرواہ ..... کسی کو کسی پرواہ نہ تھی۔ فکر نہ تھی۔ واسطہ نہ تھا۔

دنیا۔ اگر اسے ہم کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ دنیا۔ اسی کا نام ہے۔ جہاں انسان جانور ہو کر بھی اپنے کو تہذیب یافتہ سمجھتا ہے۔ میں فلسفے کی بات نہیں کرتا۔ مگر انسانیت کی بات ضرور کرنا چاہتا ہوں ..... ہو سکتا ہے ..... یہ انسانیت کا خبط مجھ پر سوار ہو گیا ہو ..... یا یہ کہ میں حادثے میں مرنے والے جوان کو جانتا تھا ..... ممکن ہے۔ کچھ اور بات ہو ..... بہرحال چونکہ میں مرحوم سے بخوبی واقف تھا اس لیے سچ کہتا ہوں۔ میری آنکھوں میں تو آنسو آ گئے ..... اور میں "پھر وہی دل لایا ہوں۔" والے بورڈ کے نیچے کھڑا کھڑا سوچنے لگا۔

نوجوان کا نام کیا تھا ..... ؟ نام کا ٹھیک پتہ نہیں۔ مگر عام طور پر لوگ اسے کلو کے نام سے پکارتے تھے۔ کہاں سے آیا۔ ؟ ..... کون لایا ؟ ——— کس کا بچہ تھا ؟ ..... کوئی نہیں جانتا۔ نہ کلو ہی کو معلوم تھا۔ غرضکہ کلو کا ماضی اتنا ہی تاریک تھا۔ جتنا یہ کالا کلوٹا کلو ..... محلے کے تمام بچوں کا ساتھی۔ دوست اچھلتا۔ کودتا۔ کھیلتا پھرتا۔ کسی نے کچھ کھانے کو دے دیا۔ کھا لیا۔ ویسے بھی محلے کے سب ہی لوگ کلو پر مہربان رہتے تھے۔ آہستہ آہستہ کلو نے پر پرزے نکالے جوان ہوئے تو ہاتھ پیر مضبوط ہوئے۔ رنگ تو ویسے ہی کالا تھا۔ چہرہ بھی کوئی خاص نہ تھا۔ بس گزارا تھا۔ اب بھی ان کا کوئی کام کاج نہ تھا محلے میں گھومنا پھرنا۔ کسی نے کچھ دے دیا۔ تو کھا لیا ..... ورنہ بس اللہ کا نام ..... میں چونکہ تنہا رہتا تھا۔ اس لیے کلو میاں اکثر میرے ہی یہاں دھرنا دیئے رہتے۔ میرے ..... کھانے میں حصہ لگاتے۔ شام میرے آفس سے لوٹنے کے بعد سے دوسرے روز میرے آفس جانے تک کلو میاں کا میرا ساتھ رہتا۔ اس درمیان وہ ..... تو .....

"جی ۔۔۔ چڑھا دوں گا۔"

"ایک بات اور ۔۔۔۔ میری قبر پر ہر جمعرات کو روشنی کیا کرنا۔"

میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ وہ غائب ہو گئے۔

یہ خبر کسی فلمی اشتہار کی سارے شہر میں پھیل گئی ۔۔۔۔ لوگ ہر جمعرات کو چراغ جلانے آنے لگے۔ پھر پھول چڑھنے لگے۔ چادریں چڑھنے لگیں اور لوگ منت ماننے لگے۔

میں نے اپنا چولا بدلا۔ چہرے پر داڑھی رکھی اور دن رات مزار پر رہنے لگے۔ مزار پر آئے ہوئے بتاشوں اور چادروں کو فروخت کر دیتا۔ کھانے کے پیسے نکال کر سارا روپیہ مزار کی سجاوٹ اور بناوٹ میں لگا دیتا۔

دو سال کے اندر میں نے مزار کو بہت خوبصورت بنا دیا۔ مزار کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ آمدنی بڑھنے لگی۔ میں نے مزار کے چاروں کونوں میں ڈبے رکھوا دیئے۔ جن میں لوگوں نے پیسے ڈالنے شروع کر دیئے۔

"اب مجھے اس مزار سے پانچ سو روپے ہفتے کی آمدنی ہے۔"

"یعنی مہینے میں دو ہزار۔"

"ہوں۔"

"ایک بات اور بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

"تم نے اس مزار کو ڈگری شاہ کا نام کیوں دیا؟"

"اس لیے کہ اس میں میری بی اے کی ڈگری دفن ہے۔"

"کار روکو۔"

"کہانی کار چیخا۔"

"کیوں۔؟"

"میں اتروں گا۔"

"کوٹھی نہیں دیکھو گے۔"

"نہیں۔"

"کار رک گئی۔

کہانی کار اتر کر بھاگا۔....

خالد شفائی

آج کی رات

آج کی رات ہو کس درجہ حسین و شاداب
زیست کی نغمہ بہ لب پیار بھری راہوں پر
کہکشاں شوخیٔ خلوت پہ ہے صد شوق نثار
آج نس نس میں ہے اک کیفِ جوانی رقصاں
گنگناتی ہے فضاؤں میں ہواؤں کی پری
جگمگاتے ہیں نگاہوں میں جنوں خیز دیئے
چاند شرماتے ہوئے جھانکتا ہے روزن سے
ہر طرف جلوۂ رنگیں میں ہے اک نور ہی نور
دل ہے غلطیدہ مسرت کے بھرے ساغر میں
انکھڑیاں بادۂ مستی سے ہیں بوجھل بوجھل،
ڈھلتے جاتے ہیں حسیں رات کے رنگیں سائے

یہ حسیں رات دبے پاؤں یونہی بیت نہ جائے
ایک مدت سے دھڑکتا تھا یہ دل جس کے لیے
ہر طرف کیف ہے، رنگینی و رعنائی ہے
اور پازیب کے تیری یہ چھمکتے گھنگھرو،
جگمگاہٹ لیے اپنی یہ جڑاؤ کنگن
دیکھ گوندھے ہوئے پھولوں کا یہ رنگیں گجرا
کتنی بے چین ہے مہکی ہوئی کلیوں کی یہ سیج
یہ دمکتی ہوئی بندیا تری پیشانی پر
یہ چمکتا ہوا جگنو ترے سینے کے قریں،
آج کی رات ہو کس درجہ طرب خیز و حسیں
زیست کی نغمہ بہ لب پیار بھری راہوں پر
آج کی رات نیا عہد ہمیں کرنا ہے
لب لعلیں کو ترے چوم کے یہ کہنا ہے

آج کی رات بہاروں کے چمن کھلتے ہیں
دو محبت بھرے، دو اجنبی دل ملتے ہیں
لیکے آئے ہیں ستارے بھی محبت کا پیام
اور بے تاب چھلکنے کو تمناؤں کے جام
رقص فرما ہو تصور میں خلا کی دولہن
تیز ہوتی ہی چلی جاتی ہے دل کی دھڑکن
چاندنی پیار سے اٹھلاتی ہوئی آتی ہے
عود و عنبر میں فضا ساری گھلی جاتی ہے
آرزو شاد و ضیا بار ہوئی جاتی ہے
زندگی مست و نشہ بار ہوئی جاتی ہے
اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے جذبات کی آگ
ہاں جگا دے کوئی نغمہ کوئی جادو کوئی راگ
اپنے جلووں کو لیے آج وہ دن آ ہی گیا،
توڑ دے سحرِ خموشی گرا دے جانِ حیا،
منتظر ہیں کہ ترے پاؤں حنائی میں سجیں
چاہتے ہیں تری صندل سی کلائی میں سجیں
مضطرب ہے ترے جوڑے کی کماں بن جائے
تیری شاداب جوانی کا جہاں بن جائے
کتنی بے تاب ہے پھر نور جہاں بننے کو
ہے تمنائی اجالوں کا نشاں بننے کو
آج کی رات بہاروں کے چمن کھلنے دے
دو محبت بھرے دو اجنبی دل ملنے دے
تیرے کاجل کی، تری مانگ کی افشاں کی قسم
ساری دنیا کو محبت کی طرف لائیں گے ہم

وہ محبت کہ جو ہے آدم و حوّا کا جمال
ہجر کا نور یہی اور یہی صبحِ وصال

رہتے۔ یا آرام سے سوتے رہتے۔ میں بھی ان سے کافی مانوس ہو گیا تھا۔ اگر کبھی اتفاق سے (اور ایسا شاذ ہی کبھی ہوا ہو) وہ دکھتے تو مجھے ان کے متعلق فکر ہو جاتی۔ یہ کچھ سمجھ کی دوستی محبت میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھے احساس ہونے لگا کہ کلو میاں کو کچھ پڑھانا یا سکھانا ضروری ہے۔ اور یہی سوچ کر میں نے ان کو پڑھانے۔ سکھانے کا بھی کام لے لیا ——

آپ جانتے ہی ہیں۔ محبت اور خلوص سے کوئی کام شروع کیا جائے تو اس کے نتائج بھی اچھے ہوتے ہیں۔ کلو میاں اب کافی مہذب ہو گئے تھے۔ کلو میاں پہلے کی طرح گندے آوارہ نہیں نظر آتے تھے۔ رنگ بھی ذرا نکھر گیا تھا۔ اور اب کچھ مینرز بھی جان گئے تھے۔ میں اکثر اتوار کے دن جب کہیں گھومنے جاتا۔ کلو میاں کبھی ساتھ ہو لیتے۔ مگر اس طرح کہ میں آگے آگے جا رہا ہوں۔ اور کلو میاں مجھ سے آٹھ دس گز پیچھے چپ چاپ لگے چلے آ رہے ہیں۔ میں چونکہ ان کی یہ عادت جان گیا تھا اس لیے میں جب تھک کر کبھی کہیں کسی ریستوران میں بیٹھتا تو ان کے ناشتے کا بھی خیال رکھتا تھا۔

اکثر میرے دوستوں نے جو چھٹی کے دن کبھی کبھی میرے گھر آیا کرتے تھے۔ اور تاش کی بازیوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مجھ سے کہا بھی "اماں کیا آدمی ہو اس کالے دیو کو اپنے ساتھ لگائے پھرتے ہو نہ کام کا نہ کاج کا.... ارے حضرت ..... کوئی دوسرا لونڈا رکھیے.... کام کاج بھی کرے۔ اور سودا سلف بھی لائے۔" ایک صاحب نے تو باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا کہ "بھائی اس کو نکالو یہاں سے آج سے اگر اس کی شکل تمہارے گھر پر نظر آئی تو بس۔ دوستی ختم۔" مگر میں نے کسی دوست کی بات نہ مانی۔ کلو میاں کی طرف دیکھتا۔ ان کی پر خلوص دوستی۔ ان کی محبت بھری نگاہ۔ دل کہتا "ٹھیک ہے۔" دوستوں نے کچھ دن میری بات کا برا ضرور مانا۔ مگر پھر کچھ نہیں ہوا۔ کلو میاں موجود رہے۔ اور دوستوں کی دوستی نہ گئی۔

غرض جب تک میں اس محلے میں رہا۔ کلو میاں میرے بہت نزدیک رہے۔ لیکن جب مجھے دوسرے محلے میں ایک اچھا سا مکان مل گیا اور میں بچوں کے ساتھ اس میں رہنے لگا۔ تب کلو میاں سے میرا ساتھ چھوٹ گیا.... اس کو بھی کافی عرصہ گزر گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا اس درمیان میں کلو میاں پر کیا گزری.... مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کلو میاں پر یقیناً مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں گے ضرور ان کو سردی نے پریشان کیا ہوگا۔ ضرور ان کو بھوک نے ستایا ہوگا۔ ضرور انھیں ذہنی اور جسمانی تکلیفوں نے گھیر لیا ہوگا۔ تب ہی انھوں نے اطمینان سے کار کے نیچے آن کر خودکشی کر لی.... اور کار بھی وہ جس کو ایک "ہپ زدہ" بورژوا طبقے کی لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی.... اس کے ہونٹوں پہ ایک سرخ گلاب کا پھول کھلا ہوا تھا۔

....

میں چونک پڑا۔ ایک رکشا مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا.... کلو میاں کی لاش تارکول کے لمبے چوڑے کنویں پر دب کر پھیل چکی تھی۔ اور اب کلو میاں تجریدی آرٹ کا ایک نادر شاہکار بن گئے تھے میں نے سوچا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو کتے کی موت مرتے ہیں۔

اویس احمد دوراں

مختصر نظمیں

"ساگر"

حسین نیلگوں آکاش کے بہت نیچے
ابلتی، کھولتی دھرتی کے سخت سینہ پر
مرے حبیب کوئی بیکراں بھیانک سے
سنا ہو آنکھوں پہ بےقرار رہتی ہے
چلو کہ دوریٔ ساحل سے اس کی لہروں کا
مہیب وحشتِ اضطراب دیکھ آئیں

"آخرِ شب"

یہ سہمے سہمے سے لمحات آخرِ شب کے
مہ و نجوم کے روشن چراغ بجھتے ہیں
متاعِ نور سے محروم ہو گئے یکسر
نہ جانے مہرِ درخشاں طلوع کب ہوگا
کہ جاں گسل ہے یہ پچھلے پہر کی تاریکی

"مسافرِ گیتی"

تم اپنا سوز جگر تاب شاہراہوں پر
بکھر کی بھیڑ میں تقسیم کر رہے ہو کیوں
یہ بھیڑ اتنی گرانیٔ شے کی اہل نہیں
یہ اس مسافرِ گیتی کے کام آئے گا
جو آج صبحِ مسرت کی جستجو میں ہے

"اندیشہ"

حسین چاند کی افسوں طراز وادی میں
کہیں پڑاؤ نہ ڈالیں یہ قافلے والے
کہیں بکھر کے نہ رہ جائے چاندنی کا طلسم
بشر کی تیزیٔ رفتار سے میں ڈرتا ہوں

"اٹوٹ رات"

مری رفیقۂ منزل، مری متاعِ حیات
قریب آ کر ترے جسم کی حرارت سے
میں اپنی روح کو، اپنے لہو کو گرما لوں
بجھے بجھے ہوئے سینے میں آگ سلگا لوں
اٹوٹ رات بہت سرد اور اندھیری ہے

"میں تنہا ہوں"

مرے شباب کے ساتھی، مرے حسین محبوب
جو ہو سکے تو ذرا خواب گاہ سے اپنی
مجھے پکار کہ دشتِ الم میں تنہا ہوں

"خوشبو"

تمہاری یاد کی خوشبو کے زمزمے جھونکے
ہماری وادیٔ غربت میں اب بھی آئے ہیں
مگر وہ پہلے سے آرامِ جاں نہیں ہوتے

حسرتِ نظر

مری نگاہ یہ کیوں بےقرار ہو ہو کر
حسین چہروں کو حسرت سے تکتی رہتی ہے
کوئی بھی ان میں سے میری اداس خلوت میں
سہاگ رات کی خوشبو لیے نہ آئے گا

اختر نظمی

"بندھن"

آفس کے چھوٹے کمرے میں
ایک شکستہ سی کرسی ہے
اس کرسی کا،
آفس کی اونچی کرسی سے
میل نہیں ہے، ربط نہیں ہے
اس کرسی کے آگے، پیچھے
دائیں، بائیں
ماہ و سال کی گرد پڑی ہے
کاغذ کی دیوار کھڑی ہے
کاغذ کی دیوار کے پیچھے
نصف صدی سے
لفظوں کی زنجیر میں جکڑا
اک ڈھانچہ، سوچا کرتا ہے
کیا اس بندھن سے چھٹکارا
اس جنم میں مل جائے گا — !!

مطرب بلیاوی

"دریچے"

وہ اک نوخیز لڑکی جو محلے ہی میں رہتی ہے
قدم اس نے ابھی رکھا ہے آنگن میں جوانی کے
نہیں واقف زمانے کی ابھی پرپیچ راہوں سے
گزرگاہوں پہ اپنی منتظر پاتا ہوں میں اس کو
کئی دن سے یہ اک حسرت مری جانب وہ تکتی ہے
اسے مرغوب ہیں شاید مری شہرت کے افسانے

وہ کیا جانے کہ اس کی ملتفت نظروں کے جھونکے سے
دریچے کتنے میرے زخم دل کے کھلتے جاتے ہیں

غزل

سید وشہ طباطبائی

چمن سے مدتوں بادِ صبا بھی اب نہیں آتی
کسی گوشے سے بوئے آشنا بھی اب نہیں آتی

رکی جاتی ہیں سانسیں تو اسیرانِ محبت کی
تمنا کی نسیمِ دلکشا بھی اب نہیں آتی

نہیں معلوم کب سے عالمِ حیرت میں تنہا ہوں
کسی گم گشتہ رہرو کی صدا بھی اب نہیں آتی

غلط راہوں میں کب کے کھپ چکے ہیں قافلے والے
یہ عالم ہے کہ آوازِ درا بھی اب نہیں آتی

جو تم نے ترک کر دی رسمِ دیرینہ تواضع کی
تو مدت سے فقیروں کی صدا بھی اب نہیں آتی

جو حسنِ شیوۂ لطف و کرم بھولے تو بھولے تھے
نہیں کوئی نئی طرزِ جفا بھی اب نہیں آتی

یہ محلِ فکر ہی ہم ہیں نظر انداز کیوں اتنے
کہ ہم تک موجِ طوفانِ بلا بھی اب نہیں آتی

جہاں ذرّوں کی پیشانی پہ مہر و مہ دمکتے تھے
وہاں مدھم ستاروں کی ضیا بھی اب نہیں آتی

کہاں ہر ہر نفس تھا ایک تازہ درسِ خودداری
کہاں اپنے شعار دل سے حیا بھی اب نہیں آتی

سلایا ہو نہیں کس نغمۂ شیریں نے اے یارو
کہ تم تک وقت کی آوازِ پا بھی اب نہیں آتی

جفاؤں پر جفائیں ہیں ستم پر ہے ستم لیکن
پشیمانی باندازِ حیا بھی اب نہیں آتی

نگاہِ منفعل نے لوٹ لیں خودداریاں دل کی
یہ نوبت ہو کہ شرمِ التجا بھی اب نہیں آتی

چمن کی خاک لے کے لالہ و شبنم سے ہم کو تو
کسی شعلے کے دامن کی ہوا بھی اب نہیں آتی

نکل آیا ہوں اتنی دور اپنے سے کہ کانوں تک
خود اپنے نالۂ دل کی صدا بھی اب نہیں آتی

سرِ شاخِ زمزمہ پردازِ کیا حیب ہے کہ گلشن سے
صفیرِ بلبلِ رنگیں نوا بھی اب نہیں آتی

کتاب، لکھنؤ

برق بہار

سادھوؤں کا گیت

پریم کی مورت دل کا مندر　　جیسے موتی سیپ کے اندر
آؤ پی کر پریم کے ساغر　　گائیں پریم کے میٹھے منتر
رات گئی ہو بیت
ہم ہیں پریم پجاری پریم کے گائیں گیت

○

آنکھ سے گنگا جل لے آئیں　　لوبھ کرودھ کو دور بہائیں
پریم کے سندر پھول چڑھائیں　　میٹھے میٹھے شبد سنائیں
اپنی آنکھوں کی ریت
ہم ہیں پریم پجاری پریم کے گائیں گیت

○

سج کر آئیں لاکھوں ناری　　سندر سندر پیاری پیاری
مل کر ناچیں ساتھ پجاری　　جیسے ہوا میں پھول کی کیاری
سب کا سمرن پریت
ہم ہیں پریم پجاری پریم کے گائیں گیت

○

مصنف	کتاب	نوعیت	قیمت	مصنف
ایم - اسلم	ممتاز		-/۶	[illegible]
شوکت تھانوی	نمک مرچ		،	
،	جوڑ توڑ		۵/۵۰	[illegible]
باقر رضا جوشی	طلوع صبح		۴/۵۰	،
ایم - اسلم	مرد غازی		-/۹	پروفیسر یوسف سلیم چشتی
،	ضرب مجاہد		۲/۷۵	کنھیا لال کپور
مظفر ہاشمی	بیتے دن		۵/۵۰	مرزا رسوا
نسیم حجازی	سفید جزیرہ		۵/۶۲	جوش محمود آبادی
ابن حیات	غفلت		۵/۶۲	،
عذرا جمال	داستان		-/۵	عذرا جمال
اے - آر - خاتون	ماہم		-/۵	ابن حیات
شارب ردولوی	جگر فن اور شخصیت		-/۳	شوکت تھانوی
خواجہ محمد شفیع دہلوی	صبح خرابات		-/۴	ایم - نسیم
رئیس احمد جعفری	مقصود		-/۳	آذر جمالی
خان محبوب طرزی	تعمیر		۲/۷۵	رئیس احمد جعفری
،	نیلوفر		۶/۵۰	جمیلہ بانو
آرزو لکھنوی	سریلی بانسری		۳/۵۰	خلیل الرحمٰن
حالی	کلیات حالی	ناول	-/۱۲	قرۃ العین حیدر
خاور بارہ بنکوی	حدیث دیگراں	داستانیں	-/۳	شوکت صدیقی
رائیدہ بیگم	موت کی لکیر	ناول	-/۵	[illegible]
[illegible]	[illegible]	ناول	۵/۵۰	[illegible]
[illegible]	[illegible]	،	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]		[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]		[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]		

غزل

کیف احمد صدیقی

آتشِ گل میں پیہم سلگتی ہوئی نکہتِ مضطرب آہ بھرتی رہی
اور موجِ نسیمِ سحر فطرتاً شعلۂ رنگ سے چھیڑ کرتی رہی

گو تری چلچلاتی ہوئی دھوپ میں میرے احساس کا پھول مرجھا گیا
لیکن اے آفتابِ غمِ زندگی تیرے چہرے کی رنگت اترتی رہی

اہلِ بزمِ جہاں گو ہر اک گام پر آرزوؤں کی بیڑی پنہاتے رہے
پھر بھی مجبور رقاصۂ زندگی آخری سانس تک رقص کرتی رہی

اپنے قدموں کی آواز سے چونکتا جیسے شہرِ خموشاں سے گزرے کوئی
آج کی رات یوں دل کے شمشان میں تیری یاد اپنی آہٹ سے ڈرتی رہی

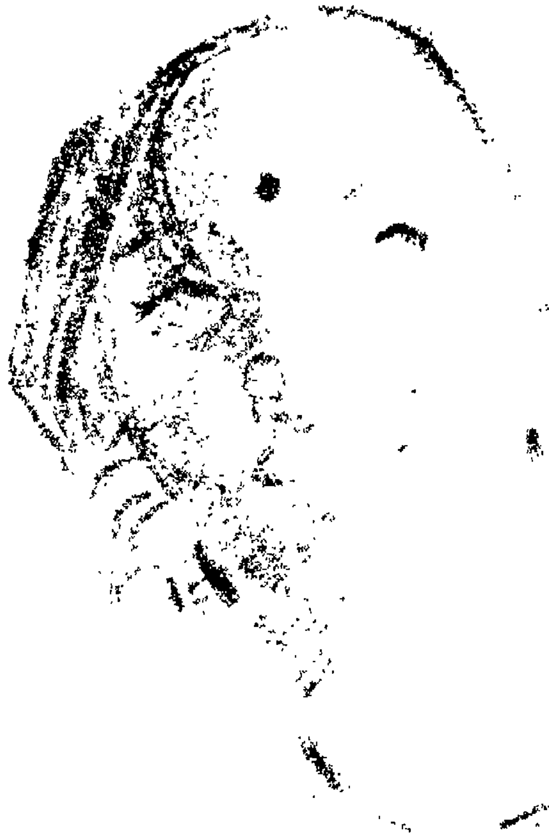
کیف میرے تخیل کی رعنائیاں ذہن کی سطح سے مٹ گئی تھیں مگر
جانے کس کے خیالوں کی قوسِ قزح میرے اشعار میں رنگ بھرتی رہی

فہرست کتب

نام کتاب	نام مصنف	قیمت	موضوع
قوموں کا عروج و زوال	سید اقبال احمد	۷/-	
مذہب کی روشنی میں	"	"	
فنون لطیفہ اور جمالیات	مظفر حسین	۵/۵۰	
اڈرنگ ادب	"	۴/۵۰	
شرح بال جبریل	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۹/-	
نرم گرم	کنھیا لال کپور	۲/۷۵	
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۵/۵۰	
خطاکار	جوشی محمود آبادی	۵/۶۲	
خون جگر	"	۵/۶۲	
داستان	عذرا اجمال	۵/-	
غفلت	ابن حیات	۵/-	
ہم زلف	شوکت تھانوی	۳/-	
جھومر	ایم۔ نسیم	۴/-	
خاموش نگاہیں	انور ہمالی	۳/-	
جدائی	رئیس احمد جعفری	۶/۷۵	
محفل	جمیلہ بانو	۷/۵۰	
عذرا (زیر طبع)	خلیل الرحمٰن	۳/۵۰	
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۱۲/-	ناول
خدا کی بستی	شوکت صدیقی	۳/-	سستا ایڈیشن
بے چارہ	الفت منہاس	۵/-	ناول
انگوری	احمد شجاع پاشا	۵/۵۰	ناول
جنگ صلیب و ہلال	صادق سردھنوی	۵/-	"
عاصیر	سعیدہ مظہر	۴/-	"
بن مانگے بچے	ڈاکٹر جی ایم۔ ناز		جنسیاتی
کامیاب ازدواجی زندگی	خلیل احمد		نفسیاتی

نام کتاب	نام مصنف	قیمت	موضوع
نشاز	ایم۔ اسلم	-/-	ناول
نمک و ق	شوکت تھانوی	۳/-	مزاحیہ
جوڑ توڑ	"	۵/-	ناول
طلسمی برج	باقر رضا جوش	۲/۲۵	"
مرد غازی	ایم۔ اسلم	۳/-	"
شرب مجاہد	"	۳/-	"
بیتے دن	مظفر ہاشمی	۳/-	"
سعید جزیرہ	نسیم حجازی	۵/۲۵	"
غفلت	ابن حیات	۵/-	"
داستان	عذرا جمال	۵/-	"
ہالہ	اے۔ آر۔ خاتون	۸/-	"
جگر فن اور شخصیت	شارب ردولوی	۳/۵۰	"
شمع خرابات	خواجہ محمد شفیع دہلوی	۵/-	"
مغرور	رئیس احمد جعفری	۴/۵۰	"
تعمیر	خان محبوب طرزی	۳/۵۰	"
نیلوفر	"	۲/-	"
سُریلی بانسری	آرزو لکھنوی	۳/۷۵	منظوم
کلیات حالی	حالی	۵/-	"
حدیث دیگراں	خمار بارہ بنکوی	۲/-	"
موت کی لکیر	رائیڈر ہیگرڈ	۳/۵۰	ناول
اور ۲۸ دسمبر کے بعد			
تنقیدی مجموعہ	احتشام حسین	۴/-	"
جھوٹی زنجیر	حیات اللہ انصاری	۴/-	افسانے
لب و رخسار	منظر سلیم	۴/-	ناول
برف کی دیوار	مائل ملیح آبادی	۴/-	"





50 PAISE

THE KITAB, MONTHLY
CHOWK, LUCKNOW.

Cover Printed by :
PRATIBHA PRESS, NAYA GAON, LUCKNOW
Phone : 24709

ماہنامہ
کتاب
لکھنؤ

ستمبر ۱۹۶۴ء

●

فیض احمد فیض، رشید ... ظہیر، حسن شہید
سلمی صدیقی، ... شیباں، طفیل ہوشیارپوری
عبدالحلیم، ... ارشاد، انور ... ، صادق ...
یوسف اختر، ... منصور وغیرہ

جلد (۳) نمبر (۹)

زرسالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں
۶½ روپے
قیمت
۵۰ نئے پیسے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

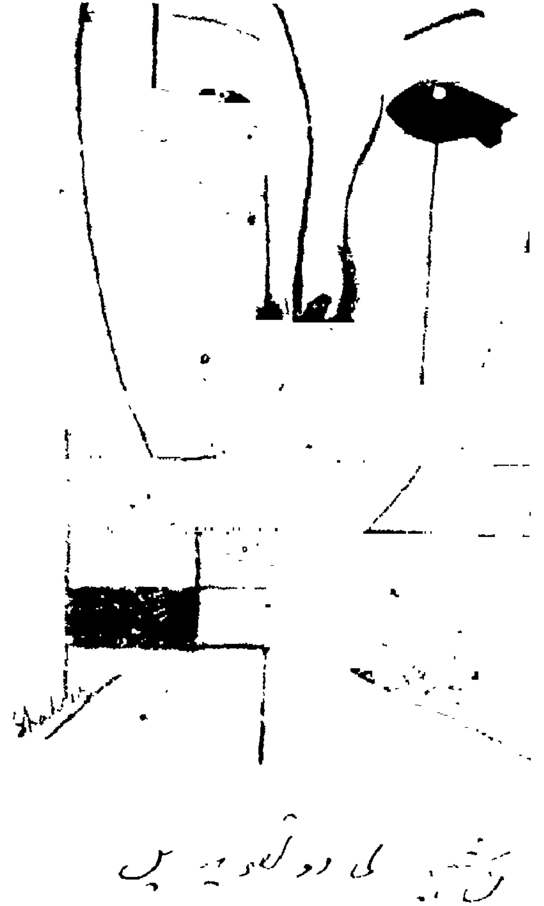
مجلس مشاورت
حیات اللہ انصاری
سید احتشام حسین
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر: سید جمیل احمد
مطبوعہ: نظامی پریس لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: کتاب ... لکھنؤ

پاکستان آفس
نعیم اکبر خاں، الائڈ فوٹو گرافرس پاکستان لمیٹڈ
4/5 موتی جھیل کمرشل ایریا ڈھاکہ





…… PRESS, NAYA GAON, LUCKNOW
Phone : 24709

ضرورت محسوس ہو تو ہمیں اُن کے پتے لکھیے تاکہ ہم ان کو نمونہ کا پرچہ بھیج کر آپ کی طرف سے خریداری قبول کرنے کی درخواست کر سکیں (۲) اپنے شہر کے اسکولوں اور کالجوں اور لائبریریوں کو کتاب کی خریداری کی طرف متوجہ کیجیے۔ اور اگر ضرورت سمجھئے تو ہمیں لکھیے تاکہ ہم بھی ان سے براہ راست درخواست کر سکیں۔ (۳) اپنے شہر کے کتب فروشوں سے کتاب منگانے کے لیے کہیے اور اگر آپ کے شہر میں رسالہ آتا ہے تو اس کی تعداد بڑھانے کی کوشش کیجیے ———

کتاب کی توسیع اشاعت کرنے کی کوشش، کوئی قدم معمولی اور حقیر نہیں۔ اگر آپ کی کوشش سے ایک خریدار بھی بڑھتا ہے، کسی ایجنسی کے آرڈر میں ایک کا بھی اضافہ ہوتا ہے تو یہ معمولی بات نہ ہوگی ذرا سوچیے تو [illegible] سیکڑوں خیر خواہ ہوں جو [illegible] "معمولی سا کام" [illegible] خریدار [illegible] بڑھتے ... [illegible] کیجیے۔ آپ کی معمولی سی معمولی کوشش ہمارے لیے بہت بڑا اہمیت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ کتاب کی توسیع اشاعت کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی تجویز کوئی خاکہ ہو تو ہمیں لکھیے تاکہ ہم آپکے مشوروں پر عمل کر سکیں۔

سرورق:— اس بار سرورق پر بنگلہ دیش کے ایک نوجوان مصور ستیش جیندر کی تصویر کا عکس پیش کیا جا رہا ہے۔ نئی ہندی کہانی نمبر کا سرورق جو پنڈت نہرو کے سوگ میں سیاہ پوش تھا شہر کے ایک دوسرے نوجوان مصور سریندر راؤ کی تخلیق تھا نومبر کے شمارہ کا سرورق جس تصویر کا عکس تھا اسے بعد میں للت کلا اکاڈمی نے سیکڑوں تصاویر میں سے منتخب کر کے انعام سے نوازا۔ تصویر این۔ این۔ رائے کی تھی۔

بنگلا کہانی نمبر:— ہندستان کی مختلف زبانوں کے بولنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان زبانوں کا ادب دوسری زبانوں میں ترجموں کی صورت میں پیش کیا جائے۔ اسی خیال کے تحت ہم نے کتاب نے نئی ہندی کہانی نمبر پیش کیا تھا جو توقع سے زیادہ کامیاب رہا اور اردو کے تمام اہل قلم نے اسے ایک قابل قدر کوشش قرار دیا۔ اب ہمارا اگلا قدم بنگلا کہانی نمبر ہوگا جو جنوری میں پیش کیا جائے گا۔ ضخامت سوا دو سو صفحات کے اس نمبر کی قیمت جسے بنگال کے مشہور ادیب اور ہم پر بودھ کمار مجومدار ترتیب دے رہے ہیں صرف ۲ روپئے ہوگی اور یہ خاص نمبر خریداروں کو مفت دیا جائے گا۔ اگر آپ گیارہ عام شماروں کے علاوہ یہ نمبر بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ۱۲ روپئے بھیج کر آج ہی خریدار بن جائیے۔ اس کے علاوہ جولائی سے سالانہ خریداری شروع کرنے پر نئی ہندی کہانی نمبر بھی مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے پاکستانی خریدار:— کسی بھی مقامی بنک کو یہ درخواست دیں کہ وہ "کتاب" لکھنؤ کے سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں۔ اس لیے "کتاب" کی سالانہ قیمت مبلغ چھ روپے ہندستانی کے عوض آپ کو ڈرافٹ دیا جائے۔ اس درخواست پر ڈرافٹ مل جائے گا جسے آپ بذریعہ رجسٹری "کتاب لکھنؤ" کے نام بھیج دیں۔ رجسٹری لفافہ ملتے ہی رسالہ آپ کے نام جاری ہو جائے گا۔ پوسٹل آرڈر نہ بھیجیں۔ کیونکہ پوسٹل آرڈر ضبط کر لیے جاتے ہیں۔ یا آپ زر سالانہ حسب ذیل پتہ پر روانہ کر دیجیے اور ڈاک خانہ کی رسید ہمیں بھیج دیجیے۔ رسید ملتے ہی رسالہ آپ کے نام کر دیا جائے گا۔

مسٹر نعیم اکبر خاں۔ الائڈ فوٹو گرافرس (پاکستان لمیٹڈ) ۵/۴ موتی جھیل کامرشیل ایریا
ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

اپنی باتیں

آج تک ہم نے ان صفحات کو علمی ادبی اور سماجی مسائل تک ہی محدود رکھا تھا۔ آئیے آج کچھ کتاب اور اسکے مسائل کے بارے میں آپ سے باتیں کریں۔

کتاب کا اجراء ستمبر ۱۹۶۲ء میں ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک سوائے دو شماروں کے کتاب آپ کی خدمت میں پابندی سے حاضر ہوتا رہا ہے۔ یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے جس پر بہت زیادہ فخر کیا جائے لیکن کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جس پر شرمندگی ہو۔ صوری اور معنوی حیثیت سے دو سال ادھر اور آج کے کتاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس دوران ہم نے کچھ تجربے بھی کئے۔ کچھ میں کامیاب رہے اور کچھ میں ناکام۔ اس بار بھی ہم نے کچھ نئے عنوانات قائم کئے ہیں اور کچھ مستقل عنوانات کو جگہ دی ہے اور بہت سے نئے عنوانات ابھی زیر غور ہیں۔ اس بار سے ہم نے کتابت کا ڈھنگ بدلا ہے اور سرخیوں کو بھی زیادہ جاذب نظر بنایا ہے۔ ان تمام نئے عنوانات، مضامین اور تبدیلیوں کے بارے میں ہم آپ کی رائے اور مشوروں کے منتظر ہیں لیکن اس سے قبل کہ آپ اس سلسلے میں اپنی رائے لکھیں ہم آپ سے ایک بنیادی سوال کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ کے خیال میں کتاب کوئی اہم خدمت انجام دے رہا ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہے؟ اور کیا اگر کتاب کی اشاعت بند ہو گئی تو آپ اپنی علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی میں ایک لمحہ کیلئے بھی خلا محسوس کرینگے؟

آپ کے جواب پر کتاب کی بقا اور زندگی کا دار و مدار ہے۔ اردو کے کسی ادبی اور تہذیبی پرچہ کا یہ کہنا کہ دو سال تک مسلسل نکلنے اور اچھا اور معیاری ادب پیش کرنے کے باوجود وہ مستقل نقصان پر چل رہا ہے ہمارے نزدیک کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔ یہ اردو کی کمبختی اور ہماری بے عملی کی دلیل ہے۔ اسی خیال سے ہم نے آج تک آپکے سامنے کتاب کے مسائل نہیں رکھے لیکن آج ہم ایسا کرنے کے لیے اس لیے مجبور ہو گئے ہیں کہ کتاب اب صرف ہمارا نہیں بلکہ ان ہزاروں افراد کا ہے جو ہر مہینہ اسے پڑھتے ہیں (خرید کر یا مانگ کر؟) اس پر جتنا ہمارا حق ہے اس سے زیادہ اسکے پڑھنے والوں کا حق ہے۔ اسی لئے ہم اردو کے بہی خواہوں، کتاب کے پڑھنے والوں اور صحت مند ادب کے دلدادہ لوگوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ کتاب کے بارے میں کسی بُرے خیال کو دل میں نہ لائیں۔ ہمیں پورا الیقین ہے کہ اگر آپ نے اس کی جانب ذرا سی بھی توجہ دی تو اس کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے اور وہ زیادہ بہتر طریقے سے آپ کی ادبی اور علمی پیاس بجھا سکے گا۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ مستقل خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہے۔ آپ کتاب کو اپنے ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں اور عزیزوں سے روشناس کرائیے۔ ان سے اس کی سالانہ خریداری قبول کرنے کی درخواست کیجئے اور اگر

رضیہ سجاد ظہیر

اللہ دے بندے

جب فخرو بستی سے سنبھل آیا تو اس نے دھوتی کی جگہ تہہ باندھا، کرتے اتار کے کرتا پہنا، سنبھل سے مراد آباد پہونچا تو تہمد کی جگہ پاجامہ نے اور کرتے کی جگہ قمیض نے لے لی۔ بستی میں وہ الف کے نام لٹھا نہیں جانتا تھا سنبھل میں ہمارے ماموں نے اس کو اردو پڑھنا لکھنا سکھایا اور مراد آباد پہونچا تو وہ اتنا تیز ہو گیا کہ ہمارے بیرسٹر ماموں جو کتاب کہتے وہ الماری میں سے نکال لاتا۔ قانون کی ایک ایک کتاب پہچاننے لگا۔ سب قصے داستانیں رسالے اسے معلوم ہو گئے۔

لیکن اس ترقی کے باوجود ایک کمی اس کی شخصیت میں رہ گئی کہ وہ بوٹ جوتا نہیں خرید سکا —— بوٹ اس وقت بھی کافی مہنگے تھے اور پانچ روپیہ میں سے تین روپیہ گھر بھیجنے اور چار آنہ مہینے میں مسجد میں چراغی، چار آنہ یتیم خانے کا چندہ اور آٹھ آنے فاخری نوازی کے پاس جمع کرنے کے بعد پھر بچتا ہی کیا تھا جو شخص وہ بوٹ جوتا بھی خرید سکتا۔ آخر ہر مہینے حجامت بنواتا تھا، بیڑی ماچس، دھوبی کی دھلائی، سر کا تیل یہ سب مفت تو ہوتا نہیں تھا —— اس لیے اس کی شخصیت میں یہ ایک کمی رہ گئی تھی —— اور دوسری کمی اس کی ذہنیت میں رہ گئی تھی —— کہ وہ نماز پڑھنے سے برابر انکار کرتا چلا گیا۔ ترقی کے کسی اسٹیج پر بھی اس نے نماز نہیں پڑھی! ہمارے بیرسٹر ماموں کو اس معاملے میں اس کا یہ ازلی بیں والا رویہ سخت ناپسند تھا۔

بیرسٹر ماموں کئی سال ولائت رہے تھے، سوٹ پہنتے تھے، انگریزی فر فر بولتے تھے مگر نماز پانچوں وقت کی پڑھتے تھے، جب وہ نماز کے لیے با آواز بلند اذان دیتے تو باقی گھر والوں کی سٹی گم ہو جاتی، ہر شخص ان کی گرجدار آواز کے رعب میں آ کر فوراً نماز پر کھڑا ہو جاتا۔ ہمارے نانا صاحب تک جیتے اس بات پر بے حد فخر کرتے رہے کہ ان کے کئی دوستوں کے بیٹے تو ولائت جا کر اپنا دین ایمان بھول گئے، مگر ان کا بیٹا اتنے دن تک ولائت میں رہنے کے بعد بھی پانچوں وقت کی نماز پڑھتا اور تیسوں روزے رکھتا تھا۔ ابھی اس کی نماز کی تو خوا نہیں تک، وہ الٹے بھیس، ایسی جیسے کتنی عورتوں کو اس نے نماز سکھا کے ان گمراہوں کو دین ایمان کا راستہ دکھایا تھا۔

ویسے بیرسٹر ماموں کو فخرو سے محبت بہت تھی اور کیوں نہ ہوتی یوں تو وہ عمر میں ان سے بڑا تھا پر آخر انھوں نے ہی تو اس کو جانور سے آدمی بنایا تھا۔ یہ بات اور تھی کہ اب فخرو کے بغیر ان کا کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا، تنا سستا، اتنا زیادہ کام کرنے والا اور ایسا نیک سر خواہ نوکر نہیں مل سکتا تھا۔ ورنہ کبھی کبھی تو وہ خود بھی کہتے تھے کہ ایسے آدمی کے تو ہاتھ کا پانی بھی نہ پینا چاہیے جو کبھی ایک ٹکر نہیں مارتا، جس کے دل پر اللہ نے مہر لگا دی ہے!

مختصر وہ روزے تیسوں رکھتا تھا، رمضان بھر جو کچھ ہو سکتا خیرات کرتا، مسجد میں آنے والوں کے لیے نکڑ کی لالٹین میں تیل اپنے پاس سے رمضان بھر ڈالتا —— تاکہ راستہ پر روشنی رہے پر خود مسجد کے اندر نماز پڑھنے کبھی نہ جاتا —— اور کاموں سے بچا کس پر سے مسجد کے کونا۔

اموں رمضان کے دوران دو تین بار اس سے کہتے "ابے کیا رکھے روزے سے فائدہ ہی کیا، بیکار فاقے کرتے ہو، بغیر نماز کے

کتاب، لکھنؤ

قطعات

فیض احمد فیض

کھلے جو ایک سے دریچے میں آج حسن کے پھول
تو صبح جھوم کے گلزار ہو گئی یکسر
جہاں کہیں بھی گرا نور ان نگاہوں سے
ہر ایک چیز طرح دار ہو گئی یکسر

میخانے کی رونق ہیں کبھی خانقہوں کی
اپنائی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداریٔ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عشّاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

یہ چار حرف پیٹ میں ڈالے کہ اب داستان امیر حمزہ پڑھ سکوں ہوں۔

بیرسٹر ماموں زچ ہو جانے پر بحث کرتے جاتے ——— آخرہ بیرسٹر تھے یہ سری کا لنگوٹی بند ان کو کیا ہرا سکتا تھا۔

بکتے ۔ تو کوٹھری میں بیٹھ کے ڈھیروں دعا مانگے ہے تو پھر کیا! جماعت میں نماز کا حکم ہے نہ ہے"

فخرو ذرا سا جھینپ کے جواب دیتا۔" اجی سب کے سامنے کسی سے کچھ مانگتے ذرا شرم آوے ہے ——— اور دعا تو حضور میاں ہر کسی کی سن لیویں ہیں میر صاحب ——— کیا کوٹھری کے نہ سنتے؟ اور مولی صاحب تو اس دن کہہ رئے تھے کہ رسول اللہ بھی اپنے حجرے میں نماز پڑھیں تھے اور کبھی مسجد میں اور حضرت یوسف نے تو قید خانے میں دعا مانگی تھی اور ....."

ماموں کھسیا کے بولے ۔ اور اور کے بچے! کیا کہتا چلا جاوے ہے، استغفر اللہ، تیری اور نبیوں کی برابری ہے؟"

فخرو نے کان کو ہاتھ لگایا ۔ توبہ ہے، توبہ ہے، اجی میں گے تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں، میں تو گے مکے، رہا ہوں کہ گنہگار بندوں کو، تو وہی کرنا چاہیئے جو آپ کریں تھے، جب ہی تو نجات ہووے گی، جب ہی تو آپ سفارش کریں گے ——— صلی اللہ ———" اس نے اپنی انگلیاں آنکھوں کو لگا کے چومیں ——— ارے عقیدت کے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں!

بیرسٹر ماموں نے عاجز ہو کے حقہ طلب کیا اور گڑگڑانے لگے۔

یقیناً فخرو کے دل پر خدا نے مہر لگا دی تھی!

پھر ایک دن گھر میں بڑا ہنگامہ مچا۔ بات یہ ہوئی کہ فخرو کے پاس یکایک ایک جوڑ جوتا کہیں سے آ گیا ——— جوتا نہیں بوٹ ——— ایک دم عمدہ والا، چاہو چم کرتا، چاہو تو اس میں منہ دیکھ لو، اس کی چھوٹی ننھی ننھی آنکھوں میں کالے ہی کالے ریشمی فیتے پڑے ہوئے تھے جن کے آخر میں سیاہ ٹین جڑا تھا اور بٹن میں سے آخر کی طرف، فیتے کا بالکل منا سا، بالکل ذرا سا ریشمی پھندنا اوپر کو منہ اٹھائے جیسے کوئی محبوب اپنے بھرے بھرے گال سے ہونٹ سکوڑ کر سیٹی بجا رہا ہو!

اور پھر اکیلا جوتا بھی نہیں، ساتھ میں ایک ڈبیہ اس پر کرنے والی پالش بھی اور ایک برش بھی۔ سب بچے بیحد خوش میں تھے، باری باری سے جوتا اٹھا کے دیکھتے، کوئی پالش کی ڈبیہ کو زمین پر گول گول نچاتا، کوئی برش کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا، کوئی فیتے کے پھندے پر انگلی پھیرتا، نوری آپا نے تو یہاں تک تجویز کی کہ جوتے کا کوئی نام بھی رکھا جائے!

بیرسٹر ماموں کا بھی موڈ اس وقت اچھا تھا، ہنس کے بولے " ہاں ہاں ضرور رکھو ——— خدا بخش نام رکھو اس کا۔"

سب ہنسنے لگے مگر فخرو سنجیدگی سے بولے " اجی یہ تو ٹھیک کہو ہو میر صاحب، میں نے بہتیری ہی دعائیں مانگی تھیں کہ اللہ میاں تم نے سب کچھ دیا بس اب ایک بوٹ جوتا اور دیدیکیں سے سو میر صاحب وہ جو عورت بھگاتے والا موکل آیا تھا، اجی وہی جن نے سجاری والی تیزن کی لونڈیا بھگائی تھی، اور تم نے دس سے صاف چھڑا لیا تھا، تو وہ ان نے مجھ سے کہا کہ بھائی جب میں آئل تھا تو تو میری بہت خاطر کرے تھا، اب میں باعزت بری ہو کے گھر جا رہا ہوں، تو بتا تو کیا لیوے گا سو جیکی بجاتے میں، چھپر پھاڑ کے اللہ میاں نے دلوا دیا گے بوٹ ——— اچھا ہے نہ میر صاحب۔" اس نے بڑے پیار سے جوتے کو دیکھا۔

" ارے ہاں، بہت اچھا ہے" بیرسٹر ماموں بولے ——— " اب آج تو چل مسجد، نماز شکرانہ تو ادا کر۔"

فخرو چپ ہو گیا، جھک کے اس نے جوتے اٹھائے، بڑی احتیاط سے ڈبے میں رکھے، برش جوتوں کی آڑ میں فٹ کیا، پھر ڈبیہ ایک کونے میں بٹھائی، ڈھکنا ڈھک کے اسے ستلی سے باندھا۔ ڈبہ بغل میں دابا ——— اور کھسک لیا۔

شام کو مغرب کے وقت بیرسٹر ماموں مسجد میں داخل ہو ہی رہے تھے کہ انھیں فخرو کا سایہ گلی کے نکڑ پر دکھائی دیا ——— نئے جوتے پہنے، نئی تہمد کا دامن اٹھا، نئے پاجامے کے پائنچے پھٹکارتا پان چباتا، ایک دوست کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ گلی میں مڑنے ہی والا تھا کہ بیرسٹر ماموں نے للکارا۔ فخرو ——— ابے او فخرو ——— یہاں آ ——— ابے آ یہاں۔"

جی آپ نے جو کتاب پڑھائی تھی میر صاحب اس میں تو نماز الگ لکھی ہے جی، روزہ الگ لکھا ہے، یہ تو
نہ ہو سکتا یا روزہ بغیر نماز نہ ہو سکتی۔"

اب اس صریحی منطق کا ماموں کے پاس کیا جواب تھا۔ وہ اسے دھتکارتے ہوئے کہتے "چل کمبخت، دور ہو، لاکھ طوطے کو پڑھایا حیوان ہی رہا ــــــ"

عجیب بات یہ تھی کہ فخرو نے کبھی بیرسٹر ماموں سے انکار بھی نہیں کیا تھا کہ وہ نماز نہیں پڑھے گا پر کچھ ایسا ہو جاتا تھا کہ وہ صاف بچ جاتا اور کبھی مزے میں رہتا ــــــ

مثلاً مغرب کی نماز کیلئے ماموں مسجد جانے لگتے تو فخرو سے بھی کہتے "ابے چل مسجد"

مغرب کی اور صبح کی نماز وہ مسجد میں پڑھتے تھے ــــــ پہلے گھر میں اذان دیتے ــــــ پھر مسجد میں جا کر نماز پڑھتے۔

فخرو گھر کے دفتر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتا اور بڑی معصوم سی صورت بنا کے چپکے سے کہتا "اجی بڑا موٹا موکل ہے گا بلکہ صاحب میں تمہارے ساتھ چلا جاؤں تو وہ مچھلی کی طرح کھسل جاوے گا، تم پڑھ آؤ نماز جتے میں اسے باتوں میں الجھاؤں ہوں"

مغرب کی اب اس کے آگے ماموں کیا کہتے!

مغرب کی نماز پڑھ کر وہ لوٹتے فخرو کو موکل سے گپ شپ کرتے پاتے!

کبھی کبھی صبح کو وہ فخرو کو آواز دیتے "ابے آ ــــــ مسجد جا رہا ہوں۔"

وہ چائے کی ننھی سی پتیلی مانجھتا ہوا صفدے ہی پر سے بڑے اطمینان سے جواب دیتا "اجی تم چلو، فاخری دادی کو رات لرزہ چڑھ گیا ان کے لیے دو پتی چائے دم کر کے ابھی آؤں ہوں فوراً، تم چلو میر صاحب"

فاخری دادی بڑی جلالی سیدانی تھیں اور گھر کی سب سے زیادہ ٹھوس قسم کی بزرگ، بچانوے برس کی عمر تھی لہٰذا ان کو سب کے حالات معلوم تھے، ہر ایک کی ماں کا مہر اور ہر ایک ــــــ کی خرابی یا عمدگی ان کو پتہ تھی، ان کو غصہ چڑھتا تھا تو وہ سات پشت کے دھر دیتی تھیں، ظاہر ہے ان کی چائے میں کون اڑچن لگا سکتا تھا۔ ماموں بڑبڑاتے، پیر پٹختے چلے جاتے۔!

جاڑوں میں اکثر سب لوگ رات کے کھانے کے بعد بیرسٹر ماموں کے کمرے میں جمع ہوتے، کیونکہ وہاں سب سے بڑی والی انگیٹھی تھی ــــــ فخرو بھی وہیں ہوتا ــــــ کبھی کبھی بیرسٹر ماموں اس سے بحث کرتے۔

" ابے میں کہوں ہوں آخر تو اللہ کے گھر جانے سے کیوں کنی کاٹے ہے"

فخرو بڑے بھولے پن سے حیران ہو کے جواب دیتا "اجی لو، اللہ کے گھر جانے سے کون بندہ کنی کاٹ سکے ہے، ابھی اس دن نہ گیا تھا روزہ داروں کی افطاری لے کے؟ گئے بڑا دیگچہ گھنگھنی کا حلوا آپا نے حوالے کر دیا کہ لے جا مسجد، دونوں نے تو کیا بھی ہچکچا کے رے پکڑانے کو، پر میں نے اکیلے ہی سر پہ اٹھا کے منٹوں میں پہنچا دیا کہ افطار ہے ثواب ہووے گا ــــــ بھلا میرے سے کیا کم رہی ہو گی گھنگھنی ــــــ کیوں حلوا آپا؟"

"اے ہاں اکڑ گیا" حلوا آپا نے گواہی دی۔

" ابے وہ تو ٹھیک ہے پر تو نماز پڑھنے کیوں نہ جاتا؟ دعا مانگنے سے کیوں گھبراوے ہے؟" بیرسٹر ماموں نے صاف سوال کیا۔

"اجی واہ میر صاحب، اتنے بڑے بالسٹر ہو کے یہی انصاف کرو ہو! اجی دعا نہ مانگوں ہوں تو کیا اللہ میاں نے یوں ہی مجھے مردہ باد تک پہنچا دیا؟ اجی میرے برابر تو کوئی دعا نہ مانگتا ہووے گا ــــــ اتنی اتنی دعا مانگی تب اللہ میاں نے

اس تقریر کے بعد اس نے کرتے کی ایک جیب سے پلاسٹک کی ڈبیہ اور دوسرے سے برش نکالا اور مسجد کے ایک کونے میں اچھال دیا ——— پھر باہر نکل کر اپنی پرانی سلیپر پہنیں اور روانہ ہو گیا۔

جب میری عمر کوئی سات آٹھ سال کی تھی تو فرزد کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ ڈیوڑھی میں بیٹھے کھانا کھاتے تھے، پوتوں پڑپوتوں والے تھے مگر ہر بار جب ہم لوگ اپنے ننھیال جاتے تو میں ایک ایک سے یہ قصہ سنتی تھی۔ اس واقعہ کے بعد وہ کبھی مسجد گئے نہ کبھی انھوں نے نماز پڑھی ——— حسب عادت نماز کا ذکر سن کر وہ کچھ نہیں کہتے تھے ——— کبھی کبھار مسکرا دیتے! لیکن اگر کوئی یہ کہہ دیتا کہ "اللہ کی مرضی یوں ہی تھی، خدا کا کرنا یوں ہی تھا۔" تب وہ بے حد بگڑتے، بے حد خفا ہوتے "اجی واہ، خوب کہو ہو، اللہ کا کرنا تھا اجی وہ تو دیوے ہے اسے لے کے کیا کرنا ہے۔ یہ تو ہے انسان، چھپنے تو ہے بندہ اور نمازی بندہ کی تو جب نیت بدلے ہے تو ایسی بدلے ہے کہ جس کی کچھ ٹھیک نہ ہے! سمجھے ہے نہ کہ نماز پڑھوں ہوں، تو سات خون مجھ کو معاف ہو جاویں گے، جانے ہے نہ کہ اللہ تو کچھ کہنے کو آنے سے رہا ——— اپنی ساری کی کرائی۔ اگلی پچھلی، گندگی سمیٹی اور اللہ کے سر تھوپ دی! اپنے آپ ہاتھ جھاڑ کے الگ ہو گئے ——— اور خواہ مخواہ اللہ کو الزام ——— کیا انصاف نہ ہو ——— واہ جی واہ۔"

کتاب کے مئی کے شمارہ میں قاضی عارف الدین کا ایک افسانہ بلا عنوان شائع کیا گیا تھا۔ یہ افسانہ دراصل دنیا کی آدمیت پستی اور مادی خوشیوں میں سکون کی تلاش کے خلاف ایک احتجاج تھا۔ کہانی کے اس بنیادی خیال نے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اس قسم کے عنوانات کو جنم دیا۔ منزل ہے کہاں تیری، اندھیرا اور اندھیرا، دنیا کی چمک، دل کا اجالا اور حقیقت۔ چند اور عنوانات جو بہت سے پڑھنے والوں نے بھیجے وہ یہ ہیں۔

روشنیوں کا شہر، اندھیری بستی۔ خواب اور حقیقت۔

ججوں نے اس کہانی کے موصول ہونے والے تمام عنوانات پر غور کرنے کے بعد متفقہ طور پر

ش سروج (ای۔ پی ۲۰۳ محلہ جولاکھ۔ ججوں [illegible] تی) کے تجویز کیے ہوئے عنوان "یشیشوں کا مسیحا" کو اول

ام دینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرا انعام ججوں نے متفقہ طور پر ریحانہ خاں (بتوسط مسٹر رئیس احمد خاں ۱۶۶/ ۵۴

ملک پور۔ الہ آباد) کو دینے کا فیصلہ کیا جن [illegible] عنوان تھا "سکون دل کی خاطر"۔ تیسرا انعام نور جہاں طلعت

۱۰۵ [illegible] ساری منڈی۔ لکھنؤ) کو دیا گیا جنھوں نے "اک سکون دل کی خاطر" عنوان

تجویز کیا تھا۔

یش سروج کو ۶ ماہ کے لیے اور ریحانہ نور جہاں طلعت کو تین تین ماہ کے لیے رسالہ کتاب [illegible]

کیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ ججوں کو سید قسیم اکمل گیاوی کا [illegible] "یاد شباب"، منیر احمد، جامراج نگر کا "اک آرزو"، رکیمہ اقبال کا "ہزاروں خواہشیں ایسی ——— " اور محمد رئیس نواب، برہان پور کا "سکون پھر بھی" پسند کیے۔

اس کے علاوہ فائر بریگیڈ کی تلاش، اعمال نامہ، ماڈرن گوتم، سکون کی تلاش، اعتراف شکست، کش مکش ——— عنوانات بھی ججوں نے پسند کیے۔

فخرو بیٹھ چکا تھا۔ اس کا دوست اور وہ دونوں آئے۔ "چل وضو کر" ماموں نے حکم دیا۔

مخنسرو کسمسا کے بولا "ابھی پان کھا رہا ہوں میر صاحب ——— اور پھر یہ بھی تو بات ہے کہ ....."

"کہ پان سسرال والوں نے کھلایا ہے، تھوک نہ سکے ہے بیچارہ" اس کے دوست نے ٹکڑا جوڑا

ماموں ہنسنے لگے "سسرال؟ کیسی سسرال ——— ابے یہ چیچپے ہی چیچپے!"

فخرو خاموش رہا ——— پر اس کا دوست بولا "ابھی کوئی ایسی ویسی بات نہ ہے، اشراف ہیں گے وہ لوگ بھی، اپنی برادری ہے، بالشرو صاحب، سرسی گئے ہیں، لڑکی بھی قبول صورت ہے گی، نماز پڑھے، کلام پاک ختم کر چکی ہے، اس دکھیا کا گھر بھی بیوی کے مرنے سے اجڑ گیا ہے سو بس جائے گا۔"

"اچھا، اچھا، چلو وضو کرو دونوں آدمی ——— چلو" ماموں نے اصل بات پھر پھیر دی۔

مخنسرو نے بے بسی سے دوست کی طرف دیکھا، دوست نے اس کی طرف، دونوں مٹی کا بدھنا اٹھا کے وضو کرنے لگے۔

مغرب کی نماز کے بعد مولی صاحب روز وعظ کہتے تھے، آج بھی کہا، اس میں کافی دیر لگی، کچھ لوگ اٹھ اٹھ کے چلے گئے۔ فخرو اور اس کے دوست نے بھی کئی بار پہلو بدلا پر بیرسٹر ماموں نے ان کو ایسا گھورا کہ وہ پھر دبک کے بیٹھ گئے!

آخر کار وعظ ختم ہوا، لوگ باہر نکلے اور فخرو کو ایک ہی لمحہ بعد پتہ چل گیا کہ اس کا نیا بوٹ جوتا غائب ہے۔

اس کے دوست کی سینپر سیپٹیاں اسی طرح محفوظ رکھی تھیں۔ سب لوگوں میں ہراسانی کی ایک لہر دوڑ گئی، بیرسٹر ماموں بھونچکا رہ گئے۔ ان پر ایک دو منٹ کے لیے تو بالکل سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر مخنسرو کو سمجھاتے ہوئے بولے "چل جانے دے ——— ہوگا، میں تجھے دوسرا لے دوں گا، اس سے ———."

——— بھئی اچھا سمجھ رے جس اللہ نے دی تھیں وسی نے لے لیں "فخرو پر ابھی اب تک تو سکتہ طاری تھا پر یہ سن کر وہ بپھر گیا۔ کھڑا کے بولا۔ "اجی گئے تو میں کبھی نہ ماننے کا ہوں کہ اللہ نے لے لیا ——— اس نے تو مجھے اتی دعائیں مانگنے پر دیا تھا، پھر لے کیوں لیوے گا اور ویسے کیا ضرورت ہے بوٹ جوتے کی ——— خواہ مخواہ کو اللہ کو الزام دو ہو بالشرو صاحب۔ لیا تو ہے کسی نمازی نے"

بیرسٹر ماموں کیا کہتے ——— وہ تو صاف ہی ظاہر تھا کہ کسی نمازی نے لیا ہے، کھسیا کے بولے "نہ جانے کون تھا شیطان کی اولاد! مسجد میں نماز کے بہانے آویں ہیں جوتے چرانے! ابھی پولیس میں رپورٹ کر کے بندھوا دوں ہوں۔"

پولیس میں رپورٹ ہوئی، بیرسٹر ماموں نے انعام کا اعلان کیا دوسرے دن وعظ میں بڑے مولی صاحب نے بھی خوب لعنت ملامت کی محلے میں بھی ایک ایک سے کہا گیا ——— پر بوٹ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔!

چوتھے دن ایک عجیب بات ہوئی، مغرب کی نماز کے وقت فخرو مسجد میں پہنچا۔ سب کو یہ معلوم تھا کہ اس کا جوتا چوری ہو چکا ہے، لوگ اسے دیکھ کر حیران ہوئے، پر بولا کوئی کچھ نہیں! جب نماز ختم ہوئی اور مولی صاحب وعظ کہنے منبر کی طرف بڑھے تو فخرو ان کے اور منبر کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ اور بولا "اجی مولی صاحب، ذرا میں کچھ کہنا چاہوں ہوں۔" مولی صاحب کو اس سے ہمدردی تھی، فوراً ایک طرف کو ہو گئے!

فخرو لوگوں کو مخاطب کر کے بولا "بھلے آدمیو، پرسوں یہاں مسجد سے میرا جوتا چوری ہو گیا ——— نمازیوں کے سوا تو کوئی یہاں آتا نہ ہے سو کسی نمازی نے ہی چرایا ہووے گا ——— خیر ——— پر میں نے گے سوچا کہ جب مسجد میں جوتا گیا ہے واں ہی گے پالش کی ڈبیہ اور گے برش بھی چلا جائے، سو میں لیتا آیا ہوں اور آپ نمازیوں کو بخشے دوں ہوں۔ میں تو اب کبھی مسجد میں آنے کا نہ ہوں اور تا زندگی نماز نہ پڑھنے کا ہوں، پر اللہ سے دعا ضرور مانگوں گا کہ ایک بار دیا تھا سو دوسری بار بھی دیوے ——— اور اس کی کرپی سے کچھ دور نہ ہے، وہ پھر دیوے گا ——— ضرور دیوے گا۔"

سلمیٰ صدیقی

سینڈل

زمانہ کتنا بدل گیا ہے، پہلے اونچی اٹاری پر کاگا بولتے تھے اب اونچی ایڑی پر چڑھ کر عورتیں بولتی ہیں۔ اور کوا بیچارہ تو بول کر اڑجاتا تھا لیکن عورتیں بولنا شروع کرتی ہیں تو بولتی ہی چلی جاتی ہیں۔ اور یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ جو عورت جتنا زیادہ بولتی ہے اسے اپنے بے زبان ہونے کا اتنا ہی زیادہ یقین ہوتا ہے۔ جو عقلمند مرد عورت کی اس خوبی سے واقف ہوتے ہیں وہ عام طور سے عورت کی لمبی زبان اور اس کی سینڈل کی اونچی اڑان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ دراصل عورت نے دنیا میں جتنی بھی آزادی یا ترقی آج تک حاصل کی ہے اس کا اندازہ کرنا ہو تو اس کی سینڈل کی ایڑی کی اونچ نیچ کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیئے اگر مرد نے آزادی دماغ کی طرف سے حاصل کی ہے تو عورت کو یقیناً پاؤں کی طرف سے ملی ہے۔

پرانے زمانہ میں لوگ اس پرانے نکتہ کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے، اسی لیے عورتوں کے پاؤں کو بچپن ہی سے لکڑی کے مضبوط جوتوں میں بند رکھے تھے۔ عورت کو قابو میں رکھنے کے لیے اور محفوظ رکھنے کے لیے اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ جن ملکوں نے عورتوں کے پاؤں پر پابندی نہیں لگائی ہے وہاں کی عورتیں عام طور سے مردوں کی برابری کا دم بھرنے لگتی ہیں۔ حالانکہ عورتیں یہ راز نہیں جانتی ہیں کہ انھیں ملکوں میں ان کے پاؤں کھلے رکھے جاتے ہیں، جہاں ان کے دماغوں کو ہمیشہ کے لیے قانون اور دستور کے خانوں میں بند کر دیا جاتا ہو۔

مرد کے ذہن کی اونچائی کی طرح عورت کی چپل کی ایڑی کی اونچائی بھی آج تک کسی ایک سطح پر قائم نہیں رہ سکی ہے، بلکہ ایک زمانہ تو ایسا آیا تھا جب سینڈل کی ایڑی اتنی اونچی اٹھ گئی تھی کہ عورت اگر ہاتھ بڑھا کر آسمان کے تارے نہیں تو کم سے کم صحن میں ٹنگی ہوئی الگنی پر سے بغیر اچکے ہوئے تولیہ تو اتارنے ہی لگی تھی۔ سینڈل کی ایڑی نے جتنے روپ بدلے اتنے تو شائد خود عورتوں نے بھی فیشن نہیں بدلے ہوں گے۔ ایک زمانہ میں سینڈل کی ایڑی، پلیٹ فارم ہیل، بھی کہلاتی تھی۔ نزدیک سے دیکھنے میں تو یہ ایک سوکھی باسی ڈبل روٹی کی طرح نظر آتی تھی لیکن دور سے دیکھنے پر محسوس ہوتا تھا کہ جیسے واقعی کوئی پلیٹ فارم حرکت میں آگیا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی تو کسی محترمہ کو ایسے سینڈل پہنے دیکھ کر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ شائد ٹرین بھولے سے پلیٹ فارم پر چڑھ گئی ہو —— جب باریک نوکیلی ایڑیوں کا زمانہ آیا تو اس زمانہ میں عورتوں کی بہت سی ضرورتیں ان ایڑیوں سے پوری ہونے لگی تھیں۔ مثال کے طور پر گراموفون کی سوئیوں کا خرچ بچنے لگا تھا۔ گھریلو کام کاج کے درمیان اگر پیچ کش کی ضرورت ہوتی تو یہی ایڑی کام آتی تھی۔ نالی میں پھانس لگ جاتی تو بڑی جلدی اسی ایڑی کی مدد سے باہر نکل آتی تھی۔ کبھی کبھار گھر میں جگہ کی تنگی ہوتی تو انہی ایڑیوں کی مدد سے بغیر کیل گاڑے سینڈل دیوار پر لٹکائے جا سکتے تھے۔ اس طرح دیوار پر سینڈل ٹنگے ہونے کے بہت سے فائدے بھی تھے یعنی سینڈل کے سینڈل اور آرائش کی آرائش!

مان لیجئے آپ بارہ برس تک ہر مہینے ایک سو روپے کی مالیت کا ۱۲ سالہ نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ خریدتے ہیں۔ بارہ برس بعد ہر مہینے ایک سرٹیفکیٹ کی میعاد پوری ہوگی اور اس طرح ہر مہینے آپ کو ۱۷۵ روپے ملیں گے۔ بڑھاپے میں جس سے بڑی یہ آمدنی آپ کے بڑے کام آسکتی ہے اس آمدنی کی حیثیت باقاعدہ پنشن کی سی ہوگی!!



آپ کے لئے ماہانہ پنشن

سرٹیفکیٹوں کی میعاد پوری ہونے پر اگر آپ چاہیں تو ۷۵ روپے اپنے پاس رکھ کر باقی یعنی ایک سو روپے کی اصل رقم سے پھر ہر مہینے نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ خرید سکتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر رقم لگانے کی نئی تاریخ کے بارہ برس بعد سے، مزید عرصہ بارہ برس کے لئے، آپ یا آپ کے متعلقین کو باقاعدہ ماہانہ آمدنی ہوگی۔ نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ اقتصادی سلامتی کی ضمانت ہیں جو آپ اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے مہیا کرسکتے ہیں

نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ خریدیے

قومی بچت آرگنائزیشن

نور شاہ



صدیوں پرانی بات ہے!
کسی جھیل کے کنارے ایک بت تھا، وہ پورے چاند کی رات تھی اور بت نے جھیل میں جھانکا تو اسے اپنی صورت نظر آئی
کہتے ہیں وہ بت اپنی ہی صورت پر عاشق ہو گیا۔

یہ صدیوں پرانی بات مجھے اس وقت یاد آئی جب شگفتہ میری آنکھوں میں مسلسل دیکھے جا رہی تھی اور میں نے پوچھا۔
"کیا دیکھ رہی ہو۔"
"اپنی صورت ـــ"
وہ زیر لب مسکرائی اور کہا۔
"اتنی خوبصورت کہ اپنے آپ سے عشق کرنے کو جی کرتا ہے۔"
"اس بت کی طرح جو اپنی ہی صورت پر عاشق ہو گیا تھا۔"
"لیکن میں تو بت نہیں ہوں۔"
"سچ شگفتہ۔"
"ہاں دیکھو نا میرا دل کیسے دھک دھک کر رہا ہے۔" اس کے لہجے میں بڑی معصومیت تھی۔
"جانتی ہو تمہارے دل کی یہ دھڑکنیں کیسے جینے کی تحریک بخشتی ہیں۔"
"نہیں تو ـــــــ"
"مجھے ـــــ"
وہ اس طرح ہنس دی جیسے ساری کائنات اس کی جوانی کی خوشبو سے نکھر اٹھی ہو۔
"شگفتہ ـــــ"

نور شاہ اردو کے ایک مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کرتے ہیں۔ اس بار ہم ان کی ایک کہانی بغیر عنوان کے پیش کر رہے ہیں اور عنوان کے انتخاب کا فیصلہ آپ پر چھوڑے دیتے ہیں ـــــ آپ اپنی پسند کا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو عنوان پوسٹ کارڈ پر لکھ کر ماہنامہ کتاب۔ چوک لکھنؤ۔ ۳ کو بھیج دیجیے۔ ۲۰ ستمبر تک موصول ہونے والے سب سے اچھے عنوان پر ۶ ماہ کے لیے اور دوسرے اور تیسرے عنوانات کے لیے تین تین ماہ کے لیے "کتاب" مفت جاری کر دیا جائے گا۔

اسی طرح محلے کے ایک گھر میں ایک شوہر رہتے تھے اور اسی طرح کی سینڈلوں سے بہت ڈرتے بھی تھے۔ ایک دن ان کی بیوی نے ان سے فرمائش کی کہ بازار جا کر ان کے لیے ایک سینڈل خرید لائیں۔ نمونہ اور ناپ کے لیے انھوں نے اپنا ایک سینڈل بھی شوہر نامدار کے حوالے کیا۔ وہ بیچارے کی سینڈل اور اپنی جان بچا کر گھر سے نکلے اور رخ انھوں نے کیا بازار کا۔ ایک زمانہ کے بعد کھلی ہوئی ہوا میں نکلنے کا اتفاق ہوا تھا، راستہ میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں کچھ دیر کے لیے ایک سایہ دار درخت کے نیچے موٹی سی جڑ پر سر رکھ کر لیٹ رہے اور میٹھی نیند کی ڈوریوں نے ان کو سینڈل کی دنیا سے بہت دور پہونچا دیا۔ اچانک ہڑبڑا کر اٹھے، ادھر دیکھا ادھر دیکھا، مگر سینڈل ندارد، سخت حیران پریشان اور سہمے ہوئے تھے کہ کیا کریں؟ گھر جاتے تو کیسے جاتے؟ وہاں تو ایک سینڈل اب بھی ان کی راہ تک رہا تھا۔

بازار جائیں تو سینڈل کا ناپ کہاں سے کریں! اسی ادھیڑبن میں پھنسے دھیرے دھیرے بازار پہونچے اور دوکاندار سے زنانی چپلیں دکھانے کی فرمائش کی۔ ایک چپل پسند آگئی، تو دوکاندار نے ناپ مانگا، غریب آدمی ادھر ادھر دیکھتے رہے دماغ پر زور دیتے رہے اور پریشانی میں سر پر بار بار ہاتھ پھیرتے رہے ...... دوکاندار نے پھر ناپ کے لیے ٹوکا، تو ان کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی، ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور انھوں نے بڑے اطمینان سے دوکاندار کے آگے اپنا سر جھکا دیا اور بولے "جہاں تک کے بال اڑے ہیں، وہی بیگم کا ناپ لے لو۔"







"ابھی جلدی کیا ہے ابھی کنا چاہتے ہونا ــــــ لیکن مجھے جلدی ہے۔ میں اپنی اس روز روز کی بیماری سے اب اکتا چکی ہوں۔

"ہاں ــ"

"میں نے لڑکی بھی دیکھ لی ہے اور ہاں بھی کردی ہے۔"

ہاں ہو گئی تھی اور ماں کی بات کیسے ٹال سکتا تھا۔ میں نے ہاں کی اور نہ نا ــــــ اور الکا میری بیوی بن کر آ گئی۔

بڑی بڑی بادامی آنکھیں بھرا بھرا چہرا۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹ ان بادامی آنکھوں کو دیکھ کر نہ میرا دل دھڑکا اور نہ ہی ان پتلے پتلے ہونٹوں نے میری پیاس بجھائی۔ اور اس روز مجھے احساس ہوا کہ میری صدیوں کی پیاس میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

●

الکا چپکے سے میرے کمرے میں چلی آئی ہے۔

"تم میرے یہاں آنے سے ناراض ہو گئے ہو کیا۔"

"نہیں۔"

"تو پھر اداس کیوں ہو۔"

(میں اداس کب نہ تھا) !

"خاموش کیوں ہو۔" اس نے پوچھا۔

"خاموش نہیں کچھ سوچ رہا ہوں۔"

"کیا۔"

"یہی کہ تم اس برفیلی وادی کو چھوڑ کر یہاں پتھروں کے شہر میں کیا لینے آئی ہو۔"

"تم جو یہاں ہو۔"

"میرا وجود یہاں ہے لیکن میری روح برف کی پگڈنڈیوں میں کسی کے قدموں کے نشانوں کی تلاش میں کھوئی ہوئی ہے۔"

"کون ہے وہ۔"

"کاش تم نے میری روح کو پا لیا ہوتا۔"

میرا ہاتھ بے اختیاری کے عالم میں سرہانے کی طرف بڑھا۔ مجھے یکایک یہی احساس ہوا کہ الکا میرے سامنے ہے اور میں اس کی موجودگی میں شستا کی تصویر سے باتیں نہیں کر سکتا ہوں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ الکا میرے لیے دو سو میل کی لمبی مسافت طے کر کے آئی ہے۔ تھکی تھکی سی ہے اور پیار کے دو بول سننے کی اسے کس قدر تمنا ہو گی۔ پر میرا دل تو ویران ہو چکا ہے۔ اور وہ پھول جو اس ویرانے میں بہار لا سکتا ہے دور بہت دور ہے۔

اگر زندگی ایک تتلی ہوتی اور اس کے پر ہوتے تو میں خود ہی اپنی روح کی تلاش میں جا نکلتا۔ لیکن زندگی نہ ایک تتلی ہے اور نہ ہی کیکر کا نرم و نازک شگوفہ ــــــ زندگی ایک کھردرا پتھر ہے اور یہ پتھر اپنے کندھے پر لٹکائے نگر نگر بستی بستی گھوم رہا ہوں۔

●

میں اور شستا شکارے میں کبوتر خانہ کی طرف جا رہے تھے۔ شام کا وقت تھا اور ہم دونوں خاموش تھے۔ شاید شستا میرے بارے میں سوچ رہی تھی میں تو الکا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ الکا جو میری بیوی ہے جس کے ساتھ میرا ازل سے ابد تک کا ساتھ ہے لیکن جو میرے قریب ہو کر بھی دور ہے۔ کس قدر دور ہے ــــــ اور شستا سے میرا کوئی ظاہری رشتہ نہیں۔ اگر رشتہ ہے تو

●

الکا ابھی ابھی دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے۔ اور میں نے ششما کی تصویر تکیہ کے نیچے چھپا کر رکھ دی ہے۔ یہ وہ بھی ایک دنیا ہے جہاں بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ جیسے میں الکا کے آنے سے پہلے ششما کی تصویر سے باتیں کرتا تھا اور سوچتا تھا۔
——— کاش ششما سنوگتا ہوتی اور میں پرتھوی راج چوہان بن کر اسے ہمیشہ کے لیے اپنا لیتا!

●

میرے یہاں تبدیلی ہونے سے پہلے کی بات ہے میں ششما کے گھر میں بیٹھا اس کا البم دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک تصویر رکھ لی۔
"اس تصویر کا کیا کرو گے ———" ششما نے پوچھا۔
"اس کی پوجا کروں گا۔"
"تصویروں کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔"
"ہاں دل کے مندر میں۔"
"نہیں تم یہ تصویر مت لے جاؤ۔ یہ تصویر تمہارے ہاں کوئی دیکھ لے گا اور پھر تمہارے گھر میں ..... !"
میں نے اس کی سنی ان سنی کر دی اور وہ چھوٹی سی تصویر لے کر ہی نکلا۔ سیدھا قہوہ خانے کا رخ کیا۔ سنتوش میرا منتظر تھا۔ سنتوش کو دیکھتے ہی مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے وہ تصویر سنتوش کو دکھائی۔
"کس کی تصویر ہے۔" سنتوش نے پوچھا۔
"ہے کسی کی۔ تم دیکھ تو لو۔"
"تصویر دکھانا چاہتے ہو لیکن اس کے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے۔"
"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس تصویر کا پورٹریٹ بنا دو۔"
جانتا تھا کہ اپنی مصروفیت کے باوجود وہ میرا کہنا نہیں ٹالے گا۔ پورٹریٹ بنا اور میں وہ پورٹریٹ لے کر ششما کے ہاں گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔
"تمہیں پسند آیا۔"
"بہت۔"
"میرا انعام۔"
"بتاؤ کیا چاہتے ہو۔"
"میں چاہتا ہوں کہ یہ چھوٹی سی تصویر رکھ لوں۔"
"نہیں۔"
"ہاں ——— اب میں یہاں سے جا رہا ہوں، جانے کب آنا ہو اور تمہاری یہ چھوٹی سی تصویر بھی میرے لیے بہت ہے۔ میری پوجا تو ادھوری نہ ہوگی۔"

●

الکا زندگی کی ایک حد ہے اور ششما دوسری۔ دونوں حدوں کے درمیان ایک خلا ہے اور میں اسی خلا میں لٹک رہا ہوں۔
میں چاہتی ہوں کہ بھول جاؤں۔" ہرماں کی طرح میری ماں نے بھی کہا۔
"مگر ماں ابھی ———

میں، اس چہرے میں اور ان ہونٹوں میں یہ کیسی کشش ہے۔ میں ان آنکھوں کی گہرائیوں میں کیوں ڈوب گیا ہوں۔ کیوں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ یہ ہونٹ مجھے کن ان دیکھے گلابوں سے روشناس کرا رہے ہیں۔

یہ شِشا ہے۔

یہ الکا ہے۔

اور اب رات کے اس تنہا لمحے میں جبکہ الکا ساتھ والے کمرے میں سو رہی ہے اور شِشا کی تصویر میرے سامنے ہے میں کچھ سوچ رہا ہوں۔ ایک آواز برابر میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔

میں شِشا سے محبت کرتا ہوں۔

میں الکا سے نفرت کرتا ہوں۔

الکا جو اپنے دل میں محبت کا چراغ جلا کر میرے گھر آئی تھی۔ پھر ایک لمحہ آیا۔ وہ لمحہ جس نے میری زندگی کی ناؤ کا رخ پھیر دیا۔ اس کے اپنے ہی چراغ نے الکا کے آنچل میں آگ لگا دی۔ اس آگ میں وہ جل کر وہ راکھ بن گئی۔ وہ چراغ جس کی روشنی سے اس کا دل منور تھا، میں تھا، آگ کا وہ روپ جس میں جل کر بالا پراکھ ہو گئی میں نے اپنا لیا تھا۔

اپرادھی کون تھا۔

میں، شِشا یا الکا ـــــ!

الکا مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں شِشا سے محبت کرتا ہوں۔ ہم تینوں ایک ہی مثلث کے زاویئے ہیں، ایک دوسرے کے بغیر ادھورے، نامکمل اور اسی مثلث کے اردگرد میری ساری زندگی گھوم پھر رہی ہے۔ میری زندگی بھی کیا ہے۔ میری زندگی بھی کیا ہے۔ میری زندگی دھواں ہیں ریل گاڑی کے انجن سے ملتا ہوا۔ وہ سیاہ دھواں ہے جو فضا میں تیرتا ہے، تحلیل ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ میری زندگی ایک رکشا ہے جیسے میں جنم جنم سے چلچلاتی دھوپ میں چلا رہا ہوں ایک ایسی سواری کی تلاش میں جس کے قدموں کے نشان برف کی پگڈنڈیوں میں نظر آ رہے ہیں۔

زندگی ـــــ!

رات اتر رہی ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ سو جاؤں ـــــ مجھے اب سو جانا چاہیئے۔ لیکن نیند کہاں ہے۔ شِشا کہاں ہے۔ اسے آواز دو..... اسے بلاؤ..... !!

"اٹھو ـــــ"

"اٹھو، صبح ہو گئی ہے۔"

"کون ہے ـــــ"

"میں ہوں الکا ـــــ"

"الکا تم ـــــ"

"اف تمہاری آنکھوں کو ہو کیا گیا ہے۔ اس قدر سرخ، تم رات بھر سوئے نہیں کیا ـــــ لو یہ چائے پی لو۔"

"چائے ..... ہاں ..... ہاں ـــــ"

"تمہیں روز سویرے سویرے چائے پینے کی عادت ہے نا ـــــ ارے تم اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو، لگتا ہے تم نے یہاں آکر یہ عادت ہی ترک کر دی ہے۔"

"الکا ـــــ"

"اٹھو مجھے تمہیں ایک ضروری بات بتانا ہے۔"

من کا اور دل کا رشتہ سارے رشتوں سے بڑا ہے گہرا ہے۔ دفعتاً ششما نے پوچھا۔
"میں کیا ہوں اور تم کیا ہو۔"
میں لوٹ آیا۔ الکا بہت دور رہ گئی جھیل کے اس پار۔ میں نے ششما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور آہستہ سے کہا۔
"تم سنگ مرمر کا خوبصورت پتھر ہو اور میں ایک سنگ تراش۔ دونوں کو ایک دوسرے کی تلاش ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کے متلاشی ہیں۔"
ششما میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کی سانسوں کے زیر و بم پر شکارا چلتا رہا!
الکا سونے کے لیے چلی گئی ہے۔ اس کے جانے کے ساتھ ہی میرے کمرے کی تنہائی میں سکوت چھا گیا ہے۔ ایک گہرا اور طویل سکوت!
سکوت جو زندگی کی آخری حد ہے!
کیا یہ سکوت نہیں ٹوٹ سکتا۔ اس سکوت اور خاموشی کو ختم کرنے کے لیے مجھے پہلے وہ حد پھلانگنی ہوگی یا اس دیوار میں سوراخ کرنا ہوگا۔ جو ان دو کمروں کے درمیان ہے۔
ساتھ والے کمرے میں الکا سو رہی ہے اور یہاں اس کمرے میں، میں ہوں میرا وجود ہے اکیلا، تنہا......
وہ روح کہاں ہے!
برف کی پگڈنڈی کہاں ہے!!
قدموں کے نشان کہاں ہیں!!!
روح کا تعلق دل سے ہے۔ روح مر گئی، دل بجھ گیا اور ابدی اندھیروں میں کھو گیا۔ میری روح بھی مر گئی تھی، دل بجھ گیا تھا اور میرا وجود چنار کے زرد پتوں جیسا ہو گیا تھا جو ہوا کے ایک جھونکے سے اڑ جاتے ہیں۔ بہہ جاتے ہیں۔ ششما نے ان پتوں میں رنگ بھرا اور میری روح لہلہانے لگی، تیرنے لگی!
ہم کب ملے مجھے یاد نہیں ہم تو شاید جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے تھے، ایک دوسرے کے قریب تھے۔
ریڈیو سے ایک ڈرامہ "آگ اور دھواں" نشر ہو رہا تھا۔ صرف دو کرداروں پر مشتمل ڈرامہ تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ اس ڈرامے کو پروڈیوس کرنے کے ساتھ ساتھ مرد کا کردار (خود میں) ادا کر رہا تھا۔ ششما نے ان ہی دنوں AUDITION دیا تھا۔ اس کی آواز میں رس تھا اور میں نے اسے اس ڈرامہ میں کام کرنے کے لیے بک کیا۔ ششما سے میری پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ ہماری پہلی ہی ملاقات میں بیگانگی اور اجنبیت کا احساس ختم ہوا۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے ششما کے وجود میں اپنے جذبے کی بے قرار لرزشیں دکھائی دیں۔ مجروح تمنا کی مضطرب دھڑکنیں سنائی دیں ——— ہم قریب آئے۔ جب خیالات کی اڑانیں ایک جیسی اونچائیاں اپنالیں، جب احساسات کی بے قراریاں ایک جیسی گہرائیاں چھو لیں، اختیاری یا بے اختیاری طور پر تو ملاپ جنم لیتا ہے۔ اور اس روح پرور ملاپ سے وہی مجرم لطف اندوز ہو سکتے ہیں جنہوں نے اپنی مٹی دبی سانسوں سے دوری اور قرب کا درمیانی، طویل اور کٹھن فاصلہ ناپا ہو۔
وقت کی لہریں بہتی رہیں اور انہی بہاؤ میں ہم دونوں بھی بہتے رہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ وقت نے کسی کا ساتھ دیا اور کسی کو بیچ بھنور چھوڑ دیا۔ ششما کہاں کھڑی ہے۔ الکا کہاں کھڑی ہے اور میں کہاں کھڑا ہوں ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔ لیکن میں اپنے آپ کو بے طوفانی منجدھار کی تلاطم آغوش میں ڈوبتے دیکھ رہا ہوں۔

•

رات آہستہ آہستہ اتر رہی ہے۔ الکا سو چکی ہے کوئی خواب دیکھ رہی ہوگی۔ اور میں نے ششما کی تصویر سرہانے سے نکال دی ہے۔ اور بغور اسے دیکھے جا رہا ہوں ——— یہ آنکھیں بادامی نہیں ہیں۔ یہ چہرا بھرا بھرا نہیں ہے۔ یہ ہونٹ پتلے پتلے نہیں ہیں۔ پر ان آنکھوں

کتاب، لکھنؤ

گربچن سنگھ

پتھر کا بُت

دور دور تک کھیتوں میں دوپہر کی پھیلی ہوئی دھوپ کی لہر کانپ سی رہی ہوتی۔ درختوں کی شاخیں آہستہ آہستہ ہوا میں ڈولتی رہتیں، اور چاروں اور ایک پرسکون خاموشی چھائی رہتی۔ یہاں تک کہ قریب ہی نہر کے بہتے ہوئے پانی کا ہلکا سا شور بھی سنائی نہ دیتا۔

اس ماحول میں وہ ایک پرانے برگد کے تلے اداس سا بیٹھا، کچھ پرے آموں کے درخت تلے جگالی کرتی ہوئی بھیڑ بکریوں کی طرف دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی کوئی مینا سوکھے پتوں پر منہ مارتا ہوا اس کی طرف آ جاتا تو وہ اسے اپنی گود میں اٹھا لیتا۔ اسے پچکارتا، پیار کرتا لیکن منہ سے کچھ نہ بولتا۔ اسے اپنے پیچھے سے سوکھے پتوں کی چرچراہٹ اور کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی۔ وہ فوراً منہ گھما کر اس کی طرف دیکھتا۔ ہمیشہ کی طرح بنتو سر پر چھابا رکھے آتی دکھائی دیتی۔ سامنے کی طرف آتی سر سے چھابا اتارتی۔ بیٹھنے سے پہلے وہ عقیدت سے نمسکار کرتی۔ اور پوچھتی ــــــ "مجھے آنے میں دیر تو نہیں ہوئی ہے بابا سائیں ...... ؟"

بنتو کا یہ جملہ اسے بڑا پیارا لگتا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ابھر آتی، اور آنکھوں میں چمک جاگ اٹھتی۔ اور وہ معصوم سی صورت بنائے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔

بنتو اس کے سامنے چھابا کھول کر ایک تھالی میں روٹیاں پروسنے لگتی۔ اور کہنے لگتی۔ "روز روز تیرے چرنوں کی دھول لینے آتی ہوں بابا سائیں۔ دیا کرو۔ میرے دکھ دور کرو۔"

وہ قریب ہی ایک کنوئیں سے پانی لے آتی۔ اس کے ہاتھوں کو دھلاتی اور جذبہ عقیدت سے کہتی ــــــ "لو، کھانا کھاؤ...." وہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اس کے کھلے کھلے انوپ روپ کو۔ اس کا جی چاہتا اسے دیکھتا ہی رہے۔ خود تو گونگا تھا۔ منہ سے کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ دل میں جذبات کا ایک طوفان اٹھ کر دب سا جاتا۔

"کھاؤ نا بابا سائیں...... !" بنتو التجا بھرے لہجے میں کہتی۔ اور تب وہ روٹیوں کی طرف دیکھنے لگتا۔

"میں کھلا دوں...... ؟" کہتی ہوئی وہ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر اس کے منہ میں ڈالتی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام لیتا، اور خود روٹی توڑ توڑ کر کھانے لگتا۔ بنتو دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگتی۔ لسی کا گلاس بھر کر اس کے سامنے رکھ دیتی۔ اور اپنی رام کہانی چھیڑ دیتی اور اطمینان سے قریب بیٹھ کر دل کی گرہیں کھولنے لگتی۔

وہ قریب ہی ایک گاؤں، کوٹلا کے صوبیدار کی لڑکی تھی، اور شمشیر نگر میں بیاہی گئی تھی۔ اس کے خاوند نے ناراض ہو کر اسے میکے بھیج دیا تھا۔ اور آج ایک برس سے اسے لے نہیں جا رہا تھا۔ وہ روز بابا سائیں کے پاس دعا کے لیے آتی۔ اس کی نظر میں بابا سائیں ایک پہنچی ہوئی عظیم شخصیت تھی۔

وہ گونگا تھا ـــــ [illegible]

"بتا دو ــــــ"

"نہیں ابھی نہیں ــــــ چائے پی لو، نہاؤ اور اس کے بعد ....!
واقعی صبح ہو گئی ہے۔ الکا کب آئی ــــــ یہ تو ...... برف کی وادی ...... نہیں نہیں الکا تو رات کو آئی تھی اور
نے ...... شششا کہاں ہے۔ شششا کی تصویر ......

"الکا ــــ"

"کیا ہے جی ــــ"

الکا قریب آئی۔ اس کی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ وہ ہنس رہی ہے۔
"الکا ...... وہ ...... وہ ...... تم کب آئیں۔"
"میں تو رات کو آئی۔ تمہیں ہو کیا گیا ہے پال ــــــ تمہارا یہ چہرہ کس قدر زرد پڑ گیا ہے۔"
"نہیں میں تو ...... میں نے یہاں ایک ...... ہاں تم کیا کہنا چاہتی تھی ــــــ" میں گھبرا گیا۔
"بتا دوں گی ــــــ بتا دوں گی ــــــ تم کیا تلاش کر رہے ہو۔"
"کچھ بھی تو نہیں ــــــ"
"تصویر ــــــ وہ تو میں نے سنبھال کر تمہارے البم میں رکھ دی ہے۔"
(اف یہ کیا ہو گیا)
"تصویر ــــــ"
"ہاں ہاں کسی لڑکی کی تصویر۔"
"الکا۔"
"کیا ہے جی۔"
"الکا ــــ"
"دیکھو جی میں یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ میں ...... میں ......!"
"بتا بھی دو ــــ"
"میں ماں بننے والی ہوں۔"
"ماں ــــــ"

●

الکا دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے۔ میرے سامنے چائے کا گرم گرم پیالہ پڑا ہے شششا کی تصویر الکا نے سنبھال کر البم میں رکھ دی ہے ــــــ الکا میری بیوی ہے اور وہ میرے ہونے والے بچے کی ماں ہے۔ میرا بچہ، چھوٹے چھوٹے سنہرے بال، چھوٹا چھوٹا چہرہ، پتلے پتلے ہونٹ اور سپید سپید دانت ...... میرا بچہ ...... میرا بچہ مسکرا رہا ہے ایسے مسکرا رہا ہے جیسے میرے دل کے ویرانے میں بہار آگئی ہو۔ یہ کیسی آواز ہے۔ یہ کیسا ساز ہے، یہ کیسی کھنک ہے ــــــ؟

میرا بچہ ــــــ میری زندگی!

نہیں ــــــ؟!

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

پر کیا کرنا چاہیئے۔؟۔ اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے۔

ایک دن وہ اسے اپنے پھوپھا کی طرف سے آیا ہوا خط سنانے کے لیے آئی۔ اس میں بہت ساری باتیں لکھی ہوئی تھیں جس میں نبتو کے مطلب کی صرف ایک ہی بات لکھی تھی۔ اور وہ یہ کہ اس کے سسرال والے ابھی تک اسے لے جانے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں۔ انھیں منایا جا رہا ہے۔

وہ اپنی اوڑھنی کے آنچل سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ تب اس کا جی چاہا۔ وہ خود اس کے آنچل میں چھپ کر رونے لگے۔ کبھی کبھی نبتو اس سے بڑی پیاری پیاری باتیں کرتی۔ خود ہنستی اور اسے ہنسانے کی کوشش کرتی۔ وہ ایک سوال کرتی ——— "بابا سائیں، جب میں یہاں سے چلی جاؤں گی تو پھر تمہیں دوپہر کے وقت روٹی کھلانے کون آیا کرے گا۔؟"

لیکن یہ سوال نہ وہ سنتا اور نہ سمجھتا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ نبتو ہنستی ہے تو بھی اسے اچھی لگتی ہے اور روتی ہے تو بھی...... کاش وہ جادو جانتا ہوتا اور اس کے زور سے وہ اس کے خاوند کو اس کے سامنے لا کر حاضر کر دیتا......

وہ ہنستی، خوب ہنستی۔ اور وہ حیرت زدہ سا اسے دیکھتا رہ جاتا۔ لیکن ایسا کمال دکھانے کی قوت اس میں نہیں تھی۔

اسی طرح کئی دن بیت گئے تھے، وہ رفتہ رفتہ اس کے آنسو بھول گیا۔ اس کی باتوں کا مطلب بھول گیا۔ یاد رہی تو فقط انہی بوڑھے پتوں کی چرچراہٹ، جو پیروں کی چاپ سے پیدا ہوتی تھی۔ اور یاد آتی تھی اس کی حسین صورت جس کا رنگ آڑو کے کھلے ہوئے پھولوں جیسا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں مسکراتے ہوئے ہونٹ ——— وہ آئے گی اس کے پاس، اور دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرے گی۔ وہ یوں محسوس کرے گا جیسے وہ ایک ادنیٰ بونے سے بدل کر لمبا تڑنگا جوان بن گیا ہے۔ خوبصورت اور حسین۔

ایک دن جب نبتو ہمیشہ کی طرح اس کے پاس آئی، تو اس نے دیکھا، وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کا روپ چاندنی کی طرح دمک رہا تھا۔ اس نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا۔ اور ناک میں سونے کا پھول سجا رکھا تھا۔ کپڑے بھی بھڑکیلے رنگ کے پہن رکھے تھے۔ آتے ہی اس نے اس کے پیر چھوئے، تو مترنم خیز لہجے میں بولی ——— "بابا سائیں! لو تمہارے لیے گھی کی چوری کوٹ کر لائی ہوں۔ لو...... کھاؤ......!"

وہ باٹی اس کے سامنے رکھ کر خود کنوئیں سے پانی لانے چلی گئی۔ وہ کنوئیں سے پانی کھینچ رہی تھی۔ انگ انگ تھرک رہا تھا، وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا، اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کی باہنوں میں ایک حرکت سی ہو رہی تھی ——— وہ نبتو کو اپنی باہنوں میں باندھ لے، وہ اس کے دھول بھرے پاؤں سے لپٹ جائے اور رونے لگے، خوب روئے ——— اس کا گلا سوکھ رہا تھا، دھوپ میں چاروں طرف تتلیاں سی اڑتی دکھائی دے رہی تھیں۔

نبتو لوٹ کر آئی اور اس کے ہاتھ دھلا کر اسے چوری کھلانے لگی، تو اس نے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے...... ؟ کیا نہیں کھاؤ گے...... ؟" نبتو نے تعجب سے پوچھا۔

وہ چپ رہا، اس نے ہونٹ کس کر بند کر لیے۔ کہیں اس کے منھ سے خوشی یا رنج کی کوئی بے ہنگم سی آواز نہ نکل جائے ——— اور نبتو بھی بھابھیوں کی طرح ہنسنے نہ لگے ——— اس وقت بھی نبتو ہنس رہی تھی، لیکن اس ہنسی میں طنز نہیں تھا، مذاق نہیں تھا، نہ ہی حقارت کا کوئی جذبہ......

"بابا دیوتا...... میں تو بڑے چاؤ سے تمہارے لیے یہ چوری لائی تھی۔ لو کھاؤ نا......!" نبتو نے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے لقمہ اس کے منھ میں ڈالنے لگی۔

لیکن اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے، اس نے اپنا سر نبتو کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

نبتو کے من میں ممتا سی امنڈ آئی — کہنے لگی

کتاب، لکھنؤ

اس کی طرف دیکھتا رہتا ...... دیکھتا رہتا ...... اور جب وہ وہاں سے چلی جاتی، اس کی ویران نظریں اس سونی سی ڈگر پر گڑی رہتیں، جس طرف سے ہو کر نبتو گئی ہوتی۔ رفتہ رفتہ شام اتر آتی۔ بسنتی کھیت سیاہی مائل سے نظر آنے لگتے —— شام اتر آتی۔

تنہائیوں میں بیٹھا ہوا وہ اکثر اپنے متعلق سوچتا، وہ کیا ہے ...... ؟ کیا نہیں .... ؟ کیا واقعی وہ ایک پہنچی ہوئی شخصیت ہے، ؟ جیسا کہ نبتو سوچتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نہ صرف گونگا ہے، بلکہ اس کے ہاتھ پاؤں بھی ٹیڑھے ہیں۔ وہ اپاہج ہے۔ ایک مرتبہ اس نے اپنی شکل آئینہ میں دیکھی تھی۔ اسے اپنا چہرہ بندر کی طرح عجیب بھونڈا سا نظر آیا تھا۔ ہونٹ سیاہ، ناک چپٹی، اور سیاہ حلقوں میں دھنسی ہوئی گول گول آنکھیں۔ گھر والے اسے اس درخت کے سامنے بھیک مانگنے کے لیے بٹھا دیا کرتے تھے۔

اس کے پاس لکڑی کا ایک قلم ہوتا اور ایک دوات، جس میں روشنائی نہیں ہوتی تھی۔ آنے جانے والے مسافروں کی نظر اس پر پڑ جاتی، اسے آنہ دو آنہ، یا کھانے کی کوئی چیز دے دیتے۔ وہ اسی وقت لکڑی کا قلم دوات میں ڈالتا اور اپنی بائیں ہتھیلی پر کچھ لکھنے لگتا جس کا لوگ یہ مطلب لگاتے کہ دینے والے کا لکھا جو کھا پرلوک میں لگ گیا ہے۔ مسافر اس کی اس عجیب سی حرکت سے بہت متاثر ہوتے۔ اور عقیدت سے ان کے سر جھک جاتے۔

وہ نہر کے پاس پل کے قریب جہاں بیٹھا کرتا تھا، وہاں کئی راستے اور پگڈنڈیاں آکر ملتی تھیں۔ ان راستوں سے ہو کر اکثر لوگ گذرا ہی کرتے تھے۔ ان کی بدولت دن بھر میں اسے ایک آدھ روپے کی آمدنی ہو ہی جاتی تھی۔ وہ ان میں، سدھ پرش، اور سائیں کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے متعلق لوگوں میں عجیب وغریب افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ دن کے وقت اپاہج کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور رات کے وقت دیوتاؤں کا روپ دھار لیتا ہے من چاہی مرادیں پوری کرتا ہے۔

دن کے وقت بسنتی کھیتوں میں کانپتی ہوئی دھوپ اور نبتو کا انتظار اسے بے چین رکھتا لیکن دن ڈھلے جب گھر سے اسے کوئی لینے کے لیے آتا، تو وہ یوں محسوس کرتا جیسے قدرت کی آزاد فضا، اس خوشگوار ماحول سے اٹھا کر وہ کسی قید خانہ میں جا رہا ہو جہاں وہ رات بھر قید رہے گا۔

گھر پہنچتے ہی اس کی سوتیلی ماں اس سے دن بھر کے جمع کئے ہوئے پیسے لے لیتی۔ انھیں بڑے اشتیاق سے گنتی۔ اگر کسی دن کی رقم کسی دوسرے دن کی رقم سے کم ہوتی تو وہ بڑبڑانے لگتی۔ بھلا وہیں منہ چھپا کر ہنسیں۔ اسے گھر کے سب لوگ پرائے پرائے سے لگتے۔ اسے رونا آتا۔ پر وہ رو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے منہ سے بڑی بے ہنگم آواز نکلا کرتی تھی۔ اور گھر کے سب لوگ ہنسنے لگتے تھے۔ نبتو جب پہلے دن اس کے درشن کو آئی تھی تو بولی تھی " بابا سائیں، تمہارے جیسا بھلا آدمی آس پاس کے اس گاؤں میں اور کوئی نہیں ہے۔ تم تو دیوتا ہو۔ اگر میرا بس چلے تو میں تیرے نام کا مندر بنوا دوں —— !"

اور وہ سوچنے لگا تھا، اس مندر میں کیا ہو گا۔ پتھر ...... پتھر کا دیوتا ...... پتھر کی مورتی .... پتھر کا بھگوان .... تنہائی اور خاموشی —— اور وہ وہاں پتھر کی طرح خاموش بیٹھا رہا کرے گا۔ نہیں نہیں۔ اس درخت کا سایہ مندر کے چھت سے کہیں زیادہ سکھ دے جاتا ہے۔

کئی مہینے بیت گئے تھے۔ نبتو اسی طرح اس کے پاس آتی۔ اپنے دل کا سارا درد اس کے سامنے کہہ سناتی —— یہ تنہا زندگی اسے قدر کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔

وہ یوں محسوس کرتا جیسے نبتو سے اس کا مدتوں کا پرانا رشتہ ہے۔ مہینے، برس اور زمانے بیت جائیں گے۔ وہ اسی طرح اس کے پاس آتی رہے گی۔ اور وہ اس کی کہانی سنتا رہے گا۔ جب وہ نہیں ہوگی تب اس کے لیے یہاں کچھ بھی نہیں رہ جائے گا ...... بیٹھا، اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتی رہتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا ایسے موقعہ

کملیشور
ترجمہ: عشرت صدیقی

جارج پنجم کی ناک

یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب برطانیہ کی ملکہ ایلزبیتھ دوم اپنے خاوند کے ہمراہ ہندستان آنے والی تھیں۔ اخباروں میں ان کی آمد کے چرچے ہو رہے تھے۔ لندن کے اخباروں کے ذریعہ روزانہ خبریں موصول ہو رہی تھیں کہ شاہی دورے کے لیے کیا کیا انتظامات ہو رہے ہیں...... شاہی درزی پریشان تھا کہ ملکہ ہندستان، پاکستان اور نیپال کے دورے پر کب کیا پہنیں گی؟ ان کے سکریٹری اور سراغ رساں ان کی آمد سے قبل ہی اس برِ اعظم کا طوفانی دورہ کرنے والے تھے...... آخر کوئی مذاق تو تھا نہیں۔ چونکہ زمانہ نیا تھا، لاؤ لشکر کے ساتھ نکلنے کے دن گزر چکے تھے۔ اس لیے تو فوٹوگرافروں کی ایک فوج تیار ہو رہی تھی۔

انگلینڈ کے اخباروں کے تراشے دوسرے ہی دن ہندستانی اخباروں میں چھپے ہوئے نظر آئے...... کہ ملکہ نے ہلکے نیلے رنگ کا ایک سوٹ بنوایا ہے جس کا ریشمی کپڑا ہندستان سے منگوایا گیا ہے...... اور اس سوٹ پر تقریباً چار سو پونڈ لاگت آئی ہے......

ملکہ ایلزبیتھ کی سوانح حیات شائع ہوئی۔ پرنس فلپ کے کارنامے شائع کیے گئے...... اور تو اور ان کے ملازموں، باورچیوں، خانساماؤں اور محافظوں کے مکمل حالات زندگی نظر آئے...... شاہی محل میں پرورش پانے والے کتّے تک کی تصویریں چھاپی گئیں.... ہر سو بڑی دھوم تھی۔ بگل انگلینڈ میں بج رہا تھا۔ بازگشت ہندستان میں سنائی دے رہی تھی۔

ان خبروں سے ہندستان میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ راجدھانی میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ جو ملکہ پانچ ہزار روپے کے ریشمی سوٹ میں ملبوس ہو کر پالم کے ہوائی اڈے پر اترے گی، اس کے لیے کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیے۔ کچھ ہی کیوں، بہت کچھ ہونا چاہیے۔ جس کے باورچی گزشتہ جنگ عظیم میں اپنی جانِ عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر شامل ہو چکے تھے، اس کی شان و شوکت کے کیا کہنے! اور وہی ملکہ دلّی آنے والی تھی......

نئی دلّی نے اپنی جانب دیکھا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ؎

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اور دیکھتے ہی دیکھتے نئی دلّی کے رنگ و روپ میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔

اور حیرت تو یہ تھی کہ کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کسی نے کسی کو نہیں دیکھا۔ لیکن سڑکیں جوان ہو گئیں، کہنگی کے آثار مٹ گئے۔ عمارتوں نے نازنینوں کی مانند سنگار کیا......

لیکن ایک بڑا مسئلہ درپیش تھا — وہ تھا جارج پنجم کی ناک کا...... نئی دلّی میں سب کچھ تھا، سب کچھ ہوتا جا رہا تھا، سب کچھ ہو جانے کی امید تھی۔ لیکن جارج پنجم کی ناک کا مسئلہ بڑا اہم تھا! نئی دلّی میں سب کچھ تھا...... صرف ناک نہیں تھی۔

اس ناک کی بھی ایک لمبی داستان ہے۔ کسی زمانے میں اس ناک کے لیے بہت ہنگامہ آرائی ہو چکی تھی۔ تحریک چلی تھی۔ سیاسی جماعتوں نے رزولیوشن پاس کیے تھے۔ چندہ فراہم کیا گیا تھا۔ کئی لیڈروں نے تقریریں بھی کی تھیں۔ گرما گرم مباحثے ہوئے تھے۔ اخبار

کرم کرو - آج میں بہت خوش ہوں، لو تمہارے چرنوں کو ہاتھ لگاتی ہوں۔

اس کی نگاہ اپنے خوبصورت دبلے تیلے میل سے اَٹے ہوئے پاؤں پر گئی۔ ننتو کہہ رہی تھی، یہ تمہارے چرنوں کا پرتاپ ہے سائیں۔ آج میرے گھر والے مجھے لینے آئے ہیں۔ انھوں نے میرا قصور معاف کر دیا ہے، آج شام کو میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ یہ سب تمہاری دعاؤں کا پھل ہے۔

وہ ایک بار چونکا۔ پھر اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔ اس نے اپنے ہونٹ اور بھی کس کے بھینچ لیے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا سائیں ......" ننتو پریشان سی بولی۔ "تم کھاتے کیوں نہیں .... " لو کھاؤ میں آج یہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکوں گی۔

وہ کچھ پیچھے کی طرف کھسک گیا۔ اور درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ انکار کے انداز میں سر ہلا کر تھالی اس نے سامنے سے کھسکا دی۔

ننتو پھر کچھ نہیں بولی۔ خاموش اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے گالوں پر آنسو کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے منھ کھولا —— "میں یہ سوچ سوچ کر بہت پریشان تھی سائیں، کہ کل سے تمہیں کون روٹی کھلانے آیا کرے گا۔ لیکن تم تو غیب کا حال جانتے ہو۔ پہلے ہی سے سب سمجھ گئے۔ آج ہی کھانے سے انکار کر کے میرا بھرم توڑ دیا۔ میں کیا کروں۔ ؟ اب میرے اپنے بس میں کچھ نہیں ہے، مجھے معاف کر دو۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ——

اس نے محسوس کیا، ہوا کے چنچل جھونکوں سے درختوں سے الجھے ہوئے پتے کثیر تعداد میں نیچے جھڑنے لگے ہیں —— معصوم مینے تعجب خیز نظروں سے انھیں دیکھ رہے ہیں۔

ننتو نے اس کے قدموں کا بوسہ لیا —— اور آنسو پونچھتی ہوئی، چلی گئی۔ ہمیشہ کی طرح سوکھے پتے اس کے پیروں تلے کچلنے سے چرچرا رہے تھے۔ دھوپ کھیتوں میں کانپ رہی تھی۔

وہ بیٹھا اسے جاتا دیکھتا رہا ...... دیکھتا رہا ...... اور پھر کب دن ڈھل گیا، کب دھوپ سمٹ گئی۔ کب کھیتوں کی ہریالی دھندلا گئی، اسے پتہ نہیں چلا۔

اچانک کچھ مینے اچھلتے کودتے ہوئے اس کے قریب آئے۔ ایک مینے کو اس نے گود میں لے لیا اور اپنے سینہ سے چپکا لیا۔ پھر اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہا۔ اس ماں کی طرح، جو اپنے کھوئے ہوئے بچے کو پا کر بھی ممتا کو روک نہیں پاتی —— اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ ہی نکلتے ہیں۔ وہ رو رہا تھا —— مینا پیار سے اس کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے مینے کو گود سے الگ کر دیا۔ لکڑی کا قلم سوکھی دوات میں دبا کر اپنی ہتھیلی پر کچھ لکھا، جیسے اس نے کسی کا سارا لیا دیا اوپر والے کو سونپ دیا ہو —— دن ڈھل رہا تھا —— کھیت اندھیرے میں ڈوب گئے تھے۔

بڑھ رہی تھی۔ اس نے بڑی مایوسی کے ساتھ اطلاع دی۔ "ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن اس قسم کا پتھر کہیں دستیاب نہیں ہوا، پتھر غیر ملکی ہے۔"

صدر نے طیش میں آکر کہا۔ "لعنت ہو آپ کی عقل پر۔ ہم لوگ غیر ممالک کی تمام چیزیں اپنا چکے ہیں...... دل دماغ، طور طریقہ، یہاں تک کہ رہن سہن بھی...... جب ہندوستان میں بال ڈانس تک مل جاتا ہے تو پھر پتھر کیوں نہیں مل سکتا؟"

بت تراش خاموش تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے کہا۔ "میں ایک بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ خبر اخبار والوں تک نہ پہنچنے پائے۔"

صدر کی آنکھوں میں بھی چمک آگئی۔ دربان کو حکم دیا گیا اور ہال کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ تب بت تراش نے کہا "ملک میں اپنے لیڈروں کے بت بھی ہیں...... اگر اجازت ہو...... اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں...... تو میرا مطلب ہے...... تو...... جس کی ناک اس بت کی ناک پر بیٹھ جائے، میں اسے اتار لاؤں!......"

سب نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ سب کی آنکھوں میں چند لمحے کی بدحواسی کے بعد خوشی تیرنے لگی۔ صدر نے آہستہ سے کہا "لیکن بڑی ہوشیاری سے!"

اور بت تراش پھر ملک کے دورے پر نکل پڑا۔ جارج پنجم کی گم شدہ ناک کا ناپ اس کے پاس محفوظ تھا۔ وہ دلّی سے بمبئی پہنچا...... دادا بھائی نوروجی، گوکھلے، تلک، شیواجی، کاؤس جی جہانگیر...... وہ سب کی ناکوں کو ٹٹولنے کے بعد گجرات کی طرف چل پڑا...... گاندھی جی، سردار پٹیل، وٹھل بھائی پٹیل، مہادیو دیسائی کے بتوں کو پرکھا...... اور پھر بنگال کی جانب چل پڑا۔ گرو دیو رابندر ناتھ، سبھاش چندر بوس، راجہ رام موہن رائے وغیرہ کو بھی دیکھا، پیمائش کی اور پھر بہار کی طرف روانہ ہوگیا۔ پھر وہ بہار ہوتا ہوا اترپردیش پہنچا...... چندر شیکھر آزاد، بسمل، موتی لال نہرو، مدن موہن مالویہ کے بتوں کے پاس گیا...... گھبراہٹ میں مدراس بھی جا پہنچا، ستیہ مورتی کو بھی دیکھا...... اور میسور، کیرالا وغیرہ صوبوں کا دورہ کرتا ہوا پنجاب گیا۔ لالہ لاجپت رائے اور بھگت سنگھ کے بتوں پر نظر ڈالی...... آخر دلّی پہنچا اور اپنی روداد بیان کی۔ "میں پورے ملک کے تمام بتوں کا معائنہ کر چکا۔ سب کی ناکوں کی پیمائش کی لیکن سب جارج پنجم کی ناک سے بڑی نکلیں......"

یہ سن کر سب کے اوسان خطا ہو گئے۔ آخر بت تراش نے ہی بات آگے بڑھائی۔ "سنا تھا کہ بہار سکریٹریٹ کے سامنے ۱۹۴۲ء میں شہید ہونے والے سات بچوں کے بت نصب کیے گئے ہیں...... شاید بچوں کی ناک ہی ٹھیک بیٹھ جائے۔ یہ سوچ کر میں وہاں بھی گیا تھا...... لیکن...... ان کی ناکیں بھی اس سے کہیں بڑی نکلیں...... اب بتائیے مجھے کیا حکم ہے؟......"

راجدھانی میں زور دار تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جارج پنجم کے بت کو رگڑ رگڑ کر نہلایا گیا۔ روغن کاری ہوئی۔ سب انتظامات مکمل تھے، صرف ناک نہیں تھی۔

بات پھر اعلیٰ حکام تک پہنچی۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں ——— اگر جارج پنجم کی ناک نہ لگ سکی تو پھر ملکہ کا استقبال چہ معنی دارد؟ یہ تو اپنی ناک کٹوانے والی بات ہوئی۔

لیکن بت تراش فن پیشے سے مجبور تھا...... یعنی وہ شکست تسلیم کرنے والا فن کار نہیں تھا۔ ایک حیرت انگیز خیال بجلی کی سی سرعت سے اس کے ذہن میں کوند گیا۔ اور اس نے اپنی پہلی شرط دہرائی یعنی ہال کے تمام دروازے پھر بند کر دیئے گئے۔ اور تب بت تراش نے اپنی نئی تجویز پیش کی "چونکہ ناک کی موجودگی اشد ضروری ہے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ چالیس کروڑ میں سے کوئی ایک زندہ ناک تراش کر لگا دی جائے!......"

بات ختم ہوتے ہی ہال پر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد صدر نے سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سب کو پریشان دیکھ بت تراش نے بڑی آہستگی کے ساتھ کہا۔ "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجئے...... ناک کی ذمہ داری

کے صفحات سیاہ ہو گئے تھے ——— اور موضوع بحث یہ تھا کہ جارج پنجم کی ناک رہنے دی جائے، یا ختم کر دی جائے — اور جیسا کہ ہر سیاسی تحریک میں ہوتا ہے، کچھ لوگ حامی تھے اور کچھ مخالف لیکن زیادہ تر لوگ خاموش تھے۔ خاموش رہنے والوں کی قوت دونوں طرف تھی……

یہ تحریک چل رہی تھی۔ جارج پنجم کی ناک کی حفاظت کے لیے ہتھیار بند پہرے دار تعینات کر دیے گئے تھے۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ ان کی ناک تک پہونچ سکے۔ ہندستان میں جگہ جگہ ایسی ناکیں کھڑی تھیں۔ اور جہاں تک لوگوں کے ہاتھ پہونچ سکے انھیں بڑے اہتمام کے ساتھ ہٹا کر عجائب خانوں میں پہنچا دیا گیا۔ شاہی لاٹوں کی ناکوں کے لیے گوریلا جنگ ہوتی رہی……

اسی زمانہ میں یہ حادثہ پیش آیا تھا ——— اچانک انڈیا گیٹ کے سامنے والے جارج پنجم کے مجسمے کی ناک غائب ہو گئی! ہتھیار بند پہرے دار اپنی جگہ تعینات رہے۔ گشت لگاتے رہے اور مجسمے کی ناک چلی گئی!

ملکہ آئے اور ناک نہ ہو! …… اچانک پریشانی بڑھی اور سرگرمی شروع ہو گئی۔ اور ملک کے بہی خواہوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی اور مسئلہ پیش کیا گیا کہ آخر اس کا کیا حل ہو؟…… وہاں سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ اگر یہ ناک نہیں آئی تو ہماری ناک بھی نہیں رہے گی!

اعلیٰ سطح پر مشاورتی جلسے ہوئے۔ اور کافی مغز سوزی کے بعد یہ طے کیا گیا کہ اس ناک کی بازیابی نہایت ضروری ہے۔ پہلے ہوتے ہی ایک بت تراش کو فوراً دلی میں حاضری کا حکم دیا گیا۔

بت تراش یوں تو فنکار تھا۔ لیکن ذرا مالی طور پر پریشان تھا۔ اس نے آتے ہی حکام کے چہروں کی جانب دیکھا عجیب وحشت سی ٹپک رہی تھی ان چہروں سے ——— کچھ لٹکے ہوئے تھے، کچھ پژمردہ تھے اور کچھ حواس باختہ تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر خستہ حال بت تراش کی آنکھوں میں آنسو آ گئے…… اسی وقت ایک آواز سنائی دی۔ بت تراش۔ جارج پنجم کی ناک لگانی ہے۔"

بت تراش نے سنا اور جواب دیا۔ "ناک لگ جائے گی لیکن مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بت کب اور کہاں تیار ہوا تھا۔ اور اس کے لیے پتھر کہاں سے لایا گیا تھا؟"

حکام نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، ایک نے دوسرے سے نگاہوں ہی نگاہوں میں کہا کہ یہ بتلانے کی ذمہ داری تمہاری ہے!

خیر یہ مسئلہ طے ہو گیا۔ ایک کلرک کو فون کیا گیا اور اس بات کی تحقیق کا تمام کام اس کے سپرد کر دیا گیا…… متعلقہ محکمے کی کرم خوردہ فائلوں کی ورق گردانی شروع ہوئی۔ لیکن بے سود ——— کلرک نے کمیٹی کے سامنے کانپتے ہوئے بیان دیا۔ "سر! میری خطا معاف کی جائے۔ فائلیں سب کچھ ہضم کر چکی ہیں۔"

حکام کے چہروں پر پژمردگی چھا گئی، پھر ایک خاص کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کے ذمہ یہ کام سونپ دیا گیا کہ جس طرح بھی ہو، اس کام کا ہونا اشد ضروری ہے۔

آخر بت تراش کو پھر بلایا گیا۔ اس نے مسئلہ حل کر دیا۔ وہ بولا "پتھر کی اصلیت کا صحیح پتہ نہیں چلتا تو اس میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے…… میں ہندستان کے ہر پہاڑ پر جاؤں گا، اور ویسا ہی پتھر ڈھونڈھ نکالوں گا۔"

کمیٹی کے ممبروں کی جان میں جان آئی۔ صدر نے چلتے چلتے بڑے فخریہ لہجے میں کہا۔ "اپنے ملک میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔ اس ملک کی زمین میں ہر شے پوشیدہ ہے…… ضرورت ہے تلاش و جستجو کی…… اور اس کے لیے محنت درکار ہے۔ اس محنت کا پھل ملے گا آئندہ دور مسرت خیز ہوگا۔"

یہ مختصر سی تقریر فوراً ہی سرخیوں کے ساتھ اخباروں میں شائع ہو گئی۔

بت تراش ہندستان کے کوہستانی علاقوں کے دورے پر نکل پڑا لیکن کچھ دن بعد وہ ناکام لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر انفعالات

ق۔ آغا

فلمی گانے

کرایہ داروں سے بھری ہوئی منزل کے زینے سے اترتے وقت بھری لال کی سرخ سرخ آنکھیں فلیٹوں کے حسینوں کا جائزہ لیتیں، اس کا موقع سخت گیر مردوں کی گھروں میں موجودگی اور عدم موجودگی پر موقوف تھا۔ اور کسی سے نگاہیں چار ہو بھی جاتیں تو اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ زینے اترتے وقت پیچھے نہ دیکھنے کے نتیجے سے اسے بارہا دو چار ہونا پڑتا، جس پر لڑکیاں بے اختیار ہنس بھی دیتیں مگر اس سے نامراد عاشق کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

زینے سے اتر کر سڑک پر پہنچتا تو مطالعہ فطرت کے لیے وسیع میدان مل جاتا۔ اور اس کی نظریں لباسوں کی بھیڑ بھاڑ میں کھو جاتیں۔ کسی کے ساتھ قدم ملا کے تیز چلنے کی کوشش کرتا تو راہ گیروں کے پٹائی کر دینے کے خوف سے باز رہتا۔

ریلوے اسٹیشن پہنچ کر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو جاتا اور اپنے مطلب کے ڈبے کو تاڑتا، بہت جلد وہ اپنے لیے مناسب ڈبہ کا انتخاب کر لیتا۔ اس کا اسے روز موقع مل جاتا کیوں کہ اسے یونیورسٹی جانے کے لیے ریل پر سوار ہونا پڑتا تھا۔ اس دس میل کے سفر کے لیے وہ جس بہادری سے بھرے ہوئے ڈبوں میں بیٹھ جاتا اس پر لوگ حیران ہو جاتے۔

ایک دن ریل آئی تو ایک ڈبے میں ریشمی ساڑی پہنے ایک خوبصورت لڑکی برتھ پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ باقی ڈبہ بالکل خالی تھا——

بھری لال ڈبے میں داخل ہو گیا اور برتھ میلی ہونے کا بہانہ کر کے اس لڑکی کے ٹھیک پیچھے بیٹھ گیا اور زاویہ ایسا رکھا کہ لڑکی برابر نظر میں رہے۔

بھری لال کی پسند کے مطابق اس لڑکی کا جسم بھی خوب بھرا بھرا تھا۔ اس کے جسم سے جوانی کی خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔

بھری لال نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ "عورتیں جس مرد کو پسند کرتی ہیں اسے نہ املی کا پیڑ ہونا چاہیے نہ سپاری کا درخت، یعنی نہ بہت موٹا ہو اور نہ بالکل مریل۔ اور اسپورٹس مین ہو تو کیا کہنا ہے۔"

مگر دو اسٹیشنوں کے درمیان ریل گاڑی گزرنے کی مدت اتنی کم ہوتی ہے کہ نہ اتنی جلدی وہ موٹا ہو سکتا تھا۔ البتہ مسکرانے کو سب ہی مسکراتے ہیں لہٰذا وقت پڑنے پر وہ بھی مسکرانے لگا۔ ہاکی اس نے زندگی بھر نہ پکڑی تھی مگر نمائش کے لیے انگلیوں پر آیوڈین لگا کر اور پٹیاں باندھ کر اور بغل میں اسپورٹس میگزین دبا کر لوگوں پر ظاہر کر دیتا کہ وہ اسپورٹس مین ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ ایم اے میں کئی سال سے ریسرچ کر رہا ہے۔

انقلاب سے پہلے اگر گلی میں کوئی عشقیہ شعر پڑھتے ہوئے گزرنے کی کوشش کرتا تو اس کی لوگ باقاعدہ مرمت کر دیتے تھے۔ مگر اب بے جھجک بآواز بلند فلمی گانے گائے جا سکتے ہیں۔ اور کسی بھی چلمن کو ہلتا دیکھ کر آپ گا سکتے ہیں۔

دھڑکتے دل کی تمنا ہو میرا پیار ہو تم ❊ مجھے قرار نہیں اور بے قرار ہو تم

میری کا ہے ...... مجھے صرف اجازت چاہیئے ۔"

سرگوشی ہوئی اور آخرکار بت تراش کو اجازت دے دی گئی ــــــ اخباروں میں صرف اتنا شائع ہوا کہ ناک کا مسئلہ بحسن و خوبی انجام پا گیا ہے ۔

ناک لگانے سے قبل پہر ہتھیار بند پہرے دار تعینات کئے گئے ۔ بت کے قریب کا حوض صاف کیا گیا اس میں تازہ پانی ڈالا گیا ۔ تاکہ جو زندہ ناک لگائی جانے والی تھی وہ خشک نہ ہونے پائے ۔ اس بات کی خبر دوسروں کو نہیں تھی ۔ یہ سب کارروائیاں درپردہ ہو رہی تھیں ملکہ کی آمد کا دن نزدیک آتا جا رہا تھا ۔ بت تراش اپنے تجویز کردہ حل سے خود بھی پریشان تھا ۔ زندہ ناک کی فراہمی کے لیے اس نے کمیٹی سے مزید مراعات طلب کیں ۔ وہ اسے دے دی گئیں ۔ لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ وقت مقررہ تک ناک بہرحال لگ جانی چاہیئے ۔

اور آخر وہ دن بھی آپہونچا ۔

جارج پنجم کی ناک لگا دی گئی ۔

تمام اخباروں نے یہ خبر شائع کی کہ جارج پنجم کے بت میں زندہ ناک لگا دی گئی ہے ...... یعنی ایسی ناک جو قطعی پتھر کی نہیں ہے ۔

لیکن اس دن کے اخباروں میں ایک بات غور طلب تھی ــــــ اس دن کسی افتتاحی جلسے کی خبر نہیں تھی ــــــ کوئی عوامی جلسہ منعقد نہیں ہوا تھا ــــــ کہیں کسی کا استقبال نہیں کیا گیا تھا ــــــ کسی کو سپاس نامہ پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی ــــــ کسی ہوائی اڈے یا اسٹیشن پر استقبالیہ تقریب نہیں ہوئی تھی ــــــ کسی کی تازہ تصویر نہیں چھپی تھی ــــــ

تمام اخبارات خالی تھے ۔

نہ جانے ایسا کیوں ہوا تھا ؟

ضرورت تو صرف ایک ناک کی تھی ــــــ اور وہ بھی بت کے لیے !!

مجھے یہ فقرہ " اسے محبت ہو گئی " ہمیشہ ناپسند رہا ہے ۔ مجھے اس " ہو جانے " پر اعتراض ہے ۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ہم نہایت پرسکون طریقہ سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یکایک " محبت ہو گئی " ۔ آپ اس بات کی تو امید نہیں کر سکتے کہ آپ بیج بوئیں اور وہ راتوں رات تنومند درخت بن جائے ۔ اسے پھلنے پھولنے کے لیے مناسب مٹی اور غذا کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہی حال محبت کا بھی ہے ۔

میں یہ نہیں کہتا کہ " پہلی نظر کی محبت " آگے چل کر حقیقی محبت نہیں بنتی ، بالکل اسی طرح جس طرح میں یہ نہیں کہتا بیج سرسبز درخت نہیں بنے گا ۔ ہاں میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اس میں وقت لگتا ہے ۔ ڈاکٹر مرے بنکس

بھری لال بآواز بلند اپیل پر اپیل کرتا رہا مگر اس کی عرض مرحا بیکار گئی اور لڑکی گاڑی سے اترنے لگی۔
بھری لال نے بطور سلام الوداعی گیت بے تابی کے ساتھ چھیڑ دیا۔

اے صنم
اے صنم
ہم نہ بھولیں گے تمہیں اللہ قسم

بھری لال پلیٹ فارم پر اس طرح اترا جیسے مایوسی کے سمندر میں قدم رکھ رہا ہو۔ دونوں ساتھ ساتھ پلیٹ فارم پر اترے تھے آگے آگے وہ پیچھے پیچھے لڑکی، لہٰذا اس کے دل میں خوشی اور خوف کے ملے جلے جذبات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک فوجی افسر نے لڑکی کا خیر مقدم کیا اور بھری لال کی رفتار تیز ہو گئی لیکن فوراً ایک کڑک دار آواز کانوں میں گونجی فوجی افسر اسے ڈانٹ کر بلا رہا تھا۔

بھری لال کو سانپ سونگھ گیا۔
فوجی نے گونج دار آواز میں پوچھا۔
"کیا بات ہے؟"
لڑکی نے کہا۔

"کچھ نہیں، بیچارے کھانسی کے دائم المریض معلوم ہوتے ہیں راستے بھر کتے کی طرح کھانستے رہے ہومیوپیتھک علاج ان کے لیے مفید ہوگا، ان کا پتہ نے لیجئے، کتاب میں سے نسخے لکھ کر بھیج دیا جائے گا۔

بھری لال کو مجبوراً پتہ دے کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔
اگلے دن اس کو ایک خط ملا۔
لکھا تھا۔

"میرا پتہ ہے:۔
لولین (LOVE LANE) کا سب سے چھوٹا بنگلہ۔

بنگلے کے کمپاؤنڈ میں گلاب کے تختے ہیں جن میں منا اور منی کھیلتے رہتے ہیں۔ منا ہو بہو ان کی شکل پر گیا ہے۔ اور منی کی صورت میری جیسی ہے۔ گھر کے ایک ممبر سے تو آپ کا تعارف کرانا ہی بھول گئی وہ ہے ہمارا ٹائیگر، بہت غصہ ور، بہادر اور وفادار۔

پچھلے ہفتے ایک چور گھر کے پھاٹک میں آگیا تھا، ٹائیگر نے چھلانگ مار کر اس کی گردن پکڑ لی تھی ان سب کو چھوڑ کر کیسے آؤں کسی دن مع اپنی فلمی گانوں کی کتاب کے تشریف لائیے۔
"گل بدن"

میں نے دیکھا ہے کہ اس دنیا کے خراب لوگ اس وقت بھی جب وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں متحد رہتے ہیں۔ ان کے طاقتور ہونے کا راز یہی ہے۔ اچھے لوگ منتشر اور غیر متحد ہیں اور یہی ان کی کمزوری ہے۔
دیگنیف ویزغینکو

اور سننے والے سمجھ جاتے ہیں کہ صاحبزادے سنیما دیکھ کر کہیں سے تشریف لا رہے ہیں، اور فلمی گانوں کا دہرانا جذبات سے خلل سمجھا جاتا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھیلنے والے اسی بہانے اپنا پیام پہونچا دیتے ہیں خواہ سلام آئے یا نہیں۔ عام لوگوں کی میں عاشق کا جنون ظاہر کرنے کا محض یہ ایک فلمی موڈ ہو۔

بھری لال کے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا کہ فلمی گانوں کے ذریعہ اس کو ہیروئن بنا کر ہیرو کا "پیام کیوں نہ پہونچا دیا جائے۔

محبوب کی تعریف پہلی شرط ہے اس لیے اس نے دھیمی لے میں حسب ذیل گیت فلمی لہجے میں شروع کیا۔

"اے گل بدن !
اے گل بدن !
پھولوں کی مہک، کانٹوں کی چبھن
تجھے دیکھ کے کہتا ہے مرا من
اے گل بدن -!
اے گل بدن -!

جب گیت ختم ہو گیا تو اس نے احتیاطاً گیت دہرایا مگر "گل بدن" پر کوئی نمایاں اثر مرتب نہ ہو سکا۔ جس وقت بھری لال گیت چوتھی بار دہرا رہا تھا۔ "گل بدن کے چہرے" پر حیا کی لہریں یوں دوڑ گئیں جیسے سوکھے تالاب میں کنول کی پتی گرے، گویا پیام پار ہو گیا اسی کے ساتھ ہی بھری لال کا دل خود بخود دھڑکنے لگا۔ زبان کانپتے کانپتے بند ہو گئی مگر قسمت کا برا ہو کہ اسٹیشن آگیا اور بھری لال اس فکر میں دبلا ہونے لگا کہ اب "گل بدن" اتر جائے گی۔

اس سفری معاشقے "کو برقرار رکھنے کے لیے اس نے گیتوں بھری دردناک اپیل کرنے کے خیال سے دوسری تان بھی شروع کر دی:

اس چھوٹی سی دنیا میں
محبت کے ہیں راستے
کبھی تو ملو گے ؟
کہیں تو ملو گے ؟

گل بدن کے رخسار مزید مسکراہٹ کے ساتھ حیا کی شوخی بکھیرنے لگے۔

بھری لال کو سو فیصدی یقین ہو گیا کہ بس اب گل بدن کی طرف سے شروعات عشق کا سگنل ہونے ہی والا ہے اور کوئی دم میں وہ اس سے کسی نہ کسی بہانے مخاطب ہو جائے گی مگر جب دیر تک کوئی سگنل نہ آیا اور دوسرا اسٹیشن بھی آگیا جو عاشق صادق کی منزل نامراد تھا۔ اسی لیے اب اس کو فوراً کسی نہ کسی نتیجے پر پہونچنا ضروری تھا۔ لہذا انتہائے جنون کے عالم میں بے باکی اور قربانی کے جذبے سے کام لیتے ہوئے اس نے ایک ایسا گیت چھیڑ دیا جس کے بعد تغافل کا سہارا گل بدن کے لیے لینا ممکن نہ تھا۔

آجاؤ
آجاؤ
تم سب کو چھوڑ کے آجاؤ
آجاؤ
آجاؤ تم سب کو چھوڑ کے

ٹوم موریس
ترجمہ:۔ رام لعل

انگلینڈ کے ادبی رسالے

(ایک جائزہ)

ادیبوں اور ادبی رسالوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ سے ناخوش شادی شدہ جوڑوں کے سے رہے ہیں۔ وہ محبت کرتے ہیں مگر ایک دوسرے سے شدید نفرت بھی کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ لیکن ہر ایک خوش بھی رہتا ہے جب دوسرا اسے اذیت نہیں پہنچاتا۔ ایک ایڈیٹر اور قلم کار ہونے کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ دونوں حیثیتوں میں کون کون سی کیفیت ہوتی ہے۔

بلاشبہ ادبی رسالے ادیبوں کے دم ہی سے نکلتے ہیں۔ اور ادیب ادبی رسالوں کی گم شدہ پسلی سے اپنا وجود نہیں پاتے۔ دونوں کے ایک دوسرے پر انحصار کا یہی بنیادی فرق ہے۔ رسالہ ادیب کے باوا آدم کے لیے اماں حوّا کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا صرف اس وقت نہیں ہوتا جب ادیب معاوضے کے لیے رسالے کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔ لیکن اس وقت بھی یہ سماج جس میں ایسے رسالوں کا ظہور ہوتا رہتا ہے' ایک ایسے طرز حکومت کا نمونہ پیش کرتا ہے جس کی باگ ڈور ہمیشہ ماؤں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رسالوں کی اماں حوّا کے بغیر کوئی ادیب باوا آدم نہیں بن سکتے کیونکہ ناشرین جو کہ اس تمام کاروبار کی نانی، دادی ہی کہلا سکتے ہیں ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اماں حوّا باوا آدم کو قبول کرلے۔ ورنہ یہ ذمہ داری وہی سنبھال لیں گے۔

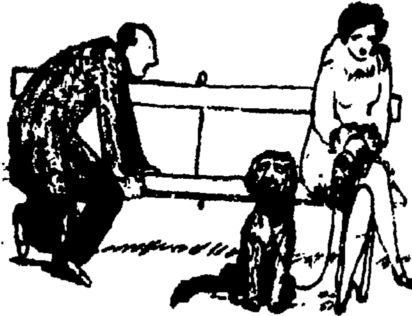
اس صدی میں بلاشبہ ان گنت ادبی رسالے نکل رہے ہیں۔ لندن مرکری، MERCURY جس کی ادارت ایک مدت تک سر جان سکوائر کے سپرد رہی، گھونٹ گھونٹ حلق کے نیچے اتاری ہوئی شراب کی مانند نشہ دیتا رہا۔ ۱۹۲۰ء۔ ۱۱۳۰ء کے درمیانی وقفے میں تو یہ آر۔ اے۔ سکاٹ وجیمز ایسے سخت مزاج ایڈیٹروں کے ہاتھوں میں رہا اور اب بھی ایسے بہت سے ادیب زندہ ہیں جو اس کے لیے انجام دی ہوئی خدمات کو یاد کرتے ہیں۔ جنگ سے قبل پہلے زمانے کے رسائل میں کرائیٹرین CRITERION کا بھی ذکر ضرور کرنا پڑے گا جس پر ٹی ایس ایلیٹ جیسی منظم اور عقابی نگاہ شخصیت نے بے پناہ محنت کی۔ اس رسالے میں نظم، ناٹک اور تنقید شائع ہوتی تھی اور سکروٹنی (SCRUTINY) بھی جس کا اجراء ایف آر لیوس کے ہاتھوں ہوا اور جو اس کی ادارت بھی کرتے رہے برف کی مانند ٹھنڈی اور ناپسندیدہ تنقید کے علاوہ کچھ اچھی نظمیں بھی چھاپتا رہا تھا۔ اس کے قبل ونڈہم لوئیس کا رسالہ بلاسٹ (BLAST) بھی تھا جو پہلی جنگ عظیم کے آغاز کے زمانے کے نہایت قابل ذکر قسم کے مضامین نظم و نثر کی اشاعت کے لیے مشہور تھا۔ کرائی ٹیرین، اسکروٹنی، اور بلاسٹ ایسے مینار وں کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی سطح پر ادبی رسالے آج تک انمٹ لکیریں ہی کھینچتے رہے ہیں۔

جن دو ایڈیٹروں نے ایک لمبی مدت تک ادارت کے فرائض نبھائے ہیں ان کے نام جان لے مان اور سٹیفن اسپنڈر ہیں۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں ہاگرتھ پریس میں لے مان نے ورجینیا اور لیونارڈ وولف کے ساتھ مل کر کام کیا اور اس کے بعد وہ نیو

صفحہ ۲۰ کا بقیہ

زندگی ششا ہے جس سے تم محبت کرتے ہو۔
نہیں ــــ ؟!
ششا وہ تصویر ہے جس کی جگہ البم ہے۔
زندگی الکا ہے۔ زندگی ایک کھردرا پتھر ہے لیکن زندگی ایک مسکراتا پھول بھی تو ہے جس کی خوشبو سے جلنے دل کے کتنے ویرانے معطر ہوتے ہیں۔

میں کیا ہوں، میری زندگی کیا ہے اور میری محبت کیا ہے ــــ!
میری زندگی اگر ریل گاڑی کے انجن سے اگلتا ہوا دھواں ہے تو زندگی سامنے جلتی ہوئی انگیٹھی پر پکتا ہوا وہ خوشبودار پراٹھا بھی ہے جو الکا میرے لیے بنا رہی ہے۔
ششا ایک تصویر ہے، خاموش تصویر۔ جیسے برف کا بت اور الکا بہار۔ بہار آتے ہی برف پگھلتی ہے، ختم ہو جاتی ہے شگوفے پھوٹتے ہیں اور ویرانے آباد ہوتے ہیں ــــ الکا ماں بننے والی ہے۔ برف پگھل رہی ہے بہار آرہی ہے اور میرے من کے ویرانے میں ایک شگوفہ پھوٹ آیا ہے ــــ میں سوچتا تھا کاش ششا گونگی ہوتی اور میں پرکھوں کی راج دہانی بن کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپناتا۔ لیکن میری گونگی تو میرے گھر میں ہے ــــ!!



اخترالزمان صاحب کی کیا ضرورت تھی۔؟

اسی سلسلے میں چھوٹے چھوٹے رسالوں کے جنگل کا ایک خودرو پودہ جو کہ انگلینڈ میں اچانک ہی ابھرا اور سوکھ گیا اور جسے ایک اچھا رسالہ کہا جا سکتا تھا ایکس (X) تھا انفرادی امداد کے بھروسے پہ نکلنے والے اس رسالہ کے جس کے اڈیٹر تھے شاعر ڈیوڈ رائٹ اور آئرش مصوّر پیٹرک سوئفٹ۔ تھے سات آٹھ ہی شمارے شائع ہو سکے۔ یہ بہت ہی حسین بنا کر شائع کیا گیا تھا اور اس نے اپنی مختصر سی زندگی میں کوکوشکا، سمکور باش، آندریلیس، ایکن اور بیکن جیسے مصوّروں کے مضامین، انٹرویو اور تصاویر کے عکس شائع ہوتے تھے۔ ورنن واٹکنز، پیٹرک کوسے نا، جارج بارکر، ہینری مثالکس، دینی ڈاڈمال وغیرہ ادیبوں اور شعراء کے ادب پر باہمی مباحثے چھپتے تھے۔ جان میک گہرن اور ایڈن ہگنز جیسے نئے کہانی کاروں کی نئی کہانیاں، برین ہگنز، جے سی ایشی اور چارلس سسنز جیسے نئے شاعروں کی نظمیں اور ہر طرف اپنے مخصوص نقطہ نظر سے ادب اور رجحانات رکھے ہوتے تھے وہ نقطہ نظر دراصل ایک انفرادی رویّہ کا اظہار ہی ہوتا تھا اور باقی تمام باتوں سے قطع نظر محض انفرادی رویّہ کی خواہش تھی۔ یہ رسالہ موت کی گود میں چلا گیا جیسا کہ عام طور پر چھوٹے ادبی رسالوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس کی امداد کرنے والوں نے اپنا دست اعانت کھینچ لیا۔

ایکس کی موت کے بعد بے شمار چھوٹے چھوٹے رسالوں کے درمیان تین اور بھی قابل ذکر رسالے نکلے ہیں ان میں سے دو کے نام تو بالکل ہی جادوئی قسم کے ہیں جو کہ اس قسم کے رسالے اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ ایک کو اسٹینڈ (STAND) کہتے ہیں دوسرے کو لسن (LISTEN)۔ اسٹینڈ DIONYSIAC قسم کا رسالہ ہے کیونکہ یہ زیادہ تر رومانی اور غیر تہذیبی شاعری کے لیے وقف ہے۔ اسے جان سلکن نامی شاعر ایڈیٹ کرتا ہے اس میں زیادہ تر شاعری اور شاعری پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس میں تراجم اور کچھ کہانیاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ بہت ہی چھوٹا سا رسالہ ہے جسے اس کا ایڈیٹر خود ہی اپنی ساتھیوں کی مدد سے شراب خانوں، کافی ہاؤسوں اور ریستورانوں میں فروخت کرتا ہے لیکن اس کی تقسیم اور مضامین کا طریقہ کار اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اس رسالے میں زندہ رہ جانے کی صلاحیت ہے لسن LISTEN کو ہل (ایک غیر معروف جگہ) سے نکالا جاتا ہے جس کے ایڈیٹر جارج ہارٹلے ہیں جو مارول پریس بھی چلاتے ہیں جہاں سے فلپ لارکن، انتھونی تھوائٹ اور امریکن ڈبلیو ڈی سنوڈگراس کی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ لسن کے ذریعہ اپولوئین APOLLONIAN ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم فراہم ہو گیا ہے۔ جو کہ غیر رومانی ہوتے ہیں اور جو ذہین ہونے کے بجائے چالاک زیادہ ہوتے ہیں اور (سچ مچ) جذباتی ہونے کے لیے بہت زیادہ جذباتی! میں رسالوں کو ادبی کے بجائے دھوٹا، اس لیے کہتا ہوں کہ یہ مضامین کا معاوضہ نہیں دیتے۔ ان کا معیار بھی حیرتناک طور پر اتنا ہی ہوتا ہے جو کہ دو نو ہی ایڈیٹر صاحبان کے لیے خراج عقیدت ہی کہا جا سکتا ہے۔

تیسرے رسالے کا نام دا ایجنڈا ہے جس کی ادارت لندن میں ایک نوجوان ولیم کاکسن نامی سے کرائی جاتی ہے جو کہ ابھی کل تک انڈر گریجویٹ تھا کاکسن اس معاملے میں بے حد ذہین ثابت ہوا ہے کہ اس نے کم و بیش کئی مشہور و معروف اہل قلم کا تعاون حاصل کر لیا ہے ڈیوڈ جونز (...ANATHEMA اور IN PARANTHESIS کا عظیم خالق جسے بے حد نظر انداز کیا گیا ہے) اس رسالہ کا سرورق بنایا کرتا ہے۔ رونالڈ ڈنکن، ہیرولڈ، ٹیڈ ہگز، تھیوڈور روتھکے اور دوسروں نے اس کے ساتھ قلمی تعاون کیا ہے۔ دوسرے مضامین کا معیار ذرا سا غیر متوازن ہے (اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ ادارتی عملے کی نئی نئی گرل فرینڈز لکھا کرتی ہیں) لیکن یہ بہت ہی باہمت اور یقیناً قابل ستائش کوشش ہے۔

میں اپنے قارئین سے بھی چند الفاظ عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ جو مجھے خطوط لکھا کرتے ہیں اور اپنے لکھے ہوئے مضامین نظم نثر کے نمونے روانہ کرتے ہیں۔ انھوں نے جو مجھ کو بھیجا ہے اس پر میں تنقید کر کے خوشی محسوس کروں گا لیکن میں انہیں چھپوانے کی ذمہ داری ہرگز نہیں لے سکتا۔ ایک قلم پیشہ ادیب کو اپنی ہی چیزیں شائع کرانے کے لیے کافی دشواری پیش آتی ہے اگر ان کے مضامین واقعی اچھے ہیں تو انھیں کوئی نہ کوئی رسالہ تو منظور ہی فرما لے گا بہرحال میں مستقبل کے ایسے تمام ادیبوں سے THE WRITERS AND AUTHORS YEAR BOOK کی کاپی خریدنے کی سفارش کروں گا اور ان سے کہوں گا کہ وہ خود ہی اپنی تخلیقات فہرست میں دیئے ہوئے ان تمام رسالوں کو بھیجا کریں مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا۔

شاعری اور نثر کے لئے ہی رسالوں اور گلدستوں کو شائع کرکے ان کا سچ مچ ایک سیلاب سامنے آیا تیسری دہائی کے اواخر میں اس کے ساتھ جیفری گرگسن جو کہ مناظروں کا حامی (اور غالباً کلیائی حلقے کا) نیو ورس (NEW VERSE) ایڈیٹ کیا کرتا تھا اور جولین سائمن جو ورس (VERSE) کا اڈیٹر تھا، آملے۔ ان دو رسالوں کا وہی حشر ہوا جو کہ عام طور پر ادبی رسائل کا ہوا کرتا ہے (جو لکہ تمام ادبی رسالے معمولی سرمائے اور بڑی توقعات سے جاری کئے جاتے ہیں) یعنی بند کر دیئے گئے۔ اس کے بعد گرگسن نباتات کے مطالعے میں مشغول ہوگیا اور سائمن نے خود کو اعلیٰ درجے کی جرائم سے متعلق ناولیں لکھنے میں لگا لیا۔ لیکن لے مان بڑی ستودی کے ساتھ سرپٹ بھاگتا رہا۔ ۱۹۳۰ء میں اس نے اپنا ایک ذاتی اشاعتی ادارہ قائم کرلیا۔ ۱۹۵۴ء میں اس نے ایک رسالہ لندن میگزین کے نام سے نکالا۔ ۱۹۶۱ء سے آج تک اس نے خود کو اپنے خاندانی محافظ خانے کی تفتیشوں میں مشغول رکھا ہے اور اس طرح شاعر دکمیل کو دکے کا علم بگاڑ رالین راس کو جس کی معاونت آسٹریلیا کے ادیب چارلس اوسبورن نے کی ہے۔

اسپنڈر نے ہرل کو نالی کے ساتھ مل کر کئی برس تک ہورائزن کو ایڈٹ کیا ـــــــ ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ۔ اس میں نہ صرف نئے و پرانے لکھنے والے ادیبوں کی نظمیں اور کہانیاں تراجم اور عمرانیات سے متعلق مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ اس نے انکاؤنٹر (ENCOUNTER) کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ اور انکاؤنٹر نے اس سوال کو جگہ دی "ادبی رسالہ کیا ہوتا ہے"؟

ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسا رسالہ ہے جو ادب شائع کرتا ہے۔ یعنی تخیلی اور عمرانیات کی نثر، نظمیں، تراجم۔۔۔ وغیرہ وغیرہ جو کہ ایک اور سوال کو جنم دیتا ہے۔ ایک اچھا ادبی رسالہ کیا ہوتا ہے۔؟

جواب، یہ ایک مخصوص مزاج اور اسلوب والے اڈیٹروں کا رسالہ ہے جو کہ شاید گروہ بندی کا شکار ہونے سے کبھی خوف نہیں کھاتے۔ کچھ بھی ہو وہ ایسے اڈیٹر ہیں جن کا ذاتی شعور اور ذوق خاصا ترقی پا چکا ہے۔ یہ ایک ایسا رسالہ بھی ہو (۱) جس میں مشہور ادیب اس لئے چھپنے کی بے حد کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ بہت اچھا معاوضہ دیتا ہے اور اس کی ایک امتیازی حیثیت ہے۔ ہے) اس میں نئے لکھنے والے اس لئے چھپنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں کہ اس کی ایک امتیازی حیثیت ہے، نئے لکھنے والے تب تک اچھا معاوضہ طلب کرنے کا حق نہیں رکھتے جب تک کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ حیثیت کو ثابت نہیں کر لیتے (ادیب دوسرے پیشوں کی طرح ہی ایک مضبوط یونین بنا لیتے ہیں۔)

یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ۱۹۴۱ء سے آج تک سوائے ایک کے کسی بھی رسالے میں جس کا ذکر میں کروں گا ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تاہم مٹمونے بلاشبہ جنگ کے دوران برسوں تک ایک غیر معمولی سفید ہاتھی پالا جس کا نام پوئٹری لندن (POETRY LONDON) ہے۔ ذاتی طور پر ایک مخصوص مزاج کا مالک تھا اس کا اداراتی ذوق عادت پسند تھا۔ اور اس کے اس دعوے کے باوجود کہ اس نے ۱۹۴۲ء بہترین شاعروں کا کلام شائع کیا ہے وہ شاعر مشکل ہی سے پھر کہیں چھپ سکے۔ اس نے ہر اس شاعر کے کلام کو شائع کر دیا جس اس کو مسودہ بھیج دیا۔ پیشہ ورانہ معیار کا تعین بورڈ کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ اس وقت سے لندن میگزین تخلیقی ادب میں ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ کا نقش ثانی ہی رہا ہے۔ یہ بہت خشک ہے اور اس کے علاوہ یہ بار بار خود کو دہراتا رہتا ہے۔ اس کی نظموں اور ... کو نصف درجن شائع شدہ شماروں سے زائد میں بیان کر دینا بہت ہی مشکل ہوگا۔ انکاؤنٹر کو زیادہ تر سیاست کے ساتھ بند رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی اصطلاح میں گفتگو کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ وقت کے دوش بدوش مشکل ہی سے چلتا ہے، کیونکہ اس میں اگر کوئی نظم یا کہانی اشاعت کے لیے منظور ہو بھی جاتی ہے تو اس کے شائع ہونے میں چھ ماہ سے دو سال تک کا لگ جاتا ہے جو کہ انکاؤنٹر کا قصور ہرگز نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی رسالہ جس کی پشت پناہی کوئی ادارہ کرتا ہو (جیسا کہ انکاؤنٹر کے ہے) حقیقی معنوں میں ادبی رسالہ نہیں بن سکتا۔ ایک حقیقی ادبی رسالے کو کسی کی ذاتی دلچسپی کی ضرورت ہوتی ہے اور بروقت اشاعت کی بھی۔

عبدالعزیز خالد

شعر آشوب

سرحدِ لفظ سے آگے ہے دیارِ نغمہ
نغمہ احساس ہے آواز نہیں
شبِ تخلیق میں احساس ڈھلے نغمے میں
اثر الفاظ کے آہنگ میں ہے پوشیدہ
شخص و اسلوب میں ہے روح و بدن کا رشتہ
قامتِ فکر پہ لفظوں کی قبا سلتی ہے
رقص اور رقاص میں تفریق کریں تو کیسے؟
ہیر، رانجھا بنے جب کس کو پکارے رانجھا؟
شعر کہتا ہے جو لب کہہ نہ سکیں
شعر کہتا ہے میں جذبے کی طرح مبہم ہوں
شبِ صحرا کی خموشی ہوں سمندر کا خروش
کبھی الحانِ مغنی کبھی آوازِ سروش
کبھی اعجازِ پیمبر، کبھی سحر و افسوں
کون سنتا ہے کسی کی نے دل میں دل کی
ادب و جذبہ کو فرزانہ سمجھتے ہیں جنوں
شاعری پلتی ہے آغوشِ قنوط و شک میں
شعر و نغمہ ہے غذا روح کی لیکن ایسی
اشتہا کو جو مٹاتی نہیں چمکاتی ہے
دلِ خلاق کو ملتا نہیں مر کے بھی سکوں
شق رہے سینہ گریبانِ سحر کی صورت
شعرِ خاموش پُراسرار عمق سے ابھرے
کہ ہے سرچشمۂ تخلیق اک اندھی قوت
کوہِ برفین میں پتھر سے نکالے مورت
سادہ لوحی ہے خصوصیتِ اہلِ جنت
خام ہے المیہ معصوم نہ ہو گر شاعر
شاعر و عاشق و مجنوں میں ہے اک ربطِ خفی

بیچتے فن کار ہیں محنتِ جگر موسیقی
فنِ فلمی ہی آدم ہے مسیح ابن اللہ
شبِ تاریک کے سینے میں ہے تیرِ خورشید
زخمِ پنہاں سے رسے آبِ حیاتِ تخلیق
فن کشودِ گرہِ دل ہے گرفتاری ہے
سخن آرا جو ہوں آوارہ بہر کوچہ و کو
فکر و فرہنگ کو رکھیں گروِ جام و سبو
پوچھو اُن سے کہ اے الہام فروشِ یزداں
خود کو کہتے ہو رسول و نبی نوعِ انساں
کس لیے نعمتِ نایابِ نفس کے ہو عدو
مفت کھوتے ہو خداداد صلاحیت کو
مشورہ کس نے دیا چھوڑ کے سب کارِ جہاں
شعر کی بھول بھلیاں میں رہو سرگرداں
اور پھر شکوۂ ناقدریٔ دوراں بھی کرو
ایسے بے لطف پُر آشوب زمانے میں حضور
شعر گفتن چہ ضرور؟
ہم سمجھتے ہیں سخنور کو اک ایسا غواص
یمِ افکار سے لے کر موتی
دلِ خونابہ فشاں سے جیوتی
جو پروتا ہے شبِ تار میں سلکِ گوہر
گیلی لکڑی کی طرح سوزِ دروں سے سلگے
جستہ جستہ پہ عرفانِ سخن کو باندھے
حرف میں معنیٔ آزاد کو محبوس کرے
چشمِ بیمار سے ٹپکائے عقیقِ احمر
سیلی اشکوں کی گلے میں ڈالے
وہ خضر مشرب و مجنوں پیشہ

لے ہے آوارۂ کوہ و بیشہ
سنجری رات کرے فریادیں
سپنے بہلائیں، ستائیں یادیں!
سرِ دربار بلاتے ہیں اسے محضر میں
مونسِ خلوتِ دل، آہِ سحرگاہی ہے!
درد ہے سر میں، خماری ہے دماغ
قطرہ قطرہ ہے لہو زیتِ چراغ
قاقمِ رود و سمورِ شب
خانہ آباد ہے بے سر و سامانی کا
دشت دیکھے مشجر کو کرے شرمندہ
گلِ کچنار کھلا ہے کہ کہیں آگ لگی
مشعلِ لالۂ فروزاں چمن و صحرا میں
سوہنی ڈھونڈے مہینوال کو جنگل جنگل
چھیل متیار کو برہا نے بنایا ہے کل
ترانان کی ترانھان کی لے کدے تا جوگ!
بن میں برباد کریں عمرِ رواں مورکھ لوگ
زندگی کھیل ہے ہنس ہنس کے سہو روگ بجوگ
ایک قطرے میں چھپا ہے دریا
ایک ذرے میں نہاں ہے سورج
رنگ اس کا ہو سیہ بیٹھے جو سورج کے قریب
مثلِ خفاش ہے چشمِ جہاں سے روپوش

اور ابنائے زمانہ دنی و ایذا کوش
بد رگ و تند و حرون و طماع
عبدِ عشتار و عبیدِ عشرت
مذہب ـــــ املاک و ضیاع

ن سہیر

انسان کا مذہب

وقت کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔
چاند زینے سے اتر رہا ہے۔
——— روشنی پھیل رہی ہے۔
ہر طرف اندھیرا ہے۔
اس روشنی اور اندھیرے میں میں بیٹھا ہوا مسکرا رہا ہوں۔
میرے دل میں غم کی اتھاہ موجیں اُٹھ رہی ہیں۔
بار بار میں ان موجوں سے لڑتا رہتا ہوں۔
میں ان موجوں سے بار بار ٹکراتا رہتا ہوں۔
——— اور دل کی آرزوؤں کو پاش پاش کرتا رہتا ہوں۔

میری یہ موجیں اب وقت کے سمندر میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔
——— اور میں تنہا ان سے لڑ رہا ہوں۔

میرے ساتھ کروڑوں انسان
میرے ساتھ کروڑوں انسان ہیں
میں کروڑوں انسانوں کے ساتھ وقت کی ان موجوں سے لڑ رہا ہوں۔
اندھیرے کو شکست دے رہا ہوں۔
اُجالا اب رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہا ہے۔

وقت کی ناؤ آخر کب تک ٹھہری رہے گی۔

میں اسے بڑھ کر کیوں نہ پاش پاش کردوں۔

علقمہ شبلی

غمِ جاناں — غمِ دوراں

مری غزل کی روانی، مرے قلم کی زباں!
مری شریکِ حیات اور میری روحِ رواں!

تمھیں یہ دکھ ہو کہ دُنیا نے تم سے چھین لیا
تمھاری مانگ کا ٹیکا، تمھارا تاج محل
تمھارے کان کے جھمکے، تمھاری ناک کا پھول
تمھارے ہاتھ کے کنگن، تمھارے لب کے کنول

جو رازدار تھا اپنی شبِ عروسی کا
تمھارے پاس وہ ساٹن کا سوٹ بھی نہ رہا
عروسی جوڑا، جو محرم تھا موسمِ گل کا
نہ چھوڑا اس کو بھی اہلِ ستم نے لوٹ لیا

تمھاری زلفِ رسا جس کی چھاؤں میں کل تک
گھٹائیں ناچتی رہتی تھیں، گنگناتی تھیں
نہ آج ہے وہاں نغمہ، نہ رقصِ ابرِ بہار
غموں کے بوجھ سے ہے پُرشکن تمھاری جبیں

مجھے بھی تم سے نہ کچھ کم ہو دکھ، مگر روحی!
غمِ زمانہ سے بڑھ کر تمھارا غم تو نہیں

ابھی تو وقت کے ماتھے پہ سیکڑوں بل ہیں
ابھی تو عارضِ گیتی نکھارنا ہے ہمیں
ابھی تو ابر کی آغوش میں ہے نورِ سحر
ابھی تو گیسوئے عالم سنوارنا ہے ہمیں

جہانِ نو کی شعاعوں سے خیرہ ہیں آنکھیں
لبِ زمانہ پہ جمہور کا ترانا ہے
بُتِ فرنگ! بتم تیری ساحری کی قسم
شکار تیرے فسوں کا نیا زمانہ ہے

بجا کہ میری امیدوں نے پائے منصوبے
مگر تلاش تھی جس کی وہ زندگی نہ ملی
قدم قدم پہ فروزاں ہوئے دیئے، لیکن
نگارِ صبح کے ماتھے کی روشنی نہ ملی

یہ مانا لہلہا اُٹھیں گے دھان کے پودے
جو کھل سکی نہ دلوں کی کلی تو کیا ہوگا؟
نہ جانے کتنی جبینوں کا خون ٹپکا ہے
جو آ سکی نہ لبوں پر ہنسی تو کیا ہوگا؟

بڑھو کہ فرض نے روحی! ہمیں پکارا ہے
بڑھو کہ اپنی محبت کا یہ تقاضا ہے

تمھارے عارضِ سیمیں کی چاندنی مجھ کو
نظامِ تیرہ سے لڑنے کا حوصلہ دے گی
تمھاری زلفِ رسا کی گھنیری چھاؤں میں
حیات آگے بڑھے گی پھلے گی پھولے گی

مری غزل کی روانی، مرے قلم کی زباں!
مری شریکِ حیات اور میری روحِ رواں!

بحث و پیکار و نزاع
مسلک - انکار وجود
نقضِ میثاق و عہود
بوئے نسرین و قرنفل سے سحر تک مہکے
حجلۂ عشرتِ امروز و شبِ رقص و سماع
شکوۂ مطرب و مغ بزمگۂ وصل و وداع
آتش آشام خرابات زرو شاہد و مے
قلتبانی سے ترقی کے مدارج کر لیں طے
پست و منکوس گراں خوابِ خراباتی ہیں
یوں دکھلانے کو سحر خیز و مناجاتی ہیں
خر کو خر مہرہ و گوہر یکساں
مستی آویزشِ کفر و ایماں
مٹے لیکن نہ سدوم اور عمورہ کے نشاں
ادبا اغلال و سلاسل میں اسیر
جادۂ شعر تپ ریگ و رہِ صعب و سترگ
رہ بے فرسنگ و بے میل و دراز و دشوار
سیر و محبوبہ و تھوا سے کہاں ناقہ سوار
رس بھی ادب و دتی رنگ بھری للتائیں
پریم کے نشے سے مخمور لوک اپلائیں
جنھیں دیکھیں تو غزالانِ ختن شرمائیں
سخن بغداد و ری و ثلم و کشمیر کہاں؟
صحنِ گلزار بنا ماندۂ آہ و فغاں
نوحہ خوانِ شب رفتہ ہو گلوں کی خوشبو
نیل ہیلو میں مچلتا ہو دل ناقابو
عوضِ سایۂ نخلِ امید
وہم و تخویف و وعید و تہدید:
کس لیے کرتے ہو توسیع لغاتِ اردو
نظر آتا ہو جنہیں حرفوں میں کالا جادو
اہلِ معنی سے کہو وقتِ سخن آرائی
لکھو آسان مروج غلط العام زباں
فکر و ادراک سے فن کو نہ گراں بار کرو

غالب [1]

ہم کو جذبات کی پینک سے نہ بیدار کرو!

اپنی زنجیروں کا جو لوگ اڑاتے ہیں مذاق
اور رہتے ہیں رہ و رسم غلامانہ پہ
خود وہ آزاد نہیں مالک و مختار نہیں
کسی مانجھی کو نہیں مَن کے سمندر کی تلاش
شکوہ و شوق فقط عشقِ بتاں فکرِ معاش!
پیئیں شورآب جو پیتے تھے عصیرِ انگور
بک گئے نانِ شبینہ پہ قلم کے مزدور
جانو شیطان کی کھڑوی ہو حکم کا تنور
ہاتھ میں ہوش کے دستانے پہن کر پکڑو
عشق کے شعلۂ جوالہ کو اے فن کارو!
طنز و تعریض و ملامت سے نہ زنہار ڈرو
کون شاعر ہو جو دُجیں کا نہ ہو منت کش
آدم خوب ہو مانند طلائے بے غش
فقط اک عیب ہو نا کردن کردن صد عیب
آپ جو گئے ہیں لکھو نہ کسی اور کی گوں
شاعری بار امانت کے سوا کچھ بھی نہیں
خود کو قربان کرو عظمتِ فن کی خاطر
ضبط و ایثار ہو وجدانِ سخن کی قیمت
بن تپائے کبھی آتا نہیں سونے پہ نکھار
عشق کا زہر پیالہ ہو سقراط صفت
سامنے دشتِ ابد پھیلا ہو تا حدِ نظر
کون ہو شمعِ صداقت کا جو پروانہ بنے
نارِ غم میں جلے، گرد وہ جانا نہ بنے
دل پہ جو گزرے لکھے کا فرد دیوانہ بنے
زندگی نذرِ حقیقت کرے افسانہ بنے؟

[1] HOW CAN WE KNOW
THE DANCER FROM THE
DANCE? W.B. Yeats

۲- اُتّی تیر سینے وچ رانجھا حال نہ جا
ما نجھا تا تھا میں کہنوں آکھاں سب پے
رانجھا ہیر تے ہیر رنجھیٹی رتی فرق
آکھ دمودر بھاگے عشق دی دودی ہو

۳- اکثر اهل الجنة البُلْہ

۴- فانّ خیرا اولادنا الابله

۵- CHE VOSTR' ART-
DIS QUASI E' NIP-
TE DANTE

۶- SS ICH NICHT UND
ZU DICHTER IN
DÜRFTIGER ZEIT?
HÖLDERLIN

۷- درد وچھوڑے دا حال نی میں کہنوں
سولاں مار دیوانی کیتی برہوں پیا خیال
نی میں کہنوں آکھاں
جنگل جنگل پھراں ڈھونڈیندی اجے نہ آیا
نی میں کہنوں آکھاں
مادھو لال حسین

۸- جوگ کدے لتّا تیر اناں کی اے
تھاں کی اے
احمد کوی

۹- نازک پیر ملوک سسّی دے مہندی نال
شنگارے
ہاشم شاہ

طفیل ہوشیارپوری

مرحلہ دید کی تکرار تک آ پہونچا ہے
طور سے چل کے جنوں دار تک آ پہونچا ہے

بات آ پہونچی ہے اندیشۂ رسوائی تک
جذبۂ دل لبِ اظہار تک آ پہونچا ہے

شعلۂ عشق جو روشن ہے مرے سینے میں
رنگ بن کر ترے رخسار تک آ پہونچا ہے

اب کہیں دل میں نہیں گردِ کدورت کا نشاں
آئینہ عکسِ رخِ یار تک آ پہونچا ہے

شمع نے لے لیا آغوش میں پروانے کو
جب یہ سمجھی مرے معیار تک آ پہونچا ہے

حسنِ مستور اسے اپنی تجلی سے نواز
ایک سایہ تری دیوار تک آ پہونچا ہے

اُن کی مخمور نگاہوں کا تصور جیسے
میکدہ خود لبِ میخوار تک آ پہونچا ہے

اب کسے منزلِ جاناں پہ رسائی کا خیال
ہر قدم کوششِ بیکار تک آ پہونچا ہے

برملا کہتی ہے یہ وقت کے ماتھے کی شکن
دور یہ کیفرِ کردار تک آ پہونچا ہے

مطمئن قبر کی آغوش میں ہے ایسے طفیل
راہ رو جیسے درِ یار تک آ پہونچا ہے

یوسف اختر

کوئی آدم نہیں!

(مشرقی اور مغربی بنگال کے حالات سے متاثر ہو کر)

ہر طرف
بین کرتی ہوا
ہر جگہ
کھنڈروں کے نشاں
سبز پیڑوں کے پتے لرزتے ہوئے
خون کی بارشیں
خنجروں کی چمک
سینکڑوں مردہ اجسام سڑتے ہوئے۔
کوئی دیکھے ذرا
کون دیکھے گا اب؟
کوئی آدم نہیں!
کوئی انساں نہیں!
چیختی بیٹیوں کی صدا نے کہا
آج پھر کس نے دہرایا تاریخ کو
باپ روتا رہا
مائیں وحشت میں ڈوبی تڑپتی رہیں
کون دیکھے گا یہ؟
کون انساں ہے اب؟
ہر طرف خون ہے
ہر طرف آگ ہے
ادھ کھلی کلیوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں
رہ گزر غم میں ڈوبی سسکنے لگی
دل میں کچھ ٹوٹنے سا لگی
آدمی اپنے بھگوان کو کیا پائے گا؟
"آدمی آدمی سے ابھی دور ہے
آدمی آدمی سے ابھی دور ہے"

انور افسر شعور

ماں اور بچہ

گاؤں کا ایک کھلنڈرا لڑکا
سانولے جسم کی دیواروں پہ
میل لیپے ہوئے اُکھڑا اُکھڑا
دھجیاں اوڑھے ہوئے
سُرخ رُو ہونے سے سُورج کے خجل ہونے تک
کوچے کوچے میں پھرا کرتا ہے آوارہ
کچھ دنوں اور یونہی ٹھوکریں کھائے گا
پھر کسی روز اسے شاخ سے ٹوٹے ہوئے بے آسرا پتے کی طرح
صرصرِ زیست اُڑا لے جائے گی
آہیں کھینچے گا، خلاؤں میں بھٹکتی ہوئی روحیں جیسے
لیکن آواز بھلا کون سُنے گا اس کی
پھر یہی موم کا پُتلا آخر
سینۂ ارض پہ اک سنگِ گراں بن کے لڑھک آئے گا
اک جگر پاش دھماکا ہوگا
اور یہ ماں، یہ زمیں کی دیوی
کرب سے چیخ کے رہ جائے گی

بشر نواز

ہر سعیِ طرب ناکام ہوئی جانے نہ تھے دل کے غم نہ گئے
کس منزل کی خاک نہ چھانی کس محفل میں ہم نہ گئے

کیا نیشِ الم کیا داغِ ستم کس کس کو نہ دی پہلو میں جگہ
ہنستے ہوئے اٹھے ہم پھر بھی محفل سے بہ چشمِ نم نہ گئے

پلکوں سے ٹپک کر دامن پر اک آگ سی ہر سو بھڑکا دی
آغوشِ فنا میں اشکِ الم مانندِ درِ شبنم نہ گئے

توہینِ مسرت ہو نہ سکی ہم سے تو ہجومِ غم میں بھی
کیا لب پہ ہنسی جب آئی بھی پلکوں ہی پہ آنسو تھم نہ گئے

مانندِ نسیمِ صبحِ چمن ہر غنچہ و گل سے نسبت ہے
بھولے سے بھی مثلِ نقشِ قدم ہم ایک ہی در پہ تھم نہ گئے

خالد ندیم

کسی بہانے وہ اس شہر میں چلے آئیں
پھر اس کے بعد وہ مہماں ہمارے کہلائیں
اگر یہ رنگِ طبیعت انھیں پسند نہیں!
وہ اپنے دل کے تقاضے ہمیں بتا جائیں
یہ شرط کتنی کڑی ہو کہ تا ابد ہم لوگ
ترے خیال کو دل میں جگہ نہ دے پائیں
کبھی بھنور، کبھی طوفاں ہو تیری آنکھوں میں
جو غرق ہو کے نہ ابھریں تو کیا مزا پائیں!
گلوں کے ساتھ مہکتی ہے پیار کی خوشبو
اگر کہو تو گلستاں اٹھا کے لے آئیں
کسی بھی فرد سے ملتی نہیں تری صورت
کوئی تو عکس ہو جس سے فریب بھی کھائیں

اویس احمد دوراں

راحتِ دل کا موسم بیتا انگاروں کی رُت آئی
پھول کی خوشبو باغ سے روٹھی، برقِ ستم کی لہرائی
غم کے نگر میں رہنے والو ! خرمنِ جاں کی خیر نہیں
دہکی دہکی آگ لیے ہیں آج کروڑوں سودائی
ننھی ننھی کلیوں کا بھی حسرت ناک انجام ہوا
وقت کی تاریکی نے جس دن صبحِ گلستاں کجلائی
رات کسی کی محفل میں کل ساز تھے وحشی ہاتھوں میں
ہم نے کلیجہ تھام کے دیکھی لحن و نوا کی رسوائی
لاکھوں ہی تدبیریں کیں پر دل کی گرہیں کھل نہ سکیں
جتنا سوچا اب کیا ہوگا؟ اور طبیعت گھبرائی
کب وہ ہنس کر بات کریں گے، قہر سے کس دن دیکھیں گے
ہم تو ناداں ہیں کیا جانیں ان کے دل کی گہرائی
پھیر لیے منہ بیزاری سے محفل میں بے مہروں نے
تم نے دوراں ناحق ہی رودادِ شبِ غم دُہرائی

جمیل کلیمی

وہ بات جو نہ آئی تھی وہم و گمان میں
چپکے سے کہہ گئی ہو صبا میرے کان میں
کچھ اجنبی سے لوگ سرِ شام آ گئے!
اے چاند شکر ہے مرے اجڑے مکان میں
بس اک جھلک دکھا کے وہ ایسے گئے کہ پھر
بیٹھا رہا میں صبح تلک اُس دھیان میں
جو بات تیرے ابروئے خم دار کر گئے
وہ بات اب کہاں رہی تیر و کمان میں
جو دوستی کے پردے میں کرتے ہیں دشمنی
ایسے بھی یار لوگ ابھی ہیں جہان میں
اے ابرِ پارہ دیکھا ہو تم نے کہیں بتاؤ
گم ہو گیا ہے چاند مرا آسمان میں
صد شکر کامیاب رہے ہم بھی اے جمیل
یارانِ تیز گام کے ہر امتحان میں

مقبولؔ جہانگیر

نورمبرگ کے قلعے میں٭

یہ ناقابلِ فراموش اور عبرتناک حادثہ نورمبرگ کے پرانے قلعے میں پیش آیا تھا۔ میں جس زمانے کا ذکر کرتا ہوں، اس زمانے میں نورمبرگ کا یہ پرانا قلعہ سیاحوں کے لیے کچھ زیادہ کشش نہ رکھتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جرمنی کے اس دُور افتادہ اور بہت پرانے شہر تک پہنچنے کی سہولتیں کچھ زیادہ نہ تھیں اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو دور دراز کا سفر طے کر کے اور سینکڑوں مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد نورمبرگ پہنچتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں نازیوں نے نورمبرگ کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا، اس لیے اس کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور جب سیر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کو پتہ چلا کہ نورمبرگ میں بارھویں صدی عیسوی کی عمارتوں کے آثار موجود ہیں، تو وہ اُسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔

ان دنوں میری شادی ہوئے دو ہی ہفتے گزرے تھے اور ہم میاں بیوی یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کرتے ہوئے ایک روز فرینکفرٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے، تو ہماری ملاقات ہوچیلسن سے ہوئی۔ وہ خوبصورت نوجوان نہایت باتونی اور مسخرے پن کی حد تک ہنس مکھ امریکی سیاح تھا جس نے جلد ہی ہم سے گہری دوستی کرلی۔ وہ منہ ٹیڑھا کر کے جب تیزی سے انگریزی بولتا، تو میری بیوی کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔ ہوچیلسن کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں۔ وہ اپنی بہادری اور سیاحت کے ایسے ایسے عجیب قصے بیان کرتا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اگرچہ مجھے بعد میں احساس ہو گیا کہ وہ جھوٹ بولنے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، تاہم ایسے ساتھی کی موجودگی ہمارے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی اور وہ تفریح کا بہت عمدہ ذریعہ بن گیا۔

نورمبرگ کا قلعہ دیکھنے کی تجویز بھی اسی نے پیش کی تھی اور میری بیوی امیلیا جسے ایسی عمارتیں دیکھنے کا از حد شوق تھا فوراً آمادہ ہو گئی۔ نورمبرگ دریائے پیگنیز کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ ایک حصہ پرانا شہر کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ نیا شہر —— پرانا شہر تو قرونِ وسطیٰ کے رومن فنِ تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ یہاں شہر کے چاروں طرف اونچی فصیل ہے جس میں چار بڑے بڑے دروازے اور ۱۲۸ سیڑھیاں ہیں۔ شہر کا یہ حصہ زیادہ تر پہاڑیوں کے اوپر آباد ہے جو شمال سے مغرب کی جانب پھیلتی چلی گئی ہیں اور اس مقام پر سرخ پتھروں کا بنا ہوا وہ عظیم الشان قلعہ واقع ہے جس کے ایک کمرے میں یہ عبرتناک حادثہ پیش آیا تھا جو میں

٭ "نورمبرگ کے قلعے میں" شہرہ آفاق مصنف بریم سٹوکر کے قلم سے ہے۔ اس کا تعارف کرانے کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ "ڈریکولا" جیسی شہرہ آفاق کتاب کا مصنف ہے جو ۱۸۹۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی اور جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس وقت سے لے کر اب تک ہر سال اس عظیم ناول کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔

(مترجم)

پرکاش فکری

جگمگاتے راستوں پر اب خموشی چھا گئی
یاد تیری غم جگانے پھر کہیں سے آ گئی

سرخ بجری کی سڑک پر چلتے چلتے آج پھر
اُس مکاں کی ایک کھڑکی سے نظر ٹکرا گئی

گرمیوں کے بعد یہ برسات کی پہلی جھڑی
پیاس سے جلتے دلوں پر ٹھنڈکیں برسا گئی

دف بجاتی فصلِ گل کا قافلہ جانے لگا
لہلہاتے جنگلوں پر پھر اُداسی چھا گئی

جون گزرا ہر گلی سے رنگ بکھراتا ہوا
دیکھتی آنکھوں میں جیسے روشنی لہرا گئی

گہرے گہرے نیلے نیلے پانیوں میں ڈوب جا
اک صدا چپکے سے فکری یہ مجھے سمجھا گئی

صادق مولیٰ

لیڈرِ شہر زندگی تیرا، شکر کس طور سے ادا کیجے!
اسپتالوں کا کچھ شمار نہیں، تندرستی کا کیا گلا کیجے!

وہ جو "رکمنڈ" کے فقیر ہوئے، ان کو تشویشِ روزگار کہاں
دعوتیں دیکھے نوکری لیں گے، اس سے خوش وقت کاروبار کہاں

نظم چھیڑی تو اُٹھ گئی محفل، منتِ طبعِ غم گسار کیے؟
سرِ اسٹیج ہو گئی "ہوٹنگ" بے سُرے کا خیال، یار کیے؟

بدنصیبی کہ چشمِ دل کی مراد، دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
عینکیں "پکش پات" کی پہنے، ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

دورِ ایٹم ہے آج کا انساں، لاکھ تسخیرِ کائنات کرے
پھر بھی اسکے سوا نہیں چارہ، ڈالڈا کھائے چکنی بات کرے

یہ پتھر کہاں سے آن گرا۔

"ارے یہ کیا غضب کرتے ہو۔" میری بیوی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "وہ ڈر جائیں گے۔ کیوں ان کا خوامخواہ کرنے کی فکر میں ہو۔"

"مادام، آپ قطعاً نہ گھبرائیے ——— یہ کھیل اور دلچسپ بن جائے گا۔"

"اچھا بھئی تمہاری مرضی ——— مگر خدا کے لیے ذرا احتیاط سے پتھر پھینکنا۔ کہیں تم اس پیارے سے ننھے بچے کو زخمی نہ کردو۔"

"اجی آپ خواہ مخواہ ڈرتی ہیں، کیا میں بچہ ہوں جو ایسی بے احتیاطی کروں گا۔" امریکی نوجوان نے گردن ہلا کر کہا۔ "مادام میں تو ایسا رحم دل آدمی ہوں کہ میں نے آج تک کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔"

"اور شیر چیتے ہلاک کرتا رہا ہوں۔" میں نے لقمہ دیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر پتھر نیچے پھینک دیا۔

آہ...... وہ منحوس لمحہ جب اس امریکی نے پتھر نیچے پھینکا، مجھے ساری زندگی یاد رہے گی، کیونکہ ہوا کے زور سے وہ وزنی پتھر تیزی سے نیچے گیا اور بلی کے معصوم بچے کے سر پر جا لگا اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کا ننھا سا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل آیا۔ چند سکنڈ تک تڑپنے کے بعد وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

اب ہم تینوں آنکھیں پھاڑے بلی کے بچے کی لاش کو دیکھ رہے تھے جو چند ثانیے پیشتر جوانی، زندگی اور حسن کی بہترین تصویر تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس غیر متوقع حادثے نے میرے جسم کو بھی سرد کر دیا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں بیکار ہو گئیں۔ یہی حال میری بیوی اور امریکی نوجوان کا تھا، بلکہ میری بیوی کا تو خوف کے مارے چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا۔

پتھر گرتے ہی سیاہ بلی نے سر اٹھا کر ہماری جانب دیکھا خدا کی پناہ...... اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں ایک دم انگاروں کی مانند سرخ ہو گئیں اور اس کا جبڑا بھیانک انداز میں کھل گیا۔ اس نے اپنی شعلہ بار نگاہیں ہم تینوں پر جما دیں۔ میرے بدن میں دہشت سے تھرتھری چھوٹ گئی اور میری بیوی تو تقریباً غش کھا کر میرے اوپر ہی آن پڑی۔ سیاہ بلی نے پلٹ کر اپنے تڑپتے ہوئے بچے کی جانب دیکھا جو جان کنی کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور سر پر سے سرخ سرخ خون کی نکلتی ہوئی پتلی سی دھار نے اس کا سارا جسم لت پت کر دیا تھا۔ بلی کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی، وہ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھی اور نہایت محبت سے اپنے مرے ہوئے بچے کا جسم چاٹنے لگی۔ اس کا جبڑا اپنے بچے کے تازہ خون میں بھر گیا اور جب اس نے منہ کھولا، تو اس کے لمبے سفید چمکتے ہوئے دانت دیکھ کر میرا کلیجہ بھی حلق میں آ گیا۔ اس کے لمبے لمبے نوکیلے ناخن بھی پوری طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور اس وقت وہ جوش اور انتقام کا ایسا نمونہ بن گئی تھی کہ بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

چند لمحے تک وہ نہایت غیظ آلود اور نفرت انگیز نظروں سے امریکی کو تکتی رہی اور پھر پوری قوت سے دوڑتی ہوئی آئی اور قلعے کی پتھریلی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے حلق سے اب غراہٹوں اور چیخوں کی دلدوز آوازیں نکل رہی تھیں۔

بلی کا یہ غیظ و غضب اور جوش کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ اگر اس کا بس چلے، تو وہ امریکی نوجوان کی بوٹیاں اڑا دے گی۔ اس کی خوفناک شکل اور غرانے، پھنکنے اور سفید دانت دکھانے کا انداز اتنا ڈراؤنا تھا کہ میری بیوی اسے برداشت نہ کر سکی اسے ہوش میں لانا بھی میرے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ بلی بار بار دوڑتی ہوئی آتی اور قلعے کی سنگین اور غیر ہموار دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی، مگر ہر مرتبہ پیٹھ کے بل نیچے گر جاتی، تاہم اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو کر نیچے گری، تو اپنے مرے ہوئے بچے پر جا پڑی اور بلی کا سارا جسم خون میں لت پت ہو گیا۔ امریکی وہیں کھڑا بلی کی ان حرکات کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کے لیے یہ بھی ایک پرلطف تماشا تھا۔ میں جلدی سے اپنی بیوی کو وہاں سے ہٹا کر ذرا فاصلے پر ایک جگہ سائے میں لے گیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد امیلیا ہوش میں آ گئی، لیکن اس کی آنکھوں سے خوف

آگے چل کر بیان کرنے والا ہوں۔

نورمبرگ کا قدیم قصبہ اس قلعے سے نیچے آباد ہے چونکہ یہ قلعہ سب سے اونچی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے، اس لیے اس کی فصیل سے نظارہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے قلعے کی شمالی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت گہری کھائی ہے جو صدیوں سے پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاسی ہے رومن بادشاہوں کے عہد حکومت میں یہ کھائی جسے دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے، یقیناً پانی سے بھری رہتی ہوگی اور خدا بہتر جانتا ہے کہ اس میں کتنے آدمی گر کر ہلاک ہوئے ہوں گے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ مجرموں کو جب اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تو اس کے بعد لاشوں کو کھائی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اُن دنوں اس کی گہرائیوں میں گوشت خور مچھلیاں بھی بڑی تعداد میں پرورش پاتی تھیں، یہ لاشیں ان مچھلیوں کا من بھاتا کھاجا تھیں۔

اس خشک کھائی نے زمین کا بہت سا حصّہ گھیر رکھا تھا، اس لیے نورمبرگ کے گورنر نے اسے استعمال کرنے کا عجیب طریقہ نکالا کیا۔ اس نے یہاں درختوں اور پودوں کی بہت سی قسمیں لگوا دی تھیں اور کہیں کہیں پھولوں کے تختے بہار دکھا رہے تھے قلعے کی فصیل کے ساتھ ان کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے فصیل سے اس کی گہرائی اندازاً پچاس ساٹھ فٹ ہوگی۔ اس سے پرے شہر کے مکانات دکھائی دیتے ہیں جن کی سرخ سرخ ڈھلوان چھتیں تیز دھوپ میں خوب چمکتی ہیں۔ دائیں جانب قلعے کی فصیل کے ساتھ ہی وہ چھوٹی بڑی برجیاں اور گنبد دور تک پھیلے ہوئے تھے جن میں پہرے دار رہا کرتے تھے اور انہی کے درمیان ایک سے گنبد کے نیچے قلعے کا سب سے اہم کمرہ بنا ہوا تھا جسے خاص طور پر دیکھنے کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔

یہ وہ کمرہ تھا جو سینکڑوں آدمیوں کی جانیں لے چکا تھا۔ اسی کمرے میں وہ عجیب و غریب مشینیں رکھی ہوتی تھیں جن کی مدد سے انسان صدیوں سے اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم، اذیت اور عذاب کے طریقے آزماتا چلا آیا ہے یہاں بادشاہ مجرموں کو ایسی سزائیں دیتے تھے کہ آج بھی انھیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے پورے قلعے کی سیر کر لیں اور پھر اس ہیبت ناک کمرے کو سب سے آخر میں دیکھیں تاکہ ہماری طبیعتیں اس کا اثر کم سے کم قبول کریں۔ اسی دوران میں ہم تینوں ذرا دم لینے کے لیے فصیل کے قریب جا کھڑے ہوئے اور جھک کر کھائی میں اُگے ہوئے پھولوں کے تختوں اور درختوں کو دیکھنے لگے۔ جولائی کی تیز اور روشن دھوپ میں یہ نظارہ آنکھوں کے لیے بڑا فرحت انگیز اور خوش گوار تھا۔ رنگ برنگ پھولوں کے تختے بڑے بڑے خوشنما قالینوں کی صورت میں ہمارے سامنے بچھے ہوئے تھے اور جب ہوا چلتی، تو یہ پھول جھومنے لگتے اور ایسا یوں محسوس ہوتا جیسے قدرت کے بنائے ہوئے ان حسین قالینوں میں حرکت پیدا ہو گئی ہو۔ قلعے کی سیر کرتے ہوئے ہم واقعی تھک گئے تھے اور اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتے تھے۔ مگر وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ جگہ ہوتی تو اس کھلے آسمان تلے دھوپ میں بیٹھتے بھی کہاں؟ دفعتہً میری بیوی نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا اور ہم نے جھک کر ادھر دیکھا، تو ایک دلچسپ تماشا نظر آیا۔

سیاہ رنگ کی ایک بڑی بلّی جس کی کھال دھوپ میں خوب چمک رہی تھی، فصیل کے عین نیچے دھوپ میں آرام سے لیٹی تھی اور اس کا بچہ جس کا بھی رنگ سیاہ تھا، قریب ہی کھیل رہا تھا۔ بلی اپنی لمبی دم ہلاتی اور بچہ اس کی طرف جھپٹتا۔ کبھی وہ دم پر پنجہ مارتا اور کبھی اسے اپنے منہ میں دبا لیتا اور پھر زور لگا کر اپنی ماں کو گھسیٹنا چاہتا۔ بلی اپنے پاؤں کو جنبش دے کر بچے کو آہستہ سے پرے دھکیل دیتی اور دم زور زور سے ہلانے لگتی۔ اس پر بچہ اور جوش میں آ کر اُچھلنے کودنے لگتا۔ غالباً اسے اس کھیل میں بڑا مزا آ رہا تھا۔

چند منٹ تک ہم تینوں نہایت دلچسپی سے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ پھر یکایک امریکی نوجوان نے قریب پڑا ہوا ایک پتھر اٹھایا اور ہنس کر بولا۔

"ذرا دیکھیے میں آپ لوگوں کو ایک اور دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں۔ میں یہ پتھر ان کے قریب پھینکتا ہوں۔ وہ دونوں حیران ہوں گے کہ

کے گھاٹ اتار دیا...... یہ بلی میرے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے ـــــ میں اب جاتا ہوں، تو مجھے جا کر آپ کے سامنے اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔"

بلی نے جب ہوچیین کا قہقہہ سنا، تو اس میں دفعتہً ایک عجیب تغیر رونما ہوا۔ اس کا سارا جوش و خروش اور غضب یک لخت ختم ہو گیا اور وہ پرسکون دکھائی دینے لگی۔ اس نے پھر ہوچیین کی طرف ایک بار دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس طرف گئی جہاں اس کا بچہ مرا پڑا تھا اور پھر زبان نکال کر بچے کا جسم چاٹنے لگی۔

"واقعی بلی تمہیں دیکھ کر اب ڈر گئی ہے۔ دراصل اس نے تمہاری آواز سن کر اندازہ کر لیا ہو گا کہ یہ شخص تو بہت بڑی بلا ہے۔ اس سے نپٹنا آسان کام نہیں۔" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ امیلیا بھی یہ فقرہ سن کر ہنس پڑی اور ہم تینوں وہاں سے آگے بڑھے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد جب ہم نے پیچھے جھانکا۔ تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سیاہ بلی بھی اسی جانب چلی جا رہی تھی جدھر ہم جا رہے تھے۔ اس نے منہ میں اپنے مردہ بچے کو دبا رکھا تھا، لیکن چند لمحے بعد جب ہم نے دیکھا، تو مردہ بچہ اس کے منہ میں نہ تھا۔ بلی نے شاید اسے کسی جگہ چھپا دیا تھا۔ اسے پراسرار انداز میں تعاقب کرتے دیکھ کر امیلیا پر پھر خوف طاری ہونے لگا اور اس نے امریکی کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی، مگر وہ بے پروائی سے ہنسا اور کہنے لگا۔

"مادام، آپ کو اس بلی سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر وہ ہمارے پیچھے آ رہی ہے، تو آنے دیجیے۔ بھلا وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ اور فرض کیجیے اگر اس کا ارادہ مجھے نقصان پہنچانے کا ہے، تو میں ابھی آپ کے سامنے اس کا خاتمہ کیے دیتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ ایک بلی کو مارنے کے جرم میں چند منٹ کے لیے پولیس مجھے پکڑ لے گی، وہ مجھے پھانسی پر لٹکانے سے تو رہی۔"

امیلیا نے اسے پستول نکالنے سے روکا، ورنہ وہ ضرور بلی پر گولی چلا دیتا۔

ہوچیین نے ایک بار پھر پیچھے جھانکا، تو بلی اسے دیکھ کر غرائی اور پھر جلدی سے ایک پتھر کی آڑ میں ہو گئی۔ میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کیا بلی کو ہوچیین کے مہلک ارادے کا پتہ چل گیا تھا؟ بلی کے یوں دبک جانے پر ہوچیین نے فخریہ انداز میں امیلیا کی جانب دیکھا اور کہا "دیکھا مادام آپ نے؟ یہ شریر بلی اب مجھ سے ڈرنے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہاں سے لوٹ کر اپنے مردہ بچے کی حفاظت کرنی چاہیے، کہیں دوسری بلیاں اسے ہڑپ نہ کر لیں۔ جاؤ خالہ بلی، یہاں سے ٹل جاؤ، ورنہ میرا پستول خواہ مخواہ چل جائے گا۔"

امیلیا نے جلدی سے ہوچیین کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹ کر آگے لے گئی۔ لیکن جاتے جاتے بھی امریکی نوجوان نے پیچھے جھانک کر بلی سے چند مزاحیہ فقرے کہہ ہی دیے۔

"اچھا الوداع ـــــ خالہ بلی ـــــ میں تم سے معذرت کر چکا ہوں کہ میں نے جان بوجھ کر تمہارے بچے کو نہیں مارا، مگر تم ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ بہرحال تم اب اس حادثے کو فوراً ہی فراموش کر دو۔"

جلد ہی ہم قلعے کی اندرونی دلچسپیوں اور عجائبات کو دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئے کہ تھوڑی دیر پہلے جس ناخوشگوار حادثے نے ہمیں مکدر کر دیا تھا، اس کی یاد بھی باقی نہ رہی۔ پھرتے پھراتے آخرکار ہم قلعے کی سب سے مشہور اور ہیبت ناک جگہ پر پہنچ ہی گئے جہاں ۹ سو سال پیشتر مجرموں اور جاسوسوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔

اس وسیع و عریض کمرے کے عمر رسیدہ چوکیدار نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر خاصا خوش نظر آتا تھا، کیونکہ اس روز وہاں کی سیر کرنے والے ہم تین ہی افراد تھے اور چونکہ چوکیدار کی بالائی آمدنی کا ذریعہ سیاحوں کی دی ہوئی بخشش ہی ہوتی ہے، اس لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہماری جانب توجہ دے رہا تھا۔ وہ عرصۂ دراز سے اس کمرے کا چوکیدار تھا اور یہاں رکھی ہوئی ہر شے کے متعلق اس کی معلومات حیران کن تھیں۔

جب ہم اس کے اندر داخل ہوئے، تو ماحول کی تاریکی اور اس میں رکھی ہوئی عجیب اور پراسرار مشینوں اور ہتھیاروں نے ہمارے

امیلیا کو وہیں چھوڑ کر جب میں دوبارہ دیوار کے قریب گیا، تو ہوچیپن نے کہا۔

"میں نے دنیا میں ایک سے ایک خوفناک درندے دیکھے ہیں، مگر جس وحشی پن کا مظاہرہ سیاہ بلی کر رہی ہے، یہ میرا پہلا مشاہدہ ہے۔ اس کا غصہ ہر لمحے بڑھتا ہی جاتا ہے۔" اس کے بعد وہ اسی طرح کا ایک اور قصہ بیان کرنے لگا جسے میں نے ڈھنگ سے نہ سنا، کیونکہ میں بلی کی عجیب و غریب حرکات دیکھنے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے پندرہ بیس مرتبہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی اور ایک تو وہ کافی اوپر آگئی تھی کہ پیر پھسل جانے کے باعث دھڑام سے نیچے جا گری۔ یقیناً اسے سخت چوٹ لگی تھی لیکن بلی نے اس چوٹ کی کوئی پروا نہ کی اور نئے ولولے کے ساتھ دوبارہ دوڑتی ہوئی آئی اور دیوار پر چڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر امریکی کہنے لگا۔

"اس جانور کی ہمت پر آفریں ہے ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوار پر چڑھ کر ہی دم لے گی، مگر افسوس کہ وہ یہاں تک نہ پہنچ سکے گی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کا غصہ سرد پڑ جائے گا، تو وہ اس حادثے کو بھول جائے گی ——— افسوس ..... صد افسوس ..... مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ پتھر اس کے بچے کو لگ جائے گا ..... یہ حادثہ بالکل اتفاقیہ ہوا ہے، ورنہ میری نیت اسے ہلاک کرنے کی نہ تھی خیر ..... اب جو ہونا تھا ہو گیا ..... اب اس بچے میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جا سکتی۔"

اتنا کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی بلی نے بھی دیوار پر چڑھنے کی کوشش ترک کر دی اور وہیں بیٹھ کر اپنی غضبناک نظروں سے اوپر دیکھنے لگی۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "کرنل، مجھے افسوس ہے کہ اس حادثے نے آپ کو ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیا۔ آہ ..... میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی بیوی نے تو اس کا بہت ہی زیادہ ناگوار اثر قبول کیا ہے ——— مجھے ان سے معذرت کرنی چاہیے۔"

یہ کہہ کر وہ اس جگہ گیا جہاں میری بیوی آرام سے لیٹی تھی۔

"مادام ..... کیا آپ مجھے معاف نہ کریں گی ..... یقین کیجیے، اس میں میری کوئی خطا نہ تھی۔ بلی کے بچے کی قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا تھا۔ اب جو ہونا تھا ہو گیا ..... اسے فراموش کر دیجیے اور آئیے قلعے کی باقی چیزیں دیکھ کر ہم جلد از جلد اس منحوس مقام سے رخصت ہوں۔"

ہم تینوں ادھر سے گزرتے ہوئے جب فصیل کے قریب آئے تو غیر ارادی طور پر ہم نے نیچے جھانکا، سیاہ بلی اسی طرح بیٹھی اوپر دیکھ رہی تھی۔ جونہی امریکی کا چہرہ اسے نظر آیا، اس نے وہیں سے چھلانگ لگائی۔ اس کے دونوں پنجے اس انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے جیسے وہ امریکی کا منہ نوچ لینا چاہتی ہے، مگر وہ حسب معمول پھر نیچے جا پڑی۔ ساٹھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا بلاشبہ بلی کے لیے ایک ناممکن بات تھی۔ امریکی نے اب خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلی کو مخاطب کیا۔

"پیاری بلی ..... مجھے معاف کر دو ..... میں نے جان بوجھ کر تمہارے بچے کو نہیں مارا ..... میں تو دراصل تمہارا کھیل اور دلچسپ بنانا چاہتا تھا ..... اب یہ اتفاق تھا کہ پتھر تمہارے بچے کو جا لگا اور وہ مر گیا۔ بخدا اس میں میرا ذرہ برابر بھی قصور نہیں ——— اب تم دیوار پر چڑھنے کی کوشش چھوڑ کر بچے کے کفن دفن کا بندوبست کرو ——— جاؤ شاباش ....."

امیلیا ایک بار پھر بلی کو دیکھ کر ڈر کے مارے کانپنے لگی اور اس نے نوجوان سے کہا۔

ہوچیپن، تم اسے مذاق نہ سمجھو ——— بلی کا ارادہ فاسد ہے۔ وہ اگر یہاں ہوتی، تو تمہیں ضرور مار ڈالتی ——— مجھے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے نفرت اور حقارت کی چنگاریاں سلگتی دکھائی دے رہی ہیں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا۔

"مادام، آپ مجھے ..... یعنی شیر دل ہوچیپن کو ..... اس حقیر سیاہ بلی سے ڈراتی ہیں جس نہ جانے کتنے درندوں کو موت

چوکیدار نے ستون سے بندھا ہوا موٹا رسّا کھولا اور پوری قوت سے اسے کھینچنے لگا۔ اب ہم نے حیرت سے دیکھا کہ مشین کے اوپر
ا ہوا ایک چھوٹا سا دروازہ گڑگڑاہٹ کی سی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ یہ آہنی دروازہ بہت بھاری تھا، کیونکہ اسے
کھینچتے ہوئے بوڑھا چوکیدار جلد ہی ہانپنے لگا تاہم اس نے دروازہ پوری طرح اوپر اٹھا دیا جس پر بہت سی نوکدار سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ہمیں
مشین کے اندر دیکھنے کا اشارہ کیا۔ آہنی دروازہ اٹھنے کے بعد مشین کے اندر اتنی جگہ تھی جس میں ایک آدمی آسانی سے لیٹ سکتا تھا۔
چوکیدار نے ہمیں بتایا۔ " اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ مشین کس کام آتی تھی۔ مجرم کے ہاتھ پیر باندھ کر اس مشین کے اندر خالی جگہ میں
ڈال دیا جاتا تھا اور لوہے کے اس سلاخ دار دروازے کو آہستہ آہستہ نیچے گرایا جاتا تھا۔ بدنصیب قیدی جب ان خون آشام سلاخوں کو اپنی
آنکھوں اور جسم کی طرف بڑھتے دیکھتا، تو موت کے لرزہ خیز خوف سے جرم کا اقبال کر لیتا اور سارے راز اگل دیتا، لیکن بعض ایسے مجرم بھی
ہوتے جو اس حالت میں بھی زبان نہ کھولتے تو رسّے کو ذرا چھوڑ دیا جاتا اور یہ آہنی دروازہ پوری قوت سے نیچے گر جاتا اور وہ آنا فانا
موت سے ہم کنار ہو جاتا۔
ایمیلیا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا۔ " خدا کے واسطے مجھے اس منحوس
جگہ سے فوراً لے چلو ـــــ میں یہاں اب ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی، ورنہ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ " میں نے
اسے دلاسا دیا اور کہا کہ ہم تو صرف یہاں کے عجائبات دیکھنے آئے ہیں اور ہمارے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔ وہ کیا خیال کرے گا۔ میں
اسے سمجھا بجھا کر جب واپس کمرے میں لایا، تو امریکی نوجوان اس مشین کے پاس کھڑا اس کا بغور معائنہ کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر بولا۔
" آپ کی بیوی بہت کمزور دل کی خاتون ہیں۔ بلاشبہ انھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کی غیر حاضری میں اس مشین کے
بارے میں بعض دلچسپ باتیں چوکیدار سے معلوم کی ہیں۔ میں نے اب تک سنا تھا کہ ریڈ انڈین باشندوں کے متعلق بڑی بڑی داستانیں سنی تھیں کہ
وہ اپنے دشمنوں اور حریفوں کو عجیب عجیب سزائیں دیتے تھے، مگر یہ مشین بے مثال ہے۔ خدا کی پناہ ـــــ مجھے تو اس کے تصور ہی سے
وحشت ہوتی ہے، لیکن ...... میں اپنا تجربہ مکمل کر کے ہی واپس جاؤں گا ـــــ "
" کیا کہتے ہو، کیسا تجربہ ؟ " میں نے حیرت سے پوچھا۔
وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔
" یہی معمولی سا تجربہ ـــــ میں خود ایک منٹ کے لیے اس مشین کے اندر لیٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ لوہے کا یہ سلاخدار دروازہ کس
طرح آہستہ آہستہ نیچے آتا ہے۔ "
" نہیں، نہیں۔ " ایمیلیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ " خدا کے لیے ہوچیسن ایسا نہ کرنا۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو ؟ "
" آپ جو چاہیں سمجھیں، مگر میں یہ تجربہ کر کے رہوں گا۔ " ہوچیسن نے اصرار کیا۔ " اگر آپ ڈرتی ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر
چلی جائیے ـــــ میں آپ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں، نہ جانے اب تک کیسے کیسے واقعات و حادثات
مجھ پر بیت چکے ہیں۔ آپ یقین نہیں کریں گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک مرتبہ مونٹانا کے جنگل سے میں گزر رہا تھا کہ دشمنوں نے مجھے مار ڈالنے
کے لیے جنگل میں آگ لگا دی۔ میں رات بھر ایک مرے ہوئے گھوڑے کے اندر چھپا رہا، تب جان بچی ـــــ اسی طرح نیومیکسیکو میں مجھے
سونے کی ایک کان میں جو حادثہ پیش آیا، وہ بڑا خوفناک تھا۔ دو روز تک میں ایک غار میں قید رہا جس کے دہانے پر ایک بڑا پتھر آن گرا
تھا۔ غور کیجیے جب ایسے عظیم حادثوں سے میں بچ گیا، تو اس دو منٹ کے تجربے سے کیا قیامت برپا ہو جائے گی۔ "
میں نے دیکھا کہ وہ اپنی ہٹ کا پکا ہے اور یہ کام ضرور کر گزرے گا، تو کہا۔
" اچھا ...... اچھا ...... جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لو ...... ہم اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ میری بیوی کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے۔ "
امریکی نے مسخرے پن سے مجھے سلیوٹ کیا اور کہنے لگا۔

"ذرا آہستہ...... تم تو ایک دم رسّا چھوڑ دینے پہ تلے ہوئے ہو۔"

بوڑھے چوکیدار نے رسّا پوری قوت سے پکڑ رکھا تھا، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ لحظہ بہ لحظہ اس کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پانچ منٹ کے قلیل عرصے میں آہنی دروازہ صرف تین انچ کے قریب جھک سکا تھا۔ دفعتہً میں نے اپنے بازو پر ایک تھرتھراہٹ سی محسوس کی۔ ایسلیا کی انگلیوں کی گرفت نرم پڑ رہی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ سپید پڑ گئے تھے۔ وہ یک ٹک چپکائے بیز مشین کے ایک جانب گھور رہی تھی۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا، تو دہشت سے میری رگوں کا خون جم گیا۔ خدا کی پناہ ...... وہی منحوس کالی بلی کمرے کے دروازے میں کھڑی مشین کی جانب دیکھ کر غرا رہی تھی۔ اس کی زرد آنکھیں مشعل کی مانند روشن تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا تھا اور وہ اپنی معمولی جسامت سے دوگنی نظر آتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنا خون آلود جبڑا کھول کر آگے بڑھی۔ ہوچین نے بھی اس کی آواز سن لی تھی، وہ دہشت سے چلایا۔

"کرنل، ذرا اس شریر بلی کو دھتکار کر نکال دو۔"

لیکن آہ ...... اس سے پیشتر کہ میں آگے بڑھتا، بلی نے اپنی لمبی دم کو گردش دی اور بجلی کی مانند اچھل کر بوڑھے چوکیدار پر حملہ کیا۔ بلی کا دایاں پنجہ چوکیدار کی آنکھ پر پڑا اور آنکھ باہر آ گئی۔ بوڑھے کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی، وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور موٹا رسّا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے رسّے کو پکڑنے کے لیے چھلانگ لگائی، میری انگلیوں نے اسے چھو لیا، مگر اگلے ہی ثانیے میں رسّا کڑے میں سے گزر چکا تھا۔ بدنصیب ہوچین کے چہرے کی آخری جھلک میں مرتے دم تک نہ بھولوں گا۔ موت کے خوف سے اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ چکا تھا اور آنکھیں تارہ بن گئی تھیں۔ آہنی دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ ہوچین کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی اور اسی لمحے میری بیوی غش کھا کر دھڑام سے فرش پر گر گئی۔

میں نے ایسلیا کو وہاں سے اٹھایا اور کمرے سے باہر برآمدے میں لے جا کر ایک بنچ پر ڈال دیا۔ اس وقت میرے ہوش و حواس بھی گم تھے۔ امریکی نوجوان کی بھیانک موت کا تصور خود میرے لیے جان لیوا تھا۔ جب میں کمرے میں گیا، تو بوڑھا چوکیدار تکلیف کی شدت سے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے خون میں تر ہو چکے تھے۔ میں نے رسّا پکڑ کر پوری قوت سے مشین کا آہنی دروازہ اٹھایا۔ ہوچین کا حال دیکھ کر میری روح لرز گئی۔ لوہے کی سلاخیں اس کی کھوپڑی، سینے اور پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل گئی تھیں۔ دروازہ اوپر اٹھتے ہی ہوچین کا مردہ اور مسخ شدہ جسم پُرشور آواز کے ساتھ کمرے کے فرش پر گرا اور وہ منحوس بلی جو ابھی تک وجود تھی، اس کی جانب لپکی اور ہوچین کے جسم سے نکلے ہوئے خون کو بڑی رغبت سے چاٹنے لگی۔ میں نے جھپٹ کر وہاں رکھی ہوئی بہت سی تلواروں میں سے ایک تلوار اٹھائی اور بلی کے دو ٹکڑے کر دیے۔

تقرری سے پہلے ہو سکتا ہے کہ کوئی فساد برپا ہو جائے۔"

ارشد خاں نے قدرے جرأت سے کام لے کر کہا کہ "کون کہتا ہے امیر خاں مر گیا ہے، وہ تو زندہ ہے" بادشاہ نے سوانح نگار کا حوالہ دیا تو ارشد خاں نے کہا "دراصل اس صوبہ کا نظم و نسق تو صاحب جی کی ذات سے ہے جب تک وہ وہاں ہے جہاں پناہ کو تردد کی چنداں ضرورت نہیں ـــــ" بادشاہ نے فوراً حکم صادر کیا کہ شاہزادہ شاہ عالم (بہادر شاہ) کابل کی صوبہ داری کے لیے روانہ ہو اور صاحب جی کو تاکید کی کہ عنانِ حکومت ذرا بھی ڈھیلی نہ ہونے پائے۔

شاہ عالم کی تقرری تو فوراً ہو گئی لیکن تعمیل میں دو سال لگ گئے۔ اس عرصے میں صاحب جی ہی کی ذات تھی جس نے ہوشیاری دیانتداری اور کمال تدبر سے افغانستان پر حکومت کی اور عالمگیر کا اعتماد ہاتھ سے نہ جانے دیا افغانستان کی صوبہ داری کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ ہر وقت بغاوت اور سرکشی کا احتمال تھا۔ غیور، بہادر اور بے باک افغانوں کے نرغے میں رہ کر صاحب جی نے کبھی دھمکی اور کبھی عاجزی سے کام لے کر امن و امان برقرار رکھا۔

امیر خاں کی موت دارالخلافہ سے سیکڑوں میل دور اس وقت ہوئی تھی جب وہ دورہ پر تھا۔ اگر اس وقت اس کی موت کی خبر پھیل جاتی تو بغاوت کا خطرہ تھا لیکن صاحب جی نے سہاگ لٹ جانے کے باوجود ہوش و حواس درست رکھے۔ اور محض حسن لیاقت سے شاہی فوج کو جو قلیل تعداد میں تھی دشوار گزار اور بیہڑ راستوں سے گزار کر کابل لے آئی۔ اس مدت میں اپنے شدید جذبات کو دبا کر، دکھے دل کو قابو میں رکھ کر اس نے نہ تو سوگ منایا اور نہ ہی اپنے خاوند کی موت کو ظاہر ہونے دیا گنے چنے خاص اشخاص خدمت گاروں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا سردار انھیں کب کا چھوڑ چکا ہے۔ اگر اس وقت صاحب جی نے دور اندیشی تدبر اور جذبات پر مکمل قابو رکھنے کا ثبوت نہ دیا ہوتا تو اہل جرگہ آن کی آن میں مغل حکومت ختم کر دیتے۔

شوہر کی موت کی خبر چھپانے کا فیصلہ کرنے کے بعد اس کے سامنے ایک مسئلہ یہ تھا کہ فوجیوں کو اس کی بھنک تک نہ ملنے پائے۔ ایک ایسے دور میں جہاں ہر بات کا انحصار حاکم وقت کی زندگی پر ہو اور جہاں بادشاہ کے چند روز درشن نہ دینے سے طرح طرح کی افواہیں پھیل جاتی ہوں اس خبر کا چھپانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن یہاں بھی صاحب جی نے نہایت تدبر کا ثبوت دیا۔ اور ایک شخص کو جس کی شکل و صورت امیر خاں سے بے حد ملتی تھی اس نے شیشہ کی پالکی میں بٹھایا اور منزل بہ منزل طے کرتی گئی، ہر روز فوج کے عہدیدار اور رعایا کے سربراہ آتے اور پالکی کے آگے مجرا بجا لاتے۔ یہ کامیاب سفر ہی صاحب جی کے تدبر اور حسن انتظامی کی دلیل ہے۔

کابل پہونچ کر اس نے امیر خاں کی موت کا اعلان کیا اور سیاہ پوش ہو لی۔ امیر خاں کی موت کی خبر سنتے ہی قبائل تعزیت کے لیے آنے لگے۔ یہاں بھی صاحب جی نے موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس نے اہل جرگہ کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور ان کے سرداروں سے وعدہ کیا کہ ہر ایک سے وہی سلوک روا رکھا جائے گا جو امیر خاں کے زمانے میں رکھا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کسی علاقہ میں نظم و نسق ڈھیلا ہوا اور لاقانونیت پھیلی تو سختی سے اس کا سدباب کیا جائے گا۔

دیوان خاص کے در و بام آج بھی صاحب جی کی تقریر کے گواہ ہیں۔

"ہمیں گوئے است و ہمیں میداں ـــ ـــ اہل جرگہ چاہیں تو مجھ عورت کا امتحان بھی لے سکتے ہیں۔ اگر میں غالب آئی تو قیامت تک میرا نام تاریخ میں روشن رہے گا۔ ـــــ اور فتنہ پرور سیہ رو ہوں گے کہ ایک عورت کے مدمقابل ہوئے اور ہار گئے۔"

اس کے خطاب کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور سبھی افغان سرداروں نے اطاعت کی قسمیں کھائیں اور آخر وقت تک اپنے وعدے کے پابند رہے۔

جس کمال خوبی اور کامیابی سے صاحب جی نے افغانوں پر حکومت کی وہ کسی بھی دوسرے مغل صوبہ دار کو نصیب نہ ہوئی یہ اس کی سمجھ داری ہمت اور بیدار مغزی کی دوسری دلیل ہے۔

صاحب جی کی حاضر دماغی اور خطرناک حالات میں بھی ہوش و حواس قائم رکھنے کی صلاحیت کا اندازہ اس کی جوانی کے حسب ذیل واقعہ



پاکستان میں شائع ہونے والے ادب کا انتخاب

قیوم راہی

غیر معمولی بات

یخ بستہ سناٹے میں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ہر شے منجمد ہو گئی ہو۔
ٹھٹھری ہوئی اس کہر آلود صبح کو مجھے دفتر پہنچنے میں دس منٹ کی تاخیر ہو گئی۔ یہ کوئی نئی یا تعجب خیز بات نہ تھی اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔
تعجب انگیز بات تو یہ تھی کہ میرا ساتھی مسٹر شریف احمد بالے ابھی تک غیر حاضر تھا۔

وہ اس دفتر میں مجھ سے کئی سال قبل کا ملازم ہے۔ عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ نام کی موزونیت کے لحاظ سے انتہائی شریف اور پرخلوص انسان ہے۔ دفتری کام میں اس کو بڑی مہارت ہے۔ وقت کا سختی سے پابند ہے۔ غرض کہ بڑا ہی دیانت دار اور با اصول ہے۔ مگر جہاں سے ملازمت شروع کی تھی وہاں سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا۔ کئی محکموں میں بہتر تنخواہ والی اسامیوں کے لیے درخواستیں دیں لیکن کامیابی حاصل نہ ہو سکی آدمی ویسے ہوشیار ہے جلد ہی اپنی ناکامی کی وجہ سے کی سمجھ میں آ گئی تو خاموش ہو رہا۔

ویسے وہ ہے بھی کم گو۔ لیکن یوریت کی حد تک نہیں۔ البتہ ہنسی مذاق میں ذرا کم حصہ لیتا ہے۔ ہم لوگ آپس میں دو دو تین تین روپے جمع کر کے کبھی کبھار پکنک کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ اس میں بھی شریک نہیں ہوتا کبھی طبیعت کی خرابی کو بہانہ بنا لیتا ہے۔ تو کبھی کسی اشد ضروری کام کی آڑ لے لیتا ہے۔

ابھی چند ہی روز کی بات ہے ہم لوگوں نے طے کیا کہ دفتر کے سب ساتھی اکٹھے پکچر دیکھیں گے چنانچہ اس سے بھی کہا گیا۔ سب کے اصرار پر وہ راضی تو ہو گیا لیکن وعدے کے مطابق شام کو نہیں پہنچا —— بڑی کوفت ہوئی۔ دوسرے دن سوکھا سا منہ بنا کر کہنے لگا۔

"بھئی معاف کرنا بچے کو اچانک شدید بخار ہو گیا تھا۔"

بات ختم ہو گئی۔
کچھ عجیب ہی طبیعت پائی ہے۔

مجھے اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے بھی کوئی دو ڈھائی سال کا عرصہ ہوا ہو گا۔ اس دوران میں مجھے یاد نہیں پڑتا وہ کبھی دیر سے دفتر آیا ہو۔ رخصت لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ذرا طبیعت خراب ہونے پر بھی دفتر آ جاتا ہے۔ پتہ نہیں اتوار کس طرح گزرتا ہو گا۔

بہرکیف مجھے جب معلوم ہوا کہ حضرت بیمار ہیں اور آج کی رخصت کی درخواست آئی ہے تو تعجب کی جگہ تشویش نے لے لی۔ حالت یقیناً کچھ زیادہ ہی خراب ہوگی۔ خدا خیر کرے۔

سہ پہر کو دفتر سے فارغ ہو کر میں سیدھا اس کے گھر گیا۔ مطلع ابھی تک ابر آلود تھا اور سنسناتی ہواؤں میں برف گھلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سخت سردی کے باعث دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ فوراً گھر جا کر آرام سے لحاف میں لیٹ جائے۔ مگر اس کی مزاج پرسی بھی بہت

سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ چند خدمت گاروں کے ساتھ چوڈول (پالکی) میں سوار ایک گلی سے گزر رہی تھی کہ سامنے سے بادشاہ کے خاصے سے متعلق سراندیپ (لنکا) کا مست ہاتھی آتا ہوا دکھائی دیا۔ صاحب جی کے خدمت گاروں نے ہر چند روکنے کی کوشش کی مگر مہاوت نے جو عام طور سے شریر ہوتے ہیں اور پھر بادشاہ کے خاصے کا مہاوت جو ظاہر ہے کہ مغرور تھا ہاتھی کو مطلق نہ روکا۔ اور دندناتا ہوا سر پر آ پہونچا۔ صاحب جی کے ہم رکاب محافظین نے تیر برسانا شروع کر دیئے مگر بے سود۔ ہاتھی نے چاہا کہ سونڈ سے چوڈول کو پکڑ کر پرزے پرزے کر ڈالے۔ کہار پالکی کو زمین پر رکھ کر کب کے بھاگ چکے تھے۔ ایسی حالت میں بھی مگر صاحب جی کے اوسان خطا نہ ہوئے۔ اور وہ فینس سے کود کر سامنے کی صراف کی دکان میں چڑھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ شاہجہانی دور کی ایک مسلم بیگم کے لیے اتنی پھرتی کسی معجزے سے کم نہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں خواتین بالکل ملفوف ہو کر چلا کرتی تھیں اس کے علاوہ کپڑوں اور زیورات کا بار ان کی رفتار کو اور بھی کم کر دیتا تھا۔

صاحب جی نے اپنی جان تو بچالی۔ مگر پردے کی قیمت پر جو اس زمانے میں ایک شریف خاتون کے لیے ناقابل معافی جرم تھا۔ چنانچہ امیر خاں بھی اپنی بیگم کی غیر معمولی جسارت پر بے حد بگڑا اور صاحب جی کو سخت سست کہنے کے بعد اس نے علاحدگی اختیار کر لی۔ ہوتے ہوتے بات اعلیٰ حضرت کے کانوں تک پہونچی۔ شاہجہاں نے امیر خاں کو طلب کر کے سرزنش کی اور کہا۔ "اس نے تو مردوں کا سا کام کیا۔ اپنی سترپوشش کے ساتھ ہی تمہارے ناموس کا بھی خیال رکھا۔ خدانخواستہ اگر ہاتھی کے لپیٹ میں آجاتی تو پھر تمہاری آبرو کدھر رہتی ———" بات امیر خاں کی سمجھ میں آگئی اور اس نے صاحب جی سے مصالحت کر لی۔

امیر خاں کی صاحب جی کے بطن سے کوئی اولاد نہ تھی اور اس کے خوف سے اس نے دوسرا نکاح بھی نہ کیا تھا پھر بھی ایک مدخولا کر لی تھی جس سے کئی اولادیں ہوئیں۔ صاحب جی کو جب اس بات کا علم ہوا تو امید کے بالکل خلاف وہ بالکل خفا نہ ہوئی اور اس نے اپنے سوتیلے بچوں کو بڑی شفقت اور ممتا سے پالا۔ ظاہر ہے کہ مردمیدان صاحب جی اپنے اندر کی عورت کو مار نہ سکی۔ اورنگ زیب نے صاحب جی کی دیرینہ خدمت کو سراہتے ہوئے اس کے لڑکوں کو ملازمتیں دیں۔

شہزادہ شاہ عالم کو کابل کی گورنری کا چارج دینے کے بعد وہ برہان پور آئی اور بادشاہ سے حج بیت اللہ کے لیے رخصت مانگی اور پھر بندرگاہ سورت سے بذریعہ جہاز مکہ معظمہ روانہ ہوئی وہاں پہونچ کر اس نے شریف مکہ اور اہل مکہ کو ایک بڑی رقم نذر کی اور بقیہ عمر یادِ الٰہی میں گذار دی۔

وہ پھر کسی خیال میں گم ہو گیا۔ شاید سوچ رہا ہوگا اب کیا بات کی جائے۔ میں خود اس بے تکی گفتگو اور خاموشی سے بور ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد آخر میں نے ہی سلسلہ کلام شروع کیا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے۔؟"

"کچھ بھی نہیں ——" وہ چونک سا گیا۔"

"کوئی بات تو ضرور ہے —— آپ چھپا رہے ہیں۔"

"نہیں یار ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

اس بار میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

مجھے چپ دیکھ کر خود بخود ہی بول اٹھا۔

"بات دراصل یہ ہے یار..... وہ ......" اس نے مسکرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

"وہ کیا؟"

"کوٹ۔"

میری نظروں کے سامنے ایک دم اس کا کشمیرے کا میلا پرانا کوٹ آ گیا جس کا کثرت استعمال کے سبب رواں تک اتر چکا تھا۔

"چوری ہو گیا؟" میں ہنسا۔

"نہیں یار!" وہ مسکرا دیا۔

"پھر؟"

ایک لمحے کے لیے اس نے کچھ سوچا۔

"کل دفتر سے واپسی پر ڈرائی کلیننگ DRY CLEANING کے لیے دے آیا تھا —— آج شام کا وعدہ ہے۔"

"تو پھر؟"

"پھر کیا —— میرا خیال تھا آج سوئٹر پہن کر دفتر چلا جاؤں گا، لیکن صبح سے ٹھنڈ ہی غضب کی ہو رہی ہے۔ بس یہ بات تھی۔"

" واہ بھئی۔" میں ایک دم ہنس پڑا۔ " یہ بھی خوب لطیفہ رہا۔"

وہ چپ چاپ بیٹھا رہا، گویا اس کا ذہن خالی ہو، اور وہ کوئی بات نہ کرنا چاہتا ہو۔ کمرے میں اب مکمل خاموشی تھی۔ جیسے طوفان گزر جانے کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔

(افکار۔ کراچی)

ضروری تھی۔

دروازے پر دستک دی تو اس کا چھوٹا لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔ میں نے پہلے اس کی طبیعت کے بارے میں ہی دریافت کیا۔

"ان کی طبیعت ——— ؟" لڑکا سوچنے کے سے انداز میں مخاطب ہوا۔

"ہاں، آج دفتر جو نہیں گئے تھے۔"

"ان کی طبیعت ——— ان کی طبیعت تو ——— ٹھیک ہی ہے۔"

"تو پھر آج دفتر کیوں نہیں گئے؟"

"معلوم نہیں ——— بلا کر لاتا ہوں۔"

میں اور الجھن میں پڑ گیا۔

چند ہی منٹ بعد شریف کمبل اوڑھے میرے سامنے موجود تھا۔ کمبل میں کئی جگہ بڑے بڑے سوراخ تھے اور اب روئیں اتر جانے کے باعث ٹاٹ کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"میں کمرہ کھولتا ہوں ——— اندر آجائیے۔"

سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جسے بوقت ضرورت وہ بطور بیٹھک استعمال کر لیتا ہے۔ میرا خیال ہے اگر اسے کوٹھری کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

میں اندر داخل ہوا تو اس نے ٹھنڈی ہوا کو روکنے کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

پلنگ پر بیٹھ کر میں نے سگریٹ کے لگاتار کئی کش لگائے اور آدھا جلا ٹکڑا ایک کونے میں پھینک دیا۔

"آج آپ کی چھٹی کی وجہ سے تشویش سی ہو گئی تھی ——— سوچا معلوم ہی کرتا چلوں، طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں ——— بالکل ٹھیک ہے۔"

"اچھا۔" میں نے تعجب کا اظہار کیا۔

"ہاں۔"

میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ جیسے مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

"پھر تو یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہوگی ——— ورنہ آپ اور چھٹی!؟" میں مسکرایا۔

"نہیں یار یہ بات نہیں ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔

ہوا کا ایک تند جھونکا زور سے آیا۔ اور بند کواڑوں کو بری طرح جھنجھوڑ کر آگے نکل گیا۔ میرے سارے جسم میں ٹھنڈی لہر دوڑ گئی۔

میں نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ اور چپ چاپ کش لگاتا رہا۔

چند منٹ تک وہ نہ جانے کیا سوچتا رہا۔

"کل تو موسم بڑا خوشگوار تھا، آج صبح سے اچانک ہی ٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔" اس نے بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔

"ہاں، یوں لگتا ہے، جیسے کولڈ ویو آ گئی ہو۔!" مجھے بھی جواب دینا پڑا۔

"میرا خیال بھی یہی ہے، ضرور کہیں اولے پڑے ہیں۔"

گاڑی آگے نہ چل سکی۔

کتاب، لکھنؤ

تبصرے

ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

نظم جدید کی کروٹیں

از ـــــ وزیر آغا

صفحات ۲۴۰، قیمت ڈھائی روپیہ

ملنے کا پتہ :- ادارہ ادبی دنیا۔ لاہور

"نظم جدید کی کروٹیں" ڈاکٹر وزیر آغا کے ۱۲ مضامین کا مجموعہ ہے جس کے ابتدائی دو مضامین "نظم اور اس کا پس منظر" اور "اردو نظم ـــــ ایک جائزہ" ۔ جیسا کہ ان کے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے نظم کے تاریخی پس منظر اور ارتقاء سے متعلق ہیں دو مضامین محمد حسین آزاد اور اقبال پر ہیں اور باقی آٹھ مضامین میں سے سات جدید نظم کے سات ممتاز شاعروں۔ راشد، میراجی، فیض، مجید امجد، یوسف ظفر، قیوم نظر اور اختر الایمان، اور ایک مضمون راجہ مہدی علی خاں پر ہے۔

کتاب کے اہم مضامین در اصل وہی ہیں جو جدید نظم کے سات ممتاز شاعروں سے متعلق ہیں۔ وزیر آغا صاحب جدید نظم سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور یہ مضامین ان شاعروں کے کلام کے تفصیلی مطالعہ و تجزیہ کے بعد لکھے ہیں اس لیے ان میں ان کا تنقیدی شعور بڑی شدت کے ساتھ اجاگر ہوا ہے اور ان کے مطالعے سے ان شاعروں اور جدید نظم کے خاص خاص رجحانات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان شاعروں پر اس سے قبل بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے وسیع مطالعہ اور جدید ادبی تحریکوں سے گہری واقفیت کی بنا پر جس انداز سے ان کے کلام پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے یہاں پائے جانے والے رجحانات کی جس عالمانہ انداز میں وضاحت کی ہے اس کی دوسری مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔

انھوں نے ان مضامین میں مختلف شاعروں کے افکار و خیالات کو پرکھنے کی جو کسوٹی استعمال کی ہے وہ بھی بڑی حد تک نئی ہے۔ انھوں نے ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد پہلے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کس شاعر کے کلام میں نمایاں ترین رجحان کیا ہے اس کے بعد اس رجحان کو موضوع بنا کر علاحدہ علاحدہ شاعروں پر مضامین قلمبند کئے ہیں اور جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اسے کہیں شاعر کے ماحول کے تذکرے سے، کہیں اس کی نجی زندگی کے واقعات سے اور کہیں اس کی نظموں کے اقتباسات سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ طریقہ تنقید کہاں تک مستحسن ہے اس بحث میں پڑے بغیر بھی ان دشواریوں کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے جو کسی شاعر کے سلسلے میں ناقد کے خود کو کسی مخصوص رجحان تک محدود کر لینے سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ خود ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی احساس ہے ان شاعروں کے یہاں دوسرے رجحانات بھی ملتے ہیں اور جس طرح انھوں نے ہر شاعر کا ایک مخصوص رجحان کا ترجمان ثابت کیا ہے اسی طرح اسی شاعر کو کسی دوسرے رجحان کا ترجمان بھی ثابت کیا جا سکتا ہے اور ثبوت کے طور پر تین تین چار چار مصرعوں کے کم از کم اتنے اقتباسات تو پیش ہی کئے جا سکتے ہیں جتنے ڈاکٹر صاحب نے پیش کئے ہیں۔ لیکن وزیر آغا صاحب کے موثر انداز تحریر نے ان کے دلائل کو اتنا وزنی بنا دیا ہے کہ مختلف شاعروں کے رجحانات کے سلسلے میں ان کے فیصلے قطعی اور آخری معلوم ہونے لگتے ہیں، اور اس

عارفؔ عبدالمتین

جُز مہر و وفا دامنِ دل میں نہیں کچھ بھی ، تجھے معلوم تو ہوگا
لیکن ترے الطاف کے قابل مرے ساتھی ، دلِ محروم تو ہوگا

بالا ہیں ترے فہم سے باتوں کے خم و پیچ ، مجھے تسلیم ہے لیکن
واضح ترے احساس پہ اے جانِ معانی ، مرا مفہوم تو ہوگا

مل جائے گی ہر طور تجھے منزلِ عشرت ، تری ہمت کے تصدق
غم ابرِ گریزاں ہے مرے ڈھلتے راہی ، کبھی معدوم تو ہوگا!

اے بادِ حوادث تری رفتار ہے مدھم ، اسے کچھ اور فزوں کر
محکوم تو کیا ہوگا ترا یہ دلِ وحشی ، ترا مظلوم تو ہوگا!

کس طرح چھپائے گا مجھے اتنا بتا دے ، تجھے ادراک نہیں ہے،
غمّاز ترے غم کی اگر آنکھ نہ ہوگی ، رُخِ مغموم تو ہوگا!

بخشی ہے تجھے جس نے یہ پاکیزہ نگاہی ، دمِ عیسیٰ کی حرارت
عارفؔ پسِ پردہ رُخِ مریم کی گواہی ، کوئی معصوم تو ہوگا

(ادبی دنیا۔ لاہور)

سرورؔ بارہ بنکوی



آؤ دیکھو آ کے ان اشعار میں اپنا جمال
شاید اپنے حسن کے عالم سے بیگانہ ہو تم

تم وہ نغمہ ہو کہ جس کی لے پہ ہو رقصاں
زندگی مخمور ہو جس سے وہ پیمانہ ہو

تم مجسّم رنگ و نکہت ہو سراپا شعر ہو
ایک دلکش راگ ہو، رنگین افسانہ ہو تم

تم وہ دیوی ہو کہ جس کے روبرو سجدہ
بتکدے کی جان ہو، روحِ صنم خانہ ہو

یہ تمہارے عارض و کاکل کی رنگیں دھوپ چھاؤں
تم گلستاں کی سحر ہو، شامِ میخانہ ہو تم

اک تمہارے دم سے ہو رنگیں جہانِ بے
زیست افسانہ سہی، عنوانِ افسانہ ہو

کوئی ایسا ہو کہ تم پہ جان و دل بھی وار دے
شمع ہو لیکن ابھی محروم پروانہ ہو تم

(افکار۔ کراچی)

ان دونوں ادیبوں اور اہم شخصیتوں سے انٹرویو رسائل اخبار میں بار بار شایع ہوتے رہتے ہیں لیکن زیر نظر ملاقاتیں ان سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ملاقاتیں مقابلتاً طویل ہیں اور اکثر کئی کئی نشستوں میں مکمل ہوئی ہیں دوسرے یہ کہ ان میں زندگی کے گوناگوں مسائل کا احاطہ کیا گیا ہو اور کسی ہنگامی موضوع یا مسئلہ تک بات چیت کو محدود نہیں رکھا گیا ہے۔ ان ملاقاتوں میں بعض جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قریشی صاحب نے پہلے سے سوالات متعین کرنے کے باوجود بات چیت کو اپنی راہ متعین کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے جس نے ان ملاقاتوں کو ایک طرح کی ندرت اور والہانہ پن بخش دیا ہو۔

ان ملاقاتوں میں سیاست، ادب، معاشرت، اقتصادیات، ذہانت، مذہب غرض ساری زندگی کا احاطہ کیا گیا ہو مختلف شخصیتوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ضروری نہیں کہ ان سے اتفاق کیا جائے۔ ہاں ان سے غور و فکر کی نئی راہیں ضرور پھوٹتی ہیں اور بہت سے مسائل اپنے صحیح منظر میں سامنے آجاتے ہیں۔

چونکہ یہ ساری ملاقاتیں ایک ہی شخص نے کی ہیں اسلیے ان میں ایک طرح کی ترتیب اور توازن کے باوجود کہیں کہیں یکسانیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ایک ہی طرح کے سوالات، اور جوابات پر کم و بیش ایک ہی طرح کا ردعمل۔ ان ملاقاتوں میں ابھر کر سامنے آنے والی شخصیت قریشی صاحب ہی کی بنتی ہو اور مجموعی طور پر ان کے خیالات کا نقش ہی قاری پر سب سے زیادہ مرتسم ہوتا ہے۔ قریشی صاحب نے جوابات پر اپنے ردعمل کو اس قدر واضح شکل دیدی ہے کہ قاری کو خود کسی نتیجہ پر پہونچنے کا موقع نہیں ملتا اور وہ خود سے نتیجہ اخذ کرنے کی خوشی سے محروم رہ جاتا ہو۔ کچھ قاری اتنا ذہین ہو کہ قدم قدم پر اس کی انگلی پکڑ کر رہنمائی کی ضرورت نہیں۔

کتابت اغلاط سے پاک اور نہایت عمدہ ہو۔ سرورق دیدہ زیب اور کتاب خوبصورت جلد سے مزین ہو۔

عابد سہیل

پیام تعلیم

ایڈیٹر۔ محمد حسین خاں ندوی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر دہلی ۲۵۔ سالانہ چندہ پانچ روپیہ۔

پیام تعلیم کا زندہ ہونا ایک روایت کا زندہ ہونا ہے۔ بچوں کا یہ رسالہ اس وقت نکلا تھا جب آج کے بڑے بھی بچے تھے اور جنھوں نے اس کی روشنی سے اپنی شمع روشن کی اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو محسوس کیا۔

۱۹۲۲ء سے جامعہ کی تحریک کے ساتھ ساتھ یہ رسالہ آگے بڑھا۔ اس وقت جامعہ ملیہ اور پیام تعلیم دونوں کی حیثیت ادارے سے زیادہ تحریک کی ہے۔ ۱۹۴۷ء کی گڑبڑ میں ۲ سال کے وقفہ کے بعد مسلسل ۱۹۶۵ء تک نکلتا رہا۔ اب ۹ سال بعد ارباب مکتبہ جامعہ نے ایک مرتبہ پھر اس بچوں کے رسالہ کو جو غالباً اردو میں بچوں کا پہلا وسیع رسالہ تھا، نکالنے کا فیصلہ کیا ہو۔

پہلا شمارہ امید افزا ہو، اس لیے کہ پیام تعلیم نے اپنی ہی روایت کو زندہ کیا ہے۔ پیسہ کمانے کے لیے بچوں کے جو رسالے نکالے گئے ہیں ان کی چمک دمک سے متاثر نہیں ہوا۔ پیام تعلیم کے بند ہونے کے بعد سے اب تک ہندستان اور اردو میں بچوں کے لیے متعدد رسالے جاری ہوتے رہے اور ہیں لیکن ان رسالوں میں سے کسی نے بچوں کے ذہن کی تعمیر کی طرف توجہ نہیں دی ہاں بچے کے ذہن میں نامعلوم کی کھوج سے فائدہ اٹھا کر ۔۔۔ کمایا ہے۔

پیام تعلیم نے بچوں کی تفریح کے ساتھ ان کے معصوم ذہنوں کو تعمیری رخ پر ڈالنے کی روایت قائم کی تھی، بعد کے رسالوں نے اس روایت کو ختم کردیا۔ اب ایک مرتبہ پھر پیام تعلیم کے اجراء سے اور خصوصاً اس خیال سے کہ اس کے اڈیٹر حسین خاں صاحب ندوی ہیں جنھوں نے ایک مدت تک اپنے پہلے دور میں رسالہ کی ادارت کے فرائض انجام دیے ہیں، یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ جدید ہندستان میں بچوں کے لیے اردو میں ایک صالح اور تعمیری رسالہ جاری ہوسکے گا۔

عثمان غنی

موصولات ۔ آدھی کتاب، م نسیم۔ رقص طاؤس، صفدر حسین۔ شعلہ و سنگ، کوثر چاند پوری۔ ورق ناخواندہ
کلک موج۔ سلومی، عبدالعزیز خالد۔ پنڈت جواہر لال نہرو ضیا عظیم آبادی

یہ منظور ہے کہ چونکہ راشد، میراجی، فیض، یوسف ظفر، قیوم نظر اور اختر الایمان وغیرہ تقریباً ایک ہی زمانے کے شاعر ہیں
لیے ماضی کے سیاسی اور سماجی مسائل اور حال کی الجھنوں کی علاحدہ علاحدہ وضاحت اور ماضی و حال کے ان مسائل اور الجھنوں کی ان سے
پہلے کے یا ان کے زمانے ہی کے دوسرے شاعروں کے کلام میں عکاسی و ترجمانی کے تذکرے میں کہیں کہیں تکرار کی کیفیت پیدا ہو گئی
اور نظیر اکبر آبادی، مولانا حالی، اقبال اور جوش ملیح آبادی وغیرہ کا بار بار ذکر کرنا پڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے اس صورت حال
بچنے کا ایک طریقہ شاید یہ ہو سکتا تھا کہ شروع کے دونوں مضامین یعنی "نظم اور اس کا پس منظر" اور "اردو نظم — ایک جائزہ"
زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھ دیتے اور باقی مضامین وہ اسی طرح شروع کرتے جس طرح یوسف ظفر والا مضمون شروع کیا ہے۔
محنت سے لکھی ہوئی ہر اچھی کتاب کی طرح اس کتاب میں بھی جن خیالات کا اظہار کیا گیا وہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں
اور بحث و مباحثہ کے دروازے کھولتے ہیں اور بعض جگہوں پر اختلاف رائے کی کافی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس مضمون
کے سلسلے میں جو فیض احمد فیض سے متعلق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے فیض کے ساتھ کچھ زیادتی کی ہے۔ دراصل انھوں نے فیض
کے معاملے میں خود اپنے اصول تنقید سے انحراف کیا ہے۔ راشد، میراجی، یوسف ظفر، قیوم نظر اور اختر الایمان وغیرہ کے سلسلے میں انھوں
نے جیسا کہ اوپر تذکرہ آچکا ہے ایک ایک رجحان تلاش کر کے اس کی وضاحت کی ہے اور اسی بنا پر ان کو منفرد اور ممتاز قرار دیا ہے لیکن
فیض کے یہاں جو عام رجحان پایا جاتا ہے اسے انھوں نے "ابجاد کی مثال" قرار دے کر ان پر نکتہ چینی کی ہے۔ رجحان کی موجود
دوسرے شعرا کے لیے قابل تعریف ٹھہرتی ہے تو فیض کے لیے آخر جرم کیوں قرار دی جائے؟
فیض ہی کی طرح مجاز کے سلسلے میں بھی ڈاکٹر صاحب کا رویہ ذرا زیادہ سخت ہو گیا ہے۔ کیونکہ مجاز کا نام انھوں نے کتاب میں
زیادہ تر ایسی جگہوں پر لیا ہے جہاں کسی کمزوری یا خرابی کی وضاحت مقصود تھی۔ کہیں کہیں کسی شاعر کی اہمیت بڑھانے کے لیے مجاز کی شاعری
کا ذکر کیا ہے یا کسی دوسرے شاعر کی اہمیت گھٹانے کے سلسلے میں بعض انتہا پسندانہ باتیں بھی ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکل گئی ہیں مثلاً
"جس دلیرانہ انداز سے راشد نے انگریزی حکومت کے خلاف لب کشائی کی ہے اور اپنے انتقامی جذبات کو بغیر کسی جھجک
کے پیش کیا ہے کسی اور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے راشد اردو کا ایک بہت بڑا قوم پرست شاعر ہے کہ اس نے اپنے
جذبات کے اظہار میں کسی قسم کی عافیت کوشی یا حسن تدبر کو سد راہ نہیں ہونے دیا۔"
یا پھر میراجی پر مضمون شروع کرتے ہوئے نظیر اکبر آبادی کے متعلق لکھتے ہیں۔
"نظیر اکبر آبادی کے ہاں ملکی تہواروں بالخصوص ہولی، دیوالی، بسنت وغیرہ کے ہنگاموں سے تحصیل مسرت کا رجحان بڑا واضح ہے.....
تاہم نظیر کی یہ وابستگی ایک بڑی حد تک سطحی ہے۔"
ڈاکٹر وزیر آغا خود بھی اچھے شاعر ہیں اور انھوں نے اس کتاب میں کہیں کہیں نثر میں شاعری بھی کی ہے جس کی سب سے خوبصورت مثال
مجید امجد والا مضمون ہے جنھیں انھوں نے ان کے ہم عصروں کے درمیان سے اٹھا کر غالب اور اقبال کے پاس بٹھا دیا
ہے۔ ان چند باتوں سے قطع نظر اس میں شک نہیں کہ جدید شاعروں پر وزیر آغا صاحب کے یہ مضامین جدید نظم کو سمجھنے سمجھانے
کی بڑی کامیاب کوشش ہیں۔
(منظر سلیم)

ملاقاتیں

مصنف: الطاف حسن قریشی
ناشر: اردو ڈائجسٹ پبلی کیشنز لاہور
صفحات ۲۰۱ قیمت ۵ روپے

زیر تبصرہ کتاب ان ملاقاتوں کی روئداد پر مشتمل ہے جو اردو ڈائجسٹ کے مدیر الطاف حسن صاحب نے پاکستان کی
۱۹ سربرآوردہ شخصیتوں سے کی تھیں۔ ان میں صاحب الرائے مذہبی رہنما، ادیب، ماہرین قانون، ماہر اقتصادیات، صف اول کے مدیر
اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق لوگوں کے خیالات پیش کیے گئے ہیں۔

تلخ ... ترش ... شیریں

نئے ادیبوں کے لیے مشعل راہ

"کتاب" کا "نئی ہندی کہانی نمبر" ملا۔ آپ نے بڑی اچھی اچھی چیزیں جمع کر دی ہیں۔ اگر طباعت و کتابت و کاغذ میں ذرا زیادہ اہتمام سے کام لیا گیا ہوتا اور مترجموں نے زبان بھی ٹھیک دی ہوتی تو یہ نمبر اردو افسانہ نویسی کے لیے ایک مرصع چیلنج کی شکل ضرور اختیار کر لیتا۔ امید ہے کہ آپ "بنگلہ کہانی نمبر" کو زیادہ دیدہ زیب بھی بنا سکیں گے۔

ٹھاکر پرساد صاحب نے جو موجودہ اردو ہندی کہانیوں کے مقابلے کے سلسلے میں یہ فرمایا ہے کہ "آدمی آدمی کے آپس کے رشتوں کو لے کر جس سطح پر ہندی کہانی سوچ بچار کر رہی ہے میرے خیال میں ابھی اردو کہانی کی نظر اس طرف نہیں گئی ہے" یہ بات میری رائے میں درست نہیں ہے۔ تقسیم ہند کے پہلے ہی اردو کہانی اس دور سے گزر چکی ہے۔ پریم چند، سدرشن، اعظم کریوی، بلونت سنگھ، اختر اورینوی اور نہ جانے کتنے اردو افسانہ نویسوں کے ہاں آپ کو "آدمی آدمی کے آپس کے رشتوں" پر بڑی گہری روشنی ڈالنے والی کہانیاں مل جائیں گی ــــ خود میں نے بھی اس موضوع پر پانچ سات کہانیاں ضرور لکھی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نفسیات کا علم جس قدر آگے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے لکھنے والوں کے لیے نئے نئے پہلو پیدا ہوتے جاتے ہیں اور ان کی باریک بین نظریں تحت الشعور میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی تلاش کر لیتی ہیں اور وہ انھیں بڑے سلیقہ سے اجاگر کر کے پیش کر دیتے ہیں۔

مجھے ان کہانیوں میں پریم چند ہی نہ دکھائی دیئے بلکہ ٹیگور کی بھی جھلک نظر آئی اور سرت چندر چٹرجی کی بھی۔ اور کہیں کہیں چیخوف موپاساں اور لارنس کے چہرے بھی ان میں سے جھانکے ــــ بہرحال مجموعی حیثیت سے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ کتاب کا یہ "ہندی کہانی نمبر" اس کے "اردو کہانی نمبر" سے کہیں زیادہ بہتر وزنی اور وقیع ہے اور نئے لکھنے والوں کے لیے یقینی مشعل راہ بنے گا۔

مجھے خاص طور سے "میرے اور ننگی عورت کے بیچ" بہت پسند آیا۔ نہ جانے کتنے نیک کام ہم محض اسلیئے نہیں کر پاتے کہ ہم ڈرتے ہیں دیکھنے اور سننے والے اس میں نہ جانے کیا کیا معنی پہنائیں گے۔ اکثر ہماری انسانی ہمدردی، بھلائی، اخوت و مساوات کا جذبہ دوسروں کی رائے کے ڈر کے نیچے دب کر رہ جاتا ہے۔ ہم نیکی کرنے کے لیے بھی "نکو" بننا نہیں چاہتے۔ رگھو ویر سہائے نے اسی طرح کے ایک جذبہ ہمدردی و انسانیت کو دبانے والے خطرات کا بڑی خوبی سے تجزیہ پیش کیا ہے۔ میں آپ کی وساطت سے شری رگھو ویر سہائے کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

"میز پر ٹکی کہنیاں" بھی اچھی کہانی ہے لیکن آجکل کے افسانہ نمبر میں اس موضوع سے ملتی جلتی کہانی جو رام لعل صاحب نے دکھ ایک فرد سے دوسرے فرد میں منتقل ہونے سے متعلق لکھی ہے، وہ اس سے زیادہ مکمل اور بہتر ہے۔ ایک پروفیسر کی ٹکی کہنیوں اور کلائیوں اس کی گالوں سے بہتے ہوئے آنسو مستقل لکیریں بناتے جاتے ہیں، محض اس لیے کہ اس کا موڈ ٹھیک نہیں، کوئی معقول وجہ نہ ہوئی اگر ابتدا یہ توجیہ ٹھیک ہو جاتی تو یہ کہانی بڑی بیش قیمت بن جاتی۔ پھر بھی اچھی ہے اور بہت اچھی ہے۔ اس لیے کہ ایک نیا نفسیاتی موضوع ہے۔ اس کے لکھنے والے بھی قابل مبارکباد ہیں۔

ایک بات اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر ستیا شانی کی "تیسرے پہر کی دھوپ" اس انتخاب میں نہ شامل کی گئی ہوتی تو بہت بہتر ہوتا۔ انسانی زندگی کے ہر گندے پہلو کا بیان کرنا کوئی بہت بڑی فنکاری اور ہنرمندی نہیں۔ ایسے گندے پہلوؤں کو خاموشی سے ترک کر دینا ہی بہتر ہے تاکہ وہ خود اپنی موت مر جائیں۔ ان گندگیوں کو [illegible]

سے درخواست نہیں کرسکتا۔ یہ بزرگ اپنا کام پورا کر چکے ہیں اور ان دنوں دوسرے کاموں میں وہ اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ نئے لکھنے والوں کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکتے لیکن ڈاکٹر محمد حسن، وزیر آغا، محمود ہاشمی، گوپی چند نارنگ، محمد حنیف فوق، سہیل بخاری، سید عبداللہ وغیرہ سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ تنقید کے نئے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ ورنہ تنقید کے فقدان سے جو ادبی سطح پر بے راہ روی پیدا ہو رہی ہے اس کے کسی حد تک وہ بھی ذمہ دار ہوں گے۔

رام لعل

بچکانہ زبان

جون کا شمارہ جسے میں بہترین نمبر کہہ سکتا ہوں اور جولائی کا نئی ہندی کہانی نمبر دونوں بہت شاندار ہیں۔ اردو میں دوسری زبانوں کے تراجم کا انتخاب پیش کرنا اچھی بات ہو لیکن ہندی جیسی بچکانہ زبان کا انتخاب ...ی حلقوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔ میں یہ بات تنگ نظری کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اردو جیسی ...تی یافتہ زبان جتنا معیاری ادب پیش کر چکی ہے یا ہمارے بزرگ اور نوجوان جو کچھ اب لکھ رہے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندی ...ہانیاں زمین چومیں گی۔

ناز مصطفےٰ آبادی۔ رام پور

...ابل قدر

صبح سے جب سے آپ کی رجسٹری موصول ہوئی ہے سخت حیرانی میں مبتلا ہوں، ہندی کہانی نمبر نکال کر آپ نے واقعی بڑی قابل قدر صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں مقابلہ مقصود نہیں ہے مگر کتاب کی وہ انفرادیت جو آپ نے قائم ...ہے اس میں اس شمارے کو سرفہرست جگہ ملنا چاہیے۔

قیصر تمکین۔ دہلی

...ہندی کہانی نمبر

زیر نظر نمبر دیکھ کر طبیعت بے حد خوش ہو گئی۔ آپ نے یہ نمبر شائع کر کے مجھ جیسے آدمیوں پر احسان کیا ہے، جو ہندی کہانی کی رفتار اور روش سے نابلد ہیں۔ تیسری قسم، گلاس ٹینک، سوال اور جواب، پرندے، تیسرے پہر کی دھوپ جیسی کہانیاں عرصے سے پڑھنے کو نہیں ملی تھیں۔ ...نئی نئی ہندی کہانی بہت آگے بڑھی ہے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کتاب کے ہر شمارے میں ایک ہندی کہانی شائع کیا کریں؟

پشکر ناتھ۔ جموں

...یارا سرورق

ہندی کہانی نمبر پیش کر کے آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔ ہندی اور اردو والوں کو ایک دوسرے کی رگ جاں کے قریب ہونا چاہیئے۔ ہندی کے کسی رسالے کو آپ کی تتبع میں اردو والوں کو ہندی پڑھنے والوں سے روشناس کرانے کے لیے بھی اقدام کرنا چاہیئے میں تو آپ سے یہاں تک عرض کروں گا کہ ہر سال یا ہر دو سال میں ہندی کی منتخب کہانیوں کا ایک نمبر آپ ...نے پڑھنے والوں کو دیں۔ اس نمبر میں لکھنے والوں کے حالات زندگی مختصراً ہوتے تو اور اچھا ہوتا۔ سرورق بہت پیارا ہے اور یقیناً آپ نے ...رے اہم اور نئے نام جمع کئے ہوں گے۔ ذرا پڑھ لوں۔

اقبال متین حیدر آباد

...ثر سرورق

ہندی نمبر آپ نے خوب نکالا ہے۔ اس کا سرورق کتنا موثر ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ اردو میں کہے گئے نہرو کے جتنے مرثیے میری نظر سے گزرے ہیں، یہ ان سے کہیں زیادہ اثر انگیز ہے اور اپنے اندر بلا کی گہرائی و گیرائی رکھتا ہے۔ ...ور کی کاوش قابل ستائش ہے۔ میری جانب سے مبارک باد کہیے گا۔

راج نرائن راز

تلخ، تند، شیریں ——— کے صفحات آپ کے مشوروں کے لیے حاضر ہیں۔

گزارش ہے کہ اگر آپ کبھی اس "نئی ہندی کہانی نمبر" کا دوسرا ایڈیشن شائع کریں یا اسے مجموعے کی صورت میں طبع فرمائیں تو یہ کہانی ضرور نکال دی جائے — علی عباس حسینی

زبردست خدمت، قابل قدر ارادے

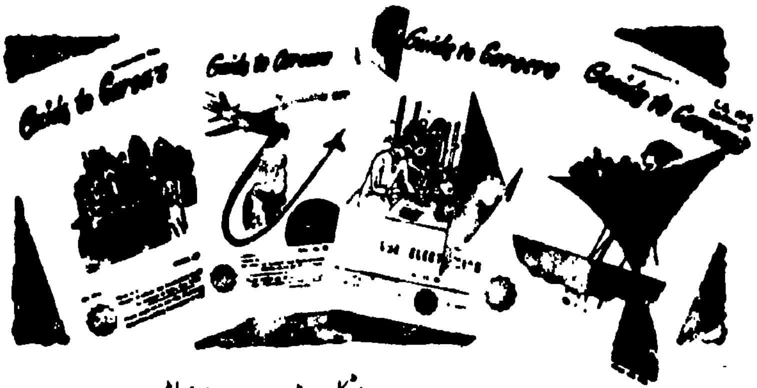
نئی ہندی کہانی نمبر! یہ نمبر کتاب کی ادبی خدمت اور کامیابیوں میں ایک زبردست اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک اردو داں طبقے کے نزدیک یشپال، امرت لال ناگر، بھگوتی چرن ورما اور الاچند جوشی جیسے چند نام ہی اہمیت رکھتے تھے جو ہندی ادیب جانے مانے ہیں لیکن کتاب کا یہ نمبر کہ نیشور رینو، موہن راکیش، اوشا پریم ودا، ٹھاکر پرساد سنگھ، کملیشور، نرل ورما، رگھویر سہائے، اور ان تمام دوسرے نئے لکھنے والوں کو بھی اردو دنیا سے روشناس کرائے گا جن کی کہانیاں اس خاص نمبر میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اہم نام ہیں جن کے کندھوں پر ہندی کہانی کا ایک نیا قصر تعمیر ہو رہا ہے۔ اور ان کو بھی متعارف کرانے کی ذمہ داری "کتاب" ہی کو اٹھانی ہوگی۔ کیونکہ ہندو پاک میں اردو کا دوسرا ایک بھی ایسا رسالہ نہیں ہے جو ہندی کہانی کی ترقی کو اردو کے لیے قابل رشک سمجھتا ہو۔ زیادہ تر رسالے یا انگریزی، روسی، امریکی یا فرانسیسی کہانیوں کے ترجمے چھاپنے کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ آپ نے کتاب کے لیے جو اگلا قدم بنگلا کہانیوں کے انتخاب کا اٹھایا ہے وہ بھی قابل قدر ہے۔ اس سے ہماری صوبائی اور علاقائی زبانوں کے کئی چھپے ہوئے خزانے سامنے آجائیں گے۔

زیر نظر نمبر میں رینو کی کہانی تیسری قسم اور ٹھاکر پرساد سنگھ کی کھوٹا سکہ قدر اول کی تخلیقات ہیں۔ مواد، فن، ہیئت، بیان ہر لحاظ سے۔ ٹھاکر پرساد سنگھ کے مضمون سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کہانی رومانویت اور زوال کے بھنور میں پھنس کر رہ گئی ہے اور ہندی کہانی اب آگے نکل گئی ہے اگر ایسا ہے بھی تو ہم اردو کے ادیب اس سے مستفید ہو سکتے ہیں اور اپنے اندر ایک "جذبہ رشک" پیدا کر کے اردو کہانی کو آگے لے جانے کی کوشش بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اردو کی صورت حال اتنی مایوس کن ہرگز نہیں ہے۔ ہندی داں طبقے کے سامنے اردو کے صرف چند پرانے افسانہ نگاروں کی تخلیقات ہی بار بار آتی رہتی ہیں جو افسانہ کے نئے رجحان کی نمائندگی ہرگز نہیں کرتے۔ کرشن، بیدی، عباس عصمت وغیرہ ہمارے ممتاز ترین افسانہ نگار سہی لیکن افسانہ نگاری انہی پر تو ختم نہیں۔ جس طرح ہندی میں کہانی کے میدان میں نئے نام آئے ہیں اسی طرح اردو میں بھی قاضی عبدالستار، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، کے علاوہ کئی اور نام ابھرے ہیں۔ اسی شور و شغب کے دور میں صرف وہی آواز سنی جا سکتی ہے جو سب سے اونچی ہو یا وہی نام جانا پہچانا بن سکتا ہے جو زیادہ جلی حروف میں لکھوا کر دیواروں پر لگا دیا جائے۔ میرا خیال ہے ہندی داں طبقے کے سامنے اگر انتظار حسین، اشفاق احمد، قیصر تمکین، شوکت صدیقی، ممتاز شیریں، انور عظیم، امر سنگھ، صادق حسین، رضیہ فصیح احمد، انور خواجہ، عابد سہیل، جوگندر پال، سریندر پرکاش، ستیش بترا، یونس رمزی، حمید کاشمیری، غلام الثقلین نقوی، ٹھاکر پونچھی، رتن سنگھ، قمرالدین کمار ورما، الطاف فاطمہ، مسیح الحسن رضوی، شبیر پردیپ، پی سی منظر، فہمیدہ اختر، جمیلہ ہاشمی، مدن مراری لال، سید قاسم محمود، ہرچرن چاولہ، اقبال متین، عوض سعید، رفعت نواز، آمنہ ابوالحسن، محمد عمر میمن، غیاث احمد گدی، اعظم راہی اور الیاس احمد گدی، کی اچھی تخلیقات رکھی جائیں تو وہ یقیناً چونک پڑیں گے۔ کسی زبان کی ترقی کا اندازہ صرف ان چند ناموں سے نہیں لگایا جا سکتا جو ترجمے کے ذریعے بار بار سامنے آجاتے ہیں۔ ترجمے کے وسائل کی کمی نے تو پورے ہندوستانی ادب کو عالمی سطح پر جانے سے روک رکھا ہے۔ اور اسی وجہ سے انگریزی والے آر کے نارائن، راج آنند، اور خشونت سنگھ وغیرہ ہی کو ہندوستانی ادب کا نمائندہ سمجھ کر کبھی تعریف کرتے ہیں کبھی تضحیک۔ جبکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ جب بھی ان ادیبوں کی تخلیقات ہندوستان کی کسی زبان میں ترجمہ کی جاتی ہیں تو وہ معمولی درجہ کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

عابد سہیل نے اپنے مضمون "ربیل تذکرہ" میں ایک سے زائد مسائل کو چھیڑ دیا ہے۔ نئی زندگی کے تقاضے، مطالبات، اور مسائل یقینی طور پر بدل چکے ہیں ان سے متعلق جتنی تخلیقات آئی ہیں ان کو ابھی تک پرانے تنقیدی معیاروں سے ہی پرکھا جا رہا ہے۔ یہ ہمارے ادب کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ تنقید نے "تخلیق" کا مکمل طور پر ساتھ نہیں دیا ہے۔ اب تک تو تنقید نے کسی منزل پر بھی تخلیقی ہونے کا ثبوت نہیں دیا اور تذکروں اور تبصروں سے ہی کام چلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے میں اب سید احتشام حسین، آل احمد سرور، سجاد ظہیر، وقار عظیم یا عبادت بریلوی

کون سا پیشہ آپ کے لئے موزوں ہوگا؟

صحیح انتخاب کے لئے یہ کتابچے پڑھیئے



دی بارٹیکلچرسٹ
دی زولوجسٹ
دی آٹوموبائل انجینئر
دی آرکی ٹیکٹ
دی میرین انجینئر
دی الیکٹریشن
دی وائرمین
دی [illegible]
دی [illegible]
دی [illegible]
دی ویلڈر
دی مشین گرائنڈر
دی ٹرنر

دی مولڈر
دی پیٹرن میکر
دی ایگزیلری نرس
دی سینیٹری انسپکٹر
دی ٹیچر (پرائمری اسکول)
دی لائبریرین
دی ٹیچر (بیسک ایجوکیشن)
دی گرام سیوکا
دی پنچایت سیکریٹری
دی ریسرچ ورکر
دی ایئرہوسٹس
دی کمرشل آرٹسٹ
کیریئرز ان کیمونٹی پروجیکٹس
.......اور [illegible] [illegible]

ہندی اور انگریزی میں یہ کتابچے ایمپلائمنٹ ایکسچینج اور سرکاری کتب فروشوں سے مل سکتے ہیں



ڈائریکٹوریٹ جنرل آف ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ
بھارت سرکار

davp 04/173

اہم اعلان

شوکت تھانوی نمبر (قیمت ایک روپیہ۔ مرتبہ احمد جمال پاشا) کی صرف چند جلدیں دفتر میں باقی رہ گئی ہیں۔ اور یہ نمبر کے بعد شائقین کی فرمائش صرف کتاب کی سالانہ خریداری قبول کرنے کی صورت میں کی جائے گی۔ اس نمبر میں شوکت تھانوی کا ایک غیر مطبوعہ ڈرامہ اور متعدد یادگار تصویریں شامل ہیں

افسانہ نمبر (۱۹۶۲ء کے بہترین افسانے مرتبہ رام لعل، عابد سہیل) معمولی کاغذ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے کی صرف ۵۰ کاپیاں دفتر میں باقی رہ گئی ہیں ان کے ختم ہونے پر سفید کاغذ پر شائع شدہ افسانہ نمبر دستیاب ہو سکے گا جس کی قیمت ۲ روپیے ہے۔ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل یہ نمبر اردو افسانوی ادب میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہندی کہانی نمبر اگر آپ ہندی افسانوی ادب کی ترقی کی رفتار سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے اس نمبر کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۱۱۲ صفحات کے اس نمبر میں ۲۱ نئی ہندی کہانیوں کے علاوہ عابد سہیل اور ستاکر پانڈے کے تین فکر انگیز مضامین بھی شامل ہیں۔ جولائی سے سالانہ خریداری قبول کر کے یہ نمبر مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

منیجر ماہنامہ کتاب، جواہر لعل نہرو روڈ، لکھنؤ نمبر ۳



خیال

بیس سالہ ایلس دے پلانس جن
کے حسن نے اس
مجسمہ میں بقائے دوام پایا

حقیقت

بحری فوج کے ایک
افسر
کے عقیدت کے پھول

قتل

یہ جل پری کا قتل نہیں آج کے
انسان کی اپنی
عقل سے محرومی کا ثبوت ہے۔

معنون کے اندر کے صفحات میں ملاحظہ فرمائیے

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 6986/62
THE 'KITAB' MONTHLY,
ember, 1964 LUCKNOW-3 Reg. No. L-1781

جلد (۳) نمبر (۱۰)

زرِ سالانہ مع دو خاص نمبر
۶ روپے
پاکستان میں
۶½ روپے
قیمت
۵۰ نئے پیسے

ایڈیٹر
سید جمیل احمد

مجلسِ مشاورت
حیات اللہ انصاری
سید احتشام حسین
عابد سہیل

پرنٹر و پبلشر:- سید جمیل احمد
مطبوعہ:- نظامی پریس لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: کتاب، چوک لکھنؤ ۳

پاکستان آفس
معرفت نعیم اکبر خان، الائیڈ فوٹو گرافرس
(پاکستان لمیٹڈ)
۶/۵ - موتی جھیل، کمرشل ایریا ڈھاکہ

ماہنامہ

کتاب لکھنؤ

اکتوبر ۱۹۶۴ء

- ۶ افسانے
- ۱۴ منظومات
- ۲ مضمون
- نئی کتابوں پر تبصرہ
- تاریخ و تمدن
- سب رنگ
- پاکستانی ادب کا انتخاب
- طنز و مزاح

اور

- ادبی مسائل پر فکر انگیز خطوط

اس شمارے میں

آل احمد سرور، رتن سنگھ، کوثر چاند پوری، شہاب شمسی
بشیر بدر، ساغر مہدی، مظفر حنفی، رام لعل، عثمان غنی
فارغ بخاری، نعمان امام، سحر اوجینی وغیرہ

ماہنامہ

کتاب لکھنؤ



ماہنامہ [illegible] لکھنؤ

اس جانب ہم متعدد مواقع پر اپنے پڑھنے والوں کو متوجہ کر چکے ہیں اور آج پھر ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ خود اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ کیا انھوں نے اپنی زبان سے اس محبت کا عملی ثبوت دیا ہے جو انھیں اس بات کا اخلاقی حق دیتی ہو کہ وہ حکومت اور دوسرے اداروں سے مطالبات پورے کرنے پر اصرار کر سکیں۔

ہم نے پچھلے شمارہ میں کتاب کے مسائل پہلی بار آپ کے سامنے پیش کیے تھے۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ بیشتر پڑھنے والوں کے خیال میں یہ رسالہ ایک اہم ادبی ضرورت پوری کر رہا ہے۔ رسالہ کو بہتر بنانے کے لیے متعدد حضرات نے تجویزیں بھی بھیجی ہیں جن پر غور کیا جا رہا ہے۔ چند دوستوں نے کتاب کی توسیع اشاعت کیلئے بھی کچھ اقدامات بھی کئے اور توسیع اشاعت کے سلسلے میں باقاعدہ ایک مہم چلانے کی تجویز بھی رکھی۔ خریداری مہم کے سلسلے میں ہم اپنے باقی پڑھنے والوں کو بھی اپنی تجاویز بھیجنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ۱۵ نومبر تک وصول ہونے والی تجویزوں پر باقاعدہ غور و خوض کے بعد ایک پلان بنایا جائے گا۔ آپ اپنی تجویزوں سے ہمیں مطلع فرمائیے۔

جل پری کا قتل:- کوپن ہاگن میں جل پری کا ایک مجسمہ جو پچاس سال سے گردن کے ایک خفیف سے خم کے ساتھ جلوہ گر تھا ۶ مہینہ قبل اس وقت اپنے سر سے محروم ہو گیا جب کسی "پاگل" نے رات میں اسے آری سے کاٹ کر گردن سے جدا کر دیا۔ — اس خوبصورت لڑکی کے قتل سے جس کی شاید دنیا میں سب سے زیادہ تصویریں کھینچی گئی ہیں ساری دنیا میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پولیس اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس کے قاتل کا پتہ لگانے میں تو ناکام رہی لیکن چونکہ اس مجسمہ کا سانچہ موجود تھا اس لیے اس کا سر دوبارہ ڈھال کر لگا دیا گیا اور پچھلے مہینہ سے وہ پھر اسی چٹان پر اسی ادائے دلنوازی کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی۔ اس بار ہم اس مجسمہ کے بارے میں ایک نہایت دلچسپ مضمون چھاپ رہے ہیں — پچھلے مہینہ کا سرورق بھی پسند کیا گیا اور دوسرے صفحہ پر حسن شہیر کی تصویریں بھی۔ ان تصویروں کی گہری معنویت کے پیش نظر ہم نے ان کے بارے میں خود کچھ نہ لکھا تھا۔ ہمارے پڑھنے والوں نے ان دونوں تصویروں کو کافی سراہا ہے اور فن مصوری پر مضامین اور تصویروں کی اشاعت کی ستائش بھی کی ہے۔

علی عباس حسینی نمبر:- علی عباس حسینی صاحب نے ستمبر کے مہینہ میں اپنی ادبی زندگی کے چالیس سال مکمل کیے ہیں۔ اس موقعہ پر ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ادارہ نے کتاب کے نومبر کے شمارہ میں اضافہ کر کے اسے علی عباس حسینی نمبر کی شکل میں شایع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نمبر میں جس کی قیمت صرف ۵۰ پیسے ہوگی حسینی صاحب کا تازہ ترین افسانہ، ان کا پہلا افسانہ، ان کے افسانوں کا انتخاب، حسینی صاحب سے ایک بہت دلچسپ اور خاصہ طویل انٹرویو، ان کی اپنی پسندیدہ کہانی اور ان کی زندگی اور فن پر مشاہیر کے مضامین شایع ہوں گے۔

سالانہ خریدار بن کر یہ نمبر مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ صرف علی عباس حسینی نمبر حاصل کرنے کے خواہشمند لوگ ۸۰ پیسوں کے ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر یہ نمبر حاصل کر سکتے ہیں۔

"کتاب" کے پاکستانی خریدار:- کسی بھی مقامی بنک کو یہ درخواست دیں کہ وہ "کتاب" لکھنؤ کے سالانہ خریدار بننا چاہتے ہیں۔ اس لیے "کتاب" کی سالانہ قیمت مبلغ چھ روپے آٹھ آنے کے عوض بھیجنے ڈرافٹ دیا جائے۔ اس درخواست پر ڈرافٹ مل جائے گا جسے آپ بذریعہ رجسٹری "کتاب" لکھنؤ کے نام بھیج دیں۔ رجسٹری لفافہ ملتے ہی رسالہ آپ کے نام جاری ہو جائے گا۔ پوسٹل آرڈر نہ بھیجیں۔ کیونکہ پوسٹل آرڈر ضبط کر لیے جاتے ہیں۔ یا پھر زر سالانہ حسب ذیل پتہ پر روانہ کر دیجئے اور ڈاک خانہ کی رسید ہمیں بھیج دیجئے۔ رسید ملتے ہی رسالہ آپ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔

مسٹر نعیم اکبر خاں - الائڈ فوٹوگرافرس (پاکستان لمیٹڈ) ۵/۲ موتی جھیل کمرشیل ایریا

ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

اپنی باتیں

اردو کا مستقبل آج اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا نہیں ہے جیسا آج سے چودہ پندرہ سال قبل تھا۔ جب اردو کے پرجوش حامی بھی ہندستان میں اس کے مستقبل سے مایوس نظر آتے تھے۔ اس دوران انجمن ترقی اردو (ہند) نے اردو کے حقوق منوانے کے لیے جس طرح جدوجہد کی ہے، کئی لڑائیاں جیتی ہیں، کئی محاذوں پر قدم آگے بڑھایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ یہ انجمن کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج اردو کی مخالفت کی شدت پہلے سے کہیں کم ہو گئی ہے اور لوگ کھلے دل سے کم سے کم اس کے بارے میں بات سننے کو تیار ہیں، ورنہ اس زبان پر تو ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب اس کے حق میں آواز اٹھانا اور غداری ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔ انجمن اپنی ان کوششوں اور کامیابیوں کے لیے مبارک باد کی مستحق ہے اور ادارہ کتاب انجمن کو ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہے۔

کل ہند اردو کانفرنس (رجے پور) میں پنڈت آنند نرائن ملا کا خطبۂ صدارت ایک ایسا اعلان حق ہے جس پر خود اردو والوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔

ملا صاحب نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ میرے جیسے لا مذہبی آدمی کے لیے زبان مذہب سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ "میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ زبان میری ذات کا آئینہ ہے، میری میراث، میری تاریخ ہے، اور میری زندگی ہے۔" یہ ایک اعلان ہے جو ہمارے دلوں کی حرارت اور زبان سے ہماری محبت کا آئینہ دار ہے لیکن اس سے بھی اہم ان کا یہ قول ہے۔

"اندھیرے کا ماتم کرنے سے کہیں زیادہ مفید یہ ہے کہ گھر میں چراغ جلائے جائیں ——— اگر اردو مٹتی ہے تو حکومت کا جبر یا عوام کا تعصب ہی خالص اس کے اسباب نہ ہوں گے بلکہ آپ کے خون جگر کی کمی سب سے بڑی وجہ ہوگی۔"

عثمان غنی

جل پری کا قتل

بڑی پرانی کہانی ہے جل پری کی۔ پرانے زمانے میں جب بادبانی جہازوں اور پتوار والی کشتیوں میں سمندری سفر ہوا کرتے تھے ملاحوں کی داستانوں میں اس کہانی کا آغاز ہوا۔ اور پھر کہانی کاروں اور قصہ گویوں نے اس کہانی کو زندگی دوام بخش دی۔

ایسی ہی ایک کہانی ڈنمارک کی راجدھانی کوپن ہاگن کی بندرگاہ کے سامنے ایک ہائٹن وزنی چٹان پر بیٹھی ہوئی اس جل پری کی بھی ہو جو ۵۰ برس سے اپنے شہزادے کا انتظار کر رہی ہے۔

ان ۵۰ برسوں میں نہ صرف کوپن ہاگن بلکہ دنیا کے کتنے ہی افراد اس جل پری کے عشق میں مبتلا ہوئے اور اس کے المناک قتل پر جان سے گزر گئے۔

سو برس ادھر کا قصہ ہے کہ اسی کوپن ہاگن شہر میں فسانہ و فسون کی دنیا میں رہنے والے ایک شاعر ہانس کرسچین اینڈرسن نے ایک جل پری کی کہانی لکھی جو بہت دور سمندر کی گہرائیوں میں جہاں پانی نیل سے زیادہ نیلا ہے سمندر کے شہنشاہ کے محل میں رہتی تھی۔ ایک دن جب وہ سمندر کی سطح پر سیر و تماشا میں مصروف تھی کہ ایک ڈوبتے ہوئے جہاز سے سمندر میں گر پڑنے والے ایک زمینی شہزادے کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔ شہزادے کی جان بچائی اور اس کو زمین پر پہونچا دیا لیکن جب واپس سمندر کی گہرائیوں میں گئی تو شہزادے کے عشق کا درد اپنے دل میں لے گئی۔ اور آخرکار عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ایک بار پھر زمین پر آنے اور اپنے محبوب کو تلاش کرنے کے لیے رخت سفر باندھا۔ جب وہ زمین پر پہونچی تو اسے محبوب ملا تو لیکن اس نے بے وفائی کی اور ایک شہزادی سے شادی کر لی۔ جل پری کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے مایوسی اور نامرادی کے عالم میں سمندر میں چھلانگ لگا دی اور "جھاگ اور ہوا میں غائب ہو گئی"۔ لیکن ایک بار پھر یہ جل پری ایک روح کی شکل میں سطح پر نمودار ہوئی اور آج تک ٹوٹے ہوئے دلوں پر مرہم رکھتی آئی ہے۔

ہانس کرسچین اینڈرسن کی یہ کہانی سنہ ۱۹۰۹ء میں کوپن ہاگن میں "جل پری کا رقص" نام کے بیلے کا موضوع بنی جس میں جل پری ایک نوجوان لڑکی ایلین پرائس ڈی پلانس تھی۔ ایک رات ایک سنکی دولت مند کارل جیکبسن نے اس کا رقص دیکھا اور اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ڈنمارک کے ایک مجسمہ ساز ایڈورڈ ارکسن سے جل پری کا ایک مجسمہ بنوا دیا جس کی ماڈل یہی نوجوان رقاصہ ایلین پرائس ڈی پلانس تھی۔

اگست ۱۹۱۳ء میں وہ ایک تاریخی دن تھا جب کہا جاتا ہے کہ یہ جل پری کوپن ہاگن کی بندرگاہ کے سامنے ہائٹن وزنی ایک چٹان پر اپنی گردن کے حسین خم کے ساتھ یوں جلوہ گر ہوئی جیسے سوز و گداز اس کے دھات کے جسم میں اسی طرح جاگزیں ہو جس طرح ہانس

آلِ احمد سُرور



غمِ جاناں غمِ دوراں کے ہیں کتنے نشتر
لیکن اب بھی مرے سینے میں لہو باقی ہے

قیدِ گیسو کے سوا اور ہیں قیدیں کیا کیا
سرکشی کی ترے عُشّاق میں خو باقی ہے

جن کا تھا مجھ کو جنوں یہ وہ بہاریں تو نہیں
میری پلکوں میں ابھی اور لہو باقی ہے

آج شعلوں کی لپک ہو نہ شراروں کا وہ رقص
خاک میں میری مگر ذوقِ نمو باقی ہے

تلخیٔ زیست کے باوصف یہ کہتا ہے سرور
شکر میں مستیٔ صد جام و سُبو باقی ہے

کوثر چاندپوری

چور راستے

اختری سیاہ کپڑے پہنے، رونی صورت بنائے صحن میں کھڑی سوچ رہی تھی،

فیکٹری اور تنخواہ دونوں بند ہیں، اور کل نویں محرم ہے، نیاز کیونکر دی جاسکے گی؟

یہی دو تین باتیں اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں، سوالات کا یہ چکر دھیرے دھیرے اتنا تیز ہوگیا کہ اختری کا سر بھی چکرانے لگا وہ زمین پر بیٹھ گئی، نگاہوں کے سامنے آگ کا دائرہ گھومے جارہا تھا، اس کے ساتھ پورا ماحول گردش کررہا تھا، خود وہ بھی اور اس کا شوہر بھی،

اس کا شوہر فدا حسین رضوی بجلی کے کارخانہ میں نوکر تھا جہاں بڑی بڑی مشینیں بنا کرتی تھیں، دو ہفتہ سے ورکروں نے ہڑتال کررکھی تھی، کچھ لوگوں کو مشتبہ قرار دے کر مزدوروں کو بھکانے کے الزام میں پہلے ہی معطل کردیا گیا تھا، فدا حسین بھی ان میں شامل تھا اور اصل انھیں لوگوں کی ہمدردی میں ہڑتال کردی گئی تھی، مانگیں اور بھی تھیں، فدا حسین کو چند روز کے لیے حراست میں بھی رکھا گیا تھا اور اب اس کا معاملہ مینیجمنٹ کے زیر غور تھا۔ دو مہینے سے تنخواہ نہیں ملی تھی، فدا حسین نہ ملازم تھا نہ بیکار، بس یوں ہی بیچ ادھر میں تھا، اس بیچ میں ورکروں پر کافی سختیاں ہوئی تھیں بدمعاشوں نے افسروں کی شہ پاکر گھروں کا سامان تک لوٹ لیا تھا، کچھ لوگ زخمی ہوکر اسپتال میں داخل ہوچکے تھے، دو تین گھنٹے تک اختری کا یہی عالم رہا، آگ کا دائرہ گھومتا رہا، اور سر چکراتا رہا، وہ بڑی کشمکش میں تھی نہ فدا حسین سے کچھ کہہ سکتی تھی، نہ اس موقعہ پر چپ رہ سکتی تھی، جانتی تھی، بہتے ہوئے لمحات کو پکڑ کر ایک جگہ ٹھہرایا نہیں جا سکتا، وقت گزر گیا تو سال بھر تک انتظار کرنا پڑے گا، پچھلے سال بھی نیاز نہیں دی جاسکی تھی، اختری کی ماں بیمار ہوگئی تھی اور وہ اسے دیکھنے وطن چلی گئی تھی، فدا حسین اسے ساتھ لے کر ٹھیک ۸ محرم کی شام کو ریل میں بیٹھا تھا، حالات ایسے تھے کہ دیر نہیں کی جاسکتی تھی، نیاز کا دن ریل میں بالکل خالی گزر گیا تھا۔

اس سال نیاز ہونی ہی چاہیئے!

یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

مگر ـــــ مگر اس نے پھر ایک بات سوچی نیاز سے پہلے کھانے کا مسئلہ بھی تو ہے، امام حسین اپنے ساتھیوں سمیت اس تاریخ پیاس سے تڑپ رہے تھے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ آج بھوک کی آگ میں جل رہی تھی۔ اور یہ ساری مصیبت اس کے خیال میں اسی وجہ سے آئی تھی کہ پچھلے برس کچھ نہ کیا جاسکا تھا، اور اس سال؟ ..... اس سال ضرور ..... اسی وقت فدا حسین رضوی ایک مینگ

[illegible] کا اظہار

[illegible] والوں نے بوسے لیے، شاعروں نے ہار پھول چڑھائے، اور ملاحوں نے عقیدت مندانہ عقیدت پیش کی لیکن عام لوگ بس [illegible] دیکھتے اور اس کے حسن کی تعریف کرتے۔ عنفوانِ شباب کی منزلوں سے گزرنے والوں نے اپنے دل کی گرائیوں کے ہیجان کو اس [illegible] سے لپٹ لپٹ کر تسکین بھی بخشا ہے۔ کبھی سردی زیادہ پڑتی ہے تو کسی عاشق نے اس کو فرکا کوٹ بھی پہنا دیا تو کبھی [illegible] نے کبھی اس کی معصوم عریانی کو سفید رنگ کا کبھی لباس عمل پہنا کر جنسیت بخشنے کی کوشش بھی کی ہے۔

یہ ساری معاملہ بندیاں اور راز و نیاز دو نسلوں سے جاری تھا کہ اچانک اپریل ۱۹۶۴ء کی رات میں جب چاند کی تیز روشنی تھی کسی پاگل نے آری سے جل پری کا سر کاٹ لیا۔ صبح ہوئی تو ڈنمارک ملکہ دنیا کو ایک دھچکا سا لگا، محبوب کا قتل۔ تمام عاشق پاگل ہو گئے۔ ڈنمارک کی پولیس نے بھی اس معاملہ کو "قتل" ہی گردانا اور قتل کی تحقیقات کرنے والے دستے کو تفتیش پر مقرر کیا۔ ہر قسم کے ماہرین آئے۔ کسی نے انگلیوں کے نشانات تلاش کیے، کسی نے کتوں کے ذریعہ پتہ لگانے کی کوشش کی لیکن ساری کوششیں بے کار ہو گئیں۔

اس جل پری کے عاشقوں نے مختلف ملکوں سے اخباروں میں احتجاجی خطوط لکھے۔ اخباروں نے اداریے لکھے مضامین شائع ہوئے غرض دنیا میں ایک کہرام ہو گیا۔ لیکن وہ سر جس نے نہ جانے کتنے دلوں کو تسکین بخشی تھی نہ ملا اور ایک اخبار نے اپنے اداریے میں لکھا "سر کٹی جل پری ایک ایسی دنیا کی علامت ہو جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہو۔"

پھر جل پری کو بے جان سے اس جگہ سے اکھاڑا گیا اور مجسمے ڈھالنے کے شاہی کارخانے میں لے جایا گیا۔ وہاں اتفاق سے پہلا سانچہ موجود تھا جس سے جل پری کا اصل سر ڈھالا گیا اور جس شخص نے پہلا سر ڈھالا تھا اسی کے پوتے پول راسموسین نے جل پری کے لیے ایک نیا سر تیار کیا اور اس کو کٹی ہوئی گردن پر جوڑ دیا۔

۶ ہفتوں بعد ایک مرتبہ پھر جل پری گردن کے اسی غم انگیز خم کے ساتھ اپنی پرانی جگہ پر آ گئی۔ ایک مرتبہ پھر عاشقوں میں دھوم ہو۔ نیا سر پرانے کے مقابلے میں کچھ زندہ ہے، پرانا سر اور جسم سمندری ہواؤں سے کچھ سبزی مائل تھا لیکن نیا سر کوپن ہیگن کے میئر کے بیان کے بموجب زیادہ مضبوط ہے۔

جل پری کی حقیقت واقعات کی دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ یہ داستان ملاحوں کی کہانیوں سے شروع ہوئی جن کا دعویٰ ہو کہ انھوں نے سطح سمندر پر جل پریوں کو بہ بسر و تماشا دیکھا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک سمندری دودھ پلانے والا جانور ہوتا ہے جس کی نسل ہاتھی سے ملتی جلتی ہے۔ یہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتا ہے اور دنیا میں کم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ جانور بحر ہند میں پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک اور جانور بحر اٹلانٹک میں پایا جاتا ہے یہ دونوں جانور اپنے بچوں کو دودھ پلاتے ہیں اور ان کے پیروں کی جگہ مچھلی کی سی دم ہوتی ہے۔ اور ہاتھوں کی جگہ ۲ پر ہوتے ہیں جن سے یہ نہ صرف تیرتے بلکہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتے وقت سینے سے لگانے کا کام بھی لیتے ہیں۔ جب یہ جانور اپنے بچوں کو سینے سے لگائے سمندر کی سطح پر تیرتے دکھائی دیتے ہیں تو جل پری لگتے ہیں اور انسان کے تصور نے ان کو ہی جل پری بنا دیا ہے جس کی افسانوی اور رومانی اپیل نے اس کو زندگی دوام بخش دی ہے۔

اصل گناہ شاید ایک ہی ہو۔ اور وہ ہو بے صبری۔ اسی بے صبری کے باعث ہم جنت سے نکالے گئے اور اسی بے صبری کی وجہ سے ہم جنت واپس نہیں پاتے۔ — فرانز کافکا

کیا ہرج ہے، اختری رات سے کام لینے دو جو آج اور کل کے درمیان اس طرح حائل ہے جیسے فرات اور شہیدان کربلا کے بیچ میں یزید کی فوج کھڑی ہو گئی تھی،

آپ کے تیور اچھے نہیں!

ایسی کوئی بات نہیں، ویسے تیوروں پر دل کا اثر پڑتا ضرور ہے مگر تم مطمئن رہو، سماج سے بغاوت نہیں کروں گا،

وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ کوئی منزل مقصود متعین کئے بغیر، اختری تنہائی سے ایک دم گھبرا گئی وہ سوچنے لگی یہ گھر نہیں ریگستان کربلا ہے جس کا ذرہ ذرہ خون کا پیاسا تھا، اور جہاں لہو کی سرخی سے مجبوری اور بےبسی کی نہ جانے کتنی لکیریں بن گئی تھی، فدا حسین بس اسٹینڈ کی طرف نہیں گیا، اس کی جیب میں پیسے نہیں تھے وہ شہر کی سمت چل پڑا، دور سے ہزاروں لاکھوں بلب چمک رہے تھے بالکل ستاروں کی طرح، اور ستاروں تک آدمی کا ہاتھ نہیں پہونچا کرتا وہ انھیں صرف دیکھ رہا تھا جگمگاتے، ٹمٹماتے، پٹرول پمپ کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک ٹیکسی تیل لے کر نیم دائرہ بناتی اس کے بازو میں آکر ٹھہر گئی۔

رضوی بابو آیئے! ——— وہ کالونی میں اسی نام سے مشہور تھا، تانگہ چلانے والوں اور ٹیکسی ڈرائیوروں کو عام طور پر بڑھالیوں سے ہم دردی تھی، مگر رضوی کی ڈرائیور سے کوئی جان پہچان نہ تھی وہ ذرا جھجکا۔

کوئی خیال مت کرو رضوی بابو، گاڑی آپ ہی کی ہے شہر جا رہے ہو، چلئے، آپ کو سبزی منڈی میں چھوڑ دوں گا ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا، رضوی کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا، چند منٹ میں سبزی منڈی آ گئی، رضوی ٹیکسی سے اتر گیا، منڈی میں بڑی چہل پہل تھی وہ پھلوں اور سبزیوں کی دکانوں اور ٹھیلوں کو دیکھتا آگے بڑھتا رہا، ایسا لگ رہا تھا جیسے ڈرائیور کی عنایت سے وہ جنت میں آ گیا تھا اور اب شامت اعمال اسے دھکے دے کر گویا جہنم پہنچانے جا رہی تھی کئی دن سے جنت اور دوزخ کا تصور اس کے تخیل پہ چھایا ہوا تھا نقطۂ نظر اور ادائی بالکل نہ تھا اس کے نزدیک جنت اور دوزخ دنیا ہی کی چیزیں تھیں، رضوی سڑکوں پر گھومتا رہا اس کی سمجھ ہی میں نہ آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کچھ کرنا ہے تو کیونکر، مگر وہ اس رات کے خلاف کب لپیٹ کر کچھ نہ کچھ کرنا ضرور چاہتا تھا، بارہ بجے کے قریب وہ تھک کر چور ہو گیا اور ایک جگہ رک کر سوچنے لگا۔

رات بڑی مقدس تھی اور اس کی ضرورت، رات کی پاکیزگی پر آہستہ آہستہ غالب آتی جا رہی تھی وہ خالی ہاتھ گھر لوٹنا نہیں چاہتا تھا، اسی وقت بشیرے سامنے سے گزرا اور رضوی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا وہ رضوی کو اور رضوی اسکو جانتا تھا، بشیرے کی شہرت اچھی نہ تھی، جواریوں کی فہرست میں اس کا نام سب سے اوپر تھا۔

کس سوچ میں ہو بابو، آؤ میرے ساتھ، جانتا ہوں کارخانے کے بہت سے بابو ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں!

کہاں جا رہے ہو؟

مجلس میں۔ جوا نہیں کھیلوں گا آج، کل سے بڑی پاک کمائی کھا رہا ہوں؛ آؤ بڑا عمدہ دھندا ہے، کوئی ڈر نہیں، میں تو کہتا ہوں بارہ مہینے محرم ہی رہا کرے۔

وہ بشیرے کے ساتھ ہو گیا۔

پیچدار، پکی اور تاریک گلیوں سے گزرتے وہ ایک کشادہ سڑک پر جا نکلے دوسرے کنارے پر ایک شاندار مکان تھا، رضوی بشیرے کے پیچھے پیچھے اس میں داخل ہو گیا وہاں بہت سے آدمی اور بچے تھے، مجلس ہو رہی تھی، بشیرے مجلس میں نہیں گیا وہ ایک کمرے کی طرف بڑھا اور چلتے چلتے رضوی سے بولا۔

بابو ڈرامہ تو کھیلا ہوگا کبھی اسکول میں آؤ آج اس میں ایک پارٹ تم بھی کر ڈالو۔

کیا پارٹ؟

سے ملا ہی آیا اور اختری کو حد سے زیادہ غمگین دیکھ کر پگھل سا گیا اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا، اس نے سوچا وہ مشکلات سے گھبرا گئی، مصائب نے اسے دل شکستہ کر دیا، ممکن ہے وہ اسی سے اکتا رہی ہو، ان ساری مشکلات کا ذمہ دار وہی تھا، اختری کی آنکھیں بھاری تھیں ان میں سرخی جھلک رہی تھی جیسے گھنٹوں روتی رہی ہو اس کی آنکھیں سچ مچ شمع بیت الحزن بنی ہوئی تھی۔

کیا بات ہے؟ فدا حسین نے اس طرح ڈرتے ڈرتے پوچھا جیسے اس کا یہ سوال چنگاری بن کر بارود میں جا پڑے گا۔

کچھ نہیں! —— کل —— اور پھر اختری کی آنکھیں بھیگ گئیں، ان سے مینہ برسنے لگا۔

کل کے آگے کا پورا جملہ فدا حسین کے ذہن پر موٹے حروف میں چھپ گیا،

گھبرانے کی ضرورت نہیں وہ بولا۔ معلوم ہے تم نیاز دے کر رہو گی، کل دور ہے رات بیچ میں ہے، فکر مت کرو،

فدا حسین یہ کہہ کر کمرے میں چلا گیا، وہ جانتا تھا کہ قرض کے تمام امکانات ختم ہو چکے ہیں، ادھار دینے والے خود دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، کوئی راستہ بھی نہیں بڑا سخت وقت ہے، اختری کے پاس ایک پائی بھی نہ ہو گی، یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی، جس زمانہ میں تنخواہ ملا کرتی تھی اسی وقت یہ کیفیت تھی کہ تینوں جیبوں کے ساتھ سارے برتن بھی خالی ہو جایا کرتے تھے۔ پانی کے گھڑے ہی بھرے رہ جاتے تھے، اس نے تاریک کمرے میں پلنگ پر پڑے پڑے سوچا بڑی مجبوری ہے —— کنکشن بھی کاٹ دیا گیا ہے، میں کیا کر سکتا ہوں، مجھے کیا کرنا چاہیئے، خودکشی مسائل کا کوئی بہتر حل نہیں، نیند آئے گی نہیں پھر کیا کروں، نیند آئے یا نہ آئے کل ضرور آئے گا، اسی وقت اختری آ گئی نیند اور کل دونوں سے پہلے، اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

لیٹ کیوں گئے وہ؟

اور کیا کروں؟ —— خودکشی، چوری، جادو سو بیس، آخر کیا؟؟

—— کچھ نہ کیجئے، مگر یوں نڈھال بھی نہ ہو جایئے۔

—— پھر کون کرے گا، تم، اور تم کیا کرو گی؟

—— میں! —— —— کیں؟

ہاں تم، جو راستہ اس وقت میرے سامنے کھلتا جا رہا ہے اسی سے ملتا جلتا ایک آدھ راستہ تمہارے سامنے بھی کھل سکتا ہے مگر ہوں گے یہ سب چور راستے۔

اختری جل بھن کر رہ گئی وہ فدا حسین کا مطلب سمجھ رہی تھی، دل سے وہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا غصہ ہی میں کہہ رہا تھا پھر بھی اسے رنج ہوا، ہونا ہی رنج کا تھا خوشی کہاں سے آتی وہ روتی ہوئی باہر چلی گئی، تاریکی سی پھیلتی جا رہی تھی، رات اپنے کالے پھولے فیکٹریوں کے ہزاروں کوارٹروں پر چھاتی جا رہی تھی، اختری کو چاندنی میں بھی ہر طرف اندھیری گھلی محسوس ہو رہی تھی، دل میں اندھیرا ہو تو روشنی کہاں سے آئے، ایسے عالم میں صرف چاند کا دھبہ ہی دکھائی دیا کرتا ہے چاند نہیں، ہڑتال کی وجہ سے یوں بھی ہر وقت سناٹا چھایا رہتا تھا اس وقت فضا اور زیادہ بھیانک اور سوگوار تھی، پورا ایریا ہیروشیما میں بدل گیا تھا۔ فدا حسین ایک عزم، جھلاہٹ اور فیصلہ کن انداز سے پلنگ سے اٹھ کر زمین پر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔

کہاں چلے؟

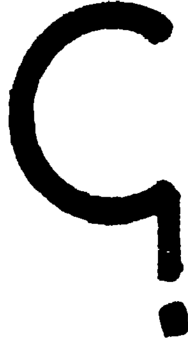
شہر!

کیوں؟

پیسوں کا بندوبست کرنے!

میں نہیں جانے دوں گی۔

رتن سنگھ



سکینہ کی ماں کو مرے اب ڈیڑھ مہینہ ہو رہا تھا پھر بھی، پورے گھر پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ خود سکینہ کی آنکھوں سے پہلے کی طرح آنسوؤں کی دھار تو نہیں بہہ رہی تھی لیکن چہرے پر اداسی اسی طرح قائم تھی۔ بڑی خاموشی سے وہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ کالج جانے کا وقت بھی نہیں ملتا تھا۔ ماں کی موت کے ساتھ ہی چنچل اور ہنسی سکینہ کی موت ہو گئی تھی جو گھر کی ہر بات میں صرف اپنی بات ہی منوانا جانتی تھی۔

ابا کہتے:۔ "بیگم سنتی ہو۔ آج بازار جاؤ تو ہری اچکن کے لیے کالا کپڑا لیتی آنا۔"

اور سکینہ بول اٹھتی۔ "امی جان۔ آئے گا تو سوٹ کا کپڑا ہی آئے گا۔ اچکن وچکن کچھ نہیں۔"

یا پھر بڑے بھیا کہتے:۔ "امی جان اس سکینہ کی بچی کو سمجھائیے۔ یہ بنا برقعہ کے گھر سے باہر نہ نکلے۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

برقعے کا نام سنتے ہی بڑی بی کے کان بھی کھڑے ہو جاتے۔ اس لیے وہ اپنے سروتے سے چھالیہ کترتی ہوئی رک کر کہتیں۔ "پتہ نہیں۔ کمبخت کیا نہ آئے گا ہے۔ اسی نگوڑی تو چھپڑی کی طرح آجا و پھرے ہے۔ سکینہ کے ابا کو تو پتہ نہیں لاگے ہے کہ بٹیا جوان ہوئی گئی ہے۔"

ایسے موقعے پر ابا کا ایک ہی جواب ہوتا۔ "ہم کیا کریں۔ بیگم نے بہت چھوٹ دے رکھی ہے۔"

بیگم کا ذکر آتے ہی چاروں طرف سے طعنوں کا حملہ شروع ہو جاتا تو بیگم وہاں سے روہانسی ہو کر اٹھتیں اور پھر اپنے کمرے میں جا کر اتنا روتیں اتنا روتیں کہ آنکھیں سوج جاتیں۔ اگلے دن پھر کالج جاتے ہوئے سکینہ جب بلا برقعہ پہنے کمرے سے تیار ہو کر نکلتی تو اسے روکنے کے لیے ابا آواز دیتے: "سکینہ"

عین اسی وقت سکینہ کی اماں آ برآمد ہوتیں۔ "دیکھیے جی۔ میری بیٹی کو آپ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں خود سمجھا لوں گی۔" اور پھر وہ قریب

رتن سنگھ اردو کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ اس بار ہم ان کی ایک کہانی بغیر عنوان کے پیش کر رہے ہیں اور عنوان کے انتخاب کا فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتے ہیں ـــــ آپ اپنی پسند کا ایک یا زیادہ سے زیادہ دو عنوان پوسٹ کارڈ پر لکھ کر ہمیں بھیج دیجئے۔ ۱۵ نومبر تک موصول ہونے والے سب سے اچھے عنوان پر انعام کیلئے اور دوسرے تیسرے عنوانات کیلئے تین تین ماہ کے لئے کتاب مفت جاری کر دیا جائے گا۔

بشیرے کمرے میں پہنچ چکا تھا، اس نے جواب نہیں دیا اور بلند آواز میں بولا ۔

دو کپ چائے منگاؤ، منے آغا ، اور بابو کو کام سمجھا دو، میرا پارٹ وہی رہے گا، شمر والا !

اب تو صرف یزید کی جگہ بچی ہے ۔

وہی ٹھیک ہے ، ہمیں تو پیسے چاہئیں ، مگر میری جگہ وہی رہے گی ۔

اطمینان رکھو بشیرے مستقل شمر ہو ——— دیکھیے بابو منے آغا نے رضوی کو مخاطب کیا ، ہم ایک تمثیل کر رہے ہیں کربلا کے واقعہ کی بشیرے اس میں شمر بنا تھا، آج آپ کو یزید کا رول ادا کرنا ہوگا اور سب کردار ہمارے پاس موجود ہیں، دس روپے جو سب کو دیے جا رہے ہیں آپ کو بھی ملیں گے ۔ آپ چند شعر پڑھیں گے اور دو تین مکالمے ادا کریں گے سب چیزیں لکھی لکھائی رکھی ہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی رضوی کے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی وہ نیاز کے لیے پیسوں کا بندوبست کرنے آیا تھا مقصد یہ تھا کہ اختری کے دل سے وہم نکل جائے اور نفسیاتی طور پر اسے یہ باور ہو جائے کہ پچھلی نحوست دور ہو گئی، لیکن یزید بن کر وہ اپنا مقصد حاصل کرے یا ...... وہ بڑے تذبذب میں پڑ گیا تھا، معاملہ تنہا نیاز کا نہیں تھا پیٹ کا بھی تھا ، اور پیسوں کی شدید ضرورت تھی سکہ اصلی ہو یا جعلی بس ہونا چاہیے، یہ اس کا آخری فیصلہ تھا ۔

کوئی ہرج نہیں !

دس روپے ملیں گے ۔

رات ہی کتنی رہ گئی ہے ۔

زمزم پر شراب پینے والے بھی تو صبح کو کپڑے دھو ڈالتے ہیں ۔ اس کے اندر سے لگاتار یہی آوازیں آتی رہیں ۔

کمرے میں ہر قسم کا سامان الماریوں میں رکھا ہوا تھا ، زرہ ، بکتر ، خود ، اور طرح طرح کے کپڑے ، اس کے سنے اس کی بڑی جا بکدستی سے جلد ہی اس کی ہیئت بدل دی وہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ششدر رہ گیا اس نے سوچا کاش اختری بھی اس روپ میں مجھے دیکھ سکتی، بشیرے بڑا بھاری بھرکم تھا وہ زرہ ، بکتر پہن کر اور سر پر بڑا سا آہنی فولاد رکھنے کے بعد شمر ذی الجوشن بنا تو خوفناک دیو کی شکل میں آ گیا، تمثیل کے اور کردار بھی اصل الگ رہے تھے، رضوی ریہرسل میں کامیاب رہا اس نے بڑی روانی سے مکالمے ادا کیے مرثیہ کا بند بھی رزمیہ لب و لہجہ میں پڑھ دیا، اسٹیج تیار ہی تھا، تمثیل شروع ہو گئی ، مجمع کافی تھا تمثیل بڑی کامیابی سے چل رہی تھی ، یزید شمر کو میدان جنگ کے متعلق ہدایات دے چکا تو شمر نے سر جھکا کر کہا ۔

میں امام سے بیعت لوں گا ورنہ ان کا سر کاٹ لوں گا شمر کے منھ سے یہ الفاظ سن کر مجمع قابو سے باہر ہو گیا بہت سے آدمی اسٹیج پر چڑھ آئے انھوں نے یزید اور شمر دونوں کو مارنا شروع کر دیا اس سختی سے زدوکوب کیا کہ وہ لہولہان ہو گئے یزید پیٹتے پیٹتے نڈھال ہو گیا، تمثیل جلد ہی روک دی گئی ، یزید اور شمر کو کمرے میں دھکیل کر کواڑ بند کر دیے گئے ، اور اپیل کی گئی ، کہ یہ نہ سمجھیے کہ آپ محض ایک تمثیل دیکھ رہے ہیں ۔ رضوی کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا مگر دس روپے کا نوٹ جیب میں ڈالتے ہی اس کی چوٹوں میں ٹھنڈک سی پڑ گئی وہ امکانی عجلت کے ساتھ کمرے سے سڑک پر آ گیا دروازے پر ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی وہ جلدی سے اس میں گھس گیا ۔

ٹیکسی اس وقت دروازے پر رکی جب اندھیرا بہت گہرا تھا چوٹیں ٹھنڈی پڑ چکی تھیں، لیکن رضوی کا پورا بدن اکڑا ہوا تھا، ڈرائیور نے کئی بار ہارن بجایا، دروازہ نہیں کھلا، رضوی آپ ہی اترا ، زور زور سے زنجیر بجائی اختری نے ڈرتے ڈرتے کواڑ کھولے اور رضوی کو دیکھ کر چیخ پڑی ۔

یہ کیا گت بنالی آپ نے ؟ ——— اور یہ خون کیسا ؟ ؟ سچ بتاؤ کیا کر کے آئے ؟

کچھ دھرا کچھ نہیں ، ہاں پیسے بہت ہیں ، ایک ڈرامہ کیا تھا ، اختری الگ رہو ڈرتا ہوں کہیں تم بھی مارنے نہ لگو، میں یزید ہوں ، شمر کو امام حسین سے لڑنے کے لیے بھیج کر آیا ہوں ابھی ابھی ۔

کیا کہہ رہے ہو ؟

جو کہہ رہا ہوں تم سن رہی ہو، میں یزید ہوں ، یزید !

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

ہربنس لال ساہنی

اگنی پریکشا

لال رنگ میں رنگے، کلف اور ابرک لگے مل کے دوپٹے میں شانو انارکلی ہی تو لگ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر، گالوں پر اور ناک پر پسینے کی بوندیں بار بار پونچھ لینے پر بھی تھوڑی دیر بعد یوں ابھر آتی تھیں جیسے چولھے پر رکھی دیگچی پر بھاپ کے قطرے —— اس تپتی ہوئی دوپہری میں ادھر سے ادھر بھاگتے بھاگتے بھی شانو کے چہرے پر تھکاوٹ کے کوئی آثار نہ تھے۔ گلی محلے والیاں اور ساس کی کیرتن منڈلی کی ساری سہیلیاں جمع ہو چکی تھیں اور رتن بابو کے دفتر کے تمام بابو یکے بعد دیگرے آ آ کر باہر گلی میں قطار در قطار لگی کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے۔ ذرا پرے شامیانہ تنا ہوا تھا اور حلوائی گرم گرم کچوریاں نکال رہا تھا۔ گرم گرم تلی ہوئی کچوریوں کی خوشبو ساری فضا میں رچی ہوئی تھی۔ بس اب تھوڑی دیر ہی میں دعوت شروع ہونے والی تھی۔ پہلا دور دکھلانے کے لیے شانو اندر دالان میں بچھانے کے لیے کھیس، دریاں اور لال پیلے پھولوں کی کڑھائی والی سفید چادروں کا ڈھیر اکٹھا کر رہی تھی۔ رام کے بیاہ کی دعوت جو تھی —— شانو رام کا بیاہ بھی اسی دھوم دھڑکے سے کر رہی تھی جس ممتا اور دلار سے اس نے بارہ برس کے رام کو بیس برس کا کیا تھا۔ اسے ایف۔ اے تک تعلیم دلائی تھی حالانکہ رتن بابو سو سوا سو روپے کے کلرک ہی تھے لیکن شانو نے دیور کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں اور اس کے لڑکپن کے تمام شوق پورا کرانے کے سلسلے میں کبھی اپنے ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دی تھی۔ گلی محلے کی بڑی سے بڑی کتنی قسم کی بوڑھی عورتیں بھی شانو کی کسی قسم کی برائی کرنے کے لیے لب وا نہ کرتی تھیں بلکہ جب کبھی سر جوڑ کر کسی کیرتن میں کتھا میں کسی کے ہاں ماتم پرسی میں ہوئے اکٹھا ہوتیں، تو شانو کا ذکر اس کی مدح میں اس طرح سے سنا جاتا۔

"بہو، بھابھی ہو تو شانو جیسی —— دیور کو یوں رکھا ہوا ہے جیسے اپنے پیٹ میں سے نکالا ہوا بیٹا ہو۔"

"ہاں بہن شانو جیسی قربانی کوئی کیا کرے گا۔ اس کے کھانے پہننے کے دن تھے جو اس نے ایک ایک کوڑی جمع کر کے اور دیور کے پالن پوشن میں خرچ کر کے جوگنوں کی طرح کاٹے ہیں۔"

اور آج جب رام کے بیاہ میں شانو نے سارے محلے کی دعوت کی تو ساری بستی کے منہ میں شانو خستہ کچوریوں کی طرح ادھر سے ادھر پھرتی جا رہی تھی —— سارا دن رتن بابو اور شانو اپنے مہمانوں کی آؤ بھگت میں یوں جٹے رہے جیسے کسی بڑے یگ کا انھوں نے انتظام کیا ہے اور دور دور سے پدھارے ہوئے رشیوں اور منیوں کی سیوا میں مگن ہوں —— تیسرے دن رام دلہن لے کر جب اپنے سگے سودھیوں کے ساتھ ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس نے اپنی بھابھی کے پیر چھوئے پھر اس کی چاند سی دلہن نے اپنی جیٹھانی کے پاؤں کی دھول اپنے ماتھے پر لگائی۔ جبھی بڑی بوڑھیوں کے منہ سے نکلا تھا کہ شانو کو دیورانی بھی اپنی جیسی بھاگوان ہی ملی ہے۔ اور سچ مچ اس کی دیورانی سرلا کو اڑوس پڑوس نے دیکھا تو گھر گھر میں یہ چرچا عام ہو گیا کہ اس کی دیورانی جیسی روپ وتی ہے اس سے بڑھ کر گن وتی اور لاجونتی ہے۔

آتی ہوئی سکینہ کو کہہ دیتیں۔ "کچھ نہیں۔ تم کالج جاؤ۔ دیر ہو رہی ہوگی۔"

سکینہ کے برقعے کے سوال کو لے کر روز نہیں تو تیسرے چوتھے روز جھگڑا ضرور ہو جاتا۔ اور جس دن بڑی بی اڑوس پڑوس والیوں کو بھی ناک پر انگلی رکھ کر اور منہ بگاڑ بگاڑ کر سکینہ کی بے پردگی کی باتیں کرتی ہوئی سن لیتیں، اس دن تو گھر میں کہرام ہی مچ جاتا۔ اس دن بڑی بی نہایت غصے میں ہوتیں۔ اپنے چہرے پر ایک طوفان لیے سارا گھر سر پر اٹھا لیتیں۔ اس طوفان سے بچنے کے لیے سکینہ کے ابا شطرنج کھیلنے کے لیے گھر سے سویرے ہی نکل پڑتے اور بیگم جائے نماز پر بیٹھی اس وقت تک کلام پاک کی تلاوت کرتی رہتیں۔ جب تک کہ بڑی بی کھانسی کا دورہ پڑ جانے سے چارپائی پر لیٹنے کے لیے مجبور نہ ہو جاتیں۔

وہ دن تو اب بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ سکینہ کی ماں کا چالیسواں ہو چکا تھا۔ لیکن گھر میں اسی طرح خاموشی تھی۔ گھر کا کوئی فرد کسی سے بغیر کسی کام کے کوئی بات نہ کرتا۔ ہر شخص بیگم کے لیے اپنا غم دل میں سمیٹے اپنے ہی میں کھویا رہتا۔ بڑی بی تو پہلے سے آدھی رہ گئیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو ہر وقت تیرتے رہتے۔ وہ بار بار یہی کہتیں۔ "قبر میں پیر لٹکائے تو میں بیٹھی تھی اور موت غلطی سے میری بیگم کو لے گئی۔ ہائے اللہ تو نے مجھے کیوں نہ اٹھا لیا پہلے۔" سکینہ کے ابا نے شطرنج کھیلنا بالکل بند کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے کمرے میں خاموشی سے حقہ گڑگڑایا کرتے۔ اکثر حقے کی نے منہ میں لیے پتہ نہیں کس سوچ میں کھو جاتے کہ کش لینا ہی بھول جاتے۔ سکینہ کے بھیا کا تو گھر سے تیار ہو کر باہر نکلنا ایک مصیبت ہوتا تھا پہلے۔ "یہ سکینہ کی بچی تو گھر پر بیٹھتی ہی نہیں، قمیص کا بٹن کون ٹانکے۔ یہ دیکھیو امی۔ میری ٹائی سے سکینہ کی بچی کتابوں کا بنڈل باندھ کر لے جاتی ہے۔ ارے تو خبر لوں۔ میں کچھ کہتا ہوں تو الٹا مجھے ہی برا بھلا کہتی ہیں آپ۔" اور اب وہی راشد میاں قمیصوں پر بٹن لگوائے بنا ہی گھر سے چپ چاپ باہر چلے جاتے۔ واپس آتے تو سیدھے اپنے کمرے میں جا کر کتابوں میں کھو جاتے۔ ناشتہ یا کھانا وقت پر ملے یا نہ ملے، شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ آتا۔ رہی سکینہ کی بات سو وہ باورچی خانے اور گھر کی دیکھ ریکھ میں سارا وقت گزارتی۔ کالج سے تو چھٹیاں لے ہی رکھی تھیں۔ محلے کی بیبیاں پہلے کی طرح اظہار افسوس کے لیے تو نہیں آتی تھیں لیکن پھر بھی اگر کوئی آ جائے تو اس کے پاس سکینہ ہی کو بیٹھنا پڑتا تھا۔ بیگم کی باتیں دہرانا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کالج کی کوئی سہیلی آ جاتی۔ تب بھی وہی بیگم کی باتیں۔ سکینہ کے کمرے میں رکھا ہوا ریڈیو اب بھی بند تھا۔ ریڈیو سننے کو اس کا دل ہی نہیں چاہتا۔

اس خاموشی کو آخر سکینہ کے ابا نے توڑا۔ "بیٹی اب تم کالج جانا شروع کر دو نہیں تو سال ضائع ہو جائے گا۔"

ابا کے زور دینے پر سکینہ نے ہاں تو کر دی لیکن اپنے کمرے میں آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کا گھر سے باہر قدم رکھنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ اگلے دن وہ کالج نہیں گئی۔ دوسرے روز بھی۔ چوتھے روز ابا صبح ہی صبح اس کے کمرے میں آ گئے۔ "آج کالج جانا بیٹی۔" اور انھوں نے خود اس کی کتابوں کی الماری کا تالا کھول دیا۔

نو بجے تک سکینہ نے ماما سے کھانا پکوا لیا۔ اور پھر زندگی میں پہلی بار وہ برقعہ پہن کر کالج کو چلی۔ بڑی بی نے سکینہ کو برقعہ پہنے دیکھا تو دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن ابا نے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے سکینہ کو برقعہ پہنے دیکھا تو ان کے دل میں کچھ ہونے لگا۔ کیا ہو رہا ہے اس بات کا اندازہ انھیں نہیں تھا۔ گھبراہٹ میں انھوں نے آواز دی "سکینہ!"

"جی ابا۔ آئی۔"

اور جب سکینہ ابا کے کمرے میں پہونچی تو اس نے دیکھا۔ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ سکینہ بھی صبر کھو بیٹھی۔ کافی دیر تک باپ بیٹی دونوں ایک دوسرے سے لپٹے روتے رہے۔ جب طوفان تھما تو ابا نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"کالج ویسے ہی جاؤ۔ جیسے پہلے جاتی تھیں ـــــ برقعہ پہن کر نہیں۔ بیگم نہیں رہیں، تو کیا ہوا۔ میں تو زندہ ہوں۔"

ہ سر ہلا کر رہ گیا اور اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی ہلکی سی جنبش نے حامی بھری تھی "ہاں بھابھی میں تمہیں روز ایک چٹھی لکھوں گا مت ذکر۔"

رام جب سے گیا دو سال ہونے کو آئے تھے اب تک کبھی گھر نہ آیا تھا۔ کسی نے پوچھا بھی تو شانو کوئی جواب دینے سے پہلے رونے لگتی۔ پوچھنے کے لیے دوسرا سوال رام کی بہو سرلا کے متعلق بھی ضرور ہوتا تھا۔ "سرلا بھی تو اس بیچ نہیں دکھائی دی کیا میکے ہی میں رہ گئی یا چلی گئی اپنے والے کے پاس" ایسے ہی سوال پر شانو ایک دن بھبھک ہی تو اٹھی "گھر والے کے پاس کیوں جائے گی وہیں رہے گی اپنے یار کے پاس" پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ——— شانو نے اپنی گلی کے ایک ایک گھر میں یہ راز افشا کر دیا تھا کہ سرلا بدچلن ہے اور وہ شادی سے پہلے ہی سے محبت کرتی تھی اور ہمارے رام سے تو ہاتھ چھوٹ گئے جو ہم وہاں ایسے کیچڑ میں جا پھنسے ——— سننے کو تو ہر ایک نے سرلا کی کہانی سنی لیکن یقین جانے کیوں کسی کو بھی نہیں آیا تھا۔ سرلا نے شانو کے پاس جو چھ مہینے گزارے تھے۔ ان چھ مہینوں میں بھی وہ کبھی باہر گلی میں اکیلی نہ دکھی گئی تھی۔ محلے کے مرد جانتے تھے کہ انھوں نے کبھی نظر بچا کر بھی اس سے نظر ملانے کی کوشش کی تو وہ ری سکے پھول کی طرح زرد ہو گئی۔ بس شرم و حیا سے چہرہ کا رنگ اڑ جاتا۔ کہانی یہ تھا کہ ایسی شرم کی پتلی اس کلنک میں کہاں دیکھی گئی ہے۔ شانو کے ساتھ ساتھ پیچھے پیچھے یوں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی تھی جیسے وہ شانو کا ہی سایہ ہو اور اب شانو نے اس شادی سے پہلے کی بدچلنی کی کہانیاں سرِ عام پھیلا دیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے کپڑے کی پھیری کرنے والے رام لال کی گھر والی پارو کا خیال تھا شانو دیور کی ساری کمائی خود ہی ہڑپ کرنا چاہتی ہے اس لیے یہ سب الزام سرلا پر لگا کر اسے رام کی نظروں سے گرانا چاہ رہی ہے۔ برعکس کے خزانچی دینا ناتھ کی گھر والی کہتی کہ شانو کے دل میں ضرور کھوٹ ہے اور وہ "اور" صرف وہی ہے بہت پوچھنے پر وہ "اور" اس لیے یہ بتایا کہ شانو رام کا بیاہ اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتی ہے جو دہلی میں کہیں استانی ہے یہ سب رام کی شادی کے بعد سوجھی ہے ——— اس طرح کی باتیں ہر گھر میں الگ الگ ڈھنگ سے کی جاتی تھیں اور شانو کے اس یہ کاروبار کسی کے پلے نہ پڑا تھا۔ لوگ اس بات کو ٹھیک سمجھتے تھے کہ سرلا پر لگایا ہوا الزام جھوٹا ہے اور وہ گنگا جل کی طرح پوتر ہے ——— شانو جھوٹی ہے۔ ساری عمر کی بنائی ہوئی ساکھ اس نے اس واقعہ سے مٹی میں ملا دی تھی ——— شانو کی سچائی کا بس دو آدمیوں پر تھا۔ ایک رتن بابو کو دوسرے رام کو۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اپنی کمائی ہوئی ساری تنخواہ ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح اپنی بھابھی کو وہ منی آرڈر کرا دیتا نہ بھولتا تھا اور اپنی بھابھی کے پیار کو یاد کر کر کے آنسوؤں سے تر خط ہر دوسرے تیسرے دن وہ وعدے کے مطابق لکھا کرتا تھا۔ شانو نے اب تمام سبھا سوسائٹی، کیرتن ست سنگ تیاگ دیئے تھے ان دس برسوں میں اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی اس کی وجہ سے وہ اپنا من ان حیلے وسیلوں سے بہلایا کرتی تھی۔ مگر اب اس کا من ان باتوں میں بھی نہ لگتا تھا۔ اب اس کا دن رام کی چٹھیاں پڑھتے پڑھتے ڈھل جاتا اور رات اس کا نام لیتے لیتے بیت جاتی۔ رتن بابو اسے اس طرح بے حال دیکھ کر بے حال ہو جاتے لیکن پھر اپنے بھائی کے لیے پتنی کا اتھاہ پیار دیکھ کر نہال ہو جاتے ———

شانو ان دو سالوں میں کافی تبدیل ہو گئی تھی اس کے شریر کی ساری چربی پگھل کر آنسوؤں کی شکل میں بہہ گئی تھی۔ اب وہ تیلی دبلی نازک چوٹ کھائی ہوئی بیراگن دکھائی دیتی تھی۔ اس کے پتلے پتلے خشک اور بے رس ہونٹ سنگترے کی باسی پھانکیں اور سپاٹ چھاتیاں کسی سنا پر پڑی ہوئی دھوبی کی چیتھڑا بنیں دکھائی پڑتیں تھیں اس کی شوخی اور رنگین مزاجی اسی دن پر لگا کر ہوا ہو گئی تھی جس دن اس نے کسی تھا کہ لڑائی چھڑ گئی ہے اور جانے ابھی کتنے دن چلے۔ ایسے میں رام کو چھٹی ملنی ممکن نہ تھی۔

رام پورے چار سال بعد دو مہینے کی چھٹی پر گھر آ رہا تھا۔ شانو کے گھر میں وہی رام کے بیاہ والے دنوں کی چہل پہل تھی گلی والیاں شانو کو بدھائی دینے آ رہی تھیں۔ وہ دلہن آئی تو شانو اپنے لمبے لمبے سیاہ بالوں کو اپنی دونوں طرف سینے پر پھیلائے کسی گہری سوچ میں غرق یوں چلا رہی تھی جیسے اس کا ذہن اور اس کے ہاتھ دو مختلف عمل میں مصروف ہوں۔ ہاتھ سرے سے بالوں کے آخری سرے تک

——— رام تو شادی کی پہلی رات کی صبح کو ہی یونٹ چلا گیا تھا جہاں وہ ملٹری ٹریننگ پوری کر رہا تھا۔ صرف شادی کے لیے پانچ روز چھٹی مل سکی تھی۔ اس نے اپنی پتنی کو اپنی گھونگھٹ کی اوٹ میں سے ہی تو دیکھا تھا لیکن اس کی پتنی کی سندرتا اور اوصاف کی خوشبو گھر گھر پھیل گئی تھی ہر گھر میں اس کا اور شانو کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا "دونوں کی گوری چٹی جوڑی دو بیلوں کی جوڑی بن گئی ہے" ——— کسی کی زبان پر "دونوں سگی بہنیں سی دکھائی دیتی ہیں" کوئی تعریف کرتا "دونوں کتنی سندر اور سشیل ہیں۔"

گلی میں ہفتہ کے تین دن، منگل، برہسپت اور سنیچر کسی نہ کسی کے گھر کیرتن کی رونق بنے رہتے۔ آج موسی کھیمی کے ہاں کیرتن منڈلی جمی ہوئی ہے تو تیسرے دن دو دلہن جیسی شانو اور سرلا کی جوڑی کیرتن کی اس محفل میں امتیازی پوزیشن کی مالک تھیں ایک سے چٹکیلے بھڑکیلے لباس زیب تن کیے جب وہ قدم سے قدم ملاتی ہوئی آئیں تو گلی کی اکٹھی ہوئی عورتوں کی نظریں جم سی جاتیں وہ انہیں دیکھتی ہی رہ جاتیں ——— رام کی ٹریننگ ختم ہوئی اسے ایک دم کسی بارڈر پر ڈیوٹی مل گئی۔ راستے میں ایک روز کے لیے وہ گھر آیا جب اس کی بیوی سرلا اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ ان چھ مہینوں میں رام بہت بدل گیا تھا۔ اتنی مختصر سی مدت میں اس کی صحت اتنی اچھی ہو گئی تھی کہ اس کے تنگڑے جیسے رخساروں کی سرخی کی تعریف جب شانو کی پڑوسن نجنا نے ان الفاظ میں کی "شانو تیرے دیور کی جوانی کی ساری سرخی اس کے منہ میں سمٹ آئی ہے۔ میں نے ایک نظر دیکھا تو دیکھا نہیں گیا۔ میرا تو سارا شریر کانپ گیا بہن۔ دل دھڑک دھڑک گیا۔ ہائے کیسا البیلا مرد نکلا ہے تیرا رام" تو شانو بھڑک اٹھی "تمہارے منہ میں خاک خواہ مخواہ رال ٹپکا رہی ہے کتیا! نظر لگا دی تُو نے میرے رام کو۔" زندگی میں پہلی بار شانو کے منہ سے گالی نکلی تھی ورنہ آج تک اس میں سے میٹھے بولوں کی رس ہی ٹپکتی ہوئی دیکھی تھی۔ پڑوسن کی بات سن کر وہ غصے سے لال ہو گئی تھی لیکن جب اس نے خود رام کو غور سے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ بارہ برس والا رام کتنا دبلا پتلا اور کمزور بدن کا تھا اور یہ رام ——— گز بھر کی چوڑی چھاتی۔ بھری بھری مچھلیوں والے بازو۔ سرخ قندھاری انار جیسا چہرہ موتیوں کی لڑیوں جیسے دانت ——— اس نے اپنی نگاہیں ایک دم نیچی کر لیں۔ آنکھیں بھینچ کر بند کر لیں جیسے اس نے اپنی نظر سے نہ دیکھا ہو اپنی پڑوسن نجنا کی نظر سے دیکھ لیا ہو۔ ——— رام یہاں ایک دن رہا تھا لیکن شانو اس سے کوئی بات نہ کر سکی تھی۔ رام آج پھر بھابھی کے پاس آ کر بچپن والے اسی لاڈ پیار سے اس کی بانہہ کو مروڑنے لگا اور اسے اپنے لمبے لمبے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں لے کر منمنانے لگا جیسے شانو بکری تھی اور وہ اس کا بچہ ——— "میری اچھی بھابھی آج ایک دن میں جو میری خاطر کر سکتی ہے کر لے۔ جو مجھے کھلا پلا سکتی ہے کھلا پلا لے پھر جانے ملیں بھی کہ نہ۔ فوج کے سپاہی کا کیا ہے۔"

"چپ رہ پاگل ایسی اشبھ باتیں نہیں کیا کرتے" شانو غصے میں یہ کہتی ہوئی اس کی گرفت سے بجلی کی طرح لہرا کر الگ ہو گئی ——— آج رام اسے کچھ معلوم نہ ہوا بلکہ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی پرائے مرد نے اس سے زبردستی کرنے کی کوشش کی ہو۔ وہ ہانپتی ہوئی دور جا کھڑی ہوئی۔ اور اپنی بدلی ہوئی حالت کو چھپاتی ہوئی بولی۔ "تیرے آنے کا پہلے پتہ ہوتا تو میں سرلا کو اس کے پتا جی کے ساتھ میرٹھ کبھی نہ جانے دیتی۔ اب پرماتما جانے کب آؤ اور اس کا منہ دیکھو۔" رام نے ہنسی ان سنی کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ساری دنیا کا منہ دیکھوں یا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن بھابھی! میں تمہیں دیکھے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ اب تم سے مل لیا ہے بس اب میں اطمینان سے نوکری پر جا سکوں گا۔" شانو ایک ٹک رام کو دیکھتی رہی پھر ایک دم نظریں جھکا کر زمین کو گھورنے لگی جیسے غلطی سے دوپہر کے سورج کی طرف منہ کر لیا تھا۔ رام "میری اچھی بھابھی" کہتا ہوا بچوں کی طرح پھر شانو سے لپٹ گیا ——— شانو نے آہستہ سے پرے ہٹا دیا اور وہ دوپٹے کے کونوں کی گیند بنا کر آنسو بہاتی آنکھوں پر یوں رکھ کر سسکنے لگی جیسے سیلاب روکنے کے لیے باندھ کھڑا کر دیا ہو۔ رات کو پٹھان کوٹ جانے والی ٹرین پر رام کو جانا تھا ——— شانو نے اسے انبالہ تک پہنچانے کا پروگرام بنا لیا۔ رتن بابو گاڑی پر دونوں کو سوار کرا آئے تھے۔ انبالہ تک کا سفر رام اور شانو نے کبھی قہقہے لگا کر اور کبھی آنسو بہاتے کاٹ دیا تھا۔ انبالہ اسٹیشن پر رام جب جدا ہونے لگا تو دونوں رو رہے تھے۔ شانو پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی "رام! چٹھی ہر دوسرے تیسرے روز لکھتے رہنا۔"

تو ملتے ہی یوں کٹ جاتی تھی جیسے کسی شجر ممنوعہ کے سایہ میں آتے ہی پرے چھلانگ لگا گئی ہو۔ رام نے آگے بڑھ کر بھابھی کے گلے میں بچپن والے لاڈ پیار میں ممیاتے ہوئے اپنی بانہیں حمائل کر دیں تو شانو کسی بکٹ گھائے کی طرح بدک کر سوئی سے باہر جا کھڑی ہوئی۔ جانے بھابھی کو کیا ہو گیا تھا۔ رام کا کم عمر ذہن کچھ نہ سمجھ سکا۔ رات کو کھانے سے پہلے شانو پلنگ پہ چڑھ کر اوپر چھت کے قریب والی الماری کھولنے لگی۔ وہسکی کا ادھا نکالتے ہوئے بولی۔ "تمہارے بھائی لائے تھے ایک روز اپنے لیے۔ آدھی سے زیادہ بچی ہوئی ہے۔ لے تو بھی چکھ لے آج" رام نے حیرت بھری نظر سے بھابھی کی جانب دیکھا تو شانو نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"لو اب تم بالک تھوڑے ہی ہو۔ تمہارے کھانے پینے کی گھڑی کیا بڑھاپے میں آئے گی۔"

کھانے کے بعد دونوں تھوڑی دور ٹہل کر واپس آئے تو رام کا سر ہلکے ہلکے نشے سے بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں سرور سے خمار آلود ہو رہی تھیں۔ آتے ہی پلنگ پر دراز ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی نیند نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا ـــــ نصف شب گزر چکی تھی۔ دسمبر کی ٹھنڈی چاندنی باہر آنگن میں بیوہ کے شباب کی طرح سونی سونی پڑی تھی۔ خنک ہوا کھڑکی کی سلاخوں کو نم کرتی ہوئی اندر کمرے میں آ کر دروازوں پر جھولتے ہوئے پردوں کو پھڑپھڑا رہی تھی ـــــ رام نے کروٹ لی اور چت لیٹ کر خراٹے بھرنے لگا ـــــ اسے اپنے بدن پر ملائم اور چکنے چکنے بوجھ کا احساس ہوا۔ اپنے ہونٹوں پر گرم گرم بوسوں کے پے در پے وار ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اپنی چھاتی پر ابھرے ہوئے غباروں کے پھٹنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ناک میں گندمی ہوئی کچی مٹی کی باس گھستی ہوئی جان پڑی۔ اس اچانک اور غیر متوقع شب خون سے بچنے کی اس نے لاکھ کوشش کی لیکن وہ بے بس ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو نشے کے ہلکورے، اور غنودگی میں اس تیر کی مانند محسوس کیا جو کمان میں تن گیا ہو اور اس کے بدن کو کوئی اپنی پوری طاقت سے کھینچ کر چلّے سے چھوڑنے والا ہو اور پھر جانے وہ اوپر خلا میں جا کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا یا کسی عمیق دلدل میں جا گھسے گا۔ اس نے اپنے آپ کو گہری دلدل میں دھنستا ہوا پایا وہ جتنے ہاتھ پیر چلاتا اور بھی اپنے آپ کو گہرائی میں ڈوبتا ہوا اور ڈوبتا ہوا محسوس کرنے لگا ـــــ اس کا بدن دکھ رہا تھا اسے یوں لگا جیسے اس کے پیر سے اتار کر کسی نے اس کے ننگے پنڈے پر جگہ جگہ اپنے دانت گاڑ دیے ہوں۔ انگ انگ زخمی کر دیا ہو ـــــ وہ زخموں سے نڈھال ہو اٹھا ـــــ

شانو صبح اٹھی تو اس نے دیکھا رام جا چکا تھا۔ ٹیبل پر رکھے ہوئے کاغذ کے ایک پرزے پر یہ لکھا ہوا ملا۔

"میں میرٹھ سلا کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ اگنی پریکشا سے سرخرو ہو کر نکلی ہے۔ باقی کی چھٹیاں وہیں گزاروں گا۔"

گھنی چھاؤں لوٹا رہے تھے جیسے یہ سب میکانکی عمل سے ہو رہا تھا۔ اور شانو کے ذہن کی کنگھی برسوں اور صدیوں سے گرد سے اٹی ہوئی اُلجھی ہوئی لٹوں کو سنوارنے کی ادھیڑبن میں لگی تھی دودھن نے بدھائی کہی تو شانو کے ذہن کی کنگھی کے جیسے دانے ٹوٹ گئے ہوں اور اس کے حال اور آنے والی گھڑیوں کے گیسوؤں میں اٹک کر رہ گئے ہوں۔ ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری اور وہ دودھن کے لیے چارپائی پر جگہ بنانے لگی۔ دودھن بیٹھی تھی کہ جمنا اور پاروتی آگئیں اور پھر ساری منڈلی جیسے آنگن میں آ جمع ہوئی۔ امرتی۔ پیڑے اور گلاب جامن کی ورق لگی پلیٹیں ان کے سامنے پھیل گئیں۔ آج کا دن خوشیوں اور مرادوں کا دن جو تھا۔ شانو کا رام لڑائی سے ٹوٹ کر گھر آرہا تھا۔ محلے والیوں نے چاہتے ہوئے بھی سرلا کا ذکر نہ چھیڑا تھا مبادا کہ شانو کا دل خوشیوں سے نکلکر اداسیوں کی کھائی میں جا گرے۔ اسی لیے رام نے بھی کبھی اپنی چٹھی پتری میں سرلا کا ذکر نہ چھیڑا تھا۔ اس کی سسرال نے منتوں سے التجاؤں سے اور دھمکیوں تک سے رام کو اس بات کے لیے راضی کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ کسی طرح سرلا کو اپنالے لیکن اس نے اس طرف زیادہ توجہ ہی نہ دی تھی اس معاملہ میں اس کی بھابی کی رائے اور حکم اس کے لیے سب سے اہم بات تھی اور شانو کے رویے سے وہ واقف ہو چکا تھا۔ سرلا اس کی زندگی کے سفر میں کسی قریبی اسٹیشن پر ہی اتر جانے والے مسافر کی طرح ملی تھی جو سیٹ پر بیٹھنے کی تکلیف بھی گوارہ نہیں کرتا اور پائدان پر کھڑے کھڑے ہی اتر جاتا ہے۔

ایک رات اور ایک دن کی تھکان بھری مسافت طے کرکے جب رام ڈبے سے باہر پلیٹ فارم پر اترا اسے اسٹیشن پر آئے ہوئے اس کے بھائی رتن بابو اور اس کے دوستوں نے گلے سے لگا لیا۔ شانو بھی ان کے درمیان کھڑی تھی وہ سوچتی رہی میں بھی آگے بڑھ کر رام کو بھینچ لوں۔ اس کے گلے سے مل کر اس کا استقبال کروں لیکن اس روز جمنا کی کہی ہوئی بات اس نے رام کے یاقوتی چہرے پر لکھی ہوئی محسوس کی اور وہ اس کی جانب نظر بھر کر نہ دیکھ سکی۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے اسکے رخساروں اور سونے کی طرح چمکتی ہوئی اس کی پیشانی کی وہ جیسے تاب نہ لا سکی۔ رام نے بڑھ کر بھابھی کے پیر چھونے چاہے تو شانو نے اس کی بانہیں تھام لیں اور اس کے کندھے تھپتھپا کر رہ گئی ——— رتن بابو اپنے بھائی کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے "اچھا ہوا تم آگئے اور میں بھی تم سے مل لیا ورنہ جانے بیس روز بعد ہی تمہیں دیکھ پاتے مجھے اس گاڑی پر دفتر کے کام سے کلکتہ جانا ہے۔"

گھر پہونچ کر رام نے دیکھا شانو نے گھر کا رنگ روپ ہی بدل دیا تھا اب کی پرانی ترتیب کا نام و نشان بھی نہیں رہ گیا تھا بڑے کمرے کو بڑے سلیقے سے ماڈرن ڈھنگ سے سجا رکھا تھا۔ دیوار پر ٹنگے ہمالیہ پوڈر کے خالی لمبے ڈبوں میں سے منی پلانٹ کی ہری ہری پتیاں جھانک رہی تھیں۔ ہر کمرے کی ہر دروازے میں لٹکے ہوئے پردے کسی پہاڑی دوشیزہ کے آنچل کی طرح لہرا رہے تھے۔ رام کی شادی میں ملے ہوئے جہیز کے فرنیچر کو دو تین کمروں میں اس ڈھب سے کھپایا ہوا تھا کہ سرلا کی یاد کی کوئی پرچھائیں ان پر نہیں پڑ رہی تھی ——— رام کی خاطر شانو نے آج طرح طرح کے ذائقہ دار کھانے تیار کر رکھے تھے۔ مرغ۔ مچھلی۔ پلاؤ۔ اور میٹھی چٹنی ——— میٹھی چٹنی پر تو بچپن سے ہی وہ جان دیتا تھا۔

"بھابھی! اتنی ساری چیزیں بنا ڈالیں ہیں تم نے سب کچھ کیا آج ہی کھالوں گا۔ دو مہینے رہوں گا اپنی پیاری بھابھی کے پاس۔ جی بھر کے میرے پیٹ میں ٹھونس دینا یہ سب الم غلم ——— ایک دن میں یہ سب بوجھ نہ اٹھایا جاسکے گا مجھ سے"۔ رام نے جلدی جلدی یہ سب کہا اور رسوئی میں بیٹھی ہوئی بھابھی کے پاس چٹائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا شانو میں بڑی تبدیلی آگئی ہے پہلے اس کا جسم بھرا بھرا تھا اور وہ موٹی ہونے کی حدوں کو چھو رہی تھی اب وہ تیلی دبلی ہو کر پہلے سے بھی چھوٹی عمر کی لگ رہی تھی پہلے کی شانو اپنے قدرتی حسن پر نازاں تھی مگر اب وہ آرائش حسن کے تمام اقسام کے ہتھیاروں سے لیس تھی۔ غازہ۔ سرخی۔ اور لپ اسٹک کا استعمال اس نے بڑی فراخ دلی سے کر رکھا تھا۔ یہ تو تھی شانو کی ظاہری تبدیلی جو رام نے فوراً نوٹ کی لیکن اس کے مزاج کی تبدیلی کو وہ نہ سمجھ سکا تھا۔ اس کی بھابھی اسے دیکھ دیکھ کر اپنے نینوں کی پیاس بجھانے میں ہر وقت ناکام پاتی تھی اور ہر وقت آتے جاتے ایک والہانہ پن سے اسے لپٹا لپٹا کر، چوم چوم کر اپنی گہری محبت کا اظہار کیا کرتی تھی مگر اب وہ اسے ایک پلک دیکھتی بھی تو چوروں کی طرح

انجمن آرا انجم

بکھرے خواب

میں وہ دن کبھی نہ بھول سکوں گی جب بجیا کو نہلا دھلا کر سفید جوڑا پہنا دیا گیا تھا۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا اور بجیا سب سے بے خبر ابدی نیند سو رہی تھیں۔ راشد بھیا ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہے تھے۔ بالکل خاموش اور حیران۔ میں کبھی بجیا کی طرف دیکھتی اور کبھی بھیا کی طرف بجیا کی آنکھیں اب بھی کچھ کچھ کھلی تھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی تک راشد بھیا کا انتظار کر رہی تھیں۔ بھولے بھولے چہرے پر اطمینان کی لہریں رقصاں تھیں۔ سکون کی جھلکیوں میں بجیا کا عزم اور فیصلہ صاف نظر آ رہا تھا۔

بجیا سے جب میری ملاقات ہوئی تو میں بہت متاثر ہوئی۔ بھیا نے جو باتیں ان کے متعلق بتائی تھیں وہ قریب قریب سب ہی سچ نکلیں۔ ان کا اخلاق، ان کی عادات اور ان کا پیار مجھے بری طرح ان کی طرف کھینچتا لے گیا۔ نہ جانے ان میں کیا مقناطیسی قوت تھی کہ پہلی ہی بار میں ان کے اتنا قریب آ گئی تھی کہ برسوں کی بے تکلفی بھی مجھے کسی سے اتنا قریب نہ کرتی۔ اسی وقت میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اگر میں اپنے بھیا کی کسی سے شادی کروں گی تو وہ بجیا ہی ہوں گی۔ اور جب میں نے بھیا کو اپنا یہ فیصلہ سنایا تھا تو خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ ان کے دل کی بات ہونٹوں پر آ ہی گئی۔

بس یہی تو میری بھی آرزو ہے صفو۔ وہ ہمیشہ مجھے پیار میں صفیہ کی بجائے صفو ہی کہتے۔

کچھ دیر بعد ذرا اداس لہجہ میں بولے بس صفو۔ یہ فیصلہ تو یک طرفہ ہے۔ کیا معلوم تمہاری بجیا پسند بھی کریں گی یا نہیں۔ میں نے دیکھا ان کے چہرے پر خوشی کے بجائے مایوسی کی لکیریں کھنچ گئی تھیں۔

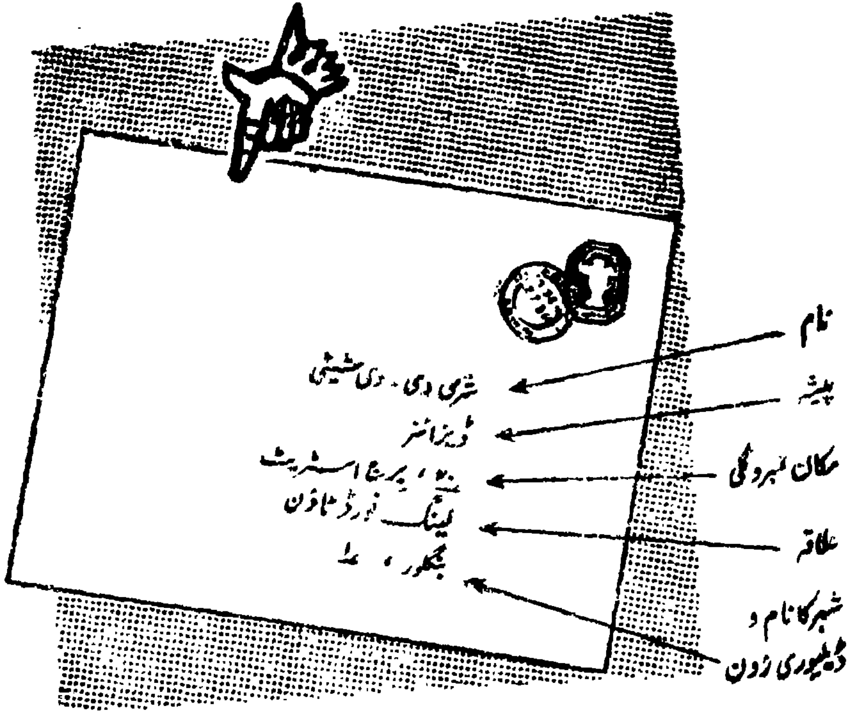
میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ تم ہمیشہ ایسی اوٹ پٹانگ باتیں سوچا کرو بھیا۔ تم لڑکے ہو۔ کسی لڑکی کے دل کی بات کیا جان سکتے ہیں نہیں معلوم وہ تم کو کتنا چاہتی ہیں۔ جب میں ان سے ملی تھی تو پورے وقت تمہارے متعلق باتیں کرتی رہی تھیں۔ میں ان کو راضی کر لوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ اور میں نے خوشی میں اپنے بھیا کو پیار کر لیا تھا۔ وہ میرے رخسار پر ہلکا سا چپت رسید کر کے باہر چلے گئے تھے۔

....

"بجیا کے چہرے پر کتنا بھولاپن اور سکون ہے۔ پریشانی کی جھلک تک نہیں"، نسرین نے مجھ سے کہا۔

"کیوں نہ ہو، انھوں نے اپنا مقصد پا لیا۔ جو زبان سے کہا تھا وہ کر دکھایا۔" میں نے جواب دیا۔ بڑے زور و شور سے گریہ و زاری

چٹھیوں پر پتہ لکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے



پتہ پورا ہو تو ڈاک
ٹھیک جگہ پر اور جلدی پہونچتی ہے



محکمہ ڈاک و تار

اور کیا چاہیئے۔ میں تو اپنی زبان دیئے دیتی ہوں۔ شہناز کی ماں نے اپنی پسند کا اظہار کیا۔
کچھ دیر شہناز خاموش رہی۔ پھر بولی۔ ہو گا خوبصورت اپنے لیے۔ مجھے کسی کال کی درکار نہیں ہے۔ آج کل تو نہ جانے کتنے ایم۔اے مارے پھرتے ہیں۔ مجھے یہ رشتہ قطعی منظور نہیں۔
ذرا زبان سنبھال کر بول۔ نہ شرم نہ غیرت۔ یہی سکھایا ہے استانیوں نے جمال کے لیے کہا تو انکار کر دی خورشید کے بارے میں پوچھا تو انکار کر دیا۔ عجیب پسند نہیں۔ پھر کون آسمان سے اترے گا جس سے تو کرے گی، شہناز کی ماں غصے سے بپھر گئیں۔
میں کسی شہزادے سے نہیں اسی دھرتی پر رہنے والے کسی انسان سے شادی کروں گی، شہناز نے بڑے عزم کے ساتھ کہا۔
خبردار جو آج سے میرے سامنے زبان کھولی۔ دیدے کا پانی ڈھل گیا ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ شہناز نے بھی زیادہ اثر نہ لیا۔
یہ سب باتیں مجھے بجیا نے بعد میں بتائیں۔ میں نے شہناز کے بجائے ہمیشہ بجیا ہی کہا تھا ان کو۔

. . . .

بجیا کا مکان کچھ دور پر تھا۔ جب ان کا جی گھبراتا وہ مجھے بلا لیتیں یا میرے پاس چلی آتیں۔ ان سے میری کوئی رشتہ داری نہیں تھی مگر انھوں نے مجھے وہ خلوص دیا تھا جو سگے نہ دے سکے۔ ان کا سب سے بڑا وصف یہی تو تھا کہ اعلی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمدردی اور محبت ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ میں اور بھیا ان کی اسی خوبی پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ بھیا نے فیصلہ کر لیا تھا اگر زندگی میں کسی لڑکی کو اپنانا ہے تو وہ صرف بجیا ہیں۔ دن میں کتنی ہی بار بجیا کو یاد کرتے۔ بجیا کے دل میں بھی بھیا کی بے پناہ محبت تھی جس کا اظہار زبان سے کم کرتی تھیں۔ مگر بھلا نگاہِ محبت بھی کہیں چھپ سکتی ہے۔ خیالات کی ہم آہنگی نے دونوں کو اتنا قریب کر دیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ رہ کر زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔
بھیا کوئی چیز لاتے تو کہتے۔ اپنی بجیا کو دے آؤ۔ بجیا بھی کوئی چیز بناتیں تو ہم دونوں کو ضرور بھیجتیں۔ اسی بات پر انھوں نے کئی دفعہ ڈانٹ بھی کھائی تھی مگر محبت کی گہرائیاں اس ڈانٹ کو بھی پی گئیں۔

. . . .

صبح سے میری طبیعت الجھ رہی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بھیا نے چھیڑتے ہوئے کہا۔ اپنی بجیا کو بلا لو ان کے پاس چلی جاؤ۔ تمہارا موڈ آن ہو جائے گا۔
ان کے مشورے پر فوراً ہی عمل شروع کر دیا میں نے۔
صفو میرا سلام پہونچا دینا۔ اور کہنا بہت یاد آرہی ہے، بھیا نے اپنے دل کی بات کہہ دی
سلام خود پہونچاؤ۔ میں نہیں پہونچاؤں گی، مجھے شرارت سوجھی اور فوراً ہی بجیا کے گھر کی طرف رخ کیا۔
بڑی زبردست جنگ چھڑی ہوئی تھی وہاں تو۔ سارا خاندان ایک طرف اور بجیا ایک طرف۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جانے کب سے اشک ریزی کر رہی تھیں۔ اشارہ سے مجھ سے بیٹھ جانے کو کہا۔
میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔ صفو اب تم آگئی ہو۔ مجھے سکون مل گیا ہے، کتنا درد تھا ان کی آواز میں۔ میرا جی چاہا کائنات کی ساری مسرتیں بجیا کے قدموں پر بکھیر دوں۔
ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ جان چلی جائے گی مگر یہ ممکن نہیں، چند ملی جلی مردانی آوازیں گونجیں۔ میں بھی خوف سے کانپ اٹھی۔ یہ آوازیں بجیا کے والد اور بھائیوں کی تھیں۔
آج تک خاندان میں ایسا ہوا ہے۔ لڑکیاں نہیں بولتی تھیں ان معاملات میں والدین نے منگنی اور نکاح کر دیا قصہ ختم۔ بیسویں صدی ہے جو نہ ہو کم ہے۔ اب تو یہ زمانہ آگیا ہے کہ خود ہی بر تلاش کر لیں۔ خدا غارت کرے اس زمانہ کو۔ قیامت قریب آگئی ہے کیا

کا طوفان اٹھا۔ کتنا دردناک اور عبرت انگیز منظر تھا وہ بھی، ہر آنکھ نم ہو رہی تھی۔ اب بھی جب خیال آجاتا ہے تو جسم کا رواں رواں اٹھتا ہے۔ بھیا تو تصویر غم و حیرت بنے کھڑے تھے۔ شاید انھیں اپنی بھی خبر نہ تھی۔ نگاہیں بجیا کے زرد چہرہ پر مرکوز تھیں جہاں خون کا نشان تک نہ تھا۔ جیسے ہی بجیا کا پلنگ اٹھایا گیا۔ ان کی چیخ نکل گئی۔ آنسوؤں کا بندھ ٹوٹ چکا تھا۔ سسکیاں بھرتے ہوئے بولے۔ صفو۔ یہ کیا ہو گیا؟ آخر کیوں ہو گیا؟ ہچکیوں میں ان کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

میں اس وقت کچھ جواب نہ دے سکی۔ میری آنکھوں میں تو خود آنسوؤں کی ہزاروں شمعیں روشن تھیں۔ لیکن بھیا یہ کیوں کہہ گئے تھے جس سماج کے وہ ایک فرد ہیں اس میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ لڑکیاں اسی طرح گھٹ گھٹ کر اپنی ارتھیاں تیار کرتی رہیں گی۔ میکہ سے لڑکی کا ڈولہ نکلتا ہے یا پھر جنازہ۔ اتنی ترقی کرنے کے بعد بھی انسان جہاں تھا وہیں ہے اور شاید وہیں رہے گا۔ لڑکیاں اس قابل ہوتی ہی کہاں ہیں کہ زندگی کے اہم معاملات میں اُن کی رائے لی جائے۔

بجیا ہم سے دور بہت دور چلی گئیں۔ بھیا نے کئی دن تک دانہ کھایا نہ پیا۔ ان کے زخم کون بھر سکتا تھا۔ میں ان کی یہ حالت دیکھ کر اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ ان سے چھپ چھپ کر روتی۔ اوپر سے ان کو تسلیاں دیتی۔ کئی دن بعد بھیا کی محبت کا واسطہ دے کر ان کے منہ میں دو چار لقمے ڈال دیئے۔

بھیا کی زندگی ویران ریگستان کی طرح بن گئی تھی۔ ان کے لیے اب دنیا میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر کھڑے تھے جہاں مایوسیوں اور موت کی ہولناک تنہائیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ بجیا تو اپنا عزم پورا کر کے چلی گئی تھیں اور بھیا تنہا غم کے بحر ناپیدا کنار میں تیر رہے تھے۔ وہ بھی اس زندگی سے جس میں اب کوئی دلکشی باقی نہ تھی کنارہ کشی اختیار کر لیتے مگر میری وجہ سے انھیں ہر حالت میں زندہ رہنا تھا۔

میرے سامنے ماضی کا البم کھل گیا۔ بجیا کی کتنی ہی تصویریں ابھر آئیں۔ پیار و محبت کی دیوی۔ جوان۔ خوش گفتار۔ بھیا کی عزیز ترین متاع۔ بجیا کا وہ غمگین اور اداس چہرہ جس دن ان کی آرزوؤں کا بڑی بے دردی کے ساتھ گلا گھونٹ گیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی ویرانی اور پھر بجیا کا وہ آخری روز جہاں دور تک کسی مایوسی کا نام نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں کی بے پناہ چمک۔ ان کا پرخلوص وہ لہجہ۔ ان کی محبت کی وہ انتہا۔ ان کا وہ آہنی عزم جس دن انھوں نے اپنا آخری فیصلہ سنایا تھا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ کہنے لگیں۔ صفو یہ ہاتھ صرف تمہارا اور تمہارے بھیا کا ہے۔ کوئی اور، کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔ اسے چھونے کا حق رکھ سکے گا۔ بیساختہ میری چیخ نکل گئی۔

کیا ہے صفو؟ بھیا ایک دم تڑپ اٹھے۔

کچھ نہیں۔ جیسے مجھ پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو بھیا کو سب باتیں بتائیں۔ بجیا پر کیا کیا گزر رہا۔ ان کی شب زندگی کی سحر کیسے ہوئی۔ کن دشوار گزار مراحل سے سابقہ پڑا تھا انھیں۔

کتنا عرصہ ہو گیا ہے بھیا بجیا کو اس دنیا سے گئے ہوئے۔ مگر کتنا اٹوٹ ہے یہ محبت کا بندھن۔ اب بھی ان کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں جن کا حق دار وہ تم کو بتا گئی تھیں۔

بھیا دور خلاؤں میں گھورنے لگے جیسے کسی کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کر رہے ہوں۔

....

بجیا کے باب حیات کا ایک اور ورق پلٹا ....

میں کہتی ہوں آخر بھیا میں کیا خرابی ہے۔ ایم اے ہو۔ اچھی ملازمت پر ہے خوبصورت اور مالدار ہے۔ ایک لڑکا

میرا ذہن بیکار ہو چکا تھا۔ بے انتہا پریشان تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں۔ میں نے بھیا کو بلا بھیجا۔ بڑی مشکل سے بھیا آئیں۔ افسردہ و غمگین۔ ان کا تو جیسے کارواں لٹ چکا تھا۔ ساتھی بچھڑ چکا تھا۔ اور منزل کا دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ مگر ان کی آنکھیں ان کے عزم او فیصلہ کا پتہ دے رہی تھیں۔

کچھ دیر ہم تینوں خاموش رہے۔ حسرت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔ بھیا کے لب وا ہوئے۔

"راشد" (اف شدت جذبات اور غم سے ان کی آنکھیں بند ہو گئیں) میں تمہارے حضور میں ایک التجا لے کر آئی ہوں۔ ایک بھیک دے دو۔ تم مت جاؤ۔ تمہیں یہیں سرو س مل جائے گی۔ میرا خیال نہ کرو مگر صفو تو تمہاری بہن ہے۔" ان کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے۔

"میں ضرور جاؤں گا۔ فیصلہ کر چکا ہوں۔ اور جو فیصلہ کر لیتا ہوں پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔" نا امیدیاں جو ان کی راہ میں بچھ گئی تھیں تو وہ کیسے نہ جاتے۔

"تم کہیں نہیں جانا چاہیے" راشد" سسکیاں بھرتی ہوئی بھیا بولیں۔

"میں یہ جگہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہاں کچھ نہیں ہے کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ میں غریب ہوں۔ ابھی ملازم بھی نہیں ہوں۔ تم میرے پاس رہ کر خوش نہ رہ سکو گی" بھیا کے جذبات کو بڑی زبردست ٹھیس ہو چکی تھی جب ہی تو وہ ایسی باتیں کر رہے تھے۔

"راشد بھیا یہ کیا کہہ رہے ہو۔" میں چلائی "کس سے کہہ رہے ہو۔ تم نے ابھی تک بھیا کو نہیں پہچانا۔"

بھیا کے اعتماد کو دھچکا لگا۔ ان کے دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی۔

"راشد میرے نزدیک امیری غریبی میں کوئی امتیاز نہیں۔ میں تو صرف انسان کی انسانیت دیکھتی ہوں۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی مت جاؤ۔"

مگر بھیا تو چلے ہی گئے" بھیا کی التجا بھی کام نہ آسکی۔

ہفتے گزر گئے۔ بھیا کا کوئی خط نہیں آیا۔ بھیا کو میں نے پھر کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔ نہ کسی تقریب میں دیکھا۔ نہ سنورتے دیکھا۔ بھیا کے کئی پیغام آئے مگر انھوں نے ہر ایک کے لیے انکار کر دیا۔ ان کا ایک رشتہ کا بھائی پاکستان سے آیا تھا۔ بھیا کو بہت پسند کرتا تھا۔ چاہت ان کی زندگی میں قوس وقزح کے رنگ بھر دے مگر بھیا نے تو عہد کر لیا تھا کہ وہ بھیا کے علاوہ کسی کی نہ بن سکیں گی۔ اداسی ان کی ہمنو اور آنسو ان کے ساتھی تھے۔ زمانہ کے دیئے ہوئے غم ناسور بن بن کر رس رہے تھے۔ مگر دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ روایات کے موجب وہ سب کچھ سہہ رہی تھیں۔ بھیا کی خیریت کئی دفعہ دریافت کرائی مگر مجھ بدبخت نے کوئی تسلی آمیز جواب نہ دیا۔

کچھ دن بعد بھیا کا ایک بہت مختصر خط ملا

"صفو۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ میں تم کو جلد بلاؤں گا۔ تمہاری بھیا کے حال تو ٹھیک ہوں گے۔

تمہارا بھائی راشد"

خط پڑھ کر روتی رہتی۔ کرتی بھی کیا۔

بھیا نے مجھے نسرین کے ذریعہ بلایا۔ میں فوراً گئی۔ دیکھ کر کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھیں۔ میں پہنچی تو ان سے لپٹ کر رونے لگیں۔ میں بھی بہت روئی۔ ساتھ ساتھ تسلی بھی دیتی گئی۔

صفو۔ میری تو جان پر بنی ہے۔ زمانہ نے بری طرح کھیل دیا ہے۔ کس سے شکایت کروں اور کس کی کروں۔ تمہارے بھیا بھی گئے۔ انھیں شاید میری محبت پر بھروسہ نہ تھا۔" ان کی آنکھیں روتے روتے لال ہو گئی تھیں۔

کتابوں میں لکھی ہوئی باتیں غلط ہیں۔ جب ہی کہتے ہیں لڑکیوں کو پڑھانا ٹھیک نہیں۔ بجیا کی ماں گرج رہی تھیں۔ اور بجیا تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ میں خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔

کچھ دیر تک تو بجیا سب سمجھتی رہیں۔ صبر کے بندھن آخر کب تک نہ ٹوٹتے۔ وہ روتے ہوئے کہتی جاتی تھیں۔

لڑکیوں کو کبھی نہ پڑھائیے۔ تاکہ وہ کہیں خود اپنا اچھا برا نہ سوچ لیں؛

'ہاں بڑی آئیں اچھا برا سوچنے والیں۔ خبردار جو مجھ سے ایسی باتیں کہیں۔ تیری اتنی مجال کہ تو ہم سے منہ زوری کرے۔ جہاں ہم کریں گے وہاں ہوگی تو اس معاملہ میں بولنے والی کون ہوتی ہو'۔

بجیا آخر بول ہی پڑیں۔ آخر راشد میں کیا خرابی ہے۔ کتنے اچھے ہیں وہ۔ ہزاروں میں ایک۔ میں ...... میں تو بس ... بھی لیتے ہی ان کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔

'کون راشد۔ تو یوں کہہ اس سے شادی کرنے چلی ہے۔ نہ ناطے دار نہ رشتہ دار۔ نہ خاندان معلوم۔ مجھے کیا معلوم یہ راز ہے'، بجیا کی ماں غضبناک ہو گئیں۔ میرے دل میں بھی اپنے بجیا کے خلاف سنتے ہوئے نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا۔

'آپ اچھی طرح جانتی ہیں ماں۔ آپ نے تو خوب دیکھا ہے۔ وہ مجھے .... بہت ..... بہت ہی پسند کرتے ہیں'، ہونٹوں پر الفاظ بکھر رہے تھے۔

'تیری شادی راشد سے ہرگز نہ ہوگی'، بجیا کی ماں فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

'ماں سن لیجئے اس چوکھٹ پر مجھے لینے نہ جمال آئے گا نہ خورشید۔ صرف راشد آئے گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں نے زبان دی ہے۔ اپنے وعدہ سے انکار نہیں کر سکتی'، بجیا کا وہ پر وقار لہجہ اور ان کا عزم مصمم۔ زمانہ کی کوئی طاقت جس سے ان کو روک نہ سکی۔ میں نے دیکھا ان کے تمتمائے ہوئے چہرے پر سکون چھا گیا تھا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا ان آنکھوں میں وہ بے پناہ خلوص اور عقیدت کے ہزاروں رنگ۔ انھوں نے بے ساختہ میرے ہاتھوں کو چوم لیا۔ میرے چہرے پر بھی ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ ان کے رخ روشن پر میں نے مسرت کی وہ آخری جھلک دیکھی تھی جس کے بعد ان کے ہونٹ کبھی ہنسی سے آشنا نہ ہو سکے۔ جس طرح منزل پر پہنچ جانے کے بعد مسافر کو اطمینان مل جاتا ہے اسی طرح بجیا کی ساری بے چینیوں کو قرار آ گیا تھا۔ ان کی کشتیٔ حیات کو ساحل مل گیا تھا۔

ایک غصیلی آواز گونجی؛ 'کان کھول کر سن۔ یہ نہیں ہوگا'۔ یہ والد کی آواز تھی۔

بجیا کے دل میں جیسے ہزاروں خار چبھ گئے۔ ان کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ ان کی کائنات لٹتی نظر آ رہی تھی۔ ان کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے چھن گئی۔ ان کا دلی کرب چہرہ پر بری طرح نمایاں تھا۔

میں بے قرار ہو اٹھی۔ بڑھ کر ان کا غمگین چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔ ان کی تکلیف کی میں تاب نہ لا سکی۔ تمناؤں کا خون آنسو بن کر بہہ رہا تھا۔ ہچکیوں کے درمیان اتنا ہی کہا۔ صفو۔ میں تمہاری ہوں۔

....

میں نے سارا ماجرا آکر بھیا کو سنایا۔ ان کی غیرت کو زبردست دھچکا پہنچا۔ ایک طرف خودداری اور دوسری طرف محبت کا سوال، ان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ وہ اٹھے اور بستر سمیٹنا شروع کر دیا۔

بھیا یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے استعجاب سے پوچھا۔

'میں یہاں ایک منٹ نہیں رہنا چاہتا۔ میں یہاں سے لکھنؤ جا رہا ہوں جب بھی ملازمت مل جائے گی تم کو بلا لوں گا'، بھیا ایک سانس میں کہہ گئے۔

مزاحیہ

خواجہ اطہر حسین

بعض آزمائشی لمحے

زندگی کے وہ لمحے جب انسان اپنے آپ کو عقلمند تصور کرتا ہے، بالعموم اس کی بیوقوفی کے شاہد، اور دوسروں کے لیے سرمایہ تفریح و تفنن ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ موقعے ایسے بھی آتے ہیں جب انسان اپنے آپ کو بالکل بے وقوف یا زلاحمق تصور کرتا ہے اور اس طرح ایک دوسرے انداز سے دیکھنے والوں کے لیے ضیافت طبع کا سامان مہیا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ موسم بہار کی ایک حسین صبح ہے۔ باد بہار کے جنون پرور جھونکے ایک طرف تو پانی کی لہروں سے کھیل رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے والہانہ جذبات کو گدگدا رہے ہیں۔ اور ہم اس رومانی ماحول میں، ایک خیالی پیکر کی یاد کے کنارے محو گلگشت ہیں۔ پیمانۂ دل جوش نشاط سے لبریز ہے، اور طبیعت خدا جانے کیسی کیسی امنگوں سے گلے مل رہی ہے۔ ارمانوں اور تمناؤں کے اس ہجوم میں ایک بار جو نظر اٹھتی ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان حسین خوابوں کی حسین تعبیر نگاہوں کے سامنے ہے یعنی ایک فریب نظر، مہوش پر جمال و پر تمکین، جس کی پشت ہماری طرف ہے۔ ندی کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی نکلتے ہوئے سورج کی کرنوں سے۔ سبزہ کے فرش مخملیں سے۔ اور ندی کی لہروں کے رقص پر پیچ و خم سے۔ لطف اندوز تماشا ہے۔ ہلکے نارنجی رنگ کا سادہ سا لباس آئینہ دار عالم دوشیزگی ہے۔ اعضا میں دلفریب تناسب ہے۔ اور انداز نشست غزل خوان شباب ہے۔ پہلے تو حیرت و استعجاب نے قدم روکے۔ مگر دوسرے لمحے وفور شوق نے دستگیری کی اور ہم آگے بڑھے۔ سوچا کہ بارگاہ حسن میں کیا پیشکش لے کر حاضر ہوں۔ دائیں بائیں نظر ڈالی تو پاس ہی کی جھاڑی میں گلاب کا ایک شاداب پھول نظر آیا۔ دل نے کہا تردد کی کیا بات ہے یہی تو وہ موقع ہے جس کے لیے بزرگ بتا گئے ہیں کہ "برگ سبز است تحفہ درویش"۔ چنانچہ پھول توڑ لیا اور دونوں ہتھیلیاں پھیلا کر بیچوں بیچ پھول کو جگہ دی اور دبے پاؤں کچھ اور قریب ہو گئے۔ جی چاہا کہ سامنے جا کر اس فقیرانہ تحفہ کو پیش کریں۔ مگر رعب حسن نے اس جسارت کی اجازت نہ دی۔ لہذا اس جان بہار کی نظروں سے اوجھل رہتے ہوئے۔ ہاتھوں کو ایک جانب سے بڑھا کر نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ ہتھیلیوں پر پھول دیکھ کر اس مجسمہ رعنائی کی صراحی دار گردن مڑی۔ نورانی پیشانی اور ستواں ناک کی ایک جھلک کے ساتھ ان شگفتہ لبوں پر لطیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک عجب انداز دلربائی سے ایک صاف باطن جوان رعنا کی سیاہ ڈاڑھی تک پھیل گئی۔ خواب محبت کی اس دوسری تعبیر کے بعد کی داستان غیر دلچسپ ہے کیونکہ زیادہ تر غرق انفعال اور احساس ندامت کی داستان ہے۔

اگر اس چھوٹی سی داستان حسن و عشق کے تتمہ نے آپ کی طبیعت کو بدمزہ کر دیا ہو تو آپ اسے نہ پڑھیے بلکہ اس کی جگہ یوں پڑھیے کہ ایک صاحب بڑی آن بان اور طمطراق کے ساتھ شاہراہ پر چلے جا رہے ہیں کہ یکبارگی کھلنڈری ہوا کا ایک شرارت پسند

نہیں بجیا۔ ایسا مت سوچو۔ وہ بہت پریشان ہو گئے تھے۔ تم نہیں جانتیں تم ان کی زندگی ہو۔ تم کو نہیں معلوم انھوں نے اپنا تاج محل بنایا تھا جس کی ملکہ تم تھیں اور ہو۔ شاہجہاں کا تاج محل تو سب نے دیکھا ہے مگر غریبوں کا کون دیکھ سکتا ہے۔ ان کی جگہ تو صرف ان دلوں ہوتے ہیں۔ بجیا کل بھیا کا خط آیا تھا۔ تمہاری خیریت پوچھی ہے۔

سچ۔ ان کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ انھوں نے کہنا شروع کیا۔ میری آخری خواہش ہے صفو تم اپنے بھیا کو بلا لو۔ میں ان کا آخری دیدار کرلینا چاہتی ہوں۔

اچھا بجیا ضرور۔ میں نے اسی دن بھیا کو تار دے دیا۔ اسی وقت سے انتظار دیکھنے لگی۔

اف وہ دن بھی کتنا بھیانک تھا۔ بجیا کے جوڑ جوڑ میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ بڑی تکلیف تھی ان کو کئی بار ڈاکٹر آیا۔ کتنے لوگ انھیں دیکھنے آئے مگر انھوں نے کسی کی طرف نظر تک نہ اٹھائی۔ اس دن ان کی ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے دیکھے تھے۔ نہ جانے اپنے کئے پر پچھتا رہی تھیں یا بجیا کی لٹتی جوانی پر۔ یا آنسوؤں میں ماں کا پیار امنڈ آیا تھا۔

بڑی کرب ناک آواز میں بجیا نے پوچھا۔ تم نے اپنے ...... بھیا ...... کو ...... اطلاع دیدی۔ آواز میں بلا کا درد تھا۔ جیسے رک رک کر زندگی اسی آواز میں سمٹ آئی ہو۔

وہ آتے ہی ہوں گے بجیا۔ اور میں ان کے سینے سے چمٹ گئی۔

ان کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ راشد بھیا کے انتظار میں۔ میری ایک نظر بجیا پر تھی تو دوسری دروازہ پر۔

انھوں نے میری طرف دیکھا۔ میں تاب نہ لا سکی۔ جیسے پوچھ رہی ہوں۔ تمہارے بھیا ابھی تک نہیں آئے۔ ان کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو رہی تھی۔ روشنی کی آخری کرن ختم ہوتی جا رہی تھی۔

آ صفو۔

اوہ بھیا اب آئے۔ دیر کر دی۔ بجیا نے دم توڑ دیا۔ ان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ بھیا کی آرزوؤں کا مدفن سامنے تھا۔ وہ تو تصویر حیرت بنے کھڑے تھے۔ تمناؤں کا خون چہرے پر جم گیا تھا۔

پھر بجیا کو سرخ جوڑے کی بجائے سفید جوڑے میں لپٹا دیا گیا۔ وہ مطمئن تھیں۔ ساری بیقراریوں کو قرار آگیا تھا۔ ہونٹ اب بھی ہلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے جیسے کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس سماج کے بندھنوں میں رہ کر بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

آنسو بھری آنکھوں سے بجیا کی ماں نے بجیا پر ایک نظر ڈالی۔ بہت دیر میں سمجھ میں آیا تھا کہ اگر راشد سے بجیا کا بیاہ رچا دیا جاتا کیا برا تھا۔

نہیں چاہتا کہ شارعِ عام پر لوگ اس کباڑ خانے کی ملکیت اس کی طرف منسوب سمجھیں۔ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اسے بھی بے تعلق راہ گیر دیں یا محض تماشائیوں میں شمار کر لیں۔ لہٰذا وہ پرانی دو ٹانگ کی تپائی اور ٹھیلے کے (جواب مفصلہ جوان ہے) پہیے پایوں والے پلنگ کی بہ حفاظت تمام لائے جانے کی نگرانی امکانی بے توجہی کی آڑ سے کرتا ہے مگر یہ ظاہری بے رخی در پردہ محبت کو چھپانے میں عبث و بے سود ثابت ہوتی ہے۔ دیکھنے والے بھانپ لیتے ہیں کہ انبارِ حماقت کی ضمیر کس طرف گھومتی ہے۔ یہ مردہ عجائب خانہ کس کی ساعیٔ جمیلہ رہینِ منت ہے۔

اس طرح کے چھوٹے موٹے واقعات تو گھر کے اندر اور گھر سے باہر۔ ہاٹ بازار میں۔ سفر حضر میں آئے دن دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی پُرخلوص عقیدت مند، لبے بال والے شاہ صاحب کے مزار پر چڑھاوے کے لیے بڑے چاؤ سے مٹھائی کا دونہ خریدتا ہے اور فضائے آسمانی سے اتری ہوئی ایک چیل جھپٹا مار کر دونہ کو نذرانہ پیش کرنے والے کی حدِ نظر سے کہیں بالاتر بلندی پر پہونچا دیتی ہے، اس وقت کا سماں بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوتا۔ مٹھائی بیچنے والا خوش کہ ایک اور دونے کے بکنے کی بات پکی ہوئی۔ دیکھنے والے خوش کہ بلا پیسہ خرچ کیے تماشہ دیکھنے کو ملا۔ چیل خوش چیل کے بچے خوش اور شاید دونہ کی مٹھائی بھی خوش کہ خطاکار انسانوں کے پیٹ میں پڑنے کی بجائے معصوم بچوں کا آذوقہ بنی۔ البتہ خوشی سے محروم ہے بیچارا خریدار، جو خجالت اور حماقت کی تصویر بنا ہوا کبھی زمین کو دیکھتا ہے کبھی آسمان کو۔ اس کا کھسیانہ پن قابلِ رحم تو ہوتا ہے۔ مگر دیکھنے والے باوجود کوشش کے ہنسے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی نانا جان کا چشمہ آنکھوں پر لگا ہوتا ہے اور نانا جان کی آنکھیں چشمے کو ڈھونڈتی ہیں۔ میز کے اوپر۔ میز کے نیچے۔ جیبوں میں۔ کتابوں میں۔ کاغذوں میں۔ یہاں اور وہاں۔ نانا جان چشمہ کی کھوج میں سرگرداں ہو کر آخر نواسے نواسیوں سے پوچھتے ہیں ارے کمبختو۔ کہیں چشمہ تو نہیں دیکھا؟۔ یہ سب حیرت سے نانا جان کے روئے مبارک پر نظر ڈالتے ہیں اور خوشی کی تالیاں بجاتے ہوئے ایسے فتحمندانہ انداز میں کہ گویا چشمۂ حیات کی سراغ رسانی کر رہے ہیں۔ نانا جان کو بتاتے ہیں کہ چشمہ تو ناک پر متمکن ہے۔ نانا جان خلافی آنکھوں کو پھیلا کر اپنے چشمہ کو دیکھنے کی ناممکن کوشش کرتے ہیں اور "اے ہاں۔" کے ساتھ مسکراہٹ کی تہوں میں احساسِ حماقت کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ ادھر بچے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ اب تو بڑھاپے میں نانا جان کو ناک کان تک کی خبر نہیں رہتی۔

جب برسات کے موسم میں بچوں کی بڑی خالہ جان۔ جو نہ صرف بڑی ہیں بلکہ خوب موٹی بھی ہیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ باوجود منع کیے جانے کے بیچ صحن سے ہو کر گزرتی ہیں پھسلتی ہیں سنبھلتی ہیں۔ اور پھر سنبھل کر پھسلتی ہیں۔ تو اللّٰہ سے دیکھنے والے اس موٹاپے کے باوجود ان کی حیرت خیز پھرتی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیچڑ میں لت پت خالہ جان کی خفت آپ بیتی۔ اور ان کے غیر ضروری گوشت کی تہوں کا ارتعاش قابلِ دید ہوتا ہے۔

خیر، یہ سب تو معمول کی باتیں ہیں۔ لیکن خود اپنی نسبت احمق پن کا احساس پیدا کرنے والے مواقع میں وہ موقع ایک انتہا درجہ انفرادی حیثیت رکھتا ہے جب گراں بارِ مادرِ وطن کی آبادی میں ایک تازہ اضافہ کی خوشخبری سننے کے لیے انسان کسی زنانہ ہسپتال کے احاطہ میں دیوانہ وار چہل قدمی کرتا نظر آتا ہے۔ اگر احساسِ حماقت میں کچھ کمی ہوتی ہے تو وہ نرسوں سے احمقانہ سوالات پوچھنے اور بے تکے جوابات سننے پوری ہو جاتی ہے۔ چہرہ متوحش۔ باتیں اُبھی اُبھی۔ تقریر میں بے ربطی۔ حرکات میں بدنظمی۔ اپنی حالیہ مکمل بےبسی کا احساس۔ یہ سب باتیں انسان کو یاد دلاتی ہیں کہ بڑی دھوم دھام سے احمق بنایا گیا تھا۔ احمق بنا تھا۔ اور اس وقت بھی احمق ہے۔ مگر گرہستی والے عجائب خانہ کی ملکیت کسی دوسرے سے منسوب سمجھے جانے کی خواہش مرغوب خاطر ہوتی ہے اور کبھی اظہارِ بے تعلقی موجبِ تسکین ہوتا ہے۔ مگر یہاں یہ راہ نجات بھی ممکن نہیں ہوتی۔ یہاں بے تعلقی کا اظہار خطرناک روش ہے۔ ذمہ داری سے پہلو تہی مردانہ علوئے ہمت کی نفی ہے اس موقع پر یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ اس تمام پریشانی کو کسی دوسرے کے سر منڈھ دیا جائے۔ اور یہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ دوست احباب اس بدحواسی کے عینی شاہد بنیں۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ جب جملہ مراحل بخیر و خوبی طے ہو جاتے ہیں اور اسپتال کی کار پرداز دیویاں

جھونکا ان کی ترچھے زاویہ سے زیب سر ٹوپی کے ساتھ خوش فعلیاں کرتا ہوا آن واحد میں اسے اڑائے جاتا ہے۔ اس زد کے وارد ہونے پر جو گوناگوں اثرات رونما ہوتے ہیں انھیں الفاظ میں قلم بند کرنا ذرا مشکل سی بات ہے۔ چلتا قدم رکتا ہے۔ رک کر بڑھتا ہے اور بڑھ کر پھر رک جاتا ہے۔ حیرت، ندامت، برہمی، برآشفتگی، غصہ، جھنجھلاہٹ۔ اور نہ جانے کتنے اسی طرح کے جذبات کی متحدہ یورش ہو جاتی ہے۔ تو نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بیچ سڑک پر کھڑا ہوا انسان اپنے آپ کو احمق محض کہنے اور تماشائی محظوظ ہوں۔ اس کی ایک نظر عتاب تو ٹوپی پر ہوتی ہے اور دوسری لعنت کا تماشہ دیکھنے والوں پر۔ ہوا کے جھونکوں کا کیا شکایت جب خود اپنی بے مروت ٹوپی جھونکوں کی دمساز بن جائے اور بدکے ہوئے پالتو جانور کی طرح نہ دور ہی بھاگ جائے اور نہ مالک کو پاس ہی آنے کا موقع دے۔ غصہ تو اس پر آتا ہے کمبخت دور سے للچاتی ہے۔ انتظار کرتی ہے اور جونہی گھبرایا ہوا ہاتھ گرفت کے لیے آگے بڑھتا ہے یہ ہرنی ایک نیا طرارہ بھر کر دس ہاتھ آگے نظر آتی ہے۔ اور پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ یہ انداز معشوقانہ محض ہلکی پھلکی ٹوپیوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ اچھے خاصے بھاری بھرکم ٹوپ جن سے متانت اور سلامت روی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جب ان کے سر پر سودا سوار ہوتا ہے۔ یا یہ کہ ان کے دماغ میں ہوا بھرتی ہے تو ایسی طفلانہ، نازیبا اور صبر آزما حرکتیں ان سے ظہور میں آتی ہیں جو کسی البیلی دوبلی کے خواب میں بھی نہ آئی ہوں۔

کہتے ہیں کہ بالحاظ اس کے کہ سستی ہے یا مہنگی، نئی ہے یا پرانی۔ بھاگی ہوئی ٹوپی کے دیوانہ وار تعاقب کی برابری اگر کوئی صورت حال کر سکتی ہے تو وہ بھاگی ہوئی بیوی کا تعاقب ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دونوں صورتوں میں بے تحاشہ گھبراہٹ اور وحشت کی بنا تھوڑی سی بچی کھچی عزت کے بچانے کی تمنا، اور بعض راز ہائے سربستہ کے کھل جانے کے خوف سے ہوتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بسا اوقات بھاگی ہوئی ٹوپی قدموں کے نیچے ہوتی ہے، اور بھاگی ہوئی بیوی کے قدموں پر سر ہوتا ہے۔ محرم راز ہونے کی حیثیت سے ٹوپی اور بیوی ہم پلہ ہیں دونوں میں سے کسی ایک کا اڑ جانا سر تاج میں سلامت کے حق میں نوید حماقت اور تمغۂ ندامت ہے۔ یوں تو کلاہ سکندر سے لے کر تاج زریں تک، ٹوپی، سرپوش کی طرح، سدا ستار عیوب رہی۔ مگر اس انتخابی دور میں صحیح کاٹ چھانٹ کی ہو، تو قاضی الحاجات بھی ہے اور کلید سرفرازی بھی۔

کچھ اسی طرح کی گومگو حالت انسان پر اس وقت طاری ہوتی ہے، جب نقل مکان کے سلسلہ میں اسے اپنی گھرداری کی کائنات آنے جانے والوں کی دعوت نظر کے لیے ٹھیلہ پر لدی نظر آتی ہیں۔ اسے یقین نہیں آتا کہ جس گھر کے ظاہری سلیقہ اور رکھ رکھاؤ پر اسے اتنا فخر و ناز ہے، اس کا عالم باطن ایسے غیر پسندیدہ اور ناگوار خاطر ملغوبے سے بھرا ہوا ہے۔ وہ بھی چور نگاہوں سے ان بدرنگ اور بدنما چارپائیوں کو دیکھتا ہے، جن میں سے بیشتر عمر طبیعی سے متجاوز ہو چکی ہیں۔ ان ڈھانچوں اور جھلنگوں کو دیکھتا ہے جنھیں اگر ہوم گورنمنٹ کی منظوری حاصل ہو جاتی، تو کبھی کا نذر آتش ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ چار میلے کچیلے گھڑے، وہ ایک آتش خوردہ و زنگ آلود انگیٹھیاں۔ پرانے تیل کے کنستر۔ فنائل کے خالی ٹین۔ خالی بوتلیں، ٹاٹ کے چھوٹے بڑے ٹکڑے، جو کبھی پردہ داری کرتے تھے اور آج مجرم افشائے راز ہیں۔ اخباروں کی ردی۔ طوطے کا پنجرہ۔ جس کا طوطا عرصہ ہوا کہانی بن چکا ہے۔ کچھ لوہے کا ٹوٹا پھوٹا سامان۔ کچھ لکڑی کا کاٹھ کباڑ۔ مشتے از خروارے۔ یہ ہے وہ گرہستی جو برسوں کی محنت کا سرمایہ اور بہت سی پرانی محبتوں کا مقبرہ ہے۔ ان سب کا بلا شرکت غیرے مالک، ٹھیلہ کے پاس کھڑا ہوا احمقانہ نظروں سے اس عجائب خانہ کو دیکھتا بھی ہے اور نہیں بھی دیکھتا۔ یعنی اس طرح دیکھتا ہے کہ کوئی نہ دیکھے کہ عجائب خانہ کو دیکھتا بھی ہے اور نہیں بھی دیکھتا۔ یعنی اس طرح دیکھتا ہے کہ کوئی نہ دیکھے کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ ایک طرف تو اس کا چاہت دل ان دیرینہ رفیقان حیات سے کسی ایک کے ایثار پر بھی رضامند نہیں ہوتا۔ اس کی وضع داری کا تقاضہ ہوتا ہے پرانے ازکار رفتہ خدمت گزاروں سے منہ نہ موڑے۔ بلکہ انھیں اپنی جان کے ساتھ گھر لیے پھرے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ

کتاب، لکھنؤ

مظفر حنفی

کوثر چاندپوری

(شعلۂ سنگ کی روشنی میں)

کوثر صاحب بے حد مخلص انسان ہیں خصوصاً مجھ سے بڑی شفقت کا اظہار فرماتے ہیں چنانچہ شعلۂ سنگ پر تبصرہ کرنے سے قبل مجھے کئی پہلوؤں پر سوچنا پڑا ہے اور اگر مجھے کوثر صاحب میں خود تنقیدی اور صاف بات پسند کرنے کا جذبہ نہ ملا ہوتا تو میں یقیناً خاموش رہنے کو ترجیح دیتا۔ کوثر صاحب کی ادبی عمر کم و بیش تیس سال ہے۔

میں اپنے بچپن سے برصغیر کے مقبول عام رسائل میں ان کی کہانیاں دیکھتا آرہا ہوں وہ بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ افسانہ، تنقید، تحقیقی مقالے طبی مضامین، ناول اور جانے کیا کیا لکھا ہے انھوں نے لیکن بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اردو افسانے کی تعداد میں تنہا اپنی ذات سے کم از کم پانچ چھ سو کہانیوں کا اضافہ کیا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے ناقدین نے دانستہ یا غیر دانستہ انھیں جس طرح نظر انداز کیا اور نظر انداز کرتے چلے جا رہے ہیں اس کی تلافی ہونی چاہیے۔

حال ہی میں ہمدرد اکیڈمی کراچی نے ان کے اٹھارہ افسانوں کا مجموعہ "شعلۂ سنگ" شایع کیا ہے اردو ادب کی بیکسی پر ترس آتا ہے آج ہمارے ناشرین جاسوسی اور فحش ناول منتہی کشادہ دلی سے شایع کر رہے ہیں افسانوں کے مجموعوں کی اشاعت کے سلسلے میں اتنے ہی زیادہ تنگ نظر ہیں اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کوثر چاندپوری جیسے پرانے لکھنے والوں کو بھی افسانوی مجموعے کی اشاعت کے لیے طبی اداروں کے نشر و اشاعت کے صیغے کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ پرانے اردو کے ادبی اشاعت گھروں کو اس مسئلے پر سوچنا چاہیے۔

کوثر صاحب ہر موقعہ پر زمانے اور نئی نسل کا ساتھ دینے کی اپنی سی کوشش کرتے ہیں چنانچہ "شعلۂ سنگ" کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں "اس (مجموعے) سے میرے اس بدلے ہوئے اسلوب کا اندازہ ہوگا جو سماج اور اس کے تقاضوں کے ساتھ تبدیل ہوتا رہا ہے جب زندگی کے تجربات کا اظہار ہے اور اس اظہار میں اس سماج کے تیور نمایاں ہوتے ہیں جس میں لکھنے والا سانس لے رہا ہے۔"

اس مجموعے کے نام کے انتخاب میں ہی کوثر صاحب نے نئی نسل کے ساتھ چلنے کی کوشش کی ہے، "شعلۂ سنگ" میں جو شاعرانہ لو ہے اس لحاظ سے یہ کسی شاعر کے مجموعۂ کلام کا نام معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے پتھروں سے شعلے نہیں اٹھا کرتے البتہ چوٹ پہنچانے پر چنگاریاں ضرور نکلتی ہیں۔ بہر حال نیا پن قابل اعتراض نہیں جبکہ اردو کی جدید ترین نسل کے شعری مجموعے "خالی مکان" اور "اظہار کی مدھی" جیسے ناموں کے ساتھ منظر عام پر آرہے ہیں۔

کوثر صاحب افسانہ نگاروں کی اس پود سے تعلق رکھتے ہیں جو پریم چند کے فوراً بعد منظر عام پر آئی تھی علی عباس حسینی، ایم اسلم، راحمد دہلوی اور سہیل عظیم آبادی جیسے چند لوگوں کو چھوڑ کر بقیہ تقریباً تمام افسانہ نگار بعد کی نسل میں ہیں منٹو، کرشن چند، بیدی،

بنا کر چاروں طرف سے حصار باندھ لیتی ہیں، تو اچھے اچھے عقلمند نہ محض بیوقوف نظر آتے ہیں۔ بلکہ صحیح معنوں میں بیوقوف بنتے ہیں پھر سب دوست احباب کا مجمع ہوتا ہے۔ مبارک باد کے تحفے پیش کیے جاتے ہیں۔ دعوت کھلائی کھائی جاتی ہے۔ تقریریں ہوتی ہیں ہوتی ہیں۔ تو خاص کر مشتاق مقرروں کی زبان سے دو چار جوانی جملوں کا نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض منکسر مزاج تو ان خبط الحواس دیکھے گئے ہیں کہ خداوند تعالے کی اس ذیل پر احباب کا شکریہ ادا کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور اس طرح احمق بننے کی سند پر مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔ اور پھر جب تالیاں بجتی ہیں قہقہے بلند ہوتے ہیں تو آپ تقریر کے برمحل اور مناسب ہونے کے تصور سے شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں۔

صفحہ ۱۲ کا بقیہ

اختری سمجھی رضوی شراب پی آیا ہو اور ضرور اس نے کوئی خطرناک جرم کیا ہو۔

کیا سوچ رہی ہو اختری، تمہاری آنکھوں سے نفرت جھلک رہی ہے، کیا کروں میں یزید بننے پر مجبور تھا، مجھے دس روپے کے لیے یہ پھر زا پشاور سے ٹیکسی کا کرایہ دے کر جو کچھ بچا ہے وہ تمہیں پیش کر رہا ہوں لیکن نیاز اس روپے سے نہیں دی جا سکتی۔

روپے میرے پاس بھی ہیں اس نے پانچ پانچ کے دو نوٹ سجاتے ہوئے کہا اور نیاز ان سے بھی نہیں دی جا سکے گی۔

پیٹ تو بھرا جا سکے گا، سب کو ملا کر ایک کر لو! رضوی نے بجھی بجھی آنکھوں سے اختری کو دیکھتے ہوئے کہا صبح کی روشنی پھیل رہی تھی ان دونوں کے چہرے نہ تاریک تھے نہ روشن، آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں، سوچ رہے تھے یہ رات کیسی تھی، کتنی بلاخیز اور اندھیری!

جاگیرداری کا رواج ہوتا تو یقین ہے کہ کوثر صاحب اب تک کئی سوا فسانہ نگاروں کے استاد ہوتے۔ تشبیہات کی اختراع میں بھی ان کی یہ استادانہ چابکدستی عجیب دلآویز گل کھلاتی ہے ذرا چند بالکل ہی نئی تشبیہات ملاحظہ فرمایئے۔

"اس کی آنکھوں میں سیندور یا آم کی لالی سے ملتے جلتے سرخ ڈورے تھے، جو لمبی اور کالی پلکوں کے سائے میں اس طرح چمک رہے تھے جیسے شام کے دھندلکے میں بیر بہوٹیاں رینگ رہی ہوں یا افریقہ کے کانوں میں کیوزم گھر گیا ہو۔" (چھوٹی آنکھیں)

ایک مستری کی محبت کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"یہ آواز ان کے کانوں سے گزر کر دل تک پہنچی اور احساس میں جذب ہو گئی دل دھڑکنے لگا اور پھر ایسا لگا جیسے انھوں نے آپ ہی آپ اپنی چھاتی پر گھونسا مار لیا ہو۔" (چھوٹی آنکھیں) "اس ایک تھپیڑے نے ریاستوں اور جاگیروں کو بھی الٹ کر پھینک دیا۔ ایسا لگا جیسے زلزلہ نے زمین کے پرت اکھیڑ ڈالے ہیں، اوپر کی مٹی نیچے دب گئی ہے۔ اور نیچے کی اوپر آ گئی ہے۔" (اٹکا ہوا خط)

"چھپکلیاں وہ اس طرح انگاروں پر جما دیا کرتی تھی جیسے چڑیا انڈے دینے سے پہلے بار بار تنکے جما کر گھونسلے بنایا کرتی ہے۔" (کلثیا)

"اس کے گالوں کی موٹی موٹی جھریوں میں ماضی کے تھکے ہوئے دنوں کا اجالا چمک رہا تھا حال کی تاریکی اسکے اوپر چھا جانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اجالے اور اندھیرے کی یہ کشمکش میری توجہ کا مرکز بن گئی میں سوچنے لگا سانولے رنگ کا یہ ادھیڑ آدمی اب بھی روشنی اور تاریکی کے درمیان لٹکا ہوا ہے۔" (ہوں ہوں نہگا) "اپنے نقش و نگار اور طاق و محراب کے اعتبار سے وہ ایک تاج محل تھا جس میں مردے تو نہایت آرام سے قیامت تک سو سکتے تھے لیکن زندہ آدمی صرف ایک نظر دیکھ کر ہی محبت کی اس یادگار کے طرز تعمیر کو سراہ سکتے تھے۔" (کمیلے کا چھلکا)۔

منظر کشی پر بھی کوثر صاحب کو عبور ہے جس کی بہترین مثالیں "اندھیرے میں روشنی" "حصار" "جنم" اور "چھوٹی آنکھیں" میں ملتی ہیں اور جزویات نگاری میں تو ان کی باریک بینی اور مشاہدے کی وسعت کا مقابلہ اردو کے دو ہی ایک افسانہ نگار کر سکتے ہیں۔ "جیون کی پگڈنڈی" میں حمیدن بوا کے روٹیاں پکانے کا تذکرہ، "ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا" میں اسپتال کا ذکر اور "پرنالہ دہیں" میں حبیب اللہ کے حقہ تیار کرنے کا سلیقہ وہ جس طور پر بیان کرتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔

زبان و بیان کی یہ استادانہ گرفت پھر نادر تشبیہات گڑھنے کی قدرت، منظر کشی کا یہ سلیقہ، جزویات نگاری کا یہ کمال، سماج کے ہر اونچ نیچ کو دیکھتی رہنے والی یہ نگاہ اور مدتوں کے فنی ریاض کی عطا کردہ یہ چابکدستی کوثر صاحب کو ہمارے عہد کا بہت اہم افسانہ نگار بنانے کے لیے کافی تھے اگر ان کے ہاں وہ بنیادی خامیاں نہ ہوتیں جن کا ذکر میں کرنے جا رہا ہوں۔

ان کے افسانوں کے عنوانات بہت عام سے ہوتے ہیں۔ اور پہلی نگاہ میں پڑھنے والوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ پاتے "درا ثمت" "جنم" "جیون کی پگڈنڈی" "جگمگاتا دن چاندنی رات" "حصار" "دھرلا پریم" اور "ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا" جیسے عنوانات میں پائی جاتی ہے۔ ان کے افسانوں کی ابتدا بھی اتنے عام انداز سے ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کو پہلے ہی جملے یا زیادہ سے زیادہ پہلے پیراگراف سے ہی چونکا کر اس کی پوری توجہ اپنی جانب مرکوز نہیں کراتی۔ عام طور پر دو تین پیراگراف یا بعض اوقات دو تین صفحے پڑھنے پر کہیں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے افسانے کچھ اس طرح شروع ہوتے ہیں۔

"اب یہی آپ کے یہاں جھاڑنے آیا کرے گا بیگم۔" کو مہترانی اپنے برابر کھڑے ہوئے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئی بولی (دکھیلی منزل) رشید خاں وزیر ریاست امیر نگر نے شہر کے ایک مشہور رادھا گنج ان محلے میں سڑک کے کنارے شاندار دو منزل مکان لیا اور پرتکلف پارٹی کے بعد اس میں رہنے لگے۔ (پرنالہ دہیں)

"مرزا جمال بیگ اگریکلچر ڈیپارٹمنٹ میں مستری تھے۔" (چھوٹی آنکھیں) "عبداللہ عرف روٹی اور دلّا شراب کے نشے میں گم خرفو خاں کے چبوترے پر بیٹھا داغ کی ایک غزل گنگنا رہا تھا جس کو اس مہینے میں اس نے چیتا طوائف سے سنا تھا۔"

عصمت، عباس، شوکت صدیقی اور آج کے صف اول کے تمام لکھنے والوں نے ان کے بعد لکھنا شروع کیا اور اپنا اپنا مقام بنا لیکن اردو افسانے میں کوثر صاحب کا مقام ناقدین آج تک متعین نہیں کر سکے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ میں نہیں کہتا کہ کوثر صاحب نے بہت اچھا لکھا ہے لیکن انھوں نے بہت زیادہ لکھا ہے، بڑے خلوص کے ساتھ لکھا ہے، اس بات سے نہ میں انکار کر سکتا ہوں نہ کوئی ناقد۔ اب وہ اس منزل پر آگئے ہیں کہ ان کے تخلیق کردہ تمام ادبی سرمائے کا جائزہ لیا جائے۔ چھان پھٹک کر اور بری چیزوں کی نشاندہی کی جائے ان کی اچھی چیزوں کا ان کے کل میں کیا اوسط ہے اور دوسرے اہم افسانہ نگاروں کی بہ نسبت انھوں نے کتنا کم یا زیادہ اچھا لکھا ہے اس کا فیصلہ کیا جائے کہ کسی فنکار کے مقام کا تعین کرنا اس کے بغیر ناممکن ہے۔ ظاہر ہے اس طرح چھان بین کرتے ہوئے کوثر صاحب کی خامیاں بھی منظر عام پر آئیں گی اور خوبیاں بھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ کوثر صاحب اپنی خامیاں نکالنے والوں سے کبھی ناخوش نہ ہوں گے ناقدین کو اس کی پرواہ کبھی نہ ہونی چاہیئے البتہ اس ضمن میں ان کی مستقل خاموشی تعصب گنی جائے گی۔

کوثر صاحب کا یہ مجموعہ ایک طویل مدت کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ اس درمیانی عرصہ میں حالات کیا سے کیا ہو گئے، تقسیم کے بعد جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ اور اس کا ردعمل بھوپال جیسی ریاست میں رہتے ہوئے کوثر صاحب نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور ظاہر ہے وہ اس سے متاثر ہوئے ہیں ——— ان کی نگاہوں کے سامنے نچلا طبقہ ابھرا اور اس تیزی کے ساتھ ابھرا کہ اچھے اچھوں کو اپنی پگڑی سنبھالنا دشوار ہو گئی۔ جاگیردار عام لوگوں کی صف میں آگئے؟ عام لوگوں میں سے چند لکھ پتی ہو گئے۔ اتنی تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے پہلو دار زمانہ پر نگاہ رکھنا معمولی فنکار کے بس کی بات نہیں، پھر جذباتی تعلق بھی کوئی چیز ہے۔ یقیناً جاگیرداری نظام کے خاتمے نے بہت سے جاگیرداروں کو اس درجہ مجبور کر دیا کہ وہ تانگے چلانے لگے۔ اور بہت سے بھنگیوں کو اس قابل بنا دیا کہ ملازموں کے ذریعہ اپنے ٹھکانوں کی صفائی کرا سکیں۔ ایسے حالات میں چند بندھے ٹکے سیاسی نظریات رکھنے والے فنکار ہی اس لٹے ہوئے جاگیردار کو نفرت اور بھنگی کو ہمدردی کی نظر سے دیکھیں گے۔ کوثر صاحب سے یہی نہیں ہوا انھوں نے اپنے قلم پر کوئی سیاسی لیبل نہیں چپکایا۔ اور اس کی ہمدردیاں، بغیر کسی تفریق کے ان تمام لوگوں کے لیے عام کر دیں، جو ہمدردی کے مستحق نظر آئے۔ "پچھلی منزل" میں وہ ان حالات کا جائزہ لیتے ہیں جو ملیا بھنگن کو ملکا بھنگی پر ظلم کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم انھیں ریاست کے نام پر ملیا بھنگن سے محبت کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ یا اگر وہ "جنم" میں اس چمارن دایہ سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں جو کسی بھنگی کے یہاں بچہ پیدا کرانے سے انکار کرتی ہے تو ہم انھیں قصور وار نہیں قرار دے سکتے۔ "شعلۂ رنگ" کے ان اٹھارہ افسانوں میں انھوں نے جاگیردار، بھنگی، چمار، مستری، غنڈے، تانگے والے، مالک مکان، باورچی، موٹر ڈرائیور، وزیر، ملازمت پیشہ، ڈاکٹر، بیکار نوجوان، فاحشہ عورت، کھیلنے والے، مہاجر، اور اسی قسم کے جانے کتنے مختلف النوع کردار ڈھالے ہیں۔ موضوعات کی بھی ان کے پاس کمی نہیں۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم، متوسط طبقے کی بڑھتی ہوئی الجھنیں، تعلیم عام ہونے کے باوجود بے روزگاری، مکانوں کی قلت، اونچے طبقے کی سطحیت، نچلے طبقے کا اوچھا پن، معاشرے کی خامیاں، جنسی بے راہ روی، تعصب، سفارش اور اقربا پروری جیسے عام موضوعات پر قلم اٹھا کر انھوں نے پرانے لکھنے والوں کی لاج رکھ لی ہے۔

وہ اپنی بات کو بیباکی سے کہنا بھی خوب جانتے ہیں، "پچھلی منزل" "پرنالہ دہن" "وراثت" اور "بھٹکا ہوا خط" میں انھوں نے جس معاشرے کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے وہ جرأت ان کے جیسے ماحول میں رہ کر کم لوگ کر سکیں گے۔

اتنے دنوں سے اور اتنا زیادہ لکھتے لکھتے ان کا قلم خوب رواں ہو گیا ہے وہ اپنی بات وضاحت کے ساتھ کہنے پر قادر ہیں زبان و بیان کی غلطیاں ان کے یہاں بالکل نہیں ملیں گی اس معاملے میں وہ شاعروں سے زیادہ محتاط نظر آتے ہیں الفاظ کی نشست و برخاست کا ایسا سلیقہ اور اتنی صحیح زبان اردو کے نئے افسانہ نگاروں میں بہت کم کے ہاں ملے گی اگر شاعروں کی طرح افسانہ نگاروں میں بھی استادی

لحاظ سے اچھی بات نہیں۔ ایک ہی وقت میں بہت کچھ کہنے اور ایک مختصر افسانے میں بہت سے کرداروں کو متعارف کرانے کی کوشش اور کچھ تو بن سکی ہے مختصر افسانہ نہیں بن سکتی۔ اس قسم کی کوششیں "کھٹکا ہوا خط" "بکھیلے والے دادا" "دھندلا چہرہ" "سکیلے کا چھلکا" اور "بجلی منزل" میں واضح نظر آتی ہے۔ روزمرہ کی بات ہے بھوک بہت زور کی لگی ہو اور وقت گزرتا جائے تو ایک وقت وہ آتا ہے جب نقاہت بھوک کی جگہ لے لیتی ہے اور کوشش کرنے پر بھی کم کھایا جاتا ہے۔ حد سے زیادہ تفصیلی بیان کے ساتھ قاری کے ذہن کو کلائمکس میں پہنچنے کے لیے آمادہ کرتے ہوئے اگر ذرا سا توازن بگڑ جائے تو افسانہ غیر دلچسپ ہو جاتا ہے اور قاری کا تجسس ذہنی تھکاوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ افسانے کے درمیان غیر متعلق باتیں بشرطیکہ وہ در پردہ مرکزی تاثر کو ابھارنے والے ٹچز (TOUCHES) نہ ہوں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھی جاتیں آج کے اردو افسانے میں یہ خامی سب سے زیادہ کرشن چندر کے ہاں پائی جاتی ہے وہ بے حد تفصیل کے ساتھ بات کہنے کے عادی ہیں حالانکہ ان کی خوبصورت اور سجی سجائی ہوئی نثر پڑھنے والے کو بور نہیں ہونے دیتی لیکن فنی لحاظ سے یہ غیر ضروری تفصیل ان کے ہاں بھی خامی میں گنی جائے گی یہ ایک ہی چیز، ایک ناول کی جان مگر مختصر افسانے کے لیے زہر ہوتی ہو۔

کوثر صاحب عام طور پر افسانوں میں ایک ہی تکنیک اور لہجہ اختیار کرتے ہیں شاعری میں یہ چیز خوبی اور نثر خصوصاً افسانہ نگاری میں خامی سمجھی جاتی ہے طرز تحریر میں انفرادیت کے آنا اور چیز ہے لیکن تکنیک افسانوں کی نئی ہونی چاہیے۔ ان کے افسانے انداز بیان میں مماثلت ہونے کی وجہ سے یکساں اور سپاٹ محسوس ہوتے ہیں۔ کہانی کہنے کا یہ روایتی سانچہ پریم چند کے عہد میں ڈھالا گیا تھا۔ آپ لگ نئے نئے تجربات کر رہے ہیں کوثر صاحب کو بھی تکنیک کے تجربات کرنے چاہئیں جبکہ ان کے پاس دوسروں سے زیادہ موضوعات اور نہ تھکنے والا قلم ہے۔

ان کے افسانوں کی بنیاد کسی مرکزی تاثر پر کم اور کرداروں پر زیادہ ہوتی ہے لہٰذا ان کے بہت کم افسانے وحدتِ تاثر کی اچھی مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ کردار کے مختلف مسائل اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بڑی اچھی عکاسی کرتے ہیں لیکن کوئی بہت گہرا تاثر، زیادہ ہمدردی یا شدید نفرت اپنے کردار سے قاری کے دل میں نہیں پیدا کر پاتے کیونکہ یہ تاثر وہ کسی ایک مرکزی نقطے پر مرکوز نہیں کر پاتے جو نگاہ کو خیرہ کر سکے بلکہ اسے اتنا پھیلا دیتے ہیں کہ وہ بکھری بکھری سی دھندلی روشنی نگاہ کو چبھتی ہی نہیں۔ اس معاملے میں ان کی نظر کا دائرہ (فوکس) بہت وسیع ہے وہ ایک ساتھ بہت سی چیزیں دیکھ سکتے ہیں نزدیک کی بھی اور دور کی بھی اس لیے وہ اپنے کردار کی ظاہری وضع قطع، بول چال حرکات و سکنات کو تفصیل سے بیان کر لیتے ہیں منظر کشی اور ماحول پیش کرنے پر بھی ان کا قلم قادر ہے لیکن ان کی نگاہ میں وہ ایکس رے (X-RAY) والی خصوصیت نہیں ملتی جو کپڑوں اور کھال کے بھیتر اتر جائے اور یہی وجہ ہے کہ کردار کی جذبات نگاری کے موقع پر ان کا قلم سمٹ سمٹ کر چلتا ہے۔ ڈھیر سارے مختلف موضوعات پر یہ افسانے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دور کھڑے ہو کر کسی مجمع کی مجموعی تحلیل اور اس کی وسعت کی تفاصیل بیان کر رہے ہوں۔ لیکن وہ یہ بتلانے سے قاصر ہیں کہ یہ سارا مجمع کون سا تماشہ دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے کی وسعت کا تو اعتراف کروا لیتے ہیں لیکن گہرائی کا نہیں ظاہر ہے وہ مجمع میں شریک ہو کر خود بھی تماشہ دیکھیں تو اندرونی کیفیات بخوبی بیان کر سکیں گے حالانکہ اس طرح نگاہ کا کینوس محدود ہو جائے گا اور اتنی زیادہ چیزیں بیک وقت نہ دیکھی جا سکیں گی لیکن کیا کیا جائے کہ افسانہ یہی اختصار اور گہرائی چاہتا ہے۔

عام طور پر ان کے کردار یا تو انتہائی نیک اور شریف ہوتے ہیں۔ یا پھر انتہائی بدباطن اور کمینے۔ یہ انتہاپسندی کرداروں کو غیر فطری اور جامد بنا کر رکھ دیتی ہے۔ عبداللہ خاں (کھٹکا ہوا خط) شیخ منیر (چھوٹی آنکھیں) گرے ہوئے ہیں اور انھیں ان میں سے کوئی خوبی نہیں نظر آتی۔ کمال بیگ (چھوٹی آنکھیں) مثلاً (بجلی منزل) حمیدن بوا (جیون کی پگڈنڈی) کریم (بابے کریم) اچھے لوگ ہیں تو اتنے کہ برائی انھیں چھو کر نہیں گزری۔ اسی طرح واقعات ان کے ہاں بالکل فلمی انداز میں اچانک تبدیل ہو جاتے ہیں کہ کوئی

"کس کی بنی رہی ہے کس کی بنی رہے گی"۔ "کب تک تکتے رہوگے کب تک تنی رہے گی" (کھٹکا ہوا خط)
"کیا بکتی ہے بدذات" مجید بابو نے طیش میں آکر سامنے کھڑی ہوئی بندو کو خشمگیں انداز سے گھورتے ہوئے کہا۔" (جگمگاتا دن چاندنی رات) "کانووکیشن ایڈریس بہت شاندار تھا۔" (کیلے کا چھلکا) دوسرے اقتباسات کی بہ نسبت یہ آخری اقتباس پھر بھی کسی حد تک دلچسپ اتبا ہے لیکن اس دلچسپی کی وجہ جملے کی عمدیت نہیں بلکہ لفظ کانووکیشن ایڈریس کا عام فہم نہ ہونا ہے پہلے ہی جملے سے کوئی دلچسپ بات کہہ کر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرلینا اور پھر اس کی دلچسپی کو کلائمکس اور ممکن ہو تو اختتام تک اکساتے جانا یا کم از کم برقرار رکھنا ہی افسانہ نگار کی معراج ہے بہتوں کو یہ معراج نصیب نہیں ہوئی ہیں چاہتا تھا کل کوثر صاحب کو ہو۔

وہ اپنی تھیم کو کہانی کے تار و پود میں اس مہارت کے ساتھ گوندھنے میں کامیاب نہیں جس کی توقع ان جیسے کہنہ مشق اور اتنی لمبی ادبی عمر رکھنے والے فنکار سے کی جاتی ہے باقاعدہ پلاٹ پر مبنی "بابے کریم" کو چھوڑ کر جو اس مجموعے کا کامیاب ترین افسانہ ہے اور بے ساختہ ٹیگور کے "کابلی والا" کی یاد دلاتا ہے، ان کے بقیہ تمام افسانوں کے پلاٹ کی بندش چست نہیں ہے۔ "کیلے کا چھلکا"۔ "جیون کی پگڈنڈی" "ٹھیلے والے دادا" اور "دھنلا رحیم" وغیرہ تو خیر ان کے ایسے افسانے ہیں جن کا کوئی پلاٹ ہی نہیں جبکہ یہ پوری طرح کردار کے افسانے بھی نہیں کہے جا سکتے۔ "جگمگاتا دن چاندنی رات" "ادہم اسلئے، بات اٹھی، یار اٹا" خالصتاً طبی مسائل ہیں جنھیں گھما پھرا کر افسانہ بنا دیا گیا ہے۔ "چہرے" "کلثیا" "چھوٹی آنکھیں" "کھٹکا ہوا خط" "حصار" اور "دل ہوں ننگا" قدرے کم جھول کے ساتھ اختتام تک پہنچتے پہنچتے پلاٹ مکمل کر دیتے ہیں باقیماندہ افسانوں میں یہ خامی بہت نمایاں ہے۔ کلیہ ہے کہ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خوبی کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ کوثر صاحب کی جزئیات نگاری اور زبان و بیان پر قدرت اس معاملے میں ان کے لیے مضرت رساں ثابت ہوئی ہے افسانہ پڑھتے ہوئے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ قلم پر ان کا قابو نہیں رہ جاتا اور افسانہ بیجا طوالت کا شکار ہو جاتا ہے کامیاب افسانہ کی ایک خوبی اختصار بھی ہے بنیادی کردار یا تاثر کو ابھارنے کے لیے جتنا کچھ کہنا ضروری ہو اس سے ہٹ کر ایک بھی غیر ضروری جملہ افسانے کی خامی میں گنا جاتا ہے دوسری طرف کوثر صاحب کوئی خیال یا کردار لے کر چلتے ہیں راہ میں انھیں دوسرا خیال یا کردار مل جاتا ہے وہ اس کی بات کرنے لگتے ہیں اور مزید تفصیل میں چلے جاتے ہیں، خواہ اس کے بعد میں آنے والے خیال یا کردار کا افسانے کے مرکزی کردار یا خیال سے کوئی تعلق نہ ہو یہی وجہ ہے کہ ان کے وہ افسانے جو مختصر ہونے کی شکل میں کامیاب ہوتے اپنی موجودہ صورت میں سپاٹ اور بے جان نظر آتے ہیں۔ اپنی بات کے جواز میں "چہرے" کا حوالہ دوں گا۔ کتنا خوبصورت پلاٹ ہے۔ رام لعل اپنی شادی کے سلسلے میں سفر کر رہا ہے ٹرین پر وہ کسی کو اپنے ڈبے میں گھسنے نہیں دیتا اس جدوجہد میں اسے کئی ایسے مسافروں کے ساتھ، جو اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، سخت رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے منزل مقصود پر پہونچ کر جب وہ اپنے ہونے والے خسر کو دیکھتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ یہ ان مسافروں میں سے ایک تھے جنھیں اس نے دوران سفر اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر شادی طے نہیں ہو پاتی ہے اس پلاٹ کو افسانے کی شکل دیتے ہوئے ضرورت اس امر کی تھی کہ رام لعل کو اس شادی کے لیے انتہائی ضرورت مند دکھلایا جاتا تاکہ یہ شادی اس کی زندگی کی اہم ترین ضرورت نظر آنے لگتی پھر دوران سفر میں اس کے خسر کو ڈبے میں داخل ہونے سے روکنے کا منظر تفصیل سے بیان کیا جاتا کچھ ایسے موثر انداز میں کہ قاری کی تمام ہمدردی اس کے خسر پر مرکوز ہو جاتی پھر جب آخر میں رام لعل اور خسر کی ملاقات ہوتی تو ایک بڑی متاثر کن ڈرامائی فضا تیار کی جا سکتی۔ لیکن ان باتوں کے بجائے افسانہ ٹھیک ریل کے ڈبے سے شروع ہوتا ہے رام لعل مختلف مسافروں سے مختلف النوع موضوعات پر بحث میں الجھا رہتا ہے جس میں فرقہ وارانہ فسادات، آزادی، مذہب، زندگی کی ناہمواری، دولت کی غیر مساوی تقسیم، کھوکھلی تہذیب قسم کے گاڑھے مسائل زیر بحث آتے ہیں اور افسانے کا مرکزی خیال مجروح ہوتا رہتا ہے، اصل افسانہ بالکل آخری صفحے میں شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی کلائمکس نہیں ابھر پاتا ــــ یقیناً افسانہ نگار کو زندگی کے بارے میں بہت علم ہونا چاہیے لیکن اپنی تمام معلومات کا اظہار ایک ہی افسانہ میں کرنا فن کے

گربچن سنگھ

نئی ہندی کہانی

(ایک بحث)

کتاب کا نئی ہندی کہانی نمبر دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ہندی اور اردو کے افسانہ نگار کی حیثیت سے میں یہ سخت ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ اس سلسلہ میں چند حقائق اردو دنیا کے سامنے لاؤں۔

ہندی افسانوں کی دنیا میں "نئی کہانی" کا ذکر اچانک ہی چل پڑا ہے۔ دو چار برس پہلے اس نام کا کوئی وجود نہیں تھا۔ بلکہ افسانوں کے سلسلے میں (پچھلے دس سال کے افسانوں) کے عنوان ہی سے بات کی جاتی تھی۔ "نئی کہانی" نام کے پرچے میں سب سے پہلے "نئی کہانی" کا نام ہندی کے ایک نئے نقاد نامور سنگھ نے لیا۔ دراصل یہ ان کا تکیہ کلام تھا، اور ان کا مطلب آج کے لکھنے والوں سے تھا۔ لیکن چند دوستوں نے ایک گروپ بنا کر اس لفظ کو کچھ اس قدر اچھالا کہ یہ ان کے لیے اپنے پروپگنڈہ کا ذریعہ بن گیا۔ (ٹھاکر صاحب اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں۔) لیکن تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ حضرات آج تک نئی کہانی کی تشریح کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور وہ دو چار لوگ جو اکثر اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے ہیں، ان کے بیانات آپس میں میل نہیں کھاتے۔ میں اس کی تفصیل میں نہ جا کر صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ افسانہ پرانا کب تھا، اور نیا کب ہے۔ اور آج کا بھی اور کل جو افسانے لکھے جائیں گے وہ کیا ہوں گے ....؟ کیا انھیں "بالکل نئی کہانی" کہا جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب میں ہمیشہ تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ لکھنے کے نئے انداز اور حد میں جنم لیتی ہیں۔ لیکن ہندی ادب میں دیکھا گیا ہے کہ گنتی کے دو تین افسانہ نگار (موہن راکیش، راجیندر یادو، کملیشور) ایک گروپ بنا کر اور چند افسانہ نگاروں کو زبردستی فہرست میں شامل کر کے "نئے افسانہ" کا شوشہ چھوڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک نہیں کئی افسانہ نگاروں کو نظر انداز کیا ہے۔ آپ سب کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ اپنی مطلب براری کے لیے وہ کرشن چندر اور بیدی وغیرہ کو بھی نئی کہانی کار مانتے ہیں۔ (رام لعل صاحب کس دنیا میں ہیں) کتاب کے خاص نمبر میں جو افسانے شائع کیے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر افسانے آٹھ دس برس کے پرانے افسانے ہیں۔ اور یہ ہندی افسانوں کا کوئی بہترین انتخاب نہیں ہے۔ اس میں شامل کی گئی کہانیاں سطحی اور روایاتی ہیں۔

ہندی کے بے شمار پرچے نکلتے ہیں۔ لیکن کسی بھی اعلیٰ معیاری پرچہ نے "نئی کہانی" کو اہمیت نہیں دی۔ ان نئے افسانہ کا ذکر ضرور کیا ہے ان پرچوں میں کلپنا، کہانی، ماسٹر پیہ بھارتی، کادمبنی، جیوتنا، مادھیم وغیرہ آتے ہیں لیکن چند حضرات اپنے آپ ہی کو اس تحریک کا پیغمبر منوانے کے لیے کمربستہ ہیں۔ اس وقت نئی کہانی کے اس گروپ کی صرف دو تین پرچے ہمت افزائی کر رہے ہیں، دوسرے الفاظ میں یہ گروپ ان پرچوں پر حاوی ہے۔ وہ پرچے یہ ہیں راج کمل پرکاشن کا "نئی کہانیاں"، اور ٹائمس جین کا، سارکا، اور گیان اودے۔ آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں، کہ اس تحریک نے اچانک ہی کیوں جنم لے لیا ہے، اس کے پیچھے کیا مقصد ہے۔ اور کس کا روپیہ کام کر رہا ہے۔ ٹھاکر پرساد سنگھ

اچانک تانگے چلانے لگتے ہیں، دو ٹکے کے لوگ کم بخت کروڑپتی بن بیٹھتے ہیں۔ مقدمہ جیتنے والا کمال بیگ ایکسیڈنٹ میں چل بستا ہے، ذرا سی بے رخی پر حمیدن کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے، جاگیرداروں کو اپنی لڑکیوں کی شادی قلیوں سے کرنی پڑتی ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ یوں نہ ہوتا ہو۔ لیکن اتنے ڈرامائی انداز میں ضروری بات سمیٹ کر کہہ جانا اور غیر ضروری مقامات پر تفصیل میں جانا افسانوں کی تاثیر دھندلا کر دیتا ہے۔

اب کچھ متفرق باتیں سنیے۔ اکثر مقامات پر ان کے کردار انھیں کی زبان سے بولتے ہیں خواہ وہ کسی عمر، کسی مقام یا کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں بھنگیوں، موٹر ڈرائیوروں اور غنڈوں کی زبان سے ادبی جملے کچھ اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ جنس پر لکھتے ہوئے ان کا قلم جھجکا جھجکا سا محسوس ہوتا ہے اس لیے ایسے مقامات پر بیان کے طنز کی دھار کند ہو جاتی ہے۔ وہ کسی ایک سیاسی نظریے کے قائل نہیں کبھی کانگرس کا کوئی عمل انھیں اپنی جانب مائل کر لیتا ہے اور کبھی کمیونزم اپنے کسی سخت اصول کے باعث ان کی نگاہ سے گر جاتا ہے حالانکہ اب وہ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں انھیں منزل کا تعین کر لینا چاہیے۔ یہ غیر جانبدارانہ روش اچھی بھی ہے اور بری بھی۔ چنانچہ وہ بااوقات افسانوں کے ذریعے عزم و عمل کا پیغام دیتے ہیں لیکن ان کے افسانوں میں جن مسائل کا تذکرہ ہوتا ہے انھیں سلجھانے کے طریقے پر کوئی بحث کیے بغیر انھیں خاموشی سے گزر جانا پڑتا ہے۔ انھیں افسانوں کے درمیان ایسی انگلش لکھنے کا شوق ہے جس کا مفہوم وہ بآسانی اردو میں ادا کر سکتے ہیں اور بریکٹ میں لکھ بھی دیتے ہیں۔ ان افسانوں کے اکثر کردار مقامی ہوتے ہیں جنھیں مقامی پڑھنے والے بہ آسانی پہچان لیتے ہیں۔ نچلے طبقے کے کردار ان کے ہاں خواہ کتنی ہی انسانیت کا ثبوت دیں آخر میں سطحیت اور کم ظرفی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

ان کے اکثر افسانے صرف دلچسپ واقعات پر مبنی ہوتے ہیں جنھیں مقصد کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور جہاں وہ شعوری طور پر کوئی مقصد اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں ان کا انداز خطیبانہ ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں رجائیت اور قنوطیت کی کشمکش ہے اور پلڑا قنوطیت کا بھاری پڑتا نظر آتا ہے۔ بعض اوقات وہ سیاسی نظریات پر بحث کرتے ہوئے قدامت پرستی کا ثبوت دیتے ہیں بھنگیوں کی طبقاتی کشمکش کا تذکرہ کرتے ہوئے جاگیرداروں کی تباہی پر اظہار افسوس کرنا، کیا بات ہوئی؟

شاید انھیں شاعری پسند نہیں کیونکہ اپنے اکثر افسانوں میں وہ شاعری یا شاعروں پر طنز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا اختتام بہت عام انداز سے ہوتا ہے ایسا کہ پڑھنے والا چونکنے پر مجبور نہیں ہوتا۔ سنجیدگی کا یہ درجہ مقالہ نگاروں کو زیب دیتا ہے افسانہ نگاروں کو راس نہیں آتا۔ اختتام سے وہ خود بھی کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے کیونکہ ہر خاتمے پر وہ تاثر کو اور ابھارنے کے لیے چند جملوں کا اضافہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ چند جملے چند پیراگراف بھی ہو جاتے ہیں۔

"شعلۂ سنگ" پڑھ چکنے کے بعد میں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ ان کے افسانے دل کو چھوتے کیوں نہیں؟ کہیں یہ وجہ تو نہیں کہ انھوں نے زندگی میں کوئی چوٹ نہیں کھائی؟ (میں ان کے حالات زندگی سے ہنوز ناواقف ہوں) یا یہ کہ وہ موجودہ معاشرت سے گھل مل نہیں سکے اور صرف سنی سنائی یا دور سے دیکھی ہوئی باتیں لکھ لینے پر اکتفا کر لیتے ہیں؟ کہیں کوئی بات ہو ضرور، ان کے ذہن میں زندہ رہنے کا رکھ رکھاؤ اور سلیقے کا ایسا خاکہ ہے جس میں ذہانت اور محنت کی آمیزش ہے اور جزویات نگاری و تفصیلی بیان کے باوجود ان کا افسانہ تو ہو جاتا ہے لیکن احساسات کی کسک، معاشرے سے گہری وابستگی اور دوسروں کے دکھ سے براہ راست متاثر ہونے کا جذبہ نہیں ملتا۔ ان تمام باتوں کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ بہت پرانے لکھنے والے ہیں اور بجائے اپنی سی راہ اختیار کرنے کے نئی نسل کا ساتھ دینے کی کوشش میں منہمک ہیں۔ جو زندگی وہ گزار رہے ہیں یا گزار چکے ہیں وہ صرف اسی کی عکاسی کریں اور نئی نسل جن نئے نئے مراحل سے گزر رہی ہے اس پر نئی نسل ہی کو لکھنے دیں تو شاید دونوں اپنی اپنی جگہ کامیاب رہیں گے

پہلے کہہ چکا ہوں "شعلۂ سنگ" سے کوئی پتھر کا شعلہ مراد نہیں، پتھر تو صرف چنگاریاں چھوڑ سکتے ہیں میں نے انھیں چنگاریوں کی کیفیت کی روشنی میں کوثر صاحب کی پہلو دار فنی شخصیت کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے کہاں تک یہ کوشش کامیاب ہو سکی ہے! پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بات صرف اس مجموعے کے لیے افسانوں کے غلط انتخاب پر آ کر ختم ہو جائے!

شہاب ششمی

مرگِ بہاراں

سالہا سال سے یہ سود و زیاں کے بندے
کھیلتے آئے ہیں سب خیر سے شر کے بدلے
کتنے انساں ہیں زمانے میں خلافت کے امیں
روح کو بیچ گئے حسنِ نظر کے بدلے
اپنے سائے پہ بھی دشمن کا گماں ہوتا ہے
ہائے کس طرح زمانے کے یہ تیور بدلے

کتنا مجروح ہوا اس دور میں فطرت کا ضمیر
جہل کے ہاتھ میں ہے علم و ادب کی تنویر
زندگی جبرِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
جبر ہی جبر ہے یہ جرم و سزا کی تعبیر
عالمِ کون و مکاں کی یہ الٰہی قدریں
مسلکِ رشتۂ وحشت سے خرد کی زنجیر
کتنے دھندلا گئے تہذیب و تمدن کے نقوش
بے گناہی ہے عدالت کی نظر میں تقصیر
کس نے بخشا انھیں "فی الارض خلیفہ" کا خطاب
کیا یہی لوگ ہیں قرآں کی مقدس تفسیر
سرزمیں مشرق و مغرب کی ہو یا مصر و حجاز
ہم سے آوارہ وطن لوگ ہیں ظلمت کے اسیر

ادھر ہو شور و شغب منزلِ مقصودِ حیات
کون جانے کہ پسِ پردۂ انفاس ہے کیا
کس نہ دانست کہ منزل گہہ مقصود کجاست
پھر من و تو کا ہر اک شے کو یہ احساس ہے کیا

نور و ظلمت کی کشاکش تو ہے تعت یرازل
لیکن اس شب کی سحر ہوگی نہ اے بُتِ بہار
اپنی ہی سانس پہ غیروں کا گزرتا ہے خیال
زندگی کیا ہے سسکتی ہوئی اک شمعِ مزار
اپنی معراج یہ ہے بے بسی لالہ و گل
کوئی مقتول کی گنتی ہے نہ قاتل کا شمار

جانے اقبال کا دعویٰ یہ کہاں تک سچ ہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
در طلب کوش و مدہ دامنِ امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

آشنا منزلِ مقصود سے وہ لوگ ہوئے
ایک بھی چاک نہیں جن کے گریبانوں میں
ڈھونڈنے نکلے تھے جو صبحِ بہاراں کا نشاں
رہ گئے اپنے ہی پندار کے بت خانوں میں
جو نکل آئے تھے امروز کے زندانوں سے
ہائے وہ کھو گئے فردا کے بیابانوں میں،

جبکہ سب راستے مقتل کی طرف جاتے ہیں
جبکہ ہر موڑ پہ ہو دار و رسن کی منزل
آ کہ ہم مرگِ بہاراں کا کریں اب ماتم
"صبحِ نو" خاکِ بسر زخم بجاں ہے اے دل



کتاب، لکھنؤ

اور ان کے چند ساتھی اگر اپنے آپ کو مجبور پاکر اردو کی دنیا میں کچھ غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کے اس دیوالیہ پن کا ثبوت ہے جو ہیجان کے ذریعہ کا ہندی ادب میں نکل رہا ہے۔ اور وہ اپنے پرچار کا میدان اردو کی دنیا میں بنانا چاہتے ہیں۔ کتاب کے خاص نمبر میں جو کہانی کار لکھے گئے ہیں، بیشک ان میں جدید افسانہ نگار ہیں، لیکن ان میں بیشتر اپنے آپ کو اس نام نہاد 'نئی کہانی' کی تحریک سے وابستہ نہیں سمجھتے۔ نئے افسانہ نگاروں کا ایک باشعور طبقہ سامنے آیا ہے جیسے کہانی کو لیکر اور "رواتی کہانی" جیسی تحریک پروان چڑھنے سے پہلے ہی دم توڑ چکی ہے۔ کیونکہ سرمایہ کے بل بوتے پر اب کوئی ادب پروان نہیں چڑھتا۔ ہندی کا افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی مجھے یہ تلخ حقیقت سامنے رکھنی پڑتی ہے۔ تاکہ اردو افسانہ نگاروں میں غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں۔ اس پر کافی طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے جو ہندی میں دونگا۔ کتاب کے خاص نمبر کی روشنی میں۔

اردو کے جدید افسانہ نگاروں نے جدید رجحانات، جدیدیتوں اور جدتوں سے نئے افسانے کی تخلیق کی ہو یا نہیں یہ تو آج کے جدید افسانہ نگاروں کی تحریر دیکھ کر ہی کا پتہ چل سکتا ہے (جناب رام لعل نے جو ستمبر کے شمارہ میں افسانہ نگاروں کی جو فہرست دی ہے، میں اس سے پوری طرح متفق نہیں) ٹھاکر صاحب نے اردو کے جدید افسانوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ انھیں اندازہ ہوتا کہ زبان اور بیان کے لحاظ سے یہ افسانے ہندی کے ان افسانوں سے کہیں زیادہ بہتر ہیں جو کہ نمونے کے طور پر کتاب کے خاص نمبر میں پیش کئے گئے ہیں۔

اس کے رخسار پر چند اشک رواں
اس کے ماتھے پہ اڑتی ہوئی یاس بھی
رنج و آلام کا ایک احساس بھی
یہ جو عورت ہے نازک بدن، گلبدن
یہ جو عورت ہے اک پھول کی پنکھڑی
سخت پتھر کی کتنی سلیں آج یہ
پھول کی پنکھڑی ہے اٹھائے ہوئے

نوجوانی کے ارمان گھائل رہے
کتنے ہی یاس و افلاس کے غمکدے
اسکی خوشیوں کے رستے میں حائل رہے
ناگنوں کی طرح رنج و آلام کے
اسکی گردن میں بازو حمائل رہے
یہ جو عورت ہے نازک بدن، گلبدن
یہ جو عورت ہے اک پھول کی پنکھڑی
سخت پتھر کی کتنی سلیں آج یہ
پھول کی پنکھڑی ہے اٹھائے ہوئے

یہ جو عورت ہے نازک بدن، گلبدن
اسکے سینے میں ہے ایک عورت کا دل
اسکے دل میں بھی عورت کے جذبات ہیں
اسکے سینے میں بھی اپنی ہی طرح کچھ
آرزوؤں کے اجڑے خرابات ہیں
فکر ہے بھائی بہنوں کی ماں باپ کی
کچھ مسائل ہیں، جاں سوز حالات ہیں
اسکے آگے ہیں ماحول کی ظلمتیں
رسم کی بیڑیاں ہیں، رواجات ہیں
یہ جو عورت ہے نازک بدن، گلبدن
یہ جو عورت ہے اک پھول کی پنکھڑی
سخت پتھر کی کتنی سلیں آج یہ
پھول کی پنکھڑی ہے اٹھائے ہوئے

آخرش ان حقائق کے تابوت میں
کھو گئی یہ سجیلی دلہن کھو گئی
رنج و آلام کی وادیٔ سنگ میں
ایک نازک بدن، سیم تن کھو گئی
اپنے ماحول کے بحر ظلمات میں
آرزوؤں کی زندہ کرن کھو گئی
اپنے احساس کے غار تنہائی میں
ہائے یہ رونق انجمن کھو گئی
یہ جو عورت ہے نازک بدن گلبدن
ساتھیو! میں نے دیکھا اسے بارہا
زندگانی کی شعلوں بھری راہ میں
اک عجب ناز و انداز سے گام زن

اس خرابے میں، اس دور میں ساتھیو
روز و شب اسکے آگے مسائل رہے
بھوک کے دست بیداد سے آج تک

اپنے آنچل کا پرچم بنائے ہوئے
اپنے آنچل کا پرچم اٹھائے ہوئے
عزم کی جنتوں کو سجائے ہوئے

نعمان امام

مسٹریس

یہ جو عورت ہے نازک بدن، گلبدن
یہ جو عورت ہے اک پھول کی پنکھڑی
سخت پتھر کی کتنی سلیں آج یہ
پھول کی پنکھڑی ہے اٹھائے ہوئے

یہ جو عورت ہے نازک بدن، گلب
یہ جو عورت ہے اک پھول کی پنکھ
سخت پتھر کی کتنی سلیں آج
پھول کی پنکھڑی ہے اٹھائے ہو

ساتھیو! میں نے دیکھا اسے بارہا
زندگانی کی شعلوں بھری راہ میں
اک عجب ناز و انداز سے گام زن
اپنے آنچل کا پرچم بنائے ہوئے
اپنے آنچل کا پرچم اٹھائے ہوئے
عزم کی جنتوں کو سجائے ہوئے
رنگ افشاں بہاروں کے ارماں لیے
سینکڑوں زخم سینے پہ کھائے ہوئے
کتنی ہی حسرتوں کا گلا گھونٹتی
کتنے ارمان دل میں بسائے ہوئے
کتنی راہوں کو پر نور کرتی ہوئی
کتنے جلووں سے دامن چرائے ہوئے
ساتھیو میں نے دیکھا اسے بارہا
زندگانی کی شعلوں بھری راہ میں
اک عجب ناز و انداز سے گام زن

یہ جو عورت ہے نازک بدن گلبدن
زینتِ بزم ہے، رونقِ انجمن
حسن کا ناز ہے، عشق کا بانکپن
اپنے بچوں کی ممتا ہے آغوش ہے
اپنے شوہر کے گھر میں سجیلی دلہن

زندگانی کی راہوں پہ اے ساتھیو!
بارہا یوں تو دیکھا اسے گام زن
بارہا یوں تو دیکھا اسے تیشہ زن
ہاں مگر اس کی آنکھوں کی گہرائی میں
میں نے پائی ہے مایوسیوں کی کرن
میں نے پائی اداسی میں ڈوبی تھکن
میں نے دیکھے ہیں بکھرے ہوئے بارہا
اس کے دامن پہ محرومیوں کے نشاں
اس کی تنہائیوں میں امنڈتے ہوئے

عتیق تابش

گریہ

زندگی کب ہوئی سیرابِ حیات
اک نہ اک تازہ سفر جاری ہے
سلسلۂ ریگ ناپیدا کنار
تا نظر —— کتنے سراب اندر سراب
نگہ و دل کے قریب
نو دمیدہ سی امیدیں جو فقط صرفِ خواب
اپنی تعبیر سے پہلے ہی تماشہ ٹھہریں
—— آنکھ کہ کاسۂ خالی ز نشاط
کو بہ کو ٹھوکریں کھاتی ہی رہی

بیش از جنبشِ یک تا بہ نفس بھی مجھ کو
اتنی فرصت نہ ملی
کوئی تصویر کشیدہ کرتا
حرفِ آخر کی طرح
—— اے دلِ آشفتہ مزاج

سحر اوجینی

خالی آنگن

مرے پڑوس کے خالی مکان کا آنگن
اُداس اُداس چنبیلی سے کہہ رہا ہو کہ کل
ترے مہکتے، تھرکتے، نشیلے سائے میں
کوئی پلنگ پہ لیٹا کتاب پڑھتا تھا
کوئی سلیٹ پہ چڑیا بنایا کرتا تھا
کوئی نہا کے سکھاتا تھا اپنی زلفوں کو
تو کوئی کھانس کے ہم کو جگایا کرتا تھا
گزشتہ رات یہ سب لوگ ہم کو چھوڑ گئے
کئی برس کا جو رشتہ تھا ہم سے توڑ گئے
ہمارے اپنے نصیبوں میں انتظار —— کہاں
نہ جانے کون اب آئے کرایہ دار یہاں

ساغر مہدی

گونج

گم ہوا جاتا ہے آفاق میں
دھیرے دھیرے
میرا نغمہ
مرے لہجے کا مقدس انداز
میری آواز کا رنگ
بازگشت اس کی مگر
اب بھی ہے قید
سماعت کے حسیں زنداں میں

سید احمد شمیم

گمراہ —!

(حالیہ فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر)

نجانے کتنے ہی رہبروں نے
پیمبروں نے
خیال و فکر و نظر کی شمعیں جلائیں لیکن
ہوئی نہ روشن یہ رہ گزارِ حیات اب تک
وہ آدمی جو کہ جنگلوں میں
شکار کرتا تھا، سادہ دل تھا
جو کم طلب تھا
ہزارہا فلسفوں، عقیدوں کی ظلمتوں میں
گھرا ہوا ہے
ہزار آنکھیں
ہزار لب ہیں
ہزار فکر و نظر کے بُت ہیں
یہ کون سمجھے، یہ کون بوجھے؟
کہ کون حق پر ہے، کون حق سے ہٹا ہوا ہے؟
مگر بچارا غریب انساں —!
نہ جانے کب سے
انھیں خیالی بتوں کی خاطر
سروں کو اپنے کٹا رہا ہے
یہ ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے
یہ راستے سے بھٹک گیا ہے

محسن زیدی

کتاب، لکھنؤ



نہیں ہے غم کہ جام جم نہیں ہے
مجھے جام سفالیں کم نہیں ہے

محبت بھی بنا کرتی ہے شعلہ
ہر اک عالم میں یہ شبنم نہیں ہے

بہت ہے جتنی ہے اپنے سبو میں
مجھے کچھ فکر بیش و کم نہیں ہے

نگاہِ لطف ابھی ہوتی ہے کم کم
نوازش ہے مگر پیہم نہیں ہے

ہے پھر بھی ایک ربط اس برہمی میں
نظامِ زندگی برہم نہیں ہے

نوشتِ غم ابھی کیا ختم ہوگی
ابھی کاغذ بھی دل کا نم نہیں ہے

سمجھ لو مدّعا دل کا نظر سے
اشارا ہے مگر مبہم نہیں ہے

ذرا دیکھو ہوا دامن کی دے کر
کہ شعلہ عشق کا مدھم نہیں ہے

نہ ہوں غمخوار اب اتنے پریشاں
مجھے بھی اب کچھ اتنا غم نہیں ہے

عنایت ہے یہ اپنے دوستوں کی
کوئی اس زخم کا مرہم نہیں ہے

مزاجِ حسن گر نازک ہے محسن
مزاجِ عشق نازک کم نہیں ہے

فضا کوثری



حال شاعر کا ہے کیا اور ترانے کیسے
دور کے ڈھول بھی ہوتے ہیں سہانے کیسے

کوئی آہٹ نہ ہوئی کوئی دریچہ نہ کھلا
وہ چلے آئے مرے دل میں نہ جانے کیسے

میری آنکھوں سے مری نیند چرانے والے
تو بناتا ہے بہر طور بہانے کیسے

کل حقیقت میں فسانوں کو کوئی دخل نہ تھا
چھا گئے آج حقیقت پہ فسانے کیسے

امتیازِ رہ و رہزن، نہ تمیزِ منزل
بن گئے راہنما آپ نہ جانے کیسے

باوجودِ دلِ مجروح و ملول و بیزار
کہہ لیے آج یہ اشعار فضا نے کیسے



بشیر بدر

ہر طرف برف برستی ہے سرِ وادیٔ ذہن
یاد کی شمع بجھی کافور ہوئی جاتی ہے
خشک پتوں کو کوئی روند رہا ہے شاید
بال بکھرائے ہوئے بادِ صبا آتی ہے
دلِ شکستہ کوئی ہم جیسا یہاں دفن ہو گیا
دیر تک رات کو رونے کی صدا آتی ہے
کسی دستک نے بہت چپکے سے سرگوشی کی
چاند سے چاندنی نزدیک ہوئی جاتی ہے
جیسے چشمے پہ نہاتی ہوئی شہزادیٔ خواب
چاندنی رات جب اشکوں میں نہا جاتی ہے
کیا یہاں دشتِ تمنا میں کوئی پھول کھلا
اب ادھر روز کئی بار صبا آتی ہے
میری آنکھوں میں امڈ آئے ہیں کالے بادل
جاؤ سو جاؤ کہ موسم بڑا جذباتی ہے

عبدالحلیم

تاریخ راجپوتانہ کا خونیں ورق

کرشنا کماری

اودے پور کی راجکماری کرشنا کماری نے اپنی امنگوں بھری زندگی کو موت کے بھیانک ہاتھوں میں سونپ کر ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ ہندستانی عورت کے لیے اگر سب راستے مسدود ہو گئے ہوں تو بھی موت کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے اور ایک راجپوتانی وطن، قوم اور خاندان کا ناموس برقرار رکھنے کے لیے کسی وقت بھی اپنا عارضی چولا اتار پھینک سکتی ہے ——— راجستھان کی ان گنت رانیوں اور شہزادیوں نے اپنی عصمت کو حریص نگاہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جو آگ صدیوں پہلے جلائی تھی وہ آج بھی فروزاں ہے ـــ بس کسی پدمنی کا ہونا شرط ہے ——— اس پدمنی کا جس نے موت سے آنکھیں لڑائیں اور ایک طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ موت کو گلے لگا لیا، لیکن یہ نہ گوارا کیا کہ اس کی پاکدامنی دشمن کی پرہوس نظروں سے آلودہ ہو سکے۔ اس بہادر رانی کو موت بھی نہ مار سکی۔ اس نے بار بار جنم لیا ہر بار آگ پر کھیلتی گزرتی رہی اور ہمیشہ اپنی راکھ کے غازے سے مادرِ وطن کے نورافشاں چہرے کو دمکاتی رہی۔

آج سے صرف ڈیڑھ سو سال پہلے راجستھان کو پھر کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس بار نہ کسی غنیم کا حملہ تھا اور نہ ہی خارا شگاف راجپوت تلواروں سے پالا ہی آ لگا تھا۔ یہ محض اندرونی نفاق تھا جس کی قربان گاہ پر معصوم کرشنا کماری کو بھینٹ چڑھنا پڑا۔ اس دل دوز واقعہ تک پہنچتے پہنچتے قلم کی روشنائی آنسو بن کر بہہ گئی تھی اور مورخ کو اپنا قلم خونِ دل میں ڈبو لینا پڑا تاکہ راجپوتانہ کی تاریخ کا آخری باب لکھ سکے۔

اس بار بہادر راجپوت خاتون نے ایک اور جنم لیا ——— آخری جنم ـــ حسین اور بدنصیب کرشنا کماری کے روپ میں اس کے ملکوتی حسن اور تقدس کو بوالہوس راجاؤں نے اپنا نشانہ بنانا چاہا ——— حسن نے اپنی ناقدری پر کفِ افسوس ملے، نسوانیت اپنی توہین برداشت نہ کر سکی ——— کرشنا کماری نے ملکی مصلحت، اور خاندان کے وقار کے پیشِ نظر زہر کا پیالہ اپنے ہاتھوں ہی سے اٹھا لیا اور اپنی نامراد زندگی ختم کر کے اپنے وطن کو امن بخش گئی۔

کرشنا کماری نے اپنی زندگی کی چند بہاریں اس وقت دیکھی تھیں جب ہندستان پر خزاں نے ڈیرے ڈالنے شروع کر دیے تھے۔ باغ لٹ رہا تھا۔ روشیں پامال ہو چکی تھیں، اور پھولوں کے تختے اجڑ چکے تھے ـــ سچ تو یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اوائل ہی میں ہندستان کی قسمت فیصلہ ہو چکا تھا۔ ۱۸۰۳ء میں آفتابِ مغلیہ کی روشنی صرف قلعہ معلیٰ کے صحن ہی تک محدود ہو گئی تھی۔ جنوب میں مادرِ وطن کا جیالا شیر، ٹیپو بھی اپنا حق ادا کر چکا تھا۔ طول و عریض ملک میں اگر کچھ تھا تو بے چینی، جنگ کا سایہ یا پھر، مرہٹے اور ان کی لائی ہوئی دہشت، لوٹ کھسوٹ اور بدنظمی۔ راجپوتوں کی بے باک تلوار محمد شاہ کے زمانے ہی سے نیام میں جا چکی تھی راجہ سوائی جے سنگھ کے زمانے ہی سے

طارق غازی

یہ زہرہ جبیں یہ حسنِ فلک، سب کیفِ نظر تاروں کی چمک
یہ سب آکاش کی باسی ہیں، یہ ساری کرنیں مہ کی ہیں
کوچہ کوچہ، قریہ قریہ، دل نے دھوکے کھائے کیا کیا
اک چشمِ عنایت کی خاطر یہ نظریں کتنی بہکی ہیں
ماحول پہ بے رنگی کا گماں، تا حدِ نظر مصروف خزاں
ہم اپنے تصور کے قرباں جس سے یہ خزائیں مہکی ہیں
تھوڑا سا گماں تھوڑا سا یقیں، یہ رات ٹھہر جائے نہ کہیں
پر بھول گئے یہ بزم نشیں اس رات سے صبحیں دہکی ہیں
پھر رات نے چادر پھیلائی، پھر لی امید نے انگڑائی
پھر پروانے اترائے ہیں، پھر شمع کی کرنیں بہکی ہیں
تو روحِ بہاراں ہے مانا، پر جانِ چمن! یہ دیکھ ذرا
اس دل کے خیاباں میں کتنی معصوم بہاریں مہکی ہیں
خوباں کے دمکتے عارض ہیں یا پگھلا ہوا سونا طارق
یا گلشنِ حسن و جوانی میں سورج کی کلیاں لہکی ہیں

واحد پریمی

اُن کی نگاہِ ناز سے پاکر بہارِ
میرا دلِ فگار ہے اک لالہ زارِ
ہر ہر قدم پہ مجھ کو ملا ہے غبارِ
گویا رہِ حیات ہو اک رہگزارِ
میری نگاہِ یاس ہو آتش گزارِ
کیا چشمِ نم تک آگئے دل کے شرارِ
ایسا بھی وقت آتا ہو الفت میں دوست
اُن کے بجائے رہتا ہو جب انتظارِ غم
ملتا نہیں ہر اک کو یہ انعامِ خاص ہے
میرے تمام عیش و مسرت نثارِ غم
تاریک کائنات ہے، بے نورِ زندگی
کچھ تو ہی روشنی دے مجھے اے نگارِ غم
اک حشر سا اُٹھے گا سرِ بزمِ میکدہ
برہم ذرا بھی ہوگئے گر بادہ خوارِ غم
واحد یہی تو حاصلِ دورِ بہار ہے
خوشیوں کے پھول چننے میں پائے جو خارِ غم

امیرخاں، سندھیا اور ہولکر نے آنکھیں دکھا دکھا کر اس کا خزانہ خالی کروا لیا۔ بات یہیں تک نہ رہی ان لوگوں نے دربار میں برابری کی جگہ کا مطالبہ کر دیا۔ اودے پور کا رانا بھلا ایسی باتیں کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ ناچار وہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف رجوع ہوا۔ مان سنگھ اور جگت سنگھ بھی تھک چکے تھے انھیں سمجھ آ چکی تھی کہ ان کے جھگڑے میں سوائے مرہٹوں اور پنڈاریوں کی فلاح کے اور کوئی بات نہیں تھی اس لیے بنائے مخاصمت کو بالائے طاق رکھ کر وہ بھی گورنر جنرل سے مدد کے خواہاں ہوئے مگر قسمت کرشنا کماری پر مسکرا رہی تھی۔ اس سے تو تاریخ کو دوسرا کام لینا تھا اسی لیے سر جارج بارلو مداخلت نہ کرنے کی قسم کھائے بیٹھا رہا۔ راجکماری کے لیے ایک ایک کر کے سارے دروازے مقفل کر دیئے گئے۔

انگریزوں کی طرف سے ٹکا سا جواب ملنے کے بعد رانا کے سامنے امن وامان کے قیام کے لیے بس ایک ہی صورت تھی اس نے امیرخاں کو اپنی آمدنی کے چوتھائی کا حصہ دار بنا لیا تاکہ اس کی سرحدیں محفوظ رہیں۔ امیرخاں کو میواڑ کے دربار میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس نے رانا کو اپنے بس میں کر لیا اس دشمن انسانیت لیٹرے نے رانا کی ذہنی کارفرمائیوں میں کچھ اپنے شیطانی خصائل کی جھلک دیکھ لی تھی جھٹ رانا کو ایک انسانیت سوز تجویز سمجھا دی تاکہ تنازعے کی جڑ ہی کو ختم کر دیا جائے معصوم راجکماری کے کھانے میں زہر دیا جانے لگا۔ لیکن سخت جان راجکماری مر نہ سکی۔ اس کو تو اپنے ہاتھوں سے زہر کے پیالے کو تھامنا تھا۔

شروع شروع میں یہ بات انتہائی رازداری میں رکھی گئی مگر راجکماری کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا کہ اس کا روپ، اس کی قسمت اس کی اپنی بیری ہو گئی ہے۔ اس کا وجود ہی خاندانی وقار اور عزت سے میل نہیں کھا رہا ہے۔ اس کی ہستی ہی ملک کے امن وامان کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہے ——— کرشنا کماری کے اندر بیٹھی ہوئی ہندوستانی عورت جاگ اٹھی، پدمنی تلملا کر باہر نکل آئی اور وہ بھی راجپوتانیاں جنھوں نے اپنا اور خاندان کا وقار قائم رکھنے کی غرض سے جوہر کی رسمیں ادا کی تھیں ——— راجکماری نے رانا کو پیغام بھیج دیا کہ اگر مجھ ناچیز ہستی سے آپ کے خدشات وسیع ہیں تو آپ ناحق بھگوان کے سامنے خود کو جواب دہ بناتے ہیں میں راجپوتانی ہوں مجھ کو مرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

اسی دن محل میں شادیانے بجنے لگے، سکھیوں نے ڈھولک اٹھا لی، ملن کے گیتوں سے فضا میں ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ کرشنا کماری نے نہا دھو کر، سولہ سنگار کر کے مخصوص عروسی جوڑا پہنا۔ زہر تیار ہو چکا تھا۔ راجکماری نے دونوں ہاتھوں سے پیالہ پکڑا سکھیوں سے مخاطب ہوئی "دیکھو میری شادی یوں ہی ہونا تھی ——— آخر مل گیا نا مجھ کو میرا سنگیتر۔" اور پھر بڑی بے صبری سے پیالے کو ہونٹوں سے لگا لیا جیسے کوئی برہا کی ماری حسینہ اپنے پریتم سے لپٹ کر جنم جنم کی پیاس بجھا رہی ہو۔

انھوں نے مرہٹوں کی چڑھتی قوت کی پشت پناہی شروع کر دی تھی ——— شاید ان کے "ہندو پد پادشاہی" کے نعرے سے متاثر مرہٹوں کا ہندو راج کا تصور انھیں کی لائی ہوئی بدنظمی اور لوٹ مار میں کہیں کھو گیا۔ مگر راجپوت ان کے نرغے میں آچکے تھے گو کہ ادے پور اور میواڑ کے رانا کو اپنا سرگروہ مان لیا تھا اور آپسی جھگڑوں میں اس کو حکم تسلیم کر لیا تھا لیکن خود انھوں نے مرہٹوں کو اپنے راستہ دکھا کر جس خطرہ کا دروازہ کھول دیا تھا اس کا سدباب نہ کر سکے۔ سندھیا اور ہولکر ہمیشہ راجپوت راجاؤں کے باہمی نفاق کو دینے کی تاک میں لگے رہتے غرض کہ مرہٹوں نے راجپوتانہ کو جی کھول کر چوس لیا تھا۔ راجپوتوں کی مصیبت محض مرہٹوں کی مداخلت ہی پر موقوف نہ تھی پنڈاری جیسے منظم لٹیروں نے بھی اس سرزمین کو اپنی آماجگاہ بنا لیا تھا۔ راجا اور پرجا دونوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔

اسی افراط و تفریط کے زمانے میں کرشنا کماری جوان ہوئی اور ۱۸۰۳ء میں رانا میواڑ بھیم سنگھ نے اس کی بات بھیم سنگھ والیٔ جودھ پور سے پکی کر دی۔ پنڈت ابھی شبھ مہورت ہی نکال رہے تھے کہ اس کے منگیتر کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اب صرف جے پور کا راجہ جگت ہی اس قابل تھا کہ ادے پور کی شہزادی کا ہاتھ تھام سکتا۔ چنانچہ رانا بھیم سنگھ کی نظر انتخاب اس پر پڑی۔ جگت سنگھ نے اپنی ہونے والی رانی کو لانے کے لیے فوراً ایک محافظ دستہ ادے پور روانہ کر دیا۔ لیکن کرشنا کماری کی قسمت میں حجلۂ عروسی کی جگہ موت کی ویران اور بھیانک گھاٹیوں میں ٹھوکریں کھانا لکھا تھا۔ حالات اس کا ساتھ کیونکر دیتے۔

جودھ پور کے نئے راجا مان سنگھ نے جو راج کماری کے سابق منگیتر کا چھوٹا بھائی تھا یہ گوارا نہ کیا کہ اس کے ملک کی ہونے والی رانی کو جے پور کا راجا لے جائے، چنانچہ اس نے جے پور کے حفاظتی دستہ پر اچانک حملہ کر کے اسے منتشر کر دیا لیجیے جنگ چھڑ گئی مرہٹے جو جیتنے والے تھے انھوں نے فاتح یعنی مان سنگھ کا ساتھ دیا تاکہ ان کے مفاد محفوظ رہیں۔ جے پور کے راجا میں اتنی سکت نہ تھی کہ جودھ پور ہولکر اور سندھیا کی متحدہ فوج کا مقابلہ کرتا۔ اس لیے اس نے لارڈ لیک سے فوجی مدد مانگی اور ایک صلحنامے کے ذریعے انگریزی حکومت کی کل شرائط مان کر اپنے علاقے کی سالمیت کی ضمانت حاصل کر لی، راجپوتانہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزوں کو وہاں کی سیاست میں قدم جمانے کا موقع ملا۔ اگر انگریز اسی وقت راجپوت تنازعے میں کود پڑتے تو کرشنا کماری کی زندگی المیہ نہ بن پاتی۔ مگر اس کی بدقسمتی تھی انگریزوں کی پالیسی بدل چکی تھی اور عدم مداخلت کا دور رواں سر جارج بارلو گورنر جنرل تھا اس نے اس مسئلے کو ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا۔ لارڈ لیک کی جے پور کو دی ہوئی ضمانت محض کاغذی ہو کر رہ گئی۔

مرہٹہ اور جودھ پوری فوج نے جے پور پر دھاوا بول دیا اور راجا جگت سنگھ کی ہار کے بعد وہاں ظلم اور استبداد کا گویا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ رانا بھیم سنگھ نے بھی جگت سنگھ سے ناتہ توڑنے ہی میں عافیت سمجھی مبادا یہ تبدیلی دل اس کے ملک کی خوشحالی کو لگ جائے۔ اب مان سنگھ کے علاوہ اور کون کرشنا کماری کا منگیتر ہو سکتا تھا۔

شکست خوردہ جگت سنگھ اب بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھا یہ اس کے خاندان کی روایات اور وقار کا امتحان تھا۔ راجکماری اس کے علاوہ بھلا کس کی ہو سکتی تھی۔ اس نے ہولکر کو بیس لاکھ روپے میں خریدا اور سندھیا کو بھی لالچ دے کر غیر جانبدار کر دیا۔ اب پھر سے جے پور اور جودھ پور میں جنگ شروع ہو گئی مرہٹوں نے بظاہر تو بے تعلقی برتی مگر ہیرا پھیری سے نہ گئے اور پردہ اپنی مخصوص چال چل گئے یعنی پنڈاریوں کو اشارہ کر دیا۔ جگت سنگھ جودھ پور کے لیے اکیلا کافی تھا اس نے مان سنگھ کو پے در پے شکستیں دے کر جودھ پور کا محاصرہ کر لیا اسی اثنا میں امیر خاں کا حملہ بیا بانی جے پور میں گھس پڑا اور سارے علاقے میں تباہی مچا دی ناچار جگت سنگھ کو جودھ پور کی ناکہ بندی اٹھا لینی پڑی۔

ادے پور کا رانا اور غریب راج کماری اس خونریزی کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے حالانکہ اس پورے واقعہ میں ان کی حیثیت محض خاموش تماشائی کی تھی۔ جودھ پور اور جے پور کے تنازعے میں پورا راجپوتانہ جل رہا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ رانا کا دامن ان شعلوں سے محفوظ رہ جاتا۔

اس زمانے میں لوگ ایک دوسرے کا مذہب نہیں بدلواتے تھے۔

وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے کیوں کہ ہاتھیوں کا کھیل ابھی جاری تھا اور رگھو نے کہا تھا بڑے بابو کے گھر جانے پر بچوں کو سب سے ے ہاتھی کے پیٹھ پر بٹھائے گا۔

سب سے بڑا لڑکا جو ہفتہ بھر ہوا اسکول سے چھٹیوں میں گھر آیا تھا گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک خالی کوارٹر میں ایک ایسے کھیل میں مصروف ا جس کا ذکر اس کہانی میں نہیں آنا چاہیے۔ کیوں کہ ان کاغذات کے بچوں کے ہاتھ میں پڑ جانے کا خدشہ ہے لیکن اسی کوارٹر میں ایک قصباتی ا بھی پھنسی ہوئی تھی جو اسے دھمکیاں دے رہی تھی۔ اس بڑے لڑکے نے اسے ایک کنگورے دار چاندی کی ٹکیلی چوتی دی اور منتیں کیں کہ بیچے کوارٹر سے باہر نکل سکے۔

قصباتی لڑکی کی کھال تنی ہوئی چمکیلی سیاہ اور چکنی تھی۔ اس نے لہنگے کو کس کر ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیا۔ کوارٹر سے نکل کر وہ ریلی پٹری کی طرف گئی۔ ڈھال پر چڑھی، لائینوں اور تاروں کو پھلانگی اور پھر آہستہ آہستہ پار کے ڈھال سے نیچے اتر گئی۔ بڑے لڑکے کے نتھنوں ابھی تک اس کے کپڑوں کے پسینے کی بوسائی ہوئی تھی اور وہ اس کے کھیوڑوں، گھنڈوں اور ہنسی کی آوازوں کو یاد کرنے کی کوشش ہا تھا۔ پھر وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اسے بھی بھوک لگ رہی تھی۔

جب سب کھانے پر بیٹھ چکے تو اسٹیشن ماسٹر بڑے بابو گھر میں داخل ہوئے۔ وہ موٹے تھے اور ہنستے میں ان کی توند پر قمیض پھڑکتی تھی یسے اس میں مینڈک بند ہو گیا۔ جس کنبے کے سب افراد زندہ ہوں، بیٹیاں ابھی گھر میں ہی ہوں اور بیٹے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے ہوں ل کسے کھل کر بھوک نہیں لگتی۔ بڑے بابو کے گھر میں سب کے سب ڈیڑھ سیرے تھے۔

انھوں نے کھانے بیٹھتے ہوئے منجھلی لڑکی کو پکارا۔

اندر چھوٹے کمرے میں جس کی پچھیت سے ریلوے لائن گزرتی تھی منجھلی لڑکی کھڑکی کی سلاخیں پکڑے کھڑی تھی، اس کی آنکھیں لائنوں کی عال سے پار چلی گئی تھیں اور اپنے اندر وہ کسی زنانے رسالے کے لیے بے معنی پر اسرار عبارتیں ڈھونڈ رہی تھی۔ ہر مہینے کی تیسری، چوتھی تاریخ یہ رسالہ ڈاک سے اس پورے ر میں پہنچتا تھا۔ سب لوگ حتی کہ بچے تک اسے لینے کو لپکتے تھے۔ باہر کا پارسل کا کاغذ جس پر اسٹیشن ماسٹر کا نام ر عہدہ چھپا ہوتا تھا احتیاط سے پھاڑ کر کتابوں کے ڈبے میں رکھ دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی یہ چھپا ہوا کاغذ بے احتیاطی سے کسی کتاب یا کسی چیز پر لپیٹ کر قصبے کے ملنے والوں کے گھر چلا جاتا تھا، لیکن عام طور سے اس سے کتابوں کی ملکیت ظاہر کرنے کا کام لیا جاتا تھا نا آنسہ یہ اور وہ نسبت یہ اور وہ اسٹیشن ماسٹر فلاں پور۔

منجھلی لڑکی کا چہرہ ستا ہوا چمپئی سفید تھا اور دو تین سال سے وہ برابر اس رسالے میں لکھ رہی تھی۔ وہ کیا لکھتی تھی یہ کسی کو پتہ نہیں ا۔ کیوں کہ اس کے لکھے میں قابل اعتراض یا قابل گرفت جذبات نہیں ہوتے تھے لیکن ان قابل اعتراض جذبات کے بغیر بھی وہ اچھی طرح تی تھی کیوں کہ اس کے اچھے اور گرفت میں آنے والے تمام جذبات اپنی کسی، فرضی سہیلی کے نام پر صرف ہوتے تھے۔ اور اب اس وقت بھی ڑکی پر کھڑی خوبصورت، پراسرار، بے معنی جملے اپنے ذہن میں درست کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس سنسان اسٹیشن کے ماحول نے اسے پوری رح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

اس نے قصباتی لڑکی کو ڈھال چڑھ کر پار جاتے دیکھا، اپنے باپ کی آواز سنی اور صحن میں لوٹ آئی۔

بچے کھانا چھوڑ کر باہر لپکے کیونکہ رگھو وہاں انتظار کر رہا تھا یا یہ ہاتھی کا انتظار کر رہے تھے۔

ٹا لڑکا منجھلا کملایا ہوا تھا کسی کو اس کی وجہ نہیں معلوم تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرض کیا جا سکتا تھا کہ اس سے اوپر کا لڑکا تو گزر گیا ہے یا کھو گیا ہے۔ وہ اپنے باپ سے دور ہو کر بیٹھا اور دل میں ڈرتا رہا کہ چہرے کی رنگت یا کپڑوں کی بو بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ اس کے برابر میں وہ لڑکا بیٹھا جو گیگلا تھا اور بولو کہلاتا تھا۔



(ڈاکٹر) حسن منظر

مسرنا

دوپہر کا وقت تھا جب بھکاریوں کا ایک بچہ آٹا مانگنے آتے ہیں۔ وہی آواز باہر گلیارے میں گونجی۔ دھوپ سخت تھی، ہوا نم اور بوجھل اور گردن کے اور بغلوں میں پسینہ کاٹ رہا تھا۔ بھکاری ۱۲، ۱۳ سال کا لڑکا تھا۔ اس نے دروازے کا ٹاٹ اٹھا کر اندر جھانکا اور جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

آٹا گوندھنے والی لڑکی اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی تھی اور پیڑھی پر بیٹھی ہوئی اچھی لگ رہی تھی۔ لڑکا گہری سیاہ رنگت کا تھا کے گھٹنے گھس گھسا کر سفید ہو گئے تھے اور چوٹی جیسے سر پر ایک جڑ کی باقی بالوں کے اوپر اٹھی نظر آ رہی تھی جس طرح گھاس میں سے ککرمتے کی چھتری دکھائی دیتی ہے۔

لڑکا کئی دن سے اس دروازے پر آ رہا تھا۔ پہلے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا جاتا تھا اب کئی دن سے دھیلا پیسہ مل رہا تھا۔ اور آج دو تین منٹ گزر جانے کے کسی نے اس کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔

اس نے اپنا سوال پھر دیواروں سے کیا۔

اندر سے کسی عورت نے پوچھا "کون ہے؟"

گوندھتی لڑکی نے کہا۔ "لڑکا۔"

"پوچھو مسلمان ہوتا ہے!"

"مسلمان ہوگا رے؟"

کالے لڑکے نے اس کے چہرے کو تعجب سے دیکھا اور بغیر جواب دیے چل کھڑا ہوا۔

شہر دور تھا، اور اسے آج کی کمائی کے لیے ابھی اپنے پیر توڑنے ہوں گے۔ یہ گھر گاؤں سے شہر کے ہاٹ جاتے میں آدھے راستے پر پڑتا تھا۔ اور یہاں سے کام کر کے جانا آسان ہوتا لیکن بھیک کے لیے کوئی لڑا نہیں کرتا!

اپنے راستے پر ہو کر اس نے سوچا 'یہ لوگ کس پر کار کے ہیں بھلا بھیک اور دھرم میں کیا سمبندھ ہے؟'

ایسا لگتا تھا دھرم پھوڑے کے سوال میں بھوک کے کانٹے کی چبھن تھی۔

جب یہ لڑکا شہر کی اور جا رہا تھا گھر کے بچّے اپنے کھیل سے ہٹ کر گھر میں گھسے۔ وہ مال گاڑیوں کے ڈبّوں میں ہاتھیوں کو گنتے لادتے دیکھ کر آ رہے تھے۔ ہاتھی راجہ کے تھے جس طرح پلیٹ فارم راجہ کا تھا۔ اور سرخ بجری کے اس پلیٹ فارم کے دونوں سروں پر تیروں کی سلوں پر راجہ کا نام کھدا ہوا تھا۔ یہ اسٹیشن اس راجہ کا ہی تھا۔ جیسے ہستناپور۔ لیکن ہستناپور کا اس قصے سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ یہ واقعہ اتنا پرانا نہیں

کتاب، کھلونے

کسی مسلمان گھرانے کے بچوں کے لیے کالی جان نرالا نام ہوتا۔ لیکن بڑے بابو کے گھر میں ایک پٹھان لڑکی مرجان رہ چکی تھی۔ کالی جان بھی ہو سکتی ہے وہ یہ بات سمجھ گیا، اور اسے بے وجہ اپنے سینے میں دل دھڑ دھڑ کرتا محسوس ہوا۔ بھاری بوجھل جوتی پہنی ٹانگوں سے جو زمین سے اٹھنے سے انکار کر رہی تھیں اس نے سڑک کو بھاگ کر پار کیا۔ ایک تانگہ اس کے سر پر سے گزرا اور تانگے والے کا چابک اس کے سر سے گزر گیا۔ دل اندر ہی اندر اندر سے دھڑکنے لگا، اور وہ پھر کھلونوں کی دکان پر جا کھڑا ہوا۔

بڑے بابو کب آئے اور کب اسے لے کر اسٹیشن پہنچے اسے بمشکل یاد تھا۔

اسے یاد تھا ان لوگوں نے دو ایک دن برداشت کرنے کے بعد کھلونے باہر پھینکوا دیئے تھے جہاں سے جانکی کے لونڈے انہیں اٹھا لے گئے تھے ی مرے گنگلے لڑکے سے پوچھا تھا۔

"تم نے کھلونے کیوں باہر پھینک دیئے تھے بالکل نئے تو تھے۔"

گنگلے لڑکے نے کہا۔ "ہماری اماں کہتی ہیں وہ ہندوؤں کے مہادیو تھے۔"

کبھی کبھی لڑکیاں کسی پجاری کو پیپل کی جڑ میں رکھے ہوئے خوب صورت چکنے پتھر کو جھک کر پرنام کرتے دیکھتیں تو اٹنگ ہانگ ٹنگ ہانگ کرنے لگتی تھیں۔

گھر میں کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اور کرنے والے بہت زیادہ تھے۔ چار پانچ لڑکیاں، دو تین نوکر رشتے کے کچھ لوگ جو ہمیشہ ڈھیا دیے رہتے تھے اور ماں۔ بڑی منجھلی کاڑھ بن سکتی تھیں اور منجھلی کے پاس سکھنے کے لیے ہمیشہ وقت رہتا تھا۔

پھر چرکی والا لڑکا آیا۔

پہلے دن اسے ڈانٹ کر بھگا دیا گیا تھا، کیوں کہ اس کے چرکی تھی۔ اگر وہ مسلمان ہوتا یا اس کے چرکی نہ ہوتی تو اسے پہلے دن ہی بھیک مل جاتی یہ ہندو لڑکے مسلمان گھرانے سے بھیک لینے آنا اس بات کی دلیل تھی کہ اس گھر میں کون رہتا ہو یا پھر وہ اناڑی ہو۔ اور ہندو مسلم کے فرق کو نہیں پہچانتا۔

دوسرے دن بارش ہو رہی تھی اتنی سخت کہ گلیارہ جوہڑ بن چکا تھا۔ وہ پانی سے بھیگا ہوا آیا اور ٹاٹ اٹھا کر چوکھٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر کے اوپر دیوار کے اوپر برگد کی ڈالی تھی، اور درخت کے پتوں میں بھیگے ہوئے کوّے بیٹھے تھے۔

ایک لڑکی نے اسے اندر آجانے کو کہا۔

وہ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

لڑکی نے دوبارہ اس سے اندر آجانے کو کہا۔

مکان کے پیچھے ایک ٹرین گزری۔ اور کمرے کی کھڑکی کی جالیوں میں سے اس نے دھندلی ہوا میں انجن کو آہستہ آہستہ گزرتے دیکھا۔ ایسا لگتا تھا انجن کانپ رہا ہے۔ وہ لڑکے مال گاڑی کے ڈبّے گننے لگے۔ چرکی والا لڑکا بھی آکر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی مال گاڑی کے ڈبّے گننے لگا۔

جب گاڑی گزر گئی، اور مال گاڑی کھڑکی کے سامنے سے گزرنے میں خاصی دیر لیتی ہے تو اس نے دھیلے کا سوال کیا۔ وہ ایک چٹکی آٹا لینے کو بھی تیار تھا۔

ایک عورت کمرے میں سے باہر آئی۔ اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ اور جس طرح گابھن بکریوں کا پیٹ چلنے میں اِدھر اُدھر ہوتا ہے اس کا پیٹ بھی جھول رہا تھا۔

"کون ہے یہ؟"

"بھکاری" لڑکی نے کہا۔

"یہاں کیوں گھسا لیا اسے تم نے؟" عورت نے خفگی سے پوچھا۔

لڑکا دوبارہ چوکھٹ پر جا کر کھڑا ہوا۔ اور وہیں کھڑا رہا۔ وہ ہاں یا نہ سننے کا منتظر تھا۔

باپ کے پاس بڑی، منجھلی، سنجھلی لڑکیاں بیٹھیں۔ لیکن سب سے آخر میں کھانے پر آئی۔ وہ باورچی خانے میں کھانا نکلوا رہی تھی۔ اس کے پیچھے چھوٹی لڑکی بھی ہر شے میں جاتی تھی ڈھیلا پاجامہ گھسیٹتی ہوئی آئی۔ وہ ضرورت سے زیادہ گندی تھی اور جانتی تھی باوجود سردی ہو جانے کے نہیں نہائی ہے۔
بڑی، منجھلی، سنجھلی اور چھوٹی بہنیں ان ناموں سے کیوں پکاری جاتی تھیں جب کہ چھوٹی سے چھوٹی بہنیں بھی تھیں، شاید اس لیے کہ ٹی کے بعد اور سب کی سب غیر متوقع تھیں۔
سب کھانے بیٹھ گئے۔ سب نے اس چرکی والے لڑکے کا ذکر چھیڑا۔ چرکی والا لڑکا ابھی تک سوکھی کالی ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا شہر کے ہاٹ طرف چلا جا رہا تھا۔ جہاں اسے اناج پھل، دمڑی اور کوڑیاں مل جانے کی توقع ہوئی اکٹھا لیے جا رہی تھی۔
کنبے کی ماں کے پیٹ میں پھر بچہ تھا۔ اس کی رنگت لڑکیوں کی رنگت تھی۔ لڑکے البتہ دھوپ میں پھر پھر کر جل گئے تھے۔
کنبے کی ماں نے پوچھا۔ "لونڈے کو کچھ دیا تھا؟"
"نہیں" لڑکی نے کہا۔
"کیوں؟"
"وہ مسلمان ہونے کے نام پر چلتا بنا۔"
بڑے بابو نے محسوس کیا تشتیا مرچ ان کے دانتوں میں کپکپی گئی ہے۔ ماں، لڑکیاں، لڑکے اور بڑے بابو سب چونک پڑے، کیوں کہ پچھلے تین دن ے یہی موضوع گفتگو تھی۔ چرکی والا لڑکا مسلمان ہو گا یا نہیں۔ یہ اتنا اہم مسئلہ تھا، کہ چھوٹے بڑے سب ہی کو اس میں دلچسپی تھی۔ بھولو تک کو، حالانکہ چھوٹی ا کا خیال تھا وہ نماز پڑھتے میں ادھر ادھر دیکھتا ہے اور جن کپڑوں سے کتے کے بچے کو گود میں لیتا ہے انہی سے نماز پڑھ ڈالتا ہے۔
ایسے اوسے باندھے کی نماز پڑھنے کے سب ہی عادی تھے۔ چھوٹے بچے عید بقرعید کو بڑے بابو کے ساتھ عید گاہ جاتے تھے۔ بڑے لڑکے جمعہ کی ز پڑھنے کھدیڑ کر بھیجے جاتے تھے اور سب جانتے تھے کس کے دل میں کیا ہے۔ مثلاً سنجھلے کو جو حقیقت میں سب سے بڑا لڑکا تھا، اور کوئی نہیں جانتا تھا منجھلا کیوں کہلاتا ہے۔ اچھی طرح معلوم تھا کہ بڑے بابو کس قماش کے آدمی رہ چکے ہیں۔ برسوں پہلے وہ ان کے سنگ الہ آباد گیا تھا۔ باپ اور وہ رکی ے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ صبح اٹھ کر بڑے بابو اپنے کام سے کہیں چلے گئے تھے۔ اور وہ ریسٹ ہاؤس کے باغیچے میں تتلیاں پکڑ رہا تھا۔ وہ دوپہر کو ر لمٹے اور اسے شہر گھمانے لے گئے۔ شہر بہت بڑا تھا۔ منجھلے کو اپنے باپ کے رویے میں راستے بھر ایک عجیب تبدیلی محسوس ہوتی رہی۔ ایسی تبدیلی جو ز اکثر باپوں کے لڑکے زندگی میں دو ایک بار ہی محسوس کرتے ہیں جب باپ یک لخت مہربان ہو جاتا ہے اور وہ ڈر ڈر کر اس کے ساتھ ہنسنے کی کوشش تے ہیں۔ بہرحال دونوں گھومتے رہے۔ بڑے بابو نے بہت سی چیزیں خریدیں۔ کچھ گراموفون ریکارڈ، کتابیں، کپڑے، منجھلی کے لیے رسالے اور بچوں کے لیے کھلونے ن ان کھلونوں کے ساتھ بھی ایک عجیب یاد وابستہ تھی۔ دیوالی آنے والی تھی اور دکانوں پر زیادہ تر مٹی اور مٹھائی کے کھلونے مل رہے تھے۔ آدمی جن کے نڈیں تھیں اور عورتیں جن کے چھ چھ ہاتھ تھے۔ لوگ جو ایسے جانوروں پر سوار تھے جن کا جسم کتے کا تھا اور سر شیر کا اور نیلے جسم والے انسان۔ [illegible] ے ہاتھ میں گرز تھے اور بیل کھانڈ کے بنے ہوئے تھے۔
کھلونے خریدتے خریدتے بڑے بابو نے اپنی انگلی چھڑائی اور لڑکے سے وہیں ٹھہرنے کو کہہ کر ایک طرف چل کھڑے ہوئے۔ لڑکا کھلونوں میں الجھا ہوا ا۔ ایک آنکھ سے وہ مورتوں کی قطار کو تک رہا تھا۔ دوسری سے اس نے باپ کو سڑک کے پار جاتے دیکھا۔ پھر وہ نکڑ کے مکان کے زینے پر چڑھ گئے۔ تھوڑی یر میں وہ کھلونوں سے اکتا گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے جمائیاں لیں اور سڑک پار کر کے اس مکان کے چھجے کے نیچے پہنچ گیا۔ ایک تنبولی نیچے کی دکان ا پھرتی سے لکڑی کی ڈنڈیاں پانوں پر پھیر رہا تھا۔
لڑکے نے پوچھا۔ "اوپر کون رہتا ہے؟"
تنبولی نے اس کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا اور دوبارہ پان پر سر جھکاتے ہوئے کہا۔
"کالی جان۔"

"باپ ؟"

"نہیں ۔" رسنا نے کہا ۔

"اور کوئی ہے ؟"

"کوئی نہیں ۔ بہو جی ۔" رسنا نے معنوعی رقت سے کہا ۔ وہ اس حربے کو برسوں سے آزماتا تھا ۔ اور اس وقت بھی آشا کی کونپل اس کے من میں پھوٹ رہی تھی ۔ بہو جی کے رحم کھانے پر آج کا تہوار بھی بن سکتا تھا ۔

جب عورت نے اس سے گھر کا حال پوچھا، تو اسے خیال آیا جو چند جملے بھیک مانگنے کے لیے رٹے تھے اس سے زیادہ خود اسے بھی آگہی نہ تھی ؛ یا ہو سکتا ہے اس سے زیادہ اس کی زندگی کی رو داد ہی نہ ہو ۔

اس کی ماں پانچ چھ برس ہوئے مر گئی تھی اور جس طرح ان نیچ جاتی عورتوں میں ہوتا ہے کھیوٹ کھا کر دستوں اور قے سے مری تھی لیکن باپ کون تھا ؟ کہاں سے آیا تھا ؟ اور کہاں گیا ؟ یہ کھوج پور والوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا ۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے ہوگا جو دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتے ہیں ۔ لیکن سب سے اچرج کی چیز تھی اس کی حیرکی جو اس کے سر پر سیاہ کبوتر کی طرح بیٹھی تھی ۔ رسنا شاید یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا جو کہ کب سے تھی اور آج تک کیوں وہ اسے اپنے سر پر اٹھائے ہوئے تھا ۔

جب وہ مکئی کا آٹا لے کر چلا گیا تو گابھن عورت دیر تک بیٹھی اس کے بارے میں سوچتی رہی ۔

پورب کی طرف دیہاتوں میں کچھ لوگ تھے جو یہاں سے گئے تھے جو لوگوں کو کلمہ پڑھاتے تھے ۔ اسے معلوم تھا، وہ لوگ تبلیغ کر رہے ہیں اور رسنا کو دیکھ کر اس کے دل میں بھی کھد بد ہونے لگی ۔ کیوں نہ تبلیغ کی جائے !

اس رات ان لوگوں نے کھل کر رسنا کے بارے میں بات کی ۔

بڑے بابو دیر تک اورنگ زیب عالمگیر کا ذکر کرتے رہے اور منجھلے لڑکے کو ایسا محسوس ہوا کہ خود وہ اورنگ زیب کا طرفدار ہے ۔ بڑی لڑکیاں جو بڑی، منجھلی اور سنجھلی اور چھوٹی کہلاتی تھیں وہ بھی جوش کے عالم میں بولتی رہیں ۔ اس سنسان ہالٹ پر جہاں سے بہت سی گاڑیاں بے ٹھہرے اتنی تیزی سے گذر جاتی تھیں کہ گھر کانپنے لگتا تھا ۔ آج ایک ڈاک گاڑی رک گئی ہو اور اس کے رک جانے سے میلے کی فضا پیدا ہو گئی ہو ۔

آہستہ آہستہ رسنا کی جگہ دوسری مذہبی باتوں نے لے لی ۔ ندی کی سطح پر جانماز بچھا کر کون نماز پڑھا کرتا تھا اور کون تہواروں میں صلی چادر پر نماز پڑھ سکتا تھا ۔ اور جس طرح ہوتا آیا ہے ہر شخص نے ان باتوں سے موت کا خوف محسوس کیا ۔ انھوں نے اپنے آپ کو کچھ اس حالت میں پایا جو خصوصاً گھر والوں کی وبا کے بعد ہوئی تھی ۔

ماں نے سویرے کی نماز پڑھی اور چھوٹی لڑکیاں جو قبر کے عذاب سے کانپتی ہوئی سوئی تھیں قرآن پڑھنے بیٹھ گئیں ، روشنی پھیلنے لگی ۔

بڑے بابو دفعتاً ایک بار کام سے کے بیچ میں چونک پڑے ۔ ان کے بڑے بھائی جو کہیں ملازمت تھے اس مرتبے کو پہنچ چکے تھے کہ روحوں سے بات چیت کر سکتے تھے ۔ بڑے بابو نے پہلی بار اس فاصلے کو محسوس کیا جو ان کے اور بڑے بھائی کے درمیان زندگی کی مختلف سمتوں نے لا ڈالا تھا ۔ وہ کیا تھے زیادہ سے زیادہ چیف کلرک ۔ لیکن زندگی کا مقصد محض کمانا کھانا اور ٹانگیں پھیلا کر سو جانا ہی تو نہیں !

منجھلا لڑکا اس دن کھویا کھویا سا رہا ۔ اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب بارہ تیرہ سال کی عمر میں اسے کسی نے بیس پچیس روپیہ کی کمک دیا کے ساتھ پکڑا تھا ۔ الی منجھلی بہن تھی جس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس واقعہ کی اطلاع ماں باپ کو کن الفاظ میں دی جائے ۔ بالآخر اس نے ایک پرچہ گول مول الفاظ میں لکھ کر ماں کو دیا جس کا مطلب ماں کی سمجھ میں نہ آ سکا ۔ اس کے بعد سے آج تک نہ جانے کتنی لکھ دیاں تھوڑی دیر کے لیے ٹل کر کھو گئی تھیں ۔

اس دن اور اس کے اگلے دن میں کھویا کھویا سا رہا ، اپنی بہنوں کی طرح ۔

دوپہر کو رسنا پھر آیا ۔ اسی طرح چیتھڑے پہنے ہوئے ننگے ۔ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے ۔ ایک لڑکی اسے پیسے دے کر چلی گئی ۔ مالکن ایک بار کمرے سے باہر نکلی کچھ دیر برآمدے میں کھڑی کچھ سوچتی رہی اور پھر اندر چلی گئی ۔ گھر سویا سویا سا لگ رہا تھا ۔ مکان کی پشت پر بھی سناٹا تھا ۔ رسنا لڑکی بے ضرورت رسنے لگی ۔

تھوڑی دیر بعد ایک بچے نے اُسے دھیلا لا کر دیا۔ اس نے "رام بھلی کریں" کہا اور دروازے کے باہر نکلتے ہوئے گا بجن عورت کو "دھتکار" کہتے رہا۔

اگلے دن وہ پھر وہیں کھڑا تھا۔

عورت نے پوچھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

چرکی والے لڑکے نے کہا۔ "رمسرنا۔"

اس کے نام پر ہنسنے لگے۔ "رمسرنا۔ رمسرنا۔"

چھوٹی بچی نے کہا۔ "واہ رمسرنا تو ہاتھیوں کا نام ہوتا ہے۔"

دوسری بچی نے کہا۔ "رمسرنا تو ہاتھیوں کا نام نہیں ہوتا۔"

رگھو کے ہاتھیوں کے نام تھے۔ جھبّو، متا، اور اتیل۔ ہتھنی کا نام تھا چمپا اور دوسری ہتھنی تھی کشوری۔ پھر بھی بچے چرکی والے لڑکے رمسرنا ہاتھی پکارنے لگے، اور چھوٹی بچی کہتی تھی۔ "رمسرنا ہاتھی جگا دے۔"

جب اُسے آٹا دیا جاتا تھا تو وہی بچی کہتی۔ "اب رمسرنا ہاتھی اپنا روٹ پکائے گا۔"

رمسرنا کو بچے پسند آنے لگے۔ وہ دوپہر کو بھیک مانگنے آتا اور چوکھٹ پر کھڑا ہو کر ایک چٹکی آٹے کا سوال کرتا۔

بچے ہاتھیوں کو بٹھانے والی آواز میں کہتے۔ "دھت دھت۔"

رمسرنا باری باری سے اپنے گرد در سفید گھٹنے زمین پر ٹیکتا اور پھر اپنی دونوں کہنیاں زمین پر رکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں کے بل بیٹھ جاتا اس طرح اس کا خیال تھا ہاتھی زمین پر بیٹھتے ہیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ مکان کی چھت سے زمین گزرتے دیکھتا۔

اس کے ایک چٹکی آٹے کے سوال پر مولو آٹے کے ٹین میں سے ایک چٹکی آٹا اپنی دو انگلیوں میں دبا کر لاتا اور کہتا۔

"اب رمسرنا ہاتھی آٹا کھائے گا اور دودھ دے گا۔"

ایک دن پھر وہ ایسے وقت آیا جب بارش ہو رہی تھی۔ گھر کی ماں نے خواہش سے برآمدے میں آجانے کو کہا، بچے اندر کمرے میں پلنگوں پر کود رہے تھے۔ بڑی لڑکیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، اور بڑے بابو اسٹیشن ماسٹر اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔

مالکن کے ہاتھ میں ترکاری کاٹنے کا چاقو تھا اور ایک انگوٹھے پر پٹی لپٹی ہوئی تھی۔

رمسرنا نے پوچھا "بہو جی انگوٹھا کٹ گیا کیا؟"

"ہاں کٹ گیا۔"

"رام رے رام۔" لڑکے نے سچ مچ تکلیف بھرے لہجے میں کہا۔

عورت کے دل میں ایک خیال آیا۔ رمسرنا، یا اللہ، کیوں نہیں کہتا؟ یا کوئی اور بات کیوں کہتا جیسے دیا علی!

تھوڑی دیر بعد عورت نے پوچھا "تیرا کون گاؤں ہے رے؟"

"بھوج پور۔"

"بہت دور ہے؟"

"دھورے ہی ہے۔" لڑکے نے کہا۔

"ماں ہے؟"

"نہیں۔"

"باجی، رمسرنا ہاتھی آیا ہے" بچوں نے کہا۔
"کیسا ہاتھی ہوتا ہے۔" ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ "آدمی کو ہاتھی گھوڑا کہتے ہیں! وہ بھی تمہاری طرح کا انسان ہے۔"
بچے سہم گئے۔
رمسرنا رونے لگا ــــ گاؤں میں کبھی کسی نے اس کی طرفداری نہیں کی تھی، بچے اُس کے ساتھ کھیل نہیں سکتے تھے اور ہر جگہ دُر دُر پھٹ پھٹ ہوتی تھی۔ اس نے لوگوں کے مکان اندر سے نہیں دیکھے تھے۔ لوگوں کی رسوئیاں کیسی ہیں وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا، اور یہ عورت اس کے لیے اپنے بچوں کو ڈانٹ رہی تھی ــــ گرم آنسو بہہ کر اس کی باچھوں میں آ گئے اور وہ انھیں چاٹ گیا۔
"روٹی کھائے گا؟" عورت نے پوچھا۔
اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔
ایک لڑکی روٹی لے آئی اور رمسرنا بھوکوں کی طرح کھانے لگا۔
کھانے کے بیچ میں عورت نے کہا۔ "مسلمان ہو جا تو تجھے اچھے اچھے کپڑے دوں گی۔ بھیک مانگ کے کیا ملتا ہے۔ نہ گھر ہے نہ در۔ کوئی پوچھنے والا تک تو ہے نہیں۔ یہیں رہ۔ بچوں کے ساتھ کھیلا کر۔"
منجھلی لڑکی نے کہا۔ "میں تجھے پڑھایا بھی کروں گی۔ پڑھ لکھ کے کہیں بابو بن جائے گا۔"
رمسرنا سوچ میں پڑ گیا۔ لڑکیاں حقیقت میں اچھی تھیں اور بھوجی تو ماتا سمان تھیں۔ آج تک بھوک کے جو دن گزرے تھے، پیٹ مانگ کی سوکھی لتی ہوئی راتیں اور لوگوں کا برتاؤ جیسے وہ روگی اور اچھوت ہو۔ ان سب باتوں کا اس گھر میں گزر کہاں تھا۔ وہ چپکا بیٹھا سنتا رہا۔
"لعل ہوگا مسلمان؟" مالکن نے پھر سے پوچھا۔ "دونوں وقت کھانے کو ملے گا۔ اور وہی جو ہم سب کھاتے ہیں، یہ نہیں کہ بھکاریوں کی طرح ہاتھ کے روٹی پکڑا دی۔"
اب تک جو ہچر مچر تھی وہ ترغیب کے ریلے میں مٹی کے باندھ کی طرح بہہ گئی۔
اُس نے مرے ہوئے لہجے میں "ہاں" کہی۔
ایک لڑکا بھاگا بھاگا ہوا اسٹیشن بڑے بابو کو بلانے گیا، اور وہ ہانپتے کانپتے گھر پہونچے۔ صحن میں ایک لڑکی نل چلا رہی تھی اور رمسرنا مل مل کر نہلایا جا رہا تھا وہ اتنا کالا نہیں ہے جتنا دھول نے اسے بنا رکھا تھا۔
اندر مالکن چھوٹے لڑکوں کے پرانے کپڑے ڈھونڈھ رہی تھی، اور برآمدے کے پلنگ پر پرانے کپڑوں کی لادی لگ گئی تھی۔
نل کی دھار چھوڑنے کو رمسرنا کا من ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس طرح تو اسے ماں نے بھی کبھی نہیں نہلایا تھا۔
"بس بس سردی لگ جائے گی۔" بڑے بابو نے کہا۔
ایک لڑکی بھاگ کر تولیہ لے آئی۔ تولیہ ہاتھ میں لے کر رمسرنا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اس موٹے روئیں دار کپڑے کا کیا کرے۔ ب کسی نے کہا۔
"رمسرنا ہاتھی جسم نہیں پونچھ رہا۔"
"اسے جسم پونچھو۔" مالکن نے کہا۔
رمسرنا اسی طرح سکم سُم کھڑا رہا۔
"سر پیار سے سر پونچھ" بڑے بابو نے کہا۔
رمسرنا سر پونچھنے لگا۔ وہ مداری کے بندر کی طرح تھا جو اشارے پر چلتا ہی کبھی کبھی الٹی حرکت بھی کو بیٹھتا ہے اور ٹوکنے پر جیب کھڑا ہو جاتا ہے۔

اور پیچھے ہٹ گئی۔ دروازے پر کچھ دیر رک کر جوگی والا لڑکا لوٹ گیا۔

وہ سوچ رہا تھا عجیب لوگ ہیں۔ آج دچھا چھی ملی تو کسی نے ٹھیک سے بات نہیں کی۔ بچے اسے دیکھ کر ہیضہ کی طرح کھل کیوں نہیں اس کے جاتے ہی سویا ہوا گھر جاگ پڑا۔

گھر والی نے کہا "چلا گیا؟ میں تو بات کرنے آ ہی رہی تھی"

بڑی لڑکی نے کہا۔ "واہ اماں تم کہاں بات کرتیں! تم تو اسے دیکھ کر لوٹ آئی تھیں"

"تم بھی تو لوٹ آئی تھیں" چھوٹی بیوہ لڑکی نے کہا۔

بڑے بابو جب کھانے کو آئے تو ان کا پہلا سوال تھا۔ "رسزا آیا تھا؟"

"ہاں آیا تھا؟" کسی نے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں" یہ سب بغلیں جھانکنے لگے۔

انھوں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیوں؟"

"بھاگ کہاں جاتا ہے۔ کل دیکھا جائے گا؟"

لیکن اگلے دن رسزا مسلمان ہونے کے نام پر چل کھڑا ہوا۔

یہ ٹھیک تھا وہ غریب ہے لیکن دل میں کوئی دھرم چھوڑنے پر تو راضی نہیں ہو جاتا۔ تو شاید اتنے دن سے یہ لوگ اسی لیے بھیک دے رہے تھے۔ وہ راستہ چلنے میں کئی بار اتنا مرحم ہوا کہ لگتا تھا کہ تانگہ پیچھے کھا رہا ہے۔ پھر رات دفتر سے بھوپنچے کا خیال کرتے ہی قدم تیز ہو جاتے تھے۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی اس میں اس نے منہ دھویا، پیر دھوئے اور دوسرے کنارے پر نکل کر پیپل کی چھاؤں میں رکھے ہوئے پتھر کو پرنام کیا۔ اس کے اندر بھی آج پہلی بار اپنے دھرم سے پیار پیدا ہوا تھا۔

لیکن جب وہ شہر پہنچا تو ہاٹ ٹوٹ رہا تھا، لوگ واپس جا رہے تھے، اور جو رک گئے تھے وہ دن بھر کی دھوپ سے بوکھلائے ہوئے تھے۔ اس روز وہ تقریباً خالی خالی پیٹ سویا جس طرح اکثر بڑے بابو کے گھر جانے سے پہلے سویا کرتا تھا۔

اگلے دن وہ پھر ٹھیک وقت پر گلیارے میں کھڑا تھا۔

اس کی آواز سن کر بچے شور مچانے لگے۔ "رسزا آگیا۔"

چھوٹی لڑکی نے اسے دھت دھت کہا اور جوگی والا تھوڑی دیر شرمانے اور ہچکچانے کے بعد اپنی سوکھی ہوئی ٹانگیں ٹیک کر زینے پر بیٹھ گیا۔

مالکن نے شور مچاتے ہوئے بچوں سے کہا۔

"چپ ہو۔ بات کرنے دو۔ رسزا کل بھاگ کیوں گیا تھا رے۔"

"کچھ نہیں بہو جی۔" رسزا نے کہا۔

"کچھ کیوں نہیں، کل بنا پیسہ لیے نہیں چلا گیا تھا؟"

رسزا چپ بیٹھا رہا۔ دو بچے صحن میں پڑی ہوئی کھاٹ پر بیٹھے اسے اس طرح تک رہے تھے جیسے اب وہ کوئی کرتب دکھانے والا ہو۔

"کل کچھ کھایا تھا؟" مالکن نے پوچھا۔

"اماں! شکل دیکھو۔ فاقے لگ رہے ہیں۔" بڑی لڑکی نے کہا۔

"کون ہے؟" اندر سے منجھلی لڑکی کی آواز آئی۔

"الا اللہ"
ال بل۔ لا۔

"ایسے نہیں، پہلے بجھو کو ٹوپی پہناؤ۔" بڑے بابو نے کہا۔
"اور اس کی چرکی؟" ہولو نے کہا۔
ان الفاظ میں جادو تھا۔ سب سے پتے کی بات گنگلے لڑکے نے کہی تھی۔
ایک لڑکی بھاگ کر بغیچہ سے قینچی لے آئی اور منجھلا چرکی کاٹنے کے لیے آگے بڑھا۔ چرکی والے لڑکے نے دونوں ہاتھوں سے کس کر اپنی چرکی دبالی جیسے وہی اس کی جمع جتھا تھی اور اس کے چلے جانے پر وہ لٹ جائے گا۔"
"ارے چھوڑ۔ چرکی کاٹنے دے۔" منجھلے نے کہا۔
"نہیں، نہیں، میں چرکی نہیں کٹواؤں گا۔" رمسرنا نے روتے ہوئے کہا۔
"ارے اسے کیا ہو گیا؟" الکن نے کہا۔
رمسرنا کے سر پر چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ اور وہ بلک کر رو رہا تھا
الکن نے کہنا شروع کیا۔ "چرکی نہیں کٹے گی تو مسلمان کیسے ہو گا۔ بھک منگے کا بھک منگا ہی رہے گا۔"
"میں چرکی نہیں کٹواؤں گا۔" لڑکے نے کہا۔
"نہیں مانے گا تو؟" بڑے بابو ڈانٹ کر بولے۔
"میں نہیں کٹواؤں گا۔"
ایک سمے تک چرکی والے لڑکے کے سر پر پڑے پچارہا۔
پھر کسی نے دھکا دے کر اسے چوکی سے نیچے اتار دیا۔
کسی نے کہا۔ "نکل یہاں سے۔"
وہ مرے مرے قدموں سے نل کے سامنے سے گزرا جہاں اس کی کھینچی ہوئی قمیض پڑی تھی۔ دروازے پر پہونچ کر اس نے بھیک مانگنے کا برتن اٹھایا اندر سے کسی نے کہا۔
"پکڑو اسے!"
رمسرنا کود کر باہر نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد سب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے میت میں سے آئے ہیں ——
بڑے بابو اسٹیشن لوٹ گئے۔
بچے ریلوے لائن پر پتھر رکھنے چل کھڑے ہوئے۔
ہولو نے سگریٹ کی خالی ڈبیوں کا اپنا ذخیرہ نکالا اور گننے لگا۔
منجھلی لڑکی نے دیکھا ریلوے لائن کی ڈھلان پر دور منجھلا چڑھ رہا تھا۔
اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اپنی پیاری سہیلی کے نام ایک خط بھیج دے جس میں یہاں کی تنہائی کا ذکر ہو اور خاموشی کا جو ریلوں اور لیڑ کی آواز سے ٹوٹتی ہے اور پھر پانی کی سطح کی طرح پرسکون ہو جاتی ہے۔
چرکی والا لڑکا ایک بنیا پر چلتا ہوا سوچ رہا تھا، اس کے رنگ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ اگر یہ کھیل تھا تو وہ بھاگ کیوں کھڑا ہوا ہے، اور اب کہاں جائے گا۔ اور اگر سچ مچ دھرم چھوڑنے کی بات تھی تو بڑی خیریت ہوئی کہ وہ بچ نکلا۔

مالکن سوچ رہی تھی اس خوشی میں ایک میلاد شریف بھی ہونا چاہیئے۔ اور بڑے بابو اس خیال میں مگن تھے کہ اس اطلاع کے جانے ماں کے بڑے بھائی بھی چونک پڑیں گے۔"

حالاں کہ منجھلے لڑکے نے رمسرنا کو مسلمان کرنے میں حصہ نہیں لیا تھا، لیکن اس کی طمانیت بھی اپنی جگہ مسلم تھی کیونکہ وہ پچھلے چند دنوں سے بڑے کاموں سے بچ رہا تھا۔

آج اس گھر میں ناخوش کون تھا! جس کنبے کے سب افراد زندہ ہوں، بیٹیاں ابھی گھر ہی میں ہوں بیٹے چھٹیوں میں گھر آئے ہوئے ہوں اور جس گھر کو دین کی سعادت نصیب ہو رہی ہو وہاں سوگ کوئی کیوں منا تا۔!

رمسرنا کو ایک پجامہ دیا گیا کہ وہ آڑ میں ہو کر پہن لے۔ پھر منجھلے نے وہیں لے جا کر اسے قمیض دی۔ کسی چھوٹی لڑکی نے ایثار سے کام لے کر اپنی پیالی سیاہ جوتیاں پہنا دیں۔ اور جب وہ اوٹ سے نکل کر باہر آیا تو مالکن نے کہا۔

"دیکھو اب کیسا میاں پوت لگ رہا ہے۔"

لڑکا پرآمدے میں کھویا کھویا سا کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ گھر کے تمام افراد کی طرح وہ بھی ہنگامے سے متاثر تھا۔ اس ہنگامے کے پیچھے جو فلسفہ ہو سکتا تھا اسے سب بھول چکے تھے۔

پھر مالکن اسے ہاتھ پکڑ کر چوکی کے پاس لے گئی اور اسے چوکی پر بٹھایا جانے لگا۔ پھر کسی نے اسے چوکی سے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور چھوٹی ایک م لے آئی جو چوکی پر بچھا دی گئی۔ رمسرنا پھر چوکی پر بٹھا دیا گیا۔

مالکن نے بڑے بابو سے کہا "اب کرو مسلمان۔"

"اوں" کر کے سوچتے ہوئے بڑے بابو آگے بڑھے۔ اور پھر اس خیال سے کہ اب کیا کرنا چاہیئے پیچھے ہٹ گئے۔

"ارے کھڑے سوچ کیا رہے ہو؟" کنبے کی ماں نے پوچھا۔

"تم ٹھیک کر رہی ہو۔ مجھے جو کرنا ہے کل کرا دوں گا۔"

مالکن نے لڑکے سے کہا۔ "تو جی سے مسلمان ہوتا ہے نا؟"

رمسرنا گیت رہا۔

"بول۔ جی سے مسلمان ہو رہا ہے نا؟" مالکن نے رمسرنا کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا بہو جی؟" رمسرنا نے پوچھا۔

"میں پوچھ رہی ہوں ارے باندھے تو مسلمان نہیں ہو رہا ہے۔ دیکھ تجھے کوئی دھمکی نہیں دے رہا ــــ گلا نہیں گھونٹ رہا..... راضی مسلمان ہو رہا ہے ـــــ"

"اپنی اچھا سے مسلمان ہو رہا ہے۔" بڑے بابو نے مالکن کے آخری جملے کے ساتھ ساتھ کہا۔

رمسرنا نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سچ سے کہہ۔" سب نے کہا۔

"بس تین دفعہ تو تم نے پوچھ لیا۔" بڑے بابو نے کہا۔

"آج سے تیرا نام خدا بخش ہے۔"

رمسرنا نے اوپر نیچے سر ہلا دیا۔

"بخشو کو کلمہ پڑھاؤ۔ بخشو پڑھو لَا اِلٰہ" ایک لڑکی بولی۔

"لَا اِلٰہ"

"نہیں مہاراج۔"

"اور کیا کہتے تھے؟" پجاری نے کہا۔

"رمسرنا۔ کہتے تھے مسلمان ہو جا۔ ہم گھر میں رکھیں گے، کپڑے دیں گے اور کھانا پیٹ بھر کے کھایا کیجیو۔" کافی دیر تک وہ اپنا دُکھڑا سناتا رہا۔

پجاری بیچ بیچ، "بدمعاش کہیں کے" کہتا جاتا تھا۔

جب رمسرنا کہہ چکا تو اس نے اسے اپنے پاس بلا کر اُس چرکی جھوکر دیکھی اور دیر تک رمسرنا کا ہاتھ پکڑے اسے سمجھاتا رہا۔ اس کے نزدیک رمسرنا نے بہت بڑا کام کیا تھا، ایسا کام جو بس اونچی جاتی کر سکتے ہیں۔ اس نے کہا۔ "کل وہ یہ کہانی سب کو سنائے گا کہ ایسے ایک بالک نے اپنے دھرم کی رکشا کی۔ اور پھر کوئی نہ کوئی اچھی گھرانے والا رمسرنا کو اپنے گھر میں رکھ لے گا۔"

جب پیٹ بھر جانے پر رمسرنا مندر کے صحن میں گہری نیند سو رہا تھا اُسے کسی کی گرم سانس اپنے چہرے پر محسوس ہوئی۔ ایک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھنے کی کوشش میں اسے ایسا لگا اس کا کمزور جسم بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہے۔ اُس نے چیخنا چاہا، لیکن پجاری نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں میں جدوجہد ہوتی رہی۔ جس کا نتیجہ رمسرنا کو اچھی طرح معلوم تھا کیا ہوگا۔ سڑک پر پھرنے والے ہر غریب لڑکے کی طرح زندگی کے بہت سے بھید وہ کم عمری کے باوجود جانتا تھا۔

بالآخر رمسرنا جیت گیا۔ اُس نے پجاری کو اپنے سینے سے اس طرح اتار پھینکا جس طرح سانپ اپنے سر پر لدے ہوئے نیولے کو جھٹک دیتا ہے۔ اور مندر سے نکل بھاگا۔ کافی دور تک بھاگتا رہا۔ لیکن بھاگنا بے سود تھا کیونکہ پجاری نے مندر سے باہر نکل کر اس کا پیچھا کرنا بے مقصد سمجھا ہوگا۔

رمسرنا گھومتا ہوا کالج ہاؤس کے سامنے جا نکلا۔ یہ شہر کی آخری پختہ عمارت تھی جس کے پاس ہی ندی کا پل تھا، اور وہیں سے گاؤں کو راستہ جاتا تھا لیکن بیچ رات میں گاؤں جانے کی اس کی ہمت نہ ہو سکی۔ وہ کالج ہاؤس کی دیوار چڑھ کر اندر اترا جہاں ایک گدھا اندھیرے میں سویا ہوا سا لگتا تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر وہ بھی بھوسے پر سو گیا۔

اگلے دن گاؤں جاتے ہوئے اس نے سوچا۔ وہ لوگ مجھے مسلمان کیوں کرنا چاہتے تھے۔ انھیں مجھے مسلمان کر کے کیا ملتا! مجھ سے انھیں پیار تو تھا نہیں، اور کون ہمیشہ اپنے گھر سے کھلاتے! پھر اسے خیال آیا پجاری بھی اس کا بھلا چاہنے والا نہیں تھا۔ پھر وہ کیوں چاہتا تھا رمسرنا ہندو ہی رہے۔ اسے میرے ہندو رہنے سے کیا ملتا اور کون سا ہندو جاتی والے سدا میرا لالن پالن کرتے! اس نے سوچا بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بلا کارن بہت سے کام کرتے ہیں انہی میں سے بڑے باؤ کے گھر والے تھے، اور یہ مہاراج اور اس کا باپ۔

انسان بدی کی طرف کبھی تنہا سفر نہیں کرتا۔ قدم اٹھانے سے پہلے وہ کوئی ایک ہراول دستے روانہ کر دیتا ہے۔

گاؤں جانے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ نئے کپڑے اُس کے من کو بھاتے تھے، اور نہانے کے بعد بھوک بھی لگنے لگی تھی۔
بیٹا کے دونوں طرف اُگے ہوئے پودوں میں اس نے کوئی کھانے والی چیز ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن کچھ نہ پاکر شہر کی طرف چل پڑا۔
جب وہ شہر پہنچا تو سورج ڈوب رہا تھا۔ وہ تین گھر جھانکتے جھانکتے اندھیرا ہونے لگا۔
اس نے ایک چبوترے پر بیٹھ کر وہ نے کی چیزیں کھائیں جو کسی حلوائی نے دی تھیں، اور جس میں مٹھائی کا چورہ نمکین دہی میں مل گیا تھا، اور چیونٹیوں کی ٹانگیں چورے کے ساتھ منہ میں چلی آتی تھیں۔
تھوڑی دیر میں آکاش سرخ ہو کر بجھ گیا۔ سامنے کے مندر سے سندھیا کے لیے آنے والے اپنے گھروں کو چلے گئے اور پجاری مندر کے چبوترے پر آکر بیٹھ گیا۔
ہوا میں گھٹن تھی۔ پجاری مندر کے دروازے پر سیاہ مورتی کی طرح بیٹھا تھا۔
ایک پرندہ پر پھڑپھڑاتا ہوا سر پر سے گزرا۔
رمسرنا اٹھ بیٹھا، اور تنہائی مٹانے کے لیے پجاری کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ آج کی بات کسی کو بتانے کے لیے وہ دوپہر سے بےکل ہو رہا تھا۔
پجاری نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے تو؟"
"مہاراج میں رمسرنا ہوں۔"
"کھیر؟"
"کچھ نہیں۔ بس ہاتھ جوڑنے آیا تھا۔" رمسرنا نے کہا۔
پجاری خاموش بیٹھا رہا۔
"کہاں رہتا ہے؟"
"کھوج پور میں۔"
"بھیک مانگتا ہے؟"
"ہاں"
"ماں باپ نہیں؟"
"نہیں۔"
"بیٹھ جا۔"
رمسرنا بیٹھ گیا۔
"کون جات ہے؟"
رمسرنا چپ بیٹھا رہا۔
پجاری بھی چپ رہا۔
پھر رمسرنا نے بالوں کا گچھا اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا۔
"ایک گھر رستے میں پڑتا ہے۔ مہاراج۔ مسلمانوں کا۔ وہ لوگ آج میری جڑ کی کاٹ رہے تھے۔"
"کون ہے وہ مدد آچاری؟" پجاری نے کہا۔
"بڑا بابو۔"
"تو نے کھڑا لی؟"

تبصرے

[ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں]

میرے خوابوں کی سرزمین (مشرقی پاکستان)

مصنف صہبا لکھنوی، قیمت ۴ روپے
صفحات ۲۳۰، پبلشر مکتبہ افکار کراچی

میرے خوابوں کی سرزمین، اردو کے مشہور ماہنامہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی کے مشرقی پاکستان کے اس پندرہ روزہ دورہ کی داستان ہے جو انھوں نے تین سال قبل مغربی پاکستان کے رسائل کے چار دوسرے مدیروں کے ساتھ کیا تھا۔

سفرنامے یونہی دلچسپ ہوتے ہیں اور جب وہ بنگال ایسی سحر انگیز مٹی، حسن، اور ندیوں سے متعلق ہوں تو کیا کہنا اور اگر ان کو قلمبند کرنے والا صہبا لکھنوی جیسی نظر اور قلم رکھتا ہو تو اس سفرنامے کی مقبولیت یقینی ہے۔

کسی ملک کے دو حصوں کے درمیان ۱۴ سو میل کا طبعی فاصلہ واقعی ایک بڑا فاصلہ ہے اور ان میں جذباتی، سماجی اور معاشرتی ہم آہنگی پیدا کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں صہبا لکھنوی نے مغربی پاکستان کے باشندوں کو مشرقی پاکستان کے رسم و رواج ادب، دریاؤں، صنعتوں، اطوار و آداب اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بنگال کی آنکھ کی فسوں سازی بھی ہے، بالیوں کی گھنگھور گھٹائیں بھی اور جادو بھرے بنگال کا سحر بھی۔ اس میں کرنا فلی کا غزل سے لے کر قاضی نذرالاسلام اور ٹیگور کے گیت تک ہیں اہم تعلیمی اداروں کی فہرست بھی اور بنگلا اور اردو کے نامور ادیبوں کے نام اور ان کے کاموں کا تذکرہ بھی۔ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ان کی یہ کوشش کامیاب بھی ہے لیکن مصنف کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ کراچی اور ڈھاکہ کے درمیان زمین سے ۱۱ ہزار فٹ کی بلندی اور ۲۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنے کے باوجود ان دونوں شہروں کے درمیان کے کلکتہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کے اطراف میں بقول کرنل سکندر خاں بنگال کی آنکھ رہ گئی ہے اور بنارس بھی ہے جس کے اوپر سے لمحات گزرنے پر بھی اس کے گھاٹ اور اورنگ زیب کی مسجد انھیں اپنی طرف ملتفت کر ہی لیتی ہے۔ یہ چشم آہو جو آج بھی اپنے جسم سے کٹ جانے پر سوگوار ہے اور وہ مسجد جو آج بھی بنارس کے گھاٹ پر "شیخ و برہمن" کے اتحاد کی علامت بن کر سربلند ہے اپنے پڑوسی ملک کے دونوں حصوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی کی متمنی ہونے کے ساتھ یہ بھی دعوا کرتی ہے کہ ہمیں پامال کر کے آگے بڑھنا کچھ ایسا آسان نہیں۔

مصنف نے کتاب کی ابتدا نذرالاسلام کی ایک نظم بعنوان "کانڈاری ہوشیار" سے کی ہے۔ اس نظم کے آخری چند اشعار بیحد خوبصورت ہیں اور دعوت فکر دیتے ہیں۔

مانجھی! تجھے سب کی رہبری کرنی ہوگی اور انھیں
ان کا حق دلانا ہوگا
یہ اس قوم ڈوب رہی ہے۔ یہ تیرنا نہیں جانتی۔
مانجھی! تو نے ماں کو آزاد کرانے کی قسم کھائی تھی۔

واحد بشیر



روتے ہیں تو ہو جاتے ہیں اپنے بھی بیزار بہت
ہنستے ہیں تو کھل جاتے ہیں زخموں کے گلزار بہت

اپنے لہو سے ہولی کھیلو یا پھر اپنا مول چکاؤ!
بکنے بنا اس شہر میں پیارے جینا ہے دشوار بہت

سورج اپنے گھاؤ چھپا کر نور بکھیرا کرتا ہے
تم بھی دل کو روشن رکھو چاہے ہوں آزار بہت

آؤ ساتھی قرض چکائیں ساری پچھلی پشتوں کا
خون ہمارا چاٹ چکی ہے سونے کی تلوار بہت

ہم مقتل میں پلنے والے کب خاطر میں لاتے ہیں
دار و رسن ہیں راہوں میں یا رستے ہیں خونخوار بہت

فن پاروں کی قدر تو دیکھو ایوانوں کی زینت ہیں
غم نہ کرو گر مارے مارے پھرتے ہیں فنکار بہت

(منشور۔ کراچی)



فارغ بخاری



انگڑائیاں جو لیتے ہیں آ آ کے دھیان میں
ان کا بھی جی اداس ہے خالی مکان میں

باہر چلو اٹھائیں ذرا بھیگنے کا لطف
کب تک چھپے رہیں گے یونہی سائبان میں

خوشبو کے ایک جھونکے کو ترسو گے کب تلک
ہمت اگر ہو پھول کھلاؤ چٹان میں

آؤ بسائیں چاند ستاروں میں بستیاں
کب تک بسر کریں گے اسی خاکدان میں

خونِ وفا سے دشتِ تمنا ہے لالہ زار
جاں بر ہوا نہ کوئی بھی اس امتحان میں

یہ شاخِ نور پھولے پھلے گی تو دیکھنا
بامِ افق کو چوم رہی ہے اٹھان میں

نظریں ملیں نہ ہوش ہی آیا نہ لب ہلے
ہم محوِ گفتگو رہے دل کی زبان میں

تعریف اس پری کی بظاہر ہے یہ مگر
فارغ قصیدے کہتے ہیں ہم اپنی شان میں

(امنگ۔ کراچی)

کتاب، لکھنؤ

اور طباعت کی خوبیوں کے علاوہ اس کے مندرجات پر نظر ڈالی جائے تو اس کے معاونین میں بے شمار اچھے لکھنے والے مل جاتے ہیں۔ کوثر چاندپوری، اقبال متین، خلیل الرحمان اعظمی، شہریار، مخدوم محی الدین، ڈاکٹر شفا گوالیاری، جوگندر پال، منظر حنفی، نریش کمار شاد، سید حرمت الاکرام، مغنی تبسم، آمنہ ابوالحسن، ہرچرن چاولہ، انور عظیم تمنائی، محمود ایاز، وقار لطیف، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، دانش فرازی، نصیر الدین ہاشمی وغیرہ ان کے علاوہ بھی اتنے سارے نام ہیں کہ وہ سب کے سب اس مختصر سے تبصرے میں نہیں سما سکیں گے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی ادبی رسالے کو اگر آغاز سفر ہی سے ایسے قلم کار مل جائیں تو آگے کا سفر ہموار اور بے خطر ہو جاتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ صحت مند اعلیٰ ادب کی تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ (رام لعل)

رنگ و بو | خرد عوث پوری۔ صفحات ۱۲۸۔ قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ گلستان ادب ۱/۱۰۱۔ کاشی پور روڈ۔ کلکتہ ۲

"رنگ و بو" خرد عوث پوری کی غزلوں کا انتخاب ہے جس میں مولانا ابر احسنی گنوری کا پیش لفظ، اور دوسرے چار پانچ حضرات کے مضامین خیال ہیں جن میں خرد عوث پوری کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی گئی۔

خرد عوث پوری کی غزلوں میں قدیم اور جدید روایات کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے اور وہ غزل میں روایتی خیالات کے ساتھ ہی ساتھ جدید خیالات کے اظہار پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ (منظر سلیم)

ستمبر کے کتاب میں نورشاہ کی ایک بلا عنوان کہانی شائع ہوئی تھی۔ پال ششما اور الکا کی کہانی۔ ایک مرد اور دو عورتوں، اس مرد کی کشمکش کی کہانی۔ اس صورت حال کا ذمہ دار نہ پال تھا نہ ششما، نہ الکا۔ پال نے اپنی بیوی الکا سے بے وفائی نہیں کی تھی لیکن اس کی شخصیت تقسیم ضرور ہو گئی تھی۔ الکا سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش تھی۔ گم سم بے زبان۔ ششما پال کی مجبوریوں کو جانتی تھی نہ وہ الکا کی جگہ لے سکتی تھی اور نہ اس کی خواہشمند ہی تھی۔ پھر ان کی زندگی میں ایک امید نے جنم لیا اور اس نے ششما کی تصویر پال کے تکیہ کے نیچے سے نکال کر البم میں پہونچا دی۔ اس شگوفہ نے ایک شگفتہ پھول کو خزاں آلود کر دیا لیکن یہ تو ہونا ہی تھا۔

اس انجام نے بہت سے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اس قسم کے عنوانات کو جنم دیا۔ ایک تصویر، ایک حقیقت، منزل ہے کہاں تیری، تو کہاں جائے گی؟، خواب اور حقیقت۔ چند اور عنوانات جو بہت سے پڑھنے والوں نے بھیجے تھے ذیل میں۔ تعلق ایک منزل، مرجھائے پھول، گناہ بے لذت۔

تمام عنوانات پر غور و خوض کے بعد ججوں نے اشفاق عالم آروی (کانکے روڈ۔ رانچی) کے عنوان "گھر کی جنت" کو پہلا انعام کا مستحق قرار دیا۔ انہیں ۶ مہینہ تک کتاب نذر کیا جائے گا، مس قمر (منہاج پور۔ الہ آباد) کے عنوان نشان منزل کو دوسرے اور تجمہ پرویز (گوالٹولی ہمیرپور) کے عنوان نئی سحر کو تیسرے انعام کا مستحق قرار دیا۔ انہیں تین تین مہینے کے لیے کتاب نذر کیا جا رہا ہے۔

ان کے علاوہ ججوں کو حسب ذیل عنوانات بھی پسند آئے۔ صبح کا بھولا (سید کمال الدین۔ الہ آباد) نیا شگوفہ (طلعت شکیل۔ لکھنؤ) سوچا تھا کیا (اے احمد۔ انصاری ہاسٹل) تصویر کی موت (مختار احمد انصاری۔ خیرآباد۔ اعظم گڑھ) بہار کی آمد (ڈاکٹر محمد اکمل شمسی۔ لکھنؤ ۳) عذر راہ (سید نفاست حسین۔ گلیا دائی۔ بھوپال) زیست کا ساحل (رضیہ بیگم۔ عبدالعزیز روڈ لکھنؤ) محبت زندگی ہے (محمد رئیس برہان پور) دو دھارے (انجم قریشی۔ سرائے گوبردھن۔ بنارس) کفر جنوں (اقبال احمد۔ مئو ناتھ بھنجن۔ اعظم گڑھ) حسین خواب (ایم مقصود عالم لاٹسنول) تو ہین مسرت (ایم اے ملک۔ بھوپال) دیوانگی (محمد یونس انصاری۔ بنارس)

آج ہم اس کا امتحان لینا چاہتے ہیں
ہندو نہیں وہ مسلمان ہو" کون نالائق یہ سوال اٹھا رہا ہو
ماجھی! بول انسان ڈوب رہے ہیں انسان
ایک ہی ماں کی اولاد

چوبیس خوبصورت تصویروں سے مزین یہ کتاب چار روپے میں نہایت سستی ہو اور مشرقی پاکستان اس کے باسیوں کو اور ان کی زندگی کو پیش کرنے کی ایک پرخلوص اور کامیاب کوشش ہو جو تاریخی اور جغرافیائی اعداد و شمار اور ناموں کی طویل فہرست کے باوجود ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کئے بغیر مشکل ہی سے چھوڑی جا سکتی ہو۔ (عابد سہیل)

موت کی شہنائی

مصنف حسن شہیر۔ طابع و ناشر دائرہ ذہن و انقلاب ۵۔ کالی داس مارگ لکھنؤ۔ قیمت چار روپے۔

حسن شہیر ذہنی اعتبار سے انقلابی اور مزاجاً رومانی شاعر کی حیثیت سے اردو میں کافی دنوں سے متعارف ہیں۔ ان کی تازہ ترین کتاب "موت کی شہنائی" اگرچہ ان کی ان دونوں خصوصیات کی حامل ہو لیکن ان کا انقلاب بغاوت اور ان کا رومان ایک ایسی کیفیت کی شکل اختیار کر گیا ہے جس کے لیے اور کوئی دوسرا موزوں لفظ نہ ہونے کی صورت میں ہم "اداسی" اور "اسے روان" کی ترکیب استعمال کر سکتے ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ اور بڑی تبدیلی ان کے اسلوب میں ہوتی ہے۔ صبح زندان اور سحاب کی غنائی اور صوتی اعتبار سے ہم آہنگ موسیقی خیز نظمیں لکھنے والا شاعر طنز لکھنے لگا ہے اور وہ بھی نثری شاعری کے اسلوب میں۔

ایک اور بھی تبدیلی حسن شہیر میں نظر آتی ہے اور وہ ہے جزو میں کل دیکھنے اور حیرت انگیز طور پر دیکھنے کی صلاحیت کا بروئے کار آنا۔

اگر آپ موت کی شہنائی کا مطالعہ کریں تو سب سے پہلے جو چیز آپ کو محسوس ہوگی وہ ہے ان کی نظموں کا اختصار۔ ۴ مصرعوں کی (یا جملوں کی) نظمیں ۳ مصرعوں کی نظمیں کتاب میں عام ہیں۔ مثلاً ایک نظم ہے ؎

آہ سمندر
کٹے ہوئے سر
اور خاموشی میں مسکراہٹ۔

نظم مکمل ہوگی۔ نظم کا عنوان ہے "موت" دیکھئے تین بالکل مختلف چیزوں یعنی سمندر، کٹے ہوئے سر اور خاموش مسکراہٹ میں ایک ایسا ربط ڈھونڈھ لیا ہے جس کے لیے ایک طول طویل ذہنی عمل کی ضرورت ہے۔

"موت کی شہنائی" کی تمام نظمیں اسی اختصار کا اعجاز ہیں۔ احساس ہوتا ہو کہ ہر نظم سے قبل شاعر ایک طول طویل ذہنی عمل سے گزرا ہو جو خود کسی خاص جذباتی کیفیت کا رد عمل ہو۔ پھر دانستہ اس طول طویل ذہنی عمل کی مکمل تصویر کو خطوط اور خطوط کو نقطوں میں لایا گیا ہو اور یہ نقطے پیش کر دیئے گئے۔ قاری کو ایک مرتبہ پھر اسی عمل سے اسی سمت میں گزرنا ہوگا نقطوں کو خطوط میں تبدیل کرنا ہوگا اور خطوط سے خود تصویر بنانا ہوگی۔

ماڈرن آرٹ کی طرح یہاں بھی صرف اشارے ہیں جن سے مختلف قاری اپنے اپنے حال کی روشنی میں خود اپنی تصویر مرتب کر سکتے ہیں۔ شہیر کی شاعری کی یہ صفت جس کو شاید قدیم تنقید میں ابہام کہا جائے بہرحال اس بات کی کوشش ہو کہ نہ صرف یہ کہ شاعر اپنی بات دوسروں تک پہونچائے بلکہ اس نئی دور میں جب لوگ خود اپنے جذبات سے ڈرنے لگے ہیں ان کو خود اپنی ہی جذباتی تکمیل پر اکسائے۔ شہیر اس میں کس حد تک کامیاب ہیں یہ فیصلہ ہر قاری کیلئے مختلف ہوگا نقطۂ نظر طاہر ہو۔ (عثمان غنی)

ماہنامہ یوگم

حیدرآباد۔ آندھرا۔ قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے، سالانہ ۶ روپے۔

آندھرا کے مشہور شاعر نامر کرنولی نے ایک صاف ستھرا ماہنامہ جاری کیا ہے جس کے چار شمارے نکل چکے ہیں۔ کتابت

اگر رگھو ویر سہائے "میرے اور سگی عورت کے بیچ [illegible] کے بجائے کوئی بھی نام رکھ لیتے تو بھی پڑھنے والا اس افسانے میں کھویا ہوا خاتمہ تک آجاتا ــــ نہ جانے کیوں رگھو ویر سہائے اور ٹھاکر پرساد ہمیں (قاری) صرف ننگے پن کا دیوانہ سمجھتے ہیں۔

"پرندے" میں قرۃ العین حیدر اور اے حمید کی یاد تازہ ہوتی ہے "ڈپٹی کلکٹری" میں امرکانت نے مڈل کلاس کی ٹریجڈی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ٹریجڈی کے بجائے اور کچھ معلوم ہوتی ہے۔ امرکانت اس قسم کیسی ٹریجڈی کے ذریعہ ہمارے کلاس کے معائب کو ہلکا کرکے ہمیں یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ہمارا افسوس بیکار رہا، ہم بہت بڑے خواب دیکھتے ہیں اور وہ خواب اس لیے پورے نہیں ہوتے کہ ہم ان کے اہل نہیں۔

"قصبے کا آدمی"۔ "سوال اور جواب" "تیسری قسم" "تیسرے پہر کی دھوپ" اور "افسر" عمدہ کہانیاں ہیں۔

"کھوٹا سکہ" بہت ہی اچھی کہانی ہے یہ کہانی بھی رگھو ویر سہائے کی کہانی کی طرح تعریف کی مستحق ہے۔

سبھی کہانیوں میں تفصیلات پر کافی دھیان دیا گیا ہے۔ اور یہ خصوصیت ایسے بیشتر اردو افسانہ نگاروں میں نہیں ہے جو ۱۹۴۷ء سے پہلے ابھرے اور جنھیں آج ٹھاکر پرساد سنگھ نے ہندی میں پڑھا ہے۔ لیکن اگر یہی بارہ کہانیاں ہندی کی نمائندہ کہانیاں ہیں تو آج کے اردو افسانہ نگار کسی طرح بھی ہندی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مزید کچھ کہنا اس لیے غیر ضروری ہے کہ عابد سہیل کا مختصر گر جامع مضمون اسی نمبر میں موجود ہے جس میں انھوں نے نہ صرف غلط فہمی دور کردی ہے بلکہ ہمارے معائب بھی اجاگر دیے ہیں۔ (فضل تابش۔ بھوپال)

تجربے نادر، ندرت غائب:- کتاب کے گذشتہ نمبروں کی طرح نئی ہندی کہانی نمبر کی بھی اپنی ایک انفرادیت ہے اور شاید اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا ہندی کہانیوں کا، جو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں، پہلے مستقبل تابناک ہو لیکن موجودہ صورت حال اطمینان بخش نہیں، ان میں اردو کہانیوں کی طرح زور، تسلسل، مکالموں میں برجستگی، اور شگفتگی بالکل سرے سے مفقود ہے۔ اگر تجربے اور مشاہدے نادر ہیں تو افسوس کہ اظہار میں ندرت غائب! اس کی وجہ ہندی زبان کی ناپختگی اور کرختگی ہے ــــ ابھی ہندی (دیوناگری رسم الخط والی) میرا خیال ہے کہ "ایام طفلی" میں ہے اور اس میں سمندر جیسی وسعت آنے میں بہت دیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر ہندی کے افسانہ نگاروں کو اظہار بیان میں دشواری ہوتی ہے اور اچھا بھلا واقعہ، الفاظ کے قالب میں ڈھل کر سپاٹ ہو جاتا ہے ــــ ہندی کہانیوں میں وہ جذبہ بھی مفقود ہے جو کہانی کے پوروں میں سما کے ANGELIC ہو جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے تاج محل، زیر نظر شمارہ میں تیری قسم، پرندے، قصبے کا آدمی، اور کھوٹا سکہ بہت اچھی کہانیاں ہیں اور ان کے خالق سے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

ہندی چونکہ قومی زبان ہے اس لیے اس کا مستقبل روشن کیا جاسکتا ہے لیکن اگر اس نے اردو سے اپنا منہ موڑ لیا تو ادب و فن کے تمام دروازے اس کے لیے بند ہو جائیں گے۔ (یوسف اختر ناگی)

نئی روشنی:- تھوڑی بہت ہندی تو مجھے آتی ہی ہے لیکن جب آپ کے اس انتخاب کو پڑھتا ہوں تو یقین مانیے یقین نہیں آتا کہ جدید ہندی کہانی سے میں کوسوں دور رہا ہوں۔ (جبار جمیل۔ اڈونی)

عالی شان نمبر:- اس بار بھی کتاب کا نمبر عالی شان ہے۔ جس طمطراق سے آپ نے ہندی نمبر نکالا ہے اس کی مبارک باد قبول فرمائیے ابھی صرف فنیشور رینو کی کہانی تیری قسم اور موہن راکیش کی گلاس ٹینک ہی پڑھ سکا ہوں تیسری قسم بہترین کہانی ہے۔ کتاب نے اس چھوٹی سی عمر میں گل کھلائے ہیں جو کبھی مرجھائیں گے نہیں ان کی بوباس ابدی ہے کبھی نہ ختم ہونے والی (راکیشام آنند۔ جموں)

جدت اور معیار:- "نئی ہندی کہانی نمبر" کے بارے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ یہ نمبر بھی "کتاب" کی گزشتہ روایات کے عین مطابق ہے آپ نے یہ نمبر نکال کر ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ "کتاب" نے جدت اور معیار کو ہمیشہ قائم رکھا ہے یہ نمبر خود اپنی مثال ہے اور اس سے اردو کے قارئین کو یہ جاننے میں بہت بڑی مدد ملے گی کہ آج کی ہندی کہانی کس مقام پر پہنچ چکی ہے۔

تلخ، تند، شیریں

خوبصورتی، سلیقہ :- "کتاب" کو اور بھی خوبصورت اور سلیقے سے سنوارنے کے لیے آپ اور آرٹسٹ شفیق چندر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

فیض کے تینوں قطعے بہت اچھے ہیں۔ حسن شہیر کی نظم "انسان کا مذہب" بھرپور ہے۔ ملقہ شبلی کی نظم اور طفیل ہوشیارپوری کی غزل پسند آئی خاص طور سے غزل کا مطلع اور تیسرا اور چھٹا شعر۔ "جارج پیجم کی ناک" کا ترجمہ عشرت صدیقی نے اچھے ڈھنگ سے کیا ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر اور نور شاہ کی کہانیاں اچھی ہیں۔ ق۔ آغا کی اطلاع کے لیے ہاکی پکڑی نہیں جاتی بلکہ اس سے "ہاکی" کھیلتے ہیں جیسے ہاکی اسٹک صرف اسٹک کہتے ہیں۔ (محمد یوسف۔ بھوپال)

اللہ دے بندہ لے :- ستمبر کا پرچہ دیکھا۔ رضیہ سجاد ظہیر کی کہانی "اللہ دے بندہ لے" بہت پسند آئی۔ کہانی ہر طرح سے مکمل ہے "نورِ مرگ کے قطعے میں" سے بہت متاثر ہوا۔ (قیصر عباس۔ رائے بریلی)

محدود دائرہ فکر :- افادیت کے لحاظ سے پچھلے دنوں نئی ہندی کہانی نمبر غالباً ۱۹۶۴ء کے تمام رسائل کے خاص نمبروں سے بازی لے گیا۔ سخت ضرورت تھی کہ اردو کے وہ قارئین اور فنکار، جو ہندی رسم الخط سے ناواقف ہیں، ہندی کی نئی کہانی سے متعارف کرائے جائیں۔ آپ نے ہندی کہانی کے بہت سے قابل ذکر نئے فنکاروں کا تعاون حاصل کر لیا لیکن اگر میں یہ کہوں کہ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ابھی ہندی کی نئی کہانی اردو کی نئی یا پرانی کہانی سے لگا نہیں کھاتی، تو آپ اسے لسانی تعصب تو نہ کہیں گے۔ موضوعات کے بارے میں تو کم از کم ان بارہ کہانیوں کے سامنے رکھتے ہوئے اردو افسانہ نگاروں پر یہ الزام نہیں عائد کیا جا سکتا کہ ان کا دائرہ فکر محدود ہے۔ تقریباً یہ تمام موضوعات اور دوسرے قابل ذکر موجودہ مسائل اردو کے نئے افسانہ نگاروں کی نگاہ میں رہے ہیں اور ان پر افسانے لکھے گئے ہیں۔ بنیادی فرق تکنیک اور ان کے علامتی تجربات کا، جن سے اردو افسانہ نسبتاً بچا رہ گیا ہے حالانکہ غزل اور نظم میں یہ بدعت زوروں سے چل نکلی ہے۔ میرا خیال ہے ترقی پسند تحریک نے فن میں مقصد کی جو اہمیت تسلیم کرائی اسی نئی ہندی کہانی اس سے بغاوت کر رہی ہے پھر اس بغاوت میں جو ابہام اور الجھاؤ ہے اس سے بھی آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ فن اور ادب میں ایسی تحریریں، جنھیں سمجھنے کے لیے ذہن کو قلابازیاں کھانی پڑیں، وقتی طور پر تو لوگوں کو چونکا سکتی ہیں لیکن کوئی دیرپا مقام نہیں بنا سکتیں۔ دیکھیے یہ نیاپن ہندی والے کب تک نبھا سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں اردو میں تو اس قسم کے افسانے جو ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ لکھے گئے ہیں مثلاً "تماشہ" اور "دودھ" (رام لعل) "سوئیاں" (انتظار حسین) "گائے" (انور سجاد) "آوازیں" (قرۃ العین حیدر) "آوازیں، آزادی، گلدستے" (الفد) وغیرہ اب تک مستحسن نگاہوں سے نہیں دیکھے گئے۔ (مظفر حنفی۔ بھوپال)

اچھی بری کہانیاں :- "نئی ہندی کہانی نمبر" کی سب ہی کہانیاں اور مضامین پڑھے لیکن اگر ہر ایک لکھنے والے کے مختصر حالاتِ زندگی بھی ہوتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ اس نمبر میں مجھے سرد جوشی کی کمی محسوس ہوئی۔

رمیش بخشی کی "میز پر ٹکی ہوئی کہنیاں" سے اچھی کہانیاں بھی ہیں جنھیں وہ زیادہ صاف اور گہرے نظر آتے ہیں۔ راجندر یادو اور موہن راکیش اگرچہ شہری زندگی کی باریکیوں کو خوردبین کے سامنے ضرور لاتے ہیں مگر محسوس ہوتا ہے کہ LENS کو ٹھیک سے ADJUST نہیں کر پا رہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں خوردبین کے استعمال پر عبور نہیں یہاں۔ ان کے حالات زندگی نہ جاننے کی بنا پر کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی۔

اس طرح یہ نمبر گائیڈ (GUIDE) بھی ہے اور ادبی دستاویز بھی۔ یوں تو اس میں ہر کہانی اپنی جگہ خوب ہے۔ لیکن ... کی "ٹھیک" اور "پرندے" لاجواب ہیں۔ (رشی سرونج ٹیموں)

بڑا کام :- دنیا ہندی کہانی نمبر، نکال کر آپ نے بڑا کام کیا۔ اردو داں لوگوں کے اس طبقے کو جو ہندی سے ناواقف ہو اس شمارے سے اندازہ ہو جائے گا کہ نئی ہندی کہانی کا کیا روپ ہے اور اس کی کیا رفتار رہی۔ آپ کا انتخاب بہت ہی عمدہ اور قابلِ داد ہے۔ میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ (وحید الحسن۔ بہرائچی)



ہندستان میں اردو کا سب سے ارزاں اور معیاری ماہنامہ

کتاب
لکھنؤ

سال ۳ شمارہ ۱۱-۱۲

دسمبر ۱۹۶۴ء

علی عباس حسینی نمبر

مدیر	مرتب	مجلس مشاورت
سید جمیل احمد	عابد سہیل عبدالحلیم انیس نصرت	سید احتشام حسین، حیات اللہ انصاری عابد سہیل

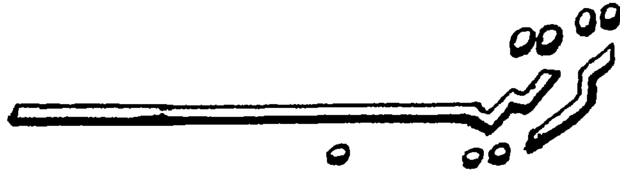
زر سالانہ	ڈی لکس ایڈیشن	بیرونی ملکوں سے
۶ روپے	۱۰ روپے	۳۰ شلنگ ۸ ڈالر

ضخامت	قیمت
۱۳۴	ایک روپیہ ۲۵ پیسے

ماہنامہ "کتاب"
چوک - لکھنؤ - ۳

'HE 'B' MONTHLY
r, 196u KNOW-3 Reg. N

اس طرح بہتر گائیڈ
ٹیک اور پرنٹ
بڑا کام
ہے بیری



پرنٹر پبلشر :- سید جمیل احمد، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ

ادارہ کتاب

اس خصوصی نمبر کو

اُردو افسانہ

کی ان روایات کے نام

معنون کرتا ہے

جو پریم چند سے لیکر اس وقت

تک

اسمیں جاری و ساری ہیں

علی عباس حسینی نمبر

کر چنو کا فاتحہ ہو جائے (مبلغ گھومنی) اور نہ کسی میں اتنی ایمانداری کہ وہ سخت جاڑے میں ٹھٹھرتے ہوئے اگر کسی لاچار و مجبور پر خوبصورت اور قیمتی شال دیکھے تو اسے ایک نئے (گناہ بے لذت)

اس زمانہ میں جہاں شائد تغیر کو بھی قیام نہیں اگر چالیس برس بعد بھی کوئی قلم حسن و حقیقت کے معیار، درد و غم کی تصویریں اور زندگی کی سحرکاری کے مرقعے پیش کرنے پر قادر ہو تو یہ بذات خود ایک عظیم کارنامہ ہے اور پھر جب اس ادیب کو علی عباس حسینی کا سا دل، کسک، درد و غم کی تاثیر، فنکارانہ مہارت، دلسوزی، زندگی کا قریب سے مشاہدہ، فن کی لطافت اور نزاکتیں اور دل کا خلوص مل جائے تو اس کی تخلیقات کی دلآویزی اور سحرکاری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

ان کے افسانوں میں ان کی اپنی شخصیت کا عکس اور زبان کی چاشنی کے علاوہ پوری چالیس سال کی سیاسی اور سماجی کشمکشوں اور حالات کی دلآویز اور دیگر تصویریں ملتی ہیں جو انھیں دوسرے افسانہ نگاروں سے ممیز کرتی ہیں۔

ادارہ کتاب حسینی صاحب کو ادبی زندگی کے چالیس سال مکمل کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

عابد سہیل

چور راستے ۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار کوثر چاندپوری کا اسی عنوان کا ایک افسانہ کتاب کے شمارہ اکتوبر میں شایع ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں موصول ہونے والے چند خطوط اور بعض احباب کے متوجہ کرنے پر جب ہم نے اسے دوبارہ پڑھا تو احساس ہوا کہ اس سے پڑھنے والوں کی دلشکنی سمجھا ہے۔ ہم ادارہ کتاب اور کوثر چاندپوری صاحب کی طرف سے اپنے تمام پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اس افسانہ کا منشا کسی فرقہ کو تو درکنار کسی فرد واحد کو تکلیف پہونچانے کا بھی نہ تھا۔ ادارہ کو اس سہو کے لیے افسوس ہے۔

پنجابی کہانی نمبر ۔ ہم نے بنگالی کہانی نمبر کا اعلان کیا تھا لیکن جب کام ہاتھ میں لیا تو اندازہ ہوا کہ وہ کافی دقت اور وقت طلب ہے اس لیے ہم نے اس نمبر کو سردست ملتوی کر دیا ہے اور فوری طور سے پنجابی کہانی نمبر کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ خاص نمبر چونکہ رسالہ کی تاخیر کا سبب بن جاتے ہیں جس سے ہمیں اور آپ دونوں کو افسوس ہوتا ہے اس لیے اب یہ نمبر کافی تیاری کے بعد ہی نکالا جائے گا اور اس طرح کہ اس سے عام نمبروں کی اشاعت التوا میں نہ پڑے۔ اسی خیال کے پیش نظر پنجابی کہانی نمبر کی تاریخ اشاعت کا اعلان نہیں کیا گیا ہے۔

"ہوئی تاخیر تو کچھ ______" ۲۰۰ صفحات کا علی عباس حسینی نمبر کم و بیش ۱۴۰ صفحات کا ہو گیا۔ گویا عام شماروں کا دگنا۔ یہ نمبر بھی ہم وقت پر نکال ہی لیتے اور ایک شمارہ کو قربان کئے بغیر لیکن کتابت و طباعت کی بعض ایسی دقتیں پیش آگئیں جن سے کتاب کو پہلی بار دوچار ہونا پڑا۔ ہمیں اس تاخیر کے لیے شرمندگی بھی ہے افسوس بھی۔ لیکن یہ یقین بھی ہے کہ آپ ہماری اس کوتاہی کو درگزر بھی کر دیں گے۔

کتاب لکھنؤ

اپنی باتیں

علی عباس حسینی کی ادبی زندگی کے چالیس سال اردو افسانہ نگاری کے اس دور پر محیط ہیں جسمیں اردو کہانی نے شعور کی انگلی پکڑ کے چلنا سیکھنے سے لیکر لاشعور کی دنیا تک کی تصویر کشی کی ہے۔ ان چالیس برسوں میں اردو کہانی نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو پچھلی کئی صدیوں میں کئی نسلوں نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ برطانوی دورِ اقتدار کے خلاف منظم تحریک، فرقہ واریت، تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات اور پھر دو مملکتوں کی اپنی اپنی دنیاؤں کو جنت نشان بنانے کی کوشش۔ زمانہ کی برق رفتاری نے گزشتہ "کل" کو اتنا دور ڈھکیل دیا ہے اور مستقبل بعید کو اتنا قریب لاکر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ نگاہ جو ابھی کل تک محو نظارہ تھی آج "چشم حیراں" بنی اس بھری پڑی دنیا کو ٹک ٹک دیکھ رہی ہے۔

آج کے گاؤں گاؤں نہیں رہے قصبے بن گئے ہیں۔ قصبے شہر، اور شہر انسانوں بلکہ کبھی کبھی انسانوں کی طرح ہنس بول لینے والی مشینوں کے انبوہ جن میں کوئی ایک دوسرے کو پہچانتا نہیں، کوئی کسی کو جانتا نہیں۔ افسانہ نگار کس کی کردار نگاری کرے کسے خود پہچانے اور کسے آپ کے سامنے پیش کرے۔

اس صورت حال کے بطن سے Abstract کہانیوں کے رجحان نے جنم لیا ہے جن میں کردار کا چہرہ مہرہ، گوشت پوست نہیں، نام نہیں، شکل و صورت نہیں، بس ایک لمحہ کی کیفیت ہے۔

اب کسی کے پاس وہ فرصت کے رات دن نہیں کہ تصور جاناں لیے بیٹھا رہے اور نہ طلسم ہوشربا سننے کی مہلت زندگی کے مسائل خود اتنے ہوشربا ہیں کہ بڑے بڑے ہوشربا واقعات ان کے سامنے پھیکے پڑ گئے ہیں۔ وہ لمحے جو پہلے کی کہانیوں میں بڑے معلوم ہوتے تھے اب ہر وقت ہماری زندگی کا حصہ ہیں۔ اس زمانہ نے ہم سے نہ صرف ہماری خوشیاں بلکہ ہمارے غم بھی چھین لیے ہیں۔

آج گردش زمانہ کسی کو ٹھہرنے ہی نہیں دیتی کہ پھر ــــــ "ہم دونوں پہلو بہ پہلو تھے ڈانڈ میرے ہاتھ میں تھی، پتوار اس کے ــــــ اس دور سے آج کا دن ہے کہ ہم دونوں یوں ہی پہلو سے پہلو ملائے سفینۂ عمر پر چلے جا رہے ہیں اور شاید مر کر بھی ساتھ نہ چھوٹے......" (جذب کامل) کا جیسا دوسرا موقع حاصل ہو سکے۔

...... اور نہ کسی میلہ گھومنی کو انتظار کا اتنا یارا ہے کہ کمبھ کا میلہ گھومنے کے لیے اس بات کا انتظار کرے

مرتب ۔ عابد سہیل

ہم قلم و ہم زبان و ہم بیاں

آپ اسے چاہیں تو چائے کی میز پر حسینی صاحب سے گفتگو کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ گفتگو کے دوران چائے ہونے کے باوجود میز نہیں تھی۔ اس گفتگو میں بزرگ ادیب اور شاعر بھی تھے اور ایسے نوجوان ادیب بھی جنھوں نے اپنی حیثیت منوالی ہے، ایسے بھی جو ادب میں اپنا مقام بنانے کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں اور ایسے بھی جن کا خیال ہے کہ دوسرے درجہ کا ادب تخلیق کرنے کے مقابلہ میں اول درجے کے ادب کا مطالعہ زیادہ اہم ہے، ماہر معاشیات بھی اور یونی ورسٹی کے ممتاز طلبا بھی ——— کم و بیش دو گھنٹہ کی یہ گفتگو ٹیپ ریکارڈ کر لی گئی اور اب نہایت معمولی ایڈیٹنگ کے بعد پیش کی جا رہی ہے۔

اس گفتگو میں علی عباس حسینی، پنڈت آنند نرائن ملا، ڈاکٹر دیر بہادر سنگھ، رام لعل، ستیش بترہ، عثمان غنی، ببر راجپوت، عبداللطیف صدیقی اور عابد سہیل نے شرکت کی۔ (مرتب)

رام لعل ۔ ہم لوگ آج جس مقصد کے تحت جمع ہوئے ہیں آپ سب کو معلوم ہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پہلے بات چیت یا چائے کا دور ہو جائے۔

متعدد آوازیں ۔ پہلے بات چیت ہی کر لی جائے۔

ملا ۔ بات چیت تو بہت تھوڑی سی ہوگی۔

رام لعل ۔ اصل میں جمع ہوئے ہیں ہم لوگ چائے پر گفتگو کے لیے اس لیے دونوں چیزیں ہی اگر ساتھ ساتھ چلتی رہیں تو جیسے گفتگو شروع ہو تو بترہ صاحب چائے لانے کا اشارہ بھی کر دیں (قہقہہ) گویا چائے حلال کر لی جائے (قہقہہ) ——— رسمی بات چیت کے لیے کیا کسی صدر کی ضرورت ہے، میرے خیال میں تو نہیں ویسے جیسا آپ لوگ چاہیں۔

ڈاکٹر سنگھ ۔ اگر صدر ہو تو بات چیت میں ربط و ضبط قائم رہتا ہے۔

رام لعل ۔ تو پھر ملا صاحب

متعدد آوازیں ۔ ملا صاحب

[illegible] صاحب تو چیت ور [illegible] ہو رہے ہیں (قہقہہ) [illegible]

[illegible] ۔ تو پھر آپ صدارت فرمایئے۔

[illegible] ۔ میں تائید کرتا ہوں۔

[illegible] ۔ آج کی بات چیت کے سلسلے میں کچھ عرض کر دوں۔ حسینی صاحب نے حال ہی میں اپنی ادبی زندگی کے چالیس سال [illegible] اسی مہینے کتاب کا علی عباس حسینی نمبر نکل رہا ہے۔ حسینی صاحب کے فن اور شخصیت کو لے کر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ عابد [illegible] بار ہم ایک طویل انٹرویو بھی لیا ہے لیکن وہ انٹرویو بھی رسمی ہو کر رہ گیا ہے۔

[illegible] ۔ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔

[illegible] ۔ آپ ہی شاید کہہ رہے تھے.....

سہیل ۔ میں ؟

[illegible] ——— ادارہ کتاب اور ہم سب نے یہ سوچا کہ ایک ایسی گفتگو کا موقع فراہم کیا جائے جس میں حسینی صاحب [illegible] بھی جھلکے اور ان کے خیالات بھی معلوم ہو جائیں اور کچھ اس طرح کہ اس میں ہم سب کے خیالات بھی شامل رہیں ——— [illegible] آپ ہی آغاز کریں تاکہ سلسلہ چل نکلے۔

[illegible] ۔ بھائی میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے جس کسی نے اس بارے میں کچھ سوچا ہو کہ حسینی صاحب سے کچھ سوال کرنے میں وہ شروع [illegible] کرے۔ اور آپ نے مجھے صدارت کا شرف بھی بخش دیا ہے تو ممکن ہے میں اس توجہ سے کام نہ لے سکوں (کھانسی)

[illegible] ۔ ملا صاحب۔ اگر ہم لوگ پہلے سے کچھ سوچ کر یہاں آتے تو یہ بات چیت بھی رسمی ہو کر رہ جاتی (حسینی صاحب کی ہنسی) [illegible] ہم میں سے غالباً کسی نے کچھ نہیں سوچا ہے اور یہ اچھی بات ہے۔ تو اب بات چیت کا سلسلہ کہیں سے بھی شروع کیا [illegible]

عابد سہیل ۔ بات چیت تو شروع ہو چکی ہے۔

[illegible] سنگھ ۔ اگر بغیر کچھ سوچے سمجھے بات کرنے کو غیر رسمی گفتگو کہتے ہیں تو سارا ملک اس وقت غیر رسمی طریقہ سے گفتگو کر رہا [illegible] (قہقہہ)

[illegible] ۔ میں تو حسینی صاحب سے پہلی بات یہی پوچھوں گا کہ کیا ان کے نزدیک فنکار کی ہر بات منظر عام پر آنی چاہیئے یا کوئی ایسی چیز [illegible] جو اس کی PRIVACY ہے اور جس کے بارے میں وہ جواب دینے کا پابند نہیں۔ کیا ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے پوچھتا [illegible] اور فنکار یہ سوچ کر کہ چونکہ یہ بات عوام کے لیے دلچسپ ہو سکتی ہے کسی چیز کو اپنا نہ رکھے بلکہ سب کچھ پیش کرتا جائے۔

[illegible] ۔ میں یہ عرض کروں گا کہ فنکار فنکار بھی ہوتا ہے اور فرد بھی۔ تو ہر فرد سے یہ حق تو نہیں چھینا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں ایسی [illegible] راز درون پردہ [illegible] جو اس کی نجی ہیں اور جنھیں وہ چھپانا چاہتا ہے ان کو بھی آشکارا کرنے پر مجبور ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ [illegible] جو اس طرح [illegible] حرکات کر ڈالتے ہیں سستی شہرت کی طرف مائل ہیں۔

[illegible] سہیل ۔ میرے خیال میں ایک فنکار کے فن کو صحیح طریقہ سے سمجھنے اور اس کے تمام رجحانات کا اندازہ لگانے کے لیے اس کی [illegible] کے ہر پہلو کا علم ضروری ہے۔ عیوب کا بھی اور محاسن کا بھی۔ اگر ہم شخصیتوں کے عیوب کی پردہ پوشی [illegible] ہم کوئی [illegible] کی اس سوانحیات سے محروم رہ جاتے ہیں [illegible]

عظیم نقصان ہوتا۔

حسینی۔ یہ صحیح ہے۔ میرا مطلب جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً میاں بیوی کے تعلقات، یا جنس کے سوالات ـــــ لوگوں نے بہت سی غلطیاں کی ہیں جوانی میں ـــ ان کو وہ بعد میں غلطیاں سمجھتے ہیں۔ وہ ان کو آشکارا نہیں کرنا چاہتے ـــــ ابھی میرے ایک دوست نے کہا کہ ان کا اٹھارہواں عشق چل رہا ہے۔ تو بھئی وہ عشق ہی کیا جو اٹھارواں ہو۔ ہم تو اس کے قائل ہیں کہ جس سے محبت ہوئی وہ فانی ہو اور ہمیشہ ہمیشہ رہے گی میں اس CONCEPTION کا آدمی ہوں۔

ملاؔ۔ بھائی وہ عشق نہیں معاشقہ ہوا (قہقہہ)

عثمان غنی۔ اس سلسلے میں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا ادیب کو اپنے ادبی خیالات یا ان کا کوئی حصہ چھپانے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔

حسینی۔ ادبی خیالات سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے بعض مواقع ایسے آتے ہیں جب آدمی ایسی مشکلوں میں پڑ جاتا ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرسکتا۔ مثلاً میں سرکاری ملازمت میں ۴۴ برس تھا۔ میں نے انگریزوں کے زمانے میں نوکری کی ہے۔ میں نے ہندوستانیوں کے زمانے میں غلامی کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اکثر و بیشتر خیالات ایسے تھے جن کا میں ذکر کرنا چاہتا تھا لیکن ملازمت کی وجہ سے نہیں کرسکتا تھا۔ تو ایسی صورت حال میں یا تو ادیب کو اپنا ذریعہ معاش چھوڑ دینا پڑے گا یا پھر صاحب کچھ ــــــــ

ملاؔ۔ ان لوگوں کی بات جو صرف ادیب ہیں دوسری ہے لیکن اگر ادیب ادیب کے علاوہ کچھ اور بھی ہے تو اسے اس حد تک جس حد تک وہ کچھ اور بھی ہے اس کو اس چیز سے سمجھوتہ بھی کرنا پڑے گا لیکن جو ادیب، برہنہ "(قہقہہ) ہے اسے COMPROMISE کرنے کی ضرورت نہیں۔

رام لعل۔ ملا صاحب ایک بات اور عرض کروں کہ جب تک آپ ملازمت میں رہے آپ نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی یا وہ بات نہیں کہی جو آپ نے ریٹائر ہونے کے بعد کہی اور جو عوامی حیثیت کی حامل بن گئی۔

ملاؔ۔ نہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح اس واسطے نہیں کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنے شعر و سخن ہی میں کیا ہے۔ تقریر تو میں نے کبھی کی نہیں۔ اور میری نظموں یا غزلوں میں مسلسل وہی خیال ملے گا۔ مجھے تو کبھی محسوس نہیں ہوا کہ میں سرکاری ملازمت کر رہا ہوں اور میری زبان میں کوئی تالا پڑا ہوا ہے یا یہ کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں اور یہ نہیں۔

ڈاکٹر سنگھ۔ لیکن ملازمت بھی ایک قسم کی نہیں ہوتی۔

ملاؔ۔ ہاں میری ملازمت ایسی نہیں تھی۔

ڈاکٹر سنگھ۔ ایک فرق اور پڑتا ہے۔ آپ بار کے ممبر ہو کر بنچ کے ممبر ہوئے تھے ـــــــ پھر اسکولوں میں میں نے بھی پڑھا ہے اور میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ اسکولوں میں صرف استاد ہی کی نہیں طالب علموں کی بھی مجبوریاں ہوتی ہیں۔

حسینی۔ جی ہاں صحیح فرمایا۔ یونیورسٹی اور اسکول میں بڑا فرق ہے۔

رام لعل۔ میں ملا صاحب سے ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے جو باتیں اپنی نظموں اور غزلوں میں کہیں وہ بڑی ڈھکی چھپی تھیں۔ لیکن کیا ہم نثر کے اندر بھی اس اشاریت سے کام لے سکتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہے تو کس حد تک۔

ملاؔ۔ اسی حد تک کہ سننے والا اس اشاریت سے جو مفہوم ہے وہ ان تک پہونچ جائے۔ اگر ایسا ہو تو یہ حسن ہے عیب نہیں۔ یہ بات آپ کے کلام کو خوبی بخشتی ہے، عیب نہیں لیکن اگر اشاریت سے مفہوم سمجھنے میں دقت ہونے لگے تو میں اس کا قائل نہیں۔

بمتراؔ۔ میرے خیال میں تو یہ سوال بعد کا ہے۔ اگر ادیب کوئی بات UNIVERSAL LEVEL پر کہتا ہے تو آپ اسے اشاریت

رام لعل۔ کیا شعوری، سنگتراشی یا افسانہ نگاری شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی۔

ملا۔ ضرور ہو۔ لیکن ان کی حدیں ہیں۔ بعض ایسے فنکار ملیں گے جو شعوری طور پر پیغام دینا چاہتے ہیں جبکہ بعض ایسے ہوتے ہیں جو شعوری طور پر کوئی پیغام نہیں دینا چاہتے۔

رام لعل۔ ملا صاحب! ایسے شاعر بھی ہیں جو شعوری طور پر کوئی پیغام نہیں دینا چاہتے۔

ملا۔ ایسے شاعر ضرور ہیں لیکن میں ان سے متفق نہیں۔

حسینی۔ ملا صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ میرے خیال میں صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر افسانہ لکھنے میں ہم لاشعور کی تہوں میں کھو گئے تو پھر ہم Psychology پر Thesis کیوں نہ لکھ دیں یا اس موضوع پر ایک مضمون لکھ ڈالیں۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو افسانہ اپنی افسانویت کھو دے گا۔ مختصر افسانہ ایک خاص چیز کا نام اس میں ایک مرکزی خیال، Main Theme ہوتا ہے اگر آپ کہیں گے کہ صاحب یہ افسانہ لاشعور سے متعلق ہے اور آپ کہتے ہیں کہ یہی اس افسانہ کا مرکزی خیال ہے تو میں کہوں گا یہ ان لوگوں میں تو دلچسپی پیدا کر سکتی ہے جو Psychology سے خاص طور سے شغف رکھتے ہیں لیکن ہر ایک کے دلچسپی کی چیز نہیں۔

عثمان غنی۔ حسینی صاحب چونکہ کہانی کی تکنیک کی بات نکل آئی ہے اس لیے یہ بھی پوچھتا چلوں کہ ایک نیا رجحان چلا ہے جس کے تحت کہانی سے کہانی پن ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ادھر ممتاز حسین نے اس طرح کی کہانیاں لکھی ہیں۔

رام لعل۔ انتظار حسین نے۔

عثمان غنی۔ انتظار حسین نے۔ زرد کتا وغیرہ۔ کیا آپ کے خیال میں کہانی میں کہانی پن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے یا اس کی ثانوی حیثیت ہے۔

حسینی۔ اگر کہانی سننے اور پڑھنے والے کی دلچسپی باقی نہیں رہتی اور وہ صرف اس لیے پڑھتا ہے کہ کہانی لکھنے والا کیا کہنا چاہتا ہے اور کیا ہے اس میں تو آپ دیکھیں گے کہ ایسی کہانیاں کہ جن میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا ہے سوائے اس کے کہ یہ جاننے کے لیے کہ کہانی کار نے کیا لکھا ہے آپ اسے زبردستی پڑھتے ہیں ورنہ عام طور سے لوگ اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے ——— تو میرے خیال میں کہانی پن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ کہانی میں کہانی پن ہونا چاہیے جو سننے یا پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرے اور اگر آپ نے چند جملے پڑھنے کے بعد اپنے ناظر کو محظوظ نہیں کر لیا تو وہ آپ کی ناکام کہانی ہے۔

عابد سہیل۔ اس ساری بحث میں مجھے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ Abstract Art اور لاشعور کی ...ontation کے Analysis کی کوشش کو ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ بعض Abstract کہانیوں اور نظموں میں لاشعور کی کارفرمائی ضرور ملتی ہے لیکن یہ اس کے لیے لازمی نہیں ہے۔ ادھر کچھ دنوں پہلے کرشن چندر نے تین چار Abstract کہانیاں لکھی تھیں۔

رام لعل۔ مردہ سمندر وغیرہ ———

عابد سہیل۔ ان میں سے دو کہانیاں تو میری سمجھ میں نہیں آئیں لیکن ان میں سے ایک کہانی تو ایسی تھی جس پر کرشن چندر کی پلاٹ کی بہت سی کہانیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

عثمان غنی۔ کونسی کہانی۔

عابد سہیل۔ مردہ سمندر۔ نیکی اور بدی کی کشمکش کو اس کہانی میں نہایت خوبی سے Depict کیا گیا تھا مجھے یہ کہانی پڑھ کر احساس ہوا کہ اگر ان تصورات (Concepts) کو زندہ کرداروں کی شکل میں گوشت پوست بخش دیا جاتا تو یہ کشمکش اتنی خوبصورتی سے

کہہ سکتے ہیں۔ دراصل اشاریت UNIVERSAL LEVEL پر کسی چیز کے بارے میں تبصرہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔

رام لعل۔ UNIVERSAL LEVEL سے آپ کی کیا مراد ہو۔

بترو۔ مثال کے طور پر ملا صاحب کے چند اشعار تھے اس غزل کے جو نقوش میں شائع ہوئی تھی جس پر مدیر نقوش نے اپنے اداریہ میں [illegible] ہو کہ شاعر کو مکمل کر بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ اشعار UNIVERSAL LEVEL پر کہے گئے ہیں۔ کسی ایک شخص سے میری د[illegible] یا عداوت ایک نجی اور ذاتی بات ہو جب کوئی بات UNIVERSAL LEVEL پہ کہی جاتی ہے تو سب کے لیے ہو جاتی ہو۔

حسینی۔ میں ایک بات اور کہوں گا۔

ملا۔ جی فرمائیے۔

حسینی۔ خلاً میں ابتدا ہی سے NATIONALIST تھا۔ اور تقسیم کے سختی سے خلاف تھا اور اس کو ہندوؤں کے لیے ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے لیے سب سے نقصان دہ سمجھتا تھا۔ اس زمانہ میں جب میں بارہ بنکی میں تھا تو الکشن ہوا تھا۔ جمیل الرحمان قدوائی صاحب اس وقت ایم۔ ایل۔ اے ہیں کانگریس کے امیدوار تھے۔ میرے جتنے جاننے والے تھے سب قدوائی صاحب کے خلاف تھے۔ وہ میرے خیالات جانتے تھے اور میری چٹکیاں کھاتے تھے لیکن میں نے ووٹ جمیل صاحب ہی کو دیا ____ لیکن کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے گرفت میں آسکوں۔ میں ہمیشہ سے حب وطن کا پرچار کرتا رہا ہوں لیکن ڈھکے چھپے لفظوں میں۔ ایک افسانہ میں کچھ باتیں زیادہ وضاحت سے لکھ دی تھیں لیکن وہ باتیں کلکٹر کو [illegible] بنا کے کی گئی تھیں۔ کہ مجھ کو قوم پرستوں سے ہمدردی ہو لیکن تشدد وغیرہ نہیں ہونا چاہیے۔ گاندھی جی کی تعلیمات پر متعدد [illegible] لکھے لیکن اس طرح کہ کوئی کہہ نہ سکے، کوئی گرفت نہ ہو سکے۔

رام لعل۔ حسینی صاحب اور ملا صاحب اور [illegible] صاحب کی بات سے ایک بات پیدا ہوتی ہے۔ اشاریت اور [UNI]VERSAL TRUTH کے تعلق۔ تو یہ جو تجریدی آرٹ ہے، جو رنگوں میں ابھر رہا ہو اور کہانیوں میں ابھر رہا ہے تو یہ کس حد تک جائز ہے۔ کیا یہ UNIVERSAL TRUTH نہیں ہے۔ میں حسینی صاحب سے خاص طور سے اس بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔

حسینی۔ بھئی وہ جو ABSTRACT آرٹ ہو وہ میری سمجھ میں ____ اچھی طرح نہیں آتا ہے۔

رام لعل۔ کہانیاں آپ نہیں سمجھ سکے یا نظمیں یا مصوری۔

حسینی۔ آپ ذرا اپنی بات کی وضاحت کریں۔

ملا۔ میں بات صاف کیے دیتا ہوں۔ میں جہاں تک سمجھا ہوں۔ میں غلط ہو سکتا ہوں۔ کہ جو ABSTRACT آرٹ ہو تو اس کا جو عمل ہے وہ ہمارا ذہن اتنا نہیں کرتا جتنا ہمارا دل کرتا ہو۔

رام لعل۔ کیسے۔

ملا۔ گویا ہم وہی دیکھتے ہیں جو لاشعوری چیز ہوتی ہے۔ وہ ہمارے اندر کے چھپے ہوئے جذبات ہوتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سمجھا جا[تا] ہم اپنے لاشعور سے واقفیت حاصل کر رہے ہیں اور اسی کی BASIS پر ہم اسے پسند کرتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ سے میرا خیال رہا ہو کہ شاعری دو مختلف قسم کا آرٹ ہو اور سنگ تراشی، موسیقی اور مصوری دوسرے قسم کا ____ اس لیے کہ ہم موسیقی سے اس دور میں روشناس ہو[ئے] ہیں جب ہم کو فن کا شعور پورے طور سے نہ تھا۔ گانا، نغمہ، رقص انسان کی ابتدائی منزلوں میں شروع ہو جاتے ہیں کہ جذباتی ردعمل فوراً ہوتا ہے جبکہ شاعری خالی سمجھنے کی بات نہیں بلکہ اس پر کافی قابو پانے کے بعد ممکن ہے۔ تو اگر آپ چاہتے ہیں کہ شعر کے فن کو بھی انہی فنون کے سا[تھ] شعور کے فن نہیں ہو [illegible] تو یہ سب خیال [illegible] صحیح نہیں ہوگا۔ شاعر [illegible]

علامہ اختر علی تلہری

حسینی ۔۔ میرے ساتھی

علی عباس حسینی ایک "طویل القامت" افسانہ نگار ہیں اور بسا اوقات ان کی باتیں بھی بڑی بھولی بھالی ہوتی ہیں اور وہ ایک سادہ سے انسان معلوم ہوتے ہیں لیکن جب قریب سے اور غور سے ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ان کی "سادگی" "پرکاری" کی غمازی کرتی نظر آتی ہے وہ باتیں کتنی ہی معصومانہ کریں لیکن ان کی بصیرت کی نگاہیں واقعات و حقائق کی تہوں میں جھانکتی نظر آتی ہے انھیں کسی قدر متضاد کیفیات نے انھیں اچھا انسان اور کامیاب افسانہ نگار بنا دیا ہے۔

میں انھیں قریب قریب چالیس سال کے عرصہ سے جانتا ہوں اور بہت قریب سے جانتا ہوں اُن کے جذباتی اُتار چڑھاؤ کے بہت سے مناظر میری نگاہوں کے سامنے سے گزر چکے ہیں لیکن میں نے انھیں کبھی شرافت و انسانیت کے تقاضوں سے انحراف کرتے نہیں پایا ہے۔ وہ بہت سخت غصہ کی حالت میں بھی حقیقی ہمدردی اور عطوفت کی جبین شکن آلود نہیں ہونے دیتے۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی ان کا لہجہ درشت اور تلخ ہو جائے لیکن دل کی نرمی اور شیرینی میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

وہ استاد بھی رہے ہیں۔ باپ بھی ہیں اور بالفعل ایک عدد زوجہ کے شوہر بھی اور ان سب رشتوں کو انھوں نے بڑی ہی "سادگی و پرکاری" سے نباہا ہے۔ شاگرد اُن سے خوش۔ ان کے معترف و مداح۔ ساتھی اُن کے گرویدہ و ثناخواں بیٹے اور بیٹیاں ان کی والہ و شیدا، شریک حیات اور ان کے خوشگوار تعلقات کے بارے میں کچھ کہنا ذرا نازک حدود میں قدم رکھنا ہے۔

میں انھیں جب سے جانتا ہوں وہ بہت زیادہ پڑھنے اور اس سے کسی قدر کم لکھنے کے عادی رہے ہیں۔ انگریزی اور اردو کے اچھے ناول اور افسانے کم ہی ایسے ہوں گے جنھیں حسینی نے نہ پڑھا ہو۔ اگرچہ ایک زمانے میں وہ اس مطالعہ کو وقت گزاری کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس مطالعہ نے اُن کی شخصیت سازی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ میں اور وہ دونوں گورنمنٹ جوبلی کالج سے وابستگی کے زمانے میں ایک ہی ساتھ مدت دراز تک رہے ہیں، میں سوتا ہوتا تھا اور وہ کسی اچھے تازہ ناول سے نہ صرف لذت اندوزی میں بلکہ سبق اندوزی میں معروف ہوتے۔ انھوں نے مجھے بھی اس راہ پر لگانا چاہا اور ان کی ترغیب و تحریص سے دو چار معیاری ناول میں نے بھی ضرور پڑھے لیکن "ثواب طاعت و زہد" جانتے کے بعد بھی اپنی شومئی قسمت کہ طبیعت ادھر نہیں آئی۔ میرا مطالعہ اس اہم ادبی صنف میں کچھ یوں ہی سا رہا۔ اب حسینی بھی بوڑھے ہو چلے ہیں اور میں تو سچ مچ بیماریوں کی پیہم یورش کی وجہ سے بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ "ستر سے بہتر کی" منزل سے

پیش نہ کی جاسکتی ـــــ ابھی حسینی صاحب نے فرمایا کہ کہانی میں ایک پلاٹ ہوتا ہے، مرکزی خیال ہوتا ہو پھر اس کا VELOPMENT ہوتا ہو، CRISIS ہوتی ہو پھر اس کا حل ہوتا ہے تو میرا خیال ہے حسینی صاحب یہ اس زمانے کی بات ہے جب زندگی ایک ایسی اکائی تھی جو کہیں سے ٹوٹی ہوئی نہیں تھی ہر CIRCLE مکمل تھا۔ ہر FIGURE مکمل تھی ـــــ اس وقت صورت حال یہ ہو کہ پلاٹ والی کہانیاں جو ہم پڑھتے ہیں انھیں اگر ہم اصل زندگی میں تلاش کریں تو کہیں نہیں ملیں گی۔ ایک شخص کی زندگی میں ایک واقعہ پیش آتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسی وقت ختم بھی ہو جائے۔ ضروری نہیں کہ کوئی CRISIS آئے۔ وہ CRISIS آنے سے پہلے بھی ختم ہو سکتا ہے یا اس وقت بھی ختم ہو سکتا ہے جب SOLUTION کی منزل قریب ہو۔ بات ایک جگہ شروع ہوئی، وہیں ختم ہو گئی۔ اس کا ایک فوری لمحاتی اثر ہوا اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

بترا۔ آپ کہانی کی بات جو کر رہے ہیں تو کہانی تین چار طرح کی ہوتی ہے اس میں ایک کہانی جو بعد میں ODD ہوتی ہے وہ ATMOSPHERE کی کہانی ہے۔ اس میں ایک پورا ماحول PAINT کر دیا جاتا ہے ـــــ ایک اور قسم کی کہانی بھی ہوتی ہے جس میں کوئی مرکزی خیال نہیں ہوتا ـــــ یہ کہانی اس قسم کی ہوتی ہے ـــــ ماحول تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔

عابد سہیل۔ الفاظ گرفت میں نہیں آرہے ہیں۔

بترا۔ تو اس طرح کی کہانی تو جائز ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ کہانی نہیں ہے جو جہاں جی چاہے توڑ دی جائے یا جہاں سے جی چاہے شروع کر دی جائے تو یہ تو پھر ـــــ

عابد سہیل۔ بترا صاحب۔ ایک آدمی ہے۔ کافی ہاؤس کا دروازہ کھولتا ہے اور ایک نظر ڈال کر لوٹ جاتا ہے۔ وہ اسی "ایک نظر" کی کیفیت کو DEPICT کرنا چاہتا ہے۔ ایک شخص نے ہاتھ اٹھایا تھا، ایک طرف بیرا کافی کا پیالہ رکھ رہا تھا۔ تیسرا شخص ٹپ کر رہا تھا۔ چوتھا ایک لڑکی کو دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ پانچواں ایک ساتھی سے اشارہ کر رہا تھا کہ اس نووارد کو کیسے کاٹا جائے ـــــ اس میں کوئی CONFLICT نہیں، کوئی CENTRAL IDEA نہیں لیکن اگر آپ اس کو کامیابی سے DEPICT کر دیں تو یہ ایک مکمل اور بھرپور کہانی ہوگی۔

حسینی۔ عابد سہیل صاحب مرکزی خیال کے معنی غلط سمجھے۔ اس کہانی میں مرکزی خیال یہی تھا کہ ہم کافی ہاؤس کے اتنے سے واقعہ کو بیان کر دیں۔ ایک روسی ادیب نے مشترک سگریٹ نام کی ایک کہانی لکھی ہے۔ ایک انجن ڈرائیور گاڑی سے اترتا ہے۔ اس کی یونین کے ممبر مل جاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ چلو پہلے ہی کی طرح ہمارے یہاں چل کر رہو۔ لیکن یہ شخص اب ذرا افسر قسم کا ہو گیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں فلاں صاحب کے ساتھ جا کر رہوں گا۔ اتنے ہی میں ان میں سے ایک نے سگریٹ جلائی کش لیے اور پھر دوسرے کو بڑھا دی۔ پہلے وہ بھی ان کے ساتھ اسی طرح سگریٹ پیا کرتا تھا۔ جب اس کی طرف ایک ساتھی نے سگریٹ بڑھائی تو اس نے کہا 'NO, I HAVE MY OWN CIGARETTE' اور نہایت شان سے ایک خوبصورت سا سگریٹ کیس نکالا اور کہا کہ اگر لوگوں کے پاس سگریٹ نہیں ہے تو اس میں سے لے لو۔ ان سب نے ایک ایک سگریٹ لے لی۔ وہ اسے زینے تک پہونچانے گئے اور اس کے جاتے ہی سب نے سگریٹ پھینک کر کچل دیے۔

بترا۔ کتنا معاندانہ ہے۔

حسینی۔ اور اتنے سے واقعہ میں۔

ہیراجیہ۔ پلاٹ کی کہانیوں میں ہم THEME سے MEANING لیتے ہیں۔ اس طرح کی کہانیوں میں مرکزی خیال

علی عباس حسینی نمبر

کے، پی، سکینہ

حسینی — ایک پڑوسی کی نظر میں

صاحبو! نہ تو میں کوئی افسانہ نگار ہوں نہ شاعر۔ نقادوں یا فلسفیوں سے بھی متاثر ہونا میرے بس کا روگ نہیں مضمون نگاروں یا مترجموں کے نزدیک سے گزرنے کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ واقعی میرا علمی وجود اس کاکٹیل کی طرح ہے جس میں بڑے بڑے گلاسوں کی تہہ سے چھلکے شراب کے قطرے شامل ہوں۔ یعنی کہ وقت پڑنے پر شاعرانہ زور آزمائی بھی کر لیتا ہوں اور کہانی بھی لکھ مارتا ہوں۔ میرا آج تک کوئی افسانہ شایع نہیں ہوا، کیونکہ آج تک کوئی ایسا ناشر پیدا ہی نہیں ہوا جسے اپنا مذاق خود بننے کا شوق ہو۔ اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو بھی میں نے صرف ان لکھنے والوں پر ہی آزمایا ہے جن کے بارے میں مجھے اطمینان ہو کہ مجھ سے ناخوش ہو کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ترجمے کی دنیا میں میں نے اپنا تختۂ مشق انھیں افسانوں کو بنایا ہے جو اب تک بیسوں مرتبہ ترجمے کا جامہ پہن چکے ہیں۔ پھر بھلا کون لفظ بہ لفظ ملا کر دیکھتا ہے کہ ترجمہ صحیح ہے یا غلط۔ اب آپ کا یہ سوال بھی واجب ہے کہ میاں جب قلم بھی صحیح طریقے سے پکڑنے کی صلاحیت نہیں ہے تو کس کمبخت نے کہا تھا آپ سے کہ بیابانی کے لیے! بھڑنے بھی چلے تھے تو کوئی چھوٹا موٹا جوڑ چھانٹا ہوتا نہ کہ سیدھے رستم ادب علی عباس حسینی سے جا بھڑے اور اپنا سا منھ لے کر چاروں خانے چت ہو گئے، جواباً عرض ہے کہ میں ایک جمہوری ملک کا باشندہ ہوں اور لکھنے بولنے اور سوچنے کے پیدائشی حق کا مجھے اتنا ہی احساس ہے جتنا کسی سرکاری ملازم کو اپنی کیزول لیو کا ہوتا ہے۔ اب یہ میری طبیعت کہ میں جب پر چاہوں مشق قلم کروں۔ پھر حسینی صاحب تو میرے پڑوسی ہیں جب وقت پڑنے پر چاول، شکر، ریزگاری وغیرہ مانگ لینا نامناسب نہیں سمجھتا، تو پھر ان پر مضمون لکھنے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔ تو صاحب سال بھر تک میں یہ جان بھی نہ پایا کہ لمبے تڑنگے قد، بانکے صدر جمہوریہ نما داڑھی، لمبی چوڑی شیروانی اور ڈھیلے پاجامے والے یہ بزرگوار ہیں کون۔ بھرے بڑھاپے میں سینہ تانے، محلے بھر کو اپنی شخصیت سے متاثر کرتے اور کبھی کبھار رک کر دو چار باتیں کسی سے کر لیتے، میں نے انھیں اکثر دیکھا۔ محلے بھر کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ادب سے جھک کر سلام کرنا شروع کر دیا۔ سلام کے جواب میں آہستہ سے گردن کو خم دے کر مسکرا دیتے اور پڑوس کے گیروے دروازے والے مکان میں داخل ہو جاتے۔ میں بھی شاید یہی سوچ کر ٹال دیتا کہ ہوں گے کوئی بزرگ۔ مگر خلاف توقع میں نے محسوس کیا کہ بڑے میاں کی جانب میرا جذبہ عقیدت بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ایک دن جب اصلیت کا پتہ ملا تو میرے

صرف پانچ چھ فرسخ دور ہونے کے باوجود ان کا تصنیفی و تالیفی ذوق شباب کی منزلوں میں قدم رکھے ہوئے ہے۔ یہ پہلو ان کی سیرت کردار کا بہت ہی خاص ہے۔ ہم پیر تو فنیوں کی طرح ان کی باتوں میں کبھی "قنوطیت" کا رنگ نہیں جھلکتا۔ بلکہ ان کے لہجہ میں۔ ان کے گفتگو کے انداز اور بہاؤ میں جوانی کی سی بے پرواخرامی "انگڑائیاں لیتی معلوم ہوتی ہے اور اس سے ہم "قنوطیت زدہ" بھی نشاط و خرمی کی کچھ چنگاریاں اپنی زندگی کے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں اور تھوڑی دیر ہی کے لیے سہی "موتوا قبل ان تموتو" کو طاق نسیاں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

حسینی بسا اوقات ادبی اجتماعات میں اپنے چہل سالہ ادبی خدمت گزاری کا تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں لیکن یہ صرف بڑے بوڑھوں کے کہنے کا ایک انداز ہوتا ہے جس کا کالبد فخر و تعلی کے عناصر سے قطعی طیار نہیں ہوتا۔ اسے چھوٹی عمر کے ادیبوں کے لیے بڑی عمر کے ادیبوں کی طرف سے ایک قسم کی مہمیز سمجھیے جس کا منشا تخلیقی تصنیفات کی پیدائش کے آتش شوق کو اور تیز کرنا ہوتا ہے ورنہ حسینی سے فطری منکسر المزاج سال ادیب کو ان باتوں سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اُن کے افسانوں کے مجموعے۔ ان کی بعض اہم تصنیفات جو ابھی منصۂ شہود پر نہیں آئی ہیں وہ ان کی ادبی عظمت کی پائداری کے لیے کافی ہیں۔ وہ خود مشک کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے تعارف کی ضرورت حسینی کو ذرا بھی نہیں۔

مختصر لفظوں میں حسینی کی شخصیت دوسروں کی دلکشی کے لیے اپنے اندر مختلف پہلو رکھتی ہے۔ وہ فطری طور سے متواضع ہیں۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ دوسروں کے دکھ درد میں دامے درمے سخنے کام کرتے ہیں۔ اپنے سے چھوٹوں کو ہمیشہ اچھے اور مفید مشورے دیتے ہیں۔ اُن کی بہتری کی باتیں انہیں بتاتے ہیں۔ اور اچھے راستوں پر چلنے کی انہیں تلقین کرتے ہیں۔ اُن کے پند و موعظہ کا لہجہ کبھی کسی قدر تلخ ہو جاتا ہے مگر اس ظاہری "حنظلیت" کے باوجود نتیجۃً وہ خالص شہد ہی ہوتا ہے۔

یہ خصوصیات جس میں پائی جائیں وہ ایک اچھا انسان ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی سیرت اس قابل ہوتی ہے کہ اس کی تاسی کی [illegible] وہ اچھے ادیب بھی ہیں۔ اچھے انسان بھی۔ یہ اجتماع جس ذات میں ہو جائے وہ بہر حال وہ صفات کہی جائے گی۔

علی عباس حسینی نمبر

میں آتا ہے کہ کہہ دوں کہ ابھی سکسینہ صاحب اردو کا پہلا قاعدہ پڑھ رہے ہیں تاکہ شین قاف درست کر کے کم از کم حسینی صاحب کے ذکر سے تو سینہ پھلا کر بات کر سکیں۔ مگر کچھ نہیں پاتے۔ البتہ آن کی آن میں تیل پھلیل سے آراستہ، رکشے پر حسینی صاحب کی بغل میں یوں بیک کر فٹ ہو جاتے ہیں گویا تول میں بکا رک مشی ہو۔

حسینی صاحب کے مشغلے ہیں کرچان ستی کا بیارہ۔ کرکٹ کمنٹری پر بھی چٹخارے لے لے کر بحث کریں گے اور خوشبو وت کی طرف بھی۔ کبھی صبح صبح غریب خانے پر تشریف لے آئے تو بس۔ ہم ہیں اور وہ ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، نل سے پانی چلا گیا۔ کوئی بات نہیں۔ عرش سے فرش تک کے قلابے ملا ڈالیں گے۔ باتوں ہی باتوں میں معلوم ہوا کہ حسینی صاحب کو دو چیزوں سے سخت چڑ ہے۔ ایبسٹریکٹ آرٹ اور سارنگی کے خلاف نما پتلون۔ دھن ہے کتابیں پڑھنے کی۔ میرے بک ریک سے بیک وقت پانچ کتابیں لے جائیں گے اور اگلے دن پانچوں واپس۔ یا مولا! کیا رفتار ہے کتب بینی کی؟ یا ہو سکتا ہے کہ صرف سرہانے رکھ کر سوتے ہوں اور عالم خواب میں سب کچھ ذہن میں منتقل ہو جاتا ہو ایک بات اور عرض کر دوں (حالانکہ ٹاپ پرسنل ہے) مجھے جنسی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ پہلے ہی دن جو بڑے میاں نے ہمارا کتابی ذخیرہ ٹٹولنا شروع کیا تو ہم بغلیں جھانکنے لگے۔ بڑے میاں زیر لب مسکرائے، پان کی پیک حلق کے نیچے اتاری اور کھل کر بولے ـــــ "کام بن گیا" ـــــ ہم تھوک نگلنے لگے۔ بڑے میاں بولے ـــــ "بھئی واہ! مزہ آ جائے گا۔ خوب وقت گزرے گا ان کتابوں میں" ـــــ ہم بمشکل کہہ پائے ـــــ "جی!" وہ بولے "ہاں بھائی! اب کیا بنتا بگڑتا ہے۔ عمر یاد ہو گئی اب ہی تو مزہ آئے گا ان کے مطالعے میں" ـــــ اور پیشتر اس کے کہ ہم اپنے آپ پر قابو پائیں، بڑے میاں پانچ عدد رنگ برنگے، زہد شکن سرورق والی کتابیں بغل میں دابے، کامدار ناگرہ لٹکاتے کمرے سے باہر ہو گئے۔

دنیا کی نگاہ میں حسینی صاحب کی شخصیت کچھ بھی ہو، مگر مجھے یقین ہے کہ تا عمر اتنا عمدہ مشفق، وضعدار، دوست نواز اور خوش مذاق پڑوسی نہیں ملنے کا۔

نزدیک گویا بم پھٹ گیا۔ شہنشاہِ افسانہ منشی پریم چند کے ہم عصر اور سیکڑوں نامور افسانوں کے خالق میرے بغل والے مکان میں رہتے ہیں!
میرا تو گویا اپنے وجود پر سے یقین ہٹا جا رہا تھا۔ اور ایک روز جب ضبط کا یارا نہ رہا تو خود ہی نہایت بھونڈے طریقے سے سلام کر-
کے پوچھ بیٹھا ـــــ معاف کیجیے، آپ جناب حسینی صاحب ہیں نا؟ گویا کہ اس سانچے کا آدمی حسینی صاحب ہو ہی نہیں سکتا۔
گویا دل ہی دل میں دھنسا جا رہا تھا۔ ان کا کیا بگڑ رہا تھا۔ آہستہ سے زیرِ لب مسکرائے اور جی ہاں کہہ کر گھر دوسرے دروازہ والے مکان میں داخل
ہو گئے۔ اپنے سوال کے بھونڈے پن کی خفت مٹانے کے لیے میں کئی روز تک بڑے میاں کی تکنی کا شکار رہا۔ مگر جب بھی وہ میرے
نزدیک سے گزرے، مجھے اس امر کی شکایت کا احساس ہونے لگتا کہ بڑے میاں جو مسکرا رہے ہیں تو یہ ہی سوچ کر کہ لونڈا
ہکا تو ہے، پوچھ لیا تو کیا حرج ہے۔ میں اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا اور سلام دعا کا سلسلہ دوبارہ شروع ہونے ہی والا تھا کہ ایک
بیوی نے بتایا کہ پڑوس والوں کا ملازم آپ کو بلانے آیا تھا۔ کاٹو تو خون نہیں۔ کیا بڑے میاں کوئی نیا شوشہ چھوڑیں گے؟ چپل پہنے
دوڑا اور دروازے پر دستک دی۔ کمرہ پرائٹ اینگل بنا ہوا ایک ملازم نمودار ہوا اور تپاک سے بولا ـــــ "حضور
کا اسمِ گرامی؟" ـــــ خاکسار ٹھیٹھ اکھڑ علاقے کا رہنے والا ٹھہرا۔ پانی پانی ہو گیا جناب ہکلاتا ہوا بولا ـــــ "حسینی صاحب
سے ملنا ہے۔" ملازم گویا میری جان لینے پر تلا تھا۔ چھوٹتے ہی بولا ـــــ "تشریف رکھیں حضور۔ میں ابھی حاضر ہوا ـــــ" اور
ڈرائنگ روم کا راستہ بتا کر زمین سونگھتا ہوا غائب ہو گیا۔ سانسوں کا توازن برابر کرکے میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ لمبائی تو اتنی
کہ محلہ بھر ایک قطار میں کھڑا ہو جائے مگر چوڑائی اتنی کم کہ دو حسینی اکھٹے برابر برابر نہ چل سکیں (خدا حسینی صاحب کو نظرِ بد سے بچائے)
دیواروں پر سیلن نمایاں اور بالکل سپاٹ۔ ایک بھی کیلنڈر نہیں۔ بابا آدم کے زمانے کے دو توسی ہیکل صوفے اور چھ سات کرسیاں شاید
سے روئی جھانک رہی تھی مگر کرسیاں خوشنما پلاسٹک کی بنی ہوئی۔ ایک نئی رائٹنگ ٹیبل اور اسی سے لگی ایک گول کرسی۔ منٹو کا
کا چکر نقادوں کی قلم تک تو آ ہی پہنچا تھا مگر حسینی صاحب کے کمرے میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ محسوس ہوا گویا کوئی کہہ رہا ہو
میاں پریم چند کے دلدادہ ہو تو صوفے پر بیٹھ جاؤ اور اگر جاسوسی ناولیں پڑھتے ہو تو کرسی پر۔ میرے جیسے کا کٹیل لکھنے پڑھنے والوں
کے لیے کہیں کوئی مونڈھا تک نہیں تھا۔ اس لیے میں نے کھڑا رہنا ہی مناسب سمجھا۔ کھانسی کی بھاری بھرکم آواز۔ میرے خیالات
منتشر ہو گئے۔ چار خانے کا تہمد اور اچکن کا براق کرتا پہنے حسینی صاحب داخل ہوئے اور بڑے پیار سے مجھے صوفے پر بٹھایا۔ میں
ساتویں آسمان پر تھا۔ بنا تمہید کے پوچھے ـــــ "بھائی سنا ہے تم ریلوے میں ہو؟" اور بغیر تصدیق کا انتظار کیے کہنے لگے ـــــ
"کل مجھے دلی کے لیے نکلنا ہے۔ ریزرویشن تمہارے سپرد ہے۔ سیٹ مل جائے گی تو آرام سے پہونچ جاؤں گا" ـــــ میں نے اطمینان
کی سانس لی۔ دو چار باتیں ادھر ادھر کی ہوئیں۔ بہت ہمت کرکے حسینی صاحب کا دیا ہوا ایک سگریٹ پھونکا اور چلا آیا۔ وہ دن ہے
آج کا دن یہ سلسلہ برابر چل رہا ہے نہ حسینی صاحب کو سفر سے چین نہ مجھے ان کا ریزرویشن کرانے سے۔ کبھی خود جا رہے ہیں کبھی
کے بھانجے (شمیم کرانی) جو بھانجے ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور شاعر بھی ہیں۔
تو صاحبو! قصہ کوتاہ یہ کہ ہم بھی شامل ہو گئے ادبی کارواں میں پچھے سوار کی حیثیت سے۔ اور مارکر ادیب بنانا اسے کہتے ہیں کہ کوئی
ادبی مجلس ہو یا شامِ افسانہ یا محفلِ غزل یا اردو کانفرنس ہم چلے جا رہے ہیں حسینی صاحب کی بھاری بھرکم اچکن کے دامن میں لٹکے
گویا ہم نہ ہوئے (ریلوے کی زبان میں) حسینی صاحب کے "موبائل لگیج" ہو گئے۔ خدانخواستہ کسی پروگرام کی بابت بھول بھی گئے تو کیا مجال
ہے کہ وقتِ مقررہ سے پانچ دس منٹ قبل حسینی صاحب کا وہی رائٹ اینگل نما نوکر ہمارے دروازے پر مستعد ہے اور خالص فارسی لہجے میں کہہ
رہا ہے ـــــ "حضور سکینہ صاحب! آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ کیا عرض کر دوں ماسٹر صاحب سے؟" ـــــ اور ہمارے جی

گیستی آرا

میرے ابّا

میرا اپنے ابّا کے متعلق کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ ٹھہرے ایک مشہور، صاحب علم، صاحب طرز افسانہ نگار، مضمون نگار اور ناول نگار اور میں ایک محدود علم و عقل والی لڑکی۔ لیکن پھر بھی میں نے قلم اس لئے اٹھایا ہے کہ میں ان کی گھریلو زندگی کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کروں جس سے ان کے افسانوں کے بہت سے پڑھنے والے ناواقف ہیں ـــــ میرا خیال ہے کہ جب تک ہم مصنف کی شخصیت، اس کے نظریات، اس کے عقیدے، اس کے رکھ رکھاؤ، اس کے برتاؤ، ان سب کے بارے میں نہیں جانتے، اس کی تخلیقات کی اصل روح تک، اس کے لکھنے کے مقصد تک اور اس کے اصل پیغام تک جو وہ دنیا کو دینا چاہتا ہے، نہیں پہنچ سکتے ـــــ صرف ناقدوں کی نگاہ کی ترازو پر تلنے سے کوئی ادیب چھوٹا یا بڑا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ میری ناچیز رائے میں تو زیادہ تر پڑھنے والے ناقدوں کی وجہ سے گمراہ ہوتے ہیں۔ وہ بھی آنکھیں بند کر کے انھیں کی رائے مان لیتے ہیں۔ اور آج کل کے زیادہ تر ناقدوں میں سے کوئی مذہب کی طرف مائل ہے، تو کوئی ترقی پسندی کی طرف ـــ انھوں نے اپنے الگ الگ گروپ بنا رکھے ہیں اور وہ اپنے ہی لوگوں کو اچھالتے ہیں ـــ تو میرا مطلب یہ ہے کہ آپ خود افسانہ پڑھیں، اس کو سمجھیں، پرکھیں اور پھر اپنی ایک رائے قائم کریں۔ لیجئے میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی میں تو آپ کو ابّا کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ بتانے جا رہی تھی کہ وہ گھر میں کیسے رہتے ہیں، ان کا اپنے عزیزوں اپنے بچوں اپنے خوردوں سے برتاؤ کیسا ہے، گھر میں کیسے کام کرتے ہیں، کتنا پڑھتے ہیں، کتنا لکھتے ہیں اور کتنا وقت باتوں میں گذارتے ہیں۔ گھر میں انسان کی اصلی شخصیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ خول اتر جاتا ہے جو کہ باہری دنیا کے لئے ہوتا ہے ـــــ مجھے امید ہے کہ یہ خاکہ آپ کو ابّا کی شخصیت کے سمجھنے میں مدد دے گا ـــ تو آئیے سب سے پہلے آپ کو یہ بتائیں کہ آج کل ابّا کا صبح سے شام تک کا کیا معمول ہے ـــ

نسیم سحری کے جھونکے ابّا کو پانچ ہی بجے جگا دیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو وہ چار ہی بجے اٹھ جاتے ہیں۔ ان کو نیند کم آتی ہے۔ اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں، کچھ دیر سگرٹ پی کر صبح کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پھر منہ ہاتھ

سنور جاتی ہے، کسی کا کام بن جاتا ہے تو میرا کیا نقصان ہے اور پھر یہ شعر پڑھ دیتے ہیں ع

خلوص و مہر و محبت تو میری عادت ہے
اگرچہ مجھ کو بھی ان سب کا ہے صلہ معلوم

آبا دن کا زیادہ حصہ بلکہ رات کا بھی پڑھنے میں گزارتے ہیں —— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب تک کئی لاکھ کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ اور وہ بھی ہر طرح کی، چاہے منطق کی خشک کتاب ہو۔ کوئی مذہبی بحث ہو، کسی سیاست داں کی آپ بیتی ہو، کسی کا ڈبوائے کی داستان ہو یا کوئی عمدہ ناول —— آبا اسی دل چسپی اور جوش سے ہر کتاب کو پڑھتے ہیں او لطف اندوز ہوتے ہیں —— مجھے تعجب ہوتا ہے کہ ان کا علم کتنا گہرا ہے۔ معاف کیجئے گا میں یہ اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ میں ان کی بیٹی ہوں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے، کچھ لوگ جو کہ ان کی افسانہ نگاری کے قائل نہیں، ان کی علمیت کے ضرور قائل ہیں —— میرا خیال ہے کہ انگریزی کی ڈکشنری میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کے معنی انھیں معلوم نہ ہوں۔ اور پھر کبھی آبا اپنے حافظہ کی شکایت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے انھوں نے اتنا زیادہ پڑھا ہے سب یاد کیسے رہ سکتا دن کے کھانے کے بعد آبا سوتے ضرور ہیں اور اٹھتے ہیں تو پھر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے چاروں طرف کتابوں رسالوں اور خطوط کا ڈھیر رہتا ہے۔ اکثر جب امی ان چیزوں کو درست کر دیتی ہیں تو وہ خفا ہو جاتے ہیں کہ میرے کاغذات ہو گئے، بس میری چیزوں کو چھوا نہ کرو —— ان کو اسی طرح رہنے دو —— ان کے پڑھنے پڑھانے کا یہ سلسلہ رات کے گیارہ بارہ، بلکہ ایک بجے تک جاری رہتا ہے۔ اگر دن میں نہیں سوئے تب البتہ جلدی سو جاتے ہیں۔ اسی دورا میں لکھتے بھی ہیں۔ آبا میز کرسی پر بیٹھ کر، کسی وقت معینہ یا باقاعدہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر نہیں لکھتے بلکہ اپنے تخت طاؤس پر بیٹھے، ہم لوگوں کے شور و غل، ہنسی و مذاق کے درمیان کام کیا کرتے ہیں۔ صرف ان سے اس وقت کو نہ بولے یہ شرط ہوتی ہے ——

آبا کو کپڑوں سے زیادہ دل چسپی نہیں۔ بس دھلے ہوئے صاف ستھرے اور سادہ ہوں۔ پان کے البتہ بہت شوقین ہیں۔ تھوڑی دیر بھی بغیر پان کے نہیں رہ سکتے —— غالباً کتاب، پان اور کھانا۔ یہی تین نعمتیں ہیں جو ذہن کو ان کے لئے اس قابل بناتی ہیں کہ اس میں رہا جا سکے ——

غصہ بہت جلد آجاتا ہے لیکن اس سے بھی جلد اتر جاتا ہے اور پھر یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کس بات پر غصہ ہوئے تھے —— غصہ جبھی آتا ہے جب کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف ہو —— اور یہ بھی تو سن لیجئے کہ سب سے زیادہ غصہ کس پر ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں پر، بیوی پر اور اپنے نوکر حافظ پر —— در اصل جس کو اپنا سمجھتے ہیں آپ پر ناراض ہوتے ہیں غیروں پر نہیں ——

آبا ڈسپلن کے سختی سے قائل ہیں۔ شاید یہ چونتیس سال کی مدرسی کا بھی اثر ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے بچوں یا خوردوں سے بے تکلف نہ ہوں بلکہ ہر چیز ان کے یہاں تمیز و تہذیب کے دائرہ میں ہونی چاہیے —— خاص طور سے لڑکیوں کے معاملے میں تو وہ زیادہ آزادی کے سخت خلاف ہیں —— نئے فیشن سے بھی ان کو چڑ ہے۔ اور اپنی لڑکیوں کو تو بس شاید آئیڈیل ہندوستانی لڑکیاں بنانا چاہتے ہیں (افسوس کہ وہ بنتی نہیں) آبا کا آئیڈیل بھی سنیئے —— ان کا خیال ہے کہ لڑکیوں کو پڑھا لکھا تو ضرور ہونا چاہیئے لیکن گھر داری سے

دھو کر نماز پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں ـــــ میں آپ کو بتاتی چلوں کہ جب سے ابّا کی پنشن ہوئی ہے اور عمر جوں جوں بڑھتی جا رہی ہے ابّا بھی سخت مذہبی ہوتے جا رہے ہیں کئی سال ہوئے انھوں نے داڑھی بھی رکھ لی ہے ـــــ ہاں تو نماز کے لئے ابّا جب اٹھتے ہیں تو وہ اپنی طرح ہم سب کو بھی مومن و مومنہ بنانا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ روز ہم لوگوں کو اٹھاتے ہیں اور یہاں کروٹ بدل کر پھر خوابوں کی دنیا میں گم ـــــ نماز و وظائف کا یہ سلسلہ تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہتا ہے پھر صبح ہو جاتی ہے اور ابّا چائے پیتے ہیں ۔ اس سلسلے میں چلتے چلتے ایک بات سن لیجئے کہ اگر ابّا (خدانخواستہ) آپ کے گھر جائیں تو ان کی خاطر کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ان کی بڑی اچھی سی دعوت کیجئے ـــــ آپ سے بے حد خوش ہو جائیں گے اور ہر صاحب فکر و فن سے آپ کے یہاں کے کھانے کی تعریفوں کے پل باندھ دیں گے ـــــ اور اس سلسلے میں، میں ایک مثال بھی پیش کر سکتی ہوں ۔ جب بھی حکیم صاحب عالم صاحب کا ذکر ابّا کرتے ہیں، ان کی اور خوبیوں کے علاوہ ان کے یہاں کی شاہی دال اور مزعفر کی تعریف ضرور کرتے ہیں ـــــ

ابّا اچھے کھانے (اور گھبرائیے مت اچھا کھلانے کے بھی) بے حد شوقین ہیں ۔ ترکاریوں سے انھیں زیادہ رغبت نہیں اس سلسلہ میں پکّے مسلمان ہیں ـــــ بلامبالغہ ان کا مقدور ہوتا تو کم سے کم تیس باورچی ضرور رکھتے جو کہ ان کو روز نئی نئی طرح کی چیزیں پکا کر کھلاتے ۔ ناولٹی (نیاپن) ہر چیز میں چاہتے ہیں خواہ کھانا ہو، کپڑا ہو یا ادب ۔ گھسی پٹی چیزوں اور گھسے پٹے موضوعات کے سخت خلاف ہیں ۔ ایک بات اور ہے ۔ وہ کھانا اور ناشتہ اکیلے نہیں کھا سکتے ـــــ وہ کہتے ہیں کہ سارا لطف ہی جاتا رہتا ہے ـــ جب تک دو چار ساتھی، مزا لے کر، خوش ہو ہو کر، ساتھ کھانے والے نہ ہوں، اچھا کھانا بھی بے مزا لگتا ہے ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ کھا نہیں رہے ہیں زہر مار کر رہے ہیں ـــــ دعوتیں کرنے کا ان کو شوق ہے (خیر یہ تو مجھے بھی اچھا لگتا ہے) اگر ابّا سے ہم کہیں کہ ہمیں کچھ روپے چاہئیں، کپڑا خریدنے کے لئے، کہیں باہر جانے کے لئے، تو شاید دینے میں تامل ہو، مگر یہ کہہ دیں کہ دعوت کرنی ہے تو بہت خوش ہو کر دیں گے بلکہ دعوت کا مینو بنانے میں بھی مدد کریں گے ـــ

صبح کی چائے کے بعد وہ اخبار پڑھتے ہیں، اکثر خبریں پڑھ پڑھ کر اس پر تبصرہ بھی کرتے جاتے ہیں ـــ اسی دوران کوئی ان سے ملنے چلا آتا ہے ۔ کبھی دوست، کبھی رشتہ دار، کبھی اجنبی ـــــ زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کہ اپنے کسی کام کے لئے آتے ہیں ۔ اور اس میں نوّے فی صدی لوگ سفارش کرانے والے ہوتے ہیں ـــ کسی کو اپنی فیس معاف کرانی ہے، کسی کا داخلہ نہیں ہو رہا ہے، کسی کو نوکری نہیں مل رہی ہے اور اگر کسی کے پاس نوکری ہے بھی تو ترقی نہیں ہو رہی ہے ان سب مسائل کو حل کرنے میں ابّا آگے آگے رہتے ہیں ـــــ کسی نے منہ سکھا کر، گلوگیر آواز میں کچھ کہا اور ابّا اس کی مدد کے لئے فوراً تیار ـــ فوراً شیروانی پہنی، چھڑی اٹھائی اور اس کے ساتھ باہر نکل گئے ـــ اگر خود کچھ نہیں کر سکتے تو بیٹھ کر پلان بنائیں گے کہ کون شخص مدد کر سکتا ہے ۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوبارہ پھر کبھی پلٹ کر نہیں آتے ۔ نہ کچھ خبر ہی دیتے ہیں کہ ان کا کام ہوا یا نہیں ـــــ اور ابّا ہیں کہ ان کے لیے بے چین ہیں، ٹہل رہے ہیں ۔ پریشان ہیں کہ معلوم نہیں اس "بیچارے" کا کام بنا یا نہیں ؟ ایسے ہی وقت میں کبھی جھنجلا کر ہم لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ابّا آپ اپنی ایک تہائی انرجی تو سفارش کرنے میں صرف کر دیتے ہیں، پریشان الگ ہوتے ہیں اور وہ بھی غیر مستحق لوگوں کی ۔ تو مسکرا کر کہیں گے : ارے بیٹا اگر میرے دو بول کہنے سے کسی کی زندگی

خود لا کر دے دیجئے۔ ہمیشہ اپنی بیماری کو ٹالا کرتے ہیں اور چوں کہ شگفتگی ان کے مزاج میں ہے اس لئے تکلیف میں بھی ہنستے رہتے ہیں کہ برداشت کرو۔ سب چیزیں کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ چار دن کی زندگی ہے منھ بنانے سے کیا فائدہ ۔۔۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود آبا کبھی منھ نہیں بناتے ۔۔۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب ان کو زیادہ فکریں ہوتی ہیں تو ساری رات کروٹیں بدل کر گزار دیتے ہیں اور اسی زمانے میں ان کی جھنجھلاہٹ بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے ۔۔۔

جہاں تک میں نے آبا کی شخصیت کا مطالعہ کیا ہے اور جہاں تک میں ان کے بچپن کی زندگی کے بارے میں جانتی ہوں کلاسیکی نفسیاتی تجزیہ کے مطابق آبا کی ORAL PERSONALITY معلوم ہوتی ہے (یہ میں دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتی کیوں کہ شخصیت کو جاننے اور سمجھنے کے لئے صرف مطالعہ کافی نہیں) یہ اس طرح کی شخصیت ہوتی جہاں کہ مرکز خودی انسان کی زبان بن جاتی ہے۔ آبا نے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا، چونتیس سال تک پڑھاتے رہے، اس طرح سارا کام زبان سے لیا۔ پھر افسانہ نگار بھی تو اپنے کو EXPRESS کرتا ہے ایک طرح سے اپنی زبان ہی کے ذریعہ۔ چونکہ وہ اتنے لوگوں تک اپنی آواز پہونچانا چاہتا ہے اس لئے قلم سے اپنی زبان کا کام لیتا ہے ۔۔۔ باتیں کرنے میں اکثر آبا اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ ہمارا خیال ہے کئی مہینے گذر جائیں اور ان کو خبر نہ ہو ۔۔۔ آبا کو کھانے سے بہت شوق ہے یعنی پھر وہی زبان کی لذت۔

اب آپ خاموش کیوں کھڑے ہیں ؟۔ آپ تو آبا سے مل لئے وہ جو سامنے ایک بزرگ شفقت بھری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لئے ہیں وہی تو میرے آبا ہیں ۔۔۔۔۔۔ پہچانا نہیں آپ نے ؟؟

دل چسپی ہونا چاہیئے بلکہ ان کو زیادہ تر توجہ گھرداری اور گھریلو کاموں پر دینی چاہیئے ـــــ وہ عورت کو شمع محفل نہیں بلکہ چراغ خانہ دیکھنا چاہتے ہیں ـــــ ان کے نزدیک عورت کی سب سے بڑی ڈیوٹی یہ ہے کہ وہ شوہر کی دیکھ بھال کرے۔ اسے اپنا مجازی خدا سمجھے (خواہ وہ کیسا ہی ہو) اس کے لئے بڑے سے بڑا ایثار کرے۔ اس کی خدمت کرے اور بچوں کی پرورش کرے۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں زیادہ تر ہم عورت کو ایثار و خدمت کی دیوی کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ عورت کو ہر حال میں شریف کردار اور انسانی کمزوریوں سے (جو کہ عام طور سے مردوں میں ہوتی ہیں) پاک دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسا احساس ہوتا ہے کہ ابا مرد کو عورت سے برتر سمجھتے ہیں ـــــ شاید اس کی مذہبی وجہ بھی ہو۔ اکثر ہمیں یاد دلاتے رہتے ہیں کہ تم میری بیٹیاں ہو۔ یہ کبھی مت بھولو کہ سیدانی ہو اور کس خاندان کا خون تم میں ہے ـــــ میں کہتی ہوں کہ ابا اپنے بیٹوں سے کبھی یہ بات کیوں نہیں کہتے۔

ابا مذہبی تو ہیں لیکن تنگ نظر نہیں ـــــ وہ تعصب نہیں کرتے اسی لئے ان کے احباب کی فہرست میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل ہیں وہ ان کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر ایک بات کے وہ مخالف ہیں یعنی دوسرے مذاہب میں شادی بیاہ کے۔ اسکی وہ اجازت نہیں دے سکتے۔ کمیونزم سے بھی انکو دلچسپی نہیں مگر اسکے بعض اچھے اصولوں کی تعریف کرتے ہیں ـــــ

اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور احباب سے ابا بہت محبت کرتے ہیں خاص طور سے کچھ بھانجوں، بھتیجوں کو تو شاید ہم لوگوں سے بھی زیادہ چاہتے ہیں ـــــ ان کی ہر معمولی تکلیف پر بے چین ہو جاتے ہیں۔ ان کی ہر مشکل کو حل کرنے میں سب سے پیش پیش ـــــ ان کو تعلیم دلانے میں سب سے آگے۔ اور ان کو ہر طرح سہولتیں دینے کے لئے تیار۔ کام سے لگایا۔ لیکن اگر آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں تو کہوں کہ ان میں سے زیادہ تر لوگ ایسے نکلے جنھوں نے بعد میں ابا کو پلٹ کر بھی نہیں پوچھا ـــــ نہ ان کا کوئی احسان مانا بلکہ ان کے سر الٹے طرح طرح کی برائیاں منڈھ دیں ـــــ وہ لوگ کام نکلا اور دکھ بسرا والے مقولے کے قائل تھے۔ مگر ابا یہ کبھی ماننے کو تیار نہیں کہ ان کے رشتہ داران کے دشمن بھی ہو سکتے ہیں ـــــ ہم سب بھائی بہنوں کی اس سلسلے میں متفق رائے یہ ہے کہ گو ابا بہت بڑے افسانہ نگار ہیں، انسانی فطرت کے نباض ہیں مگر آدمی پہچاننے میں بہت کچے ہیں ـــــ ہر ایک کو اچھا سمجھتے ہیں کیوں کہ خود اچھے ہیں۔ ان کے خیال میں ہر ایک نیک ہے اس لئے کہ نیکی ان کی فطرت بن چکی ہے ـــــ فوراً لوگوں پر بھروسہ کر لیتے ہیں، ان کی لفاظی کو حرف بہ حرف سچا سمجھ لیتے ہیں اور اسی لئے دھوکا کھاتے ہیں ان کے سچے دوست بہت کم ہیں بلکہ خود ان کے کہنے کے مطابق صرف تین ہیں۔ پیسہ جمع کرنے کی فکر ابا کو کبھی نہیں رہی۔ ابی تو یہ کہئے کہیں شریفوں کے یہاں بھی پیسہ جمع کیا جاتا ہے۔ کیا ہم کوئی بنئے ہیں کہ بینک اکاؤنٹ رکھیں۔ اسی لئے ساری عمر کمایا، نہ کوئی مکان بنایا نہ بینک بیلنس ہوا مہینہ کے آخری دنوں میں شریفوں کے خاص معمول کی طرح قرضہ ہی پر کام چلتا رہا ـــــ (اور شاید ہم لوگوں کی تسلی دل کی خاطر) بڑی شان سے کہتے ہیں "الفقر فخری" وہ صوفی منش ہیں ان کو بس اپنا ایک تخت چاہیئے، ایک گدا جو مرگ چھالہ کا کام دیتا ہے اور کتابیں ـــــ اس کے آگے انھیں کسی چیز کی ضرورت نہیں جیسا میں اوپر کہہ چکی ہوں جذباتی آدمی ہیں۔ ان کی یہ حالت ہے کہ اکثر خود قرض لے کر دوسروں کو قرض دیتے ہیں۔

اپنی بیماری کی طرف سے بہت لاپرواہی برتتے ہیں (کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ خدانخواستہ مسلسل بیمار رہتے ہیں)۔ پرہیز سے ان کو سخت نفرت ہے اور اسی لئے شدید کھانسی میں بھی ساری کھٹی چیزیں کھایا کرتے ہیں برف کا پانی پیتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کھانستے بھی رہتے ہیں اگر زیادہ اصرار کیجئے تو دوا بھی کھائیں گے لیکن ڈاکٹر کے یہاں جانے کو نہ کہئے

خواجہ اطہر حسین

حسینی ـ میرے دوست

گزشتہ تیس سال سے کچھ زائد کے عرصہ میں میں نے حسینی صاحب کو اتنے قریب سے دیکھا ہے کہ ان کے متعلق کچھ لکھتے وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عزیز ترین خیالات اور جذبات کو منظر عام پر لا رہا ہوں اور ان چیزوں کی جو دل کی گہرائی میں محفوظ ہیں بالاعلان تشہیر کر رہا ہوں۔ اور خدا جانے کیوں۔ مجھے یہ بات ایک گونہ تردد میں ڈال رہی ہے۔ یہ کچھ ایسی بات ہے کہ جیسے ہم ابھی ابھی کسی شخص سے انتہائی بے تکلفی اور گہری یگانگی سے اپنی کہہ رہے ہوں اور اس کی سن رہے ہوں۔ اور پھر یکایک پینترا بدل ڈالیں اور غیریت کا سوانگ بھر کر اس کے کردار۔ اس کی شخصیت۔ اس کی نفسیات کا ناقدانہ جائزہ لینا شروع کر دیں۔ ممکن ہے کہ اور لوگوں کو رخ بدل کر اپنی ہی شخصیت کو دو مختلف زاویوں سے دیکھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی ہو۔ مگر مجھے ایک نہایت ہی قریب کی چیز کو قدرے دور ہٹ کر، کچھ غیریت کی نظر سے دیکھنے میں، ایک عجیب سی ذہنی کش مکش کا احساس ہے

علی عباس حسینی کے بارے میں لکھنا ایک حیثیت سے تو بہت آسان ہے۔ اور ان کی پر کار زندگی کے سہارے بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ حسینی نے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تاریخ میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی ساتھ ہی ساتھ انگریزی ادب سے بھی خاصی دلچسپی جاری رکھی۔ ایل۔ ٹی کی سند حاصل کر کے سرکاری محکمۂ تعلیم میں شامل ہوئے اور ایک عرصہ تک ایک فاضل اور نکتہ رس معلم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کے طلبا ہر منزل پر ان کے طرز تعلیم اور ان کے بزرگانہ حسن اخلاق کی بنا پر ان کے گرویدہ رہے۔ ان میں سے جتنوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا میں نے ان کے دلوں میں اس زمانہ کی قیمتی یادیں موجود پائیں۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ حسینی پہلے غازی پور اور پھر حسین آباد ہائر سکنڈری اسکول لکھنؤ کے پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ یہ دو رموخر الذکر ادارے میں تقریباً چھ سال تک اس عہدہ کے فرائض غیر معمولی فہم و فراست اور دور اندیشی سے انجام دینے پر ختم ہوا۔ اور یہیں سے وہ ریٹائر ہوئے۔ بحیثیت پرنسپل وہ جس ادارے سے بھی متعلق رہے، وہاں ان کو نہ صرف اساتذہ کا مکمل تعاون حاصل رہا، بلکہ ان کے ہر ماتحت رفیق کار نے آپ کو ہمیشہ اپنا سچا بہی خواہ پایا۔ اور ان کے زیر ہدایت کام کرنے کے موقع کو اپنی خوش قسمتی سمجھا۔ طلبا کے دلوں میں ایک شفیق بزرگ کی طرح جگہ پیدا کر لینا۔ محبت کے ناتے اطاعت حاصل کر لینا ان کا خاص شعار رہا۔ ان کی باتوں میں کچھ ایسا رس اور نصیحتوں میں کچھ ایسا اثر رہتا ہے کہ کسی ادارے میں بھی آپ کو ضبط نظم کی ان دشواریوں سے سابقہ نہیں رہا، جو فی زمانہ بدقسمتی سے بہت سے ہیڈ ماسٹروں اور پرنسپلوں کو پیش آتی رہتی ہیں۔ یہی کامیاب اور

افسانے پڑھے ہیں اور ایک عام پڑھنے والے کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ مثلاً کلر یا مقامی رنگ جیسے ماحول سے مطابقت بھی کہہ سکتے ہیں ان کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجود رہتا ہے۔ یہ بات گہرے مطالعہ اور وسیع معلومات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے افسانہ نگار کو پڑھنا بھی پڑتا ہے اور حسب ضرورت چھان بین بھی کرنا پڑتی ہے۔ حسینی کا ہر ایک افسانہ اس کا شاہد رہتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ محض قلم برداشتہ افسانہ تراشی نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں موقع محل کے لحاظ سے سماجی، سیاسی، یا تاریخی صداقتیں ہیں، جن پر افسانہ کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ ان کے متعدد افسانوں میں دیہات کی زندگی کے مرقع پیش کیے گئے ہیں اور یہ تصویر کشی بالعموم حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس طرح جب کسی سماجی یا تاریخی موضوع کو لے کر چلتے ہیں تو انھیں کسی مقام پر بھی حقیقت سے دور ہٹ جانے کی ضرورت یا مجبوری لاحق نہیں ہوتی۔ اسلوب بیان بھی ہمیشہ بلند رہتا ہے۔ عامیانہ یا بازاری انداز کلام کہیں جگہ نہیں پاتا۔ افسانے کے جس کیرکٹر کی زبان سے جس طرح کے الفاظ نکلنا چاہئیں وہ موجود رہتے ہیں لیکن چھچھورے پن یا سوقیانہ رنگ کو کہیں دخل نہیں ہوتا۔ زبان کے بارے میں حسینی صحت زبان کے قائل ہیں اور اسے خاص اہمیت دیتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ زبان میں وسعت پیدا کرنے کے خواہش مند بھی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی لفظ معیاری زبان میں غیر مانوس حیثیت رکھتا ہو، یا بالکل ہی رائج نہ ہو، یا اس کا استعمال کسی خاص علاقے کی بولی تک محدود ہو، اور اس کے صحیح مفہوم کو ادا کرنے کے لیے معیاری زبان میں کوئی نعم البدل موجود نہ ہو، تو حسینی اس کے استعمال سے احتراز نہیں کرتے، بلکہ چاہتے ہیں کہ یہ لفظ بھی اردو کے سرمایۂ الفاظ میں شامل ہو کر زبان میں مزید وسعت پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکے۔

ایک اور نمایاں خصوصیت حسینی کے افسانوں میں یہ نظر آتی ہے کہ ان میں عشق و عاشقی اور آمادۂ محبت کے اس طرح کے تذکرے شاذ و نادر ہی ملتے ہیں، جن کے لیے ہمارے سماج کے باعزت طبقوں میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں بھولتے کہ ہماری سماجی دنیا میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو آپس میں ملنے جلنے اور باعزت اختلاط بڑھانے کے وہ مواقع حاصل نہیں ہیں، جن کی اجازت مغربی ممالک یعنی یورپ اور امریکہ وغیرہ کا سماج کھلے بندوں دیتا ہے۔ اور محض یہی نہیں کہ ایسے میل جول کو لائق حرف گیری نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک معمول کی روا چیز سمجھتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ حسینی کے افسانوں میں جنسی عشق و محبت کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ ایسے افسانے بھی ہیں جن کا پلاٹ ان ہی جذبات کی بنیاد پر قائم ہے۔ ایسے کردار بھی ہیں جو جنسی معاملات میں بدی کی راہیں اختیار کرکے افعال شنیعہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مگر حسینی بدی کو بدی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اسے سراہتے نہیں۔ سماج کی عکاسی کرتے وقت وہ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرتے کہ مستقبل اپنے دامن میں جو کچھ لے کر آئے یا نہ آئے۔ مگر زمانہ حال تک ہمارے سماج میں، زیادہ نہیں تو اسّی نوّے فیصدی شادیاں والدین ہی طے کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اچھا ہے یا برا غلط ہے یا صحیح، یہ ایک جداگانہ سوال ہے جس سے بحث کرنا یہاں مقصود نہیں ہے لیکن حقیقت حال یہی ہے کہ لڑکوں اور علی الخصوص لڑکیوں کی شادی بیاہ کی تجویزیں اور ان کے بارے میں آخری فیصلے والدین کے صوابدید پر منحصر رہتے ہیں۔ لہذا یہ بات قابل قدر اور لائق تحسین ہے کہ حسینی انگریزی کے ہزاروں ناول اور افسانے۔ بالکل صحیح معنوں میں ہزاروں پڑھنے کے بعد بھی حسن و عشق کی داستانوں میں معاشرہ کے رسم و رواج کو پس پشت ڈال کر ایسے مرقعے پیش نہیں کرتے جنھیں ماحول سے کوئی مطابقت نہ ہو اور جن کا وجود ناولوں اور افسانوں کی دنیا ہی تک محدود ہو۔ حسینی کو ویسٹرن ناول بے حد پسند ہیں جہاں ہر افسانے میں گولیوں کی بوچھار اور دو چار۔ بلکہ دس پانچ کا۔ اس بوچھار کی نذر ہونا بہت معمولی سی بات ہے۔ شاید ہی کوئی امریکہ کی ویسٹرن زندگی کا ناول اس سے خالی ہو۔ لیکن اوقات فرصت میں ان ناولوں کو بڑے ذوق سے پڑھنے کے باوجود حسینی نے اپنے افسانوں کو ان خصوصیات سے علیحدہ رکھا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارے سماج میں اس طرح افسانوں کے لیے کوئی بنیاد یا بیک گراؤنڈ موجود نہیں ہے۔

قابلِ قدر خدمات تھے جن کی بنا پر ان کو ہمیشہ اپنے افسرانِ بالا کا پورا اعتماد حاصل رہا اور ان کی خدمات بہ نظرِ استحسان دیکھی جاتی رہیں۔ یہ باتیں میں سنی سنائی نہیں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ ذاتی علم اور پوری واقفیت کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ حسین آباد ہائر سکنڈری اسکول میں حسینی کے پرنسپل رہنے کے آخری تین سال ایسے تھے جب میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد شیعہ کالج میں اسی طرح کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ جو لوگ سیتاپور روڈ پر شیعہ کالج کے محلِ وقوع سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ شیعہ کالج جانے والی شاہراہ حسین آباد گورنمنٹ اسکول سے بہت قریب ہو کر گزرتی ہے۔ چنانچہ متعدد موقعے ایسے نکلتے تھے کہ جب کسی نہ کسی وجہ سے مجھے حسین آباد اسکول جانے کا موقع مل جاتا تھا۔ اور ان موقعوں پر مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی تھی کہ اساتذہ اور طلبا سے کر ادنیٰ ملازمین تک ہر شخص حسینی کے چشم و ابرو کے اشارے پر کام کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے اور انھیں افسر سے زیادہ، اپنا بہی خواہ اور مربی تصور کرتا ہے۔۔۔ اس سے پہلے تقریباً بارہ سال تک حسینی اور میں جوبلی کالج کے اسٹاف میں ساتھ ساتھ کام کرتے رہے تھے۔ اس طویل مدت میں حسینی کو اپنے ہر ایک پرنسپل کا اعتماد حاصل رہا۔ رفیق کار اساتذہ سے بھی ان کے تعلقات برادرانہ میل جول کی خوشگوار بنیادوں پر قائم رہے۔ نہ وہ کسی کے شاکی ہوئے، اور نہ کسی کو ان سے شکایت ہوئی۔

کلاس روم میں مختلف مضامین کی پراثر تعلیم دینے کے علاوہ حسینی کو طلبا کے غیر درسی مشاغل سے ہمیشہ گہری دلچسپی رہی۔ طلبا کو اس طرح کے مشاغل میں مفید ہدایات اور مشورے دینے میں انھوں نے کبھی تساہل یا بخل سے کام نہیں لیا۔ جہاں بھی وہ رہے وہاں طلبا کی ادبی اور ثقافتی انجمنوں کو ان کی نگرانی، ہدایت، یا سرپرستی کا فخر حاصل رہا۔ اور وہ انھیں اپنے وسیع اور گراں قدر تجربے سے مستفیض ہونے کے مواقع فراہم کرتے رہے۔ جس زمانے میں ہم دونوں کا جوبلی کالج سے تعلق تھا تو مجھے کوئی ایسا موقع یاد نہیں آتا کہ جب اپنے کالج کی کرکٹ، ہاکی یا فٹ بال ٹیم کا کوئی خاص میچ ہو اور حسینی کھیل کے میدان میں موجود نہ ہوں۔ اگرچہ خود مجھے بھی ان مشاغل سے گہری دلچسپی رہی تاہم اکثر موقعوں پر میری موجودگی حسینی کے اصرار کی رہینِ منت ہوتی تھی۔ حسینی کی یہی "ادا" طلبا کو اپنا گرویدہ بناتی رہی۔ کھیل کے "مردِ میدان" اور قدرے منچلے طلبا، جو کسی کی ٹیڑھی نظر برداشت نہ کر سکتے تھے، حسینی کے سامنے اس طرح نظریں جھکا لیتے تھے کہ گویا وہ بالکل اللہ میاں کی گائے ہیں، جن میں کوئی دمِ خم نہیں۔ یہ بات جب ہی حاصل ہو سکتی ہے، جب طلبا کو اس بات کا پورا یقین ہو کہ ان کا تجربہ کار پرنسپل ان کا سچا بہی خواہ ہے۔ ان کی کامیاب سرفرازی کا خواہشمند ہے اور اس کے دل میں ان کے نوخیز جذبات اور امنگوں کا صحیح احترام بھی موجود ہے۔ جوبلی کالج اور حسین آباد اسکول میں یہ سب باتیں میری چشم دید ہیں اور حسینی کی افتادِ طبع کے لحاظ سے مجھے پورا یقین ہے کہ دیگر مقامات پر بھی یہی صورتِ حال رہی ہوگی۔

اب رہا افسانہ نویسی کا معاملہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی ادبی ماہنامے کے ایسے نمبر میں جو علی عباس حسینی سے منسوب کر کے شایع کیا جا رہا ہو۔ حسینی کے بارے میں کچھ لکھنے والے کو زیادہ تر ان کی افسانہ نویسی کے بارے میں لکھنا چاہیے۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر میں اس بارے میں معذرت طلب ہوں۔ پہلی وجہ تو یہی ہے کہ مجھے اردو ادب کے افسانوی تخلیقی ادب سے اتنی شناسائی اور واقفیت نہیں ہے کہ میں حسینی جیسے کہنہ مشق اور صفِ اول کے ممتاز افسانہ نگار کی تصنیفات کے بارے میں کسی قسم کے ناقدانہ تبصرہ کی جسارت کر سکوں۔ حسینی نے افسانہ نویسی کی ابتدا اس وقت سے کی جب وہ بی اے۔ کے درجات میں تعلیم پا رہے تھے۔ اور آج دس سال ہوئے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر با عزت ریٹائر بھی ہو چکے ہیں۔ اس تمام درمیانی مدت میں ان کا افسانہ نویسی کا شغلہ برابر جاری رہا اور بفضلہ آج بھی جاری ہے۔ ان کے افسانوں کے غالباً چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور خواہ نخواہ افسانے اور بھی ہوں گے۔ میں نے حسینی کے متعدد

احمد جمال پاشا

علی عباس حسینی کا ایک مزاحیہ کردار

حکیم بانا

اُردو میں گنتی کے مزاحیہ ناول ہیں، ان میں معیاری ناول کتنے ہیں؟ محض دو چار، جو با آسانی، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، ان چند ناولوں میں بجا طور پر علی عباس حسینی کے حکیم بانا کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔

زمینوں کا بادشاہ "حکیم بانا" کے مزاحیہ کردار کو ابھار کر اس ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ حکیم بانا کا تعارف مصنف نے قاری سے ان الفاظ میں کرایا ہے:-

" یوپی کے دیہاتوں میں جب زمینداروں کا دور دورہ تھا۔ بھانت بھانت کے جانور دکھائی دیتے تھے۔ پڑھے لکھوں میں بھی۔ اور اُن پڑھ جاہلوں میں بھی حکیم امان عرف حکیم بانا اسی طرح کا ایک "جنیئس" تھا۔

باوجود علم و فضل کے جبّہ و دستار کے نہ صرف درجہ لاق، چھوٹا اور ذہین تھا۔ ہماری جاگیردارانہ سوسائٹی میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ روبرو عزت و توقیر اور پس پشت تضحیک و مذمّت۔"

(حکیم بانا ص ۴)

یوپی کا یہ گاؤں ہندی پور ہے۔ آج سے تقریباً ۴۴ سال قبل، اس خوشحال گاؤں کے خوش فکروں کی بھر مار گاؤں کے زمیندار محمود علی خاں کی حویلی کے دیوان خانے، پائیں باغ، حویلی کے وسیع و عریض صحن یا دالان کے سامنے والے بڑے چبوترے پر جمتی تھی۔ شام اور رات کی ان نشستوں کے لئے فرش پر مسند و قالین بچھے آگے شفاف چم چم چاندنی، دونوں طرف مونڈھے، کرسیاں اور بنچیں لگی ہوتیں۔ فرش پر اگالدان اور خاصدان کے علاوہ حقہ رکھا جاتا۔

ان محفلوں کے روح رواں ریاست کے دیوان لالہ منبی دھر، ظہور مبین اور حکیم امان ہوتے۔ حقے کے دور کے ساتھ خان صاحب کے دوالوں کی ناز و طبع پان، سگریٹ، چائے، ناشتے اور کھانے سے کرتے، تھوڑی دیر بعد فنجان کے دور چلتے اس دوران حکیم امان برابر ایران توران کی ہانکتے رہتے۔ اس تمام داستان سرائی کا تعلق انکے فرضی سیاحی تجربات اور واہی واقعات سے ہوتا۔ انھوں نے بڑے بڑے صید رو حنین کے معرکے سر کیے تھے بارہا رستم و اسفندیار کو نیچا دکھایا تھا زمین، آسمان اور پاتال پر بڑے بڑے ستم ڈھائے تھے ان کی ان تمام مہمات کی خبریں خود بقول ان کے برابر دمشق اور شام کے اخباروں میں نمایاں طور پر چھپتی رہتی تھیں۔ حکیم بانا بات بات میں بات پیدا کرتے اور کچی ہونے کے باوجود

اس مختصر سے مقالے میں اب وہ جگہ آگئی ہے جہاں میری خواہش ہے کہ حسینی کی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھوں، مگر دیرینہ یگانگی کے رشتے سدّراہ بن جاتے ہیں۔ بہرحال چند لمحوں کے لیے حسینی کی شخصیت سے نظریں بچا کر کچھ باتیں۔ خواہ نتیجاً سطحی ہی سہی، قلمبند کر دینا ہی مناسب ہے۔ حسینی ۱۹۴۸ء میں رائے بریلی سے تبدیل ہو کر جوبلی کالج لکھنؤ کے اسٹاف میں شامل ہوئے۔ اسٹاف روم میں جب ان سے بات چیت کے مواقع پیدا ہوئے تو میں نے انھیں ملتے تو۔ چھریرے جسم اور فرنچ کٹ سی ہلکی خشخشی داڑھی سے مزین۔ ایک ایسا رفیق کار پایا جس کی معمولی بات چیت بھی شستہ الفاظ اور نپے تلے جملوں میں ہوتی تھی اور جنھیں وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایسے لب و لہجہ میں ادا کرتے تھے کہ گویا وہ ایک عمدہ قسم کی نثر لکھ رہے ہیں۔ مجھے ان انداز کلام میں بہت کچھ تصنع کا شائبہ ہوا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ حضرت ہر روز گھر سے سوچ کر آتے ہیں کہ آج اسٹاف روم میں گپ شپ میں کیا کیا باتیں کہیں گے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھے اپنی رائے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہو گئی تھوڑے ہی دن بعد مجھے یہ ماننا پڑا کہ جس چیز کو میں آورد سمجھتا تھا وہ دراصل حسینی کا فطری انداز کلام ہے، جسے تصنع سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کے انداز کلام اور لب و لہجہ کی یہ خصوصیت آج بھی موجود ہے۔ جن لوگوں نے کسی ادبی صحبت میں یا ریڈیو پر حسینی کو کوئی افسانہ یا مقالہ پڑھتے سنا ہے، وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے اور اس کی تصدیق کر سکیں گے۔ کسی چیز کے پڑھ کر سنانے میں ان کا قابل رشک صحیح تلفظ اور آواز کا لوچ، نہ صرف مطالب کو واضح کرتا چلتا ہے، بلکہ سامعہ نواز انداز میں منظر داری کی مرقع کشی بھی کرتا جاتا ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر حسینی کے کسی چیز کو پڑھ کر سنانے کا انداز ایسا رسیلا ہوتا ہے کہ جب میں اپنی ہی لکھی ہوئی کسی چیز کو خاص فرمائش کر کے ان کی زبان سے سنتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریر میں معنی اور مطالب کی تازہ خوبیاں جلوہ گر ہو گئیں۔ اور اس کا پایہ بادی النظر میں بلند ہو گیا۔ یوں پڑھنے کی صلاحیت بھی ایزد تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے جس کے سہارے پھیکی چیزیں بھی رنگین بن جاتی ہیں۔

موصوف کے جوبلی کالج میں آنے کے بعد ہمارے باہمی تعلقات میں یگانگی کا عنصر روز بروز بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ قومی اور ادبی جلسوں میں، کھیل کے میدان میں سینما ہال میں الغرض یہاں اور وہاں ہم لوگ ساتھ ساتھ نظر آنے لگے۔ اس بڑھتی ہوئی یگانگی میں علامہ اختر علی تلہری اور مولانا ثاقب حسین بھی تقریباً برابر کے شریک رہے۔ آگے چل کر اس یگانگی میں مزید اضافہ اس طرح بھی ہوا کہ حسینی کی بیگم صاحبہ اور میری اہلیہ کے باہمی مراسم بھی، اگر زیادہ نہیں تو کم از کم شوہروں کی یگانگی کے درجہ تک پہونچ گئے۔ اور اس طرح جوبلی کالج میں دس بارہ سال بڑے پرلطف طریقے سے گزرے۔ مگر بالآخر اس گٹھن کو نظر بد نے آگھیرا۔ حسینی کا تبادلہ …ن پور ہو گیا مجھے فیض آباد بھیج دیا گیا اور اختر علی صاحب شاہجہان پور روانہ کر دیے گئے۔ البتہ مولانا ثاقب جوبلی کالج میں رہے۔ ان کا کبھی تبادلہ نہیں ہوا۔ سلسلہ ملازمت جوبلی کالج سے شروع ہوا اور ملازمت کی مدت پوری کر کے اسی سے ریٹائر ہوئے۔ چار درویشوں کی ٹولی منتشر تو ہو گئی۔ مگر اس سے باہمی تعلقات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

اب جب کہ میں اور حسینی ساٹھ اور ستر کی درمیانی منزلیں بسرعت طے کر رہے ہیں میرے لیے فرصت کے زمانے کا اس سے بڑھ کر کوئی انعام نہیں ہے کہ حسینی کے یہاں بیٹھ کر۔ اور گاہ بگاہ اپنے گھر پر، طرح طرح کے مسائل اور موضوعات پر دل پسند تبادلہ خیال سے مسرت حاصل کرتا رہوں۔

(باقی صفحہ ۶۹ پر)

دادو دیتے نظر آتے ہیں کبھی کبھار محفل میں ان کے ایک آدھ فقرے یا پھبتی سنائی دیتی ہے ۔

ہندی پور گاؤں کے زمیندار اور ریاست کے مالک محمد علی خاں بہت محترم ہیں۔ سب ان کا لحاظ کرتے ہیں۔ عظمت، شہرت اور دولت ان کو ورثہ میں ملی ہے ۔ ہزار ہا روپے ماہوار کی مستقل آمدنی ہے۔ یہ انتہائی باوقار اور پرکشش شخصیت کے مالک ہیں۔ پڑھے لکھے، شعر و ادب کے رسیا، تصوف اور سماع کے دلدادہ، ہر حالت میں بزرگوں اور عالموں کا احترام کرنے والے، بیٹھک باز اور زندگی کو خوش دلی سے گزار دینے کے قائل۔

الہ بخش دھر قانون گوئی سے ریٹائر ہو کر اس ریاست کے دیوان جی ہو گئے، ان محفلوں میں وہ حکیم بابا کے شاگرد رشید کی حیثیت سے شریک ہوتے ۔

ظہور کلکٹر کی پیش کاری سے ریٹائر ہوئے تھے ۔ اپنی چھوٹی موٹی زمینداری میں مست تھے ۔ انتہائی زندہ دل، یار باش، شعر و ادب کا بہت ستھرا ذوق تھا، ان کو ہر موقع کی غزلیں منھ زبانی یاد تھیں، ہزاروں اچھے شعر حفظ تھے، شعر موزوں بھی کر لیتے، اشعار کی پیروڈی بھی کر دیتے، زیادہ تر بات چیت اشعار میں کرتے جس محفل میں پہونچ جاتے محفل زعفران زار ہو جاتی، اس علاقے کے سب بڑے بڈلہ سنج تھے۔ اس کے علاوہ حکیم بابا کے برادر نسبتی بھی تھے لہذا حکیم بابا سے سب سے زیادہ مذاق کرتے، ان کو غصہ کرنے اور منانے کا حق بھی ظہور ہی کو تھا۔ اپنے اس حق سے پورا فائدہ اٹھاتے ۔

مبین گاؤں کے کھاتے پیتے بے فکرے تھے ان کو دنیا میں نہ کوئی کام دھام تھا نہ ان پر کوئی ذمہ داری تھی ۔ ان کی ساری دلچسپیاں اور سرگرمیاں اس محفل تک محدود تھیں ۔

اس قصے کا مرکزی کردار حکیم امان عرف حکیم بابا کا ہے ۔ ان کا قد ساڑھے ۵ فٹ، دھان پان، سر منڈا ہوا، کوتاہ پیشانی، چھوٹی آنکھیں، پھیلی ہوئی ناک، پچکے ہوئے گال، چھدری داڑھی، موٹے موٹے ہونٹ، گردن، سینہ اور پیٹ تقریباً غائب، ٹانگیں بانس کی کھپچیاں، لباس، نیم ہندستانی، نیم عربی، کمر کسے ہاتھ میں بانس کی چھڑی لئے چلتے تو قبا کے دامن سے پھڑ پھڑ کی آواز نکلتی۔ غصہ کرنے اور ہنسنے میں منھ سے ہوں، ہوں کی آواز نکلتی، چہرے پر نسیں ابھر آتیں، آدھی بات کرتے، آدھی کھا جاتے ۔ ٹوکنے والے پر فوراً بگڑ جاتے اور ہاتھا پائی تک پہونچ جاتا ۔ حکمت اچھی چلتی، گاؤں کے سب لوگ ان سے ڈرتے کہ اس علاقے کے واحد حکیم جو ٹھہرے، کہیں الٹی سیدھی دوا نہ دے دیں ۔ نوجوان اس لئے خائف رہتے کہ نہ جانے کیا پوچھ بیٹھیں اور مجمع کے سامنے جاہل بنا دیں ۔ الٹی سیدھی شاعری بھی کرتے، جھوٹ ایسے اعتماد کے ساتھ بولتے کہ سچا بھی شرما جاتا ۔ پھبتی ایسی کہتے کہ تاب لانے نہ بنتی، ہر بات کا منھ توڑ جواب دینے کے علاوہ مخصوص باتوں کا جواب ان کا بانا دیتا ۔

"ہوں، ہوں" اور "شرط ہے کہ" دراصل ان کا تکیہ کلام ہے ۔

حکیم امان جراح کے پیشہ سے انتہائی بھلے، بچپن انتہائی مصیبتوں اور سختیوں میں گزرا، باپ بڑے سخت تھے مگر ایک مدت انہی کے ڈنڈے سے ان کی خبر لے کر بابا گاؤں سے بھاگ نکلے ۔ ملکوں، ملکوں خاک چھانتے ۔ ایک مدت کے بعد ہندی پور واپس لوٹے، گاؤں میں حکمت کی دوکان جمائی، ظہور خاں صاحب کی محفلوں میں جا جا کر اپنے طولانی سفر کے اصلی اور نقلی واقعات بڑھا چڑھا کر بیان کرنے شروع کیے ۔ ظہور کی چچا زاد بہن سے انھوں نے شادی کر لی ۔ شادی کی پہلی رات حجلہ عروسی میں دلہن کا منھ غالباً پھولوں اور جھنڈیوں کے کسی زنجیرے میں پھنس گیا اور نکلنے کی جد و جہد میں انھوں نے ہنسنے کے وہ ہاتھ دکھائے کہ اگلے دن سالیوں اور ساس نے ان کو حکیم بابا کا ایسا خطاب دیا کہ پھر حکیم امان کی جگہ حکیم بابا ہی مشہور ہو گئے۔ زمینداری برائے نام تھی مگر حکمت اچھی چلتی ۔ فیس لینے میں بے حد

بات اپنی ذہانت سے بٹھا دیتے سننے والے انہیں ٹوکتے، ان پر فقرے چست کرتے، لطف لیتے، مگر ان پر کسی کا اثر نہ ہوتا۔ وہ قوت گویائی، حاضر اور بذلہ سنجی کے ذریعہ جھوٹ کو سچ ثابت کر دیتے۔ ایسی دلیل لاتے یا وہ جواب دیتے کہ سب اپنا سا منھ لیکر رہ جاتے اور پھر شروع ہو جاتے ان کی زنبیل سننے کے لئے جمع ہوتے، ان سے چہل کرنے کے ساتھ ان کے بانے سے ڈرتے اور اس سے زیادہ ان کے خفا ہونے سے۔ اسی لیے ان گالیاں کھا کر بھی کوئی بے مزہ نہ ہوتا اور ان کے پاس بیٹھ کر آپس کی جھگڑوں، رقابتوں، کشیدگیوں، مقدمہ بازیوں اور دکھ درد کو بھول کر چھیڑ شعر و شاعری، ہنسی مذاق، خوش گپیوں کی پر لطف صحبتوں میں روزانہ نشاط کے چند لمحے گزار دیتے۔

قصہ بابا کا آغاز خاں صاحب کے چھوٹے لڑکے حمید کی بسم اللہ کی تقریب سے ہوتا ہے جس میں میلاد شریف اور قوالی، چراغاں، چہل پہل سلامت کے شور اور ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ شامیانے میں حکیم بابا اس شان سے جلوہ گر ہوتے ہیں کہ دمبر کے کڑکڑاتے جاڑے کے جاڑے ا کولڈ ویو میں ڈیون کی قبا زیب تن اور جوگو شیبہ ٹوپی بر سر تھی۔ پھڑ پھڑ کرتے آئے، خاں صاحب کے سلام کے جواب میں وعلیکم صدر میں جا کر گئے۔ ان کے آتے ہی طوفانی بارش کے ساتھ اولے پڑنے لگے ...... ایک بڑے میاں پر سردی کا اثر جو زیادہ ہوا تو وہ چلم کی آگ پر اپنا ہاتھ گئے

حکیم بابا نے ان کو بغور دیکھا۔ دو بار "ہوں' ہوں" کہا۔ پھر وہ بولے ــــــ "آپ کو اتنی سی ژالہ باری سے سردی لگنے لگی! کہیں سفر عر میں میرے ہمراہ ہوتے تو نہ جانے کیا گت بنتی۔" لوگ کھسک کھسک کر قریب آ گئے حکیم جی کوئی چٹ پٹا قصہ سنانے والے تھے۔ گاؤں کے نوجوا لے ایک دوسرے کو کہنیاں اور آنکھیں ماریں۔

ایک شریر نے پڑھ کر شہ دی۔ "ہاں قبلہ" اس کے بعد حکیم بابا نے اپنی آپ بیتی سنائی کہ کس طرح صحرائے عرب میں ان کو اولوں کا سامنا کرنا پڑا۔ املی کے چیاں سے لیکر خاں صاحب کی کوٹھی کے برابر اولوں کا گرنا، مگر ان میں سے ایک بھی اولا ان کے سر پر نہ پڑ سکا، سب ان کے بانے نے رو یہ ترپٹ اتنی دل چسپ ہے کہ سننے اور پڑھنے والے اس میں بالکل محو ہو جاتے ہیں۔

"حکیم بابا کا پلاٹ بالکل سیدھا سادہ ہے اس میں کوئی گھیر یا الجھاؤ نہیں ہے۔

مہندی پور کے خاں صاحب کی حویلی میں شب کی محفلوں میں حکیم بابا آتے یا بلوائے جاتے ہیں جہاں ان سے چھیڑ چھیڑ کر ملکوں ملکوں گھومنے بلاؤں کا سامنا کرنے اور ہمیشہ ان میں کامیاب ہونے کی فی البدیہہ داستانیں سنی جاتیں۔ حکیم بابا بتلاتے کہ کس طرح ان کے سر سے نیا دجلہ جاری ہو، کو انھوں نے اپنے اس بانے سے برف کے پرخچے اڑا دئیے جو کچھ بانس کا ہے اور معمولی ضرب کی تاب نہ لا کر اکثر ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے علا پیکر بھیلوں، دراز قامت درختوں، فلک بوس گنبد، پرند اور درند کو انھوں نے کیوں کر غلام بنایا، یا موت کی نیند سلا دیا۔ ایسی قیامت کی آندھی آبادیاں، شہر اور پہاڑ بگولے کے گرداب میں چکر کھا رہے تھے یہ اپنے بانے کے دم پر قائم رہے اسی بانے سے انھوں نے دیو مارے، مردے زندہ جل پری کو اپنے حلیے پر عاشق کرایا، آسمان سے پاتال تک کی سیر کی، دنیا میں محبت کے جھنڈے گاڑے اور ہوا میں پرواز کی۔ پریوں اور جنوں ہجر و وصال کے کوس گنوا کر جہاز کو ایک سمندری مچھلی کے منھ سے نکال کر ایک امدادی جہاز سے بھیجا اور پھر مہندی پور واپس آ گئے۔

حکیم بابا کا قصہ خاں صاحب کی بیٹھک سے شروع ہوتا ہے۔ اور چند نشستوں کے بعد اسی منڈلی پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ منڈلی ا مذاق اڑاتی ہے ان پر جملے چپکاتی ہے ان کے جملے کہتی اور ان کو غور سے سنتی بھی ہے۔ ان کے خلاف سازشیں بھی کرتی ہے اور ان کی تلاش بھی کرتی ہے۔

حکیم بابا کا مرکزی کردار حکیم امان کا ہے مگر ضمنی کرداروں میں ظہیر، مبین، خاں صاحب اور لالہ بنسی دھر کے کردار بہت اہم بیچ بیچ میں بے شمار بستی والوں اور ملاقاتیوں کی جھلکیاں ہیں ان میں جوان، بوڑھے اور بچے بھی شامل ہیں جو فرش یا چاندنی پر بیٹھے بابا

چھیڑ چھاڑ، مضحک واقعات اور قصوں سے مبالغے کو اُبھار کر، مزاحیہ صورت حال، دل چسپ مکالموں اور برجستہ اشعار کی مدد سے اس میں مزاح کی رنگ آمیزی کی گئی ہے۔

حکیم بانا کے ذریعہ علی عباس حسینی نے جاگیردارانہ سماج کی اس ثقافتی ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے جس میں تفنن کے لئے ایسے ظریف مسخرے اور زٹلیے جمع کیے جاتے تھے جن کے علم و فضل کی وجہ سے ان کا احترام کیا جاتا تھا اور ان کی لاف زنی سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا مذاق بھی اڑایا جاتا تھا۔ عالم طبقے کے اسی مزاج نے انشاؔ جیسے عالم کو لطیفہ گو اور مسخرا بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ "حکیم بانا" وہ حالت بتاتے تھے جس میں عالم اور اس کے علم کے بجائے اس کے ہنسی مذاق، داستان سرائی اور قصہ گوئی کی مان دان ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ محض خوش دلی اور تفریح طبع کے لئے ہوتا۔

منظر نگاری کے لحاظ سے "حکیم بانا" بہت کامیاب ہے۔ اس میں منظر نہیں مرقع پیش کیے گئے ہیں۔ حکیم بانا اپنے لاف کے زور میں جب اپنی کسی اگلی خیالی مہم کا بیان کرنے پر آتے ہیں تو اس کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم ان کے خیالی کوہ و بیابان میں پہونچ جاتے ہیں اور کھو جاتے ہیں۔ سارا منظر ہماری نظروں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ جب صحرائے عرب میں عقاب کے برابر اونٹ بڑھ کر عقاب کو کھی کے برابر ہو گئے۔ یا ان کے سر سے برف پگھلنے کے بعد نیا "دجلہ" جاری ہو گیا جہاں ان کی جیبی گھڑی کی آواز سے بغداد اور دمشق کے گھنٹے ...ئے جاتے ہیں۔ یہ اپنے بلنے کی مدد سے گلیشیر پار کرتے ہیں۔ ریگستانی آندھی سے تن تنہا مقابلہ کرتے ہیں۔ اپنے گھوڑے کو رخش سے آگے ...ھا دیتے ہیں۔ دیو کو مارتے ہیں۔ خانیوں کی جنت فتح کرتے ہیں، مار آستین ہلاک کرتے ہیں۔ سلمٰی اور جل پری کو حلیہ مبارک کی جھلک ...ھا کر عاشق و دیوانہ بناتے ہیں۔ دیو قامت جونکوں سے جنگ کرتے ہیں۔ چشمہ آب حیواں سر کرتے ہیں۔ جل پری ان کو اپنے ساتھ ...لے جا کر داد عیش دیتی ہے۔ پاتال دیس کی سیر کرتے ہیں۔ جادوگر کو ہلاک کرتے ہیں۔ ایک دیو پیکر سمندری مچھلی کے منھ سے جہاز نکالتے ہیں۔ اور ہمیں یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ یہ محض زٹل ہے۔ ہم اسے بغور سنتے ہیں۔ اور ہماری یہ خواہش رہتی ہے کہ حکیم بانا کی ...نی اسی طرح جاری رہے اور ہم ان کے عالم خیال کے رزم و بزم میں یونہی گم رہیں۔

حکیم بانا کی دل چسپ زٹلوں کے پردے میں مصنف نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک مرتی ہوئی تہذیب کی بے عملی اور کھوکھلے پن پر طنز کیا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی حکیم بانا ہمارے مزاحیہ ادب، مزاحیہ ناولوں اور مزاحیہ کرداروں میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

سخت تھے بہر حال عالم فاضل تھے اور ہر علم و فن میں کچھ نہ کچھ دخل ضرور رکھتے۔

حکیم بانا، خاں صاحب، ظہور مبین اور لالہ بنسی دھر کے کردار بہت جیتے جاگتے اور حقیقی زندگی سے بالکل قریب ہیں۔ نے کردار نگاری کا حق ادا کر دیا ہے کرداروں کو بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے وہ اپنی دنیا میں سانس لیتے ہیں اپنے انداز سے سوچ سمجھتے ہیں۔ یہ پورے طور پر اپنی انفرادی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں مگر ان سب کا محض ایک ہی مقصد ہے ا ہے خوش وقتی، تفنن اور چھیڑ چھاڑ ان سب کا ایک ہی اصول ہے ـــــ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو ـــــ زندگی زندہ دلی! ناول کی فضا بنانے، قصے کو آگے بڑھانے اور دلچسپی برقرار رکھنے میں یہ سب برابر کے شریک ہیں۔ مزاحیہ کردار صرف حکیم بانا کا سب زندہ دل کردار ہیں۔

حکیم بانا کے مکالمے مختصر، چست، برجستہ، برمحل اور دلچسپ ہیں۔ حکیم بانا کے طویل بیانات سے پیدا ہونے والی اکتا کے امکان کو ظہور اور مبین کی جملے بازی، چھیڑ چھاڑ، پھبتیوں اور فقروں نے بالکل ختم کر کے دلچسپی اور کہیں کہیں تجسس میں بھی کر دیا ہے۔ زیادہ تر اشعار، مصرعے اور صورت حال یا واقعہ کی نظمیں اور پھڑکتے ہوئے مصرعوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ حکیم کردار کو ابھارنے مضحک کیفیت پیدا کرنے، ناول کی دلچسپی اور تسلسل کو برقرار رکھنے میں ان مکالموں، اشعار اور مصرعوں نے بڑا کام کیا ہے حکیم بانا اپنی ہمہ دانی کا سکہ جمانے کے لیے جان بوجھ کر بھی اس قسم کے ثقیل الفاظ و محاورات استعمال کرتے ہیں ـــــ مثلاً ان کو ہے کہ پڑھانے کے لئے لڑکے پر سختی کرنا چاہیئے۔

" میں جناب اطفال کو سر چڑھانے کا قائل نہیں۔ وہ ہیزم خام ہوتے ہیں۔ ان کو گرما کر ہی سیدھا کیا جا سکتا ہے۔
(حکیم بانا ص ۴۹)

شاداب نثر اور خوبصورت انداز بیان کی دلکشی میں برجستہ اشعار کی آمیزش نے روانی اور دلآویزی میں اضافہ کر دیا ہے۔ کے محلات کی معیاری زبان ہے۔ اس میں چٹخارے ہیں۔ لطف زبان ہے مگر اس زبان اور ناول سے لطف اندوز ہونے کے لئے رچے بسے ذوق و شوق عربی، فارسی اور اردو کی زباندانی اور نکتہ سنجی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت، دلچسپی اور شوق ہے۔ شعر و ادب سے بے گانہ قاری اس سے یقیناً لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ لطف لے لے کر بہت اطمینان سے پڑھنے کی چیز ہے کے لئے اتنی توجہ کی ضرورت ہے جتنے انہماک سے ہم داستان سنتے تھے۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس عام بد مذاقی کے دور میں اس کو خواص کے ایک تحفہ کہنا چاہیئے یہ ہر کس و ناکس کے لیے نہیں لکھی گئی ہے۔ اس سے وہی لوگ محظوظ ہو سکتے ہیں جو حافظ و عرفی کے اشعار پر سر دھن اور غالب و مومن سے لطف اندوز ہو سکیں۔

حکیم بانا کا اسلوب سادہ اور دلنشین ہے۔ اس پر ایک طرف اگر واضح اثر داستانوں کا ہے تو دوسری طرف یہ اردو معروف مزاحیہ کرداروں مثلاً حاجی بغلول اور خوجی سے بھی متاثر ہے۔ حاجی بغلول پر پک وک پیپرز اور ڈان کیہوٹی کی چھاپ ہے خوجی پر بھی ڈان کیہوٹی کا بہت گہرا اثر ہے اسی طرح حکیم بانا پر یورپ کے سب سے بڑے زٹیئے بیرن منک ہاوزن کا سایہ ہے یورپ کا سب سے بڑا زٹیا ہے تو یقیناً یہ اس جیسے تمام زٹیوں کے بادشاہ ہیں داستانوں کے اثر سے حکیم بانا کا اسلوب شعری ہے۔ اشعار اور مصرعوں کے علاوہ نثر بھی انتہائی شاعرانہ ہے۔ اس پہلو سے اسلوب، قصے تسلسل اور روانی میں پورے طور پر معاون ہے۔

حکیم بانا کا مزاحیہ کردار، بانا کے مضحک رویہ، اس کی زٹیوں، اس کے بے پناہ عظمت کے احساس، اس کی ضرورت سے بہت خود اعتمادی، اس کے جسمانی نقائص اور اس کی مضحکہ خیز حرکات و سکنات کی مدد سے ابھارا گیا ہے۔ ظہور اور مبین کی جملہ بازی

سید محمود الحسن

ناول کی تاریخ اور تنقید پر ایک نظر

ایک انگریزی نقاد مریم آلاٹ کا قول ہے کہ کسی صنفِ ادب کا فنکار ہی اس فن کے مسائل سے متعلق قطعی اور آخری رائے دے سکتا ہے علی عباس حسینی کی کتاب "ناول کی تاریخ اور تنقید" کا مطالعہ اسی قول کی روشنی میں زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ حسینی صاحب نے یہ کتاب اس وقت تصنیف کی جب اردو ناول نگاری مغرب کی تخلیقات کے زیرِ اثر بلند منزل تک پہنچ چکی تھی، اس کے اصول و ضوابط، فنی خوبیوں اور خامیوں کے معیار اور تخلیقی تصورات مکمل طور پر تشکیل پا چکے تھے، اعلیٰ پایہ کے فنکاروں کی تخلیقات کا ذخیرہ سامنے آ چکا تھا، مرزا رسوا پریم چند اور خود ان کی بہترین تصانیف شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی تھیں لیکن ہر ادب دوست کی طرح ان کو اس کمی کا شدید احساس تھا کہ صنفِ ناول پر کوئی مستقل اور مفید تنقیدی کتاب موجود نہیں ہے۔ شاید اسی احساس کی شدت نے ان کو اس چیز کی طرف متوجہ کیا کہ وہ ناول کے نقادوں کے فرائض بھی خود ہی انجام دیں۔ ان کے ذہن میں تخلیقی جذبہ کے ساتھ تنقیدی عنصر بھی فطری طور پر ہم آہنگی رکھتا ہے۔ انگریزی ناولوں کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہے، مغربی ناول نگاروں سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کی ہے، فنی تصورات کی ابتدا، تغیر و تبدل اور اس کے ارتقاء کا بغور مطالعہ کیا ہے، تحقیق کے معیار کو پیش نظر رکھا ہے، ادبی تحریکوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے، اور ان تمام خصوصیات کے بعد جب ناول نگاری کی تاریخ و تنقید سے بحث کی تو یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ وہ ایک باشعور فنکار کے ساتھ ساتھ نقاد کا کام انجام دینے میں کسی طرح پیچھے نہیں رہتے۔ چنانچہ اس کتاب کے مطالعہ سے اگر قدیم قصے کہانیوں، مافوق الفطرت واقعات اور تاریخی داستانوں میں ناول کے ابتدائی نقوش اور اس کے بنیادی مراحل کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے تو دوسری طرف ناول کے عناصر ترکیبی کو بھی واضح طور پر پیش کر دیا گیا ہے، مختلف اقسام سے بحث کی گئی ہے، فن میں ماحول کے اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور ان تمام اصولوں اور نظریات کی روشنی میں اردو ناول نویسی کا جائزہ تنقیدی حیثیت سے لیا گیا ہے۔

"ناول کی تاریخ اور تنقید" ۱۹۳۲ء میں لکھی گئی اور ۱۹۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اردو کے ادبی سرمایہ اور خاص کر صنفِ ناول کے لیے یہ بہت بڑا خلا تھا کہ اس کتاب سے پہلے کوئی ایسی مکمل اور جامع تصنیف موجود نہ تھی جس سے ناول کے تاریخی ارتقا پر روشنی پڑتی اور ناول نگاروں کی خامیوں اور ان کی خصوصیات کو سامنے لایا جاتا۔ خود حسینی صاحب ناول کے تاریخی اور تنقیدی مطالعہ کے لیے اس کتاب کو اسی منزل پر رکھتے ہیں جو تنقید میں جس منزل پر آبِ حیات ہے۔ یعنی آئندہ آنے والے نقادوں کے لیے انھوں نے ایک ہموار اور جانا پہچانا راستہ بنا دیا

اردو کے رومانی، تاریخی، عصری اور نفسیاتی ناول نگاروں کی خصوصیات بیان کی ہیں، ان کی فنی خصوصیات بیان کی ہیں، ان کی فنی خصوصیات سے بحث کی ہے، پلاٹ، کردار، مکالمہ اور مناظر وغیرہ عناصر ترکیبی پر روشنی ڈالی ہے۔ نظریۂ حیات اور مقصد کو پلاٹ سے چولی دامن کا ساتھ قرار دیا ہے، اسلوب بیان کے لیے فطری صلاحیت اور انفرادی سعی و کوشش کو بھی دخیل سمجھا ہے اور ان تمام اصولوں کی روشنی میں جب انگریزی ناول نگاری کا تاریخی جائزہ پیش کیا تو اس سے ان کے وسیع مطالعہ اور تخلیقی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو میں ناول نگاری کا سلسلہ مغربی اثرات ہی کا عطیہ ہے۔ اسی لیے انگریزی ناول نگاروں کا تذکرہ بعض نقادوں کے خیال میں طویل اور غیر متعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن اردو ناولوں کی فنی خصوصیات اور بنیادی اصولوں کا سراغ لگانے کے لیے ان خصوصیات کا مطالعہ ضروری تھا۔ ناول کے فنی جائزہ میں جو محنت کی گئی ہے وہ خود اپنی جگہ بڑا کام ہے۔ مختلف زبانوں کے ناولوں کا مطالعہ کرتے وقت حسینی صاحب تاریخی پہلوؤں سے بے خبر نہ تھے، فن پر سماجی، قومی اور تہذیبی زندگی کے عروج و زوال اور فن کے تصور میں تغیرات کی بنیادوں پر غور و فکر کی نظر ڈالی تھی اور یہ ان کی فنکارانہ اور تخلیقی صلاحیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اعلیٰ فن پاروں کے اصولوں اور تصورات کی تشکیل کی روشنی میں اردو ناولوں کا جائزہ لے کر مناسب اور نامناسب ہر سمت کی طرف اشارے کر دیے کہ معیاری تخلیق کے لیے نئے لکھنے والے بلند اور دلکش سانچے ڈھال سکیں۔ اور یہ کام حسینی صاحب سے بہتر شاید کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اردو ناولوں کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے حسینی صاحب نے زبانِ اردو کے آغاز و ابتدا کا سرسری جائزہ لیا ہے، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کو سراہا ہے، فسانۂ عجائب کو ماحول اور معاشرت کی تصویر کشی کے لحاظ سے ایک قابل قدر تخلیق قرار دیا ہے، لیکن انھیں اس کا بھی احساس ہے کہ اصل قصہ میں کوئی خاص جدت نہیں، خلاف قیاس واقعات اور طرفہ عجائبات اور کرداروں میں خاص جاذبیت نہیں ہے۔ ایک طرف وہ اس کی طرز تحریر کی موسیقیت، اور تاثر کے حسن کو سامنے لائے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ تصنع اور تکلف کی بہتات سے نثر کی آمد کو جو ٹھیس پہنچی ہے اس پر بھی تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ اردو ناولوں کا سلسلہ مصنف نے داستانوں سے جوڑا ہے جو ان کے خیال میں احساسات انسانی کی تحریک میں لانے کے قابل نہیں ہیں پھر بھی وہ بیکار و بے سود بھی نہیں۔

ان کے مطالعے سے تخیل میں چمک اور نئے لکھنے والوں میں امنگ پیدا ہوگی۔" اس سلسلہ کے بعد حسینی صاحب نے نذیر احمد کی فنی خصوصیات کو پیش کیا ہے جس سے اردو ناول نگاری کی تاریخ کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ ان کے مختلف ناولوں کے پلاٹ، کردار نگاری، معاشرتی تصویر کشی اور زبان و بیان کی خوبیوں اور خامیوں پر گہری نظر ڈالنے پر ان کے اثر سے لکھے جانے والے بعض ناولوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں مولانا حالی کی "مجالس النساء" شاد عظیم آبادی کی "صورۃ الخیال" اور نواب افضل الدین کی "فسانۂ خورشیدی" شامل ہیں۔ ان تینوں کتابوں کی ادبی مقبولیت اور شہرت میں کمی کے اسباب بیان کرتے ہوئے حسینی صاحب نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ یہ تصانیف ناول کے فنی تقاضوں کو پورا کرنے میں بہت حد تک پیچھے ہیں۔

"ناول کی تاریخ اور تنقید" میں رتن ناتھ سرشار کو اردو کے سب سے پہلے باقاعدہ ناول نگار کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ حسینی صاحب نے سرشار کی ذاتی اور سماجی زندگی کے ان محرکات پر روشنی ڈالی ہے جن کے اثرات سے ان کی ناول نگاری میں امتیازی رنگ پیدا ہوا اور اس کے بعد سیرت نگاری کی خامیوں کی طرف اشارے کیے، محدود سوسائٹی کی عکاسی کے عیوب بیان کیے لیکن اسی کے ساتھ فسانۂ آزاد کو فنی نقطۂ نظر سے مکمل نہ مانتے ہوئے بھی معاشرت کی مصوری اور انشا پردازی، اسلوب بیان اور مکالمہ طرازی میں سب سے

دیا لیکن یہ ہے کہ تصنیف محض ابتدائی یا سطحی تنقیدی حیثیت نہیں رکھتی، محض سرسری تاریخی واقعات تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں پورے طور پر ایک توازن و ہم آہنگی ملتی ہے، گہرائی اور وسعت کا پتہ چلتا ہے، ناول کے ارتقائی منزلوں کی مختلف سمتوں کی نشاندہی ہوتی ہے، ماضی اور حال کے سرمایہ کی خصوصیات کا جائزہ لے کر مستقبل کے فنکاروں کو اعلیٰ فنی خصوصیات کے لیے راستہ دکھایا گیا ہے، روایتوں اور بغاوتوں کے مطالعہ سے جدت کے انداز اپنانے کا سلیقہ بتایا گیا ہے اور کتاب کے پلان میں ایسا ربط اور ہموار رشتہ ملتا ہے کہ کسی جگہ یہ احساس نہیں ہو پاتا کہ اردو ناول کے تاریخی اور تنقیدی مطالعہ کے لیے یہ محض سرسری ریویو کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر شمیم قمر رئیس نے اس کتاب کے بعض نتائج کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں حسینی صاحب کو تحقیقی کم نگاہی پر محمول کیا ہے لیکن غالباً انھوں نے کتاب کے "پیش لفظ" کا مطالعہ بغور نہیں کیا جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی تحقیقی اور تنقیدی تصنیف کے لیے مواد فراہم کرنا اس وقت اتنا آسان نہ تھا جیسا کہ اب ہے حسینی صاحب لکھتے ہیں:-

"...... اب اس ابھی مقصد (ادبی تحقیقات) میں قصے کہانیوں کا پتہ لگانا اور ان شاخ در شاخ دریوں میں رومانوں اور ناولوں کے شیریں چشموں اور خنک نہروں کی جستجو کرنا ویسی ہی مشکل بات ہے جیسی کہ دریائے نیل کے منبع و مخرج کی تلاش و دریافت۔ اس ظلمات کو طے کرنے اور بحرِ ذخار کو عبور کرنے کے لیے خضر سا رہنما اور نوح سا ناخدا چاہیے۔ ہمارے کہاں ایسے نصیب کہ ان ہادیانِ طریقت جیسے رہبران کامل ملتے۔ یہیں تو اپنے ہی بل بوتے کے سہارے یہ سارا ہفت خواں طے کرنا پڑا۔ منزلیں سخت و صعب تھیں اور علم کا زاد و راحلہ ساتھ نہ تھا۔ ربع صدی اس جہان کی خاک چھانی تو کچھ نامداروں کے نام معلوم کر لیے اور عمر بھر اس بحر کی غواصی کی تو کنارے کی چند لہریں گن لیں۔"

اس کتاب کی توانائی اور افادیت سے بحث کرتے وقت ان جملوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ کوئی بھی نقاد اس تصنیف پر رائے دینے میں انصاف سے کام نہیں لے سکتا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد بھی آج تک ناول کی تاریخ و تنقید سے متعلق جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں ان میں تحقیقی مواد کی فراہمی کے تمام ذرائع اور آسانیوں کے باوجود بھی بعض ایسی کمیاں نظر آتی ہیں جو اس کے مطالعہ کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں۔

زیر نظر کتاب کے ابتدائی ابواب میں قدیم قصے کہانیوں، مذہبی واقعات اور مافوق الفطرت عناصر میں ناول کے بنیادی نقوش کی تلاش کی گئی ہے، مغربی اور مشرقی تہذیب کے واقعات اور روایات سے کڑیاں ملائی گئی ہیں، ڈرامہ کے اثرات سے بحث ملتی ہے، مختلف تاریخی روایات کی بنیادوں کی طرف اشارے ملتے ہیں، ناول پر سیاسی، سماجی انقلابات کے اثرات دکھائے گئے ہیں، فلسفیانہ نفسیاتی اور مارکسی عناصر کے رجحانات کی ترجمانی ملتی ہے اور اسی کے ساتھ ناول کی مختلف تعریفوں سے بحث کرتے ہوئے حسینی صاحب نے اس صنف کے بہت سے مغربی فنکاروں کے اقوال پیش کیے ہیں، ہر ایک کی خامیوں اور خوبیوں کو واضح کیا ہے، بہت سے ناقدین کی رائیوں کا جائزہ لیا ہے اور تمام خیالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ ناول کے بارے میں ازنالڈ بینیٹ کے اس خیال سے زیادہ متفق معلوم ہوتے ہیں کہ "ناول نگار وہ ہے جو زندگی کا غائر مطالعہ کرے اور اس سے اس قدر متاثر ہو کہ وہ اپنے مشاہدہ کا حال دوسروں سے بیان کیے بغیر نہ رہ سکے اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے قصہ گوئی کو سب سے زیادہ موزوں و مناسب ذریعہ خیال کرے ...... ذرائع بیان اور فنون کی ترتیب میں ناول جس درجہ کا بھی مستحق ٹھہرے لیکن فی الحال تو حیات کی تعبیر کو پرزور سے پرزور انداز میں پیش کرنے میں کوئی بھی حریف اس کا مقابل نہیں ہے۔" اس منزل سے گزرنے کے بعد مصنف نے انگریزی اور

توجہ کی گئی ہے۔ گوشۂ عافیت، میدانِ عمل اور گؤدان کا تذکرہ حسینی صاحب نے بہت تفصیل سے کیا ہے۔ میدانِ عمل میں پیرتوں کے رجحانات، طبائع کے فرق، نوجوانوں کی ذہنی و جذباتی کشمکش اور مصنف کے موقلم کی باریکیوں کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ گؤدان جسے حسینی صاحب نے پریم چند کی تصانیف کا سرتاج کہا ہے اس کے بھی پلاٹ، کردار اور دوسری فنکارانہ خصوصیات پر تفصیلی بیانیہ بیان کی ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کی جائے گی کہ اس ناول کے کرداروں کے بارے میں حسینی صاحب کی یہ رائے کہ "ان کے کردار غیر فانی حیثیت نہیں رکھتے اور نیم مردہ سے باقی رہیں گے۔ صحیح ہے یا غلط، لیکن ناول میں حقیقت نگاری، مثال پسندی، زبان کی دلکشی اور بعض باریک نکتوں کی طرف جس انداز سے اشارے کیے ہیں وہ وہی نقاد کر سکتا تھا جس نے خود اس میدان میں اپنا خونِ جگر بہایا ہے۔

پریم چند کے ناولوں کے بعد حسینی صاحب نے جن ناول نگاروں کے فن پر تنقیدی نظر ڈالی ہے ان میں مرزا محمد سعید، محمد مہدی تسکین، نیاز فتحپوری، عظیم بیگ چغتائی، اور شوکت تھانوی شامل ہیں۔ خواتین ناول نگاروں میں بیگم احمد علی اور اے۔ آر خاتون وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور کتاب کے آخری حصوں میں مختلف ادبی تحریکات کے ساتھ ترقی پسند ادب کا ذکر کرتے ہوئے عصمت چغتائی، کرشن چندر اور سجاد ظہیر کے ناولوں کے فن سے بحث کی ہے اور اس وقت کی جدید تخلیقات کی خامیوں کی طرف بھی دلا کر ان کو زیادہ بہتر بنانے کا احساس دلایا ہے لیکن اس جگہ یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس دور کے بہت سے فنکاروں کو جگہ نہیں دی گئی ہے یا بعض ان کے نام گنوا دیے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے آج کل کے مشہور فنکاروں کو اس وقت وہ اہمیت حاصل نہیں تھی جو انھیں اس وقت حاصل ہے۔ اور تنقیدی اعتدال کا تقاضا یہی تھا کہ جن فنکاروں کی جو عظمت اور اہمیت ہو ان کی تخلیقات کا جائزہ اسی مناسبت سے لیا جائے۔

"ناول کی تاریخ اور تنقید" میں جو چیز سب سے زیادہ جاذبِ نظر اور اہم ہے وہ حسینی صاحب کا دلکش، شاعرانہ، پرکیف طرزِ تحریر، صاف ستھرا اندازِ بیان اور ساحرانہ اسلوبِ نگارش ہے۔ اسلوب کی دلکشی کسی طرز کی روایت پرستی سے نہیں بلکہ شخصیت اور ذہن کی فطری فراوانیوں سے وجود میں آتی ہے۔ اچھے اسلوب بیان سے فنکار کی شخصیت کی امتیازی خصوصیات جھلکتی ہیں اور فن پر اس کے قادر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ جمالیاتی احساس تخلیقی پیکر میں جلوہ گر ہوتا ہے اور اس احساس کے بغیر زبان و الفاظ پر خلاقانہ قدرت ظہور پذیر نہیں ہو سکتی۔ حسینی صاحب کی اس خصوصیت نے ان کی تخلیق کو ایک بیش بہا حیثیت بخش دی۔ یہ انھیں کا کام ہے کہ تنقید کے خشک اور بے کیف میدان میں بھی پورے اعتماد کے ساتھ دلکش الفاظ کو مفہوم کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں اور کسی جگہ ان کا مقصد مجروح نہیں ہونے پاتا، حقیقت نگاری میں کمی نہیں آتی، اور تقلید اور تتبع کے بجائے امتیازی انداز بھی برقرار رکھا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے حسینی صاحب کا انداز کہیں کہیں مولانا محمد حسین آزاد کی شاعرانہ، رنگین اور مسحور کن عبارات سے ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی تحریر محض تخیل کی پابند ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ وہ ناولوں اور افسانوں کی طرح تنقیدی زبان کی جمالیاتی دلکشی برقرار رکھنے کے قائل ہیں اور اپنی خلاقانہ صلاحیت پر اتنا بھرپور اعتماد ہو کر شعوری مقصد کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔ وہ خود محظوظ ہوتے ہیں اور ناظر و قاری بھی لطف اندوزی کے ساتھ ان کے مقصد تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ بعض ناقدین نثر میں کسی سنجیدہ موضوع کے لیے مقفیٰ و مسجع عبارات، تشبیہ و استعارات کی زبان اور رمز و کنایہ کا انداز اختیار کرنے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اگر کسی نقاد کو یہ یقین ہے کہ اس طرز سے اس کا بنیادی مقصد فوت نہیں ہوگا تو یہ اس کے تخلیقی فن کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ "ناول کی تاریخ اور تنقید" میں ابتدا سے انتہا تک مرصع اور آراستہ

زیادہ کامیاب مانا ہے۔ جامِ سرشار، سیر کہسار، پی کہاں، اور کامنی وغیرہ ناولوں کا جائزہ ہر پہلو سے لیا گیا ہے۔ فسانۂ آزاد میں آزاد کے کردار سے جس طرح بحث کی گئی ہے اس سے وہ کردار جیتا جاگتا قاری کے سامنے آ جاتا ہے اور اسی لیے اردو ادب میں اسے صف اول میں جگہ دی گئی ہے۔ سرشار کی فن کارانہ صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے بعد ناول نگاروں کی فہرست میں عبدالحلیم شرر، محمد علی طبیب، سجاد حسین، مرزا عباس بیگ ہوش، اور مرزا محمد ہادی رسوا، کا نام شامل کیا گیا ہے۔ ان تمام ناموں میں مرزا رسوا کے علاوہ کسی کے فن میں ایسی کوئی جاذبیت اور خصوصیت موجود نہ تھی جو انھیں مقبول عام بناتی: لیکن حسینی صاحب نے ان کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ وہ محض عام نقادوں کی رائیوں سے متاثر ہو کر اپنے نتائج اخذ کرنے کے قائل نہیں تھے، محض ناموں کی شہرت سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ فن کی سچی قدر دانی کو تنقید کا بنیادی جز سمجھتے ہیں اور اپنی انفرادی ناقدانہ صلاحیت کو ظاہر کرنے میں کسی احساس کو غالب نہیں ہونے دیتے۔ اسی سلسلہ میں اردو ناول نگاری کی وہ بلند منزل آ جاتی ہے جہاں مرزا ہادی رسوا کا نام آتا ہے۔ "علی عباس حسینی" وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ان کو وہ مقام دیا ہے جس کے وہ صحیح طور پر مستحق تھے۔ ذات شریف، افشائے راز اور خاص کر امراؤ جان ادا کا مطالعہ اور اس کی فنی خصوصیات پر قاری نے کبھی اس شکل میں توجہ نہیں کی تھی جس کی طرف حسینی صاحب نے دھیان دلایا ہے۔ عبدالماجد دریا آبادی اور بہت سے دوسرے نقادوں نے اپنے مضامین میں اس کی خصوصیات کو روشن کیا تھا لیکن فن کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر جائزہ لینے میں سب سے پہلے حسینی صاحب ہی نے توجہ کی۔ حسینی صاحب کو مرزا رسوا سے خاص تعلق تھا، ان کی تخلیقات کے مطالعہ کے ساتھ انھوں نے ان کی ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قریب سے دیکھا تھا، ان کے ذہنی مسائل سے واقف تھے، اسی لیے جب ان پر تنقیدی خیالات پیش کیے تو پوری طرح واقعیت اور حقیقت سے قریب کر دیا۔ مرزا رسوا کا شاہکار "امراؤ جان ادا" اردو ناولوں میں اہم ترین حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی کردار نگاری، منظر کشی، پلاٹ کا ربط و اعتدال، اور زبان و بیان کی دلکشی کے متعلق جن خصوصیات سے روشناس کرایا گیا ہے وہ حسینی صاحب کی ذہنی عظمت کے ان نقوش کا پتہ دیتے ہیں جن میں ایک طرف غور و فکر کی امتیازی خصوصیت ہے، دوسری طرف ناقد کی حیثیت سے رخاص فطرت کا پتہ دیتی ہے۔ بعض نقادوں کو حسینی صاحب کے اس قول سے اختلاف ہے کہ امراؤ جان ادا کا موضوع ایک طوائف کی کہانی ہے یا کچھ اور، لیکن رسوا کی فنکارانہ خصوصیات کو جس طرح انھوں نے پیش کیا ہے اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اردو ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے جب حسینی صاحب پریم چند کی منزل تک پہنچتے ہیں تو ان کا کام آسان ہو جاتا ہے کیونکہ دونوں تقریباً ایک ہی دور سے تعلق رکھتے ہیں، دونوں نے افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی صنف میں ایک سے تجربات حاصل کیے تھے، دونوں کے فن میں بعض مشترک قدروں کی ترجمانی ملتی ہے، دونوں فنکار اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور قومی ماحول کی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر عوامی زندگی کے مسائل کی ترجمانی کر رہے تھے، دونوں کو احساس تھا کہ فن کی مقبولیت کے لیے امراء و روسا، شہزادوں اور امیرزادوں اور شہری زندگی کے کرداروں سے ہٹ کر دیہاتوں کے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کے مسائل کا اظہار ضروری ہے۔ حسینی صاحب نے اپنی کہانیاں لکھنے کی ابتدا تقریباً ۱۹۱۰ء سے کی جبکہ پریم چند اس سے تقریباً ۲۰ سال پہلے بیوہ، زلا، اور بازارِ حسن وغیرہ مشہور ناول لکھ چکے تھے لیکن "ناول کی تاریخ اور تنقید" کے مطالعہ سے قاری کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند کے ابتدائی ناولوں کے بارے میں حسینی صاحب نے وہ تفصیلی رائیں نہیں پیش کیں جن کے وہ مستحق تھے۔ انھوں نے ان ناولوں کے سلسلہ میں محض اس رائے پر اکتفا کی ہے کہ یہ رومانی طرز کے ناول تھے اور ان میں معاشرتی اصلاح پر زیادہ

کشور زیدی

مشفق باپ

اگر پہلا سا طریقہ ہوتا تو میں بڑے ڈرامائی انداز میں کہتی

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ !

یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ !

لیکن وہ دور گزر چکا۔ اب مضمون شروع کرنے کے لیے افتتاحیہ الفاظ سوچنے پڑتے ہیں۔ بہرحال میرے دل نے کہا کہ علی عباس حسینی کی شخصیت سے مجھ سے زیادہ کون واقف ہوگا گو میرے الفاظ ان کو اچھی طرح روشن اور واضح نہ کر سکیں ہلکا سا خاکہ تو بن ہی جائے گا تکلف و تمہید برطرف۔ ایک شفیق باپ۔ ذرا سی شرارت پر ڈانٹا اور پہنچے فریادی۔ آنسو پونچھے گئے، تھوڑی بہت نصیحت بھی ہوئی۔ ساتھ ہی والدہ بھی لپیٹ میں آگئیں ...... آپ ہی نے بگاڑ رکھا ہے بچوں کو ...... وہ بگڑ رہیں ...... وہ پھر مسکرائے وہی شفیق پیاری مسکراہٹ جو انسان کے چہرے کو فرشتوں سے بلند اور بہتر بنا دیتی ہے۔ کسی کو پیسے ملے کسی کو گڑیا لانے کا وعدہ ہوا۔ اور کوئی گیند کی خوشی میں اچھلنے لگا۔ اپنے ہی بچے نہیں اوروں کی فریاد بھی اسی دلسوزی سے سنتے ہیں۔ کسی کی فیس نہیں داخل ہوئی، کسی کے پاس کتابیں نہیں، کسی کے پاس گرم کوٹ نہیں ہے، کسی کے بچی کے جوڑوں میں کمی پڑ رہی ہے ...... غرض کہ دنیا کے ہر مرض کا واحد علاج ہ امرت دھارا " یعنی حسینی صاحب ...... گو کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا اظہار کرنا چھچھوراپن اور کم ظرفی ہے۔ لیکن مجھے تو غصہ صرف اس بات پر آتا ہے کہ جو لوگ ہمیشہ ساتھ رہے۔ پڑھایا لکھایا سرپرستی کی۔ وہی آج کہتے ہیں کہ حسینی صاحب نے بیوقوفی کی فضول خرچی کی ہمدردی یا ممنون احسان ہونا تو دور کی بات ہے میرے خیال میں حسینی صاحب کو خود ان ہی لوگوں کا ممنون کرم ہونا چاہیے۔

ہزاروں روپے کمائے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ گو کہ کمائی خالص حلال کی تھی لیکن روپے ایسے اڑنچھو ہو جاتے کہ بس آدمی دیکھتا رہے اس لیے کہ اگر کوئی شناسا شہر میں آیا ہے تو جائے قیام سوائے حسینی صاحب کے اور کہاں ؟ اگر کسی کو تعلیم حاصل کرنی ہے تو بہترین علم کا گھر موجود ہے۔ اگر مہینے میں کم از کم آٹھ دس شاندار دعوتیں نہ ہوں تو پھر جینے کا لطف ہی کیا ......

والد کے ساتھیوں نے اپنی عمارتیں بنوالیں، لاکھوں کا کیش بنک میں جمع کر لیا۔ لیکن یہ جیسے کے تیسے رہے، خدا نے صبر اور مستقل مزاجی کی ساری حدیں ان پر ختم کر دی ہیں۔ سادات ہونے کے لحاظ سے اور کیا چاہیے ؟ کھانے کو مل جائے، تن ڈھک جائے، اور اگر اس کے

اسلوب اور پرلطف زبان و بیان کے بعد بھی کسی کمی کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ البتہ اگر درمیان کے چند غیر اہم ناول نگاروں کے تذکروں میں کمی کر کے ۱۹۴۷ء کے بعد کے اہم فنکاروں کی تخلیقات کو شامل کر کے جدید دور کے تقاضوں کے تحت ان کا جائزہ لیا جائے تو اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہو جائے گا لیکن اردو ناول نگاری کی تنقید میں آج بھی اس تصنیف کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

صفحہ ۴۳ کا بقیہ

کھانے پر بیٹھیں گے تو گھر کا ہر فرد ساتھ ہو خواہ جگہ کتنی ہی کم ہو ہر ایک سمٹ سمٹا کر اسی میں بیٹھ جائے۔ اکیلے کھانا نہیں کھا سکتے، اکیلے کوئی تفریح نہیں کر سکتے اکیلے بس وہ ایک ہی کام کرتے ہیں ــــ مطالعہ ــــ!

لباس کے معاملے میں حد سے زیادہ بے فکر۔ بس صاف اور اجلا ہونا چاہیے قمیص کا کالر اگر ترچھا ہے تو کیا ہوا ــــ شیروانی زیادہ چوڑی لمبی ہو تو کیا خرابی ــــ؟ چنانچہ پہلے پہل میں نے والد ہی کی قمیصوں کو تختۂ مشق بنایا اور وہ بہت خوش ہو ہو کر میرے بنائے ہوئے جھولوں کو پہنتے رہے لیکن اس لاپرواہی کے باوجود آپ ان کے پاجامے کی مہری کو "نوک پاپوش سے چاک گریباں نہیں پائیں گے اور نہ کبھی سڑک کی گندگی سے آلودہ دامن"۔ قمیص کے گریبان میں اگر نچلے بٹن نہ ہوں تو مضائقہ نہیں لیکن گلا ضرور بند رہے گا۔ گھر میں صرف تہمد اور بنیائن پر قناعت کرتے ہیں اگرمیوں میں لیکن آپ انھیں اس لباس میں کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ بغیر کرتے پاجامے کے وہ ڈرائینگ روم میں نہیں جاتے اور بغیر شیروانی، ٹوپی اور چھڑی کے قدم گھر سے باہر نہیں نکلتا۔

اپنی صحت کے معاملہ میں بھی مستغنی ہیں، کھانا بہت کم چھوٹتے ہیں۔ ہلکی سی حرارت یا پیٹ کی گرانی کسی وقت کے کھانے ناشتے میں حارج نہیں ہوتی آج اسکا نتیجہ ہے کہ ماشاءاللہ اب بھی اپنے لڑکوں سے زیادہ قوی ہیں۔۔۔۔ کسی کام سے عار نہیں ہے، بضرورتِ شوق آپ انھیں کباب کی سیخیں بھی سینکتے دیکھ سکتے ہیں اور لڑکی کے پھوڑے پر پلٹیس لگانے کے لیے آدھی رات کو نیم کی پتیاں بھی کچلتے ــــ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ خالص دیہاتی ماحول کو پسند کرتے ہیں زمیندار کے بیٹے لیکن تعلیم حاصل کرنے روز شہر سات میل پیدل آتے اور جاتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ آج ان کے بیٹے چند قدم پیدل یونیورسٹی نہیں جا سکتے۔

لکھتے پڑھتے ایک عمر آئی لیکن نہ تو اب تک کوئی خاص لکھنے کا کمرہ ہے نہ میز نہ کرسی۔ حتیٰ کہ کسی وقت کاغذ کی بھی کمی پڑ جاتی ہے۔ بان کے پلنگ یا زیادہ سے زیادہ بستر پر گاؤ سے ٹیک لگائے تہمد بنیان میں ملبوس، ایک پنسل اور چند کاغذات اپنے سامنے بکھیرے آپ انھیں اس فنکار کو کسی تخلیق میں مشغول دیکھ سکتے ہیں۔ اسی دوران میں بچے آ آ کر اپنی شکائتیں اور فرمائشیں بھی صادر کر دیتے ہیں۔ کبھی ذرا مسکرا کر تسلی دے دیتے ہیں کبھی ہلکی سی ڈانٹ۔ اور زیادہ تنگ کئے تو کاغذ سمیٹے اور راہ لی اپنے گھر کی ــــ یعنی اوپر چلے گئے۔

ادھر انھوں نے ایک ناول پندرہ دن کے اندر لکھ کر ختم کیا ہو جس کے ہیرو کے کردار کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انھوں نے یہ ناول مسلسل سترہ اٹھارہ گھنٹے تک یک نشست بیٹھ کر لکھا ہے اور ساتھ ہی اپنے چہیتے نواسے عسکری میاں کی ساری فرمائشیں بھی سنتے رہے اور ان کو تسلی بھی دیتے رہے ان کی چوٹوں کی مرہم پٹی بھی کرتے رہے۔۔۔۔۔ جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جیسے وہ اب اپنے آپ کو توانا محسوس کرتے ہیں اور زیادہ جوش اور لگن کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ خداوند عالم ان کو ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے اور وہ ہمیشہ اسی طرح ادب کو زندہ جاوید کرنے والے ادب پارے پیش کرتے رہیں۔۔۔۔۔۔!

مظفر شاہ خاں

علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری

ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی بہر حال زندگی سے مفر نہیں۔ خواہ اس کی صورت شعوری ہو یا غیر شعوری کیونکہ محض خلا میں کوئی ادب پیدا نہیں ہو سکتا، پھر افسانے کی تخلیق تو صرف زندگی کی کشمکش سے ہوتی ہے، اس لیے افسانے میں زندگی کا پورا پورا عکس موجود ہونا لازمی ہے کسی دور اور کسی رنگ کے افسانوں کو لے لیجئے زندگی ان میں عصری تقاضوں کے ساتھ ہر پہلو سے جلوہ گر نظر آئے گی۔ اسی طرح اردو افسانہ بھی زندگی سے بھرپور ہے اور اپنے ماحول کی پوری طرح ترجمانی کر رہا ہے۔

ابتدا میں اگرچہ خالص رومانی طرز کے افسانے لکھے گئے لیکن جوں جوں زمانہ بدلتا گیا مقامی اثرات ہمارے افسانوں میں پھیلتے گئے اور گرد و پیش کی عام زندگی کی عکاسی ہونے لگی چونکہ ہمارے افسانے کی پرورش سماج کی گود میں ہوئی، اس لیے مفلسی، بیکاری، سرمایہ داری اور جاگیرداری کی تکلیف دہ داستانیں اس کا خاص موضوع بنیں۔ نیا افسانہ پہلی مرتبہ اردو ادب کو دیہات کی دنیا میں کھینچ کر لایا، گاؤں کی سادہ مگر کھلی ہوئی زندگی، کسانوں کے کھیت کھلیان، ان کے رسم و رواج اور ان کی ارضی و سماوی آفتوں سے افسانے کا مواد حاصل کیا جانے لگا۔

اردو افسانے میں مقامی رنگ کی صحیح ابتدا پریم چند سے ہوتی ہے۔ پریم چند نے ہندوستان کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، اور عام ماحول کی پوری طرح ترجمانی کی۔ انھوں نے اصلاحی جذبے کے ساتھ سماج کے ہر طبقے کی اچھائیوں اور برائیوں کا جائزہ لیا، اور وقت کے تقاضوں کے مطابق سماجی الجھنوں کا مناسب حل پیش کرنے کی کوشش کی۔

اس کے بعد اردو افسانے میں عام طور سے یہی رنگ پھیلتا گیا اور بعد کے افسانہ نگاروں نے زیادہ اچھی فن کاری کے ساتھ اسے اپنایا۔ علی عباس حسینی بھی صف اول کے انھیں افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی سماجی زندگی کو بڑی خوبی کے ساتھ افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔

علی عباس حسینی دردمند دل رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں میں درد اور تڑپ ہے، زندگی کی گہرائیوں پر ان کی خاص نظر ہے اور وہ فطرت انسانی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا احساس گرد و پیش کے ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، ہندوستان

علاوہ کسی کو کھلایا اور پہنایا جا سکے تو ایک سو ایک فی صدی جنتی ——— گھر کا ہر فرد بیمار دواؤں اور ڈاکٹروں کا میاب ہو کہ اطلاع آتا ہے روپے ختم ہو چکے ہیں پھر بھی اگر کوئی دوست آ گیا تو ایک دعوت اور ایک پکچر ...... چلیے پریشانی کا علاج ہو گیا پکچر دکھا کے خوش خوش گھر پلٹے باری باری سے سب کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھا اگر بہت محبت آئی تو دوا بھی پلا دی اور چلے گئے اوپر نئی کتاب ہیں اور وہ ہیں ...... رات کے ایک دو بجے تک مطالعہ میں مشغول رہے ۔ صبح سویرے اٹھتے ہی اخبار مانگا ۔ اخبار ختم ہوا اور پھر کتاب ہاتھوں میں آ گئی ۔ صبح سے شام ہو گئی نہ کہیں باہر گھومنے پھرنے جائیں گے ، نہ کسی دوست کے گھر ملنے ملانے ان کی ساری دنیا تو انہی کتابوں میں سمٹ آئی ہے جن میں اپنی ساری فکریں ، پریشانیاں ، غم سب کچھ غرق کر دیتے ہیں غصہ بہت کم آتا تھا کیونکہ اب کافی آنے لگا ہے) اسی لیے سب ان کے غصہ سے بہت ڈرتے ہیں ...... غصہ صرف کھانے پر آتا ہے یا کسی دعوت کے سلسلے میں ...... کیا کبھی اس قورمے میں گھی کی کفایت کیوں برتی گئی ۔ ؟ اور صبح ناشتے میں صرف کباب ہی کیوں ہیں ——— ؟ انڈا کہاں غائب ہے ۔ ؟ اگر انڈا فوراً آ گیا تو خیر ۔ ورنہ وہ چار لقمے جلدی جلدی کھائے اور پھر کتاب ملا ایسے جلدی سے اٹھائی گویا معذرت کر رہے ہوں ...... معاف کرنا عزیزم میں تجھ سے اتنی دیر جدا رہا — !

کہیں سے افسانے کا تقاضہ آیا ہے مگر یہاں خاموشی ، آخر ہم لوگ ہمت کرتے ہیں ۔ ابا دیکھیے فلاں کا آج بھی خط آیا ہے ۔ اگر موڈ میں ہوئے تو حکم ہے ، پنسل کاغذ لاؤ میں بولتا جاؤں تم لکھتے جاؤ ...... حکم حاکم ۔ کیونکہ کبھی افسانہ پڑھنے میں ضرور لطف آتا ہے ۔ ٹائپ رائٹر کی طرح لکھنے میں نہیں ...... اور بات جہاں ذرا دلچسپ ہوتی تو اپنا تو دم ہی نکل جاتا لیکن آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگا کہ فنکار کی حیثیت سے رشتوں کا موازنہ کرنا حماقت ہے ۔ یوں بھی وہ جو کہانی لکھتے ہیں ہمیں ضرور سناتے ہیں تاکہ ہمارے اندر سمجھنے کا شعور پیدا ہو ۔ وہ بھی اب جبکہ ہم خود سن شعور کو پہنچ گئے ...... شروع شروع میں جب میں نے کہانیاں لکھیں تو والد کو دکھاتے بڑی شرم آئی ۔ چنانچہ کہانیاں شائع ہو گئیں تو انھوں نے پڑھیں ۔ بلا کے شاباشی دی ، کچھ تصحیح کر کے دکھا ...... مگر ہم تو یہی سوچتے رہے کہ والد نے وہ ردینگ پھر اپڑھ کر اپنے دل میں کیا سوچا ہو گا ۔ ؟ خیر اب ہم ایسے احمق نہیں رہے ...... آموں اور پان کے بیحد شوقین ہیں اس بارے میں کبھی کبھی غصہ آ جاتا ہے لیکن شوکت تھانوی کی طرح پاندان سے شوق نہیں ۔ پانوں کی ڈبیا رکھتے ہیں پاندان ان کے خیال میں صرف مستورات ہی کا حق ہے ۔

ہر مہینے جتنی نئی کتابیں خرید سکتے ہیں خرید لیتے ہیں گو کہ یاران شاطر کچھ باقی نہیں چھوڑتے پھر بھی سینکڑوں کتابیں گھر میں موجود ہیں ! کتابیں خرید کر پڑھیں ، پھر ان سے بے نیاز ہو گئے خواہ وہ ردی میں جائیں یا کسی صاحب ذوق کی الماری میں محفوظ ہو جائیں انھیں کوئی خبر نہیں ——— اگر کبھی ضرورت پڑ گئی کسی کتاب کی تو گدھے کے سر کے سینگ تو شاید مل جائیں مگر کتاب نہیں مل سکتی ۔ اس لیے کہ صرف والد ہی کے دوست نہیں ہمارے دوستوں میں سے بھی ؎

جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

حد یہ ہے کہ خود اپنی تصنیفات میں سے بھی ایک کی بھی نسخہ گھر میں نہیں ہے ۔ والد کی خاص ذاتی کاپی بھی لوگ مانگ لے گئے اور امی بیچاری کی جو کاپی نذر ہوئی تھی وہ بھی کسی کی بھینٹ چڑھ گئی ۔

یوں تو آپ انھیں کافی آزاد خیال سمجھیں گے لیکن حقیقتاً والد کافی قدامت پرست ہیں ۔ نسل ذات پات کے قائل ۔ اور اپنے سید ہونے پر فخر ...... لڑکیوں کو ڈاکٹری پڑھانے کے قائل نہیں ۔ نہایت ہی بے خبری کی پڑھائی ہوتی ہے اور جانے کیا کیا ۔ لڑکیاں پڑھیں لیکن اگر ڈاکٹری نہ کریں تو بہتر ہے ۔

(باقی صفحہ ۲۴۲ پر)

وہ کس کس طرح کی آفتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے یہ پُربہار فضائیں تنگ و تاریک ہیں، ان کے اترے ہوئے چہرے ان کی اندرونی حالت کی غمازی کر رہے ہیں۔ علی عباس حسینی نے اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے اس پہلو کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔ بچارے کسانوں کو زمیندار، کارندے، پٹواری اور چوکیدار ہر طرف سے لپیٹے ہوئے ہیں۔ اور ان کے ہاتھوں انھیں آئے دن طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس مسلسل بیداد نے ان میں کمتری کا احساس پختہ کر دیا ہے، اور وہ اپنے کو انھیں آلام کے لیے وقف سمجھنے لگے ہیں۔ حسینی کے افسانہ "بیگار" میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے، جیتا آئے دن کے مظالم سے گھبرا اٹھتا ہے اور اس کے دل میں بے چینی اور بغاوت کا خفیف جذبہ ابھرتا ہے، وہ چھمن سے پوچھتا ہے۔

جیتا:- دادا یہ تو بتاؤ کہ جس پرمیشور نے جمعدار کو جنم دیا۔ اس نے ہم پرجا کو بھی بنایا کہ کوئی اور ہے۔

چھمن اپنے بڑھاپے کے تجربے پر اطمینان کرتے ہوئے بولا۔ پنڈت جی کہتے تھے۔ ہزاروں، لاکھوں دیوی دیوتا ہیں، ایسا جان پڑتا ہے کہ جمعدار کو کسی بڑے دیوتا نے بنایا اور پرجا کو کسی بالکل چھوٹے کم جور دیوتا نے۔"

وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی مذہبی اور کمزوری سے سب لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں ان پر ہر قسم کا بے جا دباؤ ڈالتے ہیں۔

چھمن نے کہا۔ اور مجاہد کہ جیسے دیکھو وہ ہماری دم گھما کے ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے۔ جمعدار ہو، تھانیدار ہو کہ سرکار، گھونسہ، لات ہم ہی پہ سہے۔ ہر سال بھوسے کو کوئی نہیں پوچھتا۔"

لیکن پیڑھیوں کی موروثی غلامی انھیں ابھرنے نہیں دیتی۔ اور کوئی نہ کوئی خیال بے چینی کے احساس کو تھپکی دے کر سلا دیتا ہے۔

علی عباس حسینی نے دیہاتیوں کی سادہ فطرت، ان کا بھولاپن، ان کا آپس کا میل ملاپ اور ان کے خلوص اور ایثار کے دلچسپ مرقعے جگہ جگہ پیش کیے ہیں۔ ان لوگوں میں سچی انسانیت ہے، انھیں اپنے کھیت، کھلیان اور بے زبان جانوروں سے والہانہ لگاؤ ہے۔ وہ آپس کی لڑائی بھڑائی میں بھی انسانیت سے دور نہیں ہوتے ان کی دشمنی میں بھی دوستی کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ حسینی کے تازہ افسانے "کھیت" کو لے لیجیے، متضاد جذبات کے پیچھے سے گہری انسانیت جھانکتی ہوئی نظر آئے گی، چھیدا کے دل میں اگرچہ انتقام کی آگ بھڑکی ہوئی ہے، لیکن دشمن کی بیکسی پر اس کا دل پسیج جاتا ہے۔

" اتنا سخت بدلہ نہیں لیا جا سکتا! اس کے مویشی اور بیل یونہی بک گئے تھے، اب ان کھیتوں کے آسرے پر تو جیتا ہوگا۔ وہ بھی نکال لیے جائیں تو بے موت مر جائے گا کوئی کہتا تھا۔ کہ اس کو چار پانچ دن سے بخار آتا ہے۔ اونہہ مرے پاجی! اگر وہ جو اس کے تین چھوٹے چھوٹے بچے ہیں؟ کوئی کاہے کو ایسا کام کرے؟ پر اس کے بچوں نے کیا کیا؟ اور یہ میرا جیسے کھیت؟ کیسے اچھے لگتے ہیں اس وقت پانی سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس کو چاہیے ان کی مینڈھ اس وقت باندھ دیتا اور اندھیرے منھ بیل اور ہل کھیت ان میں ہل پڑتا۔ مگر اس کے پاس تو بیل ہی نہیں ہیں۔ کھیتوں نے جواب دیا۔ چھیدا کے دل میں بے زبانوں کی زیادتی کی طرح چبھ ہو گئی، وہ کانپنے لگا۔"

علی عباس حسینی نے خالص دیہاتی رنگ کے افسانوں میں دیہاتی زبان برتنے کی کوشش کی ہے، اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب ہیں۔ گاؤں والوں کے سیدھے سادے محاورے، ان کی بولی ٹھولی، اور ان کی بات چیت کا بھولا انداز، یہ سب چیزیں ان کے افسانوں میں حقیقت شعاری کا رنگ بھر دیتی ہیں اور پڑھنے والا اپنے کو اسی ماحول میں پاتا ہے جیتی جاگتی زندگی اس کے سامنے ہوتی ہے اور وہ اس سے پوری طرح متاثر نظر آتا ہے۔

۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں پے در پے انقلاب آتے رہے ہیں،

کی سماجی زندگی کو انھوں نے ہر پہلو سے دیکھا ہے، اور سماج کی خامیوں کا خوب تجزیہ کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ہندستان کی سیاسی، معاشی، اور معاشرتی تبدیلیوں کا عکس پوری طرح نمایاں ہے۔

علی عباس حسینی بھی پریم چند کی طرح انقلاب پسند نہیں، بلکہ اصلاح پسند ہیں۔ جاگیرداری نظام کی خرابیوں کو وہ تعاون اور عام انسانی محبت کے ذریعے سے دور کرنا چاہتے ہیں وہ سرے سے اس فرسودہ نظام کو ختم کرنے کے حامی نہیں معلوم ہوتے انھوں نے اپنے افسانوں میں جہاں کہیں طبقہ وارانہ کش مکش کی ترجمانی کی ہے، یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

متوسط طبقے کی گھریلو زندگی، ان کے آپس کے تعلقات، ان کی ذہنیت، ان کا اخلاق، اور ان کی رنج و خوشی کی داستانیں علی عباس حسینی کے افسانوں میں نہایت مربوط انداز میں ملتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے ان لوگوں کی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے کیونکہ ان کے بعض افسانوں کے پلاٹ ایسے جزوی واقعات سے لیے گئے ہیں جن کی بادی النظر میں کوئی اہمیت نہیں وہ گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں کوئی نئی بات ڈھونڈ نکالتے ہیں، جس سے افسانے کی پوری فضا متاثر نظر آتی ہے۔

ہندستانیوں کی وضعداری اور شرافت ہمیشہ سے مشہور رہی ہے، اگرچہ مغرب کی کاروباری تہذیب نے ہمارے تمدن پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اس نے ہماری سماجی قدروں کو بہت کچھ بدل دیا ہے، پھر بھی ہم اپنے آبائی ورثے سے یکسر محروم ہوکر نہیں رہ گئے ہیں۔ ہماری روزانہ کی زندگی میں اب بھی خلوص، محبت، رواداری، اور شرافت کی تھوڑی بہت روایات باقی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں پہلی سی گرمی نہیں رہی شہروں کے مقابلے میں ہمارے قصبے اور گاؤں مغربیت کے سیلاب سے بہت کچھ محفوظ رہے۔ اس لیے وہاں پرانی سماجی قدروں کا رنگ ذرا کم پھیکا پڑا۔ علی عباس حسینی نے ہمارے تمدن کے ان ٹھوس روایات کو جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں وضعداری کی چلتی پھرتی مثالیں جب ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ایسے لوگوں کی دوستی پر بھی بھروسہ کیا جاسکتا ہے اور دشمنی پر بھی۔ شرافت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اور وہ بات کے دھنی تھے۔ "دو شریفوں کا مقابلہ" میں ساوجی کا کردار، پرانی وضعداری، شرافت اور سچی انسانیت کی مکمل تصویر ہے۔ آپس کی لڑائی میں بھی انسانی ہمدردی جوں کی توں قائم ہے۔ لاکھ مقدمہ بازی اور مخالفت سہی، لیکن جب زمیندار پر وقت پڑتا ہے، تو ساوجی ان کی امداد سے نہیں باز آسکتے، آخر کو زمیندار بھی اس سچی انسانیت کے سامنے سپر انداختہ ہوکر اپنی شرافت کا ثبوت دیتے ہیں۔

ہندستان اپنے دیہات میں رہتا ہے۔ اس لیے مقامی رنگ میں جس چیز نے نمایاں اضافہ کیا ہے، وہ دیہات کی عام زندگی ہے۔ پہلے تو افسانے کا سارا مدار صرف شہری زندگی پر تھا، لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا اور زمانے کی چال بدلی تو افسانوی ادب کو بھی زمانے کا ساتھ دینا پڑا اور دیہاتی زندگی کی ترجمانی کرنی پڑی، ہندستان میں، سرمایہ داروں، نوابوں، اور راجاؤں کی گنتی گنتی ہے، ساری آبادی تو کسانوں اور مزدوروں کی ہے، یہی لوگ ہماری معاشی زندگی کے کل پرزے ہیں: انھیں کے بل بوتے پر سارا کارخانہ چل رہا ہے، اور ان کے کندھوں پر ہمارے سماج کا سارا بوجھ ہے۔ علی عباس حسینی نے پریم چند کی طرح دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور دیہاتیوں کے گرد و پیش کے عام حالات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دیہات کی سادہ زندگی، آرام و اطمینان کی زندگی ہے۔ عام نظریں لہلہاتے کھیتوں، صاف شفاف چشموں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں، اچھلتے کودتے گٹے بیلوں، اور اس ماحول میں بسنے والے دیہاتیوں کی سادہ معاشرت کا ظاہری مطالعہ کرتی ہیں، انھیں کیا معلوم، اس بظاہر جنت ارضی میں بیچارے دیہاتیوں کی زندگی کس کشمکش میں گزر رہی ہے اور

نئے افسانوں میں نفسیات سے بڑا کام لیا گیا ہے۔ علی عباس حسینی نے بھی ایسے افسانے لکھے ہیں جن کا مرکز کوئی اہم نفسیاتی حقیقت ہے ایسے افسانوں کے پلاٹ عموماً بہت سادہ ہیں، اور ان میں کسی نفسیاتی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ رفیق تنہائی، "بوڑھا اور بالا"، ادھوری کی منی۔ اسی رنگ کے اچھے افسانے ہیں۔ رفیق تنہائی میں ایک فطری جذبہ کی کارفرمائیوں کا ذکر ہے۔ انسان کی فطری خواہشیں کبھی نہیں دب سکتیں۔ حالات خواہ کیسے ہی ناسازگار ہوں یہ اپنا رنگ لاکر رہتی ہیں۔ قربان میاں شروع ہی سے مجرد ہے، لیکن بالآخر بڑھاپے میں آکر تنہائی ان کے لیے سوہان روح ہو گئی۔

"ان کی نظر جس طرف جاتی تنہائی کی ڈراؤنی شکل دکھائی دیتی۔ دن ہو کہ رات، مکان میں ہوں کہ بازار میں، کام کر رہے ہوں یا بیکار بیٹھے ہوں اس درجہ دل ملول ہونے لگا، اسی کے ساتھ ہمدردی کی خواہش، شریک غم کی تمنا، ساتھی اور رفیق کی آرزو بڑھنے لگی جیسے اب دنیا میں ان کے لیے یہی ایک تلاش تھی اور یہی ایک جستجو۔"

آخر کو ایک کتے کے پلے نے ان کی رفاقت اختیار کی، وہی ان کی بقیہ زندگی کا سہارا بنا، اور اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی جان بھی دے دی۔

حسینی نے اس افسانے میں ساتھ ہی محبت کا ایک اعلیٰ اور وسیع تصور بھی پیش کیا ہے۔ محبت صرف جنس تک محدود نہیں۔ طبع انسانی کا یہ لطیف جوہر کسی قسم کی بندش قبول نہیں کرتا۔ تعلق اور لگاؤ ہو جانے سے چرند پرند بلکہ بے جان چیزوں سے بھی والہانہ محبت ہو سکتی ہے محبت جیسے عالمگیر جذبہ کو محض جنسیات کی بھول بھلیوں میں پھنسائے رکھنا مناسب نہیں نئے افسانہ نگار اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ چنانچہ عام طور پر ان کے افسانوں میں محبت، فطرت اور نفسیات کی پابند ہے۔

علی عباس حسینی کے انداز تحریر میں تکلف نام کو نہیں۔ ان فقروں میں بول چال کا رنگ ہے، اور عبارت میں انتہائی روانی ہے برمحل اور موزوں محاورے افسانے کی لطافت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ ان کے لفظوں میں جان ہوتی ہے اور وہ اپنے مفہوم پر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں۔

حسینی نے جہاں کہیں پس منظر کے طور پر کوئی سماں دکھایا ہے، وہاں لفظوں کے ہیر پھیر سے ایسی فضا پیدا کر دی ہے جو پورے افسانے پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

علی عباس حسینی کے افسانوں میں جا بجا ان کی تصویریں ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے سماج، دیش کی مختلف سیاسی اصلاحی تحریکوں اور ان سے پیدا ہونے والے اچھے اور برے حالات کا بھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ان کی نگاہوں نے تہ میں پہنچ کر ان کی چھپی ہوئی مصلحتوں کو بھی بے نقاب کیا ہے جو ان تحریکوں کے پس پردہ کام کر رہی ہیں۔

خلافت اور کانگرس کی تحریکیں بڑے زور شور سے چلیں، ان تحریکوں میں ہندو مسلمانوں کا گہرا اتحاد ہوا لیکن پھر یکایک اختلاف کی ایسی آندھی چلی کہ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ شدھی، اور سنگھٹن کا زور ہوا، اور جگہ جگہ بلوے اور خونریزیاں ہونے لگیں۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا دکھائی دینے لگا۔ شہروں کی زندگی دوبھر ہو گئی، حسینی کے افسانے "ایک ماں کے دو بچے" کو پڑھیے تو آپ کی آنکھوں کے سامنے اس زمانے کی پوری تصویر پھر جائے گی۔ لوگوں کی درندگی، بے گناہوں کا قتل، گھروں کی بربادی اور اس قسم کے دوسرے واقعات۔ لیکن افسانے کا خاتمہ ایسے انداز میں ہوتا ہے کہ سچی دیش بھگتی اور سچی انسانیت کا نمونہ سامنے آجاتا، اور پڑھنے والے کے دل میں مادر وطن کی سچی محبت کا جوش ابل پڑتا ہے۔

شہروں میں جو کچھ ہنگامہ آرائیاں ہو رہی تھیں، ہوتے ہوتے ان کا اثر دیہات تک بھی پہنچا، اور وہاں کی پرسکون فضا بھی مسموم ہونے لگی۔ سیدھے سادے دیہاتی اب تک بھائیوں کی طرح میل ملاپ سے رہتے سہتے تھے۔ ان کا مذہب الگ الگ تھا، لیکن مذہب کے نام پر انھیں لڑنا بھڑنا نہیں آتا تھا۔ اب جو شہر کے چالاک لوگوں نے گاؤں میں پہنچ کر انھیں دیش اور دھرم کے نام پر بھڑکایا تو وہ بھی بھڑک اٹھے اور وہی مسجد، مندر اور باجے گاجے پر جھگڑے ہونے لگے۔

علی عباس حسینی نے "دیش اور دھرم" میں ان ہی واقعات کو پیش کیا ہے، عام طور پر ایسے افسانوں میں حسینی اصلاحی جذبہ سے کام لیتے ہیں کیونکہ افسانہ نگار کا صرف یہی کام نہیں کہ وہ واقعات کی سیدھی سادی ترجمانی کر دے بلکہ اس کا فرض ہے کہ زندگی کو آگے بڑھنے کی بھی کوشش کرے لیکن اصلاح کا خیال ایسا غوابیدہ ہونا چاہیئے کہ افسانوی حیثیت میں کوئی فرق نہ آنے پائے افسانہ نگاری کی بڑی خوبی یہی ہے کہ اصلاحی اور اخلاقی مقصد کے باوجود افسانویت مجروح نہ ہو، اور افسانوی دلچسپی برقرار رہے حسینی نے اپنے افسانوں میں کہیں اس خوبی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

علی عباس حسینی کے تازہ مجموعہ "میلہ گھومنی" میں چند افسانے ایسے بھی ہیں جن میں آپ کو پچھلی لڑائی کے زمانے کے ہندوستان کی مختلف تصاویر ملیں گی۔ عام بے چینی، کھانے، پینے اور ضرورت کی دوسری چیزوں کی زبردست کمی، کنٹرول، اور اس کے ساتھ چور بازاری، غریبوں کی مصیبت، اور ان سب سے بڑھ کر ہولناک بنگال کا قحط۔ "میخانہ" میں کلکتہ کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے، جہاں لاکھوں فاقہ زدہ لوگ ادھر ادھر سے آکر جان توڑ رہے تھے۔ سڑکوں پر لاشیں سڑ رہی تھیں، لیکن انسان کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ انھیں اپنے حلوے مانڈے سے غرض تھی، اور مزے سے عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ حسینی ایسے موقعوں پر تضاد سے کام لے کر افسانے کی چاشنی اور تیز کر دیتے ہیں یہاں بھی انھوں نے شروع ہی سے تضاد قائم رکھا ہے جس سے فضا اور بھی بھیانک بن گئی ہے۔

"رات کے گیارہ بج چکے تھے، سڑک پر بلیک آؤٹ تھا، ٹرام گاڑیاں اور بسیں بند ہو چکی تھیں، ٹیکسیاں اور فٹ پاتھ خالی خالی چلتی تھیں۔ فضا پر ایک غنودگی اور سکوت کی سی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے اندھیری راتوں میں مقبروں اور مرگھٹوں میں محسوس ہوتی ہے، اس مرگ وش سکوت کو دو آوازیں بار بار توڑتی تھیں ایک تو سڑک پر تڑپتے ہوئے قحط زدہ بھوکوں کی چیخ، دوسری پر شباب ہوکے گراموفون پر بجتے ہوئے ریکارڈوں کی صدا۔"

علی عباس حسینی کی کہانیوں کا انتخاب

پہلی کہانی

پژمردہ کلیاں

وہ اپنے چھجے پر کھڑی محوِ نظارہ تھی اور میں اپنی کھڑکی سے اسے دیکھ رہا تھا ہمارے درمیان صرف ایک دو گز چوڑی گلی تھی اور دونوں کوٹھوں کے نیچے دوکانداروں اور آنے جانے والوں کا مجمع۔ گو اس کے کوٹھے کے سامنے چلمن پڑی تھی لیکن وہ اس کے بوٹے قد چھریرے بدن اور آفتابی چہرے کو مجھ سے نہ چھپا سکی۔ اس نازک اندام کے جسم پر فالسئی ساری چست ہلکا گلابی فلوک اور پیروں میں سیاہ بوٹ تھا۔ اور اس پیکرِ رعنائی میں ایک عجیب خداداد جذب تھا جو مجھ جیسے خشک آدمی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

دفعتاً اس نے میری جانب مڑ کر دیکھا اس کے پنکھڑیوں سے ہونٹ کھلے۔ ایک ہلکی سی آواز "اوئی" کی سنائی دی اس نے جھجک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور گھبرا کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا جسم غصے، خوف اور شرم سے کانپنے لگا۔ میں نے غیرت سے منھ پھیر لیا اور جب پلٹ کر دیکھا تو وہ وہاں موجود نہ تھی۔

جذب متقاضی تھا کہ میں وہیں کھڑا رہوں حمیت کا اصرار تھا کہ یہاں سے کھسک چلو۔ جنگ سخت تھی لیکن غیرت اور شرافت کی جیت رہی اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر ٹہلتا رہا بالآخر علم النفس کی کتاب کھولی۔ تخیل و حسیات کا باب کھلا۔ دو چار سطریں پڑھی ہونگی کہ جذبات کا بیان نکالا اور غور سے پڑھنے لگا۔ محبت کے وجوہ اور اس کے اسباب پر نظر کی فلاسفروں کی بحثیں دیکھیں اس جملے کو بار بار پڑھ کر سوچنے لگا "ہر شخص اپنی معشوقہ کی ایک ذہنی تصویر اپنے دماغ میں رکھتا ہے اور جب اس سے ملتا جلتا ہوا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تو وہ فطرتاً پہلی ہی نظر میں اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔" میں نے دل سے پوچھا "کیا میری معشوقہ سنہرے چہرے کی غزالی آنکھوں والی ہے۔"

دل بولا "مجھے اس وقت فلسفہ یاد نہیں ہے!"

میں نے علم النفس کی کتاب پھینکی اور یونان کی تاریخ اٹھائی پہلے ہی "انطونی اور قلوپطرا" کے قصے پر نظر پڑی اور میں نے دیکھا کہ جس نیل کے سانپ نے جولیس سیزر سے فاتح کو مدہوش بنا دیا تھا۔ وہ بعد میں انطونی کے گلے کا ہار ہوا۔ میرے جذبات سے مملو دل پر چوٹ سی لگی اور میں نے کتاب دور پھینک دی ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ" اٹھائی اب جو دیکھتا ہوں تو ساری انسانی کرہ

انجمن کی نئی مطبوعات

سوگوار یاد

مترجم ۔ رحم علی الہاشمی

یہ لارڈ ٹینی سن کی مشہور نظم اِن میموریم کا منظوم اردو ترجمہ ہے جس کو رحم علی ہاشمی صاحب نے نہایت سلیس زبان میں نظم کیا ہے شروع میں ٹینی سن کے مختصر حالات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحے ۱۱۲ قیمت دو روپے ۲۵ نئے پیسے۔

صحیفۂ خوش نویساں

از مولوی احترام الدین احمد شاغل۔

یہ کتاب ساڑھے پانچ سو سے زیادہ خوش نویسوں کے حالات پر مشتمل ہے نیز اس میں خوش نویسی کے متعلق تفصیلی معلومات اور اساتذہ کی شاہکار وصلیوں پر تفصیلی تبصرہ ہے اور شجرۂ خوش نویساں پچاس سے زیادہ وصلیوں اور مختلف خطوں کے نمونے شامل ہیں۔ یہ کتاب اس موضوع پر جامع اور مکمل ہے۔ سائز ۳۰×۲۰/۸ صفحے ۶۶ قیمت چھ روپے۔

نسیم مغرب

مترجم ۔ سلے سی بہار

یہ ۴۶ انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ ہے جو بہار صاحب نے نہایت سلیس اور شگفتہ انداز میں نظم کیا ہے۔ ترجموں میں اصل کا حسن پورے آب و تاب کے ساتھ موجود ہے جن شاعروں کی نظموں کے ترجمے اس میں شامل ہیں آخر میں ان سب کے مختصر حالات دیے گئے۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۱۲۰ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

غالب (ایک مطالعہ)

از ڈاکٹر خورشید الاسلام

اس کتاب میں غالب کی ابتدائی شاعری پر پہلی بار روشنی ڈالی گئی ہے اور ان اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے جنھوں نے غالب کی شخصیت کی تشکیل کی۔ اس تحقیقی تصنیف پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے مصنف کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۲۴۰ قیمت چھ روپے۔

مضامین رشید

از پروفیسر رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کے مضامین کا مجموعہ کئی بار چھپ چکا ہے لیکن یہ مجموعہ مصنف کی نظرثانی کے بعد مرتب کیا گیا ہے اس مجموعے میں کئی ایسے نئے مضامین بھی شامل ہیں جو دوسرے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔

سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۲۰۰ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

غصہ کا پتہ دیتی تھی آنکھوں میں شرم۔ خوف و استعجاب کی تھوڑی تھوڑی جھلک موجود تھی۔ میں نے دیکھا کہ دفعتاً ایک چھوٹے سے خوبصورت رومال سے چہرہ پونچھا گیا۔ اس ادا نے میرے دل پر نشتر کا کام کیا۔ اللہ میرے دیکھنے سے عرقِ شرم آ گیا! میں نے اسی لیے کھڑکی بند کر لی اور وہاں سے چلا آیا۔

کمرے کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کروں پھر چاقو اٹھایا اس سے میز پر کھٹکھٹایا کیا اور دل سے لڑا کیا۔ بالآخر ایک سگرٹ جلائی اور وہیں میز کے اوپر سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ جسم کی تشنجی کیفیت شاید پیروں میں سمٹ آئی تھی کہ وہ خود بخود ہلنے لگے۔ میں نے گھبرا کر سگرٹ کے پانچ سات کش پیئے لیکن دم گھٹنے لگا اس لیے سگرٹ تو میں نے جھلا کر پھینکی اور پھر سیدھا کھڑکی پر پہنچا۔ تھوڑی دیر یونہی چپکا کھڑا رہا۔ بالآخر نہ برداشت کر سکا اور چپکے سے کھڑکی کھولی۔ دیکھا دو حوروشیں اسے بھی کھینچ رہی ہیں کہ صابرہ! ایک ذرا تم بھی جھانک کر دیکھ لو لیکن وہ بچا بچا کر رہ جاتی ہے آخر استعجاب نے جو زنانی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اسے مجبور کر دیا کہ وہ بھی دونوں کے ساتھ جھک کر نیچے کو دیکھنے لگی۔

اب تینوں مہوشیں وہیں کمرے کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھیں اور آنچل کا نچلا حصہ ان کی پیٹھ پر پڑا تھا۔ صابرہ ان کے بیچ میں بالکل اس طرح تھی جیسے تاروں کے جھرمٹ میں چاند۔ وہ اپنی دونوں کہنیاں چھتے کے فرش پر ٹیکے دونوں ہتھیلیوں پر اپنا پیارا رخسار رکھے نیچے دیکھ رہی تھی اس کی صراحی دار گردن کا وہ جھکاؤ اور اس کے سیاہ بالوں کی وہ چمک جیسے اس وقت ڈوبتے ہوئے آفتاب کی زرد شعاعیں اور بھی چمکا رہی تھیں ایک محشر خیز منظر تھا۔ میری حریص آنکھیں اس کے اعضا کے تناسب اور جسمانی خوبیوں کو دیکھنے لگیں کہ فطری کشش نے اسے میری موجودگی کی خبر دی اور اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اور مجھے پھر سانپ سونگھ گیا!

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کا رنگ متغیر ہو گیا اور ان سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ میں خوف سے کانپ کر پیچھے ہٹا تھا کہ دفعتاً اس کے ہونٹوں کے کونے ہلنے لگے اور چہرے پر کچھ مسکراہٹ سی ظاہر ہوئی اور اس نے پھر میری جانب دیکھا۔ آنکھوں نے پوچھا "تم نہ مانو گے؟ کیا اب تماشا نہ دیکھوں؟" پھر ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی اور سہیلیوں کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ پھر دونوں بولیں "کیا ہے؟" انگلی سے میری جانب اشارہ کیا گیا۔ دونوں ایک اجنبی کو یوں سامنے دیکھ کر جھجکیں، چلمن چھوڑی گئی اور سب کے سب کھڑی ہو گئیں۔

بائیں جانب والی سہیلی دفعتاً پلٹ پڑی اور میری طرف رخ کر کے بولی۔ "کیا نوجوان شریفوں کا ایک یہی دستور ہے کہ پرائی بہو بیٹیوں کو گھوریں؟" میں شرم سے عرق عرق ہو گیا اور میرے ہاتھ کھڑکی کے پٹ کی طرف بڑھے اور میرے قدم پیچھے ہٹے لیکن قبل اس کے کہ میں کھڑکی بند کر سکوں داہنے والی شوخ نے مجھے جھک کر سلام کیا اور مسکرا کر بولی "لیجئے ہم لوگ جاتے ہیں۔ اب تو آپ کے دل کی پوری ہوئی!" میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر لی ——— اور سامنے والے کوٹھے سے سریلی اور پرترنم آوازوں میں ایک ہلکے سے قہقہے کی آواز سنائی دی!

کمرے پر واپسی پر میں بہت دیر تک اس مسئلہ پر غور کرتا رہا کہ قدرت نے ایک صورت میں جو مجموعہ ہے تھوڑے سے بال کچھ گوشت اور چند عناصر خیالی کا اور جو فلسفہ مشرقین کی بنا پر محض مٹی پانی ہوا آگ سے بنائی گئی ہے اس میں اس بلا کی دلآویزی ودیعت کر دی ہے نہ تو عارضے درست ہیں۔ نہ سطح برابر ہے۔ نہ خطوط متوازی ہیں اور نہ مستقیم اور پھر اتنی دلفریبی! جتنا ہی میں اعضا۔ ان کی ساخت ان کی اقلیدسی شکلوں پر غور کرتا تھا اتنی ہی میری حیرت بڑھتی جاتی تھی۔

میں نے تحقیق کے لیے علم التشریح کی ایک کتاب اٹھائی اور آنکھوں کا بیان پڑھنا شروع کر دیا مصنف نے آنکھوں کے

کے ذمہ دار حضرت آدم حوا ایک دوسرے کی محبت میں شاد لگے میں باہیں ڈالے گیہوں کے درخت کی طرف جا رہے ہیں میں نے اسے بھی غصے سے بند کر کے میز پر رکھ دیا۔

چونکہ میری الجھن بڑھتی جاتی تھی اس کے رفع کرنے کے لیے میں نے قلم دوات اور کاغذ اپنی طرف کھینچا اور اپنے دوست محمود صاحب کو خط لکھنے لگا ابھی پانچ سطریں بھی نہ لکھی ہوں گی کہ بجائے اس کے کہ یہ لکھوں کہ علامہ اقبال کا "پیام مشرق" بھیج دینا۔ "فالسئی ساری گلابی شلوکہ" لکھ گیا۔ میں گھبرا کر خط کو دیکھا۔ پھر اپنے ہاتھوں کو اور پھر اس حصے کو جہاں میں تھوڑی دیر پہلے محو تماشہ تھا۔ اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر خط چاک کر کے پھینک دیا۔

کرسی سے اٹھا اور ایک عجیب طرح کی گھبراہٹ سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پانچ منٹ اس حالت میں نہ گزرے تھے کہ میرے پیروں نے پھر مجھے اسی گوشے میں لا کر کھڑا کر دیا۔ جہاں سے وہ چلمن نظر آتی تھی۔ میں کھڑا کھڑا چلمن کی تیلیاں گننے لگا۔ بارہا کوشش کی لیکن دس بارہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جب دو چار گن لیتا میری قوت تخیل چلمن کے پیچھے ایک بوٹا سا قد فالسئی ساری اور گلابی شلوکہ پہنے لا کر کھڑا کر دیتی اور میں تیلیوں کی تعداد بھول جاتا پھر شروع کرتا اور پھر ایک سنہرے چہرے پر سامنے کے دو چار بکھرے نیلے سیاہ چمکدار بال ہوا میں اڑتے اور کانوں کے دونوں گوشوارے آہستہ آہستہ گالوں کی طرف بڑھتے اور جھلکتے دکھائی دیتے اور مجھے دس کے بعد گیارہ نہ یاد آتا اور میں پھر انگلیوں پر گننا شروع کر دیتا۔

تھوڑی دیر اسی حماقت میں گزری تھی کہ دفعتاً غیرت و شرم کے ایک چھینٹے نے مجھے چونکا دیا۔ کمرے میں لوٹ کر میں نے لنگی باندھی اور کپڑے اتار کر نل کے نیچے بیٹھ گیا۔ سر پر پانی جیسے جیسے پڑتا جاتا تھا۔ میرے محسوسات بہتے جاتے تھے گویا پانی میرے احساسات و جذبات سب کو دھوتا گیا تھوڑی دیر میں مجھے اتنا ہوش آیا کہ میں نے ملازم کو آواز دی اور اس سے تولیہ اور دوسری لنگی مانگی اور کپڑے پہن کر میں نے نماز پڑھی اور امین آباد کی طرف تفریح کے لیے روانہ ہو گیا۔

امین آباد سے واپسی پر میں نے دوسرے دن کے سبق کی تیاریوں کے لیے پڑھنا شروع کیا لیکن کتابوں میں کسی طرح بھی دل نہ لگا ہر دس منٹ کے بعد کھڑکی کا طواف کر آتا لیکن جب امید بر نہ آئی تو ناکامی نے غیرت کو پھر ابھارا اور میں دل پر جبر کر کے پلنگ پر پڑ رہا۔ دوسرے دن سہ پہر تک میری یہی حالت رہی لیکن پانچ بجے میری جھجک دفعتاً رفع ہو گئی اور میں پھر اپنی کھڑکی پر کھڑا تھا۔

سامنے کی چلمن تو دونوں جانب سے ہٹی ہوئی تھی دو پری وشیں چاند سے چہرے نکالے نیچے کی طرف جھانک رہی تھیں بیچ میں وہی فالسئی ساری والی گلابی ساری زیب بدن کیے کھڑی ہنس ہنس کر دونوں کو منع کر رہی تھی کہ "اے کوئی دیکھ لے گا!" کہ اتنے میں نظر اوپر اٹھی اور میرے چہرہ پر پڑی اور اس نے جلدی سے آنچل کو گھونگھٹ نما چہرے پر ڈال لیا۔ میں آڑ میں چلا گیا۔ اب دونوں سہیلیوں کو کھینچ کر بولی۔ "اے بہن کوئی ایسا محو ہو جائے! وہ خدا سامنے تو دیکھو!"

داہنے جانب والی سہیلی منہ بنا کر بولی، اے ہو بہن کوئی سما ہو گا۔ وہ اپنی آنکھیں خود پھوڑتا ہے ہمیں کیا؟" اور پھر سڑک کی جانب دیکھنے لگیں۔

میں یہ جملہ سن کر خواہ مخواہ مسکرا دیا اور پہلے ڈرتے ڈرتے پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی لیکن آنکھوں کا ملنا تھا کہ اس نے منہ پھیر لیا اور وہی اپنی سہیلیوں کے پیچھے سمٹ کر بیٹھ رہی چہرے کا جو حصہ مجھے دکھائی دیتا تھا اس کی سرخی

اور نہایت ہی شرمیلا۔ !"

سہ پہر والی شوخ نے چہک کر کہا "جی ہم لوگوں کو تو معاف ہی رکھیئے خدا آپ ہی کو مبارک کرے!" میں نے عرض کیا کہ "میری تو دعا یہی ہے کہ آپ لوگوں کو خدا اس نعمت سے محروم ہی رکھے۔!"

دوسری صاحبہ بول اٹھیں "یہ آپ کی محبت ہے!" جواب میرے لبوں تک آ چکا تھا کہ صابرہ نے میرے مخاطب کی اس زور سے چٹکی لی کہ وہ بے چینی سے اف کہہ کر لیٹ پڑی اور صابرہ نے نہ معلوم کیا چپکے سے کہا کہ تینوں نے قہقہہ لگایا اور میری طرف دیکھتی جاتی تھیں اور ہنسی بڑھتی جاتی تھی۔ میں اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک آنا کی جھلک دکھائی دی اور میں اپنی کھڑکی کے سامنے سے کھسک آیا۔ تھوڑی دیر میں وہ اندر واپس چلی گئی اور میں کھڑکی پر پھر آ موجود ہوا۔

مجھے دیکھتے ہی ایک شوخ بول اٹھی۔ "اجی میاں ہمسائے۔ آپ بڑے بھولے معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے کہا "جی ہاں طالب علم ہوں۔ اس کے بعد گدائے حسن!"

وہ بولی "جی ہاں جبھی تو آپ کسی کو نگاہوں میں کھائے جاتے ہیں۔" صابرہ نے پھر ایک چٹکی لی۔ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

میں نے جواب دیا کہ "آپ کا فرمانا بجا ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ پیٹ نہیں بھرتا دل بھرتا ہے۔"

صابرہ نے میری طرف شرماتے ہوئے دیکھا۔ نگاہوں میں ندامت اور غیرت بھری تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ "للہ آپ یہاں سے چلے جاؤ کیوں میری رسوائی کرتے ہو؟"

میں نے دل پر جبر کیا۔ متانت سے سر جھکایا۔ آنکھوں سے کہا "جیسا حکم!" اور کھڑکی بند کر کے چلا آیا۔

کئی ہفتے اسی طرح کے نظارے اور مکالمے میں گزرے اور بے چینی اور اضطراب میں روز بروز زیادتی ہی ہوتی گئی۔ بالآخر ایک دن صبح کو میں نے دو جوڑے کپڑے اور کچھ کتابیں سینڈ بیگ میں رکھیں اور بارہ بنکی اپنے دوست رضا علی صاحب کے یہاں چلا آیا۔ لکھنؤ سے آنا محض ان سے ملنے کی غرض سے نہ تھا اور نہ بارہ بنکی میں کوئی ضروری کام تھا۔ یہ صرف تقاضائے شرافت تھا یا یوں کہیے کہ عقل سے بھاگی تھی یا یوں سمجھیے کہ حضرت دل ہی کو نظر کا معاوضہ لینا منظور نہ تھا۔

میں رضا علی صاحب کے یہاں تین دن مقیم رہا اور جہاں تک ہو سکا میں نے دل بہلانے اور دنیا کے بہترین رنگ کے بھول جانے کی کوشش کی۔ چوتھے روز بارہ بنکی سے پھر لوٹا جب اپنے محلے کی گلی میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ معمول سے زیادہ ہجوم ہے اور کچھ باجوں کے بجنے کی آواز آ رہی ہے میں نے اس وقت جلدی میں اس پر دھیان نہیں دیا اور ملازم کو آواز دیتا ہوا سیدھے اپنے کمرہ میں پہنچا۔ نہا دھو کر جب ذرا سفر کی تکان رفع ہو گئی اور میں آدمی بنا تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھے کوئی خاص قوت کھڑکی کی جانب کھینچ رہی ہے اور میں اپنی حماقت پر افسوس کرتا تاب ضبط کھاتا لیکن بے بس کھڑکی پر آیا۔ سامنے صحن پر آج پھولوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اور کمرے میں ہر طرف پھول ہی پھول دکھائی دیتے تھے گلدستے گلدانوں میں رکھے ہوئے ہار اور پلنگوں میں بدھیاں، جوڑوں میں گلابوں کے پھول! غرض ہر طرف بہار تھی۔ میری نگاہیں صابرہ کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ دفعتاً ایک چمکتی سی چیز نظر پڑی۔ غور سے دیکھا تو صابرہ زرد چمکتے ہوئے کپڑے پہنے ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں نئی طرح کے گوٹے کے کنگنے ہیں اور وہ پھولوں سے لدی ہوئی سمٹائی بیٹھی ہے۔

اف بلا کی دلربائیت تھی اس کے گہرے گورے رنگ وہ زرد چمکتا ہوا جوڑا! اس پر اس کی شرمائی ہوئی بھولی صورت۔ میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور میں ایسا محو نظارہ ہوا کہ یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس طرح کی خوشی اور ایسے جوڑے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اتفاقاً مجھے میری مہربان شوخ نے دیکھ لیا۔ نہ معلوم اس غریب کو میری صورت دیکھ کر کیا یاد آیا کہ اس نے سب اجنبی چھوکریوں کو وہاں سے مختلف بہانوں سے وہاں سے نکال دیا۔ اب صرف

ان کی رگوں کی باریکیاں اور نزاکتیں سب کے متعلق بہت ہی تحقیق کی تھی لیکن افسانہ کہیں نہ لکھا تھا کہ غصہ میں ان سے شعلے کیوں نکلتے ہیں رنج میں ان کی سیاہی اور گہرائی کیوں بڑھ جاتی ہے۔ ان کے اشارے دشنہ و خنجر اور ان کی غلط انداز نگاہیں تیر نیم کش کیوں بن جاتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محقق، فلسفہ جذبات سے تو بالکل نابلد تھا ہی اس کے ساتھ اس نے سوائے کتابوں اور سوکھے مردوں کے کبھی کسی جیتی جاگتی توبہ شکن عورت سے محبت نہیں کی تھی!

میں نے اس کی باتیں لگ بھگ تحریر سے تھک کر کتاب رکھ دی اور پھر ایک نئی سوچ میں گرفتار ہو گیا۔ قابل غور یہ امر تھا کہ مجھے اس صورت سے جو چلمن کی پشت سے جلوہ نمائی کرتی ہے محبت ہے؟ مجھے اس خیال پر ہنسی آئی۔ میں نہ تو ایسا چھچھورا تھا اور نہ بے وقوف، کہ حسن کی دیوی کو بھی دوبارہ دیکھنے کے بعد یہ خیال کرنے لگوں کہ اس سے محبت ہو گئی لیکن اگر ایسا نہ تھا تو پھر بے چینی کاہے کی تھی؟ مجھے کل سے نہ تو اپنے کھانے کا خیال تھا اور نہ اپنے پڑھنے کا۔ دن میں کالج تو گیا تھا لیکن پروفیسروں کے لیکچر کے درمیان اکثر خیال ہوتا تھا جیسے کوئی فالسئی ساری پہنے منہ چھپائے بیٹھا ہے اور میرے ذہن سے کتاب کے معانی و مطالب سب معدوم ہو جاتے تھے۔ میرے ساتھی ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے اور درمیان گفتگو میں ایک سریلی پیاری آواز میں "اوئی" کا لفظ سنائی دیتا تھا اور میری آنکھوں سے مسرت غائب ہو جاتی تھی۔

کالج سے آکر میں شیروانی اتارنے لگا تو مجھے شبہ گزرا کہ میری قمیص کا رنگ بھی فالسئی ہے۔ شام سے دماغ کو سرد کرنے کے لیے میں نے ملازم سے پوچھا۔ وہ گھبرا گیا اور جلدی سے شربت کا ایک گلاس برف دے کر لے آیا۔ میں نے پوچھا کہ "یہ کیا بات ہے؟" وہ کہنے لگا "میاں آج دھوپ سے چلے آتے ہیں اس وجہ سے ذرا اسے پی لیجیے پھر آنکھوں میں جو چکاچوند ہے جاتی رہے گی۔" میں نے ایک حسرت بھری مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور چپکے سگرٹ پینے لگا۔ شاید میں اس سے یہ کہہ دیتا کہ شربت کا رنگ بھی فالسئی ہے تو وہ ڈاکٹر کو بلا لاتا اور میری اصلاح دماغ کی فکر کیے بغیر نہ رہتا۔ اس لیے میں نے سکوت اختیار کیا اور دل میں اس کی اور اپنی حماقت پر زہر خند کرتا رہا۔

اپنی حالت پر شب کو مدد کی ایک مثل یاد آئی۔ "ساون کے اندھے کو ہری ہی ہری سوجھتی ہے" اور میں بہت دیر تک ہنسا کیا۔ میں نے اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ان خیالات کو اپنے دل سے نکالا اور نیند لانے کے لیے تارے گننے لگا۔ دفعتاً زہرہ پر نظر پڑی۔ نام یاد آتے ہی صابرہ کی آنکھیں یاد آگئیں۔ زہرہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس کی چمک دمک، اس کی تازگی اور قوت خیرگی سب جاتی رہی۔ میں نے اپنی کمزوری پر لاحول بھیجی اور کروٹ لے لی۔ مجھے اپنے پر سخت غصہ تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے اس نئے رنگ سے نفرت سی ہو چلی تھی میں اسی خطرے پر تھا ہی ہوا تھا کہ کھڑکی کی طرف سے ایک پر ترنم قہقہے کی آواز آئی۔ سارا فلسفہ ہوا ہو گیا۔ ساری خودداری جاتی رہی اور کھڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

اس وقت چلمن اٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں قالین پر ایک سفید دسترخوان بچھا ہوا تھا اور اس پر طرح طرح کی نعمتیں چنی ہوئی تھیں۔ دسترخوان کے دونوں پہلوؤں پر دونوں سہیلیاں اور بیچ میں صابرہ بیٹھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ قہقہہ میرے بلانے کے لیے تھا۔ اس لیے کہ میرے آتے ہی تینوں نگاہیں ایک ساتھ اٹھیں۔ دو بجلیوں نے مجھے دو جانب سے گھیر کر بے بس کر دیا تیسری بجلی دل پر آتی ہوئی جگر کے پار ہو گئی۔ سہرے والی شوخ نے ایک نیم خندہ سے دسترخوان کی طرف اشارہ کیا اور بولی "کھانا حاضر ہے" میں بلا تکلف بول اٹھا "آپ کے پوچھنے کا شکریہ لیکن میں تو خون جگر کھاتا ہوں وہ یہاں موجود نہیں۔" دوسری بولی "اے وَج یہ بھی بھلا کوئی کھانے کی چیز ہے؟" صابرہ کے چہرے پر سرخی جھلک آئی اور اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور نگاہیں نیچی کر لیں۔

چونکہ تینوں میرے جواب کی منتظر معلوم ہوتی تھیں اس لیے میں نے کہا "اجی اس کا مزا کچھ کھانے والے ہی جانتے ہیں۔ نہایت ہی تلخ اور

نورجہاں سے پوچھا "عقد کب ہے؟" وہ بولی "پرسوں شب کو!"

میں بیساختہ کہہ اٹھا "ہائے اتنی جلدی!"

پھر دونوں جانب تھوڑی دیر سکوت رہا .... دفعتاً مجھے اپنی قسمت پر غصہ آیا اور میری کمزوریاں رفع ہونے لگیں۔ میں نے کوشش کر کے مسکرا کر پوچھا "یہ خوش نصیب صاحب کون ہیں؟"

صابرہ کے چہرے پر پسینہ کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے اور وہ کچھ پیچھے ہٹی۔ مجھے اس کے انداز سے کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں سے چلی جانا چاہتی ہے، میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور نورجہاں کی طرف پھر سوالیہ انداز سے دیکھا۔

وہ بولی "ایک نواب صاحب پاٹے نالہ پر رہتے ہیں۔"

مجھ سے صبر نہ ہوسکا بیساختہ بول اٹھا "اور ماشاء اللہ اسی رنگ میں گرفتار ہوں گے! چانڈو افیون بٹیر اور مرغ!"

نورجہاں نے روکنے کے لیے مجھے غصہ سے دیکھا۔ اسی نظر سے تازیانہ کا کام دیا۔ میں نے زہرخندہ کر کے کہا۔ آپ کا غصہ بیکار ہے۔ میں سچ عرض کرتا ہوں۔ اگر جوان ہونگے تو ان شوقوں کے علاوہ اور بھی اشغال ہوں گے مثلاً چوک کا جانا۔ غزلیں گانا۔ ماماؤں کو گھور کر ٹھنڈی سانس بھرنا! اور اگر عمر ڈھل چلی ہے تو پانچ چار بچے ہوں گے اور اس سے زائد محل!"

نورجہاں سے صبر نہ ہوسکا بول اٹھی "آخر ہم لوگوں کے بھی رنج کا کچھ خیال ہے یا بس دنیا میں آپ ہی کو تکلیف ہوئی؟"

میں نے کہا جی ہاں آپ کو بڑا رنج ہوگا۔ آپ ابھی ہمجولیوں میں پہنچتے ہی ڈھول لے کر بیٹھ جائیں گی گانے گائیں گی، پھبتیاں کہیں گی اور دھول دھپا کریں گی! آپ اور رنج۔ لاحول ولا .... !"

نورجہاں نے بات کاٹ کر کہا "اے میں اپنے کو نہیں کہتی صابرہ پر تو رحم کرو!"

میں نے جواب دیا "جی ..... وہ قابل رحم ہیں! کل شادی ہوگی پرسوں رنگ رلیاں منائیں گی (صابرہ کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں اور اس نے اپنے چہرہ سے ہاتھ ہٹا لیے) ایک سوکھے مودی طالب علم کے رنج سے۔ اس کی آرزوؤں کے خون ہونے اور اس کی زندگی کے ملیامیٹ ہونے سے انہیں کیا مطلب! یہ ہوں گی اور پھولوں کی سیج! مخملی تکیے۔ اور نواب صاحب کا پہلو! میرا غصہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ مجھے صابرہ کے ستے ہوئے چہرہ پر بھی رحم نہیں آیا۔ مجھے جا بجا الفاظ کے استعمال کی تفریق کا بالکل خیال نہ تھا۔ میرے منہ میں جو کچھ آتا تھا کہے چلا جاتا تھا۔ نہ معلوم ابھی اور کیا کچھ کہتا کہ نورجہاں نے صابرہ سے کہا "آؤ بہن چلو۔ یہ اس وقت اپنے حواس میں نہیں، نہ جانے کیا کیا بک رہے ہیں!" میں نے بھی کہا "جی ہاں یہی بہتر ہے۔ خدا حافظ!" اور کھڑکی بند کر کے اپنے پلنگ پر آکر پڑ رہا۔

گو رات بھر بےچینی اور تکلیف سے نیند نہیں آئی لیکن صبح تک غصہ رفع ہوگیا اور مجھے اپنی بیجا جھلاہٹ پر بے حد ندامت تھی۔ عقل نے صابرہ کی بےبسی دکھلا کر ہندستانی شرافت کے معنی رسم و رسم کی پابندی بتلا کر بہت کچھ تسکین دی اور سچ پوچھو تو عزت و شرافت نے بڑا سہارا دیا ورنہ دل نے مجھے کہیں کا نہ رکھا ہوتا۔ جذبات کا طوفان حسرتوں اور ناامیدیوں کا سیلاب حمیت کے مستحکم قلعہ کو جنبش نہ دے سکا۔ اس لیے کہ اس کا قول تھا کہ عشق ناکام عشق کامل ہے۔ وصل عارضی ہے۔ لطف دم بھر کا ہے۔ عیش و عشرت فانی ہے ہاں اگر کسی چیز کو بقا ہے تو وہ درد ہے۔ عیش ہو یا ہوس یہ بوالہوسی کی علامتیں ہیں اور چشم زدن کی باتیں۔ لیکن درد۔ دل کا درد یہ زندگی کے ساتھ ہے بلکہ انسان کو ابدی البقا بنانے والا ہے! ...... صبر و تحمل مرد کے جوہر ہیں اگر اس وادی میں پیر ڈگمگایا تو پھر اس میں مردانگی نہیں! غیرت نہیں! شرافت نہیں!

میں نے ایک موقع پر نورجہاں سے کہا تھا کہ "شمع کہ جاں گوازم و دم برنیاورم!" تقاضائے شرافت یہی تھا کہ جو کچھ کہنا ہے اسے

وہ اور صابرہ رہ گئیں۔ تنہائی ہوتے ہی اس نے نہایت دھیمے سے پوچھا "کیوں سعید صاحب یہ آپ تین دن کہاں غائب رہے۔"
مجھے اصل بات بتلاتے کچھ شرم آئی لیکن میں نے جھینپتے جھینپتے کہہ ڈالا "اپنے خیالات سے بھاگ کر بارہ بنکی چلا گیا تھا۔"
صابرہ نے مجھے ایک ایسی نگاہ سے دیکھا جس سے شکایت اور ہمدردی ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن ایک نئی طرح کی جھلک بھی تھی۔ نہ معلوم وہ رحم تھا یا غم ——— یا ——— یا محبت تھی! ———
اور چپکے سے بولی "بہن نورجہاں جانے بھی دو۔ کیوں بیچارے کو خواہ مخواہ ستاتی ہو۔؟"
نورجہاں نے اسے گھورکر دیکھا اور آواز سے بولی۔ "جی ہاں۔ ہیں بھی یہ قابلِ رحم۔ بہن ایسے مردوں کی یہی سزا ہے۔"
میں نے لجاجت سے پوچھا "آخر میں نے کیا قصور کیا ہے۔"
نورجہاں بولی "آنکھ ہوتے اندھے بنے۔ دہکتے ہوئے انگاروں میں پھاندے۔ اب جلو!"
میں نے کہا "ہائے یہ تو ازل ہی سے مقدر تھا۔ اس معاملہ میں تو میں اتنا ہی قصوروار ہوں جتنا پروانہ لیکن آپ اطمینان رکھیں میں شکایت نہیں کروں گا۔ شمعم کہ جان گداز م و دم بر نیاورم!"
یہ میں نے کچھ ایسے درد بھرے لہجے میں کہا کہ ان کافروں کا بھی دل پسیج گیا۔ صابرہ نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے وہ معذرت مانگ رہی اور نورجہاں نے لب کھولے۔ مگر کچھ کہا نہیں۔ بلکہ صابرہ کا شانہ پکڑ کر زبردستی اور باصرار کھڑکی پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اور اچھی طرح دیکھا اس طرح دیکھا کہ نورجہاں ہمارے چہرے کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئی۔
تھوڑی دیر دونوں جانب نہایت عجیب طرح کا سکوت رہا۔ اس کے بعد میں نے بات ٹالنے کے لیے پوچھا "آج یہ ماشاءاللہ چہل پہل کاہے کی ہے؟ وہ کمرہ چمن کیوں بنایا گیا ہے؟" نورجہاں نے منہ پھیر لیا اور صابرہ کانپ کر بیٹھ گئی۔ میرا استعجاب اور زیادہ ہوا اور میں نے پوچھا کہ کیا میں نے کوئی بے موقع بات پوچھ لی۔"
نورجہاں کے ہونٹ ہلنے لگے اور چہرے پر رنج کے آثار صاف نمایاں ہو گئے۔ صابرہ نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور اس کے شانے ہلنے لگے۔ میں گھبرا گیا اور میں نے نورجہاں سے کہا "نورجہاں بہن اللہ کچھ بولیے مجھے خلجان ہو رہا ہے۔!"
نورجہاں کے سینہ پر پڑا ہوا آنچل کا پلو اور بھی متحرک ہوا اور اس نے اس کے ایک کونے سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ میں نے کانپ کر پوچھا "کیا صبر و تحمل کا امتحان منظور ہے؟ آخر آپ دونوں صاحبوں کی میرے اس سوال پر یہ حالت کیوں ہوئی؟" نورجہاں دفعتاً پلٹ کر اور رک رک کر خجالت بھری آواز میں بولی "آپ کی ...... صابرہ ..... کی ...... شادی ..... ہے۔" میں نے یہ تو ضرور دیکھا کہ صابرہ کے شانوں کو اور زیادہ حرکت ہونے لگی لیکن جو کچھ نورجہاں نے کہا میں اسے مطلقاً نہ سمجھا۔ اس لیے میں نے پھر پوچھا کہ "کیا؟"
نورجہاں نے مجھے گھبرا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے ہمدردی، اور حسرت ٹپکی پڑتی تھی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر صابرہ کا کاندھا آہستہ سے تھپک کر بولی ان کے سہرے کے پھول کھلے ہیں ...... اور یہ ...... پروان چڑھنے والی ہیں!"
میری زبان سے نکلا ان کی ...... شادی ...... ہے؟" اور نورجہاں کے گردن ہلا دینے پر ایک تیر کلیجہ سے پار ہو گیا۔ کچھ چکر سا آیا!
میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا اور اندھوں کی طرح ادھر ادھر ٹٹولتا رہا۔ ہاتھ میں کھڑکی کی چوکھٹ آ گئی اور میں نے اتنی زور سے پکڑا کہ لکڑی ہتھیلی میں چبھ گئی۔ ایک منٹ ...... یا ایک ہزار برس ...... بعد میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ صابرہ اور نورجہاں دونوں پر حد درجہ مضطرب ہیں اور صابرہ کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے تار جاری ہیں۔ مجھے اس اضطراب نے بالآخر میں دیوار کے سہارے سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے صابرہ سے پوچھا کیا یہ سچ ہے؟" اس نے اپنے کپڑوں کی طرف اشارہ کر دیا......؟

جذبِ کامل

اسٹیشن ہاؤس کے قریب والے مکان میں آئرین اپنے چھجے پر کھڑی شاخ صندل سا ایک ہاتھ ڑھلکے کف میں بہاڑوں کے موتی جمع کر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے ساری کا وہ نچلا حصہ دبائے ہوئے تھی جسے پہاڑ کی سرد ہواؤں کے جھونکے محبت شوخی اور بیباکی سے اس کو فرائض کی انجام دہی سے باز رکھتے تھے اور بار بار بلوریں پنڈلیاں بے نقاب ہوئی جاتی تھیں ساتھ ہی ساتھ ان کی چھیڑ چھاڑ سے چھٹکی ہوئی زلفوں کے بال اکثر جھنجھلا کر اس کے کان تک ہوا کی بے ادبی کی شکایت کرنے آتے اور گردن و رخ پر غصہ میں بل کھا کر مچلنے لگتے تھے۔ ہوا کی اس گستاخی سے آئرین کے چہرے کا گلابی رنگ نکھر گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک کئی گنی ہو گئی تھی اور اس کا سرو سا قد کبھی کبھی بید کی طرح لچک جاتا تھا۔

میں نے اس الھڑ پن شوخی و چلبلے پن کی آمیزش کو دیکھا۔ دل میں ایک سوئی سی چبھ گئی عینک اتاری صاف کر کے لگائی اور پھر دیکھنے لگا۔ آئرین نے بھی مجھے دیکھا پہلے کچھ جھجکی اور شرمائی پھر اس نے ایک خاص انداز سے میری طرف دیکھ کر شاخ گل کی طرح جھکے ہاتھ کو سیدھا کر دیا۔ بند انگلیاں کھلیں اور پانی نیچے آ رہا۔ کچھ قطرے تو ہوا درمیان ہی سے لے اڑی وہ ایک لمحہ جگنو کی طرح چمکے اور فضائے عالم کے دامن میں جا چھپے کچھ سخت و سنگلاخ پتھروں پر گر کر پاش پاش ہوئے۔ چاندی کی طرح چمکتے ہوئے ریزے ایک لمحہ باقی رہے پھر پتھریلی زمین کے بوالہوس ذرات نے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیا!

میری آنکھوں کے سامنے بجلی کوندگئی اور لڑکھڑاتے ہوئے پیروں کے سنبھالنے کے لیے چھڑی پر ٹیک لگائی پلٹی اور وہ شوخ نزاکت سے بل کھاتی اور شوخی سے ناچتے ہوئے مور کی طرح اتراتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

(۲)

دوسرے دن مسٹر گنگولی کے یہاں آئرین سے ملاقات ہوئی تعارف کے وقت اس کی مسکراتی ہوئی نگاہیں دیکھ کر مجھے یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ "مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں اور بھی دیکھا ہے۔"

آئرین نے نہایت رکھائی سے منہ بنا کر کہا۔

نہا ہو جو کچھ منھ سے نکل گیا تھا اسے کرکے دکھا دو۔ اس اصرار نے میرے کمزور دل و دماغ میں صاف ڈالدی اور میں صبح کی نماز سے فارغ ہو کر ... کھڑکی کے پاس آیا کہ صابرہ سے اپنی بیجا باتوں کی معافی مانگ لوں اور اسے ایک نظر جی بھر کر دیکھ لوں۔ کھڑکی کھولی تو تنہا نور جہاں جانماز پر دکھائی دی۔ میں نے اشارہ سے اسے قریب بلایا اور کہا۔ "نور جہاں بہن۔ میں نے جو کچھ رات غصہ میں کہا اسے بھلا دو۔ میں اپنے حواس میں نہ تھا" وہ شوخی سے بولی۔ "یہ تو مشتے بعد از جنگ ہے!"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ اس لیے تو اپنے کو موت سے زیادہ سخت سزا دے رہا ہوں۔"

وہ بولی "ہائے رے بھولا پن سرکار۔ نادان میں اپنے کو نہیں کہتی۔ تم نے میرا کیا بگاڑا ہے میں تو اس کو کہہ رہی ہوں جس کے دل پر رات چھریاں چلیں جس کے ہرے زخم پر نمک چھڑک گئے۔"

میں نے لجاجت سے کہا۔ "اچھی بہن اتنی اور عنایت کرو کہ ان کو ایک مرتبہ اور یہاں لے آؤ! شاید میں زخموں کے بھرنے اور ان کے اندمال کی کوئی صورت کر سکوں۔"

وہ شوخ سر ہلاتی ہوئی اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد — صابرہ شرماتی ہوئی آئی — لیکن تنہا! ..... میں ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہا اور وہ نظریں نیچی کیے سر جھکائے اس طرح کھڑی رہی جیسے کوئی کنیز اپنے آقا کے حکم کی منتظر ہو ..... اف!!

میں نے بمشکل اچھلتے ہوئے دل پر قابو حاصل کیا اور حلق و تالو کی خشکی ہونٹ چاٹ کر رفع کی اور کہا "صابرہ! میں نے رات ..... تم کو نہ معلوم کتنا دکھ دیا۔ میں اس وقت اس لیے آیا ہوں کہ تم ..... مجھے جو سخت سے سخت سزا دے سکو ..... میں اس کا اپنے کو مستحق ثابت کر دوں!"

اس نے مجھے ایک غم آلود نگاہ سے دیکھا اور بولی۔ "ہم اور آپ دونوں مجبور ہیں۔ ہماری زندگیاں دوسرے کے ہاتھوں میں ..... لیکن جو کچھ رات آپ نے کہا آپ کو اس کا حق تھا اور میں اس کی مستحق تھی!"

اس انکسار پر میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے منھ پھیر لیا اور یوں کہہ چلا۔ "صابرہ! صابرہ!! ... کے کتنا پیارا نام ہے ..... ہاں تو خواہ تم نو ..... لیکن میں نے رات بہت کچھ نازیبا باتیں کہیں ..... میں تم سے نہایت عاجزی سے معافی مانگتا ہوں ان باتوں کو بھول جاؤ۔ وہ ایک سودائی کی بڑ تھی! لیکن ہائے جب سے میں نے تم کو دیکھا ہے۔ میرے دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیال آئے۔ میں نے لاتعداد حسین و خوشنما خیالی محل بنائے اور تم کو اس میں ملکہ کی طرح بٹھایا ..... دیکھو میں پھر بہک چلا ..... ہاں تو میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ..... یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہے ..... کل سے تم کسی اور کی ..... ہو جاؤ گی اور میرے لیے مرث ہو! ..... لیکن اس کا یقین رکھو کہ میں دکھ میں رہوں یا سکھ میں ..... تمہارے لیے ہر وقت یہی دعا کرتا رہوں گا کہ تم رنج سے اتنی ہی دور رہو جتنی کہ آفتاب سے سیاہی! خدا تمہیں ہر طرح کی خوشیاں دے اور تمہارے دن ہمیشہ عیش و آرام میں کٹیں!"

صابرہ کی آنکھوں سے موتی سے آنسو اس کے پھول سے گالوں پر ڈھلک آئے۔ میں نے کہا کہ "خدا تمہارے لیے پھر یہ دن نہ لائے کہ تمہاری آنکھوں میں آنسو چھلکیں!"

صابرہ نے روتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ "یہ سب تو میرے لیے ہے اور آپ؟"

میں نے کہا کہ "میں؟ میری زندگی تمہاری خوشی! میرا چین تمہیں سکھ میں دیکھنا ہے۔ میری سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ خدا کرے تم مجھے بھول جاؤ! نہ کبھی تمہیں یہ میری نحس صورت یاد آئے اور نہ کبھی آج اور کل کی باتیں!" صابرہ نے مجھے ایک ایسی نگاہ سے دیکھا کہ میں لاجواب ہو کر ساکت ہو گیا ..... پھر میرے دل میں ایک آواز پیدا ہوئی اور بیساختہ میرے منھ سے نکل پڑی۔ "صابرہ میری تمنا ہے کہ میں تمہیں وہی

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)

وہ پلٹ پڑی اور بولی "جو کچھ آپ نے دیکھا میں اسے خوب جانتی ہوں۔ اور مجھے یاد بھی ہے لیکن میں عورت ہوں مجھے یاد رکھنے کا بھی حق ہے اور بھول جانے کا بھی۔ آپ مرد ہیں آپ کو کوئی حق نہیں ہے"

میں نے نہایت عاجزی سے پوچھا۔ "اگر اس پر بھی نہ ہوسکے تو؟"

وہ بولی تو پھر مرد کے لیے ڈوب مرنے کو ایک چلو پانی کافی ہے!" اور بہار کی لطافت اور صبا کی آہستگی سے میرے ہریہ دل کو ٹھکرا کر کمرے سے چلی گئی۔

میں نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ نظروں میں در و دیوار سے شکایت کی اور چپکا گردن جھکائے وہاں سے چلا آیا۔

میں نے آئرین کا حکم سر آنکھوں پر رکھا۔ بھول جانے کی کوشش کی۔ دنیا و دین سب کچھ بھولا خودداری و غیرت کھو بیٹھا۔ لیکن دل سے مجبور تھا۔ وہ سماں یاد رہا۔ وہ صورت قائم رہی، وہ نقش مٹائے نہ مٹا۔ بلکہ روز روز کے ملنے جلنے سے ارتباط و اعتماد کے بڑھنے سے بے تکلفی بڑھی، بیتابی بڑھی، پریشانی بڑھی، اختلاج بڑھا اضطراب بڑھا، شیشۂ صبر ٹوٹا۔ دامن غیرت چھوٹا۔ آخر دل کی بات زبان پر آئی اور میں اس قصۂ دل کو کہہ سنانے کی تدبیر سوچنے لگا۔

ایک دن آئرین کو تنہا جھیل کی سیر کے لیے لایا۔ کشتی کی اور خود ہی کھینا شروع کیا دل اچھلتا رہا زبان و حلق کی خشکی بڑھتی رہی لیکن میں حد درجہ انجان بنے اپنے کام میں مشغول رہا۔

آئرین پر بھی میرے اضطرابی سکوت کا اثر ہوا تھا گو وہ بظاہر ایک طرف جھکی ہوئی نازک انگلیوں سے پانی پر مٹنے والے نقش بناتی رہی لیکن کبھی کبھی مجھے گوشۂ چشم سے ضرور دیکھ لیتی تھی۔

بالآخر میں نے ڈانڈ روکی اور اس کی طرف جھک کر کہا "آئرین"!

اس نے چشم ابرو کے اشارے سے پوچھا "کیا ہے؟"

میں نے کہا "اب چپ نہیں رہا جاتا"!

وہ مسکرا کر بولی "تو باتیں کیجیے"!

میں نے کہا "باتیں کیا خاک کروں......"

وہ بات کاٹ کر بول اٹھی "تو پھر چپ رہیے"!

میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "بس تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ کبھی تو سنجیدگی سے باتیں کرتیں۔"

وہ نہایت متین چہرہ بنا کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی فرمایئے "میں ہمہ تن گوش ہوں اور مجسم سنجیدگی!"

میں نے کہا "میں تم سے محبت کرتا ہوں"!

اس نے متعجب صورت بنا کر کہا "ہوں! بڑی عزت افزائی فرمائی!"

میں نے کہا "بناؤ نہیں! لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ارے محبت! محبت! یہ تو ایک ہلکا سا معمولی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ میں تم پر جان و دل سے قربان ہوں! فدا ہوں! نہیں اتنا ہی نہیں میں تمہاری پرستش کرتا ہوں۔ تم کو پوجتا ہوں! میرے لیے چاند کی خنکی آفتاب کی روشنی۔ آسمان کا رنگ، سبزہ کا لہلہانا، بلبل کی چہک پھولوں کی مہک سب تمہاری ذات سے ہے! تم اگر نہ ہو تو دونوں عالم ایک مٹھی خاک سے بھی حقیر خس و خاشاک سے کہیں زیادہ بے مقدار"!

آئرین نے کہا "اللہ! آپ نے تو مجھے فرشتوں سے بڑا بنا دیا۔ دیوتاؤں سے آگے اور پری مہوشوں کے ہم پلہ کر دیا۔ میں کیا ہوں رہا ہوں!

ممکن ہے دنیا چھوٹی سی جگہ ہے لیکن مجھے نہیں یاد آتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرا حافظہ ذرا کمزور ہے۔ مسٹر گنگولی بڑے زور سے ہنسے اور مجھ سے بولے۔ "ٹھاکر صاحب اسی حافظہ کی کمزوری ہی کا نتیجہ ہے کہ مس آئرین چیٹرجی اب کی سینیر کیمبرج کے امتحان میں اوّل آئی تھیں۔"

آئرین بولی۔ جی ہاں کتابوں کا یاد رکھنا اور صورتوں کا یاد رکھنا دونوں ایک ہی ہے نہ؟

میں نے کہا جی میں نے یہ کب کہا کہ آپ نے بھی مجھے دیکھا ہے۔ علاوہ بریں دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا یاد رکھنا مشکل ہے۔

گنگولی بات کاٹ کر بولے۔ "اور بیرسٹر تم انھیں میں سے ہو!" اس پر ہم سب ہنس پڑے میں نے پھر عرض کیا۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کا بھول جانا محال ہے!

گنگولی نے پھر بات کاٹی اور بولے۔ "اور آئرین انھیں میں سے ہے!"

آئرین اپنی کرسی سے یہ کہتی ہوئی اٹھی کہ برینیدر دگو تم میرے بھائی سے بڑے ہو لیکن میں تمہاری گوشمالی کیے بغیر نہ رہوں گی اور گنگولی ہنستے ہوئے پھرتی سے اپنی کرسی سے اٹھے اور کمرے سے نکل کر بھاگ گئے۔ آئرین اس کی اس طفلانہ حرکت پر مسکراتی ہوئی کھڑکی پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر میں چپ چاپ بیٹھا رہا اس کے بعد ٹہلتا ہوا کھڑکی کے قریب آیا اور میں نے پوچھا۔ "کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟" اس نے مجھے قدرے استعجاب سے دیکھا اس کی نیم وا آنکھیں کچھ کھلیں۔ اس کے ابرو کا خنجر وار کے لیے اونچا ہوا اس نے پوچھا "خفا! آپ سے کیوں خفا ہونے لگی؟"

میں نے کہا "کچھ باتیں نہ بھولنے پر!"

وہ کھڑکی پر اس طرح بیٹھ گئی اور اس کا پھول سا چہرہ نصف میری طرف تھا اور نصف جھیل کی جانب سامنے ہمالیہ کی سر بفلک چوٹیاں تھیں جنھیں رنگ برنگ کے پتھر کہیں کالی کہیں سبز کہیں دھانی۔ کہیں پیلے جا بجا سڑکیں اور پگڈنڈیاں اور ان پر اونچے اونچے ہرے بھرے درخت اور ان میں چکر کاٹتی ہوئی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سپید چمکدار تپتی سڑکیں جلوہ گر تھیں شام ہونے کو تھی۔ آفتاب ڈوب رہا تھا۔ اس کی زرد و سرخ شعاعیں جدائی کے صدمے سے کبھی پتھروں کو چومتیں کبھی درخت کے پتوں کو ہاتھ ملتے دیکھ کر ان سے لپٹتیں کبھی دھوئیں کے سے ابر کے ننھے ننھے ٹکڑوں کے تعاقب سے گھبرا کر کسی غار میں روپوش ہو جاتیں لیکن کافر کالے بادل بیڈھب ان کے پیچھے پڑے تھے کہیں بھی ان بیچاریوں کو دم لینے کا موقع نہ دیتے تھے بالآخر عاجز آ کر کرنوں نے جھیل میں پناہ لی اور چادر آب اوڑھ لی۔

ان میں سے ایک چھوٹی سی کرن کھڑکی کی طرف سے گذرتی ہوئی میری نگاہوں کی طرح آئرین کی آشفتہ زلفوں میں اٹک رہی اور کان کے قریب آ کر دل کی آگ سے کچھ اس طرح تڑپ اٹھی کہ میں بیتاب ہو کر ایک ٹھنڈی سانس لینے پر مجبور ہوا۔ آئرین نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "دنیا میں کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کا یاد رکھنا گناہ ہے۔"

میں نے حیرت سے کہا "لیکن کچھ ایسی بھی چیزیں ہیں جن کا بھول جانا مصیبت ہو!

اس نے جھنجھلا کر منہ پھیر لیا۔ میں نے کہا "مجبوری بھی کوئی شے ہے؟"

وہ بولی "آخر میرے لیے کیوں نہیں ہے؟"

میں نے کہا "میں نے یہ کب کہا کہ آپ نے بھی دیکھا۔"

زلفیں ہیں! کیا کہر ہے! میرے دل کی الک جیسی کسی مذہب کی دیوی بھی نہیں ہو سکتی۔ اف ظالم کس قیامت کی ..... !"

میں نے لرز کر بات کاٹی اور بیاختہ بول اٹھا " بس آئرین! بس اف کس قدر ڈراونی تصویر ہے!"

وہ ہنس کر بولی " میں سچ کہوں آپ تو بالکل کانپ اٹھے محض خیالی تصویر پر تو یہ حالت ہے اگر واقعیت سے سابقہ پڑے تو زندگی دشوار ہو جائے اور اس پر اصرار ہے کہ آپ محبت فرماتے ہیں۔ تو بہ کیجئے! آخر ان میں اور بوالہوسی میں کیا فرق ہے!"

میں نے کہا " آئرین! میری محبت تمسخر کے لائق نہیں۔ اس کی ہنسی نہ اڑاؤ سچی مرد کی پاک محبت ایسی چیز نہیں کہ دنیا جہان کی ملکہ بھی اسے ٹھکرا دے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ جس کی حوریں امید رکھتی ہیں اور دیویاں تمنا کرتی ہیں۔ سچ کہتا ہوں دل کی نذر ایسی نذر ہے جو خدا کو بھی سب سے زیادہ مرغوب ہے! اور اسی کی تمنا میں ملائک یہ سب کھیل تماشے بنائے! اس کا مقابلہ اور بوالہوسی سے! دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اتنا ہی فرق جتنا کہ راون اور رام میں قابیل و ہابیل میں! ابن نوح و ابن مریم میں شیطان و خدا میں!!"

وہ بولی۔ " یہ سب بالکل سچ ہے لیکن ...... پہلے اپنی آنکھوں سے حیوانیت دور کر لیجیے! اس کے بعد کسی عورت کو اس کا یقین آسکتا ہے!"

میں نے ایک لمبی سانس لی اور بیٹھے ہوئے دل اور گرفتہ آواز سے پوچھا " تو یہی جواب ہے؟"

وہ پانی سے کھیلتی رہی اور اس نے میری طرف رخ بھی نہیں کیا۔ صرف گردن ہلا دی۔ میں نے کشتی پھیری، کنارہ پر پہنچ کر ٹوٹتے ہوئے دل سے آواز نکلی۔ " آئرین خدا حافظ!" اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور کنارے کے پتھر کے ٹکڑوں پر سیدھے سیدھے قدم رکھتی ہوئی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

میری ڈائری میں اس واقعہ کے متعلق یہ نوٹ درج ہے: " اس شام کو جھیل کے کنارے میری آرزوؤں پر پانی پھر گیا میں اسی شب کو مکان لوٹ آیا اب اپنے کام میں بڑے شغف سے مشغول ہوں۔ نام پیدا کر رہا ہوں فیس و آمدنی بڑھتی جاتی ہے۔ ہر شخص میری لیاقت کی تعریف اور میری قسمت پر رشک کرتا ہے۔ لوگ مجھے سہاگ والا اور تقدیر والا کہتے ہیں۔ میں ان کے اس بھولے پن پر بظاہر میں ہنستا ہوں اور باطن میں خون کے آنسو روتا ہوں۔ لوگ کیا جانیں کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے اور میری زندگی کیونکر برباد ہو گئی! انھیں کیا معلوم کہ اس باغ میں یہ بہار نہیں بلکہ خزاں کا ایک انوکھا روپ ہے یہ پھول کے کھلنے کے نہیں بلکہ پتیوں کے گرنے کے آثار ہیں انھیں کیا خبر کہ غریب غیرت و شرافت پر کیا آ بنی ہے۔ میں پستول اٹھاتا ہوں اور غیرت ہاتھ تھام لیتی ہے۔ میں لوہے کے پل سے ڈوب مرنے کے لیے پیر بڑھاتا ہوں حمیت قدم پکڑ لیتی ہے میں شراب کی بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہوں کہ اپنے خیالات کو بلکہ اپنے کو جام سے میں ڈبو دوں عقل روک لیتی ہے، میں جوئے میں جی بہلانا چاہتا ہوں دھرم آڑے آتا ہے۔ غرضکہ راہیں ہر طرف کی مسدود تھیں اور میں بالکل مجبور۔ میں نے اسی لیے اپنا سارا وقت اپنے کام میں لگا دیا ہے اور ساری قوتیں اس میں صرف کرنے لگا ہوں لیکن ...... اس سے مجبور ہوں کہ جب کبھی تفریح کرتا یا باغ میں آ جاتا تو سنبل مو افشاں سر پاتی ہے نرگس چشمک کرتی ہے غنچے مسکراتے ہیں۔ پھول ہنستے ہیں۔ بلبلیں طعنہ زنی کرتی ہیں اور میں اس طرح زمین و آسمان کے بدل جانے سے پریشان ہو کر پھر اپنے کمرے میں آ کر بیٹھ رہتا ہوں! اور تنہائیوں میں جب عالم میں سناٹا چھا جاتا ہے اور میں بستر غم پر پڑا تڑپا ہوتا ہوں اس وقت اگر کوئل کی کوک اور پپیہے کی "پی کہاں!" سنائی دیتی ہے تو میں دیوانہ وار اپنی پیاری کی یاد میں روشوں پر ٹہلنے لگتا ہوں۔ درخت کی شاخوں میں دیکھتا ہوں، بیلوں میں جھانکتا ہوں، فوارے کے حوض میں تاروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں والے چہرے کا عکس ڈھونڈتا ہوں اور اسے کہیں نہ پا کر کسی حباب کو دیکھ کر اور اپنی سعی بے حاصل سے تھک کر پھر پلنگ پر پڑ کر سو رہتا ہوں، تو خواب میں ایک سرسبز باغ نظر آتا ہے جس کی ہوا کی لپٹ میں جنت کے پھولوں کی مہک ہوتی ہے۔ اور جس کے وسط میں ایک چھوٹا سا لعل کا ایک بنگلہ دکھائی دیتا

میں نے کہا "نہیں برہما تو نہیں! لیکن اس کی محبوب ترین خلقت" ! اور کشتی میں دونوں گھٹنے ٹیک کر بڑی سماجت سے بولا۔

"دیوی اب اپنے پجاری پر رحم کرا اور اسے اپنی زندگی کا شریک بنالے" !

میں نے دیکھا کہ میرے جذبات سے وہ متاثر ہوئی اور اس کی کافر آنکھوں میں وہ روشنی پیدا ہونے لگی جس سے حوا کی آنکھیں منور تھیں لیکن چشم زدن میں نہ معلوم کیا خیال آیا کہ آنکھوں کی پھیلی ہوئی پتلیاں سمٹیں اور ان کے آتشیں شعلوں سے میرا جسم جلنے لگا۔ میں بے بسی و سماجت سے "رحم! رحم!" کہتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ لیکن اس کے نازک پنکھڑی جیسے ہونٹ سخت ونگ ہوئے اس نے ایک عجیب حقارت آمیز انداز سے اپنی ساری کے پھیلے ہوئے حصے سمیٹ کر میری مس سے بچا لیئے !

"تلوار کی کاٹ، نشتر کا توڑ، بندوق کی گولیوں کا سینہ چھلنی کرنا، برق کا آنکھ مارتے خاک سیاہ کرنا۔ سب کچھ دیکھا اور سنا ہے آئرین کے اس انداز کے زخم کی گہرائی۔ اس کی سکون سوزی۔ اس کی جانگدازی کسی شئے میں نہیں! مجھے اپنی اسی حرکت سے اپنی ذات حتیٰ کہ خود اپنے سے نفرت سی ہو گئی۔ میرا جھکا ہوا سر اور جھک گیا۔ میری اٹھی ہوئی نگاہیں تختہ پر جم گئیں اور میں نادم و منفعل اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔

آئرین میرے جذبات سمجھ کر کچھ ندامت کچھ تالیف قلب کے انداز میں بولی۔ "ٹھاکر صاحب معاف کیجئے گا باوجود بیرسٹر ہونے کے آپ اپنے خیالات میں اس طرح ڈوبے ہوئے ہیں کہ آپ نے ان دیواروں کا مطلقاً خیال نہیں کیا جو میرے اور آپ کے درمیان حائل ہیں۔ آپ چھتری ہیں برہمنی آپ سناتن دھرم۔ میں برہمو سماج۔ آپ پنجابی میں بنگالن۔ نہ ذات ایک۔ نہ مذہب ایک۔ نہ زبان ایک۔ بے اکل جوڑ میں پیوند کیسا۔ بیاہ کیسا۔ کتنی محال بات ہے!"

میں نے غمگین آواز سے کہا۔ "یہ سب سچ ہے لیکن محبت ایسی پابندیوں پر ہنستی ہے! عشق ایسی دشواریوں کو فنا کر دیتا ہے!"

وہ جھنجھلا کر بولی۔ "محبت! محبت کا اس زمانہ میں وجود کہاں ؟"

میں نے پوچھا "تو مجھے تم سے محبت نہیں ؟"

وہ بولی۔ "ہرگز نہیں! مرد کو عورت سے محبت ہوتی ہی نہیں۔ وہ صرف اس کی صنفی لطافتوں کا دیوانہ ہوتا ہے۔ اگر وہ عشق کرتا تو اس کے پھول رخساروں سے اس کی مدبھری آنکھوں سے اس کی صراحی دار گردن سے اس کے بھرے بھرے بلوریں پنڈے سے اور اس کی اٹھتی ہوئی جوانی سے خواہ عورت کی روح حد درجہ گندی ہو اور اس کا دماغ بالکل بیکار ہو۔ لیکن اگر اس میں ظاہری صنفی خوبیاں موجود ہوں تو مرد کے لیے وہ بہترین نعمت ہے! اسے اپنی نفس پرستی سے مطلب ہے نہ کہ عورت کی روح کی صفائی سے !

آپ اسے عشق کہتے ہوں گے۔ میں تو اسے بوالہوسی کہتی ہوں۔

میں نے کہا "یہ سب صحیح سہی لیکن میں تو تم سے محبت کرتا ہوں۔!"

وہ بولی۔ "بس رہنے دیجئے! زبان نہ کھلوائیے! آپ بھی آخر مرد ہی ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں ضرور کہہ ڈالیے۔ دل کی بات دل ہی میں کیوں رہے ذرا میں بھی تو سن لوں۔"

وہ بولی "اچھا جب آپ بضد ہیں تو سنئے! میں جب جانتی کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں جب بجائے ان لمبی زلفوں کے مٹھی بھر میرے بال ہوں۔ ان گلاب جیسے رخساروں کی جگہ پچکے ہوئے گال ہوتے اور ان پر چیچک کے ہزاروں داغ۔ متوالی غزالی بجلیاں گرانے والی آنکھوں کی جگہ چھوٹے بڑے دیدے ہوتے اور ان میں بھی پھولی اس بھرے بھرے نرم گرم پنڈے کی جگہ سوکھے ہاتھ پیر ہوتے اور میں ایک میلی کچیلی ساری پہنے لنگڑاتی پیر گھسیٹتی چلتی اور آپ کہتے "ہائے آئرین کس بلا کی حسین ہے! کیا متوالی چال ہے کیا

اس نے شرما کر گردن نیچی کر لی اور میں اپنے جذبات کے تلاطم سے گھبرا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اٹرین میری وحشت جیکی بیٹھی دیکھ رہی تھی اور میں اپنے جاتے حواس کی روک تھام میں مشغول ہی تھا کہ دفعتاً کمرہ کا دروازہ کھلا اور ایک بیس بائیس برس کا خوش رو نوجوان داخل ہوا۔ میں نے دیکھا کہ اٹرین کے چہرے پر اس کے آنے سے ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس نے سر سے ڈھلکے ہوئے ساری کے آنچل کو اوپر کھسکایا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ وہ مسٹر مکرجی سر رابندر ناتھ مکرجی کے بیٹے ہیں اور خود ماشاء اللہ ایف اے کے طالب علم مکرجی کے تجسسانہ رشک آمیز نگاہوں سے میں فوراً تاڑ گیا کہ ان کو بھی اسی مار زلف نے ڈسا ہے۔ جس کے کاٹے کا لہر تک نہیں آتی، اٹرین کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے ہم دونوں کے لیے چائے بنانے کا بہانہ کیا اور وہاں سے چلتی ہوئی۔

میں تھوڑی دیر مکرجی کو نظروں میں تولتا رہا اس کے بعد ٹٹولنے کے لیے میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ کے تو اس گھر سے پرانے تعلقات ہوں گے؟"

وہ بولے "جی ہاں میرے والد اٹرین کے باپ دونوں ایک ہی جگہ پیدا ہوئے ایک ساتھ بڑھے اور پڑھے۔ یہی حالت میری اٹرین کی ہے۔ ہم دونوں بچپنے سے ایک ہی ساتھ کھیلے اور ایک ہی ساتھ پڑھے ہاں جب سے ان کے والد کا انتقال ہو گیا ساتھ چھوٹ گیا تھا اب پھر والد کی خواہش سے ایک خاص غرض سے یہاں آیا ہوں۔

میرا دل دھڑکنے لگا اور میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا "وہ خواہش اٹرین سے تعلق رکھتی ہے؟"

مکرجی نے سر ہلا کر حامی بھری۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ اور اچھلتے ہوئے دل کی اضطراری اور جنبش روکی اور مکرجی سے متانت سے کہا خدا آپ کو کامیاب فرمائے۔ وہ مرد بڑا ہی خوش نصیب ہے جسے اٹرین سی بیوی ملنے کی امید ہو!" اور اٹھنے کو تو کرسی پر سے اٹھ بیٹھا لیکن ٹانگوں نے جواب دے دیا اور میں اپنے میں برسوں کے بیمار کی سی ناطاقتی پا کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا!

مکرجی نے گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے مزاج کیسا ہے؟" میں نے ضعیف آواز سے کہا۔ "کچھ نہیں اچھا ہوں۔"

وہ دیر تک مجھے بغور دیکھتے رہے ان کے چہرہ پر طرح طرح کے جذبات نمایاں تھے۔ ہمدردی، رحم۔ افسوس، غصہ، رشک، رقابت، بغض، اور بالآخر آثار حیوانیت ہی غالب آئے اور علامات انسانیت معدوم ہو گئیں اور وہ مسکرا کر فاتحانہ لب و لہجہ سے بولے۔

"ٹھاکر صاحب آپ کے لیے یہ خیال خام ہے۔ چچا جی اور والد میں بات طے ہو چکی اور اٹرین کو بھی معلوم ہے!"

اس فقرے نے میری رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ میری بچی کھچی غیرت کو ابھار کر مجھے مرد بنا دیا۔ میں نے عمر میں کبھی شکست نہیں پائی۔ مجھے دقتوں اور مشکلوں نے ہراساں نہیں کیا میرے لیے دشواریاں مقابلہ کرنے کی چیز تھیں نہ کہ دل شکستہ ہو کر بیٹھ جانے کی۔ میں مکرجی کا ممنون ہوں کہ ان کی مسکراہٹ نے میری فطری و جبلی دشوار پسندی کو ٹھوکا دے کر میری دبی ہوئی جنگجوئی کو ابھار دیا۔

میں نے مکرجی کو حقارت آمیز مسکراہٹ سے دیکھا اور عرض کیا۔ "مسٹر مکرجی کسی امر کے قریب قریب طے ہونے اور اس کے قطعی طور پر ہو جانے میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ جام کے لبریز ہونے اور اس کے پی لینے میں ممکن ہے کہ کاسہ منہ تک پہنچ کر ہاتھ سے چھوٹ جائے اور تشنہ لب یونہی ناکام رہے ابھی سے آپ کے لیے نازیبا نہیں!

وہ بولے "یہ سب ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کے لیے تو اتنی بھی امید نہیں کہ کاسہ لبریز سامنے کبھی ہو گا۔"

میں نے اس ناکردہ کار کو حسرت سے دیکھا اور جواب میں کہا۔ "صاحبزادے میں تمہارا حریف نہیں تم اطمینان رکھو اور اپنا کام دیکھو۔" مکرجی کا چہرہ لال ہو گیا اور وہ کوئی سخت جواب دینے ہی کو تھے کہ اٹرین چائے ساتھ لیے ہوئے آئی۔ اور اس نے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر دی اور میں نے پی۔ سیم قاتل کی سی تلخی۔ نمک زخم کی سی شوریت۔ من و سلویٰ کی سی لذت۔ شراب طہور کی سی مدہوشی اور تسنیم کی سی طراوت

ہے اور اس میں ایرین کمر سے نیچے بال چھٹکائے کھڑی ہوئی ایک ہاتھ میں آب حیات کے قطرے جمع کرتی ہوتی ہے اور میری طرف بڑھا دیتی ہے۔ لیکن جب میں اسے پینے کے لیے منہ بڑھاتا ہوں تو وہ ایک دلکش قہقہے کے ساتھ اس عبادوانی زندگی کے پانی کو زمین پر پھینک دیتی ہے اور گلاب کی طرح ہنستی شاخ کی طرح لچکتی مجھے اشارے کرتی غائب ہو جاتی ہے اور میں نیند کی حالت میں دونوں ہاتھ پھیلائے "آئرین" "آئرین!" پکارتا پلنگ سے اٹھ کر اس کی تلاش میں چلتا ہوں دفعتاً کسی چیز کی ٹھوکر لگتی ہے آنکھیں کھل جاتی ہیں اور میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے بیٹھ جاتا ہوں۔ زندگی بیکار معلوم ہوتی ہے۔ دنیا آنکھوں میں تاریک ہو جاتی ہے۔ بہترا ضبط کرتا ہوں لیکن دامن صبر ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے اور......

ایک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے ایک درد سا پیدا ہوتا ہے۔
میں رات کو اٹھ کر روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

تین مہینے تک میرے روز افزوں پریشانیوں کا یہی نقشہ رہا۔ ایک دن آئرین کے بھائی مسٹر چیٹرجی نے مجھے دور سے دیکھا "ٹھاکر صاحب" بیرسٹر صاحب! پکارتے ہوئے دوڑ کر آ کر گلے سے چمٹ گئے۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے بھی یہیں عدالت خفیفہ میں وکالت شروع کی ہے۔ اور آئرین ان کے ساتھ ہے میں انھیں اپنے بنگلہ پر لے گیا دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور شکایتیں کیا کہتے۔ اس روز تو ادھر ادھر کی باتیں رہیں لیکن دوسرے روز پھر آئے اور ایک خط ساتھ لائے۔ میں نے اسے کھولا اور پڑھا۔ نہ تو کسی کے دستخط تھے نہ نام صرف یہی شعر لکھا تھا:۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ ہے

میں نے ٹوپی اٹھائی اور چیٹرجی کے ساتھ ہو لیا ان کے مکان پر پہونچا دیکھا آئرین اپنی پرانی ادا سے آشفتہ مو خنداں لب کھڑی ہے۔ میں نے خاموشی سے ہاتھ ہلایا۔ آنکھوں میں محبت کی روشنی نہ پائی۔ صرف خجالت و شرمندگی کی جھلک دکھائی دی۔ چپکا کرسی پر بیٹھ رہا۔ وہ بولی۔

"آپ تو اب بالکل عید کا چاند ہو گئے!"
میں نے کہا "جی ہاں لیکن وہ غریب تو صرف آفتاب کا عکس ہے جب آفتاب ہی ضیا پاشی میں کمی کرے تو اس کا دھندلا پڑ جانا بالکل دکھائی نہ دینا کوئی قابل تعجب بات نہیں۔"

آئرین کی گردن جھکی اور چیٹرجی سادہ لوح نے کہا۔ "ٹھاکر صاحب آپ تو اس قدر رکھائی سے باتیں کر رہے ہیں جیسے آپ آئرین کو دیکھ کر خوش نہیں ہوئے۔"

میں نے کہا "آپ سچ مانیے میں آپ دونوں کو دیکھ کر جس سے کہیں زیادہ خوش ہوں جتنا کہ آپ لوگ مجھ سے مل کر ہو سکتے ہیں"۔ چیٹرجی کچھ کہنے کو تھے کہ ان کا ایک موکل آ گیا اور وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔ آئرین نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا "ابھی تک غصہ میں کمی نہیں ہوئی۔؟"

میں نے کہا "غصہ تو کبھی بھی نہ تھا۔ ہاں دل میں ناسور تھا اور ہے۔ وہ لاعلاج ہو چکا۔"
آئرین مسکرا کر بولی۔ "دل میں ناسور! تو خیر سے ابھی تک دل آپ کے پاس ہی ہے؟"

میں نے مسکرا کر کہا "ارے میں بھول گیا۔ دل کی جگہ ناسور ہے۔ دل کہاں! وہ ہدیۂ نامقبول تو جھیل کے کسی کونے میں پڑا سڑتا ہوگا"

وہ بولی "میرے اقرار وانکار سے فائدہ؟ آپ تو پہلے ہی ایمان لا چکے ہیں واقعی مردوں کے بھولے پن کی انتہا نہیں۔"
آخری جملہ پر میں نے جھلا کر کہا "اگر اس قدر بھولے نہ ہوتے تو عورتیں اس آسانی سے بھلا بے وقوف کیسے بنا لیتیں!
کیوں صاحب یہ آخر اس دن کا سارا فلسفہ کیا ہوا؟"
آئرین نے پوچھا "کیا فلسفہ؟"
میں نے کہا وہی کہ مرد صرف نفس پرست ہوتے ہیں اور وہ عورتوں میں صرف صنفی خوبیوں کے متلاشی ہوتے ہیں ان کے انتخاب کا تعلق جسم سے ہوتا ہے نہ کہ روح سے۔ میں پوچھتا ہوں آپ نے اپنی پسند میں اس کے علاوہ اور کیا تلاش کیا؟ وہی صنفی خوبیاں اور وہی مردانگی کے جوہر! وہی چوڑے چکلے ہاتھ پیر! وہی گورا چٹا رنگ! وہی شیر کا سینہ! وہی ببر کی سی کمر! جب میں جانتا کہ کرجی میں یہ خوبیاں نہ ہوتیں اور پھر بھی آپ کی نظر انتخاب انھیں پر پڑتی۔ ہندوستانیت سے علاوہ ہو کر اور مغرب کی اندھی پیروی کر کے باتیں چاہے جتنی بنا لیجئے لیکن حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور فطرت کے قانون نہیں بدلے جا سکتے!"
آئرین تھوڑی دیر چپ رہی مجھے دکھائی اس کے بعد کچھ عجیب طرح مسکرا کر بولی "میں نے مسٹر کرجی کی نسبت نامنظور کر دی۔ آپ بالکل بیکار غصہ ہو رہے ہیں۔"
یہ فقرہ تھا کہ صرف آرزو کے لیے نیساں کا قطرہ! یا سوکھی ہوئی کشت میں رحمت کی بارش! دل کا خشک باغ لہلہا اٹھا۔ لیکن شک کا برا ہو بات حلق سے نہ اتری اور میں نے مسرت سے پوچھا کیوں؟ مجھے یقین نہیں آتا! وہ بولی آپ کو یقین کیوں آنے لگا میں کرجی تھوڑے ہوں! میں ایک جھوٹی عورت ہوں بھلا میری بات یقین قابل کہاں؟"
شک سے زیادہ فلسفیانہ تو کھلا میٹھا کا برا ہو کہ میں اس پر بھی نہیں سنبھلا اور پوچھ بیٹھا کہ "آخر یہ کیوں؟"
اس سیدھے سادھے جملہ میں نہ معلوم کیا ضمیر تھا کہ وہ دفعتاً آگ بگولا ہو کر بولی "مرا! آپ پوچھنے والے کون؟ آپ کو میرے افعال پر، کیوں، کیسے، کیا، کرنے کا کس نے حق دیا؟ مجھے مردوں میں یہی بات تو ناپسند ہے۔ ان کا جو جی چاہے کریں کوئی ان سے پوچھ نہیں سکتا لیکن اگر عورت نے کوئی بات کی بس پیچھے پڑ گئے! ایسا کیوں ہوا؟ کیا وجہ ہوئی؟ کیا سبب ہوا؟ پوچھو تم کون ہو؟ تم ہمارے مالک؟ ہمارے آقا؟
میں اس دفعتی غصہ سے اس قدر سراسیمہ و پریشان تھا جتنا کہ بچہ بجلی کی چمک سے یا صید تیروں کی بوچھار سے ہوتا ہے۔ میں نے بالآخر گردن جھکا لی...... وہ بولی "میں اس سے قبل آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ یک گونہ محبت کرتی تھی لیکن آج سے ...... اس وقت سے ...... مجھے نفرت سی ہو گئی!"...... یہ کہتی ہوئی وہ باغ سے بڑی سرعت سے چلی۔ میں نے نہایت لجاجت سے اسے پکارا "آئرین" وہ پلٹ کر بھرائی ہوئی آواز سے بولی "میں آپ سے نہیں بولتی۔"
میں نے کہا "آخر میں نے کیا تصور کیا!"
وہ بولی "اتنی بڑی بات کہہ دی اور تصور ہی نہیں کیا! میری اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی کہ آپ نے مجھے کرجی کی محبت سے متہم کیا اور گو میں نے گڑگڑا کر معافی مانگی لیکن وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں چلی گئی۔

اس کے بعد میں نے آئرین سے کئی بار ملنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی سہیلیوں سے کچھ ایسا کہا نہ کہلوا بھیجتی کہ بس ہمیشہ ٹالا گیا۔ رہا بالآخر میں بھی تھک کر بیٹھ رہا۔ اور جیسے تیسے زندگی کے دن کاٹنے لگا، برسات تو ختم ہو چکی تھی جاڑے کی پہاڑ سی راتیں بھی کٹ گئیں۔

ہر گھونٹ میں ... اس کا ذائقہ لینے میں اس قدر محو تھا کہ کرجی کی باتیں اور ان کا وجود میرے دل و دماغ سے نکل گیا۔

میں نے گھونٹ پی کر پیالی ختم کی اور آیرین کا منہ تکنے لگا۔ اس نے مسکرا کر دوسری پیالی بڑھا دی۔ پہلی پیالی کے اثر کے ساتھ ل کر اس مسکراہٹ نے ستم ڈھایا۔ میرے رہے سہے حواس جاتے رہے۔ میں متوالوں کی طرح جھوم جھوم کر رندوں کی طرح مزا لے لے کر اسے بھی چڑھا گیا۔ آیرین کی آنکھوں سے پوچھا۔ "اور؟" میں نے کہا "اور! اللہ اور!!!" آیرین میرے لب و لہجہ پر گھبرائی لیکن اس نے تیسری پیالی میری طرف بڑھا دی ...... میں نے مخموروں کی طرح پیالی کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھام کر لگائی ہی تھی کہ کان میں آواز آئی "آیرین ایک پیالی ادھر بھی"!

میں نے پلٹ کر دیکھا مکرجی کھڑے ہیں ہونٹھ پیالی تک آ کر رہ گئے۔ آدم کی طرح کسی نے فردوس سے زمین پر دے مارا پیالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر آ رہی مکرجی بیساختہ ہنس پڑے گویا میرے دل میں کسی نے چٹکی لی اور میں بیقراری سے اٹھ کر کمرا ہو گیا۔
آیرین نے کہا کیوں خیر تو ہے کیا ہوا؟"

میں "کچھ نہیں۔ تنہائی میں مخل ہو رہا ہوں۔" کہتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

گھر پہنچ کر میں نے غور کیا کہ میں نے یہ کیا حرکت کی۔ مجھے جب معلوم تھا کہ میری نذر نامقبول تھی تو پھر مجھے رقابت کا حق کیا؟ جب آس ٹوٹ چکی تو پھر امید بے بنیاد سے حاصل؟ مقتضائے فطرت یہی تھا کہ ہم مذہب و ہم زباں کو ترجیح دی جائے۔ میرے معاملے میں سنوں کا خاصا تفاوت، وہاں بچپنے کا ساتھ اور پھر ہم سنی!

ہر فرد کو حق ہے کہ وہ اپنے مذاق کے موافق انتخاب کرے۔ اس میں نہ شکایت کی جا ہے اور نہ گلہ کا موقع، پھر میری آزردگی ایک بھونڈی سی بات تھی میرا خفا ہو کر چلا آنا یقینی قابل مضحکہ ہے۔ مجھے چاہیئے تھا کہ میں آیرین کی پسند کی داد دیتا اس کے صاحب نظر ہونے کی تعریف کرتا، اور اس کو دل سے مبارک باد دیتا۔ میں نے اس لیے شرمندہ و شرمسار ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیئے اور مبارک بادی کا فرض بھی جلد سے جلد ادا کرنا چاہیئے۔

میں اسی غرض سے دوسرے روز شام چٹرجی کے یہاں گیا۔ شب ماہ تھی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور بنگلے کے باغ کا پتہ پتہ جگنو کی طرح چمک رہا تھا۔ آیرین وہیں ٹہلتی ہوئی ملی، ابھی سلام و نیاز کے بعد میں نے کہا "آیرین میں اپنی حرکت پر منفعل تم سے معافی مانگنے اور تمہیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا، "انفعال کاہے کا اور مبارک باد کیسی؟"

میں نے کہا۔ "شرمندگی اپنے بے جا غم و غصے اور مبارک باد ......"

اس نے ہنس کر پوچھا "ہاں مبارک باد کا ہے کی؟"

میں نے بڑے درد سے کہا "آیرین دیکھو بنو نہیں! تم خوب جانتی ہو کہ میں کاہے کی مبارک باد دے رہا ہوں میں تمام باتوں سے واقف ہوں اس طے شدہ نسبت سے بھی اور اس سے ہونے والی شادی سے بھی! مجھ سے خود مکرجی نے کہا۔ کیا اب اس سے بھی زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے؟"

آیرین کی آنکھوں سے عجیب طرح کی شعاعیں نکلنے لگیں اور وہ بولی "آپ کو بھی سنی سنائی باتوں کا بہت جلد یقین آجاتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا آپ کو اس کے سچ ہونے سے انکار ہے؟"

کشتی لوٹی مگر کیسے ؟ ہم دونوں پہلو بہ پہلو تھے۔ ڈانڈ میرے ہاتھ میں بھی تھا اور اس کے ! ——— اس روز سے آج کا دن ہے کہ ہم دونوں یونہی پہلو سے پہلو ملائے سفینۂ عمر پر چلے جا رہے ہیں اور شاید مر کر بھی یہ ساتھ نہ چھوٹے اور فردوس بریں میں دوسری زندگی بھی یونہی گزرے ! آمین !!

صفحہ ۳۰ کا بقیہ

حسینی کے گھر کا ماحول علم و ادب کا ماحول ہے۔ سب سے بڑے صاحبزادے مہدی عباس سلمہ نے لکھنؤ اور دہلی سے انگریزی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اور اب ایک اعلیٰ سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں ان کا قیام حیدرآباد دکن میں ہے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بہت اچھے ادبی مذاق کے حامل ہیں۔ پہلے صاحبزادے باقر عباس سلمہ نے لکھنؤ سے اینتھراپالوجی میں ایم اے کیا اور اب ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ڈاکٹریٹ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ تیسرے صاحبزادے اصغر عباس سلمہ نے ذرا مختلف لائن اختیار کی ہے اور بمبئی میں کسی فلم کمپنی کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہیں۔ لڑکیوں میں سب سے بڑی کشور سلمہا ہیں۔ یہ بھی بہت اچھا ادبی مذاق رکھتی ہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ ان کا دہلی میں قیام ہے۔ اور دہلی ریڈیو اسٹیشن میں اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ ڈرامے بھی۔ کتابیں بھی۔ اپنی تصانیف پر چار چار انعامات بھی حاصل کر چکی ہیں۔ دوسری بیٹی گیتی آرا سلمہا ہیں جنھوں نے اسی سال لکھنؤ یونی ورسٹی سے سائیکالوجی میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اور اسی مضمون میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لیے مزید تعلیم میں مصروف ہیں۔ ان صاحبزادی سے پہلے تو میں آزادی سے باتیں کرتا تھا۔ مگر اب مجھے ان سے ذرا ڈر لگنے لگا ہے۔ یہ ہیں علم نفسیات کی ماہر۔ خدا جانے چچا کی کون سی خامیوں پر کیسے کیسے تضاد پر ان کی نظر پڑتی ہو۔ اور دل ہی دل میں مزے لیتی ہوں۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ چلنے والا چچا سمجھ کر بخش دیتی ہوں۔ سب سے چھوٹی بیٹی نازش آرا ہیں۔ انھوں نے اسی سال بہت کم عمر میں اعلیٰ نمبروں سے ہائی اسکول پاس کیا ہے اور اب میڈیکل لائن میں جانے کے ارادے سے انٹر سائنس کے پہلے سال میں زیر تعلیم ہیں۔ کالج میں مینڈکوں اور کیچوے وغیرہ کی چیر پھاڑ کرتی ہیں۔ مگر مینڈک جو ہے۔ چھپکلی، چمگادڑ وغیرہ سے ان کا ڈر ابھی تک بدستور سابق باقی ہے۔ غرض حسینی جو میرے بہت ہی عزیز بھائی ہیں اور بہن بھی ہیں سبھی بڑے رکھ رکھاؤ اور غیر معمولی خودداری کے ساتھ جذبات سے متصف ہیں۔ طبیعتاً ہمدرد مزاج نفاست پسند واقع ہوئی ہے۔ ان سے اور میری اہلیہ سے دانت کاٹی روٹی کا جو ساتھ ہے وہ شاید میری اور حسینی کی یگانگی سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس طرح یہ دونوں گھرانے ایک دوسرے کے لیے بلند پایہ سوشل کلب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشی۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنی خوشی اور اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں یہ بھی ایک عجیب حسن اتفاق ہے کہ فی الحال جب کہ حسینی کے یہاں ان کے بچوں میں سے محض دو بیٹیاں لکھنؤ میں ہیں میرے یہاں بھی دونوں چھوٹے لڑکوں کے سوا اور سب لکھنؤ سے باہر ہیں۔ آپس کی یگانگی کا یہ نتیجہ ہے کہ دونوں ماؤں کے پاس دو دو لڑکیوں کے ساتھ دو دو لڑکے بھی ہیں۔ اور دونوں بہنوں کے لیے دو بھائی بھی ہیں خداوند کریم ان سب کو نظر بد سے بچائے اور کامیاب زندگیاں عطا فرمائے۔ با

غرض حسینی نہ تو میرے لیے دور سابق کے ایک کامیاب ٹیچر ہیں۔ نہ ایک نیک نام پرنسپل۔ نہ ایک بلند پایہ ادیب ہیں۔ نہ ایک مستند افسانہ نگار۔ بس وہ حقیقی معنوں میں اس حد تک حقیقی معنوں میں جس حد تک اس لفظ کے مفہوم کی رسائی ہو سکے۔ ایک دلی دوست ہیں جن سے دنیا بھر کے موضوعات پر مزے مزے کی باتیں ہوتی ہیں۔ دل چسپ تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ گرما گرم بحثیں بھی ہوتی ہیں۔ بحثیں میں نے اس لیے کہا کہ باوجود اس درجہ یگانگی کے جس کا تذکرہ کر چکا ہوں، بعض مسائل میں ہمارے نظریات سو فی صدی یکساں نہیں ہوتے۔ اور یہی تھوڑا سا فرق تبادلہ خیال کو پھیکا اور بے مزہ ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ دو دیوانوں میں خوب گزرتی ہے۔ "عاقبت کی خبر خدا جانے !"

اور اوائل اپریل میں پھر نینی تال پہنچا۔

ایک دن شام کے وقت جب کہ آفتاب ہمالیہ میں روپوش ہو چکا تھا اور تاریکی آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی میں جھیل کے کنارے آ کر کھڑا ہو گیا اور جھیل کی سیر کشتی کے مکالمے کو یاد کر رہا تھا کہ ایک سریلی دلکش آواز میں کسی نے چپکے سے کہا "ٹیگرٹ صاحب کیا اب کرایہ کی کشتیاں نہیں ملتیں ؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہی حور لقا کھڑی تھی جس کی بے نیازیوں نے میری زندگی کو موت سے بدتر بنا رکھا تھا۔

دل کی جو کچھ حالت ہوئی وہ خدا ہی جانتا ہے۔ میرے منہ سے جو کچھ نکلا وہ یہ تھا "ایں آئرین! تم یہاں کہاں ؟"

وہ بولی "ابھی سوال کرنے کی عادت نہیں چھوٹی ؟"

میں نے ندامت سے گردن جھکا لی۔

وہ بولی کشتی منگوائیے۔ کشتی۔

میں نے کرایہ کی ایک کشتی کی اور خود ہی کھیتا ہوا اسے لے چلا۔ تھوڑی دیر وہ چپکی بیٹھی مجھے دیکھا کی اس کے بعد شرارت و شوخی سے بولی "ٹھاکر صاحب آپ کا دل تو یہیں کہیں ہو گا۔ شست لگائیے نا! شاید مل جائے!"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وہ چمک تھی جو سائک[1] کی آنکھوں میں کیوپڈ پر نظر کرنے سے اور جو سیتا کے نینوں میں رام کو دیکھنے سے پیدا ہو جاتی تھی۔

گو سامنے اور چاروں طرف پہاڑ کے اونچے نیچے مقامات پر، اس کے درختوں کی شاخوں پر، اس کے چھوٹے بڑے بنگلوں پر بجلی کے قمقمے روشن تھے لیکن ان کی چمک دمک ان دونوں خوبصورت ستاروں کے سامنے بالکل ماند تھی یہ دیکھ کر ذرا ڈھارس بندھی اور میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "اگر برا نہ مانو تو اس کی بھی صورت ہو سکتی ہے۔"

وہ بولی "شوق سے فرمائیے مجھے بھی بڑی فکر ہے کہ کسی طرح آپ کا گم شدہ دل آپ کو مل جائے۔ آپ کے غلط گمان میں تو میں بھی تھوڑی بہت اس کے کھوئے جانے کی ذمہ دار ہوں!"

میں نے کہا "تو زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں اپنے ہی آئینہ دل میں دیکھو جام جمشید کی طرح سب کچھ مل جائے گا۔ اور گڑگڑا کر کہا "آئرین اب تو میرا دل مجھے واپس کر دو! اچھا اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو اس کا عوض ہی دیدو!"

اس کے چہرے پر بجائے شوخی و شرارت کے حد درجہ کی نرمی آ گئی! اور وہ محبت سے آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی "نرائن اس کے عوض میں کیا مانگتے ہو؟ میں حاضر ہوں!"

میں نے کہا "میں تمہیں مانگتا ہوں۔ تمہارے اس چاند سے مکھڑے کو۔ نہیں بکھرے ہوئے بالوں کو۔ انہیں محبت بھری آنکھوں کو!"

وہ بولی نرائن سب تمہارا ہے۔ میں نے دیا سب کچھ دیا! بخوشی دیا!

میں نے پوچھا "ارے جب یہی تھا تو پھر ایک سال کامل مجھے اس طرح دہکتے انگاروں میں بھڑکتے شعلوں میں کیوں چھوڑ رکھا تھا۔

وہ بولی "ہائے رے نادانی! اگر ایسا نہ ہوتا تو تم میں اور مکرجی میں فرق کیسے ہوتا؟ کھوٹے کھرے کا امتحان منظور تھا سو دیکھ لیا سو میں اب تیری باندی ہوں جان و دل زندگی و حشر و نشر سب تیرے ہاتھ میں ہیں! جو تیرا جی چاہے تو کر!"

اور اس نے ہاتھ جوڑ کر میرے پیر چھوئے! اور میں نے کانپ کر ان بندھے ہاتھوں کو چوم لیا!

---

[1] کیوپڈ یونانیوں کا خدائے عشق اور سائک اس کی معشوقہ

علی عباس حسینی

دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہونچی۔ سیدانی بی نے شکل صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے سیدانی بی اس درزی کی حرکتیں سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انھوں نے کہا۔

"اچھا گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمہارے لئے کوئی بند و بست کر دوں گی۔"

اُدھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے اسکی تاریخ یوں بیان کی۔

"راویانِ صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کنجڑن، کنجڑن سے درزن اور اب وہ درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا "اور اس کے بعد؟"

وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے "خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت بھُز بھُز ہوئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفا کے گھر میں۔ وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلہ میں سامنے آ گئیں۔ میر صاحب بل کھا گئے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف ڈھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں جگہ دیتے ہیں تو گھر میں ماشاءاللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلوا کر انھوں نے اسے نادر شاہی حکم دے دیا "ہم نے منو کی نسبت طے کر دی۔ اس سے کہہ دو، کل اس کا عقد ہوگا۔"

بیچاری جولاہن کو چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی اس لئے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔ جولاہن اسکے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انہی کا دیا ہے، چنو کی نوکری انہی کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی انہی کے ہیں۔ پھر لالچ بھی تھا اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے۔ غرض گھر آئی اور اس نے رات کو منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا، جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دئے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے، دن بیتتے گئے، مہینے ہوئے، ایک سال ہونے کو آیا مگر منو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے ——— کہ دفعتاً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہونچیں۔ معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے نشے کا شوق ہے اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتارتا ہے اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لیکر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی، جولاہن سولئے ماتا

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے، جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا۔

دو بھائی تھے چنو منو نام، کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا اور ددھیال سید واڑے میں۔ ماں، ایرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آتی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لئے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنو منو۔ وہ تو یادگار یہ چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انھوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لئے کچھ روپے دیئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے، اچھے ہاتھ پاؤں نکالے، چنو ذرا سنجیدہ تھا، ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہمسن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا، اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لئے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہونچیں۔ انھوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہونچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہونچ گئیں۔ انھوں نے عاجز آکر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے، لجاتی، سمٹی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا۔ اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔

اس نے آہستہ سے کہا۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی تانے سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہی دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک

علی عباس حسینی

بترین چارپائی کی کمائی میں کہاں نصیب، وہ دگا کھیسے ہمال سے ہاتھ پھیلانے اور پٹیں کھانے۔ مگر اس پر کبھی جو کچھ ملتا بجا دیں نہ سماتا
رافیون کی لت پڑ ہی چکی تھی وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چھنو خاں کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے
رسو کبھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی والے تھے کہ چھنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی
م کے سلسلہ میں حاضر تھا۔ دُلیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری۔ منھ کے بل
ین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منھ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے ماں! ارے ماں!" چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ
ھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا۔
ہ ٹھوکر کھاتا سنبھلتا پھسلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بہری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی
رح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی "ارے کیا ہو گیا تو کو!" کہتی ہوئی دوڑی۔ چھنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:
"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔
چھنو کی ناتھ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کے ساتھ کمبھ کا میلہ دیکھنے الہ آباد چلی گئی۔

کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انھوں نے حکم دے دیا آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہوگئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چرا جائے گا۔" ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔" منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی ـــــ اور تاڑی بند ہو گئی ـــــ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا ـــــ

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی ـــــ اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں ملنے لگا۔ بالکل زرد، سوکھا ہوا آم اور کھانسی بخار کا شکار ہوا جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں ـــــ اور منو کی بہو نینوں کے بان چلانا شروع کر دیئے تو انھوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی ذہان اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں، انھوں نے کلمہ بہ کلمہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو نوبت ہاتھا پائی تک پہونچی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہونچا۔ بیوی نے پر وہ لات ماری کہ وہ ہائے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں۔ لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ ٹھنا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آ کر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلاب غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتۂ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتاً جنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جنو دلور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔ ایسے ہی ایک موقع سے جنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ درد دل بیان ہوا، تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو جنو ماں نے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہونچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انھوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرمایا۔ بڑی بی دیر تک ایک کی طرح بکتی رہیں۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں "چل رے گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ تیری بیوی ہے، میں خوش، میرا خدا خوش!" ـــــ جنو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دی اور اپنے چاروں بچوں کو اسی گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو بیتے، تین بیتے مگر چوتھے مہینے جنو کی کمر میں چک آ گئی۔ اکڑتا، برماتا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کر چلنے لگا۔ ہمسن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے، ان کو دکھایا۔ انھوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے پانچ دن اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس! جنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ کسی نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا مگر افیون کی خشکی نے دبا دیا اور جب چینا بیگم مانگتی دودھ، مکھن، گھی، ملائی اور

منجھو نے یہ فن ممدو سے سیکھا تھا۔ ممدو نے اپنے اس چہیتے شاگرد پر بڑا کام کیا تھا۔ منجھو کے باپ کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اسے دو برس کے سن میں اس کی نخاس کی گندی گلی میں رہنے والی ماں، بے ٹھور ٹھکانے کا بنا کر، بسورتا چھوڑ کر چل بسی تھی۔ ممدو نے بے کس ماں کے کفن دفن کا بار اپنے ذمہ لیا اور بیٹے کو اپنی کوٹھری اور بستر میں جگہ دی۔ منجھو کو اس کی یہ یتیم پروری زیادہ گراں نہ گزری۔ ماں کی زندگی میں وہ اپنے چاروں طرف انسانی جسموں کا خوشی ناخوشی سے بکتا دیکھتا رہا تھا۔ خود ماں کی حرفتوں اور حرکتوں سے واقف ہو چکا تھا اور ماں کی علالت کے دوران اس نے ماں کے گاہکوں کے طمانچے بھی کھائے تھے اور دوسری دست درازیاں بھی سہی تھیں۔ اس لیے پچاس سالہ ممدو کے آغوش میں اسے کچھ راحت ہی ملی۔ پہلی رات اور کئی رات منجھو نے اس اجنبی ہیبت ناک ماحول میں اس طرح گزاریں کہ اگر ممدو کا غار دار سینہ تکیہ نہ بنتا تو شاید خوف اور ڈر سے اس کی پلک سے پلک نہ لگتی، اور اس کا دم ہی نکل جاتا۔

غسل خانہ رمضان کے حمام کی طرح رات کو بھی چلتا رہتا۔ "مردہ بدست زندہ" مثل مشہور ہے۔ روپے والے اور کام کاجی دونوں طبقے مردوں کو زیادہ دیر گھر میں رکھنے کے قائل نہیں۔ دونوں کا سخت ہرج ہوتا ہے۔ ایک کی مزدوری کا، دوسرے کی عیش پرستی کا۔ اس لیے ممدو کو ایک مستعد سپاہی کی طرح فرائض کی انجام دہی کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑتا۔ اس کے دو اسسٹنٹ تھے۔ ایک مرد، ایک عورت۔ محلے ہی میں دونوں کے گھر تھے۔ مرد کی میت میں حجن مدد کو بلایا جاتا۔ عورت کی لاش ہوتی تو رحیمن کی طلبی ہوتی۔

۴۴ سال کی رحیمن ایک مرحوم غسال کی بیوہ تھی۔ صورت شکل میں بس آدمی کا بچہ، مگر تیزی طراری میں آفت کی پرکالہ۔ اس کی باتوں میں بلا کا رس تھا، جسے چاہے منٹوں میں شیشے میں اتار لے۔ بیوہ ہوتے ہی اس نے ممدو پر ڈورے ڈالے تھے، مگر اس کا شوق کچھ اور ہی تھا۔ پھر رحیمن سے وہ ڈرتا بھی تھا۔ بوڑھے سفید بالوں میں کہیں داغ نہ لگا دے۔ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور منجھو اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں آگرا۔ رحیمن ممدو کے لیے ایک حقارت آمیز جذبہ لیے بل کھا کر رہ گئی۔

عورتوں کو غسل دینے کا کام وہ اکیلے ہی انجام دے لیتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس کی سات برس کی بیٹی کریمن اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ بند کواڑ کے پیچھے سے کبھی کبھی ممدو بھی ہدایتیں دے دیتا تھا۔ اگر کوئی شوقین مزاج اپنی چہیتی کی بگڑی صورت بہروپ سے بنانے کی اجازت دے دیتا تو ممدو اپنی صنعت گری دکھاتا اور منہ مانگے دام لیتا، نہیں تو بیشتر سوکھے ہار کفن میں لپیٹ کر توپ دیے جاتے۔

شروع شروع میں تو منجھو، ممدو کا ہاتھ بٹانے میں جھجکا، گھبرایا، ڈرا، مگر جلد ہی اسے مساوات سی ہو گئی۔ اس نے بچپن ہی سے ایسے ماحول میں تربیت پائی تھی جس میں احساس لطیف کا گزر نہ تھا۔ نہ جسم اور لباس کی صفائی ملی تھی نہ خوشبو اور بدبو کی کوئی خاص تمیز۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ انسانی جسم کی ایک مقررہ قیمت ہے۔ جہاں اس کے دام ملے، پھر وہ ہر طرح کچلا جا سکتا ہے، زخمی اور مجروح بنایا جا سکتا ہے۔ ممدو نے اس کو رہنے کو دیا بستر اور مکان، اس کے پہننے کو لباس، اس کے کھانے کو شیر مال اور پلاؤ ـــــ اس لیے کہ مرنے والوں کے ان "پلاؤ کھائیں گے احباب اور فاتحہ ہوگا" والی مجلسیں ہوتیں تو ممدو غسال کو مولانا کے ساتھ ساتھ پانچ شیر مالیں اور بھرا قاب ضرور ملتا ـــــ اور ان سب پر بالا، ممدو نے اسے ایک خاص قسم کا پیار اور چاؤ بھی دیا تھا، تو پھر منجھو کے لیے خاموشی سے اس کے ہر اشارے پر چلنا نمک حلالی کا ہم معنی کیوں نہ بنتا؟

انسان کی زندگی میں عادت کو بہت بڑا دخل ہے۔ یہ احساس و جذبے کے نوکیلے دندانوں کو آہستہ آہستہ گھس کر ہر ایک کو ایک مشین جیسا بنا دیتی ہے۔ ناگوار گوارا بن جاتا ہے، کڑوا میٹھا۔ افیون اور تمباکو کی تلخی سے کون نہیں واقف؟ مگر کسی "بجھوا" پینے والے سے اس کا لطف پوچھ کر دیکھیے، یا کسی افیونی سے "چنیا بیگم" کی لذت دریافت کیجیے، تعریفوں کے پل باندھ دے گا۔ چنانچہ منجھو کا ذرا احساس بدبو، گندگی سے جھجک، غلاظت سے گھن ان سب نے چولے بدلے، کفن اور کافور کی بو اس کے لیے عطر حنا کی خوشبو بن گئی۔ منجھو اس

ایک غسل خانے میں

کچھ لوگ فطری طور پر ننگے ہوتے ہیں، کچھ کو تربیت اور ماحول ننگا بناتے ہیں، کچھ کو اپنے پیشے کے باعث ننگا بن جانا پڑتا ہے۔ منجھو کچھ، قسم کا ننگا تھا۔ کام ہی ایسا تھا کہ بغیر ننگا بنے، ننگا کیے اور بنائے انجام ہی نہ پاتا تھا۔ منجھو غسال تھا۔

نہ جانے کیسے کیسے مردوں کو اس نے نہلایا کفنایا تھا۔ یہ مردے ہر سن و سال کے ہوتے تھے، بچے، لڑکے، جوان، ڈھلتی عمر والے، بوڑھے کھوسٹ، ایسے بھی جو غنچہ سا شگفتہ کی طرح بادِ سموم کے ایک جھونکے میں مرجھا گئے، ایسے بھی جو ادھ کھلے پھول بن کر سوکھ گئے۔ ایسے جنھوں نے دو دن اپنی بہار جانفزا دکھائی اور وہ بھی جو برسوں مرنے کی دعائیں مانگ کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے۔ چاہے کتنا ہی حسین ہو، مرنے کے بعد ہر ایک چہرہ بھیانک ہو جاتا ہے۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی، ہونٹ اکڑے ہوئے، زبان باہر لٹکتی ہوئی یا سانپ کی طرح پھن نکالے تالو سے چپکی ہوئی۔ صراحی دار گردن کی نازک رگیں سوکھی تانت بنی ہوئی اور نرخرا باہر ابھر کر بالکل کپڑے لٹکانے، کھونٹی جیسا۔

کیسا ہی جوان ہو، پسلیوں کے آخری جوڑ کے نیچے گڈھا ضرور پڑتا اور پیٹ کی شکلیں خوفناک بھی ہوتیں اور مضحکہ خیز بھی۔ کوئی طبلہ اور ڈھول بنتا ہے، کوئی بے ڈھنگا اور بے کسا تاشہ، کوئی خاصا بڑا کدو، کوئی رائے بریلی کی بھیڑ۔ کمر سے نیچے کا حصہ حد درجہ گھناؤنا غلاظت سے بھرا۔ وہ تعفن ہوتی کہ سانس لینا مشکل ہوتا، اور وہی پاؤں، جنھیں زندگی میں صندل کے پاؤں کہتے، کنول سے تشبیہ دیتے، اکھوپڑا اور ناگ پھنی کے سوکھے پتے بن جاتے۔

لیکن منجھو کو غسال ہونے کے ناطے انھیں بدبودار، اکڑی ہوئی، بگڑی ہوئی صورتوں میں اپنے پیشے کا کمال دکھانا ہوتا۔ انھیں آبِ سدرہ اور بیسن سے دھونا، رگڑنا، مانجھنا پڑتا تھا۔ انھیں ایسا بنانا پڑتا تھا کہ جان چھڑکنے والی بیوی اور چاہنے والی بہن، بیٹے بیٹیاں سب جھک جھک کے، مرنے والے کے قریب آکر اس کا آخری دیدار کریں۔ منہ پر رومال رکھیں تو ناک چھپانے کے نہیں، آنسو پونچھنے کے لیے۔ منجھو کو اسی کام کے خاص طور پر پیسے ملتے تھے۔ اسی ہنر کے لیے تو وہ دور دور مشہور تھا۔ کیسی ہی بگڑی ہوئی لاش ہو، کیسا ہی اکڑا ہوا مردہ ہو، کیسا ہی کٹا پھٹا، پوسٹ مارٹم کیا ہوا جسم ہو، منجھو غسال کے سپرد کر دو، وہ اسے گھنٹے دو گھنٹے کی محنت میں دولہا سا سنوار دے گا، آخری رخصت کے لائق۔

خدمت کے لیے پیش کیا تھا، مگر ممدو نے منجھو کو اُس پر ترجیح دی اور اس کے نتیجے میں رحمن کو بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ نہ وہ جنس کی ماری تھی اور نہ اسے غسالن کے کام سے کوئی رغبت تھی۔ مگر پیٹ پالنے کے لیے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اس نے اندھیرے اجالے چار بیبیوں کے لیے نواب زادوں، رئیس زادوں کو بھی خوش کیا اور ان کے بچے مفت خور لازموں کو بھی۔ اور وہ کالی کالی راتوں میں ڈراؤنی اور بھیانک میتوں کو دھوتی، کفناتی بھی رہی اور فیس میں سے ممدو کا کمیشن بھی ادا کرتی رہی یہ سب کچھ اس کے دل پر داغ بن کر نقش تھا۔ ممدو نے لیے اپنایا ہوتا تو وہ آج ایک رئیس کی ڈیوڑھی میں بھکارن کی طرح کیوں پڑی رہتی۔

پھر بھی رحمن ممدو کو ناخوش کرنا نہیں چاہتی تھی، اس لیے وہ کرمن سے منجھو کی سگائی کی بات کو دونوں کی کم عمری کا بہانہ کرکے ٹال گئی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ کرمن سے منجھو کو بیاہے گی ضرور، ممدو سے ناک رگڑوا کر بیاہے۔ منجھو کو کیا خبر رحمن کے دل کی کڑھائی میں کیا کیا پک رہا تھا اس کو اپنی جگہ یقین تھا کہ رحمن اب، جب کہ وہ پورے غسل خانے کا مالک تھا، اس کی بات نہ ٹالے گی۔ وہ کرمن کو پسند بھی کرتا تھا۔ اس کا ناک نقشہ بھی اس کے لیے دلفریب تھا۔ اس کے مزاج، رنگ ڈھنگ سے بھی وہ مطمئن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کرمن کو بھی اس سے تھوڑا بہت لگاؤ ضرور تھا۔ سال بھر پہلے جب رشتے کی بات چلی تھی تو کرمن کے بھی یقینی سن گن مل گئی تھی۔ وہ اس سے تھوڑا بہت شرمانے لگی تھی، اور اس نے غسل خانے میں آنا جانا گویا چھوڑ دیا تھا۔ مگر جب بھی منجھو سے کوئی بات کرتی تو بڑے گھمنڈ سے اور لہجہ بالکل حاکموں جیسا ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ "بیوی میں تیرا غلام" منجھو سے سات بار کہلا چکی ہے۔

غرض منجھو نے ٹھان لی کہ فاتحہ کے بعد ہی رحمن سے وہ تو بات کرے گا۔ مگر مجلس تمام بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک نہیں دو دو پوسٹ مارٹم کی ہوئی لاشیں آگئیں اور شام تک اسے رحمن سے ملنے اور باتیں کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ اس کے پاس جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ چراغ جلنے سے قبل ایک امیر زادی کا مردہ بھیلاں اٹھا کر لائیں۔ رحمن بلائی گئی وہ پاس ہی ایک رئیس کی ڈیوڑھی میں کھٹولا ڈالے پڑی رہتی تھی۔ اندر جانے کی اسے اجازت نہیں تھی۔ مردہ شو کی صورت سے بیگمات کو گھن آتی تھی۔ دل میں ہول اٹھنے لگتے تھے۔ موت یاد آجاتی تھی۔ لیکن کرمن بڑی سرکار کی پوچھی پر مقرر تھی۔ وہ جب سے بیوہ ہوئی تھیں پنڈلیاں اینٹھتی رہتی تھیں۔ مجبوراً بیٹی کی خاطر ماں کی ڈیوڑھی تک رسائی ہو گئی۔

رحمن کی غسل دی ہوئی اور کفنائی ہوئی میت جب لوگ لے کر چلے گئے تو اس نے خود نہانا شروع کیا۔ منجھو کو بھی چونکہ اس سلسلے میں صندوق میں ہاتھ لگانا پڑا تھا، اس لیے وہ بھی صحن میں تہمد باندھے نہانے کی نیت سے ٹہل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رحمن جیسے ہی فارغ ہو کر نکلے گی وہ اس سے کرمن کے بارے میں بات چیت کرے گا۔ پھر وہی تنہائی کا ڈراؤنا منظر سامنے تھا۔ جس کے سبب دو راتوں سے اس کی دم پر بنی تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ اگر غسل خانے سے متعلق مولوی صاحب کو بلا لائے، نکاح ہو جائے اور اس کے خالی پہلو میں کرمن آجائے۔ اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ اگر رحمن اس دھیٹ منگنی پٹ بیاہ، والے سودے کے لیے دو چار سو روپے مانگے گی تو وہ بھی اسے بہ خوشی پیش کر دے گا۔

"منجھو میاں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ رحمن نے اندر سے آواز دی۔
"منجھو میاں، اللہ ذرا کوئی صابن کی گھسی پٹی بٹی ہو تو ہاتھ بڑھا کر دے دو!"
جب منجھو نے کواڑ کی آڑ سے صابن کی ٹکیا اندر بڑھائی تو ٹھنک کر بولی، "ارے میاں، میں پیٹھ پھیرے بیٹھی ہوں اندر آکر ہی دیدو!"
منجھو اندر گیا تو وہ بولی، "اللہ تمہیں جیتا رکھے، ذرا پیٹھ پر لگا بھی دو۔"
منجھو ہکلا کر بولا، "کیا؟ کیا کہا خالہ!"

کی نالی کا کیڑا، رفتہ رفتہ غسل خانہ کے سفید چوہے کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔

دیکھنے میں تو وہ پندرہ برس کے سن میں کندنی رنگ، کرنجی آنکھوں اور کالے گھنگریلے بالوں والا، پانچ فٹ چار انچ کا گٹھے جسم کا لڑکا ہی معلوم ہوتا تھا ایسا بھولا بھالا کہ جو دیکھے اسے پیار آئے لیکن ممدو کی چھ برس کی تعلیم اور تربیت نے اس میں انسانی غم اور خوشی سے بے پروائی اور موت سے وہ ساری بے خوفی پیدا کر دی تھی، جو ایک غسال کی خصوصیت ہے۔ غسال ہو یا شمشان کا ڈوم، دونوں قصاب سے بھی زیادہ سنگدل ہوتے ہیں۔ وہ تو حیوان کے مردہ گوشت کو کاٹتا پیٹتا ہے۔ یہ انسان کے پھول جیسے جسم کو توڑتا مروڑتا ہے۔ منجھو نوجوان ہونے کے باعث بوڑھے ممدو سے کچھ زیادہ ہی سخت دل نکلا۔ اسے اپنے پیار کرنے والے استاد کے پیشے کے سارے گر سیکھ لینے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ وہ ایسی چابکدستی دکھانے لگا کہ ممدو کبھی اس کے کام کو فخر کے ساتھ ساتھ رشک سے دیکھنے لگا تھا مگر قبل اس کے کہ گرو اور چیلے میں گڑ اور چینی کا فرق نمایاں ہو کر بات پھیلے ممدو کو ایک وبائی مرض کا مردہ چلتے چلاتے ایسے جراثیم تحفے میں دے گیا کہ وہ بھلا چنگا اڑتالیس گھنٹے کی بیماری میں لوٹ لگا کر اس گڑھے میں جا پہنچا، جہاں ایک دن سب کو جانا ہے۔

ممدو نے منجھو کے لیے ورثے میں چھوڑا ایک سائیں سائیں، بھائیں بھائیں کرتا ہوا غسل خانہ، پیشے کے فرائض ادا کرنے کو۔ اپنی اندھیری کوٹھری اور گندہ دالان، رہنے بسنے کو۔ لاشوں پر سے اتارے ہوئے منتخب قیمتی لباس اور چادریں، اوڑھنے پہننے کو۔ عمر بھر کا زمین میں گڑا ہوا اندوختہ، پورے دو ہزار روپے، پھیلنے بڑھنے کو بے حس دل، مگر جھنجھناتے اعصاب، رنگ رلیاں مچانے کو!

ممدو کا ترکہ منجھو کا دیکھا بھالا، سمجھا بوجھا تھا۔ وہ انہیں پا کر نہ تو بوکھلایا اور نہ آپے سے باہر ہوا۔ اسے سب سے زیادہ جو فکر تھی وہ تنہائی کی تھی اسی کا اسے سب سے زیادہ ڈر تھا۔ رات کی مدھم روشنی میں پہلی رات اسے غسل خانے میں ہر طرف سائے ہی سائے چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ بد روحیں جو عورت ہوتیں، چھل پائیاں بن کر لیٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ قوت واہمہ ہر آواز کو ایک منمناہٹ میں تبدیل کر دیتی۔ خیال احساس کو متاثر کرتا گیا، آنکھ کان کی فریب دہی بڑھتی ہی چلی گئی۔ دیئے کھڑکا، بندہ دھڑکا، والی پوری کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ اس کا بار بار غسل خانے سے چیخ کر بھاگ جانے کو جی چاہنے لگا کہ گیارہ بجے ایک لاش آ گئی۔ گویا اس کے تن بے جان میں جان آ گئی۔ اس نے جانتے بوجھتے تجہیز و تکفین میں اتنی دیر لگائی کہ تین بج گئے۔ وہ بستر پر تھک کر گرا تو ایسا غافل سویا کہ آٹھ بجے صبح ہی آنکھ کھلی۔

دوسری رات وہ بارہ بجے شب تک لالٹین جلائے ڈنڈا ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ غسل خانے کے پھاٹک کے اندر سے کنڈی بند تھی۔ دیواریں بھی کافی اونچی تھیں۔ چور چکار کا کوئی ڈر نہ تھا۔ رات کو غسل خانے میں قدم رکھتے ان کا بھی دم نکلتا تھا۔ مگر ذرا ذرا سی دیر میں منجھو کا دل بلیوں اچھلتا اور وہ بار بار زور زور سے پیشے کے سلسلے میں جو دو چار سورے اس نے یاد کر لیے تھے، ان کی تلاوت کرتا، ماتھے، بازوؤں اور سینے پر دم کرتا، تالیاں بجا بجا کر حصار باندھتا، مگر ظالم دل کے پنکھے کسی طرح بند نہ ہوتے۔ وہی گھبراہٹ وہی دھڑ دھڑاہٹ نہ کر جاری ہو جاتی۔ پورے بارہ بجے کے قریب کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی تو معلوم ہوا کہ ایک مزدور کی لاش آئی ہے قسمت جاگی۔ بیداری بہانہ مل گیا۔ سارے کام اس اطمینان سے کیے کہ صبح ہو گئی۔

جب وہ نہا دھو کر پلنگ پر لیٹا، تو اس نے طے کر لیا کہ ممدو کے فاتحے سے فراغت پاتے ہی وہ رحیمن خالہ سے کہے گا کہ آج ہی کرمن سے نکاح کر کے وہ اسے شام تک رخصت کر دے۔ رفیقہ کے بغیر اب رات نہیں کٹ سکتی۔ اسے یقین تھا، رحیمن اس کی بات نہ ٹالے گی۔ ممدو اپنی زندگی ہی میں کرمن سے اس کی منگنی کی بات چلائی تھی۔ رحیمن نے دونوں کی کم سنی کا عذر کیا تھا۔ اصل میں تو رحیمن کے دل میں گھاؤ اب تک رس رہا تھا، جو ممدو نے خود سے ٹھکرا کر لگایا تھا۔ بیوہ ہوتے ہی رحیمن نے ممدو کا سہارا ڈھونڈا تھا، ڈھکے پردے اپنے کو اس کی

تھا، اور اسے پکڑا دی گئی تھی پھیپھوندی لگی شیرمال ۔ لاکھ تو سے پر الٹو پلٹو پرانے پن کی مہک نہیں جاتی ۔ اس لیے سسرال گئی تو ماں کی طرف سے ایک جذبہ انتقام لیے ہوئے، طے کر کے کہ تو تو سہی کہ بدلہ لے کر چھوڑوں !

ایک دن ایک لڑکے نے منجھو کو ایک پرزہ دیا۔

لکھا تھا۔

" اللہ، اماں کی طرح آپ بھی طوطا چشم نکلے ۔ جھوٹوں خیر صلاّ پوچھنے بھی نہ آئے!۔"

منجھو کے دل میں گدگدی ہوئی۔ وہ رحیمن سے چھپا کر زرین کی خیریت پوچھنے چلا گیا، اور اس پوچھنے میں وہ مزہ آیا کہ ہر دوسرے تیسرے پوری پیچھے جانے لگا۔ داماد کو کچھ شبہ سا ہوا۔ وہ رحیمن کے یہاں شکایت لے کر پہنچا۔ وہ بیٹی کو ملامت کرنے سمدھیانے گئی۔ جب وہ جی کھول دل کھول کے بکی اور گالیوں اور کوسنوں کی پونجی ختم ہو گئی تو زرین نے ٹکڑا توڑ کر ہاتھ پر رکھ دیا۔

" یہ کاہے کا تہلکہ ہے ؟ میں تمہاری ہی تو بیٹی ہوں۔ تم نے میرا حق مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں نے حلق میں انگلی ڈال کر وصول کر لیا جاؤ، اپنے بیل کو اچھی طرح باندھ کر رکھو، اب مجھے اس سے کوئی کام نہیں !"

غرض منجھو چھٹا سانڈ بنتے بنتے، رحیمن کا نتھا بیل ہی بنا رہ گیا۔ پھر اس نے بھی منجھو کو اس طرح کس کس کر امیٹھ امیٹھ کر جوتا کہ جب برس بعد رحیمن کا دوسرا چاند، بادشاہ نمودار ہوا، تو منجھو ساری دون خاں بھول گیا تھا۔ وہ بالکل تیلی کا بیل بن گیا تھا۔ خاموش، آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی، ایک ہی محور کے گرد گھومتا ہوا اور رحیمن اسے سختی سے ہانکتی اور تیل نکالتی رہی۔

اٹھارہ انیس برس کے سن میں منجھو کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے، اور وہ تھکے ہارے ہونے کا بیوی سے اقرار کرنے لگا تھا۔ مگر رحیمن سنوں کے کوڑے برابر لگاتی اور اسے جدھر چاہتی ہنکاتی رہتی۔ وہ تسمہ پانی منجھو کی گردن پر سوار رہی اور اس نے منجھو کو نچلے بیٹھنے ہی نہیں دیا۔ اک دری دکان بھاری پگڑی دے کر سہ دری کر دی گئی۔ اب اس میں غسل اور کفن ہی کی چیزیں نہ ملتی تھیں، بلکہ مُردوں کا عطا کردہ، ہر طرح کا سیکنڈ ہینڈ سامان بھی ملتا تھا۔ پھر شادی غمی تو توام ہیں ہی۔ قناتیں، شامیانے، دریاں، چاندنیاں، میز کرسیاں، صوفے، گیس کی لالٹینیں بھی بڑھیں۔ یہ چیزیں محفل سرود ہو کہ مجلس ماتم، دونوں میں یکساں کام آتی ہیں۔ ادھر غسل خانے میں رحیمن کا کام بہ یک وقت دو دو میتوں کے غسل دینے کے مصرف میں آیا۔ نتیجے میں آمدنی تگنی چوگنی ہو گئی۔ اس حساب سے بینک میں رقم بڑھی ہی نہیں لالچ بڑھا، منجھو کی مشغولیت بڑھی۔

ایک دن کسی لکڑی والے سے قبر کے تختوں کے کمیشن کے سلسلے میں منجھو سے خاصی تو تو میں میں ہو گئی۔ رحیمن نے جو ٹھانا تو ایک مہینے کے اندر ایک بنا بنایا دو منزلہ مکان لب سڑک خرید لیا، نیچے آرے کی مشین لگا دی، اور پر پورا خاندان اٹھ کر چلا آیا۔ اپنا مکان پچاس روپے کرائے پر اٹھا دیا۔

لکڑی کا کام تو شروع کیا گیا تھا قبروں کے تختے مہیا کرنے کی غرض سے مگر سال دو سال میں اس نے پورے لکڑی کے بزنس کی صورت اختیار کر لی۔ منجھو عنسال اب ٹمبر مرچنٹ، میں تبدیل ہو گیا۔ بچے بھی انگریزی اسکول میں داخل کر دیے گئے، اور ان کے آنے جانے کے لیے ایک رکشا خرید دیا گیا۔ کارخانے کے لیے مزدوروں کے علاوہ ایک انگریزی داں منشی بھی رکھنا پڑا، اور دکان کے لیے الگ سے ایک معتبر مددگار بھی۔ منجھو کو دونوں جگہ کی نگرانی کے لیے ایک سائیکل خرید دی گئی۔ غسالی کا کام بالکل رحیمن اور اس کی بیوی پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کا عزیز کچھن اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ رحیمن ہی اب بیوی بچوں سمیت غسلخانے میں رہتا اور وہی فاتحہ کی شیرمالیں اور پلاؤ اپنے استعمال میں لاتا۔ رحیمن نے ممانعت کر دی تھی کہ اب فاتحہ، چالیسویں کا کھانا اس کے ہاں نہ بھیجا جائے۔ اللہ اس کے شہنشاہ اور بادشاہ کو سلامت

وہ پلٹ پڑی، "وہ خالہ کی دُم! اب تم ایسے ننھے نادان بھی نہیں!" اور ماں نے منجھو کو اس طرح اپنی طرف کھینچا کہ وہ کانپ کے غسل خانے میں پھسل گئی، اور پھر پھسلتا ہی چلا گیا۔ رحمن نے مردوں کو غسل دینے والے تخت کو سیج بنایا اور بیٹی کی جگہ اپنے ہی سر پر سہرا باندھ لیا!

دولہا دلہن میں پورے پندرہ برس کا فرق تھا۔ مگر پرانی دلہن ایک مشاق کھلاڑی کی طرح مزاجوں اور عمروں کے فرق کی ساری گتھیاں پھاندتی چلی گئی، اور صبح ہوتے ہی منجھو ایسا رام ہوا کہ اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔

صبح ماں کو تلاش کرتی ہوئی کرمن آئی۔ رحمن نے اس سے کوٹھری اور دالان میں جھاڑو دلوائی۔ پھول، ہار، اگر بتیاں اور عطر کی شیشیوں کا ڈبہ منگوایا۔ اپنا ٹوٹا بکس منگوایا، اور مردہ بیگموں میں سے ایک کا نیا عمدہ جوڑا جو اس نے کرمن کے جہیز کے لیے رکھ چھوڑا تھا، خود پہنا، کپڑوں میں، پنڈے بھر میں خوب عطر ملا، کنگھی چوٹی کی اور رحمن کے ذریعے مولوی کو بلا کر دو بول بھی پڑھوا لیے۔ کرمن منہ بنا بنا کر، کچھ دل میں کڑھ کر، کچھ ماں کے بڑھے چونچلوں پر ہنس کر، کچھ اپنی جگہ خجل اور شرمندہ ہو کر خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھتی رہی۔ مگر اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی نفرت کی ایک چمک بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ماں کی اس حرکت سے تپ گئی ہے اس لیے اس دن سے جو وہ اپنی سرکار میں جا کر بیٹھی تو پھر غسل خانے میں بلانے پر بھی نہ آئی۔

رحمن بڑی ہوشیار عورت تھی۔ وہ پہلے ہی سے سب کچھ سوچے سمجھے بیٹھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا، اس نے ممدو کے مرتے ہی پورا منصوبہ بنا لیا تھا جب ایک ہفتے کے جوار بھاٹے کے بعد مزاجوں میں سکون آیا تو اس نے بھولے منجھو کو "اسکیم" کا دھیان دلایا، اور اپنی اسکیم کے مطابق ممدو کے دفینے کو سڑنے سے بچایا۔ غسل خانے کے قریب ہی ایک درزی کی دکان کرائے پر لے کر اس کے وہ سامان رکھوا دیے جن کا استعمال غسل اور کفن کے سلسلے میں ضروری تھا۔ مرنے والوں کی تعداد روزانہ پانچ سے کم نہ ہوتی تھی۔ اس لیے اوسطاً ۳ روپے روزانہ کی آمدنی اور پھر غسل دینے کی اجرت ملا کر ۵۰ - ۶۰ روپیہ روز کی آمدنی اور خرچ کچھ بھی نہیں۔ کھانے کپڑے کی فکر ہی نہ تھی۔ مرنے والوں کے ورثا یہ دونوں چیزیں اس افراط سے بہم پہنچاتے کہ دوسروں کو بانٹ بھی جاتی اور کبھی کبھی بیچی بھی جاتی۔ اس لیے بینک میں اکاؤنٹ کھلا اور روز بہ روز بڑھتا رہا۔ پہلے تو غسل خانے ہی میں نجی غسل کے لیے ایک حمام بنا، مگر کافی بڑا تاکہ وقت ضرورت مردوں کے بھی کام آ سکے۔ پھر محلے ہی میں موقع کی ایک زمین دیکھ کر خرید لی گئی اور اس پر پکا ایک مکان بننا شروع ہوا۔ دس مہینے بعد جب پہلا بیٹا شہنشاہ پیدا ہوا تو اسی مکان میں ولادت ہوئی۔ غسل خانے کی ہوا اس کے نازک جسم کو نہ لگنے دی گئی!

شہنشاہ کی ولادت کے سلسلے میں روٹھی ہوئی کرمن بھی بلائی گئی۔ روٹی ٹکڑ، نکنے بچے کھلانے اور گھر کی صفائی میں اس سے بڑی مدد ملی، مگر چند ہی دنوں میں رحمن کو محسوس ہوا کہ نوجوان میاں کی آنکھیں بوڑھی ماں اور جوان بیٹی کو نظروں میں تولنے لگی ہیں۔ کرمن کی چال ڈھال سے بھی لگاوٹ والی چشمک نمایاں ہونے لگی۔ بیٹی پر کڑی نگاہ رکھنے کے لیے رحمن نے غسل خانے کا کام قطعی چھوڑ دیا پھر جلد ہی ایک رشتہ ڈھونڈ کر ایک دولہا جو پچاس سالہ کلرک کے ہاتھ میں کرمن کا ہاتھ تھما دیا۔

شادی خوب دھوم دھام سے کی۔ اس کے پاس نہ جوڑوں کی کمی تھی اور نہ کسی اور جہیز کے سامان کی۔ اللہ مرنے والی بیگمات کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، ان کا آثار اغسال ان کے گھر ہی تو آتا تھا۔ رئیس زادیاں مردہ ماں بہنوں کے نئے تہہ شدہ جوڑے ہوں، یا قیمتی سنگار کی چیزیں، چھونا تک پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کے دلوں میں ان چیزوں پر نظر ڈالتے ہی طرح طرح کے وہم اٹھتے تھے۔ تخیل ملک الموت کو سامنے لا کھڑا کر دیتی تھی۔ یہی حال رئیسوں امیروں کا تھا۔ مرنے والے باپ بھائی، بیٹے کی کوئی چیز گھر میں نہ رہنے پاتی تھی۔ یہ سب حصے میں آتی ہیں مولوی کے، مثال کے، یا اس سے بھی نیچے اتر کر شہدوں کے۔ چنانچہ منجھو اور رحمن کے گھر میں جہیز کی کمی نہ تھی۔ جہیز دیا گیا اور جی کھول کر دیا گیا، چھکڑوں پر لاد کر دیا گیا۔ مگر کرمن جو چاہتی تھی وہ اسے نہ ملا۔ اس کے منہ کا تر نوالہ رحمن نے چھین کر خود کھا لیا!

تم تو ہمیشہ غسل خانے کا کیڑا بنا رہنا چاہتے ہو، مگر کان کھول کر سن لو، میں اپنے بیٹوں کے نتھنوں تک اس کی بو بھی نہ پہنچنے دوں گی۔ جس طرح ہوگا جن داموں پر بکے گی، میں دکان بیچ کر سانس لوں گی، یہ نہ بھولو کہ مکان، دکان، کارخانہ یہ کوٹھی سب میرے نام ہیں۔ میں یہ سب کچھ اپنے بیٹوں پر سے وار دوں گی۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

اس لیے ہوا وہی جو رحیمن چاہتی تھی۔ منجھو نے رحمن کے ہاتھ ۵۰ ہزار کی مالیت کی دکان ۱۰ ہزار میں بیچ دی اور سارے دام خاموشی سے رحیمن کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ رحیمن خوشی سے کھل اٹھی۔ اس نے برسوں کے بعد وضو کیا اور دو رکعت نماز شکر پڑھی۔

نہ جانے کارساز عالم کو یہ سجدۂ شکر اس کی حکمت پر طنز معلوم ہوا، اس لیے، یا یہ کہ منجھو نے یہ آخری قربانی ایک آہ جگر دوز و دل سوز کے ساتھ چڑھائی تھی اس لیے۔ ہوا یہ کہ جب دکان کی فروخت کے دام بھی کارخانے میں چھونک دیے گئے اور شیشم، ساگون کے شہتیروں، بلیوں، دھنیوں، تختوں کا اوپر نیچے انبار لگ گیا، تو ایک دن بے پروا مزدور کی جلتی ہوئی بیڑی کا ٹکڑا، برادے کے ڈھیر میں گر گیا اور منجھو کے دل کی طرح نظروں سے پوشیدہ جلتا، سلگتا رہا۔ جب شام کو منجھو کارخانے میں بڑا سا قفل ڈال کر کوٹھی چلا گیا تو برادے سے چنگاریاں اڑیں، پھیلیں اور بڑھیں اور ایسی آگ لگی کہ لاکھوں کی لکڑی ہی نہ جل کر خاک ہو گئی، بلکہ ہزاروں ہزار کی مشینیں اور مکان کی دیواریں اور چھتیں تک پگھلیں، ٹوٹیں اور خاکستر بنیں۔

ٹیلیفون کے ذریعہ آتش زدگی کی اطلاع پاتے ہی منجھو بھی آیا، رحیمن بھی آئی، ایم بی بی ایس کا طالب علم شہنشاہ بھی آیا۔ انجینئرنگ کالج میں تعلیم پانے والا بادشاہ بھی آیا، اور شہر کے فائر بریگیڈ کے بڑے بڑے انجن بھی آگئے مگر جسے آگ لگی جلکھے اسے کون رکھے، بس اتنا ہو سکا کہ ہمسایوں کا گھر سلامت رہا۔ مگر رحیمن کا لکڑی کا کارخانہ لاکھ کے گھر کی طرح آناً فاناً بھسم ہو گیا۔ وہ موٹر پر بیٹھی بت بنی اپنی آرزوؤں، تمناؤں، خوابوں کے محل کی چتا دہکتی دیکھتی رہی۔ جب اسی طرح سکتے کے عالم میں گھر پہنچی تو قلبی دورہ پڑا اور چند منٹوں میں تڑپ کر رہ گئی۔

برسوں کے بعد منجھو نے رحیمن کے جنازے کے ساتھ غسل خانے میں قدم رکھا۔ اب رحمن کی جگہ چھجن مع اپنی بیوی کے دالان اور کوٹھری میں رہتا تھا۔ دالان میں دو کھٹولے پڑے تھے۔ فرش پر ایک پھٹی سی دری بچھی تھی۔ اس پر ایک سیانا، جگہ جگہ پچکا پاندان رکھا تھا۔ ایک در کے سامنے ایک الگنی پر ایک پیوند لگی دھبہ دار بدرنگ شال چادر پردے کے طور پر پڑی تھی۔ اس کے پیچھے ایک چودہ سال کی قبول صورت چنچل لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ بار بار اس طرح جھانکتی کہ نظر اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔

دفعتہً چھجن کی بیوی نے غسل خانے سے پکارا "اری چھبو بیٹی، تم بھی چلی آؤ، بھاری لہاس ہے، مجھ سے اکیلی نہیں سنبھلتی۔" اور وہ لڑکی بڑا سا گھونگھٹ نکال کر سب کے سامنے سے ٹیڑھے میڑھے قدم رکھتی، چھجن کی بیوی کے پاس اس طرح گئی کہ شہنشاہ بادشاہ نے بھی آنکھ کے آنسو پونچھ کر، اسے کنکھیوں سے گھورا۔

منجھو کے دماغ نے بھولی بسری تصویریں کٹی پٹی فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیں۔ اس کا ماں کے ساتھ پہلی بار غسل خانے میں آنا، ممدو کا اسے روک کر شیرمال اور بالائی، پلاؤ اور قورمہ کھلانا، پھر پہلی رات کا ڈر اور ممدو کا کھاری پسینے سے مہکتا سینہ۔ پھر وہ رحیمن کا غسل خانے میں نہانا اور وہاں کی غضب کی پھسلن، پھر کرمن کا ٹہی لٹک سے اس کے سامنے اسی لڑکی کی طرح بار بار سینا۔ پھر کرمن کی سسرال میں خیر صلاح کے لیے جانا اور اس کا اپنی سوتیلی ماں کی طرح اسے دبوچ بیٹھنا اور راز کھلنے پر رحیمن کی برہمی اور علاج بالمثل...... اور کرمن کا چھٹے مہینے ایک نوجوان تانگے والے کے ساتھ بھاگ جانا۔ کاش وہ اس وقت ہوتی!

منجھو گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور صحن میں ٹہلنے لگا۔

سکے، وہ نہیں چاہتی کہ ان لاڈلوں کے منھ میں اس طرح کے کھاؤں کا ایک چاول بھی اُڑ کر پڑے!

پھر پانچ سات سال میں لکڑی کا کام اور بڑھا تو کارخانے میں تنگی محسوس ہونے لگی۔ اسے باقاعدہ چلانے کے لیے ایک گودام اور ایک بڑے دفتر کی سخت ضرورت پڑی۔ طے ہوا کہ اوپر کا حصہ بھی خالی کروا یا جائے۔ مگر سوال اٹھا کہ خود کہاں جائیں، کہاں رہیں۔ اپنا مکان کرایہ پر اٹھا ہوا تھا۔ کرایہ داروں کو آج کل مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔ رحیمن کے مکان میں جو شخص رہتا تھا وہ بڑا کھرا آسامی تھا۔ مہینے کے مہینے پچاس روپیہ پہلی تاریخ کو ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ اُس سے کس منھ سے کہیں کہ مکان خالی کردو۔ پھر اب وہ رحیمن کے خاندان کے لیے ناکافی تھا۔ دالان اندر دالان، چار بغلی کمرے، باورچی خانہ، حمام، پاخانہ، پائپ، بجلی، ساری ضرورت کی چیزیں موجود تھیں، مگر اب رحیمن بڑی آدمی تھی، اور شہنشاہ، بادشاہ، منجھو بھی اسی کی نسبت سے بڑے آدمیوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ اس لیے مکان میں جانا اپنے کو گھٹانا تھا۔ اب تو ایسا مکان ہونا چاہیے جس میں ہر لڑکے کے لیے کمرہ ہو، لائبریری ہو، ڈرائنگ روم ہو، رحیمن اور منجھو کے لیے الگ الگ بیڈ روم ہوں۔ ہر کمرے کے ساتھ غسل خانہ اور فلیش ہو۔ پھر نوکروں چاکروں کے لیے بھی کچن سے متصل لیٹنے سونے کے لیے دو کمرے ہوں۔ موٹر کے لیے ایک گیراج ہو اور لان کے ایک گوشے میں چمن لگانے والے مالی کی ایک کوٹھری بھی۔

اس لیے تیسرے مکان کی نہیں، ایک شاندار کوٹھی کی تعمیر ضروری ہوئی۔ رحیمن کے مزاج کی خصوصیت تھی کہ جو بات طے کرتی، بس اس کا جھٹ پٹ ہو جانا ضروری تھا۔ پھر نہ وہ روپے کا منھ دیکھتی تھی اور نہ کوئی حیلہ حوالہ سنتی تھی۔ منجھو تو حکم کا بندہ تھا ہی، سارے کام چھوڑ کر اس ڈیوٹی پر لگا دیا گیا۔ ہفتے کے اندر ہی موقع کی زمین دیکھ کر مہنگے داموں خریدی گئی اور ایک کا چار لگا کر کوٹھی تین مہینے میں تیار ہو گئی۔ خوب صورت فرنیچر، پردے اور مختلف مغربی سامانوں سے سجا دی گئی۔ سُگھانی رحیمن نے نئی کوٹھی میں شاندار دعوت ولیمہ دی اور اپنے پورے جاہ و حشم کے ساتھ اس میں منتقل ہو آئی۔ گراج کو خالی رکھنا پسند نہ آیا، اس لیے ایک موٹر بھی خرید لی۔ اس نئے ماحول میں وقار حاصل کر لینا آسان کام نہ تھا۔ ہمسایہ میں سب ہی بڑے لوگ تھے۔ ان سے بینگ بڑھانے کے لیے گندے ماضی سے رشتہ توڑنا ضروری تھا۔ لڑکے بھی "ماشاء اللہ جوان" ہو چکے تھے۔ اسکول سے نکل کر کالجوں میں پہنچے تھے۔ اُن کے کانوں میں اب تک بھنک نہ پڑنے دی تھی کہ ماں باپ کا اصلی پیشہ کیا تھا۔ اس لیے منجھو پر قدغن شروع ہوئی۔

"دکان پر نہ بیٹھو، جس طرح بنے اسے بیچ ڈالو۔ موت کس کا گھر نہیں جھانکتی نئے ہمسایوں میں سے اگر کسی نے تمہیں دیکھ لیا، یا شہنشاہ، بادشاہ کو پتہ چل گیا، تو سارا کیا دھرا مٹی میں مل جائے گا۔ ہماری ناک کٹ جائے گی اور بچوں کا مستقبل برباد ہو جائے گا!"

مگر منجھو کو تو دکان ہی سے محبت تھی۔ اس کی بُو، اس کی سرانڈ، منجھو کے خمیر میں داخل تھی۔ اُسے دکان کارخانے کے شور میں مزہ آتا اور نہ نئی کوٹھی کے چمن کی بہار میں۔ ربڑ کے گدّے والی اسپرنگ کی مسہری پر جب وہ سوتا تو ہر کروٹ پر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ جب سے کوٹھی میں آیا تھا اسے اپنے بیڈ روم میں الگ سونا پڑتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی کے پہلو میں سونے کا عادی تھا۔ ماں کی گود سے چھوٹا تھا تو ممرو کا آغوش ملی تھی۔ اس سے بچھڑا تو رحیمن نے کبھی بغل سے الگ نہ ہونے دیا۔ اب جب سے کوٹھی میں آئی تھی، وہ انگریزی قسم کی "میم صاحب" بن گئی تھی، یا اپنے دیش کی کوئی رانی مہارانی۔ جب مرضی ہوئی ایک خاص ٹھسک سے منجھو کے پاس چلی آئی، ورنہ وہ اپنے بیڈ روم میں، یہ اپنے بیڈ روم میں خراٹوں کی کیزی بولتی مگر الگ الگ پنجروں میں۔

اس لیے منجھو نے اس حکم کے بجا لانے میں خدا آنا کانی کی۔ سو روپے روز کی آمدنی اس طرح ہاتھ سے کھو دینے کا عذر کیا، کوئی اچھا گاہک نہ ملنے کا بہانہ کیا۔

بس ایک دن وہ برس پڑی، "تمہیں کیا، تم تو بس روپوں کا منھ دیکھتے ہو، تمہیں شہنشاہ اور بادشاہ کے آگم کی کوئی فکر نہیں۔

جب منجھو نے یہ دعوت خوشی خوشی منظور کر لی تو جمن کچھ سویرے ہی دکان بڑھا کر چلا گیا۔ منجھو نے بھی اپنے گھر جا کر چائے پی اور ملازم کو اطلاع دے دی کہ رات کا کھانا وہ گھر پر نہ کھائے گا۔ صرف شہنشاہ ہی ساتھ رہتا تھا۔ بادشاہ تو علی گڑھ میں تھا۔ کہہ دیا کہ بھیا سے بتا دینا، میرا انتظار نہ کریں۔ پھر اس نے شیو کیا۔ نہایا، کپڑے بدلے، بار بار اپنی صورت آئینہ میں دیکھی۔ ۴۵ برس کا سن مگر شکل سے ۴۰ کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ رحمن ہی نہیں، کسی نے بھی اس کی دھونس نہ مانی۔ خود شہنشاہ اور بادشاہ کبھی اس کو باپ سمجھ کر مرعوب نہیں ہوئے۔ اللہ غلام بنائے، غلام صورت نہ بنائے اور یہاں تو صورت میں غلام سیرتی بھی بڑھ گئی تھی۔ اپنی کوئی رائے نہیں جو کچھ دوسرے کہیں، اسی پر عمل۔

آٹھ بجے کے قریب جب وہ جمن کے گھر پہنچا تو دیکھا، اس کے یہاں خاصی چہل پہل ہے۔ گیس کی کئی لالٹینیں روشن ہیں، دالان میں ایک طرف مسہری بچھی ہے، جس پر خوب صورت پلنگ پوش بچھا ہے۔ بقیہ حصے میں دری چاندنی بچھی ہے۔ مسند گاؤ بھی لگا ہے۔ بچھن کی بیوی باورچی خانے میں اور بچھن دسترخوان بچھانے اور کھانا چننے میں مصروف ہے۔ کھانا سب لذیذ تھا کسی بڑے آدمی کے ناکتے چالیسیا کا تھا۔ بالکل توبے کا معلوم ہوتا تھا۔

جب کھانا ختم ہوا تو جمن اپنا "ڈیڑھ خما" لے کر منجھو کی بغل میں آ کر بیٹھا اور ذرا کھانس کر بولا، "منجھو میاں، جب سے تم نے کوٹھی بیچی ہے، میں یہی سوچ رہا ہوں کہ اب تم کیا کرو گے کیسے وقت کٹے گا؟"

منجھو نے کہا، "یہی تو مجھے بھی فکر ہے۔"

جمن نے پھر ذرا کھانس کر کہا، "دیکھو منجھو میاں، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہیں دکان کا کام بہت پسند ہے۔ تو بس ایسا کرو کہ اس میں آدھے کے ساجھے دار بن جاؤ۔"

منجھو نے کہا، "چاہتا تو میں بھی ہوں، مگر میرے پاس روپے کہاں ہیں؟ جس جس سے لکڑی ادھار آئی تھی، سب کا حساب صاف کر کے جو کچھ بچ رہا میں نے شہنشاہ بادشاہ میں برابر برابر بانٹ دیا اب سب کچھ انھیں کا ہے۔"

جمن نے حقہ منجھو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "ارے تم سے دام کون مانگتا ہے؟ میری جھمو کے جہیز میں لے لو۔"

منجھو نے حقے کی نے کی طرف منہ بڑھاتے ہوئے رک کر جمن کی طرف دیکھا۔ پھر کئی کش جلدی جلدی لگائے اور دبی زبان سے اس طرح بولا، گویا اپنے دل ہی سے باتیں کر رہا ہے، "مگر ___ مگر شہنشاہ اور بادشاہ کیا کہیں گے؟"

جمن نے کہا، "ارے کہیں گے کیا! تم نے انھیں مکان دے دیا۔ ان کی پڑھائی کے روپے جمع کرا دیے، سال دو سال میں جب وہ ڈاکٹر انجینئر ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے تو تمہیں پہچانیں گے بھی نہیں۔ تمہارے پیٹنے والی بات تو پھوٹ ہی چکی۔ منجھو عنال کو باپ کہتے ہوئے وہ ابھی سے شرماتے ہوں گے۔ ارے دور کیوں جاؤ، میری گلی میں مل جاتا ہے تو باپ کے سلام کو ہاتھ تک نہیں اٹھاتا!"

اتنے میں بچھن آ گیا۔ اس نے جمن سے خاص انداز میں کہا، "گلی میں مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ بلا رہے ہیں۔" اور جمن کے باہر چلے جانے کے بعد وہ منجھو سے بولا، "منجھو میاں، کیا سوچ رہے ہو؟ ارے میاں تم نے ساری جوانی باسی چپاتی چبائی، اب تازہ تازہ گرم گرم کڑھائی سے نکلتی پوری کھاؤ۔ سچ مانو، اس کا مزہ کچھ اور ہی ہے!"

اور وہ ہنستا ہوا باورچی خانے کی طرف گیا اور وہاں سے ایک لڑکی کو قیمتی دوشالہ اوڑھائے ساتھ لا کر منجھو کی بغل میں بٹھا کر بولا، "لو، گھونگھٹ الٹ کر دیکھو۔ آدھی دکان اور اس پورے مکان کے ساتھ سودا برا نہیں ہے۔"

دفعتہً اس کی نظر اپنی کوٹھری پر پڑی۔ بے ساختہ جی چاہا کہ جھانک کر دیکھے اب اس کی کیا حالت ہے۔ ایک اور پرانی رفیقہ اس کی خیریت پوچھ آئے۔ مگر بہت سے بڑے آدمی اس کے پاس بیٹھے تھے۔ شہنشاہ اور بادشاہ منل خانے کی خاص طرح کی باند کی خاطر منہ پر رومال رکھے برداشت کر رہے تھے، اور باپ کی گھبراہٹ کو تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ مگر منجھو کے پاؤں چلنے ہوئے تھے۔ اس لیے اس نے قدم باہر کی طرف موڑ دیے۔ وہ دوکان پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے رومال جیب سے نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا اطمینان کی سانس لی، گویا بڑے خطرے سے بال بال بچنے کے بعد جائے پناہ مل گئی ہو۔

رحمین کی شادی جتنی چپ چپاتے ہوئی تھی اتنے ہی دھوم دھڑکے سے اس کا جنازہ اٹھا۔ منجھو کے اشارے پر جمن نے بڑا اہتمام کیا۔ زرکار چوبی شامیانے کے نیچے بند صندوق پر کارچوبی غلاف پڑا ہوا، اس پر منجھو کا دیا ہوا پانسو کا کشمیری دوشالہ، کئی آدمی بخورات کی انگیٹھیاں ہاتھوں میں لیے، کئی قرآن خوان خوش الحانی سے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے ہوئے بڑے مجمع کے ساتھ تال کٹورے تک گئے۔ قبلہ و کعبہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ قبر میں دونوں بیٹوں نے اپنے ہاتھوں سے اتارا۔ تلقین پڑھانے کے بعد جب تختے جڑ دیے اور مٹی ڈھیلوں اور پھاؤڑوں سے بھر دی گئی تو ہر ایک نے نیچے گرد اگرد فاتحہ پڑھا۔ قبر لیٹے کی نئی چادر سے ڈھک دی گئی اور اتنے پھول چڑھ گئے کہ آس پاس کی زمین تک چھپ گئی۔

کارخانے میں آگ لگی اور بجھی۔ رحمین کے دل میں آگ لگی اور ٹھنڈی ہو گئی۔ مگر قرض داروں کے کھاتوں میں بھی تو آگ لگی تھی۔ رحمین کے سوم ہی کے دن سب اس آگ کو بجھانے والا پانی لینے اس کی کوٹھی پر دوڑ پڑے۔ بڑے بزنس کی لین دین، ساکھ پر ہوتی ہے۔ وہ تو لاکھوں کا مال اٹھا لو۔ خوش خوش مل جائے گا وہ جاتی رہی، تو کوڑی کا مال بھی لاکھ جتن کر کوئی ہاتھ نہ لگنے دے گا۔ ہر طرف ساکھ رحمین کی، منجھو اس کے رہتے کسی گنتی شمار میں نہ تھا۔ اب رحمین نہ رہی تو اسی کے ساتھ ساکھ بھی خاک میں مل گئی۔ یہی سبب تھا کہ سب پریشان تھے۔ یہاں بھی یہی پریشانی کہ سب کچھ کیا دھرا تھا منجھو کا، مگر ہر جگہ نام چڑھا تھا رحمین کا۔ گویا منجھو محض چاکر تھا، مالکن وہی تھی۔ مگر اس کے مرنے کے بعد اسے زیادہ سے زیادہ روپے میں دو آنہ حق شوہری مل سکتا تھا، ورنہ سب کچھ تھا شہنشاہ و بادشاہ کا۔ قرض ادھار والے یہ سب جانتے تھے، اسی لیے لڑکوں کی موجودگی ہی میں تقاضے لے کر آئے تھے۔ منجھو کو ان کی جلد بازی پر غصہ تو آیا، مگر وہ کسی قسم کا نہ چاہتا تھا۔ اس نے بیٹوں کو راضی کر کے پہلے تو موٹر نکالی۔ پھر پانچ سات دن میں ایک لاکھ کی کوٹھی ساٹھ ہزار میں بیچ دی۔ قرض سے سبکدوش تو ہوا مگر اب سب رہیں کہاں؟ نظر اپنے ہی گھر کی طرف گئی۔ کرایہ دار نے پورے ایک ہزار روپے لیے تو مکان خالی کیا۔ منجھو بیٹوں سمیت اس میں اٹھ آیا۔

جمن کئی دن تو منجھو کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ نظروں نظروں میں اسے تولتا پرکھتا رہا۔ اس کی بھی اب ایک حیثیت ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا مکان بنوا لیا تھا۔ بیوی مر گئی تھی۔ بس ایک جوان بیٹی رہ گئی تھی۔ لڑکا پڑھ لکھ کر سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا الگ گھر کر لیا تھا۔ جمن کو لڑکی کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا، اسی لیے اسے دن میں مکان میں اکیلا نہیں چھوڑتا۔ صبح کو جب دکان پر آتا تو بیٹی کو منجھلے نانے پہنچا دیتا کہ جمن کی بیوی اس پر نگاہ رکھے گی۔ لونڈیا راہ سے بے راہ نہ ہونے پائے گی۔ رات کو گھر جاتے وقت پھر اسے ساتھ لے جاتا۔ جمن کو یہ ہیرا پھیری پسند نہ تھی۔ اچھے لڑکے کی تلاش تھی۔ کوئی کماتا بیٹا بھلے اطوار کا مل جائے تو جمن لونڈیا کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر سبکدوش ہو جائے۔

ایک دن اس نے کچھ سوچتے ہوئے منجھو سے کہا، "منجھو میاں بہت دنوں سے ہم نے تم نے ساتھ کھانا نہیں کھایا ہے آج شام کو ہمارے یہاں دال دلیا کیوں نہ کھاؤ۔"

منجھو نے گھونگھٹ اٹھا کر دیکھا، تو یہ وہی لڑکی نکلی جو غسل خانے میں رحمین کے جنازے کو نہلاتے وقت اپنی چھب دکھلا گئی تھی۔ اس کا جوان جسم اسی دوشالہ میں لپٹا ہوا تھا، جو اس نے رحمن کو رحمین کے صندوق پر ڈالنے کے لیے دیا تھا اور دفعۃً ہوا کے ایک نے کافور کی بو فضا میں بکھیر دی جو منجھو کے لیے عطر عروس بن گئی۔

منجھو نے چھمو کی طرف اشارہ کرکے شرارت سے کہا، "ارے ان سے بھی پوچھ لیا ہے؟"

بجھن ہنس کر بولا، "ان سے مولوی صاحب ابھی پوچھے لیتے ہیں" اور اس نے ذرا بلند آواز سے پکارا، "رحمن چچا مولوی صاحب کو اندر ہی لیے آؤ نا!"

اور منجھو نے بجھن کی آنکھ بچا کر چھمو کی ٹھوڑی میں ایک انگلی لگا کر آہستہ سے پوچھا، "منظور ہے؟"

اس نے جواب میں منجھو کی ران میں اس زور کی چٹکی کاٹی کہ اس کے منھ سے بے ساختہ "اف" نکل گئی۔

مولوی صاحب نے جب دونوں جانب سے وکیل بن کر نکاح پڑھا دیا اور رحمن کے دیے ہوئے دس دس کے پانچ نوٹ جیب رکھ لیے تو وہ چلنے کے ارادے سے کھڑے ہوئے اور بولے، "رحمن میاں میں تو چلا، مگر تم بھی جلدی کرو!"

بجھن نے سوالیہ انداز سے رحمن کو دیکھا۔ وہ بولا، "مولوی صاحب خبر لائے ہیں کہ شاہ گنج والے گونگے نواب چل بسے۔ ڈری سہمی بیٹھی ہیں۔ اس لیے راتوں رات ان کا سب انتظام کرنا ہے۔ آؤ، ہم لوگ بھی چلیں۔ بڑے لوگ ہیں، اچھے پیسے ملیں گے۔" اور اس کے مسکرانے پر سب کے دانت نکل آئے۔

جب بجھن کی بیوی مولوی صاحب کے لیے سر پر خوان دھرے اور بجھن دو دو لالٹینیں لیے گھر سے نکلے تو رحمن نے منجھو سے باہر جاتے ہوئے کہا، "منجھو دولہا! اندر سے کنڈی بند کر لینا۔" اور قبل اس کے منجھو اپنی جگہ سے اٹھے، چھمو دلہن چمکتی اٹھی اور نے جھپٹ کر کنڈی چڑھا دی!

(بشکریہ سریتا۔ دہلی)

سیلاب کی راتیں

پہلی رات۔ آسمان کا چہرہ کسی نہائی دھوئی کشمیری دوشیزہ کے رُخِ زیبا کی طرح صاف تھا۔ نہ بادلوں کے آنچلوں کے گھونگھٹ، نہ بجلی کے چمکتے آویزے، اور نہ دھوپ ہی میں تاش بادلے کی کیفیت۔ ایسا محسوس ہوتا کہ نہ تو برسات کا موسم تھا، اور نہ ابھی تین دن پہلے لکھنؤ میں دھواں دھار بارش نے پانچ سو گھر زمین دوز کر دیے تھے۔ حضرت گنج کی وہی گہما گہمی تھی۔ امین آباد میں وہی آدمیوں کی ریل پیل، چوک میں وہی لٹی ہوئی شامِ اودھ کی خوشبوئیں اور ڈالی گنج میں وہی اناج کو اور بھی مہنگا کرنے کے مشورے۔ چھوٹے دوکان دار دیوالی کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ لیّا بھونی جا رہی تھی، چوڑا کوٹا جا رہا تھا۔ کھلونے بنائے جا رہے تھے نئے نئے برتن دوکانوں پر سجائے جا رہے تھے اور لڑکوں نے ابھی سے پٹاخے داغنا اور پھلجھڑیاں چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔

گومتی کے تیور البتہ بدلے ہوئے تھے، اس کا دامن پھیلتا جاتا تھا، اس کی غرّاہٹ میں دہشت انگیزی آگئی تھی۔ اس کے سینے پر درخت چھپر، کھاٹ، لاشیں، بیل، گائیں، بہتی دکھائی دینے لگی تھیں۔ مگر ڈالی گنج والوں کے لیے گومتی کے یہ غرّے ڈبے نئے نہ تھے، یہ ان کی جانی پہچانی چیز تھی، دریا کنارے کے سو پچاس گھر، آس پاس کے چند گاؤں ہر سال ہی گرتے بہتے تھے۔ وہ ایسے مناظر کے عادی تھے۔ نہ انھیں اس میں کوئی نئی بات دکھائی دیتی تھی اور نہ کوئی نیا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

رام بھروسے ہر چیز سے بے خبر اور بے پروا لکشمی دیوی کی مورتی بنانے میں مشغول تھا۔ اس نے سیٹھ رام داس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اب کی دیوالی پر لکشمی دیوی کی ایسی مورتی انھیں بنا کر دے گا جیسی نہ آج تک کسی سنگ تراش نے بنائی ہوگی، نہ کسی کمہار نے اور نہ کسی سادہ کار نے۔ سیٹھ جی کے گھر میں لکشمی کی بہت سی مورتیاں تھیں۔ سونے چاندی کی بھی، دوسری دھاتوں کی بھی، صندل کی بھی، آبنوس کی بھی، سنگِ مرمر کی بھی اور سنگِ بغلم کی بھی۔ لیکن رام بھروسے کا دعویٰ تھا کہ وہ مٹی کی ایسی مورتی بنائے گا کہ ان میں سے ہر ایک اس کے سامنے ماند پڑ جائے گی۔

رام بھروسے لکھنؤ کے کمہاروں کے اس خاندان سے تھا جس کے بنائے ہوئے کھلونے ہندوستان ہی نہیں، غیر ملکوں میں بھی ڈرائنگ روم کی زیبائش کا سامان تھے۔ فن تو اسے اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا، لیکن قدرت نے بھی اسے ایجاد و اختراع کا مادہ دینے میں بخل سے کام نہ لیا تھا۔ اس نے خاندانی روایت کے خلاف ہائی اسکول تک تعلیم بھی حاصل کی تھی اور وہ اپنے گھر سے قریب والے آرٹ کالج میں دوسرے تیسرے جا کر مجسمہ سازی کے بہترین نمونے بھی دیکھتا رہتا تھا۔ وہ نئے سانچے بناتا، کھلونوں کی مٹی میں نئے نئے مسالے ملا کر تجربے کرتا، آنوے سے نکالنے کے بعد کھلونوں، مورتیوں کو ریتی سے، ریگ مال سے گھس گھس کر کھرچ کھرچ کر ان کا حسن بڑھاتا، رنگ روغن کے ذریعے ان کے چہروں سے طرح طرح کے جذبات ظاہر کرتا،

منجھو کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "تو دیکھو، سب چیزیں سنبھال کر رکھ دینا اور کل ضرور چلے آنا!.....؟"

رام بھروسے نے پوچھا۔ "ارے دونوں بچے کہاں ہیں؟"

منجھو نے کہا۔ "میں نے انھیں رنبھیر، پان والے، کے ساتھ پہلے ہی سے لوہے والے پل پر بھیج دیا ہے.....؟"

رام بھروسے بولا۔ "یہ تو تم نے اچھا ہی کیا۔ پر اب تم بھی جلدی کرو۔ شام ہونے کو آئی، بچے گھبراتے ہوں گے!"

منجھو جھپٹتی ہوئی کمرے میں گئی، اس نے کچھ زیورات، کچھ روپے بکسوں میں سے نکالے اور ان کی پوٹلی بنا کر اُسے ہاتھ میں لیے تیز تیز گھر سے باہر چلی۔ مگر دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ پھر پلٹی، اس نے کنجیوں کا بڑا سا گچھا بھروسے کی طرف پھینکا۔ "دیکھو سارے بکسوں کے تالے دیکھ لینا، باہری دروازے پر بڑا علی گڑھ والا لگا دینا..... اور دروازے سے نکلتی نکلتی بولی۔ "اور کل ضرور چلے آنا!"

بھروسے مسکرایا۔ اس نے "اُنو کھی ناگن" کو اٹھا لیا۔ اس نے گھما گھما کر ہر رُخ سے دیکھا۔ خود ہی بول اٹھا "بڑی رنگیلی چھبیلی ہے رے!"

اور اس نے اپنی اس ناگن کو لکشمی دیوی کے چرنوں میں لٹا کر بانکے بہادر کو اٹھا لیا۔ اور اسے چھیلنے، تراشنے اور وہی مصرعہ گنگنانے لگا۔ "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں! کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!" وہ یونہی منہمک تھا کہ اُسے محسوس ہوا جیسے اندھیرا سا ہو رہا ہے، وہ گھبرا کر صحن میں نکل آیا۔ سورج نے سیاہی مائل چادر میں منہ چھپا لیا تھا۔ فضا میں اڑتی ہوئی چڑیاں اپنے اپنے بسیروں کی طرف چلی جا رہی تھیں۔ محلّے کا شور، جس سے ہر وقت گھر گونجا رہتا تھا، بالکل سنائی نہ دیتا تھا۔ اندھیری راتوں کے، بارہ بجے کے بعد والے سناٹے کی کیفیت تھی۔ نہ کسی آدمی ہی کی آواز آتی تھی اور نہ ان کتوں کی جنھوں نے کئی راتوں سے رو رو کر کان پکا دیے تھے۔ بس ایک خاص قسم کی آواز تھی جو سرسراہٹ سے ملتی جلتی، کچھ چھپ چھپ میں بدل جاتی تھی۔

رام بھروسے کو وحشت سی ہونے لگی۔ اس نے گھر کے کونے کونے پر نظر ڈالی۔ ہمیشہ کا ہنستا ہوا گھر اس وقت بھیانک محسوس ہونے لگا۔ اس نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اب بھی نہائی دھوئی دوشیزہ کی طرح صاف تھا۔ البتہ صباحت پر ملاحت غالب تھی۔ اور پچھم دکن کے کونوں پر دو تارے جھلمل جھلمل کرنے لگے تھے۔ ان کے درمیان سے قازوں کی ایک قطار اڑتی چلی آ رہی تھی۔ ان کے سپید پروں پر ڈوبتے سورج کی کوئی تھکی کرن ایک لمحے کے لیے دم لینے کی غرض سے بسیرا لیتی اور وہ افشاں بھری مانگ کی طرح چمک اٹھتے۔

بھروسے اس حسین منظر کے نظارے میں محو تھا کہ دفعتاً کوئی ٹھنڈی سی بھیگی ہوئی چیز اس کے پاؤں پر سے سرسراتی ہوئی گزرنے لگی۔ اس نے غیر ارادی طور پر پاؤں جھٹک دیا، تو ایک سانپ کا بچہ بھاگتا دکھائی دیا۔ وہ چیخ کر ڈنڈا اٹھانے دالان کی طرف لپکا تو سنپولیا آلوے کے پاس والے ٹوٹے کھلونوں کے انبار میں گھس کر غائب ہو گیا۔

رام بھروسے سارے جسم سے کانپنے لگا۔ اس اکیلے مکان میں سانپ کے کاٹنے اور اس کے زہر کے اثر سے ایک بھیانک موت سے دوچار ہونے کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں ایک لمحے میں کھنچ گیا۔ وہ پسینے میں نہا گیا، اسے یقین آ گیا سنپولے نے ضرور کاٹا ہو گا۔ اس نے پاؤں کو آہستہ آہستہ ہاتھ سے ٹٹولا۔ کہیں کسی خراش کی تکلیف نہیں محسوس ہوئی۔ اب اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے بڑے غور سے دیکھا۔ دانت کا کوئی نشان نہ دکھائی دیا۔ اپنی نظر پر یقین نہ آیا۔ چاہا کہ بجلی جلا کر اس کی تیز روشنی میں اسے پھر دیکھے۔ سوئچ کا کھٹکا اٹھایا، گرایا، مگر روشنی نہ ہوئی۔ اندھیارے کا راج بڑھتا ہی گیا۔ بھروسے کا ڈر بھی بڑھتا ہی گیا۔ مگر اسی حالت میں یاد آیا۔ منجھو ہمیشہ دیا سلائی کی ڈبیاں اور موم بتی کے پیکٹ ایسے ہی موقعوں کے لیے دالان کے طاق پر رکھے رہتی تھی۔ وہاں ہاتھ ڈالا، دونوں چیزیں مل گئیں۔ دھڑکتا دل ٹھہر گیا۔ بتی جلاتے ہی، اس نے اپنے پاؤں کو "انوکھی ناگن" کی مورتی کی طرح گھما گھما کر دیکھا۔ مور کے پاؤں تھے۔ کالے کالے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے، مٹی رنگے اور روغن سے داغ دار۔ یہ بدصورت، مگر سالم پاؤں، بھروسے کو اس وقت حسین ترین محسوس ہوئے۔ اس نے اطمینان

اور ایک سچے فن کار کی طرح اپنی ہر تخلیق کو بہتر سے بہتر بنانے کی دھن میں لگا رہتا تھا۔

خوش قسمتی سے اُسے منجھو جیسی بیوی مل گئی تھی۔ ملبان میں تو وہ میاں کے برابر ہی تھی، یعنی پانچ فٹ چار انچ، مگر جوڑان میں حمام کی دیوار اور چھپکلی کی نسبت تھی۔ اسی لئے رام بھروسے کے معاملے میں اس کا ماورانہ انداز دانو کھا معلوم ہوتا، نہ غیر فطری۔ اپنی چھوٹی چھوٹی چمکتی آنکھوں سے، وہ بھروسے کو بھی اسی محافظانہ نظر سے دیکھتی جس سے وہ اپنی تیرہ سالہ بیٹی مالتی، اور اپنے پانچ برس کے بیٹے منو کو دیکھتی تھی۔ منجھو نے ابتدا ہی سے میاں کی فن کاری سے تجارتی نفع اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اسی کے حسن انتظام کا نتیجہ تھا کہ گلی کے اندر کی ایک در کی دکان آج ایک بڑے کارخانے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس میں بھروسے کے دو مددگار کمہار اور پانچ مزدور کام کرتے تھے، اپنا ایک پختہ بجلی لگا ہوا مکان بن گیا تھا اور دور دراز کے ملکوں سے براہ راست بھروسے ٹوائیز کے نام آرڈر آتے تھے۔

رام بھروسے آمد و خرچ سے بے پروا، بچوں کی پرورش و پرداخت سے بے پروا منجھو کی محبت اور ممتا سے بے پروا اپنے کھلونوں اور مورتیوں کے بنانے میں لگا رہتا۔ فن کا بھگت ہو کہ بھگوان کا، دونوں کے استغراق کی حالت یکساں ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ دونوں کی منزل ایک ہی ہے، حسن مجرد کی تلاش!

چنانچہ آج بھی رام بھروسے اپنے گھر کے اندر والے دالان میں، تخت پر بیٹھا، تین مورتیوں کی تیاری میں محو تھا۔ سیتھ جی کی کشتی مکمل ہو چکی تھی۔ آنوے سے نکالنے کے بعد تیا کوڈنی، ریتیوں اور ریگ مال سے تراش اور گھس کر اور اس کو منجھے اور روغن چڑھانے میں پوری فن کاری سے کام لے کر، بھروسے نے اس مٹی کے مجسمے کو ایسا مقدس حسن دے دیا تھا اور جود و بخشش و کرم کا ایسا مجموعہ بنا دیا تھا کہ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ اب دو اور مجسموں کے بنانے میں مشغول تھا۔ ان میں سے ایک نوجوان حسینہ۔ بوٹی بوٹی سے جوانی پھوٹتی ہوئی، اور رگ رگ سے جذبۂ کشش ٹپکتی ہوئی۔ نظر میں رس، مسکراہٹ میں لگاوٹ اور انداز میں دل فریبی بھری ہوئی۔ بھروسے نے اس کا نام رکھا تھا "اڈ کھی ناگن" دوسری مورتی تھی "بانکے بہادر" کی۔ ایک راجپوتی ڈھنگ کا چھیل چھبیلا جوان۔ مضبوط ٹانگیں، پتلی کمر، چوڑا سینہ آنکھوں اور ہونٹوں کے وہ تیور کہ محسوس ہوتا کہ اگر اس میں جان ہوتی تو یہ شیر کو للکارتا اور ارجن و بھیم دیکھ لیتے تو انہیں بھی اس پر پیار آتا۔

بھروسے "اڈ کھی ناگن" کو ہاتھ سے سنبھالے اُسے آہستہ آہستہ گھماتا جا رہا تھا، اور گنگناتا جا رہا تھا "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!" کہ اچانک گھر کا دروازہ دھڑ سے کھلا، اور منجھو ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

اس نے صحن میں قدم رکھتے ہی چیخ کر پوچھا "ارے او کھلونوں سے بہلنے والے! کچھ تمہیں گھر اور بچوں کی بھی پھکر (فکر) ہے؟"

بھروسے نے اپنے اس محبوب ممتا کو کے پٹھے پر اچٹتی سی نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا "اور یہ کھلونے کس لیے بنا رہا ہوں؟"

وہ سر پر ہاتھ مار کر بولی "ہائے دیا! میں تم کو کیسے سمجھاؤں! تم کو ٹھٹھول کی سوجھی ہے اور پانی محلے میں گھستا چلا آ رہا ہے، لوگ کہتے ہیں ایسی بھیا آنے والی ہے کہ اس محلے کا کچھ نہ بچے گا، سب کچھ ڈوب، بہہ جائے گا!...."

بھروسے بڑے وثوق سے بولا "ارے یونہی بے پر کی اڑاتے ہیں پاجی! چاہتے ہیں لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھاگ جائیں۔ پھر گنڈوں، چوروں کی بن آئے!....."

منجھو نے کہا "تم کو چاہے یکین (یقین) نہ آئے، پر آدھے سے جیادہ (زیادہ) لوگ محلے سے بھاگ چکے ہیں۔ پل کے اس پار ناؤ چل رہی ہے!"

رام بھروسے نے دلاسا دیتے ہوئے کہا "اچھا، تو تم بھی بچوں کو لے کر اپنے کاکا کے ہاں چوک چلی جاؤ۔ میں کل تک یہاں کا پوری طرح انتجام (انتظام) کر کے وہیں آ جاؤں گا!"

اتنی مسلسل محنت کے بعد بھوک بھی لگی اور پیاس بھی۔ صحن کا پائپ کھول کر دو چلو منہ پر پانی ڈالا ہی تھا کہ شیں شیں کی آواز ہوئی اور پانی بند ہو گیا۔ ہے بھگوان، یہ کیا تیری لیلا ہے کہ چاروں طرف پانی، اور پینے کا پانی بند! وہ دل میں بڑبڑایا۔ پھر اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ گھڑونچی پر ایک گھڑا اور ایک گگرا رکھا دکھائی دیا۔ دونوں میں پانی موجود تھا۔ بھروسے نے گھڑا جھکا کر اوک ہی سے پانی پی لیا۔ منجھو گھر میں ہوتی تو ڈانٹ پڑتی۔ وہ یہ سوچ کر مسکرایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو خوشی بھی محسوس ہوئی کہ وہ بچوں کے ساتھ اس مصیبت سے بچ کر نکل گئی۔

رسوئی گھر میں کچھ اور کھانے کو تو نہ ملا مگر ایک باسی روٹی اور بچوں کے پینے کا آدھ سیر دودھ ابالا ہوا رکھا دکھائی دیا۔ اس نے روٹی کا ملیدہ بنایا اور اسے دودھ میں ڈال کر شکر ملائی اور خوب شکم سیر ہو کر کھا ڈالا۔ لیکن اتنی دیر میں گلی کا پانی اتنا بلند ہو گیا تھا کہ دروازے کی دہلیز سے ٹکرانے لگا تھا۔ اس کو چھپاکے کی آواز صاف صاف اندر سنائی دیتی تھی۔ بھروسے نے جھانک کر باہر دیکھا۔ ایک لہر نے آگے بڑھ کر اس کے قدم لینا چاہے۔ بھروسے کو یہ چاپلوسی پسند نہ آئی۔ اس نے جلدی سے پاؤں کھینچ کر دروازہ بند کر لیا اور بند دروازے سے پیٹھ لگائے اپنی سانس درست کرتا اور سوچتا رہا کہ اس دشمن سے گھر کو کس طرح بچایا جائے۔ پھر وہ سارے گتے اٹھا لایا جو بکسوں کے نیچے منجھو نے رکھ چھوڑے تھے۔ اور کھلونا بنانے والی گیلی مٹی کئی ٹوکری لا کر اس نے دروازے کو پٹنا شروع کر دیا۔ ایک گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد آدھے سے زیادہ دروازہ نئی دیوار سے چھپ گیا۔ مگر اب وہ تھک کر چور ہو گیا تھا اور دالان کی بتی بھی جھلملانے لگی تھی۔ بھروسے نے اطمینان کی جگہ مایوسی کی ایک نظر گھر پر ڈالی۔ موم بتیاں اور دیا سلائی کی ڈبیاں، جیب میں ڈالیں۔ منو کا کھٹولا اٹھایا اور زینے کی بتی بجھاتا ہوا اوپر پہنچا۔ وہاں بتی اب بھی جل رہی تھی اور ہوا میں ٹھنڈک سی تھی۔ جسمانی محنت سے تھکے ہوئے بھروسے کو یہ خنکی بہت پسند آئی۔ اس نے منو کا کھٹولا ٹین ہی کے نیچے بچھایا اور وہ اس پر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ چند منٹ میں وہ غافل سو گیا۔

کوئی دو گھنٹے بعد وہ ایک دھماکے اور چیخ کی آواز سن کر جاگا۔ شمع گل ہو چکی تھی اور ہر طرف اندھیرا ہی تھا۔ ایک لمحہ تک تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس نئے دیس میں، کس نئے مقام پر پہنچ گیا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جب اسے اپنے بکس دھندلے نظر آئے، تو اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے جلدی سے ایک نئی شمع روشن کی اور اسے لیے ہوئے وہ پوری چھت پر گھوم آیا۔ تین طرف تو اس کی نیچی نیچی منڈیریں تھیں۔ ان میں سے دو جانب تو گلی تھی جہاں پانی چھپ چھپ کرتا موجود تھا، تیسری طرف خود اس کا صحن تھا، چوتھی طرف جدھر ٹین تھا دیوار ذرا زیادہ اونچی تھی۔ ادھر تھا ملیا ترکاری والی کا مکان۔ اس نے آہٹ لی۔ اسی طرف سے کسی کے سسکنے اور رونے کی آواز آ رہی تھی۔ بھروسے نے "ملیا! ملیا!" پکارنا شروع کیا۔

کسی عورت کی گھٹی گھٹی آواز آئی "کاکا میں ہوں!" یہ ہریا تھی۔ ملیا کی بیٹی۔ وہ بچپن ہی میں بیاہ دی گئی تھی، ابھی اچھی طرح جوان بھی نہ ہونے پائی تھی کہ شوہر مر گیا۔ سسرال چھوڑ کر وہ ماں کے پاس چلی آئی تھی، اور جب سے آئی تھی ملیا کی دکان چمک اٹھی تھی، گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، اور ملیا نے بھروسے کی بغل میں ایک چھوٹا سا مکان بھی بنوا لیا تھا۔ منجھو ہر وقت۔ منمناتی اور ایسی ہمسائی کو کوستی کاٹتی رہتی تھی۔ مگر بھروسے کو اپنے کھلونوں سے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ ایسی باتوں پر دھیان دیتا۔ اس وقت بس اسے اتنا یاد رہا کہ ہمسائے میں رہنے والی ایک عورت مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس نے کئی بکس ایک دوسرے پر کھینچ کھینچ کر دیوار سے ملا کر، رکھے اور ان پر چڑھتا ہوا دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا تو اسے ہریا اپنی چھت پر لالٹین لیے کھڑی کانپتی نظر آئی۔

بھروسے نے پوچھا "کیا ہوا ہریا؟ ملیا کہاں ہے؟"

وہ بولی "ماتا جی دوپہر ہی سے سبز ترکاری لے کر گئی تھیں، پلٹیں نہیں۔ میں سام سے اکیلی بیٹھی ڈر رہی ہوں۔ ابھی پانی کے زور سے دروازہ (دروازہ) کٹ کر گر پڑا! اور پانی آنگن میں گھس آیا۔ مجھے اس گھر سے نکالو کاکا! میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے بچاؤ کاکا!

کی لمبی سانس لی۔

معاً خیال آیا، بجلی کیوں نہیں جلی۔ میں دیکھوں، فیوز تو نہیں ہو گیا۔" سوئچ کو آف کر کے میں نے ڈبیکنے کو لے۔ دونوں تار اپنی جگہ پر تھے۔ دروازہ کھول کر باہر گلی میں جھانکا۔ وہاں بھی کالی ماں کی سواری اُتری تھی۔ بجلی کے کھمبے کالے لبادے اوڑھے منہ چھپائے کھڑے تھے۔ اور ٹپکا دور سے بہت سے لوگوں کے چیخنے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی "ہائے بجلی بھی چلی گئی! اندھیرے میں پانی اور بھی ڈراؤنا ہو گیا!" رام بھروسے پھر کانپنے لگا۔ اپنا ہی گھر جو ساری خوشیوں کا مرکز تھا۔ جہاں آکر ساری آفتوں اور بلاؤں سے پناہ ملتی تھی، اس وقت اکیلا ہونے، اندھیرا ہونے سے سانپوں، بچھوؤں سے بھرا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بے تحاشہ چیختا ہوا باہر نکل پڑا۔ اس نے دروازے کے پٹ بھی اچھی طرح نہیں بھیڑے اور گلی کے سرے پر نکل جانے کو تیز تیز چلنے لگا۔ دفعتاً اس کا پاؤں دھپ سے پانی میں پڑا۔ اس نے جھجک کر ہلکی سی چھلانگ ماری۔ اب کے صرف تلوا ہی نہیں بھیگا، پورا پاؤں پانی میں ڈوب گیا۔ اس نے دھوتی سمیٹ کر گھٹنوں سے اوپر اٹھالی۔ گلی کے سرے تک پہنچا، اب وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں تھا۔ گلی سڑک سے بلندی پر تھی، اس لیے اس نے نیچے اترنے سے پہلے سڑک پر نظر ڈالی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ نہ آدمی، نہ کوئی جانور نظر آیا۔ عجیب بے کسی سی محسوس ہوئی۔ کس سے پوچھے، کس سے مدد مانگے، کس کا سہارا لے، کہاں جائے کہ کوئی جانا پہچانا اپنے محلے والا ملے! سامنے مٹھو مل کا سہ منزلہ مکان تھا۔ وہ اپنی کنجوسی اور اپنے سود بٹے کے لیے مشہور تھا۔ ایک روپیہ قرض دے کر سو روپے وصول کرنا، اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ بھروسے کو اس کے نام سے چڑھ تھی مگر اس وقت وہی دیوتا محسوس ہوا۔ اس نے بے اختیار زور زور سے پکارنا شروع کیا "سیٹھ جی! سیٹھ جی!" تیسری منزل کی چھت سے مٹھو چوکیدار نے جھانک کر کہا "ارے کون ہے؟ رام بھروسے کاکا؟"

بھروسے نے کہا "ہاں بھیا، میں ہی ہوں!"

وہ بولا "ارے کاکا، تم اس پار نہیں گئے؟ اب تو پل تک پہنچنے میں ہاتھی کا ڈباؤ ہے! نہ کہیں نکلنے کا راستہ ہے، نہ بھاگنے کی جگہ!"

بھروسے نے بڑی مایوسی سے پوچھا "تو پھر کیا کروں بھیا! اکیلا گھر تو کاٹے کھاتا ہے!"

وہ بولا "اب ہو ہی کیا سکتا ہے کاکا؟ بس اپنے گھر کی چھت پر جا کر کسی طرح رات کاٹو، صبح کوئی بندوبست ہو سکا تو میں تمہیں نکلوانے کی چکر (فکر) کروں گا۔"

بھروسے پلٹا۔ اب گھر پھر جائے پناہ بنا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی دالان میں جلتی شمع نے ڈھارس کا دیا دل جلا دیا۔ اس نے اندر آکر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ وہ شمع کے پاس جاکر تخت پر پاؤں لٹکا کر ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح ڈھیلا سا بیٹھ گیا۔ پورا انداز کہتا تھا کہ اب اس میں کسی مصیبت کے مقابلے کی نہ طاقت ہے، نہ ہمت۔ وہ یونہی مایوسی کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا کہ ہوا کے ایک جھونکے سے شمع کی لو لہرائی اور بانکے بہادر کا چہرہ چمکا۔ رام بھروسے کو محسوس ہوا جیسے وہ للکار رہا ہو "واہ! اسی دم خم پر مجھ جیسا بانکا جوان بنانے چلے تھے؟" اور رام بھروسے "دھت تیری کی!" کہتا ہوا اٹھا اور ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور ایک میں کئی موم بتیاں اور دیا سلائی کی ڈبیاں لے کر زینے سے چڑھتا ہوا چھت پر چڑھ گیا۔ مکان کی چھت تین طرف سے کھلی ہوئی تھی۔ بچوں کے گرنے سے بچانے کے لیے صرف دو فٹ اونچی جھجھری دار منڈیریں بنا دی گئی تھیں۔ چوتھی طرف زینے سے ملے ہوئے حصے پر ٹین کا سائبان پڑا ہوا تھا۔ رام بھروسے نے اسی ٹین کے نیچے ایک کونے میں شمع روشن کر کے رکھ دی۔ اور نیچے اترتے ہوئے دو شمعیں اور جلائیں۔ ایک تو وہیں زینے پر رکھ دی، دوسری ہاتھ میں لیے وہ کمرے میں گھس گیا۔ وہاں کئی چھوٹے بڑے بکس اور صندوق رکھے تھے۔ منجھولے ان میں بڑے بڑے قفل ڈال رکھے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے ان سب کو چھت پر پہنچا آیا۔ پھر کچھ خاص خاص کھلونے بھی ڈھو ڈالے۔ سب سے پہلے تو لکشمی دیوی کی سواری نکلی، پھر انوکھی ناگن اور بانکے بہادر کو بھی چھت کی سیر کرائی گئی۔

عورت اور مرد کے ساتھ نے دونوں کی ہمت بڑھا دی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہیں، رت جگا منا رہے ہیں اور گھر کے مختلف طاقوں پر جلتی ہوئی موم بتیاں اس سلسلے میں چراغاں کا کام انجام دے رہی ہیں۔

ہریا نے اسٹوو جلا کر کھچڑی ابالی، چٹنی بھی پیس لی۔ دونوں نے اسے اس طرح چٹخارے لے کر کھایا جیسے انھوں نے اس سے زیادہ خوش ذائقہ چیز آج تک کھائی ہی نہ تھی۔ جب ہریا برتن مانجھ دھو چکی، تو اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "کاکا، کھٹولا تو ایک ہی ہے اور ہم ٹھہرے دو جنے!" اور اس کی آنکھیں شرارت سے چمکنے لگیں۔

بھروسے نے ذرا رک کر کہا "تو کھٹولے پر سو رہ، میں یہ بکس ملا کر، ان پر گدے ڈال کر لیٹ رہوں گا!"

ہریا نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ لب کج کر کے مسکرائی، اور کھٹولے پر لیٹ گئی۔ بھروسے نے کئی بکس کھسکا کھسکا کر ملائے، گدوں کی مدد سے ان کی سطح برابر کی اور موم بتی بجھا کر ان پر دراز ہوگیا ـــــ مگر وہ ستاروں کے چھپائے ہوئے دھندلکے میں بھی، بار بار کروٹیں بدلتی ہوئی ہریا کو دیکھتا رہا، اور اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر ادھر بھی چلی جاتیں، جہاں اس کی "انوکھی ناگن" اپنی ساری لنگڑاہٹ سمیت، دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

دوسری رات۔ صبح تڑکے ہی رام بھروسے کی آنکھ کھل گئی۔ آج نہ کسی مسجد سے اذان سنائی دی اور نہ مندر سے گھنٹے اور سنکھ کی آواز آئی۔ بس ایک کوا منڈیر پر بیٹھا قائیں قائیں کر کے، ان سونے والوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔ بھروسے کو یہ بے سری قائیں قائیں بھیرویں کی طرح بھلی معلوم ہوئی۔ اس اجنبی سناٹے، خاموشی اور تنہائی میں، یہ سامعہ خراش آوازوں دل کش موسیقی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اس کے لیے کوا بلبل ہوگیا تھا۔

وہ اٹھ بیٹھا۔ رات کی غیر معمولی محنت سے، پھر بکس پر لیٹنے سے جسم اکڑ سا گیا تھا۔ اس نے بکس پر بیٹھے ہی بیٹھے کمر سے اوپر کے دھڑ کو دائیں بائیں گھما جھکا کر، اپنی رگیں پٹھے ڈھیلے کیے۔ پھر اس نے بکس سے اتر کر پندرہ بیس بیٹھکیں لگا ڈالیں۔ وہ ڈنڈ بھی کرنے جا رہا تھا کہ ہریا جاگ گئی، اور اس نے لیٹے ہی لیٹے اس طرح انگڑائی لی کہ کھٹولے کی چولیں بولنے لگیں۔ بھروسے نے رک کر اسے بغور دیکھا۔ بھدا بھدا سا نقشہ تھا، مگر رنگ صاف تھا۔ اس وقت، جو وہ کھٹولے پر تنی، تو جسم کے کچھ حصے ابھرے کچھ دبے، اور فن کار کو محسوس ہوا کہ چہرے سے کہیں زیادہ اس کا جسم حسین ہے۔ بھروسے کے دل میں ایک مجسمہ بنانے والے کی خواہش جاگی۔ کاش وہ اسے عریاں دیکھ سکتا! لیکن فوراً ہی، ہندوستانی تہذیب کی روایتوں نے، اسے آنکھ دکھائی اور بھروسے نے کچھ شرما کر منہ پھیر لیا۔

ہریا، جو درپردہ بھروسے کو چھیڑنے کے لیے اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھی، بھروسے کے تمتائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر فاتحانہ انداز سے مسکرائی۔ اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے لے جا کر پھنسائے اور انگلیاں چٹخائیں۔ پھر وہ اٹھ کر بولی "کاکا، اس وکھت (وقت) تو چائے پینے کو جی چاہتا ہے"۔

بھروسے نے کہا "گھر میں بوند بھر بھی تو دودھ نہیں ہے"۔

وہ بولی "ایسے میں تو بلا دودھ ہی کے مجا (مزہ) دے گی"۔

"اسٹوو پھر جلا۔ مگر جب کیتلی میں پانی بھرنے کی نوبت آئی تو گھڑا بھی خالی ملا، گگرا بھی، بالٹیاں بھی۔ رات کی کھچڑی پکانے اور برتنوں کے ملنے مانجھنے، دھونے میں، پانی سب صرف ہو چکا تھا۔ ہریا نے جھٹ بالٹی اٹھائی اور نیچے اسے بھر لانے چلی۔ بھروسے نے ٹوکا "ارے، کہاں جا رہی ہے، پائپ سے پانی نہیں آتا"۔

اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

بھروسے نے کہا "تو روتی کیوں ہے، میری چھت پر چلی آ!"

یہ کہہ دینا تو آسان تھا مگر دیوار ہریا کے قد سے کہیں اونچی تھی، وہ اس پر چڑھے کیوں کر؟ بھروسے نے ادھر ادھر نظر ڈال "ارے نیچے کوئی بسکٹ نہیں ہے؟ جا اسے اٹھا لا!"

اس نے کہا "ہم سے اکیلے جینے (زینے) پر نہ آیا جائے گا"

بھروسے نے کہا "ارے جا بھی کسی طرح کھینچ کھانچ کر تو لا!"

وہ بولی "ہمیں نیچے جاتے ہوئے لگتا ہے کاکا! ہم اکیلے نہ جائیں گے!"

پانچ فٹ چار انچ کا دبلا پتلا بھروسے ہریا کی فریاد پر بانکے بہادر بن گیا۔ وہ اپنے ٹین کی منڈیر سے پاؤں لٹکا کر، سات فٹ کی اونچائی ہریا کی چھت پر پھاند پڑا۔ ایڑیاں ذرا جھنجھنائیں، مگر اس نے کچھ خیال نہ کیا۔ اس نے ہریا سے کہا "کہاں ہے بسکوٹ؟ چل دکھا!"

ہریا کی مدد سے وہ بسکٹ چھت پر اٹھا لایا۔ اس نے اسے اپنی دیوار سے لگا کر دیکھا۔ سرے کے پائے اور ٹین کی منڈیر سے کچھ نیچے تک پہنچتی تھی۔ اس نے جھٹ اور دائن کھول ڈالی۔ ہریا سے کہا "بسکٹ پکڑے رہ!" اور وہ اس پر چڑھ گیا۔ اور اس نے پٹی پر کھڑے ہو کر بسکٹ سے اپنے ٹین کی پتلی دھنی میں باندھ دیا۔ پھر خود اپنی منڈیر پر چڑھ کر ہریا سے کہا "اب چڑھ آ!" ہریا نے کوشش کی تو اس کی ساری بار بار پھنسی۔ اس بھروسے سے کہا "کاکا، جرا (ذرا) ادھر منہ کر لو!" — اور بھروسے کے منہ پھیرتے ہی اس نے ساڑی کھول کر اسے دھریا کر کے بھروسے کی دھوتی طرح باندھ لیا۔ اور وہ بھروسے کے ہمت دلانے پر پلنگ پر چڑھ کر سرہانے کی پٹی پر پہنچ کر بیٹھ گئی۔ اس پر کھڑے ہونے کا اس کا حیاؤ دھڑکتا بھروسے ٹین پر لیٹ کر آدھے دھڑ سے لٹک گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہریا کو سہارا دیا اور اسے ٹین پر کھینچ لایا۔ پھر وہ بکس پر ذرا سا پاؤں رکھ کر اپنی چھت پر کود گیا۔ مگر جب ہریا اترنے لگی تو بکس ڈگمگائے۔ بھروسے نے لپک کر ہریا کی کھلی ٹانگیں پکڑ لیں اور اسے کندھے پر بٹھا کر نیچے اتار دیا۔ بھروسے کے لمس نے ہریا کے جسم میں ایک گدگدی سی پیدا کر دی اور وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ چھت پر بھدے سے بیٹھ گئی۔

رام بھروسے نے اسے تعجب سے دیکھا۔ وہ بات ٹالنے کے لیے بولی "کاکا کچھ کھانے کو نہیں ہے؟ بڑی بھوک لگی ہے"

بھروسے نے کہا "جنس تو سب گھر میں ہوگی، مگر کھد (خود) پکانا پڑے گا"

وہ بولی "کڑی مل جائے تو کچھ دکھ آبال لوں گی!"

رام بھروسے جلتی ہوئی شمع لے کر جینے (زینے) اترا۔ پھر "باپ رے باپ!" کہتا ہانپتا ہوا پلٹا۔

ہریا نے پوچھا "کیا ہوا کاکا؟ کیا ہوا؟"

وہ بولا "شاید آنگن میں پانی آ گیا ہے جینے (زینے) پر نہ جانے کتنے مینڈک اور سانپ بچھو بیٹھے ہیں" پھر وہ ڈنڈا اٹھا کر بولا "تو بتی لے کر چل، میں ڈنڈے سے کھٹکھٹاتا چلتا ہوں"

دونوں ساتھ ساتھ چلے۔ مینڈک، کیڑے مکوڑے، اپنے سب سے بڑے دشمن "انسان" کو یوں مسلح آتے دیکھ کر جلدی جلدی ادھر ادھر بھاگ گئے۔ بھروسے نے ہریا کو روک کر زینے کی بتی پھر جلا دی۔ جب وہ اپنے آنگن میں پہنچا تو اس نے دیکھا، نابدان کے راستے ایک فٹ پانی اندر گھس آیا ہے۔ وہ کنارے کنارے ہو کر رسوئی گھر میں گئے اور سارے برتن، جنس، مسالہ، سِل بٹا، لکڑی، کوئلہ، جتنا بھی سامان وہاں تھا، وہ سب اوپر اٹھا لائے۔ بھرا ہوا اسٹوو بھی گرہستن منجھو نے وہیں اٹاری پر رکھ چھوڑا تھا، وہ بھی لے آئے۔ رات کافی آ چکی تھی، صحن میں پانی برابر بڑھ رہا تھا، مینڈک ادھر ادھر اچک رہے تھے، کچھ اور کیڑے مکوڑے بھی رینگتے بھاگتے دکھائی دے جاتے تھے۔ مگر

اس نے نہ کوئی بنڈی کوٹ پہن رکھا تھا، نہ کوئی بلاؤز، اس کے جسم کے سارے نشیب فراز، ساری کجیاں، ہمواریاں ہو رہی تھیں۔ بھرّوسے کی نظریں آپ ہی آپ اس حسین جسم کی طرف اٹھ گئیں۔ ہریا نے جو جھک کر بھیگی ہوئی ساڑھی منڈیر پر پھیلانا شروع کی تو جارجٹ کی ساری کا بغل میں دبا ہوا کونا پھسل گیا اور وہ کمر تک ننگی ہو گئی۔

اس نے شرارت سے بھرّوسے کو دیکھ کر کہا "کیسے بے سرم (شرم) ہو، میں ننگی ہوں اور تم گھور رہے ہو!"

بھرّوسے پانی پانی ہو گیا، اور اس نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اٹھلاتی ہوئی ٹین کے نیچے آئی اور اس نے بڑی بے باکی سے بکس کھولا، اور اس میں سے ڈھونڈھ کر آئینہ کنگھا نکال لیا۔

بھرّوسے نے ڈانٹا "کیا کرتی ہے چھوکری؟ یہ سب منجھو نے مالتی کے بیاہ کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔"

وہ بولی "جارجٹ کی ساری پہنائی ہے، تو مجھے اپنی صورت تو آئینے میں دیکھنے دو!" اور وہ بھیگے بال جھٹک کر کنگھا کرنے اور گنگنانے لگی۔

بھرّوسے نے چائے کی ایک پیالی خود لی اور ایک اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ چائے پی رہے تھے کہ نیچے سے چپ چپ ہٹی کٹ کر پانی میں گرنے کی آواز آئی۔ بھرّوسے نے ڈنڈا اٹھا کر کہا "دیکھوں، یہ کیا ہو رہا ہے۔" اور وہ نیچے آیا۔ اس نے دیکھا صحن میں ٹابدان کے ذریعہ آنے والا پانی بڑھ گیا تھا اور گلی کا پانی اونچا ہو کر دروازے کے پیچھے کی گیلی دیوار کو کاٹ کر گرا رہا تھا۔ بھرّوسے نے گھبرا کر ادھر اُدھر نظر ڈالی، تو اسے دوسرے دالان کے کونے میں ڈھیروں بالو دکھائی دی جو بعض برتنوں، کھلونوں کی مٹی میں ملانے کے لیے رکھی تھی۔ یہیں کئی بورے بھی تہہ کیے رکھے تھے۔ اس نے ایک بورے میں آدھے کے قریب بالو بھری اور اُسے ٹابدان کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر اس نے پانچ چھ بورے بالو سے بھر کر دروازے کے پیچھے والی دیوار کے پیچھے پشتے کے طور پر لگا دیئے۔

وہ انھیں کاموں میں مصروف تھا کہ ہریا نے زینے سے جھانکا۔ وہ پورا سنگار کر چکی تھی۔ وہ دالان اور صحن کی کیچڑ میں اتر کر اپنی جارجٹ کی ساری غارت کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ پھر بھی عورت تھی، بے کار نہ بیٹھ سکتی تھی۔ اس لیے اس نے وہیں سے پکار کر پوچھا "اس وکھت (وقت) بھی کھچڑی ہی پکے گی نا؟"

بھرّوسے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی چھب نے دل میں چٹکی لی، وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا "ہرام جادی!" پھر زور سے بولا "ہاں، کھچڑی ہی پکالے!"

دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ سورج گومتی کو اتنی تیکھی نظروں سے دیکھ رہا تھا، کہ لمحہ بہ لمحہ اس کی تڑپ بڑھتی۔ ہر طرف سے دھاکوں، چھپاکوں کی آوازیں آ رہی تھیں، مکان گر رہے تھے، دیواریں ڈھئی جا رہی تھیں۔ فضا میں منڈلاتی ہوئی چیلوں اور گِدّوں کے علاوہ کوئی چڑیا نظر نہ آتی تھی۔ صبح کے کوّے تک غائب تھے۔ ایک عجیب طرح کا سنّاٹا تھا۔ ہر لمحہ تنہائی، خطرے اور بے بسی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی کے اثر سے ہریا نے منڈیر سے جھک کر پکارا "ارے کاکا، اب اوپر آؤ، ہمیں ڈر لگتا ہے!"

"ہرام جادی!" وہ پھر بڑبڑایا، اور وہ بالو کے بوروں پر نظر ڈالتا ہوا، اوپر جانے کے قصد سے چلا۔ دالان میں پہنچتے ہی اُسے کچھ خیال آیا۔ اس نے ایک جھوبے میں مورتی بنانے والی مٹی بھری اور اُسے سر پر رکھ کر اوپر لے گیا۔ اس نے دیکھا ہریا نے جارجٹ کی ساری اتار کر کے بکس پر رکھ دی ہے، اور وہ اپنی پھٹی سوتی ساری پہنے چٹنی پیس رہی ہے، اس نے چھت پر ایک طرف مٹی ڈال دی اور خاموشی سے دو جھوبے مٹی اور لے آیا۔

ہریا کچھ دیر تو چپکی یہ تماشہ دیکھتی رہی، پھر تعجب سے بولی "اے اب کھتم بھی کرو۔ یہ نگوڑی مٹی کون سونا چاندی ہے کہ اُسے ڈھو کر جان ہلکان کر رہے ہو؟"

وہ بولی "ہونہہ! اور یہ جو آنگن بھر میں جل ہی جل ہے!"

بھروسے نے ہاتھ پکڑ لیا "میں مر بھی جاؤں گا، پر اپنے آنگن کے ناب دان سے آیا ہوا پانی نہ پیوں گا!"

ہریا نے کہا "تو پھر چاروں اور پانی ہی پانی ہے، اسی میں سے ایک گگرا بھر کر نکالو۔"

بھروسے نے گگرا اٹھا لیا۔ منڈیر سے جھک کر دیکھا، پانی دو گز سے بھی زیادہ نیچا تھا۔ وہ بولا "کوئی رسّی ہوتی، تو اس میں باندھ کر گگرا لٹکا لیتا۔"

ہریا نے کہا "اچھا تم ذرا (ذرا) منھ پھیر لو، میں بندوبست کرتی ہوں" اور بھروسے کے منھ پھیرتے ہی اس نے اپنی ساری کھول کر بھروسے کے سامنے پھینک دی۔ بھروسے نے کانپتے ہاتھوں سے ساری کا ایک کونہ گگرے میں مضبوط باندھا، پھر اسے لٹکا کر پانی بھر لیا۔ جب گگرا کھینچ کر اس نے منڈیر پر رکھا تو وہ نظریں نیچی کیے کیے بولا "تو کھٹولا کھڑا کر کے اس کے پیچھے ہو جا، تو میں سارے برتنوں میں پانی بھر دوں۔"

ہریا ہنستی ہوئی آڑ میں ہو گئی، بھروسے نے گھڑے کے علاوہ سارے برتنوں اور بالٹیوں میں پانی بھر دیا۔

جب وہ گگرے سے ہریا کی ساری کھولنے لگا تو اس نے دیکھا وہ جگہ جگہ سے بھیگ بھی گئی ہے اور پھٹ بھی گئی ہے، اس نے ساری کھول کر چھت پر پھینک دی، اور کھٹولے کی طرف سے منھ پھیرے، بکسوں کی طرف بڑھا۔

ہریا چھیڑنے والی آواز میں بولی "ارے ادھر کہاں چلے آ رہے ہو؟"

وہ بولا "ارے میں تجھ کو دیکھ تھوڑے رہا ہوں، چھوکری!"

اور اس نے منجھو کا دیا ہوا کنجیوں کا گچھا کمر سے نکالا، اور ایک بکس کھولا۔ سب سے اوپر ایک نئی چادر دکھائی دی، اور اس کے نیچے ایک چارجٹ کی ساری، اس نے منھ پھیرے ہی پھیرے یہ ساری ہریا کی طرف بڑھا کر کہا "لے تو اب یہ پہن لے!"

وہ بوکھلا گئی "ک۔ک۔کیا۔ کیا یہ مجھے دے رہے ہو کاکا؟"

وہ بولا "ہاں، ہاں، تیری ساری میں نے پھاڑ ڈالی، اب اس کے بدلے تو یہ ساری باندھ!"

وہ بولی "تو میں اسے بنا نہائے نہ پہنوں گی۔ ایسی بڑھیا ساری میں کھراب (خراب) نہ کروں گی۔"

وہ بولا "تو گگرا اٹھا لے۔ جینے (زینے) پر چلی جا، وہیں نہا دھو کر ساری بدل لے!"

وہ پھدک پھدک کر دوڑی اور پرانی اور نئی دونوں ساڑھیاں ایک ہاتھ میں لیے، دوسرے میں گگرا اٹھائے زینے کی نیچی والی سیڑھیوں پر چلی گئی۔

بھروسے نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ بکس سے نئی چادر نکال کر وہ پانی اُبالنے اور اُسے چھاننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنے خیالات میں اس طرح کھویا ہوا تھا کہ بکس کے قفل میں کنجی لگی رہی اور وہ کھلا ہوا کنڈے میں لٹکا رہا۔ اس وقت ہریا کے عریاں جسم نے پھر اس کی فنکاری کو ٹھوکا دیا تھا۔ اس کا بے ساختہ جی چاہتا تھا کہ وہ مغربی فن کاروں کی طرح اس چھوکری کو اپنا "ماڈل" بنائے۔ لیکن ہریا سے یہ بات کہنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔ وہ سوچنے لگا "لڑکی ذرا تیز ہے وہ بات ہی سے بار بار چھیڑ رہی ہے، کچھ اور نہ سمجھے۔ پھر اگر وہ راضی بھی ہو جائے، مگر بعد میں بات پھوٹی تو! اور تو کسی کی پروا نہیں، مگر منجھو اپنی گھر گرہستی سمجھ، وہی جو اس کے جیسے ناکارہ آدمی کا بوجھ اپنے کندھوں پر خوشی خوشی اٹھائے ہوئے تھی بس۔۔۔ اور بھروسے کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔

وہ ماتھے سے پسینہ پونچھ ہی رہا تھا کہ ہریا چارجٹ کی ساری باندھے، اور پرانی ساری دھوئی نچوڑی ہوئی ہاتھ میں لیے، اوپر آ گئی۔

مگر اتنا ضرور نظر آتا تھا کہ اس پر سیکڑوں آدمی کھڑا ہے۔ بھر وسے کو یقین ہو گیا کہ یہ تماشائی ہیں، جو بہیا کے نظارے سے لطف لے رہے ہیں۔ اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ بچاؤ! بچاؤ! اسے دیا کر کے ہمیں یہاں سے نکالو!

مگر پانی کے شور میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔ البتہ سڑک کے پار والے سیٹھ کے چوکی دار نے پھر منڈیر سے سر نکال کر کہا۔ کاہے پن نایک، پن نایک (ناحق) چیختے ہو کاکا؟ اس پانی میں نہ ڈونگی کشتی آسکتی ہے، اور نہ تم تک کوئی آدمی پہنچ سکتا ہے! کہہ تو دیا اپنی چھت پر جا کر بیٹھو، کوئی اپائے نکلے گا تو ہم کھد مدد بھیجیں گے!

بھر وسے نے کہا ارے میں ہی اکیلا نہیں ہوں، وہ مُلیا کی چھوکری بھی تو پھنسی پڑی ہے۔

وہ ہنس کر بولا "چلو پھر کاہے کا کا! مجے (مزے) کرو وہ تو بڑی پٹاخا ہے!"

بھر وسے بڑبڑایا "ہرام جادہ!" اور گھر کی طرف پلٹا۔ چوکی دار نے آواز دی "کہیں منگلو نجر پڑا تو میں اس کو کھبر کر دوں گا۔ وہ اس چھوکری پر بُری طرح لٹو ہے!"

منگلو کا نام سنتے ہی بھر وسے کا دم نکل گیا۔ منگلو گنڈوں کا سردار تھا۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو گیا کہ بھر وسے نے اس کی چہیتی کو بُری نظر سے دیکھا ہے، تو وہ اس کا بھرتا ہی نکال دے گا۔ وہ سوچنے لگا اس نے ناحق ہی ہریا کے بارے میں چوکی دار کو بتایا۔ بھجو کا ڈر تو تھا ہی اب منگلو کا خوف بھی دل میں سمایا۔ پھر محلے بھر میں رسوائی اور بدنامی گھاتے میں! واہ! اچھا عذاب اپنے سر لیا! وہ یہی سوچتا، ڈرڈر کر قدم رکھتا گھر کی طرف پلٹ رہا تھا کہ اس نے ہریا کی آواز سنی "کاکا! کاکا! بھر وسے کاکا!" اس نے دیکھا تو وہ ٹین والی دیوار پر کھڑی ہے، ہوا کے جھونکے سے وہ پھول کی ٹہنی کی طرح ہل رہی ہے۔ جارجٹ کی ساری، کبھی غبارے کی طرح پھول جاتی ہے، کبھی جسم میں اس طرح چپک جاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جسم پر کپڑا ہی نہیں ہے۔ اس نے وہیں سے چیخ کر ڈانٹا "تو کیوں اوپر چڑھ آئی؟ نیچے اتر! میں آرہا ہوں!" وہ جلدی سے نیچے اتر گئی۔

بھر وسے نے اب مکانوں میں جھانک جھانک کر ہر ایک کی کیفیت دیکھی۔ ہر جگہ پانی بھرا تھا۔ ہر گھر کے صحن میں طرح طرح کی چیزیں تیر رہی تھیں۔ چوکیاں، میزیں، اسٹول، دھنیاں، بانس، چھڑیاں، ڈنڈے، اوندھے گھڑے، کبوتروں والے گھر میں سانپ اب کابک کے خانے میں گھس گیا تھا اور انڈے غائب تھے۔ مرغی والی چھت کی دیوار پر، ایک جنگلی بلی دبے پاؤں چلی جا رہی تھی۔ فطرت کے خطرات و مظالم کو اس نے غیر شعوری طور پر محسوس کیا اور وہ ذرا جلدی جلدی چلنے لگا، اور ایک جگہ اس طرح ڈگمگایا کہ گرتے گرتے بچا۔ بیساختہ ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی اور وہ دیوار پر بیٹھ کانپنے لگا، وہ پھر کھڑا ہو کر نہ چل سکا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس نے بقیہ مسافت طے کی۔ جب وہ اپنے ٹین پر پہنچا تو اس نے ہریا کے گھر میں جھانک کر دیکھا۔ لالٹین اب بھی جل رہی تھی اور سکھوٹ اب بھی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ پھر اس نے اپنے گھر پر نظر ڈالی۔ عجیب منظر نظر آیا۔

ہریا پوت کا لہنگا اور اس کا چست شلوکا پہنے، گوٹوں، پٹھوں سے لدا دوپٹہ اوڑھے عجیب بھاؤ سے ناچ رہی تھی — معلوم ہوتا تھا سچ مچ اس کی الوکھی ناگن میں جان آگئی ہے جسم کے روئیں روئیں سے جوانی پھٹی پڑ رہی تھی، وہ لہک لہک کر گا رہی تھی۔

کانھا ملنے نا ارجیا، مور ڈگر یا روکے نا!
جاؤ چھلیاں ہم سے نہ بولو، بنتی کروں تمہاری
تم ہو اہیر کے بٹوا، میں ہوں سجان دلاری
کانھا ملنے نا ارجیا، مور ڈگر یا روکے نا!

بھروسے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود بھی تھک گیا تھا۔ اس نے مٹی سے بھرے ہاتھ اپنی دھوتی میں پونچھ پونچھ کر صاف کیے پھر اس ایک کے بعد ایک بکس کھول کر دیکھا۔ آخر ایک میں اس کے دھلے کپڑے مل گئے۔ اس نے ایک کرتا اور ایک دھوتی نکالی اور گھڑا اٹھایا۔ ہریا چیخی" اسے اسی میں پینے کا پانی رکھا ہے، اُسے کہاں لیے جا رہے ہو! نہانا ہے تو گگرا بھر لو!"

بھروسے نے کہا" تو لا اپنی ساری اتار!"

وہ بولی" واہ، میں کیوں اپنی چار جٹ کی ساری ابھی سے پہن کر کھراب (خراب) کروں۔ لو تم یہ اپنی چادر لو!" اور اس نے وہی چادر بڑھا دی جس میں بھروسے نے پانی چھانا تھا۔ بھروسے نے کھونٹے میں چادر باندھی اور اسے لٹکایا۔ پانی پہلے سے اونچا ہونے پر بھی گگرا وہاں تک نہ پہونچ سکا۔ وہ جھنجھلا کر پلٹا اور اس نے اپنی دھلی ہوئی دھوتی، جو اب جگہ جگہ سے بھیگ بھی گئی تھی، باندھ لی اور میلی دھوتی پھاڑ کر پھیلا دیا پھر وہ ہریا کے پاس جا کر بولا" لا اب کھانے کو دے!"

کھچڑی میں جیسے افیون گھلی ہوئی تھی۔ وہ اسے کھاتے ہی کھٹولے پر پڑ کر سو رہا۔ ہریا کچھ دیر تو برتنوں کے دھونے میں لگی۔ پھر اس نے آہستہ سے بھروسے کے سرہانے رکھا ہوا کنجیوں کا گچھا اٹھایا اور ہر بکس کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دو میں تو متو، مالتی، منجو اور بھروسے کے دھلے کپڑے رکھے تھے۔ ایک میں منجو کے نئے نئے جوتے تھے اور دو بکسوں میں مالتی کے جہیز کے جوڑے اور سامان تھا۔ بھاری بھاری ساریاں، لہنگے، شالیں، بیاہ میں دینے والا چاندی کا سامان۔ ہریا نے ایسی گراں قیمت چیزیں نہ میکے میں دیکھی تھیں نہ سسرال میں۔ یاروں نے بھی دو چار سو روپے سے زیادہ کا کوئی تحفہ نہیں پیش کیا تھا۔ ہریا کو ان چیزوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اتنی تکلیف ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ جھنجھلائی ہوئی اپنے بھگوان سے دل ہی دل میں اپنے اور مالتی میں فرق کا سبب پوچھ رہی تھی کہ بھروسے نے کروٹ لی۔ ہریا نے جلدی سے کنجیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ کر تھنک کر کہا" ارے پڑے سویا ہی کرو گے کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی اپا کرو گے؟"

بھروسے آنکھ ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ دن ڈھلنے لگا تھا، اور بھیانک پن بڑھنے لگا تھا۔ دوسری رات بھی اپنے ہی مکان میں کاٹنے کے خیال ہی سے اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ چاروں طرف مکانات گر رہے ہیں۔ نہ جانے کب یہ بھی بیٹھ جائے۔ اسے ڈسنے لگا تھا۔ اس طرح ہاتھ پاؤں ڈالے بیٹھے رہنا موت کے منہ میں خود سے جانا ہے۔ وہ کھڑا ہو گیا اور وہ بکسوں کو ایک کے اوپر ایک رکھ کر دیوار پر چڑھنے لگا۔

ہریا نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا" میں اکیلی نہ رہوں گی، مجھے بھی لیتے چلو! مجھے بہت ڈر لگتا ہے!" وہ دلاسا دے کر بولا" پگلی! میں کہیں دور تھوڑے جا رہا ہوں جرا کوٹھے کوٹھے سڑک تک جا کر دیکھوں گا۔ کہیں سے نکلنے کا رستہ بھی ہے کہ نہیں۔ تو ڈر مت، میں ابھی آتا ہوں"

ہریا گرفت ڈھیلی کر کے گڑگڑائی" پر پلٹ آنا جرور!"

وہ" ہاں، ہاں!" کہتا بکسوں پر کھڑا ہو کر دیوار پر چڑھ گیا۔ پھر ہمسایوں کی چھتوں سے ہوتا ہوا سڑک کے کنارے والے مکان کی چھت پر پہنچا۔ کوئی بھی اپنے مکان میں نہ دکھائی دیا۔ البتہ ایک چھت پر ایک مرغی اپنے چند بچوں کو پروں میں چھپائے بیٹھی نظر آئی۔ ایک دیوار پر کبوتروں کا ایک جوڑا دکھائی دیا۔ اس نے مکان کے اندر جھانکا تو ان کی کابک کے اوپر والے حصے پر ایک سانپ رینگتا دکھائی دیا۔ اور کابک کے اندر دو چھوٹے چھوٹے انڈے جھلکے۔ سڑک پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبے تقریباً پورے پورے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے، اور پانی اتنا اونچا تھا کہ کشتیاں چھتوں سے لا کر لگائی جا سکتی تھیں۔ اس پر تموج بلا کا تھا۔ ہر لہر بانسوں پانی اچھالتی اور ہر گھر کے در و دیوار کو اس زور کی ٹکر مارتی کہ ہر مکان ہلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ داہنی طرف دور بلندی پر لوہے کا پل تھا۔ یہاں سے صاف تو نہ دکھائی دیتا

کے سینے سے لگی ہوئی سسک سسک کر رونے لگی۔ بھروسے خود بھی ہراس بانختہ تھا۔ ہریا کے مکان کو گرتے دیکھ چکا تھا، اپنی چھت بھی ہل رہی تھی، ٹین بھیانک طور پر ٹن ٹن کر رہا تھا۔ مگر جس طرح ہریا کے خوف اور ڈر نے اس کے ڈر کو بڑھا دیا تھا۔ اسی طرح ہریا کے خود عورت کے لپٹ جانے نے، اس کی مردانگی کو ابھار بھی دیا۔ بھروسے اس لئے اپنا ڈر بھول کر اسے دلاسا دینے، پچکارنے لگا۔

"ڈر...... ڈر نہیں...... ڈر نہیں!...... ڈر نہیں!"

چھت کی لرزش میں کچھ کمی ہوئی۔ دھماکوں، دھماکوں کی آواز کسی قدر کم ہوئی۔ ہریا نے بھروسے کے سینے سے سر اٹھا کر پیلے پھیلے دیدوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ دیوار سے لگی لکشمی کی مورتی نظر آئی۔ وہ دوڑ کر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے سجدے میں گر پڑی "تم مجھے بچاؤ، دیوی! مجھے بچاؤ!"

دھماکوں کی آوازیں رک گئیں۔ چھت کا ہلنا موقوف ہوا۔ بھروسے نے کانپتے ہاتھوں سے اسٹو جلایا اور چائے کے لئے پانی کیتلی میں چڑھا دیا۔ پھر وہ ہریا کے کندھے ہلا کر بولا "اٹھ! منہ دھو ڈال!"

اس نے منہ تو دھو لیا، مگر اس کے آنسو نہ رکتے تھے۔ بھروسے نے پوچھا "ارے اب کیوں رو رہی ہے؟"

وہ سسکیاں لے کر بولی "ارے کاکا میں لٹ گئی! میرا تو سب کچھ اسی مکان میں تھا!"

بھروسے نے پیار سے ڈانٹا "ہرجادی! بھگوان کا شکر نہیں کرتی کہ جان بچ گئی! دھن دولت روپیہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے......"

ہریا مکان کے گرنے کا منظر یاد کرکے کانپنے لگی۔ وہ بولی "ہاں کاکا، تم نے ہاتھ نہ پکڑ لیا ہوتا تو میں چھت پر پھاند پڑی ہوتی اور پھر......!" وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر زور سے کانپی۔

بھروسے نے چائے کی ایک پیالی اس کی طرف بڑھا کر کہا "لے چائے پی! اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔"

وہ احسان مندانہ لہجے میں بولی "تم نے میری دو مرتبہ جان بچائی۔ رات بھی، اس دکھت (وقت) بھی۔ میں جنم بھر تمہاری داسی رہوں گی!"

بھروسے نے کہا "کیا بکتی ہے پگلی!" اور اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

چائے کے گرم گرم چار گھونٹوں نے ہریا کے ٹھنڈے جسم کو پھر گرمایا۔ وہ بھروسے کے شرمانے پر مسکرائی۔ اس نے شرارت سے کہا "اب تو تم نے ہاتھ پکڑا ہے تو جندگی (زندگی) بھر نباہنا!......"

بوڑھے بھروسے نے بوکھلائے ہوئے کہا "کیا! کیا!" پر وہ ہنس پڑی۔

بھروسے "ہرجادی!" بڑبڑاتا کھلونوں والی مٹی کے پاس چلا گیا۔ اس نے تھوڑی سی مٹی ہاتھ میں اٹھالی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں اسے لمبا، چپٹا، گول بناتی رہیں، پھر اس نے اسے مختلف صورتیں دینا شروع کیں ایک سے ایک بھیانک، گھناؤنی۔ مرد کا جسم سور کا سر، آدھا انسان آدھا بھالو۔ عورت کا دھڑ ناگن کا سر، عورت اور ہر عضو میں اس کے سانپ لپٹا ہوا انسانی ڈھانچہ اور اس پر طرح طرح کے کیڑے مکوڑے رینگتے ہوئے۔ اور وہ ہر بار جھنجھلاتا اور بنی ہوئی صورت کو توڑتا اور کوئی نئی حسین شکل بنانے کی کوشش کرتا اور ناکامیاب رہتا۔ پھر اس نے ہاتھ کی مٹی گول کرکے زمین پر پھینک دی۔ اور وہ لکشمی دیوی کی مورتی کو اٹھا لایا۔ اس نے اسے ایک ہاتھ سے سہارا دیا اور دوسرے سے گھما گھما کر دیکھا۔ پھر اسے دیوار سے لگا کر ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے سر جھکا لیا۔

ہریا اسے دیر تک حیرت سے دیکھا کی۔ پھر وہ خاموشی سے اٹھی اور کھٹولے پر لیٹ گئی، اسے ایسا سکون محسوس ہوا کہ وہ سو گئی۔

(اے کنہیا تم میری عرض قبول نہیں کرتے، تم میرا راستہ روک کر نہیں کھڑے ہو جاتے! اچھا تو پھر جاؤ اے نٹ کھٹ! مجھ سے نہ بولو، میں گڑگڑا کر تمہاری خوشامد کرتی ہوں (حالانکہ) تم امیر کے بیٹے ہو، اور میں بڑے بڑوں کی چہیتی ہوں
اے کنہیا تم میری عرض کیوں نہیں سنتے؟ تم میرا راستہ روک کر کیوں نہیں کھڑے ہو جاتے؟)

بھروسے کو بڑا غصہ آیا۔ اس لونڈیا نے تو انگلی پکڑتے پکڑتے پہونچا پکڑا۔ ایک ساری کیا دے دی کہ سالے بکس کی مالکن بن بیٹھی۔ پھر دیکھو کتنا قیمتی جوڑا نکال کر پہنا ہے۔ وہ ڈھائی سو کی لاگت کا ہوگا۔ منجھو دیکھ لے تو اپنی اور اس کی جان ایک کر دے۔ نہ جانے بے چاری نے کن کن دکھوں کو جھیل کر اتنا بچایا ہوگا کہ ایسا جوڑا مالتی کو جہیز میں دے سکے! اور مالتی کا خیال آتے ہی، اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اس کی بھولی بھالی بچی کے بیاہ کا جوڑا اور اسے گندہ کرے ہریا جیسی عورت! اس نے دیوار پر بیٹھے زور سے ڈانٹا "کیا کر رہی ہے حرام جادی! لے کے لڑکی کے بیاہ کا گہنا بھی پہن لیا!"

ہریا نے بھی بھروسے کو تیکھے تیوروں سے دیکھ کر جواب دیا "دو دو بکس تو بھرے پڑے ہیں۔ اک جرا (ذرا) لہنگا پہن لیا تو کیا ہوا؟"
اور اس نے ایک جھٹکے سے دوپٹہ سر سے گرا دیا، اور اپنی میلی ساری الٹاتے الٹاتے شلوکا بھی اُتار پھینکا، پھر ساری کمر تک لپیٹ کر بولی "گھورے جا رہے ہو، گھورے جا رہے ہو! اس میں نہیں سرم آتی؟"

بھروسے نے جلدی سے منھ پھیر لیا۔ وہ مسکرائی اور گرے ہوئے کپڑوں کو اٹھا اٹھا کر جھٹکنے اور تہہ کرنے لگی۔ اس نے وہ جوڑا ہی نہیں بلکہ جار جٹ کی ساری بھی سنبھال کر بکس میں رکھ دی۔

بھروسے کے کان کی لویں سُرخ ہوگئیں، حلق خشک ہوگیا، دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ کیسی اچھی مورتی بن سکتی ہے اس چھوکری کے جسم کی! یورپ والے بھاگ کرتے ہیں۔ ماڈل بننے میں نہ تو لونڈیوں ہی کو کوئی عذر ہوتا ہے اور نہ آرٹسٹ اس کو کوئی شرم کی بات سمجھتا ہے۔ لیکن یہاں ہندستان میں۔ پھر اپنے لکھنؤ میں اگر کسی نے سُن لیا تو ناک ہی کٹ جائے گی۔ اور منجھو! اپنی منجھو تو اس کو نہ جانے کتنا کمینہ سمجھنے لگے گی۔ مگر کسی کو خبر ہی کیسے ملے گی؟ اس لونڈیا سے بات پکی کر لی جائے کہ کسی پر بھید نہ کھلے۔ پر وہ ملنے گی کیسے کہیں کچھ اور نہ سمجھے!"

اور وہ ٹین سے نیچے اترنے لگا۔ ہریا نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا "ٹھہرو ٹھہرو! ابھی ادھر نہ اُترو۔ ہمارے گھر کی چھت پر اتر جاؤ۔ ہم گریبوں (غریبوں) کے پاس بھی دو چار جوڑے کپڑے ہیں۔ انھیں نیچے جا کر اٹھا لاؤ....؟

بھروسے نے اُسے تعجب سے دیکھا۔ پھر جھنجھلا کر بولا "میری بلا سے۔ مُفت (مفت) کی نہیں چھوکری! تیرے گھر میں تو پانی ہی پانی ہے" وہ جھپٹ کر بکسوں پر چڑھ کر ٹین پر آ گئی "تم نہ جاؤ، میں کود جاؤں گی!" اور اس نے دیوار پر پیٹ کے بل لیٹ کر دونوں ٹانگیں اپنی چھت کی طرف لٹکا دیں اور وہ پاؤں سے بسکٹ کی پٹی ٹٹولنے لگی۔ بھروسے نے لپک کر اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔ وہ بولا "اری کیوں جان دینے پر تلی ہے چھوکری! گر جائے گی تو ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی!"

وہ اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "چھوڑ دو میرا ہاتھ! چھوڑو! مر جاؤں، مگر جاؤں گی جرور!"
ان دونوں میں رسہ کشی کا مقابلہ جاری تھا ہی کہ ہریا کے مکان سے بھس! بھس! جیسی آواز پیدا ہوئی اور پورا مکان ہلنے لگا۔ بھروسے نے کہا۔ "اری بھاگ! مکان گر رہا ہے۔"

ہریا چیخ کر بھروسے کے سہارے ٹین پر آ ہی گئی تھی کہ ایک دھماکے کے ساتھ اس کا مکان آنگن کی طرف گر گیا۔ بھروسے کی ٹین والی دیوار اس طرح ہلنے لگی کہ محسوس ہوتا تھا اب گری۔ اب گری! ہریا ڈر سے بر ابر چیخے چلی جا رہی تھی۔ بھروسے بڑی مشکلوں سے اسے ٹین سے نیچے اُتار کر لایا۔ پوری چھت پر ایک زلزلہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ دونوں ٹین سے دور، دوسرے کنارے پر کھڑے ہو گئے۔ اور ہریا بھروسے

رام! کہتا ہوا اوٹے میں پانی لے کر نیچے چلا گیا۔ جب وہ وہاں سے پلٹنے پر کوئلے سے دانت مانجھ کر نہا رہا تھا تو ہریا جاگی ــــ وہ لیٹے ہی لیٹے انگڑائی لیتی ہوئے بولی "ہم بھی نہائیں گے کاکا! ہمارے لئے بھی پانی نکال دینا"۔

بھروسے نے بھیگی دھوتی بدل کر گھڑے اور برتنوں میں بھی پانی بھر دیا۔ پھر ہریا کو پھر آگر آواز دے کر کہا "لے تو بھی نیچے جاکر نہا ڈال!" اور جب وہ لگڑا اور لوٹا لے کر نیچے چلی، تو اس نے کہا "ارے، وہ چار چوٹ والی ساری بھی تو لیتی جا، نہا کے پہنے گی کیا؟"

ہریا نے مسکرا کر اسے دیکھا، ساری بکس سے نکالی اور کمر لچکاتی نیچے چلی گئی ــــ

بھروسے نے ہریا کے واپس آنے تک چائے تیار کر لی تھی، اور یہ بھی طے کر لیا تھا کہ وہ ہریا سے اپنی وہ خواہش بھی بیان کرے گا جو کل سے اس کے لئے وبالِ جان بنی ہوئی تھی۔ جب ہریا کنگھی چوٹی سے فارغ ہو کر چائے پینے لگی تو بھروسے نے اس سے کہا "تجھے یہ گھا گھرے والا جوڑا بہت پسند ہے؟"

وہ ناک سکوڑ کر بولی "پسند ہو یا ناپسند، کچھ مجھے مل تھوڑے جائے گا!"

بھروسے نے کہا "تجھے دینے ہی کے لئے تو پوچھ رہا ہوں!"

ہریا تعجب اور خوشی سے اچھل پڑی "سچ؟" اس نے اپنے کانوں پر بھروسہ نہ کر کے پوچھا۔

بھروسے نے نظریں جھکا کر کہا "ہاں، مگر ایک شرط پر....."

وہ لپک کر گھا گھرے والا جوڑا اٹھا لائی، اور اسے گال سے لگا کر ہنس کر بولی "مجھے ساری شرطیں منظور ہیں!"

بھروسے کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ کچھ جھنجھلا کر بولا "اری پوری بات تو سن لے!...... یہ جوڑا لینے کے لئے تجھے میرے سامنے ننگی ہو کر کھڑا رہنا پڑے گا!"

نہ جانے کیوں ہندوستان کی عورت، اپنے پورے دھڑ کی نمائش کو سب سے زیادہ بے شرمی سمجھتی ہے۔ وہ اپنی خوشی سے نہ پتی کے سامنے عریاں ہوگی، اور نہ یار کے سامنے۔ غالباً اس کے دل میں یقین چھپا بیٹھا ہے، کہ اس کا جسم اتنا حسین نہیں جتنا کہ اس کا چہرہ۔ رُخِ زیبا، حنائی ہاتھ، صندلی پاؤں کے علاوہ اسے کسی عضو کے حسین بنانے کی فکر بھی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک بھی ان کی دلکشی مشتبہ رہتی ہے۔ اسے فطرت اس کی نمائش پر نہیں اکساتی۔ حسن کا یقین ہی خود نمائی پر ابھارتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ یہی ہریا جو دیدوں سے اپنی نسوانیت اور اپنی جوانی کی طرح طرح سے نمائش کر رہی تھی، بھروسے کی شرط سنتے ہی چیخ اٹھی "ہائے دیا! کبھی نہ ہوگا!"

بھروسے نے سمجھایا "بگلی! میں کسی اور گرج (غرض) سے تھوڑے کہہ رہا ہوں۔ میں تیرا ننگا شریر دیکھ دیکھ کر بھرپور جوانی کی ایک مورتی بناؤں......"

وہ ذرا نرم پڑ کر بولی "اور سارے لوگ مورتی دیکھ کر مجھے پہچان جو لیں گے......!"

بھروسے "ارے اس میں تیرا چہرہ تھوڑے ہوگا۔ بس تیرا شریر!"

ہریا نے ہاری ہوئی آواز میں کہا "اور جو کوئی مورتی بناتے دکھت (وقت) مجھے دیکھ لے!"

بھروسے نے جیتی ہوئی آواز میں کہا "بگلی! آج اس چھت پر اور اس کے ارد گرد آکاش پر لٹکے ہوئے سورج کے سوا اور کون دیکھنے والا ہے!"

اور وہ اٹھ کر مٹی کے پاس چلا گیا۔ ہریا لہنگے والا جوڑا سینے سے لگائے خوشی سے کھڑی جھومتی رہی، بھروسے نے کہا "اب اسے کھونٹے پر رکھ کر ادھر آ!" اور جب وہ اس کے قریب آ کر لجاتی ہوئی کھڑی ہوگئی تو پھر بھروسے نے کہا "سر کے بال کھول دے!"

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ بھروسے نے نیچے سے ایک اور بسکٹ لاکر چھت پر ڈال دیا ہے۔ لکشمی کی مورتی بجائے کھلی چھت کے، ٹین کے نیچے پڑے بکس کے اوپر دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی گئی ہے اور بھروسے بجائے اسٹوو کے لکڑی جلا کر توے پر موٹی موٹی روٹیاں ڈال رہا ہے۔ اور کئی اچاریاں آم، لیمو، سُرخ مرچوں کے اچار سے بھری اس کے پاس رکھی ہیں۔

ہریا نے ان کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "ارے یہ کہاں سے آگئیں؟"

بھروسے نے فخریہ لہجے میں کہا "ہمارے مالتی کی ماں بڑی گھر ہستن ہے۔ وہ سال کا سال پھل (فصل) میں اچار بنا کر رکھ لیتی ہے۔ مجھے بھیا بھیجیا تو میں کمرے کی اٹاریوں سے جا کر اتار لایا۔"

ہریا نے پاس آکر پوچھا "اور دال بھی پکائی؟"

اس نے ایک بٹلوئی کی طرف اشارہ کرکے کہا "ہاں دال پہلے ہی تیار کر لی تھی۔"

اور ان دونوں نے دال روٹی طرح طرح کے اچاروں کے ساتھ خوب ڈٹ کر کھائی۔ اور جب سونے کی باری آئی تو ہریا اپنا کھٹولا باہر اٹھا لائی اور اس نے اُسے بھروسے کے کھٹولے سے ملا کر بچھایا۔

بھروسے نے کہا "ٹین کے نیچے کیوں نہیں لیٹتی؟"

وہ بولی "ہمیں ڈر لگتا ہے۔" اور جب وہ کھٹولے پر لیٹی تو اس نے اپنے جسم کو اس طرح تانا، مروڑا، کھینچا، سکوڑا کہ ہرن ہو دعوت جنس دینے لگا۔ بھروسے بڑبڑایا "ہرام جادی!" اور اس نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ہریا کو اس چھیڑ میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ گنگنانے لگی۔

کا کا نا مانے ارجیا، کا کا نا مانے ارجیا!
کا کا کمہار کا بٹوا، میں سجان دلاری
کا کا نا مانے ارجیا! کا کا نا مانے ارجیا!

بھروسے کے ہاں جنسی طوفان اٹھنا شروع ہوئے۔ کیا برائی ہے اگر ایک رات گھر کے ٹھرّے کی جگہ، باہر کی برانڈی پی لی جائے؟ اگر سردی میں خوب دہکا ہوا کوئلہ ملے، تو ہاتھ کیوں نہ سینکے جائیں؟ اگر اس سے فائدہ نہ اٹھائیں گے تو وہ بھی تھوڑی دیر میں جل کر ٹھنڈی راکھ کا ڈھیر ہو جائے گا! دو الگ الگ ڈر نے والے، دونوں کی جان کے لالے پڑے ہوئے، ڈراؤنی رات، بھیانک سناٹا، پانی کی وہ چھپ چھپاہٹ کہ معلوم ہوتا بڑا سا بھوت ہونٹ چپ چپ جاتا، ان کو نگل لینے کو بڑھا چلا آتا ہے، ایسے میں اپنے کو دا سی کہنے والی ہریا! وہ کہنی کے بل تھوڑا سا پلنگ سے اٹھا۔ نظر پہلے مٹی ہی کے نیچے رکھی ہوئی چیزوں پر پڑی۔ موم بتی کی لو لہرائی، لکشمی دیوی کا چہرہ چمکا۔ دیا اور رحم والا چہرہ غصے سے تمتایا ہوا محسوس ہوا، بھروسے کا سر بھد سے تکیہ پر گر پڑا! ہریا بھی ہنسی کے ساتھ گانے لگی۔

"کا کا نا مانے ارجیا!"

اور بھروسے نے اس پر یوں غصہ اُتارا "چپ ہرجادی! میں تیرے باپ کے برابر ہوں!"

وہ چپ ہو گئی مگر برابر ہنستی رہی، ہنستی رہی، یہاں تک کہ آنسو کے چند قطرے آنکھوں سے نکل کر گالوں پر ڈھلک آئے! اور ہوا کے ایک جھونکے نے ٹمٹاتی شمع کو بھی خاموش کر دیا۔

تیسری رات۔ صبح بھروسے کسی پرند کے پھڑپھڑانے سے اٹھا۔ اس نے دیکھا سامنے گلی پار والے مکان کی دیوار پر کئی گدھ بیٹھے ہیں۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر کر ادھر دیکھنا چاہا، جدھر لکشمی کی مورتی رکھی تھی تو پہلے جوانی کی متوالی نیند سونے والی ہریا ہی پر نظر پڑی اور وہ رام!

دیکھتا ہے۔ اسے نظروں نظروں میں تول رہا ہے کتنا گوشت نکلے گا اس میں اور کتنی چربی، کتنے کوکلے پائے بکیں گے اور کھال کے کیا دام آئیں گے یا خود ہی کہتا ہے اس کا شریر بجلی کا روپ ہے۔ پھر اس بھرپور جوانی کو دیکھ کر اس بوڑھے میں گرمی کیوں نہیں پیدا ہوتی؟ کیا اس کی ساری گرمی اسی ہتھنی بجھو کے لئے ہے؟ اور کیا کہے وہ کھد بکھد بجھو، جو اپنے اس سوکھے گاجر کے سے پتی کو یوں آدھمے: ہر نے نگلی ہریا کو گھورتے دیکھ لیا؟ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

اس ہنسی پر بھروسے نے سر اٹھا کر اسے تعجب سے دیکھا اور جلدی جلدی گردن کی رگوں کے اس تناؤ کو بیرتی میں منتقل کرنے میں محو ہو گیا۔ ہریا نے بھروسے پر ایک حقارت آمیز نظر ڈالی اور وہ گردن جھکائے ٹین کے نیچے لکھمٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔ پھر لوٹے میں پانی بھر کر وہ اسے ہاتھ میں لئے نیچے چلی گئی۔

ہریا کی چیخ سن کر بھروسے چونکا "کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" کہتا وہ جھپٹ کر اٹھا۔ اس نے چھت پر نظر ڈالی۔ ہریا دکھائی نہ دی۔ اس نے صحن میں جھانک کر دیکھا، وہ وہاں بھی نظر نہ آئی۔ اس نے پکارا "ہریا! کہاں گئی رے؟" نیچے سے گھٹی گھٹی آواز آئی "یہاں!" وہ ڈنڈا اٹھا کر اسے زمین پر مارتا، کھٹ کھٹ کرتا نیچے اتر آیا۔ اس نے دیکھا ہریا کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی کانپ رہی ہے۔ اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا "کیا ہوا؟" مگر ہریا کی گھگھی بندھی تھی، وہ بول نہ سکتی تھی۔ اس نے کمرے کے اندر اشارہ کر دیا۔ بھروسے نے جھانک کر دیکھا۔ وہ ڈھائی گز کا ایک ناگ پھن پھیلائے جھوم رہا تھا اور اس کے سامنے ایک نیولا اپنے جسم کو سمیٹے پچھلے پاؤں جھکائے اچک کر حملہ کرنے کے انداز سے کھڑا تھا۔ بھروسے نے ہریا کو ڈھکیل کر پیچھے کیا "ارے تو یہاں آئی کیوں؟ —— چل اوپر، لڑنے دے ہرجادوں کو!"

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ سانپ نے پھپکاری مار کر حملہ کیا۔ نیولا اچک کر وار خالی دے گیا۔ سانپ نے جھنجھلا کر پھر سر اٹھایا۔ بھروسے تماشا دیکھنے کے لئے ذرا اور آگے بڑھا تو ہریا نے اسے کھینچ کر دروازے کی چوکھٹ اور بازوؤں کی طرف انگلی اٹھا دی۔ چوکھٹ پر بیسیوں کنکھجورے لپٹے ہوئے تھے اور بازوؤں پر کالے کالے بچھو اپنے ڈنک اٹھائے اس طرح ٹہل رہے تھے جیسے پہرا دے رہے ہوں کہ کوئی ان کے راج میں گھسنے نہ پائے۔ بھروسے نے ان کی طرّم خانی نکالنے کے لئے ڈنڈا اٹھایا ہی تھا کہ اس نے ایک بھنبھناہٹ سنی۔ نظر اونچی کی، تو دیکھا دروازے کی اوپر والی چول میں لال بھڑوں نے چھتا لگا رکھا ہے۔ اس کے آگے بچھوؤں کا بھی پتا پانی ہوتا تھا۔ مجال نہ تھی کہ وہ بھی ان کی سلطنت میں قدم رکھیں۔

بھروسے خود بھی ڈر گیا۔ وہ ہر کیڑے مکوڑے میں، نہ جانے کتنی بھیانک روحوں کے روپ دیکھتا تھا۔ نہ جانے ان میں کس کس طرح کے بھوت ہوں! وہ ہریا کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹا ہی تھا کہ ایک مینڈک رسوئی گھر کی دہلیز سے اچھل کر پانی میں اچانک چھپاک سے کودا۔ اور وہ دونوں چیختے ہوئے ایک ساتھ بھاگے۔ ان کی اس سراسیمگی پر کئی مینڈک ٹر ٹر کر کے بے ساختہ ہنس پڑے اور یہ بھاگتا ہوا جوڑا زینے کی پہلی سیڑھی پر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ہریا نے مڑ مڑ کر مینڈک کو ڈانٹا "ہرجادے! لے کے ڈرا دیا!" اور پھر پلٹ کر بھروسے کو طعنہ دیا "واہ رے کاکا واہ! تم تو مجھ سے بھی ڈرپوک نکلے!" وہ ہنستی ہوئی زینے پر چڑھ گئی۔ اور بھروسے کچھ تو اپنے گھر کو کیڑوں مکوڑوں کا مسکن بنا ہوا دیکھنے سے، اور کچھ ہریا کے سچے طعنے پر جھنجھلایا ہوا اوپر آیا، اور اس نے بانکے بہادر کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ وہ بھی اس کی کم زوری اور بے بسی پر ہنستا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جلا کر مورتی دیوار پر کھینچ ماری۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پھر اس نے جھپٹ کر وہ بھی ناگن اٹھالی۔ وہ اسے بھی دیوار پر دے مارنے والا تھا کہ ہریا نے چیخ کر کہا "ارے کیا کر رہے ہو؟ کاہے کا تمہا ہے؟"

بھروسے نے ڈانٹ کر کہا "تو چپ رہ! تجھے کیا مطلب؟ تو جانے بنا!" مگر اس نے انوکھی ناگن کو پٹکا نہیں۔ بلکہ اسے دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے ہریا کو کنکھیوں سے دیکھا، وہ آگ جلانے میں مشغول تھی۔ اس نے بانکے بہادر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے

ہریا نے جوڑا کھول دیا۔ کالے بال ہوا میں لہرانے لگے، بھروسے نے بہت سی گیلی مٹی لے کر اسے پورے انسانی چہرے کی صورت شروع کی۔ سر کے بال، پیشانی، بھویں، آنکھیں، ناک، کان، ہونٹ، ٹھوڑی جب ساری چیزیں بن چکیں، تو گردن اور اس سے نیچے حصّوں کی نوبت آئی۔ ہریا نے اب بھی یہ سارے اعضا ساری سے ڈھک رکھے تھے۔ بھروسے اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اس نے اسے ترچھا کیا اور بغل میں دبے ہوئے ساری کے آنچل کو کھینچ کر اسے آدھے دھڑ سے ننگا کر دیا۔ ہریا نے "ہائے رام!" کہہ کر منہ چھپایا۔ بھروسے نے اپنی مورتی میں اس کے کھلے ہوئے اعضا اتارنے شروع کر دیئے۔ مگر ہاتھوں کے چہرے پر ہونے سے وہ اپنی صحیح شکل میں اور ٹھیک جگہ تھے۔ اس نے کہا "ہاتھ گرا دے!" ہریا ہاتھ گرا کر بھروسے کو بڑے تعجب سے دیکھنے لگی۔

فن کار کے چہرے پر ہوس کی چھاؤں تک نہ تھی۔ اس کے ماتھے پر شکن تھی اور وہ اسے جب بھی دیکھتا تو اس طرح دیکھتا جیسے فوٹو گرافر نے دیکھا تھا جس نے منگلو کی فرمائش پر اس کا فوٹو کھینچا تھا۔ وہ منگلو کے ساتھ حضرت گنج سینما دیکھنے گئی تھی۔ وہاں، پان سگریٹ والے کی دوکان کی بغل میں، ایک فوٹو گرافر نے اپنی دوکان بھی کھول رکھی تھی۔ چار آنے فی تصویر لیتا تھا۔ پھر مزہ یہ کہ انٹرول میں تصویر کھنچواؤ اور کھیل ختم ہوتے ہی پیسے دے کر اپنی تصویر لیتے جاؤ۔ منگلو مچل گیا تھا "میں تیری تصویر کھنچوا کر اپنے پاس رکھوں گا!" اور ہریا نے کہا تھا "میں بھی تیری تصویر اپنے پاس رکھوں گی!" بس انٹرول میں دونوں نے اپنی اپنی تصویریں کھنچوائی تھیں۔ لیکن فوٹو لینے سے پہلے فوٹو گرافر نے اس سے سیدھے ٹھیک طرح کھڑے ہونے کو کہا تھا۔ پھر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا جھکا سر اٹھایا، گھمایا تھا، پھر وہ بولا تھا "مسکراؤ!" اور اس رات کی زبردستی کی بلائی ہوئی مسکراہٹ یاد کر کے، وہ اس وقت بھی مسکرا دی۔ اور اس نے دل ہی دل میں سوچا "اس بے چارے بھروسے کا کاہے کا شرمانا ہے، یہ تو فوٹو کا کیمرہ ہے!" اور اس نے ایک "اونہہ!" کر کے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لئے اور ذرا تن کر کھڑی ہو گئی۔ بھروسے کے منہ سے بے ساختہ "واہ!" نکل گئی اور وہ جلدی جلدی اس انداز کو مٹی کی مورتی میں اتارنے لگا۔

ماڈل بننا کوئی آسان کام نہیں۔ جیتی جاگتی، ہنستی بولتی حسینہ کو بُت بن جانا پڑتا ہے۔ وہ سوچنے لگتی ہے عورت ہو کر، وہ کیوں مداری کا بندریا بن رہی ہے۔ اس کے لئے جسم کی نمائش میں نہ کوئی راحت ہوتی ہے نہ لذّت، بس چند سکّے، کچھ پیسے مل جاتے ہیں۔ اس کا ہر لمحہ اپنی بے بسی، اپنی کمتری، اپنی تنگ دستی، اپنی ذلّتِ نفس کے احساس میں گزرتا ہے۔ ہریا بھی کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ ڈھلتی ہوئی دھوپ بھی ننگے جسم کو جلانے لگی تھی ــــــ مگر فن کار بھروسے اپنی جنّت میں تھا، اُسے نہ تھکن کا احساس تھا، نہ گرمی کا، نہ سردی کا ــــ اُسے تو وہ راحت مل رہی تھی، جو پکتے پھوڑے سے مواد نکلتے وقت ملتی ہے۔ جلن، کھٹک، درد آہستہ آہستہ کم ہوتا جاتا تھا اور آرام و سکون بڑھتا چلا جاتا تھا ــــ وہ آہستہ آہستہ گنگنانے بھی لگا تھا: کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں! کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!

ہریا نے تھک کر ہاتھ نیچے گرا دیئے، اس کے سارے اعضا میں ایک ڈھیلا پن سا آ گیا۔

بھروسے غرّایا "کیا کرتی ہے چھوکری! ویسے ہی کمر پر ہاتھ رکھے تنی کھڑی رہ!"

ہریا نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "تھک گئی کاکا!"

وہ اسی طرح ڈانٹ کر بولا "تھکنا وکنا کچھ نہیں! اس طرح کھڑی رہ، جیسے مجھ سے لڑ رہی ہے!"

اور ہریا سر جھٹک کر واقعی لڑنے والے انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اور اس کا بھروسے کیا، بھگوان سے بھی لڑنے کو جی چاہنے لگا۔ "یہ حق ہے ایک پرائے مرد کو کہ وہ اس طرح اسے آدھا ننگا کر کے دیکھے؟ بس اسی لئے نا کہ اس نے اُسے ایک ساری ایک لہنگا دے دیا ہے؟ خود بھگوان نے کیوں اسے پہلے ہی سے ایسی ساری ایسا لہنگا نہ دیا؟ بھگوان کے ہاں تو کسی چیز کی کمی نہیں۔ وہ سیٹھ رام داس کی بہوؤں بیٹیوں کو سب کچھ دے سکتا تھا، وہ مُنیا کی بیٹی کو کیوں نہ دے سکتا تھا؟ اور اس بھروسے کو تو دیکھو۔ یا یہ اس طرح دیکھ رہا ہے جیسے قصائی بکری کو

کچھ یہی بیان کر رہا تھا کہ ایک ہیلی کاپٹر اڑتا ہوا آیا، اور پل کی طرف نیچا ہو کر، کچھ گراتا دکھائی دینے لگا۔ ہو مظلوموں کی آوازیں بھروسے تک لانے لگی "ارے روٹی ہے! روٹی! چنا ہے! ارے ایک ٹکڑا مجھ کو بھی! اچار والے اس بچے کو بھی! ہائے، ہائے! ابو! اکیلا پانی میں چلا گیا! ہائے! ہائے! ارے بچاؤ! بچاؤ! ہمیں یہاں سے نکالو!" مگر ہیلی کوپٹر ان کے سروں پر سے اڑتا ہوا اونچا ہو گیا اور نہیں اور مدد پہنچانے نکل گیا۔ اس میں بیٹھنے والوں نے مشین کے شور میں غالباً فاقہ کشوں کی چیخیں بھی نہ سنیں!

چوکی دار نے پھر چیخ کر کہا "اور بھروسے کاکا جزارات کو ہوسیار سونا۔ رات کو ناؤ پر چور ڈاکو بھی گھومنے لگے ہیں۔ اس آپھت (آفت) میں بھی ہرامجادے اپنے کام میں لگے ہیں۔ کھوب کھوب مال کاٹ رہے ہیں!"

اور پھر ہریا نے پکارنا شروع کیا "کاکا! کاکا! بھروسے کاکا! بھروسے کاکا!"

بھروسے نے پکار کر جواب دیا "آ رہا ہوں، آ رہا ہوں!" اور جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا ہریا ٹین والی دیوار پر کھڑی ہے۔ اور بھروسے نے وہیں سے پھر ڈانٹا "تو کیوں اوپر چڑھ آئی؟ نیچے اتر!"

لیکن وہ اس وقت تک وہیں کھڑی رہی جب تک بھروسے ٹین پر آ گیا۔ پھر وہ بولی "میں سمجھی تم بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ سارا گھر کاٹ کھانے لگا۔ اور میں نے اوپر چڑھ کر اپنے گھر کو دیکھا، مجھے جان پڑا تا بھی اسی کے نیچے کچلی پڑی ہیں!" اور وہ وہیں بیٹھ کر سسکنے لگی۔ بھروسے نے دلاسا دیا "پگلی! وہ سہر میں چین کر رہی ہے۔ وہ یہاں کہاں تھی کہ کچل جاتی؟ بے کار مت رو۔ چل، نیچے اتر!" اور وہ اسے سنبھال کر نیچے لے آیا۔ اور گو اس کا مورتی بنانے کا آج جی نہ اٹھتا تھا مگر ہریا کی توجہ ہٹانے اور اسے غصہ دلانے کے لیے بھروسے نے کہا "چل، چل! لہنگے کے دام ادا کر!"

ہریا نے اسے بڑے غصے سے دیکھا۔ وہ بولا "گھورتی کیا ہے؟ ایسا بڑھیا لہنگا کہیں ممت (مفت) ملتا ہے" اور وہ مٹی میں تھوڑا پانی ملا کر اسے نرم کرنے لگا۔ ہریا کھڑی اسے غصے سے دیکھا کی۔ بھروسے نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے حکم سنایا "کھڑی دیکھتی کیا ہے؟ چل، ساری اتار!" ہریا ٹہلتی ہوئی کمر میں بیسیوں بل ڈالتی ہوئی اس کے پاس پہنچی اور دانت پیس کر بولی "نہیں ننگے ہوں گے انہیں ننگے ہوں گے! تمہارا جو جی چاہے کر لو!"

بھروسے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ ٹین کے نیچے سے لہنگے والا جوڑا اٹھایا اور اسے لئے ہوئے گلی والی منڈیر کی طرف چلا۔ ہریا نے تعجب سے پوچھا "کہاں لئے جا رہے ہو اسے؟"

بھروسے نے کہا "تو اب اسے لگی نہیں! مالتی کو میں اسے پہننے نہ دوں گا۔ اس لئے یہ تین سو کی لاگت کا جوڑا بے کار ہے اسے پانی میں بہا دینا ہی ٹھیک ہے!" اور اس نے جوڑا اس طرح ہاتھوں پر اونچا کیا کہ جیسے وہ اسے پھینکنے والا ہی ہے۔ لہنگے کے زری کے کام میں اور دوپٹے کی ٹانکی میں سورج کی کرنیں جھلس کر تڑپیں، ہریا کے دل پر بجلی سی گری۔ اس نے اچک کر بھروسے کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ گڑگڑائی "نہ پھینکو کاکا! میں تمہارے سامنے ننگی ہوں گی! سو بار ننگی ہوں گی!"

بھروسے ایک جیتے ہوئے شاطر کی طرح مسکرایا اور اس نے جوڑا ہریا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اسے سینے سے لگائے دیر تک کھڑی جھجکی۔ پھر اس نے اسے جا کر کھونٹے پر رکھا اور اس طرح آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا جیسے! اس کا سویا ہوا بچہ ہے! پھر اس نے سر جھٹک کر ساری کھول کر پھینک دی اور بڑی متانت سے ٹہلتی ہوئی بھروسے کے پاس آ کر بولی "لو! دیکھ لو! جی بھر کر دیکھ لو!"

اور بھروسے دوپہر تک دھوپ میں بیٹھا پسینے میں نہایا مورتی بنا تا رہا۔ ہریا کو ایک گھنٹے کے بعد روٹی دال پکانے کے لئے چھٹی مل گئی تھی۔ مگر خود بھروسے کا نہ تو ہاتھ رکا اور نہ اس نے دم لیا۔ بار بار مختلف اعضا کو بناتا، بگاڑتا، توڑتا، بدلتا رہا۔ کسی کے تناؤ میں کمی کرتا،

ایک ایک کر کے بڑے پیار سے اٹھائے اور آہستہ آہستہ گلی والی منڈیر کی طرف جا کر ہاتھ بڑھا کر انھیں پانی میں اس طرح ڈالا جیسے کوئی جگر کے ٹکڑے کی لاش اپنے ہاتھ سے گنگا میں بہاتا ہے۔

شفق کی سرخی غائب ہو چلی تھی، جانے کے بعد کھچڑی تیار ہو رہی تھی۔ بھروسے پر ایک عجیب طرح کی یاسیت چھائی جا رہی تھی۔ کیا فائدہ گھر بنانے کا؟ کیا فائدہ مورتیاں بنانے کا؟ کیا فائدہ آدرشوں، اصولوں پر چلنے کا؟ کیا فائدہ بھگوان پر یقین کرنے کا؟ ایک دن مرنا سب کو ہے۔ کون جانتا ہے کہ شمشان میں جل جانے کے بعد پھر کیا ہوگا، کیا نہیں ہوگا؟ دوسرا جنم، تیسرا جنم! میں اس کے پہلے کیا تھا، میں کچھ نہیں جانتا۔ میں مر کے کیا بنوں گا، میں کچھ نہیں جانتا۔ کچھ نہیں جانتا۔ کچھ نہیں! کچھ نہیں! سب کچھ مایا ہے، ڈھکوسلا ہے، دھوکا۔ بیوی بچے، شہرت، نام، سب بے کار! لوگ کہتے ہیں فن کار، ادیب شاعر، بڑے بڑے کام کرنے والے امر ہو جاتے ہیں۔ لوگ انھیں کبھی نہیں بھولتے۔ مگر اس سے مرے ہوئے فن کار کو فائدہ؟ کوئی یاد کرے یا نہ کرے، کوئی اچھا کہے یا برا سمجھے، جب ہم ہی نہ رہے تو پھر کیا؟ چتا میں جلنے کے بعد، ہوا اس کی راکھ کو کہیں اور اڑا لے جائے گی اور منجھو کی راکھ کو کہیں اور ذرے ملے بھی تو کیا۔ ۔ ایک دوسرے کو جان سکیں گے، پہچان سکیں گے؟ کچھ نہیں، کچھ نہیں! ہم سب بڑے کمہار کے کھلونے ہیں، جب ٹوٹ جاتے ہیں وہ ہمیں پھینک کر دوسرے بنانے لگتا ہے۔ اور وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگا: کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں۔ کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں! پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔ کون بہلا گیا ہے؟ میں یا بڑا کمہار؟ میرے لئے تو ہزاروں جنجال ہیں، ہزاروں فکریں۔ اگر ان کھلونوں سے میرا دل بہل جاتا، تو پھر مجھے منجھو کی کیوں فکر ہوتی، مالتی اور منّو کے لیے میرا دل کیوں کڑھتا؟ اور یہ چھوکری ہریا بھی تو ایک کھلونا ہی ہے۔ کیوں نہ دل بہلاؤں میں اس سے؟ مگر بہلے گا بھی دل اس سے؟ بس چند منٹ کی لذّت اور جنم بھر کی ذلّت! میں اور منگلو دونوں تلے میں برابر ہی ٹھہریں گے۔ منگلو کو تو لوگ گنڈا کہتے ہیں۔ مگر میں! میں تو دیوی، دیوتاؤں کا بنانے والا ہوں۔ اگر میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھوں، تو کیا میں پھر کسی دیوی کی مورتی بنا سکوں گا؟ کیا میں لکشمی کو بلا کسی گندے خیال کے چھو سکوں گا....؟"

اس کے خیالات کی زنجیر ہریا کی آواز نے ایک جھٹکے سے توڑ دی۔ وہ بٹلوئی آگ سے نیچے اتار کر بولی "لو آؤ کھچڑی کھا لو، تیار ہو گئی۔" ــــ اور بھروسے کو دفعتاً محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک گیا ہے، اور اسے بھوک بھی لگی ہے۔ وہ خاموشی سے منھ ہاتھ دھو کر کھچڑی کھانے بیٹھا تو ہریا نے تعجب سے پوچھا کہ "نہاؤ گے نہیں؟" وہ بولا "سارا محلہ ہی پانی میں نہا رہا ہے۔ میں نہ نہاؤں گا تو کون سا ہرج ہو جائے گا!"

کھچڑی کھا کر وہ لکشمی دیوی کی مورتی کو اٹھا لایا۔ ہریا نے گھبرا کر پوچھا "اب کیا اسے بھی توڑنے کا ارادہ ہے؟" وہ بولا "نہیں! تو بار بار کہتی ہے ڈر لگتا ہے۔ اسے تیرے سرہانے کھڑا کر دوں گا، اس کے چرنوں میں تو تجھے ڈر نہ لگے گا!"

اور ہریا آج کی رات کے لئے ساری سوچی ہوئی شرارتیں بھول کر دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر جھک گئی۔

دوسرے دن بھی سویرے اٹھتے ہی، جو سب سے بڑی فکر سر پر سوار ہوئی وہ گھر سے نکلنے کی تدبیر کی تلاش تھی۔ پھر دیوار پر چڑھا، پھر دوسروں کی دیواروں اور چھتوں سے ہوتا ہوا سڑک تک پہنچا۔ اس نے سیٹھ جی کے چوکی دار کو آواز دی۔ تک اپنی چھت کی منڈیر پر آ بیٹھا۔ دونوں میں باتیں ہوئیں۔ خبریں بڑی بھیانک تھیں۔ دو سو سے زیادہ آدمی، عورتیں بچے، لوہے کے پل پر پھنسے ہیں اور پل کو پانی دونوں کناروں سے کاٹ رہا ہے۔ دھارا اتنا تیز ہے کہ نہ کوئی کشتی، نہ کوئی پیرنے والا اُن تک پہنچ سکتا ہے۔ رات کے سناٹے میں جب پل ہلتا ہے تو لوگ اس طرح چیختے ہیں کہ آواز گھنٹہ گھر تک آتی ہے۔ ان کی فریاد سن کر دل ٹکڑے ہوتا ہے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔ اس پر دو دن سے سب بھوکے ہیں، ایک دانہ کسی کو نہیں ملا ہے۔

ہریا نے جھنجھلا کر کہا "وہ بھردے کاکا! مرد! تم جیسا نہیں!"

بھردے نے حد درجہ تپ کر جواب دیا "ہاں وہ مرد ہے۔ شیر ہے باگھ ہے! اسے معلوم ہوتا تو یہاں ہے تو وہ ہمکتا، اچکتا، بھاگتا پہنچ جاتا! پانی دیے رونق تو وہ ایسی ڈانٹ بتاتا کہ یہ سارے میں پھیلی ہوئی گوشت سمٹ کر سر کٹا نالا بن جاتی! ہونہہ!"

اور اس نے کروٹ لے لی۔ ہریا نے پہلے تو اس کی باتیں تعجب سے سنیں، پھر وہ ہنسنے لگی۔ اسے بھردے کے منگلو سے تپنے جلنے سے تسکین سی محسوس ہوئی۔ وہ دیر تک مسکراتی رہی، پھر بھردے کی اس بلا کو نیند آ گئی!

چوتھی رات۔ آدھی رات گزری ہوگی کہ کسی نے ٹارچ کی تیز روشنی چھت پر ڈالی، ہریا کے کھٹولے سے ہوتی ہوئی جب روشنی بھردے کے چہرے پر پڑی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ روشنی تو غائب ہو گئی، مگر کئی آدمیوں کے بولنے اور پھر دھا دھم چھت پر کودنے کی آواز آئی۔ بھردے نے خوف زدہ آواز میں پوچھا "ک۔۔۔ ک۔۔۔ کون؟"

جواب ملا "تمہارے بچا!" پھر ٹارچ جلا کر اس کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی گئی اور تین سائے ہاتھوں میں بلم لئے اس کی طرف بڑھنے لگے۔ بھردے کی گھگی بندھ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ حواس ٹھکانے کر کے ان کے مقابلے، یا اپنی حفاظت کی ہمت کر سکے، ایک انی اس کے سینے پر رکھ دی گئی۔ اور ایک موٹی آواز میں حکم ملا "خبردار جو اپنی جگہ سے ہلا۔۔۔!"

ٹارچ کی روشنی بکسوں سے ہوتی ہوئی موم بتی پر بھی پڑی جو آدھی سے زیادہ جل چکی تھی، اور جو سوتے وقت بجھا دی گئی تھی۔ ان میں سے ایک بولا "ارے اسے جلاؤ میاں تو بڑا سامان ہے!"

ایک نے تو بتی جلائی، دوسرا جو بھردے کے سینے پر انی رکھے تھا، بولا "لاؤ جی، بکسوں کی چابی ادھر بڑھاؤ!"

بھردے نے سرہانے رکھا ہوا گچھا کانپتے ہاتھوں سے اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ گچھا لے کر بکس کھولنے لگا۔ اتنی جو کھٹ پٹ ہوئی تو ہریا جاگ اٹھی، اور گھٹی گھٹی آواز میں "چور! چور!" چلانے لگی۔ تیسرے ڈاکو نے بڑھ کر اسے طمانچہ مارا "چپ حرام جادی!"

بھردے کی مردانگی کو ٹھیس لگی۔ ڈر پر غصہ غالب آیا۔ اس نے کہا "استری پر ہاتھ اٹھاتے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

وہ بولا "اچھا تو لے مرد کو مارتے ہیں!" اور اس نے بھالے کا ڈنڈا اس زور سے بھردے کے سینے میں کونچ دیا کہ وہ "ہائے!" کر کے پلنگ سے نیچے گر پڑا۔ دوسرا ڈاکو پلٹ پڑا "ارے اسے مارو نہیں، اسے باندھ کر ڈال دو۔ یہ اپنے شہر کا سب سے بڑا کاریگر ہے!"

اس نے کہا "ہوگا کاریگر! اکڑتا کیوں ہے!" پھر وہ ہریا کی طرف مڑ کر بولا "چپکی بیٹھی رہ، نہیں تو یہ بھالا سینے کے پار ہوگا!" اور اس نے نیم بے ہوش بھردے کو ننگا کر کے اسی کی دھوتی سے اس کے ہاتھ پاؤں کس کے باندھ دیے۔ ہریا بھردے کو یوں ننگا دیکھ کر اپنا ڈر بھول گئی اور بے ساختہ کھل کھلا کر کے ہنسنے لگی۔ ڈاکو نے بھردے کے پاس ہی سے بیٹھے بیٹھے پوچھا "کیوں ہنستی ہے رے؟" ہریا کی ہنسی رک گئی۔ اس نے سر ہلا کر کہا "کچھ نہیں!"

وہ ہاتھ سے خاک جھاڑتا ہوا اٹھا، اس نے ہریا کے سر کے بال پکڑ کر اس طرح کھینچے کہ ہریا کا چہرہ بالکل اس کی طرف ہو گیا۔ اس نے ہریا کی سہمی آنکھوں میں اپنی خونی آنکھیں ڈال کر کہا "ہم ایسوں کی ہر بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہیں، میری جان!"

وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی "انھیں ننگا دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ انھوں نے مجھے ننگا کر کے۔۔۔۔"

اس نے ہریا کے بال چھوڑ دیئے اور بھردے کے چوتڑوں پر بلم کے ڈنڈے سے ہلکی سی چوٹ دے کر کہا "اچھا تو یہ کرتوت ہیں، ان بڑے میاں کے!" اور وہ خود بھی مسکرانے لگا۔

پھر اس نے ہریا سے پوچھا "کون ہے یہ تیرا؟ پتی کہ یار؟"

ہریا نے سر ہلا کر کہا "کوئی نہیں!"

کبھی کے ڈھیلے پن کو کستا، کسی کی کو بڑھاتا، کسی کے ابھار کو گھٹاتا۔ اس نے مورتی سے اسی وقت سر اٹھایا جب ہریا نے روٹی کھانے کے لئے پکا
اس نے پہلے اشنان کیا پھر وہ تھوڑا سا کھانا کھا کر بکس پر لیٹ گیا اور منزل پر پہونچے ہوئے مسافر کی طرح اطمینان سے سو گیا۔

ہریا پر بھی اس کی متانت، اور فن میں اس کی محویت کا بڑا اثر پڑا۔ وہ اپنا چنچل پن بھول گئی۔ اور وہ بھی برتن مانجھ دھو کر، جب کمٹھا پکڑ سیدھی کرنے کے لئے لیٹی تو اُسے فوراً نیند آ گئی۔

سہ پہر کو بیلی کا پٹرکی پھڑپھڑاہٹ نے انھیں جگا دیا۔ دونوں کھلی چھت پر آ کر اسے دیکھنے لگے۔ پھر سے ہریا کی میلی ساری کا ہوا میں لہرا لہرا کر زور زور سے پکارا "ہمیں بچاؤ!" مگر بیلی کا پٹر اڑتا ہوا دور نکل گیا۔ نہ جانے اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی نظر ان دونوں پر پڑی بھی یا نہیں۔ ہریا سسکنے لگی "کسی کو ہماری پروا نہیں! کوئی سنتا ہی نہیں! ہم یہیں مریں گے! سڑیں گے!"

بھروسے نے دلاسا دیا "کیوں بن ناہک (ناحق) ہلکان ہوتی ہے! بھگوان تو ہے، وہ تو سب سنتا دیکھتا ہے!"

ہریا نے جل کر کہا "پر اس کے ہردے میں دیا نہیں! وہ کسی کی بپتا سن کر پسیجتا ہی نہیں!"

بھروسے نے اپنی قابلیت جتائی "ارے گالب کہہ گیا ہے، ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا! آ، چل، مورتی بنائیں!" اور وہ مورتی کے پاس جا کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ ٹانگوں کے تناؤ یا جھکاؤ میں اسے کچھ شک ہوا۔ وہ بولا "جا ساری کھول کر گرا دے!"

ہریا جھنجھلا اٹھی "تمہارا جی ہی نہیں بھرتا ننگی دیکھنے سے!"

وہ عاجزی سے دانت نکال کر بولا "کھپا (خفا) مت ہو! ایک جگہ مورتی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ میں پھر دیکھ لینا چاہتا ہوں!"

ہریا نے پھر جھٹکے سے ساری کھول کر دور پھینک دی "لو پھر دیکھو! اچھی طرح دیکھو!" وہ بولی۔

تھوڑی دیر تو وہ تنی کھڑی رہی، پھر بھروسے کی پتلی پتلی انگلیوں کو مٹی کو بے پروائی سے توڑتے، مروڑتے، گھٹاتے، بڑھاتے دیکھ کر وہ خود مورتی کو جھک کر دیکھنے لگی۔ وہ اسے دیکھتی، پھر اپنے جسم کے مختلف حصوں کو دیکھتی۔ معلوم ہوتا ہو بہو وہی کھڑی ہے۔ بس چہرہ دوسرا تھا۔ حد درجہ حسین، دلکش نک سک سے درست۔

ہریا احساس کمتری کا شکار ہو کر بھروسے کا کندھا جھنجھوڑ کر بولی "اس کو میرا شریر دیا ہے، تو مجھے بھی اس کا چہرہ دو!"

بھروسے نے سر اٹھا کر مسکرا کر کہا "پگلی! یہ تو مٹی کی ہے، اس کو میں بنا رہا ہوں۔ تجھے تو سب سے بڑے کمہار نے بنایا ہے، بھگوان نے!"

ساری باندھنے کی غرض سے مٹی کی طرف اٹھلاتے ہوئے جا کر ہریا نے کہا "تو وہ تم سے بھی چھوٹا کمہار ہے!"

رات کو جب دونوں الگ الگ لیٹے، تو ہریا نے انگڑائی لے کر لیٹنے کو اتنا تانا کہ اس کی ٹانگیں کھٹولے سے باہر نکل گئیں، اس نے شرارت سے بھروسے کو چھیڑنے کے لئے کہا "کاکا، یہ کھٹولا بہت چھوٹا ہے، کہو تو تمہاری ہی کھاٹ پر میں بھی آ جاؤں!"

بھروسے نے غرّا کر کہا "ہر مجادی! لگی پھر پاجی پن کرنے!"

وہ بولی "اب اس میں لجانے کی کیا بات ہے؟ تم میرا رواں رواں تو دیکھ چکے!"

بھروسے نے جھلا کر طعنہ دیا "میں ننگلو نہیں ہوں!"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "نہ جانے کس حال میں ہے وہ بے چارا۔ وہ یہاں آ سکتا تو اب تک کب کا مجھے آ کر نکال لے گیا ہوتا!"

بھروسے نے طنز سے کہا "جرور! جرور!"

وہ ہنس کر بولی "ہو تمہارا یہ مردے سے نہیں ڈرتی!"

ڈاکو نے پکارا "اری کیا کرنے لگی؟"

وہ اس کی طرف جاتے ہوئے بولی "کچھ نہیں اس ہیجڑے پر تھوک رہی تھی!" اور اس نے پلٹ کر سچ مچ بھرو سے پر تھوک دیا!

بھروسے کو زور کے قہقہوں کے ساتھ چپو کی چپ چپ تھوڑی دیر تک سنائی دیتی رہی، پھر وہی اپنے آنگن کے مینڈکوں کی ٹرٹر۔ بھروسے نے دھوتی کے پھندے ہاتھوں سے نکالے، ٹانگوں میں بندھی گرہیں کھولیں اور دھوتی باندھے بغیر وہ بکسوں پر جھکا۔ ایک ایک کر کے انہیں دیکھ ڈالا۔ تہہ میں بچھائے ہوئے کاغذ کے سوا ان میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ہر بکس کو دھڑاکے سے بند کرتا اور ہر بار "حرام جادے! حرام جادے!" کہتا رہا۔ پھر اس نے دفعتاً اپنے جسم پر ہریا کے تھوک کی ٹھنڈک محسوس کی۔ وہ سارے جسم سے گنگنا اٹھا۔ اور اس نے منہ بنا کر کہا "حرام جادی!"

اس نے اپنی دھوتی گگرے کی گردن میں باندھی اور اسے گلی میں لٹکا کر بھرا اور پورا گگرا اپنے پر انڈیل لیا۔ اس نے جسم کے ہر حصے کو خوب ملا، مگر تھوک سے داغ دار حصے پر وہ اپنا ہاتھ نہ پھیر سکا۔ اس نے دوسرا گگرا پھر بھرا اور اسے کمر سے ٹانگوں پر انڈیلا۔ اب بھی وہ تھوکے ہوئے حصے تک ہاتھ نہ لے جا سکا۔ اسے نہ جانے کیوں اپنے اس حصے سے گھن لگتی تھی۔ اس گھن کی وجہ جسمانی سے زیادہ ذہنی تھی۔ کیا وہ ایسا برا تھا کہ ہریا جیسی چھوکری اس پر تھوکے؟ اور اسے عمر میں پہلی دفعہ اپنے جسم کے بڈھے پن کا احساس ہوا۔ دوسروں کے جسم کی خوب صورتی و بدصورتی پر کھنے والے فن کار نے اپنے سوکھے لاغر جسم کو غور سے دیکھا۔ واقعی اس کے اعضا میں کوئی تناسب نہ تھا۔ اس نے تلخی سے سوچا: "عورت تو مضبوط سے مضبوط بازوؤں کا سہارا چاہتی ہے، اور تو، ناآسودہ شی کی پناہ"۔۔ وہ ہریا کے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ پھر بھی یہ تھوک! اس نے بڑی نفرت اور حسرت سے "حرام جادی!" کہا اور بڑی بے بسی سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ شمع کی جھلملاتی روشنی میں مورتیوں والی مٹی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور اسے صابن کی طرح کمر سے نیچے سارے دھڑ پر مل ڈالا۔ اور جب اس نے تیسرا گگرا بھر کر جسم دھویا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے فن میں کام آنے والی مٹی نے اسے پاک کر دیا ہے۔ وہ عجیب طرح کی فرحت محسوس کرنے لگا۔ اس کا کام کرنے کو بے ساختہ جی چاہنے لگا۔ اس نے اپنی نیم خشک دھوتی باندھ کر دھندلکے ہی میں، ناتمام مورتی سنبھالی اور کام میں لگ گیا اور زبان پر چڑھا ہوا مصرعہ گنگناتا رہا "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں، کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!"

صبح دیر تک وہ سوتا رہا۔ اس کی آنکھ کسی کے پکارنے پر کھلی۔ کوئی قریب والی چھت سے پکار رہا تھا "بھروسے کاکا!" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے چیخ کر پوچھا "کون ہے بھائی؟ میں یہاں ہوں، اپنی چھت پر!"

تھوڑی دیر میں منگلو دیوار دیوار آتا دکھائی دیا۔ بھروسے نے دانت نکال کر پوچھا "ارے تم کیسے ادھر نکل آئے، منگلو!" وہ بولا "تم ہی لوگوں کی کھوج میں نکلا ہوں کاکا" پھر اس نے ادھر ادھر نظر ڈال کر پوچھا "وہ بے چاری ہریا کہاں ہے کاکا؟ اس کا تو پورا گھر ہی گر پڑا ہے!" بھروسے نے کہا "ہاں بھیا بڑی تباہی آئی ہم سب پر! میں تو ہریا کو اسی رات اپنی چھت پر لے آیا تھا، جس رات پانی بڑھا ہے۔ بڑا آرام ملا اس لونڈیا کی وجہ سے۔ پر کل رات تین تین ڈاکو ناؤ پر چڑھ کر آئے اور میری چھت پر دھما دھم کودے۔ مجھو نے جو کچھ عمر بھر میں اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر مالتی کے بیاہ کے لئے اکٹھا کیا تھا، وہ سب بٹور لے گئے حرام جادے! اور ہریا کو بھی ساتھ لے گئے......"

منگلو نے فکر کے لہجے میں پوچھا "وہ ہریا کو پکڑ لے گئے اور تم بیٹھے دیکھا کیے؟"

بھروسے نے کہا "نہیں بھیا! تمہیں ایسا ہو سکتا تھا! پر انھوں نے پہلے ہی سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے۔ اور ہریا تو خود

"پھر تو یہاں کیسے آئی؟ کہاں گھر ہے؟" اس نے پوچھا۔

ہریا نے کہا "بجلی (بجلی) والے مکان میں۔ وہ گرنے لگا تو یہ مجھے بچا لائے!"

وہ مسکرا کر بولا "اچھا، تو اسی جان بچانے کے دام یہ وصول کر رہے تھے! تو پھر چل ہمارے ساتھ! ہم تجھے سہر پہنچا دیں گے!"

بھروسے وہیں فرش پر پڑا بولا "ارے نہ جانا اس کے ساتھ! یہ ڈاکو ہے!......"

ڈاکو نے پلٹ کر بھروسے کو دیکھا "اچھا، چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں!" وہ غرایا اور اس نے بھروسے کو ایک ٹھوکر رسید کی۔ بھروسے چپ ہو گیا، ایک شبد بھی منہ سے نکالا! پھر وہ ہریا سے پلٹ کر بولا "بول! چلے گی سہر؟"

ہریا نے کہا "سچ؟ پہنچا دو گے؟"

اس نے کہا "ہاں، ہاں، چل ہمارے ساتھ، نہ جانے کب یہ گھر بھی گر جائے!"

اتنے میں بجسوں میں سے ساری چیزیں سمیٹنے والوں میں ایک بولا "ارے یار، کیا لونڈیا سے ٹھٹھول (مخول) کر رہا ہے، لے یہ گٹھری تو ناؤ میں رکھ آ!"

ہریا کو چھیڑنے والے نے ساتھی سے گٹھری لے کر ہریا کے سر پر رکھ دی "چل! اسے ناؤ تک پہنچا!"

وہ ذرا ٹھٹکی تو ڈاکو بولا "ارے نخرے دکھرے، نہ بگھار! سیدھے سیدھے چل!" اور اس نے ہریا کو اس طرح ڈھکیلا جس طرح ٹھنڈے انجن والا موٹروں کو ڈھکیلا جا رہا ہے۔ گلی والی منڈیر تک آکر ہریا نے نیچے جھانکا۔ پانی اب منڈیر کے نیچے تھا۔ وہ غرا غرا کر دیوار کو ٹکریں مار رہا تھا۔ اس میلے، جھاگ سے بھرے پانی پر ایک کشتی تیر رہی تھی، جو منڈیر کی جھجھریوں سے بندھی تھی۔ اندھیرا تھا، پانی کی بھیانک آواز تھی اور بلم لیے ڈاکو بغل میں۔ ہریا جھجھک کر پیچھے ہٹی۔ ڈاکو نے زور سے بازو پکڑ کر کہا "خبردار، جیکی کھڑی رہ!" وہ کھڑی ہو کر تھر تھر کانپنے لگی۔ وہ کمند تھپ تھپا کر بولا "بڑی ڈرپوک ہے رے!" اور وہ منڈیر پر چڑھ کر کشتی میں اتر گیا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ہریا کے سر سے گٹھری لے لی اور چبڑ والے لہجے میں بولا "آ، تو بھی چلی آ، کہاں اس بوڑھے کھوسٹ کے ساتھ رہ کر بھوکوں مرے گی! ابھی پانی ہفتوں (ہفتوں) نہیں گھٹے گا!"

ہریا نے کہا "مجھے بڑا ڈر لگتا ہے!"

وہ بولا "ڈر کاہے کا؟ ہم تین تین جوان ہیں، ابھی چٹکی بجاتے تجھے پار اتار دیں گے!" اور وہ پھر منڈیر پھاند کر چھت پر آ گیا۔

ادھر دونوں ساتھی خوشی سے کھل کھلا رہے تھے "اچھے کا منہ دیکھ کر آج سگوں (صبح) اٹھے! بڑا مال مالا اکٹھا کر کے رکھا ہے اس کہار نے!" انھیں منجوکی چھپا کر رکھی ہوئی چاندی کی اینٹیں ملی تھیں اور کئی ساریوں کی تہوں میں سو سو کے نوٹ بھی۔ انھوں نے یہ سب سمیٹ کر دوسری گٹھری میں باندھنا چاہا تو لہنگے والا جوڑا بھی اٹھایا۔ ہریا چیخ پڑی "اسے نہ رکھو! یہ میرا ہے!" اور وہ ان کی طرف جھپٹی۔ ڈاکو نے اس کی کمر میں ہاتھ دے کر روکا "ہاں، ہاں، یہ تیرا ہی ہے، بلکہ اس مال میں پورا تیسرا حصہ تیرا ہے۔ تو چل میرے ساتھ!"

ہریا نے ٹھنک کر کہا "تو ہم وہ بنارسی ساری بھی لیں گے جو دھانی رنگ کی ہے!"

اس نے ذرا جھجک کر کہا "ہاں، ہاں، وہ بھی لے لینا۔ سب کچھ تیرا ہے پیاری!"

اور وہ اس کی گردن میں باہیں ڈال کر بولی "تم بڑے اچھے ہو!" اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔ منڈیر کے پاس جب وہ سب پہونچے تو دونوں ساتھیوں نے کہا "یہ کہاں کا جھول پال رہے ہو؟"

ہریا کے ساتھ والے ڈاکو نے کہا "تم دونوں کی اپنی اپنی بستی ہے۔ ہم اپنا گھر نہ بسائیں؟" اور ہریا سے بولا "آؤ چلو، پیاری!"

اس نے کہا "میں ابھی آئی" اور لپکی ہوئی بھروسے کے پاس آئی۔ اس نے جھک کر تیزی سے اس کے ہاتھ کی گرہ کھول دی۔ بھروسے نے کہا "ارے مت جا ان کے ساتھ۔ یہ ڈاکو ہیں جان جوکھوں کا ماملا (معاملہ) ہے۔"

گناہِ بے لذّت

عبید جب ٹرین سے اترا تو اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بج چکے تھے، مگر سورج نے گہرے کہرے میں منہ چھپا رکھا تھا۔ یخ پڑ رہی تھی۔ برف میں جھلی ہوا چل رہی تھی۔ چار باغ جیسے بڑے اسٹیشن پر، جہاں ہر ٹرین کی آمد و روانگی کے وقت کھوے سے کھوا چھلتا ہے، ایک عجیب طرح کا سناٹا تھا۔ اسٹیشن کیا تھا، جیسے برات اتارنے والا گھر، لڑکی کی رخصتی کے بعد۔ بس پانچ سات قلی دکھائی دیئے وہ بھی سمٹے لپٹے، پالا مارے ہوئے پودوں کی طرح سکڑے سکڑائے۔ موسم کی یہ کیفیت عبید کی اس سفر کی روانگی کے وقت بھی لکھنؤ میں موجود تھی۔ مگر اس وقت لوگوں پر ٹھنڈک کا اتنا اثر نہ تھا۔ وہ ابتدا تھی، قوت برداشت زیادہ تھی۔ اب شاید خون جمنے لگا تھا ٹھنڈک ہڈیوں میں اتر گئی تھی۔

رات کو ٹرین پر اس نے خود بھی سردی کی اس تیزی کو بڑی طرح محسوس کیا تھا۔ اس نے برتھ پر اپنا خاصا موٹا گدا بچھا رکھا تھا۔ اس پر دو دو کمل اوڑھے تھے۔ ان کے اوپر سے اپنا موٹا اوورکوٹ بھی ڈال لیا تھا۔ مگر پاؤں پھیلا کر نہ سو سکا تھا۔ ٹھنڈک کے مارے گٹھری ہی بنا رہا۔ اس کا بار بار جی چاہا تھا کہ وہ حمیدہ کی بیش قیمتی چادر اٹیچی سے نکال کر جسم بھر میں لپیٹ لے یقیناً وہ اس طرح سے گرما سکتا تھا۔ لیکن اس نے سردی کھائی، تکلیف اٹھائی، مگر بیوی کی قیمتی چادر نہ نکالی۔ ڈر تھا اوڑھنے لپیٹنے میں وہ ڈل جائے گی۔ عبید یہ بات کسی طرح پسند نہ کر سکتا تھا۔

بڑی عزیز تھی یہ چادر حمیدہ کو۔ بہت دنوں سے اس کی خواہش تھی کہ اس کے پاس ایک شال چادر، ایسی خوبصورت، اور اتنی اچھی ہو کہ ہم چشموں میں کسی کے پاس نہ نکلے۔ اب کے اپریل میں عبید جشن بہار کے مشاعرے میں شریک ہونے سری نگر گیا تھا۔ وہیں سے یہ شال شہر کی ساری دوکانیں چھان کر وہ اپنی حمیدہ کے لیے لایا تھا۔ اس کے چوڑے حاشیے پر بہت ہی عمدہ نازک سرک اور باریک کام بنا تھا اور بیچ والے حصے میں ہر طرح کے بیل بوٹے کھلے تھے۔ گلاب و لالہ، بنفشہ و نرگس، سیوتی اور سوسن، کنول اور کوزہ۔ اس نے سوچا تھا کہ جب وہ حمیدہ کی پیٹھ اور شانوں پر پڑے گی تو وہ پھولوں کی سیج جیسے دکھائی دیں گے۔ کتنی خوش ہو گی وہ یہ شال پا کر۔ اس کے کندن جیسے گالوں میں ہلکی سی سرخی دوڑ جائے گی، اس کی آنکھوں میں تارے چمکیں گے، وہ۔ اسے اوڑھ کر اٹھلائے گی اور شوہر کو اپنی ہر ادا سے اس نادر تحفہ کے معاوضہ دینے کا وعدہ کر کے آپ ہی آپ شرمائے گی۔ کتنی پیاری ہوتی ہیں یہ اپنے شوہر سے شرمانے

(خود) اپنی مرضی (خوشی) سے ان کے ساتھ گئی۔۔۔"

منگلو نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں! اب اس کی جان بچنا مشکل ہے!"

بھروسے نے کہا "مگر ان میں کا ایک بار کہتا تھا میں تجھے اُس پار پہنچا دوں گا!"

منگلو نے کہا "اسے ساتھ لے جانے کے لئے اس پاجی نے باتیں بنائیں، وہ پار کیا اُتارے گا، ہر یا سے ان کا نام پتہ پولیس کو مل جائے گا، پھر وہ رک کر بولا "اچھا آؤ کاکا انہیں تو نکال لے چلیں یہ محلہ تو ابھی کئی دن پانی میں ڈوبا رہے گا!"

بھروسے نے پوچھا "ارے بیٹا کچھ منجو اور میرے بچوں کی بھی انہیں خبر ہے؟"

"وہ بڑا بھگوان جانے کاکا۔ دو سو سے زیادہ (زیادہ) عورت، مرد، بچے، بوڑھے لوہے کے پُل پر تین دن سے پھنسے پڑے ہیں، ہوائی جہاز سے روٹی چنا گرایا جا رہا ہے۔ اب تک ان کو نکالنے کو کوئی ناؤ نہ جا سکی۔ ہم کھدر گرجا گھر میں تھے۔ وہاں سیکڑوں آدمی لیو کا پڑا ہے — نہ جانے کہاں سے یہ پانی پھٹ پڑا ہے!"

بھروسے جلدی جلدی بکس پر بکس رکھ کر اوپر چڑھنے لگا تو منگلو کی نظر کھانے کے سامان پر پڑی۔ اس نے کہا "کاکا، یہ سب سامان اور برتن باہر لو۔ گرجا گھر میں کسی کے منہ میں کئی دن سے ایک دانہ نہیں گیا ہے۔ سیٹھ رام داس بھی وہیں پھنسے ہیں!" بھروسے نے ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ اناج ٹینوں میں تھا، صرف چاول ایک تھیلے میں تھا۔ اسی میں اس نے ایک بنڈلی مسالے کا ڈبہ، تواا، کڑچھا رکھا۔ مگر اور سامان کاہے میں رکھا جائے؟ اس نے منگلو کو بے بسی سے دیکھ کر کہا "بیٹے تو سب کچھ، مگر جائے گا کاہے میں اور کیسے؟"

منگلو نے کہا "ارے یہ بکسے تو خالی ہی ہیں، ان میں سے کسی میں بھر دو۔ پھر کسی طرح لے چلیں گے!"

اور منگلو اور بھروسے — گنڈا اور فن کار — انسانیت کے ناطے، اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر اناج اور برتن سے بھرا بکس گرجا گھر تک لے ہی گئے۔ اور راستے بھر فن کار بھروسے، منگلو گنڈے کو سچے دل سے "بیٹا" اور "بیٹا" کہتا گیا!—

آٹھویں دن جب بھروسے منجو، مالتی اور منو کے ساتھ ٹوٹے ہوئے لوہے کے پل کی جگہ کشتی کے ذریعہ ڈالی گنج پہنچا، تو اُسے دریا کے کنارے ہی پر منگلو ملا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بھروسے نے بیوی بچوں کو آگے بڑھ جانے دیا اور خود رک کر منگلو سے پوچھا "کیا بات ہے منگلو؟ کھیریت (خیریت) تو ہے؟"

منگلو نے بھروسے کا ہاتھ پکڑ کر کہا "میرے ساتھ آؤ، کاکا!" اور وہ دریا کے کنارے کنارے چل کر تھوڑی دور گئے تھے کہ بھروسے کے نتھنوں نے سڑی ہوئی لاش کی خبر دی، اور پھر گدھوں کے ایک جھنڈ نے، لڑتے، نوچتے، کھسوٹتے جھنڈ نے اس کی تصدیق کر دی۔ منگلو نے ڈھیلے مار مار کر گدھوں کو اڑا دیا۔ ہڈیوں کے ڈھانچے کے قریب کچھ گوشت کے سڑے ٹکڑے پڑے تھے، کچھ چادر چھٹ کی ساری کی دھجیاں۔ پہچان صرف کالے بالوں اور گھنی بھوؤں سے ہوتی تھی یا منگلو کی دی ہوئی چاندی کی ایک انگوٹھی سے جو گدھوں کے نوچنے پر بھی انگلی سے نہ نکل سکی تھی۔

بھروسے نے (تھوک) کر کہا "ہائے، چھوکری کو حرام جادوں نے مار ہی ڈالا!" پھر وہ بڑے ہار کر تھو تھو کرتا، ڈگمگاتا، لڑکھڑاتا گھر کی طرف چلا۔ منگلو کھڑا دانت پیستا رہا۔ پھر اس نے اپنا انگوچھا ناک اور منہ میں لپیٹ لیا اور بڑے بڑے ڈھیلے چن کر وہ گدھوں کو مارنے لگا۔

بھروسے کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اس میں مالتی اور منو تو تھے ہی، اس کے دونوں ماتحت کاریگر اور دو ایک محلے والے بھی موجود تھے۔ مگر بھروسے نے کسی سے بات نہ کی۔ وہ سیدھا اپنی چھت پر چلا گیا۔ اس نے دیکھا ہوا نے دیوار سے لگی لکشمی دیوی کو زمین پر گرا دیا

(باقی صفحہ ۱۱۶ پر)

والی ادائیں۔ حمیدہ اس دلربائی میں طاق تھی۔

اور جب وہ لکھنؤ پہنچا تھا، اور گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے یہ حسین چادر حمیدہ کے کندھوں پر ڈال دی تھی، تو اس کے سارے خواب حرف حرف سچ نکلے تھے۔ وہ بوکھلائی سی تھی، وہ مسکرائی بھی تھی، وہ کھل کھلائی بھی تھی اور وہ بلبل کی طرح چہک بھی اٹھی تھی اور اس نے عبید کو جسم و جان کے انعامات سے مالا مال بھی کر دیا تھا۔ مگر چادر بیٹے اور شوہر کا رقیب بھی بن گئی تھی۔ حمیدہ کی نظر میں اس نے ایک نوبہ نو صنم کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس نے اسے سینت کر ایک شیشے کی الماری میں رکھا اور اس میں ایک مضبوط قفل ڈال دیا۔ یہ الماری کنجوس کے دل کی طرح ہمیشہ بند رہتی۔ بس اس کے شیشے دن میں دو دفعہ باہر سے جھاڑ دیے جاتے تھے گویا خاص مواقع ہوتے اس کی زیارت کے۔ چادر مغل بادشاہوں کی طرح اپنے جھروکے میں بیٹھی رہتی اور حمیدہ خود یا اس کی اجازت سے کوئی ہمسائی یا سہیلی اس کے درشن کر لیتی۔ عبید نے دو ایک بار ٹوکا بھی۔ "شال اوڑھنے کی چیز ہے، پرستش کی نہیں، ابھی گرمیاں ہیں اس لیے اتنا ہی کرو کہ اسے الماری سے نکال کر دو ایک بار دھوپ دکھا دو۔ اونی ہے کیڑا دیڑا نہ لگ جائے!" وہ کہتی "برا نہیں لگتا تمہیں ایسی بدشگونی کی بات زبان سے نکالتے! ارے میں دو تین بار تو اسے دن میں دیکھتی ہوں۔ موئے کیڑوں کی کیا مجال کہ اس کے پاس پھٹک سکیں!"

عبید کہتا۔ "اچھا بھئی، یونہی الماری سے نکال کر اپنے زانو کے پاس رکھ لیا کرو۔ معلوم ہو گا لہلہاتے باغ میں بیٹھی ہو!"

وہ کہتی: "دیکھتے نہیں کیسی آفت کی آندھیاں آجکل چل رہی ہیں۔ موئی گرد اس کے رویوں میں پیوست ہو کر منٹوں میں اس کو میلا کر دے گی۔ بس اب تو میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اسے اسی دن نکالوں گی، جس دن جاڑوں کے موسم میں اسے اوڑھ کر اپنے منّو کی برات کے ساتھ چاند سی بہو لانے جاؤں گی!"

اور وہ کھلونوں سے کھیلتے ہوئے تین برس کے بیٹے کو گود میں اٹھا کر اتنا چومتی، اتنا چومتی، کہ بچہ کسمسانے لگتا اور عبید کا جی چاہتا لگتا کہ دونوں غنچہ دہنوں کو ایک ساتھ سمیٹ کر کلیجے میں بھر لے!

یہی وجہ تھی کہ عبید اس چادر سے کچھ کچھ جلنے لگا تھا۔ اس کو یقین سا ہو چلا تھا کہ حمیدہ نے اپنی محبت میں چادر کو بیٹے اور شوہر کا برابر کا شریک بنا لیا ہے۔ لیکن اس کے تعجب کی انتہا ہی نہ رہی تھی وہ دن پہلے۔ اس روز جب اس کڑاکے کی سردی میں، وہ اپنے مختصر سفر پر روانہ ہونے لگا تھا، اور ہولڈال میں بستر رکھا جانے لگا تھا تو دونوں کو یاد آیا تھا کہ اس وقت تک عبید کا نیا لحاف تیار نہ ہو سکا تھا۔ بچہ اپنی چھوٹی سی مسہری میں سوتا تھا اور عبید شریک زندگی ہی کے لحاف کا شریک بن جاتا تھا۔ اپنا لحاف نہ ہونے سے اسے روئی اور دوئی دونوں نعمتیں نصیب رہتیں۔ مگر اس سفر کے لیے نہ تو روئی مہیا تھی، نہ دوئی۔ حمیدہ تھوڑی دیر تو سوچتی ہی پھر جھپٹ کر اپنی چہیتی شال چادر نکال لائی۔ عبید نے منع کیا "میں تمہاری چادر نہ لے جاؤں گا، سفر میں میلی ہو جائے گی!" مگر وہ کسی طرح نہ مانی، اس نے شال اٹیچی کیس میں رکھ ہی دی۔ عبید نے اسے چھیڑنے کے لیے یہ بھی کہا کہ "اور اگر کہیں یہ چوری ہو گئی تو؟" وہ بولی تھی "بلا سے جائے گی تو میلی جائے۔ تمہارا صدقہ جائے گی!" "تم سلامت رہو، ایسی بیسوں آ جائیں گی!"

عبید کو بیوی کی اس اتھاہ محبت کا اندازہ نہ تھا۔ حمیدہ اپنی محبوب ترین چادر اپنے میاں پر سے نچھاور کرنے کو تیار تھی۔ اور اس نے سمجھ لیا تھا اس چادر کو اپنا رقیب۔ وہ دل میں بہت کٹا اور اس نے اپنے طور پر طے کر لیا کہ چاہے اس پر کیسی ہی گزر جائے وہ اس چادر کو ایک منٹ کے لیے بھی اپنے استعمال میں نہ لائے گا اور اسے حمیدہ کو ویسی ہی صاف ستھری، بے شکن لا کر واپس کرے گا جیسی کہ وہ بیوی کے ہاتھوں سے اسے ملی تھی۔ اس نے پورے سفر میں اسی لیے چادر نہیں اوڑھی۔ رات کو ٹرین میں سردی بھی کھائی

... کیا ... ... طرف ... ؟ کیا وہ اس سے کم محنت کرتا ہے یا کم جانفشانی اٹھاتا ہے؟ اور یہ رکشے والا بیوقوف اسے کہتا ہے نواب صاحب!

عبید اسی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ نم ہوا، اپنے دوش پر، کہیں دور سے، ایک دل دوز کراہ کی آواز لائی۔ کراہنے والا کچھ منمنا بھی رہا تھا۔ مگر صاف نہیں سنائی دے رہا تھا۔ پھر بھی آواز میں انسانی دل کے لیے ایک ناقابل برداشت درد تھا، سینے کو برما دینے والا، آنکھوں میں مرچیں لگا دینے والا۔

عبید نے گھبرا کر رکشے والے سے پوچھا "ارے یہ کون کراہ رہا ہے بھائی؟"

اس نے رکشا دھیما کر کے، آستین سے منہ کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا، "او اک بگلی ہو شاب!۔ ہرم جادے او کا بھی کھراب ہی ہت۔ اوسے ایک چھوٹا بالک چھاتی سے لگائی سڑک پر پڑل ہو! بس ہر وکھت چیکھت ہو۔

ہوا ٹے مور بالک کا بچا لیو! ای سردی سے مرت ہو!۔ دوی دن سے سڑک پر پڑل چیکھت ہو!"

عبید نے تعجب سے پوچھا "ارے تو اتنے بڑے شہر میں کسی اللہ کے بندے نے اسے کوئی رضائی یا کمبل نہ اڑھا دیا؟"

وہ بولا "ہما سا مال جیہ کے پاس رہجائی کمل ہوئی وہ کھو او ڈھی کی بگلی کا دے ای؟"

عبید نے کہا "ارے تو کیا ہمارے شہر کے رئیس، امیر، سیٹھ، ساہوکار سب مر گئے؟"

اس نے رکشا روک کر بڑے زور سے کھنکار کر سڑک پر تھوکا۔ پھر وہ بولا "اجی نواب شاب! بڑا لوگ موٹراں سیہ چڑھا ئے پوں پوں کرتے سن سن نکل جات ہیں۔ او کا ہے کا بگلی کی اور دیکھیں۔ او آپن دو سو اڑھائی سو کا کمل بگلی پر ڈال دہیں؟ آپو کا بات کہت ہو نواب شاب!"

اور اس نے پھر رکشا تیز چلانا شروع کیا۔ آواز اب بالکل صاف صاف سنائی دینے لگی تھی۔ "ارے بھگوان کے نام پہ بچا لو اس بالک کو! کوئی دستر اس کو اڑھا دو! مر رہا ہے یہ سردی سے آہ! آہ! آہ! بھگوان! کیا اس پر کتھوری میں کیس دیا نہیں! آہ! آہ! آہ!——"

عبید نے دیکھا بگلی فٹ پاتھ پر آدھی ننگی پڑی ہے۔ بس ایک چھوٹی سی پھٹی دھوتی رانوں میں لپٹی ہے۔ اسی کا ایک کونہ پیٹ پہ پڑا ہے۔ اس چیتھڑے میں سے ایک بچے کا سر دکھائی دے رہا ہے۔ بگلی کے بال مٹی میں اٹے ہیں، اور اس کے چہرے اور چھاتی پر اس طرح کے نشان ہیں جیسے کسی نے انھیں تیز ناخنوں سے نوچا ہو۔ اس کی آنکھیں بند ہیں اور وہ کراہے جا رہی ہے، آہ! آہ! آہ! بھگوان، کیا کیس دیا نہیں!"

عبید کے جسم میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔ دل و دماغ جھنجھنا اٹھے۔ وہ اس طرح کا نپا کہ گھٹنے پہ رکھی شال پھسل کر اس کے جوتے پر آ رہی۔ وہ اسے جھک کر اٹھاتے اٹھاتے بے ساختہ چیخ اٹھا "روکو رکشا!"

رکشے والے نے پورا برک لگایا، رکشا جھٹکے سے رک گیا۔ اس نے عبید کو سوالیہ انداز سے دیکھا۔

عبید نے شال اس کی طرف بڑھا کر کہا "لو یہ چادر اسے اڑھا دو۔"

رکشے والے کا تعجب سے منہ کھل گیا "او بگلی کا؟" اس نے پوچھا۔

عبید نے کہا "ہاں، اسی کو!"

رکشے والے نے اپنی سیٹ سے اترتے ہوئے پھر احتجاج کیا "ارے ای چادریا بہت بڑھیا ہے، نواب شاب"

عبید نے ڈانٹ کر کہا "بکو مت! جا کے اسے اڑھا آؤ۔"

مگر وہ خود نہ تو اپنی جگہ سے ہلا اور نہ اس نے بگلی کے پاس جانے کی ہمت کی۔ بڑی گندی تھی وہ۔ نہ جانے کتنی بیماریوں کے جراثیم اس کے جسم سے لپٹے ہوں گے۔ اسے تو بگلی کو دیکھنے ہی سے گھن آتی تھی۔ اس نے ادھر ادھر سڑک پر گھبرائی گھبرائی نظر ڈالی کوئی دیکھ تو نہیں رہا اس کی اس بے وقوفی کو۔ کس قدر ہنسے گا اپنے دل میں اس کی اس حرکت پر! بگلی اور ایسی خوبصورت اور قیمتی شال! اور رکشے والے نے بگلی کے پاس پہنچ کر چادر کے کونے پکڑ کر اسے پھیلانے کے لیے زور سے جھٹکا۔ اور اس کے ننگے، میلے، گھناؤنے جسم پر حمیدہ کی چہیتی کے پھول بکھیر کر کہا "ارے بگلی! تو ہار قسمت جاگی! اب خوب گرما کے لیٹ!"

بگلی نے شال کی سرسراہٹ جسم پر محسوس کی۔ خون کبوتر آنکھیں کھول کر رکشے والے کو دیکھا۔ دانت نکال کر اس طرح مسکرائی کہ چہرہ اور بھی ڈراؤنا ہو گیا۔ رکشے والا جلدی سے پیچھے ہٹا اور اس نے رکشے پر بیٹھتے ہی اسے تیز چلایا۔ نہ جانے وہ بگلی سے ڈر کر بھاگ رہا تھا یا اپنی سواری کو مجنوں سمجھ کر اس سے جلد سے جلد چھٹکارا پانا چاہتا تھا، یا خود اس کے اپنے کچھ خیالات و جذبات تھے جن سے وہ پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

اور عبید اس سوچ میں پڑ گیا کہ چادر عبید نے کو تو دے دی بگلی کو مگر وہ کہے گا کیا حمیدہ سے یہی کہ اس نے اس کی چہیتی چادر ایک بگلی کو دے دی؟ کیا حمیدہ اس میں اپنی توہین نہ سمجھے گی۔ اور اگر کہیں اس سلسلے میں اس کی چشم سے گھوں میں آنسو آ گئے؟ یا کہیں اتر گیا اس کا غمگین چہرہ تو؟ اس نے طے کیا اسے بات بنانا ہی پڑے گی۔ اسے جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ مگر ایسا جھوٹ کہ بجائے آنکھوں سے آنسو کے اس کے منہ سے کلمۂ شکر نکلے۔

حمیدہ نے میاں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اسے اوورکوٹ اتارنے میں مدد دی۔ لہکی ہوئی انگیٹھی اس کے پاس لا کر رکھ دی۔ گرم گرم پانی سے ہاتھ منہ دھونے کا انتظام کیا۔ جلدی جلدی کھولتی ہوئی چائے تیار کرا کے پلائی۔ جب وہ سوٹ اتارنے اور گھریلو کپڑے پہننے دوسرے کمرے میں چلا گیا تو حمیدہ نے اٹیچی کیس کھولا کہ اس کے کپڑے کپبرڈ میں رکھ دے۔ ساری چیزیں موجود تھیں، صرف اپنی شال نہ دکھائی دی۔ اس نے ہولڈال بھی کھول ڈالا۔ وہاں بستر میں بھی چادر غیر حاضر نکلی۔

اس نے گھبرا کر عبید سے بلند آواز سے پوچھا۔ "میری شال کیا ہوئی؟"

عبید نے جھوٹی کہانی گڑھ لی تھی۔ وہ بیوی کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور منہ لٹکا کر بولا "وہ تو ریل میں چوری ہو گئی۔"

حمیدہ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ بولی "ارے یہ کیسے؟"

عبید نے کہا "رات ریل میں جب دو مکلوں سے سردی نہ گئی تو میں نے اوپر سے تمہاری چادر بھی ڈال لی۔ معلوم ہوتا ہے وہ کروٹ لینے میں پھسل کر بستر کے نیچے گر پڑی۔ میں سو رہا تھا کہ وہ مسافر اتر گئے۔ انھیں میں سے کوئی اسے بغل میں دبا کے لے گیا!"

حمیدہ روہانسی آواز میں کوسنے لگی "موئے کا ہاتھ سڑ جائے! میری شال اوڑھنا اسے کبھی نصیب نہ ہو! اس کی قبر میں کیڑے پڑیں!" اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ ہی گئے۔

ماما عقیدن عبید کے ناشتے کے لیے ہدایت لینے آئی ہوئی پاس ہی کھڑی تھی، وہ بولی "ارے ہے بی بی، اتنی سی بات پر آپ روتی ہیں۔ خدا کا شکر کیجیے کہ میاں کو کوئی چوٹ چپیٹ نہیں آئی۔ سنتی ہوں موئے آج کل چلتی گاڑیوں میں ڈاکا ڈالتے ہیں، لوٹتے بھی ہیں، اور جان سے مار بھی ڈالتے ہیں۔ اللہ آمین — میاں سلامت پلٹ آئے۔ صدقہ اتروائیے، شکر کا سجدہ کیجیے!"

حمیدہ کا موڈ بالکل بدل گیا۔ اس نے جھٹ آنکھیں پونچھ ڈالیں اور سر ذرا عبید کی طرف بڑھا کر بولی "سچ کہتی ہو بوا، میں بڑی ناشکری

عثمان غنی
عابد سہیل

آئینہ در آئینہ

حسینی صاحب آپ سے ایک انٹرویو لینا ہے۔

"ارے بھائی انٹرویو ونٹرویو کیا ہے ہاں اگر آپ لوگ آئے ہیں تو گھنٹہ دو گھنٹہ بات چیت ہوگی۔"

ہم تو بہت ڈرتے ڈرتے گئے تھے کہ حسینی صاحب ٹھہرے اردو کے اتنے بڑے اتنے کہنہ مشق افسانہ نگار کہیں انکار نہ کر دیں یا اقرار بھی کریں تو سیکڑوں انکار کے بعد لیکن وہاں تو پہلی ہی مختصر سی درخواست انتہائی سادگی سے منظور کر لی گئی۔

حسینی صاحب آداب مجلس کے بڑے قائل ہیں ان کے یہاں مجلس آرائی کا پورا فن ایسے سامنے آتا ہے جیسے آپ اودھ کے کسی پرانے خاندان میں کسی ایسے فرد سے محو گفتگو ہوں جس کو اس بیسویں صدی کے مشغلوں میں بھی اپنی دھیمی آنچ پر ناز ہو۔ طویل قامت، دوہرا بدن، ہنستی ہوئی آنکھیں چھوٹی سی سفید داڑھی جو ان کی شوخ و طرار آنکھوں سے ہرگز میل نہیں کھاتی۔ موٹی لیکن پوروں تک گاؤدم انگلیاں حسینی صاحب کو دیکھا تو بارہا ہے لیکن اس ملاقات میں پہلی بار احساس ہوا کہ ان کے ابداع میں ان کے ہاتھوں کی مخصوص جنبش کو کتنا دخل ہے۔

پہلا سوال جو حسینی صاحب سے کیا گیا وہ پہلا ہی سوال تھا یعنی یہ کہ حسینی صاحب آپ افسانہ نویسی کی طرف مائل کب اور کن حالات میں ہوئے؟

سوال طویل جواب کا محتاج تھا اور حسینی صاحب نے بڑی تفصیل سے اپنی ابتدائی زندگی اور افسانہ نویسی سے اپنے شغل کا تذکرہ کیا۔ ان کا یہ جواب ایک ادیب کے تعمیر کی داستان ہے۔ اس کے ذہن کے ڈھلنے، سنورنے اور کرشمے کی ایک لمبی کہانی۔

حسینی صاحب نے بتایا کہ بچپن میں اپنی بڑی بوڑھیوں کی گود میں انھوں نے "ایک تھا بادشاہ......" قسم کی کہانیاں سنیں (ایک روایت جس سے آج کے بچے افسوس ناک حد تک محروم ہیں۔) یہ کہانیاں مستقبل کے ادیب کو کہانی کار بننے کے فن کا پہلا سبق تھا۔ ایک ایسا سبق جو حسینی صاحب آج تک نہیں بھولے ہیں۔ اور وہ ہمارے ان چند افسانہ نگاروں میں ہیں جن کے یہاں اب بھی کہانی پن پایا جاتا ہے۔

گیارہ سال کی عمر میں حسینی صاحب کو پٹنہ بھیج دیا گیا جہاں کشتی اور کرکٹ ان کے محبوب مشغلے تھے لیکن ہر چھٹی میں گھر کی کتابوں کی الماریاں ان کا انتظار کرتی

ہوں۔ تم یہ سہارے بےلو، اور اسے ایک سینی میں سوا سیر ماش اور سوا پاؤ کڑوے تیل کے ساتھ رکھ کر ان کے ہاتھ سے چھوا کر کسی فقیر کو دے دو اور میں جا کر ابھی دوگانہ پڑھتی ہوں! ۔ اور وہ فوراً ہی وضو کرنے لگی۔ حمیدہ نے شرم سے گردن جھکالی اور وہ پانی پانی ہو گیا۔ جھوٹ بھی کس قدر کثیر الاولاد ہے۔ ایک بولو جھوٹ اس کے پیٹ سے دس پیدا ہو جائیں گے۔

دوسرے دن جب ٹھنڈی ہوا اور گرمائی تو پانچ بجے وہ کارخانے سے پلٹتے وقت اس سڑک پر مڑ گیا جدھر بھگی ملی تھی۔ اس نے دیکھا میونسپلٹی کے مہتر اس کی اکڑی ہوئی لاش ایک ٹھیلے پر لاد رہے ہیں۔ اس کے جسم پر وہی میلی کچیلی ہو گا دھوتی ہے اس کا مرا ہوا بچہ اسی طرح چھاتی سے چپکا ہے ۔۔۔ اور حمیدہ کی چھینٹ چادر کا دور دور پتہ نہیں!

بقیہ :- سیلاب کی راتیں

ہے اور اس کا داہنا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔ اس نے ادھر دیکھا جہاں اوشی ناگن تھی۔ وہ بھی کسی حادثے کا شکار ہو کر ٹوٹی پڑی تھی۔ پھر اس نے ادھر دیکھا جدھر وہ مورتی تھی، جس میں ہریا کے جسم کی نقل اتاری گئی تھی۔ منجھو اس پر جھکی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور غصے سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ آہٹ پاتے ہی اس نے بھروسے کو گھور کر دیکھا اور مورتی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی؟ تمہاری بیٹی اب جوان ہوئی!......"

بھروسے نے عمر میں پہلی بار منجھو سے جھڑک کر کہا "بکو مت! جوان عورت ہی کی تو مورتی ہے! میں نے مٹی ہی کی تو بنائی ہے! اس سے کیوں نہیں پوچھتیں جو گوشت کی بناتا ہے۔ وہ کیوں جوان عورت میں جان ڈالتا ہے، پھر کیوں اسے مٹا دیتا ہے!" اس نے ایک کرسسکی لی "ہریا جیسی جوان عورت کو مار ڈالتا ہے۔ اس کے سندر شریر کو گدھوں کو کھلا دیتا ہے! ہے بھگوان گدھوں کو!" اور اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اس کے سوکھے گالوں پر ڈھلک آئے۔ وہ ہاتھ میں گیلی مٹی اٹھا کر جوش سے بولا "مگر میں ہریا کو مرنے نہ دوں گا! کبھی مرنے نہ دوں گا۔ میں اسے لکشمی کی مورتی میں بدل دوں گا!"

اور گھبرائی، بوکھلائی ہوئی منجھو کو محسوس ہوا کہ جیسے مورتی میں جان سی پڑ گئی ہے اور وہ بھروسے کو بڑے پیار سے مسکرا کر دیکھ رہی ہے!۔

(بشکریہ شمع)

اور نوجوانوں کی عادت کے مطابق زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ——— وہ دن بھی ——— جو حسینی صاحب کی زندگی میں ایک اہم دن ثابت ہوا ——— عام دنوں کی طرح تھا۔ تمام احباب بحث و مباحثہ میں مصروف تھے کہ نہ جانے کہاں سے پریم چند کا تذکرہ آ گیا۔ حسینی صاحب اس زمانے میں تازہ تازہ انگریزی اور فرانسیسی اعلا افسانوی ادب سے دوچار ہوئے تھے۔ ان کے ذہن پر بھی نئے تصورات چھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بھی بڑی گرمجوشی سے اس بحث میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

عہد حاضر کے کسی نامور ادیب کا تذکرہ ہو تو یقیناً دو گروہ ہو جائیں گے۔ ایک موافق اور دوسرا مخالف۔ یہی یہاں بھی ہوا دو گروہ ہو گئے۔ ایک پریم چند کا حامی و حلیف اور دوسرا مخالف و معترض۔ حسینی صاحب پر تو اناتول فرانس اور روکر دہیوگو کی تصنیفات کے مطالعہ کا سرور تھا۔

اس مطالعہ نے ان کے دل و دماغ کو جس طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا دیا تھا پریم چند کی دنیا اس سے بالکل مختلف اور جدا تھی۔ اور وہ دنیا حسینی صاحب کو پسند نہ تھی۔ انھوں نے نہایت زور و شور سے پریم چند کے افسانوں میں خامیاں نکالنا شروع کر دیں۔ اس سلسلہ نے اتنا طول کھینچا کہ پریم چند کے مداحوں میں سے ایک نے کہا "میاں ان کے ایسا ایک بھی افسانہ خود لکھ کر دکھا دو تو جانیں۔"

حسینی صاحب کے لیے یہ ایک چیلنج تھا ——— انھوں نے اسے قبول کر لیا۔

یہ چیلنج وہ ٹھوکر تھی جس کا ان کے تخلیقی ذہن کو برسوں سے انتظار تھا۔ ان کے تخیل کی تمام پریاں اچانک انگڑائیاں لے کے اٹھ بیٹھیں۔ تمام ان کہی لیکن کہے جانے کی خواہش مند کہانیاں اچانک یلغار کر کے ذہن پر چھا گئیں۔ ان کے دوستوں نے ان کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ نتیجہ "پژمردہ کلیاں" نام کی ایک کہانی کی شکل میں برآمد ہوا۔

یہ کہانی حسینی صاحب نے ۱۹۱۶ء میں لکھی تھی اور اس کے بعد کچھ برس بعد دوسرا افسانہ "جذب کامل" لکھا جو حسینی صاحب کا پہلا مطبوعہ افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ستمبر ۱۹۲۵ء میں زمانہ کانپور میں شایع ہوا اس کے بعد ان کا لکھا ہوا پہلا افسانہ پژمردہ کلیاں اس رسالہ میں دو یا تین ماہ کے بعد شایع ہوا۔

لیکن ان دونوں افسانوں کے درمیان ۱۹۱۹ء میں حسینی صاحب نے ایک رومانی ناول بھی لکھ ڈالا جس کا نام انھوں نے سر سید احمد پاشا عرف تقدیر کے ۳ خطا یا قاف کی پری رکھا۔ یہ ناول ۱۹۲۲ء میں بھارگو بکڈپو سے بھی شائع ہوا۔

۱۹۲۰ء میں حسینی صاحب ملازم ہوئے (سرکاری مدرس) اور ۱۹۲۷ء میں ان کی شادی ہو گئی (حسینی صاحب نے ۸ جولائی ۱۹۲۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۵۶ء تک نوکری کی!)

حسینی صاحب کے افکار و تصورات کے بارے میں ان سے سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیتے ہوئے کہا "میں مزاجاً اعتدال پسند ہوں۔" اس ایک جملے میں حسینی صاحب کے تمام افکار و تصورات پر چڑھا ہوا رنگ سامنے آ جاتا ہے۔ حسینی صاحب مذہبی آدمی بھی ہیں لیکن ترقی پسند تحریک سے بھی ان کا لگاؤ رہا ہے۔ وہ جدید بھی ہیں لیکن قدیم تصورات و اقدار کو بھی فراموش نہیں کر سکے ہیں ان کے ادب پر بھی اس اعتدال پسندی کی چھاپ مسلسل دکھائی دیتی ہے۔

حسینی صاحب نے اپنے لیے دو مثبت نصب العین پسند کئے ہیں پہلا یہ کہ وہ قوم پرست ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ انسانیت دوست تھا۔ وہ ہمیشہ سے تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ آزادی کی جدوجہد کے زمانے میں سرکاری نوکر ہونے کے سبب جب وہ اپنی بات کھل کر نہیں کہہ

رہتیں اس وقت مطالعہ کے سلسلے میں کسی خاص موضوع اور مضمون کی کوئی قید نہ تھی کوئی منتخب مطالعہ نہ تھا بیرونی ذہن بچے کی طرح ایک تجسس تھا ذہن کو غذا دینے کی ایک امنگ تھی چنانچہ الف لیلہ کا اردو ترجمہ عبدالحلیم شرر شاہنامہ محمد علی طبیب کی ناولیں، اساتذہ کے دواوین، ان میں سبھی کچھ شامل تھا۔

ان کا بیان ہے کہ ان میں سب سے زیادہ لطف ان کو الف لیلہ اور شاہنامہ میں آیا جس نے ان کے فن پر بہت اثر ڈالا ہے۔
اسی زمانہ میں حسینی صاحب نے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کر لیا۔ اور اس کے بعد انگریزی فکشن کے مطالعہ کا دور شروع ہوا شروع میں انگریزی زبان کے جن ادیبوں سے حسینی صاحب کا سابقہ پڑا اور جنھوں نے ان کو متاثر کیا ان میں لیمب، سروالٹر اسکاٹ اور رینالڈس خاص طور سے قابل ذکر ہیں لیمب کی "شیکسپیر کی کہانیاں" اس سلسلے میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شیکسپیر کی کہانیوں کے علاوہ WAVERLY NOVELS اور MYSTRIES OF COURT OF LONDON نے بھی اس زمانے میں حسینی صاحب کے نوجوان ذہن پر اپنے رومانی اسرار کی پرچھائیاں ڈالیں۔

پھر حسینی صاحب لکھنؤ کرسچین کالج میں داخل ہو گئے اور یہاں کی لائبریری نے ان کے متجسس ذہن کے لیے مزید غذا فراہم کی۔ یہاں ان کو انگریزی کے زیادہ سنجیدہ اور بامقصد مصنفین سے سابقہ پڑا جن میں ٹھیکرے، خاص طور سے قابل ذکر ہے اسی زمانے میں حسینی صاحب نے اسٹیونسن کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد سنجیدہ مطالعہ کا دور آیا۔ اور مذہبی تاریخوں اور انجیل کا مطالعہ کیا انجیل خاص طور سے قابل ذکر ہے کیونکہ مذہب حسینی صاحب کی پوری زندگی کو متاثر کرتا رہا ہے اور وہ باوجود ترقی پسندی کی طرف مائل ہونے کے مذہب سے کبھی منحرف نہ ہو سکے۔ مذہب نے ان کو جو اقدار دیئے وہ تمام زندگی ان کو جکڑے رہے۔

حسینی صاحب بی اے میں تھے اور اس زمانے میں انھوں نے انگریزی کے اعلیٰ ترین کلاسیکی ادب کا مطالعہ کیا۔ انہی دنوں انھوں نے شیکسپیر اور ملٹن کو پڑھا۔ اسی زمانے میں کیٹس، شیلی، ورڈزورتھ اور براؤننگ کا انھوں نے مطالعہ کیا لیکن ورڈزورتھ نے ان کو کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔

بی اے ہی کے زمانے میں انھوں نے عالمی افسانوی ادب کا بھی تفصیلی مطالعہ کیا چنانچہ ہارڈی، ہوپ، ایچ جی ویلس، او ہنری، وکٹر ہیوگو، اناتول فرانس، ہولیان، ٹالسٹائی اور ترگنیف ان کے اس زمانے کے مطالعہ پر چھائے رہے۔ اس زمانے کے مطالعہ میں ایک قابل ذکر مصنف دوستوفسکی نے ان کو متاثر نہیں کیا۔

یہ تھا حسینی صاحب کے مطالعہ کا پس منظر، اس پس منظر سے یہ نہ سمجھئے کہ حسینی صاحب نے یہ سب پڑھنے کے بعد ہی لکھنے کے لیے قلم اٹھایا حسینی صاحب اس سے پہلے سے لکھ رہے تھے لیکن بہت پہلے سے بھی نہیں۔ ان کے پہلے افسانہ کی داستان بھی دلچسپ ہے۔

ہر افسانوی اور تخلیقی ذہن کی طرح کہانیاں حسینی صاحب کے ذہن میں اکثر سر اٹھاتی تھیں لیکن صاحب ذہن کو متوجہ نہ پا کر پھر سو جاتی تھیں۔ ذہن اس وقت مطالعہ میں معروف تھا اس نے تخلیق کی طرف رخ نہ کیا تھا اور اس طرف ذہن کو متوجہ کرنے کے لیے کسی واقعہ، کسی مجبوری، کسی ٹھوکر کی ضرورت تھی۔

...... اور یہ واقعہ [illegible] کی گرمیوں کی تعطیلات میں پیش آ گیا۔

حسینی صاحب ان دنوں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے پٹنہ گئے ہوئے تھے وہ پہر میں ایک جگہ بہت سارے ہم عمروں کا جمگھٹا تھا۔ اور خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ بادشاہ منزل کی نچلی منزل بخش خانہ تھی جہاں زمین پر فرش بچھا کر تمام احباب جمع ہوا کرتے تھے۔

حسینی صاحب کا کہنا ہے کہ ان تمام خیالات کا اظہار کرنے میں ان کو ایک دقت یہ تھی کہ وہ سرکاری نوکر تھے۔ حکومت برطانیہ اپنے تمام ملازمین کو ایک سامراجی مشین کا پرزہ سمجھتی تھی۔ اس لیے ان کو قدم قدم پر محتاط اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر میں کوئی ایسی بات کبھی نہیں آنے دی جو اس زمانے کی حکومت کے لیے قابل گرفت ہوتی۔ چنانچہ وہ قوم پرست اور گاندھی جی کے نظریات کے قائل ہوتے ہوئے بھی کھل کر کبھی ان کا اظہار نہ کرتے افسانوں میں بھی ان کے یہ افکار و خیالات بے باکی سے سامنے نہیں آئے اس قسم کی باتوں کو ہمیشہ انھوں نے ڈھکا چھپا کر بیان کیا۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہمارے جو ادیب بہ بانگ دہل انقلاب کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور ہندستان کے غریب ترین طبقہ کی زندگی کی عکاسی کا دعا کر کے خود کو ترقی پسند سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کو ایسا ہی سمجھیں ان میں سے ۹۹ فیصدی ایسے ہیں جنھوں نے کبھی خود غریبوں کی زندگی کا مطالعہ نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو حسینی صاحب نے "آرام کرسی کے ادیب" قرار دیا۔ یہ لوگ کبھی کسی جھونپڑے میں نہیں گئے نہ انھوں نے کبھی نچلے طبقہ کے رسوم و رواج کا مطالعہ کیا اور اس لیے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ حقیقت پر مبنی نہیں کہا جاسکتا برخلاف اس کے حسینی صاحب کا دعوا ہے کہ انھوں نے چماروں، اہیروں، جولاہوں غرض ہر اس طبقہ کی شادیوں میں، دوسری تقریبات میں شرکت کی ہے جن کو عرف عام میں نچلا یا پس ماندہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ حسینی صاحب ان کے دکھ درد میں شریک رہے ہیں اس لیے انھوں نے اس طبقہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان آرام کرسی نشینوں کی تخلیقات کے مقابلے میں زیادہ عوامی اور نتیجتاً زیادہ ترقی پسند ہے۔

حسینی صاحب سے خود ان کے فن کے بارے میں سوال کیا گیا اور پوچھا گیا کہ آپ کا سب سے کامیاب افسانہ کون سا ہے یا آپ خود اپنے کس افسانے کو سب سے کامیاب تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے آئی۔ سی۔ ایس۔ رفیق تنہائی، بھوک کی ہنسی، میلہ گھومنی، باسی پھول، نور و نار اور سیلاب کی راتیں، ایک غسل خانے کے نام لیے۔

اس سوال کے جواب میں آپ اپنے ادبی میلان میں کن افسانہ نگاروں کو پسند کرتے ہیں اور کن سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وہ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور مرزا محمد ہادی رسوا سے خاص طور سے متاثر ہوئے ہیں، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، اور نیاز فتح پوری نے بھی ان کو متاثر کیا ہے۔ خاص طور سے سجاد حیدر یلدرم سے وہ بہت متاثر ہوئے ہیں اور یلدرم کا "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ اس کو کبھی بھول نہیں سکتے۔ مغربی افسانہ نگاروں میں ان کے پسندیدہ لکھنے والے موپاساں، اناطول فرانس، برٹ ہارٹ، او ہنری، چیخوف، اور سامرسٹ مام ہیں لیکن ان کے خیال میں او ہنری کے آگے کوئی نہیں ٹکتا۔ ہندستان کی دوسری زبانوں کے لکھنے والے میں وہ خاص طور سے ٹیگور اور سرت چند چٹرجی کے قائل ہیں۔ ٹیگور کے "ہوم اینڈ دی ورلڈ" کو وہ غیر فانی شاہکار سمجھتے ہیں۔

اپنے ہم عصروں میں پریم چند، ل۔ احمد، اعظم کریوی، کی بعض کہانیوں کے وہ بہت قائل ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں میں وہ کرشن چندر کی کشمیر سے متعلق کہانیوں کو اچھا سمجھتے ہیں اور احمد عباس اور بیدی کی بعض کہانیوں کو پسند کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ وہ قدرت اللہ شہاب ممتاز مفتی، ابراہیم جلیس، آغا بابر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، حجاب امتیاز علی، اختر انصاری، احمد علی، بلونت سنگھ، حیات اللہ انصاری حسن عسکری، ممتاز شیریں، اور رام لال کے فن کے بھی قائل ہیں۔

ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ وہ اب تک دو سو سے زیادہ افسانے لکھ چکے ہیں۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں حسینی صاحب نے کہا کہ کسی غیر ملکی فنکاروں کی تخلیقات پڑھ کے مجھے اپنی اور اپنی زبان کی بے بضاعتی پر

سکتے تھے وہ اس عقیدہ پر راسخ رہے کہ تقسیم ہند ہندو اور مسلمان اور ہندوستان کے تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے نقصان دہ ہوگی۔

حسینی صاحب کی اعتدال پسندی نے ان کو اصلاح پسندی کی طرف مائل کیا اور مذہبی غلو اور انتہا پسندی کے خلاف لا کھڑا کیا اگرچہ خود ان کا کہنا ہے کہ "میں موحد ہوں، مسلمان ہوں، شیعہ ہوں" لیکن وہ خود کو مطلقاً ان میں سے کسی ایک کے ڈھانچے میں تقا اور مکمل طور سے بھو نہیں سکے۔ حسینی صاحب کا خیال ہے کہ ادیب اور جس کو دانشوری کا دعوا ہے اس کا رہبر سوائے اس کے دل، دماغ کے کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد بات ترقی پسندی اور ترقی پسند تحریک کی طرف مڑ گئی۔ حسینی صاحب نے شروع ہی میں یہ کہا کہ ان کے خیال میں کوئی ادیب غیر ترقی پسند نہیں ہوتا کیونکہ ترقی پسندی بہتر دنیا کی تلاش کا نام ہے اور ادیب ایک بہتر دنیا کی تعمیر کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ اس کمیٹی میں انھوں نے چندہ بھی دیا تھا لیکن اسی زمانے میں سرکاری احکامات آ گئے اور اس تحریک کو "ناپسندیدہ" قرار دے دیا گیا چنانچہ اس کے بعد حسینی صاحب نے کھلے عام اس کانفرنس سے شروع ہونے والی تحریک میں حصہ لینا بند کر دیا اور معتوبین کی فہرست میں بھی ان کا نام نہیں آیا۔

حسینی صاحب نے بتایا کہ اگرچہ ترقی پسند تحریک کمیونسٹوں کے ہاتھ میں تھی اور رسالہ نیا ادب بھی کمیونسٹوں کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ باقر علی، سردار جعفری اور اسرار الحق مجاز وغیرہ سے ملتے تھے اور ان سے ادبی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔

ترقی پسندی سے بات فرد اور جماعت کے ربط و تعلق تک جا پہونچی۔ حسینی صاحب کا خیال ہے کہ فرد اور جماعت دونوں اہم ہیں کسی جماعت کو کسی بھی قیمت پر فرد سے اس کی آزادیاں یعنی آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے چھین لینے کا حق نہیں ہے۔ حالانکہ جماعت فرد کی اصلاح کے لیے اور بحیثیت مجموعی معاشرہ کی صحت کے لیے افراد کے افعال اور اعمال پر پابندیاں لگا سکتی ہے اور اکثر ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں اس کے بالکل خلاف ہوں کہ انسان سے سوچنے کا حق سلب کر لیا جائے اور کمیونزم سے میرا سب سے بڑا اختلاف یہی ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ بائیس کروڑ روسیوں کو اظہار خیال کی آزادی کیوں نہیں ہے بائیس کروڑ روسی ایک ہی طرح کیوں سوچتے ہیں؟

فکر و خیال پر اس پابندی کے سلسلے میں ان سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ کیا آپ کے خیال میں اسلام نے یہ پابندی نہیں لگائی؟ حسینی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ اسلام نے ہرگز یہ پابندی نہیں عائد کی ہے۔ کیوں کہ اسلام نے صاف صاف کہا ہے کہ تم وہیں تک مکلف ہو جہاں تک تم سوچتے ہو۔ اگر اس ارشاد پر غور کیا جائے تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ اسلام آزادیٔ فکر و خیال کا نہ صرف حامی بلکہ مبلغ بھی ہے۔ لیکن جب ان سے سوال کیا گیا کہ کیا کسی مسلمان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد وجود خداوندی کا قائل نہ ہو سکے تو اس کا اقرار کر دے اور کیا وہ اس کے بعد بھی مسلمان رہے گا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

انھوں نے کہا کہ خدا نے اپنے اوپر رحم و عدل واجب کر لیا ہے اور برے سے برا انسان بھی اعمال حسنہ ضرور کرتا ہے جس کی جزا اس کو ایک روز ضرور ملے گی۔

حسینی صاحب اسی لیے سیوٹر چیال کے مخالف ہیں۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ حسینی صاحب سمجھوتہ کر لینے کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی بھی شخص کو اس کا حق نہیں کہ وہ اختلافات کو وجہ رنجش بننے دے کیوں کہ ان کے خیال میں دل آزاری سب سے بڑا گناہ ہے۔

قوم کا احساس ہوا ہو لیکن خدا کے شکر سے اپنی زبان کے کسی افسانہ نگار نے مجھے اس احساس سے دوچار نہیں کیا۔

حسینی صاحب سے کچھ سوال ان کی ادبی زندگی سے الگ بحیثیت ایک تجربہ کار مدرس کے بھی کیے گئے۔ اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے خیال میں آپ کا سب سے لائق طالب علم کون ہوا انھوں نے کہا کہ "بھائی میں نے تو ۳ نسلوں کو پڑھایا ہو [illegible] تک مدرسی کی ہے۔ بہت سے لڑکے آئے اور ان میں سے بعض اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز ہوئے وہ ایک سے ان میں سے اکا دکا ہیں۔ ایسے بھی ہوئے۔"

طلبا کے موجودہ ضبط و نظم کی بندشوں کو توڑنے کے رجحان پر اظہار خیال کرتے ہوئے حسینی صاحب نے ڈسپلن کی کمی کی کیا وجوہ ہیں یہاں تو وجہ تعلیم کا عام ہونا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پہلے تعلیم ایک خاص طبقہ کا حق تھی اور اسی طبقہ کے لوگ پڑھتے تھے۔ سماج کے نچلے طبقوں میں تعلیم کا بالکل رواج نہیں تھا۔ اساتذہ اور طالب علم دونوں تو سماج کے اونچے گھرانے کے ہوتے تھے کچھ اعلیٰ طبقہ کے ہوتے تھے لیکن وہ لوگ جن کو آزادی سے قبل پس ماندہ اور نچلا کہا جاتا تھا تعلیم کے مستحق یوں نہ تھے کہ ان کے حالات ہی اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے میں مانع تھے۔ اس زمانے میں جو لڑکے پڑھنے آتے تھے ان کے یہاں ایک تہذیبی پس منظر ہوتا تھا۔ اس لیے وہ ڈسپلن کے زیادہ پابند ہوتے تھے۔ وہ لوگ جو نچلے طبقے کے کہے جاتے ہیں بالکل مختلف اقدار کے حامل ہوتے ہیں اور ان کے یہاں ڈسپلن کا وہ تصور نہیں پایا جاتا جو کہ عام تصور ہے اس لیے طلبا میں ڈسپلن کی کمی کے آثار نمودار ہو گئے ہیں۔

ان سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ تعلیم میں اس توسیع کے مخالف ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ یہ ڈسپلن کی کمی عارضی ہے اور رفتہ رفتہ جب معاشرے کی طبقاتی تقسیم کا موجودہ ڈھانچہ بدل جائے گا خود بخود یہ دور ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ انھوں نے ڈسپلن کی کمی کا دوسرا سبب یہ بتایا کہ ہماری روزمرہ زندگی میں سیاست بہت زیادہ دخیل ہو گئی۔ گھر گھر سیاسی مباحثے ہوتے ہیں جس کا اثر بچوں پر بھی پڑتا ہے۔ اب والدین اور سرپرست خود بچوں کے سامنے گفتگو کرتے ہوئے اپنے اقدار کو قائم اور پرکھتے نہیں۔

طلبا میں ڈسپلن کی کمی کا تیسرا سبب انھوں نے اساتذہ کو قرار دیا اور بتایا کہ آج کل اسکولوں میں اساتذہ کی بڑی تعداد یا تو نااہل ہے یا بے پروا۔ اساتذہ معاشی دقتوں سے اس قدر پریشان ہیں کہ ان کو اپنے طلبا پر پوری محنت کرنے اور ان کی شخصیت کی تعمیر کرنے میں اپنی پوری صلاحیت صرف کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی استاد کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ پڑھا سکتا ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ طالب علم اس کو پڑھا لکھا سمجھتے ہوں اور شخصیت کے اعتبار سے اپنا اعلیٰ سمجھتے ہوں کہ اس کو اپنا آئیڈیل بنا سکیں اور یہ کام اساتذہ بلا خلوص و محبت کے انجام نہیں دے سکتے۔

حسینی صاحب نے اپنی مدرسی کے زمانے کا ایک ناقابل فراموش واقعہ بھی بیان کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ حسین آباد اسکول میں پرنسپل تھے ــــ "ایک طالب علم نے کچھ نازیبا حرکت کی تھی کہ مجھے کالج کے تمام طلبا، اساتذہ اور اس لڑکے کے والد کے سامنے اسے بید سے مارنا پڑا۔ میرے لیے یہ ایک نہایت تکلیف دہ عمل تھا لیکن اس کی حرکت سے میرے دل کو سخت چوٹ لگی تھی۔ مجھے اپنے طالب علموں سے ایسی توقع نہیں تھی۔ اسی لیے اس کو سزا دیتے وقت بھی متعدد بار اپنے ذاتی صدمہ کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی لڑکا میرے کمرے میں آیا اور اس نے کہا کہ اس کی غلطی کی تلافی تو مار سے ہو چکی لیکن آپ کو جو قلق ہوا اس کی معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے اٹھ کر اس کو سینے سے لگایا اور اس کی سعادت مندی پر اپنے آنسو نہ روک سکا ــــ" اتنے سال بعد یہ واقعہ دہراتے وقت بھی حسینی صاحب کی آنکھوں میں دو موتی چمک رہے تھے۔

یہ تھی علی عباس حسینی صاحب سے ملاقات کی روداد ایک کہنہ مشق افسانہ نگار جس کی ادبی زندگی کے ۵۰ برس تقریباً پورے ہوئے (ہجری کے اعتبار سے ورنہ ۴۸ برس) اور ایسا استاد کہ جس نے تقریباً ۴۵ برس مدرسی کی اور تین نسلوں کی ذہنی تربیت کی۔

[illegible]

[illegible] کو معلوم کر کے ختم ہو جاتا ہے۔ اصل میں کہانی کا Abstraction اور Inspiration سے فرق [illegible]
جب ہم [illegible] کہہ دیا، تو اس کی شکل واضح کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم ایک خاص صورت حال یا [illegible]
اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ اسے اپنے اندر سمو لیتے ہیں اس کے بعد ایک کہانی بالکل فریم کر کے نکالتے ہیں۔ پھر ہم یہ دیکھتے [illegible]
یہ کردار اس طبقہ کا ہے یا اس طبقہ کا۔ پھر اس صورت حال میں کیا ہونا چاہیئے اور کیا نہیں — — — اور اس سارے کی کوشش [illegible]
وہ اصل بات کہیں رہ جاتی ہے جو ہم لاکھ کہنے کے باوجود بھی نہیں کہہ پاتے، وہ بات اس فریم میں بالکل کھو جاتی ہے [illegible]
بھی آپ کو ایک SITUATION بتاتا ہوں۔ آپ SPUTNIK کی بات کرتے ہیں، چاند پر جانے کی ——
ایک ہی منٹ کے بعد آپ محسوس کرتے ہیں، ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہو جاتے ہیں کہ خود کو سٹرک کے کتے سے بھی [illegible]
کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو بالکل helpless محسوس کرتے ہیں —— ان دونوں کے درمیان آپ کی جو feeling [illegible]
آپ کسی فریم میں فٹ نہیں کر سکتے۔ بات کہنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک میں آپ کرداروں کی تفصیلات میں جاتے ہیں [illegible]
آپ کیفیت کو پیش کرتے ہیں۔ ممکن ہے ساری تفصیلات میں وہ بات ابھر کر سامنے نہ آسکے کیا حسینی صاحب آپ نے اب تک [illegible]
لکھا ہے اسکے Inspiration میں Abstraction سے کام نہیں لیا ہے۔

حسینی۔ بہت زیادہ لیا ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ Abstraction سے آپ کی کیا مراد ہے اور آپ کیا کہنا [illegible]
میں خلا آپ نے اس احساس کی جو بات کہی ہے جب آدمی خود کو سٹرک کے کتے سے بھی زیادہ حقیر محسوس کرتا ہے تو یہ بات [illegible]
کے نام سے بھی لکھی جا سکتی ہے اور رام لعل صاحب کے نام سے بھی۔ ضروری نہیں کہ میں ہی کہہ کے لکھی جائے۔ کردار [illegible]
خیالات اور جذبات کو equalised تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

[illegible]۔ یہ تو صحیح ہے کہ زندگی جس طرح بدلتی چلی جا رہی ہے اور جو تاثرات انسان کے دل پر زندگی کے پڑ رہے ہیں [illegible]
چیز کا تصور تبدیل ہو رہا ہے پہلے ہم جو قاشیں کاٹتے تھے ان کے کنارے بڑے صاف ہوتے تھے۔ قاشیں پوری اور مکمل ہوتی [illegible]
اب زندگی میں اتنی فرصت نہیں ہے۔ آپ ٹیڑھی میڑھی، چھوٹی بڑی کھردری جیسی زندگی آتی ہے۔ جس قسم کی قاشیں آتی [illegible]
آپ کاٹتے چلے جاتے ہیں لیکن Basic سوال جس بات پر ختم ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی کی قاش ہے بھی یا نہیں۔ اگر آپ [illegible]
لاشعور میں اس حد تک غائب ہو جاتے ہیں کہ یہ شک ہونے لگتا ہے کہ یہ قاش ایک فرد کا ذاتی ردعمل تو نہیں ہے تو ظاہر [illegible]
سے دوسروں کو کوئی دلچسپی نہیں ہو گی۔ آپ کے فن سے دلچسپی اسی وقت ہو سکتی ہے جب آپ کسی قسم کی قاش بھی کاٹیں، وہ زندگی [illegible]
قاش ہو۔

[illegible]۔ ایک فرد کا ذاتی ردعمل بھی سوسائٹی سے جڑا ہوا ہے۔

[illegible]۔ اگر جڑا ہوا ہے تو جوڑ کو پیش کیجئے۔ علیحدہ نہ پیش کیجئے۔

[illegible]۔ اور میرے کہنے کا مطلب یہی ہے کہ جتنے بڑے Impact میں کوئی چیز لیں گے تو اس کی خوشبو اس میں [illegible]
[illegible] کے لیے ہمارے پاس بڑا vision ہونا چاہیے اگر ہم نراشا کی بھی بات؟ اور اگر ادیب کوئی نراشا وادی کردار [illegible]
[illegible] نراشا وادی نہیں ہو جائے گا بشرطیکہ اس کو پورا Impact معلوم ہو۔

[illegible] آپ کے بڑے بڑے ادیب ہیں۔ ارنسٹ ہیمنگوے۔ آندرے ژید۔ آپ انھیں نراشا وادی کہیں گے یا نہیں [illegible]
[illegible] کی حیثیت سے ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔ اگر زندگی میں تنوع ہو تو آپ اس کو کہانی کے ذریعے [illegible]

عابد سہیل۔ جتنے بھی Existentialists ہیں ان میں کوئی ایک دوسرے کو نہیں مانتا۔

رام لعل۔ اس لیے ان میں Confusion ممکن نہیں ویسے ملا صاحب آپ سارتر اور ہینگوئے کو ملا کر بات کر رہے ہیں۔

عابد سہیل۔ میرا خیال ہے یہاں Existentialism کو غلط طریقے سے پیش کیا جا رہا ہے۔ سارتر زندگی کے اس لمحہ کو کہ جس میں زندگی کی تمام اندرونی قوتیں اور پورا شعور یکجا ہو جاتا ہے اور جس وقت ہم ایک اہم فیصلہ کرتے ہیں اہمیت دیتا ہے Existentialism اس لمحہ کو Grasp میں لینا چاہتا ہے Eternal now کا فلسفہ دوسرا ہے جو امریکا کی موجودہ تہذیب میں پروان چڑھ رہا ہے۔

ڈاکٹر سنگھ:۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ چھ Existentialist فلسفی ایک دوسرے سے متفق نہیں۔

بتر ا۔ یہ جو دو جنگوں کے درمیان انسان کو اتنے المناک واقعات سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کی وجہ سے ––– اس کا یہ نظریہ پیدا ہو گیا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے آج کے لیے کرو۔ کل کے لیے نہیں۔ لیکن یہ صورت حال ختم ہو جائے گی۔

ڈاکٹر سنگھ۔ صرف جنگ کی بات نہیں۔ جس سماج میں آج ہم رہتے ہیں وہی کچھ اس قسم کا ہو گیا ہے آپ پیدا کرتے ہیں تو کسی کے لیے۔ آم کا باغ لگاتے ہیں تو اس خیال سے کہ کل کوئی اس کا کھانے والا ہوگا Provident fund جمع کرتے ہیں تاکہ بڑھاپے میں کام آئے۔ برخلاف اس کے اب Span of life بے حد چھوٹا ہو گیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کنبہ کو چھوٹا کر رہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اصل خاندان تو وہ ہے جہاں بچے ہی نہ ہوں۔ (قہقہہ) تو بچے ہی نہ ہوں گے تو جمع کس کے لیے کریں گے۔

ملاؔ۔ Thinking for today یہی ہے۔

بیرراجہ۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے Old associations ٹوٹ رہے ہیں۔ اور نئے Associations اس طرح نہیں بن رہے ہیں۔ یہ کیفیت Abstraction کو جنم دے رہی ہے۔

ڈاکٹر سنگھ جی نہیں یہ نفسیاتی کیفیت Subjective نہیں ہے۔ لندن۔ بمبئی۔ دہلی یا ۱۵ اگست کو حضرت گنج میں گھومیے تب آپ کو احساس ہوگا کہ بھیڑ میں آدمی کس قدر تنہا ہو جاتا ہے۔ پرانی جڑیں ٹوٹ رہی ہیں، نئی جڑیں نکل رہی ہیں۔ میں آپ سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ نئی جڑیں ہمارے ادب میں کیوں نہیں نظر آتیں۔ حسینی صاحب آپ کچھ فرمائیں۔

رام لعل۔ یہ سوال آپ نے حسینی صاحب کے بجائے مجھ سے پوچھا ہوتا ––––– میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب آپ کو جو شکایت ہے اسے میں لاعلمی تو نہ کہوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نے نیا ادب نہیں پڑھا ہے۔ نئے ادیب جو کچھ تخلیق کر رہے ہیں وہ آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ پرانے نقاد بھی اب کچھ پڑھ نہیں رہے ہیں۔ ان کا رشتہ نئے لکھنے والوں سے بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ نئے لکھنے والوں کا خیال ہے کہ وہ زیادہ گہرائی اور زیادہ صداقت سے لکھ رہے ہیں۔

عابد سہیل۔ رام لعل صاحب میں آپ سے متفق نہیں۔ آپ اصل سوال کو ٹال گئے (قہقہہ) اصل سوال یہ نہیں کہ آپ لکھ رہے ہیں یا نہیں لکھ رہے ہیں۔ اور آج کا ادیب زندگی کی نمائندگی کرتا ہے یا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ نئی قدروں کی نمائندگی ادب میں ہو رہی ہے یا نہیں۔ کیا اسی طرح اور اسی ایمان اور اعتماد کے ساتھ نئی اقدار کی نمائندگی ہو رہی ہے جس طرح پہلے ہوتی تھی ––––– میں بھی نیا ادب پڑھتا ہوں اور میرا کہنا ہے کہ یہ نمائندگی نئے ادب میں نہیں ہو رہی ہے۔ لیکن اس کا ذمہ دار آج کا ادیب نہیں۔ بلکہ وہ عہد ہے جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ خود مجھے نئی قدروں پر آج اس قدر یقین نہیں جتنا ۵۰ برس پہلے اس وقت کی قدروں پر میرے دادا کو تھا۔ ہم اس نہایت تیزی سے بدلتی دنیا میں اعتماد اور یقین کے ساتھ کسی ایک چیز پر بھی انگلی نہیں رکھ سکتے۔

ملّا۔ ایک ہی کہانی میں کیوں۔؟

ڈاکٹر سنگھ۔ میرا مطلب ہر کسی بھی کہانی میں۔ اگر زندگی میں Variety ہو تو اس کی Outline نہیں ہو سکتی۔ اس کی اتنی ہی قسمیں ہوں گی جتنے کہ انسان۔

عابد سہیل۔ ڈاکٹر صاحب فرق کو تسلیم کرنا یہ بھی تسلیم کرنا ہے کہ اس کی Outline ہو۔ ورنہ آپ ایک کو دوسرے سے الگ کیسے کریں گے۔

بیر راجہ۔ ایک اور بات ہو۔ فرض کیجئے ہم گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ اس میٹنگ میں بیٹھ کر بات کر رہے ہیں۔ ایک بات کرتے کرتے بہت سی باتیں سوچتے جاتے ہیں جن کو میں Express کرنا چاہوں بھی تو نہیں کر سکتا۔.....

بترا۔ اس وقت میں کہانی کی ایک اور قسم کی بات کر رہا تھا۔ اور وہ ہو Unity of effect کی کہانی۔ اب تک پلاٹ اور Situations کی کہانیاں لکھی جاتی رہی ہیں۔ لیکن اگر آپ کی بات کا مطلب Unity of effects سے ہے تو مجھے کوئی اختلاف نہیں لیکن جہاں Abstract کا سوال آجاتا ہے وہاں ڈانڈے سے ڈانڈا نہیں ملتا۔ جہاں پڑھنے والا کہانی کار کے خیالات تک پہونچ نہیں پاتا۔ ایسی کہانی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

بیر راجہ۔ وہ کہانی Obscure ہوگی، Abstract نہیں۔ Abstract کہانی میں آپ کو ایک آدمی اندر سے جیتا جاگتا ملے گا۔

ملّا۔ نہیں۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ میں نے سنا ہو کہ ابھی P.E.N کانفرنس میں ایک مراٹھی ادیب نے کہا کہ میں صرف ۵ سو افراد کے لیے لکھتا ہوں۔ اگر ۵۰۱ واں آدمی بھی مجھے سمجھ لیتا ہے تو یہ محض اتفاق ہے۔ یہ انتہائی قسم کا Egoism ہو آپ لکھے جاہیے۔ آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ڈاکٹر سنگھ۔ اس ادیب نے تو یہ بھی کہا تھا کہ مجھے حیرت ہے ۵ سو افراد مجھے کیسے سمجھ لیتے ہیں (قہقہہ)

رام لعل۔ ملّا صاحب ابھی آپ نے ہیمنگوے کا نام لیا تھا تو کیا وہ Individualist نہیں تھا۔

ملّا۔ ہیمنگوے Individualist نہیں لیکن میں کہوں گا کہ یہ جو Existentialists کہلاتے ہیں ان کا ایک حصہ ایسا ہو جس کو آج سے بحث ہے، کل سے بحث نہیں۔

رام لعل۔ لیکن آپ نے ابھی فرمایا کہ ہیمنگوے نرا شاوادی تھا۔ اس کی تخلیقات میں ایک زبردست ہارڈل فورس ملتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شاعری میں وجدان ہوتا ہے۔ آپ خود شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری میں جیسے رمزیت چھپی ہوتی ہے۔

ملّا۔ فورس! لیکن ادب کے اندر ہمیشہ سوال یہ آتا ہے کہ ادیب ہمیں دیتا کیا ہے۔ ہیمنگوے جو ہم کو دیتا ہے وہ یہ ہو کہ زندگی کے بارے میں اس کی گراسپ بہت اچھی ہے۔ لیکن اس کا پیغام کیا ہے۔ اس کا پیغام بس یہ ہے کہ آج زندہ رہو اور کل نہیں۔ اور یہ کسی بڑے فنکار کا پیغام نہیں ہو سکتا۔

رام لعل۔ تو ملّا صاحب مجھے ڈر ہے کہ آپ سارتر اور ہیمنگوے کو ملا کر بات کر رہے ہیں۔ یہ نظریہ سارتر کے یہاں ملتا ہے ہیمنگوے کے یہاں صورت حال دوسری ہے۔ اسے جنگ سے نفرت ہے، غیر انسانی اعمال سے نفرت ہو اور یہ نظریہ نہایت قوت کے ساتھ 'Old Man And The Sea' میں پیش کیا گیا ہے۔

بترا۔ بنیادی قدریں کیسے تبدیل ہو رہی ہیں۔ مثلاً

ملا۔ بنیادی قدریں۔ جیسے Sex کے بارے میں لے لیجئے۔ یا مرد اور عورت کے رشتے Victorian Age میں کہا جاتا تھا کہ خاوند اور بیوی کے تعلقات ہی پاک تعلقات ہوتے ہیں۔ دوسری عورتوں سے تعلقات ہونا غلط ہو لیکن آج Topless کے زمانے میں کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ آج مرد اور عورت دونوں Sex کو اپنی Stride میں لیتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ہم کہتے ہیں کہ جنس ایک لمحہ کی چیز ہے۔ زندگی کچھ اور ہو۔ اگر یہ ہماری Urge ہو تو ہم اس Urge کو بھی Fulfil کرتے ہیں۔ اب آپ کو بنیادی تصورات میں تبدیلی معلوم ہو رہی ہے یا نہیں۔ اس طریقہ سے ایک اور بنیادی قدر ——— کے بارے میں شکوک پیدا ہونے لگے ہیں یا نہیں۔ یہ جو انفرادی آزادی ہے اس پر رسوم اور سماج نے بے جا قیود ڈال دیے ہیں۔ ایک فرد کو اس بات کا حق حاصل ہے وہ جس طرح چاہے اپنی زندگی گزارے۔

سہیل۔ مثلاً وطن پرستی ہی کا تصور بدل رہا ہے۔

ڈاکٹر سنگھ۔ بدل گیا ہے۔

بترا۔ میرے خیال میں Sex کے بارے میں جو ملا صاحب نے فرمایا تو یہ تھوڑی بہت تبدیلی تو ہمیشہ سے چلی ہی آ رہی ہو۔ یہ تو Swing of pendulum ہو۔ کبھی ادھر، کبھی ادھر۔

بیر راجہ۔ ہماری زندگی میں یہ جو Political Structure ہو وہ Reflect کرتا ہو۔ اس کا دباؤ بہت سخت ہے۔ اس سنسکار کی گرفت بے حد مضبوط ہے۔ ہم اس سے نکل نہیں پاتے ہیں۔

بترا۔ سوال بنیادی قدروں کا ہو، معاشرتی قدروں کا نہیں۔

بیر راجہ۔ بنیادی قدروں کے معنی کیا ہیں۔

بترا۔ سچائی۔

عابد سہیل۔ سچائی کے معنی ہی بدل گئے ہیں۔

؟ ۔ کیسے ؟

عابد سہیل۔ ایک صنعت کار مزدوروں کا خون چوس کر لاکھوں کروڑوں روپے جمع کرتا ہے۔ وہ قانونی طور پر تمام ٹیکس بھی ادا کرتا ہو کوئی قانون گرفت نہیں لیکن اس کے باوجود اس کی دولت میرے خیال میں غریبوں کی محنت کی چوری ہو۔ اس سے یہ روپیہ چھین لینا قانوناً غلط ہو اور اس کی سزا شاید جیل ہے لیکن میرے خیال میں اس "غیر قانونی" دولت کو اس سے چھین لینا سچائی ہے۔ وہ ہمارا روپیہ ہے۔ وہ میرا روپیہ ہے۔

بترا۔ یہ معاشرتی قدر ہے۔

عابد سہیل۔ یہ معاشرتی قدر نہیں ہے۔ یہ بنیادی قدر ہے۔

بترا۔ ایک بچہ پنسل چراتا ہے۔ آپ اسے جیل کیوں نہیں بھیج دیتے۔

عابد سہیل۔ اس لیے کہ وہ بچہ ہو۔ آپ چوری کیجئے، جیل بھجوا دوں گا (قہقہہ)

ملا۔ اس لیے کہ وہ Triviality ہو۔

بترا۔ میں بھی یہی کہہ رہا تھا۔ ایک لاکھ کی چوری اور پنسل کی چوری میں فرق ہے۔ اسی فرق کو آپ نے اپنی مثال

حسینی ۔ عابد سہیل صاحب یہ جو آپ نئی قدروں کی بات کر رہے ہیں تو آپ نے کبھی دیکھا کہ اس کی تبلیغ کرنے والوں کی زندگی کیا پرانی قدروں کو تسلیم کرنے والوں کی زندگی سے مختلف ہوتی ہے ۔ انھوں نے کیا اپنی بیوی اور بچوں سے محبت کرنا چھوڑ دیا ہے ۔ کیا وہ اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلاتے ۔ ان کے مستقبل کے بارے میں فکر مند نہیں ہوتے ۔ کیا اب اخوت کا پرچار نہیں ہوتا ۔ مساوات کی تبلیغ نہیں ہو رہی ۔ آخر خدمت خلق کیا ہے ۔ آج کیا آپ چوری کو چوری نہیں کہیں گے LOOSE CHARACTER کے آدمی کو کبھی اچھا نہیں سمجھا جاتا ۔ کیا نئے لوگ اسے اچھا کہیں گے ۔

سہیل ۔ مسئلہ یوں نہیں ہے ۔

حسینی ۔ اگر آپ کسی کو قتل کر دیں تو کیا یہ اچھی بات ہوگی ۔

لطیف ۔ حسینی صاحب اس وقت ہم جو کہانیاں پڑھتے ہیں ان میں اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی کہانیوں میں کیا فرق ہے ۔ اگر آپ کو معلوم نہیں ہو کہ یہ کب چھپی ہیں تو آپ ان کہانیوں سے تو کم سے کم یہ اندازہ لگا نہیں سکتے کہ یہ آج کے ادیبوں کی ہیں یا پہلے کے ادیبوں کی ہیں وہی پرانے کردار وہی پرانی باتیں ۔ لوگ باتیں چاہیں کچھ کریں لکھتے وہی ہیں ۔

حسینی ۔ میں نے آزادی کے بعد ، خاص طور سے سرکاری اخباروں میں تعمیری کہانیاں لکھی ہیں ۔ ملک کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لینے کی طرف عوام کو رجوع کیا ہے ۔ یہ کہانیاں پراپیگنڈہ نہیں ہیں ۔ آپ نے سیلاب کی راتیں پڑھی ہوں گی ۔ میں نے خود سیلاب کی دقتیں برداشت کی ہیں ۔ میں نے کہانی لکھنی شروع کی اور ایک کمہار کے گھر میں ایک خراب عورت کو لاکر ڈال دیا ۔ وہاں ان کی چار راتیں گزریں ۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ ہمارے سماج میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو عورت ماڈل بنی وہ خراب ہوئی ۔ ہم ان سب کو خراب کردار کی عورتیں سمجھتے ہیں ۔ خود ان آرٹسٹوں کے بارے میں جو ماڈل لڑکیوں کی برہنہ تصویریں بناتے ہیں عام طور سے لوگوں کا یہی خیال ہوتا ہے ۔

لطیف ۔ آپ نے ۱۹۵۲ء کے آس پاس ایک کہانی لکھی تھی جو ایک خاتون بس کنڈکٹر کے متعلق تھی ۔ وہ ملازمت کرکے باعزت زندگی کے لیے جد و جہد کرتی ہے ۔ لیکن عام انسان اس کی قدر نہیں کرتے ۔

بیر راجہ ۔ کچھ عجیب حالت ہے ۔ آپ کسی سے کہیں گومتی پر نیا پل بنے گا کسی کو دلچسپی پیدا نہ ہوگی ۔

عابد سہیل ۔ میں اس نئی قدر کی بات کر رہا تھا ۔ ایک زمانہ تھا جب عورت کا گھر سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا ۔ آپ آج اس کو بس کنڈکٹر بنا کر تعریف کر رہے ہیں ۔ آج سے پچاس سال قبل جیل جانا عام طور سے معیوب سمجھا جاتا چاہے وہ کانگرس کی تحریک کے سلسلے ہی میں کیوں نہ ہو ۔ آج غلہ تحریکوں اور دوسری تحریکوں میں جیل جانا باعث افتخار سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن ابھی نئی قدروں کو اتنا Recognition نہیں ملا ہے ۔ ان کا صرف ڈھانچہ ہی بن سکا ہے ۔ گوشت پوست انھیں ابھی نہیں ملا ہے ۔ Love thy neighbour ایک بہت پرانی قدر ہے لیکن میں آج اپنے محلہ کے چور بازاری کرنے والے سیٹھ سے قطعاً محبت نہیں کرتا بلکہ بہت دور رہنے والے مظلوم و مجبور انسان سے مجھے محبت ہے ۔

ملا ۔ کچھ بنیادی قدریں ہیں جو بہت دھیرے دھیرے بدل رہی ہیں ۔ کچھ معاشرتی قدریں ہیں جو نہایت تیزی سے بدل رہی ہیں

بترا ۔ وہ تو بدلتی رہیں گی ۔

ملا ۔ قدروں میں معاشی قدریں بھی شامل ہیں اور سماجی بھی ۔ ایک فنکار اگر وہ واقعی فنکار ہے تو اس کے فن میں اس تبدیلی کی نمائندگی ضرور ہوگی ۔ اور بنیادی قدروں کے بارے میں جو شکوک پیدا ہو گئے اس کی نمائندگی بھی اس کی تخلیقات میں ضرور ہوگی ۔

عثمان ۔ ملّا صاحب اگر ایک ادیب یہ محسوس کرے وہ جس سماج میں رہ رہا ہو وہ اس کے خوابوں کا سماج نہیں ہے تو اس کا کیا فرض ہے

ملّا ۔ ادیب کا فرض ہے کہ اس مقصد کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انھیں بے نقاب کرے ۔

رام لعل ۔ یہ تو تبلیغ ہوئی ۔

ملّا ۔ تبلیغ تو انداز بیان میں ہوتی ہے ۔ پیام میں نہیں ۔

عابد سہیل ۔ بالکل صحیح ۔

رام لعل ۔ ابھی حسینی صاحب نے سیلاب کی راتیں کا ذکر کیا تھا مجھے یاد پڑتا ہے کہ لکھنؤ کے سیلاب کے بارے میں تین افسانہ نگاروں نے کہانیاں لکھی تھیں ۔ ایک مسیح صاحب نے ۔ انھوں نے یہ کہانی ایک خاص مذہبی نقطہ نظر سے لکھی تھی ۔ ایک کہانی میں نے لکھی جو بچوں کے نقطہ نظر سے لکھی گئی تھی ۔ اور ایک حسینی صاحب نے لکھی ۔ سیلاب کی راتیں بڑے روانی انداز سے چل رہی تھی کہ حسینی صاحب اتفاقاً یا شعوری طور پر اس میں جنس کو لے آئے ۔ اس سلسلہ میں میں عابد سہیل صاحب سے دریافت کرنا چاہوں گا کہ اس کہانی میں جو Sex آیا ہے وہ اتفاقی ہے یا Sex کے ذریعہ کہانی کو کامیاب بنانے کی ایک شعوری کوشش ہے ۔

عابد سہیل ۔ صاحب میں نے وہ کہانی پڑھی ہے اور دوبار پڑھی ہے ۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ اس میں جنس غیر شعوری طور پر لائے ہیں ۔ حسینی صاحب نے اس کہانی میں Sex کو ایک خاص مقصد سے متعارف کرایا ہے اور اس کے گرد کہانی نہیں ہے ۔ خود حسینی صاحب اس کہانی کو اچھی کہانیوں میں شمار کرتے ہیں لیکن ان کی اس کہانی اور ' ایک غسل خانے میں ' کے بارے میں زبردست اختلاف رائے پایا جاتا ہے ان لوگوں میں بھی جو حسینی صاحب کے فن کے مداح ہیں اور ان میں بھی جو شائد اتنے مداح نہیں ہیں ۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس کہانی میں حسینی صاحب نے جنس کو ضرورت سے زیادہ استعمال کیا ہے ۔ حسینی صاحب مجھے معاف کریں یہ کہانی پڑھتے وقت مجھے احساس ہوا کہ معاملات اس میں شائد ضرورت سے زیادہ بڑھ گئے ہیں ۔ " سیلاب بلا سر سے گزر گیا ہے " (قہقہہ)

اس عورت کی زندگی میں وہ پہلا مرد تھا جس نے جسم کو جسم کے حسن کی حیثیت سے دیکھا ۔ باقی تمام مردوں نے تو اس کے جسم کو جنس کی حیثیت سے دیکھا تھا ۔ اگر ہم اس کہانی کو تمام قاری کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو اس میں جنس ضرورت سے زیادہ ہے لیکن اگر ہم اسے اس کمہار کی آنکھوں سے دیکھیں جس کے ہاتھوں مٹی کے ہی سہی جسم ڈھلتے رہتے ہیں تو اس میں جنس نہیں ہے ۔

اس سلسلہ میں میں ایک دلچسپ واقعہ سناؤں ۔ ایک صاحب ہیں جو مجھ سے مانگ کر شمع پڑھتے ہیں ۔ اس کہانی کی پہلی قسط کے بعد وہ اس قدر بے چین ہوئے کہ روزانہ مجھ سے نئے شمع کے بارے میں دریافت کرتے تھے ۔ یہ سلسلہ چوتھی قسط تک چلتا رہا لیکن چوتھی قسط پڑھنے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے آئے اور بولے کبھی حسینی صاحب نے بیڑا کر دیا ۔ یہ انتظار صرف ان ہی کو نہیں تھا بلکہ ہر جگہ تھا ، ہر شمع پڑھنے والے کو تھا ۔ ویسے جنسی لطف تو ہر ہر چیز سے لیا جا سکتا ہے ، مذہبی کتابوں تک سے ۔ لیکن حسینی صاحب نے جہاں کہانی کو ختم کیا اور جس طرح لوگوں کی امیدوں کے قلعہ کو ڈھایا یہ ان کے فن کی کامیابی ہے معراج ہے ——— برخلاف اس کے اس قدر توقعات پیدا کرنا حسینی صاحب مجھے معاف کریں گے ، ان کے فن کی ناکامی ہے ۔ کہانی ہی نے نہیں بلکہ جنس نے عوام کو اس کہانی کا اتنی بے چینی سے انتظار کرنے پر مجبور کیا ۔

رام لعل ۔ حسینی صاحب کی فنکارانہ مہارت سے تو ظاہر ہے کسی کو انکار نہیں لیکن یہاں دیکھنا یہ ہے کہ اس کہانی سے اگر اس عورت کو نکال لیا جائے تو کیا سیلاب کا المیہ ہمیں متاثر کرتا ہے ۔

میں پیش کیا ہے۔

عابد سہیل ۔ جی نہیں ۔ آپ جسے ایک لاکھ کی چوری کہہ رہے ہیں وہ بھی آپ کے آج کے قانون میں جائز ہے ۔

عثمان غنی ۔ بیرا صاحب میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے بنیادی قدر Abstract ہوتی ہے۔ مثلاً محبت کی عزت کرنا۔ میں کسی سے محبت کروں کسی سے نہ کروں یہ ایک معاشرتی معاملہ ہے۔ پہلے صرف ماں، بہن اور بیوی سے محبت کی اجازت تھی۔ اب دوسری عورتوں سے بھی محبت کی اجازت ہے۔ لیکن محبت وہی ہے۔

بیرراجہ ۔ میرا خیال ہے کہ ادیب کے لیے آج کی Sensibilities کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اگر اس کے پاس یہ فہم ہے تو وہ ہر طرح کی قدروں کو سمجھ لے گا۔ آج متحدہ خاندان کا تصور ٹوٹ چکا ہے۔ سماجی حالات نے ایک دوسرے کو دور پھینک دیا ہے۔

مُلّا ۔ اس وقت ایک ایک بنیادی چیز Revolt of man against the community ہے یہ ایک بنیادی چیز ہے ۔

عثمان غنی ۔ مُلّا صاحب میں پوچھتا ہوں کہ امریکا، برطانیہ یا روس کی جدید تہذیب ابھی ہندستان تک نہیں آئی ہے۔ لیکن وہاں بھی سوسائٹی اتنی Organise نہیں ہوتی۔ کیا ہم اس کو بھی Revolt کہیں گے۔ اور کیا یہ Revolt جائز ہے۔

مُلّا ۔ مغربی ممالک میں ہمارے ملک سے کہیں زیادہ آزادیاں حاصل ہیں۔ وہاں فرد کے رابطے ہمارے یہاں کے مقابلے میں بہت کم ہیں مغرب میں Individual زندگی بسر کرنا آسان ہے۔ ہمارے ادیب اب بھی Every Individual for himself کا قائل ہے باپ بھائی کا Pressure ہے آج انسان یہ سوچتا ہے کہ I must have a fulfil of my life یہ ایک بنیادی اجازت ہے۔

ڈاکٹر ونگھ ۔ آپ اسے Revolt کس طرح کہیں گے۔

بیرراجہ ۔ یہ تو Loneliness ہوئی۔

مُلّا ۔ آپ اسے جو بھی چاہیں نام دیں ۔

عثمان غنی ۔ کیا ادیب کا یہ فرض نہیں کہ وہ صورتِ حال کی Analysis کرکے اسے صحیح اور سالم رجحان عطا کرے۔

مُلّا ۔ ضرور۔ میرا تصور تو ادیب کا یہی ہے کہ اس کے ذہن میں سماج کا ایک تصور ہونا چاہیے۔ کل کا تصور ہونا چاہیے۔ اسے پڑھنے والوں کو اس طرف راغب کرنا چاہیے۔ وجودیت والوں کے لیے سامنے تو کل ہو ہی نہیں۔

بیرراجہ ۔ یہ آپ کا Tomorrow بڑا گمراہ ہے۔ آپ کا اس سے مطلب کیا ہے۔

مُلّا ۔ کل سے میری مراد یہ ہے کہ ادیب کے ذہن میں مستقبل کا ایک تصور ہونا چاہیے۔ ان قدروں کا جنھیں وہ اچھا سمجھتا ہے ایک ایسے سماج کا تصور جس میں ایک فرد کو آزادی بھی حاصل ہے اور امن بھی ہے۔ اسے اس کلچر کے تحت پیغام دینا چاہیے۔

بیرراجہ ۔ یہ تصور کسی بھی ادیب میں آپ کو ملتی ہے۔

مُلّا ۔ بہت سے ادیبوں میں ۔

رام لعل ۔ مثلاً ۔

مُلّا ۔ مثلاً فاکنر کے یہاں، ابرٹ موراویا کے یہاں ۔

[illegible] کے ساتھ کسان پر ایک بہادر عورت پر بھی اور انسان کو [illegible] ہیں۔

[illegible] صاحب ہیں:

[illegible] واقعات کو سیلاب زدہ علاقوں کی چوریاں میں۔

سوال یہ ہے کہ آپ نے افسانہ بدست الیہ میں اس کمہار اور عورت کو کیوں شامل کیا کیا اس کے بغیر کہانی ممکن نہیں تھی [illegible] صاحب سے پوچھوں گا۔

اصل میں میں نے سیلاب کے موضوع پر ایک مکمل ناول کے لیے مواد جمع کیا تھا لیکن اپنی کاہلی کی وجہ سے [illegible] اگر رک گیا۔ میں نے سیلاب زدہ علاقہ کے لوگوں سے تباہی کے بہت سے واقعات سنے۔ لوگ کس طرح ایک [illegible] جا کر [illegible] تک پہونچے۔ مشنریز اور پادریوں نے ان کی کس طرح مدد کی جیسے وغیرہ واقعات مجھ تک پہونچے پھر اس [illegible] میں [illegible] درست۔

[illegible] قدوائی صاحب۔

جی ہاں قدوائی صاحب نے بتایا کہ وہ ایک چھت پر سے گزر رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک عورت چلا رہی [illegible] ہائے میرا مکان گر گیا اور اس کے چاہنے والے اسے مکان سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور کچھ ایسے بھی [illegible] اس کے زیورات کا بکس ہی غائب کر دیں اس کے بعد میں نے ساری صورت حال کو analyse [illegible] اس کمہار کے ساتھ اس عورت کو ڈال دیا جائے۔ لیکن صاحب غور کیجیے کہ میں نے اس کمہار کے لیے کس قدر [illegible] ایک جوان بیٹی کا باپ ہے۔ اس کا ایک بیٹا بھی ہے، اس کی بیوی اس پر حاوی ہے اور وہی اس کا بزنس دیکھتی ہے [illegible] ہے کہ جو ہر وقت اپنے فن میں مگن رہتا ہے۔ اور گنگنایا کرتا ہے، 'کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں' ______ [illegible] کوشش اس وقت کشتی کی صورتی بنا رہا ہے۔ دیوالی آنے والی ہے اور اس نے وعدہ کر رکھا ہے وہ مٹی کی ایک ایسی مورت بنائے [illegible] اور دوسری تمام مورتیوں سے بہتر اور خوبصورت ہوگی۔ اسی وقت یہ عورت [illegible] کی [illegible] ہو رہی ہوتی ہے اس کے بعد اسے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں اس عورت کو دیکھ سکتا [illegible] کپڑوں کے اندر [illegible] ذہنی تصویروں کی مورتیاں بنائی ہیں۔ اگر Realist [illegible] اس نے ایک ساری [illegible] کیا۔ وہ عورت چونکہ ایسی ویسی ہی ہے اس لیے وہ کمہار کو چھیڑتی بھی ہے کہ جب ہمیں بار بار ننگا دیکھ [illegible] ہے ______ لیکن صاحب وہ عورت بھی اس فنکار سے اتنی قدر متاثر ہے کہ جب ڈاکو آ کر اسے [illegible] ہاتھ سے آ کر اس کو آزاد کر دیتی ہے۔ اس طرح کمہار پر اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ اخیر [illegible] مورتی [illegible] میں اسے کشتی بنا کر [illegible] گا۔

[illegible] یہاں اس سلسلے میں [illegible] صاحب سے [illegible]

نئی کتابیں

لب و رخسار

عہدِ حاضر کے سماجی مسائل اور الجھنوں کی بے باکی سے عکاسی کرنے والے ناول نگار منظر سلیم کا نیا ناول لب و رخسار شائع ہو گیا۔ گزشتہ چند برسوں میں منظر سلیم کے متعدد ناولوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو کر فروخت ہو چکے ہیں

ضخامت ۳۲۰ صفحات قیمت چار روپے آٹھ آنے (للعہ)

برف کی دیوار

دو افراد کے دلوں کے درمیان ہو یا دو مذہب کے ماننے والوں کے درمیان اسکے پگھلنے کیلئے دونوں طرف دلوں کی گرمی اور خلوص کی ضرورت ہوتی ہے ملک کے موجودہ حالات کے پس منظر میں اُردو کے مشہور ناول نگار (ن ملیح آبادی) نے یہ چونکا دینے والا ناول خونِ جگر سے لکھا ہے۔

ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قیمت ۴ روپے آٹھ آنے (للعہ)

فوراً اپنے آرڈر سے نوازیئے **کتاب پبلشرز۔ چوک لکھنؤ ۔ ۳**

ماہنامہ کتاب کے ۳ یادگار نمبر

شوکت تھانوی نمبر:- شوکت تھانوی پر یہ ہندوستان میں شائع ہونے والا اور سب سے پہلا نمبر ہے ۲۴۲ صفحات کے اس خاص نمبر میں شوکت تھانوی کی یادگار تصویریں، ان کے فن اور شخصیت پر متعدد مضامین، ان کے بہترین مزاحیوں کے رنگا رنگ انتخاب کے علاوہ ایک ایسا مزاحیہ ڈرامہ بھی شامل ہے جو اس سے قبل کہیں نہیں شائع ہوا اس نمبر کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے

افسانہ نمبر:- اردو افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۲ء میں کم و بیش دو ہزار افسانے تخلیق کیے ان میں سے رام لعل اور عابد سہیل نے ۲۷ افسانے منتخب کیے۔ ان میں کرشن چندر سے لے کر رفعت نواز تک افسانے شامل ہیں۔ سفید کاغذ کے ۲۱۲ صفحات کے اس نمبر کی قیمت صرف ۲ روپے ہے۔

نئی ہندی کہانی نمبر:- ضروری ہے کہ اپنی زبان کے ساتھ ساتھ قومی زبان و ادب کے نئے تقاضوں اور رجحانات کو بھی ذہن میں رکھا جائے کتاب کا یہ نمبر اسی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے، قیمت ایک روپیہ (عہ/)

منیجر ماہنامہ کتاب چوک لکھنؤ ۳

پژمردہ کلیاں کا بقیہ

فالسئی ساری پہنے ایک بار اور دیکھ لوں..... گو یہ مقتضائے شرافت نہیں لیکن شاید یہ میری خواہش ہوگی! صابرہ نے پوچھا "آخری کیوں؟"
میں نے کہا "اس لیے کہ پھر کل سے ایسی خواہش تم سے نہیں کی جا سکتی!"

صابرہ چپکی تھوڑی دیر مجھے ..... پیار سے ..... دیکھا کی اور اس کے بعد اندر چلی گئی۔ پانچ سات منٹ بعد وہی فالسئی ساری اور گلابی شلوکہ پہنے پھر آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں بڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ اور اس تصویر کو دل پر نقش کر کے کانپتے ہاتھوں سے اسے سلام کر کے "صابرہ! ..... جان و دل سے عزیز صابرہ! رخصت! ..... ہمیشہ کے لیے رخصت ..... جاؤ ..... دنیا جہاں کی خوشیاں اور نعمائے الہٰی تمہیں ہمیشہ گھیرے رہیں"!

صابرہ مبہوت بنی چشم پر آب سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھا کی۔ میں اس تصویر کا خزانہ دل میں لیے کمرے کی طرف پلٹا لیکن تھوڑی ہی چلا ہوں گا کہ پلٹ پڑا اور صابرہ سے بولا! "مجھے اپنی بدھی کا ایک پھول دے دو۔ میں اسے حرز جاں بناؤں گا۔!"

صابرہ میری آواز سن کر چونکی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے بدھی اتارنی چاہی میں نے کہا "نہیں صرف ایک مرجھایا ہوا پھول!" اس نے مرجھایا ہوا پھول بدھی سے نکالا لیکن میری طرف کچھ عجیب طرح سے دیکھنے لگی اور اس کی ایک ایک پتی نوچ کر پھینکتی گئی پھر اس ایک مرجھائی کلی نکالی اور ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اور کلی اس میں لپیٹ کر میری جانب پھینک دی۔ میں نے کاغذ کھولا تو اس میں لکھا "صابرہ کا بن کھلا غنچۂ دل"! میں نے کاغذ اور کلی دونوں کو سمیٹ کر ہاتھ میں دبایا اور اسی ہاتھ سے اپنا پاش پاش دل تھا اور اس سے کہا "خیر! زندہ رہو! ..... لیکن خدا نہ کرے تمہارا غنچۂ دل یوں مرجھائے! ..... اچھا صابرہ خدا حافظ ..... جاؤ! ..... میرے سامنے یہاں سے چلی جاؤ!

صابرہ نے مجھے ایک منٹ تک بغور دیکھا ..... اس کی ایک نظر میں ماضی و حال و استقبال کے احساسات و واقعات سب کی ایک جھلک موجود تھی! ..... دفعتاً اس کی آنکھوں سے جاری ہو گئے اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی مڑ مڑ کر مجھے دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں نے صابرہ کی مرجھائی بن کھلی کلی کو آنکھوں سے لگایا۔ ڈرتے ڈرتے پیار کیا پھر دیر تک اس کی خوشبو سونگھتا رہا ..... اسی حالت میں کھڑکی بند کی ..... چکر سا آیا ..... اور وہیں فرش پر بیہوش ہو کر گر پڑا۔

صابرہ کے عقد کو آج پانچ برس ہو چکے ہیں ہمارے ہاں ریت و رسم کی پابندیاں ابھی اسی طرح قائم ہیں ہندوستانی معیار شرافت اب تک زنجیر پا ہے اس لیے اس دن کے بعد سے پھر میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن دلوں کے ناسور اور زخم کی گہرائی کی کیفیت کا اس سے اندازہ کیجئے کہ ہر سال عقد کی تاریخ کو میرے پاس کہیں کی طرف سے کاغذ میں لپٹی ہوئی مرجھائی بن کھلی کلی بھیج دی جاتی ہے۔ اور میں اسے اس کی ہم جلیسوں کے ساتھ صندوق میں بند کرتا جاتا ہوں۔ دوست احباب نے اگر کبھی دیکھ لیا اور پوچھا کہ "بھئی یہ کلیاں کیسی ہیں؟" تو میں ان سے یہ کہہ دیتا ہوں کہ یہ تابوت کے پھول ہیں! لیکن ان میں سے کسی کو یہ نہیں معلوم کہ یہ تابوت میری زندگی بھر کی تمناؤں اور امیدوں کا ہے اور یہ پھول وہی چڑھاتا ہے جس نے ہماری معاشرت کا آلہ کار بن کر ان کا خون کیا! ..... عجب نہیں کہ غنچوں کا یہ ڈھیر قبر میں میرے ساتھ ہو اور محشر کے دن جب یہ کلیاں پھولیں اور ان میں بہار کی تازگی پھر آ جائے تو میں ان کا ہار گلے میں ڈالے مستوں کی طرح جھومتا کسی کو تلاش کرتا پھروں ..... لیکن

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

ایک ایسے دور میں

جب ادبی رسائل ایک ایک کر کے دم توڑ رہے ہیں

"کتاب"

شوکت تھانوی نمبر، افسانہ نمبر، نئی ہندی کہانی نمبر اور

علی عباس حسینی نمبر ایسی

لازوال اور بے مثال اشاعتوں کے بعد

پنجابی کہانی نمبر

پیش کرنے کا اعلان کرتا ہے

مزید تفصیلات کے لیے اگلا شمارہ دیکھیے

زر سالانہ - ۶ روپے بھیج کر آپ یہ نمبر مفت حاصل کر سکتے ہیں

کتاب

اعلیٰ صحت مند ادب کا ترجمان ہے

منیجر ماہنامہ کتاب، چوک، لکھنؤ ۳

...th the Registrar of Newspapers at R. N. No. 6988/62
'KITAB' MONTHLY,
...r, 1964 LUCKNOW-3 Reg. No. L-1781

"جی آپ کی مرضی" شوکت بیگم نے کسی جوش و خروش کا اظہار کیے بغیر جواب دیا۔

بیوی کے منہ سے ہوں ہاں سن کر انھیں کچھ تسلی نہ ہوئی۔ کہاں تو اتنا جوش و خروش تھا۔ دن بھر خود باہر کا کمرہ صاف کرایا تھا۔ اوپر کا کمرہ سجایا تھا۔ بیٹے کو دیکھنے کا ایسا چاؤ تھا۔ اور کہاں اب "جی آپ کی مرضی"۔

بولے "کیا لڑکا پسند نہیں آیا؟"

شوکت بیگم نے سروتہ پاندان میں رکھا۔ گلوری منہ میں دبائی اور بولیں "اے ہے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا خوشی میں اچھلوں کودوں۔ سروری بیگم لاکھ آپ کی بہن سہی لیکن ہیں تو پرائے گھر کی اور انور میاں ان کے دیور ہی تو ہیں۔ کوئی سسرال والوں کے سامنے بات پکی ہونے سے پہلے ایسی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ سن لیں گی تو سوچیں گی لڑکی بھاری ہو رہی تھی۔"

بات سیٹھ جی کی سمجھ میں آ گئی۔ انھوں نے اپنے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی پیدا کی۔ لیکن خوشی تھی کہ بتی کھوں کے باہر نکلی آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر چپ رہے۔ پھر بولے "بھئی اور چاہے کچھ ہو پر اب تک جتنے لڑکے دیکھے ہیں ان میں تو سب سے اچھا ہے۔ بس ذرا سن زیادہ ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اور ایسا کوئی زیادہ فرق بھی نہیں۔" انھوں نے بیگم کی طرف دیکھا۔ اور بات جاری رکھی "اور پھر ہم دونوں کی عمروں میں بھی تو کافی فرق تھا۔ میں تو سروری سے ہاں کہے دیتا ہوں۔"

"آپ کی یہ عمر ہو گئی لیکن جلد بازی نہ گئی۔" شوکت بیگم نے دوپٹہ سر پر ڈالا "کوئی اب پرانا زمانہ تو ہے نہیں کہ ماں باپ نے جس کو چاہا بیٹی کا ہاتھ تھما دیا۔ نگارش کو پڑھایا لکھایا ہے۔ یونیورسٹی سے بی۔ اے کرایا ہے تو اس کا بھی عندیہ معلوم کر لیا جائے۔"

"واہ بیگم تم رہیں نری بچی کی بچی" سیٹھ صاحب اس وقت بڑے خوش نظر آ رہے تھے "اب تم جاؤ گی نگارش سے پوچھنے کہ تجھے رشتہ پسند ہے یا نہیں۔ دیکھا نہیں جب سے انور میاں آئے ہیں کمرے سے نکلی ہی نہیں۔"

شوکت بیگم نے شوہر کی طرف دیکھا اور بولیں "وہ شرمیلی ہے اور خود کچھ نہ کہہ پائے تو ہم اسے جس کے چاہیں حوالہ کر دیں۔ خدا بھلا میں پوچھنے جاؤں گی۔ یہ کام آپ میرے اوپر چھوڑ دیجئے۔ عذرا گھر گئی ہے شام کو آئے گی تو اسی سے پچھوا لوں گی۔ ابھی ہاں نہ کہیے گا۔"

ابھی سروری بیگم سے بھائی یا بھاوج نے ہاں نہیں کی تھی لیکن برتاؤ اور پھر کل صبح سے اس وقت تک کی خاطر مدارات سے وہ یہ ضرور سمجھ گئی تھیں کہ یہ رشتہ بس منظور ہی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ کل صبح جب وہ واپس جانے لگیں گی تو انور میاں کی ماں کی طرف سے امام ضامن نگارش کے بازو میں باندھ دیں گی اور یاقوت کی انگوٹھی جو ان کے بکس کے اوپری خانہ میں ایک ڈبیہ کے اندر محفوظ ہے نگارش کی انگلی میں سرک چکی ہو گی۔

انور میاں کے پاس سے سروری بیگم اوپر کوٹھے پر سے اتریں تو بیحد مسرور تھیں اتنی رات گئے تک بھاوج کو جانماز پر دیکھ کر انھیں کچھ حیرت ضرور ہوئی لیکن یہ سوچ کر کہ لڑکی کا رشتہ پکا کرنا ہے کچھ دعا درود پڑھ رہی ہوں گی۔ وہ اپنی مسہری پر جا کر دراز ہو گئیں۔ شوکت بیگم نے دوا سے نگار کو اپنے پاس بلوایا۔ اور گھٹنے کے قریب جانماز پر بٹھا لیا۔ اور ایک لمبی سی دعا پڑھ کر اس کی پیشانی پر دم کی دونوں ہاتھوں سے بلائیں لیں۔ اسے سینے سے لگایا اور پھر ان کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے۔ وہ کیا دعا مانگ رہی تھیں یہ نگارش کی خاک سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ گلا رندھا ہوا تھا۔ اور سینے پر بیٹی کے سر کے بوجھ سے آواز دبی دبی نکل رہی تھی۔ پر اس نے اتنا ضرور سنا "یا اللہ میرے گناہوں کو معاف کیجیو! سوچتی ہوں کس منہ سے سامنا کروں گی اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ یا اللہ (انھوں نے ایک ہچکی لی) میری بیٹی کی زندگی میں ایسا کوئی لمحہ نہ لائیو۔ اسے آزمائش میں نہ ڈالیو۔"

نگارش تھوڑی دیر تک تو اسی طرح ماں کے سینے سے سر لگائے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھیں پر ماں کے سامنے رو کر وہ انھیں اور رنجیدہ نہ کرنا چاہتی تھی۔ اور کل شام

مہیش بخشی
ترجمہ: بیر راجہ

میز پر ٹکی ہوئی کہنیاں

کہنیاں میز پر ٹکی تھیں اور دونوں ہاتھ سر پر اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے سر ہی دونوں ہاتھوں پر رکھا ہوتا لیکن کچھ اس طرح بے تھے کہ ان کی انگلیوں کے گیلے پن سے دونوں کلائیوں پر سوکھی گیلی سلوٹ سی بن گئی تھی۔ یہ حالت سویرے سے ہے۔ سویرے سے تو کیا، سچ بات تو یہ ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں اسی وقت سے ہے۔ صبح پہاڑ، شام پہاڑ، رات پہاڑ اور اوپر سے نوکری، جوانی اور شہر بھی پہاڑ، اس ست پڑا پہاڑ میں ایسا بھٹکا ہوں، اس لئے شہر میں آ کر کہ چہرہ پر جیسے اداسی کا تیل الیپ سے ہو گیا ہو۔ بارہوں مہینے بہار رہے گا۔

آب و ہوا کا کوئی اثر بھی نہیں ہوتا۔ لگتا ہے جیسے ہنسی اور مکان کو دیش نکالا دے دیا گیا ہے۔

سوچ ہی رہا تھا کہ کبھی موڈ ٹھیک ہو گا بھی یہاں، کبھی سمجھ دیکھی لگا یہاں کی دھول سے کہ دروازہ بجا۔ کون ہو گا؟ ڈاکٹر ہی ہو گا۔ چلا آتا ہے بور کرنے یا پھر جہاز اور اترتے پرندوں والی چھپائی کی ہینڈلوم اسکرٹ پہنے وہی لڑکی ہو گی ——— منہ پونچھا ذرا تیار ہوا، رد نہیں رہا تھا۔ ایسا پوز بنایا۔ دروازہ کھولا۔

"تم بھی خوب ہو پروفیسر۔ دروازہ کیوں بند کیے رہتے ہو بھائی؟" ڈاکٹر ہی تھا۔ ہاتھ میں بیگ لیے شاید اسپتال سے لوٹا ہو۔ سواگت کیا۔ میں نے ٹھیک اسی تالاب کے پانی سا ٹھنڈا سواگت کیا جس کا پانی اوپر سے جم گیا ہو اور جس میں پتھر پھینکنے سے ایک کیا آدھی لہر بھی نہ اٹھ پا رہی ہو۔

ڈاکٹر کرسی پر آ جما۔ بولا "دو برس میں ریسرچ پوری ہو جائے گی۔ چھوت چھات کی بیماریوں کے مریضوں پر اتنی تفصیل سے کسی نے ریسرچ نہیں کی ہے اب تک۔ میں نے سوچا ہے کہ ٹی۔ بی، ہیضہ، کالرا، فلو سب میں یہ کام کر ڈالوں۔" وہ جیب سے سگریٹ نکالنے، پھر ماچس ڈھونڈھنے اور پھر سگریٹ کو ہونٹوں کے درمیان دبا کر اسے جلانے میں لگ گیا۔

"ہاں" میں بولا تو پر بولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کس ڈاکٹر کا پڑوسی بن بیٹھا کہ ہر لمحہ سر پر سوار رہتا ہے۔ آئے گا اور کر دے گا شروع "ان چھوت کی بیماریوں کے کیڑے بڑے خطرناک ہوتے ہیں، بڑی تیزی سے پھیلتے ہیں، لاکھوں کی تعداد میں پیدا ہوتے ہیں یہ۔ میں نے تو دوربین سے ان کی چھوٹی چھوٹی قسموں کو دیکھا ہے۔ پروفیسر کسی دن آؤ نا اسپتال میں تو دکھاؤں میں تم کو یہ کیڑے۔ عجیب ہوتا ہے ان سالوں کا چلنے کا طریقہ۔ ٹی بی والے کیڑے ماں کے جسم سے بیٹے کے جسم میں اس کے بیٹے کے جسم سے ———" اس کی بات سنتے سنتے مجھے کئی بار ایسا لگتا رہا ہے کہ مختلف طرح کے کچھ کیڑے اس ڈاکٹر کے دماغ سے میرے دماغ میں منتقل ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر سگریٹ پیتے پیتے بولا "یار، ذرا ہنسا بولا بھی کرو، کیا رکھا ہے اس زندگی میں۔ میرے گھر دیکھو نا سب خوش ہیں۔ مسز طرح طرح کے آملیٹ بنانے میں لگی رہتی ہیں، لڑکی ہے تو وہ ہمیشہ ہنستی ہی رہتی ہے۔ ایک ہزار روپیہ دوں پروفیسر کسی دن اگر اداس پا جاؤں اسے پانچ منٹ کے لیے بھی۔ اور بھیا میں تو لگا ہوں چھوت کی بیماریوں پر ریسرچ میں۔ ہے مزے دار سبجیکٹ۔"

میں اپنے صدمے میں گھسا جا رہا تھا، سو چڑھ کر بولا "کبھی اس بیماری کے علاوہ اور کوئی بات بھی کرو گے۔" وہ ہنس کر بولا "اچھا اب تمہارے بارے میں کرتا ہوں باتیں۔ تمہیں کیسی لگتی ہیں اس چھوت کی بیماری کی باتیں؟" وہ ہنسا اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ چلا گیا تو